اردو شاعری میں اہم سانحات کی عکاسی اور اُن کا فکری پس منظر

(تحقیقی و تنقیدی مطالعہ)

جلد اوّل

مقالہ برائے پی ایچ۔ ڈی۔

مقالہ نگار

فیض الدین احمد
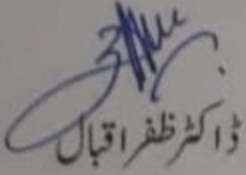
نگران

پروفیسر ڈاکٹر ظفر اقبال

شعبہِ اردو، جامعہ کراچی

۲۰۱۹ء

تصدیق نامہ

تصدیق کی جاتی ہے کہ فیض الدین احمد نے یہ مقالہ میری زیرِ نگرانی مکمل کیا ہے۔ یہ مقالہ اوریجنل مواد پر مشتمل اور ہر قسم کے سرقے سے پاک ہے۔

یہ مقالہ کسی دیگر یونی ورسٹی میں، کسی بھی ڈگری کے لیے پیش نہیں کیا گیا۔ میں اس مقالے کو جانچ اور تجزیے کے لیے کراچی یونی ورسٹی میں پیش کرنے کی اجازت دیتا ہوں۔

ڈاکٹر ظفر اقبال

پروفیسر میریٹوریس

DR. ZAFAR IQBAL
Prof Meritorious
Dept. of Urdu
University of Karachi

فہرست

ملخص		
پیش لفظ		۱
مقدمہ		۳
باب اوّل	سانحہ، حادثہ، المیہ، واقعہ: تشریحات اور مباحث مع شعری امثال	۶
باب دوم	آغاز تا سترھویں صدی میں اردو کا سانحاتی شعری منظر نامہ: محرکات وعوامل	۱۹
	۔ امیر خسرو اور حسن سجزی کا واقعہ اسیری: چند مغالطوں کی تصحیح اور ہندوستان میں فارسی شاعری کا سانحاتی بیانیہ	۲۳
	۔ سیدی مولا کے قتل کا سانحہ	۴۷
	۔ غیاث الدین تغلق کی ناگہانی موت	۴۷
	۔ پایۂ تخت کی منتقلی؛ ہجرت کا کرب اور دلّی کی حالتِ زار	۵۰
	۔ جنگِ تالی کوٹ؛ جنوبی ہند میں اردو شاعری کا ابتدائی سانحاتی بیانیہ	۵۵
	۔ اردو شاعری کا دکنی دور: عشقیہ مثنویوں میں رزمیہ عناصر؛ دورِ انتشار؛ قحط کے اثرات	۷۷
	۔ تانا شاہ: زوالِ سلطنتِ دکن	۹۳
باب سوم	اٹھارھویں صدی میں اردو کا شعری منظر نامہ	۱۱۸
	۔ اورنگ زیب کی وفات: دورِ انتشار	۱۱۹
	۔ مغلیہ حکومت کا دورِ زوال: سیاسی ومعاشی ابتری	۱۲۲
	۔ کمزور حکومتیں: محمد شاہ رنگیلا کا دورِ حکومت؛ نادر شاہی حملے	۱۲۸
	۔ احمد شاہ ابدالی کے حملے: دلّی کی بربادی کا سانحہ	۱۳۰
	۔ شکستِ سراج الدولہ اور ٹیپو سلطان	۱۴۹
باب چہارم	اردو کا شعری بیانیہ: انیسویں صدی کے اہم سانحات	۱۷۶
	۔ انگریزوں کی سازشیں؛ سکھوں کا زوال	۱۷۶
	۔ انتزاعِ سلطنتِ اودھ؛ واجد علی شاہ اختر کی اسیری	۱۹۱
	۔ جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء؛ مغل سلطنت کا خاتمہ؛ بہادر شاہ ظفر کا واقعۂ اسیری	۲۰۳
باب پنجم	اردو کی سانحاتی شاعری: بیسویں صدی کا ربع اوّل	۲۴۹
	۔ طغیانیِ رودِ موسیٰ: اردو شاعری میں سانحات کے اظہار کی روایت کا ایک گمشدہ باب	۲۴۹

	– تقسیم اور تنسیخ بنگال: محرکات اور عوامل	۲۸۰
	– سانحہ مسجد کان پور اور شہید گنج: مسلمانوں کا ردِ عمل	۳۰۸
	– جلیاں والا باغ: محرکات اور عوامل اور شعری منظر نامہ	۳۴۴
	– عثمانی خلافت: برعظیم میں سیاسی ہل چل، طرابلس اور بلقان کی جنگیں؛ جنگِ عظیم اوّل	۳۶۹
باب ششم	اردو کی شاعری میں سانحات کی عکاسی: بیسویں صدی کا ربع دوم	۴۴۴
	– قحطِ بنگال: انسانی بے حسی؛ انگریزوں کی سازشیں، ناقص منصوبہ بندی	۴۴۴
	– جنگِ عظیم دوم: برعظیم کا شعری بیانیہ	۴۷۸
	– تقسیم ہند: محرکات اور عوامل، کانگریس اور مسلم لیگ کے اختلافات	۵۴۹
باب ہفتم	اردو شاعری میں سانحات کی پیش کش: بیسویں صدی کا ربع سوم	۶۵۳
	– تنازعۂ کشمیر: حل طلب مسئلہ	۶۵۳
	– مسئلۂ فلسطین: عالمی اداروں اور بڑے ممالک کی ناکامی	۷۴۳
	– ۱۹۶۵ء: محرکات و عوامل	۸۶۲
	– سقوطِ مشرقی پاکستان: پاکستان کا دولخت ہونا	۸۸۲
باب ہشتم	اردو شاعری کا سانحاتی منظر نامہ: بیسویں صدی کا ربع آخر	۱۰۰۶
	– کراچی: تاریخ، ہجرت، سیاسی رسہ کشی اور انتشار	۱۰۰۶
ماحصل		۱۱۶۶
کتابیات		۱۱۷۱

ملخص

اس تحقیقی مقالے میں اردو شاعری کے اس بیانیے کو بھرپور انداز میں پیش کیا گیا جس کا راست تعلق مقامی اور عالمی سطح پر رونما ہونے والے سانحات سے ہے۔ اس میں ابتدا تا بیسویں صدی کی شاعری کو پیش نظر ضرور رکھا گیا ہے لیکن اس تحقیقی مقالے کا خصوصی موضوع بیسویں صدی کے اہم سانحات اور اس کا شعری منظر نامہ ہے جو مستقبل کے کسی بھی مورخ کے لیے ایک اہم ماخذ کے طور پر استعمال میں لایا جاسکتا ہے۔ اردو شاعری کے ضمن میں یہ مطالعہ اس لیے بھی ناگزیر ہے کہ اس مطالعے نے نہ صرف ایک بڑے خلا کو پر کیا ہے بلکہ اردو شاعری کا ایک خوب صورت منظر نامہ جس میں نمائندہ اور نسبتاً کم معروف شاعروں کی تخلیقات بھی سامنے آسکی ہیں۔

مستقبل کے محققین کے لیے یہ مطالعہ اس طور پر بھی مفید ہوسکتا ہے کہ بیسویں صدی کے بہت سے ایسے واقعات ہیں جو کمیت اور کیفیت کے لحاظ سے اہم ہیں لیکن ان پر شاعرانہ ردعمل کم ملتا ہے جو بلا شبہ قابل تحقیق ہے کہ ان محرکات اور عوامل کا پتا چلایا جائے تاکہ اردو کی ادبی تاریخ نویسی ایسے عناصر سے خالی نہ رہ پائے۔ اس مطالعے میں ابتدائی ابواب تمہیدی ہونے کے باوجود تفصیلات کے حامل ہیں بلکہ بیسویں صدی کی اسالیب شاعری سے بھی مربوط ہیں۔ اس مطالعے کے ذریعے اظہار کی سطح پر ایسی لفظیات اور اسالیب بھی سامنے آئی ہیں جو اس مطالعے سے قبل ہمارے محققین اور تجزیہ نگاروں کے ہاں خال خال ہی موضوع بنی ہیں۔

بلا مبالغہ یہ مطالعہ ایک بڑے دور کا احاطہ کرتا ہے جس کی وجہ سے اسالیب شاعری پر تجزیہ کی کمی محسوس کی جاسکتی لیکن یہ امر بھی تسلی بخش ہے کہ بیسویں صدی کے کسی ایک عنوان کے تحت بھی نمائندہ اور کم معروف شعرا کی تسلی بخش تخلیقات کی کھوج لگائی گئی ہے۔ اس مطالعے کی یہ دَین بھی ہے کہ بعض موضوعات کو پہلی بار اس مقالے میں تحقیق کا موضوع بنایا گیا ہے خصوصاً شعری حوالے سے ان موضوعات پر اردو کی ادبی تاریخیں بھی تہی دست ہیں۔ اس ضمن میں طغیانیِ رودِ موسی، تنسیخ بنگال کا سانحہ، جلیاں والا باغ کا سانحہ، قحطِ بنگال کا سانحہ اور دوسری جنگ عظیم کا سانحہ وغیرہ مثال کے طور پر پیش کی جاسکتی ہیں۔ اس مطالعے سے یہ بات بھی سامنے آئی ہے کہ بعض سانحات اپنے موضوعات کی گہرائی اور پھیلاؤ کی وجہ سے علاحدہ سے تحقیق کا موضوع بنائے جاسکتے ہیں مثلاً سقوط ڈھاکا اور کراچی جیسے موضوعات پر مزید تحقیق کرکے اس خلا کو پُر کیا جاسکتا ہے۔ اس مطالعے کی خاص بات یہ ہے کہ اردو شعرا علاقائی حدود سے پرے جو سانحات رونما ہو رہے تھے ان پر بھی ایک خاص انداز میں ردعمل ظاہر کرتے نظر آتے ہیں مثلاً عالمی تناظر میں جنگ عظیم اول اور دوم کا واقعہ ہو یا خلافت کی تنسیخ، سانحہ فلسطین ہو یا افغان وایران کی جنگیں، ہر موضوع پر اردو شعرا کا ردعمل ملتا ہے جس سے اردو شاعری کے عالمی بیانیے کو تقویت ملتی ہے۔ اس مقالے میں مختلف سانحات کے ضمن میں شعری امثال پیش کرنے سے قبل قاری کو اس واقعے کے تاریخی تسلسل سے بھی آگاہ کرنا ضروری سمجھا گیا ہے تاکہ ان سانحات کی بھرپور تصویر سامنے آسکے اور اس کی مدد سے اس شعری بیانیے کو سمجھنے میں مدد ملے۔

ABSTRACT

This thesis aims at providing a detailed account of Urdu poetry replete with feeling of dejection and reaction followed by tragic events such as wars; death of emperor Aurangzaib Alamgir; invasion of Nadir Shah and Ahmed Shah Abdali; defeat of Sirajudolah and Tipu Sultan; decline and fall of the Mughal Empire; British rule and atrocities created by them and so on. This dissertation covers tragic events taken place well before the seventeenth century to the twentieth century. The research pertaining to 14 tragic events of the twentieth are primarily focused. Rests of the chapters are of introductory nature in which the writer of the thesis has carried out research using the primary and secondary sources.

As has been said earlier, the thesis focused tragic events of the twentieth century because in the entire century no research work have so been done to trace the motives behind the tragedies nor their depiction in Urdu poetry. It would not be out of place to cite here some of the events of the twentieth century for which this research work would not only be pioneering but it will serve a reliable source for the historians to revisit. Flood of Rood-e Mosi (tughyan-e rood-e mosi); Bangal Tragedy (tansikh-e Bangal ka saneha); Bagal Famine (qaht-e bangal ka saneha); Jalianwala Bagh Massacre (Jalianwala bagh ka saneha) and the World War II (dosri jang-e azeem ka saneha) are of pertinent examples of this work for which exhaustive research on account of their historical accounts and their portrayal in Urdu poetry has been carried out for the first time.

Aside from the events mentioned above, the rest of the events of twentieth century are of great importance in the literary historiography of Urdu as many of the Urdu literary historians have little touched these topics of the twentieth century. Therefore, this work would serve to fill the vacuum left by historians.

The researchers would really notice and attempt to resolve why some of the tragic events where Urdu poets overreacted and on the other hand few tragedies where Urdu poets little noticed. This research work has another contribution for Urdu literature that many of little known and unknown Urdu poets have for the first time been discussed how they shared their feeling of dejection and reaction followed by incidents of national and international importance.

The continuous journey of this research spans over five years. In these years, much work done to reach the primary, secondary and few unpublished sources for the events of the twentieth century. As the numbers of event were more than expected for the thesis of PhD, the writer focused to present the Urdu poetry emerged after any event selected. Here the writer must confess about the little amount of analysis for dejected Urdu poetry for which I should have done more. On the other hand, the huge amount of poetical references have been made which will enable the Urdu critic to know which and why some poetical forms used frequently by poets to express their feeling of dejection.

Keywords:

Urdu poetry of dejection and reaction; little known Urdu poets; portrayal of tragic events of twentieth century in Urdu poetry

پیش لفظ

پی ایچ ڈی کی سند کے حصول کے لیے اس تحقیقی کام کا ڈول تقریباً پانچ برس قبل ڈالا گیا تھا۔ موضوع کے پھیلاؤ کے باعث اس دوران متعدد مواقع ایسے آئے جب ہمت و طاقت جواب دینے لگی۔ تاریخ کے مختلف واقعات و سانحات کے مطالعے کے دوران یہ اندازہ ہوا کہ اس قدر متنوع موضوع کو بیک وقت دیکھنا اور اُن سانحات کے شعری بیانیے کی تلاش کوئی سہل کام نہ تھا۔ کبھی کبھی تو بہ قولِ غالب یوں بھی محسوس ہوا کہ:

دل میں طاقت جگر میں حال کہاں　　　ایسا آساں نہیں لہو رونا

لیکن احباب کی حوصلہ افزائی نے میری ہمت کو جلا بخشی اور میں اس کام سے مستقل وابستہ رہا۔ اس اثنا میں اداروں اور احباب کے اصرار پر ایسے تحقیقی مقالات بھی تحریر کرنے پڑے جن کا میرے پی ایچ ڈی کے موضوع سے راست تعلق نہ تھا جس کی وجہ سے مقالے کی پیش رفت میں وقفے وقفے سے کچھ تعطل بھی رہا۔ کبھی کراچی یونی ورسٹی کے شعبہ تاریخ کی جانب سے تاریخ کے موضوع پر عالمی کانفرنس میں مقالہ پیش کرنا پڑا اور کبھی بابائے اردو مولوی عبدالحق کی جانب سے قائم کردہ انجمن ترقی اردو کے سہ ماہی مجلّے 'اردو' کے مدیر کی جانب مقالے تحریر کرنے کا اصرار رہا۔ کبھی گورمانی انسٹی ٹیوٹ آف لینگویجز کے تحقیقی مجلّے 'بنیاد' کے لیے مقالہ لکھنا پڑا اور کبھی ادارۂ معارفِ اسلامی کی جانب سے بہ عنوان 'جنوب مغربی ایشیا کا علمی تناظر: تاریخ، تہذیب اور ادب' کے لیے نگارشات پیش کرنی پڑیں۔ ظاہر سی بات ہے کہ ان کاموں کے لیے وقت درکار تھا۔ بہرحال تمام تر رکاوٹوں اور دشواریوں سے نبرد آزما ہوتے ہوئے اس تحقیقی مقالے کی تکمیل کا وقت آن پہنچا جس کے لیے میں اللہ رب العزت کا شکر گزار ہوں جس نے اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی ہمت و صلاحیت مجھ ناچیز کو عطا کی۔

اس تحقیقی کام میں ابتدا تا بیسویں صدی تک اردو شاعری کے اس بیانیے کو موضوع بنایا گیا ہے جس کا راست تعلق مختلف سانحات، المیوں اور ان کے ردِعمل سے ہے۔ اس طویل دورانیے پر محیط تحقیقی کام کے لیے ضروری تھا کہ اُن اہم بنیادی و ثانوی مآخذ تک رسائی حاصل کی جائے جو مختلف کتب خانوں سے استفادے کے بغیر ممکن نہ تھا۔ اس مقصد کے حصول کے لیے اہم تخصیصی کتب خانوں سے رجوع کیا گیا جن میں کتب خانہ شرف آباد بیدلؔ لائبریری، کراچی، بابائے اردو کی قائم کردہ انجمن ترقی اردو کی لائبریری، ادارۂ یادگار غالب، بیت الحکمت کراچی، لیاقت نیشنل لائبریری کراچی، ڈاکٹر محمود حسین لائبریری کراچی یونی ورسٹی کے ساتھ ساتھ کچھ ذاتی کتب خانوں مثلاً مشفق خواجہ میموریل لائبریری، پروفیسر ڈاکٹر ظفر اقبال صاحب اور پروفیسر ڈاکٹر معین الدین عقیل صاحب کے کتب خانوں سے بھی استفادہ کیا گیا۔ آن لائن کتب خانہ ریختہ نے کام میں بہت آسانیاں پیدا کیں اور سیکڑوں کم یاب کتب ایسی تھیں جن کا حصول ریختہ کے بغیر پاکستان میں ممکن نہ تھا۔ میں ریختہ کے منتظمین کا بھی تہِ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔

ان کتب خانوں سے وابستہ احباب نے مثالی تعاون کیا جس کی وجہ سے یہ احباب میرے خاص شکریے کے مستحق ہیں۔ ان میں بیدلؔ لائبریری کے محمد زبیر صاحب اور امان صاحب کا خاص طور پر ممنون رہوں گا کہ انھوں نے بیک وقت درجنوں کتب و رسائل میری

رسائی کو ممکن بناتے ہوئے علمی تعاون کے لیے کشادہ دلی کا مظاہرہ کیا۔ ادارۂ یادگارِ غالب کے محمد نسیم صاحب اور محترمہ نازیہ صاحبہ، انجمن ترقی اردو کے معروف صاحب اور ان کے معاون عذیر صاحب، مشفق خواجہ میموریل لائبریری کے ناصر جاوید صاحب، نوید صاحب اور صابر صاحب وغیرہ نے ہمیشہ علمی تعاون کا سلسلہ جاری رکھا جس کی وجہ سے ان احباب کی خندہ پیشانی کا نقش میرے دل پر مزید گہرا ہوا ہے۔ اللہ رب العزت ان کی زندگیوں برکت اور آسانی مہیا فرمائے۔

اس تحقیقی کام میں میرے مشفق اور فاضل نگران پروفیسر ڈاکٹر ظفر اقبال صاحب نے ہر لمحے میرا ساتھ دیا۔ اس دوران ہمیشہ اُن کی مدداور راہ نمائی کا سلسلہ جاری رہا۔ جب بھی کوئی دشواری پیش آئی تو انھوں نے اپنا قیمتی وقت نکالا اور میری مشکلاتِ تحقیق کو حل فرمایا۔ اُن کے اعتماد کی وجہ سے یہ ممکن ہوسکا کہ میں اس مشکل موضوع پر مبسوط تحقیقی مقالہ لکھنے میں کامیاب ہوسکا۔ ڈاکٹر صاحب کی شخصیت کی درست ترجمانی کے لیے سرور بارہ بنکوی کا یہ شعر برمحل ہے:

جن سے مل کر زندگی سے عشق ہو جائے وہ لوگ　　　آپ نے شاید نہ دیکھے ہوں مگر ایسے بھی ہیں

اس تحقیقی کام کے دوران پروفیسر ڈاکٹر معین الدین عقیل صاحب اور پروفیسر ڈاکٹر رؤف پاریکھ صاحب جیسے علم پرور اساتذہ کا بھی ساتھ رہا۔ انھوں نے مفید مشوروں سے نوازا جس کے باعث مقالہ لکھنا آسان ہوسکا۔ میں ان اساتذہِ کرام کا بھی ممنون ہوں جنھوں نے قدم قدم پر میری راہ نمائی کی اور قیمتی مشوروں سے نوازا۔

اس کام کے دوران اکثر دوستوں کا بھی خوش گوار ساتھ رہا جن کے مفید مشوروں کا اعتراف کرنا مجھ پر واجب ہے۔ ان میں ڈاکٹر داؤد عثمانی، ڈاکٹر طاہر قریشی اور ڈاکٹر خالد امین قابل ذکر ہیں لیکن ایک شخصیت ایسی ہے جن سے اظہارِ تشکر کے لیے الفاظ میرا ساتھ نہیں دے سکتے۔ وہ میرے عزیز دوست ڈاکٹر جاوید احمد خورشید ہیں۔ مجھے یہ اعتراف کرنے میں کوئی عار نہیں کہ ڈاکٹر جاوید کی مدد اور تعاون کے بغیر میرے لیے اس مقالے کی بروقت تکمیل ممکن نہ ہوتی۔ متعدد مواقع پر ان کے عملی تعاون نے میرے کام کے بوجھ کو نہ صرف کم کیا بلکہ حروف چینی جیسے مرحلے کو آسانی اور وقت پر انجام کار تک پہنچایا۔ میں دل کی گہرائیوں سے ان کا ممنون رہوں گا۔

اس ضخیم تحقیق مقالے کی کتابت ایک صبر آزما کام تھا جسے جناب جاوید عالم صاحب نے نہ صرف بہ خوبی انجام دیا بلکہ متعدد بار ان کی مستعدی نے مجھے کام کرنے پر مجبور کیا۔ جاوید عالم صاحب کو میں نے ایک نہایت فرض شناس فرد پایا جو اپنی شخصی خوبیوں میں ایک کاتب سے بڑھ کر ایک باریک بین اور محتاط فرد ہیں۔ اللہ ان کی زندگی میں برکت عطا فرمائے۔ آمین

یہ تحقیقی کام میری اہلیہ اور بچوں کے لیے ایک صبر آزما تجربہ رہا کہ انھوں نے میری ان مصروفیات کو خندہ پیشانی سے قبول کیا۔ گھر کے مختلف کمروں میں بکھرے ہوئے کتب ورسائل کے انبار کی وقتاً فوقتاً ترتیب وصفائی کا کام ہو یا مختلف کتب ورسائل سے کشید کردہ حوالہ جات ہوں، میری اہلیہ اور بچوں نے اس بات کو ملحوظِ خاطر رکھا کہ کبھی کوئی چیز اپنی درست جگہ سے اِدھر اُدھر نہ ہو پائے۔ میری ان دشواریوں کو کم کرنے پر میں ان سب کا شکر گزار ہوں۔ اس کے علاوہ اُن احباب جن کا میں یہاں ذکر نہیں کر سکا اور جنھوں نے دامے، درمے، سخنے میری مدداور راہ نمائی کی اُن سب کا شکریہ مجھ پر واجب ہے۔ اگر اس مقالے میں کوئی خوبی ہے تو میرے اساتذہ کی تربیت اور میری والدہ کی دعاؤں کا نتیجہ ہے۔ اگر کوئی خامی یا کمی ہے تو اس حقیر پر تقصیر کی کوتاہ علمی ہے۔ کوشش ہوگی کہ مقالے کی اشاعت کے وقت ان کوتاہیوں کو دور کیا جائے۔

فیض الدین احمد

مقدمہ

برعظیم پاک و ہند کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو ہمیشہ سے یہ خطہ سیاسی، سماجی اور طبقاتی کشمکش کا شکار رہا ہے۔ گزشتہ تین چار صدیوں میں بیرونی حملہ آوروں نے اس خطہ زمین کی سیاسی اور معاشرتی زندگی کی تار و پود کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔ ظاہری بات ہے کہ اردو زبان و شاعری بھی ان ہی ادوار میں اپنے تخلیقی عمل سے گزر کر ارتقائی مدارج طے کرتی رہی۔ لہٰذا مختلف ادوار میں رونما ہونے والے سانحات اور المیوں کو اردو زبان کے شاعروں نے نہ صرف موضوع بنایا بلکہ اپنا ردِعمل بھی اس طرح ظاہر کیا ہے کہ اس دور کے تاریخی شواہد اس نوع کی شاعری سے کشید کیے جا سکتے ہیں۔

عالم گیر ادب اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ سانحات یا المیے ادبی تخلیقات کا ایک بڑا محرک ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر جنگ و جدل، سیاسی رسا کشی، محلاتی سازشیں، سماجی و معاشی ناہمواری، عظیم شخصیات کی اموات اور قدرتی آفات وغیرہ جیسے موضوعات نے اردو کے ہر دور کے شعرا کو کس طرح متاثر کیا؟ اور ان کے یہاں ان موضوعات کے اظہار کی کیا روایت رہی؟ یقیناً ان سوالات کے جوابات کی تلاش اردو ادب کی تاریخ فہمی میں اہمیت کے حامل ہیں اور تحقیق کے نئے مباحث کے در وا کرنے میں معاون ہو سکتے ہیں۔ جہاں تک اردو شاعری کے سانحاتی بیانیے کا تعلق ہے، مقالہ نگار کو اچھی طرح اس بات کا اندازہ ہے اس قدر مبسوط اور مربوط بیانیے کو پیش کر کے نتائج کا حصول کوئی آسان کام نہ ہوگا۔ کیوں کہ یہ مطالعہ محض شاعری کا نہیں بلکہ تاریخ، سیاسیات، اقتصادیات اور عمرانیات وغیرہ جیسے اہم علوم تک پھیلا ہوا ہے جسے سمیٹنے کے لیے علوم کی ان تمام شاخوں سے اپنے موضوع کی مناسبت سے معلومات کو کشید کرنا ایک صبر آزما کام ہو سکتا ہے۔ جہاں تک اس ضمن میں اب تک ہونے والے تحقیقی اور تالیفی کام کا تعلق ہے، اُن کی نوعیت کسی بھی طرح تسلی بخش نہیں۔ خاص طور پر بیسویں صدی، جس کو سانحات کی صدی بھی کہا جا سکتا ہے، اور یہ دور اردو شاعری اور دیگر تخلیقات کے لیے بھی ایک اہم دور سمجھا جاتا ہے۔ اسی لیے اس دور میں رونما ہونے والے اہم سانحات کو اس تحقیقی مطالعے میں موضوع بنانے کا ڈول ڈالا جا رہا ہے۔ اس ضمن مطالعات نہ ہونے کے برابر ہیں۔ مثال کے طور پر بیسویں صدی کی ابتدا میں حیدر آباد دکن میں طغیانیِ رودِ موسیٰ کا سانحا ایسا ہے جس نے وہاں کی نصف سے زائد آبادی کو متاثر کیا لیکن اس واقعے کا ذکر ادبی اور عمومی تاریخوں میں بھی مفقود ہے جس کی وجہ سے اس تحقیقی مطالعے میں اس موضوع پر تسلی بخش تحقیق کی ضرورت محسوس کی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ بیسویں صدی میں ہونے والی دونوں عالمی جنگیں، قحطِ بنگال، تقسیم ہند، ہجرت کے سانحات اور سقوطِ ڈھاکا وغیرہ جیسے اہم موضوعات پر تحقیقی مطالعات کی بے حد کمی محسوس کی جاتی ہے۔ اس ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے اس مقالے میں مذکورہ موضوعات اور بیسویں صدی کے دیگر اہم سانحات پر سیر حاصل شواہد کو جمع کر کے پیش کرنے کی ضرورت اس لیے بھی بڑھ جاتی ہے تا کہ بیسویں صدی کی اردو شاعری کا بھرپور شعری منظر نامہ قاری کے سامنے آ سکے۔

یہ مطالعہ اس لیے بھی اہمیت کا حامل ہو سکتا ہے کہ اس کے ذریعے اردو کے سانحاتی بیانیے کی تلاش کو ممکن بناتے ہوئے اُن معروف اور کم معروف شعرا کی تخلیقات کا تفصیلی جائزہ لیا جائے تا کہ اس ضمن میں موجود خلا کو پُر کیا جا سکے۔ اس مقالے میں ابتدا تا بیسویں

صدی کی شاعری کو پیش نظر ضرور رکھا جائے گا تا کہ مقامی اور عالمی سطح پر رونما ہونے والے سانحات کے شعری منظر نامے کو سمجھا جا سکے۔ لیکن اس مطالعے میں خاص طور پر بیسویں صدی کے اہم سانحات کو تفصیل سے موضوع بنایا جائے گا تا کہ ان اہم سانحات کے شعری منظر نامے کی بنیاد پر مستقبل کا مورخ ان شعری مآخذ سے مدد لے سکے اور ان سے استفادے کے بعد تاریخ کی گم شدہ کڑیوں آپس میں جوڑ سکے۔ اردو شاعری کے ضمن میں یہ مطالعہ اس لیے بھی ناگزیر ہے کہ اس قسم کا مطالعہ ایک بڑے خلا کو نہ صرف پُر کرنے میں معاون ہوگا بلکہ اردو شاعری کا مبسوط منظر نامہ بھی ہمارے سامنے آسکے گا جن میں معروف اور کم معروف شعرا کی تخلیقات کے ذریعے ہم اُن اہم سانحات کے محرکات اور عوامل کو سمجھنے میں درست نتائج تک رسائی حاصل کر سکیں گے۔

اس مطالعے کے ذریعے بیسویں صدی کے اُن سانحات پر مفید معلومات یک جا کی جا سکیں گی جو کمیت اور کیفیت کے لحاظ سے اہمیت کی حامل تو ضرور ہیں لیکن پر شعرا کی خاطر خواہ توجہ نہ ہو سکی۔ مطالعے کے ذریعے اُن محرکات وعوامل کا بھی پتا لگانے کی کوشش کی جائے گی کہ آخر ان واقعات کو شعرا نے کیوں غیر اہم سمجھا؟ اور نسبتاً کچھ غیر اہم واقعات پر شاعروں کی بھر پور توجہ کیوں رہی؟

یہاں اس بات کا ذکر اہمیت کا حامل ہے کہ بیسویں صدی میں واقعاتی شاعری کو کم اہمیت دیتے ہوئے اس کی بھر پور ترجمانی کا حق ادا نہیں کیا جا سکا لیکن کچھ مولفین ایسے ضرور ملتے ہیں جنھوں نے اہم واقعات پر مبنی شعری تخلیقات کو مرتب کر کے محفوظ کیا۔ مثال کے طور پر 'نشید حریت' از شان الحق حقی، 'اردو میں قومی شاعری کے سو سال' از علی جواد زیدی، 'نوائے آزادی' از عبدالرزاق قریشی، 'ضبط شدہ نظمیں' از خلیق انجم اور مجتبیٰ حسین، 'نغماتِ حریت' از خلیق انجم اور شمس الرحمٰن فاروقی جیسی تالیفات میں نظمیں تو ملتی ہیں لیکن اس جانب تحقیقی مطالعات کو فروغ نہ مل سکا۔ جدو جہد آزادی کی چھاؤں میں جو اردو ادب تخلیق ہوا اُسی کے ایک بڑے حصے کو یقیناً ہنگامی اور وقتی نوعیت کا ادب قرار دیا جا سکتا ہے۔ بلاشبہ اس قسم کی شاعری کو میر تقی میر، مرزا غالب اور علامہ اقبال کی آفاقی شاعری سے موازنہ نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن یہاں یہ سوال ضرور اہمیت کا حامل ہے کہ اس قسم کی شاعری نے جدو جہد آزادی میں کیا کردار ادا کیا اور تحریک آزادی کو کس طرح متاثر کیا۔ اس اعتبار سے مختلف واقعات اور سانحات کے ضمن میں ایسی ہنگامی اور وقتی شاعری کا مطالعہ نہ منفرد اہمیت کا حامل ہوگا بلکہ اس قسم کے مطالعے ہم اس دور کے مختلف سانحات پر مبنی شعری تخلیقات کو تاریخی دستاویز کے طور پر بھی محفوظ کرنے میں کامیاب ہو سکے گے۔

سانحات کے ضمن میں ایسی کتابیں بھی تحریر کی گئیں جو صرف تاریخی شواہد کی حامل ہیں یعنی ان میں اردو شاعری کو موضوع نہیں بنایا گیا۔ مثال کے طور پر عالمی جنگیں، قحطِ بنگال اور جلیاں والا باغ وغیرہ پر تاریخی شواہد کی حامل کتابیں ضرور ملتی ہیں لیکن ان موضوعات میں شعری منظر نامہ نہیں ملتا۔ اس تعلق سے یہ کتابیں ملاحظہ کی جا سکتی ہیں: 'جلیاں والا باغ: تاریخ آزادی پاک و ہند کا ایک خونی باب' از ابوالہاشم ندوی؛ 'جلیاں والا باغ کا قتل عام اور مظالمِ پنجاب' از ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار وغیرہ۔ لہٰذا ضرورت اس بات کی ہے کہ تاریخ کے اس بیانیے کو اردو شعرا نے کس طرح برتا، اس کی تلاش وتفحص پر توجہ دی جائے۔ اس ضمن میں مقالہ نگار کی کوشش ہوگی کہ ان موضوعات پر موجود شعری تخلیقات کو تلاش کر کے تاریخی شواہد کی بنیاد پر اُسے نہ صرف پرکھا جائے بلکہ اس کا غیر جانب دارانہ تجزیہ بھی پیش کیا جائے۔

اردو شاعری کے باب میں کچھ مطالعات ایسے ضرور ملتے ہیں جن میں ان سانحات اور اردو شاعری کی جانب ضمنی توجہ دی گئی ہے اور کسی ایک موضوع پر بھر پور توجہ صرف کی گئی ہے۔ مثال کے کے پر 'جنگِ آزادی کے اردو شعرا' از محمود الرحمٰن، 'اردو شاعری میں قومی

یک جہتی کے عناصر' از سید مجاور حسین، 'ہندوستان کی تحریک آزادی اور اردو شاعری' از گوپی چند نارنگ وغیرہ میں سانحات کو ضمنی موضوع بنایا گیا ہے۔ اس مقالے میں راقم کی کوشش ہوگی کہ ہر اہم سانحے کو سامنے رکھتے ہوئے رسائل و جرائد، شعرا کے دواوین، کلیات اور مجموعات میں موجود کلام کو یک جا کر کے انفرادی سطح پر ہر سانحے پر سیر حاصل تحقیق کی جائے اور مختلف سانحات کے شعری بیانیے کو پیش کیا جائے۔

ابتدائی ابواب تمہیدی رنگ کے حامل ہوں گے کیوں کہ برعظیم کے تاریخی، سیاسی اور سماجی منظر نامے کا جائزہ لیتے ہوئے ڈاکٹر ابوالخیر کشفی نے اپنی تحقیق بہ عنوان 'اردو شاعری کا سیاسی اور تاریخ پس منظر: (۱۷۰۷۔۱۸۵۷)'، ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار نے 'اردو شاعری کا سیاسی اور سماجی پس منظر' منظر'، پروفیسر محمد حسن' دہلی میں اردو شاعری کا تہذیبی اور فکری پس منظر'، شہناز بیگم 'اردو شاعری میں مغل سلطنت کے زوال کی عکاسی'، ڈاکٹر محمد ذاکر اللہ 'اردو شاعری پر سیاسی اثرات'، ڈاکٹر محمد عمر 'اٹھارویں صدی میں ہندوستانی معاشرت (میر کا عہد)'، ڈاکٹر نعیم احمد 'شہر آشوب' اور 'شہر آشوب کا تحقیقی مطالعہ' وغیرہ نے اس وقت کے سیاسی اور سماجی انحطاط کے اردو شعری منظر نامے پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ اٹھارویں اور انیسویں صدی کے دوران برعظیم کے مسلمانوں کے پیش نظر جو مسئلہ اہم ترین رہا وہ برطانوی سامراج سے چھٹکارا حاصل کرنا تھا۔ اس ضمن میں کی جانے والی کوششوں اور اس کے نتائج مثلاً اٹھارہ سوستاون کی ناکام مزاحمت، انتزاعِ سلطنت اودھ، اور سکھا شاہی کے زوال وغیرہ جیسے معاملات کو ضرور موضوع بنایا جائے گا تا کہ ان سانحات کو شعری بیانیہ مکمل صورت میں سامنے آسکے۔ اس لیے مقالہ نگار نے ان ادوار جن کا تعلق ابتدا تا انیسویں صدی کو بالاستیعاب تحقیق کا موضوع نہیں بنایا جائے گا لیکن کسی موضوع پر مزید تحقیق کی ضرورت محسوس کی گئی تو اس خلا کو ضرور پُر کرنے کی کوشش کی جائے گی۔

اس مطالعے کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ اردو شاعری کے علاقائی اور مقامی سانحاتی بیانیے کے ساتھ ساتھ عالمی تناظر میں رونما ہونے والے واقعات مثلاً سانحہ فلسطین، ایران وافغان جنگ، جنگ عظیم اول و دوم اور ترکی کی خلافت کے خاتمے کے موضوع پر اردو شعرا کے ردعمل کو بھر پور انداز سے پیش کیا جاسکے۔ اس طرح کے مطالعے سے اردو شعرا کے عالمی بیانیے کو تقویت ملتی ہے اور اس بات پر احساس فخر بھی جاگزیں ہوتا ہے کہ اردو شاعری کسی مخصوص جغرافیائی حدود کی پابند نہیں بلکہ اس میں اظہار، موضوعات، اسالیب اور لفظیات کی سطح پر ہر طرح کے موضوعات کو برتنے کی صلاحیت موجود ہے۔ اس سے قبل اس طرح کا مطالعہ ہمارے محققین اور تنقید نگاروں کے یہاں نہیں ملتا۔ لہٰذا تحقیق کا یہ انداز مستقبل میں نئے مباحث اور تلاش وجستجو کے نئے در وا کرنے میں ضرور معاون ثابت ہوسکتا ہے۔

دورانِ تحقیق اس بات کا قوی امکان موجود ہے کہ طویل دورانیے پر محیط اس مقالے میں جن اہم موضوعات کو منتخب کیا گیا ہے اُن سانحات کی بابت سیکڑوں شعرا کی تخلیقات منظر عام پر آسکیں گی جن سے اردو شاعری کے سانحاتی بیانیے کی پوری تاریخ مرتب کی جاسکے گی۔ یہ مطالعہ ایک جانب سقوطِ ڈھاکا کے المیے کو سمجھنے میں مددگار ثابت ہوسکتا ہے تو دوسری جانب اس قسم کے مطالعے کی ذریعے ہم کراچی جیسے بڑے شہر کی بے چینی اور انتشار کے محرکات وعوامل کو بھی تلاش کرسکیں گے۔ شعرا نے ان موضوعات پر جس قسم کا ردعمل ظاہر کیا اس مطالعے میں اسے پیش کرنے کے ساتھ ساتھ ان مسائل کے تدارک کے امکانات پر بھی غور کیا جائے گا تا کہ قوم مزید کسی قومی المیے سے دوچار ہونے سے محفوظ رہ سکے۔

باب اوّل:

سانحہ، حادثہ، المیہ، واقعہ: تشریحات اور مباحث مع شعری امثال

سانحہ: لغوی مباحث، شعری و نثری امثال

لفظ سانحہ سے جو فوری تاثر ذہن میں آتا ہے، وہ کسی منفی یا برے واقعے کا ہے۔ یہ عربی زبان کا لفظ ہے۔ عربی میں اس لفظ کا تلفظ ''السانح'' رائج ہے جس سے مراد دائیں سے بائیں کو گزرنے والا[1] ہے۔ عرب ''سانح'' سے نیک فال اور بارح سے بدشگون لیتے ہیں[2]۔ ''المعجم الاعظم'' میں اس کے معنی ''دائیں طرف سے بائیں کو گزرنے والا (شکار) خلاف بارح''[3] درج ہے۔ عرب لوگ سانح سے برکت لیتے ہیں اور بارح بدفالی اور بے برکتی[4] کی علامت سمجھی جاتی ہے۔ ''اردو لغت'' (تاریخی اصولوں پر) کے مطابق لفظ سانح سے مراد ''وہ شکار جو پیش آئے، جو بائیں سے دائیں کو گزرے، ظاہر ہونے والی چیز، ہر اچھا برا حال اور واقعہ''[5] درج ہے۔ ''لغات سعیدی'' کے مطابق ''لغوی معنی اس کے کسی امر میں ظہور کے آنے کے ہیں خواہ وہ مرغوب ہو یا نامرغوب لیکن مستعمل امر مکرہ و وحشت آمیز کے ظہور میں ہے''[6]۔ ظاہر سی بات ہے کہ آج یہ لفظ اردو میں ان معنوں میں مستعمل ہے گویا بعض اردو تصانیف میں اس لفظ کو عربی کے معنوں میں بھی استعمال کیا گیا ہے۔ مثلاً ''ایام عرب'' کے مصنف لکھتے ہیں کہ ''جب بادشاہ اور تمام لوگ صید افگنی میں مشغول تھے سانح، بارح، ناطح اور تعید ہر قسم کے شکار سامنے سے گزر رہے تھے''[7]۔ ''حکمت الاشراق'' کے مترجم نے لکھا کہ ''روح حامل نوری قوتوں کی ہے...اور قواہر سے جو نور اس پر سانح ہوتا ہے، وہ اس سے منعکس ہوتا ہے''[8]۔ عربی میں اس لفظ کی جمع ''سوانح''[9] ہے۔ اس سے مراد واردات متوحش و نیز پیش آنے والی باتیں[10] ہیں۔ ''اردو لغت'' (تاریخی اصولوں پر) کے مطابق اس سے مراد حادثات، سوانح اور واقعات کے ہیں[11]۔ سید حسن برنی نے اس بابت لکھا کہ ''اعتراض اس قسم کی مروجہ تاریخوں پر وارد ہوتے ہیں جنھیں صرف وقائع، حوادث اور سوانح سے تعلق ہے''[12]۔

اردو میں سوانح سے مراد ''سرگزشت اور حالاتِ زندگی''[13] کے بھی ہیں۔ مولانا حالی نے لکھا کہ ''ایسے لوگوں کے سوانح لکھے گئے ہیں جن کے حالات پڑھ کر کوئی عمدہ تحریک دل میں پیدا نہیں ہوتی''[14]۔ سید سلیمان ندوی نے اس حوالے سے لکھا کہ ''قرآن مجید میں اکثر انبیاء کے سوانح و حالات کے ضمن میں ان آیات و معجزات کا بھی بیان ہے جو ان کو خدا کی بارگاہ سے عطا ہوئے تھے''[15]۔ ''اقبال کی صحبت میں'' کے مصنف نے لکھا کہ ''علامہ کے علمی و فنی کارناموں پر تو سبھی متفق ہیں مگر ان کی سوانح کے معاملے میں خاصا وسیع اختلاف رائے موجود ہے''[16]۔ ڈاکٹر گوہر نوشاہی نے لکھا کہ ''تیرا خود سانحۂ عمری کہ جس میں تو نے ہزار ہا نیرنگی فلک حقہ باز دیکھی اور سنی ہیں کیا کم ہے تو تلاش روایات کہن یا تخیلات بے جا میں آئینہ کاخ دماغ کی جوہر نمائی کرے''[17]۔ ''جامع اللغات'' میں لفظ ''سانحات''[18] بھی سانحہ کی جمع کے طور پر درج ہے۔ اس کے علاوہ ''قاموس مترادفات'' میں ''سوانح'' کے مترادف کے طور پر ''سانحات، واقعات، حالات، کوائف، حادثات اور حوادث''[19] وغیرہ درج ہے۔ گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ اردو میں اس کے معنی تبدیل ہوتے گئے۔ ''فرہنگ آصفیہ'' میں واضح طور پر ''سانحہ'' سے مراد کسی ''واقعہ، حادثہ، صدمہ کی بات مجازاً خبر بد کا ظہور''[20] درج ہے۔ ''مہذب اللغات''

کے مطابق ''ظاہر ہونے والا، پیش آنے والا حادثہ، واقعہ، قول فیصل، عام طور سے بری اور ناگہانی ہو جانے والی بات کے لیے بولتے ہیں جس میں غم اور افسوس کا پہلو ہو''[۲۱]۔ ''نور اللغات'' کے مطابق یہ لفظ ''اردو میں بری بات کی نسبت مخصوص ہے''[۲۲]۔ ''جامع اللغات'' کے مطابق اس سے مراد وہ حادثہ اور واقعہ ہے جو برے معنوں میں استعمال ہوتا ہو[۲۳]۔ ''فرہنگ تلفظ'' میں اس کے معنی ''رونما ہونے والا واقعہ، اردو میں افسوس ناک واقعے کے لیے مستعمل''[۲۴] ہے۔ ''اردو لغت تاریخی اصولوں'' میں اس کا ایک املا ''سانحا''[۲۵] بھی درج ہے۔ اردو کے بے شمار ادیبوں نے یہ املا بھی استعمال کیا ہے۔ مثلاً سیماب اکبر آبادی نے لکھا کہ ''کچھ ایسے وقت بھی آتے ہیں جب مایوس انسان کو خواہش بھی اک طرح کا سانحا معلوم ہوتی ہے''[۲۶]۔ اسی طرح محمود عاصم کا ایک شعر دیکھیے :

بکھر گیا ہے کچھ اس طرح آدمی کا وجود　　　ہر ایک فرد کوئی سانحا لگے ہے مجھے[۲۷]

''اردو لغت'' (تاریخی اصولوں پر) میں لفظ سانحہ کا مطلب ''پیش آنے والا... عموماً اندوہ ناک واقعہ، حادثہ''[۲۸] درج ہے۔ زیادہ تر ادبا اور شعرا نے اس لفظ کو انھی معنوں میں استعمال کیا ہے۔ ''طلسم ہوش ربا'' کی عبارت ہے کہ ''حیرت اس سانحے کو سن پھری اور اپنے لشکر میں آئی''[۲۹]۔ پنڈت رتن ناتھ سرشار نے لکھا کہ ''جب میں نے یہ سانحہ ہوش ربا اور واقعہ جان گزا اپنی بیٹی کی زبانی سنا تو ہاتھ مل کر رہ گیا''[۳۰]۔ نذیر محمد خان نے لکھا کہ ''اس افسوس ناک سانحہ سے اتنا ضرور ہوا کہ ان کا دل لکچروں کی طرف سے ملول ہو گیا''[۳۱]۔ علامہ صادق الخیری نے لکھا کہ ''۴۷ء کے سانحہ میں مجھے اپنے کتب خانے سے ہاتھ دھونا پڑا''[۳۲]۔ نذیر محمد خان نے لکھا کہ ''سانحوں میں اگر سانحہ واقعی ان کی شخصیت کو تہ و بالا کر سکتا تھا تو ان کی اولاد کی موت کا سانحہ تھا''[۳۳]۔ مولوی ذکاء اللہ نے لکھا کہ ''تجرد گزینی کا یہ عجب سانحہ ہے کہ قبول خان ناچنے کا فن خوب جانتا تھا''[۳۴]۔ مولانا ابوالحسن ندوی نے لکھا کہ ''ان کے مطلقاً اس کا احساس نہیں کہ یہ کتنا بڑا سانحہ اور انسانیت کی کیسی بڑی بدقسمتی تھی''[۳۵]۔

نثر کے علاوہ شاعری میں بھی اس لفظ کو غم و اندوہ ناک واقعے کے طور پر لیا گیا ہے۔ مرزا دبیر نے مرثیے کے ایک شعر میں کہا کہ:

یہ کیا مرے گلے سے نہ پانی اترتا تھا　　　مجھ پر عجیب سانحہ ماہِ عزا میں تھا[۳۶]

میر تقی میرؔ نے اس لفظ کا خوب صورت انداز میں استعمال کرتے ہوئے کہا کہ:

مصائب اور تھے پر دل کا جانا　　　عجب ایک سانحا سا ہو گیا ہے

قصہ میرا بھی سانحہ ہے عجب　　　کس پہ گزرا ہے یہ ستم یہ غضب[۳۷]

اسی مناسبت سے اشک کا ایک شعر دیکھیے :

کچھ ایسے وقتِ اسیری کا سانحہ گزرا　　　بہار روئی مسلسل گلے لگا کے مجھے[۳۸]

رند نے کہا کہ:

سنیو یہ سانحہ بھی ہے یارو شنیدنی　　　لے لے کے خط جو میرے کئی نامہ بر گئے

کہتا ہے کیا وہ شوخ کہ جتنے ہیں رند کیا　　　مدت ہوئی کہ میں نے سنا تھا وہ مر گئے[۳۹]

سیماب اکبر آبادی نے اس حوالے سے کیا خوب کہا ہے:

کچھ ایسے وقت بھی آتے ہیں جب مایوس انساں کو　　　خوشی بھی اک طرح کا سانحا معلوم ہوتی ہے[۴۰]

نظم و نثر کی ان مثالوں سے اچھی طرح اندازہ ہو جاتا ہے کہ اس لفظ کو بالعموم کسی غمگین اور اندوہ ناک واقعے کے معنوں میں ہی استعمال کیا گیا ہے۔ بعض نے اسے انفرادی رنج والم کے طور پر لیا ہے اور بعض اسے اجتماعی دکھ اور غم کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ انگریزی میں اس لفظ کے لیے Incident [41] کا لفظ مستعمل ہے جو کسی Tragic Event یا Tragic Occurrence کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ Webster's کے مطابق Incident سے مراد Something that happens, event; Occurrence ہے [42]۔ ایک اور جگہ اس کی وضاحت کرتے ہوئے Webster's میں درج ہے کہ:

> Something that happens as a result of or in connection with something more important; minor event or episode, specially one in a novel, play etc. [43]

شان الحق حقی نے اس لفظ کو ''واقعہ، ہونے والی بات، کوئی معمولی یا غیر اہم بات جس کی جانب عام یا خصوصی توجہ منعطف ہو جائے اور جنگ میں مخالفین سے جھڑپ'' کے معنوں میں استعمال کیا ہے [44]۔ ''قاموس مترادفات'' میں لفظ حادثہ، المیہ اور واقعہ [45] بھی سانحہ کا مترادف کے طور پر درج ہے اس لیے ان مترادفات کے معنی اور مفہوم کی وضاحت بھی ضروری ہے۔

حادثہ: لغوی مباحث، شعری و نثری امثال:

لفظ حادثہ عربی زبان کا لفظ ہے۔ ''المعجم الاعظم'' میں ''الحادث'' حادثہ کی جمع حوادث اور حادثات درج ہے جس کے معنی دنیاوی تکالیف، زمانے کے شدائد، نئی چیز، واقعہ، نیا ماجرا، تازہ حادثہ اور پہلے پہل واقعے کے ہیں [46]۔ ''المنجد'' میں اس کے لیے الحادث کے ساتھ ساتھ الحدث یعنی کسی امر کا اوّل اور اس کی ابتدا اور الحدثی یعنی حادثہ وغیرہ جیسے الفاظ درج ہیں [47]۔ اردو میں بھی یہ لفظ انھی معنوں میں مستعمل ہے۔ ''فرہنگ آصفیہ'' میں اس کے لغوی معنی کوئی نئی بات اور اصطلاحاً، وقوعۂ، رنج آمیز واقعہ، واردات، صدمہ اور سانحہ [48] درج ہے۔ ''جامع اللغات'' میں اس کے لیے کوئی ''نئی بات، واقعہ، ماجرا، واردات، سانحہ، وقوع، مصیبت، تکلیف اور زمانے کی گردش ہونا'' [49] درج ہے۔ ''لغات سعیدی'' میں ''نو پیدا واقعہ، مصیبت'' [50] اور ''مہذب اللغات'' میں کوئی ''آفت ناگہانی، وہ آنے والی مصیبت جس کا پہلے سے علم نہ ہو'' [51] تجرید ہے۔ ''فرہنگ تلفظ'' میں اس کے معنی ''اچانک پیش آنے والا ناخوش گوار واقعہ، سانحہ'' [52] درج ہے۔ ''اردو لغت'' (تاریخی اصولوں پر) کے مطابق اس سے مراد ''نئی بات، سانحہ، افسوس ناک امر، غم انگیز واقعہ، مصیبت یا آفت، ناگہانی، خلاف توقع واقعہ'' [53] درج ہے۔ انگریزی لغت میں اس کے لیے Accident, Mishap, Disaster, Calamity, Case, Incident, Happening, New things, Novelty [54] وغیرہ جیسے الفاظ درج ہیں۔ ''قاموس مترادفات'' میں سانحہ، واقعہ، واردات، وقوعہ، ایکسیڈنٹ، صدمہ، مصیبت، بپتا، عذاب، فساد اور ہنگامہ [55] وغیرہ جیسے الفاظ اس کے مترادفات کے طور پر استعمال کیے ہیں۔

اس لفظ کو گردشِ زمانہ کے معنوں میں استعمال کرتے ہوئے برق دہلوی نے کہا کہ:

ازل سے وقفِ تغیر نظامِ ہستی ہے ‏ ‏ ‏ ‏ جو پائمالِ حوادث ہے یہ وہ بستی ہے [56]

بعض ادبا اور شعرا نے اس لفظ کو ذاتی دکھ، حادثے، مصیبت اور پریشانی کے طور پر لیا ہے، جیسے حالی نے لکھا کہ ''یہ حادثہ ہم پر گزرا تو ان لوگوں نے دستور کے مطابق شادی ملتوی کرنی چاہی'' [57]۔ اقبال اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں کہ ''میں تو سمجھتا ہوں کہ اللہ

تعالیٰ نے انھیں از سرِ نو زندگی بخش کر مجھے ایک حد درجہ الم ناک حادثے سے بال بال بچالیا''[۵۸]۔ میر تقی میر نے اس لفظ کو موت کے معنوں میں استعمال کرتے ہوئے کہا کہ:

سب سے مل چل کہ حادثے سے پھر　　　کہیں ڈھونڈھا بھی تو نہ پائے گا[۵۹]

اپنے ذاتی رنج والم کی کیفیت کا اظہار کرتے ہوئے ابرار صدیقی نے کہا کہ:

ہر نفس حادثہ بردوش ہوں ابرار مگر　　　تنگ آتا نہیں جینے سے جیے جاتا ہوں[۶۰]

منظور حسین شور نے اس کیفیت کو آفاقی حقیقت قرار دے کر یہ تک کہہ دیا کہ:

رکا ہے اور نہ رکے گا یہ حادثات کا سیل　　　خدا کے واسطے گیسو سنوار اے ساقی[۶۱]

یہی لفظ جب اجتماعی غم واندوہ کی کیفیت اجاگر کرنے کے لیے استعمال کیا گیا تو اس کا مفہوم اور بھی وسیع ہو گیا۔ سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں کہ ''کائنات فطرت میں زوال وانحطاط، فنا وفساد کی مثالیں اس کثرت سے ملتی ہیں کہ اگر کسی حادثے سے اس کی تباہی کے آثار پائے جائیں تو اس کے بارے میں انسانی شہادت قابل قبول ہوگی''[۶۲]۔ شبلی نعمانی نے اس بابت فرمایا کہ ''ایک ایسے فرقے کے واقعات کا معدوم ہو جانا تاریخی دنیا کا بہت بڑا افسوس ناک حادثہ کہا جا سکتا ہے''[۶۳]۔ شعرا نے تو اجتماعی غم اور تکلیف پر خوب آنسو بہائے ہیں اور مضمون کو سوسو طرح سے باندھنے کی کوشش کی ہے۔ مرزا دبیر نے واقعات کربلا جیسے اجتماعی المیے کو تاریخ انسانی کا سب سے بڑا حادثہ قرار دیتے ہوئے کہا کہ:

اے یارو سنی شبّر و شبیر کی توقیر　　　اب یاد کرو حادثۂ شبّر و شبیر[۶۴]

مولانا حالی نے بھی گردشِ زمانہ کی بابت کہا کہ:

کھولی ہے تم نے آنکھیں اے حادثو ہماری　　　احسان یہ نہ ہرگز بھولیں گے ہم تمھارا[۶۵]

اسیر نے بھی اس لفظ کو گردش زمانہ کے طور پر استعمال کرتے ہوئے کہا کہ:

کب اسے دھیان میں لاتی ہے تیری گردشِ چمن　　　حادثے لاکھ کرے گردشِ گردوں پیدا[۶۶]

جوش نے اس لفظ کو واقعات کے معنوں میں استعمال کرتے ہوئے کہا کہ:

وائے بر تقدیرِ آدم وائے بر لیل و نہار　　　بزمِ عشرت بھی ہے خونی حادثوں کی راہ گزار[۶۷]

منظور حسین شور نے اس لفظ کو زندگی کی تیز رفتاری سے بھی جوڑا ہے۔ وہ کہتے ہیں:

حادثو! توسنِ ایّام کو مہمیز کرو　　　انقلابوں کی ہواؤں کو ذرا تیز کرو[۶۸]

احمق پھپھوندی نے اس لفظ کو غم، تکلیف اور مصیبت کے معنوں میں استعمال کرتے ہوئے لکھا کہ:

رہیں گے حادثوں سے مطمئن اہلِ جہاں کب تک　　　بچیں گے آسماں کی زد سے زیرِ آسماں کب تک[۶۹]

ضیاء عباس ہاشمی نے اس لفظ کی معنویت میں کیا خوب صورت اضافہ کیا ہے۔ کہتے ہیں:

صیاد کیا چمن میں نیا حادثہ ہوا　　　آتا ہے تو جو شاخِ نشیمن لیے ہوئے[۷۰]

''قاموس مترادفات'' میں سانحہ، واقعہ، واردات، وقوعہ، ایکسیڈنٹ، صدمہ، مصیبت، بپتا، عذاب، فساد اور ہنگامہ[۷۱] وغیرہ

جیسے الفاظ اس کے مترادف کے طور پر استعمال کیے گئے ہیں۔

المیہ: لغوی مباحث، شعری و نثری امثال

المیہ بھی عربی زبان کا لفظ ہے۔ یہ مذکر استعمال ہوتا ہے اور اس کے معنی رنج، غم اور دکھ کے ہیں۔ ''المنجد'' میں اس کے لیے ''الاَلَـمۂ'' کا لفظ درج ہے جس کے معنی سخت دکھ کے ہیں [۲]۔ اس کی جمع ''آلاَمـہ'' استعمال ہوتا ہے۔ اردو میں بھی یہ لفظ اسی معنی میں رائج ہے۔ ''نور اللغات'' میں غم و الم کے درمیان جو معمولی فرق ہے اس کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''غم کی کیفیت عارضی ہوتی ہے لیکن الم کی کیفیت عارضی نہیں ہوتی ہے۔ الم کا اثر دل و دماغ پر ہوتا ہے اور غم کا اثر اس سے کم ہوتا ہے'' [۳]۔ ''اردو لغت'' (تاریخی اصولوں پر) میں اس کا مطلب ''ذہنی کرب، جس کا اثر دل و دماغ دونوں پر ہو'' [۴] درج ہے۔ ظاہری بات ہے یہ اثر ہر دو صورتوں میں انسان کے دل و دماغ پر پڑ سکتا ہے۔ اوّل کوئی ذاتی رنج و الم کی کیفیت ہو۔ دوم قوم، ملک، ملّت اور معاشرے کے اجتماعی مصائب پر انسان رنج و الم کی تصویر بن جائے۔ انفرادی اور اجتماعی دونوں پہلوؤں سے اس لفظ کو ادب میں بہت برتا گیا ہے۔ ''عجائب القصص'' میں شاہ عالم ثانی نے ذاتی رنج غم و الم کے حوالے سے لکھا ہے کہ ''گاہ بے گاہ یہ الم دل پر گزرتا ہے'' [۵] یا میر اپنے ذاتی غم و الم کے حوالے سے فرماتے ہیں کہ:

میں کیا کہوں جگر میں لہو میرے کم ہیں کچھ ۔۔۔ کچھ تو الم ہے دل کی جگہ اور غم ہیں کچھ [۶]

ایک اور جگہ میر نے کہا کہ:

کرو تو کل کہ عاشقی میں نہ یوں کرو گے تو کیا کرو گے ۔۔۔ الم جو یہ ہے تو دردمندو کہاں تلک تم دوا کرو گے [۷]

مصحفی نے اپنے ذاتی غم و الم کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ:

اے مصحفی میں وہ ہوں الم دوست کہ جس نے ۔۔۔ برسوں دمِ خنجر دلِ زنگار میں رکھا [۸]

آرزو لکھنوی نے جب غم و الم کی شدت کو محسوس کیا تو بے اختیار کہہ اٹھے کہ:

اظہارِ الم کے لیے پہلو نکل آئے ۔۔۔ نالوں کو کیا ضبط تو آنسو نکل آئے [۹]

خواجہ ارشد علی خاں قلق نے اپنے ذاتی رنج کا اظہار کچھ اس انداز سے کیا ہے کہ وہ ذاتی الم نہیں اجتماعی غم محسوس ہوتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ:

دشتِ غربت میں بجز بے کسی و یاس و الم ۔۔۔ قبر مجنوں پہ نہ کوئی پئے ماتم آیا [۸۰]

اسی طرح شاہ مبارک آبرو نے بھی لفظ الم کو کچھ اس انداز سے برتا ہے کہ وہ ان کا ذاتی الم محسوس ہونے کے بجائے اس عہد کا الم معلوم ہوتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ:

خدا کے واسطے اس طرح مہربانی کر ۔۔۔ کہ میرے جیو سیں جاتا رہے تمام الم [۸۱]

اپنے دل سے تمام آلام کو نکالنے کی بات کی جائے تو وہ الم ذاتی نہیں رہتا بلکہ اجتماعی المیہ بن جاتا ہے۔ بعض ادبا اور شعرا نے تو اس لفظ کو خالصتاً مصائب و آلام کی نشان دہی کے لیے استعمال کیا ہے، جیسے ''ان الم ناک اعداد و شمار کی روشنی میں پاکستانی عورت پر ہمارے اخبارات و رسائل اور جرائد کے اثرات کا اندازہ کرنا مشکل نہیں'' [۸۲]۔ مرزا غالب نے تو اس اجتماعی احساس کو اس خوب صورتی

سے شعر کے قالب میں ڈھالا ہے کہ الم کا یہ اظہار اجتماعی شدت غم کا عکاس ٹھہرا۔ شعر ملاحظہ کیجیے:

طاقتِ رنجِ سفر ہی نہیں پاتے اتنی ہجرِ یارانِ وطن کا بھی الم ہے ہم کو[۸۳]

الم سے ہی لفظ ''المیہ'' بنا۔ ادب میں اس لفظ کو بالعموم ''غم ناک انجام کا منظوم یا غیر منظوم''[۸۴] اظہار کے طور پر لیا جاتا ہے۔ ڈراموں میں اس کا چلن بہت عام ہے۔ شیکسپئر کے ڈرامے ''میک بتھ'' کے بارے میں گارساں دتاسی نے کہا کہ ''کیا تعجب کہ اس وقت دہلی اور آگرے کے تھیٹروں میں بہ مقابلہِ پیرس 'میک بتھ' کا قابل قدر المیہ کھیلا جا رہا ہو''[۸۵]۔ ادب کے علاوہ موسیقی کے سُروں میں بھی خوشی اور غم کے سُروں میں تخصیص کی جاتی ہے۔ اس کیفیت کی عکاسی فضل الرحمٰن کے اس جملے میں بہ خوبی ہوتی ہے جب وہ لکھتے ہیں کہ ''لڑکیاں المیہ سُروں میں منڈھا اور بابل گا رہی تھیں''[۸۶]۔ ''اردو لغت'' (تاریخی اصولوں پر) میں المیہ سے مراد دردناک واقعہ، غم انگیز سانحہ اور غم گین حادثہ[۸۷] درج ہے۔ نثار عزیز بٹ نے سقوطِ ڈھاکا جیسے قومی المیے کی بابت لکھا کہ ''مارچ میں مشرقی پاکستان کے المیے کے لیے میں، یحییٰ، مجیب، بھٹو، تینوں کو ذمے دار ٹھہراتا ہوں''[۸۸]۔

اسی طرح قاضی عبدالغفار نے ایک جگہ لکھا کہ ''مولانا آزاد ان حوصلہ مند انسانوں میں سے ایک ہیں جو فرقہ واری تقسیم کے اس المیے کے باوجود اپنے مقام پر قائم ہیں''[۸۹]۔ ''اردو انگریزی لغت'' میں اس کے لیے Tragedy[۹۰] کا لفظ درج ہے۔ Webster's میں اس کی وضاحت کرتے ہوئے A very sad or tragic event or events, a disaster[۹۱] درج ہے۔ ''قاموس مترادفات'' میں ''حزینہ، دردناک، واقعہ، سانحہ، ہائلہ اور ٹریجڈی''[۹۲] کو اس لفظ کے مترادف کے طور پر درج کیا گیا ہے۔

صدمہ: لغوی مباحث، شعری و نثری امثال

صدمہ بھی عربی زبان کا لفظ ہے۔ ''المنجد'' میں اس کے معنی ''رفع کرنا، ہٹانا اور آپڑنا''[۹۳] درج ہے۔ اردو میں یہ لفظ ''کوفت، رنج و غم، آزار، اذیت، تکلیف، بلا اور مصیبت''[۹۴] کے معنوں میں مستعمل ہے۔ ''فرہنگ آصفیہ'' میں اس کے معنی ''حادثہ، واقعہ اور سانحہ''[۹۵] بھی درج ہیں۔ ''مہذب اللغات'' میں بھی اسی مفہوم کو دہرایا گیا ہے[۹۶]۔ ''جامع اللغات'' میں بھی اس کے معنی رنج و غم کی چوٹ، مصیبت، ٹھیس، حادثہ اور آفت''[۹۷] درج ہے۔ ''نور اللغات'' میں اس لفظ کی وضاحت کرتے ہوئے ''رنج و غم کی چوٹ اور غم سہنا''[۹۸] درج ہے۔ اردو میں یہ لفظ دھکا، ٹکر اور تصادم کے معنوں میں بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ جیسے ''راجپوت ... محمود شاہی فوج کے صدمے سے بھاگ کر قلعہ کے سوراخوں میں گھسے''[۹۹]۔ لیکن ان معنوں میں اس لفظ کا یہ قلیل استعمال ہے، جب کہ ضرب، چوٹ، ٹھیس[۱۰۰] وغیرہ کے معنوں میں بھی بعض ادبا نے استعمال کیا۔ مثلاً ''دامن پر اس کے منج گڑی دیکھی تو ان کو یقین ہوا کہ یہ اسی صدمے سے مارا پڑا''[۱۰۱]۔ زیادہ تر ادبا اور شعرا نے اسے دکھ اور افسوس ناک واقعے کے معنوں میں استعمال کیا ہے۔ مولوی نذیر احمد اس حوالے سے لکھتے ہیں کہ ''جراحوں نے پانوں کو جان کا فدیہ تجویز کیا مگر کلیم بے چارہ ناز و نعمت کا پلا ہوا تھا، اس صدمے کا متحمل نہ ہو سکا''[۱۰۲]۔ اس لفظ کو فکر اور اندیشے کے معنوں میں استعمال کرتے ہوئے میر انیس نے کہا کہ:

صدمہ ادھر تو مشک کا جانِ حزیں پہ تھا دیکھا جو بھر کے دستِ مبارک زمیں پہ تھا[۱۰۳]

کسی بڑے حادثے اور مصیبت کے معنوں میں استعمال کرتے ہوئے حیدر بخش حیدری نے لکھا کہ ''یہ بات یاد رکھنا کہ کسی دشمن کا اعتبار نہ کرنا نہیں تو وہ صدمہ گزرے گا جو اس امیر زادے پر اس سانپ کے سبب گزرا''[۱۰۴]۔ اس کے علاوہ ناسخ نے اس لفظ کو

حادثات، سانحات اور رنج و غم پہنچنے کے معنوں میں استعمال کیا ہے۔شعر ملاحظہ کیجیے:

صدمہ دل کو جو ہوا نالۂ سوزاں نکلا جس طرح سنگ سے ہو آتشِ پنہاں پیدا[۱۰۵]

اس لفظ کو قولِ فیصل یعنی تکلیف اور دکھ کے معنوں میں بھی استعمال کیا جاتا ہے۔اس حوالے سے جلال لکھنوی کا شعر دیکھیے:

دبے رہے ہیں بہت زیرِ کوہ رنجِ فراق ہمیں لحد میں نہ کچھ صدمۂ فشار ہوا[۱۰۶]

اسی طرح غم و الم کی شدت کا حال بیان کرتے ہوئے پنڈت رتن ناتھ سرشار نے لکھا کہ ''یا الٰہی یہ کیا ہو رہا ہے۔معلوم ہوتا ہے اس نے بھی کوئی صدمۂ عظیم سہا ہے''[۱۰۷]۔''اردو لغت'' (تاریخی اصولوں پر) میں اس کی جمع ''صدمات''[۱۰۸] درج ہے۔ادبا اور شعرا نے ''صدمے'' کو بھی اس کی جمع کے طور پر استعمال کیا ہے۔خواجہ حیدر علی آتش نے پے در پے ملنے والے صدمات پر بے اختیار کہا کہ:

دوستوں سے اس قدر صدمے ہوئے ہیں جان پر دل سے دشمن کی عداوت کا گلہ جاتا رہا[۱۰۹]

اس حوالے سے نسیم دہلوی کا بھی ایک شعر ملاحظہ کیجیے:

جو مجھ پہ گزرتی ہے کہیں جلد گزر جائے ہر روز کے صدمے تو اٹھائے نہیں جاتے[۱۱۰]

یوسف کامران نے لکھا کہ ''میں جب گئے وقت کے سفیر کا ورق ورق ذہن کے دریچوں سے دیکھتا ہوں تو آنے والی رتوں کے صدمے پکارتے ہیں''[۱۱۱]۔امیر مینائی نے کہا کہ:

قدر مرنے کی ہم سمجھتے ہیں صدمے جھیلے ہیں زندگانی کے[۱۱۲]

بعض اوقات صدمے کی شدت اس قدر زیادہ ہوتی ہے کہ شاعر صبر کی فریاد کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔اس بابت یاس یگانہ چنگیزی کا شعر ملاحظہ کیجیے:

صدمے دیے تو صبر کی دولت بھی دے گا وہ کس چیز کی کمی ہے سخی کے خزانے میں[۱۱۳]

''قاموس مترادفات'' میں ''ٹھیس، دھچکا، گزند، تکلیف، مصیبت، بپتا، آفت، بلا، رنج، الم، غم، اندوہ، ملال، حزن، رنج و غم، درد و الم اور کوفت''[۱۱۴] وغیرہ جیسے الفاظ صدمہ کے مترادف کے طور پر درج ہیں۔راقم بھی انھی معنوں کو ملحوظ رکھ کر اس سے مراد ایسے سانحات لے رہا ہے جس نے قومی اور اجتماعی زندگی پر گہرے منفی اثرات مرتب کیے ہوں۔

واقعہ، عربی زبان کا لفظ ہے۔اس لفظ کا عربی تلفظ ''الـــواقِـــعة'' ہے۔اس سے مراد لڑائی، تصادم، مصیبت اور قیامت کے ہیں[۱۱۵]۔محمد حسن الاعظمی کے مطابق یہ لفظ لڑائی، جنگ، دھاوا، لڑائی کی دھکا پیل، مصائب زمانہ میں سے ایک مصیبت، قیامت، حادثہ اور بلا[۱۱۶] وغیرہ کے معنوں میں مستعمل ہے۔''فرہنگ عامرہ'' میں اس کے معنی خواب، جنگ، حادثہ، خبر، سختیِ زمانہ، موت، حال اور قیامت درج ہے۔لفظ وقائع اور واقعات کو اس لفظ کی جمع کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔عربی میں یہ لفظ مونث کے طور پر مستعمل ہے[۱۱۷]۔جب کہ اردو میں اس لفظ کو مذکر کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔''فرہنگ آصفیہ'' کے مطابق اس کے لیے اردو میں ''حادثہ، سانحہ، وقوعہ، واردات، روئداد، حال، سرگزشت، بپتی، ماجرا، خبر، سماچار، لڑائی، جنگ کا آزار، موت، کال، انتقال، وفات، سختی، رقت، قیامت اور حشرِ آفت''[۱۱۸] کا لفظ رائج ہے۔''اردو لغت'' (تاریخی اصولوں پر) میں اس لفظ کے معنی ''وہ امر جو پیش آئے، جو ہوا ہو، جو کچھ گزرا ہو، جو بپتا ہو''[۱۱۹] درج ہے۔''جامع اللغات'' کے مطابق ''حادثہ، سانحہ، ماجرا، سرگزشت، حال، خبر، بپتی، واردات، وقوع، لڑائی، جنگ، آفت،

مصیبت، سختی، حشر، موت اور انتقال''[۱۲۰] کے معنوں میں یہ لفظ مستعمل ہے۔ ''مہذب اللغات'' میں اس کے معنی ''سانحہ، حادثہ، واردات، وقوعہ، سرگزشت، حال، ماجرا، خبر، روداد اور قصہ''[۱۲۱] درج ہیں۔

مختلف لغات کے جائزے سے اس لفظ کا جو مفہوم سامنے آتا ہے وہ کسی واقعے، حادثے، صدمے، سانحے اور المیے کا ظہور پذیر ہونا ہے۔ اسی لیے وارث سرہندی نے سانحہ، حادثہ اور واردات کو اس کے مترادف کے طور پر پیش کیا ہے[۱۲۲]۔ اردو انگریزی لغت میں اس کے لیے Event, Incident, Tale, Story, Matter, Happening, Occurrence اور Conflict[۱۲۳] وغیرہ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔

شعر و ادب میں اس لفظ کے مختلف معنی اور مفہوم رائج ہیں۔ ابوالکلام آزاد نے اس لفظ کو جائے وقوع کے معنوں میں بھی استعمال کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ''یہ جگہ عین دریائے ہوگلی پر واقعہ ہے''[۱۲۴]۔ مولوی ذکاء اللہ نے واقعہ طلب کو مفاد پرستی کے معنوں میں استعمال کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''بہت سے واقعہ طلب اور فرصت جو مخالفت سے مل گئے''[۱۲۵]۔ کسی حادثے یا تاریخی واقعات کو رقم کرنے والا واقعہ نویس کہلاتا ہے۔ اس حوالے سے مولانا محمد حسین آزاد نے لکھا کہ ''ہر لشکر میں ہر شہر کے حاکم کے پاس بھی واقعہ نویس اور امین رہتے تھے''[۱۲۶]۔ مولانا شبلی نے اس کے لیے لکھا کہ ''لکھنؤ کے واقعہ نگار نے فوراً دربار کو اطلاع دی''[۱۲۷]۔ فقیر محمد گویا نے اس لفظ کو استعمال کرتے ہوئے لکھا کہ ''علاج، واقعہ کے وقوع سے پہلے کرنا چاہیے''[۱۲۸]۔ کسی مخصوص واقعے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے ''مطلع العجائب'' کے مصنف نے لکھا کہ ''ارہاص وہ ہیں جو نبی کی نبوۃ سے پہلے ظہور میں آئیں، جیسے واقعۂ فیل، اور شق صدر''[۱۲۹]۔ اسی طرح کسی خاص حادثے اور سانحے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پروفیسر آرنلڈ کے مترجم عنایت اللہ دہلوی نے لکھا کہ ''انطالیہ کے قرب و جوار میں ایسا ہی واقعہ گزرا''[۱۳۰]۔ مخصوص تاریخی واقعات کی نشان دہی کرتے ہوئے سید سلیمان ندوی نے لکھا کہ ''بردوان میں ایک عجیب پراسرار واقعہ پیش آیا جس نے لوگوں میں کافی سنسنی پھیلا دی''[۱۳۱]۔ سرسید نے بھی اس لفظ کو تاریخ سے جوڑتے ہوئے لکھا کہ ''ایک ہی واقعہ حضرت مسیح کے قتل کا ہے جو کالوری کی بھاڑی [کذا۔ پہاڑی] میں بیت المقدس کے پاس گزرا''[۱۳۲]۔

لفظ واقعہ کو بعض ادبا اور شعرا نے مصیبت، پریشانی اور کسی اندوہ ناک حادثے اور سانحے کے مترادف کے طور پر بھی استعمال کیا ہے۔ ملا وجہی نے اس حوالے سے لکھا کہ ''اگر گھر میں تی انوں کا پانوں بھار بڑے خدا جانے بچارے مرداں پر کیا کیا واقعہ کھڑے''[۱۳۳]۔ یہاں ''واقعہ'' مصیبت اور پریشانی کے معنی دے رہا ہے۔ اسی طرح پنڈت رتن ناتھ سرشار لکھتے ہیں کہ ''سمندر کی موج اس کو بوٹ پر سے بہا لے گئی۔ اس واقعۂ جگر دوز کو دیکھ کر آزاد نہایت استقلال اور جواں مردی کے ساتھ سمندر میں کود پڑا''[۱۳۴]۔ اسی لفظ کو کسی قومی یا ملّی سانحے کے طور پر بھی برتا گیا۔ ہاتف نے واقعۂ کربلا کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ:

آ کربلا کا واقعہ دیکھو حرم رو رو اگت ۔۔۔ سینے کوں لگ لگ شاہ کے پڑتے ہیں دن میں مرثیہ[۱۳۵]

یقین نے کہا کہ:

یقیں کے واقعہ کی سن خبر وہ بد گماں بولا ۔۔۔ یہ دیوانہ تو کچھ ایسا نہ تھا بیمار کیا کہیے[۱۳۶]

مرزا دبیر نے بھی اس لفظ کو موت کے معنوں میں استعمال کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ:

تابوت کو سب دیکھ کے کرنے لگے مذکور ۔۔۔ یہ واقعہ کس کا ہوا اے عابدِ رنجور[۱۳۷]

مہر نے اس حوالے سے لکھا کہ:

مر گئے ہم مسیح کے دم میں یہ بھی اک واقعہ عجیب ہوا[۱۳۸]

شاہ مراد اللہ انصاری نے بھی انھی معنوں میں استعمال کرتے ہوئے لکھا کہ "ابو طالب حضرتؐ کے چچا... حضرتؐ کی یاری مددگاری... کرتے رہے۔ پھر کئی برس کے پیچھے ان کا بھی واقعہ ہوا"[۱۳۹]۔ غرض کہ یہ لفظ بھی ذاتی سانحے کے ساتھ ساتھ قومی و ملّی سانحات اور اندوہ ناک واقعات کے معنوں میں مستعمل ہے۔

مذکورہ بالا مباحث میں جن لغوی صراحتوں سے بحث کی گئی ہے ان میں ایک بات قدرِ مشترک ہے کہ ان تمام الفاظ کو کسی افسوس ناک حادثے، واقعے اور سانحے کے معنوں میں استعمال کیا گیا ہے۔ سانحے کے مترادف کے طور پر مستعمل ان تمام الفاظ کو راقم نے بھی مذکورہ معنوں میں ہی لیا ہے تاہم یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ راقم نے ذاتی حادثات، سانحات اور واقعاتِ بد کو مقالے میں شامل نہیں کیا، کیوں کہ یہ مقالہ ان سانحات کے بیان کی طوالت کا متحمل نہیں ہوسکتا۔ البتہ ابتدا تا سترھویں صدی، اٹھارھویں اور انیسویں صدی بالعموم اور بیسویں صدی میں رونما ہونے والے وہ تمام اہم قومی وملّی سانحات اور قدرتی آفات بالخصوص جنھوں نے برصغیر کی تاریخ میں ہلچل مچائی اور یہاں کی تہذیبی، ادبی اور معاشرتی زندگی کو متاثر کیا، ان پر سیر حاصل بحث کی کوشش ضرور کی جائے گی۔ یہ سانحات تاریخ کے ہر دور میں ہوتے رہے ہیں اور قومیں ان سے متاثر ہوتی رہی ہیں۔ لہٰذا ایسے المیے جنھوں نے اجتماعی زندگی کے تار و پود کو بکھیر کر رکھ دیا ہو، راقم کے مطالعے کا موضوع ہیں۔

بیسویں صدی کے سانحات پر تفصیلی مباحث کے آغاز سے قبل ضروری ہے کہ اردو شاعری میں سانحات کے اظہار کی روایت کا مختصر احوال ضرور پیش کیا جائے تا کہ موجودہ صدی میں پیش آنے والے سانحات اور شعری رویوں کو سمجھنے میں آسانی ہو۔

حوالہ جات

۱۔ حسن، محمد، الاعظمی، ''المعجم الاعظم''، عربی۔اردولغت، (کراچی، مکتبۂ اعظمیہ، ۱۹۵۴ء)

۲۔ المنجد، عربی۔اردولغت، اضافہ شدہ جدید ایڈیشن، (کراچی، دار الاشاعت، ۱۹۷۵ء)

۳۔ مرتب، حسن، محمد، الاعظمی، عربی۔اردولغت، ۱۹۵۴ء

۴۔ ایضاً

۵۔ مرتب، فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، جلد یازدہم، (کراچی، اردو لغت بورڈ، ۱۹۹۰ء)

۶۔ مرتب، عبدالعزیز، محمد، (کان پور، مطبع مجیدی، ۱۹۲۹ء)

۷۔ شرر، عبدالحلیم، مولوی، جلد دوم، (بمبئی، مکتبۂ سلطانی، ۱۹۰۰ء)، ص۱۲۳

۸۔ مترجم، رسوا، مرزا ہادی، مصنف شیخ فاضل حکیم، اوّل، (دکن، جامعہ عثمانیہ، ۱۹۲۵ء)، ص۳۹۱

۹۔ المنجد، محولہ بالا

۱۰۔ فرہنگ آصفیہ

۱۱۔ مرتب، فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، جلد دوازدہم، (کراچی، اردو لغت بورڈ، ۱۹۹۱ء)

۱۲۔ ''مقالات برنی''، (کراچی، انجمن ترقی اردو، ۱۹۵۹ء)، ص۶۵

۱۳۔ عبدالمجید، خواجہ، جامع اللغات، (لاہور، جامع اللغات کمپنی، سن ندارد)

۱۴۔ ''حیات سعدی''، طبع اوّل، (علی گڑھ، محمڈن پریس، ۱۸۸۶ء)، ص۵

۱۵۔ ''سیرۃ النبیؐ''، جلد سوم، طبع اوّل، (اعظم گڑھ، مطبع معارف، ۱۹۲۳ء)، ص۱۹۳

۱۶۔ چغتائی، عبداللہ، ڈاکٹر، ''مقدمہ''، (کراچی، مجلس ترقی ادب، ۱۹۷۷ء)، ص ط

۱۷۔ مترجم، ''نتائج المعانی''، ازمحمود بیگ راحت، طبع اوّل، (لاہور، مجلس ترقی ادب، ۱۹۶۷ء)، ص۲۹

۱۸۔ مرتب، خواجہ عبدالمجید، محولہ بالا

۱۹۔ مؤلف، ''وارث سرہندی''، طبع اوّل، (لاہور، اردو سائنس بورڈ، ۱۹۸۶ء)

۲۰۔ مؤلف، ''مولوی سید احمد دہلوی''، طبع سوم، (لاہور، مکتبہ احسن سہیل، سن ندارد)

۲۱۔ مرتب، ''مہذب لکھنوی''، (لکھنؤ، نامی پریس، ۱۹۶۹ء)

۲۲۔ مرتب، نیر، نورالحسن، (لکھنؤ، نیر پریس، ۱۳۴۷ھ)

۲۳۔ مؤلف، خواجہ عبدالمجید، محولہ بالا

۲۴۔ مرتبہ، ''شان الحق حقی''، طبع اوّل، (اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۵ء)

۲۵۔ مرتب، فرمان فتح پوری، جلد یازدہم، محولہ بالا

۲۶۔ ''لوحِ محفوظ''، طبع اوّل، (کراچی، احمد برادرز، ۱۹۸۳ء)، ص۲۵۰

۲۷۔ ''سکوت شب''، طبع اوّل، (لاہور، مکتبہ عالیہ، ۱۹۷۶ء)، ص۶۴

۲۸۔ مرتب، فرمان فتح پوری، جلد یازدہم، محولہ بالا

۲۹۔ ''محمد حسین شاہ''، طبع اوّل، (لکھنؤ، نول کشور، ۱۸۸۲ء)، ص۳۳۲

۳۰۔ ''الف لیلہ باتصویر''، جلد اوّل، طبع اوّل، (لکھنؤ، نول کشور، ۱۹۰۱ء)، ص۳۶

۳۱۔ ''لکچروں کا مجموعہ''، جلد اوّل، طبع دوم، (آگرہ، مفید عام پریس، ۱۹۱۸ء)، ص۱۴

۳۲۔ ''میری زندگی فسانہ''، طبع اوّل، (کراچی، نوید پرنٹنگ پریس، ۱۹۸۲ء)، ص۱۲۷

۳۳۔ ''غالب: شخصیت اور شاعری''، طبع دوم، (کراچی، مکتبہ دانیال، ۱۹۵۸ء)، ص۳۹

۳۴۔ ''تاریخ ہندوستان''، جلد چہارم، طبع اوّل، (دہلی، مطبع شمس المطابع، ۱۸۹۷ء)، ص۶۷

۳۵۔ ''انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر''، طبع دوازدہم، (مجلس نشریات اسلام، ۱۹۷۳ء)، ص۱۶

۳۶۔ ''دفتر ماتم''، جلد۱۶، (لکھنؤ، مطبع احمدی، ۱۸۹۷ء)، ص۳۳

۳۷۔ ''کلیات میر''، مرتبہ ڈاکٹر عبادت بریلوی، طبع اوّل، (کراچی، اردو دنیا، ۱۹۵۰ء)، ص۳۴۹و۹۳۹

۳۸۔ مشمولہ: ''تذکرہ شعرائے بدایوں''، جلد اوّل، طبع اوّل، مرثیہ

شہید حسین بدایوں، (کراچی، انجمن بدایوں، ۱۹۸۷ء)، ص ۳۲۸

۳۹۔ رند، سید محمد خان، ''دیوان رند''، طبع اوّل، (لکھنؤ، مطبع نول کشور، ۱۸۳۲ء)، ص ۱۳۰

۴۰۔ ''لوح محفوظ''، طبع اوّل، (کراچی، احمد برادرز پرنٹرز، ۱۹۸۳ء)، ص ۲۵۰

۴۱۔ پاریکھ، رؤف، ''اوکسفرڈ اردو انگریزی لغت''، طبع اوّل، (کراچی، اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس، ۱۹۱۳ء)،

۴۲۔ Noah, Webster (نوح ویبسٹر)، Webster's New Twentieth Century Dictionary of the English Language، Second Edition، طبع دوم، (امریکہ، کولن ورلڈ، ۱۹۷۸ء)

۴۳۔ ایضاً

۴۴۔ "Oxford English-Urdu Dictionary"، طبع اوّل، (کراچی، اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس، ۲۰۰۳ء)

۴۵۔ مؤلف، وارث سرہندی، محولہ بالا

۴۶۔ عربی۔اردو لغت، محولہ بالا

۴۷۔ ایضاً

۴۸۔ مؤلف، مولوی سید احمد دہلوی، محولہ بالا

۴۹۔ مرتب، خواجہ عبدالمجید، محولہ بالا

۵۰۔ مرتب، عبدالعزیز، محمد، محولہ بالا

۵۱۔ مرتب، مہذب لکھنوی، محولہ بالا

۵۲۔ مرتب، شان الحق حقی، محولہ بالا

۵۳۔ مرتب، فرمان فتح پوری، جلد ہشتم، (کراچی، اردو لغت بورڈ، ۱۹۷۸ء)

۵۴۔ مرتب، ''رؤف پاریکھ''، محولہ بالا

۵۵۔ مؤلف، وارث سرہندی، محولہ بالا

۵۶۔ برق دہلوی، مہاراجہ، بہادر، ''مطلع انوار''، طبع اوّل، (دہلی، محبوب المطابع، ۱۹۲۹ء)، ص ۱۳۶

۵۷۔ حالی، خواجہ الطاف حسین، ''حیات جاوید''، طبع اوّل، (کان پور، محمد احمد اللہ رعد پریس، ۱۸۹۹ء)، ص ۲۸

۵۸۔ اقبال، محمد، علامہ، ''اقبال نامہ: مجموعۂ مکاتیب''، جلد دوم، مرتبہ شیخ عطا اللہ، طبع اوّل، (لاہور، دین محمدی پریس، ۱۹۵۱ء)، ص ۱۱۵

۵۹۔ میر، محمد تقی، میر، ''کلیات میر''، طبع اوّل، (کراچی، اردو دنیا، ۱۹۵۰ء)، ص ۱۴۶

۶۰۔ ابرار، صدیقی، بدایونی، ''صدر رنگ''، (کراچی، انجمن پریس، ۱۹۷۸ء)، ص ۸۶

۶۱۔ شور، منظور حسین، علیگ، ''نبض دوراں''، (کراچی، مکتبۂ افکار، ۱۹۵۹ء)، ص ۲۹

۶۲۔ ''سیرۃ النبیؐ''، جلد سوم، طبع دوم، (اعظم گڑھ، مطبع معارف، ۱۹۲۸ء)، ص ۱۳۱

۶۳۔ ''مقالات شبلی''، جلد ۵، (اعظم گڑھ، مطبع معارف، ۱۹۳۵ء)، ص ۵

۶۴۔ ''دفتر ماتم''، جلد چہارم، طبع دوم، (لکھنؤ، مطبع احمدی، ۱۹۰۹ء)، ص ۲۵۰

۶۵۔ ''دیوان حالی''، طبع دوم، (لکھنؤ، الناظر پریس، ۱۸۹۲ء)، ص ۵۷

۶۶۔ اسیر، منشی مظفر علی خاں، ''دیوان اسیر''، جلد سوم، (کان پور، مطبع نول کشور، ۱۹۷۰ء)، ص ۴۶

۶۷۔ ''سیف و سبو''، طبع دوم، (مکتبۂ اردو، لاہور، ۱۹۳۳ء)، ص ۵۱

۶۸۔ ''نبضِ دوراں''، (کراچی، مکتبۂ افکار، ۱۹۵۹ء)، ص ۸۱

۶۹۔ ''سنگ وحشت''، طبع اوّل، (ناگ پور، احمد پریس، ۱۹۴۲ء)، ص ۱۳۲

۷۰۔ ''ضیائے سخن''، طبع اوّل، (کراچی، ابن حسن پرنٹنگ پریس، ۱۹۷۷ء)، ص ۱۴۴

۷۱۔ مرتب، وارث سرہندی، محولہ بالا

۷۲۔ عربی۔اردو لغت، محولہ بالا

۷۳۔ مولف، نورالحسن نیر، محولہ بالا

۷۴۔ مرتب، مولوی عبدالحق اور ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، (کراچی، ترقی اردو بورڈ، ۱۹۷۷ء)

۷۵۔ طبع اوّل، (لاہور، مجلس ترقی ادب، ۱۹۶۵ء)، ص ۵۳

۷۶۔ ''کلیات میر''، مرتبہ ڈاکٹر عبادت بریلوی، طبع اوّل، (کراچی، اردو دنیا، ۱۹۵۰ء)، ص ۶۲۵

۷۷۔ ''کلیات میر''، محولہ بالا، ص ۳۴۷

۷۸۔ ''انتخاب مصحفی''، مرتب نا معلوم، (رام پور، تاج المطابع، ۱۹۷۸ء)، ص ۴۱

۷۹۔ آرزو لکھنوی، انور حسین، ''فغان آرزو''، طبع دوم، (حیدر آباد دکن، رزاقی مشین پریس، ۱۹۴۵ء)، ص ۲۷۰

۸۰۔ ''مظہر عشق''، (کان پور، نول کشور، ۱۸۷۲ء)، ص ۲۰

۸۱۔ اصل نام نجم الدین، ''دیوان آبرو''، مرتبہ ڈاکٹر محمد حسن، (علی گڑھ، ادارۂ تصنیف، سن ندارد)، ص ۱۱۴

۸۲۔ حنا، زاہدہ، ''عورت زندگی کا زنداں''، (کراچی، سمیع سنز پرنٹرز، ۲۰۰۴ء)، ص ۱۲۸

۸۳۔ ''دیوان غالب''، طبع اوّل، مرتبہ امتیاز علی عرشی، (علی گڑھ، انجمن ترقی اردو، ۱۹۵۸ء)، ص ۱۱۶

۸۴۔ ''تمہیدی خطبے''، بہ تصحیح عبدالستار صدیقی، اوّل، (دہلی، انجمن ترقی اردو، ۱۹۴۰ء)، ص ۱۵۳

۸۵۔ دتاسی، گارساں، تصحیح، عبدالستار صدیقی، طبع اوّل، (دہلی، انجمن ترقی اردو ہند، ۱۹۴۰ء)، ص ۱۵۳

۸۶۔ ''آفت کا ٹکڑا''، طبع اوّل، (لاہور، مکتبہ جدید، ۱۹۶۲ء)، ص ۱۱

۸۷۔ مرتب مولوی عبدالحق اور ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، محولہ بالا

۸۸۔ ''گئے دنوں کے سراغ''، (لاہور، سنگ میل پبلشرز، ۲۰۰۴ء)، ص ۳۸۳

۸۹۔ ''آثار ابوالکلام آزاد: ایک نفسیاتی مطالعہ''، طبع سوم، (دہلی، آزاد کتاب گھر، ۱۹۵۸ء)، ص ۴۷

۹۰۔ مرتب رؤف پاریکھ، محولہ بالا

۹۱۔ مرتبہ، Noah, Webster، محولہ بالا

۹۲۔ مرتب، وارث سرہندی، محولہ بالا

۹۳۔ عربی۔اردو لغت، محولہ بالا

۹۴۔ اردو لغت (تاریخی اصولوں پر)، مرتبہ ڈاکٹر فرمان فتح پوری، (کراچی، اردو لغت بورڈ)

۹۵۔ مولف، مولوی سید احمد دہلوی، محولہ بالا

۹۶۔ مرتب، مہذب لکھنوی، محولہ بالا

۹۷۔ مرتب، خواجہ عبدالمجید، محولہ بالا

۹۸۔ مولف، نورالحسن نیر، محولہ بالا

۹۹۔ ذکاء اللہ، مولوی، ''تاریخ ہندوستان''، جلد چہارم، طبع اوّل، (دہلی، مطبع شمس المطابع، ۱۸۹۷ء)، ص ۳۱۷

۱۰۰۔ ''جامع اللغات''، محولہ بالا

۱۰۱۔ حیدری، سید احمد بخش، ''مختصر کہانیاں''، مرتبہ ڈاکٹر عبادت بریلوی، (لاہور، اشرف پریس، ۱۹۶۴ء)، ص ۲۰۰

۱۰۲۔ ''توبۃ النصوح''، مشمولہ: ''مجموعہ ڈپٹی نذیر احمد''، (لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۴ء)، ص ۴۴۶

۱۰۳۔ میر ببر علی، ''مراثی انیس''، جلد اوّل، طبع دوم، مرتبہ علی حیدر طباطبائی نظم لکھنوی، (بدایوں، نظامی پریس، ۱۹۳۵ء)، ص ۶۸

۱۰۴۔ ''طوطا کہانی''، (ندارد، مطبع اسماعیلیہ، ندارد)، ۱۲۷۰ھ، ص ۵۸۔۶۰

۱۰۵۔ ناسخ، شیخ امام بخش، ''دیوان ناسخ'' اوّل، طبع پنجم، (کان پور، نول کشور، ۱۸۸۶ء)، ص ۲۷

۱۰۶۔ بحوالہ ''تہذیب اللغات''، جلد ہفتم، ص ۲۹۸، محولہ بالا

۱۰۷۔ سرشار، پنڈت رتن ناتھ، ''فسانۂ آزاد''، بحوالہ ''مہذب اللغات''، جلد ہفتم، ص ۲۹۷، محولہ بالا

۱۰۸۔ مدیر، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، جلد دوازدہم، محولہ بالا

۱۰۹۔ آتش، خواجہ حیدر علی، ''کلیات آتش''،

۱۱۰۔ بحوالہ ''نوراللغات''، حصہ سوم، ص ۴۸۴، محولہ بالا

۱۱۱۔ ''اکیلے سفر کا اکیلا مسافر''، طبع اوّل، (لاہور، طارق پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۸۱ء)، ص ۳۳

۱۱۲۔ ''صنم خانۂ عشق''، (آگرہ، مطبع مفید عام، ۱۸۸۸ء)، ص ۳۵۷؛ مہذب اللغات کے صفحہ نمبر ۲۹۷ میں سہواً اس شعر کو میر تقی میر سے منسوب کیا گیا ہے۔ دیکھیے جلد ہفتم۔

۱۱۳۔ ''آیات وجدانی''، طبع اوّل، (لاہور، مطبع شیخ مبارک علی، ۱۹۲۷ء)، ص ۲۱۱

۱۱۴۔ مولف، وارث سرہندی، محولہ بالا

۱۱۵۔ ''المنجد''، محولہ بالا

۱۱۶۔ عربی۔اردولغت،محولہ بالا

۱۱۷۔ مرتب،محمد عبداللہ خان خویشگی،طبع اوّل، (اسلام آباد،مقتدرہ قومی زبان،۱۹۸۹ء)

۱۱۸۔ مولف،مولوی سیداحمد دہلوی،طبع سوم،محولہ بالا

۱۱۹۔ مرتب،ڈاکٹر رؤف پاریکھ،جلدبیست ویکم،۲۰۰۷ء،محولہ بالا

۱۲۰۔ مرتب،خواجہ عبدالمجید،محولہ بالا

۱۲۱۔ مرتب،مہذب لکھنوی،محولہ بالا

۱۲۲۔ ''قاموس مترادفات''،محولہ بالا

۱۲۳۔ مرتب،رؤف پاریکھ،محولہ بالا

۱۲۴۔ آزاد،ابوالکلام،مولانا،''غبارِ خاطر''،طبع اوّل، (لاہور،مکتبۂ القریش،۱۹۷۲ء)،ص۲۱۴

۱۲۵۔ ذکاء اللہ،مولوی،''تاریخ ہندوستان''،جلد پنجم،طبع سوم، (علی گڑھ،مطبع انسٹی ٹیوٹ،۱۹۱۶ء)،ص۳۱۷

۱۲۶۔ آزاد،محمد حسین،مولانا،''سخندانِ فارس''،حصہ دوم،طبع اوّل، (لاہور،مطبع مفید عام،۱۹۷۲ء)،ص۱۱۸

۱۲۷۔ شبلی،نعمانی،علامہ،''مقالاتِ شبلی''،جلدسوم، (اعظم گڑھ،مطبع معارف،۱۹۳۲ء)،ص۹۲

۱۲۸۔ گویا،فقیر محمد،''بستان حکمت''،ترجمہ انوار سہیلی،طبع اوّل، (لکھنؤ،نول کشور،۱۸۳۸ء)،ص۱۰۴

۱۲۹۔ مترجم،مہدی علی خاں، (کان پور،نول کشور،۱۸۷۳ء)،ص۱۱

۱۳۰۔ آرنلڈ، پروفیسر، ٹی۔ڈبلیو،''دعوت اسلام''،مترجم،عنایت اللہ دہلوی، (آگرہ،مطبع مفیدعام،۱۸۹۷ء)،ص۸۰

۱۳۱۔ ندوی،سیدسلیمان،''سیرۃ النبی''،جلدسوم،طبع دوم، (اعظم گڑھ، مطبع معارف،۱۹۲۸ء)،ص۱۴۴

۱۳۲۔ خان،سرسید احمد،''خطبات احمدیہ''،طبع اوّل، (علی گڑھ،مطبع فیض عام،۱۸۷۰ء)،ص۳

۱۳۳۔ وجہی،ملاّ،''سب رس''،طبع اوّل، (کراچی،انجمن ترقی اردو، ۱۹۵۲ء)،ص۲۴۸

۱۳۴۔ سرشار، پنڈت رتن ناتھ،''فسانۂ آزاد''، جلد دوم، طبع سوم، (لکھنؤ،نول کشور پریس،۱۸۹۴ء)،ص۱۷۰

۱۳۵۔ ہاتف، مرزا، مشمولہ: ''بیاض مراثی''، مرتبہ افسر صدیقی، امروہوی،طبع اوّل، (کراچی،انجمن ترقی اردو،۱۹۷۵ء)،ص ۱۳۴

۱۳۶۔ یقین،انعام اللہ،''دیوان یقین''،مرتبہ مرزا فرحت اللہ بیگ، طبع اوّل،(علی گڑھ،مطبع مسلم یونیورسٹی،۱۹۳۰ء)،ص۶۴

۱۳۷۔ دبیر،مرزا سلامت علی،''دفترِ ماتم''،جلد چہارم،طبع دوم، (لکھنؤ، مطبع احمدی،۱۹۰۹ء)،ص۱۷۷

۱۳۸۔ مہر،آغا علی خان،لکھنوی،''دیوان مہر''، (مطبع ندارد،۱۸۴۶ء)، ص۲۵

۱۳۹۔ انصاری، مراد اللہ شاہ،''تفسیر مرادیہ''،طبع اوّل، (بنگال،مطبع ستاریہ،۱۸۶۶ء)،ص۳۴۳

باب دوم:

آغاز تا سترھویں صدی میں اردو کا سانحاتی شعری منظر نامہ: محرکات وعوامل

ہندوستان میں مختلف سلاطین کے ہاں کوئی با قاعدہ نظام سیاست کا چلن نہیں تھا۔لہٰذا ان خاندانوں میں ولی عہدوں کی تخت نشینی کے وقت اکثر وبیشتر خانہ جنگی ضرور ہوتی۔ ہندوستان میں مسلم حکم رانوں کا کوئی دور ایسا نہیں جوان خانہ جنگیوں سے بچ سکا ہو۔تخت و تاج کے دعویٰ دار یہ شہزادے اکثر ایک دوسرے کے خون کے پیاسے رہتے اور آپس کی معرکہ آرائیوں میں مصروف رہتے۔ان معرکوں کے نتیجے میں بھی طرح طرح کے سانحات جنم لیتے۔اگر ان تخت نشینی کی خون ریز جنگوں، کامیابیوں اور ناکامیوں، سازشوں، پدر اور برادر کشیوں، بغاوتوں اور اندرونی شورشوں، بیرونی حملوں اور قتل وغارت کے نہ ختم ہونے والے سلسلے کو تفصیل سے بیان کیا جائے تو دفتر کے دفتر سیاہ ہو جائیں گے اور ان واقعات کا بیان پھر بھی ختم نہیں ہو پائے گا۔لہٰذا ضرورت اس بات کی ہے کہ چند ایک اہم واقعات کی نشان دہی کرتے ہوئے چیدہ چیدہ واقعات بیان کیے جائیں اور ان اسباب وعلل پر غور کیا جائے جن کی وجہ سے مختلف سانحات نے جنم لیا۔ خصوصاً ان واقعات کو ضرور موضوع بحث بنایا جائے جسے اردو شعرا نے اپنی تخلیق کا موضوع بنایا۔اس طرح ہم شاید ان سانحات کے بارے میں بہتر نتائج اخذ کرنے کے قابل ہوسکیں۔

شعر وادب کو ہماری سماجی، معاشی اور تمدّنی زندگی میں خاص اہمیت حاصل ہے۔ یہ بات مسلّم ہے کہ قوت متخیّلہ کی ترقی اور جذبات کی تربیت کا شعر سے بہتر کوئی ذریعہ نہیں[۱]۔ ''شعر وادب کی تخلیق انسان کی اس فطری خواہش کے تابع ہے کہ وہ اپنے جذبات و احساسات سے دوسروں کو آگاہ کرے''[۲]۔علامہ شبلی نعمانی کے مطابق ''شاعری صرف وزن وقافیہ کا نام نہیں بلکہ وہ کلام موزوں ہے جسے بہ ارادہ موزوں کیا گیا ہو''۔ ''شعرائے فارسی کے نزدیک بھی شاعری دراصل تخیل کا نام ہے''[۳]۔لیکن تخیل کو اظہار کے لیے زبان کی ضرورت پیش آتی ہے۔لہٰذا صرف تخیل کو شاعری سمجھنا درست نہیں۔اس سلسلے میں مواد content اور ہیئت form کی بحث کو بھی شامل کیا جاسکتا ہے۔الگ الگ ہونے کے باوجود یہ دونوں اجزا درحقیقت ایک ہی تصویر کے دو رخ ہیں۔

''شاعری سے جذبات انسانی برانگیختہ ہوتے ہیں''[۴]۔اسی لیے ''شعر کی تاثیر کا کوئی شخص انکار نہیں کرسکتا۔سامعین کو اکثر اسے حزن یا نشاط یا جوش یا افسردگی کی کم یا زیادہ ضرور پیدا ہوتی ہے''[۵]۔شاعری کے متعلق محض یہ کہہ دینا کہ وہ داخلی زندگی کی ترجمان ہوتی ہے، سراسر غلط فہمی ہے[۶]۔ کیوں کہ شاعری انسان کے خارجی معاملات کو بھی زیر بحث لاتی ہے۔ ''کسی ملک اور قوم کی اجتماعی زندگی کے مختلف اداروں اور شعبوں کا عکس اس کے ادبیات میں جھلکتا ہے''[۷]۔خصوصاً ''شاعری صحیح معنوں میں معاشرے اور ماحول کی عکاسی کرتی ہے۔عام مروجہ حالات وکوائف کو احاطۂ نور میں لے آنا اس کا اہم فریضہ ہے۔خارجی اثرات وعوامل پر اس کی گرفت بے حد مضبوط ہوتی ہے۔ وقت کی دھڑکن، زمانے کی رفتار، سیاسی کیفیت اور معاشی ومعاشرتی روایت شاعری کے سانچے میں ہمیشہ کے لیے ڈھل جاتی ہے''[۸]۔اسی لیے شاعر اپنی تخلیق کے ذریعے اپنی ''انفرادی کاوش کو اجتماعی اظہار وابلاغ کا وسیلہ بنا دیتا ہے''۔زندگی کے مختلف حادثات و سانحات کے ذریعے پیدا ہونے والی صورت حال اور اس کے نتائج کا عمومی جائزہ عام طور پر شاعر کا حساس دل بہت خوب صورتی سے لیتا ہے۔''ان ذکی الحسن افراد کی ذات میں معاشرہ اپنے آپ کو پہچان لیتا ہے اور محاسبہ کرتا ہے''۔کیوں کہ غیر ارادی طور پر شاعر اپنے دور

میں پیش آنے والے حادثات و سانحات کو موضوع بناتا ہے۔ شوپنہار نے صاف صاف لکھا کہ جمالیاتی تخلیق میں ارادہ بالکل معطل ہو جاتا ہے۔ برگساں کہتا ہے کہ عملی زندگی ہمارے شعور پر ایک دبیز غلاف چڑھا دیتی ہے، جو اتنا گاڑھا ہوتا ہے کہ پردے یا غلاف کے اس پار اپنی شخصیت کے ان گوشوں کو بھی دیکھتا ہے جو عملی شعور کی فضا سے باہر کی چیز ہیں۔ سلیم احمد کے مطابق ارادہ اور شعور دونوں تخلیق کی ضد نظر آتے ہیں۔ ڈاکٹر اجمل کا حوالہ دیتے ہوئے انھوں نے لکھا کہ ''عملی تخلیق دراصل انا کی ضد ہے اور تخلیق کا یہ انداز اس سپردگی سے پیدا ہوتا ہے جو فن کار کو انا کی نفی سے حاصل ہوتا ہے''[9]۔ لیکن ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا بلکہ بعض اوقات یہی انا شاعر کے تخلیقی عمل کو آگے بڑھانے میں مہمیز دیتی ہے۔ جعفر زٹلی اور بے شمار دیگر شعرا اس کی مثال ہیں۔ شاعری، صدیوں سے جاری انسانی روایت کا ایسا اظہار ہے جس میں ہر عہد کے اہم سانحات اور واقعات کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ انجم اعظمی نے درست کہا کہ:

> ہر شاعر کسی زمانے میں اور کسی جگہ پیدا ہوتا ہے۔ زمان و مکان کا یہ جبر ہر انسان کی تقدیر ہے اور اس کا تجربہ زمان و مکان سے باہر نہیں ہوتا۔ ادب و شعر میں اس تجربے کی بنیاد پر جو اظہار ہوتا ہے اسے مقامیت کا نام دیا جاتا ہے جو شاعری کی اساس ہے لیکن شاعری بجائے خود چیزے دگر ہے۔ شاعری انسان کی داخلی صداقت کا اظہار ہے... ہر شاعر ایک فرد ہونے کے علاوہ ساری دنیا کے انسانوں... کا نمائندہ بھی ہوتا ہے۔ اسی لیے مقامیت کے اظہار کے ساتھ ساتھ اس کے سارے جذبے ایک آفاقی سطح بھی رکھتے ہیں[10]۔

غرض کے شاعری انسان کے شعور کی اعلیٰ ترین شکل ہے۔ اس لیے انسانی دکھ، درد، تکلیف، پریشانی، خوشی، غمی، جذبات و احساسات اور فکر و تجربے کا اظہار شاعر جس زبان اور معاشرے میں کرتا ہے، اس طرح اس سماج کی پوری تاریخ ہماری نظروں کے سامنے آجاتی ہے۔ بقول شان الحق حقی:

> اردو شاعری، حتیٰ کہ غزل بھی نہ صرف مادی حالات سے کتنی متاثر رہی ہے بلکہ کسی حد تک کھلے بندوں سیاست کی طرف مائل اور قومی دکھڑوں میں گرفتار نظر آتی ہے[11]۔

ڈاکٹر محمود الرحمٰن کے مطابق:

> اردو شاعری بھی برعظیم پاک و ہند کے ماحول اور معاشرے کی آئینہ دار ہے۔ شاعروں نے اپنی آنکھوں سے جس تہذیبی، ثقافتی، سیاسی اور تمدنی حالت و کیفیت کا مشاہدہ کیا، اسے بلا کم و کاست اشعار کے قالب میں ہمیشہ کے لیے سمو دیا۔ اردو ادب کی تاریخ اس حقیقت کو بہ خوبی واضح کر رہی ہے کہ ہر شاعر اپنے وقت کا مورخ ہے۔ اس نے خارجی اثرات و عوامل کو اس طرح پیش کیا ہے کہ اس کا کلام تاریخ کی حیثیت اختیار کر گیا ہے[12]۔

لہٰذا اس تناظر میں شاعری کا مطالعہ دل چسپی سے خالی نہیں ہوگا کیوں کہ اردو شاعری پر ''سیاسی حالات کا اتنا بھرپور اثر اور واضح پرتو موجود ہے کہ ادب کی تاریخ سیاسی تاریخ کا ایک خلاصہ معلوم ہوتی ہے''[13]۔

اردو زبان و ادب کے آغاز و ارتقا پر نگاہ ڈالیں تو ایک بات بڑی واضح ہو جاتی ہے کہ ابتدا میں اس زبان کو ''کبھی اقتدار کی قوت

نے دبایا، کبھی اہل نظر نے حقیر جان کر اسے منھ نہ لگایا اور کبھی تہذیبی دھاروں نے اسے مغلوب کر دیا'' [۱۴]۔ لیکن یہ زبان پھر بھی اپنی جگہ بناتی رہی اور بالآخر برصغیر پاک و ہند کی سب سے اہم زبان بن کر ابھری۔

مسلمان جب برصغیر میں داخل ہوئے تو ایک فاتح قوم کی حیثیت سے داخل ہوئے۔ ڈاکٹر تارا چند کے مطابق اس ''سیاسی فتح کے ساتھ ساتھ تمدنی موت نظر آتی ہے مگر بنیادی طور پر اس فتح کا مختلف اثر ہوا'' [۱۵]۔ یعنی ایک تمدن کی موت کسی نئے تمدن کی بنیاد بنی۔ تاریخ شاہد ہے کہ جب کوئی قوم فاتح بن کر ابھرتی ہے تو مقامی تہذیب و تمدن پر گہرے اثرات ڈالتی ہے۔ کچھ یہی صورت حال برصغیر میں بھی پیش آئی۔ مسلمانوں کی تہذیب و ثقافت اور معاشرت کا برصغیر کی تہذیب و ثقافت پر بہت گہرا اثر ہوا۔ ان اثرات کے ساتھ زبان تو ترقی کرتی رہی لیکن فارسی زبان نے اسے بہت کچھ دینے کے باوجود اپنے برابر کبھی جگہ نہ دی [۱۶]۔ اس کے باوجود اردو زبان اور اس کا ادب برصغیر کے مختلف خطّوں میں پروان چڑھتا رہا۔ ''قدیم زمانے میں اردو کہیں گجری کہلائی اور کہیں اسے دکنی کا نام دیا گیا۔ کہیں وہ لاہوری اور دہلوی کے نام سے موسوم ہوئی اور کہیں ہندوی اور کھڑی بولی کہا گیا۔ پھر صدیوں کے بعد ولی کے دور میں ریختہ اور بعد میں اردو کے نام سے ایک عالم گیر معیار تک پہنچی'' [۱۷]۔

مسلمانوں کے اقتدار اور حکمرانی کے دور میں اردو کی روایت نے بڑا فروغ پایا۔ فارسی، ترکی اور عربی لغات اس زبان میں نہ صرف داخل ہوئیں بلکہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جذب ہوگئیں۔ اس گری پڑی زبان میں اظہار کی قوت تیز تر ہوتی چلی گئی۔ نئے الفاظ اور نئے خیالات نے احساس اور شعور کو اظہار کا نیا سلیقہ عطا کیا [۱۸]۔ مسلمانوں کے اس ابتدائی دور حکومت میں ہی یہ زبان شمالی ہندوستان سے نکل کر جنوب میں دکن اور مشرق میں بہار و بنگال تک پہنچ گئی تھی جس کا اندازہ مختلف علاقوں میں موجود اس زمانے کے ادیبوں اور شاعروں کی تخلیقات سے لگایا جاسکتا ہے [۱۹]۔

''اس ادب کی ایک طویل تاریخ ہے جس کے نمونے برعظیم پاک و ہند کے مختلف علاقوں میں ملتے ہیں اور ہر علاقے کے ادبی نمونے گہری مماثلت کے باوجود، ساخت و مزاج کے اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف بھی ہیں'' [۲۰]۔ وجہ ظاہری بات یہ ہے کہ زبان ابھی اپنے تشکیل کے دور سے گزر رہی تھی اور اس تشکیلی دور میں زبان کے مختلف روپ کا بیک وقت وجود میں آنا کوئی اچنبھے کی بات نہیں۔ ایک بات اور جو ہمارے ذہنوں میں رہنی چاہیے کہ جدید زبانوں کے ارتقا کے فطری عمل میں عوام کے ساتھ ساتھ علماء، صوفیا اور مبلغین کا کردار بھی نہایت اہم رہا ہے [۲۱]۔ اس بابت مولوی عبدالحق نے لکھا کہ:

> خواص سے زیادہ عوام ان کی طرف جھکتے تھے۔ اس لیے تلقین کے لیے انھوں نے جہاں اور ڈھنگ اختیار کیے ان میں سب سے مقدم یہ تھا کہ اس خطے کی زبان سیکھیں تاکہ اپنا پیغام عوام تک پہنچا سکیں۔ چناں چہ جتنے اولیاء اللہ سرزمین ہند میں آئے یا یہاں پیدا ہوئے وہ باوجود عالم و فاضل ہونے کے (خواص کو چھوڑ کر) عوام سے انھیں کی بولی میں بات چیت کرتے اور تعلیم و تلقین فرماتے تھے [۲۲]۔

ان حالات نے شمال سے لے کر جنوب میں دکن و گجرات تک اس زبان کے پھلنے پھولنے کی ایسی سازگار فضا پیدا کر دی کہ دیکھتے ہی دیکھتے یہ زبان ان سارے علاقوں کی مشترکہ زبان بن گئی۔ ''یہی عوامی ارتباط کی لگن اور عوامی زبان سے لگاؤ تھا جس نے امیر خسرو کی ہندی اور اردو شاعری کی طرف راغب کیا''۔ ''قوالی، موسیقی، شاعری اور درس اخلاق کی یہی زبان ٹھہری'' [۲۳]۔ لسانی تحقیق سے

یہ تو ثابت ہے کہ زبان کا مولد شمال ہے لیکن اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ سیاسی وتہذیبی تقاضوں کے تحت اس زبان کو ادبی درجہ شمال سے صدیوں پہلے جنوبی ہند میں ملا۔ اس سے قبل کہ سترھویں صدی تک کے دکن اور گجرات میں پیش آنے والے واقعات اور سانحات کا جائزہ اس عہد کی شاعری میں تلاش کیا جائے، ضروری ہے کہ ابتدائی دور کے شمالی حصے میں اس زبان کی صورت حال اور ماخذ ادب کا جائزہ لیا جائے تا کہ اس عہد کا منظر نامہ بھی ہمارے سامنے آ سکے۔

اردو کے آغاز وارتقا کا جائزہ لیتے ہوئے ''علاقے اور زمانے کا تعین کرنے کے بعد ہمارے سامنے جو سب سے بڑی مشکل آتی ہے وہ یہ کہ کس زبان اور کس تخلیق کو اردو کہا جائے اور کس کو ہندی'' [۲۴]۔ ''قدیم دور کے اکثر شعرا اور ادبا اس زبان کو ہندی یا ریختہ کے نام سے پکارتے ہیں''۔ برصغیر پاک و ہند پر اسلامی تہذیب کے اثرات تو محمد بن قاسم کے عہد سے ہی مرتب ہونا شروع ہو چکے تھے۔ ''پہلی صدی ہجری کے اواخر میں محمد بن قاسم کی فتوحات، سندھ اور ملتان کو اسلامی قلم رو میں شامل کر دیتی ہیں۔ اور اسلامی تہذیب و تمدن ان ممالک میں شامل ہو جاتے ہیں۔ لیکن تیسری صدی سے صفاریوں کی فتوحات کی بنا پر ایرانی اثرات بھی پھیل جاتے ہیں''۔ اس دور کا ہندی ادب پوری طرح اپنے ماحول کے سیاسی اور تہذیبی انتشار کی عکاسی کرتا ہے۔ یہ وہ دور ہے جب ہندو مرکزیت ہرش وردھن کے ساتھ ختم ہو چکی تھی۔ شمالی ہندوستان مختلف ہندو ریاستوں میں تقسیم ہو چکا تھا اور ان میں آئے دن خانہ جنگی رہتی تھی۔ یہی وہ زمانہ تھا جب مسلمانوں کے حملوں کا زور بھی بڑھتا جا رہا تھا۔ ان حملوں کا تذکرہ فارسی ادبیات میں دست یاب نہیں البتہ سنسکرت کی کچھ تاریخی کتب میں ان واقعات کو بیان کیا گیا ہے۔ اس دور کی رزمیہ نظمیں اور ہندو مصلحین کی تخلیقات میں حب الوطنی کے پرخلوص جذبات بھی پائے جاتے ہیں [۲۵] اور مختلف حادثات وسانحات کا اظہار بھی ملتا ہے۔

آل غزنہ کی حکومت ہندوستان میں کم وبیش ایک سوستر سال تک رہی۔ اس زمانے میں مسلمان اور ہندو اقوام کے باہمی میل ملاپ سے ایک نئی زبان کا پیدا ہو جانا لازمی بات ہے۔ بدقسمتی سے اس عہد کی تاریخ پر ایسا پردہ پڑا ہوا ہے کہ ہم ان ایّام کے سیاسی حالات سے پوری طرح واقف نہیں اور نہ ہی اس دور کی معاشی اور اقتصادی حالات کی ہمیں خبر ہے لیکن اس عہد میں ایک نہایت اہم نام خواجہ مسعود سلمان ۵۱۵ھ [۲۶] کا ہے ''جن کے متعلق متقدمین ومتاخرین متفق ہیں کہ وہ ہندی میں بھی صاحب دیوان تھے'' [۲۷]۔ محمد عوفی اس شاعر کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ''واورا سہ دیوان ست یکے بتازی و یکے بپارسی و یکے بہندی'' [۲۸]۔

امیر خسرو نے مسعود سعد سلمان کی بابت ''غرۃ الکمال'' کے دیباچے میں لکھا کہ:

> پیش ازیں شاہانِ سخن کسے راسہ دیوان نبودہ مگر مرا کہ خسرو ممالک کلامے۔ مسعود سعد سلمان راا گرچہ ہست رما آں سہ دیوان درعبارتِ عربی و فارسی و ہندی است و در پارسی مجرد کسے سخن راسہ قسم نکردہ جز من [۲۹]۔

اس کے علاوہ میر غلام علی آزاد بلگرامی نے اپنا ماخذ دیے بغیر مسعود سعد سلمان کے ہم عصر عروضی سمرقندی کا یہ قول نقل کیا ہے کہ ''مسعود سعد سلمان میری طرح سہ زبان ہے۔ تین دیوان رکھتا ہے۔ عربی، فارسی اور ہندوی'' [۳۰]۔ اکثر تذکرہ نویسوں نے بہرام شاہ غزنوی کے دربار سے وابستہ اس شاعر کا ذکر احترام سے کیا ہے [۳۱]۔ وہ فارسی کے مشہور شاعر تھے اور زندگی کا بڑا حصہ لاہور میں گزرا [۳۲]۔ مذکورہ بالا حوالوں سے یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ انھیں فارسی کے علاوہ ہندی یا ہندوی شاعری سے خاص شغف تھا۔

ان کے فارسی کلام سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ انھیں ہندوستانی طرزِ فکر سے ایک لگاؤ تھا اور ہندی میں غالباً انھوں نے بہت کچھ کہا ہوگا [۳۳]۔ ان کا ہندی کلام اگرچہ دستبردِ زمانہ سے محفوظ نہیں رہا اور شاید ہمیشہ کے لیے برباد ہو گیا لیکن تذکرہ نویسوں نے جو شواہد دیے ہیں ان کی بنیاد پر یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ خواجہ مسعود سعد سلمان ہندی میں شعر کہتے ہوں گے۔ بالخصوص بارہ ماسا تو سب سے پیش تر انھی نے لکھا۔ چناں چہ فارسی میں ان کا مشہور یہ دوازدہ ماہہ اب تک محفوظ ہے۔ وہ یہیں پیدا ہوئے اور ۶۰ برس تک ہندوستان میں رہے [۳۴]۔ وہ شاہی دربار سے متعلق رہے۔ چالیس برس کی عمر میں کسی سیاسی جرم میں گرفتار ہوئے اور ۱۹ برس تک قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں۔ اس دور کی سیاسی فضا اور اندرونی خلفشار کا بیان ان کی فارسی شاعری میں موجود ہے۔ رشید یاسمی نے طہران سے تقریباً آٹھ سو صفحات پر مشتمل ان کا فارسی دیوان شائع کیا ہے [۳۵]۔ اگر ان کا ہندی دیوان کا سراغ لگ جاتا تو اس زمانے کی محلاتی سازشوں کے بے شمار المیے اور سانحات ہمارے سامنے آ جاتے۔ اس کے ساتھ ساتھ ''لسانی مسائل کی بہت سی گتھیاں سلجھ جاتیں اور اردو کی نشو ونما اور رواج کی گمشدہ کڑیاں مل جاتیں'' [۳۶]۔

امیر خسرو اور حسن سجزی کا واقعہ اسیری: چند مغالطوں کی تصحیح ہندوستان میں فارسی شاعری کا سانحاتی بیانیہ:

مسعود سعد سلمان کے بعد ابوالحسن یمین الدین امیر خسرو (۱۲۵۳ء۔۱۳۲۵ء) نے اپنی صلاحیت کے چند قطرے اس زبان کے خون میں شامل کیے ہیں۔ وہ ۹۹ تصانیف کے مالک اور بنیادی طور پر فارسی کے شاعر اور عالم تھے [۳۷]۔ ان کا نام اسلامیانِ ہند کی تاریخ ثقافت میں ایک سنہرے عنوان کی حیثیت رکھتا ہے۔ بلا سبہ امیر خسرو کی تاریخی سخت جانی ہفت عجائبات میں شمولیت کا مستحق ہے۔ صدیوں پر محیط گرد آلود شب و روز اور مورّخین کی کم نظری اور غفلت شعاری بھی امیر خسرو کو ''مردہ جاوید'' نہ کر سکی۔ ابنِ بطوطہ سے لے کر محمد حسین آزاد، یہاں تک کہ موجودہ زمانے کے محققین اور جیّد اہلِ قلم نے بھی امیر خسرو کی اصل شخصیت اور کارناموں کو اب تک پوری طرح اجاگر نہیں کیا۔ ابنِ بطوطہ ۷۳۴ھ میں بعہدِ محمد تغلق ہندوستان پہنچا۔ اس نے شیخ کمال الدین غزنوی قاضی القضاۃ سے کرید کرید کر حالاتِ ماقبل دریافت کیے اور ان سے اپنے سفرنامے کے صفحات کو زینت بخشی۔ محمد تغلق کے زمانے کے جلسے جلوسوں، تقاریب، درباری ہنگامہ آرائیوں، حتیٰ کہ گینڈے اور دوسرے جانوروں تک کی رام کہانی مزے لے لے کر رقم کی مگر خسرو کے بارے میں اس کا مورّخانہ تجسس منجمد اور قلم گم صم اور خاموش رہا [۳۸]۔ محمد حسین آبِ حیات مرتب کی تو اس میں بھی امیر خسرو کی شخصیت اور کارناموں کا ذکر کچھ اس طرح کیا ہے کہ اس کی روشنی میں علم و ہنر سے عاری ایک ایسے مسخرے اداکار کا تصوّر ابھر کر سامنے آتا ہے جو لطیفے، پہیلیاں، انملیاں اور کہہ مکرنیاں سنا کر حاضرینِ محفل کا دل خوش کرتا رہتا ہے [۳۹]۔ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ امیر خسرو اپنی ۷۲ برس کی زندگی میں عمر بھر حرکت و عمل کی تصویر بنے رہے۔ وہ جب تک جیے ہندوستان کے چاروں طرف گھومے پھرے، زمینوں اور زبانوں کی سیر کی، ظاہری مناظر سے چادر سرکا کر اپنے زمانے کی تہ و بالا حقیقتوں کو چھو کر، برت کر دیکھا۔ نہ صرف خود دیکھا بلکہ اپنی نظم و نثر کے ذریعے ہمیں بھی دکھایا اور جو کچھ دکھایا وہ آج سات صدی بعد بھی پرانا یا از کارِ رفتہ میں ہوا۔ ماہ و سال نے تقویم پلٹی، کلینڈر بدلے، معاملات اور واقعات کی سطح بدلی، اصطلاحیں بدلیں، استعارے بدلے لیکن ان تمام تبدیلیوں کے باوجود مطالعۂ خسرو کی اہمیت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔ بلکہ موجودہ تناظر میں تو امیر خسرو کے ذہنی اور جسمانی سفر کی داستان، ان کے ہاں ردو قبول کا عمل، اختیار و رنکار کا مطالعہ، ہمارے لیے اور بھی بامعنی

ہو جاتا ہے۔ ان کی تحریریں شعری اور نثری ادبیات کے علاوہ سماجی اتھل پتھل، سیاسی عروج و زوال، تہذیبی آداب و اطوار، گیا تاریخ کے ہر پہلو سے کچھ نہ کچھ ہم تک پہچاتی ہیں اور ہمارے تاریخی شعور میں اضافے کا سبب بنتی ہیں [۴۰]۔ امیر خسرو نے اپنی صلاحیت کے چند قطرے اس زبان کے خون میں شامل کیے ہیں۔ وہ ۹۹ تصانیف کے مالک اور بنیادی طور پر فارسی کے شاعر اور عالم تھے [۴۱]۔ ان میں صرف ۴۵ تصانیف کا سراغ اب تک مل سکا ہے [۴۲]۔ امیر خسرو کی ہندی شاعری تحقیق کا خاصا دقت طلب مسئلہ ہے۔ اس راہ میں ہر قدم بحث کی نئی راہ کھولتا ہے [۴۳]۔ ''ان کا جو کچھ اردو کلام آج ملتا ہے اس میں ابتداءِ زمانہ سے اتنی تبدیلیاں ہو چکی ہیں کہ اب اسے مستند نہیں مانا جا سکتا'' [۴۴]۔ ہندی، اردو یا ہندوستانی سے جو موجودہ لسانی مفاہیم ہم نے دریافت کر لیے ہیں، تیرھویں صدی میں ان لسانی مفاہیم کا تصور موجود ہی نہیں تھا۔ علاالدین خلجی کا عہد امیر خسرو کے انتہائی عروج کا زمانہ ہے۔ ان کی زیادہ تر تصنیفات اسی دور میں مکمل ہوئیں [۴۵]۔ ان کے اشعارِ ریختہ کو پڑھ کر زبان و بیان کے لہجے، آہنگ، طرز اور ساخت سے واضح طور پر یوں محسوس ہوتا ہے کہ دو کلچر ایک دوسرے کے گلے مل رہے ہیں اور اس امتزاج سے ایک تیسرے کلچر کی بنیادیں استوار ہو رہی ہیں [۴۶]۔ ہمارے ادب کے ابتدائی نقوش خسرو کے کلام کے ذریعے ہی سامنے آئے۔ ان کا ہندی کلام ہمارے قومی شعر و ادب کا نقش اوّل ہے۔ اردو ہندی، ہندوستانی یا کھڑی بولی کی پہلی واضح شکل ہمیں خسرو ہی کی شاعری میں نظر آتی ہے [۴۷]۔ ان کی تصانیف کا مطالعہ:

> ہندوستان کی تیرھویں اور چودھویں صدی کی ایسی تصویر پیش کرتا ہے جس میں ملک کی ملوان جلوان تہذیب کے نقش صاف نظر آتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک ہندوستانی مسلمان عالم، شاعر اور ادیب اس زمانے میں کیسے جذبے کیسے خیال رکھتا ہے۔ اسے ہندوستان کے ساتھ کیسی والہانہ محبت تھی اور وہ کس طرح اپنے وطن کو تمام دنیا کے ملکوں پر جن میں اسلامی دنیا شامل تھے، ترجیح دیتا تھا، اس کے دل و دماغ پر ہندوستان کا کتنا گہرا اثر تھا اور ہندوستانی فضا کس قدر ان کے ذہن پر چھائی ہوئی تھی [۴۸]۔

ان کی ہندوی شاعری کی روایت کی توثیق، ان کے اپنے دور سے آج تک مختلف ذرائع سے ہوئی ہے۔ ان کی شاعری کے نمونے آج سے ساڑھے چار سو سال پہلے کی تصانیف میں موجود ہیں [۴۹]۔ اردو شعرا کے تذکروں میں بھی ان کے کلام کے نمونے ملتے ہیں۔ اس بات پر تو سب ہی متفق ہیں کہ خسرو بہت بسیار نویس تھے۔ ڈاکٹر وحید مرزا کے مطابق:

> خسرو نے اپنے مجموعی کلام کا کہیں کوئی اندازہ نہیں لکھا۔ اگرچہ دولت شاہ نے لکھا کہ خسرو اپنے اشعار کی مجموعی تعداد چار لاکھ بیت سے زائد اور پانچ لاکھ سے کم بتاتے ہیں [۵۰]۔

شبلی اس حوالے سے رقم طراز ہیں کہ:

> ہندوستان میں سو برس سے آج تک اس درجہ کا جامع کمالات نہیں پیدا ہوا۔ اور سچ پوچھو تو اس قدر مختلف اور گونا گوں اوصاف کے جامع، ایران و روم کی خاک نے بھی ہزاروں برس کی مدت میں دو ہی چار پیدا کیے ہوں گے.... امیر صاحب (خسرو) کا کلام کئی لاکھ سے کم نہیں.... اس میں غالباً ایک غلط فہمی ہے۔ امیر صاحب نے ابیات کا لفظ لکھا ہے اور قدما کے محاورہ میں بیت ایک سطر کو کہتے ہیں [۵۱]۔

ان کے اشعار کی درست تعداد کے تعین سے قطع نظر اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ وہ زود نویس شاعر تھے۔ اسی لیے ان کے

انتقال کے دو برس بعد مرزا بایسنغر نے بہت کوشش اور جستجو کے بعد ایک لاکھ بیس ہزار بیت جمع بھی کر لیے[52]۔ ان سب پر مستزاد یہ کہ اوحدی نے تذکرۂ عرفات میں لکھا کہ امیر خسرو کا کلام جس قدر فارسی میں ہے اسی قدر برج بھاکا میں ہے[53]۔ ان کی ہندی دانی میں کوئی شک نہیں۔ ترکی اور فارسی تو ان کی اصلی زبان ہے۔ عربی میں بھی ادبائے عرب کے ہمسر ہیں[54]۔ لیکن یہ بھی ذہن میں رہے کہ ان کی ماں ہندوستانی نسل سے تھیں[55]۔ وہ ہندوستان ہی میں پیدا ہوئے۔ اس کا ذکر کرتے ہوئے وہ مثنوی ''نہ سپہر'' میں کہتے ہیں کہ:

ست مرا مولد و ماویٰ و وطن[56]

اس مثنوی کا سب سے بڑا اور تیسرا باب مکمل طور پر ہندوستان کی تعریف میں ہے جس میں تقریباً چار پانچ سو اشعار ہیں۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ انھوں نے اپنی پدری زبان ترکی اور فارسی پر ہندوی کو ترجیح دی ہے۔ اس بات کی تائید خسرو کے اس شعر سے بھی ہوتی ہے:

اثبات گفت ہند بہ حجت کہ راجح است　　　　بر پارسی و ترکی از الفاظِ خوش گوار[57]

ان کے ہندوی کلام کے بارے میں سب سے مضبوط دلیل ان کا تیسرا دیوان ''غرۃ الکمال'' کا دیباچہ ہے۔ یہ دیوان ۶۹۳ھ میں مرتب ہوا۔ اس وقت خسرو کی عمر ۴۳ برس تھی[58]۔ اس دیباچے میں وہ کہتے ہیں کہ:

ترک ہندوستانیم من ہندوی گویم جواب　　　　شکر مصری ندارم کز عرب گویم سخن[59]

ان تمام دلائل کے باوجود ان کے ہندوی کلام کی تعداد کے حوالے سے اوحدی اور دیگر متقدمین کا بیان مبالغہ معلوم ہوتا ہے۔ بد قسمتی سے اب تک کی تحقیقات کے مطابق ان کے محض چار پانچ سو ہندوی اشعار ہی ہماری ادبی تاریخ میں زندہ ہیں۔ اس میں مشہور زمانہ متنازعہ کلام ''خالق باری'' بھی شامل ہے جس کو حافظ محمود شیرانی، خسرو کی تصنیف ماننے سے انکاری ہیں[60]۔ اس کے باوجود کہ اقبال صلاح الدین اور ان کے ہم خیالوں نے حافظ محمود شیرانی کے نظریے کے خلاف اعتراضات اٹھائے ہیں[61]۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ امتداد زمانہ سے اس کتاب میں اس قدر الحاق و اضافے ہوئے ہیں کہ آج یہ بتانا بہت مشکل ہے کہ ان میں سے کون سے اشعار امیر خسرو کے لکھے ہوئے ہیں۔ محققین کا ایک گروہ اسے امیر خسرو کی تصنیف قرار دیتا ہے اور دوسرا اسے ضیاء الدین خسرو کی تصنیف بتاتا ہے۔ پہلے گروہ کے نمائندے محمد امین عباسی اور دوسرے کے ترجمان حافظ محمود شیرانی ہیں[62]۔ اس بابت ڈاکٹر جمیل جالبی کی بات درست معلوم ہوتی ہے کہ:

> یہ دونوں زاویہ نظر انتہا پسندانہ ہیں۔ شیرانی صاحب یہ بھول گئے کہ امیر خسرو نے اپنا سارہ ہندی کلام تفنن کے طور پر لکھا تھا اور اس میں وہ سنجیدگی اور توجہ مفقود ہے جو فارسی میں ان کا طرۂ امتیاز ہے[63]۔

اگر متنی تنقید کے اصولوں کو مدنظر رکھ کر ان کے کلام کا جائزہ لیا جائے اور ان کے تمام الحاقی کلام کو نکال دیا جائے تو ان کے اشعار کی تعداد دو سو تک بھی بہ مشکل رہ پائے گی۔

''خسرو جیسے عظیم شاعر کا اتنا بڑا ذخیرہ کلام ضائع ہو جانا ایک جان کاہ ادبی سانحہ ہے جس کے لیے وقت کی بدعنوانیوں کو کبھی معاف نہیں کیا جا سکتا''[64]۔ بہر حال زمانے کی دست برد اور ادبی بدعنوانی کے بعد خسرو کا جتنا بھی ہندی کلام ہماری دسترس میں ہے وہ بھی غنیمت ہے اور ہمارا قومی اثاثہ ہے[65]۔ امیر خسرو کا ہندوی کلام اگر ضائع نہیں ہوتا تو اردو شاعری اس عہد کی تاریخ اور سیاسی کش مکش

کے ادبی اظہار سے محروم نہ رہتی کیوں کہ وہ بہت سے بادشاہوں کے مصاحب رہے اور ان حکمرانوں کے عروج و زوال کو بہت قریب سے دیکھا۔ ڈاکٹر تارا چند کے مطابق انھوں نے ''بہتر برس کی عمر میں سات سلطانوں کا زمانہ دیکھا''[۶۶] جب کہ شیخ سلیم احمد کا کہنا ہے کہ انھوں نے ''غیاث الدین بلبن کے زمانے سے محمد شاہ تغلق کے عہد تک گیارہ بادشاہوں کا زمانہ دیکھا اور سات بادشاہوں کی ملازمت اور مصاحبت کی''[۶۷]۔ خاندانِ غلاماں کی با اقبال سلطنت کا چراغ ان کے سامنے گل ہوا۔ خاندان خلجی کے عروج و زوال کو انھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ مشہور مورخ سر ایلیٹ کی رائے ہے کہ خسرو ایسے زمانہ میں ہوا ہے کہ جب ہندوستان میں اخلاقی قدروں کا خون ہو رہا تھا[۶۸]۔ ان تمام پہلوؤں کو امیر خسرو کی فارسی شاعری میں بہ آسانی تلاش کیا جا سکتا ہے۔ غور سے دیکھنے والوں کو یہ دور ہندوستان کی سیاہ ترین تاریخ نظر آتا ہے۔ اس تاریک دور میں ہندوستان میں مسلسل کشت و خون اور سازشیں جاری تھیں۔ اس طوائف الملوکی نے اکثر یورپین مورخوں سے ہندوستان کی اسلامی تاریخ کو قصاب کی دکان کے نام سے موسوم کرایا ہے[۶۹]۔

امیر خسرو نے جو دور پایا تھا وہ ہندوستان میں ترقی کرتی ہوئی ابتدائی مسلم سلطنت کا دور تھا۔ اس دور کا المیہ یہ تھا کہ ہندوستان کے مختلف حصوں میں سیاسی اور معاشرتی سطحوں پر متضاد قوتیں باہم برسرِ پیکار تھیں۔ معاشرے میں شکست و ریخت نے عجیب طرح کا اضمحلال پیدا کر دیا تھا۔ امیر خسرو پر الزام یہ ہے کہ انھوں نے دربار سے وابستہ رہ کر بادشاہوں کی شان میں قصائد لکھے لیکن ان الزامات کی اس وقت کوئی حقیقت نہیں رہتی جب ہم ان کی مثنویوں کا مطالعہ کرتے ہیں۔ ''عاشقہ''، ''آئینہ سکندری''، ''مطلع الانوار'' اور دیگر بہت سی مثنویوں میں وہ شاہانِ وقت کو پند و نصیحت اور ان کی بے اعتدالیوں پر نکتہ چینی کرتے نظر آتے ہیں[۷۰]۔ وہ مصاحبتِ شہہ پر کبھی فخر نہیں کرتے اور نہ ہی نوکر ہونے پر شہ کو دعائیں دیتے ہیں بلکہ وہ تو اپنی درباری زندگی سے ہمیشہ شاکی نظر آتے ہیں[۷۱]۔ بادشاہوں کی بے اعتدالیوں اور بے راہ روی پر شاید ہی کسی شاعر نے زمانے میں اتنی سخت پکڑ کی ہو جیسی پکڑ خسرو کے یہاں نظر آتی ہے۔ مثنویوں کے ساتھ ساتھ قصائد میں بھی وہ پند و نصیحت سے باز نہیں آتے۔ انھوں نے ہمیشہ عوامی فلاح و بہبود پر زور دیا۔ ان کا آزاد رویہ ان کے فارسی کلام میں بہت نمایاں ہے[۷۲]۔

''تغلق نامہ'' میں ان کے لہجے کی بے باکی دیکھیے :

چوں خدایت سریرِ شاہی داد	ملک از ماہ تا بہ ماہی داد
بر ستمکش ز عدل کم نہ کنی	بر ستمگار جز ستم نہ کنی
خارِ بن را بر افگنی ز گرز	خار کن را کُنی نہال ز سر
چوں بہ پیلاں علف دہی حالی	از غمِ مور دل مکن خالی

سو اشعار تک یہ سلسلہ چلتا ہے اور آخری شعر میں کہتے ہیں کہ:

در چہ کس نیست دشمنِ تن تو	غفلتِ تو بس است دشمنِ تو[۷۳]

پند و نصائح کا یہ سلسلہ امیر خسرو کے انسان دوست نقطۂ نظر کی پوری طرح عکاسی کرتا ہے۔ ایک جرأت مندانہ نصیحت سلطان قطب الدین خلجی کی تباہی کے لیے بروقت پیشین گوئی کی حیثیت رکھتی ہے[۷۴]۔ وہ کہتے ہیں:

شراب و عشق و مستی و جوانی	نشاط و عیش و ملک و کامرانی

کسے کیں بادشاہش افتاد در خویش | کے اندیشہ کند (اندیشۂ پیش [کذا])
نشاید پاد _شارا مست بودن | نہ در عشق و ہوس پیوستِ بودن
بودشہ پاسبانِ خلق پیوست | خطا باشد کہ باشد پاسباں مست
شہاں چوں شک خراب از بادۂ ناب | رمہ در معدۂ گر گاں کُند خواب[۷۵]

امیر خسرو کے زمانے کا تفصیلی جائزہ لیا جائے تو نظر عبرت سے دیکھنے والوں کو دنیا میں مکافاتِ عمل سے نصیحت اور عبرت حاصل کرنے کا موقع ملے۔ شاعر نے کیا خوب کہا ہے:

سر اے آفرینش سرسری نیست | زمین و آسماں بے داوری نیست
در اندیش اے حکیم از کارِ ایّام | کہ پاداشِ عملہا شد سر انجام[۷۶]

برصغیر کی تاریخ ایسے سانحات سے بھری ہوئی ہے۔ حکومت اور اقتدار کی ہوس نے اس خطے کی مسلم تاریخ پر ایسے ایسے بدنما داغ لگائے ہیں کہ ان سانحات کی ٹیس آج بھی محسوس کی جاسکتی ہے۔ مسلم اقتدار کے ابتدائی دور سے آج تک ایسی بے شمار مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں مثلاً کیقباد نے اپنے چچازاد بھائی کیخسرو کو بے قصور قتل کرایا اور دوسرے سال اسے بھی یہی روز بد دیکھنا پڑا۔ جلال الدین خلجی نے سید مولیٰ کو شہید کرا کر اپنی نیک نام سلطنت پر بدنما دھبا لگایا لیکن اس کے بعد وہ زیادہ عرصے تک اطمینان سے اپنے سلطنت کے امور نہ چلا سکا اور خود بھی اسی مصیبت میں گرفتار ہوا۔ علاء الدین نے اپنے محسن چچا سے جو افسوس ناک برتاؤ کیا اس کی سزا اس کی اولاد کو ملی۔ کافور اپنی نمک حرامی سے فوراً ہی دنیا سے کافور ہو گیا۔ قطب الدین نے خضر خاں اور شادی خاں وغیرہ کے قتل سے اپنے ہاتھوں کو رنگا۔ اس کی شامت اعمال سے جلد اس کا خاتمہ بھی بدترین طریقے سے ہوا۔ خسرو خاں کی نمک حرامی نے خسروی کی آرزو میں اپنی عزیز جان کو بھی کھویا[۷۷]۔ نیازی نے بلند پروازی سے دنیا کے مکافات عمل کا کیا خوب نقشہ کھینچا ہے:

صبح چو خورشیدِ علم بر فراشت | نقشِ دگر اخترِ عالم نگاشت
تافت چو بر سطحِ زمین و زماں | فیض رساں گشت بہ بحر و بہ کاں
تا کہ زا اطوار قضا و قدر | مور ضعیفے بہ یکے رہ گزر
بود ز ناسازئ نفسِ لئیم | از پئے یک دانۂ مقصود یافت
دانہ کش از رہ چو بردوں پا نہاد | چشم یکے مرغ برد اوفتاد
حملۂ بیداد براں مور کرد | روز براں چوں شبِ دیجور کرد
کرد تقاضاے فرو بر ونش | بُرد چو منقار بہ خوں خور ونش
تا شدہ آں مور بہ چنگال بند | تا سرش از کزلکِ منقار کند
مرغ کے ار کرد دل مور ریش | یافت ہماں لحظہ مکافاتِ خویش
پند نیازی بشنو زینہار | تا نخوری خون زہدِ روزگار[۷۸]

خسرو کی شاعری بھی اس دور کی آئینہ دار ہے۔ ان کے کلام میں تیرھویں اور چودھویں صدی کے ہندوستان کی ذہنیت کا بھرپور

عکس دکھائی دیتا ہے۔اس زمانے کی سیاست، اخلاقی اقدار اور ناکامیوں کا المیہ دیکھنا ہو تو خسرو کی شاعری اس کا بہترین نمونہ ہے [۷۹]۔ ان کی تاریخی مثنویوں میں اس عہد کی ثقافتی اور سماجی زندگی کے بارے میں جو سرمایہ موجود ہے وہ ہر اعتبار سے بے نظیر ہے [۸۰]۔ سید حسن عسکری کے مطابق یہ کہنا ضروری ہے کہ:

> Amir Khusro's histrorical works have defects and merits of their own. His isolated fragments of historical continuum of about four decades, couched in a high artificial, affected and obscure language and style can not be put in comparison with the works of other medieval historians.[۸۱]

یہاں اس بات کی گنجائش تو نہیں کہ ان مثنویوں میں موجود تمام حادثات و سانحات کو تفصیل سے پیش کیا جائے لیکن چند اہم واقعات کا بیان یہاں ناگزیر ہے تاکہ اس دور کے اہم سانحات اور اس کا منظرنامہ واضح ہو جائے۔ ان میں سے ایک اہم واقعہ شہزادہ محمد سلطان کی شہادت کا ہے۔ مورخین نے اس سانحے کو تفصیل سے بیان تو کیا ہے لیکن واقعات کے بیان میں ان کے ہاں اختلاف پایا جاتا ہے۔ شہزادہ محمد سلطان، سلطان غیاث الدین بلبن کا ولی عہد اور ملتان کا حاکم تھا۔ اس کی سعادت مندی کی وجہ سے بلبن اسے بے حد عزیز رکھتا تھا۔ وہ بہت بہادر، نیک طینت، شریف اور شائستہ انسان تھا۔ وہ علما و فضلا اور بزرگانِ دین کی بڑی عزت کرتا تھا [۸۲]۔ اس کی علم دوستی اور ادب نوازی سے متاثر ہو کر امیر خسرو نے اس کے دربار سے وابستہ ہونے کا فیصلہ کیا۔ امیر خسرو کے ہم راہ امیر حسن سجزی بھی شاہ زادہ کی ملازمت میں داخل ہوئے [۸۳]۔ جنھیں شاہزادہ محمد نے دوات داری کا منصب عطا کر کے عزت و اکرام سے نوازا۔ آپ کا نام نجم الدین اور تخلص حسن تھا [۸۴]۔ امیر خسرو اور سید حسن سجزی کی دوستی ایسی مثالی اور مشہور تھی کہ دونوں ایک جان دو قالب سمجھے جاتے تھے۔ ملتان کے دربار میں خسرو کے بعد سب سے زیادہ مشہور شاعر حسن سجزی ہی تھے۔ غزل گوئی میں تو ان کو ملکہ حاصل تھا۔ اسی مناسبت سے انھیں ''سعدیٔ ہند'' بھی کہا جاتا تھا [۸۵]۔ یہ خطاب انھیں عبدالرحمٰن جامی نے دیا [۸۶]۔ خسرو کی طرح حسن نے بھی غالباً ہندی میں شعر کہے ہوں گے لیکن اب تک ان کا کوئی قابلِ ذکر ہندی کلام سامنے نہیں آیا۔ غالباً مولانا شیرانی نے ہندوی کے ایک آدھ شعر کو ان سے منسوب کیا ہے جیسے:

شاہان کندت چاکری یہ جیو تجسو گو ملے
گو بہ حسن یہ ریختہ سنسار دیکھو کیوں چلے [۸۷]

ڈاکٹر جمیل جالبی نے بھی ان کی ایک غزل کے چند اشعار نقل کیے ہیں جس سے اس دور کی زبان پر روشنی پڑتی ہے۔ انھوں نے بھی فارسی اور ہندی کو ملا کر وہی طریقہ اختیار کیا ہے جو امیر خسرو کے کلام کی خصوصیت ہے جیسے:

ہر لحظہ آید دردلم دیکھوں اسے ٹک جائے کر — گویم حکایت ہجر خود یا آن صنم جیئو لائے کر
بس حیلہ کر دم اے حسن جانا شدم از دم بدم — کیسے رہوں تجھ جیئوں بن تم لے گئے سنگ لائے کر [۸۸]

یہ دونوں اصحاب پانچ برس تک ملتان میں شہزادہ محمد سلطان کی مصاحبت میں رہے۔ ان دنوں خطۂ ملتان ان اصحاب کے فن کی

وجہ سے رشکِ گلستانِ ارم ہو رہا تھا[89]۔

غیاث الدین بلبن کے اس جو اس سال کی حکومت ہندوستان میں مستحکم ہونے کے بعد سب سے اہم سانحہ جو اس عہد میں پیش آیا، وہ لکھنوتی کے صوبے دار طغرل کی بغاوت تھی۔ ۶۷۸ھ میں طغرل نے وہاں کے راجا کو شکست دے کر مالِ غنیمت اور شاہی حصہ بھی ہضم کر لیا۔ اس بے وفا غلام نے ملک پر قبضہ کرنے کے ساتھ ساتھ سرخ رنگ کا چتر بھی سر پر سایہ فگن کیا اور اپنے آپ کو سلطان مغیث الدین کے خطاب سے لکھنوتی کا بادشاہ مشہور کیا۔ بلبن نے اس بغاوت کی سرکوبی کی۔ طغرل قتل ہوا۔ نہ صرف طغرل بلکہ لکھنوتی پہنچ کر بلبن نے حکم دیا کہ بازار شہر کے دونوں طرف پھانسیاں لٹکائی جائیں۔ اس کے بعد طغرل کے تمام حاشیہ نشینوں کو نذر اجل کیا۔ اس کے بعد بلبن نے اپنے بیٹے شہزادہ محمد سلطان شہید کو کچھ نصیحتوں کے ساتھ امارت اور بادشاہی سے سرفراز کیا[90]۔ تخت نشینی کے وقت سے لے کر شہادت تک شہزادہ محمد کو کبھی بھی اطمینان وسکون کا سانس لینے کا موقعہ نہ مل سکا۔ اسے مغل حملہ آوروں کا مقابلہ کرنے کے لیے آئے دن میدانِ جنگ میں جانا پڑتا تھا۔ خسرو دیوان ''وسط الحیوۃ'' میں درج چند نظمیں ان واقعات پر بھرپور روشنی ڈالتی ہیں ان نظموں کو دیکھنے سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ اس زمانے میں مغلوں کا خطرہ ہر وقت سر پر منڈلاتا رہتا تھا۔ جیسے:

منت ایزد را کہ عمر رفتہ از سر باز گشت　　واں سریع السیرہ من زلشکر باز گشت
کو ہ غم برداشت از پیش دِلم چوں مژدہ داد　　کز غزائے کن خاقانِ مظفّر بازگشت
کافرِ بدکیش ہر تیرے کہ سوئے دیں کشاد　　سہم تو بارے بروزِ دہمِ بکافر باز گشت[91]

ایک اور موقع پر خسرو کہتے ہیں کہ:

گر دریں سالے مغل با پر بوم در روئے شوم　　صف کشیدہ چوں کلنگاں از خراساں می رسد
خاکِ ملتاں ہر زماں بر آب دیگر می شود　　چوں بجا ہے ہم چو دریائے بملتاں می رسد[92]

مغل اپنی سابقہ شکستوں کا بدلہ لینے کے لیے اکثر حملے کرتے[93]۔ اس صورت حال میں شہزادے کو ہر وقت مستعد رہنا پڑتا۔ مغل رہزنوں کی طرف سے ایسا ہی ایک شدید حملہ اخیر ۶۸۳ھ میں کیا گیا[94]۔ ظ انصاری لکھتے ہیں کہ شہزادہ محمد نے پوری تیاری کے بغیر دریائے راوی پار کیا اور جان ہتھیلی پر رکھ کر دشمنوں کو کچھ دور تک پسپا کر دیا[95]۔ اس نے انتہائی بہادری سے مغل رہزنوں کو موت کی گھاٹ اتارا۔ اس زمانے میں ارغون خاں اباق خاں بن بلاکو خاں ایران کے تخت سلطنت پر بیٹھا ہوا تھا۔ تیمور خاں جو بہت نام ور چنگیزی امیر اور قندھار، بدخشاں، غزنی اور بامیان وغیرہ کا حاکم تھا، اپنے عزیزوں اور ہم قوموں کا بدلہ لینے کے لیے بیس ہزار مغلوں کے ساتھ لاہور اور دیپال پور اور اس کے گرد ونواح کو تاخت وتاراج کرتا ہوا ملتان کی طرف بڑھا[96]۔ اس حملے کی اطلاع جب شہزادہ محمد کو دی گئی تو محمد سعید احمد مارہروی کے مطابق ''اس نے اپنے دربار میں بتیس ہزار فوج کو تین ہزار پڑھا''[97]۔ جب کہ پروفیسر محمد حبیب نے لکھا کہ سلطان محمد کو اس مقابلے میں عجیب دھوکا ہوا۔ مغلوں کی آمد کی جو اطلاع دی گئی تھی، اس میں تیس ہزار درج تھا جس کو غلطی سے تین ہزار پڑھا گیا[98]۔ درست صورت حال یہ ہے کہ اس پیغام میں بتیس ہزار نہیں بلکہ ۳۰ ہزار ہی درج تھا جس کی تائید ملا عبدالقادر ان الفاظ میں کرتے ہیں:

۱۰۰۰ ایتمر مغول با سی ہزار سوار آب راوی را از گذر... مضمون بخان شہید فرستاد او در مجلس خویش سی ہزار را سہ

ہزار خوانده[99] ۔

شہزادہ محمد مغل لشکر کی سرکوبی کے لیے روانہ ہونے کے چند ہی گھنٹوں بعد دریائے راوی (لاہور) تک پہنچ چکا تھا۔ تیمور خاں نے پیش دستی کی اور دریا عبور کر کے شہزادے کے لشکر پر حملہ آور ہوا۔ گھمسان کی لڑائی ہوئی اور کئی مغل سردار اس معرکے میں کام آئے۔ تعداد میں کم ہونے کے باوجود ہندوستانی فوج نے مغلوں کے دانت کھٹے کر دیے تھے لیکن بھاگتے ہوئے مغلوں کے تعاقب میں شہزادے کی فوج نے دور اندیشی کو خیر آباد کہا اور شہزادے کے پاس محض پانچ سو سپاہیوں کی جماعت رہ گئی۔ ظہر کے وقت جب یہ لوگ نماز کی ادائیگی میں مصروف تھے، مخالف سمت سے مغلوں کے ایک تازہ دم دستہ[100] جو کمین گاہ میں چھپا ہوا تھا[101]، نے ہندوستانی فوجیوں کو موت کی گھاٹ اتارنا شروع کر دیا۔ حملہ اچانک ہوا اور مغلوں کی تعداد بھی دو ہزار تک تھی۔ لہٰذا شجاعت اور جواں مردی سے لڑنے کے باوجود ایک ایسا سانحہ رونما ہوا جس نے بلبن کی سلطنت کو ہلا کر رکھ دیا۔ بدقسمتی سے اس لڑائی میں ایک تیر شہزادہ محمد کو آ کر لگا۔ زخم اس قدر شدید تھا کہ شہزادہ فوراً گر پڑا اور اس کی روح اس دنیا سے پرواز کر گئی۔ اس سانحے نے ہندوستانی فوج کی کمر توڑ کر رکھ دی۔ فوج میں بھگ دڑ مچ گئی اور مغلوں نے بھاگتے ہوئے ہندوستانیوں کو چن چن کر قتل کرنا شروع کر دیا۔ شاہی خیمے کو تاخت و تاراج کر کے اور سیکڑوں قیدیوں کو گرفتار کر کے مغل واپس روانہ ہوئے[102]۔ شہزادہ محمد کی شہادت کے بعد امیر خسرو بھی مغلوں کے ہاتھوں گرفتار ہوئے[103]۔ مولانا شبلی نعمانی ''بیانِ خسروؒ'' میں کہتے ہیں کہ ''اس معرکے میں امیر خسرو اور خواجہ حسن دہلوی بھی شریک تھے''[104]۔ پروفیسر شفقت رضوی نے بھی مذکورہ تصنیف کے حوالے سے کہا کہ ''شبلی نے شبہ ظاہر کیا ہے کہ حسن سجزی بھی گرفتار شدگان میں شامل تھے''[105]۔ دیوان حسن سجزی کے مرتب مسعود علی محوی نے شبلی کی تائید کرتے ہوئے لکھا کہ میر حسن دہلوی غالباً اس معرکے میں شریک تھے''[106]۔ یہ تائید بھی محض شبلی سے عقیدت کی وجہ سے تھی۔ انھوں نے تحقیق کے بنیادی اصولوں کو بالائے طاق رکھ کر ''خطائے بزرگاں گرفتن خطا است'' کی مصداق شبلی کی بات پر آنکھ بند کر کے یقین کر لیا۔ ان کی اس عقیدت کا اظہار ان جملوں سے بھی ہوتا ہے جس میں وہ کہتے ہیں کہ ''ہمارے مکرم استاد مولانا شبلی مرحوم حیات خسرو [کذا: بیان خسرو] میں ایک فقرہ تحریر فرمایا ہے جس سے شبہ ہوتا ہے کہ حسن کو بھی تاتاری گرفتار کر کے بلخ لے گئے تھے.... غالباً مولانائے موصوف نے کسی سند کی بنیاد پر ایسا تحریر فرمایا ہوگا جس سے ہم ناواقف ہیں''[107]۔ مسعود علی محوی صاحب نے ''بیان خسروؒ'' میں موجود جس فقرے کی طرف اشارہ کیا ہے، راقم مذکورہ سطور میں اسے درج کر چکا ہے۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ ''بیان خسروؒ'' کی اشاعت سے قبل خسرو کے بارے میں یہی معلومات من وعن شعر العجم حصہ دوم میں بھی شائع ہو چکی تھیں[108]۔ ''بیان خسروؒ'' میں سن اشاعت موجود نہیں لیکن شواہد یہ بتاتے ہیں کہ یہ کتاب شعر العجم کی اشاعت ۱۳۲۵ھ کی اشاعت کے بعد شائع ہوئی۔ اس کی ایک واضح دلیل یہ ہے کہ ''بیان خسروؒ'' کے سرورق کے بعد مضمون کے آغاز سے قبل ایک صفحے پر ''شبلی کی مشہور تصانیف'' کے عنوان سے جو فہرست دی گئی ہے اس کے چوتھے نمبر پر ''شعر العجم'' کا اشتہار موجود ہے[109]۔ اس کے علاوہ محوی صاحب کا یہ کہنا کہ ''بیان خسروؒ'' میں سند یا حوالہ درج نہیں، سراسر غلط ہے کیوں کہ ان دونوں تصانیف میں شبلی نے سہواً ملا عبدالقادر بدایونی کا حوالہ بھی دیا ہے[110]۔ شبلی کے مذکورہ بالا بیان کو خان بہادر تقی محمد خان خورجوی نے بھی بغیر حوالے کے لفظ بہ لفظ درج کیا ہے[111]۔ اقبال صلاح الدین نے بھی شبلی کا حوالہ دیتے ہوئے اس معرکے میں حسن سجزی کی موجودگی کی تائید کی ہے[112]۔ ممتاز حسین نے بھی حسن سجزی کے بیان میں ملا عبدالقادر بدایونی کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا کہ ''اس معرکے میں امیر حسن بھی گرفتار ہوئے''[113]۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ ان تمام لوگوں نے بدایونی کے بیان کردہ

جملے کی صداقت کو جانچنے کی کوشش نہیں کی اور محض شبلی نعمانی کے بیان کردہ جملے کو درست مان کر یقین کرلیا۔ بدایونی کے تصنیف ''منتخب التواریخ'' کا مطالعہ کرتے ہوئے راقم کی نظر سے ایسا کوئی جملہ نہیں گزرا جس سے میدان جنگ میں حسن سجزی کی موجودگی کا پتا چلتا ہو۔ البتہ ملا عبدالقادر نے یہ ضرور لکھا کہ اس اندوہ ناک سانحے کے بعد میر حسن دہلوی نے ایک مرثیہ نثر میں لکھ کر دہلی بھیجا[۱۱۴]۔
اصل فارسی عبارت ملاحظہ کیجیے:

میر حسن دہلوی مرثیۂ نثر انشا نمودہ بدھلی فرستادو دراینجا بجنس نقل کردہ میشود[۱۱۵]۔

اس مرثیے میں حسن دہلوی نے کہیں بھی اپنی گرفتاری کا ذکر نہیں کیا جس کا اعتراف خود ممتاز حسین نے بھی کیا ہے[۱۱۶]۔ بھلا یہ کیوں کر ممکن ہے کہ کوئی شخص اس معرکے میں شریک ہو اور گرفتار ہوا ہو لیکن وہ ان واقعات کے بیان میں اپنا ذکر تک نہ کرے۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر معین الدین عقیل نے بھی ''تاریخ فیروز شاہی'' کا حوالہ دیتے ہوئے سہواً یہ لکھا ہے کہ ''اس لشکر میں خسرو اور حسن سجزی بھی ہم رکاب تھے۔ شہزادہ (محمد) کی شہادت کے بعد مغل ان دونوں کو قید کرکے اپنے ساتھ لے گئے''[۱۱۷]۔ انھوں نے لاہور سے شائع ہونے والے مترجم ڈاکٹر معین الحق کی مذکورہ ''تاریخ فیروز شاہی'' کا حوالہ دیتے ہوئے یہ بھی لکھا کہ ''یہ حادثہ بروز جمعہ ذی الحجہ ۶۸۳ھ/۱۲۸۴ء کے آخری اور ۶۸۴ھ/۱۲۸۵ء کے پہلے دن پیش آیا''[۱۱۸]۔ راقم نے جب تاریخ فیروز شاہی کا مطالعہ کیا تو امیر حسن سجزی کے بیان میں برنی نے کہیں بھی ان کی گرفتاری اور قید ہونے کا ذکر نہیں کیا ہے[۱۱۹] جب کہ خسرو کے حوالے سے یہ ضرور لکھا ہے کہ ''اس جنگ میں خسرو مغلوں کے ہاتھ قید ہوئے''[۱۲۰]۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ اس سانحے کے حوالے سے ڈاکٹر معین الدین عقیل نے جو سن درج کیا ہے، مذکورہ ترجمے میں وہ سن بھی درست نہیں لکھا گیا بلکہ مترجم ڈاکٹر سید معین الحق نے سہواً ۶۸۴ھ کے بجائے ۷۸۴ھ کا سن درج کیا ہے[۱۲۱] غالباً سہو کاتب کی وجہ سے ایک صدی کا فرق آیا۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ڈاکٹر معین عقیل صاحب نے مذکورہ سن کہاں سے درج کیا۔ دراصل اس واقعے کی تاریخ اور سن خود امیر خسرو نے ''دیوان وسط الحیات'' میں بیان کیا ہے جو بعینہٖ وہی ہے جو معین الدین عقیل نے درج کی ہے[۱۲۲]۔ غالباً انھوں نے خسرو کے اسی دیوان سے یہ سن درج کیا ہوگا۔ اس واقعے کے درست تاریخ اور سن کے تعین کے لیے ایک اور معتبر حوالہ خود حسن سجزی کا منثور مرثیہ ہے جس میں وہ کہتے ہیں کہ:

> ۶۸۳ھ ماہ ذی الحجہ کی آخری تاریخ کو جمعہ کے روز جب آفتاب، لشکرِ اسلام کی معیت میں، تیغ زناں (پردۂ تاریکی سے) برآمد ہوا••• اس (شہزادہ محمد) کی طبعِ مشکل کشا پر جب یہ بات کھلی کہ تمرِ ملعون اپنے لاؤلشکر سمیت تین فرسنگ کے فاصلے پر خیمہ زن ہو چکا ہے تو اس نے صبح ہوتے ہی اس طرف پیش قدمی کی••• وہ شاہ دین پناہ••• تمام قلب سپاہ کے ہم راہ اس گروہِ گم راہ کے ساتھ، از نیمروز تا شبانگاہ، بلا جبر و کراہ، جنگ کرتا رہا••• عین اسی عنا اور اسی اثنائے آشوبِ بلا میں اچانک ایک تیر شستِ قضا سے نکل کر اس شہبازِ فضائے غزا کے شہپر پر لگا اور اس کا طائرِ روح قفسِ عنصری سے گلستانِ جنان اور بوستانِ رضوان کی طرف روانہ ہوا... ٹھیک غروب کے وقت اس شاہ کی زندگی کا ماہ، جس کی روشنی مدھم پڑ چکی تھی، مغرب کی فنا میں غروب ہو گیا[۱۲۳]۔

حسن سجزی کے مذکورہ بیان سے صاف ظاہر ہے کہ شہزادہ محمد نے میدانِ جنگ تک کا فاصلہ دوپہر کے درمیان طے کیا اور

دریائے راوی کے کنارے باغ نیر کے قریب یہ معرکہ ہوا۔ دوپہر سے شام تک جاری رہنے والے اس معرکے میں شہزادہ محمد کی شہادت ہوئی اور یہ سب کچھ ایک ہی دن میں ہوا جب کہ خسرو نے اس حوالے سے اگلے روز یعنی ۶۸۴ھ کی پہلی تاریخ درج کی ہے۔ خسرو اور حسن سجزی کے ہاں یہ اختلاف کیوں پایا جاتا ہے اس کی وضاحت خسرو کے واقعۂ اسیری کے بیان میں کی جائے گی۔ یہاں ایک اور غلط فہمی کو دور کرنا ضروری ہے جو ''منتخب التواریخ'' کے مترجم محمود احمد فاروقی کو ہوئی۔ مذکورہ مترجم نے حسن سجزی کے مرثیے کی بابت لکھا کہ ''ضیاء الدین برنی لکھتا ہے کہ یہ نثری مرثیہ امیر خسرو نے لکھا تھا۔ فرشتہ نے بھی اس کی تائید کی اور لکھا کہ ....اس (خسرو) نے یہ نثری مرثیہ لکھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ''منتخب التواریخ'' کے کاتب نے غلطی سے میر حسن کا نام لکھ دیا ہے ورنہ ملاّ بدایونی سے ایسی فاش غلطی سرزد نہیں ہوسکتی [۱۲۴]۔ راقم نے جب اس حوالے سے برنی کی ''تاریخِ فیروز شاہی'' کا مطالعہ کیا تو اس کی نظر سے ایسا کوئی جملہ نہیں گزرا۔ برنی نے تو اس واقعے کو نہایت مختصر بیان کیا ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ اس نے حسن سجزی کے مرثیے کا ذکر تک نہیں کیا۔ البتہ برنی نے امیر خسرو کے حوالے سے بڑے واضح طور پر لکھا کہ ''انھوں (خسرو) نے خان شہید کے دو مرثیے نظم میں کہے جن میں جادو کیا ہے'' [۱۲۵]۔ اس کے علاوہ تاریخ فرشتہ میں بھی اس واقعے کے بیان میں کہیں بھی امیر خسرو اور حسن سجزی کے ان مرثیوں کا تذکرہ موجود نہیں [۱۲۶]۔

حقیقت یہ ہے کہ میر حسن سجزی کا نام درج کرتے ہوئے نہ تو کاتب سے غلطی ہوئی اور نہ ہی ملا عبدالقادر سے سہو ہوا۔ یہ نثری مرثیہ حسن سجزی ہی کا تحریر کردہ تھا۔ معاصر تاریخ سے بھی اس کی وضاحت ہوتی ہے۔ اس حوالے سے سب سے بڑی دلیل تو یہ ہے کہ ملا عبدالقادر بدایونی اور اسلامی ہند کی عمومی تاریخ لکھنے والے اکثر مورخین کے پیش رو ''تاریخ مبارک شاہی'' کے مصنف یحییٰ بن احمد سر ہندی ہیں۔ ''منتخب التواریخ'' میں سبب تالیف کتاب کے عنوان سے ابتدائیہ لکھتے ہوئے خود ملا عبدالقادر بدایونی اس بات کا اعتراف کرتے ہوئے کہتا ہے کہ ''تاریخ مبارک شاہی اور نظام التواریخ نظامی دونوں کو میں نے اپنے پیش نظر رکھا'' [۱۲۷]۔ ''منتخب التواریخ'' کی تالیف ملا عبدالقادر نے ۹۹۹ تا ۱۰۰۴ھ کے دوران کی۔ اس کا اختتامیہ لکھتے ہوئے انھوں نے خود کہا کہ ''میں نے ۲۳ ماہ جمادی الثانی ۱۰۰۴ھ کو اپنے رہوار قلم کی باگیں کھینچ لیں اور جتنا کچھ لکھا گیا، اس پر اکتفا کر لیا'' [۱۲۸]۔ جب کہ ''تاریخ مبارک شاہی ۸۳۸ھ کے لگ بھگ تصنیف کر کے خاندان سادات کے مشہور فرماں رواں معزالدین ابوالفتح مبارک شاہ بن خضر خان ۸۲۴ھ۔۸۳۷ کے نام نامی سے معنون کی گئی'' [۱۲۹]۔ منتخب التواریخ سے تقریباً ۱۶۶ برس قبل لکھی گئی اس تاریخ میں بھی امیر حسن دہلوی کے اس مرثیے کا مکمل متن پیش کیا گیا ہے۔ اس بابت یحییٰ بن احمد سرہندی کا بیان ہے کہ:

> ان سطور میں ملاعین کے آنے اور ''خانِ بذرگ'' (شہزادہ محمد شہید) کے شہادت پانے کی کیفیت من وعن اسی طرح بیان کی جاتی ہے جس طرح افصیح المتکلمین، امیر حسن علاء سجزی، علیہ الرحمتہ، نے اس کے مرثیے میں بیان کی ہے [۱۳۰]۔

محمد سعید مارہروی [۱۳۱] اور ڈاکٹر وحید مرزا نے صرف بدایونی کا حوالہ دے کر کہا کہ خواجہ حسن دہلوی کا منثور مرثیہ اس نے ''منتخب التواریخ'' میں نقل کیا ہے [۱۳۲]۔ جب کہ درست صورت حال یہ ہے کہ اس کتاب سے ۱۶۶ برس قبل ہی یحییٰ بن احمد سر ہندی نے اپنی تصنیف ''تاریخ مبارک شاہی'' میں مکمل مرثیہ فارسی میں درج کیا [۱۳۳]۔ اور بعد کے مورخین نے وہیں سے نقل کیا ہے۔

حسن سجزی کے حوالے سے مذکورہ بالا مباحث سے قطع نظر خود سجزی کے بیان سے شبہ ہوتا ہے کہ وہ اس معرکے میں شہزادہ محمد

شہید کے ساتھ موجود نہیں تھے۔ اسی لیے مسعود علی محوی، شبلی کی پیروی میں یہ بات کہنے کے باوجود کہ خسرو کے ساتھ حسن سجزی کو بھی گرفتار کرلیا گیا تھا، شکوک وشبہات کا شکار نظر آتے ہیں۔ وہ خود اس بارے میں کہتے ہیں کہ:

امیر حسن کے متعلق اب تک ہمیں ایسا کوئی مواد نہیں ملا جس کی بنا پر ہم کہہ سکیں کہ وہ بھی قطعاً شریکِ معرکہ اور گرفتاری اور قید میں امیر خسرو کے ساتھ تھے'' [۱۳۴]۔

سوچنے کی بات یہ ہے کہ یہ اعتراف ایک ایسے شخص کا ہے جس نے بڑی محنت سے کلیات حسن سجزی مرتب کیا۔ اس کی ابتدا میں ۱۱۴صفحات کا دیباچہ لکھا جس میں حسن سجزی کے حیات اور کارناموں کا تحقیقی جائزہ کیا گیا ہے۔ اس کے بعد ۶۲۳ صفحات پر مشتمل ان کا فارسی کلام درج ہے۔ انھوں نے حسن سجزی کا کلیات مرتب کرتے ہوئے ان کے ایک ایک شعر کے سن پر غور کیا۔ اس کے ساتھ ساتھ تمام معاصر تذکروں اور تواریخ کو کھنگالا لیکن آخر میں اس بات کا اعتراف کرنے پر مجبور ہوئے کہ حسن سجزی کے کلام میں کہیں بھی اس واقعے کی طرف اشارہ نہیں پایا جاتا [۱۳۵]۔ بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک شاعر جس کے کلام کا اتنا بڑا ذخیرہ محفوظ ہو اور اس میں ہزاروں کی تعداد میں اشعار ہوں وہ شاعر کسی سانحے سے دوچار ہوا اور اسے نظم نہ کرے۔ یہ بات قرین قیاس معلوم نہیں ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ حسن سجزی کی مشہور تالیف فوائدفواد میں ایک عالمانہ ''مقدمہ'' لکھتے ہوئے پروفیسر نثار احمد فاروقی نے سوائے اس کے کہ ''امیر خسرو نے نظم میں اور امیر حسن نے نثر میں مرثیہ لکھا'' [۱۳۶] کوئی اور وضاحت نہیں کی۔

اس بارے میں ایک مضبوط دلیل یہ ہے کہ بعد کے تذکرہ نویس اور مورخین اس حوالے سے جس قسم کے مخمصے کا شکار نظر آتے ہیں، اس کی وجہ محض حسن سجزی کا منثور مرثیہ ہے۔ جب کہ اس مرثیے میں کہیں بھی ایسے شواہد نہیں ملتے کہ وہ خود اس معرکے میں موجود تھے۔

یہ وہ شواہد ہیں جن کی بنیاد پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ حسن سجزی غالباً خود اس معرکے میں شریک نہیں تھے۔ لہٰذا امتیاز حسین کا یہ کہنا درست معلوم نہیں ہوتا کہ وہ اس واقعے کے عینی شاہد تھے۔ بلکہ شواہد یہ بتاتے ہیں کہ انھوں نے یہ مرثیہ معرکے میں شریک عینی شاہدین سے سن کر قلم بند کیا ہوگا۔ اس بات کی وضاحت کے لیے ضروری ہے کہ مرثیے کے بعض حصوں کا گہرائی سے جائزہ لیا جائے۔ سجزی نے اس مرثیے میں ایک جگہ لکھا ہے کہ:

...تمر ملعون با تمامئ لشکر بسہ فرسنگی فرود آمدہ است [۱۳۷]۔

سیدہ فلیحہ کاظمی نے سہواً اسے ایک فرسنگ سمجھا [۱۳۸]۔ فرسنگ یا فرسخ سے مراد تین میل کی مسافت ہے۔ اہل فارس ۴۰۰۰ گز کی مسافت کو ایک میل جب کہ زمانۂ حال میں انگریزوں کے ہاں ۱۷۶۰ گز کی مسافت کو ایک میل مانا جاتا ہے [۱۳۹]۔ سجزی نے اسی مرثیے میں جنگ کا مرکز آب لاہور بھی قرار دیا ہے [۱۴۰]۔ تاریخ مبارک شاہی کے مؤلف نے بھی لکھا کہ ''دریائے لاہور کے کنارے باغ نیر میں ملعونوں کے ساتھ جنگ ہوئی'' [۱۴۱]۔ ملا عبدالقادر نے بھی آبِ لاہور اور راوی کو ہی میدانِ جنگ ٹھہرایا ہے [۱۴۲]۔ برنی نے اس بابت لکھا کہ:

...درمیان لوھور و دیوبالپور باتمر ملعون کہ سگی سگرف از سگان جنگیز خانی بود محاربہ ومقابلہ افتاد [۱۴۳]۔

بعد کے بیشتر مورخین اس بات پر متفق ہیں کہ یہ معرکہ راوی کے کنارے اور دیپال پور سے کچھ فاصلے پر پیش آیا۔ حسن سجزی

کے تین فرسنگ والے بیان کو ذہن میں رکھتے ہوئے دریائے راوی اور دیپال پور کی جغرافیائی صورتِ حال اور فاصلے کے بارے میں کچھ وضاحت یہاں ضروری ہے۔ راوی پنجاب کا مشہور دریا، جو کانگڑہ کے پہاڑوں سے نکل کر شمال ومغربی جانب بہتا ہوا گورداس پور کے ضلع میں پہاڑی علاقے سے میدانی علاقوں میں آتا ہے۔ پھر لاہور کے قریب سے گزرتا ہوا چناب و جہلم میں شامل ہو جاتا ہے۔ جب کہ دیپال پور ضلع اوکاڑہ کا قدیمی شہر ہے۔ یہ وہی شہر ہے جہاں سلطان التمش نے تاتاریوں کی یورش کو روکنے کے لیے ایک بڑی فوجی قائم کی جو بعد میں ایک صدی تک قایم رہی[۱۴۴]۔

ملتان سے دیپال پور کا فاصلہ تقریباً سوا دو سو کلومیٹر سے بھی زیادہ کا ہے جب کہ دیپال پور سے راوی کا فاصلہ بھی تقریباً دو سو کلومیٹر ہے[۱۴۵]۔ سجزی کے ''تین فرسنگ'' والے بیان کو اگر درست مان لیا جائے تو یہ ملتان سے مذکورہ معرکے کا فاصلہ پندرہ بیس کلومیٹر سے زیادہ نہیں بنتا۔ خود سجزی کے اس جملے سے جس میں انھوں نے لکھا ہے کہ:

...و بہ یک فرسنگی آن ملاعین پیش باز آمد۔ موضع مصارف در حدود باغ تیز بر راست کہ سوارۂ چرخ در ولایت نیم روز رسید[۱۴۶]۔

اس جملے سے اچھی طرح اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ فاصلہ تین فرسنگ سے بہت زیادہ تھا۔ اسی لیے شہزادہ محمد شہید فجر کے وقت روانہ ہوئے اور دوپہر کے قریب معرکۂ جنگ کے مقام تک پہنچے۔ وہیں شام کے وقت ان کی شہادت ہوئی۔ اگر یہ فاصلہ تین فرسنگ ہی ہوتا تو بمشکل ایک سے دو گھنٹے میں یہ فاصلہ طے ہو جاتا۔

اس کے علاوہ ضیاء الدین برنی کی ''تاریخ فیروز شاہی'' بھی اس واقعے کو سمجھنے کا اہم ذریعہ ہے۔ یہ تصنیف امیر کے انتقال کے ۳۱ویں برس (۱۳۵۶ء) کو مکمل ہوئی۔ برنی ایک صاحب حیثیت مؤرخ تھے۔ انھوں نے اپنے پیش رو مؤرخین مثلاً قاضی منہاج وغیرہ کے پُر پیچ طرزِ تحریر سے ہٹ کر سادہ واقعہ نگاری کی زبان اپنائی اور ہر واقعہ لکھنے سے پہلے خوب چھان بین کی۔ واقعے اور تاثر کو پیش کرنے میں وہ ایک طرح سے ابن خلدون کا پیش رو ہے[۱۴۷]۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ سات صدی سے زائد کا عرصہ گزرنے کے باوجود آج تک مجموعی طور پر،

برنی کی کتاب کو ہر دور کے مؤرخ نے مستند اور قابلِ اعتبار سمجھا۔ جس عہد کی تاریخ اس میں لکھی گئی ہے، اس پر اسی کو سب سے اوّل اور سب سے معتبر ماخذ قرار دیا ہے[۱۴۸]۔

ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ امیر خسرو، حسن سجزی اور ضیاء الدین برنی کے گہرے دوستانہ مراسم رہے ہیں۔ خود برنی سے حسن سجزی کے بیان میں اس بات کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

سالہا مرا با امیر خسرو و امیر حسن مذکو تو دد و یگانگی بودہ است و نہ ایشاں بی صحبتِ من بتوانستندی بود نہ من توانستمی کہ مجالست ایشیاں را گذرانم واز صحبتِ من میانِ ایشاں ہر دو اوستاد قرابتی شدہ و در خانہائی یکدیگرا مدوشد کردن گرفتند[۱۴۹]۔

اس سانحے سے بلبن حکومت کو زبردست صدمہ پہنچا۔ ضیاء الدین برنی اس منظر کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اس کے بعد ''ملتان میں عام مصیبت کی وجہ سے ہر گھر تعزیت کا گھر بن گیا اور سوگ میں لوگوں نے سیاہ کپڑے پہن لیے۔ نوحہ کرنے والوں کا شور

آسمان تک پہنچا''[150]۔

شہزادہ محمد کی شہادت کی خبر غیاث الدین بلبن کو پہنچانا ایک مشکل ترین مرحلہ تھا۔ اتنے بڑے سانحے کی بابت زبان کھولنے کی ہمت کسی میں نہیں تھی۔ ''فتوح السلاطین'' کے مصنف عصامی کا بیان ہے کہ جس خط کے ذریعے اس سانحے کا پیغام بھیجا گیا تھا، سلطان کے سامنے اسے پڑھنے کی ہمت نا پا کر یہ طریقہ اختیار کیا گیا کہ اس خط کو سلطان بلبن کے جوتے میں رکھ دیا گیا تا کہ جب بلبن اس جوتے کو پہنے تو اس خط کو دیکھ لے۔ عصامی لکھتا ہے کہ:

ھم آخر شنیدم پس از چند گاہ	نہادند آں نامہ در کفشِ شاہ
موذّن چو زد نعرۂ سو بہ سو	شہ از تخت برخاست بہرِ وضو
بہ کفش اندروں پائے خودمی کشید	یکے نامہ افتادہ در کفش دید
سرِ نامہ چوں دید خسرو سیاہ	بزد نعرہ و بر زمین زد کلاہ[151]

اس خبر سے بلبن پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ ایک اسّی سالہ بوڑھے کے لیے یہ سانحہ نا قابل برداشت تھا۔ وہ راتوں کو اٹھ اٹھ کر خلوت میں زار زار روتا اور آہ وفریاد کرتا[152]۔ اسی کیفیت میں ۶۸۶ھ میں اس کی وفات ہوئی[153]۔ اس سانحے کی شدت کا اندازہ امیر خسرو کے ان جملوں سے لگایا جا سکتا ہے جس میں وہ کہتے ہیں کہ لڑائی کے دوران ''شہیدوں کے لہو سے زمین سرخ ہوگئی اور پانی کی مانند ان کا خون زمین میں جذب ہوتا رہا''[154]۔ یہ سانحہ عہد بلبن میں تاریخ کا سب سے بڑا المیہ ہے۔ اگر شہزادہ محمد کو تخت بلبن پر بیٹھنے کا موقعہ ملا ہوتا تو ہندوستانی ادب وثقافت کی تاریخ دوسرے ہی انداز میں لکھی جاتی[155]۔

اس سانحے میں امیر خسرو کی گرفتاری مسلّم ہے۔ ''تاریخ فیروز شاہی'' سے لے کر آج تک لکھی جانے والی تمام تواریخ اور خسرو کے سوانح نگاروں نے اس گرفتاری پر کسی قسم کے شکوک وشبہات کا اظہار نہیں کیا۔ حیرت ہے کہ مشاہیر نے اس گرفتاری کے حوالے سے مبالغہ آمیز واقعات لکھتے ہوئے محتاط رویہ اختیار نہیں کیا۔ یہاں تک کہ سید ہاشمی فرید آبادی نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ:

> امیر خسرو اس معرکے میں مغلوں کے ہاتھوں اسیر ہوئے (فرشتہ وغیرہ) غالبًا قیاسی ہے اگرچہ ان کی گرفتاری اور کوئی دو برس تک بلخ میں قید رہ کر رہا ہونا مثنوی خضر خاں دول رانی اور ان کے دوسرے اشعار واقوال سے ثابت ہے[156]۔

عبارت میں ہاشمی فرید آبادی عجیب مخمصے کا شکار نظر آتے ہیں۔ ایک طرف تو وہ امیر خسرو کی اسیری کے واقعے کو قیاسی قرار دے کر اس کو ماننے ہی سے انکاری ہیں اور دوسری طرف یہ بھی کہہ رہے ہیں کہ خسرو کی مثنوی خضر خاں دول رانی اور دیگر اشعار سے ان کی گرفتاری اور دو برس بلخ میں قید ہونا ثابت ہے۔

اقتباس میں درج ہاشمی فرید کی ہر بات تاریخی حقائق کے خلاف ہے کیوں کہ خسرو کی گرفتاری تو خود اس عہد میں لکھی گئی ''تاریخ فیروز شاہی'' سے ثابت ہے جس میں برنی لکھتے ہیں کہ:

> اس جنگ میں خسرو مغلوں کے ہاتھوں قید ہوئے، لیکن کسی صورت سے ان سے رہائی پالی[157]۔

جب کہ خسرو کی رہائی کے حوالے سے مثنوی خضر خاں دول رانی کا حوالہ دے کر بلخ میں دو برس کی قید کے واقعے کا بیان بھی

سراسر مبالغہ آرائی کے سوا کچھ نہیں۔ ہاشمی فرید آبادی خسرو کے واقعہ اسیری کے حوالے سے خلط مبحث کا شکار نظر آتے ہیں۔ انھوں نے مذکورہ مثنوی کا مطالعہ کیے بغیر بلخ میں دو برس کی قید کو اس مثنوی سے نتھی کرنے کی کوشش کی جو سراسر غلط ہے۔ انھیں یہ غلط فہمی غالباً فرشتہ کے اس بیان سے ہوئی جس میں وہ کہتا ہے کہ ''ان (خسرو) کی رہائی کا وہی قصّہ ہے جو خود حضرت خسرو اپنی تصانیف خضر خانی اور دیولدی [کذا: دیول رانی] وغیرہ میں تحریر کیا ہے''[158]۔

حقیقت یہ ہے کہ اس مثنوی میں خسرو نے اس سانحے کے بعد اپنی گرفتاری اور اس دوران ہونے والی تکالیف اور رہائی کا ذکر تو کیا ہے لیکن بلخ لے جا کر دو برس کی قید کا کوئی اشارہ اس مثنوی میں نہیں ملتا[159]۔ شیخ محمد اکرام بھی اس بابت اپنی شکست کا اعتراف کرتے ہوئے یہ کہنے پر مجبور ہوئے کہ خسرو نے ''پتہ نہیں اس بلا سے کس طرح رہائی پائی''[160]۔ حسن برنی بھی مبہم انداز میں یہی لکھ کہ گرفتاری کے بعد ''خوش قسمتی سے کسی طرح چھوٹ کر آ گئے''[161]۔ زینب ساجدہ نے تو مزید ایک قدم آگے جا کر یہ تک لکھ دیا کہ:

> جب سب لوگوں کو رہائی ملی تب بھی خسرو کو نہ مل سکی کیوں کہ ان کی شہرت دشمنوں تک بھی پہنچ چکی تھی۔
>
> جب معلوم ہوا یہی خسرو ہیں تو انھیں روک لیا گیا اور بدلے میں مال غنیمت چھوڑ دیا اور تاوان معاف کیا گیا۔ دو سال تک یہ وہیں رہے[162]۔

اس صورت حال میں مسعود علی محوی کا یہ کہنا ہے کہ دو سال کے بعد مغلوں کی قید سے رہا ہو کر دہلی پہنچنا مسلّم ہے[163] کسی طور پر بھی ثابت نہیں۔ مذکورہ بالا تمام اقتباسات کے جائزے کے بعد ایک اہم سوال جو ہمارے ذہنوں میں پیدا ہوتا ہے وہ یہ کہ آخر اردو والوں کے پاس خسرو کے حوالے سے بلخ اور دو برس قید کی روایت آئی کہاں سے؟ اس بارے میں سب سے اہم حوالہ شبلی کا ہے۔ ان کا بیان ہے کہ ''تاتاری ان کو گرفتار کر کے بلخ لے گئے....دو برس بعد امیر نے کسی طرح تاتاریوں کے ہاتھ سے رہائی پائی''[164]۔ بعد کے لکھنے والوں نے اس روایت کو شبلی سے نقل کر کے دہرایا۔ نہ صرف دہرایا بلکہ مسعود محوی نے تو پیروئ شبلی میں اس بات کو مسلم بھی مان لیا۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ شبلی نے یہ روایت کہاں سے نقل کی۔ اس سلسلے میں بلخ والی بات کو شبلی نے بدایونی سے منسوب کرنے کی کوشش کی ہے جو کہ درست نہیں۔ انھوں نے ''شعر العجم'' حصہ دوم کے حواشی میں اس کی وضاحت میں حوالہ دیتے ہوئے ''بدایونی ص ۱۳۱''[165] تو درج کیا لیکن یہ کہیں نہیں لکھا کہ یہ کون سا نسخہ تھا یا کس ایڈیشن سے شبلی نے استفادہ کیا۔ راقم نے اس حوالے سے کوشش کی تو ۱۸۶۸ء میں ایشیاٹک سوسائٹی، کلکتہ سے شائع ہونے والی ''منتخب التواریخ'' کے صفحہ نمبر ۱۳۱ میں اس واقعے کی تفصیل تو ملی اور درست سن اور تاریخ کی بھی تصدیق ہوئی لیکن کہیں بھی بلخ یا دو سال کی قید کے حوالے سے تفصیلات نہیں ملیں[166]۔ البتہ اس کتاب کے اگلے صفحات میں خسرو کے حوالے سے یہ ضرور درج ہے کہ:

> میر خسرو نیز دران روز در بند لاہوری نوکر مغول افتادہ بود و بارتوبرہ وجل بر سر داشت و ازاں حالت یاد میدھد ومیگوید منکہ بر سرنمی نہادم گل بار بر سر نہاد و گفتا جل و در مرثیہ ترکیب بند کہ در دیوان غرۃ الکمال مسطور است[167]۔

اس اقتباس میں کہیں بھی بلخ اور دو سال قید کی وضاحت نہیں ہوتی۔ اس سلسلے میں ایک اور بات سمجھ لینا ضروری ہے کہ کیا شبلی وہ پہلے محقق ہیں جن سے یہ سہو ہوا یا اردو میں یہ روایت اس سے قبل بھی کہیں ملتی ہے؟ اس بابت ڈاکٹر وحید مرزا کا بیان ہے کہ:

شبلی نعمانی کا یہ بیان جو غالباً انھوں نے احمد سعید مارہروی کی کتاب ''حیاتِ خسرو'' سے اخذ کیا ہے، کسی طرح صحیح نہیں ہوسکتا کہ مغل خسرو کو قید کر کے بلخ لے گئے تھے اور وہاں سے دو سال کے عرصے کے بعد وہ ملتان واپس آئے[۱۶۸]۔

یہ بات درست ہے کہ شبلی نے شعرالعجم کا اختتام (۸۔۱۹۰۷ء) ۱۳۲۵ھ میں کیا[۱۶۹] اور اس کتاب کی اشاعت سے ۴ برس قبل (۱۹۰۳ء) ۱۳۲۱ھ کو احمد سعید مارہروی کی تصنیف ''حیات خسرو'' شائع ہوچکی تھی[۱۷۰]۔ اپنی اس تصنیف میں احمد سعید مارہروی نے بڑے واضح انداز سے لکھا کہ ''امیر خسرو کو قید کر کے بلخ لے گئے جہاں دو برس کے بعد نہایت مشکل سے رہائی ملی''[۱۷۱]۔ اس عبارت سے صاف ظاہر ہے کہ یہ روایت شبلی سے قبل احمد سعید مارہروی نے درج کی۔ غالباً شبلی کے پیش نظر احمد سعید مارہروی کی کتاب ''حیات خسرو'' ضرور رہی ہوگی اور غالب امکان یہی ہے کہ انھوں نے یہ روایت مذکورہ تصنیف سے ہی لی ہو لیکن شبلی جیسے بلند پایا محقق نے نسبتاً غیر معروف احمد سعید مارہروی کا حوالہ دینے سے گریز کیا۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ احمد سعید مارہروی نے یہ روایت کہاں سے نقل کی؟ ڈاکٹر معین الدین عقیل نے اس بابت لکھا کہ ''انھوں (شبلی اور احمد سعید مارہروی) نے اس کی کوئی سند فراہم نہیں کی''[۱۷۲]۔ یہ بات درست ہے کہ احمد سعید مارہروی نے اپنی تصنیف میں اس بابت کا کوئی حوالہ درج نہیں کیا لیکن شبلی کے حوالے سے وضاحت ہوچکی ہے کہ انھوں نے سہواً غلط حوالہ درج کیا۔ یہاں اس بات کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ ڈاکٹر وحید مرزا اور ڈاکٹر معین الدین عقیل نے بھی خسرو کے واقعہ اسیری کی بحث کے دوران یہ نہیں بتایا کہ آخر احمد سعید مارہروی نے دو برس قید اور بلخ والی روایت کہاں سے درج کی۔ ماضی میں حواشی اور حوالے نہ ڈالنے کی روایت کی وجہ سے اس بات کی تہہ تک پہنچنا خاصا دشوار طلب کام تھا۔ راقم نے جب فارسی مآخذ اور متون کو کھنگالنا شروع کیا تو اس روایت کی تلاش میں بڑی دقت پیش آئی۔ بالآخر پیش رفت ہوئی اور عالم گیر کے زمانے کے مشہور مورخ سجان رائے بھنڈاری، جن کا انتقال ۱۱۰۷ھ مطابق ۱۶۹۵ء میں ہوا تھا[۱۷۳] نے اپنی مشہور تصنیف ''خلاصۃ التواریخ''، جو اورنگ زیب کے ۴۰ جلوس میں لکھی گئی تھی[۱۷۴]، میں امیر خسرو کے واقعۂ اسیری کی بابت لکھا کہ ''اکمل الشعرا امیر خسرو دہلوی کے ہمراہ شاہزادہ بود بہ دست مغول اسیر گردید و در بلخ رفتہ از انجا نجات یافتہ باز بہندوستان آمد''[۱۷۵]۔ اس اقتباس میں بھی بلخ لے جانے کا بیان تو موجود ہے لیکن دو برس کی قید کا کہیں ذکر نہیں۔ لہٰذا راقم نے تلاش کا سلسلہ جاری رکھا۔ بہت سے فارسی مآخذ کو دیکھنے کے بعد بالآخر یہ تلاش نتیجہ خیز ثابت ہوئی اور فارسی کی مشہور تصنیف ''خزانہ عامرہ'' کا مطالعہ کرتے ہوئے راقم کی نظر سے بلگرامی کا یہ جملہ گزرا کہ:

سلطان محمد را شہید ساختند و امیر خسرو را اسیر کردہ ببلخ بردند بعد دو سال رہائے یافتہ بخدمت سلطان بلبن آمد و قصیدۂ کہ در مرثیہ خان شہید گفتہ بود[۱۷۶]۔

بلگرامی کے ان جملوں کے بعد اس بات میں شبہ کی گنجائش باقی نہیں رہی کہ احمد سعید مارہروی نے خسرو کی دو برس قید اور بلخ کی روایت کو بہ عینہٖ ''خزانۂ عامرہ'' سے ترجمہ کیا ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے ''خزانۂ عامرہ'' ڈاکٹر ایوب قادری کے مطابق ۱۱۷۱ھ[۱۷۷] اور شمس بریلوی کے مطابق ۱۱۷۶ھ کی تالیف ہے۔ اس سن کو شمس بریلوی نے درست نہیں مانا[۱۷۸] لیکن درست سن کا تعین بھی نہیں کیا۔ غالباً ڈاکٹر ایوب قادری کا بتایا ہوا سن ہی درست ہے۔ بلگرامی کا انتقال ۱۷۸۶ء میں ہوا[۱۷۹] جب کہ اس سے ۹۱ برس قبل سجان رائے بھنڈاری اس

دنیا سے کوچ کر چکے تھے۔ اس لحاظ سے قدیم ماخذ تو ''خلاصۃ التواریخ'' ہی ہے لیکن اس میں خسرو کو بلخ لے جانے کا بیان موجود ہے جب کہ ''خزانۂ عامرہ'' میں بلخ اور دو برس کی قید، دونوں بیانات موجود ہیں۔ لہٰذا یہ بات حتمی طور پر کہی جا سکتی ہے کہ احمد سعید مارہروی کے پیش نظر اس حوالے سے خزانۂ عامرہ رہی ہوگی۔ ''خلاصۃ التواریخ'' ہرگز نہیں۔ ظاہر سی بات ہے یہ سارے مآخذ گیارھویں اور بارھویں صدی ہجری کے ہیں جن پر یقین کرنے کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی جب کہ اس بات میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ خسرو کے ہاں ایسا کوئی بیان نہیں ملتا اور نہ ہی معاصر تاریخ سے ایسے شواہد ملتے ہیں جن سے آزاد بلگرامی یا سجان رائے بھنڈاری کے ان بیانات کی تائید ہوتی ہو۔ بلخ کی روایت کے خلاف منشی افتخار عالم مارہروی نے مولانا عبدالماجد دریا آبادی کے نام اپنے خط میں لکھا کہ امیر خسرو کو قید کر کے تبریز لے جایا گیا اور شہادت کے طور پر یہ شعر لکھا ہے:

خسرو خستہ کہ ماندہ ست بہ تبریز اسیر — آہ اگر زو خبرے سوی خراساں ترود[۱۸۰]

حالاں کہ اکثر وبیشتر نسخوں میں ''بہ تبریز اسیر'' کی بجائے ''بدھلی در بند'' تحریر ہے۔ لہٰذا اس شعر کو سند قرار دینا قرین قیاس ہے[۱۸۱]۔ جہاں تک دو برس کی قید کا تعلق ہے، ڈاکٹر معین الدین عقیل نے شبلی اور احمد سعید مارہروی کے اس خیال کی تردید کرتے ہوئے کہا کہ ''یہ بات درست معلوم نہیں ہوتی''[۱۸۲]۔ ڈاکٹر وحید مرزا کا بھی یہی کہنا ہے کہ ان کے کچھ اشعار سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ ملتان سے کچھ زیادہ دور نہیں گئے تھے کہ قسمت نے ان کی گلوخلاصی کر دی[۱۸۳]۔ ان کے کلام کے مطالعے سے اس بات کا کہیں اشارہ تو نہیں ملتا کہ انھیں دو برس قید یا بلخ لے جایا گیا بلکہ بعض ایسے شواہد ضرور ملتے ہیں جن سے اس بیان کی تردید ہوتی ہے۔ مثلاً خسرو نے اپنے مرثیے میں ایک جگہ لکھا کہ:

کنون کہ شش صد و هشتاد و چار شد تاریخ — مرا ایں و سہ آید نوید سی و چہار
نہ سی و چار کہ گرسی ہزار سال بود — چو در حساب فنا شد نہ سی شمر نہ ہزار[۱۸۴]

ان اشعار کو پڑھ کر صاف پتا چلتا ہے کہ یہ مرثیہ انھوں نے اپنی رہائی کے فوراً بعد ۶۸۴ھ میں لکھا۔ اس میں وہ یہ بھی کہہ رہے ہیں کہ:

نماند هیچ کس از دوستاں پار امسال[۱۸۵]

گزشتہ سال کے دوستوں میں اس سال کوئی باقی نہیں رہا۔ اس سال یعنی ۶۸۴ھ کو میری عمر ۳۴ برس کی ہوگئی مگر اس سے کیا حاصل اگر میری عمر بجائے تیس اور چار کے تیس ہزار بھی ہو جائے تو بھی میرا انجام فنا ہے۔

اس شعر سے صاف ظاہر ہے کہ خسرو اس واقعے کے اگلے ہی سال ملتان میں موجود تھے اور دوستوں سے بچھڑنے پر نوحہ کناں تھے۔ بات یہیں ختم نہیں ہوتی بلکہ اس قصیدے میں ایک شعر ایسا بھی ہے جس سے گمان ہوتا ہے کہ خسرو اپنی اسیری کے اگلے ہی روز رہا ہو گئے تھے۔ شعر ملاحظہ کیجیے:

جمعہ بود و سلخ ذی حجہ کہ بود آں کار زار — آخر هشتاد و سہ آغاز هشتاد و چہار[۱۸۶]

خسرو نے یہاں شعر میں غالباً اس سانحے کے رونما ہونے کی تاریخ ۶۸۳ھ کا آخری دن قرار دیا جب کہ ۶۸۴ھ کے روز اوّل

کو اس جنگ کے خاتمے کی طرف اشارہ کیا ہے جب کہ حسن سجزی نے اپنے مرثیے میں واضح طور پر لکھا کہ جب شہزادہ محمد کو معلوم ہوا کہ تمر ملعون اپنے تمام لاؤ لشکر سمیت تین فرسنگ کے فاصلے پر خیمہ زن ہے تو وہ ۶۸۳ھ کے ماہ ذی الحجہ کی آخری تاریخ کو جمعے کے روز صبح ہوتے ہی اس طرف روانہ ہوئے۔ اسی مرثیے کے آخر میں تمام واقعات کی تفصیل بیان کرنے کے بعد انھوں نے لکھا کہ ٹھیک غروب آفتاب کے وقت اس شاہ کی زندگی کا ماہ، جس کی روشنی مدھم پڑ چکی تھی، مغربِ فنا میں غروب ہو گیا[۱۸۷]۔ ممتاز حسین نے لکھا کہ ''ممکن ہے کہ خسرو جنگ کرتے ہوئے سلطان محمد کے شہید ہونے سے پہلے ہی گرفتار ہو گئے ہوں''[۱۸۸]۔ لیکن یہ بات درست معلوم نہیں ہوتی کیوں کہ مورخین کا بیان ہے کہ شہزادے کی شہادت سے قبل ہندوستانی فوج نے مغلوں کے بڑے بڑے سورما مار گرائے تھے لیکن قسمت کی خرابی سے شہزادے کے تیر لگا اور اس کی موت واقع ہو گئی تو فوج میں بھگدڑ مچی ہوگی اور اسی بھگدڑ کے دوران خسرو کو گرفتار کیا گیا ہوگا۔ بعد میں ملتان میں کیا ہوا خسرو اس سے بے خبر رہے ہوں گے لیکن سجزی چوں کہ گرفتار نہیں ہوئے تھے لہٰذا انھیں اس صورت حال اور شہزادے کی موت کے صحیح وقت کا ضرور پتا ہوگا جب ہی ان دونوں کے بیان کردہ تاریخ میں ایک دن کا اختلاف پایا جاتا ہے۔ مولوی ذکاء اللہ نے اس بابت لکھا کہ نماز ظہر کی ادائیگی کے بعد مغل سے ہونے والی ایک جھڑپ میں ایک تیر ایسا لگا کہ شہزادہ محمد کا خاتمہ ہو گیا[۱۸۹]۔ ظاہر سی بات ہے یہ جھڑپ دیر تک جاری رہی ہوگی اور غروب آفتاب کے وقت ہی شہزادہ محمد کی شہادت ہوئی ہوگی۔ یہ سب کچھ اسی روز ہوا یعنی ۶۸۳ھ کے آخری روز لیکن خسرو کا ۶۸۴ھ کے پہلے روز کے حوالے سے جو بیان ہے وہ غالباً اس لیے ہے کہ انھیں اس گرفتاری کے بعد اگلے روز بھاگنے کا موقع ملا ہوگا اور خسرو نے اس مصیبت سے اپنی رہائی کی تاریخ ۶۸۴ھ کے روز اوّل کو شہزادہ محمد کی شہادت کے سانحے سے جوڑ کر اس واقعے کے اختتام کو اگلے روز سے نتھی کرنے کی کوشش کی ہے۔

اس بات کی حمایت میں ایک دلیل یہ بھی ہوتی ہے کہ فتوح السلاطین کے مصنف نے اس واقعے کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے آخر میں لکھا کہ شہزادے کی نعش مغلوں سے زر کثیر دے کر حاصل کی گئی۔ شعر ملاحظہ کیجیے:

پس از گریہ و شور و آہ و نفیر	کہ ہر چار در ماتم است ناگزیر
شنیدم براں زمرۂ بدشگال؟	ز اقطاع خود بس فرستادہ مال
زرے داد آں رائے اختر سعید	تنِ جاں ز دستِ مغل و اخرید[۱۹۰]

ظاہر سی بات ہے ان تمام معاملات کو طے کرنے میں بھی وقت لگا ہوگا۔ خسرو نے مرثیے میں ان باتوں کا ذکر نہیں کیا ہے۔ غالباً اس کے بیان سے خاندان بلبن کی ہتک کا پہلو نکلتا ہو۔ اس لیے خسرو نے اس کو بتانے سے اجتناب کیا لیکن غالب امکان یہی ہے کہ ان تمام معاملات سے خسرو ضرور آگاہ رہے ہوں گے۔

خسرو نے خود اپنی مثنوی دول رانی خضر خاں کے بعض اشعار میں اپنی اسیری کے واقعات پر روشنی ڈالی ہے۔ ان کے قصیدے ''حکم الحکم'' (وسط الحیوۃ) اور مثنوی دول رانی خضر خاں دونوں کو ملا کر پڑھنے سے اس سانحے کی پوری تصویر سامنے آجاتی ہے۔ مثنوی دول رانی خضر خاں میں وہ کہتے ہیں کہ:

در ایامی کہ ایں نفسِ بد آموز	گرفتار مغل شدہ ور ز امروز
بیاباں می بریدم ریگ بر ریگ	ز بس گرما سرم جو شید چوں دیگ

من و بامن چو من تشنہ سوارے	رسیدیم از رہ اندر جو ئباری
من از چہ نقطہ جانم بود در تاب	ندارم نفط خود را روغن از آب
لبے تر کر دم و تر شدہ جگرہم	سکونت یافت لختے جاں درہم
فتاد اں تشنہ و زاں نشد تر رخش	کہ بخش جاں برو زاں آب جاں بخش
ہم او سیراب شد و ہم مرکبش سیر	نشد درد ادن جاں ہر دور ادیر[۱۹۱]

خسرو کے اشعار سے صاف ظاہر ہے کہ جس وقت مغلوں کے ہاتھوں اسیر ہوئے تو انھیں ایک ویران ریگستان میں چلنا پڑا۔ گرمی اس قدر شدید تھی کہ جس کی شدت سے ان کا سر دیگ کی طرح پک رہا تھا۔ سفر کے دوران وہ اور ان کا ساتھی مغل جو انھیں قید کر کے لیے جا رہا تھا، شدید پیاس کے عالم میں ایک چشمے پر پہنچے۔ خسرو نے پیاس بجھانے میں بڑی احتیاط سے کام لیا اور صرف اپنے خشک ہونٹ تر کر لیے جس سے ان کے قلب وجگر کو راحت وسکون نصیب ہوا جب کہ ان کے مغل ساتھی اور اس کے گھوڑے نے شدّت پیاس سے مجبور ہو کر ضرورت سے زیادہ ہی پانی پی لیا۔ اس قدر پانی پیا کہ دونوں ہی گر کر ہلاک ہو گئے[۱۹۲]۔ قید ہونے کے بعد امیر خسرو اور دیگر قیدیوں کے ساتھ منگولوں کا جو رویہ تھا اس بارے میں پروفیسر جیلانی کامران نے دیباچہ غرۃ الکمال کے حوالے سے لکھا کہ تمام قیدیوں کو رسی سے باندھ کر زینوں کے ساتھ کس دیا گیا۔ قیدی غول درغول یا پیادہ گھوڑوں سے اس طرح کھینچے جاتے کہ ان کے سر ایک دوسرے سے ٹکراتے۔ مسلسل بھاگنے کی وجہ سے امیر خسرو کے پاؤں زخمی ہو گئے اور ان میں چھالے پڑ گئے۔ لباس، خاردار جھاڑیوں میں پھنس کر چیتھڑے ہو گیا۔ جس ملعون نے انھیں اپنی زین سے باندھ رکھا تھا، گھوڑے پر ایسے بیٹھا تھا جیسے کوئی چیتا چٹان پر جست لگائے بیٹھا ہو۔ اس کے چوڑے منھ سے بدبو کے بھبکے آ رہے تھے اور اس کی مونچھیں زیر ناف بالوں کی طرح اس کی ٹھوڑی پر لٹکی ہوئی تھیں۔ تھکن سے اگر خسرو کے قدم سست پڑ جاتے تو وہ بد بخت کبھی خنجر نکال لیتا اور کبھی تلوار سے انھیں ڈراتا[۱۹۳] اس پر ستم یہ کہ سفر کے دوران ان کے مغل ساتھی نے ان کے سر پر توبڑہ بھی چڑھا دیا[۱۹۴]۔ اس ساری صورت حال کو خسرو نے زیادہ تفصیل کے ساتھ اپنے قصیدے ''حکم الحکم'' میں بیان کیا ہے۔ اس قصیدے کے چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

اسیر کشتم و از بیم آں کہ خون ریزد	نمی نماند ز خون در تن نحیف و نزار
چوں آب بے سر و پائی دو یدم و چو حباب	ہزار آبلہ در پا ز رفتن بسیار
نہ پائہائے من از آبلہ جدا شد پوست	چناں کہ باز شود در نہ پائے ہا افزار
زرنج سخت شدہ جاں چو قبضۂ شمشیر	ز ضعف ڈوب شدہ تن چو دستۂ جفار
دے نماند بنایم از بودہ رہ تشنہ	دمے شدہ شکم من ماندۂ ناچار
برہنہ ماندہ تن چوں درخت گاہ خزاں	ہزار بارد چوگل از خراش خار آزار
بگریہ مرد مکِ دیدہ قطر ہامی ریخت	چناں کہ گردن عروسی ہا بگسا آزار
فروجۂ کہ مرا پیش کردہ رومی رخت	نشتہ بر فرشتے چوں پلنگ در کسار
کشادہ از دہنش نکہتے چو بوئے مغل	فتادہ بر زنخش سبلتے چو موئے زہار

زماندگی قدمے گر بیماندی می یستوہ گہے طفانہ کشیدے ختم جوں تکمار[195]

قصیدہ (حکم الحکم)

اس جنگ میں شہادت پانے اور بچھڑ جانے والے دوستوں کی یاد خسرو کو بے چین رکھتی۔ ڈاکٹر وحید مرزا کا بیان ہے کہ:

کتنے ہی عزیز ہوں گے جو اس ہنگامے میں ان سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو گئے، کیسی کیسی صورتیں ہوں گی جو مغلوں کے بے پناہ تیروں اور بے محابا تلواروں نے ہمیشہ کے واسطے خاک میں پنہا کر دیں، ان دوستوں کی موت کا رنج خسرو کو اپنی جان کی سلامتی سے زیادہ ہوا اور جگہ جگہ اپنے اس رنج والم کا بہت ہی دردناک الفاظ میں ذکر کرتے ہیں[196]۔

انھوں نے ''اپنے مربی کی شہادت پر دونہایت ہی دردانگیز اور الم ناک مرثیے لکھے''[197]۔ ان کا لکھا ہوا مرثیہ جب دلّی پہنچا تو مہینوں تک لوگ گھر گھر ان مرثیوں کے اشعار پڑھتے رہے اور اپنے مقتول عزیزوں پر نوحہ کرتے رہے[198]۔ اس مرثیے کے چند اشعار درج کیے جاتے ہیں تا کہ غم کی اس شدت کو محسوس کیا جا سکے۔

واقعہ است ایں یا بلا از آسماں آمد پدید آفت است ایں یا قیامت در جہاں آمد پدید

راہ در بنیادِ عالم داد سیلِ فتنہ زا رخنۂ کامسال در ہندوستاں آمد پدید

مجلسِ یاراں پریشاں شد چو برگِ گل زباد برگ ریزی گوئی اندر بوستاں آمد پدید

بسکہ آبِ چشم خلق شد رواں در چار سو پنج آبے دیگر اندر مولتاں آمد پدید

جمع شد سیارہ درد چشم مگر طوفاں شود چوں برجِ آبی انجم را قراں آمد پدید

تاچہ ساعت بُد کہ شاہ از مولتاں لشکر کشید تیغ کافر کش بر اے کشتنِ کافر کشید

چوں خبر کر دندش از دشمن بداں قوت کہ داشت بے محابا چشم در سر کرد ورایت بر کشید

آنچناں رنگیں کنم امسال خاک از خونِ شاہ کز زمیں باید مشفق را گونۂ احمر کشید

او دریں تدبیر و آگہ نے کہ تدبیرِ فلک صفحۂ تدبیر را خطِ مشیت در کشید

تاچہ ساعت بد کہ کافر بر سر لشکر کشید میگذیستد جوق جوق از آب و ناگہ در کشید[199]

خسرو کا مرثیہ گیارہ بندوں کے ترجیع بند کی صورت میں ہے۔ جو اپنی اثر انگیزی کے لحاظ سے دنیا کے کسی بھی مرثیے کے مقابل رکھا جا سکتا ہے[200]۔ یہ تمام کے تمام بند اور مزید کچھ اشعار کو ملا عبدالقادر نے منتخب التواریخ میں بھی درج کیا ہے[201]۔ مرثیے کا اثر اتنا گہرا تھا کہ دہلی کے شاہی محل سے لے کر کوچہ و بازار تک پر اس مرثیے کی وجہ سے ایک عجیب سی سوگواری چھائی ہوئی تھی۔ مرثیے میں انھوں نے شہزادے کی ملتان سے روانگی، میدان جنگ میں اس کی اور اس کے ساتھیوں کی دلیری اور جاں بازی، مغلوں کی پسپائی اور ہندوستانی فوج کی نماز ظہر کی ادائیگی، مغلوں کا غیر متوقع حملہ اور شہزادے کی شہادت اور آخر میں ملتان کے رنج و غم کی تصویر کو موثر پیرائے میں پیش کیا ہے[202]۔

برنی نے بھی تاریخ فیروز شاہی میں اس مرثیے کا ایک شعر نقل کیا ہے۔ شعر ملاحظہ کیجیے:

روز چوں باقی نہ بود آں آفتابِ ملک را　　　روز چیزے بود کانِ آفتاب افتادہ شد[۲۰۳]

خسرو نے ایک اور مرثیے میں بھی ان واقعات پر روشنی ڈالی ہے۔اس کا مطلع ہے:

اے دل بہ غم نشیں کہ ز شادی نشاں نماند　　　اے دیدہ خوں گری کہ طرب دو جہاں نماند[۲۰۴]

اس واقعے کے بعد خسرو کیوں کہ دو برس تک سیاسی ہنگاموں سے دور اپنی والدہ اور عزیزوں کے ساتھ پٹیالی میں رہے[۲۰۵] غالباً اسی وجہ سے دو برس قید کا قصہ زبان زدِ عام ہوا۔ظاہر سی بات ہے اس جنگ میں مسلمانوں کو ذلت آمیز شکست اور بڑی ہزیمت اٹھانی پڑی۔اس جانب اشارہ کرتے ہوئے خسرو کا بیان ہے کہ:

ہمیں بد ان کہ زا مسال در حدِ ملتان　　　شکستہ میمنۂ مومن از صفِ کفار[۲۰۶]

اپنی رباعیوں میں بھی خسرو نے اس سانحے کو پیش کرتے ہوئے شدید رنج والم کا اظہار کیا ہے[۲۰۷]۔مثلاً:

در جنگ مغل کہ تیر کین شد پرتاب　　　ہم تاب روی رفت و ہم روی زتاب

زاں کشتہ و خستہ کاندر آب افتادند　　　آں آب ہمہ خون شد و آن خون ہمہ آب

جمعی ہمہ گردن بر سن کردہ گرو　　　بودند چو خون کُشتگان اندر رو

ہم خار ہمی گرفت دامن کہ مپری　　　ہم آبلہ می فتاد در پا کہ مرو[۲۰۸]

ہندوستان کی تاریخ میں بڑی بڑی لڑائیاں ہوئیں۔بڑے بڑے سورما مارے گئے۔آب لاہور کے قریب لڑی جانے والی اس لڑائی اور اس کے ہیرو شہزادہ سلطان کی شہادت کی بازگشت آج بھی سنائی دیتی ہے[۲۰۹]۔تاریخ کا یہ کتنا بڑا المیہ ہے کہ ایک ایسا شخص جس کی شہرت برصغیر سے نکل کر ایران، افغانستان اور وسط ایشیائی ریاستوں سے ہوتی ہوئی یورپ تک پہنچی، اس کے ساتھ تاریخ نے کیسا بے رحمانہ سلوک روا رکھا۔خسرو اور دیگر ہم عصر شعرا کی شاعری میں جو سوز و گداز دکھائی دیتا ہے وہ دراصل معاشرے کے انھیں رویوں کی دین ہے۔ان سانحات اور المیوں کو پڑھ کر نہ صرف ہمیں ان کی زندگی پر رحم آتا ہے بلکہ وہ لوگ خود بھی اپنی زندگی پر رحم کھاتے ہوئے یہ کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ:

ماجرا اے دوست پرسیدی کہ چوں بگذشت حال　　　اے سرت گردم چہ میپرسی بدشواری گذشت[۲۱۰]

خسرو کو ''ملتان کی بربادی کی یاد رہ رہ کر ستاتی''[۲۱۱]۔ظاہر سی بات ہے اس جنگ میں مسلمانوں کو ذلت آمیز شکست ہوئی۔انھیں بڑی ہزیمت اٹھانی پڑی۔برنی بھی اس شکست کی تائید کرتا ہے[۲۱۲]۔لیکن خسرو نے اپنے مرثیے میں جوش اور آہنگ پیدا کرنے کے لیے کہیں کہیں مبالغے سے کام لیا ہے۔مغلوں کے اس حملے کو خسرو آسمانی بلا اور قیامت سیل فتنہ قرار دینے کے باوجود ہندوستانی فوج جس بہادری اور پامردی سے لڑی اس کا مبالغہ آمیز نقشہ کھینچتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:

برزمیں از خوں شدہ دریا پدید　　　روشنی گشتہ ز عالم نا پدید

از مغل ہر سو فغاں برداستہ　　　است خیزی از جہاں بر حاستہ[۲۱۳]

یعنی ان خنجروں نے بہادروں کے ناف چیر ڈالے، ان کے گرزوں کے پہلوانوں کو پسپا کیا، وہ شیروں کی طرح ہر طرف بڑھے، زمین سے خون کا دریا ابلنے لگا، دنیا سے روشنی جاتی رہی اور مغلوں کی طرف سے آہ و زاری بلند ہونے لگی اور قیامت کا سماں بندھ

گیا[۲۱۴]۔ لیکن انجام کار ہندوستانی فوج ان چنگیز خانیوں کے سامنے پسپا ہوگئی۔ اس پسپائی پر خسرو خود بھی خون کے آنسو روئے اور جس طرح ہندوستان کے لوگ روئے ان کی بھی پوری تصویر کھینچ کر رکھ دی۔ اس طویل مرثیے میں انھوں نے لکھا کہ:

آسماں یا با ہزاراں دیدہ بر اہلِ زمیں　　ہمچو یا رانِ بہاری بر گیا بگر یستند

خلق ملتاں مرد و زن گریہ کناں و موکناں　　کو بکوی دسو بسوی و جا بجا بگر یستند[۲۱۵]

خسرو کے کلام میں ان واقعات کو پڑھ کر ہم تاریخ کے اس دور میں ہونے والے اس اہم سانحے کے ایک ایک پہلو سے پردا اٹھا سکتے ہیں۔ وہ اپنے کلام کی روشنی میں ایک شاعر ہی نہیں بلکہ ایک مورخ کا فریضہ بھی انجام دیتے نظر آتے ہیں۔ اسیری اور رہائی کے دوران کی جانے والی حکمت عملی کو دیکھتے ہوئے پروفیسر محمد حبیب کی یہ بات درست معلوم ہوتی ہے کہ وہ بلبن دور حکومت میں شہزادہ محمد شہید کے صرف ندیم ہی نہ تھے بلکہ ایک فوجی افسر بھی تھے[۲۱۶]۔

اس واقعے کے بعد ساری زندگی خسرو کو مغلوں سے نفرت رہی۔ بعد میں بھی مغلوں نے ہندوستان پر کئی حملے کیے اور قتل و غارت گری کا بازار گرم رہا۔ علاء الدین خلجی کے عہد میں اس فتنے کے سد باب کے لیے سنجیدہ کوشش کی گئی۔ اس کے عہد میں پہلا حملہ ۶۹۷ھ میں کدر نامی ایک مغل سردار نے لیا جس نے ستلج اور جہلم کو پار کر کے قصور اور جالندھر کے علاقوں میں خوب لوٹ مار مچائی لیکن انوع خاں نے مغلوں کو شکست دے کر بھگایا۔ اس کے بعد ۶۹۸ھ میں ایک اور مغل سردار قتلغ خواجہ نے ہندوستان کا رخ کیا اور دہلی کے قریب تک آ پہنچا جس کے بارے میں خسرو اپنی مثنوی ''عشقیہ'' میں کہتے ہیں کہ:

ازاں پس بود قتلغ خواجہ گستاخ　　قوی تر شجرۂ معلونہ را شاخ

بحدِ کیلی آمد کافراں سال　　شہ آن جرأت مبارک دید در فال[۲۱۷]

یہ بادشاہ، مغلوں کے مقابلے کے لیے نکلا۔ تیسرا حملہ توغی کی قیادت میں مغلوں نے کیا اور دہلی کو تقریباً محصور کر لیا۔ یہ حملہ ۷۰۵ھ میں ہوا۔ اس بار ملک کافور نے مغلوں کو شکست فاش دی۔ علی بیگ اور قوتاق نامی مغل سپہ سالار قید کر کے دہلی لائے گئے[۲۱۸]۔ فرشتہ کے مطابق انھیں ہاتھیوں سے کچلوا کر قتل کیا گیا اور اس کے ساتھیوں کو تلوار سے کاٹ کر ان اعضا سے مینار بنائے گئے۔ تھوڑے عرصے بعد کبک خاں نامی مغل سردار نے حملہ کیا اور ناگور تک پہنچ گیا۔ اس مرتبہ بھی ملک کانور نے مقابلہ کیا اور کبک خاں کو گرفتار کر کے دہلی لے آیا۔ پانچواں حملہ دو مغل سرداروں کی سرکردگی میں ہوا۔ ملک کانور اور ملک غازی (تغلق) نے سخت ہزیمت کے بعد انھیں بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ اس بار بھی سیکڑوں مغل قید ہوئے اور انھیں دہلی لا کر ہاتھیوں سے روندا گیا اور قلعے کی دیواروں پر لٹکایا گیا[۲۱۹]۔ ان واقعات پر خسرو خوشی کا اظہار کرتے ہوئے بیان کرتے ہیں کہ:

چو زنگیاں نگو نسار از عمارت نو　　شد از حصار تتاری و چینی آویزاں[۲۲۰]

اس کے بعد علاء الدین کے عہد تک مغلوں کی پھر کبھی ہمت نہیں ہوئی کہ وہ ہندوستان کا رخ کریں[۲۲۱]۔ لطف کی بات یہ ہے کہ ان تمام حادثات و سانحات اور تاریخی واقعات کو ہم امیر خسرو کے کلام میں تلاش کر سکتے ہیں۔ ڈاکٹر نذیر احمد کا یہ کہنا درست معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے ''فارسی شاعری کو تاریخی عناصر سے روشناس کر کے اس کا دامن بہت وسیع کر دیا''[۲۲۲]۔ ''قرآن السعدین''، ''مفتاح الفتوح''، ''خضر خاں دول رانی''، ''نہ سپہر'' اور ''تغلق نامہ'' وغیرہ تاریخی لحاظ سے نہایت اہم ماخذ سمجھے جاتے ہیں۔ ان مثنویوں میں

موجود اکثر واقعات میں خسرو خود شریک تھے۔ ایک طرح سے یہ نظمیں چشم دید گواہ کا بیان ہونے کے سبب زیادہ قابل اعتماد حوالہ سمجھی جاتی ہیں[۲۲۳]۔ ان کے بعض اہم مرثیوں میں بھی رنج والم کی خاص فضا نظر آتی ہے۔ ملک محمود خانخانا می خلف جلال الدین خلجی اور اپنے بیٹے محمد وغیرہ پر لکھے گئے مرثیے بھی اس حوالے سے کافی اہمیت کے حامل ہیں[۲۲۴]۔ ''تغلق نامہ'' بھی اس عہد کی مفصل تاریخ ہے[۲۲۵] جس میں بے شمار ایسے سانحات ہیں جس پر خسرو نے اشعار کہے۔ ''اگر ان تمام اشعار جمع کر دیے جائیں تو ان کی وطنی محبت کی اور بھی زیادہ صحیح تصویر سامنے آجائے''[۲۲۶]۔ لیکن اختصار کے باعث یہاں مزید وضاحت کی گنجائش نہیں۔

> امیر خسرو وہ پہلے اہم شاعر نظر آتے ہیں جنھوں نے کئی مثنویات جنگ سے متعلق لکھی ہیں۔ ان مثنویات کو شاعرانہ محاسن کے علاوہ تاریخی ماخذ کے طور پر قبول کیا گیا ہے۔ چنانچہ ایلیٹ اینڈ ڈاؤسن نے اپنی اہم تاریخ 'History of India As Told by Its Own Historians' میں امیر خسرو کو بطور مؤرّخ شامل کیا ہے[۲۲۷]۔

وہ اگرچہ ہندی نژاد تھے لیکن ایرانی شعرا کو بھی ان کی زبان دانی کا اعتراف کرنا پڑا۔ مولانا جامی ''بہارستان'' میں رقم طراز ہیں کہ ''خمسہ نظامی'' کا جواب خسرو سے بہتر کسی نے نہیں لکھا۔ خود ایرانی بھی امیر خسرو کو طوطی ہند کے خطاب سے یاد کرتے تھے[۲۲۸]۔ شبلی نے اس بات کی تائید میں عرفی اور خواجہ حافظ کے اشعار نقل کیے ہیں۔

بروح خسرو ازیں پارسی شکر دادم　　　　که کام طوطیِ هندوستاں شود شیریں[۲۲۹] عرفیؔ

شکر شکن شوند همه طوطیانِ هند　　　　زیں قند پارسی که به بنگاله می رود[۲۳۰] حافظؔ

آذریؔ نے جواہر الاسرار میں لکھا کہ شیخ سعدی شیرازی بھی خسرو سے ملنے شیراز سے دہلی آئے لیکن بعض تذکرہ نویسوں نے صراحتاً اس واقعے سے انکار کیا ہے[۲۳۱]۔ اس بات میں کچھ شبہ نہیں کہ خسرو کے عہد سے لے کر آج تک ہندوستان کے طول وعرض سے لے کر ایران، افغانستان اور وسط ایشیائی ریاستوں میں خسرو پر سیکڑوں مقالات تحریر کیے گئے۔ لہٰذا ہمیں بھی اس بات پر فخر ہونا چاہیے کہ اپنے اشعار میں ''خون رونے اور خون رلانے والے امیر خسروؔ''[۲۳۲] وہ پہلے ہندوستانی شاعر ہیں جنھوں نے ''ہندوستان کی خاک کو اپنی آنکھوں کا سرمہ بنایا،.... ان کا دل ہندوستان کی مٹی سے بنا تھا۔ انھوں نے فارسی اور بھاشا کی آمیزش سے ہندوستان میں مسلمانوں کے عہد میں ایک نئی زبان اور نیا تمدنی ذوق پیدا کرنے کی کوشش کی اور سب سے پہلے اس ملی جلی زبان میں شاعری کی بنیاد رکھی''[۲۳۳]۔ افسوس کہ ان کا پورا ہندوی کلام آج تک دست یاب نہ ہو سکا ورنہ اس دور کے نہ جانے اور کتنے سیاہ باب عیاں ہو جاتے اور گریہ و بکا کے کتنے باب کھل جاتے۔ وہی گریہ و بکا جس کے بارے میں خود خسرو نے کہا کہ:

سرودِ ذوق فراواں شنیده ای اکنوں　　　　بیاز خسرو ذوق فغاں و زاری پرس[۲۳۴]

اور جس کی جانب حنیف نجمی نے شیخ محدث دہلوی کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا کہ ایک روز حضرت نظام الدین اولیا نے خسرو سے پوچھا ''اے ترک تمھاری مشغولیات کا کیا حال ہے'' خسرو نے عرض کیا ''سیدی! رات کے آخری حصے میں اکثر و بیشتر آہ و بکا اور گریہ وزاری کا غلبہ رہتا ہے''[۲۳۵]۔

یہ فطری امر ہے کہ اس دور آشوب میں جب کہ روز نئی سازشیں ہو رہی ہوں اور سیاسی کش مکش نے انسانی سکون اور اطمینان

برباد کر دیا ہو، ایک حساس دل شاعر کیوں کر ان حالات سے پیچھا چھڑا سکتا ہے۔ اسی لیے خسرو کے اشعار کو پڑھ کر ''ایسا محسوس ہوتا ہے کہ دھواں اٹھ رہا ہے، معلوم ہوتا ہے رو رہے ہیں، روتے روتے ٹھہر جاتے ہیں اور جب رو لیتے ہیں تو آگے بڑھ جاتے ہیں، ان کی طبیعت میں یہ سوز و گداز، یہ درد آگنی ان صوفیانہ کیفیات سے پیدا ہوئیں جو ان کو فطری طور پر حاصل تھیں''[۲۳۶]۔ اور جس کو حضرت نظام الدین اولیاء کی صحبت خاص سے مزید جلا ملی۔ سلطان الاؤلیاء حضرت نظام الدین محبوب الٰہی سے ان کی وابستگی اور عقیدت، ان کے مذہبی جذبات اور سوزِ قلب کی آئینہ دار ہے۔ اس سیاسی افراط و تفریط کے ماحول میں روح کے سکون اور اطمینان قلب کے لیے خسرو نے ایک ابدی پناہ گاہ تلاش کر لی تھی۔ انھوں نے اپنے تمام کمالات کو اپنے مرشد برحق کی خدمت اور رضا کے لیے وقف کر دیا تھا۔ ایسی واضح شہادتیں موجود ہیں کہ انھوں نے اپنے مرشد کے خاطر دربار میں بھی حق گوئی کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا اور شاہ مبارک سے صاف صاف کہہ دیا کہ ''میری جان حاضر ہے۔ آپ نہایت آسانی سے میرا سر قلم کر سکتے ہیں لیکن محبوب الٰہی کی بارگاہ میں شرمندگی قبول نہیں''[۲۳۷]۔ اس حوالے سے بھی ان کے فارسی کلام سے متعدد مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں لیکن خسرو کے مضمون کا اختتام اس عظیم دوہے پر ہی مناسب معلوم ہوتا ہے جسے اپنی تمام تعصّبات کو بھلا کر ہندی اور اردو دونوں ادب سدا اپناتے رہے ہیں۔ یہ دوہا اردو کے ابتدائی زمانے کا عظیم شاہ کار سمجھا جاتا ہے۔ یوں تو ان کے بیش تر ہندوی کلام کو ۱۹۱۸ء میں ''جواہر خسروی'' کے نام سے مولانا امین چڑیا کوٹی اور مولانا سید احمد سالم نے مرتب کیا اور جس پر چڑیا کوٹی نے عالمانہ مقدمہ بھی لکھا[۲۳۸]۔ اگر چہ حافظ محمود شیرانی نے جواہر خسروی میں شامل امیر خسرو سے منسوب ''خالق باری'' اور دیگر بہت سے اشعار کو امیر خسرو کے اشعار ماننے سے انکار کیا[۲۳۹] لیکن اس دوہے کے بارے میں متن کے اختلاف سے قطع نظر، کسی قسم کے شکوک و شبہات کا اظہار نہیں کیا گیا۔ یہ دوہا محبوب الٰہی کی وفات سے متعلق ہوتے ہوئے بھی اردو کی ادبی تاریخ میں ہمیشہ کے لیے امر رہے گا۔ مرشد کی قبر پر پہنچ کر خسرو کا یہ دوہا کہنا، ترک دنیا کر کے وہیں ڈیرے ڈال دینا اور کچھ ماہ بعد اس دنیا سے رخصت ہو جانا، موضوع جس قدر عالم گیر نوعیت کا ہو گیا ہے خسرو کا اظہار بھی اتنا ہی انفرادی ہو گیا ہے[۲۴۰]۔

وصال کے خاص متصوفانہ پس منظر میں خسرو نے ایسا کمال کر دکھایا ہے کہ اس دوہے کو ہمیشہ زندہ ادب میں شمار کیا جائے گا۔ خصوصاً اپنے مرشد کے انتقال جیسے بڑے سانحے کو پیش کرتے ہوئے بھی خسرو کا شعر کی فضا کو سوگوار نہ ہونے دینا، فن کمال کی معراج نہیں تو اور کیا ہے۔ خسرو کا ایک فارسی شعر بھی اسی طرح کا اظہار لیے ہوئے ہے ملاحظہ کیجیے:

ایں مکانیست کہ منزل گہہ جاناں بودہ است — سرو؟ راہِ آمدہ شدِ ایں سروِ؟ خراماں بودہ است[۲۴۱]

لیکن اس ہندوی دوہے جیسی دوسری نظیر غالباً پوری اردو شاعری کی تاریخ میں نہ مل سکے۔

گوری سووے سیج پر مُکھ پر ڈارے کیس
چل خسرو گھر اپنے سانجھ بھئی چھو ندیس[۲۴۲]

غرض کے ان کا کلام اپنی مقبولیت کی وجہ سے سینہ بہ سینہ منتقل ہوتا رہا اور ان سات صدیوں میں یہ کلام ہماری لوک روایت کا حصہ بن گیا۔ لاکھوں کروڑوں زبانوں پر چڑھنے سے اس میں تبدیلیاں اور تحریف ضرور ہوئی ہوگی[۲۴۳]۔ انھوں نے ہندوی کلام میں جو زبان استعمال کی ہے وہ اس زمانے کی ادبی زبان بھی نہیں۔ ظاہر سی بات ہے کہ فارسی کی پیروی میں یہ ممکن بھی نہ تھا لیکن یہ ضرور ہے کہ اس قسم کی پہلی کوشش خسرو نے ہی کی کہ شاعری عوام کی زبان میں کی جائے۔ اس عہد میں خسرو کا کوئی مقلد نہیں تھا۔ ان کی پہیلیاں، دو

سخنے اور گیت ان کی زندگی کے ساتھ ہی ختم ہو گئے لیکن اس سے ان کے رتبے میں کوئی فرق نہیں آتا۔ انھوں نے اپنی شاعری سے یہ ضرور ثابت کر دیا کہ کھڑی بولی میں بھی شاعری کی جا سکتی ہے[۲۴۴]۔ خسرو کے انھیں کمالات کا اعتراف کرتے ہوئے ڈاکٹر جمیل جالبی درست کہا کہ:

> اردو زبان و ادب کے وہ شاعر اوّل جن کی مٹھاس آج بھی زبان میں شہد گھول رہی ہے۔ امیر خسرو دو تہذیبوں کے امتزاج کے وہ گل نورس ہیں جو ابھرتی پھیلتی تہذیبوں کے ایسے ہی موڑ پر ظہور میں آتے ہیں اور خود تہذیب کی علامت بن جاتے ہیں۔ امیر خسرو ''ہند مسلم ثقافت'' کی وہ روز ندہ علامت ہیں کہ رہتی دنیا تک وہ اس تہذیب کے اوّلین نمائندے کی حیثیت سے یادگار رہیں گے[۲۴۵]۔

خسرو کے کلام کا جائزے کے بعد اس بات میں کوئی شبہ کی گنجائش نہیں کہ ان کا کلام نہ صرف شاعری کے بلند ترین معیارات پر کھرا اترتا ہے بلکہ اس عہد کی سیاسی اور سماجی اور معاشی صورت حال کے بے شمار شواہد ان کی شاعری میں تلاش کیے جا سکتے ہیں۔ خسرو کے بارے میں ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ:

> دنیائے شاعری میں بہت کم شاعر ایسے ملیں گے جو تعداد اشعار اور گونا گوں اصناف سخن میں یکساں کمال رکھنے کے اعتبار سے خسرو کے ہم پلہ ہوں۔ پھر ان کے ہاں محض تعداد اشعار اور گونا گوئی اصناف ہی نہیں بلکہ ان کا کلام دنیا کے کسی بڑے سے بڑے شاعر کے مقابلے میں رکھا جا سکتا ہے۔ ان کے ہاں فن کی تمام خوبیاں اوج کمال پر ملتی ہیں۔ شاعری میں جس قدر نئی باتیں ان کے ہاں پائی جاتی ہیں اس کی مثال ملنا مشکل ہے[۲۴۶]۔

یہی وجہ ہے کہ خسرو آج بھی ادبی تاریخ میں زندہ ہیں اور فارسی ادبیات میں تو ان کا نام سعدی اور حافظ جیسے شعرا کے ساتھ لیا جاتا رہے گا۔

اس دور میں منگول بہت بڑا خطرہ بن چکے تھے۔ دہلی کے باشندوں کو تو اس خطرے کا احساس اس وقت ہو چکا تھا جب ۱۲۴۰ء میں منگول فوج نے لاہور کا محاصرہ کیا تھا۔ اس فوج کا سپہ سالار طائر بہادر تھا جو ہرات، غزنی اور افغانستان کا کمانڈر تھا۔ شہر پر قبضے کے دوران منگولوں کو جس طرح کی مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا تھا، اس کی روداد تو مختلف تواریخ میں درج ہے مختصراً یہ کہ اس معرکے میں منگول سردار طائر خان سمیت تقریباً چالیس ہزار منگول قتل ہوئے۔ بدلے میں منگولوں نے بھی قتل و غارت گری کی انتہا کی۔ انھوں نے لاہور کے تمام باشندوں کو یا تو چن چن کر قتل کیا یا پھر غلام بنا لیا۔ اس دور میں لاہور شہر ایسا برباد کیا گیا کہ کافی عرصے تک اس کی رونق بحال نہ ہو سکی۔ بعد میں لاہور پر دوبارہ دہلی کی حکمرانی قائم ہوئی لیکن بیس برس تک یہ شہر ایک اجاڑ کا نقشہ پیش کرتا رہا۔ بعد میں بھی منگولوں اور کھوکھروں جو کہ منگولوں ہی کے ساتھی تھے، نے لاہور پر حملے جاری رکھے[۲۴۷]۔ ان حملوں میں ہزاروں لوگوں کی جانیں ضائع ہوئیں۔ ان واقعات کو بھی اس دور کے فارسی شعرا نے موضوع بنایا۔ ظاہر سی بات ہے کہ ابھی اردو زبان میں اظہار کی وہ طاقت پیدا نہیں ہوئی تھی کہ ان واقعات کو شاعرانہ رنگ میں ڈھال سکے۔

سیدی مولا کے قتل کا سانحہ:

اس دور کے سانحات میں ایک اہم سانحہ سیدی مولہ کا قتل ہے۔ عصامی نے اس بابت لکھا کہ:

دراں وقت آں مرد را خاص و عام — بخواند ند سیدی مولہ بہ نام[۲۴۸]

سلطان جلال الدین خلجی کے عہد میں سیدی مولہ کو ہاتھی کے پاؤں تلے کچلا گیا[۲۴۹]۔ ''قدرت کی ستم ظریفی ہے کہ ایسا بادشاہ جو چیونٹی کو بھی پاؤں تلے روندنا پسند نہ کرتا تھا... ایک فقیر کی ظالمانہ موت کا باعث ہوا''[۲۵۰]۔ اس قتل کے بعد جلال الدین خلجی کی حکومت میں فتور آنا شروع ہو گیا۔ فرشتہ نے سیدی مولہ کے اس واقعے کی تفصیل بیان کرتے ہوئے لکھا کہ جب سیدی مولہ کے جسم پر استرے اور سوئے سے زخم لگائے جا رہے تھے تو انھوں نے بادشاہ جلال الدین کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ ''مجھے اپنے مرنے کا غم نہیں ہے لیکن یاد رکھو میرا خون رنگ لائے گا اور اس کا وبال تم پر اور تمھاری اولاد پر پڑ کر رہے گا''[۲۵۱]۔ برنی جو اس واقعے کے چشم دید گواہ تھے، لکھتے ہیں کہ:

> مجھے یعنی اس کتاب کے مؤلف کو یاد ہے کہ سیدی کے قتل کے روز ایسی کالی آندھی آئی کہ آسمان سیاہ ہو گیا
> ... اس سال جب سیدی مولہ کا قتل ہوا، خشک سالی بھی واقع ہوئی۔ دہلی میں قحط پڑا اور غلّہ ایک چیتل فی
> سیر فروخت ہونے لگا۔ سوالک کے علاقے میں ایک قطرہ بھی بارش کا نہیں گرا۔ چناں چہ وہاں کے ہندو
> اپنے بال بچوں کو لے کر دہلی آ جاتے اور بیس بیس تیس تیس افراد مل کر فاقہ کشی کی وجہ سے خود کو دریائے جمنا
> میں گرا دیتے اور ڈوب جاتے[۲۵۲]۔

ہزاروں مسلمان بھی قحط سے بے حال ہو کر مر گئے[۲۵۳]۔ ان واقعات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے عصامی کہتا ہے کہ:

چنیں گفت دھقانِ ہندوستاں — کہ گفتند مرغانِ ایں بوستاں
بہ عہدِ جلالی چواز حد گزشت — یکے قحط مہلک پدیدار گشت
دگرگو نہ پیرانِ ہندی نژاد — بدیں سال ازیں قصہ دادند یاد
کہ تا گشت پیر مَولّہ ہلاک — بہ بہتاں نشاند خوش بہ خاک
نسیفتاد یک قطرہ آبے دو سال — جہاں گشتِ عاجز ز تنگیِ حال
چناں گشت خرشیدِ تاباں بہ زور — کہ شد خشک ہر ہفت دریائے شود
بہ روئے زمیں دانہ نایاب شد — جہاں جملہ از فاقہ سیراب شد
ھمی غرق کشتند در آبِ جون — فسادے چنیں گشت پیدا بہ گون[۲۵۴]

بعد میں علما اور فقرا نے خوب دعائیں کیں اور نماز استسقا کرائی گئی تا کہ سلطنت دہلی اس مصیبت اور بلائے ناگہانی سے نجات حاصل کر سکے[۲۵۵]۔ اس سانحے کو بھی اس عہد کے فارسی شعرا نے تو موضوع سخن بنایا لیکن اس وقت تک اردو شاعری گھٹنوں کے بل چل رہی تھی۔ لہٰذا یہ ممکن نہ تھا کہ یہ نئی زبان ان سانحات کے اظہار پر قدرت حاصل کر سکے۔

غیاث الدین تغلق کی ناگہانی موت:

غیاث الدین تغلق کو حکومت کرنے کے لیے بہت کم عرصہ ملا لیکن اس دوران اس نے خلجی کی طرح زراعتی اصلاحات کی طرف

توجہ دی۔ زراعت کو ترقی دینے کے لیے آب پاشی کا نظام بہتر کیا۔ ضبط شدہ جاگیریں واپس کیں۔ لوٹی اور بانٹی ہوئی دولت واپس لی۔ ورنگل، جارج نگر، بنگال اور ترہٹ وغیرہ کی مہمات کو سر کر کے کامیاب لوٹا۔ ان فتوحات کے بعد اس کی واپسی پر نائب السلطنت الغ خان نے بنگال میں شان دار جشن کا اہتمام کیا۔ دہلی (تغلق آباد) سے چار کوس کے فاصلے پر افغان پورہ میں ایک محل (کوشک) تعمیر کروایا تاکہ سلطان یہیں دربار کر سکے۔ یہ محل جس کا ستون چوبی کا تھا، بڑی عجلت میں تیار کروایا گیا تھا اور کچھ زیادہ مستحکم نہ تھا۔ سلطان تغلق یہیں ٹھہرا۔ دہلی کے امرا، مشائخ اور علما یہیں سلطان کی خدمت میں حاضر ہوتے اور یہیں سے بنگال سے آئے ہوئے مالِ غنیمت کی نمائش ہوتی۔ نمائش کے دوران ہی سلطان کے حکم سے کچھ دیوہیکل ہاتھیوں کو اس کے سامنے سے گزارا گیا۔ ہاتھیوں کے پاؤں کی دھمک سے محل ایک دھماکے سے زمین بوس ہوا اور بادشاہ سمیت کئی لوگ ملبے تلے دب کر ہلاک ہو گئے [۲۵۶]۔ بقول یحییٰ سرہندی یہ واقعہ ۷۲۵ھ مطابق ۱۳۲۵ء کے ماہ ربیع الاول میں پیش آیا [۲۵۷]۔ غیاث الدین تغلق کی ناگہانی موت کو بھی بڑے سانحات میں شمار کیا جانا چاہیے۔ حیرت انگیز طور پر یہ سانحہ آج تک اختلافی مسئلہ بنا ہوا ہے۔ ابن بطوطہ کا کہنا ہے کہ الغ خان نے جان بوجھ کر ایسا محل تعمیر کروایا جو معمولی دھماکے سے گر جائے اور بادشاہ اس میں دب کر ہلاک ہو جائے۔ حالاں کہ ابن بطوطہ خود اس واقعے کے نو برس بعد برعظیم آیا۔ لہٰذا وہ اس واقعے کا عینی شاہد نہیں تھا [۲۵۸]۔ معاصر مورخین میں امیر خسرو نے ''تغلق نامہ'' میں [۲۵۹] اور برنی نے ''تاریخ فیروز شاہی'' میں محل کے انہدام کو آسمانی حادثہ قرار دیا ہے [۲۶۰]۔ بعد کے مورخین یحییٰ سرہندی [۲۶۱] اور نظام الدین بخشی نے بھی اس واقعے کو محض حادثہ قرار دیا ہے [۲۶۲]۔ البتہ عصامی نے ابن بطوطہ کی پیروی میں محمد بن تغلق پر پدر کشی کا الزام لگایا۔ ابن بطوطہ اور بعد میں عصامی کے الزام کی وجہ بہ ظاہر ذاتی عناد لگتا ہے۔ ابن بطوطہ سلطان محمد بن تغلق سے ذاتی پرخاش اور عداوت رکھتا تھا کیوں کہ اسے قیام دہلی کے آخری برسوں میں باغیوں سے رسم وراہ اور تعلق رکھنے کے شبہے میں قید بھی کیا گیا تھا۔ رہائی کے بعد بھی وہ مصر کے باغی حکمراں سلطان احسن شاہ کیتھلی کے فروکش ہو گیا۔ بعد میں بھی وہ جنوبی ہند اور مل جاوا (مالدیپ) وغیرہ میں مقیم رہا اور دہلی واپس نہ آیا۔ اپنی تصنیف ''الرحلہ'' میں وہ دہلی واپس نہ آنے کی وجہ سے سلطان تغلق کے خوف اور سزا کو بتاتا ہے۔ اس کے ''راوی'' شیخ رکن الدین ملتانی بھی ذاتی رنجش اور اپنے شیخ ہود کے قتل کی وجہ سے بھی سلطان تغلق سے سخت خفا تھے [۲۶۳]۔ لہٰذا ابن بطوطہ کے بیان کو جانب دارانہ سمجھنا چاہیے کیوں کہ وہ سلطان کو اپنا بدترین دشمن سمجھتا تھا۔ جہاں تک عصامی کا تعلق ہے، اسے اپنے دادا اعز الدین کے ہم راہ جبراً ''دولت آباد'' بھیجا گیا تھا اس لیے وہ بھی سلطان کا بدترین مخالف ہو چکا تھا۔ اس حادثے کی تفصیل درج کرنے کے بعد شہزادہ محمد بن تغلق کو اس کا ذمے دار ٹھہراتے ہوئے کہا ہے کہ:

ازاں حادثہ خلق خود را جہاں — سرِ شاہ در زیرِ شہنیسر ماند

کہ شہزادۂ ظالم و حیلہ ساز — ملک زادہ را کرد بررہ بہ رار

بہ ظاہر یکے ماتمے ساز کرد — بہ باطن یکے عشرت آغاز کرد [۲۶۴]

ابن بطوطہ، شیخ رکن الدین اور عصامی کے بیانات جانب دارانہ اور سچائی سے دور ہیں گو کہ بعد کے مورخین میں سے نظام الدین احمد نے طبقات اکبری میں [۲۶۵] اور بدایونی نے ''منتخب التواریخ'' میں سلطان کو مطعون کیا [۲۶۶] لیکن یہ سب کچھ ذاتی پرخار اور عداوت کے باعث ہوا۔ اس کا ثبوت برنی کی تاریخ ''فیروز شاہی'' ہے۔ برنی کو سلطان سے کسی قسم کی عقیدت نہیں تھی بلکہ اس نے تو سلطان کے مظالم و مصائب کو بڑے اہتمام اور تفصیل سے اپنی تاریخ میں پیش کیا ہے اور بعض اقدامات پر سخت تنقید بھی کی ہے [۲۶۷]۔ اس

کے باوجود اس نے کہیں بھی شہزادہ محمد کو اس موت کا ذمے دار نہیں ٹھہرایا۔ اسی طرح عہد علائی اور عہد تغلق کے مشہور امیر عین الملک ملتانی جو سلطان محمد بن تغلق سے سخت ناراض تھا اور اس کے خلاف ایک ناکام بغاوت بھی کر چکا تھا، اس نے بھی اپنی تصنیف ''انشائے ماہ رو'' میں اس جانب بالکل اشارہ نہیں کیا[۲۶۸]۔ اسی طرح تاریخ فیروز شاہی کے مولف شمس سراج عفیف نے بھی سلطان محمد پر پدرکشی کا الزام نہیں لگایا[۲۶۹]۔ ان تمام حقائق کی موجودگی میں بھی ''منتخب التواریخ'' کے مترجم محمود احمد فاروقی کا شیخ رکن الدین ملتانی اور ابن بطوطہ کی رائے کو سب سے ''زیادہ وزنی''[۲۷۰] قرار دینا حیرت انگیز بات ہے۔ عصامی کی جانب داری اور عداوت کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ ہجرت کے دوران سفر کی صعوبتوں سے جب اس کے بزرگوں نے جان ہاری اور علاء الدین بہمن شاہ کی بغاوت کے بعد جب دکن میں نئی سلطنت کی داغ بیل ڈلی تو اس نے اپنی کتاب بھی اسی بادشاہ کے نام معنون کی[۲۷۱]۔ غرض کہ ایک ایسا فاتح جس نے مشکل حالات میں سلطنت کو استحکام بخشنے کی کوششیں کی ایک ایسے حادثے سے دوچار ہوا جس نے اس کی جان ہی لے لی۔ اس کی موت اسلامیانِ ہند کی تاریخ کا ایسا سانحہ ہے جس سے بقول برنی ''سارا جہاں تاریک ہو گیا''[۲۷۲]۔ خاقانی نے غالباً ایسے ہی سانحات کو مدنظر رکھ کر یہ اشعار کہے ہوں گے کہ:

آں مصر مملکت کہ تو دیدی خراب شد	واں نیل مکرمت کہ شنیدی سراب شد
ہم پیکرِ سلامت و ہم نفس عافیت	از دیدہِ نظارہ کناں در حجاب شد
افلاک را لباسِ مصیبت بساط گشت	اجرام را وقایہِ ظلمت نقاب شد[۲۷۳]

ایسا بادشاہ جس نے اقلیم ہند فتح کی وہ اپنی تمام طاقت اور تاج وری کے باوجود آخری وقت میں اپنے گھر والوں تک کی شکل نہ دیکھ سکا۔ اس عبرت ناک انجام کا منظر کھینچتے ہوئے شاعر نے کیا خوب کہا کہ:

گفتنی کہ کجا رفتند آن تاج وراں اینک	زاں‌ایشانِ شکم خاک است آبستنِ جاویداں
کسریٰ و ترنجِ زر پرویز و ترہ زریں	برباد شدہ یکسر و از باد شدہ یکساں[۲۷۴]

سلطان علاء الدین خلجی کے بعد دکن کے علاقے سلطنت دہلی کے قبضے سے نکل گئے۔ جب سلطان محمد تغلق سریر آرائے سلطنت ہوا تو اس نے دکن پر فوری توجہ دی اور دیوگڑھ کو فتح کر کے وہاں کی بغاوتوں کو مٹایا۔ بیجاپور اور کرناٹک وغیرہ پر حملہ کر کے وہاں کے راجا کو زیر کیا۔ چودھویں صدی کے ربع آخر تک پورا ہندوستان محمد بن تغلق کے ماتحت آ گیا[۲۷۵]۔ خلجیوں کے زوال کے بعد ۷۲۸ھ (۱۳۲۷ء) میں محمد تغلق نے دہلی کے بجائے دولت آباد (دیوگری) کو اپنا پایہ تخت بنایا تو بڑی تعداد میں لوگ وہاں منتقل ہونے لگے[۲۷۶]۔ اس جدّت پسند بادشاہ نے دکن، گجرات اور مالوہ وغیرہ پر اپنے قدم جمانے کے لیے دولت آباد کو پایہ تخت بنانے کا تاریخی فیصلہ کیا۔ اس فیصلے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ایک طرف تو اس نے دو داد دہش سے رعایا کو دولت آباد جانے پر آمادہ کیا تو دوسری طرف سخت احکامات نافذ کر کے لوگوں کو دہلی چھوڑنے پر مجبور کیا۔ اس فیصلے نے اردو زبان کے پنپنے کی نئی راہیں ہموار کیں۔ اس کے حکم کی تعمیل میں سب سے پہلے عمّال حکومت، فوج، افسران اور متعلقین نے دولت آباد ہجرت کی[۲۷۷]۔ اس کے بعد لوگ جوق در جوق جنوب کی سمت منتقل ہونے لگے۔ اہل حرف، علما، صوفیا، سپاہی پیشہ اور دوسرے طبقات سے تعلق رکھنے والے بے شمار افراد راستے کی صعوبتیں برداشت کرتے ہوئے دولت آباد پہنچے[۲۷۸]۔

پایۂ تخت کی منتقلی، ہجرت کا کرب اور دلّی کی حالتِ زار:

تغلق سے قبل جنوبی ہندوستان خصوصاً دکن اور اس کے قرب و جوار کے علاقوں کو زیر کر کے مستقل قبضہ جمانے اور دہلی کی فوجوں کو جنوبی ہند کے دور دراز حصوں پر مشتمل حکومت قائم کرنے کا موقع نہیں ملا تھا[۲۷۹]۔ پایۂ تخت کی منتقلی کے بعد دلّی ایسی سنسان ہوگئی کہ بقول فرشتہ "آواز ہیچ متنفس بجز شغال و روباہ و جانوران صحرائی بگوش نمی رسید"[۲۸۰]۔ ابن بطوطہ لکھتا ہے کہ "شہر میں صرف ایک اندھا باقی رہ گیا تھا، اسے بھی دولت آباد پہنچا دیا گیا"۔ دہلی جیسے بارونق، بنے بنائے شہر کو چھوڑ کر اتنے دور دراز مقام پر منتقل ہونا، اکثر اہل شہر کو ناگوار گزرا[۲۸۱]۔ سفر کی صعوبتیں اہل دہلی کے لیے کسی سانحے سے کم نہ تھیں۔ اس کی شہادت معاصر تاریخوں میں مل سکتی ہے۔ عصامی نے "فتوح السلاطین"، میں محمد تغلق کے بیان میں اس عمل پر "آغاز ظلم سلطان محمد شاہ ابن تغلق شاہ در شہر دہلی و رواں کردن خلق در دیوگیر"[۲۸۲]۔ کے عنوان سے ان واقعات کو بڑی وضاحت سے پیش کیا ہے۔ اس بارے میں اس کا کہنا ہے کہ:

چوں شد بد گماں بود بر خلقِ شہر   نہفتہ بسے داشت در نوشِ زہر
نہانی یکے رائے زد ناصواب   کہ در یک مہ آں شہر گردد خراب
سزا وارِ آہن بگردد سرش   سرش خاک و برباد گردد زوش[۲۸۳]

بوڑھوں، بچوں، عورتوں، جوانوں، پردہ نشینوں اور پرہیزگاروں کی آہ وزاری کا بھی اس پر کوئی اثر نہ ہوا:

گرو ہے کہ گشتند در خانہ تیر   زغوغائے عالم شدہ گوشہ گیر[۲۸۴]

ہجرت اور دارالخلافہ کی منتقلی سے جو اذیتیں اور مصیبتیں لوگوں کو سہنی پڑیں اس کا حال بیان کرتے ہوئے عصامی کہتا ہے کہ:

سوم روز حلقے ازاں راحلہ   سراسر رواں گشت با قافلہ
ہمی رفت خلقے بہ سختی کشتی   زمیں آہنی گشتہ، خاک آتشی
چہ پیر و چہ کودک، چہ مرد و چہ زن   رہا کردہ ہر یک دیارو دمن
بسے نازنین داد جاں باگداز   چو حجّاج ماندہ بہ راحِ حجاز
بسے طفل بے شیر گشتہ ہلاک   بسے سر پئے آب خفتہ بہ خاک
ہما ناز کانے کہ ہرگز بہ خواب   نخوردہ غم از گرمیِ آفتاب
یکے جامہ کہنہ پیچیدہ پالے   ہمی کردہ سجدہ بہ گامے دو جالے
یکے پا برہنہ رہے می نوشت   ہمہ دشت از ایشاں صنم خانہ گشت
بسے آبلہ اندر آں پانشست   بسے خار گردوں در آں پاشکست
ازاں قافلہ با عذابِ شدید   سوئے دولتاباد عشرے رسید
شہ، از ظلم، بے زادو بے راحلہ   ھمہ خلق را کردہ شش قافلہ
پیاپے رواں کرد ہرشش ز شہر   نہ از عدل و احساں کہ از خشم و قہر[۲۸۵]

عصامی نے تغلق کے اس عمل کو سخت تنقید کا نشانہ بنایا۔ اس کے سارے خاندان کو بھی اس جلا وطنی کے نتیجے میں گھر بار چھوڑ کر

نکلنا پڑا۔ اس کا نو دسالہ دادا، عزالدین عصامی پہلی ہی منزل یا پڑاؤ پر اس دنیا سے کوچ کر گیا۔ ان وجوہات کی بنا پر مصنف ''فتوح السلاطین'' نے جی بھر کر اُسے بھلا بُرا کہا اور لکھا کہ آبادی کا دسواں حصہ بھی زندہ سلامت دولت آباد نہ پہنچ سکا۔ بے شمار لوگ راستے ہی میں مرکھپ گئے[۲۸۶]۔ ہجرت کے اس عمل سے دلّی کی جو حالت ہوئی اس کا بیان کرتے ہوئے عصامی کا بیان ہے کہ:

چنیں شہرِ معمور کردہ خراب	چہ گوید بہ دادار فردا جواب
ہما خانہا دیو خانہ شدہ	دراں شہرِ ایّام آتش زدہ
برآمد نفیرے ز دیوار و در	چناں شہر خالی شدہ سر بہ سر
ہما شاہِ دوں خلق و ظالم سیَر	مرمت گری گرد پیدا زسر
نگشتہ دلش نرم بر طفل و پیر	نہ منعم از و در اماں، نے فقیر
دگر آں کہ ضحّاک دینے نداشت	بہ خاطر بجز خشم و کینے نداشت
یکے از مطیعانِ ابلیس بود	ہمہ اسم و آئینِ شیطان و بود[۲۸۷]

اس عہد میں دہلی کی تباہی ایک بڑا سانحہ تھا۔ مورخین لکھتے ہیں کہ اس وقت دہلی ایسی اجڑی کہ وہاں کتوں اور بلیوں کے سوا کوئی نہ رہا[۲۸۸]۔ بادشاہ نے مطلوبہ نتائج حاصل کرنے کے لیے لوگوں پر سختیاں کیں جس سے عوام وخواص دونوں کے دلوں میں سلطان محمد بن تغلق کے خلاف بددلی، ناخوشی اور دشمنی کے جذبات پیدا ہوئے[۲۸۹]۔ برنی کا بیان ہے کہ دہلی اور اطراف کے چار پانچ کوس تک کے قصبوں میں آباد مسلمان امرا، ملوک اور مشائخ کو اپنے اہل وعیال، غلاموں اور کنیزوں کے ہم راہ دولت آباد جانے کا حکم ہوا۔ مکانات مسمار کیے گئے، شہر کے کتے بلی تک کو رہنے نہ دیا گیا۔ یوں ڈیڑھ سو سالوں سے آباد مسلمان گھرانوں کو غریب الوطن کہا گیا[۲۹۰]۔ عصامی نے دہلی کی بربادی کا نقشہ کھینچتے ہوئے کہا کہ:

شدہ باغ فردوس خالی زحور	سراسر شدہ دیو خانہ قصور
پریشاں کند ہر کجا انجمن	کند غول گاہے بہ ہر جا چمن
غرض جوں کہ شد شہرِ دہلی خراب	بہشتِ بریں گشتہ دارالعذاب
ہمہ شہر از فتنہ پامال گشت	ہمہ خلق از ظلمِ بے حال گشت
اسیر آمدہ یک بیک منعماں	گدائی کناں در بہ در مکرماں
بسے سرداراں حادثہ سر نہار	بسے تن دواں واقعہ جاں بدار[۲۹۱]

عصامی کا کہنا ہے کہ سلطان محمد بن تغلق دہلی کے مسلمانوں سے بدظن تھا۔ اس لیے وہ ان سے بدلہ لینا چاہتا تھا۔ اس سے قبل ابن بطوطہ نے ''الرحلہ'' میں لکھا کہ سلطان کے مظالم سے تنگ آئے ہوئے لوگ اسے خطوط میں گالیاں لکھ کر بھیجتے تھے جس کی وجہ سے بادشاہ نے دہلی کو اجاڑنے کا ارادہ کیا[۲۹۲]۔ ہاشمی فرید آبادی نے عصامی وغیرہ کے بیانات کو افسانہ طرازی قرار دیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ مصنف ''فتوح السلاطین'' نے مبالغے سے کام لے کر محمد بن تغلق پر ضرورت سے زیادہ تنقید کی ہے[۲۹۳]۔ بلاشبہ عصامی کی نظر میں وہ ایک ظالم وجابر بادشاہ تھا لیکن اس کے بیان پر یقین نہیں کیا جا سکتا کیوں کہ یحییٰ سرہندی نے تو پایہ تخت کی منتقلی کے دوران اس کے حسن انتظام

کی بہت تعریف کی ہے اور یہ تک لکھا ہے کہ وہاں پہنچ کر سب لوگ خوش حال ہو گئے[۲۹۴]۔علی محسن صدیقی تو اس بات کو ماننے سے انکاری ہیں کہ دہلی کے بجائے دولت آباد کو پایہ تخت بنایا۔ان کا خیال ہے کہ سلطان نے دہلی کے ساتھ دولت آباد کو ملک کا دوسرا پایہ تخت قرار دیا۔ لہٰذا یہ بیان حقیقت پر مبنی نہیں کہ شہر دہلی مسلمانوں سے خالی ہو گیا۔ابن بطوطہ جب دہلی آیا تو یہاں کی رونق اور چہل پہل دیکھ کر حیران رہ گیا۔خود سلطان بھی دولت آباد سے دہلی آتے رہتے تھے۔مثلاً بہرام آئیہ کی بغاوت فرو کرنے کے لیے وہ دولت آباد سے دہلی آیا۔دہلی سے اس زمانے میں فوج میں بھرتیاں بھی ہوئیں۔دیوگیر جانے والوں دور ونزدیک کے شہروں اور قصبات سے جب مسلمانوں کو لا کر دہلی میں آباد کیا گیا تو نتیجتاً دہلی کی آبادی بجائے کم ہونے کے بڑھ گئی تھی[۲۹۵]۔پایہ تخت دولت آباد منتقلی کے معاملے میں سلطان کی نیک نیتی اس بات سے بھی ظاہر ہوتی ہے کہ اس کے حکم پر خود بادشاہ کی والدہ مخدومہ جہاں نے سب سے پہلے عمل کیا[۲۹۶]۔سلطان نے معاوضہ دے دے کر ان لوگوں کو دولت آباد روانہ کیا تھا۔اتنی بڑی آبادی کی ہجرت تاریخ کا ایک حیرت انگیز واقعہ ہے۔کہا جاتا ہے کہ اس وقت علما اور زہاد کی چودہ سو پالکیاں دلّی سے دیوگیر پہنچی تھیں۔امرا جو دہلی کی رہائش سے مایوس ہو چکے تھے انھیں دیوگیر پسند نہیں آیا۔اس سے بھی سازشیں شروع ہوئیں۔مورخین بعد میں آنے والے واقعات کے لحاظ سے محمد بن تغلق کے پایہ تخت بدلنے پر ہزار الزام دیں لیکن اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ سلطان نے دولت آباد کو اس لیے دہلی پر ترجیح دی کہ یہ شہر ہندوستان کے وسط میں تھا۔پایہ تخت بدلنے کے بعد جو ناگوار واقعات پیش آئے،وہ اگر وقوع پذیر نہ ہوتے تو شاید ملکی مفاد کے لحاظ سے ہندوستان کی تاریخ میں اس سے بہتر فیصلہ کوئی اور تصور نہ ہوتا۔محمد بن تغلق کے امرا اگر باغی نہ ہوتے اور اس کی یہ تجویز اگر کامیاب ہو جاتی تو آج جنوبی ہند کا نقشہ ہی کچھ اور ہوتا اور مورخین یہ کہنے پر مجبور ہو جاتے کہ تغلق جیسا تجربے کار اور مدبر بادشاہ ہندوستان کی تاریخ میں کوئی اور نہیں ہوا۔غالبًا یہ ایک انتظامی فیصلہ تھا۔دکنی علاقوں میں آئے دن ہونے والی بغاوتوں کو کچلنے،فوجی اور سفارتی وفود سے رابطے کو ہر وقت بحال رکھنے اور دور دراز مقامات کی فوجی مہمات میں دشواریاں کم کرنے کے لحاظ سے یہ ایک صائب اور دانش مندانہ فیصلہ تھا جسے سلطان کے ناراض مورخین نے انتقامی فیصلہ قرار دیا۔سلطان کی عجلت پسندی،خودسری اور تشدد آمیز رویے کی وجہ سے علما و مشائخ کی مخالفت کے سبب بادشاہ کو ناکامی کا منھ دیکھنا پڑا[۲۹۷]۔برنی نے اس کے شدت پسند رویے اور خودسری پر کڑی تنقید کرتے ہوئے کہا کہ:

> مسلمانوں کو مروانا اور مومنین کو قتل کرانا اس کی عادت اور طبیعت بن گئی تھی۔وہ اتنے علما،مشائخ،سادات،
> صوفیا،قلندروں،منشیوں اور لشکریوں کو قتل کراتا تھا کہ کوئی دن اور ہفتہ ایسا نہیں گزرتا تھا کہ بہت سے
> مسلمانوں کا خون نہ بہائے اور محل کے داخول کے سامنے خون کی نہر رواں نہ ہو[۲۹۸]۔

اس کی غلط پالیسیوں کی وجہ سے سلطنت کو بے حد نقصان بھی اٹھانا پڑا۔ابتدا میں تو اس کی فتوحات کے بعد خراج کی رقم کی فراوانی کی وجہ سے اس کے دربار کی رونق دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی لیکن اس کے بعض فیصلوں نے دور نزدیک کے اقالیم کے والیوں اور حاکموں کو رفتہ رفتہ اس سے بدظن کر دیا۔اس کے سخت فیصلوں خصوصاً لگان اور خراج کی شرح میں اضافے اور حکم عدولی پر دی جانے والی سزاؤں نے رعایا کو سرکشی پر مجبور کر دیا۔برنی نے اس کی تفصیلات بیان کی ہیں۔مثلاً دو کے علاقے میں خراج کی شرح میں اضافے کے فیصلے سے کاشت کار تباہی کا شکار ہوئے اور ان پر کی گئی سختیوں کے نتیجے میں دور افتادہ ولایتوں کے کاشت کاروں نے بھی بغاوت کر دی اور جا کر جنگلوں میں چھپ گئے۔کاشت کی کمی اور خانہ ویرانی کے نتیجے میں غلے کی کمی ہوئی اور نواح دہلی اور دوآبہ وغیرہ میں سخت قحط آیا۔

غلہ بہت مہنگا ہو گیا۔ ہزار ہا لوگ اس قحط میں ہلاک ہوئے اور یہ قحط کئی برسوں تک جاری رہا[۲۹۹]۔ محصولات میں کمی اور قحط کی وجہ سے شاہی خزانہ خالی ہو گیا۔ اس کی تلافی میں کیا گیا فیصلہ بھی اس کی سلطنت میں انتشار کا سبب بنا۔ سلطان نے خزانے کے نقصان کی تلافی کے لیے تانبے کے علامتی سکّے جاری کیے اور اس کی قیمت چاندی کے سکّے کے مساوی رکھی۔ بعد میں اس فیصلے کو منسوخ کرنے کی وجہ سے بھی خزانے پر برا اثر پڑا۔ لوگوں نے اس پر سخت احتجاج اور ردِ عمل دکھایا۔ رعایا کے دل میں عام تاثر یہ ابھرا کہ سلطان ان کی دولت چھین لینا چاہتا ہے[۳۰۰]۔ سلطان کے اس عمل سے بھی بڑی خرابی اور انتشار پھیلا۔ مفلس اور شر پسندوں نے اپنے اپنے گھروں میں ٹکسال بنا لیں۔ غیر ملک کے پردیسی چوں کہ اس سکّے کو قبول نہیں کرتے تھے جس کی وجہ سے بازار اور کاروبار مندے ہو گئے۔ ۷۳۸ھ میں کوہ قراچل کی مہم کے دوران سلطان کی فوجی طاقت کو بھی سخت نقصان پہنچا۔ بدایونی کے مطابق اس مہم میں اسّی ہزار[۳۰۱] اور عصامی کے مطابق ایک لاکھ کے قریب فوجی کام آئے۔ واپسی پر اس فوج کو شدید بارش اور طاعون کی وبا نے بھی نقصان پہنچایا۔ ابن بطوطہ نے صرف تین لوگوں کے بچنے کی اطلاع دی جب کہ عصامی کا بیان ہے کہ چھے ہزار فوجی زندہ بچے[۳۰۲]۔ لیکن ملا عبدالقادر نے اس بابت لکھا کہ ''جو بچے، مدتوں ان پہاڑوں میں بھٹکتے رہے۔ کچھ لوگ جو مصیبتیں اٹھاتے، آفتیں جھیلتے وطن پہنچے تو بادشاہ نے بھاگ آنے کے جرم میں ان کو قتل کرا دیا''[۳۰۳]۔ حالاں کہ اس سے قبل خراساں کی مہم کے دوران تین لاکھ ستر ہزار فوج کو ایک سال تک جو تنخواہ دی گئی اس سے خزانہ پہلے ہی خالی ہو چکا تھا اور ملک میں عام بے روزگاری کی حالت تھی[۳۰۴]۔ اس کے خلاف ہونے والی بغاوتوں نے سلطان کو کبھی بھی سکون سے بیٹھنے نہیں دیا۔ ۷۲۷ھ مطابق ۱۳۲۶ء میں گلبرگہ کے گورنر بہاء الدین گرشاسپ کی بغاوت، ۷۲۸ھ مطابق ۱۳۲۷ء میں ملتان کے گورنر کشلو خان کی بغاوت، کمال پور، سندھ کی بغاوت، بنگال میں غیاث الدین بھورا کی بغاوت، سہون کی بغاوت، معبر کی بغاوت، ہولا جون کی بغاوت، ملک ہوسنگ کی بغاوت، قاضی جلال کی بغاوت، علی شاہ کی بغاوت عین الملک، شاہو افغان، امیران صدہ اور سلاطین ٹھٹھ کی بغاوت کے علاوہ دکن کے ہندو راجاؤں نے اسے علما کی مخالفتوں میں الجھا دیکھ کر اس کے خلاف سازش شروع کی اور دکن کے بڑے حصے پر قابض ہو گئے۔ فرشتہ کے مطابق ناٹک جو راجا کا بیٹا تھا، نے کرناٹک کے رائے بلالہ دیو کے پاس جا کر اس کو بغاوت پر اکسایا۔ اسی بلالہ دیو نے پہلی بار ایک پہاڑی سرحدی چوکی پر BIJAY NAGAR نامی حصار قائم کی جو بعد میں Vijya Nagar کے نام سے مشہور ہوئی۔ اس دور میں کومیلا کے نومسلم گورنر دیو رائے نے اسلام ترک کر کے ہندو دھرم اختیار کیا اور یہی شخص بعد میں ہری ہر کے لقب سے مشہور ہو کر وجیانگر کا پہلا راجا ہوا۔ اس بغاوت کے نتیجے میں ورنگل، کمپلا اور سمدرا وغیرہ کے علاقے مسلمانوں کے ہاتھوں سے نکل گئے[۳۰۵]۔ اور ایک بڑی ہندو ریاست وجود میں آئی جن سے دکنی بادشاہوں سے بے شمار معرکے ہوئے جن کی تفصیل آئندہ صفحات میں بیان کی جائیں گی۔

اس دور انتشار میں بیرونی حملہ آوروں نے بھی مذہب، رنگ و نسل کا لحاظ کیے بغیر جو قتل و غارت گری مچائی اس نے بھی انسانی المیوں کو جنم دیا۔ ایسے ایسے سانحات برصغیر پر گزرے کہ کم ہی ایسے خطے ہوں گے جن پر اس قدر شدت سے عذاب نازل ہوا ہو۔ دہلی کے لوگ آج تک تیموری عذاب کو نہیں بھول سکے جس میں بے شمار جانیں ضائع ہوئیں۔ وہ ۱۳۹۸ء میں افغانستان کے راستے ہندوستان میں آیا۔ راستے میں جہاں جہاں سے گزرا قہر الٰہی کی طرح علاقوں کو تخت و تاراج کرتا اور باشندوں کو قتل کرتا ہوا آیا۔ دہلی میں سلطان محمود تغلق کے گجرات فرار ہونے کے بعد اس نے شہر دہلی کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ شہر میں لوٹ مار اور باشندگان کے قتل عام کے بعد وہ

میرٹھ اور جموں کے راستے واپس چلا گیا۔ بعض مورخین اس کے حملے کو کفر و شرک کی بیخ کنی سے تعبیر کرتے ہیں لیکن ایران اور دیگر اسلامی ممالک میں جس طرح اس نے مسلمان مقتولین کے سرکاٹ کر کلہ مینار بنائے اس سے کون سے کفر و شرک کی بیخ کنی ہوتی ہے سمجھ سے بالا تر ہے۔ اس نے اسلامی تہذیب و تمدن پر ضرب لگانے کے سوا کچھ نہیں کیا۔ اس طرح اس نے ہلاکو اور چنگیز خان کے جانشین ہونے کا حق ادا کر دیا[۳۰۶]۔ ملا عبدالقادر کے مطابق ''اس زمانے میں ہندوستان کی طوائف الملوکی کی حد انتہا کو پہنچ گئی تھی۔ جہاں جہاں جس نے قدم جما لیے وہ اپنے آپ کو ہندوستان کا بادشاہ سمجھنے لگا''۔ اس سال بھی دہلی میں زبردست قحط سالی ہوئی۔ اس قحط کے نتیجے میں شہر اور آس پاس کے مضافاتی علاقے ویران ہو گئے۔ شہر کی بربادی اور ویرانی میں جہاں تیموری لشکر نے بربریت کا مظاہرہ کیا وہیں اس قدرتی آفت کے نتیجے میں انسان تو انسان چرند و پرند کا سایہ بھی دور دور تک شہر میں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اسی طوائف الملوکی کے دور میں مختصر عرصے کے لیے کئی بادشاہوں نے دہلی پر قبضہ کیا اور اپنی اپنی حکومتیں قائم کیں۔ اس دور میں کوئی مستحکم حکومت قائم نہ ہو سکی۔ جنگ و جدل کے دوران لشکریوں کو اکثر قحط کی صورت حال درپیش رہتی۔ غلے کی گرانی کی وجہ سے عوام بے حال تھے اور فوجیں میدان جنگ چھوڑ چھوڑ کر بھاگ جاتی تھیں۔ ۸۷۶ھ مطابق ۱۴۷۲ء میں سلطان مبارک شاہ بن خضر خاں کے دور میں بھی ہندوستان بہت بڑے قحط کا شکار رہا۔

۸۸۵ھ مطابق ۱۴۸۰ء میں بہلول بن کالا لودھی تخت نشین ہوا۔ اڑتیس برس سے زائد عرصے تک حکم رانی کر کے ۸۹۴ھ مطابق ۱۴۸۹ء میں اس نے وفات پائی۔ بعد میں اس کے بیٹے سکندر بن بہلول لودھی نے حکومت سنبھالی۔ اس کے دور میں جنگ و جدل اور معرکہ آرائیوں کے سبب شاہی لشکر کو بدترین قحط اور تنگ دستی کا سامنا کرنا پڑا۔ اسی بادشاہ کے دورِ حکومت میں چن ۹۱۱ھ مطابق ۱۵۰۵ء کو پورے ہندوستان میں بہت سخت زلزلہ آیا، جس کے نتیجے میں بلند و بالا عمارتیں زمین بوس ہو گئیں۔ جگہ جگہ سے زمین شق ہو گئی۔ درخت اکھڑ گئے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ ہر طرف ایک قیامت بپا ہے۔ ''کتب التواریخ'' کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ زلزلہ نہ صرف ہندوستان میں بلکہ آس پاس کے دیگر ممالک میں بھی اپنی تباہی کے آثار چھوڑ گیا۔ ملا عبدالقادر کے مطابق تاریخ عالم میں ایسے زلزلے کی کوئی دوسری نظیر نہیں ملتی[۳۰۷]۔ فرشتہ نے بھی بدایونی کی تائید میں لکھا کہ اتوار کے دن آگرے میں آنے والا زلزلہ کسی قیامت سے کم نہیں۔ زلزلے کے بعد سے اس وقت تک پھر کبھی ایسا بھونچال ہندوستان میں نہیں آیا اور نہ کسی کو یاد ہے۔ اسی دن ہندوستان کے اکثر شہروں میں زلزلہ آیا[۳۰۸]۔ لیکن یہ بات مبالغہ آمیز معلوم ہوتی ہے۔ یہ تو ممکن ہے کہ زلزلے کے مرکز میں جو جو شہر آئے ہوں وہاں اسے محسوس کیا گیا ہو لیکن ہندوستان کے اکثر شہروں میں بیک وقت زلزلے کا آنا ناقابل یقین ہے۔ ماہرین ارضیات اس بات کی تائید کریں گے کہ اس قدر وسیع رقبے پر پھیلی ہوئی مملکت ہندوستان کے اکثر شہروں میں بیک وقت زلزلے کے آثار اس دور میں نہیں ملتے۔ البتہ آگرے اور اس کے آس پاس کے علاقے ضرور متاثر ہوئے ہوں گے۔ اس کے علاوہ بدایونی کا یہ کہنا بھی مبالغہ معلوم ہوتا ہے کہ تاریخ عالم میں ایسا زلزلہ نہیں آیا۔ کیوں کہ اس دور میں ابلاغ کا کوئی ایسا ذریعہ نہیں تھا کہ دنیا میں آنے والی تباہی و بربادی، قدرتی آفات اور زلازل کے بارے میں کوئی حتمی بات کی جا سکے۔ بے شمار ایسے زلازل ہوں گے جن کا علم اس دور کے ہندوستانی مورخین کو نہ ہو سکا۔ بہر حال بدایونی نے مذکورہ زلزلے کی قطعہ تاریخ درج کی ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

در نہصد واجدی عشراز زلزلہ ہا ۔۔۔ گر دید سواد آگرہ چوں مرحلہا

با آں کہ بنا ہاش بسے عالی بود ۔۔۔ از زلزلہ شد عالیہا سافلہا[۳۰۹]

سلیم شاہ سوری کے عہد میں پانی پت کی دوسری جنگ بھی ہوئی۔ سوریوں کے دور میں جب مبارز خاں، سلطان محمد عادل کے لقب سے تخت نشین تھا، مختلف سردار آپس میں برسرِ پیکار تھے۔ ہیمو کی یلغار میں ابراہیم خاں کو شکست ہو چکی تھی۔ ۹۶۱ھ مطابق ۱۵۵۴ء میں جب ابراہیم خاں نے ہیمو کی فوج پر چڑھائی کر رکھی تھی، اسی زمانے میں آگرہ، دہلی اور بیانہ میں ایسا قحط آیا کہ ہر گھر سے دس دس، بیس بیس لوگ بھوک اور فاقے سے مر گئے۔ ان علاقوں میں قحط سالی کی وجہ سے یہ حال تھا کہ لوگوں کی نعشیں بے گور وکفن پڑی ہوئی تھیں۔ لوگ کیکر کے بیج اور مویشیوں کے چمڑے کھا کھا کر جان بچا رہے تھے جس کی وجہ سے بھی موذی مرض کا شکار ہو کر بے شمار لوگ ہلاک ہوئے۔ مصنف ''منتخب التواریخ'' خود کو ان واقعات کا چشم دید گواہ بتاتا ہے۔ اس کے مطابق اس قحط میں آدمی، آدمی کا گوشت کھاتے تھے جس کی وجہ سے لوگوں کی شکلیں اس قدر ڈراؤنی ہوگئی تھیں کہ ان کو دیکھنا محال تھا۔ دو برس تک مسلسل جنگ اور لڑائیوں کی وجہ سے یہ سارا علاقہ تباہ و برباد ہو چکا تھا۔ ایک طرف تو عوام الناس تھی جو ایک ایک روٹی پر جان لینے اور دینے کو تیار تھی اور دوسری طرف ہیمو اپنے لشکر میں شامل ہاتھیوں کو روزانہ چاول، شکر اور گھی کا راتب کھلاتا اور اپنے پٹھان امیروں کو روزانہ ایک وقت کا کھانا اپنے دسترخوان میں کھلاتا۔ وہ ان پٹھان امیروں کو طنزیہ اور فخریہ انداز سے کہتا کہ بڑے بڑے لقمے کھاؤ اور اگر کسی کو کم کھاتا دیکھتا تو گالیاں کہتا کہ اپنے مغل دامادوں سے بغیر کھائے کس طرح مقابلہ کرے گا؟ یہ وہ وقت تھا جب ان افغانوں کا ستارہ غروب ہونے کو تھا۔ ان کی غیرت وحمیت ایسی مرچکی تھی کہ وہ ہیمو کی مغلظات پر بھی خاموشی اختیار کر لیتے۔ اپنی طبعی جنگ جوئی کو بالائے طاق رکھ کر خوف اور لالچ کے مارے ان لقموں کو حلوے کی طرح نگل لیتے [۱۳۰]۔ اس صورت حال کی عکاسی فارسی کے اس شعر میں بڑے زبردست انداز سے کی گئی ہے۔

بخدمت منہ دست برپائے من مرا نان دہ وکفش برسرِ بزن [۱۳۱]

اس دور میں بنگال کے علاوہ تقریباً پورے ہندوستان کو قحط سالی نے گھیرے ہوئے تھا [۱۳۲]۔ جنوبی ہندوستان میں اس قحط کے نتیجے میں جس قسم کے واقعات پیش آرہے تھے اس کے بیان سے انسانیت شرما جاتی ہے۔

جنگ تالی کوٹ: جنوبی ہند میں اردو شاعری کا ابتدائی سانحاتی بیانیہ

دکن کی عظیم الشان لڑائیاں جن کے ذریعے سلطنتوں کی قسمت کا فیصلہ ہوا، ان میں سے ایک مشہور جنگ ''تالی کوٹ'' کی جنگ ہے۔ اس جنگ میں ایک فریق وجیانگر کا مہاراجا رام راج اور دوسری جانب بے جاپور، گول کنڈا اور احمد نگر کی اسلامی سلطنتیں تھیں۔ اگرچہ دورانِ جنگ تینوں اسلامی ریاستیں متحد اور متفق ہو چکی تھیں مگر ساز وسامان فوج اور ہاتھیوں کی کثرت کے لحاظ سے وجیانگر کو بہت تفوّق حاصل تھا [۱۳۳]۔ حسن شوقی کی اس مثنوی کے مطالعے سے قبل ضروری ہے کہ اس سیاسی منظر نامے سے واقفیت حاصل کی جائے جس پس منظر میں یہ مثنوی لکھی گئی۔

جنوبی ہند کی ریاستوں میں وجیانگر ہمیشہ مسلمانوں کے خلاف سازشوں کا گڑھ بنا رہا۔ اچھوت رایا کی موت کے وقت وجیانگر جس قسم کے داخلی انتشار کا شکار تھا، اس کا اندازہ اس عہد کی تاریخ کے مطالعے سے اچھی طرح لگایا جا سکتا ہے۔ ''اچھوت رایا'' کے مرتے ہی اس خادان سے اقتدار جاتا رہا اور رام راج اور اس کے بھائی ترملا کے حامی برسرِ اقتدار آ گئے۔ انھوں نے سداسیورایا کو جو اچھوت رایا کا سوتیلا بھائی تھا، تخت نشین کرایا۔ سیّاح گیا سپرے گوا ے جو اس زمانے میں وجیانگر میں موجود تھا، لکھتا ہے کہ اچھوت رایا کی وفات کے بعد اس کے چھوٹے بیٹے وینکٹاری کو تخت پر بٹھایا گیا لیکن محض چھے ماہ ہی اس کی حکومت قائم رہی۔ پھر اسے قتل کر کے سداسیورایا تخت

نشین ہوا۔ اس زمانے میں یہ بس نام کا راجا تھا کیوں کہ تمام امور سلطنت رام راج اور اس کے بھائی کے ہاتھ میں آچکے تھے۔ رام راج نے اس زمانے میں اس قدر طاقت حاصل کر لی تھی کہ سدا سیورایا کو بھی محل میں قید کر رکھا تھا۔ سلطنت کے کاموں میں راجا کا عمل دخل نہ ہونے کے برابر تھا۔ وہ بڑی ہوشیاری سے تمام احکامات وفرامین راجا کے نام سے جاری کرتا۔ حقیقتاً اس ہندو ریاست کے سیاہ وسفید کا مالک رام راج بن چکا تھا [۳۱۴]۔ ۹۳۵ھ میں اپنے باپ تمراج کے مرنے کے بعد ہی اس نے اپنے ہاتھ پیر پھیلانے شروع کر دیے تھے۔ اس کے باپ نے ہی راجا کے خاندان کے تین ماہ کے وارث کو زہر دے کر قتل کروایا تھا۔ لہٰذا باپ کے نقش قدم پر چلتے ہوئے اس نے سازشوں کے ذریعے پوری سلطنت کو اپنے قابو میں کر لیا تھا۔ راجا کے خاندان کی ایک لڑکی سے شادی کر کے اس کا رتبہ اور زیادہ بڑھ گیا تھا۔ اس نے چاہا کہ وہ اعلانیہ خودمختار راجا بن جائے جس پر اسے دیگر سرداروں کی جانب سے مخالفت کا سامنا کرنا پڑا جس کی وجہ سے اسے راجا کے خاندان کے ایک بچے کو دکھاوے کے طور پر تخت پر بٹھانا پڑا۔ اس بچے کے ماموں بھوج نرمل راج نے کچھ سرداروں کے ساتھ مل کر راجا کو آزاد کرانے کی کاشش بھی کی۔ اس سلسلے میں ۹۴۲ھ میں ابراہیم عادل شاہ کو چھے لاکھ ہون اور تحفے تحائف بھیج کر مدد کے لیے راضی بھی کر لیا گیا لیکن رام راج نے دانش مندی اور چالاکی سے اس خطرے اور مصیبت کو اپنے سر سے ٹالا۔ بھوج نرمل راج کی بدمزاجی اور دیوانے پن سے لوگ جلد ہی اس سے خائف ہو گئے اور بالآخر رام راج کو ہی سرداروں نے اپنی اعانت کے لیے بلوایا۔ ابراہیم عادل شاہ نے اس داخلی انتشار سے فائدہ اٹھا کر اسد خان کو قلعہ ادھونی کی تسخیر کے لیے بھیجا لیکن رام راج نے سخت مقابلہ کیا۔ شدید لڑائی ہوئی اور مسلمانوں کو اس میں نقصان اٹھانا پڑا بعد میں صلح کے بعد فریقین اپنے اپنے ملکوں کو واپس لوٹ گئے [۳۱۵]۔

رام راج کی شخصیت اس زمانے میں ایک زبردست سیاسی شخصیت بن کر ابھری۔ اس نے سلطنت وجیانگر کی اندرونی کمزوریوں کو دور کر کے اسے ایک باعزت مقام دلایا۔ اس کے عہد میں وجیانگر کی سلطنت کا ڈنکا دور دور تک بجنے لگا تھا۔ اس کی بہترین قائدانہ صلاحیتوں کی وجہ سے پورے ملک میں اس کی دھاک بیٹھ چکی تھی۔ آج بھی جنوبی ہند کے ہندو، رام راج کے عہد کو بڑے فخر و عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں [۳۱۶]۔ رام راج کی زبردست حکمت عملی اور دلیری سے یہ سلطنت ہمیشہ مسلمانوں کے لیے خطرے کی علامت رہی [۳۱۷]۔ جیسے جیسے اس کی سلطنت نے طاقت حاصل کی ویسے ویسے رام راج کی خودسری بھی بڑھتی گئی اور اس نے رفتہ رفتہ شاہی لقب بھی اختیار کرنا شروع کر دیا [۳۱۸]۔ دکن کے مسلمان سلاطین آپس کے اختلاف میں الجھ کر بروقت اس خطرے کا تدارک نہ کر سکے جس کی وجہ سے رام راج کا فتنہ بہت تیزی سے تمام مسلم ریاستوں تک پھیلنے لگا۔ اکثر مسلم سلاطین رام راج کی فوج کی طاقت کے خوف اور دبدبے میں آکر اس سے صلح کرنے پر مجبور ہو جاتے۔ یہی نہیں مسلمان سلاطین آپس کی لڑائیوں میں اس سے مدد بھی طلب کرتے تھے۔ علی عادل شاہ نے تو جنگ وجدل کو بدترین صفات سمجھ کر کچھ ایسی تدابیر اختیار کیں کہ رائچور، مدگل، کلیانی اور شولاپور وغیرہ تک کے علاقے بغیر کسی قتل وغارت کے اپنے قبضے میں کر لیے۔ اس نے اپنے دور میں محمد کشور خاں اور شاہ ابوتراب شیرازی کو ایلچی بنا کر رام راج کے پاس پیار ومحبت اور امن وامان کا پیغام دے کر بھیجا۔ رام راج نے جو اس وقت اپنی سلطنت کے استحکام کی کوششوں میں مصروف تھا، اس دوستی کو مناسب جانا۔ دوسری جانب حسین نظام شاہ نے علی عادل شاہ اور رام راج کی دوستی کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا۔ علی عادل شاہ تو رام راج سے رابطۂ اتحاد بڑھانے میں اس حد تک آگے بڑھا کہ جب رام راج کا بیٹا فوت ہوا تو وہ خود سو سواروں کے ساتھ بے جانگر روانہ ہوا اور رام راج سے تعزیت کر کے اس کے جسم سے ماتمی لباس اتارا۔ رام راج کی بیوی نے علی عادل شاہ کو منھ بولا بیٹا کہا اور تین دن تک اس

کے دربار میں علی عادل شاہ کی مہمان داری ہوئی[۳۱۹]۔ ایک جانب تو دوستی اور تعلقات کی نوعیت اس قدر آگے بڑھ رہی تھی دوسری طرف حسین نظام شاہ اور علی عادل شاہ کے درمیان تناؤ نے فاصلوں کو مزید بڑھا دیا تھا۔ ۱۵۵۱ء میں ہونے والے معرکے اور زبردست خوں ریزی کے بعد بے جاپور کو جو شکست ہوئی تھی اس کے نتیجے میں ''کلیان'' کے قلعوں سے بھی انھیں ہاتھ دھونا پڑا۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ تین اسلامی سلطنتوں کی سرحدیں وجیانگر کی سرحدوں سے ملنے کے باوجود یہ لوگ رام راج کا کچھ بگاڑ نہیں پا رہے تھے۔ احمد نگر، بے جا پور، اور گول کنڈہ کی یہ ریاستیں بدقسمتی سے ایسی نا اتفاقی کا شکار تھیں کہ ہمہ وقت آپس میں ہی برسرِ پیکار رہتیں۔ ان تینوں میں سب سے طاقت ور سلطنت بے جاپور کی تھی جو اکثر وجیانگر کے ہندو راجاؤں سے صف آرا رہتیں۔ رام راج اپنے خسر کرشنا دیورایا کے نقش قدم پر چلتے ہوئے ان مسلم سلطنتوں کے خلاف طرح طرح کی سازشیں کرتا رہتا تھا۔ وہ ان بادشاہوں کے درمیان آپس میں پھوٹ ڈالنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔ لہٰذا یہ تینوں سلطنتیں مذہبی ہم آہنگی کے باوجود پہلے سے بھی زیادہ ایک دوسرے کی دشمن ہوگئیں۔ نتیجتاً رام راج کو ان مسلم ریاستوں کو نیست و نابود کرنے کے مواقع ہاتھ آتے رہتے اور وہ انھیں لڑانے کے لیے طرح طرح کے منصوبوں میں مصروف رہتا۔ اس زبردست ہندو ریاست کے سامنے ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ دکن کی مسلمان ریاستیں متحد ہوکر اس کا مقابلہ کرتیں لیکن بجائے آپس کے اتحاد کے یہ ریاستیں رام راج کی سازشوں کا شکار ہوکر ایک عرصے تک اس کی آلہء کار بنی رہیں۔ ان سازشوں کی تفصیل بہت طویل ہے۔ محض ایک دو واقعے سے ہی اس سیاسی منظرنامے کو با آسانی سمجھا جاسکتا ہے۔ مثلاً بے جاپور کی مضبوط فوج کو کمزور کرنے اور شکست دینے کی غرض سے رام راج نے جب پرتگالیوں سے معاہدہ کیا تو شہر ''کلیان'' کے تنازعے کی وجہ سے احمد نگر کے حکم راں بھی رام راج اور پرتگالیوں کے معاہدے میں شامل ہوگئے جس کے نتیجے میں ۱۵۵۱ء میں دریائے بیما کے کنارے ایک خوں ریز معرکے کے بعد بے جاپور والوں کو شکست کا سامنا کرنا پڑا[۳۲۰]۔ کلیان اور شولاپور کے قلعے واپس نہ کرنے پر علی عادل شاہ نے نظام شاہ بحری کو جو دھمکی دی تھی، اس کا ردِعمل بڑا سخت آیا۔ مصنف تاریخ فرشتہ لکھتا ہے کہ اس پیغام کے بعد نظام شاہ نے ''ایسے سخت کلمات زبان سے نکالے کہ ان کا ذکر زبان پر لانا ناگوار ہے[۳۲۱]۔ اس زمانے میں دکن میں یہ رواج تھا کہ کسی ایک ریاست کا نشان اور علم کوئی دوسرا اختیار نہیں کرسکتا۔ عادل شاہی سلطنت کے علم کا رنگ زرد تھا جب کہ سبز رنگ کے جھنڈے نظام شاہیوں کے ساتھ مخصوص تھے۔ ابراہیم عادل شاہ نے حسین نظام شاہ کو نیچا دکھانے کے لیے نظام شاہیوں کی طرح سبز علم اختیار کیا[۳۲۲] اور دھمکی دی کہ ہمت ہے تو اپنا نشان واپس لے کر دکھاؤ[۳۲۳]۔ حسین نظام شاہ نے اس بے عزتی کا بدلہ لینے کے لیے لشکر جمع کیا۔ علی عادل شاہ پہلے ہی رام راج سے معاہدہ کرچکا تھا۔ یہ ساری صورت حال ۹۷۶ھ کو پیش آئی۔ علی عادل شاہ نے حسین نظام سے نبٹنے کے لیے رام راج سے مدد کی درخواست کی۔ جب رام راج نے احمد نگر کی طرف کوچ کیا تو حسین نظام شاہ نے موقع کی نزاکت دیکھ کر قلعہ کلیانی علی عادل شاہ کو دے کر صلح کرلی[۳۲۴]۔ لیکن اس طرح کی صلح اور امن بھی عارضی ثابت ہوئے۔ اکثر یہ دونوں سلطنتیں شولاپور اور کلیان کے قلعے حاصل کرنے کے لیے ایک دوسرے سے برسرِ پیکار رہتیں۔ کبھی حسین نظام شاہ، قطب الملک سے اتحاد کرتا[۳۲۵]۔ تو کبھی قطب شاہ باوجود عہد و پیماں کے رام راج اور علی عادل شاہ سے مل جاتا[۳۲۶]۔ آپس کی ان لڑائیوں کا یہ نتیجہ نکلا کہ رام راج اب ان مسلم سلاطین کے اندرونی معاملات میں بھی دخل دینے لگا۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ گول کنڈا میں جمشید قطب شاہ کی وفات کے بعد جب امرا نے اس کے جانشین کو تخت نشین کرنا چاہا تو رام راج نے دوسرے بیٹے ابراہیم قطب شاہ کی حمایت کی اور فوج کشی کر کے اسے تخت پر بٹھایا۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ مسلمان ریاستیں اس زمانے

میں کس قدر بے بس ہو چکی تھیں اوران ممالک کے اندرونی حالات کس قدر بدنظمی کا شکار تھے۔

۹۷۶ھ میں حسین نظام شاہ اور علی عادل شاہ کے درمیان ہونے والا معاہدہ بھی زیادہ دن برقرار نہیں رہ سکا۔ دونوں ریاستوں کی فوجیں ایک بار پھر کلیان حاصل کرنے کے لیے آمنے سامنے ہوگئیں [۳۲۷]۔ اس بار رام راج نے علی عادل شاہ کی مدد کے لیے پچاس ہزار سوار اور دولاکھ پیادوں کے ساتھ بے جاپور کی طرف روانہ ہوا [۳۲۸]۔ تعجب کی بات یہ ہوئی کہ قطب شاہ جو اس وقت حسین نظام شاہ کا ساتھ دے رہا تھا، اچانک رام راج اور علی عادل شاہ سے آملا۔ حسین نظام شاہ بحری نے جب یہ صورت حال دیکھی تو اس کے اوسان خطا ہوگئے [۳۲۹]۔ صورتِ حال کی سنگینی کا احساس کرکے وہ احمد نگر کی طرف بھاگا۔ رام راج اور علی عادل شاہ کی فوجوں نے تعاقب جاری رکھا تو وہ خود تو جنیر بھاگ گیا [۳۳۰] مگر احمد نگر کو بے یارو مددگار چھوڑ گیا۔ اس جنگ میں احمد نگر والوں کو بدترین شکست ہوئی [۳۳۱]۔ تینوں بادشاہوں نے احمد نگر کا محاصرہ کرکے ملک کو غارت کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی [۳۳۲]۔ ان کی بربریت کی وجہ سے اطراف شہر، گاؤں اور دیہات میں آبادی اور سرسبزی کا نام ونشان تک باقی نہ رہا [۳۳۳]۔ بے جانگر کے ہندوؤں نے موقع کا فائدہ اٹھاتے ہوئے احمد نگر کو خوب لوٹا۔ عمارات کو اکھیڑا اور جلایا [۳۳۴]۔ فرشتہ نے اس بابت لکھا کہ ''غیر مسلموں نے عمارتوں کو ڈھانے اور جلانے میں کوئی کوتاہی نہیں کی اور طرح طرح کے فساد ملک میں برپا کیے۔ ہندو مسجدوں میں گھس گئے اور گھوڑوں کو مسجدوں میں باندھ کر چھتیں اور جو چیزیں لکڑی کی تھیں، ان کو خوب جلایا'' [۳۳۵]۔ ہندوؤں نے ''اس بدقسمت شہر کی تباہی اور اسلام و مسلمانوں کی توہین میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی [۳۳۶]۔ Briggs نے اپنی کتاب میں لکھا کہ:

> ظلم وستم کی انتہا نہیں رہی۔ مسجدوں میں سور کاٹے گئے، گھوڑے باندھے گئے اور گھروں سے ڈھونڈ ڈھونڈ کر قرآن کے نسخے لاکر ان کی بے حرمتی کی گئی اور انھیں سرِ بازار جلایا گیا۔ مسلمان پردہ نشین عورتوں کی دن دھاڑے... عصمت دری کی گئی... مسجدوں اور دوسری مذہبی عمارات کو ڈھایا گیا [۳۳۷]۔

مولوی ذکاء اللہ نے اس منظر کو بیان کرتے ہوئے فارسی کے دوشعر بھی درج کیے ہیں۔ ان اشعار سے بھی اس تباہی و بربادی کی شدت کو محسوس کیا جاسکتا ہے۔ شعر ملاحظہ کیجیے:

همہ شہر بازار احمد نگر ۔۔۔ شداز صدمہء قہر و زیر و زبر
همہ کشتہ شد طمعہِ چار پائے ۔۔۔ نماند اندراں، مرز چیز نے بجائے [۳۳۸]

مورخ ہیگ نے بھی اپنی کتاب میں ان واقعات اور مظالم کی شہادت دی ہے۔ اس بابت ''تاریخ منظوم سلاطینِ بہمنیہ'' کے مولف کا بیان ہے کہ:

دم تیغ تھا اس قدر برق دم ۔۔۔ دکھاتا تھا ہر اک کو راہِ عدم
کیا دیو نے اس قدر قتلِ عام ۔۔۔ سروں کا تھا انبار ہر سو تمام
پئے قتلِ اسلام گاڑا قدم ۔۔۔ مساجد بھی اکثر کیے منہدم
تو پھر خانِ خاناں نے انجام کار ۔۔۔ فراہم کیا لشکرِ بے شمار
نہ کیوں شہ کو ہوتا غمِ دل خراش ۔۔۔ کہ پیری میں پہنچا تھا یہ زخمِ فاش [۳۳۹]

مسلمانوں کے لیے اس سے بڑھ کر اور کیا سانحا ہوگا کہ آپس کی نا اتفاقی نے اس با رونق شہر کو پل بھر میں اجڑے دیار میں تبدیل کر دیا۔ ان کے مقدس مقامات کی بے حرمتی ہوئی۔ ان کی عورتوں کی آبرو ریزی کی گئی اور یہ سب کچھ دوسری مسلم ریاستوں کے سامنے ہوتا رہا اور وہ لوگ خاموش تماشائی بنے رہے۔ علی عادل شاہ نے نظام شاہ بحری کے ساتھ مستقل لڑائیوں سے تنگ آ کر رام راج سے مدد طلب کی تھی لیکن اس سے وعدہ کیا تھا عام مسلمانوں کے قتل عام سے گریز کیا جائے گا، عورتوں کی عزتیں محفوظ رہیں گی اور مساجد کو نقصان نہیں پہنچایا جائے گا لیکن رام راج اپنی طاقت کے نشے میں مست وعدہ خلافی سے باز نہ آیا۔ ہندوؤں نے احمد نگر کے مسلمانوں کی تخریب وتعذیب کی، ان کی ہتک میں کوئی دقیقہ نہیں چھوڑا اور مساجد میں بت پرستی کرنے، گانا گانے اور آلات موسیقی بجانے سے بھی باز نہ آیا۔ اس صورتِ حال نے دشمنی کے باوجود علی عادل شاہ کو اندر ہی اندر رنجیدہ اور ملول کر دیا۔ اس کے اندر اتنی طاقت بھی نہیں تھی کہ وہ رام راج اور اس کی سپاہ کو ان مظالم سے روک پاتا[۳۴۰] لیکن دل ہی دل میں وہ رام راج سے کبیدہ خاطر ضرور ہو گیا۔

آپس کی ان جنگوں کے نتیجے میں جیسا کہ ذکر کیا گیا کہ دکن کی تینوں مسلمان حکومتیں کمزور سے کمزور تر ہوتی چلی گئیں۔ اکثر مسلم سلاطین رام راج کی خود سری اور مظالم کے باوجود اس سے صلح پر مجبور ہو جاتے۔ احمد نگر کے مظالم اور خوف ناک سانحے کے بعد حسین نظام شاہ بحری بھی حالات سے تنگ ہو کر رام راج سے صلح پر مجبور ہوا اور وجیانگر حاضر ہو کر سرِ عام دربار میں رام راج کے ہاتھ سے پان کا بیڑا لینا قبول کیا جو اس بات کی علامت تھی کہ وہ رام راج کو اپنے سے برتر اور بڑا حکم راں مانتا ہے[۳۴۱]۔ فرشتہ کا کہنا ہے کہ مسلمان بادشاہوں کی کمزور حالت کو دیکھ کر:

> رام راج کے غرور کا یہ عالم ہوا کہ مذہب اسلام کو اس قدر حقیر سمجھنے لگا کہ مسلمان ایلچیوں کو دربار میں آنے نہیں دیتا تھا اور اگر کبھی عنایت کر کے ان سے ملاقات کرتا تو بڑے تکبر وغرور کے ساتھ مسلمان ایلچیوں کو بہت دور تک پیادہ اپنی سواری کے ساتھ دوڑاتا[۳۴۲]۔

ہارون خاں شروانی نے درست لکھا کہ آپس کی لڑائیوں کا یہی نتیجہ ہوتا ہے کہ دونوں لڑنے والے اغیار کی نظروں میں ذلیل ہو جاتے ہیں۔ رام راج بھی تینوں مسلمان ریاستوں کے حکم رانوں کو ذلیل سمجھنے لگا تھا[۳۴۳]۔ رام راج اپنے مغلوب مسلمان حریفوں کی اسی طرح تحقیر کرتا تھا جس طرح کرشنا دیورایا نے اپنے مغلوب حریف اسماعیل عادل شاہ کی کی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ اس دور میں پورے جنوبی ہندوستان میں رام راج جیسا کوئی دوسرا حکم راں نہیں تھا۔ برتری کے اس زعم میں اس کا دماغ بھی ساتویں آسمان پر پہنچا ہوا تھا۔ عام مسلمانوں کی تحقیر کے ساتھ ساتھ وہ مسلمان سلاطین کے ساتھ بھی تحقیر آمیز سلوک کرنے لگا تھا۔ بات بات پر مسلم سلاطین کے سامنے مذہب اسلام کی توہین کرتا۔ اس کی دیکھا دیکھی عام ہندو بھی سرِ بازار مسلمانوں کی تحقیر اور اسلام کی توہین کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیتے[۳۴۴]۔ سید علی بلگرامی نے لکھا کہ رام راج کی:

> فوج احمد نگر سے واپسی کے وقت اپنے بے ہودہ غرور اور محض متکبرانہ کوتاہ اندیشی میں آ کر علی عادل شاہ کے امراء سے مسخرہ پن کرتی تھی اور مسلمانوں کو مجبوراً اس سے تجاہل عارفانہ کرنا پڑتا تھا[۳۴۵]۔

طاقت کے نشے میں چور رام راج نے بہت سے مسلم مقبوضہ علاقوں پر بھی قبضہ شروع کر دیا۔ اس کے جنگی رویے سے تنگ آ کر مسلم سلاطین اپنے اپنے ملک کا کچھ حصہ دے کر خون خرابے سے بچنے کی کوشش کرتے۔ عادل شاہی اور قطب شاہی ممالک پر دست

درازی کے نتیجے میں عادل شاہ نے ولایت ایتکری اور باگری کوٹ [۳۴۶] دے کر صلح کی اور ابراہیم قطب شاہ نے قلعہ کویل کنڈہ پانگل اور گنوا [۳۴۷] کے علاقے وینکٹاری کو دیے تا کہ اس بلا کو سر سے ٹالا جا سکے [۳۴۸]۔ رام راج کی سیاسی پالیسی کے متعلق میسور گزیٹیر کے مصنف کا بیان ہے کہ ''حقیقت میں رام راج اس وقت جنوبی ہند کا ڈکٹیٹر تھا جن کے اشاروں پر اس کے ہم سائے رقصاں رہتے [۳۴۹]۔ اس کی بڑھتی ہوئی ہٹ دھرمی اور مظالم نے بالآخر مسلمان حکمرانوں کو سوچنے پر مجبور کر دیا۔ عادل شاہی حکومت پر پہلے ہی رام راج کا دباؤ بڑھتا جا رہا تھا جس کی وجہ سے وہ انتقام کی آگ میں جل رہے تھے [۳۵۰]۔ لہٰذا علی عادل شاہ نے بے جانگر کے ہندوؤں سے مقابلہ کرنے کا منصوبہ بنانا شروع کر دیا۔ وہ مجبوراً رام راج سے صلح کیے بیٹھا ضرور تھا لیکن اوّل روز سے ہی اس کی بڑھتی ہوئی فوجی طاقت اور جنگی جنون علی عادل شاہ کے لیے خطرے کی علامت بنی رہی۔ فرشتہ نے تو اس جانب اشارہ کرتے ہوئے یہ تک لکھا کہ جب وہ رام راج کے بیٹے کی موت اور تعزیت کے غرض سے بے جانگر گیا تھا، اس وقت سے ہی وہ اس متکبر بادشاہ کے سلوک سے نالاں تھا۔ خصوصاً وہاں سے واپس روانہ ہوتے وقت جب رام راج نے اس کی تعظیم میں کھڑے ہو کر اس کے ساتھ چند قدم تک چلنا گوارا نہیں کیا اور صرف اپنے بھائیوں اور عزیزوں کو ہی اس کی خدمت پر مامور کیا تو یہ بات علی عادل شاہ کو بہت ناگوار گزری۔ وہ مصلحتاً اس وقت تو خاموش رہا لیکن دل ہی دل میں اپنی بے عزتی کا بدلہ لینے کی ٹھانی [۳۵۱]۔ بعد میں ہونے والے سانحات اور واقعات نے اس نفرت کو مزید بڑھایا۔ مثلاً محمود بنگلوری نے ایک واقعے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا کہ ایک روز بے جاپور کے سفیر نے رام راج کے دربار میں شکایت کی کہ محل کے ملازموں کی خوراک کے لیے جو سور لائے جاتے ہیں، وہ ہمیشہ سفیر بے جاپور کے دربار میں آتے وقت ہی لائے جاتے ہیں۔ اس شکایت کو سن کر رام راج نے جواب دیا کہ اس سے کیا فرق پڑتا ہے ''تم تو مرغ کھاتے ہو جو سوروں کے پاخانے سے اناج چن چن کر کھاتا ہے'' [۳۵۲]۔ سفیر نے احتجاجاً یہ واقعہ علی عادل شاہ کے گوش گزار کیا۔ علی عادل شاہ اس مذہبی توہین کو برداشت نہ کر سکا اور رام راج کے خلاف جنگ کر کے اس کے غرور کو خاک میں ملانے کا فیصلہ کیا۔ علی عادل شاہ نے اس منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے سلطنت کے امراء کی مجلس مشاورت منعقد کی اور امراء کے سامنے مدعا بیان کیا اور رائے طلب کی۔ درباری امراء میں دو انتہائی قریبی معتمد محمد کشور خاں اور ابوتراب خاں شیرازی نے مشورہ دیا کہ کشنا سے لے کر راس کماری تک پھیلی ہوئی رام راج کی سلطنت کو تنہا شکست دینا آسان نہیں بلکہ دیگر مسلمان سلاطین کو ساتھ ملانا ضروری ہے [۳۵۳]۔ یہ دونوں عقل مند وزرا علی عادل شاہ کو اس بات پر قائل کرنے میں کامیاب رہے کہ جب تک سلاطین اسلام متحد ہو کر طاقت ور دشمن سے بچنے کی کوشش نہیں کریں گے، دشمن ان پر حاوی رہے گا [۳۵۴]۔ علی عادل شاہ نے محمد کشور خاں کو اختیار دیا کہ وہ اس مقصد کے حصول کے لیے جو تدابیر مناسب سمجھے، اس عمل میں لائے [۳۵۵]۔ محمد کشور خاں نے منصوبے پر عمل شروع کر دیا اور علی عادل شاہ کی جانب سے ایک قاصد ابراہیم قطب شاہ کی طرف روانہ کیا۔ ابراہیم قطب شاہ پہلے ہی بے جانگر کے مظالم سے تنگ آ چکا تھا۔ اس نے آپس کے اتفاق کو غنیمت جانا اور ساتھ ہی ایسی کوشش شروع کی جس سے علی عادل شاہ اور حسین نظام شاہ کی دشمنی کا بھی خاتمہ ممکن ہو۔ اس شولا پور کے متنازعہ قلعے کا مسئلہ بھی حل کرنے کی کوشش کی۔ ابتدائی طور پر سید گھرانے کے ایک بزرگ مصطفیٰ خاں اردستانی بے جاپور گئے تا کہ علی عادل شاہ کے ارادے کی پختگی کو جانچ سکیں۔ اس کے بعد وہ احمد نگر گئے اور حسین نظام شاہ بحری کو سمجھانے کی کوشش شروع ہوئیں [۳۵۶]۔ بالآخر یہ کوششیں رنگ لائیں۔ اس اتفاق واتحاد کو مزید مستحکم کرنے کے لیے حسین نظام شاہ بحری نے احمد نگر کے رؤسا حکیم قاسم بیگ تبریزی اور ملا عنایت اللہ قاینی کے مشورے سے اپنی بیٹی چاند بی بی کا نکاح علی عادل شاہ سے

کرادیا اور قلعہ شولا پور اسے جہیز میں دے دیا[۳۵۷]۔ اس طرح اس قلعے کا تنازعہ ختم کرنے کی کوشش کی۔ دوسری طرف علی عادل شاہ نے اپنی بہن ہدیہ سلطان کا نکاح حسین نظام شاہ کے بیٹے شہزادہ مرتضٰی سے کر دیا[۳۵۸] اور جہیز میں شہر کلیان اسے دے دیا[۳۵۹]۔ اس شادی کے نتیجے میں احمد نگر اور بے جاپور کے درمیان نئے سیاسی اتحاد نے جنم لیا اور یہ سیاسی اتحاد بہت مضبوط ہو گیا[۳۶۰]۔ اس سیاسی اتحاد کا ایک فائدہ یہ بھی ہوا کہ یہ تمام مسلم ریاستیں جو بلحاظ عقیدہ سنّی اور شیعہ میں بٹی ہوئی تھیں، اپنے اپنے اختلافات مٹا کر اسلام کے نام پر پھر سے متحد ہو گئیں۔ ظاہری بات ہے اس اتحاد کی بنیاد والیِ بے جاپور علی عادل شاہ نے رکھی[۳۶۱] لیکن "Resurreetionof Vijay Nagar" کے مصنف کا خیال ہے کہ: ''اتحاد کی بنیاد حسین نظام شاہ نے رکھی...علی عادل شاہ اس اتحاد میں شامل ہونے سے کترا تا رہا۔ اس نے رام راج سے بہت سے مواقع پر مدد لی تھی لیکن وہ اس موقع سے فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔ اس لیے اس نے اس نازک صورتِ حال میں مدگل اور رائچور کی واپسی کا مطالبہ رام راج سے کر دیا۔ رام راج نے علی عادل شاہ کے سفیر کو سرِ دربار ذلیل اور بے عزت کر کے نکال دیا۔ اس خبر کے بعد علی عادل شاہ بھی اس اتحاد میں شامل ہو گیا''[۳۶۲]۔

مورخ ہیگ نے بھی تقریباً یہی بات دہرائی ہے لیکن درست صورتِ حال وہی ہے جو مذکورہ صفحات میں بیان کی جا چکی ہے کیوں کہ مدگل اور رائچور کی واپسی کا مطالبہ تو میدان جنگ میں پہنچنے کے بعد دہوا تھا اور اتحاد اس سے پہلے قائم ہو چکا تھا۔ دراصل مسلمان سلاطین نے اس بات کو اچھی طرح سمجھ لیا تھا کہ ان کے باہمی اختلاف کے نتیجے میں رام راج ہمیشہ فائدہ اٹھاتا رہے گا[۳۶۳]۔ بعض مورخین نے لکھا کہ یہ صرف تین سلاطین علی عادل شاہ، حسین نظام شاہ اور ابراہیم قطب شاہ کا اتحاد تھا لیکن سید علی بلگرامی کا کہنا ہے کہ اس اتحاد میں علی برید شاہ بھی ان کے ساتھ شریک ہو گیا تھا[۳۶۴]۔ مولوی ذکاء اللہ نے بھی اس کی تائید کی ہے۔ غرض کہ اس اتحاد نے رام راج کے غرور وتکبر کو خاک میں ملانے کی غرض سے جنگی تیاریاں شروع کیں۔ مولوی ذکاء اللہ کا بیان ہے کہ ''۱۵۶۵ء میں وعدے کے موافق چاروں بادشاہوں نے والیِ بے جاپور میں ملاقات کی اور ۲۰ جمادی الاوّل کو یہاں سے لڑنے کے ارادے سے کوچ کیا[۳۶۵]۔ جب کہ مولوی بشیر الدین کا کہنا ہے کہ ۲۵ دسمبر ۱۵۶۴ء یوم دوشنبہ کو یہ لوگ جنگ کے لیے روانہ ہوئے[۳۶۶]۔ غالباً یہی تاریخ قرین قیاس ہے۔ مورخ فرشتہ سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ رام راج کو اسلامی لشکر کی آمد کا پتا چلا تو اس نے اس بات کو کوئی خاص اہمیت نہیں دی۔ اس نے اس جنگ کو بچوں کا کھیل سمجھا۔ سفر کی منزلیں طے کرنے کے بعد مسلمانوں کا لشکر دریائے کرشنا کے کنارے بالنکوتھہ کے نواح پر پہنچا۔ یہ علاقہ علی عادل شاہ کے قبضے میں تھا[۳۶۷]۔ اسی دریا کے قریب ''تالی کوٹہ'' وہ مقام ہے جو اس عظیم لڑائی کی وجہ سے جنوبی ہند کی تاریخ میں بے حد مشہور ہے[۳۶۸]۔ ۲۶ دسمبر ۱۵۶۴ء کو یہ لشکر تالی کوٹ کے مقام پر پہنچا۔ رام راج نے اپنے بھائی ترول کو اسلحہ سے لیس کر کے ایک بڑی فوج کے ساتھ دریائے کرشنا کی حفاظت پر مامور کیا تا کہ اسلامی لشکر دریا عبور نہ کر سکیں[۳۶۹]۔ مورخ ہیگ نے اپنی کتاب ''ہسٹورک لینڈ مارک آف دی دکن'' میں لکھا کہ مسلمانوں نے سراغ رسانوں کو بھیجا کہ دریا پار اترنے کا کوئی راستہ تلاش کریں۔ راستہ مناسب وہی تھا جو اس وقت مسلمانوں کے سامنے تھا لیکن مشہور کیا گیا کہ شمال کی طرف سے دریا عبور کیا جائے گا۔ حکمت عملی کے تحت بیس ہزار سواروں کو چھپا کر بقیہ کو شمال کی جانب کوچ کا حکم دیا۔ اس حکمت عملی کے نتیجے میں رام راج کی فوج کو دھوکا ہوا اور وہ سامنے کے حصے کو کھلا چھوڑ کر آگے بڑھے۔ مسلمانوں کی چال کامیاب رہی۔ مسلمانوں کو اپنی بہتر حکمت عملی کی وجہ سے پے در پے کامیابی ملی جب کہ تعداد کے اعتبار سے مسلمان، ہندوؤں کے مقابلے میں نصف بھی نہیں تھے[۳۷۰]۔ ہندوؤں کی جنگی تیاریوں کے حوالے سے "Resurreetion

"of Vijay Nagar" کے مصنف کا بیان ہے کہ ''ہندو فوج کا کیمپ اس قدر بڑا تھا کہ وجیا نگر میں جس ہندو کے پاس بھی گھوڑا تھا وہ فوج میں داخل ہو گیا''[۳۷۱]۔ یہ لشکر مختلف صوبوں سے جمع کیا گیا تھا اور یہ فوج اپنے اپنے سرداروں کے ماتحت تھی[۸۰۷]۔ گوٹو نے ہندو فوج کے بارے میں لکھا کہ اس جنگ میں چھے لاکھ پیادے اور ایک لاکھ سوار جمع تھے جب کہ مسلمانوں کے پاس اس کی آدھی فوج بھی نہ تھی[۳۷۲]۔ پرتگالی مورخین لکھتے ہیں کہ ہندوؤں کے پاس نو ہزار پیدل سپاہی اور ستر ہزار فوج تھی اور مسلمانوں کے پاس پچاس ہزار سوار اور تیس ہزار پیادے تھے[۳۷۴]۔ فرشتہ نے بے جانگر کی ہندو افواج کی تعداد ۹ لاکھ پیدل اور ۴۵ ہزار سوار کے علاوہ دو ہزار زنجیر فیل اور متفرق امدادی فوج پندرہ ہزار تک درج کی ہے۔ فرشتہ کے یہاں تعدادِ افواج کے بارے میں تضاد پایا جاتا ہے[۳۷۵]۔ اس کی بتائی ہوئی تعداد کے درست ہونے میں شک پیدا ہوتا ہے تاہم یہ بات یقینی ہے کہ ہندو افواج کی ایک بہت بڑی تعداد اس جنگ میں شریک تھی۔ غالباً دکن کے تین سو سالہ مسلم سلاطین کے دورِ حکومت میں اس سے بڑی تعداد کسی اور جنگ میں جمع نہیں ہوئی۔

مسلم اور ہندو مورخین کے درمیان اس جنگ کے نام میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے۔ تالی کوٹ کے اس معرکے کو کنٹری اور مراٹھی کے مورخین نے ''رُکساس ٹگڑی کی جنگ'' کے نام سے درج کیا ہے کیوں کہ یہ جنگ موضع رکساس جی اور ٹگڑی کے درمیانی میدان میں ہوئی تھی[۳۷۶]۔ جب کہ تالی کوٹ دریائے کرشنا سے ۲۵ میل شمال کی جانب واقع ہے[۳۷۷]۔ محمود بنگلوری نے سہواً یہ فاصلہ ۳۵ میل درج کیا ہے[۳۷۸]۔ مولوی بشیر الدین کا خیال ہے کہ لڑائی کے صحیح مقام کے بارے میں کوئی حتمی رائے دینا مشکل ہے لیکن اغلب یہی ہے کہ یہ مقام مدگل ہوگا جہاں ایک مشہور قلعہ ہے اور جو دریائے کرشنا کے شمال اور دریائے تنگ ھدرا کے جنوب میں واقع ہے[۳۷۹]۔ ناموں کے اختلاف کی وضاحت کرتے ہوئے نیل کنٹھ شاستری کا بیان ہے کہ: ''ہندو کیمپ دریائے کرشنا کے جنوبی کنارے پر واقع تھا۔ چوں کہ یہ دونوں گاؤں راکشی اور تانگڑی دریائے کرشنا کے شمالی کنارے سے دس میل پر واقع تھے اور تالی کوٹ کے مقابلے میں زیادہ نزدیک تھے اس لیے بعض مورخین نے اس جنگ کو تالی کوٹ کی جنگ نہ کہہ کر ''راکشسی تانگڑی'' کی جنگ[۳۸۰] کہا ہے۔ ہندو مورخین اس بات پر حیرانی کا بھی اظہار کرتے ہیں کہ جب میدان جنگ سے تالی کوٹ کا مقام اس قدر فاصلے پر ہے تو اس جنگ کو تالی کوٹ سے کیوں منسوب کیا گیا ہے[۳۸۱]۔ حالاں کہ یہ حیرانی بھی عجیب ہے کیوں کہ وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ اس جنگ کے فاتح مسلمان تھے اور ان کی افواج نے ایک ماہ سے زیادہ عرصے تک تالی کوٹ کے مقام پر ہی قیام کیا تھا۔ اسی لیے اکثر مورخین نے اس جنگ کا نام تالی کوٹ لکھا۔ مولوی ذکاء اللہ نے تو اس کی وضاحت کرتے ہوئے یہ لکھا بھی کہ اس کا سبب یہ ہے کہ اکثر بادشاہوں کا صدر مقام یہاں تھا ورنہ لڑائی کرشنا کے جنوبی کنارے پر یہاں سے بیس کوس پر واقع ہوئی[۳۸۲]۔

بعض ہندو مورخین نے میدانِ جنگ میں پیش آنے والے واقعات کے بیان میں بھی غلو سے کام لیا ہے۔ اس مقام پر ہندوؤں اور مسلمانوں کے لشکر کے درمیان جو ابتدائی جھڑپیں ہوئیں اس میں مسلمانوں کو کافی نقصان اٹھانا پڑا لیکن مورخین کا یہ کہنا کہ میدانِ جنگ میں ان مسلم سلاطین کے لشکر میں بھی پھوٹ پڑ گئی اور وہ لوگ فرار تلاش کرنے لگے، سراسر دروغ گوئی کے سوا کچھ نہیں۔ جیسا کہ نیل کنٹھ شاستری نے لکھا کہ ان جھڑپوں میں ''نظام شاہ اور قطب شاہ کی زبردست ہار ہوئی اور انھوں نے چال چلنے کی سوچی۔ انھوں نے مشہور کر دیا کہ وہ طاقت ور رام راج سے دوستی کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اس سلسلے میں انھوں نے بات چیت بھی شروع کر دی تھی... انھوں نے شاید رام راج کی فوج کے مسلم افسروں کے ساتھ بھی گفت وشنید کی۔ جب ہر طرح سے تیاری مکمل ہو گئی تو مسلم فوج کے مخصوص دستے

نے دھوکا دے کر دریا عبور کرلیا جس کی وجہ سے ہندو فوج کو گھاٹ کی حفاظت کے لیے آگے بڑھنا پڑا۔ اس کے بعد مسلم فوج ہندو کیمپ پر حملہ کرنے کے لیے آگے بڑھی۔ اگر چہ رام راج پر یہ حملہ اچانک ہوا تھا لیکن وہ دفاع کرنے میں کامیاب ہوگیا[۳۸۳]۔

مذہبی تعصب کی وجہ سے شاستری نے دریا پار کرنے کے حوالے سے مسلمانوں کی حکمت عملی کو دھوکا قرار دیا ہے جب کہ مورخ فرشتہ نے بھی اس جانب اشارہ کرتے ہوئے لکھا کہ مسلمان افواج نے یہ افواہ اڑائی کہ وہ اس طرف سے دریا پار کرنے والے ہیں جو ذرا فاصلے پر اور دشوار راہ داری ہے اور جب رام راج کی فوج اس جانب روانہ ہوگی تو با آسانی دریا پار کر کے دوسری جانب پہنچ گئے۔ جہاں تک رام راج سے دوستی کے حوالے سے شاستری کا موقف ہے، یہ بات مضحکہ خیز معلوم ہوتی ہے۔ اتنی بڑی فوج کا آمنے سامنے جمع ہو جانا اور پھر حسین نظام شاہ اور قطب شاہ کا مسلمانوں سے غداری کر کے رام راج سے دوستی کا ہاتھ بڑھانا سوائے مبالغے کے اور کچھ نہیں۔ شاستری غالباً اس بات کو بھول گئے کہ یہ تمام سلاطین رام راج کے کس قدر ستائے ہوئے تھے اور ان کے دل میں رام راج کے خلاف کس قدر نفرت بھری ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ رام راج کی فوج کے مسلم افسران والی بات بھی تاریخی حقائق کو مسخ کرنے کی کوشش ہے کیوں کہ رام راج جیسے مسلم دشمن نظریات کے حامل راجا کی فوج میں مسلم افسران کا ہونا ہی ایک سوالیہ نشان ہے اور خود شاستری بھی اس بارے میں مخمصے کا شکار ہیں یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اس جملے کے شروع میں ''شاید'' کا لفظ استعمال کیا ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ جنگ کی ابتداء میں جیسا کہ مسلمانوں کا طریقہ رہا ہے کہ پہلے صلح کی کوشش ضرور کی جائے اور دشمنوں کے سامنے اپنے مطالبات رکھے جائیں، یہ کوشش ضرور کی گئی۔ اس کی تائید فرشتہ[۳۸۴] اور پھر مولوی زکاء اللہ نے بھی کی ہے[۳۸۵]۔ علی عادل شاہ کے ایلچی کے ساتھ رام راج نے جو سلوک کیا وہ تاریخ کے اوراق میں درج ہے بلکہ اس نے تو یہ دھمکی تک دے ڈالی کہ ''اگر تو ایلچی نہ ہوتا تو ابھی قتل کرا دیتا''[۳۸۶] اور اس کے بعد بے عزت کر کے اسے نکال دیتا وغیرہ ایسے حقائق ہیں جسے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ ظاہر سی بات ہے کہ جنگ کے آغاز سے قبل یہ ساری کوششیں ضرور ہوئیں۔ لہٰذا شاستری کا یہ بیان بھی غلط معلوم ہوتا ہے کہ حملہ اچانک ہوا کیوں کہ انھوں نے خود سیول اور فرشتہ کا حوالہ دے کر لکھا کہ ''فیصلہ کن جنگ ۲۳ جنوری ۱۵۶۵ء کو ہوئی''[۳۸۷]۔ اب ذرا سوچیے کہ ۲۵ دسمبر ۱۵۶۴ء سے شروع ہونے والی جنگ ۲۳ جنوری ۱۵۶۵ء تک تقریباً ایک ماہ کا عرصہ گزار چکی ہے تو اس جملے کو ''اچانک'' کیوں کر کہا جاسکتا ہے۔ یہاں یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ فرشتہ نے فیصلہ کن جنگی معرکے کے حوالے سے ایسی کوئی تاریخ درج نہیں کی جس کا ذکر شاستری نے کیا ہے۔ البتہ مولوی بشیر الدین نے یہی تاریخ درج کی ہے[۳۸۸]۔

اس معرکے میں رام راج اور اس کے دونوں بھائی شریک تھے[۳۸۹]۔ رام راج کی عمر اس وقت ۸۰ برس کی تھی۔ تھا تو وہ بوڑھا مگر اس میں جوانوں کی سی ہمت تھی۔ اس نے سنگھاسن (پالکی) میں سوار ہو کر جنگ میں جانے کا ارادہ کیا۔ مشیروں نے گھوڑوں پر سوار ہونے کے لیے اصرار کیا لیکن اپنے تکبر اور غرور کی وجہ سے اس نے اس پیش کش کو قبول نہ کیا اور معرکے کو بچوں کا کھیل سمجھا[۳۹۰]۔ فوج کے مرکزی حصے کی کمان اس نے خود کی۔ اس کے مدمقابل حسین نظام شاہ تھے۔ بائیں جانب کی کمان اس کے بھائی ترومل نے کی جس کے مدمقابل علی عادل شاہ کے زیر کمان مسلمان فوج تھی جب کہ دائیں طرف کی فوج اس کے بھائی وینکٹ دری کے زیر کمان ہندو فوج تھی جس کے مدمقابل احمد نگر، گول کنڈا اور بیدر کے سلطان تھے۔ شروع میں ہندو افواج کو واضح برتری حاصل رہی[۳۹۱]۔ ہندو اور مسلم افواج ایک دوسرے کو خاک وخوں میں ملانے کے لیے بے چین تھے۔ رام راج تو گھمنڈ اور غرور کے نشے میں چور ہو کر اپنے لوگوں کو حکم دے رکھا تھا

کہ حسین نظام شاہ کا سر کاٹ کر اس کے سامنے پیش کریں اور علی عادل شاہ اور ابراہیم قطب شاہ، بادشاہانِ بے جاپور اور گول کنڈا کو زندہ پکڑ کر لائیں تا کہ وہ ان کو بقیہ عمر لوہے کے پنجرے میں قید رکھ سکے[۳۹۲]۔ اسے اس بات کا بالکل بھی اندازہ نہیں تھا کہ اس بار مسلمان سلاطین مصمم ارادے کے ساتھ میدان جنگ میں اترے ہیں۔ اس نے جب یہ دیکھا کہ مسلمان فوج اس کے اندازے اور خیال کے برعکس بہت بہادری سے جنگ میں مصروف ہیں تو اسے پہلی بار خوف محسوس ہوا[۳۹۳]۔ اپنی فوج کو ہمت دلانے کی غرض سے وہ پالکی سے اترا اور ایک مرصع تخت پر روپے، پیسے اور ہیرے جواہرات کے انبار لگا دیے اور اعلان کیا کہ کوئی اسلامی لشکر کو مغلوب کر کے میرے پاس واپس لوٹے گا اسے طبق ہائے طلائی اور بے شمار جواہر دیے جائیں گے[۳۹۴]۔ اس حکمت عملی کا خاطر خواہ نتیجہ نکلا۔ ہندوؤں کی فوج میں تازہ روح بیدار ہوگئی اور انھوں نے مسلمانوں کے خلاف شدید حملے شروع کیے[۳۹۵]۔ بقول بلگرامی ''بے جانگر کے پیادوں نے قیامت مچا دی۔ ہر مرتبہ تقریباً پچاس ہزار بان اور بندوق ضر بزن وتوپ کے گولے، گولیاں ان کی فوج سے چھوٹتی کہ سپاہ اسلام کے پیرا کھڑ کر رہ گئے[۳۹۶]۔ حملے کی شدت اور مسلمان فوج کو پہنچنے والے نقصان کو دیکھ کر مسلمان بادشاہ فتح سے قطعی مایوس ہو گئے تھے۔ اس صورتِ حال میں حسین نظام شاہ بحری کا کردار بہت اہم رہا۔ اس نے بڑی بہادری سے کام لیا اور جواں مردی کا مظاہرہ کرتے ہوئے دشمنوں کو چیرتا ہوا آگے بڑھا۔ اس دوران محمد کشور خاں بھی حسین نظام شاہ کی مدد کو پہنچ گیا[۳۹۷]۔ حسین نظام شاہ نے بہترین جنگی صلاحیتوں کا مظاہرہ کرتے ہوئے داروغہِ توپ خانہ رومی خان کو حکم دیا کہ ''ملک میدان'' جو کہ نظام شاہیوں کا خاص توپ تھا، اس میں پیسے بھر کر دشمن پر گولا باری کی جائے۔ لہٰذا ایسی گولا باری ہوئی جیسے درختوں کے پتے گرتے ہیں۔ ہندو فوج اس گولا باری کے نتیجے میں ہلاک وزخمی ہو کر گرنے لگے۔ پہلے ہی حملے میں دشمنوں کے پانچ ہزار سپاہی توپ خانے کے سامنے مردہ پڑے تھے۔ اتنی بھاری ہلاکتوں سے ہندو افواج میں سنسنی پھیل گئی۔ اس کے علاوہ مسلمان افواج سے پانچ ہزار سوار بھی ہندوؤں کے لشکر کو مارتے کاٹتے اس مقام تک پہنچ گئے جہاں رام راج براجمان تھا[۳۹۸]۔ اس دوران حسین نظام شاہ کے لشکر سے غلام علی نامی ایک مست ہاتھی بھی سنگھاسن کے قریب پہنچ گیا اور لوگوں کو پامال کرنے لگا۔ سنگھاسن کے مزدور، سنگھاسن مع رام راج کو زمین پر پھینک کر اپنی جان بچانے کے غرض سے بھاگے[۳۹۹]۔ اس افراتفری کے نتیجے میں رام راج بے یار و مددگار اکیلا میدانِ جنگ میں پڑا تھا۔ فیل بان نے جو مرصع پالکی دیکھی تو دل میں لالچ آئی۔ ہاتھی پالکی کی جانب بڑھا۔ رام راج کو اتنی مہلت بھی نہ مل سکی کہ وہ گھوڑے پر سوار ہو کر بھاگتا۔ مسلمان افواج نے پوری طرح اسے نرغے میں لے رکھا تھا۔ رام راج کے ایک مقرب ولیت رائے نے حق رفاقت ادا کرتے ہوئے رام راج کو اپنی آڑ میں لے کر مہاوت کو لالچ دی۔ فیل بان نے مہاراج کا نام سنتے ہی ہاتھی کو اشارہ کیا جس نے رام راج کو اپنی سونڈ میں اٹھالیا۔ اس کے ہاتھ جیسے کھویا ہوا خزانہ لگ گیا ہو۔ بجلی کی سی تیزی کے ساتھ واپس دوڑا اور مسلم لشکر میں جا داخل ہوا۔ اس نے رام راج کو داروغہِ توپ رومی خاں کے حوالے کیا اور رومی خاں نے رام راج کو بادشاہ احمد نگر حسین نظام شاہ کے روبرو پیش کیا۔ حسین نظام شاہ کو اس قدر جلدی اتنی بڑی کامیابی کی توقع نہیں تھی۔ اس نے رام راج کو اپنے سامنے بٹھا کر پوچھا کہ ''مہاراج کیا حال ہے'' تو رام راج نے محض اشارہ کر کے اسے تقدیر کی گردش قرار دیا۔ حکیم قاسم بیگ تبریزی جو نظام شاہ کے قریبی مقرب تھے، نے مضطرب ہو کر بادشاہ سے عرض کیا کہ یہ باتیں کرنے کا وقت نہیں۔ علی عادل شاہ اس کی فرزندی کا دم بھرتا رہا ہے۔ اسے خبر ملے گی تو نہ جانے کیا صورتِ حال پیش آئے[۴۰۰]۔ حسین نظام شاہ نے موقع کی نزاکت سمجھتے ہوئے فوراً رام راج کا سر تن سے جدا کر دیا[۴۰۱]۔ اور اسے ایک بلند نیزے پر چڑھوا کر ہنود کے لشکر کے سامنے بلند کر دیا۔ نیزے پر سر کا چڑھنا تھا

کہ بے جانگر کے لشکر میں عجیب بھگدڑ اور کھلبلی مچ گئی۔ ہندو افواج کے رہے سہے حواس بھی جاتے رہے۔ایسی بھگدڑ مچی کہ خدا کی پناہ۔ اس بھگوڑی فوج کے پیچھے مسلمانوں کے لشکر نے بارہ کوس تک تعاقب کیا[۴۰۲]۔ جنگ میں آخر کار مسلمانوں کو فتح ہوئی[۴۰۳]۔ میسور گزیٹیر کے مصنف نے ہندوؤں کی شکست کی وجہ رام راج کی فوج کے مسلمان جنرلوں کی غدّاری کو قرار دیا ہے۔اس کا کہنا تھا کہ جب رام راج کی صفوں میں ابتری پھیلی تو یہ دونوں مسلمان جرنیل موقع سے فائدہ اٹھا کر دشمن سے مل گئے[۴۰۴]۔اسی تقلید میں شاستری نے لکھا کہ:

> قریب قریب ہندو فوج کی جیت ہوگئی تھی لیکن جب رام راج کی فوج کے دو مسلم سپہ سالار جن میں ہر ایک کے تحت ستر اسّی ہزار فوج تھی، ٹوٹ کر مسلمانوں سے جا ملے تو جنگ کا نقشہ ہی پلٹ گیا۔فریڈرک سیزر کا بیان ہے کہ ''جب دونوں فوجیں لڑتے لڑتے مل گئیں تو لڑائی بہت کم وقت تک چلی۔لڑائی چار گھنٹے بھی نہ چل سکی کیوں کہ جب لڑائی زوروں پر تھی تو دو غدار کپتانوں نے اپنی فوج کے ساتھ اپنے بادشاہ کی طرف منھ موڑ لیا اور بقیہ فوج میں ایسی بدنظمی پھیلی کہ وہ حیران ہو کر بھاگ کھڑی ہوئی[۴۰۵]۔

محمود خاں بنگلوری نے میسور گزیٹیر کے اس بیان پر اعتراض کرتے ہوئے لکھا کہ: ''ہراس نے یہ روایت سیزر فریڈرک سے لی ہے جو اس جنگ کے ایک برس بعد وجیانگر آیا تھا[۴۰۶]۔ جب کہ مولوی ذکاء اللہ کا کہنا ہے کہ وہ اس واقعے کے دو برس کے بعد وجیانگر آیا[۴۰۷]۔ ہراس، شاستری اور ان کے ہم خیال دیگر مورخین کا، اس واقعے کے گزرنے کے کافی عرصے بعد آنے والے سیزر فریڈرک کی سنی سنائی بات پر یقین کرنا اور اسلامی مورخوں کی روایات خصوصاً فرشتہ وغیرہ کی روایت پر یقین نہ کرنا محض تعصب اور جانب داری نہیں تو اور کیا ہے۔غالباً فرشتہ اس وقت ''بے جاپور میں موجود تھا۔اس کو جو اطلاعات ملتی تھیں وہ صحیح ملتی تھیں۔ممکن ہے وہ میدانِ جنگ میں بھی موجود ہو۔اس کی دیانت کا حال یہ ہے کہ وہ اپنے آقا علی عادل شاہ کی رعایت بھی نہیں کرتا۔اس نے اس جنگ کی فتح کا سہرا حسین نظام شاہ کے سر باندھا ہے۔اگر چہ یہ اس کے لیے آسان تھا کہ وہ اپنے آقا کو خوش کرنے کے لیے حسین نظام شاہ کو نظر انداز کر دے''[۴۰۸]۔ نہ صرف فرشتہ نے بلکہ تمام ہی مورخین نے اس فتح کا سہرا حسین نظام شاہ کے سر باندھا ہے۔دکن کی منظوم فارسی تاریخوں میں بھی اس کی روایت

سرِ کُشتہ را چوں ز نزدیک شاہ — بُبر دند برنیزہ تا رزم گاہ
ہنر برانِ لشکر پسِ آں دلیر — ہماں حملہ کر دند چوں نرِّ شیر
بہ ہندو غریواندر افتاد باک — فگند ند یکسر تن اندر بہ خاک[۴۰۹]

لہٰذا اس بات میں کوئی شک نہیں رہتا کہ مسلمان افواج کو یہ فتح حسین نظام شاہ کی بہادری اور جواں مردی کی بدولت نصیب ہوئی۔ایسا محسوس ہوتا ہے کہ سیزر فریڈرک کی سنی سنائی ان روایات پر زور دے کر اکثر ہندو مورخین اس فتح کا سہرا حسین نظام شاہ اور دیگر سلاطین دکن سے بزور قلم چھین لینا چاہتے تھے۔مذکورہ وضاحتوں کے بعد ایک بات تو واضح ہے کہ سیزر فریڈرک کی یہ روایت کچھ زیادہ قابل اعتبار نہیں۔اس روایت پر یقین نہ کرنے کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ کرسنا دیورایا اور رام راج کے رویے اور مسلمانوں کے ساتھ دشمن جیسے سلوک کے بعد اس بات کا یقین کیوں کر کیا جائے کہ اس ہندو راج میں کوئی مسلمان سپہ سالار وجیانگر کی فوج میں ملازم ہو۔تیسرا ثبوت یہ ہے کہ حسن شوق نے جو اس وقت حسین نظام شاہ کے دربار سے وابستہ تھے۔انھوں نے اس پورے واقعے کو اپنی مثنوی ''فتح نامہ

نظام شاہ'' میں قلم بند کیا ہے۔ انھوں نے اس سانحے کے ایک ایک پہلو کو بڑی وضاحت سے اس مثنوی کا موضوع بنایا ہے لیکن کہیں بھی ہندو فوج کے ان دو مسلم جرنیلوں کا ذکر نہیں کیا۔ البتہ اس مثنوی کو پڑھ کر رام راج کی شخصیت کے بارے میں جو تاثر قائم ہوتا ہے اس کو بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر جمیل جالبی یہ لکھنے پر مجبور ہوئے کہ رام راج کی شخصیت میں ''چھچھورپن اور گھمنڈ ہے جس میں دولت و طاقت کا ایسا نشہ ہے کہ وہ کسی کو خاطر میں نہیں لاتا، جو انتہائی ظالم، سفاک، متکبر، سخت، متعصب، تنگ نظر، بدتہذیب اور غصیل ہے''[۴۱۰]۔

اب ایسے تنگ نظر اور متعصب ہندو حکم راں کی ریاست میں کسی مسلمان کا رہنا ہی ناممکن تھا چہ جائے کہ فوج کا اتنا بڑا عہدہ کسی مسلمان کے پاس ہو۔ کرشنا دیورایا کی حکم رانی سے قبل وجیانگر میں مسلمانوں کے قیام کے شواہد ضرور ملتے ہیں[۴۱۱]۔ لیکن ایسی شہادتیں بھی ملتی ہیں کہ کرشنا دیورایا کے عہد میں تمام مسلمانوں کو جلاوطن کر دیا گیا تھا اور وجیانگر کے علاقے مسلمانوں کے لیے ممنوعہ علاقے تصور کیے جاتے تھے[۴۱۲]۔ پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ رام راج کی فوج میں فوج کے مسلم سردار ہوں جن کی غداری اور دھوکے کی وجہ سے اسے شکست ہوئی ہو۔ سیزر فریڈورک کا غداری کے مرتکب ان دو سرداروں کے نام نہ بتانا بھی اس کے بیان کی صداقت پر بہت بڑا سوالیہ نشان ہے[۴۱۳]۔ مورخ ہیگ نے اس جانب اشارہ کرتے ہوئے درست لکھا کہ: ''یہ حسین نظام شاہ کا استقلال تھا جس نے اس دن ناکامیابی کو کامیابی میں بدل دیا''[۴۱۴]۔ رام راج اور ہندوؤں کی اصلی شکست دراصل رومی خاں کے توپ کی گولا باری اور رام راج کے قتل کی وجہ سے ہوئی تھی اور اس گولا باری کا حکم جیسا کہ مذکورہ صفحات میں ذکر کیا گیا کہ حسین نظام شاہ نے دیا تھا۔ اس حملے کے نتیجے میں ہندو فوج کا بڑھتا ہوا سیلاب نہ صرف رکنے پر مجبور ہوا بلکہ انتشار کا شکار بھی ہوا۔ لہٰذا اس فتح کا سہرا حسین نظام شاہ کے سر ہی باندھنا درست ہے۔

نظام شاہ نے جب رام راج کی گردن اڑائی اور اس میں گھانس بھروا کر ہند افواج کے سامنے لہرایا[۴۱۵] تو ہندو افواج میں زبردست ابتری پھیلی۔ اپنی شکست کو سامنے دیکھ کر رام راج کے بھائی وینکٹ دری اور ترملا نے بھی راہ فرار اختیار کرنے میں ہی عافیت جانی۔ دورانِ جنگ ترملا کی آنکھ بھی ضائع ہو چکی تھی[۴۱۶]۔ مسلمان افواج نے ہندو افواج کا تعاقب کر کے اس قدر مارا کہ کئی کوس تک زمین سرخ ہو گئی[۴۱۷]۔ ایک روایت کے مطابق اس معرکے میں تین لاکھ ہندو تہ تیغ کیے گئے لیکن یہ بات درست نہیں[۴۱۸]۔ میسور گزیٹیر کے مصنف نے برہان مآثر کی روایت پر زور دے کر مرنے والے ہندوؤں کی تعداد صرف ۹ ہزار بتائی ہے[۴۱۹]۔ فرشتہ کا بیان ہے کہ معرکہ کارزار میں جس میں مقابلہ اور تعاقب دونوں داخل ہیں، ایک لاکھ ہندو مارے گئے[۴۲۰]۔ تاریخ رشید الدین خانی میں بھی یہی تعداد درج ہے[۴۲۱]۔ مولوی بشیر الدین[۴۲۲] محمود خاں بنگلوری[۴۲۳] اور نیل کنٹھ شاستری وغیرہ نے بھی فرشتہ کی بتائی ہوئی تعداد کو دہرایا ہے[۴۲۴]۔ معرکے میں مسلمانوں کو زر و جواہرات، اونٹ، گھوڑے، خیمے، غلام اور لونڈی اس کثرت سے ہاتھ آئے کہ ان کا شمار مشکل تھا[۴۲۵]۔ منظوم فارسی تاریخوں میں اس کی تفصیلات:

جو ہر نہ چنداں کہ آں راد بیر — در آرد بہ انگشت یا در ضمیر
بلو ریں طبقہا و خواں ہا ے لعل — ظرائف کشاں رابفر سود نعل
ہماں تازی اسپانِ بازینِ زر — غلامانِ موزونِ زرّیں کمر
نوردِ ملو کا نہ بیش ازشمار — شتر بارِ زرّینہ بیش ازہزار
غنی گست لشکر زبس خواستہ — سراسر سپہ گشت آراستہ[۴۲۶]

مولوی بشیرالدین احمد نے اس تباہی اور ہلاکتوں کے منظر کو بیان کرتے ہوئے لکھا کہ ''ہزار توپ اور بے انتہا بیش قیمت اسباب سرکارِ بادشاہانِ اسلام میں داخل ہوا۔ اناگندی تک کے دس کوس کا فاصلہ ہے، تمام زمین مردوں اور زخمیوں سے پٹی پڑی تھی۔ منشیانِ تیز قلم بارہ دن تک شمار مقتولین اور زخمیوں کا کرتے رہے اور ایسا قتلِ عام ہوا کہ کرشنا ندی جو میدان کارزار کے پاس تھی اس کا پانی خون سے لال ہو گیا[۴۲۷]۔ رام راج اور اس کے حامیوں نے دارالخلافہ کے دفاع کا بھی کوئی انتظام نہیں کیا تھا۔ لہٰذا وجیانگر شہر تک جانے کا سارا راستہ خالی پڑا ہوا تھا۔ وہاں سے ترومل ۱۵۵۰ ہاتھیوں پر رام راج کا کل خزانہ لے کر وہاں سے بھاگ نکلا اور شہر وجیانگر کے باشندوں کو بے یارومددگار چھوڑ گیا[۴۲۸]۔ اس صورت حال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے فاتح فوج کی آمد سے پہلے ہی اطراف کی جنگلی اقوام اور لٹیروں نے آ کر شہر کو لوٹنا شروع کر دیا[۴۲۹]۔ جنگلی افراد اور ڈاکوؤں کے گروہ نے بے سہارا عوام پر حملہ کر کے ان کے مال و اسباب کو لوٹا[۴۳۰]۔ بنجاروں، لمباڑوں، کوروؤں اور اس قسم کے دیگر لٹیروں کی گروہ سازی کی ساری دولت لوٹ کر لے جاتے۔ گوتو نے لکھا کہ ایک ایک روز میں یہ لٹیرے چھ چھ حملے کرتے۔ فتح یاب مسلمان اس دوران زخموں کی مرہم پٹی اور آرام کے غرض سے دس روز تک وہیں مقیم رہے۔ اس کے بعد وجیانگر کا رخ کیا۔ اس دن سے لگاتار ۵ مہینے تک لوٹ مار کا بازار گرم رہا[۴۳۱]۔ سینر فریڈرک کا بھی کہنا ہے کہ دو شہر کو مسلمان چھ مہینے تک لوٹتے رہے اور سب جگہ گڑے دبے خزانے ڈھونڈتے رہے''[۴۳۲]۔ شہر کے لاکھوں باشندے جو بے یارومددگار رہ گئے تھے، ان میں سے چند ہی کو بھاگنے کا موقع مل سکا۔ مقامی لوگوں نے اپنی مدد آپ کے تحت خزانوں کو چھپانے کا انتظام کیا۔ سونے اور جواہرات زمین کے اندر گاڑے گئے[۴۳۳]۔ مسلمان لشکر نے خزانوں کے چکر میں میدان کے میدان کھود ڈالے۔ صورتِ حال کی سنگینی کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ نظام شاہی اور عادل شاہی افواج میں مال و دولت کی طمع میں آپس میں بھی لڑائیاں ہوئیں اور کچھ لوگ قتل بھی ہوئے۔ اسی لیے حسین نظام شاہ اور دیگر ارکان دولت کی مشاورت سے یہ فیصلہ کیا گیا کہ آپس میں لڑنے بھڑنے سے بہتر ہے کہ شہر کو جلا کر اس فساد کو موقوف کیا جائے۔ لہٰذا شہر کی تمام بڑی عمارتوں اور اطراف و جوانب کے بیس بیس کوس تک پھیلے ہوئے قصبات کو جلا کر خاک کر دیا گیا۔ مندر اور محلات کو مسمار کر دیا گیا مختصر یہ کہ کوئی چیز ان کے ہاتھ سے نہ بچ سکی[۴۳۴]۔ اس تباہی کے بعد وجیانگر ایسا خراب اور ویران ہو گیا کہ پھر نہ پنپ سکا۔ اس فیصلہ کن جنگ نے وجیانگر کی قوت و حشمت کو پاش پاش کر دیا[۴۳۵]۔ مولوی بشیرالدین نے درست لکھا کہ ''یہ جنگ کا ہے کو تھی ایک طوفانِ عظیم کی رو تھی کہ جو اس کے سامنے آ گیا اس کو بہا لے گئی[۴۳۶]۔ غرض کہ یہ عالی شان شہر اس طرح تباہ ہوا کہ پھر کبھی اس کی رونق واپس نہ آ سکی۔'' آج تصور میں بھی اس کی شان و شوکت اور عظمت کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ اس کی آباد گلیاں، اس کے بھرے بازار، اس کی فلک بوس عمارتیں، اس کے عالی شان معابد سب خاک میں مل گئے''[۴۳۷]۔ مسلمان افواج نے جو کچھ کیا وہ بھی کسی سانحے سے کم نہیں کیوں کہ اس حقیقت کو ہرگز نہ بھولنا چاہیے کہ جنگ ہمیشہ سانحات کو ہی جنم دیتی ہے لیکن یہ سب کچھ صرف ایک مغرور اور گھمنڈی حکمراں رام راج کی وجہ سے ہوا جس کے مظالم کے ردِ عمل میں مسلمانوں نے اپنے اتحاد سے اس کی عظیم سلطنت کو نیست و نابود کر دیا۔ اس کا یہ گھمنڈ ہندوؤں کی عظیم سلطنت کے زوال کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ سیول نے اپنی تاریخ میں درست لکھا کہ ''مسلمان انتقام لینے آئے تھے اور انھوں نے پوری طرح انتقام لیا[۴۳۸]۔ اس معرکے کے بعد کسی ہندو راجا میں یہ ہمت نہ ہوئی کہ پھر کبھی مسلمانوں کی سلطنت میں مزاحم ہو[۴۳۹]۔ اس تاریخی فتح کے بعد وجیانگر کے علاقے سلاطین دکن میں تقسیم ہوئے[۴۴۰]۔ دل چسپ امر یہ ہے کہ رام راج کی موت کے بعد کی وجیانگر کی تاریخ کو برہمنو نے بالکل معکوس کر دیا۔ انھوں نے اپنی طرف سے اس بارے میں

ایسی ایسی مبالغہ آمیز باتیں شامل کیں، جن کا حقائق سے کوئی تعلق نہیں۔ ایسی ایسی کہانیاں گھڑی گئیں جن میں مسلمانوں کی فتح کا کہیں ذکر تک نہیں ملتا۔ ان تواریخ کے مطالعے سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ مسلمان سلاطین دکن وجیانگر کے راجا کے ملازم تھے۔ اور اس کے حکم اور حمایت سے اپنی اپنی ریاستوں میں حکومت کیا کرتے تھے۔ ان میں ایک ہاتھیوں کا، دوسرا گھوڑوں کا، تیسرا بیلوں کا اور چوتھا چھتر کا سردار تھا لیکن اس کے بعد کی تفصیل سے چشم پوشی کی گئی [۴۴۱]۔ حالاں کہ یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ یہ تمام سلاطین الگ الگ مفتوحہ علاقوں کے حکم راں تھے بلکہ تلخ حقیقت تو یہ ہے کہ ان سلاطین کی آپس میں بھی جنگیں جاری رہتی تھیں۔ سلاطین دکن کی سیاسی تاریخ اور اس دور کے اہم واقعات کو جن مثنویوں اور نثری کہانیوں میں پیش کیا گیا ہے، وہ اس بات پر مہرِ تصدیق ثبت کرتے ہیں۔

مذکورہ واقعے کے حوالے سے اس جنگ کے واقعات پر مبنی مثنوی ''فتح نامہ نظام شاہ'' ہے۔ اس مثنوی کا مصنف حسن شوقی ایک بلند پایہ شاعر تھے۔ یہ پہلے نظام شاہی دربار (احمد نگر) سے توسّل رہے۔ پھر وہ بے جاپور آئے اور آخر میں قلی قطب شاہ کے زمانے میں گول کنڈا آ گئے [۴۴۲]۔ اس مثنوی میں مذکورہ بالا یادگار معرکے کی روداد قلم بند کی گئی ہے جو تالی کوٹ کے میدان میں وجیانگر کے ہندو اور اسلامی سلطنتوں کی صف آرائی کی بنا پر وقوع پذیر ہوئی تھی [۴۴۳]۔ ڈاکٹر ساجد امجد کا یہ کہنا ہے کہ یہ مثنوی ''۱۵۶۴ء میں پایۂ تکمیل کو پہنچی'' [۴۴۴] سراسر غلط ہے اس سے قبل اس کی وضاحت ہو چکی ہے کہ اس جنگ کا آغاز ۲۵ دسمبر ۱۵۶۴ء میں ہوا لیکن دکن کے مسلم سلاطین کو یہ فتح ۲۳ جنوری ۱۵۶۵ء [۴۴۵] کو ملی۔ ظاہر سی بات ہے کہ مذکورہ مثنوی اس تاریخی فتح کے بعد ہی لکھی گئی۔ لہٰذا ڈاکٹر جمیل جالبی کا اس مثنوی کو ۹۷۲ھ مطابق ۱۵۶۵ء کی تخلیق قرار دینا درست معلوم ہوتا ہے [۴۴۶]۔ اس مثنوی میں شوقی نے ''اپنے مربی حسین نظام شاہ کو فاتح تالی کوٹ قرار دیا ہے'' [۴۴۷]۔ حسن شوقی اس عہد کے قادر الکلام شاعر اور ''مسلم الثبوت'' استاد کی حیثیت رکھتے تھے۔ ان کی وفات کے برسوں بعد تک دکن کی ادبی فضاؤں میں ان کا نام گونجتا رہا [۴۴۸]۔ ابن نشاطی نے ''پھول بن'' ۱۰۶۶ھ کے ایک شعر میں شوقی کا ذکر کچھ اس طرح کیا ہے:

حسن شوقی اگر ہوتے تو فی الحال ہزاراں بھیجتے رحمت مجہ اُپرال [۴۴۹]

سید اعظم بے جاپوری نے ''فتح نامہ جنگ'' (۱۰۷۷ھ) میں ضرورت قافیہ کے تحت ان کا نام شوقی حسن لکھتے ہوئے کہا کہ:

سلاست میں جیوں شعرِ شوقی حسن ہنر فن منیں نصرتی کے بچن [۴۵۰]

نصرتی نے ''علی نامہ'' کے ایک قصیدے میں اپنی شاعری کا موازنہ حسن شوقی سے کرتے ہوئے اپنی عظمت کا اظہار کچھ اس انداز سے کیا ہے:

دس پانچ بیت اس دھات کے ہیں تو شوقی کیا ہوا معلوم ہوتا شعر اگر کہتے تو اس بستار کا [۴۵۱]

مولوی عبدالحق کا خیال ہے کہ مثنوی ''فتح نامہ نظام شاہ'' کو حسن شوقی نے اس واقع کے رونما ہونے کے برسوں بعد تخلیق کیا۔ مولوی عبدالحق کو یہ شبہ اس لیے ہوا کہ اس مثنوی کا نسخۂ ثانی جس کو مولوی عبدالحق ناقص نسخہ قرار دیتے ہوئے اس کے بعض حصوں کو الحاقی کلام مانتے ہیں [۴۵۲]۔ خصوصاً وہ اشعار جن میں بادشاہ نظام شاہ کو بہت دعائیں دی گئی ہیں۔ یہ دعائیں اس طرح دی جا رہی ہیں جیسے کوئی زندہ شخص کو اس کے روبرو دعائیں دیتا ہے [۴۵۳]۔ مثلاً:

سدا جیو راجے جنم راج کر بسے لگ دنیا نت نوے کاج کر

مبارک ظفر آسمانی اچھو تجے فتح نصرت سبحانی اچھو[۴۵۴]

ان اشعار کو الحاقی قرار دے کر مولوی عبدالحق شبہے کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس وقت جب یہ جنگ ہوئی، حسن شوقی زندہ نہیں تھا۔ لہٰذا اس طرح سے کامیابی کی مبارک باد دینے کی کوئی وجہ سمجھ نہیں آتی۔ ممکن ہے کہ یہ اشعار بعد میں کسی اور نے شامل کیے ہوں[۴۵۵]۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے ان شبہات کو دور کیا۔ ان کا کہنا ہے کہ ''حدیقہ سلاطین'' سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۰۴۳ھ مطابق ۱۶۳۳ء میں شوقی، عادل شاہی سفیر کی حیثیت سے گول کنڈا بھیجے گئے۔ گویا اس وقت تک وہ زندہ تھے۔ ۹۷۲ھ مطابق ۱۵۶۴ء اور ۱۰۴۳ھ مطابق ۱۶۳۳ء کے درمیان ۷۱ سال کا عرصہ ہوتا ہے۔ اگر ۹۷۲ھ میں ان کی عمر ۲۵۔ ۲۶ برس کی بھی مان لی جائے تو ۱۰۴۳ھ میں ان کی عمر ۹۷ برس کے قریب بنتی ہے۔ اس عمر تک زندہ رہ جانا تاریخ کا کوئی عجیب وغریب واقعہ ہرگز نہیں۔ حضرت گیسو دراز نے ۱۰۵ سال عمر پائی۔ شاہ باجن کے والد نے ۱۲۰ سال کی عمر میں وفات پائی اور خود شاہ باجن ۱۲۳ برس تک زندہ رہے[۴۵۶]۔ مثنوی کے وہ اشعار جن کو مولوی عبدالحق نے الحاقی کلام قرار دیا ہے، کی بابت ڈاکٹر جمیل جالبی کا کہنا ہے کہ شوقی نے اپنی دوسری مثنوی ''میز بانی نامہ'' میں بھی انھیں مصرعوں کو دہرایا ہے۔ غرض کہ ان شواہد نسخہء ثانی کے اشعار کے الحاقی ہونے کی گنجائش نہیں رہتی جب کہ ان اشعار کے ذریعے موضوع کا تسلسل بھی پورے طور پر برقرار رہتا ہے اور شاعر کا تخلص بھی آتا ہے[۴۵۷]۔

یہ مثنوی موجودہ شکل میں ۱۶۲۰ اشعار پر مشتمل ہے[۴۵۸]۔ شوقی نے اس مثنوی میں اس جنگ کا پورا حال شاعرانہ طرز پر لکھا ہے۔ یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ شوقی نے اس مثنوی کا نام ''فتح نامہ نظام شاہ'' کیوں رکھا؟ وجہ ظاہر ہے یہ ہے کہ ایک تو حسین نظام شاہ رام راج کے ہاتھوں جس قدر ذلیل ہو چکا تھا اس کی وجہ سے وہ دیگر بادشاہ کی نسبت سب سے زیادہ انتقام کی آگ میں جل رہا تھا۔ دوسرا یہ کہ حسین نظام شاہ نے اس جنگ میں بڑی دلیری اور شجاعت بھی دکھائی۔ وہ قطب لشکر کے زیر کمان تھا۔ ہندو افواج کے تابڑ توڑ حملے کے بعد جب مسلمانوں کے پاؤں اکھڑنے لگے تو اس کے جوابی حملے سے ہی رام راج کے لشکر میں کھلبلی مچی[۴۵۹]۔ اسی لیے شاعر نے حسین نظام شاہ کو اس مہم کا روح رواں ثابت کرنے کی کوشش کی ہے[۴۶۰]۔ مثنوی کے آغاز میں حسبِ معمول چند اشعار حمد کے ہیں۔ پھر نعت اور اس کے بعد آغاز جنگ کے عنوان سے سب سے پہلے ''شروع جنگ کردن رام راج و نظام شاہ و عادل شاہ و قطب شاہ و برید شاہ''[۴۶۱] کے عنوان سے اس عظمت رفتہ کو دہرایا گیا ہے جو مسلمانوں کا خاصا تھی۔ ابتدا میں شاعر نے بیان کیا ہے کہ دنیا میں کیسے کیسے دلیر و بہادر، دولت منداور نام ور لوگ ہوئے ہیں۔ ان لوگوں کی شہرت اور کارنامے اب تک یادگار ہیں[۴۶۲]۔ ابتدا میں تو شاعر نے نظام شاہ بحری کے علاوہ جنگ میں حصّہ لینے والے دیگر سلاطین دکن کا بھی ذکر کیا ہے لیکن بعد میں کہیں بھی دوسرے سلاطین کا ذکر موجود نہیں۔ حالاں کہ یہ جنگ سلاطین دکن کے باہمی اشتراک واتحاد سے جیتی گئی تھی اور اس میں عادل شاہیوں، قطب شاہیوں اور بریدشاہیوں کا بھی اتنا ہی حصّہ تھا جتنا کہ نظام شاہی حکم راں کا تھا۔ جنگ میں ان سلاطین کی متحدہ افواج نے ہی وجیانگر کی سلطنت کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ کیا تھا جس کے نتیجے میں رام راج کو شکست اور زندگی سے ہاتھ دھونا پڑا تھا[۴۶۳]۔

جنگ سے قبل رام راج جس قسم کے مظالم مسلمانوں پر ڈھا رہا تھا اس کی حرکتوں سے مسلمانوں کے دینی جذبات جس طرح مجروح ہو رہے تھے اس فتح کے ذریعے ان تمام باتوں کا تدارک کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ خصوصاً مساجد کی بے حرمتی کے حوالے سے مذکورہ بالا سطور میں جو بیانات درج کیے گئے ہیں، اس کے جواب میں حسن شوقی نے مثنوی کے اختتام میں لکھا کہ:

نہ ایسا ظفر کیں یو شانی ہوا	یو شہ کوں فتح آسمانی ہوا
ہوئی دینداراں کوں شادی تمام	بہ برکت محمد علیہ السلام
تڑا بہوت خانے و دیول قدیم	بندھے مسجداں پر منا رے عظیم
موذن بلند بانگ دینے لگیا	زمیں تھیں نکل گنج آنے لگیا[۴۶۴]

جس وقت یہ مثنوی لکھی گئی حسن شوقی نظام شاہی دربار سے وابستہ تھے۔ لہٰذا اس امر کا جواز نہیں ہوسکتا کہ نظام شاہ کے علاوہ اس مثنوی میں کسی دوسرے سلاطین کا ذکر بھی ہو[۴۶۵]۔ اس لیے شوقی نے فتح کا سہرا نظام شاہ کے سر باندھتے ہوئے بقیہ سلاطین کو فراموش کر دیا۔ اس طرح مثنوی کے مطالعے کے ذریعے ''احمد نگر'' کا نقطۂ نظر، اندازِ فکر، جنگی تیاریاں، رام راج سے دشمن اور دوسرے حالات و کوائف کی پوری تصویر نظروں کے سامنے آجاتی ہے لیکن دوسرے سلاطین اسلام کا نقطۂ نظر پوری طرح سامنے نہیں آتا۔ گو کہ مثنوی کی ابتدا میں ان چاروں بادشاہوں کا ذکر ہے لیکن یہ اشارہ محض سات اشعار تک محدود ہے۔ مختلف ممالک کی خاص خاص خوبیوں اور اوصاف کی تفصیل فراہم کرنے کے بعد شاعر نے سلاطین دکن کے عہد و پیمان اور متحد ہو کر رام راج کے خلاف آمادۂ جنگ ہونے کا احوال بیان کیا ہے۔ اس بابت شاعر کہتا ہے کہ:

اپس میں اپیں دوست سب مل ہوئے	محبت سوں اخلاص یک دل ہوئے
نزاع دل میں کا دور کیتے نفاق	اپس میں اپیں مل کیے اتفاق
یو سب مل کے بیا کیے یک پنا	جو اس کفر کوں مار کرنا فنا
کیے بھاگ سو گندو عہد استوار	یو غازی غزا پر ہوئے برقرار
نکو ڈر بلاتے جو شب درمیاں	دیکھیں کیا چرخ پھیر ہے آسماں
کہ نسدن پھر اتا یو چرخِ فلک	کہ ہر یک فلک سات کے لکھ مَلک[۴۶۶]

اس کے بعد جنگ کے اسباب و علل کے بارے میں اظہارِ خیال کیا گیا ہے۔ حسین نظام شاہ اور رام راج کے دربار دکھائے گئے ہیں۔ بعض رفتہ رفتہ نظم کے تیور، بیان اور تفصیل اس طرح سامنے آتے ہیں کہ سارے مسلم سلاطین منظر سے غائب ہو جاتے ہیں اور مثنوی پڑھ کر یوں محسوس ہونے لگتا ہے کہ یہ جنگ صرف حسین نظام شاہ بحری اور رام راج کے درمیان لڑی گئی ہے[۴۶۷]۔ مثنوی میں وجیا نگر اور احمد نگر کے درمیان نامہ و پیام کا سلسلہ دکھانے کے ساتھ ساتھ دکنی سلاطین کی وجیا نگر کی طرف پیش قدمی اور رام راج کا اپنے ما تحت راجاؤں کو دربار میں بلوا کر صلاح و مشورے کے مناظر، درباریوں کا تعظیم و تکریم کے ساتھ حاضر ہونا[۴۶۸] وغیرہ جیسے مناظر کو شاعر نے بڑی وضاحت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ وزیروں کی دربار میں طلبی کے منظر کو دکھاتے ہوئے شاعر کہتا ہے کہ:

بیٹھا رام تب آسیا سن اوپر	مکٹ مال گل گھال ابرھن اوپر
سو ڈنڈوٹ کیے او کررائے سب	جیتے رائے رایل پڑے، پائے سب
پڑے آ ۓ کر آڑ جوسی جیتے	مہا پنڈتاں ہور مجوسی جیتے[۴۶۹]

رام راج اپنے خاص خاص مصاحبوں اور ارکان سلطنت کو بلا کر کہتا ہے کہ نظام شاہ نے میرے دل میں بڑا گہرا گھاؤ لگایا ہے۔

پوری دنیا میں میری حکومت کا ڈنکا بج رہا ہے۔ سب نہ صرف میری حکومت کو مانتے ہیں بلکہ خراج بھی دیتے ہیں لیکن یہ ترک مجھے خاطر میں نہیں لاتا۔ اس صورت حال میں اس کے ساتھ کیا کرنا چاہیے؟[۷۰] حسن شوقی اس منظر کو بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

کیا رام خلوت منے انجمن — بلایا جیتے رائے ہور رائے زن
چندر بھان یلٹم وینکٹا دھری — جنن بھار سوں دھرتری تھرتھری
رتن جڑت چو کھی رکھیا سامنے — کھیا بیں مجہ آمنے سامنے
سو بل رام بھجبل بلندر کے تیں — بلندر کوں ہور رام چندر کے تیں
کہیا رخت دولت کے تم تھا نب ہیں — تمیں مردِ میداں کے رن کھانب ہیں
لگن سات میں پانچ اوڑ کن ثمیں — مہا رائے ہیں پر مہاجن تمیں
دھرم بھیم ارجن لکھل ساہ دیو — تمیں پانچ پانڈو تمیں ماہ دیو
تمیں پانچ تن مل کے یک بُد کہو — تمیں پانچ جن مل کے یک سُو کہو
بہوت دن تے چھاتی منے سل رہے — نظامیا سوں مجہ آج سو ندل رہے
مجے راج جگ کے کہیں راج راج — دیویں باج سارے مگر ترک باج
نہ چیتل دکھا وے نہ پیتل مجے — کیا نیر میرا مرک جل مجے[۷۱]

شاعر نے یہاں منظر نگاری کے زبردست جوہر دکھائے ہیں اور خوب صورت لفظوں کے استعمال سے ایسا نقشہ کھینچا ہے کہ پوری تصویر آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔ جوش اور جذبات کو پورے توازن کے ساتھ رفتہ رفتہ اس مثنوی میں ابھارا گیا ہے[۷۲]۔ تمام وزیر اور مشیر اس صورت حال پر یک زبان ہو کر کہتے ہیں کہ آج دنیا میں تیرا وہ زور ہے کہ کسی راجا یا بادشاہ کی یہ مجال نہیں کہ تیرے سامنے آنکھ اٹھا سکے۔ تو وہ شہہ زور ہے کہ شیر اور سیمرغ تیرے آگے کبوتر کے بچے ہیں۔ لہٰذا نظام شاہ کی تیرے سامنے کیا حقیقت:

کہاں رام راجا کیاں شاہ حسین — کہں بھر قلزم کہاں قلّتیں
نبڑ راج بنڈا مہا جوج توں — نہ یا جوج چھوڑے نہ ما جوج کوں[۷۳]

رام راج اپنے وزیروں سے مشورے کے بعد حسین نظام شاہ کو مکتوب بھیجتا ہے۔ یہ خط اس کے غرور و تکبر کا منھ بولتا ثبوت ہے۔ اس مکتوب میں رام راج نے جس طرح اپنی عظمت اور طاقت کا نقشہ کھینچا ہے اور اپنے مقابلے میں نظام شاہ کو ایک حقیر اور کمتر درجے کا حکم راں قرار دے کر اطاعت اور فرماں برداری کا حکم دے رہا ہے، اس سے اس کے ظلم و بربریت اور ذہنی حالت کا بہ خوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی اس لیے یہ کہنے پر مجبور ہوئے کہ:

> رام راج کو شاہی سلطنت سے بڑی نفرت تھی۔ اپنی دشمنی نکالنے کے لیے وہ کسی نہ کسی بہانے نظام شاہی سلطنت پر حملے کرتا رہتا تھا۔ طاقت، دولت اور ثروت کے نشے میں چور مسلمانوں کی بے عزتی کرنا اس کا شیوہ بن چکا تھا[۷۴]۔

خط میں رام راج نے اپنے مطالبات کی ایک طویل فہرست بھی پیش کی ہے۔ ان مطالبات کو پڑھ کر کسی بھی مسلمان کا خون

کھولنے لگے گا۔خراج کا حکم تو اپنی جگہ فہرست میں وہ اشیاء بھی شامل تھیں جو حسین نظام شاہ کے خاندانی روایات کا حصہ بھی تھیں۔ مطالبات میں نظام شاہی وزیر اور سپہ سالار رومی خاں، مخدوم خواجہ جہاں اور اسد خاں وغیرہ کو رام راج کے سامنے پیش کرنے کا حکم بھی شامل تھا۔فہرست میں مسلمانوں کی غیرت کو للکارنے کے لیے خونزا ہمایوں کے پائل کو بھیجنے کا مطالبہ بھی کیا گیا۔اس کے علاوہ وہ گائے کا گوشت کھانے سے ممانعت اور کعبہ کی جگہ جنکماں کی پوجا کرنے کی ہدایت بھی شامل تھی [۴۷۵]۔اس صورتِ حال کا نقشہ کھینچتے ہوئے شوقی کہتا ہے کہ:

نظامیاں کوں فرمان یوں لیکھ توں — جیتے قاعدے ہندوی سیکھ توں
سو گو بند جگ دیو پال ہے — سو رکھپال کرپال دیپال ہے
سو بھگوان بھگونت کرتار ہے — سو کلدیس پرمیس اوتار ہے
مجھے باج میں بھیج دے روم خاں — دوجا بیگ مخدوم خواجے جہاں
حشم سات دے کر اسد خان کوں — بیٹھا بیگ دے ملک میدان کوں
خونزا ہمایوں کے ہے پاؤ میں — بیٹھا بیگ دیگر نہ لیا تاؤ میں [۴۷۶]

رام راج کے اس مکتوب میں غرور وتکبر کی جھلک پوری طرح نمایاں ہے۔اس دھمکی آمیز خط میں جواہرات، گہنے، ہتھیار، طوائف، ڈومنیاں، رنڈیاں اور یاقوت کا پیالہ وغیرہ بھی خراج کے طور پر مانگا گیا۔مسلمانوں کو کمزور اور مجبور سمجھ کر طرح طرح کے تقاضے دراصل اس زمانے کے مسلم سلاطین دکن کی سیاسی اور داخلی صورت حال کی پوری طرح عکاسی کر رہے ہیں۔خصوصاً کسی مسلمان کو مکے کے بجائے یلورا اور دولت آباد کو اپنا محور ومرکز سمجھنے کی تلقین اور گائے کے گوشت کھانے سے منع کرنے جیسے احکامات دراصل اس دور کے حالات کی سچّی تصویر ہیں۔شاعر اس طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے کہ:

نہ کھا وے کدھیں ماس توں گائے کا — جسے سیس پیتک ہوا رائے کا
مکے ٹھا نوں ترمل کے تین بوج توں — عرب چھوڑ جنکماں کے تین پوج توں
عرب تے عجم پر بڑائی نہ کر — عرب ہور عجم سوں لڑائی نہ کر
یلورا سو ترمل تے نزل اہے — یلورے تے نزل سو ترمل اہے
قوی کریلوری کی بنیاد کوں — جو خجلت اچھے قصر شدّاد کوں
نہ کم مان دے دولت آباد کوں — نہ سر پار کر دیکہ شمشاد کوں [۴۷۷]

مثنوی میں شوقی نے خود رام راج سے ایسے شعر بھی کہلوائے ہیں جسے پڑھ کر اس کی جنگی سوچ کا پورا عکس ہمارے سامنے آجاتا ہے جیسے:

سو میں رام دجّال کوں اصل ہوں — سو شدّاد بن عاد کی نسل ہوں [۴۷۸]

یہاں پہنچ کر شوقی ہندو راجا کے درباری ماحول، اس کی سوچ اور خیالات کے ساتھ ساتھ اس جنگی ماحول کو بھی کچھ اس طرح پیش کرتے ہیں کہ وہ پورا منظر کسی فلمی سین کی طرح ہماری نظروں کے سامنے پھرنے لگتا ہے۔اپنے مطالبات پیش کرنے کے بعد رام

راج نظام شاہ کو حکم رانی کے نشیب و فراز سمجھاتے ہوئے یہ نصیحت بھی کرتا ہے کہ اس خراج کو وہ خدا کی زکوٰۃ سمجھے۔ اور بدلے میں احمد نگر اسے بخشش میں دینے کا وعدہ کرتا ہے۔ شعر ملاحظہ کیجیے:

بتا باج گر بھیج توں مجہ دیا — سیوا ساکہ احمد نگر تجہ دیا[479]

اس مکتوب کے آخر میں کچھ فخریہ اشعار بھی ہیں جس میں بڑے متکبّرانہ انداز سے نظام شاہ کو یہ دھمکی بھی دی جاتی ہے کہ اگر اس نے رام راج کے احکامات کی تعمیل نہ کی تو وہ نظام شاہی حکومت کی اینٹ سے اینٹ بجا دے گا[480]۔ نظام شاہ کو مخاطب کرتے وقت رام راج کا لہجہ بڑا تلخ اور تحقیر آمیز تھا۔ اپنے حکم کی خلاف ورزی کے نتائج بتاتے ہوئے وہ دھمکی آمیز انداز میں کہتا ہے کہ:

نہ ترکاں کوں چھوڑو نہ ترکی کماں — اگر کیو رُستم حاضر ضماں
زآبِ بھنور تالب نر بدا — نہ چھوڑوں تو نگر نہ چھوڑوں گدا
نہ چھوڑوں کدہیں کد خدایانِ ہند — نہ چھوڑوں کدہیں کدخدایان سند
نہ بڑکا نہ لڑکا نہ برنا نہ پیر — نہ چھوڑوں ملانا نہ چھوڑوں فقیر[481]

ہرعاداس کا ایلچی جب رام راج کا مکتوب لے کر نظام شاہ کے دربار پہنچتا ہے تو وہ منظر بھی بڑا دلچسپ اور معنی خیز ہے۔ نظام شاہ کی قوت ارادی، بلند ہمتی، شجاعت و بہادری اور بردباری کا اندازہ شوقی کے اس شعر سے بہ خوبی لگایا جا سکتا ہے:

سو فرمان جب آن حاجب دیا — تسے شاہ سُن تب تبسّم کیا[482]

ایسے جنگی ماحول میں جب کہ دشمن کی لاکھوں فوج جنگ پر آمادہ سامنے کھڑی ہو، نظام شاہ کا زیرلب تبسم کرنا دراصل اس کی خود اعتمادی کا اظہار ہے اور یہی خود اعتمادی شوقی یہاں دکھانا چاہتا ہے۔ خط موصول ہونے کے بعد نظام شاہ دربار کے تمام امرا کو طلب کرتا ہے اور ایک ایک کو مخاطب کر کے رام راج کا خط سناتا ہے[483]۔ یہاں وہ تمام درباریوں کو ان کی غیرت وحمیت کا احساس دلا کر کفر کے مقابلے میں اسلام کی حفاظت کے لیے سینہ سپر ہونے کی تلقین بھی کرتا ہے[484]۔ وہ نہایت جوش اور غصے کے عالم میں رام راج کے مظالم، سرکشی، نافرمانی، جبر، اسلام کی بےحرمتی اور سجدوں کے انہدام کے حوالے سے کی جانے والی کارروائیوں کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے کہ:

دیا شاہ دُشنام نا پاک تے — تنگ آیا ہوں اس حُرسِ ناپاک تے
نہ پیراں کوں مانے نہ میراں کے تیں — مدبر کو جانیں دبیراں کے تیں
سو مسجد کے تیں پاڑ ویراں کرے — موذن کے تیں مار حیراں کرے
نہ مانے کدھیں کس نمازی کے تیں — دیوانہ کہے فخرِ رازی کے تیں
مجا ور کے تیں خوار کر لائیا — قبر کھود کر خوک و خر کاٹیا[485]

رام راج کو اس کے متکبرانہ خط کا جواب دینے کے لیے دبیر شاہی[486] کو ہدایت کی جاتی ہے۔ وہ حمد وثنا سے خط کا آغاز کرتا ہے۔ مقدس بزرگوں، مقدس کتابوں اور قسمیں کھا کر بڑے جچے تلے انداز سے رام راج کو اپنی حرکتوں سے باز رہنے کی تلقین کرتے ہوئے کہتا ہے کہ:

نپ پیتاؤ کچھ زورِ بازو کے تیں — نگہ راکھ وزنِ ترازو کے تین

نہیں خوب بُد بَل بڑا کھیلنا ترنگ گیند کے دھا نوں میں میلنا
نہ کر کچھ بھروسہ کہ آپار مال گھنا مال جِس تس گھنا گو شمال
بنی جال نا جال فانوس کوں نگہ راکہ توں اپنے ناموس کوں[۴۸۷]

اس نصیحت میں رام راج کو یہ باور کرانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ اپنے زور بازو پر اس قدر گھمنڈ کوئی عقل مندی کی بات نہیں۔ ترازو کے وزن کا دھیان رکھو۔ اپنی بے شمار مال و دولت پر بھروسا نہ کرو کیوں کہ جس قدر دولت ہوگی اسی قدر مصیبتیں بھی بھگتنی پڑیں گی۔ چراغ جلاتے جلاتے کہیں فانوس ہی نہ جلا دینا مطلب یہ کہ اپنی عزت کا خود ہی پاس رکھو کہیں یہ تمھیں مہنگی نہ پڑے[۴۸۸]۔ خط کے آخر میں رام راج کو اس کی دھمکی کا جواب کچھ اس انداز سے دیا جاتا ہے:

سو مشعل جلاؤں سراندیپ پر اجالا کروں سب سنگل دیپ پر
دسا سیر کا سیر چابوں کچا کہ سیمرغ مجہ کن کبوتر بچا[۴۸۹]

قاصد کا پیغام پڑھ کر رام راج تلملاتے ہوئے سخت برہمی کا اظہار کرتا ہے:

دیا لیکھ فرمان، حاجب چلیا جو سن رام راجا وہیں تلملیا[۴۹۰]

اسی کیفیت میں وہ حسین نظام شاہ کو اس کے آبا و اجداد کا حوالہ دے کر کہتا ہے کہ تو شاہ بن شاہ ہے۔ عماد الملک تیرا پیشوا ہے۔ تو نے جگہ جگہ اپنی دھاک بٹھائی اور خراج لیا ہے۔ بہادر شاہ کو تو نے زیر کیا، ہمایوں سے بہادری سے لڑا، فرنگیوں کو بھگایا۔ تیسری تعریف سلطان روم تک نے کی ہے[۴۹۱] لیکن اس بات کو اچھی طرح سمجھ لے کہ اس بار تیرا پالا سخت دشمن سے پڑا ہے۔ یہ رام راج کچھ اور ہی چیز ہے۔ اس سے مقابلہ اتنا آسان نہیں۔ اپنی بڑائی کرتے ہوئے وہ کہتا ہے کہ:

سب ہی جگ ملیا رام ان میل ہے بلے موم آتش کتے تیل ہے[۲۹۲]

اس کے بعد شاعر نے جنگ کی تیاری اور افواج کے کوچ کرنے کا منظر پیش کیا ہے۔ میدان جنگ کے مناظر اور واقعات کی تفصیل بھی بڑی وضاحت سے پیش کی گئی ہے۔ ایک طرف حسین نظام شاہ کی فوج کے جوش و جذبے اور بہادری کا حال بیان کرتے ہوئے شاعر کہتا ہے کہ:

سنیا بو خبر شاہ جیوں سر بسر غصے میں ہو کر تب ووجیوں شیرِ نر
دیا شاہ دہلیز اسمان پر کیا رخ و سیلاب سراندیپ پر
شہنشاہِ میداں بمر دانگی سرِ سرفرازاں بفرزانگی
علم شیر پیکر فرس شیر دل درآمد بزیں شاہِ شمشیر دل
طبل ٹھوک کرنائے زرّیں دَماں چلیا تُند جیوں اژدھائے دماں
کمر بند ترکش منڈا سا سو خول نہ دکھنی نہ رومی نہ سمجھے مغول
چلیا کوچ پر کوچ شاہِ دکن قبا چار آہن زرہ پیر ہن[۴۹۳]

تو دوسری طرف رام راج کی جھنجھلاہٹ اور جنوں کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے کہ:

سنا جب یو آواز کرنائے کا ہوا گرم تر مغز تب رائے کا[۴۹۴]

رام راج کی فوجی تیاریوں کا حال بیان کرتے ہوئے شاعر نے جو تفصیلات فراہم کی ہیں اس سے رام راج کے گھمنڈ اور مسلمانوں کو چیونٹی کی طرح مسل دینے کی خواہش کا اظہار پوری طرح عیاں ہے۔شاعر اس منظر کو دکھاتے ہوئے کہتا ہے کہ:

سمندر اچھے حوض کوں شور کیا کہ میں رام اچھتیں ترک زور کیا[۴۹۵]

جس قدر بری فوج کا وہ مالک تھا،اس طاقت کے نشے میں گھمنڈ کا پیدا ہوجانا فطری امر تھا۔لہذا رام راج کو بھی یہ گھمنڈ ہمیشہ گھیرے رکھتا۔اس بڑی فوج کی نشان دہی کرتے ہوئے شاعر کا کہنا ہے کہ:

چلیا کوچ پر کوچ وینکٹا ہتی ترنگ پانچ لکھ پر سوا لکھ ہتی[۴۹۶]

جنگ کا بیان بھی نہایت دل چسپ اور واقعاتی رنگ لیے ہوئے ہے۔دورانِ جنگ حسین نظام شاہ کی شجاعت اور بہادری کا حال بیان کرتے ہوئے شاعر نے ایسی فن کاری دکھائی ہے کہ شاعری پر مصوری کا گمان ہوتا ہے۔میدان جنگ کا نقشہ کھینچتے ہوئے شاعر نے پرشکوہ الفاظ اور زور بیان کے ذریعے اردو شاعری کو اس کی ابتدائی زمانے میں ہی رزمیہ شاعری کی دولت سے مالا مال کر دیا ہے۔ جیسے:

دما میں دما میں اُپر در پڑا جتے راج بندی کئے گڑ بڑا
نفارے دما میں وبا جیں طبل چلے جوش آکر سو دریا اُبل
سلحدار سردار جیتے وزیر سلح پوش راوت و برناؤ پیر
چلی فوج جوں موج دریا ابل سو سو ندل جو بادل گرجتا نکل
سو جیوں ابردودھرتے فو جاں چلیاں جھمکنے لگے سلح جیوں بجلیاں
کھڑک کوں کھڑک لگ سو چنگیاں چھڑیاں وہ چنگیاں کیریاں بنچلیاہو چڑیاں
جھلک دیکھ بجلیاں کی تروا کی پرانا اڑی دھرتی سنسار کی[۴۹۷]

اس معرکے میں آخر کار شاعر نے اپنے مربّی حسین نظام شاہ کی فتح دکھائی ہے اور تاریخی حقیقت بھی یہی ہے۔رام راج کے عبرت ناک انجام کا نقشہ کھینچتے ہوئے شاعر نے اس فتح کو غیبی مدد قرار دیا ہے۔اس منظر کو دکھاتے ہوئے شاعر کا بیان ہے کہ:

مدد جیوں فتح آسمانی جو پائے پکڑ رام کوں شاہ نزدیک لائے
نظر شاہ کی اس اُپر جو پڑی کیا قتل کا حکم سو اس گھڑی
کہ یارب دی منج اس صبر کی جزا جو بے دین کوں میں جو دیتا سزا
خلل تھا کفر کا دیا جس خدا کیا رام کا سیں تن تے جدا[۴۹۸]

اس طرح اس مغرور راجا کا جس نے اس زمانے میں مسلم سلاطین دکن کے ناک میں دم کر رکھا تھا، خاتمہ ہوتا ہے۔اس کے غرور و تکبر کی وجہ سے مثنوی پڑھنے والے کے دل میں حسین نظام شاہ سے محبت اور رام راج سے نفرت کا شدید احساس پیدا ہوتا ہے۔اس کی موت رام راج کی موت پر قاری کے دل میں یہ احساس بھی پیدا ہوتا ہے کہ اس بدکردار سے جہاں پاک ہوگیا[۴۹۹]۔

یہ مثنوی اس عہد کی شاعری کا بہترین نمونہ ہے۔ زورِ بیان، واقعہ نگاری اور جذبات کے دل کش اظہار کے لحاظ سے بھی بہت کم مثنویاں اس کا مقابلہ کرسکتی ہیں [۵۰۰]۔ مثنوی میں کہیں کہیں مبالغہ آرائی بھی کی گئی ہے لیکن اسے شعری ضرورت سمجھ کر نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔ دورانِ جنگ روزِ اوّل سے ہی حسین نظام شاہ کا جو غلبہ دکھایا گیا ہے وہ تاریخی حقائق کے خلاف ہے۔ اس کے علاوہ پیغامات کے تبادلے لیے دونوں بادشاہوں کی جانب سے جو خطوط لکھے گئے، اس کے تاریخی شواہد موجود نہیں۔ بقول ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار:

> بہ ظاہر یہ فرضی اور شاعر کے تخیل کی پیداوار معلوم ہوتی ہے ...تاہم اس سے یہ ضرور واضح ہوتا ہے کہ دو متحارب طاقتیں ...جب میدان جنگ میں نکلتی ہیں تو لوگوں کے خیالات ایک دوسرے کے متعلق کیا ہوتے تھے اور پھر جنگ کے اس دستور کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ ضرب و حرب سے پہلے فریقین، تمام حجت کو بھی ضروری خیال کرتے تھے [۵۰۱]۔

حسین نظام شاہ بحری اور رام راج کی خط کتابت سے قطع نظر، مورخینِ جنگ سے قبل علی عادل شاہ اور رام راج کی خط و کتابت کا ذکر ضرور کرتے ہیں۔ جو ان چاروں مسلم سلاطین کے مشورے کے بعد جنگ چھیڑنے سے قبل ہوئی تھی۔ اُس خط کے ذریعے علی عادل شاہ نے رام راج کے زیرِ قبضہ اپنے علاقے اس سے واپس مانگے تھے [۵۰۲]۔ شوقی نے مثنوی لکھتے ہوئے تاریخی حقائق کو بھی اپنے سامنے رکھا۔ تاریخ سے انحراف کی مثالیں اس مثنوی میں کم ہی ملیں گی۔ اس کے پیش کردہ اکثر بیانات کی تصدیق دکن کی مختلف تاریخوں سے کی جاسکتی ہے۔ اس کے علاوہ بعض مشہور اور نام ور لوگوں کے ناموں کی تصحیح و تصدیق بھی اس مثنوی سے ہوتی ہے۔ لڑائی میں شریک دونوں افواج کے مختلف سرداروں اور امراء کے نام بھی اس مثنوی کے ذریعے معلوم ہو جاتے ہیں [۵۰۳]۔

یہ مثنوی ایک اہم تاریخی واقعے کو بیان کرنے کے علاوہ اس عہد کے سیاسی رجحانات پر بھی روشنی ڈالتی ہے [۵۰۴]۔ رام راج کی عظیم فوجی طاقت اور اس کی چال بازیوں سے دکن کے سلاطین کو جو خطرات لاحق تھے، اس کا اندازہ بھی مثنوی کے مطالعے سے اچھی طرح ہو جاتا ہے۔ اس کی فوجی طاقت کے آگے مسلمان سلاطین کی کمزوری اور مایوسی کی جھلک بھی اس میں دیکھی جاسکتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ ''حسین نظام شاہی کا تدبر تھا کہ اس نے نہایت ہوشیاری اور عقل مندی سے رام راج کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور عظیم کامیابی حاصل کی'' [۵۰۵]۔

مثنوی کے مطالعے سے جنگوں کے نتیجے میں پیدا ہونے والے انسانی المیے اور سانحے پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ انسانی جانوں کے زیاں کی ایسی مثالیں تاریخ عالم میں کم ہی ملتی ہیں جیسی کہ اس جنگ کے نتیجے میں ہوئیں۔ اس کی رزمیہ خوبیوں کی وجہ سے آر۔ سی۔ مجمدار نے ''دی مغل ایمپائر'' میں اس مثنوی کو Heroic Poem قرار دیا ہے [۵۰۶]۔ تاریخی اعتبار سے بھی اسے اردو کی پہلی رزمیہ نظم کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ حسین نظام شاہ اور رام راج کی دشمنی کے بیان میں شاعر نے رام راج کے کردار کو ایک ایسے دشمن کے طور پر پیش کیا ہے کہ یہ کردار دکنی اسلامی تاریخوں میں نقیب کی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔ اس کے اوصاف خبیثہ اور خصائل کو شوقی نے اس طرح پیش کیا ہے کہ اس کی شخصیت کے سارے خد و خال مثنوی کے لیے بہت موزوں اور مناسب معلوم ہوتے ہیں۔ اس تاثر کو ابھارنے کے لیے شوقی نے بحر کی روانی اور دھمک سے بھی پورا پورا کام لیا ہے۔ مثنوی کی زبان پر فارسیت کا غلبہ ہے [۵۰۷] جو کہ اس زمانے کی بہمنی سلطنت کا عام رجحان تھا۔ ظاہر سی بات ہے کہ ساڑھے چار سو سال قبل جس قسم کی زبان برصغیر کے طول و عرض میں رائج تھی اس کا اثر دکن میں بھی ہوا۔ مثنوی میں

شوقی نے شاعرانہ اظہار بیان اور موقع محل کے مطابق تشبیہات بھی استعمال کی ہیں اور بیان کے ساتھ ساتھ تیکھا لہجہ بھی۔ اس قدرت بیان نے شوقی کے اسلوب میں ایسی روانی پیدا کر دی ہے[۵۰۸] کہ اتنا عرصہ گزرنے کے باوجود بھی وہ زبان ہمیں اجنبی نہیں لگتی۔ مثنوی میں جہاں جہاں مکالمے آئے ہیں، وہاں وہاں افرادِ واقعہ کی طرز فکر اور شخصیت بھی ضرور ملحوظ خاطر رکھا گیا ہے[۵۰۹]۔ بقول ڈاکٹر جمیل جالبی ''مثنوی کے مطالعے سے نہ صرف شوقی کی قادرالکلامی کا پتا چلتا ہے بلکہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ خود اردو زبان میں بڑے موضوعات کو طویل نظموں کے ذریعے بیان کرنے کی صلاحیت بھی پیدا ہو چکی ہے''[۵۱۰]۔ پوری مثنوی میں روانی اور تیز بہاؤ کا احساس نمایاں ہے۔ اس روانی میں ایک ایسے آہنگ کا احساس ہوتا ہے جیسے تاشے بج رہے ہوں۔ اس فنی عمل کے لیے شوقی الفاظ کو ایسی ترتیب سے استعمال کرتے ہیں جس میں ایک ہی حرف بار بار استعمال ہوا اور آوازوں کے ٹکراؤ سے آہنگ پیدا ہو جائے۔ مثنوی کے مطالعے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کو رزم و بزم دونوں بیان میں قدرت حاصل ہے۔ وہ موقع و محل کے مطابق اسلوب و لہجہ استعمال کرتا ہے۔ مثنوی کے مطالعے سے ہندو مسلم تہذیب کا فرق بھی پوری طرح ابھر کر سامنے آجاتا ہے[۵۱۱]۔ اس زمانے میں مسلمانوں کے ساتھ روا رکھے جانے والے سلوک اور مظالم کے خلاف مسلمانوں کے اتحاد نے جس طرح دشمن کو نیست و نابود کیا، اس مثنوی میں ان تمام حقائق کو بیان کیا گیا ہے۔ مثنوی کے مطالعے سے یہ پیغام بھی ملتا ہے کہ مسلمان اگر اپنے باہمی اختلافات کو مٹا کر ایک ہو جاتے تو بڑے سے بڑا دشمن بھی ان کا کچھ نہیں بگاڑ پائے گا۔

اس مثنوی کی زبان اور اسلوب کے بارے میں بحیثیت مجموعی جو احساس ابھرتا ہے کہ اس پر اظہار خیال کرتے ہوئے ڈاکٹر جمیل جالبی نے درست کہا کہ ''یہ مثنوی زبان کا جنگل ہے، بیان کے پرخار راستوں کو صاف کرنے، صحراؤں اور دلدلوں میں راستہ بنانے کی انتہائی کامیاب کوشش ہے''[۵۱۲]۔

اردو شاعری کا دکنی دور: عشقیہ مثنویوں میں رزمیہ عناصر، دور، انتشار، قحط کے اثرات

دکنی شاعروں نے عشقیہ مثنویوں میں بھی جنگ و پیکار کے مناظر دکھائے ہیں[۵۱۳]۔ ان مثنویوں میں بھی اکثر و بیشتر جنگ و جدل اور معرکہ آرائی کے حالات کئی کئی صفحات میں نظم کیے گئے ہیں۔ اس زمانے میں آئے دن جنگ و جدل کا بازار گرم رہتا تھا۔ لہٰذا ماحول سے متاثر ہو کر لڑائی جھگڑوں اور جنگ و جدل کا ہنگامہ ان مثنویوں میں بھی بپا رہتا تھا[۵۱۴]۔ غواصی بزم کے میدان کا شہ سوار ہے اور رزمیہ میں اس کی طبیعت کچھ کندسی نظر آتی ہے لیکن پھر بھی اس کی مثنوی ''سیف الملوک بدیع الجمال'' میں دو ایک مقام ایسے ضرور ہیں جن میں جنگ کے مناظر دکھائے گئے ہیں۔ رزمیہ کے بیان میں یہ مناظر کم زور سے ہیں البتہ شہپال اور بادشاہ دریائے قلزم کی لڑائی کے موقع پر اس کا زورِ قلم رزمیہ کے لیے موزوں دکھائی دیتا ہے[۵۱۵]۔ شعر ملاحظہ کیجیے:

جو دریا لہو ہو ابلنے لگیا　　لگن اس پہ کشتی ہو چلنے لگیا
سرا تیرتے لُہو کے سمدورتے　　جو دستے اٹھے بُڑ بڑے دورتے
دھڑاں سب نپٹ موج کے لوٹ مار　　تھے ڈبتے، نکلتے، نہنگا کے سار
بڑا رن پڑیا سخت رگڑا ہوا　　کہیں کے سونا دریو جھگڑا ہوا
عضب پر عضب کا جو مارا ہوا　　سو ایسا بڑا کچ دھولارا ہوا[۵۱۶]

جنگ کے ان مناظر میں دریائے قلزم کے کنارے جو لڑائی ہو رہی ہے اور دیووں کے سر پانی میں کٹ کٹ کے گر رہے ہیں دراصل اس زمانے کے مختلف مناظر کی تصویر ہے جو کہ ہندو اور مسلمانوں کے درمیان لڑی گئی۔ جنگ کی خوں ریزی، غضب ناکی اور قیامت خیزی کے جو مناظر غواصی کے مافوق الفطری عناصر کے ذریعے دکھائے ہیں، گمان ہوتا ہے کہ وہ دراصل اس دور کے حقیقی مناظر ہیں جیسے:

ہوئے جمع جنگی ہزاراں تمام	قوی دست خوں خوار شیراں تمام
غصب ناک ہو جیوں انگے دَل ہوئے	کلیجے پہاڑاں کے پھٹ جل ہوئے
اٹھیا غل جہاں کا تہاں مار مار	قیامت زمیں پر ہوئی آشکار
غصے کا جو بازار اٹھیا زور سوں	پڑیا اس کے لشکر پہ جا قہر سوں
سٹیا اس کے لشکر کوں جاں تاں بکھیر	لگیا توڑنے تول سوں گھیر گھیر
اتالے ہو آفت بھرے عزم سوں	کھڑے آگے میدان میں رزم سوں
جھلک دیک بجلیاں سی تروار کی	اوڑی فاختی سخت سینسار کی[۵۱۷]

اس کی دونوں مثنویوں ''سیف الملوک بدیع الجمال'' اور ''طوطی نامہ'' میں سلطان عبداللہ قطب شاہ کے مدح میں اشعار موجود ہیں۔ جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ مثنویاں اسی کے دور میں لکھی گئیں [۵۱۸]۔ غواصی کے کلام میں بعض تاریخی حقائق کی نشان دہی بھی موجود ہے۔ قطب شاہی سلطنت میں ہندوؤں کے مندروں اور دیگر عبادت گاہوں کو خاصا تحفظ حاصل تھا۔ اس مذہبی رواداری کے برخلاف میر محمد سعید اردستانی نے جب مندروں پر حملہ کر کے لوٹ مار کی اور تمام زر و جواہر غصب کر لیے تو عبداللہ قطب شاہ نے اس سے جواب طلبی کے لیے بلوایا۔ بجائے وہ دربار میں حاضر ہوتا، اس نے اورنگ زیب کے ساتھ ساز باز کر کے گول کنڈا پر حملہ کر دیا۔ اس حملے کے بعد ہی قطب شاہی سلطنت کو زوال آیا اور رفتہ رفتہ یہ سلطنت ختم ہوگئی۔ غواصی کو اس بات پر بڑا رنج تھا کیوں کہ محمد سعید اردستانی نے اپنی غداری سے قرآن پر حلف لینے کے باوجود غداری کی اور اسے بھی بادشاہ کے سامنے شرمندہ کیا[۵۱۹]۔ غواصی کے کلیات میں ان واقعات سے متعلق درج ذیل قطعہ محفوظ ہے۔

اے کردگار میں جو کرم جس کے باب کر	درجہ بلند کر دے کہ نواز کر
ستی پہ جا دنیا کی یکا ایک منج تھی پھیر	کیسا گناہ اپنے لیا سر پہ لاب کر
مصحف پہ ہاتھ مار گنوایا سب اعتبار	ایمان ہور دین کون اپنے خراب کر
حیران ہو سعید کور کیوں سیقی ہو آج	حق نے پڑیا یو اور منم کا حجاب کر
کیا شرح اس کی شکر گزاری کی میں کروں	آدم ہو آخر اپسیں دکھایا دواب کر
میری بھلائی کوچ نہ لیا یا حساب میں	عاصی ہوا برائے مسوں بے حساب کر
ایسے حرام خور کی یا رب نہ رکھ بنیاد	منج شاہ عبدلا کی دعا مستجاب کر[۵۲۰]

ابن نشاطی عبداللہ قطب شاہ کا درباری شاعر اور معزز عہدیدار تھا[۵۲۱]۔ مثنوی کی تخلیق کے وقت وہ دربار سے وابستہ نہیں تھا اس

کا ثبوت وہ اشعار ہیں جن میں دریا تک رسائی کی آرزو کرتا ہے[۵۲۲]۔ پھول بن کوئی رزمیہ مثنوی تو نہیں لیکن اس مثنوی میں بھی قصے کے درمیان جنگ کے مناظر کو جس سلیقے اور معرکہ آرائی کی تصویریں جس دیدہ وری سے نظم کی گئی ہیں اس سے شاعر کے زور بیان اور فنی پختگی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ ابن نشاطی آلات حرب اور جنگی معرکہ آرائی سے اچھی طرح واقف تھا اسی لیے اس کے رزمیہ بیان میں مشاہدے کی گہرائی کا پورا احساس نظر آتا ہے[۵۲۳]۔ تلوار کی تیزی اور چمک کے منظر کو پیش کرتے ہوئے شاعر کا بیان دیکھیے:

ھوے کا جھل جھلانا دیکھ جھلکار   دیویں بوسے سمجھ کر دھن کے رخسار
ہماری تیغ کوں ہے نانوں اونا   کہے اونا کرے دو کام دونا
اسی تے اس کوں ہے سب ٹھار قیمت   سنے گا پھول سوہے اس کو حجت[۵۲۴]

اسی طرح جنگی نقاروں اور باجوں کا بیان بھی نہایت پر اثر ہے۔

لگی یک دھرتے بھیں بھیں بھیر بجنے   لگے دھم دھم دمامے سب گرجنے
اٹھیا جو پھیر پیشا پوش کا شور   نقاریاں کا ہوا باجا بہت زور
کیا بادل تک یو شور ہو رغل   پڑیا غوغے سوں نس جنگ میں تزازل[۵۲۵]

اس شاعر میں رزمیہ شاعری کے بیان کی اچھی صلاحیتیں موجود تھیں۔ اگر وہ خالصتاً رزم کو اپنا موضوع بناتا تو دکنی ادب کو بے مثل رزمیہ شاعری سے مالا مال کر دیتا۔ ''پھول بن'' جیسی عشقیہ مثنوی میں بھی جہاں رزم کا منظر بھی دکھایا گیا ہے، وہاں وہ جنگ کے آداب کو نہیں بھولتا۔ وہ جنگی باجوں، ہتھیاروں اور لوازمات سے پوری طرح واقفیت رکھتا تھا اس لیے جہاں موقع ملتا ہے ان ہتھیاروں اور آلات حرب کے نام اور قسمیں تک گنواتا ہے۔ جزئیات نگاری کی وجہ سے ابن نشاطی کے رزمیہ مناظر حقیقی اور سچے معلوم ہوتے ہیں[۵۲۶]۔

دورِ انتشار کی شاعری:

عبداللہ قطب شاہ کے آخری زمانے میں اورنگ زیب عالم گیر کے حملے کی وجہ سے قطب شاہی سلطنت میں انتشار پیدا ہو چکا تھا۔ ۱۶۶۶ء میں اورنگ زیب سے جو صلح ہوئی تھی وہ صلح نہ تھی بلکہ قطب شاہی سلطنت کے خاتمے کا اعلان تھا۔ اس زمانے میں اورنگ زیب سفیر دکن کے تمام امور کی براہ راست نگرانی کر رہے تھے۔ ان کی دخل اندازی سے قطب شاہیوں کی آزادی تقریباً ختم ہو چکی تھی۔ شعرا اس دور کے زیادہ تر مرثیے کی طرف مائل تھے[۵۲۷]۔ سلطنت کے خاتمے کے باوجود محسوس یہ ہو رہا تھا کہ ان بادشاہوں کو اس کا ذرہ برابر بھی افسوس نہیں تھا۔ اتنے بڑے سانحے کے باوجود وہ ہنستے کھیلتے اور دادِ عیش دیتے ہوئے زندگی کے بقیہ دن پورے کرنے لگے۔ عبداللہ قطب شاہ کے اس شعر سے اس کی زندگی کے فلسفے کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے[۵۲۸]۔

یو دنیا دو دن کی ہے مہماں، اسے کچھ ٹھیر نیں   دل نہ باندھ اس سات توں خوش حال رہ پاں غم نہ تھا[۵۲۹]

مغل سفیر شیخ محی الدین کے ذریعے گول کنڈا اور شیخ عبداللطیف گجراتی کے ذریعے بے جا پور حکمرانوں کو شاہ جہاں کا فرمان ارسال کر دیا گیا تھا کہ خطبے میں شاہ ایران کے بجائے شہنشاہ ہندوستان شاہ جہاں کا نام لیا جائے[۵۳۰]۔ پورے دکن خصوصاً حیدر آباد میں

بدظنی اور عدم اعتمادی کی لہر دوڑ گئی۔ عوام کے اعتماد کو بحال کرنے میں ابن خاتون کو سخت محنت کرنا پڑی[۵۳۱]۔ عبداللہ قطب شاہ کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھا کر مغل سلطنت گول کنڈا میں قدم جمانے میں پوری طرح کامیاب ہو چکی تھی[۵۳۲]۔ مغلوں سے تعلقات پہلے ہی کشیدہ تھے۔ مذکورہ صفحات میں ذکر کیا جا چکا ہے کہ اس کے بعد اورنگ زیب کے درمیان ہونے والے معاہدے کے نتیجے میں جو ہزیمت اسے اٹھانی پڑی اس نے قطب شاہی حکومت کو تقریباً خاتمے کے قریب کر دیا تھا۔ یہ واقعہ گول کنڈا کی تاریخ میں انقلاب کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس جنگ کے دوران حکومت کے تمام خزانے خالی ہو چکے تھے۔ رعایا پریشان اور ناآسودہ تھی[۵۳۳]۔

ملک میں ہر طرف تاریکی ہی تاریکی تھی۔ لوگوں کی حالت بد سے بدتر ہوتی جا رہی تھی۔ اس انتشار کا آغاز تو خیر اس سے بہت پہلے ہی ہو چکا تھا۔ محمد قطب شاہ کے عہد میں ہی لوگوں کی جو معاشی حالت تھی اس عہد کی شاعری میں کہیں کہیں اس صورت کی عکاسی نظر آتی ہے۔ غواصی نے اپنی تنگ دستی، پریشان حالی اور زمانے کی ناقدری کی جو شکایت کی ہے اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ جب خواص کا یہ عالم تھا تو عوام الناس کس حال میں ہوں گے۔ دنیا سے بےزاری اور اکتاہٹ کا اظہار کرتے ہوئے اس نے ''کتخدائی سیف الملوک وبدیع الجمال'' کے عنوان سے جو اشعار کہے ہیں، ملاحظہ کیجیے:

کہ غمگیں ہوں میں سخت سنسار تھے	دھروں دغدغے لاک اس آزار تھے
پریشانگی میں جمیا خیال میں	لے آیا ہوں اسے رتن ڈھال میں[۵۳۴]

ہندو ریاستیں ہوں یا مسلمان، ہر جگہ بادشاہ اور اس کے درباری پُرتعیش زندگی بسر کر رہے تھے، لیکن عوام کا رہن سہن اور معیار زندگی بہت پست تھا[۵۳۵]۔ شمالی ہند میں بھی طبقۂ اعلیٰ جو کہ کل آبادی کا ایک جزوی حصہ تھے، دولت مند اور خراج تھے۔ وہ لوگ عیش کی زندگی بسر کر رہے تھے لیکن عام لوگوں کا کوئی پرسانِ حال نہیں تھا۔ اس پر سے طرّہ یہ کہ فوجی افسر رشوت خور اور سرکاری اہل کار عیاش تھے[۵۳۶]۔ دکن میں بھی دربار سے وابستہ امرا اور حکام اور شاہی ملازمین رشوت ستانی، اخلاقی زبوں حالی اور دیگر بدعنوانیوں میں ملوث تھے۔ اس زمانے میں ہندوستان میں بسنے والی ہر قوم کی ذہنی حالت زوال کا شکار نظر آتی ہے۔ تعلیم یافتہ اور قابل لوگ عہدوں سے محروم رہتے اور امرا کے عزیز رشتے داروں کو بڑی بڑی آسامیوں پر مقرر کیا جاتا۔ امرا میں اخلاقی تنزلی بہت نمایاں تھی۔ عیش وعشرت، کاہلی اور تن آسانی ان کا شیوہ تھا۔ عہد مغلیہ تک بھی یہ تاریکی برقرار رہی اور مختلف عہدوں پر مامور تقریباً ہر محکمے اور شعبے میں رشوت ستانی کا دور دورہ نظر آتا ہے۔ عہدے داروں کی رکاکت اور شرفا کی عیش پرستی کا احوال تو مختلف شعرا کے ہاں ملتا ہے[۵۳۷]۔ غواصی نے خود ان درباروں کو بہت قریب سے دیکھا تھا اور وہاں کے ارباب حل وعقد میں بھی شمار ہوتا تھا۔ لہٰذا امرا اور حکام اور شاہی ملازمین پر کی گئی اس کی تنقید کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا[۵۳۸]۔ عبداللہ قطب شاہ کے عہد کے بعض عہدے داروں نے جس طرح رشوت ستانی کا بازار گرم کر رکھا تھا، اس سے بادشاہ بےخبر تھا۔ غواصی نے ایک با اعتماد مشیر کا فرض ادا کرتے ہوئے کافی تفصیل سے اس صورت حال کی جانب اپنے قصیدے میں اشارہ کیا ہے[۵۳۹]:

ہر کام میں کر حرکتاں بے شک وہ لیتے رشوتاں	ہیں یو بڑے بے دولتاں جم راج کرائے راج توں
ہر داناں کو توڑیو چھوچیاں کوں لیا لیا جوڑیو	لشکر سے سب کوں پھوڑیو جم راج کرائے راج توں
یو ملحداں جب سے تھے ملے تب تھے نہیں یاں کچھ ملے	اتینچ میں توں سمجھ لے جم راج کرائے راج توں[۵۴۰]

غواصی نے بڑے اعتماد، راست گوئی اور آزادی کے ساتھ ان امرا اور حکام کی اخلاقی زبوں حالی کی طرف اشارہ کیا ہے اور ہماری توجہ مبذول کروائی۔ عہد محمد قطب شاہ میں اس نے جو خاموشی اختیار کی تھی وہ سکوت اس نے بعد میں توڑا[۵۴۱]۔ اور بالآخر یہ کہنے پر مجبور ہوا کہ:

تج دور میں منہ کھول میں بولیا ہوں نادر بول میں　　جو ہرا مولک رول میں جم راج کرائے راج توں[۵۴۲]

ایسے زوال پذیر معاشرے میں فرد صرف اپنی ذات کو مرکز نگاہ بنا کر زندگی کا سفر طے کرنے لگتا ہے۔ تنگ نظری، مفاد پرستی، مذہبی منافرت، تعصب، ملک فروشی وغدّاری جیسے تخریبی رویے معاشرے کا ناسور بن جاتے ہیں۔ اجتماعی شعور معاشرے کے وسیع تر مفاد سے اس قدر دور ہو جاتا ہے کہ فرد اپنی ذات سے آگے دیکھنے کی قوت سے محروم ہو جاتا ہے۔ معاشرے کی بربادی کے سانحے کو لوگ خاموش تماشائی بن کر اس طرح ان جان بن جاتے ہیں جیسے اس بربادی سے ان کا کچھ لینا دینا نہیں۔ حکمرانوں سے لے کر حکمت و دانش سے وابستہ لوگ اسی ڈگر پر چلنے لگتے ہیں۔ مثبت قدروں کی جگہ منفی قدریں لے لیتی ہیں[۵۴۳]۔ غواصی نے سرد و گرم زمانے کو خوب اچھی طرح دیکھا تھا۔ وہ دنیا کے تمام نشیب و فراز سے واقف ہو چکا تھا۔ لہٰذا زندگی کے ان تجربات کو بھی اپنے شعر کی شکل دی۔ اسی لیے دنیا کی طمع و لالچ کے بجائے وہ اپنی شاعری میں یہ پیغام دیتا نظر آتا ہے کہ:

دنیا کے طمطراق سے درد مندگی بھلی　　یعنی زمین کے ساد سرافگندگی بھلی

یا

ہمن سر کوں چندوئی بس بلش بھر یک لنگوٹی بس　　سکھی کھانے کوں روٹی بس قیولیاں نعمتاں کیا کام[۵۴۴]

کچھ یہی صورت حال سترھویں صدی کے اواخر میں ابوالحسن تانا شاہ اور سکندر عادل شاہ کے دور حکومت میں دکن کو درپیش تھی۔ تہذیب کی عمارت کچھ تو گر چکی تھی اور جو بچی کچی تھی اس کے مٹ جانے کا خوف بھی لوگوں کو مایوسی کی طرف دھکیل رہا تھا۔ ملا وجہی نے اسی بے مہری اور خودغرضی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ:

دنیا کے سو لوگاں میں وفا دستا نیں　　دھنڈ دیکھی جنا باج جفا دستا نیں
بے مہری بنی آدم ہے اس سوں سسکی　　دل باندنے میں کچ نفا دستا نیں[۵۴۵]

لوگوں کے دلوں میں موجود اس خودغرضی اور مفاد پرستی کی جانب اشارہ محمود کے اس شعر میں بھی ملتا ہے:

سرد مہری بس کہ لوگاں کی دلاں میں جا کی　　سکھ گرم کس کا دسا نئیں مجہ کوں[۵۴۶]

برہان الدین جانم نے بھی ''عبرت آدم'' نامی ایک نظم میں انسانوں کی بداعمالیوں کا ذکر بڑے افسوس کے ساتھ کرتے ہیں:

کہیں یہ سب بنائے کاہے کیرج کاج　　کہیں عبرتِ آدم گونج مج سوں ہوئیں آج[۵۴۷]

امین گجراتی نے مثنوی ''یوسف و زلیخا'' میں عشق کی تڑپ اور اضطراب کا نقشہ کھینچا ہے لیکن اس مثنوی میں بھی کچھ شعر ایسے ملتے ہیں جو اس زمانے کی صورت حال پر صادق آتا ہے:

زمانے کا ستم بسیار ہے رے　　زماناں توں بڑا خونخوار ہے رے[۵۴۸]

اس زمانے کی معاشی حالت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ دربار سے وابستہ شاعر اور اہل علم تک اس سے متاثر

ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ بے روزگاری اور معاشی عدم استحکام کی وجہ سے ایک ایک شخص پر کنبے کے سیکڑوں افراد کی کفالت کا بوجھ پڑ رہا تھا۔ ہاشمی سکندر کے عہد میں بے جاپور میں مقیم تھا، معاشی پریشانیوں سے تنگ آ کر بعد میں اپنے آبائی وطن برہان پور چلا گیا۔ اس کی معاشی تنگ دستی اور بے روزگاری کا حال ذوالفقار خان کی مدح میں لکھے گئے قصیدے میں درج ہے۔ یہ قصیدہ قلعہ جنجی کی فتح کے موقع پر ۱۱۰۹ھ میں لکھا گیا۔ قصیدے کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہاشمی پہلے خاصے خوش حال تھے لیکن بعد میں معاشی پریشانیوں نے انھیں آ گھیرا[۵۴۹]۔ ظاہری بات ہے یہ پریشانیاں اس زمانے کے سیاسی، سماجی اور معاشی زوال کی طرف اشارہ کر رہے ہیں جہاں جنگ وجدل نے انسان کی مجموعی زندگی کو ترقی کے بجائے تنزلی کی طرف دھکیل دیا ہے۔ قصیدے کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ ہاشمی کو اکیلے ہی گھر کے ایک سو چار افراد کا بار اٹھانے کے ساتھ ساتھ گھر کے اونٹ اور گھوڑے کے اخراجات اٹھانے میں خاصی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ ہاشمی اپنی پریشانیوں کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

تجھ جس برس کوں دیکھ کر مجھ کن عزیز تے آ ملے   زن مرد بزرگ وخورد مل سو کے اوپر آدمی ہیں چار

پھرتا ہوں تیرا جس تیرا جس گلر زینت سوں مجھ رہنا لگیا   گھوڑے ہیں ہور اونٹ دو گاڑیاں ہیں دو گھر کے مجھار[۵۵۰]

ملک میں ہر طرف تاریکی کے گہرے بادل چھائے ہوئے تھے۔ لوگوں کی حالت بد سے بدتر ہوتی جا رہی تھی۔ صرف دکن ہی نہیں بلکہ اس عہد کی مغلیہ سلطنت پر بھی اسی قسم کی تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ ملک کو ہر طرف سے پریشانیوں اور بلاؤں کا خوف تھا۔

اورنگ زیب کی مہم دکن میں لگ بھگ پچیس برس تک جاری رہی۔ اس دوران ملک میں اور ابتری پھیلی، محاصروں اور ملک سوزیوں نے ان مصیبتوں کو اور بڑھایا۔ ان حالات میں ملک کے اندر ہی ایک جگہ سے دوسری جگہ سفر کرنا مشکل ہو گیا۔ ایسے میں تجارت کا محدود ہونا فطری امر تھا۔ لہٰذا تجارت محض مقامی ہو کر رہ گئی۔ دیہاتی صنعت وحرفت کو سخت نقصان پہنچا۔ نتیجتاً ملک کی اقتصادی اور مالی حالت مفلوج ہو کر رہ گئی۔ ایک طرف شمال میں اورنگ زیب نے باپ دادا کی جمع کی ہوئی بے انداز دولت کو دکن میں جاری مہمات میں خرچ کر ڈالا[۵۵۱] تو دوسری جانب قطب شاہی اور عادل شاہی حکم رانوں نے بھی مغلوں اور شیوا جی کے ساتھ لڑائیوں میں بے دریغ خزانہ خرچ کیا۔ نتیجتاً خزانے خالی ہو گئے۔ سید محمد کے مطابق ''انقیاد نامہ'' کی تکمیل کے بعد جب کہ مغل فوج سے جنگ کے نتیجے میں خزانے خالی ہو چکے تھے، عبداللہ قطب شاہ اس قدر دل گرفتہ ہوا کہ قلعۂ گول کنڈا میں گوشہ نشینی اختیار کر لی۔ حالات کی نزاکت کو بھانپتے ہوئے اس نے عملی طور پر حکومت کے انتظامات سے کنارہ کشی اختیار کر لی تھی[۵۵۲]۔ ایسے میں شر وفساد کی گرم بازاری کوئی اچنبھے کی بات نہیں۔ صوبہ جات کے حاکموں میں بغاوت اور ملکی بدعنوانیوں اور سازشوں کو دبانے اور پسپا کرنے کی قدرت اور صلاحیت اب حکم رانوں میں نہیں رہی تھی۔ خصوصاً اورنگ زیب کے عہد حکومت کے آخری دور میں تو یہ ابتری اور خانہ جنگیاں بہت نمایاں ہو گئیں جن کی وجہ سے ملک بے چارگی، شکستہ حالی اور فلاکت کے گڑھے میں ڈوب گیا[۵۵۳]۔ عبداللہ قطب شاہ کی شاعری میں اسی وجہ سے اس دنیا کی بے ثباتی اور بے اعتباری کا رویہ پایا جاتا ہے۔ جیسے:

یو دنیا دو دن کی ہے مہماں اسے کچھ تھیر نیں   دل نہ باندھ اس سات توں خوش حال رہ یاں غم نہ کھا[۵۵۴]

ملک خوشنود نے بھی دنیا کی بے ثباتی، مایوسی اور بے مہری کی جانب اشارہ کرتے ہوئے مثنوی ''ہشت بہشت'' میں درست کہا کہ:

عجب بے مہر دنیا بے وفا ہے   محبت عین اس کا سب جفا ہے

جتے ہیں دوستاں فرزند ساقی | سکل ہے گورنگ او سب ینگائی
بخیل نیکی کے گھر کا واں بنیاد | ترے بعد از کرے سب خلق تج یاد
نگر ایسا بدی جو سر دھنا وے | موئے پیچھے ترا کوئی غم نہ کھاوے
کہاں دارا سکندر شہہ کیانی | کہاں جمشد جم حاتم دو رانی
کہاں خسرو کہاں اور ستم زال | سینا نوشیرواں کا کیا ہوا حال[۵۵۵]

مقیمی بھی ان حالات کے زیر اثر ایک طرف تو دنیا کی بے ثباتی کا حال بیان کرتے ہوئے کہتا ہے کہ:

دنیا تو فنا ہے مقیمی سہی | رہے گی بچپن کی نشانی یہ[۵۵۶]

تو دوسری جانب اس غم وگریہ کو بیان کرنے سے نہیں چوکتا جو اس زمانے کے معاشرے میں بالعموم پائی جاتی تھی۔ وہ سماج کے اس سانحے کو جب لفظوں کے سانچے میں ڈھالتا ہے تو اس غم کی شدت میں بے اختیار یہ کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ:

جب مقیمی بیانِ غم کرتا | آگ جھڑتا ہے سب بچن سوں سکل[۵۵۷]

دنیا سے کنارہ کشی اور بے زاری کا یہ رویہ اس دور کی شاعری میں بالعموم ملتا ہے۔ دنیا میں محبت اور غم خواری کے بجائے جس طرح خود غرضی اور مفاد پرستی کے رجحان میں اضافہ ہو رہا تھا اس کا اظہار کرتے ہوئے سلطان نے فکر و غم میں ڈوبی ہوئی جو غزل کہی اس کے چند اشعار دیکھیے:

اے یار سن مجھ پندیو دنیا ستی رکھ پیار کم | ہور راکھ اپنے پاس توں سنسار کا بستار کم
کم بیٹھ صحبت خلق کی کم دہر طلب از سیم و زر | روشن ہوئے گا دل تیرا کم سوکھ کھا آدہار کم
مہر و وفا اس دہر میں کم ہیں عزیزاں تس سبب | ہر کس ستی تجھ درد و دل بے بول ہیں غم خوار کم[۵۵۸]

اکبر کے گجرات فتح کرنے کے بعد ترک وطن کر کے دکن کی ریاستوں کا رخ کرنے والے اکثر اہل کمال، معاشی یا سیاسی خلفشار سے گھبرا کر جنوب کا رخ کرنے پر مجبور ہوئے۔ ابتدا میں وہاں کچھ معاشی آسودگی نظر آتی ہے۔ اسی لیے احمد گجراتی نے مثنوی ''یوسف زلیخا'' میں اس اطمینان بخش معاشی واقتصادی حالت کا ذکر کیا ہے[۵۵۹]۔ جیسے:

کہیں نعمت خدا کا کم نہ تھا منج | کدھیں روزی کے تیں کچ غم نہ تھا منج
سدا منج کوں خدا عزت سوں راکھیا | جو عزت کوں میری کم کوئی ٹاکیا[۵۶۰]

لیکن کچھ ہی عرصے بعد ''لیلیٰ مجنوں'' لکھتے ہوئے حالات یکسر تبدیل ہو جاتے ہیں۔ اس مثنوی میں احمد پریشانیٔ روزگار سے شاکی اور انقلاب زمانہ کا ستایا ہوا شاعر نظر آتا ہے۔ اس نے اعتراف کیا ہے کہ وہ نامساعد حالات کی وجہ سے روزگار فراہم کرنے کے مختلف شغلوں میں مصروف رہا[۵۶۱]۔ جیسے:

بہوتیک پریشانِ روزگار | اگرچے منجے ہے مِلا مت سو بار
بہوتیک شغلاں سیتی رات دن | نہ تھی منج فرصت بھلڑیک بن[۵۶۲]

احمد کو یہ دیکھ کر سخت صدمہ ہوا کہ اس کے عہد میں کم تر درجے کے لوگوں کو تو دربار شاہی میں بڑے اعزاز و اکرام سے نوازا جا رہا

ہے لیکن اہلِ علم کی ناقدری عام ہے۔ اسی لیے اس نے غزل کی صنف میں بھی شکایتِ زمانہ کی داستان رقم کرنے کی کوشش کی ہے[۵۶۳]۔ جیسے:

مدح ملک ور چھوڑ کر دل میں ہجو کوئی بھاتے ہیں	کیا شعر کے مضمون میں ناکارہ حجت پاتے ہیں
یتی کے ہزاراں کی متاع نا جان کر اصراف سوں	در عیش و عشرت میں جتا، لولیاں سوں مل سب کھائے ہے
کنچن نمن سب تھا سو تن اسکوں نا کر سک جتن	پیوستہ قہبایاں سوں ہو علّت اپس کوں لائے ہے
حق نمک کا حق بڑا حق میں کتا ہوں نیں غلط	بڑکیاں کا اس نمکی بڑے بارے نمک تو کھائے ہے[۵۶۴]

جس زمانے میں عالم گیر کے ہاتھوں گول کنڈا کی اینٹ سے اینٹ بج رہی تھی، قاضی محمود بحری وہ تمام تحائف جو اسے بے جا پور میں ملے تھے، لے کر حیدر آباد روانہ ہوئے کہ راستے میں تمام تحائف اور سارا کلام دکنی و فارسی جو پچاس ہزار اشعار کے قریب تھا، رہزنوں نے لوٹ لیا[۶۶۵]۔ اس واقعے سے اس دور کے انتشار کا پوری طرح اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ظاہری بات ہے جب لوگوں کی معاشی حالت ابتر ہو رہی ہو اور روزگار کے مواقع دستیاب نہ ہوں تو لوٹ مار اور رہزنی کی وارداتوں کا بڑھنا ایک فطری امر تھا۔ خود بحری کے کلام کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ پہلے دکن کی معاشی حالت بہت اچھی تھی لیکن آسمان کی گردش نے انھیں بے حال کر دیا تھا۔ سقوطِ دکن کے زمانے میں وہ نہایت تنگ دستی اور پریشانی کا شکار رہے۔ چناں چہ سلطان سکندر عادل شاہ نے جو منظوم ''دعا نامہ'' فارسی میں لکھا اس کے دو اشعار تو دل دہلا دینے والے ہیں۔ شعر ملاحظہ کیجیے:

ایں دیں است کہ بے زباں فقیرم	در چنگلِ مفلسی اسیرم
باشم بتیں زار و بے زور	درخانہِ خود چو مردہ در کور[۵۶۶]

اپنی ذاتی حالت اور معاشی بدحالی کا نقشہ کھینچتے ہوئے انھوں نے لکھا کہ:

ہاں نہ مارو منجے سجن کہ کفن	مول لینے کوں زر کہاں ہے کو[۵۶۷]

مثنوی ''من لگن'' میں ''در شکایت روزگار'' کے زیرِ عنوان بحری نے اس عہد کی سماجی، معاشی اور اخلاقی تنزلی کا حال بیان کرتے ہوئے بڑے پر درد انداز سے اس سماج کا مرثیہ پڑھا ہے۔ ان کے مطابق کون سی برائی ایسی ہے جو اس دور میں عام نہیں۔ نیکی کا نام و نشان مٹ چکا ہے۔ صداقت اور ایمان عنقا ہیں۔ شرم و حیا رخصت ہو چکی ہے۔ معیشت کا برا حال ہے[۵۶۸]۔ غرض ہر طرح سے معاشرہ بدترین دور سے گزر رہا ہے۔ یہ مثنوی ۱۱۱۱ھ یا ۱۱۱۲ھ

اے بھائی یوں بارویں صدی ہے	نیکی کا دبا بدی بدی ہے
ہے آج تو قحط سال ست کا	جھٹکیا ہے دھرم سوں دل جگت کا
او دور منے جو ہے کمی کا	دبلا ہے دیانت آدمی کا
انصاف گیا ہے صاف جگ تے	ہور عدل کی وونچہ لاف جگت تے
دھرتی پہ ادھرم ادک ہوا ہے	امرت کے بجائے بک ہوا ہے
یک جیو پہ درد دین کا نیں	یک تن پہ اثر یقیں کا نیں

اس دور منے کتام نامی چولا کرے دور کی غلامی
نہ جائی کوں مائی کا بھروسا نہ بھان کوں بھائی کا بھروسا
دشمن بھی دسیا نہیں کہیں گھٹ ھور دوست تو دشمنی کی لٹ پٹ
نا ایک کوں دوسرا قبولے گرچہ اوسے دوسرا قبولے[۵۶۹]

بحری اس عہد میں پیدا ہونے کو اپنے لیے زبردست بدبختی سمجھتے ہیں، اسی لیے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ بحری نے جو کچھ مذکورہ اشعار میں کہا ہے، محض رسماً نہیں کہا۔ جیسا کہ اس زمانے کا رواج تھا کہ فارسی مثنویوں میں ''شکایت روزگار'' کے عنوان سے اس قسم کی باتیں لکھی جاتی تھیں بلکہ اس عہد کی معاشرتی اور اخلاقی حالات واقعی نہایت پست تھے[۵۷۰]۔ جھوٹ، مردم آزادی، بدنیتی، ظلم وزیادتی وغیرہ کے خلاف بحری کے اشعار پراثر ہیں[۵۷۱]۔ مثلاً

یک جھوٹ سوں دو جہاں لرزتا دھرتی سوں مل آسماں لرزتا
جے اور کوں آپ بچھانے وے کیوں کریں دشمنی دوانے[۵۷۲]

بحری اس ماحول میں جس میں ظلم و ناانصافی کا بازار گرم ہے، مثنوی ''من لگن'' میں ''در وعظ و نصیحت'' کے عنوان کے تحت معاشرے سے ظلم کے خاتمے اور انصاف کی سربلندی کے حوالے سے کہتے ہیں کہ:

ہاں خیر کوں چاہ چھوڑ دے شر یو خیر یو شر ہے تا کہ محشر
انصاف کوں جن جوسٹ دیا ہے ان ظلم اپس پہ گھٹ گیا ہے
یو ظلم فنا بقا ہے انصاف ہر باٹ کوں بدرقا ہے انصاف[۵۷۳]

اس دور کے دیگر شعرا میں سید شاہ حسین ذوقی جو کہ اپنے آپ کو نصرتی سے بھی بلند پایہ شاعر سمجھتے تھے[۵۷۴]۔ انھوں نے بھی اس عہد کی معاشی منظر نامے شوریدہ حالی اور بے التفاتی کی شکایت کی ہے۔ دو شعر ملاحظہ کیجیے:

نہیں ہے ہاتھ میں کھپرے پھریں درشن کی بھکیاں کو نیائے ایک در پر بھی بھکاری در بدر نکلے
رہے نادر خیالاں میں پلے شوریدہ حالاں میں ہوئے صاحب کمالاں میں کدھر سے آ کدھر نکلے[۵۷۵]

علی رحمتی بھی بے جاپوری شاعر تھے۔ مثنوی ''پند دل بند'' ان کی مشہور تصنیف ہے۔ محی الدین قادری زور نے اس مثنوی کو ۱۶۱۱ء۔۱۶۵۶ء کے درمیان کی تصنیف قرار دیا ہے[۵۷۶]۔ اس مثنوی میں بھی شاعر اس عہد کی عام اخلاقی حالت اور بے راہ روی کی تصویر کھینچتے ہوئے ان سے بچاؤ کے لیے جو مناجات لکھتے ہیں اس سے بھی اس سماجی منظر نامے کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ شعر دیکھیے:

ہمارے گناہاں سوں لرزے زمیں ترحم کرائے ارحم الراحمیں
جو نا چیز درکار بد حیف حیف گنوائے ہمیں عمر صد حیف حیف[۵۷۷]

مذکورہ صفحات میں جس قسم کی شاعری ہمارے پیش نظر رہی اس میں جنگ وجدل اور واقعات حرب کی وجہ سے پیدا ہونے والے انسانی سانحات اور المیوں کا تفصیلی جائزہ لیا گیا لیکن اس مطالعے کے دوران ایک چیز جو بہت واضح ہو کر سامنے آئی وہ یہ کہ یہ پوری کی پوری شاعری ''خواص'' کی شاعری ہے۔ بادشاہوں، حکم رانوں اور جرنیلوں کی زندگی اور ان کی مہمات کا بیان ہے۔ ان مہمات کے

نتیجے میں بھی بے شمار انسانی المیوں نے جنم لیا اور لاکھوں لوگ اس کے نتیجے میں لقمہِ اجل بنے لیکن سماجی، معاشرتی اور اقتصادی سطح پر جس قسم کے سانحات وقوع پزیر ہوئے، اس دور کی شاعری میں ان کی جھلک خال خال ہی ملتی ہے۔ بقول ڈاکٹر جمیل جالبی:

> ازمنی وسطی کا معاشرہ ''بادشاہوں'' کا معاشرہ تھا اور سارا معاشرہ اسی ادارے کے گرد گھومتا تھا۔ اس لیے اس دور کے ادب میں سارے کردار شہزادے، شہزادیاں، بادشاہ، وزیر، راجے اور مہاراجے ہی ملتے ہیں[578]۔

لہٰذا اس دور کی شاعری میں ہم ان راجاؤں مہاراجاؤں اور بادشاہوں کے حالات سے تو باخبر ہو جاتے ہیں لیکن عوام کی زندگی کس قسم کی تھی یا اس دور میں عام لوگ کس قسم کے مسائل کا شکار تھے، اس کے بارے میں کوئی واضح صورت نہیں ابھرتی۔ اس صورت حال میں ملا وجہی یا ان کے ہم خیالوں کا دکن کی تعریف میں اس قسم کا بیان کہ:

دکھن سا نہیں ٹھار سینسار میں — پنج فاضلاں کا ہے اس ٹھار میں

دکھن ہے نگینا انگوٹھی ہے جگ — انگوٹھی کوں حرمت نگینا ہے لگ

دکھن ملک کوں دھن عجب ساج ہے — کہ سب ملک سر ہور دکھن تاج ہے[579]

بے معنی معلوم ہوتا ہے۔ تاریخ کے مطالعے سے اس بات کا اچھی طرح اندازہ ہوسکتا ہے کہ خواص سے قطع نظر عام رعایا کی معاشی حالت کس حد تک پتلی تھی، حکم رانوں کی جانب سے لوگوں کے روزگار کا کوئی مستقل بندوبست نہیں ہوتا تھا۔ جو لوگ دربار سے وابستہ ہو جائیں ان کو تو انعام و کرام اور وظائف سے نوازا جاتا لیکن عمومی طور پر لوگوں کو اپنی زندگی کے معاشی مسائل سے خود ہی نبرد آزما ہونا پڑتا تھا۔ غالباً دو بڑے پیشے زراعت اور فوجی ملازمت ہی تھے جس سے عام لوگ وابستہ تھے، لیکن ان دونوں پیشوں میں وقتاً فوقتاً عدم استحکام پیدا ہوتا اور لوگ مفلوک الحال ہو جاتے۔ جہاں تک زراعت کا تعلق ہے اکثر و بیشتر یہ علاقے سیلاب اور قحط سالی کا شکار رہتے۔ شمال ہو یا جنوب ہر جگہ کم و بیش یہی صورت حال رہی۔ محمد بن تغلق کے زمانے میں جب وہ معبر کی بغاوت ختم کرنے کی غرض سے روانہ ہوا تو پورے ہندوستان میں بڑا سخت قحط پڑا تھا۔ معبر کے حاکم سید احسن شاہ کی بغاوت رفع کرنے کی غرض سے بادشاہ دکن کی طرف گیا تو کچھ ہی منزل چلا تھا کہ قحط شروع ہو گیا۔ جب وہ واپس آیا تو پورے ملک کو قحط میں مبتلا پایا۔ فرشتہ سے معبر کی بغاوت کا ذکر ۷۴۶ھ لکھا ہے[580]۔ اس وقت بادشاہ کی سفاک خوں ریزی سے تو ہزاروں لوگوں کی جانیں گئیں اس کے علاوہ جو بچ گئے وہ قحط سالی کا شکار ہوئے۔ معبر کی بغاوت ۷۳۷ھ یا ۷۳۸ھ میں ہوئی لہٰذا یہ قحط ۷۴۰ھ سے پہلے ہوئی ہوگی[581]۔ فرشتہ نے لکھا کہ قحط کی مصیبت ایسی عالم گیر تھی کہ سترہ روپے میں بھی ایک سیر غلہ میسر نہیں آتا تھا۔ انسان اور جانور بھوکے مر رہے تھے۔ پانی کا ایک قطرہ بھی آسمان سے نہ گرا اور ہزاروں بندگانِ خدا کی جانیں حقیقی و مجازی دونوں خداؤں کے قہر و غضب کا شکار ہوئیں[582]۔ بدایونی نے قحط کا ذکر ۷۴۴ھ میں کیا ہے لیکن اس نے ماضی کا صیغہ استعمال کیا جس سے یہ ابہام ہوتا ہے کہ قحط کب شروع ہوا اور کب ختم، اس کی وضاحت نہیں ہوتی۔ دوسری تاریخوں میں ۷۴۸ھ میں بھی قحط کا ذکر ملتا ہے۔ تمام مورخوں کے مطابق اس زمانے میں دو مرتبہ قحط پڑا، جیسا کہ فرشتہ نے لکھا کہ ''دو مرتبہ امسال باراں شد''[583]۔ پہلی بار ۷۴۲ھ اور دوسری بار ۷۴۳ھ اور ۷۴۴ھ میں۔ تاریخ مبارک شاہی میں تحریر ہے کہ ''قحط عام و گرانی غلہ ہفت سال چناں شد کہ قطرۂ از آسماں بنارید''[584]۔ گویا ۷۴۶ھ سے ۷۴۹ھ تک قحط رہا۔ ابن بطوطہ نے لکھا کہ قحط سے نرخ یہاں تک مہنگا ہوا

کہ ایک من کی قیمت ساٹھ درہم تک ہوگئی[۵۸۵]۔ برنی نے ایک سیر کی قیمت ۱۶ یا ۱۷ جیتل لکھی ہے[۵۸۶]۔ فرشتہ نے لوگوں کی حالت بیان کرتے ہوئے ایک جگہ لکھا کہ ''قحط کا اب یہ عالم تھا کہ آدمی کو آدمی کھاتے تھے اور پھر بھی بھوک کی آگ میں جلے جاتے تھے''[۵۸۷]۔ فرشتہ نے آدمی کو آدمی کے کھانے کا ذکر کیا ہے اس کی تصدیق ابن بطوطہ سے بھی ہوتی ہے۔ اس کے مطابق لوگ چمڑے کو پکا پکا کر بازار میں بیچتے اور عورتیں مرے ہوئے گھوڑے کی کھال کاٹ کاٹ کر کھاتی ہیں۔ کچھ خراسانی طالب علموں کے گروہ کا حوالہ دیتے ہوئے اس نے لکھا کہ جب وہ شہر پہنچے تو سارا شہر خالی پڑا تھا۔ صرف ایک شخص خالی مکان میں آگ جلا کر کسی آدمی کی ٹانگ بھون کر کھا رہا تھا[۵۸۸]۔ ایک مرتبہ قحط آتا تو تین تین سال تک لوگ اس کی مصیبت میں مبتلا رہتے۔

سترھویں صدی کے آخر تک پہنچتے پہنچتے دکن کو بہت سے قحط کا سامنا کرنا پڑا۔ یہ قحط کچھ تو جنگ اور کثرت بارش کی وجہ سے پڑے اور کچھ خشک سالی کی وجہ سے۔ ۷۹۹ھ میں بھی بارش کی کمی کی وجہ سے بہت برا قحط ہوا۔ اس قحط میں بھی ہزاروں جانیں تلف ہوئیں اور لاکھوں خانما برباد ہوئے۔ یہ قحط دکن اور نواح میں درگا دیوی کے نام سے مشہور ہوا تھا[۵۸۹]۔ ۸۷۷ھ میں محمد شاہ ثانی بن ہمایوں شاہ ظالم کے زمانے میں بھی بدترین قحط آیا اور دکن کے لوگ اس قحط سے بہت زیادہ متاثر ہوئے۔ اس زمانے میں بادشاہ جزیرۂ کوہ کی فتح کے لیے نکلا ہوا تھا۔ اس معرکے میں اس کی والدہ مخدومہ جہاں بھی اس کے ہم راہ تھیں۔ معرکہ سر کرنے کے بعد اس کی والدہ کا انتقال ہو گیا تو اس نے نعش احمد آباد بیدر روانہ کر دیا اور کود بے جاپور پہنچا[۵۹۰]۔ وہاں خواجہ محمود گاواں کی جاگیریں تھیں۔ محمود گاواں نے بادشاہ کی دل جوئی میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ خوب دعوت وضیافت کی۔ وہاں کی آب و ہوا بادشاہ کو اس قدر پسند آئی کہ اس نے ایام برسات تک یہاں قیام کا ارادہ کر لیا[۵۹۱]۔ اتفاق سے اس سال سارے دکن اور بے جاپور میں پانی نہ برسا اور کنویں کے کنویں خشک ہو گئے[۵۹۲]۔ صرف اس سال ہی نہیں بلکہ اگلے سال بھی بارش نہیں ہوئی۔ تلنگانہ، مرہٹ اور مالوے وغیرہ میں دو سال تک ایک دانا بھی نہیں بویا گیا۔ سبزی کا کہیں نام و نشان تک نہ رہا۔ بے شمار آدمی مر گئے۔ وہی زندہ بچے جو بھوک کے مارے گھروں کو چھوڑ گئے تھے[۵۹۳]۔ شہروں، قصبات اور دیہاتوں میں آبادی کا نام ونشان تک نہ رہا۔ کچھ لوگوں نے گجرات اور جاج نگر میں پناہ لی[۵۹۴]۔ تیسرے سال ۸۸۰ھ میں بارش ہوئی تو ملک میں کوئی کاشت کار ہی نہ تھا جو کھیتی باڑی کرتا[۵۹۵]۔ تاریخ منظوم سلاطین بہمنیہ کے مولف سہیل نے اس قحط کا حال بیان کرتے ہوئے لکھا کہ:

ہوا آٹھ سو اور ستتر جو سال	ہوئی قحط سالی دکن میں کمال
برار اور گجرات تا مالوہ	تو بیدر تلنگاں اور مرہٹہ
ہوئے شہر ویران اور دہ خراب	زمین خشک سالی سے بے آب و تاب
ہوا قحط باراں کا جو دو برس	گئی خلق پانی کو بالکل ترس
وزاں پس جہاں راگبیر دبد حال	کہ قطعاً نبا رید باراں دو سال[۵۹۶]

سید علی بلگرامی نے اس قحط کے تدارک کے لیے کیے جانے والے اقدامات کی بابت بادشاہ کے رویے کی شکایت کرتے ہوئے لکھا کہ تاریخ میں اس کا کہیں ذکر نہیں کہ محمد شاہ نے اس قحط کو رفع کرنے کی کوئی تدبیر یا کوشش کی ہو بلکہ اس بدترین صورت حال میں بھی وہ عیش وعیاشی میں مصروف رہا اور ملک کو تباہ ہونے دیا[۵۹۷]۔ بشیر الدین احمد نے ۱۴۷۵ء میں دکن اور تلنگاں میں آنے والے قحط کی بابت

لکھا کہ یہ قحط مستقل دو برس تک جاری رہا۔ غالباً یہ وہی قحط ہے جس کی بابت ''تاریخ منظوم سلاطین بہمنیہ'' کے مولف کے مذکورہ اشعار درج کیے جا چکے ہیں لیکن یہ قحط ۱۴۵۷ء میں نہیں بلکہ ۱۴۷۳ء میں آیا تھا[۵۹۸]۔ اس قحط کے نتیجے میں ہندو باشندگانِ کنڈہ پلّی نے بغاوت کر کے مسلمان حاکم کو مار ڈالا اور راجا اڑیسہ سے مدد طلب کی۔ اڑیسہ کے راجا نے راج مندری کا محاصرہ کیا جس کا حاکم نظام الملک تھا۔ بعد میں شاہ محمد نے اڑیسہ پر چڑھائی کی جس کی وجہ سے اسے دوبارہ اطاعت پر مجبور ہونا پڑا[۵۹۹]۔ ۹۳۱ھ میں سلطان مظفر کے زمانے میں بہت برا قحط آیا۔ بادشاہ کی دعاؤں اور خدا کی مدد سے یہ قحط جلد ختم ہو گیا۔ بادشاہ نے اس قحط سے نبٹنے کے لیے اپنے خازن ہشیار الملک کو حکم دیا کہ جو شخص بھی سوال کرے اس کو ایک مظفری عطا کرے۔ اس کے علاوہ بادشاہ نے فقرا اور مساکین کے لیے بہت سے لنگر خانے بھی تعمیر کروائے[۶۰۰]۔

اس طرح کے چھوٹے بڑے بے شمار قحط ہندوستان کے مختلف علاقوں میں آتے رہے لیکن گیارہویں صدی میں عبداللہ قطب شاہ کے زمانے میں آنے والے ایک قحط نے بھی بہت تباہی مچائی۔ اس زمانے میں دکن پر شاہ جہاں نے چڑھائی کی ہوئی تھی۔ نظام شاہی افواج اس کے حملوں سے پامال ہو چکی تھیں اور اس سیاسی عدم استحکام کی وجہ سے رعایا میں بڑی بے اطمینانی چھائی ہوئی تھی۔ اس سبب کاشت کاروں نے زراعت میں وہ تن دہی نہ دکھائی۔ ادھر خاندیس میں بھی افواج شاہی کی کثرت کی وجہ سے غلہ اور ماتحیات کی بہت زیادہ ضرورت تھی۔ اس جنگ و جدل کے ماحول میں بہت لوگ کھیتی باڑی کرنے کے بجائے عادل شاہی اور قطب شاہی فوج میں بھرتی ہو گئے تھے[۶۰۱]۔ لہٰذا اس سال ۱۰۳۹ھ۔ ۱۰۴۰ھ میں سخت قحط پڑا[۶۰۲]۔ ۱۰۴۰ھ میں بالکل بارش نہ ہوئی۔ حسین ساگر، تالاب پانگل، ابراہیم پٹن اور حوض دار السلطنت سب کے سب خشک ہو گئے۔ پہاڑوں اور وادیوں میں سو سو فٹ کھدائی کے باوجود پانی نہیں ملتا تھا۔ باغات کے پرانے درخت خشک ہو گئے۔ صحرا میں حیوانات مر گئے۔ گاؤں میں مُردوں کے ڈھیر لگ گئے۔ مُردوں کو اٹھانے اور دفنانے کی طاقت بھی لوگوں میں نہ رہی۔ روٹی کے لیے لوگ ایک دوسرے کی جان لینے لگے[۶۰۳]۔ قحط سے پہلے ایک ہون میں ۱۲ من چاول آتے تھے لیکن قحط کے بعد صرف ۳ من کے قریب نرخ رہ گیا۔ عبداللہ قطب شاہ نے مسلمانوں سے نماز استسقاء کی اپیل کی اور اہل ہنود سے ان کے مذہب کی رو سے پوجا پاٹ کی جس کے نتیجے میں پانی برسا۔ لیکن چار ماہ تک اس قدر بارش ہوئی کہ موسی ندی میں طغیانی ہوئی۔ پانی قدیم پل سے اوپر بہتا ہوا شہر میں داخل ہو گیا جس کی وجہ سے سخت نقصان پہنچا[۶۰۴]۔ عبداللہ قطب شاہ نے حکم ضرور دیا کہ جہاں سے بھی غلہ دستیاب ہو لے آئیں، اس کے انتظام کی وجہ سے شہر میں کہیں کہیں غلہ ملتا لیکن گاؤں دیہات میں لوگ بھوکے مرتے[۶۰۵]۔

یہ وقت دکن کے لوگوں کے لیے بہت بھاری تھا کیوں کہ بارش کے فوراً بعد ہی قحط کا سلسلہ ایک بار پھر شروع ہوا۔ بڑے بڑے تالات مثل ساگر، ابراہیم پٹن اور پانگل وغیرہ خشک ہو گئے۔ وہ عمیق باولیاں جو کبھی خشک نہ ہوتی تھیں، وہ بھی خشک ہو گئیں۔ جنگلوں میں حیوانات ناپید ہو گئے۔ خوراک اور پانی نہ ملنے کی وجہ سے تمام جانور مر گئے۔ مانک راؤ وٹھل راؤ کے مطابق شہروں میں مُردوں کے خشک ڈھانچوں کے ڈھیر لگ گئے۔ ہر کوچے اور ہر گلی میں نعشیں ہی نعشیں دکھائی دیتی تھیں اور کوئی ان کو گور و کفن دینے والا نہیں تھا[۶۰۶]۔ قریب قریب ایک لاکھ لوگوں کو سرکار کی جانب سے کفن فراہم کیے گئے۔ مرنے والوں کی تعداد کا درست تعین تو ممکن نہیں لیکن اس سانحہِ عظیم کی تاریخ تین لفظوں میں نکالی گئی۔ ''غم، مرض، مرگ خلق'' ۱۰۴۰ھ۔ اس وقت خاندیس اور گجرات تک کے علاقوں میں یہی صورت حال

درپیش رہی۔لوگ روٹی کے بدلے جان دیتے تھے،شرافت ایک کلچے میں بیچنے کو تیار تھے۔صورت حال کی سنگینی کا اندازہ سید علی بلگرامی کے ان جملوں سے لگایا جا سکتا ہے جس کے مطابق خشک مُردے کا گوشت جس کسی کے ہاتھ لگتا، وہ اس کو پانی سے تر کر کے کھا لیتا۔ قبرستان میں تازہ مُردوں کے اور سال خوردہ مُردہ گوشت کی خرید و فروخت ہوتی۔اس طرح کے مقدمات کوتوال اور عدالت میں پہنچتے تھے۔ایک عورت روتی پیٹتی قاضی کے پاس آئی کہ میں نے ہمسائے کو اپنا لختِ جگر ذبح کر کے پکانے کے لیے دیا تھا تا کہ مجھے کچھ کھانے کو ملے مگر اس نے تو میرے جگر گوشے کی ہڈی اور گوشت کا ریزہ تک نہ دیا۔غرض آدمی کا گوشت آدمی کھاتے تھے۔کتوں کا گوشت بکری کی جگہ بکتا۔نان بائی رات کو بوسیدہ ہڈیاں لاتے اور چکی میں پیس کر اس میں تھوڑا گیہوں ملا کر آٹا بناتے۔ماں باپ فرزندوں کے گوشت کو ان کی محبت سے زیادہ شیریں جانتے۔مُردوں کی کثرت سے آمد و رفت کی راہ مسدود ہوتی جاتی[۶۰۷]۔

زبس در کوچہ فرشِ مردہ افتاد نشان از کوچہ تابوت میداد[۶۰۸]

کی مصداق لوگ ہر طرف مردہ حالت میں پڑے تھے۔کفن کا طریقہ تک موقوف ہو چکا تھا۔نوحہ اور عزا مرگ کی بلا سے نجات ملی ہوئی تھی۔سفر کے دوران بھی مختلف قصبات اور دیہاتوں میں مرنے والوں کی قطار لگی ہوئی تھی۔تاریخ میں درج وہ تمام وبائیں اس قحط کے بعد نظر میں معمولی دکھائی دیتی ہیں۔ہر کوچے و محلے میں بجائے ابرِ باراں کے غم برستا تھا۔اس قدر آدمیوں کے مرنے سے شہر کے شہر ویران ہو گئے[۶۰۹]۔اس سال گھاس کی بھی کمیابی کا یہ عالم تھا کہ ایک مٹھا ایک سونے کے پتر میں بکتا تھا۔شاعر نے گھاس کی کمیابی کا نقشہ کچھ اس طرح کھینچا ہے:

بہوش باش کہ رنداں کہہ فروش ترا بجائے کاں مبادا کہ زعفرانت دہند[۶۱۰]

یہ قحط ہندوستان کے دیگر مقامات مثلاً حیدر آباد، برودہ اور برہان پور وغیرہ میں بھی تھا۔اس قحط کا خاتمہ ۱۰۴۲ھ کی پیداوار سے ہوا لیکن اس کے نتیجے میں شاہی خزانے میں جس قدر روپیہ تھا سب خرچ ہو گیا۔۱۰۷۰ھ اور ۱۰۹۷ھ میں بھی یہاں قحط سالی رہی۔اس کا سبب ملکی لڑائیاں تھیں جو شاہ جہاں اور پھر اورنگ زیب کے عہد میں واقع ہوئیں۔یہ سلسلہ دکن میں بارھویں اور تیرھویں صدی میں بھی تواتر سے جاری رہا۔خصوصاً ۱۲۰۷ھ والے قحط کو بھی دکن میں کھوپڑی والے قحط کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے[۶۱۱]۔

ایک ایسا خطہ جو اپنی ذرخیز زمین، دل نشین وادیوں، سر بفلک کوہسار، ہرے بھرے لہلاتے کھیت، پر فضا باغات اور معدنی وسائل سے ہمیشہ اقوام عالم کو مبہوش کرتا رہا۔اس ذرخیز خطے کو حاصل کرنے کی خواہش میں ہمیشہ اقوام عالم مشتاق و مضطرب رہے۔اسی لیے کوہ ہمالہ اور ہندو کش کی مضبوط اور سر بلند پہاڑوں اور بحرِ عرب و ہند کی سفاک موجوں کے حصار کو توڑ کر اس علاقے میں تسلط جمانے کا سلسلہ خاصا دراز ہے[۶۱۲]۔اس بابت ڈاکٹر گستاؤلی بان کا بھی یہی کہنا ہے کہ ''اس ملک کی بے نظیر ذرخیزی کی بدولت بہت سے موانع کے باوجود اقوام عالم نے کئی ہزار سال کے اندر اس پر بیس دفعہ دھاوا کیا''[۶۱۳]۔اس کے علاوہ اس خطے کے معدنی ذخائر کی بابت معروف یونانی مورخ ہیروڈوٹس (HERODOTUS) نے ساڑھے چار سو قبل مسیح، اس جانب اشارہ کیا کہ دیگر تمام علاقوں کی نسبت یہ علاقہ سلطنت فارس کو سب سے زیادہ خراج سونے کے دھات کی شکل میں دیا کرتا تھا[۶۱۴]۔ان مورخین کے بیانات کو دیکھ کر ہی غالباً سکندر اعظم نے ان سونے کے ذخائر کو دسترس میں لانے کے لیے مشرق کی طرف یلغار کی ہوگی۔اس کی فتح مندیوں نے پہلی بار مشرق کی دولت کو مغرب کے قدموں میں لا ڈالا[۶۱۵]۔غرض کہ دولت و ثروت سے معمور یہ سرزمین بحر و بر اور ہمالیہ کے جھنڈ میں چھپی نہ رہ سکی اور اس کی

خوش حالی کی گونج سوادِ عالم میں پھیلتی چلی گئی[۶۱۶]۔ کبھی یونانی سفیر مگاستھینز Megasthenes نے ''انڈکا'' میں شاہی محلات کا نقشہ کھینچتے ہوئے یہ کہا کہ ''محل ایسے بے شمار سنہرے ستونوں سے آراستہ ہیں جن پر سونے کے بیل بوٹے بنے ہوئے ہیں''، تو کبھی یونانی مورخین نے یہاں کے معدنی وسائل، ترقی یافتہ بحری مراکز، ہیرے، نیلم، زمرد اور دوسرے بیش قیمت پتھر، سیاہ مرچ، انواع واقسام کے مصالحے، دوائیں، مرہم اور دیگر پارچہ جات کا ذکر[۶۱۷] کچھ اس انداز سے کیا ہے کہ بیرونی اقوام کا اس خطے پر رشک کی نظر ڈالنا فطری معلوم ہوتا ہے۔ بودھ مت کے سادہ لوح بھکشو جو عام طور پر دنیا کی رنگا رنگی سے کنارہ کش رہنا پسند کرتے تھے، ان کے سفرناموں میں بھی جا بجا ان بے پایاں نعمتوں کے تذکرے ملتے ہیں۔ ہیون سانگ (Hiuen Tsang) نے حکومت کی ترقی اور فروغ میں طلائی، نقرئی اور کانسی کے بنے لاتعداد سکوں کی اہمیت کی شہادت دی ہے[۶۱۸]۔ فاہیان (FA-HIEN) بھی یہاں کے حسین قصر وایوان کو دیکھ کر بے اختیار یہ کہہ اٹھتا ہے کہ ''کیا یہ انسانی ہاتھ کا کرشمہ ہے''[۶۱۹]۔ غرض کہ دولت وثروت کی اس فراوانی نے بقول ڈاکٹر محمود الرحمٰن ''حملہ آوروں کے دلوں کو برمایا، بادشاہوں کے ذوق وجستجو کو اکسایا اور کشورکشاؤں کی طلب وآرزو کو دہکایا''[۶۲۰]۔ ہر چہار جانب اس اقوام عالم کے غول کے غول اس ''پراسرار سرزمین''[۶۲۱] کی جانب گامزن ہوئے۔ ان قوموں میں یونانی بھی تھے اور ترک بھی، عرب بھی تھے اور پرتگالی اور فرانسیسی بھی، افغانی بھی تھے اور ایرانی بھی، تاتاری بھی تھے اور منگول بھی[۶۲۲]۔ مسلمان حملہ آوروں نے بھی جب اس خطے میں قدم رکھا تو ان کے پیش نظر بھی یہ باتیں ضرور رہیں۔ غزنی کے سلطان محمود نے برعظیم پر حملہ آور ہونے سے قبل اس سرزمین کی تعریف وتوصیف کرتے ہوئے کہا کہ ''سارا ملک ہند سونے اور جواہرات سے بھرا پڑا ہے۔ وہاں ایسے نباتات پائے جاتے ہیں جو ملبوسات بنانے کے لیے نہایت موزوں ہیں''[۶۲۳]۔ ۱۶۰۳ء میں ایرانی سفیر بھی جب سلطان قلی قطب شاہ کے دربار میں حاضر ہوا اور ۱۶۰۹ء میں ایران واپس گیا تو یہاں سے تحفتاً کم خواب کا تھان لیتا گیا۔ اس کی تیاری میں پٹن کے کاری گروں کے پانچ سال صرف ہوئے تھے۔ مارکوپولو دکن کی مصنوعات کے بارے میں لکھتا ہے کہ اس ملک میں بہترین قسم کا زربفت کا کپڑا بنایا جاتا ہے اور یہ اعلیٰ سے اعلیٰ قیمتوں کا ہوتا ہے۔ دنیا میں کوئی بادشاہ اور ملکہ ایسے نہ ہوں گے جو ان نفیس کپڑوں کو زیب تن کر کے خوش نہ ہوں[۶۲۴]۔ برصغیر پاک وہند کی انھیں خوبیوں نے مغلیہ حکومت کے بانی ظہیر الدین بابر کو برسوں اس خطۂ زمین پر قبضہ کرنے کی ہوس میں مبتلا رکھا[۶۲۵]۔ جب وہ تخت دلی پر متمکن ہوا تو بے اختیار اس ملک کے متعلق یہ کہنے پر مجبور ہوا کہ ''ہندوستان کی بڑی خوبی یہ ہے کہ وسیع ملک ہے۔ اس میں سونا چاندی بہت ہے''[۶۲۶]۔ اس خاندان کے پانچویں حکمران شہاب الدین محمد شاہ جہاں کے زمانے میں جب شاندار اور خوب صورت عمارات اور قلعوں کی تعمیر کا سلسلہ شروع ہوا اور نقرئی چھتوں اور قیمتی پتھروں سے مرصع دیوانِ خاص تیار ہوئے تو ان دیواروں پر سعد اللہ خاں کا شعر کندہ کیا گیا جو ان حملہ آوروں کے خیالات ومحسوسات کی پوری طرح ترجمانی کرتا ہے:

اگر فردوس بر روئے زمیں است   ہمیں است وہمیں است وہمیں است[۶۲۷]

مذکورہ سیاحوں اور مورخوں نے ہندوستان کے بارے میں جو بھی بیانات دیے ہیں، ظاہر سی بات ہے حکم رانوں اور درباری زندگی کے مشاہدے کے نتیجے میں دیے ہیں ورنہ جن کپڑوں کے تھان کی تیاری میں پانچ برس صرف ہوں اسے خود اس کے تیار کرنے والے بھی کبھی زیب تن نہیں کر سکتے تھے یا جن ہیرے، جواہرات اور عمارات کا ذکر انھوں نے کیا ان کے استعمال کی نوبت ہندوستان کے عام لوگوں کو کیوں کر نصیب ہو سکتی تھی۔ پروفیسر ستیش چندر کے مطابق ہندوستان کے معاشی ڈھانچے کو ترک سلاطین کے عہد میں سخت

نقصان پہنچا۔اس دور کو معاشی اعتبار سے تاریک ترین دور قرار دیا جاسکتا ہے۔اس دور میں جو معاشی نقصان پہنچا اس کی تلافی مغلوں کے عہد تک بھی نہ ہوسکی[۶۲۸]۔بلبن نے تو دولت جمع کرنے کے خاطر سونے کے سکے کے عوض تانبے کے کم قیمت سکوں کو رواج دیا۔اس کی وجہ سے تجارت بالکل ڈوب گئی۔اس ناکامی کے بعد خزانے کو بھرنے کی غرض سے اس نے جو طرح طرح کے محصولات لگائے اس کا ذکر مذکورہ صفحات میں ہو چکا ہے لیکن اس کے اس عمل سے زراعت کو جو ناقابل تلافی نقصان پہنچا، وہ انتہائی دل دہلا دینے والا ہے۔اس کے اس عمل سے زراعت بالکل برباد ہوگئی۔کاشت کار، زراعت کا پیشہ چھوڑ کر لوٹ مار پر پل پڑے جس سے ملک تباہ و ویران ہو گیا۔رعایا مفلس اور قلاش ہر کوئی بھوکوں مرنے لگا۔بادشاہ کو اپنی رعایا کی اس قدر بھی پرواہ نہیں تھی جتنی کہ جانوروں اور غلاموں کی کی جاتی ہے۔ بستی کی بستی اجڑ گئی۔اگر کسی علاقے کے رہنے والوں نے بادشاہ کے سخت اور جابرانہ مطالبات کو ماننے سے معذوری ظاہر کی تو بادشاہ ان پر فوج بھیج دیتا اور رعایا کو تہ تیغ کرنے سے بھی گریز نہیں کرتا۔ایک بار تو اس نے ہندوؤں کی کثیر آبادی والے شہر قنوج میں اس قدر قتل عام کروایا کہ اس کے تصور سے ہی دل کانپ جائے۔اس قتل عام کے نتیجے میں بھی وہاں زبردست قحط کی صورت پیدا ہوگئی۔ایسے واقعات ایک بار نہیں بلکہ بار بار پیش آتے[۶۲۹]۔اس طویل عرصے میں گو بعض ایسے سلاطین بھی گزرے ہیں جنھوں نے زرعی اصلاحات اور نہری نظام کی بہتری کی جانب بھی توجہ دی ہے۔مثلاً محمد بن تغلق اور فیروز تغلق کے دور حکومت یعنی چودھویں صدی میں باغات میں خاص ترقی ہوئی۔فیروز تغلق نے دہلی اور اس کے مضافات میں بارہ سو سلورا (دریا) کے کنارے کنارے اسی اور چتوڑ میں چوالیس باغات لگائے جن سے پھلوں کی پیداوار بڑھی۔جودھ پور، گوالیار، اور دھول پور بھی ایسے علاقے تھے جہاں پھلوں کی پیداوار کے بہتر طریقے اپنائے گئے لیکن یہ بھی ایک تلخ حقیقت ہے کہ ان باغات کی پیداوار بھی بنیادی طور پر دولت مندوں کے دستر خوان کی زینت بنتے۔چودھویں صدی کے دوسرے نصف میں فیروز تغلق نے نہروں کا وسیع جال بچھانے کی کوشش کی۔مگر ان اصلاحات کا فائدہ بھی عوام کو قلیل عرصے کے لیے پہنچتا۔محنت کش کسانوں کی دل سوز غربت اور پریشان حال زندگی کے سلسلے میں دھرم شاستروں کے مفسر اور دوسرے تمام لکھنے والے متفق ہیں کہ وہ انتہائی کس مپرسی کی زندگی بسر کرتے تھے۔پدم پران میں کرشک کی مصیبت زدہ زندگی کو بیان کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ یہ لوگ اپنے اپنے وقت کے حکم رانوں کے ظلم سے اس قدر کچلے ہوئے تھے کہ اپنے گھر والوں تک کی دیکھ بھال سے معذور تھے۔کسانوں کی غربت کا زمین داروں، رؤسا اور صاحب ثروت لوگوں کی زندگی کے عیش و آرام سے مقابلہ کیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ معاشرے میں کس قدر طبقاتی ناہمواری اور غیر مساویانہ سلوک تھا۔زرعی پالیسیاں بنائی بھی جاتیں تو وہ محض اس خیال کو مدنظر رکھ کر وضع کی جاتی تھیں کہ حکم رانوں اور افسروں کی آمدنی متواتر جاری رہے[۶۳۰]۔غریب کسانوں اور مختلف صنعتوں خصوصاً سب سے بڑی کپڑا بنانے کی صنعت کو اس وقت شدید نقصان پہنچا۔جب جنگ و جدل کے دوران لاتعداد ہاتھی، ہزاروں گھوڑے اور لاکھوں کی تعداد میں پیادے کھیتوں اور باغات کو روندتے ہوئے پورے پورے علاقے کو تباہ و برباد کر دیتے۔کسانوں کی سال بھر کی محنت ایک لمحے میں کسی ناعاقبت اندیش بادشاہ کے تکبر اور ذاتی چپقلش کی بھینٹ چڑھ جاتی۔کیوں کہ دکن میں ۸۵ فی صد آبادی ہندوؤں کی تھی اور صرف ۱۵ فی صد ہی مسلمان تھے۔لہٰذا ہندوؤں کو زیادہ نقصان سہنا پڑتا[۶۳۱]۔جس سے ہندو مسلم نفرت میں اور زیادہ اضافہ ہوتا۔مختلف سلاطین کی آپس کی عداوت نے تو جو نقصان پہنچانا تھا، پہنچایا لیکن ہندو مسلم ہم آہنگی کو سلاطین کے اس طرز عمل سے خاصا نقصان پہنچا۔ہمیشہ ہی مقامی ہندو مسلم سلاطین کے خلاف بننے والے محاذ کا حصہ بنتے اور اپنے آپ کو ایک آزاد مملکت کی تکمیل کے لیے قتل و غارت سے بھی باز نہ آتے۔

اسی لیے ہم دیکھتے ہیں کہ شمال وجنوب ہر دو جانب کئی جنگیں وقوع پذیر ہوئیں جن کا مختصر احوال مذکورہ صفحات میں بیان کیا جا چکا ہے۔ ان جنگوں میں لاکھوں انسانی جانیں ضائع ہوئیں جو تاریخ انسانی میں کسی بڑے سانحے سے کم نہیں لیکن ان جانوں کے ضیاع کے علاوہ جو معاشی اور مالی نقصان ہوتا وہ بھی کچھ کم نہ تھا۔ خصوصاً کھڑی فصلوں کی تباہی کے نتیجے میں آنے والے قحط برسوں لوگوں کو سسک سسک کر مرنے پر مجبور کرتے۔ ڈاکٹر گیان چند جین نے اس بابت درست لکھا کہ ''شمال میں جو بدامنی اور قتل وغارت گری اٹھارھویں صدی میں ہونے کو تھی، دکن کو اس کا ذائقہ سترھویں صدی کے آخر میں ہی مل گیا تھا'' [۶۳۲]۔

اس زمانے میں اورنگ زیب کی طویل مہم سے تو دکن کی رعایا سخت پریشان تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ آسمانی بلاؤں، وباؤں اور بارش کی وجہ سے طوفانوں نے اور بھی زیادہ قہر ڈھایا۔ زراعت پیشہ لوگوں نے اس اضطراب اور سراسیمگی کی حالت میں لوٹ مار پر کمر کس لی تھی [۶۳۳]۔

اب اگر تمام صورت حال کو سامنے رکھ کر ہم اس دور کی ادبیات کا جائزہ لیں تو ہمیں نہ صرف مایوسی بلکہ حیرت کا شدید دھچکا بھی لگتا ہے۔ ماہرین ادب تو ہمیشہ یہ کہتے رہے ہیں کہ کسی ملک اور قوم کا ادب اس کی زندگی، کردار، عقائد، رسومات، تصورات، خوشیوں، غموں، امیدوں، امنگوں اور فطرت کا ترجمان ہوتا ہے۔ وہ صرف فن کار کی نفسیات کا آئینہ نہیں ہوتا بلکہ اس عہد کی تاریخ کا بھی عکاس ہوا کرتا ہے۔ اس سے کسی ملک کے باشندوں کی ترقی کے عوامل اور انحطاط کے اسباب بھی اجاگر ہوتے ہیں [۶۳۴]۔ یہ ٹھیک ہے کہ اس دور کے ادبیات میں مذکورہ موضوعات میں سے بیش تر کو شعرانے اپنی تخلیق کا موضوع بنایا۔ یہ بھی درست ہے کہ اس دور کی شاعری ہمیں اس سماج کے بیش تر رجحانات اور حوادث وسانحات کے بارے میں کافی معلومات فراہم کرتی ہے لیکن اس حقیقت سے بھی انکار ممکن نہیں کہ ان قدرتی آفات اور قحطوں سے پھیلنے والی تباہی کے بارے میں ہمارے شعرانے اس طرح خاموشی اختیار کی کہ جیسے یہ کوئی بڑا سانحہ ہی نہ ہو۔ حالاں کہ مذکورہ صفحات میں ان قحطوں سے آنے والی تباہی اور لاکھوں جانوں کے زیاں سے پیدا ہونے والے انسانی المیے کی نشان دہی کے بعد توقع یہ تھی کہ شعرانے بھی اس اہم انسانی مسئلے پر بھرپور توجہ دی ہوگی۔ مگر ایسا نہیں۔ بہت تحقیق کے بعد ان موضوعات پر ان تین صدیوں میں شمال وجنوب میں کہیں بھی کسی شاعر کے ہاں کوئی باقاعدہ نظم یا شاعری کے نمونے نہیں ملے۔ یعنی ان آفات پر تفصیلی اشارے تو اردو شاعری میں ناپید ہیں لیکن کہیں کہیں ایسے اشعار ضرور ملتے ہیں جو ان قحطوں کی ہول ناکی اور بربادی کے حوالے سے اہم تاریخی دستاویز کہے جا سکتے ہیں۔ قحط نے لوگوں کی معاشی حالت تباہ کر کے رکھ دی ہے۔ امیر اور غریب سب غلے کی تلاش میں مارے مارے پھر رہے ہیں۔ ہر طرف بارانِ رحمت کی دعائیں مانگی جارہی ہیں۔ بحری اس صورت حال کا نقشہ کھینچتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

ولے لوکاں میں کچہ ابریا نہیں حال — نہ رانا بھار خوش نا گھر میں رانی
جگت کا ٹوکرا دینے پر آیا — گیا پانی دے دنیا کوں چکانی
نہ تھا اس سال بارا بلکہ تیرا — جو اڑ گے ابر جنوں پانی پرانی
ہوائی دعوائیاں کی کان پوری — تو جا کس سات کہنا یو کہانی
ہوئے یک تول تیسے ہو تو انگر — بھی یک مول کیانی ہور اگیانی [۶۳۵]

تانا شاہ کی گرفتاری اور خاتمۂ سلطنتِ دکن:

ایک ایسے ذہنی انتشار کے دور میں جب عبداللہ کا انتقال ہوا تو اس کے داماد ابوالحسن تانا شاہ نے جرأت اور بہادری کا مظاہرہ کرتے ہوئے تخت پر قبضہ کرلیا۔ ابوالحسن شاہ راجو کا ایک مرید تھا جس کو انھوں نے حسبِ عادت تمام مریدوں کی طرح تانا شاہ کے خطاب سے اس وقت نوازا جب وہ پریشان حال اور غریب تھا۔ یہ خطاب اس قدر مشہور ہوا کہ ۱۶۷۲ء میں جب ابوالحسن قطب شاہ کے لقب سے حیدرآباد کا بادشاہ بنا اور پندرہ برس تک اس نے حکومت کی تو اہلِ حیدرآباد اس کو تانا شاہ کے نام ہی سے یاد کرتے تھے[۶۳۶]۔ اس بادشاہ کے بارے میں بھی مورخین نے طرح طرح کے قصے گھڑے اور اس کی شخصیت کو مسخ کرنے کی کوشش کی گئی۔ خصوصاً مغلوں نے اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا کیوں کہ انھیں دکن میں اپنی دراندازی کی تاویل پیش کرتے ہوئے اس کی کردارکشی سے بہتر کوئی اور بہانہ نہیں مل سکتا تھا۔ محمد حسین نے ''تاریخ محبوب السلاطین'' اور ٹیورنر نے اپنے سیاحت نامے میں ابوالحسن کو ایک خود پسند انسان تحریر کیا ہے[۶۳۷] جو درست نہیں۔ اسی طرح خافی خان نے بھی ابوالحسن کو ''قبیح کردار'' اور ''سوختہ اختر'' لکھا ہے[۶۳۸]۔ ''ماہ نامہ'' کا مورخ لکھتا ہے کہ ابوالحسن ایک رندمشرب انسان تھا اور فقرا کے لیے بھنگ اور گانجے کی فراہمی کا انتظام کیا کرتا تھا[۶۳۹]۔ اس بابت سید علی محسن نے ایک مراہٹی کتاب ''گولکنڈا میں انقلاب'' کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے کہ ممکن ہے کہ ابوالحسن کی ابتدائی زندگی اوباشی میں گزری ہو لیکن بعد میں وہ تائب ہو کر شاہ راجو قتال کی خانقاہ سے وابستہ رہا[۶۴۰]۔ حقیقی صورتِ حال کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اس نکتے پر بھی غور کیا جائے جو اس کی تاج پوشی کے وقت گولکنڈا کی سلطنت کو درپیش تھی۔ شہزادہ محمد سلطان فرزند اورنگ زیب اور عبداللہ قطب شاہ کے بڑے داماد سید احمد کی موجودگی میں جو امورِ سلطنت میں دخیل تھا، ابوالحسن کی تاج پوشی ایک حیرت انگیز کرشمہ تھی۔ غالباً اسی لیے دربار میں اس کے بہت سے موئید اور بدخواہ پیدا ہوئے ہوں گے[۶۴۱]۔

۱۰۸۳ھ مطابق ۱۶۷۲ء میں عبداللہ قطب شاہ کے انتقال کے بعد شاہی خاندان میں تخت نشینی کے معاملے میں کش مکش شروع ہو چکی تھی[۶۴۲]۔ ابوالحسن کو بھی خانہ جنگی کا سامنا کرنا پڑا لیکن بالآخر اس کی بادشاہت کا اعلان ہو گیا۔ اس صورتِ حال میں مخالفین کا اس کے بارے میں بدکلامی کرنا اور افواہیں پھیلانا ایک فطری امر تھا۔ طبعی جو ابوالحسن کا پیر بھائی تھا اپنی مثنوی ''بہرام و گل اندام'' میں اس کی بڑی تعریف کرتا ہے۔ اس کی بہادری اور دلیری کے حوالے سے اس کا کہنا ہے کہ:

ملاحت جیوں سور چند رہے توں　　صلابت منے جیوں سکندر رہے توں
عدالت میں فاضل ہے تو شہ جواں　　برابر نہیں تیرے نوشیرواں
دیکھے کر تیرے ہات میں تیر کماں　　رکھے چاند بھُیں پر سورج کا کماں
تو کاوِس ہے گا زمانے میں شاہ　　کہ رستم ہے ہر ایک تیرا سپاہ[۶۴۳]

بے شک طبعی کے کلام میں بھی مبالغہ ہے اور اس نے تانا شاہ کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملائے ہیں لیکن دوسری جانب بھی مخالفین نے اس کے کردار کو بہت زیادہ توڑ مروڑ کر پیش کیا ہے۔ اس کی عادات اور اطوار کا تجزیہ کرنا ہو تو مورخ گلزار آصفیہ کے اس بیان کو ذہن میں رکھیے جس میں وہ کہتے ہیں کہ بادشاہ نے تخت نشینی کے بعد اپنے وزیر سید مظفر سے کہا کہ یہ ساری دولت اور خزانہ ماضی کے سلاطین یہیں چھوڑ کر دنیا سے خالی ہاتھ رخصت ہو گئے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ اس ساری دولت کو ریاست کی جملہ آبادی میں

مساوی تقسیم کر دیا جائے۔ جملہ آبادی کو چار حصوں میں تقسیم کر کے خزانے کا ایک حصہ خدا کی خوش نودی کے لیے فقیروں اور درویشوں پر، دوسرا سپاہیوں کی تنخواہ پر، تیسرا نظم و نسق پر اور چوتھا میری ذات پر صرف ہونا چاہیے[۶۴۴]۔ ایک ایسا بادشاہ جو دولت و ثروت سے اس قدر بے گانہ ہو اور جس پر دنیا کی بے ثباتی کا راز اس حد تک کھل چکا ہو جس کے بارے میں ''ماہ نامہ'' کے مورخ کا یہ بیان کہ وہ ایک لاپرواہ، بے حس اور غیر ذمے دار انسان تھا اور قلعہ گول کنڈا میں حملے کے وقت رقص و سرور کی محفل سجائے رنگ رلیوں میں مصروف تھا، محض الزام تراشی کے سوا کچھ نہیں۔ محی الدین قادری زور نے درست لکھا کہ وہ ایک دور اندیش اور قلندر منش حکم راں تھا۔ قطب شاہیوں کی اس امانت یعنی سلطنت گول کنڈا کو وہ جب تک حکم راں رہا، دشمنوں سے بچانے کی کوششوں میں مصروف رہا۔ اس نے اپنے قلیل دورِ حکومت میں سلطنت کے کل پرزوں کو کافی حد تک درست کر لیا جو سلطان عبداللہ کے پچاس سالہ طویل دورِ حکومت میں بالکل کمزور تھا۔ اگر شہنشاہ اورنگ زیب جیسے طاقت ور دشمن سے اس کا مقابلہ نہ ہوتا اور تمام ہندوستان سے فوجیں اس سے مقابلے کے لیے جمع نہ ہوتیں تو وہ قطب شاہیوں کی اس امانت کو اپنی اولاد تک نہایت مستحکم اور طاقت ور حالت میں منتقل کرتا۔ اس نے جس مردانگی سے مغلوں کا مقابلہ کیا، اور دورانِ جنگ اس کا برتاؤ جس قدر شریفانہ اور بہادرانہ رہا اس کے چرچے ہر خاص و عام کی زبان پر آج تک جاری ہیں[۶۴۵]۔ اس کی سرفروشی اور گول کنڈا کی دیگر سرفروشوں کی تعریف کرتے ہوئے مکیش نے اپنی نظم ''گول کنڈا کے سرفروش'' میں کہا کہ:

جان کی بازی لگا دیں جاں نثاری کی قسم	سربلندوں کو جھکا دیں خاک ساری کی قسم
کام میں اپنی خودی سے وضع داری کی قسم	خود خدا ہے ساتھ اپنے ذاتِ باری کی قسم

آج اپنی آن رہ جائے یہاں یا جان جائے
قلعہ کے اندر کوئی گرد و غبار آنے نہ پائے

برہنہ تیغوں کے سائے میں سنبھالا ہم نے ہوش	ہے ہمارے دل کی ہر جنبش میں مردانہ خروش
بازوؤں میں آہنی قوت ہے اور نبضوں میں جوش	بچہ بچہ بھی ہماری قوم کا ہے سرفروش

اپنے مالک کے لیے کٹ کر بہا دیں گے لہو
ہم نہ دیکھیں گے کبھی غیروں کو اس جا سرخ رو[۶۴۶]

عبدالمجید صدیقی نے بھی ابوالحسن کی علمیت اور پرہیزگاری کے گن گائے ہیں[۶۴۷]۔ تانا شاہ کے دور کے ہی ایک شاعر محبّ نے اپنی مثنوی ''معجزہ فاطمہ'' جو کہ ۱۶۷۵ء کو تکمیل تک پہنچی۔ اس مثنوی کے آغاز میں ہی بادشاہ ابوالحسن تانا شاہ کی ایک ایسی مدح لکھی جو اس زمانے میں ایک شخصیت کے حوالے سے پھیلائی گئی ان تمام افواہوں کی تردید کرتی ہے کہ وہ ایک عیاش اور نا اہل بادشاہ تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس دور میں یہ افواہ حیدرآباد تک پہنچ چکی تھی۔ چناں چہ شاعر نے اس مثنوی میں دشمنوں کی مخالفت کا بھی ذکر کیا ہے۔ یہ مثنوی ابوالحسن تانا شاہ کی تخت نشینی کے پانچویں سال لکھی گئی۔ غالباً یہ مثنوی اب تک شائع نہیں ہوئی ہے۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے اپنی تصنیف میں اس مثنوی کے کچھ اشعار نقل کیے ہیں۔ ملاحظہ کیجیے:

کہ اے نامور قطب شاہ ابوالحسن	عطا تجھ کیے پیر تختِ دکن
توں پیتے ستی یادِ حق کا شراب	وندے کا ہے دل جل کے اگ پر کباب

تو ہے عدل میں آج نوشیرواں سکیں عدل تج تے سگل خسرواں
سخاوت میں دیکھوں تو اے شہ نجے تو حاتم تے افضل ہو دستا مجے [۶۴۸]

سلطان عبداللہ نے ملّا حکیم کی تاریخ قطب شاہی کا تکملہ ''حدیقۃ السلاطین''، ملّا نظام احمد سے لکھوایا۔ ابوالحسن تانا شاہ نے موخرالذکر کا تکملہ ''حدائق السلاطین''، علی ابن طیفور ریتامی سے لکھوایا۔ اس کے دیباچے میں بھی علی ابن طیفور نے ابوالحسن تانا شاہ کے عمدہ عادات وخصائل کی تفصیلات بیان کی ہیں [۶۴۹]۔ اورنگ زیب کی فتح دکن کو تین صدی سے زائد کا عرصہ گزر چکا ہے لیکن آج بھی اس دورِ انتشار کے اثرات شعرا کے ہاں اپنی جھلک دکھلاتے ہیں۔ میکش نے توان موضوعات کو بالخصوص اپنی شاعری میں جگہ دی ہے۔ کبھی وہ تانا شاہ کی زندگی کی حالت کا نقشہ کھینچتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

پاؤں میں جوتی نہیں شانوں پہ اک صد پارہ شال شانِ غربت میں نمایاں ہے قناعت کا جلال
بھوک فاقہ مفلسی بوسیدہ کپڑے تار تار ہے خزاں کے رنگ میں بھی زندگانی کی بہار [۶۵۰]

اور کبھی وہ اس خونیں جنگ کا نقشہ کھینچتے ہوئے انسانی لہو کے زیاں اور ہلاکتوں کو بیان کرتے ہوئے اس طرح تانا شاہ کی عزم و ہمت اور جواں مردی کا حال بیان کرتے ہیں کہ وہ تمام مناظر ہماری نگاہوں کے سامنے پھرنے لگتے ہیں۔ یہاں پر میکش نے نظم میں ایک ڈرامائی انداز بھی پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ جیسے:

بہہ رہے ہیں خون کے چشمے زمینِ خاک پر مخملیں مسند کا دھوکا ہو رہا ہے خاک پر
پڑ رہی ہے جنتِ ارضی پہ دوزخ کی نگاہ دیکھ کر خوں ہنس رہا ہے جنگ کا دیوِ سیاہ
لپٹیاں لے کر جو پھرتی تھیں عبیر و عود کی ان ہواؤں میں بسی جاتی تھی بو بارود کی
آستیں الٹے ہوئے اور ہاتھ میں تیغ و تفنگ گردنیں اکڑی ہوئی چہرے پہ ہیبت ناک رنگ
خون میں لتھڑی ہوئی نعشیں لہو کی ندیاں اسلحہ کی کھڑ کھڑاہٹ میں اجل کی بجلیاں
دوپہر کی دھوپ توپوں کی گرج جنگ و قتال پاک قدموں کے لیے پھیلا ہے بربادی کا حال
عزم تانا شاہ ہے جوہر دکھانے کے لیے قطب شاہیوں کی امانت کو بچانے کے لیے [۶۵۱]

اورنگ زیب جب گول کنڈا کی فوج کشی سے فارغ ہوا تو ۱۰۹۸ھ میں بیدر واپس ہوا۔ ظاہر سی بات ہے کہ تانا شاہ کو اس نے گرفتار کر لیا تھا۔ بعد میں اسے دولت آباد بھیج دیا گیا [۶۵۲]۔ قید و بند کے ان مناظر کو دکھاتے ہوئے میکش اپنی ایک اور نظم ''وداعِ شاہ'' میں زوالِ سلطنت کا حال کچھ یوں بیان کرتے ہیں:

با حالِ تباہ جا رہا ہے کانٹوں کی ہے راہ جا رہا ہے
کس پاس سے آہ جا رہا ہے اب قلعے سے شاہ جا رہا ہے
کس طرح غبارِ راہ دیکھیں ٹوٹے ہوئے دل کی چاہ دیکھیں
واللہ تڑپ کے جان دیں گے مر کر ہی تجھے مکان دیں گے [۶۵۳]

اسی نظم میں میکش نے عورتوں کی خودکشی اور غم والم کے وہ مناظر بھی دکھائے ہیں جو عموماً تاریخ کی کتاب میں درج نہیں۔

خواتین کا ڈر اور خوف کے عالم میں آبرو بچانے کے لیے خودکشیاں کرنا اور تانا شاہ کے غم میں جان دینا وغیرہ ایسے مناظر ہیں جو بڑے ہول ناک بھی ہیں اور شرم انگیز بھی۔ یہ کتنا بڑا سانحہ تھا کہ اپنی چودہ برس کی حکم رانی کے بعد اس بادشاہ نے چودہ برس قید میں گزارے۔ اس کا ایک فرزند ''بندہ سلطان یا خدا بندہ'' بھی زمانہ قید میں اس کے ساتھ چینی محل میں تھا۔ اس کی زندگی کے یہ چودہ سال انتہائی کس مپرسی میں گزرے [۶۵۴]۔ ایک طرف تو یانا شاہ کی رحم دلی اور مخلوقِ خدا کے ساتھ ان کا وہ رویہ ہے جس میں قیدیوں کو بھی انسانی ہم دردی کی بنیاد پر رہا کرنے کا حکم دے رہا ہے جیسے:

قیدیوں کو پابجولاں لائے ہیں اہلِ دکن — جن کے چہروں سے نمایاں ہے دلی رنج و محن
ہو رہا ہے حکمِ سلطانی کہ ان کو چھوڑ دو — میں نہ دیکھوں گا کبھی طوق و رسن کو توڑ دو
آہ اس دو دن کی دنیا میں ستم کیسے کروں — اپنے ہم جنسوں کو پابندِ الم کیسے کروں [۶۵۵]

تو دوسری طرف خود اس کی قید کے مناظر ہیں۔ ان مناظر کو پیش کرتے ہوئے میکش کے ہاں جو کرب ہے وہ ان کی نظم ''تانا شاہ کی زندگی کے چند پہلو'' میں بہت نمایاں ہے۔ جیسے:

قید ہو کر شاہ جاتا ہے مغل فوجوں کے ساتھ — اٹھ رہے ہیں قلعے کی جانب وداع ہونے کو ہاتھ
ہو رہی ہے آہ و نالہ سے فضا زیر و زبر — اشک افشانی ہے ''خداوندے'' کی صورت دیکھ کر
اک طرف ہے غم، اسیری، جاں نثاروں کا خیال — اک طرف ہے موت، طوفاں، ظلم بربادی جلال
اک طرف نظروں کے آگے ہے گناہوں کا لہو — اک طرف آراستہ ہے کائناتِ رنگ و بو
جس نے لوٹے تاج داری اور فقیری کے مزے — مردِ کامل سو رہا ہے اب کفن اوڑھے ہوئے
آنکھ میں آتے ہیں آنسو کپکپاتی ہے نگاہ — قطب شاہی رعیت کی ہے آخری آرام گاہ [۶۵۶]

ایک اور اہم شاعر سکندر علی وجد نے بھی ''چینی محل کا قیدی'' کے زیرِ عنوان ایک بہت پُر درد نظم کہی تھی۔ اس نظم میں بھی گول کنڈا کے آخری تاج دار کے ''ایامِ قید'' کی بے بسی اور مجبوری کو بڑے موثر انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ سکندر علی وجد کی یہ نظم کہیں شائع نہیں ہوئی۔ ڈاکٹر سیدہ جعفر نے اس نظم کی بابت لکھا کہ اس نظم کو مولوی عبدالحق نے شائع کرنے سے انھیں منع فرمایا کیوں کہ اس کی اشاعت سے اورنگ زیب کے مظالم سامنے آجاتے۔ مصنفہ کو یہ نظم عالیہ لطیف دختر تقی بلگرامی کے ذریعے مریم بلگرامی سے ہوتی ہوئی بریگیڈیئر جعفر علی خان کے ذریعے ملی [۶۵۷]۔

دکن آگیا شاہِ غازی کے بس میں — کمی آئی لیکن نہ حرص و ہوس میں
نہ پوچھی کبھی بات چودہ برس میں — یوں ہی عمر گزاری یہاں خار و خس میں
سخی نے مکانِ اجل دے دیا — دکن لے کے چینی محل دے دیا [۶۵۸]

تانا شاہ کے اکلوتے فرزند خدا بندے کا مذکورہ سطور میں ذکر کیا گیا کہ وہ بھی گرفتاری کے بعد چینی محل میں اپنے والد کے ساتھ قید کر دیے گئے۔ اس دوران تانا شاہ اور خدا بندے کے درمیان ہونے والی بات چیت کو میکش نے اپنی نظم ''خدا بندے سے تانا شاہ کی آخری گفتگو'' میں بڑے موثر انداز سے پیش کیا ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

جو دنیا تھی ہماری اب وہی دنیا ستائے گی
کلی بھی خار بن کر تیرا نازک جی دُکھائے گی

غرض سو سو طرح سے زندگانی آزمائے گی
فقط تقدیر تیرے حال پرآنسو بہائے گی

ستم تونے نہیں دیکھا جفا تونے نہیں دیکھی
ابھی بچہ ہے دنیا کی ہوا تونے نہیں دیکھی

ان آنکھوں سے وطن والوں کا غم دیکھا نہیں جاتا
ستم نا آشناؤں پر ستم دیکھا نہیں جاتا

دیا تھا جس نے سکھ ہم کو اسے بپتا سناؤں گا
میں اپنی بے گناہی اپنے خالق کو دکھاؤں گا

مرے دل کی تمنا ماہ پارے جا رہا ہوں میں
نہ گھبرا زندگانی کے سہارے جا رہا ہوں میں

خدا حافظ مری آنکھوں کے تارے جا رہا ہوں میں
خدا رکھے تجھے خوش غم کے مارے جا رہا ہوں میں

جہنم سے اٹھا کر خُلد میں آباد کرتی ہے
مجھے رنجِ اسیری سے اجل آزاد کرتی ہے

مجھے ڈر ہے نہ گھبرا جائے تو نازوں کا پالا ہے
خدا رکھے تجھے تو گول کنڈا کا اجالا ہے

تقدیر کو پھر دولتِ بیدار پیدا کر
بہ اندازِ دگر ہنگامہ بازار پیدا کر

ارادے میں بلندی ہاتھ میں تلوار پیدا کر
جو ممکن ہو تو خارستان میں گلزار پیدا کر

تجھے میری قسم منت کشِ احساں نہ بن جانا
''خدا بندے'' خدارا بندۂ سلطاں نہ بن جانا[۶۵۹]

۱۰۹۸ء میں ابوالحسن تانا شاہ کی گرفتاری اور سقوطِ گول کنڈا کے ساتھ تاریخ دکن کے ایک زریں دور کا اختتام عمل میں آیا۔ ایک طرف یہ سانحہ دکن والوں کے لیے ایک طویل عرصے تک حزن وملال کا باعث رہا تو دوسری جانب دکن کی فتح سے مغل سلاطین کے ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ وقائع نعمت علی خان عالی میں فتح گول کنڈا کے بارے میں مندرجہ ذیل اشعار قلم بند کیے گئے ہیں:

سال تاریخش از خرد جستم
ایں چنیں گفت عقل خوش تقریر

بوالحسن داشت جا بہ چار محل
بدرش کرد زاں میاں تقدیر

چوں بروں رفتِ او بجاش نشت
شاہ اورنگ زیب عالم گیر[۶۶۰]

سقوط کے بعد بھی دکن سے قطب شاہیوں کی یادوں کا مٹانا اس قدر آسان نہ تھا۔ خصوصاً تانا شاہ اور اس کے فرزند کے ساتھ جو سلوک مغلوں نے کیا اس کے بعد تو یہ ممکن ہی نہ تھا کہ ان مظالم کو آسانی سے فراموش کیا جا سکے۔ ان کی بے بسی اور بے کسی پر شعرا نے بہت کچھ کہا۔ یادوں کے اس ''ناسٹلجیا'' کو آج تک شاعر اپنی شاعری کا موضوع بنا رہے ہیں۔ دکن کے آثار اور در و دیوار آج بھی اس عظیم الشان سلطنت کی کہانی سناتے محسوس ہوتے ہیں۔ ساتھ ساتھ وہاں کے دریا اور پہاڑ ان بادشاہوں کی بے بسی اور لاچاری کا سوگ بھی مناتے محسوس ہوتے ہیں۔ میکش نے اپنی شاعری کے ذریعے بیسویں صدی میں بھی ان مناظر کو ہماری آنکھوں میں زندہ رکھا ہوا ہے۔ اپنی نظم ''(حسین شاگر) ایک غمگین صبح'' میں وہ اس بے بسی کی تصویر کھینچتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

قافلہ گزرا تھا جب اس پر سے تانا شاہ کا
اس نے گزرانا تھا تحفہ نالۂ جاں کاہ کا

بے کسی میں اپنے شہ کی دے دیا جو بھی تھا پاس
اس کے پانی نے بجھائی تھی خدا بندے کی پیاس[۶۶۱]

اس سے قبل یہ بیان ہو چکا ہے کہ مغل بادشاہ نے جب بے جا پور پر فوج کشی کی تو اہلِ بے جا پور میدانِ جنگ میں ڈٹ کر

لڑے۔ پھر قلعہ بند ہو کر بہت دنوں تک مغلوں کے خلاف کھڑے رہے [۲۶۲]۔ بالآخر عادل شاہ ثانی شاہی کو اورنگ زیب سے صلح کرنی پڑی۔ ۱۰۹۷ء۔۱۶۸۵ء میں قلعے کی کنجیاں مغلوں کے حوالے کی گئیں۔ ان واقعات کا اظہار بھی اس دور کی شاعری میں خوب ہوا [۲۶۳]۔

قاضی محمود بحری کا تعلق بھی اسی دور سے ہے۔ بحری اس زمانے میں بے جاپور کے ایک علاقے گوگی کے مقام پر قاضی تھے۔ ۱۰۹۵ھ میں ترک وطن کر کے بے جاپور آئے اور تقریباً دو برس سکندر عادل شاہ کے دربار سے وابستہ رہے۔ ۱۰۹۷ھ میں سلطنت کی تباہی کے بعد حیدرآباد کا رخ کیا۔ ان کی مثنوی ''عروس عرفان'' سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے مرثیے، غزل، رباعی اور قصائد وغیرہ سمیت پچاس ہزار سے زائد شعر کہے لیکن بے جاپور سے حیدرآباد ہجرت کے دوران چوروں اور لٹیروں نے سب کچھ لوٹ کر غارت کر دیا [۲۶۴]۔ بعد میں انھیں حیدرآباد سے بھی بھاگنا پڑا۔ اس افراتفری میں بحری جیسے بے شمار شاعروں کو حیدرآباد سے نکل کر کس مپرسی کی حالت میں روپوش ہونا پڑا۔ حیدرآباد سے تباہ حال نکلنے اور لُٹ جانے کا حال بھی انھوں نے قلم بند کیا ہے۔ بحری کے علاوہ بھی بے شمار ایسے شعرا تھے جن کو اپنے وطن سے ہجرت کا کرب سہنا پڑا۔ کچھ شاعر ایسے بھی تھے جو اپنا وطن چھوڑ کر کہیں نہیں جانا چاہتے تھے۔ انھوں نے اس تباہ حال شہر ہی میں اقامت اختیار کیا اور نہ صرف شہر کی بلکہ اپنی بربادی پر آخری وقت تک آٹھ آٹھ آنسو بہاتے رہے [۲۶۵]۔ شغلی بے جاپوری نے ہجرت کے اس کرب کو محسوس کر کے اپنے خیالات کو کچھ اس طرح سے پیش کیا ہے کہ وہ سارا منظر آنکھوں کے سامنے پھرنے لگتا ہے۔ شعر ملاحظہ کیجیے:

حب الوطن تیرا کہاں چھوڑیا وطن کس دھات بول ۔۔۔ کیا سات لے آیا یہاں کیا جالے گا لے سات بول
تیری حقیقت کر عیاں کس واسطے آیا یہاں ۔۔۔ یہاں سوں گیا تو پھر کہاں جا کر رہے گا بات بول [۲۶۶]

سقوطِ دکن کے بعد جب شہنشاہ اورنگ زیب نے دکن پر پوری طرح تسلط حاصل کر لیا تو اس ابتری کے زمانے میں اورنگ زیب اور ان کے کارندوں کی سیاسی چالوں کے ڈر سے بہت سے شاعر اپنے جذبات، خیالات اور محسوسات کو صاف صاف بیان نہیں کر پا رہے تھے۔ اسی لیے اکثر شعرا نے اس عہد میں مرثیہ گوئی کو اپنا شعار بنا لیا۔ ان شعرا سے سقوطِ دکن اور معاشرتی تباہی کو دیکھ کر اپنے غم زدہ دلوں کی بھڑاس حضرت امام حسینؓ اور شہدائے کربلا کے مرثیے لکھ لکھ کر نکالی۔ بہت سے شعرا اپنے محبوب بادشاہ ابوالحسن تانا شاہ کے آٹھ ماہ تک محصور رہنے اور جرات و بہادری سے مقابلہ کرنے کو امام حسینؓ کی مظلومیت سے تشبیہ دینے لگے تھے [۲۶۷]۔ یہی وجہ ہے کہ اس شہر کے مشہور سپہ سالار عبدالرزاق لاری نے محاذ جنگ میں اورنگ زیب کو جواب دیتے ہوئے کہا کہ:

> ایں جنگ بلاتشبیہ بجنگ کربلامی ماند۔ عبدالرزاق لاری امیدوار است کہ تا نفس باقی ست در زمرۂ کسانے
> کہ اوّل با حضرت امام حسین علیہ الصلوٰۃ والسلام بیعت نمودہ آخر تیغ برروئے آں شہید کربلا کشیدند در نیاید
> بلکہ منجملہ ہفتاد و دو تن سرخروئی دنیا و آخرت حاصل نماید [۲۶۸]۔

اس عہد کے دکنی شعرا کے نفسی رجحانات اور ذہنی کیفیتوں کا آئینہ دار یہی مرثیے ہیں۔ ان لوگوں نے مرثیوں کو اپنے سیاسی جذبات کے اظہار کا ذریعہ بنایا۔ اس کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ ان مرثیوں میں محض ایک آدھ لفظ کی تبدیلی کے ذریعے شعرا اپنا اصل مقصد یعنی تباہی وطن کا نقشہ بہ آسانی ظاہر کر دیتے ہیں [۲۶۹]۔ مثال کے طور پر پیرزادہ روحی کا یہ مرثیہ دیکھیے:

آج غم ناک ہیں چمن کے گل ۔۔۔ بلکہ دل چاک ہیں سمن کے گل

غم زدہ سینہ داغ حیراں ہیں   نرگس و لالہ یاسمن کے گل

یوں نہ لائے شفق کے دستے ہیں   لہو میں ڈوبے ہیں سب گگن کے گل

نقش پا دیکھ دل ہوس رکھتا   سر پہ رکھنے کوں تجھ چرن کے گل[٦٧٠]

بہ ظاہر مرثیہ ہونے کے باوجود بقول محی الدین قادری زور ''اس کے پہلے مصرعے میں بجائے ''چمن'' کے ''دکن'' لکھ دیا جائے تو پورا مرثیہ بجائے امام حسینؓ کے ابوالحسن کا مرثیہ بن جاتا ہے''[٦٧١]۔ ایک مخمس میں بھی روحی نے پل پل مرنے کے بجائے ایک بار مرنے کی دعا کرتے ہوئے کہا کہ:

پل پل منیں ہے یہ مرن یک بار ہوتا کاش کے   نِس دل سجن تجھ درس کا آدھا ہوتا کاش کے[٦٧٢]

اس عہد کے ایک اور شاعر طبعی نے باقاعدہ سیاسی موضوعات پر الگ سے تو شعر نہیں کہے لیکن ان کی مثنوی ''بہرام و گل اندام'' کے بعض اشعار پوری طرح ان حالات و واقعات کی ترجمانی کرتے ہیں۔ مثلاً:

ترا دل ہو گیا پھوڑا دکھوں تے   نہیں اس زخم کا مجھ پاس مرہم[٦٧٣]

شاہ عبدالرحمٰن قادر کا تعلق بھی بے جا پور ہی سے تھا۔ وہ بھی بحری کی طرح بے جا پور کی تباہی کے بعد وطن سے نکل کھڑے ہوئے اور برار کا رخ کیا۔ کچھ دن اورنگ زیب عالم گیر کے جانشین شاہ عالم بہادر شاہ کے مقربین میں بھی شامل رہے پھر دربار چھوڑ کر دلّی کی طرف کوچ کیا۔ وہیں جمنا کی سیر کے دوران کچھ ایسے فقرا پر نظر پڑی جو امام حسینؓ کے واقعات اور حالات کو درد انگیز فارسی اشعار میں سناتے تھے۔ ان اشعار کا اتنا گہرا اثر ہوا کہ ۱۷۲۷ء میں ایک طویل مثنوی لکھی جو ''باغ حسینی'' کے نام سے مشہور ہوئی۔ سولہ ہزار اشعار پر مشتمل اس مثنوی کے بعض حصوں کا مطالعہ کر کے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے اس مرثیے میں اورنگ زیب کے اس اقدام کی سخت مذمت بھی کی ہے اور اس کی حیلہ جو طبیعت پر سخت چوٹیں بھی کی ہیں[٦٧٤]۔ شہر بے جا پور کی حالت کا نقشہ کھینچتے ہوئے شاعر نے پہلے اس کی خوبیوں کو کچھ اس انداز سے بیان کیا:

جو اس وقت میں تھا بے جا پور شہر   سو اس شہر کی تھی جہاں میں خبر

اتھے بادشاہ واں کے صاحبِ عدل   نہ تھا یک رتی کام کا کیں دغل

جتی خلق واں کی وضیع و شریف   سخی مہرباں ہور بھوتیج لطیف

مبرّا تھے سب چھند فریباں ستے   اتھے معتقد وہ فقیراں ستے

اتھا نام اس شہر کا ہر دیار   تو آویں خبر سن کے عالم اپار

خدا کے فضل سوں وہ معمور تھا   اسی کے کرم سوں وہ منصور تھا[٦٧٥]

اور پھر جب اورنگ زیب کے قبضے کے بعد کے مناظر پیش کرتے ہوئے شاعر کا کہنا ہے کہ:

ہوئے بادشاہ جب سوں اورنگ زیب   کیے اس کے لینے کے تئیں کئی فریب

دیے بھیج فوجاں کو اوّل عتاب   جو جا کر کریں ملک سارا خراب

پچھیں آپ آ ایک حیلے ستے   لیے شہر ہور ملک سب غصب تھے[٦٧٦]

اس طرح شاعر نے اورنگ زیب کو غاصب، فریبی اور بے جاپور کی ساری خرابیوں کا ذمے دار قرار دیا ہے۔

اس دور میں دکن ایک ایسے انقلاب اور سانحے سے دوچار رہا جس نے اس شہر کی تہذیب وشائستگی اور علم وفضل کی بنیادیں ہلا کر رکھ دیں۔ بے جاپور اور حیدرآباد دکن اس انقلاب سے اس قدر متاثر ہوئے کہ آئندہ پچاس برسوں تک سنبھل نہ سکے۔ سکندر عادل شاہ اور ابوالحسن تانا شاہ کی شکست اور قید کے بعد ان شہروں کی مرکزیت ختم ہوگئی جو کبھی علم وفضل اور شعروسخن کا گہوارا سمجھی جاتی تھی۔ بشیر النساء بیگم نے دکن کی اسی عظمتِ رفتہ کو یاد کرتے ہوئے درست کہا کہ:

تیری نوا سے شعلۂ غم میں سکون ہے — نیرنگی حیات میں تیرا جنون ہے
تیری نگاہ، زخمۂ سازِ فنون ہے — تاریخ کی رگوں میں رواں تیرا خون ہے
اس دور، کش مکش میں عجب تیری شان ہے — باقی تجھی سے عظمتِ ہندوستان ہے[۶۷۷]

لیکن اب اس کی عظمت کے نشان مٹ چکے تھے۔ متعدد شعرا سی مٹی ہوئی تہذیب کا نوحہ لکھنے پر مجبور تھے۔ جو سانحہ جنوبی ہندوستان پر گزرا وہ ان شعرا کے لیے ناقابلِ برداشت تھا۔ نہ صرف اس عہد کے شاعر بلکہ آج تین صدیاں گزرنے کے بعد دورِ جدید سے تعلق رکھنے والے متعدد شعرا نے اس سانحے پر آنسو بھی بہائے اور اس کی عظمتِ رفتہ کے گن بھی گائے۔ شاہد صدیقی اپنی نظم میں اسی قسم کے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

میرے ہر حال میں ماضی کے فسانے پنہاں — میری مٹی میں جواہر کے خزانے پنہاں
نقشِ ماضی جو تصور میں ابھر آتا ہے — چار مینار نگینہ سا نظر آتا ہے
میں نے دیکھے ہیں زمانے کے بدلتے ہوئے رنگ — صلح غیروں سے اور کبھی اپنوں سے جنگ
میری گلیوں سے دلیرانِ جہاں گزرے ہیں — صف شکن، تیغ بکف، نعرہ زناں گزرے ہیں
بادشاہانِ الوالعزم کا مدفن ہوں میں — بجلیاں جس میں ہیں آسودہ وہ خرمن ہوں میں
ہیں بہت عہدِ گزشتہ کے دفینے مجھ میں — ذوق پختہ ہو تو ملتے ہیں خزینے مجھ میں[۶۷۸]

مسعود علی محوی نے اس بے کس دکن پر ٹوٹنے والی مصیبت کو ایک ترجیع بند میں موضوع بنایا۔ ان کے مطابق دکن پر ٹوٹنے والی اس ناگہانی مصیبت نے سب کو اداس کر دیا تھا۔ شاعر اسی اداسی کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

کس کی نظر لگی تجھے اے خوش نما دکن — کیوں ہو گیا تو رنج میں یوں مبتلا دکن
لایا ہے کون سر پہ تیرے یہ بلا دکن — بگڑی تیری جہان میں کیسے ہوا دکن
بے کس دکن، غریب دکن، بے نوا دکن

جھوٹے ہیں جو یہ کہتے ہیں امن و امان ہے — امن و امان کا نام نہ کوئی نشان ہے
محفوظ اب کسی کی نہ عزت نہ جان ہے — تیرا قدیم امن و اماں کیا ہوا دکن
بے کس دکن، غریب دکن، بے نوا دکن[۶۷۹]

صدق نقوی نے بھی حیدرآباد دکن کی تباہی و بربادی کو ماضی کی عظمت سے موازنہ کرتے ہوئے دعائیہ انداز میں کہا ہے کہ:

آج ہے یومِ قلی آؤ ارادہ کر لیں　　اپنی دھرتی پہ نہ لاشوں کی تجارت ہوگی
خون مظلوم کا نہ ہوگا نہ شقاوت ہوگی　　گھر جلیں گے نہ نہ مذہب کی تجارت ہوگی
اپنی تاریخ محبت تھی محبت ہوگی　　زندگی پیار سے الفت سے عبارت ہوگی[۲۸۰]

بعض غزل گوشعرا نے بھی تہذیب کے مٹنے کے غم کو شدت سے محسوس کیا۔ حامد کاشمیری نے شہر کی دگر گوں حالت اور تباہی پر کہا کہ:

شہر کے شہر ڈھے تو جائیں گے　　وضع کوئی جواز کرنا تھا[۲۸۱]

اسی طرح شکیل اعظمی نے اپنے رنج وغم کا اظہار کرتے ہوئے غزل کی ایمائیت کا سہارا لیتے ہوئے کہا کہ:

اتنا سفاک تھا قاتل کہ مرے قتل کے وقت　　سلوٹیں آئیں نہ ماتھے پہ پسینہ آیا[۲۸۲]

سعیدالدین احمد خان نے ماضی کی ان محفلوں کو یاد کرتے ہوئے اپنے کرب کا اظہار کچھ ان الفاظ میں کیا ہے کہ:

گلشن رہا نہ بلبلیں، لے دے کے ویرانے کی یاد　　محفل کی شمع بجھ گئی تڑپے ہے پروانے کی یاد[۲۸۳]

ڈاکٹر محمد علی اثر نے بھی صدیوں پر محیط اس تہذیب کو یاد کرتے ہوئے کہا کہ:

چار سو سال گزرنے پہ یہ اندازہ ہوا　　اپنی تہذیب کے آداب نرالے ہوں گے[۲۸۴]

وہ محفل جواب خواب وخیال ہوکر رہ گئی تھی لوگ اس کی ماضی کی داستانیں سن سن کر اس پر رشک کیا کرتے تھے۔ کلیم زیدی نے ان ایام گزشتہ کی داستانوں کو یاد کرتے ہوئے کہا کہ:

اے پرستانِ چمن! اے جاں نثارانِ گلستاں　　اپنے ایّامِ گزشتہ کی سنا کچھ داستاں
بارہا کرتی تھی ہر دم محوِ گلگشتِ چمن　　یا ہوں اک مدت سے اب محروم دید آشیاں
دل تڑپتا تھا بہ شکلِ ماہیِ بے آب جب　　یاد کر لیتی تھی میں عہدِ گزشتہ کا سماں
اف یہ انساں کس قدر سفّاک ہے جلّاد ہے　　قید کرتا ہے اسے جو فطرتاً آزاد ہے[۲۸۵]

حقیقتاً آج بھی لوگ اس تہذیبی مرکز کو یاد کر کے آنسو بہاتے ہیں۔ جن لوگوں نے اس دور کو نہیں دیکھا، انھیں آرزو ہے کہ کاش وہ دورِ زریں پھر سے لوٹ آئے اور جن لوگوں نے تہذیب کے اس المیے کو محسوس کیا وہ اسے یاد کر کے اطہر راز کی طرح یہ کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ:

حیدر آباد کو دیکھا تو نہیں ہے میں نے　　لوگ اس شہر کے افسانے سناتے ہیں مجھے
وقت کی دھوپ میں ڈھلتا ہوا مغلوں کا شباب　　ایک گرتی ہوئی دیوارِ تمدّن کہ جہاں
سایۂ دولتِ احساس بہ اندازِ کرم　　مرکزِ اہلِ نظر عظمتِ رفتہ کا بھرم
ایسی بستی کے اجڑنے کا سبب کیا ہوگا[۲۸۶]

حوالہ جات

۱۔ رضوی، مسعود حسن، ''ہماری شاعری''، نول کشور پریس، لکھنؤ، ۱۹۵۳ء، ص۱۴

۲۔ ذوالفقار، ڈاکٹر غلام حسین، ''اردو شاعری کا سیاسی اور سماجی پس منظر''، مطبع جامعہ پنجاب، لاہور، ۱۹۶۶ء، ص ا

۳۔ نعمانی، علامہ شبلی، ''شعر العجم'' (جلد اوّل)، عشرت پبلشنگ ہاؤس، لاہور، ص۱۹۶۶ء، ص۸

۴۔ نعمانی، ص۹

۵۔ حالی، مولانا الطاف حسین، ''مقدمہ شعر و شاعری''، نیشنل پریس، الہ آباد، ۱۹۵۳ء، ص۷۔۱۰

۶۔ محمود الرحمٰن، ''جنگ آزادی کے اردو شعرا''، قومی ادارہ برائے تحقیق و تاریخ و ثقافت، اسلام آباد، ۱۹۸۶ء، ص ا

۷۔ ذوالفقار، ص الف

۸۔ محمود الرحمٰن، ص ا

۹۔ احمد، سلیم، ''شاعری اور ارادہ''، مشمولہ: ''مضامین سلیم احمد''، مرتبہ جمال پانی پتی، اکادمی بازیافت، کراچی، ۲۰۰۹ء، ص۲۱۳۔ ۲۱۴

۱۰۔ اعظمی، انجم، ''شاعری کی زبان''، الباقریہ پبلی کیشنز، کراچی، ۱۹۸۹ء، ص۳۷

۱۱۔ حقی، شان الحق، ''نقطہ راز''، عصری کتب، کراچی، ۱۹۷۲ء، ص ۳۰۹

۱۲۔ محمود الرحمٰن، ص ا

۱۳۔ حقی، ص۳۰۹

۱۴۔ جالبی، ڈاکٹر جمیل، ''تاریخ ادب اردو'' (جلد اوّل)، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۸۴ء، ص۲

۱۵۔ تارا چند، ڈاکٹر، ''تمدن ہند پر اسلامی اثر''، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۶۴ء، ص۲۲۴

۱۶۔ جالبی، ص۲

۱۷۔ ایضاً، ص۶۔۷

۱۸۔ ایضاً، ص۳

۱۹۔ بخاری، ڈاکٹر سہیل، ''لسانی مقالات'' (حصہ سوم)، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۹۱ء، ص۴۰۹

۲۰۔ جالبی، ص۳

۲۱۔ شیرانی، حافظ محمود، ''مقالات حافظ محمود شیرانی'' (جلد دوم)، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۶۶ء، ص۹۶

۲۲۔ عبدالحق، مولوی، ''اردو کی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا حصہ''، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی، ۱۹۸۶ء، ص۸

۲۳۔ جالبی، ص۱۵

۲۴۔ جعفر، سیدہ، پروفیسر گیان چند جین، ''تاریخ ادب اردو ۱۷۰۰ء تک'' (جلد اوّل)، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی، ۱۹۹۸ء، ص۳۷۱

۲۵۔ حسن، محمد، ''ہندی ادب کی تاریخ''، اورینٹ لانگ مین، نئی دہلی، ۱۹۷۳ء، ص۱۷

۲۶۔ جعفر، ص۳۷۳

۲۷۔ شیرانی، حافظ محمود، ''پنجاب میں اردو'' (جلد اوّل)، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۸۸ء، ص۵۳

۲۸۔ عوفی، محمد، ''لباب الباب''، بہ حوالہ: ''پنجاب میں اردو''، محولہ بالا، ص۲۴۶

۲۹۔ خسرو، امیر، ''غراۃ الکمال''، بہ حوالہ: ''پنجاب میں اردو''، محولہ بالا، ص۵۳

۳۰۔ بلگرامی، میر غلام علی آزاد، بہ حوالہ: ''تاریخ ادب اردو'' (جلد اوّل)، از سیدہ جعفر، پروفیسر گیان چند جین، ص۳۷۴

۳۱۔ کریوی، اعظم، ''ہند شاعری''، ہندوستان اکیڈمی، الہ آباد، ۱۹۳۱ء، ص۵

۳۲۔ جعفر، ص۳۷۳

۳۳۔ آ ی، صفدر، ''امیر خسرو بہ حیثیت ہندی شاعر''، امیر خسرو اکیڈمی، دہلی، سن ندارد، ص۱۴

۳۴۔ شیرانی، ''پنجاب میں اردو''، ص۱۲۶

۳۵۔ آہ، ص۱۴

۳۶۔ جالبی، ص۳۳

۳۷۔ ایضاً، ص۲۷

۳۸۔ خان، پروفیسر عصمت اللہ، ''ایک تہذیبی کیمیا گر''، مشمولہ: ''ہم

سخن''، مجلّہ جناح کالج، کراچی، امیر خسرو نمبر، ص ۱۶

۳۹۔ آزاد، محمد حسین، ''آبِ حیات''، مرتبہ: ابرار عبدالسلام، بہاؤ الدین ذکریا یونی ورسٹی، ملتان، ۲۰۰۶ء، ص ۴۳۔۴۴

۴۰۔ انصاری، ظ، ''دیباچہ''، مشمولہ: ''خسرو کا ذہنی سفر''، انجمن ترقی اردو ہند، دہلی، ۱۹۸۸ء

۴۱۔ جالبی، ص ۲۷

۴۲۔ مرزا، وحید، ڈاکٹر، ''امیر خسرو''، نیشنل امیر خسرو سوسائٹی، دہلی، ۱۹۸۶ء، ص ۵۰

۴۳۔ نارنگ، گوپی چند، ڈاکٹر، ''امیر خسرو کا ہندی کلام مع نسخہ برلن ذخیرۂ اسپرنگر''، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۰ء، ص ۱۴۱

۴۴۔ جالبی، جمیل، ڈاکٹر، محولہ بالا، ص ۳۷

۴۵۔ نارنگ، گوپی چند، ڈاکٹر، محولہ بالا، ص ۲۵۔۲۸

۴۶۔ جالبی، جمیل، ڈاکٹر، محولہ بالا، ص ۶۹

۴۷۔ آہ، ص ۱۴۔۱۵

۴۸۔ تارا چند، ڈاکٹر، ''امیر خسرو اور ہندوستان''، امیر خسرو اکیڈمی، دہلی، سن ندارد، ص ۶۔۷

۴۹۔ صدیقی، ابواللیث، ڈاکٹر، ''حضرت امیر خسرو اور ہماری لسانی روایت''، مشمولہ: ''ہم سخن''، محولہ بالا، ص ۱۴۸

۵۰۔ مرزا، وحید، ڈاکٹر، محولہ بالا، ص ۱۵۱

۵۱۔ شبلی نعمانی، علامہ، ''حیات خسرو''، مشمولہ: ''امیر خسرو''، مرتبہ، شیخ سلیم احمد، ادراہ ادبیات دلّی، دہلی، ۱۹۷۶ء، ص ۵۰۔۵۱

۵۲۔ بایسنغر، مرزا، بحوالہ ڈاکٹر وحید مرزا، محولہ بالا، ص ۱۵۲

۵۳۔ اوحدی، بہ حوالہ: ''حیات خسرو''، از علامہ شبلی نعمانی، محولہ بالا، ص ۵۱

۵۴۔ ایضاً

۵۵۔ نارنگ، گوپی چند، محولہ بالا، ص ۳۰؛ و نیز ڈاکٹر وحید مرزا، محولہ بالا، ص ۴۰

۵۶۔ خسرو، امیر، ''نہ سپہر''، بحوالہ گوپی چند نارنگ، محولہ بالا، ص ۳۱

۵۷۔ ایضاً

۵۸۔ نارنگ، گوپی چند، محولہ بالا، ص ۳۱

۵۹۔ ایضاً

۶۰۔ شیرانی، حافظ محمود، ''پنجاب میں اردو''، آئینہ ادب، لاہور، ۱۹۷۲ء کے صفحہ ۱۴۰ تا ۱۵۲ میں اس بابت بحث ملاحظہ کیجیے

۶۱۔ صلاح الدین، اقبال، ''خسروِ شیریں زباں''، مکتبہ میری لائبریری، لاہور، ص ۱۴۳۔۱۵۰

۶۲۔ جالبی، جمیل، ڈاکٹر، محولہ بالا، ص ۳۰

۶۳۔ ایضاً، ص ۳۰۔۳۱

۶۴۔ آہ، ص ۱۷

۶۵۔ صلاح الدین، اقبال، محولہ بالا، ص ۱۴۳

۶۶۔ تاراچند، ڈاکٹر، محولہ بالا، ص ۱۲

۶۷۔ مارہروی، محمد سعید احمد، منشی، ''حیات خسرو''، مشمولہ: ''امیر خسرو''، مرتبہ: شیخ سلیم احمد، ادارۂ ادبیات دلّی، دہلی، ۱۹۷۶ء، ص ۱۶۸

۶۸۔ ایلیٹ، سر، بحوالہ سعید احمد مارہروری، محولہ بالا، ص ۱۶۸

۶۹۔ مارہروی، محمد سعید احمد، منشی، محولہ بالا، ص ۱۶۷۔۱۶۸

۷۰۔ خان، عصمت اللہ، پروفیسر، محولہ بالا، ص ۲۴۔۲۵

۷۱۔ زاہد، انصار، ڈاکٹر، ''امیر خسرو کی سیاسی زندگی''، مشمولہ: ''ہم سخن''، محولہ بالا، ص ۹۳

۷۲۔ خاں، عتیق احمد، پروفیسر، ''درباداری اور خسرو کا رنگ طبیعت''، مشمولہ: ''ہم سخن''، محولہ بالا، ص ۴۳

۷۳۔ خسرو، امیر، ''تغلق نامہ''، مشمولہ: ''ہم سخن''، محولہ بالا، ص ۴۷

۷۴۔ خاں، عتیق احمد، پروفیسر، محولہ بالا، ص ۴۷

۷۵۔ خسرو، امیر، ''تغلق نامہ''، مرتبہ، سید ہاشمی فرید آبادی، مطبع اردو اورنگ آباد، دکن، ۱۹۳۳ء، ص ۱۶

۷۶۔ بہ حوالہ: شیخ سلیم احمد، ص ۱۶۹

۷۷۔ نامعلوم، بہ حوالہ: مارہروی، محمد سعید احمد، منشی، محولہ بالا، ص ۱۶۹

۷۸۔ نیازی، بہ حوالہ: شیخ سلیم احمد، ص ۱۷۰

۷۹۔ تاراچند، ڈاکٹر، ''امیر خسرو اور ہندوستان''، مشمولہ: ''امیر خسرو''، مرتبہ: شیخ سلیم احمد، محولہ بالا، ص ۳۶۳

۸۰۔ انصاری، نورالحسن، ڈاکٹر، ''مقدمہ''، مشمولہ: ''امیر خسرو: احوال و آثار''، مرتبہ: ڈاکٹر نورالحسن انصاری، مطبع کوہ نور پریس، دہلی، ۱۹۷۵ء، ص ۸

۸۱۔ عسکری، سید حسن، پروفیسر، "Amir Khusrau as a

"Historian" خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ، ۱۹۹۲ء،ص۱۳

۸۲۔ اظفر،محی الدین،''امیر خسرو اور علی گڑھ''،نسرین پبلشنگ ہاؤس، علی گڑھ،۱۹۸۱ء،ص۳۳

۸۳۔ مارہروی،محمد سعید احمد،منشی،''حیات خسروؔ''،مطبع اکبری،آگرہ، ۱۹۰۳ء/۱۳۲۱ھ،ص۲۳

۸۴۔ صلاح الدین،اقبال،محولہ بالا،ص۴۶

۸۵۔ مرزا،وحید،ڈاکٹر،محولہ بالا،ص۵۹

۸۶۔ بحوالہ ڈاکٹر جمیل جالبی،محولہ بالا،ص۳۴

۸۷۔ سجزی،سید حسن،بحوالہ''اوراق پارینہ،ایک نایاب قلمی بیاض''، مشمولہ:''نوائے ادب''،بمبئی،جولائی ۱۹۵۶ء،ص۶۰۔۶۱

۸۸۔ سجزی،سید حسن،بحوالہ ڈاکٹر جمیل جالبی،محولہ بالا،ص۳۵

۸۹۔ مارہروی،محمد سعید احمد،منشی،''حیات خسروؔ''،مطبع اکبری،آگرہ، ۱۹۰۳ء/۱۳۲۱ھ،ص۳۱۔۳۲

۹۰۔ فرشتہ،محمد قاسم،''تاریخ فرشتہ''،جلد اوّل،مترجم،مولوی فدا علی، مطبع جامع عثمانیہ،حیدرآباد دکن،۱۹۲۶ء،ص۲۹۶۔۳۰۵

۹۱۔ خسرو،بہ حوالہ:انصاری،ظ،''خسرو کا ذہنی سفر''،محولہ بالا،ص۷

۹۲۔ ایضاً

۹۳۔ اظفر،محی الدین،محولہ بالا،ص۳۷

۹۴۔ برنی،حسن،''خان شہید قاآن ملک سلطان محمدؔ''،مشمولہ: ''مقالات برنی''،مرتبہ:''مقالات برنی''،انجمن ترقی اردو، کراچی،۱۹۸۶ء،ص۱۳۶۔۱۴۱

۹۵۔ انصاری،ظ،''خسرو کا ذہنی سفر''،محولہ بالا،ص۳۵

۹۶۔ فرشتہ،محمد قاسم(اردو ترجمہ)محولہ بالا،ص۳۰۴۔۳۰۵

۹۷۔ مارہروی،محمد سعید احمد،منشی،اشاعت آگرہ،محولہ بالا،ص۳۲۔ ۳۳

۹۸۔ حبیب،محمد،پروفیسر،''سوانح امیر خسروؔ''،مترجم حیات اللہ انصاری،ہندوستانی اکیڈمی،الہٰ آباد،۱۹۸۴ء،ص۱۴

۹۹۔ بدایونی،ملا عبدالقادر،''منتخب التواریخ''(فارسی)،مرتبہ:مولوی احمد علی،ایشیاٹک سوسائٹی بنگال،کلکتہ،۱۸۶۸ء،ص۱۳۱

۱۰۰۔ مرزا،وحید،ڈاکٹر،اشاعت دہلی،محولہ بالا،ص۶۲۔۳

۱۰۱۔ فرشتہ،محمد قاسم(اردو ترجمہ)محولہ بالا،ص۳۰۵

۱۰۲۔ مرزا،وحید،ڈاکٹر،اشاعت دہلی،محولہ بالا،ص۶۳

۱۰۳۔ فرشتہ،محمد قاسم(اردو ترجمہ)محولہ بالا،ص۳۰۵

۱۰۴۔ شبلی نعمانی،علامہ،''حیات خسروؔ''،جامعہ ملیہ برقی پریس،دہلی، سن ندارد،ص۶

۱۰۵۔ رضوی،شفقت،پروفیسر،''امیر خسرو کے ہم عصر اردو شعراء''، مشمولہ:''ہم سخن''،محولہ بالا،ص۱۹۸

۱۰۶۔ محوی،مسعود علی،''مقدمہ''،مشمولہ:''کلیات حسن سجزی''،شاد ایڈیشن،مکتبہ ابراہیمیہ پریس،حیدرآباد دکن،۱۳۵۲ھ،ص۳۴

۱۰۷۔ ایضاً ص۸؛محوی صاحب نے''حیات خسروؔ''نامی جس تصنیف کا ذکر کیا ہے وہ بہ عینہٖ وہی ہے جو اس سے قبل''شعر العجم''حصہ دوم میں شائع ہو چکے تھے۔

۱۰۸۔ شبلی نعمانی،علامہ،''شعر العجم''حصہ دوم،عشرت پبلشنگ ہاؤس، لاہور،۱۳۲۴ھ۔۱۳۲۵ھ،ص۴۷؛غالباً''شعر العجم''میں شائع ہونے والا خسرو کا سارا مواد بہ عینہٖ''حیات خسروؔ''،جامعہ ملیہ برقی پریس،دہلی اور''بیان خسروؔ''،مطبع الناظر،لکھنؤ نے بعد میں الگ سے شائع کیا۔

۱۰۹۔ دیکھیے:''بیان خسروؔ''،از شبلی نعمانی،الناظر پریس،لکھنؤ،سن ندارد،سرورق کے بعد والا صفحہ۔

۱۱۰۔ ملاحظہ کیجیے:''حواشی''،مشمولہ:''شعر العجم''حصہ دوم،محولہ بالا، ص۸:و نیز''حواشی''،مشمولہ:''بیان خسروؔ''،محولہ بالا،ص۸

۱۱۱۔ خورجوی،نقی محمد خان،''حیات امیر خسرو مع ایجاد موسیقی''،شیخ غلام علی اینڈ سنز،کراچی،سن ندارد،ص۴۴

۱۱۲۔ صلاح الدین اقبال،محولہ بالا،ص۴۶

۱۱۳۔ حسین،ممتاز،پروفیسر،''امیر خسرو دہلوی:حیات اور شاعری''، پاکستان ہیرالڈ لمیٹڈ،کراچی،۱۹۷۵ء،ص۱۶۵

۱۱۴۔ بدایونی،ملا عبدالقادر،''منتخب التواریخ''،مترجم محمود احمد فاروقی، شیخ غلام علی اینڈ سنز،لاہور،۱۹۶۲ء،ص۸۱

۱۱۵۔ بدایونی،ملا عبدالقادر،''منتخب التواریخ''(فارسی)،مرتبہ:مولوی احمد علی،محولہ بالا،ص۱۳۱

۱۱۶۔ حسین،ممتاز،پروفیسر،محولہ بالا،ص۱۶۵

۱۱۷۔ عقیل، معین الدین، ڈاکٹر، ''امیر خسرو فرد اور تاریخ''، ابوالکلام آزاد انسٹی ٹیوٹ، کراچی، ۱۹۹۷ء، ص ۳۵

۱۱۸۔ ایضاً، ص ۳۵۔۴۱

۱۱۹۔ برنی، ضیاء الدین (فارسی)، محولہ بالا، ص ۱۰۰؛ و نیز اردو ترجمہ، ص ۱۳۱۔۱۳۴، ۵۰۵، ۵۲۲، ۵۲۳ دیکھیے۔

۱۲۰۔ برنی، ضیاء الدین (اردو ترجمہ)، محولہ بالا، ص ۱۹۰

۱۲۱۔ ایضاً، ص ۱۸۹

۱۲۲۔ خسرو، امیر، ''دیوان وسط الحیات''، بحوالہ، ڈاکٹر وحید مرزا، محولہ بالا، ص ۶۸؛ موازنے کے لیے دیکھیے: ڈاکٹر معین الدین عقیل، محولہ بالا، ص ۳۵

۱۲۳۔ سجزی، میر حسن، بحوالہ، ''تاریخ مبارک شاہی''، از یحییٰ بن احمد سرہندی، مترجم، ڈاکٹر آفتاب اصغر، مرکزی اردو بورڈ، لاہور، ص ۱۱۱۔۱۱۶

۱۲۴۔ فاروقی، محمود احمد، ''حواشی''، مشمولہ: ''منتخب التواریخ'' (اردو ترجمہ)، محولہ بالا، ص ۸۱

۱۲۵۔ برنی، ضیاء الدین (فارسی)، محولہ بالا، ص ۱۱۰؛ و نیز اردو ترجمہ، محولہ بالا، ص ۱۹۰

۱۲۶۔ فرشتہ، محمد قاسم (اردو ترجمہ)، محولہ بالا، ص ۲۹۳۔۳۰۵، ۴۰۸۔۴۰۹ و دیگر صفحات

۱۲۷۔ بدایونی، ملا عبدالقادر، ''سبب تالیف''، مشمولہ: ''منتخب التواریخ'' (اردو ترجمہ)، محولہ بالا، ص ۳۲

۱۲۸۔ ایضاً، ص ۳۱، ۷۷۵

۱۲۹۔ اصغر، آفتاب، ڈاکٹر، ''مقدمۂ مترجم''، مشمولہ: ''تاریخ مبارک شاہی'' (اردو ترجمہ)، محولہ بالا، ص ۴۲

۱۳۰۔ سرہندی، یحییٰ بن احمد، ''تاریخ مبارک شاہی'' (اردو ترجمہ)، محولہ بالا، ص ۱۱۰

۱۳۱۔ مارہروی، محمد سعید، اشاعت آگرہ، محولہ بالا، ص ۳۴

۱۳۲۔ مرزا، وحید، ڈاکٹر، محولہ بالا، ص ۶۳

۱۳۳۔ سرہندی، یحییٰ بن احمد، ''تاریخ مبارک شاہی'' (فارسی)، تصحیح محمد ہدایت حسین، ایشیاٹک سوسائٹی بنگال، کلکتہ، ۱۹۳۱ء، ص ۴۳۔۵۱؛ و نیز اردو ترجمہ، ص ۱۱۰۔۱۱۷

۱۳۴۔ محوی، مسعود علی، محولہ بالا، ص ۳۵

۱۳۵۔ ایضاً

۱۳۶۔ فاروقی، نثار احمد، پروفیسر، ''مقدمہ''، مشمولہ: ''فوائد الفواد''، مرتبہ: خواجہ امیر حسن علا سجزی، مترجم، خواجہ حسن نظامی، اردو اکادمی، دہلی، ۱۹۹۱ء، ص ۱۶۱

۱۳۷۔ سرہندی، یحییٰ بن احمد (فارسی)، ص ۴۵

۱۳۸۔ کاظمی، سیدہ فلیحہ، ڈاکٹر، ''مرثیہ حسن سجزی در رثای محمد خان شہید و دیگر آثارش''، مشمولہ: اورینٹل کالج میگزین، لاہور، اکتوبر۔دسمبر ۲۰۱۳ء، ص ۶۵

۱۳۹۔ سید احمد دہلوی، ''فرہنگ آصفیہ''، جلد سوم، مکتبہ سہیل لمیٹڈ، لاہور، ۱۹۷۴ء، ص ۳۳۲

۱۴۰۔ سجزی، میر حسن، بحوالہ، یحییٰ بن احمد سرہندی (اردو ترجمہ)، محولہ بالا، ص ۱۱۲

۱۴۱۔ سرہندی، یحییٰ بن احمد (اردو ترجمہ)، اردو ترجمہ، محولہ بالا، ص ۱۱۰

۱۴۲۔ بدایونی، ملا عبدالقادر (فارسی)، محولہ بالا، ص ۱۳۱

۱۴۳۔ برنی، ضیاء الدین (فارسی)، ص ۱۰۹

۱۴۴۔ محمود، سید قاسم، ''انسائیکلوپیڈیا پاکستان''، شاہ کاربک فاؤنڈیشن، کراچی، ۱۹۹۸ء، ص ۴۹۶، ۵۰۹

۱۴۵۔ http:// www.distancefrom.com/ distance- from-ravi-river- to- Okara/ Distance History/ 10616933. aspx

http:// www. distancefrom. com/pk/distance-from-multan-to-Depalpur- Pakistan/ DistanceHistory/ 18050239. aspx

۱۴۶۔ سجزی، میر حسن، بحوالہ، یحییٰ بن احمد سرہندی، فارسی، محولہ بالا، ص ۴۵۔۴۶

۱۴۷۔ انصاری، ظ، محولہ بالا، ص ۱۸

۱۴۸۔ معین الحق، سید، مقدمہ، مشمولہ: ''تاریخ فیروز شاہی'' (اردو ترجمہ)، محولہ بالا، ص ۳۱۔۳۲

۱۴۹۔ برنی، ضیاء الدین (فارسی)، محولہ بالا، ص ۳۶۰

۱۵۰۔ برنی، ضیاء الدین (فارسی)، محولہ بالا، ص ۱۰۱؛ و نیز اردو ترجمہ، محولہ بالا، ص ۱۹۰

۱۵۱۔ عصامی، ''فتوح السلاطین'' (فارسی)، مرتبہ: ای۔ ایس۔ یوشع، یونیورسٹی آف مدراس، ۱۹۴۸ء، ص ۱۸۱

۱۵۲۔ فرشتہ، محمد قاسم (اردو ترجمہ) محولہ بالا ص ۳۰۵-۳۰۶

۱۵۳۔ بدایونی، ملا عبدالقادر (فارسی) محولہ بالا ص ۱۵۷

۱۵۴۔ خسرو، امیر، ''دیباچۂ غیر الکمال''، بحوالہ: جیلانی کامران، مشمولہ: ''امیر خسرو کا صوفیانہ مسلک''، جنگ پبلشرز، لاہور، ۱۹۹۲ء، ص ۹۳

۱۵۵۔ فاروقی، نثار احمد، پروفیسر، مقدمہ محولہ بالا ص ۱۶۱

۱۵۶۔ فرید آبادی، سید ہاشمی، ''تاریخ مسلمانانِ پاکستان و بھارت''، جلد اوّل، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی، ۱۹۸۷ء، ص ۲۰۸

۱۵۷۔ برنی، ضیاء الدین اردو ترجمہ) محولہ بالا ص ۱۹۰

۱۵۸۔ فرشتہ، محمد قاسم، محولہ بالا، ص ۳۵؛ مترجم نے سہواً خضر خاں دیولدی لکھا جب کہ درست نام مثنوی خضر خاں دیول رانی ہے۔

۱۵۹۔ تفصیلات کے لیے امیر خسرو کی مثنوی ''خضر خاں دیول رانی'' ملاحظہ کیجیے نیشنل کمیٹی سات سو سالہ تقریبات، استقلال پریس، لاہور، ۱۹۷۵ء، مکمل عکس

۱۶۰۔ اکرام، شیخ محمد، ''آبِ کوثر''، فیروز سنز، لاہور، ۱۹۶۵ء، ص ۱۷۸

۱۶۱۔ برنی، حسن، محولہ بالا ص ۱۴۲

۱۶۲۔ ساجدہ، زینب، ''امیر خسروؔ''، مشمولہ: ''صبا''، حیدر آباد دکن، فروری ۱۹۶۱ء، ص ۱۱

۱۶۳۔ محوی، مسعود علی، محولہ بالا، ص ۳۵

۱۶۴۔ شبلی نعمانی، علامہ، ''شعر العجم''، حصہ دوم، محولہ بالا، ص ۴۷-۵۷

۱۶۵۔ شبلی نعمانی، علامہ، ''حواشی''، مشمولہ: ''شعر العجم''، حصہ دوم، محولہ بالا ص ۴۷

۱۶۶۔ بدایونی، ملا عبدالقادر (فارسی) محولہ بالا ص ۱۳۱۔

۱۶۷۔ ایضاً ص ۱۳۷

۱۶۸۔ مرزا، وحید، ڈاکٹر محولہ بالا ص ۶۵

۱۶۹۔ ملاحظہ کیجیے ''شعر العجم''، حصہ دوم، سرورق کے بعد والا صفحہ

۱۷۰۔ مارہروی، محمد سعید احمد، ''حیاتِ خسروؔ''، اشاعت آگرہ، محولہ بالا، ملاحظہ کیجیے سرورق جس میں واضح طور پر (۱۹۰۳ء) ۱۳۲۱ھ درج ہے۔ جب کہ ''شعر العجم'' کا سن اشاعت ۱۳۲۵ھ (۸-۱۹۰۷ء) ہے۔

۱۷۱۔ ایضاً ص ۳۴

۱۷۲۔ عقیل، معین الدین، ڈاکٹر محولہ بالا ص ۳۷

۱۷۳۔ بدایونی، نظامی، ''قاموس مشاہیر''، جلد اوّل، نظامی پریس، بدایوں، ۱۹۲۴ء، ص ۲۸۳

۱۷۴۔ حسن، ظفر، بی۔ اے۔ ''مقدمہ''، مشمولہ: ''خلاصۃ التواریخ''، از سبحان رائے بھنڈاری، مطبع جی اینڈ سنز، دہلی، ۱۹۱۸ء، ص ج

۱۷۵۔ بھنڈاری، سبحان رائے، ''خلاصۃ التواریخ''، بہ تصحیح ظفر حسن، محولہ بالا ص ۲۰۴

۱۷۶۔ بلگرامی، میر غلام علی آزاد، ''خزانۂ عامرہ''، مطبع نول کشور، کان پور، ۱۹۰۰ء، ص ۲۱۰

۱۷۷۔ قادری، ایوب، ڈاکٹر ''تعارف''، مشمولہ: ''مآثر الکرام''، از میر غلام علی آزاد بلگرامی، مترجم، مولانا شاہ محمد خالد میاں فاخری، دار المصنفین، کراچی، ۱۹۸۳ء، ص ۱۰

۱۷۸۔ بریلوی، شمس، ''مقدمہ''، مشمولہ: ''مآثر الکرام'' (اردو ترجمہ)، محولہ بالا ص ۹۰

۱۷۹۔ قادری، ایوب، ڈاکٹر محولہ بالا ص ۷

۱۸۰۔ عالم، افتخار، منشی، بحوالہ: ''حواشی'' اقبال صلاح الدین، ''دیباچہ''، مشمولہ: ''کلیات غزلیات خسروؔ''، جلد اوّل، مرتبہ اقبال صلاح الدین، پیکجز لمیٹڈ، لاہور، ۱۹۷۲ء، ص ۹۷

۱۸۱۔ صلاح الدین، اقبال، ''حواشی''، مشمولہ: ''دیباچہ'' کلیات غزلیات اقبال، جلد اوّل، محولہ بالا ص ۹۷

۱۸۲۔ عقیل، معین الدین، ڈاکٹر محولہ بالا ص ۳۸

۱۸۳۔ مرزا، وحید، ڈاکٹر محولہ بالا ص ۴۵-۴۶؛ یہاں ملتان سے مراد آب لاہور کا وہ حصہ ہے جہاں امیر خسرو کو گرفتار کیا گیا تھا۔

۱۸۴۔ خسرو، امیر، بحوالہ: ملا عبدالقادر بدایونی، فارسی، محولہ بالا ص ۱۵۴

۱۸۵۔ ایضاً ص ۱۵۳

۱۸۶۔ ایضاً ص ۱۴۸

۱۸۷۔ سجزی، میر حسن، بحوالہ یحییٰ بن احمد سرہندی (اردو ترجمہ) محولہ بالا ص ۱۱۱-۱۱۶

۱۸۸۔ حسینی، ممتاز، پروفیسر محولہ بالا ص ۱۶۸

۱۸۹۔ ذکاء اللہ، مولوی، ''تاریخ ہندوستان''، جلد اوّل، مطبع انسٹی ٹیوٹ، علی گڑھ، ۱۹۱۵ء، ص ۳۹۴۔۳۹۵

۱۹۰۔ عصامی، محولہ بالا، ص ۱۸۱

۱۹۱۔ خسرو، امیر، ''خضر خاں دول رانی''، بحوالہ ڈاکٹر معین الدین عقیل، ص ۳۸۔۳۹

۱۹۲۔ عقیل، معین الدین، ڈاکٹر، محولہ بالا، ص ۳۸

۱۹۳۔ کامران، جیلانی، ڈاکٹر، محولہ بالا، ص ۹۳۔۹۴

۱۹۴۔ عقیل، معین الدین، ڈاکٹر، محولہ بالا، ص ۳۶

۱۹۵۔ خسرو، امیر، ''قصیدہ حکم الحکم''، بحوالہ ڈاکٹر ممتاز حسین، محولہ بالا، ص ۱۶۷؛ و نیز ڈاکٹر معین الدین عقیل، محولہ بالا، ص ۳۶۔۳۷

۱۹۶۔ مرزا، وحید، ڈاکٹر، محولہ بالا، ص ۶۹

۱۹۷۔ عقیل، معین الدین، ڈاکٹر، محولہ بالا، ص ۳۹

۱۹۸۔ شبلی نعمانی، علامہ، ''بیان خسروؔ''، محولہ بالا، ص ۸

۱۹۹۔ خسرو، امیر، بحوالہ ملا عبدالقادر بدایونی (فارسی)، ص ۱۳۸۔۱۳۹

۲۰۰۔ صلاح الدین، اقبال، ''حواشی'' کلیات اقبال، جلد اوّل، محولہ بالا، ص ۸۷

۲۰۱۔ بحوالہ ملا عبدالقادر بدایونی (فارسی)، ص ۱۳۸۔۱۵۴

۲۰۲۔ اظفر، محی الدین، محولہ بالا، ص ۳۹۔۴۱

۲۰۳۔ بحوالہ ضیاء الدین برنی (فارسی)، محولہ بالا، ص ۱۱۰؛ و نیز اردو ترجمہ، محولہ بالا، ص ۱۹۰

۲۰۴۔ خسرو، بہ حوالہ: ڈاکٹر معین الدین عقیل، محولہ بالا، ص ۳۹

۲۰۵۔ انصاری، ظ، محولہ بالا، ص ۳۵

۲۰۶۔ خسرو، بہ حوالہ: ممتاز حسین، محولہ بالا، ص ۱۶۸

۲۰۷۔ عقیل، معین الدین، ڈاکٹر، محولہ بالا، ص ۴۰

۲۰۸۔ خسرو، امیر، بحوالہ ڈاکٹر وحید مرزا، محولہ بالا، ص ۷۰۔۷۱

۲۰۹۔ برنی، سید حسن، محولہ بالا، ص ۱۶۰۔۱۶۱

۲۱۰۔ بہ حوالہ: شیخ سلیم احمد، ص ۵۸

۲۱۱۔ انصاری، ظ، محولہ بالا، ص ۴۳

۲۱۲۔ برنی، ضیاء الدین (اردو ترجمہ)، محولہ بالا، ص ۱۹۰

۲۱۳۔ خسرو، امیر، ''قرآن السعدین''، ص ۶۲، بحوالہ ''وطن اور حب وطن''، از سید صباح الدین عبدالرحمٰن، مشمولہ: ''خسرو نامہ المعروف خسرو شناسی''، مؤلف، ظ انصاری و ابوالفیض سحر، مشتاق بک ڈپو، سن ندارد، ص ۷۶

۲۱۴۔ ایضاً

۲۱۵۔ خسرو، امیر، ''قرآن السعدین''، بہ حوالہ: ''وطن اور حب وطن''، مشمولہ: ''خسرو شناسی''، مرتبین: ظ۔ انصاری، ابوالفیض سحر، نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا، نئی دہلی، ۱۹۷۵ء، ص ۷۶۔۷۷

۲۱۶۔ حبیب، محمد، پروفیسر، محولہ بالا، ص ۱۵

۲۱۷۔ خسرو، امیر، بحوالہ ڈاکٹر وحید مرزا، محولہ بالا، ص ۱۰۰

۲۱۸۔ مرزا، وحید، ڈاکٹر، محولہ بالا، ص ۱۰۰

۲۱۹۔ فرشتہ، محمد قاسم (اردو ترجمہ)، محولہ بالا، ص ۳۹۰۔۳۹۳

۲۲۰۔ خسرو، امیر، بحوالہ ڈاکٹر وحید مرزا، محولہ بالا، ص ۱۰۱

۲۲۱۔ مرزا، وحید، ڈاکٹر، محولہ بالا، ص ۱۰۱

۲۲۲۔ احمد، نذیر، پروفیسر، ''امیر خسرو کے ادبی و شعری کمالات''، مشمولہ: ''شرح کلام امیر خسرو المعروف جہانِ خسروؔ''، مترجم فاروق ارگلی، مشتاق بک ڈپو، لاہور، ۲۰۰۷ء، ص ۱۴۸

۲۲۳۔ کوثر، انعام الحق، ''امیر خسرو کی فارسی شاعری''، مشمولہ: ''ہم سخن''، محولہ بالا، ص ۱۸۵

۲۲۴۔ حسین، ممتاز، محولہ بالا، ص ۱۹۱۔۱۹۴

۲۲۵۔ شبلی نعمانی، مولانا، ''شعر العجم''، حصہ دوم، محولہ بالا، ص ۹۷

۲۲۶۔ عبدالرحمٰن، صباح الدین، سید، ''دیباچہ''، مشمولہ: ''ہندوستان امیر خسرو کی نظر میں''، معارف پریس، اعظم گڑھ، ۱۹۶۶ء، ص ۱

۲۲۷۔ انصاری، سحر، پروفیسر، ''جنگ اور ادب''، مشمولہ: ''تنقیدی افق''، پاکستان اسٹڈی سینٹر، کراچی، ۲۰۱۴ء، ص ۳۹۔۴۰

۲۲۸۔ شبلی نعمانی، مولانا، ''شعر العجم''، حصہ دوم، محولہ بالا، ص ۹۱

۲۲۹۔ عرفی، بحوالہ مولانا شبلی نعمانی، ''شعر العجم''، حصہ دوم، محولہ بالا، ص ۹۱

۲۳۰۔ حافظ، بحوالہ مولانا شبلی نعمانی، ''شعر العجم''، حصہ دوم، محولہ بالا، ص ۹۱

۲۳۱۔ آذری، بحوالہ مولانا شبلی نعمانی، ''شعر العجم''، حصہ دوم، محولہ بالا، ص ۹۱

۲۳۲۔ صدیقی، محمد علی، ڈاکٹر، ''امیر خسرو کا سیاسی و سماجی پس منظر''،

مشمولہ: ''افکار''، امیر خسرو ایڈیشن، نومبر۔دسمبر ۱۹۷۵ء، ص ۲۱۸

۲۳۳۔ شبلی نعمانی، علامہ، بحوالہ سید صباح الدین عبدالرحمٰن، ''دیباچہ''، محولہ بالا، ص ا

۲۳۴۔ خسرو، امیر، بحوالہ حنیف نجمی، ''کلام خسرو میں گریہ''، مشمولہ: ''معارف''، جون ۲۰۰۹ء، ص ۴۵۱

۲۳۵۔ دہلوی، محدث، شیخ، ''اخبار الاخبار''، بحوالہ حنیف نجمی، محولہ بالا، ص ۴۵۱

۲۳۶۔ نجمی، حنیف، ''کلام خسرو میں گریہ''، محولہ بالا، ص ۴۵۱

۲۳۷۔ اکمل، فصیح، ''امیر خسرو: میوزیکل اوپیرا''، ایم۔آر۔پبلی کیشنز، نئی دہلی، ۲۰۱۰ء، ص ۶۔۷

۲۳۸۔ جین، گیان چند، ڈاکٹر، ''کھڑی بولی کے ارتقاء میں امیر خسرو کا حصہ''، مشمولہ: ''شرح کلام امیر خسرو''، مترجم فاروق ارگلی، محولہ بالا، ص ۲۹۲

۲۳۹۔ شیرانی، حافظ محمود، ''پنجاب میں اردو''، مکتبہ معین الادب، لاہور، سن ندارد، طبع چہارم، ص ۱۷۵۔۱۹۳؛ و نیز صفدر آہ، محولہ بالا، ص ۶۶۔۹۶

۲۴۰۔ فتح پوری، ظہیر، ڈاکٹر، ''ہندی میں خسرو کا شعری رویہ''، مشمولہ: ''افکار''، نومبر۔دسمبر ۱۹۵۰ء، محولہ بالا، ص ۱۷۲۔۱۷۳

۲۴۱۔ خسرو، امیر، بحوالہ ڈاکٹر ظہیر فتح پوری، محولہ بالا، ص ۱۷۳

۲۴۲۔ خسرو، امیر، بحوالہ ڈاکٹر وحید مرزا، محولہ بالا، ص ۲۶۷

۲۴۳۔ نارنگ، گوپی چند، ڈاکٹر، ''امیر خسرو کا ہندوی کلام: استناد کا مسئلہ''، محولہ بالا، ص ۲۳۹

۲۴۴۔ سنگھ، انگد، بی۔اے۔ ''امیر خسرو کی ہندی شاعری''، مشمولہ: ''آج کل'' (دہلی)، ۱۵ جون ۱۹۴۳ء، ص ۳۳

۲۴۵۔ جالبی، جمیل، ڈاکٹر، محولہ بالا، ص ۳۴

۲۴۶۔ فاضل، عبدالرشید، پروفیسر، ''مطلع الانوار''، مشمولہ: سہ ماہی ''اردو'' (کراچی)، اکتوبر۔دسمبر ۱۹۷۵ء، ص ۱۰۹

۲۴۷۔ چندر، پروفیسر ستیش، ''عہدِ وسطیٰ کا ہندوستان''، قومی کونسل برائے فروغِ اردو، دہلی، ۲۰۰۳، ص ۷۶۔۷۷

۲۴۸۔ عصامی، ص ۲۱۵

۲۴۹۔ برنی، (اردو)، ص ۳۱۸

۲۵۰۔ اکرام، شیخ محمد، ''آبِ کوثر''، فیروز سنز، لاہور، ۱۹۶۵ء، ص ۱۰۲

۲۵۱۔ فرشتہ، ص ۳۳۶

۲۵۲۔ برنی، ص ۳۲۴

۲۵۳۔ عصامی، ص ۹۰

۲۵۴۔ ایضاً، ص ۲۱۷۔۲۱۸

۲۵۵۔ ایضاً، ص ۲۱۹

۲۵۶۔ صدیقی، پروفیسر علی محسن، ''تاریخ سلاطین تغلق''، قرطاس پبلشرز، کراچی، ۲۰۰۸ء، ص ۹

۲۵۷۔ سرہندی، ص ۱۷۹

۲۵۸۔ صدیقی، پروفیسر علی محسن، ص ۳۲

۲۵۹۔ خسرو، ''تغلق نامہ''، بہ حوالہ ''تاریخ سلاطین تغلق''، ص ۳۲

۲۶۰۔ برنی، ص ۶۴۶

۲۶۱۔ سرہندی، ص ۱۷۹

۲۶۲۔ بخشی، نظام الدین، ''در طبقاتِ اکبری''، بہ حوالہ، ''تاریخِ سلاطین تغلق''، ص ۳۳

۲۶۳۔ ابن بطوطہ، ''الرحلہ''، بہ حوالہ، ''تاریخِ سلاطین تغلق''، ص ۴۰

۲۶۴۔ عصامی، ص ۴۱۹۔۴۲۱

۲۶۵۔ صدیقی، پروفیسر علی محسن، ص ۴۱

۲۶۶۔ بدایونی، ص ۱۲۴

۲۶۷۔ برنی، ص ۶۴۶

۲۶۸۔ صدیقی، پروفیسر علی محسن، ص ۴۰

۲۶۹۔ عفیف، شمس سراج، ''تاریخ فیروز شاہی''، ترجمہ از مولوی محمد فدا علی صاحب طالب، جامعہ عثمانیہ، حیدرآباد دکن، ۱۹۳۸ء، ص ۸۰۔۸۲

۲۷۰۔ فاروقی، محمود احمد، (حواشی)، مشمولہ 'منتخب التواریخ'، محولہ بالا، ص ۱۲۵

۲۷۱۔ صدیقی، پروفیسر علی محسن، ص ۴۱

۲۷۲۔ برنی، ص ۶۴۷

۲۷۳۔ خاقانی، بہ حوالہ برنی، ص ۶۴۷

۲۷۴۔ نامعلوم، بہ حوالہ برنی، ص ۶۴۸

۲۷۵۔ شیروانی، ہارون خان، ''دکن کی بہمینی سلاطین''، مترجم رحم علی الہاشمی، نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا، نئی دہلی، ۱۹۷۸، ص۲۲
۲۷۶۔ جعفر، سیدہ، (جلد اول)، ص۱۲۰
۲۷۷۔ جالبی، (جلد اول)، ص۱۴
۲۷۸۔ جعفر، سیدہ، (جلد اول)، ص۱۲۰
۲۷۹۔ صدیقی، پروفیسر علی محسن، ص۹
۲۸۰۔ فرشتہ، ص۱۳۶
۲۸۱۔ فرید آبادی، ہاشمی، ''تاریخ مسلمانانِ پاکستان و بھارت''، (جلد دوم)، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی، ۱۹۹۳، ص۳۱۲
۲۸۲۔ عصامی، ص۴۴۶
۲۸۳۔ ایضاً
۲۸۴۔ ایضاً، ص۴۴۹
۲۸۵۔ ایضاً
۲۸۶۔ فرید آبادی، ص۳۱۳
۲۸۷۔ عصامی، ص۴۵۰
۲۸۸۔ بدایونی، ص۱۲۸
۲۸۹۔ صدیقی، پروفیسر علی محسن، ص۴۷
۲۹۰۔ برنی، بہ حوالہ ''تاریخ سلاطین تغلق''، ص۴۷
۲۹۱۔ عصامی، ص۴۵۲۔۴۵۹
۲۹۲۔ بدایونی، ص۱۲۸
۲۹۳۔ فرید آبادی، ص۳۱۲
۲۹۴۔ سرہندی، ص۱۸۱۔۱۸۲
۲۹۵۔ صدیقی، پروفیسر علی محسن، ص۴۹۔۵۰
۲۹۶۔ فرید آبادی، ص۳۱۲
۲۹۷۔ صدیقی، پروفیسر علی محسن، ص۵۰۔۵۱
۲۹۸۔ برنی، ص۶۶۲۔۶۶۳
۲۹۹۔ ایضاً، ۶۷۱۔۶۷۲
۳۰۰۔ صدیقی، پروفیسر علی محسن، ص۵۹۔۶۰
۳۰۱۔ بدایونی، ص۱۲۹
۳۰۲۔ صدیقی، پروفیسر علی محسن، ص۶۰۔۶۱
۳۰۳۔ بدایونی، ص۱۳۰
۳۰۴۔ صدیقی، پروفیسر علی محسن، ص۵۶
۳۰۵۔ ایضاً، ص۶۲۔۸۵
۳۰۶۔ اکرام، ص۴۴۳۔۴۴۴
۳۰۷۔ بدایونی، ص۱۷۳۔۲۱۱
۳۰۸۔ فرشتہ، (جلد دوم)، ص۱۵۱
۳۰۹۔ نامعلوم شاعر، بہ حوالہ ''منتخب التواریخ''، ص۲۱۱
۳۱۰۔ بدایونی، ص۲۸۷۔۲۸۸
۳۱۱۔ نامعلوم شاعر، بہ حوالہ ''منتخب التواریخ''، ص۲۸۸
۳۱۲۔ بدایونی، ص۲۸۷
۳۱۳۔ ہاشمی، نصیر الدین، ''قدیم اردو کی رزمیہ مثنویاں''، مشمولہ: ''نقوش''، لاہور، دسمبر ۱۹۵۰، ص۶۰
۳۱۴۔ بنگلوری، محمود خان، ''تاریخ جنوبی ہند''، یونائیٹڈ بک ڈپو، لاہور، ۱۹۴۷، ص۲۳۔۲۸
۳۱۵۔ بلگرامی، مولوی سید علی، ''تاریخ دکن''، (جلد سوم)، مطبع مفیدِ عام، آگرہ، ۱۸۹۷، ص۳۵۰۔۳۵۳
۳۱۶۔ بنگلوری، ص۲۰۴
۳۱۷۔ فرید آبادی، ص۵۰۲
۳۱۸۔ شاستری، کے اے نیل کنٹھ، ''جنوبی ہند کی تاریخ: زمانہِ ماقبل تاریخ سے ودیانگر کے زوال تک''، مترجم آر کے بھٹ ناگر، ترقی اردو بیورو، دہلی، ۱۹۸۰، ص۳۳۶
۳۱۹۔ فرشتہ، (جلد چہارم)، ص۵۹۔۶۰
۳۲۰۔ بنگلوری، ص۲۰۴۔۲۰۸
۳۲۱۔ فرشتہ، (جلد چہارم)، ص۶۱
۳۲۲۔ ذکاء اللہ، (جلد چہارم)، ص۵۵۳
۳۲۳۔ فرشتہ، (جلد چہارم)، ص۶۱
۳۲۴۔ ذکاء اللہ، (جلد چہارم)، ص۵۵۳
۳۲۵۔ فرشتہ، (جلد چہارم)، ص۶۱
۳۲۶۔ ذکاء اللہ، (جلد چہارم)، ص۵۵۳
۳۲۷۔ بنگلوری، ص۲۰۹۔۲۱۰
۳۲۸۔ ذکاء اللہ، (جلد چہارم)، ص۵۵۳
۳۲۹۔ فرشتہ، (جلد چہارم)، ص۶۱

۳۳۰۔ ذکاءاللہ، (جلد چہارم)، ص۵۵۳

۳۳۱۔ بنگلوری، ص۲۱۰

۳۳۲۔ ذکاءاللہ، (جلد چہارم)، ص۵۵۳

۳۳۳۔ فرشتہ، (جلد چہارم)، ص۶۲

۳۳۴۔ ذکاءاللہ، (جلد چہارم)، ص۵۵۳

۳۳۵۔ فرشتہ، (جلد چہارم)، ص۶۲

۳۳۶۔ بنگلوری، ص۲۱۰

۳۳۷۔ برج، بہ حوالہ ''تاریخ جنوبی ہند'' از بنگلوری، ص۲۱۰

۳۳۸۔ بہ حوالہ، ذکاءاللہ، (جلد چہارم)، ص۵۵۳

۳۳۹۔ سہیل، ''تاریخ منظوم سلاطین بہمنیہ''، انجمن ترقی اردو، دہلی، ۱۹۴۱ء، ص۵۴

۳۴۰۔ ذکاءاللہ، (جلد چہارم)، ص۵۵۴

۳۴۱۔ بنگلوری، ص۲۱۰

۳۴۲۔ فرشتہ، (جلد چہارم)، ص۶۳

۳۴۳۔ شیروانی، ہارون خان، ''مختصر تاریخ دکن''، شمس المطابع، مشین پریس، حیدرآباد دکن، ۱۳۴۴ھ، ص۶۸

۳۴۴۔ بنگلوری، ص۲۱۰۔۲۱۱

۳۴۵۔ بلگرامی، سید علی، ''تاریخ دکن'' (جلد سوم)، مطبع مفید عام، آگرہ، ۱۸۹۷ء، ص۴۵۰

۳۴۶۔ فرشتہ، (جلد چہارم)، ص۶۳، ''نے ناکری کوپ'' لکھا ہے۔

۳۴۷۔ ایضاً، ''فرشتہ نے کوپل کندہ پانگل اور دکنوز'' لکھا ہے۔

۳۴۸۔ ذکاءاللہ، (جلد چہارم)، ص۵۵۵

۳۴۹۔ میسور گزیٹیئر، ص۲۰۵۹۔۲۰۶۰، بہ حوالہ ''تاریخ جنوبی ہند'' از بنگلوری ۲۱۲

۳۵۰۔ ذکاءاللہ، (جلد چہارم)، ص۵۵۵

۳۵۱۔ فرشتہ، (جلد چہارم)، ص۶۰

۳۵۲۔ بنگلوری، ص۲۱۳

۳۵۳۔ بلگرامی، (جلد سوم)، ص۴۵۲

۳۵۴۔ ذکاءاللہ، (جلد چہارم)، ص۵۵۵

۳۵۵۔ بلگرامی، (جلد سوم)، ص۴۵۳

۳۵۶۔ فرشتہ، (جلد چہارم)، ص۶۴۔۶۵

۳۵۷۔ احمد، بشیر الدین، ''واقعات مملکت بیجاپور''، مطبع مفید عام، آگرہ، ۱۹۱۵ء، ص۲۸۲

۳۵۸۔ فرشتہ، (جلد چہارم)، ص۶۵

۳۵۹۔ بنگلوری، ص۲۱۵

۳۶۰۔ شاستری، ص۳۴۱

۳۶۱۔ بنگلوری، ص۲۱۳

۳۶۲۔ بہ حوالہ بنگلوری، ص۲۱۵

۳۶۳۔ شاستری، ص۳۴۱

۳۶۴۔ بلگرامی، (جلد سوم)، ص۴۵۴

۳۶۵۔ ذکاءاللہ، (جلد چہارم)، ص۵۵۶

۳۶۶۔ احمد، بشیر الدین، ص۱۱۲

۳۶۷۔ فرشتہ، (جلد چہارم)، ص۶۶

۳۶۸۔ احمد، بشیر الدین، ص۲۸۴

۳۶۹۔ شاستری، ۳۴۲

۳۷۰۔ ہیگ، بہ حوالہ ''تاریخ جنوبی ہند'' از بنگلوری، ص۲۱۷

۳۷۱۔ بنگلوری، ص۲۱۸

۳۷۲۔ احمد، بشیر الدین، ص۲۸۵

۳۷۳۔ بہ حوالہ ''واقعات مملکت بیجاپور''، ص۲۸۵

۳۷۴۔ بہ حوالہ ''تاریخ جنوبی ہند'' از بنگلوری، ص۲۱۷

۳۷۵۔ احمد، بشیر الدین، ص۲۸۷

۳۷۶۔ بنگلوری، ص۲۲۰

۳۷۷۔ احمد، بشیر الدین، ص۲۸۴

۳۷۸۔ بنگلوری، ص۲۲۰

۳۷۹۔ احمد، بشیر الدین، ص۲۸۴

۳۸۰۔ شاستری، ص۳۴۲

۳۸۱۔ بنگلوری، ص۲۲۰

۳۸۲۔ ذکاءاللہ، (جلد چہارم)، ص۵۵۶

۳۸۳۔ شاستری، ص۳۴۲۔۳۴۳

۳۸۴۔ فرشتہ، (جلد چہارم)، ص۶۶

۳۸۵۔ ذکاءاللہ، (جلد چہارم)، ص۵۵۵۔۵۵۶

۳۸۶۔ بلگرامی، (جلد سوم)، ص۴۵۴

۳۸۷۔ سیول، بہ حوالہ ''''جنوبی ہند کی تاریخ: زمانہ ماقبل تاریخ سے ودیا نگر کے زوال تک'' از شاستری، ص۳۴۳
۳۸۸۔ احمد، بشیر الدین، ص۲۱۷
۳۸۹۔ شاستری، ۳۴۵
۳۹۰۔ احمد، بشیر الدین، ص۲۸۹
۳۹۱۔ شاستری، ص۳۴۵
۳۹۲۔ احمد، بشیر الدین، ص۲۸۹۔۲۹۰
۳۹۳۔ فرشتہ، (جلد چہارم)، ص۶۸
۳۹۴۔ احمد، بشیر الدین، ص۲۹۰
۳۹۵۔ فرشتہ، (جلد چہارم)، ص۶۹
۳۹۶۔ بلگرامی، ص۴۵۷۔۴۵۸
۳۹۷۔ فرشتہ، (جلد چہارم)، ص۹
۳۹۸۔ احمد، بشیر الدین، ص۲۹۱
۳۹۹۔ فرشتہ، (جلد چہارم)، ص۶۹
۴۰۰۔ احمد، بشیر الدین، ص۲۹۱۔۲۹۲
۴۰۱۔ ذکاءاللہ، (جلد چہارم)، ص۲۵۰
۴۰۲۔ احمد، بشیر الدین، ص۲۹۲۔۲۹۳
۴۰۳۔ ذکاءاللہ، (جلد چہارم)، ص۵۵۷
۴۰۴۔ میسور گزیٹیر، ص۱۷۰۲، بہ حوالہ ''تاریخ جنوبی ہند'' از بنگلوری، ص۲۲۵
۴۰۵۔ شاستری، س۳۴۳
۴۰۶۔ بنگلوری، ص۲۲۶
۴۰۷۔ ذکاءاللہ، (جلد چہارم)، ص۵۵۸
۴۰۸۔ بنگلوری، ص۲۲۶
۴۰۹۔ بہ حوالہ ''واقعات مملکت بیجاپور''، محولہ بالا، ص۲۹۳
۴۱۰۔ جالبی، ڈاکٹر جمیل، (مقدمہ)، مشمولہ ''دیوان حسن شوقی''، مرتبہ ڈاکٹر جمیل جالبی، انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۷۱، ص۲۱
۴۱۱۔ بلگرامی، ص۴۵۸۔۴۶۰
۴۱۲۔ بنگلوری، ص۲۲۶
۴۱۳۔ ذکاءاللہ، (جلد چہارم)، ص۵۵۸
۴۱۴۔ ہیگ، بہ حوالہ ''تاریخ جنوبی ہند''، محولہ بالا، ص۲۲۲
۴۱۵۔ بلگرامی، ص۴۶۱
۴۱۶۔ بنگلوری، ص۲۲۲
۴۱۷۔ ذکاءاللہ، (جلد چہارم)، ص۵۵۷
۴۱۸۔ فرشتہ، (جلد چہارم)، ص۷۰
۴۱۹۔ بہ حوالہ ''تاریخ جنوبی ہند''، محولہ بالا، ص۲۲۸
۴۲۰۔ فرشتہ، (جلد چہا،رم)، ص۷۰
۴۲۱۔ ہجر و ملک، محمد غلام امام خان ترین، ''تاریخ رشید الدین خانی''، خورشید پریس، حیدرآباد دکن، ۱۲۸۲ھ، ص۲۰۸
۴۲۲۔ احمد، بشیر الدین، ص۲۹۴
۴۲۳۔ بنگلوری، ص۲۲۷۔۲۲۸
۴۲۴۔ شاستری، ص۳۴۳
۴۲۵۔ فرشتہ، (جلد چہارم)، ص۷۰
۴۲۶۔ بہ حوالہ ''واقعات مملکت بیجاپور''، محولہ بالا، ص۲۹۳
۴۲۷۔ احمد، بشیر الدین، ص۲۹۴
۴۲۸۔ شاستری، س۳۴۳
۴۲۹۔ احمد، بشیر الدین، ص۲۹۶
۴۳۰۔ شاستری، س۳۴۳
۴۳۱۔ بہ حوالہ ''واقعات مملکت بیجاپور''، محولہ بالا، ص۲۹۷
۴۳۲۔ فریڈرک، سیزر، بہ حوالہ ذکاءاللہ، (جلد چہارم)، ص۵۵۸
۴۳۳۔ احمد، بشیر الدین، ص۲۹۶
۴۳۴۔ بنگلوری، ص۲۳۴۔۲۳۵
۴۳۵۔ ذوالفقار، ص۱۳۰
۴۳۶۔ احمد، بشیر الدین، ص۲۹۶
۴۳۷۔ بنگلوری، ص۲۳۸
۴۳۸۔ سیول، بہ حوالہ ''تاریخ جنوبی ہند''، محولہ بالا، ص۲۳۶
۴۳۹۔ ذکاءاللہ، (جلد چہارم)، ص۵۵۷
۴۴۰۔ ذوالفقار، ص۱۳۰
۴۴۱۔ ذکاءاللہ، (جلد چہارم)، ص۵۵۸
۴۴۲۔ سروری، عبدالقادر، ''دکن میں اردو مثنوی کا ارتقا''، صفیہ اکیڈمی، کراچی، ۱۹۶۶، ص۱۳۷
۴۴۳۔ ہاشمی، نصیر الدین، ''دکن میں اردو، نظام دکن پریس، حیدرآباد

دکن، ۱۹۳۹، ص۱۹۹۔۱۲۰

۴۴۴۔ امجد، ڈاکٹر ساجد ''اردو شاعری پر برصغیر کے تہذیبی اثرات''، الوقار پبلی کیشنز لاہور، طبع دوم، ص۱۲۹

۴۴۵۔ احمد، بشیر الدین، ص۲۸۷

۴۴۶۔ جالبی، ''دیوانِ حسن شوقی''، محولہ بالا ص۶۹

۴۴۷۔ جالبی، ''تاریخ ادب اردو''، (جلد اول) ص۲۸۱

۴۴۸۔ جالبی، ''دیوانِ حسن شوقی''، ص۴

۴۴۹۔ ابن نشاطی، بہ حوالہ ''قدیم اردو'' از مولوی عبدالحق، مشمولہ، سہ ماہی اردو، جولائی ۱۹۲۹، ص۵۴۰

۴۵۰۔ بیجاپوری، سید اعظم، بہ حوالہ ''دیوان حسن شوقی''، محولہ بالا ص۴

۴۵۱۔ نصرتی، بہ حوالہ ''دیوان حسن شوقی''، محولہ بالا ص۴

۴۵۲۔ عبدالحق، مولوی، ''قدیم اردو''، محولہ بالا ص۵۴۱

۴۵۳۔ ایضاً

۴۵۴۔ شوقی، حسن، ''دیوان حسن شوقی''، محولہ بالا ص۱۱۸

۴۵۵۔ عبدالحق، مولوی، ''قدیم اردو''، ص۵۴۱۔۵۴۲

۴۵۶۔ جالبی، ''تاریخ ادب اردو''، (جلد اول) ص۲۸۱

۴۵۷۔ جالبی، ''دیوان حسن شوقی''، محولہ بالا ص۱۰۔۱۱

۴۵۸۔ جالبی، ''تاریخ ادب اردو''، (جلد اول) ص۲۸۱

۴۵۹۔ عبدالحق، مولوی، ''قدیم اردو''، ص۵۴۲

۴۶۰۔ جعفر، سیدہ، (جلد دوم) محولہ بالا ص۵۱۸

۴۶۱۔ شوقی، ص۷۱

۴۶۲۔ عبدالحق، مولوی، ''قدیم اردو''، ص۵۳۳

۴۶۳۔ جعفر، سیدہ، (جلد دوم) ص۵۲۱

۴۶۴۔ شوقی، ص۱۱۶

۴۶۵۔ ذوالفقار، ص۱۳۱

۴۶۶۔ شوقی، ص۷۴۔۷۵

۴۶۷۔ جالبی، ''دیوان حسن شوقی''، محولہ بالا ص۱۶

۴۶۸۔ ذوالفقار، ص۱۳۲

۴۶۹۔ شوقی، ص۷۶۔۷۷

۴۷۰۔ عبدالحق، مولوی، ''قدیم اردو''، ص۵۴۶

۴۷۱۔ شوقی، ص۷۷۔۷۸

۴۷۲۔ جالبی، ''تاریخ ادب اردو''، (جلد اول) ص۲۸۳

۴۷۳۔ شوقی، ص۸۱

۴۷۴۔ جالبی، ''تاریخ ادب اردو''، (جلد اول) ص۲۸۲

۴۷۵۔ ایضاً، ص۲۸۳

۴۷۶۔ شوقی، ص۸۲۔۸۵

۴۷۷۔ ایضاً، ص۸۳

۴۷۸۔ ایضاً، ص۱۰۰

۴۷۹۔ ایضاً، ص۸۲

۴۸۰۔ عبدالحق، مولوی، ''قدیم اردو''، محولہ بالا ص۵۴۸

۴۸۱۔ شوقی، ص۸۷

۴۸۲۔ ایضاً

۴۸۳۔ عبدالحق، مولوی، ''قدیم اردو''، ص۵۴۸

۴۸۴۔ ذوالفقار، ص۱۳۲۔۱۳۳

۴۸۵۔ شوقی، ص۹۰

۴۸۶۔ ایضاً، ص۹۳

۴۸۷۔ ایضاً، ص۹۶

۴۸۸۔ عبدالحق، مولوی، ''قدیم اردو''، ص۵۴۹۔۵۵۰

۴۸۹۔ شوقی، ص۹۶

۴۹۰۔ ایضاً

۴۹۱۔ عبدالحق، مولوی، ''قدیم اردو''، ص۵۵۰

۴۹۲۔ شوقی، ص۱۰۰

۴۹۳۔ ایضاً، ص۱۰۲

۴۹۴۔ ایضاً

۴۹۵۔ ایضاً، ص۱۰۳

۴۹۶۔ ایضاً، ص۱۰۵

۴۹۷۔ ایضاً، ص۱۰۶۔۱۰۸

۴۹۸۔ ایضاً، ص۱۱۰

۴۹۹۔ جالبی، ''دیوان حسن شوقی''، ص۲۱

۵۰۰۔ قیوم، ڈاکٹر صادق، ''بیجاپور کی اردو مثنویاں''، مرہٹ وار ادبی سرکل، مہاراشٹرا، ۱۹۸۰، ص۱۰۹

۵۰۱۔ ذوالفقار، ص۱۳۳

۵۰۲۔ احمد، بشیر الدین، ص ۲۸۷۔۲۸۸
۵۰۳۔ عبدالحق، مولوی، ''قدیم اردو''، ص ۵۵۲
۵۰۴۔ ذوالفقار، ۱۳۳
۵۰۵۔ شریف، ڈاکٹر محمد جمال، ''دکن میں اردو شاعری: ولی سے پہلے''، ادارہ ادبیات اردو، حیدرآباد، ۲۰۰۴، ص ۴۶۲
۵۰۶۔ مجمدار، آر سی، ''دی مغل ایمپائر''، بہ حوالہ سیدہ جعفر، (جلد دوم)، ص ۵۲۱
۵۰۷۔ جعفر، سیدہ، (جلد دوم)، ص ۵۲۲
۵۰۸۔ جالبی، ''تاریخ ادب اردو''، (جلد اول)، ص ۲۸۴
۵۰۹۔ جعفر، سیدہ، (جلد دوم)، ص ۵۲۲
۵۱۰۔ جالبی، ''تاریخ ادب اردو''، (جلد اول)، ص ۲۸۴
۵۱۱۔ ایضاً، ص ۲۸۵۔۲۸۶
۵۱۲۔ ایضاً، ۲۸۶
۵۱۳۔ عقیل، ڈاکٹر معین الدین، ''تحریک آزادی میں اردو کا حصہ''، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۲۰۰۸، ص ۱۹
۵۱۴۔ ہاشمی، ''قدیم اردو کی رزمیہ مثنویاں''، محولہ بالا، ص ۵۹
۵۱۵۔ رضوی، میر سعادت علی، (مقدمہ)، مشمولہ ''طوطی نامہ'' از غواصی، مرتبہ مصنف مذکور، مجلس اشاعت دکنی مخطوطات، حیدر آباد دکن، ۱۳۵۷ھ، ص ۱۴
۵۱۶۔ غواصی، ''سیف الملوک بدیع الجمال''، مرتبہ میر سعادت علی رضوی، مجلس اشاعت دکنی مخطوطات، حیدرآباد دکن، ۱۳۵۷، ص ۱۶۰
۵۱۷۔ ایضاً، ص ۵۹
۵۱۸۔ شریف، ص ۳۱۰۔۳۱۱؛ اشعار یہاں ملاحظہ کیے جاسکتے ہیں۔
۵۱۹۔ زکریا، ڈاکٹر خواجہ محمد، ''اردو میں قطعہ نگاری''، منیب بک ڈپو، لاہور، ۱۹۷۷، ص ۲۱
۵۲۰۔ غواصی، بہ حوالہ ''اردو قطب شاہی دور میں'' از ڈاکٹر محی الدین قادری زور، مشمولہ ''علی گڑھ تاریخ ادب اردو'' (جلد اول)، مسلم یونی ورسٹی پریس، علی گڑھ، ۱۹۶۲، ص ۳۹۱
۵۲۱۔ قادری، شمس اللہ، ''اردوے قدیم''، تاج پریس، حیدرآباد دکن، ۱۸۸۹، ص ۶۸
۵۲۲۔ شریف، ص ۴۷۴
۵۲۳۔ جعفر، سیدہ، (جلد چہارم)، محولہ بالا، ص ۴۸۔۴۹
۵۲۴۔ ابن نشاطی، بہ حوالہ ''تاریخ ادب اردو'' (جلد چہارم)، محولہ بالا، ص ۴۹
۵۲۵۔ ایضاً
۵۲۶۔ جعفر، سیدہ، (جلد چہارم)، محولہ بالا، ص ۴۹
۵۲۷۔ زور، محی الدین قادری، ''دکنی ادب کی تاریخ''، اردو اکیڈمی سندھ، کراچی، ۱۹۶۹، ص ۸۷
۵۲۸۔ جالبی، (جلد اول)، ص ۴۶۶
۵۲۹۔ شاہ، عبداللہ قطب، بہ حوالہ ''تاریخ ادب اردو''، (جلد اول)، محولہ بالا، ص ۴۶۶
۵۳۰۔ جعفر، سیدہ، (جلد سوم) محولہ بالا، ص ۴۲۸
۵۳۱۔ محمد، سید، (مقدمہ)، مشمولہ ''دیوان عبداللہ قطب شاہ''، مرتبہ مصنف مذکور، مکتبہ ابراہیمیہ، ۱۹۵۹، ص ۷
۵۳۲۔ صدیقی، عبدالمجید، ''تاریخ گولکنڈہ''، اعجاز پرنٹنگ پریس، حیدرآباد دکن، ۱۹۶۴، ص ۱۷۷
۵۳۳۔ جعفر، سیدہ، (جلد سوم) محولہ بالا، ص ۴۳۱
۵۳۴۔ غواصی، ''سیف الملوک بدیع الجمال''، محولہ بالا، ص ۱۸۷
۵۳۵۔ شاستری، ص ۳۶۷
۵۳۶۔ عمر، ڈاکٹر محمد، ''اٹھارویں صدی میں ہندوستانی معاشرت: میر کا عہد''، شعبہ تاریخ، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی، ۱۹۷۳، ص ۳۵۱۔۳۵۵
۵۳۷۔ سید، محمد حفیظ، ''بحری کے عہد کی تاریخ''، مشمولہ ''کلیاتِ بحری''، مرتبہ، مصنف مذکور، نول کشور، لکھنو، س ن، ص ۱۶
۵۳۸۔ جعفر، سیدہ، (جلد سوم) محولہ بالا، ص ۳۹۴
۵۳۹۔ اثر، محمد علی، ''غواصی شخصیت اور فن''، اردو اکیڈمی آندھرا پردیش، حیدرآباد، ۱۹۷۷، ص ۴۲
۵۴۰۔ غواصی، بہ حوالہ ''غواصی شخصیت اور فن'' از محمد علی اثر، اردو اکیڈمی آندھر پردیش، حیدرآباد، ۱۹۷۷، ص ۴۲۔۴۳
۵۴۱۔ جعفر، سیدہ، (جلد سوم) محولہ بالا، ص ۳۹۶
۵۴۲۔ غواصی، مشمولہ ''غواصی شخصیت اور فن'' از محمد علی اثر محولہ بالا، ص

۴۳

۵۴۳۔ جالبی، (جلد اول) محولہ بالا ص ۵۰۶

۵۴۴۔ غواصی، مشمولہ ''اردو شاعری پر برصغیر پر تہذیبی اثرات'' محولہ بالا ص ۲۱۰

۵۴۵۔ وجہی، ملا، مشمولہ: ''دکن میں اردو شاعری: ولی سے پہلے''، محولہ بالا ص ۲۴۳

۵۴۶۔ محمود، مشمولہ: ''تاریخ ادب اردو'' از سیدہ جعفر، (جلد دوم)، ص ۱۳۳

۵۴۷۔ جانم، برہان الدین، مشمولہ ''تاریخ ادب اردو'' از سیدہ جعفر، (جلد دوم) ص ۱۸۲

۵۴۸۔ گجراتی، امین، مشمولہ ''تاریخ ادب اردو'' از ڈاکٹر جمیل جالبی، (جلد اول) محولہ بالا ص ۱۴۱

۵۴۹۔ جعفر، سیدہ، (جلد سوم) محولہ بالا ص ۱۷۶

۵۵۰۔ ہاشمی، مشمولہ ''تاریخ ادب اردو'' از سیدہ جعفر، جلد (سوم)، ص ۱۷۶

۵۵۱۔ سید، محمد حفیظ، محولہ بالا ص ۱۶۔۱۷

۵۵۲۔ محمد، سید، محولہ بالا ص ۱۴

۵۵۳۔ سید، محمد حفیظ، محولہ بالا ص ۱۷

۵۵۴۔ شاہ، عبداللہ قطب، بہ حوالہ ''دکن میں اردو شاعری: ولی سے پہلے''، محولہ بالا ص ۳۲۳

۵۵۵۔ خوشنود، ملک، مشمولہ، ''اردو شہ پارے''، مکتبہ ابراہیمیہ، حیدرآباد دکن، ۱۹۲۹، ص ۲۰۳

۵۵۶۔ مقیمی، بہ حوالہ ''دکن میں اردو شاعری: ولی سے پہلے''، محولہ بالا، ص ۳۶۴

۵۵۷۔ ایضاً

۵۵۸۔ سلطان، مشمولہ ''اردو شہ پارے''، محولہ بالا ص ۲۲۶

۵۵۹۔ جعفر، سیدہ، (جلد سوم)، ص ۲۲۴۔۲۲۵

۵۶۰۔ گجراتی، احمد، مشمولہ ''تاریخ ادب اردو'' از جمیل جالبی، (جلد اول)، ص ۴۲۵

۵۶۱۔ جعفر، سیدہ، (جلد سوم)، ص ۲۲۴۔۲۲۵

۵۶۲۔ گجراتی، مشمولہ ''تاریخ ادب اردو'' از جمیل جالبی، (جلد اول)، ص ۴۲۵۔۴۲۶

۵۶۳۔ جالبی، (جلد اول)، ص ۴۲۸

۵۶۴۔ گجراتی، مشمولہ ''تاریخ ادب اردو'' از جمیل جالبی، (جلد اول)، ص ۲۲۸۔۲۲۹

۵۶۵۔ مرزا، محمد سخاوت، (مقدمہ)، مشمولہ ''من لگن'' از قاضی محمود بحری، مرتبہ مصنف مذکور، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی، ۱۹۵۵، ص ۲۲

۵۶۶۔ بحری، قاضی محمود، ''دعا نامہ مثنوی فارسی بہ نام سکندر عادل شاہ''، (قلمی)، بہ حوالہ ''من لگن'' مقدمہ، ص ۲۲

۵۶۷۔ بحری، قاضی محمود، ''کلیات بحری''، مرتبہ محمد حفیظ سید، نول کشور، س ن، ص ۱۸۸

۵۶۸۔ سید، محمد حفیظ، محولہ بالا ص ۵۷

۵۶۹۔ بحری، قاضی محمود، ''من لگن''، محولہ بالا ص ۲۴

۵۷۰۔ سید، محمد حفیظ، محولہ بالا ص ۵۷

۵۷۱۔ مرزا، ص ۵۰

۵۷۲۔ بحری، قاضی محمود، ''من لگن''، محولہ بالا ص ۵۰

۵۷۳۔ ایضاً ص ۲۶۔۳۱

۵۷۴۔ ہاشمی، نصیرالدین، ''دکن میں اردو''، محولہ بالا ص ۲۶۱

۵۷۵۔ ذوقی، سید شاہ حسین، بہ حوالہ محمد حفیظ سید، محولہ بالا ص ۳۰

۵۷۶۔ زور، بہ حوالہ ''دکن میں اردو شاعری: ولی سے پہلے''، محولہ بالا ص ۵۶۹

۵۷۷۔ رحمتی، علی، بہ حوالہ ''دکن میں اردو شاعری: ولی سے پہلے''، محولہ بالا ص ۵۷۲

۵۷۸۔ جالبی، (جلد اول)، ص ۳۹

۵۷۹۔ وجہی، بہ حوالہ ''اردو شہ پارے''، محولہ بالا ص ۹۸

۵۸۰۔ فرشتہ، (جلد دوم)، ص ۲۱

۵۸۱۔ بدایونی، (حواشی) ''منتخب التواریخ''، محولہ بالا ص ۱۳۴

۵۸۲۔ فرشتہ، (جلد دوم)، ص ۲۳

۵۸۳۔ بدایونی، (حواشی) ''منتخب التواریخ''، محولہ بالا ص ۱۳۵

۵۸۴۔ سرہندی، یحییٰ بن احمد، ''تاریخ مبارک شاہی'' (فارسی)، بہ حوالہ ''منتخب التواریخ''، ص ۱۳۵

۵۸۵۔ ابن بطوطہ، بہ حوالہ ''منتخب التواریخ''، ص۱۳۴

۵۸۶۔ برنی، بہ حوالہ ''منتخب التواریخ''، ص۱۳۴

۵۸۷۔ فرشتہ، (جلد دوم)، ص۲۳

۵۸۸۔ ابن بطوطہ، بہ حوالہ ''منتخب التواریخ''، ص۱۳۶

۵۸۹۔ راؤ، مانک راؤ وٹھل، ''بستانِ آصفیہ''، (حصہ اول)، مطبع انوارالاسلام، حیدرآباد دکن، ۱۳۲۷، ص۸۰۱

۵۹۰۔ فرشتہ، (جلد سوم)، ص۱۹۲

۵۹۱۔ بلگرامی، ''تاریخ دکن''، (جلد سوم)، مفید عام پریس آگرہ، ۱۹۰۳، ص۲۰۴

۵۹۲۔ فرشتہ، (جلد دوم)، ص۱۹۳

۵۹۳۔ بلگرامی، (جلد سوم)، ص۲۰۴

۵۹۴۔ فرشتہ، (جلد دوم)، ص۱۹۴

۵۹۵۔ بلگرامی، (جلد دوم)، ص۲۰۴

۵۹۶۔ سہیل، ص۹۰

۵۹۷۔ بلگرامی، (جلد سوم)، ص۲۰۴

۵۹۸۔ احمد، بشیرالدین، محولہ بالا، ص۱۵۲

۵۹۹۔ سہیل، محولہ بالا، ص۹۰

۶۰۰۔ فرشتہ، (جلد چہارم)، ص۴۳۳۔۴۴۴

۶۰۱۔ بلگرامی، (جلد ہشتم)، ص۱۰۲

۶۰۲۔ راؤ، محولہ بالا، ص۸۰۱

۶۰۳۔ بلگرامی، (جلد ہشتم)، ص۱۰۳

۶۰۴۔ راؤ، محولہ بالا، ص۸۰۱۔۸۰۲

۶۰۵۔ بلگرامی، (جلد ہشتم)، ص۱۰۲

۶۰۶۔ راؤ، محولہ بالا، ص۸۰۲

۶۰۷۔ بلگرامی، (جلد ہشتم)، ص۱۰۴۔۱۰۵

۶۰۸۔ بہ حوالہ، بلگرامی، (جلد ہشتم)، ص۱۰۵

۶۰۹۔ بلگرامی، (جلد ہشتم)، ص۱۰۵۔۱۰۶

۶۱۰۔ بہ حوالہ، بلگرامی (جلد ہشتم)، ص۱۰۶

۶۱۱۔ راؤ، محولہ بالا، ص۸۰۲۔۸۰۳

۶۱۲۔ محمودالرحمٰن، محولہ بالا، ص۱۱

۶۱۳۔ بان، ڈاکٹر گستان، ''تمدنِ ہند''، مترجم سید علی بلگرامی، مقبول اکیڈمی، لاہور، ۱۹۶۲، ص۲

۶۱۴۔ دانی، ڈاکٹر اے ایچ، ''اے شورٹ ہسٹری آف پاکستان''، (جلد اول)، شعبہ تصنیف و تالیف، جامعہ کراچی، کراچی، ۱۹۶۷، ص۸۵

۶۱۵۔ ویچ، ڈبلیو این، ''ہسٹری آف دی ورلڈ''، ادھم پریس لمیٹڈ، لندن، ۱۹۶۱، ص۱۲۸

۶۱۶۔ محمودالرحمٰن، محولہ بالا، ص۲۱

۶۱۷۔ واٹسن، فرانسس، ''اے کنسائز ہسٹری آف ماڈرن انڈیا''، تھامس اینڈ ہڈسن، لندن، ۱۹۷۴، ص۱۷

۶۱۸۔ دانی، محولہ بالا، ص۱۵۱

۶۱۹۔ بہ حوالہ ''شورٹ ہسٹری آف انڈیا۔ پاکستان''، مشمولہ: پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی، کراچی، ۱۹۶۳، ص۷۰

۶۲۰۔ محمودالرحمٰن، محولہ بالا، ص۱۳

۶۲۱۔ بان، گستاؤلی، محولہ بالا، ص۲

۶۲۲۔ محمودالرحمٰن، ص۳

۶۲۳۔ واٹسن، محولہ بالا، ص۸۸

۶۲۴۔ ترابی، رشید،

۶۲۵۔ بابر، ظہیرالدین، ''تزک بابری''، مترجم مرزا نصیرالدین حیدر، کراچی، محمڈن پرنٹنگ ورکس، دہلی، ۱۹۲۴، ص۳۱۹

۶۲۶۔ ایضاً، ص۳۴۳

۶۲۷۔ ہاشمی، انوار، ''تاریخ پاک و ہند''، ادارہ ثقافتِ پاکستان، کراچی، ۱۹۷۴، ص۳۶؛ عطا شاہ کاکوی نے اس شعر کو سعداللہ خان سے منسوب کیا ہے۔

۶۲۸۔ چندر، پروفیسر ستیش، ''عہدِ وسطٰی کا ہندوستان: سلطنت سے مغل عہد تک''، قومی کونسل برائے فروغِ اردو، دہلی، ۲۰۰۳، ص۱۷۰

۶۲۹۔ احمد، بشیرالدین، محولہ بالا، ص۳۱۔۳۲

۶۳۰۔ چندر، محولہ بالا، ص۱۷۲۔۱۷۴

۶۳۱۔ بدر، شکیب، ''حیدرآباد کا عروج و زوال''، عثمانیہ اکیڈمی کراچی، ۱۹۶۴، ص۲۳

۶۳۲۔ جین، گیان چند، ''اردو مثنوی شمالی ہند میں''، (جلد اول)، انجمن ترقی اردو ہند، دہلی، ۱۹۸۷، ص۱۲۰

۶۳۳۔ سید،محمد حفیظ،محولہ بالا،ص ۱۷
۶۳۴۔ عمر،ڈاکٹر محمد،محولہ بالا،ص ۱
۶۳۵۔ بحری،''کلیات بحری''،محولہ بالا،ص ۲۲۵
۶۳۶۔ زور،ڈاکٹر محی الدین قادری،''دکنی ادب کی تاریخ''،اردو اکیڈمی سندھ،کراچی،۱۹۶۰ء،ص ۸۷۔۸۸
۶۳۷۔ بہ حوالہ،''تاریخ ادب اردو''، از سیدہ جعفر، (جلد چہارم) محولہ بالا،ص ۱۵۹
۶۳۸۔ خان، خافی، ''منتخب اللباب''، (جلد دوم)، نفیس اکیڈمی، کراچی،۱۹۶۸ء،ص ۳۴۲
۶۳۹۔ جوہر، غلام حسین خان،''ماہ نامہ'' (قلمی)، بہ حوالہ سیدہ جعفر، (جلد چہارم) محولہ بالا،ص ۱۵۹
۶۴۰۔ محسن، سید علی،''زوالِ دولت قطب شاہیہ''، بہ حوالہ، سید جعفر، (جلد چہارم) محولہ بالا،ص ۱۵۹
۶۴۱۔ صدیقی،عبدالمجید،محولہ بالا،ص ۲۴۶
۶۴۲۔ چوہدری، جے این،''دی مغل ایمپائر''، بہ حوالہ، سید جعفر (جلد چہارم) محولہ بالا،ص ۱۵۸
۶۴۳۔ طبعی، بہ حوالہ،سیدہ جعفر، (جلد چہارم)،ص ۱۵۸۔۱۵۹
۶۴۴۔ جعفر،سیدہ، (جلد چہارم) محولہ بالا،ص ۱۶۰
۶۴۵۔ زور،سید محی الدین قادری،''گولگنڈہ کی قطب شاہی سلطنت''، مشمولہ ''سب رس''،حیدرآباد دکن،۱۹۳۹ء،ص ۱۰
۶۴۶۔ میکش اکبرآبادی، سید محمد علی شاہ،''گولگنڈہ کے سرفروش''، مشمولہ ''سب رس''، (میکش نمبر)، مارچ ۱۹۴۸ء،ص ۱۳۵
۶۴۷۔ صدیقی،عبدالمجید،محولہ بالا،ص ۲۳۹
۶۴۸۔ محبّ، بہ حوالہ ''دکنی ادب کی تاریخ''،محولہ بالا،ص ۹۵
۶۴۹۔ زور،محی الدین قادری،''دکنی ادب کی تاریخ''،ص ۸۹۔۹۶
۶۵۰۔ میکش اکبرآبادی،محولہ بالا،ص ۱۴۷
۶۵۱۔ ایضاً،ص ۱۴۷۔۱۴۸
۶۵۲۔ بہ حوالہ،سیدہ جعفر، (جلد سوم) محولہ بالا،ص ۱۶۵
۶۵۳۔ میکش اکبرآبادی،''وداع شاہ''، مشمولہ: سب رس، (میکش نمبر) محولہ بالا،ص ۱۳۸
۶۵۴۔ جعفر،سیدہ، (جلد سوم) محولہ بالا،ص ۱۶۵
۶۵۵۔ میکش آکبرآبادی،محولہ بالا،ص ۱۴۹
۶۵۶۔ ایضاً،ص ۱۵۰۔۱۵۱
۶۵۷۔ جعفر،سیدہ، (جلد سوم)،ص ۱۶۶
۶۵۸۔ وجد، سکندر علی،''چینی محل کا قیدی''، بہ حوالہ، سید جعفر، (جلد سوم)،ص ۱۶۶
۶۵۹۔ میکش اکبرآبادی،''خدا بندے سے تانا شاہ کی آخری گفتگو''، مشمولہ، سب رس، (میکش نمبر) محولہ بالا،ص ۱۳۶۔۱۳۷
۶۶۰۔ عالی،نعمت خان، بہ حوالہ سید جعفر، (جلد دوم)،ص ۳۷
۶۶۱۔ میکش اکبرآبادی،''حسین سا گر ایک غم گین صبح''، مشمولہ: سب رس،حیدرآباد دکن، جون ۱۹۶۴ء،ص ۱۳۴
۶۶۲۔ فریدآبادی، (جلد اول) محولہ بالا،۵۶۲
۶۶۳۔ جالبی، (جلد اول) محولہ بالا،ص ۶۶۳
۶۶۴۔ صادق،ڈاکٹر قیوم،''بیجاپوری کی اردو مثنویاں''،مرہٹ وارا ادبی سرکل،مہاراشٹر،۱۹۸۰ء،ص ۱۱۸
۶۶۵۔ زور،''دکنی ادب کی تاریخ''،محولہ بالا،ص ۱۰۱
۶۶۶۔ بیجاپوری شغلی، بہ حوالہ،''دکن میں اردو شاعری: ولی سے پہلے''، محولہ بالا،ص ۶۳۰
۶۶۷۔ زور،''دکنی ادب کی تاریخ''،محولہ بالا،ص ۱۴۲
۶۶۸۔ لاری،عبدالرزاق، بہ حوالہ،''دکنی ادب کی تاریخ''، محولہ بالا،ص ۱۰۲
۶۶۹۔ زور،''دکنی ادب کی تاریخ''،محولہ بالا،ص ۱۰۴۔۱۰۵
۶۷۰۔ روحی، پیرزادہ، بہ حوالہ ''دکنی ادب کی تاریخ''،محولہ بالا، ۱۰۵
۶۷۱۔ زور،''دکنی ادب کی تاریخ''،محولہ بالا،ص ۱۰۵
۶۷۲۔ روحی، پیرزادہ،محولہ بالا،ص ۱۰۳
۶۷۳۔ طبعی، مشمولہ ''دکن میں اردو شاعری: ولی سے پہلے''، محولہ بالا،ص ۶۲۰
۶۷۴۔ زور،''دکنی ادب کی تاریخ''،محولہ بالا،ص ۱۱۲
۶۷۵۔ قادر، شاہ عبدالرحمٰن،''باغِ حسینی''، مشمولہ: ''دکنی ادب کی تاریخ''،محولہ بالا،ص ۱۱۳۔۱۱۴
۶۷۶۔ ایضاً،ص ۱۱۴
۶۷۷۔ بشیرالنسا،بیگم محترمہ،''دکن کے فن کار سے'' (نظم)، مشمولہ: سب

رس، حیدرآباد دکن، جنوری ۱۹۴۰ء، ص ۸۸

۶۷۸۔ صدیقی، شاہد، ''حیدرآباد''، (نظم)، مشمولہ: سب رس، حیدرآباد دکن، ستمبر ۱۹۴۳ء، ص ۲۸

۶۷۹۔ محوی، مسعود علی، ''ترجیع بند''، مشمولہ: سب رس، حیدرآباد دکن، جولائی ۱۹۹۵ء، ص ۴۰

۶۸۰۔ نقوی، صادق، ''تاریخ حیدرآباد''، (نظم)، مشمولہ: سب رس، حیدرآباد دکن، ستمبر۔اکتوبر ۱۹۸۳ء، ص ۵۰

۶۸۱۔ کاشمیری، حامدی، ''غزل''، مشمولہ: سب رس، حیدرآباد دکن، اکتوبر ۲۰۱۱ء، ص ۴۷

۶۸۲۔ عاظمی، شکیل، ''غزل''، مشمولہ: سب رس، حیدرآباد، اکتوبر ۲۰۱۱ء، ص ۴۹

۶۸۳۔ خان، سعیدالدین احمد، مشمولہ: سب رس، کراچی، نومبر ۱۹۹۷ء، ص ۱۰۔۱۱

۶۸۴۔ اثر، ڈاکٹر محمد علی، ''غزل''، مشمولہ، سب رس، کراچی، مئی ۱۹۹۱ء، ص ۳۹

۶۸۵۔ زیدی، کلیم، ''مکالمہ شاعر و بلبل''، مشمولہ، سب رس، کراچی، اپریل ۱۹۸۷ء، ص ۴۸

۶۸۶۔ راز، اطہر، ''حیدرآباد دکن''، مشمولہ، سب رس، کراچی، اکتوبر ۱۹۸۰ء، ص ۱۵

باب سوم:

اٹھارھویں صدی میں اردو کا شعری منظرنامہ

کسی زبان کی شاعری کو زمانی خانوں میں تقسیم کر کے مطالعہ کرنا اس شاعری سے انصاف نہیں لیکن اس حقیقت سے بھی انکار کی گنجائش نہیں کہ ہر دور کا ادب اس کے عصری تقاضوں کا عکاس ہوتا ہے۔ کسی قوم اور سماج کی جیتی جاگتی تصویر ہم اس دور کے ادب میں بہ آسانی تلاش کر سکتے ہیں۔ اٹھارھویں صدی کو ویسے بھی ہندوستان کی تاریخ میں انتشار اور شکست و ریخت کے سرِ آغاز سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ لہٰذا اس دور کی شاعری میں پیش کیے گئے سانحات کا مطالعہ بھی خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔

مغلیہ سلطنت کے دورِ انحطاط میں شریعت اور طریقت کی آویزش بے حد نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔ اس دور کی قوالیوں، عروسوں کی مجالس، سرمد شہید، چراغ دہلی، خواجہ سماء الدین اور دوسرے بزرگوں کے مزار مرجع عوام بنے ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ مرزا مظہر جانِ جاناں اور خواجہ میر درد کی صحبتیں بڑی بابرکت اور احترام کی مستحق سمجھی جاتی تھیں۔ تصوف کے مطالعے اور اردو ادب پر اس کے اثرات کے بارے میں درست نقطۂ نظر کیا ہو سکتا ہے؟ کیا تصوف کو محض نفیِ خودی، اوہام پرستی اور انحطاط پذیری کا فلسفہ کہہ کر رد کرنا مناسب عمل ہوگا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ابتدا میں تصوف بذاتِ خود اسلامی شریعت سے الگ کوئی حیثیت نہیں رکھتا تھا لیکن جب اس نے ایک منفرد اور امتیازی حیثیت اختیار کی تو اس وقت سے اس کی اصل روح احتجاجی، خود انکاری اور مجہولیت کی شکل اختیار کرتی چلی گئی۔ وہ شریعت اور ریاست کے جبر کے خلاف موثر احتجاج اور آواز اٹھاتا نظر آتا ہے۔ جبر اور جاگیردارانہ شکنجوں کو توڑنے کے لیے وہ رندی اور ''بخاک وکوں غلطیدن'' کا سبق دیتا ہے۔ اس کے باوجود اٹھارھویں صدی میں تصوف نے معاشرے میں ایک موثر صورت اختیار کر لی اور نمایاں کردار ادا کرنا شروع کر دیا لیکن اس حقیقت سے بھی انکار ممکن نہیں کہ اپنے انحطاطی دور میں یہ ادارہ مختلف قسم کی خرابیوں کی آماج گاہ بن کر رہ گیا۔ رفتہ رفتہ یہ ادرہ ظاہر پرستی میں گرفتار ہوتا گیا۔ مزار پرستی، سماع پرستی، تعویز گنڈے، نذر و نیاز اور توہمات نے تصوف کی باطنیت، روحانی آہنگ اور تزکیہ نفس کی تعلیمات کو نچلی سطح پر لا ڈالا اور بالآخر یہ تحریک مریضانہ، منفی اور مجہولیت پسند تحریک بن کر رہ گئی[1]۔ اس صورتِ حال کا ردعمل بھی شدید آیا۔ مگر یہ ردعمل شاعری کی سطح پر کم اور سماجی رویوں کی شکل میں زیادہ نمایاں نظر آتا ہے۔ اٹھارھویں صدی سے شروع ہونے والے اس عمل نے بیسویں صدی تک آتے آتے مذہبی دہشت گردی اور شدت پسندی کی شکل اختیار کر لی۔ صوفیا کے زیرِ اثر آزاد خیالی اور آزاد مشربی کے خلاف ایک گروہ ایسا پیدا ہوا جس نے طریقت کے بجائے شریعت پر زیادہ زور دینا شروع کیا اور اپنے خیالات کو معاشرے پر بہ زورِ طاقت رائج کرنے کی کوشش کا بیڑا اٹھایا۔ نتیجتاً مذہبی تنازعات اور فرقہ وارانہ آویزش کی جھلک اس دور میں بہت ابھر کر سامنے آئے۔ ان تنازعات نے بعض اوقات ایسی شکل اختیار کر لی کہ ایک ایک واقعے میں درجنوں قیمتی جانیں ضائع ہو جاتیں۔ یہ سلسلہ آج تک جاری ہے اور مسلم معاشرہ خصوصاً اس معاملے میں ذہنی اور فکری سطح پر پوری طرح تقسیم نظر آتی ہے۔ مذہبی منافرت پر مبنی زیادہ تر مواد اٹھارھویں صدی کے نثر میں بکھرے ہوئے ہیں جس کا مطالعہ میرے موضوع سے خارج از بحث ہے۔ البتہ تصوف کا غلبہ بہرحال اس دور کی شاعری میں نظر آتا ہے۔ اردو شاعری پر تصوف کے اثرات اور اس کے رجحانات کے حوالے سے بھی بہت سے اہلِ قلم نے عمدہ مواد جمع کر دیا ہے۔ لہٰذا اس پہلو کو نظرانداز کرتے ہوئے خالص سیاسی اور سماجی سطح پر جس قسم کے

سانحات سے اٹھارھویں صدی کا معاشرہ دوچار نظر آتا ہے، یہاں اس کی تفصیل پیش کی جاتی ہے۔

اورنگ زیب کی وفات: دورِ انتشار

اٹھارھویں صدی کی ابتدا میں اورنگ زیب عالم گیر کی وفات کے بعد ہندوستان میں جس قسم کے انتشار نے جنم لیا اسے دیکھتے ہوئے خود اورنگ زیب کی وفات بھی کسی سانحے سے کم محسوس نہیں ہوتی۔ ہندوستان کی تاریخ میں اورنگ زیب عالم گیر ایک متنازعہ شخصیت رہی ہے۔ ان کا عہدِ حکومت مغلیہ سلطنت میں ایک طرف سے وسعت اور فتوحات کا دور رہا ہے تو دوسری جانب اس عہد کے مغل حکمراں طبقے بدعنوانیوں اور سہل پسندی میں مبتلا نظر آتے ہیں۔ برصغیر کی تاریخ میں اب یہ بحث عام اور مقبول ہوگئی ہے کہ کیا مغل زوال کا ذمے دار اورنگ زیب کو ٹھہرایا جائے؟ راسخ العقیدہ مسلمان امن زوال کے تانے بانے اکبر سے جوڑنے کی کوشش کرتے ہیں اور اورنگ زیب کو مثالی حکم ران تسلیم کرتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں لبرل اور ترقی پسند مورخ اورنگ زیب کو ذمے دار بتاتے ہوئے اسے مذہبی عدم رواداری کا علم بردار گردانتے ہیں۔ ہندوستان کے جدید مورخوں نے اورنگ زیب کی شخصیت کو اس وقت مزید کریہہ، مذہبی جنونی اور انتہا پسند بنا کر پیش کیا جب کہ ان کے مقابلے میں شیواجی کی شخصیت کو مبالغہ آرائی کے ذریعے ابھارنے کی کوشش کی گئی۔ اس بحث اور تنازعہ میں ہندستان اور پاکستان کے لبرل اور ترقی پسند مورخ بڑی پیچیدگی کا شکار ہوگئے۔ ان دلائل کو رد کرتے ہوئے بعض سیکولر مورخوں کی دلیل یہ ہے کہ اورنگ زیب نہ تو مذہبی جنونی تھا اور نہ ہی انتہا پسند۔ اس نے جو بھی اقدامات اٹھائے، ان کے پس منظر میں سیاسی مقاصد تھے۔ اسی لیے اسے مذہبی فریم ورک میں رکھ کر دیکھنے کے بجائے بحیثیت حکم ران اس کے اقدامات کا جائزہ لینا ضروری ہے[2]۔

۱۷۰۷ء میں اورنگ زیب کی وفات محض ایک عظیم حکم ران، منتظم اور فاتح کی موت ہی نہ تھی بلکہ ایک دور کے خاتمے کا اعلان تھی۔ اس کی وفات کے بعد تاریخ کا ایک عظیم دور ختم ہوگیا اور اس کی جگہ انتشار، ہنگامہ پروری اور بے نظمی کا ایسا دور شروع ہوا جو برعظیم پاک و ہند کو ڈیڑھ سو سال تک اپنی گرفت میں لیے رہا[3]۔ اورنگ زیب خود اپنے عہد میں ہی ایک متنازعہ شخصیت بن چکے تھے۔ نہ صرف سکھوں، افغانوں اور راج پوتوں میں بلکہ مسلمان برادری میں بھی ان کی شخصیت متنازعہ ہوتی چلی گئی۔ اس کی وجوہات سیاسی سے لے کر مذہبی تھیں لیکن اس بارے میں تاریخی طور پر مدلل طریقے سے جو الزامات لگائے گئے وہ برطانوی دور میں انگریز مورخوں کی جانب سے تھے جنھوں نے اورنگ زیب کو ایک متعصب، کٹر، جنونی مذہبی ثابت کر کے ہندو اور مسلمان کی تفریق کو ابھارا۔ ہندوستان کی تاریخ نویسی میں اس وقت تبدیلی آنا شروع ہوئی جب یہاں انگریزوں کے خلاف قومی تحریک شروع ہوئی۔ اس تحریک کے ساتھ ساتھ فرقہ وارانہ جذبات کو بھی ابھرنے کا موقع ملا[4]۔ بقول شبلی نعمانی ان کے اوپر عائد کی گئی فردِ جرم کی فہرست اتنی لمبی ہے کہ شاید کسی مجرم کی نہ ہوگی۔ باپ کو قید کیا، بھائیوں کو قتل کرادیا، دکن کی اسلامی ریاستیں مٹادیں، ہندوؤں کو ستایا، بت خانے ڈھائے، مرہٹوں کو چھیڑ کر تیموری سلطنت کے ارکان متزلزل کردیے[5] لیکن اس حقیقت سے بھی انکار ممکن نہیں کہ اورنگ زیب عالم گیر کی ذات میں ہمیں جہاں گیری اور جہاں بانی جیسے اوصاف کے علاوہ سیرت و کردار کی پاکیزگی اور صالحیت بھی نظر آتی ہے۔ انھوں نے کم و بیش نصف صدی سے زیادہ عرصے تک ہندوستان کے ایک وسیع و عریض علاقے پر حکومت کی۔ ان کی سلطنت کے حدودِ اربعہ میں کابل سے چاٹگام اور کشمیر کا ویری تک کے علاقے شامل تھے۔ اس کی سلطنت ہندوستان کی سب سے وسیع اور عظیم سلطنت تھی جو رقبے کے اعتبار سے اس وقت کی دنیا کی سب سے بڑی مملکت تھی۔ برعظیم کی تاریخ میں اس سلطنت سے قبل اور اس کے بعد ایسی کوئی سلطنت وجود میں نہیں آئی۔ اگرچہ اس کے اقدامات کی تائید اور حمایت اور مخالفت میں لمبی لمبی بحثیں ہوئیں۔ انگریز مورخوں نے پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو کی حکمت عملی کے تحت ان کی شخصیت

کو مسخ کرنے کی بھرپور کوشش کی، جس پر شبلی نے کہا نے کہا کہ:

تمھیں لے دے کے ساری داستاں میں یاد ہے اتنا	کہ اورنگ زیب ہندو کش تھا، ظالم تھا، ستم گر تھا[6]

تاریخ کے ساتھ ساتھ ادبیات کا مطالعہ ہمیں اس دور کے سیاسی اور سماجی منظر نامے کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔ اس دور میں اردو شعر و ادب کی تخلیق کا سلسلہ باقاعدہ طور پر شروع ہو چکا تھا۔ شمالی ہند میں سترھویں صدی کے آخر اور اٹھارھویں صدی کے شروع کا پہلا بھرپور شاعر مرزا محمد جعفر ہے جو اپنی روایت کا خود ہی خالق ہے اور خود ہی خاتم۔ جعفر زٹلی نے طنز اور ہجو سے اپنے دور کی روح اور مزاج کی ایسی ترجمانی کی کہ تین سو سال کا عرصہ گزرنے کے باوجود اس کا نام آج بھی زندہ ہے۔ اورنگ زیب کے بارے میں بھی اس کے ہاں مختلف انداز کی تین نظمیں اور ایک قطعہ تاریخ وفات ملتا ہے جس سے اس دور کے حالات پر روشنی پڑتی ہے جو عالم گیر کی زندگی میں اس کے بیٹوں نے اس کے لیے پیدا کر دیے تھے۔ ان تینوں نظموں ''ظفر نامہ بادشاہ عالم گیر غازی''، ''عالم گیر اورنگ زیب گردی''، ''در وفات اورنگ زیب عالم گیر بادشاہ غازی'' وغیرہ اس حوالے سے اہمیت کی حامل ہیں۔ ''ظفر نامہ'' فتح دکن کے بارے میں ہے۔ دوسری نظم میں وفات اورنگ زیب کے بعد اس کے بیٹوں میں تخت نشینی کی رسا کشی کو موضوع بنایا گیا ہے اور تیسری میں اورنگ زیب کا مرثیہ لکھ کر اس کے کردار، شجاعت اور بہادری، تدبر و حکمت، تقویٰ اور پاک بازی کی تعریف کی گئی ہے۔ اورنگ زیب کے بیٹوں کے بارے میں جعفر زٹلی کا کہنا ہے کہ چاروں ناخلف تھے۔ اگر ایک بیٹا بھی باپ کے راستے پر چلتا تو شہنشاہ کا سکہ چاند پر چلتا۔ ان نظموں میں جعفر نے جو کچھ محسوس کیا اور اپنے دور کے حالات دیکھے اسے سچائی سے بیان کر دیا۔ اس نے عالم گیر کے کسی بیٹے کو نہیں بخشا۔ معظم کامیاب ہو کر بہادر شاہ اوّل کے نام سے تخت پر بیٹھا تو اسے ''گم راہ'' کہہ کر سارے معاشرے کی ترجمانی کی۔ وہ اورنگ زیب کو ملک و ملّت کے لیے اہم اور ضروری شخصیت قرار دیتا ہے[7]۔ ملاحظہ کیجیے:

دریغا! عدل و دیں بے او دونیم است	عروسِ سلطنت بے او سقیم است
کہاں اب پایے ایسا شہنشاہ	مکمل، اکمل و کامل، دل آگاہ[8]

دکنی دور کے سخن وروں کے خیالات کا بھی جائزہ لیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ جو الزام دکن کی بابت اورنگ زیب پر لگائے جاتے ہیں، شعرا اس سے متفق نہیں۔ ظاہری بات ہے کہ اس دور کا ادب اس بابت سب سے بڑا حوالہ ہے۔ اس کی پہلی مثال سید مظفر مازندرانی جو ابوالحسن تانا شاہ کا پہلا دیوان تھا۔ تانا شاہ سے کسی بات پر ناراض ہو کر اورنگ زیب کی خدمت میں چلا گیا۔ ''ظفر نامہِ عشق'' کے عنوان سے ایک مثنوی لکھی جس کا دوسرا نام ''قصہ مہر و ماہ'' ہے۔ اس کے آغاز میں ''صفتِ بادشاہِ اورنگ زیب غازی'' کے عنوان سے ۱۲۸ اشعار ہیں۔ عالم گیر کو وہ ''جہاں کے شاہاں میں ولی''، ''شاہ ابلابلی''، ''شاہ بلند اختر''، ''رسولِ خداؐ کا خلاصہ''، ''شیرِ خدا کا شاگرد''، ''عالم باعمل''، ''سخاوت اور شجاعت میں لاثانی'' وغیرہ جیسے القابات سے نوازتا ہے[9]۔ چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

شہِ کامراں، شاہِ ابلابلی	جہاں کے شہاں میں ہے بے شک ولی
خدا کے جو خاصاں میں خاصہ ہے او	رسولِ خداؐ کا خلاصہ ہے او
سواو کون جو شاہِ اورنگ زیب	کیا فکر کوں دور اس کا نہیب
دھریں لطف سو اس پو آلِ رسول	اچھے شاخ پر سائباں جیوں کہ پھول

قوی طالع او شاہِ اختر بلند | کمند سٹ پکڑتا ہے کیوں کوں بند
شجاعت میں شاگردِ شیرِ خداؓ | غنیم اس انگے جیوں خدا کا مندا[10]

اس دور کے ایک اور بلند پایہ شاعر شیخ داد و ضعیفی تھے انھوں نے مسائل فقہ کے موضوع پر ایک ضخیم مثنوی ''ہدایت ہندی'' کے عنوان سے لکھی۔ اس مثنوی کے آخری باب میں شاعر نے اورنگ زیب کی مدح کرتے ہوئے اسے عادل شہنشاہ، اسلام کا کارساز، بدعت اور ضلالت سے ہندوستان کو پاک کرنے والا نیک کردار حکم ران قرار دیا اور اس کی عمر درازی کی دعا کرتے ہوئے کہا کہ:

یہ دورِ جہاں دارِ اورنگ زیب | کہ جس تے ہوا اس زمانے کو زیب
شہنشاہِ عادل اہے در امور | کہ بدعت ضلالت ہوا جس تے دور
بڑا دین اسلام کا کارساز | الٰہی توں کر عمر اس کی دراز[11]

''قصہ ابوشحمہ'' کے مصنف اولیا گول کنڈوی بھی ابوالحسن تانا شاہ کے دور کے شاعر گزرے ہیں۔ اپنی مثنوی میں عالم گیر کی مدح کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

توں ہے شاہِ اورنگ آفاق گیر | کہ سارے شہاں تجھ تے اخلاق گیر
تو ہے شاہِ گنبھیر عالی نوا | خدا نے دیا تجھ کو معالی فضل[12]

سلطنت بے جاپور کا خاتمہ ۱۶۸۵ء میں ہوا لیکن مغلیہ حکم ران عملی طور پر طویل عرصے سے دکن کے علاقوں پر اپنا سکہ جما چکے تھے۔ اس کا اظہار بھی اس دور کی شاعری میں دیکھا جا سکتا ہے۔ حسن شوقی کے فرزند شاہ حسین ذوقی نے اورنگ زیب کی وفات سے دس برس قبل وجہی کی نثری تصنیف ''سب رس'' کے قصے پر مبنی مثنوی ''وصال العاشقین'' میں عالم گیر کی مدح کرتے ہوئے کہا کہ:

جو ہے اس وقت اورنگ زیب عالی | نبیؐ کے شرع کے گلشن کا مالی
عبادت کے ہنر دوڑا کے بالذّات | رکھا تازے ہیں دیں داروں کے پھل پات
سہاوے نام عالم گیر اس کوں | کتا لازم ہے جگ کا پیر اس کوں[13]

اسی طرح قاضی محمود بحری نے اپنے دوسرے قدر دان سلاطین کی طرح اورنگ زیب عالم گیر کی مدح بھی کی ہے۔ بحری نے عالم گیر کو ''دیں پناہ''، ''غازی''، ''دیں دار''، ''دانا''، ''دلیر'' اور ''ماہر علوم'' وغیرہ جیسے القابات سے یاد کرتے ہوئے کہا کہ:

اب بول توں مدح بادشاہ کا | اور اس کی کمالیت کی کلاہ کا
ایسا نہ ہوا کُئی شہاں میں | نا بلکہ بڑے مشائخاں میں
جس ناؤ اہے ابو معازی | سلطان اورنگ زیب غازی
دیں دار، دلیر اور دانا | یک علم نہ سب میں سیانا
پیچھے بھی کوئی ہوا نہ ایسا | آگے بھی تو سچ نہ ہوگا ویسا
اللہ کرے شاد دل کو شہ کے | بالا کرے بول بادشہ کے[14]

غرض اس طرح کی متعدد مثالیں اس دور کے شعرا کے کلام سے پیش کی جا سکتی ہیں جس سے بعد کے مورخین کے اس بیانیے کی

نفی ہوتی ہے جس کا مذکورہ صفحات میں ذکر کیا گیا۔

مغلیہ حکومت کا دورِ زوال: سیاسی و معاشی ابتری

اورنگ زیب کی وفات ۱۷۰۷ء میں ہوئی اس وقت اس کے تین لڑکے معظم شاہ، اعظم شاہ اور کام بخش زندہ تھے۔ ذہنی قابلیت، تجربہ، انتظامی صلاحیت و معاملات اور سیاسی سوجھ بوجھ میں تینوں شہزادے مختلف عادات اور عقیدے کے حامل تھے۔ شاہ عالم عقیدے کے لحاظ سے شیعہ اور قرآن و حدیث کا بے مثل عالم تھا۔ اس کی بڑی خامیوں میں بہت جلد لوگوں کے کہنے پر آ جانا اور ان پر اعتماد کر کے انھیں اپنا ہمدرد سمجھنا تھا۔ شاہِ عالم معظم شاہ فطرتاً لڑائی جھگڑے اور جنگ وجدل سے دور رہنے والا شخص تھا۔ اسی لیے سلطنت کے بہت سے لوگ اس کی نرم مزاجی کی وجہ سے دوسرے بھائیوں پر ترجیح دیتے تھے لیکن تخت حاصل کرنے کے بعد بھی اس قسم کی شخصی کمزوری کے باعث یقیناً اسے تاریخ کے کمزور ترین بادشاہ کے طور پر یاد رکھا گیا۔ دوسرا لڑکا اعظم شاہ فطرتاً سخت گیر اور بہتر منتظم تھا لیکن جذباتی شدت کی وجہ سے وہ اپنے ساتھیوں کی ہمدردیاں حاصل نہ کر سکا۔ کام بخش عالم گیر کا تیسرا لڑکا عقیدتاً سنی مذہب سے تھا۔ اس کی طبیعت میں خود ستائی بہت تھی۔ عالم گیر کے انتقال کے وقت اس کے پوتے بھی ۴۵ برس سے زیادہ کے ہو چکے تھے۔ کئی پڑپوتوں کی بھی شادیاں ہو چکی تھیں۔ مغل دور میں ہر بادشاہ کی وفات شہزادے یہی سمجھتے تھے کہ اب ان کے لیے دو ہی راستے ہیں یا تو وہ خود کو بھائیوں کے رحم و کرم پر چھوڑ کر بقیہ زندگی قید و بند میں گزاریں یا پھر حصولِ تخت کی کوشش کریں۔ اسی لیے عموماً موخر الذکر طریقہ اختیار کیا جاتا۔ عالم گیر کو بھی شہزادوں کے درمیان خانہ جنگی کا مکمل علم تھا۔ لہٰذا اس نے اپنی زندگی ہی میں حکومت کو تقسیم کر دیا۔ اس کے باوجود اس کے انتقال کے محض چند برسوں ہی میں مغلیہ حکومت غیر یقینی صورتِ حال سے دوچار ہوگئی [۱۵]۔ اٹھارھویں صدی کا ابتدائی عہد سیاسی طور پر ہندوستان کی تاریخ میں انتشار کا دور ہے۔ دلّی میں مغل سلطنت کی مرکزیت تقریباً ختم ہو چکی تھی۔ ایک طرف سیاسی اور سرکاری ادارے ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھے تو دوسری طرف معاشرہ ان حالات سے بری طرح متاثر تھا۔ اس زوال پذیری کے باعث جو انتشار اور ابتری پھیلی، اس نے لوگوں کی سماجی، ثقافتی اور معاشی زندگی کو بری طرح متاثر کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس طرح ایک ایک کر کے بنگال، اودھ، میسور اور حیدر آباد جیسی خود مختار ریاستیں وجود میں آئیں۔ اپنے محلات میں شاہانہ ٹھاٹ باٹ سے رہنے والے اورنگ زیب کے جانشینوں کے پاس کوئی راستہ نہ بچا تھا۔ درباری سازشوں نے حالات کو اور زیادہ نازک کر دیا تھا۔ غیر ملکی حملہ آوروں کی وجہ سے جو ابتری پھیلی، اس کا سب سے زیادہ اثر بھی دہلی پر پڑا۔ اتفاق سے یہی دہلی اس زمانے میں اردو شاعری کا بھی مرکز تھا۔ زیادہ تر شعرا دہلی ہی سے وابستہ تھے۔ مغلیہ سلطنت کے اس زوال پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے ولیم آرون سے لے کر، جادو ناتھ سرکار، ستیش چندر، عرفان حبیب، اظہر علی اور نور الحسن وغیرہ نے بہت سے تفصیلی تجربے کیے۔ اس طرح جدید مورخین کے نظریات کا مطالعہ کرنے کے بعد واضح ہوتا ہے کہ مغلیہ سلطنت کے زوال کا کوئی ایک سبب نہیں تھا بلکہ کئی اسباب تھے۔ یہ اسباب مختلف تھے اور اپنے آپ میں پیچیدہ بھی۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اٹھارھویں صدی کے شعرا نے مغل سلطنت کے زوال کو اپنے مشاہدے کی بنا پر اپنے اشعار میں نمایاں کیا [۱۶]۔ اس دور کی شاعری کے مطالعے سے اٹھارھویں صدی کے ہر ایک پہلو کی عکاسی کی جا سکتی ہے۔ اس دور کی تاریخ کے مطالعے کے دوران اس دور کی شاعری کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ساری قوم کا عکس اور اس دور کی ترجمانی کرتے ہوئے شعرا نے اقتصادی اور مذہبی صورتِ حال کا جائزہ بھی لیا اور اخلاقی انحطاط کی روداد بھی سنائی ہے۔ اس عہد کے شعرا نے سماج کا جو نقشہ کھینچا ہے وہ عبرت انگیز بھی ہے اور پریشان کن بھی۔ اسی طرح سے اس دور کے شعرا ایک وقائع نویس کی طرح حالات کا تذکرہ بھی کرتے ہیں اور زوال کی تصویر بھی دکھاتے ہیں۔ محمد شاہ کے زمانے میں امرا نے، جن میں حسین علی

خاں، عبداللہ خاں، ذوالفقار خاں اور سعادت خاں خاص طور پر قابل ذکر ہیں، اقتدار کی ہوس میں سلطنت کو سازشوں اور خانہ جنگیوں میں ملوث کر کے انتشار کی ان طاقتوں کو ابھارا جو اب تک سر چھپائے بیٹھی تھیں۔ نتیجے میں معاشرہ اندر سے کمزور اور اس کا اتحاد پارہ پارہ ہو گیا۔ آپس کی ذاتی نفرتوں نے فرد کو اندھا کر دیا۔ معاشی مسائل اور شدید بے روزگاری عام ہو گئی [17] جعفر زٹلی نے ان حالات و کوائف کو دائرۂ تحریر میں لا کر شاعری سے وہی کام لیا جو مورخ تاریخ سے لیتا ہے۔ ''مرثیۂ اورنگ زیب'' کے کچھ اشعار دیکھیے جس میں یہ فحش نگار شاعر کس طرح سے ثابت کر رہا ہے کہ وہ اپنے وقت کی سب سے تیز اور جان دار آواز ہے:

دریغا! رونقِ باغِ جہاں رفت　　　دریغا! آبروئے میر و خاں رفت

رکت کے آنسوؤں جگ روَوتا ہے　　　نہ میٹھی نیند کو سوؤتا ہے

صدائے توپ و بندوق است ہر سو　　　بہ سر اسباب و صندوق است ہر سو

جھٹا جھٹ و پٹا پٹ است ہر سو　　　کٹا کٹ و لٹا لٹ است ہر سو

بہ ہر سو مار مار و دھاڑ دھاڑ است　　　اچل چال و تبر، خنجر کٹار است [18]

ملک میں پھیلا ہوا انتشار اور بدنظمی کی فضا کا بیان ہو، مرکزیت کے پارہ پارہ ہونے کا احوال ہو، مطلق العنانی، طوائف الملوکی اور مالیاتی نظام کی تباہی کا ذکر ہو، زٹلی نے بڑی فن کاری سے ان تمام مسائل کو موضوع بنایا۔ ملاحظہ کیجیے:

ہر صبح ڈھونڈیں نوکری کوئی نہ پوچھے بات ری　　　سب قوم ڈھونڈن لاگ ری، یہ نوکری کا حظّ ہے

صاحب عجب بے داد ہے، محنت ہمہ برباد ہے　　　اے دوستاں فریاد ہے، یہ نوکری کا حظّ ہے

ہم نام کوں اسوار ہیں، روزگار میں بے زار ہیں　　　یارو ہمیشہ خوار ہیں، یہ نوکری کا حظّ ہے [19]

اس زمانے میں جس طرح سے انسانیت اور محبت و خلوص کے رشتے بوسیدہ ہو رہے تھے، ہر طرف شر، فساد اور بغاوت کے بادل گھرے ہوئے تھے۔ اسی زمانے میں بیرونی طاقتیں بھی برعظیم کے ساحلوں پر اپنے قدم جما رہی تھیں۔ معاشرتی رشتے بکھر رہے تھے۔ انسانی رشتے بھی اپنی اہمیت کھو چکے تھے۔ فرخ سیر نے تخت پر بیٹھتے ہی میر جملہ کے مشورے سے جس طرح مخالفوں کو قتل کروایا۔ بڑے بڑے نام ور امرا کو قتل کروانے کے علاوہ ذوالفقار خاں کے دیوان سبھا چند کی زبان کٹوانے کا معاملہ ہو، جہاں دار کے بڑے بیٹے عزالدین کو محمد اعظم شاہ کے بیٹے والا تبار کو اور اپنے چھوٹے بھائی ہمایوں بخت کو جس کی عمر محض دس برس تھی، اندھا کرا دیا تھا۔ کچھ عرصے کے بعد شادمان خواص اور جعفر زٹلی کو بھی نئی بادشاہت کی تضحیک کے جرم میں قتل کروا دیا گیا۔ ان واقعات نے سارے شہر میں غم و غصے کی لہر دوڑا دی تھی۔ جعفر زٹلی بھی اس قتل عام کے عینی شاہد تھے اسی لیے فرخ سیر کے نام کا سکہ جب مسکوک ہوا تو اس کے جواب میں جعفر زٹلی نے جو ''سکّہ'' لکھ کر اپنے غم و غصے کا اظہار کیا [20] اسے ملاحظہ کیجیے:

سکّہ زد بر گندم و موٹھ مٹر　　　بادشاہ ہے تسمہ کش فرخ سیر [21]

جعفر زٹلی کی شاعری دراصل قدروں کے زیر و زبر ہونے کا نوحہ ہے۔ جس معاشرے میں شریف زادے پریشان حال اور حرام زادے خوش حال ہوں، فقیہ ننگے پاؤں پھریں اور چمار جام بدست ہوں، باپ بیٹے کا رشتہ تک کمزور ہو گیا ہو، عورتوں میں بے حیائی، شہوت پرستی اور جسم فروشی عام ہو گئی ہو، صدق و محبت اور مہر و وفا جیسی قدریں ختم ہو گئی ہوں، علم و ادب ناقدری کا شکار ہو، ظلم کے

خلاف آواز اٹھانے والا کوئی نہ ہو[۲۲]۔ تو اسی قسم کا عمرانی مسئلہ ضرور سر اٹھاتا ہے۔ اسی لیے اٹھارھویں صدی کے بیہ پر گو شاعر اس مسئلے کو اپنے فکر وفن کا موضوع بنایا۔ اپنی دو نظموں ''دراختلافِ زمانہ'' اور ''دور نامہ گوید'' میں انھوں نے معاشرے کے ان ہی پہلوؤں کی تصویر کشی کرتے ہوئے کہا کہ:

گیا اخلاص عالم سے عجب یہ دور آیا ہے	ڈرے سب خلق ظالم سے عجب یہ دور آیا ہے
نہ یاروں میں رہی یاری نہ بھائیوں میں وفاداری	محبت اٹھ گئی ساری، عجب یہ دور آیا ہے
نہ بولے راستی کوئی، عمر سب جھوٹ میں کھوئی	اتاری شرم کی لوئی، عجب یہ دور آیا ہے
بہت سے مکر جو جانے، اوسی کوئی سب کوئی مانے	کھرا کھوٹا نہ پہچانے، عجب یہ دور آیا ہے
چغل کرتے پھریں چغلے، بھکل کرتے پھریں بھکلے	دغل کرتے پھریں دغلے، عجب یہ دور آیا ہے
خوشامد سب کریں زر کی، چہ بے گانہ چہ باگھر کی	ملاوے بات سب ہر کی، عجب یہ دور آیا ہے
سپاہی حق نہیں پاویں، نٹ اٹھ اٹھ چوکیاں جاویں	قرض لے لے سبھی کھاویں، عجب یہ دور آیا ہے
خصم کو جورو اٹھ مارے، گریباں باپ کا پھاڑے	زنوں سے مرد بھی ہارے، عجب یہ دور آیا ہے[۲۳]

ان کے کلام میں رباعیاں، دوہرے اور قطعات بھی ہیں اور مثنویاں، نظمیں، نصیحت نامے، ظفر نامے اور ہجویات بھی۔ ان کی شاعری کو اس دور کی واقعاتی شاعری کی عمدہ مثال قرار دیا جاسکتا ہے۔ وہ جس طرح سے چاہتے تھے، لفظوں کو اپنے مزاج کی مناسبت اور اظہار کی ضرورت کے لحاظ سے استعمال کرتے تھے[۲۴]۔ جعفر کی آواز کو بھی وقت کے آمروں نے دبانے کی کوشش کی لیکن یہ آواز اپنے دور کی ایسی زوردار آواز ثابت ہوئی کہ اس کی گونج آج بھی سنائی دیتی ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے جعفر زٹلی کی بابت درست لکھا کہ:

> سچائی اس کی سب سے بڑی خوبی تھی اور سچ کی یہی کڑوی گولی معاشرے کے حلق سے نہیں اترتی تھی۔ جعفر کی آواز ایک ایسے انسان کی آواز ہے جو اپنی آنکھوں سے معاشرے کی گرتی ہوئی دیوار کو دیکھ کر غم و غصہ میں زور زور سے قہقہے لگا رہا ہے۔ وہ اس لیے ہنس رہا ہے کہ آپ کو رلائے۔ وہ اس لیے چیختا اور چنگھاڑتا ہے کہ معاشرے کے بہرے کانوں تک اس کی آواز پہنچ سکے۔ ایک ایسے معاشرے میں، جہاں لوگ اندھے، بہرے ہوگئے ہوں، زٹلی کا طرز اظہار ہی موثر ذریعہ ہوسکتا ہے[۲۵]۔

اس پرآشوب زمانے میں مغلیہ سلطنت کے چپے چپے پر بغاوتیں ہورہی تھیں۔ ایک معمولی سردار بھی ہندوستان پر بادشاہت کرنے کے خواب دیکھ رہا تھا۔ پنجاب میں سکھوں کی طاقت عروج پر تھی۔ بھرت پور اور اس کے آس پاس کے علاقوں میں جاٹ سر اٹھا رہے تھے۔ اودھ میں روہیلے اپنی مضبوط ریاست بنا چکے تھے مگر ان میں سب سے زیادہ طاقت مرہٹوں نے حاصل کر لی تھی۔ میر تقی میر نے اس عہد کی سیاسی صورتِ حال کو بیان کرتے ہوئے کہا کہ:

چور اچکے سکھ مرہٹے شاہ و گدزر خواہاں ہیں	چین میں ہیں جو کچھ نہیں رکھتے فقر ہی اک دولت ہے اب[۲۶]

جیسے جیسے زمانہ آگے بڑھتا گیا، مغل سلطنت کے زوال کی رفتار بھی تیز ہوتی گئی۔ مرکزی حکومت کی کمزوری کا اثر حکومت کی مالیاتی زندگی پر بھی پڑا۔ رسل و رسائل میں دقتیں ہوتیں، صنعت و حرفت مقامی طور پر محدود ہوگئے۔ اس انتشار کا فائدہ اٹھا کر انگریز اقتدار

میں آ گئے [۲۷]۔ جعفر علی حسرت کے مطابق:

کہاں سے دیجیے طلب اب کہاں خزینا ہے — کہ لال قلعہ میں اب تو کہاں دفینا ہے
مرا بھی کہہ تو کہاں سے بھلا مہینا ہے — جو ملک تھا سو مرا سرکشوں نے چھینا ہے
جو تجکو لکھ دوں میں پروانا مانیں کب عمّال [۲۸]

ولی دکنی کا زمانہ بھی برِعظیم میں فرنگیوں کے قیام کا ابتدائی زمانہ تھا۔ ابھی ان کی فطری جبلت اور سیاسی رنگ وروپ پوری طرح نمایاں نہیں ہوئی تھی مگر ولی دکنی کی نگاہِ دوربیں نے بیرونی تاجروں کے باطن کا مشاہدہ قبل از وقت ہی کر لیا [۲۹]۔ اس بابت اس نے جو اندازے لگائے وہ بعد کے زمانے میں درست ثابت ہوئے۔ ملاحظہ کیجیے:

فرنگی اس میں آتے ہیں کلہ پوش — عدو واں جن کی گنتی میں ہے بے ہوش
وگران میں فرنگی بے عدو ہیں — کہ قول و فعل میں مکروہ و بد ہیں [۳۰]

انگریزوں کے قول و فعل سے متعلق ولی دکنی نے جو اندازے لگائے تھے وہ بعد میں حرف بہ حرف ثابت ہوئے۔ انگریزوں نے فرخ سیر ہی کے زمانے میں ۱۷۱۵ء میں اپنی سفارت بھیجی تھی جس میں ولیم ہیملٹن بھی شامل تھے۔ بادشاہ بیمار تھے، ہیملٹن نے علاج کیا۔ بادشاہ صحت یاب ہو گیا اور خوش ہو کر ایسٹ انڈیا کمپنی کو بغیر محصول کے بنگال میں تجارت کے لیے مراعات دے دیں۔ حیدرآباد میں بھی بغیر محصول کے تجارت کے حقوق بحال کر دیے گئے۔ مدراس میں معمولی کرائے پر اور سورت میں دس ہزار روپے سالانہ ادا کر کے ہر قسم کے محصولات میں معافی مل گئی [۳۱]۔ فرخ سیر کے اس احمقانہ اقدام نے آگے چل کر مغلیہ سلطنت اور برصغیر کی تاریخ کا دھارا بدل کر رکھ دیا۔ مولانا محمد حسین آزاد نے اپنی ایک نظم ''حبِ وطن'' میں فرخ سیر کے اس احمقانہ اقدام کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ:

فرخ سیر تھا ہند میں فرماروائے ملک — اور غیرتِ نسیم و صبا تھی ہوائے ملک
ہند پر تھا حادثۂ غم عجب پڑا — یعنی کہ بادشاہ تھا خود جاں بلب پڑا
پر اس مسیح دم نے جو آ کر کیا علاج — ایسا بہ حسبِ طبع موافق پڑا علاج
گویا دوا بہ کارِ دعا ہوگئی اسے — اور تین چار دن میں شفا ہوگئی اسے
بولا یہ شاہ اس کا بھی تجھ پر مدار ہے — جو مانگنا ہے مانگ تجھے اختیار ہے
تھوڑی زمیں نواحِ دریا کنار ہے — مجھ کو عطا ہو مملکتِ شہر یار میں
اور جنس جو کہ لائیں وہ نزدیک و دور سے — محصول سب معاف ہو اس کا حضور سے
دامن میں اک عطائے خداداد پڑ گئی — اور سلطنت کی ہند میں بنیاد پڑ گئی [۳۲]

چند ہی دنوں میں سادات اور مغلوں کے درمیان شدید اختلافات پیدا ہو گئے۔ فرخ سیر کو یہ ڈر لگا رہتا کہ سادات اس کی جگہ کسی اور مغل شہزادے کو بادشاہ نہ بنا دیں چناں چہ اس نے آلِ تیمور کے بچے کھچے تینوں شہزادوں کو اندھا کر دیا۔ مغل روایات کے مطابق کوئی اندھا شخص بادشاہ نہیں ہو سکتا تھا۔ اس دور میں سکھوں اور راج پوتوں نے بھی سر اٹھایا ہوا تھا۔ درباری سازشیں بھی عروج پر تھیں۔ فرخ سیر نے سید برادران کی سرکوبی کے لیے متعدد کوششیں کیں مگر ناکام رہا۔ ناکامی کے بعد اکثر سید برادران کو منانے ان کے گھر جانا

پڑا۔ بالآخر سادات برادران نے فرخ سیر کو معزول کرنے کا فیصلہ کرلیا اور ۱۷۱۹ء کو سادات کے سپاہیوں نے بادشاہ کو گھسیٹتے ہوئے محل سے نکالا۔ اسے اندھا کیا اور بعد میں گلا گھونٹ کر ہلاک کر دیا [۳۳]۔ میر تقی میر کا یہ شعر حالات کی ان ستم ظریفیوں کا بہترین عکاس ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

شہاں کے کحلِ جواہر تھی خاک پا جن کی　　　انھیں کی آنکھوں میں پھرتی سلائیاں دیکھیں [۳۴]

فرخ سیر کے قتل کے بعد حرم کی عورتوں کے ساتھ جو کچھ ہوا، وہ بھی تاریخ کا ایک سیاہ باب ہے۔ انھیں ہوس کا نشانہ بنایا گیا۔ سادات باریہ نے رفیع الدرجات کو تخت طاؤس پر بٹھایا جو بیماری کی وجہ سے ناکارہ ہو چکا تھا۔ دو ماہ بعد اس کے بڑے بھائی رفیع الدولہ کو شاہ جہاں ثانی کے خطاب کے ساتھ تخت طاؤس پر بٹھایا گیا جو افیم کا عادی تھا۔ محض تین ماہ زندہ رہا پھر ۱۷۱۹ء میں بہادر شاہ کے پوتے اور شاہ جہاں کے بیٹے، روشن اختر کو محمد شاہ کے خطاب سے تخت سلطنت پر متمکن کیا گیا۔ اورنگ زیب کی وفات کے بعد بارہ سال کے اندر اندر یہ چھٹا بادشاہ تھا۔ یہ محمد شاہ رنگیلے کے نام سے معروف ہوا اور ۱۷۴۸ء تک تخت سلطنت پر متمکن رہا۔ اس کے دور میں ایوانِ سلطنت کے ستون ایک ایک کر کے گرتے رہے اور وہ اس زوال کو محض تماشائی بنا ''غرق مے ناب'' کرتا رہا [۳۵]۔ اس تیس برس کے عرصے میں ساری مغلیہ سلطنت تقریباً بکھر کر رہ گئی۔ اسی لیے اسے ''خاتم السلاطین بابریہ'' بھی کہا جاتا ہے [۳۶]۔ بادشاہوں اور امرا کی عیش پسندی، کوتاہ اندیشی اور پست ہمتی نے حالات کو نازک سے نازک تر اور بد سے بدتر بنا دیا۔ انھوں نے اپنی طاقت آپس ہی میں لڑ کر ختم کر دی اور بیرونی طاقتوں سے مقابلے کی تاب ان میں نہیں رہی [۳۷]۔ ایک شاعر نے درج ذیل شعر میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ:

کہیں ہے شیشہ سرنگوں اور کہیں شکستہ جام ہے　　　کیا مچائی مے کشوں نے آج مے خانے میں دھوم [۳۸]

شاہی خزانہ عیش وعشرت کی محفلوں کی نذر ہو کر خالی ہوتا رہا اور بادشاہ اپنی زندگی میں مست رہے۔ ان حالات کے ردعمل میں حاتم، حسرت، قائم اور سودا وغیرہ کے شہر آشوب اس زوال پذیر معاشرے کی بڑی واضح تصویر پیش کرتے ہیں۔ شاہ حاتم نے ایک مخمس میں ان حالات کی تصویر کشی کرتے ہوئے کہا کہ:

یہاں کے قاضی و مفتی ہوئے ہیں رشوت خور　　　یہاں کے دیکھ لو سب اہل کار ہیں گے چور
یہاں کرم سے نہیں دیکھتے ہیں اور کی اور　　　یہاں سبھوں نے بھلائی ہے دل سے موت اور گور
یہاں نہیں ہے مدارا، بغیر دار و مدار

امیر زادے ہیں حیران اپنے حال کے بیچ　　　تھے آفتاب پر، اب آگئے زوال کے بیچ
پھریں ہیں چرخی سے ہر دل، تلاشِ مال کے بیچ　　　وہی گھمنڈِ عمارت ہے ہر خیال کے بیچ
خدا جو چاہے تو پھر ہو، پر اب تو ہے دشوار

عجب ہے الٹی بہی ہے گی باؤ دلّی میں　　　کہ شاہ باز چڑی مار کی ہے انٹی میں
روغن فروش کی ہیں پانچوں انگلیاں گھی میں　　　جنگل کو چھوڑ کے بوم آبسے ہیں بستی میں
نجیب چھوڑ کے شہروں کو، ہیں جنگل میں خوار

جہاں میں صاحبِ شمشیر ہیں گے صیقل گر | ہے گندھیوں کا معطر سدا، دوکان اور گھر
ہمیشہ نازاں ہیں بھڑ بھونجے اپنے بختوں پر | رہبر دودھ ملائی، دہی سے ہیں خوگر
بنا ہے خانۂ نقاش، رشکِ نقش و نگار[۳۹]

اس بات سے کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ انگریز راج کے آغاز سے انجام تک ہندوستان کی قومی دولت کے ذرائع کئی اعتبار سے محدود ہوگئے۔ اٹھارھویں صدی کا ہندوستان ایک بڑا صنعتی اور زراعتی ملک تھا۔ ہندوستانی بنکروں کا بنایا ہوا کپڑا ایشیا اور یورپ کی منڈیوں میں بکتا تھا۔ انگریز راج کے ابتدائی زمانے ہی سے دستکاروں کی حوصلہ شکنی کی گئی تاکہ ابھرتی ہوئی برطانوی مصنوعات کو فروغ دیا جاسکے۔ وہ چاہتے تھے کہ ہندوستان، برطانوی صنعتوں کے تابع رہے اور زیادہ سے زیادہ خام مال پیدا کرے تاکہ برطانیہ کے کارخانوں کو خام مال مہیا کیا جاسکے۔ اس پالیسی پر انھوں نے سختی سے عمل کیا جو ہندوستان کے لیے خاصی مہلک ثابت ہوئی۔ ہندوستان سے انگلستان جانے والے ریشمی اور سوتی کپڑوں پر بھاری محصول عائد کیا گیا تاکہ ان کی آمد رک جائے جب کہ ہندوستان میں درآمد ہونے والا انگلستانی مال محصولات سے بری تھا۔ مشہور مورخ ایچ۔ ایچ۔ ولسن نے برطانوی صنعت کاروں کی بابت لکھا کہ انھوں نے سیاسی ناانصافی سے کام لے کر ایک ایسے مدمقابل کو دبایا اور آخر میں اس کا گلا گھونٹ دیا جس سے وہ برابر کے مقابلے کی تاب نہیں لا سکتے تھے۔ ہندوستانی صنعتوں کی تباہی اس دن مکمل ہوگئی جس دن یورپ میں مشینی کرگا ایجاد ہوا۔ اس کے بعد ہندوستانی قومی آمدنی کا واحد ذریعہ صرف زراعت ہوگیا۔ ہر پانچ میں سے چار ہندوستانی کا انحصار زراعت پر تھا لیکن برطانوی حکومت کا عائد کردہ قانونِ مال گزاری نے ان کے لیے مزید مشکلات پیدا کردیں۔ ۱۷۹۸ء سے پہلے ایک صدی تک انگلستان میں مال گزاری کی شرح ایک شلنگ سے چار شلنگ فی پاؤنڈ تک تھی جو کہ یہاں سے لی جانے والی لگان سے محض ۵ سے ۶ فی صد تک بنتی ہے[۴۰]۔ اس صورتِ حال میں ہندوستانیوں کا معاشی ابتری کا شکار ہونا کوئی اچنبھے کی بات نہیں۔ اٹھارھویں صدی عیسوی میں بالکل سطحی مشاہدہ بھی یہ دیکھ سکتا ہے کہ اس معاشی ابتری کی وجہ سے برعظیم پر مسلمانوں کی گرفت کیوں باقی نہیں رہی۔ ایک ادنیٰ درجے کے مسلمان پر بھی یہ دردناک حقیقت واضح ہوچکی تھی کہ جہاں کہیں مرہٹوں کے حملے ہوئے، ان کی زندگی یہاں تک کہ ان کی عزت وآبرو بھی محفوظ نہیں رہے گی۔ دہلی جو مسلمانوں کی قوت کا مرکز تھا اس کے نواح میں سکھوں اور جاٹوں کی غارت گری نے زندگی کو مخدوش اور غیر محفوظ بنا دیا تھا۔ مسلم امرا کی نمایاں خودغرضی کے باعث صفدر جنگ نے بادشاہ احمد شاہ کے خلاف بغاوت کرکے جاٹوں سے امداد طلب کی اور وہ انھیں دہلی کے نواح میں لے آیا۔ اس موقعے پر شاہ جہاں آباد کے باہر، اس علاقے کی آبادی جو اس زمانے میں پرانی دلّی کے نام سے مشہور تھا، شدید مصائب برداشت کیے، آبرو ریزی، قتل وغارت اور لوٹ مار اس علاقے کا مقدر ٹھہرا۔ طباطبائی کے مطابق بہت سوں نے خودکشی ہی میں پناہ لی۔ شاہ ولی اللہ نے اپنے متعدد مکتوبات میں اس ''مصیبت کبریٰ'' کا ذکر کیا ہے۔ یہ صورتِ حال ملّت کے وجود کو ختم کردینے کے درپے تھی مگر اس کے باوجود خود غرض عناصر اپنی سرگرمیوں سے باز نہیں آئے۔ کوئی امید کوئی مستقبل اور اس بیماری کا کوئی علاج دور دور تک سجھائی نہیں دے رہا تھا[۴۱]۔
مرزا جعفر علی حسرت نے اس صورتِ حال کی عکاسی کرتے ہوئے کہا کہ:

مٹے وہ چہچہے، سب کی گئی خوش الحانی | اسیرِ غم ہوئے یہ بلبلِ گلستانی
اب آب و دانے کی خاطر اٹھے ہے حیرانی | گہر فشانوں کی اب ہو چکی پر افشانی

کٹی وہ شاخ ہی کرتے تھے جس پہ سب گُزیال

نجیب تو ہوئے فاقوں سے اب سبھی انجور | رہی نہ چہرے پہ رونق، نہ ان کی چشم میں نور

جو اہلِ حرفہ ہیں، ان کا تو کچھ کیا مذکور | جنھوں کا کسب تھا ملاّئی، ان کا یہ دستور

کہ جاکے چوک میں دیکھیں ہیں ایک دمڑی پہ فال

معاش کیا کروں سوداگروں کی تم سے بیاں | گدھے کے مول ہے گھوڑا، خریدِ صد توماں

اگرچہ نسل عراقی ہو یا ہو از ایراں | یہاں سے پھیر ہی لے جائے زیرہِ کرماں

بتاوے پشم کی قیمت، اگر ہے کیسی شال

گراں نہیں ہے کوئی جنس، ہے گراں سوا ناج | اسی پہ آرہا محصول، بادشاہی خراج

سپاہی رہتے ہیں بنیوں کے رات دن محتاج | نہیں ہے سلطنت اور بنیوں کے ہے گھر میں راج

کہ مال دار ہوئے سارے بنیے اور بقال[۴۲]

میر تقی میر نے اس عہد کی بابت درست لکھا کہ:

اس عہد کو نہ جانیے اگلے سا عہد میر | وہ دور اب نہیں وہ زمیں آسماں نہیں[۴۳]

کمزور حکومتیں: محمد شاہ رنگیلا کا دورِ حکومت، نادر شاہی حملے

ایسے حالات میں انتشار کی ان طاقتوں کا ابھر کر سر اٹھانا فطری امر تھا جو اب تک سر چھپائے بیٹھی تھیں۔ معاشرے کی کمزوری، معاشی مسائل، بے روزگاری اور اتحاد کے پارہ پارہ ہونے کا منطقی نتیجہ نادر شاہ کی صورت میں ظاہر ہوا۔ اس دور میں امرا کی ریشہ دوانیوں، خودغرضیوں، سازشوں اور غداریوں کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ جب آصف جاہ نظام الملک نے نادر شاہ سے معاہدہ کر کے یہ طے کرلیا کہ نادر شاہ، محمد شاہ کو بحال رکھے گا اور محمد شاہ دو کروڑ بدلے میں اسے پیش کرے گا، تو برہان الملک سعادت خان نے یہ دیکھ کر کہ خانِ دوراں کی وفات کے بعد اب امیر الامرا کا عہدہ نظام الملک کو مل جائے گا[۴۴] نادر شاہ سے کہا کہ: محمد شاہ کے لشکر میں سوائے آصف جاہ کے دوسرا شخص حکم صادر نہیں کرسکتا اور یہ کہ دو کروڑ روپے اس کے لیے کیا حیثیت رکھتے ہیں۔ اس نے نادر شاہ کو بہکایا کہ محض اس قدر رکم دولت پر اس نے قناعت کرلی، دو کروڑ تو تنہا یہ غلام اپنے گھر سے دینے کا وعدہ کرتا ہے۔ شرط یہ ہے کہ شاہ جہاں آباد جو محض تیس چالیس کوس سے زیادہ مسافت پر نہیں، آپ وہاں تشریف لے چلیں[۴۵]۔ غرض اگر برہان الملک سعادت خان یہ غداری نہ کرتا اور نادر شاہ کو دہلی آنے کی دعوت نہ دیتا تو دہلی کی تباہی و بربادی کا یہ ہول ناک سانحہ پیش نہ آتا جس نے مغلیہ سلطنت کی کمر توڑ کر رکھ دی۔ نہ صرف مغلیہ سلطنت بلکہ اس حملے سے ہندوستان میں مرہٹوں کے تسلط کو روک کر تاریخ کو ایک نئی سمت پر ڈال دیا۔ یہ حملہ متعدد مشاہدین کی نظر مین قہر خداوندی سے کم نہیں تھا۔ نادر شاہ کے حملے نے دنیا کی نظر میں مغل سلطنت کی کمزوری کا پردہ بھی فاش کردیا۔ اسی حملے کے بعد باجی راؤ کی جانب سے نئے سیاسی طریقہ کار کا آغاز ہوتا ہے جس کے تحت مفاہمت کے ذریعے فوجی وفاق کے قیام کی ضرورت اور تمام طاقتوں کو تیموری جھنڈے تلے رکھنے کی تجاویز بھی شامل تھیں[۴۶]۔ مورخین نے نادر کو اس کی اکثر کارروائیوں خصوصاً دہلی کے قتلِ عام پر ملامت کی ہے اور اسے وحشی قرار دیتے ہوئے اس کے قتلِ عام کو چنگیز اور تیموری مظالم کے مماثل قرار دیا ہے جب کہ ہم عصر مورخ اس کی غیر معمولی صلاحیتوں کی وجہ سے اسے مستثنیٰ قسم کا آدمی سمجھتے تھے۔ ایک ایسے شخص کا جو غارت گر اور سارق ترکمانوں میں پیدا ہوا ہو، اس

درجے تک مستعدی، مستقل مزاجی، جفاکشی اورعزم راسخ کی صفات سے متصف ہونا کم تعجب کی بات نہیں۔ نادر نے اپنے آپ کو کبھی کسی شاہی خاندان کی یادگار نہیں بتایا بلکہ ہمیشہ اپنی تلوار کو نصرت وفتح اور نام وری کا ذریعہ ظاہر کیا۔ اسی لیے جب ہندوستان کے بادشاہ محمد شاہ کو شکست کے بعد اپنی لڑکی نادر شاہ کے بڑے لڑکے نصر اللہ کو بیاہنی پڑی تو دلہن والوں کی طرف سے اس اصرار کے بعد کہ دولھا نکاح کے وقت سات پشتوں تک اپنے باپ دادا کے ناموں کا اظہار کرے تو نادر نے اس مطالبے پر ہنستے ہوئے کہا کہ ''نصر اللہ نادر کا لڑکا ہے اور نادر شاہ شمشیر کا خلف الصدق ہے، اس طرح سات کیا ستر پشتوں تک نام گن جاؤ''۔ مورخ مرزا مہدی ''نادر نامہ'' میں لکھتے ہیں کہ مغول چنگیزی کی یورش کے زمانے میں یہ لوگ سرزمین ترکستان میں خیمہ زن تھے، لیکن مغول حملے سے تنگ آ کر آذربائی جان کے نواح میں نقل مکانی کی۔ مرزا مہدی کا ''نادر نامہ'' ۱۷۷۰ء میں فرانسیسی میں ترجمہ ہوا۔ مسٹر جیمز فریزر جو کہ نادر کے ہم عصر تھے، ایرانی اور دیگر دستاویزات و نیز چشم دید واقعات کی بنا پر ۱۷۴۲ء میں نادر شاہ کے حالات کو تاریخی پیرائے میں بیان کر چکے تھے۔ ان کے مطابق جنگ آرائی، شجاعت کے آثار اس کے ہاں اوائل عمری ہی میں پیدا ہو چکے تھے، محض پندرہ برس کی عمر ہی میں اس نے اپنی بہادری کے کارناموں سے صاحب اقبال ہونے کا ثبوت دے دیا تھا۔ اس کم عمری سے لے کر آخر عمر تک گھوڑے کی زین سے خود کو جدا نہ کیا۔ ۴۷ برس کی عمر میں پہنچنے تک ایک بہادر سپاہی کی حیثیت سے اس کی شہرت نہ صرف ایران بلکہ بیرونجات تک بھی پھیل چکی تھی۔ اس وقت تک وہ عملاً ایران کا بادشاہ بن چکا تھا اور اب ہندوستان پر حملہ آور ہونے کے خواب دیکھ رہا تھا۔ ابتدا میں نادر نے ہندوستان میں دو قسم کے قاصد بھیجے۔ اوّل سرکاری طور پر روانہ ہوئے اور دوم خفیہ ایجنٹ جن کو ہدایت تھی کہ وہ ہندوستان کے امرا اور سرداروں سے ملیں اور ناراض درباریوں کو اپنے ساتھ ملائیں۔ اس زمانے میں ہندوستان اپنی اندرونی انتشار کی وجہ سے پہلے ہی ابتری کا شکار تھا۔ دہلی کی حالت افسوس ناک تھی۔ جنوبی ہند میں مرہٹے نظام الملک کے اتحاد سے سلطنت دہلی کو صفحۂ ہستی سے مٹانے کے درپے تھے۔ مشرق کی جانب ہندوستان کے آئندہ فرماں روا یعنی انگریز، شاہ جہاں کی اجازت سے کالونیاں قائم کرتے جا رہے تھے۔ ۱۶۸۶ء تک وہ کلکتے پر قابض ہو چکے تھے۔ اس کے علاوہ باجی راؤ کے ماتحت مرہٹے غارت گری کی مہم جاری رکھے ہوئے تھے۔ دہلی کے نالائق عہدے داروں میں مرہٹوں سے نبرد آزما ہونے کی سکت باقی نہیں رہی تھی اور وہ آگرہ تک پہنچ چکے تھے۔ ۱۷۳۷ء تک تو مرہٹے قلب سلطنت تک پہنچ کر چاروں طرف سے تباہی و بربادی پھیلا رہے تھے۔ اسی دوران نظام الملک نے سعادت خان کے ساتھ مل کر سازش شروع کی اور دونوں طاقت ور امرا نے نادر شاہ کے ہندوستان آنے کی راہ ہموار کی۔ بدقسمت محمد شاہ کو اس بات کی خبر تک نہ ہوئی۔ ۱۷۳۸ء کو اس کے لشکر عظیم نے جلال آباد کے مشرق میں خیمے نصب کر دیے۔ یہ لشکر پشاور کے صوبے دار کو شکست دیتا ہوا دہلی اور شاہ جہاں آباد کی طرف روانہ ہوا۔ جہلم، چناب، وزیر آباد وغیرہ میں اسے معمولی مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا لیکن اس کی فوج فتح کے جھنڈے گاڑتی دہلی پہنچ گئی۔ نادری لشکر ایک بلائے ناگہانی کی طرح دشمن پر گرتے تھے۔ فریزر کے مطابق سوار اور پیدل سپاہ کی تعداد دو لاکھ تک تھی۔ بہ قول مرزا مہدی، جنگ میں بیس ہزار آدمی کام آئے اور اس سے زیادہ اسیر ہوئے۔ بہت سے ہاتھی، توپ اور مال و اسباب نادر کے ہاتھ لگا۔ اگر نادر چاہتا تو اس زرخیز ملک پر تیموری خاندان کے بہ جائے اپنی مستقل حکومت قائم کر سکتا تھا، مگر وہ صرف ہندوستان پر قابض نہیں رہنا چاہتا تھا۔ لہٰذا بادشاہ کو بحال کر کے واپس چلا گیا، لیکن جاتے جاتے وہ ہندوستان کے تمام خزائن، زر و جواہر ساتھ لے گیا۔ نادر کے مورخ لکھتے ہیں کہ اس قدر دولت تھی کہ دنیا کی تمام سلطنتوں کا اندوختہ بھی ایک جگہ جمع ہو تو اس کے دسویں حصے کو نہ پہنچے۔ اس نے باشندگانِ دہلی پر بھاری جرمانہ بھی لگایا۔ اس

طرح اس نے ۲۵ کروڑ تک وصول کیے۔ اس دوران چھوٹی چھوٹی باتوں پر ایرانی سپاہ دہلی میں دندناتے پھرتے، قتل عام کرتے، بڑی بڑی عمارتیں آناً فاناً مسمار ہوتیں۔ ہر طرف آہوں، سسکیوں اور نالہ وشیون کی صدا گونجنے لگی۔ جامع مسجد سے اجمیری دروازے تک تمام کے تمام لوگوں کو قتل کیا گیا۔ خاندان کے خاندان ہلاک کر دیے گئے۔ فریزر نے اس دوران مرنے والوں کی تعداد ایک لاکھ بیس ہزار تک بتائی ہے۔ روٹر نے دو لاکھ چالیس ہزار ہلاکتوں کا ذکر کیا۔ سر جان میلکم نے موخر الذکر کے اعداد کو قریب ترین بتایا ہے[۴۸]۔ اس واقعے میں نادر کے کل ۷۰۰ آدمی مارے گئے۔ نادر کے سپاہیوں نے قزلباشوں کو چن چن کر قتل کیا۔ سپاہیوں نے گھروں میں گھس کر لوٹ مار مچائی۔ مقتولین کی بیویوں اور بیٹیوں کو بھی ساتھ اٹھا کر لے گئے۔ متعدد مکانوں میں آگ لگا دی۔ بعد میں نادر نے عام معافی کا اعلان کیا لیکن اس کے باوجود گلی سڑی نعشیں کئی روز تک دلّی کی سڑکوں پر پڑی رہیں۔ ان سے تعفن اٹھتا رہا[۴۸]۔

احمد شاہ ابدالی کے حملے: دلّی کی بربادی کا سانحہ

۱۷۳۹ء میں تاریخ کی سفاکی نے ایک بار پھر اپنے آپ کو دہرایا۔ آشوب نے اس واقعے پر تبصرہ کرتے ہوئے اپنی تاریخ میں لکھا کہ خون بہانا تورانیوں کی فطرت ہے اور نادر خون ریزی میں چنگیز خان اور تیمور کا شاگرد ثابت ہوا۔ نادر کا قتل عام آج بھی ہندوستانیوں کو یاد ہے اور ''نادرشاہی'' کی اصطلاح آج بھی سفاکی اور بے رحمی کے لیے استعمال کی جاتی ہے[۴۹]۔ بعد میں احمد شاہ ابدالی نے بھی ۱۷۶۱ء میں پہلے لدھیانہ اور اس کے گرد و نواح کو اور پھر دلّی کو تخت و تاراج کیا۔ اس دورِ انحطاط اور عرصہ طوائف الملوکی کے لیے ''تاریخ سلطانی'' از سلطان محمد خان، ''خلاصۃ الاحوال'' از محمد علی، ''وقائع بدائع'' از آنند رام مخلص، ''سیر التواریخ'' از روشن علی خان میران پوری، ''تاریخ ہند'' از الفنسٹن حصہ اوّل، ''تاریخ سادات بارہہ'' از شیر علی خان، ''سفر بر نیر موج سلطانی''، ''مراۃ الافتاب نما''، ''سیر المتاخرین'' از غلام حسین طباطبائی، ''تاریخ مظفری'' از محمد علی، ''بیان واقع'' از عبدالکریم، ''تاریخ فارس'' از سالیکس، ''ماثر الامرا'' از نواب صمصام الدولہ شاہ نواز خان، ''نصائح نادر شاہ'' از لالہ بہاری لال، ''واقعات دارالحکومت دہلی'' از بشیر الدین، ''آثار الصنا دید'' از سر سید احمد خان، ''مفتاح التواریخ'' اور ''عمدہ التواریخ'' وغیرہ کا مطالعہ خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ ان تصانیف میں جہاں دلّی کے بادشاہوں کے عبرت انگیز احوال سامنے آتے ہیں، بلکہ اہل دلّی کی بربادی کے قیامت خیز واقعات کا بھی پتا چلتا ہے۔ نادر شاہ نے جس طرح سے سلطنت دہلی کے جسم سے سارا گوشت نوچ کر اسے ہڈیوں کا ڈھانچا بنا دیا، اس کی مثال کم ہی ملتی ہے۔ آخرش اس کا انجام بھی بدترین نکلا۔ ۱۱۴۰ھ میں اسی کے ایک ملازم نے اس کے برادر زادہ قلی خان کے اشارے پر بلایہ کوچوں کی حویلی میں جو مشہد ایران سے سہ منزل کے فاصلے پر ہے، ہلاک کر دیا۔ اور اس کا سر کاٹ کر علی قلی خان کے پاس بھیج دیا۔ کئی روز کے بعد اس کی نعش کو مقتل سے اٹھوایا گیا اور تقریباً پندرہ روز کے بعد دفن کیا گیا۔ یہ عبرت ناک انجام اس نادر شاہ کا ہوا جس کے حملے اور قتل عام سے ہندوستان کے مسلمانوں کی حکومتی ساکھ بالکل اکھڑ کر رہ گئی اور ابھی اس ظلم و ستم سے سنبھلی تک نہ تھی کہ ایک بار پھر احمد شاہ ابدالی کے حملے کی زد میں آ گئی۔ ابدالی نے رہی سہی کسر پوری کرتے ہوئے اس ہڈیوں کے ڈھانچے سے گودا (مغز) بھی نکال لیا۔ ''تاریخ سلطانی'' کے مصنف لکھتے ہیں کہ افغانوں کے لشکر کی بے انتظامی کی وجہ سے دہلی میں تین دن تک حشر برپا رہا۔ احمد شاہ نے علی محمد روہیلہ سے بھی ساز باز کر لی اور مغلیہ سلطنت کے دارالحکومت کی رہی سہی ساکھ بھی زمین بوس ہوگئی۔ احمد شاہ ابدالی کے حملوں سے بے شک مرہٹوں کا زور ٹوٹا لیکن مغل سلطنت کا پایہ تخت بھی منہدم ہو گیا۔ انگریز، فرانسیسی، مرہٹے، سکھ، جاٹ غرض ہر وہ فریق جو مغلوں اور مسلمانوں کے خلاف تھا، برسرِ پیکار ہو گیا اور مغلیہ سلطنت کی لاش سے گوشت نوچنے لگا۔

وہ دلّی جو عروس البلاد تھی، اب ایک مکروہ چہرے والی عورت تھی جس کو دیکھنے کے لیے حوصلہ چاہیے تھا۔ نادر شاہ اور احمد شاہ ابدالی کی تباہی کے بعد سکھوں نے، جاٹوں اور مرہٹوں نے اس کو جس طرح تباہ کیا وہ ایک الگ داستان ہے جس کی انتہا یہ ہے کہ مرہٹے شاہ عالم ثانی بادشاہِ دہلی کو قید کر کے لے گئے اور اپنے ساتھ ساتھ لیے پھرتے رہے۔ کل تک جو باج گزار تھے، آج سلطان بن گئے۔ دلّی کے لوگوں نے خصوصاً مسلمانوں نے ان وقتاً فوقتاً عذابوں کے دوران اپنی عزت بچانے کے لیے کیا کچھ نہیں کیا۔ آنند رام مخلص نے ''وقائع بدائع'' میں لکھا کہ '' کار جمع غفیر بہ زہر خوردن وکارد بہ شکم فرو بردن کشید'' یعنی ایک جم غفیر نے زہر کھا کر اور پیٹ میں چھری گھونپ کر اپنا کام تمام کر لیا۔ ''تاریخچہ نادر'' کے مصنف میور سکی نے لکھا کہ اس زمانے کے دلّی میں جہاں قحط، وبا اور غربت نے پہلے ہی پنجے گاڑ رکھے تھے، شہر کے لوگ چھوٹے، بڑے، دنیا دار، فقیر اس پر آشوب دور میں صبح سے کبھی کبھی شام تک اور کبھی پہر رات تک حملہ آور ظالم سپاہیوں کے حضور کھڑے رہتے اور رخصت ملنے پر بہ حالِ تباہ گھر آتے اور اسی خیال میں رات گزر جاتی کہ نہ جانے کل کیا ہوگا۔ قتل کیے جائیں گے یا زندہ بچیں گے۔ سکھوں نے الگ مسلمانوں کو اذیت میں مبتلا کر رکھا تھا۔ کوئی شہر ایسا نہ بچا تھا جو ان کے ظلم سے بچ سکا ہو۔ ان کی عبادت گاہیں ویران کرنے کے علاوہ مسلمانوں کو قبروں سے نکال کر جانوروں کے آگے ڈال دیتے۔ مولف ''واقعات درانی'' نے محمد معظم شاہ اور عالم بہادر شاہ کے زمانے میں سکھوں کے ہاتھوں مسلمانوں کی تباہی کا حال لکھتے ہوئے کہا کہ انھوں نے بہت سے مسلمانوں کو قتل کیا۔ بچوں اور عورتوں کو گرفتار کر کے ہلاک کیا اور مسلمان اولیا کی قبروں کو آگ لگائی۔ بعض مورخین نے یہ بھی لکھا کہ مسلمانوں کو زندہ آگ میں پھینک کر تڑپا تڑپا کر مارا جاتا۔ شیعہ سنی فساد کی آگ بھی اس زمانے میں خوب بھڑکی۔ قحط کی وجہ سے ہزاروں لوگوں کی ہلاکتیں بھی ہوئیں۔ ۱۱۴۰ء میں قحط کی وجہ سے ہزاروں لوگ لقمۂ اجل بنے۔ تاریخ کاشمیری کے مولف محمد اعظم نے اس موقع پر ایک ''مثنوی شہر آشوب'' بھی لکھی۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان ذبیحہ گاؤ کی بنا پر بدترین فسادات رہے۔ قصاب کے ساتھ ساتھ ہندوؤں نے مسلمانوں کے قتل عام کا بھی بندوبست کیا۔

اخلاقی پستی اور طوائف الملوکی کے اس عالم میں ملک کے اندر اور باہر نئے نئے فتنے سر اٹھانے لگے۔ ایک طرف مرہٹے پورے برصغیر پر اپنا راج قائم کرنے کے خواب دیکھ رہے تھے تو دوسری طرف مغربی سرحد سے خوف ناک آندھی ہندوستان کے دروازے پر دستک دے رہی تھی۔ یورپ کی تجارتی کمپنیاں بڑی گہری توجہ سے کرناٹک کو دیکھ رہی تھیں۔ اس کس مپرسی کی حالت میں ملک کی معیشت بھی تباہ و برباد ہو چکی تھی۔ سپاہیوں کو کئی کئی ماہ کی تنخواہوں کی عدم ادائیگی نے ان کے دل میں بھی بد دلی کی فضا پیدا کر دی تھی۔ انھوں نے اپنے ہتھیار، لباس اور جو کچھ ان کے پاس تھا، بیچ بیچ کر اپنے پیٹ کی آگ بجھانے کا بندوبست شروع کر دیا۔ فاقہ کشی کی حالت میں لوٹ مار کرنے سے بھی وہ دریغ نہیں کرتے۔ زوال وانحطاط کے اس زمانے میں اردو شاعری کو خوب فروغ ملا۔ میر ان تمام واقعات کے عینی شاہد تھے۔ نادر شاہ کے بعد احمد شاہ ابدالی کے ساتھ آنے والے وحشی اور اجڈ پٹھانوں کے ہاتھوں دہلی کی تباہی و بربادی کے مناظر نے میر تقی میر کو ہمیشہ مضطرب رکھا۔ وہ خود اس قلزم خوں سے گزرے اس لیے ان کے بیان میں جو صداقت اور دل برشتگی ہے وہ دوسرے شعرا کے ہاں نہیں [۵۱]۔ ''ذکر میر'' میں وہ اس صورتِ حال کی عکاسی کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

> شام کو منادی ہوئی کہ شاہ ابدالی نے سب کو امان دے دی ہے۔ رعایا میں سے کوئی پریشان نہ ہو۔ لوگ مطمئن تھے۔ لیکن تھوڑی رات گزرے درانیوں نے دستِ تطاوُل دراز کیا۔ شہر کو آگ لگا دی۔ گھروں کو

لوٹ کر جلا دیا۔ اگلی صبح صبحِ قیامت تھی۔ افغان اور روہیلے قتل و غارت میں مصروف ہو گئے۔ انھوں نے مکانوں کے دروازے توڑ ڈالے۔ لوگوں کی مشکیں کس لیں۔ اکثر کو جلا دیا یا ان کے سر کاٹ لیے۔ ایک عالم خاک و خون میں مل گیا۔ تین دن اور تین رات یہ ظلم جاری رہا۔ درانیوں نے کھانے اور پینے کی کوئی چیز نہ چھوڑی۔ انھوں نے چھتیں اور دیواریں توڑ ڈالیں اور لوگوں کے سینے زخمی کر دیے۔ اعیانِ سلطنت فقیر ہو گئے۔ وزیر و شریف عریاں اور کتخدایانِ بے نماں۔ ان میں سے اکثر مصیبت میں گرفتار اور کوچہ و بازار میں رسوا تھے۔ لوگوں کے بیوی بچے قید تھے اور قتل و غارت کا سلسلہ تھا کہ بلا روک ٹوک جاری تھا۔ افغان ذلیل کرتے، گالیاں دیتے اور طرح طرح کے ظلم کرتے تھے۔ جو چیز لوٹنے کو ملی لوٹ لی۔ بعضوں نے تو ستر پوس تک نہ چھوڑے۔ شاہ جہاں آباد خاک کے برابر ہو گیا۔ اس کے بعد یہ بے رحم پرانی دلی کی طرف متوجہ ہوئے اور بے شمار لوگوں کو ہلاک کر ڈالا۔ سات آٹھ دن تک یہی ہنگامہ گرم رہا[۵۲]۔

دسمبر ۱۷۴۷ء میں احمد شاہ ابدالی نے ہندوستان پر حملہ کیا۔ اس سے پہلے حملے کے وقت محمد شاہ نے اپنے لڑکے احمد شاہ کو اس کے مقابلے کے لیے بھیجا۔ شہزادہ احمد شاہ دشمنوں پر ''فتح خدا ساز'' حاصل کر کے لوٹا تو اسے محمد شاہ کے انتقال کی خبر ملی۔ انتہائی عجلت میں احمد شاہ کی تخت نشینی کا اعلان ہوا۔ اس زمانے کے حکم رانوں کے غیر سنجیدہ رویے کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ جس جانب سے افغان حملہ آور دہلی کی طرف بڑھتے تھے، احمد شاہ نے سلطنت کے انتظام کو گڑیوں کا کھیل سمجھتے ہوئے اپنے تین سالہ بیٹے محمود شاہ کو لاہور کا صوبے دار اور دو برس کے بچے کو اس کا نائب مقرر کیا۔ اسی طرح محض ایک برس کے بچے کو کشمیر کا صوبے دار مقرر کیا۔ اس کی تخت نشینی کے چوتھے برس ۱۷۵۲ء میں شاہی ملازموں نے اپنی تنخواہ کے لیے ایک بار پھر ہنگامہ کھڑا کیا۔ اس کے بعد صفدر جنگ کی معزولی اور چھے ماہ تک دلی اور گرد و نواح میں گزرنے والی آشوب قیامت نے لوگوں کی تکالیف میں اور اضافہ کر دیا۔ خانہ جنگی نے مصائب میں بے پناہ اضافہ کیا۔ لوگ پناہ کے لیے گلی کوچوں میں مارے مارے پھرتے رہے۔ صفدر جنگ کے جاٹ دستوں نے پرانی دلی کو بالکل اجاڑ کر رکھ دیا۔ ایک عرصے تک یہ ''جاٹ گردی'' جاری رہی۔ احمد شاہ کے جلوس کے چھٹے برس بندوقچیوں کی پندرہ ماہ کی تنخواہوں کی عدم ادائیگی کے باعث نماز جمعہ کی سواری کے لیے توپیں نکالنے سے انکار اور شاہی قلعہ پر محاصرے جیسے واقعات ہوں یا چار چار روز تک فیل خانے کے داروغہ کی یہ تاویل کہ چار چار روز تک فاقے کی وجہ سے ہاتھی سواری کا بوجھ اٹھانے کے قابل نہیں[۵۳]، اس طرح کے لاتعداد واقعات اس دور کے اندرونی اور بیرونی انتشار کو واضح کرنے کے لیے کافی ہیں۔ میر تقی میر نے یہ تمام حالات اپنی آنکھوں سے دیکھے اسی لیے ان کے تقریباً پورے کلام کو ہی بڑی آسانی سے آشوبیہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ انھوں نے اشعار کے پردے میں ایسے نغمے بھر دیے ہیں جو دل و دماغ پر سیدھا حملہ کرتے ہیں۔ ان نغمانی حملوں سے احساس اور شعور پر وہ گھاؤ لگتے ہیں جن میں عرصۂ دراز تک ٹیسیں اٹھتی رہتی ہیں۔ میر نے دہلی کو اپنے آنکھوں سے عروسی جوڑا اتار کر کفنی جوڑا پہنتے دیکھا تھا۔ جہاں دارا اور فرخ سیر کا قتل کانوں سنی باتیں تھیں تو احمد شاہ اور عالم گیر ثانی کی مذلّت اور تحقیر آمیز نام نہاد بادشاہی اور ان کی دردناک موت آنکھوں دیکھے واقعات تھے۔ اسی لیے میر نے شہر آشوبوں کے علاوہ غزلوں میں بھی ان انفرادی اور اجتماعی پریشانیوں اور دلی کی تباہی، بربادی اور ویرانی کے دردناک نقشے کھینچے۔ ان متفرق اشعار میں بڑی مشّاقی، چابک دستی اور فن کاری کا مظاہرہ ملتا ہے۔ انھوں نے اپنے احساسات، تاثرات اور مشاہدات کے اظہار کے لیے تشبیہیں،

اچھوتے استعارے اور منفرد علامتیں استعمال کی ہیں[۵۴]۔ ''ذکر میر'' کے مطالعے سے اچھی طرح اندازہ ہوجاتا ہے کہ میر جیسے قادرالکلام شاعر کو بھی تلاشِ معاش میں کس کس طرح کی اذیتیں اور مصیبتیں برداشت کرنا پڑیں۔ میر کے بہ قول ان کے دل میں جو ناسور تھا، اس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ:

گئے قیدی ہو ہم آواز جب صیاد آ ٹوٹا | یہ ویراں آشیانے دیکھنے کو ایک میں چھوٹا[۵۵]

میر نے دلّی اور دلّی کی نامرادی کو جن سانچوں میں ڈھالا ہے، ان کی ترکیب میں واقعاتی صداقت کے ساتھ ساتھ شعری بلاغت بھی موجود ہے۔ دلّی کے لٹنے، اجڑنے کے مناظر کو شعری علامتوں کی شکل میں جس خوبی سے میر نے اپنی غزلوں میں پیش کیا، کوئی دوسرا شاعر ہمیں ان کا ہم پلّہ نظر نہیں آتا۔ جیسے:

شہرِ دل ایک مدت اجڑا بسا غموں میں | آخر اجاڑ دینا اس کا قرار پایا
دل کی ویرانی کا کیا مذکور | یہ نگر سو مرتبہ لوٹا گیا
خرابی دل کی اس حد ہے کہ یہ سمجھا نہیں جاتا | کہ آبادی بھی یاں تھی یا کہ ویرانہ تھا مدت کا
اس کے گئے پہ دل کی خرابی نہ پوچھیے | جیسے کسو کا کوئی نگر ہو، لٹا ہوا[۵۶]

کبھی وہ دل کے لٹنے کو شہر کے لٹنے اور کبھی دل کے اندر لگی آگ اور اس سے بنتی راکھ کو شہر اور محلّوں کے جلے مکانوں سے مماثل قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

جل جل کے سب عمارت دل خاک ہوگئی | کیسے نگر کو آہ! محبت نے دی ہے آگ

اور کبھی ابدالیوں، مراٹھوں اور جاٹوں کی ستم انگیزیوں کو بیان کرتے ہوئے ان کے لشکر کو علامتی طور پر پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

دل کی آبادی کی، اس حد ہے خرابی کہ نہ پوچھ! | جانا جاتا ہے کہ اس راہ سے لشکر گزرا
خرابی دل کی کیا انبوہ درد و غم سے پوچھو ہو | وہی حالت ہے جیسے شہرِ لشکر لوٹ جاتا ہے[۵۷]

دلّی شہر سے ان کا یہ عشق جا بہ جا اپنے اظہار کے لیے نئے اسلوب تلاش کرتا ہے۔ یہ شہر جس طرح نت نئی آفتوں اور مصیبتوں کا شکار ہو کر ویران ہوا، یہاں کے اعلیٰ خاندان کے لوگ، فن کار، کاری گر اور ہنرمند دوسرے مقامات پر ہجرت کرنے پر مجبور ہوئے، اس بھرے پرے شہر سے انخلا کے یہ مناظر میر نے اپنی آنکھوں سے دیکھے۔ اس بارونق شہر کو چند ہی برسوں میں خالی ڈھنڈار دیکھ کر انھیں سخت ملال ہوتا ہے[۵۸]۔ وہ ان مناظر کو شعری علامت بناتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

میرؔ! ابتر بہت ہے دل کا حال | یعنی ویراں پڑا ہے گھر، افسوس
دل کی ویرانی کو پہنچا اپنے گویا چشمِ غم | دیکھتے ہی دیکھتے یہ شہر سب ویراں ہوا[۵۹]

اس شہر کے غم میں میر کا دل خون ہوا تھا۔ اسی لیے اس میں بہنے والے خون کی بوندیں جا بہ جا الفاظ کا روپ دھار کر اس تباہی و بربادی کے مضمون کو طرح طرح سے باندھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

ہم بھی اس شہر میں، ان لوگوں سے ہیں خانہ خراب | میرؔ! گھر بار جنھوں کا رہِ سیلاب میں ہیں
ان اجڑی بستیوں میں دیوار و در ہیں کیا کیا | آثار جن کے ہیں یہ، ان کا نہیں اثر کیا[۶۰]

میر کے یہی مشاہدات و تجربات ہیں جو انھیں غم کے قدر مشترک ہونے کا احساس دلاتے ہیں۔ مغل سلطنت کے عروج و زوال کی پوری داستان کو میر کے اس ایک شعر سے سمجھا جا سکتا ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

ہمارے دیکھتے زیرِ نگیں تھا ملک سب جن کا — کوئی اب نام بھی لیتا نہیں ان ملک گیروں کا
دلّی میں آج بھیک بھی ملتی نہیں انھیں — تھا کل تلک دماغ جنھیں تخت و تاج کا[۶۱]

معاشی اور اقتصادی پریشانیوں کے بیان میں بھی میر نے ''من وتو'' کی تمیز نہیں رکھی۔ وہ ان شعرا میں سے نہیں تھے جنھیں صرف اپنا ہی کیسہ خالی نظر آتا ہے۔ انھیں اس بات کا بھرپور احساس تھا کہ ان مالی مشکلات کا تعلق اجتماعی ہے۔ اسی لیے وہ کہتے ہیں کہ:

خوب رو اب نہیں ہیں گندم گوں — میر! ہندوستان میں کال پڑا
بلا قحطِ مروّت ہے کہ ہے محصول غلے پر — کہیں سے چار دانے لاؤ، لیویں جا بہ جا حاصل
کیا کہیے، اپنے عہد میں جتنے امیر تھے — ٹکڑے پہ جان دیتے تھے، سارے فقیر ہیں
کیا کہیں میر جی! ہم تم سے معاش اپنی عرض — غم کو کھایا کریں ہیں، لوہو پیا کرتے ہیں[۶۲]

میر کی کلیات میں شامل تین شہر آشوب بھی اس دور کے آشوب کو پیش کرتے ہوئے مختلف مناظر کا بیانیہ معلوم ہوتے ہیں۔ میر کے ایک شہر آشوب کا عنوان ''مخمس در حالِ لشکر'' ہے۔ اس میں ۱۹ بند ہیں۔ اس نظم میں شاعر نے لشکر کی حالت اور وہاں بھوک اور محتاجی کا شکار سپاہ کی حالت بیان کرتے ہوئے معاشی ابتری کا نقشہ کچھ اس طرح کھینچا ہے:

مشکل اپنی ہوئی جو بود و باش — آئے لشکر میں ہم برائے تلاش
آن کے دیکھی یاں کی طرفہ معاش — ہے لبِ ناں پہ سو جگہ پرخاش
نے دمِ آب ہے نہ چمچۂ آش

زندگانی ہوئی ہے سب پر وبال — کنجڑے جھینکیں ہیں روتے ہیں بقال
پوچھ مت کچھ سپاہیوں کا حال — ایک تلوار بیچے ہے ایک ڈھال
بادشاہ و وزیر سب قلاش

جیّے والے جو تھے ہوئے ہیں فقیر — تن سے ظاہر رگیں ہیں جیسے لکیر
ہیں مغدّب غرض صغیر و کبیر — مکھیاں سی گریں ہزاروں فقیر
دیکھیں ٹکڑا اگر برابر معاش

شور مطلق نہیں کسو سر میں — زور باقی نہ اسپ و اشتر میں
بھوک کا ذکر اقل و اکثر میں — خانہ جنگی ہے امن لشکر میں
نہ کوئی رند ہے، نہ کوئی اوباش

چار لچّے ہیں مستعدِ کار — دس تلنگے جو ہوں تو ہے دربار
ہیں وضیع و شریف سارے خوار — لوٹ سے کچھ ہے گرمیِ بازار

سو بھی قندِ سیاہ ہے یا ماش[۶۳]

غرض میر کی شاعری کو ہم اس دور کا عکس قرار دے سکتے ہیں۔ انھوں نے زوال آمادہ سلطنت دہلی کے انتشار، انحطاط، سپاہ کی مفلسی و قلاشی، عوام کی اقتصادی اور معاشی بدحالی اور زندگی کی بے کیفی اور بے اطمینانی کی جو تصویر کشی کی ہے وہ انھیں اس دور کا سچا ترجمان بنا دیتی ہے۔ میر نے ان شہر آشوبوں میں اپنے مخصوص انداز میں اس زمانے کے سیاسی و فوجی نظام کو پیش کیا ہے۔ وہ اس دور میں مختلف درباروں سے وابستہ رہے اور ان کے نظم و نسق کا قریب سے مشاہدہ کیا۔ ان کے اس مشاہدے کا نچوڑ یہ بے لاگ نظمیں ہیں۔ جرات کی قطعیت اور بے باکی ان نظموں کی خصوصیت ہے۔ خاص طور پر اقتصادی حالت کے بارے میں میر کا جو بیان ہے وہ اس دور کی معاشی ابتری کو پیش کرنے کے لیے کافی ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

آٹھ آنے ہیں شاہ پر بھاری — اس کی لوگوں نے کی ہے اب خواری

آپ ہے تو یہ ہے گرفتاری — فوج ہے گی تو قحط کی ماری

کیوں یہ جس جا رہے ہیں، واں تھا کال[۶۴]

میر کے یہ اشعار اس شاعرانہ حقیقت بیانی کی ایک کڑی ہے، جس کا سلسلہ میر جعفر زٹلی سے شروع ہوا۔ میر کا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے غزلوں میں بھی اس فتنے اور فساد کو موضوع بنایا۔ انھوں نے کہیں درد بھرے لہجے میں اور کہیں طنز کے پیرائے میں اپنے احساسات اور تاثرات کی ترجمانی کی۔ انھوں نے زٹلی، حاتم اور سودا کی طرح اپنے ہم عصروں اور مابعد کے فن کاروں کو یہ سبق دیا کہ زلف و رخسار اور چشم و دہن کے مضمون کی طرح سیاسی، معاشی اور معاشرتی پہلو بھی فن کار کی توجہ کے مستحق اور بیان کے لائق ہوتے ہیں[۶۵]۔

کسی ملک میں معاشی حالات کے ابتر ہونے کی صورت میں روزگار کے مواقع کم سے کم تر ہو جاتے ہیں اور لوگ فاقہ مستی دور کرنے کی غرض سے کاسہ گدائی اٹھانے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ شاکر ناجی بھی اس دور کے اہم شاعر تھے۔ اتفاق سے سپاہی پیشہ بھی تھے[۶۶]۔ مذکورہ صفحات میں ذکر کیا جا چکا ہے کہ ان سپاہیوں کو کئی کئی ماہ تک تنخواہ نہیں ملتی تھی۔ شاکر ناجی نے نادری حملے کا بہ نفس نفیس مقابلہ بھی کیا[۶۷]۔ برق نادری گرنے کے بعد شہر جس طرح تباہ و برباد ہوا، معاشرت جس طرح بگڑی اور دربار کا رنگ جس طرح پھیکا پڑا، ان تمام واقعات کو ناجی نے اپنی ایک طویل مخمس میں پیش کیا ہے۔ اس مخمس کی اہمیت دو وجوہ سے زیادہ ہے۔ اوّل تو یہ کہ اس کے مطالعے میں یہ حقیقت مترشح ہوتی ہے کہ آپس کی خانہ جنگی نے مرکزی طاقت کو کمزور کر دیا تھا اور امرائے سلطنت تعیش پسند ہو گئے تھے اور دوسری یہ کہ اس مخمس نے شہر آشوب کی روایت کو آگے بڑھایا[۶۸]۔ ناجی کی اس نظم کے محض دو ہی بند مختلف تذکروں میں درج ہیں۔ مولف ''مجموعہ نغز'' اور ''آب حیات'' نے بھی ان ہی دو بند کو نقل کیا ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

لڑے ہوئے نہ برس بیس ان کو بیتے تھے — دعا کے زور سے دائی دووں کے جیتے تھے

شرابیں گھر کی نکالے مزے سے پیتے تھے — نگاہ و نقش میں ظاہر گویا کہ چیتے تھے

گلے میں ہنسلیاں بازو اوپر طلائی نال

قضا سے بچ گیا، مرنا نہیں تو ٹھانا تھا — کہ میں نشان کے ہاتھی اوپر، نشانہ تھا

نہ پانی پینے کو پایا وہاں، نہ کھانا تھا　　ملے تھے دھان جو، لشکر تمام چھانا تھا
نہ ظرف و مطبخ و دوکاں نہ غلہ و بقال [۶۹]

اشرف علی فغاں بنیادی طور پر غزل کے شاعر تھے۔ وہ بادشاہ احمد شاہ کے رضائی بھائی بھی تھے۔ احمد شاہ درانی کے دہلی پر حملے کے بعد وہ دل برداشتہ ہوکر دلّی سے نکلے اور مرشدآباد پہنچے۔ وہاں سے فیض آباد ہوتے ہوئے عظیم آباد آئے۔ دربدری یہ ٹھوکر دراصل اس بگڑے ہوئے معاشرے اور غیر سیاسی نظم کی وجہ سے ان کا مقدر بنی [۷۰]۔ اسی لیے ان کی شاعری میں دربدری اور ہجرت کے کرب کو دیکھا جا سکتا ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

کوہ میں مسکن کبھی ہے اور کبھی صحرا کے بیچ　　خانۂ الفت ہو ویراں، ہم کو آبادی کے بیچ
پھر لیے جیو دامن میں فغاں لختِ جگر کو　　ہم خانہ بدوشوں کا سر انجام یہی ہے
دل بستگی قفس میں یہاں تک ہوئی مجھے　　گویا مرا چمن میں کہیں آشیاں نہ تھا [۷۰]

اٹھارھویں صدی کے پُرفتن دور کو فغاں نے اپنی غزلوں کے ذریعے معاشرے کا ترجمان بنایا۔ اپنے اردگرد کے ماحول کا بہ نظر غائر مطالعہ کرکے اور شاہِ دہلی کی قربت کی وجہ سے زوالِ سلطنت کا قریب سے مشاہدہ کرکے، قتل و غارت گری کے روح فرسا مناظر کو اپنی آنکھوں سے دیکھ کر انھوں نے ان تمام موضوعات کو اپنی فکر اور موضوعات کے سانچے میں ڈھالا۔ انھوں نے اپنے کلام کو اس دور کی آہ و فغاں اور زوال پذیر معاشرے کا ترجمان بنانے کے ساتھ ساتھ اس دور کی تلخ اور سچی تصویر بھی پیش کی ہے [۷۱]۔ ملاحظہ کیجیے:

در و دیوارِ چمن آج ہے خوں سے لبریز　　دستِ گل چیں سے مبادا کوئی دل ٹوٹا ہے
یاروں نے سن لیا ہے اسیری کے نام کو　　پہچانتے ہیں یہ نہ قفس کو نہ دام کو [۷۲]

سلطنتِ دہلی کے ضعف، فوج کی بدنظمی اور سپاہیوں کی حالت زار کا نقشا کھینچتے ہوئے انھوں نے اس انتشار زدہ معاشرے کا سارا پول کھول کر رکھ دیا ہے۔ علم سیاست کا کون سا طالب علم آج یہ نہیں جانتا کہ جب فوج مضبوط اور منظّم نہ ہو، اسے جملہ سہولیات حاصل نہ ہوں اور وہ نانِ جویں کی محتاج ہو تو ایسے حالات میں ملک و قوم کا دفاع ممکن نہیں رہتا۔ بیرونی حملوں کو روکنا، فاقہ زدہ سپاہیوں کے بس کا روگ نہیں [۷۳]۔ فغاں نے کچھ اسی قسم کی صورتِ حال کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ:

اعلیٰ سے تا بہ ادنیٰ جتنے ہیں گرسنہ ہیں　　لشکر میں ہوگئے ہیں بے اعتبار فاقے
کوئی اگر سپاہی سردار سے کہے ہے　　لینا خبر شتابی مرتے ہیں ہار فاقے
دیوان کے تو در پر دربان یوں کہیں ہیں　　کیا لکڑیوں کو کھاویں ہیں چوبدار فاقے
اقبال کے نشاں کو ادبار لے گیا ہے　　چٹ کر گئے پھریرے، ہیں باندار فاقے
کہتا ہے سارباں کو کیا میں شتر کو لادوں　　ہوں ایک دو بلا سے، ساری قطار فاقے [۷۴]

جاگیردارانہ معاشرے میں ہزاروں انسانوں کی معیشت کسی ایک فرد سے وابستہ ہوتی ہے۔ کسی ایک وزیر اور امیر کی بربادی اس کے متوسلین کے لیے بھی تباہی و بربادی کا پیغام بن کر آتی ہے۔ اردو شہر آشوبوں میں مغل بادشاہوں اور امرا کے افواج کی بربادی کا ذکر بہت موثر انداز سے کیا گیا ہے۔ ہتھیاروں کی کمی، گھوڑے اور ہاتھیوں کی لاغری اور طوائف الملوکی کے عسکری اسباب کا حال دیکھنا ہو

تو یہ شہر آشوب اس کا بہترین اور درست ترین حوالہ ہیں۔ ان شہر آشوبوں کے مطالعے سے اچھی طرح اندازہ ہوجاتا ہے کہ یہ بھوکے، ننگے اور بڑی حد تک غیر مسلح فوجی، ملکی سرکشیوں یا غیر ملکی حملہ آوروں کا مقابلہ کس طرح کر سکتے تھے۔ درگاہ قلی خاں جو آصف اوّل صوبے دار دکن کے ساتھ نادر شاہ کے حملے کے وقت دلّی آئے اور اسی طرح کچھ دوسری مہمات میں بھی شریک رہے [۷۵]، غذائی قلت، قحط اور معاشرتی ابتری کا حال اپنے ذاتی تجربے کی روشنی میں کچھ یوں بیان کرتے ہیں:

نہیں ہے تختۂ بازار پر اناج کی جنبش — نہ غلّہ بلکہ سبھی نقد و جنس ہے کمتر
گیہوں کی جنس ہے نایاب، مثلِ آدمِ خوب — مثالِ ہن نظر آتی نہیں ہے اب تو زہر
مگر ذخیرہ کیا ہوے ماش خوروں نے — ہے دال ان کی رکاکت پہ با کمال ہنر
ہوا ہے قحط سے دیکھو دو باجرا عالم — نہیں ہے ہمت اک جو کسی میں بل کمتر
غنی فقیر سبھی مبتلا ہیں رنج برنج — دھیان، ہوش نہیں ہے کسی میں سب مضطر
نکل گیا ہے رئیسوں کا بھی پلیتھن اب — تلاشِ دال اڑاتے ہیں دوڑتے گھر گھر
غرض کہ سخت مصیبت میں ہیں وضیع و شریف — غنی، فقیر سبھی احتیاج میں مضطر
علاوہ گولۂ توپ و تفنگ و زنبورک — صدائے بان سے سب کان ہوگئے ہیں کر [۷۶]

شاہ حاتم نے بھی اردگرد کے ماحول کی بھرپور عکاسی کی ہے۔ ان کا کلام بھی اپنے دور کا آئینہ دار معلوم ہوتا ہے۔ حاتم اردو کی سیاسی، قومی، ملّی اور معاشرتی نظموں کے فروغ اور ارتقا کا ذریعہ بنے۔ ان کا ایک شہر آشوب جو قطعے کی ہیئت میں ہے، اس زمانے کے سماجی حالات اور معاشی ابتری کا آئینہ دار ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

کیا بیاں کیجیے نیرنگِ اوضاعِ جہاں — کہ بیک چشم و زدن ہوگیا عالم ویراں
جن کے ہاتھی تھے سواری کو سو اب ننگے پاؤں — پھرتے ہیں جوتے کو محتاج پڑے سرگرداں
جن کے پوشاک سے معمور تھے توشے خانے — سو وہ پیوند کو پھرتے ہیں ترستے عریاں
ولے جو بے کار ہیں ان کا تو خدا حافظ ہے — ولے نہیں نام کو نوکر انھیں تنخواہ کہاں
پوچھتا کوئی نہیں حال کسی کا اس وقت — ہے عدم دہر کی آنکھوں سے مروت کا نشاں
گرم ہے ظلم کا بازار خدا خیر کرے — کہیں مظلوموں کے رونے سے نہ آئے طوفاں [۷۷]

مرزا محمد رفیع سودا نے بھی سپاہ کی حالت پر افسوس کا اظہار کیا ہے۔ اردو میں ہجوگوئی کو رواج دینے کا سہرا انھیں کے سر ہے [۷۸]۔ وہ زندگی بھر قصیدے کی صورت میں امرا اور روٴسا کی تعریف و توصیف کے پل باندھتے رہے لیکن اورنگ زیب کی وفات کے بعد رونما ہونے والے سیاسی حالات اور سماجی تنزل نے انھیں خاموش بیٹھنے نہیں دیا۔ ان کا مندرجہ ذیل شعر اپنی جگہ اس پورے دورِ تنزل کی تاریخ ہے [۷۹]۔ ملاحظہ کیجیے:

کہ ایک شخص ہے بائیس صوبوں کا مالک — رہی نہ اس کے تصرف میں فوج داری سوں [۸۰]

سلطنتِ دہلی کی مرکزیت کے خاتمے یا صوبے کی سطح پر خود مختاری کے اعلان نے بہ ظاہر بائیس صوبے والے ہندوستان کو قلعۂ

معلیٰ تک جس طرح محدود کر دیا تھا، مذکورہ شعرا اس سانحے کی جانب واضح اشارہ ہے۔ سودا نے ہم عصر شعرا کی طرح ملک کی اقتصادی حالت، عوام کی بے اطمینانی، بے سروسامانی، سیاسی عدم استحکام اور قتل و غارت گری کے مناظر کو اپنے فکر وفن کا موضوع بنایا[۸۱]۔ ان کی شاعری اس دور کی موثر ترین آواز ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

گھوڑا لے اگر نوکری کرتے ہیں کسو کی | تنخواہ کا پھر عالمِ بالا پہ مکاں ہے
گزرے ہے سدا یوں علف و دانہ کی خاطر | شمشیر جو گھر میں تو سپر بنیے کے یہاں ہے[۸۲]

سودا نے اس ہجو میں سپاہیوں، قاضی، موذن، خطیب، مصاحب، طبیب، سوداگر، وکیل، کسان، شاعر، ملائی، کاتب، خطاط غرض کہ زندگی کے مختلف پیشوں سے وابستہ افراد اور ہنرمندوں کی بے توقیری کا نقشا کچھ اس طرح سے کھینچا ہے کہ ہمیں ان سے ہم دردی ہونے لگتی ہے۔ ''مخمس درویرانیِ شاہ جہاں آباد'' میں تو وہ طنز کے نشتر برساتے ہوئے معاشرے کے المیے کو کچھ اس طرح پیش کرتے ہیں:

سپاہی رکھتے تھے نوکر، امیر دولت مند | سو آمد ان کی تو، جاگیر سے ہوئی ہے بند
کیا ہے ملک کو مدت سے سرکشوں نے پسند | جو ایک شخص ہے، بائیس صوبے کا خاوند
رہی نہ اس کے تصرف میں فوج داری کول

قوی ہیں ملک میں مفسد، امیر ہیں سو ضعیف | ٹکے کہاں، جو ہمیں دے کے ہوں، انھوں سے حریف
نہ کچھ ربیع میں حاصل، نہ درمیانِ خریف | جو عامل اب ہیں محلات پر، سو یوں ہیں حفیف
کہ جس طرح کسی حاکم کے گھر گنوار ہوں اُول

جو اصطبل میں کئی گھوڑے ہیں، سو کیا امکان | کہ ہووے گھاس کے پٹھے کا، ان کے آگے نشان
کسی کی ٹوٹی ہے ٹنگری، کس کا جھڑ گیا کان | طویلہ اس کو کہوں یا میں، پنج پیر کا تھان
اسی خیال میں رہتی ہے عقل ڈانواڈول[۸۳]

یہ معاشی بحران بھی کوئی ایک دن میں نہیں آیا۔ زراعت کے شعبے میں جہانگیر کے عہد سے مال گزاری کے نظام میں جو انتشار پیدا ہوا تھا۔ خالصا مرکز میں زمینوں کی تعداد میں اضافے کی وجہ سے آمدنی کم سے کم ہوتی رہی۔ اٹھارھویں صدی میں اس مسئلے نے شدت اختیار کر لی۔ جاگیروں کی کمی اور جاگیرداروں کی تعداد میں اضافے نے معاشی بحران کو مزید بڑھایا۔ اورنگ زیب کے عہد تک جاگیرداری نظام تقریباً ناکام ہو چکا تھا۔ نادر شاہ کے حملے کے بعد تو جاگیرداروں پر سے شاہی دبدبہ بھی ختم ہو گیا۔ انھوں نے اپنے اپنے علاقوں کی زائد آمدنی شاہی خزانے میں جمع کرنے کے بہ جائے اپنے استعمال میں لانی شروع کر دی[۸۴]۔ خلیق احمد نظامی کے مطابق:

> بڑے بڑے جاگیردار ایک طرف حکومت کو ٹیکس ادا کرنے سے گریز کرتے تھے۔ دوسری طرف غریب کاشت کاروں کا خون چوستے تھے۔ ان کا وجود حکومت کے لیے پریشان کن اور کاشت کاروں کے لیے ایک بلائے آسمانی کی مانند تھا۔ چھوٹے چھوٹے منصب داروں کی حالت مختلف تھی۔ انھیں کوئی لگان دینے پر آمادہ نہیں ہوتا تھا...ان حالات میں ہر طبقہ پریشان اور اقتصادی بدحالی میں مبتلا تھا[۸۵]۔

ستیش چندر کے مطابق اس زمانے کی پیداوار پہلے کی نسبت کافی کم ہو چکی تھی۔ بہادر شاہ کے دور حکومت میں جاگیرداری کی

رسم کا خطرہ اور بھی بڑھ گیا۔ بہادر شاہ نے امیروں کو بڑے بڑے منصب اور ترقی دے کر حالات کو اور بھی پے چیدہ بنا دیا۔ خانہ جنگی نے بھی مالی مشکلات کو مزید ابتر بنا دیا تھا[۸۶]۔ بہادر شاہ کی حد سے زیادہ فیاضی، جہاں دار کی عیش وعشرت اور محمد شاہ کی غلط پالیسیوں نے معاشی حالت کو پہلے سے زیادہ خراب کر دیا۔ شاہ ولی اللہ کا کہنا ہے کہ نوکرانِ بادشاہ جن کی تعداد ایک لاکھ سے زائد تھی، ان میں پیادہ و سوار بھی تھے، اہلِ نقدی و جاگیر دار بھی تھے، بادشاہوں کی غفلت کی وجہ سے نوبت یہاں تک پہنچی کہ جاگیر دار اپنی جاگیر پر عمل دخل نہیں پاتے۔ جب خزانہ بادشاہ کے پاس نہ رہا، نقدی موقوف ہوگئی۔ آخر کار سب ملازمین تتر بتر ہوگئے اور کاسۂ گدائی اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ سلطنت کا بجز نام کے اور کچھ باقی نہ رہا۔ جب ملازمینِ بادشاہ کا یہ برا حال ہے تو تمام دیگر اشخاص کے حال کو جو کہ وظیفہ خوار، سوداگر یا اہل صنعت ہیں، انھیں پر قیاس کر لینا چاہیے کہ کس حد تک خراب ہو گیا ہوگا[۸۷]۔ مغل سلطنت کی اس معاشی ابتری کو اردو شعرا نے بھرپور طریقے سے موضوع بنایا۔ سودا نے ان حالات کی منظر کشی کرتے ہوئے کہا کہ:

مچا رکھی ہے سلاطینوں نے، یہ تو بہ دھاڑ — کوئی تو گھر سے نکل آئے ہے، گریباں پھاڑ
کوئی در اپنے پہ آوے، دے مارتا ہے کواڑ — کوئی کہے ہے جو ہم ایسے چھاتی کے ہیں پہاڑ
تو چاہیے کہ ہمیں سب کو، زہر دیجیے گھول[۸۸]

مصحفی نے شاہی گھرانوں کی خستہ حالی بیان کرتے ہوئے لکھا کہ:

احوالِ سلاطین کیا لکھوں کیا میں خرابی — یعنی کہ مہ عید اب ان کو لبِ ناں ہے
فاقوں کی زبس مار ہے بے چاروں کے اوپر — جو ماہ کو آتا ہے وہ ماہِ رمضاں ہے[۸۹]

عام لوگوں کی زندگی کی حالت جس قدر تکلیف دہ ہوگی اس کا اندازہ امرا اور سلاطین کی معاشی بدحالی سے لگایا جا سکتا ہے جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جعفر علی حسرت کا کہنا ہے کہ:

رہے بچارے سلاطین کا حال سو کیا — کسی کے مرنے کی نوبت کوئی پڑا ہے نڈھال[۹۰]

بادشاہ احمد شاہ کے عہد میں منصب داروں سے لے کر چھوٹے چھوٹے ملازمین تک کو تین تین برس تک تنخواہوں کی عدم ادائیگی نے جو صورتِ حال پیدا کی، اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جعفر علی حسرت نے جو نقشا کھینچا ہے وہ تصویرِ عبرت ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

وہ شہ شہپر کے انجم نمط سی جس کی سپاہ — سو اس کی ڈیوڑھی پہ کئی پیارے ہیں بحالِ تباہ
سو مارے فاقوں کے مرتے ہیں چھٹانے تنخواہ — کہیں ہیں ہم کو ملے کیا خوراک خاص کو آہ
سحر کو تب ہو جو بھیجے کروڑ یا کتوال[۹۱]

اقتصادی بدحالی کے بعد بادشاہ کی بیگمات اور شہزادے محل کا ساز وسامان بیچ بیچ کر گزارہ کر رہے تھے[۹۲]۔ ان حالات کے بیان میں مصحفی کا کہنا تھا کہ:

گل جائے زباں میری کروں ہجو گر ان کی — یہ تنگ معاشی کا سلاطیں کی بیان ہے[۹۳]

جادو ناتھ سرکار نے شاکر خاں کے حوالے سے لکھا ہے کہ ''احمد شاہ'' کے گدی نشین ہوتے ہی حالات اس قدر ابتر ہو چکے تھے کہ شاہی دربار میں جو بھی اشیاء تھیں، اس کی فہرست بنائی گئی اور یہ اشیاء دکان داروں کو بیچی گئی اور حاصل ہونے والی تنخواہ سے فوج کی

تنخواہ چکائی گئی۔ان اشیاء میں قالین، برتن، تھالیاں، کتابیں، بینڈ باجوں اور کارخانے کا سامان شامل تھا [۹۴]۔ بادشاہ کے ساتھ ساتھ امرا کی حالت بھی کافی پتلی ہو چکی تھی۔اس عہد میں امرا کی جاگیروں پر مرہٹوں، جاٹوں اور سکھوں کے قبضے نے آمدنی کے تمام ذرائع بند کر دیے تھے۔ان امرا سے وابستہ ہر فرد مفلسی کی زندگی گزارنے پر مجبور تھا۔ان کی جاگیریں بے اثر و بے توقیر ہو چکی تھیں۔لگان وصول کرنا تقریباً ناممکن ہو چکا تھا۔اس صورتِ حال پر سودا کا کہنا تھا کہ:

قوی ہیں ملک میں مفسد امیر ہیں سوضعیف ٹکے کہاں جو ہمیں دیکھے ہوں انھوں سے حریف

نہ کچھ ربیع میں حاصل نہ درمیان خریف [۹۵]

سلاطین کی رہائش گاہیں اونچی دیواروں میں گھری ہوئی ہیں تاکہ کوئی ان کے اندرونی حالات پر نظر نہ ڈال سکے۔ان کے درمیان لاتعداد جھونپڑیاں ہیں جن میں ذلت کے مارے لوگ رہتے ہیں۔جب کبھی قلعہ کا دروازہ کھلتا ہے تو غریب، مفلس، نیم برہنہ اور بھوکے لوگوں کا ہلہ ہوتا جو ارد گرد کھڑا ہو جاتا۔یہ بچپن سے یہاں قید ہیں، ان میں کچھ تو جوان ہیں، کچھ بادشاہ کے بچے ہیں جن کی مائیں یا تو مر چکی ہیں یا ٹھکرا دی گئی ہیں [۹۶]۔اس طرح شاہی خاندان کے وہ لوگ جو روٹی کو بھی محتاج ہو چکے تھے، ان کے بیان میں راسخ کے یہ اشعار ملاحظہ کیجیے:

بیان کیا ہو بے مہریِ آسماں ہیں اہلِ زمین اس کے ہاتھوں بہ جاں

شہوں کو بھی اس نے گدا کر دیا غمِ فقر میں مبتلا کر دیا [۹۷]

اٹھارھویں صدی میں سوائے کچھ امرا کے سب ہی کی معاشی حالت بے حد خستہ تھی۔زیادہ تر امرا قرض کے بوجھ تلے دبے ہوئے تھے۔مورخین کے علاوہ شعرا کے بیانیے سے بھی اس بدترین اقتصادی بدحالی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔حاتم نے امرا کی معاشی پس ماندگی کا ذکر کرتے ہوئے درست کہا کہ:

جنھوں کے محل تھے ان کو کھنڈر کے لالے ہیں جہاں میں صاحبِ خس خانہ گھاس والے ہیں [۹۸]

سترھویں صدی کے اواخر میں ہونے والے اقتصادی بحران کا سب سے زیادہ اثر نچلے درجے کے امرا پر پڑا۔امرا اور بادشاہ کی اقتصادی کی زبوں حالی کے باعث شعرا کی سرپرستی بھی مفقود ہو گئی۔نادر شاہ درانی کے حملے کے بعد حالت مزید ابتر ہو گئی۔سودا نے منصور علی خاں نامی ایک منصب دار کا ذکر کیا جس کا سات ہزار کا منصب تھا لیکن وہ بھی اس اقتصادی بحران کا شکار ہو کر کس کیفیت کا شکار تھا، وہ سودا کی زبانی ملاحظہ کیجیے:

بالفرض اگر آپ ہوئے ہفت ہزاری یہ شکل بھی مت سمجھیو تو راحتِ جاں ہے

ٹک دیکھنا منصور علی خاں جی کا احوال چھاتی پہ کڑک بجلی ہے اور شیرِ دہاں ہے [۹۹]

خزانہ خالی ہو اور تنخواہ تک دینے کے پیسے نہ ہوں تو پھر مملکت اور ریاست کی حفاظت کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔لہٰذا اس زمانے میں ملک جس طرح سے سیاسی عدم استحکام کا شکار ہوا، اس کی جڑیں اسی معاشی ابتری میں تلاش کی جا سکتی ہیں۔نظیر نے سپاہیوں اور سواروں کی حالت کے بیان میں اس دور کے تلخ حالات کی منظر کشی کرتے ہوئے درست لکھا کہ:

ایسا سپاہ مرد کا دشمن زمانہ ہے روٹی سوار کو ہے نہ گھوڑے کو دانا ہے

تنخواہ نہ طلب ہے نہ پینا نہ کھانا ہے　　　پیادے دوال بند کا پھر کیا ٹھکانہ ہے

در در خراب پھرنے لگے جب نقار بند[۱۰۰]

نادر شاہ کے حملوں کے بعد ابدالی کے حملوں نے مغل سلطنت کے رہے سہے وقار کو بھی مٹی میں ملا دیا۔۱۷۴۷ء سے ۱۷۶۹ء تک ابدالی کے نو حملوں کی وجہ سے مغل سلطنت کی حالت دگرگوں ہوتی چلی گئی۔ احمد شاہ کا پہلا حملہ ۱۷۴۷ء عام طور پر ہندوستان کی تاریخ میں بد امنی اور بے اطمینانی کا دور دورہ تھا۔ ابدالی سپاہ کے ہاتھوں شرفا کی بہو بیٹیوں کی عزت و عصمت بھی خطرے میں رہتی تھی۔ دوسری مرتبہ ابدالی ۱۷۵۰ء میں پنجاب پر حملہ آور ہوا۔ صفدر جنگ نے مقابلے کے لیے مرہٹوں سے مدد حاصل کی جو بے نتیجہ ثابت ہوئی۔ اس حملے میں سیال کوٹ، گجرات، اورنگ آباد اور پسرور کے چاروں محال جن کی سالانہ آمدنی ۱۴ لاکھ روپے تھی، ابدالی نے قبضے میں لے لیے۔ تیسرا حملہ ۱۷۵۱ء میں ہوا جس میں معین الملک نے جاں بخشی کے عوض ۱۰ لاکھ روپے کی ادائیگی کی۔ چوتھا حملہ ۱۷۵۲ء میں ہوا جن کے بعد کشمیر بھی ابدالی کے قبضے میں چلا گیا۔ میر نے ابدالی کے چوتھے اور پانچویں حملے کے بارے میں امتیاز نہیں کیا۔ ۱۷۵۷ء کے پانچویں حملے میں ابدالی خود نہیں آیا بلکہ اپنے مغرور طاقت ور وزیر عماد الملک غازی الدین سے نجات حاصل کرنے کے لیے عالم گیر ثانی سے خود اسے بلوایا[۱۰۱]۔ اس موقع پر ابدالی کی سپاہ نے جو مظالم اور جبر و تشدد کیے تھے، ان کی دردناک تصویر اس زمانے کے لٹریچر میں تفصیل سے ملتی ہے۔ اس حملے میں خود میر کا مکان بھی منہدم ہوا تھا۔ میر نے ان واقعات کا حال بڑے دل دوز پیرائے میں لکھا۔ اس دور کے کم و بیش تمام ہی شعرا نے دہلی کی تباہی و بربادی کا ماتم کیا ہے۔ شہر آشوب کی صورت میں ان کے جذبات اور تاثرات کا بیان مذکورہ صفحات میں کیا جا چکا ہے۔ سماجی اور سیاسی اعتبار سے سودا، حاتم، جعفر علی حسرت، میر تقی میر اور قائم چاند پوری وغیرہ کے شہر آشوب خاص اہمیت کے حامل ہیں۔ سودا نے دہلی کی ویرانی کی بابت کہا کہ:

سخن جو شہر کی ویرانی سے کروں آغاز　　　تو اس کو سن کے کریں ہوش چغد کے پرواز

نہیں وہ گھر، ہو جس میں شغال کی آواز　　　کوئی جو شام کو مسجد میں جائے بہرِ نماز

تو واں چراغ نہیں ہے، بجز چراغِ غول

خراب ہیں وہ عمارات کیا کہوں تجھ پاس　　　کہ جس کے دیکھے سے جاتی رہی تھی بھوک و پیاس

اور اب جو دیکھو تو دل ہوئے زندگی سے اداس　　　بجائے گل چمنوں میں کمر کمر ہے گھاس

کہیں ستون پڑا ہے، کہیں ڈھے مرغول[۱۰۲]

اس زمانے میں جعفر علی حسرت نے اپنے کلام میں سماج کے گھناؤنے اور ناپسندیدہ گوشوں کو بے نقاب کرنے اور اس ہیجان و انتشار کو شعر کا مضمون بنانے کا راستہ اختیار کر کے معاشرے سے اپنی گہری وابستگی کا ثبوت دیا۔ انھوں نے مخمس در احوال شاہ جہاں آباد میں ابدالی کے حملوں کے باعث دلّی میں جو بربادی پھیلی تھی، اس کا تذکرہ کرتے ہوئے اس عہد کا پورا نقشہ ہمارے سامنے پیش کر دیا ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

نہیں ہے مرثیے سے کم جہاں آباد کا حال　　　اگر لکھوں تو قلم نالہ زن ہونے کی مثال

ہر آپ رووے ہے رکھ منھ ابر سے رومال　　　کیا غنیم کے لشکر نے یوں اسے ویراں

کہ جیسے بادِ خزاں سے ہو حالت بستاں
نہ سیلِ حادثہ لاوے کسی پہ یوں طوفاں

گزر گیا ستم افغاں کے ظلم سے جو وہاں
فغاں کہ ہو گیا یہ کشت سبز سب پامال

جو ترشے سرو کی صورت تھے اور شکل ہلال
جہاں کی جان تھا یہ شہر جسم تھا عالم

دیا اسی ہی کو عالم کا اس فلک نے غم
اب اس کے غم کی خرابی سے آہ مرتے ہیں ہم

کدھر گئے وہ رفیق اور کدھر گئے ہم دم
کہ دور ہوتا تھا دیکھے سے جن کے رنج وملال [۱۰۳]

ان وحشی اور بے قابو پٹھانوں کے ہاتھوں دہلی نے تباہی و بربادی کے جو بھیانک مناظر دیکھے، اسے پڑھ کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ۱۷۵۷ء دلّی والوں کے لیے بڑے آلام ومصائب کا سال تھا۔ پہلی سہ ماہی میں ابدالی کی سپاہ نے ان کا خون نچوڑا۔ دوسری سہ ماہی نجیب کے فوجی اخراجات کا بوجھ برداشت کرنے میں گزری اور اس کے بعد مرہٹہ توپ خانے نے دلّی کی رہی سہی عمارتوں کو پیوندِ زمین کر دیا۔ نظم ونسق کی ابتری سے شہر میں چوری اور ڈاکا زنی وبائی صورت اختیار کر گئی۔ اقتصادی بدحالی نے ادنیٰ واعلیٰ سب کو زندگی سے بیزار کر دیا۔ شہر کے کوتوال اور عہدے دار بھی ان چوروں اور ڈاکوؤں کے پشت پناہ بنے ہوئے تھے [۱۰۴]۔ مصحفی نے ان حالات کی منظر کشی کرتے ہوئے کہا کہ:

اطراف میں دلّی کے یہ لٹھ ماروں کا ہے شور
جو آوے ہے باہر سے وہ بشکستہ وہاں ہے

اور پڑتے ہیں راتوں کو جو نت شہر میں ڈاکے
باشندہ جو واں کا ہے بہ فریاد و فغاں ہے

بیداد سے نائب کی یہ احوال ہے واں کا
ہر روز نیا قافلہ پورب کو رواں ہے

دو چار تلنگے جو کھڑے رہتے ہیں ان سے
بس قلعے کے نیچے ہی ٹک اک امن واماں ہے

جز دیدۂ گریاں نہیں منبع کسی گھر میں
ناسور ہے سینے کا اگر آبِ رواں ہے

خوں ریزی ہی اس خاک پہ رہتی ہے ہمیشہ
اب سنگ بھی واں ہے تو یہی سنگِ فساں ہے

اس شہر کے باشندوں سے جا کر کوئی پوچھے
جز خونِ جگر کچھ بھی غدائے دل و جاں ہے

اے مصحفی اس کا کروں مذکور کہاں تک
ہے صاف تو یہ گلشنِ دلّی میں خزاں ہے [۱۰۵]

دلّی پر مرہٹوں کے علاوہ چوراچکوں کا قبضہ تھا اور یہ بات مصحفی کے لیے ناقابلِ برداشت ہو چکی تھی۔ سندھیا نائب شاہ تھا اور مسلمانوں پر اس کے مظالم کا یہ عالم تھا کہ مہاجروں کے قافلے ہر صبح جامع مسجد کے میناروں کو حسرت سے تکتے ہوئے دور دراز نامعلوم منزل کی طرف روانہ ہو جاتے۔ مصحفی نے اس شہر آشوب میں جس طرح ان مناظر کو پیش کیا ہے اس میں کوئی دوسرا ان کا شریک نہیں [۱۰۶]۔ اس عہد کے تلخ حقائق کو جس طرح مصحفی نے پیش کیا اس کا اندازہ مندرجہ ذیل اشعار سے بھی لگایا جا سکتا ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

کہتی ہے اسے خلقِ جہاں سب شہِ عالم
شاہی جو کچھ اس کی ہے سو عالم پہ عیاں ہے

اس شہر کا جس دن سے ہوا سندھیا حاکم
چوروں کی وہاں سیندھ سے ہر ایک نگراں ہے [۱۰۷]

ظاہری بات ہے کہ نام کے بادشاہ کا اثر ورسوخ قلعے کی حدود میں بھی نہ رہا تھا۔ غلام قادر روہیلہ نے نہ صرف بادشاہ کے ساتھ بدکلامی کی بلکہ سینے پر چڑھ کر اپنے خنجر سے اس کی آنکھیں تک نکال لیں اور باقی عمر اسے تڑپنے کے لیے چھوڑ دیا۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی

کا بیان ہے کہ غلام قادر روہیلہ کے ہاتھوں شاہ عالم پر جو گزری اسے مرزا جعفر علی حسرت نے اپنی آنکھوں سے دیکھا اور ان واقعات کو ایک دردناک نظم میں بیان بھی کیا ہے[۱۰۸]۔ غرض کہ اٹھارھویں صدی میں ملک کا ادبار و انحطاط اپنی آخری حد تک پہنچ چکا تھا۔ حکم رانوں کی بے بسی اور لاچاری کا جب یہ عالم ہو تو رعایا کی تباہی اور فلاکت کا اندازہ خوب اچھی طرح لگایا جا سکتا ہے[۱۰۹]۔ مصحفی نے اس دور کی ویرانی اور دلّی کی تباہی کے مناظر کے بیان میں کہا کہ:

دلّی ہوئی ہے ویراں سونے کھنڈر پڑے ہیں — ویران ہیں محلے، سنسان گھر پڑے ہیں

دیکھا تو اس چمن میں بادِ خزاں کے ہاتھوں — اکھڑے ہوئے زمیں سے کیا کیا شجر پڑے ہیں

بلبل کا باغ باں سے اب کیا نشان پوچھوں — بیرونِ درچمن کے، یک مشتِ پر پڑے ہیں[۱۱۰]

احمد شاہ ابدالی کی فوج کے اسّی ہزار سوار جنھوں نے غارت اور لوٹ کام کا بازار گرم کر رکھا تھا، جہاں جہاں سے گزرے سب کچھ تباہ و برباد کر ڈالا۔ مال و متاع کی لوٹ مار کا عالم یہ تھا کہ ایک مریل ٹٹو بھی انھوں نے کسی کے پاس نہ چھوڑا[۱۱۱]۔ قائم چاند پوری نے اس صورتِ حال کا نقشہ کھینچتے ہوئے کہا کہ:

شہر داخل ہوا جب ابدالی — دیکھ درانیوں کا چہرہِ رفت

ایک شش و پنج میں تھی خلقِ خدا — کہ کہیں ہو نہ اون سے ہشت وہفت

نہ فقیروں کو چھوڑتے تھے کلاہ — نہ امیروں کا جامہِ زر بفت

شاہ از تخت گاہِ دہلی رفت[۱۱۲]

اس عہد کے شعرا نے اس وقت کے سانحات کو مختلف اصناف میں پیش کیا۔ شہر آشوب، مثنوی، قصیدہ، قطعہ، رباعی، مخمس اور مسدس کی صنف کے علاوہ غزلوں میں بھی دردانگیز اظہار کی عمدہ مثالیں ملتی ہیں۔ ان غزلوں میں اس زمانے کے حالات کا عکس اور اس کا ردِعمل صاف نظر آتا ہے۔ مغلوں کی سیاسی قوت کے انحطاط کے بیرونی حملوں اور اندرونی شورشوں کے نتیجے میں ملک اور عوام کو مسلسل مصائب و آلام میں مبتلا رہنا پڑتا تھا۔ شعرا نے ان تمام صورت حال کو موضوعِ سخن بنایا۔ وہ اپنے جذبات و احساسات کی ترجمانی اشاروں اور کنایوں میں کرتے۔ وہ جہاں گلستان، باغ، چمن، آشیاں، گل و بلبل، قفس و صیاد وغیرہ کا استعمال کنایتاً اپنے ملک، وطن، احباب اور گھر بار گھر بار کے ذکر میں کرتے تو کبھی ظالموں، قاتلوں اور غارت گروں کو گلچیں، صیاد، بیداد گر وغیرہ کے نام سے یاد کرتے۔ امن و سکون کے دور کو ''بہار'' اور دورِ انتشار و زبوں حالی کو ''خزاں'' سے تعبیر کرتے[۱۱۳]۔ امیر خاں انجام کا یہ شعر ملاحظہ کیجیے:

اب یہی احسان ہے تیرا جو ہوں آزاد ہم — پھر چمن میں جائیں کیا منھ لے کے اے صیاد ہم

ٹک تو فرصت دے کہ ہولیں رخصت اے صیاد ہم — مدتوں اس باغ کے سائے میں تھے آباد ہم[۱۱۴]

سیاسی انتشار اور عدمِ استحکام کا نتیجہ اقتصادی بدحالی اور بے روزگاری کی صورت میں نکلا۔ معاشی نظام کی تباہی نے عوام و خواص دونوں کو متاثر کیا۔ شاہ حاتم نے اس جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ:

ایسی ہوا چلی ہے کہ چاروں طرف فساد — جز سایہِ خدا کہیں دارالاماں نہیں

کیا بیاں کیجیے نیرنگی اوضاعِ جہاں — کہ بہ یک چشم و زدن ہو گیا عالم ویراں

پوچھتا کوئی نہیں حال کسی کا افسوس ہے عدم دہر کی آنکھوں سے مروت کا نشاں [۱۱۵]

تاباں نے بھی اہلِ ثروت کی معاشی بدحالی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا کہ:

فرش پر مخمل کے جو سوتے تھے ہائے اب میسر ان کو نہیں ہوتا ہے ٹاٹ

داغ ہے ہاتھ سے نادر کہ مرا دل تاباں نہیں مقدر کہ جا چھین لوں تخت و طاؤس [۱۱۶]

تاباں نے مثنوی کی ہیئت نواب امیر خاں عمدۃ الملک کے دربار کی عشرت انگیزیوں اور پھر اس کے الم ناک انجام پر روشنی ڈالی ہے۔ ان کے ہاں اس مثنوی میں جو غم و الم کی فضا ہے وہ عبرت انگیز ہے۔ شاعر فلک کی ستم رانی اور انقلاب دوراں کا واقعہ بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

کیا اس فلک نے بڑا ہی ستم وہ عشرت کدا سب ہوا جائے غم

نہ آیا اسے رحم کچھ ساقیا دیا خاک میں ویسے گھر کو ملا

ابھی ایک دم میں جہاں اور ہے زمیں اور ہے آسماں اور ہے [۱۱۷]

شعرا اپنے عہد کے ماحول، سیاسی اور تہذیبی ہیجانات سے بے حد متاثر تھے۔ وہ بڑی حد تک حقیقت پسندانہ اظہار کو اہمیت دیتے لیکن بعض اوقات ابہام کے پردے میں وہ اس عہد کے حالات کی بھرپور عکاسی کرتے۔ مثلاً محمد شاہی دور کے بعد حالات کی مزید ابتری، نادر شاہی حملے سے برصغیر کی تاریخ کا ایک الم ناک سانحہ قرار دیا جاتا رہا ہے۔ ان مظالم کو ابہام کے پردے میں بیان کرنے کی روایت بھی اس دور کے شعرا میں دکھائی دیتی ہے۔ اشرف علی خاں پیام کا یہ شعر نادر شاہ کی سپاہ کے مظالم کی طرف واضح اشارہ ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

ایک عاشق نظر نہیں آتا ٹوپی والوں نے قتلِ عام کیا [۱۱۸]

اسی طرح نادر شاہ کو قتل و غارت گری کی علامت قرار دیتے ہوئے مرزا عسکری کا یہ شعر ملاحظہ کیجیے:

تو نادر ہے ملک پری رویوں کا اے ظالم جدھر بھر کر نظر دیکھے تو قتلِ عام ہو جائے [۱۱۹]

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ یہ شعرا ابہام گو شعرا کی نگاہ بھی کتنی دوررس تھی اور وہ ملکی اور معاشرتی حالات کا کس قدر گہری نظر سے مشاہدہ کر رہے تھے۔ کمترین، شاکر ناجی اور شاہ حاتم وغیرہ نے جو شہر آشوب لکھے، وہ اسی زمانے سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ شعرا محض لفظی صنعت گری ہی میں الجھے ہوئے نہیں تھے بلکہ ذو معنی الفاظ سے کام لے کر بڑے کام کی باتیں کہہ جاتے تھے۔ ان شعرا کے ہاں ایہام گوئی سے کام لے کر اس زمانے کے معاشرتی اور سیاسی حالات کو طنز کا نشانہ بنایا [۱۲۰]۔ اس ضمن میں متعدد شعرا کے اشعار کی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ شاہ مبارک آبرو کا یہ شعر ملاحظہ کیجیے:

آدمی درکار نہیں سرکار میں حیوان ڈھونڈ کون بوجھے یاں سپاہی کے تئیں گھوڑا نہیں [۱۲۱]

اسی طرح شاکر ناجی نے بادشاہوں اور حکم رانوں کی حالت کا نقشہ کھینچتے ہوئے جو منظر نامہ بیان کیا اس سے بہ آسانی اس دور کے سیاسی حالات کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ اشعار ملاحظہ کیجیے:

نہیں غم بادشاہِ ہند کوں سب ملک ڈوبے گا مگر اک رہ گیا ہے خیال اسے ٹھٹے کے صوبے کا

بڑے غافل ہیں صاحب نوبت اور سب ہند کے راجے ‏ ‏ نکلتے نہیں علاقوں سے مگر جب سر پہ آیا ہے [۱۲۲]

شاہ مبارک آبرو نے معاشی بدحالی اور بے روزگاری کے مسائل کو ایہام کے پردے میں پیش کرتے ہوئے کہا کہ:

اب زمانہ ہے بے طرح بگڑا ‏ ‏ کیا بنے روزگار کی صورت [۱۲۳]

شاہ حاتم نے تو اس دور کے رنگ ڈھنگ کو دیکھ کر حواس باختہ ہونے اور معاشرے میں دکھ اور مایوسی کے پھیلنے کی نشان دہی کرتے ہوئے واضح طور پر کہا کہ:

اس زمانے میں ہمارا دل نہ ہو کیوں کر اداس ‏ ‏ دیکھ کر احوالِ عالم ہیں اڑے جاتے حواس [۱۲۴]

مرزا مظہر جان جاناں کی اردو شاعری میں بھی اس زمانے کے سیاسی حالات کی موثر جھلک دکھائی دیتی ہے۔ مرہٹوں کے خلاف اہالیانِ روہیل کھنڈ کو تیار کرنے کے لیے انھوں نے مراد آباد، امروہہ، آنولہ، بریلی اور شاہ جہاں پور کے دورے کیے جس کا خاطر خواہ نتیجہ نکلا۔ وہ پہلے شاعر ہیں جن کی غزلوں میں سیاسی رنگ کی بڑی کامیاب جھلک ملتی ہے۔ مسلمانوں کے مصائب اور بڑھتے ہوئے غلامی کے آثار دیکھ کر ان کے ہاں جواب اضطراب دکھائی دیتا ہے [۱۲۵] وہ ان کے گہرے سیاسی شعور کا ثبوت ہے۔ انھوں نے آزادی کے احساس کو موضوع بنا کر بڑی حسرت سے اس کے کھونے کا درد محسوس کیا اور کہا کہ:

یہ حسرت رہ گئی کس کس مزے سے زندگی کرتے ‏ ‏ اگر ہوتا چمن اپنا گل اپنا باغ باں اپنا

قفس کے بیچ بلبل کس قدر حسرت سے کہتی ہے ‏ ‏ کہ پھر بھی دیکھنا قسمت سے ہوگا بوستاں اپنا [۱۲۶]

ان شعرا نے جس داستانِ حیات کو اپنا موضوع بنایا ان میں آپ بیتی بھی ہے اور جگ بیتی بھی۔ سودا اور میر تقی میر کا ذکر مذکورہ صفحات میں ہو چکا ہے۔ اس عہد کی شاعری میں انقلاب روزگار کا گہرا قلق اور افسوس موجود ہے۔ اپنے دور کی طرح اس دور کی شاعری بھی ہلاکت، بربادی اور انتشار سے عبارت ہے۔ سلطنت مغلیہ اور دہلی شکست و ریخت اور نظام سلطنت کے انحطاط میں صرف بیرونی حملہ آوروں کی یلغاریں اور اندرونی بغاوتیں ہی روبہ عمل نہیں تھیں، اس دور کی ناعاقبت اندیش شاہوں، وزیروں اور امیروں کی نااہلی اور خودغرضی بھی برابر کی شریک تھی [۱۲۷]۔ میر تقی میر نے اس بابت واضح طور پر کہا کہ:

تھا ملک جن کا زیرِ نگیں صاف مٹ گئے ‏ ‏ تم اس خیال میں ہو کہ نام ونشاں رہے [۱۲۸]

یہ زمانہ ہندوستان کی تاریخ کا نہایت پر آشوب دور ہے۔ دہلی مائل بہ انحطاط و زوال تو تھی ہی، اس کے ساتھ ہندوستان کے دوسرے علاقے بھی اقتصادی بدحالی کا شکار ہوتے جا رہے تھے۔ خودغرضی اور محلاتی سازشوں نے قومیت کے احساس کو فنا کر دیا تھا۔ دہلی روزانہ اجڑتی تھی اور شہریوں کو ہر روز ایک نئی بلا کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ انتشار اور خلفشار کا اس درجہ غلبہ ہوا کہ لوگ زندگی سے عاجز آ گئے اور دہلی کے ہزاروں باشندے ترک وطن کرنے پر مجبور ہو گئے [۱۲۹]۔ ''کلیات نظیر اکبر آبادی'' میں کئی مسدس اور مخمس ایسی ہیں جو شہر آشوب کی خصوصیات کی حامل ہیں۔ ایک طویل مخمس ''شہر آشوب'' کے عنوان سے ان کے کلام میں شامل ہے۔ یہ شہر آشوب نظیر کے عہد میں آگرہ کی اقتصادی بدحالی، معاشرتی بے چینی، خستہ حالی اور بے روزگاری کے ذکر پر مشتمل ہے۔ اس نظم میں نظیر نے اپنے دور کے ان سیاسی حالات پر بھی روشنی ڈالی ہے جس اس قسم کی صورتِ حال کو پیدا کرنے کا سبب بن رہے تھے [۱۳۰]۔ ملاحظہ کیجیے:

ہے اب تو کچھ سخن کا مرے کاروبار بند ‏ ‏ رہتی ہے طبع سوچ میں لیل و نہار بند

دریا سخن کی فکر ہے موج دار بند ہو کس طرح نہ منھ میں زباں بار بار بند

جب آگرے کی خلق کا ہو کاروبار بند[131]

اسی نظم میں وہ آگے چل کر مختلف پیشہ وروں، سپاہیوں، امرا اور عام لوگوں کی پریشان حالی کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

کیا چھوٹے کام والے کیا پیشہ ور نجیب روزی کے آج ہاتھ سے عاجز ہیں سب غریب

چھتیس پیشہ والوں کا ہے کاروبار بند[132]

عام پیشہ وروں کی بدحالی کے ساتھ ساتھ سپاہ اور امیر زادوں کی زبوں حالی کا نقشہ بھی اس نظم میں کھینچا گیا ہے۔ آگرہ کے اقتصادی اداروں اور کارخانوں کی بندش سے بے روزگاری میں جو اضافہ ہوا، اس کا تذکرہ بھی اس نظم میں ملتا ہے۔ اس کے علاوہ آگرہ کے باغ، چمن اور عمارتوں کی زبوں حالی کا نقشہ کھینچتے ہوئے شاعر نے ماحول میں پھیلی ہوئی اداسی اور افسردگی کو بھی موضوع بنایا ہے۔ سانحات کے اظہار میں نظیر کی اس قسم کی نظموں کو عمدہ مثال قرار دیا جا سکتا ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

بے وارثی سے آگرہ ایسا ہوا تباہ پھوٹی حویلیاں ہیں تو ٹوٹی شہر پناہ

ہوتا ہے باغ باں سے ہر ایک باغ کا تباہ وہ باغ کس طرح نہ لٹے اور نہ اجڑے آہ

جس کا نہ باغ باں ہو نہ مالک نہ خار بند[133]

نظیر کی شاعری کا ایک اہم موضوع اقتصادیات ہے جو ان کے کلام میں دوسرے موضوعات کے مقابلے میں زیادہ نمایاں ہے۔ اس زمانے میں اقتصادی بدحالی نے پورے ہندوستان کو جس طرح متاثر کیا، نظیر نے اپنی نظموں میں اس کی جھلک پیش کی ہے۔ سیاسی انتشار کے باعث معاشی بدحالی اور بے روزگاری جس انتہا کو پہنچی ہوئی تھی، نظیر نے اپنے مخصوص انداز میں اس اہم موضوع پر نظمیں کہیں۔ اس دور میں لوگ دانے دانے کے لیے جس طرح محتاج ہوتے جا رہے تھے، نظیر کے یہ اشعار اس صورتِ حال کی بہترین عکاس ہیں۔ ملاحظہ کیجیے:

کیا تو نگر کیا غنی کیا پیر اور کیا بالکا سب کے دل کو فکر ہے دن رات آٹے دال کا

دو چپاتی کے ورق میں سب ورق روشن ہوئے اک رکابی میں ہمیں چودہ طبق روشن ہوئے

کاندھے پہ تیغ دھرتے ہیں روٹی کے واسطے آپس میں خون کرتے ہیں روٹی کے واسطے[134]

غالباً یہ پہلا موقع تھا کہ کسی شاعر نے نظام کی آسودہ حالی کے دارومدار کو ان دست کاروں اور پیشہ وروں کی آسودہ حالی سے جوڑا ہے۔ ان کی کچھ اور نظموں میں بھی اس قسم کے شہر آشوبیہ موضوعات ملتے ہیں۔ مثلاً مخمّس بہ عنوان ''در بیانِ تماشائے دنیائے دوں'' میں وہ اس زمانے کے مخصوص معاشرتی حالت کا مرقع پیش کرنے کی کوشش کی ہے[135]۔ اس کے علاوہ ان کی نظمیں ''اژدھے کا بچہ'' اور ''چوہوں کا اچار'' وغیرہ میں بھی اس عہد کی زبوں حالی کو نمایاں کیا ہے۔ یہ نظمیں اس دور میں فن کاروں، ہنرمندوں اور اہلِ علم کی ناقدر دانی کی شکایت کے طور پر لکھی گئی ہیں۔ نظم میں پیشہ وروں کی ناگفتہ بہ حالت پر طنز کیا گیا ہے[136]۔ نظم ''اژدھے کا بچہ'' کے ایک بند میں اس جانب اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

روزی کے اب تو ایسے گھر گھر میں ہیں کسالے ہاتھی و گھوڑے اپنے دیتے ہیں لوگ ڈھالے

جب تنگ ہووے روزی کون اژدھے کو پالے	اس کی بھی اور ہماری یارو خبر خدا لے
سب بیچتے ہیں آکر چیتے کھرے کا بچہ	ہم بیچتے ہیں یارو لو اژدھے کا بچہ [۱۳۷]

ان کی بیش تر نظموں کا موضوع عوام ہی ہیں۔ یہ نظمیں عوامی مسائل پر سوچنے پر مجبور کر دیتی ہیں۔ اس دور میں نظیر نے جو طرح عوامی جذبات و احساسات کی صحیح ترجمانی کی، کوئی شاعر ان کے قریب نہیں پہنچ سکا۔

پانی پت کی تیسری لڑائی ۱۷۶۱ء نے برصغیر کی تاریخ کا رخ ہی موڑ کر رکھ دیا تھا۔ ابدالی کا یہ چھٹا حملہ تھا۔ اس حملے کے نتیجے میں دلّی کی تباہی و بربادی کا احوال تفصیل سے بیان کیا جا چکا ہے، لیکن مرہٹہ حملوں کے دوران جب درانیوں سے سخت ناکہ بندی کر کے مرہٹہ لشکر کو غلے اور رسد کی فراہمی روک دی تو اس کے لشکر کو سخت قحط کی صورت حال کا سامنا کرنا پڑا۔ نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ ہر روز بہت سے افراد گھوڑے، ٹٹو، اونٹ اور بیل بھوک سے مرنے لگے۔ ایک شاعر نے ذیل کے اشعار میں مرہٹوں کی فاقہ کشی کا نقشہ پیش کیا ہے [۱۳۸]۔ ملاحظہ کیجیے:

ہوئی شکل روٹی کی ایسی ہی مشتاق	کہ نقشِ پا کو کلچہ جانتے تھے
نکلتا تھا جو لکڑی میں سے بورا	غنیمت جان اس کو پھانکتے تھے
سپاہی جو دکن کے تھے دلاور	پڑے تھے راہ میں عریاں و لاغر [۱۳۹]

اس جنگ کے نتائج بڑے دوررس تھے۔ مغل بادشاہوں میں سے کوئی ایسا ذی شعور ہوتا تو اس فتح سے بھرپور فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتا۔ بہ قول خلیق احمد نظامی:

> اگر سلطنت مغلیہ میں تھوڑی سی بھی جان ہوتی تو وہ جنگ پانی پت کے نتائج سے فائدہ اٹھا کر اپنے اقتدار کو ہندوستان میں پھر صدیوں کے لیے قائم کر سکتی تھی، لیکن حقیقت یہ ہے کہ مغلیہ سلطنت اس وقت ایک بے روح جسم کی مانند تھی۔ جنگ پانی پت کا اصلی فائدہ فاتحین جنگ پلاسی نے اٹھایا [۱۴۰]۔

اس صدی میں ایک طرف سلطنت مغلیہ کا بتدریج زوال ہوا تو تو دوسری طرف اطراف و جوانب میں بہت سی خود مختار و نیم خود مختار ریاستیں ابھریں۔ یہ چھوٹی چھوٹی ریاستیں خود اپنے اندر ایک دنیا بسائے ہوئی تھیں۔ ان میں سب سے اہم سلطنت اودھ تھی جس کی چکا چوند نے تھوڑے عرصے کے لیے دنیا والوں کی آنکھیں خیرہ کر دی تھیں۔ غازی الدین حیدر نے اوّل اوّل اپنی خود مختاری کا اعلان کیا جس کے بعد انتزاعِ اودھ ۱۸۵۶ء تک اس ریاست نے پورے ہندوستان میں خوب شہرہ حاصل کیا [۱۴۱]۔ اودھ کے حکم راں ہمیشہ سے انگریزوں کے دست نگر تھے۔ انگریزی سلطنت کا ایک بڑا اصول یہ رہا کہ دہلی کی مرکزیت کو کمزور کرنے کے لیے لکھنؤ کی اسی ریاست کو زیادہ سے زیادہ خوش حال اور فارغ البال بنایا جائے [۱۴۲]۔ نواب اور جاگیر داروں کے زیر اثر اودھ میں تعیش پسندی کا رجحان پروان چڑھا۔ اسی تعیش پسندی کی وجہ سے جب انگریزوں کی بالا دستی نے سلاطین اودھ کے گرد گھیرا تنگ کیا تو سلاطین اودھ اپنے علاقے، جاگیریں اور سیاسی قوت چھن جانے پر بھی ندامت محسوس نہ کرتے بلکہ خود کو ان ذمے داریوں اور بوجھ سے فارغ البال تصور کرتے ہوئے اپنی لاغری اور ناطاقتی پر فخر بھی کرتے نظر آتے ہیں [۱۴۳]۔ ناسخ نے اس کیفیت کا اظہار اپنے ایک شعر میں کیا ہے کہ:

لاغر ایسا ہوں کہ میں اکثر ہوا سے اُڑ گیا	میرے پیکر میں ہے عالم کاغذِ تصویر کا [۱۴۴]

اسی طرح رند نے اس کمزوری اور لاچاری کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ:

ہم سے کاوش کر کے کیا ہاتھ آئے گا اے آسماں　　　مالکِ طبل وعلم نے صاحبِ جاگیر ہم [۱۴۵]

لکھنؤ میں پروان چڑھنے والی صنف ریختی میں عورتوں کی زبان سے اس معاشرے کی اقتصادی صورتِ حال، حکومت کی بدنظمی، رشوت کی فراوانی، عدل وانصاف کے فقدان اور غربت وافلاس کے مسائل کو شاعرانہ اظہار کا موضوع بنایا گیا ہے۔ انگریز تاجر ہوسِ ملک گیری میں نئے نئے قوانین وضوابط کے ذریعے اودھ اور دیگر ریاستوں کے حکم رانوں کی خودمختاری کے گرد مسلسل اپنا حصار مضبوط کر رہے تھے۔ ۱۷۷۵ء میں آصف الدولہ کی تخت نشینی تک اودھ کے حکم ران انگریزوں کی حکمت عملی کے تحت کافی بے بس ہو چکے تھے۔ انتہا یہ کہ مسند نشینی اور مرکز سے دیگر ریاستوں کے تعلقات کے امور بھی کمپنی کی مرضی سے طے پاتے تھے۔ اس ضمن میں جرأت کا مندرجہ ذیل قطعہ اودھ کے حکم رانوں اور امرا کی بے بسی پر گہرے طنز اور سیاسی شعور کا حامل ہے [۱۴۶]۔ ملاحظہ کیجیے:

سمجھے نہ کوئی ان کو امیر اور نہ وزیر　　　انگریزوں کے ہاتھوں اک قفس میں ہیں اسیر

جو کچھ وہ پڑھائیں سو یہ منھ سے بولیں　　　بنگالہ کی مینا ہیں یہ پورب کے امیر [۱۴۷]

اودھ کے نواب سیاسی نقطۂ نظر سے دوراندیش اور مدبرانہ تھے۔ وہ حکم راں کی حیثیت سے بھی نہایت ناکام تھے۔ نوابین اودھ سیاست کے معاملے میں بھی کسی ضابطۂ اخلاق کے پابند نہ تھے۔ مورخین نے نادر شاہ کو دہلی پر حملہ کرنے کی خفیہ دعوت دینے کا الزام بھی برہان الملک پر لگایا۔ عسکری طور پر بھی وہ زبردست انتشار کا شکار تھے۔ کم حوصلگی کا یہ عالم تھا کہ انگریز اپنی فوجی برتری اور جنگی مہارت کا مختلف محاذوں پر مظاہرہ کر رہا تھا اور اس کے باوجود حزیمت کھانے والے یہ ہندوستانی حکم راں سبق حاصل نہیں کر رہے تھے۔ ان سپاہیوں کا اخلاقی معیار بھی پست ہو چکا تھا [۱۴۸]۔ اس دور میں حکومت اور انگریزوں کے درمیان کئی بار معاہدے بھی ہوئے۔ ہر نئے معاہدے کے ساتھ انگریزوں کا اقتدار اور مطالبے بڑھتے گئے۔ ۱۷۷۳ء کے معاہدے کے تحت ان کی عمل داری کے کئی اضلاع ان کے قبضے سے نکل گئے۔ انگریزی دستے کی تعیناتی کے بعد ان اضلاع کے اخراجات بھی نواب اودھ کے ذمے ہوتے۔ کمپنی کا ایجنٹ اودھ کے دربار ہی میں رہنے لگا۔ ۱۷۷۳ء سے شجاع الدولہ کو شاہ انگلستان کے گورنر کا عہدہ ملا اور برطانیہ کے بادشاہ جارج سوم کے نام کے سکے جاری ہو گئے [۱۴۹]۔ اس خمارِ غفلت کے باوجود حقائق کی ترشی کبھی کبھی ان کے نشے کو ہرن کر دیتی تھی۔ ملک جن حالات سے دوچار تھا ان سے ہر شخص واقف تھا۔ اودھ کی مملکت بھی اسی ملک کا حصہ تھی اور عملاً انگریزوں کے زیرِ تسلط تھی۔ ان غفلت شعار حکمرانوں اور امرا کو بھی اب احساس ہونے لگا تھا کہ یہ بدیسی حکم راں ملک کی دولت وحشمت نہایت تیزی سے اپنے ملک منتقل کر رہے ہیں جس کے نتیجے میں یہاں کی اقتصادی حالت بد سے بدتر ہوتی جا رہی ہے [۱۵۰]۔ مصحفی کا یہ شعر اسی احساس اور ادراک کا غماز ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

ہندوستاں میں دولت حشمت جو کچھ کہ تھی　　　کافر فرنگیوں نے بہ تدبیر چھین لی [۱۵۱]

اہلِ اودھ کے دل میں جب خوف اور اندیشے کی لہر پیدا ہو چکی تو نشاط وعیش کے اس ماحول میں بھی شعرا بے چین ہو کر خطرہ انقلاب کی آہٹ ضرور سننے کی کوشش کرتے۔ انشا کا یہ شعر اسی انقلاب کی آمد کا پتہ دیتا ہے:

ہے خوشی سب طرح کی ناحق کا　　　خطرۂ انقلاب باقی ہے [۱۵۲]

فارغ البالی اور خوش وقتی کی یہ تہذیب جو اپنا عروج حاصل کر کے مٹ رہی تھی، اس کی ہر اچھی بری چیز پر شاعر جان چھڑکتے

تھے۔اسی لیے لکھنؤ کی محبت میں شعرا نے بہت کچھ کہا۔ ناسخ نے اسی قسم کے جذبات کا اظہار کرنے کے بعد لکھنؤ کو ''بیت الحزن'' قرار دیتے ہوئے کہا کہ:

ہم صفیر اپنا وطن ہے لکھنؤ ہم تو بلبل ہیں چمن ہے لکھنؤ

ان دنوں بیت الحزن ہے لکھنؤ[۱۵۳] میں حزیں آوارۂ غربت جو ہوں

شیخ غلام علی راسخ عظیم آبادی کا شہرآشوب عظیم آباد یا بہار کے حالات تک محدود نہیں بلکہ اس میں برعظیم کی عام کیفیت و حالات کو پیش کیا گیا ہے۔مختلف مقامات کے سفر کے دوران جو کچھ ہندوستان میں انھوں نے دیکھا اسے یہاں قلم بند کر دیا ہے۔ملاحظہ کیجیے:

فقط مفلسی بر سر کار ہے معطل ہے ہر کوئی بے کار ہے

ہیں آوارہ اربابِ فضل و ہنر گدائی کا کاسہ لیے در بدر

دُرِ مدعا یاں تو نایاب ہے[۱۵۴] زراعت کا پیشہ بھی بے آب ہے

اس مختصر جائزے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ لکھنؤ کے سیاسی و سماجی پس منظر میں زندگی سے گریز اور معاشرتی فلاح و بہبود سے فرار کا رویہ عمومی طور پر معاشرے میں پھیلا ہوا تھا۔

شکستِ سراج الدولہ اور ٹیپو سلطان

اردو شاعری میں انگریزوں سے نفرت کے اظہار کی روایت بھی قدم ہے۔سولھویں صدی میں یورپ کے قسمت آزما اور تاجروں کی نظریں مشرق کی دولت پر پڑنے لگیں۔ یورپ کی تاجر کمپنیوں نے بڑی آسانی سے، بحری شاہ راہوں پر اپنی بالادستی قائم کر لی۔مغلوں کے زوال اور ملک کے اندرونی انتشار کو یہ فرنگی تاجر گہری نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ساتھ ساتھ اپنی تجارتی کوٹھیوں کو قلعوں میں تبدیل کر رہے تھے۔اپنی فوجی طاقت کو مضبوط سے مضبوط بنا رہے تھے۔۱۷۴۸ء میں نظام الملک کی وفات کے بعد دکن اور کرناٹک میں اقتدار کی جو لڑائی ہوئی اس نے انگریز اور فرانسیسیوں کو دیسی امرا کے نجی معاملات میں دخل اندازی کا موقع ملا[۱۵۵]۔مقامی نواب اور امیر اپنی جانشینی کے معاملات سلجھانے کے لیے انگریزوں کے دست نگر بن گئے۔دکن کی خانہ جنگیوں نے برٹس ایسٹ انڈیا کمپنی اپنے فرانسیسی حریفوں پر غالب آئی۔اس کی قوت میں اضافہ ہوا اور انگریزوں کے حوصلے بڑھ گئے۔ بنگال کے بیدار مغز صوبے دار نواب علی وردی کے انتقال ۱۷۵۶ء کے بعد انگریزوں کو وہاں بھی ریشہ دوانیوں کا جال بچھانے کا موقع میسر آیا۔سراج الدولہ نے خطرے کو بروقت بھانپ لیا اور فورٹ ولیم میں انگریزی قلعہ بندیوں کو گرانے کا حکم دے دیا۔ لیکن کمپنی کی سیاسی حکمت عملی جس میں بقول میجر باسو معاہدے، سازش، غداری، فریب دہی اور ڈپلومیسی کے نام پر سراج الدولہ کے خلاف محاذ بنایا گیا۔عسکری لحاظ سے پلاسی کی جنگ ۱۷۵۷ء خاص اہمیت کی حامل نہیں لیکن نتائج کے اعتبار سے اس جنگ کا شمار ہندوستان کی فیصلہ کن جنگوں میں ہوتا ہے۔ پلاسی کی جنگ نے انگریز کو بنگال کا واحد حکمراں بنا دیا[۱۵۶]۔اور بکسر کی جنگ ۱۷۶۴ء کے بعد تو وہ بنگال، بہار اور اڑیسہ کے آئینی حکمراں بن گئے۔پانی پت کی تیسری جنگ میں ہندوستانی قوتوں کی کمزوری نے کمپنی کے لیے تسخیر ہند کا رستہ بالکل صاف کر دیا۔دکن میں سلطان حیدر علی کی دور اندیشی اور اس کے اولوالعزم بیٹے ٹیپو سلطان کی جرات اور بہادری نے سامراجی خطرے کے خلاف حصار بنایا اور عرصے تک اس خطرے کے خلاف مصروفِ پیکار رہے۔لیکن عام ہندوستانی کو اس خطرے کا پوری طرح ادراک نہیں تھا۔ یہ حصار بھی سرنگا پٹم کی تسخیر ۱۷۹۹ء میں ٹیپو سلطان کی شہادت کے بعد ٹوٹ گیا[۱۵۷]۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے توسط سے ہندوستان پہنچنے والے سرمائے نے سترھویں صدی کے مالی بحران میں

پھنسے ہوئے ہندوستان کو خونِ جگر فراہم کیا۔ وہاں کے بدترین معاشی اثرات زائل ہو گئے۔ ۱۷۴۸ء سے ۱۷۶۳ء کے دوران کلائیو کی قیادت میں کمپنی ایک منظّم سیاسی طاقت بن چکی تھی۔ کلائیو ایک مکار، متعصب اور شیطان خصلت مزاج رکھنے والا انگریز تھا۔ بنگال حکم رانوں کی باہمی چپقلش اور لڑائیوں کے دوران کمپنی نے بادشاہ گری کا کردار ادا کیا تھا۔ ہندوستان کی جو تاریخ اس کے ہاتھوں بنی تھی اس کے کھاتے میں لکھی جا چکی تھی۔ بنگال میں سراج الدولہ کے خلاف جنگ پلاسی جیت کر اس نے ہندوستان کی تقدیر کا رخ موڑ دیا تھا اور ہندوستان کو تاجِ برطانیہ کے قدموں میں لا کر رکھ دیا تھا۔ نواب سراج الدولہ نے جب انگریزوں کے مرکز کلکتہ کو فتح کیا تو اور ۲۰ جون ۱۷۵۶ء کو اس نے ۱۴۶ انگریزوں کو پکڑ کر ایک تاریک کوٹھڑی میں بند کر دیا تھا۔ اس کوٹھڑی میں پہلی ہی رات ۱۲۳ انگریز قیدی مر گئے تھے۔ جس کے بعد انگریز لکھاریوں، سیاست دانوں اور اہل الرائے نے اسے بدترین ظلم قرار دے کر نواب سراج الدولہ کی کردار کشی شروع کر دی۔ اس واقعے کے فوراً بعد کلائیو کو بنگال روانہ کیا گیا۔ اپنے ساتھ ایڈمرل واٹسن کو لے کر وہ وہاں پہنچا اور اندرونِ خانہ سازش کا گہرا جال بچھایا۔ نواب کے وفادار اور بااعتماد کمان دار میر جعفر کو بھاری رشوت دے کر اس وعدے پر خرید لیا کہ کامیابی کے بعد اسے بنگال کا نواب بنا دیا جائے گا۔ ۱۸ جنوری ۱۷۵۷ء کو اس نے کلکتہ پر دوبارہ قبضہ کر لیا اور ۲۳ جون ۱۷۵۷ء کو پلاسی کے میدان میں میر جعفر کے تعاون سے نہ صرف نواب سراج الدولہ کو شکست دی بلکہ اسے قتل بھی کر دیا۔ معاہدے کے مطابق غدار میر جعفر کو کٹھ پتلی نواب بنا دیا گیا[158]۔ اس سے قبل علی وردی کی موجودگی میں یورپی قومیں بنگال پر اپنی اجارہ داری قائم نہیں کر سکی تھیں۔ علی وردی یورپی اقوام کے عزائم کو بخوبی سمجھ چکا تھا۔ اس نے سراج الدولہ کو وصیت کی تھی کہ انگریزوں کو فوج رکھنے یا قلعہ بنانے کی اجازت نہ دینا۔ ۱۷۶۵ء کو علی وردی کے انتقال کے بعد جب اس کا پوتا سراج الدولہ تخت پر بیٹھا تو انگریزوں کا رویہ اس کے ساتھ بے حد معاندانہ تھا۔ وہ اس کے خلاف سازشوں میں مصروف رہے۔ اس کے برعکس سراج الدولہ نے ہر موقعے پر ان تاجروں سے شریفانہ سلوک روا رکھا۔ انگریز سراج الدولہ کو ختم کر دینے کے درپے تھے۔ سراج الدولہ کو بھی انگریزوں کی درباری سازشوں کا علم تھا۔ ان حالات میں اس نے فروری ۱۷۵۷ء کو ''عہد نامہ علی نگر'' پر دستخط کر کے تناؤ کو ختم کرنے کی کوشش کی لیکن کلائیو نے بعد میں سراج الدولہ پر الزام لگایا کہ وہ فرانسیسیوں سے گٹھ جوڑ اور خط کتابت کر رہا ہے۔ درباری امرا اور بیرونی امداد سے مایوس ہو کر اس نے انگریزوں کے خلاف لڑنے کا فیصلہ کیا۔ میر جعفر اور دوسرے سازشی سرداروں سے وفاداری کا دم بھرا چناں چہ پلاسی کے مقام پر انگریزوں سے مقابلہ ہوا۔ ناکامی سراج الدولہ کا مقدر ٹھہری جس کے بعد ہندوستان میں انگلستان کے بے حربی اور سیاسی فتوحات کا طویل سلسلہ شروع ہو گیا۔ پلاسی کی جنگ دراصل بہتر اسلحہ یا شجاعت و مردانگی کی فتح نہ تھی بلکہ انگریزوں کی مکاری اور عہد شکنوں کی فتح تھی۔ اس فتح کے بعد بنگال مکمل طور پر انگریزوں کے ہاتھ میں دے دیا گیا۔ انگریزوں کے مقابلے میں یہ ہماری پہلی شکست تھی۔ اس شکست سے جہاں انگریزوں کو ہماری اخلاقی گراوٹ اور ملّت فراشی کا علم ہوا وہاں میر جعفر کی مثال سے ہر چھوٹے بڑے ہندوستانی غدار نے قوم کی ہر مصیبت کو غنیمت جان کر ذاتی مفاد کی تکمیل کے لیے ہر قسم کی ملت کشی اور دشمن نوازی کو اپنا شعار بنا لیا۔ انگریزوں نے بعد میں اس حربے کو متعدد بار استعمال کیا جس کے بعد انھیں یقین ہو گیا کہ وہ ان ملت فروشوں کے ذریعے پورے برعظیم پر قابض ہو سکتے ہیں[159]۔ پلاسی کے بعد بکسر کی لڑائی بھی انگریزوں کے خلاف مزاحمت کی ایک کوشش تھی لیکن اس کی ناکامی نے بھی انگریزوں کے تسلط کو مزید وسیع کیا۔ یہ دونوں جنگیں جو انگریزوں سے لڑی گئیں اپنے پس منظر میں انتہائی تکلیف دہ سیاسی اور معاشی پہلو رکھتی ہیں۔

سراج الدولہ پر انگریزوں کی جانب سے سب سے بڑا الزام بلیک ہول یا کال کوٹھری کی جھوٹی کہانی ہے۔ڈاکٹر عمر کے مطابق یہ افسانہ ہندوستان کے بچے بچے کے ذہن پر کندہ کیا گیا اور اس کے لیے بہت محنت اور صرفِ زر سے کام لیا گیا کہ فتح کلکتا کے وقت ۱۴۶ انگریزوں کو جن میں مرد اور عورتیں شامل تھیں، ۲۰ مربع فٹ کمرے میں محبوس کیا جس میں سے صرف ۲۳ جاں بر رہ سکے باقی حبس دم کے باعث مر گئے۔اس اقدام پر بڑے بڑے مورخوں، ادیبوں نے نواب سراج الدولہ کی ذات کو سخت تنقید کا نشانہ بنایا اور انگلستان میں اس کی شخصیت کو ایک خوف ناک قاتل کی صورت میں پیش کیا گیا۔مگر جب بنگالی محققین نے اس جانب توجہ کی تو ثابت ہوا کہ بلیک ہول کا واقعہ محض طبع زاد کہانی ہے۔اس کہانی کا موجد ڈاکٹر پال ویل ہے۔اس نے یہ کہانی ۱۷۵۷ء میں یعنی وقوعہ سے پانچ ماہ بعد اس وقت لکھی جب وہ سائرن (Syaran) نامی جہاز پر انگلستان واپس جا رہا تھا۔وقت گزارنے کے لیے اس کے پاس کوئی اور شغل نہ تھا اس سے قبل اس نے کبھی اس واقعے کا ذکر کسی سے نہیں کیا تھا [۱۶۰]۔ڈاکٹر پال ویل کی بابت ایک انگریز محقق لٹل کا کہنا ہے کہ ''پال ویل کا تذکرہ افواہوں کی پوٹ ہے، جس کی کوئی ہم عصر تائید نہیں کرتا۔بلیک ہول کی کہانی پال ویل اور کُک وغیرہ کی گھڑی ہوئی ہے'' [۱۶۱]۔بہرحال پلاسی کے معرکے میں سراج الدولہ نے اپنی پچاس ہزار فوج کے ساتھ برطانوی استعمار کی بڑھتی ہوئی یلغار کو روکنے کی کوشش ضرور کی۔اگر تیس جون ۱۷۵۷ء کو سراج الدولہ کی فوج کے سالارِ اعلیٰ میر جعفر غداری نہ کرتا اور چند ٹکوں کے باعث اپنے ضمیر کو نہ بیچتا تو آج تاریخ کا دھارا کسی اور سمت بہہ رہا ہوتا۔انگریزوں نے اپنے مکر و فریب اور دھوکے سے ٹیپو سلطان کو شہید کر دیا۔علامہ اقبال نے شیر بنگال سراج الدولہ اور ٹیپو سلطان جیسے بہادر پرجوش مسلمانوں کے خلاف کی جانے والی غداری پر جو شعر کہا وہ تاریخی اہمیت کا حامل ہے۔میر جعفر اور میر صادق کی بابت ان کا کہنا ہے کہ:

جعفر از بنگال و صادق از دکن ننگِ ملت، ننگِ دیں، ننگِ وطن [۱۶۲]

بہار سے تعلق رکھنے والے راجا رام نرائن موزوں پر تفصیلی اظہارِ خیال کیا کہ ان سے منسوب اردو کا ایک شعر جو نواب سراج الدولہ کی شہادت کی خبر سن کر فی البدیہہ کہا گیا تھا، اردو ادب کی تاریخ میں بے حد مشہور ہے۔شعر ملاحظہ کیجیے:

غزالاں تم تو واقف ہو کہو مجنوں کے مرنے کی دوانا مر گیا آخر کو ویرانے پہ کیا گزری [۱۶۵]

میر حسن نے اپنے تذکرے میں اس شعر کی بابت لکھا کہ:

در وقتیکہ خبر شہید شدن سراج الدولہ در شہر اُفتاد ہماں وقت فی البدیہہ ایں شعر می خواند [۱۶۶]۔

مگر قاضی عبدالودود نے میر حسن کے بیان کو مشکوک قرار دیا ہے۔ان کا کہنا ہے کہ یہ شعر موزوں کا نہیں کیوں کہ ''تذکرہ شورش''، ''تذکرہ گلزارِ ابراہیم'' اور ''تذکرہ مسرت افزا'' میں یہ شعر موزوں کے نام سے نہیں۔قاضی عبدالودود نے اپنی تصنیف ''آوارہ گرد اشعار'' میں اس شعر کو مرزا ابراہیم مشتاق سے منسوب کیا ہے [۱۶۷]۔عطا کاکوی نے بھی اپنی تصنیف ''غلطی ہائے مضامین'' میں رسالہ ''آج کل'' کے شمارہ نومبر ۱۹۶۸ء میں شائع شدہ مضمون بعنوان ''عبرت نامہ'' پر تنقید کرتے ہوئے مذکورہ شعر کی بابت لکھا کہ:

> میر حسن نے صرف یہ لکھا کہ یہ شعر موزوں نے پڑھا۔اس عبارت سے اکثر لوگوں کو یہ شبہ ہوا کہ موزوں ہی کا برجستہ موزوں کیا ہوا ہے۔موزوں اس میں شک نہیں کہ فارسی کے صاحبِ دیوان شاعر تھے اور شیخ علی حزیں کے شاگرد تھے۔اردو کے صرف دو تین اشعار ان سے منسوب ہیں۔اگر یہ واقعہ مان بھی لیا

جائے تو ممکن ہے کہ یہ حسبِ حال شعر ان کی زبان پر جاری ہوگیا... انھوں نے ممکن ہے یہ شعر مشتاق کا سنا ہو اور سراج الدولہ کی خبر شہادت سن کر یہ شعر پڑھا[۱۶۸]۔

قاضی عبدالودود اور عطا کاکوی کے شبہات اور دعوؤں کے باوجود اردو کی مختلف ادبی تاریخوں اور کتب میں اسے موزوں کا ہی شعر سمجھا جاتا رہا ہے۔ فصیح الدین بلخی، اختر اورینوی اور ڈاکٹر جمیل جالبی جیسے اہم محققین نے اسے میر حسن کے حوالے سے موزوں کا ہی شعر قرار دیا[۱۶۹]۔ اس بابت ایک اور دل چسپ دلیل منشی عیوض رائے مسرت نے دی ہے۔ انھوں نے اپنی کتاب ''آفتاب مسرت'' میں یہ دل چسپ انکشاف فاخر مکیں کا حوالہ دیتے ہوئے کیا کہ موزوں کے ہاں مذکورہ بالا شعر کی زمین میں کئی اور اشعار بھی ملتے ہیں۔ انھوں نے مزید اشعار اپنی تصنیف میں نقل کیے ہیں۔ ملاحظہ کیجیے:

غزالاں تم تو واقف ہو کہو مجنوں کے مرنے کی — دوانا مر گیا آخر کو ویرانے پہ کیا گزری
کوئی رندوں سے پوچھے ایک ساقی کے نہ ہونے سے — مے و مینا پہ کیا بیتی ہے مے خانے پہ کیا گزری
کوئی تو تبصرہ یارو! گدازِ شمع محفل پر — یہی سب کی زباں پر ہے کہ پروانے پہ کیا گزری
یہ سچ ہے دل کو راہِ عشق میں سمجھا لیا موزوں — مگر یہ کون جانے دل کے سمجھانے پہ کیا گزری[۱۷۰]

جنگ پلاسی میں فتح مند ہو کر انگریزوں نے مغلیہ سلطنت کے متمول اور خوش حال صوبے بنگال پر اپنا مضبوط قبضہ جما لیا تھا۔ بعد میں شہزادہ عالی گہر شاہ عالم ثانی کے لقب سے دہلی کی تخت پر بیٹھا تو بنگال اور بہار کو فتح کرنے کے غرض سے بہار کی حدود تک پہنچا۔ بکسر کی لڑائی ۱۷۶۴ء میں انگریزوں نے شجاع الدولہ نواب وزیر اودھ اور میر قاسم کو شکست دی۔ اس شکست کے بعد ہی بادشاہ کا قیام الٰہ آباد قرار پایا۔ گویا اب بادشاہ انگریزوں کی حراست میں تھے۔ یہ قیام سات برس تک رہا۔ بعد میں دہلی کے قلعے تو پہنچ گئے لیکن اب ان کے قبضے میں ملک و مال کچھ بھی نہ رہا حالاں کہ اس وقت بھی وہ ہندوستان کے ہی نہیں بلکہ ایک عالم کے بادشاہ کہلاتے تھے[۱۷۱]۔ انگریزوں کی ان کامیابیوں کا احوال اس زمانے کی مختلف تالیفات میں درج ہے۔ میر نے اپنی آپ بیتی میں بھی انگریزوں کے بڑھتے تسلط پر تفصیل سے لکھا ہے۔ ''اخبار رنگین'' میں بھی سعادت یار خان رنگین نے اس تصنیف میں دل چسپ طریقہ بیان اختیار کرتے ہوئے مختلف واقعات کے ضمن میں ہندی اور فارسی امثال اور معروف شعرا اور ادبا کے اشعار و اقوال کو بھی نقل کیا ہے۔ سید معین الحق نے ''مفتاح الخزائن'' کا حوالہ دیتے ہوئے ''اخبار رنگین'' کے مقدمے میں لکھا کہ شاہ عالم کو انگریزوں کی حراست سے چھڑا کر دہلی لانے میں سب سے بڑھ کر کوشش سندھیہ نے کی تھی جس کی وجہ سے بعد میں دربار شاہی پر اس کا اثر قائم ہوگیا۔ اس بابت ان کا کہنا ہے کہ مراد آباد کے ایک صوفی بزرگ شاہ عبدالہادی نے جن کی شاہ عالم سے خط کتابت تھی، اپنے ایک معتقد روہیلہ سردار دوندے خاں سے کہا تھا کہ ان کو جا کر الٰہ آباد سے شاہ عالم کو اپنے ہمراہ لانا چاہیے۔ وہ جانتے تھے کہ مرہٹے بھی ان کو اپنے ہم راہ لانے کی کوششوں میں لگے ہوئے ہیں لیکن جس طرح شاہ ولی اللہ کی کوشش تھی کہ مرہٹہ اقتدار کو ختم کیا جائے بالکل اسی طرح شاہ عبدالہادی بھی کوشاں تھے کہ مغل بادشاہ کو مرہٹہ اقتدار کے چنگل میں پھنسنے نہ دیا جائے لیکن وہ اپنی تدبیر کو عملی جامہ نہ پہنا سکے اور دوندے خاں کا سن ۱۷۷۱ء میں انتقال ہوگیا۔ مسلمان انگریزوں کے اس عمل کو نفرت کی نگاہ سے دیکھ رہے تھے۔ انگریزوں کے بڑھتے ہوئے اقتدار سے وہ پریشان اور نالاں تھے۔ یوں تو کلائیو اور وارن ہسٹنگز بھی استعماری قوت کے زبردست حامی تھے لیکن کمپنی کی مقبوضات اور پالیسی کو اوج کمال تک ویلزلی نے پہنچایا

تھا۔ وہ ۱۷۹۸ء میں گورنر جنرل مقرر ہوا۔ دو سال بعد ٹیپو سلطان کی سلطنت کا بڑا حصہ اس نے اپنے قبضے میں لے لیا۔ اسی طرح نواب وزیر اودھ کی تقریباً نصف پر قبضے کے علاوہ چھوٹی چھوٹی متعدد ریاستوں پر بھی اپنے مقبوضات قائم کرنا شروع کیں لیکن اس کی اہم کامیابی یہ تھی کہ سندھیہ فوج کو شکست دے کر انگریز افواج دہلی تک پہنچ گئیں۔ سن ۱۸۰۳ء میں بادشاہ نے انگریز فوج کو دہلی میں داخل ہونے کی اجازت دے دی۔ اس بابت مغل حکم راں اور کمپنی کے درمیان کوئی تحریری معاہدہ تک نہیں ہوا۔ البتہ ویلزلی نے جو خط بادشاہ کو لکھا اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو ایک رعایا کے طور پر بادشاہ کی حفاظت کے فریضے کی ذمے داری لینے کی پیش کش کر رہا ہے۔ ۱۱ ستمبر ۱۸۰۳ء کو دہلی میں لڑائی ہوئی اور پانچ روز کے بعد لیک کو بادشاہ کی جانب سے دربار میں باریابی کا شرف عطا ہوا۔ شاہ عالم نے ۲۱ ستمبر کو اسے صمصام الدولہ اشجع الملک خاں دوراں خاں بہادر فتح جنگ کا خطاب عطا کیا۔ یہ خطاب قبول کر کے کمپنی نے یہ مہر تصدیق ثبت کر دی کہ شاہ عالم ہی آئینی بادشاہ ہے۔ اقتدار کا مالک وہی ہے اور وہ لوگ اس کے محافظ اور رعایا ہیں۔

یہ وہ واقعات ہیں جن کے ذکر کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ کمپنی نے کس قدر مکر وفریب سے کام لے کر بادشاہ کو دھوکے میں رکھا اور اپنی عہد شکنیاں جاری رکھیں۔ ویلزلی سے ڈلہوزی تک کئی گورنر جنرلوں کی یہی کوشش رہی کہ کسی ترکیب سے اس اخلاقی اور قانونی پابندی سے بھی چھٹکارا حاصل کیا جائے لیکن اس وقت انھیں یہ کامیابی نہیں ملی۔ تقریباً پندرہ برس بعد اکبر بادشاہ کو مجبوراً گورنر جنرل کو یہ رعایت دینی پڑی کہ گورنر جنرل کو دربار میں کرسی دے کر نذر سے مستثنیٰ کر دیا جائے۔ اس سے قبل مغل دربار میں بادشاہ کے علاوہ ہر شخص حتیٰ کہ وزرا بھی کھڑے رہتے تھے۔ دربار کا ماحول بھی رفتہ رفتہ تبدیل ہوتا جا رہا تھا۔ گورنر جنرل اور دوسرے حکام ہر موقع پر یہ کوشش کرتے تھے کہ بادشاہ کی توہین کر کے یہ ظاہر کریں کہ اقتدار اعلیٰ رفتہ رفتہ کمپنی کے حکام کی طرف منتقل ہوتا جا رہا ہے۔ نذر کے علاوہ ایک اور اہم مسئلہ ولی عہدی کا تھا۔ جو بادشاہ اور کمپنی کے درمیان وجہ تنازعہ رہا۔ کمپنی کی حکمت عملی میں جو بددیانتی اور دھاندلی کارفرما تھی اس کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ حکام ہر طرح کے معاہدے مثلاً پچاس برس تک مغلیہ بادشاہ کو تسلیم کرنے، نذریں دینے، جانشینی کا مسئلہ اپنے ہاتھ میں لے کر بادشاہ کا خطاب ختم کر کے محض شہزادہ کا خطاب باقی رکھنے سے مکر گئی[۱۷۲]۔ ''اخبار رنگین'' جو اس زمانے کے معاملات و مسائل پر ایک اہم ماخذ ہے، ۹۳ حکایات پر مشتمل ہے۔ اس تصنیف میں ذاتی زندگی کے علاوہ اس دور کی سیاسی، معاشی و معاشرتی زندگی کی سچی تصویریں بھی ملتی ہیں۔ دم توڑتی مغلیہ حکومت، جاگیردارانہ نظام کی افادیت کے خاتمے، نئی بیرونی طاقت کمپنی کی سرکار کے بڑھتے اثرات، حقائق سے چشم پوشی اور اس دورِ انحطاط میں انگریز مورخوں، کی جانب سے مبالغہ آرائی پر مبنی ہندوستانی رہنماؤں کی مسخ شدہ تصویر کو جانچنے اور پرکھنے کے لیے ''اخبار رنگین'' کو اہم ماخذ شمار کرنا چاہیے۔ اس تصنیف میں بھی رنگین متعدد مواقع پر انگریزوں کے بڑھتے حلقہ اثر اور جنگی کامیابیوں پر بے لاگ رائے دیتے نظر آتے ہیں جس سے کمپنی کے اقتدار کی لمحہ بہ لمحہ روداد سامنے آجاتی ہے۔ انگریزوں کے ارادوں کی مضبوطی اور مستقل مزاجی پر رنگین کا یہ بیان دیکھیے:

> خبر گزری کے بھرت پور کا قلعہ انگریزوں سے ایسا لڑا کے کچھ بیان میں نہیں آتا۔ اور مدت تلک لڑ کر کس طرح بچ رہا یہ دھیان میں نہیں آتا۔ کیوں کہ انگریز لوگ جس طرف جس سے لڑنے کو جاتے ہیں ادھر سے منھ نہیں موڑتے اور جس مکان کا ارادہ کرتے ہیں اسے بن مارے زنہار نہیں چھوڑتے[۱۷۳]۔

ان تمام صورتِ حال کے مطالعے سے اچھی طرح اندازہ ہو جاتا ہے کہ ۱۸۵۷ء کے سانحے سے بہت پہلے ہی انگریزوں کے

اقتدار کی جڑیں ہندوستان میں مضبوط ہو چکی تھیں۔اس دور کی شاعری میں ضمنی طور پر کہیں کہیں انگریزوں کے بڑھتے ہوئے اثرات پر نفرت کا اظہار ملتا ہے۔شاہ کمال کی ایک نظم کا ذکر مذکورہ صفحات میں کیا جا چکا ہے۔اس نظم میں بھی شاعر کا سیاسی و سماجی شعور حیرت انگیز ہے۔کمال نے صاف طور پر اس نظم میں کہہ دیا کہ اب اس ملک کے حاکم انگریز ہیں۔اس نظم میں وزیر علی خاں پر طعن وطنز کیا گیا ہے۔ ۱۷۹۹ء میں انگریزوں کی قید سے وقتی طور پر انھیں رہائی ملی لہٰذا گمان ہے کہ یہ نظم اسی دور کی تصنیف ہوسکتی ہے [۱۷۴]۔اس نظم میں شاعر کہتے ہیں کہ:

وزیر شاہ جو ہیں ان کے ملک کا ہے یہ ڈھنگ ——— کہ اپنے بخت سے رہتے ہیں ان کو نت اٹھ جنگ
وزیر تو ہے گرفتاریاں بہ قیدِ فرنگ ——— سکھ اور مرہٹوں نے واں کیا ہے شاہ کو تنگ
نہیں رہا ہے کچھ اقبال ان کا جز ادبار [۱۷۵]

اس نظم میں شاہ کمال الدین نے انگریزوں کی حاکمیت اعلیٰ کا اعتراف کرتے ہوئے واضح طور پر لکھا کہ:

نہ ہوئے دیکھ کے کیوں کر یہ اپنا دل مغموم ——— ہو جب کہ جائے ہما آہ آشیانۂ بوم
وہ چھچے تو بس ملک میں ہیں اب معدوم ——— فرنگیوں کے جو حاکم ہی ہوگئے محکوم
تو ہم غریبوں کا پھر کیا ہے یاں قطار و شمار [۱۷۶]

یہ نظم انگریز سرکار سے گہرے تنفر کا اظہار بھی ہے اور غیر ملکیوں کے ماتحت اور غلام ہونے کے خطرے کا کھلا ثبوت بھی۔شاعر نے جس قسم کے خدشے کا اظہار کیا وہ آگے چل کر درست ثابت ہوا۔شاہ کمال ہی پر بس نہیں بلکہ ماضی میں دیگر بہت سے شعرا نے بھی اس قسم کے خدشے کو اپنی شاعری میں پیش کر کے قومی شعور و آگہی کا ثبوت دیا۔شاہ حاتم کا یہ شعر ملاحظہ کیجیے جس میں وہ انگریز حکام کی بابت کہتے ہیں کہ:

شہر میں چرچا ہے اب تیری نگاہِ تیز کا ——— دو کرے ہے دل کے تئیں نیچا انگریز کا [۱۷۷]

اس کے علاوہ مذکورہ صفحات میں ذکر کیا جا چکا ہے کہ کس طرح مصحفی ان انگریزوں کے آنے کے بعد ہندوستان کی دولت و حشمت کے چھن جانے پر افسوس و ملال کا اظہار کر رہے تھے۔یہ بات تو بہت واضح ہے اور عام سی تاریخوں میں لکھی ہوئی حقیقت ہے کہ ۱۷۵۷ء کی جنگ پلاسی اور حیدر علی اور ٹیپو سلطان کی چوبیس پچیس سالہ جدوجہد کے خاتمے سے برصغیر میں مغلیہ سلطنت کے خاتمے کی پیش بینی مشکل نہیں رہ گئی تھی۔اس جنگ کے بعد غیر ملکی استعمار کے جابر اور قاہر نمائندے یعنی ایسٹ انڈیا کمپنی کو لوٹ کھسوٹ اور سیاسی ریشہ دوانیوں کی کھلی چھٹی مل گئی تھی۔پلاسی میں فتح کے نشے کے بعد کمپنی کے عمال کی ہوس زر اندوزی کچھ زیادہ ہی بڑھتی چلی گئی اور ہر چھوٹا بڑا افسر دولت بٹورنے اور سیاسی شہرت کمانے کی راہ پر لگ گیا۔اس عمل سے جب برطانوی حکومت بدنام ہونے لگی تو ۱۷۷۶ء میں پارلیمنٹ کے اندر لارڈ نورتھ (Lord North) نے یہ بل پیش کیا جس کی رو سے کمپنی کے عمال آئندہ سے ہندوستانی امور میں برطانوی پارلیمنٹ کو جواب دے ہوں گے۔اس Regulating Act سے کمپنی کے عمال کی بے ضابطگیوں میں کچھ قدغن ضرور لگی لیکن تجارتی معاملات کے بہانے در پردہ کمپنی اپنی بالادستی قائم کرنے میں کامیاب رہی۔کمپنی کے چھوٹے عمال سے لے کر گورنر جنرل تک ہر قیمت اور ہر بہانے روپیہ بٹورنے اور نجی جائیدادیں بنانے میں مصروف رہتے۔اس عمل نے ہندوستانی معیشت تباہ و برباد کر کے رکھ دی۔ان دنوں

ہندوستان کی پارچہ بانی کی صنعت اپنے عروج پر تھی۔ بڑے بڑے کارخانوں کے علاوہ گھر گھر چھوٹی صنعتوں کا جال بچھا ہوا تھا۔ انگریز نے سب سے پہلے اس ہی صنعت کی تباہی کا ڈول ڈالا تا کہ معاشی ڈھانچے کی یہ ریڑھ کی ہڈی مفلوج ہو کر رہ جائے۔ یہ وہ دور تھا جب ہندوستان کا بنا ہوا کپڑا یورپ بالعموم اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے قیام کے بعد انگلستان بالخصوص بڑی مقدار میں برآمد کیا جاتا تھا، چناں چہ کمپنی نے پہلے انگلستان میں اس کپڑے کی تجارت پر پابندی لگائی جس سے یہاں کا معاشی ڈھانچہ مفلوج ہو کر رہ گیا۔ کارخانوں کی پیداوار گھٹتی گئی۔ دیہی پیداوار میں کمی آنے لگی۔ خام مال یعنی روئی کے انبار جمع ہونا شروع ہو گئے۔ یہی وہ دور تھا جب انگلستان میں صنعتی انقلاب بر پا تھا۔ بھاپ سے چلنے والی مشینوں کا رواج عام ہو رہا تھا۔ اس طرح باقاعدہ منصوبہ بندی کر کے ہندوستانی روی سستے داموں انگلستان کے کارخانوں میں پہنچنے لگی۔ اس طرح کمپنی نے سیاسی میدان کے ساتھ ساتھ اقتصادی میدان میں بھی پنجے گاڑھ لیے [۱۷۸] ظلم کی انتہا تو یہ ہے کہ اپنے ان کارخانوں کو چلانے کے لیے ہنر مند دست کاروں کی انگوٹھے تک کاٹے گئے تا کہ وہ کھڈی میں بُنائی کا کام نہ کر سکیں۔ جوش ملیح آبادی نے انھیں مظالم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اپنی نظم ''ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں سے خطاب'' میں کہا کہ:

دست کاروں کے انگوٹھے کاٹتے پھرتے تھے تم — سرد لاشوں سے گڈھوں کو پاٹتے پھرتے تھے تم
صنعت ہندوستان پر موت تھی چھائی ہوئی — موت بھی کیسی تمھارے ہاتھ کی لائی ہوئی [۱۷۹]

روش صدیقی نے بھی انھیں سامراجی ہتھکنڈوں اور فرنگی حکم رانوں کے ظلم و بربریت کے نت نئے طریقوں کو طنز کا نشانہ بناتے ہوئے مقامی صنعتوں کی تباہی اور دست کاروں کے ساتھ روا رکھے جانے والے ظلم کے خلاف آواز بلند کی۔ غلامی کی زنجیروں کو مضبوط سے مضبوط تر کرنے کے لیے ایسے مظالم کی مثالیں تاریخ عالم میں کم کم ہی ملتی ہیں جیسی کمپنی بہادر نے ہندوستانی کاریگروں کے ساتھ کی۔ ملاحظہ کیجیے:

با ہنر صنعت گروں کے ہاتھ کٹوائے گئے — کاسۂ سر شدتِ نفرت سے ٹھکرائے گئے
بے محابہ کوچہ و بازار لٹوائے گئے — خونِ انساں کے لبالب جام چھلکائے گئے
شاد تھا ابلیس یہ کارِ نمایاں دیکھ کر — خوں بھرے ہاتھوں میں کلیوں کا گریباں دیکھ کر
حریت کے تند شعلوں کو بجھانے کے لیے — روحِ آزادی کے پرچم کو جھکانے کے لیے
حیلۂ شیطاں کا جادو آزمانے کے لیے — چشمِ بدبیں نے مجھے تا کا نشانے کے لیے
پھر غلامی قحط کے بہروپ میں لائی گئی — زندگی کو موت کی زنجیر پہنائی گئی [۱۸۰]

کمپنی کے لوٹ مار کی روداد بہت طویل ہے۔ سراج الدولہ کو شہید کرنے کے بعد بنگال میں کمپنی نے جس قسم کی لوٹ مار کا بازار گرم کیا وہ بھی تاریخ کے سیاہ باب کے طور پر ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ کمپنی کے اسی عمل کے ذریعے خوش حال بنگال سے بدحال بنگال کے سفر کا آغاز ہوتا ہے جو آگے چل کر ڈیڑھ صدی سے زائد کا عرصہ گزرنے کے باوجود آج تک جاری ہے۔ کرنل مالسن نے اپنی تصنیف ''لارڈ کلائیو'' کے صفحہ ۱۰۷ میں بنگالے کی لوٹ مار کا ذکر کرتے ہوئے لکھا کہ کلائیو نے میر جعفر کو صوبے دار بنانے کے عوض یہ مطالبہ کیا کہ سراج الدولہ کو جو رقم ادا کرنی تھی، ادا کی جائے۔ کلکتے کے جنوب میں جس قدر زمین ہے کمپنی کو دے دی جائے، صوبے میں جس قدر فرانسیسی کوٹھیاں ہیں وہ بھی کمپنی کے حوالے کر دی جائیں، بطور تاوانِ جنگ ایک کروڑ پچاس لاکھ روپے کمپنی کو ادا کیا جائے۔ اس

کے علاوہ کروڑوں روپے مختلف افسروں کو بطور انعام دلوائے گئے۔ کلائیو نے رقوم کی وصولی کے لیے وائس اور واش کو بھیجا لیکن جب دیکھا کہ خزانہ خالی ہے تو نصف رقم لے کر باقی رقم تین سال کی اقساط میں وصولی کا فیصلہ ہوا۔ چند ماہ میں ہی نئے صوبے دار کو اندازہ ہو گیا کہ انگریزوں کے مطالبات پورے کرنے کے لیے اسے اپنی رعایا کا گلا گھونٹنا پڑے گا۔ اس کے بعد کے حالات میں میر جعفر کو انگریزوں کا ہر وہ مطالبہ تسلیم کرنا پڑا جس سے صوبے کی معیشت مزید دگرگوں ہوتی چلی گئی۔ خود میر جعفر کا انجام بھی عبرت ناک ہوا۔ آخری دنوں میں جب اس کے پاس کچھ بھی نہ تھا۔ بنیے کی طرح پانچ لاکھ کی فوری ادائیگی کے سخت مطالبے نے اس کی ناک میں دم کیے رکھا۔ ان حالات میں کسی نے اس کا ساتھ نہ دیا۔ صرف نند کمار اس کے ساتھ تھا جس نے میر جعفر کو ہر نائسٹ پلایا اور اسی سے اس کو غسل دیا[۱۸۱]۔ بنگالے میں اس دور کی بدحالی پر شعرا کا ردعمل فطری تھا۔ شیخ غلام علی راسخ بھی معاشی بدحالی کے اس دور میں بڑھاپے تک تلاش معاش میں سرگرداں رہے۔ کلکتہ اور لکھنؤ میں عمر کا بڑا حصہ گزرا۔ اس دور میں مختلف مقامات پر پھنس گئے اور معاشی حالات کا بغور مشاہدہ کیا اور ایک شہر آشوب جس کا عنوان ''مثنوی در بیان انقلاب زمانہ وشکایت ملک مخملہ احوال مقیمانِ بلدہ عظیم آباد'' ہے، یہ نظم ۱۲۰ اشعار پر مشتمل ہے[۱۸۲]۔ اس کی ابتدا میں شاعر گزشتہ زمانے کے سکون اور خوش حالی کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

عجیب عہدِ دل چسپ تھا پیشِ ازیں	نہ تھا کوئی مخزون و اندوہ گیں
گزرتی تھی آرام سے بے تعب	کہ تھے جمع اسبابِ عیش و طرب
کسو کو نہ تھی غم سے فرسودگی	جہاں اور دل خواہ آسودگی[۱۸۳]

اس کے بعد راسخ نے حالات کے بدلتے منظر نامے اور تنگ دستی کے جال میں جکڑے لوگوں کا احوال درج کیا ہے۔ اس وقت کی بے چینی اور اضطراب کا ذکر کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ:

اب اس باغ کی جائے عبرت ہے تنگ	ہوا ہو گیا ہے زمانے کا رنگ
کوئی اس چمن میں تو نگر نہیں	کوئی غنچہ ساں صاحبِ زر نہیں
ہر ایک تنگ دستی کا ہے پائمال	سبھی اپنے اپنے گرفتارِ حال[۱۸۴]

اس نظم میں بے کاری کی شدت کے اظہار کے لئے مشائخ، خطاط، شعرائے کامل، تاجر، طبیب، مزارع، وکلا، مصاحب اور سپاہیوں کی اقتصادی حالت کو بطور مثال پیش کیا گیا ہے۔ ان کا احوال شاعر نے اس قدر موثر انداز سے کیا ہے کہ اس عہد کے اقتصادی ڈھانچے کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ اس شہر آشوب میں خاص طور پر پٹنا، عظیم آباد اور بہار کے دیگر علاقوں کے حالات کی تفصیلات درج ہیں لیکن اس شہر آشوب کو محض بہار کے حالات کا منظر نامہ سمجھ کر محدود نہیں کرنا چاہیے بلکہ اسے پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ شاعر نے اس نظم میں برعظیم کی عام کیفیت کو بالعموم پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے اپنے زمانہ سیاحت میں ہر جگہ ارباب ہند کو پریشان حال پایا۔ معاشرے کی اسی ناہمواری کا حال راسخ کی مثنوی شہر آشوب میں موجود ہے۔ یہ مثنوی میر کی مثنویوں کی طرح داخلیت اور خارجیت کا امتزاج ہے[۱۸۵]۔ کچھ اشعار ملاحظہ کیجیے:

معطل ہے ہر کوئی بے کار ہے	فقط مفلسی برسر کار ہے
گدائی کا کاسہ لیے در بدر	ہیں آوارہ اربابِ فضل و ہنر

مشائخ جو ذی عز و تعظیم ہیں	دل ان کے بھی صدمہ کشِ بیم ہیں
گئے سارے ورد و وظائف کو بھول	کیا ایسا فکرِ شکم نے ملول
لکھوں خوش نویسوں کا میں حال کیا	نوشتے پہ اپنے ہیں گریاں سدا
زراعت کا پیشہ بھی بے آب ہے	دُرِ مدعا یاں تو نایاب ہے
تجارت کا مایا کسو میں کہاں	کہ باقی نہیں کچھ بجز نقدِ جاں
طبابت میں بھی اب نہیں کچھ حصول	اطبا ہیں اس عہد میں سب ملول
سپاہی کی مٹی بھی اب ہے خراب	کہ تیغا ہوا نوکری کا تو باب
نہ ترکش ہے، نے تیر ہے، نے کماں	خدنگِ الم کے نشاں ہر زماں[۱۸۶]

اس سے قبل کے شعرا نے کس طرح سے عوامی مسائل کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا اس کی تفصیلات مذکورہ صفات میں درج کی جا چکی ہے۔ مزید بے شمار مثالیں درج کی جا سکتی ہیں لیکن موضوع کو سمیٹتے ہوئے مزید ایک دو مثالیں پیش کر کے دوسرے سانحات پر توجہ ضروری ہے۔ ہندوستانی عوام جس طرح سے معاشی بدحالی کا شکار تھی، کون سا ایسا شاعر ہے جس نے اس بدحالی کا نقشہ اپنی شاعری میں نہیں کھینچا۔ حاتم، سودا، میر، فغاں، جعفر علی حسرت، مصحفی، نظیر وغیرہ کا ذکر تفصیلی طور پر کیا جا چکا ہے۔ قائم کا ذکر بھی مذکورہ صفحات میں کیا جا چکا ہے۔ انھوں نے بھی دلّی میں روزگار کی بگڑتی صورتِ حال کو اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ شاہ عالم کے دربار میں تعلق رہنے کی وجہ سے وہ اصل حقیقت سے باخبر بھی تھے۔ اسی لیے اپنے شہر آشوب میں ایک بند عوام کی حالت کے بارے میں بھی پیش کیا جو بالخصوص دلّی کے لوگوں کی معاشی حالت کو ظاہر کرتا ہے اور بالعموم پورے ہندوستان کے لوگوں کی معاشی حالت کی جھلک اس بند میں دیکھی جا سکتی ہے۔ عوام کی حالت کو بڑی دل سوزی کے ساتھ پیش کرتے ہوئے فاقوں سے ہونے والی ہلاکتوں اور بھوک کی ماری عوام کی حالت زار کو قائم نے دردانگیز پیرائے میں بیان کیا ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

مردوں کے ہر طرف ہیں پڑے سیکڑوں اٹم	سسکے ہے کوئی راہ میں، نکلے کسی کا دم
اک ہاتھ سر کے نیچے رکھے، ایک پر شکم	مانندِ چوب پاؤں میں خشکی سے پیچ و خم
چہرے کا ڈول فاقے کے اوپر گواہ ہے[۱۸۷]

ہدایت کے ایک شہر آشوب کا عنوان ''قصیدہ زلزلۂ فلک'' ہے۔ اس کا موضوع بھی نظامِ معیشت و معاشرت کے معین اقدار میں خلل آ جانے اور شرفا کے مفلس اور رذیلوں کے دولت مند ہو جانے کا بیان ہے۔ مندرجہ ذیل دو اشعار سے ہدایت کے معاشرتی شعور اور احساس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے[۱۸۸]۔ ملاحظہ کیجیے:

خشک ہو جب قحطِ بے آبی سے دریائے خوشی	ماہیِ بے آب سا تب کیوں نہ ہر ایک تلملے
ہمسری اوس سے ہے جس کے ٹکڑوں سے پلے[۱۸۹]	ہے عجب رسمِ زمانہ، ہوئے جب اسفل غنی

نظیر اکبر آبادی کی شہر آشوب نگاری میں جو نئی طرز ابھر کر سامنے آئی اس نے دوسرے شعرا کے لیے بھی یہ راہ سجھائی کہ وہ محض بڑے آدمیوں کی تباہی کے غم و اندوہ بیان کے بہ جائے معاشرے کے تباہ حال پیشوں اور پیشہ وروں کی طرف توجہ دیں۔ اسی راستے پر چلتے

ہوئے رنگین کی مثنوی شہرآشوب میں نظیر ہی کی صدائے بازگشت سنائی دیتی ہے۔ انھوں نے اپنے دور کے بارہ پیشوں، پیشہ وروں، قصاب، دہقان، سپاہی، تجار، حلوائی، بھڑ بھونجا اور عطار وغیرہ کا ذکر کرتے ہوئے تمام پیشہ وروں سے متعلق اشعار کہے [۱۹۰]۔ ملاحظہ کیجیے:

اس دنیا میں آئے ہیں جب سے — چین نہیں ہے مطلق تب سے
دولت اپنے پاس نہیں ہے — کچھ آمد کی آس نہیں ہے
فکرِ معیشت نے ہے مارا — کیجیے کس صورت سے گزارا
مجھ کو تو یہ بات یقیں ہے — کوئی دنیا میں کسی کا نئیں ہے
چیز بڑی دنیا میں ہے دولت — بن اس کے ہوتی ہے ذلت
کام یہی دنیا میں ہے آتی — اس لیے سب کو ہے یہ بھاتی
جس سے اس پر ہو کر شیدا — کر اس کو اے جان تو پیدا
کھیتی کر یا کر تو تجارت — نوکری کر یا باندھ کے ہمت
تو ہی بتا اے مردِ غافل — بن بوے کیا ہووے حاصل [۱۹۱]

پلاسی اور بکسر کی جنگوں نے ملک کی قسمت تو انگریزوں سے وابستہ کر دی لیکن انگریزوں کی معاشی پالیسی نے ہندوستان کو بدحالی کی انتہا تک پہنچانے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ بکسر کے معاہدہ صلح نے نواب وزیر شجاع الدولہ کو کلکتے کا باج گزار اور مغل شہنشاہ کو کمپنی کا وظیفہ خوار بنا دیا تھا۔ اہل نظر کے لیے یہ بات اب واضح تھی کہ ہندوستان میں کوئی قوت ایسی باقی نہیں رہی جو کمپنی کو سلطنت مغلیہ کا جانشین بننے سے باز رکھ سکے۔ آئندہ نصف صدی تک سرزمین ہند کی فضا کو گومگو، تذبذب اور ایک ان جانے خوف نے غبار آلود رہی [۱۹۲]۔ منادی کرنے والے کے یہ الفاظ اسی کیفیت کا مظہر نظر آتے ہیں کہ خلقت خدا کی، ملک بادشاہ کا، حکم کمپنی بہادر کا [۱۹۳]۔ اب ہندوستان کی دولت دھڑا دھڑ انگلستان پہنچنے اور وہاں کے صنعتی انقلاب میں کام آنے لگی۔ گویا ملکی معیشت کی لاش پر اجنبی سامراج کا دیو استبداد پلنے لگا۔ مسلمانوں کی حالت ہر جگہ الم انگیز تھی۔ کیوں کہ من حیث القوم انھوں نے ہی اس آشوب سیاست سے سب سے زیادہ نقصان اٹھائے تھے [۱۹۴]۔ اس نقصان کے وہ خود ہی ذمہ دار تھے۔ اس سے بڑھ کر شرم کی اور کیا بات ہوگی کہ ۱۷۵۷ء میں ۳۲ سالہ کلائیو کی سرکردگی میں صرف بارہ سو پیدل سپاہی پلاسی کی طرف روانہ ہوئے جن میں سے تین سو کے قریب انگریز اور باقی بے ضمیر ہندوستانی اور انھوں نے سراج الدولہ کی دس ہزار فوج کی دھجیاں بکھیر دیں۔ اس جنگ میں صرف ۳۲ انگریز ہلاک ہوئے اور ۹۴ زخمی ہوئے۔ اس طرح صرف ۳۲ جانیں ضائع کر کے اس نے برعظیم کو غلام بنانے کی ابتدا کی۔ غداری اور عیاری کے جو بھی بہانے تراشے جائیں، یہ بات عیاں ہے کہ ہماری اپنی ہی قوم سے غدار پیدا ہوئے۔ قرآن پر حلف اٹھانے والے میر جعفر نے ہمیشہ وفادار رہنے کا وعدہ کر کے کس طرح ایمان بیچا اور کیا وہ اکیلا ہی غدار تھا؟ جس کی قبر پر قوم آج تک جوتے برساتی ہے یا اس کی سالاری میں لڑنے والے وہ دس ہزار مسلمان سپاہی جنھوں میں میر جعفر کا اشارہ پاتے ہی غیرت اور ایمان کا سودا کر لیا اور اپنی وفاداریاں انگریز کے قدموں میں نچھاور کر دیں [۱۹۵]۔ اس کے بعد ۱۷۶۴ء میں بکسر کے مقام پر مغل شہنشاہ اور اودھ کے نواب شجاع الدولہ کی ڈھائی لاکھ افواج کے مقابلے میں انگریز فوج کے محض ۴۴ ہزار سپاہ جن کی اکثریت بھی مسلمانوں پر مشتمل تھی اور جو ابدالی کی قیادت میں پانی پت کے مقام پر مرہٹوں کو شکست دے چکے تھے،

لیکن ابدالی کے اچانک چلے جانے کے بعد بے یار و مددگار رزق کی تلاش میں سرگرداں تھے۔ وہ دو وقت کی روٹی کے لیے اپنا دین وایمان بیچنے کے لیے تیار تھے۔ لہٰذا انگریز بہتر خریدار کے روپ میں آیا اور بہترین اجرت پر ان چالیس ہزار اجرتی قاتلوں کو انگریزی فوج کا حصہ بنالیا۔ محض چند گھنٹوں میں بکسر کی لڑائی ختم ہوگئی اور مغلیہ سلطنت کی عظیم الشان ڈھائی لاکھ فوج انگریز توپوں کی گھن گرج سے خوف زدہ ہو کر تتر بتر ہو کر بھاگ کھڑی ہوئی۔ مغل شہنشاہ مع اودھ کے نواب نے جان کی امان پانے کے لیے انگریز کے قدموں میں سر رکھ کر جان بخشی کی بھیک مانگی۔ یہاں ایک آدھ میر جعفر نہیں بلکہ چالیس ہزار سے زیادہ ننگِ دیں اور ننگِ وطن غدار جنھوں نے روٹی کی خاطر اپنے ہی وطن کو غلام بنا کر انگریز کے سر پر فتح کا تاج پہنا دیا[196]۔ غلام تو خیر ہندوستان کو بننا ہی تھا۔ غلامی کی ترکیب کے تمام تر آثار اس قوم کے اندر پیدا ہو چکے تھے۔ حاتم کا یہ شعر اس زمانے کے حالات کی بہترین عکاسی ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

اس زمانے میں ہمارا دل نہ ہو کیوں کر اداس   دیکھ کر احوالِ عالم ہیں اڑے جاتے حواس[197]

ہندوستان کی ملت اسلامیہ نے سراج الدولہ کے بعد ٹیپو سلطان کی شخصیت میں ایک اور لائق مجاہد اور منتظم پیدا کیا۔ اس کی شخصیت میں اس قدر پیش بینی تھی کہ اس نے پہلے سے ہی اندازہ لگا لیا کہ انگریز برعظیم کے حکم رانوں اور سرداروں سے اقتدار چھین لیں گے۔ اس نے اپنی ساری جدوجہد سے ثابت کر دیا کہ وہ مغرب کی بڑھتی ہوئی طاقت کے حقیقی اسباب کا فہم وادراک رکھتا ہے۔ ۱۷۶۱ء میں حیدر علی نے برسر اقتدار آ کر بیس سال میں میسور کو اپنے دور کی ایک عظیم طاقت بنا دیا تھا۔ جس وقت حیدر علی نے عنان حکومت سنبھالی تھی، میسور، دارالحکومت سرنگاپٹم سمیت محض ۳۳ دیہاتوں پر مشتمل ایک تحصیل کے برابر چھوٹی سی ریاست تھی جس کے نام سے جنوبی ہند کے علاوہ کہیں اور کوئی واقف نہ تھا، لیکن جب اس نے ۱۸۸۲ء میں رحلت کی تو میسور کی حدود ۸۰ ہزار میل رقبے پر محیط تھی اور اس کی شہرت یورپ اور انگلستان تک پہنچ چکی تھی۔ اس وقت کے برعظیم میں انگریزوں کے بڑھتے ہوئے قدموں کے سامنے تین بڑی رکاوٹیں تھیں۔ حیدر علی، نظام اور مرہٹے وغیرہ نے ابتدا سے ہی انگریز حکم رانوں کے ساتھ دوستانہ مراسم اختیار کر رکھے تھے۔ مرہٹے پانی پت کی تیسری لڑائی میں شکست کے بعد متحد قوت کی حیثیت سے اپنی اہمیت کھو چکے تھے۔ ان سب کے برعکس حیدر علی ایک تازہ دم قوت کی صورت میں ابھرا تھا اور انگریزوں کی فتوحات کی راہ میں ایک زبردست رکاوٹ بن گیا تھا۔ انگریزوں کی خواہش تھی کہ حیدر علی نظام اور مرہٹے آپس میں لڑ کر کمزور ہو جائیں کہ کمپنی کو کوئی خطرہ نہ رہے۔ یہ ریاستیں یا تو اسی طرح ختم ہو جائیں یا کمپنی کی سرپرستی میں آ جائیں۔ وہ سمجھتے تھے کہ جب تک دکن پر ان کا مکمل اقتدار قائم نہ ہوگا اور فرانسیسی اثر ختم نہ ہوگا وہ شمالی ہند میں مرہٹوں اور دیگر والیانِ ریاست سے نبرد آزما نہیں ہو سکتے۔ انگریزوں نے اس ابھرتی ہوئی طاقت کو کچلنے کے لئے مرہٹوں اور نظام سے گٹھ جوڑ بھی کر رکھا تھا اور حیدر علی کے خلاف بلا وجہ اعلان جنگ کر دیا تھا۔ اس طرح میسور اور انگریزوں کے مابین لڑائیوں کا سلسلہ شروع ہوا جو تاریخ میں میسور کی جنگیں کہلاتی ہیں۔ ان چار جنگوں میں سے دو حیدر علی اور دو ٹیپو نے لڑیں۔ حیدر علی اور ٹیپو نے متعدد معرکوں میں انگریزوں کو شدید نقصان پہنچایا[198]۔ حیدر علی کی بڑھتی ہوئی قوت کو پیشوا اور سرکار نظام دونوں ہی اپنے لیے مخدوش خیال کرتے تھے۔ چناں چہ جب حیدر علی نے مالابار کے اضلاع فتح کرنے کے بعد شمال میں دریائے کرشنا کے علاقوں کی طرف توجہ کی تو ۱۷۶۷ء میں پیشوا اور سرکار نظام نے اس کے خلاف متحد ہو کر فوج کشی کر دی۔ بعد میں میر نظام علی خان اور حیدر علی نے صلح نامے پر دستخط کیے اور ۱۷۶۷ء میں متحدہ فوج نے کرناٹک پر حملہ کر دیا۔ اس دوران انگریز حکومت اور سرکار نظام میں صلح ہوگئی۔ حیدر علی نے باوجود سرکار نظام کے علاحدہ ہو جانے کے جنگ کا سلسلہ جاری رکھا اور

۱۷۶۸ء میں اس نے کرنل اسمتھ اور کرنل وڈ کو پے در پے شکستیں دیں[۱۹۹]۔ حیدر علی کے انتقال کے بعد ٹیپو سلطان آخری دم تک اسی کوشش میں رہا کہ نظام الملک انگریزوں کا ساتھ چھوڑ کر اس کا ساتھ دے لیکن وہ اس مقصد میں کلی طور پر کامیاب نہ ہوسکا۔ ہندوستان کے مفاد اور اجتماعی فلاح و بہبود کو جس قدر نقصان انگریزوں اور فرانسیسیوں کی آویزش نے پہنچایا وہ سب سے زیادہ تباہ کن تھا۔ انگریزوں نے نظام الملک کو اقتدار کا جھانسا دے کر اور فوجی امداد کا وعدہ کر کے اسے اپاہج بنا دیا۔ مرہٹوں میں پہلے ہی سازش کے ذریعے پھوٹ ڈال کر اور ٹیپو اور زمان شاہ کے فرضی حملوں کا خوف پیدا کر کے انھیں یہ باور کرایا کہ ٹیپو عن قریب مرہٹہ حکومت کا استیصال کر کے ہندوستان میں اسلامی حکومت قائم کر لے گا۔ محمد علی والا جاہ پہلے ہی ان انگریزوں کے پٹھو بنے ہوئے تھے۔ وہ کیوں کر ٹیپو کی حمایت کرتے[۲۰۰]۔ دوسری طرف فرانسیسی مقبوضات کا گورنر دیوما ۱۷۳۵ء۔ ۱۷۴۱ء وہ پہلا یورپین تھا جس کے ذہن میں ہندوستان میں حکومت قائم کرنے کا خیال پہلے ہی پیدا ہو چکا تھا۔ اس مقصد کے لیے اس نے زبردست فوج تیار کر رکھی تھی مگر دکن میں فرانسیسی اقتدار کا اصل معمار دو پلے تھا جو ۱۷۴۱ء سے ۱۷۵۵ء تک فرانسیسی مقبوضات کا گورنر رہا۔ اس کا صدر مقام پانڈی چری تھا۔ اسی نے سب سے پہلے ہندی سپاہیوں کو فوج میں بھرتی کر کے فوجی تربیت دی۔ یہ تجربہ اس قدر کامیاب رہا کہ بعد میں انگریزوں نے بھی اس کی تقلید کی۔ اہل فرانس کی کامیابی نے انگریزوں کو چوکس کر دیا اور وہ اسے نیچا دکھانے کے لیے میدان عمل میں کود پڑے۔ کرناٹک کی پہلی جنگ ۱۷۴۶ء تا ۱۷۴۸ء اس سلسلے کی پہلی کڑی تھی۔ بھری ۱۷۵۱ء تا ۱۷۵۵ء کرناٹک کی دوسری جنگ بھی دکن کی پیچیدہ سیاست اور اہل یورپ کی براہ راست مداخلت کا نتیجہ تھا۔ یہ جنگ دراصل نظام الملک کی وفات کے بعد تخت کے دونوں دعوے داروں ناصر جنگ اور مظفر جنگ کے درمیان چپقلش کا نتیجہ تھی۔ انگریزوں نے ناصر جنگ اور انورالدین کے لڑکے محمد علی کی حمایت کا عزم کیا جس کے بعد ان کی اور فرانسیسی کمپنیوں کے درمیان لڑائی کا آغاز ہوا۔ کرناٹک کی تیسری جان ۱۷۵۸ء تا ۱۷۶۱ء ہوئی جو اس سلسلے کی آخری اور فیصلہ کن جنگ تھی۔ اس جنگ کے بعد انگریزوں کو کلی طور پر کامیابی حاصل ہوگی[۲۰۱]۔ بنگال کی فتح کے بعد انگریزوں کے ذہن میں یہ واضح تھا کہ اب دکن کی آزادی سلب کر کے اسے بھی اپنے زیر نگیں کر لیا جائے۔ حیدر علی نے فرنگی خطرے کو بڑھتے ہوئے طوفان کا احساس کیا اور ملک کو انگریزی تسلط سے نجات دلانے کی جدوجہد شروع کی۔ انگریز اس سے بہت گھبرائے۔ ساتھیوں کی بے وفائی سے حیدر علی بعض اوقات صلح پر بھی مجبور ہوئے لیکن انگریز حیدر علی کو تنہا کر کے اس کی کمزوری سے فائدہ اٹھانا چاہتے تھے۔ حیدر علی بھی آسانی سے ہار ماننے والے نہ تھے۔ اس نے بھی فوجی طاقت کو منظم انداز سے اختیار کر کے انگریزوں کو پسپا ہونے پر مجبور کر دیا۔ بعد میں عہد نامہ مدراس کی توثیق کر کے مفتوحہ علاقوں کی واپسی، جنگی قیدیوں کی رہائی اور باہمی اتحاد و اشتراک پر دستخط ہوئے لیکن ۱۷۷۰ء میں مرہٹوں نے میسور پر حملہ کیا تو حیدر علی کی یاد دہانی کے باوجود انگریزوں نے وعدے کی پاس داری نہیں کی اور حیدر علی کی مدد سے چشم پوشی کی[۲۰۲]۔ انگریزوں کی طرف سے جو وعدہ خلافی اور بدسلوکی دکھائی گئی تھی حیدر علی اس سے برگشتہ ہو چکا تھا اور درشت الفاظ میں مدراس گورنمنٹ سے اس کی شکایت بھی کی۔ حیدر علی نے بے تکلف اور لگی لپٹی رکھے بغیر سرکار انگلشیہ کو بے ایمان اور دغا باز کہا اور بعد میں اس کی تمام تجاویز کو نامنظور کر کے ان کے سفیر کی بے عزتی بھی کی۔ اس نے انگریزوں کے خلاف جنگ کا مصمم ارادہ کر لیا۔ اس نے بنگلور میں ۸۳ ہزار آدمیوں کی جمعیت فراہم کی جو بہ لحاظ قوت تمام فوجوں سے بڑھ کر تھی۔ جنگ کے نتیجے میں انگریزوں کو سخت نقصان اٹھانا پڑا۔ معرکے میں ۷۰۰ انگریز مارے گئے۔ فرانسیسی مورخ لکھتے ہیں کہ دو ہزار انگریز مقید ہوئے۔ پانچ ہزار دیسی سپاہ اور سات ہزار گورے مارے گئے[۲۰۳]۔ میسور کی دوسری جنگ ۱۷۸۰ء میں

ٹیپو سلطان بھی شریک تھے۔ پولی لور کے مقام پر انھوں نے کرنل بیلی کو شکست دے کر اسے گرفتار کر لیا تھا۔ اس معرکے میں جنرل منرو اپنی توپیں دریا میں پھینک کر مدراس فرار ہوا۔ اس مرحلے پر اگر نواب چاہتے تو مدراس فتح کر سکتے تھے لیکن انگریزوں کی خوش قسمتی سے انھوں نے ویلور اور ارکاٹ کا رخ کیا اور ان علاقوں کو فتح کرتے ہوئے چندر گیری، چتور، ساتگڑھ اور آمبور وغیرہ پر قبضہ کر لیا[۲۰۴]۔

حیدر علی ایک معمولی فوجی افسر سے ترقی کرتے کرتے ریاست کے حکم راں بنے تھے۔ جب وہ نواب حیدر علی کے نام سے مشہور ہو گئے تو دکن کے دربارِ دکن نے اس خطاب کو پسند نہ کیا۔ میسور ایک ایسی ریاست تھی جس کے دونوں حکم رانوں مستقبل کا وژن رکھتے تھے۔ اسی لیے انھوں نے ریاست کو مضبوط بنانے کے لیے صرف فوجی اصلاحات ہی نہ کیں بلکہ سماجی و معاشی اصلاحات کر کے معاشرے کو منظم و متحد کیا۔ فوجی اصلاحات میں جدید یورپی طریقوں کو اختیار کیا۔ وقت پر تنخواہوں کی ادائیگی، فوجیوں کے لیے یونی فارم، زخمیوں کے لیے اسپتال، ریٹائرڈ فوجیوں کے لیے پنشن اور بحریہ کو مضبوط بنانے کے پیش نظر ۲۷ مسلح جہاز وغیرہ جیسے اقدامات نے جدید میسور کی بنیاد رکھنے میں اہم کردار ادا کیا۔ ٹیپو سلطان نے جاگیرداری نظام کو ختم کر کے اراضی کسانوں میں تقسیم کی۔ صنعتی ترقی کے لیے کارخانے قائم کیے۔ تاجروں کو سہولیات دیں۔ سیاسی، سماجی، معاشی اور دفاعی سطح پر میسور کو اس قابل بنا دیا کہ وہ انگریزوں کا مقابلہ کر سکے۔

حیدر علی اور ٹیپو سلطان دونوں متوسط طبقے سے تعلق رکھتے تھے، اسی لیے امرائے دکن انھیں پسندیدگی کی نگاہ سے نہ دیکھتے تھے۔ بلکہ انھیں حقارت سے دیکھتے تھے۔ اسی لیے انگریزوں نے جب انھیں جاگیریں واپس کرنے کا اشارہ کیا تو وہ خوشی سے انگریزوں کے ساتھ ہو گئے[۲۰۵]۔ انگریزوں نے ان کے خلاف زبردست پروپیگنڈا کیا۔ انھیں مذہبی جنونی قرار دیا۔ حالاں کہ مذہبی حوالے سے یہ دونوں حکم راں روشن خیال اور متوازن فکر کے حامل تھے۔ انھوں نے ہندوؤں اور عیسائیوں کے ساتھ مساوی سلوک کیا۔ نیرنگیِ زمانہ دیکھیے کہ آج دو صدیوں سے زائد کا عرصہ گزرنے کے باوجود برعظیم انگریز مورخین نے ان کے کردار کشی میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ ان عظیم محسنوں کو غاصب کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ان پروپیگنڈوں کا پہلا موثر جواب سیتا دیوی بی اے نے اپنے ایک مضمون میں دیا۔ انھوں نے لکھا ہے کہ حیدر علی پر پہلا بڑا الزام یہ لگایا جاتا ہے کہ اس نے اپنے ہندو راجا سے غداری کی اور اس کا ملک چھین لیا۔ اس کے برعکس اگر تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو یہ الزام درست نہیں دکھائی دیتا۔ اس نے ہمیشہ راجا میسور کی عزت کی۔ اس نے کئی بار میسور کو تباہی سے بچایا۔ راجا کے غداروں نے تو اسے بالکل مفلوج کر رکھا تھا اور یہی عناصر حیدر کے بھی خلاف رہے اور ان کے خلاف سازشیں بھی کیں۔ مجبوراً اسے جاگیر کی زمامِ کار ہاتھ میں لینی پڑی اور راجا کو والیِ ریاست کی حیثیت سے اپنی نگرانی میں رکھا۔ راجا کی خدمت میں وہ نذریں پیش کرتا[۲۰۶]۔ اس کے باوجود حیدر علی کو غدار کہنا کہاں تک درست ہے۔ اس کا فیصلہ وہ مورخ ہی کر سکتا ہے جو متوازن اور معروضی فکر کا حامل ہو۔ ٹیپو نے متعدد معرکوں میں انگریزوں کو شدید نقصان پہنچایا۔ تیسری جنگ ابھی جاری تھی کہ حیدر علی کے انتقال کی خبر ٹیپو پر بجلی بن کر گری۔ ان کی بے وقت موت کی وجہ سے دشمنوں کو ایک بار پھر اپنے قدم جمانے کا موقع میسر آیا۔ ٹیپو نے میسور کی حکومت سنبھالی تو چاروں طرف سے اسے خطروں نے گھیر رکھا تھا۔ اس کی حکومت کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلا دور ۱۷۸۲ء سے ۱۷۹۲ء ہے اور دوسرا دور ۱۷۹۲ء سے ۱۷۹۹ء ہے۔ پہلا دور فتوحات کا ہے جب کہ دوسرے دور میں ان کی نصف سلطنت چھن گئی تھی اور خزانہ خالی تھا۔ ٹیپو نے اپنے والد کی طرح برعظیم کی نجات اس میں سمجھی تھی کہ یہاں پر انگریزوں کے قدم نہ جمنے پائیں۔ ۱۷۹۸ء میں ویلزلی کمپنی کی مقبوضات کا گورنر جنرل بن کر ہندوستان آیا۔ اس نے ٹیپو کے خلاف ۱۸ نومبر ۱۷۹۸ء کو جنگ کے تمام منصوبے مکمل کر لیے۔ ٹیپو نے صلح

کی پیش کش کی لیکن شرائط اس قدر ذلت آمیز تھیں کہ سلطان ٹیپو کو قبول نہ تھیں۔ تیسری جنگ کے دوران وزیر اعظم محمد مہدی مہکری نے اعلانیہ غداری کی۔ سلطان داخلی اور خارجی معاملات میں گھر چکے تھے۔ اس کے بعد کی ساری داستان غداریوں سے عبارت ہے جس کا انجام ٹیپو کی شہادت کی صورت میں ظاہر ہوا[۲۰۷]۔

آخری معرکے میں جس وقت انگریز سرنگاپٹم کے مقام پر نمودار ہوئے، اس وقت ٹیپو دموں کے مقام پر پڑاو ڈالے تھے۔ جنگ کے دوران ٹیپو پیادہ پا رہے اور ادنیٰ سپاہی کی طرح مقابلہ کرتے رہے۔ ولکس کا بیان ہے کہ ٹیپو اگر چاہتے تو آسانی سے فرار ہو سکتے تھے کیوں کہ آبی پھاٹک قریب ہی تھا۔ پھاٹک سے گزرنے کی کوشش میں ٹیپو بار بار زخمی ہوئے۔ انگریزوں کی گولا باری کی وجہ سے زخمی دم توڑتے رہے اور ٹیپو بھی سخت زخمی ہوئے لیکن وہ بہادری سے میدان جنگ میں مصروف رہے۔ اس موقعے پر اس کے خادم خاص راجا خان نے مشورہ دیا کہ دشمن پر اپنی شخصیت کو ظاہر کر دے لیکن ٹیپو نے اس مشورے کو مسترد کر دیا کہ وہ انگریزوں کا قیدی بننے سے مرنے کو بہتر سمجھتا ہے۔ چند انگریزی سپاہی پھاٹک کے قریب پہنچے اور ان میں سے ایک نے ٹیپو کی تلوار کی بیش قیمت پٹی جھپٹ لی۔ خون بہہ جانے کی وجہ سے ٹیپو سخت نڈھال تھے تاہم وہ اس ذلت کو برداشت نہ کر سکے۔ تلوار اٹھا کر سپاہی پر وار کیا اور دوسرا وار بھی ایک سپاہی پر کیا جو کاری ثابت ہوا۔ اس اثنا میں ایک گولی ان کی کنپٹی پر لگی جس کے باعث وہ جاں بر نہ ہو سکے۔ ۴ مئی کی رات انگریزوں نے جشن مناتے ہوئے شہر کا ایک ایک گھر لوٹا۔ متعدد گھروں کو نذر آتش کیا اور شہریوں کو طرح طرح کی اذیتیں دیں[۲۰۸]۔

سلطنتِ میسور کے زوال میں دربارِ میسور کے غدار امرا کا بڑا ہاتھ رہا۔ یہ امرا کلیدی عہدوں پر فائز تھے۔ لہٰذا ان کے تعاون سے انگریزوں کا کام بالکل آسان ہو گیا۔ ارکانِ دولت میں بدرالزمان، سلطان ٹیپو کا نائب دیوان پورنیا برہمن، میر صادق، غلام علی لنگڑا، میر قمر الدین، میر معین الدین اور میر قاسم علی وغیرہ نے ضمیر فروشی کی اور اپنے آقاؤں کو تباہ کرنے کے لیے انگریزوں سے گٹھ جوڑ کیا۔ غداروں میں سے زیادہ بربادی میر صادق کے حصے میں آئی۔ اقبال کے مذکورہ بالا شعر سے اس کی غداری کو شہرت ملی۔ فرانسیسی جرنل اگرچہ تنخواہ دار ملازم تھا لیکن اس میں سے بعض سے خلوص کا مظاہرہ کرتے ہوئے جان کی بازی لگا دی۔ غداروں نے دشمن کے قلعے کے تین اطراف سے راہ داری فراہم کی۔ بعض ساتھیوں نے دشمن کی اطاعت کا مشورہ بھی دیا لیکن اس وقت سلطان کے منھ سے ادا ہونے والا یہ جملہ تاریخ کے صفحات پر ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو گیا کہ ''شیر کی حیاتِ یک روزہ گیدڑ کی صد سالہ زندگی سے بہتر ہے''[۲۰۹]۔ علامہ اقبال نے سلطان میسور کے اس جذبے سے متاثر ہو کر ''جاوید نامہ'' میں لکھا ہے کہ:

در جہاں نتواں اگر مردانہ زیست	ہمچو مرداں جاں سپردن زندگیست
سینہ داری اگر در خوردِ تیر	در جہاں شاہین بزی شاہین بمیر
زندگی را چیست رسم و دین و کیش	یک دمِ شیرین نہ چہ از صد سال میش[۲۱۰]

میسور میں کمپنی کے ایک جاسوس کی فراہم کردہ اطلاعات کے مطابق ۱۷۹۷ء میں میر صادق ''پرنیا'' قمر الدین خان اور کچھ دوسرے افسروں کے خطوط پکڑے گئے تھے جو انھوں نے نظام دکن، مرہٹوں اور انگریزوں کو لکھے تھے۔ اس سازش میں برہمن کو پھانسی اور میر صادق اور پرنیا کو قید بھی کیا گیا تھا لیکن بعد میں ان دونوں کو وفاداری کا عہد کرنے پر چھوڑ دیا گیا۔ میسور میں غداروں کے وجود کو ویلزلی نے بھی تسلیم کیا تھا۔ ۱۵ فروری ۱۷۹۸ء کو اس نے لکھا تھا کہ ٹیپو کی قلم رو کے مختلف حصوں سے اس کے خاص خاص وزیروں اور

افسروں کے اشارے موصول ہورہے ہیں جو اس کے خلاف جنگ کرنے میں ہمارے مددگار ہو سکتے ہیں [۲۱۱]۔

ٹیپو سلطان کے بعض غدار ایسے بھی ہیں جن کا نام عموماً غداروں کی فہرست میں نہیں ملتا لیکن میسور کی نئی ریاست میں ان غداروں کو مراعات، پنشن اور ملازمتیں دی گئیں جس سے کچھ اور غداروں کے نام سامنے آئے۔ ان میں سے ایک سلطان کے غلام راجا خاں کو ریاست میں بخشی کا عہد دیا گیا تھا لیکن چند دن بعد ہی وہ بیمار ہو کر میسور سے ارکات جاتے ہوئے مر گیا۔ اس کی لاش میسور لاکر کولیس گارڈن کے دروازے کے قریب دفن کی گئی۔ اسے کڑکولہ میں کچھ زمین بھی دی گئی تھی۔ بہرحال جب یہ غدار مر گیا تو سرنگا پٹم کے ایک ظریف شاعر نے میسور میں اپنے قیام کے وقت یہ قطعہ لکھا [۲۱۲]، ملاحظہ کیجیے:

راجا خاں اپنی جان بچانے کے واسطے	میسور چھوڑ راہی ہوا آرکاٹ کا
اتنے میں آ کے جلد کری اس کو جب قضا	دھوبی کا گدھا گھر کا ہوا نہ گھاٹ کا [۲۱۳]

اس سانحے کے بعد انگریزوں کا عمل دخل شمال سے جنوب تک پھیل گیا۔ ''دیوانِ تراب'' میں کچھ اشعار ایسے ملتے ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس زمانے میں اقوام مغرب سرزمینِ دکن پر کس طرح اپنے قدم جمارہی تھیں اور ان کے اثرات معاشرے پر اس طرح پڑ رہے تھے [۲۱۴]۔ ملاحظہ کیجیے:

ملک سارا اوفرنگستاں ہوا	پلا پلی ملک کفرستاں ہوا
غلبۂ قومِ نصارا بسکہ دستا ہر طرف	کر ظہور اپنا شتاب اے مہدیِ آخر زماں
ہوا ہے ہر طرف ہنگامہ دیکھو قوم نصاریٰ کا	خدایا بھیج مہدی کوں جوں قائم رہے مسلمانی [۲۱۵]

ٹیپو سلطان کی دلیری اور بہادری پر اس کی شہادت سے لے کر آج تک بہت سے شعرا نے اسے خراجِ تحسین پیش کیا۔ اس کے اقدامات اور طرزِ حکم رانی کو سراہا۔ اس کی مدح سرائی کی۔ قاضی غلام احمد جو ٹیپو سلطان کے زمانے میں دارالسلطنت کے قاضی تھے، شاعر بھی کرتے تھے۔ ان کی ایک تصنیف ''خلاصہ سلطانی'' عقائد و شریعت سے متعلق ہے۔ اس کتاب میں بھی مختصر قطعہ ٹیپو سلطان کی مدح میں ہے [۲۱۶]، ملاحظہ کیجیے:

اوشہ کہ جن کی فتح جہاں میں ہیں آشکار	تیغ ان کی دشمناں کے یو سر کوں کرے شکار
روشن کیے ہیں دین کو توڑے ہیں کفر کو	کفارات کے عصر میں ہیں یوں ذلیل و خوار
ہیبت سوں ان کے شاہ فرنگوں کا دل جگر	ٹیکے کہ جیون کہ شیشہ سنیں یا قوت خام کار
شاہِ جہاں ہے اور ٹیپو سلطانِ دین کے	عالم کو ان کے فیض سوں راحت ہے بے شمار [۲۱۷]

''نشانِ حیدری'' کے مصنف سید حسین علی کرمانی المتخلص بہ حاکم نے جو ٹیپو سلطان کے مصاحبین اور وقائع نگار تھے اور جن کی فارسی تاریخیں ٹیپو سلطان کے گنبد کی سنگین دیواروں پر کندہ ہیں۔ ٹیپو سلطان کا مرثیہ اردو میں لکھا [۲۱۸]۔ اس کے چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

اے فلک بس تو سفلہ پرور ہے	نیک بدخواہ و کینہ آور ہے
حامیِ دیں و اہلِ اسلام آہ	صاحبِ تاج او رافسر ہے
اس پر روتے ہیں سب زمین و آسماں	پر الم کہترا و رمہتر ہے

جب اٹھا جنگ سے وہ شہ با شرع | زندگی آج کس کو خوش تر ہے
نام پوچھاہے اس سے باتاریخ | کون یہ شاہ نام آور ہے
بولے مجھ کو یہ نالہ سر کو پیٹ | ٹیپو سلطاں شہیدِ اکبر ہے[۲۱۹]

اس زمانے میں میسور میں اردو شاعری کا ذوق عام ہو رہا تھا۔ ''نوحہ ٹیپو سلطان'' غالباً اسی دور کی تصنیف ہے جو کسی نامعلوم شاعر کی تخلیق ہے۔ اس نوحے میں بھی اسلامی جذبہ موجود ہے اسی لیے ٹیپو سلطان کی اس جنگ کو جہاد قرار دیا گیا ہے۔ بہ قول شاعر سلطان نے دینِ احمدؐ کے لیے اپنی جان فدا کی[۲۲۰]۔ نوحے کے کچھ بند ملاحظہ کیجیے:

تاریخ تھا انیسویں ذیقعد، روزِ ہفت تھا | تقویم کے احوال کو آ کر منجم نے کہا
تقدیر کی تحریر پر راضی ہوں بولا بادشاہ | از برائے دینِ احمدؐ جان خود سازم فدا
ذلت اسلام نہ ہووے ''الٰہی در جہاں''

دوپہر کا وقت تھا غوغا کیے کافر تمام | چھوٹے سلخ توپوں کے اسدم، نا رہا کوئی سقف و بام
میر صادق لعنتی کا جس طرف تھا اہتمام | کردیا ہلہ فرنگی اس طرف سیتی تمام
تاب نہ لا کر بھاگ نکلا لعنتی ولدِ زناں

جب ہوئی شہ کو خبر ہلہ کیے کافر تمام | چڑھ کو گھوڑے کے اُپر، لے دست میں سیفِ امام
جھپٹ سرک کر سیف کو کیتا بہوت سے قتل عام | لاعدو کفار کو مارا بہ حسنِ انتظام
میر فوجِ کافراں کے بہوت سے کاٹا سراں[۲۲۱]

اس قسم کی شاعری میں شاعرانہ حسن کی تلاش بے سود ہے البتہ اس قسم کی تخلیقات میں تاریخی صداقت کو پیش کرنے کا التزام ضرور رکھا جاتا ہے۔ ٹیپو سلطان کی پوری زندگی ایک تھکا دینے والی جدوجہد اور گوناگو مصائب کی طویل داستان ہے۔ خاص طور پر تخت نشینی کے بعد تو اس کا سارا وقت آگ وخوں کی ہولی کھیلتے گزرا[۲۲۲]۔ اسلامی جاہ وجلال کے اس آخری دور میں اس جری سلطان نے بکھری قوتوں کو یک جا کر کے ملت کی پھر سے شیرازہ بندی کی کوشش کی[۲۲۳]۔ اپنوں کی غداری اور غیر ضروری نرم دلی کے باعث اس نے آستین کے سانپوں سے بارہا دھوکے کھائے۔ ۱۷۹۹ء میں سلطان کی شہادت کے بعد پہلی بار انگریزوں کے منھ سے یہ معنی خیز جملہ نکلا کہ ''آج سے ہندوستان ہمارا ہے''[۲۲۴]۔ اسی لیے ٹیپو سلطان ملی تشخص کے طور پر نہ صرف موضوعِ سخن بنے رہے بلکہ بعد کے شعرا ظفر علی خان، اقبال، سیماب اکبرآبادی اور شورش کاشمیری جیسے شعرا سے خراجِ تحسین وصول کرتے رہے[۲۲۵]۔ سلطان کی فوجی تنظیم زین العابدین شوستری نے ''فتح المجاہدین'' مرتب کی۔ اس میں فوجی اصلاحات اور جنگ کے طور طریقوں پر روشنی ڈالی گئی ہے[۲۲۶]۔ اس کے شعر ملاحظہ کیجیے:

ملک ہندوستان میں دیں کا وہی سلطان ہے | غرق جس کے آب خنجر میں فرنگستان ہے
کیا ہے نسبت جاہ وحشمت میں سکندر سیں تجھے | بارگاہِ قدر کا دارا تیرا دربان ہے
ہے وہی انسانِ کامل جس میں ہے معنی کو یو | نقش دیبائی وگرنہ صورتِ انسان ہے

فرنگ و زنگ تیرے تیغ سے کیوں کر نہ لرزاں ہو — کہ جس کے خوف دم سے برق ہر دم پا بہ داماں ہو
دعا کرتا ہے ہر اک مور جس وادی سیں تو گزرے — کہ یارب یہ جہاں داور زمانے کا سلیماں ہو
اب ہر ذرہ سے یہ الفاظ نکلے ہے بہ صد آمیں — فلک پر مہر ہے جب تک زمیں پر ٹیپو سلطاں ہو[۲۲۷]

اس کے علاوہ ۱۸۷۸ء عیسوی میں حسن علی عزت نے ''اضراب سلطانی'' کے نام سے ٹیپو سلطان کا فتح نامہ لکھا۔ یہ نظم مثنوی کی ہیئت میں ہے جس میں نظام دکن، سلطان اور مرہٹوں کی اتحادی افواج کے مابین لڑی جانے والی جنگوں کا احوال درج ہے۔ اس مثنوی کو ڈاکٹر معین الدین عقیل نے ''فتح نامہ ٹیپو سلطان'' کے عنوان سے مرتب کیا[۲۲۸]۔ عزت نے یہ تاریخی نظم فتوحات ٹیپو سلطان کے کارناموں کے بارے میں لکھی تھی۔ یہ وہی لڑائی ہے جس میں مرہٹوں اور نظام نے مل کر اس کی ریاست پر حملہ کیا تھا۔ اس موقعے پر ٹیپو نے نظام کو خط بھیج کر آپس میں لڑنے کے بجائے انگریزوں کے خلاف اتحاد کی ضرورت پر زور دیا تھا مگر پھر بھی جنگ نہ ٹل سکی اور مسلسل چار برس تک جاری رہ کر مرہٹوں اور نظام کی شکست پر ختم ہوئی[۲۲۹]۔ ''اضرابِ سلطانی'' کے مصنف نے یہ مثنوی ٹیپو سلطان کے حکم سے لکھی تھی[۲۳۰]۔ اس کی زبان دکنی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

مرہٹہ مغل فوج سب جمع ہوکر — خوشی ساتھ سلطاں کی سن بد خبر
کئی سب نے یوں شرط سوگند ساتھ — لیوے ملک جلدی سوں اب ہاتھے ہاتھ
پٹن بیچ پہنچی ہے جب یہ خبر — کہ لڑنے کو باندھے ہیں راندہ کمر
خوشی ساتھ سلطان سب فوج لے — ملاقات خاطر انوں کے چلے[۲۳۱]

شاعر نے ٹیپو سلطان کے توپ چلانے کا ذکر کرتے ہوئے عملی طور پر میدان جنگ میں اس کی دلیری دکھائی ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

اپس ہات سوں داغ توپاں کئیں — جہنم میں بھیجے بہت مشرکیں
دیکھے اس کا احوال سب مشرکاں — پکارے ہو بے تاب سب الاماں[۲۳۲]

مثنوی کا سب سے اہم حصہ وہ ہے جس میں عزت نے فتح و کامرانی کی مناظر دکھائے ہیں۔ اس فتح کی خبر سے ارکارٹ میں مقیم انگریز کس طرح خوف و دہشت میں مبتلا ہوئے اس کا احوال درج کرتے ہوئے شاعر کہتے ہیں کہ:

یہ اخبار سب سن کے اہل فرنگ — بنادر میں تصویر سا ہوکے دنگ
رہے کھو کے سب عقل و تاب و تواں — خصوصاً کرستان از خوف ِجاں[۲۳۳]

نظم میں جابجا سلطان کی دینی حمیت اور اسلام کے سچے پیروکار کی حیثیت سے نبی آخرالزماں سے دوران جنگ فتح و نصرت کی دعا کے مناظر بھی پیش کیے گئے ہیں۔ ملاحظہ کیجیے:

اٹھائے تفرع سوں منگنے دعا — کہے اے خدا وندے ارض و سما
بجز پاس دینِ رسول اللہؐ — نہیں ہے میرے دل میں حرص و ہوا
بحق محمد نبی انامؐ — بحق صحاباں و بارہ امام[۲۳۴]

ڈاکٹر حبیب النسا نے ٹیپو سلطان پر لکھی گئی چند اور نظموں کا ذکر اپنی تالیف میں کیا ہے[۲۳۵]۔ان نظموں کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ سلطان ٹیپو کی شہادت کے بعد بھی اس کی توقیر میں کوئی کمی نہ آئی۔بعض شعرا نے اس عاشقانہ مضامین باندھتے کچھ غیر حقیقی قصوں کو بھی ٹیپو سلطان سے جوڑ دیا ہے۔ایک نامعلوم شاعر کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر حبیب النسا کا کہنا ہے کہ اس مثنوی میں پرنیا کے بھائی کی بیٹی اور سید حسن نامی ایک مسلمان نوجوان کی داستان عشق بیان کی ہے۔اس نظم کی ابتدا میں بھی سلطان کی مدح میں چند اشعار ملتے ہیں۔ملاحظہ کیجیے:

اے عزیز اں ٹک سنو تم یہ بیاں ہے راز دار	آفرین کہتے ملائک عرش پر صد بار بار
ملک دکن کے شہر میں کوئی ہو اک دین دار	آج لگ سلطانِ ثانی نیں شہنشہ اس کے ثار
نہ طمع دنیا کی راکھا دل منے دولت کا یار	پا شہادت ہوگیا دینِ محمد پر نثار[۲۳۶]

اس طرح کے قومی و ملی سانحات پر بعض اوقات بہت سے دردمند دلوں نے اپنی نظموں اور گیتوں میں غم کا اظہار موثر انداز سے کیا ہے۔بہت سی ایسی نظمیں بھی ہیں جو اس وقت بہت مقبول ہوئیں لیکن شائع نہ ہوسکیں۔شان الحق حقی نے ''نشیدِ حریت'' میں کسی نامعلوم شاعر کی نظم ''نوحہ ٹیپو شہید'' شامل کی ہے۔یہ نظم انھیں ایک بیاض سے ملی جس پر شاعر کا نام درج نہ تھا۔چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

سلطان ٹیپو دوستوں مارا گیا ہے ناگہاں	تھا میر صادق لعنتی امرا یزیدِ نابکار!
سونپا تھا شہ اس کے تئیں قلعہ کا دے کل اختیار	کر کر فتور او بد بخت کیتا فرنگی سے قرار

مردود کے اقرار پر پٹن کو گھیرا نابکار[۲۳۷]

برعظیم پاک و ہند کی شمع آزادی کے اس رکھوالے کو اردو کی بیش تر اصناف میں زبردست خراجِ تحسین پیش کیا گیا ہے۔شاعر مشرق علامہ اقبال نے اپنی نظم ''ٹیپو سلطان کی وصیت'' میں انھیں بھرپور خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے کہا کہ:

تو رہ نوردِ شوق ہے منزل نہ کر قبول	لیلیٰ بھی ہم نشیں ہو تو محمل نہ کر قبول
اے جوئے آب بڑھ کے ہو دریائے تند و تیز	ساحل تجھے عطا ہو تو ساحل نہ کر قبول
کھویا نہ جا صنم کدہ ِکائنات میں	محفل گداز! گرمیِ محفل نہ کر قبول
صبحِ ازل یہ مجھ سے کہا جبرائیل نے	جو عقل کا غلام ہو وہ دل نہ کر قبول
باطل دوئی پسند ہے حق لاشریک ہے	شرکت میانہ ِحق و باطل نہ کر قبول ![۲۳۸]

اقبال نے ''جاوید نامہ'' میں قصر سلطان شہید کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ:

آں شہیدان محبت را امام	آبروے ہند چین و روم و شام
نامش از خورشید و مہ تابندہ تر	خاک قبرش از منو تو زندہ تر[۲۳۹]

اقبال کا کہنا ہے کہ اس دنیا میں ایسے شہیدوں کا نام چاند اور سورج سے بھی زیادہ روشن رہتا ہے۔سلطان ٹیپو نے اپنے والد حیدر علی کے لیے جو مقبرہ تعمیر کیا تھا خود بھی وہیں دفن ہیں۔مقبرے کے باہر کی طرف تاریخیں تحریر ہیں[۲۴۰]۔ایک قطعہ تاریخ کا مصرعہ یہ ہے:

یک زاں میاں گفت (شمشیر گم شد)[۲۴۱]

علامہ اقبال کو ٹیپو سلطان سے بے پناہ عقیدت تھی۔ ''جاوید نامہ'' میں جا بجا اس کا اظہار ملتا ہے۔ مذکورہ بالا شہر میں وہ اپنے اس روحانی سفر کا ذکر کر رہے جس میں آسمان کی طرف محو پرواز ہو کر وہ جب ٹیپو سلطان سے ملاقات کرتے ہیں تو انھیں خراج تحسین پیش کرتے ہوئے ''فقرِ سلطاں وارثِ جذبِ حسین'' قرار دیتے ہیں[۲۴۲]۔ ٹیپو سلطان کو اپنے وطن عزیز کی غلامی پر ہمیشہ غم رہا۔ ان کے خیال میں اسی غلامی کے سبب اس سرزمین کے باسی اپنے اصلی جوہر دکھانے سے قاصر ہیں اسی اضطرابی کیفیت میں اقبال اور ٹیپو سلطان کے درمیان ہونے والا مکالمہ بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ ٹیپو، اقبال سے ہندوستان کی حالت کے بارے میں سوال کرتے ہیں جس کے غم میں ان کا دل خون کے آنسو روتا ہے۔ جواباً اقبال انھیں فرنگیوں کی حکمت عملی کے ناکام ہونے اور ہندوستانیوں کے دلوں میں انگریز سامراج کے بارے میں بتاتے ہوئے کہتے ہیں[۲۴۳]:

اے شناسائے حدودِ کائنات	دردکن دیدی زا آں سارے حیات
تخم اشکِ ریختم اندر دکن	لالہ ہا روید زا خاک آں چمن[۲۴۴]

ٹیپو سلطان کی اس شہادت پر مولانا ظفر علی خان نے بھی ایک نظم بہ عنوان ''سرنگا پٹم'' (سلطان ٹیپو کے مزار پر دو آنسو) تحریر کی جس میں ظفر واضح طور پر سلطان ٹیپو کی غیرت اور بہادری کا اعتراف کرتے ہوئے غداروں کے مکر وفریب کا ذکر کر رہے ہیں۔ ان کے مطابق ٹیپو کے دربار میں ایسے غداروں کی جماعت نہ ہوتی تو ہندوستان کا رنگ کچھ اور ہی ہوتا۔ شعر ملاحظہ کیجیے:

کشورِ ہند کا رنگ اور ہی ہوتا کچھ آج	مکر کا دام بچھاتا نہ اگر چرخِ کبود[۲۴۵]

اس نظم میں شاعر نے ٹیپو سلطان کی ہیبت اور خوف کے ان اثرات کا بھی جائزہ لیا ہے جو اس زمانے میں انگریزوں پر طاری تھے۔ وہ ٹیپو کو اسلام کی غیرت اور حمیت کا علم بردار ٹھہراتے ہوئے کہتے ہیں:

اے سرنگا پٹم! اے گنجِ شہیدانِ کرام	آخری وقت میں اسلام کی غیرت کی نمود
سو رہا ہے تیرے پہلو میں وہ میسور کا شیر	مایۂ ناز تھا ملت کے لیے جس کا وجود
کہیں سوتے میں نہ کروٹ یہ مجاہد بدلے	اب بھی اس خوف سے ہیں لرزہ براندام حسود
آخری قول یہ اس کا نہ ہمیں بھولے گا	جس سے قائم ہوئی آئینِ حمیت کی حدود
شیر اچھا ہے جسے مہلتِ یک روزہ ملی	یا وہ گیدڑ جسے بخشا گیا صد سالہ خلود؟[۲۴۶]

سیماب اکبر آبادی نے اپنی ایک نظم میں ٹیپو سلطان کی تعریف کی ہے اور انھیں میدان وفا کا شہید قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

اے شہیدِ مرد میدانِ وفا تجھ پر سلام	تجھ پر لاکھوں رحمتیں لاانتہا تجھ پر سلام[۲۴۷]

سیماب نے اس نظم میں ٹیپو سلطان کو سرنگا پٹم کا ہیرو اور شہیدِ ذوقِ آزادی کا علم بردار قرار دیتے ہوئے کہا کہ اگر وقت مہلت دیتا تو ٹیپو ہندوستان کا نقشہ بدلنے میں ضرور کامیاب ہو جاتے۔ اپنے ان خیالات کا اظہار کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ:

اے سرنگا پٹم اے عہدِ کمالِ حیدری	ہے امانت تجھ میں تصویرِ جلالِ حیدری
وہ شہیدِ ذوقِ آزادی وہ غازی وہ جواں	جو بدلنا چاہتا تھا نقشۂ ہندوستاں[۲۴۸]

ان شعرا کے علاوہ بھی متعدد اردو کے شاعر ایسے ہیں جنھوں نے ٹیپو سلطان کی شہادت کو قوم وملت کا ایک سانحہ قرار دیا ہے اور اس احساس کے تحت اشعار بھی کہے ہیں۔ان میں قمر اجنالوی، افسر بنگلوری، اثر سعید وغیرہ کے نام لیے جاسکتے ہیں۔اس کے علاوہ لوگ گیتوں اور نظموں میں بھی ٹیپو سلطان کی تلوار سے لے کر ان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں سے محبت کا اظہار کیا ہے۔آج بھی قوم کو ٹیپو سلطان جیسے جاں بازوں کی ضرورت ہے جو وطن کی آزادی کی خاطر اپنی جان کی پرواہ کیے بغیر اپنے مقاصد حاصل کر سکیں۔افسوس ہمارے درمیان میر صادق جیسے کردار تو موجود ہیں لیکن سراج الدولہ اور ٹیپو سلطان جیسے رجال نہیں۔اسی قحط الرجال کا ذکر کرتے ہوے افسر بنگلوری نے کیا خوب کہا ہے:

افسوس ہے یاروں اہلِ وطن ٹیپو کی شہادت بھول گئے — جو خون دیا اس دھرتی کو اس خون کی قیمت بھول گئے

اس سونا اگلتی دھرتی کو آزاد کرانے کی خاطر — اک صاحبِ ایماں مردِ خدا ٹیپو کی شہادت بھول گئے [۲۴۹]

حوالہ جات

۱۔ حسن، پروفیسر محمد، ''دہلی میں اردو شاعری کا تہذیبی وفکری پس منظر: میر کے عہد تک''، اردو اکادمی، دہلی، ۱۹۸۹ء، ص۴۵۔۴۷

۲۔ پرشاد، اوم پرکاش، ''اورنگ زیب: ایک نیا زاویہ نظر''، مشمولہ: سہ ماہی ''تاریخ''، ۵، لاہور، اپریل ۲۰۰۰ء، ص۸۶۔۸۷

۳۔ کشفی، ابوالخیر، ڈاکٹر، ''اردو شاعری کا سیاسی اور تاریخی پس منظر''، ادبی پبلشرز، کراچی، ۱۹۷۵ء، ص۱۹

۴۔ علی، ڈاکٹر مبارک، ''اورنگ زیب ایک تعارف''، مشمولہ: ''اورنگ زیب عالم گیر''، مرتبہ ڈاکٹر مبارک علی، فکشن ہاؤس، لاہور، ۲۰۰۰ء، ص۶

۵۔ نعمانی، شبلی، ''اورنگ زیب عالمگیر''، مرتبہ ڈاکٹر مبارک علی، محولہ بالا، ص۲۳۔۲۴

۶۔ نعمانی، شبلی، ''کلیاتِ شبلی''، معارف پریس، اعظم گڑھ، سن ندارد، ص۴۷

۷۔ جالبی، ڈاکٹر جمیل، ''تاریخ ادب اردو''، جلد دوم، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۲۰۰۹ء، ص۹۰۔۱۰۵

۸۔ زٹلی، مرزا جعفر، ''زٹل نامہ: کلیات جعفر زٹلی''، مرتبہ: رشید حسن خاں، انجمن ترقی اردو ہند، دہلی، ۲۰۱۱ء، ص۱۳۸

۹۔ اثر، ڈاکٹر محمد علی، ''اورنگ زیب، دکنی شعرا کی نظر میں''، غیر مطبوعہ مقالہ، ص۱

۱۰۔ مازندرانی، سید مظفر، بہ حوالہ: محمد علی اثر، ص۱۔۲

۱۱۔ ضعیفی، شیخ دادو، بہ حوالہ: ''اورنگ زیب: دکنی شعرا کی نظر میں''، محولہ بالا، ص۲

۱۲۔ اولیا گولکنڈوی، بہ حوالہ: ''اورنگ زیب: دکنی شعرا کی نظر میں''، محولہ بالا، ص۲

۱۳۔ ذوقی، شاہ حسین، بہ حوالہ: ''اورنگ زیب: دکنی شعرا کی نظر میں''، محولہ بالا، ص۳

۱۴۔ بحری، قاضی محمود، بہ حوالہ: ''اورنگ زیب: دکنی شعرا کی نظر میں''، محولہ بالا، ص۳

۱۵۔ محمد ظہیر، ''عالم گیر اور سلطنتِ مغلیہ کا زوال''، ایجوکیشنل پریس، کراچی، ۲۰۰۶ء، ص۴۳۵۔۴۴۲

۱۶۔ بیگم، شہناز، ''اردو شاعری میں مغل سلطنت کے زوال کی عکاسی''، انجمن ترقی اردو ہند، دہلی، ۲۰۰۴ء، ص۱۵۔۲۶

۱۷۔ جالبی، جلد دوم، ص۳

۱۸۔ زٹلی، ص۱۳۸۔۱۳۹

۱۹۔ ایضاً، ص۲۷۹۔۲۸۰

۲۰۔ جالبی، جلد دوم، ص۹۰۔۹۴

۲۱۔ زٹلی، ص۲۶۵

۲۲۔ جالبی، جلد دوم، ص۱۰۳

۲۳۔ زٹلی، ص۹۵۔۹۶

۲۴۔ جالبی، جلد دوم، ص۱۰۹

۲۵۔ جالبی، ڈاکٹر جمیل، ''تاریخ ادب اردو''، جلد اوّل، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۲۰۰۸ء، ص۶۴۲

۲۶۔ میر، تقی میر، ''کلیات میر''، مرتبہ عبدالباری آسی، نول کشور پریس، لکھنؤ، ۱۹۴۱ء، ص۵۴۸

۲۷۔ بیگم، شہناز، ص۲۸

۲۸۔ حسرت، جعفر علی، ''کلیات حسرت''، مرتبہ ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی، دانش محل، لکھنؤ، ۱۹۶۶ء، ص۵۶

۲۹۔ محمود الرحمٰن، ص۴۷

۳۰۔ دکنی، ولی، بہ حوالہ: محمود الرحمٰن، ص۴۷

۳۱۔ جالبی، جلد دوم، ص۲۔۳

۳۲۔ آزاد، مولانا محمد حسین، بہ حوالہ: ''اردو شاعری پر سیاسی اثرات''، از ڈاکٹر محمد ذاکر اللہ، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۱۱ء، ص۴۵

۳۳۔ ذاکر اللہ، ڈاکٹر محمد، ''اردو شاعری پر سیاسی اثرات''، محولہ بالا، ص۴۶

۳۴۔ میر، تقی میر، بہ حوالہ: ''اردو شاعری پر سیاسی اثرات''، محولہ بالا، ص۴۶

۳۵۔ جالبی، جلد دوم، ص۳

۳۶۔ طباطبائی، غلام حسین خان، ''سیر المتاخرین''، جلد سوم، مطبع نول کشور، لکھنؤ، ۱۸۶۶ء، ص۸۷۰

۳۷۔ عمر، محمد، ''اٹھارھویں صدی میں ہندوستانی معاشرت (میر کا

عہد)''، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی، ۱۹۷۳ء، ص ۱۔۲

۳۸۔ بہ حوالہ: ''چمنستانِ شعرا''، مرتبہ مولوی عبدالحق، ص ۳۸

۳۹۔ حاتم، شاہ، مشمولہ: ''شہر آشوب''، مرتبہ ڈاکٹر نعیم احمد، مکتبہ جامعہ، دہلی، ۱۹۶۸ء، ص ۷۱۔۷۵

۴۰۔ دت، رمیش، ''ہندوستان کی معاشی تاریخ''، جلد اوّل، مترجم غلام ربانی تاباں، ترقی بورڈ اردو، نئی دہلی، ۱۹۷۹ء، ص ۳۲۔۳۵

۴۱۔ قریشی، اشتیاق حسین، ''برعظیم پاک و ہند کی ملّت اسلامیہ''، مترجم ہلال احمد زبیری، شعبہ تصنیف و تالیف کراچی یونی ورسٹی، کراچی، ۱۹۹۹ء، ص ۲۲۶۔۲۲۷

۴۲۔ حسرت، مرزا جعفر علی، مشمولہ: ''شہر آشوب''، محولہ بالا، ص ۹۳۔۹۷

۴۳۔ میر، تقی میر، ص ۲۹۰

۴۴۔ جالبی، جلد دوم، ص ۳۔۴

۴۵۔ طباطبائی، غلام حسین خان، ''سیر المتاخرین''، جلد دوم، نول کشور، لکھنؤ، ۱۸۶۶ء، ص ۸۴۴

۴۶۔ چندر، ڈاکٹر ستیش، ''مغل دربار کی گروہ بندیاں اور ان کی سیاست''، مترجم: محمد قاسم صدیقی، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، ۱۹۸۷ء، ص ۲۱۹۔۲۲۱

۴۷۔ سلٹیوف، میجر جنرل، ''ہندوستان پر حملے: مغرب اور افغانستان کی جانب سے''، مترجم: میرزا علی حسین، خادم التعلیم اسٹیم پریس، لاہور، ۱۹۰۹ء، ص ۶۹۔۱۵۵

۴۸۔ طباطبائی، غلام حسین خان، ''سیر المتاخرین''، مترجم یونس احمر، نفیس اکیڈمی، کراچی، ۱۹۶۸ء، ص ۲۴۷۔۲۴۹

۴۹۔ آشوب، ''ہسٹری آف پرشیا''، جلد دوم، ص ۲۶۲، بہ حوالہ: ''تاریخ شاہ عالم''، از ڈبلیو۔ فرینکلن، مترجم نثار الحق صدیقی، آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس، کراچی، ۱۹۷۶ء، ص ۲۱۲

۵۰۔ نسیم، ڈاکٹر الف۔ د۔ ''بارھویں صدی ہجری میں دلّی کا شاعرانہ ماحول''، اردو اکیڈمی پاکستان، لاہور، ۱۹۹۹ء، ص ۱۵۰۔۱۵۶

۵۱۔ ذوالفقار، ص ۶۵۔۷۵

۵۲۔ میر، میر تقی، ''ذکر میر''، انجمن ترقی اردو، اورنگ آباد، ۱۹۲۸ء، ص ۸۵۔۸۸

۵۳۔ احمد، ڈاکٹر نعیم، ''شہر آشوب کا تحقیقی مطالعہ''، ادبی اکادمی، علی گڑھ، ۱۹۷۹ء، ص ۶۰۔۶۶

۵۴۔ احمد، پروفیسر نعیم، ''میر کی شہر آشوبیہ شاعری: ایک مطالعہ''، مشمولہ: ''میر تقی میر''، مرتبین: ڈاکٹر تحسین فراقی و ڈاکٹر عزیز ابن الحسن، مقتدرہ قومی زبان پاکستان، اسلام آباد، ۲۰۱۰ء، ص ۳۴۵۔۳۴۶

۵۵۔ میر، میر تقی، بہ حوالہ: ''میر کی شہر آشوبیہ شاعری''، محولہ بالا، ص ۳۴۶

۵۶۔ ایضاً، ص ۳۴۷

۵۷۔ ایضاً

۵۸۔ احمد، پروفیسر نعیم، ''میر کی شہر آشوبیہ شاعری''، محولہ بالا، ص ۳۴۸

۵۹۔ میر، میر تقی، بہ حوالہ: ''میر کی شہر آشوبیہ شاعری''، محولہ بالا، ص ۳۴۸

۶۰۔ ایضاً، ص ۳۴۹

۶۱۔ ایضاً، ص ۳۵۰

۶۲۔ ایضاً، ص ۳۵۱

۶۳۔ میر، میر تقی، ''شہر آشوب''، مرتبہ: ڈاکٹر نعیم احمد، مکتبہ جامعہ، دہلی، ۱۹۶۸ء، ص ۱۲۱۔۱۲۲

۶۴۔ ایضاً، ص ۱۲۹

۶۵۔ احمد، پروفیسر نعیم، ''میر کی شہر آشوبیہ شاعری''، محولہ بالا، ص ۳۵۵۔۳۵۶

۶۶۔ سکسینہ، رام بابو، ''تاریخ ادب اردو''، مترجم: مرزا محمد عسکری، نول کشور، لکھنؤ، سن ندارد، ص ۹۳

۶۷۔ آزاد، محمد حسین، ''آب حیات''، شیخ مبارک علی، لاہور، ۱۹۵۴ء، ص ۱۰۵

۶۸۔ ناجی، شاکر، مشمولہ: ''شہر آشوب''، محولہ بالا، ص ۴۷۔۴۸

۶۹۔ محمود الرحمٰن، ص ۵۳

۷۰۔ فغاں، اشرف علی، بہ حوالہ: ''جنگ آزادی کے اردو شعرا''، محولہ بالا، ص ۵۳۔۵۴

۷۱۔ محمود الرحمٰن، ص ۵۴

۷۲۔ فغاں، بہ حوالہ: ''جنگ آزادی کے اردو شعرا''، محولہ بالا، ص۵۴

۷۳۔ محمود الرحمٰن، ص۵۵

۷۴۔ فغاں، بہ حوالہ: ''جنگ آزادی کے اردو شعرا''، محولہ بالا، ص۵۵

۷۵۔ احمد، ڈاکٹر نعیم، ''شہر آشوب''، محولہ بالا، ص۵۵

۷۶۔ ایضاً، ص۴۹۔۵۰

۷۷۔ ایضاً، ص۵۷

۷۸۔ حسینی، ڈاکٹر سید اعجاز، ''مختصر تاریخِ ادب اردو''، اردو اکیڈمی سندھ، کراچی، ۱۹۵۶ء، ص۸۰

۷۹۔ محمود الرحمٰن، ص۵۸

۸۰۔ سودا، مرزا محمد رفیع، مشمولہ: ''جنگ آزادی کے اردو شعرا''، محولہ بالا، ص۵۸

۸۱۔ محمود الرحمٰن، ص۵۸

۸۲۔ سودا، مرزا محمد رفیع، مشمولہ: ''شہر آشوب''، محولہ بالا، ص۵۴

۸۳۔ ایضاً، ص۶۱۔۶۳

۸۴۔ بیگم، شہناز، ص۲۲۷۔۲۲۸

۸۵۔ نظامی، خلیق احمد، ''تاریخ مشائخ چشت''، ندوۃ المصنفین، دہلی، ۱۹۵۳ء، ص۳۱۲

۸۶۔ چندر، ستیش، ص۲۴۷۔۲۴۸

۸۷۔ ولی اللہ، شاہ، ''شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات''، مرتبہ: خلیق احمد نظامی، ندوۃ المصنفین، دہلی، ۱۹۶۹ء، ص۸۹۔۹۰

۸۸۔ سودا، مشمولہ: ''شہر آشوب''، محولہ بالا، ص۶۶

۸۹۔ مصحفی، غلام ہمدانی، ''دیوانِ مصحفی''، مرتبہ و منتخبہ: اسیر لکھنوی و امیر مینائی، پٹنہ، ۱۹۹۰ء، ص۳۶

۹۰۔ حسرت، جعفر علی، ''کلیات حسرت''، مرتبہ: ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی، لکھنؤ، ۱۹۶۶ء، ص۵۷

۹۱۔ حسرت، ص۵۶

۹۲۔ بیگم، شہناز، ص۱۴۰

۹۳۔ مصحفی، ص۳۶

۹۴۔ بیگم، شہناز، ص۱۴۰

۹۵۔ سودا، محمد رفیع، ''کلیات سودا''، جلد اوّل، مرتبہ: عبدالباری آسی، نول کشور، لکھنؤ، ۱۹۳۲ء، ص۳۶۷

۹۶۔ سپیئر، پرسیوال، "Twilight of the Mughals"، دہلی، ۱۹۶۹ء، ص۶۲

۹۷۔ راسخ، مشمولہ: ''شہر آشوب''، مرتبہ: ڈاکٹر نعیم، محولہ بالا، ص۱۵۵

۹۸۔ حاتم، شیخ ظہور الدین، ''دیوان زادہ''، مرتبہ: ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار، لاہور، ۱۹۷۵ء، ص۱۹۴

۹۹۔ سودا، ''کلیات سودا''، جلد اوّل، ص۳۶۷

۱۰۰۔ اکبر آبادی، نظیر، ''کلیات نظیر اکبر آبادی''، مرتبہ: عبدالباری آسی، لکھنؤ، ۱۹۵۱ء، ص۴۷۰

۱۰۱۔ عمر، محمد، ''اٹھارھویں صدی میں ہندوستانی معاشرت: میر کا عہد''، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی، ۲۰۱۳ء، ص۲۲۔۳۲

۱۰۲۔ سودا، جلد اوّل، ص۳۷۰

۱۰۳۔ حسرت، جعفر علی، ''کلیات جعفر''، محولہ بالا، ص۵۴۔۵۵

۱۰۴۔ ذوالفقار، ص۷۷۔۷۸

۱۰۵۔ مصحفی، ص۱۸۴

۱۰۶۔ کشفی، ص۱۸۴

۱۰۷۔ مصحفی، بہ حوالہ: ''اردو شاعری کا سیاسی اور تاریخی پس منظر''، محولہ بالا، ص۱۸۴

۱۰۸۔ صدیقی، ڈاکٹر ابواللیث، ''لکھنؤ کا دبستانِ شاعری''، ص۱۲۰

۱۰۹۔ نارنگ، گوپی چند، ص۲۵۵۔۲۵۶

۱۱۰۔ مصحفی، بہ حوالہ: ''اٹھارھویں صدی میں ہندوستانی معاشرت: میر کا عہد''، محولہ بالا، ص۳۶۔۳۷

۱۱۱۔ عمر، محمد، ص۳۱

۱۱۲۔ چاند پوری، قائم، بہ حوالہ: ''اٹھارھویں صدی میں ہندوستانی معاشرت: میر کا عہد''، محولہ بالا، ص۳۸

۱۱۳۔ عقیل، ڈاکٹر معین الدین، ''تحریک آزادی میں اردو کا حصہ''، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی، ۱۹۷۶ء، ص۱۳۴۔۱۳۵

۱۱۴۔ انجام، نواب امیر خان، بہ حوالہ: ''تحریک آزادی میں اردو کا حصہ''، محولہ بالا، ص۱۳۵

۱۱۵۔ حاتم، بہ حوالہ: ''تحریک آزادی میں اردو کا حصہ''، محولہ بالا، ص۱۳۸

۱۱۶۔ تاباں، میر عبدالحئی، بہ حوالہ: ''تحریک آزادی میں اردو کا حصہ''، محولہ بالا،ص ۱۳۷۔۱۳۹

۱۱۷۔ ایضاً،ص ۱۴۸

۱۱۸۔ پیغام، اشرف علی خاں، بہ حوالہ: ''تحریک آزادی میں اردو کا حصہ''،محولہ بالا،ص ۱۵۵

۱۱۹۔ عسکری، مرزا، بہ حوالہ: ''تحریک آزادی میں اردو کا حصہ''، محولہ بالا،ص ۱۵۵

۱۲۰۔ اختر، ڈاکٹر ملک حسن، ''اردو شاعری میں ایہام گوئی کی تحریک''، فروغِ ادب اکادمی، گوجرانوالہ،۱۹۹۲ء،ص ۱۵۲

۱۲۱۔ آبرو، شاہ مبارک، بہ حوالہ: ''اردو شاعری میں ایہام گوئی کی تحریک''، محولہ بالا،ص ۱۵۳

۱۲۲۔ ناجی، محمد شاکر، بہ حوالہ: ''اردو شاعری میں ایہام گوئی کی تحریک''، محولہ بالا،ص ۱۵۳

۱۲۳۔ آبرو، شاہ مبارک، بہ حوالہ: ''اردو شاعری میں ایہام گوئی کی تحریک''، محولہ بالا،ص ۱۵۴

۱۲۴۔ حاتم، شاہ، بہ حوالہ: ''اردو شاعری میں ایہام گوئی کی تحریک''، محولہ بالا،ص ۱۵۴

۱۲۵۔ عقیل،ص ۱۵۹

۱۲۶۔ جانِ جاناں، مرزا مظہر، بہ حوالہ: ''تحریک آزادی میں اردو کا حصہ''، محولہ بالا،ص ۱۵۹

۱۲۷۔ عقیل،ص ۱۶۱

۱۲۸۔ میر، میر محمد تقی، بہ حوالہ: ''تحریک آزادی میں اردو کا حصہ''، محولہ بالا،ص ۱۶۲

۱۲۹۔ صدیقی، ثناء الحق، ''میر وسودا کا دور: اردو شاعری کا عہد زریں''، اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ، کراچی،۱۹۹۳ء،ص ۳۱۱

۱۳۰۔ عقیل،ص ۱۷۵

۱۳۱۔ اکبر آبادی، نظیر، بہ حوالہ: ''تحریک آزادی میں اردو کا حصہ''، محولہ بالا،ص ۱۷۵

۱۳۲۔ ایضاً،ص ۱۷۵۔۱۷۶

۱۳۳۔ ایضاً،ص

۱۳۴۔ ایضاً،ص ۱۷۷

۱۳۵۔ عقیل،ص ۱۷۶

۱۳۶۔ نقوی، ڈاکٹر سید طلعت حسین، ''نظیر اکبر آبادی کی نظم نگاری''، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی،۱۹۹۲ء،ص ۶۱

۱۳۷۔ اکبر آبادی، نظیر، بہ حوالہ: ''نظیر اکبر آبادی کی نظم نگاری''، محولہ بالا، ص ۶۱

۱۳۸۔ عمر، محمد، ''اٹھارھویں صدی میں ہندوستانی معاشرت: میر کا عہد''، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی،۲۰۱۳ء،ص ۵۱

۱۳۹۔ نامعلوم، بہ حوالہ: ''اٹھارھویں صدی میں ہندوستانی معاشرت: میر کا عہد''، محولہ بالا،ص ۵۱

۱۴۰۔ نظامی، پروفیسر خلیق،ص ۱۹

۱۴۱۔ کاظمی، ڈاکٹر روشن اختر، ''اردو میں طویل نظم نگاری کی روایت اور ارتقا''، موڈرن پبلشنگ ہاؤس، دہلی،۱۹۸۴ء،ص ۴۳۔۴۷

۱۴۲۔ عبداللہ، ڈاکٹر سید، ''تنقیدی مقالات''، مرتبہ: مرزا ادیب، لاہور اکیڈمی، لاہور،۱۹۶۳ء،ص ۱۵۷

۱۴۳۔ عابد، سیدہ افصح، ''مغلیہ عہد مین جاگیرداری نظام کا عروج اور اردو شاعری''، مشمولہ: ''معیار''، اسلام آباد، جنوری۔جون ۲۰۱۳ء، ص ۱۴۷۔۱۴۸

۱۴۴۔ ناسخ، امام بخش، بہ حوالہ: ''مغلیہ عہد میں جاگیرداری نظام کا عروج اور اردو شاعری''، محولہ بالا،ص ۱۴۸

۱۴۵۔ لکھنوی، رند، بہ حوالہ: ''مغلیہ عہد میں جاگیرداری نظام کا عروج اور اردو شاعری''، محولہ بالا،ص ۱۴۸

۱۴۶۔ نیر، ڈاکٹر طاہرہ، ''اردو شاعری میں پاکستانی قومیت کا اظہار''، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی،۱۹۹۱ء،ص ۶۶۔۶۷

۱۴۷۔ جرات، شیخ قلندر بخش، بہ حوالہ: ''اردو شاعری میں پاکستانی قومیت کا اظہار''، محولہ بالا،ص ۶۷

۱۴۸۔ عبدالباری، ڈاکٹر سید، ''لکھنؤ کے شعر و ادب کا معاشرتی و ثقافتی پس منظر''، نشاط آفسٹ پریس، فیض آباد،۱۹۸۷ء،ص ۵۹۔۶۳

۱۴۹۔ جین، ڈاکٹر گیان چند، ''اردو مثنوی شمالی ہند میں''، جلد اوّل، انجمن ترقی اردو ہند، دہلی،۱۹۸۶ء،ص ۲۶

۱۵۰۔ ذاکر اللہ، ڈاکٹر محمد، ''اردو شاعری پر سیاسی اثرات''، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی،۲۰۱۱ء،ص ۱۳۰۔۱۳۱

۱۵۱۔ مصحفی، غلام ہمدانی، بہ حوالہ: ''اردو شاعری پر سیاسی اثرات''، محولہ بالا، ص۱۳۱
۱۵۲۔ انشا، انشااللہ خان، بہ حوالہ: ''اردو شاعری پر سیاسی اثرات''، محولہ بالا، ص۱۳۱
۱۵۳۔ ناسخ، امام بخش، ''دیوانِ ناسخ''، دوم، نول کشور پریس، لکھنؤ، ۱۹۳۷ء، ص۱۲۹
۱۵۴۔ راسخ، شیخ غلام علی، بہ حوالہ: ''اردو شاعری کا سیاسی اور تاریخی پس منظر''، محولہ بالا، ص۱۷۱
۱۵۵۔ حسین، ڈاکٹر یوسف، ''تاریخ دستورِ حکومتِ ہند''، دہلی، ۱۹۳۹ء، ص۲۳
۱۵۶۔ علیگ، باری، ''کمپنی کی حکومت''،
۱۵۷۔ ذوالفقار، ص۸۵
۱۵۸۔ صدیقی، پروفیسر ریاض، ''ایسٹ انڈیا کمپنی کی کہانی''، مشمولہ: سہ ماہی ''تاریخ''، شمارہ ۱۹، فکشن ہاؤس کتابی سلسلہ، لاہور، ۲۰۰۳ء، ص۱۳۸۔۱۴۰
۱۵۹۔ عقیل، ص۳۴۔۳۷
۱۶۰۔ عمر، ڈاکٹر محمد، ''سراج الدولہ''، انجمن ترقی اردو ہند، دہلی، ۱۹۴۶ء، ص۱۵۸۔۱۵۹
۱۶۱۔ لطل، بہ حوالہ: ''سراج الدولہ''، محولہ بالا، ص۱۵۹۔۱۶۰
۱۶۲۔ اقبال، علامہ، بہ حوالہ: ''اردو ڈائجسٹ''
۱۶۳۔ اعظمی، شہاب ظفر، ''راجا رام نرائن موزوں کی اردو شاعری''، مشمولہ: ''فکر و تحقیق''، اپریل۔مئی ۲۰۱۲ء، ص۱۱۷۔۱۱۸
۱۶۴۔ عبدالودود، قاضی، ''مقالات قاضی عبدالودود''، پٹنہ، ص۴۹
۱۶۵۔ موزوں، راجا رام نرائن، بہ حوالہ: ''تذکرۂ شعرائے اردو''، از میر حسن، مرتبہ: محمد حبیب الرحمٰن خاں شروانی، انجمن ترقی اردو ہند، دہلی، ۱۹۴۰ء، ص۱۵۰
۱۶۶۔ حسن، میر، ''تذکرۂ شعرائے اردو''، مرتبہ: محمد حبیب الرحمٰن خاں شروانی، انجمن ترقی اردو ہند، دہلی، ۱۹۴۰ء، ص۱۵۰
۱۶۷۔ عبدالودود، قاضی، ''آوارہ گرد اشعار''، خدا بخش لائبریری، پٹنہ، ۱۹۸۴ء، ص۴۹
۱۶۸۔ کاکوی، عطا، ''غلطی ہائے مضامین''، جلد اوّل، خدا بخش جرنل، پٹنہ، ۱۹۸۴ء، ص۶۰
۱۶۹۔ اعظمی، ص۱۲۰
۱۷۰۔ موزوں، بہ حوالہ: ''راجا رام نرائن موزوں کی اردو شاعری''، محولہ بالا، ص۱۲۰۔۱۲۱
۱۷۱۔ عمر، محمد، ''اٹھارھویں صدی میں ہندوستانی معاشرت''، محولہ بالا، ص۶۰۔۶۴
۱۷۲۔ معین الحق، سید، ''مقدمہ''، مشمولہ: ''اخبار رنگین''، از سعادت یار خان رنگین، پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی، کراچی، ۱۹۶۲ء، ص۴۔۱۸
۱۷۳۔ رنگین، سعادت یار خاں، ''اخبار رنگین''، پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی، کراچی، ۱۹۶۲ء، ص۶۸
۱۷۴۔ کاظمی، ص۱۰۹۔۱۱۱
۱۷۵۔ شاہ، کمال الدین، بہ حوالہ: ''اردو میں طویل نظم نگاری کی روایت اور ارتقا''، محولہ بالا، ص۱۱۰
۱۷۶۔ ایضاً، ص۱۱۱
۱۷۷۔ حاتم، شاہ، بہ حوالہ: ''اردو شاعری میں ایہام گوئی کی تحریک''، محولہ بالا، ص۱۵۵
۱۷۸۔ احمد، عتیق، ''اردو ادب میں احتجاج''، مکتبہ عالیہ، لاہور، ۱۹۸۷ء، ص۳۰۔۳۶
۱۷۹۔ ملیح آبادی، جوش، ''ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں سے خطاب''، مشمولہ: ''نشید حریت''، مرتبہ: شان الحق حقی، ادارۂ مطبوعات پاکستان، فیروز سنز، کراچی، ۱۹۵۷ء، ص۲۲۴
۱۸۰۔ صدیقی، روش، ''قحطِ بنگال''، مشمولہ: ''افسوس تکلم''، کتاب بھون، دہلی، ۱۹۱۳ء، ص۱۹۲۔۱۹۴
۱۸۱۔ عمر، محمد، ''سراج الدولہ''، محولہ بالا، ص۲۳۴۔۲۴۲
۱۸۲۔ احمد، ڈاکٹر نعیم، ''شہر آشوب کا تحقیقی مطالعہ''، محولہ بالا، ص۱۴۵۔۱۴۶
۱۸۳۔ راسخ، شیخ غلام علی، بہ حوالہ: ''شہر آشوب کا تحقیقی مطالعہ''، محولہ بالا، ص۱۴۶
۱۸۴۔ ایضاً
۱۸۵۔ کشفی، ص۱۷۱

۱۸۶۔ راسخ، بہ حوالہ: ''اردو شاعری کا سیاسی اور تاریخی پس منظر''، محولہ بالا، ص ۱۷۱

۱۸۷۔ چاند پوری، قائم، بہ حوالہ: ''اردو شاعری کا سیاسی اور تاریخی پس منظر''، محولہ بالا، ص ۱۵۸

۱۸۸۔ احمد، عتیق، ص ۵۴

۱۸۹۔ ہدایت، بہ حوالہ: ''اردو ادب میں احتجاج''، محولہ بالا، ص ۵۴

۱۹۰۔ احمد، عتیق، ص ۵۸۔۵۹

۱۹۱۔ رنگین، سعادت یار خاں، بہ حوالہ: ''اردو ادب میں احتجاج''، محولہ بالا، ص ۵۹

۱۹۲۔ ذوالفقار، ڈاکٹر غلام حسین، ص ۸۰

۱۹۳۔ دہلوی، ظہیر، ص ۴۶

۱۹۴۔ ذوالفقار، ڈاکٹر غلام حسین، ص ۸۶

۱۹۵۔ خان، کیپٹن نذیر الدین، ''پہلا پتھر''، نیو ہورائزن پبلی کیشنز، کراچی، ۲۰۰۸ء، ص ۱۴۶۔۱۴۷

۱۹۶۔ ایضاً، ص ۱۴۸۔۱۵۰

۱۹۷۔ حاتم، شاہ، بہ حوالہ: ''اردو شاعری میں ایہام گوئی کی تحریک''، محولہ بالا، ص ۱۵۴

۱۹۸۔ عقیل، ص ۳۸۔۳۹

۱۹۹۔ خان، ڈاکٹر یوسف حسین، ''تاریخ ہند: عہد جدید''، مطبع جامعہ عثمانیہ، حیدر آباد دکن، ۱۹۴۸ء، ص ۱۳۷۔۱۳۹

۲۰۰۔ نجی اللہ، ''ٹیپو سلطان شہید''، ادارہ اشاعتِ چنچل گوڑھ، حیدر آباد دکن، سن ندارد، ص ۹۔۱۲

۲۰۱۔ عبدالرسول، صاحب زادہ، ''پاک و ہند کی اسلامی تاریخ''، ایم۔آر۔ برادرز، لاہور، ۱۹۶۶ء، ص ۲۴۳۔۲۵۱

۲۰۲۔ رحمانی، عشرت، ''ہماری آزادی کی کہانی''، مکتبہ معین الادب، لاہور، ۱۹۵۷ء، ص ۲۲۔۲۴

۲۰۳۔ نگم، ڈپٹی لال صاحب بی۔ اے۔ ''سوانح عمری حیدر علی''، کرزن اسٹیم پریس، دہلی، سن ندارد، ص ۷۔۴۵

۲۰۴۔ عبدالرسول، صاحب زادہ، ص ۲۶۶۔۲۶۸

۲۰۵۔ علی، ڈاکٹر مبارک، ''ہندوستانی معاشرہ اور نظریات کا تصادم: سولہویں صدی سے اٹھارویں صدی تک''، مشمولہ سہ ماہی ''تاریخ''، شمارہ ۱۹، ص ۱۸۱۔۱۸۲

۲۰۶۔ محمود، محمود خاں، ''حیدر علی: تاریخ ناول''، کوثر پریس، بینگلور، ۱۹۳۶ء، ص ۷۵

۲۰۷۔ عقیل، ص ۳۸۔۳۹

۲۰۸۔ محبّ الحسن، ''تاریخ ٹیپو سلطان''، مترجمین حامد اللہ افسر اور عتیق صدیقی، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی، ۲۰۱۳ء، ۴۳۰۔۴۳۴

۲۰۹۔ فرینکلن، ڈبلیو، ''تاریخ شاہ عالم''، مترجم ثنا الحق صدیقی، آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس، کراچی، ۱۹۷۶ء۔ ۱۹۷۷ء، ص ۳۴۷۔۳۴۸

۲۱۰۔ اقبال، علامہ، بہ حوالہ سہ ماہی صحیفہ، لاہور، ''ٹیپو سلطان''، از محمود بنگلوری، گوشہ ادب، لاہور، ۱۹۲۷ء، ص ۳۶۳

۲۱۱۔ محبّ الحسن، ص ۴۲۰

۲۱۲۔ بنگلوری، محمود، ''صحیفہ ٹیپو سلطان''، گوشہ ادب، لاہور، ۱۹۴۷ء، ص ۳۲۵

۲۱۳۔ نامعلوم، بہ حوالہ ''صحیفہ ٹیپو سلطان''، محولہ بالا، ص ۳۲۵

۲۱۴۔ جالبی، جلد دوم، ص ۳۱۳

۲۱۵۔ تراب، شاہ، بہ حوالہ ''تاریخ ادب اردو''، جلد دوم، محولہ بالا، ص ۳۱۳

۲۱۶۔ عقیل، ص ۱۸۲

۲۱۷۔ احمد، قاضی غلام، بہ حوالہ ''تحریک آزادی میں اردو کا حصہ''، محولہ بالا، ص ۱۸۲

۲۱۸۔ عقیل، ص ۱۸۲

۲۱۹۔ کرمانی، سید حسین علی، بہ حوالہ ''تحریک آزادی میں اردو کا حصہ''، محولہ بالا، ص ۱۸۲

۲۲۰۔ کشفی، ص ۱۷۲

۲۲۱۔ نامعلوم، بہ حوالہ ''اردو شاعری کا سیاسی اور تاریخی پس منظر''، محولہ بالا، ص ۱۷۲۔۱۷۳

۲۲۲۔ بٹ، عبداللہ، ''ٹیپو سلطان''، مرتبہ عبداللہ بٹ، قومی کتب خانہ، لاہور، ۱۹۶۳ء، ص ۳۶

۲۲۳۔ عبداللہ، ڈاکٹر سید، ''ٹیپو سلطان کا کتب خانہ''، مشمولہ ''ٹیپو

سلطان''، مرتبہ عبداللہ بٹ، محولہ بالا، ص ۹۹

۲۲۴۔ ندوی، محمد الیاس، ''سیرت سلطان ٹیپو''، مجلس نشریات اسلام، کراچی، ۱۹۹۷ء، ص ۴۲۶۔۴۲۷

۲۲۵۔ قریشی، محمد طاہر، '' اردو کی ابتدائی ملی شاعری میں نعتیہ موضوعات''، مشمولہ نعت رنگ، کراچی، شمارہ ۲۷، ص ندارد

۲۲۶۔ عقیل، ص ۱۸۳

۲۲۷۔ شوستری، زین العابدین، بہ حوالہ ''تحریک آزادی میں اردو کا حصہ''، محولہ بالا، ص ۱۸۳۔۱۸۴

۲۲۸۔ عقیل، ڈاکٹر معین الدین، ''فتح نامہ ٹیپو سلطان''، الوقار پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۹ء، تمام صفحات

۲۲۹۔ محمود الرحمٰن، ص ۶۱۔۶۲

۲۳۰۔ ہاشمی، نصیر الدین، ''فتح نامہ ٹیپو سلطان'' مشمولہ سہ ماہی ''اردو''، کراچی، جولائی ۱۹۶۶ء، ص ۴۷

۲۳۱۔ عزت، حسن علی، بہ حوالہ ''جنگ آزادی میں کے اردو شعرا''، بہ حوالہ، ص ۶۲

۲۳۲۔ ایضاً

۲۳۳۔ ایضاً

۲۳۴۔ عزت، حسن علی، ''فتح نامہ ٹیپو سلطان''، مرتبہ ڈاکٹر معین الدین عقیل، الوقار، پبلی کیشنز، لاہور، ص ۱۰۶۔۱۰۷

۲۳۵۔ حبیب النسا، ڈاکٹر، ''ریاست میسور میں اردو کی نشو ونما'' ترقی اردو پریس، بنگلور، ۱۹۶۲ء، ص ۱۴۳

۲۳۶۔ نامعلوم، بہ حوالہ ''ریاست میسور میں اردو کی نشو ونما''، محولہ بالا، ص ۱۴۳

۲۳۷۔ نامعلوم، ''نوحہ ٹیپو سلطان''، مشمولہ ''نشید حریت'' مرتبہ شان الحق حقی، فیروز سنز، کراچی، ۱۹۵۷ء، ص ۲۲۔۲۳

۲۳۸۔ اقبال، علامہ محمد، ''کلیات اقبال''، اردو، مکتبہ جمال لاہور، ۲۰۰۴، ص ۹۳۱

۲۳۹۔ اقبال، بہ حوالہ ''شیر میسور سلطان ٹیپو سلطان شہید'' از فیض عالم صدیقی، بک کارنر پبلشر، جہلم، ص ۱۸۱

۲۴۰۔ صدیقی، حکیم فیض عالم، ''شیر میسور سلطان شہید''، بک کارنر پبلشر، جہلم، س ن، ص ۱۸۰

۲۴۱۔ ایضاً

۲۴۲۔ عندلیب، ثوبیہ ''ٹیپو سلطان کی وصیت''

۲۴۳۔ شمیم، سید یعقوب، ''علامہ اقبال اور ٹیپو سلطان''،

۲۴۴۔ ''علامہ اقبال اور ٹیپو''، http:// urdu. siasat. com. /news/ 812180

۲۴۵۔ خان، مولانا ظفر علی، ''کلیات مولانا ظفر علی خان''،

۲۴۶۔ ایضاً، ص ۴۳

۲۴۷۔ اکبر آبادی، سیماب، http:// daleel. pk/ 2017/ 11/ 18/ 66473

۲۴۸۔ اکبر آبادی، سیماب، بہ حوالہ ''ٹیپو سلطان شہید: شعرا کا خراج عقیدت'' از سید محمود خاور، dunya. com. pk/ index. php/ special- feature 2013- 05- 043714...

۲۴۹۔ بنگلوری، افسر، بہ حوالہ ایضاً

باب چہارم:

اردو کا شعری بیانیہ: انیسویں صدی کے اہم سانحات

انگریزوں کی سازشیں:

انیسویں صدی کو عالمی تاریخ میں کئی حوالوں سے اہمیت حاصل ہے۔ جیسا کہ پچھلے باب میں بیان کیا گیا ہے کہ نو آبادیاتی قوتوں اور استعماری رویوں کی بنا اٹھارھویں صدی ہی میں پڑ چکی تھی لیکن ان قوتوں اور رویوں کو استحکام میں انیسویں صدی میں ملا۔ اسی صدی میں نپولین کی شکست کے بعد نہ صرف برطانیہ نے اپنے آپ کو سب سے بڑی عالمی طاقت کی حیثیت سے منوایا بلکہ کرۂ ارض کے متمول ترین علاقوں پر اپنا سیاسی و اقتصادی تسلط بھی قائم کر لیا۔ اس طرح یہ نو آبادیاتی نظام جہاں برطانیہ کے امرا اور متوسط طبقے کے لیے خوش حالی اور مادی ترقی کی نوید لے کر آیا وہیں کروڑوں انسان سیاسی جبر اور اقتصادی استیصال کا شکار ہو کر غلامی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہو گئے۔ ان تمام نو آبادیات میں ہندوستان کا علاقہ اپنے وسائل اور افرادی قوت کے اعتبار سے سب سے اہم علاقہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان ملکہ وکٹوریا کے تاج کا سب سے قیمتی ہیرا قرار پایا۔ ہندوستان پر نو آبادیاتی غلبے کا جو آغاز جنگِ پلاسی میں سراج الدولہ کی شکست ۱۷۵۷ء سے ہوا تھا، اس کا انجام ٹیپو سلطان کی مزاحمت کے خاتمے، مرہٹوں کی شکست، الحاق سندھ اور الحاق پنجاب سے ہوتا ہوا ۱۸۵۶ء میں اودھ کی تسخیر کی صورت میں عمل میں آیا۔ گویا انیسویں صدی کے نصف اوّل کے دوران ہندوستان بہ حیثیت مجموعی عدم استحکام اور غیر یقینی صورتِ حال کے پیشِ نظر ایسٹ انڈیا کمپنی کے لیے تر نوالہ ثابت ہوا[۱]۔ ہندوستان کی تاریخ میں جو سیاسی اتار چڑھاؤ آئے، اُس نے کمپنی کو تجارت کے ساتھ ساتھ رفتہ رفتہ سیاست میں ملوث کرنا شروع کر دیا۔ پلاسی کی جنگ کے بعد کمپنی کو تجارت سے زیادہ سیاست میں فائدہ دکھائی دیا۔ اس وقت کمپنی کے ملازمین نے بدعنوانی کے ذریعے بے انتہا دولت اکٹھی کی۔ اسی دولت کے بل بوتے پر انگلستان جا کر زمینیں اور جائیدادیں بنائیں۔ یہاں تک کہ برطانوی پارلیمنٹ کی نشستیں حاصل کر کے اُس کے رکن بھی بن بیٹھے۔ نو دولتیوں کا یہ طبقہ انگلستان میں ''نو باب'' کہلایا۔ بعد میں ان ملازمین کی بدعنوانیوں کو ختم کرنے کی مہم بھی شروع ہوئی اور ایک ایسی انتظامیہ کی بنیاد ڈالی گئی جو ملک میں امن و امان قائم کر کے قانون و انصاف کے ذریعے حکومت کرے۔ ابتدا میں کمپنی کے ملازمین نے نہ صرف ہندوستانیوں سے میل ملاپ رکھا بلکہ یہ لوگ اردو اور فارسی زبانیں سیکھتے، بولتے اور ان زبانوں میں شعر بھی کہتے لیکن جیسے جیسے کمپنی کی طاقت بڑھتی گئی ویسے ویسے رشتۂ حکمراں اور رعیت میں تبدیلی آ گئی۔ یہ لوگ ہندوستانیوں سے دور رہنے لگے، فوجیوں کے لیے کنٹونمنٹ اور سول انتظامیہ کے لیے سول لائن کے رہائشی علاقے وجود میں آئے۔ لوگوں سے سماجی و ثقافتی رابطے منقطع ہو گئے۔ ایسے کلب بھی تھے جہاں ہندوستانیوں کو رکن تک بننے کی اجازت نہیں تھی۔ ہندوستان میں ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے بعد کمپنی کی حکومت کا خاتمہ ہوا اور اسے تاجِ برطانیہ کے ماتحت کر دیا گیا[۲]۔ انتونی وائلڈ (Antony Wild) نے اس حوالے سے جو کتاب لکھی وہ کمپنی کی تاریخ، تجارتی سرگرمیوں اور سیاسی و سماجی اثرات کے حوالے سے اہم دستاویز سمجھی جاتی ہے[۳]۔ ان تمام صورتِ حال کو سمجھنے کے لیے اس کتاب کا مطالعہ خالی از دل چسپی نہ ہوگا۔ انیسویں صدی کو عالمی تاریخ میں اس حوالے سے بھی اہمیت حاصل ہے کہ نو آبادی اور استعماری قوتوں کی جو بنیاد اٹھارھویں صدی میں پڑی تھی، اسے استحکام انیسویں صدی میں حاصل ہوا۔ اس صدی میں نپولین کی شکست کے بعد برطانیہ نے

نہ صرف عالمی طاقت کی حیثیت سے اپنے آپ کو منوالیا بلکہ کرہِ ارض کے متمول ترین علاقوں میں اپنا سیاسی اور اقتصادی تسلط قائم کر کے سیاسی جبر اور اقتصادی استیصال کے ساتھ ساتھ کروڑوں انسانوں کی غلامی کا ڈول بھی ڈالا۔ برطانوی سرکار کی پالیسی میں مکاری در آئی۔ کمپنی کے سرکردہ انگریز اپنی کامیابیوں کے جوش میں ہندوستان کی مقامی ساکھ کو بالکل نظر انداز کر بیٹھے۔ ہندوستان کے مختلف علاقوں کے لیے جو انگریز راج پاٹ کے لیے آئے ان کے لیے کمپنی کی جانب سے کوئی یکساں پالیسی نہیں تھی۔ ہر علاقے کے لیے الگ الگ پالیسیاں وضع کی گئیں۔ کسی علاقے میں نواب اور راجاؤں سے رشوت کے عوض مراعات زیادہ دی جاتیں اور کہیں لوگوں کو دبایا جاتا۔ کمپنی حکم راں کی حیثیت سے فائدہ اٹھاتی۔ تحائف اور رشوتیں وصول کرتی۔ نواب اور روسا قرض کے جال میں پھنستے چلے جاتے۔ مدراس کے گورنر سر تھامس رمبولڈ (Thomas Rumbold) نے اپنی دو برس کی گورنری کے دوراں سات لاکھ پچاس ہزار تک رشوت کے ذریعے کمائے۔ ۱۷۷۸ء سے ۱۷۸۰ء کے دوران اس رقم کا بیش تر حصہ نواب سے رشوت کے طور پر ملا۔ بنگال پر قبضہ کرنے اور میسور کی لڑائیوں کے دوران اودھ کے نواب اپنی آزاد اور خودمختار ریاست بنانے کی جدوجہد میں جُتے رہے۔ اس زمانے میں کمپنی نے اودھ کے حکم رانوں سے تعلقات بنا رکھے تھے کیوں کہ بنگال پر مکمل کنٹرول ان کی ترجیح تھا۔ بعد میں بادشاہ شاہ عالم نے جب برطانوی مفادات کے خلاف میر قاسم کی پیٹھ تھپتھپائی تو کمپنی کو تشویش ہوئی۔ ۱۷۶۴ء میں کمپنی نے میر قاسم اور شجاع الدولہ کی مشترکہ فوج پر دھاوا بول کر ان کو شکست دی۔ اس طرح اودھ کے معاملات میں بھی کمپنی کی مداخلت بڑھتی گئی۔ ۱۸۰۱ء میں کمپنی نے اودھ پر مکمل کنٹرول قائم کر لیا۔ انگریزوں نے رفتہ رفتہ اپنی علاقائی حدود کو پھیلانے کا سلسلہ جاری رکھا۔ متعدد راجے، مہاراجے اور نوابین انگریزوں کے ماتحت آ گئے اور وفاداری کا عہد نبھایا۔ بہت سے علاقوں کے الحاق کا سرکاری طور پر اعلان نہیں ہوا لیکن بعد میں سندھ، پنجاب اور اودھ وغیرہ کے بڑے حصے کا بھی برطانوی ہند سرکار سے الحاق ہو گیا۔ اودھ اور سندھ کے نوابین جیل میں پہنچا دیے گئے۔ مغل بادشاہ ایک خاموش تماشائی بنا دہلی کے محل تک محدود ہو گیا اور انگریزوں کی طرف سے ملنے والی سالانہ پنشن پر گزارا کرنے لگا[۴]۔

سکھوں کا زوال:

انیسویں صدی کے نصف اول کے دوران ابتدائی چار دہائیوں تک پنجاب میں سیاسی استحکام رہا اس عرصے میں سکھ ریاست کو جس تیزی سے عروج حاصل ہوا یہ ریاست اس تیزی سے زوال کی جانب بھی گام زن ہوئی۔ رنجیت سنگھ نے چالیس برس تک پنجاب پر حکومت کی لیکن ۲۷ جون ۱۸۳۹ء میں اس کے انتقال کے وہ استحکام، امن و آشتی کا عہد جو رنجیت سنگھ کا بطورِ حکم راں طرّہ امتیاز تھا، محلّاتی سازشوں اور جاں نشینی قصوں کے باعث طوائف الملوکی اور انتشار کی نذر ہو گیا۔ آخری دس برسوں خصوصاً ۱۸۴۹ء میں پنجاب کی استثنائی حیثیت کے خاتمے کا ادراک رنجیت سنگھ کو اپنی زندگی ہی میں ہو چکا تھا۔ اس کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ کہ ''ایک دن سب لال ہو جائے گا'' دراصل ایک ایسے مستقبل کا عندیہ دے رہے تھے جو غلامی سے عبارت ہے۔ عمر کے آخری ایام میں رنجیت سنگھ کی صحت مسلسل خراب رہنے لگی تھی۔ ۱۸۳۴ء میں فالج کے حملے کے بعد وہ کلی طور پر صحت مند نہ ہو سکا۔ بگڑتی صحت کے باعث اس نے اپنے بڑے بیٹے کھڑک سنگھ کو اپنا جاں نشین مقرر کیا۔ کھڑک سنگھ کی بادہ نوشی اور انتظامی اہلیت کے فقدان سے متعلق رنجیت سنگھ کو کوئی خوش فہمی نہیں تھی[۵]۔ لہٰذا اس نے دھیان سنگھ جیسے معاملہ فہم شخص کو اس کا وزیر نامزد کر دیا۔ رنجیت سنگھ کی موت کے بعد مسائل کی ابتدا اس وقت ہوئی جب نئے مہاراجا کے ایک قریبی عزیز چیت سنگھ دربار میں غیر معمولی اثر و رسوخ حاصل کر چکا تھا۔ اس نے دھیان سنگھ کو راستے سے ہٹانے کی کوشش

شروع کی تو دھیان سنگھ نے شہزادہ نونہال سنگھ کے ساتھ ساز باز کر کے اکتوبر ۱۹۳۹ء میں چیت سنگھ کو قتل کر دیا۔ یوں سکھ امرا میں باہمی کشت وخوں کی ابتدا ہوئی۔ عنانِ حکومت نونہال سنگھ کے ہاتھوں میں آ گئی جس نے راجا دھیان سنگھ کی معاونت میں کاروبارِ سلطنت چلانا شروع کر دیا لیکن محض ایک برس کے بعد ۵ نومبر ۱۸۴۰ء کو مہاراجا کھڑک سنگھ بھی چل بسا۔ اس کے کریا کرم سے لوٹتے ہوئے نونہال سنگھ اور میاں اودھم سنگھ پر ایک بھاری آہنی گیٹ گرا جس سے نونہال سنگھ کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ اس کے بعد چھ شہزادے اقتدار کے حصول کے لیے برسرِ پے کار ہوئے۔ شیر سنگھ اور اس کا جڑواں بھائی تارا سنگھ، پشاورا سنگھ، کشمیرا سنگھ اور ملتانا سنگھ اور محض تین برس کے دلیپ سنگھ کے ضمن میں کی جانے والی سازش تو سمجھ میں آتی ہے لیکن نونہال سنگھ کی بیوہ کی کوکھ میں پرورش پانے والے بچے کے لیے کی جانے والی مہم نے اس ریاست کی جڑوں کو ہلا کر رکھ دیا۔ بعد میں شیر سنگھ نے دھیان سنگھ کی مدد سے ۲۰ جنوری ۱۸۴۱ء کو لاہور کے قلعے پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد ہونے والی خانہ جنگی، نونہال سنگھ کے بچے کو دنیا میں نہ آنے دینے کے لیے چاند کور کا قتل وغیرہ جیسے سانحات نے سکھ راج کو کمزور کر دیا۔ فوج کا پورا نظام تباہ و برباد ہو گیا۔ خالصا فوج نے سیاست کی بساط پر طاقت ور ترین مہرے کی شکل اختیار کر لی۔ اپنی قسمت وصول کرنے کا فن انھیں آ گیا۔ فوج نے سرداروں کے احکامات ماننے سے انکار کر دیا۔ شیر سنگھ کے لاہور میں قبضے کے بعد اسی خالصا فوج نے شہر میں لوٹ مار کا جو بازار گرم کیا، اس سے حکم رانی اور نظم و نسق کی کمزوری کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ فوجی کمانڈروں نے اس دوران کئی یورپی افسروں کو گولی مار کر ہلاک کر دیا۔ بہت سے انگریز افغانستان کی طرف کوچ کر گئے[۶]۔ بعد میں شیر سنگھ بھی سندھیانوالیہ سرداروں کی دشمنی کی بھینٹ چڑھ گیا۔ ایک فوجی مشق کے دوران اجیت سنگھ نے مہاراجا کے دل کا نشانہ لیتے ہوئے گولی چلائی اور وہ موقعے پر ہی ہلاک ہو گیا۔ اس کے بعد راجا دھیان سنگھ کو بھی قتل کر دیا گیا[۷]۔ بعد میں سندھیانوالیہ سرداروں اور دھیان سنگھ کے بیٹے ہیرا سنگھ کے درمیان ہونے والے معرکوں میں اجیت سنگھ سمیت ہزاروں لوگ کام آئے اور قلعے پر ہیرا سنگھ کا قبضہ ہو گیا۔ ہیرا سنگھ کے غیر ذمے دارانہ رویے کی وجہ سے فوج اور اس کے تعلقات میں سرد مہری پیدا ہوئی۔ اس کے بعد ہیرا سنگھ اور پنڈت جھلا نے خزانے میں موجود جمع پونجی سمیت لاہور سے فرار ہونے کی کوشش کی۔ راوی کے قریب مہاراجا دلیپ سنگھ کے ماموں جواہر سنگھ نے انھیں جا لیا۔ معمولی مزاحمت کے بعد ہیرا سنگھ جھلا، سوہن سنگھ اور میاں ولبھ سنگھ موت کے گھاٹ اتار دیے گئے[۸]۔ اس کے بعد کے واقعات بھی کم و بیش اسی قسم کے رہے۔ فوجی اخراجات میں اضافے اور اندرونی انتشار نے انگریزوں کو بھی سنہرا موقعہ فراہم کیا۔ مہارانی جنداں اور اس کے حامی سرداروں کو بھی فوج کے بڑھتے اثر و رسوخ اور خود سری سے پیچھا چھڑانے کا یہی حل سوجھا کہ خالصا فوج کو انگریزوں سے ٹکرا دیا جائے۔ فوج کے خلاف معاونت کے لیے گلاب سنگھ بھی تیار ہو گیا۔ ستلج کے اس پار انگریز پہلے ہی سکھ سلطنت سے دو دو ہاتھ کے لیے پر تول رہے تھے۔ مہارانی جندہ نے فوج کے پنچوں سے رنجیت سنگھ کی سمادھی پر حلف لیا کہ ہر قیمت پر سکھ ریاست کا تحفظ کیا جائے گا۔ ساتھ ہی پنچوں کی اتھارٹی تحلیل کر دی۔ اس طرح خالصا فوج کی شکست کا مکمل اہتمام کر لیا گیا۔ گورنر جنرل لارڈ ہارڈنگ نے ۱۳ دسمبر کو ریاست لاہور کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا۔ سکھوں اور انگریزوں کے درمیان پہلا معرکہ ۱۸ دسمبر کو 'مدکی' کے قریب ہوا۔ مختصر دورانیے کی اس لڑائی میں انگریزوں کا جانی نقصان توقع سے بڑھ کر ہوا۔ ان کے ۲۱۷ لوگ ہلاک ہوئے اور ۶۵۷ زخمی ہوئے البتہ ۱۲ دسمبر کو فیروز شہر کے دوسرے معرکے میں انگریزوں کو فتح ہوئی جس میں لال سنگھ اور تیج سنگھ نے کلیدی کردار ادا کیا۔ انگریزوں کو فتح انھیں کے گھناؤنے کردار کی وجہ سے ممکن ہوئی۔ سبھراؤں کی جنگ میں شکست کے بعد ۹ مارچ کو فریقین کے درمیان معاہدہ ہوا جس کی رو سے خالصا دربار کو اپنی مسلح فوج میں خاطر خواہ

کمی کرنی پڑی۔

یہ تعداد پیادہ ۲۰ ہزار اور سوار ۱۲ ہزار تک محدود ہوگئی اس کے علاوہ ڈیڑھ کروڑ تاوان کی ادائیگی نہ کرنے کے نتیجے میں انگریزوں نے دوآبہ پست جالندھر وغیرہ کے علاقے اپنی قلم رو میں شامل کر لیے اور اس کی مالیت کا اندازہ ایک کروڑ لگایا گیا جب کہ بقیہ پچاس لاکھ کے عوض لاہور دربار کشمیر اور ہزارہ کے صوبوں سے دستبردار ہوگیا۔ انگریزوں نے یہ پورا علاقہ محض ۷۵ لاکھ کے عوض گلاب سنگھ کو فروخت کر دیا[9]۔ اسی معاہدۂ امرتسر نے بعد میں کشمیر کے سانحے کو جنم دیا جو آج ڈیڑھ صدی سے زائد کا عرصہ گزرنے کے باوجود برصغیر کا ایک رستا ہوا ناسور بنا ہوا ہے۔ اس سانحے کی تفصیل کشمیر کے سانحات کے عنوان کے تحت آئندہ باب میں پیش کی جائے گی لیکن پنجاب کی آزادی اور خود مختاری کے خاتمے نے جس طرح سے کشمیر کے معاملات کو الجھایا، اُسے سمجھنے کے لیے انیسویں صدی کی اس سیاسی کش مکش کو سمجھنا بے حد ضروری ہے۔ انگریزی راج سے قبل اس خطے میں سکھوں کی زیادتیاں کس قدر بڑھ چکی تھیں، اس کا اندازہ، متعدد بار لاہور کی تباہی و بربادی سے لگایا جا سکتا ہے۔ اس تباہی و بربادی کا نوحہ مراد شاہ نے اپنی ایک مثنوی ''مگس نامہ'' اور ''مسوش نامہ'' میں بڑے بھرپور طریقے سے کیا ہے۔ انھوں نے مکھی اور چوہے کو علامت بنا کر اس دور کے پریشان کن حالات اور ظلم و ستم کے خلاف آواز بلند کی۔ آزادیِ اظہار پر جب پابندی ہو تو یہی اشارتی زبان و بیان اظہار کا موثر ذریعہ بن جاتی ہے۔ اس دور میں ظلم و ناانصافی نے اہلِ قلم کو کس طرح خوف زدہ کر رکھا تھا، اس کا اندازہ اس مثنوی سے لگایا جا سکتا ہے[10]۔

شہرِ لاہور قبہِ اسلام	روشن آفاق میں ہے جس کا نام
تھا بہشتِ بریں بہ روئے زمیں	عجب انسان تھے اس مکاں کے مکیں
رشکِ آبادیِ جہاں تھا یہ	الغرض خوب ہی مکان تھا یہ
کوئی اس پہ پڑا جو بوم قدم	ہے اب اس کا وجود رشکِ عدم
نہ وہ رونق نہ وہ صفائی ہے	مکھیوں کی غرض دہائی ہے
زر تو شاہِ زماں سدھارے لے	مکھیوں کو گئے اجارہ دے
اسی صورت سے آگے احمد شاہ	تھا گیا چھوڑ چیونٹیوں کی سپاہ
اب ہیں پر مکھیوں سے سب ناچار	ہیں یہ گردن پہ آہ سب کی سوار[11]

اس کے علاوہ حافظ محمود شیرانی نے اپنی تصنیف ''پنجاب میں اردو'' میں نام دار خاں دت کا ذکر کرتے ہوئے ان کے مرثیے ''چڑت سنگھ'' کی نشان دہی کی ہے۔ چڑت سنگھ نے حقیقت سنگھ اور جے سنگھ کے ساتھ مل کر برج راج دیو کے لیے جب جموں کا رخ کیا تو اس غیر فیصلہ کن جنگ میں چڑت سنگھ اور اس کے ہم راہی کی بندوق پھٹ جانے سے اس کی موت واقع ہوگئی۔ اس وقت نام دار خاں دت نے اس کا جو مرثیہ لکھا[12] اس کے چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

افسوس ہے جہاں کہ ثبات اور قرار پر	اس باغِ بے وفا کی خزاں اور بہار پر
اس پیرِ زال عروسِ نما کے نگار پر	دو دن کی زندگانیِ ناپائیدار پر
دل بستگی نہ کر دمِ بے اعتبار پر	احوال چڑت سنگھ کا لکھتا فی المثل

پہنچا جب اس کا حکم قضا میں دمِ اجل — آیا ولایت اپنی میں لے کر ہجومِ دل

فرصت نہ دی قضا میں چلاچل ایک پل — آیا اجل کا شیر ہرن کے شکار پر

یک بارگی دلیر چلا کارِ زار پر — دل موں غرور اپنی شجاعت کا دھر چلا

اوڑ کر لگی تفنگ کی چھپر دماغ میں — جیوں تند باد پون کا چھٹکا چراغ میں

تیری قضا میں چپرِ بندوق تیز تھا — یک لخت دور کاسہِ سر ریز ریز تھا

لکھتا ہوں مجمل اس کی تاسف کا یاد داد — تقریر بات فرض تھی، یہ نام دار پر[۱۳]

اسی طرح محمد غوث بٹالوی نے بھی گور بخش سنگھ کی موت پر اس کا مرثیہ لکھا۔ جے سنگھ نے مسلمانانِ بٹالہ کو سخت اذیتیں پہنچائیں۔ شرفا سے لوٹ مار اور مکانات جلانے کے علاوہ قید و بند کی صعوبتیں بھی لوگوں کو برداشت کرنی پڑیں۔ اٹھارھویں صدی کے اواخر میں چڑت سنگھ نے جب جے سنگھ کی فوج پر چڑھائی کی تو اس وقت جے سنگھ کی فوجیں اس کے فرزند گور بخش سنگھ کی زیرِ کمان تھیں۔ اس جنگ میں گور بخش سنگھ ہلاک ہو گیا تو جے سنگھ اپنے نوجوان اکلوتے بیٹے کی لاش دیکھ کر اس قدر بددل ہوا کہ تلوار، تیر و ترکش پھینک کر گھوڑے سے اترا اور زار و قطار روتا ہوا دشمن کی گولیوں کی زد میں جا کر کھڑا ہو گیا۔ غنیم اس بوڑھے کی نوحہ و شیون سے اس قدر متاثر ہوا کہ اس پر گولیاں نہیں برسائیں۔ گور بخش سنگھ کی موت پر بٹالے کے شاعر محمد غوث جو کہ گور بخش کی فوج داری میں ملازم تھے، اس کا مرثیہ لکھا[۱۴]۔ اس کے چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

بہار اندر آیا تھا باغِ جہاں — قضا سوں پڑی جھول بادِ خزاں

گرا آہ پاؤں سے سروِ رواں — پڑا ہر طرف میں یہ شور و فغاں

کدھر ہے وہ گوربخش سنگھ پہلواں — کدھر موتیاں والا ہے نوجواں

ہویا ہے یہ ماتم سوں غم بے شمار — جگت اس مصیبت سوں ہے بے قرار

سر اپنے اس غم سوں اٹھا خاک دار — تاسف سوں کہتے ہیں سب شہرِ دار

کدھر ہے وہ گوربخش سنگھ پہلواں — کدھر موتیاں والا ہے نوجواں

کیا اس قدر رن موں جا کارزار — کہ دشمن ہو یا بھاگنے کوں تیار

بہ حکمِ قضا کارِ پروردگار — یہ حکمت ہو یا پڑ گئی یہ پکار

کدھر ہے وہ گوربخش سنگھ پہلواں — کدھر موتیاں والا ہے نوجواں

ہویا گل ہے جے سنگھ جی کا چراغ — خزاں اندر آیا جوانی کا باغ

مٹایا گورو نے خوشی کا چراغ — جگر موں لگا غم کا ہر یک کوں داغ

کدھر ہے وہ گوربخش سنگھ پہلواں — کدھر موتیاں والا ہے نوجواں

یہ کیسا ہویا ہے ستم سخت آہ — بٹالہ کے سر پر سوں گیا پادشاہ

اسی درد سوں رات دن ہے سیاہ — نرنکار ست گور کیے اپنی چاہ

کدھر ہے وہ گوربخش سنگھ پہلواں کدھر موتیاں والا ہے نوجواں [۱۵]

دل محمد دل شاد پسروی کے زمانے میں بھی سکھ جماعت غارت گری میں مصروف تھی۔ ہر سو قتل و غارت گری کا بازار گرم تھا۔ اس دور کے تمام واقعات کی جھلک ان کے کلام میں موجود ہے۔ شاعر کبھی افغانوں کے مظالم سے نالاں ہیں تو کبھی وہ سکھوں کے مظالم پر لعنت ملامت کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ مصیبت کی اس گھڑی میں وہ اپنی فریاد لے کر کبھی حضرت علیؓ، کبھی مہدی آخرالزماں، کبھی غوث الاعظمؒ اور کبھی حضرت عیسیٰؑ کے دربار میں جاتے ہیں [۱۶]۔ ان کی التجاؤں کی جھلک ملاحظہ کیجیے:

غمِ ہجوم آور دمارا یا رسول اللہ اغث در چنیں وقتے خدارا یا رسول اللہ اغث

زہندیانِ سحر ملک ما بشام رسید تواز نیام بہ پنجاب ذوالفقار برآر

امامِ مہدیِ آخر الزماں بیا وقت ست ندانم از تو شود کے ظہور یا قسمت

دیں را چوں محی دینتِ احیا کند بہ پنجاب یاں عیسیٰؑ زماں را ارشاد یا محمدؐ [۱۷]

اسی زمانے میں رنجیت دیو والیِ جموں، ۵۷ برس راج کر کے فوت ہو گیا۔ پسرور پر بھی اس غاصبانہ قبضہ کر رکھا تھا۔ دل شاد کی آمد و رفت بھی اس دوران جموں میں ہوتی ہے۔ جہاں مسلمانوں پر زندگی تنگ ہو چکی ہے۔ ان پر مظالم کے پہاڑ توڑے جا رہے تھے۔ یہاں تک کہ مسلمانوں کو اذان تک دینے کی اجازت نہیں تھی [۱۸]۔

بسکہ منعت دریں شہر اذانِ جمعہ نکند گوش کسے نالہِ بے کاراں را

گریہ را نیست اثر در دل راجا جموں سبزہ بر سنگ نہ روید چہ کنہ باراں را

موذیاں کردہ ہجوم اے شہِ دولہ فریاد تیغ گجرات سنزیست دلِ آزاراں اند [۱۹]

اس دور میں لاہور کا نوحہ ہمیں زور و شور سے سنائی دیتا ہے۔ پنجاب کا دل جس طرح سے سکھوں کے مظالم کا نشانہ بنا رہا، اس کے مقامات مقدسہ کی جس طرح توہین ہوئی اور جس طرح سے اس شہر کو اپنے تصرف میں رکھ کر اس کا استیصال کیا گیا، تاریخ کے واقعات ان حالات سے بھرے ہوئے ہیں۔ قاضی ثنا اللہ پانی پتی کے مکتوبات اور دیگر بہت سے حوالے اس ضمن میں پیش کیے جا سکتے ہیں [۲۰]۔ سنکٹ سنگھ نے سکھ زوال کو برہمنوں خصوصاً ڈوگرا برادران کا شاخسانہ قرار دیا ہے لیکن سکھ ریاستی ڈھانچے کے لیے استحکام حاصل کر لینے کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ خالصا فوج کی آزادانہ روش تھی [۲۱]۔ سر لیپل ہنری گرفن نے اس زوال کا اصل سبب رنجیت سنگھ کے شخصی اقتدار کو قرار دیا۔ رنجیت سنگھ کے جانشیں اس وقت پھیلی بے عملی پر قابو نہ پا سکے، بعد میں انگریزوں کے ساتھ ہونے والی لڑائی نے اس کے حصے بخرے کر دیے اور آخر کار اس کا الحاق عمل میں آیا [۲۲]۔ احمد شاہ ابدالی اور اس کے بیٹوں کے پنجاب پر حملوں کا مختصر احوال پچھلے باب میں بیان کیا جا چکا ہے۔ البتہ انیسویں صدی میں رنجیت سنگھ جیسا حکمران جس نے تھوڑے ہی عرصے میں پنجاب، کشمیر اور پشاور تک قبضہ کر کے مضبوط حکم رانی کی بنیاد ڈالی تھی۔ فوج کو جدید انداز میں منظّم کرنے کے ساتھ ساتھ اس کے دربار میں فرانسیسی اور اطالوی جرنیلوں کے علاوہ ہزاروں کی تعداد میں یورپی لوگ مختلف عہدوں پر فائز تھے۔ اسی لیے ایسٹ انڈیا کمپنی کو اس کی حیات تک پنجاب پر چڑھائی کی ہمت نہیں ہوئی۔ البتہ اس کی موت کے تھوڑے ہی عرصے کے بعد خانہ جنگی کا شکار سکھ دربار اپنی حیثیت کھو بیٹھا اور اسی دوران انگریزوں کے حملے بھی شروع ہو گئے [۲۳]۔ ایسٹ انڈیا کمپنی اور پنجابیوں کی جنگوں کے بارے میں بھاشا، ہندی اور پنجابی میں بھی کئی جنگ

نامے اور واریں لکھی گئیں۔ اہم ترین جو واریں لکھی گئیں ان میں شاہ محمد کی وار ''جنگ ہند پنجاب'' بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ اس وار میں رنجیت سنگھ کی پیدائش، اس کے عروج اور پھر زوال کی کہانی پیش کرنے کے ساتھ ساتھ ایسٹ انڈیا کمپنی اور پنجابیوں کی مُد کی، پھیرو،علی وال اور سبھر اؤں کی جنگوں اور لڑائیوں کا ذکر تفصیل سے کیا گیا ہے۔ شاہ محمد نے ایک جانب تو سکھ غدّ اروں کی منافقت کا پردہ چاک کیا ہے اور دوسری جانب ہندوستان کے دوسرے صوبوں کے باسیوں کے پنجاب پر حملوں پر بھی انھیں تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔ وہ ان حالات کی منظر کشی کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

لگی دھمک سارے ہندوستان اندر، دلی، آگرہ، ہانسی، حصار میاں
بیکا نیر، لکھنؤ، اجمیر، جے پور پٹیاں، بھاجڑاں، جمناتو پار میاں
چلی سبھ پنجاب دی پادشاہی نہیں، دلاں دا انت شمار میاں
شاہ محمد اکسے نہ اڑکنا ایں سنگھ رہن گے دلی نوں مار میاں
جنگ ہند پنجاب دا ہون لگا دوویں، پادشاہی فوجاں بھاریاں نی
اج ہووے سرکار سے مُل پاوے، جیہڑیاں خالصے نے تیغاں ماریاں نیں
سَنے آدمی گولیاں نال اُڈن، ہاتھی ڈگدے سنے انباریاں نی [۲۴]

پنجابی واریں، سرکھنڈی، اور نشانی چھند میں ہی لکھی جاتی تھیں۔ محمد شاہ نے یہ وار ''بیت'' میں لکھی۔ یہ وار پنجابی دستاویز ہونے کے ساتھ ساتھ اپنی مقبولیت کی وجہ سے لوگوں کے حافظے میں بھی محفوظ رہتی تھیں۔

مٹک شاعر نے ڈیوڑھ کی نصف میں ''جنگ سنگھاں تے فرنگیاں'' لکھی۔ غالباً مٹک اس کا قلمی نام تھا جو اسے انگریزی عہد کے جبر کی وجہ سے رکھنا پڑا۔ اس وار میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے ساتھ مُد کی، پھیرو شہر،علی والی اور سبھر اؤں کی لڑائیوں کا ذکر ملتا ہے۔ مٹک کے وچار موجب ستلج پار کے عوام نے ایسٹ انڈیا کمپنی کی معاندانہ سرگرمیوں کی شکایت کرتے ہوئے دربارِ لاہور سے فریاد کرتے ہیں۔ اس فریاد کے نتیجے میں پنجابی فوج ایسٹ انڈیا کمپنی سے مقابلے کے لیے تیار ہو جاتی ہے [۲۵]۔ اس صورتِ حال کی منظر کشی کرتے ہوئے شاعر کا کہنا تھا کہ:

پار سبھ ہوئے اکٹھے، پہنچے دُھر سرکارے، آن پکارے
پیسہ ساتھیوں منگے فرنگی، اسیں غریب وچارے، کھیتیاں وارے
جے زور ہے وچ تمارے، ڈھل نہ کرو پیارے، لشکر بھارے
کہت مٹک جب سنی پنتھ نے، غصہ چڑھیا سارے، بھٹے تیارے [۲۶]

سوبھا شجاع آبادی نے ''دیوان مولراج'' میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے ساتھ ملتان میں ہونے والی لڑائی کو وار کا روپ دیا۔ اس وقت تک کمپنی کو مکمل فتح تو حاصل نہیں ہوئی تھی البتہ ایک انگریز ریزیڈنٹ مقرر کیا جا چکا تھا جو تمام انتظامی امور کا نگران تھا۔ یہ حالات دیکھ کر دیوان مولراج نے ملتان کی گورنری سے استعفیٰ دے دیا۔ انگریز آفیسر اور سردار کاہن سنگھ جب اس سے چارج لینے آئے تو ایک سپاہی امیر چند نے انگریز آفیسر پر حملہ کر دیا جس سے صورتِ حال مخدوش ہوگئی۔ ملتان کی رعایا نے مولراج کو انگریزوں سے جنگ کرنے پر

اکسایا۔ بہاول پور اور دوسرے ملتانی وڈیروں نے کمپنی کا ساتھ دیا۔ دیوان مولراج کو اپنوں کی غداری کی وجہ سے شکست ہوئی۔ مولراج کو قید کر دیا گیا۔ اسی حالت میں اس کی وفات ہوئی[۲۷]۔ اس بابت ''سوبھے کے وار'' میں سے کچھ اشعار ملاحظہ کیجیے:

گورے دی لڑپون زورے کیتی ونجن اڈائی
بھج بھج پوون اگاہاتیں جیویں کرے پتنگ تکھائی
لک چھپ کوئی نہ چھٹا جو منھ گوریاں دے آئی
تھئی خراب خلقت ملتانی رلی جا بہ جائی[۲۸]

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی سے پہلے ہی ایسٹ انڈیا کمپنی نے برعظیم پر قبضہ کر لیا تھا لیکن بہادر شاہ ظفر کی علامتی حیثیت ضرور موجود تھی۔ جب دلّی کی لڑائی کی خبریں دربار میں پہنچیں تو رائے احمد خاں کھرل نے بھی انگریزوں کو پنجاب سے نکالنے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ دیسی قبائل کی سربراہی میں سر پر کفن باندھے یہ لوگ لڑنے کے لیے تیار ہو گئے۔ اس جنگ کی سرگزشت ''ڈھولے'' کی صنف میں محفوظ ہے[۲۹]۔ اس ڈھولے کے چند مصرعے ملاحظہ کیجیے:

انگریز برکلی آہندا اے: رائے احمد دیویں گھوڑیاں/ تیری لندنوں لکھ لیا وساں نیک نامی/

رائے احمد آہندا اے: رناں بھوئیں سے گھوڑیاں، وند کسے نہ دتیاں/ ہوندیاں بت وچ سا سلامی[۳۰]

اس جنگ میں رائے احمد کھرل پہلے ہی روز ۲۱ ستمبر ۱۸۵۷ء کو شہید ہو گئے۔ ان کی شہادت کے بعد انگریزوں کے خلاف نفرت کو مزید ہوا ملی۔ سور ماؤں نے کمالیہ اور چیچہ وطنی پر قبضہ کر لیا۔ بدقسمتی سے ۱۸۵۷ء میں دلی کو شکست ہوئی اور انگریز فوج نے پنجاب کے باروں کا رخ کیا۔ اس کے بعد یہاں مظالم کی انتہا کر دی گئی۔ کئی سور ماؤں کو شہید اور بہت سوں کو کالے پانی کی سزا ہوئی۔ ان مظالم کا ذکر اس زمانے کے ڈھولوں میں دیکھا جا سکتا ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

کال بلیندی نارو پیارو نگاردا/ ایہناں انگریزاں، بلند بیگ داتر ہانا، فتح پور گوگیریں پھاہے
چاڑھیا/ جیہڑا لاڑا ہا ساندل بار دا/ ایہناں انگریزاں بنھ لیا لال گاجی دا کاٹھیا، مامد جلے دا
کاٹھیا/ ولی دادمُر دانا تے مرکھا پتر کوڑھی ویہنی وال دا/ ایہناں انگریزاں بنھ لیے، مراد تے
بہاول فتیانے/ جیہڑے راوی دے اُتے چکیندے مال چودھار دا[۳۱]

پنجاب کے باروں میں لڑنے والے پیشہ ور سپاہی نہیں تھے اور نہ ہی یہ سکھ افواج کی طرح تنخواہیں بڑھانے کے مطالبے کرتے تھے۔ انھوں نے کسی مہاراجے کے اکسانے پر بھی انگریزوں سے لڑائی نہیں کی بلکہ یہ ایسے سور ماؤں کی لڑائی تھی جو اس دھرتی پر دیسی راج کے خواہش مند تھے، اسی لیے وہ اپنی جان کا نذرانہ پیش کر کے اس جدوجہد میں شامل تھے[۳۲]۔

اٹھارھویں صدی سے شروع ہونے والا انحطاط انیسویں صدی تک آتے آتے سیاسی عدم استحکام کی ایسی صورت اختیار کر گیا جس کے بعد اس دور انحطاط سے نکلنے کی کوئی سبیل دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ امن و امان کے فقدان کے نتیجے میں بے روزگاری اور معاشی

زبوں حالی کی جو کیفیت رونما ہوئی، اس نے پورے معاشرتی ڈھانچے کو الٹ کر رکھ دیا۔ بیرونی حملوں نے ملک کے خزانے کو شدید دھچکا لگایا۔ اس معاشرتی اور سماجی ابتری سے کیا عوام، کیا فوج، کیا اہل کار سب ہی متاثر ہوئے[۳۳]۔۱۸۰۳ء میں انگریزوں نے مرہٹوں کو شکست دے کر دلّی پر قبضہ کر لیا اور مرکز سلطنت کے ساتھ مغل بادشاہ بھی ان کے قبضۂ قدرت میں آ گیا[۳۴]۔ جنسی الجھنوں اور اعتدال سے گرے ہوئے عیش و عشرت سے شاہ عالم بھی اپنے اسلاف کی طرح دامن نہ بچا سکے۔ بڑھاپے میں ایک ادنیٰ درجے کی طوائف عزیزن پر عاشق ہوئے اور اسے ''ملکہ عالم'' کا خطاب عطا کر دیا۔ یہ ملکہ عالم ناراض ہو کر بادشاہ کو بھرے دربار میں ذلیل کرتی اور اسے خوش کرنے کے لیے بوڑھا بادشاہ اس کے بھائیوں کی خوشامد کرتا۔ ان تلخ حقائق کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ مصاحبین بادشاہ کو بھرے دربار میں منھ توڑ جواب دینے پر ہی اکتفا نہیں کرتے بلکہ نوبت گالم گلوچ تک پہنچ جاتی[۳۵]۔ حافظ عبدالرحمٰن نے بادشاہ کو جو دشنام آمیز جواب دیا وہ ''وقائع عالم شاہی'' میں موجود ہے[۳۶]۔ یہ وہ حالات تھے جن کی وجہ سے مغل دربار ایک سوانگ بن گیا تھا۔ ویسے تو شاہ عالم کے بعد ۱۸۰۶ء میں اکبر شاہ ثانی اور پھر بہادر شاہ ظفر یکے بعد دیگرے مزید نصف صدی تک تخت شاہی پر براجمان رہے لیکن یہ مغل تاجدار محض ایک نمائش تھے۔ ان کا اثر اقتدار لال قلعے کی چار دیواری تک محدود تھا بلکہ وہاں بھی انھیں اپنے ملازمین کی معزولی یا تادیب وغیرہ کے سلسلے میں اکثر انگریز ریذیڈنٹ کی مدد لینا پڑتی تھی[۳۷]۔ ۱۸۳۵ء تک کمپنی کے سکوں پر مغل بادشاہ کا نام کندہ ہوتا تھا۔ اس کے بعد یہ تکلف بھی ختم ہوا اور سکوں پر انگریز شہنشاہوں کی شبیہیں نظر آنے لگیں[۳۸]۔ اس دور میں مغل بادشاہ کا ملک کے انتظام سے کوئی علاقہ نہ رہا۔ بادشاہ کمپنی کے پنشن خوار ہوئے اور پنشن کا وقت پر ملنا یا اضافہ وغیرہ ہی ان کی زندگی کا سب سے بڑا مسئلہ تھا۔ کبھی کبھی تو نام نہاد بادشاہ کی علامت کا وجود بھی خطرے میں نظر آتا۔ اکبر شاہ ثانی کی تخت نشینی کے وقت تک گورنر جنرل نے ''یور مجسٹی'' کو تہنیت کا پیغام بھیجا تھا۔ ریذیڈنٹ سٹین (Setan) بھی بادشاہ سے الجھنا نہیں چاہتا تھا لیکن اس کا نائب مٹکاف اس ڈھونگ کو ختم کرنے کے سلسلے میں انتہا پسند رائے رکھتا تھا۔ ۱۸۱۳ء سے ۱۸۲۳ء تک ہیسٹنگز کے عہد تک کمپنی کی پالیسی میں بڑی تبدیلیاں دیکھنے میں آئیں۔ گورنر جنرل کے دورے کے موقع پر کمپنی کے عہدیداروں اور اکبر شاہ ثانی کے درمیان شدید اختلافات پیدا ہو گئے۔ بادشاہ کی خواہش تھی کہ گورنر جنرل رعایا کی طرح اسے نذر پیش کرے مگر وہ آمادہ نہ ہوا۔ ہیسٹنگز نے انتقاماً نواب وزیر اودھ کو اپنی بادشاہی کے اعلان پر اکسایا اور کمپنی کی جانب سے نذر کا سلسلہ بند کر دیا۔ بات یہیں تک نہیں رکی بلکہ ۱۸۲۰ء میں جب اکبر شاہ ثانی نے شہنشاہِ انگلستان کی موت پر تعزیتی خط بھیجنا چاہا تو اسے اس امر سے روکا گیا۔

۱۸۲۷ء میں بے بس مغل بادشاہ نے اپنے وکیل افضل بیگ کے ذریعے گورنر جنرل کو وہ وعدے یاد دلائے جو کمپنی کی حکومت نے جنرل لیک کی معرفت کیے تھے۔ جواب میں ان وعدوں اور جنرل لیک کے خطوط کو اخلاقی تحریریں قرار دیا گیا۔ مٹکاف دہلی کا ریذیڈنٹ ہو چکا تھا اور گورنر جنرل ہر بات پر اس سے متفق تھا۔ مجبوراً بادشاہ نے دادرسی کے لیے راجا رام موہن رائے کو لندن بھیجنے کا فیصلہ کیا لیکن یہ سفارت بھی ناکام رہی اور اکبر شاہ ثانی کو پنشن میں ۳ لاکھ اضافے کی خاطر مجبور ہو کر ۱۸۳۳ء کے بعد ''راضی نامے'' پر دستخط کرنے پڑے۔ بادشاہ کی دی ہوئی خاندانی فہرست بھی کمپنی نے رد کر دی۔ اسی عالم میں ۱۸۳۷ء میں اس کا انتقال ہوا۔ اس اجمال سے بادشاہ اور کمپنی کی باہمی چپقلش اور کش مکش کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے[۳۹]۔ قلعے کی حالت بیان کرتے ہوئے مولوی ذکاء اللہ نے لکھا کہ سارے شہر کے بدمعاش قلعے میں گھسے رہتے۔ شہر سے مال چرا کر لے جاتے اور قلعے میں کھلے بازار بیچ کر کھاتے۔ لاوارث لڑکے اور

لڑکیوں کو پکڑ کر لے جاتے اور وہاں دام کھرے کر لیتے۔ ڈگری دار مارے مارے پھرتے، فرض دار مزے اڑاتے، شہزادے عجیب عجیب حرکتیں کرتے۔ کبھی مال چراتے کبھی کسی کو قتل کرتے، کسی کو مارتے، کسی کو پیٹتے اور آپس میں لڑتے [۴۰]۔ ۱۸۳۷ء میں ابوالمظفر، سراج الدین محمد بہادر شاہ تخت نشین ہوئے۔ ان کے دور کا آغاز بھی کش مکش اور چپقلش سے عبارت ہے۔ کمپنی ان سے اختیارات سے دست بردار ہونے کا مطالبہ کرتی اور بہادر شاہ ظفر ان سے اپنی پنشن میں اضافے کا مطالبہ کرتے۔ بہادر شاہ ظفر، بادشاہت کی علامت کی توقیر کے بھی قائل تھے۔ لہٰذا جب لارڈ آک لینڈ نے دہلی میں بادشاہ سے مساویانہ سطح پر ملنا چاہا تو بادشاہ نے ان سے ملنے سے انکار کر دیا۔ لارڈ الن برو نے بعد میں نذر کی رسم کو باضابطہ طور پر ختم ہی کر دیا۔ کمپنی کے ڈائریکٹروں نے بھی اس فیصلے کی توثیق کر دی۔ اگلے مرحلے میں لارڈ دلہوزی نے تو شاہی خاندان کو شاہی قلعے ہی سے بے دخل کرنے کا منصوبہ بنایا تا کہ قلعے کی علامت کو بھی عوام کے ذہنوں سے ختم کیا جائے۔ وہ اس سلسلے میں تشدد پر بھی آمادہ دکھائی دیتا ہے لیکن اس مسئلے پر انگلستان کے کورٹ آف ڈائریکٹرز اور بورڈ آف کنٹرول میں اختلافات پیدا ہوئے۔ کورٹ کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ اس سے مسلمانوں میں بے چینی پھیلے گی۔ دلہوزی اپنے موقف پر ڈٹا رہا۔ ۱۸۴۹ء میں ولی عہد دارا بخت کے انتقال کے بعد دلہوزی نے مرزا فخر الدین کو بلا کر اس وعدے پر کہ وہ لال قلعہ چھوڑ دے گا، بہادر شاہ ظفر کی مخالفت کے باوجود اسے ولی عہد نامزد کر دیا۔ ۱۸۵۶ء میں مرزا فخرو کے انتقال کے بعد زینت محل کے کہنے پر بہادر شاہ ظفر مرزا جواں بخت کی ولی عہدی کوششوں میں مصروف رہے لیکن کمپنی نے ایک بار پھر بادشاہ کی بات نہ مانی اور ایک اور شہزادے کی حمایت کی جو رہے سہے اختیارات سے لال قلعہ چھوڑنے پر آمادہ تھا۔ مگر ولی عہد کا مسئلہ حل ہونے سے قبل ہی ۱۸۵۷ء میں تاریخ نے ایک اور کروٹ لی اور وہ ساغر ہی ٹوٹ گیا اور ساقی کو دیارِ غیر میں ایک ادنیٰ قیدی کی حیثیت سے رنگون بھیج دیا گیا [۴۱]۔

دورِ زوال میں ہندوستان کے مختلف صوبوں میں نوابین اور صوبے داروں نے خودسری کا علم لہرایا اور مختلف صوبوں میں اپنی اپنی موروثی حکومت قائم کر لی تھی۔ مغل سلطنت کی بنیادیں جب کمزور ہوئیں تو اس کے اجزا تسبیح کے دانوں کی طرح بکھر گئے۔ یہ منتشر دانے یکا و تنہا ہو کر اور جانشینی کے جھگڑوں کے سبب مرہٹا یلغاروں اور سامراجی ریشہ دوانیوں کے لیے تر نوالہ ثابت ہوئے۔ طوائف الملوکی اور صوبوں کی عملی خودمختاری کا جو سلسلہ شروع ہوا اس نے اودھ اور حیدرآباد دکن جیسی ریاستوں کو جنم دیا۔ کچھ اہلِ حرفہ مرشدآباد کے صنعتی مراکز کا رخ بھی کر رہے تھے۔ داغ اور امیر مینائی کی نسبت سے حیدرآباد دکن کو بھی کچھ اعتبار حاصل ہوا لیکن دلّی کے بیش تر باکمالوں نے اودھ کے دامن میں پناہ لی۔ دیکھتے ہی دیکھتے لکھنؤ ایک تہذیبی مرکز کے روپ میں ابھرا۔ سلطنت اودھ کے بانی سعادت خان برہان الملک، محمد شاہ کے عہد میں اودھ کے صوبے دار مقرر ہوئے۔ ۱۷۵۴ء میں اس کے بھانجے اور داماد صفدر جنگ نے وزارت سے علاحدہ ہو کر اپنی خودمختاری کا اعلان کر دیا۔ اس کے انتقال کے بعد شجاع الدولہ ۱۷۵۷ء میں مسندِ اقتدار پر بیٹھا۔ بکسر کی لڑائی میں ناکامی کے بعد اس کی فوجی قوت کا خاتمہ ہو گیا اور اس نے انگریزوں کی بالادستی قبول کر لی۔ ۱۷۷۵ء میں انگریزوں کی مدد سے روہیلوں کی طاقت کو کچل دیا، اسی سال اس کا انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد اس کا عیاش اور نااہل بیٹا آصف الدولہ اقتدار پر براجمان ہوا [۴۲]۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے مفاد کے لیے ایسا ہی حکم راں موزوں تھا [۴۳]۔ اس نے شجاع الدولہ کی بچی کھچی فوج کو اپنے خرچ پر معمور کر لیا۔ اس کے بعد اودھ کی معاشی حالت بد سے بدتر ہوتی گئی۔ کمپنی کے اہل کار اپنے فوجی اخراجات کے لیے نواب اور وزیر اپنی عیاشیوں کے لیے کاشت کاروں کا کون نچوڑنے لگے۔ آصف الدولہ کے جانشین اس سے بھی زیادہ لہو و لعب میں غرق تھے۔ ۱۸۱۸ء میں نواب غازی الدین حیدر نے انگریز

گورنر جنرل کی انگیخت پر بادشاہ کا لقب اختیار کرلیا۔ بےاختیار اور برائے نام شاہانِ اودھ انگریزی سنگینوں کے سائے میں کچھ مدت تک تو لکھنؤ میں دادِعیش دیتے رہے لیکن ان کی ظاہرداریوں، عیاشیوں اور بدکرداریوں نے بہت جلد انھیں قلاش کر دیا۔ یہ سلسلہ خرابات ۱۸۵۶ء تک چلتا رہا۔ حتیٰ کہ ایسٹ انڈیا کمپنی نے اودھ کا الحاق کر کے اور یہاں کے آخری تاج دار واحد علی شاہ کو مٹیا برج کلکتا میں نظر بند کر کے، اس نام نہاد بادشاہ کا ٹمٹماتا ہوا چراغ ہمیشہ کے لیے گل کر دیا [۴۴]۔

دلّی کے زوال کے بعد اس کا لازمی اثر شعروسخن پر بھی پڑا۔ اس کس مپرسی کی حالت میں خانما برباد شعرا نے لکھنؤ کا رخ کیا۔ ان کے خیال میں اس وقت وہی ان کی جائے پناہ تھی لیکن یہ جائے پناہ بھی جنگ بکسر ۱۷۶۴ء کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی کے چنگل میں آ چکی تھی [۴۵]۔ کبھی تاوان کے بہانے، کبھی خراج کے حیلے، کبھی تحفظ کے ناطے، اس خطۂ زرخیز کے زروجواہر انگریزوں کے وسیع وعریض دامن میں انڈیلنے لگے تھے۔ شاہی خزانہ جس سے اہلِ علم وادب کو انعام وکرام عطا ہوتے تھے اور ان کی کفالت کا سلسلہ قائم تھا، اب غیروں کے تصرف میں تھا۔ غرض اودھ کی دولت ہتھیانے کا ہر ذریعہ استعمال ہو رہا تھا یہاں تک کہ وہاں کی حکومت میں دخل اندازی بھی شروع کر دی گئی تھی۔ جیسا کہ ہم دیکھتے ہیں کہ رفتہ رفتہ سعادت علی خاں کی قائم کردہ سلطنتِ اودھ پر پوری طرح دخل اندازی کا سلسلہ شروع ہوتا ہے [۴۶]۔ سرفہرست اودھ کے نواب وزیر علی خاں کا نام سامنے آتا ہے جو وزیر اور وزیری دونوں تخلص استعمال کرتے تھے۔ آصف الدولہ کے بیٹے تھے، اور ان کے انتقال کے بعد اس علاقے کے وزیر ہوئے لیکن انگریزوں نے سازش کر کے انھیں مسند سے ہٹا دیا اور بعد میں سرکشی وبغاوت کے جرم میں قید کر دیا [۴۷]۔ ان کی ایک غزل میں اپنے غم والم کا اظہار کرتے ہوئے وہ اس عہد کے دیگر فرماں رواؤں کے حالات کی جھلک بھی دکھائی دیتے ہیں جو فرنگیوں کے استبداد کا نشانہ بنے ہوئے تھے [۴۸]۔ حسرت ویاس سے مملو اس غزل کے چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

جوں سبزہ رندے اگتے ہی پیروں کے تلے ہم	اس گردشِ افلاک سے پھولے نہ پھلے ہم
روتے ہیں شب و روز اسی فکر سے یا رب	غنچے کی طرح باغ میں گل ہو نہ کھلے ہم
جس گل پہ نظر کرتے ہیں آتا ہے نظر خار	گلشن کے چلے جاتے ہیں کانٹوں پہ دبے ہم
اب پہلے ہی آغاز میں پامال ہوئے ہم	فریاد کریں کس سے یہ قسمت کے جلے ہم
زندانِ مصیبت میں بھلا کس کو بلائیں	رہتے ہیں وزیری ہی سے دن رات ملے ہم [۴۹]

آصف الدولہ کے بیٹے وزیر علی خان کو معزول کر کے انگریزوں نے اپنی حاکمیت سلطنت اودھ پر پوری طرح قائم کر لی تھی اور اس خطۂ زرخیز کو پوری طرح اپنے تسلط میں لے لیا تھا۔ وہ لوگ جس قسم کی سازشوں میں مصروف تھے، اس کا اندازہ شاہ کمال الدین کی مخمس شہر آشوب سے پوری طرح لگایا جا سکتا ہے۔ یہ نظم اس دور کے زہریلے اثرات کو پوری طرح اجاگر کر کے بڑھتے ہوئے برطانوی تسلط کا پردہ بھی چاک کرتی ہے اور سیاست ومعاشرت پر اس کے جو اثرات مرتب ہوتے تھے، اس کا احاطہ بھی کرتی دکھائی دیتی ہے۔ کمال محض اودھ کے انتشار کا بھی جائزہ نہیں لیتے اور امرائے سلطنت کی بےکسی وبےبسی کو نہیں دکھاتے بلکہ وہ اس دور میں دلّی پر چھائی ہوئی مایوسی اور تباہی وبربادی کے مناظر بھی دکھاتے، اس کا ماتم کرتے دکھائی دیتے ہیں [۵۰]۔ ملاحظہ کیجیے:

وزیر شاہ جو ہیں ان کے ملک کا ہے یہ ڈھنگ	کہ اپنے بخت سے رہتی ہے ان کو نت اٹھ جنگ

وزیر تو ہے گرفتاریاں بہ قید فرنگ
سکھ اور مرہٹوں نے واں کیا ہے شاہ کو تنگ
نہیں رہا ہے کچھ اقبال ان کا جز ادبار

وہ ہی یہ شہر اور ہے وہی یہ ہندوستان
کہ جس کو اشکِ جناں جانتے ہیں سب انسان
فرنگیوں کی سو کثرت سے ہوئے سب ویراں
نظر پڑے ہے بس اب صورتِ فرنگستاں
نہیں سوار رہے یاں سوائے ترک سوار

جہاں کی نوبت و شہنائی و جھانجھ کی تھی صدا
فرنگیوں کا ہے اس جا یہ ٹم ٹم اب بجتا
اسی سے سمجھو رہا سلطنت کا کیا رتبہ
ہو جب کہ محل سراؤں میں گوروں کا پہرا
نہ شاہ ہے نہ وزیر اب فرنگی ہیں مختار

نہ ہوئے دیکھ کے کیوں کر دل اپنا اب مغموم
ہو جب کہ جائے ہما آج آشیانہ بوم
وہ چھپے تو بس اب اس ملک میں ہیں سب معدوم
فرنگیوں کے جو حاکم تھے ہوگئے محکوم
تو ہم غریبوں کا پھر کیا ہے یاں شمار و قطار[۵۱]

اس مخمس میں پہلے بار انگریزوں کے تسلط کے خلاف کھل کر نفرت کا اظہار کیا گیا۔ شاعر نے سیاسی صورت حال کی تبدیلی، عدم استحکام اور معاشرے کی مفلوک الحالی کا ذمے دار ان انگریزوں کا ٹھہرایا ہے[۵۲]۔

گو اس سے قبل ولی دکنی نے ان فرنگیوں کو تاجروں کے روپ میں ''مکر و بد'' قرار دیا تھا لیکن تیزی سے بدلتے سیاسی منظر نامے اور انگریزوں کے بڑھتے ہوئے اثر و رسوخ کے بعد شاہ کمال نے تو سلطنت اودھ کے زوال اور انتشار کا براہ راست ذمے دار ان انگریزوں کو ٹھہرایا ہے[۵۳]۔ اس شہر آشوب کی یہی خوبی انھیں دوسرے شعرا سے ممتاز کرتی ہے۔ انگریزوں نے تو اودھ کے حکم رانوں کو کبھی اس قدر عزت کے قابل بھی نہ سمجھا جو وہ مغلیہ بادشاہوں کو ایک عرصے تک دیتے رہے۔ اس زوال کا ذمے دار صرف انگریزوں کو ٹھہرانا بھی درست نہیں کیوں کہ نواب اور امرا کی حد سے بڑھتی ہوئی عیاشیاں اور کمپنی کے نت نئے مطالبات نے اس سلطنت کو اقتصادی لحاظ سے مکمل طور پر کھوکھلا کر دیا تھا۔ امرا کی فضول خرچیوں کا سارا بوجھ کسانوں اور عام لوگوں پر پڑتا۔ نواب اور کمپنی کے مطالبات سے مجبور ہو کر اکثر کاشت کار اپنی زمینیں چھوڑ چھوڑ کر فرار ہونے کو ترجیح دیتے۔ زیر کاشت زمینیں ویرانوں اور صحراؤں میں تبدیل ہونے لگیں۔ اس صورتِ حال کا ریاست کے خزانے پر شدید منفی اثر پڑا۔ نواب کی عیاشیاں روز افزوں تھیں جب کہ ریاست کی آمدنی روز بروز گھٹتی جا رہی تھی۔ نواب اور متوسلین تو کسی نہ کسی طرح اپنی وضع داری نبھا رہے تھے لیکن دیگر امرا اور جاگیرداروں کی معاشی حالت نہایت خستہ ہو چکی تھی۔ وہ لوگ قرض لے کر یا گھر کی قیمتی اشیا بیچ کر اپنا گزارا کر رہے تھے[۵۴]۔ ان شا اللہ خاں کے مندرجہ ذیل قطعات سے اس معاشی ابتری کی صورتِ حال کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

کہاں تک کروں میں زمانے کا شکوہ
مصیبت ہے یوں تو سب اہلِ ہنر پر
خصوص وہ جو وضع داروں میں ہیں یاں
برستا افلاس ہے ان کے در پر
مکھا رام جانے رو پیادے گیا لو
کھڑا بنیا کہتا ہے اب ان کے در پر

سلیمانی تلوار تو لے چکا ہے | لگائی ہے اب تاک شاید سپر پر
پڑا ہنہناتا ہے بن گھاس گھوڑا | ہوئے چار فاقے ہیں پیہم نفر پر[۵۵]

سعادت یار خاں رنگین نے بھی مثلث رنگین کے ابتدا میں ''شہر آشوب رنگین'' کے عنوان کے تحت دوسو اشعار پر مشتمل نظم لکھی[۵۶]۔ انھوں نے نظم کے آغاز ہی میں کہا کہ:

سنو بیان اک میرا یارو | منصف ہو تو سن کر رو دو
ایک دن مجھ کو سوچ یہ آیا | یعنی زمانے نے ہے ستایا
اس دنیا میں آئے ہیں جب سے | چین نہیں ہے مطلق تب سے
دولت اپنے پاس نہیں ہے | کچھ آمد کی آس نہیں ہے
فکرِ معیشت نے ہے مارا | کیجے کس صورت سے گزارا[۵۷]

رنگین اس نظم میں بارہ پیشوں میں درپیش دشواریوں کا ذکر بھی کرتے ہیں۔ در بیانِ کسبِ دہقان، در بیانِ سپاہ گری، در بیانِ کسبِ تجارت، در بیانِ کسب قصاب، در بیانِ کسبِ گاذر، در بیانِ باغ باں، در بیانِ کسب تجار، در بیانِ حاجی طواف کعبہ، در بیانِ کسب حلوائی، در بیانِ بھڑ بھونجا، در بیانِ کسبِ عطار، در بیانِ سیاحی ودہقانی[۵۸] کے عنوان کے تحت مختلف پیشوں کی مشکلات اور دشواریوں کا احوال بیان کرتے ہیں۔ مجموعی طور پر یہ مثنوی اخلاقی مثنوی کے تحت آتی ہے جس میں اپنے نفس سے لڑنے اور آخرت کی تیاری کرنے کا مشورہ دیتے ہیں جو اس بے عمل معاشرے کا عمومی رجحان تھا۔ ملاحظہ کیجیے:

تو تو یہاں کرتا ہی نہیں کچھ | وہاں کے لیے دھرتا ہی نہیں کچھ
یوں ہاتھ نہیں کچھ آتا | بنے گا یہاں سے خالی جاتا
تو ہی بتا اے مردِ غافل | بن بووے کیا ہووے حاصل[۵۹]

لکھنؤ میں طبقۂ امرا کی بدحالی کا اثر زندگی کے ہر شعبے پر پڑا۔ ہنرمند، فن کار اور اہلِ علم بھی ان حالات سے بے حد متاثر ہوئے۔ کیوں کہ اکثر کا انحصار ان امرا ہی پر تھا۔ ہنرمند اور فن کار بے روزگار ہوئے تو امرا کو وہ پاس ولحاظ بھی نہ رہا[۶۰]۔ میر یار علی جان صاحب نے اپنے ایک شہر آشوب جو ریختی کے انداز میں ہے، کہتے ہیں کہ:

گر ہیں گویا اے بوا! اس شہر کے دکان دار | نوچیں مردہ جان کر دیکھیں جو گا ہک جان دار
ایک ڈھونڈے سو میں تو نکلے نہیں ایمان دار | بھاری بھر کم دیکھنے کو ہیں یہ بھڑوے شان دار
کھو کھلے تربوز سے دے ان کو نسبت آج کل

نائی دھوبی کنجڑے بھٹیارے قصائی بابکار | ایک کوڑی کے لیے ہوتے ہیں گردن پر سوار
لوٹ کر ہم کو ہوئے تیلی تنبولی مال دار | ہم فقیروں سے ہیں تدبر دیکھو لو ہے آشکار
پاجیوں کے گھر میں ہو کیوں کر نہ دولت آج کل[۶۱]

۱۸۵۷ء سے قبل لکھی گئی اس شہر آشوب میں ۴۲ بند ہیں[۶۲]۔ نچلے طبقے کی ہٹ دھرمی، بدکلامی اور شرفا سے مرعوب ہونے کے بہ

جائے ان سے اپنی اجرت زبردستی وصول کرنے کی حالت بیان کرنے کے علاوہ شاعر نے ریاستی اداروں بالخصوص محکمۂ پولیس اور عدالتوں میں رشوت خوری عام ہونے [۶۳] اور معاشرتی برائیوں کے پھیلنے کے مناظر دکھاتے ہوئے کہا کہ:

آتے ہیں حاکم کے کتے اتنی سی تکرار میں　　کچھ نہ دو تو باندھ لیں مشکیں موئے بازار میں
گیلی سوکھی دونوں جلتی ہیں بوا سرکار میں　　چاندنی خانم عجب اندھیر ہے دربار میں
ہیں وہی میری کہ جن کی ہے حمایت آج کل

لالچی بندے یہ لینا ہی سمجھتے ہیں ثواب　　ڈر نہیں مرنے کا ہے کس کھیت کی مولی عذاب
صاف ٹکڑا توڑ کر دیتے ہیں کارندے جواب　　جو بہت دے اس کا کہنا جو کم دے ہو خراب
ہر کچہری میں ہے کرتی کام رشوت آج کل [۶۴]

جان صاحب نے نہ صرف ان سماجی برائیوں کا ذکر کیا بلکہ انھوں نے ان خرابیوں کے پیدا ہونے کی وجوہات پر بھی غور کیا۔ خراب اقتصادی نظام، زرعی نظام کی بربادی اور تباہی کی وجہ بیان کرتے ہوئے سرکاری منصوبوں میں بار بار کی تبدیلیوں کے برے اثرات کا ذکر کرتے ہوئے ان کا کہنا تھا کہ:

جب گنواروں کو ہو عامل کے نہ رہنے کا یقیں　　کس طرح پیسہ چلے دستور ہے یہ بھی کہیں
سال میں بارہ بدلتے ہیں بوا عامل یہیں　　بی امانی سال بھر کا کچھ اجارہ ہی نہیں
جو اضافہ دے، وہی بس پہنے خلعت آج کل [۶۵]

بدعنوانی اور اداروں کی تباہی کی وجہ سے جرائم کی شرح بھی تیزی سے بڑھتی جارہی تھی۔ حالات کی خرابی کے ذمے دار قانون کے رکھوالوں نے عجیب وغریب حربہ استعمال کرنا شروع کر دیا تھا تاکہ لوگ ان جرائم کی رپورٹ لکھوانے کی زحمت بھی نہ کریں۔ اس صورتِ حال کی عکاسی کرتے ہوئے شاعر کا کہنا تھا کہ:

حق کو ناحق کرتے ہیں ناحق کو حق یہ برملا　　نوج دکھلائے خدا ہے یہ عدالت آج کل
اور جو ہو چوری تو دہشت سے نہ ہو اس کی خبر　　پہلے گھر والے بندھیں اوس کے ہو چوری جس کے گھر
تھانے داروں نے نکالی ہے یہ حکمت آج کل [۶۶]

اس مخمس شہر آشوب کا ہر بند اس عہد کی سچی تصویر دکھاتا ہے۔ ایک ایسا دور جس میں شرفا، فاقہ کشی پر مجبور ہو جائیں۔ بھوک اور پیاس سے وہ مردے سے بھی بدتر دکھائی دیں، جیسے:

چارپائی سے بھی اب طاقت نہ اٹھنے کی رہی　　ہوگئی ہے حشر کا میدان انگنائی اجی
جیتے جی ایسی ہی شدت بھوک کی اور پیاس کی　　حال ہے بدتر ہر ایک کا گور کے مردے سے بھی
کون سا گھر ہے نہیں جس میں قیامت آج کل [۶۷]

اور رذیل امیر ہو کر اثر ورسوخ حاصل کر لیں۔ جان صاحب ان لوگوں کی معاشی برتری کو تسلیم کرتے نظر نہیں آتے۔ ان کے خیال میں اس معاشی بہتری کے پیچھے ایسے متعدد مکروہ کام ہیں جو کسی بھی صورت میں قابلِ قبول نہیں ہو سکتے، جیسے:

جورو ساس سلہج اور بھتیجی بھانجی ہر محل میں ان موئے سوموں نے اپنی بھیج دی

ان کے کہنے کی یہ ہے بی بی حقیقت آج کل[۶۸]

نظم کے پہلے بند ہی میں اس کایاپلٹ پر شاعر مضطرب دکھائی دیتے ہیں اور تمہید کے طور پر وہ اس زمانے کے حالات کی منظر کشی کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

کم نہیں قارون سے ہر ایک کی خصلت آج کل دفن مردے کی طرح گھر گھر ہے دولت آج کل

مَردوں کی ہوگئی نامرد ہمت آج کل لکھنؤ میں شاد ہیں سوموں کی خست آج کل

گور پر حاتم کے روتی ہے سخاوت آج کل[۶۹]

ڈاکٹر نعیم احمد نے شہر آشوب کے حوالے سے اپنی تحقیق کے دوران بعض غیر مطبوعہ شہر آشوب کے نمونے بھی اپنی تصنیف میں درج کیے ہیں۔ نیشنل لائبریری کلکتا میں موجود طالب علی عیشی کے ایک نامکمل شہر آشوب کا ذکر کرتے ہوئے ان کا کہنا تھا کہ قصیدے کی ہیئت میں لکھے گئے اس شہر آشوب کے ۲۰ اشعار دستیاب ہوسکے ہیں[۷۰]۔ اس شہر آشوب میں بھی شرفا کی مفلسی اور رذیلوں کی امارت کو موضوع بنایا گیا ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

جز ایک برگ و بار نہیں ان کے باغ میں بخشے جنھوں نے گلشن و بستاں ہزار بار

دروازہ پھر نفر کے نفیری بجے ہے اور پھرتے ہیں پیادہ پا سر و سردار لکھ سوار

مالک وہ گنج زر کے ہوئے سانپ کی طرح سونا جنھوں نے دیکھا نہ جز خواب ایک بار[۷۱]

حیدرآباد سنٹرل اسٹیٹ لائبریری سے دستیاب ہونے والے ایک اور قلمی نسخے کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر نعیم احمد کا کہنا ہے کہ اس شہر آشوب کے شاعر کا نام معلوم نہیں ہوسکا۔ یہ نظم مخمس کی ہیئت میں ہے اور اس کے بھی ۴۶ بند دست یاب ہیں[۷۲]۔ اس شہر آشوب میں بھی اس عہد کی سماجی تبدیلیوں کا ذکر کرتے ہوئے شاعر ادنیٰ اور اعلیٰ طبقے کے درمیان ہونے والی کش مکش کا احوال سناتے دکھائی دیتے ہیں۔ زمانے کی کروٹ پر وہ افسردگی کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

گلہ میں کیا لکھوں یاروں فلک کی نارسائی کا زمانہ دوں پرور پر جفا کی بے وفائی کا

ہوا ہے حرفِ یکسر حک ؁ ـوں کی آشنائی کا لگے اجلاف دم بھرنے خودی میں کبریائی کا

رجالی قوم دجالی کرے دعویٰ خدائی کا[۷۳]

اس معاشرتی انتشار کے دور میں ادنیٰ پیشے والے جس طرح سے اہمیت جتانے لگے، شاعر کو یہ بات ایک آنکھ نہیں بھاتی۔ وہ اس تبدیلی کی مذمت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

جو پیچھے تھے لحم گولی بنا قیمہ کبابوں کا سو پھرتا ہے بغل میں اب لیے جزداں کتابوں کا

کہے جھوٹے وہ مسئلے ڈر نہ دوزخ کے عذابوں کا سوال اس کے سے منھ بند ہے سبھی عالی جوابوں کا

لگا جبریل ہو اڑنے ہر ایک لونڈا قصائی کا[۷۴]

ایک بیاض کشکول میں ایک نظم مخمس کی ہیئت میں درج ہے۔ اس کے ۲۱ بند ہیں۔ آخری بند میں صرف دو مصرعے ہیں۔ اس کا

عنوان ''بموجب احوال امرایانِ حال'' ہے۔اس کے مضمون کی وجہ سے اسے بھی شہر آشوب قرار دینا مناسب ہوگا۔نظم کے مطالعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ نظم میں ۱۸۵۷ء سے قبل کہی گئی ہوگی[۵]۔اس نظم میں بھی شرفا کی مفلسی اور رذیلوں کی معاشی برتری کو ہدفِ تنقید بنایا گیا ہے۔یہ بات چوں کہ معاشرے کے مروجہ اصولوں کے خلاف تھی لہٰذا شاعر اس کی مذمت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

اس دور کے امیر عجب ان کا حال ہے — درجے کا ان کے پاس مراتب کمال ہے

بازو نسیں منیار کے تیغ و ڈھال ہے — کنجڑے کے ہاتھ سانگ گلے میں زوال ہے

اشراف خوار زار تنبولی نہال ہے

ڈنڈ پیل پیل فربہ غلاماں ہوئے غرور — نادر لباس پہن دسیں جگ میں پر ظہور

اشراف ان کے سامنے دستے ہیں جیوں مزدور — طاقت کہاں جو بات کرے ان کے کوئی حضور

اس دور میں خوب جو کو بد خصال ہے[۶]

انتزاعِ سلطنتِ اودھ: واجد علی شاہ اختر کی اسیری

انتزاع سلطنت اودھ کوئی ایسا واقعہ نہیں جو اچانک خلا میں رونما ہوا ہو۔انگریزوں سے تعلقات اس ریاست کے ساتھ رفتہ رفتہ حد درجہ تاریک ہوتے جا رہے تھے جو خود ان کی تخلیق کردہ تھی۔عام خیال یہ ہے کہ ۱۸۵۶ء میں واجد علی شاہ کی معزولی کے ساتھ ہی سلطنت اودھ کو ضبط کیا گیا،لیکن حقیقت یہ ہے کہ واجد علی شاہ کی معزولی اور جلاوطنی کے ساتھ ضبطی اودھ کا ادھورا کام مکمل کیا گیا۔بکسر کی لڑائی سے انتزاع سلطنت تک کئی بار اودھ کا نقشہ بدلا۔سب سے پہلے غازی پور،بنارس اور کان پور کو اودھ سے علاحدہ کیا گیا۔۱۷۸۷ء میں فتح گڑھ اور ۱۷۹۸ء میں الہ آباد،چنار کے بدلے انگریزوں کے دائرۂ مملکت میں شامل ہوئے۔پھر سعادت علی خاں رنگیں کی تخت نشینی کے وقت سلطنت اودھ کا آدھا رقبہ انگریزوں کے قرضے کی ادائیگی کے نام پر ہتھیا لیا۔ایک طرف تو اودھ کے بڑے حصے پر انگریز قابض ہوتے جا رہے تھے اور دوسری طرف انگریز مختلف صورتوں سے ''وزیرانِ عہد'' اور بعد ازاں شاہانِ اودھ سے روپیہ وصول کر رہے تھے۔انگریز جو چاہتے تھے سو کرتے تھے اور اعمال کی ذمے داری مجبور و مقہور شاہِ اودھ پر تھی[۷]۔ریذیڈنٹ ہر قسم کی سازشوں کی نگرانی کرتا اور بلا واسطہ سلطنت کے معاملات میں دخل دیتا۔سر جان شور نے اس بابت درست لکھا کہ اس عہد کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ اودھ پر قبضے کے لیے بہانے اور تاویلیں گھڑی جا سکیں۔ایسٹ انڈیا کمپنی کی جانب سے کیے جانے والے متعدد معاہدوں کا مقصد انگریزی اثرات بڑھانا تھا۔اس بات کا اعتراف کمپنی کے معروف رکن ہنری لارنس نے بھی کیا ہے۔اودھ سے متعلق کمپنی کی مداخلت سے پیدا شدہ بد نظمی کو ہنری لارنس نے Blighting influence of interference کہا۔ہنری لارنس کا کہنا تھا کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی مالی مشکلات کو ختم کرنے کے لیے اودھ کو خزانے کی تھیلی کی طرح استعمال کیا گیا[۸]۔ظاہر سی بات ہے کہ تمام حالات واجد علی شاہ کو ورثے میں ملے۔انتزاع سلطنت کے اسباب کے مطالعے سے یہ بات پوری طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ انتزاع سلطنت دراصل جنگ آزادی کے محرکات میں سے ایک ہے۔ہماری قومی تاریخ اور شاعری کے رجحانات پر اس کا گہرا اثر پڑا ہے[۹]۔نوجوان واجد علی شاہ نے ابتدا میں حالات پر قابو پانے کی کوشش ضرور کی۔فوج کی پریڈوں،دادخواہی اور عدل وانصاف کے تقاضوں کو عملی شکل کی سر توڑ کوششوں میں ناکامی کے بعد وہ مشکلات سے گھبرا کر قیصر باغ کے ہنگاموں اور رہس کی مجلسوں میں کھو گئے۔واجد علی شاہ میں اتنی قوت نہیں تھی کہ وہ اپنے

بزرگوں کی میراث سے اپنے آپ کو بچا سکتے۔ ہارڈنگ نے اگرچہ انھیں واضح الفاظ میں تنبیہ کی تھی لیکن واجد علی شاہ بقائے سلطنت کے لیے وفاداری کو کافی سمجھتے تھے اور یوں ضبطیِ سلطنت کے لیے اسباب مہیا ہوتے رہے [۸۰]۔ سیلمین کی رپورٹ جو اس نے نومبر ۱۸۴۹ء سے مارچ ۱۸۵۰ء تک سلطنت اودھ کے بعد مرتب کی تھی، تاریک اور سیاہ تھی۔ وہ مداخلت کے حق میں نہ تھا لیکن اس کی رپورٹ میں ضبطی اودھ کے امکانات کا سراغ لگانا مشکل نہیں [۸۱]۔ انگریزوں کے پاس اودھ کے بارے میں کئی تجاویز زیرِغور تھیں ایک بفر اسٹیٹ کی حیثیت سے اس ریاست کی افادیت باقی نہیں رہی تھی۔ لارڈ ڈلہوزی اگر برما کی جنگ میں نہ الجھتا اور ایران سے الجھنے کی تیاری نہ کر رہا ہوتا تو ۱۸۵۶ء سے قبل ہی اودھ کو کمپنی بہادر کے زیرنگیں کرنے کے احکامات صادر کر دیتا [۸۲]۔ شاہِ اودھ اور ریذیڈنٹ دونوں کی فرماں روائی اب کمپنی کو منظور نہ تھی لہٰذا صرف بدنظمی کو ضبطی اودھ کا سبب قرار دینا درست معلوم نہیں ہوتا۔ ڈلہوزی کی یہ کوشش رہی کہ واجد علی شاہ نام کے بادشاہ بنے رہیں اور مملکت کا انتظام کمپنی کے سپرد کر دیں لیکن یہ صورت ممکن نہ ہوئی۔ سیلمین اور اوٹرم کی رپورٹوں کی روشنی میں کمپنی کے کورٹ آف ڈائریکٹرز نے یہ فیصلہ کیا کہ ''اودھ کو ممالک سرکار کمپنی میں داخل کر لیا جائے'' [۸۳]۔ ۴ر فروری ۱۸۵۶ء کو اوٹرم نے بادشاہ سے ملاقات کی اور عہد نامہ پیش کیا۔ واجد علی شاہ نے اس پر دستخط نہ کیے۔ اوٹرم نے ضبطیِ حکومت کا اشتہار چسپاں کیا جس کی رو سے ۱۸۰۱ء کا عہد نامہ ساقط ہو گیا۔ ۱۲ر فروری ۱۸۵۶ء کو کان پور سے انگریز فوج سلطنت اودھ کے کمپنی کے ممالک میں شامل کرنے کی غرض سے آ پہنچی۔ اوٹرم نے دربار منعقد کر کے ضبطیِ سلطنت کا اعلان کیا۔ لکھنؤ کا ریذیڈنٹ چیف کمشنر بن گیا اور سلطنت اودھ کا چراغ گل ہو گیا [۸۴]۔

اردو شاعری میں جس طرح سے لکھنؤ کی مجلسی زندگی، حسن و زیبائش اور عیش و عشرت کے زمزمے ملتے ہیں اسی طرح انتزاع سلطنت اودھ کے بے شمار نوحے بھی موجود ہیں۔ سلطنت کی تباہی و بربادی، معاشی ابتری اور سماجی انتشار کے یہ مناظر آج ہماری کلاسیکی ادب کا حصہ ہیں۔ واجد علی شاہ نے اپنی مثنوی ''حزنِ اختر'' میں صرف مٹیا برج کے حالات نظم نہیں کیے بلکہ انتزاع سلطنت کو بھی پس منظر کے طور پر شامل کیا ہے۔ اس مثنوی میں انھوں نے اپنی معزولی سے لے کر کلکتا آمد تک کے تمام حالات مع احکامات گورنر جنرل بیان کیے ہیں۔ انھوں نے کمال دیانت داری سے ان تمام الزامات کا ذکر کیا جو انگریزوں نے ان پر لگائے تھے۔ اس لحاظ سے یہ مثنوی بڑی اہمیت کی حامل ہے [۸۵]۔ ابوالخیر کشفی کے مطابق ''یہ مثنوی واجد علی شاہ کی زندگی کے آخری ایام کی خودنوشت سوانح کا درجہ رکھتی ہے'' [۸۶]۔ اس سانحے کی بابت عبدالحلیم شرر نے لکھا کہ:

> سننے والوں کے کلیجے پاش پاش ہو گئے۔ واجد علی شاہ تو چلے گئے مگر ان کی یاد شہر کے ہر مرد و زن کے قلب و جگر پر تیر و خنجر کا کام کر رہی تھی۔ ان کے فراق پر غزلیں لکھی گئیں، گیت بنائے گئے، ڈنڈے والوں اور بھاٹوں نے اپنے انداز کی نظمیں گلی گلی پھر کے سنانا شروع کیں اور کوئی گھر نہ تھا جس سے عورتیں وہ غزل نہ گا رہی ہوں جس کا شعر یہ تھا [۸۷] کہ:

سڑکیں نکل رہی ہیں سونی گلی گلی ہے   واجد علی پیارا کلکتا کو سدھارا [۸۸]

لکھنؤ کا وہ تاج دار جس کے دربار میں عیش و عشرت کی فراوانی تھی ابتداً اپنی مثنوی میں قید خانے کی تکلیف و مصیبت کو درج کرتے ہوئے قید خانے میں مچھروں کی کثرت اور پے خانے کے تعفن تک کا حال ظاہر کرتا دکھائی دیتا ہے [۸۹]۔ ملاحظہ کیجیے:

پھر اس پر غضب چار سنڈاس ہیں
کہ مجھ دل جلے کے وہ سب پاس ہیں
ابھرتی ہے ہر عطر داں کی جو بو
کہ جس طرح مرچوں کی ہو تند خو[90]

حمد، نعت اور منقبت کے بعد ''ساقی نامہ واحوال ضعف در قید'' کے عنوان سے انھوں نے قید خانے میں اپنی کس مپرسی کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ:

اکیلا ہے زنداں میں اک مے پرست
شب و روز ہے خوفِ روزِ الست
رفیقوں نے چھوڑا اکیلا مجھے
سبھوں نے کنویں میں دھکیلا مجھے
خبر تک نہیں اپنے احوال کی
توقع نہیں کچھ زر و مال کی
عیال و اطفال لوٹے گئے
جہاں میں مرے لال لوٹے گئے
نہ کھانے کا اسباب ہے کچھ نصیب
نہ پانی کا ہے ذکر لب کے قریب[91]

مثنوی میں انتزاعِ سلطنت کی داستان شروع کرتے ہوئے شاعر کہتے ہیں کہ:

یہ واجد علی ابنِ امجد علی
سناتا ہے اب داستاں رنج کی
کہ جب دس برس سلطنت کو ہوئے
جو طالع تھے بے دار سونے لگے
ہوا حکم جنرل گورنر یہ یار
کرو سلطنت کو خلا ایک بار
جو تھے ملک میں بیٹھتے سہ کروڑ
اسی کی تھی یہ بادشاہی یہ زور
جفا کش کا شاہِ اودھ نام ہے
حکومت کا آخر یہ انجام ہے
جو وہ لاٹ دلہوزی اس وقت تھے
مضامیں انھوں نے یہ خط میں لکھے
رعایا بہت تم سے ناراض ہے
تمھاری ریاست ہے بد نام شے
رعایا نہ دیکھیں گے ہر گز تباہ
فقط نام کو تم رہو بادشاہ
مہینہ ہر اک اک لاکھ کا
ملے گا تمھیں کچھ نہیں شک ذرا
ہوا گھر میں کہرام اس کر یہ بات
وہ دن دوپہر ہوگئی ساری رات
وہ لائے تھے اس طرح کی ساتھ فوج
کہ جس طرح دریا کی آتی ہے موج
مرے دل میں آتا تھا ہر دم خیال
جو ہونا تھا ہو چکا کیا ملال
کرو مہر تم راضی نامہ پہ اب
گئی سلطنت تو گئی بے سبب
مگر سارے گھر نے نہ چھوڑا مجھے
دبایا ڈرایا جھنجھوڑا مجھے
رعایا یہ سب کہتی تھی واہ واہ
کیا ہم کو اس بادشہ نے تباہ[92]

مثنوی کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ واجد علی شاہ کو اپنی سلطنت سے معزولی کا کوئی قلق نہیں تھا اور جو کچھ بھی وہ قانونی چارہ جوئی کا ارادہ کر رہے تھے، وہ گھر والوں اور دوستوں کے دباؤ کی وجہ سے کر رہے تھے۔ رخصت ہوتے وقت بدقسمت بادشاہ نے حسرت

ویاس سے اپنی سلطنت پر الوداعی نظر ڈالی اور یہ کہتے ہوئے اس نے اجازت لی کہ:

شب و اندوہ میں رو رو کے بسر کرتے ہیں		دن کو کس رنج و تردد میں بسر کرتے ہیں
نالہ و آہ وہ غرض آٹھ پہر کرتے ہیں		در و دیوار پہ حسرت سے نظر کرتے ہیں
رخصت اے اہلِ وطن ہم تو سفر کرتے ہیں
شکوہ کس سے کروں ہاں دوست نے مارا مجھ کو		جز خدا کے نہیں اب کوئی سہارا مجھ کو
نظر آتا نہیں بن جائے گزارا مجھ کو		در و دیوار پہ حسرت سے نظر کرتے ہیں
رخصت اے اہلِ وطن ہم تو سفر کرتے ہیں [۹۳]

کلکتے میں قید کے دوران جن احباب نے ان کا ساتھ دیا اور ایام اسیری میں کام آئے، واجد علی شاہ ان سے شکر گزاری کا اظہار کرتے ہوئے نام لے لے کر ان کی تحسین کرتے ہیں کہ:

جو کلکتے کے قلعے میں میں رہا		تو ان لوگوں نے ساتھ میرا دیا
میں ہر اک کے ظاہر کروں تجھ سے نام		مرے قید خانے میں آئے جو کام [۹۴]

اس کے بعد کے حالات یعنی انگریزوں کی قید میں لکھنؤ سے کلکتا تک کے سفر کا مکمل احوال اس مثنوی میں درج ہے۔ اس کے علاوہ وہ تمام مصائب اور مشکلات جس سے واجد علی شاہ گزرے، انھوں نے اس مثنوی میں قلم بند کر دیا۔ سفر کے مصائب کے ضمن میں وہ کہتے ہیں کہ:

فلک نے جو گھر سے نکالا مجھے		برنڈن کے بنگلے میں ڈالا مجھے
ہوئے کانپر میں ہم آ کر مقیم		عجب وقت تھا اور عجب خوف و بیم
لکھوں حال دشتِ جنوں خیز کا		عمل ہے ہر اک جا پہ انگریز کا [۹۵]

انگریزوں نے انھیں کلکتا میں لاٹ صاحب کی کوٹھی کے درمیانی حصے میں نظر بند رکھا۔ انھیں نہ تو کلکتا پسند آیا اور نہ ہی یہ محل۔ بلکہ اس شہر کو انھوں نے دوزخ کے ٹکڑے سے تعبیر کرتے ہوئے لکھا کہ:

یہ ٹکڑا زمینِ دوزخ کا		ہوئی جس پہ بنائے کلکتا [۹۶]

انھوں نے اپنی حکومت کی بحالی کے لیے لندن میں مقدمہ بھی دائر کیا۔ اپنے عزیزوں کو مقدمے کی پیروی کے لیے لندن روانہ کیا۔ ابتدا میں انھوں نے انگریزی حکومت سے کچھ بھی قبول نہ کیا کیوں کہ یہ ان کے مقدمے کو کمزور کرنے کی وجہ بن سکتا تھا لیکن بھائی اور والدہ کے پیرس میں انتقال کے بعد جب قرضوں کا بوجھ بڑھ گیا تو انھوں نے برطانوی حکومت سے وظیفہ جاری کرنے کی درخواست کی جو منظور ہوئی اور دو لاکھ فوری طور پر ادا کیے گئے [۹۷]۔ اس ضمن میں ان کا کہنا تھا کہ:

ہوا حکم جنرل گورنر یہ بار		خبر لیں گے سب کی نہ ہو بے قرار
ہوا حکم کونسل جوائے نیک طرف		تو دو لاکھ مبلغ ملے بہر صرف [۹۸]

تاہم یہ رقم واجد علی شاہ کے لیے ناکافی ثابت ہوئی۔ چناں چہ انھوں نے لارڈ کیننگ کا شکریہ کے ساتھ ساتھ وظیفے کے اجرا

کے لیے ایک قصیدہ نما درخواست روانہ کی جس میں وہ اس کی شان میں تعریفوں کے پل باندھتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

اعانت خرچ کی اس وقت میں کی کیوں نہ حاتم ہو — مرا ہر مو ہوا رطب اللسان نواب اکرم ہو

سکندر جاہ و کیکاؤس و نوشیروانِ عالم ہو — ارسطوفہم و افلاطوں منش حاتم سے ہم جم ہو [99]

اس قصیدے کو پڑھ کر واجد علی شاہ کی بے بسی اور بے کسی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ انھوں نے کیسی بے کسی کے عالم میں یہ الفاظ کہے ہوں گے کہ:

جو مارو کچھ نہیں چارہ، جلاؤ معجزہ یہ ہے — ہمارے حق میں عیسیٰ ہو،نہیں شک ان میں کیا کم ہو [100]

اس درخوات کے نتیجے میں سالانہ بارہ لاکھ کا وظیفہ مقرر ہوا جو قابلِ محصول تھا اور اسی میں سے دیگر شاہی خاندان کے افراد کے وظیفے بھی منہا کیے جاتے تھے۔ اس طرح تقریباً پچھتر ہزار کی رقم واجد علی شاہ کے حصے میں آتی جو اس کے لیے ناکافی رہتی۔ اسی لیے متعدد اشعار میں اس کے اظہار کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ ملاحظہ کیجیے:

ہے اک لاکھ سکّے کی تنخواہ یار — مگر ربع پر نہیں کچھ اختیار

جو نوچا کھسوئی میں وہ آ گئے — جو ستر پچھتر پہ ہم آ رہے [101]

یہ رقم بھی واجد علی شاہ صرف اپنے اہل وعیال کی آسائش پر نہیں کرتے بلکہ وہ اس کا خطیر حصہ اپنے متوسلین کی ضروریات کے علاوہ اشاعت کتب اور تعمیرات وغیرہ پر بھی خرچ کرتے۔ انھوں نے مٹیا برج میں ایک نیا لکھنؤ بنانے کا بیڑا اٹھایا۔ مہاراجا بردان کی کوٹھی کرائے پر حاصل کی اور اسے شاہ منزل کے طور پر ڈھالنے کا کام شروع کیا۔ اسی طرح انھوں نے امام باڑہ سبطین، رہس محل وغیرہ بھی تعمیر کروایا۔ اپنی کتب کی اشاعت کے لیے مطبع سلطانی قائم کیا۔ انگریزوں کی جانب سے نواب اودھ کی معزولی کو ہندوستانیوں کی جانب سے عام طور پر ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھا گیا۔ ان کی نظر میں وہ بھلے برے جیسے بھی تھے، اپنے تھے [102]۔

واجد علی شاہ کو بھی ساری زندگی اودھ سے دوری کا غم ستاتا رہا۔ اپنے دلی جذبات کی ترجمانی کرتے ہوئے انھوں نے اپنی متعدد غزلوں میں اس غم والم اور افسردگی کو موضوع بنایا۔ جیسے:

چمن سے پھینک دیا میرا آشیاں کیا خوب — نہال مجھ کو کیا آ کے باغ باں کیا خوب [103]

لکھنؤ کی دل کش فضا اور پرکشش ماحول سے دور کلکتے میں شاہ اودھ جس کس مپرسی کی زندگی گزار رہے تھے اور عالمِ غربت میں گھر کی یاد کو سینے سے لگائے جس کرب سے دوچار تھے، وہ ایک تاریخی واقعہ ہے۔ وہ بے کس و مجبور تھے، تاب و طاقت نہ تھی کہ قیدِ تنہائی سے رہائی پاتے۔ ناچار یہ دعا کر کے ہی رہ جاتے کہ وطن کا دیدار نصیب ہو۔ اختر کے اس نوع کے اشعار حبِ وطن کے جذبات سے بدرجہ اتم مملو ہیں [104]۔ چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

یہ تمنا نہ رہے زیست میں اے بارِ خدا — پھر مجھے لکھنؤ دنیا میں دکھا دئے غربت

ہاں وطن دیکھوں تو شاداں ہو دلِ زار مرا — یہ بھی ممکن ہے کہ روتے کو ہنسائے غربت

وسعتِ خلا سے بڑھ کر کہیں ہے حبِ وطن — تنگیِ گور سے بدتر ہے قضائے غربت [105]

اسی بے بسی اور حزن وملال کی کیفیت میں وہ اپنی رہائی کی فریاد کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

قفس میں بند ہوں بے بال و پر ہوں دل دھڑکتا ہے　　　سبب ہے کون سا صیّاد اب میری رہائی کا[۱۰۶]

قید فرنگ کے دوران لکھی گئی ''حزنِ اختر'' کو اس عہد کا جیتا مرقع کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ یہ مثنوی محض ایک فردِ واحد کی روداد غم نہیں جسے بیرونی تاجروں نے تاج و تخت سے بے دخل کر کے پابہ زنجیر کر دیا تھا، بلکہ یہ پوری قوم کی درد بھری کہانی ہے۔ اس کے مطالعے سے ہماری تاریخ کا وہ باب سامنے آتا ہے جو اودھ کی قومی حکومت ختم کر کے برطانوی تسلط کا آغاز ہوا اور جس کے ڈانڈے محض ایک برس بعد زوالِ دہلی سے جا ملتے ہیں۔ بادی النظر میں ''حزنِ اختر'' ایک تاج دارِ اودھ کا ہی نہیں بلکہ پوری ملّت کا حزن بے کراں ہے[۱۰۷]۔ ملاحظہ کیجیے:

ہوا تک نہیں قید خانے میں آہ	ہوا بے گنہ قید میں بادشاہ
عجب ہے یہ نیرنگِ دنیائے دوں	زبوں ہی زبوں ہے زبوں ہی زبوں
فقط نامِ شاہی سے ہوں میں خراب	کہاں میں کہاں قید لیکن عذاب[۱۰۸]

اپنی حالت زار کا مکمل احوال بیان کرنے کے بعد واجد علی شاہ نہایت دردانگیز طور پر خدا سے اپنی رہائی کی بھیک مانگتے دکھائی دیتے ہیں۔ ملاحظہ کیجیے:

الٰہی مجھے قید سے دے نجات	نکلتی نہیں غم سے اب منہ سے بات
بس اب الحذر الحذر اے خدا	کر اس اخترِ زار کو تو رہا[۱۰۹]

لیکن واجد علی شاہ وطن سے دور اسی عالمِ غربت میں انتقال کر گئے اور پھر لکھنؤ دیکھنے کی تمنا ان کے دل میں ہی رہ گئی۔ سلطنتِ اودھ کو کمپنی سے ملحق کرنے کے لیے برطانوی کارندے جہاں ہزار حیلے بہانے کر رہے تھے، وہیں لکھنؤ کا ریذیڈنٹ سیلمین نے بادشاہ کو بدنام کرنے کے لیے اس پر طرح طرح کے عیب لگائے۔ اس نے دلہوزی کو خط لکھتے ہوئے واجد علی شاہ پر یوں الزام تراشیاں کیں کہ اس کے تساہل اور غفلت نے اس کی رعایا کی نظروں میں اسے ذلیل کر دیا اور وہ اس سے نفرت کرتی ہے[۱۱۰] لیکن جب یہی تساہل پسند بادشاہ معزول کر کے قید کر دیا گیا تو ساری خلقت خون کے آنسو رونے لگی۔ شعرا اس کی بربادی کا نوحہ لکھتے رہے، اس کی اجڑی ہوئی سلطنت کا ماتم کرتے رہے اور برطانوی استبداد پر تاسف کا اظہار کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ اس نوع کی اردو نظمیں جہاں ایک طرف اہلِ اودھ کے رنج و تعب کے اظہار کا ذریعہ بنتی ہیں وہیں برطانوی مورخین و اعمال کی الزام تراشیوں کی نفی بھی کرتی ہیں۔ یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ شاہِ اودھ پر انگریزوں کے عائد کردہ الزامات کا جواب اس پُرفتن دور میں اگر کسی سے بن پڑا تو وہ شعرا ہی تھے[۱۱۱]۔ کچھ شعرا نے تو ان عوامی احساسات کی کھل کر ترجمانی کی۔ آغا حجو اشرف نے ''افسانۂ لکھنؤ'' کے عنوان سے ایک طویل مثنوی لکھی جس میں واجد علی شاہ کی معزولی اور کلکتا آمد تک کے حالات قلم بند کیے گئے ہیں۔ اس کے ساتھ حضرت علیؓ سے ان کے اقتدار کی واپسی کی دعا مانگی گئی ہے۔ اس مثنوی سے بھی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ عوام نے معزول شاہ کو بادیدۂ پرنم رخصت کیا[۱۱۲]۔ ملاحظہ کیجیے:

ہوا شہر میں غل سواری چلی	گلستاں سے بادِ بہاری چلی
جو وا ماندہ تھے رنج ان کو رہے	ہزاروں کی آنکھوں سے آنسو بہے
مدد کیجیے لکھنؤ لٹ گیا	خبر لیجیے لکھنؤ لٹ گیا

عطا کیجیے ان کو پھر تخت و تاج ملے راج پھر ان کو راجیں یہ راج [۱۱۳]

ایک ہندو شاعر دیبی پرشاد فرقت نے دوسو چورانوے اشعار پر مشتمل ایک مثنوی لکھی [۱۱۴] جس میں شاہِ اودھ سے اپنی عقیدت کا اظہار کیا گیا ہے۔ اس زمانے کے حالات پر روشنی ڈالنے کے ساتھ، اقتصادی مسائل کا جائزہ بھی لیا گیا ہے۔ ساتھ ساتھ معزول بادشاہ کی لکھنؤ واپسی کی دعا بھی کی گئی ہے تاکہ لکھنؤ میں مسرت اور شادمانی کا وقت واپس لوٹ آئے۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ فرقت کو دربارِ اودھ سے کوئی ناتا نہیں تھا جس کا اقرار انھوں نے خود بھی کیا ہے [۱۱۴] لیکن پھر بھی وہ واجد علی شاہ کی ادب پروری سے متاثر ہو کر یہ کہتے ہیں کہ:

زمانے کو حضرت نے بخشے خطاب ہوا بزمِ شہ میں نہ میں باریاب
کہ تھا کچھ تعلق نہ سرکار سے نہ واقف تھے ہم شہ کے دربار سے
سبھوں کو تو ہے نوکری کا الم ہمیں ہے فقط شہ کے جانے کا غم
مگر عیش و عشرت میں بایک دگر خوشی سے تھی اوقات ہوتی بسر
سو وہ اس زمانے میں دشوار ہے خیال اپنی عزت کا ہر بار ہے
جدھر جاؤں بازار سنسان ہیں محل شہ کے دیکھوں تو ویران ہے
رعیت کی حالت بہت ہے تباہ شتابی سے آئے مرا بادشاہ
چمک پر جہاں کا ستارا رہے نہ گردش میں اختر ہمارا رہے [۱۱۵]

سادہ اور رواں انداز میں لکھی گئی اس مثنوی میں اس دور کے اودھ کا منظر نامہ پوری طرح واضح ہو جاتا ہے۔ خاص طور پر واجد علی شاہ کے زمانے کے حالات جس پر کڑی تنقید کی جاتی رہی ہے اور انگریزوں نے طرح طرح کے الزامات لگائے ہیں اور اس کے بعد کے حالات کا موازنہ کرتے ہوئے عوام کی زبوں حالی کا الم ناک نقشہ کھینچا گیا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ واجد علی شاہ کے کلکتے جانے کے بعد کی خبر بھی لکھنؤ والوں میں تسلسل کے ساتھ ملتی رہی ہے۔ مثلاً انھوں نے سلطنت کی بحالی کے ضمن میں جو سفیر لندن بھیجے یا ان کے عزمِ لندن سے لکھنؤ والے بھی واقف تھے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ ناسخ کے شاگرد شہید کا مندرجہ ذیل شعر اسی موقع پر کہا گیا ہوگا۔ ملاحظہ کیجیے:

لکھنؤ بے کس ہوا حضرت جو لندن کو گئے ہم یہاں نالاں ہیں وہ فریادِ دشمن کو گئے [۱۱۶]

لکھنؤ والے مدتوں حقائق سے نظریں چراتے رہے۔ وہاں کی مجلسوں، محفلوں، چائے خانوں اور افیون خانوں میں مدتوں واجد علی شاہ کی واپسی کے امکانات پر بحثیں ہوتی رہیں۔ غالباً لکھنؤ والوں کو مدتوں اپنے بادشاہ کی واپسی کا انتظار رہا [۱۱۷]۔ مذکورہ شاعر شہید ہی نے اس صورتِ حال پر بڑی حسرت سے کہا کہ:

فصلِ گل کب آئے گی، کب ہوں گے آ کر نغمہ زن ایک مدت ہوگئی مرغانِ گلشن کو گئے [۱۱۸]

مگر لکھنؤ کے گلشن میں وہ بہار پھر نہ آئی اور مرغانِ گلشن کے وہ نغمے پھر سنائی نہ دیے [۱۱۹]۔ اس موضوع پر نواب رضا خاں عاشق کی دو مثنویاں ''زوالِ لکھنؤ'' اور ''رشکِ ماہِ تمام'' [۱۲۰] بھی اہمیت کی حامل ہیں۔ ان مثنویوں میں بھی انتزاعِ سلطنت کے بعد پیدا ہونے والی صورتِ حال کو موضوع بنایا گیا ہے۔

صغیر لکھنوی واجد علی شاہ کے وفادار ساتھی اور مصاحب تھے۔ ایسے وفادار ساتھی جنھوں نے اپنی زندگی کے مستقبل کو معزول شاہِ اودھ کے ساتھ کر دیا۔ وہ واجد علی شاہ کے ساتھ کلکتے بھی گئے۔ اپنی طویل مثنوی میں واجد علی شاہ کے اس سفر کے حالات لکھے ہیں۔ ۱۳/ مارچ ۱۸۵۶ء کو جب واجد علی شاہ نے وادیِ غربت میں قدم رکھا تو لکھنؤ اور حرم والوں پر کیا بیتی، اس روداد کو صغیر نے کچھ اس طرح نظم کیا ہے[۱۲۱] ملاحظہ کیجیے:

یہ سرکش دمِ گریہ نالے ہوئے	کہ لبریز اشکوں کے تھالے ہوئے
درِ باغ تک آئے اہلِ حرم	بہاتے ہوئے چشم سے اشکِ غم
دعا شاہ کو کوئی دینے لگی	بلائیں کوئی بڑھ کے لینے لگی
کیے تھے کوئی سایہ قرآن کا	کہ اللہ حافظ رہے جان کا
چلے ہو دلِ عاشقاں توڑ کر	نہ جاؤں ہمیں نیم جاں چھوڑ کر
ذرا شاہ دیوڑھی سے باہر کو جائیں	کریں گے اکیلے مکاں سائیں سائیں
ہمیں اپنے سائے سے ہول آئیں گے	اکیلے مکانوں میں ٹکرائیں گے[۱۲۲]

صغیر کا یہ بیان محض تخیلی نہیں اور نہ ہی انھوں نے شاعرانہ مبالغے سے کام لیا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ برطانوی استبداد کے اس دور کے اخبارات اپنی رپورٹوں میں بھی لکھنؤ کی بربادی اور بے رونقی کا احوال سناتے نظر آتے ہیں۔ رئیس احمد جعفری نے اپنی تصنیف میں اخبار ''کوہِ نور'' لاہور کے ۲۵/ مارچ ۱۸۵۶ء کی ایک رپورٹ نقل کی ہے جس میں اخبار لکھتا ہے کہ:

> لکھنؤ میں بہ سبب مہاجرت بادشاہ کے بڑی بے رونقی ہوگئی ہے۔ جہاں بازار میں بادشاہی نقیب اور چوب دار اور اہالیانِ دربار نظر آتے تھے اب ان کے بجائے صاحبانِ انگریز نظر پڑتے ہیں۔ محل شاہی کہ جہاں تمام شہر سے زیادہ رونق رہتی تھی اور ہزارہا آدمی بہ شانِ وشوکت موجود ہوتے تھے اب خالی نظر آتے ہیں۔ دروازے ان کے بند ہیں۔ سنسان معلوم ہوتے ہیں[۱۲۳]۔

ظاہر ہے انتزاعِ سلطنت سے ہزاروں گھر ویران اور لاکھوں لوگ بے روزگار ہو گئے تھے، اردو شاعری کے حق میں یہ جگ بیتی آپ بیتی بھی تھی۔ آفتاب الدولہ قلق، مظفر علی اسیر، ذکی، درخشاں، نسیم، امیر اللہ تسلیم، ہنر، عطار اور بلال وغیرہ سمیت متعدد شعرا بے سہارا ہو گئے۔ فتح الدولہ برق، ایام ولی عہدی سے ہی واجد علی شاہ کے ہم صحبت و ہم جلیس تھے۔ انھوں نے اس جلاوطنی میں بھی بادشاہ کا ساتھ دیا۔ اور وہیں مٹیا برج میں جان، جانِ آفرین کیا[۱۲۴]۔

اسی دور میں خواجہ ارشد علی خاں معروف بہ خواجہ اسد اللہ تخلص قلق نے ایک طویل شہر آشوب واجد علی شاہ کے سفر لکھنؤ تا کلکتا کی بابت لکھی۔ مسدس کی ہیئت میں تحریر اس شہر آشوب کو مولانا حسرت موہانی نے اردوئے معلّٰی کے ۱۹۰۲ء کے شمارے میں کچھ اضافی نوٹ کے ساتھ شائع کیا۔ اس منفرد آشوب کے ۹۱ بند تھے جن میں سے کچھ بند مولانا نے شائع کرتے ہوئے حذف کر دیے۔ اس کی وضاحت کرتے ہوئے مولانا نے سولہویں بند کے بعد جو نوٹ لکھا[۱۲۵]، ملاحظہ کیجیے:

> اس موقع پر شاعر نہایت سخت الفاظ میں انگریز منتظم اور مالک ہوٹل کی شکایت کی ہے جس نے بہ وقت

رخصت کرائے کے لیے بادشاہ کی بگھی کو روکنے کا ارادہ کیا۔ ہم نے اس قصہ ناگوار کے متعلق چند بند
حذف کر دیے ہیں [۱۲۶]۔

قلق شاہ اودھ کے ساتھ کلکتے گئے تھے اور خود بھی ان کے ساتھ اسیر زنداں رہے۔ جیسا کہ خود اپنی مسدس میں کہتے ہیں کہ:

بے خطا سات مہینے تو گرفتار رہے   اپنے خالق سے رہائی کے طلب گار رہے [۱۲۷]

لکھنؤ لوٹ آنے کے بعد انھوں نے یہاں جو حالت دیکھی، اس کا ذکر کرتے ہوئے لکھا کہ سلطنت کے انتزاع کی وجہ سے خاص و عام بے چین ہیں۔ رعایا میں بد دلی، بے چینی اور بے اطمینانی پھیلی ہوئی ہے۔ کوچہ و بازار بے رونق اور شہر بے کس کے دل کی طرح سونا پڑا ہے۔ کوٹھیوں اور باغات میں خس و خاشاک کے ڈھیر ہیں۔ محلوں میں زاغ و زغن بولتے ہیں اور لوگ بادشاہ کی بحالی کے لیے درگاہوں میں منتیں مانتے پھر رہے ہیں [۱۲۸]۔ غم و الم کی اس فضا کو دکھاتے ہوئے شاعر کا کہنا تھا کہ:

چوک ویران گلی کوچے میں سناٹا ہے   شہر سارا دلِ بے کس کی طرح سونا ہے
تین حصے سے سوا شہر کھدا پایا تمام   جس طرح دیکھو نظر آتا ہے اک ہو کا مقام
برسا کرتا ہو شب و روز جہاں پر کنچن   ان محلات میں ہوں زاغ و زغن کے مسکن
جو نہ دیکھا تھا ان آنکھوں نے دکھایا ہم کو   نہ سنا تھا سو وہ کانوں نے سنایا ہم کو
منتیں مانی گئیں ہیں یہ ہوا خواہوں میں   چلّے باندھے ہیں پری زادوں نے درگاہوں میں
تو مرے شاہ کو سلطانِ اودھ پھر کر دے   درِ مقصود سے دامانِ تمنا بھر دے [۱۲۹]

مذکورہ مسدس قلق کے جذبات اور مشاہدات کا حسین مرقع ہے۔ اس نظم کی اہمیت اس لیے بھی زیادہ ہے کہ شاعر نے واجد علی شاہ کی بے بسی کے عالم میں لکھنؤ سے روانگی، سفر کی صعوبتوں، دشواریوں، قیدِ فرنگ کی مصیبت و پریشانی اور پھر اہلِ اودھ کی تباہی و بربادی کے جو دل دوز مناظر دکھائے ہیں، وہ حقیقت پر مبنی ہیں۔ یہ واجد علی شاہ کے دور کی ایسی نظم ہے جسے محض اردو ادب میں نہیں بلکہ جنوبی ایشیا کی تاریخ میں بھی اہم ماخذ تصور کیا جائے گا [۱۳۰]۔ نظم کی تمہید بھی بہت جان دار ہے۔ شاعر نے دل کے درد کو لکھنؤ کی صناعی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ کان پور سے گوپی گنج تک کے مصائب کو تفصیل کے ساتھ پیش کیا ہے۔ صغیر لکھنوی کی طرح قلق بھی مہاراجا بنارس کے حسن اخلاق سے بے حد متاثر دکھائی دیتے ہیں [۱۳۱]۔ ۱۹ بند کے بعد اگلے سات بند مہاراجا بنارس کی تعریف اور مہمان نوازی کی روداد ہیں۔ کچھ اشعار ملاحظہ کیجیے:

چند دن بعد بنارس میں تو پائی راحت   وہاں کے راجا نے بڑی ختم کی انسانیت
اپنے مالک کی ہر اک طرح ادا کی خدمت   شاہ کے آنے کی تھی دل میں جو اس کے حسرت
شادی و فرح سے پھولے نہ سماتا تھا وہ   اپنے جامے ہی سے باہر ہوا جاتا تھا وہ [۱۳۲]

کلکتا میں واجد علی شاہ نے جس طرح اپنے ابتدائی دن گزارے، اس کی مشکلات کا ذکر کرتے ہوئے شاعر کا کہنا تھا کہ:

شاہ کرتے تھے جہاں شکوۂ ایذائے سفر   جتنے ہم راہی تھے سب کرتے تھے افسوس آ کر
کچھ عجب چرخ ستم گار بھی ہے بد خصلت   طرفہ ڈالی ہے غریب الوطنی میں آفت [۱۳۳]

قلق کو اس بات کا قلق ہے کہ جس بادشاہ کے حکم سے ہر سال سیکڑوں خس خانے تیار ہوتے تھے، آج اس بادشاہ کو خس کی ٹٹی کے لیے حکام کی منت سماجت کرنی پڑ رہی ہے۔ تاریخ کا یہ کیسا جبر تھا کہ اس سانحے سے بادشاہ کو عرش سے فرش پر لا ڈالا تھا۔ جس بادشاہ کے غلاموں کے گھر میں بھی برف کے ڈھیر لگے رہتے تھے، آج اس بادشاہ کو محض آٹھ سیر برف کے لیے غیروں کا محتاج اور ممنون ہونا پڑ رہا ہے۔ ان تلخ حالات کے ذکر میں شاعر کا کہنا تھا کہ:

اور اس چرخِ ستم گار کی سنیے نیرنگ
شاہ غربت زدہ پر دیکھیے بے داد کے ڈھنگ

ہر برس سیکڑوں خس خانے ہوں جس کے تیار
ایک ٹٹی کا وہ حکام سے ہو شکر گزار

برف کا جس کے غلاموں کے ہو گھر گھر انبار
آٹھ سیر اس کو کرے برف عنایت سرکار

کیا کروں نقل میں اس ماہ کی بربادی کو
یوں اجڑتے نہیں دیکھا کسی آبادی کو[۱۳۴]

لکھنؤ کی تباہی و بربادی کا جو نقشہ قلق نے کھینچا ہے، اسے پڑھ کر اور ماضی کی روایات کا سوچ کر ہر دردمند دل اداس ہو جاتا ہے۔ شہر کی تباہی و بربادی کے مناظر دکھاتے ہوئے شاعر کا کہنا تھا کہ یہ تباہی دراصل بادشاہ کی گرفتاری کی وجہ سے ہوئی ہے۔ اس ضمن میں شاعر کے مطابق:

ایک اس گھر کے بگڑنے سے زمانہ بگڑا
لکھنؤ شہر اجڑنے سے زمانہ بگڑا

جو جو عشرت کدہ تھا آج وہ غم خانہ ہے
گنج لٹتے تھے جہاں اب وہیں ویرانہ ہے

شہر کو میرے نظر کھا گئی کس کی یارو
ہائے ہونسا تھا یہ کس اہلِ حسد نے اس کو

لکھنؤ آپ کا اب بے کس و بے والی ہے
چرخ نے آہ مصیبت یہ نئی ڈالی ہے[۱۳۵]

ان اشعار میں قلق اودھ کی حرماں نصیبی کی روداد ہی نہیں سناتے بلکہ حکومت برطانیہ کے مظالم کا پردہ چاک کرتے ہوئے بے جرم وخطا واجد علی شاہ کی معزولی پر صدائے احتجاج بھی بلند کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ ان کی شہر آشوب میں لطافت کے ساتھ ساتھ ایسی تلخی اور کڑواہٹ بھی ہے جسے حسین الفاظ چھپا نہیں سکے۔ انگریزی راج میں ان کی حکومت کے خلاف اس قدر کھل کر اظہار کرنا اس زمانے میں آسان کام نہیں تھا لیکن واجد علی شاہ کے سچے عاشق اور شیدا کی حیثیت سے قلق نے وفاداری کا پورا پورا حق ادا کر دیا[۱۳۶]۔ ان کا سفر آشوب واجد علی شاہ کے سفر کلکتا کی صعوبتوں کا بہترین مرقع ہے جسے ادبی تاریخ میں کبھی فراموش نہیں کیا جا سکے گا۔

سلطنت اودھ کو مولانا عبدالحلیم شرر نے بجا طور پر مشرقی تمدن کا آخری نمونہ قرار دیا ہے۔ اس تمدن کا اندازہ مولانا شرر کی مفصل کتب مضامین اور مقالات کے مطالعے سے لگایا جا سکتا ہے۔ ''فسانہ عجائب'' کے دیباچے، ''فسانہ عبرت'' کے بیانات اور ''فسانہ آزاد'' کی جو فضا ہے، وہ صحیح معنوں میں اودھ کی تہذیب و تمدن کا عکس ہے۔ چراغ بجھنے سے پہلے جس طرح ایک بار بھڑکتا ہے، واجد علی شاہ کے عہد میں بھی اربابِ کمال کا اجتماع اپنی بھرپور توانائی کے ساتھ دکھائی دیتا ہے۔ دوسری طرف اس تمدن کے مظاہر عوام کی زندگی میں بھی نظر آتی ہے۔ محض قیصر باغ ہی نہیں بلکہ لکھنؤ کے گلی کوچوں میں بھی ان مظاہر کو تلاش کیا جا سکتا ہے لیکن ضبطی سلطنت کے بعد ایک تہذیب کے خاتمے کا جو سلسلہ شروع ہوا اس نے پورے معاشرتی ڈھانچے کو ہلا کر رکھ دیا۔ ہر طرف بے کاری کا دور دورہ دکھائی دینے لگا۔ اخبار ''کوہِ نور'' کے مطابق ضبطی اودھ سے تقریباً سات آٹھ لاکھ لوگ بے روزگار ہوئے[۱۳۷]۔ علی حسن اشک نے گلشن کے اجڑنے کی روداد بیان

کرتے ہوئے کہا کہ:

کیا وطن میں جی لگے دیوان گانِ عشق کا　　عیش باغ اجڑا پڑا ہے خشک موتی جھیل ہے [۱۳۸]

انتزاع کے بعد لکھنؤ کی اقتصادی حالت بد سے بدتر ہوتی گئی۔ سحر لکھنوی ے مندرجہ ذیل اشعار کے ذریعے اس زمانے کی ابتر معاشی صورتِ حال کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

گردشِ چرخ سے ابتر ہے زمانے کا حال　　ذرہِ خاک ہیں پستی میں نجومِ اقبال
ہے عطارد کی طرح اہلِ قلم چکر میں　　صورتِ بدر ہیں گردش میں تمام اہلِ کمال
نیستی پھیلی ہے اس شہر میں کنگلوں کی طرح　　لوگ واقف نہیں دینے سے بجز حرفِ سوال
دینے والا نہیں ملتا ہے کوئی زندوں میں　　جمع ہیں قبر پر حاتم کے ہزاروں کنگال
مدتوں سے نہیں دیکھی ہے روپے کی صورت　　لوگ سب بھول گئے سبز تھی رنگت یا لال [۱۳۹]

لکھنؤ سے سحر کی محبت دیگر تمام شعرا سے بڑھی ہوئی تھی اسی لیے ان کے بعض اشعار میں اس شہر کے اجڑنے پر افسردگی نمایاں ہے۔ یہ اشعار بہت سے طوفان اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہیں۔ تہذیب وتمدن کے مٹنے اور اہلِ حرفہ کے بے حال ہونے کا غم دوستوں اور با کمال لوگوں کی صحبتیں اور ہنرمندوں کی بے قدری کی بابت ان کے یہ اشعار دیکھیے:

عجیب مجمع اہلِ کمال تھا افسوس　　ہزار حیف وہ صحبت فلک نہ دیکھ سکا
نہ چوتھی کا کہیں جلسہ نہ تیجے کی صحبت　　جہاں میں شادی وغم دونوں کا مزہ نہ رہا
نہ پانچوں وقت کی نوبت نہ وردیاں نہ گجر　　نہ توپ چلتی ہے اب ہے غضب کا سناٹا
جہاں میں صاحبِ جوہر کی ہے یہ بے قدری　　ٹکے ٹکے میں بکیں اصفہانیاں کیا کیا [۱۴۰]

یہ ہے وہ پس منظر جس کے بعد یہ سمجھنا مشکل نہیں رہتا کہ اودھ کی عوام واجد علی شاہ کے جانے کے بعد بھی کیوں ان کے دور کو اپنی یادوں سے نہ نکال سکے۔ کتنے ہی لوگ ان کی واپسی کی توقع کے سہارے اپنے آپ کو دھوکے میں رکھے ہوئے تھے۔ اس طرح ان کے حال کی تلخیاں کسی حد تک کم ہو جاتی تھیں۔ کبھی کبھی خود فریبی کے بغیر ایسے مشکل حالات کا مقابلہ ممکن نہیں رہتا۔ لکھنؤ کے ادیب، فن کار جب شاہی محلات کو دیکھتے تو لامحالہ انھیں دربار سے وابستگی کے اچھے دن یاد آتے جو بات شعر کے سانچے میں ڈھل کر ان کے جذبات کے اظہار کا ذریعہ بنتے [۱۴۱] لیکن افسوس واجد علی شاہ کی دوبارہ لکھنؤ دیکھنے کی خواہش جب خود انھیں بھی سراب معلوم ہونے لگی تو وہ یہ کہنے پر مجبور ہوئے کہ:

وہ وطن یاد ہے غربت میں وہ سارے احباب　　ہائے کب مجھ سے ملیں گے میرے پیارے احباب [۱۴۲]

اودھ کے ولی عہد حامد علی مرزا کوکب نے بھی نہ جانے اپنی بادشاہت کے کتنے خواب دیکھے ہوں گے لیکن جب وہ انجمن ہی اجڑ گئی تو آوارہ وطن ہونے کے احساس نے انھیں بھی افسردہ کیے رکھا۔ اس صورتِ حال پر ان کا یہ شعر خود ان کے حال کا عکس معلوم ہوتا ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

نشان بھی اب نہیں چمن کا　　نہ ذکر باقی ہے انجمن کا [۱۴۳]

برق لکھنوی کے بھتیجے صولت کے کلام کو علامہ نظم طباطبائی نے مرتب کیا تھا۔ صولت کے ہاں بھی لکھنؤ واپسی کا خواب الفاظ کے پیکر میں ڈھل کر ان کے غم والم کو ظاہر کرتا ہے۔ وہ پردیس میں لکھنؤ کو اختر نگر ہی کہتے تھے اور اختر کے بغیر اختر نگر لوٹنا انھیں بے معنی لگتا تھا۔

وطن میں کس کو دکھائیں صورت — یہ دل میں مانی ہے ہم نے منت
بغیر شاہِ اودھ کے صولت کبھی نہ اختر نگر کو چلیے [۱۴۴]

میر انیس مداح اہلِ بیت تھے۔ شاہِ اودھ اور نوابینِ اودھ کی کفش برداری کو اپنے لیے باعث فخر سمجھتے تھے لیکن جب سلطنت ہی نہ رہی تو ظاہر سی بات ہے کہ مجلس ہائے عزا بھی درہم برہم ہوگئی۔ ان کے دل سے بے ساختہ اس اجڑی سلطنت کی بحالی کے لیے دعا نکلی کہ:

کیوں کر دلِ غم زدہ نہ فریاد کرے — جب ملک کو یوں غنیم برباد کرے
مانگو یہ دعا کہ اب خداوندِ کریم — اجڑی ہوئی سلطنت کو آباد کرے [۱۴۵]

میر انیس نے مغموم اور مضمحل ہو کر ملک کی بربادی پر جو فریاد کی تھی وہ اس وقت تو قبول نہ ہوئی لیکن بعد میں آنے والے شعرا کے لیے تازیانے کا کام کر گئی۔ امیر مینائی بھی واجد علی شاہ کے دربار سے چار سال وابستہ رہے لیکن واجد علی شاہ کے بغیر لکھنؤ امیر مینائی کے نزدیک ایک شہر نہیں بلکہ محض لفظِ بے معنی تھا۔ اسی لیے انھوں نے کہا کہ:

ہے لکھنؤ کی جان تو کلکتا میں امیر — خاک آئے میری آنکھ کو اب لکھنؤ پسند [۱۴۶]

منیر شکوہ آبادی نے زندگی کے کتنے ہی ماہ و سال فرخ آباد، باندہ اور الہ آباد وغیرہ میں گزارے لیکن قیصر باغ کی یاد ہمیشہ انھیں ستاتی رہی۔ ۱۸۵۶ء میں انتزاعِ سلطنت اودھ کے بعد منیر کے ہاں بیگمات اور شہزادیوں کی خانہ خرابی اور شاہانِ سلیمان منزلت کی بربادی کا تذکرہ انتزاعِ اودھ سے متعلق ہی معلوم ہوتا ہے [۱۴۷]۔ ملاحظہ کیجیے:

ہوگئے برباد شاہانِ سلیماں منزلت — اب بلائیں ہوں تو کیا دنیا میں پریاں ہوں تو کیا
بیگمیں، شہزادیاں پھرنے لگیں خانہ خراب — اب چڑیلیں صاحبانِ قصر ایواں ہوں تو کیا
بجھ گئیں شمعیں، جلیں پروانے تو کیا فائدہ — اڑ گئے پروانے، شمعیں نور افشاں ہوں تو کیا [۱۴۸]

وحید الہ آبادی کا قطعہ شہر آشوب بھی اس حوالے سے اہمیت کا حامل ہے۔ سلطنت کی بربادی اور چمن کے اجڑنے کا نوحہ پیش کرتے ہوئے شاعر کہتے ہیں کہ:

لالہِ خوش رنگ تھا جانِ چمن کیا ہوگیا — جلوہِ شمع شبستانِ چمن کیا ہو گیا
اپنے موقعے پر نظر آتا نہیں کوئی نہال — انتظامِ نخل بندانِ چمن کیا ہو گیا
جس کو دیکھو بے اجازت اب وہ رکھتا ہے قدم — انتظامِ اہلِ کارانِ چمن کیا ہو گیا
کیا ہوئی وہ باغ باں کی عقل جو سابق میں تھی — اب وہ افلاطونِ یونانِ چمن کیا ہو گیا
کس لیے وہ روشنی چشمِ عنادل میں نہیں — سرمہِ گردِ صفاہاں چمن کیا ہو گیا
غنچہ و گل یار و ساقی شیشہ و جامِ شراب — اے وحید اپنا وہ سامانِ چمن کیا ہو گیا [۱۴۹]

لکھنؤ کے متعدد شعرا نے اپنی بزم کے اجڑنے کے ماتم کو شاعری کے قالب میں ڈھالا۔اس ماتم میں تہذیبی پہلو بہت نمایاں ہے لیکن ساتھ ساتھ خارجی تبدیلیوں اور تباہیوں کا بھی ذکر جا بہ جا موجود ہے۔ بعض شعرا نے بڑی وضاحت کے ساتھ موثر انداز سے ان واقعات اور تاثرات کو نظم کیا اور بعض نے غزل کی ایمائیت اور اشاریت کے ساتھ موسمِ گل، آشیاں، صیاد، آسماں، چمن، بلبل وغیرہ جیسی علامتیں استعمال کر کے شاعری میں احتجاجی رویہ اختیار کیا۔ظاہر سی بات ہے جس انگریز کو بہ طور ''صیاد'' پیش کیا گیا، وہ ایک صدی گزرنے کے بعد ہندوستان سے بے نشان ہو گیا۔جیسا کی رند نے بڑے جوش اور شدت سے جو دعا مانگی کہ:

خدا کرے یوں ہو جائے بے نشاں صیاد[150]

وہ پوری ہو گئی ہو۔صرف لکھنؤ کے ادبا اور شعرا نے ہی اس غم گساری کا اظہار نہیں کیا بلکہ دور دراز بیٹھے شعرا نے بھی اس سانحے کی شدت کو محسوس کیا۔ غالب کے ہاں ۱۸۵۶ء کے بہت بعد تک ''انتزاعِ سلطنت اودھ'' کا ذکر نظر آتا ہے۔میاں داد خان سیاح کے نام ۳ جون ۱۸۶۰ء کو جو خط انھوں نے لکھا، اس میں کہتے ہیں کہ:

> لکھنؤ! کیا کہنا ہے۔ وہ ہندوستان کا بغداد تھا۔ اللہ اللہ وہ سرکار امیر گر تھی۔ جو بے سروپا وہاں پہنچا امیر بن گیا۔اس باغ کی یہ فصلِ خزاں ہے[151]۔

جنگ آزادی ۱۸۵۷ء: مغل سلطنت کا خاتمہ، بہادر شاہ ظفر کا واقعہ اسیری

مذکورہ صفحات میں سلطنت اودھ کے زوال اور بادشاہ کی معزولی کے حوالے سے مختصر جائزہ پیش کیا گیا اس سے ہم نے دیکھا کہ مروجہ اصنافِ سخن کے محدود دائرے میں رہ کر شعرائے اردو نے اس دور اور معاشرے کی کتنی صحیح منظر کشی کی ہے۔ یہ درست ہے کہ بدلے ہوئے سیاسی حالات کو بہتر بنانے کی سکت ان میں نہیں تھی، اس لیے وہ ان پر کڑھتے اور آنسو بہاتے رہے۔اس طرح ان شعرا نے اپنا اور اپنی بگڑی ہوئی تہذیبی حالت کا مرثیہ لکھا[152]۔لیکن اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہی ملکی و ملّی نوحے آنے والے دور کے شعرا کے لیے ایسے مینارۂ نور ثابت ہوئے۔اب ان منظومات سے پھوٹنے والی روشنی نے نئے آنے والوں نے اپنے لیے الگ الگ راہ تلاش کی جس پر چل کر ان شعرا نے اپنے فکر و فن کو انقلاب کا مظہر بنایا[153]۔

اب لوگوں نے بہ قول غالب ''اس باغ فصل خزاں'' کے جلوس میں امیدِ بہاراں کو اپنے قلب و نظر میں فروغ دے کر ہنگامہِ دار و گیر کو دعوت دی۔انتزاعِ سلطنت اودھ جس طرح ہمارے شعرا کے لیے ایک تحریک کا درجہ رکھتا ہے سلطنت اودھ کی ضبطی انگریزوں کو غاصبانہ کارروائیوں کے طویل سلسلے کی ایک کڑی تھی۔ اتفاقاً اگلے سال دو سال کے مختصر عرصے میں چند ایسے واقعات رونما ہوئے کہ انگریزوں کے خلاف نفرت میں شدت آئی جو بعد میں انقلاب ۱۸۵۷ء کا موجب بنی۔اس انقلاب کو پہلی جنگ آزادی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔گو کہ اس بابت تمام مورخوں کو اتفاق نہیں۔اس میں کوئی شک نہیں کہ سن ستاون کے واقعات کے پس پشت کوئی منظّم تحریک نہیں تھی۔اس کے آغاز کو میرٹھ کے سپاہیوں کی شورش سے جوڑا جاتا ہے لیکن اس لڑائی کے پیچھے کوئی قومی تحریک نہیں تھی۔لہٰذا یہ تحریک ملک گیر تحریک بھی نہ بن سکی۔ بے شک یہ شورش ناکام رہی لیکن اس کے باوجود سن ستاون کے واقعات بہت اہم تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتے ہیں۔ان واقعات کو آج کے معیارات کی روشنی میں نہیں دیکھنا چاہیے۔اتنا ضرور ثابت ہے کہ اس زمانے میں انگریزوں کے خلاف نفرت بہت نمایاں تھی اور اس کا اظہار بھی اسی شدت کے ساتھ ہوا۔انگریزوں کے خلاف ہندوؤں اور مسلمانوں کا یہ پہلا متحدہ محاذ تھا۔ یہ

شورش کام یاب تو نہ ہوئی لیکن اس سے انگریزوں کی برتری کا طلسم ضرور ٹوٹ گیا۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ ہوا کہ آگے چل کر قومیت اور سیاسی شعور کو ابھارنے میں بھی ان تحریکوں نے اپنا کردار خوب نبھایا۔ چناں چہ اس سلسلے میں یہ مطالعہ کہ اردو شاعری نے ۱۸۵۷ء کے واقعات کو پیش کرنے میں کیا کردار ادا کیا، خارج از دل چسپی نہیں ہوگا۔

۱۸۵۷ء کے محاربۂ عظیم میں متحارب تین اقوام تھیں، انگریز، ہندو اور مسلمان۔ مئی تا ستمبر محض پانچ ماہ جاری رہنے والی اس دور رس نتائج کی حامل جنگ کے پلڑے اوپر نیچے ہوتے رہے۔ بالآخر مغلیہ سلطنت کا خاتمہ ہوگیا اور برصغیر ایسٹ انڈیا کمپنی کے استعمارانہ اور توسیع پسندانہ چنگل سے نکل کر براہِ راست مکمل طور پر برطانوی شہنشاہیت کے زیرِ نگیں آ گیا۔ بلاشبہ انگریزی افواج نے میدان مارلیا اور ہر جگہ اپنی فتح مندی اور کامرانیوں کے پھریرے لہرائے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی انھوں نے ایک اور محاذ کا آغاز کر دیا جس میں آلات، حرب کے بہ جائے قلم کا سہارا لیا گیا اور اس جنگ کے اسباب وعلل، لرزاخیز حالات وواقعات اور عبرت انگیز نتائج پر اپنے نقطہ نظر کی تشہیر کے لیے خامہ فرسائی شروع کر دی۔ تصویر کے ایک ہی رخ کو تسلسل سے مختلف پیرایوں میں بیان کیا گیا۔ بہ الفاظ دیگر ایک ہی ''مضمون'' کو سو رنگ سے باندھا گیا۔ اصل جنگ تو چند مہینوں کی قلیل مدت میں اپنے منطقی انجام کو پہنچ گئی لیکن یہ قلمی جنگ گذشتہ ڈیڑھ صدی سے جاری ہے اور اس میں متحارب گروہوں کی تعداد بھی تین سے دو رہ گئی یعنی مسلمان اور غیر مسلمان۔ بہ ظاہر اس جنگ میں مسلمان ہی پسپا ہوئے، ہندو مقتدر فریق سے جا ملے اور پھر اشتراکِ عمل سے ۱۸۵۷ء کی داستانِ خوں چکاں کو بیان کرنے میں جانب دارانہ اور کسی حد تک متعصّبانہ اندازِ نظر کا ثبوت دیا، وہ روزِ روشن کی طرح عیاں ہے اور اس حقیقت کا مظہر ہے کہ دروغ گوئی میں اعتماد، تواتر اور مبالغہ آرائی کو مہارت سے استعمال کیا جائے وہ وہی سچ دکھائی دیتا ہے۔ ۱۸۵۷ء کے شدید متاثرین میں صرف مسلمان ہی تھے بعد میں اس عضوِ ضعیف کو انگریزوں نے ہر طرح کے ظلم وتشدد کا نشانہ بنایا۔ مسلمانوں کو صدیوں اقتدارِ اعلیٰ کے چھن جانے کا جاں گسل غم واندوہ تو لاحق تھا ہی اس پر سے نئے سفید فام حاکموں کے منتقمانہ حربوں نے ان کے ناک میں دم کر رکھا تھا۔ وہ قید وبند کی جان لیوا صعوبتوں کو برداشت کرتے رہے، دار ورسن پر لٹائے گئے اور انڈیمان جیسے دور افتادہ جزیروں کے آفت زدہ ماحول کی نظر کیے گئے۔ ظلم وستم کا کون سا حربہ تھا، جو ان پر استعمال نہیں ہوا[۱۵۴]۔ تاریخ کی متعدد کتابوں میں اس داستان پر اس قدر رنگ آمیزی اور ملمع سازی کی گئی کہ اصل حقائق تک پہنچنا دشوار ہوگیا۔ اس دوران اٹھنے والی مسلمانوں کی نحیف آواز پروپیگنڈے کے اس طوفان میں نقار خانے میں طوطی کی آواز ثابت ہوئی۔ بعد میں اس حوالے سے متعدد اردو اور انگریزی کتب سامنے آئیں جن میں اس تاریخی سانحے کے متنوع پہلوؤں کو سچائی کے ساتھ اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی۔ مختلف رسائل کے خاص نمبر شائع ہوئے ہفت روزہ ''لیل ونہار''، لاہور بابت ۱۲ مئی ۱۹۵۷ء، جنگ آزادی نمبر، روزنامہ ''امروز'' ۱۲ مئی ۱۹۵۷ء، جنگ آزادی نمبر، صحیفہ، لاہور، بابت جنوری تا جون ۲۰۰۷ء، جنگ آزادی ۱۸۵۷ء نمبر، نیا دور، لکھنؤ، اپریل مئی ۲۰۰۷ء، انقلاب ۱۸۵۷ء نمبر، آج کل، دہلی بابت جولائی ۱۹۵۷ء، جنگ آزادی نمبر کے علاوہ متعدد سلسلہ کتب میں ۱۸۵۷ء کے سانحہ عظیم سے متعلق روزنامچے، معاصر تحریریں، یادداشتیں، علمی اور ادبی مضامین اور مقالات کو یک جا کرنے کا سلسلہ شروع ہوا۔ اس ضمن میں اکرم چغتائی کی مرتبہ متعدد کتابی سلسلے، ''۱۸۵۷ء: مجموعہ خواجہ حسن نظامی''، ''۱۸۵۷ء: روزنامچے، معاصر تحریریں، یاد داشتیں''، ''۱۸۵۷ء: تاریخی، علمی اور ادبی پہلو'' وغیرہ مشفق خواجہ کی مرتبہ ۱۸۸۲ء کی اہم تصنیف ''فرمان سلیمانی اور یادِ ایام'' وغیرہ کافی اہمیت کے حامل ہیں۔ یہ سلسلہ ظاہر سی بات ہے غالب کی مختصر تصنیف ''دستنبو'' اور ان کے مکاتیب سے شروع ہو کر مولانا فضل حق خیر

آبادی کی ''الشورۃ الہندیہ'' کے اردو تراجم سے ہوتا ہوا آج بہت بڑے خزانے کی صورت اختیار کر چکا ہے۔ انگریز مورخین نے کثیر تعداد میں انقلاب ۱۸۵۷ء پر کتابیں لکھیں اور ہماری جنگ آزادی کو ''غدر'' اور ''بغاوت'' کا نام دیا۔ ان لوگوں نے یہ باور کرایا کہ کچھ باغی اور چند مفسدوں نے یہ ہنگامہ مچایا اور انگریز سرکار کے خلاف غداری کر کے بدامنی پھیلائی۔ سو سال تک یہ گمراہ کن پروپیگنڈا جاری رہا یہاں تک کہ اسکولوں اور کالجوں کے طلبہ بھی اس کو ''غدر'' اور ''بغاوت'' ہی سمجھتے رہے۔ حالاں کہ یہ عوامی تحریک تھی۔ شاہ ولی نے جو تحریک شروع کی تھی شاہ عبدالعزیز نے اسے پروان چڑھایا۔ سید احمد شہید اور شاہ اسماعیل شہید نے اپنی جانوں کا نذرانہ دے کر اسے ہمہ گیر تحریک بنایا۔ مسلمانوں کی اس جنگ کو منظم کرنے میں مولوی احمد اللہ شاہ، مولوی سرفراز علی، مولوی لیاقت علی، جنرل بخت خان، عظیم اللہ خان اور ڈاکٹر وزیر خان وغیرہ وہ زعما ہیں جن کو کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ مولوی احمد اللہ شاہ نے اس مقصد کے لیے یورپ کا سفر کیا تاکہ انگریزوں کے حالات و معاملات سے واقف ہو سکیں۔ ملک گیر دورہ کر کے لوگوں کو مرید بنا کر مجالس اور قوالی کی محافل میں جہاد کی تبلیغ کی۔ جنرل بخت خاں نے دہلی اور اودھ وغیرہ میں بڑے کارہائے نمایاں انجام دیے۔ مسلمانوں نے یہ جنگ جہاد سمجھ کر لڑی۔ جنگ آزادی کا علم ''محمدی جھنڈا'' کہلاتا تھا۔ سپاہیوں کا نعرہ ''دین دین'' تھا۔ مسلمانوں کو اس جنگ کی بھاری قیمت ادا کرنی پڑی۔ مسلمان زعما میں نواب عبدالرحمٰن خاں والیِ جھجر، نواب مظفر الدولہ، نواب میر خاں جاگیردار پلول، احمد مرزا، میر محمد حسین، حکیم عبدالحق دہلوی، قاضی فیض اللہ سررشتہ دار، میر پنجہ کش، امام بخش صہبائی، خلیفہ محمد اسماعیل، خلف شیخ محمد، ابراہیم ذوق اور میاں حسن عسکری جیسے صوفی بزرگ یا تو گولیوں سے اڑا دیے گئے یا پھانسی پر چڑھا دیے گئے۔ مولانا فضل حق خیرآبادی، مفتی مظہر کریم دریا آبادی، مولوی لیاقت علی الہ آبادی، مولوی ایوب کیفی مرادآبادی، شیخ فصاحت اللہ بدایونی، شیخ بولن سیوہاروی، مولوی سید احمد بریلوی، مفتی عنایت اللہ کاکوروی وغیرہ کو حبس دوامِ بعبور دریائے شور کی سزا ہوئی۔ نواب خاں بہادر خاں بریلی، مولانا کفایت اللہ کافی، مولوی وہاج الدین منو مرادآبادی، مولوی رضی اللہ بدایوں، نواب مجد عرف مجو خاں، نواب جلال الدین خاں، نواب سعد اللہ خاں وغیرہ بھی پھانسی پر لٹکائے گئے یا گولی سے اڑا دیے گئے۔ جنرل بخت خاں، عظیم اللہ خاں، مولوی فیض احمد بدایونی، ڈاکٹر وزیر خاں، مولوی سرفراز علی وغیرہ جیسے قائدین کا پتا ہی نہیں چلا کہ ان کے ساتھ کیا سلوک کیا گیا۔ شہزادہ فیروز شاہ، مولوی رحمت اللہ کیرانوی، حاجی امداد اللہ تھانوی، نواب تفضّل حسین خاں، شاہ عبدالعزیز خاں مجددی اور شاہ سعید وغیرہ وطن چھوڑ کر حجاز چلے گئے۔ اس کے علاوہ ساری مسلمان قوم کو بڑی قربانیوں سے پڑا۔ انگریزوں نے دل کھول کر مسلمانوں پر مظالم کے پہاڑ توڑے۔ تقریباً ستائیس ہزار اہلِ اسلام کو پھانسی پر لٹکایا گیا۔ سات روز تک مسلسل قتلِ عام جاری رہا۔ بچوں تک کو مارا گیا۔ ''قیصر التواریخ'' کے مطابق آٹھ ہزار مجاہدین مار دیے گئے[۱۵۵]۔ حیرت تو یہ ہے کہ اس قدر بدترین حالات کے باوجود پنڈت کنہیا لال نے مسلمانوں کے خلاف زہر اگلتے ہوئے یہ کیوں کر لکھا کہ ملک بھر میں انگریز عورتوں اور بچوں کے قتل جیسے بہیمانہ واقعات ہوئے۔ خود کو وفادار بتانے والوں نے پیشہ سپہ گری کو داغ لگایا اور انگریز سرکار کے باعث اپنی جان و مال کا تحفظ پانے والے ہندوستانی روٴسا نے بھی فسادیوں کا ساتھ دیا۔ ہندوستانی رجمنٹوں ۱۹ اور ۳۴ میں اس فساد کا بیج بویا گیا تھا جو بعد میں دوسری رجمنٹ کی سرکشی کی ترغیب تک پہنچا تو حکام کو ان کے خلاف ایکشن لینا پڑا[۱۵۶]۔ اس کے علاوہ مولوی ذکا اللہ نے ''سلطنت تاریخ انگلیشائے ہند'' کے جلد پنجم میں بہت تفصیل سے ۱۸۵۷ء کے الم ناک سانحات کو پیش کیا ہے لیکن اس تصنیف میں بھی مصنف کا معذرت خواہانہ رویہ ان کی جانب دارانہ سوچ کو پوری طرح ظاہر کرتا ہے۔ شاہ سے زیادہ شاہ کے وفادار بننے کی کوشش میں انھوں نے

ایسی ایسی مبالغہ آرائی کی ہے کہ پڑھ کر ہنسی آتی ہے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد انگریزوں کی طرف سے اٹھائے جانے والے مظالم کو درست ثابت کرنے کے لیے انھوں نے طرح طرح کی تاویلات پیش کیں اور متعدد جگہوں پر انگریزوں کے نقصانات کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا [۱۵۷]۔ سلطنت دہلی کی بدانتظامی اور تباہی کا نقشہ کھینچتے ہوئے انھوں نے لکھا کہ:

> جس وقت انگریزی عمل داری شہر سے کافور ہوئی تو چوبیس گھنٹے کے اندر شہر میں کوئی گناہ اور پاپ ایسا نہ تھا کہ جو انسان کر سکتا تھا، وہ نہ ہوا ہو۔ قتل لوٹ مار کا بازار گرم رہا.. تلنگے کئی سبب لوگوں کو قتل کرتے تھے۔ اوّل جن کو وہ کرسٹان جانتے تھے ... دوسرا سبب لوگوں کے قتل کرنے اور ان کے گھر لوٹنے کا یہ تھا کہ تلنگوں کو شہر کے آدمی یہ بتلا دیتے تھے کہ اس گھر میں انگریز عورت، مرد، بچہ چھپا ہوا ہے ... تیسرا سبب لوگوں کے قتل کرنے اور لوٹنے کا یہ ہوتا کہ ان کو شبہ ہوتا تھا کہ وہ انگریزوں کے ساتھ سازش رکھتے ہیں۔ ان کو چٹھیاں وخبریں بھیجتے ہیں [۱۵۸]۔

اس کے مقابلے میں سرسید نے اپنی مشہور تصنیف ''اسبابِ بغاوتِ ہند'' میں اس صورتِ حال کی بابت لکھا کہ مفلسی اور قلت روزگار خصوصاً مسلمانوں کو ملازمت سے دور رکھے جانے والی پالیسی کے ساتھ ساتھ ضبطی اراضی، مشنری اسکولوں میں عیسائیت کے فروغ، تعلق داروں کی شکست، اسٹامپ کا اجرا، حکام کی سخت مزاجی بالخصوص پنجاب کی فتح کے بعد فوج کا مغرور ہو جانا وغیرہ جیسے عوامل کے بعد حالات پیدا ہو گئے کہ سورش کی راہ ہم وار ہوتی چلی گئی اور ان حالات میں حکومت کے مخالف محض ڈیڑھ آنے یومیہ یا سیر بھر اناج کے عوض باغیوں کی نوکری اختیار کرنے پر مجبور ہو گئے [۱۵۹]۔ ۱۸۵۷ء کی سرکشی سے قبل مدت دراز سے بہت سی باتیں لوگوں کے دلوں میں جمع ہوتی رہیں۔ ہندوستان میں جہاں بھوک، افلاس، بیماری اور موت کا بازار گرم تھا۔ ردِعمل میں جو کچھ ہوا اس کے بعد سزا بھی مسلمانوں کو ہی بھگتنا پڑی۔ اس دور میں دار و گیر کا یہ عالم تھا کہ جس کسی پر ذرا سی سازش کا مخبری کا شبہ ہوتا یا کسی طرح سے یہ محسوس ہوتا کہ انگریز سے اس کی وفاداری مشکوک ہے تو بغیر فردِ جرم عائد کیے، بغیر صفائی کا موقع دیے، ملزم کو برطانوی انصاف کی قربان گاہ کے بھینٹ چڑھا دیا جاتا [۱۶۰]۔ انگریزوں کے بغاوت کی سرکوبی اس قدر شدت سے کی کہ سالہا سال تک ملک میں خوف و دہشت کی فضا موجود رہی۔ ہزاروں کو بغیر کسی عدالتی کارروائی کے پھانسی پر چڑھا دیا گیا۔ شمالی ہند میں کم ہی کوئی ایسا حصہ ہو گا جہاں ٹُخنوں پر لٹکتی ہوئی نعشیں دلوں میں حکومت کے خلاف جذبہِ انتقام تازہ نہ کر دیتی ہوں [۱۶۱]۔ ایڈورڈ تھامس نے انگریز سرکار کے متعصّبانہ رویے کی بابت لکھا کہ اس جنگ میں ہندوستان کے تقریباً تمام ہی فرقے یا مذہب کے باشندوں نے حصہ لیا لیکن عتاب مسلمانوں کو زیادہ جھیلنا پڑا۔ مسلمانوں کے جسم پر سور کی چربی مل کر پھانسی دی گئی۔ انھیں زندہ جلایا گیا۔ ہندوستانیوں کو مجبور کیا گیا کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ بدفعلی کریں [۱۶۲]۔ کمپنی کی ظالمانہ حکومت کا انداز اس قسم کا تھا کہ ہر ایک فرنگی کو عام انسانوں سے بلندتر مخلوق سمجھتا۔ اس بابت وزیرِاعظم انگلستان مسٹر ڈزرائیلی کا ۲۷ جولائی ۱۸۵۷ء کا یہ بیان کافی اہمیت کا حامل ہے جس میں انھوں نے کہا تھا کہ مجھے یہ کہنے میں ذرا بھی تامل نہیں کہ باغیوں نے محض فوجی تکلیفات کی بنا پر بغاوت کی بلکہ در پردہ وہ ملک کی عام سیاسی بے چینی کی حمایت میں اٹھے تھے۔ سور کی چربی سے بنے کارتوس کی بابت مسٹر اینن کا یہ بیان کہ کارتوس کے معائنے کے بعد مجھے سپاہیوں کے اعتراضات پر کوئی حیرت نہیں ہوئی۔ میری رائے میں ان کارتوسوں کے استعمال سے سپاہیوں کے مذہبی جذبات کو ناقابلِ یقین طریقے سے ٹھکرا دیا گیا ہے۔ میرٹھ میں سوار فوجی پلٹن نمبر ۳ کے پچاس سواروں نے ۹ مئی

۱۸۵۷ء کو ان کارتوسوں کے استعمال سے انکار کیا تو اسی روز عدالت نے ان میں سے ہر ایک کو دس سال قید با مشقت کی سزا سنا دی۔ خود انگریز مورخوں نے کمپنی کے اس اقدام کو تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔ ان کے مطابق سپاہیوں کو بدکار مجرم قرار دیتے ہوئے ان کی وردیاں پھاڑ دی گئیں۔ ان سے فوجی نشانات چھین لیے گئے۔ ہتھکڑیاں اور بیڑیاں پہنا کر ان کی بےعزتی کی گئی۔ یہ نظارہ نہایت دردناک اور ذلت آمیز تھا۔ اس وقت میدان میں ایک سپاہی بھی ایسا نہ تھا جس نے اپنے دل میں اس واقعے سے نفرت اور رنج کو محسوس نہ کیا ہو۔ اسی واقعے کے اگلے روز ۱۰ مئی ۱۸۵۷ء کو میرٹھ رسالہ نمبر ۳ کے سواروں نے ردعمل کے طور پر آزادی کا پرچم بلند کیا اور انگریزوں کو شکست دے کر دہلی پر قابض ہو گئے [۱۶۳]۔ فوجی بغاوت کا یہ سلسلہ محض ایک دن میں وقوع پذیر نہیں ہوا بلکہ اس سے قبل فوجی اصلاحات کے نام پر کیے جانے والے اقدامات نے بھی سپاہیوں میں بےچینی اور اضطراب کی کیفیت پیدا کر دی تھی۔ انگریزی فیشن میں ڈرل، انگریزی فیشن کی حجامت، داڑھی منڈوانا، ایک ہی قسم کے یونی فارم کا استعمال، پیشانی پر تلک اور کانوں میں بالیاں پہننے کی ممانعت، پگڑی کی جگہ ٹوپی پہننے کا حکم، فوج کو جب افغانستان اور برما جانے کا حکم ہوا تو اسے بھی انھوں نے اپنی ذات پات کے لیے خطرہ سمجھا۔ جب ایک نئی قسم کی ٹوپی جس میں چمڑا لگا ہوا تھا، اسے بھی ہندو اور مسلمان دونوں نے اپنے لیے ناپاک خیال کیا۔ کارتوسوں کا استعمال بھی اسی سلسلے کی کڑی تھی۔ ان اصلاحات نے ایک طرف تو ہندوستان کے عوام میں بدگمانیاں پیدا کیں تو دوسری طرف فوج میں بھی بےچینی پیدا ہوئی۔ تاریخ کے اس موڑ پر یہ نئی اور پرانی اقدار کا تصادم تھا۔ اس تصادم کے نتیجے میں ہی ۱۸۵۷ء کا المیہ پیش آیا۔ کمپنی کی حکومت بہر حال ایک ترقی پسند سامراجی قوت تھی جب کہ ہندوستانی طاقتیں رجعت پسند تھیں۔ اس میں کام یاب اسے ہی ہونا تھا تو ترقی پسند تھا۔ اسی لیے اہلِ ہندوستان کی ناکامی دراصل ان کی روایت پرستی اور قدامت پرستی کی شکست تھی [۱۶۴]۔ اس شکست کے بعد انگریز صرف مسلمانوں ہی سے خائف تھے کیوں کہ اقتدار ان ہی سے چھینا گیا تھا، مسلمانوں کے دلوں میں انگریزوں کے خلاف سخت نفرت اور ملال تھا۔ انگریزوں کو یقین تھا کہ جنگ آزادی میں مسلمانوں ہی نے نمایاں طور پر حصہ لیا ہے [۱۶۵]۔ اس زمانے کے روزنامچے، خطوط اور یادداشتوں میں بھی ان الم ناک واقعات پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ مرزا غالب نے ''دستنبو'' میں بعد کے حالات کی طرف اشارہ کرتے لکھا کہ:

> شہر کا ہاتھ سے نکل جانا اور پھر قبضے میں آ جانا یہ دونوں کام ایک ہی دن میں ہوئے۔ مختصر یہ کہ فاتحین نے راستے میں جس شخص کو پایا قتل کر دیا۔ شہر کے عالی خاندان اور صاحب عزت افراد عزت آبرو کو بچانے کے لیے گھروں کے دروازے بند کر کے بیٹھ رہے [۱۶۶]۔

انگریزوں کی ریشہ دوانیوں کی بابت اس دور کی اردو صحافت بھی خاموش نہیں رہی۔ برصغیر میں شائع ہونے والے اخبارات اور رسائل میں اس موجوع پر کھل کر اظہار خیال کیا گیا۔ ''دہلی اردو اخبار'' کو اس حوالے سے خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ یہ اخبار مولوی باقر کی ادارت میں نکلتا تھا۔ اس اخبار میں چھپنے والی سیاسی وسماجی خبریں اور مضامین مسلمانوں میں حریت فکر کا احساس پیدا کرنے میں اہم کردار ادا کر رہے تھے [۱۶۷]۔ اس اخبار میں کمپنی کے حکام اور اس کی پالیسیوں کے خلاف بہت کچھ لکھا گیا۔ مولوی باقر نے دسمبر ۱۹۴۱ء کی اشاعت میں کابل کے مسلمانوں کے انگریزوں کے خلاف جذبات پر نہ صرف تبصرہ کیا بلکہ ان جذبات کی عکاسی کو پیش کرتے ہوئے انھیں درست بھی قرار دیا۔ اس کے علاوہ اخبار میں انگریزوں کی بدعنوانیوں اور مظالم کو بیان کرتے ہوئے ان تمام تر سیاسی وسماجی انتشار اور بےچینی کا ذمے دار انگریزوں کو قرار دیا ہے [۱۶۸]۔ اسی طرح ماسٹر رام چند کے اخبار ''فوائد الناظرین'' کے نومبر ۱۸۴۸ء کے شمارے

میں سکھوں کے خلاف انگریزوں کی ریشہ دوانیوں کی خبر کو سخت تنقید کا نشانہ بنایا گیا۔منشی امان اللہ لکھنوی نے ''کشف الاخبار'' میں انگریزی محکموں کے مظالم اور بدعنوانیوں پر مبنی متعدد خبریں شائع کیں [۱۶۹]۔غرض اس زمانے کے اخبارات نے ۱۸۵۷ء کے واقعات کو ایک مخصوص انداز میں پیش کیا جس میں انگریزوں کے خلاف نفرت کی جھلک بہت نمایاں ہے۔لہٰذا ان اخبارات و رسائل کے مدیروں کے ساتھ انگریزوں کا ردِ عمل فطری تھا۔اسی لیے ان لوگوں کو سخت کارروائی کا سامنا کرنا پڑا۔متعدد مقدمات قائم کیے گئے۔سزائے موت بھی دی گئی۔ملتان کے ہفت روزہ ''مرتضائی'' کے مدیر کو باغیانہ خبریں پھیلانے کے جرم میں قید کیا گیا۔''صادق الاخبار'' کے مدیر جمیل الدین کے علاوہ ''سلطان الاخبار'' اور دیگر کئی مدیروں کو قید و بند کی مصیبتیں جھیلنا پڑیں [۱۷۰]۔

علما نے آزادی کی اس جدوجہد کو جہاد قرار دیا اور اس ضمن میں اپنا فتویٰ بھی شائع کیا۔ظاہری بات ہے کہ مسلمان ان طریقوں سے خوش نہیں تھے جو عیسائی مبلغین نے اختیار کر رکھے تھے۔۱۸۳۷ء میں ایک بڑے قحط کے بعد ان یتیم بچوں کو جن کا کوئی سرپرست نہیں بچا تھا، عیسائی مبلغوں کے حوالے کر دینا اور مسلمانوں کو ان کی نگہداشت نہ کرنے دینا وغیرہ جیسے واقعات مسلمانوں کی دل آزاری کا سبب بن رہے تھے۔مسلمان اپنے آپ کو تبدیلی مذہب کے لیے پیش کرنے پر زیادہ آسانی سے آمادہ نہیں ہوتے تھے اور یہ بار مسیحی مبلغین کو خار کی طرح کھٹکتا تھا جس کے سبب انگریز حکم رانوں کی ناراضگی میں کافی اضافہ ہوا۔یہ آگ اسی طرح سلگتی ہوئی ۱۸۵۷ء میں پوری طرح بھڑک اٹھی تھی [۱۷۱]۔شاہ عبدالعزیز کا فتویٰ حقیقی معنوں میں جنگ آزادی کی پہلی آواز تھی جس میں انھوں نے کہا کہ:

> برعظیم اب دارالاسلام یعنی وہ ملک جہاں اسلام کو برسرِ اقتدار یا کم از کم آزاد سمجھا جا سکے، نہیں رہا۔مسلمان اب دارالحرب میں ہیں [۱۷۲]۔

شاہ عبدالعزیز ہی کے ایما پر سید احمد شہید ٹونک سے فوجی تربیت حاصل کر کے واپس لوٹے اور ملک کے متعدد شہروں میں جا کر لوگوں کو جہاد کے لیے تیار کیا۔جنوری ۱۸۲۶ء کو جب سید احمد شہید نے اعلانِ جہاد کیا تو برصغیر کے طول و عرض سے مجاہدین اٹھ اٹھ کر ان کے پرچم کے نیچے جمع ہونا شروع ہو گئے۔ان کے فوجی کیمپ میں مال و اسباب، زر و جواہر اور روپے پیسے کے ڈھیر لگ گئے۔ہر شخص سر سے کفن باندھے تیار کھڑا تھا۔سید احمد بریلوی کی سربراہی میں یہ قافلہ گوالیار، ٹونک، سندھ، بلوچستان، قندھار، غزنی اور کابل ہوتا ہوا درہ خیبر کے راستے پشاور پہنچا۔افسوس کہ سازش و فریب کاری کی کمند بالاکوٹ کی پہاڑیوں پر بھی پھینکی گئی اور سکھ شب خون مار کر غالب آ گئے۔چھ سو مجاہدین شہید کر دیے گئے اور اس میں شاہ اسماعیل اور سید احمد شہید بھی شامل تھے [۱۷۳]۔اگرچہ اس تحریک کا اصل رخ انگریزوں کی طرف ہی تھا [۱۷۴] لیکن سید احمد شہید نے ابتدائی طور پر ان سکھوں کے خلاف عملی جدوجہد شروع کی جو مسلمانوں پر ظلم ڈھا رہے تھے۔ان کے پیش نظر یہ اہم نکتہ تھا کہ پنجاب پر قبضہ جما لینے کے بعد پٹھانوں اور افغانوں کے ساتھ مل کر متحدہ محاذ بنا کر انگریزوں سے بہتر طریقے سے نبرد آزما ہوا جا سکے گا۔سید احمد شہید نے اپنے ایک مکتوب میں اس عزم کا اظہار کرتے ہوئے لکھا کہ:

> اس کے بعد میں اپنے مجاہدین کے ساتھ ہندوستان کا رخ کروں گا تا کہ اس کو کفر و شرک سے پاک کیا جائے۔اس لیے میرا مقصود اصلی ہندوستان پر جہاد ہے نہ کہ ملک خراسان میں سکونت اختیار کرنا [۱۷۵]۔

بہر حال ۶ مئی ۱۸۳۱ء کو یہ تحریک کچل دی گئی لیکن بالاکوٹ کی خاکستر سے جو چنگاری رونما ہوئی اس نے برصغیر کے مسلمانوں میں بیداری کی لہر پیدا کر دی۔اس تحریک سے متاثر ہو کر مختلف علما و مجاہدین نے اپنی اپنی بساط کے مطابق انقلابی تحریکیں شروع کر دیں۔

احمد اللہ شاہ جو ملک گیر جدوجہد کے محرک تھے، نے اس مقصد کے لیے دہلی، میرٹھ، کلکتا اور پٹنا کا سفر کیا۔ شمالی ہند میں انھوں نے اپنی تحریر و تقریر سے انقلابی تحریک کو منظم کیا اور عوام کو جنگ آزادی پر ابھارا۔ عظیم اللہ خان نے انقلابی مقاصد کے لیے مختلف ممالک کا سفر کیا۔ یورپ، ترکی اور روس گئے۔ عمر پاشا کو خطوط لکھے [۱۷۶]۔ علما میں عملی جدوجہد رنگ لائی۔ تحریکِ جہاد نے عوام میں جوش و خروش، ولولہ، عزم و حوصلہ پیدا کیا۔ اس صورتِ حال پر ہمارے شعرا بھی تہی داماں نہیں رہے۔ انھوں نے اپنے فکر و فن اور لوح و قلم کے ساتھ اس تحریک کا ساتھ دیا اور ایسی نظمیں لکھیں جن میں میر کارواں کے ساتھ بے پناہ خلوص اور عقیدت کا اظہار کیا گیا۔ اس نوع کی یہ جہادیہ نظمیں ہماری قومی و ملّی شاعری کا اہم ستون ہیں۔ یہ اس دور کی ترجمان ہیں جب پوری قوم حصولِ حریت کے لیے عملی جدوجہد میں قدم رکھ چکی تھی [۱۷۷]۔ اس قسم کی جہادیہ شاعری میں سرفہرست مومن خان مومن کا نام آتا ہے۔ جب مجاہدین کا قافلہ سید احمد کی قیادت میں میدانِ جہاد کی طرف روانہ ہوا تو مومن بے اختیار پکار اٹھے کہ:

خدایا لشکرِ اسلام تک پہنچا کہ آ پہنچا — لبوں پر دم بنا ہے جوشِ خوں شوقِ شہادت کا
نہ کر بے گانۂ مہرِ امام اقتدا سنت — کہ انکار آشنائے کفر ہے ان کی امامت کا
امیرِ لشکرِ اسلام کا محکوم ہوں، یعنی — ارادہ ہے مرا فوجِ ملائک پر حکومت کا
زمانہ مہدیِ موعود کا پایا اگر مومن — تو سب سے پہلے تو کہیو سلام پاک حضرت کا [۱۷۸]

انیسویں صدی کے ابتدائی سالوں میں حزن و ملال کی جو فضا طاری تھی، اس میں کوئی ایسا قائد دکھائی نہیں دے رہا تھا جو روشنی کا مینار بن کر اس اندھیرے کو دور کرتا۔ اس وقت نہ راستے کا کوئی تعین تھا اور نہ ہی منزل کا کوئی پتا۔ اس پرآشوب وقت میں جب سید احمد شہید قیادت کے لیے اٹھے تو ہر شخص ان کے ساتھ ہو لیا۔ سب کے دل میں امید کی کرن جاگی [۱۷۹]۔ اسی لیے مومن خان مومن نے اس عظیم مجاہد کی مدح کی قطعہ لکھ کر اپنے دلی جذبات کا اظہار کچھ اس طرح کیا کہ:

گلابِ ناب سے دھوتا ہوں مغزِ اندیشہ — کہ فکرِ مدحتِ سبطِ قسیم کوثر ہے
وہ کون امام، امامِ جہانیاں احمد — کہ محض مقتدیِ سنتِ پیمبرؐ ہے
زبس کہ کام نہیں ہے اسے سوائے جہاد — جو کوئی اس کے مقابل ہو سو وہ کافر ہے
وہ بادشاہِ ملائک سپاہ، کوکب دیں — کہ نور شمس و قمر جس کے گرد لشکر ہے [۱۸۰]

مومن نے سید احمد شہید کے مشن اور جہاد کی فضیلت پر ایک مثنوی بھی لکھی۔ یہ مثنوی ہماری قومی تاریخ میں نہایت اہمیت کی حامل ہے۔ وہ اس مثنوی میں جہاد کی فضیلت پر روشنی ڈالتے ہوئے خود بھی اس عملی جدوجہد میں شریک ہونے کی خواہش کا ظہار کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ ملاحظہ کیجیے:

وہ خضرِ طریقِ رسولِ خداؐ — کہ سایہ ہے جس کے تجل مہر و مہ
رہے حشر تک زندہ وہ نیک ذات — ہے کفار کی موت اس کی حیات
خدا نے مجاہد بنایا اسے — سرِ قتلِ کفار آیا اسے
ہوا مجتمع لشکر اسلام کا — اگر ہو سکے وقت ہے کام کا

ضرور ایسے مجمع میں ہونا شریک　　　کہ خوش تم سے ہو وحدہٗ لاشریک [۱۸۱]

جہاد میں شریک ہونے کے ساتھ ساتھ وہ جذبہ جہاد سے سرشار ہوکر شہادت کے عظیم مرتبے پر فائز ہونے کی خواہش کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

الٰہی مجھے بھی شہادت نصیب　　　یہ افضل ہے افضل عبادت نصیب

الٰہی اگرچہ ہوں میں تیرا کار　　　پہ تیرے کرم کا ہوں امیدوار

تو اپنی عنایت سے توفیق دے　　　عروجِ شہید اور صدیق دے [۱۸۲]

مومن کی شاعری کو علامہ نیاز فتح پوری نے محض جنسیاتی شاعری [۱۹۳] قرار دے کر کم تر درجہ دینے کی کوشش کی، ہم دیکھتے ہیں کہ اس دور میں وہ واحد توانا آواز تھی جس نے سوئے ہوئے مسلمانوں کے جذبات کو بیدار کرنے کی کوشش کی۔ ان کی جہادیہ شاعری کو ملی شاعری کی تاریخ میں نمایاں مقام حاصل رہے گا۔ ملاحظہ کیجیے:

کہتے ہیں یہ ہم چاٹ کے خاک اس میں ہوں گر خاک　　　پر اب تو زمیں بوس کلیسا نہ کریں گے [۱۸۴]

اس دور میں بعض غیر معروف شعرا کی جہادیہ نظمیں بھی طبل جنگ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ مولوی خرم علی بلہوری (م: ۱۸۵۴ء) جو کئی دینی کتب کے مصنف بھی تھے سید احمد شہید کے ساتھ سرحد گئے۔ بعد میں وہ دعوت تبلیغ کی غرض سے واپس آ گئے [۱۸۵] انھوں نے اس موضوع پر جو جہادیہ نظم لکھی وہ اکثر میدان جنگ میں خوش الحانی سے پڑھا کرتے تھے [۱۸۶] شان الحق حقی نے سہواً یہ نظم مولوی لیاقت اللہ کے نام سے منسوب کی ہے [۱۸۷] اس نظم میں بھی انھوں نے جہاد کی فضیلت اور اہمیت واضح کرتے ہوئے کہا کہ:

فرض ہے تم پے مسلمانوں جہاد کفار　　　اس کا سامان کرو جلد اگر ہو دیں دار

فتنہ ایک قبر و غمِ صورو قیامِ محشر　　　اسے صدموں سے شہیدوں کو نہیں ہے کچھ ڈر

دوستو جب تمہیں مرنا ہی مقدر ٹھہرا　　　پھر تو بہتر ہے کہ جاں دیجیے در راہِ خدا [۱۸۸]

مولوی محمد حسین فقیر نے شاہ اسماعیل کی شخصیت کو اپنی نظم کا موضوع بناتے ہوئے قصیدہ ''در فضائل صبر نبیل مولانا محمد اسماعیل'' میں ان کی خوب تعریف وتوصیف کی ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

ان کی شمشیر کا زہر اب ملا دیتا تھا　　　فوجی کفار کے دریا میں عجب سمیت

یہ سنا ہوگا کہ سکھوں کو بہت قتل کیا　　　سُکھ سے پھر رہ نہ سکے سکھ ہوئے ایسے غارت [۱۸۹]

مجاہدین کا یہ قافلہ مقامی سازشوں کی وجہ سے اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہوسکا۔ سید احمد شہید اور شاہ اسماعیل اور ان کے متعدد ساتھی بالاکوٹ میں شہید کر دیے گئے۔ اس جانب اشارہ کرتے ہوئے سید عبدالرزاق کلامی نے کہا کہ:

فنا عشق مولا میں وہ ہوگئے　　　ہیں دونوں جہاں ان کے قدموں تلے

خوشی سے وہ جام شہادت چڑھا　　　ہوئے واصلِ حضرت کبریا

ہمیشہ ہو ان پر خدا کا کرم　　　وہ تھے ہادی و رہنمائے امم [۱۹۰]

اگرچہ قوم کا یہ ہادی و رہنما بالاکوٹ کی سرزمین میں دفن ہوگیا لیکن اس کی جلائی ہوئی شمع آگے چل کر ہندوستان میں آزادی

کے پروانوں کے لیے مشعل راہ ثابت ہوئی۔ اس سے پھوٹنے والی روشنی میں حریت پسندوں کا قافلہ آگے بڑھا۔ اس کے ساتھ ساتھ اردو کی قومی سیاسی شاعری میں تاب وتوانائی بھی پیدا ہوئی۔ بعد کے حالات میں ۱۰ مئی ۱۸۵۷ء کی صبح میرٹھ کی فوجی چھاؤنی میں انقلاب کی یہ دبی ہوئی چنگاری شعلہ جوالہ بن کر ابھری تو برطانوی استبداد کے قصر وایواں اس سے لرز اٹھے۔ انقلاب وآزادی کی یہ آگ جو چربی آمیز کارتوسوں سے بڑھی تھی، یہ آگ محض اتفاقی نہیں تھی بلکہ اس کے پسِ پردہ جدوجہد آزادی کی ایک طویل داستان مضمر ہے[۱۹۱] اس ہنگامہ دار وگیر کے زیر اثر تخلیق کی جانے والی شاعری کا جائزہ خارج از دلچسپی نہ ہوگا۔

۱۸۵۷ء کے اس پس منظر اور اسباب کی روشنی میں اس دور کی شاعری کو سمجھا جا سکتا ہے جو اس انقلاب کی یادگار ہے۔ ''فغان دہلی''، میں جن شعرا کا کلام شامل ہے ان میں سے بیش تر نے پوربیوں، تلنگوں اور دیسی سپاہیوں کو دہلی کی بدبختی کی وجہ قرار دیا اور انھیں برا بھلا کہا ہے لیکن ان کی شاعری میں جو بات قدر مشترک کا درجہ رکھتی ہے وہ ہے ان کی شاہ پرستی۔ بہادر شاہ ظفر کو کسی نے بھی اس تحریک کے قائد کی حیثیت سے یاد نہیں کیا بلکہ ان کو مظلوم اور رنگون کا صید زبوں قرار دیتے ہوئے ان کی حکومت کے خاتمے اور جلاوطنی کا ماتم کیا ہے۔ بہادر شاہ ظفر ایک المیہ ڈرامے کے ہیرو کی طرح شاعری کے اس آئینے میں ہمارے سامنے آتے ہیں[۱۹۲] اسی لیے میرٹھ سے مجاہدوں کا کاروان بے پناہ دہلی کی طرف بڑھا اور اس نے بہادر شاہ ظفر سے قیادت سنبھالنے کی استدعا کی تو اس وقت بھی اس بوڑھے مغل بادشاہ کو اپنی تہی دامنی کا پوری طرح احساس تھا۔ چناں چہ اس نے پوری مایوسی کے ساتھ جواب دیا کہ ''میرے پاس فوج ہے نہ اسلحہ نہ خزانہ''[۱۹۳]۔ حالاں کہ جنگ آزادی کے بعد بہادر شاہ ظفر کو اس جنگ کا مرکزی کردار بنانے کی ناکام کوشش بھی کی گئی۔ ڈاکٹر مہدی حسن کی انگریزی تصنیف کے علاوہ متعدد اردو کتابوں میں اس نوعیت کی غلط فہمی پیدا کرنے کی کوشش کی گئی۔ یہ درست ہے کہ جنگ آزادی کے دنوں میں سپاہیوں اور عوام میں شاہ پرستی اس قدر رچی ہوئی تھی کہ پورب کے جو ہندو سپاہی دلی پہنچے وہ بہادر شاہ ظفر کو دھرم اوتار کہتے تھے[۱۹۴] ان سپاہیوں نے بہادر شاہ ظفر کو علامتی طور پر اپنا سربراہ چن لیا لیکن یہ سپاہی مختلف گروہوں سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے باہمی تعلقات بھی خوشگوار نہ تھے۔ ۱۸۵۷ء میں بہادر شاہ ظفر کی عمر ۸۲ برس کی تھی[۱۹۵] لہٰذا اس نئی صورتِ حال میں خواجہ حسن نظامی کے مطابق بہادر شاہ ظفر کو کچھ حقیقت معلوم نہ تھی۔ ان کے مطابق:

> اصل حقیقت یہ ہے کہ غدر کے دن کی مجھے پہلے خبر نہ تھی۔ آٹھ بجے کے قریب باغی سوار دفعتاً آ گئے اور محل کی کھڑکیوں کے نیچے شور وغل مچانے لگے[۱۹۶]۔

یہ بہادر شاہ ظفر کے ''جواب تحریری'' کا اقتباس ہے۔ اس میں انھوں نے مئیر فریزر (ریذیڈنٹ دہلی) کو بچانے کے لیے اپنی کوششوں کا ذکر کیا ہے۔ ان کے مطابق:

> باغی سپاہ دیوان میں گھس آئی... مجھے چاروں طرف سے گھیر کر پہرا لگا دیا۔ میں نے ان کا مطلب دریافت کیا اور چلے جانے کو کہا جس کے جواب میں انھوں نے خاموش کھڑے رہنے کو کہا اور کہا کہ جب انھوں نے اپنی زندگیوں کو خطرے میں ڈالا ہے تو اب اپنی طاقت کے موافق سب کچھ کر کے چھوڑیں گے۔ خوف کھا کر کہ کہیں میں قتل نہ کر دیا جاؤں، میں نے منھ سے اُف تک نہ کی... میری مہر کے ثبت شدہ دستخط کیے ہوئے احکام کی نسبت معاملہ کی اصل حالت یہ ہے کہ جس روز سے سپاہ آئی... میں ان کے اختیار میں

رہا[۱۹۷]

ان شہادتوں کے پیشِ نظر ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ باغی فوج کے دباؤ کے تحت سربراہ بننے پر مجبور ہوئے اسی لیے ولیم کیتھ نے لکھا کہ ۱۱ مئی کو میرٹھ کے سپاہیوں کے آنے کے بعد صورت حال تبدیل ہوگئی۔ ان سپاہیوں نے پچھلی ایک صدی کا بدلہ لینے کے لیے غیر ملکیوں کو قتل کرنا شروع کر دیا اور انھیں شہر سے فرار ہونے پر مجبور کر دیا۔ ۱۰ مئی کو رات بہادر شاہ ظفر علامتی بادشاہ کی حیثیت سے سویا لیکن ۱۱ مئی کو باغی سپاہ نے اسے ہندوستان کا شہنشاہ بنا دیا۔ اس وقت شہر مکمل طور پر نراجیت کا شکار تھا۔ لوٹ مار اور قتل و غارت گری میں مصروف سپاہ خود کو ہر قسم کی پابندی سے آزاد سمجھتے تھے[۱۹۸]۔ یہ بغاوت کیوں کہ پوری طرح منظم نہیں تھی لہٰذا انگریزوں کو سنبھلنے اور تیاری کا پورا موقع ملا۔ دوسری طرف ایران سے معاہدہ ہوجانے کی وجہ سے وہاں سے بھی انگریزی فوجی لوٹ آئی۔ چین جانے والے انگریزی دستے بھی کلکتے میں ہی روک لیے گئے۔ انگریزوں نے سکھوں اور مغلوں کی دیرینہ عداوت کا بھی پورا فائدہ اٹھایا چنانچہ ۱۸ ستمبر کو دہلی پر دوبارہ انگریزوں کا قبضہ ہوگیا[۱۹۹]۔ اس سے قبل کچھ عرصے تک تو یوں محسوس ہو رہا تھا کہ مغلیہ سلطنت ایک بار پھر ہندوستان پر اپنا پرچم بلند کرنے میں کامیاب ہوجائے گی۔ بہادر شاہ ظفر کے انکار کے باوجود مجاہدین نے جس طرح یک زبان ہوکر یہ کہا تھا کہ:

> آپ صرف اپنی رضامندی ظاہر کر دیں۔ ہم ہر چیز مہیا کریں گے۔ میرٹھ میں انگریزوں کو شکست ہوچکی تھی۔ دہلی آپ کے ہاتھ میں ہے اور پشاور سے کلکتے تک سارے سپاہی اور عوام آپ کے حکم کے منتظر ہیں۔ سارا ہندوستان غلامی کی زنجیریں توڑ دینے اور آزادی حاصل کرنے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا ہے۔ اب آپ آزادی کا پرچم اپنے ہاتھ میں لے لیں[۲۰۰]۔

تو اس وقت واقعی ہندوستان کی بیش تر ریاستوں نے عزم و حوصلے کے ساتھ اپنی وفاداری کا یقین دلایا تھا۔ جب جنرل بخت خان جو ۱۴ ہزار کی فوج لے کر دہلی پہنچا تو مغل سلطنت کے استحکام کے آثار نمایاں ہونے لگے تھے۔ سارا ملک ان غیر ملکیوں کو دیس نکالا دینے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا تھا[۲۰۱]۔ بہ قول سر جان ولیم:

> کئی انگریز جنگلوں اور ویرانوں میں چھپتے پھرتے تھے۔ اپنے ملبوسات سے فوجی نشانات نوچ کر پھینک رہے تھے اور خرگوشوں کی مانند ڈرے سہمے گڑھوں اور سوراخوں میں دبکے بیٹھے تھے[۲۰۲]۔

اس موقع پر انگریزوں کی دیرینہ سازش ایک بار پھر کام کر گئی اور وہ بہادر شاہ ظفر کے خاص خاص مقربین کو توڑنے میں کامیاب ہوگئے۔ میر جعفر اور میر صادق کی طرح انھیں اس قوم پر بھی منشی رجب علی، حکیم احسن اللہ اور مرزا الٰہی بخش جیسے لوگ ہاتھ آگئے۔ انھیں بڑی بڑی لالچ دے کر اس بات پر آمادہ کرلیا گیا کہ وہ گولہ بارود کے ذخیرے کو تباہ کرنے میں انگریزوں کی مدد کریں۔ بارود کی موجودگی میں تمام آلاتِ حرب بے کار تھے۔ اس طرح حصول آزادی کا نادر موقع ایک بار پھر ہاتھ سے نکل گیا۔ درباری سازشوں اور متعصب سکھوں کی بدولت اسلامی سلطنت کا پرچم سرنگوں ہوگیا۔ تختِ شاہی ہمیشہ بہادر شاہ ظفر کے ہاتھ سے چھین گیا اور مغلیہ سلطنت کا ٹمٹماتا ہوا چراغ ہمیشہ کے لیے گل ہوگیا[۲۰۳]۔ بہادر شاہ ظفر کا زمانۂ غدر کا کہا ہوا کلام نہیں ملتا۔ یہ کلام حکیم احسان اللہ کے پاس ترتیب کے لیے جمع ہوتا تھا یعنی انھوں نے اسے غائب کر دیا یا ہنگامے میں تلف ہوگیا۔ یہی حالت ان کے رنگون کے زمانے کے کہے ہوئے کلام کی ہے۔ ایک روایت ہے کہ ظفر اپنے ملاقاتیوں کو اپنا تازہ کلام تحفتاً پیش کیا کرتے تھے[۲۰۴]۔ اس کلام نے اپنے زمانے میں بہت شہرت پائی اور

سینہ بہ سینہ ہم تک پہنچا۔ ان کے کلام میں امتدادِ زمانہ سے اس قدر تبدیلی اور الحاق ہوا کہ اصل صورت کیا تھی، اسے بیان کرنا مشکل ہو گیا ہے لیکن جو کچھ بھی کلام ان کا دستیاب ہو سکا اس میں ان مخصوص حالات کی ترجمانی ضرور ملتی ہے۔ ان کے کلام میں تصرف ضرور ہوتا رہا لیکن کچھ کلام ہے اس میں سوز و غم کی تپش ایک دکھی دل سے نکلنے والی آہ کا پتا دیتی ہے۔ ظفر اپنے آخری زمانے کے احساسِ شکست اور بے بسی پر گریہ و زاری کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

نہ دبایا زیرِ زمین انھیں نہ دیا کسی نے کفن انھیں — نہ ہوا نصیب وطن انھیں نہ کہیں نشانِ مزار ہے
کوئی کیوں کسی کا لبھائے دل کوئی کیا کسی سے لگائے دل — وہ جو بیچتے تھے دوائے دل وہ دکان اپنی بڑھا گئے
بندھے کیوں نہ آنسوؤں کی جھڑی کہ یہ حسرت ان کے گلے پڑی — وہ جو کالیں تھیں بڑی بڑی وہ انھی کے بیچ میں آ گئے
یہ رعایا ہند تباہ ہوئی کہوں کیا جو ان پہ جفا ہوئی — جسے دیکھا حاکم وقت نے کہا یہ تو قابل دار ہے
نہ تھا شہر دہلی یہ تھا چمن ولے سب طرح کا تھا یاں امن — سو خطاب اس کا تو مٹ گیا فقط اب تو اجڑا دیار ہے [۲۰۵]

بہادر شاہ ظفر ایک ایسے طائر اسیر تھے جو پرواز تو بڑی بات ہے فغاں بھی کرنے کا حوصلہ اپنے اندر نہیں رکھتا۔ اس مجبور بادشاہ کی ذہنی کیفیت کو سمجھنا ہو تو ان کی شاعری اس کا بہترین آئینہ ہے۔ وہ خود اس کیفیت کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

کیا طائرِ اسیر وہ پرواز کر سکے — جس میں نا اتنا دم ہو کہ آواز کر سکے
چاکِ قفس سے دیکھ رہا ہوں رخِ چمن — صیاد ہے نہیں ہوسِ بال و پر مجھے
ہزار حیف کہ بلبل کا صحنِ گلشن میں — نہ چھوڑا ایک بھی صیاد نے نشانی پر [۲۰۶]

ظفر نے ۱۸۵۷ء کے دوران مختلف روایات کے مطابق جو شعر کہے ان میں کہیں تو دبا دبا سا حوصلہ ہے اور کہیں شکست کا اعلان۔ بعض غزلیں سہواً بہادر شاہ ظفر سے منسوب تو ہو گی لیکن بغور دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کہیں کہیں شاعر اپنی ہی کہی ہوئی بات سے انکاری ہے مثلاً:

غازیوں میں بو رہے گی جب تلک ایمان کی — تب تلک لندن چلے گی تیغ ہندوستان کی
دمدمہ میں دم نہیں ہے خیر مانو جان کی — اے ظفر ٹھنڈی ہوئی تلوار ہندوستان کی [۲۰۷]

یہ دونوں شعر الگ الگ کیفیات کے حامل ہیں اور ایک دوسرے کی ضد معلوم ہوتے ہیں۔ مہدی حسن نے ظفر کی شاعری کے انتخاب کو دو حصوں میں تقسیم کرتے ہوئے ایک معروف غزل کو ان سے منسوب کیا ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

گئی یک بیک جو ہوا پلٹ نہیں دل کو میرے قرار تھا — کرو اس ستم کا میں کیا بیان میرا سینہ غم سے فگار تھا
نہ تھا شہر دہلی یہ تھا چمن کہوں کس طرح کا تھا یاں امن — جو خطاب تھا وہ مٹا دیا فقط اب تو اجڑا دیار ہے
شب و روز پھولوں میں جو تلے کہو خارِ غم کو وہ کیا سہے — ملے طوق قید میں جب انھیں، کہا گل کے بدلے یہ ہار ہے
یہ کسی نے ظلم بھی ہے سنا کہ دی پھانسی لاکھوں کو بے گناہ — ولے کلمہ گویوں کی سمت سے ابھی دل میں ان کے غبار ہے [۲۰۸]

خلیل الرحمٰن داؤدی نے مذکورہ غزل کو ظفر کے بجائے دہلی کے ایک غیر معروف ناخواندہ شاعر حسامی سے منسوب کیا ہے [۲۰۹]۔ ظفر کی جو شاعری ہمارے پیشِ نظر ہے ان میں ایک مسدس ''شکوہِ روزگار'' بھی ''فغانِ دہلی'' میں شامل ہے۔ یہ کلام ۱۸۵۷ء سے قبل کا

ہے لیکن اشعار کا لہجہ ہمیں یہ بھی سوچنے پر مجبور کر دیتا ہے کہ یہ اشعار ۱۸۵۷ء کے واقعات پر گہرے تبصرے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ دو بند ملاحظہ کیجیے:

باد صبا اڑاتی چمن میں ہے سر پہ خاک — ملتے ہی سر بہ سر کفِ افسوس برگ تاک
غنچے ہیں دل گرفتہ گلوں کے جگر ہیں چاک — کرتی ہیں بلبلیں یہی فریاد دردناک
شاداب حیف خار ہوں، گل پائمال ہوں — گلشن ہوں خوار، نخل مغیلاں نہال ہوں
جائیں نکل فلک کے احاطے سے ہم کہاں — ہووے کا سر پہ چرخ بھی، جائیں گے ہم جہاں
کوئی بلا ہے خانۂ زندہ یہ آسماں — چھٹنا محال اس سے ہے جب تک ہے تن میں جاں
جو آ گیا ہے اس محلِ تیرا رنگ میں — قیدِ حیات سے ہے وہ قیدِ فرنگ میں [۲۱۰]

ملک کی سیاسی باگ ڈور پر جب ان کی گرفت مکمل طور پر ختم ہوگئی تو اس یاس انگیز سیاسی ماحول میں دلی کی بزم آخر پر قنوطیت کے بادل چھانے لگے۔ اکثر لوگوں کے ذہن حال اور مستقبل کی تاریکی کو تقدیر کا اٹل فیصلہ مان کر معطل اور بے بس ہو چکے تھے۔ ان کی غزلوں میں اس بے چارگی وہ بے بسی کی بہترین ترجمانی کی گئی ہے [۲۱۱]۔ ملاحظہ کیجیے:

نے خرد نے ہوش نے تدبیر پر شاکر ہیں ہم — دوستوں اپنی فقط تقدیر پر شاکر ہیں ہم
ہاتھ سے قاتل کے کچھ شکوہ نہیں کرتے کبھی — رکھ کے آپ اپنا گلا شمشیر پر شاکر ہیں ہم
تو برا کہہ یا بھلا ہم سے نہ ہو تیرا گلا — اے ستم گر تیری ہر تقدیر پر شاکر ہیں ہم
کرتے کیا کیا شکر کچھ ہوتا جو نالوں میں اثر — جب کہ اپنی آہِ بے تاثیر پر شاکر ہیں ہم [۲۱۲]

ظفر کی ایک مسلسل غزل میں دلی کی تباہی و بربادی کا ایسا منظر نظر آتا ہے کہ ان کی معاملہ شناسی اور شعور و بصیرت کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ وہ اپنے اسلاف کی طرح خود کو زیادہ دیر دھوکے میں نہیں رکھنا چاہتے تھے اسی لیے حقیقت کا ادراک کرتے ہوئے اس حقیقت کا کھل کر اظہار بھی کیا کہ:

جوں بوئے گل رفیق نسیمِ چمن ہیں ہم — اے ہم دمو وطن میں غریب الوطن ہیں ہم
جی قفس میں لگ گیا اپنا چمن سے بھی سوا — ہم کو ایسے صیاد پر وائے رہائی کیا رہے
اے ظفر اب ہے تجھی تک انتظامِ سلطنت — بعد تیرے نے ولی عہدی نہ نامِ سلطنت [۲۱۳]

ظاہر سی بات ہے جب کمپنی کے کارپردازوں نے ولی عہد سلطنت مرزا محمد اویس کے سامنے ۱۸۵۶ء میں یہ شرائط رکھیں کہ بہادر شاہ ظفر کے بعد ان کے جانشین قلعہ معلی کی رہائش ترک کر کے قطب صاحب میں رہائش اختیار کریں گے اور بادشاہ کے بجائے شہزادہ لقب اختیار کریں گے [۲۱۴]۔

مئی ۱۸۵۷ء کا انقلاب بہادر شاہ ظفر کے لیے غیر متوقع انقلاب تھا۔ بہادر شاہ کو ان عساکر کی وفاداری اور انقلاب کی کامیابی سے متعلق شبہات تھے۔ وہ ٹیپو کے ساتھ امرا اور روسا کی غداری کو اپنے لیے ایک سبق کے طور پر لیتے تھے [۲۱۵]۔ لیکن پھر بھی دباؤ میں آ کر رسمی طور پر قیادت قبول کر لی۔ اس کے باوجود اپنے شبہات کا اظہار کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ:

اعتبارِ صبر و طاقت خاک میں رکھوں ظفر! فوجِ ہندوستان نے کب ساتھ ٹیپو کا دیا[216]

ظفر کو بخوبی احساس تھا کہ ہندوستانی عساکر اور امرا میں قومی احساس کی کمی ہے۔عین ہنگامہِ کارزار میں بھی ان پر ذاتی مفادات غلبہ حاصل کر لیتے ہیں۔۱۸۵۷ء کے بعد ان کے دل میں اس خواہش نے ضرور جنم لیا کہ وہ پھر سے ہندوستان کو آزاد دیکھنے کے خواب دیکھنے لگے۔راجستھان کے راجاؤں سے لے کر نانا صاحب پیشوا، رانی لکشمی بائی، بیگم حضرت محل، تانیا ٹوپے، شہزادہ فیروز بخت، فیض اللہ خان، عظیم اللہ خان، کنور سنگھ، راجا ہرنام سنگھ وغیرہ جیسے سرفروشوں نے آزادی کا پرچم لہراتے ہوئے انھیں اپنا سالار تسلیم ضرور کیا لیکن ان تمام اقدامات کا نتیجہ بہادر شاہ کے حق میں بہت برا نکلا۔۲۰ ستمبر کو ہمایوں کے مقبرے میں جہاں بہادر شاہ مقیم تھے، مع تین شہزادوں کے گرفتار ہوئے۔کیپٹن ہڈسن نے خونی دروازے فیروز شاہ کوٹلہ کے نزدیک مرزا خضر سلطان، مرزا مغل اور ابوبکر کو تین تین گولیاں ماریں، ان کے سرتن سے جدا کیے اور بادشاہ کو یہ کہتے ہوئے پیش کیا کہ یہ کمپنی کی جانب سے آپ کی نذر[217]۔ان کے خاندان کے بیشتر افراد کو انگریزوں نے پھانسی دے دی۔بیسیوں شہزادوں کو گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا۔دلی کی اینٹ سے اینٹ بجادی گئی۔کابلی دروازے سے لے کر لال قلعہ تک ہزارہا مکان منہدم کیے گئے[218]۔ان مناظر کی عکاسی ظفر کے کلام میں جا بجا ملتی ہے۔شہر کی بربادی پر ان کا یہ کہنا کہ:

جہاں ویرانہ ہے پہلے کبھی آباد گھر یاں تھے ''شغال'' اب ہیں جہاں، رہتے کبھی بستے بشر یاں تھے

جہاں پھرتے بگولے ہیں، اڑاتے خاک صحرا میں کبھی اڑتی تھی دولت، رقص کرتے، سیم بر یاں تھے

جہاں سنسان اب جنگل ہے اور ہے شہرِ خاموشاں کبھی کیا کیا تھے ہنگامے یہاں اور شور و شر یاں تھے[219]

ظفر کی شاعری دراصل ان کی آپ بیتی ہے۔ان کی شاعری سے ان کی شخصیت کی پوری تصویر اتاری جا سکتی ہے بس یہ شاعری اپنے عصر سے جڑی ہوئی ہے۔بعض اشعار میں آبلہ کے پھوٹ بہنے کی کیفیت بھی موجود ہے۔۱۸۵۷ء کے ہنگامہ پر ظفر کا یہ شعر اس دور کے حالات پر ایک جامع تبصرہ معلوم ہوتا ہے۔ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ظفر کو واقعہ کے ظہور میں آنے سے پہلے غلامی کی جڑوں کے دور دور تک پیوست ہونے کا پوری طرح اندازہ تھا۔اسی سبب وہ ۱۸۵۷ء کی کارروائی کی بابت کہتے ہیں کہ:

اے اسیرانِ خانہِ زنجیر تم نے یاں غل مچا کے کیا پایا[220]

اس کے باوجود ان کی دلی خواہش اکثر ان کی زبان پر آ جاتی تھی جس کا اظہار اشعار کی صورت میں ہوتا۔جیسے عیدالاضحیٰ کے تہوار کے موقع پر ''صادق الاخبار'' میں ان کا جو قطعہ شائع ہوا اس میں انھوں نے جنرل بخت خان کی نذر کرتے ہوئے کہا تھا کہ:

لشکرِ اعدا الٰہی آج سارا قتل ہو گورکھا، گورے سے، تا گوجر، نصاریٰ قتل ہو

آج کا دن عید قرباں کا جبھی جانیں گے ہم اے ظفر! تہِ تیغ جب، دشمن تمہارا قتل ہو[221]

تاریخ کا یہ کیسا المناک سانحہ تھا کہ مغلیہ سلطنت کے اس آخری تاجدار کی موت انتہائی کس مپرسی کے عالم میں ہوئی اور اس کے خاندان کے افراد عبرت کا نشان بن گئے۔بہادر شاہ ظفر کے ساتھ رنگون پہنچنے والے تیس افراد میں سے گیارہ تو مرتے دم تک اس کے ساتھ رہے۔باقی میں سے کچھ ہندوستان لوٹ آئے اور کچھ نے برما میں ہی سکونت اختیار کر لی۔کئی شہزادوں نے برمی خاتون سے شادی کر کے وہی اپنا مستقل مستقر بنایا۔کسی بادشاہ کی آتما کا خون کرنا ہو تو اس کی شاہی توقیر کا خاتمہ کر دو۔اس کے بعد اس کی ہر سانس ایک آہ

اور ہر بول ایک کراہ کی صورت میں نکلے گا۔ظفر نے بھی تین سو پچاس سالہ اقبال اور وقار کو اپنی آنکھوں سے خاک میں ملتے دیکھا۔اس کے کانوں نے بیٹیوں کی چیخ وپکار اور ننھے بچوں کی فریاد سنی۔لہٰذا اس کے دکھوں کا اندازہ لگانا ناممکن ہے۔ظفر قید کی حالت میں اپنے کمرے سے کبھی باہر نہ نکلے۔چارپائی پر پڑے حقہ گڑگڑاتے رہتے، پُردرد اشعار گنگناتے رہتے، کبھی کبھی جواں بخت کو اس فانی دنیا کے دکھ اور ماضی کی کہانی سناتے رہتے۔قید تنہائی میں لکھے گئے اشعار ان کے دلی جذبات کی صحیح معنوں میں عکاس ہیں [۲۲۲] ملاحظہ کیجیے:

کون نگر سے آئے ہم اور کون نگر میں باسے ہیں	جائیں گے ہم کون نگر کو، ہوتے من میں ہراسے ہیں
دیس نیا ہے، بھیس نیا ہے، رنگ نیا ہے، ڈھنگ نیا	کون آنند کرے ہیں واں، اور رہتے کون اداسے ہیں [۲۲۳]

کہتے ہیں کہ دلی سے رنگون جاتے وقت اس بدنصیب بادشاہ نے اپنے جو اشعار گنگنائے اس کے ایک ایک لفظ سے اداسی ٹپکتی ہے یہ اشعار دراصل ایک بادشاہ کی زندگی کی کہانی معلوم ہوتے ہیں انھوں نے بہت سے اشعار اپنے ناخنوں سے کھرچ کر دیواروں پر لکھ دیے تھے۔ان کی موت کے بعد انھیں نوٹ کر کے تیس پینتیس برس قبل شائع کیا گیا [۲۲۴] ملاحظہ کیجیے:

جلایا ہارنے ایسا کہ ہم وطن سے چلے	بہ طور شمع کے روتے اس انجمن سے چلے
نہ باغباں نے اجازت دی سیر کرنے کی	خوشی سے آئے تھے، روتے ہوئے چمن سے چلے [۲۲۵]

آخر کار اس رنج والم نے خون کی حدت کو اس قدر بڑھایا کہ بادشاہ کے دماغ کی نس پھٹ گئی اور اسے فالج ہو گیا۔اسی حالت میں ۷ نومبر ۱۸۲۶ء کو روح کا یہ پنچھی جسمانی پنجرہ توڑ کر آزاد ہو گیا [۲۲۶]۔اس کی اولاد درباری سازشوں کا شکار ہو کر کبھی انگریز سرکار کی آلہ کار بنتی اور آپس میں دست وگریباں رہتی۔کئی شہزادے تو ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے دوران قتل ہوئے۔حیرت کی بات تو یہ ہے کہ کچھ ایسے شہزادے جن کی عمر کافی زیادہ تھی مثلاً بہادر شاہ ظفر کے دادا شاہ عالم کے بیٹے شہزادہ قیصر جو بڑھاپے کے باعث ہوش وخرد سے بیگانہ ہو چکے تھے انگریز حکام نے اس بوڑھے شہزادے تک کو پھانسی پر لٹکا دیا۔اسی طرح گٹھیا کے مرض میں بستر پر پڑے اکبر بادشاہ کے پوتے شہزادہ مرزا محمود شاہ کو بھی پھانسی دی گئی۔جن شہزادوں کو قید کی سزا دی گئی ان کی مشقت موت سے زیادہ سخت تھی۔ان سے آٹا پسوایا جاتا، کوڑے برسائے جاتے اور اسی حالت میں بہت سے شہزادے قید ہستی سے رہائی پاتے۔شہزادوں کے علاوہ شہزادیاں جنھیں کبھی چشم فلک نے بے نقاب نہ دیکھا تھا، اندوہ ناک مصائب سے دوچار ہونا پڑا۔بہادر شاہ ظفر کی ایک بھتیجی کو مولوی ذکاءاللہ نے مرتے دم تک اپنے ہاں مہمان بنائے رکھا۔

بہادر شاہ ظفر کی صاحب زادی احمدی بیگم کے بارے میں مولوی ذکاءاللہ ہی نے لکھا کہ ان کے شوہر مرزا منجو کے غدر میں کام آنے کے بعد اپنی بہو اور بیٹیوں کا زیور لے کر خانم کے بازار والی حویلی میں گاڑھنے نکل کھڑی ہوئی۔بہادر شاہ کی ایک بیٹی رقیہ بیگم نے اپنا نکاح حسینی باورچی سے محض اس لیے پڑھایا کہ روز تر دیگی کھانے میں آئے گی۔فاطمہ سلطان نے مشنریوں کے زنانہ اسکول میں وظیفہ دار بن کر معلّمی کا پیشہ اختیار کیا۔محمد شفیع دہلوی نے ایک شہزادے مرزا کالے کی بابت لکھا کہ وہ فقیروں کا بھیس اختیار کر کے ایک گویے کے روپ میں اپنی زندگی بسر کرتے رہے [۲۲۷]۔غرض کہ یہ سارا خاندان اس طرح دربدر ہوا کہ تاریخ میں ایسے الم ناک حالات کم ہی وقوع پذیر ہوئے۔

ظہیر دہلوی جو کہ بہادر شاہ ظفر کے متوسلین میں سے تھے انھوں نے اس ناکام جنگ آزادی کے بعد اپنی آنکھوں سے قیامت

خیز آندھی کو گلی در گلی تباہی و بربادی پھیلاتے ہوئے دیکھا۔اسی حالت میں وہ دربدر کی خاک چھانتے ہوئے دکن پہنچے اور وہی پیوند خاک ہوئے۔ان کا لکھا ہوا شہر آشوب اس دور کی داستان الم ناک ہے۔اس شہر آشوب کے مطالعے سے انگریزوں کے ظلم وستم کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھرنے لگتا ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ دہلی، دہلی نہیں بلکہ انسانوں کا مقتل ہے۔جدھر نگاہ اٹھا کر دیکھیے بے گناہوں کے لاشے دکھائی دیتے ہیں [۲۲۸] ظہیر کے مطابق:

ہر ایک رونقِ بزمِ جہان قتل ہوا	ہر ایک قبلہ ہر خاندان قتل ہوا
ہر ایک طوطیِ شیریں زبان قتل ہوا	ہر ایک بلبلِ نوشیں زبان قتل ہوا
گھروں سے کھینچ کے کشتوں پہ پشتے ڈالے ہیں	نہ گور ہے نہ کفن ہے نہ رونے والے ہیں [۲۲۹]

غدر کے بعد ظہیر کا گھر، مال اور اثاثہ بھی گوروں نے لوٹ لیا۔انھوں نے اپنی خودنوشت سوانح احباب کے اصرار پر ''داستانِ غدر'' کے نام سے لکھی [۲۳۰]۔اس تصنیف میں بھی اس عہد کا پورا منظر نامہ دیکھا جا سکتا ہے۔لیکن شہر آشوب میں جو تڑپ اور الم کی کیفیت دکھائی دیتی ہے وہ نہ صرف پر اثر ہے بلکہ اس دور کی سچی تصویر کا ایک اہم ماخذ بھی ہے۔انگریز فوج نے جس طرح سے شہر دہلی کو تاراج کیا، بغاوت کا الزام لگا کر ہر شخص کو تہ تیغ کیا، نا کردہ گناہوں کی پاداش میں قتل گاہوں کی طرف لے جائے گئے اور سر تن سے جدا کیے گئے، ان تمام مناظر کو دیکھنا ہو تو ظہیر کے اس بند میں دیکھا جا سکتا ہے [۲۳۱]۔ملاحظہ کیجیے:

جہاں کی تشنۂ خوں تیغ آب دار ہوئی	سنانِ نیزہ ہر اک سینے سے دو چار ہوئی
رسن ہر ایک بشر کے گلے کا ہار ہوئی	ہر ایک سمت سے فریاد گیر و دار ہوئی
ہر ایک دشت فضا میں کشاں کشاں پہنچا	جہاں کی خاک تھی جس جس کی وہ وہاں پہنچا [۲۳۲]

ظہیر کے شہر آشوب کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ہڈسن کے ہاتھوں بہادر شاہ ظفر کے بیٹوں اور پوتے کو بے دردی سے قتل کا پورا ماجرا بھی بیان کیا گیا ہے۔اس دل دوز سانحے کی طرف اس دور کے کسی بھی شاعر نے اشارہ نہیں کیا ہے۔ان شہزادوں کی موت پر ظہیر کا نوحہ سنیے [۲۳۳]۔

نہال گلشنِ اقبال پائمال ہوئے	گلِ ریاض خلافت لہو میں لال ہوئے
یہ کیا کمال ہوئے اور کیا زوال ہوئے	کمال کو بھی نہ پہنچے تھے جو زوال ہوئے
جو عطر گل کو نہ ملتے ملے وہ مٹی میں	جو فرشِ گل پہ نہ چلتے ملے وہ مٹی میں [۲۳۴]

اس مسدس کے مطالعے کے بعد قاری ظلم وتشدد کے اس روح فرسا مناظر اور عوام کی بے بسی اور بے چارگی کو کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔ظہیر کو سب سے زیادہ رنج دو باتوں سے ہوا۔اوّل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کی مجبوری و بے بسی اور دوم اہلِ کمال کے قتل کا رنج۔انھوں نے دہلی کی تباہی و بربادی کا جو نقشہ کھینچا ہے اس میں دہلی کے پریشان حال لوگوں کی بدحواسی اور شہر سے بے سروسامانی کے عالم میں راہ فرار اختیار کرتے ہوئے خوف و دہشت کی فضا بھی دکھائی دیتی ہے [۲۳۵]۔ملاحظہ کیجیے:

گلی گلی سے آتی صدائے واویلا	زمیں زمیں سے ہے اٹھتی نوائے واد روا
دکاں دکاں سے ہے گھر گھر سے حشر ہے پیدا	مکاں مکاں سے اٹھا غلغلہ ہے شیون کا

زمیں زمین کے در پے ہے خاک اڑانے کو مکاں مکان کے دوڑے ہے کاٹ کھانے کو [۲۳۶]

کوئی نہیں جانتا کہ اتنی پر تشدد شورش آخر ہوئی کیوں اور اتنی جلدی اس کا خاتمہ کیوں کر ممکن ہوا۔ یہ محض سپاہیوں کی بغاوت تھی، عوامی مدافعت یا دم توڑتی فرسودہ استبدادی حکومت کی آخری کراہیں۔ مارکس نے دہلی میں شکست کے اسباب میں ریجی منٹس میں اختلاف، ہندوؤں اور مسلمانوں میں تفرقہ اور سپاہیوں اور تاجروں کے، کہ جنھیں سپاہیوں نے لوٹا تھا، باہمی اختلاف کو قرار دیا ہے [۲۳۷]۔ بہر حال وجہ کچھ بھی ہو۔ اس ناکام بغاوت کا خمیازہ مسلمانوں کو پوری طرح بھگتنا پڑا۔ اس کی بھاری قیمت بھی انھیں ہی چکانی پڑی۔ ایسے ایسے نام ور مسلمانوں کو چن چن کر قتل کیا گیا جو آئندہ اس قوم کی راہ بری کا فریضا انجام دینے والے تھے۔ اس میں عربی کے جید عالم اور اردو و فارسی کے قادر الکلام شاعر صدر الدین آزردہ بھی شامل تھے۔ وہ اس جنگ آزادی میں برابر کے شریک تھے۔ بہادر شاہ ظفر نے انھیں ہی حکم دیا تھا کہ وہ فوجی مقدمات کی سماعت کریں [۲۳۸]۔ انگریزوں سے جہاد کے سلسلے میں جو فتویٰ جاری ہوا اس پر بھی آزردہ کے دستخط موجود تھے [۲۳۹]۔ دہلی کو دوبارہ فتح کرنے کے بعد انگریزوں نے ان پر فردِ جرم عائد کر کے زندان میں ڈال دیا اور جائیداد، کتب خانہ اور مکان سب ضبط کر لیا [۲۴۰]۔ اس سانحے سے آزردہ کا مسدس شہر آشوب جو کہ گیارہ بند پر مشتمل ہے، اہمیت کا حامل ہے۔ اس شہر آشوب میں آزردہ نے اس مخصوص طبقے کا حال بیان کیا ہے جس سے خود ان کا بھی تعلق تھا۔ وہ دلی کے معاشرے کی تباہی و بربادی کی منظر کشی کے بہ جائے ان افراد کی تباہی و پریشانی کا مرقع پیش کر رہے ہیں جو براہ راست مملکت دہلی پر اثر انداز تھے [۲۴۱]۔ اس باعزت طبقے کا نوحہ لکھتے ہوئے آزردہ کا کہنا تھا کہ:

جن کو دنیا میں کسی سے بھی سروکار نہ تھا اہل و نا اہل سے خلطہ انھیں زنہار نہ تھا
ان کی خلوت سے کوئی واقفِ اسرار نہ تھا آدمی کیا ہے فرشتہ کا بھی واں بار نہ تھا
وہ گلی کوچوں میں پھرتے ہیں پریشاں در در خاک بھی ملتی نہیں ان کو کہ ڈالیں سر پر [۲۴۲]

اس شہر آشوب کے ایک بند میں خواتین کی بے بسی، بے پردگی اور بدنصیبی ذکر بھی بڑے دکھ اور افسوس کے ساتھ کیا ہے۔ اس زمانے کی خواتین میں پردے کا خاص اہتمام ہوتا تھا، سواری کے بغیر وہ قدم نہ باہر نکالتی تھیں، لیکن بدلے ہوئے حالات میں شاعر کے مطابق:

زیور الماس کا جن سے نہ پہنا جاتا بھاری جھومر بھی کبھی سر پہ نہ رکھا جاتا
کانچ کا جن سے دوپٹا نہ سنبھالا جاتا لاکھ حکمت سے اوڑھاتے تو نہ اوڑھا جاتا
سر پہ وہ بوجھ لیے چار طرف پھرتی ہیں دو قدم چلتی ہیں مشکل سے تو پھر گرتی ہیں [۲۴۳]

آزردہ کے آخری ایام بڑی تلخی میں بسر ہوئے۔ دہلی کی تباہی اور اپنی عزت و آبرو کی بربادی سے جو ان کے دل پر گزری، اس کا کچھ اندازہ اس شہر آشوب کے مطالعے سے ہوتا ہے۔ یہ شہر آشوب بھی ''فغانِ دہلی'' میں شامل ہے۔ پہلے ہی بند میں میرٹھ کے کالوں کی یلغار کا ذکر کرتے ہوئے ان کا کہنا تھا کہ یہ مصیبت ان ہی کی وجہ سے اہلِ قلعہ کو جھیلنا پڑی [۲۴۴]۔ آخری بند تو اس قدر پر تاثیر ہے کہ قاری پر ایک رقت سی طاری ہو جاتی ہے۔ اس میں وہ شیفتہ اور صہبائی کو یاد کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

روز وحشت مجھے صحرا کی طرف لاتی ہے سر ہے اور جوشِ جنوں، سنگ ہے اور چھاتی ہے

ٹکڑے ہوتا ہے جگر، جی ہی پہ بن جاتی ہے مصطفیٰ خاں کی ملاقات جو یاد آتی ہے
کیوں کہ آزردہ نکل جائے نہ سودائی ہے قتل اس طرح سے بے جرم جو صہبائی ہو[۲۴۵]

اردو کے صف اوّل کے شاعر مرزا غالب بھی اسی دور سے تعلق رکھتے تھے۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں شروع سے آخر تک دہلی ہی میں مقیم رہے۔ شاعری کے علاوہ ان کے خطوط میں بھی اس الم ناک سانحے کی جانب بہت سے اشارے ملتے ہیں۔ اکرام چغتائی نے ان خطوط میں سے اس لحہ جان کنی سے متعلق تقریباً تمام حوالوں کو اپنے ایک مقالے میں یکجا کر دیا ہے[۲۴۶]۔

غالب کے خطوط ۱۸۵۷ء کے واقعات کی مستند دستاویز کا درجہ رکھتے ہیں۔ آزادی سے قبل اس ہنگامے کی یک رخی تصویر پیش کی جاتی تھی ایسی تصویر جس میں انگریز مورخوں نے ہندوستانیوں کے مظالم کی عکاسی کی ہے۔ غالب کے خطوط تصویر کے دوسرے رخ کا درجہ رکھتے ہیں[۲۴۷]۔ اپنے متعدد خطوط میں انھوں نے اس زمانے کے حالات کی جو تفصیلات بتائی ہیں اس کے مطالعے سے اس مایوس کن صورت حال کا بہ خوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ کبھی وہ عبدالغفور سرور کو لکھتے ہیں کہ:

میں مع زن و فرزند ہر وقت اس شہر میں قلزم خوں کا شناور ہوں[۲۴۸]۔

اور کبھی ہر گوپال تفتہ کو لکھتے ہیں کہ:

یہاں کا حال سن لیا کرتے ہو اگر جیتے رہے اور ملنا نصیب ہوا تو کہا جائے گا ورنہ قصہ مختصر تمام ہوا لکھتے ہوئے ڈرتا ہوں[۲۴۹]۔

ایک اور خط میں دلی کا حال بتاتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

شہر میں اہل اسلام کی آبادی کا حکم نہیں اور ان کے مکانات ورک ہیں ضبط ہو گئے ہیں نہ واگزاشت کا حکم ہے[۲۵۰]۔

اور خوف و دہشت کے عالم میں اپنی زبان بندی کی وجہ بتاتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

واللہ ڈھونڈنے کو مسلمان اس شہر میں نہیں ملتا۔ کیا امیر کیا غریب کیا اہل حرفہ۔ اگر کچھ ہیں تو باہر کے ہیں۔ ہنود البتہ کچھ کچھ آباد ہو گئے ہیں... مفصل حال لکھتے ہوئے ڈرتا ہوں۔ ملازمان بالا پر شدت ہے اور باز پرس اور دارو گیر میں مبتلا ہیں[۲۵۱]۔

قلزم خون کے شناور، مرزا غالب انگریزوں سے خوف زدہ و ہراساں دکھائی دیتے ہیں کہ مبادا باز پرس نہ ہو۔ اسی لیے ہر گوپال تفتہ کے نام ایک خط میں جب وہ یہ کہتے ہیں کہ:

انگریز کی قوم میں سے جوان روسیاہ کالوں کے ہاتھ سے قتل ہوئے، اس میں سے کوئی کوئی میرا امید گاہ تھا اور کوئی میرا شفیق اور کوئی میرا دوست، کوئی میرا یار اور کوئی میرا شاگرد[۲۵۲]۔

تو ان پر انگریز پرست ہونے کی تہمت لگائی جاتی ہے اور اس اتہام اس وقت مہر تصدیق لگ جاتی ہے جب ملکہ وکٹوریا کی شان میں کہے گئے قصیدے میں مبالغہ آرائی سے کام لے کر ان کی تعریف کے پل باندھنے لگتے ہیں۔ الزام تراشی کرنے والے اس وقت یہ بھول جاتے ہیں کہ انقلاب ستاون کے موقع پر منعقد ہونے والے دربار شاہی میں مرزا نے بہادر شاہ ظفر کا مندرجہ ذیل سکہ بھی کہا تھا کہ:

برزرِ آفتاب و نقرہِ ماہ سکہ زد در جہاں بہادر شا[253]

یہ وہی سکہ ہے جس کی وجہ سے غالب عتاب کا شکار بھی رہے جس کے بعد غالب کو بار ہا یہ وضاحت پیش کرنا پڑی کہ یہ سکہ ان کا کہا ہوا نہیں[254]۔ الزام بغاوت سے بریت کا یہ پہلو اس قدر غالب آ گیا کہ غالب کے بارے میں ایک عمومی تاثر یہ بن گیا کہ وہ انگریزوں کے قصیدہ خواں تھے اور ان کا دل باغیوں کے ساتھ نہیں تھا[255]۔ یہاں اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ غالب جیسے دنیادار شخص جس کے اندر قناعت نام کی چیز نہ تھی، اس کی مالی خستہ حالی نے انھیں بڑے بڑوں کی قصیدہ خوانی پر مجبور کیا[256] لیکن اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ غالب:

حب وطن سے عاری تھے یا اپنے ہم وطنوں کے لیے ان کے دل میں کوئی ہم دردی نہ تھی[257]۔

حقیقت تو یہ ہے کہ اس جنگ میں جو امرا اور رؤسا مغل بادشاہ کے ساتھ تھے، ان سے غالب کی عزیز داری تھی۔ ان کے قریبی عزیز ترین احباب میں شیفتہ، آزردہ، مولانا فضل حق خیرآبادی بنفس نفیس اس معرکے میں انگریزوں کے خلاف صف آرا تھے۔ غالب کو ان سے ہم دردی تھی۔ وہ اپنے دوستوں کے لیے پریشان رہتے۔ اس کے ساتھ وہ جنگ آزادی کے اہم ترین رکن بہادر شاہ ظفر کے بھی طرف دار تھے[258]۔ اس کا واضح ثبوت یہ ہے کہ جب آگرے میں انقلابیوں نے اہل برطانیہ کو شکست دی تو جیون لال نے اپنے روزنامچے مورخہ ۱۳ جولائی ۱۸۵۷ء میں لکھا کہ مرزا نوشانے اس خوشی کے موقع پر قصیدہ پڑھ کر سنایا[259]۔ غالب کے کلام میں بھی اس دور کی ترجمانی کے شواہد تلاش کیے جا سکتے ہیں۔ انقلاب ۱۸۵۷ء کی ناکامی کے بعد اہل دہلی کو جس قسم کے مصائب و آلام کا سامنا کرنا پڑا اور ان پر جس طرح عرصہِ حیات تنگ ہوا اس کے روح فرسا مناظر غالب کے درج ذیل قطعے سے بہ خوبی عیاں ہیں۔ ملاحظہ کیجیے:

بس کہ فعال ما یرید ہے آج ہر سلحشور انگلستاں کا
گھر سے بازار سے نکلتے ہوئے زہرہ ہوتا ہے آب انساں کا
چوک جس کو کہیں وہ مقتل ہے گھر بنا ہے نمونہ زنداں کا
شہر دہلی کا ذرّہ ذرّہ خاک تشنہِ خوں ہے ہر مسلماں کا
کوئی واں سے نہ آ سکے یاں تک آدمی واں نہ جا سکے یاں کا
میں نے مانا کہ مل گئے پھر کیا وہی رونا تن و دل و جاں کا
گاہ جل کر کیا کیے شکوہ سوزشِ داغ ہائے پنہاں کا
گاہ رو کر کہا کیے باہم ماجرا دیدہ ہائے گریاں کا
اس طرح کے وصال سے یا رب کیا مٹے دل سے داغ ہجراں کا[260]

یہ قطعہ ۱۸۵۷ء کے حوالے سے خاصا مشہور و مقبول ہوا۔ ابتدا میں غالب کے دیوان میں یہ قطعہ شامل نہیں تھا لیکن بعد میں شائع ہونے والے دیوان میں اس قطعے کو شامل کر لیا گیا۔ ابوالخیر کشفی کے مطابق یہ قطعہ علاؤالدین احمد خاں علائی کے نام ۱۸۵۸ء کے ایک خط میں پہلی بار غالب نے لکھ بھیجا تھا[261]۔ اس قطعے میں غالب نے ایک حقیقت کا اعتراف کیا کہ اس آشوب میں ملاقات کی بھی سبیل نہیں اور اگر کوئی سبیل نکل بھی آئے تو گفتگو کا موضوع سوائے رنج و غم اور تباہی و بربادی کے اور کچھ نہیں[262]۔ داغ ہجراں کی طرف

یہ اشارہ آزادی کی جنگ میں ہلاک ہونے والوں اور حبس دوام بہ عبور دریا شور کی سزا پانے والوں کی فرقت میں شاعر کا نوحہ نہیں؟ غالب کے کلام میں ایسے متعدد اشعار ملتے ہیں جن میں رمز و کنایہ کو بروئے کار لا کر انقلاب کے اثرات کو شعر کے قالب میں ڈھالا گیا ہے۔ اس قسم کے اشعار میں ان کے گہرے مشاہدے اور قومی احساس کی کارفرمائی واضح طور پر دیکھی جا سکتی ہے۔ درد و اثر میں ڈوبے یہ اشعار ان حالات کا نوحہ بھی معلوم ہوتے ہیں اور غالب کے سماجی اور سیاسی شعور کا پتا بھی دیتے ہیں۔ ملاحظہ کیجیے:

گلشن میں بندوبست برنگِ دگر ہے آج　　　قمری کا طوق حلقۂ بیرونِ در ہے آج

آتا ہے ایک پارۂ دل ہر فغاں کے ساتھ　　　تارِ نفس کمندِ شکارِ اثر ہے آج

اے عافیت کنارہ کر، اے انتظام چل　　　سیلاب گریہ درپے دیوار و در ہے آج [۲۶۳]

دلی کی ویرانی کا نقشہ یوں تو ہر شاعر نے کھینچنے کی کوشش کی ہے لیکن اس خطے میں غالب کا انداز دیکھیے جس میں وہ مغلیہ سلطنت کے زوال، تمدن اور معاشرتی تباہی اور قوم کی بے چارگی وہ بے بسی کی سچی تصویر پیش کرتے دکھائی دیتے ہیں:

ایک اہلِ درد نے سنسان دیکھا تھا قفس　　　یوں کہا آتی نہیں اب کیوں صدائے عندلیب

بال و پر دو چار دکھلا کر کہا صیّاد نے　　　یہ نشانی رہ گئی ہے اب بہ جائے عندلیب [۲۶۴]

دہلی کی تباہی و بربادی اور اس پر انگریزی تسلط کے زمانے میں شکست و ریخت کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ غالب کو ہمیشہ بے چین رکھتا۔ اس بابت ان کا یہ شعر دیکھیے:

روز اس شہر میں ایک حکم نیا ہوتا ہے　　　کچھ سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ کیا ہوتا ہے [۲۶۵]

غالب شب و روز کی تخریبی کارروائیوں پر حیرت زدہ ہی نہیں بلکہ اس قتل و غارت گری نے خود ان کی زندگی کو بھی مشکل میں ڈالے رکھا۔ انھوں نے خود اور پورے شہر نے جو جو صعوبتیں دیکھیں اس کی بابت درست لکھا کہ:

ہے موج زن اک قلزمِ خوں کاش یہی ہو　　　آتا ہے ابھی دیکھیے کیا کیا مرے آگے [۲۶۶]

اس سانحے کا شکار ہر شاعر اسی طرح خون کے آنسو رو رہا تھا۔ ایسے شعرا کی فہرست کافی طویل ہے۔ حکیم محمد نقی سوزاں، افسردہ، محسن، شیفتہ، تشنہ، ظہور، مبین، کوکب، عیش، کامل، سالک، صابر، مجروح، داغ، حسامی وغیرہ کے ہاں نمایاں طور پر اس موضوع پر بہت کچھ کلام مل جاتا ہے۔ ان تمام ہی شعرا کے ہاں مرقع ملتا ہے۔ سب ہی کا موضوع تقریباً ایک جیسا ہے۔ انداز نگارش میں بھی یکسانیت پائی جاتی ہے [۲۶۷]۔ غالب کے بعد جن شعرا نے انگلستان کے مظالم کو اپنے اشعار کا بنیادی موضوع بنایا ان میں حسامی اور ناصر کے اشعار میں ملی درد کی جھلک بھی ہے اور سیاسی شعور کی عکاسی بھی۔ بہادر شاہ ظفر کے ضمن میں حسامی سے منسوب ایک غزل کا تذکرہ مذکورہ صفحات میں کیا جا چکا ہے۔ یہ غزل کافی مشہور ہوئی۔ حسام الدین حسامی کو کوئی ان پڑھ شاعر [۲۶۸] اور کوئی نابینا شاعر کہہ کر یاد کرتا ہے [۲۶۹]۔ ان کی آواز اپنے دور کی ایک ایسی آواز تھی جو کل بھی دل کے تاروں کو مرتعش کر رہی تھی اور آج بھی لوگوں کو متاثر کرتی ہے۔ ان کی یہ غزل مندرجہ بالا صفحات میں درج کی جا چکی ہے لیکن اس غزل کے دو اشعار کا حوالہ یہاں نہایت ضروری ہے تاکہ اس دور کے مظالم کا پردہ چاک ہو سکے۔ یہ دونوں اشعار انگریزوں کے مظالم کی شہادت کے طور پر پیش کیے جا سکتے ہیں۔ مرزا غالب نے چوک کو مقتل قرار دیتے ہوئے جو صورت حال بتائی تھی اس کی صحیح معنوں میں تشریح حسامی کے ان اشعار سے ہوتی ہے۔ اس زمانے میں مسلمانوں کی جانب سے

انگریزوں کے دل میں اس قدر کدورت بھری ہوئی تھی کہ جگہ جگہ مسلمانوں کو بے جرم سزا دی جا رہی تھی۔ چاندنی چوک کا شاید ہی کوئی درخت ایسا ہو جس پر کسی مسلمان کو سولی پر چڑھایا نہ گیا ہوں۔ اس صورت حال کی عکاسی ۱۸۵۷ء کے بعد اس اہم واقعے سے بھی ہوتی ہے جب کان پور میں دو مسلمانوں کو محض اس بات پر پھانسی دے دی گئی کہ انھوں نے عیسائیوں کے لیے لفظ نصاریٰ کیوں استعمال کیا۔ سر سید کو لفظ نصاری کی تحقیق کے ضمن میں پورا رسالہ لکھنا پڑا [۲۷۰]۔ حسامی نے بھی اس صورت حال اور ظالمانہ طرز عمل کی عکاسی اپنے ان دونوں اشعار میں کی ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

کیا رعایائے ہند تباہ ہوئی ، کہو ان پہ کیا یہ جفا ہوئی | جسے دیکھا حاکمِ وقت نے ، کہا یہ تو قابل دار ہے
یہ ستم کسی نے بھی ہے سنا ، دیا پھانسی لاکھوں کو بے گناہ | وے لکلمہ گویوں کی طرف سے، ابھی دل پہ ان کے غبار ہے [۲۷۱]

حسامی کی یہ غزل فنی عیوب کے باوجود قبول عام کا درجہ رکھتی ہے۔ مترنم بحر، سادہ اور سلیس انداز اور حوادث کی صحیح ترجمانی کے باعث اسے اردو شاعری میں امتیازی مقام حاصل رہے گا [۲۷۲]۔ ناصر دہلوی کا قلمی دیوان ابوالخیر کشفی کو احمد سلیم اللہ کے ذاتی کتب خانے سے دستیاب ہوا۔ اس دیوان میں بھی تین غزلیں ۱۸۵۷ء سے متعلق ہیں [۲۷۳]۔ ان غزلوں کے اشعار سے بھی دلی کی تباہی و بربادی اور انگریزوں کے مظالم کی تصویر نظروں کے سامنے پھرنے لگتی ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

نقش ہر منظر دیرینہ مٹا آنکھوں سے | چاندنی چوک میں وہ خونِ مسلماں دیکھا
ہر روش خونِ شہیداں سے ہوئی ہے رنگیں | باغ میں بلبلِ بے تاب کو نالاں دیکھا [۲۷۴]

اسی طرح انگریز سرکار کے مظالم، مسلم کشی اور قید و بند کی مصیبتوں کی بابت شاعر کا کہنا تھا کہ:

لہو اس درجہ ارزاں ہو گیا مردِ مسلماں کا | شہادت نامہِ بلبل ہے ہر پتہ گلستاں کا
فرنگی کی نظر میں جرم ہے ایمان کی دولت | کھلا ہے آج اپنے واسطے دروازہ زنداں کا [۲۷۵]

شیفتہ نے انگریزوں سے نفرت اپنے استاد مومن سے ورثے میں لی تھی۔ فتح دہلی کے بعد یہ بھی انگریزوں کے معتوب قرار پائے۔ جاگیر ضبط ہو گئی اور عدالت سے سات برس قید کی سزا بھی ہوئی۔ بعد میں اپیل کے بعد بری بھی ہوئے [۲۷۶]۔ دہلی کی تباہی و بربادی سے متعلق ۱۱۳ اشعار پر مشتمل ایک مرثیہ اہمیت کا حامل ہے۔ یہ مرثیہ مطبوعہ دیوان میں شامل نہیں۔ ''فغانِ دہلی'' میں یہ اشعار شامل ہیں۔ اس مرثیے میں جس طرح سے وہ دہلی کی بربادی پر خون کے آنسو روتے دکھائی دیتے ہیں، اس سے ان کی دلی کیفیات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

ہائے دہلی و زہے دل شدگانِ دہلی | آپ جنت میں ہیں اور دل نگرانِ دہلی
وہی جلوہ نظر آتا ہے تصور میں ہمیں | مٹ گئے پھر بھی یہ باقی ہے نشانِ دہلی
گر نہ کہویں کہ یہ دلی ہے تو ہرگز نہ پڑے | دلّی والوں کو بھی دلّی پہ گمانِ دہلی [۲۷۷]

داغ دہلوی کا تعلق بھی قلعہ معلیٰ سے تھا۔ اس ذہنی اور قلبی لگاؤ سے ان کے بیان میں بھی درد و غم کی شدت پیدا کر دی۔ بہادر شاہ ظفر کے زوال میں انھیں اپنا زوال بھی دکھائی دیا۔ سلطنت دہلی کی تباہی و بربادی داغ کی اپنی تباہی و بربادی تھی۔ ہزاروں لوگوں کی طرح وہ بھی اس صورت حال پر دلّی چھوڑنے پر مجبور ہوئے [۲۷۸]۔ البتہ سن ستاون کے حادثے کے وقت وہ قلعے ہی میں تھے۔ شیخ اسماعیل پانی

پتی کے مطابق دہلی کی شکست کے وقت جب قلعہ خالی ہونے لگا تو یہ بھی بہ حالِ تباہ وہاں سے نکلے۔ جلدی میں بہت سا ابتدائی کلام وہیں رہ گیا[۲۷۹]۔ اس زمانے کے حالات سے متاثر ہو کر انھوں نے جو شہر آشوب لکھا وہ ''فغانِ دہلی'' میں درج ہے۔ فکر و غم کا یہ احساس ان کی اس مسدس میں پوری طرح کارفرما دکھائی دیتا ہے۔ اس کرب و کسک کے دوش بدوش ان کی زبان، طرز ادا اور صداقت کی آمیزش اسے حد درجہ اثر انگیز بنا دیتی ہے[۲۸۰]۔ اسی لیے ان کا شہر آشوب بقول ڈاکٹر سید عبداللہ دلّی کی بربادی سے متعلق سب شہر آشوبوں میں خاص امتیاز رکھتا ہے[۲۸۱]۔ اس نظم کے ابتدائی تین بند تو دہلی کی تعریف و توصیف سے متعلق ہیں۔ چوتھے سے ساتویں بند میں میرٹھ کے سپاہیوں کے دہلی آنے اور دین کے نام پر جنگ و جدال کرنے کا تذکرہ ہے۔ بعد کے بند میں شہر اور عوام کی تباہ حالی کی پردرد تصویر کھینچی گئی ہے۔ ملاحظہ کیجیے

فلک نے قہر و غضب تاک تاک کر ڈالا	تمام پردۂ ناموس چاک کر ڈالا
یکا یک ایک جہاں کو ہلاک کر ڈالا	غرض کہ لاکھ کا گھر اس نے خاک کر ڈالا
جلیں ہیں دھوپ میں شکلیں جو ماہ تاب کی تھیں	کھنچی ہیں کانٹوں پہ جو پتیاں گلاب کی تھیں
برنگ بوئے گل اہلِ چمن، چمن سے چلے	غریب چھوڑ کے اپنا وطن، وطن سے چلے
نہ پوچھو زندوں کو بےچارے کس چلن سے چلے	قیامت آئی کہ مردے نکل کفن سے چلے
مقامِ امن جو ڈھونڈا تو راہ بھی نہ ملی	یہ قہر تھا کہ خدا کی پناہ بھی نہ ملی
جہاز ایسا تباہی میں آ گیا اپنا	ملا نہ تخت ثریٰ تک کہیں پتا اپنا[۲۸۲]

خون آشام واقعات نے جب دہلی چھوڑنے پر مجبور کیا تو کس مپرسی کی حالت میں مقامِ امن اور جائے پناہ کی تلاش اور ہجرت کا کرب وغیرہ جیسے معاملات کے بیان میں داغ نے فن کے عمدہ جوہر دکھائے ہیں۔

اس سانحے کے بعد انگریزوں نے جس طرح سے مسلمانوں کو معاشی طور پر مفلوج کرنے کی کوشش کی، اس صورتِ حال نے بھی داغ کو متفکر کیے رکھا۔ انگریز یہ چاہتے تھے کہ مسلمان کسی طرح بھی ان کے سامنے دوبارہ سر اٹھانے کے قابل نہ رہیں۔ لہٰذا معاشی بد حالی کے نت نئے حربے استعمال کیے گئے۔ اہلِ ہنر اور نوجوانوں کو بے روزگاری کے اندھیرے میں دھکیل دینے اور معاش کے دروازے ان پر بند کرنے جیسے معاملات کو بیان کرتے ہوئے داغ کا کہنا تھا کہ:

پئے محاسبہ پرسش ہے نکتہ دانوں کی	تلاشِ بہر سیاست ہے خوش زبانوں کی
جو نوکری ہے تو اب یہ ہے نوجوانوں کی	کہ حکمِ عام ہے بھرتی ہے قید خانوں کی
یہ اہلِ سیف و قلم کا ہو جب کہ حال تباہ	کمال کیوں نہ پھرے در بدر کمال تباہ[۲۸۳]

بساطِ سلطنت الٹ جانے کے بعد برعظیم میں جس طرح سے تمدن اور معاشرت کا ڈھانچا تباہی و بربادی کا شکار تھا، اس بکھرتے شیرازے کی منظر کشی کرتے ہوئے داغ کا کہنا تھا کہ:

یہ وہ جگہ ہے کہ عبرت پہ عبرت آتی ہے	یہ وہ جگہ ہے کہ شامت پہ شامت آتی ہے
یہ وہ جگہ ہے جہاں بے کسی بھی ڈر جائے	یہ وہ جگہ ہے اجل خوف کھا کے مر جائے[۲۸۴]

میر مہدی مجروح اور قربان علی بیگ سالک کو بھی اس ہنگامے میں دہلی کو خیر باد کہنا پڑا۔ ہنگامے کے فرو ہو جانے کے بعد سالک کا دہلی واپس آنا ثابت نہیں لیکن دشتِ غربت میں بھی وطن کی یاد کو وہ کبھی اپنے دل سے نہ نکال سکے۔ دہلی کی بربادی کی بابت انھوں نے ایک ترکیب بند، ایک غزل اور ایک قطعہ لکھا ہے جو ''فغانِ دہلی'' میں شامل ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

جہاں میں شہر ہیں جتنے جہاں جہاں آباد — بس ان بلاد میں تھا منتخب جہاں آباد
اجڑ کے یاں سے نہ پوچھو ہوا کہاں آباد — گیا عدم کو دوبارہ ہوا وہاں آباد
فلک نے کس سے کہوں کیا مٹا دیا اس کو — ارم کا جوڑ سمجھ کر اٹھا لیا اس کو
یہ انقلاب ہے یا ہے قیامتِ صغرا — کوئی نہیں ہے کہ جس کے رہے ہوں ہوش بجا
ہوئی آدمی کی شکل شہر سے عنقا — بنا ہے ہو کا مکاں بس ہر اک گلی کوچا
ہوئے ہیں لوگ یہاں کے کہاں کہاں آباد — ہر ایک گاؤں بنا ہے مگر جہاں آباد
کسی کے لب پہ ہے نالہ کسی کی چشم ہے تر — کسی کا چاک گریباں ہے اور کوئی مضطر
کسی کا ہاتھ ہے دل پر کوئی ہے تھامے جگر — غرض کہ رنج سے خالی نہیں ہے کوئی بشر
بہ جائے زمزمہ ہر جائے شیون وغم ہے — محلِ عشق تھا یا اب سرائے عالم ہے [۲۸۵]

سالک نے ہجرت کے کرب اور غریب الوطنی کے درد کو بھی اس نظم میں بیان کیا ہے۔ پورا ہندوستان اس وقت جس کس مپرسی کی حالت میں گرفتار تھا، اس میں کوئی کسی کا پرسانِ حال نہ تھا۔ ایسی صورتِ حال میں زندگی گزارنا جس قدر کٹھن اور دشوار ہوتا جا رہا تھا اس کی عکاسی مندرجہ ذیل اشعار میں پوری طرح سے کی گئی ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

سمجھ کے اپنا ٹھکانا جہاں گئے ہم لوگ — ذلیل یاں سے زیادہ ہوئے وہاں ہم لوگ
بنے ہیں طائرِ گم گشتہ آشیاں ہم لوگ — پھرے ہیں امن کے طالب کہاں کہاں ہم لوگ [۲۸۶]

دلّی کی تباہی و بربادی کے مناظر کا بیان ہو یا اس کی بے رونقی کا رونا، سالک کے ہاں ہر منظر بہت واضح ہے۔ ان کے مطابق دلّی اب جیسی دکھائی دے رہی ہے، اس تصویر کو دکھانا بہت تکلیف دہ امر ہے لیکن پھر بھی سالک یہ فریضہ انجام دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

شہر دلّی ہوا کیوں خالی — کیوں مٹی یاں سے صورتِ آدم
روز بازارِ موت دیکھ کے چین — ملک الموت کو نہیں اک دم
ڈھیر کس جا نہیں ہے مُردوں کا — کس زباں پر نہیں فغاں پیہم
نہیں تل دھرنے کو زمیں میں جگہ — مُردے کا دفن ہو بلا سے اہم
خاک آلودگانِ پیشیں پر — یہ نئے طور کا ہوا ہے ستم
ایک کی قبر میں گئے سو اور — تنگیِ جا سے لڑتے ہیں باہم [۲۸۷]

میر مہدی مجروح بھی شکستِ دہلی کے بعد، گھر بار چھوڑ چھاڑ کر در در کی ٹھوکریں کھاتے پیدل پانی پت پہنچے۔ یہاں پہنچ کر بھی وہ دہلی کے حالات جاننے کے لیے ہمیشہ بے تاب رہتے۔ غالب ان کے بار بار پوچھنے پر انھیں ''ان کی دلّی کی باتیں'' لکھ بھیجتے۔ یہی وجہ

ہے کہ غالب کے ہاں دہلی کی تباہی و بربادی کے بارے میں جس قدر تفصیل مجروح کے نام لکھے گئے خطوط میں ملتی ہے، کسی دوسرے کے ہاں نہیں ملتی۔ غالب کے ہی لکھے ہوئے ایک خط مورخہ ۱۶ستمبر۱۸۶۲ء سے ثابت ہوتا ہے کہ اس دوران مجروح ایک بار دہلی آئے اور مشاعرے میں شرکت بھی کی[۲۸۸]۔ ''فریاد دہلی'' میں مجروح کے سات اشعار کی ایک غزل ملتی ہے جس میں دلّی کی تباہی و بربادی کا رونا رویا گیا ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

یہ کہاں جلوہِ جاں بخش بتانِ دہلی — کیوں کہ جنت پہ کیا جائے گمانِ دہلی
ان کا بے وجہ نہیں لوٹ کے ہونا برباد — ڈھونڈے ہیں اپنے مکینوں کو مکانِ دہلی[۲۸۹]

''مرثیہ دہلی'' کے عنوان کے تحت عبدالرزاق قریشی نے بھی کچھ اشعار دہلی کی غم و یاس کی فضا کو پیش کرتے ہوئے درج کیے ہیں۔ ملاحظہ کیجیے:

ذکر بربادیِ دہلی کا سنا کر ہمدم — نیشتر زخمِ کہن پر نہ لگانا ہرگز
آب رفتہ نہیں پھر بحر میں پھر کر آتا — دہلی آباد ہو یہ دھیان نہ لانا ہرگز
وہ تو باقی ہی نہیں جن سے کہ دہلی تھی مراد — دھوکا اب نام پہ دہلی کے نہ کھانا ہرگز[۲۹۰]

۱۸۵۷ء سے متعلق لکھے گئے شہرآشوب اس قیامتِ صغریٰ کی منظوم داستان ہیں۔ میرٹھ کی افواج کے دلّی آنے سے لے کر، چربی والے کارتوس، حکم عدولی پر انگریز افسران کے مظالم اور ردعمل میں انگریز فوجیوں کے قتل کر کے دلّی جانے تک کے واقعات ہوں یا بہادر شاہ ظفر اور شاہی خاندان کو انگریزوں کے خلاف مسلح جنگ میں شرکت پر مجبور کرنے کا معاملہ ہو یا پھر بعد میں پیش آنے والے واقعات جس نے دلّی کی سماجی اور معاشی زندگی کو اتھل پتھل کر کے رکھ دیا۔ ان تمام واقعات کو اس زمانے کے شہرآشوب میں بھرپور طریقے سے پیش کیا گیا ہے۔ ۱۸۵۷ء کے انقلاب میں دوسری جگہوں کی طرح دلّی کے باشندوں کو جن دردناک حالات سے گزرنا پڑا ان کی تفصیل ''فغانِ دہلی'' کے شہرآشوبوں میں دیکھی جا سکتی ہے۔ اس کا قلمی نسخہ مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ میں محفوظ ہے۔ اس نسخے کو محمد تفضّل حسین کوکب نے ۱۸۶۲ء میں مرتب کیا۔ ان شہرآشوب میں ۱۸۵۷ء کی پریشانیوں کے علاوہ دلّی کی عظمت، یہاں کی عمارتوں اور سابقہ عیش و عشرت کا بیان بھی ملتا ہے۔ ڈاکٹر نعیم احمد نے ان تمام شعرا کی فہرست نظم کے عنوان اشعار اپنی تصنیف میں فراہم کر دی ہے[۲۹۱]۔ شہرآشوب کا مطالعہ ہمیں اس دور کے ہندوستان کی سماجی اور سیاسی حالات کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔ ہندوستان کی تاریخ کے اس فیصلہ کن موڑ اور افسوس ناک باب سے متعلق اب تک جتنی بھی نظمیں ملتی ہیں ان میں چند ایک کو چھوڑ کر اکثریت کا تعلق دلّی پر گزری ہوئی واردات سے ہے۔ دلّی کی اس بپتا کو سمجھنے کے لیے یہ نظمیں ہماری مددگار ثابت ہوتی ہیں۔ بہادر شاہ ظفر کی معزولی اور قوم کے ہاتھوں اس کی ذلت نے پوری قوم پر مایوسی کا ایسا احساس پیدا کر دیا کہ متعدد شعرا نے اس غم و یاس کو موضوع بنانا ضروری سمجھا۔ تشنہ نے اس منظر کو بیان کرتے ہوئے اپنی شہرآشوب میں کہا کہ:

زحل کی آنکھ پڑی اتفاق سے نہ گاہ — تمام ہوگیا تاراج ملک کو مال اور جاہ
کہ اس سے ہوگئے بدتر غریب شہنشاہ — رعیت ان کی ہوئی ان سے بھی زیادہ تباہ
وہ ساہوکار نہ تھا جس کی ساکھ میں بٹا — عباس کے نام پر لگتا ہے لاکھ میں بٹا[۲۹۲]

اسی طرح عیش کو بھی تباہی و بربادی کی اس افسوس ناک صورتِ حال کو دیکھ کر یہ کہنا پڑا کہ:

وہ بارگاہ کہ تھا جس کا کتبہ بوس فلک | طواف کرتے تھے جس گھر کا مہر و ماہ تلک
جہاں میں اس کی تھی عظمت سما سے تا بہ فلک | پہنچتا کب تلک اس کے تھا فخر حور و ملک
تباہی ان کے سنا قابل بیان نہیں | کہوں تو کیوں کہ کہوں طاقتِ زبان نہیں[۲۹۳]

پوربی افواج کا مقصد انگریزوں کو شکست دے کر اس مغلیہ سلطنت کا جس سے ان کو گہرا لگاؤ تھا، دوبارہ احیا تھا۔ اس کے باوجود بعض شعرا کچھ تو ذاتی مفاد اور کچھ اپنی مجبوریوں کی وجہ سے پوربی افواج کے اقدام کو ناپسندیدہ نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ لہٰذا انگریزوں کو بے دخل کرنے کے اس عمل کو ان شعرا نے سرکشی و گمراہی، حرام کاری، نمک حرامی، محسن کشی، نادانی اور خلاف ورزیِ مذہب سے موسوم کیا[۲۹۴]۔ مثلاً سوزاں نے اس بابت کہا کہ:

سمجھ میں آتا نہیں کیسی یہ بلا آئی | عدولِ حکمی کی دل پر جو فوج کی چھائی
کہیں یہ کس سے کہو کس کی تھی یہ کم راہی | تھی اپنی زشتیِ اعمال کی یہ رسوائی
بلا یہ پوربی میرٹھ کی جو یہاں لائے | عمل ہمارے مجسم ہو سامنے آئے
رہی کسی کو فراست نہ نامِ دانائی | جو سرورانِ حکومت سے جنگ ٹھہرائی
خمار جاتا رہا ہے قضا نے پلوائی | حصول کچھ نہ ہوا جوز ملالو رسوائی
ہوئے تھے جمع جو نااہل واو نا کارکمین | بلا میں ڈال کے سب کو نکل گئے بے دیں[۲۹۵]

پوربی افواج کی مذمت اور شدید نکتہ چینی کی بڑی وجہ یہ تھی کہ ان افواج کے دلّی میں داخل ہوتے ہیں اعلیٰ طبقے کے افراد کو خاصا نقصان پہنچا۔ ان کی پرسکون زندگی میں خلل آ گیا۔ اسی لیے بعض نظموں میں ان لوگوں کی آمد کو قہر، بلا اور آفت سے تعبیر کیا گیا ہے۔ سالک، ظہیر، داغ اور تشنہ وغیرہ نے تو صاف صاف قتل و غارت گری کا الزام ان پر لگاتے ہوئے کہا کہ[۲۹۶]۔

غضب میں آئی رعیت بلا میں شہر آیا | یہ پوربی نہیں آئے خدا کا قہر آیا[۲۹۷]

تشنہ نے بھی اپنے شہر آشوب میں واضح طور پر لکھا کہ:

تمام شہر تلنگوں نے آ کے لوٹ لیا | مثل ہے بھوکوں کو ننگوں نے آ کے لوٹ لیا[۲۹۸]

سوزاں نے تو ان لوگوں کو اوباش کے لقب سے نوازا۔ ان کے خیال میں یہ لوگ ہندوستانی فوجیوں کی شکل میں آ کر اپنے ہی گھر کو لوٹنے اور برباد کرنے پر تلے بیٹھے تھے۔ جس کسی کھاتے پیتے گھر کو دیکھتے سوزاں کے مطابق:

جو اونچا گھر کوئی تکتے تو اس پہ چڑھ جاتے | فرنگی اس میں ہیں، یہ کہہ کے گھر وہ لٹواتے[۲۹۹]

کچھ شعرا نے حقیقت پسندی کا اظہار کرتے ہوئے اس زوال کا ذمہ دار نہ تو انگریزوں کو قرار دیا اور نہ ہی پوربی افواج کو بلکہ وہ اس آفت کی وجہ اپنی بداعمالی کو قرار دیتے ہیں۔ اس کی عمدہ مثال غلام دستگیر کے مندرجہ ذیل اشعار میں ملتی ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

دل غنی رکھا سخاوت پہ نہ زر والوں نے | شکر نعمت نہ کیا ہم سے بد اقبالوں نے
گھر سے بے گھر جو کیا ہے تو انھیں چالوں نے | پھینکا صحرائے پُر آفت میں انھیں حالوں نے

ظلم گوروں نے کیا اور نہ ستم کالوں نے　　ہم کو برباد کیا اپنے ہی بد اعمالوں نے [300]

مذہب اور حکومتی فرائض سے کوتاہی کا معاملہ ہو یا عیش وعشرت میں پڑ کر حکم رانوں کی کوتاہ نظری، یہ سارے مناظر مبین کے ہاں بڑے واضح ہیں۔ ملاحظہ کیجیے:

ہائے کیا کیا نہ زمانے نے کیے مکروہات　　ناچ اور رنگ میں دن رات گزارے اوقات

عیش میں محو رہے بھول گئے صوم و صلوۃ　　زر کی الفت میں ادا بھی نہ کیے حج و زکوۃ

ظلم گوروں نے کیا اور نہ ستم کالوں نے　　ہم کو برباد کیا اپنے ہی اعمالوں نے [301]

اس ضمن میں مولانا الطاف حسین حالی کا مرثیہ تہذیبی لحاظ سے خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ یہ مرثیہ اپنے ادبی مرتبے کی بنا پر بھی یادگار ہے۔ اس مرثیے کی اہمیت اس وقت اور بھی بڑھ جاتی ہے جب ظہیر دہلوی اور میر مہدی مجروح جیسے شعرا نے بھی اس زمین کو اپنے خیالات کے اظہار کے لیے چنا [302]۔ دلّی کی تباہی و بربادی کے مناظر حالی نے بھی اپنی آنکھوں سے دیکھے۔ اس پُر رونق دلّی میں جہاں حالی نے شیفتہ اور غالب کی صحبتیں اٹھائی ہوں، حالات نے ایسا پلٹا کھایا کہ حالی مغموم اور دل گرفتہ ہو کر دلّی کو مرحوم قرار دیتے ہوئے کہا کہ:

تذکرہ دہلی مرحوم کا اے دوست نہ چھیڑ　　نہ سنا جائے گا ہم سے یہ فسانہ ہرگز

لے کے داغ آئے گا سینے پہ بہت اے سیّاح　　دیکھ اس شہر کے کھنڈروں میں نہ جانا ہرگز

چپے چپے پہ ہیں یاں گوہرِ یکتا تہہِ خاک　　دفن ہوگا نہ کہیں اتنا خزانہ ہرگز [303]

اس تہذیبی مرثیے کا جتنا خوب صورت اظہار حالی کے ہاں ملتا ہے ایسی دوسری مثال اس دور میں کوئی اور نہیں ملتی۔ حالی کا یہ نوحہ ۱۸۵۷ء کے خاصے عرصے بعد لکھا گیا جس کی داخلی شہادتیں اشعار سے بھی مل جاتی ہیں لیکن یہ اشعار دراصل ۱۸۵۷ء میں دلّی کی بربادی کا نوحہ ہیں۔ حالی، مجروح، سالک، داغ، صہبائی، مومن، آزردہ اور ممنون وغیرہ اسی قافلے کے پسماندگان ہیں جن کا ذکر کرتے ہوئے حالی نہ صرف افسردہ ہو جاتے ہیں بلکہ اس وقت ان کی افسردگی میں اور زیادہ اضافہ ہو جاتا ہے۔ وہ یقینی اور حتمی انداز میں اس بزم کے پھر سے زندہ نہ ہونے کا اعلان کرتے ہیں۔ تہذیبی مرثیے کا انداز دیکھیے:

شاعری مر چکی اب زندہ نہ ہوگی ہرگز　　یاد کر کر کے اسے جی نہ کڑھانا ہرگز

غالب و شیفتہ و نیر و آزدرہ و ذوق　　اب دکھائے گا یہ شکلیں نہ زمانہ ہرگز

مومن و علوی و صہبائی و ممنون کے بعد　　شعر کا نام نہ لے گا کوئی دانا ہرگز

داغ و مجروح کو سن لو کہ پھر اس گلشن میں　　نہ سنے گا کوئی بلبل کا ترانہ ہرگز [304]

اس ہنگامے کے ابتدائی زمانے میں جو کامیابیاں ہندوستانی افواج کو ملیں اس سے بہت سے شعرا نے یہ سمجھا کہ اب انگریزوں کا اقتدار محض دنوں کی بات ہے۔ اس موقع پر مولانا محمد حسین آزاد اور مشتاق وغیرہ نے تہنیتی اشعار بھی کہے۔ مشتاق جو کہ ادبی طور پر زیادہ معروف نہیں ہوئے، ان کا ایک قطعہ تہنیت ملتا ہے [305]۔ جنگ آزادی کے دوران جو عید قرباں کا وقت آیا تو بادشاہ نے اس موقع پر برسرِ دربار چند اشعار سنائے تھے جن میں گورا فوج کی شکست کی دعا مانگی گئی تھی۔ جس موقع پر مشتاق نے اپنے دو قطعات بطور تہنیت پیش

کیے۔ یہ اشعار محض بادشاہ کی تعریف پر مبنی نہیں بلکہ اس میں انگریزوں کے خلاف شدید نفرت کا اظہار بھی کیا گیا ہے[۳۰۶]۔ ملاحظہ کیجیے:

عید ہر سال تمھیں تہنیت آموز رہے	غرقِ خوں جانِ عدو خنجرِ خوں ریز رہے
قتل کفار ہوں اور فتح مبارک ہو ظفر	کام کو بھی نہ جہاں میں سرِ انگریز رہے[۳۰۷]

مولانا محمد حسین آزاد کی نظم فتح افواج مشرق میں بھی اسی امید کا اظہار ملتا ہے کہ آزاد کے پوتے آغا محمد باقر کے مطابق آزاد غیر ملکی حکومت سے پرخاش رکھتے تھے اور دہلی اردو اخبار میں ایسٹ انڈیا کمپنی پر بے لاگ تنقید کیا کرتے تھے[۳۰۸]۔ چناں چہ غدر کے بعد تمام پرچے ضبط ہو گئے۔ کچھ پرچے نیشنل آرکائیو آف انڈیا میں محفوظ ہیں۔ ان میں سے ۲۴ مئی ۱۸۵۷ء کے پرچے میں آزاد کی یہ نظم ''تاریخ عبرت افزا'' کے نام سے شائع ہوئی[۳۰۹]۔ چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

کو ملک سلیمان و کجا حکمِ سکندر	شاہانِ اولی العزم و سلاطین جہاں دار
ہوتا ہی ابھی کچھ سے کچھ اک چشم و زدن میں	یاں دیدہِ دل کھول دے اے صاحبِ ابصار
ہے کل کا ابھی ذکر کہ جو قومِ نصاریٰ	تھی صاحبِ اقبال و جہاں بخش و جہاں دار
اللہ ہی اللہ ہے جس وقت کہ نکلے	آفاق میں تیغ و غضب حضرتِ قہار
سب جوہرِ عقل ان کے رہے طاق پہ رکھے	سب ناخنِ تدبیر و خرد ہو گئے بے کار
کام آئے نہ علم و ہنر و حکمت و فطرت	پورب کے تلنگوں نے لیا سب کو وہیں مار
ہاں دیدہِ عبرت کو ذرا کھول تو غافل	ہیں ہند یہاں اہلِ زباں کے لبِ گفتار
حکام نصاریٰ کے بدیں دانش و بینش	مٹ جائے نشاں خلق میں اس طرح سے یک بار
اس واقعہ کی چاہی جو آزاد نے تاریخ	دل نے کہا ''قل فاعتبروا یا اولی الابصار''[۳۱۰]

افسوس کہ شعرا کی نکالی ہوئی تاریخ اور امید افزا تہنیتی پیغامات غلط ثابت ہوئے۔ آزادی کے حصول کی یہ پہلی کوشش پوری طرح ناکام ہوئی۔ انگریزوں نے جلد ہی حالات پر قابو پا لیا اور چن چن کر بدلہ لیا۔ یہ وہ پرآشوب دور تھا جس سے گزرنے کے بعد ہر حساس اور باشعور فرد یہ محسوس کرنے لگا کے نئے حالات کے مطابق معاشرتی زندگی کو بدلنے اور ذہنی ساخت کو بہتر بنانے کی ضرورت ہے۔ یہ احساس سب سے زیادہ مسلمانوں کے اندر پیدا ہوا۔ اس کی وجہ جیسا کہ مذکورہ صفحات میں ذکر کیا گیا کہ انگریز حکمرانوں نے ہندوؤں کے مقابلے میں مسلمانوں پر زیادہ مظالم ڈھائے۔ چناں چہ تحریک آزادی میں اہل قلم نے اسی لیے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اس پس منظر میں اہل قلم خود بھی آزادی کی تحریکوں میں شامل رہے[۳۱۱]۔ اس دور کے متعدد شعرا نے آزادی کے نعرے بھی لگائے اور حب الوطنی کے گیت بھی گائے۔ مولانا آزاد نے اپنی نظم 'حبِ وطن'' میں کہا کہ:

اے آفتابِ حبِ وطن تو کدھر ہے آج	تو ہے کدھر کہ کچھ نہیں آتا نظر ہے آج
تجھ بن جہاں ہے آنکھوں میں اندھیر ہو رہا	اور انتظامِ دل زبر و زیر ہو رہا
بن تیرے ملکِ ہند کے گھر بے چراغ ہیں	جلنے عوض چراغوں کے سینوں میں داغ ہیں
کب تک شبِ سیاہ میں عالم تباہ ہو	اے آفتاب ادھر بھی کرم کی نگاہ ہو[۳۱۲]

جس طرح سے انگریزوں نے اپنی پالیسیاں تبدیل کی اور ہندوؤں اور مسلمانوں میں تفرقہ ڈال کر آزادی کی جدوجہد کو کمزور کرنے کے ہر حربے آزمائے، اس کا ادراک اسی زمانے میں حالی کو ہو چکا تھا۔ اسی لیے انھوں نے کہا کہ:

تدبیر یہ کہتی تھی کہ جو ملک ہو مفتوح — واں پانوں جمانے کے لیے تفرقہ ڈالو [۳۱۳]

پھر اسماعیل میرٹھی نے بھی اسی آزادی کی قدر و قیمت کی بابت کہا کہ:

ملے خشک روٹی جو آزاد رہ کر — تو وہ خوف و ذلّت کے حلوے سے بہتر
جو ٹوٹی ہوئی جھونپڑی بے ضرر ہو — بھلی اس محل سے جہاں کچھ خطر ہو [۳۱۴]

غرض کہ شعرا کی ایک طویل فہرست ہے جنھوں نے آزادی کی نعمت اور اس کی قدر و قیمت کا احساس دلانے کی کوشش کی۔ لیکن اس صورتِ حال میں ایسے بہت سے شعرا کی مثال بھی پیش کی جا سکتی ہے جنھوں نے کھل کر حصول آزادی کی اس پہلی کوشش کی نہ صرف مذمت کی بلکہ میرٹھ کی افواج اور بخت خاں وغیرہ کی ہجو بھی کہی۔ اس قسم کی نظموں میں بخت خاں اور مجاہدینِ آزادی کی مذمت اور انگریزوں کی مدح سرائی کرتے ہوئے ان کے اقتدار اور سلامتی کی دعائیں بھی مانگی گئیں۔ نواب محمد رضا خان عاقل نے اس بابت کہا کہ

آئے تھے روسیاہ کہاں سے وہ نابکار — عالم ہوا تھا جن کے سبب سے خراب و خوار
اپنے ہی حاکموں سے وہ کرتے تھے کارزار — کرتا ہوں عرض یہ میں اگر سن لے کردگار
جس جائے وہ گروہ ہو اس جا خراب ہو — یاں تک کہ بعد مرگ بھی اس پر عذاب ہو
صد شکر کہ اب پھر وہی حکام ہیں بحال — جن کے بحال ہونے سے مخلوق ہے نہال
ہر وقت ان کو رہتا ہے انصاف کا خیال — یارب نہ ہووے ان کو کسی وقت میں زوال [۳۱۵]

اسی طرح محسن نے بخت خاں کو کم بخت جیسے القاب سے یاد کرتے ہوئے کہا کہ:

رہا نہ کوئی حسین اور نہ کوئی وارثِ تخت — مٹانے تخت کو آیا تھا بخت خاں کم بخت [۳۱۶]

امداد صابری نے اپنی تصنیف ''۱۸۵۷ء کے غدار شعرا'' میں ایسے ۱۹ شعرا کا حال اور نمونہ کلام قلم بند کیا ہے جنھوں نے جنگ آزادی کے موقع پر مجاہدین کو نقصان پہنچانے، شہید کرانے اور انگریزوں سے ساز باز کر کے انھیں فتح سے ہم کنار کرانے کی کوشش کی۔ اس فہرست میں نواب یوسف علی خاں والیِ رام پور اور ان کے صاحب زادے نواب کلب علی خاں کا نام بھی شامل ہے۔ نواب یوسف علی خاں انگریزوں کے سب سے بڑے وفادار اور جنگ آزادی کے دشمن تھے۔ روہیل کھنڈ کے بڑے حصے کو انھوں نے انگریزوں کے طوقِ غلامی سے جکڑ کر مجاہدین کو بے رحمانہ اور بے دردی سے قتل کروایا [۳۱۷]۔ اس بابت حقیقت پسندانہ نظر ڈالنے کی ضرورت ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ بہت سے مقامی رہنما جنگ آزادی کو انگریزوں کے خلاف بغاوت سے زیادہ خانہ جنگی اور بدامنی کا شاخسانہ سمجھتے تھے۔ نواب یوسف علی خاں کی دوراندیشی کا نتیجہ یہ نکلا تھا کہ ان کی ریاست باغیوں کے غضب سے محفوظ رہی [۳۱۸]۔ اس کے علاوہ سلیم اللہ قریشی نے ''۱۸۵۷ء کے غداروں کے خطوط'' کے عنوان سے اپنی تصنیف میں غلامی کے خلاف اس مسلح جدوجہد کی داستان کے پوشیدہ باب کو تلاش کرنے کی عمدہ کوشش کی ہے۔ تسلسل کے ساتھ ان خطوط کو پڑھنے سے جنگ آزادی کی ایسی ڈائری پڑھنے کا موقع ملتا ہے جس سے محاذ جنگ کی صورتِ حال نگاہوں کے سامنے آجاتی ہے [۳۱۹]۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کا مرکز تو دہلی تھا لیکن اس سانحے سے برعظیم کا ہر شہر اور ہر خطہ متاثر ہوا۔ حسن وزیبائی کا شہر لکھنؤ بھی اس مہم میں پیش پیش تھا۔ بیگم حضرت محل بنفس نفیس بیرونی قوتوں سے برسرپیکار رہیں۔ شہزادہ فیروز نے اس حویلی ''شیر خوباں'' میں علم حریت بلند کیا تھا اور حصولِ آزادی کے سلسلے میں بڑی سرگرمی دکھائی تھی[۳۲۰]۔ بیگم حضرت محل کو اس بڑی جنگ کی سربراہی اس وقت کے حالات نے پیش کی تھی۔ یہ وہ حالات ہی تھے جنھوں نے اس کے چودہ سالہ فرزند برجیس قدر کو اودھ کا تاج دار بنا دیا تھا۔ یہ کانٹوں بھرا تاج تھا جس کے پہننے کا مطلب تھا طاقت کے غرور میں ڈوبی بے رحم ایسٹ انڈیا کمپنی کے خلاف کھلی بغاوت[۳۲۱]۔ ان کے جذبۂ حریت اور انتظامِ سلطنت کا کرب خود انھی کے کلام میں دیکھا جا سکتا ہے۔ ملاحظہ کیجیے

حکومت جو اپنی تھی، اب ہے پرائی — اجل کی طلب تھی، اجل بھی نہ آئی
نہ تخت اور تختہ، اسیری نہ شاہی — مقدر ہوئی ہے جہاں کی گدائی
زمانہ رکھے گا، پر اپنی نظر میں — مری سرفروشی، میری نارسائی[۳۲۲]

رباب رشیدی نے اپنی نظم میں بیگم حضرت محل کی ان ہی خوبیوں کو سامنے رکھتے ہوئے ان کے جذبۂ حریت، سرفروشی اور قائدانہ صلاحیت کی خوب داد دی ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

> سرفروشانہ قیادت، شاہ بازانہ سرشت / نازشِ اسلاف، فخرِ قوم، شاہِ لکھنؤ / حریت کے رنگ میں ڈوبی ہوئی / ہاں وہی حضرت محل / جہدِ آزادی کا اک پائندہ باب / غلامی کے اندھیرے چاک کرنے کو / کیسی انگریزوں سے ٹکر لی / حمیت اس کو کہتے ہیں، شجاعت اس کو کہتے ہیں[۳۲۳]

لیکن ان تمام کوششوں کے باوجود فتح ونصرت اہلِ وطن کا مقدر نہ بنا۔ شکست وریخت کا جو نتیجہ سامنے آیا، اس کی تفصیل بیان کی جا چکی ہے۔ انگریزوں نے فتح مندی کے نشے میں سرشار نا کام انقلاب کے بعد وہاں کا جو حشر کیا، اس کی بابت نیر مسعود کا یہ اقتباس ملاحظہ کیجیے:

> جن بارونق بازاروں میں زندگی اور زندہ دلی کا ہجوم رہتا تھا، ان میں لاشوں کی کثرت اور انسانی گوشت کے سڑنے سے، تعفن کی وہ شدت ہوئی کہ ایک عرصے تک کتوں اور کرگسوں کے سوا انسان کا اُدھر سے گزرنا مشکل ہو گیا۔ برے بھرے باغ کے تھالے خون سے بھر گئے[۳۲۴]۔

ظاہر سی بات ہے کہ دلّی کے بعد اودھ ہی وہ خطہ تھا جو اس ہنگامے میں دوسرے علاقوں کی نسبت زیادہ قوت اور شدت سے شریک ہوا تھا۔ آزادی کے یہ شعلے ایک عرصے تک اودھ میں فضا کو روشن اور گرم بناتے رہے۔ اسی روشنی میں مولوی احمد اللہ شاہ ایک غیبی اشارے کی طرح اودھ آئے اور ''کاروانِ آزادی'' کے سالار بن گئے۔ انگریزوں نے انھیں اس قدر خطرناک مجرم سمجھا کہ ۱۸۵۸ء میں ان کی گرفتاری پر پچاس ہزار روپے انعام مقرر کیا۔

احمد شاہ کے کارناموں کو فتح محمد تائب لکھنوی نے مثنوی کی صورت میں نظم کیا ہے۔ یہ مثنوی بھی ۱۸۵۷ء کے واقعات کی ایک اہم شاعرانہ دستاویز بن چکی ہے۔ یہ مولانا احمد اللہ ہی تھے جنھوں نے مضافاتِ لکھنؤ میں کمپنی کی فوجوں کو شکست دی تھی۔ انھیں کے ساتھ

معرکے میں ہنری لارینس زخمی ہوکر مرا۔ تائب لکھنوی نے ان واقعات کو بیان کرتے ہوئے کہا کہ [۳۲۵]:

روایت ہے یہ بھی کہ وقت مضاف — لگی گولی اس شیر کے زیرِ ناف
نہ مرہم کوتا زخم جانے دیا — نہ دل پر کبھی میل آنے دیا [۳۲۶]

انگریز مورخین نے بھی انگریزوں کے بے جا مظالم پر شرم وندامت کا اظہار کیا ہے۔ انھوں نے تسلیم کیا کہ ننگِ انسانیت مظالم کا جو سلسلہ مسلمانوں کے خلاف شروع ہوا تھا، وہ سخت جان مسلمان ہی برداشت کر سکے۔ اگر کوئی اور قوم ہوتی تو ان کا نام ونشان تک مٹ جاتا۔ انگریزوں نے اپنی طرف سے ایسا کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی [۳۲۷]۔

۱۸۵۷ء میں سلطنت اودھ کے خاتمے کا ماتم ابھی زبان قلم پر ہی تھا کہ یہ نیا انقلاب رونما ہوا۔ شعرائے لکھنؤ جو پہلے ہی اپنے دیار کے ماتم گسار بنے بیٹھے تھے، اس سانحے سے بھی متاثر ہوئے۔ ''فغانِ دہلی'' میں حکیم آغا جان عیش کا جو کلام ملتا ہے، وہ اس کی شہادت کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔ انھوں نے دہلی اور لکھنؤ کی تباہی جو ہندوستان کی قومی وحدت کی دو علامتیں تصور کی جاتی تھیں، ایک نظم لکھی۔ اس طرح علاقائی اور سیاسی وحدتوں کی ہم آہنگی کے تصور کو پیش کیا [۳۲۸]۔

ہوگئے ویران دہلی و دیارِ لکھنؤ — اب کہاں وہ لطفِ دہلی و بہارِ لکھنؤ
ٹکڑے ہوتا ہے جگر دہلی کے صدمے سن کے عیش — اور دل پھٹتا ہے سن کر حالِ زارِ لکھنؤ [۳۲۹]

لکھنؤ کے حالِ زار پر میر انیس نے بھی اپنے مخصوص انداز میں رباعی لکھی۔ ان رباعیوں کا حلقہ اثر محض اودھ تک محدود نہیں بلکہ انیس کا کمال یہ ہے کہ ان کی دعا سارے ملک کے حالات پر صادق آتی ہے۔ ''انقلابِ ہند'' کے عنوان سے لکھی گئی رباعی ملاحظہ کیجیے:

افسوس زمانہ کا عجب طور ہوا — کیوں چراغ کہن آہ ''نیا دور'' ہوا
اب یاں سے کہیں اور چلو جلد انیس — اب یاں کی زمیں اور فلک اور ہوا [۳۳۰]

''یاں'' کے ٹکڑے کی تاویل مختلف انداز سے کی جا سکتی ہے۔ اسے ''اودھ'' بھی کہا جا سکتا ہے اور ''ہندوستان'' بھی۔ اسی طرح ''اجڑی ہوئی مملکت'' کی ترکیب استعمال کرکے جب وہ کہتے ہیں کہ:

کیوں کر دلِ غمزہ نہ فریاد کرے — جب ملک کو چرغ پیر برباد کرے
مانگو یہ دعا کہ پھر خداوندِ کریم — اجڑی ہوئی مملکت کو آباد کرے [۳۳۱]

سحر لکھنوی کا قصیدہ ''شہر آشوب'' بھی ڈاکٹر نور الحسن کے مطابق ۱۸۵۷ء سے متعلق ہے [۳۳۲]۔ یہ قصیدہ شہر آشوب کی روایت کے مطابق مختلف پیشوں کے افراد کی ناقدری سے متعلق ہے۔ اہلِ کمال اور اہلِ قلم کی معاشی حالت کا رونا روتے ہوئے زمانے کی گردش کا جو منظر سحر نے پیش کیا ہے وہ اس زمانے کے حالات کی عکاسی کے ساتھ ہم سب کے لیے لمحہ فکریہ کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ سحر کے مطابق:

ہیں عطارد کی طرح اہلِ قلم چکر میں — صورتِ بدر ہیں گردش میں تمام اہلِ قلم
نیستی پھیلی ہے اب شہر میں کنگلوں کی طرح — لوگ واقف نہیں دینے سے بجز حرفِ سوال
مدتوں سے نہیں دیکھی ہے روپے کی صورت — لوگ سب بھول گئے سبز تھی رنگت یا لال [۳۳۳]

شہر کی تباہی و بربادی کے ساتھ ہی وہ تمام رونقیں اور روایات بھی اٹھ گئیں جو اس شہر کا خاصا تھیں۔ میر امان علی سحر نے ایک طرف روایات کے مٹنے کا نوحہ لکھتے ہوئے کہا کہ:

عجیب مجمعِ اہلِ کمال تھا افسوس ہزار حیف وہ صحبت فلک نہ دیکھ سکا
نہ پانچوں وقت کی نوبت نہ وردیاں نہ گجر نہ توپ چلتی ہے اب، ہے غضب کا سناٹا [۳۳۴]

تو دوسری جانب وہ ان مکانات کی تباہی اور منہدم کیے جانے کے مناظر دکھاتے ہوئے لوگوں کی بے سروسامانی کی بابت کہتے ہیں کہ:

کسی کا کھد گیا پشتہ کہیں گری دیوار چبوترا کہیں غائب کسی کا دروازہ
جو کچھ خرید کو بازار تک گیا کوئی وہاں سے پھر کے جو آیا تو گھر نہ پہچانا [۳۳۵]

سید مجاور حسین کے مطابق اس دور میں غدر کے واقعات کو سب سے زیادہ بھرپور انداز سے جس شاعر نے پیش کیا وہ منیر شکوہ آبادی تھے [۳۳۶]۔ منیر کے متعلق رام بابو سکسینہ نے لکھا کہ بعد غدر ایک رنڈی مسماۃ نواب جان کے قتل کی سازش میں ان پر مقدمہ چلا اور کالے پانی کی سزا تجویز ہوئی [۳۳۷]۔ غلام رسول مہر نے اس سے ایک قدم آگے بڑھتے ہوئے یہ تک لکھا کہ ۱۸۵۷ء کے جہادِ آزادی میں بعض ایسی شخصیات کو شامل کرلیا گیا جو جس دوام کی سزا پا کر انڈیمان پہنچے [۳۳۸]۔ لیکن تاریخ کو بغور مطالعہ کرنے سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ رنڈی کے قتل کا محض بہانہ تھا بلکہ منیر شکوہ آبادی ان مجاہدین کی آزادی سے متعلق قلمی حمایت کرتے رہے تھے جن کو انگریزوں سے معرکہ ہونے کی یادداشت میں ناکام بغاوت کے بعد پھانسی دے دی گئی۔ اس کا ثبوت نواب تجمل حسین خاں جو اس آزادی کی جنگ میں مع تیس ہزار لشکر شریک تھے، غداروں کی وجہ سے ناکامی کا سامنا کرنا پڑا [۳۳۹]۔ ایک انگریز افسر کی جان بخشی کے وعدے پر خود کو انگریزوں کے حوالے کیا جس کے بعد ان کی خواہش کے مطابق انھیں مکے بھیج دیا گیا لیکن ان کے چھوٹے بھائی نواب سخاوت حسین خاں جو خود بھی اس جنگ میں شریک تھے، برطانوی حکام نے پھانسی پر چڑھا دیا [۳۴۰]۔ منیر نے اس الم ناک حادثے کی تاریخ کہی۔ قطعہ کے آخری دو اشعار یہاں نقل کیے جاتے ہیں:

وہ بے گنہ ہوا تیغِ مرگ سے مقتول عنایت اس کو کیا حق نے گلشنِ جنت
منیر نے یہ کہی اس کے قتل کی تاریخ ہوا شہید امیرِ دلیر با ہمت [۳۴۱]
۱۲۷۴ھ

غلام رسول مہر کے مطابق منیر نے فرخ آباد کے دو اور رئیسوں کے پھانسی پانے پر قطعہ تاریخ کہی [۳۴۲]۔ ان کے بھی دو اشعار ملاحظہ کیجیے:

دونوں جوان نیک، امیرانِ باحشم مقتول تیغ تیز فضا آہ آہ ہائے
تاریخ ان کے قتل کی کافی ہے یہ منیر دونوں شہید راہِ خدا آہ آہ ہائے [۳۴۳]

دونوں قطعات کا جائزہ لینے سے یہ حقیقت سامنے آجاتی ہے کہ منیر جنگ آزادی میں کام آجانے والوں کو مجرم نہیں بلکہ شہید کا لقب عطا کر رہے ہیں۔ اب یہ کیسے ممکن ہے کہ ان رؤسا کے بارے میں کہے گئے قطعات کی خبر مخبروں کے ذریعے انگریز حکام کو نہ ہوئی ہو۔ اسی لیے غالباً انھوں نے باغیوں کا نوحہ لکھنے والے شاعر کا نام بھی باغیوں کی فہرست میں شامل کرلیا [۳۴۴]۔ منیر نے مولانا فضل حق خیر آبادی کا جو مرثیہ لکھا، اسے بھی ۱۸۵۷ء سے متعلق شاعری میں شامل کرنا چاہیے۔ مولانا فضل حق انگریزوں کے قبضۂ دلّی کے بعد کئی دنوں

تک بھوکے پیاسے گھر میں محصور رہے۔ پھر عام معافی کے باوجود انھیں گرفتار کرلیا گیا۔ جائیداد ضبط کرکے کالے پانی کی سزا دی گئی۔ منیر کے مرثیے سے معلوم ہوتا ہے کہ کالے پانی میں وہ مولانا فضل حق خیرآبادی کے ساتھ ساتھ رکھے گئے تھے۔ منیر نے فضل حق خیرآبادی سے متعلق کہا کہ:

مولویِ بے نظیر، فضلِ حق اسمِ شریف	دہلی سے تا لکھنؤ مشتہر و موتمن
نصف قصیدہ کیا سامنے اس کے رقم	ختم ہوا جب تھے وہ ہم دمِ گور وکفن [۳۴۵]

جنگ آزادی کے زمانے میں وہ نواب علی بہادر خاں، والیِ باندہ کے مصاحب تھے۔ اس زمانے میں جھانسی کی رانی لکشمی بائی، تانیتا ٹوپے، اور ڈھونڈو پنت نانا انگریزوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ منیر نے نواب علی بہادر کو انقلاب ۱۸۵۷ء میں شریک ہونے پر آمادہ کیا [۳۴۶]۔ چناں چہ باندہ بھی انگریزوں کے خلاف صف آرا ہوگئے اور راج گڑھ پر حملہ کر کے اس پر قابض بھی ہوگئے [۳۴۷]۔ اس فتح ونصرت کے موقع پر منیر نے کہا کہ:

فتح دی اپنی عنایت سے خدا نے آپ کو	سب عدو مقتولِ تیغ و بستۂ زنجیر ہیں [۳۴۸]

منیر نے اپنی گرفتاری اور قید کے حالات کو اپنے اشعار میں بے محابا پیش کیا ہے۔ جنگ آزادی میں رونما ہونے والے مختلف واقعات کو انھوں نے جس طرح سے اپنے اشعار میں پیش کیا۔ ان کی تاریخی اور ادبی حیثیت سے انکار ممکن نہیں۔ ملاحظہ کیجیے:

کچھ شدائد قید کے کہہ دوں اگر	خون ٹپکے ہر لبِ تقریر سے
باندہ کے زندان میں لاکھوں ستم	سہتے تھے ہم گردشِ تقدیر سے
کوٹھری تاریک پائی مثلِ قبر	تنگ تر تھی حلقۂ زنجیر سے
روٹیاں گوبر کی گویا ملتی تھیں	نان گندم تھی سوا اکسیر سے
گھاس ترکاری کے بدلے تھی نصیب	خشک تر تھی سبزۂ شمشیر سے
ہتھکڑی ہاتھوں میں بیڑی پاؤں میں	ناتواں تر قیس کی تصویر سے [۳۴۹]

انڈیمان میں اپنی اہلیت کی وجہ سے منیر کمشنر کے محکمے میں منشی گیری پر مامور ہوگئے۔ اس طرح وہ قید یا مشقت سے بچ گئے۔ دوسری جانب نواب یوسف علی خاں والیِ رام پور کی کوششوں سے ان کی باقی سزا معاف ہوئی اور وہ ۱۸۶۵ء میں رہا ہوگئے [۳۵۰]۔ ایک نظم ''قید سے نجات'' میں اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے منیر کا کہنا تھا کہ:

بارے آئی نجات کی باری	کھل گیا عقدۂ گرفتاری
رخصت اے دوستانِ زندانی	الوداع اے غمِ گرفتاری
کالے پانی سے ہوتے ہیں رخصت	اشک شادی ہیں آنکھوں سے جاری [۳۵۱]

ایک اور جگہ قید سے رہائی پانے کی خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

آج میں نے قید سے پائی رہائی اے منیر	فضلِ حق سے یہ خوشی کی دوپہر مسعود ہو
اس جزیرے سے سوئے کلکتا ہوتا ہوں رواں	اے خدا ہندوستاں کا اب سفر مسعود ہو [۳۵۲]

''فریادِ زندانی'' کے عنوان سے لکھی گئی نظم میں بھی وہ قید کی صعوبتوں کا حال بتاتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

پڑے ہیں ٹھوکروں میں کاسۂ سر بادشاہوں کے | الٰہی روئے کس کا سر پکڑ کر تاجِ سلطانی
اگر اشیا میسر ہیں تو خود محتاج ہیں قیدی | بڑی قسمت جو روٹی دال مل جائے بہ آسانی
مناجات و دعا و استغاثہ بڑھتے جاتے ہیں | نہیں جاتی نہیں جاتی نہیں جاتی پریشانی [۳۵۳]

اس ہنگامۂ دار و گیر کے وقت امیر مینائی یوں تو دربارِ رام پور اور حیدر آباد دکن کے شاہی خاندان سے جڑے رہے لیکن انھیں بھی لکھنؤ کے زوال نے خون کے آنسو رلایا۔ اسی لیے لکھنؤ کو یاد کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ:

امیر ایسی ادائیں حور و غلماں میں کہاں ہوں گی | رہے گا خلد میں بھی یاد ہم کو لکھنؤ برسوں [۳۵۴]

انھوں نے غزل کے پیرائے میں اس خونیں انقلاب کی کرب ناک فضا کو بڑے موثر انداز سے پیش کی:

قریب ہے یارو روزِ محشر چھپے گا کشتوں کا خون کیوں کر | جو چپ رہے گی زبانِ خنجر لہو پکارے گا آستیں کا [۳۵۵]

جنگ آزادی سے متاثرہ اردو شاعری میں اس دوران تین طرح کے رویے منظر عام پر آئے۔ اوّلاً یہ کہ حقائق پر مصلحت کا رنگ غالب رہا جس کے تحت مجاہدین کی مذمت بھی کی گئی اور انگریزوں کی تعریف۔ اس مصلحت کی وجہ وہ خوف و دہشت کی فضا تھی جو حکومت کی انتقامی طرزِ عمل کا نتیجہ تھی۔ مذکورہ صفحات میں اس کی متعدد مثالیں پیش کی جا چکی ہیں۔ منشی خلیق احمد کی طویل نظم ''سرگزشت دہلی'' کو بھی اس طرز اظہار کی نمائندہ نظم قرار دیا جا سکتا ہے[۳۵۶]۔ سید فضل حسین افسردہ کی اس نظم کو بھی اس ضمن میں شمار کرنا چاہیے، ملاحظہ کیجیے:

ہائے کیا دہلی پہ آفت آ گئی | چین سے بیٹھے تھے آفت آ گئی
سر پہ عالم کے مصیبت آ گئی | فوج کیا آئی قیامت آئی [۳۵۷]

اس سلسلے میں اکثر شاعروں کے مرثیوں، نوحوں اور شہر آشوبوں میں اسباب بغاوت کا تجزیہ کم اور تہذیب و معاشرت کے مٹنے کا غم زیادہ ہے۔ ان شہر آشوبوں میں کوئی خاص قومی نقطۂ نظر کی تلاش بھی بے سود ہے مگر ان میں انقلاب سے متعلق وہ فرقہ وارانہ نظریہ بھی نہیں تھا جو بعد میں ایک خاص مصلحت کے تحت ملک کے اتحاد کے لیے خاص طور پر ضرر رساں ثابت ہوا[۳۵۸]۔ ان فوجوں اور شہر آشوبوں میں شاہی خاندان کی بربادی پر گہرے رنج و غم کا اظہار بھی کیا گیا۔ بعض شعرا نے اس واقعے کو معاشی بدحالی، طبقاتی امتیازات، اخلاقی بے راہ روی اور اعمال بد کے تناظر میں دیکھتے ہوئے سخت تجزیہ بھی کیا اور حکم ران طبقے کی پستی کو اس سانحے کی وجہ قرار دیا۔ ان شعرا نے ۱۸۵۷ء کی ناکام بغاوت کے بعد انگریزوں کے غیظ و غضب اور بے گناہ رعایا کے قتل عام کے ساتھ ساتھ لاکھوں ہندوستانیوں کو گولیوں کا نشانہ بنائے جانے اور توپوں کے دہانوں سے اڑائے جانے کے مناظر کو بھی قلم بند کیا[۳۵۹]۔ نظم کے پہلو بہ پہلو غزل بھی اس سانحے سے پوری طرح متاثر ہوئی۔ اس دور میں کئی ایسی غزلیں کہی گئیں جو شہر آشوبوں کی کیفیت لیے ہوئے ہیں۔ ان غزلوں میں عظمت گم گشتہ کا ماتم بھی کیا گیا اور اس دور کے سیاسی، سماجی، معاشی اور تہذیبی المیے کو بہ خوبی اجاگر کیا گیا۔ ان آشوبیہ غزلوں میں درد و الم، تباہی و بربادی کے ساتھ ساتھ اہلِ علم و ہنر کی ناقدری، دہلی کی تباہی، مستورات کی بے حرمتی، جامعہ مسجد کی ویرانی اور قلعہ کی بربادی جیسے موضوعات کو پہلی بار کھل کر غزل کے پیرائے میں جگہ ملی۔ ان غزلوں کی وجہ سے غزل کے مزاج میں واضح فرق پیدا ہوا۔ سر سید اور حالی کو سوچنا پڑا کہ شاعری بھی قومی ہتھیار کے طور پر کام آ سکتی ہے۔ حکیم محمد احسن، ممتاز بجنوری احقر، نواب شہاب الدین ثاقب، مرزا داغ دہلوی، رضا علی عاقل،

مولانا حالی اور دیگر بہت سے شعرا[۳۶۰] کی غزلوں میں اس بدلتے ہوئے رجحان کو محسوس کیا جاسکتا ہے۔

۱۸۵۷ء کا ہنگامہ دارو گیر جان و مال اور املاک کی تباہی کا سبب تو بنا ہی تھا مگر اس سے زیادہ اندہ ناک بات یہ ہوئی کہ یہ سیلاب ڈیڑھ سو برس کے لگ بھگ کے عرصے میں جڑیں جمانے والی ہندی مغل تہذیب کے مشترکہ سرمائے کو اپنی لہروں میں اس طرح بہا لے گیا کہ آنے والی نسلوں کے لیے اس کی یادوں کے سوا کچھ نہ بچا[۳۶۱]۔ اس وقت کی اردو شاعری درد و کرب، افراتفری، مایوسی اور تذبذب کی آئینہ دار تھی۔ انگریز سامراج نے نہ صرف ۱۸۵۷ء میں بلکہ اپنے پورے دور حکومت میں اسی تشدد سے کام لیا۔ سیاسی تحریک آزادی کا گلا گھونٹنے کی کوشش کی۔ عام لوگوں کے ساتھ جو سلوک ہوا سو ہوا اس وقت کے عالموں، قومی دانش وروں پر سخت مظالم ڈھائے گئے۔ غالب کی پنشن کی بندش کا معاملہ ہو یا صدرالدین آزردہ کی جائیداد کی ضبطی، شیفتہ کی سات برس قید ہو یا امام بخش صہبائی کو توپ کے منھ سے باندھ کر اڑائے جانے کا واقعہ[۳۶۲]۔ جس پر آزردہ نے کہا تھا کہ:

کیوں کر آزردہ نکل جائے نہ سودائی ہو	قتل اس طرح سے بے جرم جو صہبائی ہو[۳۶۳]

ان تمام حالات اور واقعات نے آنے والے انقلاب کی راہ ہموار کی۔ حصولِ آزادی کی جدوجہد کی تکمیل کو مزید ڈیڑھ صدی کا عرصہ لگا۔ اس دوران متعدد سانحات نے ہندوستان کی تہذیبی اور سیاسی زندگی کو ہیجان میں مبتلا رکھا۔ ان تمام سانحات کی تفصیل آئندہ ابواب میں پیش کی جائے گی لیکن یہاں اس امر کا اظہار ضروری ہے کہ ان واقعات نے انگریز دشمنی کے جذبات کو تیز تر کرنے میں بہت اہم کردار ادا کیا۔

۱۸۵۷ء کے اس مختصر جائزے سے اس بات کا بہ خوبی اندازہ ہوجاتا ہے کہ ان ناکام جنگ آزادی سے پیدا ہونے والی صورتِ حال کو ہمارے شعرا نے بہ حسن وخوبی اجاگر کیا۔ شعرا کی یہ فہرست بہت طویل ہے۔ ان میں اہم ترین شعرا کے بیانیے کو یہاں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ صفحات کی کمی کے باعث متعدد شعرا کا یہاں ذکر نہیں کیا گیا جنھوں نے اس موضوع کو بھرپور انداز سے اظہار خیال کا موضوع بنایا۔ اس اظہار کے لیے کوئی باقاعدہ منصوبہ بندی دکھائی نہیں دیتی۔ کوئی لے آؤٹ یا فارم بھی مختص نہیں کیا گیا۔ موزونی طبع کے لحاظ سے شعرا کو بھی مروجہ ہیئت پسند آئی محسوسات اور مشاہدے کی عکاسی کا ذریعہ بنی۔ واقعات کی ترجمانی کہیں صاف اور واضح طور پر کی گئی اور کہیں رمز و کنایے سے کام لے کر ان موضوعات کو پیش کیا گیا۔ لیکن ان تمام صورتِ حال میں یہ بات تو عیاں ہے کہ شعرا نے اس خارجی ماحول سے خود کو الگ تھلگ نہیں رکھا[۳۶۴]۔ البتہ مختلف ذہنی اور سماجی رابطوں کی وجہ سے غدر کے واقعات سے متعلق اردو شاعری کا طرز فکر الگ الگ رہا۔ اکثر نے ان سیاسی وجوہ کا ذکر نہیں کیا جس کی وجہ سے یہ سانحہ رونما ہوا۔ کچھ نے انگریزوں کے ساتھ اپنے مستقبل کو وابستہ کر کے خاموشی اختیار کرنا ہی بہتر جانا۔ تاہم چند شعرا ایسے ضرور تھے جنھوں نے غدر کے اسباب و علل پر غور بھی کیا اور اسے آزادی کی جنگ سمجھ کر اس میں شریک بھی ہوئے[۳۶۵]۔ مختلف شہروں اور صوبوں میں جنگ آزادی کی حمایت اور مخالفت میں شعرا کے گروہ نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اکثر نے مغلیہ سلطنت کی بساط الٹ جانے کے بعد اپنے دکھ کا اظہار بھی کیا اور انگریزوں کے مظالم پر سخت تنقید بھی کی۔ اس کی ایک مثال الٰہ آباد کے غزل گو شاعر مولوی وحیدالدین وحید کی دے کر بات ختم کرنے کی کوشش کروں گا جو دور افتادہ قصبے کے درویش صفت شاعر تھے۔ اپنی ایک غزل میں بڑے سوز و گداز کے ساتھ وہ یہ کہنے پر مجبور ہوئے کہ[۳۶۶]:

لالۂ خوش رنگ تھا جانِ چمن کیا ہوگیا	جلوۂ شمعِ شبستانِ چمن کیا ہوگیا

اے صبا نشوونمائے غنچہ و گل کیا ہوئی	آب و رنگِ خوب رویانِ چمن کیا ہوگیا
تختہ ہائے ارغوان و لالہ و گل کیا ہوئے	کشورِ آباد، سلطانِ چمن کیا ہوگیا[۳۶۷]

اس پورے منظر نامے کو آج ڈیڑھ صدی بعد بھی مختلف انداز سے جانچنے اور پرکھنے کی کوشش کی جاتی رہی ہے۔ دور جدید کے شعرا نے بھی اس موضوع پر بہت کچھ کہا۔ اکثر نے جنگ آزادی کے سرفروشوں کو خراج تحسین پیش کیا۔ ان شہیدوں کی یاد میں نظمیں کہیں اوران سے عقیدت کا اظہار کرتے ہوئے کہا گیا کہ:

اے شہیدانِ وطن! اے سرفروشانِ وطن	مرحبا! صد مرحبا! اے جاں نثارانِ وطن
ہے تمھارے خون سے رنگیں گلستانِ وطن	زندگی کو زندگی کا ساز و ساماں مل گیا
اک جہاں کو دردِ محکومی کا درماں مل گیا	جہدِ آزادی کو افسانے کا عنواں مل گیا
تم نے زورِ دست و بازو آزما کر دم لیا	پنجۂ اغیار سے دامن چھڑا کر دم لیا
صفحۂ محکومیِ انساں الٹ کر رکھ دیا	جبر و استبداد کا پانسا پلٹ کر رکھ دیا
آفتوں میں گھر کے تم نے منھ کبھی موڑا نہیں	موت کی آغوش میں پل کر بھی جی چھوڑا نہیں
جادۂ ہمت شکن سے تم گزر کر ہی رہے	چیر کر گرداب کا سینہ ابھر کر ہی رہے
ساحلِ مقصود پر آخر اتر کر ہی رہے	اے شہیدانِ وطن! تم زندہ جاوید ہو
سچ تو یہ ہے، تم شبِ تاریک میں ناپید ہو	چرخِ ظلمت پر درخشاں غیرتِ خورشید ہو[۳۶۸]

حقیقت یہی ہے کہ سامراج دشمنی کی روایات کا جب ذکر کیا جائے گا جنگ آزادی کے ان شہدا کو ضرور یاد کیا جائے گا۔ مذکورہ بالا نظموں کی اہمیت شاعری کے معیارات کے لحاظ سے خودہ کچھ بھی ہو لیکن اس پرآشوب دور کی تاریخ مرتب کرنے کے لیے یہ تمام منظومات ایک مستند اور قابل اعتبار حوالے کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان نظموں کو تاریخ ہند کے ایک خونیں باب کے مرکز کے طور پر دیکھنا چاہیے۔ دورِ جدید میں کچھ لکھنے والوں نے اس تحریک کو رجعت پسندانہ تحریک قرار دے کر اس کی حیثیت کم کرنے کی کوشش کی۔ ان کا موقف ہے کہ اس پوری تحریک کا مقصد شہنشاہیت اور جاگیرداری کا احیا تھا[۳۶۹] لیکن وہ لوگ استعماری قوتوں کی چالوں کو سمجھنے سے قاصر ہیں۔ وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ یہی وہ استعماری چالیں تھیں جن کی وجہ سے ہندوستان کے لوگوں کو معاشی اور سماجی انقلاب کے سنہرے خواب دکھا کر ان کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت تک چھین لی تھی۔

حوالہ جات

۱۔ کامران، طاہر، ''رنجیت سنگھ کے بعد انتشار کا دور: ۱۸۳۹ء۔ ۱۸۴۹ء''، مشمولہ: سہ ماہی ''تاریخ''، پنجاب اور سکھ تاریخ نمبر، شمارہ۱۴، جولائی۲۰۰۲ء،ص۱۵۹۔۱۶۰

۲۔ علی، ڈاکٹر مبارک، ''ایسٹ انڈیا کمپنی''، مشمولہ: سہ ماہی ''تاریخ''، شمارہ۸، جنوری۲۰۰۱ء،ص۱۵۱۔۱۵۵

۳۔ وائلڈ، انتونی، "The East India Company: Trade and Conquest from 1600"، Lyons Press، 2000

۴۔ صدیقی، پروفیسر ریاض، ''ایسٹ انڈیا کمپنی کی کہانی''، مشمولہ: سہ ماہی ''تاریخ''، لاہور، اکتوبر۲۰۰۳ء،ص۱۴۲۔۱۴۶

۵۔ سنگھ، سنگٹ، "The Sikhs in History"، سنگھ برادرز، دہلی، ۲۰۰۲ء،ص۱۲۱

۶۔ گریوال، جے۔ ایس۔ "The Sikhs of the Punjab"، کیمبرج یونی ورسٹی پریس، ۱۹۹۱ء،ص۱۱۹۔۱۲۱

۷۔ سنگھ، سنگٹ،ص۱۲۸۔۱۲۹

۸۔ گریوال،ص۱۲۲

۹۔ کامران،ص۱۶۶۔۱۶۹

۱۰۔ جالبی، جمیل، ''تاریخ ادب اردو''، جلد اوّل، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۱۹۸۹ء،ص۶۶۱

۱۱۔ شاہ، مراد، بہ حوالہ ''ڈاکٹر جمیل جالبی''، جلد اول، ۱۹۸۹ء، ص ۶۶۱۔۶۶۲

۱۲۔ شیرانی، حافظ محمود، ''پنجاب میں اردو''، حصہ اول، مقتدرہ قومی زبان پاکستان، اسلام آباد، ۱۹۹۸ء،ص۲۷۹

۱۳۔ دت، نامدار خان، بہ حوالہ: حافظ محمود شیرانی، محولہ بالا،ص۲۸۰۔ ۲۸۲

۱۴۔ شیرانی،ص۲۸۳۔۲۸۴

۱۵۔ بٹالوی، محمد غوث، بہ حوالہ: حافظ محمود شیرانی، محولہ بالا،ص۲۸۳

۱۶۔ شیرانی،ص۲۸۸

۱۷۔ پسروری، ولی محمد دلشاد، بہ حوالہ: حافظ محمود شیرانی، محولہ بالا،ص ۲۸۸

۱۸۔ شیرانی،ص۲۸۸۔۲۹۰

۱۹۔ پسروری، بہ حوالہ: حافظ محمود شیرانی، محولہ بالا،ص۲۹۱

۲۰۔ محمود الرحمٰن، ''جنگ آزادی کے اردو شعرا''، قومی ادارہ برائے تحقیق وثقافت، اسلام آباد، ۱۹۸۶ء،ص۶۷

۲۱۔ کامران،ص۱۷۲

۲۲۔ گرفن، سرلیپل ہنری، ''تمہید''، مشمولہ: سہ ماہی ''تاریخ''، پنجاب اور سکھ تاریخ نمبر، شمارہ۱۴، جولائی۲۰۰۲ء،ص۱۸۱۔۱۸۳

۲۳۔ بھٹا، پروفیسر ڈاکٹر سعید، ''بیرونی حملہ آوروں پر پنجابی واریں''، مشمولہ: ''تحقیق نامہ''، شمارہ۲۳، جولائی تا دسمبر۲۰۱۸ء،ص۱۱۔۱۲

۲۴۔ محمد، شاہ، ''جنگ ہند پنجاب''، مرتبہ محمد آصف خاں، عزیز بک ڈپو، لاہور، ۱۹۷۲ء،ص۱۴۴۔۱۵۳

۲۵۔ بھٹا،ص۱۲۔۱۳

۲۶۔ مٹک، بہ حوالہ: ''پنجاب دیاں واراں''، از گنڈا سنگھ، پبلی کیشن بیورو، پنجابی یونی ورسٹی، پٹیالہ، ۱۹۹۴ء،ص۱۹۶

۲۷۔ بھٹا،ص۱۳

۲۸۔ بہ حوالہ: قیصرانی، م۔ ی۔ ''سرائیکی تاریخی واراں''، ری پبلکن بکس، لاہور، ۱۹۹۴ء،ص۹۳

۲۹۔ بھٹا،ص۱۳۔۱۴

۳۰۔ بہ حوالہ: اعجاز، اے۔ ڈی۔ ''کان بلیندی''، پنجابی ادبی بورڈ پاکستان، لاہور، ۱۹۸۳ء،ص۱۳

۳۱۔ بہ حوالہ: اعجاز، اے۔ ڈی۔ محولہ بالا، ص۱۳۰

۳۲۔ بھٹا، ص۱۴

۳۳۔ محمود الرحمٰن، ص۶۶

۳۴۔ ذوالفقار، ڈاکٹر غلام حسین، ''اردو شاعری کا سیاسی اور سماجی پس منظر''، مطبع جامعہ پنجاب، لاہور، ۱۹۶۶ء، ص۸۰

۳۵۔ کشفی، ابوالخیر، ''اردو شاعری کا سیاسی اور تاریخی پس منظر''، ادبی پبلشرز، کراچی، ۱۹۷۵ء، ص۴۰

۳۶۔ فراقی، کنور پریم کشور، ''وقائع عالم شاہی''، سلسلۂ مطبوعات کتاب خانۂ رام پور ہندوستان پریس، رام پور، ۱۹۴۹ء، ص۱۴۱

۳۷۔ لی پولڈ، کیپٹن وان آرچ، "Travel in India", vol. II، لانگ مین پبلشرز، لندن، ۱۸۴۵ء، ص۲۱

۳۸۔ ذوالفقار، ص۸۰

۳۹۔ کشفی، ص۴۰۔۴۱

۴۰۔ ذکا اللہ، مولوی، ''تاریخ ہند''، جلد ۱۰، علی گڑھ پریس، علی گڑھ، ۱۹۱۵ء، ص۳۴۶

۴۱۔ کشفی، ص۴۲

۴۲۔ ذوالفقار، ص۸۱۔۸۲

۴۳۔ حسین، سید غلام، ''سیر المتاخرین''، جلد دوم، کلکتا، ۱۲۴۸ھ، ص۱۰۰

۴۴۔ ذوالفقار، ص۸۳۔۸۴

۴۵۔ عزیز، اے۔ "Discovery of Pakistan"، شاہ غلام علی پبلشرز، لاہور، ۱۹۵۷ء، ص۱۹۲

۴۶۔ جعفری، رئیس احمد، ''واجد علی شاہ اور ان کا عہد''، کتاب منزل، دہلی، ۱۹۵۸ء، ص۳۱۲۔۳۱۵

۴۷۔ سکسینہ، رام بابو، ''تاریخ ادب اردو''، مترجم: مرزا محمد عسکری، لکھنؤ، ۱۹۵۱ء، ص۲۵۴

۴۸۔ محمود الرحمٰن، ص۳۷۔۴۷

۴۹۔ وزیری، نواب وزیر علی خان، بہ حوالہ: ''جنگ آزادی کے اردو شعرا''، محولہ بالا، ص۴۷

۵۰۔ محمود الرحمٰن، ص۴۷

۵۱۔ کمال، شاہ کمال الدین، بہ حوالہ: ''جنگ آزادی کے اردو شعرا''، محولہ بالا، ص۴۷۔۵۷

۵۲۔ عقیل، ڈاکٹر معین الدین، ''تحریک آزادی میں اردو کا حصہ''، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی، ۱۹۷۶ء، ص۱۷۴

۵۳۔ محمود الرحمٰن، ص۷۶

۵۴۔ ذاکر اللہ، ڈاکٹر محمد، ''اردو شاعری پر سیاسی اثرات''، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۱۱ء، ص۱۳۳

۵۵۔ انشاء، انشاء اللہ خاں، بہ حوالہ: ''اردو شاعری پر سیاسی اثرات''، محولہ بالا، ص۱۳۳

۵۶۔ خان، ڈاکٹر صابر علی، ''سعادت یار خان رنگین''، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی، ۱۹۵۶ء، ص۱۹۳

۵۷۔ رنگین، سعادت یار خان، بہ حوالہ: ڈاکٹر صابر علی، محولہ بالا، ص۱۹۵

۵۸۔ احمد، ڈاکٹر نعیم، ''شہر آشوب کا تحقیقی مطالعہ''، ادبی اکادمی، علی گڑھ، ۱۹۷۹ء، ص۱۵۵

۵۹۔ رنگین، سعادت یار خان، بہ حوالہ: ڈاکٹر صابر علی، محولہ بالا، ص۱۹۶

۶۰۔ ذاکر اللہ، ص۱۳۴

۶۱۔ جان صاحب، میر یار علی، بہ حوالہ: ''شہر آشوب کا تحقیقی مطالعہ''، محولہ بالا، ص۱۵۷

۶۲۔ جان صاحب، میر یار علی، ''دیوانِ جان صاحب''، نیر پریس،

لکھنؤ،سن ندارد،ص۵۹۹۔۶۰۳

۶۳۔ احمد،ص۱۵۷

۶۴۔ جان صاحب، میر یار علی، بہ حوالہ: ''شہر آشوب کا تحقیقی مطالعہ''، محولہ بالا،ص۱۵۸

۶۵۔ ایضاً،ص۱۵۷

۶۶۔ جان صاحب، میر یار علی، بہ حوالہ: ''اردو شاعری پر سیاسی اثرات''،محولہ بالا،ص۱۳۵

۶۷۔ جان صاحب، میر یار علی، بہ حوالہ: ''شہر آشوب کا تحقیقی مطالعہ''، محولہ بالا،ص۱۵۸

۶۸۔ جان صاحب، میر یار علی، بہ حوالہ: ''اردو شاعری پر سیاسی اثرات''،محولہ بالا،ص۱۳۵

۶۹۔ جان صاحب، میر یار علی، بہ حوالہ: ''شہر آشوب کا تحقیقی مطالعہ''، محولہ بالا،ص۱۵۷

۷۰۔ احمد،ص۱۵۹

۷۱۔ عیشی ،طالب علی، بہ حوالہ: ''شہر آشوب کا تحقیقی مطالعہ''،محولہ بالا، ص۱۵۹

۷۲۔ احمد،ص۱۶۰

۷۳۔ نامعلوم، بہ حوالہ: ''شہر آشوب کا تحقیقی مطالعہ''،محولہ بالا،ص۱۶۰

۷۴۔ ایضاً،ص۱۶۱

۷۵۔ احمد،ص۱۶۲۔۱۶۳

۷۶۔ نامعلوم، بہ حوالہ: ''شہر آشوب کا تحقیقی مطالعہ''،محولہ بالا،ص۱۶۳

۷۷۔ کشفی،ص۲۶۹۔۲۷۰

۷۸۔ احمد،سید محمد تقی، ''تاریخ اودھ''، مشمولہ: سہ ماہی ''ہندوستانی''،الہ آباد،جنوری۱۹۴۲ء،ص۲۷۳

۷۹۔ کشفی،ص۲۷۱۔۲۷۲

۸۰۔ ایضاً،ص۲۷۳

۸۱۔ احمد،سید محمد تقی،ص۲۷۳

۸۲۔ کشفی،ص۲۷۲۔۲۷۳

۸۳۔ خان، نجم الغنی، ''تاریخ اودھ''، جلد پنجم، مطبع نول کشور، لکھنؤ، ۱۹۱۹ء،ص۶۰۔۱۱۵۹

۸۴۔ کشفی،ص۲۷۳۔۲۷۴

۸۵۔ ذاکر اللہ،ص۱۳۶

۸۶۔ کشفی،ص۲۷۴

۸۷۔ شرر، عبدالحلیم، بہ حوالہ: ''ہندوستان کی تحریک آزادی اور اردو شاعری''، از گوپی چند نارنگ، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی،۲۰۰۳ء،ص۲۷۷

۸۸۔ نا معلوم، بہ حوالہ: ''ہندوستان کی تحریک آزادی اور اردو شاعری''،محولہ بالا،ص۲۷۷

۸۹۔ شرر، عبدالحلیم، ''مقدمہ''، مشمولہ: ''حزن اختر''، از محمد واجد علی شاہ، دائرہ ادبیہ، لکھنؤ، ۱۹۲۲ء،ص۱۶۔۱۷

۹۰۔ شاہ، محمد واجد علی، ''حزن اختر''، دائرہ ادبیہ، لکھنؤ، ۱۹۲۲ء، ص۳۴۔۳۵

۹۱۔ ایضاً،ص۳۰۔۳۱

۹۲۔ ایضاً،ص۳۶۔۳۸

۹۳۔ شاہ، واجد علی، بہ حوالہ: ''اردو شاعری پر سیاسی اثرات''،محولہ بالا، ص۱۳۸

۹۴۔ شاہ،ص۴۷

۹۵۔ شاہ، واجد علی، بہ حوالہ: ''اردو شاعری پر سیاسی اثرات''،محولہ بالا، ص۱۳۸

۹۶۔ ایضاً

۹۷۔ ذاکراللہ،ص۱۳۸۔۱۳۹

۹۸۔ شاہ، واجد علی، بہ حوالہ: ''اردو شاعری پر سیاسی اثرات''، محولہ بالا، ص۱۳۹

۹۹۔ ایضاً

۱۰۰۔ ایضاً

۱۰۱۔ ایضاً

۱۰۲۔ ذاکراللہ،ص۱۳۹

۱۰۳۔ شاہ، واجد علی، بہ حوالہ: ''جنگ آزادی اور اردو شعرا''، محولہ بالا، ص۷۷

۱۰۴۔ محمودالرحمٰن،ص۷۷

۱۰۵۔ شاہ، واجد علی، بہ حوالہ: ''جنگ آزادی اور اردو شعرا''، محولہ بالا، ص۷۷

۱۰۶۔ ایضاً

۱۰۷۔ محمودالرحمٰن،ص۷۸

۱۰۸۔ شاہ، واجد علی، بہ حوالہ: ''جنگ آزادی اور اردو شعرا''، محولہ بالا، ص۷۸

۱۰۹۔ ایضاً

۱۱۰۔ برلاس، مرزا علی اظہر، ''واجد علی شاہ اختر''، مشمولہ: سہ ماہی ''اردو''، کراچی، شمارہ۴، ۱۹۶۸ء،ص۸۱

۱۱۱۔ محمودالرحمٰن،ص۷۹

۱۱۲۔ ذاکراللہ،ص۱۳۹۔۱۴۰

۱۱۳۔ اشرف، آغا جو، بہ حوالہ: ''اردو شاعری پر سیاسی اثرات''، محولہ بالا،ص۱۴۰

۱۱۴۔ جعفری، ڈاکٹر قمقام، ''شہر آشوب''، مشمولہ: سہ ماہی ''اردو''، کراچی، شمارہ۲، ۱۹۷۷ء،ص۱۶۵

۱۱۵۔ فرقت، دیبی پرشاد، بہ حوالہ: ''جنگ آزادی کے اردو شعرا''، محولہ بالا،ص۷۹۔۸۰

۱۱۶۔ شہید، بہ حوالہ: ''اردو شاعری کا سیاسی و تاریخی پس منظر''، محولہ بالا،ص۲۷۶

۱۱۷۔ کشفی،ص۲۷۶

۱۱۸۔ شہید، بہ حوالہ: ''اردو شاعری کا سیاسی و تاریخی پس منظر''، محولہ بالا،ص۲۷۶

۱۱۹۔ رضوی، مسعود حسن، ''اردو ڈراما اور اسٹیج، ابتدائی دور کی مفصل تاریخ''، کتاب نگر، لکھنؤ، ۱۹۵۷ء،ص۱۶

۱۲۰۔ ذاکراللہ،ص۱۴۰

۱۲۱۔ کشفی،ص۲۷۶

۱۲۲۔ لکھنوی، صغیر، بہ حوالہ: ''اردو شاعری کا سیاسی و تاریخی پس منظر''، محولہ بالا،ص۲۷۹۔۲۸۰

۱۲۳۔ جعفری، رئیس احمد، ''واجد علی شاہ اور ان کا عہد''، کتاب منزل، لاہور، ۱۹۵۸ء،ص۲۸

۱۲۴۔ نارنگ، گوپی چند، ''ہندوستان کی تحریک آزادی اور اردو شاعری''، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی، ۲۰۰۳ء،ص۲۷۷

۱۲۵۔ کشفی،ص۲۸۱

۱۲۶۔ موہانی، حسرت، مشمولہ: ''رسالہ اردوئے معلیٰ''، علی گڑھ، ۱۹۰۲ء،ص۱۷

۱۲۷۔ قلق، خواجہ ارشد علی، بہ حوالہ: ''جنگ آزادی کے اردو شعرا''، محولہ بالا،ص۸۰

۱۲۸۔ نارنگ،ص۲۷۸

۱۲۹۔ قلق، بہ حوالہ: ''انتخاب اردوئے معلیٰ: ۱۹۰۳ء۔ ۱۹۰۸ء''، مرتبہ

حسرت موہانی، مولانا حسرت موہانی میموریل لائبریری ٹرسٹ،
کراچی، ۱۹۹۹ء، ص ۴۷۔۶۹

۱۳۰۔ محمود الرحمٰن، ص ۸۰

۱۳۱۔ کشفی، ص ۲۸۲

۱۳۲۔ قلق، بہ حوالہ: ''انتخاب اردو معلّیٰ''، محولہ بالا ص ۵۲

۱۳۳۔ ایضاً ص ۵۱۔۵۵

۱۳۴۔ ایضاً ص ۵۷۔۵۸

۱۳۵۔ ایضاً ص ۶۳۔۶۶

۱۳۶۔ کشفی، ص ۲۸۳۔۲۸۴

۱۳۷۔ جعفری، ص ۱

۱۳۸۔ اشک، علی حسن، بہ حوالہ: ''ہندوستان کی تحریک آزادی اور اردو شاعری''، محولہ بالا، ص ۲۷۸

۱۳۹۔ لکھنوی، سحر، ''ریاض سحر''، بہ حوالہ: ''ہندوستان کی تحریک آزادی اور اردو شاعری''، محولہ بالا، ص ۲۷۹

۱۴۰۔ ایضاً

۱۴۱۔ کشفی، ص ۲۸۷۔۲۸۸

۱۴۲۔ شاہ، بہ حوالہ: ''اردو شاعری کا سیاسی و تاریخی پس منظر''، محولہ بالا، ص ۲۸۹

۱۴۳۔ کوکب، حامد علی مرزا، بہ حوالہ: ''اردو شاعری کا سیاسی و تاریخی پس منظر''، محولہ بالا ص ۲۸۹

۱۴۴۔ صولت، بہ حوالہ: ''اردو شاعری کا سیاسی و تاریخی پس منظر''، محولہ بالا، ص ۲۹۰

۱۴۵۔ انیس، میر، بہ حوالہ: ''ہندوستان کی تحریک آزادی اور اردو شاعری''، محولہ بالا، ص ۲۷۹

۱۴۶۔ مینائی، امیر، بہ حوالہ: ''اردو شاعری کا سیاسی و تاریخی پس منظر''، محولہ بالا، ص ۲۹۰

۱۴۷۔ کشفی، ص ۲۹۰۔۲۹۱

۱۴۸۔ شکوہ آبادی، منیر، بہ حوالہ: ''اردو شاعری کا سیاسی و تاریخی پس منظر''، محولہ بالا ص ۲۹۱

۱۴۹۔ الہ آبادی، وحید، مشمولہ: ماہ نامہ ''ماہِ نو''، کراچی، جولائی ۱۹۵۷ء، ص ۱۶

۱۵۰۔ رند، بہ حوالہ: بہ حوالہ: ''اردو شاعری کا سیاسی و تاریخی پس منظر''، محولہ بالا ص ۲۹۲

۱۵۱۔ غالب، مرزا اسد اللہ خاں، ''خطوطِ غالب''، مرتبہ غلام رسول مہر، غلام علی اینڈ سنز، کراچی، سن ندارد، ص ۴۳۷

۱۵۲۔ بریلوی، ڈاکٹر عبادت، ''روایت کی اہمیت''، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی، ۱۹۵۳ء، ص ۴۲۲

۱۵۳۔ محمود الرحمٰن، ص ۸۲۔۸۳

۱۵۴۔ چغتائی، محمد اکرام، ''پیش لفظ''، مشمولہ: ''۱۸۵۷ء (تاریخی، علمی اور ادبی پہلو)، مرتبہ محمد اکرم چغتائی، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۷ء، ص ۹

۱۵۵۔ قادری، محمد ایوب، ''۱۸۵۷ء اور ہم''، مشمولہ: ''۱۸۵۷ء (تاریخی، علمی اور ادبی پہلو)، مرتبہ محمد اکرم چغتائی، محولہ بالا، ۲۰۰۷ء، ص ۴۵۔۴۶

۱۵۶۔ کنہیا لالا، پنڈت، ''تاریخ بغاوت ہند مسمّی بہ محاربہِ عظیم''، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۷ء، ص ۸۔۱۳

۱۵۷۔ ذکا اللہ، مولوی، ''تاریخ عروج عہد سلطنت انگلشیہ ہند''، شمس المطابع، ۱۹۰۴ء، ص ۶۳۰۔۶۵۸

۱۵۸۔ ایضاً ص ۶۶۱۔۶۶۳

۱۵۹۔ خان، سر سید احمد، ''اسباب بغاوتِ ہند''، اردو اکیڈمی سندھ،

کراچی، ۱۹۵۷ء، ص۱۱۳۔۱۸۶

۱۶۰۔ صدیقی، ابواللیث، ''مقدمہ''، مشمولہ: ''اسبابِ بغاوت ہند''، محولہ بالا، ص۱۱

۱۶۱۔ آزاد، مولانا ابوالکلام، ''۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی نئی تاریخ''، مشمولہ: ''انقلاب ۱۸۵۷ء: جدید انکشافات''، ترتیب وتدوین، پی۔سی۔ جوشی، محمد علی فاروق، مکتبہ اخور، لاہور، ۱۹۹۵ء، ص۱۵

۱۶۲۔ تھامسن، ایڈورڈ، ''انقلاب 1857: تصویر کا دوسرا رخ''، مترجم، شیخ حسام الدین امرتسری، گوتم پبلشرز، لاہور، ۱۹۹۳ء، ص۱۳

۱۶۳۔ بسمل، ممتاز حسین، ''انگریز کے خون آلود ہاتھ''، مشمولہ: ''۱۸۵۷ء: تاریخی، علمی اورادبی پہلو''، محولہ بالا، ص۱۵۴۔۱۵۵

۱۶۴۔ علی، ڈاکٹر مبارک، ''آخری عہدِ مغلیہ کا ہندوستان''، آگہی پبلی کیشنز، حیدرآباد سندھ، ۱۹۸۴ء، ص۱۲۷

۱۶۵۔ مہر، غلام رسول، ''۱۸۵۷ء: کوائف وصحائف''، ادارۂ مطبوعاتِ پاکستان، ۱۹۵۷ء، ص۲

۱۶۶۔ غالب، مرزا اسد اللہ خاں، ''دستنبو''، مترجم: رشید حسن خاں، مشمولہ: ''۱۸۵۷ء: روزنامچے، معاصر تحریریں، یادداشتیں''، مرتبہ اکرام چغتائی، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۷ء، ص۵۷

۱۶۷۔ ترین، ڈاکٹر روبینہ، ''انقلاب ۱۸۵۷ء اور ہم عصر اردو صحافت''، مشمولہ: ''الماس''، خیرپور، شمارہ دہم، ۲۰۰۸ء، ص۱۲۵

۱۶۸۔ بہ حوالہ: ''ہندوستان کی اخبار نویسی: کمپنی کے عہد میں''، از محمد عتیق صدیقی، انڈس پبلی کیشنز، کراچی، ۱۹۸۰ء، ص۲۶۶۔۲۷۵

۱۶۹۔ ترین، ڈاکٹر روبینہ، ''انقلاب ۱۸۵۷ء اور ہم عصر اردو صحافت''، مشمولہ: ''الماس''، خیرپور، شمارہ دہم، ۲۰۰۸ء، ص۱۲۸۔۱۳۰

۱۷۰۔ صدیقی، محمد عتیق، ''ہندوستان کی اخبار نویسی: کمپنی کے عہد میں''، انڈس پبلی کیشنز، کراچی، ۱۹۸۰ء، ص۳۹۸۔۴۰۴

۱۷۱۔ قریشی، اشتیاق حسین، ''برصغیر پاک و ہند کی ملّت اسلامیہ''، مترجم: ہلال احمد زبیری، شعبہ تصنیف وتالیف کراچی یونی ورسٹی، کراچی، ۱۹۹۹ء، ص۲۹۳۔۲۹۴

۱۷۲۔ عبدالعزیز، شاہ، ''فتاوائے عزیزی''، جلد اول، سعید کمپنی، کراچی، ۱۴۰۸ھ، ص۱۶۔۲۵

۱۷۳۔ محمود الرحمٰن، ص۹۰۔۹۳

۱۷۴۔ ندوی، مولانا ابوالحسن علی، ''سیرۃ سید احمد شہید''، نامی پریس، لکھنؤ، ۱۹۳۹ء، ص۱۳۵

۱۷۵۔ بہ حوالہ: محمود الرحمٰن، ص۹۲

۱۷۶۔ عقیل، ص۵۷

۱۷۷۔ محمود الرحمٰن، ص۹۳

۱۷۸۔ بہ حوالہ: محمود الرحمٰن، ص۹۴

۱۷۹۔ محمود الرحمٰن، ص۹۴

۱۸۰۔ بہ حوالہ: محمود الرحمٰن، ص۹۵

۱۸۱۔ ایضاً

۱۸۲۔ ایضاً، ص۹۶

۱۸۳۔ محمود الرحمٰن، ص۹۶

۱۸۴۔ بہ حوالہ: محمود الرحمٰن، ص۹۶

۱۸۵۔ مہر، غلام رسول، ''جماعت مجاہدین''، جلد سوم، کتاب منزل، لاہور، سن ندارد، ص۲۹۴

۱۸۶۔ محمود الرحمٰن، ص۹۶

۱۸۷۔ حقی، شان الحق، ''نشید حریت''، فیروز سنز، کراچی، اگست ۱۹۵۷ء، ص۳۷۔۴۰

۱۸۸۔ بہ حوالہ: محمود الرحمٰن، ص۹۷

۱۸۹۔ ایضاً، ص۱۰۰

۱۹۰۔ ایضاً،ص۱۰۱

۱۹۱۔ محمود الرحمٰن،ص۱۰۳

۱۹۲۔ کشفی،ص۳۰۸

۱۹۳۔ وحید الزماں، ڈاکٹر، "A Short History of Pakistan"، جلد چہارم، شاہ غلام علی پبلشرز، کراچی، ۱۹۶۷ء، ص۲۹۴

۱۹۴۔ حسین، مہدی، "Bahadur Shah II and the War of 1857 in Delhi with its unforgettable scenes"، آتما رام پبلشرز، دہلی، ۱۹۵۸ء، ص۷۸

۱۹۵۔ کشفی،ص۳۱۰

۱۹۶۔ نظامی، خواجہ حسن، ''بہادر شاہ کا مقدمہ: غدر دہلی کے افسانوں کا چوتھا حصہ''، کارکن حلقۂ مشائخ بک ڈپو، دہلی، ۱۹۲۳ء، ص۱۴۷

۱۹۷۔ ایضاً،ص۱۴۸۔۱۵۲

۱۹۸۔ ولیم کیتھ، جان، "A History of the Great Revolt"، گین پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۱۹۸۸ء، ص۵۶

۱۹۹۔ نارنگ، گوپی چند، ''ہندوستان کی تحریک آزادی اور اردو شاعری''، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی، ۲۰۰۳ء، ص ۲۸۷

۲۰۰۔ بال، چارلس، "The History of Indian Mutiny"، جلد اوّل، کلاسکس بکس اینڈ ایفی میرا، لندن، ۱۸۵۸ء، ص۷۷

۲۰۱۔ محمود الرحمٰن،ص۱۱۰

۲۰۲۔ ولیم کئی، سر جان، "History of the Sepoy War in India"، جلد دوم، لانگ میز، لندن، ۱۸۷۴ء، ص۶

۲۰۳۔ محمود الرحمٰن،ص۱۱۰۔۱۱۱

۲۰۴۔ ''مقدمہ''، مشمولہ: ''انتخاب ذوق وظفر''، ص۱۱۴

۲۰۵۔ ظفر، بہادر شاہ، مشمولہ: ''فغان دہلی''، قلمی، مرتبہ تفضّل حسین کوکب، بہ حوالہ: ''ہندوستان کی تحریک آزادی اور اردو شاعری''، محولہ بالا، ص۳۰۵

۲۰۶۔ ظفر، بہادر شاہ، مشمولہ: ''اردو شاعری کا سیاسی اور تاریخی پس منظر''، محولہ بالا، ص۳۱۳

۲۰۷۔ ایضاً،ص۳۱۴

۲۰۸۔ ظفر، بہ حوالہ: ''بہادر شاہ دوم''، محولہ بالا، ص۴۵۔۴۶

۲۰۹۔ داؤدی، خلیل الرحمٰن، ''دہلی کے اخبارات''، مشمولہ: ''۱۸۵۷ء: کوائف وصحائف''، محولہ بالا، ص۴۱

۲۱۰۔ ظفر، بہ حوالہ: ''اردو شاعری کا سیاسی اور تاریخی پس منظر''، محولہ بالا، ص۳۱۵

۲۱۱۔ ذوالفقار، ڈاکٹر غلام حسین، ''اردو شاعری کا سیاسی اور تاریخی پس منظر''، محولہ بالا، ص۳۰۳

۲۱۲۔ ظفر، بہ حوالہ: ''اردو شاعری کا سیاسی اور تاریخی پس منظر''، محولہ بالا، ص۳۰۳

۲۱۳۔ ایضاً،ص۳۲۰

۲۱۴۔ سپیر، پرسیوال، "The Twilight of the Mughuls"، کیمبرج یونی ورسٹی پریس، لندن، ۱۹۵۱ء، ص۱۹

۲۱۵۔ فاروقی، محمد حمزہ، ''انقلاب ۱۸۵۷ء اور اردو شاعری''، مشمولہ: ''صحیفہ''، لاہور، یادگارِ ۱۸۵۷ء، جنوری تا جون ۲۰۰۷ء، ص۱۷۳

۲۱۶۔ ظفر، بہ حوالہ: ''نشید حریت''، محولہ بالا، ص۵۵

۲۱۷۔ افراہیم، ڈاکٹر صغیر، ''پہلی جنگ آزادی کا پہلا سپہ سالار''، مشمولہ: ''دریافت''، اسلام آباد، جنوری ۲۰۰۹ء، ص۲۴۶۔۲۴۷

۲۱۸۔ جالبی، ڈاکٹر جمیل، ''تاریخ ادب اردو''، جلد چہارم، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۲۰۱۲ء، ص۲۹۶

۲۱۹۔ ظفر، بہ حوالہ: ''اردو شاعری کا سیاسی اور تاریخی پس منظر''، محولہ

بالا،ص۳۱۵۔۳۱۶

۲۲۰۔ ایضاً،ص۳۱۶

۲۲۱۔ ظفر، بہ حوالہ:''انقلاب ۱۸۵۷ءاور اردو شاعری''،محولہ بالا،ص ۱۷۴

۲۲۲۔ رائے پوری،اختر حسین،''رنگون میں آخری مغل شہنشاہ''،مشمولہ: ''صحیفہ''،جنگ آزادی ۱۸۵۷ء،محولہ بالا،ص۲۹۱۔۲۹۲

۲۲۳۔ ظفر، بہادر شاہ، بہ حوالہ:''رنگون میں آخری مغل شہنشاہ''،محولہ بالا،ص۲۹۲

۲۲۴۔ رائے پوری،اختر حسین،محولہ بالا،ص۲۹۳

۲۲۵۔ ظفر، بہادر شاہ، بہ حوالہ:''رنگون میں آخری مغل شہنشاہ''،محولہ بالا،ص۲۹۳

۲۲۶۔ رائے پوری،اختر حسین،ص۲۹۴

۲۲۷۔ فرقت، غلام احمد،''خاندانِ بہادر شاہ کی تباہی''،مشمولہ:''آج کل''،دہلی،جنگ آزادی نمبر،اگست ۱۹۵۷ء،ص۱۱۸۔۱۲۱

۲۲۸۔ جعفری، قمقام،''شہر آشوب''،مشمولہ: سہ ماہی''اردو''، کراچی، شمارہ۳،۱۹۷۷ء،ص۲۶

۲۲۹۔ دہلوی،ظہیر، بہ حوالہ:''جنگ آزادی کے اردو شعرا''،محولہ بالا،ص ۱۱۸

۲۳۰۔ جالبی،ص۵۰۷۔۵۱۲

۲۳۱۔ محمود الرحمٰن،ص۱۱۸

۲۳۲۔ دہلوی،ظہیر، بہ حوالہ:''جنگ آزادی کے اردو شعرا''،محولہ بالا،ص ۱۱۸

۲۳۳۔ محمود الرحمٰن،ص۱۱۹

۲۳۴۔ دہلوی،ظہیر، بہ حوالہ:''جنگ آزادی کے اردو شعرا''،محولہ بالا،ص ۱۱۹

۲۳۵۔ عبداللہ، سید محمد،''سانحات ۱۸۵۷ء کا ایک مرثیہ خواں: ظہیر دہلوی''،مشمولہ:''۱۸۵۷ء،تاریخی،علمی اور ادبی پہلو''،محولہ بالا، ص۵۸۶۔۵۸۸

۲۳۶۔ دہلوی،ظہیر، بہ حوالہ:''سانحات ۱۸۵۷ء کا ایک مرثیہ خواں: ظہیر دہلوی''،محولہ بالا،ص۵۸۸

۲۳۷۔ مشیر الحسن،''جان کمپنی سے جمہوریہ تک''، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان،دہلی،۲۰۰۱ء،ص۱۱۷۔۱۲۰

۲۳۸۔ نظامی،خواجہ حسن،ص۱۸۸

۲۳۹۔ مہر، غلام رسول،''۱۸۵۷ء کے مجاہد''، کتاب منزل، لاہور، ۱۹۷۱ء،ص۱۳۳

۲۴۰۔ پانی پتی،شیخ محمد اسماعیل، بہ حوالہ:''جنگ آزادی کے اردو شعرا''، محولہ بالا،ص۱۲۰

۲۴۱۔ محمود الرحمٰن،ص۱۲۰

۲۴۲۔ آزردہ،صدر الدین، بہ حوالہ:''جنگ آزادی کے اردو شعرا''، محولہ بالا،ص۱۲۱

۲۴۳۔ آزردہ،صدر الدین،''مسدس''،مشمولہ:''شہر آشوب''، مرتبہ: ڈاکٹر نعیم احمد،مکتبہ جامعہ لمیٹڈ،نئی دہلی،۱۹۶۸ء،ص۲۱۳

۲۴۴۔ نارنگ، گوپی چند،ص۲۹۳

۲۴۵۔ آزردہ،صدر الدین، بہ حوالہ:''شہر آشوب''،محولہ بالا،ص۲۱۵

۲۴۶۔ چغتائی، محمد اکرام،''۱۸۵۷ء: خطوطِ غالب کے آئینے میں''، مشمولہ:''۱۸۵۷ء، روزنامچے، معاصر تحریریں، یادداشتیں''،محولہ بالا،ص۸۷۔۱۲۷

۲۴۷۔ کشفی،ص۳۱۷

۲۴۸۔ غالب، مرزا اسد اللہ خاں،''اردوئے معلیٰ''، مطبع مفید عام، آگرہ،۱۹۱۴ء،ص۱۰۵

۲۴۹۔ غالب، بہ حوالہ: ''۱۸۵۷ء: خطوط غالب کے آئینے میں''، مرتبہ اکرام چغتائی، مشمولہ: ''۱۸۵۷ء: روزنامچے، معاصر تحریریں، یاد داشتیں''، محولہ بالا، ص ۸۷۔۱۲۷

۲۵۰۔ غالب، ''اردوے معلیٰ''، محولہ بالا، ص ۲۹

۲۵۱۔ ایضاً، ص ۱۵۹

۲۵۲۔ ایضاً

۲۵۳۔ غالب، بہ حوالہ: ''جنگ آزادی کے اردو شعرا''، محولہ بالا، ص ۱۲۳

۲۵۴۔ غالب، ''اردوئے معلیٰ''، محولہ بالا، ص

۲۵۵۔ حسین، پروفیسر ممتاز، ''غالب ایک مطالعہ''، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی، ۱۹۶۹ء، ص ۵۶

۲۵۶۔ سرور، آل احمد، ''غالب''، مشمولہ: ''غالب نام آور''، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی، ۱۹۶۹ء، ص ۲۸۱

۲۵۷۔ نارنگ، گوپی چند، ''۱۸۵۷ء اور غالب''، مشمولہ: ''غالب نام آور''، محولہ بالا، ص ۱۲۳

۲۵۸۔ محمود الرحمٰن، ص ۱۲۴۔۱۲۵

۲۵۹۔ حسین، پروفیسر ممتاز، ص ۶۱

۲۶۰۔ غالب، مشمولہ: ''نشید حریت''، مرتبہ شان الحق حقی، فیروز سنز، کراچی، ۱۹۵۷ء، ص ۵۳

۲۶۱۔ کشفی، ص ۳۱۸

۲۶۲۔ محمود الرحمٰن، ص ۱۲۵

۲۶۳۔ غالب، بہ حوالہ: ''جنگ آزادی کے اردو شعرا''، محولہ بالا، ص ۱۲۶

۲۶۴۔ ایضاً، ص ۱۲۶۔۱۲۷

۲۶۵۔ غالب، بہ حوالہ: ''مکتوب بنام میر مہدی مجروح''، مشمولہ: ''خطوطِ غالب''، حصہ دوم، کتاب منزل، لاہور، ۱۹۴۹ء، ص ۲۷۳۔ منقول غلام رسول مہر

۲۶۶۔ ایضاً، ص ۲۶۶

۲۶۷۔ محمود الرحمٰن، ص ۱۲۸

۲۶۸۔ جعفری، ڈاکٹر قمقام، ص ۱۱۷

۲۶۹۔ حقی، ص ۵۸

۲۷۰۔ کشفی، ص ۳۲۰

۲۷۱۔ حسامی، بہ حوالہ: ''اردو شاعری کا سیاسی اور تاریخی پس منظر''، محولہ بالا، ص ۳۲۰

۲۷۲۔ محمود الرحمٰن، ص ۱۳۳

۲۷۳۔ کشفی، ص ۳۲۰

۲۷۴۔ دہلوی، ناصر، بہ حوالہ: ''اردو شاعری کا سیاسی اور تاریخی پس منظر''، محولہ بالا، ص ۳۲۱

۲۷۵۔ ایضاً

۲۷۶۔ نارنگ، ص ۲۹۶

۲۷۷۔ شیفتہ، غلام مصطفیٰ خاں، بہ حوالہ: ''ہندوستان کی تحریک آزادی اور اردو شاعری''، محولہ بالا، ص ۲۹۲

۲۷۸۔ سکسینہ، رام بابو، ''تاریخ ادب اردو''، مترجم: مرزا محمد عسکری، مطبع نول کشور، لکھنؤ، سن دارد، ص ۳۶۶

۲۷۹۔ نارنگ، ص ۲۹۷

۲۸۰۔ محمود الرحمٰن، ص ۱۲۸

۲۸۱۔ عبداللہ، ڈاکٹر سید، ص ۹۶

۲۸۲۔ داغ، دہلوی، ''خون کے آنسو''، مشمولہ: ''نشید حریت''، محولہ بالا، ص ۷۸۔۸۱

۲۸۳۔ ایضاً، ص ۸۰

۲۸۴۔ ایضاً، ص ۸۱

۲۸۵۔ سالک، قربان علی، مشمولہ: ''نوائے آزادی''، مرتبہ عبدالرزاق

قریشی، مکتبہ جامعہ، دہلی، سن ندارد، ص۱۵

۲۸۶۔ سالک، ''انقلاب دہلی''، مشمولہ: ''نغماتِ حریت''، مرتبہ خلیق انجم اور شمس الرحمٰن فاروقی، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی، ۲۰۰۷ء، ص۵۲

۲۸۷۔ سالک، ''بازارِ موت''، مشمولہ: ''نغماتِ حریت''، محولہ بالا، ص ۵۱

۲۸۸۔ نارنگ، ص۲۹۶۔۲۹۷

۲۸۹۔ مجروح، میر مہدی، بہ حوالہ: ''ہندوستان کی تحریک آزادی اور اردو شاعری''، محولہ بالا، ص۲۹۷

۲۹۰۔ مجروح، مشمولہ: ''نوائے آزادی''، محولہ بالا، ص۱۸

۲۹۱۔ احمد، ڈاکٹر نعیم، ''شہر آشوب کا تحقیقی مطالعہ''، ادبی اکادمی، علی گڑھ، ۱۹۷۹ء، ص۱۷۸۔۱۸۲

۲۹۲۔ تشنہ، محمد علی، ''مسدس''، مشمولہ: ''شہر آشوب''، مرتبہ، ڈاکٹر نعیم احمد، محولہ بالا، ص۲۳۳

۲۹۳۔ عیش، بہ حوالہ: ''شہر آشوب کا تحقیقی مطالعہ''، محولہ بالا، ص۲۴۵

۲۹۴۔ احمد، ڈاکٹر نعیم، ''شہر آشوب کا تحقیقی مطالعہ''، ص۲۴۶

۲۹۵۔ سوزاں، حکیم محمد تقی خاں، مشمولہ: ''شہر آشوب کا تحقیقی مطالعہ''، محولہ بالا، ص۲۴۶

۲۹۶۔ احمد، ڈاکٹر نعیم، ''شہر آشوب''، ص۲۸

۲۹۷۔ داغ، بہ حوالہ: ''شہر آشوب''، محولہ بالا، ص۲۸

۲۹۸۔ تشنہ، بہ حوالہ: ''اردو شاعری کا سیاسی اور تاریخی پس منظر''، محولہ بالا، ص۳۲۶

۲۹۹۔ سوزاں، حکیم محمد تقی خاں، بہ حوالہ: ''اردو شاعری کا سیاسی اور تاریخی پس منظر''، محولہ بالا، ص۳۲۶

۳۰۰۔ مبین، غلام دستگیر، بہ حوالہ: ''شہر آشوب''، محولہ بالا، ص۳۴۵

۳۰۱۔ ایضاً، ص۳۴۶

۳۰۲۔ کشفی، ص۳۳۱

۳۰۳۔ حالی، الطاف حسین، ''دہلی مرحوم''، مشمولہ: ''اردو میں قومی شاعری کے سو سال''، مرتبہ علی جواد زیدی، اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ، ۱۹۸۲ء، ص۱۳۴

۳۰۴۔ ایضاً، ص۱۳۵

۳۰۵۔ ذاکر اللہ، ڈاکٹر محمد، ''اردو شاعری پر سیاسی اثرات''، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۱۱ء، ص۱۵۱

۳۰۶۔ محمود الرحمٰن، ص۱۳۳

۳۰۷۔ مشتاق، مشمولہ: ''صادق الاخبار''، دہلی، مورخہ ۱۲ ذی الحجہ ۱۲۷۳ھ، ص اوّل

۳۰۸۔ باقر، آغا محمد، ''محمد حسین آزاد''، مشمولہ: ''نقوش''، لاہور، شخصیات نمبر، شمارہ ۴۷۔۴۸، جنوری ۱۹۵۵ء، ص۱۲

۳۰۹۔ نارنگ، ص۲۹۹

۳۱۰۔ آزاد، مولانا محمد حسین، ''فتح افواجِ شرق''، مشمولہ: ''اردو میں قومی شاعری کے سو سال''، محولہ بالا، ص۸۵

۳۱۱۔ انصاری، سحر، ''تنقیدی افق''، پاکستان اسٹڈی سینٹر، جامعہ کراچی، کراچی، ۲۰۱۴ء، ص۱۰۳

۳۱۲۔ آزاد، مولانا محمد حسین، ''حبِ وطن''، مشمولہ: ''آزادی کی نظمیں''، مرتبہ سبط حسن، حلقہ ادب مال روڈ، لاہور، سن ندارد، ص۱۶

۳۱۳۔ حالی، ''سیاست''، مشمولہ: ''آزادی کی نظمیں''، محولہ بالا، ص۱۹

۳۱۴۔ میرٹھی، محمد اسماعیل، مشمولہ: ''آزادی کی نظمیں''، محولہ بالا، ص۲۱

۳۱۵۔ عاقل، نواب محمد رضا علی، بہ حوالہ: ''اردو شاعری پر سیاسی اثرات''، محولہ بالا، ص۱۶۰

۳۱۶۔ محسن، بہ حوالہ: ''اردو شاعری پر سیاسی اثرات''، محولہ بالا، ص ۱۶۱

۳۱۷۔ صابری، امداد، ''۱۸۵۷ء کے غدار شعرا''، یونین پریس، دہلی، ۱۹۶۰ء، ص ۲۲۔۲۵

۳۱۸۔ علی، لیاقت، ''رام پور میں اردو شاعری کا منظر نامہ''، مشمولہ: ''اورینٹل کالج میگزین''، لاہور، جلد ۹۱، شمارہ ۴، اکتوبر۔دسمبر ۲۰۱۶ء، ص ۳۶

۳۱۹۔ قریشی، سلیم اللہ، ''۱۸۵۷ء کے غداروں کے خطوط''، مترجم سلیم اللہ قریشی، مرتبہ سید عاشور کاظمی، انجمن ترقی اردو ہند، دہلی، ۲۰۱۱ء، ص ۱۸

۳۲۰۔ محمود الرحمٰن، ص ۱۳۴

۳۲۱۔ صدیقی، شکیل، ''بیگم حضرت محل''، مشمولہ: ''نیا دور''، لکھنؤ، انقلاب ۱۸۵۷ء نمبر، اپریل۔مئی ۲۰۰۷ء، ص ۵۶

۳۲۲۔ محل، بیگم حضرت، ''مری سرفروشی مری پارسائی''، مشمولہ: ''نیا دور''، محولہ بالا، ص ۲۳۴

۳۲۳۔ رشیدی، رباب، ''بیگم حضرت محل''، مشمولہ: ''نیا دور''، محولہ بالا، ص ۲۳۹

۳۲۴۔ رضوی، نیر مسعود، ''لکھنؤ کا عروج و زوال''، مشمولہ: ''نقوش''، لاہور، شمارہ ۱۰۴، ص ۲۳۴

۳۲۵۔ کشفی، ص ۳۳۳۔۳۳۴

۳۲۶۔ تائب، فتح محمد، بہ حوالہ: ''اردو شاعری کا سیاسی اور تاریخی پس منظر''، محولہ بالا، ص ۳۳۴

۳۲۷۔ جعفری، سید رئیس احمد، ''کاروانِ گم گشتہ''، سید رئیس احمد جعفری اکیڈمی، کراچی، ۱۹۷۱ء، ص ۸۸۔۸۹

۳۲۸۔ حسین، سید مجاور، ''اردو شاعری میں قومی یک جہتی کے عناصر''، اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ، ۲۰۰۴ء، ص ۲۹۴۔۲۹۵

۳۲۹۔ عیش، آغا جان، بہ حوالہ: ''اردو شاعری میں قومی یک جہتی کے عناصر''، محولہ بالا، ص ۲۹۵

۳۳۰۔ انیس، میر، بہ حوالہ: ''اردو شاعری کا سیاسی اور تاریخی پس منظر''، محولہ بالا، ص ۳۳۵

۳۳۱۔ انیس، بہ حوالہ: ''اردو شاعری میں قومی یک جہتی کے عناصر''، محولہ بالا، ص ۲۹۵

۳۳۲۔ ہاشمی، نور الحسن، ''لکھنؤ اور جنگ آزادی''، ادبی اکیڈمی، لکھنؤ، ۱۹۵۷ء، ص ۳۳۶

۳۳۳۔ سحر لکھنوی، بہ حوالہ: ''اردو شاعری کا سیاسی اور تاریخی پس منظر''، محولہ بالا، ص ۳۳۶

۳۳۴۔ سحر، بہ حوالہ: ''جنگ آزادی کے اردو شعرا''، محولہ بالا، ص ۱۳۵

۳۳۵۔ ایضاً

۳۳۶۔ حسین، سید مجاور، ص ۲۹۵

۳۳۷۔ سکینہ، ص ۲۴۰

۳۳۸۔ مہر، غلام رسول، ''۱۸۵۷ء کے مجاہد''، محولہ بالا، ص ۲۰۱

۳۳۹۔ شہابی، مفتی انتظام اللہ، ''ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علما''، دینی بک ڈپو، دہلی، ۱۹۴۶ء، ص ۸۹

۳۴۰۔ مہر، غلام رسول، ''۱۸۵۷ء کے مجاہد''، محولہ بالا، ص ۱۷۴

۳۴۱۔ منیر، شکوہ آبادی، بہ حوالہ: ''جنگ آزادی کے اردو شعرا''، محولہ بالا، ص ۱۴۰

۳۴۲۔ مہر، غلام رسول، ''۱۸۵۷ء کے مجاہد''، محولہ بالا، ص ۱۷۶

۳۴۳۔ منیر، بہ حوالہ: ''اردو میں قومی شاعری کے سو سال''، محولہ بالا، ص ۱۰۱

۳۴۴۔ محمود الرحمٰن، ص ۱۴۱

۳۴۵۔ منیر، بہ حوالہ: ''اردو شاعری کا سیاسی اور تاریخی پس منظر''، محولہ

بالا،ص۳۳۷

۳۴۶۔ صدیقی، ابواللیث، ''لکھنؤ کا دبستان شاعری''، اردو مرکز، لاہور،۱۹۶۷ء،ص۴۶۹

۳۴۷۔ شہابی،مفتی انتظام اللہ،''مشاہیر جنگ آزادی''، دینی بک ڈپو، کراچی،۱۳۷۶ھ،ص۱۲۶

۳۴۸۔ منیر، بہ حوالہ:''جنگ آزادی کے اردو شعرا''،محولہ بالا،ص۱۴۱

۳۴۹۔ منیر،''مصائب قید''،مشمولہ: ''اردو میں قومی شاعری کے سو سال''،محولہ بالا،ص۱۰۶

۳۵۰۔ نارنگ،ص۳۰۲

۳۵۱۔ منیر،''قید سے نجات''،مشمولہ:''اردو میں قومی شاعری کے سو سال''،محولہ بالا،ص۱۰۹

۳۵۲۔ منیر، بہ حوالہ:''ہندوستان کی تحریکِ آزادی اوراردوشاعری''، محولہ بالا،ص۳۰۲

۳۵۳۔ منیر،''فریاد زندانی''،مشمولہ: ''اردو میں قومی شاعری کے سو سال''،محولہ بالا،ص۱۰۳۔۱۰۴

۳۵۴۔ مینائی،امیر، بہ حوالہ:''جنگ آزادی کے اردوشعرا''،محولہ بالا،ص ۱۴۴

۳۵۵۔ ایضاً،ص۱۴۵

۳۵۶۔ نیر،ڈاکٹر طاہرہ،''اردوشاعری میں پاکستانی قومیت کا اظہار''، انجمن ترقی اردو پاکستان،کراچی،۱۹۹۹ء،ص۲۷

۳۵۷۔ افسردہ، سید فضل حسین، بہ حوالہ: ''اردو شاعری میں پاکستانی قومیت کا اظہار''،محولہ بالا،ص۲۷

۳۵۸۔ عبداللہ،ڈاکٹر سید،''دہلی مرحوم کا مرثیہ''،مشمولہ ہفت روزہ ''لیل ونہار''، لاہور،مئی ۱۹۵۷ء،ص۵۷

۳۵۹۔ ذوالفقار،ڈاکٹر غلام حسین،''اردوشاعری کا سیاسی اورسماجی پس منظر''،مطبع جامعہ پنجاب،۱۹۶۶ء،ص۳۲۸۔۳۲۹

۳۶۰۔ ذاکراللہ،ڈاکٹر محمد،ص۱۶۲۔۱۷۲

۳۶۱۔ احمد، عتیق، ''اردو ادب میں احتجاج''، مکتبہ عالیہ، لاہور، ۱۹۸۷ء،ص۸۴

۳۶۲۔ منٹو، عابد حسن،''غدر کے ادب کے ترقی پسند روایات''،مشمولہ: ''۱۸۵۷ء: تاریخی،علمی اورادبی پہلو''،محولہ بالا،ص۶۴۲

۳۶۳۔ آزردہ، بہ حوالہ:''غدر کے ادب کے ترقی پسند روایات''،محولہ بالا،ص۶۴۲

۳۶۴۔ محمودالرحمٰن،ص۱۴۸۔۱۴۹

۳۶۵۔ نارنگ،''ہندوستان کی تحریک آزادی اوراردوشاعری''،محولہ بالا، ص۳۱۳

۳۶۶۔ محمودالرحمٰن،ص۱۴۷

۳۶۷۔ وحید،مولوی وحیدالدین، بہ حوالہ:''ہندوستان کی تحریک آزادی اوراردوشاعری''،محولہ بالا،ص۱۴۷

۳۶۸۔ نظیر،سعادت،''نذرِعقیدت''،مشمولہ:''آج کل''، دہلی، جنگ آزادی نمبر،اگست ۱۹۵۷ء،ص۹۰۔۹۱

۳۶۹۔ عبداللہ، ڈاکٹر سید،''غدر دہلی: سر سید کی نظر میں''،مشمولہ: ''۱۸۵۷ء: تاریخی،علمی اورادبی پہلو''،محولہ بالا،ص۵۸۲

باب پنجم:

اردو کی سانحاتی شاعری: بیسویں صدی کا ربع اوّل

طغیانیِ رودِ موسیٰ:

اردو شاعری میں سانحات کے اظہار کی روایت کا ایک گم شدہ باب

اکثر مورخین اور محققین اس بات پر اتفاق رکھتے ہیں کہ کرۂ ارض کی تمام تہذیبوں کا جنم بڑے بڑے دریاؤں کے کنارے پر ہوا۔انھیں دریاؤں کے پانی سے ان تہذیبوں کی آب یاری ہوئی۔ وہیں کے چڑھتے سورج سے ان کو بینائی ملی اور وہیں کی آب وہوا نے تاریخ کو گویائی دی[1]۔ ہندوستان کے مشہور شہر حیدرآباد دکن کی تہذیب نے مشہور ندی ''رودِ موسیٰ''[2] کے کنارے جنم لیا۔اس ندی کے کنارے بسنے والے لوگ آج بھی اپنی بود و باش،طرز زندگی اور انداز بیاں کی وجہ سے منفرد نظر آتے ہیں۔ان کے مزاج میں نہ لکھنؤ والوں کا سا تکلف ہے اور نہ ہی دہلی والوں کا شاہانہ انداز بلکہ بہ نظر غائر دیکھا جائے تو اس مٹتی ہوئی تہذیب کی سادگی اور بانک پن میں کچھ ایسی خاص بات ہے جس کو صرف محسوس کیا جاسکتا ہے[3]۔اس شہر کی خوش حالی جس کے چرچے ہندوستان کے دور دراز شہروں تک سنے جاتے تھے۔ یہ خوش حالی اچانک طغیانیِ رودِ موسیٰ کی وجہ سے بدحالی میں تبدیل ہو جاتی ہے[4]، جو بیسویں صدی کی پہلی دہائی میں ہندوستان کی تاریخ بالخصوص حیدرآباد دکن کی تاریخ کا انتہائی افسوس ناک سانحہ ہے۔

بیسویں صدی اپنے آغاز ہی سے بے شمار ہنگامے ساتھ لائی لیکن اس عظیم سانحے کے نتیجے میں حیدرآباد دکن کی حسرت ناک تباہی نے ہزاروں کی تعداد میں ہلاکتوں کے ساتھ ساتھ بے تحاشا املاک کو بھی نقصان پہنچایا۔اس طغیانی نے شہر کے ہر گھر میں صف ماتم بچھا دیا اور لوگ مدتوں اس سانحے کو اپنے ذہن سے محو نہ کر پائے۔

موسیٰ ندی کی تاریخ بہت قدیم ہے۔اس ندی نے دو سو برس تک بہمنی سلطنت کے تاب ناک سورج کو ابھرتے اور ڈوبتے دیکھا۔اس نے کم وبیش دو صدیوں تک قطب شاہی دور کے پرسکون لیل ونہار دیکھے اور آخر میں اس ندی نے سلطنت آصفیہ کا وہ درخشندہ دور بھی دیکھا جس سے برصغیر کے دیگر شہروں کی آنکھیں چکا چوند تھیں[5]۔ یہ ندی شہر حیدرآباد سے پچاس میل کے فاصلے پر 'وقار آباد' کی مشرقی پہاڑوں میں موضع راکم چرلر کے پاس سے نکلتی ہے اور شمال مغرب کی جانب سے شہر میں داخل ہو کر کئی میل تک آبادی میں بہنے کے بعد مشرق کی طرف سے باہر نکل جاتی ہے[6]۔ یہ حیدرآباد دکن کی خاص ندی ہے جسے رودِ موسیٰ کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ریاست حیدر آباد کے ایک وسیع خطۂ ارض کو سیراب کرتی ہوئی یہ ندی شہر کے بیچوں بیچ سے گزر کر دریائے کرشنا سے جا ملتی ہے[7]۔یہی ندی شہر کو دو حصوں میں بانٹتی ہوئی قدیم وجدید حیدرآباد میں تقسیم کرتی ہے[8]۔اس ندی کا نظارہ نہ صرف مقامی لوگوں کے لیے فرحت انگیز ہے بلکہ دور دراز سے آنے والے سیاح بھی رودِ موسیٰ کے ساحل کے نظارے، اس کی خوش گوار فضا اور دل کش و پرکیف مناظر کو دیکھ کر اس کے حسن میں کھو جاتے ہیں۔ بہت سے شعرا اور ادبا نے ان مناظر کو اپنی تخلیق کا موضوع بنایا۔ظفر علی خاں قیام حیدرآباد کے دوران اس ندی کے حسن اور دل کشی کو دیکھ کر بے اختیار یہ کہنے پر مجبور ہو گئے کہ:

کس شان و تمکنت سے بہتی ہے نہرِ موسیٰ　　　　لہرا رہی ہے ناگن یا جلوہ گر پری ہے

جاں بخش تیری لہریں دل کش تیری[کذا: تری] روانی　　　قدرت نے تجھ کو بخشی کیا شانِ دل بری ہے
روزِ ازل سے آصف پر ہے ہما کا سایہ　　　اوس کا دکن کے سر پر اوس پر خدا کا سایہ [۹]

حیدرآباد دکن کے باسیوں کے دلوں میں اس ندی کی اہمیت، اس کی قدامت اور تاریخی حیثیت پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے فخرالدین ارمان نے کہا کہ:

رودِ موسیٰ رودِ موسیٰ تیرا یہ دل کش سماں　　　تجھ میں ہے حبِ وطن کا جذبہِ آبِ رواں
تو ہے دریا چھوٹا سا یا رحمتِ عالم ہے تو　　　دیکھنے میں خرد لیکن موسیِٰ اعظم ہے تو
ہے دکن میں بادشاہی دور کا آغاز تو　　　اک زمانے سے رہا ہے ہم دم و ہم ساز تو
ہاں بھٹکتے قافلے کا تو ہی خضرِ راہ ہے　　　تو ہماری آصفی تاریخ سے آگاہ ہے
تیرا ہر قطرہ تمنّا، آرزو، ارمان ہے　　　ہر نفس میں تیرے زندہ باد یا عثمان ہے [۱۰]

گرمی اور سردی دونوں موسموں میں یہ ندی پایاب رہتی ہے۔ آبادی میں اس کی گزرگاہ کی حدود چار سو قدم سے زیادہ نہیں لیکن ندی کا پاٹ ہمیشہ اَسّی سے نوّے قدم کا ہوتا ہے البتہ موسم برسات میں بعض اوقات اس کا پاٹ دو ڈھائی سو فٹ تک ترقی کر جاتا ہے [۱۱]۔ اس ندی کے شمال اور جنوب کی آبادی کو باہم ملانے کے لیے وقتاً فوقتاً چار پل تعمیر کیے گئے تھے۔ ''پرانا پل'' جو ان چاروں پلوں میں سب سے قدیم اور زیادہ مستحکم ہے، ۱۵۹۳ء میں بعہدِ سلطان قطب شاہ تعمیر ہوا۔ اس کے بعد غفران منزل نواب ناصرالدولہ آصف جاہ رابع کے عہد میں کرنل آلی فنٹ کے حسنِ اہتمام سے ۱۸۳۱ء میں ''چادر گھاٹ'' کا پل بنا۔ ۱۸۶۰ء میں بعہد نواب افضل الدولہ پرانے پل اور چادر گھاٹ کے پل کے درمیان ''افضل گنج'' کا پل تعمیر ہوا۔ اس کے بعد سن ۱۳۱۸ھ مطابق ۱۹۰۰ء میں مسلم جنگ لائق الدولہ غالب الملک نے کثیر رقم خرچ کر کے افضل گنج کے پل کے درمیان ایک اور پل تعمیر کرایا جو ''مسلم جنگ'' کے نام سے مشہور ہوا [۱۲]۔

قدیم دور میں اس ندی کو مختلف ناموں سے یاد کیا جاتا رہا۔ ایک فرانسیسی سیاح نے اسے ''قروا ندی'' کے نام سے یاد کیا ہے۔ مانک راؤ وٹھل راؤ کا کہنا ہے کہ مورخ گلزار آصفیہ نے اسے ''عیسیٰ ندی'' کہا [۱۳]۔ لیکن یہ بات درست نہیں کیوں کہ ''گلزار آصفیہ'' میں واضح طور پر اس ندی کا نام ''دریائے موسیٰ'' [۱۴] درج ہے۔ بعض نے اسے ''ساکل'' اور ہندوؤں میں پڑھے لکھے اور مذہبی علم سے مذاق رکھنے والوں نے اس ندی کو ''موچ کندا ندی'' کے نام سے پکارا ہے [۱۵]۔ حیدرآباد دکن کے آباد ہونے سے اب تک تقریباً دس دفعہ موسیٰ ندی میں ایسی طغیانی ہوئی ہے کہ وہ اپنے مقررہ حدود سے آگے بڑھی اور کنارے کے مکانوں اور محلّوں پر اپنا تسلط قائم کر کے انھیں برباد کر دیا [۱۶]۔

موسیٰ ندی میں آنے والا پہلا سیلاب جس کا ذکر تاریخوں میں ملتا ہے، وہ ۷ صفر ۱۰۴۱ھ بمطابق ۱۶۳۱ء میں سلطان عبداللہ قطب شاہ کے عہد میں آیا جس میں شاہی باغ جو نواح شہر میں واقع تھا، تباہ و برباد ہو گیا [۱۷]۔ اس دوران چار ماہ تک مسلسل بارش ہوتی رہی اور ۷ صفر روز چہار شنبہ کو طغیانی کے نتیجے میں سیلابی ریلا پرانے پل کے اوپر سے بہنے لگا اور پانی شہر کے اندر داخل ہو گیا [۱۸]۔

۱۰۷۹ھ مطابق ۶۹۔۱۶۶۸ء میں بھی بعہد عبداللہ قطب شاہ، طغیانی ہوئی اور دو ہزار کے قریب مکانات اس طغیانی میں بہہ گئے جب کہ لاتعداد لوگ سیلاب کی نذر ہو گئے [۱۹]۔ (۱۴ شعبان) ۱۰۹۸ھ مطابق ۱۶۸۷ء کو سلطان ابوالحسن تانا شاہ کے زمانے میں بے ہنگام

بارش سے ایک بار پھر طغیانی ہوئی۔ اس وقت اورنگ زیب عالم گیر قلعہ گول کنڈہ کا محاصرہ کیے ہوئے تھے۔ طغیانی سے ان کی فوج اور سامان جنگ کو سخت نقصان پہنچا[20]۔

نعمت علی خان عالی نے اُس عہد میں تباہیِ گول کنڈہ پر جو پرسوز شہر آشوب لکھا اس میں ان واقعات کا ذکر کیا ہے:

دریں ملکِ خراب امروز کس را نسیت سامانی چو گنج افتادہ انداہل ہنر در کنجِ ویرانی

بہ سرحدی رسیدہ خلق را افراط ناداری کہ معنی ہم نہ دارد ایں زماں حرفِ سخن دانی

طبیب ازعلم طب دریا دمی دارد ہمی معنی نہ باشد خوب تراز شربت دینار در مانی

ز بس عطارِ مشتاق است قوت لایموتی را بہ چشمش آش و نان آید چو بنو بیسند اُشنانی

ز فکرِ مفلسِ رمّال ازبس ریش خوہ کندہ نمودہ باد دستی لحیہ اش را شکلِ لحیانی

نہ باشد آن قدر سرمایہ ہم جرّاح مسکیں را کہ بر زخمِ دلِ خود سرنگوں ساز و نمکدانی

صدائے ماتمی از خانۂ برخاست پر سیدم چہ شد گفتند درایں خانہ دارد گشتِ مہمانی

زجائے غلغلِ شادی شنیدم گفت ہمسایہ کہ شخصے دید شب در واقعہ پر آرد انبانی[21]

اس کے بعد ۱۱۵۰ھ مطابق ۳۸۔۱۷۳۷ء روز جمعہ کو بعہد نواب آصف جاہ شدید طغیانی سے شہر کی فصیل کئی جگہ سے ٹوٹ گئی اور پانی شہر کے جنوبی حصے میں داخل ہو گیا[22]۔ ۱۷۴۸ء میں بھی اس ندی میں ایک بڑا اسیلاب آیا اور انسانی جانیں ضائع ہوئیں[23]۔ ۱۱۸۰ھ مطابق ۱۷۶۸ء میں میر نظام علی خاں آصف جاہ ثانی کے عہد میں بھی اس ندی میں بڑی طغیانی ہوئی جس سے کافی نقصان پہنچا۔ اس کے بعد ۷ ربیع الثانی ۱۱۸۵ھ مطابق ۱۷۷۱ء بروز جمعہ کو نواب میر نظام علی خاں آصف جاہ ثانی کے عہد میں طغیانی کے نتیجے میں شہر پناہ کی دیوار مغربی جانب سے منہدم ہو گئی۔ تمام فصیل مغربی اور جنوبی سیلاب میں بہہ گئی۔ ہزار ہا مضبوط و مستحکم مکانات منہدم ہو گئے[24]۔ اور تقریباً دو ہزار افراد اس طغیانی کی نذر ہو گئے[25]۔

۱۲۲۴ء، ۱۸۰۹ء اور ۱۲۳۷ء۔ ۲۲۔۱۸۲۱ء میں بعہد نواب سکندر جاہ کثرت بارش کی وجہ سے رودِ موسیٰ میں ایسی طغیانی آئی کہ بہت سے مکانات ایک بار پھر غرق آب ہو گئے[26]۔ ۱۹ ربیع الثانی ۱۲۴۵ھ مطابق ۱۸۲۹ء روز دوشنبہ کو بعہد نواب ناصر الدولہ، زبردست طغیانی کے نتیجے میں پرانے پل کے قریب فصیل کا ایک حصّہ ٹوٹ گیا اور پانی شہر میں داخل ہو کر دوکانوں اور گھروں میں گھس گیا[27]۔ سید خورشید علی نے سہواً اس طغیانی کا سن ۱۲۴۶ھ۔ ۱۸۳۰ء لکھا ہے[28]۔ کیوں کہ نواب ضرغام الدولہ کے زمانے میں یہ واقعہ پیش آیا تھا لہٰذا اپنی فارسی مثنوی میں انھوں نے اس سانحے کی مادہ تاریخ نکالی ہے جو درج ذیل ہے۔

خدا ایں شہر را مامون بدارد زآفاتِ چنیں مصؤن بدارد

دعائے بے نظیر ایں است دایم رئیس شہر باشد حیٔ وقایم

مادۂ تاریخ ۱۲۴۵ھ طغیانی موج موسیٰ[29]

اس طغیانی کے نتیجے میں بازار عنبر، چیلہ پورہ، بازار گھانسی، بازار کوکہ اور حوض چار محل وغیرہ غرق آب ہو گئے اور ان محلّوں کا نام ونشان بھی باقی نہ رہا۔ اس طغیانی کے باعث پل قدیم کے دروازے کا ایک تختہ جو آہن پوش تھا اور سیکڑوں منوں کا وزن رکھتا تھا، باغ امین

الملک میں جا گرا اور پل کے دونوں جانب بہت بڑے غار پڑ گئے اور ہزار ہا آدمی ہلاک ہوئے[۳۰]۔ نواب ضرغام الدولہ نے اپنی فارسی مثنوی میں اس طغیانی کی تباہی کا بڑا نقشہ کھینچتے ہوئے لکھا کہ:

بعہدِ ناصرالدولہ بہادر	شدہ دریائے موسیٰ دفعتہً پر
بہ نصف الیل طغیاں کرد موسیٰ	خرابی ہا نمایان کرد موسیٰ
غریق بحرِ آفت کارواں شد	مکانِ شوخ ہرجا بے نشاں شد
ہمہ ضایع شدہ باغِ امین است	درختاں گشتہ ہموارِ زمین است
درودیوار باغِ میر عالم	شدہ ضایع ازاں سیلِ دمادم
سرانجامِ اثاث البیت مردم	ہمہ تاراج تا بازاربیگم
مثالِ شیشہ ریزہ چوڑی بازار	زبے سرمایہ گی مردم در آزار
ہمہ بازارگھانسی بے نشاں شد	خس و خاشاک آنجاہم نہاں شد
جگر ہائے ترحم حالِ خلق است	بہر صورت تلف اموالِ خلق است[۳۱]

یہ ایک طویل مثنوی ہے جسے پڑھ کر اس سانحے کی ہول ناک تباہی کا منظر ہماری آنکھوں کے سامنے پھرنے لگتا ہے۔ ۱۲۶۵ھ مطابق ۱۸۴۹ء کو بعہد نواب ناصرالدولہ ایک بار پھر رودِ موسیٰ کو طغیانی ہوئی۔ کناروں پر جو مکانات تھے، گرتے رہے اور ندی کا پانی ۲۰ سے ۳۰ فٹ تک بلند ہو گیا[۳۲]۔ ۲۲ رمضان ۱۲۶۷ھ مطابق ۱۸۵۱ء کو بھی رودِ موسیٰ کو طغیانی ہوئی۔ قدیم پل پر جو چند افراد غفلت اور دھوکے میں رہ گئے تھے، نذرِ سیلاب ہو گئے[۳۳]۔ ۲۹ محرم ۱۲۷۵ھ مطابق ۱۸۵۱ء کو شدید بارش کے باعث رودِ موسیٰ میں طغیانی کے نتیجے میں بیگم بازار کولسہ واڑی کے بہت سے مکانات منہدم ہو گئے۔ محلّہ محبوب شاہی واقع چار محل کو سخت نقصان پہنچا[۳۴]۔ سید خورشید علی کے مطابق اس طغیانی سے بہت کم نقصان ہوا[۳۵]۔ لیکن مانک راؤ وٹھل راؤ کا کہنا ہے کہ:

> کنارے پر رہنے والے غربا کے جس قدر مکانات تھے وہ تمام منہدم ہو گئے۔ اس کی تعمیر و ترمیم وغیرہ کے لیے ۱۳۱۴ف میں سرکار نے انھیں دو لاکھ روپے کی امداد عطا فرمائی۔ منہدم شدہ مکانات کی تعداد ۳۰۶ تھی۔ اور نقصان کا اندازہ تقریباً ۵ لاکھ کیا گیا تھا[۳۶]۔

نجم الغنی خاں نے سہواً اس سانحے کا سن اکتوبر ۱۹۰۲ء لکھا ہے[۳۷]۔ جب کہ یہ واقعہ ۱۹۰۳ء میں پیش آیا تھا[۳۸]۔ یہ تو تھی رودِ موسیٰ کی مختصر تاریخ اور وقتاً فوقتاً پیش آنے والی طغیانی کی روداد لیکن رودِ موسیٰ کی جس طغیانی نے پورے حیدرآباد دکن کو بری طرح تہہ و بالا کیا وہ واقعہ جاں کاہ یکم رمضان المبارک ۱۳۲۶ھ مطابق ۱۹۰۸ء روز دوشنبہ کو پیش آیا[۳۹]۔ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار نے اپنی تصانیف ''ظفر علی خان ادیب و شاعر''[۴۰] اور ''مولانا ظفر علی خاں: حیات، خدمات و آثار'' میں سہواً اس طغیانی کا سن ۱۹۰۵ء لکھا ہے[۴۱]۔ یہ غلط فہمی انھیں کیوں ہوئی، اس کی تفصیل ظفر علی خاں کی نظم ''شورِ محشر'' کے جائزے کے دوران پیش کی جائے گی۔ یہاں مقصد اس سانحے کے درست سن کا تعین ہے لہٰذا ہمارے ذہن میں رہنا چاہیے کہ یہ واقعہ ۲۸ ستمبر ۱۹۰۸ء میں پیش آیا اور شہر حیدرآباد کو تباہ و برباد کر گیا[۴۲]۔ بارش کا یہ سلسلہ طغیانی کے تین چار روز پہلے سے لگاتار جاری تھا۔ نجم الغنی خاں نے سہواً لکھا کہ ''۲۶ ستمبر مطابق ۲۹ شوال کو دوپہر سے ۲۸ ستمبر مطابق

یکم رمضان کی رات تک موسلا دھار پانی پڑا''[۴۳]۔

یہاں شوال کے بجائے ۲۹ شعبان ہونا چاہیے کیوں کہ وہ خود مانتے ہیں کہ یکم رمضان کی رات تک شدید بارش کے نتیجے میں دریائے موسی میں طغیانی ہوئی[۴۴]۔ مانک راؤ وِٹھل راؤ کا بھی یہی کہنا ہے کہ ۳۰ شعبان کو ۹ بجے سے ندی میں پانی بڑھنا شروع ہوا اور ۴ بجے شام تک دہلی دروازہ اور افضل گنج کے پل فیل پائیوں کے اوپر چڑھ گیا[۴۵]۔ جن لوگوں کے مکانات دریا کے کنارے تھے ان لوگوں نے جلدی جلدی نقل مکانی شروع کی۔ اور صبح سات بجے تک ہزاروں آدمیوں نے اپنے اپنے مکان خالی کر دیے[۴۶]۔ طغیانی کے نتیجے میں ندی کے کنارے کا کوئی محلّہ ایسا نہیں تھا جو اِس سرے سے اُس سرے تک صاف نہ ہو گیا ہو اور کوئی خاندان ایسا نہیں تھا جس میں سے کم از کم دو چار آدمی نہ بہہ گئے ہوں[۴۷]۔ صبح تک پانی بڑھتے بڑھتے اس قدر بڑھا کہ افضل گنج اور چادر گھاٹ کے پلوں پر سے دو دو نیزے بلندی کے ساتھ بہنے لگا۔ نتیجتاً اندرون و بیرون بلدہ کے بے شمار علاقوں میں پانی پھیل گیا۔ طغیانی کے نتیجے میں جن مقامات کا بالکل صفایا ہو گیا ان میں یوسف بازار، پتھر گٹی، مکرم الدولہ کی دیوڑھی، سرائے بواہیر، کوچۂ میر معانی جان، احاطہ نواب رشید الملک، جوہری گلی، بازہ گلی، بازار گھانسی، چار محل، پٹیلہ برج، محبوب کی مہندی، چیلہ پورہ، غالب جنگ کی دیوڑھی، ہیجڑوں کا الاوہ، بادشاہی عاشور خانہ، محلّہ اردو، ہائی کورٹ، دیوڑھی نواب سالار جنگ بہادر، لکڑ کوٹ، بازار چھتہ، دار الشفا، نیا محلّہ، نندی مسلائی کوڑہ، کشن باغ، بہادر گوڑہ، زست پورہ، دیوی باغ، حیا گوڑہ، سبزی منڈی، مستعد پورہ، کاروان ساہوان، دھول پیٹھ، کاروان اسپان، چوڑی بازار، بیگم بازار، درگاہ حضرت موسیٰ شاہ قادری، فیل خانہ، کولسہ واڑی، افضل گنج، محبوب گنج، بازار سیدی عنبر، رسالہ عبد اللہ، گنبۂ گوشہ محل، ترپ بازار، باغ محی الدین بادشاہ، کٹل منڈی، بازار اکبر جاہ، عثمان شاہی، گولی گوڑہ، پتلیوں کی باولی، ریذیڈنسی، تار آفس، ٹھگی جیل، چادر گھاٹ، کاپی گوڑہ اور ملک پیٹھ وغیرہ قابل ذکر ہیں[۴۸]۔ یہ بارش حیدر آباد دکن والوں پر قہر خدا کی صورت میں برسی اور اس کے نتیجے میں جو بپتا پڑی ہے وہ ممکن نہیں کہ کوئی سنگ دل شقی القلب بھی اسے دیکھ کر اشک حسرت نہ بہائے[۴۹]۔ مرزا فرحت اللہ بیگ اس صورتِ حال کا نقشہ کھینچتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

> راستے میں لوگوں کی جو حالت اور پریشانی دیکھی وہ بیان نہیں کی جاسکتی۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ قیامت آ گئی۔ سب کے سب نفسی نفسی کی مصیبت میں مبتلا تھے۔ کوئی صندوق سر پر اٹھائے بھاگ رہا ہے۔ کوئی بچوں کو گود میں سنبھالے دوڑ رہا ہے۔ عورتیں ہیں کہ ننگے سر ننگے پاؤں ادھر سے اُدھر پریشان حال پھر رہی ہیں[۵۰]۔

سید محمد فاروق نے اس صورتِ حال کی عکاسی درست طور پر اس شعر میں کی ہے:

اس مصیبت پر تری ہے سارا عالم رنج میں — تیری حالت پر تاسف کر رہا ہے اک جہاں[۵۱]

نجم الغنی کا کہنا ہے کہ ''۳۶ گھنٹوں میں پندرہ انچ پانی برسا[۵۲]۔ جب کہ اس سے قبل مانک راؤ وِٹھل راؤ کا بیان ہے کہ اس بارش میں جس سے یہ غیر معمولی طغیانی آئی تھی، مابین ایک رات اور دن کے ۱۷ انچ بارش ہوئی اور چالیس گھنٹوں میں جس قدر پانی بہا تھا اس کی مقدار تخمیناً سات کروڑ دو سو کسر فیٹ شمار کی گئی[۵۳]۔ سید خورشید علی کے مطابق:

> اس سال کی برسات حیدر آباد کی تاریخ میں ابد الآباد تک یادگار اور اس کی جگر فگار درد انگیز داستان صفحات

تاریخ پر قیامت تک خونیں حروف میں منقوش رہے گی[۵۴]۔

دو پشتوں سے دار الصدور نظام کو کبھی ایسی خرابی لاحق نہیں ہوئی تھی جیسی اس وقت ہوئی[۵۵]۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ حیدر آباد دکن کی تاریخ میں ایسی تباہی کی دوسری نظیر نہیں ملتی۔ امجد حیدر آبادی نے بارش کی شدت اور تباہی کا نقشہ کھینچتے ہوئے لکھا کہ:

وہ رات کا سناٹا وہ گھنگھور گھٹائیں	بارش کی لگاتار جھڑی، سرد ہوائیں
گرنا وہ مکانوں کا وہ چیخوں کی صدائیں	وہ مانگنا ہر ایک کا رو رو کے دعائیں
پانی کا وہ زور اور وہ دریا کی روانی	پتھر کا کلیجہ ہو جسے دیکھ کے پانی[۵۶]

طغیانی کے دن بندگانِ خدا کو جن جن الم ناک دشواریوں، دقتوں اور مصیبتوں کا سامنا ہوا ہے ان کے بیان کرنے سے زبان قاصر اور لکھنے سے قلم عاجز ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ طغیانی کا دن قیامت کے دن سے کچھ کم نہ تھا۔ کچھ عجیب طرح کی بے بسی و بے چارگی کا عالم تھا۔ جدھر دیکھو..... پانی کے سوا کچھ نظر نہ آتا تھا۔ ہزاروں مکانات اور ہزاروں جانیں نذر سیلاب ہوگئیں[۵۷]۔ محبّ حسین محبّ نے اس منظر کی عکاسی کرتے ہوئے لکھا کہ:

سنگِ فصیل زور سے پانی کے بہہ گئے	پتھر بڑے بڑے کہیں گر گر کے رہ گئے
موجوں کے جو مکان تھپیڑوں کو سہہ گئے	وہ بعد جزر کان میں زندوں کے کہہ گئے
سنگیں عمارتوں پہ تکبر نہ کیجیو	دامن میں نام حق کے اماں جاکے لیجیو[۵۸]

تعجب کی بات تو یہ ہے کہ ستمبر ۱۹۰۸ء کے وسط تک تو عالم یہ تھا کہ بارش کی قلت تھی لیکن ۱۸۔ ۱۷ستمبر سے یکا یک رت بدلی اور ۲۸ستمبر تک ایسی جھڑی بندھی اور موسلا دھار بارش ہوئی کہ الامان الحفیظ۔ چھوٹے بڑے ہر طرح کے نالے، کوئیں اور تالاب ابل پڑے۔ صرف بوسیدہ اور خستہ حال مکان ہی نہیں بلکہ اکثر پختہ عمارتیں بھی منہدم ہونے لگیں۔ جا بجا ریل کی پٹری بہہ گئی[۵۹]۔ بقول عبدالحلیم شرر:

> یہ سب ہنگامہ اور یہ سارا شورِ محشر چند گھنٹوں میں ہوگیا۔ موسیٰ ندی اپنا جلال وغضب دکھا کے چلی گئی۔ عالم پر خموشی اور موت کا سناٹا طاری ہے۔ نہ سڑکوں کا پتا ہے نہ گلیوں کا۔ نہ آبادی کا نشان ہے نہ عالی شان عمارتوں کا۔ جدھر نظر جاتی ہے پتھروں کا ڈھیر ہے اور حسرتوں کو انبار[۶۰]۔

مخلوق کے ضائع ہونے کے کئی سبب ہوئے۔ اکثر لوگ اس دھوکے میں رہے کہ پانی ان کے مکانات تک نہیں آئے گا اور اگر آ بھی گیا تو مضبوط و مستحکم مکانات کا کچھ بگاڑ نہ پائے گا لیکن بمصداق اس مصرع کے ''ماں در چہ خیالیم فلک در چہ خیال است'' دفعتاً پانی کا ایسا ریلا آیا کہ لوگوں کو مع ان کے مکانات، بہالے گیا۔ ہلاکتوں کی دوسری بڑی وجہ یہ تھی کہ لوگ رات کے وقت اپنے اپنے مکان میں پڑے سو رہے تھے کہ پانی نے ان کے مکانوں کو چاروں طرف سے گھیر لیا اور افسوس کہ ان بے چاروں کو اپنی جانیں بچا کر نکل جانے کا موقع تک نہ ملا[۶۱]۔ ملبے کے نیچے سے ملنے والی اکثر نعشیں ان تاجروں اور ساہوکاروں کی تھیں جو اپنا مال واسباب چھوڑ کر مکان سے جانے سے انکاری تھے[۶۲]۔ اکثر آباد مقامات کے گنجان محلے مع اپنے بسنے والوں کے دریا برد ہو چکے تھے۔ ہزاروں جانیں تلف ہو چکی تھیں۔ اور لاکھوں کا اثاثہ ضائع ہو چکا تھا[۶۳]۔ دوشنبہ کے دن صبح کے وقت جب کہ طغیانی اپنے انتہائی زور پر تھی، اس وقت لوگوں کی کیفیت دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ مرد، عورتیں، بوڑھے اور بچے سب کے چھکے چھوٹے ہوئے تھے۔ لوگ مکان چھوڑ کر محفوظ مقام کی طرف بھاگے جاتے

تھے لیکن انھیں کوئی جائے اماں نہیں مل رہی تھی۔ عفیفہ اور پاک دامن بی بیاں جنھوں نے اپنے مکان کی دہلیز تک کو نہ دیکھا تھا، سڑکوں پر نامحرم لوگوں کے سامنے، بحالت پریشانی دوڑی پھرتی تھیں۔ اس وقت خاوند کو بیوی کی، ماں کو بیٹی کی، بہن کو بھائی کی اور اولاد کو والدین کی خیر وخبر کی مطلق فکر نہ تھی بلکہ ہر ایک کو نفسا نفسی کی پڑی ہوئی تھی۔ اکثر لوگ بہ تحفظ جاں درختوں پر چڑھ گئے اور بہت سے پہاڑوں اور بلند مقامات پر جا کر بیٹھ گئے[64]۔ ندی کے بیچ کا دھارا کناروں سے بیس پچیس فٹ بلند تھا۔ اس دھارے میں ہر قسم کا سامان، صندوق، پلنگ، تخت وغیرہ قلابازیاں کھا رہے تھے[65]۔ ندی کے ایک جانب موجود لوگوں کو دوسری طرف کی خبر نہ ملتی تھی۔ ایسا منظر تھا کہ آج بھی اس کے خیال سے بدن پر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ندی کی رفتار کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ''اُس دھارے پر چکر کھاتی ہوئی لوہے کی سینکڑوں تجوریاں بہہ گئی اور کئی کئی میل دور جا کر نکلیں''[66]۔ بقول سید خورشید علی:

> پانی کی خوف ناک لہریں ہر چیز کو نگلتی اور فنا کرتی چاروں طرف بڑھ رہی تھیں۔ ہزار ہا آدمی عجب بے کسی اور بے بسی کے عالم میں نذر آب ہو رہے تھے۔ ظالم ندی نہ شکستہ حال بوڑھوں کی بے دست پائی کا لحاظ کرتی تھیں اور نہ اس کو نوخیز نوجوانوں کی نوجوانی اور چھوٹے چھوٹے معصوم بچوں کی ننھی ننھی جانوں کا پاس تھا۔ اس کی متلاطم موجیں جس بے رحمی سے ہزاروں مردوں کو نگل رہی تھیں اسی ہیبت ناک تندی اور سنگ دلی کے ساتھ بدحواس، تباہ حال، بدنصیب مصیبت زدہ عورتوں کو بھی لقمۂ اجل بنا رہی تھیں[67]۔

افضل گنج اور چادرگھاٹ کے پل کے ٹوٹنے سے بہت زیادہ تباہی ہوئی۔ افضل گنج کے اسپتال سے جب یہ سیلابی ریلا ٹکرایا تو اسپتال میں موجود بہت سے مریض بھی پانی میں بہہ گئے[68]۔ مرزا فرحت اللہ بیگ اس تباہی کا آنکھوں دیکھا حال بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں ''دارالشفا کے آس پاس کیا دیکھتے ہیں کہ سڑک پر ایک دریا بہہ رہا ہے اور اس میں کئی مردے تیرا کی کر رہے ہیں''[69]۔ کیفیت یہ تھی کہ جدھر دیکھو نعشیں نظر آتی تھیں۔ سُوؤں کی تعداد میں درختوں پر لٹکی ہوئی تھیں اور ہزاروں کی تعداد میں غاروں اور ریت میں دبی ہوئی تھیں[70]۔ نجم الغنی خاں کے مطابق ''دیواروں پر آٹھ فٹ سے بھی زیادہ پانی کا نشان تھا''[71]۔ جب کہ فرحت اللہ بیگ کا کہنا ہے کہ ''یہاں کے مکانوں پر پانی کا جو نشان تھا وہ کسی طرح انیس بیس فٹ سے کم اونچا نہ ہوگا''[72]۔ ہزاروں آدمی کا ایسی حالت میں بچ جانا کسی معجزے سے کم نہ تھا[73]۔ لیکن جو لوگ بچ گئے تھے ان کا حال مُردوں سے بھی بدتر تھا۔ ہر متنفس کے چہرے پر آنسوؤں کی جھڑی لگی ہوئی تھی۔ مصیبت زدہ عورتوں کے جگر خراش بین، ننھے ننھے معصوم بچوں کے دردناک نالہ وشیون اور تباہ حال مردوں کی دل گداز آہ و بکا سے آسمان پھٹا پڑتا تھا۔ ہر طرف ماتم برپا تھا اور محشر کا سماں دکھائی دیتا تھا[74]۔

سانحے کے بعد حکومت کی جانب سے فوراً امدادی سرگرمیاں شروع کی گئیں۔ لوگوں کو بچانے کے لیے اہل کار اور افسران دوڑے چلے آئے۔ کشتیاں منگوائی گئیں اور لوگوں کی جانیں بچانے کے لیے ہاتھیوں سے بھی مدد لی گئی[75]۔ حکومت کے لیے سب سے بڑی پریشانی یہ تھی کہ اتنی بڑی تعداد میں نعشوں کی شناخت کیسے کی جائے۔ امتیاز مذاہب اس وقت ایک دشوار مرحلہ تھا لہٰذا مجبوراً بلا امتیاز مذہب و ملت سب کو دفن کر دیا گیا۔ ایسا جگر خراش منظر اس سے قبل حیدرآباد کے لوگوں نے کبھی دیکھا نہ سنا[76]۔ ہر طرف ''سڑی ہوئی لاشوں کے ڈھیر پڑے ہوئے تھے''[77]۔ سید خورشید علی نے اس صورت حال کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے لکھا کہ:

> کشتگان سیلاب کی بے گور وکفن لاشوں کو جو بے شمار تعداد میں جا بجا پڑی ہوئی تھیں۔ جس قدر ممکن ہو

اٹھانے کی سخت ضرورت تھی۔ چناں چہ حضور نظام کے حکم سے.....اس جانب فوری توجہ مبذول کی گئی.....
طغیانی فرو ہونے کے دوسرے ہی روز سے ان ہزار ہا لاشوں کو جو قدم قدم پر پڑی ہوئی تھیں اور نگاہوں
سے پوشیدہ نہ تھیں، صفائی، کوتوالی اور فوج والوں نے مل کر اٹھانا شروع کیا.....غسل وکفن، تجہیز وتکفین،
فاتحہ یا کریا کرم کا تو کیا ذکر، اس بات کی تمیز بھی نہ ہوسکتی تھی کہ لاش مسلمان کی ہے یا ہندو کی.....ڈھیروں
لاشیں بند ڈبوں میں بھر کر شہر سے دور پہنچائی جا رہی تھیں کہ سب یکساں تہہ خاک کر دی جائیں [۷۸]۔

پورے شہر کی فضا پر ایک عجیب سی سوگواری چھائی ہوئی تھی۔ ہر شخص اپنی زندگی سے مایوس حسرت و یاس کی تصویر بنا ہوا تھا۔ طوفان کے فرو ہونے کے بعد جب ندی اپنی معمول کی حالت پر آ گئی اور شہر سے پانی نکلنا شروع ہوا تو وہ جگر خراش مظالم جواب تک چادر آب کے نیچے پوشیدہ تھے، نمایاں ہونے لگے۔ جہاں جہاں پانی کی خوف ناک لہریں پہنچیں تھیں۔ عام تباہی چھائی ہوئی تھی۔ جدھر نگاہ ڈالو ویرانہ ہی ویرانہ نظر آتا تھا۔ ہر طرف ایک ہو کا عالم تھا۔ نصف سے زیادہ شہر کا پتا نہ تھا۔ یہ معلوم ہونا بھی مشکل ہو گیا کہ کون سا محلّہ کہاں آباد تھا۔ سڑکوں اور گلیوں کے آثار بھی مٹ چکے تھے [۷۹]۔

طغیانی کے بعد کی صورت حال بھی عجیب وغریب تھی۔ ایک طرف ہزاروں لوگ اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے تو دوسری طرف لوگ فاقوں مر رہے تھے۔ مفلس اور مجبور لوگوں نے غلّے کی دوکانوں میں لوٹ مار شروع کر دی [۸۰]۔ موقعے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بدمعاشوں اور لٹیروں کو لوٹ گھسوٹ کی سوجھی۔ جو لوگ اپنا مال واسباب چھوڑ کر گھروں سے نکل گئے تھے۔ ان لٹیروں نے ان بے چاروں کے گھروں کو لوٹنا شروع کر دیا۔ بے حسی کی انتہا یہ تھی کہ مُردوں کے جسم سے زیورات اتارے گئے اور اگر کوئی چیز بوجہ جسم کے پھول جانے کے اتاری نہ جا سکی تو اس کو قطع کرنے میں بھی تامل نہ کیا [۸۱]۔ خودغرضی کی انتہا یہ تھی کہ کوئی حضرت بغل میں بکرے دبا کر بھاگ رہے ہیں تو کوئی سونے چاندی لوٹنے میں مصروف [۸۲]۔ بڑی تعداد ایسے لوگوں کی تھی جو اس انسانی المیے پر خدمت خلق کے جذبے سے شرشار ہو کر امدادی کاموں میں مصروف تھی۔ لیکن قلیل تعداد میں موجود ان لٹیروں نے پوری انسانیت کا سر شرم سے جھکا دیا۔ نظام حیدرآباد کی جانب سے فوری طور پر ریلیف کمیٹیاں بنائی گئیں لنگر خانے کھولے گئے۔ عارضی رہائش کا انتظام کیا گیا۔ کپڑے، بستر اور بنیادی ضروریات کی اشیا کی فراہمی ممکن بنائی گئی [۸۳]۔ مفلوک الحال اور بے خانما لوگوں کی امداد کے لیے شہر کو کئی حصوں میں تقسیم کر کے مختلف عہدے داروں کو ذمہ داری سونپی گئی [۸۴]۔ اُس زمانے میں حیدرآباد دکن میں غیر ملکیوں کے ستارے عروج پر تھے لہٰذا عزیز مرزا بھی اُسی زمانے میں محکمۂ داخلہ کے معتمد بنائے گئے [۸۵]۔ مہاراجا کشن پرشاد کی قائم کردہ ریلیف کمیٹی کے معتمد بھی عزیز مرزا ہی مقرر ہوئے [۸۶]۔ اُن کے علاوہ دوسرے محکمے سے عہدے داروں کو بھی اس کمیٹی میں شامل کیا گیا۔ ان میں ایک اور اہم نام مولانا ظفر علی خان کا ہے [۸۷]۔ نواب وقار الملک کے مطابق:

مولوی عزیز مرزا صاحب نے انسانی ہمدردی اور نیز خدا ترسی کے خیال سے اس موقع پر غیر معمولی محنت
کی۔ ڈھیروں منہدم کھنڈروں اور افتادہ مکانوں میں جہاں راستہ بھی نہ تھا، شب و روز مارے مارے
پھرتے اور واجب الرحم ستم رسیدوں کا پتا لگاتے تھے...غربا کی امداد کے لیے تیرہ لاکھ رقم چندہ جمع کی اور
اس کی تقسیم کا انتظام کیا [۸۸]۔

اس سلسلے میں انھوں نے ناچار اور غریب لوگوں کے کھانے اور کپڑے کا انتظام کیا۔ نعشوں کے منتقل کرنے اور بڑے بڑے ملبے سے ان نعشوں کو نکالنے کا معقول انتظام کیا۔ انجینئروں کی زیرنگرانی پلوں اور دوسری عمارتوں کی دیکھ بھال اور مرمت کروائی۔ رات رات بھر اصلاحی کام میں مصروف رہتے اور روزانہ اس کی روداد لکھ کر ٹائپ کرواتے اور پھر سرشتہ کے ناظم کے پاس بھجواتے۔ انھی کی تحریک پر تمام سرکاری ملازمین کو ایک ماہ کی تنخواہ پیشگی ادا کی گئی [89]۔ مولوی محمد یحییٰ تنہا کے مطابق "سیلاب حیدرآباد کے زمانے میں آپ نے عوام کے لیے اس قدر زحمتیں برداشت کی تھیں کہ بیمار ہو گئے" [90]۔ لیکن صحت بگڑنے کے باوجود وہ فرائض کی بجا آوری سے باز نہ آئے [91]۔ اس بے لوث محنت کی وجہ سے پورے حیدرآباد میں ان کی بڑی نیک نامی ہوئی تھی لیکن ان کی ترقی اور اثر و رسوخ، ان کے حاسدوں کو چراغ پا کرنے کے لیے کافی تھا۔ اس موقع پر ان کے سب سے بڑے مخالف مسٹر واکر (Sir George Casson Walker) جو ۱۹۰۱ء تا ۱۹۱۱ء ریاست حیدرآباد دکن میں مالی امور کے مشیر تھے، نے امین جنگ کو آلہ کار بنا کر نظام حیدرآباد میر محبوب علی خاں تک یہ اطلاع پہنچائی کہ عزیز مرزا نے ریلیف کے کاموں میں روپیہ بے جا صرف کیا ہے اور امدادی رقوم مستحقین سیلاب تک پہنچنے کے بجائے اپنے پسندیدہ خوش حال افراد کو اس کی رقم سے نوازا گیا ہے [92]۔ جب کہ مولوی عزیز مرزا نے چندے سے حاصل شدہ رقم کی تقسیم کا انتظام ایسی عمدگی سے کیا تھا کہ حسابات میں ایک پائی کا بھی فرق نہ آیا [93]۔ کمیٹی کے ذریعے تحقیقات کروائی گئیں تو سارے الزامات غلط ثابت ہوئے۔ اس پر عزیز مرزا کی عزت میں مزید اضافہ ہوا۔ نظام نے خوش ہو کر میر عثمان علی خاں کو رموزِ مملکت اور انتظام حکومت سکھانے کی ذمہ داری بھی انھی کے سپرد کی۔ یہ بات مسٹر واکر کو سخت ناگوار گزری [94]۔ خدا جسے عزت دینا چاہے تو حاسدوں کی سازشیں بھی ناکام ہو جاتی ہیں۔ مسٹر واکر کی مخالفت کے باوجود عزیز مرزا کو اس سیلاب کے دوران عمدہ انتظامی امور کی انجام دہی کے صلے میں سرکارِ برطانیہ کی طرف سے اول درجے کا "تمغۂ قیصرِ ہند" عطا ہوا [95]۔ یہ تمغا طغیانی رودِ موسیٰ کے فوراً بعد ۱۹۰۸ء ہی کو ملا [96]۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ وہی مسٹر واکر جو مولوی عزیز مرزا کے سب سے بڑے مخالف تھے، تمغا ملنے کے بعد اپنی مبارک باد کی چٹھی میں لکھتے ہیں کہ "یہ آپ کی محنتوں کا ادنیٰ صلہ ہے" [97]۔ "قیصرِ ہند" کے یہ تمغے دو قسم کے تھے۔ ایک چھوٹا تمغا تھا جو ڈنر سوٹ پر لگانے کے لیے تھا اور دوسرا بڑا تمغا جو درباری لباس پر لگانے کے لیے تھا۔ دونوں تمغے سونے کے تھے جن پر انگریزی میں FOR PUBLIC SERVICE IN INDIA"KAISAR-HIND" درج تھا [98]۔

دوسرے بہت سے لوگوں کی جانب سے بھی انسانی ہمدردی کی لازوال داستانیں دیکھنے کو ملیں۔ بہادری اور فرض شناسی کی بے شمار مثالیں دیکھنے میں آئیں۔ لیڈی اسسٹنٹ سرجنوں اور نرسوں نے ایسی بہادری دکھائی کہ ایسی مثالیں کم ہی دیکھنے کو ملتی ہیں۔ ۲۷ ستمبر کے ہولناک طوفان کے نتیجے میں جب سیلاب کا پانی افضل گنج کے پل کو توڑتا ہوا اسپتال میں داخل ہوا اور متعلقہ حکام نے تمام سرجنوں اور نرسوں کو محفوظ مقام پر منتقل ہونے کی ہدایت کی تو وہ سب لوگ مریضوں کو چھوڑ کر جانے پر تیار نہ ہوئے [99] بلکہ آخری دم تک وہ سب لوگوں کی خدمت میں مصروف کار رہے۔ فوج نے بھی اس زمانے میں جو کام کیا اس کی تعریف نہیں ہو سکتی۔ پہلے تو انھوں نے شہر میں امن قائم کیا۔ اس کے بعد دبے ہوئے لوگوں کو ملبے سے نکالنے، مُردوں کو دفن کرنے اور حیدرآباد کو وبائی امراض سے بچانے کے اقدامات کیے [100]۔ اس کے علاوہ ریلیف کے کاموں میں خواتین کا کردار بھی قابل ذکر رہا۔ طغیانی کے بعد رسم و رواج کی پابند وہ خواتین جو گھروں سے باہر بھی نکل نہیں پا رہی تھیں، ان کے لیے یہ خواتین فرشتہ ثابت ہوئیں۔ ان خواتین میں مسز حیدری اور مسز نائڈو کے علاوہ

یورپین خواتین مسز سہراب جی، مسز اسٹیونس، مسز جیفری، مسز بلین، مسز فیلوز، مسز لاریمر، مسز چیٹ وڈ وغیرہ نے بھی دل کھول کر امدادی کاموں میں حصہ لیا۔ اس ریلیف کمیٹی کی سکریٹری مسز حیدری اور جوائنٹ سکریٹری مسز نائڈو مقرر ہوئیں۔ مسز واکر کو اس کمیٹی کا صدر مقرر کیا گیا۔ مسز نائڈو کے مکان میں کمیٹی کا دفتر قائم ہوا۔ ان تمام خواتین نے بڑی مستعدی اور جفاکشی سے دور دراز آباد پردہ نشیں خواتین تک کپڑے اور غذائی اجناس کی فراہمی کو ممکن بنایا۔ ان امدادی سرگرمیوں میں مسز سید ہمایوں مرزا، بنت نصیر الدین حیدر صاحبہ اور عماد الملک مولوی سید حسین بلگرامی کی صاحب زادی مسز خدیو جنگ وغیرہ نے بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا[۱۰۱]۔

سرکاری رپورٹ کے مطابق اس سانحے میں اندازاً دو ہزار لوگ لقمۂ اجل بنے[۱۰۲] لیکن جس قسم کی تباہی ہوئی اس کو دیکھ کر ان اعداد و شمار پر یقین کرنا محال ہے۔ کیوں کہ ''موسیٰ ندی کے اطراف کی آبادی کے تین ہزار افراد تو دیکھتے ہی دیکھتے ڈوب گئے'' تھے[۱۰۳]۔ اخبار ''ایڈوکیٹ''، بمبئی اور ''ٹائمز آف انڈیا'' نے ہلاک شدگان کی تعداد پانچ ہزار سے زائد بتائی ہے[۱۰۴]۔ بعض انگریزی اخبارات نے یہ تعداد ایک لاکھ بیس ہزار تک بتائی[۱۰۵]۔ اموات اور ہلاکتوں کا اندازہ عبدالحلیم شرر کے اُس مضمون سے اچھی طرح لگایا جا سکتا ہے جس میں طغیانی رودِ موسیٰ کا حال بیان کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ:

> موسیٰ ندی ایک بھوکے اژدھے کی طرح پیچھے دوڑی آتی ہے۔ وہ سڑکوں پر سانپوں کی طرح لہرا لہرا کے دوڑ رہی ہے کہ کوئی ملے تو اسے ہڑپ کر جائے... اپنی قہار بھوک سے وہ بے تاب ہے۔ چاروں طرف وہ زندہ مخلوق کو ڈھونڈتی پھرتی ہے۔ ہزاروں بندگانِ خدا کو نگل گئی اور پیٹ نہیں بھرتا... ان جگہوں کی خونی تصویر دیکھی بھی نہیں جا سکتی جہاں تو نے اپنا جوش دکھانے سے پہلے ہی لوگوں کو اپنی آغوشِ مرگ میں گھیر لیا ہے۔ وہاں کا عالم! عالمِ مرگ! عالمِ تباہی! عالمِ بے کسی و بے بسی نہ دیکھا جا سکتا ہے اور نہ بیان ہو سکتا ہے... کوئی تو تیرے دستِ ستم سے بچا ہوتا... بیبیاں، شوہروں کے سامنے، بیٹے بیٹیاں، ماں باپوں کے سامنے، بہن بھائی، بہن بھائیوں کے سامنے، دوست، دوستوں کے سامنے ڈوب ڈوب کے مر رہے تھے اور کسی کو بچانے کی جرات نہیں ہوئی[۱۰۶]۔

عبدالحلیم شرر کے بیان کردہ حقائق سے یہ بات تو پوری طرح عیاں ہے کہ بڑی تعداد میں ہلاکتیں ہوئیں اور دیکھتے ہی دیکھتے اس طغیانی نے آبادی کی آبادی نیست و نابود کر دی اس کے باوجود ماہرین نے ہلاک شدگان کی تعداد پر کچھ شکوک و شبہات کا اظہار کیا ہے۔ علامہ نجم الغنی خاں کے مطابق اس سانحے میں پچاس ہزار سے کم جانیں ضائع نہیں ہوئیں اور تقریباً پندرہ سے بیس ہزار مکانات گر کر تباہ ہو گئے[۱۰۷]۔ سانحے کے فوراً بعد دکن سے نکلنے والے رسالے ''ادیب'' کے طوفان نمبر کے مطابق اس قیامت خیز طغیانی میں پچاس ہزار سے کم جانیں تلف نہیں ہوئیں[۱۰۸]۔ اکثر ماہرین اسی تعداد کو درست مانتے ہیں۔ ہلاکتیں اور تباہی اس قدر زیادہ تھیں کہ پورے حیدر آباد دکن میں افراتفری پھیل گئی۔ معاملے کی سنگینی کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ حیدر آباد دکن کی اس تباہی کا حال بہت تیزی سے اطراف عالم میں پھیل گیا۔ کلکتا، مدارس، بمبئی، علی گڑھ، لکھنؤ کے علاوہ لندن وغیرہ میں بھی حیدر آباد دکن کے متاثرین کے ساتھ اظہار ہمدردی کے غرض سے جلسے منعقد کیے گئے۔ مصیبت زدگان کے لیے لاکھوں روپے چندے کی مد میں جمع ہوئے۔ صرف چند روز میں بمبئی کے لوگوں نے ایک لاکھ روپے فراہم کیے۔ دنیا کے مختلف حصّوں سے خطوط کا سلسلہ شروع ہوا۔ قیصر ہند نے وائسرائے

بہادرکواس ہول ناک تباہی کے حوالے سے خط لکھ کر ہمدردی کا اظہار کیا۔ شہزادہ ویلز اور گورنر بمبئی نے نظام حیدرآباد کو ہمدردی کے پیغامات بھیجے۔ ندوۃ العلماء اور مدرستہ العلوم مسلمانان علی گڑھ کی جانب سے بھی ہمدردی کے پیغامات موصول ہوئے۔ پورے ہندوستان میں جگہ جگہ اس مناسبت سے جلسے ہوئے یہاں تک کہ ان مصیبت زدگان کے لیے لندن میں بھی ایک جلسہ منعقد ہوا۔ اس جلسے میں نواب عمادالملک، مولوی سید حسین بلگرامی، مسٹر کے۔ جی۔ گپتا، مسٹر آر۔ جے۔ ٹاٹا، سید علی بلگرامی، مسٹر رومیش چندادت، مسٹر گھوکھلے اور مسٹر علی اکبر کے علاوہ ہندوستان کے سابق وائے سرایان لارڈ لنسڈ ون، لارڈ رپن، گورنر لارڈ ایمپتھل، لارڈ ہیمنگٹن، لیفٹیننٹ گورنر سر جیمس لاٹوش اور سر چارلس ایلیٹ وغیرہ بھی شریک تھے۔ یہ اجلاس ۳ دسمبر ۱۹۰۸ء کو انجیٹیشن ہال میں بصدارت لارڈ میئر کے منعقد ہوا اور تقریباً دس ہزار کے قریب چندہ جمع ہوا۔ شہزادہ ویلز نے بھی اس میں سو پاؤنڈ عنایت کیے [۱۰۹]۔

طغیانیِ رودِ موسیٰ ایک صدی سے زائد کا عرصہ گزر گیا لیکن آج بھی اس کی ہول ناکی کو پڑھ کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ یہ خورشید علی نے درست کہا کہ:

> کیا زمانے کا الٹ پھیر ہے کہ صدہا سال کی متواتر اور مسلسل کوششوں میں حیدرآباد کو جو رونق، جو بہار اور جوشان وشوکت نصیب ہوئی تھی، چشم وزدن میں سب پر پانی پھر گیا.....وہ مقامات جہاں دن بھر اور رات رات بھر میلے سے لگے رہتے تھے آج ویران وسنسان ہیں۔ جہاں ہر وقت عجیب چہل پہل رہتی تھی آج ایک وحشت ناک سناٹا چھایا ہوا ہے اور وہ عالی شان سر بفلک عمارتیں جو سینکڑوں تمناؤں اور ہزاروں ارمانوں کے ساتھ بے شمار دولت صرف کرنے پر تعمیر ہوئی تھیں۔ آج مسمار و نابود ہو کر زمین کے برابر ہوگئی ہیں [۱۱۰]۔

اس صورت حال میں جو لکھ پتی تھے وہ دیکھتے ہی دیکھتے تھوڑی ہی دیر میں فقیر سے بھی بدتر ہوگئے [۱۱۱]۔ غرض کہ یہ ندی ''آناً فاناً میں عصائے موسیٰ سے وہ عظیم آلشان [کذا: عالی شان] اژدھا بن گئی جو دم بھر میں مصر کی ہزارہا خلقت کو نگل گیا تھا'' [۱۱۲]۔ افسوس ناک صورت حال یہ تھی کہ ان ہزارہا نعشوں میں سے بے شمار نعشیں ان کے پیاروں کو مل بھی نہ سکیں۔ اس اژدھے نے نعشوں کو اس طرح نگلا کہ ان کا نام ونشان تک مٹ گیا۔ ندی کے اس عمل پر شکوہ کرتے ہوئے عبدالحلیم شرر نے بڑے جذباتی انداز سے لکھا کہ:

> موسیٰ ندی! بتا کہ ہمارے مُردوں کو بہا کے تو کہاں لے گئی؟ موسیٰ ندی! یہ مُردے نہیں، یہ ہماری امانتیں ہیں جنھیں ہم تجھ سے لیں گے۔ آج نہیں تو کل قیامت کو لیں گے۔ ایک دن ضرور آنے والا ہے جب اے اژدھا صفت ندی تجھے اپنی یہ لذیذ لقمے اگلنے پڑیں گے اور تجھے اپنے اس ظلم وستم کا یقیناً جواب دہ ہونا پڑے گا...آہ تیرا غیض وغضب! تیرا جوش وخروش! تیری بے رحمی وسنگ دلی! تیری وہ غضب ناک صورت! تیری وہ پرشکن جبینیں! تیری وہ بدحواس کر دینے والی والی ہیبت! تو کیا تھی اور دم بھر میں کیا ہوگئی [۱۱۳]۔

مندرجہ بالا صفحات میں طغیانیِ موسیٰ ندی کی تباہی وبربادی کی جو تصویر پیش کی گئی وہ کسی طرح قیامت صغریٰ سے کم نہیں لہٰذا یہ کیسے ممکن ہے کہ اتنے بڑے واقعے پر ہمارے شعرا اور ادیب خاموش رہے ہوں۔ بہت سے شعرا نے اس سانحے کو موضوع سخن بنایا۔ اس

سلسلے میں سب سے پہلا اور اہم نام مولانا ظفر علی خاں کا ہے۔

جس زمانے میں یہ سانحہ ہوا مولانا ظفر علی خان بہ سلسلۂ ملازمت دکن میں ہی مقیم تھے۔طغیانی نے جب پوری ریاست کو ہلا ڈالا اور متاثرہ لوگوں کی امداد کے لیے تحریک چل نکلی تو مولانا ظفر علی خان نے بھی اس موضوع پر ایک طویل نظم لکھی۔اس نظم سے ادبی و شعری حلقوں میں ان کا نام ثقہ ہوگیا۔اپنے موضوع کے اعتبار سے بھی اس نظم کو اوّلیت کا درجہ ملا [۱۱۴]۔راقم نے مندرجہ بالا صفحات میں اس سانحے کے درست سن کے حوالے سے ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار کی غلط فہمی کا ذکر کیا ہے۔دراصل یہ غلط فہمی انھیں ظفر علی خان کی مشہور نظم ''شورِ محشر'' کی وجہ سے ہوئی تھی۔پہلی بار یہ غلطی ۱۹۶۷ء میں ہوئی [۱۱۵]۔جب اس نظم پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ یہ نظم ''حیدر آباد کے زمانۂ قیام میں رودِ موسیٰ کی طغیانی (۱۹۰۵ء) کے موقع پر لکھی گئی اور ہزاروں کی تعداد میں چھپی'' [۱۱۶]۔جب کہ دوسری بار انھوں نے ۱۹۹۳ء [۱۱۷] میں شائع ہونے والی ایک اور تصنیف میں اپنی اس غلطی کو دہراتے ہوئے لکھا کہ ''۱۹۰۵ء میں رودِ موسیٰ کی طغیانی ایک حادثۂ عظیم تھی جس نے حیدر آباد میں حشر برپا کر دیا تھا'' [۱۱۸]۔اس سے قبل تفصیل سے وضاحت ہوچکی ہے کہ طغیانی رودموسیٰ کا سانحہ ۱۹۰۸ء میں ہوا تھا اور ظفر علی خاں نے اپنی مشہور نظم ''شورِ محشر'' ظاہر سی بات ہے اس سانحے کے رونما ہونے کے بعد ہی کہی تھی۔ لیکن ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار اس بارے میں دلیل دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ ''رودموسیٰ'' کی طغیانی پر انھوں [ظفر علی خاں] نے جو نظم ''شورِ محشر'' کے نام سے لکھی اسے پڑھ کر مولانا حالی اپنے ایک خط مورخہ ۱۱ مارچ ۱۹۰۵ میں [۱۱۹] بہت تعریف کی ہے۔راقم نے مولانا حالی کا مذکورہ خط غور سے دیکھا تو اندازہ ہوا کہ اس خط میں مولانا نے کہیں بھی نظم ''شورِ محشر'' کی تعریف نہیں کی اور نہ ہی پورے خط میں اس نظم کا کہیں ذکر کیا ہے۔ظاہر سی بات ہے جو نظم حالی کی تحریر کردہ اس خط کے تین برس بعد یعنی ۱۹۰۸ء کی تخلیق ہو، اس کی تعریف وہ ۱۹۰۵ء میں کیسے کر سکتے تھے؟ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار نے مذکورہ خط کا حوالہ ''مکاتیب حالی'' مرتبہ شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی سے دیا تھا۔شیخ محمد اسماعیل نے یہ خط کہاں سے لیا، اس بات کی کوئی وضاحت نہیں کی گئی۔راقم نے اس خط کی تلاش شروع کی تاکہ تاریخ کے حوالے سے ذہن میں پیدا ہونے والے خدشے کو دور کیا جا سکے۔بالآخر یہ خط ''دکن ریویو'' مارچ ۱۹۰۵ء کے شمارے میں مل ہی گیا۔اس خط کی آمد پر اپنی مسرت کا اظہار کرتے ہوئے مولانا ظفر علی خاں نے لکھا کہ ''حقیقت یہ ہے کہ بی۔اے۔کی ڈگری نے بھی مسرت وفخر کی وہ کیفیت ہمارے دل میں پیدا نہ کی تھی جو اس والا نامہ کی ہے'' [۱۲۰]۔اس نظم کی مزید وضاحت سے قبل مولانا حالی کے مذکورہ خط کے متن کو ملاحظہ کیجیے:

> جنوری کا دکن ریویو سامنے رکھا ہوا تھا جس کو تفصیلی نظر سے اب تک نہ دیکھا تھا۔سرے ہی پر آپ کی نظم جو ''رودِ موسیٰ'' پر لکھی گئی تھی، نظر پڑی اوّل سے آخر تک بڑے غور سے اور بڑے شوق کے ساتھ پڑھی۔میرا حال اب یہ ہوگیا ہے کہ اب پرانی نظمیں تو (الا ماشاءاللہ) اس لیے دیکھنے کو جی نہیں چاہتا کہ ان میں کوئی نئی بات دیکھنے میں نہیں آتی اور نئی طرز کی نظموں میں گو مضامین نئے ہوتے ہیں مگر وہ چیز جس کو شاعری کی جان کہنا چاہیے، کہیں نظر نہیں آتی۔لیکن اس نظم کو دیکھ کر میں متحیر ہوگیا.....رودِ موسیٰ پر جو کچھ آپ نے لکھا ہے۔ یہ محض زورِ طبع اور شاعری کی خداداد قابلیت سے لکھا ہے.....اگر آپ جیسے دو چار آدمی ملک میں پیدا ہو جائیں تو کچھ امید پڑتی ہے کہ نئی شاعری چل نکلے۔مجھے تو مسلمانوں کے دکھڑے نے اتنی مہلت ہی نہیں دی کہ نیچر کے مظاہر پر کچھ طبع آزمائی کرتا [۱۲۱]۔

پورے خط میں مولانا حالی نے کہیں بھی نظم ''شورِ محشر'' کا ذکر نہیں کیا البتہ 'رودِ موسیٰ' پر لکھی گئی نظم کا تذکرہ کرتے ہوئے مولانا ظفر علی خاں کی نیچرل شاعری کی داد دی ہے۔ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار نے اپنی ایک اور تصنیف میں ''شورِ محشر'' کے ضمن میں لکھا کہ ''مختلف ادبی جریدوں نے اس نظم کو بڑے اہتمام سے شائع کیا۔ 'دکن ریویو' کے شمارہ جنوری ۱۹۰۵ء میں بھی یہ نظم چھپی''[۱۲۲]۔ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ مذکورہ شمارے میں جو نظم چھپی وہ ''شورِ محشر'' نہیں بلکہ ''رودِ موسیٰ'' ہے[۱۲۳]۔ ۳۲ اشعار پر مشتمل اس نظم میں شاعر نے طغیانی سے ہونے والی تباہی کا نہیں بلکہ اس ندی کے حسن و جمال اور خوب صورتی کا حال بیان کیا ہے۔ یہ نظم نیچرل شاعری کے سلسلے کی ایک ناقابلِ فراموش کڑی تھی۔ اس لیے مولانا حالی نے خط لکھ کر اس نظم کی تعریف کی تھی۔ نظم میں ظفر علی خاں نے جذبات نگاری کے ساتھ ساتھ مناظر قدرت کی جس انداز سے تصویر کشی کی ہے وہ بڑی موثر ہے۔ نظم کا ڈرامائی انداز قاری کے ذہن کو ایسی فضاؤں میں لے جاتا ہے جہاں سے اسے مختلف مناظر کی چلتی پھرتی تصویریں دکھائی دیتی ہیں[۱۲۴]۔ کبھی نہر کے ٹھنڈے میٹھے پانی کا ذکر کرتے ہوئے شاعر کہتا ہے کہ:

اے نہر تیرا پانی شیریں ہے یا گوارا — مصری کی ایک ڈلی ہے جو تیری کنکری ہے[۱۲۵]

اور کبھی ندی کے آس پاس موجود ہریالی اور مختلف موسموں میں ندی کے اندر آنے والی تبدیلی کا حال بیان کرتے ہوئے کہتا ہے کہ:

موجوں کے آستاں پر سبزے کا لہلہانا — آبِ رواں کا آنچل جھالر ہری ہری ہے
جنگل میں ہو رہا ہے تیرے قدم سے منگل — تو صنعِ[۱۲۶] ایزدی ہے تو شان داوری ہے
چلمن پڑی ہوئی ہے تجھ پر کہیں کنول کی — اور نرسلوں سے تیری دہلیز اخضری ہے
ساون میں تونے اوڑھا جب اگرئی دوپٹا — دنیا یہ سمجھی جوگن کے بھیس میں پری ہے[۱۲۷]

غرض کہ دکن ریویو ۱۹۰۵ء میں شائع ہونے والی اس نظم میں کہیں بھی اُس طغیانی کا حال بیان نہیں کیا گیا جس نے حیدرآباد دکن کو تباہ و برباد کر دیا تھا۔ کیوں کہ نظم کا موضوع ''رودِ موسیٰ'' ہے اس لیے ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار کو گمان ہوا ہوگا کہ یہ ہول ناک سانحہ ۱۹۰۵ء میں رونما ہوا۔ لہٰذا اپنی دو مختلف تصانیف میں نہ صرف انھوں نے اس سن کو دہرایا بلکہ مولانا حالی کے خط کا حوالہ بھی دے ڈالا جو انھوں نے نیچرل شاعری کی تعریف کے ضمن میں ظفر علی خاں کو لکھا تھا۔ کسی حادثے، سانحے یا واقعے کی تاریخ کے بیان میں ضروری ہے کہ ہم مستند تاریخ کی کتابوں سے ضرور مدد لیں۔ اگر ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار حیدرآباد دکن پر لکھی گئی مستند تاریخوں کا مطالعہ کرتے تو ان سے یہ سہو ہرگز نہ ہوتا۔ اس کے علاوہ ان کا یہ کہنا کہ اب یہ نظم ''نایاب ہے اور ان کے کسی مجموعۂ کلام میں بھی شامل نہیں''[۱۲۸] سراسر غلط ہے کیوں کہ یہ نظم نامکمل حالت میں ''شورِ محشر'' ہی کے عنوان سے ان کے شعری مجموعے ''بہارستان'' میں شامل ہے[۱۲۹]۔ اس مجموعے میں نظم کا تیسرا، چوتھا اور پانچواں بند شامل ہے جب کہ پہلا، دوسرا اور چھٹا بند اس مجموعے میں موجود نہیں[۱۳۰]۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ اس نظم کا تعارف کراتے ہوئے ''بہارستان'' کے مرتب اصغر حسین خان نظیر لدھیانوی نے بھی طغیانی رودِ موسیٰ کے سانحے کا سن ۱۹۰۸ء ہی درج کیا ہے[۱۳۱]۔

طغیانی رودِ موسیٰ کے بعد خانماں برباد لوگوں کے لیے شہر میں جب مختلف امدادی مراکز قائم کیے گئے تو افضل گنج کے علاقے کا انتظام، جہاں تقریباً پچاس ہزار تباہ حال انسانوں کے کھانے پینے، کپڑے اور رہائش کا سامان مہیا کیا گیا تھا۔ ظفر علی خان کے سپرد ہوا[۱۳۲]

اصغر حسین خاں نظیر لدھیانوی نے سہواً اس علاقے کا نام افسر گنج لکھا ہے[۱۳۳]۔ ''افضل گنج'' میں فرض کی ادائیگی کے دوران ظفر علی خان نے اپنی جان کی پروانہ کرتے ہوئے مصیبت زدوں کی مدد کی۔ سیلاب کی زد میں آیا ہوا ایک مکان جو گرنے والا تھا، اس مکان میں ایک عورت اور کم سن بچے پھنسے ہوئے تھے۔ امداد کی کوئی صورت نظر نہیں آ رہی تھی۔ ایسے میں ظفر علی خاں تمام خطرات سے بے پروا ہو کر اس مکان میں پہنچ گئے اور عورت اور بچہ کو صحیح سالم نکال لائے۔ ان کے نکلنے کے چند منٹ کے بعد ہی وہ مکان زمین بوس ہو گیا[۱۳۴]۔ انھوں نے نہایت ہمدردی اور جاں سوزی سے مسلسل اٹھارہ دن تک، دن رات یہ خدمت انجام دی۔ حکومت نظام نے ان کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے خوش نودی کا اظہار کیا[۱۳۵]۔ اس قیامت خیز طغیانی کے بارے میں ظفر علی خاں کی نظم ''شورِ محشر'' کو ہزاروں کی تعداد میں چھاپا گیا[۱۳۶]۔ اور اس کی آمدنی رودِ موسیٰ کے سیلاب زدوں کی امداد کے لیے وقف کر دی گئی۔ انھوں نے یہ نظم ایک بڑے جلسے میں بھی سنائی جس میں مہاراجا سرکشن پرشاد کے علاوہ بہت سے دوسرے حیدر آبادی امرا اور اکابر سمیت مسٹر واکر بھی موجود تھے[۱۳۷]۔ ہندوستان کے ادبی حلقوں میں اس نظم کا بڑا شہرہ رہا[۱۳۸]۔ نظم کی شہرت کا یہ عالم تھا کہ کان پور سے نکلنے والے ادبی رسالے ''زمانہ'' نے بھی اس کی اشاعت کا اہتمام کیا[۱۳۹]۔ اور یہیں سے نقل کر کے ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار نے اپنی تصنیف ''ظفر علی خاں ادیب و شاعر'' کے ضمیمے میں شامل کیا[۱۴۰]۔ لیکن اب بھی اس بات کا امکان ہے کہ اس نظم کے کچھ بند آج بھی نایاب ہیں۔ شک میں مبتلا کرنے کا باعث مدیر ''مخزن'' سر عبدالقادر کا وہ جملہ ہے جو انھوں نے اس نظم کے تعارف میں لکھا۔ ان کا کہنا ہے کہ یہ ''نظم مستقل قدر کے قابل ہے اس لیے اس کے پہلے چھے بند ہم ان اوراق میں شائع کرتے ہیں''[۱۴۱]۔ لہٰذا وہی چھے بند آج تک دست یاب ہو سکے۔ نظم کے بقیہ حصّے سے آج بھی اردو دنیا محروم ہے۔

نظم کی تمہید میں ظفر علی خاں نے حیدر آباد دکن کی تباہی و بربادی کے بعد وہاں کے باسیوں کی پریشانی اور غم والم کی کیفیات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ:

اس باغ میں ہے کیسا یہ مجمعِ پریشاں — صورت سے فکر ظاہر چہروں سے غم نمایاں
لالہ کی طرح سب کے سینوں میں داغ تاباں — شبنم کی طرح سب کی آنکھوں سے اشک غلطاں
بجتے تھے جس میں کل تک شادی کے شادیانے — شانِ خدا وہیں ہیں ماتم کے آج ساماں
ماتم بھی ایک دو کا گر ہو تو صبر کر لیں — لیکن یہاں تو صدہا گھر ہو گئے ہیں ویراں
قہرِ خدا کی صورت نازل ہوا دکن پر — بن کر قضائے مبرم موسیٰ ندی کا طوفاں[۱۴۲]

یہ وہی ندی ہے جس پر حیدر آباد کے لوگ دل و جان سے فدا تھے اور جس کے نغمے ہمیشہ سے گائے جاتے تھے۔ اس کے حسن میں کھو کر اور خوش گوار فضاؤں کو یاد کر کے شعرا اور ادبا، اسے موضوعِ سخن بناتے تھے۔ بقول ظفر علی خاں:

سمجھے ہوئے تھے جس کو ہم شہر کی رگِ جاں — میں جس کے وصف میں تھا کل اس طرح غزل خواں[۱۴۳]

اس شعر کے بعد تمہیدی بند کا اختتام ہوتا ہے اور دوسرے بند کا آغاز۔ اس بند میں ندی کے حسن اور خوب صورتی کا حال بیان کیا گیا ہے۔ اس بند کے اکثر اشعار وہی ہیں جو اس سے قبل ''رودِ موسیٰ'' کے نام سے دکن ریویو کی زینت بن چکے تھے[۱۴۴]۔ البتہ اس نظم کے سات اشعار ''شورِ محشر'' میں شامل نہیں[۱۴۵]۔ ''شورِ محشر'' کے دوسرے بند کے آخری دو اشعار نئے ہیں اور ''رودِ موسیٰ'' میں شامل نہیں۔ ان ہی دو اشعار

کے ذریعے شاعر دوسرے بند میں اپنی کہی ہوئی ہر بات کی نفی کرتا ہوا نظم کے اصل موضوع کی طرف بڑھتا ہے۔ وہ دو شعر ملاحظہ کیجیے:

آصف کہ جس کے سر پر سایہ ہے کبریا کا　　جس کی جبیں سے ظاہر شانِ سکندری ہے

جو کچھ کہا ہے میں نے اے نہر تیری نسبت　　الزام شاعری ہے افسوس میری نسبت [۱۴۶]

دوسرے بند میں دل فریب مناظر کو پیش کرنے اور رودِ موسیٰ کی تعریف میں کیے گئے تمام اشعار کو الزام شاعری قرار دینے کے بعد تیسرے بند میں شاعر ''امڈی ہوئی ندی کے طوفانِ درماں کا خوف ناک منظر پیش کرتا ہے''[۱۴۷]۔ یہاں اس کا نرم اور شیریں لہجہ اچانک تند و تیز اور تلخ ہو جاتا ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

او نامراد ندی تجھ پر غضب خدا کا　　الٹا ہے تونے تختہ یارانِ آشنا کا

تیری ہر ایک ٹکر داعی بنی اجل کی　　تیرا ہر اک تھپیڑا قاصد بنا قضا کا

اس واقعے کا ماتم برسوں بپا رہے گا　　کانٹا ہر ایک دل میں غم کا چبھا رہے گا [۱۴۸]

مسلسل بارش اور اس کے نتیجے میں آنے والے طوفان نے جب تباہی و بربادی کا سلسلہ شروع کیا تو انسان کی ساری کوششیں اور تدبیریں، اس طوفان کو روکنے میں ناکام ثابت ہوئیں اور پورے حیدرآباد دکن میں ایک ایسے انسانی المیے نے جنم لیا جس میں ہر انسان حسرت و یاس کی تصویر نظر آ رہا تھا۔ دکن کی تاریخ میں انسانی بے بسی اور بے چارگی کی ایسی دوسری مثال کم ہی ملے گی۔ چوتھے بند میں شاعر نے اس صورتِ حال کو دیکھتے ہوئے درست کہا کہ:

قدرت کی طاقتوں کو دستِ قضا ہی روکے　　انساں کی کوششیں ہیں بے کار اور معطل [۱۴۹]

اس منظر کو دیکھنے والے بے اختیار یہ کہنے پر مجبور ہو گئے کہ اس زمانے کا حیدرآباد ایک ایسے کھنڈر کا نقشہ پیش کر رہا تھا، جیسے روز محشر کسی نے صور پھونک کر اسے نیست و نابود کر دیا ہو۔ اس صورتِ حال کی عکاسی کرتے ہوئے شاعر کہتا ہے کہ:

محشر کا صور پھونکا موسیٰ نے کو بہ کو ہے　　شورِ نشور برپا بلدے میں سو بسو ہے [۱۵۰]

تباہی و بربادی بھی ایسی کہ ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ ندی کا پانی ہر لحظہ بڑھتا ہی چلا جا رہا تھا اور یوں محسوس ہوتا تھا جیسے پورا شہر صفحۂ ہستی سے مٹ کر دریا کا حصّہ بن جائے گا۔ بڑھتے ہوئے پانی کو دیکھ کر لوگوں کا خوف کے مارے جو حال تھا اس منظر کو پیش کرتے ہوئے شاعر کہتا ہے کہ:

جوش و خروش اس کا ہر لحظہ بڑھ رہا ہے　　سہمی ہوئی ہے خلقت ہوش و حواس [۱۵۱] ہیں شل [۱۵۲]

جیسے جیسے مکانات کھنڈر میں تبدیل ہوتے گئے اور انسانی نعشیں جا بجا پانی میں بہتی دکھائی دیں تو شاعر اس منظر کو کربلا کے مناظر سے تشبیہ دیتے ہوئے یہ کہنے پر مجبور ہوا کہ:

ہر ہر کھنڈر میں لاشے صدہا پڑے ہوئے ہیں [۱۵۳]　　بلدہ کا ہر محلّہ ہے کربلا کا مقتل [۱۵۴]

حسرت و غم کی تصویر پیش کرتے ہوئے اس تباہی کا ایسا حال نظم کے پانچویں بند میں نظر آتا ہے کہ آج بھی اس طوفان کے ہول ناک مناظر انسان کو خوف میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ ان اشعار میں شدت غم اور انسانی جذبات و احساسات کی حقیقی مصوری نظر آتی ہے جیسے:

وا حسرتا وہ صدہا گھر بار کا اجڑنا　　ہر نخل آرزو کا بنیاد سے اکھڑنا

دیوار و بام و در کا پانی میں غرق ہونا　　سنگیں عمارتوں کا پتوں کی طرح جھڑنا
وہ جسمِ بے اماں کا موجوں کی نذر ہونا　　وہ جانِ ناتواں کا کُشتیِ قضا سے لڑنا
اس ہاتھ کا نہیں ہے کچھ جس میں جان باقی　　بہتے ہوئے درختوں کی ٹہنیاں پکڑنا
ماں سے لپٹ لپٹ کر بچّے کا وہ بلکنا　　اور ضد سے اس کے سینے پر ایڑیاں رگڑنا
شانِ جلالِ باری قہرِ خدا کا نقشہ　　ہر لہر کا بپھرنا ہر موج کا اکڑنا[۱۵۵]

افسوس ناک حقیقت یہی ہے کہ اس طوفان کے نتیجے میں تقریباً ہر گھر سے جنازے اٹھے اور ہر وہ شخص، جو بچ گیا اس کے پاس اپنی اپنی ایک الگ دردناک کہانی ہے جسے سن کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ان خونی داستانوں کو الفاظ میں بیان کرنا خاصا مشکل کام ہے۔ غم واندوہ کی اس داستان پر درد کو قلم بند کرنے اور سنانے میں شاعر کا کتنا جگر خون ہوا ہوگا[۱۵۶] اس کا اندازہ ہم اس نظم کے آخری بند کے مطالعے سے کر سکتے ہیں۔ شاعر کہتا ہے کہ:

پھر بھی نہیں ہے لیکن یہ غم وہ غم کہ جس کا　　حق ہو ادا زباں سے یا چشمِ خوں فشاں سے
صدہا ہزارہا گھر ڈوبا ہوا ہے غم میں　　کیا خاک ان کی تسکیں ہو ایک نوحہ خواں سے
ایسی مصیبتوں کا جن سے فلک بھی کانپے　　کیوں کر مقابلہ ہو اک مشتِ استخواں سے[۱۵۷]

یہ نظم ظفر علی خاں نے اس طغیانی کے متاثرین کے لیے لکھی تھی لہٰذا جس جلسے میں یہ نظم سنائی گئی اس کے سامنے پورا منظرنامہ پیش کرنے اور اس تباہی کی تصویر دکھانے کے لیے نظم میں سوز وگداز پیدا کرنے کی کوشش بھی کی گئی ہے:

ندی کے دونوں جانب ہے ایک ہو کا عالم　　حیراں ہے عقل آئے اتنے کھنڈر کہاں سے
منظر ہے عبرت افزا ٹوٹے ہوئے پلوں کا　　وحشت برس رہی ہے ہر پل کی ہر کماں سے
بازار اجڑ گئے ہیں ویران ہیں دکانیں　　سنسان ہیں محلّے رستے ہیں بے نشاں سے
پامال ہو گئی ہے بستی یہ آفتوں کی　　تاراج ہوگیا ہے یہ گلستاں خزاں سے[۱۵۸]

تمام مصیبتوں اور پریشانی کے باوجود شاعر اس گلشن کو پھر سے آباد کرنے کا عزم وحوصلہ بھی پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جس طرح نظام حیدرآباد میر محبوب علی[۱۵۹] نے ان مصیبت زدہ لوگوں کی مدد کی، اس کا اعتراف کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

لاکھوں ستم رسیدہ جو فاقہ کر رہے تھے　　اٹھے ہیں سیر ہو کر اس کے کرم کے خواں سے
ڈھکنے کو تن کے کپڑا جن کو نہ تھا میسر　　جا جا کے وہ دوشالہ لے آئے اس کے ہاں سے
احسان مانتے ہیں اپنے نظام کا ہم　　منت پذیر دل کی زینت ہے امتناں سے[۱۶۰]

اور آخر میں صاحب حیثیت لوگوں کو دل کھول کر چندہ دینے کی اپیل اور مصیبت زدگان کے لیے مدد کی درخواست کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

جیبوں کو اپنے ہم بھی پیسوں سے کر دیں خالی　　نکلے ہیں لعل و گوہر جس طرح بحر و کاں سے
مدارس و بمبئی سے جب آ رہے ہیں لاکھوں　　لازم یہ ہے کروڑوں کا چندہ ہو یہاں سے[۱۶۱]

اس نظم کا اثر بہت گہرا ہوا۔ بہت عرصے تک ادبی حلقوں میں اس کی بازگشت سنائی دیتی رہی۔ ندی کی تندی وتیزی کا قیامت خیز منظر اور بپھری ہوئی لہروں کے نتیجے میں آنے والی تباہی و بربادی کی جیسی تصویر ظفر علی خاں کی اس نظم میں پیش کی گئی ہے، بہت کم نظمیں واقعات کو اس طرح پیش کرنے کی خصوصیات رکھتی ہیں۔

طغیانی رودِ موسیٰ کے موضوع پر لکھنے والے دوسرے اہم شاعر سید احمد حسین امجد حیدر آبادی ہیں۔ امجد نے یوں تو پندرہ سولہ برس کی عمر میں شاعری شروع کر دی تھی۔ ابتدائی پانچ چھے برس تک زیادہ تر غزلیں اور رباعیاں کہیں لیکن اس زمانے کا بیش تر کلام ۱۹۰۸ء کی طغیانی رودِ موسیٰ کی نذر ہو گیا[۱۶۲]۔ اس واقعے نے ان کی شاعری میں عجیب طرح کا سوز و گداز پیدا کیا۔ ان کو شاعری کا چسکا تو ناسخ کے دیوان کے مطالعے سے ہوا۔ پندرہ سولہ برس کی عمر میں انھوں نے پہلا شعر جو موزوں کیا[۱۶۳]۔

نہیں غم گرچہ دشمن ہو گیا ہے آسماں اپنا مگر یارب نہ ہوتا مہرباں وہ مہرباں اپنا[۱۶۴]

اس شعر میں بھی ان کے لہجے کا سوز و گداز پوری طرح نمایاں ہے۔ امجد حیدر آبادی طغیانی رودِ موسیٰ سے راست متاثر ہوئے تھے۔ اس سانحے کے نتیجے میں ان کی والدہ، بیوی اور بیٹی، ان کی آنکھوں کے سامنے ڈوب گئی تھیں[۱۶۵]۔ وہ خود اس حادثۂ جاں کاہ کی تفصیل بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

> رات کے آٹھ بجے تک ہمارے گھر میں گھٹنوں گھٹنوں پانی چڑھ آیا..... ہمارے لیے یہ بہت نازک وقت تھا..... نہ اِدھر کوئی راستہ نہ اُدھر کوئی سفر، اِدھر موت اُدھر ملک الموت..... فوراً ماں کا ہاتھ پکڑا اٹھ کھڑے ہوئے، ماں کے ساتھ بیوی، بیوی کی گود میں بچّی،..... میر قافلہ نے پہلے قدم رکھا اور یہ سمجھ کر کہ پانی میں اتر رہے ہیں، مگر ایسا نہیں ہوا، بلکہ ہمارا قدم ایک گرے ہوئے مکان کے ملبے پر پڑا۔ ہمارے بعد والدہ اور بیوی بچی مکان سے باہر ہو کر ملبے پر کھڑی ہو گئیں۔ اِدھر ہم باہر ہوئے اُدھر چھت بیٹھ گئی[۱۶۶]۔

غوطے کھاتی ہوئی والدہ، بیوی اور بچّی کو بڑی مشکل سے پانی سے نکال کر چھپر پر چڑھایا۔ لیکن صبح ہوتے ہی ندی کی زد سے فصیل شہر کا ایک حصّہ گر پڑا جس کی وجہ سے ندی کا سمٹا ہوا زور دور دور تک پھیل گیا۔ پہلے پانی میں صرف چڑھاؤ تھا لیکن فصیل گرنے کے بعد روانی اور تیزی بھی آ گئی تھی۔ سب کے قدم اکھڑ گئے۔ بچی کو صندوق میں بند کر کے بہانے کی تدبیر بھی کی گئی لیکن سب بے سود۔ جس ڈالی کا سہارا لے کر اب تک بچے ہوئے تھے وہ بھی ٹوٹ گئی۔ پورا خاندان اسی وقت غرق آب ہو گیا اور خود امجد بڑی مشکل سے اس خوفناک دھارے سے نکل کر کم زور دھارے میں آ پڑے۔ کچھ دور بہنے کے بعد زنانہ ہسپتال کی بیمار عورتوں نے ہمت کر کے انھیں بچایا۔ ان واقعات کی تفصیل خود امجد حیدر آبادی نے ''طغیانی رودِ موسیٰ ۱۳۲۶ھ'' کے عنوان سے ''جمالِ امجد'' میں پیش کی ہے[۱۶۷]۔ ان کی نثر کی لطافت، معرفت کے بیش بہا مضامین اور اسلوبِ بیان کی جدّت کا اعتراف نصیر الدین ہاشمی نے بھی کیا ہے[۱۶۸]۔ رودِ موسیٰ کے واقعے نے امجد کی شاعری میں گہرا اثر ڈالا۔ غم والم، یاس وحسرت اور سوز و گداز ان کی شاعری کا بنیادی موضوع بن گیا۔ یہاں تک کہ رباعیوں میں بھی اس قسم کے موضوعات جگہ بنانے میں کامیاب رہے:

بحرِ متلاطم میں بہا جاتا ہوں ہر دم طرفِ لحد کھینچا جاتا ہوں
بازارِ فنا میں کیا ٹھہرنا ہے مجھے میں صرف کفن لے کے چلا جاتا ہوں[۱۶۹]

امجد کی رباعیات، سوز و گداز اور درد و الم سے مملو نظر آتی ہیں۔ وہ غم و الم کی اس کیفیت کا حکیمانہ استدلال پیش کرتے ہوئے، جس قسم کی توجیہات دیتے ہیں، اس سے ان کی زندگی کے فلسفے کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے [۱۷۰]۔ جیسے:

ہر چیز کا کھونا بھی بڑی دولت ہے　　بے فکری سے سونا بھی بڑی دولت ہے
افلاس نے سخت موت آساں کر دی　　دولت کا نہ ہونا بھی بڑی دولت ہے [۱۷۱]

ان کی رباعیاں ایسی بلند پایہ ہیں کہ اردو ادب میں شاید ہی ان کا جواب مل سکے۔ وہ پہلے اردو کے شاعر ہیں جنھوں نے رباعی گو شاعر کی حیثیت سے اردو دنیا میں نام پیدا کیا اس لیے ان کو ''زندہ سرمد'' بھی کہا جاتا ہے۔ ان کی حقیقت نگاری، حکیمانہ اور فلسفیانہ خیالات نے روحانی طور پر بھٹکے ہوئے لوگوں کی رہنمائی کی [۱۷۲]۔

ابتدائی مشق سخن کے زمانے میں ہی انھوں نے رباعیاں کہیں۔ ان کی رباعیوں کا پہلا مجموعہ ۱۳۲۳ھ مطابق ۱۹۰۵ء میں شائع ہو چکا تھا۔ اس مجموعے کی اشاعت کے ساتھ ہی ارباب نظر نے جان لیا کہ دکن کے افق سے رباعی گوئی کا ایک ایسا روشن ستارہ ابھرنے والا ہے جس کے آگے دوسرے تمام رباعی گو شعرا کی چمک ماند پڑ جائے گی [۱۷۳]۔

دنیا کی بے ثباتی اور ذاتی زندگی کے تلخ تجربات کا اظہار ان کی شاعری کا بنیادی وصف ہے۔ اپنے آشیانے کے اجڑنے کا حال وہ جا بجا بیان کرتے نظر آتے ہیں۔ جیسے:

بادِ صرصر سے آشیاں گرتا ہے　　اب لشکرِ عیش کا نشاں گرتا ہے
اب جاؤں کدھر کہاں پناہ لوں یا رب　　پھٹتی ہے زمیں، آسمان گرتا ہے [۱۷۴]

اپنے چمن کی بربادی کا رونا رونے اور اپنی بے بسی اور لاچارگی کی داستان سنانے کا کوئی موقع وہ ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ غزل کی تنگ دامانی میں بھی وہ ان موضوعات کو سمیٹنے میں کامیاب نظر آتے ہیں۔ جیسے:

برباد نہ کر بے کس کا چمن بے درد خزاں سے کون کہے　　تاراج نہ کر میرا خرمن اس برقِ تپاں سے کون کہے
مجھ خستہ جگر کی جان نہ لے یہ کون اجل کو سمجھائے　　کچھ دیر ٹھہر جا اے دریا، دریائے رواں سے کون کہے
ہر چند ہماری حالت پر رحم آتا ہے ہر اک کو لیکن　　کون آپ کو آفت میں ڈالے اس آفتِ جاں سے کون کہے [۱۷۵]

طغیانیِ رودِ موسی کے سانحے کے بعد ''امجد کی زندگی رنج و الم اور یاس و حرماں کا ایک مجسمہ بن گئی'' [۱۷۶]۔ ظاہر سی بات ہے، جس شخص کی زندگی میں ایسا حادثہ ہوا ہو جس میں بیک وقت گھر کے تین افراد موت کی آغوش میں چلے گئے ہوں وہ بھی ایسے کہ ان کی نعش تک نہ ملی ہو [۱۷۷]۔ اس صورت حال میں یہ رویہ پیدا ہو جانا فطری عمل تھا۔

دیگر اصناف کی طرح امجد کی نظم گوئی میں بھی وہی شان موجود ہے۔ وہ نظم کے موضوعات سے پورا پورا انصاف کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ''قیامتِ صغریٰ'' کے نام سے انھوں نے جو نظم طغیانیِ رودِ موسی کے سانحے پر لکھی وہ شاہ کار کا درجہ رکھتی ہے۔ یہ نظم ان کے شعری مجموعے ''ریاضِ امجد'' میں شامل ہے۔ ریاض امجد کی نظموں میں لطیف احساسات، سوز و گداز اور انسانی ہمدردی کے وہ نمونے ملتے ہیں جو امجد کے دل کی تڑپ اور روحانی بلندی کا پتا دیتے ہیں [۱۷۸]۔ اس مجموعے کا دیباچہ لکھتے ہوئے عبدالغنی وارثی نے لکھا کہ:

ہر نظم اعلیٰ اخلاق کی ایک بہترین کتاب ہے۔ طرز ادا دل کش، زبان نہایت صاف، مضمون چست اور موثر

ہے.....(رودِموسی کے موضوع پر لکھی گئی نظم)''قیامت صغریٰ'' خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہے[179]۔

اس نظم میں ان کی آپ بیتی بھی ہے رودِموسیٰ ندی کی طغیانی کے کرب ناک مناظر بھی[180]۔ دوستوں کی فرمائش پر اس ہول ناک واقعے سے متعلق جو کچھ ان پر بیتی اسے امجد نے بڑے جذباتی انداز سے پیش کیا ہے۔ نظم مسدس کی ہیئت میں تخلیق کی گئی ''قیامتِ صغریٰ'' کے عنوان سے پچیس بند اور ''تصویرِ غم'' کے عنوان سے نو بند شامل ہیں۔ نظم کیا ہے طغیانی رودِموسیٰ کے پورے واقعے کی منظرکشی ہے۔ کبھی شاعر، بیٹی کی یاد میں آنسو بہاتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

بیٹی! نہ تجھے باپ نے افسوس بچایا — دستِ ستمِ سیلِ فنا سے نہ چھڑایا
دریا نے ترے حال پہ کچھ رحم نہ کھایا — کیا بھولی سی صورت پہ اسے رحم نہ آیا
یہ جسم ترا پھول سا دیواروں سے ٹکرائے — سیلاب میں بہہ جائے تری ننھی سی جاں ہائے[181]

اور کبھی پورے کنبے کو اس سیلابی ریلے میں ڈوبتے دیکھ کر بے بسی کے عالم میں پکار اٹھتے ہیں کہ:

مادر کہیں اور میں کہیں بادیدہِ پُر نم — بی بی کہیں اور بیٹی کہیں توڑتی تھی دم
عالم میں نظر آتا تھا تاریکی کا عالم — کیوں رات نہ ہو ڈوب گیا نیرِ اعظم
سب سامنے آنکھوں کے نہاں ہو گئی پیارے — وہ غم تھا کہ دن کو نظر آنے لگے تارے[182]

زندگی کے ستم بالائے ستم اور دکھ کی اس کیفیت کے بیان میں امجد اپنے آپ کو دنیا کا سب سے بدقسمت انسان سمجھنے پر مجبور نظر آتے ہیں۔ زندگی نے جو دکھ انھیں دیا وہ دشمنوں کے لیے بھی اس دکھ سے پناہ چاہتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

جو ہم نے سہا ہے نہ سہا ہوگا کسی نے — دیکھا ہے جو کچھ ہم نے وہ دشمن بھی نہ دیکھے
کچھ ایسے دیے چرخِ ستم گار نے چرکے — یک لخت ہوئے قلب و جگر کے کئی ٹکڑے
لختے برد از دل گذر دہر کہ زپیشم — من قاش فروشِ دلِ صد پارہِ خویشم[183]

مسلسل بارش نے جب سیلاب کی شکل اختیار کر لی اور پانی ہر چیز کو تباہ برباد کرتا ہوا شہر میں داخل ہوا تو خلق خدا کی پریشانی کا عجب ہی منظر تھا۔ ہر کسی کو اپنی موت سامنے نظر آ رہی تھی اور لوگ رو رو کر اس مصیبت سے چھٹکارے کی دعائیں مانگ رہے تھے۔ لیکن یہ دعائیں بھی بے اثر ہو چکی تھیں۔ لوگ یکے بعد دیگرے اس سیلاب کی نذر ہوتے جا رہے تھے۔ اس منظر کو پیش کرتے ہوئے امجد کہتے ہیں کہ:

تاریکی میں دریا نے اک اندھیر مچایا — سیلابِ فنا بن کے کیا سب کا صفایا
پاؤں سے گزرتا ہوا پھر سینے تک آیا — آگے جو بڑھا موت نے بس حلق دبایا
شب بھر رہے سب پانی میں فوارے کے مانند — ہوتے ہی سحر ڈوب گئے تارے کے مانند[184]

جب سب کچھ ختم ہو جاتا ہے اور سوائے حسرت و مایوسی کے کچھ ہاتھ نہیں رہتا۔ یہاں تک کہ اپنے پیاروں کی نعشیں بھی انھیں نہیں ملتیں تو غم کی شدت مزید بڑھ جاتی ہے۔ اس شدت غم میں وہ بے تاب ہو کر اپنی بے بسی کا اظہار کچھ اس طرح کرتے نظر آتے ہیں:

کس جا سے میں ڈوبی ہوئی نعشوں کو لاؤں — بیٹی کا پتا کیا ہے، کہاں بی بی کو پاؤں
دوں کس کو کفن کس کا میں تابوت بناؤں — ہے قبر کہاں پھول کہاں جا کے چڑھاؤں

ہے ہے ہدفِ رنج و محن کر گئیں اماں　　　افسوس کہ بے گور و کفن مرگئیں اماں [۱۸۵]

انفرادی غم جب اجتماعی غم میں تبدیل ہوااوراس قیامت خیز منظر کو شاعر نے پورے حیدرآباد میں دیکھا تو اسے اپنے غم کا احساس کم ہوتا ہوا محسوس ہوا۔ ہر جگہ بکھرے ہوئے ملبے کے ڈھیر اور جا بجا پھیلے نعشوں کے انبار کو دیکھ کر امجد اس اجتماعی کرب سے دوچار ہوئے جو اس وقت پورے حیدرآباد دکن پر چھائی ہوئی تھی۔ اس کیفیت کا اظہار اپنی ایک اور نظم ''تصویرِ غم'' کے آخری بند میں کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

ہزاروں گھر ہوئے ظالم اجل کے ہاتھ خراب　　　فنا کی سینکڑوں چہروں پہ پڑ گئی جلباب

بہت سے ڈوب گئے آفتابِ عالم تاب　　　خدا کسی کو نہ دے داغِ فرقتِ احباب

جدا کسی سے کسی کا غرض حبیب نہ ہو　　　یہ داغ وہ ہے کہ دشمن کو بھی نصیب نہ ہو [۱۸۶]

غرض کہ امجد کی اس نظم نے قاری کو پوری طرح اپنی گرفت میں لے لیا۔ یہ نظم اثر پذیری میں اپنا کمال دکھاتی ہوئی انسانی رنج والم کے اس احساس کی پوری طرح عکاسی کرتی ہے، اور جو اس زمانے کے حیدرآباد میں بالعموم پایا جاتا تھا۔ انھوں نے اس موضوع کے ساتھ پورا پورا انصاف کیا۔ نظم کا ہر ہر مصرع اور ایک ایک شعر انتہائی مربوط ہے اور نظم کو پڑھ کر قاری اس واقعے کے ہر منظر کو اپنی نظروں کے سامنے پاتا ہے۔ اس نظم کی تاثیر کا اندازہ مولانا مناظر احسن گیلانی کے بیان کردہ اس واقعے سے لگایا جاسکتا ہے جس میں وہ کہتےہیں کہ:

> حکیم سید محمد احمد، حیدرآباد ایک دفعہ اپنے بال بچوں کے ساتھ آئے ہوئے تھے۔ ہمارے ہاں سے حضرت امجد کی نظموں کا وہ مجموعہ پڑھنے کے لیے لے گئے جس میں قیامت صغریٰ والی مشہور نظم بھی شریک تھی.....اس نظم کو مولانا سید محمد مرحوم کہتے تھے کہ قیام گاہ پر پہنچنے کے بعد پڑھنے لگا۔ رات کا وقت تھا۔ پڑھتے پڑھتے اچانک مجھ پر یہ حالت طاری ہوئی کہ گویا طوفان کا وہی سماں میرے سامنے قائم ہوگیا ہے.....اس ہل چل میں مجھ پر ایسی بدحواسی چھائی کہ پلنگ سے بے محابا اٹھ کر اس چارپائی کی طرف دوڑ پڑا جس پر میری بچی فاطمہ سوئی ہوئی تھی۔ وہ سو رہی تھی اور میں بار بار اس کے چہرے کو یہ سوچتے ہوئے دیکھ رہا تھا کہ خدا نے بڑا فضل کیا۔ طوفان کے ریلے میں بہہ جانے سے بچی بچ گئی [۱۸۷]۔

ایسی تاثیر بلاشبہ بہت کم نظموں میں پائی جاتی ہے۔ اس تاثیر کو پیدا کرنے میں امجد جیسی جگر سوزی کی ضرورت ہے۔ اپنے شعری مجموعے ''ریاض امجد'' طبع دوم میں اس نظم کے پس منظر کے بیان میں جو شعر انھوں نے درج کیا ہے وہ پوری طرح ان کے حال کی عکاسی کرتا ہے۔ شعر ملاحظہ کیجیے:

ہیں بدن میں زخم ہزار ہا وہ ہے کون جا کہ جہاں نہیں　　　مرے دردِ دل کو نہ پوچھیے کہ کہاں ہے اور کہاں نہیں [۱۸۸]

اس کے علاوہ بھی امجد کے یہاں اس موضوع پر بہت سے اشعار موجود ہیں۔ رسالہ ''ادیب'' دکن کے طوفان نمبر میں بھی ''نالہ ہائے دردمند'' کے نام سے اُن کا کلام شائع ہوا جو شدّتِ احساس اور تاثیر میں اپنی مثال آپ ہے۔ جیسے:

وہ زور شور ندی کا وہ حشر زا طوفان　　　نزولِ رحمتِ حق تھا عذاب کی مانند

ابھر ابھر کے سب اک دم کے دم میں ڈوب گئے　　　حیات ان کی تھی گویا حباب کی مانند [۱۸۹]

اس سانحے کے بعد شاعر کو جس ذہنی کرب سے گزرنا پڑا اور معاشی تباہی کے بعد جس کس مپرسی کی حالت میں وہ جینے پر مجبور

ہوئے اس کا حال بیان کرتے ہوئے اپنی ایک اور نظم ''افسانۂ غم'' میں وہ کہتے ہیں کہ:

ہوئی جب خانہ بربادی مری سیلابِ موسیٰ سے | رہا کپڑا پہننے کو نہ کھانے کے لیے ٹکڑا
پریشانی کا عالم، رنج وحسرت، یاس و ناکامی | دلِ پر درد میں رہ رہ کے ہر دم درد اٹھتا ہے
زن و فرزند و مادر ہوگئے نذرِ اجل ہے ہے | کروں کس کس کا ماتم کچھ سمجھ ہی میں نہیں آتا
خدارا آپ سے جو ہو سکے، دلوایے حضرت! | کریں گر آپ مجھ پر رحم، اجر اس کا خدا دے گا
نہیں تو، قرض ہی سے کچھ مدد فرمایے اس دم | کروں گا قسط سے میں انتظام اس کی ادائی کا[190]

اپنی حالت زار پر نہ صرف امجد نے بلکہ دیگر شعرا نے بھی اُن کی حالت پر اظہار خیال کیا۔ رودِ موسیٰ کی طغیانی اور امجد کی زندگی کی تلخ یادوں کو بیان کرتے ہوئے بشیر النساء بیگم کا شعر دیکھیے:

رودِ موسیٰ کا وہ طوفاں! اور تنہا تیری جاں | پانی ہی پانی نظر آتا تھا زیرِ آسماں[191]

اسی طرح ابوسعد اسمٰعیل سید نے اس صورت حال کا نقشہ کھینچتے ہوئے کہا کہ:

طغیانِ موسیٰ میں نہا کر نکلا | آلام کا طوفان اٹھا کر نکلا
وہ کون؟ وہی شاہِ رباعی امجد | توحید کی اک راہ دکھا کر نکلا[192]

امجد کے علاوہ جن شعرا نے اس موضوع پر عمدہ نظمیں کہیں ان میں ایک نام محبّ حسین محبّ کا بھی ہے۔ ''مرثیہ شہدائے طغیانی رودِ موسیٰ'' کے نام سے لکھی گئی نظم میں انھوں نے ان واقعات کو بڑی تفصیل سے پیش کیا ہے۔ مسدس کی ہیت میں لکھی گئی اس نظم میں ۴۸ بند ہیں۔ نظم میں تسلسل کے ساتھ اس پورے واقعے کو پیش کرتے ہوئے تمام جزئیات کو بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ آج بھی اس مرثیے کو پڑھ کر اس عہد میں ہونے والی تباہی اور اس کی بحالی کے لیے کیے جانے والے اقدامات کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے۔ ابتدا میں اس طوفان کی خوف ناکی اور تباہی کا حال بیان کرتے ہوئے شاعر نے کہا کہ:

وہ خوف ناک رات قیامت کی وہ سحر | پھٹتے تھے جس کے ڈر سے فرشتوں کے بھی جگر
کہتے تھے کانپ کر ملک الموت الحذر | جبریل زیرِ عرش کھڑے تھے برہنہ سر
جنبش تھی عرشِ حق کو یا قہرِ الٰہ تھا | کرّو بیاں کی چشم میں عالم سیاہ تھا[193]

رودِ موسیٰ کے پلوں کی تباہی اور ندی کے پانی کی بلندی کا حال بیان کرتے ہوئے شاعر نے اس منظر کو اس طرح بیان کیا ہے کہ وہ سارا منظر ہماری آنکھوں کے سامنے پھرنے لگتا ہے:

بلدہ پہ قہر حق کا نمایاں ہوا اثر | ندی چڑھی تو ہوش اڑے سب کے سر بسر
طوفانِ نوح آگیا ہر شخص کو نظر | تھا ڈوبنے کا شہر کے ہر ایک کو خطر
ڈوبے جو پل تو شور قیامت بپا ہوا | بھا گر پڑی تو جان کا خطرہ سوا ہوا[194]

لوگ کس طرح اپنی جان بچانے کی تگ و دو میں مصروف تھے اور اس سلسلے میں کیا کیا جتن کیے جا رہے تھے اس صورت حال کا نقشہ کھینچتے ہوئے شاعر کہتے ہیں کہ:

کچھ چڑھ گئے تھے اونچے درختوں پہ جا بجا　　جڑ سے وہی اکھڑ کے بہے وا مصیبتا
پانی میں ان درختوں کا تھا کچھ عجب سماں　　شاخوں پہ پھل تھے آدمِ زندہ ہزارہا
آئی جو موج غرقِ تہ آب ہوگئے　　دم میں وہ سب شجر شجرِ خواب ہوگئے[195]

گھر بار، مال واسباب کی تباہی تو ایک طرف انسانی بے بسی اور بے کسی کی جو داستان یہ طوفان چھوڑ گیا کچھ اس کا اندازہ اس بند سے لگایا جاسکتا ہے:

کہتے ہیں لوگ فیل بھی دو ایک بہہ گئے　　چوہوں کی طرح ریت میں دب دب کے رہ گئے
موجوں کی سختیاں تہہِ افلاک سہہ گئے　　جانوں کو دے کے سب سے یہی بات کہہ گئے
تھا ہم کو ناز جسم کی قوت پہ زور پر　　آئی اجل تو بس نہ چلا کچھ بھی مور پر[196]

جس قدر انسانی جانیں اس طوفان کی نذر ہوئیں اور ہلاکتوں کا شمار کرنا جس قدر مشکل ہوا اس کے متضاد دعووں کا اوپر بیان ہو چکا ہے۔ اس صورت حال کی عکاسی کرتے ہوئے شاعر کا کہنا ہے کہ:

لاشاں پہ لاشے مُردوں پہ مُردے تھے جا بجا　　جو دب گئے مکانوں میں ان کا نہیں پتا
ندی میں بہہ گئے تھے جو مردے ہزارہا　　وہ کرگس اور زاغ و زغن کی ہوئی غذا
بہہ بہہ کے مردے ساحلِ مدراس تک گئے　　ساتھ ان کے سب مکانوں کی آساس تک گئے[197]

لوٹ مار کرنے والے بے حس لوگ جس طرح موقعہ پرستی کا مظاہرہ کر رہے تھے اور مُردوں کے مال وزر پر ہاتھ صاف کر رہے تھے اس پر طنز کرتے ہوئے شاعر کہتے ہیں کہ:

بے رحم لوٹنے لگے مُردوں کا مال و زر　　تھا غم ہر ایک دل میں خوشی تھی نہیں مگر
سمجھے نہ یہ کہ ہم کو بھی در پیش ہے سفر　　اس حادثے کا بھی نہ ہوا دل پہ کچھ اثر
سیلاب لطف زیست ہر اک دل سے دھو گیا　　لیکن یہی بردن کے لیے جشن ہو گیا[198]

اس طوفان کے تھمنے کے بعد نظام حیدرآباد کے حکم سے جو ریلیف کیمپ قائم ہوئے اور امدادی سرگرمیاں شروع ہوئیں اس منظر کو بھی شاعر نے قلم بند کیا ہے، ملاحظہ کیجیے:

کپڑے، ڈوپٹا، ساریاں بٹتی تھیں جا بجا　　نقد اور ادھار ملتا تھا کپڑے کے بھی سوا
تھا وقف بے کسوں کے لیے گنجِ عامرہ　　صرفِ مدد تھے سکہِ عالی ہزارہا
آفت زدوں کی ہر طرح امداد کرتے تھے　　ویراں شدہ مقاموں کو آباد کرتے تھے[199]

اس سانحے پر لکھی گئی ایک اور نظم ''سیلِ فنا'' کے نام سے رسالہ ''ادیب'' کے طوفان نمبر شائع ہوئی۔ اس نظم کو سید نثار احمد احمدی نے تخلیق کیا۔ شاعر نے دکن میں پیش آنے والے اس واقعے کو ایک ایسا سانحہ قرار دیا ہے جس کا اثر تادیر قائم رہے گا۔ وہ کہتے ہیں کہ:

ظلم و ستم کا تیرے برپا رہے گا ماتم　　عالم میں ہم ہیں جب تک، ہم میں ہے جب تلک دم[200]

اس کے علاوہ شاعر نے اس تباہی و بربادی اور انسانی جانوں کے زیاں کو بڑے پُر درد انداز سے پیش کرنے کی کوشش کی ہے جیسے:

صد حیف وہ ہزاروں گھر بار کا اجڑنا اور سطحِ آب پر یوں بہ بہ کے جان دینا
غفلت میں آفتوں کا اک دم سے ٹوٹ پڑنا بچنے کی فکر کرنا اور پھر بھی بچ نہ سکنا
بچوں کا وہ بلکنا ماؤں کا وہ پھڑکنا فرزند نوجواں کا بوڑھے پدر سے چھٹنا
طوفان کی وہ شدت موجوں کے وہ تھپیڑے وہ بے کسی کا عالم وہ بے بسی کا مرنا[۲۰۱]

طوفان کی شدت جس قسم کی تباہی و بربادی لائی اس کی نظیر تاریخ عالم میں کم ہی ملتی ہے۔ کوئی گھر ایسا نہ بچا کہ جہاں ماتم بپا نہ ہو۔ جہاں جہاں سے اس طوفان کا گزر رہا ایک دل خراش داستان چھوڑ گیا۔ لوگوں کے آنسو، رو رو کر اس غم میں خشک ہو گئے اور ہر گھر سے سوائے آہ وزاری کے کچھ سنائی نہ دیتا تھا۔ اسی لیے شاعر یہ کہنے پر مجبور ہوئے کہ:

پتھرا گئی ہیں آنکھیں آنسو نہیں نکلتے ہاتھوں میں بھی نہیں اب سینہ زنی کی طاقت[۲۰۲]

آخر میں شاعر اس ساری تباہی و بربادی کو اپنے اعمال کی سزا قرار دیتے ہوئے سپردگی کے عالم میں یہ تک کہنے سے گریز نہیں کرتے کہ:

ندی کی کیا حقیقت اس کی بساط کیا تھی یہ تھی سزا عمل کی یہ مرضئ خدا تھی[۲۰۳]

طغیانی رودِ موسیٰ کے عنوان سے ایک اور نظم سیف الدین شباب نے تخلیق کی[۲۰۴]۔ یہ نظم بھی مسدس کی ہیئت میں ہے اور اس میں ۱۴ بند ہیں۔ اس نظم میں بھی رودِ موسیٰ کے واقعے کو پُر درد انداز میں بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ نظم کے آغاز کا بند ہی اپنے موضوع کی پوری وضاحت کرتا نظر آتا ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

صبحِ دو شنبہ آہ آفت تھی مخبرِ آمدِ قیامت تھی
طرح نقصانِ مال و دولت تھی دشمنِ جاں عدوے راحت تھی
نذرِ سیلاب لوگ آہ ہوئے کیسے کیسے مکاں تباہ ہوئے[۲۰۵]

شاعر نے اس واقعے کو قیامت سے تشبیہ دیتے ہوئے گھر گھر سے اٹھنے والی آہ و بکا کو بڑے موثر انداز سے پیش کیا ہے جیسے:

سچ تو یہ ہے کہ روزِ محشر تھا نفسی نفسی کا شور گھر گھر تھا
عورتوں کا گروہ باہر تھا نہ کسی کو خیالِ چادر تھا
چشمِ تر سیلِ بحرِ رقت تھی کیا مصیبت تھی کیا قیامت تھی[۲۰۶]

ایک اور نظم سید ظفر حسن عبرت نے ''انقلابِ دہر'' کے نام سے لکھی[۲۰۷]۔ چھے بندوں پر مشتمل اس نظم میں حیدر آباد دکن کی تباہی و بربادی کا پرسوز بیان موجود ہے۔ وہ شہر جس کی رونق اور ترقی کی مثالیں پورے ہندوستان میں دی جاتی تھیں۔ بیک لخت وہاں ویرانیوں نے بسیرا کرلیا۔ اس انقلابِ دہر کا حال بیان کرتے ہوئے شاعر کہتے ہیں کہ:

اے سوادِ حیدرآباد اے مقامِ مغتنم بن گیا تو دفعتاً کیوں منبعِ درد و الم
آہ تجھ کو کھا گئی کیوں رودِ موسیٰ کی نظر انقلابِ دہر نے کیوں تجھ پہ توڑا یہ ستم
تیرا نظارہ تھا ایسا دل فریب و بے نظیر جس پہ عالم کی نگاہیں خود بخود جاتی تھیں جم
ہائے وہ رعنائیاں نقشِ مثالی ہوگئیں حسن جوبن کی بہاریں سب خیال ہوگئیں[۲۰۸]

نظم میں شاعر نے بڑی خوب صورتی کے ساتھ ماضی کے حیدرآباد کا موازنہ طغیانی رودِ موسیٰ کے بعد کے حیدرآباد سے کیا ہے اور اس اجڑے چمن پر آٹھ آٹھ آنسو بہائے ہیں۔ جس طرح حیدرآباد کی تہذیبی زندگی تباہ ہوئی اور معاشی بدحالی نے لوگوں کے گھروں میں دستک دی اس کا اندازہ اس شعر سے بخوبی کیا جاسکتا ہے:

یک بیک یارب زمانے نے جو لی کروٹ بدل　　　سب ہمارے عیش و راحت کا گیا کس بل نکل [۲۰۹]

محمد عبدالکریم خاں صبؔر دہلوی نے بھی ''فسانۂ عبرت'' [۲۱۰] کے نام سے اس موضوع پر ایک طویل نظم لکھی شاعر نے رودِ موسیٰ کی طغیانی کے نتیجے میں پیدا ہونے والی صورت حال کو بہت تفصیل سے اس نظم میں پیش کیا ہے۔ ابتدا میں اس طوفان کی ہول ناک تباہی اور آخر میں امدادی سرگرمیوں کی روداد پیش کی گئی ہے۔ خود شاعر بھی اس سانحے کے موقع پر محلّہ محبوب شاہی پٹیلہ برج میں مقیم تھے لیکن اتوار کو جب پانی چڑھنا شروع ہوا تو سارے محلے والے گھر بار چھوڑ کر محفوظ مقام کی طرف نکل گئے تھے [۲۱۱]۔ نظم میں شعری حسن کی کمی ہے۔ لیکن شاعر نے چوں کہ اس پورے واقعے کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھا لہٰذا پوری تفصیل اس نظم میں بیان کی ہے۔ اس طغیانی کو وہ عظیم سانحہ قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ وہ اس سانحے کو ساری عمر نہیں بھول پائیں گے:

یوں تو اس کے واقعے جتنے ہیں سب ہیں پُر اثر　　　میں نے جو دیکھا نہیں بھولوں گا اس کو عمر بھر [۲۱۲]

سید علی حیدر طباطبائی نے ''شہرِ آشوب'' [۲۱۳] کے عنوان سے مختلف اشعار اور قطعات کو یکجا کیا ہے۔ جان و مال کی تباہی کے ساتھ ساتھ نادر و نایاب جواہر اور کتب خانوں کی بربادی پر وہ کہتے ہیں کہ:

مرنے سے بچے جو وہ ہیں محتاج و فقیر　　　سیلاب میں ہو گیا تلف مالِ خطیر
نادر وہ جواہر کہ نہ تھا جن کا نظیر　　　بے مثل کتابیں کہ نہ تھا جن کا شمار [۲۱۴]

اس کے علاوہ محمد احمد علی جودتؔ نے ''قیامتِ صغریٰ'' [۲۱۵] کے نام سے چھوٹی بحر کی ایک نظم لکھی جس میں اس انقلاب کے اثرات کا جائزہ لیا ہے۔

کل جنھیں دنیا کی نعمت تھی نصیب　　　در بدر ہیں آج محتاج و غریب [۲۱۶]

فاروق شاہ پوری کی نظم ''حیدرآباد کی تباہی'' [۲۱۷] کے عنوان سے ''زمانہ''، کان پور میں شائع ہوئی۔ خود شاعر نے اسے اپنے درد بھرے دل کی صدا قرار دیا اور اس تباہی پر خوب خوب آنسو بہائے۔ جس طرح ایک ہنستا بستا شہر اس طغیانی کے بعد اجڑے دیار کا نقشہ پیش کر رہا تھا۔ اس کی تصویر دکھاتے ہوئے شاعر نے کہا کہ:

بن گیا ہے رنج و مایوسی کی اک تصویر تو　　　تیری صورت سے عیاں ہیں حسرت و غم کے نشاں
آہ کس کے سوگ نے تجھ کو کیا ہے سوگ وار　　　اشک خونیں دیدۂ تر سے ترے ہیں کیوں رواں
کس مصیبت نے تجھے یوں کر دیا خانہ خراب　　　آئی کیا آفت ہوا جو اس طرح بے خانماں
کون سی بجلی گری تجھ پر کہ جس کی آنچ سے　　　خاک جل کر ہوگئیں سرسبز تیری کھیتیاں [۲۱۸]

اس تباہی کا دردناک منظر پیش کرتے ہوئے شاعر نے بڑے جذباتی انداز میں اس شہر کی رفعت و شان کو نہ صرف بیان کیا بلکہ ماضی اور حال سے دریچوں میں جھانک کر ان مناظر کو بڑے موثر انداز سے ہمارے سامنے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ عظمت جس کا

اب نشان تک باقی نہیں رہا اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے شاعر کہتے ہیں کہ:

نذرِ سیلِ آب موسی ہوگئے یہ سب کے سب — مٹ گئے پانی کے ہاتھوں تیری عظمت کے نشاں
نذر صدہا قیمتی جانیں ہوئیں طوفان کے — اس پہ طرہ یہ ہوا جو مال و دولت کا زیاں[۲۱۹]

اس عظیم سانحے پر پورے ہندوستان میں جو ردِعمل سامنے آیا اور لوگ جس طرح سوگ وار اس بابت شاعر کہتے ہیں کہ:

مشتہر ہے تیری بربادی کا قصّہ چار سو — خون کے آنسو رلاتی ہے یہ تیری داستاں
صفحۂ تاریخ رنگیں ہوں گے تیرے ذکر سے — خوں سے لکھا جائے گا تیری تباہی کا بیاں[۲۲۰]

''سیلِ فنا'' کے نام سے ایک اور نظم مرزا نظام شاہ لبیب گورگانی دہلوی نے بھی لکھی۔ مسدس کی ہیت میں لکھی گئی اس نظم کے آٹھ بند ہیں۔ نظم میں فنی خامیاں موجود ہیں لیکن اس واقعے پر ایک حساس دل کی صدا صاف سنائی دیتی ہے۔ اس طغیانی کی شدت کے بیان کو دیکھیے:

شور طوفاں سے لرزتے تھے جبال و کوہ سار — صور پھکنے کا گماں ہوتا تھا سب کو ہر بار
تھے اذا زلزلت الارض کے پیدا آثار — نفسی نفسی کی صدا ہوتی تھی گردوں کے پار
زندہ در گور تھے اس طرح سے گھبرائے تھے — مردے بھی چھوڑ کے قبروں سے نکل آئے تھے[۲۲۱]

حامد حسن قادری نے بھی ''سیلاب'' کے نام سے ایک نظم لکھی۔ نظم اصل میں تو رام پور میں آنے والے سیلاب سے متاثر ہو کر لکھی گئی لیکن اس ضمن میں شاعر حیدرآباد دکن میں آنے والی تباہی کو بھی فراموش نہ کر سکے۔ لہٰذا وہ سیلاب کی غضب ناکی کا حال بیان کرتے ہوئے بے اختیار کہہ اٹھے:

تیری ٹکر سے نہ سنبھلا حیدرآباد آج تک — ہو سکے ہرگز نہ سب اوجڑے گھر آباد آج تک
کل کیا تھا تو نے اس کا شیشۂ دل چور چور — آج تیرے ہاتھ سے ہے چاک داماں رام پور[۲۲۲]

ماہر کنتوری نے اس واقعے کی مادہ تاریخ نکالتے ہوئے ایک مختصر نظم میں کہا کہ:

پیر گردوں کچھ خبر بھی ہے تجھے کیا ہوگیا — سینکڑوں گھر گر گئے اک حشر برپا ہوگیا
سنگ دل روتے ہیں ماہر دیکھ کر اس حال کو — کھا گئی کس کی نظر یہ شہر کو کیا ہوگیا[۲۲۳]

(۱۳۱۷ف)

غرض کہ ایک صدی قبل پیش آنے والا یہ واقعہ حیدرآباد دکن کی تاریخ کا وہ الم ناک سانحہ ہے جس کو آج بھی یاد کیا جاتا ہے اور جس کے جگر خراش اور دردناک واقعات کسی قیامت سے کم نہ تھے۔ زمانہ ہزاروں رنگ بدلتا ہے۔ دنیا میں ہمیشہ اس قسم کے تغیرات، انقلابات اور سانحات ہوتے رہتے ہیں لیکن کچھ سانحات ایسے ہوتے ہیں جن کا اثر چار پشت کے بعد بھی باقی رہتا ہے۔ ایسے ہی سانحات میں طغیانی رودِ موسیٰ کو بھی شمار کیا جا سکتا ہے۔

مندرجہ بالا صفحات میں یہ کوشش کی گئی ہے کہ طغیانی کی مفصل واقعات اور شاعری میں اس واقعے کے اثرات کا جائزہ لیا جائے۔ ان واقعات کی مزید تفصیل ملاحظہ کرنا مقصود ہوں تو رسالہ ''ادیب'' دکن کا طوفان نمبر ۱۹۰۸ء، بہار خزاں حیدرآباد یعنی طغیانِ رودِ موسیٰ مولفہ و مصنفہ مولوی سید محمد حسین صاحب اغلب موہانی اور اخبار مشیر دکن کی فائل بابت ۱۹۰۸ء۔۱۹۰۹ء ملاحظہ کی جا سکتی ہے[۲۲۴]۔

حوالہ جات

۱۔ نسیم، وحیدہ، ''پیش لفظ''، ''موسیٰ کے کنارے''، مصنفہ حبیبہ قاضی، گلستان مصطفےٰ، کراچی، ۱۹۹۱ء، ص۵
۲۔ بہت سے ادبا اور شعرا نے اس ندی کو ''موسیٰ ندی'' بھی لکھا ہے لیکن اصل نام ''موسیٰ'' ہی ہے۔ دیکھیے ''تاریخ گلزار آصفیہ'' مصنف خواجہ غلام حسین خان، مطبع محمدی، حیدرآباد دکن، ۱۳۰۸ھ، ص۵۵۰
۳۔ نسیم، ص۶
۴۔ علی، خورشید، سید، ''حیدرآباد کی حسرت ناک تباہی''، مشمولہ: ''ادیب''، حیدرآباد دکن، طوفان نمبر، ۱۹۰۸ء، ص۳۔۲
۵۔ نسیم، ص۶
۶۔ علی، ص۶
۷۔ ارمان، فخر الدین، ''رودِ موسیٰ''، سب رس، دکن، جنوری ۱۹۳۹ء، ص۱۹۷
۸۔ ظفر الحسن، مرزا، ''دکن اداس ہے یارو''، ادارۂ یادگارِ غالب، کراچی، ۱۹۷۸ء، ص۳۹
۹۔ خان، ظفر علی، ''رودِ موسیٰ''، مشمولہ: دکن ریویو، حیدرآباد دکن، جنوری ۱۹۰۵ء، ص۱۔۲
۱۰۔ ارمان، ص۱۹۷
۱۱۔ علی، ص۶
۱۲۔ ایضاً، ص۷
۱۳۔ راؤ، مانک راؤ وٹھل، ''بستانِ آصفیہ''، حصہ اوّل، مطبع انوار الاسلام، حیدرآباد دکن، ۱۳۲۷ھ، ص۸۰۴
۱۴۔ غلام حسین، خواجہ، ''گلزار آصفیہ''، محولہ بالا، ص۵۵۰
۱۵۔ راؤ، ص۸۰۴
۱۶۔ علی، ص۸
۱۷۔ ایضاً
۱۸۔ راؤ، ص۸۰۵۔۸۰۴
۱۹۔ ایضاً، ص۸۰۵
۲۰۔ ایضاً
۲۱۔ عالی، نعمت علی خاں، بہ حوالہ: سید خورشید علی، محولہ بالا، ص۲۸۔۲۷
۲۲۔ راؤ، ص۸۰۵
۲۳۔ خاں، نجم الغنی، علامہ، ''تاریخ ریاستِ حیدرآباد''، مطبع نول کشور، لکھنؤ، ۱۹۳۰ء، ص۵۶۷
۲۴۔ راؤ، ص۸۰۵
۲۵۔ خاں، ص۵۶۷
۲۶۔ راؤ، ص۸۰۵
۲۷۔ ایضاً، ص۸۰۶
۲۸۔ علی، ص۸
۲۹۔ ضرغام الدولہ، نواب، بہادر، بہ حوالہ: ''بستان آصفیہ''، محولہ بالا، ص۸۰۷
۳۰۔ راؤ، ص۸۰۶
۳۱۔ ضرغام الدولہ، ص۸۰۷۔۸۰۶
۳۲۔ راؤ، ص۸۰۸
۳۳۔ ایضاً
۳۴۔ ایضاً
۳۵۔ علی، ص۸
۳۶۔ راؤ، ص۸۰۸
۳۷۔ خاں، ص۵۶۷
۳۸۔ راؤ، مانک راؤ وٹھل، محولہ بالا، ص۸۰۸۔ مزید وضاحت کے لیے دیکھیے رسالہ ادیب دکن کا طوفان نمبر ۱۹۰۸ء، ص۸
۳۹۔ خاں، ص۵۶۲
۴۰۔ ذوالفقار، غلام حسین، ڈاکٹر، ''ظفر علی خاں ادیب و شاعر''، مطبع مکتبہ خیابان ادب، لاہور، ۱۹۶۷ء، ص۳۸
۴۱۔ ذوالفقار، غلام حسین، ڈاکٹر، ''مولانا ظفر علی خاں: حیات۔ خدمات و آثار''، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۳ء، ص۴۸
۴۲۔ بیگ، فرحت اللہ، مرزا، ''میری داستان''، فکشن ہاؤس، لاہور، ۱۹۹۸ء، ص۹۸۔ اس کے علاوہ حیدرآباد کے تمام مورخین نے یہی سن درج کیا ہے۔
۴۳۔ خاں، ص۵۶۳
۴۴۔ ایضاً
۴۵۔ راؤ، ص۸۰۹

۴۶۔ خاں،ص۵۶۳

۴۷۔ بیگ،ص۱۰۵

۴۸۔ راؤ،ص۸۰۹

۴۹۔ علی،ص۲

۵۰۔ بیگ،ص۱۰۴

۵۱۔ فاروق،سید محمد،''حیدرآباد کی تباہی''،مشمولہ:''زمانہ''،کان پور، دسمبر۱۹۰۸ء،ص۳۱۵

۵۲۔ خاں،ص۵۶۴۔

۵۳۔ راؤ، مانک راؤ وٹھل،محولہ بالا،ص۸۱۰۔ان کی بات اس لیے بھی معتبر مانی جائے گی کہ ان کی تصنیف بستان آصفیہ اس سانحے کے صرف ایک برس بعد۱۳۲۷ھ منظرعام پر آئی جب کہ نجم الغنی خاں صاحب کی تصنیف''تاریخ ریاستِ حیدرآباد''اس سانحے کے۲۲ برس بعد۱۹۳۰ء میں شائع ہوئی۔

۵۴۔ علی،ص۵

۵۵۔ خاں،ص۵۶۳

۵۶۔ امجد حیدرآبادی، سید احمد حسین،''ریاض امجد''، بار دوم، عماد پریس،حیدرآباد دکن،۱۳۴۲ھ،ص۵۳

۵۷۔ راؤ،ص۸۱۰

۵۸۔ محبّ، محبّ حسین،''مرثیہ شہدائے طغیانی رود موسیٰ''، مشمولہ: ''ادیب''،دکن،۱۹۰۸ء،ص۹۵

۵۹۔ علی،ص۵

۶۰۔ شرر، عبدالحلیم،''موسیٰ ندی! موسیٰ ندی!!''، مشمولہ: ''دل گداز''،حیدرآباد دکن،اکتوبر۱۹۰۸ء،ص۶

۶۱۔ راؤ،ص۸۱۰

۶۲۔ خاں،ص۵۶۵

۶۳۔ علی،ص۱۰

۶۴۔ راؤ،ص۸۱۱۔۸۱۰

۶۵۔ بیگ،ص۱۰۲

۶۶۔ ایضاً

۶۷۔ علی،ص۱۲

۶۸۔ خاں،ص۵۶۳

۶۹۔ بیگ،ص۹۹

۷۰۔ راؤ،ص۸۱۱

۷۱۔ خاں،ص۵۶۳

۷۲۔ بیگ،ص۱۰۷

۷۳۔ خاں،ص۵۶۳

۷۴۔ علی،ص۱۴

۷۵۔ خاں،ص۵۶۳

۷۶۔ راؤ،ص۸۱۱

۷۷۔ خاں،ص۵۶۵

۷۸۔ علی،ص۴۲

۷۹۔ ایضاً،ص۲۶۔۱۷

۸۰۔ خاں،ص۵۶۴

۸۱۔ راؤ،ص۱۲۔۸۱۱

۸۲۔ بیگ،ص۱۰۲

۸۳۔ علی،ص۴۱۔۲۹

۸۴۔ فوق، محمد الدین،''ظفر علی خان''،مشمولہ:''اخبار نویسوں کے حالات''،رفاہ عام اسٹیم پریس،لاہور،۱۹۱۲ء،ص۱۲

۸۵۔ رضوی، شفقت،''مولانا ظفر علی خان کا تعلق ریاست حیدرآباد سے''،مشمولہ:''خدابخش جنرل''، پٹنہ،اپریل جون ۲۰۰۹ء،ص ۵۶

۸۶۔ بیگ، اکبر علی، مرزا،''محمد عزیز مرزا: شخصیت، حیات اور کارنامے''،ادارۂ شعر وحکمت،حیدرآباد دکن،۱۹۸۷ء،ص۱۲۶

۸۷۔ فوق،ص۱۲

۸۸۔ وقارالملک،نواب،''دیباچہ''،مشمولہ:''خیالات عزیز''،مرتبہ منشی دیانرائن نگم،انجمن ترقی اردو،کراچی،۱۹۶۱ء،ص۱۵۔۱۴

۸۹۔ بیگ،ص۱۲۶۔

۹۰۔ تنہا، محمد یحییٰ،''سیر المصنفین''، حصہ دوم، مکتبہ جامعہ، دہلی، ۱۹۲۸ء،ص۲۶۶

۹۱۔ وقارالملک،ص۱۵

۹۲۔ رضوی،ص۵۶۔۵۵

۹۳۔ وقارالملک،ص۱۵

۹۴۔ رضوی،ص۵۶

۹۵۔ وقارالملک،ص۱۵

۹۶۔ تنہا،ص۲۶۷

۹۷۔ وقارالملک،ص۱۵

۹۸۔ بیگ،ص۱۲۷

۹۹۔ خاں،ص۵۶۶

۱۰۰۔ بیگ،ص۱۰۷

۱۰۱۔ علی،ص۵۳۔۴۴

۱۰۲۔ راؤ،ص۸۱۶

۱۰۳۔ بیگ،ص۱۲۶

۱۰۴۔ راؤ،ص۸۱۷

۱۰۵۔ بہ حوالہ: سید خورشید علی،محولہ بالا،ص۴۳

۱۰۶۔ شرر،ص۵۔۴

۱۰۷۔ خاں،ص۵۶۵

۱۰۸۔ علی،ص۴۳

۱۰۹۔ ایضاً،ص۷۹۔۶۲

۱۱۰۔ ایضاً،ص۳۔۲

۱۱۱۔ بیگ،ص۱۰۵

۱۱۲۔ شرر،ص۲

۱۱۳۔ ایضاً،ص۳

۱۱۴۔ کاشمیری، شورش،''مولانا ظفر علی خان''، مشمولہ: ''نقوش''، شخصیات نمبر، لاہور،۱۹۵۶ء،ص۵۹۸

۱۱۵۔ ذوالفقار،ڈاکٹر غلام حسین،''ظفر علی خاں: ادیب وشاعر''،مکتبۂ خیابان ادب، لاہور،۱۹۶۷ء،ص سرورق کی پشت

۱۱۶۔ ایضاً،ص۱۳۸

۱۱۷۔ ذوالفقار، ڈاکٹر غلام حسین،''مولانا ظفر علی خاں: حیات۔ خدمات وآثار''، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور،۱۹۹۳ء، سرورق کی پشت اور مندرجات سے پہلے والے صفحے پر سن درج ہے۔

۱۱۸۔ ایضاً،ص۴۸

۱۱۹۔ ذوالفقار،ص۱۵۲

۱۲۰۔ خاں، ظفر علی، مولانا،''دکن ریویو کی عزت افزائی''، مشمولہ: ''دکن ریویو''، حیدرآباد دکن، مارچ ۱۹۰۵ء،ص۲۵۔اس میں دو خطوط شائع ہوئے پہلا خط نوراللہ اور دوسرا مولانا الطاف حسین حالی کا ہے۔

۱۲۱۔ حالی، مولانا الطاف حسین،''دکن ریویو کی عزت افزائی''، خط مشمولہ: ''دکن ریویو''، حیدرآباد دکن، مارچ ۱۹۰۵ء،ص۲۵

۱۲۲۔ ذوالفقار،ص۴۸

۱۲۳۔ خان،ظفر علی،مولانا،''رودِ موسیٰ''، مشمولہ: دکن ریویو، حیدرآباد دکن، جنوری ۱۹۰۵ء،ص۲۔۱

۱۲۴۔ ذوالفقار،ص۱۸۳

۱۲۵۔ خاں،ص۱

۱۲۶۔ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار نے یہ نظم ''مخزن''۔ دہلی کے شمارہ جنوری ۱۹۰۹ء سے نقل کی ہے۔لیکن سہواً یہ مصرع ''تو وضع ایزدی ہے تو شان داوری ہے'' درج کیا ہے جب کہ درست مصرع وہی ہے جو مقالے میں درج ہے۔ ملاحظہ کیجیے ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار،۱۹۶۷ء،ص۳۳۷

۱۲۷۔ خاں،ص۲

۱۲۸۔ ذوالفقار،ص۱۸۴

۱۲۹۔ خاں،ظفر علی،مولانا،''شورِ محشر''، مشمولہ: ''بہارستان''، مکتبۂ کاروان، لاہور، سن ندارد،ص۱۲۔۱۰

۱۳۰۔ موازنے کے لیے دیکھیے ''بہارستان'' میں شامل نظم ''شورِ محشر'' کا صفحہ نمبر ۱۰ تا ۱۲ اور ''مخزن''، دہلی، جنوری ۱۹۰۹ء،ص۷۰۔۶۶

۱۳۱۔ نظیر لدھیانوی، اصغر حسین خاں، مشمولہ: ''بہارستان''، محولہ بالا، ص۱

۱۳۲۔ ذوالفقار،ص۶۷

۱۳۳۔ نظیر لدھیانوی،ص۱۱

۱۳۴۔ زمین دار، بابت ۱۴؍جولائی ۱۹۶۴ء

۱۳۵۔ فوق،ص۱۲

۱۳۶۔ ذوالفقار،ڈاکٹر غلام حسین،۱۹۹۳ء،محولہ بالا،ص۴۸

۱۳۷۔ فوق، محمد الدین، محولہ بالا،ص۱۲

۱۳۸۔ ذوالفقار،ڈاکٹر غلام حسین،۱۹۹۳ء،محولہ بالا،ص۴۸

۱۳۹۔ خاں،ظفر علی،مولانا،''شورِ محشر''، مشمولہ: ''مخزن''، دہلی، جنوری

۱۹۰۹ء،ص ۶۶-۷۰

۱۴۰۔ ذوالفقار، ڈاکٹر غلام حسین، ۱۹۶۷ء،محولہ بالا،ص ۳۴۲-۳۳۵

۱۴۱۔ عبدالقادر، سر،''شورِمحشر''،مشمولہ:مخزن، دہلی، جنوری ۱۹۰۹ء،ص ۶۶

۱۴۲۔ خاں،ظفرعلی،مولانا،۱۹۰۹ء،محولہ بالا،ص ۶۶

۱۴۳۔ ایضاً،ص ۶۷

۱۴۴۔ موازنے کے لیے نظم''رودموسیٰ''،مشمولہ دکن ریویو، حیدرآباد دکن، (جنوری ۱۹۰۵ء) اور''شورِمحشر'' مشمولہ: مخزن، دہلی، (جنوری ۱۹۰۹ء) ملاحظہ کیجیے

۱۴۵۔ ۳۲ اشعار پر مشتمل نظم''رودِموسیٰ'' کے وہ سات اشعار جو''شورِمحشر'' میں شامل نہیں درج ذیل ہیں:

میرا خیال موزوں میرا کلام رنگیں
ہم سنگ عسجدی ہے ہم رنگ انوری ہے
اِشا کا رنگ پھیکا مانی کا نقش باطل
تصویر میری خالِ روئے مصوری ہے
سن کر ترے ترانے سب غم لگے ٹھکانے
کس درجہ روح آسا تیری نواگری ہے
بازیچہ مچھلیوں کا مرغابیوں کا ممکن
تیری رہین منت تیری برادری ہے
دیکھے بہ وقتِ طوفاں کوئی جلال تیرا
ہر ایک سنگ سرکش کھاتا سکندری ہے
ہاتھ اور دل کو جس کے کہتے ہیں بحر اور کان
خود تو نے جس سے سیکھی طرزِ تونگری ہے
روزِ ازل سے آصف پر ہے ہما کا سایہ
اوس کارکن کے سر پر اوس پر خدا کا سایہ

ملاحظہ کیجیے دکن ریویو، حیدرآباد دکن، (جنوری ۱۹۰۵ء)،ص ۲-۱

۱۴۶۔ خاں،ظفرعلی،مولانا،۱۹۰۹ء،ص ۶۸

۱۴۷۔ ذوالفقار، ڈاکٹر غلام حسین،۱۹۹۳ء،محولہ بالا،ص ۵۲

۱۴۸۔ خاں،ظفرعلی،مولانا،۱۹۰۹ء،ص ۶۸

۱۴۹۔ ایضاً

۱۵۰۔ ایضاً،ص ۶۹

۱۵۱۔ ذوالفقار، ڈاکٹر غلام حسین، ۱۹۶۷ء،محولہ بالا،ص ۳۳۹ میں سہواً یہ مصرع''سہمی ہوئی ہے خلقت، ہوش، حواس ہیں شل'' درج ہے۔اسی وجہ سے یہ مصرع وزن سے بھی گر گیا ہے

۱۵۲۔ درست شعر کے لیے ملاحظہ کیجیے،ظفرعلی خاں ۱۹۰۹ء محولہ بالا،ص ۶۹

۱۵۳۔ ظفرعلی خاں کے مجموعہ کلام''بہارستان'' میں یہ مصرع اس طرح درج ہے۔''ہر گھر میں ہر کھنڈر میں لاشے پڑے ہوئے ہیں''، دیکھیے محولہ بالا،ص ۱۲۔ جب کہ''مخزن'' جنوری ۱۹۰۹ء ص ۶۹ اور ڈاکٹر غلام فیض ذوالفقار کی مذکورہ بالا تصنیف ۱۹۶۷ء کے صفحہ نمبر ۳۳۹ میں یہ مصرع اس طرح درج ہے جیسا کہ راقم نے مقالے میں درج کیا ہے۔

۱۵۴۔ خان ظفرعلی،مولانا،۱۹۰۹ء محولہ بالا،ص ۶۹

۱۵۵۔ ایضاً

۱۵۶۔ ذوالفقار، ڈاکٹر غلام حسین،۱۹۹۳ء،محولہ بالا،ص ۵۴

۱۵۷۔ خان،ظفرعلی،مولانا،۱۹۰۹ء،محولہ بالا،ص ۷۰

۱۵۸۔ ایضاً

۱۵۹۔ ذوالفقار، ڈاکٹر غلام حسین،۱۹۶۷ء،محولہ بالا،ص ۶۷

۱۶۰۔ خان،ظفرعلی،مولانا،۱۹۰۹ء،محولہ بالا،ص ۷۰

۱۶۱۔ ایضاً

۱۶۲۔ سید محمد پروفیسر،''امجد، جواب سرمد''،مشمولہ:''سب رس''، دکن، امجد نمبر، مئی جون ۱۹۶۲ء،ص ۱۳

۱۶۳۔ محبت، عظیم الدین،''امجد بحیثیت غزل گو''، سب رس، دکن، ۱۹۶۲ء،محولہ بالا،ص ۴۶

۱۶۴۔ امجد حیدرآبادی، سید احمد حسین، بحوالہ عظیم الدین محبت، محولہ بالا، ص ۴۶

۱۶۵۔ شاہد خواجہ حمید الدین، پروفیسر،''حکیم الشعرا حضرت امجد حیدر آبادی ایک تعارف''، بہادر یار جنگ اکیڈمی، کراچی، ۱۹۹۳ء، ص ۱۸

۱۶۶۔ امجد حیدرآبادی، سید احمد حسین،''جمال امجد''، اعظم اسٹیم پریس، دکن، ۱۹۴۸ء،ص ۸۷-۸۵

۱۶۷۔ ایضاً،ص ۹۶-۸۸

۱۶۸۔ ہاشمی، نصیر الدین، ''مقدمہ''، ''مکتوبات امجد''، مرتبہ نصیر الدین ہاشمی، شمس المطابع، حیدرآباد دکن، ۱۳۴۵ھ، ص۸

۱۶۹۔ امجد حیدرآبادی، سید احمد حسین، ''رباعیات امجد''، احمد برادرز، کراچی، ۱۹۶۸ء، ص۵۸

۱۷۰۔ کاؤس جی، میزہ بانو، ''امجد بحیثیت رباعی گو شاعر''، مشمولہ: ''ارمغانِ امجد'' مرتبہ خواجہ حمید الدین شاہد، ادارۂ ادبیات اردو، حیدرآباد دکن، ۱۹۵۹ء، ص۳۶

۱۷۱۔ امجد حیدرآبادی، سید احمد حسین، ''رباعیات امجد''، (کراچی، دار الاشاعت، ۱۹۶۰ء)، ص۸۳۔

۱۷۲۔ شاہد، خواجہ حمید الدین، ''دکن کا نام ور شاعر''، مشمولہ: ارمغان امجد، محولہ بالا، ص۶۹

۱۷۳۔ سید محمد، پروفیسر، محولہ بالا، ص۱۳

۱۷۴۔ امجد حیدرآبادی، سید احمد حسین، ''جمال امجد''، محولہ بالا، ص۱۴

۱۷۵۔ امجد حیدرآبادی، مشمولہ: ''اردو شاعری کا انتخاب'' مرتبہ ڈاکٹر محی الدین قادری زور، ساہتیہ اکیڈمی، نئی دلّی، ۱۹۹۳ء، ص۱۹۴

۱۷۶۔ ہاشمی، نصیر الدین، ''امجد حیدرآبادی''، مشمولہ: ''یادگار امجد''، مرتبہ محمد اکبر الدین صدیقی، مطبع ابراہیمیہ، حیدرآباد دکن، ۱۹۶۴ء، ص۲۶

۱۷۷۔ ہاشمی، نصیر الدین، ''امجد حیدرآبادی''، مشمولہ: ''نقوش''، لاہور، شخصیات نمبر اوّل، جنوری ۱۹۵۶ء، ص۳۳۲

۱۷۸۔ سید محمد، پروفیسر، محولہ بالا، ص۱۳

۱۷۹۔ وارثی، عبدالغنی، ''دیباچہ''، مشمولہ: ''ریاض امجد''، عماد پریس، حیدرآباد دکن، ۱۳۴۲ھ، ص۲

۱۸۰۔ شاہد، خواجہ حمید الدین، پروفیسر، ۱۹۹۳ء، محولہ بالا، ص۵۸

۱۸۱۔ امجد حیدرآبادی، سید احمد حسین، ''ریاضِ امجد''، محولہ بالا، ص۵۴

۱۸۲۔ ایضاً

۱۸۳۔ ایضاً، ص۵۳۔۵۲

۱۸۴۔ امجد حیدرآبادی، سید احمد حسین، ''ریاض امجد''، عماد پریس، حیدرآباد دکن، ۱۳۴۵ھ، ص۵۶

۱۸۵۔ ایضاً، ص۵۶

۱۸۶۔ امجد حیدرآبادی، سید احمد حسین، ''تصویرِ غم''، محولہ بالا، ص۶۰

۱۸۷۔ گیلانی، مولانا مناظر احسن، ''حکیم الشعرا حضرت امجد حیدرآبادی اور فقیر گیلانی''، مشمولہ: ''سب رس''، حیدرآباد دکن، ش۸۔۷، جلد۱۹، امجد نمبر، سن ندارد، ص۵۲

۱۸۸۔ امجد حیدرآبادی، سید احمد حسین، ۱۳۴۲ھ، محولہ بالا، ص۵۲

۱۸۹۔ امجد حیدرآبادی، سید احمد حسین، ''نالۂ ہائے دردمند''، مشمولہ: ''ادیب''، حیدرآباد دکن، طوفان نمبر، ۱۹۰۸ء، ص۹۳

۱۹۰۔ امجد حیدرآبادی، سید احمد حسین، ''افسانۂ غم''، مشمولہ: ''زمانہ''، کان پور، فروری ۱۹۰۹ء، ص۱۳۲

۱۹۱۔ بشیر النسا بیگم، ''یادِ امجد''، مشمولہ: ''سب رس''، کراچی، امجد نمبر، ۱۹۶۲ء، محولہ بالا، ص۱۰۴

۱۹۲۔ ابو سعد، سید اسمٰعیل سید، ''شاہ رباعی، امجد''، مشمولہ: ''سب رس''، کراچی، امجد نمبر، ۱۹۶۲ء، محولہ بالا، ص۱۱۸

۱۹۳۔ محبّ حسین، محبّ، ''مرثیہ شہدائے طغیانی رود موسیٰ''، مشمولہ: ''ادیب''، حیدرآباد دکن، طوفان نمبر، ۱۹۰۸ء، ص۹۲

۱۹۴۔ ایضاً، ص۹۳

۱۹۵۔ ایضاً، ص۹۴

۱۹۶۔ ایضاً، ص۹۷

۱۹۷۔ ایضاً، ص۸۹

۱۹۸۔ ایضاً، ص۹۰۔۸۹

۱۹۹۔ ایضاً، ص۹۰

۲۰۰۔ احمدی، سید نثار احمد، ''سیلِ فنا''، مشمولہ: ''ادیب''، حیدرآباد دکن، طوفان نمبر، ۱۹۰۸ء، ص۹۶

۲۰۱۔ ایضاً، ص۹۶۔۹۵

۲۰۲۔ ایضاً، ص۹۶

۲۰۳۔ ایضاً، ص۹۷

۲۰۴۔ شباب، سیف الدین، ''سیل فنا''، مشمولہ: ''ادیب''، حیدرآباد دکن، طوفان نمبر، ۱۹۰۸ء، ص۱۰۱۔۹۸

۲۰۵۔ ایضاً، ص۱۰۲

۲۰۶۔ ایضاً، ص۹۹

۲۰۷۔ عبرت، سید ظفر حسن، ''انقلاب دہر''، مشمولہ: ''ادیب''، حیدرآباد دکن، طوفان نمبر، ۱۹۰۸ء، ص۱۰۴۔۱۰۲

۲۰۸۔ ایضاً،ص۱۰۲

۲۰۹۔ ایضاً،ص۱۰۴

۲۱۰۔ صبر دہلوی، عبدالکریم خاں، ''فسانۂ عبرت''، مشمولہ: ''ادیب''، حیدرآباد دکن، طوفان نمبر، ۱۹۰۸ء، ص۱۲۰۔۱۱۳

۲۱۱۔ صبر دہلوی، عبدالکریم خاں، ''حواشی''، محولہ بالا، ص۱۱۷

۲۱۲۔ صبر دہلوی، عبدالکریم، ''فسانۂ عبرت''، محولہ بالا، ص۱۱۵

۲۱۳۔ طباطبائی، سید علی حیدر، ''شہرآشوب''، مشمولہ: ''ادیب''، حیدر آباد دکن، طوفان نمبر، ۱۹۰۸ء، ص۸۱۔۷۳

۲۱۴۔ ایضاً،ص۸۰

۲۱۵۔ جودت، محمد احمد علی، ''قیامت صغریٰ''، مشمولہ: ''ادیب''، حیدرآباد دکن، طوفان نمبر، ۱۹۰۸ء، ص۱۳۲۔۱۳۱

۲۱۶۔ ایضاً، ص، ص۱۳۲

۲۱۷۔ فاروق، شاہ پوری، ''حیدرآباد کی تباہی''، مشمولہ: زمانہ''، کان پور، دسمبر۱۹۰۸ء، ص۳۱۶۔۳۱۵

۲۱۸۔ ایضاً،ص۳۱۵

۲۱۹۔ ایضاً،ص۳۱۶

۲۲۰۔ ایضاً

۲۲۱۔ لبیب گورگانی، دہلوی، مرزا نظام شاہ، ''سیل فنا''، مشمولہ: ''ادیب''، حیدرآباد دکن، طوفان نمبر، ستمبر۱۹۰۹ء، ص۳۵

۲۲۲۔ قادری، حامد حسن، ''سیلاب''، مشمولہ: ''زمانہ''، کان پور، ستمبر ۱۹۰۹ء، ص۳۰۷

۲۲۳۔ ماہر کنتوری، ''تاریخ ہائے طغیانی''، مشمولہ: ''ادیب''، حیدرآباد دکن، طوفان نمبر، ۱۹۰۸ء، ص۱۳۳

۲۲۴۔ راؤ، ص۸۲۲

تقسیم اور تنسیخ بنگال: محرکات و عوامل

بیسویں صدی کے آغاز سے برصغیر پاک و ہند میں بالعموم اور سارے ایشیا میں بالخصوص آزادی کی تحاریک میں نیا اُبال دیکھنے میں آیا۔ اس اُبال نے جہاں نئے نئے محاذ کھولے وہیں ان کی وجہ سے بہت سے سانحے بھی رونما ہوئے۔ اس صدی کے آغاز ہی میں ترکی میں انقلاب آیا، ایران کے حالات بدلے، چین نے بیداری کی کروٹ لی، اور جاپان نے روس کو شکست دے کر یورپ کی برتری کے طلسم کو توڑا۔ ان تبدیلیوں کے ہندوستان پر بھی گہرے اثرات مرتب ہوئے۔ برطانوی حکومت کی آمرانہ چالوں اور لڑاؤ اور حکومت کرو کی پالیسی کی وجہ سے یہاں کے سیاسی حالات بھی روز بروز بد سے بدتر ہونے لگے۔ جزوی اصلاحات کی ناکامی اور انگریزوں کی تعزیری تدبیروں سے کانگریس میں انتہا پسند طبقہ ابھر کر سامنے آگیا تھا۔ تلک، بپن چندر پال، آربندو گھوش اور لاجپت رائے وغیرہ آئینی ایجی ٹیشن چھوڑ کر عملی جدوجہد کے لیے فضا تیار کر رہے تھے[1]۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ زندہ معاشرے نے آزادی کو زندگی کے تمام معاملات میں سب سے اہم سمجھا اور اس کی حفاظت اور حصول کے لیے بے مثال قربانیاں بھی دیں۔ تاہم یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اکثر اوقات افراد اور اقوام اس وقت اپنی آزادی کی قدر نہیں کرتے، جب وہ آزاد ہوتے ہیں لیکن اگر گردشِ زمانہ کے ہاتھوں غلامی کا طوق پہنا دیا جائے تو پھر احساس ہوتا ہے کہ کیسی گراں بہا نعمت ان سے چھین لی گئی ہے۔ یہی المیہ مسلمانوں کی تاریخ میں بھی گاہے گاہے رونما ہوتا رہا۔ مسلم اسپین کی مثال ہمارے سامنے ہے کہ آٹھ سو سال کی اسلامی حکومت اس طرح ختم ہوگئی کہ اس کا کہیں نام و نشان تک نہیں۔ یہی المیہ برصغیر میں پیش آیا اور مسلمانوں کا تقریباً ایک ہزار سالہ دورِ حکومت انگریزوں کے استعماری حربوں کی نذر ہوگیا۔ برصغیر کی آزادی اور غلامی کی داستان بھی متعدد تغیرات سے بھری ہوئی ہے۔ اس خطے میں انگریزوں کی عمل داری سے ابتدا میں ہندو اور مسلمان یکساں طور پر عتاب میں آئے کیوں کہ سیاسی، معاشرتی اور معاشی زبوں حالی کے ساتھ ساتھ انھیں بڑے پیمانے پر اپنا مذہب اور عقیدہ بھی خطرے میں نظر آنے لگا۔ یہ وہ پُر آشوب دور تھا جس سے گزرنے کے بعد ہر حساس اور باشعور فرد یہ محسوس کر رہا تھا کہ نئے حالات کے مطابق معاشرتی زندگی کو بدلنے اور ذہنی ساخت کو بہتر بنانے کی ضرورت ہے۔ یہ احساس سب سے زیادہ مسلمانوں میں پیدا ہوا، اس کا سبب یقیناً یہ تھا کہ انگریز حکمرانوں نے ہندوؤں کے مقابلے میں مسلمانوں پہ زیادہ مظالم ڈھائے اور مسلمانوں کو زیادہ قربانیاں دینی پڑیں۔ اس کا اعتراف خود پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنی خودنوشت میں بھی کیا ہے[2]۔ برصغیر کی سیاسی زندگی میں یہ دور بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ اس دور میں رونما ہونے والے اہم واقعات و سانحات یہاں کے لوگوں کی ذہنی تبدیلی میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ۱۹۰۵ء کی تقسیم بنگال اور پھر تنسیخِ بنگال، ۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ کا قیام، جنگ طرابلس و بلقان، سانحہ مسجد کان پور اور مسجد شہید گنج، جنگ عظیم اوّل و دوم، ۱۹۱۹ کا رولٹ ایکٹ اور ملک گیر ستیا گرہ تحریک، جلیاں والا باغ کا خونیں سانحہ، خلافت تحریک، بائیکاٹ، فسادات، سائمن کمیشن، گول میز کانفرنسوں سے لے کر تقسیم ہند کے منصوبے تک جدوجہد کی ایسی داستان برصغیر میں رقم کی گئی جس کی نظیر تاریخ عالم میں کم ہی ملتی ہے۔

اگلے چند صفحات میں مختصراً بنگال کے مسلمانوں کی جدوجہد آزادی اور مختلف تحریکوں کو اجاگر کرتے ہوئے تقسیم بنگال کے اسباب اور تنسیخ کی بابت کچھ ضروری باتوں کا احاطہ کرنا ضروری ہے تاکہ اس ضمن میں کی جانے والی اردو شاعری کے محرکات کو سمجھنے میں دشواری نہ پیش آئے۔

یہ بات کم ہی لوگ جانتے اور سمجھتے ہیں کہ شاہ ولی اللہ، شاہ عبدالعزیز اور سید احمد شہید کی جن تحریکوں نے مسلمانوں کے جذبات کو گرمایا، اگر ان تحریکوں کو عوامی تائید کہیں میسر آئی تو وہ بنگال اور مشرقی پاکستان ہی تھا۔ کس طرح وہاں کے مسلمان کسانوں نے ڈیڑھ صدی قبل (الارض اللہ۔ زمین اللہ کی ہے) کا نعرہ اور زمین داری کے خلاف بغاوت کا پرچم بلند کیا۔ ظاہر سی بات ہے زمین داری کے خلاف یہ بغاوت ان کے پشت پناہ برطانوی شہنشاہیت کے خلاف بھی بغاوت تصور کی گئی۔ یہ تحریکیں اٹھیں تو مذہب کے نام پر مگر اس کی بنیاد عوام کی معاشی پستی اور بے چینی پر ہی استوار ہوئی تھی[۳]۔ بنگال میں ہندو مسلم تضاد کی تاریخ گزشتہ آٹھ سو سال سے زائد عرصے پر محیط ہے۔ اس کا آغاز تیرھویں صدی کے اوائل میں ہوا جب غزنی کے فرماں روا سلطان محمد غوری کے غلاموں نے برصغیر میں باقاعدہ مسلمان سلطنتیں قائم کیں۔ محمد غوری کے ایک غلام بختیار خلجی نے سلطنت بنگال کی بنیاد رکھی۔ ترکوں اور افغانوں کے کم و بیش چار سو سالہ دور میں بنگال زیادہ تر آزاد و خود مختار حکمرانوں کے زیر نگیں رہا۔ اسے تخت دہلی کے تحت کرنے کی زیادہ تر کوششیں عارضی ثابت ہوئیں۔ یہاں کی اکثر آبادی جنھیں ملیچھ قرار دے کر آریائی ہندوؤں نے معاشی، سماجی اور معاشرتی استحصالی کا شکار بنا رکھا تھا، حکم رانوں کے رویّے سے تنگ تھی۔ لہٰذا ترکوں کو کوئی خاص مزاحمت کا سامنا نہیں کرنا پڑا اور بہ آسانی سین خاندان کی حکمرانی کا خاتمہ ہو گیا۔ یہ وسط ایشیائی خلجی حکمران، دشت مارگو سے نکل کر ڈیڑھ ہزار میل دور واقع اس خطے پر جذبۂ ایمانی نے سرشار ہو کر اسلام کے پھیلاؤ کے خاطر نہیں آئے تھے بلکہ ان کی نقل مکانی کی وجوہات میں سے اوّل وسطی ایشیا کی چراگاہیں ہیں۔ معیشت ان کا بوجھ اٹھانے کے قابل نہیں رہی تھی اور دوم وہاں منگولوں کی یلغار شروع ہو چکی تھی جو ان سے بھی پس ماندہ علاقوں سے آندھی کی طرح اٹھے اور بگولے کی طرح وسط ایشیا کو روندتے ہوئے ایران و عراق کا رخ کر رہے تھے۔ اس صورتِ حال کو دیکھ کر وسط ایشیا سے ترک غول کے غول برصغیر کا رخ کرنے پر مجبور تھے۔ ان ہی میں سے خلجی ترک اوّل اوّل قسمت آزمائی کرنے بنگال پہنچے۔ اس کے بعد بہت سے ترک اور افغان گروہ کم و بیش پونے چار سو برس تک یہاں آکر متعدد خود مختار اور آزاد سلطنتوں کے حکمراں بنے۔ نتیجتاً ہندو حکمراں جو اس وسائل پر قابض بیٹھے تھے، تمام وسائل ان کے ہاتھوں سے نکل کر مسلم حکمرانوں میں منتقل ہو گئے۔ اس طرح اس دو گروہوں کے درمیان مادی وسائل کے مابین تضادات کا پیدا ہونا فطری امر تھا۔ لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ یہ مسئلہ کوئی دو مذاہب کے مابین محض عقائد کا جھگڑا نہیں تھا بلکہ دو مقتدر قوتوں کے مابین مفادات کی لڑائی تھی جس میں باہر سے آیا ہوا فریق غالب ٹھہرا[۴]۔

ان دنوں اقتدار ہندوؤں کے ہاتھوں سے نکل کر ترکوں یا افغانوں کے ہاتھوں میں آگیا۔ حاکم اعلیٰ سے لے کر شہر کے کوتوال تک مسلمان امرا فائز ہوئے۔ تمام انتظامیہ پر ان کا قبضہ ہو گیا۔ قطعہ دار، ویرِ دبیرِ خاص، سر لشکر، امیر البحر، قاضی، عارض، مشق دار وغیرہ جیسے اہم عہدے مسلمانوں کے لیے مخصوص ہو گئے۔ اعلیٰ عہدوں پر ہندوؤں کے تقرر کو حرام سمجھا جاتا تھا[۵]۔ زمینیں اور جاگیریں ہندو زمین داروں سے چھین کر مسلم امرا کو دی گئیں۔ جن ہندو زمین داروں کے پاس زمین رہنے دی گئی، ان سے خراج وصول کیا جاتا۔ نصف سے زائد فصل بطور جزیہ وصول کیا جاتا۔ فخر الدین مبارک شاہ کے دور میں ابنِ بطوطہ نے

۱۳۴۵ء۔ ۱۳۴۶ء میں مشرقی بنگال کی سیاحت کی۔ اُس نے سلہٹ اور سونار گاؤں کے علاقوں میں سیاحت کی۔ اس نے یہاں کی معاشی اور سماجی صورت حال کا نقشہ کھینچتے ہوئے ہندوؤں کی معاشی ابتری کا ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ "حاکم ان کی فصل کا آدھا حصہ بلا وجہ چھین لیتا۔ دوسرے ٹیکس اس کے علاوہ ادا کرنے پڑتے ہیں"[۶]۔ ترک افغان حکمران جس علاقے کے ہندو راجا کو شکست دیتے تھے، اس کی راج دھانی کو بری طرح پامال کرتے اور جس حد تک ممکن ہو تا مال غنیمت لوٹتے۔ ہندو راجاؤں کی جانب سے اس دوران مسلسل مزاحمت کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ اونچی ذات کے ہندوؤں کے قائم کردہ نفرت کے نظام سے تنگ آئے ہوئے یہاں کے قدیم باشندے مسلمان بن کر نہ صرف برہمنی نظامِ جبر سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتے تھے بلکہ وہ نئے حکمرانوں سے تحفظ کی ضمانت کا بندوبست بھی حاصل کرنا چاہتے تھے۔ یہ وہ پس منظر تھا جس کی وجہ سے مشرقی بنگال کی اکثریت مسلمان ہو گئی۔ اسی وجہ سے بعد میں ہندو راجاؤں اور حملہ آوروں کی لڑائی نے مسلمان اور ہندوؤں کی لڑائی کی صورت اختیار کر لی[۷]۔ افغانوں کے دور میں یہ تضاد اس قدر شدید ہو گیا کہ اس سے نجات حاصل کرنے کے لیے یہاں کے ہندوؤں نے ٹوڈرمل اور مان سنگھ کا ساتھ دیا، اس طرح بنگال پر مغلوں کا غلبہ ہو گیا۔ ترکوں میں طویل عہد حکومت کی بدولت دورِ آخر میں جو وسیع المشربی اور وسیع النظری آئی تھی، وہ ظاہر ہے کہ افغانوں میں نہیں تھی۔ انھوں نے لوٹ مار کا ایسا بازار گرم کیا کہ لوگ ترکوں کے مظالم بھی بھول گئے۔ ان افغانوں کی بابت خواجہ نعمت اللہ ہروی کا بیان ہے کہ مندروں میں پناہ لینے والی عورتوں کو بھی نہ بخشا[۸]۔

سولھویں صدی کے ربع آخر میں مغلوں کے ہندو جرنیل بہار، اڑیسا اور بنگال کے ہندو راجاؤں کو ساتھ ملا کر افغانوں کی سرکوبی میں مصروف رہے۔ سترھویں صدی کے اوائل میں جہاں گیر کے برسر اقتدار آنے کے بعد مغلوں کی جانب سے ہندوؤں کو ہٹا کر اعلیٰ عہدوں پر مسلمان امرا کو متمکن کرنے کی کوشش کی گئی۔ تاہم کچھ ہی عرصے میں یہ رویّہ تبدیل ہوا اور پھر سے انتظامیہ میں ہندوؤں کی حیثیت بحال ہو گئی۔ ۱۶۰۶ء میں جہاں گیر نے اسلام خان کو بنگال کا گورنر مقرر کر کے ڈھاکا کو صدر مقام بنایا اور مغل حکمرانی کو مستحکم کیا۔ سخت گیر مرکزیت اور مضبوط انتظامی ڈھانچے کی وجہ سے ریونیو جمع کرنے کے منظم بندوبست سے رعیت پر جبر و تشدد کے نئے دور کا آغاز ہوا۔ اس سے قبل اخراجات صرف بنگال کی صوبے داری تک محدود تھے۔ اب مرکز کے اخراجات میں بھی بنگال کو حصہ دینا پڑا۔ بنگال جیسے خوش حال صوبے نے مرکز کو سب سے زیادہ ریونیو دیا۔ گویا یہاں کے محنت کشوں نے مغلوں کی سلطنت کو سب سے زیادہ خون دیا۔ اس دور میں بھی ہندو زیادہ تر نچلے عہدوں کے ملازم ہوتے تھے، لہٰذا ترکوں اور افغانوں کے زمانے میں جو امتیاز تھا وہ معمولی رد و بدل کے ساتھ مغلوں کے عہد میں بھی جاری رہا۔ سترھویں صدی کے اواخر اور اٹھارھویں صدی کے اوائل میں وہ آثار نمودار ہونا شروع ہو گئے جو مغلوں کے زوال پزیر جاگیر دارانہ نظام سلطنت کے خاتمے کی نشان دہی کرتے تھے اور محروم و محکوم ہندوؤں کے روشن مستقبل کی نوید تھے[۹]۔

ایسٹ انڈیا کمپنی بحیثیت تجارتی ادارے کے تو ہندوستان میں سترھویں صدی کے برسوں میں ہی پہنچ گئی تھی لیکن سیاسی قوت کی حیثیت سے برصغیر میں اس کے اقتدار کا دور اٹھارھویں صدی کے نصف سے شروع ہوتا ہے۔ ۱۷۵۷ء کو کمپنی کے استحکام کا پہلا سال قرار دیا جا سکتا ہے۔ یہی وہ سال تھا جب پلاسی کے مقام پر کمپنی نے فتح حاصل کر کے اپنے استحکام کے جھنڈے گاڑھ دیے۔ اس کے بعد کا دور مقبوضات میں توسیع اور سیاسی مرکزیت کے حصول کا دور ہے۔ برصغیر کی تاریخ میں یہ بڑے کرب کا دور تصور کیا جاتا ہے۔ جن لوگوں نے یہ زمانہ دیکھا انھوں نے ایک عجیب کرب اور مخمصے کا تجربہ کیا ہو گا اس لیے کہ یہ وہ

زمانہ تھا جب ایک نظام دم توڑ رہا تھا اور دوسرا وجود میں آ رہا تھا۔ ایک سلطنت انتشار کی گہرائیوں میں اتر رہی تھی، دوسری عدم سے وجود میں آ رہی تھی۔ یہی وہ زمانہ تھا جب سلطنت مغلیہ کا چراغ ٹمٹمار ہا تھا۔ خانہ جنگیوں کے تند و تیز جھونکے بر اعظم کے اس چراغ کی آخری لو کو بھی سلب کرتے دکھائی دے رہے تھے۔ نوشتہ تقدیر معلوم ہو رہا تھا کہ یہ نظام چند دنوں کا مہمان ہے۔ پام دت کے مطابق اس کش مکش میں انگریز سرمایہ داروں کو فتح نصیب ہوئی[۱۰]۔ بنگال یورپی تاجروں کی تجارت کا سب سے بڑا راستہ تھا۔ یہاں کے تجارتی محصولات سے اس قدر آمدنی ہوتی تھی کہ مغل امرا اپنی تعیناتی کے لیے بنگال کی طرف لالچ بھری نظروں سے دیکھتے تھے۔ یہاں وہ یورپی تاجروں سے بھاری رشوتیں بھی وصول کرتے تھے، جسے ''سودائے خاص'' کہا جاتا تھا۔ شائستہ خان کے بعد تعینات ہونے والے صوبے دار ابراہیم خان ۱۶۸۹ء۔ ۱۶۹۷ء کے عہد میں یہ بدعنوانیاں عروج پر تھیں۔ اورنگ زیب کے متعین کردہ وزیر مال مرشد قلی خان نے جو کہ ایک کروڑ روپے سالانہ مالیہ اورنگ زیب کو دیتا تھا، زیادہ سے زیادہ مالیہ کی وصولی کا ٹھیکے دار مقرر کیا گیا تھا، اس صدی کے اواخر تک لارڈ کارنوالس (Cornwallis) نے بندوبست دوامی کے ذریعے اس اراضی کا مستقل زمین دار بنا دیا گیا۔ اس اقدام کے بعد مستقل طور پر یہ زمین دار مسلمان کسانوں کے لیے درد سر بنے رہے اور ان کے مصائب میں اضافے کا سبب بنتے رہے۔ ۱۷۱۷ء میں مرشد قلی خان کو بنگال کا باقاعدہ صوبے دار بنا دیا گیا۔ صوبے پر مغلوں کی گرفت ڈھیلی ہوئی تو وہ بنگال کا نواب بن گیا اور اپنی خود مختار حکومت کی بنیاد رکھی جس کا صدر مقام مرشد آباد رکھا گیا۔ اب بنگال اور دہلی کا تعلق محض سالانہ نذرانے کی وصولی تک محدود ہو کر رہ گیا۔ مرشد قلی خان کے زمانے میں ہندو مسلم تضاد نے تاریخ ساز کروٹ لی۔ اس نے ہندو رعایا سے ٹیکسوں کی وصولی پر پُر تشدد طریقے اختیار کیے۔ کچھ من پسند افراد اور خاندانوں کو سرکاری عہدوں کے لیے نوازا اور وہ عہدے برہمن، ویدا اور کھیشت ذاتوں سے منسوب ہو کر ان خاندانوں کے نام کا حصہ بن گئے۔ مثلاً بخشی، سرکار، قانون گو، موجم دار، شاہنہ، چاکل دار، طرف دار، منشی اور خان وغیرہ۔ اس طرح بنگال میں ایک نئی ہندو اشرافیہ وجود میں آئی۔ سترھویں صدی میں جب خلیج بنگال کی بندر گاہوں سے یورپ کے تاجر ہندوستانی مال بھر بھر کر لے جانے لگے تو بہار سے خلیج بنگال تک آبی راستوں سے اس مال کی ترسیل کے لیے یہی ہندو کاروباری طبقہ پیش پیش تھا۔ وہ یورپی تاجروں کے گماشتے بن کر خوب دولت سمیٹنے لگے۔ دوسری طرف مارواڑی ہندو تاجر بھی جوق در جوق بنگال کے تجارتی مراکز پہنچ گئے۔ ان میں سے بعض ساہوکار اور سیٹھ تو اس قدر دولت مند ہو گئے کہ بنگال کے نواب اور مغل شہنشاہ تک ان سے قرض لینے لگے۔ مانک چند سے فرخ سیر نے اپنی تخت نشینی کے وقت قرضہ حاصل کیا تھا۔ فتح چند کو مغل شہنشاہ محمد شاہ نے جگت سیٹھ یعنی عالمی بینکر کا خطاب دیا تھا۔ وہ دہلی اور بنگال کے حکمرانوں کو انگلیوں پر نچانے کی اہلیت حاصل کر چکا تھا[۱۱]۔

جب بنگال میں ہندوؤں کے مراعات یافتہ طبقے کو بنگال کے معاملات پر کنٹرول حاصل ہوا تو ۱۷۴۱ء میں مرہٹوں نے بنگال پر حملہ کر دیا۔ ۱۷۴۱ء۔ ۱۷۵۱ء لڑائی جاری رہی اور علی وردی خاں اس دوران مرہٹوں سے الجھا رہا۔ نادیہ کے برہمن زمین دار کرشن چندر کے ایک درباری شاعر نے بنگالی زبان میں ''اناڈامنگلہ'' کے عنوان سے ان واقعات کو منظوم کیا ہے۔ اس نے مرہٹوں کے حملوں کو ظالم مسلم حکمرانوں کے خلاف جہاد قرار دیا[۱۲]۔ اس زمانے میں داخلی اور خارجی ہر لحاظ سے ہندو ایک موثر قوت کے طور پر ابھر کر سامنے آ چکے تھے۔ ۱۷۴۳ء میں مرہٹہ سردار بالاجی راؤ کو خراج کے طور پر اپنی ریاست کی آمدنی کا چوتھائی حصہ جسے ''چوتھ'' کہتے ہیں، مع ۲۲ لاکھ نقد ادا کیا تو یہ حملے بند ہوئے۔ بنگال کے زبوں حال عوام الناس نے اپنی نجات کے

لیے مرہٹوں سے جو امید وابستہ کی تھیں وہ اس پر پورا نہ اترے لیکن مرہٹوں کی بار بار یلغار سے مسلمانوں کی کھوکھلی حکومت کی جڑوں میں ایسے شگاف ضرور پڑ گئے کہ چند برسوں بعد اس حکومت کا خاتمہ ہوا تو ہندو عوام کو بھی بے شمار فوائد حاصل ہوئے۔ مرہٹوں کے حملوں کے دوران ہی ہندو تاجروں اور سیٹھوں کا انگریزوں کے ساتھ تعاون بڑھا۔ ہندو تاجر مرشد آباد سے نقل مکانی کر کے کلکتہ جا کر محفوظ ہو گئے۔ گویا اب وہ وقت آ پہنچا جب جاگیر دارانہ نظام پر کھڑی مسلمان حکمرانی کی بوسیدہ عمارت کو کسی بھی وقت گرایا جا سکتا تھا۔ پلاسی کی جنگ کے ذریعے بنگال میں مسلمانوں کے دور کے خاتمہ کروانے میں نمایاں کردار ہندو زمین داروں اور سیٹھوں نے بھی ادا کیا[۳۳]۔ ۱۷۵۷ء میں پلاسی کی جنگ کی آڑ لے کر ہوشیار اور چالاک انگریزوں نے اس ملک پر سیاسی اقتدار اور دور رس اختیارات حاصل کر لیے، پلاسی کی جنگ میں سراج الدولہ کی شکست نے صرف ایک حکومت کی بیخ کنی اور دوسری سلطنت کی بنیادوں کو مضبوط ہی نہیں کیا بلکہ اس نے برصغیر کے ہزار سالہ تہذیب و تمدن اور طرز معاشرت میں ایک انقلاب پیدا کر دیا[۳۴]۔ جیسا کہ ذکر کیا گیا کہ اس جنگ میں ہندو زمین دار اور سیٹھوں نے مسلم اقتدار کے خاتمے میں اہم کردار ادا کیا۔ مرشد آباد میں جگت سیٹھ کے گھر پر ہی تمام بااثر ہندو اکٹھے ہوئے، وہیں اس سازش کی منصوبہ بندی کی گئی۔ میر جعفر نے بھی اس اجلاس میں شرکت کی۔ اومی چند، رنجیت رائے اور جگت سیٹھ اس سے قبل واٹس (Watts) کے ذریعے کلائیو (Clive) کو یقین دلا چکے تھے کہ سراج الدولہ اندر سے انگریز دشمن ہے اور کسی بھی وقت معاہدہ توڑ کر کلکتہ پر حملہ کر سکتا ہے۔ چناں چہ انگریز، ہندو سیٹھوں اور میر جعفر کے درمیان ایک معاہدہ طے پایا[۳۵]۔ کلائیو نے سراج الدولہ کو شکست دے کر میر جعفر کو برائے نام نواب بنایا اور وصولیِ محاصل کی ذمے داری خود اپنے ہاتھوں میں رکھی۔ تاہم محب وطن اور آزادی پسند مسلمانوں نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے پنجۂ اقتدار سے نجات حاصل کرنے کے لیے کوششیں جاری رکھیں۔ میر قاسم نے انگریزوں سے متعدد لڑائیاں لڑیں۔ اس زمانے کا بنگال جو کہ ''ملک زریں'' کہلاتا تھا، کمپنی کی دست حرص کا شکار ہو کر بدحال ہوتا گیا۔ ۱۷۷۶ء کا مشہور قحط بھی اسی حرص کا نتیجہ تھا۔ پلاسی کی جنگ سے قبل تک مرشد آباد بنگال کی تہذیب و تمدن کا مرکز تھا لیکن حکومت کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ اس کی تہذیبی اہمیت بھی کم ہوتی گئی اور نو تعمیر دارالحکومت کلکتہ مالی اور سماجی سرگرمیوں کا مرکز ٹھہرا[۳۶]۔

کمپنی کا اقتدار جیسے ہی قائم ہوا، ویسے ہی طور طریقوں اور تجارتی ادارے کے بارے میں نقطۂ نظر میں تبدیلی رونما ہونے لگی۔ کمپنی نے تجارت کے اس فرق کو بہ زور شمشیر ختم کرنے کی کوشش کی جو ایک صدی تک اسے برداشت کرنا پڑا۔ اس استحکام اور اقتدار کے ساتھ جبر و تشدد کا ایک لامحدود سلسلہ شروع ہو گیا۔ چناں چہ اس دور میں زیادہ سے زیادہ سامان کم سے کم معاوضے پر حاصل کرنے کے لیے دوڑ دھوپ شروع کر دی۔ تاجروں نے شمشیر و سنان کے ساتھ کسانوں اور پارچہ بافی کا استیصال شروع کر دیا۔ اس استیصال نے انگریزوں کے نمک خوار نواب کو بھی مجبور کر دیا کہ وہ کمپنی کے خلاف احتجاج کرے۔ چناں چہ ۱۷۶۲ء میں بنگال کے نواب نے کمپنی کو ایک احتجاجی مراسلہ لکھا جس میں کہا گیا کہ انگریز تاجر چوتھائی قیمت دے کر رعیت اور دیسی تاجروں کا سامان چھین لیتے ہیں اور جبر و تشدد کر کے ان چیزوں کا پانچ روپیہ وصول کرتے ہیں جن کی قیمت محض ایک روپیہ ہوتی ہے۔ کمپنی کے مظالم ان گنت ہیں اور ان کی شہادت کے لیے خود انگریز مورخ ایسٹ انڈیا کمپنی کی دستاویزات پارلیمنٹ میں برطانوی نمائندوں کی تقریریں وغیرہ ثبوت کے طور پر پیش کی جا سکتی ہیں۔ جنگ پلاسی کے بعد تو بنگال کی دولت لُٹ لُٹ کر لندن منتقل ہونے لگی۔ صنعت و حرفت میں انگلستان کے انقلاب کا آغاز ۱۷۶۰ء سے شروع ہوا۔ یہی وہ زمانہ ہے اس انقلاب کے لیے سرمایہ

بنگال اور کرناٹک سے فراہم کیا جارہا تھا۔ کمپنی نے ریاست کے نوابوں سے خود دولت کمائی۔ کبھی میر جعفر، کبھی میر قاسم اور ہر نواب کو گدی نشین کر کے خوب دولت اینٹھتے۔ اندازاً ان اتھل پتھل میں پانچ کروڑ روپے حاصل کیے گئے۔ انگریز جب بنگال میں تجارتی قبضہ حاصل کرنے کی دھن میں مصروف تھے تو اس مقصد کے حصول میں سب سے زیادہ مدد بنگالی ہندوؤں نے کی۔ اس طرح یہ پہلا گہرا رابطہ انگریزوں اور ہندوؤں کے مابین ہوا۔ ان ہندو گماشتوں نے بھی ظلم و بربریت کا بازار گرم کیے رکھا۔ ان ہندو گماشتوں کے مظالم کا شکار خود ہندو بھی بنتے۔ اس کے نتیجے میں کچھ احتجاجی اور اصلاحی تحریکیں بھی اٹھیں۔ بنگال کی اطمینان بھری زندگی میں ایک ہلچل سی پیدا ہو گئی۔ ۱۲ اگست ۱۷۶۵ء کو دلّی کے بادشاہ شاہ عالم نے بنگال، بہار اور اڑیسا کی دیوانی عدالتوں کے اختیارات بھی محض ۲۶ لاکھ روپے سالانہ میں فروخت کر دیے۔ نتیجتاً مالیہ وصول کرنے کا اختیار کمپنی کے اختیار میں آ گیا جس سے بنگال کا زرعی ڈھانچا مکمل طور پر تباہی و بربادی کے دہانے تک پہنچ گیا۔ لوگ اس ظلم کے خلاف لڑنے مرنے پر مجبور ہو گئے۔ ہر طرح کے کاروبار سے مسلمانوں کی علاحدگی، دیوانی اختیارات مسلمانوں سے واپس لے لینے، دوامی بندوبست، لگان، پارچہ بافوں کے انگوٹھے تک کاٹ دینے کے واقعات جو کہ مسلمان ہی تھے وغیرہ جیسے مظالم نے بنگال کی زراعت، صنعت اور معاشی ڈھانچا تباہ کر کے رکھ دیا۔ ان اقدامات کا نتیجہ تھا کہ اٹھارھویں صدی کے آخر تک کاشتکاروں اور زمین داروں کی جانب سے لاتعداد مزاحمتی تحریک شروع ہو گئیں۔ یہ تحریک مسلح بغاوت تک بھی جا پہنچی۔ ان تحریکوں میں مسلم بھی تھے اور ہندو بھی۔ یہ سلسلہ ایسا دراز ہوا کہ پھر نصف صدی تک بنگال کا امن و امان بحال نہ ہو سکا۔ بنگال کے سیاسی ڈکیتوں اور فقیروں نے بھی اس دوران اپنا خوف قائم کر رکھا تھا۔ ان میں مجنوں شاہ کی تو اس قدر دھوم تھی کہ بڑے زمین دار اور کمپنی کے اہل کار تک اس کے نام سے کانپتے تھے۔ مفلس دیہاتی ایسے لوگوں کو اپنا مسیحا سمجھتے لیکن اس طرح کے ماحول سے بھی دیہاتی آبادی کو شدید نقصان پہنچتا[۱۷]۔ ان نقصانات اور ہلاکتوں کا اندازہ پنچانن داس کی اس نظم سے لگایا جا سکتا ہے، جو اس نے ۱۸۱۳ء میں لکھی۔ "مجنوں کبتیا" کے عنوان کے تحت لکھی گئی اس نظم میں اس زمانے کے حالات کی سچی تصویر ملتی ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

> دوستو! تم سب سنو ایک نئی نظم / مجنوں برہنہ نے بنگال کو تباہ کر دیا ہے / کیا یہ فقیر ہے؟ / یہ تو موت کا دیوتا ہے ____ مایا / اسی کی طرح وحشت ناک اور سنگ دل / بادشاہ اس کے خوف سے کانپتے ہیں / پُر امن شہری اس کے ہاتھوں امن کو ترستے ہیں / اس کا حملہ بادشاہ کی فوجوں کی طرح منظم ہوتا ہے / یہ حالت بنگال کی، بنگالی فرار کے علاوہ کر بھی کیا سکتا ہے / آرہا ہے کی صدا / ان کو ڈرا دیتی ہے / مائیں اپنے بچوں کو چھوڑ جاتی ہیں / چاروں طرف بھگ دڑ مچ جاتی ہے / یہ آفت کہاں سے آتی ہے / یہ موت کا دوسرا نام ہے[۱۸]

انیسویں صدی کے آغاز میں بنگال میں مسلمان کسانوں کی مسلح تحریک فرائضی تحریک کے نام سے چلی۔ یہ تحریک مسلمان کسانوں کی ہندو زمین داروں اور انڈیگو کے انگریز کاشت کاروں کے خلاف تھی۔ اس کی نوعیت طبقاتی تھی۔ اس تحریک کے علم برداروں میں حاجی شریعت اللہ، دودو میاں اور تیتو میر زیادہ قابل ذکر ہیں[۱۹]۔ اس زمانے کے ہندوستان میں جو ہندوانہ رسم و رواج تیزی سے پروان چڑھ رہے تھے، اس کا نقشہ شیخ محمد اکرام نے "رود کوثر" میں تفصیل سے کیا ہے[۲۰]۔ حاجی شریعت اللہ نے ان تمام رسوم و رواج کے خلاف سخت مزاحمت کی۔ اس دور میں بنگال میں ہندوانہ اثرات کا جادو ٹوٹا۔ اس تحریک نے بنگال کی مذہبی زندگی میں نئی تحریک پیدا کر دی[۲۱]۔ فرائضیوں نے زمین داروں کو ٹیکس اور مالیا دینے سے انکار کر دیا۔ بنگال کے کاشت کار

اس تحریک سے بے حد متاثر ہوئے اور ہر گاؤں اور پر گنے میں اس کا اثر ورسوخ بڑھنے لگا۔ یہ ایک ایسی آگ تھی جو ہر گاؤں میں سلگ رہی تھی۔ مسلمان کاشت کار جو اس زرعی بحران سے پہلے ہی تباہ و برباد ہو چکے تھے، ان کی زندگیوں میں مایوسیوں نے گھر کر رکھا تھا، تحریک نے انھیں جھنجھوڑا۔ ان کے دلوں میں نئی امنگ پیدا کی۔ ہندو زمین داروں نے بغیر کسی شہادت کے فرائضیوں اور ان کی تنظیم کو ایک سیاسی جماعت کے طور پر ایسٹ انڈیا کمپنی کے سامنے پیش کیا اور حکام کو ان کے خلاف صف آرا ہونے پر مجبور کیا[۲۲]۔ یہ بات درست ہے کہ حاجی شریعت اللہ برصغیر کو دار الحرب مانتے تھے۔ وہ عیسائی انگریزوں کے پنجۂ اقتدار میں محصور لوگوں کو آزادی دلانے کے خواب دیکھ رہے تھے۔ اس کام کا آغاز انھوں نے مقامی لوگوں کی اصلاح سے کیا۔ محرم کے جلوس کو ہندوؤں کے درگا پوجا کے مماثل سمجھ کر شدید مخالفت کی، پیر پرستی کے خلاف آواز بلند کی۔ استاد اور شاگرد کے تصور کو استوار کیا۔ ان کی وفات کے بعد ان کے وارث کی حیثیت سے تحریک کی سربراہی ان کے فرزند محمد محسن عرف دودو میاں کے حصے میں آئی[۲۳]۔ ۱۸۳۸ء میں دودو میاں کے خلاف لوگوں میں اشتعال پھیلانے اور لوٹ مار کے لیے اکسانے کے الزام میں مقدمہ چلا۔ وہ بری ہوتے رہے، مقدمات چلتے رہے۔ ان کے گھر پہ دھاوا بول کر املاک کو نقصان پہنچایا گیا۔ آخر کار دودو میاں نے ''الارض اللہ'' یعنی زمین اللہ کی ملکیت ہے کا نعرہ بلند کر دیا۔ ویمپیئر کا کہنا ہے کہ انھوں نے اپنے گرد اسّی ہزار کارکن جمع کر لیے تھے۔ ۱۸۴۶ء میں انگریز تاجر کے تیل کے کارخانے پر دھاوا وغیرہ جیسے اقدام سے اس کی تنظیمی صلاحیتوں کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اس کے پیغامات کو مقدس صحیفے سمجھ کر سختی سے عمل کیا جاتا۔ بنگال میں مسلمانوں کی آزادی اور سماجی انصاف کی تحریک میں ان کو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا[۲۴]۔ اس اصلاحی جدوجہد کے دور میں مغربی بنگال میں بھی اس تحریک نے زور پکڑا۔ مغربی بنگال کے ضلع چوبیس پرگنہ اور ضلع ندیا کو مرکز بنا کر نثار علی عرف تیتو میر نے اس جدوجہد میں نئی جان ڈال دی۔ حاجی شریعت اللہ کی طرح وہ بھی پیر پرستی کے مخالف تھے۔ اصلاحی تحریک کو جاری اور کامیاب کرنے کے لیے انھیں ہندو زمین داروں سے جنگ بھی کرنی پڑی۔ انھوں نے نارکل باڑی کے مقام پر ایک آزاد حکومت کی بنیاد بھی رکھی۔ باراسات کے جوائنٹ مجسٹریٹ الیگزینڈر کو تیتو میر کی سرکوبی کے لیے مقرر کیا گیا لیکن اسے شکست ہوئی۔ کلکتے سے میجر اسکاٹ کی کمان سے ایک بٹالین فوج سے مقابلے کے بعد وہ ۱۸۳۱ء کو شہید ہوئے[۲۵]۔ ولیم ہنٹر اور دیگر تجزیہ نگاروں نے تیومیر کی تحریک کی بابت حاجی شریعت اللہ اور دودو میاں کی تحریک سے زیادہ غیظ و غضب کا اظہار کیا ہے۔ اسی لیے جب میجر اسکاٹ نے حملہ کیا تو بے دردی سے گولا باری کی گئی۔ تیتو میر کے حامیوں کے مکانات لوٹ لیے گئے۔ سینکڑوں کاشت کار گرفتار کر لیے گئے اور تیتو میر اور ان کے ساتھیوں کی نعشوں کو نذر آتش کر دیا گیا[۲۶]۔ مسلمانوں کی اصلاحی تحریک متمول اور صاحب حیثیت ہندوؤں کی نگاہ میں خار بن کر کھٹکنے لگی تھی۔ انگریز اور ہندوؤں کے گٹھ جوڑ کے بعد انگریزوں نے ہندوؤں کے اس طبقے کو ایک ایسی پوزیشن عطا کر دی تھی کہ وہ مسلمانوں کو اپنا دشمن تصور کرنے لگے تھے۔ اس دور میں بنگال کے ہندوؤں میں مسلم آزادرویّے کی اَن گنت شہادتیں موجود ہیں۔ اس زمانے کے بنگالی ادب میں بھی مسلمانوں کے خلاف اچھا خاصا مواد ملتا ہے۔ کئی نام ور بنگالی تذکرہ نگاروں نے بھی ہندوؤں پر مسلمانوں کے مظالم کا تذکرہ کیا ہے۔ اور تو اور راجا رام موہن رائے جیسا روشن خیال بنگالی بھی ان متعصبانہ جذبات سے خود کو بچا نہیں پائے۔ وہ خود عربی فارسی کے عالم تھے اور فارسی زبان میں اخبار بھی جاری کیا تھا لیکن اس کے باوجود وہ مسلم راج سے چھٹکارا پانے کو ترقی کی طرف ایک اہم قدم سمجھتے تھے۔ چناں چہ ۱۸۲۳ء میں انھوں نے ایک عرض داشت شاہ برطانیہ کے حضور پیش کی جس میں واضح طور پر مسلم حکمرانوں پر یہ الزام

لگایا تھا کہ ان لوگوں نے ہندوستان کے اصل باشندوں کے شہری حقوق کو ہمیشہ پاؤں تلے روندا۔ تنگ آکر مرہٹوں نے ان کے خلاف دکن اور پنجاب میں بغاوتیں کیں لیکن بنگالی چوں کہ جسمانی طور پر کمزور اسلحہ اٹھانے سے گریز کرتے تھے، اس لیے ان مسلم حکومتوں کے وفادار رہے۔ بدلے میں ان کی جائیدادیں تباہ ہوتی رہیں اور بے گناہوں کا خون بہایا گیا[27]۔ یہ خیالات صرف راجارام موہن لال کے نہیں بلکہ متعدد ایسی دستاویزات موجود ہیں جن میں مسلم حکمرانوں کے خلاف اسی قسم کے جذبات کا اظہار کیا گیا اور بنگال میں تمام خرابیوں کا ذمے دار ان مسلم حکمرانوں کو ٹھہرایا گیا۔ ہندوؤں اور انگریزوں کے گٹھ جوڑ سے مسلمانوں پر بنگال کی سرزمین تنگ کر دی گئی۔ ولیم ہنٹر (William Hunter) نے اس زمانے کے بنگال میں مسلمانوں اور ہندوؤں کے تعلیمی فرق کا جائزہ لیتے ہوئے مسلمانوں کی پس ماندگی کے اسباب بتائے۔ ہندو، راجارام موہن لال کی قیادت میں انگریزوں کی سرپرستی میں نئی انگریزی تعلیم سے بہرہ ور ہونے لگے لیکن مسلمان تعلیمی زبوں حالی کا شکار رہے[28]۔ صرف انگریزی تعلیم دینے والے اسکولوں ہی میں نہیں بلکہ عربی فارسی اسکولوں میں بھی ہندوؤں کی اکثریت تھی۔ ولیم ایڈم (William Adam) کی ۱۸۳۸ء کی رپورٹ کے مطابق پانچ اضلاع کے کل طلبا کی تعداد ۳۶۵۴ میں سے ۲۰۹۶ ہندو اور ۱۵۵۸ مسلمان تھے[29]۔ اس کے علاوہ بنگالی اور ہندی زبانوں کے اسکولوں میں تو مسلمان آٹے میں نمک کے برابر تھے۔ اگلے پندرہ برسوں میں ہندو طلبا کی تعداد مزید بڑھتی رہی اور مسلمان طلبا کی تعداد میں کوئی اضافہ دیکھنے میں نہیں آیا۔ یہاں تک کہ لارڈ ہارڈنگ (Hardinge) نے دیہی آبادی میں سستی تعلیم دینے کا جو سلسلہ شروع کیا وہ بھی ہندوؤں تک محدود رہا۔ تعلیمی زبوں حالی کا نتیجہ تھا کہ سرکاری ملازمتوں میں بھی ان کی تعداد ہندوؤں کے مقابلے میں خاصی کم تھی۔ جدول کے جائزے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ مسلم اکثریتی صوبہ بنگال میں مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان ملازمتوں کا تناسب ایک اور سات کا تھا[30]۔ مجموعی تعلیمی پالیسی نے ہندوؤں میں درمیانہ طبقہ تو پیدا کر دیا لیکن مسلمانوں میں یہ طبقہ بھی پیدا نہ ہو سکا۔

۱۸۵۷ء کے بعد جب بنگال باقی برصغیر کے ہمراہ کمپنی کے ظالمانہ تسلط سے نکل کر تاج برطانیہ کے تحت آگیا تو گزشتہ سو سالوں سے جاری جبر و استیصال کا شکار رہنے والے مسلمانوں کے لیے بھی ہمدردی کے جذبات پیدا ہوئے۔ ۱۸۷۰ء میں ولیم ہنٹر نے گزشتہ سو سالوں میں کی گئی زیادتیوں کا ازالہ کرنے کے لیے سفارشات پیش کیں[31]۔ ۱۸۶۲ء کی اصلاحات کے نتیجے میں بنگال لیجسلیٹو کونسل وجود میں آئی۔ اس کے تین مقامی نمائندوں میں دو ہندو اور ایک مسلمان منتخب کیے گئے مگر ہندو اس قدر موثر حیثیت اختیار کر چکے تھے کہ انگریز، مسلمانوں کو کوئی لمبی چوڑی مراعات دینے سے کتراتے تھے۔ انیسویں صدی کے ربع آخر میں انگریزوں نے مسلمانوں کے بارے میں قدرے ہمدردانہ رویہ اختیار کیا۔ دوسری جانب اسی زمانے میں ہندوؤں کے درمیانے طبقے میں ہندو احیاء کی تحریکیں سامنے آئیں۔ اس تحریک کے مطابق مسلمان اور انگریز دونوں ہی بیرونی حملہ آور تھے اور ان سے نجات حاصل کرنے کے لیے جدوجہد ضروری تھی۔ اس دور میں بنکم چندرا، چڑجی اور اس قبیل کے متعدد شعرا اور ادبا نے بنگالی ہندوؤں پر گزشتہ صدیوں کے دروان مسلمانوں کے جبر و تشدد کو اجاگر کر کے اپنی شاعری میں پیش کیا اور بندے ماترم کے نعرے نے جنم لیا۔ بنگالی قوم پرستی کے نام پر ''انند مٹھ'' نامی ناول میں درج یہ نعرہ دراصل مسلمانوں کے خلاف اعلان جنگ تھا۔ اس جیسے عنوانات کی طرح بے شمار ادب، انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے آغاز میں پیش کیا گیا جس سے ہندو مسلم تضاد کا بہ خوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اس دوران ہندوؤں کی جانب سے اپنے مطالبات میں زور پیدا کرنے کے لیے ملکی سطح پر تحریک چلائی

گئی۔ ۱۸۷۶ء میں انڈین ایسوسی ایشن کا قیام عمل میں آیا۔ سر بندر ناتھ بینر جی کی جد و جہد اور کوششیں ۱۸۵۸ء میں کلکتہ میں آل انڈیا نیشنل کانفرنس کے انعقاد پر منتج ہوئی۔ اسی سال بمبئی میں انڈین نیشنل کانگریس وجود میں آئی۔ آئندہ برس کلکتہ ہی میں دونوں مذکورہ جماعتوں کا ادغام ہو گیا اور آل انڈیا نیشنل کانگریس کا صحیح معنوں میں قیام عمل میں آیا۔ اس تنظیم میں مسلمانوں کی تعداد نا ہونے کے برابر تھی[۳۲]۔ مسلم رہنماؤں میں سر سید کو تو ہندوؤں سے متعلق تعصب نہ تھا۔ وہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو متحد رکھنے کے دل سے آرزو مند تھے لیکن اوّل اوّل ۱۸۵۷ء میں ہندوؤں کی روش سے وہ کھٹک گئے تھے۔ پھر جب اردو زبان اور فارسی رسم الخط کی مخالفت بنگال، بہار سے بڑھ کر ۱۸۶۷ء میں صوبہ متحدہ پہنچی تو انھیں یقین ہو گیا کہ دونوں قومیں دل سے ایک ساتھ کسی کام میں متحد نہیں رہ سکیں گی[۳۳]۔ ان کے مخاطب شیکسپیئر نے کہا کہ آپ کی پیش گوئی صحیح نکلے تو بڑے افسوس کی بات ہو گی تو سر سید نے جواب دیا کہ مجھے بھی نہایت افسوس ہے مگر اپنی پیش گوئی پر مجھے پورا یقین ہے[۳۴]۔ آئندہ بیس پچیس برسوں میں مستقبل کے یہ اندیشے حقیقت حال بن گئے۔ محرم، دسہرہ، بقر عید وغیرہ جیسے تہواروں میں شہر شہر ہندو مسلم فسادات ہونے لگے۔ بہار میں گاؤکشی کے خلاف مہم میں دو مرتبہ بڑے پیمانے پر خون ریز فسادات ہوئے[۳۵]۔ کانگریس کی تحریک سے سر سید کی دوری کے اسباب بھی یہی تھے۔ وہ ہندوؤں کے مذہبی اور لسانی تعصبات دیکھ کر نیابتی حکومت اور ہندوؤں کے ہاتھ میں اقتدار سونپ دینے کے خیال سے ہی متوہم تھے۔ بنگال میں مسلمانوں کی تعلیمی، معاشی اور سیاسی اصلاح کے لیے جن لوگوں نے رہنمایانہ کردار ادا کیا ان میں امیر علی خان نواب بہادر (۱۸۱۰ء۔ ۱۸۷۹ء)، مولوی عبد اللطیف نواب (۱۸۲۸ء۔ ۱۸۹۳ء)، نواب سر عبد الغنی (۱۸۳۰ء۔ ۱۸۹۶ء)، سر ولایت علی نواب بہادر، سر امیر حسین (نواب) اور سید امیر علی (۱۸۴۷ء۔ ۱۹۲۹ء) اہمیت کے حامل ہیں۔ ان لوگوں کی کوششوں سے ۱۸۵۶ء میں نیشنل محمڈن ایسوسی ایشن، ۱۸۶۳ء میں محمڈن لٹریری سوسائٹی اور ۱۹۷۹ء میں سینٹرل محمڈن ایسوسی ایشن قائم ہوئی۔ یہ پلیٹ فارم مسلمانوں کی عمومی ترقی خصوصاً تعلیم کے مسائل کے حل کی جدوجہد میں استعمال کیے گئے۔ اس دوران ہم دیکھتے ہیں کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کا اشتراک عمل کسی موقع پر بھی نہ ہو سکا۔ البتہ مسلمانوں نے اپنی جداگانہ جدوجہد کی بنا پر ۱۸۹۲ء کی اصلاحات کے نتیجے میں بنگال کونسل میں موثر نمائندگی حاصل کرنے کی کوشش میں بڑی حد تک کامیاب ضرور ہو گئے[۳۶]۔

کانگریس کے منفی رویّے کی وجہ سے مسلمان کبھی بھی اس جماعت پر بھروسا کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ سر ہنری کاٹن نے ۱۹۰۴ء میں منعقدہ کانگریس کے جلسے کی صدارت کرتے ہوئے کہا تھا کہ ہماری امیدیں بر آنے کو ہیں۔ بنیاد مستحکم اور عمارت تیار ہو رہی ہے۔ ہندوستان میں ایک قوم بننا بہت بڑا سیاسی انقلاب ہو گا[۳۷]۔ حیرت کی بات ہے کہ مسلمان کانگریس کے خلاف ہیں اور اپنی ایک جداگانہ کمزور سی سیاسی تنظیم قائم کر چکے ہیں، مگر انڈین نیشنل کانگریس کا صدر ''ایک قوم'' کا نعرہ زور و شور سے لگا رہا ہے۔ مطلب یہ کہ مسلمان چاہیں یا نہ چاہیں، کانگریس میں شریک ہوں یا نہ ہوں، اپنی جداگانہ ملی تنظیم بنائیں یا نہ بنائیں، انھیں ہندوستان کی قومیت متحدہ کے دائرے سے نکلنے کی اجازت ہرگز نہیں دی جائے گی۔ اکثریت کی حکومت کو انھیں تسلیم کر کے اسی کے زیر سایہ اپنی زندگی بسر کرنا پڑے گی۔ یہ گویا مسلمانوں کے لیے ایک بڑا چیلنج تھا[۳۸]۔ فرانسیسی مستشرق گارسیں دتاسی نے اس صورت حال کا اچھا خلاصہ کیا ہے۔ اس نے کہا کہ ''ہندو ہر اس چیز کی مخالفت کرتے ہیں جو انھیں مسلم حکومت کی یاد دلاتی ہے''[۳۹]۔ مگر اب واقعات اور حالات تیزی سے تبدیل ہوتے دکھائی دے رہے تھے۔ کچھ عرصے سے

حکومت ہند یہ سوچ رہی تھی کہ بنگال کے بے ڈول صوبے کو جس میں اس وقت مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کے علاوہ بہار اور اڑیسا کی ریاستیں بھی شامل تھیں، از سر نو تقسیم کر دے۔ ۱۹۰۳ء کے خاتمے تک اس تقسیم کے متعلق تجاویز کا اعلان کر دیا گیا اور ۱۹۰۵ء میں اس منصوبے کو آخری شکل دے کر نافذ کر دیا گیا[۴۰]۔

بنگال برطانوی راج کا ایک عظیم صوبہ تھا جو ۱۸۹۰۰۰ مربع میل کے رقبے پر پھیلا ہوا تھا۔ اس کی آبادی بھی اس زمانے میں ۸۰ ملین کے قریب تھی۔ اتنے بڑے صوبے کا انتظام محض ایک لیفٹیننٹ گورنر کے لیے خاصا مشکل تھا۔ لہٰذا برطانوی حکومت نے اسے دو حصوں میں منقسم کرنے کا فیصلہ کیا۔ پورے بنگال میں اس وقت تک مسلمانوں کی اکثریت نہیں تھی، انیس بیس کے فرق سے ہندو ہی اکثریت میں تھے لیکن لارڈ کرزن کی اس تجویز سے مشرقی بنگال میں مسلمانوں کی اکثریت کا ایک صوبہ قائم ہو جاتا۔ لارڈ کرزن کی یہ اسکیم مسلمانوں کی ہمدردی پر مبنی نہیں تھی[۴۱] بلکہ اس زمانے کے عالمی حالات بھی برطانوی حکمرانوں کو یہ فیصلہ کرنے پر مجبور کر رہے تھے۔ ۱۹۰۵ء میں جاپانیوں کے ہاتھوں روسیوں کی شکست فاش کے بعد جب انگریزوں نے برما اور مشرقی ہندوستان کی بڑھتی ہوئی دفاعی اہمیت کو محسوس کیا تو اس خطے کی انتظامی حد بندی پر نظر ثانی کی۔ بنگال کو بہت بڑا انتظامی یونٹ سمجھتے ہوئے لارڈ کرزن نے برطانوی حکومت کی سہولت کی خاطر مشرقی اور مغربی پاکستان پر مبنی دو صوبوں کے قیام کا اعلان کیا[۴۲]۔ اس کا ایک اتفاقی نتیجہ یہ بھی ہوا کہ مشرقی بنگال اور آسام کے نئے صوبے میں مسلمانوں کی اکثریت ہو گئی۔ اس سے ہندو بنگالی اس قدر مشتعل ہو گئے کہ ایک عدیم المثال شدت کی شورش عام برپا کی گئی جسے دیکھ کر مسلمان ششدر اور حیران رہ گئے[۴۳]۔ ۲ فروری ۱۹۰۵ء کو حکومت ہند نے تقسیم بنگال کی حتمی تجاویز سیکریٹری آف اسٹیٹ کو روانہ کر دیں اور انڈین سیکریٹری نے چند ترامیم کے بعد ۱۶ اکتوبر ۱۹۰۵ء کو ان تجاویز کی منظوری دے دی[۴۴]۔ لارڈ کرزن جو ۱۸۹۸ء میں وائسرائے ہند ہو کر آئے تھے تو انھوں نے بنگالی ہندوؤں، جو قومی آزادی تحریک میں پیش پیش تھے، زور توڑنے کے لیے بھی ۱۹۰۳ء سے تقسیم بنگال کی تجویز پر ڈٹے رہے۔ ان کے خیال میں اس تقسیم سے پورے بنگال میں انگریز حکومت کے خلاف تعلیم یافتہ ہندوؤں کی جس تحریک نے زور پکڑا ہوا ہے، کمزور پڑ جائے گا[۴۵]۔ ہندو جو انگریزوں کے بعد اکثریت کے بل بوتے پر ہندوستان پر بلا شرکت غیرے حکومت کا خواب دیکھ رہے تھے، انھیں مشرقی بنگال میں مسلمانوں کے لیے اکثریتی صوبہ قبول نہیں تھا۔ چناں چہ سر بندر ناتھ بنرجی کی قیادت میں انھوں نے شدید احتجاج شروع کر دیا[۴۶]۔ اس تحریک کے ذریعے انگریزوں سے اعلانیہ مخالفت کی بنیاد پڑی[۴۷]۔ برطانوی حکومت نے ماضی میں مغربی بنگال کے مسلم اوقاف، معاضیات اراضی اور بہت کچھ چھین چھین کر ہندوؤں کی جیب و دامن میں ڈال دی تھیں۔ لہٰذا انھیں ان مفلوک الحال اور فاقہ مست مسلمانوں کی اکثریت پر مشتمل صوبے کا خیال محض مسلمانوں کی اشک شوئی کے غرض سے نہیں آیا بلکہ اس کے پس پشت ایک مقصد یہ بھی تھا کہ مسلمانوں کو بے وقوف بنا کر سیاسی ہمدردی حاصل کی جائے کیوں کہ مسلم اکثریت کے اس صوبے کی اقتصادی زندگی بہر حال ہندو سرمایہ داروں کے ہاتھ ہی میں تھی۔ دوسری طرف ہندو قوم جو سارے ہندوستان میں تین چوتھائی اکثریت رکھتی تھی، مسلم اکثریتی صوبہ اس لیے بھی گوارا نہ کر سکی کہ آج مسلمان پس ماندہ اور مفلوک الحال سہی، لیکن ایک وقت ایسا آ سکتا ہے جب ان میں سیاسی شعور بیدار ہو گا۔ اس وقت یہ لوگ ہندوؤں کے لیے خطرہ بن جائیں گے۔ لہٰذا ہندوستان کو "ایک قوم" بنانے والی عظیم ہندو قوم کی عظیم سیاسی تنظیم کانگریس نے نہایت تلخ، ترش اور تند الفاظ میں س اسکیم کی مخالفت کی۔ ۱۹۰۵ء ہی میں کانگریس کے سالانہ اجلاس منعقدہ بنارس

میں مسٹر گوپال کرشنا گوکھلے جو نسبتاً اعتدال پسند رہنما تھے، نے صدارت کرتے ہوئے اس فیصلے کی نہ صرف مخالفت کی بلکہ یہ اعلان بھی کیا کہ وہ اس تقسیم کی تنسیخ کے لیے کچھ بھی کرنے کو تیار بیٹھے ہیں۔ اس فیصلے کے نفاذ کے بعد سارے ہندوستان میں عموماً اور بنگال میں خصوصاً آگ لگ گئی۔ ہنگامے پھوٹ پڑے، ہندوؤں نے بنگالی مسلمانوں پر بالا دستی قائم رکھنے کے لیے ہنگامۂ قیامت برپا کر دیا۔ وہ دہشت پسند بن کر نمودار ہوئے۔ امن شکن، باغی اور انقلابی بن گئے اور کسی قیمت پر وہ بنگال کے مسلمانوں کو اپنے اکثریتی دائرے سے باہر نکلنے کی اجازت دینے کو تیار نہ ہوئے۔ لارڈ کرزن نے بھی اس شورش کے سامنے جھکنے سے انکار کر دیا[48]۔ کانگریس اپنے قراردات میں بڑی بے باکی سے اس تقسیم کی مخالفت کرتی رہی۔ دوسری طرف مسلمانوں کے پاس کوئی ایسا سیاسی پلیٹ فارم اس وقت تک دست یاب نہیں تھا جو کانگریس کی مخالفت کا جواب دیتا[49]۔ ہندو درمیانے طبقے نے اسے قوم پرستی کا مسئلہ بنالیا۔ ہندو بو بور ژوائی طبقے نے پورے زور و شور کے ساتھ بنگال کی تقسیم کو کالعدم کرانے کے لیے تحریک چلائی[50]۔ ہندوستان میں مقیم بعض محققین ہندوستانی بیانیے کو پیش کرتے ہوئے حقائق کو چھپانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں:

> مشرقی بنگال میں سمجھ دار ہندو مسلم لیڈر تقسیم کی مخالفت کرتے رہے، مگر نیم ملاؤں نے مسلم عوام کو یقین دلایا کہ اب حکومت خود ان کے ہاتھ میں آگئی ہے، ان میں ایک اندھا جوش پیدا کر دیا اور اس نے قدرتی طور پر زمین داروں اور تجارتی طبقوں کے خلاف، جو زیادہ تر ہندو تھے، شورش کی شکل اختیار کر لی اور سارے صوبے میں فرقہ وارانہ فساد شروع ہو گئے[51]۔

حالاں کہ اس زمانے کی مسلم قیادت نے تقسیم بنگال کو خوش آئند قرار دیا۔ نواب سلیم اللہ وغیرہ نے اسے بنگالی مسلمانوں کے لیے ایک نئے دور کے آغاز سے تعبیر کیا۔ اس کی مخالفت کانگریس اور ہندوؤں ہی کی جانب سے ہوئی۔ پہلی بار لاکھوں کی تعداد میں ''وندے ماترم'' کے نعرے لگاتے لوگ حکومت کے خلاف صف آرا ہوئے[52]۔ ہندو رہنماؤں نے لارڈ کرزن پر یہ الزام بھی لگایا کہ جیسے ہی یہ تجویز سامنے آئی، ہندوؤں اور مسلمان بنگالیوں نے اس کی شدید مخالفت کی۔ لارڈ کرزن کو اس معاملے میں اتنی کد تھی کہ انھوں نے مسلمانوں کو اس تجویز کی حمایت پر آمادہ کرنے کے لیے سارے مشرقی بنگال کا دورہ کیا۔ سربر آوردہ مسلمانوں سے ملے، مسلم عوام کے پبلک جلسے کر کے انھیں سمجھایا کہ مسلم مشرقی بنگال کو الگ صوبہ بنانے کا ایک خاص مقصد یہ ہے کہ وہ ایک مسلم صوبہ ہو جس میں اسلام اور اس کے پیروکاروں کا غلبہ ہو۔ ان کے خیال میں یہ وہ تفریقی تصور کا بیج تھا جو آگے چل کر تصور پاکستان کی بنیاد بنا[53]۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بنگال کی تقسیم نے سب سے زیادہ جس سیاسی جماعت کو افروختہ کیا، وہ انڈین نیشنل کانگریس تھی۔ کانگریس نے برطانوی حکومت پر دباؤ بڑھانے کے لیے طرح طرح کے ہتھکنڈے استعمال کیے۔ ہندو بور ژوائی طبقے نے سودیشی تحریک شروع کی جس کے تحت غیر ملکی خصوصاً انگلستانی مصنوعات کا بائیکاٹ کیا گیا۔ اس تحریک نے بہت زور پکڑا اور اس کی شدت اس قدر بڑھی کہ حکومت کو ان دکانوں پر پہرے بٹھانے پڑے جہاں انگلستانی مال فروخت ہوتا تھا[54]۔ مولانا حسرت موہانی نے بھی اس تحریک میں سرگرمی سے حصہ لیا اور اس کے مبلغ بن گئے[55]۔ انھوں نے ''سودیشی اسٹور'' کے نام سے دیسی کپڑوں کی دکان قائم کی اور اس کی شاخیں ملک بھر میں جابجا قائم کرنے کا منصوبہ بھی بنایا[56]۔ مولانا شبلی اور نواب وقار الملک نے اس تحریک کی نہ صرف حمایت کی بلکہ اس کام میں مدد بھی فراہم کی اور مسٹر گوکھلے کی علی گڑھ آمد پر ہندو مسلم اتحاد پر زور بھی دیا۔ البتہ انھوں نے دبے دبے لہجے میں موجودہ صورت حال پر ان سرکردہ رہ نمائوں کی توجہ بھی دلائی[57]۔ اس

بھرپور ایجی ٹیشن میں سریندر ناتھ بینرجی سے لے کر رابندر ناتھ ٹیگور تک جیسے معتدل رہنماؤں کے علاوہ درمیانے طبقے کی دہشت پسند قیادت مثلاً بمبئی کے بال گنگادھر تلک بنگال کے آروبندو گھوش اور بیپن چندرپال نے بھی حصہ لیا۔ شدت پسندی کی اس تحریک میں کوئی مسلمان شریک نہیں تھے۔ اب مسلمان وہ کردار ادا کر رہے تھے جو اٹھارھویں صدی سے لے کر انیسویں صدی کے نصف آخر تک ہندوؤں نے ادا کیا تھا۔ اب مسلمان انگریزوں سے رعایتیں حاصل کرنا چاہتے تھے جو بنگال کی تقسیم کی صورت میں انھیں حاصل ہو رہی تھی۔ چناں چہ ہم دیکھتے ہیں کہ ہندو اور مسلمان دو الگ راستوں پر چل پڑے۔ ۱۶ اکتوبر ۱۹۰۶ء کو تقسیم کا ایک سال مکمل ہونے پر بورژوا ہندوؤں نے ایجی ٹیشن کے نام پر سوگ منایا جب کہ مسلمانوں کی جانب سے جشن سال گرہ کا اہتمام ہوا۔ اس موقع پر پہلی بار مشرقی بنگال کے مسلمانوں نے اپنی قوت کا مظاہرہ کرتے ہوئے چھوٹے بڑے شہروں میں جلسے منعقد کیے۔ ڈھاکا کے جلسے میں ۲۰ ہزار، میمن سنگھ میں ۱۰ ہزار، فرید پور میں ۶ ہزار اور سلہٹ میں ایک ہزار مسلمانوں نے شرکت کی۔ جلسے میں تقسیم بنگال کو برقرار رکھنے اور مسلمانوں کے سیاسی اور معاشی حقوق کے حق میں تقریریں کی گئیں۔ اس صورت میں ۳۰ دسمبر ۱۹۰۶ء کو محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس میں مسلمانوں کے لیے ایک علاحدہ سیاسی جماعت کا فیصلہ کیا گیا اور اس کا نام آل انڈیا مسلم لیگ رکھا گیا۔ مسلم لیگ کے وجود میں آتے ہی اس نے اپنی پہلی قرارداد تقسیم بنگال کے حق میں منظور کی۔ دوسری طرف انھی دنوں کانگریس نے اپنے سالانہ اجلاس میں بنگال کی تنسیخ کا مطالبہ دہرایا[۵۸]۔ اس احتجاج کو مسلمانوں کے خلاف اعلانِ جنگ بھی تصور کیا گیا[۵۹]۔ ۱۹۰۵ء میں لارڈ کرزن کے مستعفی ہونے کے بعد لارڈ منٹو ہندوستان کا وائسرائے بنا۔ مسلمانوں کے ایک وفد نے ۱۹۰۶ء میں لارڈ منٹو سے ملاقات کی اور موجودہ صورت حال میں جداگانہ انتخابات کا مطالبہ کیا۔ لارڈ منٹو نے مسلمانوں کے تحفظ کا یقین دلایا۔ انھوں نے مسلمانوں کو یقین دلایا کہ وہ بنگال کی تنسیخ کے فیصلے کو واپس نہیں لیں گے۔ ۱۹۰۹ء میں منٹو مارلے اسکیم نافذ ہوئی۔ اس اسکیم کے مطابق امپیریل کونسل کے ارکان کی تعداد ۱۶ سے بڑھا کر ۶۱ کر دی گئی۔ اس کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کے جداگانہ طریقۂ انتخاب کے حق کو تسلیم کر لیا گیا[۶۰]۔ یہ اس دور کے مسلانوں کی سب سے بڑی کامیابی تھی۔ تاہم منٹو مارلے اسکیم کو ہندو انتہا پسندوں نے مسترد کر دیا۔ اس سلسلے میں ہندوؤں کے متعصبانہ رویے کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ وہ تقسیم جس سے مسلمانوں کو کسی قدر فائدہ تھا اسے تو ہندوؤں نے سختی سے مسترد کر دیا جب کہ بعد میں بہار اور اڑیسا کو بنگال کے دائرے سے نکال کر علاحدہ کیا گیا تو ہندو اکثریت ہونے کی وجہ سے کسی قسم کا اعتراض سامنے نہیں آیا[۶۱]۔ بنگالی ہندوؤں نے اس زمانے میں دہشت پسند کارروائیوں کو منظم کرنا شروع کیا۔ اگلے دو تین برس تک یہ کارروائیاں جاری رہیں جن میں انگریز افسروں پر حملے اور بم دھماکے بھی کیے گئے[۶۲]۔ کانگریس نے بڑی ہوشیاری سے اس تکنیک پر عمل کیا جس کے تحت ایک گروہ انگریزوں سے مراسم رکھتے ہوئے تعاون کی فضا جاری رکھے جب کہ دوسرا گروہ شدت پسند کارروائیوں کے ذریعے حکومت کو مجبور کرے۔ تلک راجپت رائے نے پرنس آف ویلز کی آمد کے موقع پر بائیکاٹ کی تجویز منظور کرانے کی کوشش کی جس سے انگریزوں کی سرپرستی سے محرومی کا خطرہ تھا۔ اس کے برعکس پرنس آف ویلز کی شایان شان استیصال کی تجویز جو سر بندر ناتھ بینرجی نے پیش کی تھی، منظور کر لی گئی۔

تقسیم بنگال ایک ایسا گھاؤ تھا جسے ہندو سامراج کسی طور پر قبول کرنے کو تیار نہیں تھے۔ اس مقصد کے لیے سارے بنگال کو ان لوگوں نے شورش میں مبتلا کر دیا تھا۔ حکومتی اہل کاروں پر مسلسل حملے بڑھ رہے تھے[۶۳]۔ اس خونیں انقلاب میں اپنے

دست پروردہ بنگالیوں کی بے وفائی پر انگریزوں نے بہت پیچ و تاب کھایا۔ مختلف اوقات میں دو انگریز خواتین کو ہلاک کر دیا گیا۔ ڈھاکا کا مجسٹریٹ ایلن زخمی ہوئے، لارڈ ہارڈنگ بھی بم دھماکے میں زخمی ہوئے[۶۴]۔ ہندو اکثریت اپنے تمام حربوں سے مسلح ہو کر اور تمام ہتھیاروں سے لیس ہو کر میدان میں آئی تھی۔ ان کی تحریک کا مقصد یہی تھا کہ تقسیم کا فیصلہ ہر صورت منسوخ کرنا ہی پڑے گا۔ شروع شروع میں تو حکومتِ برطانیہ کی طرف سے شد و مد کے ساتھ اعلان کیا جاتا رہا کہ یہ طے شدہ مسئلہ ہے اور اب اسے بدلا نہیں جا سکتا، لیکن جیسے ہی دہشت پسندی بڑھی اور ہنگامہ آرائی میں اضافہ ہوا، انگریزوں نے پسپائی اختیار کی[۶۵]۔ اور اس طے شدہ قانون کو ہندوؤں کے دباؤ میں آ کر ۱۹۱۱ء میں منسوخ کر دیا[۶۶]۔ زاہد چودھری[۶۷] محمد امین زبیری[۶۸] اور ہاشمی فرید آبادی نے تنسیخ بنگال کا سن سہواً ۱۹۱۲ء درج کیا ہے[۶۹] جب کہ جون ۱۹۱۱ء میں سر جان جینکنز (Sir Jhon Jenkins) جو کہ وائسرائے کی کونسل کے رکن تھے، ان ہی کی تجویز پر بنگال کی تقسیم کو منسوخ کیا گیا۔ دسمبر ۱۹۱۱ء میں تقسیم بنگال کی تنسیخ کا اعلان شاہی دربار دہلی میں کیا گیا[۷۰]۔ اس سے ملت کے وفادار طبقے کو بڑا دھچکا لگا۔ مشرقی بنگال کو پہلے بھی نظر انداز کیا جاتا رہا تھا۔ تقسیم کے نتیجے میں اس خطے کی دیہی آبادی جو زیادہ تر مسلمانوں پر مشتمل تھی، بعض مخصوص قسم کے فوائد سے متمتع ہونے لگی تھی۔ مسلمان اب یہ محسوس کر رہے تھے کہ وہ برطانیہ کی مدد پر بھروسا نہیں کر سکتے۔ تقسیم کی تنسیخ پر مولانا محمد علی جوہر نے جو نکتہ چینی کی اس سے وہ برطانیہ اور ہندوؤں دونوں میں غیر مقبول ہو گئے[۷۱]۔ انھوں نے "کامریڈ" میں اس موضوع پر اداریے لکھے۔ انگریزوں نے ۱۹۱۱ء میں ڈھاکا یونی ورسٹی قائم کرنے کا وعدہ کر کے اشک شوئی کی کوشش کی لیکن یہ وعدہ بھی اگلے دس برسوں تک پورا نہ ہو سکا[۷۲]۔ مسلمان بے بس تماشائی کی طرح یہ جگر فگار مناظر دیکھتے رہے اور خاموشی سے لاچاری کی تصویر بنے رہے۔ وہ نہ تو بم پھینک سکتے تھے اور نہ توڑ پھوڑ کی پالیسی پر عمل کر سکتے تھے، نہ قاتلانہ حملے کر سکتے تھے اور نہ ہی دہشت پسند کارروائیوں میں ملوث ہو سکتے تھے۔ بقول شاعر:

زور ہی کیا تھا جفائے باغ باں دیکھا کیے　　　آشیاں لٹتا رہا، ہم ناتواں دیکھا کیے[۷۳]

تنسیخ بنگال سے مسلمانوں کو سخت صدمہ پہنچا۔ ہندو ایک مرتبہ پھر متحدہ بنگال میں اپنا اثر و نفوذ برقرار رکھنے میں کامیاب ہو گئے۔ اس عمل سے مسلمانوں کے ساتھ انگریزوں کی دغابازی کھل کر سامنے آ گئی۔ اس رنج و الم کو نواب وقار الملک نے اس طرح واضح کیا کہ:

> جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے، ان کی اکثریت کی یہ رائے ہے کہ تقسیم بنگال کی تنسیخ نہایت ناپسندیدہ فعل ہے، ان وعدوں کی روشنی میں جو کہ تاج کے مالکوں نے مسلمانوں سے بار بار کیے تھے اور تقسیم بنگال کو ایک طے شدہ حقیقت بتلایا تھا۔ اتحادِ بنگال حکومت انگریز کی کمزوری کا مظہر ہے اور آئندہ اس سبب اس کے اقوال و افعال پر اعتماد نہ کیا جا سکے گا[۷۴]۔

انگریزوں کی بے وفائی، غدّاری، خود غرضی اور منافقت کی تاریخ میں اس تنسیخ کو ایک شاہ کار واقعہ قرار دیا جائے گا۔ اس اعلان کے تین ماہ بعد مارچ ۱۹۱۲ء کو کلکتے میں مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے ڈھاکا کے نواب سر سلیم اللہ نے دل گیر انداز میں کہا ہے:

> بنگال کی تقسیم ۱۹۰۵ء سے ۱۹۱۱ء تک نافذ رہی۔ ہمارے دشمنوں نے محسوس کر لیا تھا کہ اس تقسیم نے مسلمانانِ مشرقی بنگال کے پامال شدہ حقوق نمایاں حیثیت اختیار کر لیں گے... انھوں نے تقسیم

کے خلاف ہنگامہ کھڑا کر دیا۔ بد ترین جرائم کا ارتکاب کیا، قتل کیے، ڈاکے ڈالے، ولایتی سامان کا بائیکاٹ کیا۔ اس شورش میں مسلمانانِ بنگال نے حصہ لیا۔ گورنمنٹ برطانیہ نے تقسیم منسوخ کر دی اور ہم سے مشورہ تک نہ کیا[75]۔

اس غم میں چند ہی ماہ کے بعد ان کا انتقال ہو گیا۔ سر علی محمد خان، راجہ صاحب محمود آباد اور دیگر مسلم اکابرین نے بھی انگریزوں کے اس عمل کو ہدف تنقید بنایا۔ بہر حال اس تقسیم کی تنسیخ نے مسلمانوں کے اندر ایک نیا جوش اور جذبہ ضرور پیدا کیا۔ اب وہ شورشوں سے الگ رہ کر طوفان سے مقابلہ کرنے کا فن سیکھ چکے تھے۔ ان کی پس ماندگی بھی رفتہ رفتہ ختم ہو رہی تھی اور قدرت کی طرف سے حالات بھی کچھ مسلمانوں کے موافق ہوتے جا رہے تھے۔

سیاسی انحطاط کے اس دور میں قومی یک جہتی کے فروغ کی کوششیں تو بہت ہوئیں لیکن یہ کوششیں کچھ زیادہ کامیاب دکھائی نہیں دیتیں۔ ہندو اور مسلمان دو مختلف دھاروں کی سمت بہتے دکھائی دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس دور کا شعری منظر نامہ ان دونوں اقوام کے نقطۂ نظر کو پیش کرتا دکھائی دیتا ہے۔ افسوس ناک بات تو یہ ہے کہ تنسیخ بنگال جیسے اہم معاملے میں اس دور کے اہم اردو شعرا کی جانب سے مجرمانہ خاموشی برتی گئی۔ مسجد کان پور، جس کا تفصیلی ذکر آئندہ صفحات میں کیا جائے گا، کی شہادت پر علامہ شبلی کے ہاں متعدد نظمیں ملتی ہیں لیکن تنسیخ بنگال جس سے لاکھوں بنگالی مسلمانوں کو اقتصادی اور سیاسی طور پر بد ترین نقصان اٹھانا پڑ رہا تھا، ان کے ہاں ایک شعر بھی نہیں ملتا۔ اردو شعرا نے اس اہم موضوع کو نظر انداز کیا۔ البتہ بعض اردو شعرا نے تقسیم بنگال اور اس کی مخالفت میں پیدا ہونے والے بحران کو موضوع بنا کر کچھ عمدہ نظمیں ضرور کہیں۔ ان شعرا میں درگا سہائے سرور جہاں آبادی کی نظم ''بد نصیب بنگال'' اہمیت کی حامل ہے۔

سرور جہاں آبادی کی شاعری کا آغاز انیسویں صدی کے اواخر سے ہوتا ہے۔ وہ بہت کم سنی میں اس دنیا سے گزر گئے۔ ان کی شاعری میں قومی یک جہتی اور وطنی شعور کا جذبہ بہت نمایاں ہے[76]۔ عبد القادر سروری کے مطابق ''وہ حقیقی ہندوستانی شاعری ہے۔ ان میں شاعرانہ تنگ خیالی یا مذہبی تعصب نام کو بھی نہیں''[77]۔ حالاں کہ مذکورہ نظم میں واضح طور پر ہندوؤں کے نقطۂ نظر کی حمایت کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ بنگالی ہندو تقسیم بنگال کو لارڈ کرزن کا سب سے بڑا ظلم قرار دیتے ہیں اور مسلمان اسے ایک بہترین فیصلہ قرار دیتے ہیں۔ سرور جہاں آبادی نے مذکورہ نظم میں ''اس تقسیم کی مذمت کی اور اسے کرزن کے ظلم سے تعبیر کیا ہے''[78]۔ بنگال کی بد حالی کا ذمے دار کرزن کی اس پالیسی کو قرار دیتے ہوئے وہ ''بد نصیب بنگال'' میں کہتے ہیں کہ:

آہ! اے بنگال! آلام و مصائب کا شکار — آہ! اے کرزن کی پالیسی کی صید بے قرار

آہ! اے نخچیرِ ناوک خوردہِ دستِ اجل — آہ! اے خونیں جگر، خونیں کفن، خونیں مزار

آہ! اے محنت کش و حرماں نصیب و درد مند — آہ! اے برگشتہ ایام و پریشاں روزگار

آہ! اے آماج گاہِ ناوکِ جورِ فلک — آہ! اے صید زبوں شوریدہ حال و بے قرار

آہ! اے بنگال! اے ذلت نصیب و مبتذل — کیا ہوئی وہ تیری عظمت، کیا ہوا تیرا وقار[79]

سرور کے مطابق اس فیصلے سے بنگال کی بہاروں کو دشمنوں کی نظر لگ گئی۔ یہ فیصلہ دراصل جغرافیائی لکیر نہیں بلکہ جگر میں لکیر کھینچنے کے مترادف ہے۔ اس فیصلے نے پورے صوبے میں ایک بحران اور انتشار کی کیفیت پیدا کر دی۔ شاعر کے مطابق:

مل گئیں تیری وفائیں خاک میں سب ہائے ہائے! ہو گیا حکام کی نظروں میں تو بے اعتبار
اُڑ رہی ہے آہ! اب تیرے سیہ خانے میں خاک شام ماتم سے مبدّل ہے تیری صبحِ بہار
تیرے پھولوں میں ہے عالم زخمِ دامن دار کا خوں رُلاتی ہے نگاہِ شوق کو تیری بہار
چھا گئی کیوں تیرے پھولوں پر خزاں بے وقت آہ! کس نے ہے ہے لوٹ لی تیری گلستاں کی بہار
دل کو برماتا ہوا گزرا جگر سے کس کا تیر ہو گیا تو کس شکار افگن کے ناوک کا شکار
کس کی تیغ و تیر نے دل پر تیرے چرکے دیے مرغِ بسمل کی طرح جو ہے زمیں پر بے قرار
کر کے دو ٹکڑے کلیجے کے تیرے یہ آہ! کون چل دیا تجھ کو تڑپتا چھوڑ کے بے گانہ وار
پھر گئی کرزن کی تجھ سے آہ! کیوں چشمِ کرم جاں فروشی تیرا شیوہ، جاں نثاری تھا شعار
کرزنِ بے دار خو، اہلِ پولیس، حکامِ وقت تو ہوا اف! اف! نہ کس کس کی جفاؤں کا شکار
لب پہ تھی جو آہ! اک اظہارِ ماتم کی صدا کچھ سکوں تھا جس سے تیرے دل کو کچھ صبر و قرار[80]

شاعر کے خیال میں اس اقدام سے بنگال تباہ و برباد ہو تا جا رہا تھا۔ اس کی معاشی حالت قابل رحم حد تک افسوس ناک تھی۔ لوگ بے روزگار اور شہر کی صنعتی حیثیت ختم ہو کر رہ گئی تھی۔ اس بابت شاعر کہتے ہیں کہ:

ہے تباہی پر تباہی اور ستم پر ہیں ستم رحم کے قابل ہے لب، افسوس تیرا حالِ زار
اضطرابِ دل سے ہو بس اب نہ سرگرمِ فروش صبر کر آخر ہے مظلوموں کا بھی پروردگار
تیری شہرت کے نشاں بنگال! مٹ جائیں گے کیا میٹ دے سو بار تجھ کو آہ! دورِ روزگار[81]

سرور نے ایک ایسے ہندوستان کا تصور پیش کیا جس میں نہ صیاد کا کھٹکا ہو گا اور نہ ہی کسی قسم کا ڈر اور خوف۔ ہر طرف امن و امان، خوش حالی، اتحاد و اتفاق کا دور دورہ ہو گا۔ رنگ و نسل کے نام پر ہونے والے فسادات ختم ہو جائیں گے[82]۔ آزاد ہندوستان کا جو عمدہ تصور سرور جہاں آبادی نے پیش کیا، وہ پورا تو نہ ہو سکا لیکن ان کی نظموں میں ان جذبوں کی سچائی ضرور محسوس کی جا سکتی ہے۔ اپنی نظم ''پھولوں کا کنج'' میں وہ کہتے ہیں کہ:

پھولوں کا کنج دل کش بھارت میں اک بنائیں جب وطن کے اس میں پودے نئے لگائیں
خونِ جگر سے سینچیں ہر نخلِ آرزو کو اشکوں سے بیل بوٹوں کی آبرو بڑھائیں
اک ایک گل میں پھونکیں روحِ شمیمِ وحدت اک اک کلی کو دل کے دامن سے دیں ہوائیں
حبّ وطن کا مل کر سب ایک راگ گائیں لہجہ جدا ہو گرچہ مرغانِ نغمہ خواں کا[83]

ز۔خ۔ش۔ بھی اس زمانے کی اہم شاعرہ تھیں۔ ان کے زمانے میں ہندوستان کروٹ بدل رہا تھا۔ سیاسی بیداری کے آثار پیدا ہو رہے تھے۔ بہت سے سیاسی معاملات اس زمانے میں در پیش تھے[84]۔ ان کی شاعری میں ملکی اور بین الاقوامی حالات سے باخبری واضح طور پر محسوس کی جا سکتی ہے۔ انھوں نے بعض قومی مسائل پر کھل کر اظہار خیال کیا۔ استبداد تقسیم بنگال سے ان کا دل ایسا غم آشنا ہوا کہ درج ذیل اشعار میں اس کیفیت کو شعری جامہ پہنایا۔ ملاحظہ کیجیے:

لارڈ کرزن نے جو بنگال کو تقسیم کیا — اس سے ہم سادہ دلوں کو تھی مسرت کیسی
مٹ گئی آن میں وہ حرف تمنا کی طرح — بل تک آیا نہ جبینوں پہ شکایت کیسی[85]

حسرت کی سیاسی زندگی کا آغاز تو زمانۂ طالب علمی سے ہی ہو جاتا ہے۔ علی گڑھ سے بی۔اے۔ کرنے کے بعد انھوں نے ۱۹۰۳ء میں ایک ادبی اور سیاسی مجلّہ ''اردوے معلیٰ'' جاری کیا۔ اس کا پہلا شمارہ جولائی ۱۹۰۳ء میں چھپا[86]۔ اردو زبان میں یہ پہلا جریدہ تھا جس نے نہایت بے باکی سے برطانوی حکومت پر تنقید کی اور ہندوستانیوں خصوصاً مسلمانوں کو سیاست میں حصہ لینے اور آزادی کی جدوجہد کی طرف راغب کیا کہ یہی ان کی بقا کی صورت تھی[87]۔ حسرت موہانی اپنی باغیانہ فکر، سامراج مخالف رویّوں، حریت پسندی اور نظریات کی وجہ سے کانگریس کے اس گروہ کے ہم نوا تھے جس باغیانہ اور شدت پسند رویّوں کو نہ صرف ترغیب دیتا تھا بلکہ اس کے لیے وہ ہر قسم کی صعوبتیں بھی برداشت کرنے کو تیار تھا۔ اس گروہ کے نمائندے لالہ لاجپت رائے، سری آربندر گھوش، بال گنگا دھر تلک اور بپن چندر پال وغیرہ نے کھل کر تقسیم بنگال کی مخالفت کی تھی۔ ۱۹۰۵ء میں تقسیم بنگال ہی وہ نقطہ ہے جہاں سے صحیح معنوں میں جدوجہد آزادی کا آغاز ہوا تھا[88]۔ تقسیم بنگال کے خلاف ردعمل میں جو تحریکات شروع ہوئیں ان میں سودیشی تحریک کو نمایاں حیثیت حاصل ہوئی۔ ۱۹۰۵ء میں شروع ہونے والی اس تحریک کی وجہ سے ملک گیر ایسے کئی چھوٹے بڑے بینکوں کے قیام کو بھی تقویت ملی جن کی ملکیت ہندوستانیوں کے پاس تھی۔ ۱۹۱۰ء تک ان بینکوں کی تعداد ۴۷۶ تک جا پہنچی تھی لیکن بینکاری کی اس صنعت میں مسلمانوں کا حصہ تقریباً نہ ہونے کے برابر تھا[89]۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ صنعت اور کاروبار میں مسلمان کس قدر پس ماندہ تھے۔ حسرت اس زمانے میں بھی سودیشی تحریک اور دوسری سرگرمیوں کی وجہ سے فرنگی حکام کی نظروں میں کھٹکتے تھے۔ ۱۹۰۸ء میں انھوں نے ''اردوئے معلیٰ'' میں ایک مضمون ''مصر میں انگریزی سیاست''[90] شائع کیا جس میں مصر سے متعلق برطانوی حکمت عملی پر کڑی تنقید کی گئی۔ اس مضمون کی پاداش میں انھیں قید با مشقت ہوئی۔ اس زمانے میں سیاسی قیدیوں کے ساتھ جو بہیمانہ سلوک ہوتا تھا اس کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

حادثے سن آٹھ میں گزرے بہت اب دیکھیے — کیا دکھائے گردشِ لیل و نہار اب کے برس[91]

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ بیسویں صدی کی پہلی دہائی میں حسرت وہ پہلے مسلمان ہیں جنھوں نے سیاسی قیدی کی حیثیت سے جیل میں وقت گزارا[92]۔ اس عرصے میں حسرت کا زیادہ تر کلام ان سیاسی حالات و واقعات سے متاثر ہو کر تخلیق کیا گیا۔ وہ ساری زندگی عملی اور تحریری طور پر انگریز حکام سے معرکہ آرا رہے۔ حصول آزادی کا جذبہ ان کے دل میں ابتدائی دور ہی سے موج زن تھا۔ وہ وطن کی آزادی کی خاطر سر دھڑ کی بازی لگائے ہوئے تھے۔ وہ تن تنہا سامراجی قوتوں سے ٹکر لیتے رہے۔ ان کی شاعری میں حریت پسندی کا جذبہ بہت نمایاں ہے[93]۔

ہم قول کے صادق ہیں اگر جان بھی جاتی — واللہ کبھی خدمتِ انگریز نہ کرتے
دولتِ ہندوستاں قبضۂ اغیار میں — بے عدو بے حساب دیکھیے کب تک رہے[94]

ان کے جذبۂ حریت سے انگریز ہمیشہ خائف رہے۔ انھیں خطرناک دشمن قرار دے کر مسلسل پابہ زنجیر رکھا جاتا۔ طرح طرح کے مصائب ان پر ڈھائے جاتے، لیکن حسرت ان سختیوں سے کبھی نہ گھبراتے۔ جدوجہد آزادی کی اس ٹھوس حقیقت کو حسرت نے بڑی خوب صورتی سے پیش کیا[95]۔ وہ کہتے ہیں کہ:

اچھا ہے اہلِ جور کیے جائیں سختیاں　　پھیلے گی یونہی شورشِ حبِّ وطن تمام[96]

حسرت وہ پہلے فرد تھے جنھوں نے سودیشی کپڑوں کی دکان بھی قائم کی۔ وہ چاہتے تھے کہ ہندوستان کے ہر شہر اور گاؤں میں اس طرح کی دکانیں قائم ہوں۔ شبلی نعمانی اور وقار الملک نے بھی اس تحریک میں ان کا ساتھ دیا۔ حالی اور اقبال نے تائیدی مضامین لکھے[97]۔ حسرت نے غزلوں کے ذریعے اس تحریک کے پیغامات کو عام کیا۔ قوم کی بیداری اور حصول آزادی کا جذبہ پیدا کرنے کے لیے انھوں نے شاعری سے موثر کام لیا۔ درج ذیل غزل ان کے سیاسی نصب العین اور سودیشی نقطۂ نظر کو عمدگی سے واضح کرتی ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

خرّمیِ دو روزہ کو عشرتِ جاوداں نہ جان　　فکرِ معاش سے گزر، حوصلۂ معاد کر

اے گہِ نجاتِ ہند کی دل سے ہے تجھ کو آرزو　　ہمتِ سر بلند سے یاس کا انسداد کر

خدمتِ اہلِ جور کو کرنہ قبول زینہار　　فن و ہنر کے زور سے عیش کو خانہ زار کر

غیر کی جدوجہد پر تکیہ نہ کر کہ ہے گناہ　　کوششِ ذاتِ خاص پر ناز کر اعتماد کر[98]

جب سودیشی تحریک کا آغاز ہوا تو اکبر الہ آبادی نے بھی اس کا پوری طرح ساتھ دیا۔ اس تحریک کے روح رواں حسرت موہانی کو درج ذیل قصیدہ لکھ بھیجا۔

تھا دلِ حسرت بھرا ارمان میں　　ہم نے لکھ بھیجا انھیں موہان میں

بھائی صاحب رکھ دو تم اپنا قلم　　ہاتھ میں لو اب تجارت کا عَلَم

ہو چکی غیروں سے خویشی کی بہار　　بس دکھاؤ اب سدیشی کی بہار

کام کو اٹھو چڑھاؤ آستیں　　لَا یُضِیْعُ اللّٰہُ اَجرَ المُحْسِنِین[99]

انھوں نے طنز و ظرافت کے پردے میں ایسی باتیں کہیں جس سے ایسے مال و اسباب کی وقعت اور اہمیت اجاگر ہوتی ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ:

داخل میری دانست میں یہ کام ہے پُن میں　　پہنچائے گا قوت شجرِ ملک کی بن میں

تحریک سودیشی پہ مجھے وجد ہے اکبر　　کیا خوب یہ نغمہ ہے چھڑا دیس کے دُھن میں[100]

اکبر نے جہاں ایک طرف مغرب کے سیلاب کو پوری شدت و توانائی سے روکنے کی کوشش کی وہیں برطانوی سیاست پر بھی کاری ضرب لگائی۔ انگریزوں نے برعظیم کے خام مال کو انگلستان میں درآمد کر کے جو مصنوعات بنائیں اس کی کھپت اسی پاک و ہند میں نہایت آسانی کے ساتھ ہوتی تھی۔ اکثر اشیا کی زیادہ قیمتیں بھی وصول کی جاتی تھیں۔ مغرب زدہ طبقہ انگریز کے مال و اسباب پر جان چھڑکتا تھا اور اس بات کو نظر انداز کر دیتا تھا کہ ملکی صنعت و حرفت کے فروغ کے لیے دیسی اشیا کی خرید و فروخت کس قدر ضروری ہے۔ غیر ملکی درآمدات کس قدر معاشی تباہی کا سبب بن رہی ہیں، اس بات کی انھیں کوئی پرواہ نہیں تھی۔ اکبر نے اس رویّے اور رجحان پر طنزیہ انداز میں چوٹ کرتے ہوئے کہا کہ:

چیز وہ ہے جو بنے یورپ میں　　بات وہ ہے جو پانیر میں چھپے

طرح طرح کے بنا لو لباسِ رنگا رنگ　　علاوہ روئی کے ریشم بھی اور وول بھی ہے

چمک دمک کی وہ چیزیں ہیں ہر طرف پھیلی — کہ آنکھ محو ہے، خاطر اگر ملول بھی ہے
مرعوب ہو گئے ہیں ولایت سے شیخ جی — اب صرف منع کرتے ہیں دیسی شراب سے[۱]

انھوں نے اپنے کلام میں متعدد مقام پر سودیشی تحریک کی حمایت میں باتیں کیں۔ اپنے مخصوص انداز میں وہ اس تحریک کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

کالج کے مفتیوں سے کل کہہ رہے تھے اکبر — بسکٹ سے باز آنا رہبانیت نہیں ہے
دُھن دیس کی تھی جس میں گاتا تھا اک دیہاتی — بسکٹ سے ہے ملائم پوری ہو یا چپاتی[۲]

وہ اگرچہ سودیشی تحریک کے پرزور حامی دکھائی دیتے ہیں لیکن انھیں اس امر کا احساس تھا کہ برطانوی جبر واستبداد کے آگے چند سر پھروں کی یہ جرأت کامیابی وکامرانی کی دلیل نہیں بن سکتی۔ نہ صرف حکومت اور اس کے کارندے اس تحریک میں سدّراہ بنے ہوئے تھے بلکہ ولایتی مال کا شائق طبقہ بھی سودیشی لن ترانی سے خوش نہ تھا[۳]۔ اس کیفیت کی صحیح عکاسی کرتے ہوئے اکبر کہتے ہیں کہ:

کامیابی کا سدیشی پر ہر اک در بستہ ہے — چونچ طوطا رام نے کھولی مگر پَر بستہ ہے[۴]

اکبر کی ظرافت نہایت عمیق اور بامعنی ہوتی ہے۔ ان کی ظرافت کی تہہ میں کوئی نہ کوئی نکتہ ایسا ضرور ہوتا ہے جو ایک بڑی حقیقت کی نشان دہی کرتا ہے۔ وہ اسلام کی نشاۃ الثانیہ کی تحریک کے سب سے بڑے نقاد تھے۔ لوگوں کو گزشتہ تہذیب کی خوبیوں سے آگاہ کرتے[۵] اور ساتھ ساتھ مسلمانوں کو آخرت کی فکر کی بھی ترغیب دیتے۔ سودیشی تحریک سے جُڑے رہنے کے باوجود انھیں یہ بھی فکر تھی کہ:

بھگوان کا کرم ہو سودیشی کی بیل پر — لیڈر کی کھینچ کھانچ ہے گاندھی کی ہانک ہے
اکبر پہ بار ہے یہ تماشاے دل شکن — اس کی تو آخرت کی طرف تانک جھانک ہے[۶]

تلوک چند محروم نے بھی "سودیشی" کے عنوان سے ایک نظم لکھی جس میں اس تحریک کی اہمیت کو واضح کیا گیا۔ ان کی نظر میں غیر ملکی اشیا کا استعمال ترک کرنا ہندوستان کے بہت سے مسائل کا حل ہے[۷]۔ اسی لیے وہ منزل مقصود کے حصول کا ذریعہ اسی تحریک کو قرار دیتے ہیں۔ وہ ہر مسئلے اور تکلیف سے نکلنے کے لیے ہندوستانی عوام کو اپنی بنائی ہوئی اشیا کے استعمال کے مثبت پہلوؤں کی نشان دہی کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

وطن کے دردِ نہاں کی دوا سدیشی ہے — غریب قوم کی حاجت روا سدیشی ہے
تمام دہر کی روحِ رواں ہے یہ تحریک — شریک حسنِ عمل جا بہ جا سدیشی ہے
قرار خاطرِ آشفتہ ہے فضا اس کی — نشانِ منزلِ صدق و صفا سدیشی ہے
وطن سے جن کو محبت نہیں وہ کیا جانیں — کہ چیز کون بدیشی ہے کیا سدیشی ہے
اسی کے سائے میں پاتا ہے پرورش اقبال — مثال سایہ بالِ ہما سدیشی ہے
اسی نے خاک کو سونا بنا دیا اکثر — جہاں میں گر ہے کوئی کیمیا سدیشی ہے
فنا کے ہاتھ میں ہے جانِ ناتوانِ وطن — بقا جو چاہو تو رازِ بقا سدیشی ہے

ہر ایک قوم کا جب مدعا سدیشی ہے   ہو اپنے ملک کی چیزوں سے کیوں ہمیں نفرت[۱۰۸]

پنڈت چندر کا پرشاد جگیا سو اختر نے بھی اپنی نظم ''سودیشی'' میں اہل وطن کے دلوں کو گرمانے کی کوشش کی ہے۔ ان کے خیال میں اپنی بنائی ہوئی چیزوں کے استعمال سے اس سرزمین میں معاشی انقلاب آئے گا اور بدیشی مال کے بائیکاٹ سے انگریزوں کی آمدنی میں واضح کمی آئے گی۔ اسی لیے وہ کہتے ہیں کہ:

وطن کی الفت سے ہو زباں پر   سودیشی وستو سودیشی وستو
یہیں کی روئی یہیں کی ململ   یہیں کی ریشم یہیں کی مخمل
ہوئی اسی خاک سے ہے پیدا   یہ سر زمیں ہے تمھاری ماتا
مہاتما گاندھی نے بتایا   بدیشی کپڑے اتار پھینکو
سودیشی چرخا سودیشی کرگھا   سودیشی وستو سودیشی وستو[۱۰۹]

اپنی ایک اور نظم ''داد را چرخا'' میں بھی وہ ملکی ضروریات میں خود کفالت کا درس دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ جب سے ہندوستانیوں نے چرخا چھوڑ دیا ہے، وہ مسائل کا شکار ہو گئے ہیں۔ اسی لیے وہ اس چرخے کو سوراج کی طرف بڑھنے والا قدم قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

گاندھی بابا نے بھارت جگائے دیا ہے   ہمیں چرخے کا منتر بتائے دیا ہے
جب سے گھر گھر میں وہ چرخے کا چلانا چھوٹا   بس اسی روز سے بھارت کا نصیبا پھوٹا
آکے پردیشیوں نے خوب کھسوٹا لوٹا   دھرم چھوٹا سبھی انسانوں کا پوروش لوٹا
اب بھی کچھ غور کرو ہندو و مسلمانو!   دو طلاق ان کو اور اپنی بھی دشا پہچانو
چرخا چلواؤ تجو شوق، وہ دن آئے گا   دوڑ کر قدموں سے سوراج لپٹ جائے گا
سوت کے دھاگے میں ساری ہے طاقت   سادھو نے تم کو بتائے دیا ہے[۱۱۰]

فنی کمزوریوں کے باوجود جس بیانیے کو یہاں پیش کیا گیا ہے، وہ بہت واضح ہے۔ ایک اور غیر معروف شاعر عثمان نے بھی اسی موضوع پر مبنی ایک غزل میں برطانوی اشیا کے استعمال کو ترک کرنے کا مشورہ دیتے ہوئے اس عزم کا اظہار کیا کہ اگر ہندوستانی عوام مقامی طور پر تیار اشیا کا استعمال شروع کر دیں گے تو ہندوستان کو آزاد ہونے اور انگریزوں کو اس ملک سے بھاگنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ ان کے خیال میں یہی وہ واحد عمل ہے جس سے ہندوستان کو آزادی مل سکتی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ:

غلامی سے ہم کو چھڑائے کا چرخا   لٹیروں کی ہستی مٹائے کا چرخا
نہ پھر خون چوسیں گے یورپ کے پسو   ہمیں مفلسی سے بچائے کا چرخا
بنائے گا ماتم کدہ مانچسٹر کو   لور پول کی گت بنائے گا چرخا[۱۱۱]

اقبال کے پیغام کا محور و مرکز یہ ہے کہ مسلمانوں ہر طرح کے قومی اور نسلی تعصبات سے کنارہ کش ہو کر ایک واحد منظم اور مستحکم ملت اسلامیہ کا جزو بن جائیں[۱۱۲]۔ انھوں نے رنگ و قومیت سے اجتناب کی تلقین کی۔ ان کی متعدد نظمیں ایسی ہیں جو امت مسلمہ کے اتحاد و اتفاق کا مظہر ہیں۔ بیسویں صدی کے اوائل سے ہی ملت اسلامیہ پر عالمی سطح پر خطرات کے بادل منڈلا

رہے تھے۔ ۱۹۱۱ء کے اوائل ہی میں سلطنت عثمانیہ کے کئی علاقے برطانیہ اور یورپی سامراج کے قبضے میں جا چکے تھے۔ اسی سال تنسیخ بنگال کا فیصلہ بھی ہو گیا جس نے مسلمانوں کو مزید صدمے سے دوچار کر دیا۔ یہی وہ سال ہے جب اقبال نے ملکی اور بین الاقوامی حالات سے متاثر ہو کر اپنی معرکہ آرا نظم ''شکوہ'' پیش کی [۱۳]۔ انھوں نے خدا کے حضور شکوہ کرتے ہوئے مسلمانوں کی موجودہ حالت کا ایسا دردناک نقشہ کھینچا ہے جس سے ہر آنکھ نم ضرور ہوئی۔ وہ کہتے ہیں:

تیری محفل بھی گئی چاہنے والے بھی گئے — شب کی آہیں بھی گئیں، صبح کے نالے بھی گئے
دل تجھے دے بھی گئے، اپنا صلا لے بھی گئے — آ کے بیٹھے بھی نہ تھے اور نکالے بھی گئے
آئے عشاق گئے وعدہِ فردا لے کر — اب انھیں ڈھونڈ چراغِ رخِ زیبا لے کر [۱۴]

اقبال نے ہندوستانی مسلمانوں کے سیاسی مسائل کو نہ صرف بغور دیکھا بلکہ ان مسائل کے حل کے لیے بھرپور کوشش بھی کی۔ تقسیم اور پھر تنسیخ بنگال کے فیصلے کے بعد ۱۴ دسمبر ۱۹۱۱ء کو عطیہ فیضی کے نام لکھے گئے ایک خط میں کہتے ہیں کہ:

> ہندوؤں نے بنگال کو دو حصوں (ہندو بنگال اور مسلم بنگال) میں تقسیم کو حکومت کی طرف سے بنگالی قومیت کے قلب پر ایک کاری ضرب سے تعبیر کیا ہے لیکن حکومت کی طرف سے دہلی کو دارالسلطنت قرار دے کر اپنے فیصلے کی خود ہی پوری ہوشیاری سے تنسیخ بھی کر دی ہے۔ بنگالی سمجھتا ہے کہ جیت اس کی رہی لیکن اسے نظر نہیں آتا کہ اس کی اہمیت گھٹا کر صفر کر دی گئی ہے۔ اس سلسلے کے متعلق دو شعر ہو گئے [۱۵]۔

مندمل زخمِ دلِ بنگال آخر ہو گیا — وہ جو تھی پہلے تمیزِ کافر و مومن گئی
تاج شاہی آج کلکتے سے دہلی آگیا — مل گئی بابو کو جوتی اور پگڑی چھن گئی [۱۶]

بنگال کے ہندو اس بات پر بہت خوش تھے کہ انھوں نے پچھلے چھے برسوں سے جو ایجی ٹیشن شروع کر رکھی تھی، اس کا نتیجہ ان کے حق میں آیا تھا اور انگریز سرکار بنگالی ہندوؤں اور کانگریس سرکار کا مطالبہ ماننے پر مجبور ہو گئی ہے لیکن وہ انگریزوں کی اس چال کو نہ سمجھ سکے کہ اس فیصلے کی انھیں کیا قیمت ادا کرنی پڑی تھی۔ ہندوستان کے مرکز اور دارالسلطنت کی تبدیلی کا جو نقصان آئندہ برسوں میں بنگال کو اٹھانا تھا، اس بابت ان کا شعور بیدار دکھائی نہیں دیتا۔ اس لیے اقبال نے اس نقصان کی جانب اشارہ کرتے ہوئے طنزاً پگڑی کے چھن جانے کی طرف اشارہ کیا ہے۔

ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان اس قدر تفاوت کے باوجود اقبال اس وقت تک یہی سوچ رکھتے تھے کہ ہندوستان میں اقوام کے درمیان اتحاد و اتفاق قائم رہے، لیکن حالات اس کے برعکس ہوتے جا رہے تھے۔ اسی لیے اپنی ایک نظم ''صدائے درد'' میں وہ کہتے ہیں کہ:

سر زمیں اپنی قیامت کی نفاق انگیز ہے — وصل کیسا، یاں تو اک قربِ فراق انگیز ہے
بدلے یک رنگی کے یہ نا آشنائی ہے غضب — ایک ہی خرمن کے دانوں میں جدائی ہے غضب
جس کے پھولوں میں اخوت کی ہوا آئی نہیں — اس چمن میں کوئی لطفِ نغمہ پیرائی نہیں [۱۷]

''بانگِ درا'' میں شامل ایک اور نظم ''آفتابِ صبح'' میں بھی وہ امتیاز ملت دیں اور پورے ہندوستان میں افتراق کی جو فضا فروغ پا رہی تھی اس پر افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

آنکھ میری اور کے غم میں شر سک آباد ہے　　　امتیازِ ملت و آئیں سے دل آزار ہے[۱۸]

ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان پیدا ہونے والی نفرت اور سماجی و معاشی سطح پر مسلمانوں کی حالت پر افسوس کا اظہار کرتے ہوئے اقبال کا کہنا تھا کہ:

غدار وطن اس کو سمجھتے ہیں برہمن　　　انگریز سمجھتا ہے مسلماں کو گدا گر[۱۹]

مولانا محمد علی جوہر بھی اس سیاسی بے داری کے قافلۂ سالار میں سے تھے۔ مذکورہ صفحات میں ذکر جا چکا ہے کہ جس زمانے میں تنسیخ تقسیم بنگال کا واقعہ رونما ہوا وہی زمانہ ''کامریڈ'' کے اجرا کا زمانہ بھی ہے۔ اس سے قبل ۱۹۰۶ء میں ڈھاکا میں منعقدہ آل انڈیا مسلم لیگ کے جلسۂ تاسیس میں شرکت سے وہ اپنی سیاسی سرگرمیوں کا آغاز کر چکے تھے[۲۰]۔ ۱۹۱۰ء کے اواخر میں وہ کلکتہ آ گئے اور ۱۴ جنوری ۱۹۱۱ء کو ہفت روزہ ''کامریڈ'' جاری کیا۔ ''کامریڈ'' بنیادی طور پر صلح کن اور اتحاد بین الاقوام کا داعی، وطنی اختلاف کا دشمن اور حکومتی انتظامی کمزوریوں کا ناقد اخبار تھا[۲۱]۔ مگر ۱۹۱۱ء کی تنسیخ بنگال کے دوران لکھے گئے اداریوں کی وجہ سے ہندوؤں اور انگریزوں کی نظروں میں معتوب ٹھہرا۔ تنسیخ تقسیم بنگال کے فیصلے نے مسلمانوں کے جذبات کو کس قدر متاثر کیا تھا، مولانا جوہر نے اس کیفیت کو ملکی اور بین الاقوامی سطح پر پیش کرنے کی کوشش کی۔ مولانا کی سیاسی شاعری کے جوہر چھنڈورہ کی پانچ سالہ نظر بندی کے دوران چمکے[۲۲]۔ لیکن اس طرز سخن کا آغاز ۱۹۰۷ء میں اس وقت ہو چکا تھا جب علی گڑھ کے طلبا نے انگریز اساتذہ کے خلاف ہڑتال کر رکھی تھی۔ ادارہ بند تھا اور اس کے سربراہ حیران و پریشان[۲۳]۔ اس موقع پر مولانا جوہر نے سرسید کی روح سے مخاطب ہو کر جو نظم پڑھی وہ علی گڑھ اور خود ان کے بدلے ہوئے ماحول اور ذہن کی عکاسی کرتی ہے۔ اس نظم کے چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

خبر لو قوم کی کشتی کی، گو کشتی سے باہر ہو　　　ہوئے ساحل پہ بھی تو کیا، ہمارے نا خدا تم ہو
تمھیں کو ڈھونڈتی پھرتی ہیں آنکھیں اب علی گڑھ میں　　　اور اس پر یہ تماشا، ہر طرف اور جا بجا تم ہو
سکھایا تھا تم ہی نے قوم کو یہ شور و شر سارا　　　جو اس کی انتہا ہیں ہم تو اس کی ابتدا تم ہو[۲۴]

اس نظم پر مولانا عبد الماجد دریابادی کو بھی ناز تھا۔ اس نظم کو ہم جوہر کی سیاسی شاعری کا پیش خیمہ کہہ سکتے ہیں۔ تنسیخ تقسیم بنگال کے واقعے نے مولانا جوہر کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ وہ ہندوستان میں ہندوؤں اور انگریزوں کے بھروسے پر نہیں رہ سکتے۔ عددی اعتبار سے وہ ایک سیاسی اقلیت تھے۔ اسی لیے وہ مسلمانوں کے سیاسی اور معاشی مسائل کے لیے کھل کر اظہار کرتے۔ تنسیخ تقسیم بنگال کا واقعہ ہو یا جنگ طرابلس و بلقان، ہر موقعے پر انھوں نے انگریزوں کی پالیسی پر تنقید کی۔ خصوصاً تنسیخ تقسیم بنگال کے موقعے پر لکھے گئے ان کے اداریوں نے ہندوؤں اور بنگالیوں کو بہت مشتعل کیا۔ انگریزوں نے انھیں اپنا دشمن جانا۔ ان پر کڑی نظر رکھی اور وقتاً فوقتاً قید اور نظر بند بھی کیا۔ اس موقعے پر لکھے گئے اشعار نے اس دور کے سیاسی ماحول کی بہترین عکاسی کی۔ جیسے:

ایک اک کر کے سب کے سب تنکے　　　ہوئے برباد آشیانے کے
پوچھتے کیا ہو بود و باش کا حال　　　ہم ہیں باشندے جیل خانے کے[۲۵]

تقسیم بنگال اور تنسیخ تقسیم بنگال کے دوران گزرے چھے برسوں میں ہندوؤں نے مسلمانوں کے ساتھ جو سلوک کیا وہ کسی سے ڈھکا چھپا نہیں۔ ہنگامے اور قتل و غارت گری میں بیش تر مسلمانوں ہی کا نقصان ہوتا۔ کئی انگریز بھی اس دوران ہلاک ہوئے۔ اس شر انگیزی میں بعض اوقات فرقہ وارانہ اور مذہبی فسادات کو بھی ہوا دینے کی کوشش کی گئی۔ اس صورتِ حال کا اندازہ جوہر کے اس شعر سے پوری طرح لگایا جاسکتا ہے:

ہم خاص گانِ اہل نظر اور یہ قتل عام　　　جور و ستم بھی کر تو ستم گار دیکھ کر[۲۶]

مولانا ظفر علی خان نے غالباً اسی پس منظر میں علی برادران کی مشکلات کا ذکر اپنی نظم ''کلکتہ'' میں کیا ہے۔

ملت کی آبرو سے علی بھائیوں کی ضد　　　لانے لگی وہ زنگ خود آرا کہ ہائے ہائے
بنگالا کے افق میں کچھ ایسا ہوا غروب　　　ان دونوں بھائیوں کا ستارا کہ ہائے ہائے[۲۷]

سودیشی تحریک کے زیر اثر بعد کے زمانے میں بھی اسی قسم کی نظمیں کہی گئیں جن میں مقامی صنعتوں کے فروغ اور یورپی مال سے صرف نظر کرکے ملکی ترقی کو بام وعروج تک پہنچانے کی باتیں کی گئیں۔ برق کی ایک نظم ''کم خواب بے فروغ کے کھدر کے سامنے'' میں بھی کچھ انھی جذبات کا اظہار کیا گیا ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

کھدر کا زیب تن ہو ہمارے اگر لباس　　　باہر نہ جانے پائے کبھی ہند کا کپاس
بھارت نواسیوں کو ملے نفع بے قیاس　　　دولت رہے وطن کی پھر اہلِ وطن کے پاس
فاقوں سے خستہ دل نہ کوئی بھی غریب ہو　　　کپڑا بدن کو پیٹ کو روٹی نصیب ہو
یا رب دعا ہے ہند میں اس کا چلن رہے　　　قائم جہاں میں شوکت و شانِ کہن رہے
جب تک جئیں بدن پہ لباسِ وطن رہے　　　مرنے پہ پردہ پوش سودیشی کفن رہے
چمکیں نصیب برق جو اس کا رواج ہو　　　یورپ کے مال کی نہیں پھر احتیاج ہو[۲۸]

ان ہی کی نظم ''نغمات حریت'' میں ''کھدر نامہ'' کے عنوان سے شائع ہوئی[۲۹]۔ چکبست سرور جہاں آبادی سے بے حد متاثر تھے۔ انھوں نے بھی تقسیم بنگال کے پس منظر میں ایک طنزیہ نظم ''لارڈ کرزن سے جھپٹ'' کے عنوان سے لکھی۔ یہ نظم کلکتہ یونی ورسٹی کے کانووکیشن کے موقعے پر لارڈ کرزن کے رویّے کے خلاف لکھی گئی۔ کرزن نے اپنی تقریر کے دوران ہندوستانیوں کی تہذیب واخلاق پر بہت نارواجملے کہے تھے۔ اس واقعے کے پس منظر میں لکھی گئی یہ نظم اخبار ''اودھ پنچ'' لکھنؤ میں شائع ہوئی[۳۰]۔ نظم میں شاعر کی رومان پسندی غالب ہے، خصوصاً شراب کے نشے میں مست ہو کر لارڈ کرزن سے ہونے والی جھڑپ کا منظر بیان کرتے ہوئے شاعر کا کہنا ہے کہ:

نشے میں چور ہوں اور سوجھتی ہے دور کی بات　　　ڈر ہے کرزن سے نہ ہو جائے کہیں مجھ سے جھپٹ
لیجیے سامنے میرے ہے شبیہِ کرزن　　　رنگ اس طرح بدلتی ہے کہ جیسے گرگٹ
سرخ غصے سے کبھی زرد کبھی صدمے سے　　　خوف کے مارے کبھی رنگ میں ہے نیلاہٹ
آئے ہیں آپ تو کچھ حضرتِ کرزن سنیے　　　آپ اگر منھ کے کڑے ہیں تو ہوں میں بھی منھ پھٹ[۳۱]

نظم میں چکبست کا متعصبانہ رنگ بھی خوب جھلکتا ہے۔ ظاہر سی بات ہے کہ تقسیم بنگال سے مسلمانوں کا مفاد وابستہ تھا اور علی گڑھ کے تعلیم یافتہ مسلمان بھی اس مسئلے پر بنگال کی تقسیم کے حامی تھے، لیکن چکبست کو یہ حمایت ایک آنکھ نہیں بھا رہی تھی، اس لیے وہ علی گڑھ کے اکابرین کو مخاطب کرتے ہوئے غیر مہذب رویہّ اختیار کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ ملاحظہ کیجیے:

کانگریس والے تو کیا خوش نہیں تجھ سے دل میں　　　دشمن ملک، علی گڑھ کے پرانے کھوسٹ[۱۳۲]

یہ درست ہے کہ کرزن کی پالیسی سے ہندو خوش نہیں تھے۔ ان کے خیال میں کرزن نے اپنے پانچ سالہ دور میں ملک کو برباد کر دیا تھا۔ حالاں کہ بربادی کا یہ عمل کئی دہائیوں سے جاری تھا لیکن شاعر کا مقصد غالباً حقیقت تک رسائی اور آگہی نہیں بلکہ محض کرزن کو نیچا دکھانا ہے۔ اسی لیے وہ کہتے ہیں کہ:

خوب بوچھاڑ ہوئی چاروں طرف سے تجھ پر　　　پانیر تک کو نہ خوش آئی تری زیٹ زپٹ
تاج وقعت کا اٹھا سر سے ترے چلتے وقت　　　بے چراغ آئے نظر صبح کو جیسے دیوٹ
جس سے ناشاد رعایا ہے وہ ہے دور ترا　　　کر دیا ملک کو اس پانچ برس میں چوپٹ
بس تیرا چل نہ سکا قحط و وبا سے کچھ بھی　　　شہر ویران ہیں آباد ہوئے ہیں مرگھٹ[۱۳۳]

اس طویل نظم میں چکبست پوری طرح اپنے دل کی بھڑاس نکالتے ہیں۔ کبھی اس کی تقریروں پر طنز کے تیر برساتے ہوئے انھیں جلانے اور کبھی اس کی ذات کو نشانہ بناتے ہوئے کوڑے کرکٹ سے تشبیہ دیتے ہوئے اس بات کی بابت کہتے ہیں:

آگیا اُڑ کے جو لندن سے یہ کوڑا کرکٹ[۱۳۴]

اس لیے چکبست جلد سے جلد ہندوستان کو کرزن سے پاک دیکھنے کی خواہش کا اظہار کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ ان کے خیال میں جب سے کرزن کے ناپاک قدم اس سرزمین پر پڑے ہیں، نئی نئی مصیبتوں نے یہاں گھر کر لیا ہے۔ اسی لیے وہ کرزن کو مشورہ دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

اب مناسب ہے یہی کیجیے پنجرہ خالی　　　ہم بھی خوش آپ بھی خوش، دور کہیں ہو جھنجھٹ
تو ہو جانے پہ جو راضی تو قسم سر کی ترے　　　کر کے چندہ تجھے ہم لے دیں ولایت کا ٹکٹ
اور جو تجھ کو نہیں منظور یہ احساں لینا　　　بھیج دیں ہم تجھے بیرنگ بنا کر پیکٹ[۱۳۵]

نظم کے مطالعے سے اچھی طرح اندازہ ہو جاتا ہے کہ لارڈ کرزن کے خلاف اس قدر غصہ دراصل اس لیے تھا کہ اس کی پالیسی سے کسی حد تک مسلمانوں کو فائدہ پہنچ رہا تھا، لیکن ملک کے دانش ور، ادیب، شاعر اور سیاست داں سب ہی اس قدر جانب داری کا رویہّ اختیار کیے ہوئے تھے کہ حیرت ہوتی ہے۔ عارف حجازی نے واضح طور پر لکھا کہ لارڈ کرزن کے عہد میں مشرقی بنگال کو ایک خاص منصوبے کے تحت ترقی دی گئی۔ اس کی تعمیرات سے اس دور کی انگریزی تعمیرات کا رنگ جھلکتا ہے۔ عمدہ مکانات اور دفتروں کے لیے عمارتیں تعمیر ہوئیں۔ تعلیم کی طرف توجہ دی گئی۔ ڈھاکا یونی ورسٹی کے قیام کا منصوبہ بنایا گیا۔ تجارتی ترقی کی وجہ سے پٹ سن اور دوسری پیداوار کی مانگ بڑھی[۱۳۶]۔ ۱۸۵۷ء سے لارڈ میو کے زمانے تک ہندوؤں پر انگریزوں کی نوازشیں جاری رہیں۔ اس وقت تک مسلمان انگریزوں کے دشمن تصور کیے جاتے رہے۔ بعد میں کچھ تبدیلی آئی لیکن اس تبدیلی میں بھی انگریزوں نے ہمیشہ اپنے مفادات کو ملحوظ خاطر رکھا۔ انگریزوں نے ہمیشہ فرقہ وارانہ اختلافات پر لذت محسوس کی اور ہندوؤں اور

مسلمانوں کو مشترکہ نصب العین بنانے سے ہمیشہ روکا۔ ان حالات میں جب تقسیم بنگال کے خلاف ہندوؤں کا شدید رد عمل سامنے آیا تو وہ اس مزاحمت کو برداشت نہ کر پائے اور مسلمانوں کے مفاد کا تحفظ کیے بغیر تنسیخ تقسیم بنگال کا حکم صادر کر دیا۔ اس صورتِ حال کی عکاسی کرتے ہوئے ایک غیر معروف شاعر محبوب الٰہی نے درست کہا کہ:

تمھارا قول کیوں کر معتبر ٹھہرے کہ تم اس میں　　کبھی تنسیخ کرتے ہو کبھی ترمیم کرتے ہو

حقیر ان کو سمجھتے ہو جو ہیں توقیر کے قابل　　رذیلوں کی مگر تعظیم اور تکریم کرتے ہو[۳۷]

حالاں کہ متعدد مسلمان اکابرین اس معاملے کی سنگینی کا احساس کرتے ہوئے بھی مشترکہ قومی یک جہتی کے فروغ میں اپنا کردار ادا کرنے کی کوششوں میں مصروف تھے۔ اس کی سب سے بڑی مثال مولانا ابوالکلام آزاد کی ہے جو میدانِ سیاست میں قدم رکھنے سے قبل ہی برطانوی حکمرانوں کی پالیسیوں سے شناسا ہو چکے تھے۔ ان کا نظریہ تھا کہ مقتدر طبقے نے اپنے ذاتی مفاد کے پیش نظر ہندوؤں اور مسلمانوں میں تفرقہ پیدا کر کے اقتدار پر اپنی گرفت مضبوط کرنے کی کوششوں میں مصروف ہیں۔ اسی لیے ان دونوں اقوام کے درمیان زیادہ سے زیادہ خلیج پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اسی بنا پر وہ شروع دن سے ہی ہندو مسلم اتحاد کے زبردست حامی تھے۔ متحدہ قومیت کے عقیدے پر وہ آخری وقت تک کاربند رہے۔ ابتدا میں وہ سرسید کی فکر سے متاثر تھے، لیکن عملی سیاست میں انھوں نے سرسید سے الگ راستہ اپنایا۔ ۱۹۰۵ء میں وائسرائے ہند لارڈ کرزن نے جب تقسیم بنگال کا فیصلہ کیا تو اس فیصلے سے ہندو اور مسلمانوں میں نفاق کی فضا پیدا ہو گئی۔ اس زمانے میں بنگال اور بہار کی انقلابی تحریکوں میں مسلمانوں کی شرکت نہ ہونے کے برابر تھی۔ ہندو انقلابی رہنما مسلمانوں کو حصول آزادی کی راہ میں رکاوٹ سمجھتے تھے۔ ایسے میں مولانا آزاد نے ہندو انقلابی جماعتوں کا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا[۳۸]۔ ڈاکٹر خلیق انجم کے مطابق:

> مولانا جب اس تحریک میں شامل ہوئے تو انقلابی سرگرمیاں بنگال اور بہار تک محدود تھیں۔ مولانا نے مشورہ دیا کہ ان سرگرمیوں کا دائرہ کار وسیع کیا جانا چاہیے۔ انقلابیوں کو یہ مشورہ ماننے میں تامل تھا لیکن مولانا کے اصرار پر شمالی ہندوستان اور بمبئی میں اس جماعت کی خفیہ شاخیں قائم ہو گئیں[۳۹]۔

بعد میں وہ عراق، مصر، شام اور ترکی کے سفر پر چلے گئے اور انقلابیوں سے ان کے رابطے منقطع ہو گئے۔ اسی طرح دادا بھائی نوروز جی، نواب زادہ عتیق اللہ خان اور نواب امیر حسن خان وغیرہ نے بھی تقسیم کے اس عمل پر کڑی تنقید کی۔ دادا بھائی نوروز جی کی حد تک تو بات سمجھ میں آتی ہے کیوں کہ وہ کانگریس کے سرکردہ رہنما تھے لیکن نواب زادہ عتیق اللہ خان اور نواب امیر حسن خان کی بابت آج تک یہ عقدہ نہیں کھلا کہ انھوں نے تقسیم بنگال کی مخالفت کیوں کی تھی۔ متحدہ بنگال میں وہ کون سی نعمت انھیں حاصل تھی جو منقسم بنگال میں ان سے چھن گئی تھی۔ حالاں کہ امر واقعہ یہ تھا کہ متحدہ بنگال مسلمانوں کی پس ماندگی، بدحالی اور ناامیدی کا مرقع تھا۔ ملازمت کے دروازے ان پر بند تھے، زمینیں ان سے چھینی جا چکی تھیں، لاکھوں روپے کی آمدنی رکھنے والے اوقاف تک پہ غاصبانہ قبضہ کر لیا گیا تھا اور ان کی آمدنی ہندوؤں پر صرف کی جا رہی تھی۔ یہ محرومیاں اور مایوسیاں نواب صاحبان کو اس قدر پسند تھیں کہ وہ ان سے دست بردار ہونے کو تیار نہ تھے[۴۰]۔ بہر حال تنسیخ تقسیم بنگال نے یہ ضرور کیا کہ مسلمانوں کو سیاسی طور پر منظم کر دیا۔ وہ ہندوؤں کے ساتھ ساتھ مغربی استعمار کا مقابلہ کرنے کے لیے بھی پوری طرح تیار ہو گئے۔

حوالہ جات

۱۔ نارنگ، گوپی چند، ”ہندوستان کی تحریک آزادی اور اردو شاعری“، قومی کونسل برائے فروغ اردو، نئی دہلی، ۲۰۰۳ء، ص ۳۳۴

۲۔ انصاری، سحر، ”تحریک آزادی میں اہل قلم کا حصہ“، مشمولہ: ”تنقیدی افق“، پاکستان اسٹڈی سنٹر، جامعہ کراچی، ۲۰۱۴ء، ص ۱۰۰۔۱۰۳

۳۔ ملک، عبداللہ، ”بنگالی مسلمانوں کی صد سالہ جہد آزادی: ۱۷۵۷ء۔۱۸۵۷ء“، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۶۷ء، ص ۳

۴۔ چودھری، زاہد، ”بنگالی مسلمانوں کا تحریک پاکستان میں نمایاں ترین کردار“، جلد ۹، ادارۂ مطالعہ تاریخ، لاہور، ۱۹۹۶ء، ص ۱۵۔۳۰

۵۔ Karim, Abdul, “Social History of Muslims in Bengal”, Dacca, 1995, p. 127.

۶۔ بہ حوالہ، Sirkar, Jadunath, “History of Bengal”, Dacca, 1948, vol. 11, p. 102

۷۔ چودھری، ص ۳۱

۸۔ ہروی، خواجہ نعمت اللہ، ”تاریخ خان جہانی و مخزن افغانی“، مترجم، ڈاکٹر محمد بشیر حسین، مرکزی اردو بورڈ، لاہور، ۱۹۷۸ء، ص ۳۰۵۔۳۰۶

۹۔ چودھری، ص ۴۰۔۴۴

۱۰۔ ملک، ص ۱۱۔۱۴

۱۱۔ چودھری، ص ۴۵۔۵۲

۱۲۔ Dutt, Kali-kankar, “Ali Wardi Khan and His times”, Calcutta, 1939, p.57

۱۳۔ چودھری، ص ۵۳۔۵۴

۱۴۔ بے خود، عبدالرحمٰن، ”بنگال کی سیاست و معاشرت“، مشمولہ: ”ماہ نو“، خاص نمبر، مئی ۱۹۵۷ء، ص ۴۰

۱۵۔ چودھری، ص ۵۳۔۵۴

۱۶۔ بے خود، ص ۴۰۔۴۱

۱۷۔ ملک، ص ۱۵۔۱۰۰

۱۸۔ پنچانن داس، بہ حوالہ: عبداللہ ملک، محولہ بالا، ص ۱۰۰۔۱۰۱

۱۹۔ چودھری، ص ۶۰

۲۰۔ اکرام، شیخ محمد، ”رود کوثر“، ادارۂ ثقافت اسلامیہ، لاہور، ۱۹۸۲ء، ص ۴۹۳۔۵۲۷

۲۱۔ اکرام، شیخ محمد، ”موج کوثر“، ادارۂ ثقافت اسلامیہ، لاہور، ۱۹۸۲ء، ص ۵۷۔۶۱

۲۲۔ ملک، ص ۱۵۱۔۱۶۱

۲۳۔ بے خود، ص ۴۳

۲۴۔ ملک، ص ۱۵۸۔۱۵۹

۲۵۔ بے خود، ص ۴۲

۲۶۔ ملک، ص ۱۷۲۔۱۹۲

۲۷۔ رائے، راجہ رام موہن، بہ حوالہ: عبداللہ ملک، محولہ بالا، ص ۲۰۱

۲۸۔ چودھری، ص ۶۲۔۶۳

۲۹۔ A.R.Mallick, “British Policy and Muslims in Bengal”, Dacca, 1961, p.146

۳۰۔ چودھری، زاہد، محولہ بالا، ص ۶۳۔۶۵

۳۱۔ Hunter, William (Sir), “The Indian Musalmans”, The premier book house, Lahore, 1974, p. 179-180

۳۲۔ چودھری، ص ۶۶۔۶۷

۳۳۔ فرید آبادی، سید ہاشمی، ”تاریخ مسلمانانِ پاکستان و بھارت“، جلد دوم، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی، ۱۹۸۸ء، ص ۴۹۲۔۴۹۳

۳۴۔ حالی، مولانا الطاف حسین، ”حیات جاوید“، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی، ۱۹۹۰ء، ص ۱۴۰۔۱۴۱

۳۵۔ فرید آبادی، ص ۴۹۲۔۴۹۳

۳۶۔ چودھری، ص ۶۷۔۶۸

۳۷۔ کاٹن، سر ہنری، بہ حوالہ: ”کاروان گم گشتہ“، از رئیس احمد جعفری، سید انیس احمد جعفری اکیڈمی، کراچی، ۱۹۷۱ء، ص ۱۷۶۔۱۷۷

۳۸۔ جعفری، رئیس احمد، ”کاروان گم گشتہ“، سید انیس احمد جعفری اکیڈمی، کراچی، ۱۹۷۱ء، ص ۱۷۶۔۱۷۷

۳۹۔ دتاسی، گارسیں، ”خطبات گارسیں دتاسی“، جلد اول، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی؛ دتاسی نے اپنے متعدد خطبات میں اس قسم کی باتیں لکھی ہیں۔ دیکھیے: حصہ دوم

۴۰۔ تفصیلات کے لیے دیکھیے: فریزر، ص ۳۶۵ و بعدہٗ، بہ حوالہ: ”برصغیر پاک و ہند کی ملت اسلامیہ“، از ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی، مترجم، ہلال احمد زبیری، شعبۂ تصنیف و تالیف کراچی یونی ورسٹی، کراچی، ۱۹۹۹ء، ص ۳۲۸

۴۱۔ جعفری، ص ۱۷۷

۴۲۔ چودھری، ص ۶۸

۴۳۔ لویٹ فریزر، "India Under Curzen and After"، لندن، ۱۹۱۱ء، ص ۳۸۵

۴۴۔ بہ حوالہ: https: \\ en. wikipedia. org/ wiki/ partition _of_Bangal_1905

۴۵۔ حسین، سید عابد، "ہندوستانی مسلمان آئینۂ ایام میں"، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی، ۲۰۱۲ء، ص ۱۰۱۔ ۱۰۲

۴۶۔ زبیری، جمیل، "ہندو عداوت کا تاریخی پس منظر"، مشمولہ: "نقش"، کراچی، جنگ نمبر، ۱۹۶۶ء، ص ۲۵۲

۴۷۔ بے خود، ص ۴۵

۴۸۔ جعفری، ص ۱۷۷۔ ۱۷۹

۴۹۔ حسن، سید ریاض، "پاکستان ناگزیر تھا"، شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ، کراچی یونی ورسٹی، کراچی، ۱۹۶۷ء، ص ۵۰

۵۰۔ چودھری، ص ۶۷

۵۱۔ حسین، ص ۱۰۱

۵۲۔ ذاکر اللہ، ڈاکٹر محمد، "اردو شاعری پر سیاسی اثرات"، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۱۱ء، ص ۲۱۰

۵۳۔ حسین، ص ۱۰۱

۵۴۔ ٹامپسن و گیریٹ، ص ۴۹۳، بہ حوالہ: ڈاکٹر محمود الرحمٰن، "جنگ آزادی کے اردو شعرا"، محولہ بالا، ص ۲۲۰

۵۵۔ موہانی، حسرت، "مقدمہ"، مشمولہ: "کلیات حسرت"، فرید بک ڈپو، دہلی، سن ندارد، ص ۲۵۔ ۲۶

۵۶۔ ندوی، سلیمان، "یادِ رفتگاں"، مکتبہ الشرق، کراچی، ۱۹۵۵ء، ص ۴۸۲

۵۷۔ جعفری، ص ۱۸۷۔ ۱۸۸

۵۸۔ چودھری، ص ۶۸۔ ۶۹

۵۹۔ چراغ، محمد علی، "پاکستان منزل بہ منزل"، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۷ء، ص ۲۳

۶۰۔ خان، یوسف حسین، "تاریخ دستور حکومت ہند"، انجمن ترقی اردو، ہند، سن ندارد، ص ۹۵

۶۱۔ جعفری، ص ۱۷۹

۶۲۔ چودھری، ص ۶۹

۶۳۔ جعفری، ص ۱۸۰۔ ۱۸۳

۶۴۔ فرید آبادی، ص ۵۲۴

۶۵۔ جعفری، ص ۱۸۶

۶۶۔ قریشی، اشتیاق حسین، "برصغیر پاک و ہند کی ملت اسلامیہ"، مترجم ہلال احمد زبیری، شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ، کراچی یونی ورسٹی، کراچی، ۱۹۹۹ء، ص ۳۴۹

۶۷۔ چودھری، ص ۷۰

۶۸۔ زبیری، محمد امین، "مسلمانانِ ہند کی سیاست وطنی"، عزیزی پریس، آگرہ، سن ندارد، ص ۵۷

۶۹۔ فرید آبادی، ص ۵۲۴

۷۰۔ جعفری، ص ۲۱۸۔ ۲۱۹

۷۱۔ قریشی، ص ۴۴۹۔ ۴۵۰

۷۲۔ قدسی، عبید اللہ، "آزادی کی تحریکیں"، ادارۂ ثقافت اسلامیہ، لاہور، ۱۹۸۸ء، ص ۱۳۲

۷۳۔ بہ حوالہ: "کاروانِ گم گشتہ"، ص ۱۸۶

۷۴۔ بہ حوالہ: انوار ہاشمی، "تاریخ پاک و ہند"، ادارۂ ثقافت اسلامیہ، کراچی، ۱۹۷۴ء، ص ۵۰۷

۷۵۔ سلیم اللہ، نواب، بہ حوالہ: "کاروانِ گم گشتہ"، ص ۲۱۹۔ ۲۲۰

۷۶۔ حسین، سید مجاور، "اردو شاعری میں قومی یک جہتی کے عناصر"، اترپردیش اردو اکادمی، لکھنؤ، ۲۰۰۴ء، ص ۳۵۵

۷۷۔ سروری، عبد القادر، "جدید اردو شاعری"، مکتبہ ابراہیمیہ، حیدر آباد دکن، ۱۹۳۲ء، ص ۲۶۱

۷۸۔ ذاکر اللہ، ص ۲۱۰

۷۹۔ جہاں آبادی، درگا سہائے سرور، مشمولہ: "خم خانۂ سرور"، زمانہ پریس، کان پور، ۱۹۱۱ء، ص ۱۰۱

۸۰۔ ایضاً، ص ۱۰۱۔ ۱۰۲

۸۱۔ ایضاً، ص ۱۰۲

۸۲۔ نیّر، ڈاکٹر حکیم چند، "مقدمہ"، مشمولہ: "نوائے سرور"، مرتبہ، ڈاکٹر حکیم چند نیّر، روزنامہ "ہندوستان"، بنارس، ۱۹۶۷ء، ص ۲۵

۸۳۔ جہاں آبادی، درگا سہائے سرور، مشمولہ: "نوائے سرور"، ادارۂ روزنامہ ہندوستان، بنارس، ۱۹۹۷ء، ص ۱۲۹۔ ۱۳۰

۸۴۔ شروانیہ، انیسہ ہارون، "حیات ز۔ خ۔ ش۔"، اعجاز پرنٹنگ پریس، حیدر آباد، سن ندارد، ص ۴۷

۸۵۔ شروانیہ، زاہدہ خاتون، بہ حوالہ: "حیات ز۔ خ۔ ش۔"، محولہ بالا، ص ۴۷

۸۶۔ صدیقی، نفیس احمد، "حسرت موہانی اور انقلاب آزادی"، اوکسفرڈ یونی ورسٹی پریس، کراچی، ۲۰۰۴ء، ص ۸۹

۸۷۔ نوازش، محمد خاور، ”مشاہیر ادب خارزار سیاست میں“، مقتدرہ قومی زبان پاکستان، اسلام آباد، ۲۰۱۲ء، ص ۸۵

۸۸۔ انصاری، سحر، ”حسرت ایک اشتراکی مسلم“، مشمولہ: ”جہات حسرت“، مرتبہ، ڈاکٹر سید جعفر احمد، پاکستان اسٹڈی سنٹر جامعہ کراچی، کراچی، ۲۰۰۸ء، ص ۲۴

۸۹۔ ذکریا، ڈاکٹر رفیق، ”ہندوستانی سیاست میں مسلمانوں کا عروج“، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، ۲۰۰۳ء، ص ۳۶۷

۹۰۔ بقول سید سلیمان ندوی مضمون نگار اقبال سہیل تھے، منقول ”مقدمہ“، ”کلیات حسرت“، ص ۱۳

۹۱۔ موہانی، حسرت، ”دیوان حسرت موہانی“، رئیس المطابع، کان پور، سن ندارد، ص ۱۴

۹۲۔ برنی، ضیاالدین احمد، ”عظمت رفتہ“، تعلیمی مرکز، کراچی، ۱۹۶۱ء، ص ۱۸۷

۹۳۔ محمود الرحمٰن، ڈاکٹر، ”جنگ آزادی کے اردو شعرا“، قومی ادارہ برائے محققین تاریخ و ثقافت، اسلام آباد، ۱۹۸۶ء، ص ۲۵۰۔ ۲۵۱

۹۴۔ موہانی، حسرت، ”کلیات حسرت“، بہ حوالہ: ”جنگ آزادی کے اردو شعرا“، محولہ بالا، ص ۲۵۱

۹۵۔ معین الرحمٰن، ص ۲۵۱۔ ۲۵۲

۹۶۔ موہانی، حسرت، ”کلیات حسرت“، بہ حوالہ: ”جنگ آزادی کے اردو شعرا“، محولہ بالا، ص ۲۵۲

۹۷۔ ذاکر اللہ، ص ۲۱۰۔ ۲۱۱

۹۸۔ موہانی، حسرت، ”کلیات حسرت“، بہ حوالہ: ”جنگ آزادی کے اردو شعرا“، محولہ بالا، ص ۲۵۳

۹۹۔ الہ آبادی، اکبر، ”کلیات اکبر“، بہ حوالہ: ”جنگ آزادی کے اردو شعرا“، محولہ بالا، ص ۲۲۵

۱۰۰۔ ایضاً

۱۰۱۔ ایضاً، ص ۲۲۴۔ ۲۲۵

۱۰۲۔ الہ آبادی، اکبر، ”کلیات اکبر“، بہ حوالہ: ”اردو شاعری پر سیاسی اثرات“، محولہ بالا، ص ۲۱۱

۱۰۳۔ محمود الرحمٰن، ڈاکٹر، محولہ بالا، ص ۲۲۶

۱۰۴۔ الہ آبادی، اکبر، ”کلیات اکبر“، بہ حوالہ: ”جنگ آزادی کے اردو شعرا“، محولہ بالا، ص ۲۲۶

۱۰۵۔ جوہر، شوکت اللہ، ”اردو شاعری میں ظرافت نگاری“، الفاظ اکیڈمی، کراچی، ۲۰۱۶ء، ص ۴۱۸۔ ۴۱۹

۱۰۶۔ الہ آبادی، اکبر، ”کلیات اکبر“، بہ حوالہ: ”ہندوستان کی تحریک آزادی اور اردو شاعری“، محولہ بالا، ص ۳۷۱

۱۰۷۔ ذاکر اللہ، ص ۲۱۱

۱۰۸۔ محروم، تلوک چند، مشمولہ: ”اردو شاعری پر سیاسی اثرات“، محولہ بالا، ص ۲۱۱

۱۰۹۔ اختر، پنڈت چندر کا پرشاد جگیاسوا، بہ حوالہ: ”ضبط شدہ نظمیں“، مجلس جشن علی جواد زیدی، نئی دہلی، ۱۹۷۵ء، ص ۱۱۴۔ ۱۱۵

۱۱۰۔ ایضاً، ص ۱۱۸۔ ۱۹۹

۱۱۱۔ عثمان، بہ حوالہ ”ضبط شدہ نظمیں“، محولہ بالا، ص ۱۲۱

۱۱۲۔ انصاری، اسلوب احمد، ”اقبال کی تیرہ نظمیں“، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۷۷ء، ص ۸۶

۱۱۳۔ ہاشمی، رفیع الدین، ”اقبال کی طویل نظمیں“، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۴ء، ص ۳۳

۱۱۴۔ اقبال، علامہ محمد، ”کلیات اقبال“ (اردو)، مکتبہ جمال، لاہور، ۲۰۰۴ء، ص ۲۹۵

۱۱۵۔ اقبال، علامہ محمد، ”اقبال نامہ: مجموعہِ مکاتیب اقبال“، مرتبہ، شیخ عطاللہ، اقبال اکادمی پاکستان، ۲۰۰۵ء، ص ۴۴۹

۱۱۶۔ ایضاً: یہ اشعار اقبال کے کسی مجموعے میں شامل نہیں

۱۱۷۔ اقبال، علامہ محمد، ”کلیات اقبال“، محولہ بالا، ص ۶۲

۱۱۸۔ ایضاً، ص ۷۶

۱۱۹۔ ایضاً، ص ۸۶

۱۲۰۔ نوازش، ص ۴۱۔ ۴۲

۱۲۱۔ شاہ جہاں پوری، فرحت، ”مولانا محمد علی جوہر“، مشمولہ: سہ ماہی ”صحیفہ“، لاہور، اکتوبر ۱۹۶۶ء، ص ۵۸۵

۱۲۲۔ دریا آبادی، عبدالماجد، ”مقالات ماجد“، ص ۱۹۷، بہ حوالہ: ”جنگ آزادی کے اردو شعرا“، محولہ بالا، ص ۲۴۳

۱۲۳۔ ایضاً

۱۲۴۔ جوہر، مولانا محمد علی، بہ حوالہ: ”جنگ آزادی کے اردو شعرا“، محولہ بالا، ص ۲۴۳

۱۲۵۔ جوہر، مولانا محمد علی، بہ حوالہ: ”تحریک آزادی میں اردو کا حصہ“، محولہ بالا، ص ۴۱۹

۱۲۶۔ جوہر، مولانا محمد علی، بہ حوالہ: ''ہندوستان کی تحریک آزادی اور اردو شاعری''، محولہ بالا، ص۴۶۹

۱۲۷۔ خاں، مولانا ظفر علی، ''کلیات مولانا ظفر علی خان''، مرتبہ، زاہد علی خان، الفیصل پبلشرز، ۲۰۰۷ء، ص۳۸۷

۱۲۸۔ برق، بہ حوالہ: ''ضبط شدہ نظمیں''، محولہ بالا، ص۱۴۲

۱۲۹۔ برق، بہ حوالہ: ''نغمات حسرت''، مرتبہ، خلیق انجم، قومی کونسل برائے فروغ اردو، دہلی، ۲۰۰۷ء، ص۱۹۵۔۱۹۶

۱۳۰۔ انجم، خلیق، ''حواشی: کرزن سے جھپٹ''، مشمولہ: ''نغمات حسرت''، محولہ بالا، ص۲۸

۱۳۱۔ چکبست، برج نارائن، مشمولہ: ''نغمات حسرت''، محولہ بالا، ص۲۹

۱۳۲۔ ایضاً، ص۳۱

۱۳۳۔ ایضاً

۱۳۴۔ ایضاً، ص۳۰

۱۳۵۔ ایضاً، ص۳۱

۱۳۶۔ حجازی، عارف، ''ڈھاکا: میرے خوابوں کا شہر''، ادبیات پاکستان، کراچی، ۱۹۶۱ء، ص۷۱۔۸۲

۱۳۷۔ الٰہی، محبوب، دیکھیے: http:rekhta.org/shayari

۱۳۸۔ نوازش، ص۵۷۔۵۸

۱۳۹۔ انجم، خلیق، ''مولانا آزاد: شخصیت اور کارنامے''، طیب پبلشرز، لاہور، ۲۰۰۵ء، ص۸۸۔۸۹

۱۴۰۔ جعفری، ص۱۸۲۔۱۸۴

سانحہ مسجدِ کان پور اور شہید گنج: مسلمانوں کا ردِ عمل

جنگ بلقان ابھی اپنے منطقی انجام کو بھی نہ پہنچی تھی کہ ''مسجد کان پور کا دردناک واقعہ پیش آیا''[۱]۔ مسلمانانِ ہند ابھی اپنے عرب اور ترک بھائیوں کے مصائب کو کم کرنے میں مصروف تھے کہ اچانک یہ خونیں حادثہ رونما ہوا جس نے وقتی طور پر پوری توجہ کو اپنی جانب مبذول کر لیا[۲]۔ واقعہ کچھ اس طرح پیش آیا کہ کان پور کی ایک شاہ راہ مسٹن روڈ پر ایک مسجد واقع تھی جو مسجد مچھلی بازار کے نام سے مشہور تھی[۳]۔ برطانوی حکومت نے سڑک کی توسیع کا منصوبہ بنایا مگر اس منصوبے کی تکمیل سے مسجد مچھلی بازار اور مندر پر زد پڑتی تھی[۴]۔ حکمرانوں نے ہندوؤں کی خوشنودی کے لیے مندر تو بچا لیا لیکن مسجد کے کچھ حصے کے انہدام کو حتمی شکل دے دی گئی۔ اس صورت حال پر اس زمانے کا مشہور شعر ہے کہ:

کھو گئی کان پور کی مسجد ۔۔۔ رہ گیا بت کدہ مگر باقی[۵]

مسلمانوں کے جذبات و احساسات کی پرواہ کیے بغیر طے یہ کیا گیا کہ مسجد کو تو سڑک کے بیچ میں لے لیا جائے لیکن اس کے غسل خانے اور پاخانے کو ڈھا کر اسے سڑک کا جزو بنا لیا جائے[۶]۔ لہٰذا مسلمانوں کی مخالفت کے باوجود مسجد کا وضو خانہ جو سڑک کے بیچوں بیچ آتا تھا[۷] مسمار کر دیا گیا۔ مسجد کے وضو خانے کے انہدام کا واقعہ کس تاریخ کو پیش آیا اس بارے میں متضاد آرا ملتی ہیں۔ ضیاالدین احمد برنی کے مطابق '' ۳ جولائی ۱۹۱۳ء کو مسجد کا وہ حصہ شہید کر دیا گیا جہاں وضو خانہ اور پاخانہ واقع تھا''[۸]۔ لیکن ان کی بتائی ہوئی تاریخ درست نہیں کیوں کہ اس سانحے کی لمحہ بہ لمحہ روداد ''الہلال'' اور ''ہمدرد'' کے اوراق کی زینت بنتی رہی۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے اس سانحے کی تاریخ بیان کرتے ہوئے بڑے واضح انداز میں لکھا کہ:

> یکم جولائی کی تاریخ مسلمان کبھی نہیں بھول سکتے، جب کہ بندوقوں اور سنگینوں کے حصار میں کان پور کی مسجد کا ایک مقدس حصہ شہید کر دیا گیا اور اس طرح پورے فوجی ساز و سامان کے ساتھ اس اعلان کردہ مذہبی آزادی کا جنازہ اٹھا جس کے پتلے کو ایک صدی سے زائد عرصے تک ہندوستان میں زندہ و متحرک دکھلایا گیا تھا[۹]۔

''الہلال'' میں شائع ہونے والے محمود احمد عباس علیگ کے مراسلے کے مطابق ''یکم جولائی ۱۹۱۳ء کو علی الصباح خانۂ خدا کی دیواریں گرنے لگیں''[۱۰]۔ روزنامہ ''ہمدرد'' میں اس سانحے کے رونما ہونے سے کافی پہلے ہی مسجد مچھلی بازار کے سلسلے میں ہونے والے مذاکرات اور اس میں ہونے والی پیش رفت کا احوال وقتاً فوقتاً درج ہوتا رہا۔ رئیس احمد جعفری نے ۸ جولائی ۱۹۱۳ء کے روزنامہ ''ہمدرد'' میں شائع ہونے والے ایک طویل مقالہ افتتاحیہ کا اقتباس نقل کرتے ہوئے لکھا کہ ''یکایک ۳۰ جولائی ۱۹۱۳ء کو ہز آنر سر جیمس مسٹن خود کان پور تشریف لائے اور مسجد کا معائنہ فرمایا، کسے معلوم تھا کہ ہز آنر کی تشریف آوری کی شب حصہ مسجد کی شب رحلت ہو گی''[۱۱]۔ لیکن بغور مطالعے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ درست تاریخ ۳۰ جولائی نہیں بلکہ ۳۰

جون ہوگی۔ اس کی سب سے بڑی دلیل خود روزنامہ ''ہمدرد'' کی مذکورہ اشاعت کی تاریخ ہے کیوں کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ ۸ جولائی ۱۹۱۳ء کے روزنامے میں ۳۰ جولائی ۱۹۱۳ء کو پیش آنے والا واقعہ درج کیا جاسکے۔ اپنے اسی مضمون میں ''ہمدرد'' نے لکھا کہ:

> علی الصباح سنگین چڑھائے ہوئے مسلح پولیس کے سپاہی مسجد کے چاروں طرف متعین ہوگئے ... ہمارے خاص کارسپانڈنٹ نے اس روز جو تار دیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسجد کی طرف کے تمام راستے روک دیے گئے ... لوگ بہت جلد سمجھ گئے کہ یہ ساری تیاری مسجد کے اس حصے کو منہدم کرنے کے لیے ہے جو سڑک کی داغ بیل میں آتا ہے[١٢]۔

محمود احمد عباس نے اس مسجد کے انہدام کا ذمے دار مسجد کے متولی کریم احمد کو ٹھہرایا ہے[١٣]۔ ان کا کہنا ہے کہ:

''۱۹۰۹ء میں جب کہ اے۔ بی۔ روڈ کے متعلق پیمائش جاری تھی، اور عام لوگوں کو معاوضہ دیا جارہا تھا۔ اس وقت افسر معاوضہ منشی اودہ بہاری لال صاحب ڈپٹی مجسٹریٹ مسجد میں تشریف لائے تھے، اور انھوں نے متولیوں سے جزو منہدم کے علاوہ کچھ صحن مسجد بھی لینے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ کریم احمد صاحب متولی نے ان الفاظ میں وعدہ کیا تھا کہ ہم مطلوبہ حصہ دے دیں گے'' ... چناں چہ مسجد کے ابتدائی مثل میں افسر معاوضہ کے یہ بیانات مذکور ہیں کہ ''متولی مسجد جزو مسجد دینے پر آمادہ ہے''۔ متولی کریم احمد نے اس بات کی تردید کرتے ہوئے ''الہلال'' ہی میں ایک مراسلہ بھیجا جس میں دوٹوک الفاظ میں کہا کہ ''میں نے کوئی منظوری زبانی یا تحریری کسی حاکم کو نہیں دی''[١٤]۔ لیکن حقائق یہی ہیں کہ اس معاملے میں متولی نے مثبت کردار ادا نہیں کیا۔ ۱۹۰۹ء سے شروع ہونے والے اس تنازعے کو بروقت حل کرنے کے انتظام کیے جاتے تو معاملہ اس نہج پر کبھی نہیں پہنچتا۔ حالات کی سنگینی کا اندازہ مسلمانوں کو ۱۹۱۲ء کے اواخر میں ہوا جب مجسٹریٹ کان پور مسجد کے معائنے کی غرض سے تشریف لائے۔ مسلمانانِ کان پور میں اس بات سے خاصی تشویش پھیلی۔ اہل شہر نے مسجد کے متولی کے پاس جاکر صدائے احتجاج بلند کیا مگر اس کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔ نومبر ۱۹۱۲ء میں سر جیمس مسٹن کی کان پور آمد کے موقع پر بھی حکام بلدیہ اور ڈپٹی کمشنر کے عزائم سے آگاہ کرتے ہوئے لیفٹیننٹ گورنر سے استدعا کی گئی کہ یہ ایک مذہبی معاملہ ہے اور مسجد کی حرمت کا خیال حکومت کو ہر حال میں رکھنا چاہیے جب کہ اسی سڑک پر واقع مندر کو بچانے کے لیے سڑک کو ٹیڑھا کیا جانا منظور تھا۔ اس واقعے کی پوری روداد 'ہیرالڈ آف انڈیا'' کان پور ۲۴ نومبر ۱۹۱۲ء کی اشاعت میں درج کی گئی ہے[١٥]۔ اس کے علاوہ ۸ جولائی کو ''ہمدرد'' میں شائع ہونے والے مذکورہ بالا مقالے میں بھی درج ہے کہ مسلمانانِ کان پور کے ایک جلسے میں پانچ علما جن میں مولانا آزاد سبحانی، پرنسپل مدرسہ الہیات بھی شامل تھے، وغیرہ نے مسجد کے انہدام کو خلافِ شریعت قرار دیا[١٦]۔ بااثر مسلمانوں کی جماعت نے اس سانحے کے وقوع پذیر ہونے سے قبل تک اپنی تمام تر کوششیں کرلیں۔ مسٹر شاہد حسین بیرسٹر ایٹ لا نے ۱۴ اپریل ۱۹۱۳ء کو ہز آنر لیفٹیننٹ گورنر صوبہ جات متحدہ یو۔ پی۔ کی خدمت میں میموریل پیش کیا کہ چوں کہ اس حصے کے انہدام سے ان کے مذہب پر دست

اندازی ہوتی تھی جو حکومت کی مصلحت کے منافی تھا، لہٰذا حضور لیفٹیننٹ گورنر بہادر حصہ مسجد کو انہدام سے محفوظ رکھیں[۱۷]۔
لیکن اس کا خاطر خواہ نتیجہ بر آمد نہیں ہوا بلکہ انھوں نے بھی وضو خانے کے حصے کو سڑک کا حصہ قرار دے ڈالا[۱۸]۔

''ہمدرد'' نے اس حوالے سے مزید لکھا کہ بیرسٹر شاہد حسین کی مراسلت ناکام ہوگئی تو راجا صاحب محمود آباد کو ایک محضر دے کر ہز آنر کی خدمت میں شملہ روانہ کیا گیا لیکن اس کا بھی کوئی نتیجہ نہ نکلا[۱۹]۔ مولانا محمد علی جوہر نے بھی سر جیمس مسٹن کو ذاتی خطوط لکھ کر اس اقدام سے باز رکھنے کی کوشش کی۔ خصوصاً مجسٹریٹ کان پور مسٹر بٹلر کی اس حرکت پر جس میں وہ انہدامی کارروائیوں میں حصہ لینے پہنچے اور جوتوں سمیت اس حصے میں داخل ہوئے تو متولی سمیت کسی نے بھی انھیں اس اقدام سے نہ روکا۔ لہٰذا موصوف نے علی الاعلان کہا کہ ''متنازعہ حصہ کسی طرح مسجد کا جزو نہیں ہو سکتا اس لیے کہ کسی مسلمان نے وہاں بوٹ پہن کر جانے سے نہیں روکا''[۲۰]۔ مولانا محمد علی جوہر نے اپنے ایک خط میں مسٹر بٹلر کی اس حرکت کو انتہائی شرم ناک قرار دیتے ہوئے لکھا کہ ''مہذب دنیا میں کیسا بھی کوئی مجسٹریٹ ہو، شہادت پیدا کرنے کے لیے ایسا افسوس ناک طریقہ نہیں اختیار کر سکتا''[۲۱]۔ سر جیمس مسٹن نے مولانا کے ہر خط کا جواب دیا لیکن اپنے فیصلے پر ڈٹے رہے۔ اپنے دستخط کے ساتھ جو تار انھوں نے بھیجا اس میں اس سڑک کی بناوٹ اور وضو خانے کے انہدام کو روکنے کی درخواست نامنظور کرتے ہوئے اگلے ماہ مسلمانوں سے ملاقات کا عندیہ دیا[۲۲]۔ سر جیمس مسٹن نے اس سلسلے میں نہ تو علمائے کرام سے کوئی مشورہ کیا اور نہ ہی مسلمانوں کے جذبات کو سمجھنے کی کوشش کی بلکہ ضلع مجسٹریٹ مسٹر بٹلر نے جو گوشالی کی اور حکمران قوم کا ایک فرد ہونے کے ناطے جوتوں سمیت مسجد میں گھسنے کی جو غلط قسم کی شہادت پیش کی اسے حقیقت جان کر مسجد کے انہدام کے فیصلے کو عملی جامہ پہنا دیا[۲۳]۔ مولانا محمد علی جوہر بھی اتنی آسانی سے ہمت ہارنے والے نہیں تھے۔ وہ سید وزیر حسن کے ہمراہ خاموشی سے ولایت روانہ ہوئے تاکہ مسلمانانِ ہند میں اس سانحے کے بعد جو عام بیزاری اور ناراضگی پھیل چکی تھی، اس سے برطانوی حکومت کے ارباب اقتدار کو باخبر کیا جاسکے[۲۴]۔ مولانا محمد علی جوہر نے اس سلسلے میں برطانوی مدبروں سے ملاقاتیں کیں۔ برطانیہ کے با اثر لوگوں سے ملے اور عام جلسوں میں تقاریر کر کے مسلمانوں کے جذبات کی ترجمانی کی لیکن سب نے ہی سنی ان سنی کر دی اور مولانا محمد علی جوہر ایک طرح سے ناکام واپس لوٹے[۲۵]۔

مسلمانوں کی جانب سے مسجد کان پور کی شہادت پر سخت رد عمل سامنے آیا۔ اس زمانے کے اہم اخبارات و رسائل نے اس خبر کو جلی حروف میں شائع کیا۔ اخبار ''زمیندار'' کے پلیٹ فارم سے مسجد کان پور کی شہادت کے خلاف بڑھ چڑھ کر حملے کیے گئے۔ حکمران تو پہلے ہی مولانا ظفر علی خان سے خار کھائے بیٹھے تھے، ان کی جانب سے فوری رد عمل سامنے آیا اور سر مائیکل اوڈوائر کو ''زمیندار'' پر پابندی لگانے کا موقع ہاتھ آ گیا۔ چناں چہ اخبار ''زمیندار'' اور ''پریس'' دونوں کو ضبط کرتے ہوئے دس ہزار

روپے کی ضمانت طلب کی گئی جو اس زمانے میں خاصی خطیر رقم تھی، لیکن مسلم عوام نے اس رقم کا بندوبست کر کے ''زمیندار'' کی شمع کو گل ہونے سے بچالیا[26]۔

رسالہ ''الہلال'' بھی اس سلسلے میں پیش پیش تھا۔ اس سانحے کے رونما ہونے سے قبل ہی مذکورہ رسالے میں اس موضوع سے متعلق مباحث کا آغاز ہو چکا تھا۔ مسجد کی حرمت سے متعلق متعدد مضامین اور منظومات سے صفحات کے صفحات بھر دیے گئے[27]۔ مسجد کے انہدام کے بعد مسلمانوں میں ایک ہیجانی کیفیت پیدا ہو گئی۔ کچھ پُرجوش مسلمان مسجد کے منہدم حصے کی مرمت کے لیے سرکاری حکام کے خلاف وہاں جمع ہو گئے جس کے نتیجے میں فوج نے ان پر گولیوں کی بوچھاڑ کر دی[28]۔ اس سانحے کی درست تاریخ کی بابت بعض محققین مغالطے کا شکار دکھائی دیتے ہیں۔ ''حیات شبلی'' میں سہواً ۱۳ اگست کی تاریخ درج ہے[29] جب کہ ضیاالدین احمد برنی نے بعینہٖ مذکورہ تاریخ اور واقعے کو بغیر کوئی حوالہ درج کیے اپنی تصنیف ''حیات مولانا محمد علی جوہر'' میں دہرایا ہے[30]۔ اس کے علاوہ سید اشتیاق اظہر نے اس خونیں واقعے کی تاریخ ۲ اگست ۱۹۱۳ء بتائی ہے[31]۔ سانحے کے متعلق سید سلیمان ندوی نے اپنے مشہور مضمون ''مشہد اکبر'' میں واضح طور پر ۳ اگست کی تاریخ درج کی ہے[32]۔ یہ مضمون ابتداً ''الہلال'' میں شائع ہوا تھا جس کے بعد اخبار کی ضمانت ضبط ہو گئی تھی۔ مولانا ابوالکلام آزاد ان دنوں کان پور ہی میں مقیم تھے، اس کامیاب مضمون پر انھوں نے سید سلیمان ندوی کو مبارک باد کا تار بھی بھیجا تھا[33]۔ رئیس احمد جعفری کے مطابق اس روز مولانا آزاد سبحانی، جنھیں سیاست سے دور کا بھی لگاؤ نہیں تھا اور جو اپنا وطن گورکھ پور چھوڑ کر کان پور محض درس گاہ ''مدرسہ الٰہیات'' کی خدمت کی غرض سے آئے تھے، مسجد کے انہدام کے بعد پہلی بار اپنی دنیا سے باہر نکلے اور شوقِ شہادت سے سرشار ہو کر ایسا خطاب کیا کہ پورے جلسے پر سحر طاری ہو گیا[34]۔ ان کی ولولہ انگیز تقریر نے ماحول ہی بدل ڈالا۔ بلاشبہ یہ دنیا کی تاریخ ساز تقریروں میں سے ایک تھی جو ذہنِ انسانی کو قربانی اور ایثار کی انتہائی سرحدیں چھونے پر مجبور کر دیتی ہے[35]۔ جلسے کے بعد پُرجلوش مسلمانوں نے جن میں بچے بھی شامل تھے، مسجد کا رخ کیا اور مسجد کی منہدم دیوار پر اینٹیں چُن چُن کر رکھنے لگے[36]۔ برطانوی حکومت کے اس دور میں جب کہ ان کی قلم رو میں آفتاب غروب نہیں ہوتا تھا، برصغیر میں سب سے پہلے اہل کان پور نے انھیں للکارا[37]۔ فرنگی استبداد کے لیے ماتحت رعایا کا یہ جذبہ جہاد، کھلی بغاوت کا درجہ رکھتا تھا[38]۔ سید سلیمان ندوی نے اس واقعۂ ہائلہ پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ:

> مسٹر بٹلر ڈپٹی کمشنر کان پور نے یہ دیکھ کر کہ مسجد میں متعین سکھ فوج کو ان نہتے مسلمانوں پر حملہ کرنے کا حکم دے دیا۔ فوجی، پولیس کے سپاہیوں اور سواروں نے نہایت بے رحمی سے ان پر گولیاں برسائیں اور قریب آکر برچھے مارے۔ شہیدوں اور زخمیوں میں ننھے منّے بچے بھی شامل تھے[39]۔

مولانا آزاد کے مطابق اس دن کا ''آفتاب خون کے فوّاروں، لاشوں کے اضطراب، معصوم بچوں کے زخم ہائے خوں چکاں اور انسانی مظلومی و بے کسی کے اشک ہائے حسرت کے ساتھ افق کان پور پر طلوع ہوا''[40]۔ مسلح فوج ''دس منٹ تک اپنی

بندوقوں سے اڑا اڑا کر ایک گولیوں کی چادر ہوا میں پھیلا دیتی۔ پردا جب چاک ہوتا ہے میدان میں خاک و خون میں تڑپتی ہوئی لاشیں نظر آتی ہیں"[۴۱]۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے مسجد میں ہونے والی گولیوں کی بوچھاڑ کی منظر کشی کرتے ہوئے لکھا کہ مسجد میں داخل ہوتے ہی محراب کی طرف پشت والی دیوار کے پیچھے سات فٹ کے فاصلے پر دونوں جانب گولیوں کے بے شمار نشانات ہیں۔ یہ نشانات اسی صورت میں پڑ سکتے ہیں جب پولیس اندر آ کر فائر کرے۔ جگہ جگہ خون کے دھبے دیواروں اور چو کھٹوں پر پڑے ہوئے ہیں اور یہ دھبے اس بات کی شہادت پیش کرتے ہیں کہ خدا کے گھر میں بڑی تعداد میں خون ریزی کی گئی۔ اگر مسٹر بٹلر پہلے ہی احتیاط سے کام لیتے ہوئے مسجد کی طرف مسلح پولیس کے دستے متعین کر دیتے تو غالباً یہ بلوا نہ ہوتا[۴۲]۔ اس پولیس کارروائی میں متعدد مسلمانوں نے جام شہادت نوش کیا۔ بقول ڈاکٹر سید سعید احمد "مسلمان مرتے جاتے تھے اور ان کی جگہ دوسرے مسلمان آگے بڑھ کر تعمیر کرنے لگتے"[۴۳]۔ ۷ اگست ۱۹۱۳ء کو خواجہ حسن نظامی نے میرٹھ کی جامع مسجد میں نماز جمعہ کے اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ: "مسلمانوں کو لگاتار فائر کر کے خاک و خون میں ملا دیا۔ بزرگوں کی لاشیں تڑپ تڑپ کر گرتیں اور ان کی سفید داڑھیاں خون میں لال ہو جاتیں"[۴۴]۔

سرکاری اعداد و شمار کے مطابق بلوے کے شہدا کی تعداد محض ۲۲ تھی[۴۵]۔ سید سلیمان ندوی نے ان اعداد و شمار پر اعتراض اٹھائے ہیں۔ وہ حکومتی بیانات کو طنز و تقریظ کا نشانہ بناتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

> گورنمنٹ کا فرشتۂ غیب ہم کو اطلاع دیتا ہے کہ میدان میں چودہ لاشیں تھیں۔ پھر بتاتا ہے کہ اٹھارہ لاشیں تھیں۔ عقیدت مند دل اس کو تسلیم کرتا ہے لیکن عقل حجت طلب کو کیوں کر سمجھائیں کہ ایک تنگ میدان میں دس پندرہ ہزار آدمیوں کا مجمع ہو۔ پولیس بے محابہ ... ان پر گولیاں برساتی ہو... اور صرف اٹھارہ لاشیں اس کے صدمے سے گر پڑتی ہیں[۴۶]۔

اپنی ایک اور تصنیف میں وہ سرکاری اعداد و شمار پر طنز کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ "شہدا کی تعداد کا صحیح اندازہ معلوم نہ ہو سکا۔ سرکاری اندازہ بیس تیس آدمیوں کا تھا"[۴۷]۔ حکومتی اعداد و شمار ظاہر ہے کہ درست نہیں تھے۔ اس بات کی تصدیق یکم اکتوبر ۱۹۱۳ء کے "الہلال" کی اشاعت سے بھی ہوتی ہے۔ اس شمارے میں روزنامہ "زمیندار" لاہور میں شائع ہونے والے ایک مراسلے کا ذکر ہے۔ یہ مراسلہ ایک ہندو زمیندار رام ناتھ کے دستخط کے ساتھ شائع ہوا۔ بعد میں ۱۷ ستمبر ۱۹۱۳ء کے "الہلال" میں بھی اس مراسلے کو نقل کیا گیا۔ رام ناتھ ایک مقدمے کے سلسلے میں یکم اگست سے ۱۸ اگست ۱۹۱۳ء تک کان پور میں مقیم رہے۔ اس مراسلے میں انھوں نے لکھا کہ:

> ۳ اگست کا واقعہ مسلمانوں کا نسبت مسجد مچھلی بازار میرے سامنے ہوا۔ ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ جائے وقوعہ کے علاوہ شہر میں جہاں مسلمان نظر پڑے۔ بندوقوں کے فیر (فائر) سے ہلاک کر ڈالے گئے اور جائے وقوعہ یعنی مسجد میں تو بے انتہا مسلمانوں کو گولیوں سے فنا کر ڈالا اور کوئی ڈیڑھ

سولاشیں بوریوں میں بند کر کے جب کہ ہم اشنان کرتے تھے، دریا میں عجلت کے ساتھ پھینک دی گئیں۔۔۔ ہم یہ شہادت عدالت میں دے سکتے ہیں[۴۸]۔

اس عینی گواہ کی شہادت کو مولانا ابو الکلام آزاد نے بھی اپنے ایک مضمون میں پیش کیا ہے[۴۹]۔ اس سانحے کے رونما ہونے کے فوری بعد سید سلیمان ندوی جو اس وقت ''الہلال'' کے رکن ادارت میں شامل تھے[۵۰] نے ''مشہد اکبر'' کے عنوان سے جو مضمون لکھا اس میں بھی لاشوں کو دریا برد کرنے کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ''پلس (پولیس) نے تمھاری لاشیں دریا میں نہیں پھینکیں اور زمین میں دفن نہیں کیں تو یقیناً تمھاری لاشوں کو فرشتوں نے اٹھالیا کہ رضوانِ الٰہی ان کا منتظر تھا''[۵۱]۔ شہدا کی تعداد سے متعلق اگر مذکورہ دلیل بھی ناکافی ہوں تو اس بات کا حکام کے پاس کیا جواب تھا کہ پندرہ منٹ تک جاری رہنے والی مسلسل گولیوں کی بوچھاڑ، جس کے دوران پانچ سو کارتوس استعمال کیے گئے۔ اس بات کا اعتراف مسٹر ٹیلر کو بھی تھا[۵۲]۔ مولانا ابو الکلام آزاد نے ان کارتوسوں کی تعداد بتاتے ہوئے لکھا کہ ''چھے سو کارتوسوں کے وحشیانہ اسراف قوت کے بعد برطانوی انصاف کی نعش بالآخر گنگا میں دفنا دی گئی''[۵۳]۔ اتنی بڑی تعداد میں کارتوس کسی نہ کسی پر تو استعمال کیے گئے لیکن حکومتی موقف بہر حال یہی رہا۔ گولیوں کے علاوہ سپاہیوں اور سواروں نے مظاہرین پر نہایت بے رحمی سے برچھے مارے۔ ان کے جسموں میں نیزوں سے سوراخ کیا گیا، لوگوں کی آنکھوں میں سنگین گھونپی گئی۔ ان کے ایک ایک عضو کو زخموں سے چور کیا گیا[۵۴]۔ غرض کہ اس خونیں واقعے میں سیکڑوں کی تعداد میں لوگ زخمی بھی ہوے[۵۵]۔ ان زخمیوں میں کم عمر لڑکے اور لڑکیاں بھی تھیں۔ ''الہلال'' میں ایک آٹھ برس کی لڑکی کی تصویر بھی شائع ہوئی جس کا شانہ چھرّوں سے بری طرح زخمی تھا[۵۶]۔ جس سے مسلح پولیس کی بربریت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ زخمیوں کے ساتھ ہونے والے سلوک کا اندازہ ۲۸ اگست کے روزنامہ ''ہمدرد'' کے وقائع نگار کے مکتوب سے لگایا جا سکتا ہے۔ اس کے خاص خاص حصوں کو رئیس احمد جعفری نے بھی نقل کیا ہے جس کے مطابق ان زخمیوں کو دیکھنے کے لیے سول سرجن سے ملاقات کرنے کے لیے بھی لوگوں کو پون پون گھنٹے انتظار کرنا پڑا۔ ادھر لوگ زخم سے چور چور تھے اور اُدھر موصوف ناشتہ تناول فرمارہے تھے۔ دیر سے آکر تاخیر کا یہ عذر پیش کیا کہ ''میں بھول گیا تھا، معاف کیجیے''[۵۷]۔ ملاقات کے لیے اجازت نامہ تحریری طور پر جب مل گیا، جیل کے دروازے پر ان مجروحین کے عزیز و اقارب بڑی تعداد میں موجود تھے، اجازت نامہ داروغہِ جیل کو پہنچایا گیا۔ شفاخانے میں مجروحین برآمدے تک میں پڑے ہوئے تھے۔ ایک زخمی امید علی کو بہت ضربیں آئی تھیں۔ بندوق کے چھرّوں اور نیزے کے کچوکوں سے اسی بری طرح زخمی کیا گیا تھا۔ زخمیوں میں بوڑھے اور کم عمر افراد کی بڑی تعداد تھی۔ دو سگے بھائیوں نور الٰہی اور اشفاق الٰہی کی حالت تو قابلِ رحم تھی۔ ان میں سے اشفاق الٰہی جو بارہ برس کا تھا، بعد میں شہید ہو گیا۔ دوسرے کی دماغی حالت پر بہت منفی اثر پڑا۔ ڈاکٹر عبد الصمد ان زخمیوں کی مرہم پٹی اور دل سوزی میں لگے ہوئے تھے۔ ۱۰۷ گرفتار مجروحین کا علاج وہاں ہو رہا تھا[۵۸]۔ خواجہ حسن نظامی کے مطابق:

> ایک ایک پلنگ پر دو دو زخمی نظر آئے... کسی کی آنکھ میں نیزے کی انّی چبھ گئی، کسی کا سینہ زخموں سے چُور ہے، کوئی خون تھوک رہا ہے، کسی کا سر پھٹ گیا ہے، کسی کا دھڑ سنگین سے ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا ہے... کسی کے ہاتھ میں برچھیوں کی نوکیں گھُس گئی ہیں، کوئی تڑپتا ہو گا، کوئی تڑپ بھی نہ سکتا ہو گا۔ کوئی کراہتا ہو گا کوئی کراہ بھی نہ سکتا ہو گا[۵۹]۔

ان میں سے بعض زخمی بعد میں جاں بحق ہو گئے، کچھ معذور اور لاتعداد مہینوں تک ان زخموں کی وجہ سے کام کاج کے قابل نہ رہے۔ ان مظالم کے رد عمل میں پورے ہندوستان کے مسلمانوں نے احتجاج کیا۔ بعض غیر مسلم تنظیموں نے بھی اس سانحے پر اپنے غم وغصے کا اظہار کیا۔ شدید غم وغصے اور ہیجانی کیفیت کا اندازہ اس دور میں شائع ہونے والے مضامین، مراسلات اور شعرا کی تخلیقات سے لگایا جا سکتا ہے جو "الہلال"، "زمیندار"، "ہمدرد" اور دیگر اخبارات میں وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہے۔ ایک مراسلہ نگار خان محمد قریشی نے ان مظالم کو نازیوں کے مظالم سے تشبیہ دیتے ہوئے لکھا کہ:

> افسوس! اے کان پور کے شہیدو!... تمھاری نعشوں کو پھولوں کی چادر نصیب نہ ہوئی... یاد رکھو کہ تمھارے بھائیوں کے دلوں پر تمھارے یوں چلے جانے سے جو کاری زخم لگا ہے وہ ہمیشہ ناسور بنا رہے گا۔ مسٹر ٹائلر کی دھواں دھار بوچھاڑ اور ان کی سنگینوں کی چمک بجلی کی طرح مدتوں تک ان کے کانوں میں گونجتی اور آنکھوں میں چمکتی رہے گی[۶۰]۔

اس خونیں سانحے کے بعد پولیس کی جانب سے گرفتاریوں کا لامتناہی سلسلہ بھی شروع ہو گیا۔ بڑی تعداد میں لوگوں کو گرفتار کر کے پابند سلاسل کیا گیا۔ تمام سرکردہ علما گرفتار کر لیے گئے۔ مولانا آزاد سبحانی کے علاوہ نظامی پریس کے مالک ابو سعید اور مولانا فیض الحسن گنگوہی بھی گرفتار ہونے والوں میں شامل تھے[۶۱]۔ عام قیدیوں میں بوڑھے اور جوانوں کے ساتھ ساتھ کم عمر بچے بھی شامل تھے۔ تعجب کی بات تو یہ ہے کہ مسٹر ٹیلر کی ایما پر ان کے کم عمر بچوں پر بغاوت کے مقدمات قائم کیے گئے[۶۲]۔ گرفتار شدگان میں ۱۰۶ لوگوں پر ۱۴ اکتوبر تک مقدمات چلتے رہے[۶۳]۔ کچھ کم عمر لوگوں کو اس سے قبل ہی رہا کر دیا گیا۔ "الہلال" میں وقتاً فوقتاً ان رہا کیے گئے بچوں کی تصاویر بھی شائع ہوتی رہیں۔ مثلاً ۱۳ ستمبر ۱۹۱۳ء کو رہا کیے گئے ان گیارہ معصوم بچوں کی تصاویر ۲۴ ستمبر والے پرچے میں شائع ہوئیں[۶۴]۔ اس کے علاوہ ۱۸ اکتوبر ۱۹۱۳ء کو بھی رہا ہونے والے ان ۲۴ بچوں کی تصاویر شائع ہوئیں جنھیں ۱۳ اگست کے خونیں سانحے کے بعد گرفتار کیا گیا تھا۔ تصویر کے کیپشن میں سہواً بچوں کی تعداد ۴۰ درج کر دی گئی ہے۔ جب کہ اصل تصویر میں ۲۴ بچے موجود ہیں۔ یہی تعداد درست بھی ہے کیوں کہ اسی پرچے کے سرورق پر بھی یہی تصویر موجود ہے جس میں واضح طور پر بچوں کی تعداد ۲۴ درج ہے۔ "الہلال" کے اسی شمارے میں مسجد کے صحن اور محراب کا تصویری منظر بھی دکھایا گیا ہے جس میں خون کے دھبے واضح طور پر دیکھے جا سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ متنازع منہدم حصے کی تصویر بھی موجود ہے جس کو ڈھانے کے بعد ہتھیاروں سے لیس سرکاری اہلکار مستعد کھڑے دکھائی دے رہے ہیں[۶۵]۔ یکم اکتوبر کے "الہلال" میں

بھی خون کے چھینٹوں سے بھرے صحن کے علاوہ ۱۳ ستمبر کو رہائی پانے والے گیارہ اور آخری دن رہائی پانے والے ان چار لڑکوں کی تصاویر بھی شائع ہوئیں[۶۶]۔

"ہمدرد" میں بھی اس سانحے کی لحہ بہ لحہ رپورٹ شائع ہوتی رہی۔ غرض کہ اس زمانے کے اخبارات ورسائل نے ان واقعات کو بھرپور انداز سے پیش کیا تاکہ مسلمانوں کے جوش و جذبے کو ابھارا جاسکے۔ اخبار "آزاد" کان پور نے بھی عدالت کی کارروائی اور مستند اور مفصل حالات شائع کرنے کا بھرپور اہتمام کیا۔ اس بابت اس اخبار کے اشتہارات وقتاً فوقتاً "الہلال" میں بھی شائع ہوتے رہے[۶۷]۔ ان کوششوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمانوں کی بڑی جماعت خصوصاً سرکردہ رہنماؤں نے ان مجروحین اور گرفتار شدگان کی مالی اعانت کا بیڑہ اٹھایا۔ خواجہ حسن نظامی نے اس سانحے پر "کان پور کی خونیں داستان" کے عنوان سے ۳۱ صفحات پر مشتمل کتاب چہ تحریر کیا جس کے سرورق پر یہ اعلان بھی کیا کہ اس تصنیف کا نفع مظلوم فنڈ کو دیا جائے گا[۶۸]۔ مولانا محمد علی طبیب سیشن جج صوبہ ورنگل علاقہ نظام نے ۵ روپے کی تاحیات اعانت ماہانہ دینے کے ساتھ ساتھ اس سانحے کے متاثرین کے لیے کوئی فنڈ قائم کرنے کا مشورہ دیا[۶۹]۔ مظہر الحق نعمانی ردولوی نے یکم اکتوبر کے مراسلے میں چندہ مہم چلاتے ہوئے ہندوستانی مسلمانوں کو مخاطب کیا اور کہا کہ ہندوستان کے سات کروڑ مسلمانوں نے ایک پیسہ فی نفر کے حساب سے بھی متاثرین کان پور کی مدد کی تو دس لاکھ ترانوے ہزار سات سو پچاس روپے جمع ہوسکتے ہیں[۷۰]۔ اسی طرح "انجمن دفاع مسجد مقدس کان پور کلکتہ" کے نام سے ایک الگ انجمن قائم کی گئی، جس کے صدر مولانا ابوالکلام آزاد، سیکریٹری آنرایبل فضل حق اور مسٹر اے۔ رسول ایم۔ اے۔ بیرسٹر لا کو خزانچی مقرر کیا گیا۔ ٹاؤن ہال کلکتہ میں اس مجلس کا پہلا اجلاس مورخہ ۱۹ اکتوبر کو منعقد ہوا۔ اس مجلس کے تحت ہر شہر میں "دفاعِ مسجد کان پور" کے نام سے مجالس قائم کی گئیں۔ وفود بناکر وائسرائے ہند اور انگلستان تک اس سلسلے کے لیے آواز بلند کرنے کا اعادہ کیا گیا[۷۱]۔ عام مسلمانوں کا جذبہ ایثار دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ "ہمدرد" کے نمائندہ خصوصی نے عید کے موقعے پر ہونے والے اس اجلاس کی روداد بیان کرتے ہوئے لکھا کہ ۱۹ ستمبر ۱۹۱۳ء کو کمرہ کھچاکھچ بھرا ہوا تھا۔ مجمع اس قدر زیادہ تھا کہ چندے کی رقم لینے اور رسیدیں کاٹنے میں بھی دشواری ہو رہی تھی۔ محلے محلے کے لوگ جوق در جوق آتے تھے اور اپنی اپنی مسجدوں اور گھروں سے جمع کیا ہوا چندہ، پیسے، اکنّیاں، دونیاں وغیرہ لاکر لجاجت اور انکسار کے ساتھ پیش کرتے۔ صاحبِ استطاعت لوگ اپنے بچوں کی عیدیوں کی معقول رقمیں شہدا اور مجروحین کے بچوں کے لیے پیش کرتے تھے۔ احساسِ قومی کا یہ حال تھا کہ شام کے وقت کچھ برقعہ پوش طوائفیں بھی چندہ جمع کرنے کے لیے وہاں پہنچیں[۷۲]۔ نواب وقار الملک جیسے انگریز دوست اصحاب نے بھی اس فنڈ میں دل کھول کر حصہ لیا[۷۳]۔ اس بابت سر رضا علی نے تو یہ بھی کہا کہ وقار الملک نے مہاراجا صاحب محمود آباد اور مولوی عبدالباری فرنگی محلی کے دوش بدوش اس موقع پر رہبری کا فریضا بھی انجام دیا[۷۴]۔

ملکی سطح پر اس مہم کا یہ فائدہ ہوا کہ ہندوستان کے مختلف شہروں سے ہزاروں روپے کی رقم جمع ہوئی۔ اس حوالے سے سرکردہ علما اور عوام و خواص کی وہ فہرست جنھوں نے دفاع مسجد کان پور کے تحت مالی تعاون میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، ''الہلال'' کے مختلف شماروں میں دیکھی جا سکتی ہے[۷۵]۔ ۱۷ دسمبر ۱۹۱۳ء کی اشاعت میں بھی چندہ دینے والوں کی طویل فہرست شائع ہوئی[۷۶]۔ لوگوں نے دوسرے شہروں سے بھی منی آرڈر ارسال کر کے خطیر رقم روانہ کی[۷۷]۔ اس سلسلے میں لوگوں کی تجاویز اور آرا بھی شامل ہوتی رہیں۔ مثلاً وکیل محمد علی افسوس نے لکھا کہ جو چندہ وصول کیا جا رہا ہے، وہ صرف مقدمے کے لیے اور بیرون ملک بھیجے گئے وفود کے اخراجات پر خرچ ہوتا ہے۔ کچھ پیسہ تجارت میں لگا کر اس کا منافع اس سانحے کے متاثرین کو دینے کا بندوبست کیا جائے تو بہتر ہوگا[۷۸]۔ سید احمد حسین کے مطابق ۲۹ اکتوبر ۱۹۱۳ء تک کان پور کے فنڈ میں تقریباً ایک لاکھ روپے کی خطیر رقم محفوظ ہو گئی[۷۹]۔ بعض اصحاب نے جمع کی گئی رقم سے متعلق سوالات بھی اٹھائے[۸۰]۔ مولانا نجم الدین ریٹائرڈ ڈپٹی کلکٹر نے بچی ہوئی رقم کو جنوبی افریقہ کے مصیبت زدہ مسلمانوں پر خرچ کرنے کا مشورہ بھی دے ڈالا[۸۱]۔ حالانکہ سر علی رضا نے اپنی تقریروں میں چندے کی رقم کے مصارف میں واضح طور پر کہا کہ یہ رقم پسماندگان شہدائے کان پور، مجروحین اور ملزمین کی پیروی میں خرچ کی جائے تو بہتر ہے۔ اس کے علاوہ مسجد کو واپس لینے کے لیے جو قانونی چارہ جوئی پر رقم خرچ ہو، وہ بھی اسی چندے کی رقم سے ادا کی جائے[۸۲]۔

ان ملزمین کے مقدمات کا اختتام ۱۶ اکتوبر ۱۹۱۳ء کو ہوا جب وائسرائے مچھلی بازار کے معائنے کے لیے آئے۔ مسلم اکابرین ان کے ہمراہ تھے۔ مسٹر لائل، سیشن جج کی آمد کے وقت بہ کثرت لوگ موجود تھے۔ دفعہ ۴۹۴ تین درخواستیں فوج داری کی سماعت ہونا مقصود تھی۔ عدالت نے مسٹر مظہر الحق سے دریافت کیا کہ بہ لحاظ چند وجوہات گورنمنٹ کو ان مقدمات کو چلانا منظور نہیں، آپ کو ان درخواستوں پر تو کوئی عذر نہیں؟ جواب نے مسٹر مظہر نے بہ خوشی اس بات کو قبول کر لیا۔ اس بات میں کوئی شبہ نہیں کہ مسٹر مظہر الحق، راجہ صاحب محمود آباد نے خصوصاً اور دیگر قانون پیشہ افراد نے اس سانحے کے موقع پر عموماً اپنا قومی فریضا پوری تندہی سے ادا کیا[۸۳]۔ ڈاکٹر وقار احمد رضوی کے مطابق علامہ اقبال بھی مقدمہ لڑنے کان پور گئے[۸۴]۔ لیکن اس بات کی کوئی شہادت نہیں ملتی۔ بعد میں سرمایہ مسجد جو اس وقت مبلغ نوّے ہزار روپے نقد مسٹر مظہر الحق کی تحویل میں تھا، کی بابت یہ رائے ظاہر کی گئی کہ اس سرمائے سے کان پور میں ایک اسلامیہ اسکول جس کے ساتھ ایک جامع مسجد بھی ہو، اس بے نظیر قومی ایثار کی یاد میں قائم کر دیا جائے[۸۵]۔

سانحہ مسجد کان پور بظاہر کوئی غیر معمولی نوعیت کا واقعہ معلوم نہیں ہوتا لیکن یہ سانحہ تاریخ ساز اہمیت کا حامل ضرور ہے۔ غیر منقسم ہندوستان میں مسلمانوں کی فکری، سیاسی اور ملی شعور کی تاریخ میں یہ سانحہ ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اگر یہ حادثہ رونما نہ ہوتا تو شاید ایک عرصہِ دراز تک مسلمانوں میں فرنگی سامراج سے نبرد آزما ہونے کا حوصلہ پیدا نہ ہوتا۔ وہ

بزدلی، نیاز مندی اور غیر مشروط اطاعت کی زندگی بسر کرتے رہتے، لیکن اس سانحے نے انھیں جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ وہ خواب خرگوش سے جاگ اٹھے۔ ان میں مرنے اور مٹنے کا جذبہ پیدا ہو گیا۔ سنگینوں کے سامنے وہ سینہ کھول کر کھڑے ہو گئے۔ گولیاں انھوں نے پیٹھ پر نہیں دل پر کھائیں۔ خاک و کون میں تڑپے اور جام شہادت نوش کر کے حیات جاودانی حاصل کرلی۔ ہندوستان کی تاریخ میں اس وقت تک کسی اور واقعے نے انھیں اس قدر بیدار نہیں کیا تھا جتنا اس واقعے نے کیا۔ کسی بات سے بھی ان میں اتنی جرات پیدا نہیں ہوئی جتنی اس سانحے سے پیدا ہوئی۔ مسجد کان پور کے سلسلے میں مسلمانوں کا قید و بند اور دار و رسن کا معاملہ اس جہاد، بیداری اور شعور کا محرک بنا جو تحریک خلافت کی صورت میں پوری دنیا کے سامنے آیا[۸۶]۔

قریہ قریہ شہر شہر اس مسئلے میں جو جلسے منعقد ہوئے اس نے حکمرانوں کو بوکھلا کر رکھ دیا۔ مسلمان مشاہیر کی کڑی نگرانی کی جانے لگی۔ لکھنؤ میں ہونے والے جلسے کو تو زبردستی لیفٹیننٹ گورنر کے حکم سے بند کروا دیا گیا[۸۷]۔ اس کے علاوہ ۵ اگست ۱۹۱۳ء[۸۸] کو ریسٹورنٹ اسکوائر لندن میں ہندوستانی مسلمانوں کا ایک غیر معمولی جلسہ ہوا جس میں مسجد کان پور کی زمین واپس دے کر دوبارہ سے مسجد کی تعمیر کا مطالبہ کیا گیا اور متاثرہ خاندانوں سے تعزیت کی گئی[۸۹]۔ اسی طرح حکومتی پروپیگنڈے کا موثر جواب دینے میں مسلمان کافی حد تک کامیاب رہے۔ حکومت نے یہ سمجھا تھا کہ مسلمان ہر اعتبار سے پس ماندہ ہیں۔ غدر میں انھیں اس قدر کچلا اور تباہ و برباد کیا جا چکا ہے کہ ان میں حکومت سے ٹکر لینے کی سکت نہیں رہی[۹۰]۔ انھوں نے اس حادثے کی اہمیت کو کم کرنے کے لیے مختلف طرح کے اعلانات اور بیانات حکومت کے منظور نظر اخبارات میں شائع کروائے۔ اس سلسلے میں ''پانیر'' کی روش دیکھیے، لکھتا ہے کہ ''اس کارروائی (انہدام مسجد) کے بعد یہ معاملہ جو کچھ عرصے سے زیر بحث ہے، ختم ہو جائے گا''[۹۱]۔ ہمدرد نے اس کے جواب میں لکھا کہ ''پانیر کو یاد رکھنا چاہیے کہ مسلمان اس مذہبی دست اندازی کو ہرگز نہیں بھول سکتے۔ یہ ایک خار ہے جو ان کے سینے میں چبھ رہا ہے اور چبھتا رہے گا، جب تک منہدم شدہ حصہ پہلی صورت میں نہ بنا دیا جائے''[۹۲]۔ غرض کہ اس خونیں سانحے نے تمام ہندوستان کو خونیں بنا دیا۔ آتش بیاں مقرروں، شعلہ فشاں محرروں اور شعلہ نفیس شاعروں نے مسلمانوں کے دلوں میں آگ لگا دی تھی[۹۳]۔ اب تک مسلمانوں نے مسجد کے منہدم حصے کی دوبارہ تعمیر سے متعلق جتنے مطالبات کیے وہ رد کیے جا چکے تھے۔ جتنی عرض داشتیں پیش کیں، انھیں مسترد کر دیا گیا تھا اور جتنی فریادیں کی گئی تھیں انھیں مستحق سماعت نہیں سمجھا گیا تھا۔ بالآخر راجا سر علی محمد خان محمود آباد کی قیادت میں ایک وفد مرتب کیا گیا۔ اس وفد نے ایک میمورنڈم لکھا جس میں ارکانِ وفد مولانا قیام الدین عبد الباری فرنگی محلی، آنریبل راجا میر امیر جعفر، تعلقہ دار، پیر پور، نواب محمد اسحاق خان، نواب مزمل اللہ خان آف بھیکم پور، آنریبل مسٹر عبد الرؤف سابق جج الہ آباد ہائی کورٹ، آنریبل مسٹر شاہد حسین تعلقہ دار، آنریبل خواجہ غلام الثقلین، آنریبل سر رضا علی، مسٹر سید نبی اللہ بیرسٹر لا آگرہ، نواب حبیب الرحمٰن خاں شیروانی، مولوی محمد نسیم ایڈووکیٹ اور منشی احتشام علی صاحب رئیس کاکوروی کے دستخط بھی تھے۔ اس میمورنڈم میں عام واقعات کی تفاصیل بیان

کرنے کے بعد آخر میں یہ مطالبہ بھی کیا گیا تھا کہ مسجد کے منہدم حصے کو دوبارہ تعمیر کر دیا جائے[94]۔ لیکن جیمس مسٹن پر ان مشاہیر علم و ادب اور مسلم رہنماؤں کا کوئی اثر نہ ہوا اور وہ اپنے فیصلے پر اٹل رہا۔ غالباً اس کے ذہن میں یہ بات تھی کہ ''منہدم مسجد کی دوبارہ تعمیر سے حکومت کی کمزوری ثابت ہوگی''[95] بلکہ اس نے اس وفد پر زور زبردستی اپنی بات منوانے کا الزام بھی لگایا جس کے جواب میں ''ہمدرد'' نے لکھا کہ:

> اگر ہز آنر کا اشارہ اسی زور و زبردستی کی طرف ہے جس کے مقابلے میں حکومت برطانیہ کے نمائندے کی حیثیت سے سوار اور پیدل فوج اور بے شمار پولیس لا کھڑی کرنا اپنے اقتدار کے لیے ضروری سمجھتے ہیں تو ہم نہیں کہہ سکتے یہ اقتدار کب تک قائم رہے گا؟[96]۔

اس خونی سانحے نے بقول سید سلیمان ندوی ''تمام ہندوستان کو خونیں بنا دیا تھا''[97]۔ اس معرکے میں مسلمانانِ کان پور نے انگریز تسلط کی صد سالہ تاریخ میں پہلی بار بے پناہ عزم اور ولولے کا مظاہرہ کر کے جنوبی ایشیا میں فرنگیوں کی حکومت کی بنیادیں ہلا دیں[98]۔ سیاسی اعتبار سے یہ معرکہ جنوبی ایشیا میں انگریزی اقتدار کے خلاف کھلی محاذ آرائی کے طور پر سامنے آیا اور اہلِ ہند پر یہ بات آشکار ہو گئی کہ انگریزی حکومت کا غلبہ ناقابلِ تسخیر نہیں ہے[99]۔ عوام کے جذبات مشتعل ہوئے تو ملک کے طول و عرض میں شدید بے چینی کی لہر دوڑ گئی۔ کہنے کو تو یہ ایک مسجد کا واقعہ تھا لیکن اس کی تہہ میں آزادی اور حریت پرستی کا جذبہ کام کر رہا تھا[100]۔

یہ واقعہ اس اعتبار سے بھی یادگار ہے کہ برطانوی ملوکیت کے دور میں پہلی مرتبہ شہری رعایا کے قتل عام کی نوعیت رکھتا ہے[101]۔ اس دور کے مسلم ادب کا تفصیلی جائزہ لیں تو ہندوستان میں مسلمانوں کی جگر سوزی اور غمگینی کا اندازہ ہوتا ہے۔ مقدمات چلے، چندے جمع ہوئے، پورے ہندوستان میں مسلمانوں نے ہر طرف اس الم ناک واقعے پر احتجاجی تحریک چلائی، مگر برطانوی حکومت نے پہلے سے بھی زیادہ سرد مہری دکھائی[102]۔ اس دور کے بہت سے اہلِ قلم نے اس ظلم کے خلاف آواز بلند کی۔ سید سلیمان ندوی کے مضمون ''مشہد اکبر'' کا ذکر اوپر آ چکا ہے جس پر ''الہلال'' کی ضمانت ضبط ہوئی تھی اور اس کے باوجود مولانا ابوالکلام آزاد نے اس کام یاب مضمون پر سید سلیمان ندوی کو مبارک باد کا تار دیا تھا۔ مسلمانوں کے جوش و خروش اور انگریزی حکوت کے خلاف نفرت کے اظہار کا اندازہ خواجہ حسن نظامی کی اس تقریر سے لگایا جا سکتا ہے جو انھوں نے ۷ اگست کو بعد نمازِ جمعہ میرٹھ کی جامع مسجد میں کی تھی۔ اس تقریر میں ان کا لہجہ دیکھیے:

> کیا یہ لوگ مسلمانوں کا جوش دیکھنا چاہتے ہیں۔ مگر ان سے کہہ دو کہ ہمارا جوش فیشن اور نمائش کا جوش نہیں ہے۔ ہم جب جوش میں آتے ہیں تو آسمان تھرّا جاتا ہے، سمندر ڈر کے مارے سمٹ جاتا ہے، پہاڑ پست ہو جاتے ہیں، دریاؤں کی روانی رُک جاتی ہے اور ہمارا جھنڈا جب بلند ہوتا ہے تو سینٹ پال کے گرجا کے سوا کہیں نصب نہیں ہوتا۔ ہماری مسجد کو بنا دو، ہمارے قیدیوں کو چھوڑ دو، ہمارے زخمیوں کو ہمارے حوالے کر دو[103]۔

بعد میں اس موضوع پر حسن نظامی کی کتاب "کان پور کی خونیں داستان" میر ٹھ سے ۱۹۱۳ء میں شائع ہوئی[104]۔ شبلی نے متعدد نظمیں اس سانحے سے متاثر ہو کر لکھیں۔ مولانا شبلی نے اس سانحے پر جو پُر جوش نظمیں لکھیں، وہ اس قدر پُر اثر ہوتیں کہ جس ہفتے "الہلال" کلکتا یا "ہمدرد" دہلی یا "زمیندار" لاہور میں چھپتیں، ہندوستان کے کونے کونے تک اسلامی جوش و جذبے میں اضافے کا باعث بنتیں[105]۔ ان شاہ کار نظموں میں "ہم کشتگانِ معرکہِ کان پور ہیں" پہلی نظم ہے جس میں جوش و خروش کا ایک نہ رکنے والا طوفان نظر آتا ہے۔ اس خونیں واقعے کی منظر کشی کرتے ہوئے شبلی کہتے ہیں کہ:

کل مجھ کو چند لاشہِ بے جاں نظر پڑے
دیکھا قریب جا کے تو زخموں سے چُور ہیں

کچھ طفل خور دسال ہیں جو چپ ہیں خود مگر
بچپن یہ کہہ رہا ہے کہ ہم بے قصور ہیں

کچھ نوجوان ہیں، بے خبر نشہِ شباب
ظاہر میں گرچہ صاحبِ عقل و شعور ہیں

کچھ پیر کہنہ سال ہیں دل دادہِ فنا
جو خاک و خوں میں بھی ہمہ تن غرقِ نور ہیں

پوچھا جو میں نے کون ہو تم؟ آئی یہ صدا
ہم کشتگانِ معرکہِ کان پور ہیں[106]

یہ نظم سوز و گداز کے لحاظ سے اردو کی بہترین نظموں میں شمار کی جا سکتی ہے[107]۔ شبلی نے جولائی ۱۹۱۳ء میں ندوہ سے استعفیٰ دیا تھا اور اس کے چند روز بعد ہی مسجد کان پور کا سانحہ رونما ہوا۔ یہ ایسا سانحہ تھا جس نے طرابلس اور بلقان کی لڑائیوں سے بھی زیادہ جوش پیدا کیا ہوا تھا۔ اس زمانے میں مولوی عبدالکریم کے واقعے سے طبقۂ احرار میں شبلی کی ساکھ پر منفی اثر پڑا تھا۔ لہٰذا مسجد کان پور کے سانحے سے شبلی کو ایک بار پھر موقع ملا کہ وہ پھر سے ان حلقوں میں اپنی جگہ بنا سکیں۔ اس وقت تک ان کی سیاسی نظمیں "کشاف"، "نقادیا" اس طرح کے فرضی ناموں سے شائع ہوتی تھیں۔ اب انھوں نے اعلانیہ اپنے نام سے نظمیں شائع کرائیں[108]۔ یہ نظمیں جوش و جذبے کو پیدا کرنے میں پہلے سے زیادہ موثر ثابت ہوئیں۔ اپنی ایک نظم "علمائے زندانی" میں کہتے ہیں کہ:

مساجد کی حفاظت کے لیے پولس کی حاجت ہے
خدا کو آپ نے مشکور فرمایا عنایت ہے

عجب کیا ہے کہ ہر شاہ راہ سے یہ صدا آئے
مجھے بھی کم سے کم اک غسل خانے کی ضرورت ہے

پنہائی جا رہی ہیں عالمانِ دیں کو زنجیریں
یہ زیور "سیدِ سجاد عالی" کی وراثت ہے

یہی دس بیس اگر ہیں کشتگانِ خنجر اندازی
تو مجھ کو سُستیِ بازوئے قاتل کی شکایت ہے

شہیدانِ وفا کے قطرہِ خوں کام آئیں گے
عروسِ مسجدِ زیبا کو افشاں کی ضرورت ہے

عجب کیا ہے جو نوخیزوں نے سب سے پہلے جانیں دیں
کہ یہ بچے ہیں ان کو جلد سو جانے کی عادت ہے

شہیدانِ وفا کی خاک سے آتی ہیں آوازیں
کہ شبلی بمبئی میں رہ کے محرومِ سعادت ہے[109]

سیاسی مسائل کے بیان میں شبلی جذبات سے کبھی علاحدہ نہ ہو سکے۔ کان پور کے اس سانحے کا سن کر بھی شبلی کو اپنے بر سر زمین موجود نہ ہونے کا بے حد افسوس تھا[110]۔ ان نظموں کا طنز اور اشتعال انگیزی مسلمانوں میں قومی غیرت و حمیت کا سبب تو بن ہی رہی تھی اس کے ساتھ ساتھ اس زمانے کے مسلمانوں میں اتحاد و اتفاق کا بھی زبر دست مظاہرہ دیکھنے میں آیا۔ جوشِ بیاں اور جرات گفتار کی ایسی مثالیں اس دور کی اردو شاعری میں کم ہی ملیں گی۔ مسٹر جیمس مسٹن اور مسٹر بٹلر جو اس واقعے میں براہ راست ملوث تھے۔ ان کو للکارتے ہوئے وہ اپنی ایک نظم ''آپ ظالم نہیں رہا پر ہم ہیں مظلوم'' میں کہتے ہیں کہ:

ہم غریبوں کو نہ پہلے تھا، نہ اب ہے انکار — کہ ہر اک شہر میں ہے آپ کے انصاف کی دھوم

یہ بھی تسلیم ہے ہم کو کہ یہ جو کچھ کہ ہوا — اس میں ملحوظ رہے عدل کے آداب و رسوم

آپ قانون کی حد سے نہ بڑھے یک سرِ مو — فیر کا حکم دیاآپ نے جب بہرِ نجوم

یہ حقیقت بھی قابلِ انکار نہیں — کہ بیک چشم زدن موت کو تھا اذنِ عموم

گولیاں کھا کے جو گرتے تھے جوانانِ حسین — سب یہ کہتے تھے ''قیامت ہے کہ جھڑتے ہیں نجوم''

گولیوں کے تھے نشاں منبر و محراب پہ بھی — بسکہ درکار ہیں مسجد کے لیے نقش و رسوم

جا بجا خون سے مسجد ہے نگاریں اب تک — یہ وہ صفت ہے کہ تا حشر نہ ہو گی معدوم

پا بہ زنجیر تھے مجرم بھی تماشائی بھی — اور پولس کو یہ تھا عذر کہ ''ہم ہیں محکوم''

واقعہ یہ ہے غرض، کوئی نہ مانے نہ سہی — آپ ظالم نہیں زنہار، پہ ہم ہیں مظلوم[111]

مسلمانوں کے اس قتلِ عام نے شبلی کو خون کے آنسو رلائے۔ طرابلس اور بلقان کے شہدا ہوں یا کان پور کے، شبلی نے ان سب کے لیے آنسو بہاتے ہوئے کہا کہ:

کیا پوچھتے ہو یہ کہ رسول عربؐ کی قوم — کیوں گھٹ رہی ہے آج عدو میں ظہور میں

سن لو وہ گنج ہائے گراں ما یہ دفن ہیں — کچھ بلقاں کی خاک میں کچھ کان پور میں[112]

بلقان کے معرکے کے بعد کان پور کا سانحہ جگر خراش دونوں نے شبلی کو بے چین کر رکھا تھا۔ جو لوگ اس خونیں واقعے میں زخمی ہوئی تھے شبلی ان سے اظہار یک جہتی کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

اگرچہ آنکھ میں نم بھی نہیں ہے اب باقی — اگرچہ صدمہِ بلقان سے جگر شق ہے

بچا رکھے ہیں مگر میں نے چند قطرہِ خوں — کہ کان پور کے بھی زخمیوں کا کچھ حق ہے[113]

اسی طرح جو لوگ اس سانحے کے بعد گرفتار ہوئے اور انھیں پابند سلاسل کیا گیا، ان میں علما بھی تھے اور عام لوگ بھی، ان سے آواز ملاتے ہوئے شبلی اپنی بے بسی کا اظہار کرتے ہیں۔ دراصل ۱۷ مئی ۱۹۰۷ء کو قیام اعظم گڑھ کے دوران بہو کی

غلطی سے بندوق چل جانے کی وجہ سے شبلی کو اپنے ایک پیر سے محروم ہونا پڑا۔ کارتوس میں اگرچہ چھرّے تھے مگر اس قدر قریب سے چلی تھی کہ ان کے ٹخنے کی ہدی بری طرح چور چور ہو گئی اور عمل جراحی کے ذریعے نصف پنڈلی کو جدا کرنا پڑا[۱۱۴]۔ اس بے بسی کی صورتِ حال میں بھی شبلی علمائے کان پور کے شانہ بشانہ چلنا چاہتے تھے، لیکن معذوری ان کے آڑے آرہی تھی۔ اس حالت کا اظہار کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ:

ہم قدم آپ کا ہونا تو بہت ہے دشوار	ان کا کیا ذکر جو اس درد میں شامل ہی نہیں
پاؤں کٹنے کا مجھے آج ہوا ہے صدمہ	یعنی افسوس میں زنجیر کے قابل ہی نہیں[۱۱۵]

اس کے علاوہ ''تقسیمِ عمل''، ''وضو خانہ'' اور ''کان پور میونسپلٹی کا خطاب مسجد مچھلی بازار کان پور سے'' [۱۱۶] کے عنوان سے انھوں نے فارسی نظمیں بھی کہیں اور جب اس مسجد کے متنازعہ حصے پر حکام اور مسلمانوں میں صلح کی شرائط طے ہو گئیں تو ''شرائط صلح'' کے نام سے بھی ایک نظم لکھی اور اس نظم میں حکام کی جانب سے کیے فیصلوں کو سخت تنقید کا نشانہ بھی بنایا۔ ان کی یہ نظم ''الہلال'' میں شائع ہوئی[۱۱۷] تو لوگوں نے شبلی کے نقطۂ نظر کو خوب سراہا۔

سر علی امام جو اسی زمانے میں وائسرائے کی کونسل کے رکن تھے، انھوں نے ہی مولانا محمد علی جوہر کو اور ان کے ذریعے مولانا عبد الباری فرنگی محلی کو مصالحت کا پیغام بھیجا تھا۔ اس گفت و شنید کا یہ نتیجہ نکلا کہ ملزموں سے مقدمہ اٹھا لیا جائے گا، مظلوموں کو مالی امداد دی جائے گی لیکن مسجد کے منہدم حصے کو اسی طرح چھوڑ دیا جائے گا۔ مسلمان اس کے دوبارہ تعمیر پر اصرار نہ کریں[۱۱۸]۔ اس پس منظر میں لکھی گئی نظم ''شرائط صلح'' کا انداز ملاحظہ کیجیے:

لوگ کہتے ہیں کہ حکام ہیں آمادۂ صلح	یہ اگر سچ ہے تو جز خوبیِ تقدیر نہیں
لیکن انعام گراں قدر و وظائف کی طمع	یہ حقیقت میں کوئی صلح کی تدبیر نہیں
مایہ بحث اگر ہے، تو فقط مسجد ہے	دیّتِ قتلِ شہیدانِ جواں میر نہیں
داد خواہِ حقِ مسجد ہیں اسیرانِ جفا	ورنہ ان کو گلۂ سختیِ تقدیر نہیں
آپ کہتے ہیں ''وضو خانہ تھا، مسجد تو نہ تھی''	یہ بجا مسئلہ فقہ کی تعبیر نہیں
بند کرتے ہیں جو یہ آپ جرائد کی زباں	یہ بھی کچھ مانعِ آزادیِ تحریر نہیں
داد خواہوں سے ہز آنر نے جو ارشاد کیا	کہ ''یہ حکم از کی قابل تغییر نہیں''
ہم اسیرانِ محبت سے یہی ہے جو سلوک	پھر نہ کہیے گا کہ فتراک میں نخچیر نہیں[۱۱۹]

مسلمانوں کے تمام طبقات نے اتحاد و اتفاق کے ساتھ حکومت کی اس غیر منصفانہ پالیسی کے خلاف محاذ قائم کیا۔ آخر کار وہ اس طے شدہ، ناقابل تنسیخ فیصلے کو بدلنے پر آمادہ ہو گئی۔ ہندوستان کے وائسرائے اور گورنر جنرل لارڈ ہارڈنگ بہ نفس نفیس کان

پور تشریف لائے۔ سر علی امام حکومت ہند کی طرف سے اور مولانا عبد الباری فرنگی محلی نے مسلمانانِ ہند کی طرف سے گفت وشنید شروع کی[120]۔ بالآخر تمام معاملات طے پاگئے۔ قیدیوں کو رہا کر دیا گیا، مقدمات واپس لے لیے گئے اور مسجد کا وہ حصہ جو منہدم کر دیا گیا تھا، پھر سے تعمیر کر دیا گیا۔ یہ تعمیر کچھ اس انداز سے کی گئی کہ چھت کے نیچے سے سڑک نکال کر آمد ورفت کی جگہ بنائی گئی اور اوپر کے خانے میں وضوخانہ قائم کر دیا گیا[121]۔ اس طرح یہ فیصلہ سب کو منظور ہوا۔ مولانا شبلی نے وائسرائے کے اس اقدام کو سراہتے ہوئے اپنی شکر گزاری کا اظہار کچھ اس انداز سے کیا:

اے ہمایوں گہر و افسرِ اورنگِ شہی	وہ کیا تو نے جو آئینِ جہاں بانی ہے
تو نے ظاہر میں رعایا سے جو کھائی ہے شکست	یہ حقیقت میں ظفر مندیِ سلطانی ہے
تیرے لطف و کرمِ عام نے دے دی یہ ندا	کوئی مجرم ہے نہ قیدی ہے نہ زندانی ہے
تو نے اک آن میں گرتا ہوا گھر تھام لیا	بازوؤں میں یہ ترے زورِ جہاں بانی ہے
گرچہ مدحِ امرا میں نے نہیں کی ہے کبھی	شکرِ احسان مگر فطرتِ انسانی ہے
تیرے دربار میں پہنچیں گے جو اوراقِ سپاس	ان میں یہ پیش کشِ شبلی نعمانی ہے[122]

اکبر الہ آبادی نے اس زمانے کے اہم سیاسی وسماجی مسائل کو اپنی شاعری میں جگہ دی۔ مسجد کان پور کے سانحے پر ان کے ہاں علاحدہ سے تو کوئی نظم نہیں ملتی لیکن اس زمانے میں کہی گئی نظم کا ایک مصرع

بحمد للہ اب خونِ شہیداں رنگ لایا ہے[123]

میں ''خون شہیداں'' کی تلمیح کو اس جانب اشارہ سمجھا گیا۔ مسجد کان پور میں گولی چلنے اور مسلمانوں کی شہادت کے واقعات چوں کہ ان ہی دنوں رونما ہوئے تھے لہٰذا اکبر کو بھی اس شبہے میں گرفتار کر لیا گیا۔ بعد میں اکبر کو شعر گوئی سے کنارہ کش ہونے کا اعلان بھی کرنا پڑا جس کے بعد گلو خلاصی ہوئی لیکن یہ بھی عارضی ثابت ہوئی[124]۔ اکبر کو سامراجی قوتوں کی طرف سے ڈھائے جانے والے مظالم پر غم وغصہ ضرور تھا لیکن انھوں نے سانحہ مسجد کان پور سے متعلق کچھ احتیاط سے کام لیا۔ اس کے باوجود ان کی غزلوں میں بعض اشعار براہ راست موضوع سے تعلق رکھتے ہیں۔ ملاحظہ کیجیے:

یہ سڑک کس سمت میں آخر نکالی جائے گی	آنے والی نسل کس سانچے میں ڈھالی جائے گی
خود پرستوں کو مبارک ہو یہ ایوانِ رفیع	دل شکستوں میں کوئی مسجد بنا لی جائے گی[125]

انگریزوں کی ہٹ دھرمی اور آمرانہ رویّے کے خلاف بھی اکبر نے بہت لکھا۔ مسلم رہنماؤں کی طرف سے ہونے والی مراسلت اور مسئلے کے حل کی جانب کی جانے والی کوششوں کے باوجود جب اس مسئلے کو طاقت کے بل بوتے پر حل کرنے کی کوشش کی گئی تو اکبر نے طنزاً کہا کہ:

گولیوں کے زور سے کرتے ہیں دنیا کو ہضم — اس سے بہتر اس غذا کے واسطے چورن نہیں[۱۲۶]

اس حوالے سے اکبر کے وہ اشعار بھی اہمیت کے حامل ہیں جو انھوں نے خواجہ حسن نظامی کو اگست ۱۹۱۳ء میں ارسال کیے۔ "سب سے آخری شکوہ" کے عنوان سے یہ نظم "کان پور کی خونیں داستان" میں شامل ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

اونٹ نے برگڈ میں کل گردن اٹھائی تھی مگر — ہو چکی تھی اس کو کمسریٹ میں اک مدت دراز
وہ یہ سمجھا تھا مسلم ہیں ہماری نیکیاں — خوش دلی سے آپ فرمائیں گے اس کو سرفراز
منزلِ مقصود اس کی سجدہ گاہِ خلق تھی — وہ تو تھا اک بار کشاور سالکِ راہِ حجاز
آپ نے برسائیں اس پر گولیاں ہر سمت سے — آپ اسے گردن کشی سمجھے جو تھا اک پاک باز
یا الٰہی ہم غریبوں کا کہاں ہو اب پناہ — دشمنِ اشتر ہوئے ہیں حضرتِ انجن نواز[۱۲۷]

مولانا ظفر علی خان کی طنزیہ شاعری کی حدود بھی اتنی ہی وسیع ہے جتنی کہ بیسویں صدے کے ہندوستان کی سیاسی اور معاشرتی زندگی۔ افراد۔ جماعتیں، ادارے اور تحریکیں سب ہی ظفر علی خان کی طنزیہ شاعری کی لپیٹ میں آجاتے ہیں۔ سیاسی اداروں میں انگریزی حکومت اور اس کے کاسہ لیس ہمیشہ ان کے طنز کا نشانہ بنے رہے[۱۲۸]۔ اور ہمیشہ ہی انھوں نے آزادی کے متوالوں اور اس راہ میں اپنی جانیں قربان کرنے والوں کو خوب سراہا۔ اپنی ایک نظم "فانوس ہند کا شعلہ" میں وہ شہدائے کان پور اور اس واقعے میں قیدی بنائے جانے والوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

جتنی بوندیں تھیں شہیدانِ وطن کے خون سے — قصرِ آزادی کی آرائش کا ساماں ہو گئیں
مرحبا اے نو گرفتارِ بیدادِ فرنگ — جن کی زنجیریں خروش افزائے زنداں ہو گئیں
زندگی ان کی ہے، دین ان کا ہے، دنیا ان کی ہے — جن کی جانیں قوم کی عزت پہ قرباں ہو گئیں[۱۲۹]

برصغیر پاک وہند کی سیاست کا کوئی ایسا پہلو اور اس سے جڑا کوئی ایسا واقعہ نہیں ہو گا جس پر مولانا ظفر علی خان نے قلم نہ اٹھایا ہو۔ ان کی زندگی کا اوّلین مقصد اپنے وطن کو چمنستان بنانا تھا اور اس مقصد کے لیے وہ شہیدوں کے لہو کو خاص اہمیت دیتے تھے۔ اس بابت ان کا کہنا تھا کہ:

وطن کو میں چمنستان بنا کے چھوڑوں گا — اور اس کی صبح کو خنداں بنا کے چھوڑوں گا
لہو شہید کا لوں گا ور اس کی سرخی کو — میں غازۂ رخِ ایماں بنا کے چھوڑوں گا[۱۳۰]

برطانوی استعمار کے خلاف وفادار مسلمانوں کا مذہبی جہاد کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا۔ ایک طرف جیمس مسٹن کی قہرمانیاں تھیں تو دوسری جانب مسلم زعما کی جدوجہد۔ کچھ عافیت پسند مسلمان مسئلے کو صلح و آتشی سے منطقی انجام تک پہنچانے کے حامی بھی تھے۔ اس سلسلے میں بھی جلسے جلوس جاری تھے۔ ۸ ستمبر ۱۰۱۳ء کو مراد آباد میں ہونے والے جلسے میں سر رضا علی کی

تقریر بھی اس حوالے سے اہمیت کی حامل ہے[۱۳۱]۔ اس موقعے پر مشہور عالم اور شاعر کیفی چڑیا کوٹی نے بھی ایک عمدہ قطعہ کہا۔ ملاحظہ کیجیے:

ابن مریم کو دور کی سوجھی	اور موسیٰؑ کو طور کی سوجھی
ملی فرصت تو حشر والوں کو	فتنۂ کان پور کی سوجھی[۱۳۲]

اس موقعے پر معروف شاعر حکیم آزاد انصاری بھی خاموش نہ رہ سکے۔ انگریزوں نے جو ظلم و جبر کا رویہ اختیار کر رکھا تھا، اس پر عوام بہت نالاں تھے۔ مگر برطانوی حکمرانوں کو اس ناراضگی کی کوئی پرواہ نہیں تھی۔ وہ رعایا کے جذبات کو سمجھنے سے قاصر تھے۔ اس صورتِ حال کو آزاد انصاری نے شعری قالب میں ڈھالتے ہوئے کہا کہ:

رعایا حکومت سے نا خوش نہ ہو	اسی میں ہے مضمر حکومت کی زیست
مگر لاٹ صاحب کو پروا نہیں	بریں ملک داری بباید گریست[۱۳۳]

ہم دیکھتے ہیں کہ برطانوی حکمرانوں کے اس رویّے نے بعد میں انھیں کس قدر نقصان پہنچایا اور کچھ زیادہ عرصہ نہیں گزرا کہ ملک میں ہر طرف ان کے خلاف ردعمل اور تحریک کو خوب بڑھاوا ملا۔

مصالحت کی کوششیں جب بارآور ثابت ہوئیں اور ۱۶ اکتوبر ۱۹۱۳ء کو وائسرائے بہادر شملہ سے اتر کر کان پور کی بستی پر جلوہ افروز ہوئے تو ''ہمدرد'' نے اس واقعے پر دل چسپ اور پُر لطف طنز کرتے ہوئے یہ شعر درج کیا کہ:

وہ آئے ہیں ہماری نعشیں پر آج	تجھے اے زندگی لاؤں کہاں سے[۱۳۴]

مسجد کان پور کے سانحے کے بعد مختلف اخبارات و رسائل میں شائع ہونے والی نظمیں اور قطعات بھی اس حوالے سے اہمیت کے حامل ہیں۔ اس تنازعے کے تصفیے کے بعد بھی لوگوں نے واقعات کو شاعری کا موضوع بنایا۔ ۹ ستمبر ۱۹۱۴ء کو ''مسلمانوں کی فریاد'' کے عنوان سے ایک نظم شائع ہوئی جس میں اس سانحے کے بعد متاثرین کی زندگی کیسی گزری، ان مناظر کو پیش کیا گیا ہے۔ نظم ملاحظہ کیجیے:

کان پور میں خون بہا اور ملک میں بہتا پھرتا ہے	کہنے کو تو لال ہے لیکن سب کچھ کہتا پھرتا ہے
خون میں زخمی خوب نہائیں، تجھ کو کچھ پروا ہی نہ ہو	جانیں مٹی میں مل جائیں، تجھ کو کچھ پروا ہی نہ ہو
تو جو خدائی لے کے بیٹھا، آخر یہ کس کام کی ہے	گھر تیرا یوں ڈھایا، تجھ کو کچھ پیچ اپنے نام کی ہے
بندوقوں سے جسم ہوا ہے چھلنی زخم رسیدوں کا	پھیلا ہے مقتل کی زمیں پر یہ خون شہیدوں کا
روتے روتے نور گیا سب بیواؤں کے دیدوں کا	خون ہوا بے چارے کم سن لڑکوں کی امیدوں کا
باپ ہے بوڑھا، بیٹا زخمی، جینے کی کچھ آس نہیں	بچہ بھوکا ننگا ہے اور کوڑی اس کے پاس نہیں

قومی بہنیں لاوارث ہیں، قوم کو کیا احساس نہیں　　جیبوں میں سے کچھ بھی نہ نکلے، ایسا تو افلاس نہیں

ہائے یتیمی! پڑ گئے اب تو جان کے لالے بچوں کو　　رحم کرے قوم اور بچالے، موت نہ کھائے بچوں کو[۳۵]

حامد اللہ افسر کی نظم ''مسجد سے خطاب'' میں بھی مسلمانوں کے عبادت خانے کی اہمیت اور حرمت کو بیان کیا گیا ہے۔ پوری اسلامی دنیا میں مسجد کا جو احترام ہے اس کی بابت شاعر کا کہنا ہے کہ:

ساری دنیا میں حفاظت دل سے ہوتی ہے تری　　ہر جگہ یکساں تجھے حاصل ہے عز و افتخار

زندگی تجھ پر فدا ہو یہ ہے اپنی زندگی　　مسلم دل ریش کہلاتے ہیں تیرے جاں نثار

کچھ تیری تقدیس پہ دھبّا نہ آنے پائے گا　　تو ہو بے حرمت کبھی ہم سے نہ دیکھا جائے گا[۳۶]

مسلمانوں کے مطالبات پورے ہونے کے بعد وائسرائے ہند کے لیے جو تہنیتی پیغامات کا سلسلہ شروع ہوا ان میں کچھ لوگوں نے منظوم خراجِ عقیدت بھی پیش کیا۔ شبلی کی نظم کا حوالہ مذکورہ صفحات میں کیا جا چکا ہے۔ اسی طرح کی ایک نظم سید قمر الدین احمد قمر سندیلوی نے ''تیرے ہی صدقے میں تو خان بہادر ہوں'' میں بھی ان ہی جذبات کا اظہار کیا[۳۷]۔ ''کان پور کی خونیں داستان'' میں خواجہ حسن نظامی نے بعض ایسی نظمیں بھی نقل کی ہیں جن پر شاعر کا نام درج نہیں۔ لیکن یہ نظمیں بھی سانحہ کان پور کے تناظر میں اہمیت کی حامل ہیں۔ انگریزی کے اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوان اور جذبات اسلام کے حامل شاعر جس کا نام یہاں درج نہیں، کی نظم ''عشق بازوں کی سرفروشی'' میں بھی شاعر نے اس واقعے کے حوالے سے مسلمانوں کی کس مپرسی اور لاچاری کے باوجود ان کی سرفروشیوں اور قربانیوں کا تذکرہ کچھ ان الفاظ میں کیا ہے:

یہ مانا ہم میں وہ غیرت نہیں رہی باقی　　ہمارے خوں میں حرارت نہیں رہی باقی

یہ ہم نے مانا کہ ہم ننگ و عارِ ہستی ہیں　　یہ ہم نے مانا کہ ہم وقفِ تن پرستی ہیں

یہ ہم نے مانا کہ ہم ملک و قوم کھو بیٹھے　　ہم اپنی قوتِ بازو کو آج رو بیٹھے

مگر ہم عہدِ کہن آج تازہ کرتے ہیں　　دکھا دے جلوہ کہ پھر آج تجھ پہ مرتے ہیں

ترے ہی نام کے خاطر لہو بہاتے ہیں　　یہ سرفروش لیے اپنے سر کو آتے ہیں

ہماری آرزوئے دل حصول ہو جائے　　یہ تحفۂ سرِ عاشق قبول ہو جائے

ہماری آج کی قربانیاں بھی یاد رہیں　　ہمارے خون کے قطرے نہ نا مراد رہیں

تماشا آج ہے کچھ اپنی سرفروشی کا　　کرشمہ ہے یہ بنا تیری بے نیازی کا

نظارہ دیکھ لے تو بھی تو بے قراروں کا　　ہجوم ہے درِ اقدس پہ جاں نثاروں کا[۳۸]

مسجد کے انہدام میں جس طرح انصاف کے تقاضوں کو پورا نہیں کیا گیا، بالخصوص ہندوؤں کو خوش کرنے کے لیے مندر کو محفوظ اور مسجد کے وضو خانے کو شہید کیا گیا، انتظامیہ کے اس متعصبانہ عمل سے مسلمانوں کے دل میں رنجش کا پیدا ہونا فطری امر تھا۔ اس کے خلاف جو ردعمل ہوا، وہی اس سانحے کا سبب بھی بنا۔ اس پس منظر میں مختلف رسائل و جرائد میں اشعار، قطعات اور نظمیں شائع ہوتی رہیں۔ خواجہ حسن نظامی نے بھی اپنی تصنیف میں کچھ اشعار درج کیے ہیں۔ دیکھیے:

کھو گئی کان پور کی مسجد — رہ گیا بت کدہ مگر باقی

بڑھ گئی دین سے وفا داری — نام کو بھی نہیں کسر باقی

رہ گئے بت اگر زمانے میں — نہ رہے گا خدا کا گھر باقی[۱۳۹]

اسی طرح ''توحید'' میرٹھ میں مولانا نواب علی کی ''نواب شہِ جارج سے جاکے کوئی کہہ دے'' کے عنوان سے ایک نظم شائع ہوئی۔ اس نظم میں بھی مسجد کان پور کے سانحے کے حوالے سے انگریزوں کی حکمت علی پر سخت طنز کیا گیا ہے۔ جس طرح عام مسلمانوں کا خون بہایا گیا، حق و باطل کو سمجھے بغیر ان پر ظلم کے پہاڑ توڑے گئے، اس جانب اشارہ کرتے ہوئے شاعر کہتے ہیں کہ:

خارجِ جز مسجد کو جو مسجد سے ہیں کرتے — وہ تم کو شہیدوں میں بھی داخل نہیں کرتے

کیوں! اب تو یقیں ہے کہ سمجھ ہی گئے ہو گے — سمجھے تھے جفا خلق پہ عادل نہیں کرتے

برچھوں کی ضرورت تھی نہ کچھ فیر کی حاجت — خود تیغِ زباں سے جو یہ گھائل نہیں کرتے

مستِ مے پندار جو حکام نہ ہوتے — یوں جاں کو فدا عالم و جاہل نہیں کرتے

نواب شہِ جارج سے جا کر کوئی کہہ دے — اب ہند میں فرقِ حق و باطل نہیں کرتے[۱۴۰]

''مشہد اکبر'' کے عنوان سے فارسی کے تین اشعار بھی ''کان پور کی خونیں داستان'' میں درج ہیں۔ اس نظم میں بھی اس قیامت خیز منظر کے بیان میں شاعر کا کہنا ہے کہ:

اے محمدؐ گر قیامت سر بروں آری زخاک — سر بر آوردیں قیامت درمیانِ خلق میں

خون خلقے بیگنا ہے بر حریمِ مسجدت — زآستاں بگزشت و مارا خونِ دل از امتیں

پیروانِ دینِ حق را خوں بہ خاک آغشتہ شد — از پئے خاکِ کہ ہر مسلم برو ساید جبیں[۱۴۱]

''خونِ شہیداں'' کے عنوان سے بھی ایک نظم مذکورہ کتاب میں شامل ہے۔ اس نظم میں شہیدوں کے خون سے مسلمانوں کے عزم و حوصلے میں جو نمایاں تبدیلیاں رونما ہوں گی، اس جانب اشارہ کرتے ہوئے شاعر کہتے ہیں کہ:

نہیں مٹا نشانِ خوں کبھی دامانِ قاتل سے | لکھی جاتی ہے اک تحریرِ خونیں خونِ بسمل سے
ٹپکتا ہے یہ آنسو بن کے چشمانِ یتیماں سے | عیاں ہے آبِ گوہر بن کے یہ لعلِ بدخشاں سے
اسی کا ایک قطرہ بحر کو خوناب کرتا ہے | یہی گردش میں آکر قلب کو بے تاب کرتا ہے
دہانِ زخم سے بہہ کر کچھ ایسا رنگ لاتا ہے | کہ سیرابی سے اس کی باغِ عالم لہلہاتا ہے
یہی خوں سینچتا ہے نخل بر بادِ تمنا کو | اسی سے زندگی ملتی ہے قالب ہائے بے جاں کو
غذا پا کر اسی سے کشت قومی پھول لاتی ہے | یہی وہ موت ہے، جس سے یہ دنیا جان پاتی ہے
تعجب کیا ہے گر خونِ شہیداں کچھ دکھا جائے | تنِ بے جاں میں شاید پھر ہمارے جان آجائے[۱۴۲]

آگرہ اخبار کے ایڈیٹر نے مشاہدات ملکوتی سے متاثر ہو کر ''چند لمحے شہیدان ستم کے ساتھ'' کے عنوان سے ایک نظم لکھی۔ اس نظم میں بھی شہیدوں کے مراتب اور صلہِ شہادت کی بابت کچھ سوالات و جوابات درج کیے گئے ہیں۔ آخر میں مسلمانوں کی بے کسی و بربادی پر افسوس کا اظہار بھی کیا گیا ہے۔ اشعار ملاحظہ کیجیے:

میں جو گزرا طرفِ عالمِ روحانیت | نظر آئے مجھے دس بیس شہیدانِ ستم
جا بجا خون کے چھینٹے تھے کفن پر اتنے | صبح دم پھول پہ چھا جاتی ہے جیسے شبنم
خاک آلودہ تھے بال اور بدن خون آگیں | آہ! ہر پیکرِ تصویر تھا نقشِ ماتم
ان کی آنکھوں سے ٹپکتی تھی نری مایوسی | مخبرِ کش مکشِ روح تھے اشک پیہم
ان کی حالت پہ مجھے حسرت و حیرت جو ہوئی | پوچھ بیٹھا سببِ کثرتِ اندوہِ الم
اپنی ہستی کو جو دنیا میں مٹایا تو نے | کچھ خدا سے صلہِ ظلم بھی پایا تو نے
ان کے پیکر کو ہوئی لغزشِ ہستی اک بار | اور بڑھا میری طرف اک جسد خاکِ بسر
ہمیں خالق سے ملا ہے یہ شہادت کا صلہ | کہ ہمارے لیے ہے جنتِ فردوس میں گھر
رنج اپنا ہے ہمیں اور نہ اولاد کا ہے | غم فقط بے کسیِ مسلمِ برباد کا ہے[۱۴۳]

رسالہ ''کان پور کی خونیں داستان'' کی قطعہ تاریخ منشی ارشاد علی ارشاد بریلوی نے اخبار توحید میں لکھی۔ اس میں وہ کہتے ہیں کہ:

خون آنکھوں سے رولانے کو یہ قصّہ فرد ہے | جس کو سن کے ہر بشر کے لب پہ آہِ سرد ہے
بہرِ تاریخ طبع ارشاد نے رو کر کہا | داستانِ کان پوری کچھ عجب پُر درد ہے[۱۴۴]

ڈاکٹر سید سعید احمد کے مطابق ''سانحہ کان پور پر جگر مراد آبادی نے ایک طویل رزمیہ نظم لکھی جو ان کے دیوان ''شعلہ طور'' میں شامل ہے''[۱۴۵]۔ مگر جگر کے اس مجموعے میں اس موضوع پر اردو کی کوئی طویل رزمیہ نظم تو شامل نہیں البتہ

فارسی میں ’’پیروی صحابہ کن، اسوہِ پنجتن نگر: خطاب بہ مسلم‘‘ کے عنوان سے ایک نظم ضرور موجود ہے، جس کا انداز رزمیہ نہیں بلکہ اس نظم کا مقصد مسلمانوں کی بدحالی کس مپرسی اور لاچاری کو ظاہر کرنا ہے۔ جگر نے نظم کے آغاز ہی میں یہ انداز اختیار کیا کہ:

چشم کشاد جانب رزمِ گہہ وطن مگر — مقتلِ کان پور بہ بیں لاشہِ بے کفن نگر

خونِ حیات سو بہ سو خاکِ سرشتہ مو بہ مو — خلقِ بریدہ کو بہ کو بچہ و مرد و زن نگر[۱۴۵]

نظم کے انداز میں صاف ظاہر ہے کہ اس کا مقصد مسلمانوں کی بے گور و کفن نعشوں اور زخمیوں کی مظلومیت کو ظاہر کرنا ہے۔ مولانا محب حسین حیدر آبادی نے بھی اس جانب اشارہ کرتے ہوئے واضح طور پر کہا کہ اگر سچ اور حق بات کہنے کا حوصلہ نہ ہو تو ایسی آزادی بے معنی ہے۔ اپنی نظم ’’بند شیں‘‘ میں وہ کہتے ہیں کہ:

برتر از قید ہماری ہے محب آزادی — حق بھی جب کہہ نہ سکیں ہم تو ہیں آزاد عبث

باغ باں دشمنِ جاں اور ہے قاتل صیاد — اے اسیرانِ قفس نالہ و فریاد عبث[۱۴۶]

مختلف واقعات اور حالات سے متاثر ہو کر متعدد شعرا کے ہاں اس سانحے کے حوالے سے کچھ نہ کچھ اشارے ضرور ملتے ہیں۔ احمق پھپھوندی نے نظم ’’عہد فرنگ‘‘ کے ایک شعر میں اس جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ:

ایک ہنگامہِ محشر ہے بپا چار طرف — گرم ہے معرکہِ دشنہ و شمشیر و تفنگ[۱۴۷]

اسی طرح علامہ فاخر الہ آبادی نے قید و بند کی صعوبتوں کو برداشت کرنے کے حوالے سے اپنی نظم ’’سنتِ سجاد‘‘ میں کہا کہ:

آنکھ ہے محوِ تجلی، وصل سے دل شاد ہے — قید میں بھی طبعِ بے خود ہر طرح آزاد ہے

بیڑیاں مجھ کو پہننے میں ذرا ذلّت نہیں — باپ دادا کا طریقہ سنتِ سجاد ہے[۱۴۸]

معروف شاعر بشارت احقر بہاری جو اس زمانے میں کان پور ہی میں مقیم تھے، نے اس سانحے پر ۷۰ بند کا ایک مسدس لکھا اور کان پور میں منعقدہ احتجاجی جلسے میں سنایا۔ اس نظم کا حاضرین پر بے حد اثر ہوا لیکن حکومت وقت کو یہ بات پسند نہ آئی اور اس مسدس کو ضبط کر کے ضائع کر دیا[۱۴۹]۔ اس واقعے میں متعدد سر کردہ علما بھی گرفتار کر لیے گئے۔ مولانا آزاد سبحانی کے علاوہ نظامی پریس کے مالک ابو سعید اور مولانا فیض الحسن گنگوہی کو بھی گرفتار کر لیا گیا[۱۵۰]۔

یہ معرکہ اپنے تاریخی اور سیاسی اثرات کے لحاظ سے ایک سنگ میل ثابت ہوا۔ سیاسی اعتبار سے یہ معرکہ جنوبی ایشیا میں انگریزی اقتدار کے خلاف پہلی کھلی محاذ آرائی کے طور پر سامنے آیا اور اہل ہند کے سامنے یہ بات آشکار ہوئی کہ انگریزی حکومت کا غلبہ ناقابلِ تسخیر نہیں۔ پروفیسر شر المجاہد کے مطابق اس واقعے کے بعد برصغیر کی سیاست میں احتجاج اور مظاہرے ایک لازمی حصہ بن گئے[۱۵۱]۔ اس واقعے کے بعد بقول سید سلیمان ندوی ’’آتش بیان مقرروں، شعلہ فشاں محرروں اور شعلہ نفس شاعروں

نے مسلمانوں کے دلوں میں آگ لگا دی۔ یہ واقعہ مسلمانانِ ہند کی سیاسی جدوجہد اور آزادی پرستی کی سلسلۂ تاریخ کی ایک اہم کڑی ہے"[۱۵۲]۔ اسی واقعے کے بعد مولانا محمد علی جوہر، مولانا ظفر علی خان، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا عبدالباری فرنگی محلی، مولانا آزاد سبحانی، مولانا شوکت علی، سید سلیمان ندوی اور خواجہ حسن نظامی وغیرہ نے کھل کر انگریزوں کی مسلم دشمنی پر صدائے احتجاج بلند کی۔ اس واقعے کے بعد مولانا عبیداللہ سندھی وغیرہ جیسے اکابر کے لیے اپنے اس موقف کی تائید حاصل کرنا ممکن ہوا کہ ہندوستان دار حرب بن گیا ہے کیوں کہ حکومت اپنی رعایا کی مذہبی آزادی میں مداخلت کر رہی تھی[۱۵۳]۔ اس واقعے کی اثر پزیری کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ اس دور میں جب کہ معاشرے میں مردوں کی اجارہ داری تھی اور عورتوں کو سیاسی معاملات میں رائے دینے کی آزادی نہیں تھی، ز۔ خ۔ ش۔ نے واضح طور پر رعایا اور حاکم کے درمیان ہونے والی دوری کو محسوس کیا بلکہ اس سانحے کے بعد جو صورتِ حال پیدا ہوئی اس سے متاثر ہو کر لکھا کہ:

پھٹ گیا محکوم و حاکم کا لباسِ اتحاد[۱۵۴]

یہ تمام واقعات اگرچہ بیسویں صدی کی دوسری دہائی کے ہیں۔ پوری دنیا میں جس طرح سے مسلمانوں کے مقدس مقامات کو برباد کر کے ان کے جذبات سے کھیلا جا رہا تھا، اس سے مسلمانوں کے اندر مغربی استعمار کے خلاف ایک مزاحمتی رویہ پیدا کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ حالات کی رفتار کو اصحاب بصیرت اور اکابر ملت نے محسوس تو کیا لیکن اس کے لیے درست راہوں کو متعین کرنے میں ہمیشہ انتشار کا شکار رہے۔ اس کی ایک مثال مسجد شہید گنج کے ضمن میں پیش آنے والے واقعات ہیں جس نے پنجاب میں مسلم رہنماؤں کے اختلافات کو کھل کر ہمارے سامنے پیش کر دیا۔ متحدہ ہندوستان کی سیاسی تحریکوں سے انگریز ہمیشہ ہی پریشان رہے۔ اگرچہ خلافت ایسی ہنگامہ خیز تحریک جس کی تفصیلات آئندہ ابواب میں آئیں گی، کو بھی انگریز حکمران اپنی حکمت عملی سے فرقہ وارانہ آگ کی نظر کر چکا تھا، مگر کچھ چنگاریاں ہنوز سلگ رہی تھیں جس کی تپش برطانیہ کے ایوان میں بیٹھے انگریز سیاست دان محسوس کر رہے تھے۔ اس آگ کو ٹھنڈا کرنے کے لیے انڈین ایکٹ ۱۹۳۵ء کا نفاذ ضروری تھا۔ انگریز حکمرانوں کو ہر دور میں ہندوستان سے ایسے لوگ ملتے رہے جنھوں نے وطن فروشی کا فریضا اچھی طرح نبھایا۔ پنجاب کے تو چند گھرانے ایسے تھے جن کی رگوں میں انگریزی خون ہی دوڑ رہا تھا۔ ۱۸۵۷ء کے بعد پہلی جنگ عظیم تک اس جنس کے لوگوں نے محض سترہ سترہ روپے ماہ وار کے عوض لوگوں کو انگریز فوج میں بھرتی کروا کر بیت المقدس اور پیرانِ پیر کے روضے پر گولیاں چلوانے جیسا مکروہ فریضا ادا کروایا تھا۔ انھی لوگوں نے عرب ریاستوں کا تیاپانچا بھی کروانے میں اپنا کردار ادا کیا۔ ان ہی کارناموں کے عوض وہ جاگیردار بنے، سر اور خان بہادر کے خطابات سے نوازے گئے۔ انگریزوں کو پھر سے ایسے لوگوں کی ضرورت آن پڑی تھی۔ اس بساط کا پہلا مہرہ اس دور میں میاں سر افضل حسین بنے جنھیں وائسرائے لارڈ لنگڈن نے اپنی کونسل سے فارغ کر کے پنجاب میں بھیجا تا کہ وہ یونینسٹ کے بکھرے ہوئے شیرازے کو پھر سے یکجا کریں اور مجلس احرار کے زور کو توڑا جاسکے۔ یہ

۱۹۳۵ء کا سال تھا۔ اس وقت پنجاب میں مجلس احرار کا پوری طرح غلبہ تھا۔ انگریزوں نے یونینسٹ کو کام یاب کروانے کے لیے احرار کو ہرانے کی ہر ممکن سازش اسی زمانے میں شروع کی۔ ہمیں مسجد شہید گنج کے واقعے کو بھی اسی سیاسی پس منظر میں دیکھنا ہو گا[۱۵۵]۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ اس دور کی سیاسی تحریکوں پر گہری نظر رکھنے والے مولانا ظفر علی خان بھی واضح طور پر مجلس احرار کے مخالف اور انگریزوں کی سازش کا ایک مہرہ دکھائی دیتے ہیں۔

۱۹۳۵ء کے ایکٹ کے تحت جب صوبوں کو خود مختاری کا درجہ دیا گیا اور میاں افضل حسین جو وائسرائے ہند لارڈ لنگڈن کی ایگزیکٹو کونسل کے رکن تھے، پنجاب کے وزیر اعلیٰ بننے کی خواہش میں مستعفیٰ ہو گئے اور اپنی سیٹ سر ظفر اللہ کو سونپ دی۔ یہ سیٹ چوں کہ مسلمانوں کے لیے تھی اور سر ظفر اللہ مرزائی تھے لہٰذا اس فیصلے پر مجلس احرار نے سخت اعتراض کیا۔ سارے پنجاب میں اس معاملے پر تحریک چل نکلی۔ احرار اور ہم نوا جماعتیں سر ظفر اللہ کی اس نشست سے علاحدگی کے مطالبے کے لیے سرگرم ہو گئیں[۱۵۶]۔ اس وقت ظفر علی خان بھی احرار سے وابستہ تھے اور ان کے گیت گاتے تھے۔ دیکھیے:

اگر اک سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہوئے ۔۔۔ تو اس عہد میں پنجاب کے احرار ہوئے
خیل باطل سے اگر برسرِ پیکار ہوئے ۔۔۔ تو وہ اسلام کے جاں باز رضا کار ہوئے[۱۵۷]

اپنے سیاسی عروج کے دنوں میں مجلس احرار نے حاجی رحیم کے مقابلے میں ایک نو مسلم خالد لطیف گابا کو مرکزی اسمبلی کا ٹکٹ دیا اور فتح بھی حاصل کی[۱۵۸]۔ مولانا ظفر علی خان نے اس موقعے پر بھی مجلس احرار کی حمایت میں لکھا کہ:

اہل نظر نے دیکھے اسلام کے کرشمے ۔۔۔ پہنچے اسمبلی میں خالد لطیف گابا
سرکار کا سہارا کچھ بھی نہ کام آیا ۔۔۔ کھا کر شکست نکلے حاجی رحیم بابا
ان کی مدد کو دوڑا وہ قادیاں کا ہیکل ۔۔۔ فتنوں کی آگ جس میں بُجھتی ہے بے محابا[۱۵۹]

ظاہر سی بات ہے کہ اس زمانے میں جب کہ عوام کو ووٹ دینے کا حق حاصل نہیں تھا، صرف جاگیر داروں اور ٹیکس گزاروں کو اس کا حق تھا۔ یہی طبقہ صوبائی اور مرکزی کونسلوں میں اپنا حق رائے دہی استعمال کر سکتا تھا، ان لوگوں کا مقابلہ مجلس احرار سے تھا جس کے مرکزی رہنماؤں میں عطا اللہ شاہ بخاری اور مولانا غلام غوث ہزاروی جیسے لوگ شامل تھے جن کی زندگی دنیاوی آسائشات سے دور کرائے کے مکان میں گزری۔ یہاں تک کہ جب مولانا ہزاروی کا انتقال ہوا تو وہ ۲۶ روپے کے مقروض تھے۔ یہ بدحال لوگ حکم رانوں سے مقابلے کا سوچ رہے تھے۔ مجلس احرار نے تو یہ بھی اعلان کر دیا تھا کہ عبد اللطیف گابا ان کے لیے ٹیسٹ کیس ہے۔ اگر وہ مذکورہ الیکشن جیت جائیں تو مجلس احرار آئندہ الیکشن میں بھرپور طریقے سے حصہ لے گی اور ان کا بھرپور طریقے سے حصہ لینا نہ ہی انگریز گورنر ایمرسن کو پسند تھا اور نہ ہی مسلم امرا کو یہ بات ہضم ہو رہی تھی۔ حکومت وقت انگریزوں کا نمک خوار طبقہ احرار کی کامیابی سے حراساں تھے۔ سر فضل حسین بھی ان ہی دنوں یونینسٹ پارٹی کو قابو میں لا کر ان

کے خلاف لڑائی ختم کر کے اب مجلس احرار کو مٹانے کی سوچ رہے تھے۔ ایسے میں فریب، جھوٹ، دھوکا اور لالچ ہر چیز کو جائز سمجھا جارہا تھا جس سے مخالفین کو شکست دی جاسکے۔ صحافت نے بھی اپنا فخر اس دور میں گروی رکھ دیا تھا۔ مجلس احرار کے مخالفین کو حکومتی سرپرستی بھی حاصل تھی۔ مولانا ظفر علی خان کی متلون مزاجی کی وجہ سے وہ بھی مجلس احرار سے روٹھ گئے تھے جس سے امیر شریعت اور ان کے درمیان اختلاف کی خلیج بڑھتی جارہی تھی۔ مرزائی لیڈر بشیر الدین محمود اور دلہوزی بھی احرار کے خلاف منصوبے بندی میں مصروف تھے"[۱۶۰]۔

مجلس احرار کے رہنما اپنے خلاف ہونے والی سازشوں سے باخبر ضرور تھے لیکن وہ اپنی تبلیغی سرگرمیوں میں مصروف رہے۔ ۱۹۳۵ء میں اس وقت جب کہ مسجد شہید گنج کے انہدام کا سانحہ پیش آیا، فیصل آباد میں مجلس احرار کی پروونشل کانفرنس جاری تھی۔ تمام سرکردہ رہنماوہیں مصروف تھے کہ اچانک ۲۸۔۲۹ کی شب ایک سکھ مزدور میلہ سنگھ نے مسجد کو مسمار کرنا شروع کر دیا اور اسی دوران وہ دیوار میں دب کر مر گیا۔ دوسرے روز لاہور کے مسلمانوں کو مسجد کے گرائے جانے کا علم ہوا تو دیوانہ وار ہزاروں کی تعداد میں لوگ مسجد کی طرف دوڑے۔ گردوارہ بندھک کمیٹی کو پتا چلا تو وہ بھی چونک گئے کیوں کہ مسجد کو منہدم کرنا ان کی پالیسی کا حصہ نہیں تھا۔ احرار کے رہنما بھی دوسرے روز پہنچ گئے لیکن اس سے قبل مولانا ظفر علی خان نے ایک جلسہ منعقد کر کے تحفظ مسجد کے لیے ایک کمیٹی بنا دی۔ اس اجلاس میں چودھری افضل حق، مولانا مظہر علی اظہر، ڈاکٹر سیف الدین کچلو، ڈاکٹر محمد عالم ایڈووکیٹ اور مولانا ظفر علی خان نے سکھ رہنماؤں سے مذاکرات کے لیے ایک وفد تشکیل دیا۔ صاف ظاہر تھا کہ اس واقعے کے پس پشت سکھ نہیں بلکہ کوئی پوشیدہ طاقت کام کر رہی تھی۔ بعد میں یہ بات سامنے آئی کہ دلہوزی اور مرزائیوں نے مل کر یہ سارا منصوبہ بنایا۔ اس کے مطابق سکھوں اور مسلمانوں کے درمیان کسی بھی صورت میں مفاہمت کی فضا کو قائم نہیں ہونے دینا تھا۔ ۲۷۔۲۸ جون کی شب مسلمانوں کا ہجوم مسجد کے پاس پہلے ہی جمع تھا۔ کمشنر کے وعدے کے باوجود مسجد کا بقیہ حصہ بھی شہید کیا جا چکا تھا۔ مسجد کی حفاظت کے لیے جو کمیٹی قائم کی گئی اس میں احراریوں کو دانستہ شامل نہیں کیا گیا"[۱۶۱]۔ یہ دیکھ کر مجلس احرار نے بھی مولانا ظفر علی خان کی نئی قائم شدہ جماعت کو کام کرنے کے لیے کسی بھی قسم کی سیاسی مداخلت سے گریز کیا۔ احرار کی اس حکمت عملی کو مولانا ظفر علی خان نے مسلمانوں سے غداری کے مترادف جانا اور اپنی ایک نظم "احرار کا جنازہ" میں واضح طور پر کہا کہ:

اللہ کے گھر کو کوئی ڈھا دے تو یہ خوش ہیں	مسجد کا نشاں کوئی مٹا دے تو یہ خوش ہیں
مسلم کا کوئی خون بہا دے تو یہ خوش ہیں	لاہور میں آثارِ قیامت ہیں نمودار

پنجاب کے احرار، اسلام کے غدار[۱۶۲]

یہ نظم مولانا ظفر علی خان نے اس وقت لکھی جب ۲۲ جون ۱۹۳۵ء کو مسجد کی شہادت کے بعد سرکردہ رہنماؤں کو بھی نظر بند کیا جا رہا تھا۔ مولانا ظفر علی خان کو بھی ان دنوں ان کے ذاتی گھر کرم آباد میں نظر بند کر دیا گیا تھا۔ اپنی نظر بندی کے دوران ۱۸ اگست ۱۹۳۵ء کو یہ نظم تحریر کی گئی[۶۳]۔

عوامی مطالبے پر بعد میں مسجد کی حفاظت کے لیے بنائی جانے والی کمیٹی میں چودھری افضل حق، مولانا داؤد غزنوی، اور مولانا مظہر علی کے ناموں کا اعلان ضرور ہوا لیکن باہمی چپقلش جاری رہی۔ ۴ جولائی ۱۹۳۵ء کے ''زمیندار'' میں خبر چھپی کہ مسجد کے انہدام کو روکنے کے لیے ضابطہ فوجداری کی دفعہ ۱۴۵ کے تحت ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ سے حکم امتناعی حاصل کیا گیا ہے تاکہ سکھوں کو اس اقدام سے روکا جا سکے۔ اس کیس کی پیروی خواجہ غلام مصطفیٰ نائیک، بیرسٹر فرخ حسین، سید محسن شاہ، سید حسن جعفری اور دیگر وکلا نے کی[۶۴]۔ مولانا ظفر علی خان نے احرار کے مقابلے میں مجلس اتحاد ملت نامی تنظیم کی داغ بیل ڈالی اور احرار کے سرخ پوشوں کے مقابلے میں نیلی پوش رضا کاروں کی بھرتی شروع کر دی۔ نوجوانوں کو جوش دلاتے ہوئے مولانا ظفر علی خان نے نعرہ بلند کیا کہ:

جو لینی ہے تمھیں مسجد تو نیلی پوش ہو جاؤ[۶۵]

اس مسجد کا انتظام اور قبضہ حاصل کرنے کی کوشش یوں تو پچھلی دو صدیوں سے جاری رہی۔ اس مسجد کی بابت سید حبیب کا کہنا ہے کہ اس کی بنیاد میاں میر نے رکھی تھی۔ اس مسجد کی تعمیر دارا شکوہ کے خانساماں عبداللہ خان نے شروع کی۔ اس وقت تک جب کہ لاہور میں سکھ قابض نہیں ہوئے تھے، باقاعدگی سے یہاں اذان اور نماز کا سلسلہ جاری رہا[۶۶]۔ بعد میں لاہور کے گورنر ذکریا خان (۱۷۳۷ء۔ ۱۷۴۵ء) کی وفات کے بعد قمر الدین وزیر کی مرضی سے اس کے بڑے لڑکے یحییٰ خان کو لاہور کا گورنر بنایا گیا۔ اس زمانے میں سکھوں نے ہر طرف قتل وغارت گری کا بازار گرم کر رکھا تھا۔ لاہور کا امن تباہ ہو چکا تھا۔ چناں چہ یحییٰ خان نے دیوان لاجپت رائے کو سکھوں کی سرکوبی کے لیے بھیجا۔ لیکن لاجپت رائے کو شکست ہوئی اور وہ مارے گئے۔ یحییٰ خان نے بعد میں لاجپت رائے کے بھائی لکھپت رائے کو اس کام پر مامور کیا۔ اس نے بھائی کا بدلہ لینے کے لیے سکھوں کو بری طرح مارا اور ان کی طاقت کو کچل کر رکھ دیا۔ اس معرکے کے بعد وہ اپنے ہمراہ ایک ہزار سکھوں کو زنجیروں سے جکڑ کر لاہور لایا۔ انھیں ننگی پیٹھوں والے گدھوں پر سوار کر کے لاہور گھمایا، پھر بے دردی سے قتل کر دیا گیا۔ پھر یہ معمول رہا کہ اکثر سیکڑوں کو سکھوں کو پکڑ کر لاہور لایا جاتا اور سکھ وزیر کوڑا مل کی نگرانی میں انھیں قتل کر دیا جاتا۔ اسی بنیاد پر سکھوں نے اپنے عہد حکومت میں اس جگہ کو گوردوارہ شہید گنج قرار دیا۔ ایک اور روایت کے مطابق ۱۷۴۶ء میں سکھوں کے ایک بزرگ بھائی تارو سنگھ کو گھوڑا مار کٹ میں قتل کیا گیا۔ سکھوں کے نزدیک وہ شہید تھے لہٰذا اس جگہ کا نام شہید گنج رکھ دیا گیا اور وہیں ان کی سمادھی تعمیر کر دی گئی۔ بعد میں اس سمادھی کو بنیاد بنا کر مسجد پر بھی قبضہ کر لیا گیا۔ سکھوں کے عہد میں مسلمان یہاں سے چلے تو گئے لیکن ۱۷۲۲ء میں مسجد اور

اس سے ملحقہ جائیداد کا وقف نامہ تیار کیا گیا جو فارسی میں تھا، اس وقف نامے کے مطابق مسجد کا قبضہ ہمیشہ کے لیے دین محمد نامی شخص کو سونپ دیا گیا۔ ۱۷ اپریل ۱۸۵۰ء کو نور محمد نامی شخص نے دعویٰ کیا کہ مسجد اس کے دادا دین محمد کی ملکیت ہے۔ لہٰذا اس کا قبضہ دلایا جائے لیکن کمشنر نے مدعی کے خلاف فیصلہ سناتے ہوئے سکھوں کے قبضے کو برقرار رکھا[۱۶۷]۔

اس فیصلے کے بعد بھی وقتاً فوقتاً اس مسجد کی بازیابی کے دعوے عدالتوں میں داخل کیے جاتے رہے جن کی تفصیلات جاں باز مرزا نے اپنی تصنیف "تحریک مسجد شہید گنج" میں درج کی ہے لیکن اکثر اکثر ججوں نے ۱۹۵۰ء۔ ۱۹۵۵ء میں ہونے والے فیصلے کو برقرار رکھا۔ ۲۵ جولائی ۱۹۳۵ء کے ایکٹ حکومت پنجاب نوٹیفکیشن ۲۸،۸۹۲ کے مطابق اس جگہ کو گوردواراہ قرار دے دیا۔ اس کے بعد گوردوارہ کمیٹی نے مارچ ۱۹۳۵ء کو گوردوارے کی صفائی اور بہتری کے لیے مسجد کو گرانے کا فیصلہ کیا۔ ۳۰ مئی ۱۹۳۵ء کو کام شروع ہوا۔ اس سے قبل ۱۹۲۷ء مہنتوں نے گوردوارہ بندھک کمیٹی کے خلاف جب دعویٰ دائر کیا تو اس وقت انجمن اسلامیہ پنجاب نے بذریعہ خان سعادت علی خان سیکریٹری انجمن کے ایک درخواست دائر کرنے کا فیصلہ کیا مگر اس بار بھی ناکامی ہوئی۔ ۱۹۳۵ء میں سر فضل حسن وزیر قانون نے گوردوارہ ایکٹ پیش کیا، سکھوں کو یہاں مسلم ووٹوں کی ضرورت تھی۔ اس وقت روزنامہ "سیاست" میں مسجد کی واپسی کی بابت تحریک شروع کرنے کی جانب توجہ مبذول کروائی گئی۔ سکھوں سے معاہدہ کرنے کی ترغیب اور مسجد کی حمایت میں ذہن سازی کی گئی۔ سر ملک فیروز خان نون کی ناعاقبت اندیشی کی وجہ سے سپاہیوں کو تفویض کردہ زمین گوردوارے کے پاس چلی گئی۔ مسجد کے واقعے کی وجہ سے لاہور کی فضا بڑی مکدر تھی۔ احرار چوں کہ خود کو اس تحریک سے الگ تھلگ رکھے ہوئے تھی لہٰذا "زمیندار" میں اس کے خلاف چار چار کالمی خبریں چھاپی گئیں۔ ان کے خلاف نفرت اور حقارت کا پروپیگنڈہ اپنے عروج پر تھا۔ دلہوزی، ، مرزائی اور یونینسٹ الیکشن کے زمانے میں احرار کے خلاف اس پروپیگنڈے میں پوری طرح کامیاب ہو چکے تھے۔ حکومت کی ناعاقبت اندیشانہ سوچ اور عمل نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ لاہور کے ہزاروں مسلمان مسجد کے انہدام اور اپنے رہنماؤں کی گرفتاری اور نظر بندی کا سُن کر مسجد کی جانب دوڑے چلے آئے۔ ۹ جولائی سے مسجد کے گرد پولیس اور گورا فوج متعین کر دی گئیں۔ حکومتی حمایت یافتہ رہنماؤں کے ارادے اور منشا اور مقصد یہی تھا کہ پنجاب میں احرار کی سیاسی اور مذہبی قوت کو شکست دی جائے۔ عوام کو اس جماعت سے بد ظن کیا جائے تا کہ یونینسٹ کامیاب ہوں اور یہ سارا کھیل مذہب کے نام پر کھیلا گیا۔ مذہب ہمیشہ سے مسلمانوں کی کمزوری رہا ہے۔ اس طرح ایک ایسی آگ جلائی گئی جس پر قابو پانا حکومت کے لیے بھی ممکن نہ رہا۔ راستے خار دار تاروں سے بند کر دیے گئے، علاقے فوج کے پہرے میں چلے گئے، کرفیو نافذ کیا گیا لیکن پھر بھی نوجوان ہجوم در ہجوم لاہور کی سڑکوں پر جمع ہوتے رہے۔ بار بار لاٹھی چارج سے بھی جب مسئلہ حل نہ ہوا اور حالات قابو سے باہر ہو گئے تو بالآخر پولیس اور فوج کو گولیاں چلانی پڑیں۔ سکھ اور مسلم مسلح تصادم بھی ہوئے۔ تمام تر مسلح کارروائیوں کے باوجود مسلمان مسجد کی جانب بڑھتے رہے[۱۶۸]۔ بقول شاعر:

ادھر آؤ ظالم! ہنر آزمائیں تو تیر آزما ہم جگر آزمائیں[۱۶۹]

تکبیر کی آواز کے ساتھ مسلمان آگے بڑھتے جاتے تھے اور شہادت کے رتبے پر فائز ہوتے جاتے تھے۔ ۲۰ اور ۲۱ جولائی کو انگریزوں کی جانب سے جو فائرنگ کا سلسلہ شروع ہوا اس میں حکومتی اعداد و شمار کے مطابق ۱۴ مسلمان شہید ہوئے۔ یہ بیان یکم اگست کو لندن کی پارلیمنٹ میں پوچھے گئے ایک سوال کے جواب میں دیا گیا۔ اخبارات و رسائل نے حکومتی اعداد و شمار کو درست نہیں مانا۔ حیرت ہے کہ ظفر علی خان اور دیگر رہنماؤں نے نظر بندی کے دوران اپنے وظیفے بڑھائے جانے کا مطالبہ تو بڑے زور و شور سے کیا لیکن شہادت پانے والے اور زخمیوں کی تعداد کے لیے کسی قسم کی تحقیقات کا مطالبہ نہیں کیا گیا۔ اصل میں لگام تو دلہوزی اور دیگر افسروں کے ہاتھ میں تھی ان رہنماؤں کی[۱۷۰]۔ لہٰذا وہ جیسا چاہتا تھا ان مسلم رہنماؤں کو استعمال کر رہا تھا۔

۲۸ جولائی ۱۹۳۵ء سے شروع ہونے والے شہید گنج کے عنوان سے اس ڈرامے کی تمام کہانی پر نظر ڈالیے، کہیں اصلیت دکھائی نہیں دے رہی ہے۔ لیکن ہدایت کار کا کمال یہ ہے کہ اس کے ہر کردار سے اس نے اس قدر عیاری سے کام لیا ہے کہ کسی کی ایمان داری پر شبہ نہیں پیدا ہوتا۔ حالانکہ گولیاں بھی چلیں، نعشیں بھی تڑپیں، زخمی بھی ہوئے، سیکڑوں لوگ جیل خانوں میں گئے، بچے یتیم، بہنیں بیوہ ہوئیں، ان گنت سہاگ اجڑے، کاروبار تباہ ہوئے، نتیجہ یہ ہوا کہ سکھ تو گوردوارہ سنبھال کر بیٹھ گئے[۱۷۲] لیکن مسلمان جن کا دعویٰ تھا کہ:

جہاں آج خاک اڑتی نظر آتی ہے سکھوں کی وہاں کل مسجد بنے گی اور وہ بھی مرمریں مسجد[۱۷۳]

مگر پریوی کونسل کا فیصلہ آنے تک جذبات کی بھٹیاں سرد پڑ چکی تھیں۔ وہ گیت جو مسلمان مسجد کی بازیابی کے حوالے سے گنگناتے رہتے تھے، وہ بے سُرے ہو گئے۔ یہ تمام گیت اپنے ساز کے تاروں میں الجھ کر رہ گئے۔ مفتی نے مضراب اتار پھینکی، سازندے ساز پھینک کر رخصت ہو گئے، گائیک کے گلے میں سندھور کی ایسی چٹکی ڈالی گئی کہ آواز تک نہ نکلی۔ شہیدوں کا لہو، اسیرانِ فرنگ کے مصائب، عوام کا ایثار، سب کے سب برطانوی آئین کے روبرو سینہ سپر انداز ہو چکے تھے[۱۷۴]۔ اختلافات کی جو لہر اس دور میں مسلمان رہنماؤں کے بیچ پیدا ہوئی وہ پھر کبھی ختم نہ ہو سکی۔ یہاں تک کہ مجلس احرار کے سید عطاءاللہ شاہ بخاری نے مسجد شہید گنج کے مقدمے کی کامیابی کے لیے دعا کا اعلان کیا تو مولانا ظفر علی خان نے طنز کرتے ہوئے کہا کہ:

بے سود ہے دعا، نہ ہو جب تک عمل کے ساتھ میں نے پڑھا ہے بدر و احد کی کتاب سے[۱۷۵]

شدید اختلافات کے بعد چند خیز اندیش مسلمانوں نے افہام و تفہیم بھی پیدا کرنے کی کوشش کی۔ مصالحت کے پل بھی باندھے گئے۔ چناں چہ مجلس احرار اور مجلس اتحاد مسلم کے سرکردہ رہنماؤں کا ایک اجلاس گجرات میں ہوا۔ معاہدے پر دستخط بھی ہوئے اور آئندہ کے لیے مل جل کر کام کرنے کا فیصلہ بھی ہوا لیکن یہ معاہدہ بھی زیادہ عرصے تک نہ چل سکا۔ اس صورتِ

حال پر بھی ظفر علی خان نے "میثاق گجرات" کے عنوان کے تحت ایک نظم لکھی جس میں ان اختلافات کو بیان کرتے ہوئے کہا کہ:

سرِ بازار اچھلتی ہم نے دیکھیں پگڑیاں اپنی — پڑا ہے جب سے پالا فتنۂ احرار سے ہم کو
خدا کے گھر کی بربادی پہ جب خوں آنکھ سے ٹپکا — تو روکا بڑھ کے دل کے درد کے اظہار سے ہم کو
بڑھایا آشتی کا ہاتھ جب ان کی طرف ہم نے — جواب اس کا ملا تلوار کی جھنکار سے ہم کو
سیاست اس کو کہتے ہیں کہ چھپ کر گھر میں جا بیٹھے — لڑا کر جنگ کے میدان میں سرکار سے ہم کو[۱۷۶]

مولانا ظفر علی خان مسجد شہید گنج کے معاملے میں صرف مجلس اتحاد مسلم کے کردار کو اہمیت دیتے تھے۔ یہ مجلس ان ہی کی قائم کردہ مجلس تھی۔ اس کے علاوہ وہ دیگر تمام تنظیموں خصوصاً مجلس احرار کو شک کی نگاہ سے دیکھتے تھے، اس بابت وہ کہتے ہیں کہ:

مرا گناہ یہی ہے کہ مجھ کو ہے اصرار — شہید گنج کی مسجد کی بازیابی پر
مری نظر میں ہیں مسجد کے منبر و محراب — جمی ہوئی نظر احرار کی ہے لابی پر[۱۷۷]

مذکورہ صفحات میں ذکر ہو چکا ہے کہ مجلس وضع آئین و قوانین کے انتخابات اس زمانے میں ہونے والے تھے۔ ظفر علی خان احرار پر اقتدار کی ہوس کا الزام لگا رہے تھے۔ انھوں نے ہندوؤں اور سکھوں کے مقابلے میں مجلس احرار پر مسلمانوں کو زیادہ نقصان پہنچانے کا الزام بھی لگایا۔ ان کا کہنا تھا کہ:

ہندوؤں سے ہے نہ سکھوں سے نہ سرکار سے ہے — گلہ رسوائیِ اسلام کا احرار سے ہے[۱۷۸]

وہ مسجد کی بازیابی کے لیے احرار کے سرخ پوشوں کے مقابلے میں نیلی پوش رضاکاروں کی بھرتی کو ضروری سمجھتے تھے، ان کے خیال میں ان نیلی پوش رضاکاروں پر خدا کی خاص رحمت نازل ہوگی اور وہ مسجد کو واگزار کرانے میں کامیاب ہو سکیں گے۔

رحمتیں کونین کی نازل ہوں نیلی پوش پر — تازہ جس نے کر دیا افسانۂ عہدِ الست[۱۷۹]

مسجد کی بازیابی کے لیے بہنے والے خون کو وہ اپنی ذات کا ضروری حصہ قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

جس سے گل رنگ ہوا مسجدِ لاہور کا صحن — نسبت اس خون کو میری ہی شرائین سے ہے[۱۸۰]

مسلم جماعتوں کی بے حسی اور مسجد شہید گنج کے معاملے میں سنجیدہ کوششوں کی کمی نے انھیں یہ بھی کہنے پر مجبور کیا کہ:

شہید گنج کی مسجد پکارتی ہے تمھیں — دبے ہوؤ، وہ خود اٹھ کر ابھارتی ہے تمھیں[۱۸۱]

جس دن مسجد کو منہدم کیا گیا، وہ دن ہندوستان بھر کے مسلمانوں کے لیے کسی سانحے سے کم نہیں تھا۔ پھر اس معاملے میں جو سیاست کی گئی اور مسلم اکابرین دھڑوں میں بٹ گئے، اس جانب اشارہ کرتے ہوئے شاعر کہتے ہیں کہ:

جس دن شہید گنج کی مسجد ہوئی شہید — اسلامیوں کے سر پہ قیامت گزر گئی
اپنوں کا ایک گروہ پرایوں سے جا ملا — بازی جو ہم نے جیت ہی لی تھی وہ ہر گئی[۱۸۲]

اس معاملے میں حکمرانوں نے مسلمانوں کے خلاف طاقت کا بے دریغ استعمال کیا۔ مستقل فائرنگ سے بے جا انسانی جانیں ضائع ہوئیں۔ اس جانب اشارہ کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ:

جب ہوئی لاہور کی مسجد شہید — مچ گیا شورِ قیامت کو بہ کو
بھاؤ پانی سے بھی سستا ہو گیا — بہہ گیا اتنا مسلماں کا لہو[۱۸۳]

اس مسجد کے ذریعے مولانا ظفر علی خان کے خیال میں گھر گھر مسلمانوں کے دینی مقامات کی حفاظت کا ایک ایسا جذبہ پیدا ہوا جس نے پورے ہندوستان میں حریت فکر کے جذبات کو ابھارا۔ اس بابت شاعر کا کہنا ہے کہ:

عرش آشیاں یہ رفعتِ بامِ شہید گنج — کس درجہ ہے بلند مقامِ شہید گنج
گر عمرو زر بکف ہے تو ہے زید سر بکف — گھر گھر پہنچ چکا ہے پیامِ شہید گنج
انساں کی طرح جن و ملک کی زباں پہ ہے — گونجا ہے کائنات میں نامِ شہید گنج[۱۸۴]

اس واقعے کے بعد پورے پنجاب میں بے دردی کی جو تحریک اٹھی اس کے اثرات بعد کی سیاسی فضا میں واضح طور پر دیکھے جا سکتے ہیں۔ مولانا ظفر علی خان اس واقعے کی اثر پزیری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

جب مسجدِ لاہور کو سکھوں نے گرایا — انگریزوں کے قانون کی گینتی کی مدد سے
پنجاب کے گھر گھر میں مچا شورِ قیامت — سُن کر جسے مردے بھی نکل آئے لحد سے[۱۸۵]

غرض کہ اس سانحے میں شہادت کا مرتبہ پانے پانے والے اور اپنی جان قربان کرنے والوں کو برسوں یاد رکھا گیا۔ خود مولانا ظفر علی خان ان شہدا کی برسی کے موقعے پر انھیں ان الفاظ میں خراج تحسین پیش کرتے ہیں کہ:

مرتبہ تم کو شہادت کا ملا تم کو سلام — بھیجتا ہے عرشِ اعظم سے خدا تم پر سلام
کر دیا تم نے حیاتِ جاوداں کا راز فاش — تم نے جاں اسلام پر کر دی فدا، تم پر سلام
سر کٹا کر تم نے رکھ لی عزتِ شرعِ نبیؐ — کیوں نہ پھر بھیجیں محمد مصطفیؐ تم پر سلام[۱۸۶]

غرض کہ آج اس سانحے کو رونما ہوئے برسہا برس بیت گئے۔ نصف صدی سے زیادہ کا عرصہ گزر گیا۔ مسلمانوں کے لیے نئی مملکت کا قیام بھی عمل میں آ گیا لیکن مسجد شہید گنج کا قضیہ آج تک حل نہیں ہو پایا۔ لکھنؤ اور کلکتے میں مسلم لیگ کے

اجلاسوں میں بھی مسجد کی بازیابی کے لیے قرارداد پیش کی جاتی رہیں، یونینسٹ اور اتحاد ملت نے بھی انتخابات میں مسجد شہید گنج کے نعرے لگائے لیکن نتیجہ کچھ نہ نکلا۔ ۹ فروری ۱۹۷۸ء کو لاہور کے ایک مزدور پیشہ محمد صدیق چغتائی نے سول جج سردار علی گل کی عدالت میں مقدمہ بھی دائر کیا لیکن متروکہ وقفِ املاک کے جواب داخل کرنے کے بعد جس میں دستاویزی ثبوت نہ ہونے کی طرف دلیل دے کر مقدمہ خارج کر دیا گیا[۱۸۷]۔ یہ کاغذات کہاں سے ملتے۔ خود مولانا ظفر علی خان کے فرزند اختر علی پر یہ الزام ہے کہ انھوں نے ان کاغذات کو سکھوں کے ہاتھوں فروخت کر دیے[۱۸۸]۔ اس طرح آج تک اس مسجد کی بازیابی کا مسئلہ حل نہ ہو سکا۔

انگریز دور حکومت میں اس طرح کے متعدد واقعات پیش آتے رہے۔ خود احرار نے اس زمانے میں مسجد شاہ چراغ کی جانب توجہ دلائی جس پر انگریزوں نے دفاتر قائم کر رکھے تھے لیکن احرار کے توجہ دلانے پر دوسرے روز ہی خالی کر دیے گئے[۱۸۹]۔ اسی طرح مولانا ظفر علی خان نے ''مسجد منزل گاہ سکھر'' کی بابت اگست ۱۹۳۹ء میں ایک نظم لکھی جس میں کہا کہ:

غیر کی تحویل میں مسجد ہے منزل گاہ کی ۔۔۔ قبضۂ طاغوت میں ہے جائداد اللہ کی
یوں پڑا ہوتا نہ تالا گھر میں ربّ کعبہ کے ۔۔۔ حکمرانی سندھ میں ہوتی گر آصف جاہ کی
آج سکھر میں ہے دنگل کفر و اسلام کا ۔۔۔ دیکھ لے ہندوستاں کُشتی یہ کوہ و کاہ کی[۱۹۰]

ہندوستان میں انگریزوں کے اس عمل نے مسلمانوں کو ہمیشہ بے چین رکھا لیکن ان پریشان کن اور اندوہ ناک واقعات کا مسلمانوں نے ڈٹ کر مقابلہ کیا اور اپنے عزم و حوصلے سے ہمیشہ دشمن قوتوں کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا۔

حوالہ جات

۱۔ نارنگ، گوپی چند، ''ہندوستان کی تحریک آزادی اور اردو شاعری''، قومی کونسل برائے فروغ اردو، نئی دہلی، ۲۰۰۳ء، ص ۳۳۶

۲۔ برنی، ضیاالدین احمد، ''حادثۂ کان پور''، مشمولہ: ''حیات مولانا محمد علی جوہر''، اردو اکیڈمی سندھ، کراچی، ۲۰۰۱ء، ص ۱۰۵

۳۔ احمد، ڈاکٹر سید سعید، ''شہر ادب کان پور''، سید اینڈ سید، پبلشرز، کراچی، ۲۰۰۱ء، ص ۳۳

۴۔ برنی، ص ۱۰۵

۵۔ بہ حوالہ برنی، ص ۱۰۵

۶۔ برنی، ص ۱۰۵

۷۔ نارنگ، ص ۳۳۶

۸۔ برنی، ص ۱۰۶

۹۔ آزاد، مولانا ابوالکلام، ''شہدائے کان پور، لکھنؤ کو مجوزہ جلسہ''، مشمولہ: ''الہلال''، ۳ ستمبر ۱۹۱۳ء، ص ۱۴

۱۰۔ عباسی، محمود احمد، علیگ، ''حادثۂ کان پور کی مسئولیت''، مشمولہ: ''الہلال''، ۲۳ جولائی ۱۹۱۳ء، ص ۷۹

۱۱۔ روزنامہ ''ہمدرد''، ۸ جولائی ۱۹۱۳ء، بہ حوالہ: رئیس احمد جعفری، ''کاروانِ گم گشتہ''، رئیس احمد جعفری اکیڈمی، کراچی، ۱۹۷۱ء، ص ۴۱۹

۱۲۔ ایضاً

۱۳۔ عباسی، ص ۸۷

۱۴۔ احمد، کریم، ''مراسلات''، مشمولہ: ''الہلال''، ۲۲ اکتوبر ۱۹۱۳ء، ص ۱۵

۱۵۔ ہیرالڈ آف انڈیا، ۲۴ نومبر ۱۹۱۲ء، بہ حوالہ: رئیس احمد جعفری، محولہ بالا، ص ۴۱۷

۱۶۔ روزنامہ ''ہمدرد''، محولہ بالا، ص ۴۱۷

۱۷۔ جعفری، رئیس احمد، ''کاروانِ گم گشتہ''، محولہ بالا، ص ۴۱۸

۱۸۔ ایضاً

۱۹۔ ایضاً، ص ۴۱۹

۲۰۔ ایضاً، ص ۴۲۰

۲۱۔ جوہر، مولانا محمد علی، خط، بہ حوالہ: رئیس احمد جعفری، محولہ بالا، ص ۴۲۲

۲۲۔ جعفری، رئیس احمد، محولہ بالا، ص ۴۲۲۔۴۲۳

۲۳۔ ایضاً، ص ۴۲۳

۲۴۔ سرور، محمد، پروفیسر، ''مولانا محمد علی جوہر کے یورپ کے سفر''، ادارہ ادبیاتِ نو، لاہور، ۱۹۴۶ء، ص ۶۔۷

۲۵۔ ایضاً، ص ۷

۲۶۔ طارق، رابعہ، ''مولانا ظفر علی خان کی آپ بیتی''، ندوۃ المعارف، لاہور، ۱۹۹۹ء، ص ۶۲

۲۷۔ آزاد، ص ۱۴

۲۸۔ قریشی، اشتیاق حسین، ''برصغیر پاک و ہند کی ملت اسلامیہ''، شعبۂ تصنیف و تالیف و ترجمہ، کراچی یونی ورسٹی، کراچی، ۱۹۹۹ء، ص ۳۵۰

۲۹۔ ندوی، سید سلیمان، ''حیات شبلی''، مطبع معارف، اعظم گڑھ، ۱۹۴۳ء، ص ۶۰۰

۳۰۔ برنی، ص ۱۰۶

۳۱۔ اظہر، سید اشتیاق، ''تاریخ کان پور''، کان پور اکیڈمی، کراچی، ۱۹۸۷ء، ص ۴۵

۳۲۔ ندوی، سید سلیمان، ''مشہد اکبر''، مشمولہ: ''نوائے آزادی''، مرتبہ، عبدالرزاق قریشی، ادبی پبلشرز، بمبئی، ۱۹۵۷ء، ص ۱۲۳

۳۳۔ قریشی، عبدالرزاق، ''نوائے آزادی''، ادبی پبلشرز، بمبئی،۱۹۵۷ء،ص۱۱۸

۳۴۔ جعفری، رئیس احمد، ''کاروانِ گم گشتہ''، محولہ بالا، ص ۴۴۵

۳۵۔ اظہر،ص۴۵

۳۶۔ ندوی،ص۶۰۱

۳۷۔ احمد،ص۳۳

۳۸۔ اظہر،ص۴۵

۳۹۔ ندوی،ص۶۰۱

۴۰۔ آزاد، مولانا ابو الکلام، مشمولہ: ''الہلال''، ۳ ستمبر ۱۹۱۳ء،ص۱۴

۴۱۔ ندوی، سید سلیمان، ''مشہد اکبر''، محولہ بالا، ص ۱۲۰۔ ۱۲۱

۴۲۔ آزاد، مولانا ابو الکلام، مشمولہ: ''الہلال''، ۲۰ اگست ۱۹۱۳ء،ص۱۶

۴۳۔ احمد،ص۳۴

۴۴۔ نظامی، خواجہ حسن، بہ حوالہ رئیس احمد جعفری، ''کاروانِ گم گشتہ''، محولہ بالا،ص۴۲۴

۴۵۔ آزاد، مولانا ابو الکلام، ''مسجد کان پور: رویت و روایت''، مشمولہ:''الہلال''،۲۰اگست۱۹۱۳ء،ص۱۶

۴۶۔ ندوی،سید سلیمان،''مشہد اکبر''، محولہ بالا،ص۱۲۱

۴۷۔ ندوی،سید سلیمان،''حیات شبلی''، محولہ بالا،ص۶۰۱

۴۸۔ ناتھ، رام، ''مراسلہ''، مشمولہ: ''الہلال''، ۱۷ ستمبر ۱۹۱۳ء،ص۸

۴۹۔ آزاد، مولانا ابو الکلام، ''حادثہ کان پور تصحیح و تصدیق''، مشمولہ:''الہلال''، یکم اکتوبر ۱۹۱۳ء، ص

۵۰۔ جعفری، رئیس احمد، ''کاروانِ گم گشتہ''، محولہ بالا، ص۴۱۱

۵۱۔ ندوی،سید سلیمان،''مشہد اکبر''، محولہ بالا،ص۱۲۴

۵۲۔ بہ حوالہ ''الہلال''،۲۰اگست۱۹۱۳ء

۵۳۔ آزاد، مولانا ابوالکلام، مشمولہ: ''الہلال''، ۳ ستمبر ۱۹۱۳ء،ص۱۴

۵۴۔ قریشی، عبدالرزاق، ''نوائے آزادی''، محولہ بالا، ص ۱۲۴

۵۵۔ احمد،ص۳۴

۵۶۔ بہ حوالہ ''الہلال''،۱۵اکتوبر۱۹۱۳ء،ص۱۹

۵۷۔ مشمولہ: ''ہمدرد''، ۲۸ اگست ۱۹۱۳ء، بہ حوالہ: رئیس احمد جعفری،''کاروانِ گم گشتہ''، محولہ بالا،ص۴۴۱

۵۸۔ نامہ نگار، ''کان پور کے قیدیوں اور مجروحین کی کیفیت''، مشمولہ: ''علی برادران''، مرتبہ، رئیس احمد جعفری، محمد علی اکیڈمی، لاہور، ۱۹۲۳ء، ص ۳۷۱۔ ۳۷۳

۵۹۔ نظامی، خواجہ حسن، ''کان پور کی خونیں داستان''، سید پریس،میرٹھ، ۱۹۱۳ء،ص۱۸

۶۰۔ قریشی، خان محمد، مشمولہ:''الہلال''، ۱۷ ستمبر ۱۹۱۳ء، ص ۲۰

۶۱۔ احمد،ص۳۴

۶۲۔ بہ حوالہ ''الہلال''،۲۴ستمبر۱۹۱۳ء،ص۴

۶۳۔ رضوان، مولوی حکیم محمد، مشمولہ:''الہلال''، ۱۲نومبر ۱۹۱۳ء،ص۱۹

۶۴۔ دیکھیے:''الہلال''، ۲۴ستمبر۱۹۱۳ء

۶۵۔ دیکھیے:''الہلال''،۱۸اکتوبر۱۹۱۴ء، سرورق،ص ندارد

۶۶۔ دیکھیے:''الہلال''، یکم اکتوبر ۱۹۱۳ء،ص ندارد

۶۷۔ دیکھیے:''الہلال''، ۲۴ ستمبر، ص آخر

۶۸۔ نظامی،ص سرورق

۶۹۔ بہ حوالہ،''الہلال''،۱۷ستمبر۱۹۱۳ء،ص۱۹

۷۰۔ ردولوی، مظہر الحق نعمانی، مشمولہ: ''الہلال''، یکم اکتوبر ۱۹۱۳ء، ص ۷
۷۱۔ دیکھیے: ''الہلال''، ۲۴ ستمبر ۱۹۱۳ء، ص سرورق
۷۲۔ بہ حوالہ رئیس احمد جعفری، ''کاروانِ گم گشتہ''، محولہ بالا، ص ۴۴۹
۷۳۔ اظہر، سید اشتیاق، محولہ بالا، ص ۴۵
۷۴۔ رضا، سر علی، مشمولہ: پندرہ روزہ ''آج کل''، دہلی، یکم ستمبر ۱۹۴۳ء، ص ۲۴
۷۵۔ دیکھیے: ''الہلال''، ۲۹ اکتوبر ۱۹۱۳ء، ص ۳۰
۷۶۔ دیکھیے: ''الہلال''، ۱۷ دسمبر ۱۹۱۳ء، ص ۱۸۔ ۲۰
۷۷۔ دیکھیے: ''الہلال''، ۱۵ اکتوبر ۱۹۱۳ء، ص ۱۹
۷۸۔ افسوس، محمد علی، مشمولہ: ''الہلال''، ۱۵ اکتوبر ۱۹۱۳ء، ص ۱۹
۷۹۔ حسین، سید احمد، دیکھیے: ''الہلال''، ۲۹ اکتوبر ۱۹۱۳ء، ص
۸۰۔ رشید، مولانا، ''مصالحہ، مسجد کان پور کے متعلق چند شکوک''، مشمولہ: ''الہلال''، ۲۹ اکتوبر ۱۹۱۳ء، ص ۱۵؛ موصوف مدرسہ عالیہ کلکتہ سے منسلک تھے۔
۸۱۔ دیکھیے: ''الہلال''، ۵ نومبر ۱۹۱۳ء، ص ۱۹
۸۲۔ رضا، سر علی، ''تقریر'' ۸ ستمبر ۱۹۱۳ء، مشمولہ: ''علی برادران''، محولہ بالا، ص ۳۸۰۔ ۳۸۱
۸۳۔ نامہ نگار، ''کان پور کے مشرّح حالات''، مشمولہ: ''علی برادران''، محولہ بالا، ص ۴۰۳۔ ۴۰۶
۸۴۔ رضوی، ''تاریخ جدید اردو غزل''، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۱۹۸۸ء، ص ۴۸۸
۸۵۔ نامہ نگار، ''کان پور کے مشرّح حالات''، محولہ بالا، ص ۴۰۶
۸۶۔ جعفری، ص ۴۴۰۔ ۴۴۱
۸۷۔ آزاد، مولانا ابوالکلام، ''شہدائے کان پور کا مجوزہ جلسہ۔ ہندوستان کے انگریزی عہد کی آزادی کا خاتمہ۔ فرمانِ نادری کا ورود''، مشمولہ: ''الہلال''، ۱۰ ستمبر ۱۹۱۳ء
۸۸۔ ''الہلال'' کے اس شمارے میں سہواً ۱۹۱۳ء کے بجائے ۱۳۱۹ء درج ہے۔
۸۹۔ دیکھیے: ''الہلال''، ۳ ستمبر ۱۹۱۳ء، ص ۱۰
۹۰۔ جعفری، رئیس احمد، ''کاروانِ گم گشتہ''، محولہ بالا، ص ۴۲۶
۹۱۔ پانیر، بہ حوالہ: رئیس احمد جعفری، ''کاروانِ گم گشتہ''، محولہ بالا، ص ۴۲۰
۹۲۔ ''ہمدرد''، بہ حوالہ رئیس احمد جعفری، ''کاروانِ گم گشتہ''، محولہ بالا، ص ۴۲۰
۹۳۔ ندوی، ص ۶۰۱
۹۴۔ جعفری، ص ۴۳۰۔ ۴۳۳
۹۵۔ ایضاً، ص ۴۳۸
۹۶۔ بہ حوالہ رئیس احمد جعفری، محولہ بالا، ص ۴۳۶
۹۷۔ ندوی، ص ۶۰۱
۹۸۔ اظہر، اشتیاق، محولہ بالا، ص ۴۳۔ ۴۴
۹۹۔ احمد، ص ۳۴
۱۰۰۔ نارنگ، ص ۳۳۶
۱۰۱۔ فرید آبادی، ''تاریخ مسلمانانِ پاکستان و بھارت''، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی، ۱۹۸۸ء، ص ۵۳۴
۱۰۲۔ قدسی، عبداللہ، ''آزادی کی تحریکیں''، ادارۂ ثقافت اسلامیہ، لاہور، ۱۹۸۸ء، ص ۱۳۳
۱۰۳۔ نظامی، خواجہ حسن، بہ حوالہ ''کاروانِ گم گشتہ''، رئیس احمد جعفری، محولہ بالا، ص ۴۲۵
۱۰۴۔ نظامی، ص ۱۔ ۳
۱۰۵۔ ندوی، ص ۶۰۲۔ ۶۰۳

۱۰۶۔ نعمانی، علامہ شبلی، ''کلیات شبلی''، معارف پریس، اعظم گڑھ، ۱۹۴۰ء، ص ۸۰۔۸۱

۱۰۷۔ سندیلوی، ڈاکٹر سلام، ''مولانا شبلی کی اردو شاعری''، مشمولہ: ''ادیب''، علی گڑھ، شبلی نمبر، ستمبر ۱۹۶۰ء، ص ۱۶۵

۱۰۸۔ اکرام، شیخ محمد، ''شبلی نامہ''، تاج آفس محمد علی روڈ، بمبئی، سن ندارد، ص ۲۴۳

۱۰۹۔ نعمانی، ص ۸۱

۱۱۰۔ صدیقی، صدیق احمد، ''شبلی کی سیاسی شاعری پر ایک طائرانہ نظر''، مشمولہ: ''ادیب''، علی گڑھ، شبلی نمبر، محولہ بالا، ص ۱۷۳

۱۱۱۔ نعمانی، ص ۸۲

۱۱۲۔ ایضاً، ص ۸۴

۱۱۳۔ ایضاً

۱۱۴۔ ندوی، ص ۶۶۰۔۶۶۲

۱۱۵۔ نعمانی، ص ۸۵

۱۱۶۔ ایضاً، ص ۸۲۔۸۵

۱۱۷۔ جعفری، ص ۴۱۳

۱۱۸۔ ندوی، ص ۶۰۵

۱۱۹۔ نعمانی، ص ۸۳۔۸۴

۱۲۰۔ جعفری، ص ۴۱۴

۱۲۱۔ ندوی، ص ۶۰۶

۱۲۲۔ نعمانی، ص ۸۷

۱۲۳۔ آلہ آبادی، اکبر، بہ حوالہ ''اکبر کا سیاسی مسلک''، از مولانا عبد الماجد دریابادی، مشمولہ: ''نگار''، کراچی، اکبر الہ آبادی نمبر، نومبر دسمبر ۱۹۶۹ء، ص ۱۸

۱۲۴۔ دریابادی، عبد الماجد، ''اکبر کا سیاسی مسلک''، محولہ بالا، ص ۱۸

۱۲۵۔ الہ آبادی، اکبر، ''کلیات اکبر''، مرتبہ، اکرام چغتائی، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۸ء، ص ۴۸۳

۱۲۶۔ الہ آبادی، اکبر، مشمولہ: ''اردو میں قومی شاعری کے سو سال''، مرتبہ، علی جواد زیدی، اترپردیش اردو اکیڈمی، لکھنؤ، ۱۹۸۲ء، ص ۱۷۶

۱۲۷۔ الہ آبادی، اکبر، بہ حوالہ: ''کان پور کی خونیں داستان''، محولہ بالا، ص ب

۱۲۸۔ ذوالفقار، ڈاکٹر غلام حسین، ''ظفر علی خاں، ادیب و شاعر''، مکتبۂ خیابانِ ادب، لاہور، ۱۹۶۷ء، ص ۲۱۳۔۲۱۴

۱۲۹۔ خاں، مولانا ظفر علی، مشمولہ: ''اردو میں قومی شاعری کے سو سال''، محولہ بالا، ص ۱۹۹

۱۳۰۔ خاں، مولانا ظفر علی، ''طاقت ایمانی''، مشمولہ: ''ضبط شدہ نظمیں''، مرتبین، خلیق انجم، مجتبیٰ حسین، مجلس جشن علی جواد زیدی، نئی دلّی، ۱۹۷۵ء، ص ۲۰۱

۱۳۱۔ جعفری، ص ۴۴۸۔۴۵۲

۱۳۲۔ چڑیا کوٹی، کیفی، ''قطعہ''، مشمولہ: ''کاروانِ گم گشتہ''، محولہ بالا، ص ۴۵۲

۱۳۳۔ انصاری، حکیم الطاف حسین آزاد، مشمولہ: ''کاروانِ گم گشتہ''، محولہ بالا، ص ۴۵۲

۱۳۴۔ بہ حوالہ ''کاروانِ گم گشتہ''، محولہ بالا، ص ۴۶۵

۱۳۵۔ فریادی، راقم، ''مسلمانوں کی فریاد''، مشمولہ: ''علی برادران''، محولہ بالا، ص ۴۱۲

۱۳۶۔ افسر، حامد اللہ، ''مسجد سے خطاب''، مشمولہ: ''علی برادران''، محولہ بالا، ص ۴۰۰

۱۳۷۔ سندیلوی، قمر الدین قمر، مشمولہ: ''علی برادران''، محولہ بالا، ص ۳۹۰

۱۳۸۔ نا معلوم، ’’عشق بازوں کی سر فروشی‘‘، مشمولہ: ’’کان پور کی خونیں داستان‘‘، محولہ بالا، ص۳

۱۳۹۔ نا معلوم، بہ حوالہ ’’کان پور کی خونیں داستان‘‘، محولہ بالا، ص۱۲

۱۴۰۔ علی، مولانا نواب، ’’نواب شہِ جارج سے جا کر کوئی کہہ دے‘‘، مشمولہ: ’’کان پور کی خونیں داستان‘‘، محولہ بالا، ص۲۵

۱۴۱۔ نا معلوم، ’’مشہدِ اکبر‘‘، مشمولہ: ’’کان پور کی خونیں داستان‘‘، محولہ بالا، ص۱۳

۱۴۲۔ نامعلوم، ’’خون شہیداں‘‘، مشمولہ: ’’کان پور کی خونیں داستان‘‘، محولہ بالا، ص۲۶۔۲۷

۱۴۳۔ مدیر آگرہ، ’’چند لمحے شہیدانِ ستم کے ساتھ‘‘، مشمولہ: ’’کان پور کی خونیں داستان‘‘، محولہ بالا، ص ۲۷

۱۴۴۔ بریلوی، منشی ارشاد علی، ’’تاریخ طبع رسالہ ہذا‘‘، مشمولہ: ’’کان پور کی خونیں داستان‘‘، محولہ بالا، ص ۳۱

۱۴۵۔ مراد آبادی، جگر، ’’خطاب بہ مسلم‘‘، مشمولہ: ’’کلیات جگر‘‘، لبرٹی پبلشرز اینڈ پرنٹرز، حیدر آباد، ۱۹۵۸ء، ص ۲۲۶۔۲۲۸

۱۴۶۔ حیدر آبادی، مولانا محب حسین، ’’بند شیں‘‘، مشمولہ: ’’اردو میں قومی شاعری کے سو سال‘‘، محولہ بالا، ص ۱۷۶

۱۴۷۔ پھپھوندی، احمق، ’’عہد فرنگ‘‘، مشمولہ: ’’اردو میں قومی شاعری کے سو سال‘‘، محولہ بالا، ص۲۱۵

۱۴۸۔ الہ آبادی، علامہ فاخر، ’’سنت سجاد‘‘، مشمولہ: ’’اردو میں قومی شاعری کے سو سال‘‘، محولہ بالا، ص۲۲۳

۱۴۹۔ احقر بہاری، بشارت حسین، بہ حوالہ ’’شہر ادب کان پور‘‘، محولہ بالا، ص۳۶

۱۵۰۔ احمد، ص۳۴

۱۵۱۔ ایضاً

۱۵۲۔ ندوی، ص۶۰۳

۱۵۳۔ میاں، مولانا سید محمد، ’’تحریک شیخ الہند: انگریزی سرکار کی زبان میں ریشمی خطوط سازش کیس‘‘، نگارشات پبلشرز، لاہور، ۱۹۹۱ء، ص۱۹۴؛ اس کتاب کے مرتب نے سہواً سانحہ کان پور کے سن اور تاریخ کی بابت ۱۲ اگست ۱۹۱۲ء کی تاریخ درج کی ہے۔ درست تاریخ کی وضاحت مقالے میں کی جاچکی ہے۔

۱۵۴۔ ز۔خ۔ش۔ بہ حوالہ ’’ز۔خ۔ش۔ حیات و شاعری کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ‘‘، از فاطمہ حسن، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی، ۲۰۰۷ء، ص۶۹

۱۵۵۔ مرزا، جانباز، ’’تحریک مسجد شہید گنج: سیاسی، مذہبی و تاریخی پس منظر‘‘، مکتبۂ تبصرہ، لاہور، ۱۹۸۸ء، ص۱۲۔۱۳

۱۵۶۔ ایضاً، ص۱۸

۱۵۷۔ خاں، مولانا ظفر علی، بہ حوالہ ’’تحریک مسجد شہید گنج‘‘، محولہ بالا، ص۱۸۔۱۹

۱۵۸۔ مرزا، ص۱۹

۱۵۹۔ خاں، مولانا ظفر علی، ’’خالد لطیف گابا اور حاجی رحیم بخش کی انقلابی آویزش‘‘، مشمولہ: ’’کلیات ظفر علی خان‘‘، محولہ بالا، ص۱۷۲

۱۶۰۔ مرزا، ص۲۰۔۳۲

۱۶۱۔ ایضاً، ص۳۵۔۴۲

۱۶۲۔ خان، مولانا ظفر علی، مشمولہ: ’’کلیات ظفر علی خان‘‘، محولہ بالا، ص۱۸۳

۱۶۳۔ ایضاً، ص۱۸۲۔۱۸۳

۱۶۴۔ بہ حوالہ ’’زمیندار‘‘، ۴جولائی ۱۹۳۵ء

۱۶۵۔ خان، مولانا ظفر علی، بہ حوالہ: جانباز مرزا، ''تحریک مسجد شہید گنج''، محولہ بالا، ص ۴۲
۱۶۶۔ حبیب، سید، بہ حوالہ: روزنامہ ''سیاست''، ۳ جولائی ۱۹۲۵ء
۱۶۷۔ مرزا، ص ۴۵۔۴۷
۱۶۸۔ ایضاً، ص ۴۹۔۸۳
۱۶۹۔ بہ حوالہ: جانباز مرزا، محولہ بالا، ص ۸۳
۱۷۰۔ مرزا، ص ۸۳۔۹۵
۱۷۱۔ ایضاً، ص ۳۸۰۔۳۸۱
۱۷۲۔ بہ حوالہ: جانباز مرزا، محولہ بالا، ص ۳۸۱
۱۷۳۔ ایضاً
۱۷۴۔ مرزا، ص ۳۸۱۔۳۸۳
۱۷۵۔ خان، مولانا ظفر علی، مشمولہ: ''کلیات ظفر علی خان''، محولہ بالا، ص ۱۹۱
۱۷۶۔ ایضاً، ص ۲۰۳
۱۷۷۔ ایضاً، ص ۲۰۴
۱۷۸۔ ایضاً، ص ۲۰۶
۱۷۹۔ ایضاً، ص ۲۰۵
۱۸۰۔ خان، مولانا ظفر علی، ''چمنستان''، محولہ بالا، ص ۱۱
۱۸۱۔ ایضاً، ص ۱۳
۱۸۲۔ ایضاً، ص ۱۶
۱۸۳۔ ایضاً، ص ۲۲
۱۸۴۔ ایضاً، ص ۵۲
۱۸۵۔ ایضاً، ص ۱۹۴
۱۸۶۔ ایضاً، ص ۸۸
۱۸۷۔ مرزا، ص ۳۸۴۔۳۸۵
۱۸۸۔ ایضاً، ص ۴۲۔۴۳
۱۸۹۔ ایضاً، ص ۱۲۳
۱۹۰۔ خان، مولانا ظفر علی، محولہ بالا، ص ۱۶۳

جلیاں والا باغ کا سانحہ: محرکات، عوامل اور شعری منظر نامہ

انگریزوں کے دورِ حکومت میں جلیاں والا باغ کے سانحے کو ہمیشہ ایک سیاہ باب کے طور پر یاد رکھا جائے گا۔۱۳/اپریل ۱۹۱۹ء کا وہ ناقابل فراموش دن جب گورنر مائیکل اڈوائر (Michael O'Dwyer) کے حکم سے جنرل ڈائر (Reginald Dyer) نے جلیاں والا باغ میں جمع ہزاروں ہندوستانی مظاہرین پر گولیاں برسا دیں۔نتیجتاً جلیاں والا باغ میں کئی سو افراد جاں بحق ہو گئے[۱]۔جلیاں والا باغ کے المیے نے ہندوستان کی جدوجہد آزادی میں ایک بڑے محرک کا کام کیا تھا کیوں کہ ترک موالات کی تحریک جو اس واقعے کے سوا سال بعد شروع ہوئی اس میں مظالم پنجاب اور خلافت تحریک کو کسی صورت نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔افسوس کی بات یہ ہے کہ اس دور کے سیاسی تجزیوں، تاریخی اور ادبی حوالوں میں جذباتی انداز میں جلیاں والا باغ، مارشل لا اور مظالم پنجاب کا ذکر تو ضرور ہوتا ہے مگر ان واقعات کی جزئیات وتفصیلات میں جانے کی ضرورت بہت کم محسوس کی گئی۔حقائق پر گرد کی تہہ بیٹھتی گئی اور واقعات کے بیان میں اکثر تضاد اور التباس نظر آنے لگا۔نصف صدی گزرنے کے باوجود پاکستان، بھارت، انگلستان اور امریکی مورخین کے نزدیک یہ موضوع آج بھی توجہ کا مرکز ہے۔ ہنٹر کمیٹی کی رپورٹ، کانگریس کمیٹی کی روداد اور متعلقہ شہادتیں بہت سے حقائق کو منظر عام پر لانے میں معاون ثابت ہوئیں۔ اس واقعے کے گزرنے کے کئی ماہ بعد جب پنجاب پر سر مائیکل اوڈ وائر کے ڈالے ہوئے آہنی پردے کے اندر کی خبریں انگلستان پہنچنے لگیں تو انگلستان میں کہرام مچ گیا اور پارلیمنٹ کے اندر اور باہر بحث ومباحثے کا آغاز ہوا۔اس تصادم کو بعض انگریز سول حکام اور فوجی افسروں نے ۱۸۵۷ء کے واقعات سے مشابہ قرار دے کر بغاوت (میوٹنی) کا عنوان دینے کی کوشش کی لیکن ان لوگوں کی بدنیتی اس وقت پوری طرح عیاں ہوگئی جب ہنٹر کمیشن کے سامنے اس دروغ گوئی کا کوئی ثبوت پیش نہ کر سکے۔ ۱۹۱۹ء میں رونما ہونے والا یہ سانحہ نہ کسی سازش کا نتیجہ تھا اور نہ ہی کسی بغاوت کا پیش خیمہ[۲]۔اس سانحے کے رونما ہونے سے قبل امرتسر میں ہندو مسلم اتحاد و یکجہتی کی جو فضا پھیلی ہوئی تھی اسے دیکھتے ہوئے انگریز حکمراں اس سانحے کو ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ سازش قرار دیتے ہیں۔سفید فام بیوروکریسی اسے برطانوی سامراج کے لیے خطرناک صورت قرار دے رہی تھی اور بقول روبرٹ فرینکلس:

> The next three days in Amrits are passed without incident. On the evening of the 9th He Hindu festival of Ram naumi was abserved the only disquieting feature being that it was celebrated by Hindus and Muslims alike, a simister example of religious fraternization whith boded ill for the traditional British policy of divid and rule.[۳]

برطانوی حکمرانوں نے جنوبی ایشیا پر طویل عرصے تک حکمرانی کرنے کے لیے اختلافات کو ہوا دینے، تفریق پیدا کرنے اور ہندو مسلم باہمی آویزش کو ہوا دینے پر پوری توجہ مرکوز رکھی۔فرقہ وارانہ فسادات کا پودا برطانوی عہد میں لگایا گیا، تفریق وتقسیم کی پالیسی جہاں کہیں ذرا بھی ڈولتی نظر آتی برطانوی سول سروس کے لوگ پھر سے سازشوں میں مصروف ہو جاتے۔ ۱۹۱۹ء میں جوں ہی سفید فام

حکمرانوں کو ہندو مسلم آپس میں گلے ملتے دکھائی دیتے اس منظر نے انھیں پریشان کر دیا۔ یہی بنیادی سبب بنا پنجاب میں رونما ہونے والے اس عظیم سانحے کا جس کو جلیاں والا باغ کا سانحہ کہا جاتا ہے[۴]۔

جلیاں والا باغ میں انگریزی افواج نے ہر اصول، ہر قانون اور ہر ضابطے کو نظر انداز کر کے حریت طلب اور آزادی خواہ ہندوؤں، سکھوں اور مسلمانوں کے نہتے اور پرامن مجمع پر جس طرح گولی چلائی اس کی مثال برطانوی سامراج کی تاریخ میں شاید ہی مل سکے[۵]۔

پہلی جنگ عظیم کے دوران جنوبی ایشیائی محکوم باشندوں نے حکومتِ برطانیہ سے کچھ توقعات وابستہ کر کے اپنے تمام مالی وسائل اور افرادی قوت جنگ کی بھٹی میں جھونک دیے۔ پنجاب نے خصوصاً اپنے لاکھوں جوانوں کو برطانوی فوج میں شامل کر کے سلطنت برطانیہ کا بازوئے شمشیر ہونے کا لقب حاصل کر لیا۔ جنگ کے آغاز میں ہی انگرس ایکٹ اور ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ نافذ کر کے اخبارات اور صحافتی اداروں پر پابندیاں مزید سخت کر دی گئیں۔ کئی نام ور صحافی نظر بند کر دیے گئے۔ مقامی لوگوں کو ان خدمات کے صلے میں کچھ خوش آئند وعدوں سے نوازا گیا۔ اس مقصد کے لیے ۲۰ راگست ۱۹۱۷ء کو برطانوی پارلیمانی (ہاؤس آف کامنز) میں اتفاق رائے سے ہندوستان کے لیے اپنی آئندہ پالیسی کا اعلان کیا گیا جس کے تحت اہل ہند کو خود مختاری کے سہانے خواب دکھائے گئے۔ معاہدہ لکھنؤ کے بعد ایڈون مانٹیگو (Edwin Montagu) نے دس اراکین کے ساتھ ہندوستان کا دورہ کیا جو اس وقت وزیر ہند کے عہدے پر فائز تھے۔ امپیریل کونسل کے دس ارکان اس سے قبل انھیں اپنی تجاویز دے چکے تھے لہٰذا ان تجاویز کی روشنی میں وزیر ہند مانٹیگو اور وائسرائے لارڈ چیمسفورڈ (Lord Chelmsford) نے جنگ کے خاتمے کے بعد آئینی اصلاحات کے نام پر حکومتِ خود اختیاری کی طرف قدم بڑھانے کا فیصلہ کیا[۶]۔ معاہدہ سیورے (severely) کے نتیجے میں سلطنت عثمانیہ کے حصے بخرے کے بعد مسلمانوں کے جذبات پہلے ہی مشتعل تھے۔ بہت سے برطانوی حلقے اس حق میں بھی تھے کہ جنگ کے دوران مسلمانوں نے جو وفاداری ظاہر کی ہے، اس کے صلے میں انھیں حکومت میں کچھ زیادہ حصہ ملنا چاہیے۔ ابھی مسلمانوں کی جانب سے حکومت خود اختیاری کے لیے ابتدائی قدم ہی لیے گئے تھے کہ ہندوستانی حکومت نے ''دولت ایکٹ'' نافذ کرنے کی غلطی کر دی[۷]۔ جنگِ عظیم ختم ہونے کے بعد قانون تحفظِ ہند کی میعاد ختم ہونے والی تھی لہٰذا حکومتِ ہند اس کی جگہ دوسرے ہنگامی قوانین نافذ کر کے اپنے استعماری مفادات کا تحفظ ضروری تھی، اس مقصد کے تحت تیاری پہلے ہی ہو چکی تھی۔ وزیر ہند کا ۱۰ دسمبر ۱۹۱۷ء کا دورہ اسی سلسلے کی کڑی تھا جس کے بعد مسٹر جسٹس سر سڈنی رولیٹ (Sidney Rowlatt) کی کی سربراہی میں ایک سڈیشن کمیٹی قائم کی جس کے ذمے یہ کام لگایا گیا کہ ہندوستان میں انقلابی تحریکوں کے سلسلے میں مجرمانہ سازشوں کی ماہیت اور حدود کا جائزہ لے اور اس قسم کی سازشوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے جو مشکلات پیدا ہوں، ان کا بھی جائزہ لے کر ضروری ہو تو قانون سازی میں مشورہ دے، تاکہ حکومت ان سے موثر طور پر نبٹ سکے۔ سڈیشن کمیٹی کے اجلاس بند کمرے میں لاہور اور کلکتہ میں منعقد ہوئے۔ اس نے اپنی رپورٹ ۱۵ اپریل ۱۹۱۸ء کو تیار کر کے حکومتِ ہند کو پیش کر دی[۸]۔ اس کمیٹی کی سفارش کے مطابق دو متوازی قوانین کے مسودے تیار ہوئے اور دونوں بل الگ الگ پاس ہو کر ایکٹ بنے، لیکن عوام نے دونوں کو اکٹھا کر کے دولت ایکٹ کا جامع نام دے دیا[۹]۔ یہ مسودۂ قانون ۱۹۱۹ء میں ہندوستانیوں کی شدید مخالفت کے باوجود منظور کر لیا گیا۔ اس ایکٹ کے مطابق حکومت ہند کو اختیار دیا گیا کہ جن لوگوں پر دہشت انگیز سرگرمیوں میں حصہ لینے کا شبہ ہو، ان کو بغیر کسی عدالتی کارروائی کے قید کر سکتی ہے[۱۰]۔ دراصل

جنوبی ایشیا میں جاری متشدد تحریکوں کے دو بڑے مراکز میں سے بمبئی پریزیڈنسی میں پونا اور بنگال پریزیڈنسی میں کلکتہ انقلابی تحریکوں کے بڑے مراکز رہے۔ دونوں تحریکوں کے ربط کے بارے میں حتمی بات کہنا مشکل ہے۔ پونا میں چت پون برہمن انقلابی تحریک پیش پیش تھی۔ بال گنگادھر تلک اس تحریک کے روحِ رواں تھے جو اپنا کیسری اخبار نکالتے تھے اور ''سیوا جی'' کے نام پر اپنی جارحانہ تحریک کو برطانیہ اور ہندی مسلمانوں کے خلاف منظّم کر رہے تھے۔ جب کہ کلکتہ مرکز میں بھدرا لوک جو کہ متوسط طبقے کے تعلیم یافتہ بنگالی ہندوؤں کی تحریک تھی، برطانوی سرپرستی میں ہی ترقی کر کے اپنے آقاؤں کو ہی آنکھیں دکھا رہی تھی۔ تقسیم بنگال کے عمل نے اس تحریک کو نہ صرف بنگال بلکہ ہندوستان بھر میں مقبول بنا دیا تھا۔ ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر (William Wilson Hunter) کی رپورٹ اور بنکم چیٹر جی کے ناول آنند مٹھ میں ان عزائم پر روشنی ڈالی گئی ہے جس کے تحت عام مسلمانوں کو پس ماندہ رکھنے کے لیے اس تحریک نے کیا کردار ادا کیا۔ اس تحریک نے تنسیخ بنگال کے معاملے میں اہم کردار ادا کیا اور انقلابی (انارکسٹ) نے دہشت گردی کا روپ دھار کر ''بم بازی'' کا سلسلہ شروع کر دیا۔ تاریخ کے اس پس منظر میں یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ پونا اور کلکتہ کی ان تحریکوں کو ابتداً خود برطانوی استعماری حکمت عملی نے خوب ہوا دی اور ان کے مطالبات کے سامنے سرنگوں ہو کر ''تنسیخ تقسیم بنگال'' کی صورت میں انعام سے بھی نوازا۔ یہ حقیقت پوری طرح عیاں ہے کہ ان انقلابی (انارکسٹ) تحریکوں سے مسلمانوں کا کوئی کوئی واسطہ نہیں تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ہندو، انگریزوں کے ساتھ مل کر مسلمانوں کو بدیسی قرار دے کر خالص ''رام راج'' کے قیام اور ویدک عہد کے احیا کے خواب دیکھ رہے تھے اور یہ خواب انھیں انگریز دانش وروں اور مؤرخوں نے ہی دکھائے تھے۔ اسی لیے مسلمانوں کو ان انقلابی تحریکوں کے پاس پھٹکنے بھی نہیں دیا جاتا[۱۱]۔ سڈیشن کمیٹی نے اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہوئے واضح طور پر لکھا کہ[۱۲] "So far all the trouble had been Hindu" سڈیشن کمیٹی نے اپنی تحقیقات میں جہاں ہندوؤں کی انارکسٹ تنظیموں کے بارے میں تفصیلی معلومات فراہم کیں اور ان کی دہشت پسندانہ سرگرمیوں کا جائزہ لیا، وہاں اسے مسلمانوں کی کسی ایسی انقلابی (انارکسٹ) تنظیم کا کوئی سراغ نہیں ملا۔ لے دے کے صوبہ سرحد کے قبائلی علاقوں میں زنگ آلود تلواروں اور توڑے دار بندوقوں سے مسلح سوڈیڑھ سو افراد، لاہور سے پندرہ طالب علموں کی ہجرت برائے جہاد جنھیں افغانستان پہنچتے ہی انگریزوں کے دوست امیر حبیب اللہ نے نظر بند کر دیا تھا، یا پھر ریشمی رومال والی دو چٹھیوں کا انکشاف جو مولانا عبیداللہ سندھی کے خیالی منصوبوں یا کابل میں قائم کسی انقلابی تحریک کے موہوم سلسلے کی کڑی تھی کا ذکر موجود ہے، جن کسی دہشت گردی یا تخریب کاری سے دور کا بھی تعلق نہیں تھا۔

ہندوستان میں انقلابی تحریکوں کے بانی وہ انتہا پسند ہندو تھے جو کانگریس کی اعتدال پسند سیاست اور آئینی جدوجہد سے اتفاق نہیں کرتے تھے۔ ان کے مراکز بھی بمبئی اور بنگال کے صوبوں میں تھے۔ رفتہ رفتہ یہ لوگ اپنی سرگرمیوں کو دوسرے علاقوں تک پھیلا رہے تھے، آگے چل کر یہ لوگ پنجاب میں سکھوں کو بھی متاثر کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ دسمبر ۱۹۱۲ء میں وائسرائے ہند لارڈ ہارڈنگ (Lord Hardinge) پر دہلی میں بم پھینکے جانے والا معاملہ ہو یا مختلف مقامات پر ہونے والی دہشت گردی کی کارروائیاں، ہر جگہ یہ لوگ ملوث تھے ان کے کچھ کارندے فرانس، جرمنی اور امریکا میں بیٹھ کر بھی دہشت گردی کی سرگرمیوں کو جاری رکھے ہوئے تھے۔ مثلاً ہردیال سنگھ جو پنجاب یونی ورسٹی سے اسٹیٹ اسکالرشپ حاصل کر کے ۱۹۰۵ء میں آکسفرڈ گیا مگر پھر وظیفہ چھوڑ کر انقلابی تحریک کا سرغنہ بن گیا۔ کچھ عرصے بعد امریکا گیا وہاں جو گیتر آشرم قائم کر کے ''محور'' کے نام سے ایک اخبار بھی جاری کیا۔ امریکی حکام نے ناپسندیدہ قرار دیے

جانے کے بعد جرمنی گیا وہاں اس کے ایک اور ساتھی گورودت سنگھ نے غدر پارٹی کی سرگرمیوں کو آگے بڑھانے کے لیے منصوبے کے تحت پنجاب میں ۳۵۱ سکھ اور ۲۱ مسلمانوں کو کینیڈا میں روزگار کا لالچ دے کر کوماگاٹا مارو، نامی جاپانی جہاز کے ذریعے وہاں پہنچا۔ اس دوران برین واشنگ کر کے کچھ لوگوں کو غدر پارٹی کا رکن بھی بنالیا۔ واپسی پر حکومت ہند کی جانب سے انگریس آرڈیننس کا نفاذ ہو چکا تھا۔ سکھ تارکین وطن نے ٹرین میں سوار ہونے سے انکار کر دیا اور جلوس کی شکل میں کلکتہ جانے لگے جس پر پولیس سے تصادم ہوا۔ نتیجے میں ۸ سکھ ہلاک اور متعدد زخمی ہوگئے۔ ''بج بج'' کے مقام پر رونما ہونے والے اس سانحے کو بڑی شہرت ملی اور پوری دنیا میں مقیم سکھ برطانیہ کے خلاف زہر اگلنے لگے۔ خاصی تعداد وسطی پنجاب کی تھی ان میں بھی اکثر غدر پارٹی کے ارکان تھے جو پنجاب میں آتے ہی دہشت پسندانہ سرگرمیوں میں مصروف ہوگئے۔ بیرونی طاقتوں نے ان کی حوصلہ افزائی بھی کی۔ حربی نقطہ نظر سے ان کی حوصلہ افزائی بھی کی۔

یہ وہ حقائق ہیں جو حکومت پنجاب کی سالانہ رپورٹوں اور سر مائیکل اوڈوائر لیفٹیننٹ گورنر پنجاب کی تقریروں میں موجود ہیں۔ حالاں کہ عالمی جنگ میں جرمنی کی شکست نومبر ۱۹۱۸ء کے بعد ملک کے داخلی حالات اطمینان بخش تھے۔ یہاں دہشت پسندانہ سرگرمیوں کے سر اٹھانے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ پھر نہ جانے انگریز استعمار کو ایسا کون سا خطرہ نظر آیا جس کے تحت رولیٹ ایکٹ (Rowlatt Acts) بنایا جانا ضروری سمجھا گیا۔ ظاہر ہے اس کا مقصد معمول کی سیاسی سرگرمیوں کو کچلنے کے سوا اور کیا ہوسکتا تھا۔ لیفٹیننٹ گورنر سر مائیکل اوڈوائر نہ صرف صحافت کی آزادی اور سیاسی عمل کا سخت مخالف تھا بلکہ ملک کے تعلیم یافتہ طبقے خصوصاً وکلا کا بدترین دشمن تھا۔ اس نے اور اس کے پیش رو گورنر سر کینرل ابٹن نے تعلیم یافتہ اور اَن پڑھ عوام کی اور شہری اور دیہاتی تفریق پیدا کر کے پنجاب میں سیاسی عمل کو روکنے کی بھرپور تدبیریں کیں۔ یہ تفریق مسلمانوں وسکھوں کے مذہبی قومی اختلافات پر مستزاد تھی۔ اس تفریق پر ہندوستان میں برطانوی استعمار کی پُرشکوہ عمارت تعمیر کی گئی تھی۔ برصغیر میں اس استعماری حکمت عملی کے خلاف مزاحمت میں پنجاب کو ایک سنگ میل کی حیثیت حاصل تھی، اس لیے یہاں معمولی سے سیاسی ارتعاش کو بھی مبالغہ آمیز پیرائے میں بیان کیا جاتا اور اس سیاسی عمل کے آگے بند باندھنے کی کوشش کی جاتی، حالاں کہ دہشت گردی کے اصل مراکز پونا اور کلکتہ میں تھے مگر پنجاب میں پتّے بھی ہلتے تو زلزلے کا امکان نظر آنے لگتا ہے[۱۳]۔ اس لیے سیڈیشن کمیٹی اپنی رپورٹ کے آخر میں اپنے تحفظات کا اظہار کچھ اس انداز سے کرتی ہے:

> It will be regretable if revolutionary crime breaks out anew in any province: but if it does it will be disastrous that it should run from province to province, necessitating the proclamation of emergency measures in one after another Further, in a province like the Punjab it any be absolutely necessary in order to avert the gravest danjer, to prevent the entry of certain persons coming over from peaceable provinces.[۱۴]

غدر کے حوالے سے کمیٹی نے پنجاب کے سکھوں کی بابت کہا کہ ان کے خیال اور عمل میں وقفہ بہت ہی کم ہوتا ہے، یعنی یہ لوگ عمل میں فوراً سرگرم ہو جاتے ہیں اور سوچنے کا مرحلہ بعد میں آتا ہے۔ سکھوں کی مزاج شناسی کے اس اظہار میں سر مائیکل اوڈوائر کا ذہن کارفرما معلوم ہوتا ہے۔ پنجاب انتظامیہ بھی سر مائیکل اوڈوائر کے اس موقف سے پوری طرح متفق تھی اسی لیے ہم دیکھتے ہیں کہ انگریز حکمراں ملک کی سیاسی سرگرمیوں اور باغیانہ سرگرمیوں کو ایک ہی لکڑی سے ہانکنے کی کوشش کر رہے تھے۔ سیڈیشن کمیٹی نے بھی اس حکمت

عملی سے مکمل اتفاق کیا اور پھر اس کے سد باب کے لیے ۱۸ر جنوری ۱۹۱۹ء کو مذکورہ دو بل پیش کیے۔ پہلا بل ۶ رفروری اور دوسرا جسے بحث کے دوران واپس لے کر ۱۷ مارچ ۱۹۱۹ء کو دوسرا بل پیش کیا گیا جسے ہندوستانی اراکین کی مخالفت کے باوجود کثرت رائے سے منظور کرلیا گیا۔ ۲۱ مارچ کو وائسرائے کے توثیقی دستخط کے بعد رولیٹ ایکٹ کہلایا[۱۵]۔ اس ایکٹ نے ہندوستان کی شہری آزادی کو یکسر سلب کرلیا۔ اس ایکٹ کے خلاف نہ صرف تعلیم یافتہ طبقے میں بلکہ عام لوگوں کے اندر بھی غم وغصے کی لہر دوڑ گئی۔ رولٹ ایکٹ کے مسودے کے بعد یہ عام تاثر تھا کہ حکومت برطانیہ اپنے وعدوں کے متعلق بدنیتی دکھا رہی ہے۔ اسی لیے آئندہ ایجی ٹیشن کو دبانے کے لیے قوانین نافذ کرنا چاہتی ہے۔ امپیریل لیجیسلیٹو کونسل کے غیر سرکاری اراکین میں سے محمد علی جناح نے ان قوانین کی سخت مخالفت کی۔ دوسری طرف گاندھی جی نے بھی ایجی ٹیشن کا نیا طریقہ اپناتے ہوئے اس بل کے خلاف ''ستیہ گرہ'' کی تحریک چلانے کا اعلان کردیا۔ اس نئے اور اچھوتے نعرے نے عوام کے دل ودماغ کو فوراً اپنی طرف متوجہ کیا۔ گاندھی جی نے ۳۰ مارچ بروز اتوار ملک بھر میں ہڑتال کا اعلان کردیا۔ اگلے دو ہفتوں تک احتجاج کا سلسلہ جاری رہا۔ دہلی پولیس کے ساتھ تصادم میں گولیاں بھی چلیں، لوگ زخمی بھی ہوئے لیکن ۶ راپریل کو پھر جلوس نکالا گیا۔ ان جلسوں اور ہڑتالوں میں مسلمان، ہندو، سکھ سب ہی شریک ہوئے۔ دوسرے صوبوں میں تو یہ تمام مظاہرے پُرامن انداز سے جاری تھے لیکن پنجاب جہاں جابر گورنر مائیکل اوڈوائر کی حکومت تھی اور اس کا چیف سیکرٹری ٹامسن کو اس قسم کی ایجی ٹیشن برداشت نہیں تھی وہ لوگ غیر ضروری سخت گیری پر تُل گئے۔ لاہور اور امرتسر میں جگہ جگہ فوجی دستے تعینات کردیے گئے[۱۶]۔ اس دوران حکومت سے ایک غلطی یہ بھی ہوئی کہ انڈین نیشنل کانگریس کا اجلاس جو کہ امرتسر میں ہونے والا تھا حکام نے دوسر برآوردہ رہنماؤں کو جو کہ اجلاس کی تیاریوں میں مصروف تھے، گرفتار کرکے نامعلوم مقام پر منتقل کردیا[۱۷]۔ کمشنر نے ڈاکٹر کچلو اور ڈاکٹر ستیہ پال کو علی الصبح بنگلے پر بلایا۔ عقبی دروازے سے چند پولیس والے انھیں بٹھا کر لے گئے۔ کئی گھنٹوں تک جب یہ واپس نہ آئے تو شہر میں بات پھیل گئی اور مجمع اکٹھا ہوکر ڈپٹی کمشنر کی کوٹھی کی طرف چل پڑا۔ ابھی پولیس سے گفت وشنید جاری ہی تھی کہ عقبی جانب بلکہ نیچے فوجی دستے کے کیمپ سے گولیاں چلا دیں۔ مجمعے نے مشتعل ہوکر پولیس پر دھاوا بولا تو پولیس نے بھی فائرنگ کردی۔ مجمع منتشر ہوا تو چند مشتعل بلوائیوں نے لیڈری سنبھال کر لوٹ مار اور جلاؤ گھیراؤ شروع کردیا۔ بدامنی اور تشدد کے دوران ایک انگریز لیڈی ڈاکٹر مس شروڈ کو بائیسکل پر جاتے ہوئے ڈنڈے مار کر زخمی کردیا۔ اس کارروائی کا ردعمل یہ ہوا کہ جب امرتسر شہر فوج کے حوالے کیا گیا تو فوج کے کمانڈر جنرل ڈائر نے انتقاماً یہ حکم دیا کہ جو کوئی اس گلی سے گزرے پیٹ کے بل رینگتے ہوئے گزرے۔ اس حکم کی تعمیل میں کافی لوگ نشانہ بنے جنھوں نے مس شروڈ کی جان بچائی تھی۔ بہرحال اس روز گھنٹوں متشددانہ کارروائی جاری رہی۔ پانچ انگریز ہلاک ہوئے، دو بینک اور چار سرکاری عمارتوں کو نقصان پہنچا[۱۸]۔ مجمعے میں سے بھی ایک دو افراد ہلاک ہوئے، اس قسم کے بلوے شدت سے دوسرے شہروں میں بھی ہوئے[۱۹]۔ ظاہری بات ہے کہ جب ہجوم پُرامن نہ رہے تو اسے روکنے کی کوئی نہ کوئی تدبیر تو کرنی ہی ہوتی ہے۔ ہجوم کی خشت باری کے جواب میں ہی فائرنگ کی گئی۔ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار نے ان تمام انگریز افسروں کی کوششوں اور حکمت عملی کے بیان میں یہ جملہ درست لکھا کہ ''ہماری رائے میں اس فائرنگ کا مکمل جواز تھا''[۲۰]۔ مسٹر یاسر کا تخمینہ ہے کہ ہجوم میں تقریباً ۳۰ ہزار لوگ شریک تھے۔ مذکورہ کارروائی سے قبل ہی شہر میں تخریب کاری شروع ہوچکی تھی۔ نیشنل بینک سے دھواں اٹھ رہا تھا اور اس کے منیجر مسٹر اسٹیورٹ اور اسسٹنٹ منیجر مسٹر اسکاٹ کو ہجوم نے بے رحمی سے مار مار کر ہلاک کردیا تھا ان کی لاشیں فرنیچر کے جلتے ہوئے ڈھیر میں پھینک دی گئی تھیں۔ اسی طرح الائنس بینک پر حملہ

اور مسٹر جی ایم تھامسن کی ہلاکت کا واقعہ بھی اسی روز ہوا تھا۔ چارٹرڈ بینک کو بھی آگ لگانے کی کوشش ہوئی لیکن پولیس نے ہجوم کو منتشر کر دیا۔ غرض کہ اس قسم کی تخریبی کارروائیوں کے بعد حکام کے لیے ناگزیر تھا کہ وہ ہر ممکن اقدام کرے۔ ۱۰/اپریل کو فوج کی فائرنگ سے ہلاک ہونے والوں کی تعداد ۱۰ تک جا پہنچی۔ زخمیوں کی تعداد یقیناً بہت زیادہ ہوگی۔ ۱۱/اپریل کو کچھ لوگ ہلاک شدگان کو جلیاں والا باغ میں دفن کرنے کا عندیہ ظاہر کر کے سول لائنز لائے۔ کمشنر کے مطابق یہ لوگ فسادیوں کے نمائندے نظر آ رہے تھے اور ان کا طرز عمل مخاصمانہ تھا۔ انہیں قبرستان تک محدود اور مختصر پارٹیوں کے ساتھ تدفین کی اجازت دی گئی۔ اس عمل کے لیے دو سے چار بجے کا وقت دیا گیا۔ میتوں کو مسجد خیر الدین سے نکال کر سلطان ونڈ دروازے سے باہر لایا گیا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کا ایک بڑا جلوس ان جنازوں کے عقب میں تھا مگر وہ آگے نہیں گیا۔ تدفین میں آئے نوجوان زیادہ تر وکلا تھے۔ شہر میں ہنگامی حالات کا اعلان ہو چکا تھا۔ ڈپٹی کمشنر کے دستخط سے نوٹس تقسیم کیے جا رہے تھے۔ حکام کے مطابق جنگ کی حالت ظاہر ہوگئی ہے لہٰذا محتاط رویہ اختیار کیا جائے۔ بیساکھی کا تہوار بھی قریب تھا لہٰذا خوفناک صورت حال سے بچنے کے لیے بھی سخت رویہ اختیار کیا گیا۔ امرتسر کی طرف تھرڈ کلاس ریل گاڑی کی بکنگ بھی بند کر دی گئی۔ مسلح فوجی دستے کوتوالی اور دیگر مقامات تک تعینات کر دیے گئے، امرتسر میں کاروبار زندگی مکمل طور پر مفلوج ہو چکا تھا۔ ۱۱/اپریل کو کمشنر لاہور چلے گئے اور جالندھر بریگیڈ کمانڈنگ آفیسر بریگیڈیئر جنرل آر ای ایچ ڈائر سی بی امرتسر پہنچا اور اس نے میجر میکڈونلڈ سے چارج لے لیا۔ ۱۲/اپریل کو جمع ہونے والے ہجوم کو اس نے مضبوط فوجی دستے کی کمان کرتے ہوئے منتشر کروا دیا۔ شہر کے گرد مارچ کر کے لوگوں کو شر پسندی سے روکا۔ ۱۰/اپریل کے ہنگاموں میں ملوث لوگوں کی گرفتاریاں ہوئیں، لوگوں کے طرز عمل اور نفرت انگیز رویے کے خلاف اس نے خبردار کیا کہ اگر فساد اور دنگے کا راستہ نہ چھوڑا گیا تو فوجی قوانین کے تحت سزائیں دی جائیں گی۔ فی الفور اعلان نامہ پولیس کے ذریعے ہر خاص و عام میں تقسیم کیا گیا۔ جگہ جگہ ڈھول بجا کر لوگوں کو اکٹھا کر کے سرکاری اعلان پڑھ کر سنایا گیا[۲۱]۔ اعلان نامہ جو انگریزی میں بنایا گیا تھا اس کے الفاظ یہ تھے:

> It is hereby proclaimed to all whom it may concern that no person residing in the city is permitted or allowed to leave the city in his own or hired conveyance or on foot without a pass. No person residing in the Amritsar city is permitted to leave his house after 8. Any persons found in the streets after 8 are liable to be shot. No procession of any kind is permitted to parade the streets in the city or any part of the city or outside of it at any time. Any such processions or gathering of 4 men would be looked upon and treated as an unlawful assembly and dispersed by force of arms if necessary.[۲۲]

مگر ان سب احکامات کے باوجود لوگوں نے اسے سنجیدگی سے نہیں لیا بلکہ اسے محض دھونس اور دھمکی سمجھ کر یہ خوش گمانی رکھی گئی کہ جنرل ڈائر فائر نہیں کرے گا۔ ایک طرف جنرل ڈائر اعلان کروا کر لوگوں کو متنبہ کر رہا تھا تو دوسری جانب اسی روز ۱۳/اپریل کو جلیاں والا باغ میں جلسے کے انعقاد کی تشہیر کی جا رہی تھی[۲۳]۔ اس جلسے کے انعقاد میں ہنس راج پیش پیش تھے جو بعد میں سلطانی گواہ بنے۔ ۱۳/اپریل کی سہ پہر چار بجے جنرل ڈائر کو یہ قطعی اطلاع مل چکی تھی کہ جلیاں والا میں ایک جلسہ منعقد ہونے والا ہے، وہ اسی وقت رائفلوں سے

مسلح ۲۵ گورکھوں اور ۲۵ بلوچیوں کے ساتھ روانہ ہوا۔ اس کے علاوہ ۴۰ گورکھے ککڑیوں یعنی چھوٹی تلوار سے مسلح مع دو آرمرڈ کاریں جلیاں والا باغ جا پہنچا۔ باغ کے اندر جانے کا راستہ اتنا کشادہ نہیں تھا[۲۴]۔ لندن ٹائمز کے نامہ نگار ویلنٹائن کیرول کے مطابق کسی زمانے میں یہ باغ ہوگا مگر اب ایک بے کار جگہ جس میں عام طور پر میلے لگتے یا جلسے ہوتے۔ اس کا رقبہ ٹرافلگا راسکوائر کے برابر ہوگا۔ اس کے چاروں جانب دیسی لوگوں کے مکانات اور اونچی دیواریں ہیں۔ باغ میں داخل ہونے یا نکلنے کا کوئی باقاعدہ راستہ نہیں تھا۔ نکاسی کی پتلی پتلی جگہیں ضرور تھیں جن سے بہ مشکل کوئی شخص گزر سکتا تھا۔ جلیاں والا باغ کا جلسہ بڑی جلد بازی میں بلوایا گیا تھا۔ ۱۰/۱۱/اور ۱۲/اپریل کو امرتسر میں ہونے والے واقعات نے لوگوں میں غم وغصے کی جولہر دوڑا دی تھی لوگ اس کا اظہار کرنا چاہتے تھے اور سر مائیکل اوڈوائر کے آمرانہ اقدام کے خلاف تقریریں کرنا چاہتے تھے[۲۵]۔ کیوں کہ برصغیر پاک وہند کی تاریخ میں جتنے بھی یورپی یا انگریز افسران گزرے ہیں ان میں سے شاید ہی کسی نام کو تاریخ نے اتنا ملعون ومطعون کیا ہو جتنا جنرل ڈائر کو[۲۶]۔ ظاہری بات ہے اس کے کارنامے بھی اتنے ہی بڑے تھے۔ ۱۳/اپریل کو جب کہ کسان اپنا بیساکھی کا تہوار بھی منا رہے تھے، باغ میں داخل ہوتے ہی اس نے پچیس فوجیوں کو داخلے کے راستے کے ایک طرف اور ۲۵ کو دوسری طرف کھڑا کیا[۲۷]۔

سر ویلنٹائن کیرول جو اس وقت وہیں موجود تھے، کے مطابق ڈائر نے مجمع کو وارننگ دیے بغیر محض سو گز کے فاصلے سے گولیوں سے بھوننا شروع کر دیا۔ یہ مجمع بالکل نہتا تھا اور کسی لحاظ سے اپنا بچاؤ نہیں کر سکتا تھا۔ دس منٹ تک گولیوں کے فائر چلتے رہے۔ ڈائر نے ۱۶۵ گولیاں چلوائیں۔ انسانوں کا مجمع اس مجمعے میں اس طرح گھرا ہوا تھا جیسے چوہے پھندے میں پھنسے ہوتے ہیں۔ لوگ ان تنگ راستوں سے نکلنے کی ناکام کوششیں کرتے رہے لیکن ڈائر ان جگہوں پر جہاں بھیڑ زیادہ ہوتی تاک کر نشانہ بازی کرواتا[۲۸]۔ ایک اور عینی شاہد لالہ گروہاری لال جو اپنے مکان سے یہ سارا تماشا دیکھ رہے تھے کا کہنا ہے کہ اس موقع پر سیکڑوں آدمیوں کو مرتے دیکھا۔ سب سے تکلیف دہ بات یہ تھی کہ فائرنگ ان راستوں پر کی جا رہی تھی جن سے لوگ باہر نکلنے کی کوشش کر رہے تھے[۲۹]۔ فوجیوں نے کُل ۱۶۵۰ راؤنڈ چلائے[۳۰]۔ فائرنگ اس وجہ سے بند نہیں ہوئی کہ ڈائر کو نہتے لوگوں پر رحم آ گیا تھا بلکہ مولانا محمد علی جوہر کے مطابق فائرنگ اس لیے بند ہوئی تھی کہ اس کے پاس گولیوں کا ذخیرہ ختم ہو گیا تھا[۳۱]۔ اشرف عطا کے مطابق:

۱۳/اپریل ۱۹۱۹ء کو بیساکھی کے روز جلیاں والا کے احتجاجی جلسے پر جنرل ڈائر نے انگریز سپاہیوں کے کئی دستوں کے ساتھ اندھا دھند گولیاں برسانا شروع کر دیں۔ نوجوان گولیوں کھا کھا کر گرتے تھے اور ان کی جگہ اور نوجوان کھڑے ہو جاتے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے جلیاں والا باغ میں صرف خونِ انسانی کی ندیاں بہنے لگیں۔ زخمی کر دینے اور کراہتے ہوئے نظر آنے لگے جو لوگ اس خوفناک آتش بازی میں جان بچانے کے لیے بھاگے وہ جلیاں والا باغ کے کنویں میں گر کر جاں بحق تسلیم ہو گئے۔ جلیاں والا میں ہر طرف لاشیں بکھری ہوئی تھیں اور کنواں لاشوں سے اَٹ گیا تھا[۳۲]۔ اس روز ہلاک اور زخمی ہونے والوں کی تعداد میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ بعض مؤرخین نے معروف حقیقت یعنی ۱۳/اپریل ۱۹۱۹ء کو ہونے والے اس واقعہ کی تاریخ تک غلط درج کی ہے۔ سید ہاشمی فرید آبادی نے سہواً لکھا کہ: ''۱۲/اپریل کو امرتسر میں ایک اصور مقام پر لوگ جمع تھے، جنرل ڈائر نہتی رعایا پر برابر گولیاں برساتا رہا۔ یہ واقعہ جلیاں والا باغ سے منسوب ہے''[۳۳]۔

ہاشمی صاحب نے یہ بھی لکھا کہ سرکاری اعتراف کے مطابق کم وبیش چار سو آدمی مارے گئے اور زخمیوں کا کوئی شمار نہیں[۳۴]۔

ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی نے بھی سیتا رامیا کا حوالہ دے کر مرنے والوں کی تعداد سرکاری طور پر ۴۰۰ ہی درج کی ہے جبکہ زخمیوں کی تعداد ایک سے دو ہزار تک درج کی ہے [۳۵]۔ عبدالرزاق قریشی نے لکھا کہ ''چند سیکنڈ میں پانچ سو مقتول اور پندرہ سو آدمی زخمی ہوئے [۳۶]۔ عبدالماجد بدایونی نے اپنے مضمون وولٹ بل میں ان وحشیانہ اقدام کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جنرل ڈائر کے بیان کا حوالہ دے کر پانچ سو ہلاکتوں اور ۱۵۰۰ زخمیوں کی تصدیق کی ہے [۳۷]۔ ابوالہاشم ندوی نے بھی لکھا کہ زخمیوں اور مُردوں کی تعداد ہزار سے کسی طرح کم نہ تھی [۳۸]۔ ایس کے موجمدار نے لکھا کہ ''اس الم ناک واقعہ میں ۵۰۰ سے زائد افراد ہلاک اور ایک ہزار سے زیادہ شدید زخمی ہوئے'' [۳۹]۔ جائے وقوع پر ۱۶۵۰ راؤنڈ چلائے گئے اور ابوالہاشم ندوی کے مطابق ۳۷۹ افراد ہلاک اور ۱۲۰۰ کے قریب زخمی ہوئے [۴۰]۔ تاراچند نے اس بابت درست لکھا کہ مقتول اور زخمی لوگوں کی تعداد کبھی معلوم نہیں ہو سکے گی۔ سرکاری بیان کے مطابق مرنے والے ۳۷۹ تھے [۴۱]۔ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار نے بھی ۳۷۹/افراد کی ہلاکت اور ۱۲۰۰/مجروحین کا ذکر کیا ہے [۴۲]۔ موتی لال نہرو کمیٹی کی رپورٹ کے مطابق مرنے والوں کی تعداد ایک ہزار تک قرار دی جائے تو مبالغہ نہ ہوگا [۴۳]۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جلیاں والا کا سانحہ ایک سوچا سمجھا منصوبہ تھا۔ یہ فعل ایک طے شدہ ارادے کے مطابق تھا۔ اس کا ثبوت خود ڈائر کے ارسال کردہ ۲۵/اگست ۱۹۱۹ء کی وہ رپورٹ ہے جو اس نے جنرل اسٹاف ۱۶ ڈویژن کو بھیجی تھی۔ اس رپورٹ کے مطابق:

> I fired and continued to fire till the crowd dispersed, and i considered that this is the least amount of firing which would produce the necessary moral and widespread effect it was my duty to produce if I was to justify my action. If more troops had been at hand the casualties would have been greater in proportion. It was no longer a question of merely dispersing the crowd, but one of producing a sufficient moral effect, from a military point of view, not only on those who were present, but more specially throughout the Punjab There could be no question of undue severity.[۴۴]

اس کی بربریت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ اسے اپنے کیے پر کبھی شرمندگی نہیں ہوئی۔ پھر اس نے جس مجمعے پر فائر کیا اس میں بوڑھے، بچے اور عورتیں بھی شامل تھیں۔ باغ کی دیوار پھاند کر بھاگنے والوں کو بھی تاک تاک کر نشانہ بنایا گیا [۴۵]۔ ڈائر کے نزدیک مجمعے میں شامل لوگ باغی تھے اور انھیں سبق سکھانا ضروری تھا۔ ہلاک شدگان میں ۸۷ لوگ بیرونی دیہات کے رہنے والے تھے [۴۶]۔ اس کے معاندانہ رویے کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ فائرنگ کے بعد اس نے زخمیوں کی طبی امداد کی بابت پوچھے گئے سوال کے جواب میں واضح طور پر کہا کہ No certainly not. It was not my job.[۴۷]

جنرل ڈائر کے اس سفاکانہ اقدام پر برطانیہ میں بھی خوب شور شرابہ برپا ہوا۔ ایک گروہ جنرل ڈائر کا مداح تھا، ان کے مطابق جنرل ڈائر کا ہر اقدام درست تھا کیوں کہ اس نے شرپسندوں کو ایسا سبق دیا تھا کہ ہندوستان ایک نئے غدر سے بچ گیا، جبکہ دوسری جماعت کا کہنا تھا کہ ڈاکٹروں کی درندگی اور سفاکی نے برطانیہ کے دامن پر ایسا دھبہ لگا دیا ہے جو جون آف آرک کو زندہ جلا دینے کے بعد سے اب تک رونما نہیں ہوا تھا۔ یہ ایک ایسا لرزہ خیز اقدام تھا جس نے محض ۲۸ سال کے قلیل عرصے میں برطانیہ عظمیٰ کو اس جگ

مگاتے ہوئے ہیرے سے محروم کر دیا۔۱۹۹۲ء میں ڈائر کو تحقیقاتی کمیشن کے آگے جواب دہ ہونا پڑا۔ سینٹر کمیٹی کے چشم دید گواہوں نے جو بیانات دیے وہ سب ڈائر کے خلاف جاتے ہیں [۴۸]۔ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار نے بھی لارڈ ہنٹر کمیٹی کی رپورٹ جلد۲ بعنوان (Disorders Inquiry Committee Report) اور کانگریس کی قائم کردہ تحقیقاتی کمیٹی برائے پنجاب کی رپورٹ بہ عنوان Report of the commissioners appointed by the punjab sub-committee of the Indian National Congress کے بنیادی ماخذ کے چیدہ چیدہ نکات کی نقول اور تشریحات کو اپنی تصنیف کا حصہ بناتے ہوئے بہت تفصیل سے اس سانحے پر روشنی ڈالی ہے [۴۹]۔

جلیاں والا باغ میں بے گناہ انسانوں کے قتل عام کے اصل ذمے داروں کے تعین میں ہنٹر کمیٹی اور کانگریس کمیٹی دونوں ہی متفق تھے۔ سر ہنٹر کمیٹی کی تحقیقات کے مطابق جنرل ڈائر پر جرح کے دوران یہ بات ثابت ہوئی کہ اس قتل عام کا ذمے دار صرف اور صرف جنرل ڈائر ہی تھا۔ اس کا نام تاریخ میں مجرم کی حیثیت سے چند سفاک ترین لوگوں میں شمار ہونے لگا۔ لیکن اصل مجرم یا مجرموں کے چہرے پردۂ اخفا ہی میں رہے۔ وزیر ہند مانٹیگو اور وائسرائے چیمسنو رڈ فیروز اس راز سے آگاہ ہوں گے مگر امور سلطنت کی مصلحتوں نے انھیں منہ نہ کھولنے دیا۔ بہت سی دستاویزات پردہ اخفا میں رہیں۔ کچھ راز لوگ سینوں میں چھپائے منوں مٹی تلے دفن ہو گئے۔ سر چارلس منرو جو ڈائر کے دوست بھی تھے نے برطانیہ کے سیاسی حالات کے پیش نظر کورٹ مارشل کی کارروائی سے گریز کیا۔ ۸/مئی ۱۹۹۲ء کو جنرل ڈائر کو اعزازات اور پنشن کے بغیر فوج سے برخاست کر دیا گیا۔ جنرل سر ہیوک ہڈسن نے بطور ایڈ جوائنٹ جنرل یہ فیصلہ پڑھ کر سنایا۔ نیز افغان مہم کے دوران اسے جو کمانڈر آف دی آرڈر آف دی برٹش ایمپائر کا جو اعزاز دیا گیا تھا وہ بھی واپس لے لیا گیا۔ فوج سے نکالے جانے پر ایک ملا جلا ردعمل سامنے آیا۔ اس کے سوانح نویسوں کے مطابق وہ عمر بھر اپنی جھوٹی انا اور بے سروپا منطق کا دفاع کرتا رہا اور اندر ہی اندر عجیب کش مکش کا شکار رہا۔ ۲۳/جولائی ۱۹۲۷ء کو اس ذہنی دباؤ کی حالت میں اس کی موت واقع ہوئی [۵۰]۔

جنرل ڈائر کی بابت جیسا کہ ذکر کیا گیا کہ برطانوی استعمار اور مغربی دنیا دو واضح حصوں میں بٹی دکھائی دیتی ہے۔ Rupert Furneaun کی "Swinson 1963 Massacre At Amritsar"۔ Arthur winson کی "Sir minutes to snsct" ۱۹۶۴ء اور Alfred Arther Deuper کی "The massacre that ended the Raj" ۱۹۸۱ء میں جنرل کو ''قومی ہیرو'' کی صورت میں پیش کیا گیا۔ جب کہ امریکی مصنف Stanley Wolpert کی تصنیف An Error of Judegment ۱۹۸۵ء میں Fiction کے انداز میں حقائق سے پردہ اٹھانے کی کوشش کی گئی ہے [۵۱]۔ رڈیارڈ کپلنگ (Rudyard Kipling) جیسے نامور ادیب نے اس سے ہمدردی کے اظہار کے لیے ۲۶۰۰ پونڈ مالیت کا فنڈ قائم کیا [۵۲]۔

ہم اس خونی ڈرامے میں جنرل ڈائر کو مرکزی ملزم تو ضرور سمجھتے ہیں لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس تمام واقعے میں جنرل ڈائر کی حیثیت ایک بوچر کی تھی، جسے پنجاب کے انتظامی حکام لیفٹیننٹ گورنر سر مائیکل اوڈوائر اور ان کے ماتحت افسران نے اپنے مکروہ مقاصد کی تکمیل اور انتقامی جذبے کی تسکین کے لیے استعمال کیا۔ انھیں حکام نے تحقیقات میں جنرل ڈائر کو قربانی کا بکرا بنا کر اپنا دامن چھڑایا۔ جنرل ڈائر ذہنی کش مکش کا شکار ہو کر جب دار فانی سے کوچ کر رہا تھا تو اس کے آخری الفاظ میں ایک عجیب طرح کی یاس ٹپکتی تھی۔ آخری روز اس کی بیوی اور بہو اس کے پاس بیٹھے تھے تو اس نے جاں بہ لب انداز سے اظہار کرتے ہوئے کہا کہ:

Thank you, but I did't want to get better. So many people who know the conditions in

Amritsar say I did right... but so many others say I did wrong. I only want to die and know from my maker whether I did right or wrong![53]

حقیقت یہ ہے کہ اگر جنرل ڈائر دوراندیشی سے کام لے کر افہام وتفہیم سے مسئلے کو حل کرنے کی کوشش کرتا تو شاید اتنا بڑا سانحہ رونما ہی نہ ہوتا۔ سعادت حسن منٹو کا تو کہنا تھا کہ روز ویلٹ ایکٹ کے خلاف ایجی ٹیشن کے دوران سر مائیکل اوڈوائر، ڈیفنس آف انڈیا رولز کے ماتحت گاندھی جی کا داخلہ پنجاب میں بند نہ کرتے تو جلیاں والا باغ کا سانحہ رونما ہی نہ ہوتا[54]۔ اس لحاظ سے المیہ پنجاب کا اصل مجرم سر مائیکل اوڈوائر تھا۔ لارڈ چیمسفورڈ کو اس کا شریکِ جرم قرار دے سکتے ہیں، کیونکہ وہی اس بڑے مجرم کے مکر وفریب اور کذب و افتراع کی پردہ پوشی کر رہا تھا۔ جلیاں والا کا قتل عام یعنی اس کے ایما پر ہوا۔ پنجاب میں مارشل لا لگوا کر اور اسے طول دے کر اس نے اہل پنجاب کے حوصلے پست کرنے کی مکروہ سازش کی۔ وہ پنجاب کے دیہی عوام کو اپنے یا شوموپٹی سے زیادہ اہمیت دینے کو تیار نہیں تھا۔ اجتماعات، جلسے، جلوسوں پر پابندی، جبری فوجی بھرتی وغیرہ جیسے اقدام سے اہل پنجاب کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ لیکن پنجاب کا یہ جابر حکمراں اور جلیاں والا باغ کے قتل عام کا یہ مجرم حکومت کی مصلحت کی بدولت سزا سے محفوظ رہا۔ لیکن قدرت کے انتقام کے آگے اس کی بے بسی قابل دید تھی۔ جلیاں والا باغ کے مقتل کا ایک زخمی یتیم بچہ انتقام کی آگ سینے میں لیے موقع کی تاک میں رہا۔ مستام گاؤں کا یہ بچہ اس وقت محض پندرہ سولہ برس کا تھا، اودھم سنگھ نے زخمی حالت میں لاشوں کے ڈھیر میں چھپ کر اپنی جان بچائی، لیکن اسی روز عہد کر لیا کہ جب بھی اسے موقع ملے گا وہ سانحہ جلیاں والا کے قائد کو کیفر کردار تک پہنچائے گا۔ ۱۲/ اگست ۱۹۴۰ء کو یہ موقع اس کے ہاتھ لگا۔ اس روز کشن ہال لندن میں ایسٹ انڈیا ایسوسی ایشن اور رائل سینٹرل ایشین سوسائٹی کے زیر اہتمام جلسہ تھا۔ سر مائیکل اوڈوائر خطاب کر کے جیسے ہی ڈائس سے اترا اودھم سنگھ کے ریوالور کی گولیوں کا نشانہ بن گیا، وہیں اس نے دم توڑ دیا۔ لارڈ زیٹ لینڈ اور لوئس ڈین زخمی ہوئے۔ اودھم سنگھ نے گرفتاری کے بعد اپنا نام محمد سنگھ آزاد بتایا۔ اسے ۲۸ جولائی ۱۹۴۰ء کو پھانسی دے دی گئی[55]۔

جلیاں والا باغ کی قتل گاہ نے پورے برصغیر کو لرزا کر رکھ دیا۔ شہر شہر، قریہ قریہ جلسے، جلوس، مظاہرے اور ریلیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ان جلوسوں پر بھی گولیاں برسائیں گئیں۔ طلبہ اور عوام کا جلوس پیر منڈی میں نوگزے کی خانقاہ کے قریب سے گزرا تو برطانوی استعمار کے گماشتے سر عمر حیات خان ٹوانہ اور نواب محمد علی قزلباش نے اہل جلوس پر فائرنگ کر دی جس سے ایک نوجوان طالب علم ہری رام ہلاک ہو گیا۔ مسٹر چنن الدین اور میاں فیروز الدین احمد کو ڈنڈا فوج بنانے کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا۔ لالہ لال چند فلک، مہند جی، لالہ پنڈت داس اور بعض دوسرے لیڈرروں کو مارشل لا ایکٹ کے تحت گرفتار کر کے بیس بیس سال قید کی سزائیں دی گئیں۔ گوجرانوالہ میں ریلوے اسٹیشن نذر آتش کرنے کے الزام میں شیخ عطا محمد، جسٹس شیخ دین محمد، ملک لال خاں اور دوسرے رہنماؤں کو گرفتار کیا گیا۔ پورے پنجاب میں پکڑ دھکڑ شروع ہو گئی۔ امرتسر میں خلافت اور جمعیت العلماء ہند کے اجلاس منعقد ہوئے۔ ہندو مسلمان اور سکھوں کے سرکردہ رہنما امرتسر پہنچنا شروع ہو گئے۔ امرتسر ہی کے جلوس میں تحریک عدم تعاون، تحریک خلافت اور تحریک ہجرت شروع ہوئیں۔ ڈائر نے جو مظالم پنجاب میں ڈھائے اور جس بربریت کا مظاہرہ کیا اس کی وجہ سے نوجوانوں کے دلوں میں انتقام کی آگ بھڑک اٹھی۔ برصغیر کی آزادی کا نعرہ بلند ہونے لگا[56]۔ مولانا محمد علی جوہر اور مولانا شوکت علی کو بھی اس دوران رہائی ملی تو فوراً ۳۱ دسمبر ۱۹۱۹ء کو ہونے والے کانگریس کے اجلاس میں شرکت کرنے کے لیے امرتسر پہنچے۔ اجلاس میں کی گئی تقریر سے پنڈال میں ایسا محسوس ہوا کہ شیر کی گرج تھی

جس نے سامراج کے قصر فلک رفعت میں تزلزل پیدا کر دیا ہے۔ اس تقریر میں مولانا جوہر نے برطانوی سامراج کو للکارتے ہوئے واضح طور پر کہا کہ:

> جلیاں والا میں لوگ جمع تھے، اس نے ان پر گولیاں نہ چلائیں بلکہ اس نے ہمارے دلوں پر گولیاں چلائیں۔ اس نے ایک نئی آگ بھڑکا دی ہے جس میں ہندو مسلمان ایک نئی قوم پیدا ہو رہی ہے، وہ دنیا میں جس قدر ظالم گزرے ہیں ان میں سے صرف دکا ظالموں کو ملامت کرنا بے کار ہے، تاوقتیکہ آپ اپنے دل میں یہ بات ٹھان نہ لیں کہ آج کے بعد سے آپ پھر ہرگز ظلم برداشت نہ کریں گے[۵۷]۔

غرض کہ ''ان واقعات نے ہندوستان بھر میں ہر طبقے اور ہر فرقہ کے لوگوں کے دلوں کو ہلا دیا''[۵۸]۔ مولانا محمد علی جوہر نے جنرل ڈائر کی شخصیت کا تجزیہ کرتے ہوئے درست کہا کہ:

> ڈائر کے جسم میں امپیرلزم (سامراج) کی روح تھی۔ اس کو یہ تو گوارا تھا کہ ہزاروں بے گناہ ہندوستانی اس کے فوجی دستوں کی گولیوں کا شکار ہو جائیں لیکن یہ ہرگز گوارا نہ تھا کہ ایک ہندوستانی بھی اس پر ہنس سکے اور اس کے احکام کی خلاف ورزی کر کے اس کے رعب وداب کا مذاق اڑا سکے[۵۹]۔

حیرت کی بات یہ ہے کہ اس زمانے کے اخبارات ورسائل نے اس پورے عمل میں کھل کر حکومتی اقدام کو ہدفِ تنقید بنایا لیکن طاقت کے زعم میں مبتلا برطانوی حکومت ان باتوں پر کان دھرنے کو تیار نہیں تھی۔ زمانہ کانپور کے اداریوں میں رولٹ بل اور جلیاں والا کے سانحہ کی بابت لکھا گیا۔ زمانہ نے تو رولٹ بل کی ابتدا ہی میں کہہ دیا تھا کہ کونسل کے اندر اور باہر زور وشور سے اس بل کے خلاف صدائے احتجاج بلند کیا جا رہا ہے[۶۰]۔ اسی طرح اینگلو انڈین احباب اور پارلیمنٹ کی جانب سے جنرل ڈائر کی حمایت پر بھی رفتار زمانہ کے عنوان سے لکھے گئے اداریے میں حیرت کا اظہار کیا گیا[۶۱]۔ ہمدرد دہلی نے بھی طنزیہ انداز سے کہا کہ یورپ کے میدانِ جنگ میں وفادارانہ قربانیوں کا صلہ رولٹ ایکٹ کی صورت میں ملا[۶۲]۔ پنجاب کے تقریباً ہر شہر میں اس بل کے خلاف زبردست مظاہرے کیے گئے تھے۔ لاہور، قصور، گوجرانوالہ، راولپنڈی، شیخوپورہ، شانگلہ، گجرات، ملکوال، لائل پور غرض کہ ہر جگہ حکومت کے خلاف کارروائیاں جاری رہیں[۶۳]۔

انگریزوں کی جانب سے بھی سنتھیوں میں اضافہ ہوا۔ ہندوستانیوں کی بے عزتی کو معمول بنا لیا گیا۔ سڑک پر یورپین افسر کو دیکھ کر سلام نہ کرنے پر سزائیں ملتیں، کالج کے طلبہ سے سرکاری دفتر کے سامنے سرزنش کے طور پر پریڈ کرائی جاتی۔ انھیں کوڑے مارے جاتے، مقدمے چلائے بغیر نظر بند اور کچھ دنوں یا ہفتوں کے لیے جیل میں قید رکھا جاتا۔ پروفیسروں کو بھی گرفتار کر کے تین میل کی دوری پر واقع قلعے میں گھنٹوں کے لیے نظر بند کر دیا جاتا[۶۴]۔ لیکن ان مظالم کا نتیجہ بہر حال برطانوی حکومت کے حق میں نہیں نکلا۔ اس حادثۂ خونیں نے ہندوستان کے طول وعرض میں سیاسی بے داری کی ایک لہر پیدا ہوئی۔ اب عام ہندوستانی باشندے کی نظر میں حقوق ومراعات کی باتیں پرانی ہو چکی تھیں اور وہ اب کامل آزادی کا طلب گار تھا[۶۵]۔ ان تمام حالات کو ہمارے ادیبوں اور شعرا نے بھی محسوس کیا، اردو ادب نے ان حالات کی تصویر پیش کرنے کی بھرپور کوشش کی۔ نئے اخبارات وجود میں آئے، رسالے چھپنے لگے، تند وتیز مضامین کی اشاعت ہونے لگی، شعرا کی نظمیں روح کو تڑپانے اور قلب کو گرمانے لگیں۔ ان تحریکوں کا اثر ملک وقوم پر اس قدر تھا کہ غلام بھیک نیرنگ،

چوہدری خوشی محمد خان ناظر، آغا حشر، سید ہاشمی مرید آبادی جیسے جمود پسند اور شبلی، حسرت اور اقبال جیسے شرر افشانی کرنے والوں کا کلام ہماری انقلابی شاعری کی یادگار بنا[۶۶]۔ بالخصوص جلیاں والا کے موضوع پر متعدد فلمیں بھی بنائی گئیں۔ بلراج ناج نے جلیاں والا باغ کے نام سے ہی ۱۹۷۷ء میں فلم پیش کی جس میں اودھم سنگھ کی زندگی کے واقعات کو قلم بند کیا گیا۔ فلم کا کچھ حصہ برطانیہ میں بھی عکس بند کیا گیا۔ ۱۹۸۴ء میں رچرڈ اٹینبرو کی فلم گاندھی میں اس واقعے کے بارے میں بیان کیا گیا ہے، اس فلم میں جنرل ڈائر کا کردار ایڈورڈ فاکس نے ادا کیا۔ اس فلم میں جلیاں والا باغ کے قتل عام اور پھر ہونے والی تحقیقات کو عکس بند کیا گیا ہے۔ اس طرح دی لیجنڈ آف بھگت سنگھ میں بھی ان واقعات کا پس منظر دکھایا گیا ہے۔ ڈاؤن ٹاؤن ایبے کی پانچویں قسط۲۰۱۴ ذ میں سٹی آف گھوسٹس کا کچھ حصہ ۲۰۰۹ء، اور رنگ دے بسنتیکے کچھ حصوں میں بھی ان واقعات اور قتل عام کے مناظر کو عکس بند کرکے فلم کی شکل میں پیش کیا گیا[۶۷]۔

بیسویں صدی کے آغاز میں اردو شاعری پر بھی ان قومی اور سیاسی تحریکوں کا گہرا اثر ہوا۔ جدوجہد آزادی کے لیے ذہنی فضا تیار کرنے میں اردو خاطر خواہ حصہ لے رہی تھی۔ حسرت سے اس دور کی اردو غزل میں ایک نئے دور کا آغاز ہوتا ہے۔ شعر و ادب کے معاملے میں وہ جتنے اعتدال پسند تھے، سیاسی طور پر اتنے ہی نڈر، بے باک اور انتہا پسند۔ وہ بغاوت اور انقلاب کے علم بردار تھے۔ بیسویں صدی میں حسرت نے جب ہوش سنبھالا تو اس زمانے میں سیاسی شورش کی لے کافی تیز ہو چکی تھی۔ انگریز حکومت کی کل سرگرمیاں سیاسی مصلحتوں کے تابع تھی۔ وہ ہندوستان کو آزادی کے بجائے اس کی پرچھائیں سے بھی مطمئن کرنا چاہتی تھی۔ حکومت کے اس رویے کی وجہ سے کانگریس قیادت اعتدال پسندوں کے ہاتھ سے نکل کر انتہا پسندوں کے ہاتھوں میں آ گئی تھی۔ اعتدال پسندوں کے لیڈر رکھو کھلے اور رانا ڈے تھے جو آئینی جدوجہد کے ذریعے اپنے حقوق منوانا چاہتے تھے۔ انتہا پسندوں کے سرکردہ رہنما بال گنگا دھر تلک تھے۔ یہ کانگریس کے لبرل رجحان کے سخت مخالف تھے۔ ان کے والہانہ جذبہ آزادی اور غیر معمولی قوت عمل نے انھیں جلد سارے ہندوستان میں مقبول بنا دیا۔ حسرت کا فطری رجحان بھی تلک کی طرف ہی تھا۔ ان کی پر جوش طبیعت، بلند ہمتی اور حریت پسندی انھیں کسی اور طرف لے بھی نہیں جا سکتی تھی۔ تلک سے ان کی محبت عقیدت کا درجہ رکھتی تھی[۶۸]۔ برطانوی حکومت کی شوق رزم آرائی اس زمانے میں نئے نئے قوانین کی شکل میں مسلط کی جا رہی تھی۔ رولٹ ایکٹ کے نفاذ نے اہل ہند کی امیدوں پر پانی پھیر دیا تھا ایسے میں حسرت کی کی شاعری بھی کروٹ بدلتے احساس کی ترجمان بنی۔ انھوں نے انگریزوں کی جانب سے اصلاحات اور قانون کے نفاذ کے نام پر جبریہ قانون کی کھل کر مخالفت کی۔ ایک غزل میں انھوں نے کہا کہ:

پردۂ اصلاح میں کوشش تخریب کا — خلقِ خدا پر عذاب دیکھیے کب تک رہے
نام سے قانون کے ہوتے ہیں کیا کیا ستم — جبر یہ زیرِ نقاب دیکھیے کب تک رہے
دولتِ ہندوستاں قبضۂ اغیار میں — بے عدو و بے حساب دیکھیے کب تک رہے
حسرتِ آزاد پر جور غلامانِ وقت — از رو بغض و عقاب دیکھیے کب تک رہے[۶۹]

مانٹیگو ریفارم کو بھی حسرت شک کی نظر سے دیکھتے تھے، وہ ہندوستان کی مکمل آزادی کے خواہاں تھے، اسی لیے وہ بہلاوے کے لیے کیے جانے والے اقدام کو محض دھوکا اور انگریزوں کی چال سے تشبیہ دیتے تھے۔ وہ مکر کی ان چالوں کی بابت کہتے ہیں کہ:

کس درجہ فریب سے ہے مملو — تجویز ریفارم مانٹیگو

مشہورِ زمانہ ہیں، مسلم دستور کے حسب ذیل پہلو
قانون پہ اختیارِ کامل عمال پہ زور، زر پہ قابو
ان میں سے نہ ہو جب ایک کی بھی گل ہائے ریفارم میں کہیں بو
کاغذ کے سمجھیے پھول ان کو جن میں نہیں نام کو بھی خوش بو
مدراس کے ڈاکٹر کا یہ قول کس درجہ ہے دل پذیر و نیکو
مقصود ہے صرف یہ کہ تا جنگ ہم سب رہیں ''مصرفِ ایں تگایو''
اے ہندی، سادہ دل خبردار! ہر گز نہ چلے یہ تجھ پہ جادو
کیا پائے گا خاک پھر جب ان سے اس وقت بھی کچھ نہ لے سکا تو[۷]

حسرت جب ہندوستانیوں کو انگریزوں کے مکروفریب کا شکار ہونے سے کامل آزادی کے خواب دکھا رہے تھے۔ وقتی فائدے کے بجائے وہ حتمی منزل کی جستجو کر رہے تھے۔ اسی لیے نجات ہند کو صرف اور صرف جدوجہد اور عزم پیہم کے ذریعے ممکن بنانے کی کوششوں میں مصروف تھے۔ شعر دیکھیے:

اے کہ نجات ہند کی دل سے ہے تجھ کو آرزو ہمت سر بلند سے یاس کا انسداد کر[۱]

اسی لے وہ مال گنگا دھر تلک کے نقش پدر پر چلتے ہوئے خودداری اور غلامی سے مکمل نجات کی طرف قدم بڑھانے کا مشورہ دیتے ہیں۔ وہ تلک کی طرح پورے ہندوستان میں حق وعمل کا پیغام عام کرنے کے خواہش مند دکھائی دیتے ہیں۔ اسی لیے وہ تلک کی کوششوں کو سراہتے ہوئے انھیں خراج تحسین پیش کرتے ہیں:

اے تلک اے افتخارِ جذبۂ حب وطنی حق شناس وحق پسند وحق یقین وحق سخن
تجھ سے قائم ہے بنام آزادیِ بے باک کی تجھ سے روشن اہلِ اخلاص و صفا کی انجمن
سب سے پہلے تو نے کی برداشت اے فرزندِ ہند خدمت ہندوستان میں کلفتِ قیدِ سخن
تو نے خودداری کا پھونکا اے تلک ایسا فسوں یک قلم جس سے خوشامد کی مٹی رسمِ کہن
ناز تیری پیروی پر حسرت آزاد کو اے تجھے قائم رکھے تا دیر رب ذوالمنن[۲]

ظفر علی خان کے ہاں بھی انقلابی شعور کی گہرائی نظر آتی ہے۔ عملی سیاست کے ساتھ ساتھ قومی زندگی کا کوئی ایسا گوشہ نہیں جو ان کے کلام میں موجود نہ ہو۔ پنجاب کے سانحات پر تو ان کی گہری نظر تھی، امرتسر میں ہونے والے خونیں سانحے اور اوڈوائر کی غضب ناکی پر لکھی گئی نظم مارشل لا کا انداز ملاحظہ کیجیے:

حکومت جن دنوں پنجاب میں تھی مارشل لا کی تو قابل دید کے تھی اوڈوائر کی غضب ناکی
جب امرتسر میں ہم پر گولیاں برسیں تو ہم سمجھے کہ بوندیں ہیں یہ اہل ہند کے خونِ تمنا کی
مساوات اس کو کہتے ہیں کہ مشقِ قطع اعضا میں نہ بوڑھوں ہی کو دیکھا اور نہ بچوں کی پروا کی
جناب اوڈوائر کی بم اندازی کے کیا کہنے ثریٰ کے بسنے والے سیر کرتے تھے ثریا کی[۳]

جلیاں والا کے سانحے کے بعد بھی جس طرح کا سلوک لوگوں کے ساتھ روا رکھا گیا، کبھی پیٹ کے بَل رینگ کر چلنے پر مجبور کیا جاتا، کبھی کوڑے مارے جاتے اور جیل میں دنوں ہفتوں اور مہینوں کے لیے ڈال دیا جاتا۔ اس صورت حال پر بھی ظفر نے مارشل لا کے ایام کی یاد کے عنوان سے ایک نظم لکھی، چند شعر ملاحظہ کیجیے:

میں نے امرتسر میں اک دن اپنے خواجہ سے کہا — پیٹ کے بَل رینگ لیجے بندہ پرور آپ بھی
ایک نہ اَساس کی تا فر بہی پر جائے چڑھ — کھایے ہر روز صبح و شام ہنٹر آپ بھی
ناک سے کچھ دم زمیں پر کھینچتے رہیے لکیر — پھیریے کونچی سفیدی کی بدن پر آپ بھی
بعد مغرب جایے مسجد کو اور اس جرم میں — پیٹھ پر کھنچوایے چابک سے مسطر آپ بھی
پھر یہ کہیے مارشل لا حشر تک قائم رہے — ورنہ ہوں گے منکرِ جرنیل ڈائر آپ بھی [۴۷]

جنرل ڈائر کے خلاف ہونے والی تفتیش اور ہنٹر کمیٹی کی رپورٹ کے بعد جنرل ڈائر کو ظالم، جابر اور نسل پرست کے طور پر یاد کیا گیا۔ اس صورت حال کی عکاسی کرتے ہوئے مولانا ظفر علی خان نے پنجاب میں جنرل ڈائر کے مظالم کو ہلاکو سے بدتر مظالم قرار دیتے ہوئے کہا کہ:

ولایت میں کھلا جب نامۂ اعمال ڈائر کا — طرازِ نامہ تھا نامِ گرامی اوڈوائر کا
ہلاکو کو عبث تاریخ میں بدنام کرتے ہیں — بچارے نے نہتوں پر دیا کب حکم فائر کا [۴۵]

جلیاں والا باغ میں ۱۳/اپریل کو ہونے والے سانحے کے دن جلسے سے قبل ہی مسلم اور ہندو رہنماؤں کو پابند سلاسل کیا جانے لگا۔ باغ میں جو جلسہ منعقد ہو رہا تھا وہاں اسٹیج پر ڈاکٹر سیف الدین کچلو کی تصویر بھی رکھی تھی، کیوں کہ انھیں بھی شورش کے دوران حراست میں لے لیا گیا تھا۔ اس پس منظر میں بھی ظفر علی خان نے ایک نظم کہی۔ چند شعر ملاحظہ کیجیے:

وطن کا خونِ ناحق جب بہایا مارشل لا نے — تو سرخی اس لہو کی بن گئی عنوانِ امرتسر
پکڑ کر لے گئے زنداں میں سیف الدین کچلو کو — فرنگستان کی مٹھی میں آئی جانِ امرتسر [۴۶]

ظفر علی خان نے غلام ہندوستان کی وفاداری اور انگریزوں کے ساتھ مفاہمانہ پالیسی کے نتیجے میں ملنے والے رولٹ ایکٹ کے خلاف بھی شدید ردعمل کا اظہار کیا۔ اپنی نظم ''ڈیڑھ سو سالہ وفاداری کا صلہ'' میں وہ ہندوستانی تاریخ کے اس پس منظر کو بیان کرتے ہوئے انگریزوں کے مکر و فریب کا پردہ چاک کر رہے ہیں:

ہو کسی طرح مجھ سے خوش انگریز — میری کوشش یہ انتہائی تھی
میں نے اپنے غرور کی گردن — اس کی دہلیز پر جھکائی تھی
میں جو حاکم تھا خود بنا محکوم — یہ بھی ایک شانِ کبریائی تھی
اس کے قدموں میں ڈال دی لاکر — باپ دادا کی جو کمائی تھی
آج میں ہوں اور اس کی ٹھوکر ہے — کہ اس تک مری رسائی تھی
آج روتا ہوں میں کہ کیوں میں نے — اپنی بنیاد آپ ڈھائی تھی

میں نے اپنے کیے کا پھل پایا | اس سے کی میں نے، کیوں بھلائی تھی [۷۷]

ظفر علی خان نے سانحہ جلیاں والا باغ کو عنوان انقلاب کے طور پر دیکھا اور اسے خوش آمدید کہا۔ وہ برطانوی استعمار کے خلاف سینہ سپر ہوئے اور برسوں تک زبان و قلم سے جہدِ آزادی کا علم بلند رکھا۔ بالخصوص جلیاں والا سانحے کے بعد تو بدلے ہوئے حالات نے ان کے دل میں شعلۂ آزادی کی لو کو مزید تیز کر دی۔ اپنی ایک نظم ''شعلۂ فانوس ہند'' میں وہ شہیدوں کے خوف کو قصرِ آزادی کی آرائش کا سامان قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

زندہ باش اے انقلاب اے شعلۂ فانوسِ ہند | گرمیاں جس کی فروغ مشعلِ جاں ہوگئیں
بستیوں پر چھا رہی تھیں موت کی خاموشیاں | تو نے صور اپنا جو پھونکا محشر ستاں ہوگئیں
جتنی بوندیں تھیں شہیدانِ وطن کے خون کی | قصرِ آزادی کی آرائش کا ساماں ہوگئیں
مرحبا اے نو گرفتارانِ بے داد فرنگ | جن کی زنجیریں خروش افزا سے زنداں ہوگئیں [۷۸]

''قانونِ وقت'' کے عنوان سے لکھی گئی نظم میں بھی انھوں نے اپنے وقت کے سب سے بڑے آمر کے جور و ظلم کا پردہ چاک کیا ہے۔ اس زمانے کے کالے قانون اور عام لوگوں کے ساتھ روا رکھے جانے والے سلوک کی بابت ظفر علی خان کا کہنا تھا کہ:

حق کا نہ کر اظہار کہ قانون یہی ہے | فرماتی ہے سرکار کہ قانون یہی ہے
پھٹ جائے جو تلّی تو نہ ٹھوکر سے گلہ کر | مر کر بھی نہ دم مار کہ قانون یہی ہے
کیڑوں کی طرح پیٹ کے بَل رینگ کران کو | شکریہ کے دے تار کہ قانون یہی ہے
ننکانہ کو چل، آگ میں جل، راکھ کا ہو ڈھیر | وہ پھر بھی وفادار کہ قانون یہی ہے
جینے کی تمنا ہو گر اس عہد میں تجھ کو | مرنے کو ہو تیار کہ قانون یہی ہے [۷۹]

اس زمانے میں اظہار رائے پر بھی قدغنیں لگائی جا رہی تھیں۔ اوڈوائر کی ستم پیشہ ملوکیت کے ''زمیندار'' کو سیدور کھلا رکھا تھا اور مولانا ظفر علی خان کو بھی کرم آباد میں نیم نظر بندی کا سامنا تھا۔ اس دور میں وہ سیاست میں بھی پوری طرح دل چسپی نہیں لے سکتے تھے۔ ادبی شوق پورا کرنے کے لیے روز نامہ ''ستارۂ صبح'' کی ادارت کی ذمہ داری نبھا رہے تھے [۸۰]۔ طنزیہ انداز سے وہ اس صورتحال پر بھی اوڈوائر کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

کرم آباد کو سر مائیکل نے | بنایا ہے مری علمی حوالات [۸۱]

اقبال کی شاعری میں بھی سامراج دشمنی کا جذبہ بدرجۂ اتم موجود ہے۔ یہ درست ہے کہ انھوں نے علاقائی مسائل سے ہٹ کر امت مسلمہ کے عالمی مسائل پر زیادہ توجہ دی، لیکن جلیاں والا سانحے پر شہیدوں کو خراج عقیدت پیش کرنا انھوں نے ضروری سمجھا۔ اقبال کا یہ قطعہ اسی دردناک واقعہ کی یاد دلاتا ہے:

ہر زائرِ چمن سے یہ کہتی ہے خاکِ باغ | غافل نہ رہ جہاں میں تو گردوں کی چال سے
سینچا گیا ہے خونِ شہیداں سے اس کا تخم | تو آنسوؤں کا بخل نہ کر اس خیال سے [۸۲]

احمق پھپھوندی اور تلوک چند محروم نے بھی اس حادثے سے متاثر ہو کر موثر نظمیں کہیں۔ یہ نظمیں انگریزوں کے ظلم و استبداد کے

خلاف ایک دردناک احتجاج کی حیثیت رکھتی ہیں [۸۳]۔جلیاں والا باغ کا حادثہ ہماری قومی تاریخ کا نیا موڑ ثابت ہو رہا تھا۔اس سانحے کے بعد برطانوی استعمار کا سیاسی احتساب روز بروز بڑھتا گیا۔اس کے ساتھ ساتھ تحریک آزادی بھی زور پکڑنے لگی۔مصطفیٰ خان مداح، احمق پھپھوندی نے واضح طور پر کہا کہ اگر استعماری قوتوں سے نجات کی کوشش تیز نہیں کی گئی تو جور و جبر کے حالات تبدیل نہیں ہوں گے۔ ایک نظم انگریزی ذہن کی تیزی میں وہ کہتے ہیں کہ:

یہ قتل و خوں یہ جنگ و جدل — یہ جور و ستم یہ بغض و حسد
باقی ہی رہیں گے ملک میں سب — باقی ہے اگر راج انگریزی
ہر سو ہے بپا ہنگامۂ خوں — ہر سمت ہے ڈھیر اک لاشوں کا
اوڈوائر و ڈائر کے دم سے — قائم ہے نشانِ چنگیزی [۸۴]

حقوق کے خلاف اٹھنے والی ہر آواز کو دبانے کی جو تدبیر ہو سکتی تھی وہ برطانوی استعمار نے کی۔رولٹ ایکٹ سے لے کر مارشل لا کے کالے قوانین تک ہر تدبیر برطانوی حکمرانوں نے مسلط کی،ظلم کے ایسے ایسے طریقے وضع کیے گئے جسے سُن کر انسانیت کانپ اٹھتی ہے۔اس حوالے سے احمق پھپھوندی نے اپنی ایک نظم ''حصولِ آزادی کی دقتیں'' میں کہا کہ:

ہند کا آزاد ہو جانا کوئی آسان نہیں — دیکھنا تم کو ابھی کیا کیا دکھایا جائے گا
دیکھنا تم سے ابھی کتنے کیے جائیں گے مگر — کس طرح تم کو ابھی چکر میں لایا جائے گا
انتہائی بربریت سے لیا جائے گا کام — بند کر کے تم کو جیلوں میں سڑایا جائے گا
دانہ پانی کر دیا جائے گا بالکل تم پہ بند — تم کو بھوکوں مار کر اُلّو بنایا جائے گا
جائیدادیں سب تمہاری ضبط کر لی جائیں گی — بال بچوں پر تمہارے ظلم ڈھایا جائے گا
باوجود اس کے بھی تم قائم رہے ضد پر اگر — بے تامل تم کو پھانسی پر چڑھایا جائے گا
اس طرح بھی تم اگر لائے نہ ابرو پر شکن — سر تمہارے پاؤں پر آخر جھکایا جائے گا [۸۵]

احمد پھپھوندی نے کانگریس کے پلیٹ فارم سے عملی سیاست میں بھی حصہ لیا، وہ انگریزی راج سے سخت متنفر تھے۔اسی نظام کے خلاف مزاحمت کرتے کرتے ان کی عمر گزری۔وہ صحیح معنوں میں مزاحمتی شاعر تھے۔ان کی کتاب ''نقش حکمت کا انداز بہت جارحانہ ہے'' [۸۶] میں ایک نظم ''بارِ الٰہہ پھر اب ہند کو آزاد کر'' میں بلند آہنگی اپنے عروج کو چھوتی دکھائی دیتی ہے۔ملاحظہ کیجیے:

رنج و الم کب تلک — جور و ستم کب تلک
جنگ بہم کب تلک — روز کا غم کب تلک
ختم بس اب یا خدا ملک سے بے داد کر — بار الٰہہ پھر اب ہند کو آزاد کر [۸۷]

وہ آزادی کے حصول کو سہل نہیں سمجھتے۔ان کے خیال میں ابھی بہت سی قربانیاں ہیں جسے دے کر ہی آزادی کا حصول ممکن ہوگا۔جلیاں والا کے سانحے کو وہ اس جدوجہد کے آغاز کی قربانی سے تعبیر کرتے ہیں لیکن ساتھ ہی یہ تلقین بھی کرتے جاتے ہیں کہ:

نہیں سہل آزادی ہند یارو — ابھی تم کو میداں میں آنا پڑے گا

ابھی امتحاں تم کو دینے پڑیں گے　　ابھی تم کو جیلوں میں جانا پڑے گا
کچھ آگے ابھی تختہ دار پر تم　　ابھی تم کو پھانسی پہ جانا پڑے گا
پڑے گا ابھی کام تیغ و تبر سے　　ابھی خاک و خوں میں نہانا پڑے گا
بہت سے کڑے مرحلے راہ میں ہیں　　یہ طے کر کے منزل تک آنا پڑے گا[۸۸]

اس سے قبل اکبرالہ آبادی طنزوظرافت کے لبادے میں سامراج کے خلاف شدید ردعمل کا اظہار کرتے رہے۔اکبر کے سامنے متعدد مسائل تھے جنھیں زیادہ وضاحت سے بیان کرنے کی ضرورت تھی،مثلاً پردے کی موافقت،لباس سے منافرت[۸۹]۔نماز اور دیگر اخلاقی مسائل،لہٰذا فوری حادثے اور سانحے پر اکبر کی نظر کم ہی ٹھہری۔البتہ جلیاں والا کا سانحہ اس قدر شدید تھا کہ پورے ہندوستان میں اس واقعے کی بازگشت سنی گئی۔جنرل ڈائر کو تلمیح اور علامت کے طور پر پیش کیا جانے لگا۔سر ہنٹر نے کیوں کہ اس سانحے کی تفتیش کی اور اپنی رپورٹ میں ڈائر کو مجرم ٹھہرایا تھا لہٰذا اکبر نے بھی ایک رباعی میں ان دونوں کرداروں کی بابت کہا کہ:

پالیٹکس جھگڑے چھوڑو　　ان باتوں سے اب منہ کو موڑو
کیسے ڈائر کیسے ہنٹر　　لاؤ ساغر لاؤ کنٹر[۹۰]

تلوک چند محروم بھی اقبال،چکبست اور سرور جہاں آبادی کی روایت کے امین تھے۔انھوں نے نظم کو نئی جلا بخشی اور اردو شاعری کی سماجی اور سیاسی معنویت کو ایک نیا روپ بخشا۔سترہ اٹھارہ برس کی عمر میں ہی لکھی گئی نظم ''تم کو معلوم ہے،کیوں روتی ہے بھارت ماتا؟'' کے انداز سے پتا چلتا ہے کہ سامراجیت اور خودمختاری کے حوالے سے اس نوجوان شاعر کے کیا خیالات تھے۔محروم نے اپنے پیش رو اقبال اور چکبست کے راستے پر چلتے ہوئے چراغ سے چراغ جلایا۔انھوں نے ملکی اور قومی عنصر پر اس وقت توجہ دی جب اردو کے بعض شاعر آزادی کی تحریک میں شریک ہونے سے کترا رہے تھے۔سرکاری ملازمت کی وجہ سے ان کا کلام ابتدا میں فرضی ناموں سے ''مخزن'' اور ''زمانہ'' میں شائع ہوتا رہا۔ان کے مجموعے ''صحرا نشین'' کی چند نظمیں اس دور کی یادگار ہیں۔جلیاں والا باغ کا سانحہ ہمارے سفر آزادی کا بڑا ہی دردناک حادثہ تھا۔محروم پر بھی اس سانحے کا گہرا اثر ہوا اور اس سانحے سے متاثر ہو کر انہوں نے بہت سی نظمیں کہیں[۹۱]۔ ''شکوۂ حیات'' بھی اس موضوع پر کہی گئی عمدہ نظم ہے۔اس نظم میں جنرل ڈائر کے جابرانہ رویوں کی عکاسی کرتے ہوئے ان کا کہنا تھا کہ:

حکم تیرا ہے کہ فریاد نہ ہونے پائے　　کوئی بلبل کہیں آزاد نہ ہونے پائے
دہر میں شہرتِ بے داد نہ ہونے پائے　　اور مشہور یہ روداد نہ ہونے پائے
نہ تڑپنے کی اجازت ہے نہ فریاد کی ہے　　گھٹ کے مر جاؤں یہ عرضی مرے صیاد کی ہے[۹۲]

باغ میں گھات لگا کر جس طرح لوگوں کو چُن چُن کر قتل کیا گیا اس سے ڈائر کے ارادوں کا اندازہ ہوتا ہے۔وہ امن و امان برقرار رکھنے نہیں بلکہ سامراجی استعمار کا رعب قائم کرنے کے لیے سب کچھ کرنے کو تیار بیٹھا تھا۔وہ ایک خون خوار شکاری کی طرح جس انداز میں نہتے لوگوں پر ٹوٹا اس منظر کو دکھاتے ہوئے شاعر کا کہنا ہے:

محا کمیں میں مگر اے وائے مقدر صیاد　　دشمنِ مہر جفا پیشہ ستم گر صیاد
آ گیا دام بلا دوش پہ لے کر صیاد　　ہوگیا ہر چمنِ فتنہ و محشر صیاد

نغمۂ بلبل شہدا سے فقط لاگ نہ تھی کون سا برگ وہ تھا جس کے لیے آگ نہ تھی [۹۳]

اس سانحے کی یاد شاعر کو ہمیشہ بے چین رکھتی۔ وہ اس کے شہدا کو کبھی نہیں بھول پاتے، جس طرح سے اس گلشن کو اجاڑا گیا اس نے ہر آنکھ اشک بار کر دی تھی اور جس نے ان واقعات کو اپنی آنکھوں سے دیکھا، ساری عمر اس بر بریت کو نہ بھول پایا۔ شاعر اس بابت کہتے ہیں کہ:

موسمِ گل میں جورہ رہ کے چمن یاد آئے ہم نوا! لب پہ نہ کیوں شکوۂ صیاد آئے

پھر سوئے کنج نفس نکہت برباد آئے آئے پھر بوئے غبارِ دل ناشاد آئے

آتشِ حسرت گلگشت سوا ہوتی ہے اجڑے گلشن کی بھی کیا خوب ہوا ہوتی ہے [۹۴]

محروم نے اس واقعے کے بعد انگریزوں سے نفرت کا اظہار مختلف نظموں میں کیا ہے۔ اکثر نظمیں زہر میں بجھی ہوئی ہیں اور اس ظلم و استبداد کے خلاف احتجاجی رویہ لیے ہوئے ہیں۔ وہ نادر شاہ کے مظالم کو بھی جنرل ڈائر کے مظالم کے سامنے ہیچ سمجھتے ہیں۔ ''ڈائر اور نادر'' میں اپنے جذبات کا اظہار کچھ اس طرح کیا ہے:

نادر کا قتلِ عام ہے مشہور آج تک سفاک اس کا نام ہے مشہور آج تک

لیکن ہے جو رِ نادرِ سفاک سے سوا ڈائر کے قتل عام کا پر ہوں ماجرا

نے کیا تھا قتل رعایائے غیر کو جو ہو چکی تھی جنگ میں خود اس کے روبرو

ڈائر نے قتل عام کیا اس مقام پر مرتے جہاں ہیں لوگ اطاعت کے نام پر [۹۵]

نظم میں ڈائر کے مکروہ کردار اور ظالمانہ رویے کو بیان کرتے ہوئے اس سارے خون خرابے کو بے جواز قرار دیتے ہیں۔ محروم کا کہنا ہے کہ بغیر کسی کارروائی و تشدد کے اس مجمعے کو پُرامن طریقے سے بھی منتشر کیا جا سکتا تھا لیکن ڈائر نے اپنے طرزِ عمل سے صرف جلیاں والا باغ کو لہولہان نہیں کیا بلکہ پورے برطانیہ کو بھی خون سے رنگ دیا ہے۔ اشعار ملاحظہ کیجیے:

تھی درمیانِ باغ ہزاروں کی بھیڑ بھاڑ ناگاہ اس طرف سے چلی گولیوں کی باڑ

پھر وہ ہوا کہ جس سے لرزتی ہے تن میں جاں پتھر کا دل بناؤ، تو کچھ ہو سکے بیاں

ڈائر کے قتلِ عام نے خونِ وفا کیا لہو سے لال دامنِ برطانیہ کیا [۹۶]

وہ اس بات کو اچھی طرح جانتے تھے کہ شہیدوں کا لہو کبھی رائیگاں نہیں جاتا۔ ایک نہ ایک دن ظالم کو احساس ہوگا اور وہ اپنے کیے پر پچھتائے گا۔ ڈائر کی زندگی کے آخری ایام تلوک چند محروم کے خیالات پر مہر تصدیق ثبت کرنے کے لیے کافی ہیں:

سب لکھ لینا خونِ ناحق رنگ اک دن لائے گا خود غرض ظالم کیے پر اپنے خود پچھتائے گا [۹۷]

اور واقعی محروم کی بات درست ثابت ہوئی اور جنرل ڈائر سے تمام اعزازات واپس لے کر فوج کی ملازمت سے برخاست کر دیا گیا۔

جوش ملیح آبادی بھی اپنی نظم ''کمپنی کے فرزندوں'' میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے کردار پر کڑی تنقید کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ کمپنی کے مظالم کی فہرست بہت طویل ہے۔ جوش ان مظالم کو فرداً فرداً گنواتے ہوئے سانحہ جلیاں والا باغ کو ایسا زخم قرار دیتے ہیں جس سے

پیچھا چھڑانا خود برطانوی استعمار کے لیے بھی ممکن نہیں ہوگا۔اسی لیے وہ کمپنی کے فرزندوں سے سوال کرتے ہیں کہ:

ذہن میں ہوگا یہ تازہ ہندیوں کے داغ بھی؟ — یاد تو ہوگا تمہیں جلیاں والا باغ بھی؟
پوچھ لو اس سے تمہارا نام کیوں تابندہ ہے — ''ڈائر'' گرگِ دہن آلوداب بھی زندہ ہے [۹۸]

نیکا رام سخن نے بھی ان مظالم کی منظر کشی ''ایشور پرارتھنا'' میں کی ہے۔اس نظم میں مجموعی طور پر پنجاب کے مظالم کا نقشہ کھینچتے ہوئے ظلم و جبر کے نتیجے میں پیدا ہونے والی مایوسی اور پھر عزم و حوصلے کی تصویر کھینچی گئی ہے۔ملاحظہ کیجیے:

ظلم ہے جور و وفا ہے، ہر طرف بے داد ہے — گردش دستِ ستم گر ہے جہاں برباد ہے
دیکھیے جس کو وہی مغموم ہے ناشاد ہے — بچہ بچہ ہوگا اب مائل فریاد ہے
ظلم کیا کیا ہو رہے ہیں آج معصوموں پہ دیکھ — ٹوٹتا کیا کیا ستم ہے آج مظلوموں پہ دیکھ
اک مصیبت ہو سہہ بھی لیں یہاں بھرمار ہے — بے کسی و یاس و حسرت در پے آزاد ہے
گردنوں پہ تیغ ہے، خنجر ہے اور تلوار ہے — اور بندوقوں کی دل پر گولیوں کی مار ہے
پھر بھی اے بھگوان ہم سینہ سپر ہیں دیکھ لے — صرف تیرے نام پر باندھے کمر ہیں دیکھ لے [۹۹]

''جلیاں والا باغ'' کے عنوان سے ''ضبط شدہ نظمیں'' میں سرجو کی ایک نظم بھی شائع ہوئی۔اس نظم میں بھی شاعر نے بموں اور بندوقوں کے آزادانہ استعمال پر طنز کرتے ہوئے اس واقعے کو آزادی کا محرک قرار دیا ہے۔ان کا کہنا تھا کہ ڈائر نے جو مکروہ عمل کیا ہے، ساری دنیا اس کے جبر کو نہیں بھول پائے گی:

بے گناہوں پر بموں کی بے خطر بوچھاڑ کی — دے رہے ہیں دھمکیاں بندوق اور تلوار کی
باغ جلیاں میں نہتوں پر چلائیں گولیاں — پیٹ کے بل بھی رینگایا ظلم کی حد پار کی
ہم غریبوں پر کیے جس نے ستم بے انتہا — یاد بھولے گی نہیں اس ڈائر بدکار کی
یا تو ہم ہی مر مٹیں گے یا تو لے لیں گے سوراج — ہوتی ہے اس بار محبت ختم اب ہر بار کی
جیل میں بھیجا، ہمارے لیڈروں کو بے قصور — لارڈ ریڈنگ تم نے اچھی نیائے کی بھرمار کی
خونِ مظلوماں کی سر جواب تو گہری دھار ہے — کچھ دنوں میں ڈوبتی ہے آبرو اغیار کی [۱۰۰]

''مجھے گولیوں سے اڑا دیا'' میں بھی خلیق نے پنجاب میں لگنے والے مارشل لا اور اس کالے قانون کے تحت عوام کو دی جانے والی طرح طرح کی سزاؤں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کیا۔

کریں کیا کسی سے شکایتیں بیاں کس سے کرتے حکایتیں — کی جو ہند والوں نے چوں چرا انھیں مارشل لا سنا دیا
وہی لوگ ناز کے تھے پہلے جو گلی میں پیٹ کے بل چلے — پڑی مار کوڑوں کی اس قدر کہ تمام جسم سُجا دیا
وہ یتیم کرتے ہیں زادیاں، ہیں نصیب جن کو بدھائیاں — وہ گھروں میں روتی ہیں بیویاں جنھیں ہائے بیوہ بنا دیا
یہاں سب کو جان کا بیم ہے وہاں مانٹیگو اسکیم ہے — نہ تو صبر ہے نہ قرار ہے، یہ بتاؤ تو ہمیں کیا دیا
نہیں یاد رکھنا خلیق تم کہیں دل سے کرنا نہ ان کو کم — یہ شہید قوم کے لال ہیں انھیں حق نے اتنا بڑھا دیا [۱۰۱]

مارشل لا کے پس منظر میں کہی گئی نظم ''شہاب ثاقب'' بھی اس حوالے سے اہمیت کی حامل ہے۔ اس میں شاعر ظلم و بربریت کے نت نئے طریقوں سے نجات کے لیے ہندوستان کی آزادی کو ضروری قرار دیتے ہیں۔ سوالیہ انداز سے وہ اپنے رب سے سوال کرتے ہیں کہ:

الٰہی ہند کب آزاد ہوگا — دل مضطر ہمارا شاد ہوگا

نہ ہو گر مارشل لا سے تسلی — تو اک حربہ نیا ایجاد ہوگا

جلا دے سوزِ دل سے جسم خالی — ترا اجڑا جہاں آباد ہوگا[102]

روزنامہ ''اکالی''، امرتسر میں شائع ہونے والی نظم ''کفن ہوگا ہماری لاش پر قاتل کے دامن کا'' سے شوخ کیرانوی نے عزم و حوصلے کو بڑھاتے ہوئے دشمن کو خوب للکارا ہے۔ ان کے خیال میں جو ظلم پنجاب کی سرزمیں پر توڑا گیا، استعماری طاقتیں اس کا بوجھ برداشت نہیں کر پائیں گی۔ وہ کہتے ہیں کہ:

پیا ہے خالصہ نے گھونٹ ایسا آبِ آہن کا — کہ قاتل کی چھری سے اٹھ سکے گا بوجھ گردن کا

ہوا ہے گرم میداں تیغ بر براں اپنی گردن کا — کفن ہوگا ہماری لاش پر قاتل کے دامن کا

ڈراتا ہے کیسے بندوق سے نادان سودائی — ہمارا مرنج جاں پرورده ہے گولی کے خرمن کا

نشانہ گولیوں کا تو بنا دے شوق سے ہم کو — ملے گا تجھ کو بھی تنکا نہ اک تیرے نشیمن کا

عداوت دیر سے ہے اور کینہ تجھ کو کعبے سے — ہوا ہے ناک میں دم تجھ سے ہر شیخ و برہمن کا[103]

''پنجاب کا ہتیا کار'' کے عنوان سے بھی ایک نظم ''ضبط شدہ نظمیں'' میں شامل ہے۔ اس کے شاعر کا نام معلوم نہیں ہو سکا۔ موضوع کے لحاظ سے اس نظم میں جنرل ڈائر کے مظالم اور پنجاب کے حالات کا نقشہ کھینچتے ہوئے شاعر کا کہنا ہے کہ:

پنجاب میں ہزاروں بچوں کو بھون ڈالا — شیطان کی ہے خصلت یا تیر ہے قضا کا

وا حسرتا وہ صدہا گھر بار کا اجڑنا — وہ نقشۂ اجل کا آنکھوں کے آگے پھرنا

خانہ جلال باری قہر خدا کا نقشہ — بھائی کا اپنے چھوٹے بھائی سے یوں بچھڑنا

ڈائر کا ہم نہتوں پر آکے فیر کرنا — وہ جانِ ناتواں کا کشتی قضا سے لڑنا

تھا فتنۂ قیامت اس وقت جو ستم کا — پھر اپنے جُرموں سے یک بیک مکرنا

پیٹوں کے بَل ہم کو رستے میں یوں چلانا — ہنٹر کی چوٹ سے پھر یوں جسم کا ادھڑنا[104]

ایک اور نامعلوم شاعر کی غزل میں جلیاں والا باغ کے اندر جو کچھ ہوا اس کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ چند شعر ملاحظہ کیجیے:

وہ قتیل تیغ ستم ہوں میں کہ فلک نے مجھ کو مٹا دیا — نہ نکلنے پائی تھی اُف تلک کہ گلا ہی آکے دبا دیا

پڑی لاش لاش پہ ننگے تن نہ لحد ملی نہ ملا کفن — وہ جو جاں نثار تھے ہند کے تہ خاک یوں ہی دبا دیا

جو جہاں گرا تھا پڑا رہا، جو جہاں پڑا تھا نہ اٹھ سکا — جو ذرا بھی سنبھلا تھا بس وہیں، اسے گولیوں سے اُڑا دیا[105]

جیسا کہ ذکر کیا گیا کہ اس تمام بربریت کے پیچھے رولٹ ایکٹ کی کارفرمائی دکھائی دیتی ہے۔ ہندوستان کے لوگوں نے عالمی

جنگ میں جس طرح برطانوی استعمار کے پیچھے گردنیں کٹائیں اس کے بعد اس طرح کا کالا قانون سمجھ سے باہر تھا، اسی لیے لوگ رولٹ ایکٹ کے خلاف احتجاج بھی بلند کر رہے تھے۔ اس پس منظر میں ایک غیر معروف شاعر ماہر کا یہ شعر دیکھیے:

تحفہ تم کو یہ ملا گردن کٹا دینے کے بعد   آیا سائمن کمیشن ایکٹ رولٹ بن گیا [۱۰۶]

بلراج کومل نے بھی ''گریہ سگاں'' میں چمن کے اجڑنے کے منظر کو افسردہ انداز سے بیان کیا ہے۔ شہر کی اداس فضاؤں کو دیکھ کر وہ یہ کہنے پر مجبور ہوئے کہ:

یہ شہر جلا/ اس شہر میں روشن ہنستے بستے گھر تھے کئی/ سب راکھ ہوئے/ اور ان کے مکیں/ کچھ قتل ہوئے/ کچھ جان بچا کر بھاگ گئے [۱۰۷]

خوف اور وحشت کی اس فضا کو قلم بند کرتے ہوئے بلراج کا کہنا تھا کہ شہر کی ویرانی اور اداسی دیکھ کر کتے بھی بین کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ جلیاں والا کے افسوس ناک سانحے کے بعد شہر میں موت کا سناٹا طاری ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

کتے تو آخر کتے ہیں/ دن بھر کچرے کے ڈھیروں پر/ وہ مارے مارے پھرتے ہیں/ جب رات اترنے لگتی ہے/ آنے والے دشمن موسم کی شدت سے/ سب مل کر رونے لگتے ہیں [۱۰۸]

سیاسی اور احتجاجی تحریک کے پس منظر میں لکھی گئی ان نظموں کے مطالعے سے اچھی طرح اندازہ ہوتا ہے کہ اردو شعرا نے سانحہ جلیاں والا کو کس طرح اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔ اس سانحے میں رونما ہونے والے ہر قصے اور نفرت انگیز عمل کے ردعمل کا اظہار کیا۔ خصوصاً لوگوں کو رینگ رینگ کر چلانے، کوڑے برسانے اور مارشل لا کے کالے قانون کی آڑ لے کر عام شہریوں کو طرح طرح کی اذیتیں دینے کے مناظر ان نظموں میں واضح دکھائی دیتے ہیں۔ یہ نظمیں ایسی دستاویز ہیں جو اس سانحے کو کبھی تاریخ کے اوراق میں گم نہیں ہونے دیں گی۔ یہ سانحہ دراصل اس امپیریلزم کا بھی اظہار ہے جو اس زمانے کی برطانوی استعمار کا خاصا رہا ہے۔ اس امپیریلزم کی سوچ کے تحت رعب وداب کا یہ دیوتا ایک صدی قبل ۳۲ کروڑ ہندوستانیوں کو کھا جانے پر تُلا بیٹھا تھا۔ اسے یہ تو گوارا تھا کہ منٹوں میں ہزاروں لوگوں کو موت کے گھاٹ اتارے یا انھیں مجروح کر کے معذور اور اپاہج بنا دے لیکن یہ گوارا نہیں کہ کوئی ہندوستانی اس کے اختیارات کو چیلنج کرے۔ یہ للکارا سے گراں گزرتی تھی۔ ایک ہندوستانی اس کا مضحکہ اُڑائے یہ اسے کسی صورت منظور نہ تھا۔ بقول مولانا محمد علی جوہر

''ڈائر سب سے سچا امپیریلسٹ تھا، اس لیے اس نے اپنے ان امپیریل خیالات کو مطلق نہیں چھپایا اور مرتے دم تک انہی پر قائم رہا۔ ہنٹر کمیشن نے بہت چاہا کہ ڈائر کوئی عذرِ گناہ پیش کر دے، تاکہ وہ اس کی بریت کا اعلان کر دے۔ لیکن ڈائر کو ان انگریزوں پر تعجب ہوتا تھا جو اس سے پوچھتے تھے کہ بلا کسی انتباہ کے اس نے گولی کیوں چلا دی اور پیٹ کے بل رینگنے کا کیوں حکم دیا، وہ خود ان سے پوچھ سکتا تھا کیا تم امپیریلسٹ نہیں ہو۔۔۔ اور کیا امپیریل ازم جلیاں والا باغ کے قتل عام اور لوگوں کے پیٹ کے بل رینگنے کے سوا کسی اور شے سے مطمئن ہو سکتا ہے؟'' [۱۰۹]

اس امپیریل ازم نے ڈائر کو مجبور کیا کہ وہ جلیاں والا میں موجود ہزاروں لوگوں کے ساتھ وحشت ناک سلوک کرے۔ انھیں ایسا سبق سکھائے کہ آئندہ کوئی غلام قوم ان کے سامنے سر اٹھانے کی جرأت تک نہ کر سکے۔ مگر افسوس وقت کا دھارا بہت تیزی سے بدل رہا

تھا۔جس سوچ نے ڈائر سے یہ عمل کروایا وہ اُلٹا برطانوی استعمار کے خلاف گیا،اس سانحے کے رونما ہونے کے بعد برصغیر کے ہر حصے سے انگریزوں کے خلاف آزادی کی جو تحریک شروع ہوئی،اس نے محض ۱۸ برسوں کے اندر برطانیہ بہادر کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا۔گویا یہ سانحہ ہی دراصل آزادیِ ہند کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔اسی لیے آزادی کی اس جدوجہد کے دوران نوجوانوں سے خطاب میں شورش کاشمیری نے واضح طور پر استعماری قوتوں کی شکست کی نوید سناتے ہوئے ان کی تباہی و بربادی کی یقین دہانی کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ان کا کہنا ہے کہ:

اے ملتِ لشکر کے رضا کار جوانو
آزادیٔ کامل کے طلب گار جوانو

یہ ملک ہوا جس کے تشدد کا نشانہ
اب اس کی تباہی کا بھی آیا ہے زمانہ

اب جلیاں والا کے شہیدوں کو پکارو
سرحد کے بھی پُرجوش پٹھانوں کو پکارو

اجڑے ہوئے باغوں کی بہاروں کو پکارو
افلاس شہادت کے ستاروں کو پکارو

مقتل سے اٹھا لاؤ شہیدوں کے سَروں کو
آواز دو آواز تباہ حال گھروں کو[۱۱۰]

حوالہ جات

۱۔ عطا، اشرف، ''کچھ شکستہ داستانیں''، سندھ ساگر اکادمی، لاہور، ۱۹۶۶ء، ص۴۰

۲۔ ذوالفقار، ڈاکٹر غلام حسین، ''جلیانوالہ باغ کا قتل عام اور مظالم پنجاب''، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۶ء، ص۵۔۷

۳۔ Rupert, Fruencalus, "Massacre At Amritsar", London. 1946, P.49.

۴۔ ذوالفقار، ڈاکٹر غلام حسین، محولہ بالا، ص۸

۵۔ ندوی، ابوالہاشم، ''جلیانوالہ باغ: تاریخ آزادی پاک و ہند کا ایک خونیں باب''، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، سن ندارد، ص۱۳

۶۔ ذوالفقار، ڈاکٹر غلام حسین، ص۱۹

۷۔ قریشی، ڈاکٹر اشتیاق حسین، ''برصغیر پاک و ہند کی ملت اسلامیہ''، مترجم: ہلال احمد زبیری، شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ، کراچی یونی ورسٹی، کراچی، ۱۹۹۹ء، ص۳۵۴۔۳۵۵

۸۔ ذوالفقار، ڈاکٹر غلام حسین، ص۲۰

۹۔ احمد، سید نور احمد، ''مارشل لا سے مارشل لا تک، اپریل ۱۹۱۹ء تا اکتوبر ۱۹۵۸ء''، دین محمدی پریس، لاہور، ۱۹۶۵ء، ص۱۳

۱۰۔ قریشی، ڈاکٹر اشتیاق حسین، ص۳۵۵

۱۱۔ ذوالفقار، ڈاکٹر غلام حسین، ص۲۱۔۲۲

۱۲۔ سیڈیشن کمیٹی رپورٹ، ص۱۴۵؛ بہ حوالہ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار، محولہ بالا، ص۲۲

۱۳۔ ذوالفقار، ڈاکٹر غلام حسین، محولہ بالا، ص:۲۲۔۲۶۔

۱۴۔ سیڈیشن کمیٹی رپورٹ، ص۲۱۱، بحوالہ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار، محولہ بالا، ص۲۶

۱۵۔ ذوالفقار، ڈاکٹر غلام حسین، محولہ بالا، ص۲۷۔۲۸

۱۶۔ احمد، سید نور، ''مارشل لا سے مارشل لا تک''، محولہ بالا، ص۱۳۔۱۴

۱۷۔ قریشی، ڈاکٹر اشتیاق حسین، ص۳۵۵

۱۸۔ احمد، سید نور، ص۱۴۔۱۶

۱۹۔ رامیا، سیتا، جلد اول، ص۱۶۰؛ بہ حوالہ، ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی، محولہ بالا، ص:۳۵۶۔

۲۰۔ ذوالفقار، ڈاکٹر غلام حسین، محولہ بالا، ص۱۲۸

۲۱۔ ایضاً، ص۱۲۸۔۱۴۰

۲۲۔ ذوالفقار، ڈاکٹر غلام حسین، محولہ بالا، ص۱۴۰

۲۳۔ ذوالفقار، ڈاکٹر غلام حسین، محولہ بالا، ص۱۴۱

۲۴۔ ایضاً، ص۱۴۱

۲۵۔ نامعلوم، ''جلیانوالہ باغ''، http:\\ www. rekhta. org/ ebook/ jalianwala-bagh? ebooklang- org، ص۴۰

۲۶۔ نقوی، ذکی، http://www.laaffain.com jalianwala-bagh جولائی ۱۹۱۴ء

۲۷۔ نامعلوم، ''جلیانوالہ باغ''، http:// www. rekhta. org/ ebook/ jalianwala-bagh. ebooklang. org، ص۴۰۔۴۱

۲۸۔ ایضاً، ص۲۰

۲۹۔ ذوالفقار، ڈاکٹر غلام حسین، محولہ بالا، ص۱۴۲

۳۰۔ جوہر، مولانا محمد علی، تقریر ۳۱ دسمبر ۱۹۱۹ء، 'جلوس کانگریس منعقدہ کانگریس'، محولہ بالا، ''اوراق گم گشتہ''، مرتبہ: سید رئیس احمد جعفری، محمد علی اکیڈمی، لاہور، ۱۹۶۸ء، ص:۴۸۔

۳۱۔ عطا، اشرف، محولہ بالا، ص:۴۱۔

۳۲۔ نامعلوم، محولہ بالا، ص:۴۱۔

۳۳۔ فرید آبادی، سید ہاشمی، ''تاریخ مسلمانانِ پاکستان و بھارت''، جلد دوم، انجمن ترقی اردو، پاکستان، کراچی، ۱۹۸۸ء، ص۵۴۶۔۵۴۷

۳۴۔ ایضاً، ص۵۴۶

۳۵۔ قریشی، اشتیاق حسین، محولہ بالا، ص۳۵۶

۳۶۔ قریشی، عبدالرزاق، ''مقدمہ''، مشمولہ: 'نوائے آزادی'، ص۲۱

۳۷۔ بدایونی، عبدالماجد، ''رولٹ بل''، بحوالہ، 'نوائے آزادی'، محولہ بالا، ص۱۴۸

۳۸۔ ندوی، ابوالہاشم، محولہ بالا، ص۴۲

۳۹۔ موجمدار، ایس۔ کے، ''جناح اور گاندھی''، مترجم: ثوبیہ طاہر، سارنگ پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۶ء، ص۸۳

۴۰۔ ندوی، ابوالہاشم، ص۱۹

۴۱۔ چند، تارا، ’’تحریک آزادی ہند‘‘، جلد سوم، مترجم: عدیل عباسی، ترقی اردو بیورو، دہلی، ص۶۹۳
۴۲۔ ذوالفقار، ڈاکٹر غلام حسین، محولہ بالا، ص۱۵۴۔
۴۳۔ نامعلوم، محولہ بالا، ص۲۱
۴۴۔ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار، محولہ بالا، ص۱۵۴
۴۵۔ نقوی، ذکی، محولہ بالا۔
۴۶۔ ذوالفقار، ڈاکٹر غلام حسین، محولہ بالا، ص۱۵۸۔۱۶۰
۴۷۔ بحوالہ ذوالفقار، ڈاکٹر غلام حسین، محولہ بالا، ص۱۶۴
۴۸۔ ندوی، ابوالہاشم، محولہ بالا، ص۴۲۔۴۳
۴۹۔ ذوالفقار، ڈاکٹر غلام حسین، محولہ بالا، ص۱۱۷۔۱۹۹
۵۰۔ نقوی، ذکی، محولہ بالا۔
۵۱۔ بحوالہ ڈاکٹر غلام حسین، ذوالفقار، محولہ بالا، ص۲۰۱۔۲۰۹
۵۲۔ نقوی، ذکی، محولہ بالا۔
۵۳۔ بحوالہ، ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار، محولہ بالا، ص۳۸۵۔
۵۴۔ منٹو، سعادت حسن، ’’۱۹۱۹ء کی ایک بات‘‘، http:// www. rekhta.org./?/
۵۵۔ ذوالفقار، ڈاکٹر غلام حسین، محولہ بالا، ص۲۸۴۔۲۸۶
۵۶۔ عطا اشرف، محولہ بالا، ص۴۲۔۴۳
۵۷۔ جوہر، مولانا محمد علی، اوراق گمشدہ، محولہ بالا، ص۴۸
۵۸۔ حسین، سید عابد، ’’ہندوستانی مسلمان آئینہ ایام میں‘‘، مکتبہ، جامعہ، دہلی، ۲۰۱۲ء، ص۱۲۳
۵۹۔ جوہر، مولانا محمد علی، ’’امپیریلزم کی روح‘‘، مشمولہ: ’نوائے آزادی‘، محولہ بالا، ص۱۵۵
۶۰۔ نگم، نرائن، ’’رفتار زمانہ‘‘، مشمولہ: ’’تحریک آزادی کے چالیس سال‘‘، حصہ اول، خدا بخش اورنٹیل پبلک لائبریری، پٹنہ، ۱۹۹۴ء، ص۲۳۲
۶۱۔ ایضاً، ص۲۴۶
۶۲۔ مشمولہ: ’’نوائے آزادی‘‘، محولہ بالا، ص۱۵۶۔۱۵۷
۶۳۔ ذوالفقار، ڈاکٹر غلام حسین، محولہ بالا، ص۲۱۵۔۲۴۹
۶۴۔ نامعلوم، محولہ بالا، ص۲۷
۶۵۔ شاہ، سلیم اللہ، ’’ضبط شدہ نظمیں‘‘، ایک جائزہ، مشمولہ: ’’معیار‘‘، اسلام آباد، جولائی دسمبر ۱۹۱۳ء، ص۱۳۱
۶۶۔ قریشی، عبدالرزاق، محولہ بالا، ص:۲۲۔
۶۷۔ فنکارانہ تشبیہات، http://www.rekhta.org./?/
۶۸۔ نارنگ، گوپی چند، ہندوستان تحریک آزادی اور اردو شاعری، محولہ بالا، ص۳۴۴۔۳۴۵
۶۹۔ موہانی، حسرت، مشمولہ: ’’نغمات حریت‘‘، محولہ بالا، ص۴۴۔۴۵
۷۰۔ موہانی، حسرت، مشمولہ: ’’اردو میں قومی شاعری کے سو سال‘‘، محولہ بالا، ص۲۰۲
۷۱۔ ایضاً، ص۲۰۳
۷۲۔ ایضاً، ص۲۰۱
۷۳۔ خان، مولانا ظفر علی، ’’کلیات مولانا ظفر علی خان‘‘، محولہ بالا، ص۱۵۶
۷۴۔ ایضاً، ص۴۹۰۔۴۹۱
۷۵۔ ایضاً، ص۴۹۲
۷۶۔ ایضاً، ص۱۴۰
۷۷۔ ایضاً، ص۴۹۵
۷۸۔ ایضاً، ص۳۱۵
۷۹۔ خان، ظفر علی خان، ’’قانون وقت‘‘، مشمولہ: ’نوائے آزادی‘، محولہ بالا، ص۲۲۲
۸۰۔ ذوالفقار، ڈاکٹر غلام حسین، ’’مولانا ظفر علی خان، حیات و خدمات‘‘، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۳ء، ص۱۴۲۔۱۴۳
۸۱۔ خان، مولانا ظفر علی، ’’کلیات مولانا ظفر علی خان‘‘، محولہ بالا، ص۴۵۰
۸۲۔ اقبال، علامہ، بحوالہ، ’’ہندوستان کی تحریک آزادی اور اردو شاعری‘‘، محولہ بالا، ص۳۵۴
۸۳۔ نارنگ، گوپی چند، ’’ہندوستان کی تحریک آزادی اور اردو شاعری‘‘، محولہ بالا، ص۳۵۴
۸۴۔ پھپھوندی، احمق، مشمولہ: ’’اردو میں قومی شاعری کے سو سال‘‘، محولہ بالا، ص۲۱۳
۸۵۔ ایضاً، ص:۲۵۵

۸۶۔ کلیم، طارق، ''اردو کی ظریفانہ شاعری میں مزاحمتی عناصر''، انجمن ترقی اردو، پاکستان، کراچی، ۲۰۱۸ء، ص ۸۱

۸۷۔ پھپھوندی، احمق، مشمولہ ''نقش حکمت''، مکتبہ برہان، دہلی، ۱۹۴۴ء، ص ۱۰۱

۸۸۔ پھپھوندی، احمق، ''کڑے مرحلے''، مشمولہ: ''ضبط شدہ نظمیں''، محولہ بالا، ص ۲۰۸

۸۹۔ حسین، ڈاکٹر سید اعجاز، ''اکبر فنکار کی حیثیت سے''، مشمولہ: ''علی گڑھ میگزین''، جلد ۲۴، شمارہ: ۳، ۱۹۵۰ء، ص ۱۲

۹۰۔ الٰہ آبادی، اکبر، ''کلیات اکبر''، مرتبہ: نارنگ ساقی، میڈیا انٹرنیشنل، دہلی، ۱۹۸۸ء، ص ۶۵۸

۹۱۔ نارنگ، گوپی چند، ''ہندوستان کی تحریک آزادی اور اردو شاعری''، محولہ بالا، ص ۵۰۹۔۵۱۱

۹۲۔ محروم، تلوک چند، ''شکوہ صیاد''، مشمولہ: ''اردو میں قومی شاعری کے سوسال''، محولہ بالا، ص ۱۹۵

۹۳۔ ایضاً، ص ۱۹۴

۹۴۔ ایضاً

۹۵۔ محروم، تلوک چند، ''ڈائر اور نادر''، مشمولہ: ''ہندوستان کی تحریک آزادی اور اردو شاعری''، محولہ بالا، ص ۵۱۱

۹۶۔ ایضاً

۹۷۔ محروم، تلوک چند، ''پھول برساؤ شہیدانِ وطن کی خاک پر''، مشمولہ: ''اردو میں قومی شاعری کے سوسال''، محولہ بالا، ص ۲۳

۹۸۔ ملیح آبادی، جوش، مشمولہ: ''نشید حریت''، مرتبہ: شان الحق حقی، فیروز سنز، کراچی، ۱۹۵۷ء، ص ۲۳۵

۹۹۔ سخن، ٹیکا رام، ''ایشور پرارتھنا''، مشمولہ: ''ضبط شدہ نظمیں''، محولہ بالا، ص ۱۱۲۔۱۱۳

۱۰۰۔ سرجو، ''جلیانوالہ باغ''، مشمولہ: ''ضبط شدہ نظمیں''، محولہ بالا، ص ۱۳۲۔۱۳۳

۱۰۱۔ خلیق، ''مجھے گولیوں سے اڑا دیا''، مشمولہ: ''ضبط شدہ نظمیں''، محولہ بالا، ص: ۱۴۵۔۱۴۶۔

۱۰۲۔ ثاقب، کنہیا لال، مشمولہ: ''ضبط شدہ نظمیں''، محولہ بالا، ص: ۱۴۹۔

۱۰۳۔ کیرانوی، شوخ، مشمولہ: ''ضبط شدہ نظمیں''، محولہ بالا، ص ۱۸۳۔

۱۰۴۔ نامعلوم، مشمولہ: ''ضبط شدہ نظمیں''، محولہ بالا، ص: ۱۶۲۔۱۶۳۔

۱۰۵۔ نامعلوم، ''غزل''، مشمولہ: ''ضبط شدہ نظمیں''، محولہ بالا، ص ۱۵۲۔

۱۰۶۔ ماہر، ''ہندوستانی آزاد جماعت کا پمفلٹ''، مشمولہ: ''ضبط شدہ نظمیں''، محولہ بالا، ص ۱۳۷

۱۰۷۔ کول، بلراج، ''گریہ سگاں''، http:// www. rekhta. org.nazms/girya-e-sagann

۱۰۸۔ ایضاً

۱۰۹۔ جوہر، مولانا محمد علی، امپیریلزم کی روح، محولہ بالا، ص ۱۵۵۔۱۵۶

۱۱۰۔ کاشمیری، شورش، ''نوجوانوں سے خطاب''، مشمولہ: 'نوائے آزادی'، محولہ بالا، ص: ۳۶۰

عثمانی خلافت: برعظیم میں سیاسی ہل چل، طرابلس اور بلقان کی جنگیں، جنگ عظیم اوّل

۱۹۱۹ء تا ۱۹۲۴ء کے درمیان شروع ہونے والی ''خلافت تحریک'' کی اب تک سب سے منفرد بات یہ ہے کہ اسے اسلامی نظریہ سازوں، ہندوستانی قوم پرستوں، کمیونسٹوں اور ان کے ساتھ ساتھ مغربی دانش وروں نے ہم آواز ہو کر اس طرح بڑھا چڑھا کر پیش کیا اور اسے ہندوستانی مسلمانوں کی سامراج مخالف نو آبادیات مخالف تحریک سے تعبیر کرتے ہوئے جو تصویر ہمارے سامنے پیش کی گئی اس نے اس تحریک کی حقیقت کو اب تک نظروں سے اوجھل کر رکھا ہے۔ ظاہر سی بات ہے کہ بعض زخم ایسے ہوتے ہیں جو دکھائی نہیں دیتے لیکن نظر آنے والوں زخموں سے زیادہ مہلک ہوتے ہیں۔ سلطنت عثمانیہ کی تباہی کسی فوری حادثے یا اچانک الم ناک آفت کے سبب نہ تھی لیکن یہ ایک ایسا سانحہ تھا جس نے ملت اسلامیہ کی تاریخ کے ساتھ ساتھ جغرافیہ کو بھی بدل کر رکھ دیا۔ اسی لیے خلافت عثمانیہ کی تباہی کو اسلامی تاریخ کا ایک خوں چکاں واقعہ سمجھتے ہوئے اس کی وجوہات اور مضمرات کا تفصیلی جائزہ لینا مفید ہو گا۔ اس تباہی میں مسلمانوں کا بہت جانی نقصان ہوا لیکن حقیقی ملی نقصان جانی نقصان سے بڑھ کر تھا۔ یہ وہ نقصان تھا جس نے اسلام میں پہلی بار ''مرکزیت'' کا خاتمہ کر دیا تھا۔ اسی مرکزیت کے فقدان کا نتیجہ ہے کہ آج ''مسلمان ممالک'' تو بے شمار ہیں لیکن بحیثیت ''قوم مسلمانوں کا وجود کہیں دکھائی نہیں دیتا۔ یہی وہ مقصد تھا جو مغرب حاصل کرنا چاہتا تھا جس میں بڑی حد تک کامیاب بھی رہا۔ اس کامیابی کی بڑی مثال خود ترکی ہے جہاں خلافت کے تصور کو ہی فرسودہ اور از کار رفتہ سمجھ کر اسے ترک کر دیا گیا''[۱]۔ اس پر طرح یہ کہ بیسویں صدی کی ابتدا اقوام عالم میں سیاسی و سماجی تغیرات کا سیل عظیم لے کر آئی۔ برصغیر کے لیے اس صدی کا سب سے بڑا تحفہ ہندو مسلم مغائرت میں اضافے کی صورت میں سامنے آیا جس کے آثار ۱۸۶۷ء میں ہندی اردو تنازعے اور پھر ۱۸۹۳ء میں بمبئی، اعظم گڑھ، رنگون اور بریلی وغیرہ کے فسادات کی صورت میں ظاہر ہوئے۔ تقسیم بنگال اور پھر تنسیخ بنگال وغیرہ جیسے معاملات نے اس میں مزید شدت پیدا کی جس کا ذکر مذکورہ عنوانات کے تحت کیا جا چکا ہے۔ ہندو ذہنیت کے پیشِ نظر اب مسلمان سیاسی طور پر اپنی قومی شیرازہ بندی کرنا چاہتے تھے اور اس مقصد کے لیے ۱۹۰۶ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کا قیام عمل میں آ چکا تھا جس نے جداگانہ انتخابات کے طریقہ کار پر زور دیا جس سے برصغیر کی سیاست واضح طور پر دو قومی نظریے کی جہت پر تشکیل پانے لگی تھی[۲]۔ اب اس صورت حال میں خلافت کے معاملے میں مسلم ہندو اتحاد یا مشترکہ کوششیں سمجھ سے بالاتر تھیں۔ جنگ عظیم اوّل نہ صرف اقوامِ عالم کے لیے بلکہ ملت اسلامیہ کے لیے بھی ایک لمحہ فکریہ ثابت ہوئی ''گزشتہ شاہانہ اسلامی شان و شوکت کی واحد یادگار ترکی''[۳]، جرمنی، آسٹریا، ہنگری اور بلغاریا کا حلیف بن کر ان اتحادی قوتوں کے مدمقابل میدان کارزار میں بے محابا کود پڑا جو برطانیہ، فرانس، بیلجیم، یونان، سربیا، اٹلی، روس اور رومانیہ جیسی سلطنتوں پر مشتمل تھیں[۴]۔ عالمی جنگ کا پانسا اتحادیوں کے حق میں پلٹ گیا اور شکست و ریخت ترکوں کا مقدر بنی۔ بے شمار علاقے ترکوں کے ہاتھوں سے نکل کر حریفوں کی تنگ دامانی کو وسعت دینے لگے حتیٰ کہ اماکنِ مقدسہ بھی اس کی تحویل سے نکل کر حکومت

برطانیہ کے زیر اختیار آ گئے[۵]۔ جنوبی ایشیا میں تحریک خلافت کے اثرات اور اس کے مقبول ہونے کے عوامل کا جائزہ لینے سے قبل ضروری ہے کہ سلطنت عثمانیہ کے پس منظر کا مختصراً جائزہ لیا جائے تا کہ اس ساری صورت حال کا درست طور پر تجزیہ کیا جا سکے۔

مسلمانانِ برصغیر اور سلاطین عثمانیہ کے مابین وسط ایشیائی ریاستوں کے حوالے سے قدیم تعلق رہا ہے۔ مغل اور عثمانی بادشاہ ترک قوم کے فرد تھے اور ان کے درمیان رقابت اور چشمک کی طویل داستانیں تاریخ کے صفحات پر رقم ہیں۔ برصغیر کے مغل بادشاہوں نے عثمانی سلاطین کی برتری اور خلافت کو کبھی تسلیم نہیں کیا بلکہ مغل اپنی حدود سلطنت میں خود کو خلیفہ کہتے تھے۔ برلاس ترک تیمور نے، جو بابر کا جد امجد تھا، اناطولیہ کے عثمانی بادشاہ بایزید کو شکست دے کر اس ملک کو تسخیر کیا تھا۔ اسی بنیاد پر برلاس مغل شہنشاہ اپنے آپ کو ترک عثمانیوں سے برتر سمجھتے تھے۔ بعد میں مغلوں اور عثمانیوں کی رقابت کا یہ عالم ہوا کہ بابر نے اپنے لیے سلطان کا لقب ترک کر کے بادشاہ کا لفظ استعمال کیا اور اپنے امرا کو ''خان'' کا لقب دیا۔ بابر نے تو ایران کے شاہ صفوی کو تسخیر ترکستان کی ترغیب بھی دی تھی لیکن جلدران کے مقام پر شاہ صفوی کی زبردست شکست کے بعد ترکستان پر حکومت کرنے کی امید چھوڑ کر ہندوستان کا رخ کیا۔

ان تعلقات میں وقتاً فوقتاً نشیب و فراز آتے رہے۔ اپنی جلاوطنی کے دوران ہمایوں نے شاہ طہماسپ کے سلوک سے دل برداشتہ ہو کر سلیمان ''عالی شان'' سے مدد مانگی۔ بیرم خان نے سلطان سلیمان کی شان میں ایک قصیدہ بھی لکھا۔ اس کے علاوہ ہمایوں کے دور میں گجرات کے حکمران بہادر شاہ نے بھی پرتگیزیوں کے خلاف عثمانی بحریہ کی مدد طلب کی اور تین بحری مہمات ہندوستان آئیں۔ تیسری مہم کی قیادت امیر البحر سیدی علی رئیس کے ہاتھوں میں تھی جس کو بوجوہ اپنا جہاز چھوڑ کر خشکی کے راستے بہ راستہ سندھ واپس لوٹنا پڑا۔ علی رئیس نے اپنے سفر نامے ''مراۃ المالک'' میں لکھا کہ واپسی کے مشورے پر بیرم خان نے ہمایوں کے انتقال کی خبر کو اکبر کی تخت نشینی تک پوشیدہ رکھا[۶]۔ اکبر نے بھی عثمانیوں کی خلافت کو تسلیم نہ کیا۔ ازبک اور عثمانی اتحاد کے خلاف اکبر نے ایران کے ساتھ معاہدہ کیا۔ اس سے قبل ایران کی بڑھتی ہوئی قوت کو روکنے کے لیے شیر شاہ سوری نے سلطنت عثمانیہ کے ساتھ فوجی معاہدہ کرنے کی کوشش کی۔ جہانگیر کے سلطنت عثمانیہ سے تعلقات اچھے نہ تھے البتہ شاہ جہان اور عثمانی سلطنت مراد کے مابین خوش گوار تعلقات تھے۔ متعدد سفارتوں کے تبادلے کے علاوہ شاہ جہان نے تاج محل کی تعمیر کے لیے وہاں سے ترک معمار اور انجینئر بلوائے۔

ٹیپو سلطان نے بھی انگریزوں کے خلاف سلطنت عثمانیہ سے مدد مانگی مگر یہ کوششیں بھی بار آور ثابت نہ ہو سکیں کیوں کہ اس وقت سلطنت عثمانیہ اور برطانیہ، فرانس کے خلاف متحد تھے[۷]۔ اس جائزے سے ایک بات جو سامنے آتی ہے وہ یہ کہ سلطنت مغلیہ (۱۵۲۶ء سے ۱۸۵۷ء) اور مغرب کے ترکوں یعنی عثمانیوں کی قائم کردہ سلطنت عروج و زوال کے تقریباً ایک ہی ادوار سے گزریں[۸] یعنی سلطنت عثمانیہ سلیمان اوّل (۱۵۲۰ء۔ ۱۵۶۴ء) کے زمانے میں نقطۂ عروج پر پہنچی جب کہ جنوبی ایشیا میں

مغلیہ شہنشاہ اکبر کا دور (۱۵۵۶ء۔ ۱۶۰۵ء) اپنی طاقت اور عظمت کے عروج کا زمانہ تصور کیا جاتا ہے اور جس طرح ۱۷۱۸ء میں پاساروف چا میں فوجی شکست کے بعد عثمانیوں کا زوال شروع ہوا، اسی طرح ۱۷۰۷ء میں شہنشاہ اورنگ زیب عالم گیر کی وفات کے بعد جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کے اقتدار کا سورج گہنانا شروع ہوا[۹]۔ اٹھارھویں صدی میں سلطنت عثمانیہ کا زوال شروع ہو چکا تھا اور وہ متعدد معرکوں میں یورپی طاقتوں سے شکست کھا چکی تھی۔ یعنی وہ عظیم سلطنت جو چھے سو تئیس (۶۲۳) برس قائم رہی اور سولھویں صدی کے وسط تک جسے دنیا کی سب سے عظیم سلطنت قرار دیا گیا تھا، جو اس وقت تین براعظموں افریقا، ایشیا اور یورپ اور تین سمندروں بحر اسود، بحر قلزم اور بحر ہند تک پھیلی ہوئی تھی جس نے ہنگری کو اپنے زیر نگیں کر رکھا تھا اور آسٹریا کے پایۂ تخت ویانا کی دیواروں تک جن کی فوجیں پہنچ چکی تھیں[۱۰]۔ اس کی عظمت و شوکت کے نشان مٹنا شروع ہو چکے تھے۔ ۱۲۹۹ء میں اناطولیہ کی شمال مغربی چوکی ''اوچ'' میں عثمانی سلطنت کی بنیاد ڈالنے والے عثمان خان کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ ہو گی کہ ایک دن یہ سلطنت دنیا کی عظیم سلطنتوں میں شمار کی جائے گی۔ ۱۳۵۴ء کو بھی عثمانی ترکوں کی تاریخ میں اہم ترین سال قرار دیا جا سکتا ہے، جب وہ درِ دانیال (Dardanelles) کو عبور کر کے اپنے اقتدار کو یورپی علاقوں تک بڑھانے میں کامیاب ہوئے۔ اس اثنا میں تیمور کے ہاتھوں بایزید کی انقرہ میں شکست نے کچھ عرصے کے لیے عثمانیوں کی فتوحات کو متاثر ضرور کیا اور ملک گیارہ برس تک خانہ جنگی کا شکار رہا۔ بایزید کے بیٹے عیسیٰ، محمد، سلیمان اور موسیٰ تاج و تخت کے لیے آپس میں لڑتے رہے اور بالآخر محمد نے موسیٰ پر فتح پائی۔ امن و امان بحال ہوا اور پھر سے سلطنت کی حدود پھیلنے لگی۔ ۱۴۵۳ء میں ترکوں نے قسطنطنیہ پر قبضہ کر کے بازنطینی سلطنت کو عملاً ختم کر دیا۔ ۱۴۷۳ء میں ایشیائے کوچک پوری طرح ترکوں کے قبضے میں آ گیا[۱۱]۔ اتنی بڑی سلطنت اور ریاست کی قوت اس نظم و نسق میں مضمر تھی جو ترکوں نے دو سو سال میں تیار کی تھی۔ اس نظام میں سلطان کو سب پر فوقیت حاصل تھی اور اس کے اختیارات پر صرف شریعت کی حد رکاوٹ تھی۔ حکومت کا تمام کاروبار سلطان کے ہاتھوں میں تھا۔ چناں چہ حکومت کی عمدگی، سلطان کی قابلیت، شخصیت اور کردار پر منحصر تھی۔ سلطان کے لڑکے ایام شہزادگی میں صوبائی نظم و نسق اور فوجی مہمات کا تجربہ حاصل کرتے تھے تاکہ فرائض کی بجا آوری سے واقفیت پیدا کر سکیں۔ فوجی افسران سلطان کے ساتھ مل کر ''ادارۂ حکومت'' چلاتے اور اس کے متوازی ''ادارۂ اسلامیہ'' تھا جس کے سربراہ ''شیخ الاسلام'' ہوتے۔ یہ ادارہ علما مدرّسین اور قاضی مہیا کرتا تھا۔ سلطنت کی سب سے بڑی انتظامی مجلس دیوان (یعنی سلطان کی مجلس شوریٰ) تھی۔ پندرویں صدی تک سلطان خود ''دیوان'' کی صدارت کرتا تھا لیکن سلطان سلیمان کے دور میں یہ روایت ختم ہوئی۔ وہ جالی کے پیچھے بیٹھا ان کی کارروائیوں کو دیکھتا۔ بعد کے سلاطین نے یہ روش بھی ترک کر دی اس طرح سلطنت کا سارا کام صدر اعظم کے سپرد ہو گیا اور اسے تمام ملکی، فوجی اور عدالتی اختیار حاصل ہو گئے۔ سلطنت عثمانیہ اپنے ارتقا کے بہت سے مدارج سے گزری لیکن مذکورہ بنیادی نظام میں انیسویں صدی تک

کوئی ردو بدل نہیں ہوا۔ سلطنت کے پھیلاؤ کی وجہ سے اس نظام میں کچھ ضروری تبدیلیوں کی ضرورت تھی جو نہیں کی گئی۔ لہٰذا نظم و نسق میں انحطاط، ابتری اور بد نظمی کے آثار ظاہر ہونا شروع ہو گئے[۴۲]۔

یہ ظاہر نظر نہ آنے والا زوال ۱۶۸۳ء میں ویانا(Vienna) پر دوسری فوج کشی میں ناکامی کے بعد ظاہر ہونا شروع ہوا[۴۳]۔ اس کے بعد ۱۶۹۹ء کے ''صلح کارلوٹز'' (Treaty of Carlowitz) سے ترک عثمانیوں کو مزید ہزیمت کا سامنا کرنا پڑا[۴۴]۔ آنے والے چند برسوں میں یورپ کے کئی اہم علاقے جن میں پولینڈ، ہنگری اور ٹرانسلوانیاTransylvania وغیرہ ترکوں کے ہاتھوں سے نکل گئے[۴۵]۔ سلطنت عثمانیہ کے زوال اور انحطاط میں ۱۷۷۴ء بہت اہمیت کا حامل ہے۔ اس سال روس نے افواج عثمانیہ کو شکست دے کر ''عہد نامہ کوچک کینرجی'' پر مجبور کر دیا۔ اس معاہدے کی رو سے روس کو سلطنت عثمانیہ کے عیسائی باشندوں کے حقوق کے تحفظ کے بہانے اندرونی مداخلت کا موقع مل گیا۔ زوال اور انحطاط کے یہ آثار عثمانی مدبرین اور حکام کو اٹھارویں صدی کے اواخر تک نظر نہیں آئے اور وہ سلطنت عثمانیہ کی کمزوری کے اسباب کو نہ سمجھ سکے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ یورپ کی بڑھتی ہوئی طاقت کا درست تجزیہ بھی نہ کر سکے[۴۶]۔ حالاں کہ اس وقت یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہو چکی تھی کہ سلطنت عثمانیہ نے اپنی فوج اور نظم و نسق کو جلد درست نہ کیا اور اصلاحات کی طرف توجہ نہ دی تو وہ وقت دور نہیں جب اس سلطنت کا چراغ گل ہو جائے گا۔ ظاہر سی بات ہے یہ ساری خرابیاں ایک دن میں پیدا نہیں ہوئیں تھیں بلکہ تسلسل کے ساتھ ان خرابیوں کی جڑیں برس ہا برس سے سلطنت کی جڑوں کو کھوکھلا کر رہی تھیں۔ ۱۶۰۰ء میں ''قفس'' کے نظام کے رائج ہونے، تخت کے وارثوں کو شاہی محلات میں نظر بند رکھنے اور انھیں عیش پسند بنانے کے علاوہ درباری سازشوں نے بھی اس انحطاط میں اہم کردار ادا کیا۔ اس نظام کو رائج کرانے کا سہرا بھی سلیمان اعظم کی روسی ملکہ خرم سلطان کے سر ہے جو ولی عہد کے بجائے اپنے عیش پسند لڑکے کو سلطان بنانے کی سازش میں ملوث تھی۔ نتیجتاً سلیمان نے اپنی ملکہ کی باتوں میں آکر اپنے ہی ولی عہد مصطفیٰ کو قتل کروا دیا۔ سترویں صدی کا یہی زمانہ ہے جب نااہل اور جابر سلطانوں کا دور شروع ہوتا ہے۔ اس زمانے کے سلاطین درباری سازشوں میں الجھے اور اپنی محبوباؤں کے اشاروں پر ناچتے دکھائی دیتے ہیں۔ چناں چہ حرم کی عورتوں نے عملی سیاست اور امورِ سلطنت میں دخل اندازی شروع کر دی۔ ان حالات کا اثر ناظمین حکومت پر بھی پڑا لہٰذا نظم و نسق میں رشوت خوری اور اقربا پروری نے خوب فروغ پایا۔ قابلیت اور صلاحیت بے معنی لفظ اور بخشش عام ہوئی۔ وقتاً فوقتاً فوجی شورشیں بھی بپا ہونے لگیں۔ بہت کم حکمران اس دور میں طبعی موت مرے، معزولی عام بات ہو کر رہ گئی۔ اس کا لازمی اثر یہ ہوا کہ ''ادارۂ حکومت'' بھی نااہل اور بد دیانت لوگوں کے ہاتھوں میں جاتا رہا یہاں تک کہ ''ادارۂ اسلامیہ'' بھی انحطاط سے محفوظ نہ رہ سکے۔ ''ادارۂ اسلامیہ'' کی غیر جانب دار حیثیت ختم ہو گئی اور وہ فوج اور سیاست کے لیے محض شطرنج کا مہرہ بن کر رہ گئی۔ اقتصادی طور پر بھی ترک مسلمان کمزور سے کمزور تر ہوتے چلے گئے۔ صنعت

و تجارت غیر مسلموں کے ہاتھوں میں چلی گئی۔ ظاہر سی بات ہے جب کاروانوں کی جگہ سمندری راستوں نے لے لی اور ان پر یورپی اقتدار قائم ہو گیا تو اس کا لازمی فائدہ غیر مسلموں کو پہنچا۔

مسلم نوجوان صدیوں کی جنگی مہمات کا ایندھن بنے رہے۔ خصوصاً انیسویں صدی میں کامیابیاں کم اور جانی نقصان بہت اٹھانے پڑے۔ عیسائی باشندے چوں کہ فوجی ملازمت سے مستثنیٰ تھے لہٰذا خوش حالی کے ساتھ ساتھ ان کی آبادی میں بھی اضافہ ہو تا رہا جب کہ مسلمان قربان گاہ کی بھینٹ چڑھتا رہا۔ ان کی آبادی کم ہوتی رہی۔ گاؤں اور کھیت اجڑ گئے۔ وہ تعلیم سے بے بہرہ ہونے کے ساتھ ساتھ اقتصادی طور پر بھی زوال کا شکار ہوتے رہے۔ ہر شکست کے بعد مخالف حکمرانوں کو جو "مراعاتِ خصوصی" دینے کا طریقہ مستعمل تھا، اس نے بھی اس معاشی انحطاط میں اہم کردار ادا کیا[۱۷]۔ اٹھارویں صدی کے اواخر اور انیسویں صدی میں عثمانی مدبرین کے لیے سب سے بڑا مسئلہ سلطنت کی سالمیت کا برقرار رکھنا تھا۔ چناں چہ سلطنت کو استحکام دینے کی غرض سے انھوں نے اصلاحات کی جانب توجہ دی تاکہ یورپی تہذیب کے بڑھتے ہوئے اثر و نفوذ کو روکا جاسکے۔ یوں تو سلطان محمود دوم (۱۸۰۸ء۔۱۸۳۹ء) کے زمانے میں بھی مختلف قسم کی اصلاحات کے ذریعے سلطنت عثمانیہ کے عیسائیوں کے اثر و رسوخ کو ختم کرنے کی کوششیں کی گئیں لیکن معاشی مسائل اور محمد علی کی بغاوت کے باعث مطلوبہ نتائج حاصل نہ کیے جاسکے۔ ۱۸۷۷۔۷۸ء میں ایک اور دھچکا اس وقت پہنچا جب عثمانی فوج ایک بار پھر روس کے خلاف جنگ ہار گئی۔ انیسویں صدی میں مغربی خیالات کے اثر سے عثمانی تہذیب و تمدن اور نظامت حکومت میں واضح تبدیلی کے اشارے ملتے ہیں۔ عبدالحمید اوّل (۱۸۳۹ء۔ ۱۸۶۱ء) کے دور میں رشید پاشا کی قیادت میں ترکی کی ایک مصلح جماعت نے جن میں سرکاری وزرا، فواد پاشا، عالی پاشا اور مدحت پاشا وغیرہ جیسے لوگ شامل تھے۔ سلطنت عثمانیہ کو نئے خطوط پر چلانے اور اصلاحات متعارف کرانے کا بیڑہ اٹھایا۔ چناں چہ تعلیم، انصاف، انتظامیہ، اقلیتوں اور فوجی امور میں مختلف طرح کی اصلاحات کی گئیں۔ یہ عہد ترکی میں "عہد تنظیمات" کے نام سے مشہور ہے۔ دورِ تنظیمات کا آغاز ۱۸۳۹ء سے ہوا اور ۱۴ فروری ۱۸۷۸ء کو مدحت پاشا کی برطرفی اور ترکی پارلیمنٹ تحلیل کیے جانے سے ختم ہو گیا۔

اصلاحات کے اس دوسرے دور میں یورپ اور ترکی کے قریبی تعلقات قائم ہوئے۔ ویانا، پیرس اور لندن وغیرہ میں ترکی کے اوّلین سفارت خانے قائم ہوئے، مغربی طرز کے سیکولر مدرسے قائم کئے گئے جن میں اسلام کی دینی حیثیت کو پہلی بار نظر انداز کیا گیا۔ اخبار اور رسالے جاری ہوئے۔ سلطان عبدالعزیز کے بعد جب سلطان عبدالحمید ثانی برسر اقتدار آئے تو اصلاحات کی ان پالیسیوں کے خلاف ان کے اور مدحت پاشا کے درمیان اختلافات پیدا ہوئے۔ نتیجتاً مدحت پاشا برطرف کیے گئے اور پارلیمان کو بھی کالعدم قرار دے دیا گیا[۱۸]۔ اس سلسلے میں یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ مذہبی و ملی مساوات اور اصلاحات کی راہ میں رجعت پسند مسلمانوں سے زیادہ خود عیسائیوں نے رکاوٹ ڈالیں۔ وہ سلطنت کے کھنڈرات پر آزاد عیسائی ریاستوں کے قیام کا

خواب دیکھ رہے تھے۔ ان مقاصد کی تکمیل کے لیے روس، فرانس اور برطانیہ نے سلطنت عثمانیہ کے حصے بخرے کرنے اور مشرق وسطیٰ میں اپنے سیاسی ارادوں کی تکمیل کی خاطر ان عیسائیوں کو خوب اکسایا اور خوب مدد کی۔ اس وقت تک انقلاب فرانس کے نتیجے میں جمہوریت اور قومیت جیسے سیاسی نظریات کو بھی فروغ حاصل ہو چکا تھا۔ خصوصاً قومیت کا تصور غیر ترک اقوام میں بے حد مقبول ہو چکا تھا۔ جب کہ ترک مدبرین اور سیاست دان جمہوریت کو رائج کرنے کی کوششوں میں مصروف تھے۔ یورپی طاقتوں نے مذہب اور قومیت کے نام پر بلقان کی غیر مسلم ریاستوں اور سلطنت کی عیسائی ملت کو اکسانا شروع کیا اور عثمانی ریاست کو بدنام کرنے کی زبردست پروپیگنڈا مہم چلائی۔ یونان، سربیا اور رومانیہ کی آزاد ریاستوں کے قیام کے بعد سلطنت عثمانیہ پہلے ہی سمٹ کر تھریس تک محدود ہو چکی تھی۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ ترک اس وقت تک قوم پرستی کے جذبے سے سرشار نہیں دکھائی دیتے اور اسی قومی شعور کے فقدان نے ان کو اپنی گھٹتی ہوئی طاقت کا احساس نہ ہونے دیا۔ البتہ بعد میں احمد رفیق پاشا اور سلیمان پاشا وغیرہ نے اپنے ہم وطنوں کو نسلی اور لسانی تاریخ سے روشناس کرا کے ان کے اندر قومی شعور کے جذبات پیدا کرنے میں اہم کردار ادا کیا[۱۹]۔

۱۸۶۰ء کی دہائی تک سلطنت عثمانیہ کی حکومت پر اعلانیہ تنقید کی شہادتیں ملتی ہیں۔ اصلاحات اور یورپی اثرات کے نتیجے میں سلطنت کے متوازی نوجوانوں کا ایسا طبقہ پیدا ہو چکا تھا جو حکومت کے بین الاقوامی اور اندرونی معاملات سے غیر مطمئن تھا۔ نوجوان ترکوں کی یہ انجمن ۱۸۶۰ء میں خفیہ طور پر قائم ہوئی تھی۔ انجمن اتحاد و ترقی، نوجوان عثمانی اور دیگر ناموں سے یہ عناصر ترکی میں یورپ کی شاطرانہ سیاست کا مہرہ بنے ہوئے تھے۔ ان ہی لوگوں کی کوششوں سے سلطان عبدالعزیز کو معزول کر کے سلطان مراد پنجم کو تخت پر بٹھایا گیا۔ ترکی کے ان نوجوانوں (Young Turks) سے ان کے گہرے مراسم تھے دوسری جانب سلطان مراد کے یورپ کے سرکاری اور حکومتی حلقوں سے روابط کی داستان اب پوشیدہ نہیں رہی۔ انگلینڈ کے ولی عہد سے بھی ان کے دیرینہ تعلقات تھے۔ اسی واسطے سے سلطان مراد نے فری میسن سے اپنا تعلق قائم کیا۔ ترکوں کی جدید فکر پر فری میسن کے اثرات بھی اب کھل کر سامنے آ چکے ہیں۔

مشہور ترک مصنف ابوالضیاء توفیق کے مطابق مذکورہ ''تنظیمات'' کے بیش تر رہنما فری میسن لاج سے تعلق رکھتے تھے۔ ترکی میں پہلا فری میسن لاج ۱۸۵۷ء میں برطانوی سفیر نے اور دوسرا لاج فرانسیسی سفیر نے اگلے سال استنبول میں قائم کیا۔ رشید پاشا، فواد پاشا، علی پاشا، مصطفیٰ فاضل پاشا اور منیف پاشا ان فری میسن لاجوں کے اوّلین ارکان میں سے تھے[۲۰]۔ ان نوجوانوں کو کامل یقین تھا کہ سلطان مراد کے دور میں ترکی میں یورپ کا عمل دخل ضرور بڑھے گا جس کے وہ خواہاں تھے۔ سلطان مراد کے جنون اور محض ۹۳ دن کے اقتدار کے بعد معزولی سے ان نوجوانوں کا یہ خواب فوری طور پر پایۂ تکمیل تک نہ پہنچ سکا۔ اور سلطان عبدالحمید ثانی کے خلیفہ بن جانے کے بعد تو معاملہ مزید ابتری کا شکار ہو گیا۔ نوجوان ترکوں کی سازشوں نے سلطان عبدالحمید کو اپنا

راستہ الگ کرنے پر مجبور کر دیا۔ اس دور میں بھی دو بڑی جنگیں ہوئیں۔ پہلی روس کے خلاف ۱۸۷۷ء۔۱۸۸۸ء اور دوسری یونان کے خلاف ۱۸ اپریل ۱۸۹۷ء۔ ۵ جون ۱۸۹۷ء۔ آخر میں مقدونیہ کی وہ لاینحل پے چیدگی پیدا ہوئی جس نے مختلف النسل اقوام کو اس میں بری طرح الجھا دیا۔ یورپ کی بڑی طاقتوں کی مداخلت سے نوجوان ترکوں کی بغاوت جلد ہی کامیابی سے ہم کنار ہوئی۔ ۱۹۰۸ء میں حکومت کا تختہ الٹ دیا گیا اور نوجوان ترکوں نے اقتدار سنبھال لیا۔ انھوں نے سلطان عبدالحمید کو آئین کی بحالی اور حکومت سے دست بردار ہونے پر بھی مجبور کیا۔ ۲۸ اپریل ۱۹۰۹ء کو سلطان عبدالحمید کی معزولی کا اعلان ہوا اور ان کے بھائی محمد رشاد خاں، محمد خامس کے لقب سے سلطان بنائے گئے۔ یاد رہے ان تمام اقدامات کے پس پشت انور پاشا کی شخصیت کار فرما تھی[۲۱]۔ تاریخی حقائق یہ بھی ثابت کرتے ہیں کہ نوجوان ترکوں کی مدد یورپ نے ترک حکومت کو استحکام دینے کی غرض سے نہیں کی تھی بلکہ یہ سازش محض اس خطے میں عدم استحکام کی صورت حال پیدا کرنے کی غرض سے کی گئی تھی اور بہ قول ایک انگریز مورخ نوجوان ترکوں کو اس اقتدار کے بعد بیس برس کے امن کی ضرورت تھی لیکن بدلے میں ان کو بیس سال کی جنگ ملی[۲۲]۔

ان نوجوان ترک انقلابیوں نے جدید ترکی کی بنیاد ڈالنے کے لیے جو کوششیں اور جدوجہد کیں اور شعر و ادب کے ذریعے جن اہم ترک ادیبوں نے اس تحریک کے لیے عملی کوشش کی اس کی تفصیل متعدد کتب میں موجود ہے[۲۳]۔ اس دوران کئی ایسے مواقع بھی آئے جب یہ نوجوان ترک شدید مایوسی اور ناامیدی کے تاریک دور سے بھی گزرے۔ نامق کمال نے اپنے انتقال سے کچھ عرصے قبل اس کیفیت کو بیان کرتے ہوئے کہا کہ:

مادرِ وطن کی آہ و فغاں کو سنو   سنو نفس نفس میں ان کی پکار کو سنو

ہمارا ملک مٹ چکا ہے۔ پر جب تک ہم تم زندہ ہیں وہ جاوید ہے۔ ہم دشمنوں کے نرغے میں ہیں،
میرے ہم وطنو، تم کو رب کی قسم، بہت ہو چکا، ہر خواہش اور ہر امنگ کو خیر باد کہہ دو[۲۴]۔

مذکورہ بالا صفحات میں ترک خلافت کے زوال اور انحطاط کی جو صورت حال مختصراً پیش کی گئی اس سے بخوبی اس بات کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ خلافت کا جو مفہوم امت مسلمہ کے نزدیک رائج ہے وہ خلافت خود ترکی میں بھی اپنی آخری سانسیں لے رہی ہے۔ جدید فکر کے نمائندے یہ ترک نوجوان خود نئی سرزمین میں اس نام نہاد خلافت سے جان چھڑانے کی تگ و دو میں نہ صرف مصروف ہیں بلکہ خاصے کامیاب بھی دکھائی دیتے ہیں۔ ایسے میں ہندوستان کی سرزمین پر ترک خلافت کے احیاء کی کوششیں اور جدوجہد محض دیوانے کے خواب کے سوا اور کچھ معلوم نہیں ہوتیں۔ لیکن حقیقت بہر حال یہی ہے کہ ہندوستان کے جذباتی مسلمانوں اور ان کے ہم خیال ہندوؤں نے اپنی بھرپور توانائی اس لاحاصل جستجو میں صرف کی۔ اس کی بہت سی وجوہات میں ایک سب سے بڑی وجہ یہ نظر آتی ہے کہ ہندوستان میں مغلیہ سلطنت کے زوال کے وقت مسلمان اپنے آپ کو سیاسی طور پر بہت تنہا محسوس کر رہے تھے۔ مذکورہ صفحات میں ذکر کیا جاچکا ہے کہ مغلیہ دور میں اس کے قیام سے لے کر طویل عرصے تک

مرکزی خلافت کا تصور برعظیم میں ترک کیا جاچکا تھا لیکن جیسے جیسے حکمران کمزور ہوتے چلے گئے ہندوستان کے بعض حکمرانوں کی نظریں ترک عثمانی خلفا کی طرف اٹھنے لگیں۔

ٹیپو سلطان کی بابت مزمل یاسین کا کہنا ہے کہ انگریزوں کے خلاف سلطنت عثمانیہ سے مانگی گئی مدد کا کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہ نکلا[۲۵] لیکن اس حقیقت کو ضرور ذہن میں رکھنا چاہیے کہ ٹیپو سلطان نے عثمانی خلفا سے درخواست کر کے اپنے آپ کو تسلیم کرالیا تھا[۲۶]۔ ٹیپو سلطان کا یہ عمل اس بنا پر بھی تھا کہ مغل دربار کے سلسلۂ مراتب میں اس کی کوئی گنجائش نہ تھی کیوں کہ نظام حیدر آباد کے ساتھ مخاصمت اس کی راہ میں مزاحم تھی۔ آخری مغل کے تخت سے اتر جانے کے بعد صورت حال یکسر تبدیل ہو گئی۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی ناکامی میں مسلمانانِ برصغیر کو احساس محرومی و لاچاری کے علاوہ ایک شدید نفسیاتی دھچکا بھی لگا۔ ہزیمت خوردہ مسلمانوں کا نفسیاتی اور جذباتی لگاؤ سلطنت عثمانیہ کی طرف فطری طور پر بڑھنے لگا۔ جمعے اور عیدین کی نمازوں میں جو خطبہ پڑھا جاتا تھا، اس میں مغلیہ سلاطین کی جگہ سلطان ترکی کا نام شامل کیا جانے لگا۔ اس کی کوئی تحریری شہادت تو موجود نہیں کہ اس کا آغاز کب اور کس طرح ہوا۔ مگر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس کا رواج بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں ہوا ہو گا۔ شروع میں محض چند مساجد میں شروع کی جانے والی یہ تحریک جوش و خروش کے ذریعے مختلف مقامات تک پھیل گئی۔ یہاں اس عجیب تضاد کو بھی ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ اس وقت جب کہ سلطان ترکی، برطانیہ کے بادشاہ اور ہندوستان کے شہنشاہ سے برسرپیکار تھا، برصغیر کی بہت سی مساجد میں اس کی فرماں روائی کا اعلان کیا جا رہا تھا۔ اس طرح ترکی کی قسمت برعظیم کے مسلمانوں کے لیے ایک مذہبی حیثیت اختیار کر گئی[۲۷]۔ اس دوران ہونے والے پے در پے عالمی واقعات نے بھی خلافت کی حمایت کو مزید مستحکم کیا۔ ان میں اہم ترین واقعہ جنگ طرابلس و بلقان تھا۔

جنگ طرابلس و بلقان:

سجاد حیدر یلدرم ۵ جون ۱۹۱۳ء کو محاربۂ بلقان کی بابت لکھتے ہیں کہ "اسلام کے لیے میں اس لڑائی کو پچھلے سو برس بلکہ اس سے بھی زیادہ زمانہ کی سب سے بڑی ہلاکت سمجھتا ہوں"[۲۸]۔ یوں تو اطالیہ اور ترکی کے درمیان آپس میں کوئی وجہ مخاصمت نظر نہیں آتی۔ طرابلس کی تمام آبادی مسلمانوں پر مشتمل تھی۔ عرب اور ترک نسل کے علاوہ تھوڑے سے اطالوی بھی تھے اور ان کو سلطنت عثمانیہ سے بہ ظاہر کوئی شکایت بھی نہ تھی۔ ۲ دسمبر ۱۹۱۰ء کو اٹلی کے وزیر خارجہ کے اس بیان کے باوجود کہ وہ ترکی کی سالمیت پر یقین رکھتے ہیں، بلا سبب ستمبر ۱۹۱۱ء کو اٹلی نے طرابلس پر قبضے کا اعلان کر دیا۔ تیونس پر فرانس کے قبضے کے بعد فرانسیسیوں نے اطالویوں کے اعتراضات کو دور کرنے کے لیے خفیہ طور پر اٹلی کو اس بات کی اجازت دے دی کہ وہ طرابلس پر اپنا اقتدار قائم کر لے۔ برطانیہ کی خاموش تائید بھی اٹلی کے شامل حال رہی۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ اس نے ترکوں کو بہ راستہ مصر طرابلس الغرب میں فوجیں بھیجنے سے روک دیا[۲۹]۔ ۱۹۰۴ء میں برطانوی اور فرانسیسی معاہدے کی رو سے مصر پر انگلستان کے قبضے

کو بلا شرکت غیرے تسلیم کر لیا گیا۔ دوسری جانب انگلستان نے مراکش پر فرانسیسی قبضے کی راہ ہموار کرنے کی مدد کا وعدہ کیا۔ سلطنت عثمانیہ کے خلاف حکومت برطانیہ کی سازش تو عرصۂ دراز سے جاری و ساری تھیں۔ ۱۹۰۹ء تک تو یورپ کی بعض حکومتوں نے سلطنت عثمانیہ پر قبضہ کرنے کے منصوبے بھی بنا ڈالے تھے۔ دراصل یورپ کے تمام اتحادیوں نے ترکوں کے خلاف جدید صلیبی جنگ کی ابتدا کر دی تھی۔ چناں چہ ۱۹۱۰ء میں اڈنبرا (اسکاٹ لینڈ) میں ایک کانفرنس منعقد ہوئی جس میں تمام دنیا کے مشنری انجمنوں نے شرکت کی۔ اس کانفرنس کا اوّلین مقصد تو یہ تھا کہ عیسائیت کی تبلیغ میں مسلمانوں اور اسلام نے جو رکاوٹیں کھڑی کی ہوئی ہیں کسی طرح سے ان رکاوٹوں کو دور کیا جائے۔ اس مقصد کے لیے ایک جانب تو اسلامی تاریخی روایات اور علوم کو توڑ مروڑ کر پیش کرنے کے لیے عربی اور دیگر زبانوں میں ایسے نقطۂ نظر کو پیش کیا جائے جس سے اسلام کی جڑیں کھوکھلی ہو جائیں [۳۰]۔ اور دوسری جانب اس کی طاقت کو ختم کرنے کے لیے انھیں حربی طور پر الجھا دیا جائے۔ اٹلی تو بہت طویل عرصے سے طرابلس پر قبضے کے خواب دیکھ رہا تھا۔ چناں چہ اس نے ۱۹۱۱ء میں اچانک طرابلس پر حملہ کر دیا۔ ان حملوں کے بعد بلقانی ریاستوں نے بھی اپنے ناپاک عزائم کی تکمیل کے لیے ایک دوسرے سے گفت و شنید شروع کی اور متحد و متفق ہو کر ترکی پر حملہ کرنے کی تیاریوں میں مصروف ہو گئے۔

مولانا جوہر نے اپنے انگریزی اخبار ''کامریڈ'' کے ۷ اکتوبر ۱۹۱۱ء کے شمارے میں اٹلی کے طرابلس پر حملے کی بابت ایک موثر اداریہ لکھا [۳۱]۔ مولانا جوہر نے جن خیالات کا اظہار کیا اس کا خلاصہ بیان کرتے ہوئے م کمال اوکے نے لکھا کہ یورپ، مسلمان ممالک کی ترقی پسند تحریکوں کو ختم کرنے کے لیے ان پر انتہا پسندی اور خود مختاری کے لیے جدوجہد کا الزام دھر دیتا ہے۔ بڑی طاقتیں کسی بھی مسلم ملک پر تسلط جمانے کا ارادہ کرنے کے بعد ہی یہ پروپیگنڈا شروع کر دیتی ہیں کہ اس ملک میں مذہبی رجعت پسندوں کا زور بڑھ رہا ہے۔ حالاں کہ ایک عیسائی ملک اٹلی نے نئے نئے علاقوں کو فتح کرنے کی ہوس پوری کرنے کے لیے ایک مسلمان ملک پر حملہ کر دیا ہے۔ اور یورپ کو جسے انصاف پسند اور حریت و آزادی کا محافظ ہونے کا دعویٰ ہے، سانپ سونگھ گیا ہے۔ وہ الگ ہٹ کر اپنی لگائی آگ کا تماشا دیکھ رہا ہے۔ اصل میں یورپ کے اتحادیوں نے ترکوں کے خلاف جدید صلیبی جنگ کا آغاز کر دیا ہے [۳۲]۔ ''لکھنؤ مسلم گزٹ'' نے بلنٹ کے حوالے سے لکھا کہ برطانیہ کی وزارت خارجہ کو اس بات کا علم ہوا کہ سابق وزیر ترکی سعید پاشا طرابلس کی بندرگاہ طبروق کو بحری اسٹیشن بنانے کے لیے جرمنی کو ٹھیکے پر دینے والے ہیں۔ غالباً یہ انکشاف نومبر ۱۹۱۲ء سے قبل ہو چکا تھا۔ سر ایڈورڈ گرے اس خبر سے پریشان ہوئے اور انھوں نے اس علاقے پر اٹلی کے قبضے کو جرمنی کے قبضے سے کم خطرناک سمجھا۔ لہٰذا برطانیہ نے اٹلی کو طرابلس پر حملہ کرنے کی اجازت دے دی۔ اس کے بعد لارڈ کچنر کو مصر بھیجا گیا تاکہ وہ اسے غیر جانب دار رکھنے کی کوشش کریں اور اس عمل کے ذریعے عساکر عثمانی کو خشکی کی جانب سے امداد سے بھی روکنا تھا [۳۳]۔ مولانا جوہر کے قلم سے نکلے ہوئے ان روح پرور الفاظ کی بازگشت جنوبی ایشیا کے مسلم اخبارات و رسائل میں سنائی دینے لگی۔

اسلامی جذبات بھڑکنے لگے۔ رفتہ رفتہ مغرب کے خلاف ایک طاقت ور فضا پیدا ہونے لگی۔ اس دوران یہ سوچ بھی پروان چڑھی کہ برطانیہ نے عموماً مسلمان ملکوں اور خصوصاً دولت عثمانیہ کی حمایت کی پالیسی کو بالکل خیر باد کہہ دیا ہے یہاں تک کہ وہ عیسائی ممالک کے اس خفیہ اتحاد کا حصہ بن گئی ہے جس کا واحد مقصد مسلمانوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے ترکی کی آزادی کو سلب کرنا اور مسلمانوں کو غلام بنانا ہے[۳۴]۔ ۱۹۱۱ء میں اٹلی نے جب طرابلس پر حملہ کیا تو عرب اور ترکوں نے متحد ہو کر اٹلی کا مقابلہ کیا۔ اٹلی کے اس عمل کے بعد برطانیہ اور دیگر یورپی ممالک کی حمایت کے نتیجے میں دنیائے اسلام میں یورپ کے خلاف نفرت کی لہر دوڑ گئی۔ آل انڈیا مسلم لیگ کی مرکزی اور صوبائی شاخوں نے اٹلی کی جارحانہ کارروائیوں کے خلاف برطانوی وزیر خارجہ کو مذمتی یاداشتیں بھی بھیجیں لیکن اطالوی اپنی جارحانہ کارروائیوں پر شرمندہ ہونے کے بجائے طرابلس پر اپنے قدم جمانے کو ''ہلال پر صلیب کی فتح'' قرار دے رہے تھے[۳۵]۔

ان کا یہ دعویٰ تھا کہ وہ طرابلس میں امن وامان بحال کریں گے، لیکن انھوں نے قبضے کے فوراً بعد مقامی لوگوں پر ظلم و ستم کا بازار گرم کر دیا۔ معصوم لوگوں کا قتل عام ہوا[۳۶]۔ برطانیہ نے نام نہاد غیر جانب داری کو برقرار رکھا۔ ابھی اس مصیبت سے چھٹکارا حاصل نہیں ہوا تھا کہ بلقانی ریاستوں نے بھی ترکی کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ ان تمام منصوبوں کے پیچھے کیوں کہ برطانوی ہاتھ پوشیدہ تھے لہٰذا ہندوستانی مسلمانوں کے دلوں میں حریت کی تحریک جڑ پکڑنے لگیں۔ ہندو عوام بھی یہ سوچ رہے تھے کہ اگر سامراجی قوتوں کا قبضہ مشرقی ممالک پر مضبوط تر ہوتا گیا تو ہندوستان کبھی غلامی کی زنجیروں سے چھٹکارا حاصل نہ کر پائے گا۔ اس زمانے میں پوری اسلامی دنیا یورپ کی ہوس گیری کے باعث تشویش اور پریشانی میں مبتلا تھی۔ انور بے کی قیادت میں ترک مقامی عربوں کی تنظیم کر کے بڑی بہادری کے ساتھ طرابلس کے دفاع میں مصروف تھے۔ مگر یورپی دنیا ترکی کے خلاف بہت سے محاذ ایک ساتھ کھولنے کی سازشوں میں مصروف تھی۔ ۱۹۱۲ء کے آغاز میں یونان کے وزیر اعظم موسبو دینی زیلوس کی سازشی چالوں سے ترکوں کے خلاف یونان، بلغاریا، سربیا کا اتحاد قائم ہوا۔ بعد ازاں اس اتحاد میں مانٹی نیگرو بھی شامل ہوا۔ سلطنت عثمانیہ کی مسیحی آبادیوں کی حفاظت کے بہانے سب نے ترکوں کو الٹی میٹم دے دیا[۳۷]۔ ترکی کے لیے بیک وقت دو محاذوں پر لڑائی مشکل تھی، لہٰذا اٹلی سے معاہدہ کر کے طرابلس سے اپنی فوجیں واپس بلالیں اور عارضی طور پر وہاں اٹلی کے قبضے کو تسلیم کر لیا۔ بدلے میں جزائر بحیرۂ ایجین سے اٹلی کی فوجیں ہٹانے کا وعدہ کیا گیا لیکن یہ وعدہ پورا نہ ہوا۔ ان حالات میں بلقان کی جنگوں کا آغاز ہوا۔ ان جنگوں میں مسلسل ترک فوجوں کو شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ ان شکستوں کی بنیادی وجہ ترک مقامی عیسائی افواج کا بزدلانہ عمل تھا جو دشمن کے خوف سے اکثر میدان جنگ سے راہ فرار اختیار کرتے تھے۔ مزید یہ کہ ترک فوج کی تنظیم بھی جدید خطوط پر نہیں کی گئی تھی۔ بہت سے ترک افسر اور عمال حکومت یورپ کی ان سازشوں کے حصے دار بھی تھے جو اندر ہی اندر اپنے ملک کو کھوکھلا کر رہے تھے۔ چناں چہ جنگ بلقان میں ترکوں کو شدید نقصان اٹھانا پڑا۔ اگر مفتوحہ علاقوں کی تقسیم کے معاملے میں

خود بلقانیوں کا آپس میں جھگڑا نہ ہوتا تو ترکوں کے لیے ایڈریا، نوبل، دیموٹیکا اور قرق کلیسا وغیرہ کے علاقوں کا دوبارہ حصول ممکن نہ ہوتا۔

مولانا محمد علی جوہر نے ایک بار پھر ان واقعات کے خلاف اپنے گہرے رنج و غم کا اظہار کیا۔ جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کی دلی خواہش یہ تھی کہ ان کے ترک بھائی امن و امان اور آزادی کے ساتھ رہیں۔ محمد علی جوہر نے ان خیالات کی ترجمانی مختلف اخبارات و رسائل میں لکھے گئے مضامین کے ذریعے کی۔ لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ جنگ طرابلس و بلقان کے موقع پر مسلمانانِ ہند نے ترکی کی حفاظت کو اپنا فرض سمجھتے ہوئے ہر طرح سے ترکی کی مدد کرنے کی کوشش کی۔ اس صورتِ حال پر تبصرہ کرتے ہوئے لندن کے اخبار ''ٹائمز'' نے لکھا کہ:

> ترکی اور اٹلی کی جنگ کی بنا پر نیز برطانیہ کی اس پالیسی کے نتیجے میں جس کے تحت روس کی مداخلت کو ایران میں جائز قرار دیا گیا۔ اب مسلمانانِ عالم میں ''بین اسلام ازم'' کا خیال از سر نو زندہ ہو رہا ہے اور یہ ایک خوف ناک خطرہ ہے[۳۸]۔

مولانا جوہر کے مطابق یورپ کے تمام اتحادیوں کا مقصد اسلام کے وقار کو ختم کرنا تھا۔ ان کے اخبار ''کامریڈ'' (The Comrade) نے بھی اس بات کا برملا اعلان کیا کہ بھلے ترکی کی سیاسی طاقت میں کمی واقع ہو جائے لیکن باوجود اس کے ترکی کے وقار میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔ ان حالات میں مسلمانوں کا خاموش بیٹھے رہنا ناممکن تھا۔ اسی اخبار نے مسلمانانِ ہند کو اس عمل کی طرف راغب کیا کہ مسلمانانِ ہند ترکی کے دفاع کے لیے فوجی مدد تو نہیں کر سکتے لیکن جنگ کے نقصانات کا ازالہ کرنے کی کوشش ضرور کر سکتے ہیں۔ چناں چہ بعد میں امدادی کمیٹی قائم کی گئی جس نے ترکی کے لیے چندہ جمع کرنا شروع کیا۔ جمع شدہ رقم کا بڑا حصہ طرابلس میں شہید ہونے والے ترک سپاہیوں کے اہل خانہ کے لیے مخصوص اتھا[۳۹]۔ مالی، طبّی اور اخلاقی مدد کے ذریعے اور مختلف اخبارات و رسائل میں ترکوں کی حمایت میں لکھے گئے سیکڑوں مضامین کے ذریعے ترکوں کی حمایت کے لیے آواز بلند کی گئیں اور ترکوں کو اس بات کا احساس دلایا گیا کہ وہ اس مشکل گھڑی میں ترکوں کے شانہ بشانہ ہر قسم کی قربانی کے لیے تیار ہیں۔ اس دور کا ادب ترکوں کے مسائل کی بہترین ترجمانی کرتا کھائی دیتا ہے۔ شعرا نے ان حالات کی ترجمانی کا بھرپور حق ادا کیا۔ ایسی بہت سی نظمیں لکھی گئیں جن میں انھوں نے ترک بھائیوں سے ہمدردی کا بھرپور اظہار کیا۔ فراہمیِ چندہ کے لیے شبلی نے ''شہر آشوب اسلام'' نامی نظم لکھ کر لکھنؤ کے عام جلسے میں پڑھی۔ خود بھی روئے اور دوسروں کو بھی رلایا۔ طرابلس اور بلقان کے موضوع پر لکھی گئی اس نظم نے اردو شاعری کی روایت کو ایک نئی زندگی فراہم کی[۴۰]۔ اس نظم کے متعلق بہت کچھ کہا گیا۔ چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

حکومت پر زوال آیا تو پھر نام و نشاں کب تک   چراغِ کشتۂ محفل سے اٹھے گا دھواں کب تک
مراکش جا چکا، فارس گیا، اب دیکھنا یہ ہے   کہ جیتا ہے یہ ٹرکی کا مریضِ سخت جاں کب تک

یہ سیلابِ بلا بلقان سے جو بڑھتا آتا ہے اسے روکے گا مظلوموں کے آہوں کا دھواں کب تک
کہاں تک لو گے ہم سے انتقام فتح ایوبی دکھاؤ گے ہمیں جنگِ صلیبی کا سماں کب تک
زوالِ دولتِ عثماں زوالِ شرع و ملت ہے عزیزو، فکرِ فرزند و عیالِ خانماں کب تک[۴۱]

شبلی نے واضح طور پر یہ مؤقف اختیار کیا کہ اگر ترکی لٹ گیا تو اسلام کا وجود بھی خطرے میں پڑ جائے گا۔ اس سے قبل مولانا الطاف حسین حالی کی شاعری بھی مسلمانوں کے احیاء کی تحریک کی آئینہ دار ہے۔ حالی کی مسدس میں جا بجا استعارات کے ذریعے مسلمانوں کی عظیم قوتوں، جن میں سلطنت عثمانیہ بھی شامل ہے، کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ ان کے ہاں مسلمانوں کی حالیہ پستی اور دگر گوں حالت پر زوال اور افسوس کا رنج بہت گہرا ہے۔ جیسے:

نہ وہ دور دورہ تھا عبرانیوں کا نہ یہ بخت و اقبال نصرانیوں کا
پراگندہ دفتر تھا یونانیوں کا پریشاں تھا شیرازہ ساسانیوں کا
جہاز اہلِ روما کا تھا ڈگ مگاتا
چراغ اہلِ ایراں کا تھا ٹم ٹماتا[۴۲]

حالی نے مسدس میں مسلمانوں کی عظمت رفتہ کی جانب اشارے کیے ہیں۔ پھر اس بات کا تذکرہ بھی ضروری سمجھا کہ روس اور دیگر یورپی طاقتوں نے ان علاقوں کو کس طرح مسلمانوں سے چھین لیا۔ انھوں نے مسدس کے آخر میں جو دعا مانگی وہ ملت اسلامیہ کی نشاط الثانیہ کی خواہش کے لیے رقت انگیزی، دل سوزی اور درد مندی کی تفسیر بن کر ہمارے سامنے آئی۔

اے خاصہِ خاصانِ رُسلؐ وقتِ دعا ہے امت پہ تری آ کے عجب وقت پڑا ہے
جس دین کے مدعو تھے کبھی قیصر و کسریٰ خود آج وہ مہمان سرائے فقرا ہے
وہ دین ہوئی بزمِ جہاں جس سے چراغاں اب اس کی مجالس میں نہ بتّی نہ دیا ہے[۴۳]

مولانا ظفر علی خاں نے جنگ بلقان کے موقعے پر ہندوستانی مسلمانوں کو ترکوں کی مدد کے لیے جس طرح تیار کیا اس سے متاثر ہو کر بھی حالی نے ایک نظم ”شکریہ مساعیِ جمیلہ ظفر علی خان“ اگست ۱۹۱۳ء کے ”زمین دار“ کے لیے بھیجا۔ اس نظم میں حالی کہتے ہیں:

بلقان و طرابلس میں ناگاہ اٹھا ستم و جفا کا طوفاں
ہمدردیِ اہلِ دیں نے آخر جوہر ترے کر دیے نمایاں
جمعیت و صبر کا سراسر دامن ہوا چاک تا گریباں[۴۴]

حالی نے جنگ بلقان کے واقعات پر شدید رنج و غم کا اظہار کیا۔ اس واقعے سے قبل بھی ترکی کے حالات و واقعات پر ان کی گہری نظر کے شواہد ملتے ہیں۔ ترکی کے سلطان عبد العزیز کے قتل کے بعد سرویا مانٹی نیگرو اور روس کے مقابلے میں ترکی نے جو جنگ کی اس کی بابت ایک قطعے میں کہتے ہیں کہ:

ہے اے فلک کہ چار طرف   چل رہی ہیں ہوائیں کچھ نا ساز
رنگ بدلا ہوا ہے عالم کا   ہیں دگرگوں زمانے کے انداز
ہوگا انجام دیکھیے کیا کچھ   ہے پُر آشوب جب کہ یہ آغاز
وقت نازک ہے اپنے بیڑے پر   موج حائل ہے اور ہوا ناساز[45]

خود شبلی کی نظر بھی ترکی کے حالات پر لگی ہوئی تھی۔ شبلی کی نظر میں دنیا کے تمام مسلم ممالک میں اگر کسی ملک کا وقار تھا تو صرف ترکی کا تھا۔ شبلی کی علی گڑھ سے علاحدگی کے جہاں اور بہت سے محرکات تھے وہاں ایک وجہ یہ بھی تھی کہ علی گڑھ کے ارباب ترکی کے معاملے میں انگریزی نقطۂ نظر کے حامل تھے۔ یہی وجہ ہے کہ شبلی اس گھٹی ہوئی فضا کو برداشت نہ کر سکے۔ وہ کھل کر خلیفہ عبدالحمید اور ان کے رفقاء کی حمایت اور مدح کرنا چاہتے تھے[46]۔ سلطان عبدالحمید سے انھیں گہری عقیدت تھی، اس کا اظہار انھوں نے ''تمہید قصیدہ مدح سلطان عبدالحمید'' میں کیا ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

پھر بہار آئی ہے شاداب ہیں پھر دشتِ چمن   بن گیا رشکِ گلستانِ ارم پھر گلشن
شعلہ زن پھر چمنستاں میں ہوئی آتشِ گل   پھر صبا چلتی ہے گلشن میں بچا کر دامن
آگ پانی میں لگا دی ہے کسی نے شاید   حسن میں عکس گلِ لالہ ہے یا جلوہ فگن[47]

۱۹۰۸ء میں جب ترکوں نے دستوری اصلاحات کا اعلان کیا اور اپنی بنیادوں کو مضبوط بنانے کی کوشش اور تدبیریں تیز کیں تو اس وقت بھی شبلی خاموش نہ رہے:

نالوں کو عندلیب کے میں نے دبا دیا   بھاری ہوں لاغری میں بھی تنہا ہزار پر[48]

بلقانی ریاستوں کی سیاسی امداد سے باز رہنے کے بارہا مطالبے کے باوجود حکومت برطانیہ کی جانب سے جو رویہ اختیار کیا گیا وہ مایوس کن تھا۔ اس صورتِ حال پر مولانا ظفر علی خان کو ایک خط کے ذریعے عید الاضحیٰ کی خوشیوں تک کو ترک کرنے کی تاکید کی۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

> میں نے خود فتویٰ لکھا ہے اس سے علمائے فرنگی محل بھی متفق ہیں اور مولوی عبد الباری صاحب کا خط بھی شائع ہو چکا ہے۔ بھائی! ترکوں کی امداد اس وقت فرض عین ہے اور قربانی کا درجہ واجب سے زیادہ نہیں، آپ کہتے ہیں کہ سنتِ ابراہیمی موقوف نہ ہو، وہاں وہی سنت مقصود ہے فرق یہ ہے کہ

آپ اس کو لیتے ہیں جا کا مینڈھے پر عمل ہو اور میں وہ پیش نظر رکھتا ہوں جو اسماعیل پر مقصود تھی۔
کیا ترکوں کی جان مینڈھے سے بھی کم ہے[۴۹]۔

اسی طرح ''جرائد اسلامیہ'' کے نام سے لکھے ہوئے خط میں بھی انھوں نے اپنے مذکورہ فتوے کا اعادہ کرتے ہوئے لکھا کہ:

ترکوں کی اعانت اس وقت فرض عین ہے۔ اس لیے خاص موقعے اور ضرورت کے وقت اگر یہ فرض مقدم رکھا گیا تو اس سے آئندہ کے لیے کیا حجت ہو سکتی ہے۔ قربانی شعائر اسلام ہے۔ مسلمانوں اس کو چھوڑ نہیں سکتے، نہ کوئی قوم اس کو مجبور کر سکتی ہے، نہ وہ اس کے مقابلے میں دنیا کی کسی قوم کی پرواہ کر سکتے ہیں[۵۰]۔

جنگ بلقان ہی کے دوران آغا خان نے جب تک ترکوں کو یہ مشورہ دیا کہ وہ سرزمین یورپ چھوڑ کر ایشیا چلے جائیں تا کہ ؟؟یورپ کے حملوں سے محفوظ رہیں تو شبلی نے اس مضمون پر سخت رد عمل ظاہر کیا۔ انھوں نے ایک نظم میں اس موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا کہ:

ترک سے حضرت آغا نے یہ ارشاد کیا ۔۔۔ کیوں ہوئے بے فائدہ یورپ میں گرفتارِ الم
ایشیا میں اگر آجاؤ تو پھر تابہ ابد ۔۔۔ پاؤں پھیلا کے بڑے چین سے سوؤ گے چہ غم
نظر آجائے گی بے کاریٔ آلات جدید ۔۔۔ جب کہ وادیٔ تاتار میں رکھو گے قدم[۵۱]

شبلی کی ان نظموں میں دردمندی، پُرسوزی اور حالات و واقعات کی حقیقت نگاری نے مسلمانانِ ہند کی سیاسی جدوجہد میں ایک ایسا تموج پیدا کیا جس نے آگے چل کر مسلمانوں کو آزادی اور حریت کی تحریک میں ہراول دستے کا کردار عطا کیا۔ یہ شاعری محض جذبات کی ترجمانی نہیں بلکہ مسلمانوں کے ملی شعور کا بیانیہ بھی ہے۔ شبلی نے فرنگی چالوں سے نہ صرف نکلنے کی تلقین کی بلکہ اس کے لیے جس ہمت اور بہادری کی ضرورت تھی، ان جذبات کو ان نظموں کے ذریعے مہمیز دینے کی کوشش بھی کی[۵۲]۔

اکبر الہ آبادی نے بھی اپنی غزلوں اور نظموں میں انگریزوں کی سیاسی چالوں کو خوب طنز کا نشانہ بنایا[۵۳]۔ ان کی شاعری حقیقتاً اس دور کی سیاسی، تہذیبی اور تحریکی مزاج کی آئینہ دار ہے۔ اکبر جیسے شاعر جنھوں نے ہمیشہ ''احتیاط'' کو ملحوظ خاطر رکھا اور طنز کے پردے میں اپنے خیالات کا اظہار کرنے کو ترجیح دی، طرابلس اور بلقان کے معاملے میں کھلم کھلا اظہار پر مجبور ہوئے۔ ''بحمد اللہ اب خونِ شہیداں رنگ لایا ہے'' اور بلقانیوں کی شکست پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ:

بہت کیں سختیاں بلقانیوں نے بے گناہوں پر ۔۔۔ بالآخر چرخ ان کے سر کو زیرِ سنگ لایا ہے[۵۴]

اس سے قبل اکبر نے ۱۸۷۷ء میں روس اور ترکی جنگ جسے جنگ پلونا کے نام سے جانا جاتا ہے، کی بابت ایک نظم ''جنگ نامہ روم وروس'' لکھی۔ اس جنگ نامے میں کئی تاریخی واقعات کا ذکر موجود ہے۔ انھوں نے جنگ میں ترکوں کے مقابلے میں روسی افواج کو بزدل قرار دیا۔ اس جنگ نامے میں اکبر کا کہنا ہے کہ بہادری وہی ہے جو خود غرضی سے پاک ہو، جب کہ روسیوں

نے تو بچوں اور بوڑھوں کو بھی انتقام کی آگ میں جھونک ڈالا[۵۵]۔ جنگ نامے میں دونوں ممالک کا موازنہ بیان کرتے ہوئے کہا ہے کہ:

سنو جنگ دو شنبہ کی اب خبر مقامِ پلونا پہ رکھو نظر
وہ عثمان بادشاہ جوان و دلیر جو ہے اس نیستاں میں مانندِ شیر
عدو جب اس پہ حملہ آور ہوئے تباہ و پریشاں سراسر ہوئے
سپاہ اس کی بس ہو گئی منتشر کہ با ضابطہ روس بھی ہے مصر[۵۶]

جنگ نامے میں رزم و بزم کے مناظر بے حد موثر پیرائے میں بیان کیے گئے ہیں۔ مقابلے کا منظر پیش کرنے کے ساتھ ساتھ ترکی کی سلطنت جن جن یورپی قوتوں سے نبرد آزما رہی ان کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

مددگار ترکاں ہو پروردگار کہ دو چار ہیں دوست دشمن ہزار
ادھر سرویا مائلِ سرکشی اُدھر مونٹی نیگرو میں یہ برہمی
بغاوت میں مصروف رومینیا شرارت پہ آمادہ بلگیریا
غرض صوبہ ہائے مسیحی تمام ہیں اعدائے ترکان عالی مقام
اُدھر خانگی مفسدوں کا یہ رنگ ادھر حضرتِ روس سر گرمِ جنگ[۵۷]

اسی طرح مقابلے کا منظر بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

سنو حالتِ جنگِ آرمینیا جو ہے داخلِ کشورِ ایشیا
میکاف وہ جنرلِ نام دار کہ جو سارے یورپ کا تھا افتخار
وہ جس پر بہت روسیوں کو تھا ناز جو مشہور تھا حیلہ جو فتنہ ساز
جو مختار پاشا سے کھا کر شکست پریشان تھا صورتِ فاقہ مست
جو ہے دل میں بے عزتی کی امنگ پھر آیا ہے وہ سوئے میدانِ جنگ[۵۸]

یہ ایک نامکمل نظم ہے۔ طالب الہ آبادی نے اس نظم کو غالباً سید زاہد حسین اسسٹنٹ سرجن کی ذاتی بیاض سے نقل کیا ہے۔ روس اور ترکی کے مناقشات پر مبنی اس نظم کا ماخذ وہ اخباری خبریں ہیں جو اس زمانے میں شائع ہوتی رہیں۔ اس نامکمل نظم کے ۲۵۲ اشعار ہیں۔ نظم کے نامکمل رہنے کی وجہ نامعلوم ہے لیکن ڈاکٹر روش اختر کاظمی کے مطابق جنگ کا انجام چوں کہ شاعر کی توقعات کے بر خلاف ہوا اسی لیے شاعر کی دل چسپی اس موضوع سے ختم ہوگئی[۵۹]۔ نظم کی ابتدا بغیر کسی تمہید کے ۱۳ اگست ۱۸۷۷ء کے واقعات سے ہوتی ہے۔ ابتدا میں عثمان پاشا کا مکالمہ جوش و خروش اور ہمت اور بہادری کے جذبات کا عمدہ مرقع ہے۔ یہ ایک

حوصلہ مند فوجی افسر کی میدان جنگ میں ذہنی کیفیت کا آئینہ دار بھی ہے اور زبان و بیان، طرز سیاست اور روانی کے اعتبار سے بھی ایک عمدہ شاہ کار ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

وہ عثمان پاشائے جنگ آزما — یہ اقبال و ہمت مقابل ہوا
پکارا کہ او جنرلِ روسیا — نہ کر اپنے لشکر کو نا حق تباہ
فریب و دغا پر تجھے ناز ہے — یہاں زورِ بازو میں اعجاز ہے
تجھے حیلہ سازی میں بس ہے کمال — یہاں حق پرستی کا ہر دم خیال[۶۰]

یہ جنگ نامہ کلیات اکبر الہ آبادی میں شامل نہیں۔ طالب الہ آبادی نے اپنی کتاب ''اکبر الہ آبادی'' میں اس نظم کو شائع کیا۔ نظم کے علاوہ ولفرڈ اسکاؤن بلنٹ کی جس کتاب کا ترجمہ اکبر الہ آبادی نے اردو میں کیا تھا، طالب نے اس کے کچھ اقتباسات بھی پیش کیے ہیں۔ اس ترجمے سے اکبر کی دور اندیشی اور عالمی حالات پر ان کی گہری نظر کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ غالباً وہ ترجمے کے ذریعے یورپ کے جارحانہ رویے کو مسلمانوں پر ظاہر کرنا چاہتے تھے۔ اسی لیے وہ اس بابت لکھتے ہیں کہ:

> مصنف نے جو خیالات ظاہر کیے ہیں وہ ہمارے حسبِ مراد ہوں یا نہ ہوں، ان کی صحت تمام تر لائق تسلیم ہو یا نہ ہو، ایسے نہ تھے کہ مجھے مسلمانوں کی اطلاع کے لیے اس کے ترجمے کا شوق پیدا نہ ہوتا۔ مجھ کو امید ہے کہ میں نے اپنا وقت ضائع نہیں کیا[۶۱]۔

بلنٹ کی کتاب تاریخی اور سیاسی نوعیت کی ہے۔ ترکوں کے حوالے سے اس میں کئی اہم معاصر ماخذ موجود ہیں۔ اکبر کا یہ ''جنگ نامہ'' ۱۸۷۷ء کے ''اودھ پنچ'' میں شائع ہوا۔ اکبر کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ ملت کو غیرت ایمانی کے ذریعے ہی بچایا جا سکتا ہے۔ اسی لیے وہ ترکوں کی بہادری کا مبالغہ آمیز اظہار کرنے سے بھی گریز نہیں کرتے، جیسے:

یہ سب کچھ ہے حاصل تجھے میں گواہ — مگر جنگِ ترکان خدا کی پناہ
یہ زیرِ فلک ہے وہ قومِ دلیر — کہ غصہ سے دیکھیں تو ڈر جائے شیر
اگر کوہ سے ہوں یہ سر گرمِ جنگ — اڑیں ہوش کی طرح ذرات سنگ
بہادر ہیں، منصف ہیں، دیں دار ہیں — دلاور ہیں مرنے پہ تیار ہیں[۶۲]

اکبر کی ایک اور نظم ''جنگ ترکی اور اٹلی کے متعلق رائیں'' بھی بے حد اہمیت کی حامل ہے۔ اس جنگ میں ہندوستان میں برپا مختلف آرا کو نظم کی صورت میں پیش کرنے کے ساتھ ساتھ ترکی میں برپا انقلاب کو طنز کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ اس انقلاب کے نتیجے میں ترک معاشرے میں بڑھتی ہوئی مغرب زدگی پر جو طنز اکبر نے کیا، بعد کے حالات نے ان کے تمام وسوسوں کو درست ثابت کیا۔ وہ کہتے ہیں کہ:

دکھائے نیا اب رنگ ترکی	نہ ہوگی مبتلائے جنگ ترکی
وہاں بھی آگئیں مغرب کی لہریں	ہوئی اب ہم کنارِ گنگ ترکی
بہت خود رائے تھے سلطانِ سابق	رہا کرتی تھی ان سے تنگ ترکی
ہوئے رخصت وہاں سے اولڈ فیشن	ترقی اب کرے گی ینگ ترکی[۶۳]

نوجوان ترک انقلابیوں کی سرگرمیوں کو اکبر پسند نہیں کرتے اور ان پر طنز کرتے ہوئے وہ خلافت کو مسلمانوں کے لیے ضروری سمجھتے ہیں۔ سلطان عبدالحمید کی معزولی پر بھی انھوں نے رنج و غم کا اظہار کیا اور یہاں تک کہہ دیا کہ ترکی سلطنت نے اب عیسائی چولا پہن لیا ہے[۶۴]۔ سلطان عبدالحمید اور زاد روس کی معزولی کا موازنہ کرتے ہوئے انھوں نے جن خیالات کا اظہار کیا وہ اہمیت کے حامل ہیں:

یہ قول تھا حمید جب وہ اترے تخت شاہی سے	جو پیش آیا ہے پیش آیا ہے تقدیر الٰہی سے
جو زارِ روس اترے تخت سے ان کا یہ شکوہ تھا	انھیں نے دی دغا ہم کو ہمیں جن پر بھروسا تھا
انھیں قولوں نے کھینچا عبرت و حسرت کا نقشا بھی	انھیں سے ہے عیاں طرزِ خیالِ دین و دنیا بھی[۶۵]

شاعری کے علاوہ اکبر کے نثرپاروں میں بھی ان سیاسی اور ملکی معاملات پر ہلکا پھلکا طنز نظر آتا ہے۔ اکبر نے جو شذرات لکھے ان میں ''پانیر'' میں شائع ہونے والی خبروں پر تبصرے موجود ہیں۔ ایک جگہ ''پانیر'' کے رپورٹر پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ:

> رپورٹر کے تار، تارِ عنکبوت سے کم نہیں۔ ان سے اخذ نتائج کرنا نادانی ہے۔ کل خبر لکھی کہ سلطان نے شرائط صلح منظور کرلی ہیں۔ آج فرماتے ہیں کہ شرائط صلح کی نسبت بحث کے لیے آئندہ تاریخ مقرر ہوئی ہے۔ اگر شرائط صلح منظور ہوگئیں تو بحث کیسی[۶۶]۔

غرض کہ اکبر نے صلیب و ہلال کی کش مکش میں مسلمانوں کو متحد رہنے کا نہ صرف مشورہ دیا بلکہ فکری سطح پر جہاں جہاں ان سے سہو ہو رہا تھا ان کی نشان دہی بھی کی۔

اس دور میں تحریک اتحاد اسلامی (Pan Islamism) کی جڑیں بھی تیزی سے مضبوط ہو رہی تھیں۔ اس تحریک کا یہ ثمر تھا کہ اردو شاعری میں بین الاقوامی حالات کو مؤثر انداز میں پیش کیے جانے کا رویہ عام ہوا۔ پہلی بار ایک منظم اندازِ فکر کے ساتھ شاعروں نے مذہب کے حوالے سے مسلمانوں کو مجتمع ہونے کی دعوت دی۔ اپنے مسلمان بھائیوں کی تکالیف محسوس کر کے شاعرانہ اظہار کے ذریعے مسلمانوں سے جذبۂ ہمدردی کا آغاز ہوا۔ اس کے علاوہ حکومتِ وقت کے خلاف سیاسی شعور کا مظاہرہ بھی اسی تحریک کی دین ہے۔ اس تحریک کے اثر سے کئی مؤثر نظمیں تخلیق کی گئیں جو ایک صدی سے زائد کا عرصہ گزرنے کے باوجود آج بھی اپنے موضوع اور آہنگ کے اعتبار سے اردو شاعری میں ممتاز مقام رکھتی ہیں۔ اس دور کی ایک اہم آواز ہاشمی فرید آبادی

کی ہے۔ ان کی نظم ”چل بلقان چل“ کو پان اسلام ازم کے مطالعے میں فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ یہ نظم انھوں نے علی گڑھ میں اس وقت کہی جب ڈاکٹر انصاری ایک طبّی وفد لے کر ترکی روانہ ہونے والے تھے۔ اس حوالے سے ہندوستانی نوجوانوں میں ایک عمومی جوش پایا جاتا تھا۔ نظم میں کی گئی اپیل نے ہندوستان بھر کے مسلمانوں میں حرارت پیدا کر دی تھی۔ مدیر ”الناظر“ دسمبر ۱۹۱۲ء کے شمارے میں لکھتے ہیں کہ:

> ڈاکٹر انصاری کے طبّی مشن میں لکھنؤ کے لوگ بھی شریک ہیں اور ترکی مجاہدین کی مرہم پٹّی کرنے قسطنطنیہ جا رہے ہیں۔ یہ جمعیت یکم دسمبر ۱۹۱۲ء کو بمبئی سے لائڈ نامی جہاز پر روانہ ہو جائے گی۔ ہم ان گوناگوں جذبات کے اعادے سے قاصر ہیں جو برادرِ عزیز کو رخصت کرتے وقت ہمارے دلوں میں موج زن تھے۔ پھر بھی ان کی حالت پر اظہارِ رشک کیے بغیر نہیں رہ سکتے۔[۶۷]

اس مشن کی خاص بات یہ تھی کہ جب یہ مشن اٹلی کے جہاز ایس۔ ایس۔ سردینیا(S.S. Sardinia) کو بمبئی کی وکٹوریا گھاٹ سے روانہ ہونے والا تھا تو اسے اہم مشاہیر کی موجودگی میں الوداع کہا گیا۔ ان مشاہیر میں مولانا محمد علی جوہر، ظفر علی خان، میاں محمد حاجی جان محمد چھوٹانی، فضلی بھائی ایم۔ چنائے، کرم بھائی ای۔ چنائے اور ترکی کے کونسل جنرل شامل تھے۔ مشن کے اراکین خاکی وردی زیب تن کیے ہوئے تھے اور یہ انداز ترکی کے فوجی وفد سے مماثلت رکھتا تھا۔ ہاشمی فرید آبادی کی مذکورہ نظم دراصل اسی تاریخی واقعے کا منظوم بیانیہ ہے۔ جو مذکورہ رسالے میں ہی شامل تھی۔ ایک حادثاتی نظم ہونے کے باوجود تاریخی حقائق کے بیان میں ہاشمی فرید آبادی نے جو جذباتی انداز اختیار کیا، اس نے نظم کے تاثر کو مزید بڑھا دیا ہے۔ آج بھی یہ نظم اپنی اثر پذیری کے لحاظ سے ہمیں اس عہد کے منظر نامے کی جھلک دکھانے میں بڑی حد تک کامیاب نظر آتی ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

تابہ کے رخ زرد آنکھیں خوں چکاں دل مضمحل
تابہ کے سازِ جنوں میثاقِ آہنگِ عمل
دعویِ ایمان رکھتا ہے تو اے مومن نکل
شمّۂ غیرت کا ہے گر باقی تو چل بلقان چل
جان سے لاکھوں گئی مہنگی ہے تیری آرزو
ہو فنا گر ہے بقائے جاوداں کی آرزو
سوگواری ہائے ظاہر کی نہ کر تلقین تو
شمّۂ غیرت کا ہے گر باقی تو چل بلقان چل
چھوڑ دے بے روح لوگوں کے لیے یہ اعتدال
موت حاصل کر کہ جو اس زندگی کا ہے مآل
مشکلیں کس کی؟ کہاں کا روک اور کیسا مآل
لطف مرنے کا اگر چاہے تو چل بلقان چل
تا کجا یکساں روی اب سن پیامِ انقلاب
چھوڑ بے رنگی سکوں کی ہو رہینِ اضطراب
وہ بھی کیا مرنا کہ خود فطرت تجھے دے دے جواب
لطف مرنے کا اگر چاہے تو چل بلقان چل[۶۸]

ان کی تصنیف ''سہ نظم ہاشمی'' میں متعدد نظمیں اس عہد کا تاریخی بیانیہ ہیں۔ یہ قطعات اور نظمیں ''الناظر'' لکھنؤ اور دیگر رسائل میں شائع ہوتی رہیں۔ عام تاثر یہ ہے کہ علی گڑھ تحریک کے حامیوں کے نزدیک تحریک اتحاد اسلامی محض ایک فضول قسم کا نعرہ ہے، لیکن اس یونی ورسٹی کے بہت سے طلبہ نے اس نعرے سے آواز ملا کر اسے پورے ہندوستان میں پھیلانے کی کوشش کی ہے۔ خود ہاشمی فرید آبادی بھی علی گڑھ کے زمانۂ طالب علمی سے ہی اس تحریک کا حصہ نظر آتے ہیں۔ اسی دور کی لکھی گئی ایک نظم ''ٹریپولی'' میں انھوں نے طرابلس الغرب کے مسلمانوں کی الم ناک صورت حال بیان کرتے ہوئے جنگ کے نتیجے میں جو مصیبتیں ان پر ٹوٹیں اس کا دردناک نقشہ کھینچا ہے۔ جیسے:

اے گرفتارِ بلا اے امتِ خیر البشرؐ | اے غزالِ پا شکستہ کہیں مظلوم تر
دیدہِ بیم و رجا کس بات کا ہے منتظر | ڈالتا کیا ہے ٹریپولی پہ حسرت کی نظر

یاں بنایا جائے گا مرقد تری ناموس کا
یاں نشاں ہو گا تری ذلت ترے افسوس کا[۶۹]

مسلمانوں کی کس مپرسی اور بدحالی کے ساتھ ساتھ امت مسلمہ کی ذلت اور رسوائی پر بھی وہ نوحہ کناں ہیں۔ خصوصاً امت مسلمہ میں پائی جانے والی بے حسی کا المیہ بیان کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ:

کیا یہ سچ ہے دینِ احمدؐ کا نچا دل اور جگر | کیا دعائیں کلمہ گویوں کی گئیں سب بے اثر
کیا ابھی تک قبر سے باہر نہیں نکلا عمرؓ | تا کہ دیکھے مومنوں کے خاک و خوں آشفتہ سر

انہدامِ کوشکِ توحید اٹھ کر دیکھ لے
اور دریدہ روضہِ اطہر کی چادر دیکھ لے[۷۰]

ان کی ایک نظم بہ عنوان ''بس اب ہے آج سے آغاز میری کار فرمائی'' کو عبدالرزاق قریشی نے ''نوائے آزادی'' میں شامل کیا ہے۔ اس نظم میں بھی انھوں نے انگریزوں کو مخاطب کرتے ہوئے بڑے جذباتی انداز میں کہا کہ ہم مسلمان بہت عرصے اس ظلم و ناانصافی کو برداشت کرتے رہے لیکن اب ہمارے صبر کا پیمانہ لب ریز ہو چکا ہے۔ اب ہم اس سیاسی اور تہذیبی غلامی کے طوق کو اتار پھینکیں گے۔ نظم کا لہجہ کافی باغیانہ ہے۔ جس وہ اس سرزمین کے سلطان مطلق صرف اور صرف مسلمانوں کو قرار دے رہے ہیں۔ ساتھ ساتھ نظم کے آخر میں مسلمانوں کو غیرت دلاتے ہوئے ان کے اندر خود اعتمادی اور کامیابی کے حصول کی جدوجہد کا درس بھی دے رہے ہیں:

بہت سمجھا کیا میں صبر و خاموشی کو دانائی | بہت کہتا رہا کچھ کر نہ سکنے کو شکیبائی
بہت دن ذلتوں کو مصلحت جانا کیا لیکن | بس اب اے ہم نشیں میری طبیعت جوش پر آئی

بھڑک ہے نبض میں پیدا تڑپ ہے قلب میں ظاہر　　نفس میں سانپ کی پھنکار ہے بھوبل کی گرمائی
لہو غیظ و غضب کا آنکھ کی رگ رگ سے بہہ نکلا　　گرا جب خاک پر کٹ کر مرا عثمانوی بھائی
مرے ہر سانس سے اک انقلابِ حریت اٹھا　　مرے اک ایک روئیں نے حمیت کی قسم کھائی
بیک ہیجانِ خوں پارا ہوا ملبوسِ نامردی　　مجھے خود اعتمادی نے پہنایا تاجِ دارائی
بس اب میں اپنے ملکِ نفس کا سلطان مطلق ہوں　　بس اب ہے آج سے آغاز میری کارفرمائی[41]

بلقان کی جنگوں نے مسلمانانِ ہند میں ایک ہیجانی کیفیت پیدا کر دی تھی۔ ہندوستان کے غریب سے غریب مسلمان بھی اپنے ترک بھائیوں کی ہر ممکن مدد کے لیے تیار نظر آتے تھے۔ ترکانِ آلِ عثمان کی امداد کے لیے ہندوستان کے ہر شہر میں ”ہلال احمر“ کے نام سے انجمنیں قائم ہوئیں۔ مذکورہ طبّی وفد بھی اسی انجمن کے تحت روانہ کیا گیا تھا۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ جب مولانا محمد علی جوہر نے اس وفد کی مدد کے لیے ”کامریڈ“ میں اپیل کی[42] اور ”مقدونیہ آؤ اور ہماری امداد کرو“ کے عنوان سے قسط وار مذکورہ اخبار میں اپیل شائع ہوئی تو حکومت برطانیہ کو یہ بات پسند نہ آئی۔ نتیجتاً ”کامریڈ“ کے پرچے ضبط کر لیے گئے اور دو ہزار روپے کی ضمانت طلب کی گئی۔ مولانا محمد علی جوہر نے بڑی بہادری سے ان مقدمات کا سامنا کیا[43]۔ اور اس عہد کی سب سے بڑی آواز بن کر ابھرے۔ حالاں کہ محمد علی ابتدا میں اپنے اخبار ”کامریڈ“ میں معتدل رویہ اختیار کیا لیکن بعد میں ہونے والے دل خراش واقعات نے انھیں اپنا نقطۂ نظر تبدیل کرنے پر مجبور کر دیا۔

مولانا محمد علی جوہر کی زندگی بڑی پہلو دار تھی۔ وہ بیک وقت صحافی، ادیب، شاعر، خطیب، مبصر اور ایک سپاہی رہنما کی حیثیت سے ہماری تاریخ کے چند منفرد اور نمایاں شخصیات میں شمار کیے جانے کے مستحق ہیں۔ ان کی تحریر و تقریر دونوں میں جادوئی اثر تھا۔ ان کا شعری سرمایہ مقدار میں زیادہ نہیں۔ بیش تر غزلیں ایسی ہیں جنھیں ملی شاعری میں شمار نہیں کیا جا سکتا، لیکن ان غزلوں میں بھی کچھ اشعار ایسے ضرور ملتے ہیں جس سے جوہر کے کرب اور ملت اسلامیہ کے مسائل پر ان کا واضح موقف ابھر کر سامنے آ جاتا ہے۔ وہ اس دور میں اتحاد بین المسلمین کے بڑے پیغام بر بن کر ابھرے۔ اسی لیے ان کی شاعری کے موضوعات اور رجحانات وہی ہیں جو اس زمانے میں امت مسلمہ کے مسائل ہیں۔ انھوں نے اپنی شاعری میں مسلم امہ کو حزن و ملال ترک کر کے محنت و عمل کو شعار بنانے کا مشورہ دیا تا کہ وہ ملت کے بکھرے ہوئے شیرازے کو پھر سے مجتمع کر سکیں۔ ۱۹۱۱ء میں ”کامریڈ“ کے اجرا کے بعد ملکی فضا سیاسی اعتبار سے بڑی انقلابی رویوں کی حامل تھی۔ ایک جانب اسلامی ممالک کی تباہی ہندوستانی مسلمانوں کو بے کل کر رہی تھی تو دوسری جانب یورپ کے مسلم دشمن اقدامات نے مسلمانوں کو اتحاد بین المسلمین کی جانب راغب کر دیا تھا۔ مولانا کی ترکوں سے محبت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ جب ترکوں نے ایڈریانوپل پر دوبارہ قبضہ کر لیا تو عالم اسلام میں اس خبر نے خوشی کی لہر دوڑا دی تو اس وقت دہلی میں خبر پہنچتے پہنچتے کافی رات ہو چکی تھی۔ لیکن مولانا جوہر نے صبح ہونے کا انتظار

نہیں کیا بلکہ چند رفقا کو لے کر سیدھے جامع مسجد دہلی روانہ ہوئے اور لوگوں کو چلا چلا کر یہ خوش خبری دیتے رہے۔ بالآخر مسجد میں مجمع جمع ہو گیا اور مولانا نے ایک پُرجوش مگر درد انگیز تقریر کی جس میں یورپ کی شاطرانہ چالوں کو بے نقاب کیا[۴۴]۔

طرابلس پر حملے کے واقعے نے بھی مولانا جوہر کو شدید مایوسی سے دوچار کیا۔ اس جنگ میں مسلمانوں کی شکست کی خبر مولانا پر بجلی بن کر گری۔ وہ اس قدر مایوس اور بے چین ہوئے کہ شدید ذہنی دباؤ اور اضمحلال کا شکار ہو کر خودکشی کرنے کی ٹھان لی۔ اس بابت وہ اپنی خودنوشت سوانح حیات میں لکھتے ہیں کہ:

> طرابلس کی اس تباہی کے دوران میرے جذبات اتنے شدید تھے کہ میں اس کا اعتراف کرتا ہوں کہ
> ایک دن میں نے اس سے مغلوب ہو کر خودکشی کا ارادہ کر لیا تھا۔ ۱۹۱۲ء کے موسم خزاں کی اُس
> رات مجھے اپنی ہمت اور بزدلی کی آزمائش سے میرے ایک مسلمان دوست کی آمد نے بچا لیا[۴۵]۔

جنگ طرابلس (۱۹۱۱ء سے ۱۹۱۲ء) اور جنگ بلقان (۱۹۱۲ء سے ۱۹۱۳ء) میں مسلمانوں پر جو مظالم ہوئے اس کا مختصر حال مولانا محمد علی اپنے اخبار "کامریڈ" مورخہ ۸ فروری ۱۹۱۳ء میں ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں[۴۶] "مسلمانوں کا قتل عام کیا گیا، مسلمان عورتوں کو جبراً عیسائی بنایا گیا، ان کے خاوندوں کو قتل کیا گیا، دو لاکھ چالیس ہزار مسلمان شہید کیے گئے"[۴۷]۔ ۱۹۱۴ء میں London Times میں The Choice of the Turks کے عنوان سے ایک مضمون میں وہ ترکوں کو بڑے سخت لہجے میں تنبیہ کرتے نظر آتے ہیں کہ وہ جنگ میں جرمنی کا ساتھ نہ دیں۔ اس مضمون کی پاداش میں مولانا محمد علی جھنڈوارہ جیل میں پانچ برس تک قید رہے[۴۸]۔ ان کی غزلوں میں اس جانب اشارے ملتے ہیں۔ جیسے:

یہ نظر بندی تو نکلی رو سحر	دیدہ ہائے شوق اب جا کر کھلے
فیض سے تیرے ہی ایک قیدِ فرہنگ	بال و پر نکلے قفس کے در کھلے[۴۹]

فتح سمرنا کے موقعے پر جوہر قید و بند کی صعوبتیں گزار رہے تھے، لیکن انھیں اندازہ تھا کہ ترک بہت جلد یونانیوں کی طاقت کو خاک میں ملا کر رہیں گے۔ اس موقع پر انھوں نے جو غزل کہی اس سے ترکوں کی بابت مولانا کی خود اعتمادی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

عالم میں آج دھوم فتحِ مبین کی	سن لی خدا نے قیدیِ گوشہ نشین کی
ہیں سب عرب میں شام فلسطین اور عراق	ہے شرط جس کے واسطے صرف اک حسین کی[۵۰]

محمد علی جوہر کے لیے قید و بند کی سختیاں معمولی بات تھیں۔ ان کے سامنے اپنے پیش رووں کی مثالیں تھیں۔ وہ ان کٹھن گھڑیوں میں بھی اپنے محسوسات کو شعری جامہ پہنانے میں مصروف رہے۔ قید کی اسی حالت کو بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

ہو مستزاد قید پہ تنہائی بھی تو کیا　　ہے بات جب کہ یاد خدا بھی نہ آ سکے

تسکین وہ اسیر قفس تھا خیالِ گل　　دو چار دن میں آپ طبیعت ٹھہر گئی[۸۱]

انھوں نے قوم کے خاکستر میں اضطراب کے شرر بھڑکا کر ہمیشہ کے لیے اس کو متحرک کر دیا[۸۲]۔ اپنی غزلوں میں انھوں نے گل وبلبل اور شاہد وشاقی کا پردہ استعمال کیا اور کلاسیکی مضامین میں سیاسی قدریں سمو کر غزل کو ایک نئی جلا بخشی[۸۳]۔

دورِ حیات آئے گا قاتل قضا کے بعد　　ہے ابتدا ہماری تری انتہا کے بعد

قتلِ حسین اصل میں مرگِ یزید ہے　　اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

ممکن ہے نالہ جبر سے رک بھی سکے مگر　　ہم پر تو ہے وفا کا تقاضا جفا کے بعد

ہے کس کے بل پر حضرتِ جوہر یہ روکشی　　ڈھویں گے آپ کس کا سہارا خدا کے بعد[۸۴]

اسماعیل میرٹھی کے ہاں بھی زوال امت کا احساس جابجا دکھائی دیتا ہے۔ اپنی نظم ''جریدۂ عبرت'' میں مسلمانوں میں موجود خرابیوں کا ذکر کرنے کے ساتھ ساتھ اسلام کی عظمتوں اور خوبیوں کو بھی گنواتے ہیں۔ جنگ روم و روس کے موقعے پر ۱۸۷۸ء میں بھی ترک مجروحین کی مالی امداد کے لیے میرٹھ میں ہونے والے جلسے میں تقریر بھی کی۔ یہ تقریر ''نجم الاخبار'' میں شائع ہوئی اور اس کی فصاحت کی بازگشت ''تہذیب الاخلاق'' تک میں سنی گئی[۸۵]۔ اس سے قبل وہ اُن حالات پر پوری نظم لکھ چکے تھے۔ اس نظم میں بھی ترکوں کی بہادری اور شجاعت کی انھوں نے خوب تعریف کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ:

کیا اب بھی ترک تاز میں ترکی سوار ہیں　　جن غازیوں کے تیغ سے روسی فگار ہیں

کیا کر رہی ہے احمدِ مختار کی سپاہ　　فیروز مند غازیِ جرّار کی سپاہ

اے ماہِ نور بارِ سفر میں ہے تو مدام　　حالاتِ جنگ کیا تجھے معلوم ہیں تمام[۸۶]

ترکوں کی بہادری اور ان کے کردار کو ہندوستان کی تاریخ میں کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ اسماعیل میرٹھی نے اس جنگ نامے میں ان کی شان وشوکت کا مبالغہ آمیز نقشہ کھینچا ہے۔

بلگیریا میں ختم ہو ہنگامہ جنگ کا　　رومانیہ نشانہ ہو ترکی تفنگ کا

دم بند روسیوں کا ہو صمصام ترک سے　　بھاگے سپاہِ روس فقط نامِ ترک سے

ترکی سپاہ میں علمِ فتح ہو بلند　　پہنچے سپاہ زار کو آزار اور گزند[۸۷]

اپنی ایک نظم میں ''ترکی کی یونانیوں پر فتح'' پر وہ خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

ہاں کیوں نہ ہو دو چند ہمیں عید کی خوشی　　فتحِ عظیم پائی ہے سلطانِ روم نے

سچ کہہ رہا ہوں شک ہو تو ''پانیر'' پڑھو　　کیسی شکست کھائی ہے یونانِ شوم نے

شکرِ خدا ہر ایک مسلمان خوش ہے آج | عیدی کے شعر پڑھ کے لگے ہم بھی جھومنے [۸۸]

اس دور کے ایک اور اہم ترین شاعر حسرت موہانی تھے۔ انھوں نے بھی بیک وقت صحافی، شاعر، نقاد اور تذکرہ نویس کی حیثیت سے اپنی عظمت کا لوہا منوایا۔ سیاسی موضوعات پر ان کے لکھے گئے کلام کو آج بھی خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ زمانہ طالب علمی سے ہی انھوں نے عملی سیاست میں حصہ لینا شروع کر دیا تھا۔ وہ ہندوستان میں اشتراکی تحریک کے اوّلین علم برداروں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ ان کا شمار ہندوستان کے ان باغی انقلابیوں میں ہوتا ہے جنھوں نے انگریزوں سے مصالحت کرنے کے بجائے آزادی کی خاطر جنگ لڑنے کو ترجیح دی۔ ۱۹۰۸ء میں مصر کے حوالے سے انگریزوں کی پالیسی پر لکھے گئے تنقیدی مضمون کی پاداش میں ان کے رسالے "اردوئے معلیٰ" پر بغاوت کا الزام لگایا گیا، لیکن پھر بھی انھوں نے حق گوئی ترک نہ کی۔ بزرگان فرنگی محلی سے خصوصی نسبت کی وجہ سے اتحاد بین المسلمین کے اثرات ان کی سیاسی زندگی پر بہت گہرے پڑے۔ اٹلی کے حملے کے بعد عربوں اور ترکوں نے جس طرح ان کا مقابلہ کیا اور یورپ نے اٹلی کی حمایت میں جو سازشی کردار ادا کیا، اس نے سارے عالم اسلام میں یورپ کے خلاف نفرت کی لہر دوڑادی۔ حسرت نے اس پس منظر کو سامنے رکھتے ہوئے کیا خوب کہا کہ:

قبضۂ یثرب کا سودا دشمنوں کے سر میں ہے | اب تو انصاف اس ستم کا دستِ پیغمبر میں ہے
جورِ یورپ ہے بنا بیداریِ اسلام کی | خیر ہے در اصل یہ با آنکہ شکلِ شر میں ہے
قلتِ افواج ترکی پر نہ ہو اٹلی دلیر | ایک ہے سو کے لیے کافی جو اس لشکر میں ہے
اب خدا چاہے تو حسرت جلد ہوتا ہے بلند | رایت حرّیّت و حق جو کفِ انور میں ہے [۸۹]

اس دور میں وہ مختلف شہروں میں اپنے رفقا کے ہمراہ ترکوں اور سودیشی کی حمایت میں تقاریر کرتے اور آزادی کے نعرے بلند کرتے نظر آتے ہیں۔ اس زمانے میں انھوں نے انجمن خدام کعبہ اور ہلال احمر کی تحریکوں اور فلاحی کاموں میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا [۹۰]۔ اس حوالے سے جنوری ۱۹۱۱ء تا ۱۹۱۳ء ان کے متعدد مضامین نکلے جو اتحاد بین المسلمین کی بابت خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔ ان مضامین میں پان اسلام ازم اور مصر، مسلمانوں پر جنگ اٹلی اور ترکی کے اثرات اور جنگ بلقان خصوصاً قابل ذکر ہیں [۹۱]۔ اس کے علاوہ ۱۲ دسمبر ۱۹۱۲ء کو لکھنؤ میں ہونے والے جلسے میں جو ترکی کے حالات اور ان سے ہمدردی کے اظہار کے لیے منعقد کیا گیا تھا، اور جس کی صدارت والیِ رام پور حامد علی خان کر رہے تھے، میں حسرت نے برطانوی حکومت کے کردار پر جس قدر سخت مؤقف اپنایا اس نے والیِ رام پور کو بھی پریشان کر دیا تھا۔ وہ دم بخود جلسے کی صدارت پر مجبور تو تھے لیکن اندر ہی اندر بے حد ڈرے ہوئے تھے [۹۲]۔ وہ ترکی کے خلاف ہونے والی عالمی سازش سے پوری طرح باخبر تھے۔ اسی لیے اس جانب ان کی شاعری میں جابجا اشارے بھی ملتے ہیں۔ اسی لیے وہ بہت دوٹوک الفاظ میں مسلمانوں کو یہ نصیحت کرتے نظر آتے ہیں کہ:

تقاضائے غیرت یہی ہے عزیزو | کہ ہم بھی رہیں ان سے بیزار ہو کر
کہیں صلح و نرمی سے رہ جائے دیکھو | نہ یہ عقدۂ جنگ دشوار ہو کر
یہ ترک و عرب ٹھان لیں اپنے دل میں | رہیں گے نہ محرومِ کفار ہو کر
وہ ہم کو سمجھتے ہیں احمق جو حسرت | وفا کے ہیں طالب دلِ آزار ہو کر[۹۳]

عالمی سطح پر ہونے والی تبدیلیوں اور اسلامی تحریکوں نے مسلمانوں کے فکر و احساس میں کئی اہم تبدیلیاں پیدا کیں۔ ان تبدیلیوں کے نتیجے میں ہماری اردو شاعری قومی و ملی احساسات سے نہ صرف آشنا ہوئی بلکہ وہ وقت اور حالات کے دھارے کے ساتھ ساتھ سفر کرتی دکھائی دیتی ہے۔ انگریزوں سے نفرت اور ان کی پالیسیوں کو حقارت سے دیکھنا صرف عام مسلمانوں کا رویہ نہیں تھا بلکہ اس میں خواص بھی پیش پیش تھے خصوصاً شعرا اور ادبا نے اپنی تخلیقات اور تنقیدی مضامین کے ذریعے عام مسلمانوں میں انگریزوں کے خلاف شدید نفرت کا احساس پیدا کرنے کی شعوری کوشش کی اور انھیں ان پالیسیوں کے خلاف رد عمل پر ابھارا۔ اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ بیسویں صدی کے آغاز میں حسرت ہی وہ پہلے شخص تھے جنھوں نے ایک سیاسی قیدی کی حیثیت سے صعوبتیں برداشت کیں۔ یہ سلسلہ ۱۹۲۳ء تک جاری رہا۔ اس پورے عرصے میں ان کا بیش تر کلام ان سیاسی واقعات اور حالات سے پوری طرح متاثر دکھائی دیتا ہے[۹۴]۔ ۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم کا نتیجہ ترکوں کی توقعات کے خلاف سامنے آیا۔ ان بدلتے حالات میں انور پاشا نے پھر سے اسلامی ریاست کو مجتمع کر کے مملکت کی بنیاد رکھنے کی کوششوں کا آغاز کیا۔ اس سلسلے میں وہ ۱۹۲۱ء میں بخارا پہنچے تاکہ وسط ایشیا کے ترکوں کو روسی غلامی سے نجات کی تدبیر کی جاسکے۔ انور پاشا بھی اتحاد اسلامی کے زبردست حامی تھے۔ مصطفیٰ کمال ذہنی طور پر لینن اور اسٹالن کے قریب ہونے کی وجہ سے ان کے سخت مخالف تھے۔ اس زمانے میں ہندوستانی مسلمانوں کی نظریں انور پاشا پر لگی ہوئی تھیں اور عام خیال یہ تھا کہ وہ فاتحانہ حیثیت سے ایک روز ہندوستان میں داخل ہوں گے[۹۵]۔ حسرت نے بھی ان سے اظہار عقیدت کے طور پر اشعار کہے۔ ملاحظہ کیجیے:

میں کس خوشی سے دل و دیدہ فرشِ راہ کروں | اگر وہ ترک اِدھر بھی کہیں گزار کرے
خدا سے اب یہ دعا ہے کہ جلد بادِ مراد | کہیں تلافیِ مافاتِ روزگار کرے[۹۶]

مولانا ظفر علی خان کا شمار بھی اس دور کی اہم ترین شخصیات میں ہوتا ہے۔ ان کی شاعری اور نثر دونوں ہی نے ہندوستانی سماج اور سیاست پر گہرے اثرات چھوڑے۔ انھوں نے اپنی سیاسی جدوجہد اور ادبی کارناموں کے ذریعے ہندوستانی مسلمانوں میں حریت فکر اور انقلابی سوچ پیدا کی۔ وہ بنیادی طور پر جمال الدین افغانی کی پُر اثر شخصیت سے بے حد متاثر تھے۔ اسی لیے وہ پان اسلام ازم کے مقاصد کو ذہن میں رکھتے ہوئے ہمیشہ اس کوشش میں مصروف رہے کہ مسلمان ممالک بیدار اور متحد ہو کر اپنی عزت اور وقار کے تحفظ کو ممکن بنائیں[۹۷]۔ ان کے زورِ قلم سے اس دور کی رودادِ سیاست تاریخی اہمیت کی حامل بن گئی۔ طرابلس

اور بلقان کی جنگ سے متاثر ہو کر انھوں نے جو کچھ لکھا، اس سے ان کے جذبۂ ایمانی کی جھلک بہت نمایاں طور پر سامنے آتی ہے۔ یورپ کی استعماری قوتوں نے اسلامی ممالک کے ساتھ جو سلوک روا رکھا اس کا عکس ظفر علی خان کی شاعری میں دیکھا جا سکتا ہے[۹۸]۔ اپنی نظم ''نئی صلیبی جنگ'' میں یورپ کی سامراجی ذہنیت کو نمایاں کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ:

مسیحیوں اور مسلموں میں یہ جنگ جس وقت سے ٹھنی ہے — بدن کو دیتی ہے روح دھمکی کہ آ گیا وقت جاں کنی ہے

سمجھ رہے ہیں یہ اہلِ یورپ کہ ہم مسلماں کو لوٹ لیں گے — کہ اس میں کس بل نہیں ہے کل کا وہ آج کمزور و منحنی ہے

ہوا ہے ایماں جہاں سے رخصت اٹھا ہے انصاف کا جنازہ — جہاں میں چھا جائے گا اندھیرا یہی جو یورپ کی روشنی ہے[۹۹]

طرابلس پر اٹلی کے حملے کے بعد ظفر علی خاں بھی حالات سے بے حد متاثر نظر آتے ہیں۔ اس حوالے سے انھوں نے متعدد نظمیں کہیں جن میں ''ترک اور اطالوی کارزار طرابلس''، ''جنگ طرابلس''، ''بادل میں بھی'' اور ''سمندر انور'' وغیرہ بے حد مقبول ہوئیں۔ کارزار طرابلس میں انھوں نے تاریخ اور سیاسی حالات کو مدغم کر کے رجزیہ انداز اختیار کیا اور ساتھ ساتھ روما کی چیرہ دستیوں کا حال بھی بیان کیا ہے[۱۰۰]۔ اس نظم میں پاپائیت پر بھی گہرا طنز دکھائی دیتا ہے جو ہمیشہ سے عیسائیت کی ترویج اور اشاعت کے لیے کوشاں رہا۔ وہ لوگ خود کو انسانیت کا علم بردار ظاہر کرتے ہیں لیکن ان کے حوارین اٹلی کے لشکر میں شامل ہو کر طرابلس میں مسلمانوں پر ظلم کے پہاڑ توڑ رہے ہیں۔ اس نظم میں وہ برطانوی سامراج سے یہ سوال بھی کرتے نظر آتے ہیں کہ آخر وہ اس ظلم و ستم پر خاموش تماشائی کیوں بنا ہوا ہے، وہ انھیں روکنے کی کوئی تدبیر کیوں نہیں کرتا۔ نظم کے آخر میں وہ امید اور عزم کو اعادہ کرتے ہوئے اس بات کا اظہار بھی ضروری سمجھتے ہیں کہ مسلمان بظاہر کتنے ہی کمزور کیوں نہ ہو گئے ہوں، محمد ﷺ کے نام پر وہ اپنا سر کٹانے سے گریز نہیں کریں گے اور ایک نہ ایک روز وہ دشمنوں کو عبرت ناک شکست دینے میں ضرور کام یاب ہو جائیں گے۔ ملاحظہ کیجیے:

چمک اے تیغ روما کا نشاں ہے تو مٹانے کو — گرج اے توپ اٹلی کے دھویں ہے تو اڑانے کو

مسلماں لاکھ بودے ہوں مگر نامِ محمدؐ پر — خوشی سے آپ بھی حاضر ہیں وہ اپنے سر کٹانے کو

یہ چوتھے آسماں پہ جا کے عیسیٰؑ سے کوئی کہہ دے — کہ نکلی آپ کی امت ہے قصر امن ڈھانے کو

نہ مارا چھاپا کیوں الجیریا پر اہلِ اٹلی نے — یہیں کیا مشعلِ تہذیب باقی تھی جلانے کو[۱۰۱]

انھوں نے طرابلس کی جنگ کے موقعے پر اٹلی کی بزدلی اور ترکوں کی بہادری کو اپنے اشعار کا موضوع بنایا۔ نظم میں انھوں نے مؤقف اپنایا کہ پاپائے روم جن ارمانوں کو سجائے طرابلس پر حملہ آور ہوئے تھے، مسلمانوں نے اپنی بہادری سے ان امنگوں پر اوس ڈال دی ہے۔ اس بابت ان کا کہنا تھا کہ:

کھیل بچوں کا جسے سمجھا تھا اٹلی نے وہ جنگ | کر رہی ہے قافیہ اس کے جواں مردوں کا تنگ
خاک بن کر اڑ گئی روما کے دل کی آرزو | خون ہو کر بہہ گئی پاپا کے پہلو کی امنگ
پھونک دی اٹلی نے چشمِ روشنِ ایماں میں خاک | چڑھ گیا آئینۂ انصاف پر یورپ میں زنگ
آسماں سے ابنِ مریمؑ آج اتر آئیں اگر | دیکھ کر اخلاقِ روما بے گماں رہ جائیں دنگ[۱۰۲]

مولانا محمد علی نے مذکورہ طبّی وفد کی تشکیل میں جو جدوجہد کی اس میں ہندوستان کے تقریباً تمام اہم سرکردہ قومی رہنماؤں نے حصہ لیا۔ اس موقعے پر ظفر علی خان مسلمانانِ ہند کے سیاسی نقطۂ نظر کو اس طرح بیان کرتے ہیں:

تجھ سے اے ترکی ہمارا برقرار اعزاز ہے | تو ہمارے واسطے سرمایہ صد ناز ہے
گونجتی تھی محفلِ عالم کبھی جس ساز سے | تو اسی سازِ بلند آہنگ کی آواز ہے
آئی ہے اٹلی کی شامت موت ہے سر پر سوار | اس لیے کھوئے ہوئے اپنا دہانِ آز ہے[۱۰۳]

ظفر علی خان نے محض ادبی محاذ سے ترکوں کا ساتھ نہیں دیا بلکہ وہ عملی طور پر بھی اس جدوجہد کا حصہ رہے۔ انجمن ہلال احمر کے تحت انھوں نے چندہ جمع کیا۔ وہ روپیہ خود ترکی کے وزیر اعظم کی خدمت میں پیش کرنے کے لیے گئے۔ دورۂ ترکی کے دوران انھوں نے شتلجہ کے محاذ کا دورہ بھی کیا۔ اس وقت وہاں غازی انور پاشا کی معیت میں ترک فوج اٹلی سے برسرپیکار تھی[۱۰۴]۔ سلطان عبد الحمید سے جب ان کی ملاقات ہوئی تو ایک فارسی قصیدہ بھی ان کی شان میں لکھا[۱۰۵]۔ قسطنطنیہ سے واپسی پر مصر کے علما سے بھی ملاقاتیں کیں جن میں سید ہاشم رضا کا نام قابل ذکر ہے۔ اسی دوران جب انھیں اطلاع ملی کہ حمید پر جہاز کے مشہور کپتان غازی رؤف پاشا اسکندریہ میں موجود ہیں تو خود لکھ کر ملاقات کی خواہش ظاہر کی۔ رؤف پاشا نے نہ صرف ملاقات کی بلکہ وہ توپ بھی دکھائی جس نے اطالوی فوجوں کی مزاحمت روکنے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ ظفر علی خان نے انتہائی عقیدت سے توپ کو بوسہ دیا[۱۰۶]۔ اتحاد بین المسلمین کے علم بردار ہونے کی وجہ سے صرف ترکی کے مسائل پر ہی آواز بلند نہیں کی بلکہ مشہدِ مقدس پر روسی گولہ باری کے رد عمل میں انھوں نے برطانیہ کے وزیر خارجہ سر ایڈورڈ گرے (Edward Grey) سے شکوہ بھی کیا۔ اس نظم کی اشاعت کی وجہ سے ان کا اخبار ''زمین دار'' تمام عمر مصائب کا شکار رہا۔ نظم دیکھیے:

سر ایڈورڈ آج آتش زیر پا سارے مسلماں ہیں | پریشاں کیوں نہیں کرتی تمھیں ان کی پریشانی
لگایا روس نے پہلوئے مسلم میں وہاں چرکا | یہاں لائی ہے رنگ اس زخم کی خوں نابہ افشانی[۱۰۷]

انھوں نے اپنی نظموں میں ایسا منظر نامہ ترتیب دیا جس کے ذریعے حالات و واقعات کی درست طور پر عکاسی ہو سکے۔ اس حوالے سے بلقانیوں کو نہایت مؤثر انداز سے انھوں نے طنز کا نشانہ بنایا۔ وہ کہتے ہیں کہ:

بلقانیوں کا شور ہے کوؤں کی کائیں کائیں
خبریں ہیں ان کی فتح کی سب آئیں بائیں شائیں

ہوتا ہے کوئی دم میں جلالِ حق آشکار
یہ کشتگانِ غمزۂ ابلیس رہ تو جائیں

ڈالا زمیں میں ظلم سے یورپ نے زلزلہ
مسلم دعا سے پایۂ عرشِ بریں ہلائیں[108]

ترکوں کو چوں کہ عالم اسلام میں مرکزیت حاصل تھی اس لیے عالم اسلام کی یہ خواہش تھی کہ وہ کسی طرح یورپ کی ریشہ دوانیوں سے بچ جائیں۔ یہی وجہ ہے کہ طرابلس اور بلقان کی جنگ کے دوران اخوت اسلامی کا جذبہ پوری دنیا میں بالعموم اور ہندوستانی مسلمانوں میں بالخصوص دکھائی دیتا ہے۔ ظفر علی خان نے اپنی آپ بیتی میں لکھا کہ:

> ترکوں کی نوزائیدہ طاقت کو فنا کرنے کے لیے دول مغرب نے بلقان میں ایک اور شرارہ چھوڑ دیا تو پھر بھی کوئی ایسی جماعت اس ملک میں موجود نہ تھی جو اسلام کے ان سرفروشوں کی مدد کے لیے فراہمی سرمایہ کا کام اپنے ہاتھ میں لے۔ ظفر علی خان کا یہ بھی کہنا ہے کہ ''زمین دار'' اخبار نے اس کام کا بیڑہ اٹھایا[109]۔

ان کے سفر یورپ کا مقصد بھی یہی تھا کہ وہ ترک مجاہدین کی حوصلہ افزائی کریں۔ وہ انھیں اس بات کا احساس دلانا چاہتے تھے کہ ہندوستان کے سات کروڑ بے کسوں کی دعائیں بھی ان کے ساتھ ہیں[110]۔ خاموشی سے کیے گئے اس سفر کے دوران ان کی لکھی گئی نظم ''سمندر کی روانی اور تخیل کی جولانی'' میں بھی انھوں نے یورپی جارحیت کے خلاف غم وغصے کا اظہار کرتے ہوئے لکھا کہ:

ساحل اٹلی کا اُدھر سسلی کے مینارے اِدھر
وہ فضا سے ہم کلام اور یہ صبا سے ہم کلام

مسلمِ بے کس کے خوں میں پرورش پائے ہوئے
اس کی دل کش گھاٹیاں اس کے دل آرا مرغزار

آہ وہ سسلی بسایا تھا جسے ہم نے کبھی
اندلس کی طرح مغرب میں ہماری یادگار

پرچمِ توحید اڑا تھا جس کے ساحل پر کبھی
اور اذانوں سے کبھی گونجے تھے جس کے کوہ سار[111]

یہ دور چوں کہ بڑا ہنگامہ خیز تھا لہٰذا اس دور کی ہنگامہ خیزی اقبال کی شاعری پر بھی پوری طرح اثر انداز ہوئی۔ ۱۹۱۱ء کی انجمن اسلام کے جلسے میں انھوں نے اپنی مشہور نظم ''شکوہ'' پیش کی[112]۔ اس نظم کا پس منظر بھی اتحاد بین المسلمین کے جذبے کا فروغ تھا۔ ۱۹۱۱ء کے اوائل ہی میں سلطنت عثمانیہ کے کئی علاقے برطانوی اور یورپ سامراج کے قبضے میں جا چکے تھے۔ ایران پر بھی عملاً روسی، برطانوی اور کسی قدر جرمنی کی حکمرانی قائم ہو چکی تھی۔ اس نظم میں اقبال خدا کے حضور مسلمانوں کی جانب سے شکوہ کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ نظم کے کچھ بند میں وہ سلطنت عثمانیہ کے اس دور کی نشان دہی کرتے دکھائی دیتے ہیں جب مسلمانوں کی یہ عظیم سلطنت یونان، البانیہ، بلغاریہ، ہنگری اور آسٹریا تک پھیلی ہوئی تھی[113]۔ اقبال کہتے ہیں کہ:

تھے ہمیں ایک ترے معرکہ آراؤں میں — خشکیوں میں کبھی لڑتے کبھی دریاؤں میں
دیں اذانیں کبھی یورپ کے کلیساؤں میں — کبھی افریقا کے تپتے ہوئے صحراؤں میں

شان آنکھوں میں نہ جچتی تھی جہاں داروں کی
کلمہ پڑھتے تھے ہم چھاؤں میں تلواروں کی[۱۴]

جنگ طرابلس کے موقعے پر کہی گئی اقبال کی سب سے اہم نظم "فاطمہ بنت عبداللہ" ہے۔ اس موقعے پر کہی گئی تمام نظموں میں اسے خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ جنگ کے دوران جس طرح سے اس لڑکی نے مجاہدین کو پانی پلانے کا فریضہ انجام دیا اس منظر کو دکھاتے ہوئے اقبال کہتے ہیں کہ:

فاطمہ تو آبروئے امتِ مرحوم ہے — ذرہ ذرہ تیری مشتِ خاک کا معصوم ہے
یہ سعادت حورِ صحرایہ تری قسمت میں تھی — غازیانِ دیں کی سقّائی تری قسمت میں تھی
یہ کلی بھی اس گلستانِ خزاں منظر میں تھی — ایسی چنگاری بھی یارب اپنی خاکِ تر میں تھی[۱۵]

اپنی ایک اور نظم "حضور رسالت مآبؐ" میں انھوں نے دعائیہ انداز میں مسلمانوں کی زبوں حالی کو دور کرنے کی تدبیر کو حضور ﷺ کے سامنے بڑے عجز و انکسار کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اقبال نے یہ نظم ۱۹۱۲ء میں شاہی مسجد لاہور کے ایک جلسے میں سنائی تھی جو مولانا ظفر علی خان نے جنگ بلقان کے سلسلے میں ترکوں کی مالی امداد کی غرض سے منعقد کی تھی[۱۶]۔ نظم میں شاعر مسلمانوں کی حالت بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اے حضور سرور کائنات ﷺ اس وقت یہ صورت حال ہے کہ مسلمان آسودگی کی تلاش میں بھٹک رہے ہیں مگر انھیں کہیں بھی آسودگی میسر نہیں۔ اسلام کو ماننے والوں کی تعداد تو لاکھوں میں ہے لیکن اے نبیٔ محترم ﷺ تیرے نام پر قربان ہونے والوں کی تعداد بالکل نہیں۔ وہ طرابلس کے شہیدوں کے لہو کا نذرانہ حضور ﷺ کو پیش کرتے ہوئے اسے قبول فرمانے کی گزارش کرتے نظر آتے ہیں۔ دیکھیے:

حضورؐ دہر میں آسودگی نہیں ملتی — تلاش جس کی ہے وہ زندگی نہیں ملتی
ہزاروں لالہ و گل ہیں ریاضِ ہستی میں — وفا کی جس میں ہو بو وہ کلی نہیں ملتی
مگر میں نذر کو اک آبگینہ لایا ہوں — جو چیز اس میں ہے جنت میں بھی نہیں ملتی
جھلکتی ہے تری امت کی آبرو اس میں — طرابلس کے شہیدوں کا ہے لہو اس میں[۱۷]

ان کی نظم "شمع و شاعر" میں بھی تحریک اتحاد اسلامی کا رجحان واثر نمایاں ہے۔ اس نظم میں جہاں خودی کا نظریہ ملتا ہے وہیں انھوں نے مسلمانوں کی عظمت رفتہ کی یاد دلا کر مسلمانوں کو جدوجہد کے عمل کو تیز کرنے کی تلقین کرتے دکھائی دیتے ہیں[۱۸]۔ اس نظم میں اقبال نے ملت اسلامیہ کو جرأت رندانہ پر آمادہ کرنے اور نیند کی گراں باری سے جھنجھوڑ کر بادۂ منزل پر گام

زن ہونے کی ترغیب دے رہے ہیں[۱۹]۔ اپنی ایک اور نظم "محاصرہ ادرنا" میں ترکوں کی سیرت کے روشن پہلو کو دنیا کے سامنے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس واقعے سے ترکوں کے دل میں شریعت کی پاس داری کا پتا چلتا ہے۔ ایڈریانوپل جو ترکی میں ادرنا کے نام سے جانا جاتا ہے، فروری ۱۹۱۳ء میں ترکوں کے ہاتھ سے نکل گیا، لیکن غازی انور پاشا نے ۱۹۱۳ء میں اسے دوبارہ فتح کر لیا[۲۰]۔ اس وقت مسلم لشکر کو اشیائے خورد و نوش کی شدید ضرورت تھی لہٰذا غازی انور پاشا نے مجبوراً شہر کے باشندوں کے سامان پر قبضہ کر لیا۔ فقیہہ شہر نے اس وقت فتویٰ جاری کیا کہ ذمی کا مال لشکر اسلام کے لیے حرام ہے۔ نتیجتاً مسلم فوج نے بھوک کی تکلیف برداشت کرنا گوارا کیا اور عوام کا سارا مال انھیں واپس لوٹا دیا[۲۱]۔ اپنی ایک اور نظم "بلاد اسلامیہ" میں بھی وہ ترکوں کے دارالخلافے قسطنطنیہ کی تعریف کرتے ہوئے اسے ملت اسلامیہ کا دل قرار دیتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ:

خطۂ قسطنطنیہ یعنی قیصر کا دیار — مہدی امت کی سطوت کا نشانِ پائدار
صورتِ خاکِ حرم یہ سر زمیں بھی پاک ہے — آستانِ مسند آرائے شہِ لولاک ہے
نکہت گل کی طرح پاکیزہ ہے اس کی ہوا — تربتِ ایوب انصاری سے آتی ہے صدا
اے مسلماں! ملتِ اسلام کا دل ہے یہ شہر — سیکڑوں صدیوں کی کشت و خوں کا حاصل ہے یہ شہر[۲۲]

اقبال کا خیال تھا کہ مغربی استعمار کی پوری عمارت معاشی استیصال کی توسیع پسندی کے نظریات پر قائم ہے۔ اسی منصوبے کے تحت ترکی میں خلافت کے تصور کو پامال کر دیا گیا ہے۔ اگر مسلمان دوبارہ سے اپنا جاہ و جلال چاہتے ہیں تو انھیں اتحاد بین المسلمین کے راستے پر چل کر اس بھولے ہوئے سبق کو پھر سے زندہ کرنا ہوگا[۲۳]۔

اقبال کو ترکوں سے بڑی امیدیں وابستہ تھیں۔ اردو کے علاوہ ان کے فارسی کلام میں بھی جابجا ترکوں کی تند خوئی اور جاں بازی کو موضوع سخن بنایا گیا ہے۔ تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں البتہ یہ شعر اقبال کے نقطۂ نظر کو سمجھانے کے لیے کافی ہوگا:

از ما بگو سلامے آں ترک تند خورا — کاتش زداز نگاہے، یک شہر آرزو را[۲۴]

اقبال ترکی اور خلافت کے زوال پر فکر مند تھے۔ وہ ترکی کو اسلامی دنیا کے محور و مرکز کے طور پر ایک طاقت ور قوم دیکھنا چاہتے تھے جو عالمی استعمار کے خلاف مسلمانوں کی درست وکالت کا فریضہ انجام دینے کی صلاحیت رکھتی تھی لیکن بہت تیزی سے اس مرکزی دھارے کی بنیادیں کمزور ہوتی جا رہی تھیں۔ اس لیے اقبال نے ماضی کا صیغہ استعمال کرتے ہوئے عظیم ترکوں کی بابت لکھا کہ:

قومِ ٹرکی، آہ، جو سرمایہ توقیر تھی — قوم اور وہ قوم، جو اسلام کی شمشیر تھی
جس کی ہستی سے بقائے نعرۂ تکبیر تھی — وہ درخشاں جس کے سر پر صورتِ تنویر تھی[۲۵]

اس دور کے شعری منظر نامے کے مطالعے سے ایک خوش گوار حیرت کا احساس اس وقت پیدا ہوتا ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ انقلابی تحریک سے وابستہ شعرا کے علاوہ آرزو لکھنوی جیسے رومانی شاعر بھی ان سیاسی حوادث سے متاثر ہوئے۔ ۱۳ اگست ۱۹۱۳ء کو ''ہمدرد'' میں ان کا جو کلام شائع ہوا، وہ براہِ راست ان حوادث کی نشان دہی کرتا ہے۔ اشعار ملاحظہ کیجیے:

ملتان ہو کہ ایراں، ترپولی یا مراکو — اک وقت میں لٹا ہے ہر کارواں ہمارا
کیا کام اس شجر سے سر سبز ہو کے سوکھی — جس پر نہیں ہے باقی اب آشیاں ہمارا
یا گھر میں بیٹھنا تک دشوار ہو گیا ہے — یا ایک وقت میں تھا سارا جہاں ہمارا[۲۶]

اس دور کی ایک اہم شاعرہ زاہدہ خاتون شروانیہ المعروف ز۔خ۔ش۔ بھی اتحاد اسلامی کی تحریک سے بے حد متاثر دکھائی دیتی ہیں۔ اپنی بہت سی نظموں اور غزلوں میں وہ مسلمانوں کو انگریزوں کی چیرہ دستیوں سے نکلنے کی تلقین کرتی دکھائی دیتی ہیں۔ اس دور کی ایک نظم ''ظہور امام'' میں انھوں نے موجودہ حالات کی بنیاد پر یہ تک کہہ دیا کہ امام مہدی کے ظہور کا وقت قریب آچکا ہے اور اس وقت چوں کہ ترکی ہی کے پاس مسلمانوں کی سیادت ہے لہٰذا اسی کی فوجیں امام مہدی کی رہنمائی میں دشمنوں کے خلاف اپنے قدم بڑھائیں گی۔ مخمس کی ہیئت میں کہی گئی اس نظم میں حالات کی تلخ حقیقت کے برخلاف انھوں نے مبالغہ آمیز انداز اختیار کیا۔ وہ کہتی ہیں کہ:

قائد فوج شہ ترکی و ایراں ہوں گے — اٹلی و روس یہ سب تابع فرماں ہوں گے
طیب خاطر سے کل انگریز مسلماں ہوں گے — جارج سلطان ترے نائبِ سلطاں ہوں گے
تری تصدیق کرے گا شہِ جاپاں آجا[۲۷]

اس دور کی اردو شاعری میں کسی خاتون شاعرہ سے اس قسم کے موضوعات پر شاعری کی توقع نہیں کی جاسکتی تھی۔ جنگ طرابلس کے حوالے سے بھی ایک نظم میں انھوں نے مسلمانوں کی عظیم سلطنت پر غیروں کے تسلط کا شکوہ کچھ اس طرح سے کیا ہے:

ارضِ اسلام پر غیروں کی حکومت کیسی — قبل از وقت یہ آئی قیامت کیسی
نورِ انصاف ہوا دہر سے یک دم کافور — چار سو پھیل گئی ظلم کی ظلمت کیسی
اٹلیِ غیر مہذب ہمیں تہذیب سکھائے — راہ گم کردہ سے امیدِ ہدایت کیسی[۲۸]

ایک اور مثنوی ''عالمِ خواب'' میں طرابلس کی جنگ میں پردہ دار خواتین کے ساتھ ہونے والے سلوک اور ان کی عزتیں لٹ جانے پر افسوس کا اظہار کرتے ہوئے وہ کہتی ہیں کہ:

بپا تھا سر بہ فلک کیمپ اٹلی والوں کا   تمام شہر پہ قبضہ تھا بدخصالوں کا

یہ بحر روم پہ لاشوں کا پُل بنائیں ابھی   زمینِ خشک میں دریائے خوں بہائیں ابھی

اسی گروہ میں تھیں پردہ دار خاتونیں   فدائے ملتِ غیرت شعار خاتونیں[۲۹]

انھوں نے انجمن ہلال احمر میں چندہ جمع کرنے کی مہم میں بھی اہم کردار ادا کیا۔ اپنی نظم "اپیل" میں وہ ہندوستانی مسلمان خواتین کو تلقین کرتی نظر آتی ہیں کہ وہ اس مہم میں اپنے مسلمان بھائیوں کے شانہ بشانہ کام کریں۔ ترکوں کی بہادری اور بلقانیوں کی سازشوں کا پردہ چاک کرتے ہوئے وہ کہتی ہیں کہ:

بلقانیوں نے اکثر قصبے جلا دیے ہیں   پھانسی پہ امن پرور شہری چڑھا دیے ہیں

اسباب سب کے لوٹے گھر سب کے ڈھا دیے   اربابِ گنج و زر کو فاقے کرا دیے ہیں

ہیں

باور نہ ہو تو پڑھ لو رپوٹر کے تار بہنو[۳۰]

اس نظم کی روانی اور جوش و جذبے کی فراوانی بڑی متاثر کن ہے۔ برصغیر کی خواتین جو اس عہد میں عموماً سماجی و سیاسی سرگرمیوں میں حصہ نہیں لیتی تھیں، انھیں اس نظم نے بے حد متاثر کیا[۳۱]۔ مخمس کی ہئیت میں لکھی گئی اس نظم میں شاعرہ نے خصوصاً ترک فوج جن حالات کا شکار تھی، نظم میں ان تاریخی حقائق کو بڑی عمدگی سے بیان کیا ہے۔ طرابلس کی ان مظلوم خواتین کا حال بیان کرتے ہوئے وہ ہندوستانی خواتین کے دل میں اس رنج و غم کی کیفیت کو پیدا کرنے میں پوری طرح کام یاب دکھائی دیتی ہیں:

پھرتی ہیں ماری ماری عزت شعار بہنیں   اللہ سے اجل کی ہیں خواست گار بہنیں

فانی ہیں عیش دارِ ناپائے دار بہنیں[۳۲]

انھوں نے ایک نظم انور پاشا پر بھی لکھی۔ اس نظم میں ان کی بہادری اور جفاکشی کو نہ صرف سراہا بلکہ عالم اسلام کی نظریں جس طرح ان پر مرکوز تھیں اس کی نشان دہی بھی کی ہے۔ وہ کہتی ہیں کہ:

کیسی دل سوزی سے کہتی شمع گرتا تجھ سے ہے   اے مرے انور رضائے بزمِ امکاں تجھ سے

ہے[۳۳]

انور پاشا نجمن اتحاد نوجوانانِ ترک کے سرگرم رکن تھے۔ بہت سے ہندوستانی مسلمان ان نوجوانانِ ترک کی سرگرمیوں کو پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھتے تھے لیکن کچھ لوگوں کا یہ خیال ضرور تھا کہ اس انجمن نے جو دستوری انقلاب برپا کیا ہے اس کے ذریعے ترکی اپنی گم شدہ عظمت کو پھر سے حاصل کرنے میں کام یاب ہو جائے گا۔ مگر ایسا ہوا نہیں۔ حقیقت تو یہ ہے

کہ یورپی سازشوں نے خصوصاً بلقان کی ناکامی نے اس انقلاب کو بھی ناکامی سے دوچار کر دیا۔ اس کے باوجود انور پاشا کی شخصیت کے انقلابی پہلو کو لوگ عرصہ دراز تک سراہتے رہے۔ ز۔ خ۔ ش۔ نے بھی ان کی شخصیت کو ایک انقلابی کے طور پر پیش کرتے ہوئے کہا کہ:

یا ہو تاجِ فتح سر پر ورنہ تن پر سر نہ ہو
دیکھ او غازی ابھی میان میں خنجر نہ ہو

صلح جو ہوں تجھ سے گر بلقانیِ پیماں شکن
پائیں خنجر کی زباں سے پاسخِ دنداں شکن

تیری صورت کل مسلماں قوم کے شیدا ہو کاش
عالمِ اسلام میں انور کئی پیدا ہوں کاش[134]

مولانا شبلی کے انداز میں انھوں نے بھی ایک نظم "شہر آشوب اسلام" لکھی۔ اس نظم میں ممالک اسلامیہ پر چھائی ہوئے زوال اور انحطاط کی کیفیت کو انھوں نے موضوع بنایا۔ نظم کا ایک پورا حصہ ترکوں کی عادات و خصائل کے حوالے سے اہمیت کا حامل ہے:

نہ پوچھ ہم نفسو! بار بار کیا ہیں ترک
وجودِ خلائق کا مدعا ہیں ترک

خروشِ فتح کی ہیں گونج زیرِ گنبدِ چرخ
جیوشِ جاہ و حشم کے نشانِ پا ہیں ترک

یہ قول شبلی علامہ حرفِ قسمت ہے
زوال دولت عثمان زوال ملت ہے[135]

جنگ طرابلس سے قبل کے حالات کو بھی اس دور کے بعض شعرا نے موضوع سخن بنایا۔ ۱۸۹۷ء میں ابراہیم بیگ چغتائی نے "جنگ یونان وروم" کے عنوان سے ایک مثنوی لکھی۔ مثنوی کے ابتدا ہی میں شاعر نے وضاحت کر دی کہ "میں نے اس جنگ کے واقعات کو جناب قاضی محمد جلال الدین مراد آبادی کی تاریخ یونان وروم اور دیگر تاریخ کی کتابوں سے اخذ کر کے منظوم کیا ہے"[136]۔

اس مثنوی کے بغور مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے بھی ان تاریخی حقائق کو شاعرانہ مبالغے کے ذریعے بڑھا چڑھا کر پیش کیا ہے۔ یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ اس دور میں ترکوں کو پے در پے شکستوں کا سامنا تھا، لیکن ان کا موقف یہ ہے کہ اس لڑائی میں ترکوں کو جو کامیابی حاصل ہو رہی تھی اس کی گونج عالمِ اسلام میں سنی جا رہی تھی لہٰذا انھی کامیابیوں کے بیان کو انھوں نے مثنوی کے قالب میں کیا ہے۔ اس منظوم تاریخ کے جو بھی نسخے فروخت ہوئے اور اس سے جتنی بھی رقم حاصل ہوئی اسے شاعر نے حجاز ریلوے کے لیے وقف کر دیا[137]۔ مثنوی میں ترک فوج کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ:

دور جو فوج کے ڈویژن تھے
دوسرے دن وہ فوج سے ملتے

ایک نے پائی جنگ کی جو خبر
ہو گیا جنگ میں شریک آ کر

مار کر تیس کوس کا دھاوا
شام ہونے سے پہلے آپہنچا

ہے عیاں ترکیوں کی مستعدی اور لو جنگ کی جو دل میں تھی[۱۳۸]

ترک افواج نے حقی پاشا کے ہم راہ دولو کے مقام پر جو پیش قدمی کی اور اسے فتح کر کے شہریوں کے ساتھ جو سلوک کیا اس کا نقشہ کھینچتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

فوجِ ترکی کے دو بڑے دستے حقی پاشا کے ماتحت جو بڑھے
ایک نے لے لیا ویلسٹینو دوسرا آیا جانب دولو
راہ میں ایک سخت جنگ ہوئی زک سپاہِ گریس نے کھائی
فتح ویلسٹینو دولو کا حقی پاشا کے سر رہا سہرا
مجتمع شہر کے ہیں باشندے با ادب اپنے سر کیے ننگے
جانتے ہیں یہ سب کہ عثمانی ظلم کرتے نہیں کسی پر بھی
یہ کہا نجیب پاشا نے میر عسکر ہیں تم سے فرماتے
تم کو دی جاتی ہے اماں کامل اور آزادی تم کو ہے حاصل[۱۳۹]

مثنوی کے آخر میں انھوں نے سلطان عبد الحمید کی مدح میں ایک قصیدہ بھی لکھا جس میں ان سے عقیدت کا اظہار کیا گیا ہے۔ ترک خلیفہ سے عقیدت رکھنا جیسا کہ ابتدا میں ذکر کیا گیا، ہندوستانی مسلمانوں کا عمومی رویہ تھا۔ مثنوی میں مبالغہ آرائی کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ روس کے ہاتھوں معاہدے کے بعد جو ہزیمت ترکوں کو اٹھانی پڑی اس کے برخلاف شاعر کا بیان ہے کہ:

ترک کیسے ہی ہوں شکستہ حال ساتھ ان کے ہے جنگ امرِ محال
روس پر منکشف ہوا پیہم رکھ سکے گا نہ جنگ وہ قائم[۱۴۰]

اس دور میں بعض ایسے حضرات کے مجموعے بھی منظر عام پر آئے جو عام حالات میں شاعری سے دور کی بھی نسبت نہیں رکھتے تھے۔ شاہ قسیم الدین کا شمار بھی ایسے ہی شعرا میں ہوتا ہے۔ ان کا مجموعہ دردِ جگر میں شامل تمام ہی نظمیں اتحاد اسلامی کے جوش و جذبے سے لکھی گئیں اور طرابلس اور جنگ بلقان کے مجروحین کے فنڈ کے لیے منعقدہ جلسوں میں پڑھی گئیں۔ ان نظموں میں یورپ کے ظلم و ستم اور ان کی منافقانہ پالیسیوں پر تنقید کی گئی ہے۔ نظموں کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے، ہندوستانی مسلمانوں نے ترکوں سے محبت اور تعلق کو نبھانے کے لیے ہندوستان کے چھوٹے بڑے تمام شہروں اور قصبات میں مہم چلائی۔ ۲۱ مئی ۱۹۱۳ء کو مولانا ابوالکلام آزاد کی موجودگی میں شاہ قسیم الدین نے جو نظم پڑھی وہ مسلمانوں میں جذبۂ حریت اور جرأت پیدا

کرنے کا موجب بنی[۱۴۱]۔ وہ یورپ کی شاطرانہ چالوں کی نشان دہی اور مجروحین کی امداد کے لیے ۲۳ مئی ۱۹۱۳ء کو بھی ایک نظم بانکی پور کے اجلاس میں پڑھی۔ اس نظم میں وہ کہتے ہیں کہ:

خدا سب کو بچائے مکر سے ابلیس یورپ کی
یہ وہ فتنے ہیں جو ہشیار کو غافل بناتے ہیں

کہیں گے کچھ کریں گے کچھ یہی گرُ حکومت کا
اسی کو ڈپلومیسی اپنی وہ حضرت بتاتے ہیں

ستم گارانِ یورپ ہوش میں آئیں سنبھل جائیں
انھیں اب جرأتِ آبائی کے جوہر دکھانے ہیں[۱۴۲]

ترکوں کی بہادری اور انور بے کی جرأت کی تعریف کرتے ہوئے ۲۶ مئی ۱۹۱۳ء کو منعقدہ ایک اجلاس میں پڑھی گئی اس نظم کے اشعار میں جو مبالغہ آمیز انداز اختیار کیا گیا اس کا اندازہ ان اشعار سے لگایا جاسکتا ہے:

تظلم کی لگی ہیں اپنے دل میں برچھیاں لاکھوں
ستم گارو سمجھ رکھو مزا اس کا چکھا دیں گے

رہے سایہ فگن انور اگر چندے جو ترکی میں
تو کل ہم صوفیہ میں فتح کے جھنڈے اڑا دیں گے

صلاح الدین ثانی ان کو تم سمجھو مسلمانو
یہ انور بے دلوں کو اہلِ یورپ کی ہلا دیں گے[۱۴۳]

ظاہر سی بات ہے کہ یہی اس زمانے کے مسلمانوں کا رویہ تھا۔ شاعر بھی اسی رومانوی فضا میں حقائق کے برخلاف ایک خواب آور فضا میں ڈوب کر ایسے بلند و بانگ دعوے کر رہے تھے جن کا پورا ہونا تقریباً ناممکن تھا۔ شبلی نے جن موضوعات کو شاعرانہ انداز میں بیان کیا تھا، بے شمار غیر معروف شعرا اس عہد میں اس کی تتبع کر رہے تھے۔ خود قسیم الدین نے بھی شبلی کی ''شہر آشوب اسلام'' سے متاثر ہو کر جنگ بلقان پر ایک نظم لکھی۔ ملاحظہ کیجیے:

غبارِ کفر کے سر پر رہیں گی بدلیاں کب تک
چلیں گے ظلم و ذلت کی ہمیں پر آندھیاں کب تک

مراکش مصر و چیں فارس گئے اپنے حکومت سے
گریں گی قہر و آفت کی خدایا بجلیاں کب تک

یہ شورِ جنگ بلقاں کی ہماری آفتِ جاں ہے
شہیدِ ظلم کے خوں سے بہیں گی ندیاں کب تک[۱۴۴]

اس دور کا مسلم ہندوستانی معاشرہ عجیب طرح کے تضادات کا شکار نظر آتا ہے۔ وہ جن ترکوں کی حمایت پر کمربستہ تھے، ان کی اندرونی خلفشار ہی انھیں سنبھلنے نہیں دے رہے تھے۔ عرب علاقوں میں بھی ترکوں کے خلاف بغاوت کے رجحانات جنم لے چکے تھے۔ جب عربوں نے ترکوں کے خلاف بغاوت کی تو ان کے بطور خلیفہ سلطان سے وفاداری ان کے سدّ راہ ہوئی اور نہ اسلامی اخوت کا خیال ہی ان کے دل میں پیدا ہوا۔ ہندوستان کے مسلمان اس بات پر حیرت زدہ تھے کہ عرب اپنے ہم مذہب کے مقابلے میں غیر مسلم سیادت کو کیوں ترجیح دے رہے ہیں۔ انھیں اچھی طرح ادراک تھا کہ سلطنت عثمانیہ بہت کمزور ہو چکی

ہے[۱۴۵]۔ لیکن وہ پھر بھی مسلم وفاق کی بحالی اور مسلم امہ کے تحفظ کو دیکھ رہی ہے۔ ہندوستانی حکومت بھی مسلمانوں کے جذبات سے پوری طرح واقف تھی اور وہ ان جذبات سے کسی حد تک ہمدردی بھی رکھتی تھی۔ برصغیر کے مسلمانوں کی جانب سے جو مقدمہ پیش کیا گیا ہندوستانی حکومت نے اس کی حمایت بھی کی۔ برطانوی وزیر اعظم لائڈ جارج نے ہندوستانی مسلمانوں کے جذبات کی تسکین کے لیے پارلیمنٹ میں یہ بیان بھی دیا کہ برطانوی حکومت ایسے کسی ارادے کی حمایت نہیں کرتی جس کے تحت ترکی کے حصے بخرے کیے جانا مقصود ہو[۱۴۶]۔

لیکن درپردہ مغربی قوتیں ہر صورت میں خلافت کے خاتمے کی ہر اس کوشش پر کمربستہ تھیں جس سے ترک تسلط کے حصے بخرے کرنے کو ممکن بنایا جاسکے۔ اٹلی کے بارہا اعلان کے باوجود کہ وہ سلطنت عثمانیہ کی بقا اور سلامتی کے آرزومند ہیں، بغیر کسی رنجش واختلاف کے اپنی پچاس ہزار فوج کے ساتھ طرابلس پر حملہ کرنا، جنگی جہازوں سے ترک علاقوں پر یوسیا کے شہر پر گولہ باری، بحر ایجین کے متعدد جزائر پر قبضے، مصر کی جانب سے بحری راستوں پر برطانوی تسلط جس نے مزید ترک کمک کو طرابلس جانے سے روکنے میں اٹلی کی مدد بھی کی وغیرہ جیسی صورت حال اس بات کی طرف واضح شواہد ہیں کہ برطانیہ اور مغربی استعمار اندرونِ خانہ کیا چالیں چل رہے تھے۔ ۱۹۱۲ء میں بالآخر صلح نامہ نوران پر دونوں حکومتوں کے دستخط کے بعد طرابلس پر اٹلی کے قبضے کو تسلیم کر لیا گیا۔ معاہدے کے باوجود ترک مجاہدین اور آزادی کے متوالوں نے جدوجہد جاری رکھی۔ ۱۹۲۷ء میں اٹلی نے اس جدوجہد کو کچلنے کے لیے جدید آتشیں اسلحے کا آزادانہ استعمال شروع کیا اور ۱۹۳۱ء تک سنوسیوں کو کامل شکست ہوئی۔ ان کے قائد کو پھانسی پر لٹکایا گیا۔ ۱۹۱۳ء تا ۱۹۳۱ء تک اٹلی کے ہولناک کردار کی بابت ایک انگریز نامہ نگار فرانسس مار کو جو اس وقت اطالوی فوج کے ساتھ جنگی رپورٹنگ پر معمور تھا، نے لکھا کہ لوگوں کو قتل کر کے عورتوں اور بچوں کو سکرات موت کی حالت میں بے یارومددگار چھوڑ دیا جاتا۔ اس نے اطالوی فوج کو ڈاکوؤں اور قزاقوں کا گروہ قرار دیا۔ ایک اور جرمن نامہ نگار نے لکھا کہ اٹلی کے فوجی جرنیلوں نے ہر قسم کے قوانین کی کھلم کھلا خلاف ورزی کی۔ تمام قیدیوں کو بے دریغ موت کے گھاٹ اتارا۔ ۱۴ برس کی عمر سے زیادہ تمام افراد کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ تین روز تک ایسا قتل عام جاری رہا کہ کوئی عرب انھیں دکھائی دے، اسے گولی سے اڑا دیا جاتا۔ ہر طرف لوٹ مار، قتل وغارت گری کا بازار گرم تھا۔ جگہ جگہ بوڑھوں اور بچوں کی نعشیں پڑی سڑ رہی تھیں۔ اندازاً طرابلس پر قبضہ کرنے کے بعد ان اطالویوں نے بیس ہزار اشخاص کو تختہ دار پر لٹکایا۔ یہ فوجی جہاں جاتے عورتوں پر پل پڑتے، ان کی عصمت دری کرتے۔ امیر شکیب ارسلال کے مطابق دینی کتب اور قرآن مجید کی جلدوں کو اٹھا اٹھا کر زمین پر پھینکا جاتا، انھیں پیروں سے مسلا جاتا، شراب سے تر کیا جاتا۔ علما کو جہاز پر بٹھا کر نیچے پھینک دیا جاتا۔ غرض ان اطالویوں نے طرابلس میں وہ لرزہ خیز مظالم ڈھائے کہ اس کی ہولناکی کا تصور بھی محال ہے[۱۴۷]۔ روس، فرانس اور برطانیہ قہر الٰہی کے بھیڑیے بن کر مسلمانوں کے ملک و دولت کو ہڑپ کرنے کے درپے تھے۔ بیسویں صدی کے آغاز سے ہی ترکی اور ایران کی تکابوٹی کرنے کے

باقاعدہ منصوبے بنائے جا رہے تھے۔ سلطنت عثمانیہ کی بحری قوت اور برتری کے علاوہ بری مقبوضات کو بھی سب سے زیادہ نقصان انگریزوں نے پہنچایا، پھر بھی وہ ہمیشہ ترکی سے دوستی کا دم بھرتے رہے۔ ایسی بے حیائی کی نظیر تاریخ میں شاید ہی کہیں اور مل سکے[۱۴۸]۔

اس صورت حال میں ضرورت اس امر کی تھی کہ اسلام کے ملی تشخص کو ابھار کر تمام مسلم ممالک کے باہمی تعاون سے ایک مضبوط اسلامی اتحاد کی تحریک شروع کی جائے۔ اتحاد اسلامی کے اس جذبے کو فروغ دینے کے لیے مولانا محمد علی جوہر نے ''کامریڈ''، مولانا ظفر علی خان نے ''زمین دار'' اور مولانا ابوالکلام آزاد نے ''الہلال'' کا سہارا لیا۔ مولانا شوکت علی نے مولانا عبدالباری کے ساتھ مل کر ''انجمن خدام کعبہ'' قائم کی تاکہ مقاماتِ مقدسہ کو غیر مسلموں کے ہاتھوں محفوظ رکھنے کی تحریک چلائی جاسکے[۱۴۹]۔ اس انجمن کی بھی خصوصی تاریخی اہمیت ہے۔ ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد نے جماعت ''حزب اللہ'' کے اغراض و مقاصد کا اظہار اور اس کی تشکیل کا فیصلہ انجمن خدام کعبہ کے قیام و مقاصد کے اعلان کے بعد کیا۔ ۱۹۱۳ء تک جتنے مقبوضات ترکی خلافت و انتظام سے نکل چکے تھے، اس کا آغاز تو نصف صدی قبل ہی ہو چکا تھا لیکن اس کی انتہا کے بارے میں کوئی حتمی بات نہیں کی جاسکتی تھی۔ برصغیر کے مسلمان خود غلام ہونے کے باوجود اس زمانے میں ترک خلافت کے زوال اور دشمنوں کی ریشہ دوانیوں سے سخت بے چینی محسوس کر رہے تھے۔ اس پس منظر میں ''انجمن خدام کعبہ'' کا قیام عمل میں لایا گیا[۱۵۰]۔ انجمن کے قیام سے متعلق متعدد تحریروں میں اس کے قیام کی تاریخ ۶ مئی ۱۹۱۳ء بتائی گئی ہے[۱۵۱]۔ مولانا صبغت اللہ شہید کے مطابق:

> اٹلی کے طرابلس الغرب پر حملے کے بعد ہندی درد مندانِ اسلام کو اس لیے بھی خانہ کعبہ کی حفاظت کی زیادہ فکر پیدا ہو گئی تھی کہ عمانویل شاہ اطالیہ نے ایک موقعے پر یہ بھی کہا تھا کہ ہمارے ہوائی جہاز مسلمانوں کے کعبے سے بھی نمٹ لیں گے[۱۵۲]۔

اس بیان نے مسلمانوں کے قلوب کو اضطراب میں مبتلا کر دیا۔ بہی خواہانِ اسلام یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ مرکز اسلام کی حفاظت، عزت و حرمت کے لیے ترکی اسلامی حکومت پر تکیہ نہیں کیا جاسکتا[۱۵۳]۔ ظاہر سی بات ہے کہ خود ترکی کی خلافت بد ترین زوال کا شکار ہو کر اس وقت اپنی آخری سانسیں لے رہی تھی لہٰذا ہندوستانی مسلمانوں نے حرم پاک کی حفاظت کے لیے اور حجاز مقدس کو محفوظ رکھنے کے لیے خود ہی عملی جدوجہد کا فیصلہ کیا۔ مولانا عبدالباری فرنگی محلی کو سب سے پہلے اس تحریک کے آغاز اور انجمن کے قیام کا خیال آیا۔ انھوں نے مولانا شوکت علی اور مولانا محمد علی جوہر سے مل کر اس خیال کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش شروع کی۔ مولانا فرنگی محلی سے علی برادران کی پہلی ملاقات ۳۱ دسمبر ۱۹۱۲ء کو ہوئی۔ بعد کی ملاقاتوں میں دیگر امور اور مسائل زیر بحث آئے۔ دستور سازی کے لیے کمیٹی تشکیل دی گئی۔ ۶ مئی ۱۹۱۳ء کو دستور پیش کیا گیا۔ مفتی محمد رضا انصاری فرنگی محلی نے ان واقعات کو بڑی وضاحت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ انھوں نے مفتی عنایت اللہ فرنگی محلی کی ایک تحریر کی روشنی میں انجمن

خدام کعبہ کے قیام کی تاریخ اور اغراض و مقاصد پر بھرپور روشنی ڈالی ہے۔ جس کے مطابق مولانا عبد الباری فرنگی محلی نے مفتی عنایت سے جو فرنگی محلی کے نوجوانوں کی علمی انجمن ''مجلس اصلاح'' کے سیکریٹری تھے، فرمایا کہ مسٹر محمد علی کو لکھو کہ اگر ہند اور بیرون ہند کے ملی مسائل کے سلسلے میں ہم لوگوں کی خدمات درکار ہوں تو ہم حاضر ہیں۔ علی برادران دسمبر ۱۹۱۲ء میں مسلم یونی ورسٹی فاؤنڈیشن کمیٹی اور آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس میں شرکت کی غرض سے جب لکھنؤ آئے، پہلی مرتبہ شبیر حسین قدوائی کے ہمراہ ۳۱ دسمبر ۱۹۱۲ء کو فرنگی محل بھی تشریف لے گئے۔ اسی دن انجمن خدام کعبہ کی داغ بیل پڑی[۱۵۴]۔ اس انجمن کے قیام کی صراحت کرتے ہوئے ''کامریڈ'' میں اس کے اغراض و مقاصد پر تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے[۱۵۵]۔ اس کے معتمدین و اراکین میں مولانا عبد الباری فرنگی محلی، حکیم عبد الولی، ڈاکٹر ناظر الدین حسن، مولانا محمد علی جوہر، مسٹر شوکت علی، اور شبیر حسین قدوائی شامل تھے[۱۵۶]۔ برطانوی حکومت نے اس انجمن پر شکوک و شبہات کا اظہار کیا۔ ایزامنگر کی رپورٹ محررہ ۲۰ فروری ۱۹۱۴ء میں جن لوگوں پر خاص نظر رکھی گئی ہے ان میں سر فہرست مولانا محمد علی، اس کے بعد مولانا شوکت علی جو علی گڑھ میں اس انجمن کا اثر و رسوخ بڑھا رہے تھے، اس کے بعد مولانا عبد الباری فرنگی محلی کا جو لکھنؤ میں مسلمانوں کو ابھار رہے تھے اور اس حوالے سے چندہ بھی جمع کر رہے تھے۔ ان حضرات کے علاوہ مشیر احمد قدوائی اور بھائی خان بہادر مقبول حسین کا بھی ذکر کیا گیا جن کو سلطان ترکی نے اسلام کی خدمت کے صلے میں قسطنطنیہ میں خطاب سے نوازا۔ انجمن کی ان ہی سرگرمیوں کی وجہ سے علی برادران گرفتار اور نظر بند کیے گئے[۱۵۷]۔ خدام کعبہ کے نام سے انجمن کے ترجمان، رسالے کا اجرا بھی کیا گیا۔ اس کے لکھنے والوں میں مولانا ابو الکلام آزاد، مولانا عبد الباری فرنگی محلی، سید شمس الدین قادری، مشیر حسین قدوائی، ظفر احسن علوی، شیخ عبد العزیز سندھی، شیخ عبد الرحمٰن اور فاطمہ صغرا وغیرہ کافی اہمیت کی حامل ہیں۔ مولانا شوکت علی نے اس کی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، لیکن ناکافی اسباب، نشر و اشاعت اور کارکنوں کی کمی کے باعث ان کے منصوبوں کو وہ کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ مالی معاملات میں بے احتیاطی نے بھی اس کی ساکھ کو متاثر کیا[۱۵۸]۔ ان موضوعات کو مد نظر رکھتے ہوئے متعدد شعرا نے قلم اٹھایا۔ یہاں تک کہ اس کی بابت یہ تک کہا کہ:

جس کو خدمت سے گریز، اس کو ہے کعبے سے گریز — اور گریز اس کو ہے اسلام سے نفرت گویا[۱۵۹]

اس انجمن کی مخالفت اور اس کے بارے میں کیے گئے تحفظات کے اظہار پر بھی سخت تنقید کی گئی۔ قمر سندیلوی میں علی گڑھ کالج کے پرنسپل کی جانب سے خالصتاً اس دینی انجمن کو سیاسی انجمن قرار دینے پر کہا کہ:

مجھ کو حیرت ہے پڑے ہیں کیسے عقل پر — کہتے ہیں ''خدامِ کعبہ'' کو سیاسی انجمن
کیا کہیں اس کے سوا، آتا ہے رونا فہم پر — یہ سیاسی ہے تو پھر ہے کون دینی انجمن
افسرِ اعلیٰ ہی کالج کا جو یہ کہنے لگے — وائے برحالِ زبونِ قوم و قوی انجمن[۱۶۰]

انتشار زدہ قوم کے لیے انجمن خدام کعبہ دراصل امید کی کرن تھی جو باہمی اتحاد اور یک جہتی کے فروغ کا ذریعہ بن سکتی تھی، اسی لیے شاعر اس جانب اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

دینِ احمدؐ ہے سکھاتا اتحاد و اتفاق	اس لیے سارے مسلمانوں میں ایکا چاہیے
خانہ جنگی کا تخیل نام کو آنے نہ پائے	طاق ہی میں باہمی جھگڑوں کو رکھنا چاہیے
ذلت و خاشاک اٹھے، ہر طرف ہو روشنی	قوم کو چلنے کو ایسا صاف رستہ چاہیے
اس سے بڑھ کر اور کیا ہے اک مسلماں کے لیے	شرکتِ جمعیتِ ''خدامِ کعبہ'' چاہیے[۶۱]

محمد علی صحیح معنوں میں ایک شیر دل قائد تھے۔ انھوں نے اتحاد اسلامی قائم رکھنے اور انگریزوں کی قاہرانہ طاقت سے ٹکر لینے کے لیے تعلیم یافتہ طبقے کے ترقی پسند اور مذہبی طبقے کے حریت پسند عناصر میں اشتراک پیدا کر کے ایک طرف خلافت کی سیاسی تحریک کی بنیاد ڈالی تو دوسری جانب وہ دیگر مکتب فکر کے ساتھ مل کر ہندوستان کی سیاست میں ایک موثر قوت بن کر ابھرے[۶۲]۔ ۳مارچ ۱۹۱۴ء کا دن امت مسلمہ کے لیے کسی المیے سے کم نہیں تھا کہ اس دن تیرہ سو سال سے زائد عرصے تک قائم رہنے والی خلافت کا خاتمہ ہو گیا[۶۳]۔ خلافت کے خاتمے میں جہاں بیرونی جارحیت نے اہم کردار ادا کیا وہیں مسلمانوں کی آپس کی چپقلش نے بھی اس تحریک کو کمزور کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ سید امیر علی نے مسئلہ خلافت پر ایک طویل مضمون تحریر کیا، جس میں انھوں نے بتایا کہ شیعہ فرقے میں امام اور سنیوں میں خلیفہ کا تصور موجود ہے۔ ان کی رائے میں خلیفہ کے انتظام حکومت کی ذمہ داری کسی کونسل یا پارلیمنٹ کو منتقل کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ انھوں نے مختلف ادوار میں خلیفہ کی مطلق العنانیت پر سخت تنقید کرتے ہوئے عثمانی سلطان سلیم اعظم سے لے کر سلطان عبدالحمید ثانی تک کے اکثر خلفا کو آمر مطلق قرار دیتے ہوئے سخت نکتہ چینی کی۔ امیر علی اور آغا خان نے مشترکہ طور پر تحریر کردہ مراسلہ انقرہ روانہ کیا۔ ۲۴ نومبر ۱۹۲۳ء کو لندن سے ارسال کردہ یہ مراسلہ ترکی پہنچا جو ترکی کی قومی اسمبلی میں بم کے گولے کی طرح گرا۔ مراسلے نے گرما گرم بحث کا آغاز کیا۔ اس کے شائع کرنے والوں کے خلاف خصوصی فوجی عدالتوں میں قانونی چارہ جوئی کی گئی۔ غرض کہ اسی مراسلے نے ۳مارچ ۱۹۲۴ء کے مشہور واقعے کو جنم دیا[۶۴]۔ امیر علی کی بابت ہم سب جانتے ہیں کہ وہ شیعہ رہنما تھے اور برطانیہ میں سرکاری جج کے معزز عہدے پر فائز تھے[۶۵]۔ شہنشاہ کی خصوصی مشاورتی کونسل ''پریوی کونسل'' کے بلند مقام تک پہنچے۔ وہ ہمیشہ مشرق وسطیٰ، جنوبی ایشیا اور ترکی جیسے مسائل کے بارے میں انگریز سرکار کے حمایتی اور پُر زور وکیل بنے رہے۔ روس دشمنی کے سبب وہ انگریزوں کے حمایتی ضرور تھے لیکن حیرت کی بات ہے کہ انھیں ترکی کے ٹکڑے ٹکڑے کرنے کی روس اور برطانیہ کی مشترکہ سازشوں کا کیوں کر علم نہ ہو سکا[۶۶]۔ لندن کے ''دی ٹائمز'' میں مستقل مراسلے لکھ کر وہ ہمیشہ ترک عثمانی سلطنت اور برطانوی مدد و اعانت کو ایک دوسرے کے مفاد میں قرار دیتے رہے[۶۷]۔ اسی طرح آغا خان کا تعلق ''اسمٰعیلیہ'' فرقے سے تھا جس کے

ڈانڈے حسن بن صباح سے ملتے ہیں۔ وہ خود اس بات کا اعتراف کر چکے ہیں کہ وہ برطانوی سیکرٹ سروس کے ایجنٹ تھے[۱۶۸]۔ یہ فرائض انھوں نے لارڈ کرزن کے دور میں انجام دیے۔ وہ گورنر کو ذاتی طور پر جانتے تھے اور ہندوستانی رہنماؤں سے متعلق معلومات فراہم کیا کرتے تھے۔ سلطان عبدالحمید کے پاس پیش ہو کر انھوں نے فلسطین میں یہودیوں کی ایک بستی بسانے کی باقاعدہ ایک درخواست بھی کی تھی۔

آغاز خان اور امیر علی کے مشترکہ مراسلے کی بابت میم کمال اوکے نے بڑی تفصیل سے اسے موضوع بحث بنایا ہے[۱۶۹]۔ اس مراسلے سے پیدا ہونے والے بحران کا مجموعی جائزہ لینے سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ مراسلہ ایک سازش کے تحت لکھا گیا تھا۔ انقرہ کی حکومت کو یقین تھا کہ یہ سب انگریزوں کا کیا دھرا ہے۔ اس موضوع پر بے شمار رسالے، پمفلٹ، کتابچے اور کتب شائع ہوئیں[۱۷۰]۔ متضاد خیالات کو یکجا کر کے نتیجہ اخذ کرنے کے لیے ترک پارلیمنٹ میں بحث بھی جاری رہی۔ بالآخر ۳مارچ ۱۹۲۴ء کو اس موضوع پر آخری بار بحث ہوئی۔ بحث عرفہ کے رکن پارلیمنٹ شیخ صافت افندی اور ۵۳ دوسرے اراکین کی جانب سے خلافت کا خاتمہ اور عثمانی خاندان کو ملک بدر کرنے سے متعلق پیش کردہ غیر سرکاری بل کے اوپر بحث شروع ہوئی[۱۷۱]۔ کتامونو، واصف بے، خالد بے وغیرہ کی تقریروں کے بعد یہ فیصلہ ہوا کہ وقت آگیا ہے کہ بودی پالیسی کو ترک کر دیا جائے اور ترک اپنے وجود کو مہذب اور جدید خطوط پر استوار کرے۔ وزیر اعظم عصمت پاشا نے اعلان کیا کہ آئندہ سے ترکی اس دعوے کے ساتھ کہ ''خلافت میرے پاس ہے'' دوسرے مسلمان ملکوں یا اقوام کے معاملات میں دخل اندازی نہیں کرے گا[۱۷۲]۔ خلافت کے مکمل طور پر ختم اور ساقط کیے جانے کی خبر نے دنیا کو ہلا کر رکھ دیا۔ ہندوستان میں موجود مبصرین اور عینی شاہدین کا کہنا تھا کہ اس سانحے سے تحریک خلافت کو زبردست دھچکا لگا اور اسے ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا۔ یہ پوری تحریک یکایک بیٹھ گئی۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان اتحاد جس کی بابت خلافت تحریک نے اہم کردار ادا کیا تھا، کا خاتمہ ہو گیا۔ گاندھی جی جو تحریک خلافت کے بڑے حمایتی بن کر مولانا ظفر علی خان اور دیگر شعرا سے خراج تحسین حاصل کر چکے تھے۔ تحریک خلافت کی حمایت پر گاندھی کی بابت ظفر علی خان کہتے ہیں کہ:

گاندھی نے آج جنگ کا اعلان کر دیا — باطل کر حق سے دست و گریبان کر دیا
ہندوستاں میں ایک نئی روح پھونک دی — آزادیِ حیات کا سامان کر دیا
شیخ و برہمن میں بڑھایا وہ اتحاد — گویا انھیں دو قالبِ یک جان کر دیا
تن من کیا نثار خلافت کے نام پر — سب کچھ خدا کے نام پر قربان کر دیا[۱۷۳]

نظم ''اعلانِ جنگ'' کے یہ اشعار اس بات کے گواہ ہیں کہ اس زمانے کی ہندو و مسلم قیادت باہمی اتحاد و اتفاق پر کس قدر زور دے رہی تھی اور اس بھائی چارے کی فضا کو بر قرار رکھنے کی ہر ممکن کوششوں میں مصروف کار تھی، لیکن خلافت کے خاتمے کے بعد اتحاد کے اس پودے کی آبیاری ممکن نہ رہی۔ وہ نعرہ جس پر شاعر پُر زور انداز سے کہہ رہا تھا کہ:

ہندو جو شیر ہوں تو مسلمان ہوں شکر	دونوں میں اتفاق کا رشتہ بڑھائے جا[۱۷۴]

لیکن یہ رشتہ مزید زیادہ عرصے بر قرار نہ رہ سکا۔ اس دور کے شعرا کے رویے میں ایک رومانی انداز ضرور پایا جاتا تھا۔ مقصد سے رومانیت کا یہ انداز اس دور کے بعض ایسے شعرا کے ہاں بھی دکھائی دیتا ہے جن کو اس تحریک سے کوئی لینا دینا نہیں تھا۔ حالات اور گردشِ دوراں ضرور انھیں یہ سوچنے پر مجبور کر رہے تھے، لیکن وہ ذہنی و فکری طور پر اس تحریک سے وابستہ نہیں تھے، پھر بھی امت کے بکھرنے اور منتشر ہونے کا دکھ ان سے متعلقہ موضوعات پر شعر کہلوا رہا تھا۔ اس کی عمدہ مثال آرزو لکھنوی کی ہے جو بلاد اسلامیہ کی حالت زار پر اپنے رنج و غم کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

ملتان ہو کہ ایراں ترپولی یا مراکو	اک وقت میں لُٹا ہے ہر کارواں ہمارا
کیا کام اس شجر سے سر سبز ہو کہ سوکھی	جس پر نہیں ہے باقی اب آشیاں ہمارا
یا گھر میں بیٹھنا تک دشوار ہو گیا ہے	یا ایک وقت میں تھا سارا جہاں ہمارا[۱۷۵]

اس دور میں ایسی نظمیں زبان زدِ عام و خاص ہوئیں جو فنی لحاظ سے محض تک بندی کی حیثیت رکھتی تھیں لیکن تحریکِ خلافت سے متعلق عوامی جذبات کا بے ساختہ اظہار کرتی تھیں۔ ان میں ایک نظم جس کا عنوان ''صدائے خاتون'' تھا، بے حد مشہور ہوئی[۱۷۶]۔ یہ نظم بی اماں (والدہ علی برادران) کی اپنے بیٹوں کے نام نصیحت پر مبنی ہے جس میں وہ اپنے بیٹوں کو خلافت پر جان قربان کرنے کی نصیحت کرتی دکھائی دیتی ہیں۔ یہ اس دور کی مقبول ترین نظموں میں سے ایک ہے۔

بولیں اماں محمد علی کی	جان بیٹا خلافت پہ دے دو
ساتھ تیرے ہے شوکت علی بھی	جان بیٹا خلافت پہ دے دو
بوڑھی اماں کا کچھ غم نہ کرنا	کلمہ پڑھ کر خلافت پہ مرنا
ہوتے میرے اگر سات بیٹے	کرتی سب کو خلافت پہ صدقے
ہیں یہی دینِ احمد کے رستے	جان بیٹا خلافت پہ دے دو
حشر میں حشر برپا کروں گی	پیش حق تم کو لے چلوں گی
اس حکومت پہ دعویٰ کروں گی	جان بیٹا خلافت پہ دے دو[۱۷۷]

اس کے علاوہ بعض اشعار میں مبالغہ آمیز رنگ اختیار کرتے ہوئے شاعر نے اس دور کے سیاسی و سماجی حقائق کو کلی طور پر نظر انداز کر دیا ہے۔ جیسے:

آسماں ٹوٹ پڑے اور زمیں کھا جائے　　جو خلافت کو مٹانے پہ کھڑا ہو جائے

کیوں خلافت کے مٹانے پہ کمر باندھی ہے　　ہوش میں آ کہیں یورپ نہ فنا ہو جائے

کیا کروں یا رب کوئی دل بر نظر نہیں آتا　　بس خلافت کے سوا کچھ نظر نہیں آتا

خلافت کا جھگڑا اٹھایا ہے جس نے　　وہ مٹ جائے یہ التجا کر رہے ہیں[۱۷۸]

یورپ تو نہ مٹا البتہ خلافت کا وجود ضرور مٹ گیا۔ یہاں ہمیں اقبال کا نظریہ، خلافت کمیٹی کے ارکان سے خاصا مختلف اور مبنی بر حقیقت دکھائی دیتا ہے۔ ان کے خیال میں خلافت مانگی نہیں بلکہ بزور قوت حاصل کی جاتی ہے۔ چناں چہ مولانا محمد علی جوہر جب برطانوی ارباب اختیار کو عثمانی سلطنت کو برقرار رکھنے پر آمادہ کرنے کے غرض سے وفد لے کر لندن گئے تو اقبال نے سخت مخالفانہ رویہ اختیار کرتے ہوئے طنزاً کہا کہ:

اگر ملک ہاتھ سے جاتا ہے جائے　　تو احکامِ حق سے نہ کر بے وفائی

نہیں تجھ کو تاریخ سے آگہی کیا　　خلافت کی کرنے لگا تو گدائی

خریدیں نہ ہم جس کو اپنے لہو سے　　مسلماں کو ہے ننگ وہ بادشاہی[۱۷۹]

مجلس خلافت اور اس کی شورش، سیاسی اور مذہبی سے زیادہ جذباتی نوعیت رکھتی ہے۔ مسلمانوں کا مقصد ترکی خلافت کو بحال کرنا تھا لیکن ہندوؤں کی لڑائی "سواراج" یعنی سیاسی آزادی حاصل کرنے کی غرض سے تھی۔ تقریباً تین سال خلافت اور سواراج کی لڑائی شدت سے جاری رہی جس کے بعد انگریزوں کی مخالفت کا زور لا محالہ بڑھتا رہا[۱۸۰]۔ ستمبر ۱۹۶۱ء میں علی برادران کو خلافت کانفرنس میں باغیانہ تقاریر کرنے کے جرم میں دو برس کی سزا ہوئی۔ اس پس منظر میں کہی گئی ایک نظم:

کہہ رہے ہیں کراچی کے قیدی　　ہم تو جاتے ہیں دو دو برس کو[۱۸۱]

بھی بے حد مقبول ہوئی۔ یہ ترانہ اس دور کے بچے، بوڑھے اور نوجوان، سب کی زبان پر تھا۔ اس تناظر میں مغربی استعماری رویّے کے خلاف معروف شعرا کے ساتھ کچھ غیر معروف شعرا نے بھی اپنے محسوسات کو قلم بند کیا۔ یہ رویّے کبھی تو استعماری رویّوں کے خلاف ایک رد عمل کی صورت میں ظاہر ہوتے جس میں برطانوی استعمار اور اس کے حلیفوں سے سوالیہ انداز میں طنزاً پوچھا گیا کہ جیسا کہ سید علی نقی صفی کا یہ شعر ملاحظہ کیجیے:

ایران ہو یا ٹرکی دونوں کو مٹا دیں گے　　کیا صفحۂ ہستی سے اسلام مٹا دیں گے[۱۸۲]

اور کبھی مایوسی کی کیفیت میں مجموعی سیاسی فضا اور مسلمانوں کی پے در پے شکست پر جسٹس شاہ دین ہمایوں جیسے اصحاب فکر نے اضطراری حالت میں کہا کہ:

بجلی نے جب کہ اپنا نشیمن جلا دیا رنگِ چمن پہ کون دل و جاں فدا کرے
اے ہم صغیر! حالتِ گل اب یہ ہے کہ تو شاخِ شجر سے نوحہِ ماتم بپا کرے[۱۸۳]

میر غلام نیرنگ نے شاعرانہ رمز و کنایہ میں مسلمانوں کو انگریزوں کے شاطرانہ مکر و فریب سے متعلق نہ صرف آگاہ کیا بلکہ خلافت کے خاتمے سے متعلق عالمی سطح پر ہونے والی گٹھ جوڑ کا پردہ بھی چاک کیا۔ وہ مسلم امہ کی بے خبری اور بے عملی سے متعلق کہتے ہیں کہ:

تجھے اے بلبلِ رنگیں نوا سوجھی ہے گانے کی مگر مجھ کو پڑی ہے فکر تیرے آشیانے کی
یہ گل چیں، باغ باں، صیادم، یہ تیرے کرم فرما لیے بیٹھے ہیں دل میں حسرتیں تیرے مٹانے کی
مگر اک تو ہی غافل ہے مآلِ کارِ گلشن میں ترے حصے میں آئیں غفلتیں سارے زمانے کی
پرانے برگ و گل سب چھانٹیں جائیں گے خیاباں سے لگی ہے باغ باں کو دھن نیا گلشن بنانے کی[۱۸۴]

وہ مغرب کے عزائم سے خبر دار کرنے کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کو خواب غفلت سے بیدار کرنے کی تدبیر اور سامان کرنے کا پیغام بھی دینا اپنا اوّلین فرض سمجھتے ہیں۔ ان کے خیال میں مسلمانوں کی موجودہ بے کسی اور لاچاری کے ذمے دار خود مسلمان ہی ہیں۔ ان کے مطابق:

غضب ہے آج تیری غفلتیں رسوائے عالم ہوں سمجھتے تھے تجھے ہم چشم کل تک ہوشیاروں میں
خدا ہی حافظ و ناصر ہے تیری قومِ بے کس کا شمار اس کا ہے مدت سے حوادث کے شکاروں میں[۱۸۵]

خلافت کا مسئلہ دراصل سارے ہندوستان کا مسئلہ تھا۔ مسلمانوں کی جدوجہد کا بنیادی مقصد تو یہی تھا کہ اس کے نتیجے میں ترکی کی مقبوضات اسے واپس مل جائیں[۱۸۶] لیکن اس جدوجہد کا نتیجہ کچھ نہ نکلا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں نے مل کر تحریک خلافت میں اس لیے حصہ لیا تھا کہ اس کے نتائج ہندوستان کی آزادی پر جا کر منتج ہوں گے۔ اس آزادی کو پانے کے لیے ہمارے ادیبوں، دانش وروں اور شعرا نے کیا کیا جتن نہ کیے۔ مولانا آزاد کی وہ تقریریں اور شذرات جو وقتاً فوقتاً ''الہلال'' اور ''البلاغ'' میں شائع ہوتے رہے، خلافت عثمانیہ کی تحریک سے متعلق تمام تر معلومات کا ماخذ ہیں۔ ایک زمانے تک ہندوستان کے پڑھے لکھے طبقے میں ابوالکلام آزاد کی نثر کا جادو سر چڑھ کر بولتا رہا۔ حسرت جیسے قادر الکلام شاعر نے ان اسلوب کی بابت کہا کہ:

جب سے دیکھی ابوالکلام کی نثر نظمِ حسرت میں کچھ مزا نہ رہا[۱۸۷]

مولانا کی سیاسی زندگی اس قدر نمایاں ہے کہ لوگ ان کے ادبی کمالات سے عموماً غفلت برتتے ہیں۔ ان کی ادبی زندگی کے تین ادوار میں پہلا دور ۱۹۱۲ء تک یعنی اجرائے الہلال کا زمانہ ہے۔ وہ "اندوہ" اور "ولیل" کے مدیر بھی رہے۔ ۱۹۰۴ء میں محض سولہ برس کی عمر میں وہ "لسان الصدق" کے نام سے ماہ وار جریدہ نکال چکے تھے یہ رسالہ ۱۹۰۵ء تک جاری رہا اور اپنے بھائی غلام یٰسین آہ کے ہم راہ سفر عراق کی وجہ سے اسے بند کرنا پڑا[۱۸۸]۔ دوسرا دور ۱۹۱۲ء سے ۱۹۲۲ء تک یعنی "الہلال" کے اجرا سے علی پور جیل جانے تک کا زمانہ ہے۔ اس زمانے کی یادگار "الہلال" اور "البلاغ" کے مجلدات، تذکرہ، قول فیصل، مسئلہ خلافت اور جزیرۃ عرب وغیرہ ہیں۔ یہی وہ زمانہ ہے جب مولانا آزاد اپنی بے پناہ ادب آفرینی اور تجرد علمی کی بدولت پورے ہندوستان میں شہرتِ عام بقائے دوام حاصل کر چکے تھے[۱۸۹]۔ "الہلال" ۱۹۱۴ء میں بند ہوا اور اس کی جگہ "البلاغ" نے لے لی۔ مارچ ۱۹۱۶ء میں یہ بھی بند ہو گیا۔ اس کے بعد مولانا کی جیل یاترا اور ۱۹۲۰ء میں رہائی کے بعد خلافت تحریک سے وابستگی کا زمانہ ہے۔ اس تحریک کے وہ سب سے جوشیلے اور سرگرم معاون کی حیثیت سے ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔ تحریک خلافت میں ان کی بھرپور شرکت نے اس تحریک کو ہندوستان بھر میں مقبول کیا۔ ہجرت کے حق میں سب سے زیادہ فتوے بھی انھوں نے ہی دیے[۱۹۰]۔ ان کے ادبی سفر کا تیسرا دور ۱۹۲۳ء سے شروع ہوتا ہے۔ اس دور کی یادگار "الہلال" کا دوبارہ اجرا اور "ترجمان القرآن" ہے۔ "الہلال" فی الحقیقت مسلمانوں کی انقلابی سیاست کا آئینہ دار تھا۔ مسلمانوں سے متعلق بین الاقوامی معاملات خصوصاً ترکی کے انقلابات، طرابلس اور بلقان کی لڑائیوں کے واقعات اور پھر جنگ عظیم اوّل میں ترکی کی حکمت عملی سے متعلق "الہلال" میں جتنا مواد ملتا ہے، اس دور کے کسی دوسرے رسالے میں اس کی مثال موجود نہیں۔ ترکی سے متعلق اس رسالے میں طویل مباحث ملتے ہیں[۱۹۱]۔

اس پُر جوش نثر کا جو اثر اس وقت کے ہندوستانی مسلمانوں کے دلوں پر ہو رہا تھا اس کا اندازہ اس عبارت سے لگایا جا سکتا ہے جس میں مولانا ابوالکلام آزاد بڑی دردمندی کے ساتھ قوم کو خواب غفلت سے جگانے کے جتن کر رہے ہیں:

> میں وہ صور کہاں سے لاؤں جس کی آواز چالیس کروڑ دلوں کو خواب غفلت سے بیدار کر دے؟ میں اپنے ہاتھوں میں وہ قوت کیسے پیدا کروں جس کی سینہ کوبی کے شور سے سرکشتگانِ خواب موت آور ہشیار ہو جائیں؟ آہ! کہاں ہیں وہ آنکھیں جن کو درد ملت میں خوں باری کا دعویٰ ہے؟ کہاں ہیں وہ دل جن کو زوال ملت کے زخموں پہ ناز ہے؟ کہاں ہے وہ جگر جو آتش غیرت و حمیت کی سوزش کے لذت آشنا ہیں؟[۱۹۲]

۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم میں ترکوں کی حمایت میں خلافت کمیٹی نے عامۃ المسلمین کا ساتھ دیا۔ مالی اور طبی امداد کے علاوہ ہندوستان بھر کے شعرا نے اپنی تحریروں کے ذریعے اس تحریک سے اپنی وابستگی کا اظہار کرنا لازمی سمجھا۔ بنگال کے عظیم قومی شاعر نذر الاسلام نے بھی ایک نظم "کمال پاشا" میں انھیں کچھ اس طرح سے خراجِ تحسین پیش کیا ہے:

کمال تونے کمال کیا بھائی/ ہو ہو کمال تونے کمال کیا بھائی/ شاباش بھائی شاباش تیری شمشیر/ تیری تیز تلوار سے دنیا ڈر گئی/ بھائی! تونے خوب کیا/ تیرے بزدل دشمن میدان چھوڑ کر بھاگ گئے/ شاباش جواں شاباش/ تونے دشمن کا خاتمہ کر دیا/ تیرے دشمن کو شکست ہوئی/ بھائی جو ہوا اچھا ہوا/ قلعہ فتح ہو گیا[193]

اس دور کے سیاسی اور جنگی حالات کا جائزہ لینے کے بعد اس بات کا اعتراف کرنا ہی پڑتا ہے کہ مصطفی کمال پاشا نے جنگی محاذ پر جو بھی فیصلے کیے وہ تدبر سے خالی نہ تھے۔ چھے چھے ماہ تک خندقوں کے اندر ترک فوجوں نے جو مقابلہ کیا، وہ دراصل کمال پاشا کی اسی اپیل کا نتیجہ تھا جو انھوں نے قوم سے کی تھی[194]۔ اس دور میں تحریک اتحاد اسلامی اردو شاعری کا ایک بڑا موضوع تھا۔ ۱۹۱۲ء اور اس کے بعد ہونے والے معرکے اور جنگوں کی منظر کشی پر شعرا نے نہایت تفصیل سے قلم اٹھایا۔ بین الاقوامی سیاسی چال بازیوں سے پردہ چاک کرنے کے ساتھ ساتھ عمل، بیداری اور شعور اجاگر کرنے کے لیے پُرجوش نظمیں کہی گئیں۔ گو اس تحریک کے کوئی خاص نتائج برآمد نہ ہو سکے لیکن اتنا ضرور ہوا کہ دنیا بھر کے مسلمانوں کو ایک دوسرے کے مسائل سے دل چسپی ضرور پیدا ہوئی۔ تحریک کے مختلف رویّوں اور نقطۂ نظر سے حمایت اور مخالفت نے مسلمانوں میں سوچ کے نئے نئے زاویے پیدا کیے۔ مثلاً نوجوان ترک انقلابی جن کے کارناموں سے ترک تاریخ کے اوراق بھرے پڑے ہیں۔ اکبر ان پر طنز کے نشتر چلانے سے گریز نہیں کرتے۔ اکبر چوں کہ خلافت کو ہی مسلمانوں کی راہ نجات کا ذریعہ سمجھتے تھے لہٰذا ان نوجوان ترک پر اکبر کا طنز بھی فطری تھا۔ جب وہ کہتے ہیں کہ:

کیا بحث ایران سے یا ترک و عرب سے — اس وقت تجھے قطعِ نظر چاہیے سب سے
یا تخت پہ بیٹھے کوئی یا تخت سے اترے — رکھ کام تو دن رات فقط طاعتِ رب سے
تاریخ نے دیکھے ہیں بہت رنگ فلک کے — خورشید نکلتا ہے سدا پردۂ شب سے[195]

اسی لیے وہ ترکوں کو بالخصوص اور امت مسلمہ کو بالعموم مل جل کر باہمی اتحاد کے لیے اپنے مسائل کے حل کی طرف توجہ دلانے کی کوشش کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ ایک قطعے ''سلطنت نہ سہی رہو تو مل جل کر'' میں وہ اس بابت کہتے ہیں کہ:

درخت جڑ پہ ہے قائم تو استوار بھی ہے — کبھی خزاں ہے اس پر کبھی بہار بھی ہے
نگاہِ غور کرو سوئے ترکی و ایراں — نئی بنا پہ حریفوں نے کر دیا ویراں[196]

ترک اور ایران مسلمانوں کی دو بڑی سلطنتیں تھیں جو رفتہ رفتہ زوال کا شکار ہو کے اپنے اثر و نفوذ کو کھوتی جا رہی تھیں۔ ان کا وجود ہر طرح سے تباہی و بربادی کا شکار تھا۔ اسی لیے اکبر اس صورت حال پر اضطراب محسوس کر رہے تھے اور قطعے کے آخر میں مسلمانوں کو متحد رہنے کا مشورہ دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

جو بات ٹھیک ہے کہتا ہوں میں اسے کھل کر — کہ سلطنت نہ سہی تم رہو تو مل جل کر[197]

اس دور کے شعرا نے مسلمانوں کے تابندہ ماضی کو بھی موضوع بنایا۔ مجموعی طور پر اس دور کی شاعری بین الاقوامی حالات پر اظہار کرنے کے قابل ہوئی۔ مسلم امہ کی تکلیف محسوس کر کے اس پر نہ صرف اظہار ضروری سمجھا گیا بلکہ مصیبت کے شکار لوگوں کی عملی مدد کی بھی کوشش ہوئی۔

بیسویں صدی کے اردو رسائل و جرائد میں بھی اس عہد کے حالات کا عکس بھرپور انداز میں دکھائی دیتا ہے۔ ۱۹۰۱ء سے لے کر تین دہائیوں کی عملی صحافت اتحاد اسلامی کے جذبات کی بھرپور عکاس ہے۔ نمایاں ترین اخباروں میں ''الہلال''، ''البلاغ''، ''اردوے معلیٰ''، ''ہم درد''، ''انقلاب'' اور ''زمین دار'' وغیرہ نے تو اسلامی دنیا کے بین الاقوامی مسائل ہی کو اپنی اوّلین ترجیح سمجھا۔ ''زمین دار'' اور دیگر اخبارات کے ذریعے لاکھوں روپے کا چندہ جمع ہوا جو ترکی اور طرابلس فنڈ میں جمع ہوا۔ ہندوستانی اخبارات نے لوگوں کو امداد کے لیے واقعتاً بہت اکسایا۔ ہندوستانیوں کے دل طرابلس کی جنگ کی وجہ سے ہمیشہ غم زدہ رہے۔ بلقان کی جنگ کے بعد اخبارات اور رسائل میں یہ خبریں بھی شائع ہوئیں کہ لوگوں نے دو دفعہ کھانے کے بجائے ایک دفعہ ہی کھا کر گزارا کیا لیکن چندے میں بھرپور شرکت کی۔ گوشت کے بجائے مسور کھانے لگے، اپنے گھر کی اشیا فروخت کیں، جامعۂ علی گڑھ، مدرسہ دیوبند اور دیگر تعلیمی اداروں کے نوجوان اپنے گھروں کو لوٹتے ہوئے فرسٹ کلاس میں جانے کے بجائے سیکنڈ اور تھرڈ کلاس میں سوار ہوئے اور ان پیسوں کو ترک متاثرین کے فنڈ میں جمع کرایا۔ پنجاب کی ایک خاتون نے تمام املاک و اراضی چندے کے طور پر دے دی۔ پشاور کی ایک خاتون نے جس کے پاس کچھ نہ تھا، اپنے بچے کو ہی امدادی انجمن کے حوالے کرنے گئی تو لوگوں نے ہزاروں روپے چندہ جمع کر کے بچے کو خریدا اور پھر واپس بچے کو اس کی گود میں بھی ڈالا[۱۹۸]۔

''زمین دار'' میں اس دور کے متعدد شعرا ایسے ہیں جن کے کلام نے اس پوری تحریک کو بام عروج تک پہنچانے میں اہم کردار ادا کیا۔ مولوی فضل حق آزاد بانکی پور، مولوی وجاہت حسین، اکبر، حالی، محمد شمس الدین شائق، طالب بنارسی، خواجہ دل محمد، دلو رام کوثری، خان بہادر محمد حسین شوق، حاذق رام پوری، حکیم فیروز الدین طغرائی اور شفق عماد پوری وغیرہ کی شاعری نے اس دور کے مسلمانوں کے دلوں کو خوب گرمایا۔ مرزا ہادی علی لکھنوی نے بھی روس اور ایران کی جنگ کی حالت کے بیان میں کہا کہ:

مقتل طرابلس کا ہے پیشِ نظر اب تک ۔۔۔ دل غرقِ خوں ہے اب تک ٹکڑے جگر ہے اب تک
دل ہے شرارہ افشاں اور چشمِ نم ہے اب تک ۔۔۔ اور چشم تر اگلتی لال و گہر ہے اب تک[۱۹۹]

اٹلی کے مظالم جس میں لاکھوں مسلمان متاثر ہوئے تھے۔ اس کی بابت شاعر کا بیان ہے کہ:

اٹلی کے وہ مظالم بھولے نہ تھے ابھی ہم ۔۔۔ اس گردشِ فلک نے اک اور دے دیا غم[۲۰۰]

اس کے علاوہ وجاہت جھنجھانوی نے بھی ان داخلی حالات پر عمدہ انداز سے اظہار خیال کیا ہے۔ انھوں نے مغربی استعمار اور اسکے مظالم کا پردہ چاک کرتے ہوئے کہا کہ:

مہذب ڈاکوؤں نے ہاتھ میں تلوار پکڑی ہے مسلماں دیکھتے ہیں یہ جفائیں اپنے ہاتھوں سے
غضب ہے بعض خیر قوم یہ تاکید کرتے ہیں کہ ہم ہرگز نہ اک آنسو بہائیں اپنی آنکھوں سے[۲۰۱]

شمس لکھنوی جو کہ ''سخن سنج'' کے مدیر بھی تھے، ۲۰ اپریل ۱۹۱۹ء میں ظفر علی خان کی رہائی کے بعد ''زمین دار'' کے دوبارہ اجرا کے موقع پر قانونِ زباں بندی کے خلاف فریاد کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ:

جتنا بھی چاہے ستالیں، مجھے بے داد کریں دل شکن بات مگر کوئی نہ ارشاد کریں
گر دعا بھی کوئی لکھتے ہیں تو ہو جاتی ہے ضبط ظلم اتنا تو نہ یہ بانیِ بے داد کریں
خود بھی سنتے نہیں افسوس فسانہ غم کا چاہتے ہیں کہ خدا سے بھی نہ فریاد کریں[۲۰۲]

اسی طرح آغاز غلام حسین ارشد کی نظمیں رسالہ ''تمدّن'' دہلی کے متعدد شماروں میں شائع ہوتی رہیں۔ ان نظموں میں بھی اس دور کے سیاسی مسائل اور اتحاد اسلامی کا موضوع بدرجۂ اتم موجود ہے۔ ۱۹۱۳ء کے شمارے میں ایک نظم ''نالہِ جگر سوز'' میں وہ ہندوستان کے مسلمانوں کو ترک بھائیوں کو مالی امداد دینے کی طرف رغبت دلاتے ہوئے بڑے جذباتی انداز میں کہتے ہیں کہ:

ہمیں کیا حق نہیں حاصل ہے مسلم کی کمائی میں دوا ہی کے لیے کچھ بھیج دو اپنے خزانے سے
نہ کی جب وقت پر امداد پھر کس کام آؤ گے کفن بنواؤ گے جب ہم گزر جائیں زمانے سے
تمھارے دل میں گر اسلام کی کچھ بھی محبت ہو مسلماں ہو! مسلمانو! شریکِ رنج و راحت ہو[۲۰۳]

مذکورہ نظم کی بابت شاعر کا کہنا تھا کہ انجمن ہلال احمر کے شفاخانے سے جب ترکوں سے متعلق حالات معلوم ہوئے تو ان کی حالت ناقابلِ بیان ہوگئی۔ خصوصاً ''زمین دار'' میں شائع ہونے والی مختصر روداد ''اک دردناک نظارہ'' مورخہ ۱۵ مارچ ۱۹۱۲ء میں جس ستم رسیدہ مظلومہ کی کیفیت درج تھی، وہی کیفیت اب نظم کا محرک بنی[۲۰۴]۔ اس نظم میں انھوں نے مسلمانوں کی غیرت و حمیت کو نہ صرف جھنجھوڑا بلکہ انھیں بھولا ہوا سبق پھر سے یاد بھی دلایا۔ انھوں نے نظم میں اطالویوں کے مظالم کو بھی اجاگر کیا۔ ان مناظر کو پیش کرنے کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کی بدحالی اور پریشانی کا نقشہ بھی نہایت موثر اور دردناک انداز سے بیان کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ:

مسلمانو! تمھیں کچھ پاس بھی ہے دینِ ملت کا — خیال آتا بھی ہے تم کو کبھی اپنی حمیت کا
کیا ہے آج کل کیوں ترک آئینِ وفا داری — سبق دینا نہیں اسلام کا تم کو اخوت کا
زمانہ جاگتا ہے اور تم ہو خوابِ غفلت میں — نہیں ہے کچھ تمھیں احساس ہی اپنی مصیبت کا[۲۰۵]

"اسلام" ان کی ایک طویل نظم ہے جس میں مسلمانوں کے ماضی، حال اور مستقبل کے نقوش واضح طور پر دیکھے جاسکتے ہیں۔ نظم میں دعائیہ انداز اختیار کرتے ہوئے حضور ﷺ سے نظرِ کرم کی درخواست بھی کی گئی ہے۔ جیسے:

تجھے بھی کیا نہیں یا رب نبیؐ کے دین کا پاس — ہماری خواری و زاری کا کچھ تو کر احساس
سنائیں حالِ دل بے قرار ہم کس کو — ہمیں تو تیرے سوا اور نہیں کسی کی آس
مٹانا گر تجھے منظور ہے جہاں سے ہمیں — دے گھول کے پانی میں زہر الماس[۲۰۶]

اور ساتھ ہی ماضی کی عظمت رفتہ کا احساس دلانے کے لیے اغیار کے قبضے میں مسلم مقبوضات میں مسلم امہ کی حالتِ زار کا نقشہ بھی کھینچا گیا ہے:

اوج پر تھا ستارا بلند بختی کا — کہ پہنچی عرشِ معلیٰ پہ شوکتِ اسلام
مگر زمانے کی گردش نے کھو دیا سب کچھ — کہاں ہے زور کدھر ہے دولتِ اسلام
کہوں میں کیا کہ کوئی حد نہیں غریبی کی — یہ مفلسی تو علامت ہے بد نصیبی کی[۲۰۷]

نظم میں شاعر نے مستقبل کی صورت گری بھی کی۔ مسلمانوں کو علم و ہنر سے آراستہ ہو کر پھر سے اپنی کھوئی ہوئی عظمت کو حاصل کرنے کا پیغام بھی دیا۔

رضا علی وحشت کلکتوی کا کلام بھی "الہلال" میں باقاعدگی کے ساتھ شائع ہوتا رہا۔ اپنی ایک نظم "خروشِ یاد" میں ملتِ بیضا کے نگہبانوں کو پکارتے ہوئے مسلمانوں کی مخدوش حالت کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔ دشمنوں کو یہ گمان تھا کہ مسلمانوں کے اب چل چلاؤ کا وقت ہے، جلد وہ اس دنیا سے نیست و نابود ہو کر اپنی مذہبی شناخت کھو دیں گے، وہ کہتے ہیں:

پھر ایک ستم تازہ اور کاہشِ جاں ہے — دل سینۂ ماتم زدہ میں نوحہ کناں ہے
اجڑے ہوئے گلشن میں کہاں زمزمۂ عیش — کہہ نالہ و فریاد ہے کہہ آہ و فغاں ہے
مستقبل مجہول ہو کیا باعثِ تسکیں؟ — کچھ حوصلہ افزا انھیں جو حال عیاں ہے
مذہب کی حرارت سے بھڑکتے نہیں شعلے — ہاں آتشِ خاموش کا تھوڑا سا دھواں ہے
اے شانِ جلالی تری غیرت کا کیا ہوا؟ — مٹ جائیں گے مسلم یہ حریفوں کو گماں ہے
کیا رحم کے قابل نہیں اسلام کی حالت؟ — اے ملتِ بیضا کے نگہباں تو کہاں ہے؟[۲۰۸]

اسی طرح علامہ نیاز فتح پوری کی نظم "دعوتِ درد" میں بھی مسلمانوں کو بے داری کے جذبے سے سرشار ہونے کا درس ملتا ہے۔ وہ غفلت میں سوئے مسلمانوں کو پھر سے جگانے اور ان کے اندر آزادی کی تڑپ، ذوق و شوق اور عظمت رفتہ کی بحالی کی طرف متوجہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

اٹھ دلِ راحت طلب پیدا سرِ شوریدہ کر | آپ بھی نم دیدہ ہو اوروں کو بھی نم دیدہ کر

پھونک دے محفل کو اپنے شعلۂ آواز سے | گرمیِ ہنگامہ سے ہر قلب کو تفتیدہ کر

ساقیا پھر جلوہ پیرا ہو اسی انداز سے | زندہ کر دے اہلِ محفل کو اسی اعجاز سے

طایرِ سدرہ ہماری خستگی پر کر نظر | زورِ بازو گھٹ گیا پھر رہ گئے پرواز سے

جھانک لے پھر پردۂ یمانی سے ذرا | پھر سکھا طرزِ فغاں چشمِ نوا پرواز سے

وہ حدی خوانی کے نغمے وہ سرورِ رجزِ آہ | ہو گئے نا آشنا اپنے پرانے ساز سے[۲۰۹]

اپنی ایک اور نظم "قطراتِ اشک" میں مسلمانوں کو ان کے شان دار ماضی کے حوالے بتاتے ہوئے موجودہ حالت پر طعنہ زن ہیں۔ وہ مسلمانوں کے جمود اور پستی و ذلت پر حیرت کا اظہار بھی کرتے دکھائی دیتے ہیں اور پھر موجودہ حالات کے خلاف ڈٹ کر مقابلہ کرنے کا درس دیتے ہوئے بھی کہتے ہیں کہ:

اے مسلماں نکل خوں کا محضر لے کر | گرمِ فریاد ہو پھر ہاتھ میں خنجر لے کر

ہاں نکل سینے میں امیدوں کا محشر لے کر | بے سکوں ہستی میں ظالم دلِ مضطر لے کر

کھینچ وہ نالہ کہ پیدا ہو شرر دامن میں | آگ لگ جائے تیری شمع لے پیراہن میں[۲۱۰]

ترکوں پہ ہونے والے مظالم کا حال بیان کرتے ہوئے بے گور و کفن نعشوں اور تباہ حال شہر کا نقشہ وہ کچھ اس طرح کھینچتے ہیں کہ دل بے اختیار افسردہ ہو جاتا ہے:

یا وہی ترک ہیں بلقان میں اب یوں پامال | خستگی روح میں اعضاء میں تھکن دل میں ملال

چہرے سب سرخ ہیں اور خون سے یوں کپڑے لال | ڈال دے ہولی میں جس طرح کوئی رنگِ ملال

سیل خونِ شہدا سے ہوا صحرا دریا | پٹ گیا لاشوں سے اور بن گیا دریا صحرا[۲۱۱]

"فغانِ مسلم" کے عنوان سے عبدالحکم سیف شاہ جہاں پوری نے جو نظم لکھی، اس میں بھی مسلمانوں کی بربادی کا ماتم کیا گیا ہے۔ نظم میں ایک خاص قسم کی یاسیت اور اضمحلال کی فضا موجود ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

دے گا پھر یہ جسمِ ناتواں بے روح و جاں ہو کر | اگر اترا لباس بادشاہی دھجیاں ہو کر

تڑپتا ہے گلِ پر درد جب دن رات سینے میں | تو پھر اے ہم نشیں کس طرح بیٹھیں شادماں ہو کر

کچھ ایسا کوہِ غم ٹوٹا ہے اپنے ناتواں دل پر نکلتی ہے زباں سے بات بھی آہ و فغاں ہو کر
گرایا گمرہی نے قوم کو چاہ و ضلالت میں رہا اسلام بے کس یوسفِ بے کارواں ہو کر[۲۱۲]

اس دور میں لکھنؤ سے شائع ہونے والے رسالے "الناظر" کی متعدد نظمیں ان ہی جذبات و احساسات کا آئینہ دار تھیں۔ عبدالحکیم بسمل نے "فغانِ بسمل" کے عنوان سے جو نظم لکھی، اس کے چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

بتا کوئی سبیل اے خضر مرگِ ناگہانی کی رہینِ سخت جانی ہے حیات جاودانی مری
جگا ہے مجھے خواب عدم سے بخت خفتہ کو صدائے صورِ محشر ہو الٰہی ہر فغاں میری
مٹوں خود یا مٹا دوں حسرت و حرماں کی ہستی کو کہ ایسی زندگی اک داغ ہے انساں کی ہستی کو[۲۱۳]

مرزا ثاقب قزل باش نے اپنی نظم "خونِ نابۂ جگر" میں قوم کی سیاہ بختی اور بے بسی کا رونا رویا ہے۔ اس زمانے میں جس طرح گفتار پہ تعزیریں لگی ہوئی تھیں، اس کے بیان میں وہ کہتے ہیں کہ:

کیوں وہ او جھل ہو گئے آنکھوں سے میں اس غم میں ہوں ہے سیاہ بختی تو ہر دم جامۂ ماتم میں ہوں
طائرِ بے بال و پر ہوں گو بنی آدم میں ہوں سامنے ان کا زمانہ ہے عجب عالم میں ہوں
مہیماں لاکھوں ہیں کس کس کی مداراتیں کروں ظلم فریادوں پہ ہوتا ہے اگر باتیں کروں[۲۱۴]

محمد ہادی عزیز لکھنوی نے "مقدس مشہد کا عبرت انگیز نظارہ" کے عنوان سے لکھی گئی نظم میں مسلمانوں کی ابتر حالت کا نقشہ کچھ اس انداز سے کھینچنے کی کوشش کی ہے:

زخم ہیں دل میں کچھ ایسے جو دکھا سکتے نہیں وہ ستم ہم پر ہوئے ہیں جو بھلا سکتے نہیں
مختصر سن کر مفصّل ہم بتا سکتے نہیں آہ! قبروں میں بھی اب تو چین پا سکتے نہیں
دشمنِ جانی ہماری گردشِ ایام ہے مر کے کیا آرام پائیں گے خیالِ خام ہے[۲۱۵]

سید محمد جعفر قدسی نے "داستانِ غم" میں دکھ اور کرب کی داستان کو بڑے موثر انداز سے سنانے کی کوشش کی ہے۔ پوری امت کے مسائل اس نظم میں زیرِ بحث آئے ہیں لیکن مخصوص پیرائے میں اس عہد کے سیاسی منظر نامے اور مسلمانوں کے انتشار اور بدحالی کا بھرپور نقشہ کھینچا گیا ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

مسلسل آنسوؤں نے موتیوں سے بھر دیا دامن یہ قطرہ قطر ہائے آب نیساں
خبر ہے کچھ تجھے بھی یا نہیں اے باغ باں اس کی ترے پھولے پھلے گل زار ویراں
یہ اندازِ تغافل کچھ سمجھ ہی میں نہیں آتا خراب اکثر بلادِ روم و ایراں
ذرا دیکھ اک نظر اے سونے والے باغِ یثرب کو یہ کس کی خانہ بربادی کے ساماں

کہیں ٹرکی کا اسلامی نشاں سجدے کو جھکتا ہے		کہیں پامال مقتولینِ بلقاں
شہیدانِ وفا کا خون اک دن رنگ لائے گا		یہ شیدائی تری الفت پہ قرباں
الٰہی یہ جنوں انگیزیاں کیا رنگ لائیں گی		گریباں گیر دستِ سینہ ریشاں
ہے کوئی سننے والا یا نہیں افسانۂ غم کا		ہم اپنی بے کسی پر آپ نالاں
ہمارا اخترِ اقبال دیکھیں کب چمکتا ہے		ستارے دوسری قوموں کے تاباں
اتر کر خار زارِ وادیِ نا اتفاقی میں		گلوں کی طرح ہم بھی چاک داماں[۲۱۶]

علی حیدر طباطبائی نے "حیرت و حسرت" کے عنوان سے جو نظم لکھی اس میں امت کے شیرازہ بکھرنے اور آپس میں تفرقے کی وجہ سے ہونے والی ابتری کا حال بیان کرتے ہوئے کہا ہے کہ:

ہم ہیں اور تیرگیِ روزِ سیاہ		ہم ہیں اور شامِ غم کی ہے ظلمت
ہم ہیں اور چرخِ تفرقہ انداز		ہم ہیں اور افتراقِ جمعیت
ہم ہیں اور ایک اپنا حال تباہ		اہل عالم کو مایہ عبرت
اس طرح منھ کے بل گرے ہیں ہم		کہ سنبھلنے کی اب نہیں طاقت
ایسا شیرازہ ہو چکا برہم		اب ہے امرِ محال جمعیت[۲۱۷]

فخر الدین احمد سفیر نے "جنگ بلقان" کے عنوان سے ایک نظم لکھی۔ اس نظم میں بھی سلطنت عثمانیہ کی ریشہ دوانیوں اور پے درپے ہونے والی لڑائی، جنگ و جدل، خوں ریزی ہزاروں لاکھوں لوگوں کے سسکتے لاشے اور بین الاقوامی سیاسی حالات کا نقشہ کھینچتے ہوئے شاعر کہتے ہیں کہ:

سسکتے ہیں سرِ میداں مریضِ درد و غم لاکھوں		مزے سے پی گئے جامِ شہادت بیش و کم لاکھوں
گھر ہائے یتیم اس وقت ہیں با چشمِ نم لاکھوں		نشانہ ناوکِ غم کا ہیں آ ہوے حرم لاکھوں
نہ ہو گر دردِ دل میں دل ہے یا پتھر ہے پہلو میں		وہ رونا کیا نہ جب تک خون کی رنگت ہو آنسو میں
جہاں میں ایک ترکوں کی ہے تیغِ خوں فشاں باقی		زمانے میں یہی ہے غیرتِ اسلامیہ باقی
اسی سے ملتِ بیضا کا ہے نام و نشاں باقی		خدا رکھے یہی ہے مایہ تسکینِ جاں باقی
شکستِ رنگ فارس سے جگر ہیں داغ دار اب تک		غمِ صحرائے بربر سے ہیں سینے لالہ زار اب تک
ابھی فرصت ملی تھی جنگِ اٹلی کی مصیبت سے		بلا نازل ہوئی بلگیریا کی اب شرارت سے
یہ ہنگامہ ہے کیا کم شورشِ روزِ قیامت سے		بپا ہے ہر طرف جنگ و جدل اخوانِ ملت سے

قریبِ شہر استنبول تک یلغار آ پہنچے | ستم ڈھاتے ہوئے کرتے ہوئے یلغار آ پہنچے[218]

مولانا تمنا عمادی کا کلام بھی رسالہ "تمدن" اور "الناظر" میں شائع ہوتا رہا۔ ان کے علمی کارناموں کی وجہ سے ان کی شاعری پر نقادوں کی زیادہ توجہ نہیں گئی۔ لیکن اتحاد اسلامی کے ضمن میں ان کی شاعری بھی اہمیت کی حامل ہے۔ اس دور کی ابتر حالت کے بیان میں ان کے چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

اس قوم پر ہجومِ بلا دیکھ دیکھ کر | احباب کو ملال ہے دشمن خوشی میں ہیں
کیا جانے روزِ حشر کب آنے کو ہے مگر | محشر بپا تو آج ہی دینِ نبیؐ میں ہے[219]

ایک اور نظم "دنیاے اسلام" میں عالمی منظر نامے کو بیان کرتے ہوئے اسلامی دنیا میں پھیلی غم والم، مایوس، اٹلی اور یورپ کی جانب سے روا رکھے جانے والے مظالم اور تباہی و بربادی کا حال رقم کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

بہت کچھ سن رہے تھے غلغلہ تہذیبِ یورپ کا | کہ بے تقصیر لاکھوں کٹ گئی اولاد آدم کی
ہوا اٹلی کے کرتوتوں سے یہ اندھیر عالم میں | کہ بے تقصیر لاکھوں کٹ گئی اولاد آدم کی[220]

جنگ طرابلس کے پس منظر میں لکھی گئی ایک نظم "طرابلس کی ایک بے کس ستم رسیدہ عورت کی مناجات" میں ملتِ اسلامیہ کی بے کسی، بے بسی اور ابتری کا حال بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

آپ کی ملت پہ جب وقت آ پڑا | بے تأمل سب کو قرباں کر دیا
سب کو وارا مذہبِ اسلام پر | جانیں دے دیں آپ ہی کے نام پر
یا نبیؐ! صرف ان کی حالت پر ہو رحم | نو اسیرانِ مصیبت پر ہو رحم
آپؐ اگر چاہیں تو ساماں ہیں بہت | اور ابھی بھائی مسلماں ہیں بہت[221]

کبھی وہ پستی میں گرے مسلمانوں کی حالتِ زار کو بیان کرتے ہوئے ان کی حیات کو بوجھ قرار دیتے ہیں۔ جیسے:

مگر یہ قوم مسلماں کچھ ایسی ہے قلاش | نہ اس کے پاس حکومت نہ رتبہ ہائے بلند
نہ اس کے پاس ہے تیغ و سنانِ دشمن کش | نہ اس کے پاس کمان و کمن دشمن بند
پھر ایسی زیست ہے کیوں کر نہیں وبال اس پر | یہ بے حیائی کا جینا ہے کیسے اس کو پسند[222]

اور کبھی وہ اس شکست خوردہ مسلمانوں کو پھر سے عزم و حوصلے کا پیغام دیتے ہوئے اپنی ناکامی کو کامیابی میں بدلنے کے لیے حرکت و عمل کا درس دیتے ہیں۔ ملاحظہ کیجیے:

یہ ہو سکتا ہے اب بھی پھر ہمیں اقبال دولت ہو | یہ ممکن ہے کہ واپس پائیں پھر جاہ و حشم اپنا
اگر اللہ نے چاہا تو کل افرادِ عالم کو | دکھا دے گی اثر پھر سطوت خیر الاممؐ اپنا

جہاں چاہیں گے جھنڈا گاڑ دیں گے اپنی سطوت کا	کوئی کیوں ہم کو روکے گا عرب اپنا عجم اپنا
فلک تک گونج اٹھے گا نعرہِ اللہ اکبر سے	تمنا جوش میں جس دن اٹھا لیں گے علم اپنا[۲۲۳]

غرض کہ یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ تحریک اتحاد اسلامی کے پرچار میں ان نمائندہ اخبارات ورسائل نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ متعدد مقالات و مضامین خلافت کی مخالفت اور موافقت میں لکھے گئے۔ بلا شبہ موافقت میں لکھے گئے مقالات و مضامین کی تعداد زیادہ ہے۔ اسی طرح بے شمار شعرا کا کلام ان جرائد میں شائع ہوتا رہا۔ ان اخبارات نے:

> تحریک کے حوالے سے نمایاں کردار ادا کیا۔ باوجود یہ کہ اخبارات کی ضمانتیں منسوخ کی گئیں، مدیران کو بارہا نظر بند کیا گیا مگر پھر بھی ان اخباروں نے خاموشی اختیار نہ کی اور ہر ظلم کو سہتے ہوئے عالم اسلام کے حوالے سے مسلمانوں کو بیدار کرنے اور ان میں اتحاد پیدا کرنے کا کام کرتے رہے[۲۲۴]۔

تحریک خلافت اپنے عوامی مزاج کے لحاظ سے ایک غیر معمولی تحریک تھی۔ ملک کا کوئی گوشہ اور کوئی چپا ایسا نہ تھا جہاں اس کی بازگشت نہ سنی گئی ہو۔ اس تحریک کی بدولت پہلی بار ہندوستان، برطانوی رعایا ہونے کے فخر کی ذلت سے آزاد ہوا۔ اسی تحریک کی بدولت لوگوں میں مغربی استعمار کے خلاف مزاحمت اور خلافت عثمانیہ کے لیے جاں تک دینے کا جوش ولولہ اجاگر ہوا۔ یہی تحریک تھی جس نے مزاحمت کا ایسا رنگ اختیار کیا جس میں ہندو مسلم سب خوشی خوشی جیل یاترا کے لیے تیار دکھائی دیے۔ اسی تحریک نے محمد علی جوہر اور گاندھی کو ایک ایسا پلیٹ فارم فراہم کیا جس کے ذریعے وہ ہندوستان میں ہندو مسلم اتحاد کی فضا ہموار کریں۔ اور اسی تحریک نے دونوں رہنماؤں کو عوامی سطح پر مقبول ترین مقام عطا کیا جس کی وجہ سے شاعر یہ کہنے پر مجبور ہوئے کہ:

محمد علی کے نعرے ہیں	گاندھی کے جے کارے ہیں[۲۲۵]

لیکن افسوس کہ ستمبر ۱۹۲۱ء میں گاندھی کے ہمراہ مدراس کے دورے کے دوران والٹیر میں گرفتار کر کے علی برادران کو کراچی میں دو دو برس قید کی سزا ہو گئی۔ قید سے رہائی کے بعد ہندو مسلم اتحاد کی جو فضا دو برس قبل اپنے انتہا تک پہنچی ہوئی تھی، وہ یک لخت معدوم پڑ گئی۔ ملک میں جا بجا فرقہ وارانہ فسادات پھوٹ پڑے۔ کانگریس جو باہمی اتحاد کی علم بردار تھی، شدید اندرونی نزع میں مبتلا ہو گئی۔ مولانا جوہر، مولانا آزاد اور دیگر ہندو و مسلم رہنماؤں نے مصالحت کی کوششیں ضرور کیں لیکن آپس کی کشیدگی اور بدگمانی دن بدن مزید بڑھتی ہی چلی گئی۔ مولانا جوہر کی بعض تقریروں پر یہ الزام لگا کہ وہ مذہبی ناروداری اور بدگمانی کا شکار ہو کر قوم پروری کی راہ سے ہٹ چکے ہیں[۲۲۶]۔ کیفی اعظمی نے خانہ جنگی کے اس ماحول کو پیش کرتے ہوئے فسادات اور خون ریزی کا نقشہ کچھ اس انداز سے کھینچا ہے:

لاش سوراج کی خلافت کی　　　لاش ہر جہد ہر بغاوت کی
ہو کہاں فتنہ دوست راہ برو　　　آؤ لاشیں ذرا شمار کرو
لو یہ انعام رہنمائی کا　　　لو یہ لاشوں کا خون کا تحفہ[۲۲۷]

ہندوستان میں جس قدر بھی طوفان اٹھے، خلافت کی تحریک ہو یا ترک موالات، ان سب میں سب سے جان کاہ حادثہ یہ تھا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان ۱۹۲۰ء میں فسادات اور بلوؤں کا ایسا لامتناہی سلسلہ شروع ہوا جو رکنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ یہ مولانا محمد علی جوہر ہی تھے جو مصالحت کی کوششوں میں پیش پیش تھے۔ وہ چلاّ چلاّ کر لوگوں کو ان جھگڑوں سے باز رہنے کی تلقین کرتے جاتے تھے لیکن کوئی سنتا ہی نہ تھا۔ مسلمان خفا تھے کہ وہ ہندوؤں کی پاس داری کر رہے ہیں، ہندو بیزار تھے محمد علی ہمیشہ اسلام اور مسلمانوں کا نام الاپتے رہتے ہیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ''ہمدرد'' کے پڑھنے والے بھی رفتہ رفتہ گم ہونے لگے[۲۲۸]۔ حالانکہ اس سے کچھ عرصے قبل تک ہندو مسلم، ہر کوئی ٹولیوں کی شکل میں خلافتی نظموں کو مل کر گا رہے تھے۔ اس دور میں ہندو مسلم دونوں جانب سے تخلیق کی گئی بعض نظموں کو باغیانہ ادب مانا گیا۔ صدائے خلافت میں ''جان بیٹا خلافت پہ دے دو'' اور ''کراچی کے قیدی'' والی نظم کا ذکر مذکورہ صفحات میں کیا جا چکا ہے جو اس زمانے میں زبان زدِ عام ہوئی[۲۲۹]۔ اس کے علاوہ وہ ''گرفتارانِ بلا'' میں بھی اسی اتحاد کی بازگشت سنائی دی۔ اس نظم میں شاعر کہتے ہیں کہ:

اب حکومت نہ حاکم رہیں گے　　　ہند میں ہندو مسلم رہیں گے
غیب سے ہوگا سامان بیٹا　　　ہو خلافت پہ قربان بیٹا
جان مال اپنا قرباں کریں گے　　　اور محمد علی بھی کہیں گے
اب نہ شوکت علی بھی ہٹیں گے　　　جان اب ہم خلافت پہ دیں گے
کہہ رہے ہیں گاندھی جی بھی　　　سارے دل مل کے سوراج لیں گے
اب تو یہی ہے تحریک اپنی　　　جان اب ہم خلافت پہ دیں گے[۲۳۰]

عام لوگوں میں خلافت تحریک سے جڑے رہنے اور اس تحریک کا ہر اول دستہ بن کر اپنا کردار ادا کرنے کے اجر و ثواب کے ساتھ ساتھ جو لوگ اس سے لاتعلقی برت رہے تھے، ان کے خلاف سخت انداز اختیار کرتے ہوئے واضح طور پر کہا گیا کہ:

جو بنیں گے خلافت کے جوگی　　　ان پہ اللہ کی رحمت ہوگی
ان کو فردوس میں گھر ملیں گے

اب خلافت کا دامن نہ چھوڑ　　　دیکھ مشتاق اب منھ نہ موڑو
ہوں گے کافر جو اس سے پھریں گے[۲۳۱]

اس طرح کے فتوے کا عام رواج تھا کہ اگر خلافت تحریک سے کوئی وابستہ نہیں تو اسے مسلمان کہلانے کا بھی کوئی حق نہیں۔ ایک ''مستزاد'' میں ان خیالات کا اظہار کچھ اس انداز سے کیا گیا:

جو مسلمان خلافت کا مددگار نہیں — بس وہ دین دار نہیں
اس سے بڑھ کر دنیا میں سیاہ کار نہیں — کوئی مکار نہیں[۲۳۲]

حالاں کہ خطے کی بعض قیادت کو یہ پریشانی ضرور لاحق تھی کہ نوجوانوں میں جوش کچھ زیادہ ہی بڑھتا جا رہا ہے۔ سرسید کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ وہ بھی ترکوں سے والہانہ عقیدت رکھتے تھے اور علی گڑھ کے طلبا کے لیے ترکی ٹوپی کو لازمی قرار دیا تھا۔ انھوں نے ترکوں کی حمایت میں بہت سے مضامین بھی لکھے۔ لیکن ان کا واضح طور پر یہ نظریہ تھا کہ ''ہم عبدالحمید دوم کے نہیں برطانوی حکومت کے وفادار شہری ہیں''[۲۳۳]۔ لیکن مسلمان اور ہندو دونوں ہی سوراج اور خلافت کے معاملے میں کچھ سننے سمجھنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ لہٰذا بعض عوامی نظموں میں سوراج اور چرخہ جلا کر آزادی کی جدوجہد کا راگ بھی الاپا گیا۔ عوامی سطح پر مقبول ایک اور نظم ''لیں گے سوراج چرخہ جلا کر'' میں شاعر کہتے ہیں کہ:

اب تو اٹھے ہیں بیڑا اٹھا کر — لیں گے سوراج چرخہ جلا کر
لٹ گئے ہائے دھوکے میں آ کر — لیں گے سوراج چرخہ جلا کر
شیر میداں محمد علی سے — پڑ گئی ہند میں کھلبلی ہے
بول بالا ہے شوکت علی کا — ہے تو ہم نام حضرت علیؓ کا
دشمنوں کو رہیں گے مٹا کر — لیں گے سوراج چرخہ چلا کر[۲۳۴]

ترک موالات کی تحریک میں غیر ملکی اشیا کے استعمال سے کلی اجتناب بھی شامل تھا۔ اس کا مقصد غیر ملکی صنعتوں کو نقصان پہنچانا تھا۔ اس تحریک میں سودیشی کپڑے خصوصاً گھروں میں کاتے ہوئے سوت سے بنے کھدر کے استعمال کو خصوصی اہمیت دی گئی۔ سوت تیار کرنے کے لیے چرخوں کا استعمال شروع کیا گیا۔ خلافت تحریک کے تمام رہنماؤں اور کارکنوں نے خود پر لازم کر لیا کہ اپنے ملک کی بنی ہوئی اشیا اور کپڑا استعمال کریں گے۔ اس میں گاندھی نے کانگریس ورکنگ کمیٹی کے اجلاس منعقدہ ۱۸ جولائی ۱۹۲۱ء میں کھدر اسکیم پیش کی جو اتفاق رائے سے منظور ہوئی۔ حسرت موہانی نے اس کی مخالفت بھی کی[۲۳۵]۔

تیرتھ رام اور دیگر کاروباری افراد نے اعداد و شمار کے ذریعے اس تحریک کے نقصانات گنوائے[۲۳۶]۔ اس صورت حال میں زیادہ سے زیادہ دیسی کپڑے تیار کرنے کے لیے گھر کی ماؤں، بہنوں، بیٹیوں اور بہوؤں کو چرخہ چلانے کی ترغیب دینے کے لیے بھی نظمیں کہی گئیں۔ ان عوامی نظموں کا رنگ جوش و جذبے سے بھرا ہوتا اور ان کا مقصد محض پروپیگنڈے کے اور کچھ نہیں۔ ملاحظہ کیجیے:

تم کو عزت خلافت سے ہو گی	شان اسلام کی بھی بڑھے گی
کھلبلی دشمنوں میں پڑے گی	میری ماں بہنو چرخہ چلا لو
دین کا ہوگا اس سے اجالا	دشمنو کا منھ ہوئے گا کالا
ہاتھ میں تھامو روئی کا گالا	میری ماں بہنو چرخہ چلا لو[۲۳۷]

اس طرح کی بے شمار نظمیں تحریک خلافت اور ترک موالات کے حوالے سے لکھی گئیں۔ پورے ہندوستان میں اس مسئلے پر ایک جذباتی طوفان آیا ہوا تھا۔ اس قسم کی عوامی نظمیں زیادہ تر غیر موزوں اور فنی نقطۂ نظر سے معیار پر پورا نہیں اترتی لیکن اس قسم کی شاعری کو معیار کی کسوٹی پر پرکھنا بھی کوتاہی ہو گی۔ اس زمانے میں جس قسم کی بھی عوامی شاعری ہوئی، اس نے ہمارے شعری ادب میں نمایاں مقام بے شک حاصل نہ کیا ہو لیکن سیاسی حوالے سے اس کی اہمیت ہمیشہ معتبر سمجھی جائے گی۔ اس دور میں ہونے والے سانحات اور المیے کی عکاسی جس جوش و جذبے کے ساتھ ان نظموں میں کی گئی ہے، اس کی نظیر بہت کم دیکھنے کو ملتی ہے۔ مگر اس حقیقت کو کیوں نظر انداز کیا جائے کہ امت مسلمہ کی تقدیر میں الم ناک مایوسی لکھی ہوئی تھی۔ ۱۹۲۰ء میں ترکوں پر جو میثاق سیورے عائد کیا گیا اس نے سلطنت عثمانیہ کو ختم کر کے ترک سیاست کو عملاً منسوخ کر دیا۔ نہ صرف تمام غیر ترک علاقے چھین لیے گئے بلکہ بعض ایسے خطوں کو بھی جہاں ترکوں کا غلبہ تھا، مثلاً سمرنا، تھریس اور اناطولیہ وغیرہ کے بعض علاقے دوسروں کے حوالے سونپنے کا فیصلہ کر دیا گیا۔ عرب بھی اتحادیوں سے یہ مطالبہ کر رہے تھے کہ انھوں نے بغاوت کے ذریعے اتحادیوں کی جو مدد کی تھی، اس کے انعام میں سلطنت عثمانیہ کی لاش کے ٹکڑے انھیں بھی عطا کیے جائیں۔ بہر حال معاہدہ سیورے نے برعظیم کے مسلمانوں کے جذبات کو اس حد تک مشتعل کر دیا تھا کہ اس کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی۔ وہ سارے جذبات جو ایک عرصے سے دبے ہوئے تھے، ایک ایسی تحریک کی شکل میں پھوٹ نکلے جس نے برعظیم میں سلطنت برطانیہ کی جڑوں کو ہلا کر رکھ دیا۔ مسلمانوں نے اس تحریک میں شریک ہو کر نتائج سے بے نیازی اور مصائب و آلام سے انتہائی بے پروائی کا ایسا ثبوت دیا کہ جو لوگ یہ سمجھتے تھے کہ مسلمان اس قسم کی جدوجہد کے قابل نہیں ہیں، وہ حیران رہ گئے[۲۳۸]۔

مولانا آزاد نے بھی واضح طور پر کہا کہ ''آپ کی تحریک خلافت ہندوستان کی آزادی کی تحریک ہے۔ یہ ایک مقصد ہے جو فتح چاہتا ہے، عمل چاہتا ہے''[۲۳۹]۔ مولانا محمد علی کے لیے ترکوں کی حمایت کو محض جذبات کا معاملہ نہیں کہا جا سکتا، جیسا کہ عام مسلمانوں کے لیے تھا۔ ان کا یہ سوچا سمجھا نظریہ تھا جو بد قسمتی سے اسلامی ملکوں کے اندرونی حالات کی غیر حقیقت پسندانہ تشخیص پر مبنی تھا کہ اسلام کی بقا کے لیے ترکی کی خلافت کو قائم رکھنا ضروری ہے۔ انھیں یہ انداز نہیں تھا کہ عام طور پر اسلامی ممالک اور خاص طور پر ان عرب ممالک میں جو ترکی کے ماتحت ہیں، ان کے ہم خیال بہت کم ہیں۔ جو ہیں انھیں سیاسی حیثیت سے مجبور و ناچار ہندوستانی مسلمانوں کی حمایت سے کوئی خاص تقویت نہیں پہنچ سکتی۔ البتہ اپنے ملک کے بارے میں ان کا یہ اندازہ صحیح تھا کہ ترکی

خلافت اور سلطنت کی ہمدردی کا جوش مسلمانوں کے سبھی طبقوں کو یہاں تک کہ انگریزی تعلیم یافتہ طبقے اور مذہبی علما کے طبقے جن کے درمیان گہری خلیج حائل ہو گئی تھی، متحد کر سکتا تھا اور اس سے عام مسلمانوں میں سیاسی بیداری پیدا کرنے کا کام لیا جا سکتا تھا"[۲۴۰]۔ ان حالات میں ترکوں کی سیاسی شکست اور خلافت کی منسوخی نے ملک کے طول و عرض میں ایسے گم نام شعرا کی بڑی تعداد پیدا کی جنھوں نے محض وقتی جذبات سے متاثر ہو کر اپنے ذہن میں پیدا ہونے والے خیالات کو شعر کا جامہ پہنایا۔ اکثر شعرا کی نظمیں کسی معروف نظم کی نقل میں کہی گئیں لیکن ان میں جو جذبات ترک خلافت اور سلطنت کے حوالے سے پیش کیے گئے، وہ بہر حال خالی از دل چسپ نہ ہوں گے۔ ان شعرا میں یحییٰ اعظمی کی شاعری میں جوش و خروش، حق و صداقت اور رجزیہ ماحول موجود ہے۔ اس دور کے عام حالات کو ان کی شاعری میں تلاش کیا جا سکتا ہے۔ ایک نظم ''مسلمانانِ ہند سے خطاب'' میں وہ مسلمانوں کو ان کے شان دار ماضی کا احساس دلاتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

مسلمانو! کبھی ہنگامہ آرائے جہاں تم تھے　　فروغِ بزم ہستی رونقِ کون و مکاں تم تھے
تمھاری ہر نظر رمز آشنائے جہدِ پیہم تھی　　کہ دنیا میں حیاتِ سرمدی کے راز داں تم تھے
شہنشاہوں کی جانب بھی نگاہیں تک نہ اٹھتی تھیں
خمارِ بادۂ وحدت سے ایسے سر گراں تم تھے[۲۴۱]

اور کبھی خلافت کے خاتمے کے بعد پیدا ہونے والی صورت اور اس زمانے میں مسلم امہ کے انتشار پر نوحہ کناں ہوتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

اے ترک مجاہدِ اسلام اے کمال　　ماتم میں سر نگوں ہے ترے پرچم ہلال
مرنا ترا قیامتِ کبریٰ سے کم نہیں　　لے کے عرب سے تا بہ عجم غم سے ہے نڈھال
سارے جہاں میں ہے صفِ ماتم بچھی ہوئی　　سب کو کمالِ غم ہے کہ ہے یہ ''غم کمال''[۲۴۲]

اسی طرح مولوی حکیم نواب علی برق سندیلوی نے بھی ان مصائب و آلام کی تصویر پیش کرتے ہوئے خلافت تحریک کی بابت جن شکوک و شبہات کا اظہار کیا ہے:

چھائی ہوئی ملت پہ مصائب کی گھٹا ہے　　گھیرے ہوئے اسلام کو طوفانِ بلا ہے
خاموش نہ ہو جائے کہیں شمعِ خلافت　　جھونکے ہیں قیامت کے غضب تند ہوا ہے[۲۴۳]

وہ درست ثابت ہوئے۔ اس تند ہوا نے واقعی خلافت کو اپنی لپیٹ میں لے کر ملت کے مصائب میں اور زیادہ اضافہ کر دیا۔ حالی کی مسدس کی تقلید میں ابو المحمود صدیقی نے خلافت کے خاتمے کے وقت کی صورت حال کو نظم کرتے ہوئے کہا کہ:

کفار الٹ دینے کو ہیں تختِ خلافت — دنیا سے مٹا دینے کو ہیں تیری نیابت
توحید کے مطلع پہ ہی تثلیث کی ظلمت — تہذیب کے پتلوں نے یہ اندھیرا کیا ہے
اے خاصہ خاصانِ رسل وقتِ دعا ہے — امت پہ تری آ کے عجب وقت پڑا ہے
یورپ نے سمر ناپہ ہے یونان کو چھوڑا — ان کتوں نے جو سامنے آیا سو جھنجھوڑا
پھٹکارتے پھرتے ہیں فقط ظلم کا کوڑا — کچھ شرم و حیا ہے نہ انھیں خوفِ خدا ہے
اے خاصہ خاصانِ رسل وقتِ دعا ہے — امت پہ تری آ کے عجب وقت پڑا ہے
شہروں کو اجاڑا ہے محلّوں کو جلایا — بے حرمتیاں کر کے مساجد کو گرایا
ہر منبر و محراب کو اس خوں سے دبایا — جو خون شہیدوں کی رگ و جاں سے بہا ہے
اے خاصہ خاصانِ رسل وقتِ دعا ہے — امت پہ تری آ کے عجب وقت پڑا ہے[۲۴۴]

اشتیاق سندیلوی نے بھی اپنی شاعری کے ذریعے غفلت میں ڈوبے مسلمانوں کو بیدار کرنے کی کوشش کی۔ ان کی نظمیں بھی اسلامی غیرت اور جوش سے بھرپور ہیں۔ ان کے مجموعے "دردِ دل" کا موضوع عالمی سیاسی حالات خصوصاً عالم اسلام کا انتشار ہے۔ مجموعے میں شامل نظمیں "حالت الاخوان"، "انقلابِ زمانہ"، "گریہ دل" اور "نوحہِ اسلام" میں مسلمانوں کی سماجی، سیاسی، تہذیبی اور علمی زندگی کو موضوع بنا کر موجودہ صورت حال پر سخت تنقید کی ہے۔ چھوٹی بڑی متعدد نظموں میں سیاسی اور معاشرتی بے چینی کی تصویر کشی کرتے ہوئے موثر انداز سے اس مسائل پر روشنی ڈالی ہے۔ زوال مسلم کے عوامل تلاش کرتے ہوئے شاعر اس نتیجے پر پہنچے کہ:

اسلام کا گلشن کبھی پامال نہ ہوتا — اس طرح سیہ نامہِ اعمال نہ ہوتا
برگشتہ و دشمن کبھی اقبال نہ ہوتا — غافل جو نہ ہم ہوتے تو یہ حال نہ ہوتا
تقصیر کسی کی نہیں یہ اپنی خطا ہے[۲۴۵]

ایک اور نظم "انقلاب" میں مسلمانوں کی عظمت رفتہ کی نشان دہی کرنے کے بعد انقلاب زمانہ نے مسلمانوں کو آج جس مقام تک پہنچا دیا ہے، اس کی وجوہات اور حالت کے بیان میں ان کا واضح موقف یہ ہے کہ اس تنزّل کے ذمے دار خود مسلمان ہیں۔ وہ امت کی اس حالت پر غم زدہ اور ملول تو دکھائی دیتے ہیں لیکن حقیقت حال کا احساس کرتے ہوئے یہ بھی کہتے ہیں کہ:

ہمارا اعتبار اب کوئی دنیا میں نہیں کرتا — عبث بدنام دینِ حق اس امت کی بدولت ہے
ترقی پر ہماری جس طرح دنیا کو حیرت تھی — یوں ہی اب اس تنزّل پر زمانے بھر کو حیرت ہے
ہماری ہر طرح اب قابلِ افسوس حالت ہے — مگر اس پر بھی ساری قوم مستِ خواب غفلت

ہے[۲۴۶]

نظم ''نوحۂ اسلام'' میں وہ مسلمانوں کے زوال اور خلافت عثمانیہ کے خلاتمے پر سخت رنجیدہ دکھائی دیتے ہیں۔ وہ مسلمانوں کی شان وشوکت کی زبوں حالی پر دل گرفتہ اور افسردہ تو ہیں لیکن اس افسردگی کی حالت میں بھی وہ غیرت مسلم کو جگانے کے لیے طنزیہ انداز اختیار کرتے ہوئے خلافت کے جنازے کو بڑی دھوم دھام سے دفنانے کا پس منظر پیش کرتے ہیں۔ ملاحظہ کیجیے:

اک جنازے کے لیے جاتے تھے کل جانبِ گور — آگے وہ پیچھے رواں خلق مچاتی ہوئی شور
ساتھ ساتھ اس کے مسلمان نحیف و کمزور — غالباً ہوں گے وہ تعداد میں چالیس کروڑ
ان کی آہوں سے جگر غیر کا شق ہوتا تھا — تھام لیتے تھے کلیجہ یہ قلق ہوتا تھا
پہلے پایہ کو تو اقبال دیے تھے کاندھا — دوسرا دولت و عزت کو بدلتے دیکھا
علم و فن دونوں کو مصروف اسی میں پایا — ساتھ سر پیٹتی جاتی تھی سیاست اپنا
پوچھا اک شخص سے کیا مجمعِ ناکام ہے یہ — مجھ سے لوگوں نے کہا مجمعِ اسلام ہے یہ[۲۴۷]

پوری دنیا کے مسلمانوں پر اس سے گہرا طنز اور کیا ہوگا۔ شاعر نے اس وقت کے مسلمانوں کو بھیڑ یا ریوڑ قرار دیا۔ قوم و ملت کے بنیادی عناصر اور خوبیاں پیدا کیے بغیر کسی قوم کا زندہ رہنا واقعی محال تھا۔ شاعر نے اس اہم نکتے کو سمجھانے کی کوشش کی۔ اسی طرح میر کوٹی نے بھی دشمنوں کو للکارتے ہوئے مبالغہ آمیز رنگ اختیار کیا:

خلافت کے عدو کا نام دنیا سے مٹا دو تم — وہی پہلی سی قوت اپنی یورپ کو دکھا دو تم[۲۴۸]

اور کہیں بے بسی کے عالم میں دستِ دعا بلند کرتے ہوئے دشمنوں کو بددعائیں دیتے دکھائی دیتے ہیں۔ ملاحظہ کیجیے:

چمن ٹرکی کا عالم میں پھلے پھولے صدا کامل — وہ خود برباد ہو ٹرکی کا جو چاہے برا کامل[۲۴۹]

ترکوں سے اپنی رفاقت اور وابستگی کا اظہار کرتے ہوئے محمد نصیر الحق قریشی نے برملا کہا کہ:

ترکوں سے جو الفت ہے گھٹائی نہیں جاتی — ہے نقش ہوئی دل پہ مٹائی نہیں جاتی
کیا ظلم ہے لٹتا ہے خلافت کا اثاثہ — انصاف کی انگلی بھی ہلائی نہیں جاتی[۲۵۰]

چندہ جمع کرنے کی مہم کے دوران بھی بعض لوگوں نے طبع آزمائی کر کے مسلمانوں کے دلی جذبات کو جھنجھوڑا تاکہ زیادہ سے زیادہ چندہ جمع کیا جا سکے۔ ایسی ہی ایک نظم میں تیغ انصاری نے کہا کہ:

نصاریٰ کہہ رہے ہیں ہم خلافت کو مٹا دیں گے — گھمنڈ ان کو ہے اپنی سلطنت پر اپنی طاقت پر
صلیبی جنگ کی تیاریاں ہیں آج یورپ میں — یہ نازک وقت ہے اسلامیوں کے ملک و ملت پر

فرانس، انگلینڈ اور اٹلی نے استنبول کو گھیرا گرانا چاہتی ہے آندھیاں ترکی کے پرچم پر
کرو بن کر خلافت کی حمایت زور سے زر سے زمانے کو ہلا دو نعرہِ اللہ اکبر سے[۲۵۱]

محمد یونس بوڈہانوی نے تو مسلمانوں کی زندگی کا مقصد ہی خلافت کے تحفظ کو قرار دیا۔ وہ ایسے جینے کو جینا نہیں سمجھتے جس میں دنیا میں بے آبرو ہو کر جیا جائے۔ اسی لیے وہ ترکوں کی بربادی کا نوحہ پڑھتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

نام و نشانِ مسلم معدوم ہو رہا ہے اسلام سلطنت سے محروم ہو رہا ہے
ترکوں کی یہ خلافت برباد ہو رہی ہے یا قوم کی شکستِ بنیاد ہو رہی ہے
ترکوں کا جب جہاں میں مشکل قیام سمجھو دنیا کے مے کدے میں بادہ نہ جام سمجھو
ہمت اگر نہیں ہے اٹھنے کی کارواں میں جینے سے فائدہ کیا بے آبرو جہاں میں[۲۵۲]

اور نذیر محمد انور نے بھی مسلمانوں کی ابتری اور بدحالی پر رب کے حضور دعا کی کہ:

ہوں پیر و جواں شیدا دربارِ رسالتؐ پر کمزور مسلماں کو پھر پاسِ خلافت دے[۲۵۳]

اس طرح کی متعدد دعائیہ نظمیں جنگوں سے متاثرہ ترک مسلمانوں کے لیے شہر شہر قریہ قریہ سنائی جاتی تھیں تاکہ مسلمانوں کے جذبات کو ابھارا جا سکے۔ ان نظموں میں جوش و ولولے کی فراوانی تو ہوتی تھی لیکن یہ نظمیں دیرپا اثر نہیں رکھتی تھیں۔ مثلاً مصطفیٰ غازی بہادر خوب نا آور کی نظم کے یہ چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

الٰہی لشکرِ یونان کا جلدی صفایا کر مٹا دے صفحہِ ہستی سے بنیادِ فساد و شر
جفا و جور کی تلوار سے مارے گئے لاکھوں سمرنا کے شہیدوں کا چڑھا ہے خوں ترے سر پر
جگر پھٹ جائیں گے اللہ اکبر کی صداؤں سے سزا تجھ کو ملے گی غیب سے اے ظالمِ بدتر[۲۵۴]

غرض کہ اس دور کا ادب ان عوامی جذبات کا ترجمان نظر آتا ہے جو ہندوستان کے طول و عرض میں موج زن تھا۔ نثر ہو یا نظم ہر صنف ادب میں خلافت کے معاملات کو موضوع بنایا گیا۔ نظم کی ہر صنف میں خلافت تحریک کے اہم مسائل کی تشریح بھی کی گئی اور عوامی سطح پر اسے مقبول بنانے کی کوشش بھی ہوئی۔ بعض تخلیقات جو براہ راست اس موضوع سے تعلق نہیں رکھتی تھیں اس میں بھی ترک سلطنت عثمانیہ کے سیاسی اور عمرانی حالات کو بیان کرنے کا قصد ضرور کیا گیا۔ مثلاً شیخ نور الدین کی مثنوی ''قصہ شاہِ روم'' کو ہی دیکھیے، اس میں بھی مسلمانوں کو سلطنت عثمانیہ کے پس منظر میں یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ جو قومیں دین سے غافل ہو جائیں، تباہی ان کا مقدر بن جاتی ہے۔ مسلمانوں کو تنبیہ بھی کی گئی ہے کہ وہ ان ممالک سے سبق سیکھیں جو تاج و تخت کے مالک تو بن بیٹھے لیکن اس کی حفاظت کا فریضا احسن طریقے سے ادا نہیں کر سکے۔ غیروں کے ہاتھوں ذلت اٹھانے کا موجب وہ خود ہیں۔ کہانی کے انداز میں شاعر کہتے ہیں کہ:

خودی کے کام سے بندو ڈرو تم — یہ شاہِ روم کا قصہ سنو تم
عجب اس شاہ کا یہ تذکرہ ہے — خودی سے اپنی کیا کیا دکھ سہا ہے
اسے سن کے جو ہووے مرد عاقل — خدا کے خوف سے ہووے نہ غافل[۲۵۵]

شاہ روم کے تعلق سے لکھے گئے اس قصے میں شاہِ ترکی کا جو حال بیان کیا گیا ہے اس سے سلطنت کی تباہی و بربادی کی وجوہات تلاش کرنے میں آسانی ہوتی ہے۔ ترکی شاہ جو دین سے غافل عیش و عشرت میں ڈوبا ہوا ہے، دراصل اس کی یہی غفلت اس کی سلطنت کی تباہی و بربادی کی وجہ بنی۔

اس کے علاوہ ڈراموں میں بھی ان موضوعات کو پیش کیا گیا۔ آغا حشر کاشمیری نے متعدد ڈراموں میں اس دور کے سیاسی انحطاط کو پیش کیا۔ ان کی شاہ کار نظم ''شکریہ یورپ'' تو اس دور کا پورا منظر نامہ پیش کرتی ہے۔ اس نظم کا لہجہ خطیبانہ ہے۔ نظم کیا ہے ایک جارحانہ پیغام ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جوش اور روانی کا دریا بہہ رہا ہے جو یاس و قنوطیت کے جذبات کو خس و خاشاک کی طرح بہا کر لے جا رہا ہے۔ یہ نظم نصف صدی کے قومی مرثیوں اور نوحوں کے مقابلے میں ایک نمایاں حیثیت کی حامل ہے۔ نظم میں مشرق و مغرب آپس میں متصادم ہیں۔ آغا حشر کیوں کہ ڈراما نگار بھی تھے لہٰذا نظم میں بھی ڈرامائی انداز اختیار کیا گیا ہے۔ اس قسم کی نظمیں کہنا برطانوی اقتدار میں جرأت کا کام تھا۔ نظم میں یورپ کے خلاف خوب طنز کے تیر برسائے گئے جس کی وجہ سے نظم کو ضبط بھی کیا گیا[۲۵۶]۔ خواجہ حسن نظامی کا کہنا ہے کہ اس نظم کا ہر مصرع کوہ آتش فشاں ہے مگر آخری دعا نہایت موثر اور خاکستانی پیکر میں ہلچل مچانے والی کیفیت لیے ہوئے ہے[۲۵۷]۔ اس نظم کی بابت کہا جاتا ہے کہ لاہور میں انجمن حمایت اسلام کے جلسے مورخہ ۲۱ مارچ ۱۹۱۳ء میں پڑھی گئی۔ آخری بند تک پہنچتے پہنچتے آغا حشر کی آواز بھرّا گئی۔ خود حشر کا بیان ہے کہ نظم میں جو کچھ ہے وہ مسلمانانِ عالم کے اضطرابِ درونی کا اظہار ہے[۲۵۸]۔ نظم میں اس بات کا اعتراف کیا گیا کہ مسلمان محوِ خواب تھے۔ نغمۂ توحید کا پیغام مدتوں سے بھولے ہوئے تھے۔ یورپ کے حملوں نے اسے پھر سے زندہ کر دیا۔ یورپ کی پالیسی نے مسلمانوں کو نئی راہیں تلاش کرنے کا حوصلہ دیا:

مدتوں سے نغمۂ توحید محوِ خواب تھا — ساز ہستیِ مسلماں تشنۂ مضراب تھا
پیکرِ احساس میں خوابیدہ روحِ درد تھی — شعلہ ریزیِ نواہائے اخوت سرد تھی[۲۵۹]

ماضی کی عظمت رفتہ کے روشن پہلوؤں کی جانب اشارہ کرنے کے بعد دورِ حاضر کے مسلمانوں پر چھائی ہوئی ابتلا کی تصویر کھینچتے ہوئے وہ اس بات پر افسوس کا اظہار کرتے دکھائی دیتے ہیں کہ جن قوموں کو ہمارے اباؤاجداد نے اپنا زیر نگیں بنایا تھا آج وہ ہم پر مسلط ہوئے بیٹھے ہیں۔ ملاحظہ کیجیے:

تیری لب بندی سبق آموز گویائی ہوئی — طعنہ زن ہیں تجھ پہ قومیں تیری ٹھکرائی ہوئی
آج ان ذروں کو بھی ناز اپنی تابانی پہ ہے — تیرے در کا نقش سجدہ جن کی پیشانی پہ ہے
پھر بھی ننگِ زندگی آسودہِ خواری رہا — سونے والے پر وہی خوابِ گراں طاری رہا[۲۶۰]

اس نظم میں انھوں نے یورپ کے مظالم کو خوب تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔ ان مظالم کی سخت مذمت کرتے ہوئے انھوں نے یورپ پر باور کرایا کہ صرف لفظی امن کے نعروں سے امن حاصل نہیں ہو گا بلکہ عمل سے ہی امن قائم کیا جا سکتا ہے۔ اس ضمن میں وہ یورپ کے دعوؤں کا مذاق اڑاتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

صرف تصنیفِ ستم ہے فلسفہ دانی تری — آدمیت سوز ہے تہذیبِ حیوانی تری
اٹھ رہا ہے شورِ غم خاکسترِ پامال سے — کہہ رہا ہے ایشیا رو کے زبانِ حال سے[۲۶۱]

نظم کے آخر میں دعا دراصل مسلمانوں کی زبوں حالی کا وہ احساس ہے جو اس زمانے میں ہر درد مند دل رکھنے والے مسلمانوں کے لب سے بے ساختہ جاری ہوا:

خوار ہیں بدکار ہیں ڈوبے ہوئے ذلّت میں ہیں — کچھ بھی لیکن ترے محبوبؐ کی امت میں ہیں
حق پرستوں کی اگر کی تو نے دل جوئی نہیں — طعنہ دیں گے بت کہ مسلم کا خدا کوئی نہیں[۲۶۲]

اپنی ایک اور نظم "موجِ زم زم" میں بھی انھوں نے ملت کے کرب ناک حالات کو پیش کرتے ہوئے خدا سے رحمت طلب کی اور کہا کہ:

ڈگ مگاتے گرتے جاتے ہیں یہ تیرے ناتواں — اے تری رحمت کے صدقے تھام لے بڑھ کر ہمیں[۲۶۳]

عبدالحلیم شرر کی تاریخی نظم نگاری کا اصل محرک بھی ملت اسلامیہ کے خوں چکاں حالات تھے۔ انھوں نے بھی مسلمانوں کو اتحاد و یک جہتی کا درس دیتے ہوئے اپنے فکر و عمل میں تبدیلی کا درس دیا۔ اردو میں سب سے پہلے نظم معریٰ اور آزاد نظم کا تجربہ شرر نے ہی کیا۔ مذکورہ موضوع پر تخلیق کی گئی ان کی عمدہ اور موثر نظموں میں "شبِ غم"، "زمانہ اور اسلام"، "فلورنڈا"، "مظلومِ ورجینیا" اور "اسیرِ بابل" قابلِ ذکر ہیں۔ شرر ملت اسلامیہ کے لیے درد مند دل رکھنے والے شاعر تھے۔ ان کے تاریخی ناولوں میں بھی قوم کو بیدار کرنے کا منظر نامہ موجود ہے۔ "زمانہ اور اسلام" میں انھوں نے انھی کیفیات کو موضوع بنایا اور قوم کے عروج و زوال کی داستان کو قلم بند کر دیا۔ مسلم امہ کی منتشر حالت کا حال بیان کرنے کے ساتھ ساتھ انھوں نے عروج کی داستان سناتے ہوئے عزتِ نفس کو بھی اجاگر کرنے کی کوشش کی۔ انھیں بھولے ہوئے اسباق یاد دلائے اور فکر و عمل پر آمادہ کیا[۲۶۴]۔ ملاحظہ کیجیے:

مسلمانو! افسوس عبرت کی جا ہے — زمانہ غمِ قوم میں مبتلا ہے
تمھیں ڈھونڈتا در بدر وہ پھرا ہے — بڑی مشکلوں سے لگایا پتا ہے
بہت رو چکے رونے والے اٹھو اب — زمانہ جو کہتا ہے وہ ہی کرو اب[۲۶۵]

شرر کی تحریروں اور ان کی نظموں کا بنیادی مقصد مختلف اقوام اور جماعتوں کے مابین تعصبات اور اختلافات کو مٹانا تھا۔ یہ نظمیں دراصل فرسودہ نظام معاشرت کی مدلل ہجو ہیں۔ جب کہ یہی مسلمان ماضی میں عظمت و شوکت کے مینار سمجھے جاتے تھے۔ بقول شاعر:

ممالک تھے سب زیرِ فرمانِ اس کے — دہلتے شہنشاہ تھے اس کے ڈر سے
جھکائے تھیں قومیں سر اس کے آگے — مذاہب تھے جو دست بستہ کھڑے تھے
ہوا بندھ گئی تھی زمین و زماں میں — تھی اک دھاک سی بیٹھی سارے جہاں میں[۲۶۶]

حالی کے تتبع میں لکھی گئی نظم "زمانہ اور اسلام" کا لہجہ بھی بڑا پُر اثر ہے۔ رومانی فضا میں لکھی گئی اس نظم میں بھی شاعر، اسلام کی عظمت رفتہ کو بحال کرنے کے جتن کرتے ہوئے کہتا ہے کہ:

غضب حسن تھا اس بتِ دل ربا کا — تھا اس روئے تاباں سے اک رعب پیدا
کھڑا آگے اقبال تھا دست بستہ — جبیں پر تھا اک خوش نما تاج رکھتا
چمکتے تھے حرف اس میں ہیرے سے بڑھ کر — ترقیِ اسلام لکھا تھا اس پر[۲۶۷]

خلافت کے خاتمے کے بعد بھی ہندوستان میں خلافت کے جلسے مختلف مقامات پر ہوتے رہے لیکن اس تحریک کی اصل روح نکل چکی تھی۔ ان اجلاس میں زیادہ تر اندرونی مسائل اور ہندو مسلم فسادات پر بحثیں ہونے لگیں۔ مجلس کا آخری جلسہ ۱۹۳۳ء میں بمبئی میں ہوا۔ اس کے بعد صرف اس کے دفتر کی عمارت اور "خلافت" نام کا اخبار باقی رہ گیا۔ وہ تنظیم جس نے چند سال قبل تک ممالک ہند کی سیاست مین ہلچل مچائے رکھی اور جس سے خود کانگریس کی سیاست کو بڑی تقویت پہنچی، حکایت ماضی ہوگئی[۲۶۸]۔ مبصرین اور عینی شاہدین کے مطابق اس سے ہندوستانی سیاست خصوصاً ہندو مسلم اتحاد کو زبردست دھچکا لگا اور ناقابل تلافی نقصان پہنچا۔ بعض مسلمانوں نے محمد علی جوہر اور ان کے رفقا پر الزام تراشی شروع کردی کہ انھیں مغالطے میں رکھ کر گمراہ کیا گیا۔ ایک خبر کے مطابق اس وقت چندے میں جمع ہونے والی پندرہ لاکھ (ڈیڑھ ملین) پونڈ کی خطیر رقم دھری کی دھری رہ گئی اور مولانا محمد علی کا اسے ترکی بھیجنا ناممکن ہوگیا[۲۶۹]۔ خلافت کمیٹی چوں کہ ایک قانون شکن جماعت تھی اس لیے بینک کے بجائے اس کے چندے کی رقم صدر اور خزانچی محمد احمد چھوٹانی کے پاس جمع ہوتی تھی۔ رہنماؤں کی گرفتاری کے بعد سیٹھ احمد چھوٹانی نے

یہ رقم اپنے کاروبار میں لگائی۔ کاروبار میں خسارے کے بعد کمیٹی کو رقم واپس نہ کر سکے[۷۰]۔ جب علی برادران جیل سے رہا ہو کر آئے تو لوگوں نے غبن کے الزامات عائد کیے تو مولانا نے اس کی وضاحت ان الفاظ میں کی کہ:

> ہماری والدہ اور میری بیوی نے ہماری دو برس قید میں تقریباً پینتیس لاکھ روپے بطور چندہ جمع کیا۔ اس تمام رقم کی ایک ایک پائی کا حساب دفتر خلافت میں آڈٹ کیا ہوا موجود ہے۔ ہم نے خلافت کے زمانے میں فقط تین لاکھ روپے چھوڑے تھے، بعد میں پینتیس لاکھ روپے جمع ہوئے۔ اگر یہ رقم ہم نے جمع نہیں کی تھی تو اس کی ایک پائی بھی ہم نے خرچ نہیں کی۔ سیٹھ چھوٹانی اور کمیٹی اس کے جواب دہ ہیں[۷۱]۔

خلافت کے مخالفین نے اس مسئلے کو خوب اچھالا۔ بعد میں مولانا جوہر نے اس واقعے کی تحقیق کے لیے خلافت کمیٹی کی رپورٹیں اخبارات اور شائع شدہ لٹریچر کا مطالعہ کیا۔ عارضی چھان بین کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ ایک سازش کے تحت سیٹھ چھوٹانی دیوالیہ ہو گئے۔ ۱۹۴۵ء میں جمعیت علمائے ہند کے سالانہ اجلاس منعقدہ مراد آباد میں کی گئی تقریر جو ''ایک امی کی تقریر'' کے عنوان سے ہمدرد کے شمارے ۲۰ جنوری ۱۹۲۵ء میں شائع ہوئی، میں مولانا نے فرمایا کہ خلافت فنڈ جو حقیقتاً انگورہ فنڈ تھا، اسے کسی نے غبن نہیں کیا۔ یہ ضرور ہے کہ ساڑھے سولہ لاکھ نقد سیٹھ چھوٹانی ادا نہیں کر سکے لیکن انھوں نے اپنا کاروبار اور مال اس کے عوض خلافت کمیٹی کو دے دیا۔ چھوٹانی صاحب نے سخت غلطی کی کہ یہ رقم اپنے کاروبار میں لگائی لیکن ان کی نیت بے ایمانی کی نہیں تھی[۷۲]۔ اس فنڈ میں مرکزی خلافت کمیٹی نے بیالیس لاکھ چھیالیس ہزار چار سو ایک بطور چندہ جمع کیے۔ اس کا بڑا حصہ قسطوں میں کمیٹی کی منظوری سے سیٹھ میاں محمد چھوٹانی نے مصطفیٰ کمال کو انگورہ بھیجا اور رسیدیں بھی لیں۔ لیکن سولہ لاکھ سترہ ہزار سات سو کی رقم نہیں بھیجی گئی۔ اس رقم کو کاروبار میں لگانے کا خمیازہ بھگتنا پڑا۔ حکومت نے جب ٹھیکے ختم کیے تو انھیں اپنا تمام کاروبار اور کارخانے خلافت کمیٹی کو دینے پڑے[۷۳]۔ بعد میں بمبئی چھوڑ کے بنگلور چلے گئے اور بڑی عسرت اور تنگی میں زندگی گزاری۔ آخری عمر میں وہ حج کے لیے گئے، وہیں انتقال ہوا۔ وہیں جنت البقیع میں دفن ہیں[۷۴]۔ پروفیسر محمد سلیمان اشرف کے مطابق ''تمام رقمیں صدر دفتر میں جمع ہوتیں اور وہاں سے بہت ہی احوط ذرائع سے روپیہ ترکی بھیجا جاتا۔ اس طرح روپیہ بھی ایک کافی مقدار میں جمع ہو جاتا اور بے حیاؤں کی خورد برد سے رقم محفوظ رہتی''[۷۵] لیکن اس قدر احتیاط کے باوجود خلافت تحریک پر مالی بدعنوانیوں کے الزامات لگے اور اس معاملے پر بہت لے دے ہوئی۔ دراصل خلافت کے خاتمے کے اچانک اعلان کی وجہ سے اس قسم کی صورتِ حال پیدا ہوئی۔ مولانا جوہر بھی اس اقدام پر حیران اور ششدر تھے، ان کے خیال میں یہ بھی برطانوی پروپیگنڈے کی مہم تھی، لیکن جب اس خبر کی تصدیق ہوئی تو گویا ان پر بجلی بن کر گری۔ انھوں نے علی گڑھ کی مسجد میں ایک تقریر کے دوران افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ترکوں نے انھیں ایک ''میلے رومال'' کی طرح استعمال کر کے پھینک دیا[۷۶]۔ کچھ عرصے کے بعد مولانا ظفر علی خان نے خلافت کمیٹی کے صدر کی حیثیت سے ایک ٹیلی گرام کے ذریعے اس فیصلے سے متعلق

نظر ثانی کی درخواست بھی بھیجی[۲۷۷] جسے نامنظور کیا گیا۔ مصطفیٰ کمال نے اپنے جواب میں واضح طور پر لکھا کہ ہمارے خیال میں مسلمان اقوام کا مفاد اس میں ہے کہ وہ سب اپنی اپنی الگ الگ آزاد اور خود مختار ریاستیں قائم کریں[۲۷۸]۔ اس مسئلے پر بات چیت کے لیے ایک وفد انقرہ بھیجنے کی خواہش قبول کر لی گئی لیکن وفد کے مرکزی رہنما مولانا ابوالکلام آزاد کو افغان میں موجود ترک ایجنٹوں کے ساتھ مل کر تخریبی کارروائیوں کے الزام میں پاسپورٹ جاری نہیں کیا گیا[۲۷۹]۔ اس دوران محمد علی جوہر نے چندے کی جمع شدہ مذکورہ رقم انطالیہ کے رکن پارلیمنٹ رسیخ بے (Rasih Bey) کے حوالے کرتے ہوئے بھی یہ درخواست کی کہ آپ مصطفیٰ کمال کو ہماری معروضات پیش کریں۔ رسیخ بے نے جب یہ پیغام مصطفیٰ کمال کو دیا تو وہ غصے سے آگ بگولہ ہو گئے اور کہا کہ میں ان ممالک کا خلیفہ کیسے بنوں جن کے پہلے ہی بادشاہ اور حکمراں موجود ہیں؟ اختیارات کے لحاظ سے لاچار و بے بس اور کارکردگی کے لحاظ سے بے کار اور غیر مفید منصب اور لقب کا کیا فائدہ۔ انھوں نے خلیفہ جیسے خیالی تصور کا پروپیگنڈا کرنے والوں کو ترک دشمن قرار دیا[۲۸۰]۔ خلیفہ عبدالمجید آفندی نے اپنی جلاوطنی کے آخری برسوں میں یہ بھی دیکھ لیا کہ ان کے ہاتھوں میں بیعت کرنے کے سلسلے میں عالم اسلام میں اتفاق نہیں پایا جاتا۔ الازہر یونی ورسٹی کی جانب سے منعقدہ بین الاقوامی کانفرنس میں بھی یہی تجویز دی گئی کہ خلافت کو دوبارہ زندہ اور فعال کرنا تقریباً ناممکن ہے[۲۸۱]۔ خلافت کے نام پر وقتی جذبات کے تحت ابل پڑنے والے طوفان سے مسلمانوں کی مزید بربادی کے آثار قریب آتے گئے۔ اس بابت بعض لوگوں نے گاندھی کی کوششوں کو شک کی نظر سے دیکھا اور ان کی حمایت کو مسلمانوں کی تباہی و بربادی سے جوڑتے ہوئے یہ تک کہا کہ گاندھی کے دل میں بھی شدید خواہش تھی کہ مسلم طاقت اس بے مقصد خلافت کی تحریک میں جھونک کر ہندو غلبے کے مقاصد کو مزید آسان کیا جائے۔ زمینی حقائق کے برخلاف مسلمان گلا پھاڑ پھاڑ کر مکمل آزادی کے نعرے تو بلند کر رہے تھے لیکن ان نعروں میں عقل و خرد سے بے گانگی کا عنصر بہت نمایاں تھا۔ مسلمان قیادت اپنے ذہنوں میں اس خوش گمانی کو بٹھا کر اس تحریک کا ہراول دستہ بنی کہ وہ برتر نسل ہیں اور مکمل آزادی کے بعد ہندوستان پر ایک بار پھر وہی حکم راں ہوں گے۔ جب کہ تبدیل شدہ سیاسی حالات میں مسلمانوں کو اقتدار میں محض آبادی کے تناسب سے حصہ ملنا تھا[۲۸۲]۔

اس ساری نزع کے پس پشت قومی جدوجہد کے مسائل رہے ہیں۔ خلافت اور عدم تعاون کی تحریکوں کے زمانے میں گاندھی، قوم پرستوں اور خلافت کے علم برداروں کے سامنے صرف ایک مسئلہ رہا ہے۔ وہ یہ کہ کس طرح ایک مشترکہ قومیت وجود میں آئے جس میں ہر طرح کے مذہبی گروہوں کو اپنا انفرادی تشخص برقرار رکھنے کی آزادی ہو۔ اسی مقصد کے پیش نظر مولانا محمد علی نے ''پان اسلام ازم''، ''ہندوستانی قومیت'' اور ''سوراج'' کے تصورات کا تجزیہ کیا اور اسلام کے بنیادی اصولوں کو محفوظ رکھتے ہوئے ایک نئے ہندوستان کی بات کہی حالاں کہ متعدد ہندو رہنماؤں نے علی برادران کی قیادت پر بھروسا نہیں کیا۔ لاتعداد مضامین ان لوگوں کے خلاف لکھے گئے۔ بپن لال اور ان کے پیروکاروں کی کثیر تعداد نے ان کی نیت پر شک کیا۔ مولانا محمد

علی کے مضامین کا مطالعہ کیے بغیر ان پر طرح طرح کے الزامات لگائے۔ یہ ضرور ہے کہ مولانا محمد علی کے سیاسی افکار میں بعض کوتاہیاں ضرور تھیں۔ ایک ایسے ملک میں جہاں مسلم اقلیت میں تھے اور ہندو اکثریت میں، سامراج کے خلاف محض اس وجہ سے جنگ کہ وہ خلافت اور مقامات مقدسہ کے لیے خطرہ تھے اور ترکی کا ساتھ محض مذہبی بنیادوں پر دینا وغیرہ ایسے اقدامات تھے جو پائیدار شراکت داری کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے اختلاف کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ یہی سامراج دشمن قوم پرستانہ رجحان آگے چل کر بے حد خطرناک ثابت ہوا۔ اس رویّے کی وجہ سے مسلمانوں کے سیاسی مسائل کو مذہبی رنگ سے دیکھنے اور برتنے کا رجحان راسخ ہوا اور عوام میں جدید سیکولر پسندانہ سوچ پیدا نہ ہو سکی[۲۸۳]۔ لیکن ان تمام باتوں سے قطع نظر خلافت کی تحریک کے مجموعی اثرات کا جائزہ لیا جائے تو اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ چاہے اپنی علامتی طاقت سے ہو یا اخلاقی حمایت و اثر و رسوخ کے ذریعے سے، خلافت تحریک نے ایک غلام اور غیر ملکیوں کے پنجے میں جکڑے ہوئے معاشرے میں آزادی و حریت کی روح پھونکنے کا فرض انجام دیا۔ اسے متحرک بنایا، معاشرتی اصلاح پیدا کی اور قومی نصب العین کے حصول میں ایک زینے کا کام کیا۔ اسی تحریک کی بدولت ہندوستان میں آزاد ریاستوں کا قیام عمل میں آیا۔ ہندوؤں نے سوراج حاصل کیا، ہندوستان آزاد ہوا اور نئی سیکولر حکومت قائم ہوئی، جب کہ پاکستانی حاصل کرنے کی جدوجہد بھی انھی بنیادوں پر اپنے انجام تک پہنچی۔ مولانا محمد علی کے جوش عمل نے ہی مجلس خلافت کو تخلیق کیا۔ اگر علی برادران نہ ہوتے تو مسلمانوں میں احیائے خلافت کا جذبہ پیدا نہ ہوتا۔ ان کی تنظیم ملی نہ ہوتی اور نہ وہ قومی سطح پر اپنے جداگانہ تشخص کا احساس دلانے میں کام یاب ہو پاتے[۲۸۴]۔

حوالہ جات

۱۔ افضل، میاں محمد، ”سقوطِ بغداد سے سقوطِ ڈھاکا تک“، الفیصل پبلشرز، لاہور، ۲۰۰۲ء، ص ۳۹۰

۲۔ نیّر، ڈاکٹر طاہرہ، ”اردو شاعری میں پاکستانی قومیت کا اظہار“، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی، ۱۹۹۹ء، ص ۸۴

۳۔ ندوی، سید سلیمان، ”حیات شبلی“، مطبع معارف، اعظم گڑھ، ۱۹۷۰ء، ص ۱۹۰

۴۔ پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی، ص ۳۸۱، بہ حوالہ: ”جنگ آزادی کے اردو شعرا“، از محمود الرحمن، قومی ادارہ برائے تحقیق و ثقافت، اسلام آباد، ۱۹۸۶، ص ۲۶۷

۵۔ ریاض، سید حسن، ”پاکستان ناگزیر تھا“، شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ، کراچی یونی ورسٹی، کراچی، ۱۹۸۴ء، ص ۸۳۔۸۴

۶۔ یٰسین، مزمل، ”دیباچہ“، مشمولہ: ”سلطنت عثمانیہ کی انقلابی تحریکیں“، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی، ۱۹۷۳ء، ص د۔ھ

۷۔ ایضاً، ص ھ

۸۔ او کے، میم کمال، ”تحریک خلافت (۱۹۱۹ء ۔ ۱۹۲۴ء)“، قائداعظم اکادمی، ۱۹۹۱ء، ص ۲۰

۹۔ فاطمی، قدرت اللہ، “Pakistan Movement Kamalist Revolution”، انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک کلچر، لاہور، ۱۹۷۷ء، ص ۴

۱۰۔ نگار سجاد ظہیر، ڈاکٹر، ”جدید ترکی“، قرطاس، کراچی، ۲۰۰۱ء، ص ۱۸

۱۱۔ ایضاً، ص ۱۸۔۱۹

۱۲۔ یٰسین، ص ۱۔۲

۱۳۔ نگار سجاد ظہیر، ڈاکٹر، ص ۱۹

۱۴۔ یٰسین، ص ۱

۱۵۔ نگار سجاد ظہیر، ڈاکٹر، ص ۱۹

۱۶۔ یٰسین، ص ۱

۱۷۔ ایضاً

۱۸۔ نگار سجاد ظہیر، ڈاکٹر، ص ۱۹۔۲۱

۱۹۔ یٰسین، ص ۱۲۔۱۳

۲۰۔ لین پول، ”سلاطین ترکیہ“، ص ۴۸۱، بہ حوالہ نگار سجاد ظہیر، ص ۲۱

۲۱۔ نگار سجاد ظہیر، ڈاکٹر، ص ۲۲

۲۲۔ عباسی، محمد عدیل، ”تحریک خلافت“، قومی کونسل برائے فروغ اردو، دہلی، ۲۰۱۳ء، ص ۳۳

۲۳۔ جدید ترک نوجوانوں کی سیاسی تاریخ مختصراً ڈاکٹر نگار سجاد ظہیر اور ادبی انقلابی تحریکوں کے حوالے سے مزمل یٰسین نے مختصراً عمدہ جائزہ پیش کیا ہے۔ ان کے علاوہ بھی متعدد تصانیف میں اس حوالے سے کافی معلومات ملتی ہیں۔

۲۴۔ نامق کمال، بہ حوالہ مزمل یٰسین، ص ۴۴

۲۵۔ یٰسین، ص د۔ھ

۲۶۔ قریشی، اشتیاق حسین، “The Administration of the Sultanat of Delhi”، محمد اشرف پبلشرز، لاہور، ۱۹۴۲ء، ص ۳۳۔۳۸

۲۷۔ قریشی، اشتیاق حسین، ”برصغیر پاک و ہند کی ملت اسلامیہ“، مترجم ہلال احمد زبیری، شعبہ تصنیف و

تالیف و ترجمہ جامعہ کراچی، کراچی، ۱۹۹۹ء، ص ۳۵۲

۲۸۔ یلدرم، سجاد حیدر، ''محاربۂ بلقان''، مشمولہ: ''علی برادران''، مرتبہ سید رئیس احمد جعفری، محمد علی اکیڈمی، لاہور، ۱۹۶۳ء، ص ۲۲۳

۲۹۔ ریاض، ص ۸۱

۳۰۔ شوکت علی، ''چین میں اسلام اور عیسائیت کا مقابلہ''، مشمولہ: ''ہمدرد''، بہ حوالہ 'علی برادران'، مرتبہ، رئیس احمد جعفری''، ۱۹۶۳ء، ص ۲۱۳

۳۱۔ شان، محمد، ''Indian Muslim''، جلد سوم، ص ۸۰۔ ۸۱، بہ حوالہ م کمال اوکے، ص ۳۹

۳۲۔ مولانا محمد علی جوہر، بہ حوالہ م کمال اوکے، ص ۳۹۔ ۴۰، بہ حوالہ شاہ محمد، محولہ بالا، نومبر ۱۹۱۱ء، ص ۱۱۸۔ ۱۹۹

۳۳۔ مسلم گزٹ لکھنؤ، ۱۸ دسمبر ۱۹۱۲ء، جلد نمبر ۴۹، ص ۲، بہ حوالہ ڈاکٹر ایچ۔ بی۔ خان، ''برصغیر پاک وہند کی سیاست میں علما کا کردار''، قومی ادارہ برائے تاریخ وتحقیق، اسلام آباد، ص ۸۶۔ ۸۷

۳۴۔ بہ حوالہ م کمال اوکے، ص ۴۰

۳۵۔ شان محمد، محولہ بالا، ص ۱۱۸۔ ۱۱۹

۳۶۔ PNA فائل نمبر ۶۱، بہ حوالہ م کمال اوکے، ص ۴۱

۳۷۔ ریاض، ص ۸۲

۳۸۔ بہ حوالہ مسلم گزٹ لکھنؤ، ۱۱ دسمبر ۱۹۲۱ء، جلد ۱، نمبر ۳۵، ص ۳؛ اخبار ٹائمز کا حوالہ ریڈر مسلم گزٹ نے دیا تھا۔ بہ حوالہ ایچ بی خان، ڈاکٹر، ''تحریک علی گڑھ تا قیام پاکستان و قراردادِ مقاصد''، ص ۱۷۹

۳۹۔ PNA فائل نمبر ۲۱، بہ حوالہ م کمال اوکے، ص ۴۰

۴۰۔ سندیلوی، سلام، ڈاکٹر، ''مولانا شبلی کی اردو شاعری''، ماہ نامہ ''ادیب''، شبلی نمبر، علی گڑھ، ستمبر ۱۹۶۰ء، ص ۱۲۱

۴۱۔ نعمانی، شبلی، ''کلیات شبلی''، معارف پریس، اعظم گڑھ، سلسلۂ مطبوعات نمبر ۲۳، ص ۵۸۔ ۵۹

۴۲۔ حالی، ''کلیات نظم حالی''، دوم، مجلس ترقی ادب، لاہور، جنوری ۱۹۷۰ء، ص ۸۰

۴۳۔ حالی، جنوری ۱۹۷۰ء، ص ۱۴۶

۴۴۔ حالی، الطاف حسین، ''کلیات نظم حالی''، جلد اوّل، مرتبہ، شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی، حالی بک ڈپو، پانی پت، جنوری ۱۹۲۴ء، ص ۵۴

۴۵۔ حالی، جنوری ۱۹۷۰ء، ص ۱۲۲۔ ۱۲۳

۴۶۔ صدیقی، احمد صدیق، ''شبلی کی سیاسی شاعری پر ایک نظر''، مشمولہ: ماہ نامہ ''ادیب''، شبلی نمبر، علی گڑھ، ستمبر ۱۹۶۰ء، ص ۱۷۱

۴۷۔ نعمانی، شبلی، ''کلیات شبلی'' اردو، مرتبہ سید سلیمان ندوی، دار المصنفین، اعظم گڑھ، ۲۰۰۷ء، ص ۴۵

۴۸۔ نعمانی، شبلی، ''شبلی کی سیاسی شاعری پر ایک طائرانہ نظر''، محولہ بالا، ص ۱۷۱

۴۹۔ نعمانی، شبلی، ''مکاتیب شبلی''، حصہ اوّل، دار المصنفین، اعظم گڑھ، ص ۳۳۶

۵۰۔ ایضاً، ص ۳۳۷

۵۱۔ نعمانی، شبلی، ''کلیات شبلی''، سلسلۂ مطبوعات نمبر ۲۳، ص ۶۳

۵۲۔ جعفری، سید رئیس احمد، ''کاروان گم گشتہ''، سید رئیس احمد جعفری اکیڈمی، کراچی، ۱۹۷۱ء، ص ۳۰۶

۵۳۔ مہدی صغرا، ''اکبر الہ آبادی''، ترقی اردو بیورو، نئ دہلی،، ۱۹۸۳ء، ص ۳۰

۵۴۔ الہ آبادی، اکبر، بہ حوالہ: ''اکبر کی شاعری پر ایک نظر''، از ڈاکٹر ممتاز حسن، مشمولہ: ''افکار''، کراچی، اکبر الہ آبادی نمبر، نومبر دسمبر ۱۹۶۹ء، ص ۲۲۵

۵۵۔ الہ آبادی، طالب، ''اکبر الہ آبادی''، مطبع انوار احمدی، الہ آباد، س ن، ص ۸۱

۵۶۔ ایضاً، ص ۷۹

۵۷۔ ایضاً، ص ۸۱

۵۸۔ ایضاً، ص ۸۰۔۸۱

۵۹۔ کاظمی، ڈاکٹر روشن اختر، ''اردو میں طویل نظم نگاری کی روایت اور ارتقا''، ماڈرن پبلشنگ ہاؤس، نئ دہلی، ۱۹۸۴ء، ص ۱۷۱

۶۰۔ بحولہ ڈاکٹر روشن اختر کاظمی، ص ۱۷۲

۶۱۔ اکبر الہ آبادی، محولہ بالا، ص ۱۱۵

۶۲۔ ایضاً، ص ۹۰۔۹۱

۶۳۔ اکبر الہ آبادی، ''کلیات اکبر الہ آبادی''، اسرار کریمی پریس، الہ آباد، ۱۹۳۲ء، ص ۱۰۹

۶۴۔ احسان الحق، مرزا، ''قطعات ورباعیات''، حصہ دوم، بزم اکبر، کراچی، سن ندارد، ص ۱۲۷

۶۵۔ ایضاً، ص ۱۰۸

۶۶۔ نونہروی، سید شبیہ الحسن، ''مضامین اکبر''، مشمولہ: علی گڑھ میگزین، اکبر نمبر، جلد ۳۴، علی گڑھ، ۱۹۵۰ء، ص ۱۹

۶۷۔ علوی، ظفر الملک، ''تبصرہ''، مشمولہ: ماہ نامہ ''الناظر''، لکھنؤ، دسمبر ۱۹۱۲، ص ۸۴

۶۸۔ فرید آبادی، ہاشمی، ''چل بلقان چل''، مشمولہ: ماہ نامہ ''الناظر''، لکھنؤ، دسمبر ۱۹۱۲ء، ص ۱۴

۶۹۔ فرید آبادی، ہاشمی، ''ٹریپولی''، مشمولہ: ماہ نامہ ''تمدن''، جلد ۲، نمبر ۳، دسمبر ۱۹۱۱ء، ص ۲۹

۷۰۔ ایضاً

۷۱۔ فرید آبادی، ہاشمی، ''بس اب ہے آج سے آغاز میری کارفرمائی''، مشمولہ: ''نوائے آزادی''، مرتبہ عبدالرزاق قریشی، ادبی پبلشرز، بمبئی، ۱۹۵۷، ص ۱۳۲

۷۲۔ ملک، عبداللہ، ''پنجاب کی سیاسی تحریکیں''، نگارشات، لاہور، ۱۹۷۱ء، ص ۱۳۶

۷۳۔ جعفری، رئیس احمد، ''سیرت محمد علی''، مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی، ۱۹۳۲ء، ص ۱۳۰۔۱۳۱

۷۴۔ برنی، ضیا الدین احمد، ''عظمت رفتہ''، تعلیمی مرکز، کراچی، ۱۹۶۱ء، ص ۵۳

۷۵۔ جوہر، محمد علی، ''My life: a Fragment''، مرتبہ، ایس۔ ایچ۔ محمد اشرف، لاہور، ۱۹۴۲ء، ص ۵۹؛ جوہر کو خودکشی سے بچانے والے سر راس مسعود تھے۔ نیز دیکھیے: حسین، سید حامد، ''مولانا محمد علی جوہر کا ارادہ خودکشی''، مشمولہ: ''جامعہ''، دہلی، جوہر نمبر، اپریل ۱۹۷۹ء، ص ۳۸۔۳۹

۷۶۔ امرتسری، ظہور الدین خان، ''ناشر کے قلم سے''، مشمولہ: ''البلاغ''، از پروفیسر سید محمد سلیمان اشرف، ادارہ پاکستان شناسی، لاہور، ۲۰۱۰ء، ص ج

۷۷۔ بہ حوالہ بدایونی، عبدالحامد قادری، ''خطبہ صدارت پاکستان کانفرنس''، مطبوعہ نظامی پریس، بدایوں، ۳ اگست ۱۹۴۱ء ص ۱۰

۷۸۔ ایضاً، ص۳۱

۷۹۔ دریابادی، عبدالماجد، ''اکبر کا سیاسی مسلک''، مشمولہ ماہ نامہ ''نگار''، اکبر لہ آبادی نمبر، کراچی، ۱۹۶۹ء، ص۱۴

۸۰۔ مجیب، محمد، ''مولانا محمد علی: اپنی شکست کی آواز''، مترجم، انور احمد صدیقی، مشمولہ: ''جامعہ''، دہلی، جوہر نمبر، جلد۷۶، شمارہ ۳، اپریل ۱۹۷۹ء، ص۱۱۶

۸۱۔ جوہر، محمد علی، بہ حوالہ، ''محمد علی جوہر اور ان کی شاعری''، مرتبہ، عبدالرؤف عروج، سلطان حسین اینڈ سنز، کراچی، سن ندارد، ص۲۳

۸۲۔ عروج، عبدالرؤف، ''محمد علی جوہر اور ان کی شاعری''، محولہ بالہ، ص۱۱

۸۳۔ نارنگ، گوپی چند، ''ہندوستان کی تحریک آزادی اوراردو شاعری''، کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، ۲۰۰۳ء، ص۳۷۷

۸۴۔ جوہر۔ محمد علی، ''محمد علی جوہر اور ان کی شاعری''، محولہ بالا، ص۳۸۔۳۹

۸۵۔ میرٹھی، اسمٰعیل، ''حیات وکلیات اسمٰعیل میرٹھی''، مکتبۂ اسلامیہ، دہلی، ۱۹۳۹ء، ص۱۳۴

۸۶۔ ایضاً، ص۷۹

۸۷۔ ایضاً، ص۸۰

۸۸۔ ایضاً، ص۲۴۴

۸۹۔ حسرت، فضل الحسن، ''کلیات حسرت''، کتاب منزل، لاہور، ۱۹۵۹ء، ص۴۳

۹۰۔ صدیقی، نفیس احمد، ''ڈاکٹر حسرت موہانی اور انقلاب آزادی''، خدا بخش اورینٹل لائبریری، پٹنہ، ۱۹۹۸ء، ص۱۱۱

۹۱۔ سلیم احمد، ''حسرت کی سیاست''، پاکستان اسٹڈی سینٹر جامعہ کراچی، کراچی، دسمبر ۲۰۰۰ء، ص۹۰

۹۲۔ صدیقی، ۱۴۰۔۱۴۱

۹۳۔ حسرت، ص۱۷

۹۴۔ محمود الرحمٰن، ص۲۵۰

۹۵۔ بسمل، عبدالغفور، ''وسطی ایشیا کے ترک''، مشمولہ: سہ ماہی ''العلم''، کراچی، اکتوبر تا دسمبر ۱۹۵۴ء، ص۱۱

۹۶۔ حسرت، ص۱۴۴

۹۷۔ ذوالفقار، غلام حسین، ''ظفر علی خان: ادیب و شاعر''، مکتبہ خیابان ادب، لاہور، ڈاکٹر، ۱۹۶۷ء، ص۳۸

۹۸۔ محمود الرحمٰن، ''جنگ آزادی کے اردو شعرا''، قومی ادارہ برائے تحقیق تاریخ و ثقافت، اسلام آباد، ۱۹۸۶ء، ص۲۳۹

۹۹۔ ظفر علی خان، مولانا، ''کلیات ظفر علی خاں''، مرتبہ، زاہد علی خان، مولانا ظفر علی کان ٹرسٹ، لاہور، ۲۰۱۰ء، ص۱۶۲

۱۰۰۔ عنایت، افشاں، ''تحریکِ اتحاد اسلام اور اردو شاعری''، غیر مطبوعہ مقالہ برائے ایم۔ اے۔ کراچی یونی ورسٹی، ۲۰۰۶ء، ص۸۳

۱۰۱۔ بہ حوالہ، قریشی، طاہر، ڈاکٹر، ''قرآن اور ظفر علی خان''، قرطاس، کراچی، ۲۰۱۴ء، ص۱۲۔۱۳

۱۰۲۔ ظفر علی، ص۱۸۲

۱۰۳۔ بہ حوالہ زیدی، ص۱۰۲

۱۰۴۔ ایضاً، ص۱۰۴

۱۰۵۔ ایضاً، ص۱۵۹

۱۰۶۔ ایضاً، ص ندارد

۱۰۷۔ ظفر علی خان، ص ۱۶۰

۱۰۸۔ ایضاً، ص ۳۷۰

۱۰۹۔ ظفر علی خان، ''مولانا ظفر علی خان کی آپ بیتی''، مرتبہ، رابعہ طارق، ندوۃ العلم معارف، لاہور، ۱۹۹۹ء، ص ۱۴۸۔۱۴۹

۱۱۰۔ ایضاً، ص ۱۶۹

۱۱۱۔ ایضاً، ص ۱۷۴۔۱۷۵

۱۱۲۔ ہاشمی، رفیع الدین، ڈاکٹر، ''اقبال کی طویل نظمیں''، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۴ء، ص ۳۳

۱۱۳۔ ایضاً، ص ۳۸

۱۱۴۔ اقبال، ص ۱۹۱

۱۱۵۔ ایضاً، ص ۲۴۳

۱۱۶۔ چشتی، یوسف سلیم، ''شرح بانگ درا''، عشرت پبلشنگ ہاؤس، لاہور، سن ندارد، ص ۳۷۹

۱۱۷۔ اقبا، ص ۲۲۵

۱۱۸۔ خاں، غلام مصطفیٰ، ڈاکٹر، ''کلام اقبال کا تاریخی وسیاسی پس منظر''، مشمولہ: ''صریر خامہ''، قومی شاعری نمبر، سندھ یونی ورسٹی، شعبہ اردو، ۱۹۶۶ء، ص ۲۵

۱۱۹۔ انصاری، ص ۳۶

۱۲۰۔ چشتی، ص ۴۱۲

۱۲۱۔ ایضاً

۱۲۲۔ اقبال، ص ۱۷۲

۱۲۳۔ خان، ص ۲۷

۱۲۴۔ اقبال، بہ حوالہ خواجہ منظور حسین، ''تحریک جدوجہاد آزادی بہ طور موضوع سخن''، نیشنل بک فاؤنڈیشن، لاہور، ۱۹۷۸ء، ص ۱۱۷

۱۲۵۔ اقبال، علامہ، ''کلیات باقیات شعر اقبال''، مرتبہ ڈاکٹر صابر کلوروی، لاہور، ۲۰۰۴ء، ص ۳۶۰

۱۲۶۔ آرزو، بہ حوالہ ڈاکٹر معین الدین عقیل، ''تحریک آزادی میں اردو کا حصہ''، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی، ۱۹۷۶ء، ص ۴۱۷

۱۲۷۔ ز۔خ۔ش۔ ۱۹۴۱ء، ''فردوس تخیل''، دارالاشاعت پنجاب، لاہور، ص ۳۸۔۳۹

۱۲۸۔ ایضاً، ص ۴۶

۱۲۹۔ ایضاً، ص ۴۴۔۴۵

۱۳۰۔ ایضاً، ص ۵۴

۱۳۱۔ حسن، فاطمہ، ڈاکٹر، ''ز۔خ۔ش۔ حیات وشاعری کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ''، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی، ۲۰۰۷ء، ص ۲۴۰

۱۳۲۔ ز۔خ۔ش۔ ص ۵۵۔۵۶

۱۳۳۔ ایضاً، ص ۶۶

۱۳۴۔ ایضاً، ص ۶۶۔۶۷

۱۳۵۔ ایضاً، ص ۵۹

۱۳۶۔ چغتائی، ابراہیم بیگ، ''جنگ یونان و روم''، در مطبع خیر خواہِ اسلام۔، ۱۹۰۹ء، ص ۱

۱۳۷۔ ایضاً، ص ۲

۱۳۸۔ ایضاً، ص ۱۱۲

۱۳۹۔ ایضاً، ص ۱۲۹۔۱۳۱

۱۴۰۔ ایضاً، ص ۱۹۴

۱۴۱۔ امین، خالد، ''تحریک اتحاد اسلامی...''، غیر مطبوعہ مقالہ، کراچی یونی ورسٹی، ۲۰۱۴ء، ص ۳۳۰

۱۴۲۔ قسم الدین، شاہ، ''درد جگر''، حصہ اول۔ در مطبع اخبار الپنچ بانکی پورہ، س ن، ص ۳

۱۴۳۔ ایضاً، ص۳

۱۴۴۔ ایضاً، ص۱۱

۱۴۵۔ قریشی، اشتیاق حسین، ۱۹۹۹ء، ص۳۵۳

۱۴۶۔ سیتا رامیا، ص ۱۸۹، بہ حوالہ اشتیاق حسین قریش، محولہ بالا، ص۳۵۴

۱۴۷۔ جامعی، سید نصیر احمد، ''مشہور تاریخی واقعات''، قومی کتب خانہ، لاہور، ۱۹۷۹ء، ص۹۱۔۱۰۲

۱۴۸۔ فرید آبادی، ہاشمی، ''تاریخ مسلمانانِ پاکستان و بھارت''، جلد دوم، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی، ۱۹۸۸ء، ص۵۳۵

۱۴۹۔ محمود الرحمٰن، ''جنگ آزادی کے اردو شعرا''، ص ۲۲۲

۱۵۰۔ شاہ جہاں پوری، ابو سلمان، ''انجمن خدام کعبہ: تاریخ، قیام اور مقاصد''، ادارۂ تخلیقاتِ افکار و تحریکات ملی پاکستان، کراچی، س ن، ص۸۔۹

۱۵۱۔ ایضاً، ص۱۲

۱۵۲۔ شہید فرنگی محلی، مولانا صبغت اللہ، ''مولانا محمد علی کے کچھ واقعات''، مشمولہ: ''علی برادران''، مرتبہ، سید رئیس احمد جعفری، محمد علی اکیڈمی، لاہور، ۱۹۲۳ء، ص۹۵

۱۵۳۔ شاہ جہاں پوری، ص۱۲

۱۵۴۔ انصاری، مفتی محمد رضا فرنگی محلی، ''مولانا محمد علی اور مولانا فرنگی محلی''، مشمولہ: جامعہ دہلی، مولانا محمد علی نمبر، جنوری فروری ۱۹۸۰ء، ص۱۱۔۱۱۰

۱۵۵۔ مشمولہ: ''کامریڈ''، دہلی، ۷ جون ۱۹۱۳ء، ص۴۵۸

۱۵۶۔ خدام کعبہ (دستور العمل)، مشمولہ: ''ہمدرد''، دہلی، ۱۲ مئی ۱۹۱۳ء، ''کامریڈ''، دہلی، ۲۱ مئی ۱۹۱۳ء، ص ۴۳۷

۱۵۷۔ شاہ جہاں پوری، ابو سلمان، ص۴۲۔۴۳

۱۵۸۔ ایضاً، ص۴۳۔۶۵

۱۵۹۔ کشّاف، ''خدمتِ کعبہ''، مشمولہ: ''ہمدرد''، دہلی، ۳ مارچ ۱۹۱۴ء، ص ۱، بہ حوالہ، ابو سلمان شاہ جہاں پوری، محولہ بالا، ص۹۶

۱۶۰۔ قمر سندیلوی، سید قمر الدین، ''انجمن خدام کعبہ''، مشمولہ: ''ہمدرد''، دہلی، ۱۱ جنوری ۱۹۱۴ء، ص ۱، بہ حوالہ ابو سلمان شاہ جہاں پوری، محولہ بالا، ص۹۷

۱۶۱۔ صبر، ''شرکتِ جمعیت خدام کعبہ''، مشمولہ: ''ہمدرد''، دہلی، ۵ فروری ۱۹۱۴ء، ص ۱، بہ حوالہ ابو سلمان شاہ جہاں پوری، محولہ بالا، ص۹۸

۱۶۲۔ نارنگ، ''ہندوستان کی تحریک آزادی اور اردو شاعری''، قومی کونسل برائے فروغ اردو، نئی دہلی، ۲۰۰۳ء، ص۳۷۶

۱۶۳۔ ظہیر، ڈاکٹر نگار سجاد، ص۷۹

۱۶۴۔ سید امیر علی کے بارے میں تفصیلات کے لیے دیکھیے: کے۔ کے۔ عزیز، "Ameer Ali; His life and works"، لاہور، ۱۹۶۸ء

۱۶۵۔ او۔ کے۔ میم کمال، ص۱۲۳۔۱۲۴

۱۶۶۔ TBMMZC (ترکی کی قومی اسمبلی) GCZ، ریکارڈ، جلو سوم، ص۱۷۸

۱۶۷۔ ملاحظہ کیجیے: لندن ٹائمز کے شمارے مورخہ ۲۷ نومبر ۱۹۱۸ء، ۶ جون ۱۹۱۹ء، ۲ اگست ۱۹۱۹ء وغیرہ

۱۶۸۔ گرینوال، ہیری جے۔ "His Highness, The Agha Khan, Imam of the Ismailies"، لندن، ۱۹۵۲ء، نواں باب

۱۶۹۔ او۔کے۔ میم کمال، محولہ بالا، ص ۱۷۴۔۱۷۹

۱۷۰۔ بہ حوالہ: اوکے میم کمال، محولہ بالا، ص ۱۹۱۔۱۹۲

۱۷۱۔ TBMMZC، جلد دوم، داخلی ا

۱۷۲۔ ایضاً، جلد ہفتم، ص ۲۸

۱۷۳۔ خان، ظفر علی، بہ حوالہ "ہندوستان کی تحریک آزادی اور اردو شاعری"، از گوپی چند نارنگ، محولہ بالا، ص ۳۸۲

۱۷۴۔ ایضاً، ص ۳۸۳

۱۷۵۔ لکھنوی، آرزو، بہ حوالہ: "اردو شاعری پر سیاسی اثرات"، از ڈاکٹر ذاکر اللہ، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۱۱ء، ص ۲۱۸

۱۷۶۔ ذاکر اللہ، محمد، "اردو شاعری پر سیاسی اثرات: ابتدا تا آزادی"، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۱۱ء، ص ۲۱۹

۱۷۷۔ ایضاً، ص ۲۱۹۔۲۲۰

۱۷۸۔ خان، مولانا ظفر علی، بہ حوالہ "اردو شاعری پر سیاسی اثرات"، محولہ بالا، ص ۲۲۰

۱۷۹۔ اقبال، علامہ محمد، بہ حوالہ "اردو شاعری پر سیاسی اثرات"، محولہ بالا، ص ۲۲۱

۱۸۰۔ فرید آبادی، سید ہاشمی، "تاریخ مسلمانانِ پاکستان و بھارت"، جلد دوم، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی، ۱۹۸۹ء، ص ۵۵۲۔۵۵۳

۱۸۱۔ نامعلوم، مشمولہ: "نوائے آزادی"، مرتبہ، عبدالرزاق قریشی، ادبی پبلشرز، بمبئی، ۱۹۵۷ء، ص ۲۲۶

۱۸۲۔ صفی، سید علی نقی، "رجز مسلم"، مشمولہ: "نشید حریت"، مرتبہ، شان الحق حقی، فیروز سنز، کراچی، ص ۱۵۲

۱۸۳۔ ہمایوں، شاہ دین، جسٹس، "شعرائے قوم سے خطاب"، مشمولہ: "نشید حریت"، مرتبہ، شان الحق حقی، فیروز سنز، کراچی، ص ۱۵۰

۱۸۴۔ نیرنگ، میر غلام، مشمولہ: "نوائے آزادی" مرتبہ، عبدالرزاق قریشی، ادبی پبلشرز، بمبئی، ۱۹۵۷ء، ص ۲۲۳۔۲۲۴

۱۸۵۔ ایضاً، ص ۲۲۵

۱۸۶۔ قریشی، عبدالرزاق، "مقدمہ: جنگ آزادی میں اردو کا حصہ"، مشمولہ: "نوائے آزادی"، محولہ بالا، ص ۲۱

۱۸۷۔ موہانی، حسرت، بہ حوالہ: عبدالواسع، "مولانا ابوالکلام آزاد کی انشا پردازی"، مشمولہ: "ابوالکلام آزاد سیمینار میں پڑھے گئے مقالات کا مجموعہ"، ص ۱۲۹

۱۸۸۔ نظامی، ظفر احمد، "مولانا آزاد کی کہانی"، مکتبۂ جامعہ، دہلی، ۲۰۱۱ء، ص ۳۱۔۳۳

۱۸۹۔ انور، رفیع، "مولانا ابوالکلام آزاد: ایک صاحب طرز انشا پرداز کی حیثیت سے"، مشمولہ: ابو سلمان شاہ جہاں پوری، "مولانا ابوالکلام آزاد ایک شخصیت ایک مطالعہ"، ص ۲۰۳

۱۹۰۔ اکرم، شیخ محمد، "موج کوثر"، ادارۂ ثقافت اسلامیہ، لاہور، ۱۹۸۲ء، ص ۲۷۳

۱۹۱۔ بیگم، سید عبداللہ، ''ابو الکلام کی نثر''، مشمولہ: ''ابو الکلام آزاد''، از عبداللہ بٹ، قومی کتب خانہ، لاہور، ۱۹۸۶ء، ص۵۶

۱۹۲۔ آزاد، ابو الکلام، مشمولہ: ''نوائے آزادی''، مرتبہ، عبدالرزاق قریشی، محولہ بالا، ص۱۶۹

۱۹۳۔ نذر الاسلام، بہ حوالہ ''بنگال کا عظیم قومی شاعر''، از وفا راشدی، مشمولہ: ''صریر خامہ''، قومی شاعری نمبر، ۱۹۶۶ء، ص۱۰۸

۱۹۴۔ علوی، محمد اظہر علی، ''مصطفیٰ کمال: تاریخ ترکی و فلسطین وغیرہ''، جلد سوم، برکی پریس، لکھنؤ، ۱۹۳۸ء، ص۴۰

۱۹۵۔ الہ آبادی، اکبر، ''کلیات اکبر الہ آبادی''، ۱۹۳۲ء، ص۱۰۹

۱۹۶۔ احسان الحق، ''قطعات ورباعیات''، ص۱۲۷

۱۹۷۔ ایضاً، ص۱۲۸

۱۹۸۔ طوق ار، خلیل، ''جہان اسلام: ترکی کا ایک اردو اخبار''، اردو اکیڈمی پاکستان، لاہور، ۲۰۱۱ء، ص۱۶۔۱۷

۱۹۹۔ عزیز لکھنوی، مرزا محمد ہادی، بہ حوالہ ''ظفر علی خان بحیثیت صحافی''، از نظیر حسنین زیدی، مکتبہِ اسلوب، کراچی، ۱۹۸۵ء، ص۱۱۵

۲۰۰۔ ایضاً

۲۰۱۔ جھنجھانوی، وجاہت، بہ حوالہ: ''ظفر علی خان بحیثیت صحافی''، محولہ بالا، ص۱۱۵

۲۰۲۔ لکھنوی، شمس، مشمولہ: ''زمین دار''، ۱۹ جون ۱۹۲۰ء، بہ حوالہ ''ظفر علی خان بحیثیت صحافی''، ص ۱۳۸

۲۰۳۔ ارشد، غلام حسین، ''نالۂ جگر سوز''، مشمولہ: ماہ نامہ ''تمدن''، دہلی، اپریل ۱۹۱۲ء، ص۵۵

۲۰۴۔ چغتائی، ابراہیم بیگ، ''جنگ یونان وروم''، مطبع خیر خواہ اسلام، ۱۹۰۹ء، ص۱

۲۰۵۔ ارشد، غلام حسین، ص۵۳

۲۰۶۔ ارشد، غلام حسین، ''اسلام''، مشمولہ: ماہ نامہ ''تمدن''، دہلی، اگست ۱۹۱۲ء، ص۲۹

۲۰۷۔ ایضاً، ص۲۸

۲۰۸۔ وحشت کلکتوی، رضا علی، ''خروش یاد''، مشمولہ: ''الہلال''، جلد ۲، شمارہ ۱۸، ص۱۳۸

۲۰۹۔ فتح پوری، نیاز، علامہ، ''دعوت درد''، مشمولہ: ''الہلال''، جلد ۳، شمارہ ۱۹، ص۶۷

۲۱۰۔ فتح پوری، نیاز، علامہ، ''قطرات اشک''، مشمولہ: ''الہلال''، جلد ۴، شمارہ ۳، ص۴۶

۲۱۱۔ ایضاً

۲۱۲۔ شاہ جہاں پوری، عبدالحکیم سیف، مشمولہ: ''الہلال''، جلد ۱، شمارہ ۶۴، ص۱۶

۲۱۳۔ بسمل، عبدالحکیم، ''فغان بسمل''، مشمولہ: ''الناظر''، لکھنؤ، یکم مارچ ۱۹۱۰ء، ص۳۳

۲۱۴۔ قزل باش، مرزا ثاقب، ''خوں نابۂ جگر''، مشمولہ: ''الناظر''، لکھنؤ، یکم مارچ ۱۹۱۳ء، ص۱۱۔۱۴

۲۱۵۔ لکھنوی عزیز، مرزا محمد ہادی، مشمولہ: ''الناظر''، لکھنؤ، دسمبر ۱۹۱۲ء، ص۴۲

۲۱۶۔ قدسی، سید محمد جعفر، مشمولہ: ''الناظر''، لکھنؤ، یکم جنوری ۱۹۱۳ء، ص۷۳۔۷۴

۲۱۷۔ طباطبائی، علی حیدر، مشمولہ: ''الناظر''، لکھنؤ، یکم مئی ۱۹۱۱، ص۱۸۔۱۹

۲۱۸۔ سفیر، فخر الدین احمد، ''جنگ بلقان''، مشمولہ: ''زمانہ''،کان پور، دسمبر ۱۹۱۲ء، ص ۳۷۲

۲۱۹۔ عمادی، مولانا تمنا، ''کیا اسلام تلوار کے زور سے پھیلا''، مشمولہ: ماہ نامہ ''تمدن''، دہلی، دسمبر ۱۹۱۲ء، ص ۱۶

۲۲۰۔ عمادی، مولانا تمنا، ''دنیائے اسلام''، مشمولہ: ماہ نامہ ''تمدن''، دہلی، جون ۱۹۱۲ء، ص ۵۴

۲۲۱۔ عمادی، مولانا تمنا، مشمولہ: ماہ نامہ ''الناظر''، لکھنؤ، جلد ۶، شمارہ ۳۲، ۱۳۲۷ھ، ص ۴۹۔۵۰

۲۲۲۔ عمادی، مولانا تمنا، ''قطعہ''، مشمولہ: ماہ نامہ ''تمدن''، دہلی، دسمبر ۱۹۱۲ء، ص ۲۲

۲۲۳۔ عمادی، مولانا تمنا، ''اپنا ترانہ''، مشمولہ: ماہ نامہ ''تمدن''، دہلی، مئی ۱۹۱۲ء، ص ۱۰

۲۲۴۔ عنایت، افشاں، ''تحریک اتحاد اسلامی اور اردو شاعری''، مقالہ برائے ایم۔ اے۔ شعبہ اردو جامعہ کراچی، ۲۰۰۶ء، ص ۱۵۳

۲۲۵۔ فرید آبادی، سید مطلبی، ''جدوجہد آزادی''، مشمولہ: ''نغمات حریت''، منتخب کردہ خلیق انجم، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، ۲۰۰۷ء، ص ۱۴۷

۲۲۶۔ حسین، سید عابد، ''ہندوستانی مسلمان: آئینۂ ایام میں''، مکتبہ جامعہ نئی دہلی، ۲۰۱۲ء، ص ۱۴۸۔۱۴۹

۲۲۷۔ اعظمی، کیفی، ''خانہ جنگی''، مشمولہ: ''کیفیات: کلیات کیفی اعظمی''، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۰۲ء، ص ۲۴۷

۲۲۸۔ سرور، محمد، ''مولانا محمد علی کے یورپ کے سفر''، ادارہ ادبیات نو، لاہور، ۱۹۴۶ء، ص ۸

۲۲۹۔ سیتاپوری، نادم، ''تحریک خلافت کی باغیانہ نظمیں''، مشمولہ: ''صریر خامہ''، قومی شاعری نمبر، ۱۹۶۶ء، ص ۹۴

۲۳۰۔ آہِ مظلوم ماں، ''تحریک خلافت کی باغیانہ نظمیں''، مشمولہ: ''زعمائے پاکستان''، از اعظم چودھری، سن ندارد، ص ۱۹۱۔۱۹۲

۲۳۱۔ ایضاً، ص ۱۹۳

۲۳۲۔ ایضاً، ص ۱۸۸۔۱۸۹

۲۳۳۔ اقبال، افضل، بہ حوالہ ''تحریک خلافت''، از میم کمال اوکے، محولہ بالا، ص ۳۵

۲۳۴۔ آہ مظلوماں، ''تحریک خلافت کی باغیانہ نظمیں''، محولہ بالا، ص ۱۹۵

۲۳۵۔ شاہ جہاں پوری، ڈاکٹر ابو سلمان، ''بیسویں صدی میں ہندوستان کی ملی تحریکیں''، قندیل پبلشرز، لاہور، ۲۰۰۹ء، ص ۵۸۸۔۵۹۰

۲۳۶۔ رام، تیرتھ، ''سودیشی تحریک کا زوال''، مشمولہ: ''زمانہ''، کان پور، نومبر ۱۹۱۳ء، ص ۲۷۱۔۲۷۶

۲۳۷۔ آہ مظلوماں، ''تحریک خلافت کی باغیانہ نظمیں''، محولہ بالا، ص ۲۰۴

۲۳۸۔ قریشی، اشتیاق حسین، ''برصغیر پاک و ہند کی ملت اسلامیہ''، ص ۳۵۴۔۳۵۵

۲۳۹۔ آزاد، مولانا ابو الکلام، ''خطبۂ صدارت مجلس خلافت آگرہ''، مشمولہ: ''خطبات خلافت''، مرتبہ ڈاکٹر محمود الٰہی، اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ، ۲۰۰۵ء، ص ۹۱

۲۴۰۔ حسین، سید عابد، ''ہندوستانی مسلمان آئینۂ ایام میں''، ص ۱۴۲۔۱۴۳

۲۴۱۔ اعظمی، یحییٰ، ''نوائے حیات''، ص ۸۱

۲۴۲۔ ایضاً، ص ۳۳۔۳۴

۲۴۳۔ سندیلوی، مولوی حکیم نواب علی برق، ''ترانۂ مسلم''، ص ۳

۲۴۴۔ صدیقی، ابوالمحمود، ''مظالم سمرنا اور فغانِ مسلم''، ص ۴۔۶

۲۴۵۔ سندیلوی، اشتیاق، ''درد دل''، حسن برقی پریس، لکھنؤ، سن ندارد، ص ۱۵

۲۴۶۔ ایضاً، ص ۲۷

۲۴۷۔ ایضاً، ص ۴۸

۲۴۸۔ کوٹی، میر، ''ترانۂ مسلم''، ص ۲۰

۲۴۹۔ ایضاً

۲۵۰۔ قریشی، محمد نصیر الحق، ایضاً، ص ۱۷۔۱۹

۲۵۱۔ انصاری، تیغ، ایضاً، ص ۲۴۔۲۶

۲۵۲۔ بوڑہانوی، محمد یونس، ایضاً، ص ۲۲۔۲۳

۲۵۳۔ انور، نذیر محمد، ایضاً، ص ۲۶۔۲۷

۲۵۴۔ نام آور، مصطفیٰ غازی بہادر، ''مظالمِ سمرنا و فغانِ مسلم''، محولہ بالا، ص ۷

۲۵۵۔ جیوا خان، شیخ نور الدین، ''قصہ شاہ روم''، مطبع صفدر، بمبئی، ۱۳۰۲ھ، ص ۳

۲۵۶۔ شفیع، محمد ڈاکٹر، ''آغا حشر کاشمیری اور ان کے ڈراموں کا تنقیدی مطالعہ''، فخر الدین علی میموریل کمیٹی، اتر پردیش، ۱۹۸۸ء، ص ۳۷۶

۲۵۷۔ ایضاً، ص ۲۷۹

۲۵۸۔ ایضاً، ص ۳۸۰

۲۵۹۔ ایضاً، ص ۳۷۶

۲۶۰۔ ایضاً، ص ۳۷۸

۲۶۱۔ ایضاً

۲۶۲۔ ایضاً، ص ۳۷۹

۲۶۳۔ ایضاً، ص ۳۸۱

۲۶۴۔ ہرگانوی، مناظر عاشق، ''عبدالحلیم شرر بحیثیت شاعر''، ماڈرن پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۱۹۹۰ء، ص ۱۳۲

۲۶۵۔ شرر، عبدالحلیم، ص ۱۳۱۔۱۳۲

۲۶۶۔ ایضاً، ص ۱۲۹

۲۶۷۔ شرر، عبدالحلیم، محولہ بالا، ص ۱۳۲

۲۶۸۔ فرید آبادی، ''تاریخ مسلمانانِ پاکستان و بھارت''، جلد دوم، ص ۵۵۴

۲۶۹۔ بہ حوالہ میم کمال اوکے، محولہ بالا، ص ۲۰۳

۲۷۰۔ قدسی، عبداللہ، ''آزادی کی تحریکیں''، ادارۂ ثقافت اسلامیہ، لاہور، ۱۹۸۸ء، ص ۱۹۷۔۱۹۸

۲۷۱۔ "The Indian Annual Register", 1923; vol: 11, suppl. pp. 161-182.

۲۷۲۔ جعفری، رئیس احمد، ''مقالات محمد علی''، حصہ اوّل، ص ۲۶۰۔۲۶۲

۲۷۳۔ ''نقشِ آزاد''، بہ حوالہ: ہفتہ وار ''خلافت''، گجراتی، بمبئی، یکم جون ۱۹۲۳ء، ص ۳۰۔۳۱

۲۷۴۔ بہ حوالہ، مولانا عبدالماجد دریا آبادی، مشمولہ: اخبار ''سچ''، ۱۵ جولائی ۱۹۲۳ء

۲۷۵۔ اشرف، پروفیسر محمد سلیمان، ''البلاغ''، ادارہ پاکستان شناسی، لاہور، ۲۰۱۰ء، ص ۴۷

۲۷۶۔ simsir، ص ۴۰۰، بہ حوالہ میم کمال اوکے، محولہ بالا، ص ۲۰۴

۲۷۷۔ Qureshi، "The Khilafat"، ص ۲۷۳، بہ حوالہ میم کمال اوکے، محولہ بالا، ص ۲۰۴

۲۷۸۔ بہ حوالہ میم کمال اوکے، ص ۲۰۴

۲۷۹۔ ایضاً

۲۸۰۔ Nutuk، جلد دوم، ص ۸۵۱، بہ حوالہ میم کمال اوکے، ص ۲۰۵۔۲۰۶

۲۸۱۔ اوکے میم کمال، محولہ بالا، ص ۲۰۶۔۲۰۷

۲۸۲۔ خان، کیپٹن نذیر الدین، "پہلا پتھر"، نیو ہو رائزن پبلی کیشنز، کراچی، ۲۰۰۹ء، ص ۲۶۷۔۲۶۹

۲۸۳۔ دوڑے، املین، "محمد علی اور بپن چندر پال: ایک تلخ بحث ۱۹۱۹ء۔ ۱۹۲۵ء" ، تلخیص انور صدیقی، مشمولہ: "جامعہ"، دہلی، جولائی ۱۹۸۰ء، ص ۳۲۲۔۳۲۳

۲۸۴۔ جعفری، رئیس احمد، "افاداتِ محمد علی"، ادارۂ اشاعت اردو، حیدر آباد دکن، ۱۹۴۵ء، ص ۱۵

باب ششم:

اردو کی شاعری میں سانحات کی عکاسی: بیسویں صدی کا ربع دوم

قحطِ بنگال: انسانی بے حسی، انگریزوں کی سازشیں، ناقص منصوبہ بندی

برِعظیم پاک و ہند کی تاریخ میں بنگال نے جتنی قدرتی آفات و سانحات کا سامنا کیا، غالباً اس کی نظیر ہندوستان کے کسی دوسرے علاقے کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ بیسویں صدی میں تقسیم سے قبل بنگال کو جس عظیم سانحے سے گزرنا پڑا اسے ''قحطِ بنگال'' کے نام سے جانا جاتا ہے۔ بنگال کے افراد جس بنگال کو ''شونا دیش''، یعنی ''سونے کا ملک'' کہتے ہیں، واقعی اس کی زمین سونا اگلتی ہے۔ یہ دریاؤں کی لائی ہوئی زرخیز مٹی ہے جس کی ہر سال تجدید ہوتی رہتی ہے۔ ہر سال ۶ کروڑ مکعب فٹ مٹی ہمالیائی وادی سے یہاں آتی ہے۔

اس مٹی میں پوٹاش، فاسفورس ایسڈ، مختلف تناسب میں چونا، نائٹروجن اور دیگر اہم organic اجزا شامل ہوتے ہیں۔ دریاؤں اور مون سون کی ہواؤں کے دیس کا نام آتے ہی یہاں کی آب و ہوا کا مفہوم خود بہ خود ذہن میں آ جاتا ہے۔ یہاں کی آب و ہوا متغیر، ہمالیائی سلسلے کے شمالی مشرقی زاویے کے درمیان بخارات سے لائی خلیجی ہوائیں سال بھر ملک کے بیش تر حصے کو بادِ باراں کی لپیٹ میں لیے رکھتی ہیں جو کبھی کبھی بڑے طوفان کا پیش خیمہ ثابت ہوتی ہیں۔ ملک میں اوسطاً ۸۰ انچ تک بارش ہوتی ہے۔

اپریل تا ستمبر کا درمیانی عرصہ بنگال میں فصلوں کی پیداوار اور حادثات کے وقوع پذیر ہونے کا ہوتا ہے۔ اس دوران چاول کی تین تین فصلیں اگانے والے وسیع و عریض کھیت کے ساتھ سیلاب کا خطرہ بھی منڈلاتا رہتا ہے۔ قدرت نے اگر بنگال کو سنہرا ریشہ یعنی جوٹ نہ دیا ہوتا تو یہاں کی معاشی قحطوں کی تلافی ممکن نہ تھی۔ دھان اور جوٹ کی کثیر پیداوار کے علاوہ سرسوں، السی، چنا اور دالیں بھی یہاں کافی مقدار میں ہوتی ہیں۔ سلہٹ میں چائے کے بڑے بڑے باغات اور گنے کی فصلیں یہاں کی معیشت کو سہارا دیتی ہیں۔ پان کے باغات اور سپاری کے پیڑوں کی قطاریں پورے صوبے میں پھیلی ہوئی ہیں۔ جن کی درآمد سے وافر زرِ مبادلہ کمایا جاتا ہے۔ یہاں کی زرعی، حیوانی اور جنگلاتی پیداوار سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ قدرت کا دیا ہوا یہاں بہت کچھ ہے لیکن یہاں کے باشندوں کی فلاح اور آسودگی کے لیے جو تدابیر اختیار کی جانی چاہیے تھیں وہ موقوف ہے[1]۔

تاریخ کے ہر دور میں ملک کا انتظام ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں رہا جنھوں نے اس خطے کو خوب لُوٹا لیکن عوام کی فلاح و بہبود کے لیے، خصوصاً قدرتی آفات سے بچاؤ کی کوئی مناسب تدبیر اختیار نہ کی جا سکی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی اور بعد میں برطانوی استعمار نے ہندوستان میں بالعموم اور بنگال میں بالخصوص جو ظلم کے پہاڑ توڑے، اب وہ تاریخ کے اوراق میں محفوظ ہیں۔ فرنگی نو واردوں نے تجارت کے روپ میں جو مظالم ڈھائے، امن و سکون کو جس طرح برباد کیا، دولت و ثروت جس انداز سے لُوٹا اور یہاں کے لوگوں کی آزادی کو جس دھاندلی اور فریب کاری سے سلب کیا، اِس کا اظہار خود اِن ہی کے ہم قوم اینی بیسنٹ (Annie Besant) نے بڑی وضاحت سے کیا ہے۔ فرینکوئس برنیر (François Bernier) کے مطابق فرنگی تاجروں نے پاک و ہند میں بہنے والی سیم و زر کی ندی سے اپنے جیب داماں کی جس طرح تزئین کی، اپنے قصرِ ایوانوں کو جس طرح نکھارا اور اپنی تجوریوں کو جس طرح لب ریز کر دیا، وہ مکر و فریب اور ظلم و ناانصافی کی

نہ بھولنے والی داستان ہے۔

برطانوی قوم نے تجارت کو ڈھال بنا کر برعظیم پاک و ہند پر اپنا تسلط قائم کیا اور ایک ایسی حکومت کی داغ بیل ڈالی جس نے نہ صرف جسموں کو پابہ زنجیر کیا بلکہ ذہنوں کو بھی مسخر کر دینے کی مہم چلائی[۲]۔ سترھویں صدی کے آغاز میں سر تھامس رو (Thomas Roe) نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے اہل کاروں کو سطحِ سمندر پر مضبوطی سے قدم جمانے کا جو مشورہ دیا تھا اُس پر تیزی سے عمل درآمد ہوا۔ اسی کاوش کا نتیجہ تھا کہ اِس صدی کے اختتام پر انگریزوں نے نہ صرف بحری برتری حاصل کر لی بلکہ اہم بندرگاہوں پر قلعے اور فیکٹری کی صورت میں اپنے مضبوط مورچے بھی حاصل کر لیے۔ بمبئی، مدراس، سورت اور ہگلی جیسے ساحلوں پر دست رس حاصل کر کے انھوں نے صحیح معنوں میں برعظیم کا گھیرا تنگ کر دیا۔ بالآخر ۱۶۸۳ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے اُس وقت کے صدر اور بمبئی کے گورنر جیرائڈ اونجیر (Gerald Aungier) نے لندن کے بورڈ آف ڈائریکٹرز کے سامنے ایک مراسلے کے ذریعے لکھا کہ ''اب وقت آ گیا ہے کہ ہمارے ایک ہاتھ میں تجارتی سامان اور دوسرے میں تلوار ہو''[۳]۔ اِس کے بعد فوجی تیاریوں کا سلسلہ شروع ہوا جو بالآخر برعظیم میں مضبوط اور مستحکم برطانوی حکومت کے قیام پر منتج ہوا۔ اورنگ زیب کے زمانے میں تو شائستہ خان کی شدید مزاحمت نے انگریزوں کے چھکّے چھڑا دیے تھے لیکن ان کی موت کے بعد کوئی جانشین ایسا نہیں تھا جو آنے والے اس طوفان کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ لہٰذا برطانوی جارحیت کا پہلا نشانہ بنگال ہی بنا۔ پلاسی کی جنگ ۱۷۵۷ء میں ایک سازش کے تحت سراج الدولہ کو شہید کر دیا گیا۔

اِسی سال کو دراصل کمپنی کے استحکام کا پہلا سال قرار دیا جا سکتا ہے[۴]۔ رابرٹ کلائیو (Robert Clive) سے لارڈ ڈلہوزی (Lord Dalhousie) تک کمپنی کے توڑ جوڑ سے ثابت ہوتا ہے کہ انگریز کسی نہ کسی بہانے سارے ہندوستان پر قابض ہونا چاہتے تھے جس کی ابتدا جنگِ پلاسی سے ہوئی اور انتہا بکسر کی لڑائی پر ہوئی۔ انگریزوں کی ان محاذ آرائیوں کے خلاف راجوں، نوابوں اور جاگیرداروں کے دلوں میں شدید نفرت پھیل رہی تھی۔ ڈلہوزی کی بدعنوانیوں نے اِسے شدید تر کر دیا۔ معاشی استیصال کی حالت یہ تھی کہ کمپنی نے دیسی صنعت کو بالکل تباہ کر دیا۔ تجارت کساد بازاری کا شکار تھی اور کسانوں کی حالت ناگفتہ بہ تھی[۵]۔ اپنی صنعتوں کو فروغ دینے کے لیے ظلم کی انتہا یہ کی جاتی تھی کہ کاری گروں اور دست کاروں کے انگوٹھے تک کاٹ دیے جاتے تھے۔ جوش ملیح آبادی نے اِن ہی مظالم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اپنی نظم ایسٹ انڈیا کمپنی کے جوانوں سے خطاب میں کہا تھا کہ:

کس زباں سے کہہ رہے ہو آج تم سوداگرو — دہر میں انسانیت کے نام کو اونچا کرو
سخت حیراں ہوں کہ محفل میں تمھاری اور یہ ذکر — نوعِ انسانی کے مستقبل کی اب کرتے ہو فکر
جب یہاں پہ آئے تھے سوداگری کے واسطے — نوعِ انسانی کے مستقبل سے کیا واقف نہ تھے؟
ہندیوں کے جسم میں کیا روحِ آزادی نہ تھی — سچ بتاؤ کہ وہ کیا انسانوں کی آبادی نہ تھی؟
اپنے ظلمِ بے نہایت کا فسانہ یاد ہے — کمپنی کا پھر وہ دورِ مجرمانہ یاد ہے
لُوٹتے پھرتے تھے جب تم کارواں در کارواں — سر برہنہ پھر رہی تھی دولتِ ہندوستاں
دست کاروں کے انگوٹھے کاٹتے پھرتے تھے تم — سرد لاشوں سے گڑھوں کو پاٹتے پھرتے تھے تم
صنعت ہندوستاں پر موت تھی چھائی ہوئی — موت بھی کیسی تمھارے ہات کی لائی ہوئی

اللہ اللہ! کس قدر انصاف کے طالب ہو آج؟ میر جعفر کی قسم کیا دشمنِ حق تھا سراج[6]

انگریزی راج میں کلکتے کو ترقی تو بہت ملی لیکن عام لوگوں کی حالت پھر بھی نہ بدلی۔ قیامِ پاکستان کے زمانے تک صرف کلکتے میں تقریباً ۹۰۰ کے قریب مختلف قسم کے کارخانے قائم ہو چکے تھے اور اُن میں کام کرنے والوں مزدوروں کی ایک بڑی جماعت ملک کے دور دراز علاقوں سے یہاں آ کر آباد ہو رہی تھی۔ اِسی لیے آبادی کا دباؤ بھی اس شہر پر بہت زیادہ تھا۔ مشرقی بنگال میں عوام کی غربت ناقابلِ دیدنی تھی۔ کسانوں کی حالت بھی ابتر تھی۔ گاؤں میں ایک آدھ ہی ایسے کسان ملتے جن کے پاس ایک بیگھا سے اوپر زمین ہو۔ زمینوں پر قبضہ ہندو سیٹھوں اور ساہوکاروں کا ہوتا۔ بیش تر افراد سسک سسک کر زندگی گزارنے پر مجبور دکھائی دیتے تھے۔ اکثر علاقے غذائی قلت کا شکار رہتے اور اس کمی کو وہ لوگ ''سالو'' اور ''ڈیپ'' جیسی پانی کی اشیا سے پورا کرتے[7]۔

اِسی لیے ہم دیکھتے ہیں کہ پچھلی تین صدیوں میں بنگال کو چھوٹے بڑے کئی قحطوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ۱۷۷۰ء میں قحط کا شکار ہو کر مرنے والوں کی تعداد دس ملین تک بتائی جاتی ہے[8]۔ ممکن ہے اس میں مبالغہ ہو لیکن اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ اس موضوع پر تحقیق کرنے والے اکثر محققین نے بھی قحطوں کے دوران لاکھوں کروڑوں کی تعداد میں ہلاکتوں کی تصدیق کی ہے۔ World History Association کی جانب سے ۲۰۰۲ء میں بُک پرائز حاصل کرنے والے مائیک ڈیوائس (Mike Davis) کا کہنا ہے کہ برطانوی راج کے دوران ۱۵ ملین انسانوں کی نسل کشی کی گئی۔ اپنی تصنیف :Famines and the Making of the third Late Victorians Holicaust El Nino World میں ہندوستان کی معاشی تاریخ کا مطالعہ پیش کرتے ہوئے نوآبادیاتی دور کی بدنظمی، قحط کی صورتِ حال اور اس کی وجوہات کا تفصیلی جائزہ پیش کیا ہے۔ ۴۶۴ صفحات پر مشتمل اس کتاب میں اس نے لاکھوں ہلاکتوں کی وجہ برطانوی دور کی معاشی بدنظمی کو قرار دیا ہے۔ نیال فرگوسن (Niall Ferguson) نے اس امریکی مصنف کے تجزیے کو متنازعہ بنانے کی کوشش کی[9] مگر اس کتاب کے اکثر تبصرہ نگاروں اور نقادوں نے لکھا کہ ڈیوس کی باتوں سے کُلی اختلاف ممکن نہیں۔ سکھ دیو سندھو (Sukhdev Sandhu) نے ایک جگہ معروف جریدے The Guardian میں اس پر تبصرہ کرتے ہوئے آزاد معیشت اور فری مارکیٹ اکیونومی کے مطالعے کے ضمن میں برطانوی استعمار کے کردار پر ایک بہترین کتاب قرار دیا ہے[10]۔ ڈیوس کا کہنا تھا کہ:

> A new dark age of colonial war, indentured labour, concentration camps, genocide, forced migration, famine and diseases[11].

اس معاشی قتل کی متعدد مثالیں تاریخ کے اوراق میں بھری پڑی ہیں۔ بندوبست دوامی (Permanent Settlement) کے قانون نے مزید لوگوں کو دست نگر بنا دیا تھا۔ مختلف قسم کے ناجائز ٹیکس کی وصولی نہ ملنے کی صورت میں مار پیٹ اور قید میں ڈالنا عام سی بات تھی۔ انگریز اور اس کے گماشتے بازار کے عام نرخ سے کم نرخ پر پیداوار خریدنے، طلب و رسد میں بحران پیدا کر کے اُن ہی اشیا کی زیادہ قیمت وصول کرتے۔ اِن گماشتوں کے خوف سے نقل مکانی بھی زیادہ ہوتی۔ علاقے کے علاقے ویران ہو جاتے۔ جب قحط کی صورتِ حال پیدا ہوتی تو ہزاروں لاکھوں لوگ مر جاتے۔ تنگ آ کر لوگ اپنے بچوں کو فروخت کرتے۔ لوگ بھوک سے بلبلا کر ہلاک ہو جاتے لیکن انگریز اور اُن کے گماشتے چاول اور گندم کے ذخیروں پر سانپ بن کر بیٹھے رہتے[12]۔ بات بات پر جرمانے لگانا، زیادتیاں کرنا، یہاں تک کہ مسلمانوں کی داڑھی پر ٹیکس جیسے معاملات سے کمپنی کی مجرمانہ ہٹ دھرمی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے[13]۔ قحط اور اس طرح کی دیگر

قدرتی آفات کے موقعے پر کمپنی کے افسروں کو امیر بننے کے زیادہ مواقع ملتے۔ چاول جو عام حالات میں ایک روپے میں ۱۲۰ سیر ملتا تھا، قحط کے دوران ایک روپے میں صرف تین سیر کے نرخ پر آ جاتا۔ ایک جونیر افسر ۶۰،۰۰۰ تک کی رقم قحط کے دوران کما لیتا۔ مغلوں کے زمانے میں قحط کے دوران لگان کم ہو جاتا مگر کمپنی کے اہل کار لگان بڑھا دیتے۔ وارن ہیسٹنگز (Warren Hastings) کے مطابق صرف ۱۷۷۰ء کے قحط میں ایک کروڑ افراد بھوک سے ہلاک ہوئے جو کل آبادی کا ایک تہائی تھے۔ لوگ روٹی کے بدلے بچے بیچتے۔ اسی طرح ۱۸۷۶ء تا ۱۸۷۸ء ستر لاکھ افراد قحط کی وجہ سے لقمۂ اجل بنے [۱۴]۔ کمپنی کی پالیسی کے مطالعے سے یہ بات پوری طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ وہ کسی بھی صورت میں مقامی صنعتوں کو پنپنے کا موقع نہیں دینا چاہتی تھی۔ اس کی ایک مثال تو یہ ہے کہ نہ چاہتے ہوئے بھی جبراً نیل (Indego) کاشت کرائی جاتی جس کے بدلے اپنی مرضی کا محنتانہ مقرر کیا جاتا۔ کسان اپنی مرضی سے منافع بخش فصل کاشت نہیں کر سکتے تھے اور دوسری مثال یہ ہے کہ صنعتی انقلاب کے بعد پورے بنگلا دیش میں خصوصاً ڈھاکا کی کپڑے کی صنعت کو بے رحمی سے تباہ کر دیا گیا۔ جولاہے اس جبر کا پوری طرح نشانہ بنے ابتداً اُن کے بہترین کپڑے کا من مانا نرخ متعین کر کے زبردستی خرید لیا جاتا۔ فروخت نہ کرنے پر تشدد کا نشانہ بنایا جاتا۔ یہ وہی جولاہے تھے جن کے تیار کردہ ململ کا پوری دنیا میں چرچا تھا۔ اِن کی تیار کردہ ململ کا پورا تھان ایک مٹھی میں سما سکتا تھا لیکن کمپنی کو ان کے فن کی قدر کرنے کی کیوں فکر ہوتی۔ وہ تو مانچسٹر اور برمنگھم کے تیار کردہ کپڑے کی صنعت کو فروغ دینا چاہتے تھے۔ لہٰذا ایسے حربے استعمال کیے جانے لگے جن سے مقامی صنعت کا پہیہ رک جائے مسلمان جولاہے جو بیک وقت کسان بھی تھے اور صنعت و حرفت میں بھی پیش قدمی دکھا رہے تھے، کمپنی کی طرف سے مقامی صنعت کی حوصلہ شکنی کے نتیجے میں زراعت تک محدود ہو کر رہ گئے۔ لاکھوں اہلِ حرفہ بے روزگار ہو گئے اور دیہات کا رخ کرنے لگے۔ جہاں بندوبست دوامی کے ہولناک اثرات منھ پھاڑے کھڑے تھے۔ کمپنی کی اس پالیسی کے نتیجے میں مقامی کپڑے کی مانگ ۱۷۸۹ء سے مسلسل کم ہونا شروع ہو گئی۔ صرف ڈھاکا میں تیار ہونے والے کپڑوں کی برآمد جو ۱۷۹۹ء میں بارہ لاکھ مالیت تک سالانہ تھی، گر کر ۱۸۱۳ء میں محض ساڑھے تین لاکھ تک آ گئی۔ ۱۸۱۷ء میں تو ڈھاکا سے انگلینڈ برآمد کی جانے والی ململ بالکل ختم کر دی گئی اور ڈھاکا کی تجارتی کوٹھی (کمرشل ریزیڈنسی) کو مکمل طور پر بند کر دیا گیا [۱۵]۔ کمپنی نے اپنے مقاصد کے حصول کے لیے ایسے بہیمانہ طریقے اختیار کیے کہ پڑھ کر انسانیت شرمندہ ہو جاتی ہے۔ مثلاً انگریزوں کی مرضی کے خلاف جولاہے کپڑے تیار کر کے مارکیٹ لاتے تو اُن کے ہاتھ یا انگوٹھے کاٹ دیے جاتے [۱۶]۔ مذکورہ صفحات میں درج نظم ایسٹ انڈیا کے فرزندوں سے خطاب میں جوشؔ نے جو یہ مصرعہ کہا کہ ''دست کاروں کے انگوٹھے کاٹتے پھرتے تم'' دراصل کمپنی کے اِن ہی مظالم کی طرف واضح اشارہ ہے۔ اِن اقدامات کا نتیجہ یہ ہوا کہ صنعت و حرفت میں تیزی سے ترقی کرتا یہ خطہ محض زراعت تک محدود ہو کر رہ گیا۔ ۱۸۱۳ء میں تھامس منرو (Thomas Munroe) جو بعد میں گورنر مدارس بھی بنا، نے اعتراف کیا کہ یہاں کے تیار کردہ ململ انگلینڈ کے ململوں سے اچھے ہوتے تھے۔ کمپنی کے ڈائریکٹر ہنری جارج ٹکّر (Tucker) نے ۱۸۲۳ء میں برطانوی ڈائریکٹر کو بڑے فخر سے لکھا کہ:

> India is reduced from the state of manufacturing to that of an agricultural country [۱۷].

ہندوستان کی صنعتی حیثیت گھٹا کر زرعی ملک بنا دینے پر فخریہ دعویٰ کمپنی کے ناپاک عزائم کو پوری طرح ظاہر کرتا ہے۔ اس کا نتیجہ

ظاہر ہے معیشت پر بہت منفی نکلا۔ کپڑے کی صنعت کے سب سے بڑے مرکز ڈھاکا کی آبادی ڈیڑھ لاکھ سے گھٹ کر محض ۲۰ ہزار تک رہ گئی[۱۸]۔ ۱۸۶۶ء تک برطانوی نوآبادیاتی عہد میں قحط کی شدت میں مزید اضافہ ہوا۔ کپڑا سازی کی صنعت کی تباہی کے بعد زراعت ہی اہم آمدنی کا ذریعہ اور اس کا انحصار مون سون کی بارشوں پر ہوتا تھا۔ ۱۸۶۵ء میں اخبار ''انگلش مین'' نے پہلے ہی خبردار کرنا شروع کردیا تھا کہ ہم ایک ایسے دور میں داخل ہوتے جا رہے ہیں جہاں اناج کی شدید قلت ہونے والی ہے۔ لیکن ایسی خبروں کی اشاعت کے باوجود نوآبادیاتی انتظامیہ نے قحط کے سدِ باب کے لیے کچھ نہیں کیا۔ قحط کے بعد ۱۸۶۶ء میں برطانوی گورنر سیسل بیڈن نے اپنے دورۂ اڑیسہ کے دوران واضح طور پر کہا کہ قدرت کے اِن کاموں کو روکنے یا اِن کا مداوا کرنے کے لیے کوئی حکومت کچھ نہیں کرسکتی[۱۹]۔ جب کہ مورخ این۔ کے۔ سنہا کا کہنا تھا کہ انگریز حکومت ایک قحط سے شروع ہوئی تھی اور ختم بھی ایک عظیم قحط پر ہوئی۔ انھوں نے بتایا ۱۹۴۳ء میں پڑنے والا قحط دراصل اسی رجحان کا منطقی نتیجہ تھا جو ۱۷۷۰ء میں شروع ہوا تھا۔ اِن کے مطابق ۱۸۰۰ء سے ۱۸۲۵ء، اور پھر ۱۸۷۵ء تا ۱۹۰۰ء کے مابین پڑنے والے بائیس قحط برطانوی اقتدار کی پیداوار تھے[۲۰]۔ ۱۸۶۶ء میں برطانوی حکام کے لیے تیزی سے پھیلتے ہوئے خوراک کے بحران اور اُس کے نتیجے میں پھیلنے والی تباہی و بربادی کو نظرانداز کرنا مشکل ہوگیا اور کمپنی کے فوجی اور پولیس اہل کار بھی قحط اور بھوک سے مرنے لگے تو کلکتہ میں مقیم کمپنی کی انتظامیہ کو ہوش آیا۔ ایک مبصر نے لکھا کہ بنگال میں میلوں تک لوگوں کی ایک ہی پکار تھی کہ ''آپ کے پاس کھانے کو کچھ ہے''۔ خبریں جب کلکتہ اور لندن تک کے ایوانوں میں پہنچنے لگیں کہ ہزاروں لوگ روزانہ کی بنیاد پر مر رہے ہیں تو مسٹر بیڈ نے چاول کی بوریاں اڑیسہ روانہ کرنے کا اعلان کیا۔ لیکن اس مجرمانہ سستی کی وجہ سے بھی ہزاروں ہلاکتیں ہوئیں۔ دیر سے فیصلہ کرنے کی وجہ سے مون سون کی بارشوں سے بھی دشواریاں پیدا کیں جن کی قیمت اڑیسہ والوں کو اجتماعی موت کی صورت میں دینی پڑی۔ بعد میں لمبے عرصے تک نوآبادیاتی انتظامیہ کو قحط کی بابت مختلف قسم کے الزامات کا سامنا کرنا پڑا[۲۱]۔ برطانیہ کی قحط پالیسی کی تلخ و ترش تنقید میں، مقید دیکھنے والے بہ شمول ولیم ڈگبی (William Digby) کہتے ہیں کہ برطانیہ نے ۱۸۹۰ء کی دہائی کے قحطوں کی شدت میں اچھی خاصی مدد کی اور ایسا کرنے میں انھوں نے ایسے علاقوں کو آنے والی دہائیوں تک کے لیے معاشی جمود بلکہ سماجی انتشار کا شکار بننے کے لیے چھوڑ دیا۔ پھر بھی ہمارے کچھ مورخین قحطوں اور اکالوں کو محض عذابِ الٰہی قرار دینے کی بھونڈی کوشش کرتے ہیں اور زمینوں کے بے پناہ کرایوں، ناقابلِ برداشت ٹیکسوں اور سود کی آسمان کو چھوتی شرحوں سے ان کا کوئی تعلق نہیں سمجھتے۔

۱۸۹۸ء کمیشن کی سفارشوں جیسے قحط کے تدارک کے اقدامات کے لیے اس کے سر اتنے سہرے باندھے جاتے ہیں جتنے کہ یہ مستحق نہیں ہیں۔ اسی لیے کیمرج ہسٹری آف انڈیا کی چھٹی جلد ہمیں بتاتی ہے کہ تدارک کے اقدامات کی نگرانی خود کرزن نے بڑی توجہ اور دل چسپی سے کی اور جولائی کی شدید گرمی میں گجرات کے متاثرہ اضلاع کا بہ نفسِ نفیس دورہ کیا۔ ہمیں یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ ۱۸۸۰ء میں بھوک سے ایک بھی موت واقع نہیں ہوئی تھی[۲۲] مگر ۱۸۹۰ء کی دہائی میں پڑنے والے قحطوں کا ذکر کرتے ہوئے ہندی شاعر بدری نرائن پریم گھن نے جو نقشہ کھینچا ہے، اس سے انگریزوں کے دعوے کی قلعی کھل جاتی ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

بھارت پر تباہی کے کالے بادل گھر آئے ہیں بھاگو رے بھاگو بھینکر اکال پڑا ہے

کاروبار ٹھپ، دھندے سب بند[۲۳]

(انگریزی سے ترجمہ)

اِسی طرح ۱۹۴۳ء کے قحط کی بابت بھی مورخین کا یہی کہنا ہے کہ یہ قحط بھی خراب فصل کی وجہ سے نہیں بلکہ انگریزوں کی غیر دانش مندانہ پالیسیوں کا نتیجہ تھا۔ اِس قحط کے پس منظر کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اس زمانے کی بین الاقوامی سیاست اور آپس میں برسرِ پیکار ممالک کی حربی صورتِ حال کا جائزہ لیا جائے۔

۱۸؍دسمبر ۱۹۴۱ء کو انگریزوں نے ملایا میں پنیانگ کی بندرگاہ خالی کر دی۔ پھر ۲۵؍دسمبر ۱۹۴۱ء کو انھوں نے ہانگ کانگ میں محض دو دن کی مزاحمت کے بعد جاپانیوں کے سامنے ہتھیار ڈال دیے جس سے کلکتے کے شہریوں میں خوف و ہراس کی ابتدا ہوئی۔ وائسرائے کی ایگزیکٹیو کونسل کے ہوم ممبران کلکتے ہی میں موجود تھے۔ اِن کے حکم کے تحت ۲۶ دسمبر کو سرت چندر بوس کو کلکتہ جیل سے منتقل کر کے مدراس جیل بھجوا دیا گیا۔ وزیرِ اعلیٰ فضل الحق نے بوس کی مدراس جیل منتقلی کو ایک روز کے لیے ملتوی کروانے کی کوشش کی مگر ہوم ممبر نہیں مانا اور سرت چندر بوس کو فوراً مدراس پہنچا دیا گیا جب کہ اُس کا بھائی سوبھاش چندر بوس جاپانیوں کی امداد سے ہندوستان کو آزاد کروانے کی جدوجہد میں مصروف رہا[۲۴] تقریباً ایک برس سے زائد عرصے روپوشی کے بعد مارچ ۱۹۴۲ء میں برلن ریڈیو سے اِن کی تقریر نشر ہوئی تو تمام شبہات کا خاتمہ ہوا اور یہ بات واضح ہوئی کہ وہ جرمنی پہنچ چکے ہیں اور انگریزوں کے خلاف مصروفِ عمل ہیں۔ اس دوران جاپان نے بھی ہندوستان پر انگریزوں کے تسلط کے خلاف زور وشور سے پروپیگنڈا شروع کر رکھا تھا۔ جاپان اور جرمنی کے گٹھ جوڑ اور مسلسل پروپیگنڈے نے بڑی تعداد میں ہندوستانیوں کو متاثر کیا۔ اُنھیں یقین ہو گیا کہ جاپان دراصل ہندوستان کی آزادی اور ایشیا کے استحکام کے لیے مصروفِ عمل ہیں۔ اِن کا خیال تھا کہ جاپانی حملے نے انگریزوں کی طاقت پارہ پارہ کر دی ہے۔ اس عمل سے ہماری آزادی کی تحریک کو بھی تقویت ملے گی۔ گاندھی کو بھی اب یہ یقین ہو چلا تھا کہ اتحادی یہ جنگ نہیں جیت سکیں گے بلکہ جاپان اور جرمنی کو فتح حاصل ہو گی۔ اس سے قبل گاندھی، سوبھاش چندر بوس کی بہت سی سرگرمیوں کی مخالفت کرتے رہتے تھے لیکن بوس کا جرمنی پہنچ کر آزادی کی جدوجہد میں کردار ادا کرنے سے گاندھی کے خیالات میں بھی تبدیلی آئی۔ بوس جو ایک مسلمان کے روپ میں داڑھی رکھ کر پشاور سے افغانستان اور پھر وہاں سے جرمنی پہنچے تھے پھر اُنھوں نے جاپان میں رہ کر وہاں موجود وہ ہندوستانی جو قید میں زندگی گزار رہے تھے کو مجتمع کر کے ہندوستان کی قومی فوج بنائی جس نے آسام کی حدود تک کارروائیوں میں حصّہ لیا۔ وہاں مسلمانوں کی بابت بھی اُن کے خیالات بدلے اور اُنھوں نے محسوس کر لیا کہ مسلمانوں کو رام کیے بغیر ہندوستان آزاد نہیں ہو سکتا۔ اِسی لیے نیشنل آرمی میں موجود مسلمان سپاہیوں کے ساتھ اُن کا برتاؤ بہت اچھا تھا اور سپاہی بھی اُن کے مداح تھے۔ گاندھی کے رویے میں تبدیلی کی وجہ بھی وہ عالمی حالات تھے جو بہت تیزی سے تبدیل ہوتے جا رہے تھے۔ اتحادی جب پسپا ہو رہے تھے اور جاپان نے بیک چشم وزدن برما، ملایا، سنگاپور اور انڈونیشیا کے علاقوں پر قبضہ کر لیا تو گاندھی کو بھی یقین ہو گیا کہ وہ وقت آنے والا ہے جب بوس ایک فاتح کی حیثیت سے اپنے وطن میں داخل ہو گا۔ لہٰذا انھوں نے بوس کی تعریف وتحسین شروع کر دی اور عدم تشدد کی آڑ لے کر اتحادیوں اور انگریزوں کی اخلاقی مدد تک کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ نہرو نے یہ حمایت جاری رکھی لیکن گاندھی نے بوس کی وجہ سے اپنے نظریے میں تبدیلی پیدا کی[۲۵]۔ ملکی سیاست کے نشیب وفراز اور عالمی حالات کے پیشِ نظر پوری دنیا اس وقت عالمی کساد بازاری کا شکار دکھائی دیتی ہے۔

کلکتہ کے شہریوں میں بھی خوف و ہراس کی ایک بڑی وجہ عالمی حالات کے تناظر میں چاول کی قیمت میں ہوش رُبا اضافہ تھا جس کے اثرات بتدریج کلکتہ کے ساتھ ساتھ دوسرے علاقوں میں بھی دکھائی دے رہے تھے۔ دسمبر ۱۹۴۱ء میں صوبے میں چاول کے نرخ

۱۹۳۹ء کے مقابلے میں ۲۷ فیصد تک بڑھ چکے تھے۔ اِس سال پورے بنگال میں چاول کی کاشت ۷ لاکھ ۴۷ ہزار ٹن تک ہوئی تھی جب کہ صوبے کی ۶۰٫۳ ملین آبادی کو سال بھر کی ضروریات پوری کرنے کے لیے دس لاکھ ۳۱ ہزار ٹن چاول کی ضرورت تھی۔ چناں چہ ۲٫۸۴٫۰۰۰ ٹن کمی پوری کرنے کے لیے حکومت نے ۳٫۲۳٫۰۰۰ ٹن چاول درآمد کرنے کا فیصلہ کیا۔ درآمد شدہ چاول کی بڑی مقدار کو برما سے ہندوستان آنا تھا جب کہ جنوبی ایشیا کے مختلف خطوں میں انگریزوں کی پسپائی اور ذلت آمیز شکست کے پیشِ نظر جاپانیوں کے تسلط میں چلے جانا، صاف نظر آ رہا تھا۔ ۲۳ رجنوری ۱۹۴۲ء کو جاپانیوں نے رنگون پر پہلی بار بم باری کی تو کلکتہ میں بھی بھگدڑ مچ گئی۔ اِس کہرام میں شہر چھوڑ کر بھاگنے والوں میں اناج کے تھوک اور پرچون، بیوپاریوں کی بڑی تعداد بھی شامل تھی۔ اِس صورتِ حال میں غذائی اجناس کی ترسیل میں رکاوٹ پیدا ہوئی۔ سپلائی کا نظام درہم برہم ہو گیا۔ صنعتی علاقوں میں اس سے سخت بے چینی پھیل گئی۔

حکومت نے مزدوروں کی بے چینی کے سدِ باب کے لیے کارخانے داروں سے اناج کی دکانیں کھلوائیں مگر شہر کی سراسیمگی میں اور زیادہ اضافہ ہو گیا۔ کارخانے داروں نے ایمپلائر گرین شاپس کے لیے چاول کی خریداری شروع کی تو اس کی قیمت میں مزید اضافہ ہوتا گیا۔ اس اضافے کی ایک وجہ وہ افراط و تفریط بھی تھی جو محض اس وجہ سے پیدا ہوئی کہ ہندوستان کے طول و عرض میں یہ افواہ پھیلی ہوئی تھی کہ جلد یا بہ دیر جاپانی جہاز کلکتہ پر بم باری کرنے والے ہیں۔ ہندوستان کو اب جنگ کی لپیٹ میں آنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ ذخیرہ اندوزی، چور بازاری کرنے والوں اور سٹے بازوں نے اس افراتفری سے خوب فائدہ اٹھایا اور اناج کے بھاؤ میں روز بہ روز اضافہ کرتے چلے گئے[۲۶]۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ سیاستِ ہند پر یورشِ جاپان کا براہِ راست اثر پڑا۔ اس سے قبل ہٹلر کے حملے اور فتوحات نے بھی انگریزوں کے ہوش اڑا رکھے تھے ابھی تک روس اور امریکا میدان میں نہیں کودے تھے۔ لٰہذا جرمنوں سے لڑنے کی ساری ذمہ داری بھی تن تنہا برطانیہ کے سر تھی۔ چرچل (Winston Churchill) بھی اپنی برتری قائم رکھنے کے لیے جنونی ہٹلر سے کم نہیں تھا۔ اُس نے اپنی پوری توانائی جنگ کی تیاریوں میں جھونک دی۔ برطانیہ کی جنگی تیاریوں میں ہندوستان بھی حصہ دار بنا۔ یہاں کی کثیر آبادی سے مرضی کے مطابق فوج، مزدور اور نفری بھرتی کی جا سکتی تھی۔ مرکزی حکومت نے بیسیوں نئے نئے محکمے، دفاتر، شعبہ جات اور شاخیں قائم کر کے لاکھوں کی تعداد میں ہندوستانیوں کو بھرتی کر لیا تھا۔ معمولی پڑھے لکھے جنھیں عام حالات میں کوئی پوچھتا تک نہیں تھا، ہزاروں کی تعداد میں ملازم بنائے گئے۔ اب ان تمام لوگوں کی ضروریات، خام اجناس کی فراہمی اور جنگی ساز و سامان کا بڑے پیمانے پر انتظام کیا گیا۔ کثیر تعداد میں دیہاتی شہر میں امڈ آئے۔ وسیع ہنگامی انتظامات کے مصارف کے واسطے حکومت کو کاغذ کے روپے بنانے پڑے۔ مصنوعی سکّے نے زر کی قوت گھٹا دی۔ سونا چاندی سمیٹ سمیٹ کر برطانیہ بھیجا گیا تا کہ امریکا سے سامان حرب کی خریداری ممکن بنائی جا سکے۔ اس طرح برطانیہ کی اقتصادی حالت بھی پتلی ہو گئی اور ہندوستان بھی بے تحاشا قرض تلے دب گیا[۲۷]۔ اس اقتصادی بحران کے نتیجے میں جیسے جیسے اجناس کی قیمتیں بڑھنا شروع ہوئیں، کلکتہ کے عام شہریوں کے لیے زندگی مشکل سے مشکل تر ہوتی چلی گئی۔ اس صورتِ حال میں شہریوں کا انخلا بھی شروع ہو گیا۔ ایسی صورتِ حال میں ہندوستانی سیاست میں بھی تیز رفتار تبدیلی کے آثار دیکھے گئے۔ قائداعظم نے ۱۹۳۵ کے ایکٹ کے تحت اقتدار کی منتقلی کے نتیجے میں مسلمانانِ ہند کی جانب سے جاپانیوں کے خلاف بھرپور تعاون کا یقین دلایا جب کہ دوسری جانب فضل الحق کی وزارت کے مہاسبھائی وزیر ڈاکٹر شیاما پرشاد مکر جی کے صوبۂ بہار کے شہر بھاگل پور میں خلافِ قانون اجتماع سے خطاب میں انگریزوں کے خلاف نہایت زہریلی تقریر کی جس کے نتیجے میں انھیں سر گوکل چند نارنگ اور رائے

بہادر مہر چند کھنہ کے ساتھ ایک دن کے لیے گرفتار کر لیا گیا۔ فضل الحق کی حکومت بھی اس زبردست سیاسی اور اقتصادی بحران کے نتیجے میں کمزور ہو چکی تھی۔ اخبار اسٹیٹسمین (Statesman) نے فضل الحق کی وزارت کی برطرفی کا مطالبہ پہلے ہی کر رکھا تھا۔ ۲۳/ مارچ کو جاپان نے انڈیمان پر قبضہ کر لیا۔ ۵ اور ۶ اپریل کو ہندوستان کے مشرقی ساحل کی بندرگاہ وزیگا پٹم اور لنکا پر بم باری کی اور خلیج بنگال میں انگریزوں کے تجارتی جہازوں پر بم باری کر کے بنگال کے بحری راستوں کو مسدود کر دیا تو فضل الحق حکومت اور بھی زیادہ غیر پسندیدہ ہوگئی۔ بوس برادران پہلے ہی جاپان کی مدد کر رہے تھے۔ کانگریس میں جاپان سے ہم دردی رکھنے والے اراکین کی کمی نہیں تھی۔ اس صورتِ حال سے انگریزوں نے بنگال پر جاپانی حملے کے خطرے کے پیشِ نظر بوکھلاہٹ میں کچھ ایسے اقدام کیے جو قحط کا سبب بن گئے۔ کلکتا کے ہنگامی حالات میں ہر طرف افراط و تفریط کا بازار گرم تھا۔ لوگوں کے انخلا کی وجہ سے ریل گاڑیوں، ٹرکوں، گاڑیوں، لاریوں اور بیل گاڑیوں میں تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ چٹا گانگ، نواکھلی اور پترا کے اضلاع کی حالت بہت بری تھی۔ برما سے بھی ہر روز ہزاروں پناہ گزین بہ راستہ آسام اِن اضلاع میں پہنچ رہے تھے۔ چاروں طرف نفسا نفسی اور دل خراش مناظر دکھائی دیتے تھے۔ اِس صورتِ حال میں برطانیہ کے اعلیٰ فوجی حکام نے بنگال کے ساحلی علاقوں میں ''انکار'' کی تباہ کن پالیسی اختیار کرتے ہوئے اپریل کے وسط تک مدنا پور، باقر گنج اور کھلنا کے اضلاع کے لوگوں کے پاس جو بھی فالتو ذخیرہ تھا، سرکاری کارندوں کے ذریعے زبردستی خرید لیا گیا۔ اس ظالمانہ اقدام کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ برما سے چاول کی فراہمی بند ہو چکی تھی اس لیے کلکتے اور گرد و نواح میں مقیم افواج کے لیے اناج کی ضرورت، اِن اضلاع کے عوام کو اناج سے محروم کر کے پوری کی گئی۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ انگریز فوج کی رائے کے مطابق ساحلی علاقوں میں جاپانیوں کا قبضہ بعید از امکان نہیں تھا۔ اِس لیے وہ نہیں چاہتے تھے کہ اِن ساحلی علاقوں کا فالتو اناج جاپانیوں کے ہاتھ لگے۔ تاہم ان دونوں اقدامات کا نتیجہ بڑا منفی نکلا۔ اس اقدام سے بنگال کے ساحلی علاقوں میں اناج کی شدید قلت پیدا ہوگئی۔ صوبائی حکومت کے اس اعلان کے بعد فوجی ضرورتوں کے لیے علاقوں کو مختصر نوٹس پر جبراً خالی کر لیا جائے گا۔ اس اعلان سے مزید افراتفری پھیلی۔ ماہی گیروں کے مچھلیاں پکڑنے اور عوام کی نقل و حمل کی بندش سے بھی بے روزگاری بڑھی جس سے قحط کے آثار نظر آنے لگے۔ ۱۶/ اکتوبر ۱۹۴۲ء سے صورتِ حال مزید ابتر ہونا شروع ہوگئی۔ ایک زبردست سمندری طوفان کے باعث صوبے کے مغربی اضلاع میں زبردست جانی و مالی نقصان ہوا۔ تقریباً ۳۲۰۰ مربع میل کا علاقہ اس طوفان سے متاثر ہوا۔ کھڑی فصلیں بالکل تباہ ہوگئیں اور ہزاروں افراد ہلاک ہوگئے۔ صرف مدنا پور اور ۲۴ پرگنہ کے علاقوں میں ۱۱ ہزار افراد لقمۂ اجل بنے۔ یوپی، بہار اور بنگال میں پُر تشدد ہنگامے، گولیوں اور لاٹھیوں کا استعمال بھی جاری رہا۔ ۲۵/ اکتوبر کو جاپان کے ہوائی جہازوں کی چٹا گانگ اور صوبہ آسام کے ہوائی اڈّوں پر بم باری اور پھر اگلے آٹھ دس روز تک حملوں کا سلسلہ جاری رہا۔ جس سے بنگال پر جاپانیوں کے زیرِ تسلط جانے کے تاثر کو مزید تقویت ملی۔ صوبائی گورنر سر جان ہربرٹ نے اپنی تقریروں میں بنگال کے جاپانیوں کے زیرِ تسلط جانے کو بعید از امکان قرار نہیں دیا۔ بنگال کے فوجی حکام آسام اور بنگال میں ایسی تنصیبات کو از خود تباہ کروانے لگے جو جاپانیوں کے حملے کے بعد مدد و معاون ہو سکتی تھیں۔ دسمبر ۱۹۴۲ء کے اوائل میں یورپ، افریقا اور ایشیا کے تمام محاذوں پر جرمنی، اٹلی اور جاپان کے نئے حملوں کا زور کم ہو گیا تو برطانوی فوج نے ۱۹/ دسمبر کو برما پر جوابی حملہ کیا۔ اس حملے سے بنگال کے عوام کے مصائب میں کمی آنے کے بہ جائے مزید اضافہ ہوا۔ چاول کے بھاؤ ساڑھے سات روپے فی من سے بڑھ کر سولہ روپے فی من تک پہنچ گئے۔ مشرقی بنگال کی بہت سی جھونپڑیوں میں قحط کا بھوت ناچنے لگا۔ اچھی فصل ہونے کے باوجود ''انکار

کی پالیسی'' کے تحت فالتو چاول جبراً وصول کرنے اور ایک لاکھ پچاس ہزار ٹن چاول کی درآمد برما سے بند ہو جانے کے باوجود حکومت نے اس قلت کو دور کرنے کا کوئی متبادل انتظام نہیں کیا۔ جاپانیوں نے برما میں برطانیہ کے جوابی حملے ناکام کرنے کے لیے چٹا گانگ، فینی، آسام اور دیگر علاقوں پر روزانہ ایسے ہوائی حملے شروع کیے جن سے ان علاقوں کے کسانوں کی معمول کی زندگی درہم برہم ہو کر رہ گئی۔ اناج کے ساتھ ساتھ اِن علاقوں میں نمک کی بھی کمی واقع ہوئی۔ ۲۸ دسمبر کو کمیونسٹ پارٹی کے زیرِ اہتمام پریزیڈنسی ڈویژن میں بھوکوں کا جلوس نکالا گیا۔ قحط کی وجہ سے روزانہ سیکڑوں اموات واقع ہو رہی تھیں۔ مارچ ۱۹۴۳ء میں بنگال اسمبلی اور کونسل کے بجٹ سیشن میں ابتداً کئی روز تک ایوان کے ارکان نے صوبے کی غذائی صورتِ حال پر سخت تشویش کا اظہار کیا۔ ایک طرف غریب کسانوں میں قوتِ خرید نہ ہونے کے برابر تھی تو دوسری طرف افراطِ زر کی شرح ۲۲۵ فی صد تک پہنچ چکی تھی۔ کسانوں کی بڑی آمدنی پٹ سن سے ہوتی تھی۔ جیوٹ ایسوسی ایشن نے اس سنہری ریشے کی قیمت ۱۴ سے لے کر ۱۹ روپے فی من تک مقرر کی تھی۔ اس بھاؤ میں پٹ سن بیچ کر ۲۲ سے ۲۵ روپے فی من چاول خریدنا کسانوں کے بس میں نہیں تھا۔ کئی ارکانِ اسمبلی نے کسانوں کی بدحالی کے بارے میں حکومت کی غفلت پر نکتہ چینی کی، تو ۶ مارچ کو وزیرِ زراعت خان بہادر ہاشم علی خان کا جواب یہ تھا کہ چاول کے زیرِ کاشت رقبے میں اضافے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ ۱۵، مارچ کو وزیرِ مال پی۔ این بینرجی کا بیان تھا کہ فلڈ کمیشن نے بندوبست دوامی اور لگان داری کے نظام کو ختم کرنے کی سفارش کی ہے۔ بعد میں خواجہ ناظم الدین کی مخلوط حکومت نے قحط سے نپٹنے کے لیے اقدامات شروع کیے اور ذخیرہ اندوزوں کے خلاف مہم شروع کی۔[۲۸]

۳ رمئی ۱۹۴۳ء کو بنگال اسمبلی کے اسپیکر سر عزیز الحق نے نلنی رنجن سرکار کی جگہ وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل میں تجارت، خوراک اور صنعت کے محکموں کا چارج سنبھالا تو ان کا خیال یہی تھا کہ بنگال میں چاول کی قلت اور مہنگائی مصنوعی ہے اور اس کے لیے وہ وطن دشمن عناصر ذمے دار ہیں جو ذخیرہ اندوزی اور چور بازاری کرتے ہیں۔ چناں چہ اس نے ۱۵ مئی کو کرشن نگر میں استقبالیہ تقریر کرتے ہوئے یقین دلایا کہ حکومتِ بنگال کے کروڑوں عوام کو فاقہ کشی سے بچانے کے لیے وطن دشمن عناصر کو سزا دینے کا پختہ عزم کیے ہوئے ہیں۔ امید ہے کہ ایک ہفتے میں چاول کی قیمتوں میں خاصی کمی آ جائے گی[۲۹]۔ مگر ایسا ہوا نہیں بلکہ بنگال میں چاول کی قلت اور مہنگائی میں مزید شدت پیدا ہو گئی۔ صورتِ حال جب قابو سے باہر ہو گئی تو وزیرِ اعلیٰ خواجہ ناظم الدین حکومتِ ہند سے استدعا کرنے دہلی پہنچے تاکہ چاول کی بین الصوبائی نقل و حمل پر عائد پابندی اٹھوائی جا سکے۔ ان کا خیال یہ تھا کہ اگر یہ پابندی اٹھالی جائے تو صوبۂ آسام صوبۂ بہار کی چاول کی ضرورت کو پورا کر سکتا ہے۔ ۲۷ رمئی کو دہلی میں ایک تقریر کے دوران انھوں نے انکشاف کیا کہ بنگال میں چاول کے نرخ ۳۰ سے ۴۰ روپے فی من تک پہنچ چکے ہیں۔ جن کی وجہ سے عوام شدید مشکلات کا شکار ہیں۔ تین چار روز قیام کے بعد کلکتہ واپسی پر انھوں نے وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کے رکن خوراک میجر جنرل وڈ (Wood) کی جانب سے ہر ممکن امداد کے وعدے اور یقین دہانی سے عوام کا حوصلہ بڑھایا۔ ۳۰ رمئی کو خواجہ ناظم الدین اور ان کے وزیر سول سپلائیز حسین شہید سہروردی نے کلکتہ میں اڑیسہ کے وزیرِ اعلیٰ مہاراجا آف پارلاکی میدی (Maharaja of Parlakimedi) سے ملاقات کر کے اس امر کا جائزہ لیا کہ صوبۂ اڑیسا اس مسئلے پر بنگال کی کس طرح مدد کر سکتا ہے۔ ۳۱ رمئی ناظم الدین، شیلانگ گئے اور وہاں آسام کے وزیرِ اعلیٰ سے بھی بات چیت کی لیکن ان ساری کوششوں کا کوئی طور پر مثبت نتیجہ نہیں نکلا۔ بہار، آسام اور اڑیسا کی حکومت بنگال کے لیے چاول کی فراہمی میں مدد پر آمادہ نہیں تھی۔ ۷ رجون ۱۹۴۳ء کو ذخیرہ

اندوزی کے خلاف سرکاری مہم کا آغاز ہوا۔ صوبے بھر میں ایک لاکھ خوراک کمیٹیاں بنائی گئیں مگر یہ مہم بھی نتیجہ خیز ثابت نہ ہوئی اور جون کے آخری ہفتے میں ہر طرف سے قحط قحط کا شور بلند ہونے لگا۔ ۲۶ر جون ۱۹۴۳ء کو بنگال نیشنل چیمبر آف کامرس کے صدر اے۔ سی۔ سین نے اپنی تقریر میں کہا کہ بہت جلد پورا صوبہ قحط کی لپیٹ میں آنے والا ہے۔ مولوی فضل الحق کا اسمبلی میں واویلا کوئی مثبت اثر نہ ڈال سکا۔ حالات روز بہ روز بدتر ہوتے چلے گئے۔ آفت زدہ لوگوں کے لیے امدادی رقم کے ۸۸ لاکھ بھی کوئی مدد نہ کر سکے کیوں کہ بہار نے بھی اناج کی برآمد کی اجازت نہیں دی۔ جون ۱۹۴۳ء میں اڑیسا کی حکومت پہلے ہی کھلی منڈی میں اناج کی خریداری پر پابندی لگا چکی تھی۔ آسام کی حکومت نے بھی اسی قسم کے دلائل دے کر بھوکے بنگال کو اناج فراہم کرنے سے انکار کر دیا۔ مسلم لیگی اخبارات نے الزام لگایا کہ تینوں ہم سائے صوبوں کی ہندو وزارتوں کی جانب سے بنگال کو اناج فراہم نہ کرنے کی وجہ یہ ہے کہ وہ اس طرح خواجہ ناظم الدین کی مسلم لیگی وزارت کو ناکام کرنا چاہتے ہیں۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ بنگال کے جن علاقوں کو قحط کا سامنا ہے وہاں کی آبادی زیادہ تر مسلمانوں یا اچھوتوں پر مشتمل تھی۔ تینوں صوبوں کے ہندو اربابِ اقتدار اور اناج کے ہندو بیوپاریوں کو اُن بدنصیبوں کے زندہ رہنے میں کوئی دل چسپی نہیں تھی۔ گویا مشرقی پاکستان میں ہندو مسلم تضاد، وحشت بربریت اور سنگ دلی کی ساری حدود پار کر چکا تھا۔

تیسری غذائی کانفرنس میں حکومتِ بنگال سے اس امر کی وضاحت بھی طلب کی گئی کہ اُس نے اناج کے وسیع ذخائر کس طرح تقسیم کیے۔ نئی دہلی کے مذکورہ اقدام سے بنگال کے بھوکے عوام کے پیٹ میں کچھ بھی نہ پڑا۔ اگست ۱۹۴۳ء تک صوبے کے مختلف علاقوں میں قحط سے ہلاکتوں کی تعداد میں اضافہ ہونے لگا۔ آخر کار بنگال کو مجبوراً قحط کا اعلان کرنا پڑا۔ اِس اعلان کے بعد چٹا گانگ اور دوسرے علاقوں میں امدادی مراکز کھولے گئے۔ بھکاریوں کے لیے مفت دال بھات کا انتظام کیا۔ ۱۳ اگست ۱۹۴۳ء کے بعد اخبارات میں ہر روز ہول ناک خبروں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ کلکتہ اور بنگال کے دوسرے شہروں کی سڑکوں پر سیکڑوں لاشیں اٹھائے جانے کی خبریں روز کا معمول بن گئیں[۳۰]۔ ہلاکتوں کی تعداد کے بارے میں متضاد اطلاعات کی وجہ سے یہ بتانا بھی مشکل تھا کہ کس قدر ہلاکتیں ہوئیں۔ البتہ اس بارے میں کوئی شبہ نہیں کہ اس قحط میں ''لاکھوں عوام بن آئی موت مر گئے اور ملک کا یہ حصہ زندہ جہنم کا منظر پیش کرنے لگا''[۳۱]۔ معروف محقق اور ماہرِ سماجیات حمزہ علوی نے لکھا کہ اس قحط میں ''۳۵ لاکھ کے قریب وہ غریب کسان لقمۂ اجل بن گئے جن کے پاس قحط کے دوران گزر اوقات کے لیے کوئی رقم محفوظ نہیں تھی''[۳۲]۔ بدانتظامی اور مقامی حکام کی بدنیتی کی وجہ سے قحط کے ساتھ ساتھ وبائی امراض بھی پھوٹ پڑے جن سے ہلاکتوں کی تعداد میں مزید اضافہ ہوا[۳۳]۔ یوں محسوس ہو رہا تھا کہ برعظیم کے اس زرخیز ترین صوبے کی پوری کی پوری آبادی تھوڑے عرصے میں صفحۂ ہستی سے مٹ جائے گی۔ ستمبر کے وسط میں ہونے والے صوبائی اسمبلی کے بجٹ سیشن میں حزبِ اختلاف کے اراکین نے صوبے میں قحط کی جو تصویر کھینچی ہے، اس سے بھی ہلاکت خیزی کے اثرات کا جائزہ لیا جا سکتا ہے۔ اراکین کے مطابق صوبے بھر میں کوئی گاؤں ایسا نہیں ہے جہاں لوگوں کو دو وقت کھانا نصیب ہو۔ ایک اور رکن کا بیان تھا کہ ہر قصبے میں روزانہ اوسطاً ۲۵ ہزار افراد معدوم ہوتے جا رہے ہیں، جو صورتِ حال اس وقت صوبۂ بنگال کی تھی، ایسی معاشی بدحالی کی مثال ہندوستان کی تاریخ میں نہیں ملتی[۳۴]۔

۱۹۴۳ء کے قحط کی تصاویر دیکھ کر بھی اس زمانے کے بنگال کی شکستہ حالی کا اندازہ ہوتا ہے۔ اِس موضوع پر دنیا کی مختلف جامعات میں سماجی ماہرین نے جو تحقیقات کی ہیں، اس کے اعداد و شمار اور نتائج بھی بڑے ہول ناک بیان کیے ہیں۔ مرکزی اور صوبائی

حکومتیں الزام تراشی کر کے ملبہ ایک دوسرے کے سَر ڈالنے کی کوششوں میں مصروف رہیں اور پورے بنگال میں انسانیت بلکتی اور سسکتی رہی۔ کلکتہ یونی ورسٹی شعبہ بشریات (Anthropology) کے اساتذہ اور طلبا نے جو سروے رپوٹ شائع کی، اِس کے مطابق بنگال کے ۴ء۲۴ فی صد خاندانوں کا معاشی، معاشرتی اور نفسیاتی تعلقات کا شیرازہ بکھر گیا۔ لوگ نفسیاتی عوارض کا شکار ہو گئے۔ شوہروں نے بیویوں کو، بیویوں نے بیمار شوہروں کو، بچوں نے بوڑھے اور اپاہج والدین کو گھروں سے نکال دیا۔ بھائیوں نے بھوکی بہنوں کی التجائیں سننے سے انکار کر دیا۔ قحط کا شکار ہونے والے ۷ء۵۲ فیصد اچھوت اور ۹ء۳۰ فیصد مسلمان تھے۔ ۴ء۱۵ فی صد اونچی ذات کے ہندو اور ایک فی صد عیسائی بھی قحط کے متاثرین میں شامل تھی۔ سب سے زیادہ کھیتوں میں کام کرنے والے مزدور قحط کا شکار ہوئے۔ ان کا تناسب ۷ء۴۷ فی صد تھا۔ اس کے بعد چھوٹے مالکانِ اراضی جن کا تناسب ۲۵ فی صد بنتا ہے۔ پرچون فروشوں کا تناسب ۷ فی صد اور بھکاریوں کا ۶ء۶ فی صد بنتا ہے۔ کھیتوں کے مزدوروں کے اپنے اپنے علاقوں سے چلے جانے کی وجہ سے آئندہ فصل پر بھی اس کا برا اثر پڑا۔ اس سروے رپورٹ سے بنگال اور دوسرے علاقوں کے تعلیم یافتہ درمیانے طبقے کی روح کانپ اُٹھی مگر مقامی منافع خوروں اور برطانوی سامراج کے ضمیر میں کوئی حرکت پیدا نہ ہوئی۔

نلنی رنجن سرکار نے اپنے بیان میں خواجہ ناظم الدین کی حکومت پر یہ الزام بھی لگایا کہ مسلم لیگ کے خزانچی مرزا ابوالحسن اصفہانی کی فرم کو اناج کی خریداری کی ایجنسی دینے کی وجہ سے غذائی قلت کے مسئلے کو حل کرنے میں ناکامی ہوئی۔ اگر اس کمپنی کے بہ جائے چند ہندو فرموں کو یہ کام سپرد کیا جاتا تو صورتِ حال اس قدر خراب نہ ہوئی ہوتی۔ جولائی ۱۹۴۳ء کے بعد تقریباً سارے ہی ہندو لیڈر اور اخبارات یہ الزام عائد کرتے رہے۔ مولوی فضل الحق بھی ان کے ہم نوا تھے۔ مگر مسلم رائے عامہ پر ان باتوں کا کوئی اثر نہ ہوا۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ خواجہ ناظم الدین کی وزارت کے خلاف اس عرصے میں کوئی مظاہرہ نہ ہوا۔ اس کے برعکس بنگالی مسلمانوں کا تعلیم یافتہ گروہ یہ باور کراتا رہا کہ قحط کی بڑی وجہ بہار اور اڑیسہ کی ہندو حکومتوں کا بروقت اناج مہیا کرنے سے انکار تھا[۳۵]۔ فرقہ ورانہ تضاد کی اس نوعیت کی آئینہ داری ۱۴ اکتوبر کو کلکتہ کے ایک بنگالی اخبار باسومتی میں بھی ہوئی۔

اس نے اپنے اداریے میں اس رائے کا اظہار کیا کہ ''اگر اب بنگال میں دو کروڑ ہندو اور دو کروڑ مسلمان مرجائیں تو آبادی کا یہ خلا سنتھال، اوراؤں، خاصی اور جینتیا کی پہاڑیوں کے اِن قبائل سے پُر ہوجائے گا جو کالی ماتا کی پوجا کرتے ہیں اور اپنے آپ کو ہندو کہتے ہیں۔ اس طرح دو سال سے بھی کم عرصے میں بنگال کی مسلم اکثریت پانچ اور ایک کی نسبت سے اقلیت میں تبدیل ہوجائے گی[۳۶]۔ ہری داس موزامدار نے اس روزنامے ''باسومتی'' کا یہ اقتباس نقل کرتے ہوئے یہ تعبیر پیش کی کہ اس قدر شدید قحط کے زمانے میں بھی اس ہندو اخبار کے نزدیک یہ بات زیادہ ضروری تھی کہ مسلمانوں کی اکثریت کو کیسے اقلیت میں تبدیل کیا جائے۔ اخبار کے مطابق قحط میں اگر چار کروڑ مسلمان اچھوت مرجائیں یہ مسئلہ بہ آسانی حل ہوجائے گا۔ ۹/اکتوبر ۱۹۴۳ء کو گورنر سر تھامس ردرفورڈ کی نشری تقریر سے یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ آئندہ برطانوی حکومت بنگال کے قحط کے مسئلے پر قابو پانے کی جانب سنجیدگی سے توجہ دے گی۔ پالیسی میں تبدیلی کی ایک بڑی وجہ عالمی سطح پر برطانوی سامراج کی شقاوتِ قلبی کو موضوعِ گفتگو بنانا تھا۔

گذشتہ دو ماہ میں عالمی جنگ کا پانسا بھی پلٹ گیا تھا۔ جاپان اور جرمنی کی پسپائی، اٹلی کی نئی حکومت کا ہتھیار ڈالنا وغیرہ جیسے واقعات نے حکومتِ ہند کے لیے موافق حالات پیدا کر دیے تھے۔ ۲۸/اکتوبر ۱۹۴۳ء کو لندن میں حکومتِ برطانیہ نے ہندوستان کی

غذائی صورتِ حال کے بارے میں قرطاس ابیض شائع کی جس میں بنگال کے قحط کی ذمہ داری برما کے سقوط، اکتوبر ۱۹۴۲ء کے سمندری طوفان، کلکتہ پر جاپانیوں کی بم باری، بیوپاریوں کی ذخیرہ اندوزی اور ۱۹۴۳ء کے سیلاب کے باعث ریلوے کا نظام درہم برہم ہونے پر عائد کی ہے۔ مسلم لیگ نے اس بدترین قحط کے ذمے داروں کا تعین کے لیے رائل کمیشن مقرر کرنے کا مطالبہ کیا جسے مسترد کر دیا گیا۔ قائداعظم محمد علی جناح نے تحریک پر اپنی تقریر کے دوران قحط کی ذمے داری حکومتِ برطانیہ اور حکومتِ ہند پر عائد کی۔ ان کے خیال میں صوبائی حکومت کو اس سلسلے میں موردِ الزام نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔[۳۷]

قحط بنگال کے متاثرین کو نہ کسی بحث و مباحثے سے فائدہ تھا اور نہ ہی انھیں کسی قسم کی تحقیقات فائدہ پہنچا سکتی تھی۔ انھیں تو پیٹ بھرنے کے لیے اناج کی ضرورت تھی اور وہ انھیں کسی صورت دستیاب نہ تھا چناں چہ اس دوران نہ صرف بھوک اور ہلاکت خیزی تیزی سے جاری رہی بلکہ ملیریا، ہیضہ، چیچک جیسے وبائی امراض نے مزید قیامت ڈھا دی۔ ۱۰ دسمبر کو کلکتہ کے میئر سید بدرالدجی کے مطابق ضلع مرشد آباد کی کنڈی سب ڈویژن کی چار لاکھ آبادی میں ۵۰ ہزار افراد ملیریا، ہیضہ اور دوسری بیماریوں سے ہلاک ہو چکے ہیں۔ چٹاگانگ میں واقع کشتیا کی ۴۰ ہزار آبادی میں سے ۱۰ ہزار جاں بحق ہوئے۔ ۱۷ دسمبر کو وزیر ہند ایمری کا بیان ہے کہ ۲۷ جون سے ۱۳ نومبر تک بنگال پریذیڈینسی میں ۳۰۸۹،۷۷ افراد ہیضے سے ہلاک ہو گئے۔ مسلم لیگ ریلیف کمیٹی کے سیکریٹری چودھری معظم حسین کے ایک اخباری بیان میں بتایا کہ فروری مارچ ۱۹۴۳ء کے دوران بنگال کی چھ کروڑ عوام میں سے ساڑھے پانچ کروڑ قحط سے متاثر ہوئے۔ لوگ خوراک حاصل کرنے کے لیے کچھ بھی کرنے کو تیار ہیں۔ اس قحط نے بنگال کا اخلاقی ڈھانچا بھی تباہ کر کے رکھ دیا۔ اعداد و شمار کی قیاس آرائیوں سے قطعِ نظر بنگال پبلک ہیلتھ ڈیپارٹمنٹ کا قیاس تھا کہ قحط سے ہونے والی ہلاکتوں کی تعداد ۶،۸۸،۸۴۶ تھی۔ سرکاری اعداد و شمار دس سے بیس لاکھ تک بتاتے ہیں۔[۳۸] لیکن ایک محتاط اندازے کے مطابق جیسا کہ حمزہ علوی نے بیان کیا کہ کم از کم تیس لاکھ افراد اس قحط کے نتیجے میں لقمۂ اجل بنے۔ ان ہلاکتوں پر برطانوی بے حسی کا اندازہ ونسٹن چرچل کے اس بیان سے لگایا جا سکتا ہے جو اُس نے بنگال کے قحط کے بارے میں بات کرتے ہوئے دیا۔ اُس کا کہنا تھا کہ:

I hate Indians. They are a beastly people with a beastly religion.
The famine was their own fault for breeding like rabbits[۳۹].

اس بیان سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ۱۹۴۳ء کا قحط درحقیقت ہندوستانیوں کے قتلِ عام کا سوچا سمجھا منصوبہ تھا۔ محض اقتدار اور منافع کی خاطر برطانیہ نے تاریخ کا سب سے بڑا قتلِ عام کیا چرچل نے ہنگامی سطح پر اناج کے جہاز بھیجنے کی اپیلوں کو بار بار مسترد کیا۔ اِس مصنوعی طور پر پیدا کردہ قحط کو برطانوی راج کے تاریک ترین ابواب میں شمار کیا جائے گا۔ مدھوسری مکرجی نے Churchill's secret War میں کچھ ایسی دستاویزات کا بھی ذکر کیا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ چرچل براہِ راست بنگال کے اس شدید قحط کے ذمے دار تھے۔ کتاب میں چرچل کی پیش کردہ ہر دلیل کو غلط ثابت کرنے کے ساتھ ساتھ دوسری عالمی جنگ کے دوران کابینہ اجلاس کے تجزیوں، وزارتی ریکارڈ اور ذاتی ریکارڈ کے تجزیے کے دوران اس بات کا انکشاف کیا گیا کہ جن دنوں بنگال میں شدید قحط سے لاکھوں لوگ ہلاک ہو رہے تھے اِن ہی دنوں آسٹریلیا سے روانہ ہونے والا اناج سے لدا جہاز ہندوستان کے قریب سے گذر رہا تھا۔ بحیرۂ روم کے گودام بھی اناج سے بھرے ہوئے تھے۔ مکرجی کا کہنا ہے کہ آسٹریلیا نے قحط کے دوران مدد بھیجنے کی بار بار پیش کش کی لیکن جنگی کابینہ نے جہاز مہیا کرنے سے

انکار کر دیا۔ امریکا نے اپنے بحری جہازوں سے اناج بھیجنے کی پیش کش کی لیکن برطانیہ کی جانب سے کوئی جواب نہ ملا[۴۰]۔ یہ وہ صورتِ حال ہے جس سے یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ اتنی بڑی تعداد میں ہلاکتوں کے پیچھے چرچل کا شیطانی دماغ ضرور کام کر رہا ہوگا جو ہندوستانیوں سے اپنی نفرت کا اظہار پہلے ہی کھل کر کر چکا تھا۔

قحطِ بنگال کے تناظر میں ادب کے مطالعے سے اس بات میں کوئی شبہ نہیں رہ جاتا کہ اس ہول ناک سانحے نے اس زمانے کے ادیبوں اور شاعروں کو بے حد متاثر کیا۔ اردو میں اس سانحے کے حوالے سے جہاں اَن داتا از کرشن چندر وغیرہ جیسے افسانوں نے خوب شہرت حاصل کی وہیں ایسی بہت سی نظمیں بھی زبانِ زدِ عام ہوئیں جو قحطِ بنگال سے متعلق تخلیق کی گئیں۔ اس زمانے میں مختلف قومی تحریکوں نے سیاسی اور سماجی سطح پر ہل چل پیدا کی ہوئی تھی۔ قحط سے ہونے والی ہلاکتوں کی ذمے داری چوں کہ برطانوی استعمار کے سر تھی۔ لہٰذا اس سانحے سے متعلق لکھی گئی نظموں میں بھی کسی نہ کسی شکل میں انگریزوں کے خلاف نفرت اور ان کے اقتدار کے خاتمے کی تدابیر کا راگ ضرور الاپا جاتا۔ جوشؔ نے قحط کی ہول ناک تباہی سے قبل ہی ہندوستان میں مزدوروں، کسانوں اور عام لوگوں کی زندگی کی کس مپرسی کو نہ صرف محسوس کیا بلکہ نوآبادیاتی دور میں سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف شدید مزاحمتی رویہ بھی اپنایا۔ ترقی پسند تحریک کے آغاز سے قبل ہی ۱۹۲۹ء میں نظم ''کسان'' میں کسان اور ہل کا قصیدہ لکھتے ہوئے کسانوں کا مرثیہ بھی لکھ ڈالا۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ ترقی پسند نظریے سے قبل ہی وہ کسانوں کی بدحالی پر کئی نظمیں لکھ چکے تھے۔ وہ کسانوں کی بدحالی کا ذمہ دار جاگیرداری کے بہ جائے سرمایہ داری کو قرار دیتے ہیں۔ کسانوں کی بابت اِن کا کہنا تھا کہ:

جس کے ماتھے کے پسینے سے پئے عزو وقار — کرتی ہے دریوزۂ تابش کلاہِ تاج دار
دھوپ کے جھلسے ہوئے رُخ پہ مشقت کے نشاں — کھیت سے پھیرے ہوئے منھ، گھر کی جانب ہے رواں
اپنی دولت کو جگر پر تیرِ غم کھاتے ہوئے — دیکھتا ہے ملک دشمن کی طرف جاتے ہوئے
قطع ہوتی ہی نہیں تاریکیٔ حرماں سے راہ — فاقہ کش بچوں کے دھندلے آنسوؤں پر ہے نگاہ
سوچتا جاتا ہے کن آنکھوں سے دیکھا جائے گا — بے ردا بیوی کا سر بچوں کا منھ اُترا ہوا
سیم و زر، نان و نمک، آب و غذا، کچھ بھی نہیں — گھر میں اِک خاموش ماتم کے سوا کچھ بھی نہیں
ایک دل اور یہ ہجومِ سوگواری ہائے ہائے! — یہ ستم اے سنگ دل سرمایہ داری ہائے ہائے!
تیری آنکھوں میں ہیں غلطاں و شقاوت کے شرار — جن کے آگے خنجرِ چنگیز کی مڑتی ہے دھار
بے کسوں کے خون میں ڈوبے ہوئے ہیں تیرے ہاتھ — کیا چبا ڈالے گی او کم بخت ساری کائنات
ظلم اور اتنا کوئی حد بھی ہے اس طوفان کی — بوٹیاں ہیں تیرے جبڑوں میں غریب انسان کی[۴۱]

جوشؔ نے اپنی شاعری میں مسلسل ایسے تصورات پیش کیے جو سرمایہ داری کے خلاف تھے۔ اپنے مخصوص انداز میں انھیں ''پٹاری کا سڑا انگور'' اور ''پشتِ مخلوقات پر سرطان کا پھوڑا'' کہہ کر ہدفِ تنقید بنایا۔ مہاجن، ساہوکار، زردار، جاگیردار اور حاکم کی علامتیں دراصل استیصال کی علامتیں ہیں۔ نظم مستقبل میں ایک منضبط تصور پیش کرتے ہوئے معاشی اور اقتصادی نظام کے خطوط پہلی بار جوشؔ نے ہی پیش کیے:

پک رہا ہے جو بیاباں کی کڑی دھوپ میں آج — کل اِسی سر کے لیے تاجِ گل افشاں ہوگا
آج جس رعب سے ہے روئے عمارت پہ شکوہ — کل وہ مزدور کے چہرے سے نمایاں ہوگا[۴۲]

لیکن انھیں اس بات کا بھی خوب احساس تھا کہ سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف تبدیلی کا جو خواب وہ دیکھ رہے ہیں اس کی تعبیر ابھی دور ہے۔ ہندوستانیوں میں ابھی وہ حرارت پیدا نہیں ہوئی۔ اپنی نظم پست قوم میں وہ اپنی اسی کیفیت کا اظہار کچھ اس انداز سے کرتے دکھائی دیتے ہیں:

ابنائے ملک میں وہ بصیرت کہاں ہے جوش — گردوں کی طوق پاؤں کی زنجیر کاٹ دے
اتنی غلام قوم، وہ ہمت کہاں ہے جوش — اپنی تباہیوں پہ کبھی غور کرسکے
اتنی ذلیل ملک کو فرصت کہاں ہے جوشؔ — اِک حرفِ گرم سنتے ہی کو دے اُٹھیں دماغ
ہندوستان میں وہ حرارت کہاں ہے جوشؔ[۴۳]

جوشؔ اچھی طرح جانتے تھے کہ سرمایہ دارانہ نظام کی وجہ سے ملک کا مزدور اور کسان بدحال ہے۔ سخت محنت اور مشقت کے باوجود اس کی زندگی میں سوائے پریشانی کے کچھ نہیں۔ اکثر خوراک اُگانے والا کسان ہی غذائی قلت کا شکار رہتا ہے اور سرمایہ داروں کے زر میں روز بہ روز اضافے کا سبب بننے والا مزدور دو وقت کی روٹی کو محتاج رہتا ہے۔ اِس صورتِ حال پر اُن کی نظم مہاجن اور مفلس بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ ابتدا میں ''مہاجن'' کا نقشہ کھینچتے ہوئے شاعر کا کہنا ہے کہ:

دانت میلے، پنڈلیاں پے چیدہ، دھوتی داغ دار — ناک میں مونچھوں کے گونجے، پیٹ میں توندی کا غار
سامنے غلّے کے بورے پشت پہ الماریاں — بغبغوں میں کروٹیں لیتی ہوئی زرداریاں
کہنیاں تکیے کے اندر، وزن سے دھنستی ہوئی — چُست صدری، دائرے پر توند کے پھنستی ہوئی
خوب لے لے کر ڈکاریں، دل کو بہلاتا ہوا — دونوں نتھنوں کو پُھلائے، توند سہلاتا ہوا[۴۴]

اس کے بعد وہ ''مفلس'' کی حالت بیان کرتے ہوئے ہندوستان میں موجود ان کروڑوں لوگوں کی زندگی کا منظرنامہ بیان کرتے دکھائی دیتے ہیں جن کی زندگی برطانوی استعمار کے ظلم وجبر کی وجہ سے بد سے بدتر ہوتی جارہی تھی۔ مفلسی کی بابت ان کا کہنا تھا کہ:

ضعف سے آنکھوں کے نیچے پتلیاں پھرتی ہوئیں — اوجِ خودداری سے دل پر بجلیاں گرتی ہوئیں
لاش کندھے پر خود اپنے جذبۂ تکریم کی — ملتجی چہرے پہ لہریں سی امید و بیم کی
قرض کی درخواست کی اُلجھی ہوئی تقریر میں — کپکپی اعصاب کی بے چین دل کی لرزشیں[۴۵]

''ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں سے خطاب'' میں وہ پہلے ہی دست کاروں، خصوصاً ململ کے کاری گروں کے انگوٹھے کاٹے جانے کی جانب اشارہ کرکے ایسٹ انڈیا کمپنی کے عزائم اور سرمایہ دارانہ نظام کے مظالم کو ہمارے سامنے پیش کرچکے تھے۔ اُن مظالم نے ہندوستانی معیشت کو تباہ کرکے رکھ دیا تھا۔ ہندوستان کی عظیم مملکت جس کی بابت خود مغربی مورخین نے لکھا تھا کہ میلوں چلنے کے باوجود کوئی بھیک مانگتا دکھائی نہیں دیتا ہے، وہاں اب مفلس اور نادار لوگوں کی بہتات ہے۔ خصوصاً بنگال میں تو آئے دن کے قحط نے لوگوں کی کمر توڑ دی تھی۔ اسی لیے وہ اپنی نظم بھیک کی آواز میں برطانوی راج کے ہندوستان خصوصاً معاشی صورتِ حال کا نقشہ کھینچتے ہوئے کہتے

ہیں کہ:

تصور کیجیے اُس ملک کی بے دست پائی کا — جہاں بنتا ہے شامِ بے نوائی نور کا تڑکا
جہاں بے داد ہوتے ہی فغاں ملتی ہے نالوں میں — گداؤں کی صدائیں گونجنے لگتی ہیں کانوں میں [۴۶]

جوشؔ کے بعد ترقی پسند تحریک سے وابستہ شعرانے اردو شاعری کے اُن تمام مدھم نقطوں کو متعین شکل عطا کی اور پہلی بار ملک کے سامنے ایک واضح نقطہ نظر پیش کیا یعنی ایک ایسی بنیاد جو طبقاتی شعور کی روشنی میں تیار کی گئی تھی۔ایسی بنیاد جس کی تہہ میں پورے ملک کے عوام کے مفادات شامل تھے۔آزادی کا وہ تصور جو حب الوطنی کے جذبات کے طلسم میں اب تک اسیر تھا، اُسے مفکرانہ انداز عطا کرنے کا سہرا ترقی پسند تحریک کے سر ہے۔ایسا مفکرانہ انداز جو خالص معاشی بنیادوں پر ملک کے عوام میں یک جہتی کا شعور بے دار کر سکے۔اس تحریک کے خدوخال ابھارنے میں ایک طرف تو بین الاقوامی فضا میں استعماریت کے سامراجیت اور فسطائیت سے چھٹکارا پانے کی وہ تمنا تھی جو اشتراکی نظام کے روپ میں جلوہ گر ہوئی تھی اور معاشی لوٹ کھسوٹ اور استیصال کے خلاف اعلانِ بغاوت تھی تو دوسری طرف ہندوستان میں تیزی سے بدلتے سیاسی حالات جو عوام کو احساس دلا رہے تھے کہ غلامی دراصل سیاسی محکومی ہی سے عبارت نہیں تھی بلکہ یہ ایک بہت بڑے نظام کا چھوٹا سا پرزہ ہے۔

ہندوستان کی قومی تحریکوں سے وابستہ لوگوں میں یہ احساس پیدا ہو چلا تھا کہ ہندوستانی عوام انگریزوں کی غلامی سے چھٹکارا پانے کے باوجود ہندوستانی سرمایہ داروں سے نجات حاصل نہیں کر سکیں گے [۴۷]۔دراصل اس تحریک کا مسلک ہی اشتراکی اور عوامی انقلاب تھا۔اگر چہ اس تحریک نے اپنا رشتہ ملکی آزادی کی جدوجہد اور جمہوریت سے جوڑا۔ہندوستان کے نئے ادب میں بھی انھوں نے ہماری زندگی کے بنیادی مسائل کو موضوع بنایا [۴۸]۔بھوک، افلاس، سماجی پستی اور غلامی کے مسائل اس زمانے کے ادیبوں کے محبوب موضوعات بن گئے، ہندوستانی زندگی میں رونما ہونے والی ہر تبدیلی ان کی تخلیقات کا موضوع بنیں۔پھر یہ کیوں کر ممکن تھا کہ لاکھوں لوگوں کو نگل جانے والے بنگال کے قحط پر اس تحریک کے لوگ خاموش رہے ہوں۔اس تحریک کے سرخیل علی سردار جعفری نے اپنی نظم بنگال میں قحط سے پیدا ہونے والی صورتِ حال کے ہر منظر کو قید کرنے کی کوشش کی ہے۔اندرونی اور بیرونی سیاست کے شکار بنگال پر اس وقت جو کیفیت تھی اس کی جانب اشارہ کرتے ہوئے ان کا کہنا تھا کہ:

آج ہے بدلا ہوا رنگِ مزاجِ روز گار — کرگسوں کی طرح منڈلاتی ہے روحِ انتشار
آہ! وہ بنگال وہ حسن و محبت کا دیار — ہو گیا غیروں کی دیرینہ سیاست کا شکار
اس مصیبت میں اگر اپنے بھی بے گانے رہے — فائدہ پھر کیا جو گردِ شمع پروانے رہے [۴۹]

قحط نے چھے کروڑ آبادی والے بنگال کا کوئی حصّہ نہیں چھوڑا۔صوبے کے تمام حصّے اس سے متاثر ہوئے۔شہر ہو یا گاؤں ہر جگہ موت ہی موت دکھائی دے رہی تھی۔اس کرب ناک منظر کی عکاسی کرتے ہوئے شاعر کا کہنا تھا کہ:

بستیوں میں گاؤں میں شہروں میں لہراتی ہے موت — جس طرف دیکھو اسی جانب نظر آتی ہے موت
چھین کر ماؤں سے بچوں کے لیے جاتی ہے موت — زندگی ہے سرنگوں اور ناز فرماتی ہے موت
گاؤں ویراں ہو گئے، ہر جھونپڑا سنسان ہے — خطۂ بنگال ہے یا ایک قبرستان ہے [۵۰]

شاعر یہاں بنگال کو ایک قبرستان سے تشبیہ دینے کے ساتھ ساتھ جو لوگ ابھی زندہ تھے، انھیں زندہ لاشوں سے تعبیر کر رہے تھے۔ غذائی قلت نے ان کا جو حال کر رکھا ہے اس کی تصویر پیش کرتے ہوئے نقاہت، کمزوری اور جسمانی طور پر لاغری نے انھیں کن کن مصائب کا شکار بنا رکھا تھا اس کا حال بیان کرتے ہوئے ان کی زندگی کو جانور کی زندگی سے بھی بدتر قرار دیتے تھے۔ ملاحظہ کیجیے:

سیکڑوں سڑتی ہوئی لاشوں سے اُٹھتا ہے بخار　　میتیں ہیں بے کفن چادر اُڑھاتا ہے غبار
چھاتیاں ماؤں کی جن سے دودھ کی بہتی تھی دھار　　بے بسی سے آج ان کو چوستے ہیں شیر خوار
رینگ کر لاشوں سے ہٹ جائیں یہ طاقت بھی نہیں　　ان میں انسانوں کی ہلکی سی شباہت بھی نہیں
دھنس گئیں ہیں بھوک سے آنکھیں لٹک آئے ہیں گال　　ہڈیوں پر خشک چمڑے کی طرح لپٹی ہے کھال
ماؤں کے دکھتے ہوئے شانوں پہ بچے ہیں نڈھال　　آج وہ دم توڑتے ہیں رہ گزاروں کے قریب [۵۱]

عالمی جنگ کے پس منظر میں جاپان کی برما کی طرف چڑھائی اور برطانوی استعمار کے رویے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے وہ ملک کے سیاست دانوں کو ہوشیاری اور سمجھ داری کا مظاہرہ کرنے کا درس دیتے دکھائی دیتے ہیں۔ عالمی سطح پر ہونے والی تبدیلی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ان کا کہنا تھا کہ:

اِک طرف دیو حکومت گردنوں پر ہے سوار　　اِک طرف جاپان کا لشکر قطار اندر قطار
اور اِس حالت میں ہندوستان فاقوں کا شکار　　ہوشیار اے مرد، میدانِ سیاست ہوشیار
ایک ہو جاؤ کہ دم سینے میں گُھٹ جانے کو ہے　　قوم کا سرمایۂ اخلاق لٹ جانے کو ہے [۵۲]

ہندوستان کا وہ حصّہ جہاں انقلاب کی حرارت بھی تھی اور سرسبز و شادابی بھی تھی، آج ان کو قحط کی صورت میں مصائب و آلام کا شکار بنا دیا گیا۔ صوبے کی موجودہ حالت کی بابت ان کا کہنا درست تھا کہ:

آج اِس میں قحط ہے، آلام ہے، ادبار ہے　　زندگی ہے آج اس کا ہر نفَس بے زار ہے [۵۳]

انسانیت کی سسکتی اور بلکتی تصویر ان کی ایک اور نظم ''بھوکی ماں بھوکا بچہ'' میں بھی دیکھی جا سکتی ہے۔ ایک بچے کی کس مپرسی اور لاچاری کے بیان میں دراصل بنگال کے ہر ماں اور بچے کی فریاد اس نظم میں سنائی دیتی ہے جسے سننے والا کوئی نہیں۔ ماں کے پاس محض بہلاوے کے سوا کچھ نہیں اور اسی بہلاوے میں دونوں ماں اور بچہ کس طرح موت کی آغوش میں چلے جاتے ہیں۔ یہ منظر بہت دردناک ہے۔ شاعر کے حساس دل نے اس منظر کو کس جبر کے ساتھ بیان کیا ہوگا، نظم کے مطالعے سے اس کا بہ خوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

میرے مُنے میرے معصوم مرے نورِ نظر/ آ کہ ماں اپنے کلیجے سے لگا لے تجھ کو/ اپنی آغوشِ
محبت میں سلا لے تجھ کو/ میرے افلاس کے ہیرے سو جا/ نیند میں آئیں گی ہنستی ہوئی پریاں
ترے پاس/ بوتلیں دودھ کی، شربت کے کٹورے لے کر/ جانے آواز کی لوری تھی کہ
پریوں کا طلسم/ نیند سی آنے لگی بچے کو/ کھنچ گئی نیلگوں ہونٹوں پہ خموشی کی لکیر/ مٹھیاں
کھول دیں اور موند لیں آنکھیں اپنی/ یوں ڈھلکنے لگا منکا جیسے/ شام کے غار میں سورج گر
جائے/ جھک گئی ماں کی جبیں بیٹے کی پیشانی پر/ اب نہ آنسو تھے نہ سسکی تھی نہ لوری نہ کلام/

ایک سناٹا تھا/ایک سناٹا تھا تاریک وطویل [۵۴]

اسی طرح ''ایشیا جاگ اٹھا'' میں بھی ہندوستان کے رستے ہوئے زخم اور آنسوؤں کو پیش کرنے کی عمدہ کوشش نظر آتی ہے۔ مجموعی طور پر پورے ایشیا کا منظر نامہ پیش کرتے ہوئے بھوک سے نڈھال لوگوں کا حال اس نظم میں کچھ اس طرح بیان کیا گیا ہے:

یہ ایشیا ہے، جوان شاداب اور دھنوان ایشیا ہے/ کہ جس کے نردھن غریب بچوں کو بھوک
کی ناگ ڈس رہے ہیں/وہ ہونٹ جو ماں کے دودھ کے بعد بھر واقف نہ ہوئے کبھی دودھ
کے مزے سے/زبانیں ایسی جنھوں نے چکھا نہیں گیہوں کی روٹیوں کو/وہ پیٹ جو بھوک
ہی کو بھوجن سمجھ رہے ہیں/ یہ نادر روزگار انساں/یہ آنکھ کی پتلیاں، جو خون اور پیپ کی
طرح بہہ رہی ہیں/ یہ چہرے کھنڈروں کی طرح ٹوٹے/یہ بازو لکڑی کی طرح سوکھے/یہ
پیٹ مٹکوں کی طرح پھولے/یہ مفلسی، یہ جہالت کی رات، بے چاند بے ستارے/یہ
بھوک، یہ بے بسی، یہ نفرت، یہ ہنستے پھوڑے/ لٹکتے گھینگے /دہکتے ناسور، چیختے زخم، رینگتے
جسم جیسے کیڑے/تمھاری سرمایہ دار ''تہذیب'' کی کہانی سنا رہے ہیں [۵۵]

سیماب اکبرآبادی نے رومانی انقلاب سے متعلق متعدد نظمیں کہیں مگر جب ان کی نظر فاقہ زدہ لوگوں پر پڑی تو وہ بھی قحط سے متاثر انسانوں کو نظر انداز نہیں کر پائے۔ بنگال میں قحط سے متاثرہ بھوکے، مفلس اور نادار انسانوں کی جو تصویریں ملک اور بیرونِ ملک پہنچیں، اس نے سیماب سے ''بھوکا ہندوستان'' جیسی نظم لکھوائی۔ بنگال کے لوگوں کی حالت دیکھ کر، اس نظم میں یہ کہنے پر مجبور ہوئے کہ:

آج زباں پر ہے دنیا کی بھوکا ہندوستان | بھوک کے قصّے، سنتے سنتے کانپ گیا ایمان [۵۶]

ایک اور نظم ''کلکتہ'' میں بھی وہ ہندوستان کے اس خطے میں آنے والے قحط سے پیدا ہونے والی صورتِ حال اور اس کے نتیجے میں پائی جانے والی عمومی پریشانی کو موضوعِ سخن بناتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

ایک مدت سے پریشاں دیکھتا ہوں میں تجھے | شعلہ و شبنم بد اماں دیکھتا ہوں میں تجھے
بھوک اور فاقوں سے پاتا ہوں تجھے اکثر نڈھال | کثرتِ امراض سے بگڑا ہوا ہے تیرا حال [۵۷]

طویل نظم ''عالمِ آشوب'' میں بھی انھوں نے بنگال کی سیاسی فضا کو عالمی تناظر میں دیکھتے ہوئے وہاں پر ہونے والی تبدیلی کے مثبت، منفی پہلوؤں کی نشان دہی کی ہے۔ جاپان کی جانب سے برما اور پھر متوقع بنگال پر چڑھائی کو وہ اچھی نظر سے نہیں دیکھتے ان کا کہنا تھا کہ:

جاپان کرے فضا کو برہم نہ کہیں | پھینکے اور کچھ بڑھ کے یہ بم نہ کہیں
کلکتہ سے ہے گیا فقط تھوڑی دور | برباد ہو خواب گاہِ گوتم نہ کہیں [۵۸]

اس طرح جاپان اور جرمن کے گٹھ جوڑ جس کا تفصیلی ذکر مذکورہ صفحات میں کیا جا چکا ہے، کی بابت وہ کہتے ہیں کہ:

جس قوم پہ وقتِ ابتلا آتا ہے | اُس قوم پہ ادبار ہی منڈلاتا ہے
ہے لومڑی شہر کی اُلش پر نازاں | جاپان بھی جرمن سے ملا جاتا ہے [۵۹]

اس قحط کے بعد ہندو اور مسلم قیادت جس طرح سے مذہبی منافرت کا مظاہرہ کر رہے تھے اُس کو سامنے رکھتے ہوئے سردار جعفری کا کہنا تھا کہ:

غارت کیے تسکین کے پہلو جس نے؟	ہر چیز پہ کر لیا ہے قابو جس نے
کایا پلٹتی ہوئی نظر آتی ہے	یہ کر دیا بنگال پہ جادو کس نے
یہ وقت ہے آزمائش ہمت کا	موقع ہے یہی مروت و شفقت کا
اے خود غرضو! بھوک کی پیشانی پر	لیبل نہ لگاؤ مذہب و ملت کا[۶۰]

بنگال کے اس سانحے کے پس منظر میں جگر مرادآبادی کی نظم ''قحطِ بنگال'' کو بھی خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ جگر بنیادی طور پر تغزل کے شاعر ہیں۔ اشعار میں غنائیت اور ترنم کی وجہ سے ہمیشہ، انھیں عوامی پذیرائی حاصل رہی۔ وہ خالص عشقیہ شاعر تھے لیکن قومی تحریک سے بھی وہ اس قدر متاثر تھے کہ ان کی شاعری کو ملکی سطح پر اس تناظر میں بھی خوب سراہا گیا اور وہ ایک قومی شاعر کے طور پر بھی اپنی شناخت بنانے میں کامیاب رہے۔ کہیں کہیں اُن کی غزلیں نظم کا انداز اختیار کر جاتی ہیں اور اِسے نظم کے تناظر میں ہی دیکھنا چاہیے۔ انھوں نے غزل کی ہیئت میں نظم کا جو انداز اختیار کیا، اُسے خوب اچھی طرح نبھایا بھی۔ قحطِ بنگال پر ان کی غزل نما نظم بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ افلاس زدہ روتے بلکتے لوگ، بے گور و کفن لاشیں، بچوں کی تڑپ اور اس قحط سے وابستہ اور بہت سے مناظر اس نظم میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ اشعار ملاحظہ کیجیے:

بنگال کی میں شام و سحر دیکھ رہا ہوں	ہر چند کہ ہوں دور مگر دیکھ رہا ہوں
افلاس کی ماری ہوئی مخلوق سرِ راہ	بے گور و کفن خاک پہ سر دیکھ رہا ہوں
بچوں کا تڑپنا، وہ بلکنا، وہ سسکنا	ماں باپ کی مایوس نظر دیکھ رہا ہوں[۶۱]

جگر کی یہ نظم اپنی تاثیر کے لحاظ سے ایک عمدہ نظم ہے۔ اس مختصر نظم میں شاعر نے قحط سے متعلق اہم امور کی خوب نشان دہی کی ہے۔ مثلاً بہار، اڑیسہ اور آسام کی جانب سے چاول کی فراہمی کے حوالے سے منفی رویہ ہو یا اس کے نتیجے میں ہونے والی انسانیت کی تذلیل جگر کی نظر ہر اُس پہلو تک گئی اور اس کو انھوں نے شعر کے قالب میں ڈھالا۔ جیسے:

بے مہری و بے داری و افلاس و غلامی	ہے شامتِ اعمال مگر دیکھ رہا ہوں
انسان کے ہوتے ہوئے انسان کا یہ حشر	دیکھا نہیں جاتا ہے مگر دیکھ رہا ہوں
اِک تیغ کی جنبش سی نظر آتی ہے مجھ کو	اِک ہاتھ پسِ پردۂ در دیکھ رہا ہوں[۶۲]

جگر کو اس بات کا یقین تھا کہ اس اذیت ناک سانحے کے بعد سامراج کی ظالمانہ پالیسی کے خلاف لوگ ضرور اُٹھ کھڑے ہوں گے۔ وہ اس تخریب میں بھی تعمیر کی صورت تلاش کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ اس بابت وہ کہتے ہیں کہ:

رحمت کا چمکنے کو ہے پھر نیرِ تاباں	ہونے کو ہے اُس شب کی سحر دیکھ رہا ہوں
تعمیر کے پردے میں یہ اندازِ حکومت	تخریب بہ عنوانِ دِگر دیکھ رہا ہوں
ہر چند کے آثار تو کچھ اور ہیں لیکن	اِک خیر بھی در پردۂ شر دیکھ رہا ہوں

بے داریِ احساس ہے ہر سمت نمایاں | بے تاجیِ اربابِ نظر دیکھ رہا ہوں
انجامِ ستم اب کوئی دیکھے کہ نہ دیکھے | میں صاف اِن آنکھوں سے مگر دیکھ رہا ہوں
صیاد نے لُوٹا ہے عنا دل کا نشیمن | صیاد کا جلتے ہوئے گھر دیکھ رہا ہوں
خاموش نگاہوں میں ابھرتے ہوئے جذبات | جذبات میں طوفانِ شرر دیکھ رہا ہوں [۶۳]

شاعر ہو یا عام انسان، اس کی زندگی اور موت، امن و جنگ، آسودگی اور بھوک، انصاف اور ظلم، مساوات اور طبقاتی، ترقی پسندی اور رجعت پسندی کے درمیان کسی ایک کا انتخاب کرنا ضروری ہوتا ہے۔ بیسویں صدی کے اِس بحرانی دور میں جب کہ عالمی سطح پر استعمار کے خلاف شدید ردِ عمل دیکھنے میں آتا ہے، اردو شعرا کی بڑی جماعت نے بھی اپنا فریضہ خوب نبھایا۔ وامق جون پوری بھی شاعری کے اسی گروہ سے تعلق رکھتے تھے جو اپنی شاعری کے ذریعے جدو جہد کر کے سرمایہ دارانہ نظام کے مکروہ چہرے ہمارے سامنے لانا چاہتے تھے۔ وامق نے اپنی مشہور نظم ''بھوکا بنگال'' لکھ کر مقبول شعرا کی صف میں اپنی جگہ بنالی۔ اس نظم کا آہنگ، اس کا اثر، اس کی سادگی اور اس کا اجتماعی جوش سب غور سے دیکھے جانے کی چیزیں ہیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ترقی پسند اپنے ذہن کی پوری طاقت سے زندگی اور شاعری کے رشتے کو سمجھنے میں لگے ہوئے تھے، اسی لیے ان کی اس نظم میں مستقبل کی عوامی شاعری کی جھلک بھی نظر آتی ہے [۶۴]۔ وامق اس مشکل گھڑی کو ہندوستان کی سرزمین کے لیے ایک کڑا امتحان قرار دیتے تھے۔ ان کا کہنا ہے کہ:

بھوکا ہے بنگال رے ساتھی، بھوکا ہے بنگال/ دھرتی ماتا کی چھاتی پہ چوٹ لگی ہے کاری/ مایا
کالی کے پھندے میں وقت پڑا ہے بھاری/ اب سے اُٹھ جا نیند کے ماتے دیکھ تو جگ کا
حال/ رے ساتھی دیکھ تو جگ کا حال/ بھوکا ہے بنگال رے ساتھی، بھوکا ہے بنگال [۶۵]

قحط سے ہونے والی ہلاکتوں اور ندی نالوں میں بے گور و کفن لاشوں کے وحشت ناک منظر کا بیان ہو یا مہنگائی کی چکی میں پسے معصوم لوگ، ہر پہلو کو نظم میں بیان کرنے کی کچھ اس طرح کوشش کی گئی ہے کہ اس سانحے کا پورا منظر آنکھوں کے سامنے پھرنے لگتا ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

بھوکا ہے بنگال رے ساتھی، بھوکا ہے بنگال/ پیٹھ سے اپنے پیٹ لگائے لاکھوں الٹے
کھاٹ/ بھیک منگائی سے تھک تھک کر اترے موت کی گھاٹ/ جیین مرن کے ڈانڈے
ملائے بیٹھے ہیں چنڈل رے ساتھی بیٹھے ہیں چنڈل/ بھوکا ہے بنگال رے ساتھی، بھوکا ہے
بنگال/ ندی نالے گلی ڈگر پر لاشوں کے انبار/ جان کی ایسی مہنگی شے کا الٹ گیا بیوپار/ مٹھی
بھر چاول سے بڑھ کر سستا ہے یہ مال/ سستا ہے یہ مال رے ساتھی سستا ہے یہ مال/ بھوکا
ہے بنگال رے ساتھی، بھوکا ہے بنگال [۶۶]

حکومت کی بدنظمی، ذخیرہ اندازوں، ساہوکاروں اور بنیوں کے گٹھ جوڑ نے سماجی اور اخلاقی سطح پر خاندان کے شیرازے کو جس طرح بکھیر کر رکھ دیا، اس کا حال بیان کرنے کے ساتھ ساتھ شاعر اس تلخ حقیقت کی بھی نشان دہی کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ اس قحط نے جوان لڑکیوں سے محض مٹھی بھر چاول کے بدلے جسم فروشی جیسا مکروہ فعل کروایا۔ شاعر کا کہنا ہے کہ:

بھوکا ہے بنگال رے ساتھی، بھوکا ہے بنگال/ کوٹھریوں میں گانجے بیٹھے بنیے سارا اناج/
سندر ناری بھوک کی ماری بیچے گھر گھر لاج/چوپٹ نگری کون سنبھالے چارطرف بھونچال/
چارطرف بھونچال رے ساتھی چارطرف بھونچال/ بھوکا ہے بنگال رے ساتھی، بھوکا ہے
بنگال [۶۷]

قدرت اللہ شہاب نے بھی عورتوں کی بے حرمتی کی بابت لکھا یعنی کہ عورتیں جو برسرِ عام بیچی جاتی تھیں۔ساہوکاروں اور ذخیرہ اندوزوں کے تو کیا ہی کہنے، ریلیف کے لیے آئے حکومتی نمائندے اور قحط سے متاثرین کے لیے کھولے گئے غریب خانوں سے خوراک کی جو تقسیم ہوتی اس عمل کی بابت ان کا کہنا ہے کہ:

غریب خانے میں داخلہ حاصل کرنے کے لیے بھوک اور افلاس کافی شرط نہ تھے۔سب سے پہلے گاؤں یا علاقے کا مکھیا، زمین دار یا معزز شہری ایک پرچی جاری کرتا۔۔۔اس کے بعد سرکل افسر اس پرچی کی تصدیق کرتا تھا۔ان دونوں مرحلوں میں تاخیر کے بڑے امکان تھے لیکن اگر خوش قسمتی سے کسی خاندان میں کوئی جوان اور قبول صورت لڑکی بھی شامل ہے، تو ہر مرحلے پر وہ بڑے موثر پروانۂ راہ داری کا کام دے سکتی ہے۔۔۔بچوں اور بوڑھوں کو تو ان کے حال پہ چھوڑ دیا جاتا لیکن سپروائزر سے لے کر اسٹور کلرک، ریکارڈ کلرک، باورچی، سقہ، مہتر سب اپنی اپنی توفیق کے مطابق جوان عورتوں کی پزیرائی میں منہمک ہو جاتے تھے۔کوئی انھیں چوری چوری خوش بودار صابن کی ٹکیاں دیتا تھا، کوئی دودھ کا ڈبا، کوئی بسکٹ، کوئی سگریٹ، کوئی وٹامن کی گولیاں۔غریب خانہ ہو یا راحیل خونڈکر کی جھونپڑی، بھوک کی منڈی میں جسم، جاں اور جنس کا ایک ہی ریٹ تھا [۶۸]۔

اس طویل اقتباس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ قہرِالٰہی کے اس دور میں بھی اخلاقی طور پر سماج کی حالت کیا تھی۔اردو شعرا نے بھی اس صورتِ حال کو موضوع بنایا۔قتیل شفائی نے اپنی آپ بیتی میں ایک گیت کا پس منظر بتاتے ہوئے لکھا کہ قحط کے زمانے میں عورتوں کی عزت کے ساتھ جو کھلواڑ کیا جا رہا تھا، یہ گیت اسی پس منظر میں لکھا گیا ہے۔گیت کے چند بول ملاحظہ کیجیے:

ماتا دیکھ اپنی سنسار/ تیری بیٹی لاج لٹائے تجھ کو لاج نہ آئے/ ان جل دے کر جیون چھینے/
دھن والوں کی رات/ماتا دیکھ اپنی سنسار [۶۹]

قومی شعور کا جو تانا بانا اس دور میں بُنا گیا اور جس شد و مد کے ساتھ ادب کو سماجی مسائل سے ہم آہنگ کیا گیا، وہ اب ادبی تاریخ کا حصّہ ہے۔قحطِ بنگال کے موضوع پر لاتعداد نظموں اور غزلوں کے اشعار اس بات کا ثبوت ہیں کہ ہمارے شاعر اور ادیب ملکی مسائل سے لاتعلق نہیں تھے۔قحط کے تناظر میں تخلیق کی گئی شاعری کے مطالعے سے ایک بات تو پوری طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ اردو شاعری کے ہر دور میں قومی یک جہتی کے عناصر پوری طرح موجود رہے ہیں۔اردو شاعری کے دل میں پورے ہندوستان کا درد تھا، اس علاقے کا درد بھی جہاں یہ زبان نسبتاً کم بولی جاتی تھی۔ بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ جہاں اس زبان کے ساتھ ہر دور میں نفرت کا رویہ اختیار کیا گیا۔اردو زبان کی شاعری نے ہندوستان کے کسی گوشے میں ہلکے سے کانٹے کی چبھن کو پورے ہندوستان کی تکلیف اور درد سمجھا اور یہ سب کچھ اس

وجہ سے ممکن ہوا کہ اردو شاعری کو قومی یک جہتی کا سچا شعور حاصل تھا۔ اردو شاعری دیدہ بینائے وطن تھی اور چشم شاعر، کسی عضو کے مبتلائے درد ہونے پر باوضو رہنے کو اپنی عبادت سمجھنے لگی [۷۰]۔

وامق جون پوری کے بعد ساحر لدھیانوی کی نظم کو بھی قحطِ بنگال کے ضمن میں عمدہ نظم شمار کی جانی چاہیے۔ ان کی انقلابی شاعری کی امتیازی شان اس کی روانی اور نغمگی ہے۔ ان کے ہاں گھن گرج بالکل نہیں۔ وہ ہنگامی موضوعات پر لکھتے ہوئے بھی شائستگی اور ضبط کے بندھن کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے [۷۱]۔ ساحر نے ہمیشہ جبر واستبداد کے خلاف حق وصداقت کا پرچم بلند کیا۔ ان کا لہجہ قحطِ بنگال پر ترش ضرور ہوتا ہے، وہ غیظ وغضب کے عالم میں سوال ضرور کرتے ہیں لیکن کبھی بھی اخلاق کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتے۔ پوری نظم ''بنگال'' گویا ایک سوال نامہ ہے جس میں شاعر کے مخاطب وہی سیاست دان ہیں جو اس ساری صورتِ حال کے ذمے دار ہیں۔ اس نظم میں ساحرؔ کی لفظیات کے اندچھپی برق تپاں کو واضح طور پر محسوس کیا جاسکتا ہے۔ یہ نظم محض احتجاج ہی نہیں بلکہ ایک زبردست سماجی طنز بھی ہے جس سے ایوانِ اقتدار دہل اُٹھا، نظم میں عوام کی زبوں حالی اور کس مپرسی کی بھرپور ترجمانی کی گئی ہے [۷۲]۔ چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

جہانِ کہنہ کے مفلوج سیاست دانو ں نظامِ نو کے تقاضے سوال کرتے ہیں
زمیں کی قوتِ تخلیق کے خداوندو ملو ں کے منتظمو سلطنت کے فرزندو
یہ شاہ راہیں اسی واسطے بنی تھیں کیا؟ کہ اس پہ دیس کی جنتا سسک سسک کے مرے
زمیں نے کیا اسی کارن اناج اگلا تھا؟ کہ نسلِ آدم وحوا بلک بلک کے مرے [۷۳]

قحط کے بعد بھوکی، پیاسی مخلوق کا جمِ غفیر، پھٹی پھٹی آنکھوں والے نڈھال بچے جو غنودگی کے عالم میں سر ڈھلکائے ہوئے، ہونٹوں پر پپڑیاں جمی ہوئیں، چہرے گرسنگی وتشنگی کی نقاہت سے مسخ کلکتے کی طرف دوڑ پڑے اب ہیبت ناک قحط کی زد میں آئے ہوئے بنگال اور بھوک سے سسک سسک کر مرنے والوں کی خبریں پورے ہندوستان میں پھیل رہی تھیں۔ روز بہ روز قحط کی ہولنا کی بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ قحط سے سسک سسک کر مرنے والوں کی تعداد دوسری جنگِ عظیم میں مرنے والوں سے کہیں زیادہ تھی۔ گاؤں اور قصبوں میں موت نے چھاؤنی ڈال دی تھی۔ آدمیوں کی کمریں خمیدہ ہوگئیں، عورتوں کی چھاتیاں سوکھ کر مردار گوشت کی طرح لٹک گئیں، بچوں کی پسلیاں تڑ مڑ کر اندر گھس گئیں اور پیٹ غباروں کی طرح پھول آئے۔ اس حالت میں لوگ گھبرا کر ویران جھونپڑیوں سے نکل کر سڑکوں پر آ بیٹھے۔ ان سڑکوں پر بھی وہ اکیلے نہ تھے، بلکہ ایک جہان تھا جو ان کے ساتھ اُمڈ آیا تھا۔ یہ بھوکے پیاسے لوگ موت سے لڑنے کلکتے کی سڑکوں پر پہنچ تو گئے لیکن یہاں بھی انھیں کچھ نہ ملا۔ وہ نالیوں میں تیرتے مونگ پھلی کے چھلکوں، گوبھی کے پتوں اور گندگی کو کرید کرید کر پیٹ کی آگ بجھانے کی کوشش کرتے۔ کارپوریشن کی کوڑے کرکٹ والی گاڑیوں پر چیلوں کی طرح جھپٹتے۔ ایک دوسرے سے لڑتے، نوچتے، بال کھینچتے اور جب لڑلڑ کر نڈھال ہو کر سڑک پر گر جاتے تو لال پگڑی والے کارندے انھیں ٹانگوں سے گھسیٹ کر کنارے لگا دیتے۔ دریائے ہگلی پر اس دوران کئی ماؤں نے بچوں سمیت چھلانگ لگادی [۷۴]۔ ساحرؔ ایسے میں کبھی کبھی تلخ نوائی پر اُتر آتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

ملیں اسی لیے ریشم کے ڈھیر بُنتی ہیں کہ دخترانِ وطن تار تار کو ترسیں
چمن کو اس لیے مالی نے خون سینچا تھا کہ اِس کی اپنی نگاہیں بہار کو ترسیں [۷۵]

قدم قدم پر بھوک، افلاس، انسانیت کی آہ و بکا، بے گور و کفن نعشوں، زرد بچوں، بلکتے ہوئے چہروں کو دیکھ کر شاعر کی تلخ نوائی، دراصل اس معاشرتی ڈھانچے کے خلاف احتجاج ہے جو سرمایہ دارانہ نظام کے تحت لاکھوں کروڑوں انسانوں کو کھائے جا رہی تھی۔ نظم کا اختتام بھی اسی احتجاج پر ہوتا ہے جس کی وجہ سے یہ نظم قاری کے دل و دماغ پر گہرا اثر ڈالنے میں پوری طرح کامیاب رہتی ہے۔ قاری نظم کی فضا میں گم ہو جاتا ہے گویا یہ نظم قحطِ بنگال کا منشور بن جاتا ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

پچاس لاکھ فسردہ گلے سڑے ڈھانچے — نظامِ نو کے خلاف احتجاج کرتے ہیں
خموش ہونٹوں سے دم توڑتی نگاہوں سے — بشر بشر کے خلاف احتجاج کرتے ہیں [۷۶]

ایک اور نظم ''پھر وہی کنجِ قفس'' میں بھی وہ مقتدر قوتوں کی بے حسی، رہبروں کی خود غرضی اور موت سے لڑتے بھوکے ننگے انسانوں کی لاچاری پر نوحہ کناں دکھائی دیتے ہیں۔ ایک بار پھر تند و ترش لہجے میں سوال کرتے ہوئے تہذیب کے رکھوالوں سے پوچھتے ہیں کہ:

میرے محبوب وطن میرے مقدر کے خدا — دستِ اغیار میں قسمت کی عناں چھوڑ گئے
اپنی یک طرفہ سیاست کے تقاضوں کے طفیل — ایک بار اور مجھے نوحہ کناں چھوڑ گئے
پھر وہی گوشۂ زنداں ہے وہی تاریکی ہے — پھر وہی کہنہ سلاسل، وہی خونیں جھنکار
پھر وہی بھوک سے انساں کی ستیزہ کاری — پھر وہی ماؤں کے نوحے وہی بچوں کی پکار
تیرے رہبر تجھے مرنے کے لیے چھوڑ گئے — ارضِ بنگال! انھیں ڈوبتی سانسوں سے پکار
بول! چٹگاؤں کی مظلوم خموشی کچھ بول — بول اے پیپ سے رستے ہوئے سینوں کی بہار
بھوک اور قحط کے بڑھے آتے ہیں طوفان — بول اے عفت و عصمت کے جنازوں کی قطار
روک ان ٹوٹتے قدموں کو انھیں پوچھ ذرا — پوچھ اے بھوک سے دم توڑتے ڈھانچوں کی قطار
زندگی جبر کے سانچوں میں ڈھلے گی کب تک — ان فضاؤں میں ابھی موت پلے گی کب تک [۷۷]

امامی بنگلوری کی نظم ''بھوکا بنگال'' بھی اسی موضوع پر ایک موثر نظم ہے۔ قحط کے دوران ہونے والی بد نظمی اور حکومتی لاپروائی کے نتیجے میں فوری طور پر اس صورتِ حال سے چھٹکارے کی کوئی سبیل نظر نہیں رہی تھی۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ بنگال کو خاص طور پر اس حال تک پہنچا کر سوچے سمجھے منصوبے کے تحت عوام کا قتل کیا جا رہا ہو۔ امامی بنگلوری اس صورتِ حال کو بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

یہ تڑپ، یہ بھوک، یہ آہ و فغاں کچھ بھی نہیں — آنے والے دور کے کچھ ماہ و سال دیکھ [۷۸]

نظم میں سرمایہ دارانہ نظام کی خامیوں، ظلم و استیصال اور اس کے نتیجے میں بھوک کی ماری مخلوق کا حال بیان کرنے کے ساتھ وہ لوگوں کو غفلت سے بے دار ہونے اور اپنے حق کے لیے آواز بلند کرنے کا بھی درس دیتے ہیں:

آہ، اے سونے کی چڑیا! حیف اے ہندوستاں — تیری دنیا کس قدر ہے آج مالا مال دیکھ
اب بھی اے غافل وطن چشمِ خمار آلود کھول — بھوک سے ماری ہوئی مخلوق کا احوال دیکھ
تیرے دولت زار میں یہ قحط سالی آہ! آہ! — اور پھر چاروں طرف انسان کا احوال دیکھ

پی چکا مزدور کے دل کا لہو سر مایہ دار ایک عالم ہو رہا ہے کس طرح پامال دیکھ [۷۹]

اس دور میں تلوک چند محروم کی شاعری بھی جذبہ حب الوطنی سے سرشار دکھائی دیتی ہے۔ان کی غزلوں اور نظموں کا انداز بہت نمایاں ہے۔وہ ملک و قوم کی بربادی، قوم کی محکومی اور حکمران طبقے کی ستم گری سے بے حد کبیدہ خاطر تھے۸۰۔ان کے خیال میں ہندوستان کو جس قدر بھی مصیبتوں اور بلاؤں نے گھیر رکھا ہے، اس کے ذمے دار انگریز ہیں۔بنگال میں قحط سے جو صورتِ حال پیدا ہوئی، اس پر بھی ان کا موقف یہ ہی تھا کہ دورِ غلامی میں اس طرح کے سانحات سے بچاؤ ممکن نہیں۔اگر ان سانحات سے مستقبل میں بچنا ہے تو آزادی کی لڑائی کو اور تیز کرنا ہوگا۔اپنی نظم قحطِ بنگال میں وہ کہتے ہیں کہ:

غلامی میں نہیں ہے ان سے بچنے کا کوئی چارہ یہ لڑتے ہیں جہاں سے اور ہم پر بوجھ ہے سارا
بچانے کے لیے اپنی جہاں گیری کا نقارا ہماری کھال کھنچواتے ہیں دیکھو تو یہ نظارا
ہمارے دوست بھی کب ہیں جو ہیں جاپان کے دشمن اسے بندوق سے مارا تو ہم کو بھوک سے مارا [۸۱]

وہ عالمی سطح پر ہونے والی سازشوں میں برطانوی کردار پر سخت تنقید کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ان کے خیال میں برطانیہ، عالمی امن کے لیے سب سے بڑا خطرہ بنا ہوا ہے۔اپنی اجارہ داری قائم رکھنے کے لیے وہ ہندوستان کے لوگوں اور یہاں کے وسائل کو ایندھن کے طور پر استعمال کر رہا تھا۔وہ ہندوستان کی محکومی اور لاچاری کو اس بے بسی سے جوڑنے کی کوشش کرتے ہیں جو قحطِ بنگال کی صورت میں رونما ہوئی۔قحطِ ہند کے عنوان سے لکھی گئی نظم میں وہ خدا سے شکوہ بھی کرتے دکھائی دیتے ہیں کہ دنیا میں بموں سے جو تباہی و بربادی، اور ہلاکتیں ہو رہی ہیں، بے شک ہندوستان اس سے بچا رہا لیکن بھوک سے تو نے اسے کیوں محفوظ نہیں رکھا۔ملاحظہ کیجیے:

یہ بھوک یہ رنج و تعب لاکھوں کروڑوں جاں بلب
اتنا ستم ایسا غضب آخر ہے کیا اس کا سبب؟
اس کا سبب وہ بے بسی ممکن نہیں جس کا بیاں [۸۲]

بنگال کے ساتھ انگریزوں کے اس سلوک کی ایک وجہ غالباً یہ بھی تھی کہ آزادی کی تحریک میں اس صوبے نے ہراول دستے کا کردار ادا کیا تھا۔تقسیمِ بنگال اور دیگر فیصلوں کے ردِ عمل میں بنگال کے شدت پسندوں نے انگریزی اقتدار کو زک پہنچانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔اس کے بعد جب یہاں شدید ترین قحط آیا تو انگریزوں نے اپنے رویے سے یہ ثابت کر دیا کہ وہ ماضی کی کارگزاریوں کا بدلہ یہاں کی عوام سے لے رہے ہیں۔ایسے میں شاعر کبھی تو محض اشک سوئی کر کے اپنے دل پر گزرنے والی کیفیت کا اظہار قحطِ بنگال کے عنوان سے لکھے جانے والے قطعے میں کرتے ہیں:

بارش ہم سے اے وطن تو جو بچا تو کیا ہوا قحط و وبا کے تیر ہیں، تیرے لیے قضا کے پاس
تیری مصیبتوں کی نذر، اشکِ رواں و داغِ دل اس کے سوا ہے اور کیا، شاعرِ بے نوا کے پاس [۸۳]

اور کبھی اس تکلف دہ صورتِ حال پر تلخ نوائی پر اتر جاتے ہیں۔اپنی اس تلخ نوائی کا اظہار وہ قوم سے خطاب کرتے ہوئے کرتے ہیں:

اے مستِ بے خبریِ حال جہاں دیکھ سرحدِ فنا ہے یہی پہنچا ہے کہاں دیکھ

کیا اہلِ وطن کا تجھے کچھ غم بھی نہیں ہے — بنگال کے مٹنے کا الم کچھ بھی نہیں ہے
سفاک بہت خوش ہیں تباہی پہ ہماری — یہ جور ہے ناکردہ گناہی پہ ہماری
جس خطے سے اُٹھتی تھی صداحبِ وطن کی — ملتی ہے اسے آج سزا حبِّ وطن کی
ٹوٹا نہ اگر حلقۂ زنجیرِ غلامی — اس سے بھی خطرناک ہے تقدیرِ غلامی [۸۴]

انھوں نے اس طرح کی سیاسی نظموں کے ذریعے ''ہندستانیوں کو فتح وشکست، آزادی کے نشیب وفراز اور حاکم ومحکوم کے تعلقات پر شاعرانہ انداز سے روشنی ڈالی ہے [۸۵]۔'' وہ حریت پسندانہ جذبات رکھنے کے باوجود کبھی ظلم وتشدد کی راہ اپنانے کا پیغام نہیں دیتے۔ ان کا مقصد صرف اتنا ہے کہ قوم غفلت سے بے دار ہو جائے۔ قحطِ بنگال کے پس منظر میں بھی وہ اسی اصلاحی پہلو کو اپنے سامنے ضرور رکھتے ہیں۔ اس ضمن میں ان کے اشعار کا رنگ دیکھیے:

خوں خوار بلائیں ہیں ترے سامنے غافل — قحط اور وبائیں ہیں ترے سامنے غافل
کیا اہلِ وطن کا تجھے غم کچھ بھی نہیں ہے — بنگال کے مٹنے کا الم کچھ بھی نہیں ہے
افسانہ عبرت ہوئی ویرانی بنگال — مذکور کہن ہے چمنستانی بنگال
سڑتی ہیں پڑی کوچہ و بازار میں لاشیں — ہیں نقشِ طرف دیدۂ اغیار کی لاشیں [۸۶]

محرومؔ کی شاعری کے تجزیے سے پتا چلتا ہے کہ انھوں نے اپنے دور کی بھرپور ترجمانی ونمائندگی کی۔ زندگی کے نشیب وفراز کی ترجمانی کرتے ہوئے انھوں نے ایک دردمند انسان ہونے کا ثبوت دیا۔ اسی دردمندی کی وجہ سے وہ قوم کی زبوں حالی پر ہمیشہ نوحہ خواں رہے [۸۷]۔ مخدوم محی الدین بھی علی سردار جعفری کی طرح رزمیہ مزاج اور عسکری لہجے کے مالک ہیں [۸۸]۔ ان کی شاعری کا بنیادی موضوع ہی انقلاب ہے۔ اسی لیے ان کی شاعری میں ایک للکار اور گھن گرج کی سی کیفیت دکھائی دیتی ہے۔ قحطِ بنگال کی مناسبت سے لکھی گئی نظم بنگال میں بھی وہ اسی گھن گرج کے ساتھ کانگریس اور مسلم لیگ کو ایک ہو کر دشمن کے عزائم خاک میں ملانے کا مشورہ دے رہے ہیں ان کا کہنا ہے کہ:

ایک ہو کر دشمنوں پر وار کر سکتے ہیں ہم — خون کا بھرپور دریا پار کر سکتے ہیں ہم
کانگریس کو لیگ کو بے دار کر سکتے ہیں ہم — زندگی سے ہند کو سرشار کر سکتے ہیں ہم
وہ دیارِ ہندوستاں وہ سحر ونغمہ کا دیار — دیدنی ہے آج اس کی ناتوانی کی بہار
بھوک کا بیماریوں کا بم کے گولوں کا شکار — پیٹھ میں جاپان کا خنجر تو سر پر سُود خوار
ایک ہو کر دشمنوں پر وار کر سکتے ہیں ہم — خون کا بھرپور دریا پار کر سکتے ہیں ہم [۸۹]

قحط کے نتیجے میں میں موت کا رقص، بے شمار لاشیں، سوکھی چھاتیوں کے چمٹے بلکتے بچے اور فاقے کا شکار بھوکی ننگی عوام کو اس حال تک پہنچانے والے ذمے داروں کی بابت وہ سوال کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

قبر سے روزن سے اپنا سر نکالا موت نے — بے سہارا جان کر مارا ہے بھالا موت نے
خاندانوں کو بنا ڈالا نوالا موت نے — شیر خواروں کو چبا کر تھوک ڈالا موت نے

ایک ہو کر دشمنوں پر وار کر سکتے ہیں ہم | خون کا بھرپور دریا پار کر سکتے ہیں ہم
امتِ مرحوم ہو یا ملّت زنّاردار | ان کے فاقوں کی نہ گنتی ہے نہ لاشوں کا شمار
مرد و زن، شیخ و برہمن سب قطار اندر قطار | آہ! سوکھی چھاتیوں کی چیخ، بچوں کی پکار
ایک ہو کر دشمنوں پر وار کر سکتے ہیں ہم | خون کا بھرپور دریا پار کر سکتے ہیں ہم [۹۰]

احمق پھپھوندی کی شاعری بھی ظرافت کے پردے میں ہماری قومی غیرت کو بیدار کرتی ہے۔ان کے ہاں بھی ملک وقوم کا گہرا درد موجود تھا۔احمق کی نظر مانچسٹر کی ملوں اور لندن کی کونسلوں تک پہنچی جن کے معاشی اور سیاسی استبداد نے ہندوستان کو بھوکا اور کنگال بنا دیا تھا[۹۱]۔اس پس منظر میں لکھی متعدد نظمیں غلام ہندوستان کے افراد کے دلوں کی آواز معلوم ہوتی تھیں۔ہندوستان کی دولت و حشمت پر انگریز حکم رانوں نے جس طرح قبضہ جمایا اور اس قبضۂ اغیار کی وجہ سے جس طرح ہمارے دست کار بے کار ہوئے کھلیان سُو نے اور دھرتی کو جس طرح حکم رانوں نے بانجھ کیا، احمق نے یہ سارے مناظر اپنی شاعری میں پیش کیے تھے۔ملاحظہ کیجیے:

مرتے ہیں ہر سال فاقے سے کروڑوں آدمی | ہند پر برٹش کے احسانات کو دیکھو ذرا
تو اپنی بھوک کا شاکی فضول ہے اے ہند | مریض کو یوں ہی فاقے کرائے جاتے ہیں
ہماری بے حسی نے گور تک پہنچا دیا آخر | کفن بھی اب تو ہم کو مانچسٹر مل سے ملتا ہے [۹۲]

روش صدیقی بنیادی طور پر نظم کے شاعر ہیں لیکن غزل کی قدیم روایت کی پاس داری کی وجہ سے ان کی نظموں میں بھی تغزل کی فضا چھائی رہتی ہے [۹۳]۔ ''قحطِ بنگال'' کے عنوان سے لکھی گئی طویل نظم میں بھی یہی خوبیاں بدرجۂ اُتم موجود ہیں۔نظم کا ابتدائی انداز دیکھنے سے ہی اس بات کی تصدیق ہو جاتی ہے۔

چاندنی راتوں کو مصروفِ فغاں پاتا ہوں میں | صبح کے چہرے کو زرد و ناتواں پاتا ہوں میں
دوش پر گلیوں کی ایک کوہِ گراں پاتا ہوں میں | منتشر سا زندگی کا کارواں پاتا ہوں میں
جاگتا ہے صبحِ دم خورشید تھراتا ہوا | عظمتِ کاشانۂ آدم سے گھبراتا ہوا
کس نے انجم سے ردائے شادمانی چھین لی | رس بھری راتوں سے جنت کی کہانی چھین لی
صبح سے کس نے ادائے گُل فشانی چھین لی | کس نے وہ تصویرِ خلدِ جاودانی چھین لی
کس نے حسنِ زندگی کو مرگِ ساماں کر دیا | جنتِ بنگال تجھ کو دشتِ ویراں کر دیا [۹۴]

روشؔ، برعظیم میں سامراجی استعمار کے خاتمے کا خواب دیکھ رہے تھے۔وہ فرنگی تہذیب وتمدن کے خاتمے کے آرزومند تھے کیوں کہ ان فرنگی حکم رانوں نے ہی برصغیر میں ظلم و بربریت کے نت نئے طریقے ایجاد کیے تھے۔کبھی مقامی صنعتیں تباہ کرنے کے لیے دست کاروں کے ہاتھ کٹوائے تو کبھی غلامی کی زنجیروں کو مضبوط کرنے کے لیے قحط کی صورتِ حال پیدا کر کے حریتِ فکر کے پرچم کو سرنگوں کرنے کا سامان پیدا کیا گیا۔اس منظر نامے کے بیان میں روش کا کہنا تھا کہ:

باہنر صنعت گروں کے ہاتھ کٹوائے گئے | کاسہ ٔ سر شدّتِ نفرت سے ٹھکرائے گئے
بے محابہ کوچہ و بازار لٹوائے گئے | خونِ انساں کے لبالب جام چھلکائے گئے

شا د تھا ابلیس یہ کارِ نما یا ں دیکھ کر	خوں بھرے ہاتھوں میں کلیوں کا گریباں دیکھ کر
حریت کے تند شعلوں کو بجھانے کے لیے	روحِ آزادی کے پرچم کو جھکانے کے لیے
حیلہ شیطاں کا جادو آزمانے کے لیے	چشمِ بدبیں نے مجھے تاکا نشانے کے لیے
پھر غلامی قحط کے بہروپ میں لائی گئی	زندگی کو موت کی زنجیر پہنائی گئی [۹۵]

نظم کے اس حصے میں روشؔ نے بڑے جذباتی انداز سے قحط کی تباہی اور وحشتوں کو پیش کیا ہے۔ان کے مطابق قحط سے بڑھ کر کوئی اور مصیبت نہیں ہوسکتی۔اسی لیے وہ کہتے ہیں کہ:

قحط ظالم قحط، آشوب قیامت آفریں	خاک برساتا ہے گردوں خوں اگلتی ہے زمیں [۹۶]

اس کے بعد قحط کی ہلاکتوں اور استعماری رویوں کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ جو شیطانی منصوبہ بنگال کے لیے بنایا گیا تھا، دشمن اس میں پوری طرح کامیاب رہا۔اس قحط نے ہر طرف انسانیت کی شرمندگی کے سامان پیدا کیے۔فاقوں نے کتنے ہی بچوں سے زندگی چھین لی، بچیوں کی آبرو لوٹ لی، نوجوانوں کو لاغر اور نڈھال کر دیا یہ منظر بڑا دردناک تھا۔شاعر نے ان مناظر کو پیش کرتے ہوئے کہا کہ:

کارگر شیطاں کا افسونِ تظلّم ہوگیا	دانہ دانہ خرمنِ بنگال سے گم ہو گیا
موت کے جبڑوں میں خالی پیٹ سوکھے سے بدن	ہڈیوں کے بیچ میں الجھا سا ربطِ جان وتن
زندہ لاشوں کے لیے پردہ نہ مردوں کا کفن	آفریں صد آفریں! اے سامری مرگ من
پی لیا فاقوں نے کتنے نوجوانوں کا لہو	لُٹ گئے غربت میں کتنے کاروانِ رنگ و بو
کتنی کلیاں ہوگئیں محرومِ شمعِ آبرو	بے کسی نے زہر آلودہ کیے کتنے سبو
زندگی یہ ماجرا غاصب نگہ بانوں سے سُن	تاب ہے تجھ میں تو خود مظلوم انسانوں سے سن
کتنے بچے بھوک کے شعلوں کا ایندھن بن گئے	نوجواں کتنے شکارِ برق خرمن بن گئے
کتنے مسکن زندہ انسانوں کا مدفن بن گئے	جو نگہ باں تھے وہی بے درد راہ زن بن گئے [۹۷]

روش کا کہنا ہے کہ اس قحط کے سدِ باب کے لیے کوشش نہیں کی گئی۔ظاہر سی بات ہے کہ برطانوی راج میں ہونے والی ہلاکتوں کو دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہندوستانیوں کی زندگی سے انھیں کوئی سروکار نہیں تھا۔وہ انھیں صرف اپنی غلامی میں رکھنا پسند کرتے تھے۔ان کے مسائل اور مصائب کی انھیں پرواہ نہ تھی۔انگریز سامراج کے اس رویے پر خود مغرب کے لکھنے والوں نے بھی سخت تنقید کی تھی۔روش اس بابت کہتے ہیں کہ:

خونِ آدم روئے افرنگی کا غازہ شرم ہے	آدمی ہو آدمیت کا جنازہ شرم ہے
خواجگانِ زر نئی جنت سجائیں روز و شب	فاقہ کش روٹی کا ایک ٹکڑا نہ پائیں روز و شب
اس شقاوت پر فریبِ غم گساری شرم ہے	شرم ہے لعنتِ سرمایہ داری شرم ہے [۹۸]

شاعر یہاں سرمایہ دارانہ نظام کے تحت فرنگیوں کی ہوسِ زر کی طرف تو اشارہ کر ہی رہے تھے، اس کے ساتھ ساتھ وہ یہ بات بھی

اچھی طرح جانتے تھے کہ قحط کی جو تلوار بنگال پر مسلط کی گئی تھی وہ مشرق کی خوش حالی کو دیکھ کر مسلط کی گئی تھی۔ان کے خیال میں:

دیکھ کر آزادیٔ مشرق کا گھوارہ مجھے ۔۔۔ بزدلوں نے قحط کی تلوار سے مارا تجھے [99]

لیکن اب اس کیفیت سے نکلنے کی کوئی سبیل خود شاعر کو بھی سجھائی نہیں دیتی۔ وہ قحط کی ہول نا کی پر متفکر اور پریشان تو ہیں۔اپنی ایک اور نظم ''تازیانہ'' میں اس کا اظہار بھی کرتے ہیں:

بہت ملال ہے تجھ کو کہ سرزمینِ وطن ۔۔۔ بلائے قحط و صد آفات کا نشانہ ہے

مجھے بھی غم ہے کہ آرام و خلد کا مسکن ۔۔۔ عذابِ آتشِ دوزخ کا آشیانہ ہے

اداس بھوک کے پنجر، برہنگی مجوب ۔۔۔ کدھر یہ قافلہ بے کسی روانہ ہے [100]

پڑوس کے صوبے کی بے اعتنائی، مصیبت کا شکار لوگوں کی اعانت سے انکار، صوبائی اور مرکزی حکومت کی تاویلیں، امرا اور مقتدر حلقوں کے بے حسی وغیرہ جیسے تمام اہم معاملات کو اس نظم میں قلم بند کیا گیا ہے۔جیسے:

الٰہی شفقتِ ہم سایہ ہے کہاں رو پوش ۔۔۔ یہاں تو نالہ تنہا چراغ خانہ ہے

نصیب فاقہ کشاں زہر بھی نہیں ہے جہاں ۔۔۔ کھلا ہوا وہیں بابِ شراب خانہ ہے

یہاں تباہ ہے خلقِ خدا وہاں اب تک ۔۔۔ گہر فشانی تاویل واعظانہ ہے

ہوا ہے تکملۂ انتباہِ بے داری ۔۔۔ یہ قحط ہند کی غفلت پہ تازیانہ ہے [101]

کیفی اعظمی کی شاعری میں بھی اشتراکی نظریہ پوری طرح اثر انداز ہوا۔یہی وجہ ہے کہ وہ پورے وثوق کے ساتھ ظلم و جور پر مبنی سامراجی نظام کے خلاف آوازِ حق بلند کرتے دکھائی دیتے ہیں۔مذکورصفحات میں سرت چندر بوس کے حوالے سے ذکر کیا گیا کہ کس طرح وہ جاپان کے ساتھ مل کر ہندوستانی استعمار کے خلاف صف آرا ہوئے۔اسی تناظر میں کیفی اعظمی کی نظم ''برما کے چاول'' ایک خاص تاریخی اور حربی پس منظر لیے ہوئے ہے۔ بوس نے جس طرح آزاد ہندوستان کا نعرہ بلند کیا، شاعر نے ابتدا میں ان کے خیالات کی ترجمانی کرتے ہوئے کہا کہ:

چمن سے دور اثمارِ چمن بجھوائے جاتے ہیں ۔۔۔ جو بجھوانے سے ڈرتے ہیں وہ فوجی کھائے جاتے ہیں

تمھارا دانے دانے کو ترسنا دل دکھاتا ہے ۔۔۔ فضا پیدا کرو ہم لے کے چاول آئے جاتے ہیں [102]

اس کے بعد نظم کے اگلے حصے میں ''بھوکے بنگال کا جواب'' کے عنوان سے وہ محبِ وطن ہندوستانیوں کے خیالات قلم بند کرتے ہیں۔ان کے خیال میں اس طرح سے مخالفین کو خوش آمدید کہہ کر وہ دراصل فسطائیت کی حوصلہ افزائی کریں گے۔وہ اس پیش کش کو ٹھکرا دیتے تھے۔انھیں وطن کی آبرو بیچ کر پیٹ کی آگ بجھانا گوارا نہیں۔وہ عزت کے ساتھ مرنا تو گوارا کر سکتے ہیں۔لیکن ضمیر کا سودا نہیں کر سکتے۔نظم کا یہ حصہ ملاحظہ کیجیے:

زمین ہند پر اب جال تم پھیلا نہیں سکتے ۔۔۔ یہ مکاری کی باتیں ہیں ہم اِن میں آ نہیں سکتے

وطن کو پیٹ پر قربان کرنا غیر ممکن ہے ۔۔۔ جو غیرت دار ہیں گھر بیچ کر وہ کھا نہیں سکتے

تمھارے زہر آگیں چاولوں میں خون کی بو ہے ۔۔۔ مبارک ہو تمھیں ہم تاب ان کی لا نہیں سکتے

ہمیں ہندوستان کے ذرے ذرے سے محبت ہے یہاں تم پرچم فسطائیت لہرا نہیں سکتے [۱۰۳]

اسی طرح ''شبھاس چندر بوس بہادر شاہ ظفر کے مزار پر'' کے عنوان سے لکھی گئی ایک نظم میں بھی جگن ناتھ آزاد نے قحطِ بنگال کے پس منظر میں یہ شعر قلم بند کیا:

اپنے بھولے جاں بلب بنگال کی مجھ کو قسم حاکموں کے دست پرور کال کی مجھ کو قسم [۱۰۴]

شاعر نظامی نے ''نالہ مشرقی بنگال'' کے عنوان سے لکھی گئی نظم میں بھی دو شعر قحطِ بنگال کے پس منظر میں لکھے۔ ان اشعار میں انسانی بے حسی اور طبقاتی تضاد کو نمایاں کیا ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

اِک سمت میں بھوکوں کے لرزتے ہوئے کاسے اِک سمت میں پتھر میں ڈھلے قاسم و رزاق
انسان بھی انسان کو روٹی نہیں دیتے حیران ہے یہ سنگ دلی دیکھ کے رزاق [۱۰۵]

میلا رام وفا نے بھی انگریز سامراج کے خلاف سخت رویہ اختیار کیا۔ نظم ''اے فرنگی'' میں وہ ہندوستان میں انگریز کی آمد کو سبز قدم سے تعبیر کرتے ہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ ہندوستان کو آج تک جس قدر بھی سانحات سے گزرنا پڑا، وہ اس کے پس و پشت انگریزوں کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ:

اے فرنگی! کبھی سوچا ہے یہ دل میں تو نے اور یہ سوچ کے کچھ تجھ کو حیا آئی ہے
نا مبارک تھا بہت ہند میں آنا تیرا قحط آیا تیرے ہم راہ و با آئی ہے
تیرے قدموں سے لگی آئی غلامی ظالم ساتھ ہی اس کے غریبوں کی بلا آئی ہے
دور افلاس کا نیزوں سے کیا تو نے علاج موت بن کر تیرے ہاتھوں میں شفا آئی ہے
اس روش پر کبھی اے بانیِ بے داد تجھے دل کے اندر سے ملامت کی صدا آئی ہے [۱۰۶]

اس نظم کی پاداش میں برطانوی حکومت نے انھیں گرفتار کر کے مقدمہ چلایا اور دو برس قید کی سزا بھی سنائی [۱۰۷]۔ فرقت کاکوروی نے بھی قحط کے پس منظر میں ''بنگال کی رقاصہ'' کے عنوان سے ایک نظم لکھی جس میں قحط کے زمانے اور بعد میں بنگال میں اخلاقی بحران کی کیفیت پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ قحط نے جس طرح عورتوں کو جسم فروشی پر مجبور کیا، اس کی جھلک اس نظم میں دیکھی جا سکتی ہے ملاحظہ کیجیے:

ناچیے ناچیے پائل کے بغیر/ جسم عریاں ہی رہے/ شعلہ افشاں ہی رہے/ ناچیے ناچیے پائل
کے بغیر/ بھوک اور موت کا رقص/ میرے بنگال کا رقص/ ناچیے سوچتی کیا ہیں اٹھیے/ آپ
بنگال سے کب آتی ہیں/ نغمہ و رقص کا پیکر بن کر/ جسم کو بیچیے پتھر بن کر [۱۰۸]

آنند نرائن ملا نے بھی ''قحطِ کلکتہ'' کے عنوان سے ایک نظم لکھی۔ اس نظم میں بھی قحط کے زمانے کی چور بازاری، استعمار کے مکروہ ہتھکنڈے اور اس کے نتیجے میں قحط کی صورتِ حال کو موثر انداز سے بیان کیا گیا ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

ہے مگر قہر یہ بے بلائی ہوئی موت نا تواں پہ ناتواؤں کی لائی ہوئی موت
شہہ نشینوں سے زمینوں پہ گرائی ہوئی موت چور بازار کے سکوں کی چلائی ہوئی موت

قتل کر دے کسی بے کس کو ہلا کو جیسے | لوٹ لے خانہ بیوہ کوئی ڈاکو جیسے [۱۰۹]

آنند نرائن ملا کے لیے انسان دوستی کوئی شاعرانہ موضوع نہیں، بلکہ ایک ایسا عقیدہ ہے جس پر وہ کوئی سمجھوتہ نہیں کر سکتے [۱۱۰]۔ اسی لیے وہ بڑی تعداد میں ہونے والی ہلاکتوں اور شہر کی ویرانی پر سخت مضطرب دکھائی دیتے ہیں۔ قحط کے بعد وہ کلکتے کی بے رونقی پر دل گرفتہ ہو کر یہ کہتے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ:

آج سنسان اسی شہر کی ہر بستی ہے | عرصۂ جنگ سے بھی موت وہاں سستی ہے [۱۱۱]

اشفاق احمد کی شناخت یوں تو ڈراما اور افسانوی ادب میں مسلّم ہے لیکن ان کا شعری ذوق بھی کافی بلند ہے۔ اپنی حساس طبیعت کی وجہ سے سماجی اور سیاسی سطح پر ہونے والی تبدیلیوں پر وہ گہرا اثر قبول کرتے ہیں۔ انھوں نے اپنی کئی نظموں میں قحطِ بنگال کو موضوع بنایا ہے۔ یہ نظمیں فکر و خیال کے اعتبار سے عمدہ نظمیں قرار دی جا سکتی ہیں۔ نوجوانی میں ایسے موضوعات پر طبع آزمائی کرنا ان کی پختہ فکر کی علامت ہے۔ اس ضمن میں ان کی نظمیں ''کوی''، ''اب کی دیوالی''، ''پیروان ہلاکو کی لاشیں'' اور ''پومپیائی'' وغیرہ خاص طور پر اہمیت کی حامل ہیں۔ نظم ''کوی'' میں قحطِ بنگال کے نتیجے میں پیدا ہونے والی اذیت ناک صورتِ حال کی عمدہ تصویر کشی کی گئی ہے [۱۱۲]۔ کوی نے چوں کہ قحط کے سارے مناظر آنکھوں سے دیکھے ہیں لہٰذا اس کی ہیبت ناکی کی وجہ سے اس کی آنکھوں کی نیند تک اس سے روٹھ گئی ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

آج کوی کی آنکھوں میں کیوں نیند کے سوتے سوکھ گئے؟ | آج اس نے دھرتی کے سینے پر خون کے دھارے دیکھے ہیں
ننگے روگی دیکھے ہیں کہ بھوک کے مارے دیکھے ہیں | یا گرتے بنگالی اِک چاول پر سارے دیکھے ہیں؟
یا مزدوروں کی آشاؤں پر چلتے آرے دیکھے ہیں | جلتا تو ہے اس کی کٹیا میں دیپک پر کھپ سا ہے؟
کیسی سوچ میں ہے آخر وہ آج بھلا کیوں چپ سا ہے؟ | آج کوی کی آنکھوں میں کیوں نیند کے سوتے سوکھ گئے؟ [۱۱۳]

دوسری جنگِ عظیم کے بعد بنگال میں آنے والے قحط نے سسکتی، بلکتی انسانیت کی ایسی ہول ناک تصویر پیش کی کہ فن کاروں کے ذہنوں پر بھی اس کا گہرا اثر ہوا۔ لہٰذا ایک شاعر کی ذہنی حالت اس واقعے کے بعد کیا ہو سکتی ہے؟، اس کا عمدہ منظرنامہ مذکورہ نظم میں موجود ہے۔ اس سلسلے میں ایک اور موثر نظم ''پیروانِ ہلاکو کی لاشیں'' ہے۔ مکالمے کی صورت میں آگے بڑھتی یہ نظم مچھر کے مکالمے سے شروع ہوتی ہے۔ رفتہ رفتہ یہ مکالمہ ایک بڑے مسئلے کی جانب بڑھتا چلا جاتا ہے۔ اس مسئلے کی نوعیت یہ ہے کہ قحطِ بنگال کے نتیجے میں لوگوں کے بدن اس قدر لاغر اور بے جان ہو چکے ہیں کہ مچھر بھی اس بدن سے ایک بوند خون چوس کر اپنی پیاس نہیں بجھا پا رہا ہے [۱۱۴]۔ اس کمزوری اور لاغری کو دکھاتے ہوئے شاعر کے ذہن میں ضرور وہ زندہ لاشیں ہوں گی جو لاکھوں کی تعداد میں نقاہت اور کمزوری کے باعث کلکتہ کی سڑکوں پر مر گئے۔ شاعر یہ مناظر دکھاتے ہوئے کہتا ہے کہ:

خوں کی اِک بوند بھی بھوکے نہیں دے سکتے | ہائے! اس ملک کی غیرت کہاں جا ٹپکی ہے؟
اب بھی بنگال کی لاشوں کا گلہ ہوگا کیا؟ | اور تو اور یہ مچھر کو بھی دیتی ہیں جواب
ہائے! اس ملک کی غیرت کہاں جا دبکی ہے؟ | اور اس ملک کا ہر پیرو جواں مجرم ہے
میں نے اس جنگ میں دس پونڈ لہو بیچ دیا | اب بھی آتی ہے مرے ہاتھ سے خوش بو دیکھو [۱۱۵]

یہاں معاشرے کی بے حسی پر چوٹ کی گئی ہے۔ اسی طرح فضا اعظمی نے بھی اپنی مثنوی ''زوالِ آدم'' میں قحطِ بنگال کے تناظر میں سڑکوں، گلیوں اور چوراہوں پر معصوم انسانوں کا خونِ ناحق کا ذمے دار ملک گیری کی ہوس کرنے والوں کو ٹھہرایا گیا ہے۔ وہ قحط کے نتیجے میں تہذیب کی غارت گری، اخلاقی قدروں کی پامالی اور انسانیت کی پستی کا نقشہ کھینچتے ہوئے ہمارے اندر گہری مایوسی کی کیفیت پیدا کرتے ہیں۔ یہ گہری مایوسی اور المیے کا احساس نظم کے تار پود میں از اوّل تا آخر موجود ہے۔ ملاحظہ کیجیے۔

تم نے اس دہر کو پاتال بنا رکھا ہے	بھوک اور پیاس سے سڑکوں پہ تڑپتے ہوئے لوگ
قحط و افلاس کی چکی میں سسکتے ہوئے لوگ	ملک گیری کی ہوس کے لیے لڑتے ہوئے لوگ
تشنگی آج ہے انسان کی قسمت کی لکیر	چاہِ بے آب پہ ایستادہ ہے پیاسوں کی بھی [۱۱۶]

غرض کہ قحطِ بنگال کے بعد ہم دیکھتے ہیں کہ بھوک کے مسئلے کو جس قدر اچھالا گیا، اس کی نظیر تاریخ کے کسی اور دور میں نہیں ملتی۔ یہ ایک اقتصادی مسئلہ تھا، شعرا نے اس اقتصادی مسئلے کو بھرپور طریقے سے تخلیق کا موضوع بنایا۔ اس سانحے کے بعد بھوک اور غربت کا ذکر اردو شاعری میں تواتر سے ہونے لگا۔ اس حوالے سے ترقی پسند نظریات کے حامل شعرا نے زیادہ موثر کردار ادا کیا اور زندگی کے افادی پہلوؤں کی طرف بھرپور توجہ دلائی۔

حوالہ جات

۱۔ احمر، فروغ، ''مشرقی پاکستان تاریخ اور جائزے''، مشمولہ: 'تعمیرِ انسانیت'، لاہور، اکتوبر ۱۹۵۵ء، ص ۴۳۔۴۰

۲۔ محمود الرحمٰن، 'جنگِ آزادی کے اردو شعرا'، قومی ادارہ برائے تحقیق وتاریخ وثقافت، اسلام آباد، ۱۹۸۶ء، ص ۱۶۔۱۵

۳۔ ''پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی'' ص ۳۰۳ بہ حوالہ: محمود الرحمٰن، محولہ بالا ص ۳۱

۴۔ ایضاً، ص ۳۶۔۳۵

۵۔ نارنگ، گوپی چند، ''ہندوستان کی تحریکِ آزادی اور اردو شاعری''، قومی کونسل برائے فروغِ اردو، نئی دہلی، ۲۰۰۳ء، ص ۲۸۶۔۲۸۷

۶۔ ملیح آبادی، جوشؔ، ''ایسٹ انڈیا کے فرزندوں سے خطاب''، مشمولہ: 'نغماتِ حریت'، مرتبہ: ڈاکٹر خلیق انجم و شمس الرحمٰن فاروقی، قومی کونسل برائے فروغِ اردو، نئی دہلی، ص ۲۴۔۲۳

۷۔ صدیقی، شمیم احمد، ''مشرقی پاکستان کی صنعتیں''، مشمولہ: 'تعمیرِ انسانیت'، لاہور، اکتوبر ۱۹۵۵ء، ص ۱۰۵

۸۔ بہ حوالہ: http://en.wikipedia.org,wiki Great B.

۹۔ مائیک، وائس (WiseMike)، Late Victorian Holocausts:Et Nino Famines and the Making of the third world، ورسو، یوکے، ۲۰۰۰ء

۱۰۔ سندھو، سکھ دیو (Sandhu Sukhdev)، ۲۰ رجنوری ۲۰۱۱ء، بہ حوالہ: The Guardians، برطانیہ

۱۱۔ ڈیوس، مائیک، (Mike, Davis)، The Guardians، برطانیہ، جنوری ۲۰۱۱ء

۱۲۔ دت، رمیش (Romesh Dutt)، Economic History of India، جلد ۱، لندن، سن ندارد، ص ۳۵

۱۳۔ ملک، اے آر، British policy and Muslims in Bengal، ڈھاکا، ۱۹۶۱ء، ص ۹۷

۱۴۔ صدیقی، اسرار احمد، ''پوسٹ''، debunking - athesim. blogspot. com

۱۵۔ چودھری، زاہد، ''بنگالی مسلمانوں کا تحریکِ پاکستان میں نمایاں ترین کردار''، ادارہ مطالعہ تاریخ، لاہور، ص ۶۱۔۵۹

۱۶۔ صدیقی، اسرار احمد، محولہ بالا

۱۷۔ ٹکر، ہنری سینٹ جارج، Memorials of the Indian Govt. being a selection from the papers لندن، ۱۸۵۳ء، ص ۴۹۴

۱۸۔ صدیقی، اسرار احمد، محولہ بالا

۱۹۔ بہ حوالہ رپورٹ بی۔بی۔سی۔ http://www.bbc.com/ urdu/ world

۲۰۔ سنہا، این۔ کے، بہ حوالہ: ''جان کمپنی سے جمہوریہ تک: جدید ہندوستان کی کہانی''، از مشیر الحسن، قومی کونسل برائے فروغ اردو، دہلی، ۲۰۰۱ء، ص ۱۳۶

۲۱۔ بہ حوالہ: رپورٹ بی۔بی۔سی، محولہ بالا

۲۲۔ مشیر الحسن، ''جان کمپنی سے جمہوریہ تک: جدید ہندوستان کی کہانی''، قومی کونسل برائے فروغ اردو، دہلی، ۲۰۰۱ء، ص ۱۳۶

۲۳۔ پریم گھن، بدری نرائن، بہ حوالہ: ''جان کمپنی سے جمہوریہ تک''، محولہ بالا، ص ۱۳۷

۲۴۔ چودھری، زاہد، ص ۲۹۱

۲۵۔ آزاد، مولانا ابوالکلام، ''آزادیٔ ہند''، مترجم: رئیس احمد جعفری، مقبول اکیڈمی، لاہور، ۱۹۶۵ء، ص ۳۶۸۔۳۶۲

۲۶۔ چودھری، زاہد، محولہ بالا، ص ۲۹۲۔۲۹۱

۲۷۔ فرید آبادی، سید ہاشمی، ''تاریخِ مسلمانانِ پاکستان و بھارت''، جلد دوم، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی، ۱۹۸۸ء، ص ۵۸۹۔۵۸۸

۲۸۔ چودھری، زاہد، محولہ بالا، ص ۳۱۹۔۲۹۲

۲۹۔ سول اینڈ ملٹری گزٹ، ۱۸ رمئی ۱۹۴۳ء، لاہور

۳۰۔ چودھری، زاہد، محولہ بالا، ص ۳۳۳۔۳۹۲

۳۱۔ نارنگ، گوپی چند، ص ۴۰۶

۳۲۔ علوی، حمزہ، ''تخلیقِ پاکستان: تاریخی وسماجی مباحث''، مترجم: ڈاکٹر ریاض احمد شیخ، تاریخ پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۴ء، ص ۵۸

۳۳۔ نارنگ گودلی چندص ۴۰۶

۳۴۔ چودھری، زاہد، ص۳۳۶۔۳۳۵

۳۵۔ ایضاً، ص۳۴۰

۳۶۔ ہری داس، مجمدار، Shadow of Famine، ۱۹۴۴ء، ص۱۳

۳۷۔ چودھری، زاہد، ص۳۴۲۔۳۴۲

۳۸۔ ایضاً، ص۳۵۰۔۲۴۳

۳۹۔ بہ حوالہ، قحط/http:// ur.wikipedia.org/wiki/

۴۰۔ مکر جی، مدھو سری، Churchill's Secrets War، بہ حوالہ: انکشافات/http:///www.dw.com/ur/

۴۱۔ ملیح آبادی، جوش، کسان، https:// www. rekhta. org/ nazms/ kisan

۴۲۔ ملیح آبادی، جوش، ''مستقبل''، بہ حوالہ: 'اردو شاعری میں قومی یکجہتی کے عناصر'، از: سید مجاور حسین، اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ، ۲۰۰۴ء، ص۳۸۶

۴۳۔ ملیح آبادی، جوش، مشمولہ: آیات نغمات، مکتبہ اردو، لاہور، ۱۹۴۱ء، ص۲۲۲

۴۴۔ ایضاً، ص۲۵۲۔۲۵۳

۴۵۔ ایضاً، ص۲۴۴۔۲۵۵

۴۶۔ ملیح آبادی، جوش، مشمولہ: ''حرف وحکایت''، مکتبہ اردو، لاہور، ۱۹۴۱ء، ص۱۲۸

۴۷۔ حسین، سید مجاور، ''اردو شاعری میں قومی یکجہتی کے عناصر''، اُتر پردیش اردو اکیڈمی، لکھنؤ، ۱۹۸۵ء، ص۳۸۷۔۳۸۶

۴۸۔ اعظمی، ڈاکٹر منظر، ''اردو ادب کے ارتقا میں ادبی تحریکوں اور رجحانوں کا قصہ''، اُتر پردیش اردو اکیڈمی، لکھنؤ، ۲۰۰۹ء، ص ۳۶۸۔۳۶۹

۴۹۔ جعفری، علی سردار، ''بنگال''، مشمولہ: کلیات علی سردار جعفری، جلد اوّل، مرتبہ: علی احمد فاطمہ، قومی کونسل برائے فراغ اردو زبان، دہلی، ۲۰۰۴ء، ص۱۰۷

۵۰۔ ایضاً، ص۱۰۸

۵۱۔ ایضاً

۵۲۔ ایضاً، ص۱۰۹

۵۳۔ ایضاً، ص۱۰۷

۵۴۔ جعفری، علی سردار، ''کلیات علی سردار جعفری''، جلد دوم، مرتبہ: علی احمد فاطمہ، قومی کونسل برائے فراغ اردو زبان، دہلی، ۲۰۰۶ء، ص ۱۲۶۔۱۲۷

۵۵۔ جعفری، علی سردار، ''ایشیا جاگ اُٹھا''، مکتبہ شاہراہ، دہلی، ۱۹۵۲ء، ص۱۲۸۔۲۷

۵۶۔ اکبر آبادی، سیماب، بھوکا ہندوستان، مشمولہ: 'شعرِ انقلاب'، مکتبہ قصر الادب، آگرہ، ۱۹۴۷ء، ص۱۱۰

۵۷۔ ایضاً، ص۴۷

۵۸۔ اکبر آبادی، سیماب، ''عالمِ آشوب''، مکتبہ قصر الادب، آگرہ، ۱۹۴۳ء، ص۳۳۷

۵۹۔ ایضاً، ص۱۷۵

۶۰۔ اکبر آبادی، سیماب، عالمِ آشوب، محولہ بالا ص۴۱۰

۶۱۔ مرادآبادی، جگر، ''قحطِ بنگال''، مشمولہ: ''کلیاتِ جگر''، مرتبہ، کرشن کانت، آزاد بک ڈپو، امرت سر، سن ندارد، ص۴۲

۶۲۔ ایضاً

۶۳۔ ایضاً

۶۴۔ حسین، سید احتشام، ''پیش لفظ''، مشمولہ: ''جرس''، از وامق جون پوری، دانش محل، لکھنؤ، ۱۹۵۰ء، ص۱۰۔۶

۶۵۔ جون پوری، وامق، جرس، دانش محل، لکھنؤ، ۱۹۵۰ء، ص۱۲۳

۶۶۔ ایضاً، ص۱۲۲۔۱۲۱

۶۷۔ ایضاً، ص۱۲۲

۶۸۔ شہاب، قدرت اللہ، شہاب نامہ، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۱۹۹۹ء، ص۲۲۹۔۲۳۰

۶۹۔ شفائی، قتیل، ''قتیل شفائی کی آپ بیتی: قسط نمبر ۱۰۶''، بہ حوالہ: https://dailypakistan.com.pk.

۷۰۔ حسین، سید مجاور، اردو شاعری میں قومی یکجہتی کے عناصر، محولہ بالا ص۳۹۵

۷۱۔ نارنگ گوپی، چند ص۴۱۱

۷۲۔ جعفری، ڈاکٹر مسعود، ''ساحر کی شاعری میں صدائے احتجاج''، بہ حوالہ: http://urdu.siasat.com/news/671383

۷۳۔ لدھیانوی، ساحر، بنگال، بہ حوالہ: http:// www. rekhta. org/nazms/ bangal

۷۴۔ شہاب، قدرت اللہ، ''شہاب نامہ''، محولہ بالا، ص ۲۲۱۔۲۱۷

۷۵۔ لدھیانوی، ساحر، محولہ بالا

۷۶۔ ایضاً

۷۷۔ لدھیانوی، ساحر، پھر وہی کنجِ قفس، ناز پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۱۹۹۵ء، ص ۱۱۰

۷۸۔ بنگلوری، امامی، خشیتِ خوں، انجمنِ ترقی اردو، بنگلور، ۱۹۵۶ء، ص ۱۱۳

۷۹۔ ایضاً

۸۰۔ محمودالرحمٰن ''محولہ بالا ص ۳۲۵

۸۱۔ محروم، تلوک چند، قحط بنگال، مشمولہ: 'کاروانِ وطن'، مکتبہ جامعہ، دہلی، ۱۹۶۰ء، ص ۲۵۵

۸۲۔ ایضاً، ص ۲۵۴

۸۳۔ ایضاً، ص ۲۵۶

۸۴۔ محروم، تلوک چند، ''قوم سے خطاب''، بہ حوالہ: ''تلوک چند محروم''، مرتبہ: جگت ناتھ آزاد، انجمنِ ترقیٔ اردو ہند، دہلی، ۱۹۶۰ء، ص ۱۶۵

۸۵۔ جاوید، ڈاکٹر زینت اللہ، تلوک چند محروم: شخصیت اور فن، محروم میموریل لٹریری سوسائٹی، دہلی، ۱۹۹۷ء، ص ۱۶۵

۸۶۔ محروم، تلوک چند، کاروانِ وطن، محولہ بالا ص ۲۵۷۔۲۵۶

۸۷۔ بہزادی، کامل، ''تلوک چند محروم: ایک مطالعہ''، محروم میموریل لٹریری سوسائٹی، نئی دہلی، ۱۹۹۷ء، ص ۲۵۔۲۴

۸۸۔ گورکھپوری، مجنوں، ''پچیس سال کی چند اہم شخصیتیں''، مطبوعہ افکار، جوبلی نمبر، کراچی، ۱۹۷۰ء، ص ۶۹

۸۹۔ محی الدین، مخدوم، بنگال، مشمولہ: 'بساطِ رقص'، استقبالیہ کمپنی جشن مخدوم، حیدرآباد دکن، ۱۹۶۶ء، ص ۱۱۵

۹۰۔ ایضاً، ص ۱۱۷۔۱۱۶

۹۱۔ نارنگ، گوپی چند، ہندوستان کی تحریکِ آزادی اور اردو شاعری، محولہ بالا ص ۴۱۵۔۴۱۴

۹۲۔ پھپھوندی، احمق، بہ حوالہ: ''ہندوستان کی تحریکِ آزادی اور اردو شاعری''، محولا بالا ص ۴۱۵.

۹۳۔ کاظمی، روشن اختر، ''اردو میں طویل نظم نگاری کی روایت اور ارتقا''، ماڈرن پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۱۹۸۴ء، ص ۲۷۵

۹۴۔ صدیقی، روش، ''افسوسِ تکلّم''، کتاب بھون، دہلی، ۱۹۱۳ء، ص ۱۸۷

۹۵۔ ایضاً، ص ۱۹۴۔۱۹۲

۹۶۔ ایضاً، ص ۱۹۴

۹۷۔ ایضاً، ص ۱۹۴۔۱۹۵

۹۸۔ ایضاً، ص ۱۹۵۔۱۹۶

۹۹۔ ایضاً، ص ۱۸۷

۱۰۰۔ ایضاً، ص ۱۹۷

۱۰۱۔ ایضاً، ص ۱۹۹۔۱۹۸

۱۰۲۔ اعظمی، کیفی، ''بر ما کا چاول''، مشمولہ: 'جھنکار'، قومی دارالاشاعت، بمبئی، سن ندارد، ص ۱۱۵

۱۰۳۔ ایضاً

۱۰۴۔ آزاد، جگن ناتھ، شبھاس چندر بوس، بہادر شاہ ظفر کے مزار پر، مشمولہ: 'اردو میں قومی شاعری کے سو سال'، محولہ بالا، ص ۳۷۱

۱۰۵۔ نظامی، ساغر، ''کلیاتِ ساغر نظامی''، جلد دوم، مرتبہ: ڈاکٹر مظفر حنفی، ماڈرن پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۱۹۹۸ء، ص ۱۷۱

۱۰۶۔ وفا، پنڈت میلا رام، اے فرنگی، بہ حوالہ: http:// rekhta. org/ shayari. org

۱۰۷۔ سہیل، احمد، میلہ رام وفا، بہ حوالہ: https:// facebook. com نیز http://rekhta.org/shayari

۱۰۸۔ کاکوروی، فرقت، بنگال کی رقاصہ، بہ حوالہ: http:// rekhta. org/ shayari

۱۰۹۔ ملاّ، آنند نرائن، ''قحطِ کلکتہ''، مشمولہ: 'کلیاتِ آنند نرائن ملاّ'، مرتبہ: خلیق انجم، قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، دہلی، ۲۰۱۰ء، ص ۲۵۶

۱۱۰۔ انجم، خلیق، ''پیش لفظ''، مشمولہ: 'کلیاتِ آنند نرائن ملاّ'، محولہ بالا ص xv.

۱۱۱۔ ملاّ، آنند نرائن، ص ۲۵۵

۱۱۲۔ صدف، ڈاکٹر شازیہ، ''اشفاق احمد کی ادبی خدمات اردو ادب کے تناظر میں''، غیر مطبوعہ مقالہ برائے پی۔ایچ۔ڈی، جامعہ پنجاب، ص ۱۴۷

۱۱۳۔ احمد، اشفاق، ''کون''، بہ حوالہ: 'اشفاق احمد کی اردو شاعری'، محولہ بالا ص ۱۷۴۔۱۷۵

۱۱۴۔ صدف، ڈاکٹر شازیہ، محولہ بالا، ص ۱۷۵

۱۱۵۔ احمد، اشفاق، ''ہلاکو کی لاشیں''، بہ حوالہ: ''اشفاق احمد کی اردو شاعری''، محولہ بالا ص ۱۷۵

۱۱۶۔ اعظمی، فضا، بہ حوالہ: Lib.bazmeurdu.net/

جنگِ عظیم دوم: برِ عظیم کا شعری بیانیہ

دنیا کے تمام مذاہب میں جنگ سے نفرت کا اظہار ملتا ہے مگر دنیا کا ہر مذہب کسی نہ کسی طرح جنگ اور جنگی صورت حال سے دو چار ضرور رہا ہے۔ سماجی اور مذہبی محرکات کے تحت لڑی جانے والی جنگوں میں زندگی کی بازی ہارنے والے کروڑوں بے گناہ افراد آج بھی اس مہذب دنیا سے یہی سوال کرتے ہیں کہ آخر اس قتل و غارت گری سے دنیا نے کیا حاصل کرلیا؟ معاشی آسودگی یا سلطنت فتح کرنے کے خواب نے ہر دور میں دنیا کی مختلف اقوام کو آپس میں متصادم اور برسرِ پیکار رکھا۔ جنگ کا ایک بڑا مقصد تو بہ ظاہر یہی دکھائی دیتا ہے کہ دشمن کو نہتا اور کمزور کر کے کسی طرح سے اپنا مطیع اور فرماں بردار بنایا جائے۔ لیکن تاریخ گواہ ہے کہ بڑی سے بڑی طاقتیں بھی بہت لمبے عرصے تک طاقت کے بل بوتے پر اپنا تسلط برقرار نہیں رکھ سکیں۔ کروڑوں لوگوں کی ہلاکتوں کے بعد بھی بہر حال مسائل کے حل کے لیے بات چیت اور مکالمے کا ہی راستہ اختیار کیا گیا۔ لیکن اس کے باوجود دنیا اکثر و بیش تر بڑی بڑی جنگوں کی لپیٹ میں رہی جس سے عالمی امن کو ہمیشہ خطرات کا سامنا کرنا پڑا۔

انسانی تاریخ کا دامن جنگ و جدل کے واقعات اور قتل و خون ریزی کی داستانوں سے کسی وقت بھی خالی نہیں رہا۔ ہم ہر زمانے اور ہر عہد میں نوع انسان کو ایک دوسرے سے دست و گریبان دیکھ سکتے ہیں۔ جب انسان جنگلوں میں اور دشوار گزار پہاڑوں میں حیوانوں کی طرح وقت گزارتا تھا تو اس وقت بھی جنگ جو تھا اور آج جب کہ اسے تہذیب و تمدن پر ناز ہے تو اس وقت بھی اس کے ہاتھ اپنے ہی ہم جنسوں کے خون سے لتھڑے ہوئے ہیں۔ انسان کی جارحانہ فطرت اور وحشیانہ تقاضوں کو انسانیت کے تمدنی اور دماغی ترقیاں فنا نہیں کرسکیں۔ امن اور انسانیت کے تمام دعووں کے باوجود نہ ختم ہونے والی لڑائیوں اور نہ ختم ہونے والی معرکہ آرائیوں کا غیر مختتم سلسلہ جو ہمیں انیسویں اور بیسویں صدی میں نظر آتا ہے، حالاں کہ یہ صدیاں انسانیت کی شائستگی اور تہذیب و تمدن کی ترقی کے لیے محفوظ مخصوص ہیں، اس اعتبار سے ہمیشہ یادگار رہے گا کہ تاریخ کی سب سے بھیانک اور عالم گیر جنگیں اسی صدی میں ہوئیں[1]۔ پہلی جنگِ عظیم بیسویں صدی کا پہلا بڑا عالمی تنازعہ تھا۔ اس تنازعے کی ابتدا آرکڈیوک فرانز فرڈ (Archduke Franz Fardinand) کے قتل سے ہوئی۔ یہ جنگ ۲۸ جولائی ۱۹۱۴ء تا ۱۱ نومبر ۱۹۱۸ء تک جاری رہی۔ اس جنگ میں ایک طرف جرمنی، آسٹریا، ہنگری، بلغاریا اور ترکی وغیرہ کی فوجیں تھیں تو دوسری جانب برطانیہ، فرانس، روس، اٹلی، رومانیہ، پرتگال، جاپان اور امریکی فوجیں ان کے مد مقابل تھیں[2]۔ پچھلی دونوں عالمی گیر جنگوں کے محرکات کا جائزہ لینے سے یہ بات تو پوری طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ یہ دونوں جنگیں محض جرمن رہنماؤں کی مجنونانہ خواہش اقتدار کا کرشمہ تھیں۔ اتفاق سے جرمن قوم کو یکے بعد دیگرے ایسے لیڈر ملتے رہے جو محض تلوار پر یقین رکھتے تھے۔ پرنس بسمارک ان سب کا استاد تھا۔ اس نے جرمن قوم کے بکھرے ہوئے اجزا کو ایک لڑی میں پرو کر ایک شان دار اور مضبوط قوم بنا دیا۔ اور یہ کہہ کر ان کی کمر سے تلوار باندھ دی کہ ''تم ایک پُرعظمت اور وسیع جرمن شہنشاہیت کو قائم کرنے کے لیے پیدا ہوئے ہو''۔ جادوئی اثر رکھنے والے ان الفاظ اور جملوں نے جرمن قوم کو مسحور کر دیا اور وہ پرنس بسمارک کے بتائے ہوئے راستے پر چل پڑی۔ اس کے بعد قیصر ولیم ثانی جو پرنس بسمارک کا شاگرد تھا، ایک عظیم جرمن سامراج کے خواب دیکھ رہا تھا۔ اس کی سربراہی میں بھی جرمن قوم تجارت،

صنعت، ایجاد واختراع، تنظیم وتعمیر کے ہر گوشے میں آگے بڑھتے رہے[۴۳]۔

یورپ کی مہذب اقوام کے درمیان ۱۹۱۴ء میں جس مہیب جنگ کا آغاز ہوا تھا، اس کے اغراض ومقاصد خالص ''تجارتی'' تھے۔ واقعہ یہ تھا کہ پچھلے دوصدیوں میں یورپ کی بعض چالاک اقوام نے اپنے سیاسی جوڑتوڑ اور فطری چال بازیوں سے ایشیا، افریقا، آسٹریلیا اور امریکا کے بعض ذرخیز علاقوں پر تسلط حاصل کر کے وہاں کی خام پیداوار پر قبضہ جمانا تو شروع کر ہی دیا تھا، اس کے ساتھ ساتھ انھیں اپنی مصنوعات کی کھپت کے لیے وسیع پیمانے پر تجارتی منڈیا بھی میسر آ گئی تھیں۔ ان منڈیوں کے ذریعے ان علاقوں کی دولت کھینچ کھینچ کر یورپ منتقل ہو رہی تھی۔ اس معاشی بھرم کے بل بوتے پر ان اقوام نے اپنے سیاسی اقتدار کو بھی خوب پروان چڑھایا۔ ان طاقت ور اقوام کے بڑھتے ہوئے اقتدار کو یورپ کی دیگر اقوام رشک وحسد کی نظروں سے دیکھتی تھیں۔ وہ اس معاشی برتری کو برداشت نہ کر پائیں۔ ان میں بے چینی کی لہر دوڑ گئی۔ جس کے نتیجے میں رقابت اور اختلافات کے جذبات پیدا ہوئے۔ اس ماحول نے مختلف ممالک کو آپس میں جتھا بندی پر مجبور کیا۔ جرمنی جو کہ ۱۹۰۰ء تک سائنس اور صنعت کے شعبے میں اپنی بلندیوں کو چھو رہا تھا، حیرت انگیز طور پر اس کے قبضے میں کوئی تجارتی منڈی نہیں تھی۔ بحری تجارت کے تمام وسائل پر انگلستان اور فرانس قابض تھے۔ اس صورتِ حال میں جرمنی نے بڑی تیزی سے اپنی بحری قوت میں اضافہ شروع کیا۔ انگلستان اور فرانس کو اس تیاری سے خطرہ محسوس ہوا۔ ابتداً برطانیہ نے جرمنی کو کچھ مراعات دے کر اپنا تفوق تسلیم کرانے کی کوشش کی لیکن جرمنی کسی صورت میں معاشی طور پر برطانوی تسلط کو قبول کرنے پر تیار نہ تھا۔ فرانس اور جرمنی کے درمیان اس سے قبل برسوں جاری رہنے والی محاذ آرائی کے نتیجے میں فرانس کے دوصوبے انسیس اور لوربن پہلے ہی ان کے ہاتھوں سے نکل چکے تھے جس کی وجہ سے وہ جرمنی کو نیچا دکھانے کی ہر ممکن کوشش میں لگا ہوا تھا۔ یہی وہ زمانہ تھا جب فرانس اور انگلستان افریقا کے شمالی علاقوں میں اپنے لیے تجارتی منڈیا قائم کر رہے تھے۔ انگلستان مصر میں اپنا اقتدار مضبوط کرنے کی کوششوں میں مصروف تھا، فرانس الجیریا اور مراکش کو اپنے تصرف میں لانے پر تُلا بیٹھا تھا۔ انگریزوں اور فرانسیسیوں میں قومی منافرت کے ساتھ ساتھ سیاسی اختلافات بھی تھے، اسی لیے افریقی علاقوں پر تسلط کے معاملے پر بھی جھگڑے کی فضا پیدا ہوئی۔ جرمنی نے، جو موقع کی تلاش میں تھا، ان دونوں ممالک کے جھگڑے سے فائدہ اٹھا کر مراکش پر اپنے ''تجارتی'' حق کا اعلان کر دیا۔ اس اعلان سے برطانیہ اور فرانس دونوں ہی چونک پڑے اور انھیں اپنی سلامتی اسی میں نظر آئی کہ اپنے سیاسی اور قومی اختلافات کو ختم کر کے فوراً متحد ہو جائیں۔ چناں چہ انگلستان اور فرانس نے صلح کر کے شمالی افریقا کے مالِ غنیمت کی تقسیم اس طرح عمل میں لائی کہ مصر وسوڈان برطانیہ کے حصے میں آیا اور مراکش فرانس نے ہتھیا لیا۔ یہ معاہدہ انگلستان اور فرانس کے درمیان ۱۹۰۴ء میں ہوا۔ لیکن ۱۹۰۵ء میں قیصر جرمنی، مراکش پہنچا اور وہاں سلطان کو اپنے ساتھ ملا کر اس نے پھر سے اپنے تجارتی حق کا دعویٰ کر دیا۔ جرمنی کے اس دعوے کی وجہ سے یورپ میں ہلچل مچ گئی۔ برطانیہ فرانس کی مدد سے پہلے ہی مصر پر قبضہ جمائے بیٹھا تھا لہٰذا اب اس کی اخلاقی ذمہ داری تھی کہ وہ اس معاملے میں فرانس کا ساتھ دے۔ اٹلی بھی بحر روم کی طاقت ہونے کے باعث فرانس کو دبا کر لیبیا کے ایک حصے پر قبضہ جما چکا تھا۔ اس نے جرمنی کی اس مداخلت کو ناپسندیدگی کی نظروں سے دیکھا۔ نتیجتاً دول یورپ کی کانفرنس جب مراکش کے مسئلے کو حل کرنے کے لیے منعقد ہوئی تو اس میں جرمنی کو شکست ہوئی اور اسے ہزیمت کا سامنا کرنا پڑا۔ اس طرح فرانس، اٹلی اور برطانیہ کو اپنی مقبوضات میں مداخلت کا کھٹکا نہ رہا[۴۴]۔

دوسری طرف نسلی برتری کے خبط میں مبتلا جرمن قوم جس میں مسابقت، تنظیم اور قومیت کی لہر کچھ اس طرح دوڑ رہی تھی کہ وہ دنیا

کو فتح کرنے کی جستجو میں ہر ممکن قدم اٹھانے کو تیار بیٹھی تھی۔ انقلاب فرانس کے بعد اگلی نصف صدی کے درمیان وہ ایک عظیم قوم کی صورت میں ابھر کر سامنے آ چکے تھے۔ یہاں تک کہ ۱۸۷۰ء میں فرانس کے عظیم رہ نما نپولین بھی ان کے سامنے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ جرمن اخباروں، یونی ورسٹیوں اور کالجوں میں یہ پروپیگنڈا عام تھا کہ جرمن وہ عظیم قوم ہے جو دنیا کو فتح کرنے کے لیے پیدا ہوئی ہے۔ دنیا فتح کرنے کے لیے جنگ ناگزیر ہے۔ انھیں ایک عالم گیر جنگ کے لیے تیار ہو جانا چاہیے۔ اس مقصد کے لیے نوجوانوں کو بربریت، سفاکی اور غارت گری کی تعلیم دی گئی۔ نیطشے نے اپنی تعلیمات میں بتایا کہ عدل و انصاف اور امن و آتشی دراصل کمزور قوموں کی صفات ہیں۔ اس نے اپنی تعلیمات میں یہ بھی کہا کہ دنیا کیڑے مکوڑوں سے آباد ہے۔ اسی لیے اس زمانے میں ہونے والی جنگوں میں جرمنوں نے ظلم و بربریت کا ایسا مظاہرہ کیا کہ دنیا کانپ گئی۔ خصوصاً بیلجیم کے شہریوں پر ایسی بربریت دکھائی کہ مشرق سے مغرب تک جرمن قوم کے خلاف شدید نفرت کا رویہ پیدا ہوا[۵]۔ تباہی و بربادی کی ایسی داستان رقم ہوئی جس پر انسانیت کے سر شرم سے جھک جائیں۔ صنعت و حرفت کی تباہی تو ایک طرف، قتل و زنا کے ایسے ایسے واقعات قلم بند کیے گئے کہ پڑھ کر روح کانپ جاتی ہے۔ ہزاروں مرد، عورتوں اور بچوں کو قتل کیا گیا۔ گاؤں کے گاؤں نیست و نابود کر دیے۔ کم سن لڑکیوں کی بے آبروئی کے واقعات بھی رپورٹ ہوئے[۶]۔ لوگوں کے ہاتھ، پاؤں اور ناک کاٹ دیے گئے۔ ان واقعات کے بیان میں پنڈت سندر نارائن مُشر ان نے کہا کہ:

ظلم جرمن کا لکھا حال ہے یہ تھوڑا سا — جس پہ اس دیو نے اپنا کبھی سایہ ڈالا

دشتِ غربت میں وہ آوارہ و سرگشتہ ہوا — دوست بھی چھوٹ گئے ملک بھی اپنا چھوٹا

اپنے ہر خویش و یگانہ سے وہ مہجور ہوا — کون سا شیشۂ دل ہے کہ نہ جو چور ہوا[۷]

جرمنی کے بڑھتے ہوئے فوجی عزائم کو دیکھ کر فرانس اور برطانیہ کو فوجی اور سیاسی اتحاد کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ جرمنی نے شمالی افریقا کے معاملے میں مات کھا کر ایشیائے کوچک میں اپنا سیاسی اور معاشی اثر بڑھانا شروع کر دیا تھا۔ آسٹریا بھی اس معاملے میں جرمنی کے ساتھ شامل ہو گیا۔ بوسنیا ہرزگوینا کو ترکی سے چھین کر وہ اب اس فکر میں تھا کہ کسی طرح بحیرۂ ارنجین اور بحیرۂ ایڈریاٹک میں داخل ہو جائے۔ برطانیہ اور فرانس نے جرمنی اور آسٹریا کے اتحاد کا جواب دینے کے لیے روس کو باسفورس اور دردانیال کا لالچ دے کر اپنے جتھے میں شامل کر لیا۔ اٹلی کی پوزیشن بھی اس جنگ میں عجیب تھی۔ اس نے ایک طرف جرمنی سے معاہدہ کر رکھا تھا اور دوسری جانب اس نے فرانس اور برطانیہ سے بھی اپنے تعلقات استوار کر رکھے تھے۔ مقصد یہ تھا کہ جس فریق کا پلڑا بھاری ہو، اس جانب اپنا وزن ڈال دے۔ مدت سے اس کی نظر بھی آسٹریا کے دو صوبوں ''ٹرانستی'' اور ''ٹربنٹو'' پر تھی۔ اٹلی کے علاوہ بلقان کی دو چھوٹی ریاستیں بھی اپنی سرحدوں کو وسیع کرنے کے خواب دیکھ رہی تھیں۔ رومانیہ، ٹرانسلوینیہ کا علاقہ ہنگری اور سربیہ کا علاقہ روس سے جھپٹ لینے کی فکر میں تھا۔ غرض کہ یہ مقامی رقابتیں اپنے اپنے مفادات کی خاطر دنیا کو ایک عظیم جنگ کی جانب لے جا رہی تھیں۔ یورپی اقوام کی یہ جتھا بندی ۱۹۱۴ء سے قبل مکمل ہو چکی تھی۔ جرمنی اور آسٹریا تو تیار بیٹھے تھے لیکن فرانس، برطانیہ اور روس کی جنگی تیاریاں پوری طرح مکمل بھی نہ ہوئی تھیں کہ ۲۸ جون ۱۹۱۴ء کو آرچ ڈیوک فرانز فرڈیننڈ کے قتل کا حادثہ پیش آیا۔ اگرچہ یہ قتل بوسنیا کے شہر سراجوو میں ہوا تھا لیکن چوں کہ یہ شہر سرویا کی سرحد سے ملحق تھا اور سرویا اور آسٹریا کے درمیان اس علاقے کے لیے مدت سے رقابت چلی آ رہی تھی، لہٰذا آسٹریا نے اس حادثے کی ساری ذمے داری سرویا پر ڈال دی۔

روس اپنی فوجی تیاریوں کی عدم تکمیل کے باوجود فوراً اپنے بلقانی دوست کی مدد کو لپکا اور آسٹریا کے خلاف اس نے اعلان جنگ کر دیا۔ اس اعلان کے ساتھ ہی جرمنی کا طوفانی لشکر اپنے خوف ناک آلات حرب کے ساتھ آسٹریا کی مدد کے بہانے میدان جنگ میں کودا۔ جرمنی کو حرکت میں دیکھ کر فرانس کی جان پر بن آئی اور اپنی حفاظت کی غرض سے اسے بھی میدانِ جنگ میں آنا پڑا۔ فرانس کا ساتھ نبھانے کے لیے برطانیہ کو بھی جنگ کا ایندھن بننا پڑا۔ برطانیہ جرمنی کی بڑھتی ہوئی فوجی طاقت کو اپنے وجود کے لیے بھی خطرناک سمجھتا تھا۔ اسی طرح ۱۹۱۴ء کے ختم ہونے سے پہلے یورپ کی پانچ بڑی طاقتیں ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہو گئیں اور اس خطرناک جنگ کا آغاز ہوا جسے تاریخ میں جنگ عظیم کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ جنگ کے پہلے سال جرمنی کے حق میں فیصلہ ہوا۔ اپنی شمال مشرقی سرحد پر روس کی یورش کو روکنے کے ساتھ ساتھ جرمنی نے بیلجیم کو روندتے ہوئے فرانس کے ایک چوتھائی حصے پر قبضہ جما لیا۔ جرمنوں کی اس زبردست کامیابیوں پر پورے یورپ میں تہلکہ مچ گیا۔ برطانیہ اور اس کے اتحادیوں کی کامیابی کے امکانات مشتبہ ہو گئے۔ اب سیاسی داؤ پیچ کا نیا دور شروع ہوا۔ جنگ سے علاحدہ دیگر یورپی اقوام کی ہم دردیاں حاصل کرنے کے لیے دوڑ دھوپ کا آغاز ہوا۔ بلقان کی ریاستوں میں بلغاریا کو بھی اس جنگ میں جھونک دیا گیا، بحیرۂ روم کی طاقتوں مین اٹلی اور ترکی پر بھی ڈورے پڑنے لگے۔ اٹلی نے حالات کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے فرانس سے منھ مانگی بولی لگوائی۔ دوسری جانب ترکی کی نوجوان قیادت اپنے جوشیلے رہنما انور پاشا کی غلط جنگی حکمت عملی کا شکار ہوئی۔ انور پاشا نے ترکی کی فوجی قوت کا درست اندازہ لگائے بغیر نومبر ۱۹۱۴ء میں جرمنوں کی حمایت کا اعلان کر دیا۔ طرابلس اور بلقان کے جنگی معرکوں سے تھکی ہوئی ترک فوجوں کو اتحادیوں کے خلاف جنگ میں جھونکنا خود ترکی کے لیے انتہائی نقصان دہ ثابت ہوا۔ ۱۹۱۵ء میں تک جنگ کی صورتِ حال میں کوئی واضح تبدیلی نہیں آئی۔ مغربی محاذ پر جرمنی کا دباؤ قائم رہا۔ اطالویوں کے الپس کی وادی کے حملوں کو آسٹریا نے پسپا کر دیا۔ جرمن آب دوز کشتیوں نے برطانوی تجارتی جہازوں کے لیے مشکلات کھڑی کر دیں۔ غرض اتحادیوں کے حق میں یہ سال بھی کچھ اچھا ثابت نہ ہوا۔ لیکن وہ مسلسل ایک فیصلہ کن مقابلے کی تیاریوں میں لگے رہے۔ مصر جو اس وقت سلطان ترکی کے ماتحت تھا، برطانیہ کے فوجی قبضے سے ترکی کے خلاف بھی فوجی اور سیاسی کارروائیوں کا آغاز ہوا۔ شریف مکہ کو بھی لالچ دے کر ترکی کے خلاف بغاوت پر آمادہ کیا گیا۔ برطانویوں کی اس اسکیم میں فرانس اور روس بھی اس کے شریک رہے۔ اس اسکیم کی کامیابی پر شام کا علاقہ فرانس کو اور اناطولیہ کا شمال مشرقی علاقہ روس کو بخشا گیا۔ فلسطین اور عراق پر برطانوی تسلط برقرار رہا۔

اس اسکیم سے مسلمانوں کے لیے وہ حکمت عملی تیار کی گئی اس کے مطابق اس کی کامیابی کے لیے خون تو عربوں کا بہانا تجویز ہوا لیکن کامیابی سے متمتع ہونے کا حق اتحادیوں کے لیے مخصوص کر دیا گیا۔ ۱۹۱۶ء تک آسٹریا اور جرمنی کی سرگرمیوں کی کمزوری کے آثار ظاہر ہوئے۔ مغربی محاذ پر جرمنوں کے دو نہایت زبردست حملے ناکام رہے اور ان حملوں میں انھیں پانچ لاکھ فوجیوں کا نقصان اٹھانا پڑا۔ دوسری طرف مشرقی محاذ پر منظّم روسی حملے نے آسٹریا کی فوجوں کو پسپا کر دیا۔ ترکی کے خلاف برطانیہ کو شام اور فلسطین کے معاملے میں کامیابی حاصل ہوئی جب کہ یونان کا جرمنی اور آسٹریا کی طرف جھکاؤ دیکھ کر اس کے کچھ علاقوں پر قبضہ کر کے اتحادیوں نے وہاں سیاسی انتشار پیدا کر کے حکومت کی تبدیلی کی راہ ہم وار کر دی۔ غرض کہ سیاسی اور فوجی کامیابیوں کے بعد اتحادیوں نے جرمنی کی معاشی ناکہ بندی بھی شروع کر دی۔ جرمن جنگی جہازوں نے بحر اوقیانوس اور بحیرۂ شمالی میں غیر جانب دار ممالک کا لحاظ کیے بغیر تجارتی جہازوں کو ڈبونا شروع کر دیا۔ برطانیہ کی سخت ناکہ بندی سے امریکا سمیت متعدد ممالک کی معیشت پر بھی منفی اثر پڑنا شروع ہوا۔ جرمنی نے میکسیکو سے

ساز باز کر کے ٹیکساس اور نیومیکسیکو اور ارتھرونہ کی ریاستوں کا لالچ دے کر امریکی حکومت کے خلاف نیا محاذ کھول دیا۔ اس کی چال جلد ہی کھل گئی۔ ثبوت ملتے ہی امریکا نے جرمنی کے ساتھ اپنے سیاسی تعلقات منقطع کر لیے اور ۱۲ اپریل ۱۹۱۷ء کو جرمنی کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ یہ جرمنوں کے لیے زبردست دھچکا تھا۔ اب انھیں زبردست تازہ دم فوج سے مقابلہ کرنا تھا۔ مسلسل تین برس کی بحری اور بری جنگی کارروائیوں کے بعد جرمن فوج میں وہ پہلا سا دم خم بھی نہ رہا تھا۔ ایک طرف جرمنی کی صنعت وتجارت بالکل ختم ہوتی جا رہی تھی، دوسری طرف شہریوں کو کھانے پینے کی اشیا کے بھی لالے پڑ گئے تھے۔ جرمنوں نے آخری داؤ چلتے ہوئے آب دوز کشتیوں کی سرگرمیوں کو تیز کر دیا تاکہ برطانوی تجارتی وسائل پر کاری ضرب لگائی جا سکے اور انھیں صلح پر مجبور کر سکے۔ جرمنی کے دو مشہور جنرلوں ہنڈنبرگ اور لیوڈ نڈارف نے برّی فوج کی نئے سرے سے تنظیم کر کے برطانوی اور فرانسیسی فوج پر دباؤ بھی بڑھایا۔ اسی اثنا میں اتحادیوں کا اہم شریک روس بھی انقلاب کے بھنور میں پھنس گیا جس کی وجہ سے محاذ جنگ پر روسی سرگرمیاں ماند پڑ گئیں۔ نومبر ۱۹۱۷ء میں روس میں بالشویک انقلاب برپا ہوا۔ روس کی حکومت لینن اور اس کی پارٹی کے ہاتھ میں آ گئی۔ جرمنی نے اس سے قبل روسی سرحد تک پہنچنے میں لینن کی مدد کی تھی، لہٰذا نئی حکومت نے جومنی سے صلح کی بات چیت شروع کر دی۔ اس طرح آخر ۱۹۱۷ء تک اتحادیوں کا ایک اہم ساتھی جنگ سے دستبردار ہو گیا۔

اس سال بھی اتحادیوں کو متعدد مقامات پر شکست ہوئی تھی لیکن ایک محاذ جس پر انھیں کام یابی ہوئی وہ ترکی کا محاذ تھا۔ برطانیہ کے اشارے پر عربوں کی بغاوت نے ترکوں کی فوجی طاقت کی کمر توڑ دی۔ ۱۹۱۸ء کا سال جنگ عظیم کا آخری سال ہے۔ اس سال جرمنی، آسٹریا اور ترکی میں کمزوری کے واضح آثار پیدا ہو چکے تھے۔ اتحادیوں کی فوجی سرگرمیاں ہر طرف تیز ہو چکی تھیں۔ سمندروں میں جرمن آب دوزوں کا زور ٹوٹ چکا تھا۔ خشکی پر جرمنی کی قہار فوجیں دل شکستہ ہو رہی تھیں۔ لیوڈ نڈارف نے جرمن فوجوں کو آخری بار ابھارنے کی کوشش کی لیکن اسے کام یابی نہ ملی۔ خود جرمنی کے اندر قیصر اور ان کے خاندان کے خلاف سخت شورش پیدا ہو گئی۔ فیلسر ملک چھوڑ کر ہالینڈ فرار ہو گیا اور جرمنی میں جمہوری اصولوں پر نئی حکومت قائم ہو گئی جس نے اتحادیوں کے آگے صلح کی درخواست پیش کی۔ چناں چہ ۱۱ نومبر ۱۹۱۸ء کو معاہدے کے بعد پہلی جنگ عظیم کا خاتمہ ہوا۔ اس جنگ کے خاتمے کے ساتھ ہی جرمنی، آسٹریا اور ترکی کی باجبروت شہنشاہیت بھی ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئی [۸]۔

پہلی جنگ عظیم کو تاریخ کی سب سے بڑی اور تباہ کن لڑائی قرار دیا گیا۔ ایک جنگ میں تقریباً ایک کروڑ فوجی ہلاک ہوئے۔ یہ تعداد پچھلے ایک سو برس میں ہونے والی لڑائیوں اور جنگوں کی ہلاکتوں سے زیادہ تھی۔ دو کروڑ دس لاکھ کے لگ بھگ اس جنگ میں زخمی ہوئے ہلاکتوں کی بڑی وجہ مشین گن وغیرہ جیسے ہتھیاروں کا متعارف کرانا تھا۔ اس کے علاوہ گیس کے ذریعے بھی بڑی تعداد میں ہلاکتیں ہوئیں۔ جنگ میں سب سے زیادہ نقصان جرمنی اور روس کو اٹھانا پڑا۔ جرمنی کے ۱۷ لاکھ ۷۳ ہزار سات سو اور روس کے بھی تقریباً ۱۷ لاکھ فوجی جنگ عظیم میں ہلاک ہوئے۔ جنگ میں فرانس کو بھی اپنی متحرک فوج کے ۱۶ فی صد سے محروم ہونا پڑا۔ جنگی ماہرین اور تجزیہ کاروں کے مطابق اندازاً اس جنگ میں براہ راست یا بالواسطہ غیر فوجی ہلاکتوں کی تعداد بھی ایک کروڑ بیس لاکھ تک بتائی جاتی ہے۔ جنگ کے نتیجے میں لاکھوں کروڑوں لوگ بے گھر ہوئے۔ صنعتوں کو بے حد نقصان پہنچا، تجارت تباہ ہوئی۔ جنگ کے خاتمے کے بعد بھی اقتصادی، سماجی اور سیاسی اثرات نے برسوں تک جنگ زدہ اقوام کو گھیرے رکھا [۹]۔ پنڈت سندر نارائن مُشران نے جنگ عظیم اوّل کو مہا بھارت سے بڑی

لڑائی قرار دیا۔ مہابھارت میں ۴۰ لاکھ فوج شریک تھے جب کہ جنگ عظیم میں ڈیڑھ کروڑ فوجی مصروف پیکار تھے۔ صرف جرمنی کے تیس لاکھ فوجی مقتول و مجروح ہوئے۔ میدان ہڈیوں سے سفید نظر آتے۔ تمام دشت و بیابان خون سے لالہ زار ہو رہے تھے۔ لاکھوں بے گور و کفن نعشیں انسانیت کی ذلت کا تماشا دیکھ رہی تھیں۔ ہندوستانی فوجیوں کی داد و شجاعت نے بھی اس جنگ میں جرمنوں کے دانت کھٹے کیے۔ کبھی سکھ سپاہی جرمنوں سے لپٹ رہے تھے تو کبھی سنگین و تلواروں سے کاری وار کیا جا رہا تھا[۱۰]۔ جنگ کے دوران روزانہ کے امور کی انجام دہی کے لیے فوجیوں کو جو ڈائری مرتب کرنا ہوتی تھی، نیشنل آرکائیو نے ۱۵ لاکھ صفحات، ان ڈائریوں سے محفوظ کر لیے ہیں۔ اسی میں سے پہلی بٹالین کے ایک فوجی کی ڈائری جسے ڈیجیٹل شکل میں شائع کر دیا گیا، اس کے مطابق ''جہاں دیکھیں وہاں خندقیں، آلات، خون آلات لباس، گولہ بارود، گولیاں وغیرہ اور بے چارے ساتھی جو گولیاں لگنے سے ہلاک ہو گئے، ہر سمت پڑے تھے''[۱۱]۔

ہندوستان سے بھی تقریباً ۱۳ لاکھ فوجیوں نے بھی اس جنگ میں حصہ لیا۔ ۷۴ ہزار کے قریب مارے بھی گئے۔ جنگ کے ان پانچ برسوں کے دوران لاکھوں کی تعداد میں خطوط محاذ جنگ سے ہندوستان پہنچے۔ ان سپاہیوں نے بھی جنگ سے متعلق اپنے تاثرات قلم بند کیے ہیں جس سے جنگ کی ہولناکی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ گولیوں کی سنسناہٹ اور توپوں کی گھن گرج میں لکھے گئے یہ خطوط ان واقعات کا درست منظر نامہ ہیں جن کے بارے میں بہت زیادہ ابہام پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی رہی۔ ایک سپاہی نے لکھا کہ ''جنگ کے دوران گولے ایسے گر رہے تھے جیسے ساون بھادوں میں بارش''۔ ایک اور ہندوستانی فوجی کلرک نے اپنے بھائی کو لکھا کہ گولیوں کی سنسناہٹ، توپوں کی گھن گرج کی جہازوں کی گڑگڑاہٹ میں گھر سے آئے خط ہی میرا سہارا ہیں۔ ایک اور نے لکھا کہ خندقوں کی لڑائی سب سے زیادہ پریشان کن تھی۔ سپاہی رام سنگھ نے لکھا کہ ہمیں جنگ کے بارے میں لکھنے کی اجازت نہیں، اخبارات جھوٹے ہیں۔ ہم نے محض چار سو گز کے علاقے پر قبضہ کیا ہے۔ ایک اور سپاہی نے خندقوں پر گیس کے حملے کی نشان دہی کی۔ تقریباً سات لاکھ ہندوستانی سپاہی ترک سلطنت عثمانیہ کے خلاف بھی میدان میں اترے۔ بہت سے مسلمان تھے۔ کئی نے مسلم بھائیوں کے خلاف لڑنے سے انکار کر دیا اور سزائیں کاٹیں مگر بعض نے انگریز سرکار سے اپنی وفاداری جتلانے کا موقع جانا[۱۲]۔ جنگ عظیم اوّل میں تقریباً ۲۵ لاکھ مسلمانوں نے اتحادی فوج کی جانب سے بہ طور فوجی یا مزدور شرکت کی۔ ان مسلمانوں کا تعلق عرب، افریقا، انڈیا، مشرق وسطیٰ، روس اور امریکا سے تھا۔ فرانس میں قائم جنگی قبرستان ''نوٹرے ڈیم ڈی لوٹ'' ۲۴۰ میل رقبے پر پھیلا ہوا ہے۔ یہ ان لوگوں کی مقابر ہیں جنھوں نے اتحادیوں کی جانب سے جنگ عظیم میں مغربی فرنٹ پر جنگ لڑی۔ اس حصے میں ۱۰۵ آرٹلری سیل داغے گئے جن کی وجہ سے اس علاقے کو شمال کا جہنم قرار دیا جاتا ہے۔ اس قبرستان میں ۴۰،۰۰۰ ہزار فرانسیسی سپاہیوں کی قبروں کے ساتھ ساتھ ایک کونے میں ان مسلمان سپاہیوں کی بھی قبریں ہیں جنھوں نے اس موقعے پر اپنی جانیں گنوائیں۔ ان کے کتبوں پر قرآنی آیات بھی درج ہیں[۱۳]۔ آج اس جنگ کے خاتمے کو تقریباً ایک صدی ہونے کو ہے۔ اس دوران اہل علم کے درمیان یہ مباحث زوروں پر ہے کہ اس سانحے کا ذمے دار کون ہے؟ معروف فوجی مؤرخ سر میکس ہیسٹنگ نے اس بابت درست کہا کہ کسی ایک قوم پر اس جنگ کی ذمے داری نہیں ڈالی جا سکتی لیکن ان کا خیال ہے کہ جرمنی ہی وہ واحد ملک تھا جو یورپ کو اس عظیم سانحے سے بچا سکتا تھا۔ کیمبرج یونی ورسٹی کے پروفیسر سر رچرڈ جے ایون نے اس کی ذمے داری سربیا پر ڈالتے ہوئے اس کی قوم پرستانہ اور توسیع پسندانہ پالیسی کو انتہائی غیر ذمے دار قرار دیا۔ ان کے مطابق سربیا ''بلیک ہینڈ'' نامی دہشت گردوں کی پشت پناہی کر رہا تھا۔ انھوں نے آسٹریا اور ہنگری کو بھی اس جنگ کے ابتدائی ذمے داروں میں شمار کیا۔ ڈاکٹر ہیتھر

جونز نے بھی آسٹریا، ہنگری، جرمنی اور روس کے سخت گیر سیاست دان اور فوجی پالیسی سازوں کو اس سانحے کے ذمے دار قرار دیا۔ یونی ورسٹی آف سیکس کے پروفیسر جان روہل کے مطابق یہ جنگ کسی حادثے کا نتیجہ نہیں اور نہ ہی سفارت کاری کی ناکامی تھی بلکہ یہ جنگ جرمنی، آسٹریا اور ہنگری کی سازش کا نتیجہ تھی [۱۴]۔ بہر حال اس عظیم سانحے کا ذمے دار کوئی بھی ہو، مگر اس کے سیاسی اثرات پوری دنیا پر مرتب ہوئے۔ نئی جغرافیائی حد بندی کے بعد نئی مملکتیں وجود میں آئیں۔ یورپ میں جرمنی کو عبرت ناک شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ برطانیہ ایک بار پھر اپنی برتری برقرار رکھنے میں کامیاب رہا۔ اس جانب اشارہ کرتے ہوئے پنڈت سندر نارائن مُشران نے کہا کہ:

رہی جب نہ زینہار تابِ ستیز — تو لی واں سے جرمن نے راہِ گریز
سپاہِ مخالف گریزاں ہوئی — بیاباں میں یکسر پریشاں ہوئی
ہوئے کشتہ بس جرمنی یاں تلک — کہ کشتوں کے پشتے لگے تا فلک
کیا ایسا برٹش نے جرمن کو تنگ — کہ ہرگز رہا پھر نہ یارائے جنگ
ہوا جمع توپوں کا ایسا دھواں — بنا آسماں اک تہہ آسماں [۱۵]

جنگ کے اختتام پر صلح کے معاہدے کے بعد حالات وقتی طور پر بہتر ہوئے لیکن مسلم دنیا پر جنگ عظیم اوّل کا بہت برا اثر اپڑا۔ ترکی کو جرمنی کا اتحادی ہونے کی بھاری قیمت ادا کرنی پڑی۔ خلافت کا خاتمہ ہوا۔ مسلمانوں میں ملّت کے بجائے قومیت کے جذبات پروان چڑھے۔ ان حالات کا تفصیلی جائزہ بہ عنوان ''خاتمہِ خلافت'' کے تحت کیا جا چکا ہے۔ اس موضوع پر تخلیق کی جانے والی اردو شاعری کا منظر نامہ بھی تفصیلاً مذکورہ صفحات میں درج ہے۔ مغربی استعمار نے اس وقت جو سلوک مسلم دنیا کے ساتھ روا رکھا اس جانب اشارہ کرتے ہوئے نادر کاکوروی نے درست کہا کہ:

اپنی قسمت کا نہیں راحت و آرام کہیں — کون سی سختیاں اس دور میں ہم نے نہ سہیں
ہر طرح سے ہمیں لوٹا ہے لٹایا ہی نہیں — خاک میں مل گئے ہم پھر بھی انھیں چین نہیں
دیکھیے آگے ابھی اور وہ کیا کرتے ہیں [۱۶]

اس دور کا اردو ادب بلاشبہ ترکوں کے جذبات کی بھرپور ترجمانی کرتا دکھائی دیتا ہے۔ ترکوں کی حمایت میں لکھے گئے سیکڑوں مضامین اور شعری تخلیقات میں ترکوں کے مسائل پر بھرپور روشنی ڈالی گئی ہے۔ ایسی متعدد نظمیں جس میں ترک بھائیوں سے ہم دردی کا اظہار ملتا ہے، اس کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ مختصراً یہ کہ شبلی کی ''شہر آشوب اسلام'' کے ان اشعار سے لے کر جس میں وہ کہتے ہیں کہ:

مراکش جا چکا فارس گیا اب دیکھنا یہ ہے — کہ جیتا ہے یہ ٹرکی کا مریضِ سخت جاں کب تک
یہ سیلابِ بلا بلقان سے جو بڑھتا آتا ہے — اسے روکے گا مظلوموں کی آہوں کا دھواں کب تک
زوالِ دولتِ عثماں زوالِ شرع و ملّت ہے — عزیزو! فکر فرزند و عیال و خانماں کب تک [۱۷]

مولانا ظفر علی خان، ہاشمی فرید آبادی، مولانا جوہر، اسماعیل میرٹھی، اقبال، شاہ قسیم الدین وغیرہ کے ہاں موجود نظموں میں عالمی سطح پر رونما ہونے والے ان حالات کو بڑے موثر انداز سے پیش کیا گیا ہے۔ رسائل و جرائد میں موجود ان متعدد نظموں کا ذکر بھی مختصراً کیا جا چکا ہے۔ ان تمام نتائج اور حالات کا مشاہدہ پوری طرح سے ۱۹۱۴ء۔ ۱۹۱۸ء کی جنگ کے بعد کے حالات کے تجزیے سے ہوسکتا ہے

کیوں کہ یہ وہ جنگ تھی جو سب سے زیادہ تھکا دینے والی اور سب سے زیادہ تلخ تھی۔ اس جنگ کی خاصیت یہ تھی کہ اس میں پہلی بار دنیا کے بہت سے ممالک نے بہ یک وقت شرکت کی تھی۔ ان ملکوں نے جنھوں نے جنگ میں حصہ لیا ان لوگوں کی حکومت تھی جو دہشت اور جنگ چاہتے تھے۔ یہ افراد لوگوں کی توجہ ان کے بنیادی مسائل سے ہٹا کر جنگ کی طرف لے جانا چاہتے تھے۔ خصوصاً جرمن جو کہ نہ صرف شکست خوردہ اور فوجی عزائم بھی رکھتے تھے[18]۔ ترکوں کا ان کے ساتھ شامل ہونا تاریخ کا بدترین فیصلہ تھا۔ تاریخ سے ہم یہ بھی سیکھتے ہیں کہ مکمل فتح فاتحین کی خواہشات کے مطابق ہمیشہ کے لیے امن نہیں لے کر آتی بلکہ امن کے بہ جائے ایک نئی جنگ کا پیش خیمہ ثابت ہوتی ہے۔ فتح کی وجہ سے شکست خوردہ لوگوں میں انتقام اور بدلہ لینے کے جذبات شدت سے پیدا ہوتے ہیں۔ جنگ عظیم اوّل کے صرف ۲۵ برس بعد جرمن کی جارحانہ فطرت اور ہوس اقتدار اپنے اسی مقام پر قائم رہی۔ پچھلی جنگ کی ذمے داری قیصر ولیم پر عائد ہوتی ہے تو جنگ عظیم دوم کے ہنگامے کی ذمے داری ایڈولف ہٹلر کے سر ہے۔ شخصیتیں ضرور دوا لگ الگ مگر روح یکساں ہے۔ گویا جو ڈراما ۱۹۱۴ء میں شروع ہوا تھا، وہ اب تک جاری ہے۔ اس بار ہٹلر نے پولینڈ کے خلاف وہی طرز عمل اختیار کیا جو اس سے قبل قیصر ولیم نے آسٹریا کے خلاف روا رکھا تھا۔ اس مرتبہ جرمنوں کو اس عہد نامے کا جو ۱۹۱۸ء کی شکست کے بعد جرمنوں اور اتحادیوں کے درمیان تحریر ہوا تھا، انتقام لینا تھا۔ دراصل نازی پارٹی کی بنیاد اسی لیے ڈالی گئی تھی کہ وہ عہد نامہ وار کے بندھنوں کو توڑ کو جرمنوں کے دونوں ہاتھ آزاد کر دیں۔ ہٹلر کے اصول وہی تھے جو پرنس بسمارک کے تھے کہ جرمن دنیا پر حکمرانی کے لیے آئے ہیں چناں چہ نازی اس جدوجہد کے لیے اٹھے اور محض دس بارہ برس کی زبردست جدوجہد کے بعد دنیا پر چھا گئے[19]۔

پہلی جنگ عظیم کے بحران کے بعد سماجی، سیاسی اور معاشی حیثیت سے مفتوحہ ممالک کی تباہی اور بربادی کے عجیب مناظر دیکھنے میں آئے۔ انتہائی انتشار اور بے چینی، انتہائی اضطراب اور لامرکزیت اور ان سب پر مستزاد قحط اور وباؤں کا زور، کالرا، انفلوئنزا، طاعون غرض ان سب بلاؤں کا نسلِ آدم پر بیک وقت حملہ ہوا۔ جو آبادیاں جنگ کی تباہ کاریوں سے بچ گئیں، ان وباؤں کی نذر ہونے لگیں۔ معاشی ابتری، قحط اور وباؤں سے فاتح اور غیر جانب دار ممالک بھی نہ بچ سکے اور یورپ ہی نہیں ایشیا اور افریقا کے ایک بڑے حصے پر بھی ان کا اثر پڑا۔ یہی عالم گیر معاشی تباہی اور بربادی کا احساس تھا جس نے ان ممالک کے خلاف جو اس جنگ کے اصلی محرک تھے، فاتح ممالک میں شدید جذبۂ انتقام پیدا کر دیا۔ باوجود معاہدات صلح کے یورپین اقوام کے آپس میں رشک و رقابت کے جذبات سے بچنا ناممکن رہا۔ خصوصاً مالِ غنیمت کی تقسیم کے وقت یہ جذبہ پوری طرح ابھر کر سامنے آیا[20]۔

جنگ کے بعد کے اثرات نے کافی عرصے تک یورپ کے سیاسی نظام کو غیر متوازن رکھا۔ اس دورِ انتشار میں مختلف حریف قومیں ابھریں اور آپس میں ٹکراتی رہیں۔ مختلف تحریکیں اٹھتیں اور ممالک کی بے اطمینانی اور بے چینی کو ہوا دیتی رہیں۔ ان تحریکوں میں مزدوروں کی ''کمیونسٹ'' تحریک کو سب سے زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی اور وہ روس میں جو ''کمیونزم'' کا اصلی مرکز تھا، انقلاب برپا کرنے اور بالآخر حکومت پر قبضہ کر لینے میں کام یاب ہوگئی۔ کمیونزم کی اس کام یابی سے یورپ کے جمہوریت پسند ممالک کو ایک نئی قسم کی تشویش لاحق ہوئی۔ اس مسلک کو روایتی انقلاب کے بعد تقویت حاصل ہوئی خصوصاً اٹلی اور جرمنی میں اس تحریک کو بڑا اچھا میدان ہاتھ آ گیا۔ جرمنی، جو روس کا ہم سایہ ملک تھا، جنگ عظیم میں اپنی شکست کے بعد سیاسی اور معاشی حیثیت سے پامال، معاہدۂ درسائی میں جکڑا ہوا، انتہائی بے بسی کے عالم میں پڑا تھا اور اٹلی اگرچہ جنگ عظیم اوّل میں اتحادیوں کے ساتھ تھا اور فتح مند ملکوں میں شمار کیا جاتا تھا لیکن جنگ

کے اثرات مابعد سے نہایت خستہ اور بے جان تھے۔ اس کی تجارت اور صنعت وحرفت تباہ ہوچکی تھی اور ملک میں کھانے پینے کی چیزوں کا کال پڑنے لگا تھا۔ اس کے علاوہ اطالویوں کے دل میں یہ احساس جڑ پکڑ چکا تھا کہ جنگ میں سب سے زیادہ تباہی ان کے حصے میں آئی اور مالِ غنیمت دوسروں کے حصے میں آیا۔ اس عالم گیر احساس کا یہ نتیجہ نکلا کہ اٹلی میں سوشل ازم کے ساتھ ساتھ ایک وطنی تحریک بھی نشو ونما پانے لگی۔ یہ فاش ازم تحریک تھی جس کا مقصد اطالویوں کے گرے ہوئے حوصلوں کو پھر سے ابھارنا تھا۔ ان کی عظمت رفتہ یاد دلا کر پھر سے نیا جوش اور ولولہ پیدا کرنا تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اٹلی میں سوشل ازم کو شکست فاش ہوئی اور ''فاش ازم'' نے تیزی سے سارے ملک میں قبضہ جما لیا۔ حالاں کہ ''فاش ازم'' کا بانی ''مسولینی'' پہلی جنگ عظیم تک خود بھی پکا سوشلسٹ تھا، لیکن وہ دنیا بھر کے سوشلسٹوں کی بے عملی کو پہلی جنگ عظیم میں دیکھ چکا تھا لہٰذا سوشل ازم کا کھوکھلا پن اس پر پوری طرح ظاہر ہو چکا تھا۔ اٹلی کی طرح جرمنی میں بھی ایک قومی تحریک نے کمیونزم کا راستہ کاٹا۔ جنگ عظیم کے بعد قیصر اور اس کا خاندان جرمنی سے فرار ہوگیا تو جرمنی کے سوشل ڈیموکریٹس اور کمیونسٹوں میں ملک کے اقتدار کے لیے شدید ٹکر ہوئی جس میں سوشل ڈیموکریٹس کام یاب رہے لیکن ناکامی کے باوجود کمیونسٹوں کا زور بدستور قائم رہا۔ اسی دوران میونخ کے ایک شراب خانے میں ایک چھوٹی سی مزدور پارٹی قائم ہوئی۔ ''ڈیکسلر'' اس پارٹی کا لیڈر تھا۔ ابتداً اس پارٹی کا کوئی لائحہ عمل نہ تھا اور خود میونخ میں بھی اس کا کوئی اثر رسوخ نہ تھا لیکن سال بھر بعد اس میں جان پڑنا شروع ہوئی۔ ''ڈیکسلر'' کو ہٹا کر اس پارٹی کے ایک اور رکن ''اڈولف ہٹلر'' نے پارٹی کی قیادت سنبھالی۔ اس زمانے میں جرمن درسائی کے ذلت آمیز معاہدے سے بری طرح متاثر تھے۔ یہودیوں اور کمیونسٹوں نے سازشوں کے ذریعے ان کے ملک کو جو نقصان پہنچایا تھا، وہ مستقل جاری تھا۔ اس کا جرمنوں کو بہت صدمہ تھا۔ معاہدے کے بعد فرانس کی آئے دن کی سختیوں سے وہ سخت نالاں رہتے۔ ہٹلر نے اپنی پارٹی کے لائحہ عمل میں ان ہی شکایتوں کا تدارک پیش کیا جس کی وجہ سے عوام جلد اس کی طرف متوجہ ہونے لگے۔ اس طرح اٹلی میں فاش ازم اور جرمنی میں نازی ازم کو قدم جمانے کا موقع ملا اور ان دوممالک میں ان کا تسلط قائم ہوگیا۔ فرانس اور برطانیہ کے طرز عمل نے بھی ان ممالک میں فاش ازم اور نازی ازم کو تقویت پہنچائی۔ اٹلی کو جنگ میں اپنے ساتھ شامل کرتے وقت فرانس نے جن علاقوں کو اسے سونپنے کا وعدہ کیا تھا وہ پورا نہیں کیا گیا۔ اٹلی کو یقین ہوگیا کہ فرانس برطانیہ اور امریکا تینوں نے اس کے ساتھ دغا کیا ہے۔ اسے کمزور دیکھ کر جنگ کے دوران کیے گئے وعدے سے مکر گئے ہیں۔ وسری طرف جرمنی کے ساتھ بھی اتحادیوں خصوصاً فرانس کا طرز عمل نہایت سخت اور توہین آمیز تھا۔ جرمنی کو معاہدہ درسائی کے ذریعے مکمل طور پر بے دست و پا کرنے کے باوجود فرانس کو اطمینان نہیں ہوا تھا۔ اسے امریکا اور برطانیہ سے یہ شکایت تھی کہ جرمنی کے ذرخیز ترین صوبے تو راہین لینڈ پر قبضے سے روک کر اسے نقصان پہنچایا گیا۔ فرانس کی صدارت میں تاوان جنگ مقرر کرنے والی کمیٹی کو اچھی طرح معلوم ہونے کے باوجود جرمنی دو ارب پاؤنڈ سے زیادہ تاوان کی ادائیگی نہیں کر پائے گا، اس پر چھے ارب ساٹھ کروڑ پونڈ کا تاوان لگایا گیا جس کی پہلی قسط کا فوری مطالبہ کیا گیا۔ یہ دراصل وہ سازش تھی جس کے تحت جب جرمنی تاوان کی رقم ادا نہ کر سکے تو فوراً فرانس راہین لینڈ کے صوبے پر اپنی فوج اتار دے۔ سب کچھ منصوبے کے مطابق ہوا، لیکن فرانس کا راہین لینڈ پر قبضہ زیادہ دنوں تک نہ رہ سکا۔ برطانیہ نے بیچ بچاؤ کر کے معمولی واجبی تاوانِ جنگ عائد کر کے فرانس کو قبضہ اٹھا لینے پر آمادہ کر لیا۔ ۱۹۲۵ء میں معاہدہ ''لوکارنو'' کے ذریعے نہ صرف جرمنی کی اشک شوئی کر دی گئی تھی بلکہ اسے مجلس اقوام کا رکن بھی منتخب کر لیا گیا تھا۔ لیکن نوجوان جرمن اس طرح کی قومی ذلت کے تصور سے بے حد متاثر ہوئے اور ویمز جمہوریہ کی رواداری کی پالیسی پر سے ان کا اعتقاد اٹھ گیا۔ یہی وہ موقعہ تھا کہ جوشیلے

نوجوان جرمنوں کواس ذلت سے نکالنے کے لیے ''نیشنل سوشلسٹ پارٹی'' میں شامل ہونے لگے۔اس پارٹی کو جرمن سرمایہ داروں کے علاوہ خود امریکی اور برطانوی سرمایہ داروں کی حمایت بھی حاصل ہوگئی۔اس پارٹی کی اصلی طاقت اس کی والنٹیر کور تھی جو جلد ایک مصلح فوج میں تبدیل ہوگئی[۲۱]۔

۱۹۲۰ء میں مجلس اقوام کے قیام کے مقاصد میں سے ایک اہم مقصد سلطنتوں کے آپس کے جھگڑوں کو ختم کرنا تھا جس میں یہ سلطنتیں بری طرح ناکام رہی۔اس کے پہلے اجلاس کے صدر ولسن کی پالیسی کو امریکیوں نے ناپسند کیا۔اس کے اقتدار کے خاتمے کے ساتھ ہی امریکیوں نے مجلس اقوام میں شرکت اور یورپی معاملات میں دخل دینے سے انکار کردیا۔۱۹۲۶ء میں برطانوی کوششوں سے جرمنی بھی اس مجلس کا رکن منتخب ہوگیا۔۱۹۲۸ء میں مجلس اقوام نے ایک دوسرے کے خلاف جنگ نہ کرنے کا معاہدہ ''بریاں کیلو پیکٹ'' کے نام سے کیا۔۱۹۲۹ء میں باقاعدہ تخفیف اسلحہ اور ثالثی فیصلوں کے اصول بھی وضع کیے گئے۔۱۹۳۲ء میں باقاعدہ تخفیف اسلحہ کی کانفرنسیں بھی ہوئیں۔لیکن ۱۹۳۲ء آنے سے پہلے چند اہم ناخوش گوار واقعات ظہور میں آچکے تھے۔عالم گیر معاشی کساد بازاری کا اثر انگلستان پر بھی پڑرہا تھا۔وہاں بھی بے کاروں کی تعداد خطرناک حد تک بڑھتی جارہی تھی۔مزدور حکومت اس کا علاج نہ کرسکی۔۱۹۳۱ء میں جاپان نے بغیر کسی وجہ کے چین کے ایک زرخیز صوبے منچوریا پر حملہ کردیا۔چین اور جاپان دونوں ہی مجلس اقوام کے رکن تھے۔تمام رکن جاپان کو سزا دینے کا عندیہ دیے بیٹھے تھے لیکن برطانیہ کے سرجان سائمن کی وجہ سے یہ فیصلہ نہ ہوسکا۔اپنے پہلے ہی امتحان میں مجلس اقوام صلح کرانے میں ناکام رہا۔اس کا وجود برائے نام رہ گیا۔اسی لیے فروری ۱۹۳۲ء میں تخفیف اسلحہ کی کانفرنسیں بھی بے نتیجہ رہیں۔۱۹۳۳ء میں نازی پارٹی کا لیڈر راڈولف ہٹلر برسراقتدار آیا اور آتے ہی جرمنی میں جبری فوجی بھرتی کا قانون منظور کرڈالا۔یہ عمل معاہدہ درسائی کی خلاف ورزی تھی۔دوسری خلاف ورزی اس نے یہ کی کہ زبردست ہوائی بیڑے کی تعمیر میں مصروف ہوگیا۔چناں چہ ہٹلر کے اس عمل پر احتساب کیا گیا۔کمزور ہونے کے باوجود مجلس اقوام نے ہٹلر سے باز پرس کی۔ہٹلر نے اس باز پرس کے جواب میں الٹا مجلس اقوام پر الزام لگایا کہ اس نے جرمن کے ''ہتھیار بندی میں مساوات'' کے مطالبے پر آج تک توجہ نہیں دی اس لیے جرمنی ایسی مجلس کا رکن نہیں رہنا چاہتا۔اس مطالبے کا مجلس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔اس پہلی کام یابی سے ہٹلر کا حوصلہ بڑھا۔مجلس اقوام سے علاحدگی کے بعد گویا اسے آزادی مل گئی۔وہ اعلانیہ اور پوری تیزی سے جنگی تیاریوں میں مصروف ہوگیا۔ان تیاریوں سے سوویت روس کو تشویش ہوئی۔چیکوسلواکیا اور فرانس کی کوششوں سے روس مجلس اقوام میں شامل ہوا تاکہ جرمن عزائم کو روکا جاسکے۔پہلی جنگ عظیم میں یہودیوں کے سازشی رویوں کے خلاف ہٹلر نے ان کے خلاف محاذ قائم کررکھا تھا۔جرمن یہودیوں کے استیصال میں ہٹلر کے ساتھ تھے۔یورپ اور امریکا نے اس اقدام کے خلاف آواز اٹھائی لیکن ہٹلر نے اپنے پروگرام کا یہ رخ کبھی نہ بدلا۔ان یہودیوں کا ملک کے کاروبار، صنعت وحرفت اور قانون سازی میں بڑا اثر رسوخ تھا۔ان کو ہٹانا کوئی آسام کام نہ تھا لیکن ہٹلر کا قول یہ تھا کہ جرمنی صرف آرین نسل کے لیے ہے۔غیر آرین نسلیں جرمنی کو اپنا وطن نہیں بناسکتیں۔بعد میں یہی نازی جرمنی کا سلوگن ہوگیا۔یہودیوں کا استیصال ہٹلر کا پہلا اصلاحی قدم تھا۔اس کے بعد جرمنی کے ہر شعبے میں اس نے اصلاحی قوانین نافذ کیے۔اس کی پالیسی سے روز بروز نازی ازم کو فروغ حاصل ہوا۔آسٹریا کے لوگ خود کو جرمن کہا کرتے تھے لہٰذا وہاں کمیونسٹوں کو شکست دے کر آسٹریا کو جرمنی میں شامل کرنے کی کوشش کی لیکن اٹلی کی مداخلت کی وجہ سے جرمنی کو ناکامی ہوئی۔۱۹۳۵ء میں مسولینی نے نازیوں کی مخالفت میں ایک مشترکہ محاذ برطانیہ، فرانس اور اٹلی کے ساتھ مل کر بنایا،

لیکن ۱۹۳۵ء میں اس شراکت کے سب سے بڑے فریق برطانیہ اور جرمنی نے بحری معاہدہ کرلیا جس سے اس اتحاد کو نقصان پہنچا۔ برطانیہ سے برگشتہ ہوکر اٹلی اور فرانس نے بھی معاہدے کیے۔ ۱۹۳۵ء میں اٹلی نے حبشہ پر چڑھائی کی جس کے بعد مجلس اقوام نے برطانوی دباؤ کے باعث اٹلی پر اقتصادی پابندی لگادی۔ جرمنی نے اس اقدام میں برطانیہ کا ساتھ نہ دے کر مسولینی سے تعلقات خوش گوار بنانے کی کوشش کی جس میں وہ کام یاب رہا۔ آخر کار مسولینی برطانیہ سے دل برداشتہ ہوکر فرنس کے طرزِ عمل سے غیر مطمئن ہوکر جرمنی کی طرف جھکا اور اس کے تعلقات ہٹلر سے دوستانہ ہوگئے۔ ان دونوں کی یہی دوستی دراصل یورپ کی تاریخ میں ایک ہنگامہ خیز دور کے آغاز کا سبب بنی اور یورپی سیاست میں انقلاب آیا۔ اسپین کی خانہ جنگی اور شاہ انفانسو کے فرار کے بعد ہٹلر اور مسولینی نے فرینکو کی جیت کے لیے اعلانیہ مدد کی۔ اسپین کے مسئلے پر ان دونوں کا یہ پہلا اتحاد تھا۔ بعد میں جاپان کے اقتصادی بحران اور ہٹلر کی ڈپلومیسی کو دیکھ کر وہی مسولینی جو ہٹلر کو معمولی ایجی ٹیٹر سمجھتا تھا، اس کی صلاحیتوں کا قائل ہوگیا۔ جرمن جاپان کے معاہدے کا اثر بہت جلد دنیا پر ظاہر ہو گیا۔ ۱۹۳۷ء میں اس عذر کے تحت کہ چینی سپاہیوں نے منچکو کی جاپانی چوکیوں پر گولیاں چلادیں، جاپان نے چین کے دو شمالی صوبوں پر قبضہ کرلیا۔ ہٹلر اور مسولینی کی یہی خواہش تھی کہ مشرقِ بعید کی طرف برطانیہ کی توجہ بٹا کر وہ یورپ میں اپنے عزائم کی تکمیل کی راہ ہموار کر سکیں۔ ۱۱ مارچ ۱۹۳۸ء کو نہایت خاموشی سے بغیر خون بہائے ہٹلر نے آسٹریا پر قبضہ کرلیا۔ آسٹریا پر جرمن قبضے کی خبر دولِ یورپ نے سنی لیکن کسی کو بھی ہٹلر سے باز پرس کرنے کی ہمت نہ پڑی۔ روس اور فرانس کو تشویش ضرور ہوئی خصوصاً روس کو چیکوسلواکیا کی سلامتی سے متعلق تشویش لاحق ہوئی۔ بعد میں یہ تشویش درست ثابت ہوئی۔ ۱۴ مارچ ۱۹۳۹ء کو جرمن فوج چیکوسلواکیا میں داخل ہوگئیں۔ سخت دباؤ میں چیکوسلواکیا کے صدر ''ڈاکٹر ہاکا'' کو مجبوراً فرمانِ قضا پر دستخط کرنے پڑے تاکہ اس کی بے گناہ عوام کا خون نہ بہے۔ اس فتح میں جرمنوں کے بے حساب اسلحہ اور آلاتِ جنگ ملا۔ اسلحہ ڈھالنے والی دو فیکٹریاں، دو ہی اعلیٰ درجے کے ہوائی جہاز اور کئی لاکھ پونڈ ہاتھ آئے۔ اب ان ساز وسامان کے ساتھ جرمن قوم ایک عظیم جنگ کے لیے بالکل تیار تھی۔ اس قبضے کے بعد آئندہ کے لیے ہٹلر کے ارادوں کا اندازہ لگانا مشکل نہ تھا۔ میمل پر قبضے کے فوراً بعد ڈانٹ مک بھی مسلح جرمنوں کا مسکن بنا۔ یہاں جرمن اور پولینڈ کے درمیان ہونے والی معاہدے کی بھی خلاف ورزی ہوئی۔ فرانس اور برطانیہ کی حکومتیں جواب ہٹلر پر بھروسا کرنے کو تیار نہ تھیں، نے پولینڈ کو بچانے کے لیے ''اعلانِ طمانیت'' کا اعلان کیا۔ اس کا الٹا اثر ہوا اور جرمنی اور پولینڈ کی جنگ ٹلنے کے بجائے اس میں اور زیادہ تیزی آگئی۔ اب برطانیہ اور فرانس کے پاس جنگی تیاریوں کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا۔ دوسری طرف انھوں نے یورپ کے دوسرے ممالک کو بھی اپنے جتھے میں شامل کرنے کی کوشش شروع کی۔ پولینڈ سے ہونے والی بات چیت بے نتیجہ رہی اور نہ ہی روس سے ہونے والی گفت وشنید کام یاب ہو سکی۔ البتہ روس نے دس سال تک ایک دوسرے پر حملہ نہ کرنے کے جرمن معاہدے کو بہ خوشی قبول کرلیا۔ اتنی بڑی قیمت تو اسے اتحادیوں کے ساتھ جنگ میں شامل ہوکر بھی نہ حاصل ہوتی۔ ۲۳ اگست ۱۹۳۹ء کو سوویت روس اور جرمن کے درمیان معاہدے پر ماسکو میں دستخط ہوئے۔ جرمنی اور دیگر اتحادیوں کا اس معاہدے کے خلاف شدید ردِ عمل بھی آیا۔ روس نے یہ معاہدہ صرف اپنے بچاؤ کے پیشِ نظر نہیں کیا تھا بلکہ اس کے کچھ اور بھی مقاصد تھے۔ اور وہ مقاصد یہ تھے کہ برطانیہ اور فرانس کا ہوّا دکھا کر جرمنی سے زیادہ سے زیادہ قیمت وصول کی جائے۔ نازی جرمنی سے فی الفور مصالحت کر لینے میں روس کا فائدہ ہی فائدہ تھا۔ پولینڈ پر حملے سے قبل نازی پریس نے زبردست پروپیگنڈا مہم جاری رکھی جو کہ ان کا طریقۂ واردات تھا۔ اب ہٹلر کسی بھی طرح گفت وشنید کے لیے تیار نہ تھا۔ اپنی مجوزہ شرائط پر بے حیل و

حجت دستخط کو ہی وہ اس مسئلے کا حل قرار دے چکا تھا۔ یہ توہین آمیز تجویز پولینڈ کو منظور نہ تھیں۔ جب ہٹلر کی تجویز رد کر دی گئی تو اتمامِ حجت کے طور پر اس نے ۳۱ اگست ۱۹۳۹ء کو نئی چال چلی اور ۱۶ دفعات پر مشتمل معاہدے کا مسودہ براڈ کاسٹ کر دیا۔ اس مسودے کی ایک کاپی اس ہدایت کے ساتھ پولینڈ کے سفیر کے حوالے کی کہ رات بارہ بجے تک مسودے پر اپنی رضا مندی کا اظہار کرے۔ سفیر نے مشورے کے لیے اپنی حکومت اور برطانوی عہدیداروں کو فون کرنا چاہا تو معلوم ہوا کہ تمام فون کی تاریں کاٹ دی گئی ہیں۔ یکم ستمبر کی صبح پو پھوٹتے ہی جرمن فوجیں پولینڈ میں داخل ہو گئیں۔ اسی دن ہٹلر نے برلن میں ایک اعلان نامہ شائع کیا کہ جنگ روکنے کی انتہائی رواداری نہ شرائط جرمنی نے پولینڈ کے آگے پیش کیں لیکن پولینڈ نے انھیں منظور کرنے سے انکار کر دیا۔ اب اس پاگل پن کا اس کے علاوہ ہمارے پاس کوئی علاج نہیں کہ قوت کا جواب قوت سے دیں۔ جرمنی نے برطانیہ اور فرانس کی دھمکی کے مطلق پرواہ نہ کی۔ ۳ ستمبر ۱۹۳۹ء کو وزیر اعظم برطانیہ نے دارالعوام میں ہٹلر کی امن سوز حرکتوں کی تفصیل بیان کرنے کے بعد پولینڈ کی حمایت میں جرمنی کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ اسی دن فرانسیسی حکومت نے بھی پولینڈ کی حمایت کا اعلان کیا۔ اس طرح محض ۲۵ برس کے اندر ہی دوسری جنگ عظیم کا سانحہ رونما ہوا [۲۲]۔

اس جنگ کے دوران نازی جرمنوں نے تقریباً ۱۱ ممالک پر حملے کیے۔ اس دوران حلیف ممالک سے لاکھوں یہودیوں کو جلا وطن کیا گیا اور یہودی بستیوں کو قتل گاہ میں تبدیل کر دیا گیا۔ پولینڈ کی شکست کے نتیجے میں پیدا ہونے والا عارضی سکوت ۹ اپریل ۱۹۴۰ء کو اس وقت ختم ہو گیا جب جرمن فوجوں نے ناروے اور ڈنمارک پر حملہ کر دیا۔ ۱۰ مئی ۱۹۴۰ء کو جرمنی نے یورپ کے نشیبی علاقوں نیدر لینڈ، بیلجیم اور لگزمبرگ پر حملہ کرنے کے ساتھ ساتھ فرانس پر بھی چڑھائی کر دی۔ ۲۲ جون ۱۹۴۰ء کو فرانس اپنے ملک کا نصف شمالی حصہ جرمنی کو دینے کے معاہدے پر دستخط کرنے پر مجبور ہوا۔ دوسری طرف جرمن حمایت سے سوویت روس نے بالٹک ریاستوں پر قبضہ کرنے کا سلسلہ شروع کیا۔ ۱۰ جون کو اٹلی بھی اس جنگ میں شریک ہو گیا۔ ۱۳ اگست سے ۳۱ اکتوبر ۱۹۴۰ء کو جرمنوں نے انگلستان کے خلاف ہوائی جنگ شروع کی۔ اس جنگ کو ''بیٹل آف برٹن'' کہا جاتا ہے جس میں جرمن شکست سے دوچار ہوئے [۲۳]۔ برطانوی ہوابازوں کی قوت ہٹلر کے اندازے سے زیادہ ہلاکت آفریں ثابت ہوئی اور باوجود متواتر اور مسلسل کوششوں کے وہ نہ اپنے بم باروں کی مدد سے انگریزوں کے حوصلے پست کر سکا اور نہ جنگی تیاریوں کو برطانوی طیاروں کے دست برد سے بچا سکا [۲۴]۔

برطانیہ پر ناکام حملوں کے بعد ہٹلر نے فوراً ایک اور چال چلی۔ مغربی محاذ کی ناکامی پر پردہ ڈالنے کے لیے اس نے مشرق کی طرف اپنا رخ پھیر دیا اور رومانیہ کی جانب پیش قدمی شروع کر دی تاکہ اس کے تیل کے چشموں پر قبضہ حاصل کیا جا سکے۔ دوسری طرف مسولینی نے اپنی لیبیا کی فوجوں پر سے مصر کی برطانوی فوجی دباؤ کو جو برابر بڑھتا چلا جا رہا تھا، دور کرنے کے لیے بحیرۂ ایجین کے راستے شام پر قبضہ کرنے کی طرح ڈالی۔ بحیرۂ ایجین پر قبضہ کرنے کی خواہش برسوں سے مسولینی کے دل میں تھی۔ ۲۸ اکتوبر ۱۹۴۰ء کو تین گھنٹے کا الٹی میٹم دے کر اٹلی نے یونان سے جنگ شروع کر دی۔ شروع کے دو ہفتوں تک اٹلی کا پلڑا بھاری رہا لیکن بعد میں یونانی فوجوں نے انھیں سرحد سے باہر دھکیل دیا۔ برطانیہ نے بھی اس جنگ میں یونان کی مدد کی۔ جرمنی فی الفور اٹلی کی مدد نہ کر سکا۔ اُدھر چین، جاپان اور روس کی کش مکش نے مشرق بعید میں ایک تناؤ کی کیفیت پیدا کر رکھی تھی۔ روس نے محض دس لاکھ فوج محض جاپان پر نظر رکھنے کے لیے رکھ چھوڑی تھی [۲۵]۔

۱۴ اپریل ۱۹۴۰ء کو روس اور جاپان کے درمیان معاہدہ غیر جانب داری اور ۲۲ جون ۱۹۴۰ء کو روس پر جرمن حملے کی ابتدا ہوئی

[26]۔ یونان اور بلقان کی ریاستوں پر گرفت مضبوط کرنے کے بعد جرمن اور اس کے اتحادیوں نے سوویت یونین پر بھی چڑھائی کر دی۔ یہ جرمن اور سوویت معاہدے کی راست خلاف ورزی کا آغاز تھا۔ اس موقعے پر سوویت رہنما اسٹالن نازی جرمن اور اتحادی ممالک کے خلاف اہم لیڈر بن کر ابھرے۔ ۱۹۴۱ء کے موسم گرما اور خزاں کے دوران جرمن فوج سوویت یونین کے اندر دور تک پہنچ گئیں مگر زور پکڑتی ہوئی ریڈ آرمی کی مزاحمت نے انھیں لینن گراڈ اور ماسکو جیسے اہم شہروں پر قبضہ نہ کرنے دیا۔ ۶ دسمبر ۱۹۴۱ء کو سوویت فوجوں نے بڑی کارروائی کر کے جرمنوں کو مستقل ماسکو کے مضافات سے دور دھکیل دیا[27]۔ ۷ اور ۸ دسمبر کو جاپان نے امریکا کے خلاف اعلان جنگ کر کے پرل ہاربر پر ہوائی بم باری شروع کر دی۔ ۱۱ دسمبر ۱۹۴۱ء کو جرمن اور اطالیہ نے بھی امریکیوں کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ اس جنگ میں اب ایک طرف امریکا، برطانیہ، روس، فرانس اور چین کی قومیں تھیں تو دوسری جانب جرمن، جاپان، اطالیہ کی طاقتیں۔ موخر الذکر قوتوں میں سے جاپان کے ہاتھ چین، کوریا، جاوا، ساترا، فلپائن، ملایا اور برما کے بے گناہ لوگوں کے خون سے لتھڑے ہوئے تھے۔ جرمنی بھی تسخیر عالم کے خواب دیکھ رہا تھا اور اطالیہ بھی اپنی سلطنت کو وسیع کرنے کے لیے پر تول رہا تھا[28]۔ جنگ عظیم دوم کے آخری دو برسوں میں اس وقت پانسا پلٹنا شروع ہو گیا جب ۲۶ جولائی ۱۹۴۳ء کو مسولینی کی حکومت کا تختہ الٹ کر اسے گرفتار کر لیا گیا۔ ۹ ستمبر ۱۹۴۳ء کو اطالیہ نے اتحادیوں کے آگے ہتھیار ڈال دیے۔ اس دوران خود وہاں کی عوام نے چوک پر مسولینی کو پھانسی دے کر اس کی نعش جلا ڈالی۔ اسی طرح ۶ جون ۱۹۴۴ء کو بڑی فوجی کارروائی کے طور پر ڈیڑھ لاکھ اتحادی افواج فرانس میں اترے اور فرانس کو آزاد کرا لیا گیا۔ ۱۱ ستمبر ۱۹۴۴ء کو امریکی فوجی دستے جرمنی میں داخل ہو گئے۔ اس سے قبل سوویت فوجی بھی جرمنی کو گھیر چکے تھے۔ اتحادی فوجیوں نے جرمنی کی صنعتی تنصیبات کو نشانہ بنایا۔ ۱۲ جون کو سوویت فوجوں نے شدید حملے کے بعد پولینڈ کو بھی آزاد کرا لیا۔ وسط فروری ۱۹۴۵ء کو اتحادی فوجوں نے بم باری کر کے جرمن شہر ڈریسڈن کے ۳۵ ہزار شہریوں کو ہلاک کر دیا۔ ۱۶ اپریل ۱۹۴۵ء کو سوویت فوجوں نے جرمن دار الحکومت برلن کو گھیرے میں لے لیا۔ سوویت فوجی لڑتے ہوئے ریخ چانسلری میں داخل ہوئے تو ۳۰ اپریل ۱۹۴۵ء کو ہٹلر نے خودکشی کر لی۔ ۷ مئی ۱۹۴۵ء کو رائین کے مقام پر مغربی اتحادیوں اور ۹ مئی کو سوویت فوجوں کے آگے جرمن نے ہتھیار ڈال دیے۔ ۶ اگست پر جاپان کے شہر ہیروشیما اور ۹ اگست کو ناگاساکی پر امریکا نے ایٹم بم سے حملہ کیا[30]۔ ان حملوں میں ایک لاکھ بیس ہزار شہری ہلاک ہوئے۔ جاپان نے باضابطہ طور پر ۲ ستمبر کو گھٹنے ٹیک دیے۔ اس جنگ میں تقریباً ۶۱ ممالک نے حصہ لیا[31]۔ اس کی ہول ناکی کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ تقریباً ساڑھے پانچ کروڑ لوگ دوسری جنگ عظیم کے دوران ہلاک ہوئے۔ اسے تاریخ کی سب سے بڑی اور تباہ کن جنگ بھی کہا جاتا ہے[32]۔

بیسویں صدی کی ان دو عظیم جنگوں کے نتیجے میں کروڑوں لوگوں نے زندگی کی بازی ہار دی۔ کروڑوں لوگوں نے زندگی بھر معذوری کا عذاب سہا۔ لوئس اہل سنائڈر نے جنگ عظیم دوم کی ہول ناکیوں کو سمیٹتے ہوئے ان تاریخی دستاویزات کے مطالعے کے بعد انھوں نے جنگ کے تمام واقعات کو اس طرح عیاں کیا ہے کہ قاری ان واقعات کو اپنے سامنے ہوتا محسوس کرتا ہے۔ اس جنگ میں روس کے ایک کروڑ تیس لاکھ، برطانیہ کے ۲ لاکھ ۶۴ ہزار، فرانس کے ۶ لاکھ، جرمنی کے ۴۳ لاکھ، جاپان کے ۱۹ لاکھ، امریکا کا ۲ لاکھ ۹۲ ہزار فوجیوں سمیت لاکھوں شہری لقمہ اجل بنے۔ اس جنگ کا سب سے زیادہ نقصان برطانیہ کو اٹھانا پڑا۔ اس کے سیاسی نظام اور افرادی قوت پر اس قدر کاری ضرب لگی کہ بعد میں برطانیہ اپنی نو آبادیات پر تسلط قائم نہ رکھ سکا اور رفتہ رفتہ تمام مقبوضات اس کے ہاتھوں سے نکل گئے۔ ہٹلر

کی غلط حکمت عملی نے نہ صرف جرمن قوم کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا بلکہ فرانس، روس، بیلجیم، اٹلی، پولینڈ ڈنمارک، ہالینڈ اور لگزمبرگ کی بھی اینٹ سے اینٹ بج گئی۔ یہ جنگ اس سے قبل لڑی گئی تمام جنگوں سے بڑی اور عالم گیر ہے۔ اس جنگ کے شعلے یورپ، ایشیا، افریقا، آسٹریلیا اور امریکا تک پہنچے۔ کوئی علاقہ ایسا نہیں جو اس جنگ سے متاثر نہ ہوا ہو۔ ان متاثرہ ممالک کی تباہی و بربادی کے مناظر دکھاتے ہوئے شجاع احمد نے پولینڈ، حمد عمر بن عمر نے چیکوسلوا کیا، محمد ہادی نے ہالینڈ اور عراق، پروفیسر ہارون خان شیروانی نے ڈنمارک، میر عزیز الحق نے بیلجیم، عزیز احمد نے ناروے، قاری کلیم اللہ حسینی نے سوئٹزرلینڈ، میر حسن نے رومانیہ اور یونان، سجاد مرزا نے روس، ڈاکٹر راحت اللہ خان نے مصر، میر حسن نے ایران، غلام معین الدین نے ہند چینی اور لاطینی امریکا، غلام احمد نے فلپائن اور جزائر اور ملایا اور فیض محمد صدیقی نے چین وغیرہ پر جو تفصیلی مقالے لکھے اسے ''جنگ زدہ ممالک'' کے عنوان سے میر حسن ایم۔ نے مرتب کیا ہے [۳۳]۔ یہ مقالے اس دور کے جنگ زدہ ماحول کو سمجھنے میں ہماری مدد اور رہنمائی کرتے ہیں۔

یہ درست ہے کہ جنگ انسانی سماج کا ناگزیر حصہ رہی ہے۔ ہمیں ادب کے جو قدیم شہ پارے ملتے ہیں ان کی بنیاد بعض اہم جنگوں پر ہی رہی ہے۔ جیسے قدیم ہندوستان میں مہابھارت اور رامائن وغیرہ۔ مہابھارت کوروؤں اور پانڈوں کے مابین جنگ کی داستان ہے۔ اسی طرح رامائن جسے تلسی داس اور والمیک جی نے اپنے انداز میں تحریر کیا، رام چندر جی اور راون کے مابین جنگ کی داستان ہے۔ قدیم یونان میں ٹروجن وار جو ہیلن کے اغوا کے ضمن میں شروع ہوئی اور جسے ہومر نے ایلیڈ (Ilied) کے عنوان سے تخلیق کیا، جنگوں ہی کی دَین ہے۔ تاریخ پر اور روایات پر بھروسا کیجیے تو روئے زمین پر پہلی جنگ ہابیل اور قابیل کے مابین لڑی گئی۔ ہزاروں صدیاں گزر جانے کے عمل میں ایک پہلو جو نمایاں ہوا ہے وہ یہ کہ اس جنگ میں قابیل نے آلۂ ہلاکت کے طور پر جو پتھر استعمال کیا تھا وہ ارتقائی مراحل طے کرتا ہوا ایٹم بم، ہائیڈروجن بم اور اسی قسم کے دیگر مہلک ہتھیاروں میں تبدیل ہو چکا ہے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی نے جہاں انسان کی بقا کے سامان پیدا کیے وہیں اس کی ہلاکت اور تباہی کا سامان بھی ایجاد کر رہی ہے [۳۴]۔ اسی لیے معروف شاعر منیب الرحمٰن نے انسانی ارتقا اور جنگوں کی ہول ناکی کا نقشہ کھینچتے ہوئے اپنی نظم ''جنگ'' میں کہا کہ:

اور پھر ایک صدا ایک جگر دوز صدا	جنگ! قابیل کے بیٹوں کا بہیمانہ جنوں
آخری لرزشیں گرتے ہوئے ایوانوں میں	اسلحہ جات کا، طاقت کا، حکومت کا فسوں
شہپرِ موت کی تاریک فضا میں لرزش	خون اڑتا ہوا آنکھوں میں دہن شعلہ فشاں
شہر کے کوچہ و بازار میں پیروں کی دھمک	سینہ تانے ہوئے کہسار کے مانند جواں
آہنی جوتوں سے یہ لاش کچل ہی ڈالو	مرنے والوں کا کوئی یار و مدد گار نہیں
زندگی ختم ہوئی رشتۂ الفت ٹوٹا	پھر بہ جز خاک کوئی دوسرا غم خوار نہیں [۳۵]

یہ بڑی خوش آئند بات ہے کہ آج کا شاعر حالات کی نزاکت اور جنگوں کی ہول ناکیوں کو پوری طرح سمجھتا ہے۔ وہ نظریہ اور نظریاتی مہم کو جانتا ہے۔ سرحدوں کی قید سے بالاتر ہو کر وہ انسانیت کا راگ الاپتا ہے۔ وہ سیاسی مقاصد کی خاطر حکم رانوں کا آلہ کار نہیں بنتا بلکہ اپنے شاعر ہونے کا بنیادی فریضہ ادا کرتا ہے۔ پیار، محبت، امن، بھائی چارے اور زندگی کا درس دیتا ہے۔ اسی لیے جدید دور کی اردو شاعری میں جنگوں کی ہول ناکیوں سے نفرت کا رویّہ بدرجہ اتم موجود ہے [۳۶]۔ اس سلسلے میں ایٹم بم کی تباہ کاریوں کے خلاف مرتب

دی جانے والی موثر کتاب ''زمین کا نوحہ'' بہت اہمیت کی حامل ہے۔اس کتاب میں متعدد شعرا اور افسانہ نویسوں کی تخلیقات کو یک جا کیا گیا ہے۔ یہ کتاب پاکستان میں ایٹمی دھماکوں کے دو برس بعد ردعمل کے طور پر مرتب ہوئی۔ ایک طرح سے یہ ایٹمی بم کے پھیلاؤ کے خلاف احتجاج تھی۔ متعدد افسانہ نگاروں کے علاوہ جن شعرا کی تخلیقات اس میں شامل ہیں ان میں احمد فراز، محسن بھوپالی، انور احسن صدیقی، کشور ناہید، فہمیدہ ریاض، حسن عابدی، ضیا اجالندھری، مسلم شمیم، شاہد نقوی، ہلال نقوی، صبا اکرام، عذرا عباس، ذیشان ساحل، علی محمد فرشی، شیراز راج، زاہد حسن اور حارث خلیق وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ان شعرا نے بموں کی تباہ کاری کے خلاف پُرامن انسانی معاشرے کے خواب بُنے اور جنگی سرگرمیوں کے خلاف اپنے سخت ردعمل کا اظہار کیا۔ ظاہری بات ہے کہ موجودہ دور جوہری توانائی کا دور ہے، انسان کے کمال کا دور ہے جس نے سینہ گیتی کو ہی چاک نہیں کیا بلکہ ذرے کا دل بھی چیر ڈالا ہے۔ ایک چھوٹے سے ذرے ایٹم کو چیر ڈالنا یا پھاڑنا (Fission) انسانی ذہن کا عظیم ترین کارنامہ بھی ہے اور معصومانہ غلطی بھی۔ سادہ ایٹم سے نیوکلیائی توانائی کا سفر بڑا طویل اور انتہائی پیچیدہ ہے۔ مغرب کے سائنس دانوں اور مدبّروں کے ذہنوں میں یہ خیال دوسری جنگ عظیم کے زمانے میں بڑی برق رفتاری سے پروان چڑھا کہ کسی طرح ایٹم کو چیرا جاسکے تو اس کے نتیجے میں ایک زنجیری عمل (Chain Reaction) ہونے کا احتمال ہے۔ اس کے بعد ہی ایک ایسا دھما کا عمل میں آسکتا ہے جس کا مشاہدہ دنیا نے کبھی نہیں کیا ہوگا۔ اس دوران جرمنی اور یورپ سے آئے پناہ گزین سائنس دانوں نے یہ پریشان کن کہانیاں بھی سنائیں کہ نازی جرمنی اس قسم کی دوڑ میں شریک ہے[۳۷]۔

آئن اسٹائن نے امریکی صدر فرینکلن روز ویلٹ (۱۹۴۵ء-۱۸۸۲ء) کو اس خطرے کے پیش نظر ایک اہم بلکہ تاریخ ساز خط بھی لکھا جس کے نتیجے میں صدر امریکا نے فوری طور پر ایٹمی توانائی پر تحقیق کے لیے ایک معتد بہ رقم مختص کردی۔ اس طرح ایٹم بم کی تیاری پر کام تیز ہوگیا۔ دوسری طرف جاپان کے سائنس دان بھی اس دوڑ میں (Nishina's Lab) میں مصروف کار رہے۔ امریکا کے پاس نقل مکانی کر کے آنے والے بہترین دماغ جمع تھے لہٰذا ے دسمبر ۱۹۴۱ء کو پرل ہاربر پر تین سو ہوائی جہازوں کے جاپانی حملے کے بعد جاپان کے خلاف امریکی اعلان جنگ سے دنیا ایک آتش فشاں کے دہانے پر کھڑی دکھائی دینے لگی۔ جس کا مظاہرہ ۶ اگست ۱۹۴۵ء کو ہیروشیما کے ہنستے بستے شہر کی تباہی کی صورت میں نکلا۔ چاروں طرف لاشیں ہی لاشیں، جو زندہ بچ گئے ان کے جسم پر کپڑوں کے چیتھڑے یا مادر زاد ننگے بدن کوئلہ جو کھال سے عاری۔ اس قیامت صغریٰ کو ابھی تیسرا روز بھی نہ گزرا تھا کہ ایک اور شہر کا وہی حال ہوا[۳۸]۔ دنیا پر اس تباہی و بربادی کا انتہائی منفی اثر تو ہوا لیکن اس دھماکے کے بعد متعدد ممالک نے جوہری توانائی کے حصول میں بے تحاشہ سرمایہ لگانا شروع کردیا۔ ہندوستان پاکستان جیسے غریب ممالک بھی اس دوڑ میں پیچھے نہ رہے۔ جنگ گو کہ کسی بھی ادیب کے لیے تخلیقی محرک نہیں بن سکتی لیکن شعرا نے اس تناظر میں اپنی دلی کیفیات کا اظہار ضرور کیا۔ خالد علیگ کی ایک نظم میں ان دونوں ممالک کو طنزیہ انداز میں کہا گیا کہ:

دھماکا کر دیا تم نے، دھماکا کر دیا ہم نے
بہت اچھا کیا تم نے، بہت اچھا کیا ہم نے

کئی صدیوں سے اپنے روز و شب بے نور تھے یکسر
سو ان میں روشنی کا ایک جھماکا کر دیا ہم نے

ہماری بات تک سنتا نہ تھا کوئی زمانے میں
دھماکا کر کے اپنا بول بالا کر لیا ہم نے

بہت بونے بہت چھوٹے تھے ہم اقوامِ عالم میں
سو اپنی قدر و قیمت میں اضافہ یوں کیا ہم نے[۳۹]

شیخ ایاز کی ایک نظم ''ہیروشیما'' بھی اسی تناظر میں لکھی گئی نظم ہے جس کا ترجمہ فہمیدہ ریاض نے کیا۔ اس نظم میں دھرتی پر آگ و

خون کے مناظر دکھاتے ہوئے شاعر نے کہا کہ:

یہ کون کھڑا ہے پربت پر یہ دیکھ، یہ میں ہوں، تو وہ ہے
جو امن نہ لائے دھرتی پر یہ اپنی ارتھی آئی ہے
اور اس ارتھی پر پھول چڑھا کیا ہم نے آگ لگائی ہے[۴۰]

حبیب جالب نے بھی ایٹم بم کو انسانیت کا سب سے بڑا دشمن قرار دیتے ہوئے اس سے دور رہنے کا مشورہ دیا۔ ان کا کہنا ہے کہ:

امن کا دشمن جان کا دشمن دھرتی اور دہقان کا دشمن
کھیت اور کھلیان کا دشمن پیارے پاکستان کا دشمن
ایٹم بم انسان کا دشمن[۴۱]

ضیا جالندھری نے بھی ایٹمی دھماکوں کی ہول ناکی اور تباہی کے بیان میں اپنی نظم ''عرض داشت'' میں اس عمل کو انسانیت کے لیے سب سے بدترین عمل قرار دیا۔ ان دھماکوں کو زمین کے پرخچے اڑا دینے کے مترادف قرار دیتے ہوئے انھوں نے کہا کہ:

اک بھیانک گرج اور اچانک / دھویں کے شجر / خاک سے اوج افلاک تک چھا گئے / ایک
دھماکا ہوا / اور زمیں کے پرخچے اڑے / بحر و بر کوہ و دشت / آگ کے دیو ہیکل پرندوں کی
صورت / خلاؤں میں گرتے بھٹکتے بجھ گئے / اور آدم کی اولاد کا آخری کارنامہ مکمل ہوا[۴۲]

دنیا بھر کے ممالک خصوصاً پاکستان اور ہندوستان نے اپنی عوام کی محرومیوں کو نظر انداز کر کے جس طرح ایٹمی بموں کے تجربات کیے اس پر بھی اہل قلم بے چین دکھائی دیتے ہیں۔ ان ممالک کے حکمرانوں اور مقتدر قوتوں پر طنز کے تیر برساتے ہوئے انور احسن صدیقی نے اپنی نظم ''چاغی اور پوکھران'' میں درست کہا کہ:

کہ ہم نے اپنے نحیف جسموں میں برق سوزاں کا وہ ذخیرہ / اسیر کر کے چھپا لیا ہے / کہ
جب بھی چاہیں / جلا کے اک دوسرے کو فوراً ہلاک کر دیں / نحیف جسموں کو خاک کر دیں /
خود اپنے ہاتھوں سے اپنے قصے کو پاک کر دیں / کہ خودکشی ہی مآل ٹھہرے / ہماری اس
خواہشِ جنوں کا / فنا ہی روح کمال ٹھہرے[۴۳]

جنگی جنون اور دشمنوں کو کچل دینے کی خواہش ہر زمانے میں انسانیت کی تباہی کا باعث بنی ہے۔ اس پس منظر میں لکھی گئی ایک اور نظم ''چھٹا منٹ'' بھی انور احسن صدیقی کی عمدہ نظموں میں شمار کی جا سکتی ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

اک جنگی دانش ور نے کہا / ''ہم پانچ منٹ میں دشمن کے / ہر شہر کو راکھ بنا دیں گے / سب
کچھ مٹی میں ملا دیں گے / ہر زندہ شے کو جلا دیں گے'' / اک دیوانہ یہ سن کر ہنسا / پھر عالمِ
وحشت میں بولا / اے جنگی دانش ور، یہ بتا / جب پانچ منٹ مٹ جائیں گے / پھر چھٹے منٹ
میں کیا ہوگا / وہ چھٹا منٹ کس کا ہوگا؟[۴۴]

سعیدہ گزدر بھی ان تباہ کاریوں پر ملول دکھائی دیتی ہیں۔ ان کے مطابق بم کسی مذہب اور نسل کو دیکھ کر نشانہ نہیں بناتا بلکہ پوری

پوری آبادی کو بھسم کر دیتا ہے اسی لیے وہ اپنی ایک نظم ''ایٹم بم کے بعد'' میں کہتی ہیں کہ:

اپنا خیال رکھنا، سب کا خیال رکھنا/ گمبھیروں ہیں جاناں/ ہر سمت ہے اندھیرا/ ایٹم بموں کی
پوجا/ قوموں کا ہے وتیرا/ اپنا خیال رکھنا، سب کا خیال رکھنا/ یہ بم کہاں گرے گا/ یہ وسوسا
ہے دل کو/ یہ بم جہاں گرے گا/ انسان بھسم ہوگا/ رنگ ونسل نہ مذہب/ پہچان بن سکے گا...
ایک راکھ کا سمندر/ بن جائے گا مقدر/ اپنا خیال رکھنا، سب کا خیال رکھنا[۴۵]

اس مجموعے میں ڈاکٹر ہلال نقوی کی ایک نظم ''قتلِ زمیں کا مرثیہ'' کے عنوان سے شامل ہے۔ اس نظم میں انھوں نے جوہری دھماکوں کے بعد زمین پر گزرنے والی تکلیف دہ کیفیت کا مرثیہ لکھتے ہوئے کہا کہ:

یہ ہر خیال کو ہر آگہی کو ڈس لے گا/ بڑا عذاب یہ قحط الرجال ہے لیکن/ زمیں کا قحط ہر ایک
زندگی کو ڈس لے گا/ کوئی حیات کے ان قاتلوں سے یہ کہہ دے/ اگر تمھارے جنوں نے/
زمیں کو قتل کیا/ تو پھر زمیں پہ نہ تم رہو گے نہ ہم ہوں گے[۴۶]

عذرا عباس نے بھی انسانی بے حسی اور ہول ناک ایٹمی دھماکوں کے اثرات پر ایک نظم ''یہ کیسے ہوسکتا ہے'' میں اظہار خیال کرتے ہوئے نسل در نسل انسانی ذہنوں پر اس کے منفی اثرات کی منتقلی کا ذکر کچھ ان الفاظ میں کیا ہے:

یوں تو ہم ہمیشہ سے ایٹم بم کے خلاف رہے ہیں/ اس وقت سے/ جب ہم اپنے باپ کو
ناگاساکی اور/ ہیروشیما کے بموں کے خلاف بولتے ہوئے/ منھ سے جھاگ اڑاتے ہوئے
دیکھتے تھے/ تب سے ہمارے خون کی ایک ایک بوند/ ایٹم بم سے نفرت پر آمادہ ہے[۴۷]

ن۔م۔دانش کی دو نظمیں ''ایک نظم کی موت'' اور ''ہمیں پھول درکار ہے'' میں بھی بے معنی اور لاحاصل جنگوں کو امن عالم کے لیے خطرہ قرار دیا گیا ہے۔ ان کے مطابق جوہری توانائی کے حصول اور جنگی جنون نے انسانیت سے جینے کی امنگ اور حوصلہ چھین لیا ہے۔ ان کے مطابق آج کے انسان کی آنکھوں میں صبح امید کے کرچیوں کے ڈھیر جمع ہیں جو وقتاً فوقتاً انسانیت کی اس تذلیل پر آنسو بہاتے ہیں:

ان کی حسرت زدہ آنکھوں میں/ صبحِ امید کے خواب کی کرچیاں/ ڈھیر ہیں/ ان کے سر پر
کھڑی/ آتشیں موت ہے/ موت انبوہ کی/ موت انسان کی/ ہم کو بے معنی لاحاصل جنگوں
نے جو کچھ دیا ہے/ اسے دیکھتے خوف آتا ہے/ کیا امن اور حسن دھوکا/ کہیں واہمہ تو نہیں
ہے[۴۸]

اس کے علاوہ محسن بھوپالی ''تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو'' جو کہ سابق بھارتی وزیر اعظم اٹل بہاری واجپائی کی نظم ''ہم جنگ نہ ہونے دیں گے'' کے جواب میں لکھی گئی، احمد فراز کی نظم ''ہندوستانی دانش وروں کے نام''، کشور ناہید کی نظم ''پیمانِ وفا کس سے کہاں کیجیے جا کے''، فہمیدہ ریاض کی نظم ''پوکھرن اور چاغی''، حسن عابدی کی ''ہوا کا رقص''، مسلم شمیم کی نظم ''بوم تقصیر''، شاہد نقوی کی ''خودکشی''، صبا اکرام کی ''گوتم کے لیے ایک نظم''، ذیشان ساحل کی نظم ''دنیا''، توقیر چغتائی کی نظم ''بم''، علی محمد فرشی کی نظم ''تماشائی حیرت زدہ رہ گئے''، شیراز راج

کی ''پوکھرن سے چاغی تک''، عثمان قاضی کی ''جوہری جاڑا''، مصطفیٰ رباب کی ''سائرن بج رہا ہے''، ''انگلیوں پر گنتی جتنے لوگ'' وغیرہ کے علاوہ بلوچی، سندھی، پنجابی اور انگریزی زبانوں سے ترجمہ کی گئی نظموں میں شاہ محمد پیرزادہ کی نظم ''ایک دھماکے کا جشن''، رحیم بخش آزاد کی نظم ''راسکوں سفید کفن اوڑھ کر مر گیا''، حارث خلیق کی نظم ''چاغی اور پوکھراں''، زاہد حسن کی نظم ''جنگ کی کوکھ سے جنمی نظم'' اور عطیہ داؤد کی ''دھماکے کی موسیقی'' وغیرہ کافی اہمیت کی حامل ہیں۔ ان نظموں میں ایٹمی دھماکوں کے خلاف ایک شدید ردعمل پایا جاتا ہے۔ اسی لیے عالمی امن اور بھائی چارے کے حوالے سے یہ نظمیں ایک موثر پیغام کی حیثیت رکھتی ہیں۔ یہ تیسری دنیا سے تعلق رکھنے والے ان شعرا کے دل کی آواز ہیں جو جنگ کے بہ جائے امن کے متلاشی ہیں اور جو غربت، افلاس اور انسانی فلاح و بہبود پر اس سرمائے کو خرچ کرنا چاہتے ہیں جو بدقسمتی سے جنگوں پر خرچ کیا جا رہا ہے۔ بعض تراجم تو اس قدر جان دار ہیں کہ تخلیق کی سرحدوں کو چھوتے دکھائی دیتے ہیں۔ جیسے حارث خلیق کی نظم ''چاغی اور پوکھرن'' کے چند مصرعے دیکھیے:

جن کے کپڑے اور جوتے جیسے صحرائی انار/ سخت رو، تڑخے ہوئے/ بے دریغانہ ہوا اک
جنگ کا آغاز ہے/ امید فردا کے خلاف [۵۰]

اس سے قبل دونوں عالمی جنگوں سے متعلق جو ادب تخلیق کیا گیا اس کی بھی ایک طویل فہرست اردو کی تاریخ میں موجود ہے۔ دونوں عالمی جنگوں کے حوالے سے جو ادب تخلیق کیا گیا، جو کتب، دستاویزیں اور فلمیں تیار ہوئیں، ان سے جنگ کی تاریخ اور جنگ کے متعلقات کو سمجھنے میں کافی مدد ملتی ہے۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد عالمی سیاست کو جن ملکوں نے متاثر کیا ان میں ترکی، ٹریپولی اور ہندوستان سب سے زیادہ اہم سمجھے جاتے ہیں۔ اٹلی نے جب طرابلس پر حملہ کیا تھا تو راشد الخیری اور سجاد حیدر یلدرم جیسے افسانہ نگاروں نے اس موضوع پر خوب قلم اٹھایا۔ جنگ بلقان پر کئی افسانے، ناول اور نظمیں لکھی گئیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے ''محاصرۂ ادرنہ'' جیسی تحریریں قلم بند کیں۔ اپنے پرچوں ''الہلال'' اور ''البلاغ'' میں جنگی مناظر پیش کر کے ادبی رکھ رکھاؤ کے ساتھ معلومات کی ترسیل کو ممکن بنایا [۵۱]۔ اقبال کے مجموعۂ کلام ''ضرب کلیم'' میں سیاسیات مشرق و مغرب کے عنوان سے لکھی گئی متعدد نظمیں اس سیاسی کش مکش کا منظر نامہ ہیں جو اس عہد میں رونما ہو رہی تھیں۔ شہنشاہیت، جمہوریت، اشتراکیت، فسطائیت، نازی ازم اور دیگر تمام رجحانات پر اقبال نے کھل کر اظہار کیا۔ اپنی نظم ''اشتراکیت'' میں واضح طور پر کہا کہ:

قوموں کی روش سے مجھے ہوتا ہے یہ معلوم بے سود نہیں روس کی یہ گرمیِ گفتار
اندیشہ ہوا شوخیِ افکار پہ مجبور فرسودہ طریقوں سے زمانہ ہوا بے زار [۵۲]

روس سمیت مغرب کے متعدد ممالک میں کمیون ازم اور اشتراکی رجحانات کے بڑھتے ہوئے عمل دخل کو دیکھ کر اپنی نظم ''کارل مارکس کی آواز'' میں وہ برملا کہتے ہیں کہ:

جہانِ مغرب کے بت کدوں میں کلیساؤں میں مدرسوں میں
ہوس کی خوں ریزیاں چھپاتی ہے عقلِ عیار کی نمائش [۵۳]

یورپ کی سرکردہ قومیں ملوکیت کے جو خواب دیکھ رہی تھیں، اس نے پوری دنیا کو آگ اور خون میں نہلا دیا تھا۔ اقبال نے مغربی استعماری رویّے اور لیگ آف نیشنز پہ طنز کرتے ہوئے کہا کہ:

دیکھا ہے ملوکیتِ افرنگ نے جو خواب　　ممکن ہے کہ اس خواب کی تعبیر بدل جائے
طہران ہو گر عالمِ مشرق کا جنیوا　　شاید کرہِ ارض کی تقدیر بدل جائے[۵۴]

جنگ عظیم دوم کے دوران مسولینی کے خلاف جو محاذ بنا، اقبال نے تو اس پر تو طنز کے نشتر چلائے اس کے ساتھ ساتھ یورپی اقوام کے مظالم کا پردہ چاک کرتے ہوئے انھوں نے واضح طور پر مسولینی کی زبان سے یہ کلمات کہلوائے کہ:

پردۂ تہذیب میں غارت گری، آدم کشی　　کل روا رکھی تھی تم نے، میں روا رکھتا ہوں آج[۵۵]

اقبال نے مغربی استعماری رویّوں کے خلاف ببانگِ دہل آواز بلند کی۔ جارح قوموں کے رویے اور ظلم کے خلاف طنزیہ انداز میں آئینہ دکھاتے ہوئے اقبال نے کہا کہ:

کیا زمانے سے نرالا ہے مسولینی کا جرم　　بے محل بگڑا ہے معصومانِ یورپ کا مزاج
میرے سودائے ملوکیّت کو ٹھکراتے ہو تم　　تم نے کیا توڑے نہیں کمزور قوموں کے زجاج
آلِ سیزر چوبِ نے کی آبیاری میں رہے　　اور تم دنیا کے بنجر بھی نہ چھوڑو بے خراج
تم نے لوٹے بے نوا صحرا نشینو کے خیام　　تم نے لوٹی کشتِ دہقاں، تم نے لوٹے تخت و تاج[۵۶]

مجلس اقوام کی کمزوری اور طاقت ور ممالک کے دباؤ کا شکار ہو کر کیے جانے والے فیصلوں کو بھی اقبال نے اس دور میں بہ غور دیکھا اور اس کی ساکھ پر سوالیہ نشان اٹھاتے ہوئے اپنی ایک نظم ''جمعیت اقوام'' میں کہا کہ:

بے چاری کئی روز سے دم توڑ رہی ہے　　ڈر ہے خبر بد نہ مرے منھ سے نکل جائے[۵۷]

اقبال کی ان نظموں کے مطالعے سے دوسری عالمی جنگ کے پس منظر اور وجوہات تک کو جاننے میں بھرپور مدد ملتی ہے۔ اس سے قبل ''پیام مشرق'' کے دیباچے میں بھی وہ جنگ عظیم اوّل کی تباہ کاریوں کا ذکر کچھ ان الفاظ میں کرتے دکھائی دیتے ہیں:

> یورپ کی جنگ عظیم ایک قیامت تھی جس نے پرانی دنیا کے نظام کو قریباً ہر پہلو سے فنا کر دیا ہے اور اب تہذیب و تمدن کے خاکستر سے فطرت زندگی کی گہرائیوں میں ایک نیا آدم اور اس کے رہنے کے لیے ایک نئی دنیا تعمیر کر رہی ہے جس کا ایک دھندلا سا خاکہ ہمیں حکیم آئن سٹائن اور برگساں کے تصانیف میں ملتا ہے۔ یورپ نے اپنے علمی، اخلاقی اور اقتصادی نصب العین کے خوف ناک نتائج اپنی آنکھوں سے دیکھ لیے ہیں... جنگ عظیم کی کوفت کے بعد یورپ کے قوائے حیات کا اضمحلال ایک صحیح اور پختہ ادبی نصب العین کی نشو و نما کے لیے نامساعد ہے[۵۸]۔

اقبال کی یہ بات صدفی صد درست ثابت ہوئی۔ یورپ پہلی عالمی جنگ کے محض ۲۵ برس کے اندر ہی دوسری خوں ریزی تباہ کن عالمی جنگ کا شکار ہوا۔ اقبال کے تمام اندیشے درست ثابت ہوئے۔ گو اقبال نے دوسری عالمی جنگ کی تباہ کاری نہیں دیکھی اور اس سے قبل ۱۹۳۸ء میں وہ انتقال کر گئے لیکن ان کی کہی ہوئی اکثر باتیں وقتاً فوقتاً درست ثابت ہوئیں۔ پیام مشرق کی اکثر فارسی نظمیں اسی خاص سیاسی ماحول میں کہی گئیں جن کا مطالعہ بھی جنگ عظیم اوّل کے محرکات اور نقصانات کو سمجھنے کے لیے خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔

جنگ عظیم اوّل کے بعد مسلم دنیا کو جس طرح ٹکڑوں میں تقسیم کیا گیا۔ عرب اور عجم کا جھگڑا پیدا کر کے استعمار نے اپنے مذموم

مقاصد کی تکمیل کے لیے ہر وہ راستہ اختیار کیا جس سے مسلمان انتشار کا شکار رہیں۔ظفر علی خان نے اسی پس منظر کو سامنے رکھتے ہوئے ۱۹۲۰ء میں مختصر سی نظم ''خلافت کی بنیاد'' میں مسلمانوں کو تنبیہ کی کہ:

نئی اک قبا کو سلاتے ہوئے   خلافت کی بنیاد اُکھیڑو گے تم
تو اچھی طرح سے سمجھ لو یہ بات   خود اپنے ہی بخیے اُدھیڑو گے تم
عرب اور عجم سے الگ ہی رہو   کہاں تک یہ جھگڑے نبیڑو گے تم[۵۹]

''نئی صلیبی جنگ'' کے عنوان سے لکھی گئی نظم میں بھی مغرب کی چیرہ دستی اور کمزوروں پر مشق ستم کا احوال بیان کرتے ہوئے ظفر علی خان کا کہنا تھا کہ:

بتا رہی ہے دراز دستی اطالیہ کی طرابلس پر   کہ آج کشور کشا وہی ہے جسے ذرا مشقِ رہزنی ہے
ہوا ہے ایماں جہاں سے رخصت اٹھا ہے انصاف کا جنازہ   جہاں میں چھا جائے گا اندھیرا یہی جو یورپ کی روشنی ہے[۶۰]

مغرب نے دو عظیم جنگوں کے نتیجے میں عالمی امن کو جس طرح پارہ پارہ کیا اس کی مثال تاریخ انسانی میں نہیں ملتی۔ پہلی جنگ عظیم کے دوران طرابلس پر اٹلی کے حملے کے بعد جس طرح دنیا کا امن متاثر ہوا، اس طرف اشارہ کرتے ہوئے ظفر علی خان انتہائی دکھی دل کے ساتھ کہتے ہیں کہ:

یہ چوتھے آسماں پہ جا کے عیسیٰؑ سے کوئی کہہ دے   کہ نکلی آپؑ کی امت ہے قصرِ امن ڈھانے کو[۶۱]

طرابلس اور بلقان کی جنگوں پر لکھی گئی ان کی نظمیں ''کارزارِ طرابلس''، ''جنگ طرابلس''، ''بادل میں بجلی''، ''سمندر انور''، ''دنیائے توحید پر دنیائے تثلیث کی تاخت'' اور ''سراڈور ڈگرے'' وغیرہ بڑے اہمیت کی حامل ہیں[۶۲]۔ گو ان نظموں میں حقیقت کے برعکس مسلمانوں کی برتری کا ڈنکا ضرور پیٹا گیا لیکن جنگ کے دوران پیش آنے والے بہت سے معاملات کی درست عکاسی بھی ان نظموں میں موجود ہے۔ وہ مسلمانوں کی حالت زار پر ایک سچے مسلم کی طرح دعائیہ انداز اختیار کرتے ہوئے خدا سے اچھی امید باندھے رکھتے ہیں:

خدا نے جو چاہا تو پاپائیوں کو   ملے گی نہ راہِ مفر دیکھ لیجے[۶۳]

ظفر علی خان نے جنگ عظیم اوّل اور دوم، دونوں کی تباہ کاریاں اپنی آنکھوں سے دیکھیں۔ بین الاقوامی سازشیں اور ہوس اقتدار کا شکار ہو کر لاکھوں لوگوں کے خون سے اس خطۂ زمین کو رنگین ہوتے دیکھا لہٰذا دوسری عالمی جنگ کے منظر نامے سے متعلق بھی ان کی نظموں میں متعدد حوالے ملتے ہیں۔ ''یورپ کے دو قذاق'' کے عنوان سے لکھی گئی نظم میں انھوں نے روس اور جرمنی کی ساز باز کا پردہ چاک کرتے ہوئے پولینڈ میں کھیلی جانے والی خون کی ہولی کو سخت تنقید کا نشانہ بنایا۔ اس بابت ان کا کہنا ہے کہ:

اپنی جیبوں سے رہیں اقوامِ عالم ہوشیار   سر پہ آ پہنچے فرنگستاں کے قطّاع الطریق
کیوں نہ ہوتی روس سے المانیہ کی ساز باز   چور ہی آخر ہوا کرتے ہیں چوروں کے رفیق
حصے بخرے کر لیے دونوں نے پولستان کے   خونِ نا حق کے سمندر کا یہ کشور ہے غریق
ہم نے یہ مانا کہ سنگیں ہے حصارِ جرمنی   سخت تر لیکن ہے انگلستاں کی برقی منجنیق[۶۴]

اکتوبر ۱۹۳۹ء میں لکھی گئی اس نظم میں جس طرح وہ اقوام عالم کو متنبہ کر رہے ہیں، اس سے مولانا ظفر علی خان کی دوراندیشی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اگلے تین چار برسوں میں پیش آنے والے حالات نے ثابت کیا کہ ان کے خدشات درست ثابت ہوئے اور جرمنی نے اپنے اتحادی روس پر بھی محض دو برسوں بعد چڑھائی کر دی۔ اپنی ایک اور نظم ''چیمبرلین کا جنگی ترانہ'' میں بھی وہ پولینڈ پر ہٹلر کی چڑھائی کو سخت تنقید کا نشانہ بناتے دکھائی دیتے ہیں۔ پولینڈ کی حمایت میں برطانوی ردعمل اور روس کی پالیسی پر ان کا کہنا تھا کہ:

دلاتے ہیں یہ اطمینان چیمبرلین پولوں کو ۔۔۔ چھڑا سکتے ہیں ہم اب بھی عقابوں سے ممولوں کو
مقدر ہو چکی ہے فتح انگریزی عساکر کی ۔۔۔ پڑا پھوڑا کرے ہٹلر جلے دل کے پھپھولوں کو
نبٹ کر نازیوں سے روس کو بھی ہم سمجھ لیں گے ۔۔۔ کبھی اُس پر بھی پھٹنا ہے ہمارے بم کے گولوں کو[۶۵]

مذکورہ نظم اپریل ۱۹۴۰ء میں لکھی گئی۔ اس وقت تک جرمنی پے در پے حملے کر کے متعدد یورپی اقوام کی اینٹ سے اینٹ بجا چکا تھا لیکن بعد کے برسوں میں برطانوی فوج کا پلڑا بھاری رہا۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ اسی نظم میں انھوں نے اٹلی کے حکمران مسولینی کی بابت پیشن گوئی کرتے ہوئے کہا تھا کہ:

مسولینی کا سر اٹلی میں مونڈا جائے گا جس دن ۔۔۔ برستا دیکھ لو گے اس پر انگلستاں کے اولوں کو[۶۶]

نظم کی تخلیق کے دو برس بعد دنیا نے دیکھا کہ ۲۶ جولائی ۱۹۴۳ء کو مسولینی کی حکومت کا تختہ الٹ کر اسے پھانسی پر چڑھا دیا گیا۔ یہاں تک کہ اس کی لاش تک کو جلا ڈالا گیا۔ ان کی متعدد نظموں میں دوسری جنگ عظیم کے فریقین سے متعلق بہت سا مواد موجود ہے۔ کبھی وہ ماسکو اور برلن کے اتحاد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

ماسکو سے ہو رہا ہے رشتہ برلن کا قریب ۔۔۔ طوق ہٹلر کا ہے اور گردن ہے مولوٹاف کی[۶۷]

اور کبھی وہ مسولینی کی شکست خوردگی میں اور یونان کی فتح کے تناظر میں یہ کہتے دکھائی دیتے ہیں کہ:

چلتا نہیں انگریزوں پر فسطائیوں کا بس ۔۔۔ ایک ایک کفن چور کے سرکوب ہیں دس دس
کم بخت مسولینی کو کیا اس کی خبر تھی ۔۔۔ دنگل میں اترتے ہی نکل جائے گا بھرکس
بے گور و کفن چھوڑ کے بھاگا جسے رن سے ۔۔۔ اس لاش پہ منڈلاتے ہیں یونان کے کرگس[۶۸]

جنگ عظیم دوم کے پس منظر میں مولانا ظفر علی خان مسلمانوں کے لیے امید افزا صورت حال کی نوید دیتے دکھائی دیتے ہیں۔ یورپ کی حربی اور معاشی کمزوریوں کا حال ان کے سامنے پوری طرح عیاں ہو چکا تھا۔ اسی لیے وہ اپنی نظم ''جنگ یورپ اور مشرق وسطیٰ'' کے عنوان سے لکھی گئی نظم میں مسلمانوں کے درخشاں مستقبل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

چھڑی جس روز سے مغرب میں ہے جنگِ حق و باطل ۔۔۔ درخشاں مجھ کو آتا ہے نظر مشرق کا مستقبل
فلسطین و عراق و شام کے دن پھرنے والے ہیں ۔۔۔ میری امداد حاضر ہے عرب ہوتا ہے کیوں بد دل
یمن ہوں یا عراق و مصر ہوں اچھی طرح سن لیں ۔۔۔ کہ آساں ہونے والی ہے بہت جلد ان کی ہر مشکل
پڑا ہے غلغلا ہٹلر کی ان منطق کا برلن میں ۔۔۔ جسے لندن سمجھتا ہے محض اک سعیِ لا حاصل[۶۹]

صرف مشرق وسطیٰ ہی نہیں بلکہ جنگ عظیم دوم کے بعد کمزور برطانیہ ہندوستان پر بھی اپنا تسلط برقرار نہ رکھ سکا اور بالآخر برصغیر

میں بھی آزادی کا سورج طلوع ہوا۔

جوش کے زمانے میں مغرب سے لے کر مشرق اور شمال سے لے کر جنوب تک نو آبادیاتی یا دوسرے لفظوں میں نئی نو آبادیاتی سامراجیت کی بلاشرکت غیرے آمریت کا تسلط تھا اور اس تسلط سے نکلنے کی کوئی راہ دکھائی نہیں دیتی تھی۔ برطانوی مارکٹ اور انقلابی کارکن آرنسٹ جونز نے انیسویں صدی کے اواخر میں لکھا تھا کہ: "On its colonies the sun never sets and the blood never dries" یعنی نو آبادیاتی سلطنت میں سورج کبھی غروب نہیں ہوتا اور بہتا خون کبھی جمتا نہیں۔ یہ تبصرہ اس وقت کی عالمی صورت حال میں بھی اتنا ہی سچ تھا اور موجودہ تناظر میں بھی اس سچ سے نظریں نہیں چرا سکتے۔ جوش کی شاعری دراصل سامراج کے اُنھی ہتھکنڈوں کے تناظر میں ابھر کر سامنے آئی۔ سامراج شکن اس شاعری کو عالمی تناظر میں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ ان کی شاعری میں رزمیہ لہجے کی ابھرتی ہوئی لے اور مزاحمت کی تخلیقی قوت کا فقدان نہیں اور یہی وہ فنی اور جمالیاتی تحریک تھی جو نعروں اور نظریوں کو بھی شاہ کار تخلیق بنا دیتی ہے۔ ان کی شاعری میں یہ مثالیں نمایاں اور واضح ہیں [۷۰]۔ سامراج کی مسلط کردہ جنگوں نے عالمی سطح پر بھوک اور افلاس کی جو صورت حال پیدا کر دی اور اقوام عالم عالمی کساد بازاری کا شکار ہوئی، جوش اس پر سخت مضطرب دکھائی دیتے ہیں۔ قحط اور بڑھتے ہوئے معاشی انتشار دراصل انھی جنگوں کے نتیجے میں سر اٹھانے لگے تھے۔ جوش نے اپنی ایک نظم ''حالاتِ حاضرہ! بہ زمانۂ جنگ'' میں جنگوں کی ہولناکی اور تباہی کا ذکر کرتے ہوئے درست کہا کہ جنگ کے بعد:

ہر چیز پر سکوت ہے ہر شے پہ یاس ہے	غم حکمراں ہے دہر میں دنیا اداس ہے
سلطاں بڑھے ہیں دہر کے لشکر لیے ہوئے	اور ان کے ساتھ قحط بھی خنجر لیے ہوئے
یہ جنگ کیا ہے ایک مجسم جنون ہے	گلزارِ کائنات کے تھالوں میں خون ہے
خلقت تمام قید سے بے آب و دانہ ہے	اس پر وبا کا زور یہ کیسا زمانہ ہے [۷۱]

بیسویں صدی کی ابتدائی چار دہائیوں میں ہندوستانی پڑھے لکھے طبقے کو برطانوی غلامی کا احساس شدت سے کھٹکنے لگا تھا۔ جوش کے ہاں بھی ان نو آبادیاتی حکمرانوں کے خلاف شدید ردِعمل پایا جاتا ہے۔ نو آبادیاتی حکمرانوں، سامراجیت اور اس کے تابوت میں کیلیں ٹھوکنے کا جو مشن جوش نے شروع کیا تھا، اجتماعی سطح پر اس کے گہرے اثرات مرتب ہوئے۔ ''وفادارانِ ازلی کا پیام شہنشاہِ ہندوستان کے نام'' میں تہنیتی انداز میں شہنشاہِ برطانیہ پر جو طنز کے تیر جوش نے برسائے وہ دراصل اسی نو آبادیاتی سامراجیت کے خلاف ایک ردِعمل ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

تاج پوشی کا مبارک دن ہے، اے عالم پناہ	اے غریبوں کے امیر، اے مفلسوں کے بادشاہ
اے رئیسِ پاک دل اے شہریارِ نیک نام	بھوک کی ماری ہوئی مخلوق کا پہنچے سلام
لیکن اتنا ڈرتے ڈرتے عرض کرتے ہیں حضور	ہند سے واقف کیے جاتے نہیں شاید حضور
آپ کے ہندوستاں کے جسم پر بوٹی نہیں	تن پہ ایک دھجی نہیں ہے پیٹ کو روٹی نہیں [۷۲]

اسی طرح اپنی نظم ''خونی بینڈ'' میں بھی جو فوجی بوٹوں، تیروں اور شمشیروں کے زور پر روندی ہوئی نعشوں اور ان نعشوں پر بلکتے سسکتے بچوں کی آہ و بکا پر مغموم دکھائی دیتے ہیں۔ اس کیفیت میں ان کا لہجہ تلخ اور ترش ہو جاتا ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

روح بے چین ہے، خاموش ہو اے فوج کے بینڈ
اس طرح صبح کی مخمور ہواؤں پہ نہ اینڈ
تجھ میں آواز ہے فولاد شکن تیروں کی
سنسناہٹ ہے لچکتی ہوئی شمشیروں کی
کتنی ماؤں کے کلیجے کی ہیں قاشیں تجھ میں
کتنے ماہ پارہ جوانوں کی ہیں لاشیں تجھ میں
کتنی روندی ہوئی لاشوں کی ہے سردی تجھ میں
کتنی بیواؤں کے چہرے کی ہے زردی تجھ میں
کتنی خوابیدہ ہیں مایوس نگاہیں تجھ میں
کتنے معصوم یتیموں کی ہیں آہیں تجھ میں[۴۳]

''ایسٹ انڈیا کے فرزندوں سے خطاب'' میں ان کے لہجے میں طنز کے نشتر کو بہ خوبی محسوس کیا جا سکتا ہے۔ مغربی استعمار نے جب ہٹلر کو ''بھیڑیا'' کے لقب سے نوازا اور جرمنی کو انسانیت دشمن قوم قرار دے کر اس کے خلاف صف بندی شروع کی تو جوش نے انگریزوں کو ان کے طرزِ عمل کی یاد دلاتے ہوئے کہا کہ:

کس زباں سے کہہ رہے ہو آج تم سوداگرو؟
دہر میں انسانیت کے نام کو اونچا کرو
''جس کو سب کہتے تھے ہٹلر، بھیڑیا ہے بھیڑیا''
بھیڑیے کو مار دو گولی پئے امن و بقا
ہاتھ ہے ہٹلر کا رخشِ خود سری کی باگ پر
تیغ کا پانی چھڑک دو جرمنی کی آگ پر[۴۴]

انگریز استعماریت، غلامی، نوآبادیاتی جبر اور جنگوں کی تباہ کاری کے خلاف جوش اس دور میں سب سے زیادہ موثر آواز بن کر ابھرے۔ ''ایسٹ انڈیا کے فرزندوں سے خطاب''، ''شکستِ زنداں کا خواب''، ''لمحۂ آزادی''، ''اللہ کرے''، ''آثارِ انقلاب'' اور ''وطن'' وغیرہ جیسی نظموں کو انگریز حکام نے ضبط بھی کیا۔ ان کی انقلابی نظموں میں آتشیں سیال کا ابال اور جذبے کی شدت کو محسوس کیا جا سکتا ہے۔ جنگ عظیم کی تباہ کاریوں کے بعد کمزور برطانوی استعمار نے جو مفاہمانہ رویّہ اختیار کیا خصوصاً ہندوستان کے داخلی معاملات میں ان کی حکمت عملی میں جو تبدیلی آئی اس پر جوش کو ذرا بھی حیرت نہیں ہوئی بلکہ وہ طنز کے نشتر چلاتے ہوئے برطانوی استعمار کو ان کے ماضی میں ڈھائے جانے والے قہر کی یاد دلاتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

لیکن آج اخلاق کی تلقین فرماتے ہو تم
ہو نہ ہو اپنے میں اب قوت نہیں پاتے ہو تم
آج شاید منزلِ قوت میں تم رہتے نہیں
جس کی لاٹھی اس کی بھینس اب کس لیے کہتے نہیں؟
کیا کہا ''انصاف ہے انساں کا فرضِ اوّلیں''
کیا فساد وظلم کا اب تم میں کس باقی نہیں؟
دیر سے بیٹھے ہو نخلِ راستی کی چھاؤں میں
کیا خدا نا کردہ کچھ موچ آ گئی ہے پاؤں میں؟
گونج ٹاپوں کی نہ آبادی نہ ویرانے میں ہے
خیر تو ہے اسپ تازی کیا شفا خانے میں ہے؟
آج کل تو ہر نظر میں رحم کا انداز ہے
کچھ طبیعت کیا نصیبِ دشمناں ناساز ہے؟
سانس کیا اکھڑی کہ حق کے نام پر مرنے لگے
نوعِ انساں کی ہوا خواہی کا دم بھرنے لگے
ظلم بھولے راگنی انصاف کی گانے لگے
لگ گئی ہے آگ کیا گھر میں کہ چلّانے لگے؟
خیر اے سوداگرو اب ہے تو بس اس بات میں
وقت کے فرمان کے آگے جھکا دو گردنیں
اک کہانی وقت لکھے گا نئے مضمون کی
جس کی سرخی کو ضرورت ہے تمھارے خون کی[۴۵]

ان کے خیال میں جنگ عظیم کے بعد بہت سے مسائل خود بہ خود ختم ہونے والے ہیں۔ محکوم قوموں کو آزادی ملے گی اور دنیا سے ظلم و جبر کا خاتمہ ہو جائے گا۔ اسی لیے ایک رباعی میں وہ کہتے ہیں کہ:

اک دل بھی نہیں رہے گا گندا اے دوست — کھل جائے گا ہر گلے کا پھندا اے دوست
اس عظیم جنگ کے شدائد پہ نہ جا — لکڑی پہ چل رہا ہے رندا اے دوست[۷۶]

وہ ان غازیوں کو سراہتے ہیں جنھوں نے وطن کی آزادی کی خاطر کسی بھی قربانی سے دریغ نہیں کیا۔ ہر مشکل کو بہ خوشی سہہ جاتے ہیں اور استعمار کے خلاف سیسہ پلائی دیوار بن جاتے ہیں۔ جوش ان کے بارے میں کہتے ہیں کہ:

قسم ان غازیوں کی موت سے جو جنگ کرتے ہیں — اَپی تلوار کی بُرّشش سے جن کے زخم بھرتے ہیں
قسم ان کی جو ہنس کر خون میں اپنے نہاتے ہیں — خوشی سے رن میں ڈٹ کر منھ پہ تلواریں جو کھاتے ہیں
قسم ان کی نظر تیر و سناں سے جن کی لڑتی ہے — اکڑ جاتے ہیں طبلِ جنگ پر جب چوب پڑتی ہے[۷۷]

''ملکوں کا رجز'' کے عنوان سے لکھی گئی نظم میں بھی انھوں نے انگلستان، امریکا، فرانس، جرمنی، روس، جاپان، ترکی، ایران، افغانستان اور ہندوستان کی بابت ایک ایک بند میں اظہارِ خیال کرتے ہوئے جنگ عظیم میں ان ممالک کے کردار پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ جرمنی کی پہلی جنگ عظیم میں شکست کے بعد پھر سے اپنے آپ کو عالمی سطح پر عزت مقام دلانے کی کوششوں کی بابت ان کا کہنا تھا کہ:

خرابی سے ہمیشہ درسِ استحکام لیتا ہوں — حریفوں کے نزاعِ باہمی سے کام لیتا ہوں
عروسِ ارتقا کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتا — جو چھٹ جاتا ہے تو پھر بڑھ کے دامن تھام لیتا ہوں
خدا چاہے تو پھر اب تیغِ خوں آشام لیتا ہوں[۷۸]

پہلی جنگ عظیم نے تو برصغیر پاک و ہند پر اہم اور شدید اثرات مرتب کیے لیکن دوسری جنگ عظیم نے یقیناً اس خطے کو ہر لحاظ سے متاثر کیا۔ ایک طرف ہٹلر اور مسولینی کی فسطائیت تھی اور دوسری طرف امریکا، برطانیہ اور روس کا اتحاد، لہٰذا ان ممالک کی نو آبادیات کو بھی اس ضمن میں اپنا کردار ادا کرنا پڑا۔ ہندوستان کی جنوب مشرقی سرحدوں تک جن میں برما بھی شامل ہے، جاپان نے حملہ کر دیا تھا لہٰذا برطانیہ نے اس خطے کے استحکام کے لیے اپنی فوجی قوت بڑھانے کا سلسلہ شروع کیا۔ برٹش انڈیا آرمی قائم ہوئی تو ہمارے سرکردہ ادیب اور شاعر مثلاً ن۔م۔ راشد، فیض احمد فیض، چراغ حسن حسرت، سید ضمیر جعفری وغیرہ نے اس میں شمولیت بھی اختیار کر لی۔ حفیظ جالندھری بھی پبلسٹی سانگ کے محکمے (War Publicity Department) سے وابستہ ہو گئے۔ اس زمانے میں لکھا گیا ایک گیت ''میں تو چھورے کو بھرتی کرا آئی رے'' بے حد مقبول ہوا[۷۹]۔ اس کے علاوہ ان جنگوں نے پوری دنیا پر جو موت کے گہرے سائے ڈال رکھے تھے، اس کی بابت حفیظ نے اپنی ایک نظم ''موت کا قافلہ'' میں لکھا کہ:

آہوں کے ڈیرے ساتھ ہیں — گہرے اندھیرے ساتھ ہیں
حسرت بھری خاموشیاں — ہیں ساتھ ساتھ اس کے رواں
یہ قافلہ ہے موت کا — آتی ہے آوازِ ردا

پنجے درندوں کی طرح بازو پرندوں کی طرح
ہے ہڈیوں کے ڈھانچ پر افسردگی لپٹی ہوئی
پچکے ہوئے سے گال ہیں بکھرے ہوئے سے بال ہیں
بازو پرندوں کی طرح پنجے درندوں کی طرح[80]

جنگ کے خوف ناک ماحول میں جس طرح سے انسانیت کا قتل عام ہوا اس نے پوری دنیا کے ادیبوں اور شاعروں کو متاثر کیا۔ معروف شعرا کے علاوہ بعض ایسے گم نام شعرا کی نظمیں بھی ان موضوعات کا براہ راست احاطہ کرتی نظر آتی ہیں۔ ایسے ہی ایک غیر معروف شاعر گرمکھ سنگھ کی ایک نظم ''انقلاب'' کو بھی خلیق انجم نے ''ضبط شدہ نظمیں'' میں شامل کیا۔ اس نظم کا ماحول دیکھیے :

پھر چمن زاروں سے آتی ہے صدائے انقلاب انقلاب اے انقلاب اے انقلاب اے انقلاب
تا کجا انساں پییں گے اپنے بھائی کا لہو تا کجا ان سے نہ جائے گی درندوں کی یہ خو
تا کجا کرتے رہیں گے امتیازِ رنگ و بو[81]

سیماب اکبر آبادی نے بھی جنگ وجدل سے متاثر ہو کر انقلابی نظمیں کہیں لیکن ان کی نظموں سے نہ شعلۂ جنوں بھڑکتا ہے اور نہ خون کی گردش تیز ہوتی ہے۔ ''بساطِ سیاست'' ان کی طویل نظموں میں سے ایک ہے۔ یہ ''کارِ امروز'' کی مشہور نظم ہے۔ اس نظم میں سکندرِ اعظم، قیصرِ روم، خالد بن ولیدؓ، سلطان صلاح الدین ایوبی، نپولین، لینن، رضا شاہ پہلوی اور دلیرا سمیت دیگر سیاسی رہنماؤں کی سیاسی سرگرمیوں کا تجزیہ کیا گیا ہے[82]۔ اس نظم کے مطالعے سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ انھیں بین الاقوامی سیاست اور تاریخ سے کس قدر دلچسپی تھی۔ انھوں نے ''جنگی ترانہ'' کے عنوان سے لکھی گئی نظم میں میدانِ جنگ کے مناظر دکھاتے ہوئے کہا کہ:

یہ دشمنوں کے مورچے فقط ہیں ڈھیر خاک کے
تمھارے سامنے جمے کہاں کسی میں حوصلے؟
نہیں ہو تم کسی سے کم بڑھے چلو، بڑھے چلو... دلاورانِ تیز دم[83]

''اسٹالن، ہر ہٹلر، مسولینی'' کے عنوان سے لکھی گئی نظم میں وہ آمریت اور خودسری کے نتیجے میں پیدا ہونے والی صورت کا تجزیہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

ذہنِ انساں پر مسلط ہے جنونِ خود سری شخصیت سازی کا سودا، وحشتِ ڈکٹیٹری
پھر نیا پہلو نظامِ دہر بدلے گا ضرور وقت کی دو کروٹیں ہیں قیصری و ہٹلری[84]

دوسری جنگ عظیم میں کثرت سے استعمال ہونے والے ہتھیاروں نے جو ہلاکتوں کے سامان پیدا کیے، اس کی جانب اشارہ کرتے ہوئے نظم ''امن و جنگ'' میں کہتے ہیں کہ:

قیامت کیوں بپا کی جائے ہتھیاروں کی کثرت سے تباہی آفریں کل دار توپوں کا دھواں کیوں ہو؟
ہوا سے آگ کیوں برسائی جائے سطحِ عالم پر یہ آزادی کی لعنت جانشینِ آسماں کیوں ہو؟
نشاطِ زندگی میں کیوں بہ کثرت گیس زہریلی تم اپنی نوع کے سر پر بلائے ناگہاں کیوں ہو؟

سنو، فطرت کھلے لفظوں میں یہ اعلان کرتی ہے   خلافِ امن ہو دنیا تو حق دار اماں کیوں ہو؟[85]

مہلک گیسوں اور آتشیں ہتھیاروں سے ہونے والی کروڑوں ہلاکتوں کا کرب محسوس کرتے ہوئے شاعر مجلسِ اقوام کے کردار کو بھی سخت تنقید کا نشانہ بناتے دکھائی دیتے ہیں۔ نظم ''بلائے انتخاب'' میں وہ اس مجلس کے کردار پر سوالیہ نشان اٹھاتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

مجلسِ اقوام میں پھر ہو گئی تو بارياب   اے بلائے انتخاب
گھر کی دولت ہمعناں، گھر کا قبالہ ہم رکاب   اے بلائے انتخاب
صرف ہنگامی ہے غوغائے ریا کاری ترا   خلق بازاری ترا
یہ صلائے رنگ و بو، یہ دعوتِ شہد و شراب   اے بلائے انتخاب
کیا کریں گے قوم کی خدمت یہ قومیت فروش   ہمت و غیرت فروش
زرخریدہ ممبری، زائیدہِ منت خطاب   اے بلائے انتخاب[86]

ایک اور نظم ''مجلسِ اقوام'' میں بھی وہ کمزور ممالک کے ساتھ کی جانے والی ناانصافی اور جانب دارانہ رویے کے خلاف احتجاج کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ:

آج میں یہ پوچھتا ہوں مجلسِ اقوام سے   فائدہ ہنگامہ و آہنگِ بے ہنگام سے؟
ہے وہی دنیا کی شورش، ہے وہی جنگ و جلال   امنِ عالم پائے استعمار سے ہے پائے مال
پردہِ تہذیب میں جاری وہی تخریب ہے   صلح کی تحریک میں بھی جنگ کی ترغیب ہے
مرکزِ عدوان و نفرت ہے ترا ایوانِ ناز   جرمنی برگشتہ ہے، جاپان کو ہے احتراز
تو بنی تھی شورشِ عالم مٹانے کے لیے   بن گئی خود مرکزِ شورش زمانے کے لیے[87]

سیماب کا تجزیہ بلاشبہ درست معلوم ہوتا ہے۔ مجلس اقوام متحدہ پچھلی ایک صدی کے دوران خصوصاً دوسری جنگ عظیم کے زمانے میں باہمی تنازعات کو مٹانے میں کوئی خاص کردار ادا کرنے میں ناکام رہی۔ دنیا آج بھی اسی طرح فساد اور انتشار کا شکار دکھائی دیتی ہے جیسی کہ اس صدی کے آغاز میں پہلی جنگ عظیم کے زمانے میں تھی۔ مجلس اقوام سے سوال و جواب کا سلسلہ جب دراز ہوتا ہے تو ایک نظم ''اے شاعر امن وسلام'' میں وہ اس کا جواب بھی دیتے دکھائی دیتے ہیں۔ مجلس اقوام کے مطابق دنیا میں جنگ کے بادل اس وقت تک منڈلاتے رہیں گے جب تک لوگ قوم پرستی کے جذبات سے باہر نہیں نکلتے۔ ان کے مطابق:

لیکن ابھی تادور مسلط ہے سیاہی   آنے کو ہے دنیا پہ کوئی اور تباہی
آثار ہلاکت کے عیاں دیکھ رہی ہوں   اٹھتا ہوا اک سرخ دھواں دیکھ رہی ہوں
یہ کوششیں بے کار ہیں امن اور سکوں کی   میں بھی انھیں اک نوع سمجھتی ہوں جنوں کی
انسان وہ جب تک رہے آزاد رہیں گے   بٹ جائیں گے قوموں میں تو برباد رہیں گے
دنیا یونہی ناشادیوں میں شاد رہے گی   برباد کیے جائے گی، آباد رہے گی[88]

سیماب کی متعدد رباعیاں بھی عالمی جنگوں کے تناظر میں لکھی گئیں۔ ''عالم آشوب'' کے عنوان سے شائع ہونے والے اس

مجموعے میں ۱۹۴۰ء تا ۱۹۴۳ء کی بہت سی رباعیاں یورپ کے حالات و واقعات کا بھرپور احاطہ کرتی ہیں۔ انھوں نے دنیا کو اپنی خاص نظر سے دیکھا اور ان بین الاقوامی حالات کو قلم بند کیا۔ وہ کہتے ہیں کہ:

لندن میں وہ دورِ ارغوانی نہ رہا　　پیرس میں ذوقِ نغمہ خوانی نہ رہا
یورپ میں ہوئی موت کو وہ ارزانی　　امکانِ نشاطِ زندگانی نہ رہا[۸۹]

نہ ختم ہونے والی اس طویل جنگ میں ۶۱ ممالک کے پانچ کروڑ انسانوں کی ہلاکتوں کے بعد ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اب دنیا فنا ہونے والی ہے۔ اس کرب کا اظہار اپنی ایک رباعی میں یوں کرتے ہیں کہ:

شورش سے ہے ہنوز بے محابہ باقی　　ہر سو ہے مخالفت کا سودا باقی
کیا دیر ہے تکمیلِ فنا میں یا رب　　کتنی ابھی رہ گئی ہے دنیا باقی[۹۰]

نومبر ۱۹۴۰ء کے اواخر میں اٹلی نے جب یونان پر چڑھائی کی تو یونان نے اس کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور اٹلی کی فوجوں کو یونان سے باہر دھکیل دیا۔ سیماب یونانی فوجوں کی بہادری کا ذکر ایک رباعی میں اس طرح کرتے ہیں کہ:

یونانیوں میں بلا کا جوہر نکلا　　ہر شخص اپنی جگہ دلاور نکلا
اٹلی کو نہ راستہ ملا بڑھنے کو　　یونان مگر سدِّ سکندر نکلا[۹۱]

اطالوی فوج کی شکست اور مسولینی کا تختہ الٹائے جانے کی بابت بھی ایک رباعی میں یوں رقم طراز ہیں:

سنتے ہیں اطالیہ نے ہمت ہاری　　ڈالے ہتھیار ملک کی پَت ہاری
اقبال گیا پہلے مسولینی کا　　برٹش سے اب اٹلی کی حکومت ہاری[۹۲]

غرض کہ اس مجموعے کی اکثر رباعیاں جنگ عظیم دوم کے تناظر میں ہی لکھی گئی ہیں۔ ان رباعیوں میں شعری حسن کی کمی ضرور ہے لیکن یہ رباعیاں اس دور کے جنگی حالات کی دستاویز ہیں۔ ایسی دستاویز جس میں ایک دردمند دل رکھنے والے شاعر کا احساس بھی شامل ہے۔

اختر شیرانی رومانی مزاج رکھنے کے باوجود ان جنگی ماحول اور بربریت کی فضا کو دیکھ کر اس موضوع سے پہلوتہی نہ کر سکے۔ اپنی نظم ''ساقی اٹھ تلوار اٹھا'' میں انھوں نے عالمی سطح پر پھیلی جنگ کے وحشت ناک سائے کو دیکھ کر برملا یہ کہا کہ:

پھر کا گہِ انسانی پر خوں خواری و وحشت پھیلی ہے　　اقصائے زمیں ہے فتنوں سے پُر اور فتنوں کی ہیبت پھیلی ہے
یزداں کی حکومت مٹ سی گئی، شیطاں کی حکومت پھیلی ہے　　پھر غلغلۂ تاتار اٹھا، اٹھ ساقی اٹھ تلوار اٹھا
سربازوں کے جنگی نعروں سے پھر ساحل و میداں گونجتے ہیں　　طیّاروں کی آتش بازی سے ہامون و کہستاں گونجتے ہیں
دریاؤں کی تہہ میں توپوں کے بپھرے ہوئے طوفاں گونجتے ہیں　　یا دیو شرارہ خوار اٹھا، اٹھ ساقی اٹھ تلوار اٹھا[۹۳]

ماہر القادری بھی اس دور کے خوش فکر اور خوش گو شاعر شمار کیے جاتے تھے۔ ان کی شاعری میں اختر کی رومانیت اور جوش کی انقلابیت دیکھی جا سکتی ہے۔ عالمی جنگ کے تناظر میں ''ہٹلر کا اعلان اور شاعر کا جواب'' ان کی عمدہ نظم ہے۔ نظم کے پہلے حصے میں انھوں نے ہٹلر کے نظریہ حکومت کی تشریح خود ہٹلر کی زبانی کرتے ہوئے کہا کہ:

زندگی کا لطف ہے شانہ بہ شانہ مو بہ مو
درسِ امن و آشتی ہے صرف دیوانے کی ہو
دوسروں کے لطف و رحمت پر ہے جن کو اعتماد
میں بہا دیتا ہوں ان کمزور قوموں کا لہو
میری محفل گرم رہتی ہے لہو اور آگ سے
توڑ ڈالے میں نے اک مدت ہوئی جام و سبو
میرے ایوانوں کی زینت گیس اور بارود سے
رقص خانوں میں ملیں گے شاہدانِ خوب رو
پھول کا دیتا ہوں میں دنیا کو پتھر سے جواب
توپ کے منھ سے کیا کرتا ہوں اکثر گفتگو[۹۴]

اس کے جواب میں شاعر نے ہٹلر کو غرور و تکبر سے باز رہنے کی تلقین بھی کی اور اس کے ارادوں کو عالمی امن کے لیے سب سے بڑا خطرہ قرار دیا۔ ان کا کہنا تھا کہ:

پولینڈ کے تڑپتے ہوئے دل کی دھڑکنیں
اے کاش! تو ضمیر کے کانوں سے سُن سکے
شاید ترے ضمیر کو ہوگا نہ یہ پسند
تاریخ تجھ کو جابر و ظالم اگر لکھے
ان فتح مندیوں پہ نہ اترا، مآلِ سوچ
قدرت کا انتقام بڑا خوف ناک ہے[۹۵]

فراق گورکھپوری کی نظموں میں فکری، داخلی اور تہذیبی عناصر کے ساتھ ساتھ عصری آگہی بھی موجود ہے۔ ان کی کچھ نظموں میں ایک بے ساختہ پن اور چوپال کی عوامی فضا کو عوامی بول چال کے انداز میں پرکھنے کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ ان کی نظم ''آدھی رات'' اردو کی منتخب نظموں میں شامل کی جاسکتی ہے۔ نظم ''زمانۂ جنگ'' دوسری عالم گیر جنگ کے زمانے کی تخلیق ہے۔ شاعر نے بھیگی رات اور جنگ کی فضا میں سانس لیتے ذہنی پس منظر اور اضطراب کی کیفیت میں ڈوبی اندرونی فضا کو بڑے سلیقے سے پیش کیا ہے۔ نظم کے پہلے بند سے ہی شاعر پورے ماحول کو اپنی قید میں لے لیتا ہے جب کہ دوسرے بند میں اس جگہ کا مکانی تسلسل ٹوٹ کے زمان و مکان کا تسلسل آجاتا ہے اور شاعر بے اختیار کہتے ہیں کہ:

سپاہِ روس ہے اب کتنی دور برلن سے[۹۶]

یہ متحرک خیال فراق کی شاعری میں جا بہ جا دکھائی دیتا ہے۔ ان کے جمالیاتی شعور کی جھلک بھی ان نظموں میں دکھائی دیتی ہے۔ اس دور کے تمام ہی شعرا کا کلام عہد فرنگ میں بھی آتا ہے اور آزادی کے بعد بھی لیکن اپنی عمروں کی تفاوت کے باوجود اکثر شعرا کو ہم اسی دور کے نمائندہ شعرا میں شمار کرتے ہیں۔

۱۹۳۶ء سے ۱۹۴۷ء تک ترقی پسند مصنفین کا دور اس حوالے سے بھی اہمیت کا حامل ہے کہ اس دور کو اردو ادب کا ایک مثبت تخلیقی دور کہا جاتا ہے۔ اس دور کے اثرات آج بھی ہمارے ادب میں جاری ہیں۔ اس عہد میں جدید سیاسی بصیرت، معاشی و سماجی حالات کا ادراک اکثر شعرا کے ہاں دکھائی دیتا ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد ایک نئی تسخیر و تعمیر کا دور ضرور شروع ہوا۔ بڑی طاقتوں کی سرد جنگوں کا، ایشیا اور افریقا کے ممالک کی آزادی کا، جمہوریت کے کام یاب اور ناکام تجربات کا، شدید تر معاشی بے اعتدالی کا، ان تمام مسائل کے درمیان ادب کی وہ تحریکیں جواب تک غیر ملکی طاقتوں کو اپنا حریف سمجھتی تھیں، اپنے معاشرے میں نئی راہیں تلاش کرتی دکھائی دیتی ہیں[۹۷]۔ اس دور میں حسرت موہانی ترقی پسندوں سے قبل ہی اشترا کی نظریے کا پرچار کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ پہلی کمیونسٹ کانفرنس منعقدہ کان پور میں خود حسرت بھی استقبالیہ کمیٹی کے صدر کی حیثیت سے شریک تھے۔ اس وقت انھوں نے اس تحریک کے

اغراض ومقاصد کی بابت کھل کر اظہار خیال کیا۔ اپنے اشعار کے ذریعے بھی انھوں نے محنت کش اور مظلوم طبقے سے اپنی ہم دردی کا اظہار کھل کر کیا اور اس تحریک کے مستقبل کے لامحدود امکانات کی بشارت دی[98]۔ ان کا کہنا تھا کہ بہت جلد:

نہ سرمایہ داروں کی نخوت رہے گی　　نہ حکام کا جورَ بے جا رہے گا
زمانہ وہ جلد آنے والا ہے جس میں　　کسی کا نہ محنت پہ دعویٰ رہے گا[99]

اردو شاعری میں انسان دوستی اور سامراج دشمنی کا جذبہ تو بہت پہلے ہی سے موجود تھا لیکن ۱۹۳۵ء۔ ۱۹۳۶ء میں جب کہ دنیا دوسری جنگ عظیم کا بھیانک خواب دیکھ رہی تھی، فاش ازم کا خطرہ روز بروز بڑھ رہا تھا۔ ترقی پسند تحریک نے ایک واضح اور منظّم نصب العین کے تحت ان مسائل کو شاعری کا موضوع بنایا۔ بھوک، افلاس، سماجی پستی اور غلامی کے وہ مسائل جو اس وقت بین الاقوامی سطح پر پوری دنیا کو گھیرے میں لیے ہوئے تھے، ترقی پسندوں کے پسندیدہ موضوعات بنے۔ انھوں نے ایک نئی دنیا کی تخلیق کے لیے فضا ہم وار کرنی شروع کی۔ ۱۹۳۹ء میں دوسری جنگ عظیم کے شروع ہوتے ہی وائسرائے نے مجلس قانون ساز سے مشورہ کیے بغیر جب یہ اعلان کر دیا کہ ہندوستان جنگ میں اتحادیوں کا ساتھ دے گا، ردِعمل کے طور پر کانگریس کے وزرا نے احتجاجاً استعفیٰ دے دیا۔ کانگریس کے ذمے دار رہنما جمہوریت کی حمایت اور فسطائیت کی مخالفت کے سوال پر متفق تھے۔ ہندوستانی رائے عامہ جنگ کو لمحۂ غنیمت جان کر آزادی کے پُر زور مطالبے پر مُصر تھے[100]۔ اس زمانے میں علی سردار جعفری کی ایک نظم ''جنگ اور انقلاب'' کا یہ بند ملاحظہ کیجیے:

اڑ رہا ہے ظلم و استبداد کے چہرے سے رنگ　　چھوٹ رہا ہے وقت کی تلوار کے ماتھے سے زنگ
موت ہنس کر دیکھتی ہے آئینۂ تلوار میں　　زر پرستی کا سفینہ آ گیا منجھ دھار میں
خون کی بو سے مشامِ زندگی مخمور ہے　　گولیوں کی سنسناہٹ سے فضا معمور ہے
یہ ہے وہ زنجیر خود ہاتھوں سے ڈھالا تھا جسے　　یہ ہے وہ بجلی کہ خود خرمن نے پالا تھا جسے[101]

علی سردار جعفری نے ابتدا سے ہی سامراجی رویّوں کے خلاف علم بغاوت بلند کیا۔ ان کے پہلے مجموعے ''پرواز'' میں شامل نظم ''سماج'' میں انھوں نے دنیا بھر میں ہونے والی قتل و غارت گری، مذہب اور زر کے باعث ہونے والی لڑائی، سرمایہ دارانہ نظام اور ملوکیت کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتے ہوئے کہا کہ:

کہیں آپس میں اہلِ زر کے مذہب کی لڑائی ہے　　کہیں کھوٹے کھرے چاندی کے ٹکڑوں کی خدائی ہے
عیاں سفاکیاں پرہیز گاروں کی جبینوں سے　　ٹپکتا ہے لہو پیرِ حرم کی آستینوں سے
مظالم ڈھائے اس سرمایہ داری نے خدا بن کر　　تمدّن آ گیا وہم و گماں کا دیوتا بن کر
نظامِ کہنہ کے کندھوں پہ اصلاحوں کے لاشے ہیں　　بہت سے بت ملوکیّت کے آذر نے تراشے ہیں
دھمک پیروں کے نیچے ہیں گرج توپوں کی کانوں پر　　گھٹائیں جنگ کی منڈلا رہی ہیں آسمانوں پر
فضا بگڑی ہوئی ہے زہر پھیلا ہے ہواؤں میں　　نئی پرخاش ہے جھوٹی سیاست کے خداؤں میں
بیابانوں پہ حملہ ہے پہاڑوں پر چڑھائی ہے　　سمندر پر چھڑی ہے جنگ نہروں پر لڑائی ہے[102]

اس جنگی ماحول اور انسانیت دشمن رویّے پر وہ عالمی برادری کو سخت تنقید کا نشانہ بناتے دکھائی دیتے ہیں۔ یہ تنقید محض رسمی نہیں

بلکہ اگلی ہی نظم ''بغاوت'' میں اس فرسودہ نظام کے خلاف بغاوت کا اعلان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

بغاوت جبر و استبداد سے سرمایہ داری سے بغاوت رسمِ چنگیزی سے تہذیبِ تتاری سے
بغاوت سامراجی نظم و قانون و سیاست سے[۱۰۳] بغاوت دورِ حاضر کی حکومت سے ریاست سے

اپنی ایک اور نظم ''سامراجی لڑائی'' میں بھی انھوں نے جنگ و جدل کے اس ماحول اور قتل و غارت گری کے مناظر دکھاتے ہوئے دوسری جنگ عظیم کو انسانیت کی تاریخ میں بدترین دور قرار دیا اور اس دور کے عالمی رہنماؤں کے اقدام پر چنگیز خان، ہلاکو خان اور دیگر ظالم ترین حکم رانوں کی روح کو بھی شرمندہ دکھاتے ہوئے کہا کہ:

بدلے ارض و سما کے تیور ہیں شعلہ فشاں فضا میں خنجر
ہر سمت بپا ہے قتل و غارت انساں میں نہیں رہی محبت
طیارے ہیں پر فشاں ہوا میں بمبار گرجتے ہیں فضا میں
توپوں سے دہل رہی ہے دنیا اک آگ میں جل رہی ہے دنیا
بارود کی بو میں غرق یکسر پھولوں کی شمیم روح پرور
میدان ہے جنگ ہے جدل ہے سرمائے کے پیڑ کا یہ پھل ہے
شرمندہ ہیں دیکھ کر یہ لشکر چنگیز و ہلاکو و سکندر[۱۰۴]

علی سردار جعفری کے ہاں جنگ عظیم کے زمانے کے عمومی حالات کا تذکرہ تو جا بہ جا ملتا ہی ہے، لیکن ان کی بعض نظمیں ان جنگوں میں شریک فوجیوں کے اندرونی جذبات کا مظہر بھی ہیں۔ نظم ''سرخ سپاہی کا خط اپنی بیوی کے نام'' میں ان سپاہیوں کے جذبات کا اظہار کیا گیا ہے جو زندگی کے تسلسل کو برقرار رکھنے کے لیے بہ خوشی اپنی جانیں دے رہے تھے۔ سی لستو پول کے مورچے پر جب کہ سوویت جرمن جنگ کا ابتدائی زمانہ تھا، سرخ فوجیں تیزی سے آگے بڑھ رہی تھیں۔ اس زمانے میں یہ مورچہ جہنم کا نمونہ بنا ہوا تھا۔ پیچھے ہٹتی فوج کو جرمنوں کے حملے سے بچانے کے لیے یہ ضروری تھا کہ کچھ سپاہی آخری وقت تک مورچے پر مقابلے کے لیے ڈٹے رہیں۔ جن سپاہیوں نے یہ فریضہ انجام دیا ان میں سے ایک نے اپنی بیوی کو جو خط لکھا، اس خط میں اس نے جن جذبات و محسوسات کو پیش کیا، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ سپاہی کوئی پتھر کے بنے ہوئے انسان نہیں تھے بلکہ ہماری اور آپ کی طرح گوشت پوست کے انسان تھے۔ شاعر نے ان جذبات کے بیان میں کہا کہ:

اے پرستانِ محبت کی پری اے فروغِ شمع بزمِ دلبری
تیرے شوہر کا مقامِ آخری ہے محبت کا پیامِ آخری
ملک پر اپنے فدا ہوتا ہوں میں اب ہمیشہ کو جدا ہوتا ہوں میں
خوش ہے اسٹالین میرے کام پر حرف آئے گا نہ تیرے نام پر
تیرا شوہر موت سے ڈرتا نہیں پاؤں پر دشمن کے سر دھرتا نہیں
سیل حملے کا کبھی تھمتا نہیں تیغ پر میرے لہو جمتا نہیں

ایک لمحے کو نہیں رکتی ہے جنگ
بس گیا ہے خون کا آنکھوں میں رنگ

زلزلوں کی زد میں ہے سی بستو پول
بج رہے ہیں کان کے پردوں پہ ڈھول

دور تک جنگی سفینوں کی قطار
جیسے بہہ کر آگئے ہوں کوہ سار

الاماں پر ہول بم باری کی آگ
اف وہ ہیبت ناک طیاروں کی آگ

الاماں لاشوں پہ لاشیں الاماں
موت کے بجتے ہیں تاشے الاماں

پشتِ گیتی پر ہے انگاروں کی ڈھال
ہے ہوا کے دوش پر شعلوں کا جال

شہر سارا آگ کا خرمن ہے آج
ذرا ذرا شعلہ پیراہن ہے آج[۱۰۵]

اس طویل نظم میں اس جنگی ماحول کی زبردست عکاسی کی گئی ہے جو اس زمانے میں یہاں موجود تھی۔ اس کے علاوہ سرخ فوجوں کی بہادری اور جواں مردی کو بھی اس نظم میں پیش کیا گیا ہے، لیکن نظم کا سب سے اہم حصہ وہ ہے جہاں سپاہی اپنی بیوی سے گزارش کرتے ہوئے کہتا ہے کہ:

گو نہیں ہے مجھ کو مرنے کا ملال
دل میں رہ رہ کر یہ آتا ہے خیال

ہے جوانی کا ثمر بے رنگ و بو
بے ثمر ہے میرا نخلِ آرزو

ہاں یہ سچ ہے تو مجھے کرتی ہے پیار
تیرا پیمانِ وفا ہے استوار

عمر بھر اب تجھ کو یاد آؤں گا میں
تیرے دل میں درد بن جاؤں گا میں

لیکن اے تسکینِ جانِ بے قرار
عمر بھر یوں ہی نہ رہنا سوگ وار

اس لیے تنہا نہ رہنا چاہیے
تیرا دل سُونا نہ رہنا چاہیے

گر بخارا میں ہو کوئی نوجواں
جو سمجھتا ہو ترے غم کی زباں

عشق میں اپنے سمو لینا اسے
ہار میں اپنے پِرو لینا اسے

اور جب دشمن کو ہو جائے شکست
اس کے سارے حوصلے ہو جائیں پست

مجھ سے ملنے کے لیے آنا یہاں
پھول لالے کے چڑھا جانا یہاں

جانتا ہوں وہ گھڑی بھی آئے گی
دشمنوں کی نبض جب چھٹ جائے گی[۱۰۶]

علی سردار جعفری جانتے تھے کہ جنگ کسی مسئلے کا حل نہیں۔ انھوں نے واضح طور پر جنگ پسندوں کو یہ پیغام دیا کہ ان جنگوں سے صرف اور صرف تباہی اور بربادی آتی ہے۔ کسی مثبت معاشرتی تبدیلی کا حصول ان جنگوں سے ممکن نہیں۔ اسی لیے وہ کہتے ہیں کہ:

ایٹمی بم سے نہ گیہوں کے پھلیں گے خوشے
ٹینک لائیں گے نہ کھلیاں میں کھیتوں سے اناج

پھول برسیں گے تبسم کے نہ بم باروں سے
قتل و غارت سے بڑھے گا نہ محبت کا رواج

ہڈیاں جلتی ہیں اور خوں کے ابلتے ہیں کڑھاؤ
ایک آسیب ہے سرمایہ پرستی کا سماج

سر کٹی، ہاتھ کٹی، پاؤں کٹی لاشوں سے
زندگی موت کے دریا کو دیتی ہے خراج[۱۰۷]

۱۹۵۰ء میں شائع ہونے والے مجموعے ''امن کا ستارہ'' کے آغاز ہی میں علی سردار جعفری نے جنگ باز خوں خواروں کو سزا دینے کا اعلان کرتے ہوئے واضح طور پر لکھا کہ:

جنگ باز خوں خوارو ہم تمھیں سزا دیں گے
یہ غرورِ زر داری خاک میں ملا دیں گے
خون کے پیاسے ہو ہم مزا چکھا دیں گے
وہ نظام وہ دنیا جس میں جنگ پلتی ہے
ایک دن مٹا دیں گے[۱۰۸]

اس مجموعے میں شامل تین طویل نظموں میں رومانیت کی آمیزش ملتی ہے۔ انھوں نے جنگ کے بعد اشترا کی سوویت یونین جس میں استیصال اور سامراجی مظالم کا خاتمہ ہو چکا تھا، اس کی ترقی اور خوش حالی کو رومانی انداز سے پیش کیا ہے۔ ان کے خیال میں رائفل اور بم کے بیوپاروں کو یہ امن ایک آنکھ نہیں بھا رہا۔ سامراج اور فاشسٹوں کی موت کے بعد یہ تاجر بوکھلائے ہوئے تھے۔ ان نظموں میں کہیں کہیں اس بوکھلاہٹ کی تصویر کشی بھی کی گئی ہے۔ سوویت یونین کے اس نظام کی تعریف میں شاعر کہتے ہیں کہ:

یہ دشمنوں کے ساتھ اپنا زور آزما چکے یہ زر گری کی سازشوں کو خاک میں ملا چکے
ستم کو ختم کر دیا ستم کے ہاتھ کاٹ کر ہزار گل کھلا دیے شاخِ گل کو چھانٹ کر[۱۰۹]

اسی لیے وہ دنیا کے جنگ جوؤں اور جنگ بازوں کو اس نئے روس سے ٹکر لینے کے انجام سے خبردار کرتے ہوئے برملا یہ کہتے دکھائی دیتے ہیں کہ:

جو ہاتھ روس کی طرف بڑھے گا ٹوٹ جائے گا جو جان لینے آئے گا وہ اپنی جاں گنوائے گا
جو جنگ کے لیے اٹھے گا بچ کے جا نہ پائے گا یہ نازیت کی قبر سامراج کا مزار ہے[۱۱۰]

اس کے علاوہ ''استالن کتھا'' میں بھی انھوں نے ان جنگوں کے مناظر کی بابت بہت سے مناظر دکھائے ہیں۔ اس نظم کا انداز گیت اور ڈھولک کی تھاپ پر گنگنانے والا ہے، لیکن اپنے موضوع کے لحاظ سے اس میں بھی جنگی ماحول کا عکس موجود ہے، جیسے:

نازی فوجیں روس پہ جھپٹیں جیسے کالی آندھی آئے ہرے بھرے کھیتوں پر جیسے ٹڈی دل آ کر چھا جائے
ٹینک چلیں گھڑ گھڑ کرتے لوہے کے ہاتھی جھومیں روسی کھیتوں اور شہروں میں توپیں منھ کھولے گھومیں
اڑتی ہے بارود لہو کے دھرتی پر فوّارے ہیں لوہے اور فولاد کے گدھ آکاش پہ پنکھ سپارے ہیں
بم کے گولے برسیں جیسے میگھ کے ساتھ میں اولے آئیں ایسا بھیانک یدھ کہ جس میں لاکھ مہا بھارت کھو جائیں[۱۱۱]

دوسری عالمی جنگ کا خاتمہ تو ہو گیا لیکن طاقت کے نشے میں مست بعض ممالک کے خون بہانے کا نشہ نہیں اترا۔ جنگ کے خاتمے کے بعد بھی سرد جنگ کی صورت میں کئی دہائیوں تک جنگی ماحول قائم رہا۔ علی سردار جعفری دنیا بھر میں موجود اس رویّے پر سخت مضطرب دکھائی دیتے ہیں۔ انھوں نے دنیا پر جنگ کے منڈلاتے بادل دیکھ کر اس اضطراب کا اظہار بھی مذکورہ نظم میں کیا ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

پھر سے اب سنسار کے سر پر جنگ کی آفت لاتے ہیں　　سونے اور چاندی کے گدھ لاشوں کے لیے منڈلاتے ہیں
استالن اور روس کی جانب دیکھتے ہیں غرّاتے ہیں　　ایٹم بم کا نام بنا کر دنیا بھر کو ڈراتے ہیں
پہلے جرمن پگلائے اب امریکی پگلائے ہیں　　ہٹلر کے دن بیت گئے اب ان کے دن بھی آئے ہیں [۱۱۲]

فیض احمد فیض نے بھی متعدد بار اس بات کا تذکرہ کیا ہے کہ دوسری عالمی جنگ کے زمانے میں نوجوانوں میں مایوسی اور بددلی کی کیفیت عام تھی۔ سند یافتہ نوجوان ملازمتوں کی تلاش میں مارے مارے پھر رہے تھے [۱۱۳]۔ فیض اس ماحول سے بے حد متاثر ہوئے۔ انسان دوستی اور انسانی روابط کی سب سے برتر سطح وہی ہے جب تخلیق کار ساری نوع انسانی یا نوع کے ایک بڑے حصے کے دکھ سکھ اپنا لیتا ہے [۱۱۴]۔ فیض نے بھی یہی کیا۔ انسانی رنج و غم کلفتیں، ہزاروں لاکھوں بے گناہوں اور معصوم عورتوں اور بچوں کی خون میں لتھڑی نعشیں، ؟؟، بھوک اور افلاس نے فیض کی توجہ فوراً اپنی جانب مبذول کر لی اور وہ ''مجھ سے پہلی سی محبت میرے محبوب نہ مانگ'' کا نعرہ بلند کرنے لگے۔ خصوصاً اس نظم کے اگلے بند میں جب کہ کلّی اور اساسی طور پر محض نعرے کے سوا کچھ نہیں لیکن شاعر کا کمال یہ ہے کہ اس نے نظم کے اس حصے کو نعرے کی سطح سے اٹھا کر جمال کا پیرہن عطا کر دیا۔ ملاحظہ کیجیے:

ان گنت صدیوں کے تاریک بہیمانہ طلسم　　ریشم او اطلس و کم خواب میں بنوائے ہوئے
جا بہ جا کوچہ و بازار میں بکتے ہوئے جسم　　خاک میں لتھڑے ہوئے خون میں نہلائے ہوئے
لوٹ جاتی ہے ادھر کو بھی نظر کیا کیجیے　　اب بھی دل کش ہے ترا حسن مگر کیا کیجیے [۱۱۵]

''بول'' بھی سراسر آدرشی نظم ہے۔ یہ نظم بھی دوسری عالمی جنگ کے آغاز کے ایک برس بعد کہی گئی۔ اس وقت تک جرمنی نے روس پر حملہ نہیں کیا تھا اور کمیونسٹوں کے لیے یہ جنگ نئی اور پرانی ملوکیت کے مابین سامراجی جنگ بن چکی تھی۔ جرمنی کا نعرہ "Lebenstranum" تھا، یعنی "Space to live" تھا۔ اسے افریقا اور ایشیائی نوآبادیات کی ضرورت تھی، سو وہ اس وقت کی بڑی قوتوں ہالینڈ، بیلجیم اور انگلستان کو شکست دے کر ہی ان کے غلام ملکوں کو اپنا غلام بنایا جا سکتا تھا۔ برصغیر میں جنگی حالات کی بنا پر سرکار کی جانب سے اظہارِ رائے پر پابندی لگ چکی تھی۔ خود کمیونسٹ پارٹی پر بھی بین لگا ہوا تھا اور اس کے سرکردہ افراد زیر زمین جا چھپے تھے جہاں سے وہ The People Age نامی ہفتہ وار پرچہ نکالا کرتے تھے۔ روس اور برطانیہ اس جنگ میں جرمنی کے خلاف حلیف تھے جب کہ ہندوستان کی کمیونسٹ پارٹی نے اس جنگ کو جنتا کی جنگ قرار دے دیا تھا۔ اس کی بابت وہ حکومت ہند کی بھرپور مدد کر رہی تھی۔ یہ نظم اس زمانے میں استیصالی قوتوں کے درمیان ایشیا اور افریقا کے بٹوارے کے خلاف ردعمل کے طور پر لکھی گئی۔ اس نظم کے لہجے میں کوئی غلو نہیں، کوئی بڑا بول نہیں [۱۱۶]۔ بس روانی سے وہ اس ظالمانہ نظام کے خلاف لب کشائی کی راہ ہموار کر رہے ہیں۔ دیکھیے:

بول کہ لب آزاد ہیں تیرے　　بول، زباں اب تک تیری ہے
بول یہ تھوڑا وقت بہت ہے　　جسم و زباں کی موت سے پہلے
بول کہ سچ زندہ ہے اب تک　　بول، جو کچھ کہنا ہے کہہ لے! [۱۱۷]

جنگ کے بارے میں مثبت باتیں بہت کم ذہنوں میں آتی ہیں لیکن کبھی کبھی آشوب و انتشار اور شرانگیزی میں بھی کوئی نہ کوئی خیر کا پہلو نکل آتا ہے۔ جیسا کہ دوسری عالمی جنگ کے بعد ہندوستان کی آزادی کے معاملے میں ہوا۔ ہندوستانی سیاست دان اور دانش

وروں نے اس موقعے کو غنیمت جان کر یہ سمجھ لیا تھا کہ برطانوی استعماریت کا خاتمہ اسی طرح ممکن ہے۔ اس دور میں جو سیاسی منظر نامہ دکھائی دے رہا تھا، اس کی بابت سجاد ظہیر نے اپنی مشہور تصنیف ''روشنائی'' کے گیارہویں باب میں لکھا کہ:

> جون ۱۹۴۱ء میں ہٹلری جرمنی نے سوویت یونین پر حملہ کیا جس کی وجہ سے بین الاقوامی سیاست میں بنیادی تبدیلیاں آئیں، جس کا ہمارے ملک کی سیاست پر بھی اثر پڑا... جب لڑائی محض جرمنی اور انگریز سامراج کے درمیان تھی، ہمارے آزادی خواہوں کا عام مطالبہ یہی تھا کہ برطانوی سامراج ہمارے ملک کے وسائل کو دو سامراجوں کی اس لڑائی میں استعمال نہ کرے۔ ہم برطانوی سامراج کی اس مصیبت سے فائدہ اٹھا کر اپنے ملک کی آزادی کی جدوجہد کو اور تیز کرنا چاہتے تھے[۱۱۸]۔

لیکن اس ضمن میں یہ بات بھی بڑی اہم تھی کہ ان ترقی پسندوں کے ذہن میں بھی یہ خوف ضرور تھا کہ اگر نازی جرمنوں کو اس جنگ میں فتح حاصل ہوگئی تو دنیا میں فاشسٹ سامراج کا تسلط ہو جائے گا اور محکوموں کو اور زیادہ سختی سے کچلنے اور غلام بنانے کا سلسلہ تیز ہو جائے گا۔ اسی لیے اس دور میں آزادی کے خواہاں لوگوں کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس معرکے میں کس کا ساتھ دیں۔ لیکن یہ بات تو طے تھی کہ ترقی پسند کسی طور پر بھی فاش ازم کی حمایت نہیں کر سکتے تھے۔ گویا:

> جنگ کی نوعیت اشتراکیوں کے نزدیک اب ایک ایسی عوامی جنگ کی ہوگئی تھی جس میں فاش ازم کی شکست کے ساتھ ساتھ ہمارے اپنے وطن اور سارے ایشیا کے محکوم ممالک کی قومی آزادی اور بین الاقوامی سوشل ازم کی فتح منسلک تھی[۱۱۹]۔

سجاد ظہیر عالمی تناظر میں ہونے والی تبدیلیوں کو ملکی حالات سے جوڑ کر ہندوستان کو اس خون آشام جنگ کے چنگل سے بچانے کی کوششوں میں مصروف تھے۔ ان کے مطابق جب اس:

> عالم گیر خون آشام جنگ کے بھڑکتے ہوئے شعلے انسانی تہذیب وتمدن کو ہر طرف سے بھسم اور برباد کرتے ہوئے ہمارے وطن تک بھی پہنچ جائیں اور ہماری قوم کا حال اور اس کا مستقبل دونوں ایک شدید خطرے میں ہوں تو ترقی پسند مصنفین کے لیے ہی صرف نہیں بلکہ ہر ایک ادیب، ہر ایک ایمان دار فن کار کے لیے یہ ضروری تھا کہ وہ ان تمام حالات کو سمجھے اور ان سے پیدا ہونے والی کیفیتوں کو محسوس کرے[۱۲۰]۔

لہٰذا سجاد ظہیر کی اس صدا پر اکثر ترقی پسند شعرا نے لبیک کہتے ہوئے عالمی جنگوں کی ہولناکی کے خلاف کھل کر لکھا۔ فیض نے غالباً اسی کیفیت کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا کہ:

اجنبی ہاتھوں کا بے نام گراں بار ستم　　　آج سہنا ہے، ہمیشہ تو نہیں سہنا ہے[۱۲۱]

اس زمانے میں برطانوی سامراج نے ترقی پسند ادیبوں کو گرفتار کر کے مختلف جیلوں میں ڈال رکھا تھا۔ خود سجاد ظہیر بھی قید میں تھے لیکن اب انھیں اور ان کے ساتھیوں کو یہ یقین ہو چلا تھا کہ برطانوی سامراج بہت دیر تک انھیں پابند سلاسل نہیں رکھ سکے گا۔ اس سے تحریک کو ایک بار پھر بھرپور طریقے سے سرگرم کرنے کی کوششیں شروع ہو چکی تھیں۔ اسی لیے فیض نے اس تاریکی کو ''غازۂ رخسار سحر'' سے

تعبیر کرتے ہوئے تیرگی کی چادر کو چاک کرنے اور اندھیرے کے اس پار جو روشنی کی جھلک دکھائی دے رہی تھی، اس سے پوری طرح فائدہ اٹھانے کا شعور دیا۔ اپنی نظم ''اے دل بے تاب ٹھہر'' میں اس جانب واضح اشارے موجود ہیں:

تیرگی ہے کہ اُمڈتی ہی چلی آتی ہے　　شب کی رگ رگ سے لہو پھوٹ رہا ہو جیسے
چل رہی ہے کچھ اس انداز سے نبضِ ہستی　　دونوں عالم کا نشہ ٹوٹ رہا ہو جیسے
رات کا گرم لہو اور بھی بہہ جانے دو　　یہی تاریکی تو ہے غازۂ رخسارِ سحر
صبح ہونے ہی کو ہے اے دلِ بے تاب ٹھہر

ابھی زنجیر چھنکنی ہے پسِ پردۂ ساز　　مطلق الحکم ہے شیرازۂ اسباب ابھی
ساغرِ ناب میں آنسو بھی ڈھلک جاتے ہیں　　لغزشِ پا میں ہے پابندیِ آداب ابھی
جلد یہ سطوتِ اسباب بھی اٹھ جائے گی　　یہ گراں باریِ آداب بھی اٹھ جائے گی
خواہ زنجیر چھنکتی ہی، چھنکتی ہی رہے[۱۲۲]

جنگ کے اس دور میں جب کہ سوویت یونین پر ہٹلری حملہ ہو چکا تھا اور ہندوستانی سرحدوں پر بھی جاپانی قزاق آن بیٹھے تھے۔ اردو کے بہت سے ادیبوں اور شاعروں پر روحانی تعطل سا طاری تھا۔ جنگ کے نتیجے میں پیدا ہونے والے دل خراش حالات اور ملک میں سیاسی جمود کا پرتو ان کے دماغوں کو بری طرح متاثر کر رہا تھا۔ ایسے حالات میں بہت سے ترقی پسند شعرا جام سبو کے مزے لیتے رہے۔ کچھ جنسی بے اعتدالیوں کا شکار ہو کر تلذّذ میں پڑے رہے لیکن ترقی پسندوں نے کچھ شاعر ایسے ضرور دیے جنھوں نے عالمی حالات کے تناظر میں کھل کر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ کیفی اعظمی بھی اس دور میں ترقی پسند اشتراکی کے طور پر مشہور ہوئے۔ ان کی شاعری میں سوویت روس سے وابستگی کا گہرا تاثر ملتا ہے۔ وہ اس جنگی حالات میں اسٹالن کو اپنے ہیرو تسلیم کرتے ہوئے واضح طور پر کہتے ہیں کہ:

یہ سادہ سادہ گردوں، یہ تبسم آفریں سورج　　پہ در پے کام یابی سے ہوا استالن مگن جیسے
ابلتی سرخیوں کی زد پہ حلقے ہیں سیاہی کے　　پڑی ہو آگ میں بکھری غلامی کی رسن جیسے
شفق کی چادریں رنگیں فضا میں تھرتھراتی ہیں　　اڑائے لائے جھنڈا اشتراکی انجمن جیسے[۱۲۳]

کیفی کے خیال میں اشتراکی نظام نے دنیا میں ایسے متعدد لوگ پیدا کر دیے ہیں کہ اب اس نظام کا شکست کھانا ناممکن ہے۔ جو کوئی اس نظام سے ٹکرائے گا منھ کی کھائے گا۔ اسی لیے وہ فاش ازم کی شکست کو یقینی گردانتے ہوئے اپنی ایک نظم ''اعتراف'' میں کہتے ہیں کہ:

غیر ممکن ہے کبھی دام میں آنا ان کا　　ان کی راتوں کے بھی ماتھے پہ ہے پرتو دن کا
ان کے سینوں میں دھڑکتا ہے دل استالن کا　　ان میں سب خضر ہیں یہ ٹھوکریں کھائیں کیوں کر[۱۲۴]

ان کا رہنما اسٹالن جیسا شخص ہے جو خود بھی ایک معمولی مزدور کی طرح جیتا ہے۔ کیفی نے دنیا بھر کے جنگ جوؤں کے خلاف اسٹالن کی طرز پر جنگ جاری رکھنے کا پیغام دیتے ہوئے واضح طور پر کہا کہ:

تیرے سر پہ ہے انقلاب کا تاج　　روشِ تعمیر پر ہے ہات ترا

جنگ اور ایسے خونیوں سے جنگ — اک شکن بھی مگر جبیں پہ نہیں
اپنی دھن، اپنی راہ، اپنا کام — زنگ اوہام کا یقیں پہ نہیں![125]

کیفی اپنے ہم وطنوں کو بھی اس جدوجہد میں شریک ہونے کا پرجوش پیغام دیتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ اس انقلابی دور میں ان کی قوم بھی متحد و منظّم ہو کر آزادی کی عالم گیر جنگ میں شریک ہو[126]۔ لیکن وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ جنگ کے بعد جو نظام رائج ہو اس میں مزدوروں اور کارخانے میں کام کرنے والے کارکنوں کی حکم رانی ہو۔ گویا وہ اس جنگ میں سوویت روس کی طرز پر آزادی کی جدوجہد کے لیے سرگرم ہونے کا پیغام دیتے ہیں۔ نظم ''آواز کی شکست'' میں ایک سپاہی کے جذبات کو پیش کرتے ہوئے وہ جو بیانیہ پیش کر رہے ہیں وہ واقعی متاثر کن ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

لیے ولولہ جنگ کا سر جھکائے — چلا جا رہا ہوں قدم کو بڑھائے
وطن کے لیے جاں گنوانے چلا ہوں — نشانِ غلامی مٹانے چلا ہوں
کڑی جھیل لوں گا مصائب سہوں گا — رہوں گا تو آزاد ہو کر رہوں گا
وطن کے لیے سب کو چھوڑا ہے میں نے — بڑے آب گینوں کو توڑا ہے میں نے
جو اک حورِ ارضی ہے میری نظر میں — سسکتا اسے چھوڑ آیا ہوں گھر میں
گوارا ہے اس کی بھی مجھ کو جدائی — ارے کس طرف سے یہ آواز آئی[127]

وہ زر پرستی کے اس نظام کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنا چاہتے تھے۔ ان کے مطابق ملک بھر کے شاعروں اور مغنیوں کو زرگری کی اس جنگ میں اپنا اپنا کردار ادا کرنا چاہیے۔ اسی لیے وہ اپنی ذمہ داریوں کی بابت نظم ''پیتل کے کنگن'' میں کہتے ہیں کہ:

آسماں پر ہے ہوائے زر پرستی کا دماغ — سچ ہے کیوں کر جل سکے گھر میں غلاموں کے چراغ
تو پہن کر ان کو خوش رہ چھوڑ جانے دے مجھے — جنگ کے ڈنکے پہ خوانی گیت گانے دے مجھے
آگ برساؤں گا آنکھوں سے جدھر جاؤں گا میں — دیوِ زری کا مردہ پھونک کر آؤں گا میں[128]

جنگی تباہی و بربادی کی منظر کشی کرتے ہوئے کیفی ان حالات کو قیامت سے تشبیہ دیتے ہیں۔ آتشیں اسلحے نے ہلاکتوں کے نئے نئے سامان تو پیدا کر ہی رکھے تھے، اس پر طرّہ یہ کہ آسمان سے بھی آگ برسانے کا انتظام کر لیا جس نے لمحے میں ہزاروں لاکھوں لوگوں کو نگل لینے کا بندوبست کر لیا۔ ان مناظر کی تصویر دکھاتے ہوئے شاعر کا کہنا تھا کہ:

فضا میں آتشیں پرچم اڑاتی — زمیں پر آگ کے دھارے گراتی
شرارے رولتی شعلے بچھاتی — سنہری روشنی پھیلا رہی ہے
اٹھو دیکھو وہ آندھی آ رہی ہے

فضا کل جنگ کے میداں بنی ہے — ہوا بپھرا ہوا طوفاں بنی ہے
زمیں گہوارۂ جناّں بنی ہے — فلک سے خاک سر ٹکرا رہی ہے
اٹھو دیکھو وہ آندھی آ رہی ہے[129]

نظم ''آخری جنگ'' میں بھی وہ اس زمین کو انسانیت کی قتل گاہ قرار دے کر میدانِ عمل میں کودنے کا مشورہ دیتے دکھائی دیتے ہیں۔ان کا کہنا ہے کہ:

تمام عرصہِ جہاں بشر کی قتل گاہ ہے　　زمیں ہے زرد خوف سے فلک کا منھ سیاہ ہے
دبیز تہ میں خون کی نہاں عمل کی راہ ہے　　حیات بے دیار ہے شباب بے پناہ ہے
بہا کے خون، خون کی تہیں بہا رہے ہیں ہم　　بقا کو مژدہِ بقا کہ رن میں آ رہے ہیں ہم [۱۳۰]

جنگ کے دوران امریکا، روس، چین اور برطانیہ کی حمایت اور نازی جرمنوں کو پیس کر سرمہ بنا دینے کے ارادے سے بھی کیفی سمیت تمام ترقی پسندوں کے نقطۂِ نظر کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔نظم ''موجودہ جنگ اور ترقی پسند عناصر'' میں اس نقطۂِ نظر کو پیش کرتے ہوئے واضح طور پر کہتے ہیں کہ:

چڑھے آتے ہیں نازی دَن دناتے　　جلاتے، پھونکتے فتنے جگاتے
کڑکتے، تل ملاتے، خوں بہاتے
ہم اس یلغار کو پسپا کریں گے　　ہٹو، میدان میں ہم آرہے ہیں
ہم ان کو پیس کر سرمہ کریں گے　　ہٹو، میدان میں ہم آرہے ہیں
ہمارے ساتھ ہے روسی شجاعت　　ہمارے ساتھ ہے چینی حمیت
ہمارے سامنے ہے آدمیت
تشدد کو تہ و بالا کریں گے　　ہٹو، میدان میں ہم آرہے ہیں [۱۳۱]

جنگ کی ہول ناکی، نعشیں، چیختے بلکتے انسان، تباہی اور بربادی اور انسانیت کی تذلیل نے شاعروں کے حساس دل کو نہ صرف متاثر کیا بلکہ وہ ان مناظر کو دیکھ کر خود بھی میدانِ کارزار میں جانے کا ارادہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

یہ آندھی اور یہ طوفان توبہ　　یہ لاشیں اور یہ میدان توبہ
بلکتے چیختے انسان توبہ
کہاں تک ہم یوں ہی دیکھا کریں گے　　ہٹو، میدان میں ہم آرہے ہیں [۱۳۲]

اس کے ساتھ ساتھ وہ روسی افواج کے عزم و حوصلے کی تعریف کرتے ہوئے ڈٹے رہنے اور اس جنگ کو محض روسیوں کے خلاف نہیں بلکہ انسانیت کے خلاف جنگ قرار دیتے ہیں۔اس معرکے میں سرخرو ہونے کی نوید دیتے دکھائی دیتے ہیں۔نظم ''آخری امتحان'' میں وہ کہتے ہیں کہ:

بجلیاں، آگ، ٹینک، بم، توپیں　　امتحاں عزم کا ثبات کا ہے
روس یہ تیری جنگ نہیں　　آخری معرکہ حیات کا ہے
آخری ہے یہ موت کا حملہ　　اب کوئی امتحاں نہیں ہوگا [۱۳۳]

وہ سرخ فوجیوں کو اس زمانے میں پوری دنیا کے امن کا نگہبان سمجھتے تھے، اسی لیے انھیں لڑنے کی تلقین کرتے ہوئے پر جوش

انداز میں کہتے ہیں کہ:

نازی قہر کو دنیا سے مٹانے کے لیے　　دھجیاں پرچمِ ظلمت کی مٹانے کے لیے
اپنے مستقبلِ زرّیں کو بچانے کے لیے　　ہاں لڑے جاؤ، لڑے جاؤ، لڑے جاؤ ابھی[۱۳۴]

ایک اور نظم ''استالن'' میں بھی روسی جوانوں کی نازی فوجوں کے خلاف مزاحمت اور اسٹالن کی قیادت میں نازیوں کی شکست فاش پر اپنے محبوب لیڈر اسٹالن کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

آفریں کامریڈ استالین　　ظلم کا دل ہلا دیا تو نے
خوں اگلنے لگے ہیں بانیِ جور　　زہر کیسا پلا دیا تو نے
جنگ اور ایسے خونیوں سے جنگ　　اک شکن بھی مگر جبیں پہ نہیں
آفریں کامریڈ استالین[۱۳۵]

''اتحادیوں کے نام پیغام'' کے عنوان سے لکھی گئی نظم میں بھی جنگی مناظر خصوصاً نازیوں کے خلاف روسی حکمت عملی کے نتیجے میں ملنے والی فتح کے بعد اتحادیوں کو شاعر جو پیغام دیتے ہیں وہ انتہائی اہم ہے۔ پوری دنیا کے لوگوں کو ظلم کے خلاف متحد ہو کر صف آرا ہونے کا مشورہ دیتے ہوئے ان کا کہنا تھا کہ:

نازیت کو مٹا دینے کا ہنگام آ گیا　　قصرِ استبداد ڈھا دینے کا ہنگام آ گیا
توڑ دی ہے روس نے نازی لٹیروں کی کمر　　بڑھ کے اب بیڑی پہنا دینے کا ہنگام آ گیا
جل چکے ٹیونیشیا کی فتح کے گھر کے چراغ　　آگ برلن میں لگا دینے کا ہنگام آ گیا
جاگ اٹھی ہے سینۂ پیرس میں جو چنگاریاں　　ان کو دامن سے ہوا دینے کا ہنگام آ گیا
پینے والے پی چکے انسان کا کافی لہو　　کھولتا سیسہ پلا دینے کا ہنگام آ گیا
ہیں کہاں بمبار طیارے اڑیں جلدی اڑیں　　پھونک دینے کا جلا دینے کا ہنگام آ گیا[۱۳۶]

وہ ہندوستان کے نوجوانوں کو اس جنگ کی تباہی و بربادی کے خلاف اپنا موثر کردار ادا کرنے کی طرف راغب کرتے نظر آتے ہیں۔ اپنی ایک نظم ''جگا وا'' میں فاش ازم کے خلاف ہندوستانی نوجوانوں کو اٹھ کھڑا ہونے کا مشورہ دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

فاش ازم کا خنجر ہے کلیجوں پہ رواں دیکھ　　بے داد کے ہاتھوں میں کڑکتی ہے کماں دیکھ
میدان میں انسان کے لاشے ہیں تپاں دیکھ　　اٹھ رنگِ فلک، رنگِ زمیں، رنگِ جہاں دیکھ
بھارت کے جواں اے مرے بھارت کے جواں دیکھ
شمشیر بہ کف جنگ کے میداں کی طرف دوڑ　　آندھی کی طرح آگ کے طوفاں کی طرف دوڑ
غافل ہیں جوانانِ وطن ان کو جگا دے　　ہے تیری طرف روحِ وطن کی نگراں دیکھ
بھارت کے جواں اے مرے بھارت کے جواں دیکھ[۱۳۷]

عالمی جنگ کے اس تناظر میں ایک مکتبۂ فکر ایسا بھی تھا جو نازی جرمن کے ہر ادم پر انھیں سراہتا تھا۔ بعض اوقات ان کے

استقلال اور جواں مردی کی مبالغہ آمیز تصاویر بھی کھینچتا تھا۔ ایسے لوگوں پر کیفی کے طنز کے نشتر بھی خالی از دل چسپی نہیں۔ ''استقلال'' کے عنوان کے تحت لکھی گئی کیفی کی نظم میں نازیوں کی سازشوں اور ان کی جنگ جویانہ روش پر سخت تنقید کرتے ہوئے شاعر ان لوگوں کو بھی طنز و تضحیک کا نشانہ بناتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

تو نے استقلال کی اچھی کہی اے ہم نشیں — مجھ کو شک ہے یہ چمچلتی مدح پھبتی تو نہیں
صلح کے پیغام سے قوموں کے بہلانے کے بعد — اندر اندر سازشوں کے جال پھیلانے کے بعد
لے کر اپنی پشت پر فوجوں کی اک سنگیں قطار — پھر انھیں قوموں پہ دھاوا بول دینا ایک بار
درد انسانی، نہ اپنے عہد ہی کا کچھ خیال — لوٹ احسن، ظلم بہتر، قتل جائز، خوں حلال
بھیڑیے، چیتے، درندے، چور، ڈاکو، راہ زن — بس نہتوں ہی کو دکھلاتے ہیں سارا بانک پن
الاماں، وہ لوٹ، وہ غارت، وہ فتنے الاماں — زلزلے، طوفان، ہلچل، شور، غوغا، آندھیاں
بربریت، دشمنی، سختی، جفا، نفرت، ستم — گولیاں، بارود، طیارے، سرنگیں، ٹینک، بم
مکر، حیلے، گھات، خوں ریزی، دغا، عیاریاں — آگ، شعلے بجلیاں، توپیں، جہنم باریاں
ہر طرف، ہر سمت، ہر بازار، ہر بستی میں جنگ — معرکہ دوشِ ہوا پر، دامنِ پستی میں جنگ[۱۳۸]

غرض کہ کیفی کے ہاں ایسی بہت سی نظمیں ہیں جن میں عالمی جنگوں کی تباہ کاریوں کو موضوع بنایا گیا ہے۔ ان نظموں کو پڑھ کر جنگ کے میدان کی حقیقی تصاویر بھی شاعروں کے سامنے پھرنے لگتی ہے۔ ''روسی عوام اور جنگ''، ''یلغار'' اور ''فتح برلن'' وغیرہ میں ان مناظر کی جھلک بہ خوبی دیکھی جاسکتی ہے۔ ''فتح برلن'' سے کچھ مناظر کی تصویر کشی دیکھیے:

خنجروں کی باڑھ، تیغوں کی روانی ختم ہو — رہ زنی، غارت گری، ایذا رسانی ختم ہو
آندھیوں کی، زلزلوں کی قہر مانی ختم ہو — زندگی پر حادثوں کی حکمرانی ختم ہو
ڈھل گئی شب، صبحِ عشرت کا پیام آ ہی گیا — آفتابِ ماسکو بالائے بام آ ہی گیا
کہہ دو دھو ڈالیں وہ مائیں مسکرا کر دل کے داغ — جل گئے تھے جن کے خرمن لٹ گئے تھے جن کے باغ
کہہ دو اب اٹھ کر جلائیں دیویاں گھی کے چراغ — مٹ گئے جو توڑتے پھرتے تھے عصمت کے ایاغ
زندگی پائے اجل پر جبہ سائی کر چکی — اہرمن کی نسل دنیا پر خدائی کر چکی[۱۳۹]

ساحر لدھیانوی کے ہاں بھی جنگوں کی تباہ کاریاں اور معاشرے پر اس کے اثرات کے حوالے سے متعدد حوالے موجود ہیں۔ معاشرے کی ناہمواری تو ساحر کو بے چین کرتی ہی ہے، مگر اس کے ساتھ ساتھ جنگوں میں کام آنے والے جوان جن کی جوانیاں محض ان جنگوں کی نذر ہو گئیں، ساحر کو رنجیدہ کر دیتی ہیں۔ اس اداسی کا اظہار کرتے ہوئے وہ اپنی نظم ''کسی کو اداس دیکھ کر'' میں کہتے ہیں کہ:

یہ جنگ اور یہ میرے وطن کے شوخ جواں — خریدی جاتی ہیں اٹھتی جوانیاں جن کی
یہ بات بات پہ قانون و ضابطے کی گرفت — یہ ذلتیں، یہ غلامی، یہ دورِ مجبوری
یہ غم بہت ہیں مری زندگی مٹانے کو[۱۴۰]

ساحر کو اس بات کا بھی احساس تھا کہ عالمی سطح پر ہونے والے واقعات نے ان کے لہجے میں تلخی پیدا کر دی ہے۔ان کے نغموں میں وہ لوچ نہیں رہا۔لیکن معاشرے میں ہونے والی خوں ریزی اور قتل و غارت گری بہر حال ان کی شاعری کو متاثر ضرور کرتی ہے جس کی بابت ان کا کہنا ہے کہ:

مرے سرکش ترانے سن کے دنیا یہ سمجھتی ہے ۔۔۔ کہ شاید میرے دل کو عشق کے نغموں سے نفرت ہے

مجھے ہنگامۂ جنگ و جدل میں کیف ملتا ہے ۔۔۔ مری فطرت کو خوں ریزی کے افسانے سے رغبت ہے [۱۴۱]

ظلم و بربریت کے سائے تلے اقوامِ عالم کی بے بسی، طاقت کے حصول کے لیے نت نئے ہتھیاروں کی دوڑ میں شامل حکومتیں، اقتدار و اختیارات کی جنگ میں مصروف کار فوجی طاقتیں اور ان سب کے بیچ پسے ہوئے کچلے ہوئے مظلوم عوام۔ان حالات میں ساحر یہ نہ کہیں تو اور کیا کہیں کہ:

زندگی تلخ سہی، زہر سہی، سم ہی سہی ۔۔۔ درد و آزار سہی، جبر سہی، غم ہی سہی

بھوک اور پیاس سے پژمردہ سیہ فام زمیں ۔۔۔ تیرہ و تار مکاں، مفلس و بیمار مکیں

نوعِ انساں میں یہ سرمایہ و محنت کا تضاد ۔۔۔ امن و تہذیب کے پرچم تلے قوموں کا فساد

ہر طرف آتش و آہن کا یہ سیلابِ عظیم ۔۔۔ نت نئے طرز پہ ہوتی ہوئی دنیا تقسیم [۱۴۲]

ساحر کو اس بات کا پوری طرح ادراک تھا کہ مغرب کی اس جنگ میں شرق کی غلامی کی کڑیاں جڑی ہوئی ہیں لیکن یہاں کے نوجوانوں میں جو خوابیدہ کیفیت ہے اس سے ساحر جھنجھلاہٹ کا شکار دکھائی دیتے ہیں۔اسی لیے نظم ''شہزادے'' میں سخت طنزیہ انداز اختیار کرتے ہوئے نوجوانوں کو کہتے ہیں کہ:

> دور مغرب کی فضاؤں میں دہکتی ہوئی آگ/ اہل سرمایہ کی آویزشِ باہم نہ سہی/ دور مغرب میں ہے مشرق کی فضا میں تو نہیں/ تم کو مغرب کے بکھیڑوں سے بھلا کیا لینا/ تیرگی ختم ہوئی سرخ شعاعیں پھیلیں/ دور مغرب کی فضاؤں میں ترانے گونجے/ فتح جمہور کے، انصاف کے، آزادی کے/ ساحلِ شرق پہ گیسو کا دھواں چھانے لگا/ آگ برسانے لگے اجنبی توپوں کے دہن/ خواب گاہوں کی چھتیں گرنے لگیں/ اپنے بستر سے اٹھو/ نئے آقاؤں کی تعظیم کرو [۱۴۳]

ایک جانب تو وہ اپنے وطن کے لوگوں کی غلامی سے پریشان ہیں مگر دوسری جانب سرخ انقلاب کے بڑھتے ہوئے اثر و رسوخ اور روس کی کام یاب معرکہ آرائیوں پر اسے انسانیت کی جیت قرار دیتے ہیں۔نظم ''احساس کامران'' میں وہ کام یابی کے اس احساس کو بڑے فخر کے ساتھ اس طرح بیان کرتے ہیں:

افقِ روس سے پھوٹی ہے نئی صبح کی ضو ۔۔۔ شب کا تاریک جگر چاک ہوا جاتا ہے

تیرگی جتنا سنبھلنے کے لیے رکتی ہے ۔۔۔ سرخ سیل اور بھی بے باک ہوا جاتا ہے

سامراج اپنے وسیلوں پہ بھروسا نہ کرے ۔۔۔ کہنہ زنجیر کی جھنکار نہیں رہ سکتیں

برتر اقوام کے مغرور خداؤں سے کہو آخری بار ذرا اپنا ترانہ دہرائیں
اور پھر اپنی سیاست پہ پشیماں ہو کر اپنے ناکام ارادوں کا کفن لے آئیں
سرخ طوفان کی موجوں کو جکڑنے کے لیے کوئی زنجیرِ گراں کام نہیں آ سکتی[۱۴۴]

جنگ کے نتیجے میں دنیا کے متعدد ممالک کے عوام امن کو ترس رہے تھے۔ ہر طرف موت کا رقص جاری تھا۔ ماؤں کی گود میں بچے سہمے دبکے بیٹھے رہتے۔ نعشوں کے کفن دفن تک کا انتظام نہ ہو پاتا۔ ہر طرف بربریت کا بازار گرم نظر آتا تھا۔ عورتوں کی عصمتیں لوٹی جا رہی تھیں۔ ایک عجیب سی سوگواری کی فضا پوری دنیا پر چھائی ہوئی تھی۔ ساحر اس پورے ماحول سے پریشان ہو کر اپنی نظم ''آج'' میں امن کی بھیک مانگتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

ساتھیو! آج تم نے بھسم کر دیا ہے/ اور میں اپنا ٹوٹا ہوا ساز تھامے/ سرد لاشوں کے انبار کو
تک رہا ہوں/ میرے چاروں طرف موت کی وحشتیں ناچتی ہیں/ اور انساں کی حیوانیت
جاگ اٹھی ہے/ بربریت کے خوں خوار عفریت/ اپنے ناپاک جبڑوں کو کھولے/ خون پی پی
کر غرّا رہے ہیں/ بچے ماؤں کی گود میں سہمے ہوئے ہیں/ عصمتیں سر برہنہ پریشان ہیں/
ہر طرف شور آہ و بکا ہے/ اور میں اس تباہی کے طوفان میں/ آگ اور خوں کے ہیجان میں/
سرنگوں اور شکستہ مکانوں کے ملبے سے پُر راستوں پر/ اپنے نغموں کی جھولی پسارے/ در بدر
پھر رہا ہوں!/ مجھ کو امن اور تہذیب کی بھیک دو[۱۴۵]

ساحر کی شاعری کی امتیازی شان اس کی روانی اور نغمگی ہے۔ وہ ہنگامی موضوعات پر لکھتے ہوئے بھی شائستگی کا دامن ہاتھ سے جانے نہیں دیتے[۱۴۶]۔ تلخ اور کڑوی سچائیوں کے اظہار میں بھی ان کے ہاں نغمگی کی جو کیفیت پائی جاتی ہے اس کا اظہار نظم ''نیا سفر ہے پرانے چراغ گل کر دو'' میں دیکھیے:

فضا میں گرم بگولوں کا رقص جاری ہے افق پہ خون کی مینا چھلک رہی ہے ابھی
کہاں کا مہرِ منور کہاں کی تنویریں کہ بام و در پہ سیاہی جھلک رہی ہے ابھی[۱۴۷]

جنگی جنون میں مبتلا عالمی طاقتوں کو وہ واضح انداز سے یہ پیغام دیتے دکھائی دیتے ہیں کہ دنیا میں امن و آشتی کے لیے اٹھنے والی آواز کو دبانا اب ممکن نہیں رہا۔ نظم ''لہو نذر دے رہی ہے حیات'' میں وہ کہتے ہیں کہ:

مرے جہاں میں سمن زار ڈھونڈنے والے یہاں بہار نہیں آتشیں بگولے ہیں
دھنک کے رنگ نہیں سرمئی فضاؤں میں افق سے تا بہ افق پھانسیوں کے جھولے ہیں
بنامِ امن ہیں جنگ و جدل کے منصوبے بہ شورِ عدل تفاوت کے کارخانے ہیں
تمام ارضِ جہاں کھولتا سمندر ہے تمام کوہ و بیاباں ہیں تلملاتے ہوئے
مری صدا کو دبانا تو خیر ممکن ہے مگر حیات کی للکار کون روکے گا
ہزار برق گرے لاکھ آندھیاں اٹھیں وہ پھول کھل کے رہیں گے جو کھلنے والے ہیں[۱۴۸]

دو عالمی جنگوں نے انسانی احساس کو جس طرح پارا پارا کیا، اس کا بہترین اظہار ساحر کی طویل نظم ''پرچھائیاں'' کے آخری حصے میں دیکھا جا سکتا ہے۔ دوسری عالمی جنگ میں محدود سطح پر ایٹمی ہتھیاروں کے استعمال سے جو تباہی کی تاریخ رقم ہوئی، ساحر اس تباہی کا سوچ کر ہی پریشان دکھائی دیتے ہیں۔ اسی لیے جنگ کے بجائے امن کا راستہ اپنانے پر زور دیتے ہیں۔ ان کے خیال میں اگر تیسری بار اس قسم کی جنگ چھڑی تو یہ جنگ بڑی مقدار میں موجود ایٹمی ہتھیاروں سے لڑی جائے گی۔ اسی لیے ساحر کو اس نئے خطرے کے سامنے صرف گھر بار، املاک اور انسانی جانوں کے ضائع ہونے کا خطرہ ہی نہیں بلکہ ان کے خیال میں انسان کی تنہائیاں اور پرچھائیاں بھی اس جنگ سے محفوظ نہیں رہ سکیں گی۔ وہ پچھلی جنگوں اور آنے والی جنگ کا تقابل کرتے ہوئے پوری دنیا کے امن پسند لوگوں کو اس قسم کے ایٹمی ہتھیاروں کو ختم کرنے کے لیے آواز بلند کرنے کا مشورہ دیتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ:

کہو کہ آج بھی ہم سب اگر خموش رہے — تو اس دمکتے ہوئے خاک داں کی خیر نہیں
جنوں کی ڈھالی ہوئی ایٹمی بلاؤں سے — زمیں کی خیر نہیں آسماں کی خیر نہیں
گزشتہ جنگ میں گھر ہی جلے مگر اس بار — عجب نہیں کہ یہ تنہائیاں بھی جل جائیں
گزشتہ جنگ میں پیکر جلے مگر اس بار — عجب نہیں کہ یہ پرچھائیاں بھی جل جائیں [۱۴۹]

لیکن آج بھی دنیا بھر میں جنگی تیاریوں کے لیے بے تحاشا روپے مختص کیے جاتے ہیں۔ جنگ صرف ایک فریق کی حماقت کا نام نہیں بلکہ جب جنگ مسلط ہو جاتی ہے تو اس کے ردِ عمل کے طور پر بھی جنگ لڑنا ناگزیر ہو جاتا ہے۔ اسی لیے جنگ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ "War is not action but reaction" یہ ردِ عمل انسانی معاشرے پر کس کس نوعیت کے اثرات مرتب کرتا ہے اس کی جھلک ساحر کے متعدد اشعار میں پوری حقیقت پسندی کے ساتھ موجود ہے [۱۵۰]:

ناگاہ لہکتے کھیتوں سے ٹاپوں کی صدائیں آنے لگیں — بارود کی بوجھل بو لے کر پچّھم سے ہوائیں آنے لگیں
تعمیر کے روشن چہرے پر تخریب کا بادل پھیل گیا — ہر گاؤں میں وحشت ناچ اٹھی، ہر شہر میں جنگل پھیل گیا
مغرب کے مہذب ملکوں سے کچھ خاکی وردی پوش آئے — اٹھلاتے ہوئے مغرور آئے، لہراتے ہوئے مدہوش آئے
خاموش زمیں کے سینے میں خیموں کی طنابیں گڑنے لگیں — مکھن سی ملائم راہوں پر بوٹوں کی خراشیں پڑنے لگیں
فوجوں کے بھیانک بینڈ تلے، چرخوں کی صدائیں ڈوب گئیں — جیپوں کی سلگتی دھول تلے، پھولوں کی قبائیں ڈوب گئیں
بستی کے سجیلے شوخ جواں بن بن کے سپاہی جانے لگے — جس راہ سے کم ہی لوٹ سکے، اس راہ پہ راہی جانے لگے [۱۵۱]

یہ مناظر تو دوسری جنگ عظیم کے دوران مغرب میں عمومی طور پر دیکھے جا سکتے تھے۔ نہ صرف مغرب بلکہ مشرق کی نوآبادیات سے لاکھوں کی تعداد میں سپاہیوں کی بھرتی کا عمل دیکھنے میں آیا۔ اس سے قبل فرانس میں جنگ عظیم دوم کے دوران شہید ہونے والے ایشیائی سپاہیوں کی قبور کا ذکر ہو چکا ہے۔ ساحر دنیا بھر میں جاری جنگ کو انسانیت پر سب سے بڑا ظلم قرار دیتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ:

ظلم پھر ظلم ہے بڑھتا ہے تو مٹ جاتا ہے — خون پھر خون ہے ٹپکے گا تو جم جائے گا
لاکھ بیٹھے کوئی چھپ چھپ کے کمیں گاہوں میں — خون خود دیتا ہے جلادوں کے مسکن کا سراغ
ظلم کی قسمتِ ناکارہ و رسوا سے کہو — جبر کی حکمتِ پرکار کے ایما سے کہو

محملِ مجلس اقوام کی لیلیٰ سے کہو خون دیوانہ ہے دامن پہ لپک سکتا ہے
شعلہ تند ہے خرمن سے لپک سکتا ہے[۱۵۲]

اسی لیے ساحر دنیا کے ہر ملک میں جاری جنگ کے خلاف کلمہ حق بلند کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔نظم ''اے شریف انسانو'' گو کہ ہندوستان اور پاکستان کی جنگ کے پس منظر میں کہی گئی ہے لیکن اس کا پیغام ایسا آفاقی ہے کہ دنیا کے تمام جنگ زدہ ممالک کے لیے اس پیغام کو سمجھنا اور اس پر عمل کرنا بے حد ضروری ہے۔ملاحظہ کیجیے:

جنگ مشرق میں ہو کہ مغرب میں امنِ عالم کا خون ہے آخر
فتح کا جشن ہو کہ ہار کا سوگ زندگی میتوں پہ روتی ہے
جنگ تو خود ہی ایک مسئلہ ہے جنگ کیا مسئلوں کا حل دے گی
اس لیے اے شریف انسانو! جنگ ٹلتی رہے تو بہتر ہے[۱۵۳]

جنگوں کے تناظر میں عالمی طاقتوں کے کردار پر ساحر کا طنز ان کی مختصر ترین نظم ''بڑی طاقتیں'' میں دیکھا جاسکتا ہے۔جنگ کے خبط میں مبتلا عالمی طاقتیں جس طرح سے منفی انداز میں انسانیت کی تباہی و بربادی کا سامان کرتی رہیں اس کی جھلک ان اشعار میں دیکھیے :

تم ہی تجویزِ صلح لاتے ہو تم ہی سامانِ جنگ بانٹتے ہو
تم ہی کرتے ہو قتل کا ماتم تم ہی تیر و تفنگ بانٹتے ہو[۱۵۴]

ساحر کے کلام میں جنگ و جدل کے خلاف جو بیانیہ ہے وہ ان کی انسان دوستی کا ثبوت ہے۔انھوں نے حق کو ہمیشہ حق کہا اور حق بات پر ڈٹ جانے کی ترغیب بھی دی۔اسی لیے وہ اپنی ایک نظم ''مگر ظلم کے خلاف'' میں لفظ ''جنگ'' استعمال کیے بغیر کبھی کبھی جنگ کو ناگزیر بھی سمجھتے ہیں۔ان کا کہنا ہے کہ:

ہم امن چاہتے ہیں مگر ظلم کے خلاف گر جنگ لازمی ہے تو پھر جنگ ہی سہی
ظالم کو جو نہ روکے، وہ شامل ہے ظلم میں قاتل کو جو نہ ٹوکے، وہ قاتل کے ساتھ ہے
یہ زر کی جنگ ہے نہ زمینوں کی جنگ ہے یہ جنگ ہے بقا کے اصولوں کے واسطے
جو خون ہم نے نذر دیا ہے زمین کو وہ خون ہے گلاب کے پھولوں کے واسطے
پھوٹے کی صبحِ امن، لہو رنگ ہی سہی[۱۵۵]

ساحر کے بعد مجاز نے بھی دورِ نو کا مژدہ سنایا اور اس دور کے نوجوانوں کا اضطراری اور جذباتی ردِ عمل ظاہر کرتے ہوئے کہا کہ ''اے غمِ دل کیا کہوں، اے وحشتِ دل کیا کروں'' اس تعمیری انقلاب کے اظہار کے دوران انھوں نے جنگ کے تعمیری پہلو کی جانب اشارہ کرتے ہوئے اسے ''شورِ انقلاب'' سے تعبیر کیا۔نظم ''انقلاب'' میں ان کا کہنا ہے کہ:

پھینک دے اے دوست اب بھی پھینک دے اپنا رباب اٹھنے ہی والا ہے کوئی دم میں شورِ انقلاب
آ رہے ہیں جنگ کے بادل وہ منڈلاتے ہوئے آگ دامن میں چھپائے خون برساتے ہوئے
کوہ و صحرا میں زمیں میں خون ابلے گا بھی رنگ کے بدلے گلوں سے خون ٹپکے گا ابھی

سرکشی کی تند آندھی دم بدم چڑھتی ہوئی
ہر طرف یلغار کرتی ہر طرف بڑھتی ہوئی
بھوک کے مارے ہوئے انساں کی فریادوں کے ساتھ
فاقہ مستوں کے جلو میں خانہ بربادوں کے ساتھ [156]

جنگ و جدل کے ماحول میں چاروں طرف خون ہی خون بہہ رہا تھا۔ مہذب دنیا مہذب دور عصبیت کے نام پر ایک دوسرے کے خون کے پیاسے دکھائی دے رہے تھے۔ پہاڑ، دریا، صحرا اور گاؤں سب انسانی خون سے رنگے گئے تھے۔ ان مناظر کو دکھاتے ہوئے جنگی تباہ کاری کا ذکر شاعر اس طرح کرتے ہیں:

خون کی بو لے کے جنگل میں ہوائیں گی
خوں ہی خوں ہوگا نگاہیں جس طرف بھی جائیں گی
جھونپڑوں میں خوں، محل میں خوں، شبستانوں میں خوں
دشت میں خوں، وادیوں میں خوں، بیابانوں میں خوں
پر سکوں صحرا میں خوں، بے تاب دریاؤں میں خوں
دیر میں خوں، مسجد میں خوں، کلیساؤں میں خوں
خون کے دریا نظر آئیں گے ہر میدان میں
ڈوب جائیں گی چٹانیں خون کے طوفان میں
سرخ ہوں گے خون کے چھینٹوں سے بام و در تمام
غرق ہوں گے آتشیں ملبوس میں منظر عام
اس طرح لے گا زمانہ جنگ کا خونیں سبق
آسماں پر خاک ہوگی، فرش پر رنگِ شفق [157]

ایک اور نظم ''اندھیری رات کا مسافر'' میں بھی وہ جنگی ماحول کی ہول ناکی، خوف، گولیوں کی سنسناہٹ اور مستقل جاری رہنے والے موت کے رقص کی بابت کہتے ہیں کہ:

افق پر جنگ کا خونیں ستارہ جگمگاتا ہے
ہر اک جھونکا ہوا کا موت کا پیغام لاتا ہے
گھٹا کی گھن گرج سے قلبِ گیتی کانپ جاتا ہے
مگر میں اپنی منزل کی طرف بڑھتا ہی جاتا ہوں
فنا کی آہنی وحشت اثر قدموں کی آہٹ ہے
دھویں کی بدلیاں ہیں گولیوں کی سنسناہٹ ہے
اجل کے قہقہے ہیں زلزلوں کی گڑگڑاہٹ ہے
مگر میں اپنی منزل کی طرف بڑھتا ہی جاتا ہوں [158]

مجاز کے نزدیک انسانیت کی تباہی و بربادی خود انسانوں کے ہاتھوں ہو رہی تھی۔ انسان ہی انسانیت کا خریدار بن کر اپنے لیے موت کا سامان پیدا کر رہا ہے۔ شاعر اس ماحول میں شدید ذہنی اضطراب کا شکار دکھائی دیتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ:

یہ انسانی بلا خود خونِ انسانی کی گاہک ہے
وبا سے بڑھ کے مہلک، موت سے بڑھ کر بھیانک ہے
بلائے بے اماں ہے طور ہی اس کے نرالے ہیں
کہ اس نے غیظ میں اجڑے ہوئے گھر پھونک ڈالے ہیں
کہیں یہ خوں سے فردِ مال و زر تحریر کرتی ہے
کہیں یہ ہڈیاں چن کر محل تعمیر کرتی ہے
بہ ظاہر چند فرعونوں کا دامن بھر دیا اس نے
مگر گل بارِ عالم کو جہنم کر دیا اس نے
ہمیشہ خون پی کر ہڈیوں کے رتھ میں چلتی ہے
زمانہ چیخ اٹھتا ہے یہ جب پہلو بدلتی ہے [159]

ظاہر سی بات ہے جنگ عظیم دوم کے زمانے میں اردو شاعری میں بڑی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ سکوت کی جگہ حرکت نے لے لی، موضوعات میں تنوع آیا۔ شیرینی لہجے کی جگہ تلخی نے لے لی۔ شاعری دل بہلانے کے بہ جائے غم و غصہ پیدا کرنے اور جذبات میں ہیجان پیدا کرنے کا سبب بنی۔ جنگ کے حالات میں پیدا ہونے والی نسل نے بچپن کی لوریوں کے ساتھ جرمن ہوائی جہاز کی گھن گرج،

اٹلی کی توپ میں کیڑے پڑیں، اتحادیوں کی فتح ہواور اس قسم کے بہت سے نعرے سنے[۱۶۰]۔معین احسن جذبی بھی اس زمانے کے اہم شاعر شمار کیا جاتے ہیں۔اسی لیے ان کی شاعری میں بھی توپوں کی گھن گرج جنگی ماحول کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔

کاش توپوں کی گرج میں نہ سنائی دیتا   جذبۂ غیرتِ مظلوم ابھی خواب میں ہے[۱۶۱]

ن۔م۔راشد نے بھی اس دور کے شعری تجزیوں میں ہیئت کے ساتھ ساتھ جدید تر موضوعات کو اپنی شاعری میں پیش کیا۔نظم ''سپاہی''میں بڑے افسردہ انداز میں یہ کہتا دکھائی دیتا ہے کہ:

تو مرے ساتھ مری جان، کہاں جائے گی/ اجڑے سنسار دیار/ اور دشمن کے گرانڈیل
جوان/ عزت وعفت وعصمت کے غنیم/ ہر طرف خون کے سیلاب رواں/ اک سپاہی کے
لیے خون کے نظاروں میں/ جسم اور روح کی بالیدگی ہے/ تو مگر تاب کہاں لائے گی/ دیکھ
خوں خوار درندوں کے وہ غول/ میرے محبوب وطن کو یہ نگل جائیں گے/ ان سے ٹکرانے بھی
دے[۱۶۲]

مخدوم کے ہاں بھی جنگ وجدل سے پھیلنے والی تباہی وبربادی کے مناظر کی تصویر کشی موثر انداز سے کی گئی ہے۔توپ کے دہانوں سے نکلنے والی آگ اور زمین کے جہنم بن جانے کے مناظر دکھاتے ہوئے شاعر نے اپنی نظم ''جنگ''میں کہا کہ:

نکلے دہانِ توپ سے بربادیوں کے راگ   باغِ جہاں میں پھیل گئی دوزخوں کی آگ[۱۶۳]

زندگی کی ارزانی اور انسانیت کی تذلیل پر یشان ہوتے لوگوں کی بے بسی اور لاچاری بھی مخدوم کی شاعری میں بدرجہ اتم موجود ہے۔انھوں نے جنگ کی ہولناکی اور جنگوں سے متاثرہ لوگوں کی کس مپرسی کے بعد اس نظم میں یہ سوال بھی اٹھاتے ہیں کہ کیا آج اس دنیا میں کوئی ایسی جگہ ہے جہاں انسان امن وسکون سے رہ سکے۔مخدوم کے مطابق:

اب دلہنوں سے چھین لیا جائے گا سہاگ   اب اپنے آنسوؤں سے بجھائیں وہ دل کی آگ
انسانیت کے خون کی ارزانیاں تو دیکھ   اس آسمان والے کی بے داریاں تو دیکھ
خود اپنی زندگی پہ پشیماں ہے زندگی   قربان گاہِ موت پہ رقصاں ہے زندگی
انسان رہ سکے کوئی ایسا جہاں بھی ہے   اس فتنہ زا زمیں کا کوئی پاسباں بھی ہے[۱۶۴]

مخدوم نے یہ نظم حبشہ پر مسولینی کے حملے کے بعد کہی۔سبطِ حسن کے مطابق یہ ان کی پہلی سیاسی نظم تھی جو فاشزم کے خلاف اردو شاعری کی پہلی صدائے احتجاج بن کر ابھری۔نظم کے آخری اشعار میں بے بسی اور بے چارگی کی جھلک نمایاں ہے جو اس وقت مجموعی طور پر پوری قوم پر طاری تھی۔فاشزم اپنی بھرپور طاقت کے ساتھ آگے بڑھ رہا تھا۔یورپ کی سامراجی طاقتیں برطانیہ اور فرانس فاشزم کی رضا جوئی میں لگی ہوئی تھیں اور اس بھوکے دیو کو انسانیت کا خون پلا پلا کر مضبوط کر رہی تھیں۔ہندوستانی قوم حبشے کی آزادی کی حامی تھی اور ان کی مدد کرنا چاہتی تھی لیکن برطانوی سامراج کی غلامی کے ہاتھوں مجبور تھی۔جنگ وجدل سے یورپ کی فضا تیرہ وتار تھی۔رجعت پسند طاقتیں جو سوویت یونین کو ہڑپ کر جانے کی فکر میں لگی تھیں، خود ایک دوسرے سے ٹکرا گئیں۔سرمایہ دار نظام سخت بحران میں مبتلا ہو گیا[۱۶۵]۔اس ماحول کو پیش کرتے ہوئے مخدوم اپنی نظم ''زلف چلیپا''میں کہتے ہیں کہ:

آفریں ہے تجھ پہ اے سرمایا داری کے نظام — اپنے ہاتھوں اپنی بربادی کا اتنا اہتمام
آندھیاں شعلہ بداماں خون کی برسات ہے — اب تو بوئے آتش و باروت ہے ہر بات میں
کتنی ماؤں کی سنہری گودیاں ویراں ہیں آج — غرق گیتی پر نظر آتا ہے پھر کانٹوں کا تاج
مندوروں میں مسجدوں میں اور کلیساؤں میں موت — خلوتوں میں موت ہے شاہی شبستانوں میں موت
زرگری کا رقص ہے سود و زیاں کا رقص ہے — ہر گلی کوچے میں مرگِ ناگہاں کا رقص ہے[۱۶۶]

جگہ جگہ جلتے لاشے اور سسکتی دم توڑتی انسانیت پر وہ اپنی نظم ''سپاہی'' میں یہ سوال کرتے دکھائی دیتے ہیں کہ:

لاش جلنے کی بو آ رہی ہے — زندگی ہے کہ چلّا رہی ہے
جانے والے سپاہی سے پوچھو — وہ کہاں جا رہا ہے[۱۶۷]

اگست ۱۹۴۱ء میں جب کہ پوری دنیا پر عالمی جنگ کی ہول ناکیاں پوری طرح اپنے پنجے گاڑھے بیٹھی تھیں، آنند نرائن ملا نے اپنی نظم ''اندھی لڑائی'' میں ان مناظر کو پیش کرنے کی کوشش کی۔ ان کے خیال میں اس بے سبب اور لا حاصل لڑائی کے بہ ظاہر کوئی اسباب دکھائی نہیں دیتے لیکن پھر بھی انسان ایک دوسرے سے برسر پیکار رہے۔ اس بابت ان کا کہنا تھا کہ:

کٹے جا رہے ہیں مرے جا رہے ہیں — یہ نادان انساں لڑے جا رہے ہیں
کوئی ان سے پوچھے لڑائی یہ کیوں ہے — مذاقِ نبرد آزمائی یہ کیوں ہے
بشر کی بشر پر چڑھائی یہ کیوں ہے — نہیں جانتے یہ لڑے جا رہے ہیں
کٹے جا رہے ہیں مرے جا رہے ہیں
حقیقت میں سب اختلافات کیا ہیں — جہاں کے اصولی نزاعات کیا ہیں
جو کرنے ہیں حل وہ سوالات کیا ہیں — نہیں جانتے یہ لڑے جا رہے ہیں
کٹے جا رہے ہیں مرے جا رہے ہیں[۱۶۸]

ایک اور نظم ''امن کے سپاہی'' میں بھی وہ جنگوں کی تباہ کاری اور امن کی ضرورت کا احساس دلاتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

نشیبِ صلح میں سیلابِ جنگ کے آگے — قدم جمائے ہوئے کوہ سار ہیں کیا کیا
کثیف چیتھڑے زخمی بدن یہ چہرہ پہ خاک — غبار و خوں کی تہوں میں نگار ہیں کیا کیا
دلیر مرد فقط جنگ جو صفوں میں نہیں — سپاہِ امن میں بھی جاں نثار ہیں کیا کیا[۱۶۹]

اختر الایمان کی شاعری میں بھی جنگ کے کرب ناک مناظر اور روحانی شکست و ریخت کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اس دور کی تباہی و بربادی کی داستان سے شاید ہی کوئی شاعر ہو جو متاثر نہ ہوا ہو۔ اختر الایمان نے بھی ان محسوسات کو قلم بند کرتے ہوئے نظم ''جنگ'' میں کہا کہ:

میں نے دیکھا ہے ٹپکتے رگِ آہن سے لہو — سنگ پاروں سے ابلتی ہوئی دیکھی ہے شراب
کیا خبر کہتی ہو، اک موت کا جھونکا آیا — ایک گولی نے کیا ختم کہ افسانہ سنے

کون اس سوختہ جاں، سوختہ تن کا، چھوڑو / بھاگ کر چھپ گئے ہم، اپنی کمیں گاہوں میں
کھینچ کر ڈال دیا اس کو اسی خندق میں / دفن تھے جس میں کئی ایسے فسانے کب سے
دفن ہوتے ہی چلے آئے تھے، جانے کب سے[۷۰]

مجید امجد دوسری عالمی جنگ کے زمانے میں اخبار ''عروج'' سے وابستہ تھے۔ ان کی نظم اور نثری تخلیقات ''عروج'' میں مستقل شائع ہوتی تھیں۔ جنگ کے آغاز کے دنوں میں برطانوی سامراج کے خلاف ان کی نظم ''قیصریت'' بھی اس زمانے میں اسی اخبار کے صفحۂ اوّل پر شائع ہوئی جس کے بعد سامراجی دباؤ کے نتیجے میں انھیں ''عروج'' چھوڑنا پڑا[۷۱]۔ اس نظم کا انداز یاسیت سے بھرا ہوا ہے۔ جنگ زدہ ماحول میں ایک سپاہی جو میدان جنگ کی طرف رختِ سفر باندھ رہا ہے نظم میں منظر نگاری کے جوہر دکھاتے ہوئے شاعر اس سپاہی کے میدان جنگ میں کام آنے اور پھر اس کی اولاد کے ساتھ ہونے والے سلوک کو دکھ بھرے انداز میں کچھ اس طرح پیش کرتا ہے کہ انسان کا دل اس صورتِ حال پر مسوس کر رہ جاتا ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

وہ سپاہی جنگ میں مارا گیا / ڈوب اس کی زیست کا تارا گیا
لاش اس کی جوئے خوں میں بہہ گئی / کشتوں کے پشتوں میں کھو کر رہ گئی
اس سپاہی کا وہ اکلوتا یتیم / آنکھ گریاں، روح لرزاں، دل دو نیم
بادشہ کے محل کی چوکھٹ کے پاس / لے کے آیا بھیک کے ٹکڑے کی آس
اس کے ننگے تن پہ کوڑے مار کر / پہرے داروں نے کہا دھتکار کر
کیا ترے مرنے کی باری آ گئی / دیکھ وہ شہ کی سواری آ گئی
وہ مڑا چکرایا اور اوندھا گرا / گھوڑوں کی ٹاپوں تلے روندا گیا
دی رعایا نے صدا ہر سمت سے / ''بادشاہِ مہرباں! زندہ رہے''[۷۲]

اسی طرح مجید اپنی ایک نظم میں استعماری حربوں کے خلاف ایک سپاہی کے جذبات کی عکاسی کرتے ہوئے تلخ انداز میں کہتے ہیں کہ:

اگر اس مقدس زمیں پر مرا خوں نہ بہتا/ اگر دشمنوں کے گرانڈیل ٹینکوں کے نیچے/ مری
کڑکڑاتی ہوئی ہڈیاں خندقوں میں نہ ہوتیں/ دو دوزخ کے شعلے تمھارے معطر گھروندوں کی
دہلیز پر تھے، تمھارے ہر ایک بیش قیمت اثاثے کی قیمت/ اس سرخ مٹی سے ہے، جس میں
میرا لہو رچ گیا ہے[۷۳]

جاں نثار اختر کا تعلق بھی شاعروں کے اس گروہ سے تھا جو ادب میں افادیت اور مقصدیت کے قائل تھے لیکن انھوں نے ترقی پسند نظریات کے ہاتھوں اپنی شاعری میں فن کے جمالیاتی عناصر کا خون ہونے نہیں دیا۔ انھوں نے حقیقت پسندی اور وسعت نظری کے ساتھ انقلابی موضوعات کو اپنی شاعری میں جگہ دی۔ ''تانیا'' کے عنوان سے لکھی گئی نظم میں انھوں نے اس آٹھ سالہ بچی کی تصویر اور ڈائری سے متاثر ہو کر لکھی جس نے جرمن حملے کے بعد اپنی والدہ، بھائی، بہن اور رشتے داروں کے یکے بعد دیگرے ہلاک ہونے کی تاریخ درج کی تھی۔ اس ڈائری کے آخری صفحے پر لکھی تحریر کہ ''اب میں اکیلی ہوں''[۷۴] دراصل شاعر سے یہ نظم کہلوانے کا محرک بنی جس کا اظہار

جاں نثار اختر نے کچھ اس طرح سے کیا:

تیری تصویر کھوئی کھوئی سی تیری چھوٹی سی نوٹ بک کے ورق
میری سانسوں میں تھرتھراتے ہیں ہر صفحے پر لکھی ہے اک تاریخ
آج چاچا مرے سدھار گئے چل بسے آض میرے باپو بھی
آج میری بڑی بہن نہ رہی آج مارا گیا مرا بھائی
آج ماں بھی تو مجھ کو چھوڑ گئیں آج تنہا ہوں میں اکیلی ہوں[۱۷۵]

ایک اور نظم ''مورخ'' میں بھی شاعر جنگوں کی ہول ناکیوں اور تباہی و بربادی کے مناظر کی عکاسی کرتے ہوئے ان جنگوں کا محرک ہوسِ ملک گیری اور مذہبی منافرت کو قرار دیتے ہیں۔ وہ سوالیہ انداز میں مورخ سے پوچھتے ہیں کہ:

یاد تجھ کو کل جہاں کی معرکہ آرائیاں جنگ کا اک اک زمانہ، جنگ کا اک اک مقام
ملک گیری کی ہوس میں، مذہبوں کے نام پر ہو چکی دنیا میں کتنی بار تیغیں بے نیام
نادر و چنگیز کی خوں ریزیوں کے ماسوا تو اگر چاہے تو گنوادے ہزاروں قتلِ عام[۱۷۶]

احمد ندیم قاسمی نے بھی جنگوں کے نتیجے میں پیدا ہونے والی صورت حال پر نظمیں کہیں۔ ان جنگوں کی ہول ناکی کا سب سے بڑا نشانہ وہ سپاہ بنے جو اگلے محاذ پر ایک دوسرے کے خلاف برسرِ پیکار تھے۔ ندیم نے اس سپاہیوں کی حالت بیان کرنے کے ساتھ ان کے لواحقین کے دکھ اور آنسوؤں کو بھی اپنی شاعری میں پیش کیا۔ ''ایک سپاہی کا خط'' کے عنوان سے لکھے گئے ایک قطعے کو دیکھیے:

یہ کس نے جنگ سے یہ درد ناک خط لکھا کہ آج توپوں کے گولوں کی زد میں ہیں ہم لوگ
یہ کیا سبب ہے کہ پاتی ہوں ہر جبیں پہ شکن ہر ایک آنکھ میں آنسو ہر ایک دل میں سوگ[۱۷۷]

اپنے ایک اور قطعے ''بے سود دعائیں'' میں بھی وہ ان سپاہیوں کی زندگی کی ناپائیداری کا حال کچھ اس انداز سے بیان کرتے دکھائی دیتے ہیں:

کیوں مرے جینے کی دن رات دعا مانگتی ہو جنگ میں خاک بنے کوئی مرا رکھوالا
آج کل ہی کوئی خط آئے گا اور سن لو گی توپ نے ایک سپاہی کو بھسم کر ڈالا[۱۷۸]

قاسمی صاحب دنیا بھر میں پھیلی جنگوں کا ذمے دار خود انسانوں کو قرار دیتے ہوئے ان کی جنگ جویانہ طبیعت اور مزاج پر طنز کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

اب تو انسان کچھ اس زور کا جذباتی ہے جنگ کلیوں کے چٹکنے سے بھی چھڑ جاتی ہے[۱۷۹]

اپنی نظم ''عشق کرو'' میں وہ دنیا سے نفرت اور اسلحہ وگولہ بارود کے خاتمے کے لیے پیار و محبت کے جذبات کو فروغ دینے پر زور دیتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ:

اتنی نفرت بھی نہ بوؤ کہ قیامت کاٹو عشق کر لو، کہ یہی عشق ہے اب شرطِ بقا
صحنِ گلشن میں بدل جائے یہ دھرتی ساری توپ ہوروئے زمیں پر، نہ فضا میں بم بار

آدمیت کا جو منصب ہے اسے پہچانو عشق کرنے کا یہی وقت ہے، اے انسانو[۱۸۰]

ایک اور نظم ''جوہری جنگ کے بعد کا ایک منظر'' میں وہ ایٹمی جنگوں کی تباہ کاری، جنگل، پہاڑ، صحرا، دریا، سمندر اور زمین کی گریہ وزاری کا منظر دکھاتے ہوئے اس کرب کو کچھ اس طرح پیش کرتے ہیں:

وہ سناٹا ہے جس میں روشنی دم گھٹ کے مر جائے وہ تاریکی ہے، جو آواز کو پتھر بنا ڈالے

گماں ہوتا ہے جیسے اب کبھی سورج نہ نکلے گا جو نکلا بھی تو ان ویرانیوں کا کچھ نہ بگڑے گا

پہاڑوں پر دھواں، کھیتوں میں بھوبھل، تشنہ لب دریا سمندر سے ابل کر ساحلوں کو چاٹتا لاوا

یہ کل کا شہر ہے، جس کے کھنڈر صدیوں پرانے ہیں کہ اس آج اور کل میں سینہ زن کتنے زمانے ہیں

گھروں کے آنگنوں میں سر بریدہ سائے بیٹھے ہیں زمیں کے قاتلو! یہ آپ کے ماں جائے بیٹھے ہیں[۱۸۱]

جوہری توانائی کی دوڑ میں شامل ممالک نے انسانی محسوسات کو یکسر بدل کر رکھ دیا تھا۔ معصوم بچے اب رنگ اور تتلیوں کے بہ جائے خون اور دھماکوں سے معمور فضا میں سانس لینے پر مجبور تھے۔ اس حالت میں حروف و الفاظ سے معنی کے رشتے ٹوٹنے کے کرب ناک مناظر دکھاتے ہوئے قاسمی نے اپنی نظم ''ا____ب'' میں کہا کہ:

ذہین بچو! ''ا'' سے آم اور ''ب'' سے بکری کے دن گئے/ اب ''ا'' سے ایٹم پڑھو، کہ ایٹم اٹل ہے/ اب ''ب'' سے بم بنے گا/ کہ بم ہی آج اور بم ہی کل ہے/ حروف جیسے بھی تھے وہی ہیں/ مگر جو رشتے تھے ان میں ...یکسر بدل چکے ہیں/ ان کے مفہوم عہد نو کے جدید سانچوں میں ڈھل چکے ہیں/ حروف روتے ہیں/ اپنی بے حرمتی پہ روتے ہیں... چیختے ہیں[۱۸۲]

''نارمن موریٔ'' کے عنوان کے تحت لکھی گئی نظم میں احمد فراز نے ان لوگوں کے جذبات و احساسات کی نمائندگی کی جو جنگ مخالف رویّوں کے حامل تھے۔ اس نظم میں شاعر نے احتجاجی رویّہ اختیار کرتے ہوئے کہا کہ:

واشنگٹن مینار کے نیچے/ اس نے کہا تھا/ ایٹمی ہتھیاروں کا بنانا بند کرو/ اس نے کہا تھا/ ہنستے بستے شہروں پر شعلے برسانا بند کرو/ اس نے کہا تھا/ ناگاساکی، ہیروشیما کو دہرانا بند کرو/ ورنہ میرے جسم میں جو انگار بھرا ہے/ واشنگٹن مینار کو آگ سے بھر دے گا[۱۸۳]

اس احتجاجی رویّے کے ساتھ ساتھ شاعر نے اسلحہ کے سوداگروں کے خوف کو بھی ظاہر کیا جو ہر اس آواز کو دبا دینا چاہتے ہیں جو امن کے لیے اٹھے۔ یہاں شاعر اس کمزور اور نحیف ''نارمن موریٔ'' کے بینر کی جیت دکھاتے ہوئے امن دشمنوں کی بابت کہتے ہیں کہ:

مہک ہتھیاروں کے تاجر خوف زدہ تھے/ انسانی خوں کے سوداگر خوف زدہ تھے/ سارے شہر پہ سکتا سا تھا/ سب سفاک تھے ایک طرف/ اور اک دیوانہ تن تنہا تھا/ امن کی خوشبو پیار کے سازوں کی خاطر/ پھول سے بچوں کی آوازوں کی خاطر/ لیکن اس دم ساز کو کب زندہ رہنا تھا/ سچ کی اس آواز کو کب زندہ رہنا تھا/ شام ہوئی/ جب سورج رین بسیرے میں تھا/ یہ

دیوانہ جلادوں کے گھیرے میں تھا/ دیکھتے دیکھتے اس کا لہو پیوند زمیں تھا/ وین کے اندر ذرہ
بھر بارود نہیں تھا/ لیکن اس کے ہاتھوں میں جو بینر تھا/ سب کہتے ہیں/ وہ بارود سے بڑھ کر
تھا[۱۸۴]

فراز نے اپنے احتجاجی رویّوں کے اظہار کے دوران کبھی بھی شعری محاسن کو نظر انداز ہونے نہیں دیا۔ سخت سے سخت بات بھی سنبھل کر کہنے کا ہنر جانتے تھے۔ اپنے عہد کے آشوب کو پیش کرتے ہوئے وہ مانوس استعاروں اور ملائم نشانات سے کام لے کر اپنی شاعری میں نرمی کے ساتھ ساتھ احتجاجی رویّہ پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مثلاً مقتدر قوتوں اور جنگوں سے متعلق سلامتی کونسل کے کردار کے حوالے سے جب وہ کہتے ہیں کہ:

کون اس قتل گہہِ ناز کے سمجھے اسرار/ جس نے ہر دشنہ کو پھولوں میں چھپا رکھا ہے/ امن کی
فاختہ اڑتی ہے نشاں پر لیکن/ نسلِ انساں کو صلیبوں پہ چڑھا رکھا ہے/ اس طرف نطق کی
بارانِ کرم اور اُدھر/ کاسہِ سر سے مناروں کو سجا رکھا ہے/ پھر چلے ہیں مرے زخموں کا مداوا
کرنے/ میرے غم خوار اسی فتنہ گرِ دہر کے پاس[۱۸۵]

سحر انصاری نے بھی نسل انسانی کا نوحہ لکھتے ہوئے ایٹمی تباہ کاری کی پرزور مذمت کی ہے۔ نظم ''نسل زیاں گزیدہ'' اور ''عرصہِ جنگ'' میں اس کرب کا اظہار کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ:

وہ عہد جس میں ہماری نسلِ زیاں گزیدہ نے بار پایا/ زمیں کی آنکھوں نے اس سے پہلے کبھی
نہ دیکھا/ اس آدمِ عہد نو کو دیکھو/ ہے اک ہتھیلی پہ ہیروشیما اور دوسری پر قمر فروزاں/ ہم ایک
نسلِ زیاں گزیدہ/ کہیں ہمارا نشاں نہیں ہے[۱۸۶]

کشور ناہید نے بھی عالمی امن اور بھائی چارے کے لیے جنگوں کے امکان کو مسترد کیا۔ نظم ''پیمان وفا کس سے کہاں کیجیے جا کر'' میں زمین میں پھیلی بارود اور نفرت کی بو پر وہ اپنی پریشانی کا اظہار کرتے ہوئے کہتی ہیں کہ:

میری سرزمین جس میں محبت کے بہ جائے/ بارود کی بو پھیل رہی ہے/ یہاں کچھ نہیں رہے گا/
میرے بچوں کے لیے بھی کچھ نہیں رہے گا/ انگلی کے ناخن سے بھی زیادہ تیزی سے/ جنون
پھیل رہا ہے/ زر کا، جنگ کا اور نفرت کا/ گھڑی کو چابی دے دی گئی ہے/ سیٹلائیٹ، طبل
جنگ کی طرح گونج رہا ہے[۱۸۷]

فہمیدہ ریاض نے بھی پوکھرن اور چاغی میں کیے جانے والے ایٹمی دھماکوں پر طنزیہ انداز سے ہندوستان اور پاکستان کے جنگ جویانہ رویے پر طنز کیا ہے۔ ان کی محاذ آرائی کی وجہ سے زمین، خلا، پہاڑ اور فطرت کے دیگر عناصر کس طرح متاثر ہو رہے ہیں، اس کا اظہار کرتے ہوئے شاعرہ نے اپنے کرب کا اظہار کچھ اس طرح کیا ہے:

زمیں کی کوکھ کو انسان نے جلا ڈالا/ اور اب خوشی سے خلاؤں میں رقص کرتا ہے/ حسیں پہاڑ
کو اک آن میں مٹا ڈالا/ خدا کے سامنے طاقت پہ ناز کرتا ہے/ تم اس سے اپنی بصیرت بڑھا

نہیں سکتے/ وگرنہ جشن کا یہ اہتمام کرتے کیوں؟/ مقام گریہ سے ہنستے ہوئے گزرتے کیوں؟/ یہاں ہواؤں میں اب گرم راکھ اڑتی ہے/ کوئی گڈریا یہاں اب کبھی نہ آئے گا/ فرازِ کوہ پہ جو بکریاں چرائے گا/ کوئی پرندہ بھی اس سمت اب نہ جائے گا/ کوئی کسی کو نہ پانی یہاں پلائے گا/ اٹھے گا ابر تو برسے گی زہر کی بوچھاڑ/ زمیں کے سینے میں جس شے نے ڈال دی ہے دراڑ/ چیخ گئی ہیں ہوائیں جلا دیا ہے پہاڑ/ بس اک ثبوت ہے انسان کی شقاوت کا/ بس اک مہیب نشاں دہر کی ہلاکت کا[۱۸۸]

دوسری عالم گیر جنگ کے بعد دنیا بھر میں تباہی و بربادی کی جو تاریخ رقم ہوئی، اس کے بعد یوں محسوس ہوتا تھا کہ یہ جنگ آئندہ کی تمام جنگوں کا خاتمہ ثابت ہوگی۔ کیوں کہ اس جنگ میں جس قدر انسانی ہلاکتیں ہوئیں۔ وہ تاریخ میں لڑی گئی تمام جنگوں کی ہلاکتوں سے زیادہ تھیں۔ لیکن بدقسمتی سے ایسا ہوا نہیں بلکہ عالمی جنگوں کے بعد بیسویں صدی کے نصف اواخر میں اقوام عالم کے درمیان کئی ایسے معرکے رونما ہوئے جو اپنے ساتھ ہول ناکیوں اور بربریت کی داستان رقم کر گئے۔ ان جنگوں میں ۱۹۵۰ء جنگ کوریا، ۱۹۶۲ء چین و بھارت جنگ، ۱۹۶۴ء جنگ ویت نام، ۱۹۶۴ء ہی میں انڈونیشیا اور ملائشیا جنگ، ۱۹۶۵ء بھارت پاکستان کی جنگ، ۱۹۶۷ء عرب اسرائیل جنگ، ۱۹۷۱ء پاک بھارت جنگ، ۱۹۷۳ء عرب اسرائیل جنگ، ۱۹۸۰ء روس افغانستان جنگ، ۱۹۹۰ء عراق اور امریکا جنگ، ۲۰۰۱ء امریکا اور افغانستان جنگ اور ۲۰۰۳ء میں امریکا افغانستان جنگ قابل ذکر ہیں۔ ان جنگوں میں بھی لاکھوں فوجی و شہری ہلاک و زخمی ہو چکے ہیں۔ ان میں سے کچھ اہم موضوعات پر علاحدہ ابواب میں تفصیلی جائزہ لیا جائے گا لیکن پچھلی دو تین دہائیوں کے دوران ہونے والے کچھ اہم معرکوں کا مختصر جائزہ یہاں پیش کر کے اردو شاعری کے رجحانات کو دیکھنے کی کوشش خالی از دل چسپی نہ ہوگی۔ طویل دورانیے پر محیط یہ جنگیں بیسویں صدی کے ماتھے پر سیاہ دھبے کی صورت میں ہمیشہ موجود رہیں گی۔ اس بابت اقوام متحدہ کی بے بسی اپنی جگہ کیوں کہ یہ انجمن بھی انسانیت کو جنگ کی تباہ کاریوں سے کلی طور پر نہیں بچا سکی لیکن اتنا ضرور ہے کہ اس ادارے نے دوسری جنگ عظیم کے بعد سے اب تک دنیا کو کسی خوف ناک بڑی ایٹمی جنگ سے ضرور بچا رکھا ہے۔ بڑے بڑے علاقائی تنازعات طے کرانے اور دنیا بھر کو جنگ سے پاک کر کے پُر امن بنانے میں بہر حال اس انجمن کا کوئی خاص موثر کردار اب تک دیکھنے کو نہیں ملا۔

اسّی اور نوّے کی دہائی میں روس اور افغان جنگ اپنے عروج پر تھی، اس دوران اردو شاعری کا لب و لہجہ مقامی سے زیادہ آفاقی دھارے میں شامل ہوا۔ ان دو دہائیوں میں بے پناہ انگریزی تراجم، نئی نئی اصناف میں تخلیقی تجربے اور فکری سطح پر گلوبلائزیشن کے خیالات کو زیادہ جگہ ملی۔ ۱۹۶۵ء اور ۱۹۷۱ء کے زمانے کی شاعری کے مطالعے میں جو کہ اگلے ابواب میں علاحدہ سے زیر بحث لائے جائیں گے، ہم دیکھتے ہیں کہ شعرا کا مجموعی رویہ نظریاتی اور Pro-war یعنی جنگ کی حمایت میں رہا ہے۔ مگر اسّی اور نوّے کی دہائی میں ان رویّوں میں واضح تبدیلی کے آثار دکھائی دیتے ہیں۔ اس دور میں تخلیق کیا جانے والا ادب انسان دوست ادب کہلایا۔ نوبل انعام یافتہ ادیب ہیرلڈ پینٹر نے افغان اور عراق کے خلاف جنگی پالیسی پر کڑی تنقید کرتے ہوئے امریکا کو سخت طنز و تعریض کا نشانہ بنایا۔ اس کے مطابق امریکا کا مرغوب ترین حربہ یہ رہا ہے کہ کسی ریاست پر بلاواسطہ حملہ کرنے کے بجائے چھوٹے موٹے حملوں اور ڈھیرے ڈھیرے دشمنوں کا صفایا کر کے مقاصد کو حاصل کیا جائے۔ کم شدتی تضاد کا مطلب ہی یہ ہے کہ لوگ تو ہزاروں کی تعداد میں مریں لیکن آہستہ آہستہ۔ وہ ایک دم بم گرا

کر ایک لمحے میں دشمنوں کا صفایا کرنا پسند نہیں کرتا۔ امریکا نے ۱۹۵۴ء میں گوئٹے مالا کی جمہوری طور پر منتخب حکومت گرا کر جو انتشار پیدا کیا، اعداد و شمار کے مطابق دو لاکھ سے زیادہ افراد اس فوجی آمریت کے بعد ہلاک ہوئے۔ جدید نظامِ حیات میں جنگ ایک بے معنی اور محض طاقت کے اندھے استعمال سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی۔ دنیا کے تمام مہذب لوگوں نے جنگ کو غیر انسانی رویّہ قرار دیا ہے۔ ان لوگوں کے مطابق جنگیں دراصل ملوکیت، جبریت، سفاکیت اور مغلوبیت کو قائم رکھنے کے لیے لڑی جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ اس تباہ کن کھیل کا کوئی اور مقصد نہیں۔ جیسا کہ افغان روس اور امریکا افغان جنگ کے دوران بھی دیکھنے میں آیا ہے۔ افغانستان پر روسی فوجوں کی چڑھائی کے نتیجے میں امریکا روس جنگ جو پاکستانی مجاہدین نے مقامی افغان جہادیوں کے تعاون سے لڑی، اس کا اثر بھی اردو شاعری پر بہت گہرا پڑا۔ پاکستان کی فوجی حکومت نے امریکی مفادات کے تحفظ کے لیے پاک افغان نوجوانوں کو گوریلا جنگ میں دھکیل دیا۔ امریکا نے پاکستان کی فوجی اسٹیبلشمنٹ کے ساتھ گٹھ جوڑ کر کے اس پورے جنگی معرکے کو اسلام کی بقا کا ضامن قرار دلوا دیا اور ہماری مذہبی جماعتیں فوج کا ایک خفیہ ادارہ بن کر افغان مجاہدین کو مدد فراہم کرنے لگیں۔ یہ وہی مذہبی جماعتیں ہیں جو 9/11 کے بعد کالعدم قرار دے دی گئیں۔ ایسے میں صرف ہم بہ حیثیت قوم ہی بے وقوف نہیں بنے بلکہ ایسا دکھائی دیتا ہے کہ اسلام کے نام پر ہمارے دانش ور، ادیب اور شعرا کو بھی بے وقوف بنایا گیا۔ اس اہم معاشی جگہ کو سمجھنے کے بجائے ہم حق اور باطل کی جنگ کے چکر میں الجھے رہے۔ اردو شاعری میں بھی روسی افواج کے افغانستان میں داخل ہوتے ہی دو طرح کے رویّے سامنے آئے۔ ایک وہ طبقہ جو اس جنگ کا شدید مخالف تھا۔ یہ طبقہ فوجی اسٹیبلشمنٹ کے خلاف جانے کی وجہ سے زیرِ عتاب آیا۔ دوسرا طبقہ مذہبی جذبات سے مملو ان قائدین کا تھا جو روسی افواج کے انخلا کا مذہبی بنیادوں پر تجزیہ کر کے واقعات کی کڑیوں کو قرآن اور حدیث تک سے ملانے پر تُلا بیٹھا تھا۔ اسی مذہبی رویّے کی وجہ سے اس جنگ کو ''افغان جہاد'' کا نام دیا گیا[۱۸۹]۔

اردو شاعری پر امریکی حمایت سے لڑی جانے والی افغان جنگ کے گہرے اثرات دکھائی دیتے ہیں۔ ''پاک افغان اسلامی محاذ'' کی جانب سے مذہبی جذبات کی آبیاری کے لیے جو سیل بنایا گیا تھا، اس کی جناب سے ایک کتاب شائع ہوئی جس میں افغانوں پر جنگی نظمیں لکھ کر ان کے جوش و جذبے کو ابھارنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ۱۹۸۱ء میں شائع ہونے والے اس مجموعے کا نام ''کربلا سے کابل تک'' ہے۔ اس مجموعے کو تحسین فراقی اور غافل کرنالی نے مل کر مرتب کیا۔ اس مجموعے میں ۴۸ نظمیں شامل ہیں۔ معروف لکھنے والوں میں نعیم صدیقی، حفیظ تائب، طفیل ہوشیار پوری، مظفر وارثی، عطاالحق قاسمی، جلیل عالی، غافل کرنالی، انور مسعود اور تحسین فراقی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ خواجہ محمد ذکریا نے ''حرف چند'' کے طور پر اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے مجموعے میں شامل نظموں کو تاریخ کا کبھی فراموش نہ کیا جانے والا واقعہ قرار دیا۔ انھوں نے سرخ سامراج کے مظالم، ٹینکوں اور بموں سے لیس نہتے افغانیوں پر کیے جانے والے مظالم اور اس کے تخلیقی اظہار کو ظلم کے خلاف نفرت اور مظلوموں کے حق میں اعلانِ محبت قرار دیا[۱۹۰]۔ اس مجموعے میں شامل شعرا کسی ایک نظریے کے حامل نہیں تھے مگر ظلم و بربریت کے خلاف ان سب کا نظریہ ایک ہی تھا۔ اس جنگ کی تباہ کاری بھی کسی سے ڈھکی چھپی نہ رہ سکی۔ ہزاروں لاکھوں افراد کی قید و بند، سیکڑوں گاؤں کے زمین بوس ہونے، عورتوں اور معصوم بچوں کی ہلاکتوں کے مناظر دکھانے کے ساتھ ساتھ ان نظموں میں ۱۹۶۰ء کے اواخر میں رکھی جانے والی تحریک اسلامی کی بنیاد اور اس کے بطن سے جنم لینے والی زندہ تحریکیں، یہ سب کچھ ان نظموں میں دکھائی دیتے ہیں۔ اس تحریک کے ہیرو کے کارنامے، گلبدین حکمت یار، برہان الدین ربّانی، مولوی نصر اللہ اور محمد یونس

خالص کی جنگی حکمت عملیاں بھی ان نظموں میں دکھائی دیتی ہیں۔ یہ مجاہدین میدان جہاد میں کفر اور شر کی قوتوں سے برسر پیکار دکھائی دیتے ہیں۔ زیادہ تر نظموں کا فکری محور بھی حق و باطل کے درمیان معرکہ آرائی کے گرد گھومتا ہے۔ کسی شاعر نے بھی اس جنگ کا سیاسی یا انسانی بنیادوں پر تجزیہ نہیں کیا۔ عام واقعات اور حالات کو جہاد کے رنگ میں رنگ کر دکھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ نظموں کا مزاج یکسانیت کا شکار دکھائی دیتا ہے۔[191]

ظاہری بات ہے کہ اس کی وجہ وہ انتخاب ہے جو ایک خاص نقطۂ نظر اور ہدایات کو مدنظر رکھ کر کیا گیا تھا۔ یہ یکسانیت کبھی کبھی گراں بھی گزرتی ہے لیکن افغان جنگ کے پس منظر میں بہرحال اس مجموعے کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ ان نظموں میں انجم رومانی کی نظم ''ابلیس کا فرمان اپنے سیاسی فرزندوں کے نام'' دراصل اقبال کی مشہور نظم کی تضمین ہے جس میں اشترا کی اقتدار کے خواب کو چکنا چور ہوتا دیکھنے کی خواہش کا اظہار ملتا ہے۔ اس بابت وہ روسیوں کو یاد دلاتے ہیں کہ:

میدانِ جنگ میں نہ اسے دے سکو گے مات — فکرِ عرب کے دے کے فرنگی تخیلات
دو اشترا کیت کو بہ نوکِ سناں رواج — افغانیوں کی غیرتِ دیں کا ہے یہ علاج
ملاّ کو ان کے کوہ و دمن سے نکال دو — اسلام کو حجاز و یمن سے نکال دو[192]

نعیم صدیقی نے بھی افغان جنگ کے پس منظر میں متعدد نظمیں کہیں۔ اس مجموعے میں شامل ان کی نظم ''ابھی مرا خون بہہ رہا ہے'' میں بھی ان کے جذبے کی عکاسی بھرپور انداز سے دکھائی دیتی ہے۔ ان کے مطابق چنگیز خان اور ہلاکو خان کے مظالم ایک بار پھر سے افغانستان میں دہرانے کا سہرا روس کے سر ہے۔ وہ اس ظلم و بربریت کے خلاف آواز بلند کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

شہید ہو ہو کے پھر اٹھوں گا، نہ موت کے ہاتھ آؤں گا میں — رسولِ رحمت کے دشمنوں کو لہو کے آنسو رُلاؤں گا میں
مٹا کے اس دور کا جہنم، جہانِ تازہ بساؤں گا میں — ابھی مرا خون بہہ رہا ہے[193]

افغان جنگ کے محرکات، سیاسی عزائم، پاکستان کی بطور ''مہمان جنگی مہم'' کو بظاہر شعرا نے نظرانداز کیا ہے۔ ظاہری بات ہے کہ ان شعرا کے نزدیک یہ جنگ دراصل اسلام کی بقا کی جنگ تھی لہٰذا اکثر شعرا نے اس پوری جنگ کو اسلامی جہاد کے نقطۂ نظر سے دیکھا۔ امریکا کے سیاسی اور فوجی کردار پر کم ہی بحث کی گئی۔ حالاں کہ یہ پوری جنگ دراصل امریکی مفادات کے تحفظ کے لیے لڑی گئی تھی۔ اکثر شعرا روسی مظالم کی داستان، حضورؐ کی بارگاہِ اقدس میں پیش کر کے مسلمان قوم کی بقا کی دعائیں مانگتے دکھائی دیتے ہیں۔ شیر افضل جعفری، حفیظ تائب، یزدانی جالندھری اور عبدالکریم ثمر کی نظمیں اسی رنگ میں ڈوبی ہوئی ہیں۔ اس کے علاوہ طفیل ہوشیار پوری، مظفر وارثی اور تابش صدیقی کی نظمیں بھی اسلامی رنگ میں ڈوبی ہوئی ہیں۔ وہ حق و باطل کی محاذ آرائی میں حق کی فتح کے رومانی تصور کو پیش کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ تابش صدیقی کی نظم ''دین کی آبرو کے رکھوالے'' کے عنوان سے ہی ظاہر ہے کہ وہ بدترین بربادی کے باوجود افغان مجاہدین کی بہادری اور دلیری کو پیش کرنا اپنا دینی فریضہ سمجھتے ہیں۔ اس بہادری کی مبالغہ آمیز تصویر اس نظم میں دیکھی جاسکتی ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

بیرکوں سے نہ ریچھ سے خائف — یہ ببر شیر ہیں خدا والے
سر زمینِ جمال کے بیٹے — دین کی آبرو کے رکھوالے[194]

ہارون الرشید کی نظم ''ماں''، کمال سالار پوری کی نظمیں ''اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد'' اور ''افغان خدامست کے ایماں

کی اداد یکھ'' ، غافل کرنالی کی نظمیں ''خوش بو کا نوحہ'' ، ''افغان مجاہدین کا اعلان جہاد'' ، ''افغان مجاہدین کے لیے ایک دعا'' ، ''اہل وطن کے نام'' اور ''روشن لہو'' وغیرہ میں بھی ایک یک رخا پن دکھائی دیتا ہے۔ اس کے علاوہ تحسین فراقی کی نظم ''قریہ سبز سے فاختاؤں کی ہجرت'' میں بھی جنگ میں شہید ہونے والوں کو خراج عقیدت پیش کرنے کی کوشش کے سوا کوئی اور بات دکھائی نہیں دیتی۔

افغانستان کی سرزمین ۱۷ اکتوبر ۲۰۰۱ء کی رات ایک بار پھر امریکی جارحیت کا شکار ہوئی۔ وہی افغانستان جو کل تک امریکی مفادات کی جنگ لڑ رہا تھا، امریکا کے غیض و غضب کا شکار ہوا۔ ۳۰۰ ایف ۱۶ اور ایف ۱۵ الڑا کا طیارے، ۳۵ ہزار ریز رو فوج، سعودی عرب، بحرین، خلیج فارس اور دوسری جگہوں سے بحری بیڑے افغان جنگ کے لیے روانہ کر دیے گئے۔ گائیڈڈ میزائل سے لیس یہ طیارے افغانستان کے مختلف شہروں پر بم برسانے لگے۔ امریکی جدید ترین طیارے ۵۸ ٹو بی نے کیمیائی مواد اور بارود کی بارش سے جلال آباد، قندوز، کابل، ہرات اور قندھار وغیرہ کے در و دیوار ہلا کر رکھ دیے۔ دنیا بھر سے احتجاج بلند ضرور ہوا لیکن امریکا کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔ طالبان رہنما ملّا عمر کے گھر بم باری کی کارروائی تو سمجھ میں آتی ہے لیکن تعلیمی اداروں، چلتی گاڑیوں، ریڈیو اسٹیشن، رہائشی عمارتوں اور کھیل کے میدان کو کلسٹر بموں سے نشانہ بنانا، بستیوں میں زہریلی گیس چھوڑ دینا، ایک آدھ گولی کی آواز پر وہاں سیکڑوں ٹن بارود گرانا[۱۹۵] وغیرہ جیسے اقدامات نے امریکا کا مکروہ چہرہ پوری دنیا کے سامنے عیاں کر دیا۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ ان کارروائیوں میں طالبان مخالف مقامی کمانڈروں برہان الدین ربانی اور عبدالرشید دوستم وغیرہ نے امریکی پالیسی کا کھل کر ساتھ دیا۔ افغان امریکا جنگ کے پس منظر میں اسامہ بن لادن، ایک پُر اسرار شخصیت کے روپ میں سامنے آئے۔ ۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ء کی صبح چار امریکی جہازوں کے اغوا اور ان میں سے دو جہازوں کا یکے بعد دیگرے نیویارک کے ورلڈ ٹریڈ سنٹر سے ٹکرانے، تیسرے جہاز کا امریکی وزارتِ دفاع کی عمارت ''پنٹاگون'' کے قریب گرنے اور چوتھے جہاز کا اپنے ہدف سے بھٹک کر ''پنسلوانیا'' میں گر کر تباہ ہونے کے واقعات نے پوری دنیا کو ورطہ حیرت میں ڈال دیا۔ اس اندوہ ناک سانحے میں ۲۶۶ افراد کی ہلاکت کے علاوہ بھگدڑ اور افراط و تفریط کے نتیجے میں ہزاروں کی تعداد میں لوگ زخمی ہوئے۔ اس وقت امریکی صدر جارج بش نے ان حملوں کے ڈانڈے اسامہ بن لادن کی تنظیم ''القاعدہ'' سے ملائے مگر اسامہ بن لادن نے ان کارروائیوں کی ذمہ داری قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اسامہ بن لادن جو کہ سعودی باشندے تھے، سوڈان اور پھر ۱۹۹۶ء میں افغانستان منتقل ہو چکے تھے۔ ابتدا میں طالبان اور اسامہ بن لادن کو ایک دوسرے پر اعتماد نہیں تھا لیکن جلد ان کی غلط فہمیاں دور ہو گئیں، اسامہ نے افغانستان سے اپنا پہلا انٹرویو لندن کے ''دی انڈی پنڈنٹ'' کے ''رابرٹ فسک'' کو دیا۔ اس انٹرویو میں انھوں نے برطانیہ، فرانس اور امریکی فوجوں کو سعودی عرب سے نکل جانے کا مطالبہ کیا۔ اس کے بعد پاکستانی صحافیوں کی پریس کانفرنس میں امریکا اور اسرائیل کے خلاف ''بین الاقوامی اسلامی محاذ برائے جہاد'' قائم کرنے کا اعلان کیا۔ پھر اگست ۱۹۹۸ء میں نیروبی (کینیا) اور دارالسلام (تنزانیہ) میں امریکی سفارت خانوں پر حملے نے اسامہ کا امیج ہمیشہ کے لیے تبدیل کر دیا[۱۹۶]۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ ورلڈ ٹریڈ سینٹر حملے میں تجزیہ کاروں نے اس اہم نکتے کو ہمیشہ پیش کیا کہ چار ہزار یہودیوں میں سے کوئی ایک بھی اس روز وہاں کام کے لیے موجود نہیں تھا کیوں کہ ان یہودیوں کو اسرائیلی انٹیلی جنس ایجنسی ''شبک'' کے ذریعے پہلے ہی ان حملوں کا علم ہو چکا تھا[۱۹۷]۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ سازش خود امریکا نے تیار کی تا کہ افغان مسلمانوں کو سبق سکھایا جا سکے۔ افغانستان چوں کہ پاکستان کا ہم سایہ ملک ہے لہٰذا اس جنگ کے خلاف بھی پاکستان میں ردِ عمل شدید تھا۔ متعدد شعرا نے اس جنگ کے محرکات اور امریکی جارحیت کے خلاف نظمیں لکھیں۔

احمد ندیم قاسمی نے اپنی ایک نظم ''افغانستان'' میں جنگ کی تباہ کاریوں، موت کے سائے اور خوف کی فضا کو پیش کرتے ہوئے کہا کہ:

بچے جب موت کے گھیراؤ میں چیخے/ تو یہ میں نے دیکھا ہفت افلاک تڑختے ہی چلے جاتے
ہیں/ ماؤں کی کوکھ جب اجڑی/ تو فرشتوں کی قطاروں پہ قیامت ٹوٹی/ بہنوں نے بھائیوں
کے خون میں ڈوبے ہوئے آثار سمیٹے/ تو بہت زور سے لرزا ہے نظامِ شمسی/ تم جو زندہ نظر
آتے ہو/ مگر مردہ ہو/ تم نے انسان کو ''اشرف'' کی بلندی سے نشیبوں میں/ کچھ اس
طرح سے دے مارا ہے/ جیسے کوئی کوڑا پھینکے/ اور تاریخ وہ سفاک حقیقت ہے/ رعایت
نہیں کرتی/ کہ وہ سچ بولتی ہے [۱۹۸]

آفتاب اقبال شمیم نے اپنی نظم ''زمانہ بازار بن گیا ہے'' میں اس جنگ کے محرکات اور پس منظر کو تلاش کرتے ہوئے اسے تیل کے سوداگروں کی سازش قرار دیا ہے۔ وہ اس سارے کھیل کا ذمے داران لالچی کاروباریوں کو قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

حشیش و بارود کی کثافت/ لہو کی بدرو میں بہہ رہی ہے/ ہوس کا لاکرا اٹا ہوا ہے زرِ سیہ سے/ یہ
شہرِ سوداگراں ہے جس میں/ معاش کے لنگروں میں پلتی ہوئی رعایا/ انا کی قلت سے اپنے
باطن میں مر چکی ہے [۱۹۹]

ایوب خاور کی نظم ''ایک افغان بچے کا سوال'' میں اس جنگ کے بعد معصوم ذہنوں پر پلنے والے سوالات کا نفسیاتی تجزیہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ نظم میں بچے جو جو سوالات اٹھاتے ہیں، ان میں حیرانی، معصومیت اور استعجاب کی کیفیت نمایاں ہے۔ شاعر اس معصوم بچے کے سوال کا جواب دینے کی کوشش کرتے ہیں لیکن شاید ان سوالوں کے جواب کسی کے پاس نہیں۔ ملاحظہ کیجیے:

اے امریکا/ مرے حصے کے بسکٹ بم دھماکوں کی وجہ سے/ ریزہ ریزہ ہو گئے ہیں/ بھوک
آتش گیر مادے کی طرح/ سینے میں معدے تک بھڑکتی پھر رہی ہے/ حلق میں گریہ کی ڈلیاں
ہیں/ جو نگلی جا رہی ہیں نہ اُگلی جا رہی ہیں... اے امریکا/ مرے دامن میں میری بانجھ دھرتی
کی سیہ مٹی ہے/ اور ہاتھوں میں میزائل کے ٹکڑے/ تم اس مٹی اور ان کے بدلے میں/ مجھے
کھانے کو کیا دو گے [۲۰۰]

محمد علی فرشی کی نظم ''بارود گھر'' بھی افغان امریکا جنگ کے پس منظر میں لکھی گئی ہے۔ اس نظم میں جو تصویریں ہیں وہ نہ صرف خوف ناک ہیں بلکہ معنیات کی نئی دنیا تک پہچانے اور انکشافات کی نئی نئی پرتوں کو کھولنے میں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ ایک ملک جو تباہ و برباد ہو رہا ہے، بارود گھر بنا ہوا ہے، شاعر کو بے چین رکھتا ہے۔ شاعر اس بے چینی کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

بہت دیر کر دی/ فرشتوں نے نیچے اترتے ہوئے/ فاختہ/ اپنی منقار میں/ کیسے زیتون کی سبز
پتی دبائے/ جہنم سے پرواز کرتی؟/ فلک دور تھا/ اور بارود گھر شہر کے وسط میں [۲۰۱]

صبا اکرام کی نظم ''افغانستان'' میں ایک ماں کے نوحے کو پیش کرنے کے ساتھ ساتھ جنگ کی تباہیوں کو بھی موضوع بنایا گیا ہے۔ ایک مفلوک الحال قوم جو جنگ کے عذاب کو کئی دہائیوں سے سہہ رہی تھی، امریکا کی شکل میں پڑنے والی نئی افتاد سے کس درجہ متاثر

ہوئی،اس نظم میں ان تمام حالات کو پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ملاحظہ کیجیے:

فلک سے کوئی عذاب اترا/ کہ کالی راتوں میں/ پتھروں پر گلاب نکلے/ شکستہ گھر کے/
اندھیر کمرے میں/ ایک ماں نے/ لہو میں ڈوبے ہوئے دوپٹے کو/ خشک ہونٹوں پہ/ اپنے
ننھے کے/ یوں نچوڑا/ کہ آخری بوند جیسے/ وہ اپنی چھاتی کا دے رہی ہو/ طویل اندھے سفر
پہ/ جیسے وہ جا رہی ہو[۲۰۲]

غلام جیلانی اصغر نے بھی افغان عوام پر ہونے والی بم باری اور بربریت کو دنیا پر تسلط کے خواب سے تعبیر کیا ہے۔لالچ،حرص اور طاقت کا بے دریغ استعمال ہی دراصل انسان کو انسان کا دشمن بنا رہا ہے۔شاعر نے ان جذبات کی عکاسی کرتے ہوئے کہا کہ:

اس کو آدھی دنیا دے دو/ اس کا سارا لوہا، تانبا/ سونا، چاندی/ ہیرے، موتی/ ہری بھری
آسودہ فصلیں/ اسی کو سب کچھ دے دو/ شاید تم سے خوش ہو جائے/ اور تمھارے بچوں کو جینے
کی کچھ مہلت دے دے[۲۰۳]

ادیب سہیل کی نظم ’’بے نام آگ کی دستکیں‘‘ بھی مقتدر قوتوں کے حکم نامے اور معصوم لوگوں کی موت کے پروانے کی کیفیت کو پیش کرنے کی عمدہ کوشش ہے۔نظم میں یہ کیفیت دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ ان بے آسرا لوگوں کی زندگی محض اس وقت تک محفوظ ہے جب تک موت کا پروانا ان کے لیے حکم نامہ لے کر نہیں آ جاتا۔جدید حسیت سے بھرپور اس نظم کا انداز دیکھیے:

وہ ہماری گالوں پر وحشیانہ دستکیں دیتے ہیں/ ہمیں اپنی قبر کھودنے کا حکم دیتے ہیں/ ہم قبر
کھودنا شروع کر دیتے ہیں/ تاکہ قبر تیار ہونے تک/ کچھ لمحے زندگی کا مزہ لے لیں/ محبت
اور موت کا وقت درج نہیں/ موت اور سالار کا حکم بھی/ بے وقت/ بے دستک آتا ہے[۲۰۴]

شرف الدین شامی کی نظم ’’نغمۂ طاغوت‘‘ میں جوش اور ولولے کو پیش کرتے ہوئے غیرت وحمیت کے جذبات کو ابھارنے کی کوشش کی گئی ہے۔یہ نظم پوری دنیا کے مظلوم انسانوں کا نوحہ ہے۔امن اور خوش حالی کے نام پر جس طرح سے نفرت اور بربادی کے تحفے معصوم لوگوں کو دیے گئے،اس پر تنقید کرتے ہوئے شاعر کہتے ہیں کہ:

کفِ قاتل کو چکھنے دو لہوان کا/ اترنے دو ابھی پوروں میں خوں کا ذائقہ/ جاری رہے مشقِ
ستم جاری رہے/ یوں ہی رقصاں رہو/ بے خود رہو،اس نوحۂ مظلومیت پر/ لہو،اوڑھے،لہو
پیتے/ لہو بوتے ہوئے/ جاری رہے مشقِ ستم جاری رہے[۲۰۵]

امریکا کا یہ حملہ صرف افغان غلبے تک محدود نہ رہا بلکہ بعد کے واقعات نے ثابت کیا کہ امریکا،گرفتار طالبان اور عام افغان شہریوں کو کس قدر اذیت ناک سزائیں دیتا تھا۔کنٹینر میں جس کی وجہ سے سیکڑوں افغان فوجیوں کی ہلاکتوں اور قلعہ جنگی جیسے سانحات میں زندہ انسانوں پر پٹرول چھڑک کر آگ لگانے اور ان جلتے جسموں کے تڑپتے مناظر انسانی تاریخ میں سیاہ باب سے لکھے جائیں گے۔ اشرف یوسفی نے اپنی نظم ’’قلعہ جنگی‘‘ میں ان مناظر کو دکھاتے ہوئے انسانی بے حسی کا جو نقشہ کھینچا ہے وہ بہت دردناک ہے،ملاحظہ کیجیے:

تن لہو جاں لہو/ مو بہ مو/ مقتلِ وقت میں سرخرو/ یہ ستاروں کے پرچم تلے/ رقصِ بسمل ہے،

جی بھر کے دیکھے جسے شوق سے/ رقصِ بسمل ہے جسے دیکھ کر چشمِ ہزیمت سے جھکنے لگے/
سانس رکنے لگے/ ہم جو باغی تھے، سرکش تھے، غدّار تھے/ آخری فیصلے کے تمنائی ہیں/ آج
تک/ پاک ارضِ وطن کی عدالت نے جو فیصلہ بھی کیا/ وہ سنہری عبارت میں لکھا گیا/ فیصلہ
جس سے لکھا گیا/ وہ قلم/ دستِ قاتل کو تحفے میں بھیجا گیا[۲۰۶]

یہ جنگ آج بھی ختم نہیں۔ امریکا نے اسامہ بن لادن کو ختم کر دیا لیکن طالبان کی کارروائیوں نے ابھی تک امریکا کو اس محاذ پر مکمل طور پر کام یاب ہونے نہیں دیا۔ افغان اب اس جنگ کو گوریلا کارروائیوں میں تبدیل کر چکے ہیں۔ خوف، تشدد اور بے مقصد ہلاکتیں افغان قوم کا مقدر بنی ہوئی ہیں۔ ان حالات میں اردو شعرا نے افغان پڑوسیوں کے جذبات واحساسات کو پیش کرنے کے لیے ہر ممکن کوشش کی۔ غزلوں کی نسبت نظموں میں شعرا کو بھرپور ردعمل کے اظہار کا موقع ملتا ہے[۲۰۷]۔ لہٰذا شعرا نے نظم ہی کو پیرایہ اظہار کے لیے منتخب کیا۔ افغان پس منظر میں کہی گئیں نظمیں اس جنگ جویانہ ماحول کے لیے اہم دستاویز کی حیثیت رکھتی ہیں۔ یہ رویہ اردو شعرا کے ہاں بعد میں عراق پر امریکی حملے کی صورت میں مزید شدت سے ابھر کر سامنے آیا۔

افغان جنگ کا ابھی پوری طرح خاتمہ بھی نہیں ہوا تھا کہ امریکا نے پہلے سے تیار شدہ منصوبوں کو عملی جامہ پہنانے کے لیے عراق کا رخ کیا۔ عراق جو طویل عرصے تک امریکی مقاصد کی تکمیل میں پیش پیش تھا، دیکھتے ہی دیکھتے جوہری ہتھیاروں کی سرپرستی کے الزام میں ایک خطرناک ملک بن گیا۔ امریکا صدام حسین کی شکل میں کسی کو بھی اپنے سامنے سر اٹھانے کی اجازت نہیں دے سکتا تھا۔ ''العمود'' اور ''ابابیل'' نامی مزائلوں کی تیاری کی بابت CIA کی رپورٹ دراصل امریکی حملوں کی منصوبہ بندی کی طرف ایک اور قدم تھا۔ دل چسپ حقیقت یہ ہے کہ آنے والے دنوں میں اقوام متحدہ کے اسلحہ انسپکٹروں نے عراق کا چپہ چپہ چھان مارا لیکن انھیں کسی بھی قسم کے کیمیائی یا مہلک ہتھیار نہیں مل سکے جو انسانی جان کے لیے خطرناک ہوتے۔ ''جنرل محمد البرادی'' نے واضح طور پر سلامتی کونسل کو رپورٹ دی کہ عراق نے اس اسلحہ انسپکٹروں کے ساتھ مکمل تعاون کیا ہے مگر امریکا اور اس کے اتحادی برطانیہ، جمہوریہ چیک، ہنگری، پولینڈ، ڈنمارک، اسپین اور اٹلی وغیرہ کے حکم رانوں نے عراق کی تعاون کی پالیسی کو کمزور جان کر یہی فیصلہ کیا کہ عراق پر حملہ ہونا چاہیے۔ یورپی یونین کے بعض ممالک فرانس اور اٹلی وغیرہ نے مخالفت بھی کی مگر امریکا اور اتحادی کچھ سننے کو تیار نہ تھے۔ صدر بش نے ۱۱ستمبر کو برملا اس بات کا اعلان کیا تھا کہ وہ دہشت گردوں کا مقابلہ کرنے کے لیے دنیا کے کونے کونے میں جائیں گے۔ کولن پاول نے تو یہاں تک کہہ دیا تھا کہ عراق نے اگر کیمیائی ہتھیار استعمال کیے تو امریکا ایٹم بم استعمال کرنے سے گریز نہیں کرے گا۔ برطانیہ کے وزیراعظم ٹونی بلیئر نے بھی پارلیمنٹ سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ کسی ویٹو کی پرواہ نہیں، عراق پر حملہ لازمی ہوگا۔ عراقی عوام اس اعلان کے بعد اپنے خون کی بو گلیوں اور بازاروں میں اڑتی محسوس کرنے لگے۔ افغانی بچوں کی چیخیں ابھی تھمنے نہ پائی تھیں کہ عراقی صحرائی علاقوں میں بارود کی چادر بچھا دی گئیں۔ آخر کار ۲۰ مارچ ۲۰۰۳ء کی صبح امریکی طیاروں نے عراق کے شہروں کو نشانہ بنانا شروع کر دیا۔ عراقی فوج بھرپور مقابلہ کرتی رہی۔ صدام حسین نے ٹیلی وژن تقریر میں اعلان کیا کہ وہ امریکا کو شکست دیں گے مگر یہ دعویٰ محض خام خیال ثابت ہوا۔ امریکی اور برطانوی طیاروں نے بغداد، موصل اور ناصریہ پر کلسٹر بموں سے وحشیانہ بمباری شروع کر دی۔ شہر اور سرکاری رہائشوں کا فرق کیے بغیر تمام عوامی مقامات کو نشانہ بنایا گیا۔ شروع میں امریکی فوجیوں کو خاصی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ صحرا کی تند و تیز لو سے امریکی فوجی

پریشان بھی ہوئے لیکن بالآخر عراق فتح ہوگیا[۲۰۸]۔

یہ جنگ بھی دو طاقتوں کی جنگ نہیں بلکہ ظلم کی داستان کا ایک نہ ختم ہونے والے سلسلے کا آغاز ثابت ہوئی۔ صدام حسین کو تو طویل عرصے جیل میں رکھنے کے بعد بالآخر ۲۰۰۷ء میں پھانسی دے دی گئی مگر پورے عراق میں خانہ جنگی اور بدامنی کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہوگیا۔ یہ انتشار عراقی عوام کا مقدر بن گئی۔ اس واقعے نے بھی انسان اور انسانیت کو شرمندہ کردیا۔ یہ انسانیت کا قتل عام تھا۔ دنیا بھر کے صحافیوں، دانش وروں، شاعروں اور امن پسند طبقے نے اس کارروائی کو امریکی اسٹیبلشمنٹ کی خود غرضانہ کارروائی قرار دیا۔ اردو شاعری بھی انسانیت کے قتل عام پر کیسے خاموش رہ سکتی تھی۔ خون کے چھینٹے اور کھوپڑیوں کے انبار دیکھ کر شاعروں نے اپنے جذبات کا اظہار کھل کر کیا۔ امریکی اور اتحادی حملوں کے پس منظر میں احمد ندیم قاسمی کی نظم ''لالۂ صحرا'' اہمیت کی حامل ہے۔ اس نظم میں وہ تہذیب کے علم برداروں پر طنز کے نشتر چلاتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

> عصرِ حاضر کی تہذیب کے، دور تک پھیلے صحراؤں میں/ آندھیاں چل رہی ہیں/ اس کی
> تاریخ، ٹیلوں کی صورت میں، یہاں سے وہاں، سر پٹختی نظر آرہی ہے/ اور ہوا، ریت کے تند
> چھینٹے اڑاتی/ مرے خیمۂ دل کے چاروں طرف (ایک شاعر کے چاروں طرف)/ ایک بھنور
> سا بنانے میں مصروف ہے/ یہ وہ خیمہ ہے/ جس کی طنابوں کو جھونکے قیامت کی شدت سے
> جب ٹوٹ پڑتے ہیں/ چیخوں کی آواز آتی ہے/ جیسے بہت سے فرشتے/ فلک سے اترتے
> ہوئے، رو رہے ہیں[۲۰۹]

آفتاب اقبال شمیم کی نظم ''خوف کی دوری سے'' بھی اسی پس منظر میں لکھی گئی عمدہ نظم ہے۔ امریکا نے جس طرح زبردستی دہشت گردی کی سرگرمیوں کا الزام عراقی سرزمین پر لگایا، اس پر احتجاج کرتے ہوئے شاعر کہتے ہیں کہ:

> یہ زمین، تم جسے ایک بارود خانہ بنانے کی عجلت میں ہو/ کیا نہیں جانتے!/ یہ ہزاروں محبت
> کے جھولے میں/ پلتی ہوئی زندگی... موت کے فیصلے کرنے والو، سنو!/ یہ زمینیں ہماری ہیں،
> دھرتی ہماری ہے/ صدیوں کی صدیاں ہمیں دیکھتی آرہی ہیں[۲۱۰]

وہ اس خون ریز منظر میں ایک ایسا منظر تعمیر کرتے دکھائی دیتے ہیں جس کا خواب ہر عراقی دیکھ رہا تھا۔ اپنی ایک اور نظم ''سقوطِ بغداد'' میں وہ مختلف عراقی شہروں کی سیاحت کے دوران پیدا ہونے والی اس مایوسی کے احساس کو قلم بند کرتے دکھائی دیتے ہیں جو ان کے دل میں پیدا ہوا۔ وہ بغداد جہاں اب زندگی کا نام ونشان بھی نہ بچا تھا۔ وہ صدیوں پرانی تاریخ اور روایات جو اب ویران اور مردہ دکھائی دے رہی تھیں، شاعر کے دل میں ایک اضطراب پیدا کرنے کا باعث بنیں۔ اسی لیے شاعر یہ کہنے پر مجبور ہوا کہ:

> نجف سے گزرا تو میں نے دیکھا/ ستون و محراب پر جھپٹتے/ ہوا کے قزاق، کتنی صدیوں کے/
> شوق سجدوں کو، گرم بوسوں کو/ بُردِ بارود کر چکے تھے/ سحر مجھے کربلا میں آئی/ جہاں کلسٹر
> بموں کے شب خون کی شفق سے/ کشیدہ سر جرأتوں کا سورج نکل رہا تھا.../ یہاں مقدر کا
> شہر بغداد سو رہا ہے/ کھنڈر کے نیچے/ تمھیں پتا ہے/ یہ شہر شہروں کا شہر جنگِ مزاحمت کے/

محاذ پر ہے/ ابھی اٹھے گا، بہ نام آئندگی اٹھے گا/ سیاہ تاریخ کے ورق پر/ لہو میں اپنی گواہیاں
درج کرنے والا/ نہیں مرے گا یہ مرنے والا[۲۱۱]

خالد علیگ کی تصنیف ''بغداد آشوب'' میں تو عراق امریکا جنگ سے متعلق تمام پہلوؤں کو پیش کیا گیا ہے۔ ظلم اور بربریت کے خلاف ایک باغیانہ آواز سے بھرپور یہ مجموعہ ۲۰۰۳ء میں شائع ہوا۔ کتاب کا انتخاب ہی عراقی بچوں، عراقی حریت پسندوں، عراقی ماؤں، عراقی بزرگوں اور عراقی بہنوں کے نام کیا گیا۔ شاعر نے اپنے ضمیر کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے عراقی عوام پر ہونے والے مظالم کو بڑے دکھ اور کرب کے ساتھ بیان کیا ہے۔ ایک نظم ''امن اور جنگ'' میں عالمی سطح پر مقتدر قوتوں کی جانب سے مسلط کی جانے والی جنگ پر جو سوالات انھوں نے اٹھائے، وہ ان حالات کی مکمل تصویر کشی کرتے دکھائی دیتے ہیں:

کس کی دہشت نے کسے لرزہ براندام کیا/ اور پھر الزام بھی کس پر آیا/ امن کے نام پہ جنگوں
کا یہ دستور نکالا کس نے/ ہاتھ کس کا ہے، گریباں کس کا/ اور لہو کس کا، اچھالا کس نے...امن
کے نام پہ اس جنگ کا اعلان مگر/ برتر اقوام کے مغرور خداؤں کی عنایات کا تاوان بھی ہے/
اور منطق ہے یہ کچھ مصلحت اندیشوں کی/ امن غیرت کے بدل میں بھی جو مل جائے تو بہتر
ہوگا[۲۱۲]

قمر ہاشمی نے بھی اپنی نظم ''بغداد'' میں اس جنگ کو نزاعِ تیل اور زرگری کا شاخسانہ قرار دیتے ہوئے مغرب کو اس کا ذمے دار قرار ٹھہرایا ہے۔ شاعر کا کہنا ہے کہ:

رواں ہے آج بھی دجلہ/ ہے گرچہ دجلۂ خوں/ کسے خبر یہ شہادت کا شوق ہے کہ رقصِ
جنوں/ نزاع تیل کا ہے یہ کہ زرگری کا فسوں/ شکست و فتح مقدر میں پہلے ہوتی تھی/ یہ اسلحے
کی نمائش ہے خوں کی ارزانی/ فضائے امن ندا دے رہی ہے شہروں میں/ ہلاکتوں کے
جرائم کا مرتکب مغرب/ حماقتوں کے یہ سب جنگ جو ہیں زندانی[۲۱۳]

تابش دہلوی کی غزلیہ نظم ''میرے خدا ممالکِ اسلامیہ کی خیر'' میں بھی امریکی جارحیت پر کھل کر تنقید کی گئی ہے۔ شاعر دعائیہ انداز سے اس پوری جنگی فضا سے چھٹکارے کے خواہش مند دکھائی دیتے ہیں:

میرے خدا ممالکِ اسلامیہ کی خیر — ہیں یہ تمام امریکی صیہونیت کی شاق
یہ خود بھی متحد نہیں رہتے بہ ہم دگر — افسوس پارہ پارہ ہے امت کا اتفاق
تہمت ہے اسلحے کے ذخائر عراق پر — امریکیوں کو ہو گیا ہے جنگ کا مراق
دہرائی جانے والی ہے تاریخِ کربلا — یا رب لہو لہان نہ ہو خطۂ عراق[۲۱۴]

تیل کی بو نے جس طرح سے امریکی حکمرانوں کو جنون میں مبتلا کر دیا تھا، اسلم فرخی نے ان سیاسی مقاصد کی تکمیل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ:

دختِ بغداد کی چیخوں کی کسے کیا پرواہ — کتنی مدت سے کیا ہے اسے تنہا تنہا

نہ دوائیں نہ غذا ہے نہ سکونِ دل ہے　　　تیل کے چشموں کی دولت کا یہی حاصل ہے [۲۱۵]

حسن عابدی کے ہاں بھی عراق جنگ کے حوالے سے شدید ردِعمل موجود ہے۔ان کی نظموں کے کاٹ دار مصرعے ان کے احساس کی شدت کو ظاہر کرتے ہیں۔ان کی نظموں کے مطالعے سے محسوس ہوتا ہے کہ وہ دو مختلف تہذیبوں سے مکالمہ کر رہے ہیں۔ایک طرف مغربی اقوام اور دوسری طرف تیسری دنیا کے ممالک خصوصاً مسلمان معاشرہ ہے۔اپنی نظم ''جنگ کا کوئی مذہب نہیں'' میں وہ نہایت شدت کے ساتھ اقوام متحدہ اور مغربی اقوام کو تنقید کا نشانہ بناتے دکھائی دیتے ہیں [۲۱۶]۔ان کے خیال میں ان مظلوموں کی حمایت میں مغرب خاموش تماشائی کا کردار ادا کر رہا ہے۔ایٹمی ہتھیاروں کی تلاش میں آئے اسلحہ انسپکٹروں پر تنقید کا یہ انداز ملاحظہ کیجیے:

اور اُدھر سرزمینِ عراق/ چار جانب دھواں اور الاؤ/ شہر بستے ہوئے کون دیتے ہوئے/ جسم
پر ایک کھاؤ/ وہ جو تفتیش کرنے کو بغداد آئے/ انھیں کیا ملا اور کیا لے گئے/ کیمیکل وار ویپن
کی خاطر/ مقابر سے ڈھانچے نکالے گئے/ باورچی خانوں میں جھانکا/ اور بچوں کی درسی
کتابیں اٹھالے گئے/ یہ عجب جنگ ہے جس میں کوئی کسی سے نہیں پوچھتا.../ یہ تو اب جا
کے ہم پر کھلا/ جنگ کا کوئی مذہب نہیں/ اور اگر ہے تو وہ امن ہے [۲۱۷]

یہ مناظر جو شاعر نے دکھائے ہیں، اسے دیکھ کر پورے امریکی کھیل سے نفرت سی ہو جاتی ہے۔ایک اور نظم ''ہلاکو اب جو تم بغداد آؤ گے'' میں وہ تاریخ کے صفحات پلٹتے ہوئے قاری کو بغداد کی اس تہذیبی فضا میں لے جاتے ہیں جو تہذیب کا گہوارہ تھا۔اس کے بعد تباہی و بربادی کے مناظر ان کی آنکھوں میں پھرنے لگتے ہیں۔وہ موجودہ تباہی کا موازنہ ہلاکو خان کے دور میں ہونے والی تباہی و بربادی سے کرتے ہوئے جدید دنیا کو شرمندہ کرتے دکھائی دیتے ہیں۔اس شہر کی بربادی پر شاعر کہتے ہیں کہ:

ہلاکو اب جو تم بغداد آؤ گے/ یہاں لاشیں ملیں گی، لیکن ان کے سر نہیں ہوں گے/ سروں کا
اک منارا، تمھارے شہر میں آنے سے پہلے بن چکا ہوگا/ گلی کوچے، سرائیں، خانقاہیں، قہوہ
خانے/ اپنے سائے کے مقابل ہاتھ پھیلائے کھڑے ہوں گے/ کتب خانوں کی خاکستر
اڑائی جا چکی ہوگی/ نوادر بوریوں میں بٹ چکے ہوں گے/ کلام اللہ کے نایاب نسخے اور
صحیفے/ جلائے جا چکے ہوں گے... یہاں مٹی میں جادو ہے، زمیں سونا اگلتی ہے/ لہو میں تیل
کی بو ہے/ ہلاکو اب جو تم بغداد آؤ گے/ تو پھر واپس نہ جاؤ گے [۲۱۸]

حسن عابدی نے تہذیب کا نوحہ لکھتے ہوئے مغرب کا مکروہ چہرہ بھی بے نقاب کیا۔ان کی ایک اور نظم ''اجتماعی قبریں'' بھی اسی بیانیے کو آگے بڑھاتی ہے۔امریکی فوج جس طرح قتل و غارت گری کا بازار گرم کر کے اجتماعی طور پر ان لاشوں کو دفن کر رہی تھی، اس مکروہ منظر کو دکھاتے ہوئے شاعر ان گلے سڑے جسموں اور ٹکڑوں کی بے حرمتی پر اپنے ردِعمل کا اظہار اس طرح کرتے ہیں:

سیکڑوں کیا ہزاروں تھے وہ/ آن کی آن میں جو ٹھکانے لگائے گئے/ یا گھروں میں جلائے
گئے/ جا چکی جب سپاہِ قتال/ تب زمینی خداؤں کے جنگی عزائم کا دفتر کھلا/ چل رہی ہے
کدال اور لاشیں گنی جا رہی ہیں/ اجتماعی قبور/ ڈھونڈتا ہے تو اس سمت جا/ جہاں عالمی

طاقتیں اپنا مال و منال / اپنے اسباب جنگ و جدال / بدن پر سجائے کھڑی ہیں / سارے
مردہ ضمیر ان زمینوں میں ہیں / جتنے مدفن ہیں سب ان کے سینوں میں ہیں [۲۱۹]

انیس امروہوی کی نظموں میں بھی عراق کی تباہی پر دکھ اور کرب کا احساس نمایاں ہے۔ اپنی نظم ''آزادی کے نام پر'' میں وہ ایک ایسی جنگ کے خواہش مند دکھائی دیتے ہیں جو تمام جنگوں کا خاتمہ ثابت ہو۔ شاعر اس خواہش کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

ہمیں اک جنگ کرنی ہے / اس جنگ کے خلاف / جو نام پر آزادی کے / غلام کرنا چاہتی
ہے / ہمیں اک جنگ کرنی ہے / ان سب کے خلاف / جو لگا کر انصاف کا نعرہ / مار رہے ہیں
انسانوں کو، اور / حقوق انسانی کے حسیں الفاظ / سجا کر اپنے ہونٹوں پر / معذور بنا رہے ہیں /
آنے والی نسلوں کو / ہیروشیما اور ناگاسا کی / تاریخ دہرا کے [۲۲۰]

احسان اکبر بھی جدید طرز احساس کے نمائندہ شاعر ہیں۔ ان کے ہاں قدیم تہذیب کی اساطیری روایات زندہ دکھائی دیتے ہیں۔ وہ قدیم تہذیب کے کھنڈر پر نئی عمارت کی تعمیر کے خواہش مند دکھائی دیتے ہیں۔ ان کی نظم ''باب علی بابا پر خود کلامی'' اور ''عراق آشوب''، جنگوں کی ہولناکی کے حوالے سے عمدہ شاہ کار ہے۔ ''عراق آشوب'' میں تہذیب کی بازیافت کی ایک طویل داستان چھیڑنے کے ساتھ ساتھ شاعر اس عصری منظر نامے کو بھی قلم بند کرتے ہیں جو موجودہ جنگ کا سبب بنا۔ نظم کے سب سے اہم کردار ''مرجینا'' کو پیش کرتے ہوئے وہ طنزیہ انداز میں تیل کے ان سوداگروں کی اصلیت ظاہر کرتے ہیں۔ ملاحظہ کیجیے:

مرجینا سنو! / ورجینیا کو لوٹنے والے ہیں فاتح / صابریہ! شرم الشیخ اور وادیِ بیکا، شتیلا /
گروزنی، سربرنیکا کے جاں گدازوں سے / انھیں وحشت ہے / جنگ اب عالمی سے / چور
اب کی بار اب مٹکوں میں نہ آئے / ونزویلا میں رُکے ہیں / تیل پائپ میں ہے / (پائپ
لائن میں امداد) اور امداد کے خواہاں عراقی ہوں نہ ہوں / دستِ سوال ان کے / ولادت
والے خانے میں / عراقی شہریت لکھوا چکے ہیں [۲۲۱]

علی محمد فرشی کی نظم ''ریت'' میں بھی انھیں سیاسی عزائم کا پردہ چاک کیا گیا ہے جو تیل کی بو سونگھنے کے بعد مقتدر قوتوں نے عراق کی تباہی کے لیے بنائے تھے۔ شاعر اس منظر کو دکھاتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

تو نہیں جانتا ریت کی پیاس کو / ریت کی بھوک کو / ریت کی بھوک ایسی کہ جس میں سما
جائیں / لوہا اگلتے پہاڑوں کے سب سلسلے / پیاس ایسی کہ جس میں اتر جائیں / سارے
سمندر / ترے آنسوؤں کے! / مگر تیرے آنسو ٹپکنے میں کچھ دیر ہے / دیر کتنی لگی / ہاتھیوں کی
قطاروں کو / زیر زمیں / تیل اور تار بننے کے معیاد سے خوب واقف ہے تو / تو اسی تیل کی بو پہ
پاگل ہوا / اور دھمکتا دھڑپتا ہوا / آ گیا ریت کے راج میں / وقت کے آج میں [۲۲۲]

رفیق سندیلوی بھی عراق پر ہونے والے ظلم پر خاموش نہ رہ سکے۔ ان کی نظم ''کسا شکنجہ'' میں شکنجہ کسنے والے ظالموں کو انجام سے باخبر کرتے ہوئے وہ تنبیہ کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ شاعر کہتے ہیں کہ:

یہ پھر کون سے معرکے کا ارادہ ہے/ تمھاری نسوں میں/ یہ کس خواب وحشت کا جادہ کھلا ہے/
کیسا شکنجہ /اس جنگ لامختتم کا/ کہ جس کی کشش میں/ تمھیں مارتے ہو/ تمھیں مر رہے
ہو/ سنو! تم بڑی بدنمارات کی دھند میں/ فیصلہ کر رہے ہو[۲۲۳]

کشور ناہید کی نظموں میں بھی عراقی عورتوں کا نوحہ ملتا ہے۔ جنگوں سے صرف عمارتیں تباہ نہیں ہوتیں بلکہ پورا معاشرتی ڈھانچا تباہ ہو جاتا ہے۔ نفسیاتی طور پر بچوں اور عورتوں کی نفسیات ان جنگوں سے کس طرح متاثر ہوتی ہے، اس کا ادراک کشور ناہید کو پوری طرح سے ہے۔ اس بات کی تائید کے لیے ان کا شعر دیکھیے :

عورتوں کی آنکھوں میں آنسوؤں کے جھرنے ہیں — لڑکیوں کی باتوں میں سسکیاں نمایاں ہیں
ہر سڑک پہ بے قابو ٹینک بڑھتے جاتے ہیں — ننھے ننھے بچے بھی موت سے نہیں ڈرتے[۲۲۴]

بچوں کی بھوک، خوف، بے لباس بدن اور کس مپرسی کی حالت دکھاتے ہوئے کشور کے ہاں احساس کی شدت اپنی انتہا کو چھوتے دکھائی دیتی ہے۔ وہ اس دکھ اور کرب کے لمحات کو لفظوں میں جب بیان کرتی ہیں تو یہ کرب قاری تک بھی اسی شدت سے پہنچتا ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

اٹھو اماں!/ بچے بھوک سے چیخ رہے ہیں/ چولھا کیسا!/ اب تو ہمارا سارا گھر ہی سلگ اٹھا
ہے/ دھواں بھرا ہے/ کوئی نہیں جو تجھے پکارے، کوئی نہیں جو تجھے بلائے/ کوئی نہیں جو
تجھے بچائے/ اٹھو اماں!/ پوچھو ان بچوں کا حال کہ جو/ خندقوں میں چھپے تھے/ پانی مانگتے
مانگتے/ جن کے ہونٹ ادھوری بات بنے تھے[۲۲۵]

آزاد اور نثری نظم میں بھی عراق پر حملوں اور امریکی جارحیت کے خلاف شدید ردعمل ملتا ہے۔ تفصیل پیش کرنے کی گنجائش نہیں لیکن ایک آدھ مثال یہاں پیش کرنا ضروری ہے۔ ذیشان ساحل کی نظمیں اس حوالے سے بہترین حوالہ ہیں۔ ان کے ہاں بھی امریکی جارحیت اور عراق میں معصوم انسانوں کے قتل عام کا نوحہ بھرپور انداز سے موجود ہے۔ ''عراق کے لوگوں کے نام' اپنی کتاب کا انتساب کرتے ہوئے انھوں نے عراقی عوام کی مظلومیت کی دردانگیز تصویر پیش کی ہے۔ ''نازک الملائکہ''، ''ورلڈ آڈر''، ''ایک خود کش نظم''، ''صدام حسین نظم لکھتا ہے''، ''الجزیرہ خاموش ہو گیا''، ''عراقی عوام''، ''ڈیوڈ گورس مین کے لیے نظم''، ''نجیب محفوظ کو کوئی نہیں جانتا''، ''بچوں کی سائیکل'' اور ''وہ یہ جنگ جیت جائیں گے'' وغیرہ اپنے موضوعات کے انوکھے پن کی وجہ سے ہمیشہ زندہ رہیں گی۔ ''بچوں کی سائیکل'' کے چند مصرعے دیکھیے :

بچوں کی سائیکل میدانِ جنگ میں کسی کام نہیں آتی/ ٹینک کو آتا دیکھ کر ڈر کے مارے چل
نہیں پاتی/ گھنٹی نہیں بجاتی/ ایک جگہ جم جاتی ہے/ اتنی چھوٹی ہو جاتی ہے/ کہ ٹینک کو نظر
نہیں آتا/ جب ٹینک اپنا راستہ بناتے ہوئے/ اس پر سے گزر جاتا ہے[۲۲۶]

غرض کہ ان جنگوں کے خلاف نوبل انعام یافتہ ادیب ہیرلڈ پنٹر اور مشہور ماہر لسانیات اور سماجیات نوم چومسکی جیسے امریکی اور برطانوی ماہرین نے خود اپنے ملک کے خلاف آواز اٹھائی۔ اس کھلی بربریت کو عالمی امن کے خطرہ قرار دیا۔ لیکن جنگوں کے خطرات آج

تک اس دنیا سے ٹل نہ سکے۔ ظاہر سی بات ہے کہ جنگ شروع ہوتے ہی ختم نہیں ہوتی بلکہ ایک طویل عرصے تک اس کے اثرات جاری رہتے ہیں۔ مذکورہ بالا تمام شاعری دراصل انھی اثرات کا نتیجہ ہے جو اردو شعرا کا موضوع رہے۔

اسی صدی کے آخر میں بوسنیا اور سربیا کے درمیان ہونے والی جنگ میں بھی ہزاروں کی تعداد میں ہلاکتیں ہوئیں۔۱۹۹۲ء میں جس طرح شہر کی سڑکوں پر سربیا کی فوجوں نے انسانی خون کی ہولی کھیلی اور چوالیس ماہ تک سراجیوو کا محاصرہ کیے رکھا، یہ بھی جنگی تاریخ کا انوکھا واقعہ تھا۔ اس محاصرے کے دوران تقریباً چالیس لاکھ افراد کھانے پینے اور بجلی سے محروم رہے[۲۲۷]۔ سرب افواج نے جوان لڑکوں اور مردوں کو چن چن کر قتل کیا۔ آٹھ ہزاروں کے قریب لاشوں کو جلدی میں اجتماعی قبروں میں دفن کیا گیا۔ انٹرنیشنل کرمنل ٹریبونل فار یوگوسلاویہ (ہاگ) نے اس قتل عام کو نسل کشی سے تعبیر کیا۔ ان واقعات اور جنگی حالات پر بھی اردو شاعری خاموش نہیں رہی۔ عالمی حالات اور تنازعات نے ہر دور میں اردو شاعری کے دامن کو وسیع کیا۔ بوسنیا میں ہونے والی خون ریزی پر متعدد نظمیں لکھی گئیں۔ تفصیل کی گنجائش نہیں۔ اس دور کے رسائل و جرائد میں ''بوسنیا'' کے موضوع پر نظمیں شائع ہوتی رہیں۔ چند ایک مثالوں پر اکتفا کروں گا۔ ڈاکٹر حنیف ترین کی نظم ''انسانیت کی جدید قتل گاہ: بوسنیا'' میں عالمی ضمیر کی بے حسی کا پردہ چاک کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

> لٹی ہیں جن کی عصمتیں / وہ روحیں بلبلاتی ہیں / چٹک گئے جو بھوک سے / وہ پیٹ تلملاتے
> ہیں / سڑے گلے عضو سے نکلی پیپ کی سڑانڈ سے / جوان بوڑھی نبضیں بے علاج پھڑکیں تھم
> گئیں / مدد کے واسطے جہان بھر کو یہ بلاتی ہیں / اور سارا جگ خموش ہے / یہاں بھی ہر سو ہر
> جگہ[۲۲۸]

نظم کی ابتدا میں شاعر ان مجبور اور محصور لوگوں کی دلیری اور جاں بازی کی منظر کشی کرتے ہوئے بوسنیائی مجاہدین کو خراج تحسین پیش کرتے ہیں:

> یہ کون لوگ ہیں کہ جو / ڈٹے ہوئے ہیں دھوم سے / ہیں سر بکف ہجوم سے / صلیب کے
> جنون سے / قدم قدم پہ خون سے / کہانی لکھ رہے ہیں وہ / وہ مشعل جونئی جہت کے پھولوں
> کو کھلائے گی / جو مغربی درندگی زمانے کو دکھائے گی[۲۲۹]

بوسنیائی مسلمانوں کو جس طرح سے متحد ہو کر نشانہ بنایا گیا اس منظر کو دکھاتے ہوئے شاعر نے عالمی برادری کی جانب دارانہ پالیسی اور عزائم کو بھی پیش کیا ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

> جب بھوک و پیاس و گولیاں / یو این و سرب ٹولیاں / کھا جائیں گی جہاد کو / پھر ساری دنیا
> آئے گی / آنسو کفن بھی لائے گی / دفنا کے ان کی لاش کو / یہ سوگ بھی منائے گی / مگر یہ ان
> کی بھول ہے کہ یہ انھیں مٹائیں گے / اسپین جیسا کھیل یہ وہاں بھی کھیل جائیں گے[۲۳۰]

ماہ طلعت زاہدی نے اپنی نظم ''بوسنیا! ہمیں معاف کر دے'' میں بھی عالمی ضمیر کو جھنجھوڑنے کی کوشش صاف دکھائی دیتی ہے۔ وہ بوسنیا کے محاصرے اور قتل و غارت گری کو نازیوں جیسے مظالم قرار دیتے ہوئے عالمی برادری سے اس معاملے پر مداخلت کا مطالبہ کرتے ہوئے کہتی ہیں کہ:

حقوقِ اقوام کے مددگار رہنماؤ/ عظیم ملکوں کے سربراہو/ غیور وسرکش دلیر لوگو کہاں ہو تم
سب کوئی تو جاگے/ ضمیر سویا رہے گا کب تک؟/ وہاں پہ پھر نازیوں کے کیمپوں نے لے لیا
ہے نیا جنم/ گندگی اچھلتی ہے عصمتوں پر/ برہنہ شیطانی قہقہوں میں/ ہے گونج دہشت کی/
آدمیت کے چیتھڑے اڑ رہے ہیں دیکھو... مرا قلم یا ترا قلم/ سربیا کی فوجوں سے کیسے
پوچھے/ یہ حشر برپا رہے گا جب تک؟/ یہ خونِ ناحق بہے گا کب تک/ ضمیر سویا رہے گا کب
تک[۲۳۱]

نسرین آفتاب نے اپنی نظم ''ہر منظر لہولہو ہے'' میں نہ صرف عالمی ضمیر کو جھنجھوڑا گیا ہے بلکہ خود مسلم حکمرانوں سے بھی یہ سوال پوچھا گیا ہے کہ بوسنیائی مسلمانوں کو اس مشکل سے نکالنے کے لیے انھوں نے کیا بندوبست کیا۔ شاعرا ن لوگوں سے سوال کرتے ہوئے پوچھتی ہیں کہ:

سنو/ جو خود ہی مجرم ہو/ اور فریضہ انجام دیتے ہو منصفی کا/ یہ بوسنیا ہے اس کو دیکھو/ لہو کی بارش
لہو کے بادل/ لہو کے قطرے/ لہو کی خبریں لہو کے چرچے/ یہ چور زخموں سے بوسنیا ہے/ لہو کا
اک ایسا آئینہ ہے/ کہ جس میں تم جیسے سب اہلِ ظلم اور مردہ ضمیر/ اپنے مکروہ چہروں کو دیکھ
لیں گے/ بتاؤ الشیخ، السیّدی کہ تم نے/ کبھی اپنی تسبیحِ مصلحت پر/ ان لہو کے قطروں کا بھی
کچھ حساب رکھا[۲۳۲]

شاہدہ نسیم سالک نے بھی اپنی نظم ''بوسنیا کے شہیدوں کے نام'' میں مردہ عالمی ضمیر کو جھنجھوڑا ہے۔ انسانی حقوق کے علم برداروں سے سوال کرتے ہوئے خون میں ڈوبے بوسنیائی مسلمانوں کے غم میں وہ اشک فشاں ہیں۔ قتل گاہ بوسنیا کے مناظر دکھاتے ہوئے اور عالمی برادری سے مایوسی کا اظہار کرتے ہوئے وہ ان ظالموں پر عذاب الٰہی کی نوید دے رہی ہیں۔ ملاحظہ کیجیے:

عظیم لوگو!/ لہولہو ہیں تمھارے پیکر/ تمھاری گلیاں ہیں قتل گاہیں/ تمھاری مائیں/ سسک
سسک کر یہ ساری دنیا سے پوچھتی ہیں/ حقوقِ انساں کے دعوے دارو!/ کہاں چھپے ہو؟/
زمیں ہماری ہمارے بچوں کے خوں سے تر ہے/ یزیدِ ثانی/ جو بچ گئے ہیں انھیں بھی قیدی بنا
کے زنداں میں لے گئے ہیں/ مگر ابھی تک خموش ہو تم/ تو یہ بھی سن لو/ کہ ظلم جب بھی بڑھا
ہے حد سے/ تو پھر خدا کے عذاب ہی سے فنا ہوا ہے/ عذاب کی حد نہیں مقرر/ وہ آئے گا تو
ہر ایک ظالم حساب دے گا/ ہے کوئی اتنا بڑا بہادر/ جو اس کے پنجے سے بچ سکے گا[۲۳۳]

غرض کہ اس مطالعے سے یہ بات پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ شاعر کا مقصد صرف اور صرف انسان دوستی کا فروغ ہے۔ جنگ چاہے کسی مقصد کے حصول کے لیے ہی کیوں نہ لڑی جائے، انسان کش اور نفرت آمیز انسانی رویّے جو حیوانیت کے قریب تر ہے، جنگوں کا خاصا رہی ہے۔ امن اور آشتی کے فروغ کے لیے گفتگو اور بات چیت کا دروازہ ہمیشہ کھلا رکھنا چاہیے۔ جنگوں کی ان تباہ کاریوں کے باوجود صدیوں کا تجربہ اور مشاہدہ انسان کو یہی سکھاتا ہے کہ قلم میں بم سے زیادہ طاقت ہوتی ہے۔ اس کا ثبوت تاریخ انسانی متعدد

مواقع پر فراہم کر چکی ہے۔ بیسویں صدی میں اس کی ایک بڑی مثال کیوبائی جنگ پر امریکا اور روس کے تصادم کو روکنے کے لیے برٹنڈ رسل کی تحریریں ہیں جو ''غیر مسلح فتح'' (Unarmed Victory) کے نام سے کتابی شکل میں محفوظ ہیں۔ ادیب اور شاعر کا کام محض واقعات کی ہول ناکی سے روشناس کرانا نہیں بلکہ ان کا سدّ باب بھی کرنا ہوتا ہے تاکہ آئندہ اس قسم کی صورت حال اور جنگوں کی ہول ناکیوں سے بچا جا سکے[۲۳۴]۔ دنیا میں ایسے متعدد مواقع آئے جب شعرا اور ادبا نے اپنے فریضے کو بخوبی ادا کیا۔ اردو شاعری میں بھی ایسی بہت سی مثالیں موجود ہیں جہاں مذہب اور لسانی اختلافات سے قطع نظر بھائی چارے اور محبت کو فروغ دینے کی کوشش واضح دکھائی دیتی ہے، لیکن بدقسمتی سے ایک بڑا ذخیرہ شاعری کا ایسا بھی ہے جہاں یک رخا پن اور جانب داری کے واضح اثرات دکھائی دیتے ہیں۔ خصوصاً مذہبی جانب داری سے اردو شاعری اپنا دامن نہیں بچا سکی۔

حوالہ جات

۱۔ امروہوی، نسیم، ''مقدمہ''، مشمولہ: ''جنگ عظیم''، از پنڈت سندر نرائن مشران فرخ آبادی، حاجی محمد اسمعیل ادبی پریس، لکھنؤ، ۱۹۴۳ء، ص۵۔۶

۲۔ پہلی جنگ عظیم/https:ur.wikipedia.org

۳۔ امروہوی، ص۶۔۷

۴۔ دہلوی، محمد مرزا، ''دوسری جنگ عظیم''، کتب خانہ علم وادب، دہلی، ۱۹۴۱ء، ص۱۵۔۱۶

۵۔ امروہوی، ص۱۲۔۱۳

۶۔ مُشران فرخ آبادی، پنڈت سندر نرائن، حاجی محمد اسمعیل ادبی پریس، لکھنؤ، ۱۹۴۳ء، ص۵۱۔۵۲

۷۔ ایضاً

۸۔ دہلوی، ص۱۷۔۳۰

۹۔ بہ حوالہ: http://www.ushmm.org/wlc/ur/article.php

۱۰۔ مُشران فرخ آبادی، ص۲۶۔۲۷

۱۱۔ پیٹرسن، کیپٹن، ''ڈائری''، بہ حوالہ: https:// www. bbc. com/ urdu/ world/ 2014/ 01/ 140114_ ww1_ soldier_ diaries_ online_ tk

۱۲۔ آفریدی، عمر، بہ حوالہ: https://www.bbc.com/urdu/pakistan

۱۳۔ بہ حوالہ: https://www.mashriqtr.pk.nov15 2017

۱۴۔ بہ حوالہ: https://www.bbc.com/urdu/world/2014

۱۵۔ مُشران فرخ آبادی، ص۹

۱۶۔ کاکوروی، نادر، ''مخمس''، مشمولہ: ''زمانہ''، کان پور، جنوری، ۱۹۰۹ء، ص۱۳۳

۱۷۔ نعمانی، شبلی، بہ حوالہ ''حیات شبلی''، از سید سلیمان ندوی، مطبع معارف، اعظم گڑھ، ۱۹۴۳ء، ص۵۵۲

۱۸۔ علی، مبارک، ڈاکٹر، ''بدلتی ہوئی تاریخ''، فکشن ہاؤس، لاہور، ۱۹۹۷ء، ص۱۸۵

۱۹۔ مُشران فرخ آبادی، ص۱۹۔۲۰

۲۰۔ دہلوی، ص۳۱

۲۱۔ ایضاً، ص۳۱۔۴۲

۲۲۔ ایضاً، ص۴۳

۲۳۔ بہ حوالہ: https:// www. encyclopedia. ushmm. org/ org/ content/ ur/ article/ world_ war_ii_in_europe

۲۴۔ دہلوی، ص۲۰۶

۲۵۔ ایضاً، ص۲۱۰۔۲۲۶

۲۶۔ بہ حوالہ: دوسری جنگ عظیم/https://ur.wikipedia.org/wiki

۲۷۔ بہ حوالہ: https://www.encyclopedia.ushmm. org/ content/ ur/ article/ world_war_ii_ in_ europe

۲۸۔ امروہوی، ص۲۲۔۲۳

۲۹۔ بہ حوالہ: https://www.encyclopedia. ushmm. org/ content/ ur/ article/ world_ war_ ii _in_ europe

۳۰۔ بہ حوالہ: دوسری جنگ عظیم/https://ur.wikipedia.org/wiki

۳۱۔ بہ حوالہ: https://www.encyclopedia.ushmm. org/ content/ ur/ article/ world_war_ii_ in_ europe

۳۲۔ ایضاً

۳۳۔ حسن، میر، ایم۔اے۔ ''جنگ زدہ ممالک''، ادارۂ ادب جدید، حیدرآباد دکن، ۱۹۴۲ء، ص تمام

۳۴۔ انصاری، سحر، ''تنقیدی افق''، پاکستان اسٹڈی سنٹر، کراچی، ۲۰۱۴ء، ص۳۸۔۳۹

۳۵۔ منیب الرحمٰن، ''باز دید''، انجمن ترقی اردو ہند، علی گڑھ، ۱۹۶۵ء، ص۵۔۶

۳۶۔ یعقوب، قاسم، ''اردو شاعری پر جنگوں کے اثرات''، مثال پبلشرز، فیصل آباد، ۲۰۱۱ء، ص۲۵۳۔۲۵۷

۳۷۔ نیازی، قمر، بہ حوالہ: "The makers of A. Bomb"، مشمولہ: ''زمین کا نوحہ''، مرتبہ ضمیر نیازی، شہزاد پبلی کیشنز، کراچی، ۲۳

۳۸۔ نیازی، ضمیر، ''اگر ذرے کا جگر چیریں''، مشمولہ: ''زمین کا نوحہ''، محولہ بالا، ص۲۳۔۲۷

۳۹۔ علیگ، خالد، بہ حوالہ: آصف فرخی، ''زمین اظہار چاہتی ہے''، مشمولہ: ''زمین کا نوحہ''، محولہ بالا، ص۵۱

۴۰۔ ریاض، فہمیدہ، بہ حوالہ: ''زمین کا نوحہ''، محولہ بالا، ص۱۶۱

۴۱۔ جالب، حبیب، ''ایٹم بم''، مشمولہ: ''زمین کا نوحہ''، محولہ بالا، ص۱۶۲

۴۲۔ جالندھری، ضیا، بہ حوالہ: ''زمین کا نوحہ''، محولہ بالا، ص ۱۷۰

۴۳۔ صدیقی، انور احسن، بہ حوالہ: ''زمین کا نوحہ''، محولہ بالا، ص ۱۷۵۔۱۷۶

۴۴۔ ایضاً، ص ۱۷۷

۴۵۔ گزدر، سعیدہ، بہ حوالہ: ''زمین کا نوحہ''، محولہ بالا، ص ۱۹۱۔۱۹۲

۴۶۔ نقوی، ہلال، بہ حوالہ: ''زمین کا نوحہ''، محولہ بالا، ص ۱۹۴

۴۷۔ عباس، عذرا، بہ حوالہ: ''زمین کا نوحہ''، محولہ بالا، ص ۱۹۸

۴۸۔ دانش، ن۔م۔ بہ حوالہ: ''زمین کا نوحہ''، محولہ بالا، ص ۲۰۳

۴۹۔ بہ حوالہ: ''زمین کا نوحہ''، محولہ بالا، ص ۲۱۷۔۲۲۴

۵۰۔ خلیق، حارث، بہ حوالہ: ''زمین کا نوحہ''، محولہ بالا، ص ۲۲۴

۵۱۔ انصاری، ص ۴۰۔۴۱

۵۲۔ اقبال، علامہ، ''کلیات اقبال''، اردو، مکتبہ جمال، لاہور، ۲۰۰۴ء، ۱۰۱۷

۵۳۔ ایضاً، ص ۱۰۱۸

۵۴۔ ایضاً، ص ۱۰۳۳

۵۵۔ ایضاً، ص ۱۰۳۷

۵۶۔ ایضاً، ص ۱۰۳۶۔۱۰۳۷

۵۷۔ ایضاً، ص ۱۰۴۴

۵۸۔ اقبال، علامہ، ''دیباچہ''، مشمولہ: ''پیام مشرق''، الحمرا پبلشنگ، اسلام آباد، ص ۹۔۱۰

۵۹۔ علی خان، ظفر، ''بہارستان''، مشمولہ: ''کلیات ظفر علی خان''، الفیصل ناشران وتاجرانِ کتب، لاہور، ۲۰۰۷ء، ص ۹۶

۶۰۔ ایضاً، ص ۱۶۲

۶۱۔ ایضاً، ص ۱۶۶

۶۲۔ ایضاً، ص ۱۶۶۔۱۶۷

۶۳۔ ایضاً، ص ۱۷۲

۶۴۔ علی خان، ظفر، ''چمنستان''، مشمولہ: ''کلیات ظفر علی خان''، محولہ بالا، ص ۱۷۱

۶۵۔ ایضاً، ص ۱۷۵

۶۶۔ ایضاً، ص ۱۷۶

۶۷۔ ایضاً، ص ۱۷۹

۶۸۔ ایضاً، ص ۱۸۹

۶۹۔ ایضاً، ص ۱۸۳

۷۰۔ صدیقی، ریاض، ''جوش نوآبادیاتی بعدنوآبادیاتی تناظر میں''، مشمولہ: ''ارتقا''، کتابی سلسلہ نمبر ۲۴، دسمبر ۱۹۹۹ء تا مارچ ۲۰۰۰ء، ص ۲۴۱۔۲۴۲

۷۱۔ ملیح آبادی، جوش، ''روح ادب''، مشمولہ: ''کلیات جوش''، مرتبہ ڈاکٹر رفعت ملیح آبادی، فرید بک ڈپو، دہلی، ۲۰۰۷ء، ص ۷۰۔۷۱

۷۲۔ ملیح آبادی، جوش، مشمولہ: ''نشید حریت''، ادارہ مطبوعات پاکستان، کراچی، ۱۹۵۷ء، ص ۲۲۹

۷۳۔ ایضاً، ص ۲۲۷

۷۴۔ جوش، ملیح آبادی، مشمولہ: ''نشید حریت''، مرتبہ شان الحق حقی، محولہ بالا، ص ۲۲۴

۷۵۔ ایضاً، ص ۲۲۶

۷۶۔ ملیح آبادی، جوش، ''کلیات جوش''، محولہ بالا، ص ۱۰۴۶۔۱۰۴۷

۷۷۔ ملیح آبادی، جوش، ''شعلہ وشبنم''، مشمولہ: ''کلیات جوش''، محولہ بالا، ص ۲۶۰

۷۸۔ ایضاً، ص ۲۶۷

۷۹۔ انصاری، ص ۴۲۔۴۳

۸۰۔ جالندھری، حفیظ، ''کلیات حفیظ جالندھری''، مرتبہ خواجہ محمد ذکریا، فرید بک ڈپو، نئی دہلی، ۲۰۰۸ء، ص ۳۲۱۔۳۲۲

۸۱۔ سنگھ، گرمکھ، ''انقلاب''، مشمولہ: ''ضبط شدہ نظمیں''، حلقۂ ادب، لکھنؤ، سن ندارد، ص ۱۳۵

۸۲۔ کاظمی، ڈاکٹر روشن اختر، ''اردو میں طویل نظم نگاری کی روایت اور ارتقا''، ماڈرن پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی، ۱۹۸۴ء، ص ۲۲۰

۸۳۔ اکبرآبادی، سیماب، ''ساز و آہنگ''، رفاہِ عام برقی پریس، آگرہ، ۱۹۴۱ء، ص ۲۷

۸۴۔ ایضاً، ص ۸۹

۸۵۔ ایضاً، ص ۹۰۔۹۱

۸۶۔ ایضاً، ص ۶۷

۸۷۔ ایضاً، ص ۸۷

۸۸۔ اکبرآبادی، سیماب، ''شعر انقلاب''، آگرہ اخبار برقی پریس،

آگرہ، ۱۹۴۷ء، ص۱۵۵۔۱۵۶

۸۹۔ اکبرآبادی، سیماب، ''عالم آشوب''، مکتبہ قصر الادب، آگرہ، ۱۹۴۳ء، ص۵

۹۰۔ ایضاً، ص۳۴

۹۱۔ ایضاً، ص۶۹

۹۲۔ ایضاً، ص۴۰۳

۹۳۔ شیرانی، اختر، ''کلیات اختر شیرانی''، مرتبہ، گوپال متل، موڈرن پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۱۹۹۷ء، ص۱۳۲۔۱۳۳

۹۴۔ ماہرالقادری، ''کلیات ماہر''، تعمیر انٹر پرائزز، لاہور، ۱۹۹۴ء، ص ۱۶۰

۹۵۔ ایضاً، ص۱۶۱۔۱۶۲

۹۶۔ گورکھپوری، فراق، بہ حوالہ: ''جدید اردو شاعری''، از عزیز حامد مدنی، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی، ۱۹۹۰ء، ص۳۸۱

۹۷۔ مدنی، عزیز حامد، ''جدید اردو شاعری''، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی، ۱۹۹۰ء، ص۷۱۔۷۳

۹۸۔ نارنگ، گوپی چند، ''ہندوستان کی تحریک آزادی اور اردو شاعری''، قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، دہلی، ۲۰۰۳ء، ص ۳۹۶

۹۹۔ موہانی، حسرت، بہ حوالہ: ''ہندوستان کی تحریک آزادی اور اردو شاعری''، محولہ بالا، ص۳۹۶

۱۰۰۔ نارنگ، گوپی چند، ص۳۹۶۔۴۰۰

۱۰۱۔ جعفری، علی سردار، ''کلیات علی سردار جعفری''، مرتبہ، علی احمد فاطمی، قومی کونسل برائے فروغ اردو، دہلی، ۲۰۰۴ء، ص۳۷

۱۰۲۔ ایضاً، ص۵۱۔۵۲

۱۰۳۔ ایضاً، ص۵۳

۱۰۴۔ ایضاً، ص۷۷

۱۰۵۔ ایضاً، ص۱۳۶۔۱۳۷

۱۰۶۔ ایضاً، ص۱۴۰۔۱۴۲

۱۰۷۔ ایضاً، ص۴۱۳

۱۰۸۔ ایضاً، ص۴۴۶

۱۰۹۔ ایضاً، ص۴۵۰

۱۱۰۔ ایضاً، ص۴۵۰۔۴۵۱

۱۱۱۔ ایضاً، ص۴۶۶

۱۱۲۔ ایضاً، ص۴۷۰

۱۱۳۔ انصاری، ص۴۳

۱۱۴۔ نسیم، حمید، ''پانچ جدید شاعر''، فضلی سنز لمیٹڈ، کراچی، ۱۹۹۴ء، ص ۲۱

۱۱۵۔ فیض، فیض احمد، ''نسخہ ہائے وفا''، مکتبہ کاروان، کچہری روڈ لاہور، سن ندارد، ص۶۲

۱۱۶۔ نسیم، حمید، ص۳۵۔۳۶

۱۱۷۔ فیض، فیض احمد، محولہ بالا، ص۸۳

۱۱۸۔ ظہیر، سجاد، ''روشنائی''، آزاد کتاب گھر، دہلی، ۱۹۵۹ء، ص۳۳۰

۱۱۹۔ ایضاً، ص۳۳۲

۱۲۰۔ ایضاً، ص۳۳۶۔۳۳۷

۱۲۱۔ فیض، فیض احمد، ص۷۶

۱۲۲۔ ایضاً، ص۱۰۸۔۱۰۹

۱۲۳۔ اعظمی، کیفی، ''کیفیات''، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۱۲ء، ص۴۲

۱۲۴۔ ایضاً، ص۱۲۲

۱۲۵۔ ایضاً، ص۱۱۲

۱۲۶۔ ظہیر، سجاد، ''پیش لفظ''، مشمولہ: ''جھنکار''، از کیفی اعظمی، بہ حوالہ ''کیفیات''، محولہ بالا، ص۳۰

۱۲۷۔ اعظمی، کیفی، محولہ بالا، ص۴۷

۱۲۸۔ ایضاً، ص۵۹

۱۲۹۔ ایضاً، ص۶۲

۱۳۰۔ ایضاً، ص۹۵

۱۳۱۔ ایضاً، ص۹۸۔۹۹

۱۳۲۔ ایضاً، ص۹۸

۱۳۳۔ ایضاً، ص۱۰۰

۱۳۴۔ ایضاً، ص۱۰۹

۱۳۵۔ ایضاً، ص۱۱۲۔۱۱۳

۱۳۶۔ ایضاً، ص۱۱۶۔۱۱۷

۱۳۷۔ ایضاً،ص۱۱۸۔۱۱۹
۱۳۸۔ ایضاً،ص۱۲۴۔۱۲۵
۱۳۹۔ ایضاً،ص۲۰۱۔۲۱۳
۱۴۰۔ لدھیانوی، ساحر، ''کلیات ساحرؔ''، ناز پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۱۹۹۵ء،ص۴۳
۱۴۱۔ ایضاً،ص۴۵
۱۴۲۔ ایضاً،ص۵۲۔۵۳
۱۴۳۔ ایضاً،ص۷۹۔۸۰
۱۴۴۔ ایضاً،ص۱۰۱۔۱۰۲
۱۴۵۔ ایضاً،ص۱۲۱۔۱۲۲
۱۴۶۔ نارنگ،ص۴۱۱
۱۴۷۔ لدھیانوی،ص۱۲۷
۱۴۸۔ ایضاً،ص۱۳۱۔۱۳۴
۱۴۹۔ ایضاً،ص۱۸۲
۱۵۰۔ انصاری،ص۴۷
۱۵۱۔ لدھیانوی،ص۱۷۳۔۱۷۴
۱۵۲۔ ایضاً،ص۲۰۰۔۲۰۱
۱۵۳۔ ایضاً،ص۲۱۰۔۲۱۱
۱۵۴۔ ایضاً،ص۲۳۷
۱۵۵۔ ایضاً،ص۲۴۰
۱۵۶۔ مجاز،اسرارالحق،''کلیات مجاز''، کتابی دنیا، دہلی،۲۰۰۶ء،ص۱۰۹
۱۵۷۔ ایضاً،ص۱۱۰۔۱۱۱
۱۵۸۔ ایضاً،ص۱۲۷
۱۵۹۔ ایضاً،ص۱۳۹
۱۶۰۔ سرور،آل احمد،''پیش لفظ''،مشمولہ:''فروزاں''،از جذبی،مکتبہ اردو،لاہور،سن ندارد،ص۵۔۶
۱۶۱۔ جذبی،معین احسن،''فروزاں''،محولہ بالا،ص۸۹
۱۶۲۔ راشد،ن۔م۔''کلیات راشدؔ''، ماورا پبلشرز، لاہور،۱۹۹۱ء،ص۷۸۔۷۹
۱۶۳۔ مخدوم،معین الدین،''سرخ سویرا''،اشاعت گھر،حیدرآباددکن، ۱۹۴۴ء،ص۴۲
۱۶۴۔ ایضاً،ص۴۳۔۴۴
۱۶۵۔ حسن، سبط،''خط''،مشمولہ:''سرخ سویرا''،محولہ بالا،ص۶۳
۱۶۶۔ مخدوم،معین الدین،ص۹۳۔۹۴
۱۶۷۔ ایضاً،ص۹۶
۱۶۸۔ ملا، آنند نرائن، ''کلیات آنند نرائن ملاؔ''، مرتبہ،خلیق انجم،قومی کونسل برائے فروغ اردو زباں، دہلی،۲۰۱۰ء،ص۲۱۰
۱۶۹۔ ایضاً،ص۲۳۰
۱۷۰۔ اختر الایمان،''کلیات اختر الایمان''، مرتبہ، سلطانہ ایمان اور بیدار بخت،ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،نئی دہلی،۲۰۰۰ء،ص۲۲۵
۱۷۱۔ زکریا،محمد خواجہ،''مجید امجد: سوانحی خاکہ''،مشمولہ:''کلیات مجید امجدؔ''،مرتبہ،خواجہ محمد زکریا،ماورا پبلشرز،لاہور،۱۹۸۹ء،ص۳۷
۱۷۲۔ امجد، مجید،''کلیات مجید امجدؔ''،مرتبہ خواجہ محمد زکریا، ماورا پبلشرز، لاہور،۱۹۸۹ء،ص۸۸۔۸۹
۱۷۳۔ ایضاً،ص۴۳۰۔۴۳۱
۱۷۴۔ اختر، جاں نثار،''کلیات جاں نثار اخترؔ''، الحمد پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۳ء،ص۲۴۶
۱۷۵۔ ایضاً،ص۲۴۶۔۲۴۷
۱۷۶۔ ایضاً،ص۳۵۷
۱۷۷۔ قاسمی، احمد ندیم،''دھڑکنیں''، اردو اکیڈمی، لاہور،۱۹۴۲ء،ص۵۷
۱۷۸۔ ایضاً،ص۹۲
۱۷۹۔ قاسمی، احمد ندیم،''محیط''، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور،۲۰۱۲ء،ص۱۲۲
۱۸۰۔ ایضاً،ص۱۲۲۔۱۲۳
۱۸۱۔ ایضاً،ص۱۶۶
۱۸۲۔ ایضاً،ص۳۸۸۔۳۸۹
۱۸۳۔ فراز، احمد،''زمیں کا نوحہ''،محولہ بالا،ص۱۶۳
۱۸۴۔ ایضاً،ص۱۶۴
۱۸۵۔ فراز، احمد،''کلیات فرازؔ''، مرتبہ، فاروق ارگلی، فرید بک ڈپو، دہلی،۲۰۱۰ء،ص۴۷۱
۱۸۶۔ انصاری،سحر،مشمولہ:''زمیں کا نوحہ''،محولہ بالا،ص۱۶۵

۱۸۷۔ ناہید،کشور،مشمولہ:''زمیں کا نوحہ''،محولہ بالا،ص۱۷۹

۱۸۸۔ ریاض،فہمیدہ،مشمولہ:''زمیں کا نوحہ''،محولہ بالا،ص۱۸۲۔۱۸۳

۱۸۹۔ یعقوب،قاسم،محولہ بالا،ص۲۰۳۔۲۰۶

۱۹۰۔ ذکریا، خواجہ محمد، ''حرف چند''، مشمولہ: ''پاک افغان اسلامی محاذ''، ۱۹۸۱ء،ص۴

۱۹۱۔ یعقوب،قاسم،محولہ بالا،ص۲۰۷

۱۹۲۔ رومانی،انجم،بہ حوالہ: قاسم یعقوب،محولہ بالا،ص۲۰۸

۱۹۳۔ صدیقی،نعیم،بہ حوالہ: قاسم یعقوب،محولہ بالا،ص۲۰۸

۱۹۴۔ صدیقی،تابش،بہ حوالہ: قاسم یعقوب،محولہ بالا،ص۲۰۹۔۲۱۰

۱۹۵۔ یعقوب،قاسم،محولہ بالا،ص۲۱۴۔۲۱۵

۱۹۶۔ انجم،مرتضٰی،''جنگی معرکے''،خزینہ علم وادب،لاہور،۲۰۰۴ء،ص ۲۸۵

۱۹۷۔ ایضاً،ص۲۹۵

۱۹۸۔ قاسمی، احمد ندیم، ''پاکستانی ادب''، مرتبین،جلیل عالی، یوسف حسن،اکادمی ادبیات پاکستان،اسلام آباد،۲۰۰۳ء،ص۱۱۴

۱۹۹۔ شمیم،آفتاب اقبال،بہ حوالہ:''پاکستانی ادب''،محولہ بالا،ص۱۱۱

۲۰۰۔ خاور،ایوب،بہ حوالہ:''پاکستانی ادب''،محولہ بالا،ص۱۳۴

۲۰۱۔ فرشی،محمد علی،''زندگی خودکشی کا مقدمہ نہیں''، پبلشرز ندارد، راول پنڈی،۲۰۰۲ء،ص۲۷

۲۰۲۔ اکرام،صبا،مشمولہ: ماہ نامہ''آئندہ''،کراچی،اپریل۲۰۰۲ء،ص ۶۳

۲۰۳۔ اصغر،غلام جیلانی،مشمولہ:''پاکستانی ادب''،محولہ بالا،ص۱۷۵

۲۰۴۔ سہیل،ادیب،مشمولہ:''پاکستانی ادب''،محولہ بالا،ص۱۱۳

۲۰۵۔ شامی، شرف الدین،مشمولہ: سہ ماہی''آفاق''، راول پنڈی، جون۲۰۰۲ء،ص۱۰۰

۲۰۶۔ یوسفی،اشرف،''بیل اس دریچے کے''،مثال پبلشرز،فیصل آباد، ۲۰۰۷ء،ص۹۲۔۹۳

۲۰۷۔ یعقوب،قاسم،ص۲۲۴

۲۰۸۔ ایضاً،ص۲۲۵۔۲۲۷

۲۰۹۔ قاسمی،احمد ندیم،مشمولہ:''افکار''،کراچی،اپریل۲۰۰۳ء،ص۲۳

۲۱۰۔ شمیم،آفتاب اقبال،مشمولہ: سہ ماہی''فنون''، دسمبر۲۰۰۴ء،ص ۹۸

۲۱۱۔ شمیم، آفتاب اقبال، مشمولہ: ''پاکستانی ادب''، مرتبین، سحر انصاری اور شاہدہ حسن، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، ۲۰۰۴ء،ص۱۴۵

۲۱۲۔ علیگ، خالد، ''بغداد آشوب''، اقدام پبلی کیشنز، لاہور،۲۰۰۳ء، ص۲۳۔۲۴

۲۱۳۔ ہاشمی،قمر،مشمولہ:''طلوع افکار''،اپریل۱۹۹۳ء،ص۵۸

۲۱۴۔ دہلوی، تابش، بہ حوالہ: کتابی سلسلہ''دنیا زاد''، کراچی، اکتوبر ۲۰۰۳ء،ص۲۵۹

۲۱۵۔ فرخی،اسلم،بہ حوالہ: کتابی سلسلہ''دنیازاد''،محولہ بالا،ص۲۶۰

۲۱۶۔ یعقوب،قاسم،محولہ بالا،ص۲۳۳۔۲۳۴

۲۱۷۔ عابدی،حسن،مشمولہ:''دنیازاد''،شمارہ۱۰،ص۲۷۳

۲۱۸۔ عابدی،حسن،مشمولہ: ماہ نامہ''آئندہ''، کراچی، جون جولائی ۲۰۰۳ء،ص۴۷

۲۱۹۔ عابدی،حسن،مشمولہ:''پاکستانی ادب''،۲۰۰۳ء،محولہ بالا،ص ۱۷۰

۲۲۰۔ امروہوی، انیس،مشمولہ: سہ ماہی،''قصے''،عراق نمبر، جنوری ۲۰۰۵ء،ص۱۲۱۔۱۲۲

۲۲۱۔ اکبر، احسان،''عراق آشوب''،مشمولہ:''تخلیقی ادب''، اسلام آباد، مارچ۲۰۰۴ء،ص۱۹۰

۲۲۲۔ فرشی،محمد علی،مشمولہ:ادبی سلسلہ''نقاط''،اپریل۲۰۰۶ء،ص۱۹۷

۲۲۳۔ سندیلوی،رفیق،بہ حوالہ قاسم یعقوب،محولہ بالا،ص۲۴۰

۲۲۴۔ ناہید،کشور،''نوحہ اسلامی ملکوں کا''،مشمولہ: کتابی سلسلہ''دنیا زاد''،شمارہ۱۰،ص۲۶۶

۲۲۵۔ ناہید،کشور،''بصرہ کی مردہ ماں کے لیے بچے کی لوری''، کتابی سلسلہ''دنیازاد''،شمارہ۱۰،ص۲۶۷

۲۲۶۔ ساحل،ذی شان،''جنگ کے دنوں میں''،آج پبلشرز،کراچی، ۲۰۰۴ء،ص۲۱

۲۲۷۔ بہ حوالہ https:urdu. geo. tv

۲۲۸۔ ترین،ڈاکٹر حنیف،مشمولہ: ماہ نامہ''آگہی''،کراچی،اگست ستمبر ۱۹۹۴ء،ص۳۳

۲۲۹۔ ایضاً

۲۳۰۔ ایضاً،ص۳۴

۲۳۱۔ زاہدی، ماہِ طلعت، مشمولہ: ماہ نامہ ''افکار''، کراچی، جنوری ۱۹۹۳ء،ص۳۲

۲۳۲۔ آفتاب،نسرین،مشمولہ: سہ ماہی ''سیپ''،کراچی،شمارہ۶۱،ص ۱۵۸

۲۳۳۔ سالک،شاہدہ نسیم،مشمولہ: ماہ نامہ ''اقدار''،کراچی،جلد۶،شمارہ ۳۔۴،ص۵۱

۲۳۴۔ انصاری،سحر،''تنقیدی افق''،ص۴۸

تقسیم ہند: محرکات اور عوامل، کانگریس اور مسلم لیگ کے اختلافات

بیسویں صدی کے آغاز ہی سے اردو شاعری پر قومی اور سیاسی تحریکوں کا گہرا اثر رہا۔ مذکورہ صفحات میں کچھ اہم واقعات اور اردو شاعری پر اس کے اثرات کا تفصیلی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ اس جائزے سے ہمیں اچھی طرح اندازہ ہو جاتا ہے کہ ''جدوجہد آزادی کے لیے ذہنی فضا تیار کرنے میں اردو خاطر خواہ حصہ لے رہی تھی''[1]۔ یہ وہ پُر آشوب دور تھا جس سے گزرنے کے بعد ہر حساس اور باشعور فرد یہ محسوس کرنے لگا تھا کہ نئے حالات کے مطابق معاشرتی زندگی کو بدلنے اور ذہنی ساخت کو بہتر بنانے کی ضرورت ہے۔ یہ احساس سب سے زیادہ مسلمانوں میں پیدا ہوا۔ اس کا سبب یقیناً یہ تھا کہ انگریز حکمرانوں نے ہندوؤں کے مقابلے میں مسلمانوں پر زیادہ ظلم ڈھائے۔ اس کا اعتراف پنڈت جواہر لال نہرو نے بھی اپنی خودنوشت میں کیا ہے۔ یہ ایک سنگین اجتماعی احساس تھا۔ اس لیے اس وقت کے اہل قلم، صحافت سے وابستہ افراد، ادب، مذہب اور مختلف اصناف تحریر میں اس احساس کی واضح جھلک دیکھی جا سکتی ہے[2]۔

تقسیم ہند برصغیر پاک و ہند کی تاریخ کا نہایت اہم موڑ ہے۔ برسوں کی جدوجہد اور طویل قربانی کی داستان رقم کرنے کے بعد ہندوستان اور پاکستان کو یہ آزادی نصیب ہوئی۔ مگر تقسیم ہند کے الم ناک حادثات اور سانحات نے حصول آزادی کی سرمستی اور سرشاری کو جاں کاہ اذیّت میں تبدیل کر دیا۔ ملک کے ساتھ ساتھ تہذیب، معاشرہ، خاندان، سب کچھ تقسیم ہو گیا۔ آپس کے رشتے ناتے، محبتیں، رابطے سب تقسیم ہو گئے۔ ایک طرح سے انسان کا وجود دونیم ہو گیا۔ اردو ادب خصوصاً شاعری پر اس المیے کا بہت گہرا اثر پڑا۔ اردو شاعری نے عہد بہ عہد تقسیم کے ہراس المیے کو اپنا موضوع بنایا جو یہاں رہنے والے کسی بھی قوم و مذہب سے تعلق رکھنے والوں کی زندگی کا حصہ رہا ہو۔ یہ تقسیم کیوں ہوئی، اس موضوع پر رازہائے سربستہ فاش ہو چکے ہیں۔ جو کچھ بھی ہوا وہ اب تاریخ کا حصہ بن چکا ہے۔ کہتے ہیں کہ وقت سب سے بڑا مرہم ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ زخم مندمل ہو جاتے ہیں، لیکن تقسیم کا زخم، ایسا زخم ثابت لگا جس پر وقت نے مزید جراحت کا کام کیا۔ اس تقسیم کے دوران بہت کچھ اسلاف جھیل چکے، کچھ ہم سب لوگ سرحد کے دونوں طرف جھیل رہے ہیں[3]۔ سرحد کے دونوں اطراف کے مورخین اور محققین ایک دوسرے کی قیادت کو اس تقسیم کا ذمے دار ٹھہرا کر لعن طعن کرتے ہیں۔ خصوصاً ہندوستانی نقطۂ نظر تو یہی ہے کہ مسلم لیگ اور محمد علی جناح براہ راست اس تقسیم کے ذمے دار ہیں، لیکن وہیں سے متعدل آوازیں بھی اٹھیں۔ جسونت سنگھ اور اس قبیل کے دیگر لکھنے والوں نے غیر جانب دارانہ رویہ اختیار کرتے ہوئے لکھا کہ شیوراؤ نے ۱۹۳۷ء کے انتخابات کے حوالے سے واضح طور پر لکھا کہ محمد علی جناح انتخابات کے بعد علاحدہ ریاست کے بارے میں ہرگز نہیں سوچ رہے تھے۔ اس کے لیے وہ گاندھی سے اپیل بھی کرتے رہے لیکن اس سلسلے میں گاندھی کا رویّہ خاصا مایوس کن رہا۔ جسونت سنگھ نے تو یہ تک لکھا کہ خدا کا ارادہ کانگریسیوں کو دانش مندی سے بھرنے کا نہیں تھا۔ لیگی وزیروں کو جن سخت ترین شرائط کے ساتھ وزارت میں شامل ہونے کا کہا گیا وہ سمجھ سے بالاتر تھا۔ کانگریس کے دوسالہ دور اقتدار میں مسلمانوں کا عمومی تاثر ان کے بارے میں مثبت نہیں تھا۔ مذاکرات میں کانگریس سے مسلسل انکار کے دو اہم ترین نتائج سامنے آئے۔ اتر پردیش میں مسلمانوں نے کانگریس کے بہ جائے محمد علی جناح کی مسلم لیگ سے امیدیں وابستہ کر لیں۔ اتحاد کے لیے محمد علی جناح کی کوششوں اور نظریات کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے ایک اور حوالہ راجا صاحب محمود آباد کا دیا جن کی

جانب سے اسلامی ریاست کی تشکیل کی وکالت پر راجا صاحب اور محمد علی جناح میں ٹکراؤ کی کیفیت پیدا ہوئی اور محمد علی جناح نے اس وقت ان کی بات ماننے سے انکار کر دیا[۴] تقسیم کے حوالے سے کون کتنا قصور وار تھا، اس بات کا تعین تو ایک خواب پریشان کی صورت اختیار کر گیا ہے لیکن اس تاریخی حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ کانگریس کی تشکیل میں انگریزوں کا بہت اہم کردار رہا ہے اور اس کے پس پشت ان کے کچھ مخصوص عزائم تھے۔ایسٹ انڈیا کمپنی کی جابرانہ حکومت رفع ہونے کے باوجود ملک کے حالات کلی طور پر اطمینان بخش نہ تھے۔

بنگال پر قابض ہونے کے بعد ریگولیٹنگ ایکٹ ۱۷۷۳ء، پٹ کا قانون ہند ۱۷۸۴ء، چارٹرا یکٹ مجریہ ۱۸۱۳ء، چارٹرا یکٹ مجریہ ۱۸۳۳ء، چارٹرا یکٹ مجریہ ۱۸۵۳ء، قانون مجریہ ۱۸۵۸ء اور اس کے بعد ہندوستانیوں کو اقتدار میں شرکت کے لیے کونسل ہند کا قانون مجریہ ۱۸۶۱ء، کونسل ہند کا قانون مجریہ ۱۸۹۲ء، کونسل ہند کا قانون مجریہ ۱۹۰۹ء جو منٹو مارلے اصلاحات کے نام سے مشہور ہوا اور حکومت ہند کا قانون مجریہ ۱۹۱۹ء، مانٹیگو چیمس فورڈ اصلاحات[۵] وغیرہ تک پہنچنے کا سفر ایک طویل داستان لیے ہوئے ہے۔۱۸۸۳ء میں سیلف گورنمنٹ ایکٹ کی منظوری اور اسٹامپ ایکٹ کے نفاذ کے خلاف لوگوں کا شدید ردعمل سامنے آیا تھا۔پہلی بار محسوس کیا گیا کہ انصاف اور خدمات کا بھی معاوضہ ادا کرنا ضروری ہوتا ہے۔انصاف لوگوں کا حق تھا، مسلمان بغیر کسی معاوضے کے ۷سو برس سے یہ ذمے داری نبھا رہے تھے لہٰذا ایسے ٹیکس کو مسلمانوں نے انصاف کی فراہمی کا معاوضہ سمجھا۔اسی طرح قانون اسلحہ کا نفاذ سختی سے ہوا۔پولیس کے اختیارات وسیع ہوئے، قحط اور بھوک افلاس سے لوگ پریشان ہوئے، پریس ایکٹ آیا وغیرہ وغیرہ۔اس صورت حال سے ہندوستان کی عمومی زندگی میں ایک بے چینی اور بے اطمینانی پھیلی ہوئی تھی۔ ہندوؤں کے تعلیم یافتہ طبقے نے سب سے پہلے انجمن سازی کا کام شروع کیا۔انڈین ایسوسی ایشن، بمبئی ایسوسی ایشن اور بعد میں ایسٹ انڈیا ایسوسی ایشن بھی قائم ہوئی۔لیکن ان تمام انجمنوں کے دیکھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہندوؤں میں متحدہ ہندوستان کا کوئی تصور اس وقت تک موجود نہیں تھا[۶] انگریز طبعاً اہل ہند کی آزادی کا راستہ روکنے اور انھیں محکوم رکھنا چاہتے تھے۔ان کے خیال میں ہندوستان ابھی جمہوری حکومت کے قابل نہیں ہوا ہے۔لہٰذا رفتہ رفتہ مرکزی، صوبائی اور بلدیاتی مجلسوں کی بنا ڈالی گئی اور بتدریج انتخاب اور شوریٰ کے اصول کو رواج دیا گیا۔ لارڈ رپن (۱۸۸۰ء۔۱۸۸۴ء) نے پہلی بار ہندوستانیوں کے سیاسی مسائل سے دل چسپی لی اور ہمدردی کا مظاہرہ کرتے ہوئے مجلسیں قائم کیں۔ان اصلاحات کو ''البرٹ بل'' کے نام سے جانا جاتا ہے جن پر ہندوستان کے انگریزوں نے شدید مخالفت کی اور ہنگامہ کھڑا کیا۔بل منظور نہیں ہوا غالباً اسی وجہ سے اس نے عہدے سے استعفیٰ بھی دیا۔اہلِ ہند نے ان کے اعزاز میں صدہا جلسے اور سپاس نامے پیش کیے۔سرسید نے بھی اس بل کی بھرپور تائید و حمایت کی۔اس زمانے میں پارلیمنٹ کے چند ارکان پہلے سے ہی اہلِ ہند کے حقوق کی حمایت میں آواز بلند کر رہے تھے۔جون برائٹ، ڈومنڈ، بریڈلا اور ہنری فاسٹ اس میں پیش پیش تھے[۷] یہی وہ پہلا موقعہ تھا کہ مسٹر ہیوم نے مدراس میں بیٹھ کر تنظیم سازی کا باقاعدہ آغاز کیا اور پہلی بار آل انڈیا انجمن کا خاکہ پیش کیا۔مسٹر ہیوم مجوزہ خاکہ لے کر شملہ گئے۔لارڈ کرزن اور دیگر انگریز، مسٹر ہیوم کے دلائل سے متاثر ہوئے۔اس طرح انڈین نیشنل کانگریس کے قیام کی کوششوں کا آغاز ہوا۔وائسرائے ہند اس انجمن کی منظوری کے لیے انگلستان بھی گئے۔وہاں لارڈ رپن، لارڈ ڈلہوزی، سرجیمس کیرڈ، جان برائٹ، مسٹر ریڈ، مسٹر سلیگ اور دوسرے انگریزوں کے مشورے سے یہ تنظیم قائم کر دی گئی۔اس کا پہلا اجلاس پونے میں ہونے والا تھا مگر ہیضے کی وبا کی وجہ سے ۲۸ دسمبر ۱۸۸۵ء کو دوپہر ۱۲ بجے گوکل داس تیج پال سنسکرت کالج بمبئی کے ہال میں اس کا اجلاس منعقد کر کے اغراض و مقاصد کی منظوری دی گئی۔اس اجلاس میں بھی اس بات کا اعتراف کیا

گیا کہ اس سے قبل عرصۂ دراز تک قومی وحدت کا کوئی تصور ہندوستان میں موجود نہیں تھا۔ یہ پہلا موقع تھا جس کا سہرا لارڈ رپن اور اس کے دست راست مسٹر ہیوم کے سر باندھا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ ایک طویل عرصے تک کانگریس کے اکثر امور کی نگرانی انگریز ہی کرتے رہے۔ مسٹر یوم اسکیمیں بناتے۔ پڑھے لکھے ہندو محض اس لیے ان لوگوں کی حمایت کر رہے تھے کہ کسی طرح انگریزوں کی خوش نودی حاصل کر کے برطانوی طرز کی پارلیمنٹ قائم کر دیں۔ بادی النظر میں یہ بڑی روشن خیالی اور ترقی پسندی کی باتیں تھیں لیکن ایک ایسے ملک میں جہاں دیگر بہت سی قومیں رہتی ہوں خصوصاً مسلمان جو یہاں کے حاکم بھی رہے اور اس امتیازی حیثیت کو فراموش بھی نہیں کر پائے تھے[8] اور جس کے ساتھ متعدد مواقع پر امتیازی سلوک برتا جاتا ہو، خصوصاً کانگریس کے قیام سے کچھ ہی عرصہ پہلے اردو ہندی کا جھگڑا کھڑا کر کے اکثریت کی بنیاد پر ملک کے کونے کونے میں اپنی مرضی مسلط کرنے کی کوشش کی جا رہی ہو، یہ تجربہ کسی فتنے سے کم نہیں تھا۔ یہ در اصل اس ہول ناک صورت حال کی تمہید تھی جو آئندہ کے برسوں میں ہندوستان کی سیاست میں زبردست ہلچل پیدا کرنے والی تھی۔ اس تحریک سے سرسید کے تبریٰ کے اسباب، ہندوؤں کے مذہبی، لسانی اور مسلم آزاری کے جذبات کی شدت تھی جسے دیکھ کر انھوں نے نیابتی حکومت اور ہندوؤں کے ہاتھ میں اقتدار کی منتقلی سے وہ متوہّم ہو گئے تھے[9]۔

انگریزوں کے نزدیک ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان نفاق بڑھانے کا اس سے اچھا موقع نہیں مل سکتا تھا۔ اپنی حکومت اور سلطنت کے استحکام کے لیے انگریزوں کو اس کی ضرورت بھی تھی۔ مخلوط انتخابات اور سادہ اکثریت کا واضح مطلب یہی تھا کہ ہندو اکثریت میں آ جائیں اور مسلمان ہندوؤں کی غلامی کریں۔ ہندو برطانوی پارلیمانی نظام کے داؤ پیچ اچھی طرح سمجھ چکے تھے جو صرف اور صرف ان ہی کے لیے مفید تھا۔ کانگریس کے قیام کے وقت مسلمانوں سے کوئی مشورہ نہیں کیا گیا تھا، حالاں کہ اخبارات میں یہ پروپیگنڈا کیا گیا تھا کہ اس میں مسلمان بھی شامل ہیں۔ اس وقت کی قیادت میں صرف سرسید ہی وہ رہنما تھے جو ان چال بازیوں کو اچھی طرح سمجھ رہے تھے۔ پوری قوم انگریزی سے بے بہرہ، انگریزوں سے متنفر اور عظمت رفتہ کے لیے سوگوار تھی۔ سرسید میونسپل اور ضلعی سطح پر مخلوط انتخابات کے نتائج دیکھ چکے تھے جس میں مسلمان نمائندے عموماً ناکام ہوئے تھے۔ سرسید کو مجبوراً کانگریس کی سرگرمیوں کی طرف متوجہ ہونا پڑا[10]۔ ۲۸ دسمبر ۱۸۸۸ء کو لکھنؤ اور ۱۶ مارچ ۱۸۸۸ء کو جو قرارداد پاس کی گئی تھی، سرسید نے اپنی تقاریر میں ان میں سے کچھ پر سخت تنقید کی۔ مسلمانوں کی تعلیمی حالت دیکھ کر مخلوط انتخابات اور مقابلے کے امتحان کو انھوں نے ناموزوں قرار دیا۔ سرسید نے ہی پہلی بار جداگانہ طرز انتخابات کا طریقہ وضع کیا جس میں مردم شماری کو مدنظر رکھتے ہوئے ایک مسلمان رکن کے مقابلے میں چار ہندو ارکان کے انتخاب کی حمایت کی[11]۔ یہاں اس بات کا تذکرہ بے محل نہیں ہوگا کہ وہ لوگ جو سرسید احمد خان پر اعتراض کرتے ہوئے انھیں رجعت پسند اور ہندو مسلم اتحاد کا مخالف قرار دیتے ہیں، انھیں ''اسباب بغاوت ہند'' کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیے۔ ان کے تمام اعتراضات کا جواب اس رسالے میں موجود ہے۔ سرسید نیابتی حکومت چاہتے تھے۔ واضح رہے کہ اس وقت ہندوستان میں مارشل لاء تھا، مسلمان پھانسی پر لٹکائے جا رہے تھے۔ رسالہ ''اسباب بغاوت ہند'' کو بھی سیکرٹری امور خارجہ مسٹر سیسل بیڈن نے باغیانہ تحریر قرار دیا۔ ان حالات میں سرسید کے نقطۂ نظر کو سمجھنا ضروری ہے۔ سرسید نے ۱۸۶۶ء میں جو برٹش انڈین ایسوسی ایشن قائم کی تھی، اس کا مقصد بھی یہی تھا کہ اپنے حقوق کے حصول کے لیے ہندوستانی برطانوی پارلیمنٹ سے اچھے تعلقات قائم کریں۔ اس انجمن کے افتتاحی اجلاس میں ہندو مسلم دونوں ہی شریک ہوئے اور دونوں مذاہب کے لوگوں نے رکنیت قبول کی[12]۔

اس کے مقابلے میں مسٹر ہیوم نے جو انڈین ایسوسی ایشن قائم کی، اس میں صرف ہندوؤں نے شرکت کی۔ لہٰذا یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ یہ تنظیم عملاً ہندوؤں کی خدمت کے لیے قائم کی گئی تھی۔ سرسید کی مذہبی رواداری اور متحدہ ہندوستان کے حوالے سے ان کے خیالات کو سمجھنا ہو تو وہ تقریر جو علی گڑھ سے متعلق انھوں نے جالندھر میں کی تھی، بڑی غور طلب ہے۔ سرسید ہندوؤں اور مسلمانوں کو ہندوستان کی دو آنکھیں قرار دیتے تھے۔ اسی لیے علی گڑھ کالج کے متعلق مسٹر ہنٹر کی رائے کہ یہاں ہندو، مسلم جدا جدا عبادت بھی کرتے ہیں اور ان کے کھانے کا انتظام بھی جدا جدا کیا جاتا ہے، بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ ایک طرف تو رواداری کا یہ عالم اور دوسری طرف ۱۸۶۷ء میں بنارس کے سرکردہ ہندوؤں کی جانب سے عدالتوں سے اردو کے خاتمے کی تحریک اور رسم الخط پر اعتراضات، ان دونوں واقعات کو تاریخی تناظر میں دیکھنے سے تقسیم ہند کی وجوہات تک پہنچنے میں بڑی مدد ملے گی۔ یہی وہ زمانہ تھا جب ہندو اور مسلمان اپنی اپنی راہیں جدا کرتے محسوس ہوتے ہیں [۱۳]۔ اور جس کی جانب اشارہ کرتے ہوئے مولانا الطاف حسین حالی نے سرسید کے خیالات کا اعادہ کرتے ہوئے لکھا کہ اب ہندوؤں اور مسلمانوں کا ایک ساتھ چلنا مشکل ہو گیا ہے [۱۴]۔ اس کے علاوہ انیسویں صدی میں گارسیں دتاسی کے خطبات و مقالات میں جا بہ جا ہندوؤں کے متعصّبانہ رویے کی نشان دہی کی گئی ہے خصوصاً اردو زبان کے حوالے سے ہندوؤں کے رویے پر تو دتاسی سخت حیرت کا اظہار کرتا دکھائی دیتا ہے۔ دتاسی کا کہنا ہے کہ ہندو اپنے تعصب کی وجہ سے ہر ایک ایسے امر کے مزاحم ہوتے جو ان کو مسلمانوں کی حکومت کا زمانہ یاد دلائے [۱۵]۔ ہندوؤں کے دلوں میں مسلمانوں کی مخالفت بڑھتی گئی۔ مسلمانوں کی حکومت کے خاتمے کے بعد ہندوؤں کو کھل کر اس نفرت کے اظہار کا موقع ملا۔ انگریزوں نے اس معاملے میں ان کی سرپرستی جاری رکھی اس لیے سرسید نے بعد میں کانگریس کے اجلاسوں میں شرکت سے نا صرف خود گریز کیا بلکہ مسلم اکابرین کو بھی روکا۔ سرسید پر برطانوی خیر خواہی اور خوشامد کا الزام لگانے والے اس امر کو ضرور ذہن میں رکھیں کہ کانگریس کے پہلے اجلاس منعقدہ ۱۸۸۵ء میں اس کے صدر مسٹر بونرجی اور دوسرے اجلاس میں دادا بھائی نوروزجی نے واضح طور پر کہا کہ ہم ریڑھ کی ہڈی تک برطانوی حکومت کے وفادار ہیں [۱۶]۔ کانگریسی رہنماؤں نے متعدد بار اپنی تقاریر اور قراردادوں میں انگریزوں سے اپنی وفاداری کا اعادہ کیا۔ لہٰذا انگریزوں نے بڑی ذہانت سے ہندوستان میں سیاسی تجربات جاری رکھے اور ہندوؤں کو اپنے مفاد کے لیے استعمال کیا۔ مسلمانوں کی تہذیب و تمدن، علم، سیاسی اقتدار وغیرہ کو تباہ و برباد کر کے ان پر معاش کے دروازے بند کیے اور ہندوؤں کو یقین دلایا کہ مستقبل میں وہ برطانوی حمایت سے مسلمانوں پر حکومت کریں گے [۱۷]۔

اس سلسلے میں اخبارات کے ذریعے پروپیگنڈا مہم بھی چلائی گئی۔ مثلاً کانگریس کے افتتاحی اجلاس کے موقع پر ''دی ٹائمز'' (The Times) کے خصوصی نامہ نگار نے لکھا کہ ''ابتدائے آفرینش سے لے کر آج تک شاید پہلی بار ہندوستانی بحیثیت ایک قوم کے مجتمع ہوئے ہیں'' [۱۸]۔ بی۔ پی۔ رامیا نے کانگریس کو نصف صدی کی انتھک کوششوں کا نقطۂ عروج قرار دیا جو مختلف حالات میں راجا رام موہن رائے، دوارکا ناتھ ٹیگور اور کرستو داس پال جیسی شخصیتوں کی رہین منت تھا، برٹش انڈیا ایسوسی ایشن، برہمو سماج اور پراتھنا سماج جیسی عوامی تنظیموں کی جو کئی دہائیوں تک جدوجہد میں منہمک تھیں لیکن اس حقیقت سے کیسے انکار کیا جائے ان تحریکوں میں سے اکثر کے رہنما ہندو ہی تھے اور ہر دور میں ان کی خدمت کا دائرہ ہندوؤں ہی کی حد تک محدود رہا [۱۹]۔ بے شک یہ کسی جانی بوجھی حکمت عملی کا نتیجہ نہ ہو بلکہ حالات ہی کچھ اس کے متقاضی تھے کیوں کہ ان دنوں تعلیم و ترقی کے ہراول دستے میں ہندو پیش پیش تھے۔ چناں چہ کانگریس کی تحریک پر ابتدا ہی سے ہندو رنگ غالب رہا۔ گو کہ اس کے راہنماؤں نے بار بار فرقہ واریت کے الزام کی تردید کی لیکن خارجی قوتیں ان کوششوں

سے زیادہ طاقت ور ثابت ہوئیں لہٰذا مختلف صورتِ حال میں ۱۸۶۷ء کے ہندی اردو قضیے سے لے کر مختلف مسائل پر مسلمانوں سے روا رکھی جانے والی مخاصمت نے اس موقف کو مزید مضبوط کیا لہٰذا اس زمانے کے مشہور اینگلو انڈین اخبار English man نے اسے ''ہندو کانگریس'' کہہ کر مخاطب کیا اور اس کے قیام کی مذمت بھی کی[۲۰]۔ تاہم دی ٹائمز اور چند اینگلو انڈین اخبارات کو چھوڑ کر کسی اور نے کانگریس میں مسلمانوں کی غیر موجودگی کو اس قدر شدت سے محسوس نہیں کیا۔ بعد میں چند اہم مسلم رہنماؤں اور تنظیموں نے کھلے بندوں اس کی مخالفت شروع کی۔ سرسید نے ابتدا میں اپنے آپ کو اور قوم کو اس متنازعہ فیہ مسائل سے دور رکھنے کی کوشش کی اور ساری توجہ قوم کے تعلیمی اور سماجی مسائل پر مرکوز رکھی البتہ دوسری کانگریس کے انعقاد سے ٹھیک ایک ماہ قبل علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں اس تحریک کی مذمت کرتے ہوئے اسے ایک اشتعال انگیز تنظیم قرار دیا۔ اے۔ او۔ ہیوم اس اداریے پر چونک پڑے اور فوراً کلکتے کے ''اسٹیٹسمین'' میں اس آرٹیکل کا زوردار جواب شائع کروایا جسے وائسرائے بہادر نے بھی تحسین کی نظر سے دیکھا[۲۱]۔

کانگریس نے اس صورت حال کو دیکھتے ہوئے مسلمانوں کی سرکردہ تنظیموں سینٹرل محمڈن ایسوسی ایشن اور محمڈن لٹریری سوسائٹی وغیرہ کو دوسرے اجلاس میں شرکت کے لیے وفود بھیجنے کی دعوت دی جو قبول نہیں کی گئی۔ امیر علی نے حکومت کے تعلق سے بے اطمینانی کے رویے کو پسند نہیں کیا۔ اسی طرح نواب عبداللطیف نے جلد بازی میں تیار کی گئی کسی بھی تجاویز کی حمایت سے گریز کیا۔ کانگریس کے تعلق سے مسلمانوں کے رویے پر ہندو اخبارات نے کڑی تنقید کی۔ اخبار ''ایڈووکیٹ آف انڈیا'' نے اس رویے کو خالص روسی قسم کے نظریہ محکومی پر مبنی قرار دیا۔ ''اسٹیٹسمین'' نے بھی اس رویے کو ایک عظیم تحریک سے مسلمانوں کی بے اعتنائی قرار دیا۔ کانگریس کے تیسرے اجلاس میں بدرالدین طیب جی کی شرکت، کانگریس کے منتظمین کی بڑی کامیابی تصور کی جاتی ہے۔ اس وقت تک سرسید جیسے مسلم اکابر سیاست سے الگ تھلگ رہ کر سماجی اور تعلیمی کاموں میں مصروف رہے لیکن مسلمانوں کی کانگریس میں شامل ہونے کی حالیہ کوشش پر وہ برہم ہو گئے اور لکھنؤ میں ایک تقریر کے دوران کانگریس پر بری طرح برس پڑے۔ ''پایونیر'' نے سرسید کی ناراضگی کی وجہ ۱۸۸۷ء کے مدراس کے اجلاس میں علی گڑھ کے دو طالب علموں کی شرکت بتایا ہے۔ سرسید نے اس تقریر میں اپنے ہم مذہبوں کو کھری کھری سنائیں اور متنبہ کیا کہ اگر انھوں نے کانگریس میں شرکت اختیار کی تو انھیں قومی تباہی کے لیے تیار ہو جانا چاہیے۔ نمائندہ قسم کی حکومت میں مسلمانوں کا مستقبل تاریک اور وہ ہمیشہ کے لیے ہندوؤں کے غلام بنا لیے جائیں گے۔ اپنی تقریر میں انھوں نے جو سوالات اٹھائے ان میں پہلا یہ تھا کہ بالفرض اگر انگریز ہندوستان سے چلے گئے تو اس ملک پر حکمرانی کون کرے گا؟ اس صورتِ حال میں لازمی ہے کہ ایک قوم دوسرے پر غالب آ جائے گی اور دوم یہ کہ اگر بالغ رائے دہی کا حق مل بھی گیا تو مسلمان امیدوار مسلمانوں اور ہندو رائے دہندگان ہندوؤں کو ہی ووٹ دیں گے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہندو امیدوار چار گنا زیادہ ووٹ حاصل کر کے فتح حاصل کر لے گا۔ اس صورتِ حال میں مسلمانوں کے مفادات کا تحفظ کیوں کر ممکن ہوگا؟ انھوں نے اپنی ان مساعی کے ذریعے لارڈ رپن کی رائے تبدیل کروالی تھی اور وائسرائے کو اس بات پر راضی کر لیا تھا کہ لوکل بورڈوں اور میونسپلٹیوں میں ایک تہائی ارکان نامزد کیے جائیں۔ بہرحال سرسید کی اس تقریر نے ہندوستان بھر میں تہلکہ مچا دیا۔ ہندو اخبارات نے شدت سے سرسید پر حملے شروع کر دیے۔ بنگالی دانش وروں کے جلسے میں خاص طور پر سرسید کو ہدف تنقید بنایا جاتا۔ ''انڈین مرر'' نے انھیں دشمنوں کا آلۂ کار ''دی نیشنل گارجین'' اپنے تنقیدی کلمات میں سخت رویہ اختیار کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ ''اگر کوئی شخص جان بوجھ کر اپنا گلا کٹوانے کا تہیہ کر ہی لے تو وہ علی گڑھ کا ستر سالہ مسلمان بوڑھا سرسید احمد

خان ہی ہوگا''۔''ینگ بنگالی'' نے ان کی تقریر کو احمقانہ، بچکانہ اور خوشامد پرستانہ قرار دیا جب کہ لاہور سے شائع ہونے والے ''ٹریبیون'' نے ان کی عمر کے ساتھ ساتھ ان کی عقل کی ضعیفی کا بھی ماتم کیا۔ البتہ مسلم اخبارات میں "The Muslim Herald" نے لکھا کہ سرسید جری اور بہادر انسان کی طرح کھل کر وار کرتے ہیں۔ اس دور میں ایسے شخص کا پایا جانا غنیمت ہے جو لگی لپٹی رکھے بغیر حقیقت بیان کرے۔ ہم فخریہ طور پر سرسید کو اپنا رہنما اور نمائندہ تسلیم کرتے ہیں۔ کانگریسی رہنماؤں نے بھی سرسید کی تقریر کا جواب دیتے ہوئے تلخ نوائی سے کام لیا۔ بنگالی تو اس قدر ناخوش تھے کہ ان کی تنقید سوقیانہ پن کی حدوں کو چھونے لگیں۔ پنجاب کے ابھرتے ہوئے رہنما لالہ لجپت رائے نے جو بعد میں کانگریس کے صدر بھی بنے، لاہور کے ''ٹریبیون'' میں سلسلہ وار خطوط لکھ کر سرسید پر یہ الزام لگایا کہ وہ دفتری خوشامد کا شکار ہو کر اسی چیز سے منحرف ہو گئے ہیں جس کا پرچار وہ خود گزشتہ بیس برسوں سے کرتے رہے ہیں۔ وہ انھیں درختوں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنا چاہتے ہیں جسے کبھی انھوں نے خود اپنے ہاتھوں سے لگایا تھا۔ سرسید کچھ عرصے تک تو خاموش رہے لیکن پھر ایک تفصیلی جواب کے ذریعے اپنی مہر سکوت کو توڑا۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ نہیں چاہتے کہ اس ملک میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان منافرت اور غلط فہمیاں پیدا ہوں۔ انھوں نے واضح طور پر کہا کہ ہندوستان ایک پرندہ ہے جس کی ہندو اور مسلمان دو آنکھیں ہیں۔ لیکن اس تقریر میں انھوں نے یہ بھی واضح کر دیا کہ ان کا مقصد یہ احساس دلانا ہے کہ اگر کسی نے اس فرسودہ حال قوم (مسلمان) کو اپنے پیروں تلے پامال کرنے کی کوشش کی تو توقع نہیں رکھنی چاہیے کہ مسلمان یہ سب خاموشی سے برداشت کر لیں گے۔ سرسید کو یہ خدشہ تھا کہ کانگریس ملک کو ایک مستقل خانہ جنگی کی طرف لے جائے گی[۲۲]۔ اس سے قبل محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کے پرنسپل تھیوڈور بیک (Theodore Back) نے Pioneer میں سلسلہ وار مضامین میں سرسید ہی کی طرح ملتے جلتے خیالات پیش کیے تھے اور کانگریس کے گزشتہ دو اجلاسوں کی قراردادوں کا تجزیہ کرتے ہوئے بتایا تھا کہ ان قرادادوں کا مقصد کسی نہ کسی شکل میں پارلیمانی جمہوری حکومت قائم کرنا ہے۔ جس سے صرف اور صرف مسلمانوں کا نقصان ہوگا۔ ہندو اخبارات نے بیک کے مضامین پر بھی سخت ردعمل ظاہر کرتے ہوئے اسے غیر آتشی پسند بدجانور سے زیادہ حقیر شخصیت قرار دیا[۲۳]۔

اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ کانگریس اکثریت کی بنیاد پر حاصل ہونے والے اقتدار کے ذریعے مطلق العنانی کا جو خواب دیکھ رہی تھی، اس کی راہ میں جو بھی رکاوٹ بننے کی کوشش کرتے، اسے پسند نہیں کرتی تھی۔ یہ آمرانہ رویہ کانگریس اور ہندو اخبارات کا اس زمانے ہی سے واضح ہو چکا تھا۔ جب مسلمانوں نے اپنے مفادات کے تحفظ کے لیے کوئی علاحدہ سیاسی جماعت تک قائم نہیں کی تھی۔ بیک کے خیالات کو نا صرف کانگریس نے بلکہ ان کے انگریز کرتا دھرتا ہیوم وغیرہ نے بھی سخت تنقید کا نشانہ بنایا تھا۔ مگر سرسید کے سیاسی شعور نے مسلم انجمنوں کو اس بابت ضرور سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ لہٰذا مسلمانوں کا بااثر طبقہ اب سرسید ہی کی جانب امید افزا نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ انھیں ہی اپنا سیاسی قائد تسلیم کر رہا تھا۔ چناں چہ بمبئی، مدراس اور لاہور وغیرہ میں اجلاس کر کے سرسید کے خیالات کی توثیق کرنے والی قراردادیں منظور ہوئیں اور متعدد اداروں نے سرسید کی حمایت کا اعلان کیا۔ اسی حمایت سے تقویت پا کر ۱۲ اگست ۱۸۸۸ء کو سرسید نے علی گڑھ سے جاری ایک بیان میں کانگریس سے اختلاف رکھنے والے ہندو اور مسلمانوں کو متحد ہو کر ''انڈین پیٹریاٹک ایسوسی ایشن'' نامی ادارے کی بنیاد ڈالی جس کا مقصد انگلستان کے عوام کو ہندوستان کی حقیقی صورت حال سے آگاہ رکھنا تھا۔ بنارس کے راجا شیرا پرساد اور لکھنؤ کے سید امتیاز علی وغیرہ نے اس کام میں سرسید کی بھرپور اعانت کی۔ اس وقت تک کانگریس میں مسلمانوں کی حقیقی نمائندگی کا

مسئلہ عوامی توجہات کا مرکز بن چکا تھا۔ سرسید اور ان کے حامیوں کا کہنا تھا کہ جو ممبران کانگریس کے اجلاسوں میں شریک ہو رہے ہیں وہ محض نقلی اور بناوٹی ہیں لیکن کانگریسی رہنما مسلمانوں کی شرکت کے دعوے کا پروپیگنڈا جاری رکھے ہوئے تھے۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ولیم ہنٹر جیسے مسلمانوں کے حامی شخص نے بھی اپریل ۱۸۸۸ء میں لندن میں ایسوسی ایشن کے سالانہ اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے تسلیم کر لیا کہ متعدد علاقوں سے مسلمانوں نے کانگریس کی کارروائیوں میں شرکت کرنا شروع کر دی ہے۔ ردِعمل میں مسلمانوں کی جانب سے تردیدی بنایات اخبارات میں شائع ہوئے۔ محمد شفیع، جو بعد میں آل انڈیا مسلم لیگ کے صدر بھی بنے، طویل تردیدی بیان اخبارات میں شائع کروایا جس میں ''مسلم ہیرالڈ'' میں چھپی ان رپورٹوں میں چھپے مسلمانوں کے ناموں کی شرکت کی تردید کی جنھیں مدراس کانگریس میں شرکت پر تشہیری مہم کا حصہ بنایا گیا تھا۔ ان ناموں میں سے بیشتر نے اس اجلاس میں شرکت سے انکار اور مذکورہ اخبار کی رپورٹوں کو جھوٹ کا پلندہ قرار دیا تھا[۲۴]۔

کانگریس کی مخالفت محض مسلمانوں ہی سے نہیں بلکہ منشی نول کشور، راجا شیو پرساد اور بنگال کے راجا کے علاوہ بااثر ہندو زمین داروں نے بھی کی۔ ظاہر سی بات ہے کہ اس کی وجہ وہ آمرانہ رویے تھے جو رفتہ رفتہ اس جماعت میں سرائیت کرتے جا رہے تھے۔ جوں جوں یہ تنظیم مستحکم ہوتی گئی، برطانوی انتظامیہ پر اس کی تنقیدوں میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔ اب بعض برطانوی عہدے دار بھی اس کی سرگرمیوں کو شک کی نظروں سے دیکھنے لگے۔ سرسید کی انڈین پیٹریاٹک ایسوسی ایشن کو بھی ابتداً کانگریس مخالف ہندو حلقوں کی حمایت حاصل رہی لیکن جلد ہی یہ ادارہ ایک مسلم تنظیم کی شکل اختیار کر گیا۔ ۱۸۸۸ء میں کانگریس کے چوتھے اجلاس منعقدہ الہ آباد کی کامیابی کے بعد تمام مخالفین کو کانگریس کی بڑھتی ہوئی قوت کا اچھی طرح اندازہ ہو گیا۔ کانگریسی قائدین ہمیشہ برطانوی حکم رانوں کے ساتھ تعلقات کی استواری کا دم بھرتے رہے۔ اسی لیے اس تمام عرصے میں انھوں نے کبھی بھی برطانیہ سے جھگڑا مول لینے کی کوشش نہیں کی لیکن وہ برطانوی وعدوں کو ضرور یاد دلاتی تھی۔ ہندوستان کے نظم و نسق چلانے والے برطانوی عہدے دار کانگریس کے مطالبات اور مقبولیت پر شدید کرب محسوس کرنے لگے تھے۔ سر لیپل کریفن جو وسطی ہندوستان کے لیے گورنر جنرل کے نمائندے مقرر کیے گئے تھے، کانگریس سے اس قدر متوحش ہوئے کہ سرِعام مرہٹوں اور راج پوتوں کو کانگریس کے خلاف ابھارنا شروع کر دیا۔ اس رجحان سے سرسید کو بھرپور فائدہ حاصل ہوا کیوں کہ ان دنوں کانگریس مخالف تحریک مسلمانوں میں بتدریج مقبولیت حاصل کرتی گئی۔ اس تمام عرصے میں اعلیٰ برطانوی حکام مسلمان رہنماؤں اور کانگریس کے مابین چلے آ رہے سیاسی مناقشات کے بارے میں رائے قائم کرنے کے سلسلے میں واضح طور پر دو گروہوں میں بٹ چکے تھے[۲۵]۔

انیسویں صدی کے اواخر میں ہونے والے واقعات نے سرسید کی رائے پر مہر تصدیق ثبت کر دی۔ ہندو مسلم فسادات اور ہندی اردو مناقشے جیسے واقعات نے ان کے یقین کو مزید مستحکم کیا کہ کسی بھی بنیاد پر ہندوؤں کے ساتھ تعاون اور اشتراک ممکن نہیں رہا۔ ۱۸۶۷ء میں جو پیش گوئی سرسید نے کی تھی وہ لفظ بہ لفظ صحیح ثابت ہو رہی تھی۔ جیسے جیسے اردو ہندی اختلاف بڑھا، ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان فاصلہ بھی بڑھتا گیا۔ دو مختلف قوموں کے نمائندے اب ایک دوسرے کے مدمقابل بن گئے۔ اس دوری اور صف بندی کے ذمے دار سراسر ہندو تھے۔ اس لیے کہ اس جھگڑے کی بنیاد انھوں نے ہی ڈالی تھی۔ اردو کے خلاف ابتدائی مرکز بنارس میں قائم ہوا تھا، پھر اس کی شاخیں مختلف علاقوں اور صوبوں میں قائم کی گئیں۔ ہندوؤں نے اس زمانے میں بڑے طوفان برپا کیے۔ ۱۸۶۰ء سے ۱۹۰۰ء کے

درمیانی چالیس برسوں میں اردو ہندی تنازعے کے سوا اور کوئی مسئلہ ایسا نظر نہیں آتا جو ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان اس قدر شدت سے مسلسل زیر بحث رہا ہو۔ بیش تر انگریز لسانی مباحث میں ہندوؤں کی ہم نوائی کرتے تھے[۲۶]۔ گارسیں دتاسی نے اس بابت ۱۸۶۹ء کے خطبے میں لکھا کہ:

برطانوی حکومت اس تحریک کے موافق معلوم ہوتی ہے۔ حکومت کا خیال ہے کہ ہندی کی موافقت سے ہندو لوگ خوش ہو جائیں گے، اور چوں کہ ہندوستان کی آبادی کی اکثریت انھی لوگوں پر مشتمل ہے، اس لیے ہندی کی تائید ملکی مصالح پر مبنی ہے[۲۷]۔

عدالتوں اور سرکاری دفاتر میں اردو کی جگہ ہندی کو رائج کرنے کی جو کوششیں شروع ہوئیں، وہ صرف رجعت پسند خیالات کے ہندوؤں کی جانب سے نہیں تھی بلکہ ان میں وہ لوگ بھی شامل تھے جو روشن خیال اور وسیع النظر سمجھے جاتے تھے۔ حتیٰ کہ ان میں وہ لوگ بھی پیش پیش تھے جو اردو کے ادیب اور مصنف کی حیثیت سے شناخت رکھتے تھے۔ سیاسی حالات کی تبدیلی کی بدولت ان کے دلوں میں ہندو قومیت کا جو نیا احساس پیدا ہوا تھا، اس نے انھیں ہندی کے نام سے ایک نئی قومی زبان کو جنم دینے کی ترغیب دلائی۔ اردو کے خلاف ہندی کی یہ تحریک پہلے پہل بنارس کے ہندوؤں کی طرف سے اٹھائی گئی اور وہیں اس تحریک کا پہلا مرکز قائم ہوا۔ اس زمانے میں بنارس کے پڑھے لکھے ہندوؤں نے اردو کے خلاف جو شورش برپا کر رکھی تھی، سرسید اس شورش کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے، اس لیے وہ ہندو مسلم اتحاد کی طرف سے مایوس ہو چکے تھے۔ اس خاص ہندو طبقے کو بھی اچھی طرح معلوم تھا کہ اردو کے مقابلے میں ہندی کم سن اور کم سواد ہے لیکن پھر بھی اکثریت کے زعم اور حکومت برطانیہ کی شہ پا کر وہ ہندی کو سرکاری زبان بنانے پر تلے بیٹھے تھے۔ بابو شیو پرساد جیسے سائنٹفک سوسائٹی کے رکن بھی اس معاملے میں پیش پیش تھے بلکہ انھوں نے ہی سب سے پہلے سائنٹفک سوسائٹی کی روئیداد کو ہندی میں شائع کرنے کا مطالبہ کیا۔ یہ وہی بابو شیو پرساد ہیں جو برطانوی حکومت کی ایما پر ابتدائی اور ثانوی مدارس کے لیے جدید علوم کی درسی کتب کے لیے متعدد تراجم اردو میں کر چکے تھے۔ ۱۸۸۲ء کے تعلیمی کمیشن میں ہندی کی حمایت کرتے ہوئے جو اعداد و شمار پیش کیے اس کے مطابق صوبے بھر کے تیس اخبارات میں سترہ اردو اور صرف چار ہندی کے ہیں۔ اس سے بھی اردو کی برتری کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ سرسید کے قریبی دوستوں میں راجا جے کشن داس بھی اردو مخالفت میں پیش پیش تھے۔ لہٰذا سرسید کو اپنے جن روشن خیال دوستوں سے توقعات تھیں، وہی متعصّبانہ سوچ کے حامل اقدامات سے ہندو مسلم اتحاد کو پارہ پارہ کر رہے تھے۔ اردو مخالف اداروں میں بنارس انسٹی ٹیوٹ کے بعد جو ادارہ پیش پیش تھا، وہ الٰہ آباد انسٹی ٹیوٹ تھا۔ ۱۸۶۷ء سے ۱۸۷۱ء کے درمیان اردو ہندی تنازعے پر لاتعداد مضامین لکھے گئے، لاتعداد تقریریں ہوئیں اور بحث و مباحثے کا بازار گرم رہا[۲۸]۔ اس کے باوجود ۱۸۸۶ء تک کے اعداد و شمار کے مطابق صوبے بھر میں چونسٹھ اخبار اردو اور صرف بارہ ہندی کے نکلتے تھے[۲۹]۔ اسکولوں اور کالجوں میں اسے ذریعۂ تعلیم کے طور پر استعمال کیا جا رہا تھا۔ آرٹس کے ساتھ سائنسی مضامین کی کتب تراجم کی شکل میں پڑھائے جا رہے تھے۔ پچھلے تین سو برس سے اردو اپنے ارتقا کی منزلوں کے طے کر کے برصغیر کی لینگوا فرانکا بن چکی تھی۔ چالیس کروڑ لوگ اس زبان کو بولتے اور سمجھتے تھے۔ قانونی اور اصطلاحات کے تراجم کے علاوہ علمی اور تحقیقی کتب اس زبان میں لکھی جا رہی تھیں[۳۰]۔ اسی صورت حال کو دیکھ کر پال براس کو یہ کہنا پڑا کہ:

In the eighteen and nineteen centuries, specially a large and vital body of

literature was written in Urdu in Persian script. It is important to recognize that both Hindus and Muslims contributed to this literature. Although a division gradually developed between Hindus who preferred to write Hindi-Urdu in Deonagri on the one hand and Hindus and the Muslims who wrote Hindi-Urdu in Persian script, this division was not initially entirely a communal one. Only Hindus used the Deonagri, but both Hindus and Muslims used the Persian script[۳۱]

لیکن ہندوؤں کی سیاسی مصلحتیں دانستہ اردو سے گریز پر مجبور کر رہی تھیں۔ جیسے جیسے اردو ہندی تنازعہ بڑھتا گیا، ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان خلیج بھی بڑھتی گئی۔ بنگالی مسلم رہنماؤں میں جسٹس امیر علی اور عبداللطیف بھی اردو کی حمایت میں کھڑے تھے۔ کیمبل اور میکڈونلڈ جیسے اردو دشمن ہندوؤں کے ارادوں کو تقویت پہنچا رہے تھے[۳۲]۔ سرانٹونی میکڈونلڈ اس سے قبل بہار میں بحیثیت کلکٹر تعینات تھے۔ اپنے تعیناتی کے زمانے میں وہ اردو فارسی رسم الخط کی جگہ بہاری ہندی اور کیتھی رسم الخط رائج کر چکے تھے۔ جب وہ لیفٹیننٹ گورنر ہو کر یو۔ پی۔ آئے تو یہاں بھی ہندوؤں کے حوصلے بلند ہو گئے۔ ۱۸۹۸ء میں اردو ہندی نے خوب سر اٹھایا اور ہندوؤں نے مطالبہ کیا کہ اردو فارسی رسم الخط کی جگہ ہندی اور دیوناگری رسم الخط کی اجازت دی جائے، ۱۸ اپریل ۱۹۰۰ء کو ایک قرارداد شائع ہوئی جس میں بعض سرکاری اغراض کے لیے ہندی بھاشا اور دیوناگری رسم الخط کی اجازت دے دی گئی۔ ردعمل میں نواب محسن الملک نے ۱۳ مئی ۱۹۰۰ء ایک اجلاس منعقدہ علی گڑھ ٹاؤن ہال میں اردو ڈیفنس ایسوسی ایشن قائم کی۔ میکڈونلڈ نواب محسن الملک کی جسارت پر سخت چراغ پا ہوا اور صوبے کے امرا و روسا کو جو علی گڑھ کے لیے چندہ دیا کرتے تھے، اپنی ناراضگی سے آگاہ کیا۔ اس کے باوجود ۱۸ اگست ۱۹۰۰ء میں مسلمانوں نے لکھنؤ میں جلسہ منعقد کیا جہاں نواب محسن الملک نے پُر زور تقریر بھی کی۔ اینٹونی میکڈونلڈ نے ٹرسٹیز کے اجلاس میں ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے الزام لگایا کہ اردو ہندی تنازعے کی بابت کالج کے طلبا سے پروپیگنڈا کروایا جا رہا ہے اور دھمکی دی کہ صورت حال نہ بدلی تو حکومتی امداد بند کی جاسکتی ہے۔ مسلمان رئیسوں کو تنبیہ کی گئی کہ اردو ڈیفنس ایسوسی ایشن کی تائید و حمایت بند کریں۔ حکومتی قہر سے محفوظ رکھنے کے لیے محسن الملک نے کالج کے آنریری سیکرٹری کی حیثیت سے مستعفی ہونے کا فیصلہ کیا[۳۳]۔

ہندوؤں کی سیاسی حکمت عملی میں جو چیز اس زمانے میں سب سے زیادہ ابھر کر سامنے آئی وہ یہ تھی کہ ایک سوچی سمجھی اسکیم کے تحت مسلمانوں پر دباؤ بڑھانے کے لیے ''ہندو مسلم'' فسادات شروع کروائے۔ ان فسادات میں مسلمانوں کا بہت زیادہ جانی و مالی نقصان ہوتا۔ مقابلہ جب ایک چار کا ہوتو بہرحال ہندوؤں کا پلڑا بھاری رہتا۔ انگریزوں کو مسلمانوں کے خلاف بھڑکانے کی منظّم اسکیم نے رہی سہی کسر پوری کردی۔ بنگال میں راجا رام موہن رائے کی ''برہمو سماج'' تحریک اور پنجاب میں ''آریا سماج'' تحریک بھی اس وقت زوروں پر تھی۔ آریا سماج کی ''کتاب مقدس'' کی اشتعال انگیزی نے بھی ہندو مسلم منافرت پیدا کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ خود گاندھی نے پہلی بار کتاب ''ستیارتھ پرکاش'' کا مطالعہ کیا تو تلملا اٹھے اور اپنے اخبار (Young India) میں اس کے خلاف سخت اداریہ لکھا۔ ہندو اس دور میں حد سے زیادہ قوت حاصل کرتے جا رہے تھے۔ ۱۸۹۳ء میں مسٹر تلک نے ایک خالص فرقہ وارانہ اور مسلم دشمن

جماعت Anti cow killing association کے نام سے قائم کی۔ مقصد اس کا یہی تھا کہ اس آڑ میں انگریز کی حمایت حاصل کر کے مسلمانوں کو صفحۂ ہستی سے مٹایا جائے۔ یہ تحریک مسلمانوں کے خلاف تھی جو عید قرباں پر ہندوؤں کی بیچی ہوئی ان گائیوں پر جو ناکارہ اور نکمی ہو چکی تھیں، قصاب سے چھری پھروایا کرتے تھے۔ اسی زمانے میں مسٹر تلک نے ہندو قوم کو تحفے کے طور پر ''گنپتی'' کا تہوار دیا تاکہ آسانی سے فتنہ وفساد اور کشت وخون کا بازار گرم کیا جا سکے۔ اس طرح مسٹر تلک ہندوؤں کے محبوب لیڈر بن گئے۔ اپنے انگریزی اخبار ''مرہٹہ'' اور مرہٹی اخبار ''کیسری'' سے بھی انھوں نے قیامت خیزیوں میں مزید اضافے کا خوب کام لیا[۳۴]۔ مسلمانوں کو تعلیمی اعتبار سے پس ماندہ کر کے، ہندوؤں کو حد سے زیادہ آگے بڑھا کے، مالی اعتبار سے مسلمانوں کو مفلس اور قلاش کر کے اور ہندوؤں کے جیب ودامن زروگوہر سے بھر کے، سرکاری ملازمتوں سے مسلمانوں کو بے دخل اور ہندوؤں کو زیادہ سے زیادہ ملازمتیں دے کے محکوم مسلمانوں میں زبردست احساس کمتری پیدا کر کے اور ہندوؤں کو نوازتے ہوئے مغربی جمہوریت کی سب سے بڑی نعمت ''اکثریت کی حکومت'' کا جذبہ ابھارتے ہوئے ان کے دل میں احساس برتری پیدا کر کے انگریزوں نے پہلے ہی دوقومی نظریے کی بنیاد ڈال دی تھی۔ ایک جانب اس طرح کی سیاسی فضا، دوسری جانب اردو دشمن رویہ، اب سرسید جیسے مدبر ان حالات میں کرتے تو کیا کرتے؟ لہٰذا سرسید نے جداگانہ طرز انتخاب کا جو مطالبہ انگریزوں سے کیا، وہ دراصل اسی سیاسی ماحول میں سب سے مدبرانہ فیصلہ تھا۔ اردو ہندی تنازعے نے سرسید کے اس فیصلے پر مزید توثیقی مہر لگا دی۔ اس تنازعے نے نہ صرف فرقہ واریت کو ہوا دی بلکہ دونوں اقوام ہندو اور مسلمانوں کے سوچنے کی طاقت بھی سلب کر لی۔ دلّی کالج مرحوم ہو گیا، فورٹ ولیم کالج میں اردو اور ہندی دو الگ الگ زبانیں بن گئیں۔ صوبہ بہار کی حکومت نے سرکاری دفاتر سے دیس نکالا کر کے اس کا جنازہ نکالا، پھر صوبہ متحدہ یعنی یو۔ پی۔ وغیرہ میں بھی تحریک زور وشور سے شروع ہو گئی، لہٰذا یہ بات تو اسی زمانے میں واضح ہو چکی تھی کہ ہندو اور مسلم دو جداگانہ قومیں ہیں اور اب ان میں کوئی قدر مشترک نہیں۔ بہر حال محسن الملک نے اردو کا مقدمہ بڑی دلیری سے لڑا، سرسید ان کی پشت پر تھے۔ سرسید کے انتقال کے بعد بھی وہ اس تحریک کو زور وشور سے جاری رکھے ہوئے تھے۔ ۱۲مئی ۱۹۰۰ء کو نواب لطف علی خاں (نواب چھتاری) اور ۱۸ اگست ۱۹۰۰ء کو لکھنؤ کے قیصر باغ میں ہونے والے اجلاس میں زبردست تحریک پیدا کی۔ ہندوؤں نے اس سارے معاملے میں بڑا منفی کردار ادا کیا۔ وہ انگریزوں کے ساتھ مل کر مسلمانوں کو دیوار سے لگانے کی ہر ممکن کوششوں میں مصروف تھے۔ انھوں نے محسوس کر لیا تھا کہ انگریز ایک نہ ایک دن یہاں سے چلے جائیں گے۔ اور جب وہ یہاں سے چلے جائیں گے تو پھر اکثریت کی حکومت قائم ہو گی۔ اس طرح انگریزوں کی جانشینی کا وہ حق ادا کریں گے۔

مسلمان جس طرح انگریزوں کے لیے لوہے کے چنے ثابت ہو رہے ہیں، ہندوؤں کے لیے بھی ہو سکتے ہیں۔ لہٰذا مسلمانوں کو کچلنے کے ہر اقدام میں وہ انگریزوں کے ساتھ کھڑے نظر آتے ہیں۔ مسلمانوں نے ہر جتن کر کے دیکھ لیا مگر ان کا سینہ چھلنی ہوتا رہا۔ ہندو نیابتی اور نمائندہ حکومت کا مطالبہ زور وشور سے کرنے لگے اور انگریز شفقت اور محبت سے ان کے مطالبے کو پزیرائی بخش رہے تھے۔ نمائندہ اور نیابتی حکومت کا واضح مطلب یہ تھا کہ اقلیت کے نام پر مسلمانوں کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہندوؤں کا غلام بنا دیا جائے۔ اس صورت حال میں ۹ اپریل کو فہم وفراست رکھنے والے مسلمانوں میں سیاسی تنظیم کا احساس شدت سے پیدا ہوا۔ ۱۹ اپریل ۱۹۰۱ء کے ''پائنیر'' میں نواب فتح نواز جنگ مولوی مہدی حسن کا ایک مکتوب شائع ہوا جس کا عنوان ''مسلمان اور کانگریس'' تھا۔ انھوں نے اس مکتوب میں مسلمانوں کو یہ احساس دلانے کی کوشش کی کہ سرسید کانگریس سے اس لیے الگ تھلگ نہیں تھے کہ مسلمان ہاتھ پہ ہاتھ دھر کے بیٹھ جائیں

بلکہ اس کا مقصد یہ تھا کہ اپنی ضروریات اور مطالبات جداگانہ طور پر انگریز حکومت کے سامنے پیش کریں۔ اب سرسید کے پائے کا کوئی شخص تو ہمارے درمیان نہیں جو تن تنہا یہ فریضہ انجام دے سکے، لہٰذا ضرورت اس امر کی ہے کہ ایک ایسی سیاسی جماعت قائم کی جائے جو حکومت کے سامنے مسلمانوں کی ضروریات و مطالبات پیش کر سکے۔ نواب محسن الملک تو اینٹونی میکڈونلڈ کے عتاب کی وجہ سے اس قدر سہمے ہوئے تھے کہ انھوں نے مولوی مہدی حسن کی رائے سے اختلاف کیا لیکن نواب وقار الملک نے جواب دیتے ہوئے کہا کہ مسلمانوں کو کانگریس سے الگ رکھنا ضروری ہے تو مسلمانوں کو ایک سیاسی جماعت ضرور بنا لینی چاہیے۔ علی گڑھ کالج کے پرنسپل مسٹر ماریسن نے ''انسٹی ٹیوٹ گزٹ'' اگست ۱۹۰۱ء میں اس حوالے سے ایک مضمون لکھا جس میں مسلمانوں کو اس ''خودکشی'' سے باز رہنے کی تلقین کی۔ محسن الملک کو متذبذب اور متامل دیکھ کر وقار الملک نے ۲۲ اکتوبر ۱۹۰۱ء کو ایک جلسہ حامد علی خان کی کوٹھی پر منعقد کیا۔ اس جلسے میں انھوں نے ''محمڈن پولیٹیکل آرگنائزیشن'' کے قیام کی تجویز پیش کی۔ اس طرح مسلمانوں کی پہلی سیاسی جماعت وجود میں آ گئی۔ نواب وقار الملک اپنی پیرانہ سالی کے باوجود سرگرمی سے مختلف شہروں کے دورے کرتے اور اس جماعت کی شاخیں قائم کرتے۔ یہ زمانہ لارڈ کرزن کا زمانہ تھا۔ نواب محسن الملک اس آرگنائزیشن میں سرگرم حصہ تو نہیں رہتے تھے لیکن ایک رکن کی حیثیت سے اس میں شریک تھے[۳۵]۔

اب مسلم انڈیا کی تاریخ سیاست ملی ایک نہایت اہم اور عہد آفرین دور میں داخل ہو رہی ہے۔ ۱۹۰۴ء کو کانگریس کے سالانہ جلسے منعقدہ بمبئی میں مندوبین کی تعداد ایک ہزار سے زیادہ تھی جس کی صدارت سر ہنری کاٹن کر رہے تھے۔ وہ اپنی صدارتی تقریر میں ''ایک قوم'' کا نعرہ زور وشور سے بلند کر رہے تھے جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ مسلمان چاہیں یا نہ چاہیں، کانگریس میں شریک ہوں یا نہ ہوں، انھیں ہندوستان کی قومیت متحدہ سے نکلنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ انجام کار انھیں اکثریت کی حکومت تسلیم کرنا پڑے گی۔ اس اجلاس میں جو تجاویز منظور ہوئیں ان میں سب سے زیادہ اہم اور معنی خیز تجویز بنگال کے بارے میں تھی۔ لارڈ کرزن کی اسکیم کے مطابق بنگال کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا لیکن ہندو جو پورے ہندوستان میں تقریباً تین چوتھائی اکثریت میں تھے، مسلمانوں کی اکثریت کا صوبہ برداشت نہ کر سکے۔ اس فیصلے کے نافذ ہونے کے بعد پورے ہندوستان خصوصاً بنگال میں آگ بھڑک اٹھی۔ ہنگامے شروع ہو گئے، ہندوؤں نے بنگالی مسلمانوں پر اپنی اکثریت برقرار رکھنے کے لیے ہنگامۂ قیامت برپا رکھا۔ دہشت پسند اور انارکسٹ نمودار ہوئے۔ وہ امن شکن، باغی اور انقلابی کہلائے۔ لارڈ کرزن نے بھی شورش کے سامنے جھکنے سے انکار کر دیا[۳۶]۔ ان تمام واقعات کی تفصیل ''تقسیم و تنسیخ بنگال'' والے باب میں بیان کی جا چکی ہے۔ بدیشی مال کے بائیکاٹ کی تحریک بھی اسی زمانے میں ہوئی۔ مولانا حسرت موہانی نے علی گڑھ میں اسی زمانے میں کھدر بھنڈار بھی کھول لیا۔ بہر حال اس تماشے نے انگریزوں کو یہ سوچنے پر ضرور مجبور کر دیا کہ انھوں نے جس سانپ کو دودھ پلا کر پالا ہے اب وہ اسے ڈسنے کے درپے ہے۔ مسلمان اس تقسیم سے خوش تھے۔ اب انگریز بھی مسلمانوں کو تھپک تھپک کر ہندوؤں کے مقابلے پر لانا چاہتے تھے۔ اس پس منظر میں ۱۹۰۶ء میں مسلم اکابرین کا ایک اجلاس ڈھاکا میں منعقد ہوا۔ تقسیم بنگال کے خلاف ایجی ٹیشن کو دیکھ کر نواب محسن الملک نے ہی یہ قدم اٹھایا کہ مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت کے لیے کچھ کیا جائے۔ ۱۵ اور ۱۶ ستمبر ۱۹۰۶ء کو لکھنؤ کا جلسہ اور وائسرائے سے ملاقات کے لیے وفد کی تشکیل، یکم اکتوبر ۱۹۰۶ء کو سر آغا خان کی سرکردگی میں وفد کی شملہ میں لارڈ منٹو سے ملاقات جس میں یہ مطالبہ کہ نیابتی نظامت کا طریقہ ایسا ہو کہ مسلمانوں کو یہ حق حاصل ہو جائے کہ وہ مخصوص حلقوں میں اپنے نمائندے منتخب کر سکیں۔ تاریخی اور سیاسی حیثیت کے لحاظ سے آبادی کے تناسب سے زیادہ نشستوں کا حصول، گزیٹڈ اور نان گزیٹڈ

ملازمتوں میں حصہ، یونی ورسٹی کے سینڈ یکیٹ میں مسلمانوں کی نمائندگی، مسلم یونی ورسٹی کے قیام کے لیے حکومتی امداد وغیرہ جیسے مطالبات سے خود لارڈ منٹو نے بھی کسی حد تک اتفاق کیا۔ اس ملاقات کے بعد اراکین نے شملے ہی میں ایک سیاسی انجمن کے قیام کے معاملے پر گفتگو کی۔ سر سلیم اللہ نواب آف ڈھاکا نے آل انڈیا کانفیڈریسی کے متعلق اپنے نوٹ شائع کیے۔ ۳۰ دسمبر کو ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس منعقدہ ۳۰ دسمبر ۱۹۰۶ء کو بہ صدارت نواب وقارالملک ایک سیاسی جلسہ ہوا۔ اس جلسے میں نواب محسن الملک اور نواب وقارالملک کو اس جماعت کا جوائنٹ سیکریٹری مقرر کیا گیا۔ جماعت کے دستور وضع کرنے کے لیے ۶۰ ارکان کی کمیٹی قائم ہوئی۔ اس طرح مسلمانوں کی نمائندہ جماعت کا قیام عمل میں آ گیا۔ اس جماعت کے قیام اور بانیوں میں نہ کوئی ہیوم تھا اور نہ ویڈر برن، مسلم لیگ کی تاسیس کا خیال خود مسلم رہنماؤں کے دل میں پیدا ہوا۔ نہ تو ان رہنماؤں میں سے کوئی مشورے کے لیے انگلستان گیا، نہ کسی لارڈ رپن، ڈلہوزی یا جان برائیٹ سے مشورے ہوئے۔ مسلم لیگ کا پہلا اجلاس ۲۹، ۳۰ دسمبر ۱۹۰۷ء کو کراچی میں منعقد ہوا۔ اجلاس کے صدر سر آدم جی پیر بھائی تھے۔ اکتوبر ۱۹۰۷ء میں محسن الملک کا انتقال ہو گیا۔ نواب وقارالملک آنریری سیکریٹری مقرر ہوئے۔ ان دونوں کی نشستوں پر میجر سید حسین بلگرامی کو سیکریٹری اور سر آغا خان کو صدر مقرر کر دیا گیا۔ اسی اجلاس میں مختلف صوبوں میں مسلم لیگ کی شاخوں کی منظوری بھی دی گئی۔ اس نئی سیاسی جماعت نے زور و شور کے ساتھ جداگانہ طرزِ انتخاب کا مطالبے پر زور دیا۔ مسلمان رہنماؤں کے خیال میں ہندو مسلم مفاہمت اور دوستی کی واحد تدبیر جداگانہ طرزِ انتخاب تھے لیکن اب اس مطالبے پر تیزی سے عداوت بھی بڑھتی جا رہی تھی۔ دراصل مسلمانوں کے اس مطالبے میں مشکل اس لیے بھی پیش آ رہی تھی کہ خود انگریزوں کے مزاج میں جدت نہیں تھی۔ وقارالملک نے اس موضوع پر متعدد مضامین لکھے۔ دو ایک منصف مزاج ہندو رہنماؤں نے اس مسئلے کو سمجھا اور تائید بھی کی۔ ایس۔ پی سہنا جو بعد میں لارڈ سہنا ہوئے اور مسٹر گھوکھلے وغیرہ نے افہام و تفہیم کی کوششیں بھی کیں، لیکن بے سود۔ بہر حال اب مسلم لیگ کو اپنے مطالبات میں کسی حد تک کامیابی ملنے لگی۔ اکتوبر ۱۹۰۸ء میں وزیرِ ہند کی خدمت میں جو مراسلہ بھیجا گیا اس میں جداگانہ حقِ انتخاب کے اصول کی تائید کی گئی۔ حکومت برطانیہ کے نائب وزیر نے اعلان بھی کیا۔ منٹو مارلے اسکیم کی بنیاد اسی حقیقت پر تھی کہ ہندوستان کی آبادی بہت سی نسلوں، گروہوں، طبقوں اور مذہبی جماعتوں پر مشتمل ہے لہٰذا ان گروہوں کی نیابت ہونی چاہیے۔ اسی طرح نئے اصول و ضوابط وضع ہوئے۔ اسکیم کے تحت مرکزی کونسل میں ۵ مسلم نشستیں، مدراس، بمبئی، بنگال، اڑیسا، بنگال اور صوبہ جات متحدہ کی جانب سے ایک ایک نمائندہ جداگانہ انتخاب پر مبنی ہوگا۔ پنجاب سے ممبر کی نامزدگی کا اختیار گورنر جنرل کو دیا گیا۔ سات ایگزیکٹو ممبروں کے علاوہ مجموعی طور پر ۶۰ اضافی ارکان رکھے گئے۔ یہ اسکیم اصلاحات کی پہلی قسط تھی۔ ہندو اس سے سخت ناخوش تھے۔ ان کے مطابق اس اسکیم میں مسلمانوں کے ساتھ زیادہ رعایت برتی گئی۔ حالاں کہ صوبائی سطح پر مسلمانوں کو اتنی بھی نشستیں نہیں دی گئی تھیں جتنی کہ ان کی آبادی تھی[۳۶]۔

اپنے قیام کے ابتدائی پانچ برس مسلم لیگ مختلف شہروں میں سالانہ اجلاس منعقد کرتی رہی۔ لیکن اس کی رکنیت تعلیم یافتہ معززین تک محدود تھی۔ ان اجلاسوں میں سیاسی مسائل پر قراردادوں کی منظوری کے علاوہ کبھی کبھی مسلمانوں کی حق تلفیوں پر احتجاج بھی ہوتے۔ سیاسی جماعت کا صدر دفتر لکھنؤ منتقل ہونے کے بعد ہندو اکابر سے مفاہمت کی بازگشت بھی سنائی دیتی۔ اس عرصے میں بعض نئے اخبارات اور مجلّے شائع ہوئے جس میں مسلم لیگ کی مخالفت بھی ہوئی۔ ان اخبارات میں اوّلیت ''مسلم گزٹ'' لکھنؤ کو حاصل ہے جسے مولوی وحیدالدین سلیم نے جاری کیا۔ وہ سر سید کے علمی مددگار اور ''انسٹی ٹیوٹ گزٹ'' کے نائب مدیر بھی رہے تھے۔ ایک اور رسالہ

''معارف''، ''تہذیب الاخلاق'' کی بازگشت پر نکالا گیا۔علی گڑھ والے گزٹ کی مثال سامنے رکھ کر ''مسلم گزٹ'' جاری ہوا۔ یہ تمام لوگ سرسید کے جانشینوں سے خوش نہیں تھے۔اسی دوران اخبار ''زمیندار'' کی ادارت مولانا ظفرعلی خان کو ملی۔ پھر ''الہلال'' مولانا ابو الکلام آزاد کی ادارت میں نکلا۔ بعد میں نیا جریدہ '' کامریڈ''اوراس کا اردو رفیق روزنامہ ''ہمدرد'' دہلی سے شائع ہوا جو مولانا محمد علی جوہر کی ادارت میں نکلا[۳۷]۔ان رسائل وجرائداوراخبارات میں لیگی مخالفت اپنے عروج پر دکھائی دیتی ہے۔اب مسلم لیگ کے لیے دومختلف محاذ پر ردعمل ضروری ہو گیا۔ایک جانب کانگریس اور ہندوقوم پرست مکتب فکراور دوسری جانب وہ مسلمان جومتحدہ ہندوستان کے داعی تھے۔ منٹو مارلے اصلاحات نے جوکشیدگی پیدا کی تھی،سرولیم ویڈربرن کی ہدایت پراس کورفع کرنے کے لیے پہلی بار ۱۹۱۰ء میں مسلم لیگ اور کانگریس کا مشترکہ اجلاس منعقد ہوا۔اس زمانے میں قائداعظم کو یہ خیال بہت عزیز تھا کہ دونوں قومیں کسی ایک مطمح نظر پر متحد ہو جائیں۔ وہ اس کوشش میں سرگرم رہے۔اس طرح کے اجلاس بعد میں بھی ہوتے رہے جہاں قائداعظم کی تجاویزاور مشوروں کو اہمیت حاصل رہی۔ بعد میں لکھنؤ پیکٹ کے تحت پنجاب کی صوبائی کونسلوں میں ۵۰ فی صد، یو۔ پی۔ میں ۳۰ فی صد، بہار میں ۳۵ فی صد، بنگال میں ۳۰ فی صد اور سی۔ پی۔ مدراس وغیرہ میں ۱۵/۱۵ فی صدنمائندگی کا فیصلہ قائداعظم کی جانب سے بدگمان فریقین کے درمیان معاملات کوسلجھانے کی عمدہ کوشش تھی[۳۸]۔۱۹۰۷ء سے ۱۹۱۳ء تک کا دورزمانی اعتبار سے طویل نہ ہونے کے باوجود سیاسی اعتبار سے بڑی اہمیت کا حامل تھا۔اسی دور میں تعلیم جدید کی وجہ سے ہندومسلم اختلافات کی خلیج مزید بڑھ گئی۔صلح کانفرنس میں مسائل کا حل تلاش کرنے کی کوششیں بھی ہوئیں لیکن اس کانفرنس کی ناکامی کی سب سے بڑی وجہ بھی متحدہ قومیت کے تصور سے ہندوزعما کا دست بردار نا ہونا تھا۔جداگانہ انتخاب،گاؤ کشی،ملازمتوں میں مسلمانوں کا حصہ،اردو ہندی کش مکش وغیرہ جیسے معاملات بھی اس خلیج کومزید بڑھاوا دے رہے تھے۔تنسیخ بنگال میں مسلمانوں میں مزید بے چینی پیدا کر دی تھی۔اس صورت حال میں ۱۹۱۳ء میں مسلم لیگ نے ایک انقلابی قدم اٹھاتے ہوئے حکومت خود اختیاری کواپنا نصب العین بنالیا۔مسٹر بھوپندر ناتھ باسو نے کانگریس کے کھلے اجلاس میں لیگ کے اس اقدام کوخراج تحسین پیش کیا۔جس سے کانگریس رہنماؤں کی انا کوٹھیس پہنچی[۳۹]۔اس کے بعد کے دو تین عشروں میں پیش آنے والے واقعات نے ہندوستانی سیاست کے پورے منظرنامے کو بدل کر رکھ دیا۔ جنگ عظیم اوّل ودوم،جلیان والا باغ کا سانحہ اورقحط بنگال جیسے موضوعات کا پچھلے ابواب میں تفصیلی جائزہ پیش کیا جا چکا ہے جس سے صورت حال کوسمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ جنگ عظیم اوّل کی آگ بجھی تو اس کا دھواں بہت دیر تک پھیلا رہا۔ ممالک ہند کے اگلے چار برس ہنگامہ خیز اور پُرآشوب گزرے۔ایک ہجوم ایسے ہنگاموں کا دکھائی دیتا ہے جس کا ہر ہنگامہ ہیجان خیز واقعات کا مجموعہ تھا۔اس جنگ میں برطانیہ کودس کروڑ پونڈ نذر کرنے کے علاوہ دوارب تیس کروڑ روپے حکومت ہند نے قرض لے کرخرچ کیے اورفوجوں کے مصارف سمندر پار بھیجے۔اس اقدام سے ملک کے غریب طبقوں میں فاقے کشی کی نوبت آ گئی۔مسز اینی بسنٹ کو ہوم رول کا مطالبہ کرنے کی پاداش میں نظر بند کر دیا گیا۔ جنگ کے خاتمے کے بعد علی برادران،مولانا محمودالحسن اور دوسرے سیاسی قیدیوں کو رہائی ملی۔سلطنت عثمانیہ کی تباہی سے مسلمانوں میں کہرام مچا، ۱۹۱۹ء کی رولٹ ایکٹ، جنرل ڈائر کے آمرانہ اقدامات،ترک موالات وغیرہ نے ہندوستان کی سیاست میں ہیجان پیدا کر رکھا تھا۔فرقہ واری فسادات کے انسداد اور سیاسی اتحاد کے لیے بھی اجتماعات منعقد ہوئے لیکن خاطرخواہ نتائج برآمد نہ ہونے۔انھیں ایام میں مسلم نیشنلسٹ،مجلس احرار،خدائی خدمت گار وغیرہ نے پنجاب،سرحد وغیرہ میں کوششیں تیز کر دیں۔خان عبدالغفار خان سرحدی گاندھی کہلائے۔۱۹۳۰ء سے خاک سارتحریک شروع ہوئی جو پنجاب اور سرحد کی حدود

سے نکل کر دکن کے ملکوں تک پھیلی۔عنایت اللہ مشرقی نے خلق خدا کی خدمت کو اپنا شعار بنائے رکھا۔۱۹۳۵ء میں آئینی اصلاحات کا آغاز ہوا۔ترکِ موالات کی تحریک اس وقت تک رُک گئی تھی اور ہندو مسلم اتحاد کا خواب پارہ پارہ ہو کر نفاق اور عناد میں بدل چکا تھا۔ حالات کی تحقیق اور سدھار کے لیے نئی سیاسی تجاویز کے ساتھ ایک جماعت مامورین بھیجی گئی جو سائمن کمیشن کے نام سے مشہور ہوئی۔ ۱۹۲۸ء میں اس کمیشن کے وقت ملک کا مزاج اس قدر چڑچڑا ہو رہا تھا کہ کانگریس کے ساتھ ساتھ مسلم لیگ نے بھی اس پر تبرا بھیجا۔کمیشن جہاں جہاں گیا ہڑتالیں، ہنگامے اور کالی جھنڈیوں سے اس کا استقبال ہوا۔مسلم لیگ نے بھی اپنی تجاویز اس کمیشن کو پیش کر دیں [۴۰]۔

۱۹۳۵ء تا ۱۹۴۷ء کا دور برِعظیم کی تاریخ کا انتہائی ہنگامہ خیز اور سیاسی اعتبار سے فیصلہ کن دور تھا۔تحریک خلافت اور تحریک عدم تعاون میں بے مثال یک جہتی کا مظاہرہ کرنے کے باوجود دونوں ہندو اور مسلمان باہمی رنجشوں اور نفرتوں کا شکار ہو چکے تھے۔ثالثی کی تمام کوششوں کے باوجود بغض وعناد اور تعصب میں بے پناہ اضافہ ہوا۔سائمن کمیشن کے بعد ۳۱۔۱۹۳۰ء میں ہونے والی گول میز کانفرنس منعقدہ لندن بھی بے نتیجہ رہیں۔ ہندو رہنما فرقہ واریت کو ملک کا اندرونی مسئلہ قرار دے کر کامل آزادی کا مطالبہ کر رہے تھے جب کہ مسلمان اس سے قبل اپنے سیاسی مستقبل کے تحفظ کی ضمانت چاہتے تھے۔تعلیمی اداروں میں گاندھی کی مورتی کو پرنام لازمی کرنا، بندے ماترم کو قومی ترانہ قرار دینا، نصابی کتب ہندوؤں کے نقطۂ نظر سے تیار کرنا جیسے اقدامات نے مسلمانوں کے اندر مزید فکر مندی پیدا کر دی تھی۔کانگریس نے اپنے عمل سے ثابت کر دیا تھا کہ ان کے پاس مسلمانوں کو دینے کے لیے کچھ نہیں ہے [۴۱]۔۱۹۳۵ء کے قانون کے نفاذ کے وقت مسلم لیگ سمیت ہندوستان کی مسلم اکثریت قائداعظم کی قیادت میں متحد ہو چکے تھے۔ان کی قیادت میں لیگ نے نئے سرے سے جدوجہد کا آغاز کیا۔لیگ کی بڑھتی قوت ومقبولیت سے اب انکار ممکن نہیں رہا تھا۔''پاکستان'' خواب وخیال کے بہ جائے واقعی آزادی ہند کا ایک سیاسی حل نظر آنے لگا تھا [۴۲]۔مگر ہندو اس بات کو اتنی آسانی سے کیسے قبول کر سکتے تھے۔انھوں نے شہر شہر قریہ قریہ مسلمانوں کے قتل عام سے اپنے غصے کی آگ بجھائی۔ ہندوستان کی تاریخ میں ایسے فسادات کبھی رونما نہیں ہوئے جیسا کہ اس دور میں ہوئے۔ برطانوی دستاویزات اور ان کے عہد میں بھی ایسے فسادات کا ذکر ملتا ہے جن میں کافی زیادہ جانی و مالی نقصان ہوا۔لیکن حالیہ جھگڑوں کا موازنہ ان بلووں سے نہیں کیا جا سکتا۔ برطانوی ریکارڈ کے مطابق اس قسم کا پہلا بلوا بنارس میں ہوا۔ جہاں ہندو کافی طاقت ور تھے۔ یہ بلوا ۱۸۰۹ء میں ہوا جس میں کئی سو افراد قتل ہوئے اور تقریباً ۵۰ مساجد کو نذر آتش کیا گیا۔کوپ لینڈ کے مطابق یہ بلوا عالم گیر اوّل کے زمانے میں اس فعل کا انتقام تھا کہ اس نے ہندوؤں کی نہایت متبرک زمین پر سو برس قبل مسجد تعمیر کی تھی۔اس کے بعد ۱۸۷۱ اور ۱۸۷۲ء کے بلوے بھی کافی نقصان دہ تھے۔ لاہور اور کرنال کے بلوے بڑے سخت تھے جو ۱۸۸۵ء میں ہوئے۔ پھر دہلی میں ۱۸۸۶ء اور ڈیرہ غازی خان میں ۱۸۸۹ء میں بالاکوٹ میں ۱۸۹۱ء اور بمبئی اور یو۔پی۔کے وسیع علاقوں میں ۱۸۸۳ء کے بلووں میں بڑا کشت وخون ہوا۔کوپ لینڈ کے مطابق ۱۸۸۵ء میں کانگریس کی تاسیس ہوئی اور اس کے بعد بھی چھوٹی بڑی جھڑپوں کا سلسلہ جاری رہا۔ ہنگاموں سے بھرپور، پریشانی کا دوسرا دور ۱۹۰۷ء سے ۱۹۱۴ء تک کا ہے۔منٹو مارلے اصلاحات نے فضا میں مزید زہر گھولا۔

متعصب ہندوؤں میں عناد پہلے ہی بھرا ہوا تھا لہٰذا مسلمانوں کی ہر اس تدبیر پر انھیں غصہ آتا جو وہ اپنے بچاؤ کے لیے اختیار کرتے اور اس غصے کا اظہار فساد اور بلوے کی صورت میں ظاہر ہوتا۔ بنگال کی تقسیم کے دوران بھی یہی ڈراما دہرایا گیا [۴۳]۔سامراجی قوتیں اس معاملے میں پوری طرح ہندوؤں کے ساتھ تھیں۔انگریزوں کو جب بھی کسی قسم کی مزاحمت کا سامنا کرنا پڑتا وہ مذہبی منافرت

کے آزمودہ نسخے کو آزماتے ہوئے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان فساد کو ہوا دیتے۔ ۱۹۲۱ء میں جب ۵۰۰ علما کی جانب سے ترک موالات کا فتویٰ جاری ہوا اور لاہور میں ولایتی مال کے بائیکاٹ اور عدم تعاون کی تحریک شروع ہوئی تو سید عابد علی وجدی کے مطابق:

> فرنگی سامراج نے اس دہکتی آگ کو پکڑ کر پہلے آزمایا اور کار آزمودہ نسخہ پایا۔ مشرقی قوموں کو دین و مذہب کے نام پر جتنے فتنے ڈھائے گئے اور فسادات کروائے گئے وہ سامراجی تاریخ کا سیاہ باب ہے[۴۴]۔

لالہ لاجپت رائے نے ہندو سنگھٹن کی تحریک شروع کی تو یہ تحریک بھی مسلمانوں سے لڑنے کے لیے ہی وجود میں آئی۔ ۱۹۲۷ء میں محرم کے موقعے پر بڑا جھگڑا ملتان میں ہوا۔ پھر دہلی، الہٰ آباد، لکھنؤ، ناگ پور، جبل پور، گلبرگہ، شاہ جہاں پور اور کوہاٹ وغیرہ میں بھی شدید ہنگامے پھوٹ پڑے۔ سوامی شردھانند کے قتل سے ان بلووں میں مزید تیزی آئی۔ صرف یو۔ پی۔ میں دس بلوے ہوئے۔ بمبئی میں چھے، پنجاب، سی۔ پی۔ بہار، بنگال اور دلّی میں دو مقامات پر بلوے ہوئے۔ لارڈ آرون نے ۲۹ اگست ۱۹۲۷ء کو اپنی تقریر میں خاص طور پر ان بلووں کا ذکر کیا۔ اس کے نتیجے میں کم از کم دو سو پچاس افراد کو قتل اور ڈھائی ہزار سے زیادہ لوگ زخمی ہوئے۔ ڈاکٹر امبیڈکر نے بھی اپنی تصنیف ''موسومہ پاکستان'' ۱۹۲۰ء تا ۱۹۴۰ء تک ہونے والے بلووں کی تفصیل فراہم کی ہیں۔ ان کے نزدیک یہ بلوے دراصل ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان خانہ جنگی تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ صوبہ بمبئی میں فروری ۱۹۲۹ء تا اپریل ۱۹۳۸ء تک مسلسل ۲۱۰ روز تک ہنگامے رہے۔ ان ہنگاموں میں ۵۶۰ افراد کو قتل کیا گیا اور ۴۵۰۰ سے زیادہ لوگ زخمی ہوئے۔ خان پور میں بھی سیکڑوں افراد قتل کر دیے گئے۔ عموماً ان جھگڑوں اور بلووں کی ابتدا ہندوؤں کی ہٹ دھرمی سے ہوئی۔ خصوصاً نماز مغرب کے وقت ہندوؤں کی گھنٹیاں زور زور سے بجانے اور بھجن وغیرہ گانے پر لڑائیاں شروع ہو جاتیں۔ ہندوؤں کے مذہبی جلوس عین نماز کے وقت مساجد کے سامنے کھڑے ہو کر شور وشغف کرتے۔ باجا بجایا جاتا۔ مسجد سے نمازی نکل کر روکتے ٹوکتے تو فساد برپا ہو جاتا۔ محرم کے جلوس، گاؤ کشی اور رام لیلا کے جلوسوں میں اس طرح کے بلووں کا خطرہ بڑھ جاتا۔ کوہاٹ کے فسادات اس قدر سخت تھے کہ اس کے بعد مولانا شوکت علی اور گاندھی کے درمیان بھی کشیدگی ہوگئی۔ اس موقعے پر ہندو اخبارات نے علی برادران کے خلاف سخت ہرزہ سرائی کی۔ اس بلوے کی جو رپورٹ گاندھی نے مرتب کی اس میں مسلمانوں کو اس کا قصوروار ٹھہرایا تھا جب کہ مولانا شوکت علی یہ الزام قبول کرنے کو تیار نہیں تھے[۴۵]۔ ۳۰۔۱۹۲۹ء میں لاہور کے مقدمے نے ملک کے عوام کو جس طرح متحرک کیا اس کی مثال نہیں ملتی۔ بھگت سنگھ اور اس کے ساتھی سارے ملک کے ہیرو بن گئے۔ جس روز اسمبلی میں بم کا دھما کا ہوا، اس روز سے لے کر بھگت سنگھ، راج گرو اور سکھ دیو کی پھانسی تک، پورے ملک کی توجہ اس مقدمے کی طرف مبذول رہی۔ ملک کے گوشے گوشے میں ان کی جاں بازی کے قصے مشہور تھے۔ بھگت سنگھ کے لیے کئی نظمیں لکھی گئیں۔ سائمن کمیشن کے خلاف ہونے والی ہڑتالوں اور مظاہروں میں پولیس نے لاٹھی چارج اور گولیاں چلا کر لوگوں کو منتشر کیا تھا۔ اس کے ردعمل میں لالہ لجپت رائے کی قیادت میں بھگت سنگھ اور دیگر لوگوں نے بدلہ لینے کی ٹھانی اور اس پولیس افسر کو ہیڈ کوارٹر کے سامنے قتل کر دیا۔ یہ بڑی کامیابی تھی۔ ہندو پُرعزم ہو کر ہتھیار جمع کرنے لگے۔ بم بنانے اور حکومت کے خلاف محاذ شروع کرنے کی سازش کا علم حکومت کو ہو گیا۔ جےئ گوپال اور ہنس راج کے اعتراف جرم کے بعد کارکنوں کی گرفتاری، جولائی ۱۹۲۹ء سے عدالتی کارروائی اور بعد میں لاہور سازش کے مقدمے میں بھگت سنگھ اور ساتھیوں کو پھانسی کی سزا دے دی گئی[۴۶]۔ اس کے بعد پورے ملک میں برطانوی حکومت کے خلاف ملک گیر ہڑتال کی اپیل کی گئی۔ اس زمانے میں فرقہ واریت اور مذہبی جنون میں ٹھہراؤ آ گیا تھا۔ بھگت سنگھ یا دیگر انقلابیوں کے

معاملے میں ہندو مسلم مل کر حکومت کے لیے مشکلات کھڑی کر رہے تھے[47]۔ مولانا ظفر علی خان نے بھی اس زمانے میں بھگت سنگھ کے لیے ''نوشتۂ تقدیر'' اور ''شہیدانِ وطن'' کے عنوان سے دو نظمیں کہیں۔ چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

شہیدانِ وطن کے خونِ ناحق کا جو ست نکلے — تو اس کے ذرے ذرے سے بھگت سنگھ اور دت نکلے

مسلمانوں نے کتنے نوجواں اب تک کیے پیدا — جو آزادی کے گہوارے میں پا کر تربیت نکلے

تواناؤں کے بس میں ہے سراپائے حقارت سے — کروڑوں ناتوانوں کی تمناؤں کو ٹھکرانا

دبا دینا کسی مظلوم کی آہوں کو سینے میں — کسی بے کس کو ساری عمر آنسو خوں کے رلوانا

زوال اس سلطنت کا ٹل نہیں سکتا ہے ٹالے سے — خود اپنی ہی رعایا سے پڑا ہے جس کو ٹکڑانا[48]

پورے ملک میں ہڑتال ہوئی۔ ہندو مسلم سب نے اس ہڑتال کی حمایت کی جس سے انگریز حکومت کی بنیادیں ہل گئیں۔ چناں چہ حکومت نے بدنامِ زمانہ پالیسی ''لڑاؤ اور حکومت کرو'' پر عمل کرتے ہوئے ہندوؤں کو یہ تاثر دیا کہ مسلمان اس ہڑتال میں ان کے ساتھ شریک نہیں ہیں۔ چناں چہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان جو دینی بُعد تھا، وہ رنگ لایا اور برصغیر کی تاریخ کے بدترین فسادات شروع ہو گئے۔ اکثریتی ہندوؤں نے مسلمانوں کو شدید نقصان پہنچایا۔ یہ سلسلہ ۳۰ مارچ ۱۹۳۱ء تک یعنی ایک ہفتے تک جاری رہا۔ اس خونیں واقعے کو کان پور کی سرگزشت میں ایک سیاہ باب کے طور پر یاد کیا جاتا ہے۔ یہ فسادات گویا ہندوستان میں بعد میں ہونے والے فسادات کا پیش خیمہ ثابت ہوئے۔ اس فساد میں ظلم و بربریت کا وہ مظاہرہ ہوا کہ انسانیت لرز اٹھی۔ مرد، عورت اور بچے بے دردی سے تہہ تیغ کیے گئے۔ عبادت گاہیں مسمار کی گئیں۔ املاک تباہ ہوئے۔ ۱۹۳۱ء کے فسادات کی گونج بھی سارے ملک میں سنی گئی۔ ان فسادات نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان خلیج کو اور بڑھا دیا۔ مسلمان محلے اور ہندو محلے الگ الگ ہو گئے[49]۔ ۴۰ کی دہائی میں بھی پورا ہندوستان آگ اور خون کی لپیٹ میں رہا۔ ملک کے کونے کونے میں فساد اور ہنگامے برپا ہوئے۔ مسلم لیگ پہلی بار میدانِ عمل میں آ کر مقبولیت حاصل کر چکی تھی لیکن اس کا ردِعمل ہندوؤں کی جانب سے بڑا شدید آ رہا تھا۔ کہیں ہنگامے، کہیں فساد اور کہیں شورش نے ہر طرف خوف و ہراس کی فضا پیدا کر رکھی تھی۔ حکومتی املاک تباہ کی جا رہی تھیں۔ ڈاک خانے جلانے سے لے کر ریل کی پٹریاں اکھاڑے جانے تک کی کارروائیاں معمول بن چکی تھیں۔ پولیس، تھانوں، کچہریوں اور دیگر سرکاری عمارتوں کو نذرِ آتش کرنے کے واقعات میں اضافہ ہو چکا تھا۔ سرکاری ملازمین پر حملے اور انھیں ہلاک کیا جا رہا تھا۔ حکومت بھی سختی سے جواب دیتے ہوئے عوامی جدوجہد کو کچلنے کے درپے تھی۔ لاٹھی چارج سے لے کر مشین گنوں سے فائر کرنے کی نوبت نے حکومت کی بدحواسی پوری طرح ظاہر کر دی تھی۔ یہ تمام صورت حال کانگریس کی سول نافرمانی کی تحریک کے بعد پیش آئی۔ حکومت نے تین ہفتوں میں یہ شورش فرو کر دی مگر یہ بات واضح تھی کہ حکومت بری طرح بوکھلاہٹ کا شکار ہے۔ کانگریس کا انگریزوں کے خلاف پُرتشدد رویہ تو سمجھ میں آتا تھا لیکن اس کی آڑ میں مسلمان آبادیوں پر حملے اور ان کی املاک کو نقصان پہنچانے کا معاملہ سمجھ سے باہر تھا۔

یہ حملے اتفاق سے نہیں ہوئے تھے بلکہ ۱۹۳۵ء سے ناگ پور میں ہندوؤں کا ایک نظام قائم ہو چکا تھا جس کا نام راشٹریا سیوک سنگھ رکھا گیا تھا۔ اس سنگھ کے تحت اسلحہ استعمال کرنے کی تربیت کے ساتھ ساتھ ہندو نوجوانوں کے دلوں میں مسلمانوں کے خلاف غصہ اور نفرت کے جذبات بھی پیدا کیے جاتے۔ عبوری حکومت قائم ہوتے ہی ہندوستان کے چھوٹے بڑے شہروں میں ہندو نوجوان کثرت

سے راشٹر یا سیوک سنگھ میں بھرتی ہونے لگے۔ وہ غول کے غول صبح کے وقت بستی سے شہروں کے باہر جاتے، لکڑی، تلوار اور خنجر چلانے کی مشق کرتے، عبوری حکومت نے مسلم کش سرگرمیوں پر ان کے خلاف کسی قسم کی پابندی نہیں لگائی۔ نتیجتاً کچھ ہی عرصے میں خاص دہلی کے اندر بھی انفرادی سطح پر مسلمانوں پر قاتلانہ حملے ہونا شروع ہو گئے۔ عبوری دور میں کانگریس کی بھی یہی پالیسی دیکھنے میں آئی کہ مسلمانوں کے تحفظ سے متعلق جو بھی امور ہوتے، وہ اس سے اختلاف کرتی۔ طویل گفت وشنید، حکومت، وزارت غرض ہر معاملے میں اس کا رویہ مسلم دشمنی پر مبنی ہوتا۔ ایسے میں ۲۰ فروری ۱۹۴۷ء کو وزیر اعظم برطانیہ مسٹر ایٹلی نے دار العوام میں یہ بیان دیا کہ انھوں نے ۱۵ مارچ ۱۹۴۶ء کو واضح اعلان کر دیا تھا کہ اب یہ ہندوستانیوں کا کام ہے کہ اپنے لیے وہ کون سا دستور پسند کرتے ہیں۔ وقت آ گیا ہے کہ ہندوستان میں حکومت کی ذمے داری ہندوستانیوں کو منتقل کر دی جائے۔ مگر اس وقت بدقسمتی سے دستور منظور کرنے کا کوئی ساماں نظر نہیں آتا۔ ظاہری بات ہے کہ جنگ عظیم دوم میں برطانیہ کی فتح کے باوجود وہ اندر سے بالکل کھوکھلا ہو چکا تھا۔ اس کی اقتصادی حالت بالکل تباہ ہو چکی تھی۔ مردوں کی تعداد اس قدر کم ہو چکی تھی کہ وہ سلطنت میں برطانوی فوج تک رکھنے کے قابل نہ رہے تھے۔ ہندوستانی فوج میں بھی چوں کہ سبھاش چندر بوس کی تحریک کا اثر بڑھتا جا رہا تھا لہٰذا برطانوی فوج کو توقع نہیں رہی تھی کہ یہ فوج سلطنت کے مفاد کو ترجیح دے گی [۵۰]۔ ان حالات میں اندرونی خانہ جنگی نے ان کی بوکھلاہٹ میں اور بھی اضافہ کر دیا تھا۔ تقسیم ہند کے وقت ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان خونیں فسادات نے کئی نسلوں سے ایک دوسرے کے ساتھ رہنے والے ہندو، مسلمان اور سکھ کو عجیب ذہنی کوفت میں مبتلا کر رکھا تھا۔ ان لوگوں کو تقسیم کے وقت راتوں رات اپنا سب کچھ چھوڑ کر سرحد پار جانا پڑا۔ کئی لاکھ افراد ہجرت پر مجبور ہوئے۔ سرحد کے دونوں اطراف فسادات کی وہ آگ بھڑکی کہ اس پر قابو پانا کسی کے بس کی بات نہ رہی۔ ان فسادات میں مرنے والوں کی تعداد ۲۰ لاکھ تک بتائی جاتی ہے۔ جب کہ ایک کروڑ سے زیادہ لوگ اس تقسیم کی وجہ سے ہجرت پر مجبور ہوئے [۵۱]۔ حالاں کہ قائد اعظم اور گاندھی نے ۱۹۳۸ء میں بھی اس مذہبی کشیدگی کو کم کرنے کے لیے اور کشیدگی کا حل نکالنے کے لیے بات چیت کے کئی دور کیے لیکن سب کے سب بے نتیجہ رہے۔ ۱۹۴۰ء میں لاہور کی قرارداد دراصل اس تقسیم کا اہم پڑاؤ تھا۔ ۱۹۴۶ء میں مسلم لیگ کی جانب سے کابینہ مشن سے خود کو الگ کیے جانے اور راست اقدام کے مطالبے کے بعد ملک بھر میں ہندو مسلم فسادات کی ایسی بھیانک آگ بھڑکی کہ اس نے ہزاروں لاکھوں لوگوں کو نگل لیا۔ سب سے بڑی آگ اس دور میں کلکتے میں بھڑکی۔ ۱۶ سے ۱۸ اگست کے درمیان ''گریٹ کلکتے کلنگز'' کے نام سے یاد کیے جانے والے اس واقعے میں تقریباً چار ہزار لوگ مارے گئے، ہزاروں زخمی ہوئے، تقریباً ایک لاکھ کے قریب بے گھر ہوئے اور بعد میں تشدد کی یہ لہر مشرقی بنگال کے ضلع نواکھلی اور بہار تک پھیل گئی جس میں تقریباً سات ہزار مسلمان لقمۂ اجل بنے [۵۲]۔

کلکتے کے فسادات کی آگ ابھی پوری طرح بجھ بھی نہ پائی تھی کہ اس کے اثر سے مشرقی بنگال کے نواکھلی اور تری پورا اضلاع میں فساد پھوٹ پڑے۔ کلکتے میں سارا نقصان یک طرفہ طور پر ہندوؤں کو اٹھانا پڑا تھا۔ مسلم بلوائیوں نے سیکڑوں ہندوؤں کو قتل کیا تھا، ہزاروں مکانات جلا کر خاکستر کر دیے تھے۔ بہت بڑے پیمانے پر قتل و غارت گری کے ہول ناک مناظر دیکھنے میں آئے۔ اس زمانے کا بنگالی پریس جو پوری طرح ہندوؤں کے قبضے میں تھا، نے کانگریسی رہنماؤں کے ساتھ مل کر ایک طوفان کھڑا کر دیا۔ مبالغہ آمیز تقریریں اور فسادات کی تصویریں کھینچ کے مسلمانوں کے خلاف خوب اشتعال پیدا کیا گیا۔ بہار کے انگریزی اخبار ''سرچ لائیٹ'' اور ہندی اخبار ''آریاورت'' نے ایسا زہر پھیلایا کہ ہندوؤں کے دلوں میں مسلمانوں کے خلاف آگ سی لگ گئی۔ کرشن ولبھ سہائے، مرلی منوہر پرشاد

اور جگت نرائن لال وغیرہ نے ۲۵ اکتوبر کو نواکھلی منانے کا اعلان کیا۔ چناں چہ اس روز پٹنہ کے محلوں اور سڑکوں پر اشتعال انگیز نعرے گونجتے رہے ''خون کا بدلہ خون سے لیں گے'' کے نعرے لگاتا جلوس گاندھی میدان میں جمع ہوا۔ کرشن ولبھ کی قیادت میں جلسہ منعقد ہوا۔ اشتعال انگیز تقریروں کے دوران ہیشیر دل بہادر رہنما پروفیسر عبدالباری بھی وہاں پہنچ گئے اور روایتی حق گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے مشتعل مجمع کو پھٹکارا۔ انھیں یاد دلایا کہ کانگریسی اہنسا کے پجاری ہیں اور تمام مسائل کا پُر امن طریقے سے حل تلاش کرنے کے حامی بھی۔ بے قصور شہریوں کے قتل سے مسائل حل نہیں ہوں گے لیکن اس مسئلے کا پُر امن حل نہ نکل سکا۔ ۲۶ اکتوبر سے بہار میں بدترین فساد پھوٹ پڑے۔ کئی مسلمان زخمی اور کئی دکانوں اور مکانوں کو لوٹا گیا مسلم لیگی رہنما فخرالدین رازی کو بھی زخمی کر دیا گیا۔ اگلے ہی روز چھپرا کے مضافات میں مسلمان بستیوں پر حملے ہوئے۔ ڈاکٹر سید محمود اور وزیر اعلیٰ شری کرشن سنہا نے متاثرہ علاقوں کا دورہ کر کے فساد روکنے کی کوشش کی۔ شمالی بہار تو کسی طرح سے ان فسادات سے محفوظ رہا لیکن جنوبی بہار میں اتنا بڑا طوفان اور فساد برپا ہوا کہ پورا ضلع پٹنہ، گیا، جہان آباد، سب ڈوژن مونگیر وغیرہ شعلہ زار بن گئے۔ ۲۸ اکتوبر کو بھاگل پور میں بھی فساد پھوٹ پڑے اور یہاں سے موت کا یہ کھیل بانکا سب ڈوژن اور سنتھال پرگنہ کے سرحدی علاقوں تک پھیل گیا۔ اس دوران تقریباً دس روز تک حکومت کا کاروبار ٹھپ اور مکمل سامراجیت کا راج رہا۔ سیکڑوں بستیوں کو خاک میں ملایا گیا۔ عورتوں، بوڑھوں اور بچوں تک کو قتل کیا گیا۔ اس وقت کے غیر مصدقہ اعداد و شمار کے مطابق تیس ہزار مسلمان ان فسادات میں شہید کر دیے گئے[۵۳]۔ ان ہی فسادات کو دیکھ کر مولانا تمنا عمادی نے خدائے لم یزل کو پکارتے ہوئے کہا کہ:

گر تری راہ میں مرے نہ سہی　　　پر ترے نام پر کٹے ہیں ضرور[۵۴]

فرقہ وارانہ فساد کا اصل نشانہ مسلمانوں کا علمی وثقافتی مرکز مگدھ تھا۔ عبوری حکومت کے وزرا نے پنڈت نہرو، لیاقت علی خان، سردار عبدالرب نشتر وغیرہ ۳ نومبر کو پٹنہ پہنچے لیکن فسادات پھر بھی نہ رک سکے۔ خود پنڈت نہرو نے پٹنہ میں بلوائیوں کو حملہ کرتے دیکھا تو مجسٹریٹ کو گولی چلا کر فسادات رکوانے کا حکم دیا۔ ردِّعمل میں ان کے خلاف بھی اس قدر اشتعال پھیلا کہ دوسرے روز مشتعل طلبا نے سینٹ ہال میں انھیں خطاب تک نہیں کرنے دیا۔ جئے پرکاش بابو کی بار بار اپیل کے باوجود مجمعے نے شور و ہنگامہ جاری رکھا۔ اس صورتِ حال پر گاندھی کو یہ بیان جاری کرنا پڑا کہ ۲۴ گھنٹوں کے اندر فسادات نہ رکے تو وہ مرت برت رکھنا شروع کر دیں گے۔ بہار کے ہندوؤں پر انھوں نے سخت لعنت ملامت بھی کی۔ اس بیان کے بعد خدائی خدمت گاروں کی ٹیم خان عبدالغفار کی قیادت میں وہاں پہنچی، خود ان مظالم کو دیکھا، کنویں سے شہدا کی ہڈیاں نکلوا کر انھیں دفن کروایا۔ اس واقعے کا اس قدر منفی اثر پڑا کہ رفقا میں بخت جمال خان نے کانگریس سے استعفیٰ دے دیا۔ مسلم لیگی رہنماؤں میں خواجہ ناظم الدین نے آکر بحالی کی سرگرمیوں میں حصہ لیا[۵۵]۔ جسونت سنگھ کے مطابق دراصل اس زمانے میں بٹوارے کے المیے کا سایہ لہرا رہا تھا۔ نواکھلی بہار وغیرہ میں انسانیت دشمنی کا سلسلہ ردِّعمل کی صورت میں جاری تھا[۵۶]۔ ایک اور تحقیقاتی رپورٹ میں اس سانحے میں مرنے والوں کی تعداد ۵۰ ہزار تک بتائی جاتی ہے۔ مگر قائداعظم نے وائسرائے کو جو خط لکھا اس میں یہ تعداد تیس ہزار ہی درج ہے۔ اس کے علاوہ ڈیڑھ ہزار پناہ گزینوں کے مسائل کا بھی ذکر ہے اور یہ سب کچھ عبوری حکومت کے انتظام و انصرام میں ہوا۔ کانگریس نے بہر حال عوام کے اندر اشتعال بڑھانے میں اپنا کردار ادا کیا۔ ہندو شدت پسندوں کو یہ یقین دلایا گیا کہ ہندوستان میں جلد ہندو راج قائم ہونے جا رہا ہے لہٰذا اب کوئی بھی ان کا بال بھی بیکا نہیں کر سکتا[۵۷]۔ نومبر ۱۹۴۶ء میں دہلی میں

بھی دنگے شروع ہوگئے۔ان دنگوں کوختم کرنے کے لیے کانگریس کمیٹی نے شہری اور دیہی امن کمیٹیاں بنائیں۔اس میں مسلم لیگ والے بھی شامل کیے گئے[۵۸]۔

سیاسیات ہند پر یورش جاپان کا بھی براہ راست اثر پڑا لیکن جاپانیوں کے حملے سے قبل ہٹلر نے بھی انگریزوں کے ہوش اڑا رکھے تھے۔ برطانوی حکومت نے ہٹلر کی یورش سے قبل اگست ۱۹۴۰ء میں ایک اعلان شائع کیا تھا جس کے مطابق خاتمہ جنگ کے بعد تمام متعلقہ ممبران کی مجلس بلا کر دستور سازی کا کام کیا جائے گا تا کہ ہندوستان کا آئین تیار کیا جاسکے۔کانگریس کا سب سے بڑا مطالبہ اور آزادی ہند کا مقدمہ یہی ہے۔اس اعلان میں ریاستوں اور اقلیتوں کے حقوق کی حفاظت کا صریحی اشارہ ملتا ہے۔مسلم لیگ نے اس پر اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا لیکن کانگریس بہت پیچ وتاب کھاتی رہی۔۱۹۴۵ء کے انتخابات صریحاً ''پاکستان'' اور ''اکھنڈ بھارت'' کے مسئلے پر لڑے گئے۔لہٰذا اکثر غیر مسلم گروہوں کے لشکر لیگ کے خلاف صف آرا ہوئے۔مسلمانوں کی کل تیس نشستوں میں سے سب کی سب مسلم لیگ نے جیت لیں۔یہ متحدہ قومیت کے تابوت پر آخری کیل تھی۔اس کے بعد جگہ جگہ فرقہ وارانہ فساد بھڑک اٹھے۔اس بابت لیگی تحقیقات پر جو کتاب سامنے آئی اس کے مطابق کانگریسی وزارت پر خون وفساد کے ۵۶ الزامات لگائے گئے ہیں۔بنگال و بہار پر ۴۶ء کی برسات گویا خون برسانے آئی تھی۔بہار کا قتل عام آرمینیا کی خوں ریزی سے زیادہ بہیمانہ اور ہیبت ناک تھا۔میرٹھ اور مرادآباد اور نواح کے ہزاروں دکان داروں پر ہندوؤں کا لشکر حملہ آور ہوا۔اس کے بعد قصبے کے مسلمانوں پر بھی ٹوٹ پڑا۔صدہا مسلمان ہلاک اور بہو بیٹیوں کی آبروریزی ہوئی۔انگریز در پردہ فریقین کو بھڑکاتے رہے اور باہم لڑا کر خوش ہوتے رہے۔کلکتے اور بمبئی میں چھرے گھونپنے کی مشق جاری رہتی[۵۹]۔تقسیم کی منافرت پورے ملک میں پھیل گئی۔فرقہ وارانہ عصبیت کے سبب دونوں فریقین کے دلوں میں شدید بدگمانیاں پیدا ہوگئیں۔فرقہ وارانہ فسادات کا سلسلہ جاری رہا۔کروڑوں کی املاک تباہ ہوئیں۔ہندوستانی مسلمان خوف وہراس اور عدم تحفظ کے احساس سے دبے رہے۔سرحد کے تعین کے دوران ہم نے جیسی بدعقلی اور بداعمالی دکھائی،اس سے واضح ہوگیا کہ قومی امتیاز پر قومی تفاخر کا جذبہ غالب آچکا ہے۔دونوں فریقین کی شدید دشمنی اور برطانیہ سے اس مطالبے کے بعد کہ وہ ہندمشن کی ناکامی کا باقاعدہ اعلان کرے، ہندوؤں اور سکھوں نے قبول کرنے سے انکار کردیا۔سردار پٹیل نے دھمکی تک دے ڈالی کہ اگر مسلم لیگ نے استعفیٰ نہ دیا تو فرقہ وارانہ فساد بھی ہو سکتے ہیں[۶۱]۔

آخر کار اس انتشار زدہ ماحول میں وزیر اعظم برطانیہ نے جون ۱۹۴۸ء تک ہندستان کی حکومت کا اختیار ہندوستانیوں کو منتقل کرنے کا اعلان کردیا۔دوسری طرف سکھ رہنما تارا سنگھ نے تیس فی صد نیابت نہ ملنے کی صورت میں پنجاب کی تقسیم کی دھمکی دے ڈالی۔مسلم لیگ کی مقبولیت دیکھ کر ہندوؤں اور سکھوں نے فرقہ وارانہ آگ بھڑکا کر شدید مخالفت شروع کی۔سکھوں نے اکالی فوج کے جتھے بھرتی کیے''راشٹریا سیوک سنگھ'' پہلے ہی دہشت پسندانہ سرگرمیوں میں مصروف تھی۔آسام اور دیگر مقامات سے اسلحہ فراہم کیا جارہا تھا۔نیپال سے گورکھے بلائے جانے کا انتظام ہوا۔انھیں ہندوؤں کے گھروں میں دربان، رسوئیوں، ڈرائیوروں کی حیثیت سے رکھ کر ضرورت پڑنے پر جتھا مار گوریلا جنگ میں استعمال کرنے کی کام یاب حکمت عملی وضع کی گئی۔پنجاب میں ۳ ہزار ۲ سو[۶۲] می اور ۸ ہزار راشٹریا سیوک سنگھ کے عارضی ارکان جنگی صلاحیت کے حامل تھے۔جون ۱۹۴۶ء تک سنگھ کے ارکان کی تعداد ۵۹،۴۰۰ تک ہوگئی۔مسلم لیگ کی سخت ایجی ٹیشن سے فروری ۱۹۴۷ء تک یونینسٹ کی حکومت تو ضرور متزلزل ہوگئی لیکن اس معاملے میں تارا سنگھ کا بیان کہ ''مجھے نظر

نہیں آتا کہ ہم خانہ جنگی کو کسی طرح ٹال سکیں، ہم کسی حال میں مسلمانوں پر بھروسا نہیں کر سکتے'' وغیرہ نے ان لوگوں کے ارادوں کو پوری طرح ظاہر کر دیا۔ لہٰذا اس دور میں سکھوں نے تلوار کی طاقت سے فیصلہ کرنے کا عہد کیا۔ اسمبلی کے ہال میں برآمد ہونے والے ۴ مارچ کے جلوس میں تارا سنگھ کی قیادت میں پاکستان مردہ باد، ست سری آکال وغیرہ کے نعرے لگے۔ مسلمانوں کے حواس درست کرنے کا فیصلہ ہو گیا۔ ہندو اور سکھ اخبارات نے مسلمانوں کے خلاف زبردست پروپیگنڈا مہم شروع کر دی۔ لاہور میں مسلم لیگ کے جھنڈے زبردستی ہٹوائے گئے جس کی وجہ سے ہنگامے پھوٹ پڑے۔ ۵ مارچ تک امرتسر، ملتان، گوجراں والا، جالندھر، سیال کوٹ اور راول پنڈی وغیرہ میں خوں ریزی شروع ہو گئی۔ ۷ مارچ کو پورے پنجاب میں خانہ جنگی کا ماحول تھا۔ ۸ مارچ کو ۲۴ گھنٹے کرفیو لگا کر فساد روکنے کی کوشش لیکن ۹ مارچ کو ایک بار پھر امرتسر، ۱۰ مارچ کو فتح جنگ، حسن ابدال، کیمل پور وغیرہ میں بلوے شروع ہو گئے۔ ۱۲ اور ۱۳ مارچ کو منٹگمری اور کیمل پور کی حالت تشویش ناک حد تک خراب رہی۔ ۱۴ تا ۱۷ مارچ تک پنڈت نہرو کا دورہِ پنجاب اور قائداعظم کی طرف سے امن وامان قائم کرنے کی ساری کوششیں رائیگاں گئیں۔ دس روز تک پنجاب میں وحشیانہ جنگ اور فساد کا ماحول برقرار رہا۔ بالآخر ۲۲ مارچ کو لارڈ ماؤنٹ بیٹن وسیع تر اختیارات کے ساتھ دہلی پہنچے۔ قائداعظم اور گاندھی کے ساتھ ملاقاتوں کے بعد ۱۸ مئی کو تقسیم کا مجوزہ پلان لے کر وہ برطانیہ روانہ ہوا اور آخر کار تقسیم کا منصوبہ منظور ہوا[۶۲]۔

اس اعلان کے فوراً بعد بڑے پیمانے پر ایک بار پھر فسادات شروع ہو گئے جس سے ملک کا ہر گوشہ متاثر ہوا۔ ہندوستان میں مسلمانوں کے خلاف نفرت کا رویہ شدید تر ہوتا چلا گیا کیوں کہ مسلمانوں کو ان کا ملک مل چکا تھا اور اب ہندوستان میں مسلمانوں کا رہنے کا جواز باقی نہیں رہا تھا۔ پاکستان کا مطالبہ کرنے والوں نے وقتی اور جذباتی انداز میں مسئلے کا جو حل ڈھونڈا اس سے ہندوستان میں رہنے والی بڑی مسلم آبادی بری طرح متاثر ہوئی[۶۳]۔ ہندو ان مسلم کش فسادات سے کئی طرح کے فوائد حاصل کرنا چاہتے تھے۔ ایک تو وہ مسلمانوں سے پرانے بدلے چکانا چاہتے تھے۔ دوسرا یہ کہ ان پر مسلمانوں کی برتری کا جو قدیم نفسیاتی خوف تھا، اس سے چھٹکارا پانا چاہتے تھے، تیسرا یہ کہ وہ مسلمانوں کو دبا کر اپنی سیاسی فوقیت تسلیم کرانا چاہتے تھے۔ فسادات کے ذریعے انھیں ان تمام باتوں کو عملی جامہ پہنانے کا موقع ملا۔ اس معاملے میں انھوں نے سکھوں کو بھی اپنا ہم نوا بنالیا۔ اکالی لیڈر ماسٹر تارا سنگھ، گیانی کرتار سنگھ وغیرہ نے ہندوؤں کے ساتھ مل کر مشترکہ جارحانہ مہم کا آغاز کیا جس کے باعث دہلی اور مشرقی پنجاب وغیرہ میں مسلمانوں پر قیامت صغریٰ نازل ہوئی۔ ایک اندازے کے مطابق صرف ان علاقوں میں دس لاکھ مسلمان شہید کئے گئے۔ کم از کم پچاس ہزار عورتیں اغوا کی گئیں اور عصمت سے محروم کی گئیں۔ تقریباً تین لاکھ مسلمانوں کو زبردستی تبدیلی مذہب پر مجبور کیا گیا۔ سکھ ریاست پٹیالہ میں مسلمانوں کی آبادی پانچ لاکھ کے قریب تھی جس میں تین سے چار لاکھ کے درمیان مسلمانوں کو شہید کر دیا گیا۔ سفر کرنے والے مسلمانوں کو چن چن کر قتل کیا جاتا، بے گناہ مردوں، بچوں اور بوڑھوں کو گھروں میں زندہ جلایا گیا۔ شیر خوار بچوں کو نیزوں کی نوک پر اُچھالنا، مسلمان مردوں اور عورتوں کے کٹے سروں سے جئے ہند اور پاکستان مردہ باد لکھنا، برہنہ عورتوں کے جلوس نکالنا، سرعام مسلمان عورتوں کی آبروریزی کرنا اور ۱۹۴۷ء میں عیدالفطر کے موقع پر مسلمان خواتین کی کٹی چھاتیوں کے ہار لاہور کے مسلمانوں کو بطور تحفہ بھیجنا، یہ اور اس طرح کے مزید سنگین نوعیت کے واقعات جنھیں سن کے کلیجا کانپتا ہے اور انسانیت شرما جاتی ہے۔ انسان اس طرح سے وحشی درندوں کی سطح سے بھی نیچے گر سکتا ہے، اس بات پر یقین کرنا خاصا مشکل کام ہے۔ اس بات سے انکار نہیں کہ مغربی پنجاب اور کسی حد تک صوبہ سرحد میں مسلمانوں نے ہندوؤں اور سکھوں کی جان و

مال کو بھی نقصان پہنچایا لیکن یہ کارروائیاں کسی منظم مہم کا حصہ نہیں تھیں بلکہ سرحد پار مسلمانوں پر بہیمانہ تشدد کا ردِعمل تھیں۔ الغرض کہ اس زمانے میں مسلمانوں کا خون پانی کی طرح بہایا گیا۔ انسانی شقاوت اور ظلم و جبر کی یہ داستانیں ایسی نہیں کہ فراموش کی جاسکیں[64]۔ تحریک پاکستان کے کارکن اور صحافی سردار علی احمد خاں نے اپنی تصنیف ''ہندوستان سے پاکستان'' میں متعدد کتب سے ان ہولناک واقعات اور پرتشدد مناظر کو یکجا کیا ہے۔ یہ کتاب ان فسادات سے متعلق عمدہ دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔

فرخ امرتسری اپنی تصنیف ''خون کی ہولی'' میں لکھتے ہیں کہ پندرہ اگست کے بعد اگلے دس روز کے واقعات ناقابلِ بیان ہیں۔ نہنگ سکھوں کا امرتسر میں بڑا مرکز ''برج اکالی پھولا سنگھ'' مسلمان مردوں اور عورتوں کے لیے مقتل گاہ بنا رہا۔ اس کے علاوہ امرتسر میں جہاں جہاں مسلم محلے تھے، سکھ دیوانوں کی طرح ان پر ٹوٹ پڑے، مسلمانوں کا قتلِ عام اور املاک لوٹنے کے واقعات عام تھے۔ بازار بکروانان، کوچہ رنگریزاں میں نہایت بے دردی سے مسلم آبادی کو ذبح کر ڈالا گیا۔ لڑکیوں اور عورتوں کے پستان کاٹ کر ہار بنائے گئے، لوگوں کو زندہ جلایا گیا۔ گلی کوچے اور سڑک پر موت کے مناظر عام تھے۔ علاقہ کٹڑا مہان سنگھ میں چاروں طرف لاشیں ہی لاشیں تھیں۔ ۱۷ اگست کو مجسٹریٹ پورن سنگھ مجسٹریٹ کو صوفی غلام محمد ترک نے مسلمانوں پر کیے گئے مظالم گوش گزار کیے تو مجسٹریٹ نے خود حفاظتی دستے کے ساتھ شہر کا دورہ کیا۔ جابجا لاشیں پڑی پائیں، راستے خون سے رنگین، مکانات کھنڈرات میں تبدیل، مسجد کے اندر گیارہ جوان لڑکیوں کی عصمت دری کر کے لاش کی بے حرمتی جیسے دردناک واقعات دیکھنے کو ملے۔ فرخ امرتسری نے یہ بھی لکھا کہ یہ سلسلہ ماہ جولائی سے وسط اکتوبر تک جاری رہا۔ گھات لگا کر مسلمانوں کو قتل کرنا اور راہ گیروں کو نشانہ بنانا عام ہو گیا۔ جو مسافر ریلوے اسٹیشن کی طرف جاتے، یہ لوگ انھیں راستے ہی میں قتل کر ڈالتے۔ ایسے میں ۲۸ اگست ۱۹۴۷ء کو امرتسر شہر مسلمانوں سے خالی ہو گیا۔ اس کے علاوہ رات کے وقت اکالی مسلح جتھے گھوڑوں پر سوار نزدیکی دیہات پر حملہ کرتے، مسلمانوں کے سینے چھیدتے، ان کے گھروں کو آگ لگاتے ہوئے دوسرے گاؤں پہنچ جاتے۔ جب بھی مسلمانوں سے بھری کوئی ٹرین مہاجروں کو لے کر مشرقی پنجاب سے گزرتی تو ٹرین کا ڈرائیور جو کہ اکثر غیر مسلم ہی ہوتے، کسی گھنے جنگل میں ترین روک دیتے اور مسلمانوں کا ڈبوں میں گھس کر قتلِ عام شروع کر دیتے۔ ایسے واقعات امرتسر ریلوے ٹریک، اور دلی بھٹنڈا لائن پر بار بار پیش آئے جن میں ہزاروں مسلمان شہید ہوئے[65]۔ معروف صحافی وقار انبالوی نے خواجہ افتخار کو لکھے گئے ایک مکتوب میں جالندھر کے مسلمانوں پر ڈھائے جانے والے مظالم کا حال بیان کرتے ہوئے لکھا کہ سکھ اور ہندو سرکاری افسران بھی مسلمانوں کے قتلِ عام میں ملوث تھے۔ ڈپٹی کمشنر سکھانند کی بابت انھوں نے لکھا کہ وہ پہلے موقع دیکھ کر اکا دکا مسلمانوں کو قتل کراتا تھا لیکن ۱۸ اگست ۱۹۴۷ء کو بروز عید الفطر کی نماز کے موقع پر جیسے ہی مسلمان سجدہ ریز ہوئے، ہندوؤں اور سکھوں نے گنڈاسوں، تلواروں، برچھیوں اور بندوقوں سے مسلح حملہ کر دیا۔ سیکڑوں مسلمانوں کے سر تن سے جدا کر دیے گئے۔ فرقہ پرست سکھانند نے مسلمانوں عورتوں کو گھروں سے زبردستی گھیر کر عیدہ گاہ میدان میں لایا۔ ان کی چادریں اور برقعے ہی سروں سے نہیں اُتارے بلکہ ان کے لباس تار تار کر کے حکم دیا کہ ان مُردوں کی لاشوں کو عید مبارک کہیں اور قیامِ پاکستان کی خوشی میں رقص کریں۔ ایسی سنگ دلی کی ہندوستان کی تاریخ میں مثال نہیں ملتی[66]۔ ۸۰ ہزار مسلمان دوشیزاؤں کے اغوا اور لاکھوں مسلمانوں کے خون کی ہولی کھیلنے کے باوجود ان کے غضب کی آگ ٹھنڈی نہ ہوئی تو ہندوستان سے لاہور آنے والی ٹرین میں معصوم بچوں کی گردنیں، کٹے ہوئے ہاتھ اور عورتوں کی کٹی ہوئی چھاتیاں ''پاکستانی مسلمانوں کے لیے عید کا تحفہ'' لکھ کر روانہ کیں[67]۔

امرتسر اور گرد و نواح میں مسلمانوں کی نسل کشی کے ایسے ایسے واقعات پیش آئے کہ انھیں بیان کرنے کی طاقت نہ کسی قلم میں ہے اور نہ کسی زبان میں۔ کس نے کتنا ظلم کیا، اس کا کوئی حساب نہیں لیکن ایک اندازے کے مطابق ۱۹۴۷ء سے ۱۹۴۸ء تک ایک کروڑ چالیس لاکھ سکھ، ہندو اور مسلمانوں کو ہجرت کا درد سہنا پڑا۔ ان میں بڑی تعداد مسلمانوں کی تھی۔ گم شدہ بچوں کی تعداد بھی بہت زیادہ تھی۔ ہلاکتوں کی تعداد دس لاکھ سے زیادہ تھی۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ انسانی رشتوں کی پامالی اور اخلاقی نظام کے درہم برہم ہونے کے مناظر نے روح تک کو کچل ڈالا۔ فسادات میں حصہ لینے یا اس کی تحریک دینے والے زیادہ تر پڑوسی یا جان پہچان والے لوگ ہوتے جو کہ اس سے قبل ایک دوسرے کے دکھ درد کے ساتھی تھے۔ آن کی آن میں نظر پھر گئی، رشتے اور قرابت داریاں روند ڈالی گئیں [۶۸]۔ محلے میں خواتین جن کو سب چاچی اور خالہ کہہ کر پکارتے تھے، وہ درد بھرے الفاظ میں سکھ نوجوانوں سے انھیں گودوں میں کھلانے اور لوریاں سنانے کے واسطے دیا کرتیں۔ انھیں یاد دلاتیں کہ وہ ان کی ماں کی سہیلیاں ہیں، لیکن دیرینہ تعلقات کی دہائی ان درندوں پر کسی قسم کا اثر نہ کرتیں [۶۹]۔ جسونت سنگھ چونتروی اور کرشن گوپال ساگر نے ۱۹۴۷ء کے واقعات پر مبنی ایک کتاب موسومہ بہ ''پنجاب کی تاریخ کا خونی ورق''، دسمبر ۱۹۴۸ء میں پٹیالہ سے شائع کی۔ اس کتاب میں بھی منظّم ظلم و بربریت کا تذکرہ سرسری انداز میں کیا گیا ہے۔ اس کے صفحہ نمبر ۱۹۹ سے ۲۰۸ تک میں امرتسر میں ہونے والے فسادات کے بیان میں کہیں کہیں مسلمانوں کی شرانگیزی کو ان فسادات کی وجہ قرار دیا گیا ہے [۷۰]۔ حالاں کہ نہتے مسلمان تو اپنے بچاؤ سے بھی قاصر تھے، وہ کس طرح شرانگیزی کی جرات کر سکتے تھے۔ مسلمان اکابر و امرا، سرکاری عمّال و حکام ان معرکوں سے عموماً الگ رہے۔ تارا، کرتار، اودھم سنگھیوں کی دیوانہ وار فوجی تیاریوں اور سچّر و بھارگو کی صریحی آتش افروزیوں کے جواب میں مسلم لیگ والے فقط امن و آشتی کے وعظ سناتے رہے۔ غرض کہ ابتدائی خانہ جنگی کا سارا بوجھ غیر منظّم امرتسری مسلمانوں کو اٹھانا پڑا۔ ان لوگوں نے اپنے بل بوتے پر ایسی بہادری دکھائی کہ سکھوں کے چھکے چھڑا دیے۔ سکھوں کے بموں اور آتش گیر گولوں کے توڑ میں مسلمانوں نے ایسا مصالحہ تیار کیا جو پتھر کی عمارتوں کو بھی کوئلہ بنا دے۔ یہاں تک کہ لاہور والوں کی طرف سے بھی لڑنے کے لیے امرتسر کے پہلوان ہی میدان میں اترے۔ وسط پنجاب کے اضلاع میں چناب تک مسلمانوں کی تعداد دس بارہ فی صد سے زیادہ تھی۔ سنگھ والوں کا منصوبہ یہ تھا کہ مسلمانوں کے قتل عام اور جبریہ اخراج کے ذریعے اکثریت کو اقلیت میں بدل دیا جائے۔ مہاراجاؤں نے بھی ان سنگھیوں کا ساتھ دیا۔ مہاراجا الور کی ریاست سے مسلمان میووہ کے قتل کا باقاعدہ آغاز ہوا۔ امریکی رسالے ''ٹائمز'' کے نامہ نگار نے ان خونیں مناظر کو خود دیکھ کر رپورٹ لکھی۔

چار ماہ میں ریاست کی ایک تہائی مسلم آبادی جو کہ ڈھائی لاکھ نفوس پر مشتمل تھی، معدوم کر دی گئی۔ معروف وکیل سید اظہر حسین زیدی نے اپنے انگریزی کتابچے ''The New Narcsy'' میں غیر مسلم ماخذوں سے یہ اعداد بتائے ہیں۔ بھرت پور کے راجا بھی نسل کشی میں کسی سے پیچھے نہیں رہے۔ وہاں کی ایک لاکھ دس ہزار مسلم آبادی میں سے غالباً ایک ہزار بھی باقی نہیں بچے۔ سکھ ریاستوں میں بھی چار پانچ ہفتوں کے اندر کئی لاکھ مسلمانوں کا صفایا کر دیا گیا [۷۱]۔ قرب و جوار کے ہزاروں مسلمانوں نے دہلی میں پناہ لے رکھی تھی۔ مختلف شہروں سے ہندو اور سکھ بھی وہاں پہنچے اور اپنے ہم مذہبوں کو مسلمانوں کے خلاف بھڑکانا شروع کر دیا۔ جس کے بعد ۳ ستمبر کو دہلی میں بھی مسلمانوں کے قتل عام کا آغاز ہو گیا۔ جامع مسجد دہلی کے پیش امام مولانا سعید احمد بخاری، دہلی میونسپل کارپوریشن کے صدر خان بہادر حبیب الرحمٰن کے علاوہ سیکڑوں بے گناہ مسلمان، حتیٰ کہ ریلوے اسٹیشن کے درجنوں مسلمان قلیوں کو کلمہ گوئی کی پاداش میں بے دردی

سے شہید کر دیا گیا۔ پرانی دہلی کی گرین مارکیٹ کو نذرِ آتش کر دیا گیا۔ چن چن کر مسلمانوں کو شہید کیا گیا، گھر جلائے گئے، عورتوں کو پٹرول چھڑک کر آگ لگا دی گئی۔ غرض کہ ۴ ستمبر شام تک ہزاروں مسلمان قتل کیے جا چکے تھے[۲]۔ دہلی میں بھی صورت حال یہ ہوگئی کہ ہندوؤں کے محلے سے مسلمان اور مسلمانوں کے محلے سے ہندوؤں کا گزر مخدوش ہو گیا[۳]۔ غرض کہ آزادیِ ہند کے سلسلے کا یہ تلاطم طرح طرح کے مصائب وشدائد، جرائم وخباثت کا اتنا بڑا مجموعہ ہے کہ تمام تفصیلات کا بیان یہاں ممکن نہیں۔ البتہ اس تقسیم کا افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ اس وسیع تبادلے میں طرفین کے کم وبیش ایک کروڑ افراد بے گھر ہوئے۔ ان میں زیادہ تعداد مسلمانوں کی تھی۔ اس تقسیم کے بعد ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ ہندو مسلم فسادات کا خاتمہ ہو جاتا، لیکن ایسا ہو نہ سکا۔ کانگریس والوں کی تحریک پر سندھ، سرحد اور بنگال سے نقل مکانی کرنے والے ہندوؤں کی مبالغہ آمیز تصاویر دکھا کر بھارتی اخبارات نے خوب شور مچایا اور ہندوؤں کی تباہیوں پر دہائیاں دیں۔ ردِعمل میں بھارت کے بے دست وپا مسلمانوں پر حملے ہوئے اور آج بھی یہ سلسلہ کسی نہ کسی شکل میں جاری ہے۔ بھارت میں رہنے والے مسلمانوں کی حالت آج کوئی پوشیدہ راز نہیں۔ کروڑوں مسلمان کو وہاں معاشی اور سماجی استیصال کا شکار بنا کر کسمپرسی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔ اس کے باوجود جنگ وقتال کے نعرے وقتاً فوقتاً لگا دیے جاتے ہیں[۴]۔

اس کی بہت بڑی وجہ تقسیم کی وہ لکیر ہے جس کو کھینچتے وقت دونوں اقوام کے مفادات کا بالکل خیال نہیں رکھا گیا۔ جسونت سنگھ نے تو پنڈت نہرو کی بابت واضح طور پر لکھا کہ وہ مایوس کن حد تک ناقابلِ عمل مفروضوں کے ساتھ کام کر رہے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ سرحد کمیشن کا قیام ممکنہ حد تک کم سے کم مدت میں پورا کر لیا جائے تاکہ اقتدار کی منتقلی جلد سے جلد ہو سکے۔ ان کی ترجیح، سرحد کا قابلِ عمل، تمام جھگڑوں سے پاک اور منصفانہ تقسیم نہیں بلکہ اقتدار کی جلد سے جلد منتقلی تھی۔ انھوں نے قطعاً سوچے سمجھے بغیر یہاں تک کہہ دیا کہ ایک عارضی سرحد بھی چلے گی اور آگے چل کر دونوں فریقین کے ذریعے ان میں باہمی رضامندی سے تبدیلیاں کر لی جائیں گی۔ یہ رویہ دور اندیشی سے اس قدر عاری تھا کہ یقین نہیں آتا۔ فیصلے پر جلد بازی کا رنگ نمایاں ہے۔ بنگال کی تقسیم کی بھی جو لکیر بنائی گئی وہ غیر فطری تھی۔ ان فسادات نے بعض معتدل کانگریسی رہنماؤں کو بھی یہ کہنے پر مجبور کر دیا کہ تقسیم بے گناہ شہریوں کے قتلِ عام سے بہتر تھی۔ اچاریا کرپلانی نے بدترین فسادات میں مسلمانوں کی مظلومیت کا اعتراف کرتے ہوئے کہا کہ اس بدترین تشدد نے انسان کو آدم خور بنا ڈالا۔ انھوں نے ایسا کنواں بھی دیکھا جہاں ۱۰۷ عورتیں اپنی عصمت کی حفاظت کے لیے بچوں سمیت کود کر ہلاک ہوگئیں۔ ایک عبادت گاہ میں ۵۰ نوجوان عورتوں کو ان کے اپنے مردوں نے اسی وجہ سے ہلاک کر ڈالا۔ ایک مکان میں ہڈیوں کے ڈھیر دیکھے۔ یہ ان ۳۰۷ عورتوں کی ہڈیاں تھیں جنھیں بند کر کے زندہ جلا دیا گیا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ انھیں ڈر ہے کہ اگر ہندو اور مسلمان یہی سب کچھ کرتے رہے تو وہ وقت دور نہیں کہ ہم اپنے آپ کو آدم خور سے بھی بدتر بنا لیں[۵]۔

آج ۷۰ برس سے زائد کا عرصہ گزرنے کے باوجود ہندوستان اور پاکستان تقسیم کی منافرت کو ختم نہیں کر پائے۔ پاکستان منتقل ہونے والے مہاجرین آج بھی شکوے کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ ہجرت کا سب سے خوف ناک پہلو یہی ہے کہ تقسیم کے پُرجوش نعرے اور عملی جدوجہد کرنے والے مہاجرین اور ان کی اولاد کے ساتھ آج ان کی اپنی سرزمین میں تیسرے درجے کا سلوک کیا جاتا ہے۔ دوسری جانب ہندوستان میں بھی مسلمانوں کے لیے صورت حال حوصلہ شکن ہے۔ ہندوؤں نے اغوا شدہ عورتوں کو بسانے سے ابتدا ہی میں انکار کیا تو لاتعداد خواتین کو خودکشی کرنا پڑی یا غیر اخلاقی کاموں پر مجبور ہوگئیں[۶]۔ ہندوستانی مسلمانوں کے شہری اور مذہبی حقوق کی پامالی

روز کا معمول ہے۔ اردو کے خلاف باقاعدہ مہم چلائی گئی۔ مسلمانوں کو تعلیم سے دور رکھا جا رہا ہے تاکہ وہ اپنے حقوق کے لیے جدوجہد کے قابل نہ رہیں۔ اقتصادی مسائل میں گھرے مسلمان آج ہندوؤں کی اطاعت اور غلامی ہی کو اپنی قسمت سمجھ بیٹھے ہیں [۷۷]۔

تقسیم اور اس سے جڑے ہوئے ہجرت اور فسادات کے واقعات کی ہولناکی نے سرحد کے دونوں جانب لکھنے والوں کی ایک سے زائد نسلوں کو متاثر کیا۔ منٹو کے ''گنجے فرشتے''، ''ٹوبہ ٹیک سنگھ''، بھیشم ساہنی کا ناول ''تمس''، کرشن چندر کی ''میں تیری بہن آں''، رامانند ساگر کی ''انسان کے شکاری''، عزیز احمد کی ''سات روز کی دلہن''، ابراہیم جلیس کی ''ترنگے کی چھاؤں''، مشکور حسیب یاد کی ''آزادی کے چراغ'' اور اس کے علاوہ متعدد آپ بیتیوں، افسانوں اور ناولوں میں تقسیم کی ہولناکی کو دکھایا گیا ہے۔ اردو شاعری میں بھی اس موضوع نے ایک ہیجان کی فضا پیدا کی اور فسادات اور ہجرت کے مسائل پر شاعری کا اس قدر ذخیرہ نظر عام پر آیا کہ ان سب کی تفصیل بیان کرنے کے لیے ضخیم کتاب بھی ناکافی ہوگی۔ اس بات کو پیش نظر رکھتے ہوئے اگلے صفحات میں ان شعرا کا مختصر جائزہ لیا جائے گا جنھوں نے خاص طور پر تقسیم کے معاملات اور مسائل کو اپنی شاعری میں پیش کیا۔ طفیل ہوشیار پوری نے ان فسادات اور خونیں مناظر کو قلم بند کرتے ہوئے انسانی نفسیات کی کیا خوب عکاسی کی ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

جس نے نیزوں پہ اچھلتے ہوئے سر دیکھے ہیں — جس نے مرمر سے بدن خون میں تر دیکھے ہیں
جس نے شعلوں میں نہاتے ہوئے گھر دیکھے ہیں — جس نے لُٹتے ہوئے عصمت کے گُہر دیکھے ہیں [۷۸]

ناصر کاظمی نے بھی ان ہی پُر تشدد مناظر کو دیکھنے کے بعد اپنی افسردگی کا اظہار کرتے ہوئے طنزاً کہا کہ:

شہر در شہر گھر جلائے گئے — یوں بھی جشنِ طرب مٹائے گئے
وقت کے ساتھ ہم بھی اے ناصر — خار و خس کی طرح بہائے گئے [۷۹]

سیف الدین سیف نے ''اے مرے شہر'' میں امرتسر میں ہونے والے فسادات، خوں ریزی اور بدلتے منظر نامے کو پیش کرتے ہوئے کہا کہ:

پھر وہ دن آئے کہ سرِ بازار — وحشیوں کے ہجوم لڑنے لگے
اس طرح تیرگی نے کی یلغار — روشنی کے قدم اکھڑنے لگے
بستیوں میں فساد کے شعلے — بے گناہوں کی سمت بڑھنے لگے
جان کا خوف آن کر دھڑکا — چاند سے چہرے ماند پڑنے لگے
خاندانوں میں ابتری پھیلی — لوگ روتے ہوئے بچھڑنے لگے
جن کی رونق تھی رشکِ باغِ عدن — وہ محلے وہ گھر اجڑنے لگے [۸۰]

ظلم و بربریت کے وہ مناظر جن کا ذکر مذکورہ صفحات میں کیا گیا، بچوں اور عورتوں کے ساتھ ہونے والے مظالم، بے گور و کفن لاشیں اور انسانی لاچاری کی تصویر دکھاتے ہوئے شاعر نے جو مناظر پیش کیے ہیں وہ حقیقت سے قریب تر ہیں۔ ملاحظہ کیجیے:

ہر طرف وحشتوں کے لشکر تھے — بربریت کا بول بالا تھا
تیغ قاتل نے کم سنو کا لہو — در و دیوار تک اچھالا تھا

کتنی بہنیں تھیں بھائیوں نے جنھیں اپنے ہاتھوں سے مار ڈالا تھا
ان کی لاشیں بھی دفن کر نہ سکے ناز و نعمت سے جن کو پالا تھا[۸۱]

ہمسایوں کے سلوک، بیٹیوں کی بے لباسی اور سیاست دانوں کی بے ضمیری کا نقشہ کھینچتے ہوئے شاعر نے جو منظر کشی کی ہے وہ اس دور کے حالات سے مکمل آگہی دینے کے ساتھ ساتھ اس المیے کو بھی ہمارے سامنے پیش کرتی ہے جس نے برصغیر کے بہت سے شہروں کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ جیسے:

کفر و ایماں کے اس تصادم میں بیٹیوں کے لباس اترنے لگے
ایسا ہمسائے نے سلوک کیا اپنے سائے سے لوگ ڈرنے لگے
قوم پر جب زوال آتا ہے رہنما بے ضمیر ہوتے ہیں
ملک بٹتا ہے فوج کٹتی ہے اس کے بیٹے اسیر ہوتے ہیں
موت سے چھپ کر بھاگنے والے لقمۂ دار و گیر ہوتے ہیں[۸۲]

ایسے ہیبت ناک مناظر کو انسان تاعمر فراموش نہیں کر سکتا۔ خصوصاً جب ظالم اسلحہ سے لیس اور مظلوم نہتا ہو، بے سروسامانی کا عالم ہو اور ایسے ماحول میں ہجرت کا کرب بھی سہنا پڑا ہو تو شاعر کے احساسات میں ایک عجیب سی یاسیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس یاسیت کا اظہار کرتے ہوئے شاعر کہتے ہیں کہ:

ہم نہتے بھی لڑ گئے اکثر تو نے یہ بھی کمال دیکھا ہے
تو نے جلتی ہوئی چھتوں کے تلے وہ جدال و قتال دیکھا ہے
دل سے جاتا نہیں دھواں اب تک تیرے جلتے ہوئے مکانوں کا
آج بھی گونجتا ہے کانوں میں شورِ فریاد ناتوانوں کا
ہائے وہ آخری شبِ وحشت نیند آئی نہ غم کے ماروں کو
ساتھ لاکھوں کے چل دیے ہم بھی بے کفن چھوڑ کے ہزاروں کو[۸۳]

وقار انبالوی کی نظم ''کیا کیا دیکھا'' میں بھی پڑوسی کی نظریں پھیرنے اور مسلح جتھوں سے نہتے مقابلہ کرنے کے مناظر ملتے ہیں۔ ملاحظہ کیجیے:

لڑ گئے، گرچہ نہتے بھی تھے محصور بھی تھے دیکھا! یہ شوقِ شہادت کا تقاضا دیکھا
ہم نے بدلے ہوئے احباب کے تیور دیکھے ہم نے بپھرے ہوئے اغیار کا تیہا دیکھا
جان محفوظ نہ اولاد نہ عزت نہ منال سامنے آنکھوں کے گھر بار کو لٹتا دیکھا[۸۴]

حکومت کی بے بسی، لاقانونیت، بچوں کی بھوک، نوجوانوں کی خون میں لت پت لاشیں اور عورتوں کی عصمت دری کی منظر کشی کرتے ہوئے شاعر نے ان کرب ناک مناظر کو کچھ اس طرح دکھایا ہے:

ہم نے قانون کو انصاف کو مردہ پایا ہم نے تہذیب کو اخلاق کو رسوا پایا

بھوک میں سہمے ہوئے بچوں کی صورت دیکھی	چوٹ کھا کھا کے بزرگوں کو تڑپتا دیکھا
باپ کے سامنے بیٹوں کے گلے کٹتے تھے	ماؤں کی گود میں بچوں کو بلکتا دیکھا
شیر خواروں کے گلے خون میں تر دیکھے ہیں	نوجوانوں کو تہہ تیغ تڑپتا دیکھا
عصمتِ دخترِ اسلام سے کھیلے کافر	جبر کے کاندھوں پہ غیرت کا جنازہ دیکھا[۸۵]

حفاظت خود اختیاری کے ضمن میں ان نوجوانوں کی دلیری قابل دید تھی جو نہتے ہونے کے باوجود ٹولیوں کی شکل میں محلے کی حفاظت پر مامور تھے۔ انھوں نے دشمنوں کو ڈرانے کے لیے پُر تشدد راستہ بھی اختیار کیا، لیکن یہ راستہ بھی اپنے تحفظ کے لیے تھا۔ ان سور ماؤں کی بہادری کی بابت شاعر کہتے ہیں کہ:

یہی سکھ سورما ہیں جن سے امرتسر کے بچوں نے	طمانچے مار کر چھینیں سرِ بازار شمشیریں[۸۶]

آزادی کی یہ نعمت جو آج اہل وطن کو میسر ہے، یہ ان ہی جانبازوں کی قربانیوں کا نتیجہ ہے۔ موجودہ نسل اس نعمت کی قدر نہیں کرتی۔ غالباً ان کے وہم و گمان میں بھی وہ مناظر نہیں آسکتے جو ان آزادی کے متوالوں کو بہ نفس نفیس دیکھنے پڑے۔ آزادی کی اس نعمت کا احساس دلاتے ہوئے طاہر محمود قریشی نے اپنی نظم ''آزادی'' میں درست کہا کہ:

> کیا ہے آزادی؟ کوئی سمجھتا نہیں/ جانتا ہی نہیں/ سوچتا بھی نہیں/ جو کسی نے لگایا اور اس کا ثمر/ ہم بڑے شوق سے کھا رہے ہیں مگر/ یہ سمجھتے نہیں/ سوچتے بھی نہیں/ اس چمن کے گل و رنگ و بو کے لیے/ کتنے افراد نے/ اپنے دامن کی خوشیوں کے خوں تھے کیے/ کتنی ماؤں کے لختِ جگر کٹ گئے/ کتنے مدفن بنے/ عصمتیں لُٹ گئیں، خوں کے دریا بہے/ آرزوؤں کے کتنے محل جل گئے/ اور ان کا دھواں/ ہر طرف پھیل کر/ یاس و حسرت کی اک داستان بن گیا[۸۷]

اس دور کی اردو شاعری میں اتحاد و اتفاق اور یگانگت کے بجائے شکوہ، شکایت اور اپنوں کے ظلم و جبر کا نشانہ بننے پر افسردگی اور ملال کی کیفیت نمایاں ہے۔ گو اس سے بہت پہلے حالی نے اپنی شاعری میں ادب اور سماج کے رشتے کو پہلی بار دریافت کیا۔ اردو ادب کے لیے یہ دور انقلابی حیثیت رکھتا ہے۔ سماج جو کچھ اشارے کر رہا تھا، حالی نے پہلی بار ان اشاروں کو محسوس کیا اور سماج سے گفتگو کرنے کی کوشش کی[۸۸]۔ حالی کی نظمیں ایسی ہیں جن میں وطنیت کے ساتھ ملی احساس کا پرتو اور کرب کی وہ کیفیت ملتی ہے جو ایک باشعور اور حساس فرد کو قومی زوال اور ملّی اخلاق کے انحطاط پر سراپا درد بنا دیتی ہے۔ ان میں مایوسی کا رنگ ضرور جھلکتا ہے مگر مایوسی کے ساتھ ساتھ نظمیں ہمیں جھنجھوڑتی اور بیدار کرتی ہیں۔ مسدس جب لوگوں تک پہنچی تو اس کا اثر ساکت پانی میں پتھر پھینکنے کی مانند ہوا۔ جس پر چوٹ پڑی اس نے حالی کو سنگ ملامت کا نشانہ بنایا لیکن دردمند لوگوں کی جانب سے پزیرائی بھی خوب ملی۔ حالی کی دوسری اہم ترین نظم ''شکوۂ ہند'' ہے۔ یہ نظم ۱۹۸۸ء میں لکھی گئی۔ ہماری قومی شاعری کی تاریخ میں قوم کے آشوب کی داستان اس طرح کبھی نہیں سنائی گئی کہ وہ آئندہ نسلوں کے لیے اصلاحِ احوال کی ایک تہنیتی دستاویز بن جائے۔ اس نظم میں پہلی بار کسی شاعر نے ہندوستان کو دیارِ غیر اور مسلمانوں کو بدیسی مہمان کہہ کر مخاطب کیا۔ اس طرح یہ نظم مسلمانوں کی جداگانہ قومیت کا پہلا ببانگِ دہل اعلان ہے[۸۹]۔ تقسیم ہند کا پہلا پرتو اگر دیکھنا

ہو، حالی کے اس شعر میں ایک واضح جھلک نظر آتی ہے جس میں وہ ہندوستان کو بڑی افسردگی سے الوداع کہتے دکھائی دیتے ہیں:

رخصت اے ہندوستاں اے بوستانِ بے خزاں ۔۔۔ رہ چکے تیرے بہت دن ہم بدیسی میہماں [۹۰]

نظم کے اگلے حصے میں حالی نے احسان شناسی کے طور پر اس طاقت اور ثروت کا ذکر کیا جو ہندوستان میں مسلمانوں کو حاصل ہوئی لیکن ساتھ ہی اس عیش وعشرت نے قوم کو بزدلی اور بے عملی کا جو تحفہ دیا، اس کا شکوہ بھی کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ وہ قوم جو شمیر وسنان کو اپنا زیور اور دلیری وشجاعت کو اپنا جوہر مانتی تھی، رقص وموسیقی اور طاؤس ورباب کی جھنکاروں میں مدہوش ہو کر اپنا مقام کھو بیٹھی ہے۔ اس طرح اس نے وہ سب کچھ خاک ملا دیا جو اس کی عظمت وقوت کا باعث تھا[۹۱]۔ اسی لیے وہ ہندوستان کی سرزمین میں شکوہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

تھی ہماری قوم وملّت رسم و عادت سب جدا ۔۔۔ رشتہ و پیوند کوئی ہم میں اور تجھ میں نہ تھا

بول چال اپنی الگ تھی اور زباں تیری الگ ۔۔۔ تجھ سے ہم تھے اجنبی اور ہم سے تو نا آشنا

پر گلہ یہ ہے کہ جو کچھ اپنا ہم لائے تھے ساتھ ۔۔۔ وہ بھی تو نے ہم سے لے کر کر دیا بالکل گدا

آدمیت کے تھے جوہر جو ہماری ذات میں ۔۔۔ خاک میں آخر دیے اے ہند تو نے سب ملا

یاد ہوگا تجھ کو یاں آئے تھے ہم کس شان سے ۔۔۔ تجھ کو سوگند اپنے سب جگ کی بتا ایمان سے [۹۲]

حالی نے مسلمانوں کی عظمتِ رفتہ کو یاد کرتے ہوئے ہندوستان کی سرزمین سے یہ شکوہ کیا کہ جب تک مسلمانوں نے اپنی شناخت نہیں چھوڑی تھی اور ہندی نہیں کہلاتے تھے، اس طرح کی بے عملی ان کی زندگی میں نہیں آئی تھی۔ اس بابت حالی کا کہنا ہے کہ:

جب تک اے ہندوستاں ہندی نہ کہلاتے تھے ہم ۔۔۔ کچھ ادائیں آپ میں سب سے جدا پاتے تھے ہم

سیرتیں تونے بدل دیں مسخ کر دیں صورتیں ۔۔۔ آبرو تونے ڈبو دی، کھو دیا تونے وقار

کر دیا شیروں کو تونے گوسفند اے خاک ہند ۔۔۔ جو شکار افگن تھے آکر ہوگئے یاں خود شکار

حال اپنا سخت عبرت ناک تونے کر دیا ۔۔۔ آگ تھے اے ہند ہم کو خاک تونے کر دیا [۹۳]

حالی کی دیگر نظموں میں بھی یہی تاثر ملتا ہے۔ ۱۸۵۷ء کے المیے کے بعد انھوں نے اس ملّی احساس کو اجاگر کرنے کی سرتوڑ کوشش کی۔ ان کی شاعری مسلمانانِ ہند کے ملّی تشخص کی اوّلین صورت دکھائی دیتی ہے۔ خصوصاً ''شکوۂ ہند'' کو تو ہم دوقومی نظریہ کی شاعرانہ وضاحت کہہ سکتے ہیں۔ جب وہ مسلمانوں کے ملّی کردار کی کمزوری کا شکوہ ہندوستان سے کرتے ہیں تو پہلی بار اس کی شاعری میں ہندوؤں سے الگ ایسی قوم کا تصور ابھر کر سامنے آتا ہے جو رسم ورواج، عادات اور روایات میں ان سے بالکل جدا حیثیت رکھتی ہے۔ اس نظم کو ہندوستان میں مسلمانوں کی جداگانہ قومیت کی اساس اور بنیاد قرار دیا جائے تو غلط نہ ہوگا[۹۴]۔

اس دور کے دوسرے اہم شاعر شبلی نعمانی نے بھی مسلم قومیت، تمدن اور سیاست پر گہرے اثرات چھوڑے۔ مسلم لیگ جب قائم ہوئی تو مسلم اکابرین کی بڑی تعداد اس جماعت کی مخالفت تھی۔ شبلی بھی قومی اتحاد اور یگانگت کا راگ الاپتے ہوئے مسلم لیگ مخالفت میں کسی سے پیچھے نہیں تھے۔ مسلم لیگ پر ایک الزام یہ رہا کہ اپنے قیام کے ابتدائی زمانے میں اس جماعت کا مقصد گورنمنٹ سے لڑنے کے بجائے اپنے ہم وطنوں سے لڑنا اور حکومت وقت سے اظہار وفاداری کرنا تھا۔ اسی لیے اس جماعت میں خطاب اور مراعات یافتہ

ارباب جاہ کی بڑی تعداد جمع تھی۔ اس زمانے میں معرکہ طرابلس، بلقان اور مسجد کان پور کے واقعے نے مسلم سیاست میں ہیجانی کیفیت پیدا کر رکھی تھی۔ پرجوش مسلمان جو احراری تھے، لیگ سے نفرت میں پیش پیش اور کانگریس کی طرف مائل تھے۔ یہ روش دیکھ کر مسلم لیگ نے بھی اپنی روش میں تغیر ضروری سمجھا اور اپنے مقصد میں ہندوستان کی خود مختار حکومت کا مطالبہ شامل کر لیا۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ لفظ سوٹ ایبل یعنی ہندوستان کے حالات کی مناسبت سے خود مختار حکومت کا فقط اضافہ کیا۔ احرار نے مسلم لیگ کی اس روش کی بھی سخت مخالفت کی۔ خود شبلی نے بھی احراری مسلمانوں کے جذبات کو اپنی نظموں کے ذریعے خوب ابھارا[۹۵]۔ مسلم لیگ کی بے عملی اور ملکی حالات سے عدم توجہی کی شکایت ان کی نظم ''مسلم لیگ'' میں بہت واضح ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

جنابِ لیگ سے میں نے کہا کہ اے حضرت　　کبھی تو جا کے ہمارا بھی ماجرا کہیے
عدالتوں کی پریشانیاں بیاں کیجے　　فسانۂ ستم و جور ناروا کہیے
دراز دستی پولس کا کیجیے اظہار　　مقدمات کے حالات فتنہ زا کہیے
برادرانِ وطن کہہ رہے ہیں کیا کیا کچھ　　کبھی تو آپ بھی افسانۂ جفا کہیے[۹۶]

یہ درست ہے کہ شبلی کے زمانے کی مسلم لیگ چند خواص تک محدود تھی۔ ابھی تک اس جماعت نے عوامی جذبات کی ترجمانی شروع نہیں کی تھی۔ یہ درست ہے کہ بہ حیثیت سیاسی جماعت مسلم پڑھے لکھے گھرانوں میں اس کے اثرات مرتب ہونا شروع ہو چکے تھے لیکن ابھی تک وہ حکومت برطانیہ کے خلاف کسی قسم کا راست اقدام اٹھانے سے گریزاں تھی۔ اسی پس منظر میں شبلی نے مسلم لیگ کی بابت کہا کہ:

لیگ کی عظمت و جبروت سے انکار نہیں　　ملک میں غلغلہ ہے شور ہے کہرام بھی ہے
ہے گورنمنٹ کی بھی اس پہ عنایت کی نگاہ　　زمرِ لطف رئیسانِ خوش انجام بھی ہے
مختصر اس کے فضائل کوئی پوچھے تو یہ ہیں　　محسنِ قوم بھی ہے خادمِ حکام بھی ہے[۹۷]

اس طرح کے طنزیہ اشعار سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ شبلی اپنی حیات کے آخری دنوں تک متحدہ ہندوستان کی سیاست میں مسلم لیگ کے کردار کو کوئی خاص وقعت و اہمیت نہیں دیتے تھے۔ نظم ''لیگ کی دائم المرضی کی علت''، ''لیگ مع سوٹ ایبل''، ''سوٹ ایبل سیلف گورنمنٹ''، ''مسلم لیگ خطاب بہ رائٹ''، ''آنرایبل سید امیر علی''، ''خطاب بہ احرار'' اور ''احرار قوم اور طفل سیاست'' وغیرہ جیسی نظموں میں شبلی کے سیاسی نظریات کا اظہار بھرپور انداز میں نظر آتا ہے۔ لیگ کے سیاسی نظریات، بدلتے حالات اور ہندوستان میں مختلف اقوام کے لیے مروّجہ سیاسی نظام پر بھی شبلی کی دوٹوک رائے اس زمانے کی سیاست کے نشیب و فراز کو سمجھنے میں مدد و معاون ثابت ہوتی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ کیجیے جن میں سیاست کے ان پہلوؤں پر رائے زنی کی گئی ہے:

لیگ کو جب آیا کہ چلی ہاتھ سے قوم　　اک نیا روپ بھرا اس نے بہ اندازِ دگر
منزمرِ عام پر لوگوں سے کیا اس نے خطاب　　کہ نہیں سلف گورنمنٹ سے اب ہم کو مفر
ملک میں ہم بھی ہیں، ہندو بھی ہیں عیسائی بھی　　جو کہ ہیں نخلِ حکومت کے لیے برگ و ثمر[۹۸]

یہ درست ہے کہ ملک کے یہ برگ و ثمر مل کے ہی ہندوستان کی آزادی کی نیّا پار لگاتے تو بہت اچھا ہوتا لیکن شبلی غالباً یہ بھول

گئے کہ کانگریسی سیاست نے مسلمانوں کے مفادات کے تحفظ کے ضمن میں کس طرح سے اپنی آنکھیں بند کر رکھی تھیں بلکہ جہاں اس کو موقع ملتا وہ مسلمانوں کے جائز حقوق کے لیے بھی ان کے مخالفت پر کمر بستہ دکھائی دیتی ہے۔ تقسیم اور تنسیخ بنگال کا واقعہ اس کی بہترین مثال ہے۔ مگر لگتا ایسا ہے کہ شبلی نے ان تمام واقعات کو نظر انداز کر کے کانگریس کی غلطیوں کی طرف سے اپنی آنکھیں بند کر رکھی تھیں۔ خود ان کے مشہور شاگرد سید سلیمان ندوی نے اس بات کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے مصالحانہ اتحاد کے مسئلے میں مولانا نے جس رواداری کا ثبوت دیا تھا، اس میں ترازو کے دونوں پلڑے برابر نہیں رہے تھے یعنی ہندوؤں کی رواداری کو اتنا سراہا تھا کہ دوسری طرف مسلمان مجرم نظر آتے تھے[99]۔

اس زمانے کے ہندوستان میں مجموعی طور پر دو طرح کے رجحانات نظر آتے ہیں۔ اوّل مذہبی اصلاحی رجحان، دوم سیاسی رجحان۔ اوّل الذکر کی بنیاد تفریق پسندی پر تھی مگر اس دور میں منافرت کے سائے اس قدر گہرے نہیں ہوئے تھے۔ یہ ضرور ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کا ایک طبقہ انگریز سیاست کی برکتوں سے ایک دوسرے کو اپنے دکھوں کا ذمے دار سمجھنے لگا تھا۔ مسلم احیا پرست یہ سمجھ رہے تھے کہ ہندوؤں سے اختلاط نے ان کی اسلامی تہذیب کے خد و خال مسخ کر دیے ہیں اور اسے صرف ''دامنِ اسلام'' میں پناہ مل سکتی ہے۔ ہندوؤں کو یہ احساس تھا کہ ان کی تہذیب ''بھرشٹ'' کر دی گئی ہے اور انھیں ہزار برس پہلے کے دور کی طرف واپس جانا ہے۔ ہندوؤں میں یہ احساس بھی پیدا کر دیا گیا تھا کہ اب مسلمانوں کی حیثیت ایک محکوم اور دوسرے درجے کے شہری سے زیادہ نہیں۔ انھیں دوبارہ بالادستی حاصل نہیں ہونی چاہیے۔ اب معاشرے میں فرقہ وارانہ بنیادوں پر جو اشتراکِ عمل کا مظاہرہ کیا جاتا تھا، وہ اب لڑکھڑا رہا تھا۔ ان حالات میں اردو شاعری نے اتحاد، یگانگت اور قومی یک جہتی کے جذبات پیدا کرنے کی موثر کوشش کی۔ غزل گو شعرا میں داغ، امیر، جلال، تسلیم، شاد عظیم آبادی، ریاض خیر آبادی وغیرہ کے ہاں جہاں ایک طرف محبوب کی شوخی، صنم خانہ، بت کدہ، مے کدہ اور واردات قلبی کا بیان ہے تو دوسری طرف اس وقت ملک میں جو بھی حالات و واقعات رونما ہو رہے تھے، اسے پیش کرتے ہوئے کہیں قفس و آشیانہ، نشیمن و صیاد، گناہ گار، قاتل، کارواں وغیرہ کی علامتوں اور استعاروں کے پردوں میں اس دور کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد جو کچھ بھی سیاسی و سماجی حالات رونما ہو رہے تھے، یہ اشعار اس دور کی سچی تصویر پیش کرتے ہیں[100]۔ اس طرح بیسویں صدی کے ابتدائی زمانے کی غزلیں اپنے مزاج اور موضوعات کے لحاظ سے جدید تر موضوعات کا نقطۂ آغاز تصور کی جاتی ہیں۔ جلال نے ہندو مسلم چپقلش اور باہمی اتحاد پارہ پارہ ہونے کے مناظر دکھاتے ہوئے کہا کہ:

خبر کیا کس نے شیخ و برہمن میں جھگڑے ڈالے ہیں	مگر سب بزم رنداں میں تمھارا نام لیتے ہیں
باغ باں لاکھ چھپایا کیے لیکن نہ چھپا	خونِ مرغانِ چمن رنگ ہوا بو نہ ہوا[101]

امیر مینائی نے بھی غزلوں میں علامتوں کا سہارا لے کر بڑے خوب صورت انداز سے اپنے دلی جذبات کی عکاسی کی ہے ملاحظہ کیجیے:

خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیر	سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے
میں اور اسیر لالہ و گل ہجر یار میں	کیسی بہار آگ لگا دو بہار کو
فلک کے دَور سے دنیا بدل گئی ورنہ	جہاں بنے ہیں یہ مے خانے خانقاہیں تھیں
قریب ہے یار روزِ محشر، چھپے کا کشتوں کا خون کیوں کر	جو چپ رہے گی زبان خنجر لہو پکارے گا آستیں کا[102]

نسیم نے بھی حالات کے تقاضوں کو سمجھتے ہوئے کہا کہ:

پرواز اوّلیں میں اسیری ہوئی نصیب　　　گویا قفس میں تھے جو اڑے آشیاں سے ہم[۱۰۳]

نظام رام تو حالات کے بدلتے منظر نامے پر سخت حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

کون پرساں ہے حال بسمل کا　　　خلق منھ دیکھتی ہے قاتل کا[۱۰۴]

شاد عظیم آبادی نے آشیاں کے اجڑنے کے دکھ کو محسوس کرتے ہوئے اپنی غزلوں کو ایک نیا رنگ و آہنگ بخشا۔ ملاحظہ کیجیے:

بہت سے تنکے چُنے تھے میں نے نہ مجھ سے صیاد تو خفا ہو　　　قفس میں گر مر بھی جاؤں گا میں نظر سوئے آشیاں رہے گی

ہزار نقشِ قدم مٹا کر زمانہ آنکھوں میں خاک ڈالے　　　جو مجھ سے چھوٹے ہیں ان کو تیری تلاش اے کارواں رہے گی[۱۰۵]

اور اکبرالٰہ آبادی نے تو اس تفریق کو اور زیادہ واضح کرتے ہوئے صاف لفظوں میں کہہ دیا کہ:

ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام　　　وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا[۱۰۶]

بہ ظاہر کلاسیکی رنگ میں رنگے یہ اشعار جن میں گل و بلبل، صیاد و قفس وغیرہ کی علامتیں اس عہد کے سیاسی و سماجی حالات کے مطابق اپنی معنویت میں اضافے کا سبب بن رہی تھیں۔ ۱۸۵۷ء کے بعد قتل اور خون ریزی، ظلم و ستم کا جو بازار گرم ہوا تھا، وہ ابھی تک نگاہوں سے اوجھل نہیں ہوا تھا۔ امیر مینائی نے تو اس زمانے کی عام پژمردگی کی کیفیت کو ابھارنے میں بھر پور کردار ادا کیا۔

اس عہد کا عظیم ترین رجحان قومی اور وطنی شاعری کا ہے۔ اب تک قومی یک جہتی کے جو عناصر علامتوں اور تصورات کے پردوں میں چھپے ہوئے تھے، وہ کھل کر سامنے آ گئے۔ آزاد اور حالی نے جس شاعری کا سنگ بنیاد رکھا تھا، شبلی، درگا سہائے سرور جہاں آبادی، مہاراج بہادر برق، سورج نرائن مہر، جگت موہن لال رواہ، اقبال، اکبر، چکبست اور جوش وغیرہ نے انھیں دیواروں پر قومی یک جہتی کا محل تعمیر کیا۔ اس دور کی شاعری میں ہندوستانی سماج کے دونوں پہلو احیا پرستی اور تفریق پرستی کے عناصر مضبوط شکل میں سامنے آئے۔ اس عہد کی شاعری کے مطالعے سے ہندوستان کی تہذیبی اور سماجی تاریخ بھی مرتب کی جا سکتی ہے[۱۰۷]۔ مذکورہ صفحات میں راقم نے حالی کے حوالے سے مسلمانوں کے علاحدہ تشخص اور شناخت کی اگر مثالیں پیش کی ہیں تو وہی حالی اپنی نظم ''حب وطن'' میں وطنیت کے جذبات ابھارتے ہوئے متحدہ قوم ہونے کے احساس کو اجاگر کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ یہ اشعار واضح انداز سے قومی یک جہتی کے عناصر کی بنیاد قرار دیے جا سکتے ہیں۔ فرقہ واریت کے خلاف مذہبی ہم آہنگی کے جذبات ابھارتے ہوئے حالی کہتے ہیں کہ:

تم اگر چاہتے ہو ملک کی خیر　　　نہ کسی ہم وطن کو سمجھو غیر

ہو مسلمان اس میں یا ہندو　　　بودھ مذہب ہو یا کہ ہو برہمو

سب کو میٹھی نگاہ سے دیکھو　　　سمجھو آنکھوں کی پُتلیاں سب کو[۱۰۸]

لیکن اس نظم میں حالی نے عصبیت، نا اتفاقی اور آپس کی چپقلش کے نتائج سے آگاہ کرتے ہوئے قوم کو خبردار بھی کیا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کانگریس کے قیام کے بعد جس طرح سے ہندو مسلم عصبیت میں تیزی سے اضافہ ہو رہا تھا، حالی اس سے سخت پریشان بھی تھے۔ اسی لیے وہ ہندوستانیوں کو متنبہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

ہند میں اتفاق ہوتا اگر　　　کھاتے غیروں کی ٹھوکریں کیوں کر

قوم جب اتفاق کھو بیٹھی — اپنی پونجی سے ہاتھ دھو بیٹھی

ایک کا ایک ہوگیا بدخواہ — لگی غیروں کی پڑنے تم پہ نگاہ[۱۰۹]

اب دیکھنا یہ ہے کہ ایک طرف یہ مسلم اکابرین تھے جو یک جہتی کے جذبات ابھارنے کے لیے اپنی ہر ممکن کوششوں میں مصروف تھے جب کہ دوسری جانب ہندو قوم پرستی کی احیاء میں مصروف وہ شدت پسند جو مسلمانوں کو دیس نکالا کی تیاری میں مصروف تھے۔عبداللہ یوسف علی کے مطابق جس سال حالی کی یہ مثنوی منظر عام پر آئی، تقریباً اسی برس بنکم چندر کا ناول ''آنند مٹھ'' منظر عام پر آیا۔ ڈاکٹر تاراچند نے اس ناول کا سن اشاعت ۱۸۸۲ء تحریر کیا ہے۔یاد رہے کہ یہ وہی ناول ہے کہ جس کے بعد ''بندے ماترم'' ہندوؤں کے لیے تحریک آزادی کا جنگی نعرہ بنا۔اسی ناول کے ذریعے فرقہ واریت کے جذبات کو ابھارنے کی مذموم کوششوں کا آغاز ہوا[۱۱۰]۔اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اردو شعرا اس وقت تک اس طرح کے تفرقے اور مذہبی منافرت سے کس قدر دور تھے اور علاقائی ادب ان منفی جذبات کو پروان چڑھانے میں کیا کردار ادا کر رہا تھا۔اس دور میں حالی اتحاد و اتفاق کا نغمہ پیش کرتے نظر آتے ہیں۔آزاد نے بھی ''حب وطن'' پر نظم لکھی اور وطنیت کے شعور کو بیدار کرنے کی کوشش کی۔حالی اور آزاد کے اسی کارنامے نے آنے والے دور میں اقبال سے ''سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا'' اور ''سورج نے دیا اپنی شعاعوں کو یہ پیغام'' جیسی نظمیں لکھوائیں۔اس طرح آزاد اور حالی نے اپنے دور کی رہنمائی کا فریضا احسن طریقے سے انجام دیا۔اسی دور میں وطن کو دھرتی ماں کے مقدس لفظ سے یاد کرنے کی روایت شروع ہوئی۔نادر کاکوروی کی نظموں میں بھی وطنیت کا وہی تصور جو اتفاق و یک جہتی پر مبنی ہو، پروان چڑھا:

اے مری دھرتی ماتا مائی — اے سارے سنسار کی دائی

آدم و حوّا کی اولادیں — سب ہیں تیری ہی اولادیں[۱۱۱]

نظم ''مقدس سرزمین'' میں بھی وطنیت کا تصور ابھارتے ہوئے شاعر اتحاد و یک جہتی کے جذبات پروان چڑھانے کی کوششوں میں مصروف دکھائی دیتے ہیں۔ملاحظہ کیجیے:

مرحبا اے مادرِ ہندوستاں جنت نشاں — مرحبا اے بھارت اے روحانیت کی سر زمین

ہم کبھی جائیں گے مکہ اور مدینہ چھوڑ کر — ساری دنیا میں ہے تیری پاک تر بہتر زمین

تیرے بندر ابن سے اُٹھّا پہلے ہو حق کا خروش — کیوں کہ دنیا کا وہی پہلا عبادت خانہ تھا

وہ کنہیا اور وہ تیرا بانسری والا کرشن — با خدا تھا، برگزیدہ تھا نبی تھا یا نہ تھا

بج اٹھی تھی بانسری گوکل میں تیرے ایک بار — آج تک دنیا میں ہے آواز اس کی گونجتی

سب سے پہلے تیرے گوتم اور گوپی چند نے — چھوڑ کر سب راج پاٹ اپنا گدائی کی قبول

اور وہ عارف وہ تیرا نام ور شاعر کبیر — بٹ گئے ہندو مسلماں میں برابر جس کے پھول

اے بہارستانِ جذبات، اے خراباتِ خروش — سیر گاہِ سعدیِ شیراز و بزم والمیک

ہے خم و مینا میں تیرے خاک و خسرو تہ نشیں — اور مئے احمر میں تیری خونِ سرمد ہے شریک[۱۱۲]

اسی دور میں اسمٰعیل میرٹھی نے ایک طرف آزادی کے پیغام کو اجاگر کرتے ہوئے ہندوستان کے رہنے والوں کو اس جانب

متوجہ کرتے ہوئے ''آزادی غنیمت ہے'' میں کہا کہ:

ملے خشک روٹی جو آزاد رہ کر تو وہ خوف و ذلّت کے حلوے سے بہتر ہے
جو ٹوٹی ہوئی جھونپڑی بے ضرر ہو بھلی اس محل سے جہاں کچھ خطر ہو[113]

اس کے ساتھ ساتھ اسمٰعیل نے بڑی شد و مد کے ساتھ ان طاقتوں کی حمایت کی جو اتفاق اور اتحاد کی علم بردار تھیں۔ اپنی ایک رباعی میں وہ یک جہتی کے فوائد اور رشک وحسد کے نتائج کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

جب تک کہ سبق ملاپ کا یاد رہا بستی میں ہر ایک شخص دل شاد رہا
جب رشک و حسد نے پھوٹ ان میں ڈالی دونوں میں سے ایک بھی نہ آباد رہا[114]

ان کی نظریں ایک بہتر مستقبل کی تلاش میں تھیں اور یہ اسی وقت ممکن تھا کہ جب پوری قوم تعصب کی عینک اتار کر ملک کی تعمیر و ترقی میں بھرپور حصہ لے۔ فرقہ واریت اور تعصب کا خاتمہ اس روشن مستقبل کی پہلی سیڑھی تھی اور اسمٰعیل ایسے ہی زمانے کا خواب دیکھ رہے تھے۔ ان کا یہ خواب ہندوستان کی سرزمین پر شرمندہ تعبیر تو نہ ہوسکا لیکن ان کے پیغام سے جو مصالحت اور یگانگت کا درس ملا اس سے بعض اوقات دونوں فریقین میں ایسے افراد اور سوچ ضرور پیدا کیے جنھوں نے متحدہ ہندوستان کے تصور کو آگے بڑھانے میں اہم کردار ادا کیا۔ اسمٰعیل نے مربع کی ہیئت میں لکھی گئی نظم ''اچھا زمانہ آنے والا ہے'' میں انھیں جذبات کی عکاسی کرتے ہوئے کہا کہ:

لڑائی کو انسان سمجھیں گے ڈاین تفاخر پہ ہوگی نہ قوموں میں ان بن
مشیخت کی خاطر اڑے گی نہ گردن کرو صبر آتا ہے اچھا زمانہ
عقیدوں کی مٹ جائے گی سب رقابت مذاہب کو ہو گی تعصب سے فرصت
مگر ان کی بڑھ جائے گی اور طاقت کرو صبر آتا ہے اچھا زمانہ[115]

بیسویں صدی کی ابتدا سیاسی وسماجی تغیرات کا سیل عظیم لے کر آئی۔ برصغیر کے لیے اس صدی کا سب سے بڑا تحفہ ہندو مسلم مغائرت میں اضافہ تھا۔ جس کے آثار ۱۸۹۳ء میں بمبئی، اعظم گڑھ، رنگون اور بریلی کے فسادات کی صورت میں ظاہر ہو چکے تھے۔ تقسیم بنگال اور پھر تنسیخ بنگال نے اس میں مزید شدت پیدا کر دی تھی۔ ہندوؤں میں متشددانہ کارروائی اور تنگ نظری کے باعث اب مسلمان سیاسی طور پر اپنی قومی شیرازہ بندی میں مصروف تھے۔ شُدھی اور سنگھٹن جیسی مسلم دشمن تحریکوں نے اس سوچ کو مزید پروان چڑھایا[116]۔ اس صدی کے آغاز ہی سے سیاسی، سماجی اور تہذیبی اعتبار سے ملک کی آزادی کے سال تک مختلف دھارے نظر آتے ہیں جن میں کوئی خط فاصل کھینچنا تقریباً ناممکن ہے۔ ستر برس کے عرصے سے جاری وہ تحریک جو لارڈ رپن کی لوکل سیلف گورنمنٹ کی صورت میں ظاہر ہوئی تھی، منٹو مارلے ریفارم، مانٹیگو چیمس فورڈ ریفارم، گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ، کرپسن مشن اور کیبنٹ مشن پلان سے گزرتی ہوئی آزادیِ ہند پر ختم ہوئی اور اپنے دامن میں آگ اور خون لیے ہوئے اس طرح آگے بڑھی کہ ۱۸۹۳ء کے فرقہ وارانہ فسادات سے لے کر پہلی جنگ عظیم، جلیاں والا باغ، ۱۹۲۷ء کے فرقہ وارانہ فسادات، سائمن کمیشن، نہرو رپورٹ، ڈانڈی مارچ، دوسری جنگ عظیم، بنگال کا قحط، ہندوستان چھوڑ دو تحریک، ۱۹۴۶ء سے آزادی تک کی ہولناکی اور پھر آزادی کے بعد بنگال، بہار، یو۔ پی۔ پنجاب اور سرحد کے فرقہ وارانہ فسادات[117]، تاریخ کے صفحات پر ایک خونی لکیر کھینچ گئے۔ تاریخ کے یہ صفحات ہندوستانی تہذیب وتاریخ پر ایک دھبّا ہیں جسے

کبھی بھلایا نہ جا سکے گا۔اس دور کی شاعری بھی اپنے اندر ہیجانی کیفیت لیے ہوئے ہے۔اس دور کی شاعری میں مختلف رجحانات دکھائی دیتے ہیں۔اکبرالہٰ آبادی کی شاعری میں ہندو مسلم معاشرے کی تہذیب کو بہت زیادہ اہمیت دی گئی۔ان کی شاعری کو وہ رنگ جس میں دردمندی اور تجزیاتی پہلو نمایاں ہے،ملّی شاعری کا معتبر حصہ ہے۔انھوں نے مسلمانوں کی عظمت رفتہ کا احساس دلانے کے لیے ان کے اندر ملّی جذبات بیدار کرنے کی کوشش کی۔ایک نظم میں وہ کہتے ہیں کہ:

مسلمانو! بتاؤ تو تمھیں اپنی خبر کچھ ہے — تمھارے کیا مدارج رہ گئے ان پر نظر کچھ ہے
تمھیں معلوم ہے تم رہ گئے ہو کیا سے کیا ہو کر — کدھر آ نکلے ہو راہِ ترقی سے جدا ہو کر[۱۱۸]

اکبر واضح طور پر ہندوؤں اور ہندی مسلمانوں کو دو الگ الگ قومیں سمجھتے تھے۔ان کے خیالات ''گاندھی نامہ'' کے اشعار میں پوری طرح عیاں ہیں۔گاندھیت اور اس سے پیدا ہونے والے مسائل پر اکبر نے کھل کر طنز کیا۔ترک موالات اور تحریک عدم تعاون کے منفی پہلوؤں کو بھی اجاگر کیا۔ان کے خیال میں جلوس نکالنے،نعرے لگانے،قرار دادیں پاس کرنے یا چرخا کاتنے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا[۱۱۹]۔ان کے مطابق قومی جدوجہد کے ضمن میں کی گئی یہ کوششیں بے سود ہیں اسی لیے وہ گاندھی کے ان اقدامات کو طنز کا نشانہ بناتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

مہاتما جی سے مل کے دیکھو — طریق کیا ہے سبھاؤ کیا ہے
پڑی ہے چکر میں عقل سب کی — بگاڑ تو ہے بناؤ کیا ہے

یا

بھائی گاندھی کی روش میں بہت امید نہیں — ہے وہ دل چسپ مگر وسعت تقلید نہیں
اچھلنے کودنے کا شوق تھا پروانے کے سر میں — کیا ترکِ تعاون روشنی کی ہے نہیں گھر میں

یا

اثر دورِ فلک کا پڑ رہا ہے جو زمانے پر — تمھارے یہ رزولیوشن اسے کم کر نہیں سکتے
فقط ضد ہے جو کہتی ہے کہ ''جب اپنی زباں کھولو'' — ہمارے پیشوائے ملک گاندھی جی کی جے بولو[۱۲۰]

ایسا نہیں کہ اکبر نے ہندوؤں کی مخالفت میں یک جہتی کے عناصر کو بالکل فراموش کر دیا بلکہ جب مدن موہن مالویا نے ان سے فرمائش کی تو صلح وآشتی کی بابت یہ مشہور قطعہ بھی کہا کہ:

محرم اور دسہرا ساتھ ہوگا — نباہ اس کا ہمارے ہاتھ ہوگا
خدا ہی کی طرف سے ہے یہ سنجوگ — تو کیوں رکھیں نہ باہم صلح ہم لوگ[۱۲۱]

اس دور کے کچھ شعرا نے اپنے آپ کو صرف غزل تک ہی محدود رکھا۔ان غزل گو شعرا میں سیاسی شعور کی گہرائی دکھائی دیتی ہے۔انسان دوستی کے تصور کو ابھارنے اور انسانیت کو مختلف خانوں میں تقسیم ہونے سے بچانے کے لیے غزل گو شعرا نے علامتوں کا سہارا بھی لیا۔دیر و حرم،شیخ و برہمن،سبحہ وزنار جیسی علامتیں دراصل فرقہ واریت کے خلاف اور اتحاد و یگانگت کے لیے استعمال کی گئیں۔دوسری طرف قفس،اسیری،آشیانہ،نشیمن اور صیاد کی علامتیں اپنی بھرپور اشاریت کے ساتھ ان واقعات کی طرف متوجہ کرنے کی کوشش ہیں جو اس

وقت ملک کو درپیش تھے۔اس دور میں کارواں، رہبر اور رہنما کی علامتیں بھی مستعمل ہوئیں جن کے جدید مفہوم وضع کیے گئے۔ یہ تمام علامتیں قومی تحریکات کا عکس رکھتی ہیں [۱۲۲]۔اس سلسلے میں ۱۹۳۵ء تک غزل گوشعرا کی ایک طویل فہرست ہے جنھوں نے اپنی فکر ونظر کے چراغ روشن کیے۔ کچھ شعرا کا تذکرہ مذکورہ صفحات میں مختصراً کیا جا چکا ہے اور سب کا حال بیان کرنے کی گنجائش نہیں لیکن پھر بھی حسرت موہانی، عزیزلکھنوی، ثاقب لکھنوی، صفی لکھنوی، سیماب اکبرآبادی، نوح ناروی، جلیل مانک پوری، مولانا محمد علی جوہر، یاس یگانہ چنگیزی، بیخود دہلوی، آرزولکھنوی، صغر گونڈوی اور فانی بدایونی وغیرہ کے ذکر کے بغیر یہ مطالعہ ادھورا تصور کیا جائے گا۔ ۱۹۳۶ء کے بعد کی فہرست میں فیض، فراق، جگر، اثر لکھنوی، آنند نرائن، ملاّ، سردار جعفری، مجاز، جذبی، کیفی، مجروح اور جاں نثار اختر وغیرہ کے نام اہمیت کے حامل ہیں۔ ۱۹۳۵ء تک کی شاعری کے جائزے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ ملکی فضا میں آزادی کی جوکش مکش جاری ہے، اس سے اردو غزل بے نیاز نہیں۔ گھٹن، قید و بند کی سختیاں، حالات کی کشاکش، تفریق پسندانہ رجحانات وغیرہ کو غزل نے کہیں علامتوں کے ذریعے، کہیں مبہم اور واضح طور پر ترجمانی کی۔ اصغر نے ان علامتوں کو جس خوبی سے استعمال کیا اس کا اندازہ مندرجہ ذیل اشعار پڑھ کر پوری طرح ہو جاتا ہے:

چلا جاتا ہوں ہنستا کھیلتا موج حوادث میں — اگر آسانیاں ہوں زندگی دشوار ہو جائے

جہاں کوتاہیِ ذوقِ عمل ہے خود گرفتاری — جہاں بازو سمیٹے ہیں وہیں صیاد ہوتا ہے

بنا لیتا ہے موجِ خونِ گل سے آشیاں اپنا — وہ پابندِ قفس جو فطرتاً آزاد ہوتا ہے [۱۲۳]

فانی نے بھی اپنے یاسیت بھرے مخصوص پیرائے میں ان علامتوں کو استعمال کرتے ہوئے کہا کہ:

زمانہ برسر آزار تھا مگر فانی — تڑپ کے ہم نے بھی تڑپا دیا زمانے کو

اس کے سوا نہیں خبرِ آشیاں مجھے — میں تھا اسیرِ دام تو بجلی چمن میں تھی [۱۲۴]

اور جلیل نے اس سیاسی کیفیت کا اظہار کچھ اس طرح کیا کہ:

ناز بھی ہوتا رہا ہوتی رہی بیداد بھی — سب گوارا ہے مجھے سنتے رہو فریاد بھی [۱۲۵]

ثاقب لکھنوی نے تو ملکی حالات پر باقاعدہ نظر رکھی اور شاعری میں ان موضوعات کو خصوصی طور پر شامل کیا۔ علی گڑھ کے مشاعروں میں پڑھی گئی غزلوں کے اشعار اس زمانے میں زبان زدِ عام تھے۔ ملاحظہ کیجیے:

باغباں نے آگ دی جب آشیانے کو مرے — جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے

ہے روشنی قفس میں مگر سوجھتا نہیں — ابرِ سیاہ جانبِ کہسار دیکھ کر [۱۲۶]

ثاقب کے ہاں ایسے اشعار کی کمی نہیں جو اس دور کے حالات کی عکاسی کرتے ہوں۔ آزادی کے جذبے سے معمور کشاکش کے متعدد نمونے ان کی شاعری سے پیش کیے جاسکتے ہیں۔ جیسے:

قفس کی تیلیاں اچھی ہیں تنکوں سے نشیمن کے — یہ سب کچھ ہے مگر صیاد دل پر کیا اجارہ ہے [۱۲۷]

اسی طرح عزیزلکھنوی کے اشعار میں بھی اس طرح کی بہت سی تصویریں ہیں۔ کچھ میں خیالات بہت واضح ہیں اور کچھ میں مدھم، لیکن ذرا سی کوشش سے موضوعات کی گہرائی تک پہنچنا آسان ہو جاتا ہے، ملاحظہ کیجیے:

کچھ لوگ اجنبی سے رستہ بتا رہے ہیں / زنداں سے میں چلا ہوں اجڑے ہوئے وطن کو
قفس میں جی نہیں لگتا ہے آہ پھر بھی مرا / یہ جانتا ہوں کہ تنکا بھی آشیاں میں نہیں
نکالی جا رہی ہیں ہڈیاں کچھ قید خانے سے / اسیرانِ محبت کو وہ آج آزاد کرتے ہیں
جنازہ شہر سے نکلا تھا آج یہ کس کا / ہوئی ہے دیر مگر کچھ غبارِ راہ میں ہے[۱۲۸]

آرزو لکھنوی کی شاعری بھی قومی یک جہتی کی واضح سمتوں کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ان کے مجموعے''سریلی بانسری'' میں قومی تحریکات کا شدید تاثر پایا جاتا ہے۔انیس سو بیس اور تیس کی دہائی کی قومی تحریکات، سیاسی سماجی حالات اور سیاسی شعور کی بیداری کا تجزیہ کرنا ہو تو آرزو کی شاعری اپنی منفرد معنویت کی وجہ سے عمدہ اثاثہ تصور کیا جائے گا[۱۲۹]۔

اس باغ میں آکر ہم کو بھی تقدیر ملی ہے قمری کی / بندش بازو میں اطاعت کی، گردن میں طوقِ غلامی ہے
اہلِ قفس کا خوف زدہ شوق کیا کہوں / سوئے چمن سمیٹ کے پر دیکھتے رہے
کھلتی کلیوں کی چٹک مژدۂ آزادی ہے / قید توڑیں گے یہ جھٹکے کسی دیوانے کے
تھے قبل اسیریِ قفس بازوؤں کا زور / ٹوٹے ہوئے کچھ پر کہ نشیمن میں پڑے ہیں
صور کے پردے میں کس نے روحِ تازہ پھونک دی / جاگ اٹھے برسوں کے سوئے ایک ہی آواز میں[۱۳۰]

اس زمانے کے تفریق پسندانہ رجحانات اور فرقہ واریت سے ملک کو جو کچھ نقصان پہنچ سکتا تھا، پہنچ رہا تھا۔ یہ صورت حال حساس دل رکھنے والے آرزو پر کس طرح اثر کر رہی تھی، اس کا اظہار جب شاعر کرتے ہیں تو قوم کا مجموعی درد پوری طرح جھلکتا ہے۔اس شعر میں بخوبی اس درد کو محسوس کیا جا سکتا ہے۔دیکھیے :

کروں کیا جب عداوت ہو چمن کے تنکے تنکے کو / بنا ڈالوں نشیمن کو قفس تیار ہو جائے[۱۳۱]

یاس یگانہ چنگیزی بھی مذہبی تنگ نظری سے بیزار ایک ایسے شاعر کے طور پر سامنے آئے جن کے ہاں سماجی، سیاسی اور قومی تحریکوں کا مکمل شعور موجود ہے۔ان کے ہاں وطن سے الفت کا اظہار بھی پوری طرح موجود ہے۔ملاحظہ کیجیے:

وطن کی ہے ہوا سر میں، وطن کی خاک دامن میں / گریباں چاک کر لیتا ہوں یادِ دوست دشمن میں
میں قفس میں بھی کسی روز نہ خاموش رہا / کش مکش میں بھی طبیعت کا وہی جوش رہا[۱۳۲]

فرقہ واریت کو کم کرنے کے لیے بہت سے شعرا نے یک جہتی کے عمل کو تیز کرنے کی ضرورت پر زور بھی دیا اور اشعار کے ذریعے ان جذبات کو خوب فروغ بھی دیا۔بہاری لال مشتاق دہلوی کا یہ شعر اسی یگانگت کے جذبے کے تحت لکھا گیا:

ہم ہیں ہندو تُو مسلماں دونوں باہم ایک ہیں / جس طرح آزاد رو جمنا و زمزم ایک ہیں[۱۳۳]

اردو شاعری میں وطنیت اور قومیت کا روشن اظہار درگا سہائے سرور جہاں آبادی، اقبال اور چکبست کے کلام میں بہت واضح ہے۔قومی شاعری کا اطلاق اقبال کے کلام پر پوری طرح ہوتا ہے۔اقبال کی شاعری صحیح معنوں میں نئے دور کی شاعری ہے۔انھوں نے اردو شاعری کو نیا احساس، نیا لب ولہجہ، نئی ذہنی بلندی اور نیا شعور دیا۔اقبال کی شاعری کی ابتدا حب وطن اور سامراج دشمنی کے جذبے سے ہوتی ہے[۱۳۴]۔''اے ہمالہ اے فصیل کشور ہندوستاں'' اور''سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا'' جیسے نغمے ۱۹۰۵ء تک دلوں میں

ولولہ پیدا کرتے رہے لیکن ۱۹۰۸ء تک کا وہ عرصہ جو یورپ میں گزرا، وہاں مطالعے ومشاہدے کے ذریعے وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ مروّجہ نظریہ قومیت کسی ملک کی محض اکثریت کے لیے نافع ہوسکتا ہے، اقلیت کے لیے اس میں کوئی کشش نہیں۔ اس موقع پر فکر اقبال متحدہ ہندوستانی قومیت کے تصور سے نکل کر مسلمانانِ عالم کی تمدنی وحدت کی فضا میں سانس لیتی محسوس ہوتی ہے۔ ۱۹۰۸ء کے بعد اقبال نے عالمگیر اسلامی وطنیت کا تصور پیش کیا[۱۳۵]۔ اسی تصور کے تحت انھوں نے کہا کہ:

اگر ملک ہاتھوں سے جاتا ہے جائے ۔۔۔ تُو احکامِ حق سے نہ کر بے وفائی
خریدیں نہ ہم جس کو اپنے لہو سے ۔۔۔ مسلماں کو ہے ننگ وہ بادشاہی
نہیں تجھ کو تاریخ سے آگہی کیا ۔۔۔ خلافت کی کرنے لگا تو گدائی[۱۳۶]

اقبال نے باقاعدہ طور پر فرقہ پرستی اور احیاء پرستی کے خلاف آواز بلند کی۔ اپنی نظم ''سید کی لوح تربت'' میں اپنے دل کی بات کہتے ہوئے انھوں نے کہا کہ:

وا نہ کرنا فرقہ بندی کے لیے اپنی زباں ۔۔۔ چھُپ کے ہے بیٹھا ہوا ہنگامہِ محشر یہاں
وصل کے اسباب پیدا ہوں تری تحریر سے ۔۔۔ دیکھ! کوئی دل نہ دکھ جائے تری تقریر سے
محفلِ نو میں پرانی داستانوں کو نہ چھیڑ ۔۔۔ رنگ پر جو اب نہ آئیں اُن فسانوں کو نہ چھیڑ[۱۳۷]

لیکن اقبال کی مدبرانہ سوچ بہت جلد اس نتیجے پر پہنچ گئی کہ اس تعصب اور فرقہ واریت سے چھٹکارا اب ممکن نہیں۔ اپنی نظم ''صدائے درد'' میں وہ اس جانب اشارہ کرتے ہوئے اپنی افسردگی کا اظہار کچھ اس انداز سے کرتے دکھائی دیتے ہیں کہ:

سر زمیں اپنی قیامت کی نفاق انگیز ہے ۔۔۔ وصل کیسا، یاں تو اک قربِ فراق انگیز ہے
بدلے یک رنگی کے یہ نا آشنائی ہے غضب ۔۔۔ ایک ہی خرمن کے دانوں میں جدائی ہے غضب
جس کے پھولوں میں اخوت کی ہوا آئی نہیں ۔۔۔ اس چمن میں کوئی لطفِ نغمہ پیرائی نہیں[۱۳۸]

''تصویرِ درد'' میں اقبال نے اپنے اس تصور کو پیش کیا ہے جس کی وہ پہلے ہی نشان دہی کر چکے تھے۔ دیدۂ بینائے قوم کی حیثیت سے انھوں نے ہندوستان کی حالت پر اشک فشانی کی ہے۔ یہ اشعار اس دور کے ہندوستان کی تصویرکشی کرتے ہوئے پیغام نجات بھی دیتے ہیں۔ یہاں بھی اقبال کی آواز فرقہ پرستی اور احیاء پرستی کے خلاف پوری قوت سے ابھرتی ہے۔ جب وہ کہتے ہیں کہ:

ٹپک اے شمع آنسو بن کے پروانے کی آنکھوں سے ۔۔۔ سراپا درد ہوں، حسرت بھری ہے داستاں میری
رُلاتا ہے ترا نظّارا اے ہندوستاں! مجھ کو ۔۔۔ کہ عبرت خیز ہے تیرا فسانہ سب فسانوں میں
چھپا کر آستیں میں بجلیاں رکھی ہیں گردُوں نے ۔۔۔ عنادل باغ کے غافل نہ بیٹھیں آشیانوں میں
وطن کی فکر کر ناداں مصیبت آنے والی ہے ۔۔۔ تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں
نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو! ۔۔۔ تمھاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں
تعصب چھوڑ ناداں! دہر کے آئینہ خانے میں ۔۔۔ یہ تصویریں ہیں تیری جن کو سمجھا ہے برا تو نے
شجر ہے فرقہ آرائی، تعصب ہے ثمر اس کا ۔۔۔ یہ وہ پھل ہے کہ جنت سے نکلواتا ہے آدم کو[۱۳۹]

اقبال نے فرقہ بندی اور تعصب کو ہمیشہ قومی یک جہتی کے منافی سمجھا۔ ''ترانۂ ہندی'' میں تو ان کا جذبۂ حب الوطنی اپنی معراج کو پہنچا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ یہ تاریخ کا المیہ ہے کہ ہندوستان کا قومی گیت ''ترانۂ ہندی'' نہیں۔ جب کہ ہندوستان کے سیاسی ماحول میں اقبال کے دیے ہوئے پیغام سے بہتر اور کیا پیغام ہو سکتا ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بَیر رکھنا ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا[۱۴۰]

اقبال نے اسی پر بس نہیں کیا بلکہ ''ہندوستانی بچوں کا قومی گیت'' میں ایک قدم اور آگے بڑھتے ہوئے چشتی اور نانک کی اس سر زمین سے اپنی جذباتی وابستگی کا اظہار کرتے ہوئے فرقہ وارانہ اتحاد کی اہمیت پر زور بھی دیا۔ وہ کہتے ہیں کہ:

چشتی نے جس زمیں میں پیغامِ حق سنایا نانک نے جس چمن میں وحدت کا گیت گایا

تاتاریوں نے جس کو اپنا وطن بنایا جس نے حجازیوں سے دشتِ عرب چھڑایا

میرا وطن وہی ہے، میرا وطن وہی ہے[۱۴۱]

اس کے بعد نظم ''نیا شوالہ'' میں وہ خاکِ وطن کے ذرے ذرے کو دیوتا سمجھتے ہوئے منافرت کی آگ کو دبانے کا مشورہ دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

سچ کہہ دوں اے برہمن! گر تو برا نہ مانے تیرے صنم کدوں کے بت ہو گئے پرانے

اپنوں سے بَیر رکھنا تو نے بتوں سے سیکھا جنگ و جدل سکھایا واعظ کو بھی خدا نے[۱۴۲]

غلامی کی تاریکی دور کرنے اور سامراج کے مظالم ختم کرنے کے لیے اقبال اتحاد و اتفاق پر زور دیتے ہیں لیکن سامراج کی چیرہ دستیاں اور ہندوستانیوں کی غفلت انھیں ہمیشہ تڑپاتی۔ ''سوامی رام تیرتھ'' پر کہی گئی نظم میں بھی وہ انھی خیالات کا پرچار کرتے دکھائی دیتے ہیں لیکن اسی زمانے میں ان کی فکر و نظر میں تبدیلی کے مدھم نقوش ابھرنا شروع ہو گئے۔ ۱۹۰۸ء میں اقبال کی آواز میں اجنبیت کا احساس گہرا ہوتا چلا گیا۔ اقبال نے وطنیت کے خلاف جو تصورات اس زمانے میں پیش کیے وہ اس جارحانہ وطن پرستی کے ردِ عمل میں پیدا ہوئے جو اس زمانے میں ہندو قوم پرستی کی وجہ سے پورے ہندوستان کو اپنی لپیٹ میں لے چکے تھے۔ یہ وطن پرستی کیوں کہ مخلوق خدا کو اقوام کے خانے میں تقسیم کر کے خون ریزی کی طرف مائل کر رہی تھی لہٰذا اقبال اس کے حق میں نہیں تھے۔ ہندوستان کا آئینی حل ان کی نظر میں باہمی مفاہمت اور اجتماعی بیداری کی بنیاد پر ہونا چاہیے۔ وہ مغرب کے وطنیت کے تصور کو طنزیہ انداز میں ہدف بناتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے[۱۴۳]

اقبال ہند کی تاریک فضا سے نالاں تھے۔ غلامی میں مبتلا قوم جو غفلت کی نیند سو رہی تھی، اقبال اس سے سخت مایوس دکھائی دیتے ہیں۔ اس مایوسی کا اظہار کرتے ہوئے وہ برملا کہتے ہیں کہ:

ہند میں اب نور ہے باقی نہ سوز اہلِ دل اس دیس میں ہیں تیرہ روز

وہ اس تیرہ بختی سے نکلنے کی تدبیر تو بتاتے ہیں لیکن ہندوستان کے لوگ خود اس تیرہ بختی سے نکلنا نہیں چاہتے۔

سیاسی تحریکات سے ہم آہنگ قومیت کے شعور کے عناصر کا تجزیہ کرنے سے پہلے اس کوششوں کا تذکرہ ضروری معلوم ہوتا ہے جو اس دور میں تہذیبی اور فکری سطح پر قومی ہم آہنگی کے لیے کی گئیں۔ جیسا کہ عرض کیا گیا کہ یہ کوششیں کوئی نئی نہیں بلکہ اس عظیم ادبی

سرمائے کی داغ بیل امیر خسرو چودھویں صدی میں ہی ڈال چکے تھے۔اسی تسلسل کی روشن مثال بیسویں صدی کے شعرا کی وہ کوششیں جو اردو شاعری میں مذہب کی وسیع النظری، انسان دوستی اور چمن میں سیکڑوں رنگ کے پھول کھلنے دو کے نظریے کی ترویج کرتے ہیں[۱۴۴]۔ اس صدی کے ہندوستان میں مذہبی اختلافات نے جس طرح سے انسانیت کو شرم ناک حد تک پستی کی طرف دھکیل دیا تھا، اردو شعرا نے اس کی بحالی کی کوششیں کیں۔ ان شعرا نے ہر مکتب فکر اور نقطہ خیال کو اپنی شاعری میں جگہ دی۔ ایک طرف رامائن، مہابھارت، گرو گوبند سنگھ، گرو نانک، سیتاجی، لکشمی، ساوتری وغیرہ کو مسلمان شعرا نے اپنی شاعری میں پیش کیا تو دوسری جانب ہندو شعرا نے حمد، نعت، منقبت اور مسلم اکابرین پر نظمیں کہیں۔ اس طرح کی سیکڑوں مثالیں ہندو شعرا کے ہاں سے پیش کی جاسکتی ہیں۔ جس میں تخیل پر اسلامی چھاپ بہت نمایاں ہے۔ تفصیلات کی یہاں گنجائش نہیں۔ ڈاکٹر منشی لال وحشی مظفر پوری کے ایک شعر کی مثال یہاں پیش کر دیتا ہوں:

ہندو اگرچہ وحشیِ بادہ پرست ہے ۔۔۔ لیکن مئے محبتِ حیدرؓ سے مست ہے[۱۴۵]

خود اقبال کے ہاں بھی ایسی نظمیں موجود ہیں جن میں یہ رنگ غالب ہے، لیکن یہاں بھی اقبال ان غیر مسلم اکابرین کے پیغام کو سمجھنے کا درس دیتے دکھائی دیتے ہیں۔ ظاہری بات ہے اگر اقبال گوتم بدھ کی بابت یہ کہتے ہیں کہ:

قوم نے پیغامِ گوتم کی ذرا پرواہ نہ کی ۔۔۔ قدر پہچانی نہ اپنے گوہرِ یک دانہ کی
آہ! بد قسمت رہے آوازِ حق سے بے خبر ۔۔۔ غافل اپنے پھل کی شیرینی سے ہوتا ہے ثمر
آہ! شودر کے لیے ہندوستاں غم خانہ ہے ۔۔۔ دردِ انسانی سے اس بستی کا دل بے گانہ ہے
برہمن سرشار ہے اب تک مے پندار ہے ۔۔۔ شمع گوتم جل رہی ہے محفل اغیار میں[۱۴۶]

تو اس کا مقصد ہندوستان میں موجود فرقہ وارانہ ماحول کے خلاف اپنے ردعمل کو بھی ظاہر کرنا ہوتا ہے۔ بالکل یہی انداز اقبال کی نظم ''سوامی رام تیرتھ'' کا ہے۔ اس نظم میں بھی اقبال نے، ہندوستان میں جو رنگ ونسل اور مذہب کے جھگڑے زور پکڑتے جا رہے تھے، اس کا موازنہ سوامی رام تیرتھ کی تعلیمات سے کرتے ہوئے آج کے ہندوستان کی حالت پر افسوس کا اظہار کیا ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

ہم بغل دریا سے ہے اے قطرۂ بے تاب تو ۔۔۔ پہلے گوہر تھا، بنا اب گوہرِ نایاب تو
آہ! کھولا کس ادا سے تونے رازِ رنگ و بو ۔۔۔ میں ابھی تک ہوں اسیرِ امتیازِ رنگ و بو[۱۴۷]

اقبال کی رواداری اور وسعت نظری کا اندازہ ان کی نظم ''رام'' سے لگایا جاسکتا ہے۔ جسے وہ شری رام چندر کو 'امام ہند' کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔ ملاحظہ کیجیے:

ہے رام کے وجود پہ ہندوستان کو ناز ۔۔۔ اہلِ نظر سمجھتے ہیں اس کو امامِ ہند[۱۴۸]

سرور جہاں آبادی کی شاعری کا آغاز بھی انیسویں صدی کے اواخر سے ہوتا ہے۔ وہ بہت کم سنی میں اس دنیا سے سدھار گئے لیکن اس مختصر عرصے میں بھی انھوں نے شاعرانہ اعتبار سے بلند مقام حاصل کیا۔ وطنی شعور اور قومی یک جہتی کے تصورات کو بھارنے میں سرور کی شاعری کا درجہ کافی بلند ہے۔ ان کے ہاں حب الوطنی کا جذبہ دریا کی لہر بن کر سامنے آیا۔ انھوں نے وطن کو ماں کی حیثیت سے رسیلے اور میٹھے لہجے میں یاد کرنے کا ہنر دیا۔ ان کی نظموں میں ''حب وطن''، ''عروس حب وطن''، ''پھولوں کا کنج''، ''مادر ہند''، ''چشمہِ وطن''، ''سرزمین وطن''، ''خاک وطن''، ''مادر ہند'' اور ''یاد وطن'' وغیرہ خاص طور پر اہمیت کی حامل ہیں[۱۴۹]۔ ''خاک وطن'' کے اشعار سے

سرور کے رنگ طبیعت کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے:

آہ! اے خاکِ وطن! اے سرمہِ نورِ نظر	آہ! اے سرمایہِ آسائشِ جان و جگر
تیرے دامن میں شگفتہ تھے کبھی قدرت کے پھول	گندھ رہے تھے تیری چوٹی میں کبھی وحدت کے پھول
ہر طرف جب چھا رہی تھی خوابِ غفلت کی گھٹا	موتی برساتی تھی تجھ پہ ابرِ رحمت کی گھٹا[۱۵۰]

نظم کا آخری حصہ ہمیں سرور کے کرب کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔ یہ کرب صرف سرور کا نہیں بلکہ ہندوستان میں بسنے والے ہر اس شخص کا کرب ہے جس نے اس خطۂ زمین کو رفتہ رفتہ پستی میں اترتے دیکھا۔ جہاں سب لوگ باہم شیر وشکر ہو کر رہتے تھے۔ وہاں نفرتوں اور عداوتوں نے انھیں مختلف گروہوں اور فرقوں میں بانٹ دیا ہے اور یہ سب کچھ سرور کے زمانے میں بھی ہو رہا تھا۔ اسی لیے سرور اپنے کرب کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

آہ! اے خاکِ وطن! اے درد مندِ بے قرار	آہ! اے شوریدہ قسمت! اے پریشاں روزگار
اڑ رہا تھا تیرا پرچم شوکتِ افلاک پر	سرنگوں ہے تیری عظمت کا نشاں اب خاک پر
جھلملا کر بجھ گئے سب تیرے ایواں کے چراغ	ہیں جگر کے داغ اب تیرے شبستاں کے چراغ
اڑ گیا نورِ سحر تاریکیِ غم چھا گئی	نیّرِ اقبال ڈوبا، شامِ ماتم چھا گئی
اڑ گئی بوئے وفا، حبِّ وطن جاتی رہی	چھا گیا رنگِ خزاں، شانِ چمن جاتی رہی
اب کہاں ایثارِ نفس اور اب وہ جاں بازی کہاں	حسرتیں خوں گشتہ ہیں، کچھ دل کی پستی میں نہاں[۱۵۱]

یہ نظم اس زمانے کے ہندوستان کا نوحہ ہے۔ وہ ہندوستان جہاں ہندو مسلم فسادات نے ملک کی فضا کو مکدر کر رکھا ہے، وہ ہندوستان جہاں غلامی کے گہرے بادل نے انسان سے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت تک چھین لی ہے۔ سرور کو اپنے وطن کے ذرے ذرے سے گہری محبت تھی۔ گوپی چند نارنگ کے مطابق ان کی وطنی شاعری اپنا رنگ و آہنگ سیاستِ وقت سے نہیں لیتی۔ اس کی نوعیت سیاسی نہیں جمالیاتی ہے[۱۵۲] لیکن یہ بات درست معلوم نہیں ہوتی۔ ان کی شاعری میں سیاسی وسماجی منظر کی جھلک پوری طرح عیاں ہے لیکن اس میں عصبیت اور فرقہ واریت کا رنگ کہیں نہیں۔ ان کی حب الوطنی مذہبی امتیازات کو مٹا کر پورے ہندوستان کو دیکھتی ہے۔ وہ ہر مذہب کو اس کی جگہ پر رکھ کر دیکھتے ہیں۔ اس لیے بیسویں صدی میں جب مسلمانوں کے خلاف ہندو شدت پسند یہ پروپیگنڈا کر رہے تھے کہ انھوں نے اپنے دورِ حکم رانی میں ہندوؤں کو غلام بنایا، ان پر مظالم کیے اور ان کے قومی وقار کی توہین کی تو سرور ایک غیر مسلم ہونے کے باوجود اپنی نظم ''شیونِ عروس'' میں مسلمانوں کی سیاسی عظمت کے زوال پر یوں مرثیہ لکھ رہے ہیں:

کیا ترا نام ونشاں ہے؟ کیا حسب ہے؟ کیا نسب	ہے کہاں تیرا گھرانا، اور کدھر تیرا وطن
مجھ سے سن کر یہ سخن گردن جھکا کر شرم سے	یوں ہوئی گویا زباں سے وہ عروسِ سیم تن
بارگاہِ عزّ و شان و دولتِ اسلامیہ	دلّی والی ہوں میں اردوئے معلّیٰ کی دلہن
جس پہ لہرایا کیا صدیوں تک اسلامی نظام	نذرِ طوفاں ہو گیا وہ تختۂ عہد کہن
خانہ ویرانی برستی ہے در و دیوار پر	نقشِ عبرت اب ہیں آثار الصنادیدِ کہن

ہند میں اسلام کا جھنڈا ہے اب یوں سر نگوں
کھا کے نیزہ خاک پر جیسے گرے کوئی ہرن

گل کھلاتی رزم میں تھی جن کی تیغِ خوں فشاں
ان کے مرقد پر ہے پھولا لالہِ خونیں کفن

چھپ گئے کتمِ عدم میں کیسے کیسے حکمراں
لگ گیا افسوس کس کس ماہِ کامل کو گہن

سر پہ دلّی کی جہاں داری کا سہرا اب کہاں
شاہدِ ماتم نشیں ہے اب یہ انگریزی دلہن

مٹ گئے سب رفتہ رفتہ میری عظمت کے نشاں
رہ گیا باقی فقط افسانہِ رنج و محن[۱۵۳]

سرور نے ''بندے ماترم'' لکھ کر وطن کی تعریف کی، اس کے ساتھ ساتھ ''پدمنی'' اور ''چتوڑ'' کی گزشتہ عظمت پر بھی انھوں نے نظمیں لکھیں۔ انھوں نے ہندو مسلم تاریخ کے گوشوں کو چھیڑتے ہوئے احتیاط کا دامن ہاتھ سے جانے نہ دیا۔ ان کی نظموں میں کہیں بھی مذہبی منافرت اور فرقہ وارانہ جانب داری دکھائی نہیں دیتی[۱۵۴]۔ یہی سبب ہے کہ عبدالقادر سروری نے ان کی بابت لکھا کہ ''وہ حقیقی ہندوستانی شاعر ہے ان میں شاعرانہ تنگ خیالی یا مذہبی تعصب نام کو بھی نہیں ہے''[۱۵۵]۔ نظم ''مرغ و صیاد'' میں تو شاعرانہ علامتوں اور استعاروں کا ایسا برمحل استعمال کیا گیا ہے کہ سرور کو بے اختیار داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ شعر ملاحظہ کیجیے:

ٹوٹتا ہے خانہِ صیاد میں دم ہائے ہائے
ہو رہا ہے بلبلِ تصویر ماتم ہائے ہائے[۱۵۶]

ہندوستان کی غلامی کی ایسی تصویر اور اس قدر خوب صورت شاعرانہ اظہار بہت کم دیکھنے میں آیا ہے۔ ان کا سیاسی نظریہ اگر سمجھنا ہو تو نظم ''رزم و گرم فریق'' اس کی بہترین مثال ہے۔ اس نظم میں وہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو آپس کی لڑائی، اختلافات، نفرت اور خانہ جنگی ترک کر کے یک جہتی اور بھائی چارے کا درس دیتے ہوئے آزادی کی جدوجہد میں مل جل کر کام کرنے کی طرف توجہ دلا رہے ہیں۔ سرور کہتے ہیں کہ:

فخرِ وطن ہیں دونوں اور دونوں مقتدر ہیں
اے قوم تیرے دکھ کے دونوں ہی چارہ گر ہیں

آپس کی نفرتوں سے ہیں آہ! خوار دونو
اغیار کی نظر میں ہیں بے وقار دونوں

مل کر چلو کہ آخر ہو دونوں بھائی بھائی
بھائی سے کیا لڑائی، بھائی سے کیا برائی

کب تک یہ خانہ جنگی کب تک یہ خود ستائی
زیبا نہیں بڑوں کو پندارِ خود نمائی

مل کر گلے نکالو، دل کا غبار دونو
اک خاک کے ہو پُتلے، پایانِ کار دونو

برپا ہے شورِ طوفاں ہو ہوشیار دونو
کر دو بھنور سے قومی بیڑے کو پار دونو[۱۵۷]

اس زمانے ک ہندوستان میں لوگوں کا جس طرح سے معاشی استیصال کیا جا رہا تھا۔ سرور کے نزدیک اس استیصال سے چھٹکارے کا واحد راستہ بھی آزادی کا حصول تھا۔ وہ معاشی استیصال کی تصویر کشی کرتے ہوئے نظم ''نوروز'' میں کہتے ہیں کہ:

تمام سال پیا ہو جنھوں نے خونِ جگر
وہ غم نصیب پئیں بھر کے خاک جامِ نشاط

نصیب میں ہو غمِ قحط جن غریبوں کے
اڑائیں چاپ و مٹن کیا وہ تلخ کامِ نشاط

جلا رہا ہے زمانہ وہ غم نصیب ہیں ہم
ہمارے خونِ جگر سے چراغ شامِ نشاط

الم نصیب ہے تو قوم! یہ کہاں امید
ترا نظامِ معیشت بنے نظامِ نشاط[۱۵۸]

چکبست بھی سرور سے بے حد متاثر تھے۔ان کی شاعری میں بھی تحریک آزادی کی اعتدال پسند اور مصلحانہ روش کا پرتو دکھائی دیتا ہے۔چکبست کے نزدیک ایک غلام قوم کے لیے وطن دوستی کا جذبہ تمام جذبوں سے اہم ہے۔ان کی پوری شاعری کا قصر ان ہی بنیادوں پر قائم ہے۔وہ غلام ہندوستان کی افسوس ناک صورت حال کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جب یہ کہتے ہیں کہ:

برسوں سے ہو رہا ہے برہم سماں ہمارا — دنیا سے مٹ رہا ہے نام و نشاں ہمارا
کچھ کم نہیں اجل سے خوابِ گراں ہمارا — اک لاش بے کفن ہے ہندوستاں ہمارا[۱۵۹]

تو ان کے لہجے کا کرب پوری طرح عیاں ہو جاتا ہے۔ایسا نہیں کہ وہ ''خاک ہند'' کی عظمت کے منکر ہیں لیکن وہ اس زمانے کے غلام ہندوستان کی حالت نہیں دیکھ پاتے اسی لیے ''مرقع عبرت'' میں وہ قوم کو خواب غفلت سے بیدار ہونے کی تلقین کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

ہشیار ہو اے قوم یہ غفلت نہیں اچھی — یہ خیرگیِ نشۂ دولت نہیں اچھی
معزولیِ آئینِ شرافت نہیں اچھی — یہ دشمنِ اخلاقِ شریعت نہیں اچھی
مانا شبِ ادبار کا ہر سمت اثر ہے — گر خواب سے بیدار ہو اب بھی تو سحر ہے[۱۶۰]

اردو کی وطنی شاعری میں ''خاک وطن''، ''ہمارا وطن دل سے پیارا وطن'' اور ''وطن کو ہم وطن ہم کو مبارک'' وغیرہ جیسی نظموں کو ہمیشہ اونچا مقام دیا جائے گا۔چکبست کے ہاں ہوم رول کی حمایت میں متعدد نظمیں ملتی ہیں۔وہ ہوم رول کی حمایت میں کہتے ہیں کہ:

زمیں سے عرش تلک شور ہوم رول کا ہے — شباب قوم کا ہے زور ہوم رول کا ہے[۱۶۱]

ہندوستان سے تعلق رکھنے والے محققین اور ناقدین نے چکبست کی بابت لکھا کہ اس نے اپنی شاعری میں بلا امتیاز وتفریق ہر فرقے کی ترجمانی کی۔اس کی بیش تر نظمیں ایسی ہیں جن میں ہندوؤں کے ساتھ ساتھ ان کے ہم پایہ مسلمانوں کا ذکر بھی بالالتزام ہے۔اس کے نزدیک دونوں ہند کی آنکھوں کے تارے ہیں[۱۶۲]۔ان کے ہاں فرقہ واریت کا شائبہ تک نہیں[۱۶۳]۔لیکن بہ غور دیکھنے سے یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ اپنے تمام تر رکھ رکھاؤ کے باوجود چکبست کے ہاں ایک خاص قسم کی جانب داری دکھائی دیتی ہے۔۱۹۱۱ء میں جب ان کی نظم ''قومی مسدس'' شائع ہوئی تو اس نظم سے کانگریس کی جانب ان کے جھکاؤ کے واضح اشارے سامنے آئے۔یہ نظم ہندو یونی ورسٹی کے قیام کے لیے چندہ جمع کرنے کی مہم کے طور پر لکھی گئی۔لکھنؤ میں ہونے والے جلسے میں مدن موہن مولویہ بھی تشریف فرما تھے بلکہ اس نظم کے حاشیے میں یہ بھی درج ہے کہ اسے منشی نول کشور نے خرید کر اس سے ہونے والی آمدنی بنارس ہندو یونی ورسٹی کو دے دی تھی[۱۶۴]۔اس کا مقصد بلا شبہ نیک تھا اور اس میں چکبست کی جانب داری کہیں دکھائی نہیں دیتی لیکن جب وہ اس نظم کے بیان میں ایک جانب یہ کہتے ہیں کہ:

سروں میں جب وطن کا جنون باقی ہے — رگوں میں بھیشم و ارجن کا خون باقی ہے
تمھارے واسطے لازم ہے مالوی کا بھی پاس — کہ جس کی ذات سے اٹکی ہوئی ہے قوم کی آس
لیا غریب نے گھر بار چھوڑ کر بن باس — جو یہ نہیں ہے تو کہتے ہیں پھر کسے
تمام عمر کٹی ایک ہی قرینے پر — گرایا اپنا لہو قوم کے پسینے پر[۱۶۵]

اس کے علاوہ ''گائے'' اور ''بال گنگا دھر تلک'' پر لکھی گئی نظمیں ان کے نظریے کی عکاس ہیں تو دوسری جانب علی گڑھ کے اکابرین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ''کرزن سے جھپٹ'' میں تضحیک آمیز رویہ اختیار کرنا ان کی جانب داری کو پوری طرح واضح کر رہا ہے۔اس مصرعے:

دشمنِ ملک علی گڑھ کے پرانے کھوسٹ[۱۶۶]

سے میرے اس خیال کی توثیق ہوتی ہے۔ یہاں میری مراد ہرگز یہ نہیں کہ چکبست کوئی فرقہ پرست نظریے کے حامل تھے بلکہ محض ان ناقدین کو جواب دینا مقصود تھا جنھوں نے چکبست کی غیر جانب داری کی بابت زمین آسمان کے قلابے ملائے تھے۔اس نظریاتی اختلاف سے قطع نظر چکبست کی وطن دوستی اور مشترک ہندوستانی تہذیب کے حوالے سے کی جانے والی کوششوں سے بہر حال انکار ممکن نہیں۔ دیگر بہت سے حساس شعرا کی طرح انھیں بھی ہندو مسلم تفریق سے سخت اذیت پہنچتی تھی۔جس اظہار وہ اپنی شاعری میں بھی برملا کرتے تھے۔ ملاحظہ کیجیے:

نئے جھگڑے نرالی کاوشیں ایجاد کرتے ہیں　　　وطن کی آبرو اہل وطن برباد کرتے ہیں[۱۶۷]

صفی کی نظموں اور غزلوں میں سیاسی شعور کی جھلک نمایاں ہے۔اپنے دور کے پس نظر میں کہی گئی ان کی غزلیں اس زمانے کی بہترین عکاس ہیں۔جیسے:

زور ہی کیا تھا جفائے باغ باں دیکھا کیے　　　آشیاں اجڑا کیا ہم ناتواں دیکھا کیے
دل شکستہ درد میں ڈوبی ہوئی آواز ہے　　　میں ہوں اب کنجِ قفس ہے حسرتِ پرواز ہے[۱۶۸]

وہ بنیادی طور پر نظم کے شاعر تھے لیکن ان کی غزلوں میں بھی وطن کے اجڑنے اور اس میں رہنے والوں کی بے بسی کو اچھی طرح محسوس کیا جاسکتا ہے۔انھوں نے اپنی نظموں میں قومیت کا واضح تصور پیش کیا۔اس بابت ان کا کہنا ہے کہ:

قوم سنیے نام ہے مجموعۂ افراد کا　　　جس میں ہو کچھ مادہ امداد و اسمداد کا
کام کرنا مل کے ناممکن نہیں اضداد کا　　　دیکھ لیجے کارخانہ عالمِ ایجاد کا
امتزاجِ چار عنصر آب و آتش خاک و باد　　　خود بتاتا ہے کہ منشائے ہستی اتحاد[۱۶۹]

انھوں نے ہندو مسلم، شیعہ سنّی اور دیگر تمام فرقوں کو مل جل کر اتحاد و اتفاق کا درس دیا۔ بیسویں صدی کے آغاز ہی سے ظفر علی خان کی شاعری کے خدوخال ابھرنے لگے۔ وقار عظیم نے انھیں ملّی شاعر قرار دیا ہے لیکن بیسویں صدی کے پہلے ربع میں ظفر علی خان قومی یک جہتی کے علم بردار اور تحریک آزادی کے پرجوش رہنما کے طور پر سامنے آئے۔''مارشل لا''، ''آزادیِ ہند''، ''فانوس ہند کا شعلہ'' اور اس طرح کی دیگر نظمیں ان کے جذبہ حریت کو پوری طرح ظاہر کرتے ہیں۔ظفر علی خان کا انداز پرجوش اور خطیبانہ ہے۔شبلی کے بعد ظفر علی خان ہی وہ شاعر ہیں جنھوں نے ہر سیاسی واقعے کو ملّی نقطہ نظر سے شاعری کا حصہ بنایا۔تحریک خلافت اور ترک موالات کے دوران ان کی شاعری میں جو بے باکی نظر آتی ہے اس نے مسلمانانِ ہند کے سیاسی شعور اور جذبہ ملّی کو شعلہ فشاں بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔متعدد ابواب میں ظفر علی خان کے ان رجحانات پر گفتگو ہو چکی ہے۔ سامراجیت کے ڈیڑھ سو سالہ تعزیری زمانے کو اپنی نظم ''ڈیڑھ سو سال کی وفاداری کا صلہ'' میں بڑی بے خوفی اور بے باکی سے پیش کیا ہے۔اس کے علاوہ ہندوستان میں قوموں کی تقسیم آزادی کی اہمیت اور مشرق

میں نئی بستی کے بسانے کا جس انداز میں تذکرہ ملتا ہے گویا ان کے ذہن میں نئی مملکت کے خطوط اور اس کے خدوخال کے کچھ کچھ نقوش ضرور پیدا ہو رہے ہیں۔

اے ہم وطنو یاد رہے خوب یہ تم کو — بستی نئی مشرق میں تمھیں کو ہے بسانی
وقت آپہنچا کہ ہو تقسیم قوموں کی نئی — اک نئی دنیا ہو اور اس کا نیا مقسوم ہو[170]

غلامی کے احساس کا بار بار اظہار اور ہر صورت میں استعمار سے آزادی کی جدوجہد کو ظفر علی خان لازمی سمجھتے تھے۔ اس بابت ان کا واضح پیغام یہ تھا کہ:

آزاد غلامی سے کرو اپنے وطن کو — اور مرتبہ اقوام میں پھر اس کا بڑھا دو[171]

ان کے خیال میں مشترکہ جدوجہد کے ذریعے آزادی کا حصول آسان ہو سکتا ہے لیکن ہندو مسلم فسادات نے اس راہ میں رکاوٹ کھڑی کر دی تھی۔ وہ ان اختلافات کو جلد سے جلد ختم کرنے کا مشورہ دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

آپس کی پھوٹ ختم ابھی تک نہیں ہوئی — آزادیِ وطن کے طلب گار ہیں کہاں[172]

''دسہرہ اور محرم'' اور ''خلافت اور ہنود'' وغیرہ جیسی نظموں میں بھی وہ ہندو مسلم یک جہتی کا راگ الاپتے نظر آتے ہیں لیکن ان کی کلیات میں ایسی مثالیں بہت کم ملتی ہیں۔ البتہ انگریزوں کے ظلم و تشدد کے خلاف شدید ردِ عمل کی مثالیں جا بہ جا دکھائی دیتی ہیں۔ مثلاً ''جنگ آزادی میں شامل ہو گیا لاہور بھی'' میں حکومتی جبر و تشدد کے بعد پیدا ہونے والی صورت حال بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

لاٹھیاں برسیں نہتوں پر تو آکر جوش میں — چوٹ کی لذت پکار اٹھی کہ ہاں! کچھ اور بھی
گرم تھا پنجاب کا خوں کیوں نہ آخر کھولتا — جنگِ آزادی میں شامل ہو گیا لاہور بھی[173]

تقسیم کے اعلان کے بعد لدھیانہ اور جگراؤں کے مسلم مہاجرین نے ہجرت کے کرب اور راستے میں اپنی تباہی و بربادی اور شہادتوں کی جو داستان سنائی، اس پر ہر آنکھ اشک بار تھی۔ سکھ درندوں کے وحشت ناک مظالم سے متاثر ہو کر ظفر نے پُر درد انداز میں کچھ اشعار کہے۔ ''اسلام کی تسلّی'' کے تحت یہ اشعار بھی کلیات ظفر میں شامل ہیں۔ ملاحظہ کیجیے:

مٹائی جائے گی سکھوں کی نسل دنیا سے — دبایا جائے گا فتنوں کو اور فسادوں کو
یہ گرگ زادے جہنم میں بسنے والے ہیں — یہیں ملی تھی جگہ ان کے باپ دادوں کو
خدائے پاک سے مانگو دعا مسلمانو! — خدا تباہ کرے ان خبیث زادوں کو[174]

ہندوستان میں اٹھنے والے فتنوں کو دیکھنے کے بعد ظفر علی خان کے ذہن میں یہ بات واضح ہو چکی تھی کہ مسلمانوں کے لیے علاحدہ ریاست کا قیام کس قدر ضروری ہے۔ اس لیے وہ مسلمانوں کو مسلم لیگ کے ہاتھ مضبوط کرنے کا مشورہ دیتے ہوئے واضح ہدایت دیتے ہیں کہ:

مسلماں ہے تو مسلم لیگ کا جھنڈا اڑاتا چل — پیامِ آزادیِ کامل کا ملّت کو سناتا چل[175]

اسی طرح آریا سماج کے فتنے کی بابت بھی ظفر علی خان کا لہجہ بڑا جارحانہ ہے۔ وہ ہندوستان میں ہونے والے فتنے اور فساد کی وجہ اس تحریک کو قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

شعلے جس آگ کے ہیں وطن میں بلند آج　　　بھڑکا رہا اس آگ کو ہے آریا سماج[۱۷۶]

تمام تر رکاوٹوں اور مشکلات کے باوجود ظفر نے ببانگ دہل یہ اعلان کیا کہ مسلمان اپنے لیے آزاد وطن ضرور حاصل کریں گے۔ ۱۹۴۱ء میں کہی گئی ایک نظم میں انھوں نے واضح طور پر کہا کہ:

گاندھی وساورکر ہوں کہ ایمری، ہم سے الجھ کر کریں گے کیا　　　عزم ہمارا ٹل نہیں سکتا بن کے رہے گا پاکستان[۱۷۷]

امرتسر میں ہونے والے ہنگامے ہوں یا ہندوستان کے مختلف علاقوں میں ہونے والے فسادات، ظفر علی خان کی نظر سے کوئی واقعہ اوجھل نہیں۔ انھوں نے ہر اس سانحے کو شاعری میں پیش کیا جو ہندوستان کے لوگوں کے لیے تکلیف کا باعث بنا۔ ''مقتل ننکانہ'' میں ان کا انداز ملاحظہ کیجیے:

خون امرتسر کی سرخی رونقِ ننکانہ ہے　　　کس قدر رنگیں ہماری بزم کا افسانہ ہے
جنس آزادی کی ارزانی مسلّم ہے مگر　　　خونِ ابنائے وطن اس جنس کا بیعانہ ہے
سر کے بل چل کر اکابی آئے مقتل کی طرف　　　دل میں ہے شوقِ شہادت اور بے تابانہ ہے[۱۷۸]

حسرت موہانی سے اردو غزل میں ایک نئے دور کا آغاز ہوتا ہے۔ شعر و ادب کے معاملے میں وہ جتنے اعتدال پسند تھے، سیاسی طور پر اتنے ہی نڈر، بے باک اور انتہا پسند۔ وہ بغاوت اور انقلاب کے علم بردار تھے۔ انھوں نے قومی جدوجہد میں مجاہدانہ عزم و حوصلے اور جرأت سے حصہ لیا۔ حسرت کا زمانہ سیاسی شورش اور ہنگامے کے عروج کا زمانہ تھا۔ انگریز ہندوستان کی آزادی کے بجائے اس کی پرچھائیں سے لوگوں کو مطمئن کرنے کی کوششوں میں مصروف تھے۔ اس رویے کی وجہ سے کانگریس کی قیادت اعتدال پسندوں کے ہاتھوں سے نکل کر انتہا پسندوں کے ہاتھوں میں آ گئی تھی۔ اعتدال پسند رہنما گوکھلے اور رانا ڈے آئینی جدوجہد پر یقین رکھتے تھے۔ اس کے برعکس انتہا پسندوں کے سرغنہ بال گنگا دھر تلک باغیانہ اور انقلابی خیالات کے حامل تھے۔ وہ سوراج کو اپنا پیدائشی حق سمجھتے تھے۔ حسرت کا فطری رجحان تلک کی طرف تھا۔ ان کی پرجوش طبیعت، مجاہدانہ سرشت اور جذبہ حریت پسندی انھیں تلک کے قریب لے آئی[۱۷۹]۔ وہ ہندوستان کو قبضہ اغیار سے نکالنے کے لیے عملی جدوجہد کے حامی تھے۔ اسی لیے وہ کہتے تھے کہ:

نام سے قانون کے ہوتے ہیں کیا کیا ستم　　　جبر یہ زیرِ نقاب دیکھیے کب تک رہے
دولتِ ہندوستاں قبضۂ اغیار میں　　　بے عدو و بے حساب دیکھیے کب تک رہے[۱۸۰]

جوش کے ذریعے اردو شاعری ایک نئے دور میں داخل ہوتی ہے۔ ان کی شاعری اس پس منظر میں ابھرتی ہے جس میں ایک خلافت، سودیشی اور ترک موالات کی تحریکیں پورے زور و شور سے جاری ہیں تو دوسری طرف جلیاں والا باغ کا خون آشام ڈراما رچایا جا رہا ہے اور ۱۹۲۳ء کے قریب اٹھنے والی شدھی اور سنگھٹن کی تحریکوں نے پورے ہندوستان کو فسادزدہ ملک بنا رکھا تھا۔ ۱۹۲۷ء میں محض چند ماہ کے اندر جس تواتر سے فسادات ہوئے اور یہ فسادات ہر جگہ موضوع بحث بنے رہے، اس نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے اندر خلیج کو مزید بڑھا دیا۔ ۲۵ سے زائد فسادات میں سیکڑوں لوگوں کی ہلاکتیں اور املاک کی تباہی نے نفاق اور علاحدگی پسندانہ رجحانات کو مزید فروغ دیا[۱۸۱]۔ اس کے بعد ۱۹۳۱ء میں کان پور میں ہونے والے فسادات جس میں جوش ملیح آبادی کے مطابق فریقین کے سات سو افراد ہلاک ہوئے۔ ان حالات میں ملکی یک جہتی کی فضا کو شدید خطرات لاحق ہو گئے۔ شدھی سنگھٹن اور فسادات سے لگنے والے کاری زخم کو گاندھی

جی کے اکیس روزہ برت بھی مندمل نہ کر سکے۔ ۱۹۲۷ء کی آل پارٹیز کنونشن نے مولانا محمد علی جوہر اور قائداعظم دونوں کو بدل کر رکھ دیا اور وہ لوگ ہندو مسلم اتحاد سے کلّی طور پر مایوس ہو گئے۔ ۱۹۲۹ء میں نہرو نے ہندوستان کی مکمل آزادی کا نصب العین پیش کر دیا۔ ۱۹۳۰ء میں ملک میں آزادی کا حلف اور نارچ تک گاندھی کی نمک ستیہ گرہ اور ڈانڈی مارچ سے سول نافرمانی کی تحریک کا آغاز بھی ہو گیا۔ اسی دور میں صوبہ سرحد کے پٹھانوں نے بھی تحریک آزادی میں حصہ لینا شروع کر دیا۔ قصہ خوانی بازار میں جلیاں والا کی تاریخ دہرائی گئی اور پورے ملک میں ایسا بحران آ گیا کہ اس سیاسی فضا میں ایک فریق دوسرے کی بات سننے کو تیار دکھائی نہیں دیتا۔ ملک میں جگہ جگہ متشددانہ بغاوتیں شروع ہو گئیں۔ کسانوں اور مزدوروں میں بھی سیاسی شعور پیدا ہونے لگا۔ موپلان کسانوں کی بغاوت اور احمد آباد کے ملوں کی ہڑتال بین الاقوامی کساد بازاری، ہندوستان کی اقتصادی بدحالی اور پہلی جنگ عظیم کے اثرات نے رفتہ رفتہ ہندوستان کے لوگوں کی کمر توڑ کر رکھ دی۔ اس فضا میں جوش کی شاعری نے آنکھیں کھولی اور پروان چڑھی۔ اس لیے ان کی شاعری میں وہ تین محرکات اوّل فرقہ وارانہ یک جہتی، دوم ہندوستانیت اور وطنیت کا احساس اور سوم طبقاتی کش مکش کا ادراک پوری طرح موجود ہے۔ ان کے ابتدائی دور کی نظموں میں ہندوستانیت کی فضا بھرپور طریقے سے موجود ہے۔ ''نقش و نگار'' اور ''روح ادب'' میں شامل نظمیں اس کی آئینہ دار ہیں۔ ان کی سیاسی شاعری کا آغاز ''اے وطن، پاک وطن، روح رواں احرار'' والی نظم سے واضح ہونا شروع ہوا جس میں وطن کی آزادی کا جوالہ مکھی پھوٹ پڑا اور وہ باقاعدہ طور پر وطن کی آزادی کا گیت الاپنے لگے۔ ۱۹۲۷ء کے فسادات کا ردعمل ان کے ہاں بہت شدید تھا۔ انھوں نے واضح الفاظ میں فرقہ پرستی کے خلاف اور قومی یک جہتی کی حمایت میں آواز بلند کی[۱۸۲]۔ چند اشعار ملاحظہ کیجیے جن میں وہ طنزیہ انداز میں اپنے ردعمل کا اظہار کرتے دکھائی دیتے ہیں:

یہ ستم کیا اے کنیز و کفر و ایماں کر دیا | بھائیوں کو گائے اور باجے پہ قرباں کر دیا
ولولے میرے بڑھیں گے ناز فرماتے ہوئے | فرقہ بندی کا سرِ ناپاک ٹھکراتے ہوئے
ڈال دوں گا طرح نو! اجمیر اور پریاگ میں | جھونک دوں گا کفر و ایماں کو دہکتی آگ میں
کوثر و گنگا کو اک مرکز پہ لانے کے لیے | اک نیا سنگم بناؤں کا زمانے کے لیے
ایک دینِ نو کی لکھوں کا کتابِ زر فشاں | ثبت ہو گا جس کے زریں جلد پر ہندوستاں[۱۸۳]

جوش نے جن تصورات کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا وہ تصورات اس زمانے کے ہندوستان کے لیے مشترک اور عام تھے۔ نسلی منافرت، سیاسی غلامی، قومی نفاق کی مذمت نے ان کی شاعری کو بڑی مقبولیت عطا کی۔ انھوں نے ہمیشہ جبر و استبداد سے بغاوت کا اظہار کیا اور آزادی کی قدر و قیمت کا احساس دلاتے ہوئے کہا کہ:

سنو اے بستگانِ زلف گیتی | ندا کیا آرہی ہے آسماں سے
کہ آزادی کا اک لمحہ ہے بہتر | غلامی کی حیاتِ جاوداں سے[۱۸۴]

انھوں نے جا بہ جا برطانوی اقتدار اور تسلط سے اپنی نفرت کا اظہار کیا۔ برطانوی حکومت کے خلاف لکھی گئی نظموں میں ''وفادارانِ ازلی کا پیغام شہنشاہِ ہندوستان کے نام''، ''وفاق''، ''ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں کے نام''، ''شکستِ زنداں کا خواب''، ''دامِ فریب''، ''نئے مہرے''، ''ہنٹر کو سلام''، ''روح استبداد کا فرمان''، ''خونی بینڈ''، ''لمحہِ آزادی''، ''آثارِ انقلاب''، ''وطن''، ''اللہ

کرے‘‘ اور’’لمحہِ آزادی‘‘ وغیرہ بڑی اہمیت کی حامل ہیں۔’’روحِ استبداد کا فرمان‘‘ میں مغربی استعمار کے ظالمانہ نظام پر طنز کرتے ہوئے جوش کا کہنا تھا کہ:

ہاں اے مرے ذی ہوش فسوں کار سپوتو — جاگے ہوئے محکوم دماغوں کو سلا دو
روٹی کا جو طالب ہو اسے بھوک سے مارو — جو بھوک کا شاکی ہو اسے زہر کھلا دو
پانی کا طلب گار ہو جس کھیت میں دہقان — اس کھیت میں پانی کے عوض آگ لگا دو[۱۸۵]

تحریک آزادی کی شدت اور ہر طرف پھیلی شورشوں کے پس منظر میں کہی گئی ان کی نظم’’شکست زنداں کا خواب‘‘ اور’’خونیں بینڈ‘‘ اپنی نوعیت کی منفرد نظمیں ہیں۔ وہ ان نظموں میں اس سیاسی انقلاب کی آمد کا اعلان کرتے نظر آتے ہیں جو ان کے نزدیک بہت جلد آیا ہی چاہتا ہے۔’’خونیں بینڈ‘‘ کے یہ اشعار:

کتنی ماؤں کے کلیجے کی ہیں قاشیں تجھ میں — کتنے ماہ پارہ جوانوں کی ہیں لاشیں تجھ میں
تیری ہر تان میں پوشیدہ ہیں لاکھوں آنسو — تیری آواز میں غلطاں ہے جوانوں کا لہو[۱۸۶]

جہاں ایک طرف یاسیت کے احساس کی عکاسی کر رہے ہیں وہیں’’شکست زنداں‘‘ میں وہ استعماری قوتوں کو للکارتے ہوئے غلامی کی زنجیریں توڑنے کا اعلان کرتے دکھائی دیتے ہیں:

بھوکوں کی نظر میں بجلی ہے، توپوں کے دہانے ٹھنڈے ہیں — تقدیر کے لب کو جنبش ہے، دم توڑ رہی ہیں تدبیریں
کیا ان کو خبر تھی ہونٹوں پر جو قفل لگایا کرتے تھے — اک روز اسی خاموشی سے ٹپکیں گی دھکتی تقریریں
سنبھلو کہ وہ زنداں گونج اٹھا، جھپٹو کہ وہ قیدی چھوٹ گئے — اٹھو کہ وہ بیٹھیں دیواریں، دوڑو کہ وہ ٹوٹیں زنجیریں[۱۸۷]

’’وفادارانِ ہند کا پیام شہنشاہِ ہندوستان کے نام‘‘ میں ان کے لہجے کی کاٹ اور طنز کے نشتر تو ایسا تحرک پیدا کرتے ہیں کہ اسے لفظوں میں بیان نہیں کیا جاسکتا۔ آج بھی یہ نظم اپنی تاثیر پزیدی کے لحاظ سے اتنی ہی موثر ہے جتنی کہ اپنی تخلیق کے زمانے میں تھی۔ ملاحظہ کیجیے:

تاج پوشی کا مبارک دن ہے، اے عالم پناہ — اے غریبوں کے امیر، اے مفلسوں کے بادشاہ
اے گدا پیشوں کے سلطاں، جاہلوں کے تاج دار — بے زروں کے شاہ، دریوزہ گروں کے شہریار
دل کے دریا نطق کی وادی میں بہہ سکتے نہیں — آپ کی ہیبت سے ہم کچھ کھل کے کہہ سکتے نہیں
لیکن اتنا ڈرتے ڈرتے عرض کرتے ہیں ضرور — ہند سے واقف کیے جاتے نہیں شاید حضور
آپ کے ہندوستان کے جسم پر بوٹی نہیں — تن پر اک دھجی نہیں ہے پیٹ میں روٹی نہیں[۱۸۸]

وہ جس جوش اور جذبے سے ہندوستان کو غلامی سے نجات دلانے کی جدوجہد کی توقع کر رہے تھے، وہ جذبہ جب پوری طرح ہندوستانیوں کے دل میں ابھرتا نہیں دیکھتے تو جھنجھلاہٹ کا شکار ہو کر اپنے ہم وطنوں کو اس طرح مخاطب کرتے ہیں:

اے ہند کے ذلیل غلامانِ روسیا — شاعر سے تو ملاؤ خدا کے لیے نگاہ
تجھ پر مرے کلام کا ہوتا نہیں اثر — چونکا رہا ہوں کب سے میں شانے جھنجھوڑ کر[۱۸۹]

جوش نے اس وقت کی سیاسی صورت حال پر مادر وطن کی زبان سے تبصرہ اور تنقید کا سلسلہ جاری رکھا۔ ''مادر ہند'' میں وطن کے فرزندوں، کانگریس، مسلم لیگ اور کمیونسٹوں سے خطاب کرتے ہوئے انھیں زمانے کے حالات اور سامراجی سازشوں سے آگاہ کیا[۱۹۰]۔ اس طرح کی نظمیں باہمی اتحاد اور حصول آزادی کی جدوجہد میں اہم کردار ادا کر رہی تھیں۔

اٹھ اور ہلا کے رکھ دے یہ میدانِ ہست وبود — اغیار کو پیامِ عدم دے ترا وجود
بڑھ اور طوق کاٹ دے زنجیر توڑ دے — رختِ سماں پہ آگ کا دامن نچوڑ دے[۱۹۱]

جوش ہندوستان میں فرقہ واریت کا ذمے دار انگریزوں اور ہندو شدت پسند احیا پرستوں کو سمجھتے ہیں۔ وہ نوجوانوں کو سبحہ وزنار توڑ دینے کا مشورہ دیتے ہیں چناں چہ علی گڑھ کو ''ہلاک جلوہِ وضع فرہنگ'' بھی کہنے سے گریز نہیں کرتے۔ تفریق پسندی پر افسوس کرتے ہوئے وہ برملا کہتے ہیں کہ:

ابر بن بن کر برستی ہیں خبر بھی ہے تجھے — گلشنِ اعدا پر تیری باہمی خوں ریزیاں[۱۹۲]

ایک اور نظم ''بہتے ہوئے خوں کی برادری'' میں بھی وہ اسی قسم کے خیالات کو دہراتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

یاد رکھو جذبہِ غیرت میں جوش آجائے گا — خوں بہا تو ہندو و مسلم کو ہوش آجائے گا
غنچہِ امید اربابِ وطن کھل جائے گا — خاک پر بہتے ہی دونوں کا لہو مل جائے گا[۱۹۳]

یک جہتی کی آواز اور فرقہ واریت کے خلاف اعلان جنگ کرتے ہوئے انھوں نے دونوں اقوام کو تنبیہ کی کہ:

سنتے ہیں طوفان میں ڈوبا ہوا تھا اک درخت — جس کی چوٹی پر ڈرے بیٹھے تھے دو آشفتہ بخت
ایک ان میں سانپ تھا اور ایک سہما نوجوان — دو ضدوں کا ایک بھیگی شاخ پر تھا آشیاں
سچ ہے دردِ مشترک میں ہے وہ سوزِ اتحاد — عشق میں جس سے بدل جاتے ہیں آئینِ عناد
لیکن اے عاقل مسلمانو! مدبر ہندوؤ! — ہند کے سیلاب میں اک شاخ پر تم بھی تو ہو[۱۹۴]

اپنے ابتدائی دور کی نظموں میں وہ دو قومی نظریے سے متعلق مسلم لیگ کے مطالبے کے حامی بھی دکھائی دیتے ہیں۔ ''وقت کی آواز'' میں کانگریس کو بڑی اور لیگ کو چھوٹی بہن قرار دیا۔ اپنے نقطہِ نظر کی وضاحت میں ان کا کہنا تھا کہ:

دنیا میں سب کو فکر بقائے زباں کی ہے — دل میں لگن تحفظِ نام و نشاں کی ہے
ہاں لیگ کو بھی حق ہے کہ وہ اپنا گھر بنائے — بچوں کو اپنے، اپنی زباں اپنے فن سکھائے
چھوٹی کی ہٹ غلط ہے یہ باتیں ہیں واہیات — دشمن کی ہے وہ دوست یہ ہے دھاندلی کی بات
تم میں ہر ایک چیز جدا ہر چلن جدا — دونوں کے پھول پات جدا ہیں چمن جدا
یہ تو غلط کہ اس کی ضرورت نہیں کوئی — پر ساتھ رہنے کی ابھی صورت نہیں کوئی
پھل صبح و شام پھوٹ کے چکھنے سے فائدہ — چھوٹی بہن کو گھونٹ کے رکھنے سے فائدہ
چھوٹی بہن مراد نہ جب تک کہ پائے گی — بیٹا یہ روز روز کی کل کل نہ جائے گی[۱۹۵]

جوش نے اپنی شاعری کو اسی قومی دھارے سے ہم آہنگ رکھا جو یک جہتی اور مشترک ہندوستان کی آزادی چاہتا تھا۔ وہ قومی

یک جہتی کی راہ میں حائل ہر دیوار کو گرا دینا چاہتے تھے۔ ہندو فرقہ پرستوں کے خلاف تو ان کے ہاں کوئی نظم نہیں ملتی لیکن علی گڑھ اور مسلم لیگ کے خلاف ان کی دو نظمیں [۱۹۶] ''علی گڑھ کی پنجاہ سالہ جوبلی کے موقع پر'' اور ''مسلم لیگ'' اس بات کا ثبوت ہیں کہ وہ مسلم قوم پرستی سے ہٹ کر وسیع تر مفاہمت کے حامی تھے جو ہندوستان کی آزادی کے لیے ضروری تھا۔ جوش اس بات پر کامل یقین رکھتے تھے کہ ہندوستان کی سرزمین کو جن ظلمتوں نے گھیر رکھا ہے، وہ صرف اور صرف تاج برطانیہ کے سبب ہے۔ اگر اس ظلمت سے نکلنا ہے تو تاج برطانیہ کے سائے سے بھی نکلنا ضروری ہے۔ اسی لیے وہ کہتے ہیں کہ:

یہ جو ظلمت سی آج طاری ہے ۔۔۔ سایہ تاج شہر یاری ہے [۱۹۷]

جوش کے بعد سیماب اکبرآبادی نے بھی ہندوستان کی آزادی کو اپنا محور فکر بنایا۔ ان کی نظم ''ہندوستان'' میں آزادی کی خواہش کا اظہار تو ہے ہی، اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے اس زرخیز تہذیب کے گیت گاتے ہوئے اسے ''سجدہ گاہ آفتاب، آتش عجم، پرستش گاہِ فطرت اور صنم زادعرب'' وغیرہ سے تعبیر کیا ہے۔ ان کی انقلابی اور سیاسی نظموں کا مجموعہ ''شعر انقلاب'' کے عنوان سے ۱۹۴۷ء میں شائع ہوا۔ اس مجموعے میں شامل پہلی نظم ''طوفان کی گرج'' سے ہی اندازہ ہو جاتا ہے کہ وہ مشرق کے خواب غفلت میں ڈوبے رویوں، لاپرواہی اور بے حسی پر نہ صرف افسردہ ہیں بلکہ کسی حد تک ناراض بھی ہیں۔ جب وہ یہ کہتے ہیں کہ:

مگر مشرق کو فرصت ہی نہیں اشغالِ باطل سے ۔۔۔ نہیں اربابِ ساحل پر اثر آثارِ طوفاں کا
وہی ہیں بین الاقوامی مباحث ہر طرف جاری ۔۔۔ غلامی کی وہی پھیلی ہوئی ہے ان میں بیماری
مسلّط ہے بلا کی طرح ان پر خواب غفلت کا ۔۔۔ وہی کابوس نخوت کا وہی سودا جہالت کا
کہ جن قوموں کا غفلت اور عشرت کام ہوتا ہے ۔۔۔ جہاں میں ان کا مستقبل فنا انجام ہوتا ہے [۱۹۸]

اسی لیے نظم کے اگلے حصے میں وہ مدبّروں، سیاست دانوں، مفکروں اور دانش وروں کو مخاطب کرتے ہوئے طنزیہ انداز میں ہندوستان کی صورت حال پر تنقید کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ وہ ہندوستان جہاں سیاسی تدبر کی کمی کے ساتھ ساتھ قومی یک جہتی کا فقدان اور امن وامان کا بحران بھی پیدا ہو چکا تھا۔ ملاحظہ کیجیے:

کہاں ہیں وہ مدبر جن کو دعوائے سیاست ہے؟ ۔۔۔ کہاں ہیں وہ مفکر جن کو زعم علم و حکمت ہے؟
کہاں ہیں وہ علَم بردار خالدؓ اور حیدرؓ کے؟ ۔۔۔ کہاں ہیں آزمودہ کار ماضیّاتِ خیبر کے؟
کہاں ہیں بھیشم و ارجن سے رشتہ جوڑنے والے؟ ۔۔۔ کہاں ہیں اپنا سر آپس میں لڑ کر پھوڑنے والے؟
کہاں ہیں کوندنے والے مجالس اور سبھاؤں میں؟ ۔۔۔ کہاں ہیں اڑنے والے لفظ ومعنی کی ہواؤں میں؟
کہاں ہیں ناخدایانِ وطن اب سامنے آئیں؟ ۔۔۔ سفینہ ڈوبتا ہے ڈوبتے کو تھامنے آئیں [۱۹۹]

''جاگ اے ہندوستان!'' میں بھی ان کا یہ رنگ بہت نمایاں ہے۔ اس نظم میں سیماب خواب غفلت سے جاگنے اور نیند سے جاگنے کا مشورہ دیتے ہوئے ہندوستان کے دریاؤں، مرغزاروں، پہاڑوں اور کوہ ساروں کا بچانے کا عام کر رہے ہیں۔ وہ انقلاب اور آزادی کا نعرہ لگاتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

انقلابِ وقت کا سورج ہے سر پر ضوفشاں ۔۔۔ جاگ اے ہندوستاں!

اور تو اب تک ہے محوِ غفلتِ خوابِ گراں | جاگ اے ہندوستاں!
اپنے باغوں اور اپنے مرغزاروں کو بچا | اپنے دریاؤں کو، اپنے کوہ ساروں کو بچا
پائمالی سے بزرگوں کے مزاروں کو بچا | جن سے تو جنت بنا ہے ان بہاروں کو بچا
ورنہ پھر یہ کھیت اور یہ چاندنی راتیں کہاں | جاگ اے ہندوستاں!
پَٹ نہ جائیں خاک سے اور خون سے گنگ و چمن | آگ ہر جانب نہ برسے، باغ بن جائیں نہ بن
خاک ہو جائیں نہ جل کر یہ ترے سرو و سمن | دیکھ الٹ جائے نہ یہ رنگیں بساطِ انجمن
بے نشاں تجھ کو نہ کر دے انقلابِ ناگہاں | جاگ اے ہندوستاں![۲۰۰]

سیماب کی شاعری نے اس زمانے میں بڑی شہرت حاصل کی۔اس کے شاعرانہ مرتبے کے بارے میں دو رائے ہو سکتی ہیں لیکن ان کی وطن دوستی مسلّم ہے[۲۰۱]۔اس لیے ہندوستان کی جانب بڑھتے ہوئے ہر خطرے اور مشکلات سے وہ اس خطے کے کرتا دھرتا کو ہر وقت آگاہ رکھنا ضروری سمجھتے ہیں۔اسی لیے نظم ''ہندوستان خطرے میں ہے'' میں حالات پر کڑی نظر رکھتے ہوئے سوالیہ انداز میں پوچھتے ہیں کہ:

شور ہے چاروں طرف ہندوستاں خطرے میں ہے | کیا یہ میرا خطۂ جنت نشاں خطرے میں ہے
سطح سے تہہ تک زمیں ہے مرکزِ شور و شرار | ہر عیاں بیم و رجا میں ہر نہاں خطرے میں ہے
کود پڑ خطرے میں بے خوفی و آزادی کے ساتھ | بے خبر! رازِ حیاتِ جاوداں خطرے میں ہے[۲۰۲]

''ذرا آواز دو میرے وطن کے نوجوانوں کو'' میں بھی سیماب اپنے وطن کی شورشوں اور اندیشوں سے گھبرا کر نوجوانوں کو میدانِ عمل میں کودنے کا مشورہ دے رہے ہیں۔ان کا کہنا ہے کہ:

وطن اندیشۂ بیم و رجا سے سرگراں کیوں ہے؟ | بپا شورش خلافِ دولتِ ہندوستاں کیوں ہے؟
جوانانِ وطن اس وقت کیا کام آ نہیں سکتے؟ | قوی تدبیر کیا کوئی عمل لا نہیں سکتے؟
ذرا آواز دو میرے وطن کے نوجوانوں کو![۲۰۳]

''اذانِ شاعر'' میں وہ وطن میں بڑھتے ہوئے فتنوں اور منافرت کے خلاف آواز بلند کرتے ہوئے طرفین کی جانب سے ہونے والی شعلہ فشانی کے سدباب کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

ہے اب بھی بدستور وہی شعلہ فشانی | بڑھتی ہی چلی جاتی ہے فتنوں کی کہانی[۲۰۴]

وہ جمود کا شکار ہندوستان میں تحرک اور تموّج پیدا کرنے کی جستجو میں مصروف تھے۔وہ یہ کہہ کر کہ ''نیامِ کہنۂ ہندوستاں ہے زنگ آلود''[۲۰۵] اس نیام کی زنگ کو ختم کرنا چاہتے تھے۔وہ ''بازی گرانِ قوم سے!'' یہ گزارش کرتے بھی دکھائی دیتے ہیں کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان منافرت کی فضا کو ختم کرنے میں اپنا اپنا کردار ضرور ادا کریں۔اور اگر وہ یہ نہیں کر سکتے تو ان کا کہنا ہے کہ:

جس قدر قومیں دیارِ ہند میں آباد ہیں | فطرتاً اپنے عقائد میں وہ سب آزاد ہیں
لعنتِ بے گانگی سے مائلِ فریاد ہیں | اتحاد ان میں نہیں ہے اس لیے ناشاد ہیں

اتحادِ قومیت سے ان کا رشتہ جوڑ دو   ورنہ اے بازی گرو ہندوستاں کو چھوڑ دو[۲۰۶]

حالات کے تقاضوں کو سامنے رکھ کر وہ مسلم لیگ اور کانگریس کو اپنے اختلافات بھلا کر وطن کی آزادی کے لیے مشترکہ جدوجہد کا مشورہ بھی دیتے ہیں۔ نظم ''وقت کا مطالبہ'' میں وہ دو جماعتوں کے سرکردہ رہنماؤں کو مشورہ دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

آج سازِ وقت کا ہر تار یوں ہے نغمہ زن   شرطِ آزادی ہی ربط و ضبط اقوامِ وطن

فیصلہ پیرِ فرنگی کا یہی برسوں سے ہے   متحد ہو کر جو کچھ مانگو، ملے گا من و عن

رات دن ہوتی ہے آزادی کی مہمل کوششیں   اتحادِ ملک کا کرتا نہیں کوئی جتن

پیرہن اٹھ جائیں تو انسان صرف انسان ہے   کوئی ہندو ہے نہ مسلم ہے نہ سکھ یا اریَن[۲۰۷]

چالیس کی دہائی میں ہونے والے فسادات اور خانہ جنگی نے ملکی حالات کو تباہ و برباد کر دیا۔ سیماب ان فسادات کا ذمے دار بھی غیر ملکی آقاؤں کی سازشوں کو قرار دیتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ:

فسادوں کی معاون، خانہ جنگی کی میں بانی ہوں   دیارِ ہند میں ایک بین الاقوامی نشانی ہوں

کرے کیا کام صلح و آشتی کی عارضی کوشش   کہ میں ہر دور میں اک ابتلائے جاودانی ہوں

کبھی مسجد مرا گھر ہے، کبھی مندر مرا مسکن   ''تقدس'' کے حجابوں میں تکدّر کی کہانی ہوں[۲۰۸]

وہ ہندوستان میں انگریزوں کی آمد کو استعارے میں بیان کرتے ہوئے اپنے ایک مصرعے میں کہتے ہیں کہ ''پاسبانِ وقت کو شب خوں کا موقع ملا گیا''۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ سیماب ہندوستان کو انگریزوں کے اس شب خون سے بچانا بھی چاہتے ہیں اور مکمل آزادی کے حصول تک جدوجہد جاری رکھنے کا عزم بھی کرتے ہیں۔

فرقہ وارانہ منافرت کے خلاف اثر لکھنوی نے بھی ''درس اتحاد'' کے عنوان سے عمدہ نظم لکھی۔ انھوں نے باہمی یک جہتی کی فضا قائم کرنے کے لیے شعوری کوشش کی اور اس پیغام کو پھیلانے کے لیے نظم میں جستہ جستہ اشعار بھی پیش کیے۔ جیسے:

الفت ہوئی رسمِ پارینہ   ہے اس کی جگہ دل میں کینہ

اگلوں کے چلن ہم بھول گئے   وہ رسمِ کہن ہم بھول گئے

آپس کی رواداری اٹھی   الفت اٹھی یاری اٹھی

وہ یوگ رہا نہ وہ پریت رہی   بس اک نفرت کی ریت رہی

یک جہتی جب مفقود ہوئی   توفیق ہدایت سلب ہوئی[۲۰۹]

ڈاکٹر خلیق انجم اور مجتبیٰ حسین نے ''ضبط شدہ نظمیں'' کے عنوان سے جو مجموعہ مرتب کیا، اس کی تمام تخلیقات آزادیِ ہند کے تناظر میں اہمیت کی حامل ہیں۔ اس مجموعے میں شامل بعض شعرا تو اس قدر غیر معروف تھے کہ اس مجموعے سے قبل ان کی شاعری کا نمونہ کہیں اور نظر سے نہیں گزرا۔ اس مجموعے میں شامل بعض نظمیں اس دور کے سیاسی حالات کا نہ صرف آئینہ دار ہیں بلکہ اس پورے منظر نامے کو سمجھنے میں ہماری رہنمائی بھی کرتی ہیں۔ اس مجموعے میں جہاں ایک طرف رام پرشاد بسمل کا مشہور زمانہ شعر:

سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے   دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے[۲۱۰]

تو دوسری طرف ان کی اس نظم ''دور تک یادِ وطن آئی تھی سمجھانے کو'' کی بابت ''بندے ماترم'' کے مدیر کا یہ لکھنا کہ مقدمہ لاہور سازش کے دوران اسیر پریم دت نے اس نظم کو گا کر لوگوں کو رُلا دیا تھا[۲۱۱]، اس بات کی تائید ہے کہ اس دور کے حریت پسند ہندو ہوں، سکھ یا مسلمان ہر کسی نے ان نظموں سے لوگوں کے دلوں کو گرمایا۔ نظم کا ایک بند ملاحظہ کیجیے:

اپنا کچھ غم نہیں ہے پر یہ خیال آتا ہے — مادرِ ہند پہ کب سے یہ زوال آتا ہے
دیش آزادی کا کب ہند میں سال آتا ہے — قوم اپنی پہ تو رہ رہ کے ملال آتا ہے
منتظر رہتے ہیں ہم خاک میں مل جانے کو[۲۱۲]

اشفاق اللہ خان شہید کاکوروی کی آخری نظم ''شورشِ جنوں'' بھی اسی مجموعے میں شامل ہے جو ماہ نامہ ''کرتی'' امرتسر میں شائع ہوئی تھی۔ اس نظم میں بھی شاعر باہمی نفرت و عداوت کو مٹا کر ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک ہونے کا مشورہ دیتے دکھائی دیتے ہیں۔ ملاحظہ کیجیے:

یہ جھگڑے اور بکھیڑے میٹ کر آپس میں مل جاؤ — عبث تفریق ہے تم میں یہ ہندو اور مسلماں کی[۲۱۳]

سردار نو بہار سنگھ صابر ٹوہانی کی ''پیام بیداری''، ''جذبہِ ایثار''، ''سوزِ دل بیدار ہونا چاہیے'' اور ''جذبہِ حریت'' کے عنوان کے تحت نظموں میں بھی جذبہِ حریت آزادی کو خوب ابھارا گیا ہے۔ وہ ان نظموں میں نوجوانوں کو غلامی کی زنجیریں توڑ دینے اور دشمن کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے کا پیغام دے رہے ہیں۔ وہ نوجوانوں کے جذبات میں ہیجان پیدا کرنے کے لیے کبھی انھیں غیرت دلاتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

اٹھو جاں نثارو، وطن کے ستارو — غلامی کی لعنت کو سر سے اتارو
قسم کھاؤ سوراج لے کر رہیں گے — کہو! کل نہیں آج لے کر رہیں گے[۲۱۴]

اور کبھی جذبہِ حریت بیدار کرنے کے لیے راہ میں حائل ان مشکلات کا تذکرہ کر کے ان کے عزم و حوصلے کو بڑھانا ضروری سمجھتے ہیں۔ ''جذبہِ حریت'' کے ان اشعار میں یہی رنگ نمایاں ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

دبانا چاہیں گے سختیوں سے وہ جوشِ جذبہَ حریت کو — مصیبتوں میں وطن پرستوں کو ہر طرح مبتلا کریں گے
ستایا جائے گا خادمانِ وطن کو بیداد ناروا سے — کہیں پہ لاٹھی کہیں پہ گولی کہیں پہ ہنٹر چلا کریں گے
جلا وطن کوئی ہوگا، کوئی عبور دریائے شور ہوگا — چڑھایا جائے گا کوئی سولی کسی کو بے دست و پا کریں گے
لڑیں گے آزادیٔ وطن کے لیے کہ جب تک ہے جان تن میں — جئیں گے آزاد ہو کے ورنہ غلام جی کر بھی کیا کریں گے[۲۱۵]

کنور پرتاب چندر آزاد نے ''دیوانہ بھگت سنگھ''، ''انقلاب آنے کو ہے''، ''ترانہِ آزاد''، ''وطن کے واسطے'' اور ''ستم کی انتہا کیا ہے'' میں سردار بھگت سنگھ کی جذبہِ حریت کو خراج تحسین پیش کرنے کے ساتھ ساتھ ہندو مسلم اتحاد و یک جہتی پر بھی زور دیا۔ شعر ملاحظہ کیجیے:

ہندوؤں کو چاہیے کہ قصد کعبہ کا کریں — اور پھر مسلم بڑھیں گنگ و جمن کے واسطے[۲۱۶]

اس کے علاوہ ٹیکا رام سخن، کشن چندر زیبا، عثمان، خورشید، خنجر، کمل، غنی، نیر، سرجو، روشن، گرمکھ سنگھ، ہلال، للتا پرشاد اختر، سیوک

رام ناصر، سکھدیو پرشاد بسمل، فیروزالدین منصور، منشی گوری شنکرلال اختر، کنھیا لال ثاقب، انور، مسز صدیقی بریلوی، مظفر، خلیق وغیرہ جیسے غیر معروف شعرا کی نظمیں بھی شامل کی ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ متعدد لوگوں نے اس زمانے کے سیاسی حالات سے متاثر ہو کر محض اس وقت نظمیں کہیں۔ بعد میں ان لوگوں کے اشعار کا ہمیں کہیں پتا نہیں چلتا۔ مہاراج بہادر برق کی معروف نظم ''جنت سے بھی عزیز ہے خاکِ وطن مجھے''[۲۱۷] بھی اسی مجموعے کے ذریعے ادبی دنیا تک پہنچی۔ اس نظم کا ایک اور شعر ملاحظہ کیجیے

مر کر ملی ہے چادرِ خاکِ وطن مجھے	مٹی نے اس زمیں کی دیا ہے کفن مجھے[۲۱۸]

اس مجموعے کے علاوہ بھی اکابرین ادب نے ہندوستان اور پاکستان سے حریت فکر سے متعلق نظموں اور غزلوں کے متعدد مجموعے شائع کیے۔ اس میں عبدالرزاق قریشی کی مرتبہ ''نوائے آزادی''[۲۱۹]، سبطِ حسن کی مرتبہ ''آزادی کی نظمیں''[۲۲۰]، شان الحق حقی کی مرتبہ ''نشیدِ حریت''[۲۲۱] اور شمس الرحمٰن فاروقی کی مرتبہ ''نغماتِ حریت''[۲۲۲] وغیرہ انتہائی اہمیت کی حامل ہیں۔

ان شعرا کے علاوہ بھی شعرا کی ایک طویل فہرست ہے جنھوں نے وطنی اور سیاسی تحریکات سے متاثر ہو کر نظمیں کہیں اور قوم کو پیغامِ عمل سنانے اور حریت کا درس دینے کی کوشش کی۔ ماہرالقادری نے بھی اپنے اشعار کے ذریعے قوم کے جذبۂ حریت کو بیدار کیا۔ نظم ''جدید ہندوستان'' میں سب سے پہلے تو وہ آزادی کی نعمت پر شکر بجالاتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

خوشا نصیب! کہ آزاد ہے وہ پیشانی	جو آستانۂ اغیار پہ تھی محوِ سجود[۲۲۳]

آزادی کے تمام مدارج اور مشکلات کا ادراک ماہرالقادری کو بہت اچھی طرح تھا۔ انھوں نے اس پورے ماحول کی منظر کشی بڑے موثر انداز سے کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس ضمن میں ان کا کہنا تھا کہ:

ندا یہ آئی ہے ذلت قبول ہے یا موت	کہا گیا یہ تڑپ کر کہ موت ہے منظور
بہ جبر و ظلم کی قوت کا لمحۂ آخر	شعاعِ مہر کی زد میں ہو جس طرح شبنم
جگر پہ نوک ہے نشتر کی اور لبوں پہ ہنسی	سیاسیات کے یہ پُر فریب پیچ و خم
تسلیوں کی نمائش یہ کھوکھلے وعدے	یہ جورِ خاص کا انداز یہ فریبِ کرم
ہوا ہے اپنی تباہی کا ہند کو احساس	مفادِ غیر کی بنیاد ڈالی جاتی ہے[۲۲۴]

ماہرالقادری نے سامراجی نظام کے جبر کے خلاف بھرپور مزاحمت کی۔ انھوں نے دشمنوں کو للکارتے ہوئے واضح طور پر یہ اعلان کیا کہ بہت زیادہ دنوں تک وہ لوگ اس نظام کو ہندوستان میں جاری نہیں رکھ سکیں گے۔ انھوں نے سامراجی قوتوں کو کھلا چیلنج دیتے ہوئے کہا کہ:

جبر و استبداد کی بنیاد ڈھائی جائے گی	پھر سرے سے اک نئی دنیا بسائی جائے گی
وہ کہانی جس کا عنواں ہے ''شہیدوں کا لہو''	دہر کے ایک اک ذرے کو سنائی جائے گی
لینے والا ہے جہاں فرعونیت سے انتقام	قصرِ استبداد کی بنیاد ڈھائی جائے گی[۲۲۵]

ہندوستانی سیاست میں کانگریس کی بالا دستی کے بعد مسلمانوں کے ساتھ روا رکھے جانے والے رویّے کی بابت ماہرالقادری نے کھل کر اظہارِ خیال کیا۔ ان کا کہنا تھا کہ:

اکثریت کی حکومت کا فسوں دیکھ لیا ہم نے انصاف کا بہتا ہوا خوں دیکھ لیا
مشترک قومیتِ ہند کی روداد نہ پوچھ! اس کے طوفاں کا ان آنکھوں نے سکوں دیکھ لیا[۲۲۶]

اس حوالے سے ایک اور نظم میں وہ مسلمانوں کے عزم و حوصلے کی بابت کہتے ہیں کہ:

کثرت کا شوق مسلمِ جاں باز کو نہیں یہ کر دیا ہے بدر کے میداں نے فیصلہ[۲۲۷]

ایک اور نظم ''مسلمان'' میں خطاب کرتے ہوئے انھوں نے باطل سے ٹکرانے اور اپنے لیے غلامی کے بہ جائے موت کو ترجیح دینے کا مشورہ دیتے ہوئے کہا کہ:

تجھ کو ہر باطل کی قوت سے الجھنا چاہیے موت کے کانٹوں کو فرشِ گل سمجھنا چاہیے
خاکِ آزادی سے محکومی کے دریا پاٹ دے یعنی تو نخلِ غلامی کی جڑوں کو کاٹ دے[۲۲۸]

آزادی اور غلامی کے مفہوم کو سمجھاتے ہوئے ایک نظم میں انھوں نے واضح طور پر کہا کہ غلامی کی زندگی جہنم سے بھی بدتر ہے۔ اسی لیے آزادی کی زندگی حاصل کرنے کے لیے جد و جہد کو تیز تر کر دینا ضروری ہے۔ ''محکوم اور آزاد'' کے عنوان سے لکھی گئی اس نظم کا تاثر بہت گہرا ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

محکوم کے سینے میں دہکتا ہے جہنم آزاد کے پہلو میں مچلتی ہوئی جنت
محکوم کا اندازِ تبسم بھی ہے ماتم آزاد کے آنسو میں جھلکتی ہوئی عشرت
محکوم کو جینے کا نہ مرنے کا سلیقہ آزاد کو معلوم ہے ہر چیز کی غایت
محکوم کو ہے جیت میں بھی ہار کا دھڑکا آزاد کو دیتی ہیں شکستیں بھی بشارت
محکوم کو محرومیِ تقدیر کا شکوہ آزادی کی کوشش سے بدل جاتی ہے قسمت[۲۲۹]

ان کی غزلوں میں بھی آزادی کی گھن گرج سنائی دیتی ہے۔ وہ آزادی کے گیت سنانے کے لیے ظلم و استبداد کے شعلوں کو بجھانا ضروری سمجھتے ہیں۔ اسی لیے اپنے عزم و حوصلے کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

تیغ کی جھنکار پر نغمے سنا سکتا ہوں میں نزع میں بھی گیت آزادی کے گا سکتا ہوں میں
قصرِ استبداد کی بنیاد ڈھا سکتا ہوں میں ظلم کے شعلوں کو پھونکوں سے بجھا سکتا ہوں میں[۲۳۰]

ساغر نظامی نے بھی سامراج کے مظالم کے خلاف ڈٹ جانے کا عہد کرتے ہوئے اپنے عزم و حوصلے کا اظہار کچھ اس انداز سے کیا ہے کہ:

جب مجھے پیڑوں سے عریاں کر کے باندھا جائے گا گرم آہن سے میرے ہونٹوں کو داغا جائے گا
جب دہکتی آگ پر مجھ کو لٹایا جائے گا اے وطن اس وقت بھی میں تیرے نغمے گاؤں گا
تیرے نغمے گاؤں گا اور آگ پر سو جاؤں گا[۲۳۱]

ہندو مسلم اشتراک کی فضا جب جب فروغ پاتی، مشترکہ جذبات کا اظہار بھی شعرا خوب زور و شور سے کرتے۔ انقلابی فوجی ٹولیاں ایسے بہت سے گیت گاتی تھیں جن کے شعرا کی بابت اب بھی درست معلومات ہم تک نہیں پہنچ سکی ہیں۔ ''پیام آزادی'' کے

عنوان کے تحت ایسے ہی ایک گیت کے چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

آج شہیدوں نے تم کو اے اہلِ وطن پکارا ہے　　توڑ غلامی کی زنجیریں، برساؤ انگارا
ہندو، مسلم، سکھ ہمارا بھائی پیارا پیارا　　یہ ہے آزادی کا جھنڈا، اسے سلام ہمارا[۲۳۲]

بنکم چندر چیٹر جی کے ذریعے حاصل کردہ آنند مٹھ سے ''وندے ماترم''شری شیام لال گپت پارشد کا ''جھنڈا گیت''اور''وجئ وِشوتر نگا پیارا''، سبھدار کماری چوہان کی ''سوتنتر تا پکارتی''، ماکھن لال چترویدی کی ''ایک پھول کی چاہ''، بسمل عظیم آبادی کی ''سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے''اور جگدمبا پرساد ہتیسی کی ''رنگ دے بسنتی چولا''وغیرہ جیسی نظموں کو دھرمیندر ناتھ نے اپنی تصنیف ''دہلی اور آزادی''میں شامل کیا ہے[۲۳۳]۔

انگریزوں اور ہندوستانیوں کے درمیان مخاصمت کی فضا کئی دہائیوں پر محیط ہے۔ اردو شاعری میں بھی انگریزوں کے اس امتیازی رویے کے خلاف واضح طور پر ناگواری کا اظہار ملتا ہے۔ حالی نے بھی اس امتیازی رویے پر حکایت کے انداز میں طنز کیا ہے جس میں ایک گورا اور کالا باہم دست و گریباں ہونے کے بعد ڈاکٹر کے پاس بیماری کی رخصت لینے کے لیے تصدیقی سند لینے پہنچتے ہیں جہاں ڈاکٹر گورے کو تو سند دے دیتا ہے لیکن ہندوستانی کو سند دینے سے انکار کر دیتا ہے[۲۳۴] کیوں کہ حالی کے مطابق:

دی سند گورے کو لکھ، تھی جس میں تصدیقِ مرض　　اور یہ لکھا تھا کہ سائل ہے بہت زار ونزار
یعنی اک کالا نہ جس گورے کے مکے سے مرے　　کر نہیں سکتا حکومت ہند پر وہ زینہار
اور کہا کالے سے تم کو مل نہیں سکتی سند　　کیوں کہ تم معلوم ہوتے ہو بہ ظاہر جان دار
ایک کالا پٹ کے جو گورے سے فوراً مر نہ جائے　　آئے بابا اس کی بیماری کا کیوں کر اعتبار[۲۳۵]

مولانا ظفر علی خان نے بھی اس امتیازی پالیسی کے نتیجے میں ہندوستانی اور یورپی کسانوں کے درمیان تفاوت کو تمثیلی انداز سے پیش کیا ہے۔

کسان یورپ کے ہیں پہنتے ہمیشہ پتلون اور جاکٹ　　جو پاؤں میں بوٹ پاٹتا ہے تو ہیٹ کا ان کے سر پہ سایہ
میاں کے تن پر ہے اک لنگوٹا، بھٹا سے بیوی کے بر میں لہنگا　　گزی کے چیتھڑے کا ہے دوپٹا، برہنہ بچے ہیں سر سے تا پا[۲۳۶]

حقیقت تو یہ ہے کہ انگریزوں کی اس نسل پرستانہ استیصال پر مبنی پالیسی سے لبرل خیالات کے حامل انگریز بھی سخت نالاں دکھائی دیتے تھے۔ اس کے باوجود انگریزوں نے ہندوستان کی بابت جو پالیسی اختیار کی وہ کسی طرح ہندوستانیوں کے مفاد میں نہیں تھی۔ متعدد سانحات اور واقعات کی تفصیل پچھلے ابواب میں بیان کی جا چکی ہے جس سے انگریزوں کے استیصالی رویے کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ تقسیم و تنسیخ بنگال کے معاملات ہوں، خلافت تحریک میں رہنماؤں کی گرفتاری اور مظالم کا سلسلہ ہو یا جلیاں والا باغ کے مظالم ان تمام سانحات کی کڑیوں کو تقسیم ہند کے معاملات سے جوڑ کر دیکھنا ضروری ہے۔ اس کے علاوہ متعدد تحریکات جن کا تفصیلی ذکر اور احاطہ نہیں کیا جا سکا، انھیں بھی ذہن میں رکھنا ضروری ہے۔ مثلاً اس زمانے کے شعرا نے ''سودیشی تحریک''کے حوالے سے کس قسم کے ردِّعمل کا اظہار کیا اور ہندوستانی سیاست پر اس تحریک کے کیا اثرات مرتب ہوئے، اس کے حوالے سے بھی شعرا کے ہاں موافق اور مخالف دونوں طرح کے رویے سامنے آئے۔ اسی طرح ہوم رول کے حوالے سے بھی چکبست، ظریف لکھنوی اور اکبرالہٰ آبادی کے کلام میں بہت کچھ مواد موجود

ہے۔۱۹۱۹ء کی مانٹیگو چیمس فورڈ اصلاحات کو حسرت نے یہ کہہ کر کہ

کس درجہ فریب سے ہے مملو تجویز رفارم مانٹیگو [۲۳۷]

رد کر دیا۔ ''تحریک ترک موالات'' کو ہندوؤں اور مسلمانوں میں مشترکہ تائید کی وجہ سے مقبولیت حاصل ہوئی۔ برطانوی حکومت کے خلاف عدم تعاون، اعزازات و خطابات کی واپسی، سرکاری نوکریوں سے دست برداری، بچوں کو سرکاری مدارس سے نکالنے اور غیر ملکی مال کے مقاطعہ جیسے اقدامات نے مولانا ظفر علی خان جیسے گاندھی مخالف کو بھی یہ کہنے پر مجبور کر دیا تھا کہ:

گاندھی نے آج جنگ کا اعلان کر دیا باطل سے حق کو دست و گریبان کر دیا

ہندوستاں میں ایک نئی روح پھونک کر آزادیِ حیات کا سامان کر دیا [۲۳۸]

غرض کہ اس دور میں شاید ہی کوئی ایسا شاعر ہو جس نے عوامی تحریک سے متاثر ہو کر اس میں اپنا حصہ نہ ڈالا ہو۔ اکثر شعرا نے تو ان تحاریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اپنی شاعری کے ذریعے ان نظریات کا پرچار کیا۔ لوگوں کے اندر جوش و خروش پیدا کرنے اور انھیں انگریزوں کے خطرناک عزائم سے آگاہ کرنے کے لیے شاعری کو آلے کے طور پر استعمال کیا۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ اختر شیرانی جیسے رومانی شاعر کے ہاں بھی ''دلیرانِ وطن کے نام'' کے عنوان کے تحت ایک نظم میں کہا گیا کہ:

نوجوان! ہمیں قربانِ وطن ہونا ہے سر کٹا کر سر و سامانِ وطن ہونا ہے [۲۳۹]

اپنی ایک اور نظم ''عشق و آزادی و شعر'' میں بھی وہ حوصلے کو بڑھاتے ہوئے یورپ کے سیاہ کاروں سے بدلہ لینے کے عزم کا اظہار کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ ملاحظہ کیجیے:

مشرقی قوموں کی قدرت نے اگر کی امداد ایک دن سمجھیں گے یورپ کے سیہ کاروں سے

باغ باں ہم کو ملا بھی تو بہ شکلِ رہ زن پھول کیا پتے بھی غائب ہیں چمن زاروں سے [۲۴۰]

انیس سو تیس اور چالیس کی دہائی تک آتے آتے شعرا کے لب و لہجے میں واضح تبدیلی کے آثار دیکھے جا سکتے ہیں۔ یہ تبدیلی بھی اچانک نہیں ہوئی بلکہ متعدد شعرا نے اس سے قبل اپنی شاعری میں جن جارحانہ رنگ اختیار کرنا شروع کر دیا تھا۔ ترقی پسند تحریک سے قبل ہی ایسی بہت سی مثالیں اردو شاعری سے پیش کی جا سکتی ہیں جن میں مزاحمت اور جارحانہ رویہ پوری شدت کے ساتھ موجود ہے۔ غلام بھیک نیرنگ تمام حیلوں بہانوں کو ترک کر کے اپنی نظم میں ''دعوت عمل'' دیتے دکھائی دیتے ہیں:

اگر گلشن میں رہنا ہے بدل لے تُو بھی ڈھنگ اپنا سماعت اب نہیں ہو گی کسی حیلے بہانے کی

غضب ہیں آج تیری غفلتیں رسوائے عالم ہوں سمجھتے ہیں تجھے ہم چشم کل تک ہوشیاروں میں

خدا ہی حافظ و ناصر ہے تیری قومِ بے کس کا شمار اس کا ہے مدت سے حوادث کے شکاروں میں [۲۴۱]

اقبال احمد سہیل نے اپنی نظم ''بن جائے نشیمن تو'' میں اسی آہنگ کو برقرار رکھتے ہوئے یہ نعرہ بلند کیا کہ:

ہے زیست غلامی کی مگر موت سے بدتر قابو میں رہے اپنے پر و بال تو کیا ڈر

گائیں گے ہم آزادیِ گلشن کا ترانا بے کار ہے اے برقِ بلا ہم کو ڈرانا

کافی ہے بہت وسعتِ صحرائے زمانہ ہم اور کہیں ڈھونڈ نکالیں گے ٹھکانا

بن جائے نشیمن تو کوئی آگ لگا دے[۲۴۲]

اسی طرح ''نالۂ عندلیب'' میں محمود اسرائیلی نے بھی اپنے رستے ہوئے ناسور کی طرف توجہ مبذول کراتے ہوئے کہا کہ:

زخم دل کو اب نمک پاشی کی لذت چاہیے　　فکرِ مرہم ہو چکی، فکرِ طبیباں ہو چکی
جادۂ مقصد پہ چلنا ہے تو اٹھ ہمت دکھا　　دستِ حسرت مل چکا اور چشمِ گریاں ہو چکی
خونِ دل سے آبیاری کر جو دل میں درد ہے　　مرد میدانِ شجاعت بن اگر تو مرد ہے[۲۴۳]

ساغر نظامی نے بھی آزادی کو اپنا فطری حق سمجھ کر ہندوستانیوں کو یہ تلقین کی کہ جس کسی نے بھی آزادی پر قدغن لگائی ہے، اس سے آزادی چھین لی جائے۔ اپنی نظم ''پیغامِ عمل'' میں وہ کہتے ہیں کہ:

اٹھ اے مشرق اور اپنے حقِ فطرت کی حفاظت کر　　جو آزادی ترا مقسوم ہے اس کی حمایت کر
فضا پر غور کر ہر چیز کو حاصل ہے آزادی　　بلند اپنی نظر اپنی طبیعت اپنی فطرت کر
ہلا دے جور و استبداد کی سنگین بنیادیں　　غلامی کے بتوں کو گرزِ حریّت سے غارت کر
غلامی مستقل لعنت ہے اور توہینِ انساں ہے　　غلامی سے رہا ہو اور آزادوں میں شرکت کر
فریب ایوانِ آزادی ہے کیوں مایوس ہوتا ہے　　تبسم کامیابی کا مجھے محسوس ہوتا ہے[۲۴۴]

کچھ شعرا نے تو جنگی ترانے کے انداز میں ایسی نظمیں بھی لکھیں جن سے جوش اور ولولے میں بے حد اضافہ ہوا۔ یہ نغمے اپنی تاثیر کے لحاظ سے اس دور کے لوگوں میں حرکت و عمل کا محرک بنے۔ احسان دانش کی نظم ''ترانۂ جہاد'' کا رنگ اسی قسم کا ہے جس میں وہ کہتے ہیں کہ:

مجاہدینِ صف شکن بڑھے چلو بڑھے چلو　　روش روش چمن چمن بڑھے چلو بڑھے چلو
جبل جبل دمن دمن بڑھے چلو بڑھے چلو　　بکش بکش بزن بزن بڑھے چلو بڑھے چلو
ڈرا جو موت سے نہیں وہ شاد کام زندگی　　ڈرو نہ موت سے کہ موت ہے دوامِ زندگی
ہے دل کی زندگی لگن بڑھے چلو بڑھے چلو[۲۴۵]

اس طرح کے ترانے بعد میں جمیل مظہری، الطاف مشہدی اور دیگر شعرا کے ہاں بھی ملتے ہیں۔ جمیل مظہری کی نظم ''نوائے جرس'' کا انداز بعینہٖ احسان دانش کی طرح ہے، ملاحظہ کیجیے:

اٹھائے سر بڑھے چلو تنے ہوئے غرور سے　　تمھارے قافلے کی شان دیکھتی ہے دور سے
ہمالیہ کی چوٹیاں بڑھے چلو بڑھے چلو　　برادرانِ نوجواں بڑھے چلو بڑھے چلو
سروں پہ باندھ کے کفن بڑھے چلو بڑھے چلو　　امیدِ مادرِ وطن بڑھے چلو بڑھے چلو
دعائیں دے رہی ہے ماں بڑھے چلو بڑھے چلو　　برادرانِ نوجواں بڑھے چلو بڑھے چلو[۲۴۶]

''تحریکِ موالات'' کے زمانے میں اس کی مقبولیت سے گھبرا کر انگریزوں نے مسلم لیگ اور کانگریس کے سرکردہ رہنماؤں کو گرفتار کرنا شروع کر دیا تھا۔ گاندھی کو گرفتار کرنے سے حکومت ڈر رہی تھی لیکن ان کی گرفتاری نہ ہونے سے یہ تاثر بھی ابھرا کہ کانگریس

در پردہ حکومت سے مفاہمت کی راہ ہموار کر رہی ہے۔ انگریزوں کا مقصد یہ تھا کہ مسلم لیگ اور کانگریس کی مفاہمتی پالیسی کو خاک میں ملایا جائے۔ اس جانب اشارہ کرتے ہوئے اکبرالہٰ آبادی نے کہا تھا کہ:

پوچھتا ہوں آپ گاندھی کو پکڑتے کیوں نہیں　　　کہتے ہیں آپس ہی میں تم لوگ لڑتے کیوں نہیں [۲۴۷]

ان حالات میں بعض مقامات پر پرتشدد مظاہرے بھی ہوئے۔ مثلاً چور چوری کے مقام پر ایک پولیس چوکی کو آگ لگا دی گئی جس سے پولیس کے کئی اہل کار ہلاک ہو گئے۔ گاندھی نے اشتعال ختم کرنے کے لیے فوری طور پر تحریک کی معطّلی کا حکم دیا جس سے کئی قائدین خصوصاً مسلم لیگ کے رہنما بدظن ہو گئے اور کانگریس اور مسلم لیگ کی راہیں جدا ہو گئیں۔ اس تحریک میں حصہ لینے والوں پر بھی حکومت کا ظلم وستم جاری رہا۔ قائدین کو قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنی پڑیں۔ شعرا نے اس طرح کی حکمت عملی پر بھی شدید ردعمل کا اظہار کیا۔ کئی شعرا تو خود بھی اس تحریک سے وابستہ رہے، حسرت موہانی بھی ان میں سے ایک تھے۔ انھوں نے اس ضمن میں کھل کر آواز بھی بلند کی اور کہا کہ:

حسرتِ آزاد پر جور غلامانِ وقت　　　ازرہ بغض و عتاب دیکھیے کب تک رہے [۲۴۸]

مولانا ظفر علی خان کی نظم ''انقلاب''، مولانا محمد علی جوہر کی متعدد غزلیں اور دیگر شعرا نے اس موضوع پر زوردار انداز سے احتجاج کیا۔ آغا حشر کاشمیری نے تو ''شکریہ یورپ'' میں مغرب کو مخاطب کرتے ہوئے سخت احتجاجی رویہ اپنایا اور کہا کہ:

اے زمینِ یورپ، اے مقراضِ پیرہن نواز　　　اے حریفِ ایشیا، اے شعلہِ خرمن نواز
چارہ سازی تیری بنیاد افگنِ کاشانہ ہے　　　تیرے دم سے آج دنیا ایک ماتم خانہ ہے
جلوہ گاہِ شوکتِ مشرق کو سونا کر دیا　　　جنتِ دنیا کو دوزخ کا نمونہ کر دیا [۲۴۹]

اسی طرح سر جان سائمن کی سرکردگی میں جب سائمن کمیشن نے ہندوستان کے مختلف شہروں کے دورے کیے تو ہر جگہ سیاہ جھنڈوں سے اس کا استقبال ہوا۔ مسلم لیگ کے ایک چھوٹے سے دھڑے کے سوا تمام جماعتوں نے اس کمیشن کی شدید مخالفت کی۔ پنجاب میں لالہ لجپت رائے کی قیادت میں جلوس بھی منظّم ہوئے۔ پولیس کے لاٹھی چارج کی وجہ سے لالہ لجپت رائے شدید زخمی ہو کر ہلاک ہو گئے۔ ان کے دو ساتھیوں راجا گرو اور بھگت سنگھ کو بھی فائرنگ سے ہلاک کر دیا گیا۔ کچھ قائدین کو پھانسی پر بھی چڑھا دیا گیا۔ جوش اور ظفر علی خان وغیرہ نے ''سائمن کمیشن'' کے عنوان کے تحت اثر انگیز نظمیں بھی کہیں۔ اس کے بعد سول نافرمانی کی تحریک بھی شروع ہو گئی۔ ۱۳ مارچ ۱۹۳۰ء سے شروع ہونے والی اس تحریک کے تحت غیر ملکی اشیا کے بائیکاٹ کے ساتھ ساتھ سرکاری ملازمت سے استعفیٰ اور سرکاری محاصل کی ادائیگی روکے جانے جیسے اقدامات بھی ہوئے [۲۵۰]۔ اس موقع پر بھی شعرا کسی سے پیچھے نہیں رہے۔ عوام میں جوش و جذبے کو ابھارنے کے لیے مکمل آزادی کے نصب العین کی طرف توجہ بھی دلائی اور غلامانہ ذہنیت کی سخت الفاظ میں مذمت بھی کی۔ تلوک چند محروم، جوش، روش صدیقی، آنند نرائن ملا، آزاد انصاری، علی جواد زیدی اور دیگر بہت سے شعرا نے آزادی کے حصول کے لیے اپنی نظموں سے موثر طریقے سے کام لیا۔ ظفر علی خان نے نظم ''سوارج'' میں واضح طور پر اعلان کر دیا کہ:

مٹ جاؤ مگر حق کو نہ مٹتے ہوئے دیکھو　　　سیکھو یہ روش گر تمھیں لینا ہی ہے سوراج [۲۵۱]

روش صدیقی نے بھی جفا کاروں کے عبرت ناک انجام کی نوید سناتے ہوئے اعلان کیا کہ:

حوصلہ پست ہو مغرور ستم کاروں کا بول بالا ہو صداقت کے پرستاروں کا

حیرت انگیز ہو انجام جفا کاروں کا[۲۵۲]

احسان دانش نے بھی نظم ''ناقوسِ بیداری'' میں تہذیب وتمدن کے دعوے داروں کو فتنہ ساز اور ان کی سیاسی چالوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے کا مشورہ دیتے ہوئے کہا کہ:

ہوشیار اے ہند اے غفلت شعاروں کے دیار نالہ برلب ہیں ترے الجھے ہوئے لیل و نہار

جس قدر ہیں پیشوایانِ تمدن فتنہ خو تیرے درماں کے لیے اکسیر ہے ان کا لہو

مورچے کبر و نخوت کے اڑا کر پھینک دے دمدمے ان کی سیاست کے اڑا کر پھینک دے[۲۵۳]

محروم نے ''ہندی نوجوانوں سے'' مخاطب ہوتے ہوئے غلام وطن سے آزادی کی جدوجہد میں شرکت کو نہ صرف لازمی قرار دیا بلکہ واضح طور پر ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کو فرزندِ زمین قرار دیتے ہوئے اس مایوس کن صورت حال سے نکلنے کی راہ ہموار کرنے کا مشورہ دیا۔ان کا کہنا تھا کہ:

تو مسلم ہے کہ ہندو ہے غرض اس سے نہیں مجھ کو محبت ہے وطن سے تجھ کو اتنا ہے یقیں مجھ کو

تری حالت نہ ہو حسرت فزا یاس آفریں مجھ کو اگر مل جائے کچھ اس کا جوابِ دل نشیں مجھ کو

کیا ہے کیا وطن کے واسطے اے نوجواں تو نے

وطن جس کا ہو پابندِ الم وہ شادماں کیوں ہو قفس ہو آشیاں جس کا وہ بلبل نغمہ خواں کیوں ہو

غلاموں کا وطن تیرا وطن اے نوجواں کیوں ہو جہاں آزاد ہے ہندوستاں ننگِ جہاں کیوں ہو

مٹانے کی اسے کیوں ٹھان لی چرخِ جفا تو نے[۲۵۴]

۲۶ رنومبر ۱۹۳۰ء کی گول میز کانفرنس میں کانگریس کی عدم شرکت اور پھر جنوری ۱۹۳۱ء گورنر جنرل ہند لارڈ ارون اور گاندھی کے درمیان ہونے والے معاہدے'' گاندھی ارون پیکٹ'' کے بعد دوسری گول میز کانفرنس میں شرکت کے باوجود کانفرنس بے نتیجہ ہونے کی وجہ سے حالات مزید کشیدگی کی طرف بڑھتے گئے۔ برطانوی حکمران اس وقت ہندوستان کو مکمل آزادی دینے کے حق میں نہیں تھے۔ گاندھی نے اسی وجہ سے سول نافرمانی کی تحریک دوبارہ شروع کردی اور بالآخر بہت غور وخوض کے بعد برطانوی پارلیمنٹ کی مشترکہ کمیٹی نے ہندوستان کے دستور کے لیے جو تجاویز پیش کیں،ان کی روشنی میں ۱۹۳۵ء کا قانون رائج ہوا۔اس قانون نے بھی ہندوستانیوں کو سخت مایوس کیا۔لہٰذا اس کے ردعمل میں آزادی کی تحریک میں اور شدت پیدا ہوئی۔اس دور میں ترقی پسند تحریک بھی منظر عام پر آئی۔اس تحریک سے وابستہ شعرا نے بھی اپنی اپنی جوشیلی نظموں سے ہندوستانیوں کے قلوب کو خوب گرمایا۔غرض کہ ترقی پسند ہوں یا رجعت پسند ہر مکتب فکر کے شعرا آزادی کی اس جدوجہد میں شامل رہے۔جوش ہوں یا فراق،شورش کاشمیری ہوں یا جمیل مظہری،روش صدیقی ہوں یا اقبال احمد سہیل،مجاز ہوں یا جاں نثار اختر،مخدوم ہوں یا فیض احمد فیض،جذبی ہوں یا علی سردار جعفری،احمد ندیم قاسمی ہوں یا سلام مچھلی شہری،ساحر لدھیانوی ہوں یا کیفی اعظمی ہر کسی کے ہاں اس موضوع پر متعدد نظمیں ملیں گی۔ان شعرا نے ایک بار پھر قومی یک جہتی کے فروغ میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔جمیل مظہری نے ''بھارت ماتا'' میں قومیت کی زنجیریں توڑ کر متحدہ محاذ بنانے کی طرف توجہ دلاتے ہوئے کہا کہ:

پیاری ماتا پیاری ماتا

قومیت کی کڑیاں جوڑیں لعنت کی زنجیریں توڑیں
دیکھ اپنے بچوں کا لشکر ٹھاٹھیں لے جس طرح سمندر
دیکھ کھڑے ہیں تیرے سپاہی رخ پہ جلال شاہنشاہی
تیرے لیے جانوں پہ کھیلے لے لے ان کی بلائیں لے لے
یہ تجھ کو آزاد کریں گے گھر تیرا آباد کریں گے[۲۵۵]

فراق گورکھ پوری نے بھی دھاوا بولنے اور زندگی کی برکتوں سے اپنا حصہ چھین لینے کی ترغیب دیتے ہوئے کہا کہ:

کچھ ارادے بھی تو چمکیں کیا قضا اور کیا قدر بطنِ مستقبل سے اپنی قسمتوں کو چھین لو
زندگی کو کیوں بنا رکھا ہے اک زندانِ تنگ اس فضا اس بحر و بر کی وسعتوں کو چھین لو
بڑھ کے دھاوا بول دو کھل جائیں گے گنجِ نہاں بطنِ گیتی میں دفینہ دولتوں کو چھین لو
زندگی اور موت سے اے اہلِ دل کچھ لے مرو زندگی اور موت کی سب برکتوں کو چھین لو[۲۵۶]

شورش کاشمیری بھی ''آزادیِ کامل کے طلب گار جوانو'' کو مخاطب کرتے ہوئے ناموسِ وطن پر اپنی جان قربان کرنے کا درس دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

اے لشکر ملّت کے رضا کار جوانو آزادیِ کامل کے طلب گار جوانو
تقدیر کو تدبیر کے بازو پہ جھکا دو ناموسِ وطن کے لیے جانوں کو لڑا دو
مشرق کے جوانوں کو سنبھلتے ہوئے دیکھوں یہ ہند کی سرکار بدلتے ہوئے دیکھوں[۲۵۷]

ساغر نظامی بھی غلامی کی رسم مٹانے کا اعلان کرتے ہوئے خون کے دریا بہا کر بھی آزادی کے حصول کا عندیہ دیتے دکھائی دیتے ہیں۔ اپنی نظم ''ترانہ'' میں وہ کہتے ہیں کہ:

سونے والوں کو اک دن جگا دیں گے ہم رسم و راہِ غلامی مٹا دیں گے ہم
بربریت کے ٹکڑے اڑا دیں گے ہم آسماں و زمیں کو ہلا دیں گے ہم
کون کہتا ہے کمزور نربل ہے تو ہر طرف خوں کے دریا بہا دیں گے ہم[۲۵۷]

سکندر علی وجد نے ''صبحِ نو'' میں آزادی کے وقت کو قریب سے قریب تر قرار دیتے ہوئے زنجیروں اور سلاسل کے پگھلنے اور زندان کے قفل ٹوٹنے کا اعلان کچھ اس طرح سے کیا:

راہِ آزادی میں کیا اندیشۂ سود و زیاں ٹھوکریں کھالو سنبھلنے کا زمانہ آ گیا
ہو گیا ہے آگ تپ تپ کر غلاموں کا لہو اب سلاسل کے پگھلنے کا زمانہ آ گیا
اہلِ زنداں کو مبارک ہو فروغِ صبحِ نو قیدِ ذلت سے نکلنے کا زمانہ آ گیا[۲۵۹]

علی سردار جعفری نے بھی ''آزادیِ وطن'' میں انقلابی نوجوانوں کو اٹھ کھڑے ہونے اور غلامی کی زنجیر کو توڑ ڈالنے کی ترغیب

دیتے ہوئے کہا کہ:

اٹھو ہند کے باغبانو اٹھو — اٹھو انقلابی جوانو اٹھو
اٹھو کھیلتے اپنی زنجیر سے — اٹھو خاکِ بنگال و کشمیر سے
اٹھو برق کی طرح ہنستے ہوئے — کڑکتے، گرجتے برستے ہوئے
غلامی کی زنجیر کو توڑ دو — زمانے کی رفتار کو موڑ دو[۲۶۰]

علی سردار جعفری نے اپنی ایک اور نظم ''آزادی'' میں اس امر کو لازمی قرار دیا کہ جب ظلم و بربریت اپنی انتہا کو چھو لے تو جنگ اور انقلاب کا نعرہ لازمی ہو جاتا ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ:

صبر ایوبی کا جب لبریز ہوتا ہے سبو — سوزِ غم سے کھولتا ہے جب غلاموں کا لہو
تفرقہ پڑتا ہے جب دنیا میں رنگ و نسل کا — لے کے میں آتی ہوں پرچم انقلاب و جنگ کا[۲۶۱]

انھوں نے ''حرف اوّل'' میں ایشیا کی بیداری کے گیت گاتے ہوئے ماضی میں اس خطے پر چھائی مایوسی، ناامیدی اور محرومی کا ذکر بڑی افسردگی سے کیا۔ آزادی کی جدوجہد سے قبل کے ایشیا کو زخم خوردہ اور قبر کے مردہ جسم سے تعبیر کرتے ہوئے کہا کہ:

ہاں کبھی تھا ایشیا مجبور و محکوم و فقیر — دوسروں کا ذکر کیا خود اپنی نظروں میں حقیر
قبر کا مردہ یہ جسمِ نوجوان و روحِ پیر — زخم خوردہ پیٹھ پر تاریک صدیوں کا دباؤ
ایشیا سے بھاگ جاؤ[۲۶۲]

ان کی متعدد نظموں میں مغربی استعمار کے مظالم کا جو نقشہ کھینچا گیا ہے وہ نہ صرف عبرت انگیز ہے بلکہ اس زمانے کے مغربی رویوں کا عکس بھی ہے۔ مغرب خصوصاً برطانیہ نے جس طرح ہندوستان کے جسم سے ایک ایک قطرہ خون چوسا اور اسے معاشی بدحالی کا شکار بنایا، اس جانب اشارہ کرتے ہوئے شاعر کا کہنا ہے کہ:

کہاں ہو تہذیب و تمدن کی روشنی لے کے آنے والو/ نظر اٹھاؤ قریب آؤ/ یہ کوڑھیوں کے ہجوم دیکھو/ یہ دیکھو ہیضے کی قے، یہ طاعون کی ہے گلٹی/ یہ جسم کے آبلے ہیں اس آتشک کی گرمی/ جو ایشیا کو ملی ہے انعام سامراجی سپاہیوں سے/ یہ پیٹھ دیکھو یہ پیٹھ کتنی حسیں ہے جس پر/ تمھارے کوڑوں کی بدیاں ہیں/ یہ پھانسیوں پر لٹکتی لاشیں/ یہ جیل خانوں میں بند انساں/ یہ دل جو ہیں گولیوں سے چھلنی/ یہ آنکھ کی پتلیاں جو خون اور پیپ کی طرح بہہ رہی ہیں/ یہ چہرے کھنڈروں کی طرح ٹوٹے[۲۶۳]

وہ مغرب کی استعماری قوتوں کو سفید جونک قرار دے کر ہندوستان کا خون نچوڑتی، بلکتی، سسکتی زندگی پر اظہار افسوس بھی کرتے ہیں اور ہزاروں میل دور سے آئے ان قابضین کو سخت تنقید کا نشانہ بھی بناتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ:

یہ کیسی سفاک انگلیاں ہیں/ جنھوں نے لوہے کے تیز ناخون پہلوؤں میں گڑا دیے ہیں/ یہ انگلیاں جو ہمارے جسموں سے کھال بھی کھینچے لے رہی ہیں/ یہ لمبی لمبی سفید نلیاں/ سفید

جونکیں/ہزاروں میلوں کے فاصلے سے/ہمارے جسموں سے خون دھرتی سے تیل کو چوسے
لے رہی ہیں[۲۶۴]

علی سردار جعفری کا پہلا مجموعہ ''پرواز'' ۱۹۴۰ء میں شائع ہوا۔ اس مجموعے میں شامل نظموں کے عنوان سے ہی ان کے ذہنی رویوں کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ ''سماج''، ''بغاوت''، ''انگڑائی''، ''مزدور لڑکیاں''، ''اشتراکی''، ''نیا زمانہ''، ''جنگ اور انقلاب'' وغیرہ میں رومانی رنگ کے ساتھ انقلاب کی دھیمی آنچ کی جھلک بھی صاف دکھائی دیتی ہے۔ صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ وہ ملک، معاشرے اور عام انسانوں کے دکھ درد کو کس قدر خوب صورتی سے اپنی شاعری کا موضوع بنا رہے ہیں[۲۶۵]۔ دنیا کو بدلنے کا غلامی سے نجات پانے اور بدلے ہوئے نظام کے آدرش کو پانے کی جستجو اور ولولہ ان کی شاعری میں صاف محسوس کیا جاسکتا ہے۔ ''نئی دنیا کو سلام'' کو پہلی سیاسی مثنوی قرار دیا جاسکتا ہے جب کہ ''خون کی لکیر'' تک آتے آتے علی سردار جعفری کی شاعری اپنی مقبولیت کی بلندیوں کو چھونے لگتی ہے۔ نظم ''سماج'' میں وہ معاشرے کے بدلتے منظر نامے پر ملول بھی ہیں اور اس بات کا برملا اظہار بھی کر رہے ہیں کہ اس سماج میں دلوں کو جوڑتے رکھنے کی اب کوئی تدبیر نہیں بچی۔ ان کا کہنا ہے کہ:

غلط ہے یہ کہ یاں ٹوٹے ہوئے دل جوڑے جاتے ہیں　　مرے نزدیک یاں لبریز ساغر توڑے جاتے ہیں
کہیں آپس میں اہلِ زر کے مذہب کی لڑائی ہے　　کہیں کھوٹے کھرے چاندی کے ٹکڑوں کی خدائی ہے
عیاں سفاکیاں پرہیزگاروں کی جبینوں سے　　ٹپکتا ہے لہو پیرِ حرم کی آستینوں سے
ریاکاری اشارے کر رہی ہے چشمِ پرفن سے　　تعصب کی صدا آتی ہے ناقوسِ برہمن سے
اخوت کی زباں محروم اندازِ تکلم ہے　　بتانِ رنگ و خوں کے لب پہ زہریلا تبسم ہے[۲۶۶]

''جنگ اور انقلاب'' تک آتے آتے علی سردار جعفری کے ہاں رقصِ آزادی کے جشن اور ظلم واستبداد کے اڑتے رنگ کی جھلک واضح ہوتی چلی جاتی ہے۔ وہ کھل کر اس بات کا اعلان کرتے ہیں کہ:

رقص کر اے روحِ آزادی کہ رقصاں ہے حیات　　گھومتی ہے وقت کے محور پہ ساری کائنات
اڑ رہا ہے ظلم و استبداد کے چہرے کا رنگ　　چھٹ رہا ہے وقت کی تلوار کے ماتھے کا زنگ
ہے فضاؤں میں نویدِ شادمانی کا سرور　　پڑ رہا ہے عشرتِ فردا کی پے شانی پہ نور[۲۶۷]

نظم ''سامراجی لڑائی'' میں وہ سیاسی اور جنگی ماحول اور بدلتے منظر نامے کی طرف اشارہ کرتے دکھائی دیتے ہیں تو کبھی وہ جیل کی سلاخوں کے پیچھے سے یہ نعرہ بلند کرتے نظر آتے ہیں کہ ''یہ لوہے کی سلاخیں کب تلک روکیں گی ملنے سے''[۲۶۸]۔ وہ موت کو انگریزوں کی غلامی سے بہتر سمجھتے ہیں۔ بنارس جیل میں قید کے دوران جب ایک قیدی کی وفات ہوگئی تو ''ایک قیدی کی موت'' کے عنوان سے لکھی گئی نظم میں انھوں نے واضح طور پر کہا کہ:

تونے آخر ختم کر دی داستانِ زندگی　　تنگ ہے محکوم قوموں پر جہانِ زندگی
آج خونی موت کے پنجے میں تو مجبور ہے　　لیکن انگریزی حکومت کی حدوں سے دور ہے[۲۶۹]

آگے جا کر وہ اپنی نظم ''جمہور کا اعلان نامہ'' میں ہمالہ سے اٹھنے والے طوفان کی خوش خبری سناتے ہوئے ایک بار پھر زمانے کے

بدلتے منظر نامے کو پیش کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ بکنگھم کے گل ہوتے چراغ کی نشان دہی کرتے ہوئے شاعر کا کہنا تھا کہ:

زمانے کے انداز بدلے گئے — نئے راگ ہیں ساز بدلے گئے
ہمالہ کے چشمے ابلنے لگے — گراں خواب چینی سنبھلنے لگے
اٹھا خاکِ جاوا سے طوفانِ نور — بغاوت نے پھونکا قیامت کا صور
جل اٹھے غلاموں کے سینے کے داغ — بکنگھم میں گل ہو رہے ہیں چراغ
گرے قصرِ شاہی ملے تخت و تاج — نئی کروٹیں لے رہا ہے چراغ[۲۷۰]

برطانوی ہندوستان میں ہندوستانیوں کے ساتھ ہونے والے مظالم، استیصال، بے جا پابندیوں، قید و بند کی صعوبتوں اور ان کو صفحۂ ہستی سے مٹا دینے کی سازشوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے شاعر کہتے ہیں کہ:

امیروں نے ہم کو ستایا بہت — حکومت نے ہم کو دبایا بہت
ہمارے لیے قید خانے بنے — ہمارے لیے تازیانے بنے
ہمیں پتھروں پہ سلایا گیا — ہمیں سولیوں پہ چڑھایا گیا
مگر ہم یہ سب ظلم سہتے رہے — مصائب کے دریا میں بہتے رہے[۲۷۱]

آزادی کی جو بھاری قیمت ادا کرنی پڑی اور اس آزادی کے نتیجے میں جو قتل و غارت گری ہوئی، اس نے آزادی کی خوشی ماند کر دی تھی۔ ہر طرف بہتے لہو اور انسانی جانوں کی ارزانی نے ہر آنکھ اشک بار کر دی تھی۔ علی سردار جعفری اس منظر نامے کو پیش کرتے ہوئے آزادی کو ایک ''فریب'' قرار دیتے ہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ:

اب جدھر دیکھو ادھر موت ہی منڈلاتی ہے / در و دیوار سے رونے کی صدا آتی ہے / خواب
زخمی ہیں، امنگوں کے کلیجے چھلنی / میرے دامن میں ہیں زخموں کے دہکتے ہوئے پھول /
خون میں لتھڑے ہوئے پھول / میں جنھیں کوچہ و بازار سے چن لایا ہوں / قوم کے راہ برو،
راہ زنو / اپنے ایوانِ حکومت میں سجا لو ان کو[۲۷۲]

ایک اور نظم ''آنسوؤں کے چراغ'' میں وہ ہندوستانی شرنارتھوں اور پاکستان کے مہاجرین کی زندگی کی حالت پر کفِ افسوس ملتے ہوئے سرحد کی کھینچی ہوئی لکیر کو وطن کے سینے پر گھپے خنجر اور بہتے خون سے تعبیر کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ:

یہ کون ظالم ہے جس نے قانون کے دہکتے ہوئے قلم سے / وطن کے سینے پہ خونِ ناحق کی
ایک گہری لکیر کھینچی / یہ کیا ہوا ایک دم سے محفل میں سارے سازوں کے راگ بدلے /
ہزاروں سورج نکل نکل کر گہن کے سانچے میں ڈھل رہے ہیں / ہرے بھرے کھیت گرم
شعلوں کے پیرہن میں دہک رہے ہیں / کٹے ہوئے ہاتھ اپنی بانہوں سے راہ روکے کھڑے
ہوئے ہیں / پھٹے ہوئے آنچلوں کے ٹکڑوں میں عصمتوں کی جوان لاشیں / چھدی ہوئی دھرم
اور مذہب کے خنجروں میں دلوں کی قاشیں / کٹی ہوئی چھاتیوں کی نس نس سے دودھ خون

بن کے بہہ رہا ہے/ یہ رات ہے کس قدر بھیانک/ یہ خواب ہے کس قدر پریشاں/ ہزاروں
سہمی ہوئی نگاہیں [۲۷۳]

ہجرت کا ایسا کرب ناک منظر کم ہی نظموں میں دکھائی دیتا ہے۔ ۱۹۳۵ء میں جب ترقی پسند تحریک پر چار ہوا تو اس زمانے میں دنیا دوسری جنگِ عظیم کے اندیشوں میں مبتلا تھی اور فاشزم کا خطرہ روز بروز بڑھتا جا رہا تھا۔ ضرورت تھی کہ جمہوری رجحانات، اقدار اور طرزِ فکر کو تقویت دی جائے اور ہندوستان کی تحریکِ آزادی کا پرجوش ساتھ دیا جائے۔ ترقی پسند تحریک نے نہ صرف اس ضرورت کا احساس کیا بلکہ تمام ادیبوں اور شعرا کو ایک واضح اور منظّم نصب العین کی دعوت دی۔ اس تحریک سے وابستہ شعرا نے بھوک، افلاس، سماجی پستی اور غلامی کے مسائل کو بھرپور طریقے سے موضوع بنایا [۲۷۴]۔ امین سلونوی نے بھی ''قوم سے خطاب'' میں قوم سے سوال کیا کہ ان کی ہمت، غیرت اور شجاعت کہاں چلی گئی ہے۔ انھوں نے وطن کی آزادی کے ساتھ ساتھ ان بربادیوں کا بدلہ لینے کے عزم کا اظہار بھی کیا جو ہندوستان میں قابض استعماری قوتوں کی وجہ سے تھیں۔ وہ کہتے ہیں کہ:

کیا ہوا اے قوم تجھ کو تیری ہمت کیا ہوئی	تیری ہمت کیا ہوئی تیری شجاعت کیا ہوئی
تیری عزت کیا ہوئی وہ تیری رفعت کیا ہوئی	تیری صنعت، تیری حرفت، تیری طاقت کیا ہوئی
ملّت اپنا ملک اپنا وطن اپنا آزاد کر	جس قدر بربادیاں ہیں اٹھ انھیں برباد کر [۲۷۵]

ملک میں پھیلی فساد کی آگ اور نفرت نے انگریزی راج کی طرف سے ہوا دینے والے پھوٹ ڈالو اور حکومت کی پالیسی کے خلاف ردِعمل کا اظہار کرتے ہوئے جب ہندوستان چھوڑ دو کی تحریک شروع کی تو شمیم کرہانی نے اس ماحول سے متاثر ہو کر اپنی ایک نظم ''روشن اندھیرا'' میں کہا کہ:

بن گئی تھی سر زمینِ ہند میدانِ قتال	زندگی نے زندہ رہنے کا اٹھایا تھا سوال
تھا زبانوں پر یہ نعرہ آشیاں کو چھوڑ دو	چھوڑ دو اے غاصبو! ہندوستاں کو چھوڑ دو
اس صدا نے چوٹ پہنچائی ستم کے ناز پر	چھا گئیں توپیں گرج کر، درد کی آواز پر
موت کا پرچم فضا کے دوش پہ لہرا گیا	زندگی کے صحن میں غم کا اندھیرا چھا گیا
اس اندھیرے میں گھروں کی روشنی لوٹی گئی	موت نے خوشیاں منائیں، زندگی لوٹی گئی
بے ردا تھی عزتِ مسلم ہجومِ عام میں	سر برہنہ کارواں جیسے دیارِ شام میں [۲۷۶]

نظم کا پس منظر دراصل ۱۹۴۲ء کے فسادات ہیں جن میں ہندوستان کی سر زمین ایک بار پھر مقتل بن گئی تھی۔ ان ہنگاموں میں ہندوؤں اور مسلمان عورتوں کی عصمتیں تار تار کی گئیں۔ سیکڑوں بچے یتیم اور عورتیں بیوہ ہوئیں۔ جب انگریزوں کے مظالم کا یہ سلسلہ دراز ہوا اور ہندوستانیوں کے دلوں میں بغاوت کی آگ مزید تیز ہو گئی، ریل کی پٹریاں اکھاڑنا، پل توڑنا، لاریاں اور ٹرام میں جلانا اور سرکاری املاک کو تباہ کرنا روز کا معمول بن گیا [۲۷۷] تو اس زمانے میں بھی شمیم نے حکومتی مظالم کے خلاف متعدد نظمیں کہیں۔ کنکر اور پتھر کا جواب انگریز فائرنگ اور گولیوں سے دیتے۔ شہروں اور دیہاتوں میں فوجی درندگی کا مظاہرہ کرتے۔ ظلم و بربریت کے تمام ریکارڈ حکومت نے توڑ دیے تو ان حالات کی منظر کشی کرتے ہوئے ''انسان اور سونا'' کے عنوان سے لکھی گئی نظم میں شاعر نے کہا ہے کہ:

گوروں کا رسالہ بستی میں جب آگ لگایا پھرتا ہے — عیسیٰ کے پجاری ہنستے تھے، آدم کا نشیمن جلتا تھا
وہ جلتی چھتوں کے گرنے سے، پر ہول دھماکے ہوتے تھے — ماؤں کی دھڑکتی چھاتی سے چمٹے ہوئے بچے روتے تھے
انسان کی عصمت پر جس دم، لالچ کی کمان کڑکتی تھی — حوّا کا کلیجا دکھتا تھا، مریم کی روح پھڑکتی تھی
جب آگ بجھانے کو انساں، پانی کے لیے جاں کھوتے تھے — تب سات سمندر رکھتے ہوئے دو راجہ رانی سوتے تھے
ہر سمت سنہرے گیہوں کے انبار لگائے جاتے تھے — ''سونا'' تو بچایا جاتا تھا ''انسان'' جلائے جاتے تھے[۲۷۸]

اردو شاعری نے اس زمانے میں آتش شوق کو تیز سے تیز تر کرنے میں وقت اور حالات کا پورا پورا ساتھ دیا۔ آزادی کے گیت بھی گائے اور ان کی مشکلات کو گوارا بنانے کے لیے صبح آزادی کی بشارت بھی دی۔ فراق گورکھ پوری نے ''آزادی'' اور ''زمانے کا چیلنج'' جیسی نظمیں لکھ کر آنے والے تغیر کا پتا ''آج دنیا پہ رات بھاری ہے'' میں انھوں نے تبدیلی کے آثار کی بابت واضح طور پر لکھا کہ:

انقلابِ جہاں کی باری ہے — آسمانوں پہ خوف طاری ہے
یہ جنازہ ہے عہدِ ماضی کا — وہ نئے دور کی سواری ہے[۲۷۹]

فراق نے شاعری میں شائستگی کا دامن کبھی ہاتھ سے جانے نہیں دیا لیکن جب وہ لوگوں میں آزادی کی تڑپ پیدا کرنا چاہتے ہیں تو ''زندگی کی للکار'' جیسی نظموں میں ان کا انداز بدلا بدلا دکھائی دیتا ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

زندگی کو کیوں بنا رکھا ہے اک زندانِ تنگ — اس فضا اس بحر و بر کی وسعتوں کو چھین لو[۲۸۰]

انھوں نے آزادی کا نعرہ بلند کیا تو دلوں میں آزادی کے پیغام کو جگانے کے لیے آزادی کے گیت بھی گائے۔ وہ مزدوروں، کسانوں اور معاشرے کے ہر فرد کو اس آزادی کی جدوجہد میں شریک ہونے کا مشورہ دیتے ہوئے نظم ''آزادی'' میں کہتے ہیں کہ:

مری صدا ہے گلِ شمع شامِ آزادی — سنا رہا ہوں دلوں کو پیامِ آزادی
لہو ہے تیرے شہیدوں کا یا بھڑکتے شرار — اچھل رہا ہے زمانے میں نامِ آزادی
اب انقلاب کی ٹھانو کہ کوششِ اصلاح — خیالِ خام و غمِ ناتمامِ آزادی
تمھیں کرو گے منظّم جہاں کو مزدورو! — تم ہی سجاؤ کے دیوانِ عامِ آزادی
فضا میں جلتے دلوں سے دھواں سا اٹھتا ہے — ارے یہ صبح غلامی یہ شامِ آزادی
یہ مہر و ماہ، یہ تارے، یہ بامِ ہفت افلاک — بہت بلند ہے ان سے مقامِ آزادی
ہمارے سینے میں شعلے بھڑک رہے ہیں فراق — ہماری سانس سے روشن ہے نامِ آزادی[۲۸۱]

وہ لوگوں کو آنے والے حالات سے مقابلہ کرنے پر کمر کس لینے کا مشورہ بھی دیتے دکھائی دیتے ہیں اور ساتھ ہی سامراجی قوتوں کو مظالم سے باز رہنے کی تلقین بھی کرتے ہیں۔ ان کے مطابق ان مظالم سے آزادی کی تڑپ کم نہیں ہونے والی بلکہ تغیر و تبدیلی کی جو امنگ اب لوگوں کے دلوں میں پیدا ہو چکی ہے اسے روکنا کسی کے بس کا روگ نہیں۔ ''زمانے کا چیلنج'' میں ان خیالات کی عکاسی کرتے ہوئے فراق کا کہنا ہے کہ:

دیکھ بپھری ہوئی دنیا کو دبانے کی نہ سوچ — باز آئی ہے بغاوت سے نہ باز آئی ہے

انقلاب اور کسے کہتے ہیں یہ رنگ تو دیکھ	زندگی موت کو بھی ساتھ لگا لائی ہے
روپیہ راج کرے آدمی بن جائے غلام	ایسی تہذیب تو تہذیب کی رسوائی ہے
عالمِ نزع ہے آئینِ شہنشاہی کا	چارہ گر اب تری بے کار مسیحائی ہے[۲۸۲]

روش صدیقی کے ہاں بھی حب الوطنی اور آزادی کا جذبہ ایک البیلی اور رسیلی آن بان کے ساتھ سامنے آتا ہے۔ وہ ہندوستان کو ایشیا کا دل سمجھتے ہیں اسی لیے ایشیا کی بیداری کے ترانے گاتے ہوئے اس خطے کی آرزوؤں اور امیدوں کا مرکز ہندوستان کو قرار دیتے ہیں۔ ۱۹۲۷ء کے بعد ہماری تحریک آزادی کے ہر موڑ کی جھلک ان کی شاعری میں جھلکتی ہے۔ ان کی نظمیں ''نویدِ فردا''، ''جمال آزادی'' اور ''منشور آزادی'' وغیرہ کو اس دور کی بہترین سیاسی نظمیں کہا جائے تو غلط نہ ہوگا[۲۸۳]۔ ان کے کلام میں بلند آہنگی نہیں لیکن ایک ولولہ مجاہدانہ اور نعرہ مستانہ کی جھلک ضرور دکھائی دیتی ہے۔ ان کے دھیمے اور تھمے انداز میں بھی انقلاب کی رمق صاف دکھائی دیتی ہے۔ وہ شورش اور ہیجان کے بجائے سکون آمیز اضطراب کے قائل نظر آتے ہیں۔ ان کے نزدیک انقلاب کا حتمی مقصد تخریب نہیں بلکہ تعمیر ہے[۲۸۴]۔ بیداری مشرق کا پیغام سناتے ہوئے ان کی نظم ''زبورِ حریت'' کا انداز دیکھیے:

بجلیاں قصرِ غلامی پہ گرانے کے لیے	ظلم و بے درد کی بنیاد کو ڈھانے کے لیے
آتشِ فتنہِ مغرب کو مٹانے کے لیے	نقشِ تزویرِ تمدن کو مٹانیکے لیے

شمعِ بیداریِ مشرق کو فروزاں کر دے[۲۸۵]

۱۹۳۵ء میں کانگریس کی جوبلی تقریبات کے موقعے پر ہونے والے سیاسی مشاعرے میں انھوں نے بیداریِ مشرق کے عنوان سے جو نظم سنائی اسے ہندوستان کی تاریخ میں فراموش نہیں کیا جا سکے گا[۲۸۶]۔ غلام ہندوستان میں اس قدر زور شور سے آزادیِ ہند کا نعرہ نہیں سنایا گیا۔ اس نظم میں وہ غیرت قومی، جوش، ہمت، ولولہ اور عزم پیدا کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

موجِ خونِ کوہ کن سے زندگی گلریز ہے	غیرتِ مزدور برقِ خرمنِ پرویز ہے
جس کا تیشہ آج شعلہ بار و آتش خیز ہے	ہاں وہی ہے کام ران و کام گار و کام یاب

انقلاب اے ساکنانِ ارضِ مشرق انقلاب

قلب ہو آتش کدہ، ہر سانس اک پروانا ہو	عزمِ محکم مصلحت کے خواب سے بے گانہ ہو
نوجوانو! اب تو ہر انداز بے باکانہ ہو	زندگی کب تک اسیرِ اعتکافِ احتساب

انقلاب اے ساکنانِ ارضِ مشرق انقلاب

ہوشیار اے غافلانِ حال بربادِ وطن	ڈھونڈتی پھرتی ہے تم کو روحِ ناشادِ وطن
گر ہوا اب بھی نہ تم کو پاس فریادِ وطن	ایشیا کا ذرہ ذرہ تم سے مانگے گا جواب

انقلاب اے ساکنانِ ارضِ مشرق انقلاب[۲۸۷]

انھوں نے ''جمال آزادی''، ''طلوع زندگی''، ''پرچم''، ''ایشیا''، ''یہ دیار''، ''کشورِ ہندوستان''، ''بنتِ مشرق''، ''نویدِ فردا''، ''آغازِ بہار''، ''روشنی''، ''منتظر اور مشرق'' وغیرہ جیسی نظموں کے ذریعے آزادی کی اس جدوجہد میں بھرپور طریقے سے حصہ لیا۔ اس طرح

کی نظموں نے اردو میں ایک نئی قسم کی متحرک، ولولہ خیز اور مجاہدانہ شاعری کی بنیاد ڈالی۔ جس کا اثر ترقی پسند شعرا کی پوری نسل پر پڑا[۲۸۸]۔ البتہ فیض احمد فیض کی فکر و گفتار کی انفرادیت انھیں ایک علاحدہ شناخت ضرور دیتی ہے۔

فیض کی شاعری کا خمیر ''صورتِ جاناں'' اور ''شورشِ دوراں'' کے امتزاج سے ہوا۔ ان کے ہاں سیاسی محرکات پر مبنی کئی نظمیں ملتی ہیں لیکن وہ محرکات و تاثرات کو شعریت کے لبادے میں چھپا دیتے ہیں اسی لیے ان کے کلام میں رومانیت اور حقیقت، روایت اور بغاوت کا حسین امتزاج موجود ہے۔ ان کی اعتدال پسندی اور شعریت کی بنا پر ترقی پسند شعرا میں انھیں ممتاز مقام حاصل ہے[۲۸۹]۔ مارکس ازم سے متاثر ہونے کے باوجود ان کے کلام میں پروپیگنڈا یا نعرے بازی کا عنصر نہیں پایا جاتا۔ وہ اپنے مقصد کو سامنے رکھتے ہوئے ظلم واستبداد کے خلاف ہلکے ہلکے شعلوں کو ہوا دینے کی کوشش کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ نظم ''مجھ سے پہلی سی محبت میرے محبوب نہ مانگ''، ''رقیب سے''، ''سوچ''، ''تسلی''، ''کتے''، ''سیاست لیڈر کے نام''، ''اے دل بیتاب ٹھہر''، ''میرے ہمدم میرے دوست''، ''سر مقتل''، ''صبح آزادی''، ''تمھارے حسن کے نام''، ''زنداں کی ایک صبح''، ''دو عشق''، ''نثار میں تیری گلیوں کے''، ''چند روز اور مری جان!''، ''بول''، ''موضوعِ سخن''، ''شورشِ بربط و نے'' وغیرہ کے علاوہ متعدد غزلوں میں ان کا یہ انداز نمایاں ہے۔ انھوں نے ایک حساس دل رکھنے والے فرد کی حیثیت سے ہندوستان میں ہونے والے مظالم، جبر اور استبداد پر رنج والم کا اظہار کرتے ہوئے واضح طور پر کہا کہ:

آج تک سرخ و سیہ صدیوں کے سائے تلے — آدم و حوا کی اولاد پہ کیا گزری ہے
ان دمکتے ہوئے شہروں کی فراواں مخلوق — کیوں فقط مرنے کی حسرت میں جیا کرتی ہے[۲۹۰]

وہ ''خاک میں لتھڑے ہوئے اور خون میں نہلائے ہوئے''[۲۹۱] جسموں کو دیکھ کر نوجوانوں کو متوجہ کر کے شمشیر و سنان کی ضرورت پر زور دے رہے ہیں۔ انھیں اپنے ملک کی محکومی اور غلامی کا شدید احساس تھا۔ اسی لیے اس غلامی سے نجات کی خواہش میں متعدد نظمیں لکھیں اور ان نظموں کے ذریعے ہندوستانی عوام میں ظلم کے نظام کے خلاف سرکشی اور بغاوت کے جذبات پیدا کیے۔ جیسے:

عرصۂ دہر کی جھلسی ہوئی ویرانی میں — ہم کو رہنا ہے پہ یوں ہی تو نہیں رہنا ہے
اجنبی ہاتھوں کا بے نام گراں بار ستم — آج سہنا ہے ہمیشہ تو نہیں سہنا ہے[۲۹۲]

غزل کی ہیئت میں لکھی گئی ایک نظم ''سرود'' میں درج یہ مصرعہ ''گرم رکھ آتشِ پیکار سے سینہ اپنا''[۲۹۳] میں فیض کا یہ پیغام پوری طرح واضح ہے۔ وہ اس طرح کے اشعار کے ذریعے نوجوانوں کو مقابلے کے لیے تیار کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ ان کی نظم ''سوچ'' سے بھی اس پہلو کی پوری طرح عکاسی ہوتی ہے جس میں وہ کہتے ہیں کہ:

ہم نے مانا جنگ کڑی ہے — سر پھوٹیں گے خون بہے گا
خون میں غم بھی بہہ جائیں گے — ہم نہ رہیں غم بھی نہ رہے گا[۲۹۴]

نظم ''رقیب سے'' میں بھی وہ استعماری قوتوں کے ظلم واستبداد کے خلاف شدید ردعمل کا اظہار کرتے ہیں۔ بے کسوں کی بدحالی، ناتوانوں کی کس مپرسی، مزدوروں اور غریبوں کے بہتے لہو، ان کے دل کو بے چین کر دیتے ہیں اور شدید کشمکش کے عالم میں شاعر یہ کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ:

جب کہیں بیٹھ کر روتے ہیں وہ بے کس جن کے — اشک آنکھوں میں بلکتے ہوئے سو جاتے ہیں

ناتوانوں کے نوالوں پہ جھپٹتے ہیں عقاب	بازو تولے ہوئے منڈلاتے ہوئے آتے ہیں
جب کبھی دکتا ہے بازار میں مزدور کا گوشت	شاہ راہوں پہ غریبوں کا لہو بہتا ہے
آگ سی سینے میں رہ رہ کے ابلتی ہے نہ پوچھ	اپنے دل پہ مجھے قابو ہی نہیں رہتا ہے[۲۹۵]

فیض ان مظلوم لوگوں کے دل میں آزادی کی تڑپ پیدا کرنا چاہتے تھے۔ان کے خیال میں یہ سوئی ہوئی قوم اگر اٹھ کھڑی ہوئی تو بڑے سے بڑا جابر بھی اپنی سرکشی بھول جائے گا۔نظم ''کتے'' میں انگریزوں کی لڑاؤ اور حکومت کرو کی پالیسی اور مظلوم اور مفلوک الحال عوام کی ممکنہ بیداری کی جانب اشارہ کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ:

جو بگڑیں تو اک دوسرے سے لڑا دو	ذرا ایک روٹی کا ٹکڑا دکھا دو
یہ ہر ایک سے ٹھوکریں کھانے والے	یہ فاقوں سے اکتا کے مر جانے والے
یہ مظلوم مخلوق گر سر اٹھائے	تو انسان سب سرکشی بھول جائے
یہ چاہیں تو دنیا کو اپنا بنالیں	یہ آقاؤں کی ہڈیاں تک چبالیں
کوئی ان کو احساسِ ذلت دلا دے	کوئی ان کی سوئی ہوئی دُم ہلا دے[۲۹۶]

فیض کو متاعِ لوح وقلم چھن جانے کا غم ضرور تھا لیکن وہ اس صورتِ حال پر مایوس بیٹھنے کے بجائے ''کہ خونِ دل میں ڈبولی ہیں انگلیاں میں نے''[۲۹۷] کی صدا بلند کرتے ہوئے اس مقصدِ عظیم کے حصول میں سرگرداں دکھائی دیتے ہیں جو آزادی کے متوالوں کا نصب العین بن چکا تھا لیکن جب منزل ان کی دسترس میں آئی تو فیض کو دفعتاً یہ خیال بھی آیا کہ یہ وہ آزادی کا پروانہ نہیں جس کے لیے اس قدر جانوں کا نذرانہ پیش کیا گیا تھا۔اس صورتِ حال پر وہ جھنجھلاہٹ اور بے چینی کے عالم میں ''صبحِ آزادی'' کے عنوان کے تحت لکھی گئی نظم میں کہتے ہیں کہ:

یہ داغ داغ اجالا، یہ شب گزیدہ سحر	وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں
یہ وہ سحر تو نہیں جس کی آرزو لے کر	چلے تھے یار کہ مل جائے گی کہیں نہ کہیں[۲۹۸]

ظاہری بات ہے کہ فرقہ واریت کا جو زہر اس زمانے میں بھر دیا گیا تھا اور تنگ نظری کی جو آگ بھڑکائی گئی تھی اس سے صدیوں کا تہذیبی سرمایہ فنا ہوتا جا رہا تھا۔ ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو چکے تھے اور درندگی، سفاکیت اور بربریت کی وحشی قوتیں بے لگام ہوتی جا رہی تھیں۔اس بجھی بجھی فضا اور گھٹن زدہ ماحول پر فیض احمد فیض کو سخت صدمہ بھی تھا اور ملال بھی جس کا اظہار فیض نے اپنی اس نظم میں کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

جگر کی آگ نظر کی امنگ، دل کی جلن	کسی پہ چارۂ ہجراں کا کچھ اثر ہی نہیں
کہاں سے آئی نگارِ صبا، کدھر کو گئی	ابھی چراغِ سرِ رہ کو کچھ خبر ہی نہیں
ابھی گرانیِ شب میں کمی نہیں آئی	نجات دیدہ و دل کی گھڑی نہیں آئی

چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی[۲۹۹]

فیض مصلحت کوشی کے قائل نہیں،ان کے نزدیک طوقِ سلاسل اور جبر واستبداد کی قوتیں اور ان کی حق پرستی اور حق گوئی کی آواز کو

دبا نہیں سکتی۔ وہ زندگی کے آخری سانس اور آخری قطرۂ خون تک ان منفی طاقتوں سے لڑے اور ہتھیار نہ ڈالنے کا اعلان کرتے ہوئے نظم ''شورشِ بربط ونے''میں کہتے ہیں کہ:

یہ ہاتھ سلامت ہیں جب تک، اس خوں میں حرارت ہے جب تک | اس دل میں صداقت ہے جب تک، اس نطق میں طاقت ہے جب تک
اس طوق و سلاسل کو ہم تم، سکھلائیں گے شورش بربط ونے | وہ شورش جس کے آگے زبوں ہنگامہ طبلِ قیصرو کے
آزاد ہیں اپنے فکر و عمل، بھرپور خزینہ ہمت کا | اک عمر ہے اپنی ہر ساعت، امروز ہے اپنا ہر فردا
یہ شام و سحر یہ شمس و قمر، یہ اختر و کوکب اپنے ہیں | یہ لوح وقلم، یہ طبل وعلم، یہ مال وحشم سب اپنے ہیں [300]

فیض کو آزادیِ کامل کا پورا پورا یقین تھا۔ اسی لیے وہ ان جبر کے ہتھکنڈوں سے پریشان ہونے کے بجائے دشمن کو للکار کر اس بات کا علان کرتے دکھائی دیتے ہیں کہ:

دبا رکھیں گے کب تک جوشِ صہبا، ہم بھی دیکھیں گے | اٹھا رکھیں گے کب تک جام ومینا، ہم بھی دیکھیں گے
کسے روکے گا شورِ پندِ بے جا، ہم بھی دیکھیں گے | کسے ہے جا کے لوٹ آنے کا یارا، ہم بھی دیکھیں گے
وہ لائیں لشکرِ اغیار و اعدا ہم بھی دیکھیں گے | وہ آئیں تو سرِ مقتل، تماشا ہم بھی دیکھیں گے
یہ شب کی آخری ساعت گراں کیسی بھی ہو ہم دم | جو اس ساعت پہ پنہا ہے اجالا ہم بھی دیکھیں گے [301]

۱۹۴۷ء کے زمانے میں فیض لاہور میں مقیم تھے۔ مشرقی پنجاب میں ہونے والے فسادات اور طرفین کے بہادروں اور سور بیروں کے انسانیت سوز واقعات اکثر سنایا کرتے تھے۔ ان واقعات کے بیان میں ان پر رقت طاری ہو جاتی تھی۔ گو اتنے بڑے پیمانے پر ہونے والی خانہ جنگی کو ضبطِ تحریر لانے اور شعر کی شکل میں ڈھالنے کی ہمت ان میں نہ ہو سکی لیکن وہ ان واقعات پر ملال ضرور کرتے۔ اکثر ہندوستانی اور پاکستانی دوستوں سے شکوہ ضرور کرتے کہ اس مشترکہ تہذیب کو کیسے بچایا جائے [302]۔

تلوک چند محروم نے بھی ہمیشہ شعر کی سماجی معنویت کو تسلیم کیا اور اپنی شاعری کے ذریعے جذبۂ حب الوطنی کو پروان چڑھانے کی کوشش کی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ شاعری کی معراج جمالیات ہے لیکن جب وطن کا چپا چپا دکھ اور درد کی تصویر بنا ہوا ہو اور وہاں دلوں میں آزادی کی آگ بھڑک رہی ہو تو جہد آزادی کے لیے فضا تیار کرنا اور قومی مسائل پر سوچنا بھی شاعر کا فرض ہوتا ہے۔ محروم کی شاعری اسی سماجی دردمندی کی شاعری ہے [303]۔ جلیاں والا باغ کے سانحے کے ضمن میں محروم کی شاعری کا جائزہ پچھلے ابواب میں پیش کیا جا چکا ہے البتہ آزادیِ ہند کے مختلف مراحل اور نشیب وفراز کے ضمن میں یہاں محروم کے کلام کے دیگر رجحانات کا جائزہ لینا ضروری ہے۔ ''کاروانِ وطن'' کے عنوان سے شائع ہونے والے اس مجموعے میں ان کے کلام کا بڑا حصہ ہندوستان کی تحریک آزادی کے مختلف مدارج اور منازل کی بھرپور عکاسی کرتا دکھائی دیتا ہے۔ یہ مجموعہ ان کی سیاسی منظومات کا مجموعہ ہے۔ اس کے دو حصوں میں اوّل ''فریادِ جرس'' ۱۹۰۶ء سے ۱۹۴۷ء یعنی دور، غلامی پر مشتمل ہے اور دوم بعنوان ''منزل'' میں آزادی کے زمانے کی نظمیں شامل ہیں۔ محروم کی متعدد سیاسی نظمیں جرائد میں بغیر کسی نام کے شائع ہوتی رہیں۔ نیم سرکاری قسم کی ملازمت اور پابندیوں کے باعث انھیں یہ رویہ اختیار کرنا پڑا [304]۔ ۱۹۰۶ء میں لکھی گئی ان کی نظم ''بھارت ماتا کیوں روتی ہے'' [305] سے ہی ان کے سیاسی رجحان کا پتہ چلتا ہے۔ ہندوستان کے طول وارض

میں پھیلی ہر اس تحریک کے اثرات محروم کی شاعری میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ وہ غزل کی ہیئت میں بھی سیاسی موضوعات کو بڑی خوبی سے پیش کرتے ہیں۔ ۱۹۰۶ء میں سودیشی تحریک سے متاثر ہو کر جو غزل کہی اس کا ایک شعر دیکھیے :

یہیں کی روئی، یہیں کی ململ، یہیں کا ریشم، یہیں کا مخمل   نہ لنکا شائر، نہ مانچسٹر، سدیش وستو، سدیش وستو[۳۰۶]

۱۹۰۶ء سے ۱۹۲۳ء کا زمانہ ہندو مسلم اتحاد کے عروج کا زمانہ تھا۔ خلافت تحریک اور انگریز دشمنی کے جذبے نے ملک کے کونے کونے تک آزادی کی امنگ پیدا کر دی تھی لیکن محبت اور آشتی کی یہ فضا زیادہ عرصے تک قائم نہ رہ سکی۔ ترک موالات کے دوران جو اختلافات عارضی طور پر نظروں سے اوجھل ہو چکے تھے، اتحاد ختم ہوتے ہی شد و مد کے ساتھ ابھر کر سامنے آ گئے اور دونوں ہندوؤں اور مسلمانوں میں کشیدگی خطرناک حد تک بڑھنے لگی[۳۰۷]۔ ان حالات میں محروم نے اپنی نظم ''انجامِ اتحاد'' میں جو منظر نامہ پیش کیا ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

وعدے تھے اتحاد کے، دعوے خلوص کے   کیا ہو گیا وہ عہد، وہ پیماں کدھر گیا
کیا مطمئن اہلِ وطن دیکھیے ذرا   گویا گلے سے طوقِ غلامی اتر گیا[۳۰۸]

ہندوؤں اور مسلمانوں کا باہمی اتحاد اور اخوت بڑھانے کے لیے محروم نے متعدد نظمیں لکھیں۔ وہ ان نظموں میں یگانگت کو ہندوستان کی آزادی کے لیے ضرور سمجھتے تھے۔ رنگ نظری، نفاق، پھوٹ اور تعصب کی وہ جگہ جگہ مذمت کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ ''یادِ اتحاد'' میں وہ اس امر پر افسوس کا اظہار کرتے ہیں کہ:

کل تک تھے جان و دل سے جو خواہانِ اتحاد   بیٹھے ہیں آج توڑ کے پیمانِ اتحاد
شیخ اور برہمن میں کشاکش ہے زور کی   اور اس سے پرزے پرزے ہیں دامانِ اتحاد
سینچا گیا تھا خونِ شہیداں سے جو کبھی   تاراج ہو گیا وہ خیابانِ اتحاد
ہاں اتحاد ہے سببِ شوکتِ وطن   للہ پھر دکھا دو وہی شانِ اتحاد
کیسے بھلا کے ہندو و مسلم گلے ملیں!   پھر کاش آئے ہند میں دورانِ اتحاد[۳۰۹]

بلاشبہ اس موضوع پر جس قدر نظمیں محروم کے ہاں ملتی ہیں کوئی دوسرا اردو شاعر ان کے قریب نہیں پہنچتا۔ ''آئینۂ حال''، ''پھر بھی لڑتے ہیں''، ''قافلے یوں بھی تلف ہوتے ہیں''، ''پیامِ صلح کل'' اور ''اہلِ وطن کی خدمت میں'' وغیرہ میں ان کا یہ رنگ بہت نمایاں اور گہرا ہے لیکن ہندوستان میں بڑھتی ہوی منافرت اور باہمی چپقلش نے محروم کو باور کرا دیا تھا کہ بہت جلد یہ آشیاں بکھرنے والا ہے۔ اس جانب اشارہ کرتے ہوئے ''ہندوستان ہمارا'' میں انھوں نے بڑے کرب سے کہا کہ:

گلشن اجڑ رہا ہے اے باغ باں ہمارا   ہونے کو تنکے تنکے ہے آشیاں ہمارا[۳۱۰]

محروم نے اپنے ہم وطنوں کی ہنگامہ آرائیوں اور فرقہ پردازیوں کو قریب سے دیکھا اور اس کے چرکے بھی سہے، ان کی نظموں میں جگہ جگہ ان کے دل کے داغ دکھائی دیتے ہیں[۳۱۱]۔ اسی لیے ہندوؤں اور مسلمانوں کے افتراق کا ماتم کرتے ہوئے اپنی نظم ''ہندو مسلم'' میں لکھا کہ:

غضب ہے ایک گھر کے رہنے والے یوں لڑیں باہم   جھگڑنا ہے بہم شورِ زناں ہندو مسلم کا[۳۱۲]

محروم کے مطابق لوگ خود ہی امن کے دشمن بن کر اپنی ذلّت و بربادی کا سامان پیدا کر رہے ہیں۔ باہمی فسادات پر ان کی نظم ''انقلابِ دہر'' کے یہ اشعار ایک ٹیس کی طرح چبھتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ ملاحظہ کیجیے:

دورِ زماں جو دشمنِ امن و اماں ہوا　　برہم نظامِ کشورِ ہندوستاں ہوا
جینا یہاں کا باعثِ آزارِ جاں ہوا　　دوزخ نما یہ خطۂ جنت نشاں ہوا
کیا انقلابِ دہر کدورت فشاں ہوا　　بادِ سحر چلی تو بگولا عیاں ہوا
گھیرا تمام ملک کو نفرت کی آگ نے　　دل داغ دار کر دیے ناحق کی لاگ نے[۳۱۳]

محروم کو اس بات کا بڑا صدمہ اور قلق تھا کہ شیخ و برہمن کی کشاکش نے ہندوستان کے اتحاد کی دھجیاں اڑا کر رکھ دی ہیں۔ ہند و مسلم فسادات میں جس طرح بچوں، عورتوں، بے گناہ اور راہ چلتے لوگوں کو شدت پسند اپنی بربریت کا نشانہ بنا رہے تھے، اس پر محروم جھنجھلاہٹ کا شکار ہو کر آدمیت سے گرے ہوئے ان اقدامات پر اپنی نظم ''اہل وطن کی خدمت میں'' میں کہتے ہیں کہ:

ہند کے ہندوؤ مسلمانو!　　عقل سے کام لو کہا مانو!
یہ نہ مذہب ہے نہ سیاست ہے　　بربریت ہے اور وحشت ہے
گھر سے نکلو، گھروں کو آگ لگاؤ　　بے کسوں، بے بسوں کو اس میں جلاؤ
بے گناہوں کو، راہ چلتوں کو　　گھیر لو اور ذبح کر ڈالو
چیختی عورتوں پہ وار کرو　　نیزے بچوں کے دل سے پار کرو
کیا یہی چیز آدمیت ہے؟　　یہی مذہب، یہی شرافت ہے[۳۱۴]

محروم کی قومی شاعری کا روشن پہلو یہ ہے کہ انھوں نے تحریک آزادی کے تاریک سے تاریک لمحوں میں بھی امید کا دامن کبھی نہ چھوڑا۔ ان کے حوصلے کبھی پست نہ ہوئے۔ انھوں نے یقین کی شمع کو ہمیشہ روشن رکھتے ہوئے ہند کے نوجوانوں کو عزم و حوصلے کے ساتھ میدان عمل میں شرکت کا مشورہ دیا۔ نظم ''گھر سے نکل کے دیکھو'' میں انھوں نے جذبات میں تلاطم پیدا کرنے کے لیے نوجوانوں کو کہا کہ:

کب تک یہ قعرِ پستی اونچے نشان والو!　　کب تک ذلیل رہنا، اے آن بان والو!
گھر سے نکل کے دیکھو اے جسم و جان والو!　　بے حس رہو گے کب تک اے ہندوستان والو[۳۱۵]

محروم کو ہمیشہ سرفروشوں سے الفت رہی انھوں نے متعدد نظموں میں ان لوگوں سے گہری عقیدت کا اظہار کیا۔ ان کی شاعری میں ہندوستان کی تمام محبوب ہستیوں کے خدوخال دکھائی دیتے ہیں۔ بال گنگا دھر تلک، گوپال کرشن گوکھلے، سی آر داس، موتی لال نہرو، رفیع احمد قدوائی، مہاتما گاندھی، جواہر لال نہرو، ابوالکلام آزاد، سبھاش چندر بوس، لاجپت رائے، حسرت موہانی، بھگت سنگھ اور ہر کشن جیسے محبّ وطن شہید اور غازی ان کی شاعری کا موضوع بنے لیکن اس ساری جدوجہد کا حاصل بہر حال تقسیم ہند کی صورت میں نکلا جو محروم اور مشترکہ ہندوستان کی سوچ کے حامل دیگر شعرا کے لیے کسی طرح بھی خوشی کا باعث نہیں تھی۔ اب محروم کا وطن اس کا اپنا نہ رہا۔ انھیں اپنے وطن اپنی جائے پیدائش کو خیر باد کہنا پڑا۔ پاکستان سے ہجرت کرتے ہوئے ہندوستان کی طرف جانا محروم کے لیے ایک تلخ تجربے سے کم نہیں تھا۔ اسی لیے وہ ترکِ وطن کرتے ہوئے ''پاکستان کو الوداع'' کے عنوان سے لکھی گئی نظم میں اپنے ان محسوسات کو درج کرتے

ہوئے اس کرب کا بھرپور اظہار کرتے ہیں۔نظم سے پہلے درج رباعی کے یہ اشعار:

آج اپنے وطن سے جا رہا ہے محروم | مامن پیشِ نظر، نہ منزلِ معلوم
ہنگامِ وداع ہم نے دیکھا اس کو | حسرت زدہ، دل شکستہ، حیران مغموم[۳۱۶]

ان کی حسرت و یاس کو پوری طرح پیش کرتے ہیں۔وہ ہجرت کے اسی کرب کو محسوس کرتے ہوئے آزادی اور اس کے نتیجے میں نوزائیدہ مملکتِ پاکستان جو ماضی میں ان کا بھی وطن تھا، سے شکوہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

تو نے لیکن اے وطن، مجھ کو دیا انعام خوب | زندگی کے دورِ آخر میں ہوا انجام خوب
آہٹ آزادی کی پا کر ہو گیا دیوانہ تو | آدمیت کی فضیلت سے ہوا بے گانہ تو
نام پر مذہب کے ہر فعلِ زبوں ہونے لگا | گرم بازارِ فساد و کشت و خوں ہونے لگا
یک بہ یک آبادیوں سے آگ کے شعلے اٹھے | خون کے پیاسوں کے لشکر قریہ قریہ سے اٹھے
جو تصور میں نہ تھے، وہ فتنے برپا ہوگئے | چار سو شمشیر و خنجر کار فرماں ہوگئے
حق سے بے رخ کر دیا انگریز کی تدبیر نے | آدمی سے آدمیت چھین لی تقدیر نے[۳۱۷]

اردو کی مزاحیہ شاعری میں مصطفیٰ خان مدّاح احمق پھپھوندی سیاسی طور پر کانگریسی نظریے کے حامل تھے[۳۱۸]۔وہ عملی سیاست میں بھی سرگرم رہے۔انگریز راج کے خلاف مزاحمت ان کی شاعری کا خاصا تھی۔ان کی اصل شناخت ان کا مزاحمتی رویہ تھا۔ان کی نظم ''بار الٰہا پھر اب ہند کو آزاد کر'' میں بلند آہنگی کے ساتھ ساتھ ان کا مزاحمتی رنگ نمایاں ہے۔ملاحظہ کیجیے:

رنج و الم کب تلک | جور و ستم کب تلک
جنگ پیہم کب تلک | روز کا غم کب تلک
ختم بس اب یا خدا ملک سے بیداد کر | بار الٰہا پھر اب ہند کو آزاد کر[۳۱۹]

ان کے مجموعے ''نقش حکمت'' کا مزاج بھی جارحانہ ہے۔اس میں زیادہ تر موضوعاتی نظمیں ہیں جو ساری کی ساری کانگریسی نقطۂ نظر کی حامل ہیں۔وہ انگریزوں کی منافقانہ پالیسی بالخصوص برصغیر میں ہندو مسلم کے درمیان تنازعات کو ہوا دے کر منافرت پیدا کرنے کی حکمت عملی پر سخت احتجاج کرتے دکھائی دیتے ہیں۔جیسے:

بہائیں بھائیوں کا خون تب ہم با وفا ٹھہریں | بہت دشوار ہے ان کے نمک کا حق ادا کرنا[۳۲۰]

احمق انگریزوں کے نظامِ حکومت اور استیصالی طرزِ فکر پر بھی سخت مضطرب دکھائی دیتے ہیں۔وہ ان لوگوں سے بھی نالاں دکھائی دیتے ہیں جو انگریزوں کی کاسہ گدائی اور خوشامد کرنے کا کوئی موقعہ ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ان کے مطابق:

گلشنِ آئینِ برٹش کی بہاریں دیکھ لیں | اس چمن میں بادِ صرصر کے سوا کچھ بھی نہیں[۳۲۱]

ترقی پسند شعرا نے بھی ۱۹۴۵ء تک تحریک پاکستان کی تائید و حمایت جاری رکھی لیکن بعد میں کمیونسٹ پارٹی کی پالیسی میں تبدیلی آئی اور انھوں نے تشکیلِ پاکستان کے برطانوی منصوبوں کو انگریزوں کی سازش قرار دیا۔اس زمانے میں مجاز وہ واحد ترقی پسند شاعر تھے جنھوں نے ''پاکستان کا ملّی ترانہ'' کے عنوان سے نظم لکھ کر مسلم لیگیوں کا حوصلہ بڑھایا۔ملاحظہ کیجیے:

آزادی کی دھن میں کس نے آج ہمیں للکارا — خیبر کے گردوں پر چمکا ایک ہلال اک تارا
سبز ہلالی پرچم لے کر نکلا لشکر سارا — پربت کے سینے سے پھوٹا کیسا سرکش دھارا
پاکستان ہمارا پاکستان ہمارا پاکستان ہمارا[۳۲۲]

مجاز نے اپنی البیلی آواز سے وطن دوستی کو نیا آہنگ دیا۔ان کی انقلابی شاعری میں جذبۂ آزادی والہانہ طور پر سامنے آتا ہے۔ انھوں نے جو کچھ بھی کہا، فاتحانہ انداز میں طبیعت کی حیرت انگیز سرشاری کے ساتھ کہا۔انھیں انقلاب کا مطرب بھی کہا گیا۔وہ مشکلات کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر گیت گانے اور ان کی ہیبت چھین لینے کا حوصلہ رکھتے ہیں[۳۲۳]۔''انقلاب''،''مطرب سے''،''مزدور''، ''نوجوان سے''اور''ہمارا جھنڈا''وغیرہ جیسی نظموں میں یہی رجز ملتا ہے۔نظم''انقلاب''کے چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

چھینک دے اے دوست اب بھی چھینک دے اپنا رباب — اٹھنے ہی والا ہے کوئی دم میں شورِ انقلاب
گر پڑیں گے خوف سے ایوانِ عشرت کے ستوں — خون بن جائے گی شیشوں میں شرابِ لالہ گو
سرخ ہوں گے خون کے چھینٹوں سے بام و در تمام — غرق ہوں گے آتشیں ملبوس میں منظر تمام[۳۲۴]

نظم''جلاوطن کی واپسی''میں مجاز نے بدلتے منظر نامے کو پیش کرتے ہوئے ہندوستانیوں کو دعوتِ عمل دیتے دکھائی دیتے ہیں۔ نظم کے آخری بند میں ان کا انداز ملاحظہ کیجیے:

دیکھ بدلا نظر آتا ہے گلستاں کا سماں — ساغر و ساز نہ لے، جنگ کے نعرے ہیں یہاں
یہ دعائیں ہیں وہ مظلوم کی آہوں کا دھواں — مائلِ جنگ نظر آتا ہے ہر مرد و جواں
سرفروشانِ بلاکش کا سہارا بن جا — اٹھ اور افلاکِ بغاوت کا ستارا بن جا[۳۲۵]

اپنی ایک اور نظم''آہنگِ نو''میں بھی وہ سامراجی مظالم اور ان کے مظالم کے خلاف سیسا پلائی دیوار بن جانے والے نوجوانوں کے جذبات کو بھڑکاتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

ایک اک سمت سے شب خون کی تیاری ہے — لطف کا وعدہ ہے اور مشقِ جفا کاری ہے
اُس طرف ہاتھوں میں شمشیریں ہی شمشیریں ہیں — اس طرف ذہن میں تدبیریں ہی تدبیریں ہیں
ظلم پر ظلم ہیں، تعزیروں پہ تعزیریں ہیں — سر پہ تلوار ہے اور پاؤں میں زنجیریں ہیں
اپنی سرحد پہ جو اغیار چلے آتے ہیں — تم جو اٹھ جاؤ تو بے کار چلے آتے ہیں[۳۲۶]

''بدیشی مہمان سے''کے عنوان سے لکھی گئی نظم میں انھوں نے برطانوی سامراج کو ہندوستان سے نکل جانے اور استیصال کو مزید برداشت نہ کرنے کا عندیہ دیتے ہوئے کہا کہ:

مسافر بھاگ وقتِ بے کسی ہے — تیرے سر پہ اجل منڈلا رہی ہے
تری جیبوں میں ہیں سونے کے توڑے — یہاں ہر جیب خالی ہو چکی ہے
نہ دے ظالم فریبِ چارہ سازی — یہ بستی تجھ سے اب تنگ آچکی ہے
مناسب ہے کہ اپنا راستہ لے — وہ کشتی دیکھ ساحل سے لگی ہے

بگولے اٹھ رہے ہیں بڑھ رہے ہیں	فضائے دہر میں ہلچل مچی ہے
یہاں ہر شاخ شمشیرِ برہنہ	گلوں سے خون کی بو آ رہی ہے
یہاں کے آسمانِ آتشیں پر	بغاوت کی گھٹا منڈلا رہی ہے
یہاں سے ایک طوفاں چل رہا ہے	یہاں سے آ یک آندھی اُٹھ رہی ہے[۳۲۷]

کیفی اعظمی کا شمار بھی ان ترقی پسند شعرا میں ہوتا ہے جنھوں نے اپنے دور کے سیاسی حالات و واقعات اور جدو جہد آزادی کو اپنا موضوع سخن بنایا۔ ''کرن''، ''فضا''، ''بت شکنی''، ''قلعہ احمد نگر''، ''مسیحا'' اور ''آخری مرحلہ'' وغیرہ ان کی قابل ذکر سیاسی نظمیں ہیں۔ اس کے علاوہ وقتی اور ہنگامی موضوعات پر بھی ان کی متعدد نظمیں مشہور ہوئیں۔ ۱۹۴۴ء میں شائع ہونے والے پہلے مجموعے ''جھنکار'' سے ہی ان کے فکری اور سیاسی رجحان کا پتا چلتا ہے۔ اس میں وہ واضح طور پر فاش ازم اور سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف کلمۂ حق بلند کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ ان کا محبوب رہنما اسٹالن ہے جو ایک مزدور تھا۔ وہ اپنے ہم وطنوں کو اسٹالن کی طرز پر جدو جہد اور عمل پیہم کا درس دیتے ہیں۔ اس مجموعے میں شامل نظم ''جبل کے در پر'' کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ حریت فکر کے متوالوں کے ساتھ اس زمانے میں کیا سلوک روا رکھا جاتا تھا اور ان حالات میں بھی ان کی سوچ اور خیالات سے کس طرح کے شرارے پھوٹتے تھے۔ کچھ اشعار ملاحظہ کیجیے:

اک مجسم جرات وغیرت سراپا انقلاب	کھا رہا ہے جبل کے در پر ہزاروں پیچ و تاب
آنکھ میں خونِ بغاوت قلب میں حب وطن	آگ تیکھی چتونوں میں آنکھڑیوں میں بانک پن
تپتی سانسوں میں شرر پارے، جھکولے، آندھیاں	تلملاتی تیوریوں میں تھر تھرا کی بجلیاں[۳۲۸]

دورِ غلامی کی منظر کشی بھی اس نظم سے پوری طرح عیاں ہے۔ رومانی انداز سے جوتوں کی چاپ کو سازِ غلامی سے تعبیر کرتے ہوئے شاعر کہتے ہیں کہ:

فیل پیکر سنتری پھرتے تھے بل کھاتے ہوئے	ساز جوتوں کے غلامی کے تھے، دھن گاتے ہوئے[۳۲۹]

نظم ''انتباہ'' میں وہ ایک جانب ہندو مسلم باہمی اتحاد کی ضرورت کا احساس دلاتے ہوئے یہ مشورہ دیتے ہیں کہ:

مٹا دو باہمی رنجش کہ وقتِ اتحاد آیا	منظّم قوم کو کر دو حیاتِ جاوداں دے دو
کہاں تک ٹھوکریں کھلوائے گی آخر یہ گم راہی	پریشاں قافلے کو اب تو منزل کا نشاں دے دو[۳۳۰]

تو دوسری جانب ایوانِ اقتدار میں بیٹھے حکم رانوں کو طرزِ حکم رانی کے بدلے ظلم کے اس نظام کو ختم کرنے کا مشورہ دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

گرجتے زلزلے چنگھاڑتے طوفان آتے ہیں	ارے ایسے میں یہ مشقِ ستم رانی نہیں اچھی
جمالِ زندگی پر زرد خطرہ چھایا جاتا ہے	محبانِ وطن کی خوں کی ارزانی نہیں اچھی
نکالو جیل سے ان کو جو خضر ملک و ملت ہیں	ان اجزائے جماعت کی پریشانی نہیں اچھی[۳۳۱]

کیفی کا دوسرا مجموعہ ''آخرِ شب'' ۱۹۴۷ء میں منظر عام پر آیا۔ اس مجموعے میں شامل متعدد نظمیں قومی معاملات کی عکاسی کرتی دکھائی دیتی ہیں۔ کبھی وہ قلعہ احمد نگر میں زیر حراست نظر بند کانگریسی قیدیوں کی حالت پر کف افسوس ملتے ہوئے نظم ''تلاش'' میں کہتے ہیں

کہ:

یہ بجھی سی شام یہ سہمی ہوئی پرچھائیاں — خونِ دل بھی اس فضا میں رنگ بھر سکتا نہیں
لوٹ سے ظلمت نے روئے ہند کی تابندگی — رات کے کاندھے پہ سر رکھ کے ستارے سو گئے
وہ بھیانک آندھیاں وہ ابتری وہ خلفشار — کارواں بے راہ ہو نکلا مسافر کھو گئے[۳۳۲]

اور کبھی وہ اپنی نظم ''کب تک'' میں مختلف حربوں سے ظلم و بے داد کی تاریخ رقم کرنے والی قوتوں سے صدائے احتجاج بلند کرتے ہوئے سسک سسک کر مرنے اور انفرادی طور پر بغاوت کا علم بلند کرنے کے بہ جائے مشترکہ جدوجہد کی طرف توجہ دلاتے ہیں تا کہ مقصد کا تعین اور حصول آسان ہو سکے۔ ملاحظہ کیجیے:

جانے ہم رحم کی درخواست کریں گے کب تک — کب تک آئین کی محتاج مذمت ہوگی
ایک اک نام پہ کہرام مچے گا کب تک — کب تک اس طرح بالاقساط بغاوت ہوگی[۳۳۳]

ان کی نظموں میں اقتدار سے محرومی ومحکومی، سرخ انقلاب کی آرزو، جدوجہد، سرمایہ داروں کا استیصالی نظام، غیر ملکی تسلط سے نفرت اور آزادی کی چاہت وغیرہ جیسے موضوعات کی بھرمار ہے۔ نظم ''آخری مرحلہ'' میں وہ نغمۂ آزادی کے متوالوں کے عزم وحوصلے کی منظرکشی کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

حصار باندھے ہوئے تیوریاں چڑھائے ہوئے — کھڑے ہیں ہند کے سردار سر اٹھائے ہوئے
بڑھے ہیں جھیلے ہوئے قید و بند کے آزار — اٹھے ہیں جنگِ خلافت کے آزمائے ہوئے[۳۳۴]

کیفی کو اس بات کا مکمل یقین تھا کہ ملک جلد ضرور آزاد ہو جائے گا۔ اسی لیے وہ آزادی کے متحرک پیغام کو ہر نفس تک پہنچاتے ہوئے ان کے عزم وحوصلے کو بڑھاتے ہیں:

مٹا دو مل کے مٹا دو نشاں غلامی کا — زمین چھوڑ چکا کارواں غلامی کا[۳۳۵]

اسی لیے وہ گاندھی جناح ملاقات کے موقع پر اپنی نظم ''کرن'' میں خوشی کا اظہار کرتے ہوئے باہمی اخوت اور یک جہتی کے اس عمل کو مستقل بنیادوں پر جاری رکھنے کا عزم کرتے ہیں۔ ان کے مطابق اس ملاقات سے دشمنوں کے سانس بھی اکھڑنے لگے ہیں اور آزادی کی جدوجہد کو بھی بھرپور فائدہ پہنچا ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

مل گئیں اٹھ کے نگاہیں جو نگہبانوں کی — نبض ابھر آئی سسکتے ہوئے ارمانوں کی
ناخدا جوڑ کے سر بیٹھنے والے ہیں اِدھر — اور اُدھر سانس اکھڑنے لگی طوفانوں کی[۳۳۶]

کیفی کے نزدیک آزادی اب محض دنوں کی بات رہ گئی ہے لہٰذا وہ اس ''نئی جنت'' میں امن ومحبت کے ساتھ رہنے اور تفرقہ بندی چھوڑ کر پھر سے جڑنے کی ضرورت کا احساس دلانا بھی ضروری سمجھتے ہیں۔ اسی لیے وہ کہتے ہیں کہ:

ہم اب کے تنکے تنکے کو چمن بندی سکھائیں گے — نئے ہندوستاں میں ہم نئی جنت بسائیں گے
وفورِ جستجو میں کیسے اپنے کیسے بے گانے — گتھے رہتے ہیں باہم شمعِ آزادی کے پروانے
گرہ لگنے سے اکثر رشتۂ دل ٹوٹ جاتا ہے — الگ ہو کر رہیں گے متحد تسبیح کے دانے

شکنجے توڑ دو متوالے ہنس کر مل ہی جائیں گے　　　نئے ہندوستاں میں ہم نئی جنت بسائیں گے[۳۳۷]

وطن کی آزادی کی ہواؤں کو وہ دور سے آتا محسوس کر رہے تھے۔ان کے خیال میں آزادی کی سرمستی کا اعلان اب یہ ہوائیں اور فضائیں تک کرنے لگی تھیں۔لہٰذا اس کیفیت کا اظہار کرتے ہوئے نظم ''آزادی'' میں وہ کہتے ہیں کہ:

جبیں سے نور برساتی، چلی آتی ہے آزادی　　　مچلتی، جھومتی، گاتی چلی آتی ہے آزادی

یہ سیلِ آتش و آہن یہ بحرِ خوں کی طغیانی　　　فضا کی نبض برہم، وقت کے انداز طوفانی

غلامی کا سفینہ گھومتا ہے ڈگمگاتا ہے　　　جواں موجیں لیے دامن میں ساحل مسکراتا ہے

جواں موجوں پہ بل کھاتی، چلی آتی ہے آزادی　　　چٹانیں توڑتی، ڈھاتی، چلی آتی ہے آزادی[۳۳۸]

کیفی ہندوستان کے سیاسی حالات کے تناظر میں ہندو مسلم قیادت کی حکمت عملی اور کارکردگی سے مطمئن دکھائی نہیں دیتے۔ان کے خیال میں سامراجی قوتوں کے آگے ڈٹ کر مقابلہ کرنے کی حکمت عملی کے بجائے یہ رہنما اپنی غلامانہ روش سے باز نہیں آتے۔وہ اس طرزِ عمل پر طنز کرتے ہوئے نظم ''سپردگی'' میں کہتے ہیں کہ:

یاد تو ہوگا تمھیں بھی وہ غلامانہ چلن　　　گھر کے جھگڑوں میں رہا کرتے تھے تم دونوں مگن

آ گیا عین لڑائی میں جو لندن سے مشن　　　شملہ رو ہو کے جھکا دی گئی آخر گردن

درِ دیول پہ ہری اور غنی ایک ہوئے　　　اس کے دربار میں پہونچے تو سبھی ایک ہوئے[۳۳۹]

وہ ان رہنماؤں پر طنز کرتے ہوئے مشترکہ دشمن کے ظلم و جبر یاد دلاتے ہیں۔حیرت کی بات یہ ہے کہ ہندوستانی قیادت اسی دشمن سے ساز باز کر کے حریت پسندوں کی قربانیوں کو فراموش کر بیٹھی تھی۔اس لیے شاعر اس ضمن میں کہتے ہیں کہ:

دوست سے روٹھ کے غیروں کی جفا بھول گئے　　　باہمی جنگ میں دشمن کا گلا بھول گئے

زخم سینے کا ہنسی میں نہ چھپاؤ ہم سے　　　رو برو آج نگاہیں نہ ملاؤ ہم سے

تم نے سر سامنے دشمن کے جھکایا کیسے؟　　　اپنے جے کاروں کو، نعروں کو بھلایا کیسے؟[۳۴۰]

وہ قیادت کو ماضی کی قربانیوں کی یاد بھی دلاتے ہیں اور ان کے طرزِ عمل کا حساب بھی مانگتے ہیں۔ان کے خیال میں آزادی کی جو قیمت اسلاف نے ادا کی ہے، اس کو فراموش کیے بغیر کسی بھی قسم کا معاہدہ ناقابلِ قبول ہوگا۔اسی لیے وہ ان رہنماؤں کی توجہ اس جانب دلاتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

جاؤ چٹ گاؤں کے جاں باز گنہ گار سہی　　　ویر پنجاب کے بنگال کے بدکار سہی

تھا بھگت سنگھ خطا وار، خطا وار سہی　　　لال کیّور کے غدّار تھے، غدّار سہی

موپلا سے تو کبھی شکوۂ بے داد سنو　　　سن بیالیس کے کشتوں کی تو فریاد سنو

آج اس بارِ غلامی سے بہت چور ہیں سب　　　بھوک سے، پیاس سے، آزار سے مجبور ہیں سب[۳۴۱]

اپنی ایک نظم ''حملہ'' میں بھی وہ غلامی کی زنجیروں کو توڑ کر علم بغاوت بلند کرنے کا اعلان کرتے ہیں:

بغاوت کا پرچم اڑاتے چلو　　　نظامِ غلامی مٹاتے چلو

ہمارے رفیقوں پہ یہ سختیاں چلو جیل خانوں کو ڈھاتے چلو
یہ راہوں میں بہتا ہے جو گرم خوں اسی خوں سے طوفاں اٹھاتے چلو[۳۴۲]

اس پرچم کو تھامنے کے لیے وہ ہندوستان میں بسنے والی ہر قوم اور ہر فرد کو آواز دیتے ہیں۔ ان کے خیال میں رنگ، مذہب اور ملّت سے بڑھ کر عظیم مقصد اس وقت ہندوستان کی آزادی کا ہے اور اس کے لیے وہ اتحاد باہمی کو لازمی قرار دیتے ہیں:

سکھو، ہندوٗ، پارسی بھائیو ہریجن، مسلمانو، عیسائیو
وطن، قوم ملّت کے شیدائیو قدم کو قدم سے ملاتے چلو
یہی جاں فزا گیت گاتے چلو بغاوت کا پرچم اڑاتے چلو[۳۴۳]

لیکن ان تمام کوششِ لاحاصل کے نتائج بہر حال تاریخ کی بدترین قتل و غارت گری کی صورت میں نکلے۔ خطۂ ہندوستان میں ہندو، مسلم، سکھ اور دیگر مذاہب کے درمیان امن و آشتی کی فضا قائم نہ رہی سکی۔ ملک میں نفاق اور تفرقے نے ایسا گھر کیا کہ دوست اور پڑوسی بھی ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہوگئے۔ جگہ جگہ ہونے والی خانہ جنگی، قتل و غارت گری خصوصاً سانحاتِ کلکتے و بہار سے انسانیت بھی شرمندہ دکھائی دینے لگی۔ اس صورتِ حال پر کیفی بھی مغموم دکھائی دیتے ہیں۔ اپنی نظم ''خانہ جنگی'' میں ان اندوہ ناک مناظر کی بابت کہتے ہیں کہ:

جب سے آکر گئے ہیں اہلِ مشن زندگی کا بگڑ گیا ہے چلن
بھائی بھائی کا خوں بہاتا ہے ایک کو ایک کھائے جاتا ہے
آنکھ پڑتی ہے جس کے ماتھے پر تیوریوں میں لچکتے ہیں خنجر
ہر طرف شور ہے دہائی ہے گھر کی تقسیم پر لڑائی ہے
سوکھتی ہے پڑوسیوں سے جاں دوستوں پر ہے قاتلوں کا گماں
ناکے ناکے پہ ہے پولیس کا راج ہو چکی ہے گلی گلی تاراج[۳۴۸]

مذہب اور علاقائی تقسیم کے نظریے سے کیفی سخت پریشاں دکھائی دیتے ہیں۔ وہ ان اختلافات اور جانوں کے زیاں پر تو افسوس کا اظہار کرتے ہی ہیں لیکن ساتھ ساتھ وہ ان فسادات کے نتیجے میں ہونے والی بے روزگاری، بے کاری اور افلاس کی وجہ سے بھی فکر مند دکھائی دیتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ:

بول اے سر زمینِ کلکتہ کون شعلوں کو دے رہا ہے ہوا
لگ گئی کتنے آنچلوں میں آگ لٹ گیا کتنی دیویوں کا سہاگ
ہوگئے بند کتنے کاروبار کتنے مزدور بیٹھے ہیں بے کار
خون رو خون اے نواکھالی ہو گئے دیکھ کتنے گھر خالی[۳۴۵]

وہ ہندوستان کے طول و ارض میں ہونے والے فسادات، خون ریزی، ہلاکتوں اور بے کسوں کی فریاد پر سخت اذیت کا شکار دکھائی دیتے ہیں۔ فتنہ پھیلانے والے اور آگ و شورش کو ہوا دینے والے سیاسی رہنماؤں کو مخاطب کر کے فریاد بھی کرتے ہیں اور کبھی طنزیہ

انداز میں انھیں کہتے ہیں کہ:

ہو کہاں فتنہ دوست راہ برو / آؤ لاشیں ذرا شمار کرو
لو یہ انعام رہ نمائی کا / لو یہ لاشوں کا خون کا تحفہ
لو یہ ہے شیخ و برہمن کی لاش / نسل کی، قوم کی، وطن کی لاش
دیکھ اے بمبئی، بتا دلّی / بہتی ہے کس کے خون کی ندی[۳۴۶]

وہ اس معاملے میں کانگریس اور مسلم لیگ دونوں کو ذمے دار قرار دیتے ہیں۔ ان کے خیال میں ان تمام صورت حال کی ذمے دار دونوں جماعتوں کی قیادت ہے۔ اسی لیے وہ دونوں جماعتوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

آفریں ہندوٗ مسلمانو / لیگ کے کانگریس کے پروانو
خون کے ایک ایک قطرے کا / تم نے اپنوں سے لے لیا بدلہ[۳۴۷]

دوسری طرف وہ ''عوام'' کو مخاطب کرتے ہوئے خانہ جنگی اور باہمی چپقلش کی وجوہات اور اس صورتِ حال کو پیدا کرنے والے خفیہ ہاتھ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ان کا کہنا تھا کہ:

اے وطن اس قدر اداس نہ ہو / اس قدر غرقِ رنج و یاس نہ ہو
خانہ جنگی ہے آخری حربہ / زر پرستوں کا حکم رانوں کا
سانپ جس وقت چوٹ کھاتا ہے / زہر پھنکار سے اڑاتا ہے
آڑ ظلم و ستم کی لیتے ہیں / بھائیوں کو لڑا بھی دیتے ہیں
لیکن اے غم زدہ غریب وطن / کہیں رکتا ہے انقلاب کا گھن[۳۴۸]

کیفی اعظمی دیگر ترقی پسند شعرا کی طرح اپنے کلام کے ذریعے عوام میں استعماری طاقتوں کے خلاف بغاوت کی ترغیب بھی دیتے ہیں اور آزادی و انقلاب کے لیے جدوجہد کرنے پر اکساتے بھی دکھائی دیتے ہیں۔

مخدوم محی الدین کی شاعری میں بھی آزادی اور انقلاب کے جذبات پوری شدت کے ساتھ جلوہ گر ہیں لیکن ان کی خوبی یہ ہے کہ وہ ان موضوعات کو روایتی استعاروں اور کنایوں میں بڑی خوب صورتی سے پیش کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔ ان کی اکثر نظمیں سیاسی افادیت کے ساتھ ساتھ شعری لطافت کا بھی حسین مرقع ہیں۔ ''مشرق''، ''انقلاب''، ''کہو ہندوستان کی جے''، ''مستقبل'' اور ''جہانِ نو'' وغیرہ ان کی موثر ترین نظمیں ہیں۔ ان کی نظم ''باغی'' کے اشعار ملاحظہ کیجیے جس میں انقلابی سوچ کی جھلک بہت نمایاں ہے:

گردنِ ظلم کٹے جس سے وہ آرا، ہوں میں / خرمنِ خور جلا دے وہ شرارا، ہوں میں
توڑ ڈالوں گا میں زنجیر اسیرانِ قفس / دَہر کو پنجۂ عسرت سے چھڑانے دے مجھے
آگ ہوں آگ ہوں ہاں ایک دہکتی ہوئی آگ / آگ ہوں آگ بس اب آگ لگانے دے مجھے[۳۴۹]

مغربی استعمار نے مشرق خصوصاً ہندوستان کی جو حالت کر دی تھی، معاشی طور پر اس خطے کے لوگ کس مپرسی کی حالت میں زندگی گزارنے پر مجبور تھے۔ یہاں کے لوگ ایک زندہ نعش کی مانند تھے۔ نظم ''مشرق'' میں اس صورت حال کی بابت مخدوم کا کہنا تھا کہ:

جھڑ چکے ہیں دست و بازو جس کے اس مشرق کو دیکھ | کھیلتی ہے سانس سینے میں مریضِ دق کو دیکھ
ایک ننگی نعش بے گور و کفن ٹھٹھری ہوئی | مغربی چیلوں کا لقمہ خون میں لتھڑی ہوئی
ایک قبرستان جس میں ہوں نہ ہاں کچھ بھی نہیں | اک بھٹکتی روح ہے جس کا مکاں کچھ بھی نہیں [۳۵۰]

''موت کا گیت'' میں وہ مذہب اور فرقوں میں بٹی قوم کے کریہہ مظالم، انسانی خون کی ارزانی اور خطۂ ارض پر اس انسانیت سوز عمل کے نتائج کی بابت ان کا کہنا ہے کہ:

عرش کی آڑ میں انسان بہت کھیل چکا | خونِ انسان سے حیوان بہت کھیل چکا
وقت ہے آؤ دو عالم کو دگر گوں کر دیں | قلبِ گیتی میں تباہی کے شرارے بھر دیں
ظلمتِ کفر کو ایمان نہیں کہتے ہیں | سگِ خوں خوار کو انسان نہیں کہتے ہیں
پھونک دو قصر کو گرکن کا تماشا ہے یہی | زندگی چھین لو دنیا سے جو دنیا ہے یہی
آؤ یہ کرّہ ناپاک بھسم کر ڈالیں | کاسۂ دہر کو معمورِ کرم کر ڈالیں [۳۵۱]

اپنی نظم ''آزادیِ وطن'' میں وہ ''ہندوستان کی جے'' کا نعرہ بلند کرتے ہوئے اس بات کا عہد کرتے دکھائی دیتے ہیں کہ وہ اس ملک کی آزادی کے چراغ کو کبھی گل نہیں ہونے دیں گے۔ ان بابت ان کا کہنا تھا کہ:

قسم ہے خون سے سینچے ہوئے رنگیں گلستاں کی | قسم کے خونِ دہقاں کی قسم خونِ شہیداں کی
یہ ممکن ہے کہ دنیا کے سمندر خشک ہو جائیں | یہ ممکن ہے کہ دریا بہتے بہتے تھک کے سو جائیں
جلانا چھوڑ دیں دوزخ کے انگارے یہ ممکن ہے | روانی ترک کر دیں برق کے دھارے یہ ممکن ہے
زمینِ پاک اب ناپاکیوں کو ڈھو نہیں سکتی | وطن کی شمعِ آزادی کبھی گل ہو نہیں سکتی [۳۵۲]

''حویلی'' میں وہ بے بس، لاچار اور نڈھال ہندوستان کو وہ ایسی بوسیدہ حویلی سے تعبیر کرتے ہیں جس کے در و دیوار سے حسرت اور ویرانی ٹپک رہی ہے لیکن وہ اس حالت میں بھی خدا کے آگے دعا گو ہیں کہ ان کھنڈروں میں آزادی کی تڑپ اور امنگ پیدا کرنے کا سامان پیدا کر دے۔ ملاحظہ کیجیے:

ایک بوسیدہ حویلی یعنی فرسودہ سماج | لے رہی ہے نزع کے عالم میں مُردوں سے خراج
اک مسلسل کرب میں ڈوبے ہوئے سب بام و در | جس طرف دیکھو اندھیرا جس طرف دیکھو کھنڈر
آ انھیں کھنڈروں پہ آزادی کا پرچم کھول دیں | آ انھیں کھنڈروں پہ آزادی کا پرچم کھول دیں [۳۵۳]

''زلفِ چلیپا'' مخدوم کی بہترین نظموں میں سے ایک ہے۔ اس نظم میں وہ وطن کے اندر چھائی پژمردگی اور بھرپور ردِعمل کے طور پر پیدا ہونے والے تحرک کے مناظر دکھاتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

کتنی ماؤں کی سہانی گودیاں ویراں ہیں آج | فرقِ گیتی پہ نظر آیا ہے پھر کانٹوں کا تاج
موت محوِ شادمانی، غرقِ ماتم ہے حیات | لُٹ رہی ہے ساری خلقت جل رہی ہے کائنات
مندروں میں معبدوں میں اور کلیساؤں میں موت | خلوتوں میں موت ہے شاہی شبستانوں میں موت

برہمی زلف چلیپا میں کبھی دیکھی نہ تھی　　برہمی دیکھی تھی، ایسی برہمی دیکھی نہ تھی[۳۵۴]

جذبی کے ہاں بھی بیرونی سامراج کی ناانصافیوں کے خلاف سوزِ دل کی فریاد نے ردِعمل کی صورت اختیار کر لی۔ تقسیم ہند کے موضوع پر لکھی گئی نظم ''نیا سورج'' میں ان کا یہ انداز دیکھا جا سکتا ہے۔ ۱۵/اگست ۱۹۴۷ء کو آزادیِ ہند کا سورج طلوع ہو گیا لیکن یہ آزاد فضا جس قدر مضمحل اور دل گرفتہ تھی اس جانب اشارہ کرتے شاعر کہتے ہیں کہ:

مگر برق و آتش کے سائے میں اے دل　　یہ صدیوں کی خود رفتہ ناشاد طائر

یہ صدیوں کے پر بستہ برباد طائر　　یہ ہیں آج بھی مضمحل دل گرفتہ

یہ ہیں آج بھی اپنے سر کو چھپائے　　ارے او نئی شان کے میرے سورج[۳۵۵]

جیسے جیسے تحریک آزادی کی لے تیز ہوتی گئی ہنگامی موضوعات کی آواز نقارہ جنگ کی طرح گونجنے لگی تھی لیکن جذبی کی شاعری میں اس قسم کا سیاسی پروپیگنڈا تو دکھائی نہیں دیتا لیکن علامتوں اور کنایوں میں ان کی غزلیں بھی اپنے عہد کی صدائے بازگشت ضرور کہی جا سکتی ہے[۳۵۶]۔ یہ غزلیں روایتی رنگ کی ہونے کے باوجود اپنے موضوعات کے لحاظ سے بالکل نئی اور الگ ہیں۔ اسی انفرادیت کی وجہ سے جذبی کی غزلوں کو اس عہد کی آواز سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

ان بجلیوں کی چشمک باہم تو دیکھ لیں　　ان بجلیوں سے اپنا نشیمن قریب ہے

سب کچھ نصیب ہو بھی تو اے شورشِ حیات　　تجھ سے نظر چرانے کی عادت کہاں سے لائیں

خدا کرے مری داماندگی کو غیرت آئے　　ابھی منازلِ رنج و محن کچھ اور بھی ہیں

خدا کرے نہ تھکیں حشر تک جنون کے پاؤں　　ابھی مناظرِ دشت و کہن کچھ اور بھی ہیں[۳۵۷]

ان کی نظموں میں بھی دورِ حاضر کے مسائل، ہندوستانی معاشرت کا کرب اور اس کا ردِعمل پوری طرح موجود ہے۔ ان نظموں میں براہ راست سیاسی مقصدیت کا اظہار نہیں یہ نظمیں ترقی پسند قوتوں کے روشن و تاریک اور مثبت و منفی پہلوؤں کو پوری طرح اجاگر کرتی ہیں[۳۵۸]۔ تقسیم کے حوالے سے جو کرب ان کی شاعری میں دکھائی دیتا ہے وہ دیگر شعرا سے مختلف ہے۔ ان کی نظم ''تقسیم'' اس لحاظ سے بھی اہم ہے کہ اس میں نوزائیدہ دونوں ممالک کے سیاسی اور معاشی حالات کو موضوع بنا کر تقسیم کے اس عمل کو دلوں کی تقسیم قرار دیا۔ ان کا کہنا تھا کہ:

کیا یہی انقلاب ہے، قلب اِدھر جگر اُدھر　　نالۂ بے قرار اِدھر، شورشِ چشم تر اُدھر

اف ری سیاستِ چمن، رنگ کو بوئے سوئے ظن　　کور ہے دیدۂ وطن، نور اِدھر نظر اُدھر

ایک تبسمِ فرہنگ، ہر دور افق لہو ترنگ　　نعش بدوش و لالہ رنگ شام اِدھر سحر اُدھر[۳۵۹]

تقسیم کے اس عمل نے فسادات، لوٹ مار، نقل مکانی، ہجرت، معاشی، معاشرتی اور تمدنی اتھل پتھل اور بے یقینی کا جو ماحول پیدا کیا، اس نے سماجی قدروں کو بری طرح پائمال کیا۔ ان حالات کی بازگشت جذبی کی شاعری میں بھی سنائی دیتی ہے۔ اسی لیے وہ اپنے دل کے داغ اور نوحے کو بیان کرتے ہوئے منزل کی تلاش ایک بھٹکے ہوئے راہی کی طرح کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ ملاحظہ کیجیے:

چلو تلاش گل و لالہ و سمن میں چلیں　　خزاں جہاں چمن آرا ہے اس چمن میں چلیں

یہ دل کا داغ جو چمکے تو کیسی تاریکی　　　　اسی گھٹا میں چلیں ہم اسی گہن میں چلیں[۳۶۰]

ساحرلدھیانوی کی انقلابی شاعری کی انفرادیت بھی وہ نغمگی ہے جوان کی شاعری کی پہچان بنی۔ان کے ہاں گھن گرج بالکل نہیں۔وہ ہنگامی موضوعات پر بھی لکھتے ہوئے شائستگی کا دامن ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔''میرے گیت''، ''کچھ باتیں''، ''کل اور آج''، ''تلخیاں''، ''لمحۂ غنیمت'' اور''طلوعِ اشتراکیت'' میں ان کا یہ رنگ دیکھا جا سکتا ہے۔ان کی سیاسی نظموں میں مخدوم کی طرح رومان اور حقیقت کا امتزاج ملتا ہے۔وہ کبھی حقائق کی تلخی سے گھبرا جاتے ہیں تو رومان میں پناہ لینے کی کوشش کرتے ہیں۔دیگر ترقی پسندوں کی طرح وہ بھی اپنی شاعری میں بغاوت، انقلاب اور آزادی کے تصورات کو پیش کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ان کے نزدیک بھی ہندوستان کے ان تمام مسائل کا حل صرف اور صرف اشتراکیت میں ہے[۳۶۱]۔وہ بغاوت اور آزادی کے نغمے گاتے ہوئے ہر نظام سے ٹکرانے کا عزم بھی کرتے ہیں اور اس کے ساتھ وہ نئے نظام کی آمد کا اعلان بھی کرتے دکھائی دیتے ہیں:

سرکش بنے ہیں گیت بغاوت کے گائے ہیں　　　　برسوں نئے نظام کے نقشے بنائے ہیں[۳۶۲]

''طلوعِ اشتراکیت'' میں وہ واضح طور پر اس نئے نظام کی وضاحت بھی کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ان کے خیال میں سرخ پھریرا لہرانے کے بعد دنیا کو اب کسی دوسرے نظام کی ضرورت نہیں یہاں تک کہ ہندوستان کی آزادی اور خودمختاری بھی اسی فلسفۂ حیات سے جوڑ کر وہ اعلان کرتے ہیں کہ:

جشن بپا ہے کٹیاؤں میں، اونچے ایوان کانپ رہے ہیں　　　　مزدوروں کے بگڑے تیور دیکھ کے سلطان کانپ رہے ہیں
چوک چوک پھر گلی گلی میں سرخ پھریرا لہراتے ہیں　　　　مظلوموں کے باغی لشکر سیلِ صفت اُمڈے آتے ہیں[۳۶۳]

ساحر کو اپنی غلامی اور محکومی کا شدت سے احساس رہا۔انھوں نے غلامی کی ذلتوں کو بیان کرنے اور امن کی تلخیوں کو محسوس کرانے کے لیے ہندوستان کی پژمردہ اور دبی ہوئی مخلوق کے مردہ جسم میں نئی روح پھونکنے کی کوشش کی۔''لمحۂ غنیمت'' میں وہ حالات کی نزاکت جنگ عظیم دوم کے بعد برطانیہ کی کمزور عسکری حالت اور ہندوستان میں اٹھنے والے آزادی کے طوفان کو اپنے لیے لمحۂ غنیمت قرار دیتے ہوئے موقع سے فائدہ اٹھانے کی طرف توجہ دلاتے ہیں۔ملاحظہ کیجیے:

مسکرا اے زمینِ تیرہ و تار　　　　سر اٹھائے ہوئے دبی مخلوق
کوئی تیری طرف نہیں نگراں　　　　یہ گراں بار سرد زنجیریں
زنگ خوردہ ہیں آہنی ہی سہی　　　　آج موقع ہے ٹوٹ سکتی ہیں
فرصتِ یک نفس غنیمت جان　　　　سر اٹھائے دبی ہوئی مخلوق[۳۶۴]

جنگ عظیم دوم کے بعد وہ جلد طلوع آزادی اور انقلاب کے خواب کو پورا ہوتا دیکھ رہے تھے لیکن اس وقت ان کی امید ٹوٹ جاتی جب وہ ہندوستانی سیاست دانوں کے آپسی اختلافات کی شدت کو محسوس کرتے۔مثلاً شملہ کانفرنس نے جہاں ایک طرف وطن پرستوں کے دل میں امید کی شمع روشن کی تو دوسری طرف اس کی ناکامی سے انتہائی مایوسی کی فضا بھی پیدا ہوئی۔اسی طرح کی کیفیت ساحر کی نظم ''کنجِ نفس'' میں دیکھی جا سکتی ہے۔ملاحظہ کیجیے:

چند لمحوں کے لیے شور اٹھا ڈوب گیا　　　　کہنہ زنجیر غلامی کی گرہ کٹ نہ سکی

پھر وہی سیلِ بلا ہے وہی دامِ امواج
ناخداؤں میں سفینے کی جگہ بٹ نہ سکی
ٹوٹتے دیکھ کے دیرینہ تعطل کا فسوں
نبضِ امیدِ وطن ابھری مگر ڈوب گئی
پیشواؤں کی نگاہوں میں تذبذب پا کر
ٹوٹتی رات کے سائے میں سحر ڈوب گئی
زندگی جبر کے سانچوں میں ڈھلے گی کب تک
ان فضاؤں میں ابھی موت پلے گی کب تک [۳۶۵]

وہ صدیوں سے جاری ظلم و جبر کی اس فضا کو بدل دینے کے لیے بے چین دکھائی دیتے ہیں۔ غلامی کی ہر زنجیر کو توڑنے کی امنگ ان کی شاعری پوری طرح موج زن ہے۔ ان کے خیال میں ان غلاموں کی زندگی کی حالت بدلنے کوئی اور نہیں آئے گا بلکہ خود ان ہی لوگوں کو اس غلامی کے چنگل سے نکلنے کی تدبیر کرنی پڑے گی۔ ان کا خیال ہے کہ:

ڈیڑھ سو سال سے پابندِ سلاسل کتے
اپنے آقاؤں سے لے سکتے خراجِ قوت
کاش یہ اپنے لیے آپ صف آرا ہوتے
اپنی تکلیف کا خود آپ مداوا کرتے
ان کے دل میں ابھی باقی رہتا
قومی غیرت کا وجود [۳۶۶]

اس طرح کے موضوعات کے اظہار میں ساحر کبھی کبھی تلخ نوائی پر بھی اتر آتے ہیں۔ اس بات کا انھیں شدت سے احساس بھی تھا۔ وہ ذاتی طور پر شاعری میں اس طرح کی تلخ نوائی کو پسند نہیں کرتے تھے لیکن حالات اور وقت کی ضرورت ان سے ایسے اشعار کہلواتی۔ اس تلخ نوائی کی وضاحت انھوں نے اپنی نظم ''مرے گیت'' میں بڑے خوب صورت انداز سے کی ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

مرے سرکش ترانے سن کے یہ دنیا سمجھتی ہے
کہ شاید میرے دل کو عشق کے نغموں سے نفرت ہے
مجھے ہنگامۂ جنگ و جدل میں کیف ملتا ہے
مری فطرت کو خوں ریزی کے افسانے سے رغبت ہے
مری دنیا میں کچھ وقعت نہیں رقص و نغمہ کی
مرا محبوب نغمہ شورِ آہنگِ بغاوت ہے
مگر اے کاش دیکھیں وہ مری پر سوز راتوں کو
میں جب تاروں پہ نظریں گاڑ کر آنسو بہاتا ہوں
مرے سرکش ترانوں کی حقیقت ہے تو اتنی ہے
کہ جب میں دیکھتا ہوں بھوک کے مارے کسانوں کو
حکومت کے تشدد کو امارت کے تکبر کو
کسی کے چیتھڑوں کو اور شہنشاہی خزانوں کو
تو دل تابِ نشاطِ بزمِ عشرت لا نہیں سکتا
میں چاہوں بھی تو خواب آور ترانے گا نہیں سکتا [۳۶۷]

آنند نرائن ملا نے بھی اسی زمانے میں ''زمین وطن'' اور ''محبان وطن کا نعرہ'' جیسی کامیاب نظمیں کہیں۔ سیاسی تحریکات کا عکس ان کی غزلوں میں بھی نمایاں ہے۔ ترقی پسند تحریک سے وابستگی نے انھیں آفاقی شعور بھی عطا کیا۔

بڑھے گا سلسلہ جب ارتباطِ ملک و ملّت کا
تو اس زنجیر کو اک روز عالم گیر دیکھیں گے [۳۶۹]

''محبان وطن کا نعرہ'' میں انھوں نے دھیمے لہجے میں اس انقلاب کی آمد کا احساس دلایا جو دبے پاؤں اس ملک کے گوشے گوشے میں اپنی آمد کا اعلان کر رہا تھا۔ وہ بے بسی اور لاچاری کی تصویر دکھانے کے ساتھ ساتھ ظلم و بربریت کے خلاف عزم صمیم کا دعویٰ بھی کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ ملاحظہ کیجیے:

زمانہ کر رہا ہے کوششیں ہم کو مٹانے کی
ہلا پاتا نہیں جس کو وہ بنیادِ کہن ہم ہیں

بنالیں گے ترے زنداں کو بھی ہم غیرتِ محفل لیے اپنی نگاہوں میں جمالِ انجمن ہم ہیں
ستانے کو ستالے آج ظالم جتنا جی چاہے مگر اتنا کہے دیتے ہیں فردائے وطن ہم ہیں[۳۶۹]

آنند نرائن ملا بنیادی طور پر مشترکہ ہندوستان کے حامی تھے۔اسی لیے وہ مسلم لیگ کی سرگرمیوں کو پسندیدگی کی نظروں سے نہیں دیکھتے تھے۔''مسلم لیگ ۱۹۳۷ء'' کے عنوان سے لکھی گئی نظم میں کہیں کہیں ان کی جانب داری اور تعصب بہت ابھر کر سامنے آتا ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

جہاں میں اپنی حقیقت چھپائے بیٹھے ہیں یہ لیگ کا جو گھروندہ بنائے بیٹھے ہیں
بھڑک رہی ہے تعصب کی دل میں چنگاری چراغِ عقل و حقیقت بجھائے بیٹھے ہیں
سجائے بیٹھے ہیں دوکاں وطن فروشی کی ہر ایک چیز کی قیمت لگائے بیٹھے ہیں
نہیں شریک مصیبت میں ہند کے لیکن عراق و شام سے رشتے ملائے بیٹھے ہیں
بھلا وہ قوم کو کیا دیں درسِ آزادی جو آیتِ وطنیت بھلائے بیٹھے ہیں[۳۷۰]

نظم ''اندھی لڑائی'' میں وہ انسانوں کی آپس میں لڑائی، قتل و غارت گری اور بے مقصد بہتے ہوئے لہو پر نہ صرف کف افسوس ملتے ہیں بلکہ وہ ان لوگوں سے سوال پوچھتے ہیں کہ آخر یہ لڑائی ہے کس بات کی اور اس لڑائی کا حاصل کیا ہے:

کٹے جا رہے ہیں مرے جا رہے ہیں یہ نادان انساں لڑے جا رہے ہیں
کوئی ان سے پوچھے لڑائی یہ کیوں ہے مذاقِ نبرد آزمائی یہ کیوں ہے
بشر کی بشر پر چڑھائی یہ کیوں ہے نہیں جانتے یہ لڑے جا رہے ہیں
کٹے جا رہے ہیں مرے جا رہے ہیں[۳۷۱]

آزادی کے پُرمسرت موقع پر ان کی نظمیں ''آ ہی گیا''، ''صبح آزادی''، ''سجدۂ عقیدت'' وغیرہ میں اپنے وطن ہندوستان سے الفت اور محبت کا اظہار تو کیا ہی گیا لیکن ''انسانی درندے'' میں انھوں نے آزادی کی قیمت ادا کرنے والے ان لوگوں کو بھی یاد کیا جو فرقہ وارانہ تنگ نظری کا شکار ہوگئے۔ان کا کہنا تھا کہ ملک تو آزاد ہوگیا لیکن:

غارت و قتل کی ہے گرمیِ بازار وہی ابھی انسان کی ہے فطرتِ خوں خوار وہی
سب سے قانون بڑا آج بھی قانونِ قصاص سب سے مضبوط دلیل آج بھی تلوار وہی
کس کو مظلوم کہیں کس کو ستم گار کہیں آج مظلوم وہی کل ہے ستم گار وہی
فرقہ وارانہ حکیموں کی دوا ہے ہوشیار بھیس میں آج معالج کے ہے بیمار وہی[۳۷۲]

احمد ندیم قاسمی نے بھی غلامی کے احساس کو شدت سے محسوس کیا۔ان کے خیال میں اس احساس کے ساتھ جینے سے بہتر موت ہے۔اسی لیے وہ آزادی کی قدر و قیمت کا احساس جگاتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

مٹی میں مل گئی مری فرخندہ اختری وہ خاک پر پڑا ہے مرا تاجِ سروری
اے وائے انقلاب! یہ اعجازِ انقلاب! دارا کی ٹھوکروں میں ہے تختِ سکندری

دریوزہ گر جہاں کا، ثنا خواں فرنگ کا یہ میری شاعری ہے، وہ میری قلندری[۳۷۳]

مگراس دریوزہ گری کے بعد شاعر آگے چل کر اپنی نظم ''احساس کی پھریری'' میں اس بدلتے منظرنامے کا ذکر بھی کر رہے ہیں جو احساس اور فکری سطح پر غلامی سے نجات کے لیے تحریک پیدا کر رہی تھی۔ اب استعماری نظام کے خلاف ردعمل کی چاپ صاف سنائی دے رہی تھی۔ اس بابت شاعر کا کہنا تھا کہ:

جہان والوں نے رکھا غلام تیرا نام مچا ہوا حرم و دہر میں ہے اک کہرام
یہ بے محل سے قوانین اجنبی سا نظام لبوں پہ مہرِ خموشی، زباں کو اذنِ کلام
یہ قید و بند، یہ تقسیمِ زر یہ دانہ و دام یہ جور و جبرِ مسلسل، یہ اختیار کا نام
گرفت ساحرِ یورپ میں ایشیا کی عناں غروبِ مہر کہاں اور طلوعِ مہر کہاں![۳۷۴]

اس انقلاب کے لیے جس عزم و حوصلے کی ضرورت تھی، اس کے آثار ضرور پیدا ہو چکے تھے۔ شاعر اس جانب اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

جلالِ برق ہے لرزاں تری نگاہوں میں کئی نجوم فروزاں ہیں تیری آہوں میں
اُس انقلاب کے چرچے ہیں کجکلاہوں میں جو خون بن کے سلگتا ہے تیری بانہوں میں
تری جبیں میں کئی آفتاب ہیں ضو ریز تری خرد میں کئی حکمتیں ہیں گرم ستیز[۳۷۵]

انھوں نے ''سمندر پار کے فرشتہ ہائے رحمت'' کو وقت کا چیلنج سناتے ہوئے خبردار کیا کہ وہ دن دور نہیں کہ سب کچھ بدلنے والا ہے۔ مطالبہِ تقسیم کے روز بہ روز شدت دیکھ کر وہ یہ کہنے پر مجبور ہوئے کہ:

مورخوں سے کہو خون میں ڈبوئیں قلم بدل چکا ہے ارادے میں اضطراب اپنا
خزاں رہے کہ بہار آئے ہرچہ باد ادبار اب اک زقند کا منتظر شباب اپنا[۳۷۶]

جنگ عظیم دوم کے بعد ۱۹۴۵ء میں بین الاقوامی دباؤ اور ہندوستان کے حالات کے تناظر میں برطانوی وزیراعظم نے ہندوستان کو آزادی دینے کا اعلان کر دیا۔ اس مقصد کے لیے برطانوی کابینہ کا تین رکنی وفد ہندوستان روانہ کیا گیا۔ وفد کی دیگر تجاویز کے ساتھ ایک تجویز دیسی ریاستوں کے الحاق یا آزاد حیثیت سے علاحدگی پر مبنی تھی۔ اس معاملے پر ہندوستانی رہنما بھی انتشار اور افتراق کا شکار تھے۔ جوش اور احمد ندیم قاسمی نے اس حوالے سے نظمیں بھی کہیں۔ جوش کی نظم ''وزارتی وفد کا فریت'' اور احمد ندیم قاسمی کی ''سمندر پار کے فرشتہ ہائے رحمت'' کا ذکر مذکورہ صفحات میں ہو چکا ہے لیکن اس موضوع پر سب سے عمدہ نظم جاں نثار اختر کی ''گاندھی جناح ملاقات'' ہے۔ اس مشن کے بعد مذکورہ سیاسی رہنماؤں کی ملاقات سے ہندوستانیوں کے دلوں میں ایک بار پھر امید کے دیپ جلے۔ اسی امید کا اظہار کرتے ہوئے ان کا کہنا تھا کہ:

پھر آج وطن کی دیوی کے ماتھے پہ دمکتا ہے تارا پھر آج اندھیری راہوں میں ہر سمت ہوا ہے اجیارا
بچھڑے ہوئے ساتھی مدت کے لو آج گلے پھر ملتے ہیں لو پھر سے بہاریں لوٹ آئیں لو پھول دوبارہ کھلتے ہیں
اب تک جو گریباں چاک رہے وہ آج گریباں سلتے ہیں پھر پریم بھرے جے کاروں سے گردوں کے گارے ہلتے ہیں

وہ وقت بھی کوئی دور نہیں، وہ وقت بھی اب آ جائے گا ‏ اک شمع نئی جل جائے گی، اک روپ نیا چھا جائے گا[۳۷۷]

ترقی پسند تحریک کو اپنے ابتدائی ایام میں جن نوجوان شعرا کا تعاون حاصل رہا ان میں جاں نثار اختر بھی شامل تھے۔ اختر کی شاعری میں ان کے سیاسی نظریے کی جھلک بہت واضح ہے۔ ان کے مجموعوں ''سلاسل'' اور ''تارِ گریباں'' کے مطالعے سے محسوس ہوتا ہے کہ ''زندگی''، ''بیدار ہے انسان''، ''خانہ بدوش''، ''جہاں میں ہوں''، ''ابھی نہیں''، ''نوائے وقت''، ''مسافر''، ''دعوتِ جنگ''، ''اے اہلِ وطن''، ''زندگی کی آرزو''، ''میں ان کے گیت گاتا ہوں''، ''آج اور کل''، ''اے ہمرہان قافلہ''، ''کارواں''، ''سویرا''، ''نگارِ جواں''، ''تابِ سخن اور مورخ'' وغیرہ ایسی نظمیں ہیں جو پوری طرح ان کے نظریات اور آزادیِ وطن کا احساس اجاگر کرتی ہیں[۳۷۸]۔ دیگر شعرا کی طرح اختر کو اس بات کا کامل یقین تھا کہ آزادی کی جدوجہد اب اپنے آخری مراحل میں داخل ہو چکی ہے۔ ''اے ہمرہان قافلہ'' اور ''ابھی نہیں'' میں وہ اس صورت حال کی ترجمانی کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

آج آ پہنچے ہیں یہ کس وادیِ ظلمت میں ہم ‏ پے بہ پے اٹھتے نہیں ہیں کس لیے اپنے قدم
اب بھی کیا رہبر کا ہم کرتے رہیں گے انتظار ‏ کیوں نہ کرلیں آج ہم خود راستے کا فیصلہ
سینۂ کہسار میں آؤ تراشیں رہ گزر ‏ ہمتوں کے رو برو کیا کوئی سنگیں مرحلہ
ظلمتیں میداں سے آخر بھاگنے والی ہیں اب ‏ دفعتاً منزل کی راہیں جاگنے والی ہیں اب
ختم ہے اب ان اندھیری وادیوں کا سلسلہ ‏ ہمرہانِ قافلہ اے ہمرہانِ قافلہ[۳۷۹]

نظم ''ابھی نہیں'' میں بھی ان کا یہی انداز نمایاں ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

بہار ہے تو کیا حرام ہے نشاطِ گلستاں ‏ ابھی تو خود ہی سینۂ چمن میں آگ ہے نہاں
یہ جشنِ گل ابھی نہیں یہ رنگ و بو ابھی نہیں ‏ ابھی تو دورِ نو ہے غرق شورِ ناوک و کمند
ابھی تو جامِ ارض سے ہے ایک موجِ خوں بلند ‏ مے کہن ابھی نہیں خم و سبو ابھی نہیں
جھکا وہ فرقِ آسماں اٹھی وہ تیغِ بے نیام ‏ ہم اپنے ملک و قوم کو رکھیں گے کیا سدا غلام
جوانیوں کا سرد اس قدر لہو ابھی نہیں[۳۸۰]

انھوں نے قاضی نذرالاسلام کی طرح بغاوت کی صدا بھی بلند کرنے کی کوشش کی۔ اس دور میں گرجتی دھاڑتی شاعری کو خوب عروج حاصل ہوا۔ لہٰذا نوجوان شعرا نے اس رو میں خود بھی بہنے کی کوشش کی۔ ان کے گیتوں میں بغاوت کا آہنگ اور شمشیر کی تیزی بیدار ہوئی۔ اختر کی نظم ''میں ان کے گیت گاتا ہوں''، ''دعوتِ جنگ''، ''نوائے وقت'' اور ''آج اور کل'' میں یہی انداز نمایاں ہے[۳۸۱]۔ جیسے:

جو رکھ دیتے ہیں سینے گرم توپوں کے دہانے پر/ نظر سے جن کی بجلی کوندتی ہے آسمانوں پر/
میں ان کے گیت گاتا ہوں/ جو نغمہ جانتے ہیں گولیوں کی سنسناہٹ کو/ جو سن سکتے ہیں ظالم
موت کے قدموں کی آہٹ کو/ میں ان کے گیت گاتا ہوں[۳۸۰]

وہ آزادی کے لیے عملی جدوجہد اور تلوار اٹھانے کا اعلان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

دروازے پہ دشمن آ پہنچا ‏ اٹھ ہوش میں آ، اٹھ ہوش میں آ

حامی ہے اگر آزادی کا تلوار اٹھا، تلوار اٹھا

مٹ جائے نہ ہندوستاں کا بھرم اب دیر نہ کر، اب وقت ہے کم

ٹیپو کی قسم، ارجن کی قسم تلوار اٹھا، تلوار اٹھا[۳۸۳]

اس کے بعد وہ دشمن کو زیر کرنے کے لیے نغمہ وسرود کی محفل کو وقتی طور پر چھوڑ کر خنجر وتلوار کی ضرورت اور اہمیت کا احساس دلاتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

اس خون کی جلتی بارش میں میدان میں بڑھ کر جھوم تو لیں دشمن کے لہو میں ہم اپنے ڈوبے ہوئے خنجر چوم تو لیں

کلیوں کو بھی ہم چومیں گے کبھی، پھولوں پہ بھی منڈلائیں کبھی اموات کے خونیں سائے میں دہکی ہوئی تلواروں کی قسم

توپوں سے گرجتے میداں میں شمشیر کی جھنکاروں کی قسم نغمات سے گونجی محفل میں ہم جام بھی ٹکرائیں گے کبھی[۳۸۴]

ان کی انقلابی شاعری میں بغاوت کے خشک موضوعات ضرور ہیں لیکن ان نظموں میں لطافت کا عنصر بھی موجود ہے۔اسی لیے انقلاب کا تصور ان نظموں میں حسین اور دل فریب معلوم ہوتا ہے۔نظم ''ساقی'' کا یہ انداز ملاحظہ کیجیے:

یہ کس نے کھٹکھٹایا آج مے خانے کا دروازہ ہر اک مے کش یکا یک بے پیے برہم اٹھا ساقی

یہ کیسا مے کے بدلے خون چھلکا تیرے شیشے سے یہ کیسا ساز سے اک نالہِ ماتم اٹھا ساقی

اگر ممکن ہو تو بھی آج رنگیں جام کے بدلے لہو کے رنگ میں ڈوبا ہوا پرچم اٹھا ساقی[۳۸۵]

انھیں وطن کی غلامی اور محکومی کا شدت سے احساس تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ اہل وطن رنگ ونسل، مذہب اور ذات پات کے جھگڑے اور بندشوں سے آزاد ہو کر متحدہ ہندوستان کی جدوجہد میں سرگرمی سے حصہ لیں اور انقلاب کے لیے جدوجہد کریں۔اس احساس کو اجاگر کرنے کے لیے وہ کہتے ہیں کہ:

ہم اپنے وطن کی آنکھوں کو کب یونہی پرنم رکھیں گے بکھرے ہوئے اس شیرازے کو کیا آج بھی برہم رکھیں گے

کب مل کے بڑھیں گے میداں میں کب دوش پہ پرچم رکھیں گے اے اہلِ وطن اے اہلِ وطن

ظلمت میں غلامی کی آخر یوں گھٹ کے رہیں گے کب تک یہ ظلم کہاں تک جھیلیں گے یہ جبر سہیں گے ہم کب تک

ہونٹوں پہ لگی ہوں جب مہریں پھر کچھ نہ کہیں گے،ہم کب تک اے اہلِ وطن اے اہلِ وطن[۳۸۶]

اختر کی شاعری میں تخریب کے پردے میں تعمیری رجحان نمایاں ہے۔فطری طور پر انھیں جنگ سے نفرت ہے۔ وہ عالمی امن کے خواہاں ہیں[۳۸۷] لیکن اس امن کے لیے وہ پوری دنیا کے انسانوں کو غلامی سے نجات دلانا ضروری سمجھتے ہیں۔ان کا کہنا ہے کہ:

آپ کو بند غلامی سے چھڑانا ہے ہمیں خود محبت کو بھی آزاد بنانا ہے ہمیں

اک نئی طرز پہ دنیا کو سجانا ہے ہمیں تو بھی آ وقت کے سینے میں شرارہ بن جا

تو بھی اب عرشِ بغاوت کا ستارہ بن جا زندگی صرف محبت تو نہیں ہے انجم[۳۸۸]

وہ مستقبل کے تعلق سے مایوس نہ تھے۔ان کی نظموں میں بدلتے ہوئے زمانے کے خوش آئند نقوش اور آنے والے انقلاب کے قدموں کی چاپ کو واضح طور پر محسوس کیا جاسکتا ہے۔اس انقلاب کی نوید سناتے ہوئے ان کا کہنا تھا کہ:

تھرّا کے گرے جاتے ہیں شاہوں کے علم آج اکھڑے نظر آتے ہیں حکومت کے قدم آج
نعروں سے بغاوت کے گونجا ہوا میدان بیدار ہے انسان[389]

سلام مچھلی شہری نے بھی وطن اور آزادی کے ترانے خلوص اور سوز کے ساتھ گائے۔''جنگل کا ناچ''، ''سات رنگ'' اور ''ڈرائنگ روم'' وغیرہ ان کی کافی مقبول نظمیں ہیں۔ اپنی نظم ''مجبوریاں'' میں وہ غلامی اور آزادی کے تفاوت اور دونوں صورت حال میں شعر و نغمے کے موضوعات کی بابت بڑے واضح انداز سے کہتے ہیں کہ:

مجھے نفرت نہیں ہے عشقیہ اشعار سے لیکن ابھی ان کو غلام آباد میں، میں گا نہیں سکتا
مجھے نفرت نہیں ہے حسنِ جنت زار سے لیکن ابھی دوزخ میں اس جنت سے دل بہلا نہیں سکتا
ابھی ہندوستاں کو آتشیں نغمے سنانے دو انھی چنگاریوں سے برگِ گل رنگیں بنانے دو[390]

اس کے علاوہ سکندر علی وجد بھی دل پر ذلتِ وطن کا داغ لیے ہوئے بیٹھے تھے۔ ان کی شاعری بھی آزادی کے جذبے اور قومی امنگوں کی ترجمان ہے۔ وطن دوستی کی روایت کو نکھارنے میں وامق جون پوری نے بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ ان کا عزم جواں اور جذبۂ آزادی بے باک ہے۔ نشور واحدی، شورش کاشمیری، الطاف مشہدی، نخشب جارجوی، مطلبی فرید آبادی اور وقار انبالوی وغیرہ نے بھی وطن دوستی کی روایت کو نئی آب و تاب دینے میں حصہ لیا۔ غرض کہ ترقی پسند شاعروں میں بعض کے ہاں خطابت اور قطعیت نے ادب کو پروپیگنڈے کی سطح تک پست بھی کیا[391] لیکن اس ہنگامی شاعری میں ابال اور گرمی کی لہر کو واضح طور پر محسوس کیا جا سکتا ہے۔

اس دور کے گیتوں میں بھی اس ماحول کی جھلک کو محسوس کیا جا سکتا ہے۔ ہندوستانی سماج کی عکاسی عظمت اللہ خاں عظمت کی شاعری کا بھی خاصا رہی۔ حفیظ نے بھی مترنم بحروں میں جذبۂ حب الوطنی کے موضوع پر کئی گیت لکھے۔ ''پریت کے گیت'' کو خاصی مقبولیت حاصل ہوئی۔ میرا جی اور مقبول حسین احمد پوری کے مقبول گیتوں نے بھی سحر طاری کیا[392]۔ مقبول کا ایک گیت ملاحظہ ہو جس وہ ہندوستان کی انتشار زدہ کیفیت پر کہتے ہیں کہ:

ناؤ بھنور میں کون سنبھالے ڈور پریم کی ٹوٹ گئی
چگ گئیں چڑیاں کھیت ہے خالی کھیت کی قسمت پھوٹ گئی
کون کرے جگ کی رکھوالی دل سے مروت روٹھ گئی
پریم سے ہیں من سب کے خالی[393]

اس طرح اس دور کی ہلاکت خیزی، انتشار کو بیان کرنے کے ساتھ ساتھ اردو شاعری نے انسان دوستی اور وسیع النظری کے تصورات کو بھی خوب پروان چڑھایا۔ تہذیبی بنیادوں پر اردو نے پوری کوشش کی کہ ہندوستان کا قومی شیرازہ درہم برہم نہ ہونے پائے لیکن ہندوستان کی سرزمین میں فرقہ واریت کا جو زہر گھل چکا تھا اس سے پیچھا چھڑانا تقریباً ناممکن ہوتا جا رہا تھا۔ ان حالات نے ہندوستانی سرزمین پر ایک ایسے ناسور کی شکل اختیار کر لی تھی جس کا علاج سیاست دانوں کو سوائے عمل جراحی کے اور کچھ نہ سوجھا۔ ۱۹۳۷ء میں جب کانگریسی وزارتیں بنیں تو مسلم لیگ کو انتخابی سمجھوتے کے تحت یو۔ پی۔ اور بمبئی میں وزارتوں کے حوالے سے جو توقعات تھیں وہ نہ ملیں۔ اس کے بعد مسلم لیگ نے زور و شور سے کانگریسی حکومت پر الزامات کی بھرمار کر دی۔ پیر پور رپورٹ، فضل الحق پمفلٹ، بہار مسلم

لیگ کی شریف رپورٹ اور ودیا مندر اسکیم کے خلاف مسلمانوں میں بھی فرقہ پرستی کی جڑیں گہری ہونا شروع ہو چکی تھیں۔ ہندو مہا سبھا کے لیڈر روی ساور کر نے تو ۱۹۳۷ء کے صدارتی خطبے میں واضح طور پر کہہ دیا تھا کہ '' آج ہندوستان کو ایک وحدانی اور ہم آہنگ قوم نہیں کہا جا سکتا۔ دراصل یہاں دو قومیں ہیں ہندو اور مسلمان''۔ ۱۹۳۹ء میں انھوں نے مہا سبھا کلکتے کے اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے ایک بار پھر ان خیالات کو دہرایا۔ ان کا کہنا تھا کہ ہندوؤں کا مقابلہ کسی غیر ہندو سے کیا جائے چاہے وہ انگریز ہوں، جاپانی ہوں یا ہندوستانی مسلمان۔ ہم ان سے الگ اور ممتاز نظر آتے ہیں [۳۹۴]۔ اس تقریر نے متحدہ ہندوستانیت کے تصور کو خاک میں ملا دیا تھا۔ اس طرح کی ذہنیت ۱۹۳۳ء سے انتہائی شدت سے پورے ہندوستان میں پھیل رہی تھی۔ لالہ ہردیال نے ''میرے وچار'' میں اس طرح کے خیالات پہلے ہی پیش کر دیے تھے [۳۹۵]۔ محمد علی جناح کے ۲۲ر دسمبر ۱۹۳۹ء کو یوم نجات کے اعلان نے تابوت میں آخری کیل ٹھونک دی اور ۲۳ر مارچ ۱۹۴۰ء کو قرارداد پاکستان پیش کر دی گئی۔ ۱۹۴۵ء تک مسلم لیگ کی طاقت اس قدر بڑھ گئی کہ سارے قوم پرست مسلمانوں کو بھی ہندو قوم پرستوں کے ساتھ جیل میں ٹھونس دیا گیا۔ ۱۹۴۵ء کے انتخابات میں سندھ اور بنگال میں مسلم لیگ کو اکثریت ملی۔ اقلیتی صوبوں میں اسے سو فی صدی نشستیں نہ مل سکیں، یو۔ پی۔ میں ایک تہائی نشستیں ہار گئی [۳۹۶]۔ لیکن مرکز میں مسلم لیگ نے تمام کی تمام نشستیں جیت لیں۔ مولانا آزاد اور مولانا حسین احمد مدنی کا خیال تھا کہ قرآن مجید میں بھی کئی ایسے مواقع آئے جہاں مذہبی بنیاد پر اختلاف کے باوجود ایک قوم کہا گیا۔ ان کے مطابق قوم اور ملّت میں فرق ہے۔ مسلمان دوسروں کے ساتھ مل کر بھی ایک قوم ہیں [۳۹۷]۔ مولانا آزاد نے بھی اس نظریے کی وضاحت اپنے ۱۹۴۰ء کے خطبہ صدارت میں کی تھی۔ انگریز اپنے مفاد اور اقتدار کو برقرار رکھنے کے لیے کچھ بھی کر سکتا تھا۔ ہندوستان میں بحریہ کے ملاحوں کی بغاوت، آزاد ہند فوج کے سپاہیوں کا تاریخی مقدمہ، مزدوروں کی ہڑتال، ان سب چیزوں نے انگریزوں کو بوکھلا کر رکھ دیا تھا۔ سامراج اپنی آخری لڑائی لڑنے میں مصروف تھا۔ ایک طرف مسلم لیگ پورے ہندوستان میں ڈائریکٹ ایکشن ڈے منانے کی تیاریوں میں مصروف تھی تو دوسری طرف اسے عبوری حکومت سے دور رکھنے کی ہر ممکن کوششیں کی جا رہی تھیں۔ اس صورتِ حال میں کلکتہ قتل عام ۱۶ر اگست، نواکھالی فسادات، بہار کا قتل عام اور پھر رفتہ رفتہ پورے پنجاب اور دیگر اضلاع میں پھیلنے والی اس آگ نے پورے ہندوستان کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ ۳ر جون ۱۹۴۷ء کو ماؤنٹ بیٹن نے جب تقسیم کا اعلان کیا، اس وقت ہندوستان کا شمالی حصہ آگ اور خون کی ہولی کھیل رہا تھا۔ اس دور کی اردو شاعری نے فرقہ پرستی کے عروج کے دور میں بھی ایکتا کا پرچم بلند کیا۔ اردو شعرا نے فسادات کے اس دور میں بے شمار نظمیں لکھ کر فرقہ پرستی کی مذمت کی۔ متعدد مسلم شعرا نے پاکستان کے مطالبے اور مذہبی بنیادوں پر وطن کی تقسیم کی شدید مخالفت کی۔ ان نظموں کے لکھنے والے مسلم شعرا میں سے شمیم کرہانی کی نظموں میں سیاسی بصیرت اور مشترکہ تہذیبی شعور کی جھلک واضح طور پر دیکھی جا سکتی ہے [۳۹۸]۔ ملاحظہ کیجیے:

ہم کو بتلاؤ تو کیا مطلب ہے پاکستان کا
جس جگہ اس وقت ہیں مسلم نجس ہے کیا وہ جا

نیش تہمت سے ترے چشتی کا سینہ چاک ہے
جلد بتلا کیا زمیں اجمیر کی ناپاک ہے

کفر کی وادی میں ایماں کا نگینہ کھو گیا
ہائے کیا خاکِ نجس میں شاہِ مینا کھو گیا

ہیں اماموں کے جو روضے لکھنؤ کی خاک پر
بن گئے کیا توبہ توبہ خطہِ ناپاک پر

آہ اس پاکیزہ گنگا کو نجس کہتا ہے تو
جس کے پانی سے کیا مسلم شہیدوں نے وضو

نام پاکستاں نہ لے گر تجھ کو پاسِ دین ہے	یہ گزشتہ نسلِ مسلم کی بڑی توہین ہے
گر وطن میں چھوٹی چھوٹی سی ریاست بن گئی	پھر تو یہ سمجھو کہ انگریزی حکومت بن گئی
ٹکڑے ٹکڑے ہو کے مسلم خستہ دل ہو جائے گا	نخلِ جمعیت سراسر مضمحل ہو جائے گا[۳۹۹]

تحریک پاکستان اور تقسیم ہند کے تناظر میں متعدد ایسے شعرا نے بھی حصہ لیا جو زیادہ نام ور نہیں تھے مگر انھوں نے مسلم عوام کے جذبات واحساسات کی ترجمانی کا فریضہ بہ خوبی ادا کیا۔ان کے جذبے کی سچائی،صداقت اور خلوص سے انکار ممکن نہیں۔حقیقت یہ ہے کہ نظریہِ پاکستان کی جزوی اور تفصیلی وضاحت اس دوران کی جانے والی شاعری میں بھی دکھائی دیتی ہے۔جوش اور مجاز کی شاعری میں اس کے ابتدائی نقوش تلاش کیے جاسکتے ہیں[۴۰۰]۔مجاز کی بابت تو مذکورہ صفحات میں ''ترانہ پاکستان'' کے عنوان کے تحت لکھی گئی نظم کا حوالہ دیا جاچکا ہے جس میں وہ بہ آوازِ بلند کہتے دکھائی دیتے ہیں کہ:

سبز ہلالی پرچم لے کر نکلا لشکر سارا[۴۰۱]

۱۹۴۰ء سے ۱۹۴۷ء تک کی سیاسی جدوجہد کے دوران پوری اردو شاعری سیاسی رنگ میں ڈوبی دکھائی دیتی ہے۔اس دور کی شاعری کا نمایاں حصہ مسلمانانِ ہند کے قومی شعور کا اظہار بن کر تاریخ کا دھارا موڑنے والی آواز بن کر ابھرا۔مسلم لیگ، قائداعظم اور پاکستان وہ اہم موضوعات ہیں جن پر اس دوران بے شمار معروف اور غیر معروف شاعروں نے نظمیں لکھیں۔اس قسم کی نظموں میں وقتی اور ہنگامی موضوعات کے باوجود ان نظموں نے قریہ قریہ گلی گلی دلوں میں وہ آگ روشن کی جس کی حدت اور تپش نے تمام مخالفانہ حربوں کو خاکستر بنا دیا۔پاکستانی قومیت کا بھر پور اظہار دراصل ان ہی نظموں کی صورت میں سامنے آیا۔ان شعرا میں میاں بشیر احمد، انور حارث، نعیم صدیقی، غلام بھیک نیرنگ، عبدالمجید سالک، محشر بدایونی، رئیس امروہوی، کیف بنارسی، محمود اسرائیلی، شفیق میرٹھی وغیرہ نے حد اہمیت کے حامل ہیں۔مسلمان اس دور میں مسلم لیگ کو اپنے مستقبل کا امین سمجھتے تھے۔لہٰذا شاعری میں ''مسلم ہے تو مسلم لیگ میں آ'' اور ''میں مسلمان ہوں''، ''مسلم لیگ ہی میں جاؤں گا'' وغیرہ جیسے نعروں کی گونج ہر طرف سنائی دیتی تھی[۴۰۲]۔اس طرزِ فکر کا آغاز تو سید سلیمان ندوی کی ۱۹۱۶ء میں کہی گئی اس نظم سے ہوجاتا ہے جو انھوں نے مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس کے موقع پر کہی۔ملاحظہ کیجیے:

جب ہمارے چارہ فرما زہر کہتے تھے اسے	جس پہ اب موقوف ساری قوم کا جینا رہا
یہ مریضِ قوم کے جینے کی ہے کچھ کچھ امید	ڈاکٹر اس کا اگر مسٹر علی جینا رہا[۴۰۳]

اس حوالے سے میاں بشیر کی نظم ''ملت کا پاسباں'' بڑی اہمیت کی حامل ہے۔یہ نظم ۲۳ر مارچ ۱۹۴۰ء کے سالانہ اجلاس کے موقع پر پڑھی گئی۔ملاحظہ کیجیے:

ملّت کا پاسباں ہے محمد علی جناح	ملّت ہے، جسم جاں ہے محمد علی جناح
صد شکر پھر ہے گرم سفر اپنا کارواں	اور میر کارواں ہے محمد علی جناح[۴۰۴]

یوسف اثر بدنیروی نے تو مصطفیٰ کمال کے بعد قائداعظم کی ولولہ انگیز قیادت کی بابت کہا کہ:

دنیا سے اٹھ گیا اگر مصطفیٰ کمال	ہے پیکرِ کمال محمد علی جناح
ہیں نو کروڑ مسلمِ جاں باز تیرے ساتھ	تنہا نہ کر خیال محمد علی جناح[۴۰۵]

انور حارث نے بھی قائداعظم کو نعمت بے بہا قرار دیتے ہوئے کہا کہ:

حارث وطن کی بحر سیاست میں آج کل ۔۔۔ اک دُر بے بہا ہے محمد علی جناح[۴۰۶]

سب سے زیادہ معروف منظوم نعرے ان ہی نظموں سے حاصل ہوئے۔ ''لے کے رہیں گے پاکستان'' اور ''پاکستان کا مطلب کیا لا الہ الا اللہ'' کے رجز یہ نعروں کو بنیاد بنا کر لکھی گئی نظموں میں اوّل الذکر کیف بنارسی کی نظم تو بے حد مشہور ہوئی۔ یہ نظم ۱۹۴۵ء میں کہی گئی اور ان کے مجموعۂ کلام ''شعلۂ آزادی'' میں شامل ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

لے کے رہیں گے پاکستان ۔۔۔ اپنی ہستی کا حاصل اپنا دامن پاکستان بٹ کے رہے گا ہندوستان[۴۰۷]

پاکستان کا مطلب کیا لا الہ الا اللہ کے رجز پر پہلی تضمین کے بارے میں اصغر سودائی، بشیر فاروقی اور شعلہ آسیونی کا نام لیا جاتا ہے۔ نظیر صوفی کے مطابق یہ نعرہ کسی ایک شاعر کی تخلیق نہیں بلکہ تحریک پاکستان کا فوک سلوگن تھا[۴۰۸]۔ ملاحظہ کیجیے:

لے کے رہیں گے پاکستان ۔۔۔ مل کے رہے گا پاکستان
بٹ کے رہے گا ہندوستان ۔۔۔ بن کے رہے گا پاکستان
مسلم ہے تو لا ایمان ۔۔۔ یہیں بنے گا پاکستان
پاکستان کا مطلب کیا ۔۔۔ لا الہ الا اللہ محمد الرسول اللہ[۴۰۹]

ہندوؤں کی جانب سے شروع کی گئی شدھی اور ہندوتوا نے کی تحریکات نے بھی مسلمان شعرا کو اس سلسلے میں مہمیز دی۔ محمود اسرائیلی نے ان تحریکات سے متاثر ہو کر ''جنگ جو ہندوستان کو پیام''، لکھی جس میں واضح طور پر دوقومی نظریے کی حمایت اور آزادی کو موضوع بنایا گیا:

اب وہ بہار ہی کہاں جس سے کوئی چمن بنے ۔۔۔ اب وہ خصوصیت کہاں جس سے کوئی وطن بنے
اہلِ وطن جدا ہوں تو کس طرح انجمن بنے ۔۔۔ اپنے نیاز مندوں کا آخری یہ پیام لے
ہوتا ہوں میں کنارہ کش ہند سر اسلام لے[۴۱۰]

عارف سیال کوٹی نے بھی پاکستان سے متعلق کئی نظمیں کہی ہیں۔ ان کی نظموں کا مجموعہ ''لے کے رہیں گے پاکستان'' کے نام سے شائع ہوا۔ کچھ شعر ملاحظہ کیجیے:

اک نوائے جنگ آزادی خلافِ دشمناں ۔۔۔ ایک واحد چارۂ مجبوریِ ہندوستاں
اپنے اپنے ملک میں ہر ملک ہو فرماں روا ۔۔۔ اپنے مذہب کے مطابق ہر فریضہ ہو ادا
بے سروں میں ہیں ہم سامانِ پاکستان ۔۔۔ ہم تنِ بے جان ہماری جان پاکستان
جان کی سامان کی ایمان کی باتیں کریں ۔۔۔ آؤ ہم سب مل کے پاکستان کی باتیں کریں
لے کے رہیں گے پاکستان ۔۔۔ چاہے جائے ہماری جان
ہند کے دس کروڑ مسلم کا ۔۔۔ آخری فیصلہ ہے پاکستان
دو بڑے حصوں میں تقسیم ہو جائے گا ملک ۔۔۔ اب تو ہندوستاں میں پاکستاں بنایا جائے گا

اب مسلمانوں کو نصب العین پاکستان ہے　　　　جس کی خاطر جاں لٹا دینے کا موسم آ گیا
کچھ کر کے ہمیں اب تو دکھانا ہی پڑے گا　　　　اس ہند کو اب پاک بنانا ہی پڑے گا[411]

اقبال حسین رمزی الہ آبادی نے بھی پاکستان کی حمایت میں پر جوش اور ولولہ انگیز نظمیں لکھیں۔ ان نظموں میں بھی جدوجہد کا پیغام دیتے ہوئے حصول پاکستان کے لیے عزم کا اظہار کیا گیا ہے۔ ان نظموں کا مجموعہ ''نیشنل گارڈز کے ترانے'' کے عنوان سے شائع ہوا۔ ملاحظہ کیجیے:

یقین کیجیے کہ اس سے ہم نہ ہرگز بیش و کم لیں گے　　　　اب حقِ خود ارادیت کو ہر قیمت پہ ہم لیں گے
نہ ہم ان سے درم لیں گے نہ ہم ان سے رقم لیں گے　　　　خدا چاہے تو اک دن لے کے پاکستان دم لیں گے
بس اب تو ہے یہی رمزی تمنائے دلی اپنی　　　　کہ پاکستان کی صورت بنے دنیا نئی اپنی[412]

اپنی ایک اور نظم میں اکثریت سے شکایت کرتے ہوئے اقلیت سے ہونے والے ناروا سلوک کے نتیجے میں مطالبہ پاکستان کے جواز کی بابت کہا کہ:

اکثریت کی شفقت دیکھی　　　　ان کی ہم نے حکومت دیکھی
اقلیت کی درگت دیکھی　　　　کیسی کیسی بدعت دیکھی
یہ جو ہم کو ایسا ستائیں　　　　کیوں نہ پاکستان بنائیں
مسلماں ہو منظّم جذبہ ایمان پیدا کر　　　　خدا کے پاک بندے اپنا پاکستان پیدا کر[413]

اسی مجموعے میں شامل دیگر شعرا میں عبدالمجید خاں حامد، مدہوش امروہوی، ضرغام جعفری، تاجور جلگانوی کی نظمیں بھی اسی طرز فکر کی مظہر ہیں۔ تاجور کا شعر دیکھیے:

وقت آ گیا ہے مسلمِ جاں باز خبردار　　　　مرنے کا حلف تجھ کو اٹھانا ہی پڑے گا[414]

اسی طرح امتیاز جہاں بیگم رحمٰن نے ''نغماتِ پاکستان'' میں متعدد معروف و غیر معروف شعرا کے کلام کو جمع کیا۔ اس مجموعے میں شامل اکثر نظمیں مسلم لیگ کے جلسوں میں پڑھی گئیں اسی لیے ان نظموں میں شاعرانہ حسن کی تلاش بے سود ہے۔ البتہ عام لوگوں کے دلوں میں جوش و جذبہ اور آزادی کی لگن پیدا کرنے میں ان نظموں نے بھی اہم کردار ادا کیا۔ مجموعے میں شامل محشر بدایونی کا یہ شعر ملاحظہ کیجیے:

اس جوانی کی قسم اب سینۂ باطل پہ ہم　　　　نوک نیزہ سے لکھیں گے لفظِ پاکستان ہم[415]

عمر انصاری نے اس عزم و حوصلے کو اسلام اور قربانی کے جذبے سے جوڑتے ہوئے کہا کہ:

درس لیں گے کربلا سے حوصلہ فاران سے　　　　عزم خیبر سے تو استقلال پاکستان سے
آرزو سر میں اگر سودائے پاکستان ہے　　　　پاؤں کے چھالوں کو لے کر دشت کے خاروں سے کھیل[416]

اصغر سودائی، ریاست علی، محمود کامن، غلام علی یکتا، رئیس امروہوی، مجاز، سیمابی، شکیلہ نصرت، آرزو شیدائی، رفیق قریشی، شفیق میرٹھی، کوثر امروہوی، سعد سلیم شاہ، اجرا اور آذر ڈبائیوی وغیرہ کی نظموں میں اسی قسم کے موضوعات اور خیالات کے اظہار کی تکرار ہے۔

اسی لیے تکرار سے گریز کرتے ہوئے بس یہ کہنا کافی ہوگا کہ تحریک پاکستان کے دوران تخلیق کردہ ان تمام نظموں نے مسلمانانِ ہند میں قوت، جوش وولولہ پیدا کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ ان پر جوش پاکستان کے حامیوں کو یہ سوچنے کا موقع بھی نہیں ملا محض چھے کروڑ مسلمانوں کے لیے بسنے والے پاکستان کے بعد اقلیتی صوبوں میں رہ جانے والے بقیہ مسلمانوں کا کیا ہوگا؟ انھیں ان اقلیتی صوبوں میں کس قسم کے انتقامی جذبے سے گزرنا پڑے گا۔

اردو شاعری کا یہ جائزہ حقیقتاً ہندوستان کی سیاسی تاریخ اور داخلی اختلافات کا مرقع ہے۔ ملک میں جس قسم کے سیاسی حالات تھے اس سے نبرد آزما ہونے کے لیے اردو شاعری نے ایک جانب فرقہ پرست عناصر سے ٹکر لی اور دوسری طرف آزادی اور ترقی پسندوں کی ہم نوائی کر کے اپنے قومی مظہر ہونے کا ثبوت بھی دیا۔ اس دور کی شاعری میں مختلف دھارے بیک وقت نظر آتے ہیں۔ اس دور کی اردو شاعری ہندوستان کی سالمیت کی نقیب، قومی یک جہتی کی علم بردار، ترقی پسندوں کی حلیف اور انتشار پسندوں کی حریف دکھائی دیتی ہے۔ یہ درست ہے کہ تقسیم ہند نے اس مشترکہ ہندوستانی کلچر کو بری طرح نقصان پہنچایا جس کی حفاظت اردو شاعری کئی صدیوں سے کر رہی تھی۔ تقسیم کا سب سے اہم سبب یہ تھا کہ بیسویں صدی میں ہندو مسلم دونوں قوتوں کے درمیان سیاسی سمجھوتے بازی کی تو متعدد کوششیں ہوئیں لیکن تہذیبی یک جہتی کے لیے کوئی قدم نہیں اٹھایا گیا[۱۷] جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ڈاکٹر عابد حسین نے درست نشان دہی کی کہ ''حقیقت میں اس اختلاف کی جڑ تہذیب تھی۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کی تہذیبی تحریکیں ایک مدت سے ایک دوسرے کی مخالف سمتوں میں بڑھ رہی تھیں''[۱۸]۔ آزادی ملنے سے قبل کے آخری چند ماہ کے ادبی منظرنامے کا تجزیہ کرتے ہوئے احتشام حسین نے لکھا کہ اس زمانے کے اردو ادیبوں کی کاوشوں میں تین خواہشات کی جھلک واضح طور پر دیکھی جا سکتی ہے۔ اوّل ہندوستان کا جسم زخمی نہ کیا جائے، دوم فرقہ واریت انگریزی سیاست کی ناجائز اولاد ہے اس کا گلا گھونٹ دیا جائے اور سوم اگر ہندوستان کی تقسیم ناگزیر ہے تو مہاتما گاندھی کے الفاظ میں اس طرح ہو جیسے بھائی بھائی اپنی ملکیت تقسیم کرتے ہیں یعنی یہ تقسیم انگریزوں کے ہاتھوں نہ ہو بلکہ آپس کے سمجھوتے کے نتیجے میں عمل میں آئے۔ اس سیاسی بحران کی فضا میں جو کہ ہندوستان کے دل و دماغ میں چھایا ہوا تھا، ادیبوں کا اس طرح سے سوچنا قابل قدر تھا۔ شعرا کے ہاں متعدد مواقع پر یہ دیکھا جا سکتا ہے کہ انھوں نے برطانوی سیاست کی چال بازیوں سے نہ صرف آگاہ کیا بلکہ اس میں پھنسنے سے روکنے کی کوشش بھی کی۔ یہی نہیں بلکہ شعرا نے اپنے رہنماؤں کی غلط کاریوں پر سخت تنقید بھی کی[۱۹]۔ انگریز ہندوستان تو چھوڑ گیا لیکن نفرت اور عصبیت کا جو بیج بو کر گیا اس کی جانب اقبال سہیل نے اشارہ کرتے ہوئے درست کہا کہ:

لالے کو دبایا سنبل سے قمری کو لڑایا بلبل سے   جاتا تو ہے صیاد مگر گلشن کو لٹا کر جاتا ہے[۲۰]

آزادی کا سورج طلوع ضرور ہوا مگر خون میں ڈوبے ہوئے ہندوستان کی شکل میں۔ پورے ہندوستان میں فرقہ واریت کے زہر نے گھر کر لیا۔ تعصب اور تنگ نظری اس قدر بھڑکی کہ صدیوں کا تہذیبی سرمایہ فنا ہوتا محسوس ہونے لگا۔ ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو گئے۔ درندگی، سفاکی اور بربریت نے ہندوستان کی ترقی اور خوش حالی کا خواب دیکھنے والوں کے سر شرم سے جھکا دیے۔ اس بجھی بجھی فضا اور درد کی اس لہر کو فیض کی نظم ''صبحِ آزادی'' میں صاف محسوس کیا جا سکتا ہے، جس میں انھوں نے واضح طور پر کہا کہ:

نجات دیدہ و دل کی گھڑی نہیں آئی   چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی[۲۱]

تقسیم ہند کے فریب نے انگریزوں کے چہرے سے نقاب بھی الٹ دی تھی خصوصاً کرپسن مشن کی تجاویز روکے جانے کے بعد یہ بات پوری طرح واضح ہو چکی تھی کہ انگریز، ہندوستانیوں کو صرف اور صرف دھوکے میں رکھنا چاہتا ہے[۴۲۲]۔ اس موقع پر نذیر بنارسی کی کہی ہوئی نظم سے ہندوستانیوں کے قومی شعور کی جھلک کو واضح طور پر محسوس کیا جاسکتا ہے جس میں وہ انگریزوں کے سامنے جو سوالات رکھتے ہیں، اس کے جواب نہ تو کسی مورخ کے پاس ہیں اور نہ ہی آج تک ان سوالوں کے جوابات کسی ماہر سیاسیات اور سماجیات نے دینے کی کوشش کی۔ ملاحظہ کیجیے:

بن کے غدار آج تم سے اک غلام ابن غلام — نظم کے پردے میں چھپ کر ہو رہا ہے ہم کلام
آج لندن سے منانے کو چلے آتے ہو کیوں — اب تمھارے سر پہ آئی ہے تو چلاتے ہو کیوں
نند کو پھانسی کے پھندے پر چڑھایا کس نے تھا — لفظِ آزادی پہ رحمت خاں کو مارا کس نے تھا
جب کھلیں آنکھیں نہ اختر کا جنازہ دیکھ کر — جب نہ گرمایا لہو ٹیپو کا لاشہ دیکھ کر[۴۲۳]

۱۹۴۷ء کے بعد دونوں نوزائیدہ ممالک کے نفوس اس یقین اور گمان کی کیفیت میں مبتلا رہے کہ معاشرے کا وہ ڈھانچا جو انگریز عمل داری کے طابع تھا، اسے قومی امنگوں کے مطابق کس طرح ڈھالا جائے۔ اس غیر یقینی فضا کو بھی شعرانے بڑی ذمے داری کے ساتھ موضوع سخن بنایا۔ فارغ بخاری نے اس صورت حال پر کہا کہ:

قفس سے نکلے تو صحنِ چمن میں بند ہوئے — رہائی نہ مل سکی تہمتِ اسیری سے
نئے چہرے سے جی گھبرا رہا ہے — غنیمت تھیں پرانی صحبتیں بھی[۴۲۴]

قیام پاکستان سے ۱۹۵۸ء تک کا ابتدائی زمانہ پاکستان کے لیے ابتری کا زمانہ ہے۔ اس دور کے غیر مستحکم سیاسی نظام نے معاشرے کو کئی طرح کے مسائل سے دو چار کیا جس کی وجہ سے لوگ تہذیبی، معاشرتی اور اخلاقی انحطاط کا شکار ہوئے۔ معاشی عدم مساوات اور سیاسی جبر نے بھی خوف و ہراس کی فضا پیدا کر دی تھی۔ ۱۹۵۸ء کے مارشل لا نے صورت حال کی سنگینی کو مزید بڑھا دیا۔ آمریت اور جبر و استبداد کے ماحول میں غزل کو نیا طرز اظہار ملا[۴۲۵]۔ عدم اطمینان، دربدری، گھٹن، بے گھری اور ہجرت وغیرہ جیسے موضوعات اس دور کے متعدد شعرا کے ہاں موجود ہیں۔ محسن بھوپالی نے اس پس منظر میں کیا خوب کہا کہ:

نیرنگیِ سیاستِ دوراں تو دیکھیے — منزل انھیں ملی جو شریکِ سفر نہ تھے[۴۲۶]

شکیب جلالی نے کہا کہ:

کیا جانیے منزل ہے کہاں، جاتے ہیں کس سمت — بھٹکی ہوئی اس بھیڑ میں سب سوچ رہے ہیں[۴۲۷]

اس دور کی تمام شاعری اسی طرز فکر میں ڈوبی نظر آتی ہے۔ شعرا کے ہاں احتجاج کا لہجہ بھی دکھائی دیتا ہے اور مصائب و مسائل کا گہرا ادراک بھی۔ تقسیم وطن کے ساتھ ساتھ گھر اور روایت سے دوری نے ان شعرا کو بہت زیادہ متاثر کیا[۴۲۸]۔ ان کے بیانیے میں یکسانیت کے باوجود سب کے لہجے جدا اور کیفیت مختلف دکھائی دیتی ہے۔ تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں البتہ افتخار عارف کے اس شعر سے اس دور کے شعرا کی ذہنی کیفیت کو سمجھنے میں ضرور مدد مل سکتی ہے:

عذاب یہ بھی کسی اور پر نہیں آیا — کہ ایک عمر چلے اور گھر نہیں آیا[۴۲۹]

اسی طرح کی ملتی جلتی صورت حال سرحد کے اس پار ہندوستان کو بھی درپیش رہی۔ آزادی کا تصور بہت ہی خوش آئند سہی لیکن ہزار ہا برس کی تہذیبی روایات کو خون میں نہلا کر حاصل کیا گیا تھا۔ ماہرین سیاسیات وسماجیات اسے دونوں اطراف کے سیاسی رہنماؤں کی فاش غلطی قرار دیتے ہیں۔ ہندوستانی عوام نے تقسیم کے درد کو بڑی شدت سے محسوس کیا۔ ۱۹۴۷ء کے بعد فسادات کا وہ طوفان اٹھا جس کی نظیر تاریخ عالم میں کم ہی ملتی ہے۔ اس کی بابت ڈاکٹر جعفر رضا نے کہا کہ اس تقسیم کے بعد ''ہند و پاکستان کے تمام شہری ہندو، مسلمان اور سکھ ہوگئے۔ انسان کوئی نہ رہا''[۴۳۰]۔ آزادی کی یہ قیمت بہت زیادہ تھی۔ مغربی پنجاب، سرحد، مشرقی پنجاب، دہلی، گڑھ مکتیشور، کلکتے، بہار اور دیگر علاقوں میں انسانی زندگی کیڑے مکوڑوں سے بھی زیادہ حقیر ہوگئی۔ انسانی ذہن نے قتل وغارت گری کے وہ نت نئے طریقے وضع کیے جس سے انسانیت کی روح تک کانپ جائے۔ ڈاکٹر عابد حسین نے اس بابت لکھا کہ:

> آخر کار ہندوستان نے آزادی حاصل کر لی مگر بہت بڑی قیمت پر اور بڑے اذیت دہ طریقے سے اسے منظور کرنا پڑا اور تقسیم کے دوران خوف وہراس اور قہر وغضب کے طوفان میں سرحد کے دونوں طرف اپنے چھ لاکھ بیٹے اور بیٹیوں کو قتل ہوتے ہوئے اور ایک کروڑ چالیس لاکھ کو گھر سے بے گھر ہوتے دیکھا پڑا...
> تقسیم کے ساتھ مسلمانوں کی جماعت بھی تقسیم ہوگئی۔ فرقہ پرور اور قوم پرور مسلمانوں کی لڑائی میں اوّل الذکر کو فتح ہوئی[۴۳۱]۔

قومی تاریخ کا ایک المیہ یہ بھی تھا کہ تقسیم کی بنیاد ایک زبان کو بھی بنایا گیا تھا۔ اس کے باوجود اردو شعرا نے اپنے فرائض سے کوتاہی نہیں برتی۔ اس خطۂ زمین کو آگ وخون سے بھری ہوا میں مرجھاتا ہوا نہ دیکھ سکے۔ راہی معصوم رضا نے اس کرب کو اپنی نظم ''اے اجنبی'' میں پیش کرتے ہوئے کہا کہ:

اور نتیجے میں ہندوستاں بٹ گیا	یہ زمیں بٹ گئی آسماں بٹ گیا
شاخِ گل بٹ گئی آشیاں بٹ گیا	طرزِ تحریر طرزِ بیان بٹ گیا
ہم نے سوچا جو، وہ خواب ہی اور تھا	اب جو دیکھا تو پنجاب ہی اور تھا
ہیر سڑکوں پہ ننگی پھرائی گئی	زخمی چھاتی سے محفل سجائی گئی
راوی میں ہر روایت بہائی گئی	دونوں ہاتھوں سے غیرت لٹائی گئی
کچھ لٹیرے بڑے آدمی بن گئے	اور ہم گھر میں شرنارتھی بن گئے[۴۳۲]

اسی طرح مظفر شاہ جہاں پوری کی اس دور کی بے حد مقبول نظم ''شعورِ آزادی'' میں بھی قومی یک جہتی اور ہم آہنگی کے فروغ کی کوششیں نمایاں ہیں۔ وہ اس نظم میں تعصب اور نفرت کی اس فضا پر سخت افسوس کا اظہار کرتے نظر آتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ:

پھر باہمی جھگڑوں سے پورے انگریز کے ارماں ہونے لگے	اسبابِ غلامی پھر جاگے تفریق سے ساماں ہونے لگے
اب ریل بھی ہندو ہونے لگی ڈبّے بھی مسلماں ہونے لگے	صدیوں کے تعلق چیخ اٹھے ہفتوں نے وہ نفرت پھیلا دی

اے دوست ابھی آرام نہ کر ہے خام شعورِ آزادی[۴۳۳]

غلام ربانی تاباں نے بھی اپنی نظم ''انتقام'' میں ان فسادات کا ذمے دار انگریزوں کو ٹھہراتے ہوئے انتقام کے جذبے کو سرد

کرنے کی کوشش کی۔ ان کا کہنا تھا کہ:

میں کس سے انتقام لوں / یہ سچ ہے کہ بے کسوں کے خوں سے سرخ ہوگئی زمیں / مگر کسے
میں دوش دوں / میں کس سے انتقام لوں / تباہیوں کی گود کے پلے ہوئے کسان سے؟ / کہ
جنگِ انقلاب کے سپاہی، نو جوان سے؟ / غریب و ناتوان سے؟ / نہیں نہیں / یہ سب مرے
عزیز ہیں، یہ سب مجھے عزیز ہیں / میں کس سے انتقام لوں / بتا کسے میں دوش دوں / چمن میں
کس نے آگ لگا دی ہے موسمِ بہار میں / اک اجنبی سفید ہاتھ، آتشیں و شعلہ بار / فضائے
تیرہ و طن میں رقص کر رہا ہے آج [۴۳۴]

مذکورہ صفحات میں جس دور کی شاعری کا جائزہ پیش کیا گیا، وہ ہماری قومی تحریک کی انتہائی شدت کا زمانہ تھا۔ یہی وہ زمانہ تھا جب آزادی کا جذبہ ہر دل میں بے قرار تھا۔ اردو شاعری بھی ان حالات سے پوری طرح باخبر رہی اور اس دور کی تمام تر سیاسی کش مکش اور فکری تناظر کو اپنے اندر سمونے کی کوشش کی۔ ہر صنف ادب میں اس کا اظہار بہت توانا دکھائی دیتا ہے۔ تقسیم کے موضوع پر ردو قبول کے اس منظر نامے کو اس دور کی شاعری سے بہ آسانی سمجھا جا سکتا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ نارنگ، گوپی چند، ''ہندوستان کی تحریک آزادی اور اردو شاعری''، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان و ادب، دہلی، ۲۰۰۳ء، ص۳۴۳

۲۔ انصاری، پروفیسر سحر، ''تحریک آزادی میں اہل قلم کا حصہ''، مشمولہ: ''تنقیدی افق''، پاکستان اسٹڈی سینٹر جامعہ کراچی، کراچی، ۲۰۱۴ء، ص۱۰۳

۳۔ سعید، ڈاکٹر ظفر، ''تقسیم ہند اور اردو افسانہ''، ناولٹی بکس، دربھنگہ، ۲۰۰۰ء، ص۸

۴۔ سنگھ، جس ونت، ''جناح اتحاد سے تقسیم تک''، روپا اینڈ کو، دہلی، ۲۰۰۹ء، ص۱۶۹۔۱۷۰

۵۔ عبدالرسول، صاحب زادہ، ''پاک و ہند کی اسلامی تاریخ''، ایم۔آر۔ برادرز، لاہور، ۱۹۶۶ء، ص۳۰۹۔۳۱۷

۶۔ ریاض، سید حسن، ''پاکستان ناگزیر تھا''، شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ جامعہ کراچی، کراچی، ۱۹۸۴ء، ص۳۰۔۳۱

۷۔ فرید آبادی، سید ہاشمی، ''تاریخ مسلمانانِ پاکستان و بھارت''، جلد دوم، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی، ۱۹۸۸ء، ص۵۱۷۔۵۱۹

۸۔ ریاض، ص۳۲۔۳۴

۹۔ فرید آبادی، ص۵۲۱

۱۰۔ ریاض، ص۳۴۔۳۵

۱۱۔ خان، سر سید احمد، ''مکمل مجموعہ لیکچرز و اسپیچز''، نول کشور، لاہور، سن ندارد، ص۲۹۷۔۳۶۴

۱۲۔ حالی، مولانا الطاف حسین، ''حیات جاوید''، انجمن ترقیِ اردو ہند، دہلی، ۱۹۳۹ء، ص۱۱۱

۱۳۔ ریاض، ص۳۶۔۴۰

۱۴۔ حالی، ص۱۲۲

۱۵۔ دتاسی، گارسیں، ''مقالات گارساں دتاسی''، حصہ اوّل، انجمن ترقی اردو ہند، دہلی، ۱۹۴۳ء؛ و نیز دیکھیے: ''مقالات گارساں دتاسی''، جلد دوم، ''خطبات گارسیں دتاسی''، جلد اوّل و دوم، مزید دیکھیے: ''حیات جاوید''، محولہ بالا، ص۱۹۷

۱۶۔ رامیا، سیتا، "The History of the Indian National Congress"، جلد دوم، مدراس، ۱۹۳۵ء، ص۶۱

۱۷۔ ریاض، ص۴۲۔۴۵

۱۸۔ The Times، فروری ۱۸۸۶ء، بہ حوالہ: ''ہندوستانی سیاست میں مسلمانوں کا عروج''، از ڈاکٹر رفیق ذکریا، قومی کونسل برائے فروغ زبان اردو، دہلی، ۲۰۰۳ء، ص۷۵

۱۹۔ ذکریا، ڈاکٹر رفیق، ''ہندوستانی سیاست میں مسلمانوں کا عروج''، محولہ بالا، ص۷۵

۲۰۔ اخبار انڈین مرر (Indian Mirror) نے اے۔سی۔ مجمدار کی تحریر سے اقتباس ۲۰ دسمبر ۱۸۸۷ء کی اشاعت سے نقل کیا ہے، ص۱۴۱، بہ حوالہ ''ہندوستانی سیاست میں مسلمانوں کا عروج''، محولہ بالا، ص۷۶

۲۱۔ The Statesman، دسمبر ۱۸، ۱۹، ۲۱، ۱۸۸۶ء، بہ حوالہ: ''ہندوستانی سیاست میں مسلمانوں کا عروج''، محولہ بالا، ص۷۷

۲۲۔ ذکریا، ص۷۸۔۸۳

۲۳۔ ایضاً، ص۸۳۔۸۴

۲۴۔ ملاحظہ ہو: ''مسلم ہیرالڈ''، بابت ۱۵ اور ۲۳ر دسمبر ۱۸۸۷ء، بہ حوالہ: ''ہندوستانی سیاست میں مسلمانوں کا عروج''، محولہ بالا، ص۸۵۔۸۷

۲۵۔ ذکریا، ص۸۹۔۱۰۵

۲۶۔ فتح پوری، فرمان، ''ہندی اردو تنازعہ''، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۱۹۸۸ء، ص۱۰۵۔۱۰۸

۲۷۔ دتاسی، گارسیں، ''خطبات گارسیں دتاسی''، جلد دوم، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی، ۱۹۷۴ء، ص۲۷۰

۲۸۔ فتح پوری، ص۹۷۔۱۳۲

۲۹۔ Francis, Robinson، ''سپریٹ ازم امنگ انڈین مسلم''، کیمبرج، ۱۹۷۴ء، ص۳۲

۳۰۔ فتح پوری، ص۱۴۰۔۱۴۱

۳۱۔ P,B، ''لینگویج، ریلیجن اینڈ پالٹکس ان ساؤتھ انڈیا''، کیمبرج، ۱۹۷۴ء، ص۱۲۹

۳۲۔ فتح پوری، ص۱۵۰۔۱۵۶

۳۳۔ ریاض، ص۴۵۔۵۰

۳۴۔ جعفری، رئیس احمد، ''کاروانِ گم گشتہ''، سید رئیس احمد جعفری اکیڈمی، کراچی، ۱۹۷۱ء، ص ۱۱۵۔۱۲۰

۳۵۔ ایضاً، ص ۱۴۶۔۱۶۷

۳۶۔ ریاض، ص ۵۵۔۶۰

۳۷۔ فرید آبادی، ۵۲۷۔۵۳۰

۳۸۔ ریاض، ص ۷۰۔۷۱

۳۹۔ جعفری، ص ۲۲۵۔۲۴۰

۴۰۔ فرید آبادی، ص ۵۴۴۔۵۶۰

۴۱۔ نیر، ڈاکٹر طاہرہ، ''اردو شاعری میں پاکستانی قومیت کا اظہار''، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی، ۱۹۹۹ء، ص ۶۴۔۶۵

۴۲۔ فرید آبادی، ص ۵۹۳۔۵۹۴

۴۳۔ ریاض، ص ۷۱۔۷۶

۴۴۔ وجدی، سید عابد علی، ''بھوپال: تحریک آزادی کے آئینے میں''، بھوپال بک ہاؤس، بھوپال، ۱۹۸۶ء، ص ۳۵۳

۴۵۔ ریاض، ص ۱۵۰۔۱۵۲

۴۶۔ گھوش، اجے، ''بھگت سنگھ اور اس کے ساتھی''، قومی دارالاشاعت، لاہور، سن ندارد، ص ۵۔۳۲

۴۷۔ احمد، سید سعید، ''شہر ادب کان پور''، سید اینڈ سید پبلشرز، کراچی، ۲۰۰۱ء، ص ۴۲

۴۸۔ علی خاں، مولانا ظفر، ''کلیات ظفر علی خاں''، مرتبہ زاہد علی خاں، الفیصل پبلشرز، لاہور، ۲۰۰۷ء، ص ۲۹۴۔۳۲۹

۴۹۔ احمد، ص ۴۲۔۴۳

۵۰۔ ریاض، ص ۳۱۷۔۴۷۷

۵۱۔ بہ حوالہ: تقسیم سے متاثرہ افراد کی کہانی، https://www.dw.com/ur/

۵۲۔ بہ حوالہ: تقسیم کی لکیر https:// www.bbc.com/ urdu_ resources/ idt-sh/ partition- timeline- urdu

۵۳۔ رحیم، تقی، ''تحریک آزادی میں بہار کے مسلمانوں کا حصہ''، خدا بخش اورینٹل لائبریری، پٹنہ، ۱۹۹۸ء، ص ۵۲۱۔۵۲۲

۵۴۔ عمادی، مولانا تمنا، بہ حوالہ: ''تحریک آزادی میں بہار کے مسلمانوں کا حصہ''، محولہ بالا، ص ۵۲

۵۵۔ رحیم، ص ۵۲۳۔۵۲۷

۵۶۔ سنگھ، جسونت، ''جناح، اتحاد سے تقسیم تک''، رویا اینڈ کو، دہلی، ۲۰۰۹ء، ص ۳۰۱

۵۷۔ ریاض، ص ۴۵۹

۵۸۔ ناتھ، دھرمیندر، ''دہلی اور آزادی''، مترجم انیس مرزا، اردو اکیڈمی، دہلی، ۲۰۱۱ء، ص ۲۵۳

۵۹۔ فرید آبادی، ص ۵۸۸

۶۰۔ سعید، ڈاکٹر ظفر، ''تقسیم ہند اور اردو افسانہ''، ص ۱۰۔۱۸

۶۱۔ سنگھ، ص ۳۳۱

۶۲۔ ریاض، ص ۴۸۰۔۵۰۵

۶۳۔ سعید، ص ۱۰

۶۴۔ خاں، سردار علی احمد، ''ہندوستان سے پاکستان''، استقلال پبلشرز، لاہور، ۱۹۸۹ء، ص ۳۲۔۹۹

۶۵۔ امرتسری، فرخ، ''خون کی ہولی''، ص ۵۷، بہ حوالہ: ''ہندوستان سے پاکستان''، ص ۱۰۳۔۱۰۹

۶۶۔ انبالوی، وقار، بہ حوالہ: ''جب امرتسر جل رہا تھا''، از خواجہ افتخار، خواجہ پبلشرز، لاہور، ۱۹۸۱ء، ص ۲۹۰۔۲۹۱

۶۷۔ افتخار، خواجہ، ''جب امرتسر جل رہا تھا''، خواجہ پبلشرز، لاہور، ۱۹۸۱ء، ص ۲۹۲

۶۸۔ سعید، ص ۱۱۔۱۲

۶۹۔ افتخار، ص ۱۱۳۔۱۱۴

۷۰۔ راز جونتروی، جسونت سنگھ، بہ حوالہ: ''جب امرتسر جل رہا تھا''، محولہ بالا، ص ۱۱۰۔۱۱۱

۷۱۔ بہ حوالہ: فرید آبادی، سید ہاشمی، ص ۶۱۹۔۶۲۶

۷۲۔ افتخار، ص ۲۴۸۔۲۴۹

۷۳۔ دہلوی، شاہد احمد، بہ حوالہ: ''ہندوستان سے پاکستان''، ص ۲۷۷

۷۴۔ فرید آبادی، ص ۶۳۳۔۶۴۸

۷۵۔ سنگھ، ص ۳۳۵۔۳۴۸

۷۶۔ سعید، ص ۱۴

۷۷۔ خان، عبدالوحید، ''تقسیم ہند''، مکتبۂ ایوانِ ادب، لاہور، ۱۹۵۹ء، ص ۶۷۔۶۸

۷۸۔ ہوشیار پوری، طفیل، بہ حوالہ: ''جب امرتسر جل رہا تھا''، محولہ بالا،

ص۲۳

۷۹۔ کاظمی، ناصر، ''برگِ نے''، شانِ ہند پبلی کیشنز، دہلی، ۱۹۹۰ء، ص۳۷

۸۰۔ سیف، سیف الدین، بہ حوالہ: ''جب امرتسر جل رہا تھا''، محولہ بالا، ص۶۵

۸۱۔ ایضاً، ص۶۶

۸۲۔ ایضاً، ص۶۶۔۶۷

۸۳۔ ایضاً، ص۶۷۔۶۸

۸۴۔ انبالوی، ص۶۹

۸۵۔ ایضاً، ص۶۹۔۷۰

۸۶۔ افتخار، ص۱۴۳

۸۷۔ قریشی، طاہر محمود، ''آزادی''، مشمولہ: ''جب امرتسر جل رہا تھا''، محولہ بالا، ص۲۹۶۔۲۹۷

۸۸۔ حسین، احتشام، ''نقش حالی''، مرتبہ نور الحسن ہاشمی، حصہ دوم، قومی پریس، لکھنؤ، ص۴۲۹

۸۹۔ نیر، ص۷۷۔۷۸

۹۰۔ حالی، الطاف حسین، ''شکوۂ ہند''، محمدن پریس، علی گڑھ، ۱۸۹۵ء، ص۱

۹۱۔ قریشی، اشتیاق حسین، ''برصغیر پاک و ہند کی ملّت اسلامیہ''، مترجم: ہلال احمد زبیری، شعبۂ تصنیف و تالیف و ترجمہ، کراچی یونی ورسٹی، کراچی، ۱۹۹۹ء، ص۱۳۲

۹۲۔ حالی، ''شکوۂ ہند''، ص۲

۹۳۔ ایضاً، ص۴۔۶

۹۴۔ ذوالفقار، ڈاکٹر غلام حسین، ''اردو شاعری کا سیاسی و سماجی پس منظر''، گلڈ اشاعت گھر، لاہور، ۱۹۶۶ء، ص۳۶۷

۹۵۔ ندوی، سید سلیمان، مشمولہ: ''کلیات شبلی''، از علامہ شبلی نعمانی، مرتبہ سید سلیمان ندوی، دار المصنفین، اعظم گڑھ، ۲۰۰۷ء، ص۷۲

۹۶۔ نعمانی، شبلی، ''کلیات شبلی''، معارف پریس، اعظم گڑھ، سن ندارد، ص۶۷۔۶۸

۹۷۔ ایضاً، ص۶۶۔۶۷

۹۸۔ ایضاً، ص۷۵

۹۹۔ ندوی، سید سلیمان، ''حیات شبلی''، ادارۂ معارف، اعظم گڑھ، ۱۹۴۳ء، ص۶۲۲

۱۰۰۔ حسین، سید مجاور، ''اردو شاعری میں قومی یک جہتی کے عناصر''، اتر پردیش اردو اکیڈمی، لکھنؤ، ۲۰۰۴ء، ص۳۰۸۔۳۱۰

۱۰۱۔ لکھنوی، جلال، بہ حوالہ: ''اردو شاعری میں قومی یک جہتی کے عناصر''، محولہ بالا، ص۳۱۰

۱۰۲۔ مینائی، امیر، بہ حوالہ: ''اردو شاعری میں قومی یک جہتی کے عناصر''، محولہ بالا، ص۳۱۰

۱۰۳۔ بہ حوالہ: ''اردو شاعری میں قومی یک جہتی کے عناصر''، محولہ بالا، ص۳۱۰

۱۰۴۔ رام پوری، نظام، بہ حوالہ: ''اردو شاعری میں قومی یک جہتی کے عناصر''، محولہ بالا، ص۳۱۰

۱۰۵۔ عظیم آبادی، شاد، بہ حوالہ: ''اردو شاعری میں قومی یک جہتی کے عناصر''، محولہ بالا، ص۳۱۰

۱۰۶۔ الہ آبادی، اکبر، بہ حوالہ: ''اردو شاعری میں قومی یک جہتی کے عناصر''، محولہ بالا، ص۳۱۰

۱۰۷۔ حسین، سید مجاور، بہ حوالہ: ''اردو شاعری میں قومی یک جہتی کے عناصر''، محولہ بالا، ص۳۱۲

۱۰۸۔ حالی، الطاف حسین، ''حب وطن''، صدیق بک ڈپو، لکھنؤ، سن ندارد، ص۱۸

۱۰۹۔ ایضاً

۱۱۰۔ حسین، سید مجاور، بہ حوالہ: ''اردو شاعری میں قومی یک جہتی کے عناصر''، محولہ بالا، ص۳۱۵

۱۱۱۔ کاکوروی، نادر، ''انتخاب نادر کاکوروی''، مرتبہ ذکی کاکوروی، اتر پردیش اردو اکیڈمی، لکھنؤ، سن ندارد، ص۱۷

۱۱۲۔ ایضاً، ص۳۶۔۳۷

۱۱۳۔ میرٹھی، اسمٰعیل، ''کلیات اسمٰعیل میرٹھی''، دی اورینٹل پبلشنگ کمپنی، میرٹھ، ۱۹۱۰ء، ص۱۰۱

۱۱۴۔ ایضاً، ص۲۹۵

۱۱۵۔ ایضاً، ص۱۰۵

۱۱۶۔ نیر، ص۸۴

۱۱۷۔ حسین،ص۳۲۳

۱۱۸۔ الہ آبادی، اکبر، بہ حوالہ: ''اردو شاعری میں قومی یک جہتی کے عناصر''،محولہ بالا،ص۸۴

۱۱۹۔ نارنگ،ص۳۳۷۔۳۷۰

۱۲۰۔ الہ آبادی، اکبر، بہ حوالہ: ''ہندوستان کی تحریک آزادی اور اردو شاعری''،محولہ بالا،ص۳۷۳۔۳۷۴

۱۲۱۔ ایضاً،ص۳۶۷

۱۲۲۔ حسین، سید مجاور، محولہ بالا،ص۳۲۵۔۳۲۶

۱۲۳۔ گونڈوی، اصغر، بہ حوالہ: ''اردو شاعری میں قومی یک جہتی کے عناصر''،محولہ بالا،ص۳۲۷

۱۲۴۔ بدایونی، فانی، بہ حوالہ: ''اردو شاعری میں قومی یک جہتی کے عناصر''،محولہ بالا،ص۳۲۷

۱۲۵۔ مانک پوری، جلیل، بہ حوالہ: ''اردو شاعری میں قومی یک جہتی کے عناصر''،محولہ بالا،ص۳۲۶

۱۲۶۔ لکھنوی، ثاقب، بہ حوالہ: ''اردو شاعری میں قومی یک جہتی کے عناصر''،محولہ بالا،ص۳۲۸

۱۲۷۔ ایضاً

۱۲۸۔ لکھنوی، عزیز، بہ حوالہ: ''اردو شاعری میں قومی یک جہتی کے عناصر''،محولہ بالا،ص۳۲۸

۱۲۹۔ صدیقی، ابواللیث، ''لکھنؤ کا دبستان شاعری''، مسلم یونی ورسٹی پریس، علی گڑھ،۱۹۴۴ء،ص۸۲۸

۱۳۰۔ لکھنوی، آرزو، بہ حوالہ: ''اردو شاعری میں قومی یک جہتی کے عناصر''،محولہ بالا،ص۳۲۹۔۳۳۰

۱۳۱۔ ایضاً،ص۳۳۰

۱۳۲۔ چنگیزی، یاس یگانہ، بہ حوالہ: ''اردو شاعری میں قومی یک جہتی کے عناصر''،محولہ بالا،ص۲۳۱۔۲۳۲

۱۳۳۔ بہ حوالہ: ''اردو شاعری میں قومی یک جہتی کے عناصر''، محولہ بالا، ص۳۳۷

۱۳۴۔ نارنگ،ص۳۳۹۔۳۴۱

۱۳۵۔ نیرہ،ص۸۸

۱۳۶۔ اقبال، علامہ محمد، ''کلیاتِ اقبال''، اردو، مکتبہ جمال، لاہور، ۲۰۰۴ء،ص۴۵۵

۱۳۷۔ ایضاً،ص۸۴۔۸۵

۱۳۸۔ ایضاً،ص۶۲

۱۳۹۔ ایضاً،ص۱۱۳۔۱۱۸

۱۴۰۔ ایضاً،ص۱۳۶

۱۴۱۔ ایضاً،ص۱۴۴

۱۴۲۔ ایضاً،ص۱۴۶

۱۴۳۔ ایضاً،ص۲۸۳

۱۴۴۔ حسین،ص۳۳۳

۱۴۵۔ وحشی، ڈاکٹر منتھی لال، بہ حوالہ: ''اردو شاعری میں قومی یک جہتی کے عناصر''،محولہ بالا،ص۳۳۶

۱۴۶۔ اقبال،ص۴۲۵

۱۴۷۔ ایضاً،ص۱۹۲

۱۴۸۔ ایضاً،ص۳۱۷

۱۴۹۔ نارنگ،ص۳۴۰

۱۵۰۔ جہاں آبادی، سرور، ''پیمانۂ سرور''، شورہ بک ڈپو، دہلی، سن ندارد، ص۲۲

۱۵۱۔ ایضاً،ص۲۴

۱۵۲۔ نارنگ،ص۴۶۱

۱۵۳۔ جہاں آبادی، سرور، ''خم کدۂ سرور''، اعظم اسٹیم پریس، حیدرآباد دکن، سن ندارد،ص۲۳۳۔۲۳۴

۱۵۴۔ حسین،ص۳۵۷

۱۵۵۔ سروری، عبدالقادر، ''جدید اردو شاعری''، انجمن امداد باہمی مکتبہ ابراہیمیہ، حیدرآباد دکن،۱۹۳۲ء،ص۲۶۱

۱۵۶۔ جہاں آبادی، سرور، ''پیمانہ سرور''،ص۲۷

۱۵۷۔ ایضاً،ص۱۲۳۔۱۲۴

۱۵۸۔ جہاں آبادی، سرور، ''خمکدۂ سرور''،محولہ بالا،ص۱۵۰

۱۵۹۔ چکبست، پنڈت برج نارائن، ''مرقع عبرت و خاک ہند''، فخر المطابع، لکھنؤ،۱۹۰۹ء،ص۱۹

۱۶۰۔ ایضاً،ص۱۵

۱۶۱۔ چکبست، بہ حوالہ: ''ہندوستان کی تحریک آزادی اور اردو

شاعری''،محولہ بالا،ص۳۶۳

۱۶۲۔ نارنگ،ص۳۶۵

۱۶۳۔ حسین،ص۳۵۸

۱۶۴۔ بہ حوالہ:''روحِ چکبست''،مرتبہ رضوان احمد،رام نرائن لال اون کمار پبلشرز،الہ آباد،۱۹۸۸ء،ص۳۳

۱۶۵۔ چکبست، پنڈت برج نرائن،''روحِ چکبست''،ص۳۴

۱۶۶۔ چکبست، پنڈت برج نرائن،''صبحِ وطن''، مرتبہ اُما چکبست، دانش محل لکھنؤ،۱۹۸۵ء،ص۲۴۲

۱۶۷۔ بہ حوالہ''ہندوستان کی تحریک آزادی اور اردو شاعری''،محولہ بالا، ص۳۶۴

۱۶۸۔ لکھنوی،صفی، بہ حوالہ:''اردو شاعری میں قومی یک جہتی کے عناصر''،ص۳۳۲

۱۶۹۔ ایضاً،ص۳۷۳

۱۷۰۔ خاں،مولانا ظفر علی،''کلیاتِ مولانا ظفر علی خاں''،مرتبہ زاہد علی خان،الفیصل پبلشرز، لاہور،۲۰۰۷ء،ص۸۹

۱۷۱۔ ایضاً،ص۱۳۱

۱۷۲۔ ایضاً،ص۲۷۵

۱۷۳ ایضاً،ص۳۱۶

۱۷۴۔ ایضاً،ص۵۹۰

۱۷۵۔ ایضاً،ص۱۵۴

۱۷۶۔ ایضاً،ص۱۶۰

۱۷۷۔ ایضاً،ص۱۹۱

۱۷۸۔ ایضاً،ص۱۳۸

۱۷۹۔ نارنگ،ص۳۴۴۔۳۴۵

۱۸۰۔ موہانی،حسرت، بہ حوالہ:''اردو شاعری میں قومی یک جہتی کے عناصر''،ص۳۶۷

۱۸۱۔ ندوی،ابوالحسن علی،''ہندوستانی مسلمان''، بہ حوالہ:''اردو شاعری میں قومی یک جہتی کے عناصر''،ص۳۷۵

۱۸۲۔ حسین،ص۳۷۵۔۳۷۷

۱۸۳۔ ملیح آبادی، جوش، بہ حوالہ:''اردو شاعری میں قومی یک جہتی کے عناصر''،محولہ بالا،ص۳۶۸

۱۸۴۔ ملیح آبادی، جوش،مشمولہ:''نشیدِ حریت''، مرتبہ شان الحق حقی، فیروز سنز، کراچی،۱۹۵۷ء،ص۲۲۸

۱۸۵۔ ایضاً،ص۲۲۲۔۲۲۳

۱۸۶۔ ایضاً،ص۲۲۷

۱۸۷۔ ایضاً،ص۲۲۸

۱۸۸۔ ایضاً،ص۲۲۹

۱۸۹۔ بہ حوالہ:''تحریکِ آزادی میں اردو کا حصہ''،از ڈاکٹر معین الدین عقیل، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی،۱۹۷۶ء،ص۴۵۱

۱۹۰۔ عقیل،ص۴۵۱

۱۹۱۔ ملیح آبادی،ص۴۵۱

۱۹۲۔ ملیح آبادی، جوش، بہ حوالہ:''اردو شاعری میں قومی یک جہتی کے عناصر''،ص۳۶۸

۱۹۳۔ ایضاً

۱۹۴۔ ایضاً،ص۳۷۹

۱۹۵۔ ملیح آبادی، جوش،''اردو شاعری پر سیاسی اثرات''،از ڈاکٹر ذاکر اللہ، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی،۲۰۱۱ء،ص۱۸۹

۱۹۶۔ حسین،ص۳۸۰

۱۹۷۔ ملیح آبادی، جوش، بہ حوالہ:''آزادی کی نظمیں''،مرتبہ سبطِ حسن، حلقۂ ادب لکھنؤ،سن ندارد،ص۶۴

۱۹۸۔ اکبر آبادی، سیماب،''شعرِ انقلاب''، مکتبہ قصر الادب، آگرہ،۱۹۴۷ء،ص۹۔۱۰

۱۹۹۔ ایضاً،ص۱۱۔۱۲

۲۰۰۔ ایضاً،ص۱۳۔۱۶

۲۰۱۔ نارنگ،ص۳۹۱

۲۰۲۔ اکبر آبادی، سیماب،ص۱۷۔۱۸

۲۰۳۔ ایضاً،ص۳۶

۲۰۴۔ ایضاً،ص۳۸

۲۰۵۔ ایضاً،ص۴۰

۲۰۶۔ ایضاً،ص۴۳

۲۰۷۔ ایضاً،ص۵۴

۲۰۸۔ ایضاً،ص۱۲۲

۲۰۹۔ لکھنوی، اثر، بہ حوالہ ''اردو شاعری میں قومی یک جہتی کے عناصر''، ص۳۸۱
۲۱۰۔ بسمل، رام پرشاد، بہ حوالہ ''نغمات حریت''، مرتبہ: خلیق انجم و شمس الرحمٰن فاروقی، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان و ادب، دہلی، ۲۰۰۷ء، ص۱۹۷
۲۱۱۔ بہ حوالہ ''ضبط شدہ نظمیں''، مرتبین: خلیق انجم و مجتبیٰ حسین، مجلسِ جشنِ علی جواد زیدی، دہلی، ۱۹۷۵ء، ص۸۹
۲۱۲۔ بسمل، رام پرشاد، بہ حوالہ ''ضبط شدہ نظمیں''، ص۸۹
۲۱۳۔ کاکوروی، اشفاق اللہ خان، ''ضبط شدہ نظمیں''، ص۹۱
۲۱۴۔ صابر ٹوہانی، سردار نو بہار سنگھ، مشمولہ: ''ضبط شدہ نظمیں''، ص۹۵
۲۱۵۔ ایضاً، ص۱۰۲
۲۱۶۔ آزاد، کنور پرتاب چندر، مشمولہ: ''ضبط شدہ نظمیں''، ص۱۰۷
۲۱۷۔ برق، مہاراج بہادر، مشمولہ: ''ضبط شدہ نظمیں''، ص۱۳۹
۲۱۸۔ ایضاً
۲۱۹۔ قریشی، عبدالرزاق، ''نوائے ادب''، ادبی پبلشرز، بمبئی، ۱۹۵۷ء
۲۲۰۔ مظہری، جمیل، مشمولہ: ''آزادی کی نظمیں''، مرتبہ: سبط حسن، حلقہ ادب، لکھنؤ، ص۱۰۵
۲۲۱۔ حقی، شان الحق، ''نشید حریت''، ادارۂ مطبوعات پاکستان، مطبوعہ فیروز سنز، کراچی، ۱۹۵۷ء
۲۲۲۔ خلیق انجم اور شمس الرحمٰن فاروقی، ''نغمات حریت''، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی، ۲۰۰۷ء
۲۲۳۔ ماہر القادری، ''کلیات ماہر القادری''، ادارۂ تعمیر ادب، کراچی، ۱۹۹۴ء، ص۱۹۹
۲۲۴۔ ایضاً، ص۲۰۱-۲۲۰
۲۲۵۔ ایضاً، ص۲۱۸
۲۲۶۔ ایضاً، ص۳۰۷
۲۲۷۔ ایضاً، ص۳۰۸
۲۲۸۔ ایضاً، ص۳۳۸
۲۲۹۔ ایضاً، ص۶۳۵-۶۳۶
۲۳۰۔ ایضاً، ص۷۱۵
۲۳۱۔ نظامی، ساغر، ''عہد''، مشمولہ: ''دہلی اور آزادی''، از دھرمیندر ناتھ، مترجم: رئیس مرزا، اردو اکادمی، دہلی، ۲۰۱۱ء، ص۳۰۰
۲۳۲۔ بہ حوالہ: ''دہلی اور آزادی''، ص۲۸۱
۲۳۳۔ ایضاً، ص۲۷۸-۳۰۴
۲۳۴۔ ذاکر اللہ، ڈاکٹر محمد، ''اردو شاعری پر سیاسی اثرات''، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۱۱ء، ص۲۰۸
۲۳۵۔ حالی، ''کلیات حالی''، ۱۹۶۰ء، ص۲۷
۲۳۶۔ بہ حوالہ: ''اردو شاعری پر سیاسی اثرات''، ص۲۰۹
۲۳۷۔ موہانی، حسرت، بہ حوالہ: ''اردو شاعری پر سیاسی اثرات''، ص۲۱۵
۲۳۸۔ خان، مولانا ظفر علی، ''کلیات مولانا ظفر علی خان''، ص۴۰۵
۲۳۹۔ بہ حوالہ: ''اردو شاعری پر سیاسی اثرات''، ص۲۲۲
۲۴۰۔ ایضاً
۲۴۱۔ نیرنگ، میر غلام بھیک، بہ حوالہ: ''اردو شاعری پر سیاسی اثرات''، ص۲۲۳
۲۴۲۔ سہیل، اقبال احمد، بہ حوالہ: ''اردو شاعری پر سیاسی اثرات''، ص۲۲۳
۲۴۳۔ اسرائیلی، محمود، بہ حوالہ: ''اردو شاعری پر سیاسی اثرات''، ص۲۲۳
۲۴۴۔ نظامی، ساغر، بہ حوالہ: ''اردو شاعری پر سیاسی اثرات''، ص۲۲۴
۲۴۵۔ دانش، احسان، بہ حوالہ: ''اردو شاعری پر سیاسی اثرات''، ص۲۲۴
۲۴۶۔ مظہری، جمیل، بہ حوالہ: ''اردو شاعری پر سیاسی اثرات''، ص۲۲۴
۲۴۷۔ الہ آبادی، اکبر، بہ حوالہ: ''اردو شاعری پر سیاسی اثرات''، ص۲۲۶
۲۴۸۔ موہانی، حسرت، بہ حوالہ: ''اردو شاعری پر سیاسی اثرات''، ص۲۲۷
۲۴۹۔ کاشمیری، آغا حشر، بہ حوالہ: ''اردو شاعری پر سیاسی اثرات''، ص۲۲۷-۲۲۸
۲۵۰۔ ذاکر اللہ، ص۲۲۹-۲۳۰
۲۵۱۔ خان، مولانا ظفر علی، ''کلیات مولانا ظفر علی خان''، ص
۲۵۲۔ صدیقی، روش، بہ حوالہ: ''اردو شاعری پر سیاسی اثرات''، ص۲۳۰

۲۵۳۔ دانش، احسان، بہ حوالہ: ''اردو شاعری پر سیاسی اثرات''، ص ۲۳۱-۲۳۰

۲۵۴۔ محروم، تلوک چند، بہ حوالہ: ''اردو شاعری پر سیاسی اثرات''، ص ۲۳۲-۲۳۱

۲۵۵۔ مظہری، جمیل، بہ حوالہ: ''اردو شاعری پر سیاسی اثرات''، ص ۲۳۳

۲۵۶۔ گورکھپوری، فراق، بہ حوالہ: ''اردو شاعری پر سیاسی اثرات''، ص ۲۳۳

۲۵۷۔ کاشمیری، شورش، بہ حوالہ: ''اردو شاعری پر سیاسی اثرات''، ص ۲۳۳

۲۵۸۔ نظامی، ساغر، بہ حوالہ: ''اردو شاعری پر سیاسی اثرات''، ص ۲۳۴

۲۵۹۔ وجد، سکندر علی، بہ حوالہ: ''اردو شاعری پر سیاسی اثرات''، ص ۲۳۴

۲۶۰۔ جعفری، علی سردار، بہ حوالہ: ''اردو شاعری پر سیاسی اثرات''، ص ۲۳۴

۲۶۱۔ ایضاً، ص ۲۳۵

۲۶۲۔ جعفری، علی سردار، ''کلیات علی سردار جعفری''، جلد دوم، مرتبہ علی احمد فاطمی، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، ۲۰۰۵، ۲۲

۲۶۳۔ ایضاً، ص ۳۸-۳۹

۲۶۴۔ ایضاً، ص ۴۱

۲۶۵۔ فاطمی، پروفیسر علی احمد، ''مقدمہ''، مشمولہ: ''کلیات علی سردار جعفری''، جلد اوّل، مرتبہ علی احمد فاطمی، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، ۲۰۰۴ء، ص ۱۷

۲۶۶۔ جعفری، ص ۵۱-۵۲

۲۶۷۔ ایضاً، ص ۴۷

۲۶۸۔ ایضاً، ص ۸۲

۲۶۹۔ ایضاً، ص ۹۱

۲۷۰۔ ایضاً، ص ۲۸۲

۲۷۱۔ ایضاً، ص ۲۸۲-۲۸۳

۲۷۲۔ ایضاً، ص ۴۰۳

۲۷۳۔ ایضاً، ص ۴۰۷

۲۷۴۔ نارنگ، ص ۳۹۶-۳۹۸

۲۷۵۔ سلونوی، امین، بہ حوالہ: ''اردو شاعری پر سیاسی اثرات''، ص ۲۳۴

۲۷۶۔ کرہانی، شمیم، ''روشن اندھیرا''، دانش محل، لکھنؤ، ۱۹۴۲ء، ص ۶۲-۶۳

۲۷۷۔ انجم، ڈاکٹر سید خواجہ علی، ''شمیم کرہانی: حیات، شخصیت اور شاعری''، ریکھا آرٹس پبلشرز، مہاراشٹر، ۱۹۸۶ء، ص ۱۹۰-۱۹۲

۲۷۸۔ کرہانی، شمیم، محولہ بالا، ص ۳۹

۲۷۹۔ گورکھپوری، فراق، ''روح کائنات''، ایوانِ اشاعت، گورکھپور، سن ندارد، ص ۱۳۸

۲۸۰۔ ایضاً، ص ۱۴۵

۲۸۱۔ ایضاً، ص ۱۵۶-۱۵۹

۲۸۲۔ ایضاً، ص ۱۸۱-۱۸۳

۲۸۳۔ نارنگ، ص ۴۱۷-۴۱۸

۲۸۴۔ اعظمی، افتخار، ''اردو کی سیاسی شاعری میں روش کا مقام''، مشمولہ: ''افسونِ تکلم''، از روش صدیقی، مکتبہ جامعہ، نئی دہلی، ۲۰۱۳ء، ص ۱۹

۲۸۵۔ صدیقی، روش، ''افسونِ تکلم''، محولہ بالا، ص ۲۰۴

۲۸۶۔ اعظمی، ص ۲۱

۲۸۷۔ صدیقی، ص ۱۸۴-۱۸۶

۲۸۸۔ نارنگ، ص ۴۰۹

۲۸۹۔ ذاکر اللہ، ص ۲۵۹

۲۹۰۔ فیض، احمد فیض، ''نسخہ ہائے وفا''، مکتبہ کارواں، لاہور، سن ندارد، ص ۹۰

۲۹۱۔ ایضاً، ص ۶۲

۲۹۲۔ ایضاً، ص ۶۷

۲۹۳۔ ایضاً، ص ۴۶

۲۹۴۔ ایضاً، ص ۶۶

۲۹۵۔ ایضاً، ص ۷۰

۲۹۶۔ ایضاً، ص ۷۹-۸۰

۲۹۷۔ ایضاً، ص ۱۰۷

۲۹۸۔ ایضاً، ص ۱۱۶

۲۹۹۔ ایضاً، ص ۱۱۷-۱۱۸

۳۰۰۔ ایضاً،ص۱۲۵
۳۰۱۔ ایضاً،ص۱۳۰۔۱۳۱
۳۰۲۔ اسحاق، میجر محمد،''روداد قفس''،مشمولہ:''زنداں نامہ''، بہ حوالہ: ''نسخہ ہائے وفا''،ص۲۲۱
۳۰۳۔ نارنگ،ص۵۰۷
۳۰۴۔ آزاد،جگن ناتھ،''تمہید''،مشمولہ:''کاروانِ وطن''،ازتلوک چند محروم،مکتبہ جامعہ،دہلی،۱۹۶۰ء،ص۱۲
۳۰۵۔ محروم،تلوک چند،''کاروانِ وطن''،مکتبہ جامعہ،دہلی،۱۹۶۰ء،ص ۲۹۔۳۱
۳۰۶۔ ایضاً،ص۴۱
۳۰۷۔ نارنگ،ص۵۱۳
۳۰۸۔ محروم،ص۱۷۹
۳۰۹۔ ایضاً،ص۲۸۷۔۲۸۹
۳۱۰۔ ایضاً،ص۵۷
۳۱۱۔ نارنگ،ص۵۱۳
۳۱۲۔ محروم،ص۶۵
۳۱۳۔ ایضاً،ص۱۱۳
۳۱۴۔ ایضاً،ص۲۸۸۔۲۸۹
۳۱۵۔ ایضاً،ص۹۰
۳۱۶۔ ایضاً،ص۳۰۷
۳۱۷۔ ایضاً،ص۳۰۸
۳۱۸۔ رفاعی،احمد،''اردو ادب میں طنز و مزاح کی روایت: اپنے عبوری مراحل میں''،مشمولہ:''ادب اور نقدِ ادب''، جاوداں پبلشرز، کراچی،۲۰۰۱ء،ص۱۷۰
۳۱۹۔ پھپھوندی،احمق،''نقش حکمت''،مکتبہ برہان،دہلی،۱۹۴۴ء،ص ۱۰۱
۳۲۰۔ پھپھوندی، احمق،''سنگ وحشت''، دانش پبلشرز، دہلی، سن ندارد،ص۹
۳۲۱۔ پھپھوندی،احمق،''جذبات احمق''،دارالاشاعت احمقیات،سن ندارد،ص۲۶
۳۲۲۔ مجاز،اسرارالحق،''کلیات مجاز''،کتابی دنیا،نئی دہلی،۲۰۰۲ء،ص ۱۸۷۔۱۸۸
۳۲۳۔ نارنگ،ص۴۱۰
۳۲۴۔ مجاز،ص۱۰۹۔۱۱۰
۳۲۵۔ ایضاً،ص۱۴۴
۳۲۶۔ ایضاً،ص۱۵۳۔۱۵۴
۳۲۷۔ مجاز، اسرار الحق،''آہنگ''، مکتبہ جامعہ، نئی دہلی، ۲۰۱۱ء،ص ۲۳۷۔۲۳۸
۳۲۸۔ اعظمی، کیفی،''کیفیات''، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۰۳ء،ص۴۲
۳۲۹۔ ایضاً
۳۳۰۔ ایضاً،ص۱۱۵
۳۳۱۔ ایضاً،ص۱۱۴
۳۳۲۔ ایضاً،ص۱۸۳
۳۳۳۔ ایضاً،ص۱۸۴
۳۳۴۔ ایضاً،ص۱۸۵
۳۳۵۔ ایضاً،ص۱۸۶
۳۳۶۔ ایضاً،ص۱۹۶
۳۳۷۔ ایضاً،ص۱۹۷۔۱۹۸
۳۳۸۔ ایضاً،ص۲۰۲
۳۳۹۔ ایضاً،ص۲۲۶
۳۴۰۔ ایضاً،ص۲۲۶۔۲۲۷
۳۴۱۔ ایضاً،ص۲۲۸۔۲۲۹
۳۴۲۔ ایضاً،ص۲۳۳۔۲۳۴
۳۴۳۔ ایضاً،ص۲۳۶
۳۴۴۔ ایضاً،ص۲۴۵
۳۴۵۔ ایضاً
۳۴۶۔ ایضاً،ص۳۴۶۔۳۴۷
۳۴۷۔ ایضاً،ص۲۴۸
۳۴۸۔ ایضاً،ص۲۵۵
۳۴۹۔ محی الدین، مخدوم،''بساطِ رقص''، ادبی ٹرسٹ، حیدرآباد دکن، ۱۹۷۶ء،ص۱۱۔۱۲

۳۵۰۔ ایضاً،ص۳۷۔۳۸
۳۵۱۔ ایضاً،ص۳۹۔۴۱
۳۵۲۔ ایضاً،ص۴۹۔۵۰
۳۵۳۔ ایضاً،ص۶۹۔۷۰
۳۵۴۔ ایضاً،ص۸۷۔۸۹
۳۵۵۔ جذبی، معین احسن، ''کلیات جذبی''، فرید بک ڈپو، دہلی، ۲۰۰۷ء،ص۱۲۸
۳۵۶۔ رئیس خان، ڈاکٹر نسرین، ''جذبی کی شاعری کا تنقیدی مطالعہ''، آزاد آفسٹ پریس، دہلی، ۱۹۹۳ء،ص۱۰۴
۳۵۷۔ جذبی،ص۱۳۴۔۱۵۴
۳۵۸۔ رئیس خان،ص۱۲۱
۳۵۹۔ جذبی،ص۱۵۰
۳۶۰۔ ایضاً،ص۱۵۵
۳۶۱۔ ذاکر اللہ،ص۲۶۵
۳۶۲۔ لدھیانوی، ساحر، ''کلیات ساحر''، کتابی دنیا، دہلی، ۲۰۰۳ء،ص ۲۷
۳۶۳۔ ایضاً،ص۷۱
۳۶۴۔ ایضاً،ص۷۰
۳۶۵۔ ایضاً،ص۱۰۹۔۱۱۰
۳۶۶۔ ایضاً،ص۵۷
۳۶۷۔ ایضاً،ص۴۵۔۴۶
۳۶۸۔ ملا، آنند نرائن، ''کلیات آنند نرائن ملا''، مرتبہ خلیق انجم، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی،ص۴۳
۳۶۹۔ ملا، آنند نرائن،ص۷۶
۳۷۰۔ ایضاً،ص۱۳۰۔۱۳۱
۳۷۱۔ ایضاً،ص۲۱۰
۳۷۲۔ ایضاً،ص۳۱۹
۳۷۳۔ قاسمی، احمد ندیم، ''جلال و جمال''، نیا ادارہ، لاہور، سن ندارد،ص ۲۴۶
۳۷۴۔ ایضاً،ص۲۵۳۔۲۵۴
۳۷۵۔ ایضاً،ص۲۵۳
۳۷۶۔ قاسمی، احمد ندیم، بہ حوالہ: ''ہندوستان کی تحریک آزادی اور اردو شاعری''،ص۴۲۲
۳۷۷۔ اختر، جاں نثار، بہ حوالہ: ''جاں نثار اختر: حیات وفن''، از ڈاکٹر کشور سلطانہ، مکتبہ ادب، بھوپال، ۲۰۰۸ء،ص۲۴۵
۳۷۸۔ سلطانہ، ڈاکٹر کشور، ''جاں نثار اختر حیات وفن''، مکتبہ ادب، بھوپال، ۲۰۰۸ء،ص۱۸۲۔۱۸۴
۳۷۹۔ اختر، جاں نثار، ''کلیات جاں نثار اختر''، الحمد پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۳ء،ص۳۶۱۔۳۶۲
۳۸۰۔ ایضاً،ص۲۶۹۔۲۷۰
۳۸۱۔ سلطانہ،ص۱۸۴
۳۸۲۔ اختر،ص۳۷۸
۳۸۳۔ اختر، جاں نثار، بہ حوالہ: ''جاں نثار اختر: حیات وفن''،ص۱۸۵
۳۸۴۔ اختر، جاں نثار، ''کلیات جاں نثار اختر''،ص۲۷۹۔۲۸۰
۳۸۵۔ ایضاً،ص۲۵۵
۳۸۶۔ اختر، جاں نثار، بہ حوالہ: ''جاں نثار اختر: حیات وفن''،ص۲۶۹
۳۸۷۔ سلطانہ،ص۱۸۶
۳۸۸۔ اختر، جاں نثار، ''کلیات جاں نثار اختر''، محولہ بالا،ص۲۶۰
۳۸۹۔ ایضاً،ص۲۶۲۔۲۶۳
۳۹۰۔ ذاکر اللہ، ڈاکٹر محمد،ص۲۰۵
۳۹۱۔ نارنگ،ص۴۱۲
۳۹۲۔ حسین،ص۳۹۹
۳۹۳۔ احمد پوری، مقبول حسین، بہ حوالہ: ''اردو شاعری میں قومی یک جہتی کے عناصر''،ص۳۹۹
۳۸۹۔ گوپال، رام، "Indian Muslims: A Political History (1858-1947)"، ایشیا پبلی کیشنز ہاؤس، ۱۹۶۴ء،ص۲۵۴
۳۹۵۔ ایضاً
۳۹۶۔ حسین،ص۴۰۱
۳۹۷۔ Aziz, Ahmed, "Islamic Modernism in India and Pakistan 1857 to 1964", p.187-192
۳۹۸۔ حسین،ص۴۰۳
۳۹۹۔ کرہانی، شمیم، بہ حوالہ: ''اردو شاعری میں قومی یک جہتی کے

عناصر''،ص ۴۰۶۔۴۰۷

۴۰۰۔ نیر،ص ۹۸

۴۰۱۔ مجاز، بہ حوالہ:''اردو شاعری میں پاکستانی قومیت کا اظہار''،ص ۹۹

۴۰۲۔ نیر،ص ۱۰۰

۴۰۳۔ ندوی،سید سلیمان، بہ حوالہ:''اردو شاعری میں پاکستانی قومیت کا اظہار''،ص ۱۰۱

۴۰۴۔ احمد،میاں بشیر، بہ حوالہ:''اردو شاعری میں پاکستانی قومیت کا اظہار''،ص ۱۰۱

۴۰۵۔ بدنیروی، یوسف اثر، بہ حوالہ:''اردو شاعری میں پاکستانی قومیت کا اظہار''،ص ۱۰۲

۴۰۶۔ حارث، انور، بہ حوالہ: ''اردو شاعری میں پاکستانی قومیت کا اظہار''،محولہ بالا،ص ۱۰۲

۴۰۷۔ بنارسی، کیف، بہ حوالہ: https://www.nawaiwaqt.com.pk/14-aug.2013

۴۰۸۔ نیر،ص ۱۰۳

۴۰۹۔ بہ حوالہ:''اردو شاعری میں پاکستانی قومیت کا اظہار''،ص ۱۰۳

۴۱۰۔ اسرائیلی محمود، بہ حوالہ:''اردو شاعری پر سیاسی اثرات''،ص ۱۹۰

۴۱۱۔ سیال کوٹی، عارف، بہ حوالہ:''اردو شاعری پر سیاسی اثرات''،ص ۱۹۰

۴۱۲۔ رمزی الہ آبادی، اقبال حسین، بہ حوالہ:''اردو شاعری پر سیاسی اثرات''،محولہ بالا،ص ۱۹۱

۴۱۳۔ ایضاً

۴۱۴۔ جلگانوی، تاجور، بہ حوالہ:''اردو شاعری پر سیاسی اثرات''،ص ۱۹۱

۴۱۵۔ بدایونی،محشر، بہ حوالہ:''اردو شاعری پر سیاسی اثرات''،ص ۱۹۳

۴۱۶۔ انصاری،عمر، بہ حوالہ:''اردو شاعری پر سیاسی اثرات''،ص ۱۹۳

۴۱۷۔ حسین،ص ۴۰۷۔۴۰۸

۴۱۸۔ حسین، ڈاکٹر سید عابد،''قومی تہذیب کا مسئلہ''،انجمن ترقی اردو ہند،علی گڑھ،۱۹۵۵ء،ص ۲۳۹

۴۱۹۔ نارنگ،ص ۴۲۳

۴۲۰۔ سہیل، اقبال، بہ حوالہ:''ہندوستان کی تحریک آزادی اور اردو شاعری''،ص ۴۲۳

۴۲۱۔ فیض،ص ۱۱۸

۴۲۲۔ صبا،سید محمد یحییٰ،''قومی شعور کے فروغ میں اردو کا کردار''، بہ حوالہ: www.urdu.starnews/today

۴۲۳۔ بنارسی، نذیر، بہ حوالہ:''قومی شعور کے فروغ میں اردو کا کردار''، محولہ بالا،ص ندارد

۴۲۴۔ بخاری، فارغ، بہ حوالہ:''قیام پاکستان: ردِ قبول کا شعری منظر نامہ''،از صائمہ ناز انصاری،مشمولہ:''دریافت''،اسلام آباد،نمبر ۹،جنوری ۲۰۱۰ء،ص ۲۷۸

۴۲۵۔ ناشاد، ڈاکٹر ارشد محمود،''پاکستانی اردو غزل: رجحانات اور امکانات''،مشمولہ:''معیار''،اسلام آباد،نمبر ۷،جنوری تا جون ۲۰۱۲ء،ص ۳۶۵

۴۲۶۔ بھوپالی،محسن، بہ حوالہ:''قیام پاکستان: ردِ قبول کا شعری منظر نامہ''،ص ۲۸۰

۴۲۷۔ جلالی، شکیب، بہ حوالہ: ''پاکستانی اردو غزل: رجحانات اور امکانات''،ص ۳۶۵۔۳۶۶

۴۲۸۔ انصاری،ص ۲۸۰۔۲۸۱

۴۲۹۔ عارف، افتخار، بہ حوالہ:''قیام پاکستان: ردِ قبول کا شعری منظر نامہ''،ص ۲۸۱

۴۳۰۔ رضا، ڈاکٹر جعفر،''ادھنک اردو کاویہ ساہتیہ''، ہندی، بہ حوالہ: ''اردو شاعری میں قومی یک جہتی کے عناصر''،ص ۴۱۳

۴۳۱۔ حسین، ڈاکٹر سید عابد،''ہندوستانی مسلمان آئینہ ایام میں''،مکتبہ جامعہ،نئی دہلی،۱۹۶۵ء،ص ۱۹۲۔۱۹۳

۴۳۲۔ رضا، راہی معصوم،''اجنبی شہر اجنبی راستے''،سعید پبلی کیشنز،الہ آباد،سن ندارد،ص ۵۔۶

۴۳۳۔ شاہ جہاں پوری،مظفر، بہ حوالہ:''اردو شاعری میں قومی یک جہتی کے عناصر''،ص ۴۱۸

۴۳۴۔ تاباں، غلام ربانی،''غم دوراں''،مرتبہ غلام ربانی تاباں، حالی پبلشنگ ہاؤس،دہلی،۱۹۵۱ء،ص ۱۵۵۔۱۵۶

باب ہفتم:

اردو شاعری میں سانحات کی پیش کش: بیسویں صدی کا ربع سوم

تنازعِ کشمیر: حل طلب مسئلہ

قیام پاکستان کے بعد کی کئی دہائیوں تک بر صغیر کی دو بڑی اقوام ہندو اور مسلمان کیوں قریب نہ آ سکے، ان کے درمیان کون سے ایسے معاملات ہیں، جو وجہ تنازعہ رہے اور اردو شاعری نے ان موضوعات کو کس طرح برتا، آئندہ کے صفحات میں کوشش ہو گی کہ ان موضوعات کا مختصر محاکمہ کیا جائے۔

قیام پاکستان کے بعد سے بعض ریاستوں کے الحاق کا سلسلہ ہنوز حل طلب ہے۔ ان ریاستوں میں کشمیر، جونا گڑھ، حیدر آباد دکن اور مانا ودر وغیرہ کی ریاستیں کافی اہم ہیں۔ لیکن جس ریاست کے رستے زخموں نے آج تک ہندوستان اور پاکستان کے درمیان مفاہمت کو پنپنے نہیں دیا وہ مسئلہ کشمیر ہے۔

کشمیر کی ۸۰ فی صد آبادی مسلم اکثریت پر مشتمل تھی۔ یہ خطہ جغرافیائی لحاظ سے بھی پاکستان کے قریب ہے۔ سیکڑوں میل تک اس ریاست کی سرحدیں ایک دوسرے سے ملی ہوئی ہیں۔ قیام پاکستان کے وقت کشمیر کو ایک آزاد ریاست کی حیثیت حاصل تھی اور اسے اختیار حاصل تھا کہ وہ پاکستان اور ہندوستان میں سے جس ملک کے ساتھ چاہے الحاق کر لے۔

تقسیم ہند کے اعلان کے ساتھ ساتھ آزاد ریاستوں کی بابت یہ فیصلہ کیا گیا تھا کہ وہ ہندوستان یا پاکستان، ہر دو ریاست سے الحاق کے بارے میں خود مختار ہیں۔ ذرائع ابلاغ کے ذریعے انگریزوں کی اس پالیسی کا بڑا چرچا کیا گیا لیکن لارڈ ماؤنٹ بیٹن سمیت متعدد ہندو رہنماؤں کی درپردہ یہی کوشش رہی کہ جس حد تک ممکن ہو زیادہ سے زیادہ ریاستوں کی ہندوستان میں شمولیت اور الحاق کی راہ ہموار کی جائے۔ رائے بہادر وی۔ پی۔ مینن کا یہ بیان کہ ۲۸ جولائی کو ماؤنٹ بیٹن نے سترّ والیانِ ریاست اور سو کے قریب نمائندگانِ ریاست کے اعزاز میں دیے گئے استقبالیے میں اس کوشش کو عملی جامہ پہنانے کے لیے بھرپور اقدامات کیے۔ جو والیانِ ریاست ہندوستان کے ساتھ الحاق پر آمادہ نہ تھے، ایک ایک کر کے انھیں اے۔ ڈی۔ سی۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے پاس لے جاتا۔ اس کے پاس وہ میرے سپرد کیے جاتے اور پھر اسی طرح باری باری یہ لوگ سردار پٹیل کے پاس پہنچا دیے جاتے۔ اس طریقہ کار نے ان والیانِ ریاست پر بڑا اچھا اثر ڈالا[۱]۔

کشمیر کی بابت بھارت کی خصوصی دل چسپی کی وجہ اس خطے کی جغرافیائی اہمیت ہے۔ اس ریاست کی سرحدیں شمال کی جانب روس اور چین، مغرب میں افغانستان اور شمال مغرب میں پاکستان سے ملتی ہیں۔ جنوب مشرقی حصہ بھارت سے ملحق ہے۔

رقبے کے لحاظ سے بھی یہ ایک وسیع و عریض ریاست ہے۔ اس ریاست کو حسن و جمال سے نوازنے میں قدرت نے اس قدر فیاضی سے کام لیا کہ اس کو دیکھنے والا اس بات کا اعلان کیے بغیر نہ رہ سکا کہ:

اگر فردوس بروئے زمیں است — ہمیں است و ہمیں است و ہمیں است[۴]

یہ ریاست ۸۴۴۷۱ مربع میل پر مشتمل ہے۔ بعض کتب میں رقبہ اس سے کہیں زیادہ بتایا گیا ہے۔ تقسیم سے قبل یہ ریاست انتظامی لحاظ سے تین صوبوں پر مشتمل تھی[۵]۔ صوبہ کشمیر رقبہ ۸۵۳۹ مربع میل، صوبہ جموں ۱۲۳۷۸ مربع میل اور صوبہ گلگت ولداخ رقبہ ۶۳۵۵۴ مربع میل۔ جب کہ تقسیم کے بعد بھارت کے زیر تسلط علاقے لداخ، کشمیر اور جموں کا کل رقبہ ۴۹۵۲۳ مربع میل اور آزاد ہونے والے علاقے گلگت وبلتستان اور آزاد کشمیر کا کل رقبہ ۳۴۹۴۸ مربع میل پر مشتمل ہے[۶]۔

اس وادی کا حسن و جمال ہر آنے والے کو اپنے انداز سے متاثر کرتا اور فرحت بخشتا ہے۔ اس وادی کے حسن کو احاطِ تحریر میں لانے کے لیے متعدد ادباء اور شعراء نے بہت کچھ کہا لیکن یہاں اس کا موقع نہیں کہ ان تفصیلات کو بیان کیا جائے۔ البتہ اس کے حسن کی سحر انگیزی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے سراج احمد سراج نے جو کچھ لکھا اس سے اس وادی کے حسن کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ:

> اس وادیِ پُر بہار کو قدرت نے نہایت فیاضی سے سنوارا ہے۔ سرسبز و شاداب دھان کے ہموار کھیتوں، نظر فریب مرغزاروں اور گل پوش میدانوں میں ادھر اُدھر چنار کے پر عظمت اور بلند و بالا درخت، بوڑھے فلسفیوں کی طرح سر نیہوڑائے فطرت کے کسی اہم راز کی گتھی سلجھاتے محسوس ہوتے ہیں۔ جگہ جگہ سفیدے کے سیدھے اور سبک درختوں کی قطاریں اور ان کی اوٹ میں پھل دار درختوں کے باغات، سرخ و سفید گلاب، چنبیلی اور دوسرے عطر فشاں پھولوں کے جھنڈوں میں لکڑی، مٹی یا کچی پکی اینٹوں کے دو منزلہ رہائشی مکانوں پر مشتمل بستیاں اور پھر شمال مشرقی پہاڑیوں پر واقع جھیلوں، چشموں کے بہتے ہوئے پانی کی نقرئی اور سانپ کی طرح بل کھاتی ہوئی لکیریں جو نیچے جاکر آپس میں مربوط ہو جاتی ہیں، اس وادی پر ایک تیز رنگ کے قالین کا گمان ہوتا ہے[۸]۔

اس ریاست کی کل آبادی ایک کروڑ بیس لاکھ سے زائد بتائی جاتی ہے۔ اس میں ۷۲ لاکھ افراد ہندوستان کے زیر تسلط، ۲۷ لاکھ آزاد کشمیر اور تقریباً ۱۲ لاکھ مختلف علاقوں میں مقیم مہاجرین ہیں[۹]۔

مغلوں نے کشمیر پر ۱۵۵۷ء سے ۱۷۵۲ء تک دو سو برس حکومت کی۔ یہ زمانہ کشمیریوں کے لیے بڑی فراغت اور خوش حالی کا زمانہ تھا۔ سڑکوں کی تعمیر سے لے کر صنعت و حرفت کے مختلف مدارج اس دور میں کشمیریوں نے بڑی تیزی سے طے کیے۔ ۱۷۵۲ء کے بعد پنجاب ابدالی کے ہاتھ آیا اور اس کے کچھ ہی عرصے کے بعد افغانوں نے بڑی آسانی سے کشمیر پر قبضہ کر لیا۔ پنجاب

تو افغانیوں کے قبضے سے جلد ہی نکل گیا لیکن کشمیر پر کوئی ۶۷ برس تک ان کا تسلط قائم رہا۔ اس زمانے میں کشمیریوں کو مختلف مشکلات اور آفتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اس عہد سے متعلق بہت سی کہاوتیں اور اشعار مشہور ہیں۔ جیسے ایک کشمیری شاعر کہتا ہے کہ:

خو است حق کیں زمینِ مینا رنگ　　　چوں دلِ نے شود زا فغاں تنگ

کر بروئے مسلّط افغاں را　　　باغ جمشید دادِ دیواں را[۷]

ایک اور شاعر لکھتا ہے کہ:

پر سیدم از خرابیِ گلشن باغ باں　　　افغاں کشید و گفت کہ افغاں خراب کرد[۸]

غیر ملکی جبر کا یہ دور انتہائی صبر آزما اور کٹھن تھا۔ اس سفاکانہ عہد کا ذکر کرتے ہوئے والٹر لارنس لکھتے ہیں کہ: ''بے رحمانہ استبداد کا زمانہ تھا جس میں کوئی اچھا کام نہیں ہوا''[۹]۔ ینگ ہسبند کے مطابق افغان گورنروں کے لیے انسان کا سر قلم کرنا پھول توڑنے سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا تھا[۱۰]۔ بے انتہا ظلم و جبر کے باوجود انتہائی مخدوش حالات میں بھی اس دور میں کشمیر کی جدوجہد آزادی کسی نہ کسی انداز میں جاری رہی۔

افغانوں کے بعد سکھ کشمیر کے حکمراں ہوئے۔ یہ دور بھی جبر کی انتہا کو چھوتا دکھائی دیتا ہے۔ مسلمانوں کو بالخصوص اس دور میں نشانہ بنایا گیا۔ اذان دینے پر پابندی تھی۔ مسجدیں بحق سرکار ضبط کر لی گئی تھیں۔ سکھوں کی بالادستی کا یہ دور تاریخ کشمیر کا بدترین دور شمار کیا جاتا ہے۔ اس زمانے کی حالت بیان کرتے ہوئے ایک غیر ملکی سیاح کرافٹ لکھتا ہے کہ گاؤں نیم ویران، لوگ تقریباً ننگے تھے اور ان کی ہڈیاں نکل آئی تھیں۔ وہ غربت اور فاقہ کشی کی بھیانک تصویر دکھائی دیتے تھے۔ سکھ کشمیریوں کو مال مویشیوں سے بھی زیادہ بدتر سمجھتے تھے[۱۱]۔ رنجیت سنگھ کے دور میں سب سے زیادہ مظلوم صوبہ کشمیر تھا۔ رنجیت سنگھ کے بعد اس کے خاندان میں صرف سات برس حکومت چلی[۱۲]۔ ۱۸۲۲ء میں مہاراجا رنجیت سنگھ نے گلاب سنگھ کو اس کی وفاداریوں کے بدلے میں جموں کا علاقہ عطا کر دیا، تو اس نے اقتدار سنبھالتے ہی ارد گرد کے پہاڑی علاقوں کو اپنے زیر نگیں لانا شروع کر دیا۔ سب سے پہلے والیِ بھمبھر سلطان خان کو گرفتار کیا۔ پھر راجوری کے راجگان عزیز خان اور اعز خان کو اقتدار سے فارغ کیا۔ ۱۸۳۲ء میں سکھوں کو جب پشاور اور گردونواح سے شکست کا سامنا کرنا پڑا تو پونچھ کے پہاڑی قبائل پر اس کا یہ اثر پڑا کہ آزادی کا ولولہ ان کے اندر جوش مارنے لگا۔ ڈوگروں کے خلاف نفرت اور حقارت نے بغاوت کی شکل اختیار کر لی[۱۳]۔ پونچھ میں آباد سدھن قبائل نے سردار جموں خان اور سردار مہتا خاں کی قیادت میں غاصب فوجوں کے خلاف بغاوت کی اور قلعہ فتح کر کے کامیابیاں حاصل کیں۔

کشمیر کی آزادی کی تحریک کا ایک نہایت درخشاں باب اس وقت شروع ہوا جب سردار شمس خاں جو سدھن قبیلے کا ایک نام ور سردار تھا، نے سردار راج ولی خاں، سردار سبز علی خاں اور سردار ملی خان کے ساتھ مل کر غاصبوں کے خلاف علم بغاوت بلند کیا۔ جب اس بغاوت کی خبر حکمرانوں تک پہنچی تو اودھم سنگھ جو گلاب سنگھ کا بیٹا تھا، ایک بڑے لشکر کو لے کر اس ''شورش'' کو کچلنے

کے لیے پونچھ کی طرف روانہ ہوا۔ اس معرکے میں گلاب سنگھ کے دو معروف جرنیل زور آور سنگھ اور میاں سنگھ بھی اس کے ہمراہ تھے۔ جارح فوج نے چاروں جانب سے نہتے عوام پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑے لیکن کشمیریوں نے اپنے وطن کی آزادی کے لیے جس بہادری کا مظاہرہ کیا اس کی مثال کم ہی ملتی ہے۔ پونچھ کی سرزمین کا چپہ چپہ حریت پسندوں کے لہو سے رنگین تو ہوا لیکن ان کی بے مثل قربانیوں کے باعث ظالم ڈوگرا فوج کو عبرت ناک شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ رنجیت سنگھ نے گلاب سنگھ کو جو اس وقت ہزارہ اور سوات میں مصروف جنگ تھا، یہ مہمات ملتوی کر کے فوراً پونچھ پر حملہ آور ہونے کا حکم دیا۔ گلاب سنگھ کی سفاک فوج جدھر سے بھی گزرتی موت کا اندوہ ناک کھیل کھیلتی۔ درندہ صفت ڈوگرا کے ہاتھوں اس مہم میں ہزاروں افراد جن میں معصوم بچے اور خواتین بھی شامل تھیں، تہ تیغ ہوے۔ قتل و غارت گری کے علاوہ ان ڈوگروں نے پانچ ہزار عورتوں کو اغوا کر کے ان پر بے تحاشا ظلم ڈھائے۔ ان میں سے ڈیڑھ ہزار خواتین دم توڑ گئیں۔ ہر جانب بربریت کی انتہا تھی۔ آزادی کی شمع کو ہمیشہ کے لیے گل کر دینے کا فیصلہ تھا۔ دوسری جانب ظلم کا ہر وار ان حریت پسندوں کو نئے جذبے اور توانائی بخشنے کا باعث تھا۔ سر جھکانے کے بجائے سر کٹا دینا ان کا وتیرہ بن چکا تھا۔ وہ لوگ نہایت بے فکری اور بے جگری سے لڑے۔ مزاحمت کی اس کش مکش میں پہلے سردار شمس خان اور پھر سردار راج ولی شہادت کے رتبے پر فائز ہوئے۔ سردار سبز علی خان اور سردار ملی خان نے اپنے رفقا کے ساتھ مل کر قربانی کی وہ مثال قائم کی جو کشمیر کی تاریخ میں ابد تک یاد رکھی جائے گی۔ یہ لوگ آزادی کے وہ عظیم محسن تھے جنھوں نے اس جدوجہد میں اپنی کھالیں کھچوائیں لیکن ظالموں کے سامنے سر تسلیم خم نہ کیا۔ اس خونیں معرکے میں پندرہ ہزار حریت پسندوں نے جام شہادت نوش کیا[۱۴]۔

پنجاب میں سکھا شاہی کے زوال کے وقت موقعہ پرست انگریزوں نے ریاست جموں و کشمیر کو ڈوگرا گلاب سنگھ کے ہاتھوں ۱۸۴۶ء میں فروخت کرنے والا وہ رسوائے زمانہ معاہدہ کیا جس کے تحت فرنگیوں نے پوری ریاست کو اور اس میں موجود ہر ذی روح کو ۷۵ لاکھ نانک شاہی کے عوض گلاب سنگھ کے حوالے کر دیا تھا۔ دنیا کی تاریخ میں قوموں کی فروخت کا ایسا سودا شاید کسی اور خطے میں نہ ہوا ہو۔ اس جانب اشارہ کرتے ہوئے اقبال نے لکھا کہ:

بادِ صبا اگر بہ جنیوا گزر کنی　　　حرفِ زما بہ مجلسِ اقوام باز گوئے
دھقان و کشت و جوئے خیاباں فروختند　　　قومے فروختند و چہ ارزاں فروختند[۱۵]

اس زمانے میں ڈوگرا حکمران اہل کشمیر سے جبری مشقت لیا کرتے تھے۔ غریب دیہاتیوں کو پکڑ کر ان سے بے گار لی جاتی، بدلے میں اجرت تو دور کی بات ہے خوراک بھی نہ دی جاتی۔ ڈاکٹر آرتھر اور نائٹ (Knight) نے بھی بے گار لینے کے غیر انسانی طریقوں کو نہایت دردناک انداز میں پیش کیا ہے[۱۶]۔

۱۸۵۰ء میں مقامی لوگوں اور داروپل قبیلے کے سرداروں نے ڈوگر اراج کے خلاف آواز بلند کی۔ گلگت کے لوگوں نے بھی گوہر امان کی قیادت میں آزادی کا علم بلند کیا[۷]۔ جدوجہد آزادی کا ایک اور رخ اس وقت سامنے آیا جب ۱۸۶۶ء میں ہنزہ کے نواح میں مسلمانوں نے بغاوت کی۔ سردار بہادر علی خان نے عوامی سطح پر تحریک چلانے کے علاوہ لاہور میں قانونی جنگ بھی شروع کی[۸]۔ انھوں نے ہی لاہور ہائی کورٹ میں حقوق ملکیت کا مقدمہ دائر کر کے اہل کشمیر کو پہلی بار ملکیتی حقوق دلوائے۔ عوامی حقوق کی جنگ نے اس وقت مزید شدت اختیار کر لی جب ریشم خانہ سری نگر کے کارکنوں نے اپنے حقوق کے حق میں احتجاج شروع کیا۔ شیخ محمد عبداللہ کہتے ہیں کہ ۱۹۲۴ء کے موسم بہار کی بات ہے کہ ریشم خانہ کے مزدوروں نے کارخانے میں ہونے والے ظلم کے خلاف آواز بلند کرتے ہوئے اپنے مطالبات کے حق میں جدوجہد شروع کی۔ حضوری باغ میں جمع ہو کر مزاحمت شروع ہوئی تو حکومت نے رسالہ فوج کو ننگے نیزوں کے ساتھ چڑھائی کا حکم دے دیا۔ متعدد مزدور زخمی ہوئے اور شہر کا کوئی حصہ ایسا نہ تھا جس کے رہنے والے اس ظلم سے بچ سکے ہوں[۹]۔ اسی دوران جموں میں ۱۹۲۲ء میں کشمیر کے پڑھے لکھے نوجوانوں نے ینگ مینز مسلم ایسوسی ایشن کی بنیاد ڈالی۔ چودھری غلام عباس اس کے اوّلین صدر منتخب ہوئے[۱۰]۔ سماجی اور علمی سرگرمیوں کے علاوہ اس تنظیم نے سیاسی محاذ پر بہت کام کیا۔ مارچ ۱۹۲۹ء میں مہاراجا کی ایگزیٹو کونسل کے سینئر ممبر سر ایلبین سبرجی نے کشمیری مسلمانوں کی حالت زار اور ان کے ساتھ روا رکھی جانے والی ناانصافیوں کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے وزارت سے استعفیٰ دے دیا۔ ایک راز دار کے ہاتھوں سیاسی مظالم کا پردہ چاک ہونے پر پورے برصغیر میں ہلچل مچ گئی۔ اس دوران ریاست کے نوجوان علی گڑھ اور پنجاب کے تعلیمی اداروں میں اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے وطن لوٹ رہے تھے جنھوں نے بعد کے وقتوں میں جدوجہد آزادیِ کشمیر کے لیے بہت کام کیا۔ جلیاں والا باغ کے سانحے کے بعد اہل کشمیر کے جذبوں کو نئی توانائی میسر آئی۔ اب اس جدوجہد کو مربوط اور منظم کرنے کی ضرورت محسوس ہونے لگی۔ لہٰذا مسلم اکابرین کے باہمی مشورے سے اکتوبر ۱۹۳۲ء کو آل جموں کشمیر مسلم کانفرنس کی بنیاد رکھی گئی۔ شیخ عبداللہ مسلم کانفرنس کے پہلے صدر اور چودھری غلام عباس جنرل سیکریٹری مقرر ہوئے۔ ۱۹۳۲ء سے ۱۹۳۹ء تک مسلم کانفرنس ہی تحریک آزادیِ کشمیر کے حوالے سے سرگرم رہی اور ریاست کی واحد نمائندہ جماعت تصور کی جاتی تھی۔ بعد میں غیر مسلم کشمیریوں کو بھی اس تحریک کا حصہ بنانے کے لیے اس تنظیم کو نیشنل کانفرنس میں بدل دیا گیا[۱۱]۔

قراردادِ پاکستان کے بعد تحریک پاکستان کا ایک اثر یہ بھی ہوا کہ مسلم کانفرنس اور نیشنل کانفرنس کی سیاسی جدوجہد میں بھی تیزی آئی اور ریاست پر صدیوں سے چھائے گھٹاٹوپ اندھیرے چھٹنے لگے۔ اس ماحول میں ۱۹۴۶ء میں نیشنل کانفرنس کی کشمیر چھوڑ دو تحریک نے جدوجہد آزادی کو نئی منزلوں سے روشناس کرایا۔ اب کشمیری مردوں کے ساتھ ساتھ خواتین بھی آزادی

کی تحریک کا ہراول دستہ بننے کو تیار دکھائی دیں۔ نور گجری جو ایک گوالے کی صاحب زادی تھیں اور فاطمہ جو ڈوگرا افواج کے ہاتھوں شہید ہوئیں، اپنی مسلح کارروائیوں کے لیے کشمیر سمیت دنیا بھر میں مشہور ہوئیں[۲۲]۔

جبر و محکومی کے بعد ذہنوں پر پڑے جالے اور زبانوں پر پڑے تالے ٹوٹ رہے تھے۔ فکر کا محور بدل چکا تھا اور قوم سوئے منزل گام زن تھی، لیکن دوسری جانب درندہ صفت ڈوگرا کا قہر و جبر بھی تیز تر ہوتا جا رہا تھا۔ اس صورتِ حال میں عوام بالعموم یہ سوچنے پر مجبور ہو چکے تھے کہ شعور اور حکمت سے لیس ہونے کے ساتھ ساتھ مسلح جدوجہد بھی ناگزیر ہے۔ لہٰذا بابائے خاں کرنل خان محمد خاں نے جنھیں پونچھ کا سرسید بھی کہا جاتا ہے، سدھن ایجو کیشنل کانفرنس کے پلیٹ فارم سے لوگوں کو منظم کرنا شروع کیا۔ کیپٹن حسین خاں شہید نے پونچھ میں اپنے رفقا کے ساتھ مل کر عوامی فوج کی تشکیل کا کام شروع کیا۔ اس محنت کے نتیجے میں خاطر خواہ تعداد میں مجاہدین کی فوج تیار ہو گئی۔

کشمیر کی تحریک آزادی کے پس منظر میں ۱۹ جولائی ۱۹۴۶ء کا دن بے انتہا اہمیت کا حامل ہے۔ اس دن سری نگر میں سردار محمد ابراہیم خاں کے مکان پر مسلم کانفرنس نے الحاق پاکستان کی قرارداد منظور کی تھی۔ مجاہدین پونچھ نے کیپٹن حسین خان شہید کی قیادت میں بے سروسامانی کے باوجود ایک وسیع رقبہ آزاد کرا لیا تھا۔ یہ عمل دوسرے علاقوں میں بھی کام یابی سے جاری تھا کہ ہندوستان نے مہاراجا کی ایما پر اپنی فوجیں سری نگر میں اتار لیں۔ پھر مسئلہ کشمیر اقوام متحدہ میں لے جایا گیا، لیکن آج بھی ہزاروں شہدا کی قربانیوں کے باوجود یہ مسئلہ اقوام متحدہ کے سرخ فیتے کی نذر ہو کر سرد خانے میں پڑا ہے۔ مسلمانوں کی درخواست اور فریاد کے باوجود کہ کشمیر کو الحاق یا آزادی کا اختیار دیا جائے، مہاجارا نے ہمیشہ ٹال مٹول سے کام لیا۔ مہاجارا کشمیر کے ساتھ بھارتی لیڈروں کی خفیہ گفت و شنید غالباً باؤنڈری کمیشن کے فیصلے کے اعلان سے پہلے ہی ہو چکی تھی۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ اس زمانے کے کشمیری وزیر اعظم پنڈت کاک اسے پاکستان کے ساتھ الحاق کا مشورہ دے چکے تھے۔ لیکن مہاجارا کا جھکاؤ بھارت کی طرف تھا۔ لہٰذا ۲۷ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو مہاجارا کی درخواست کے جواب میں حکومت نئی دہلی نے ”الحاق کشمیر“ منظور کرنے کا سرکاری اعلان نامہ جاری کیا۔ بھارت کے اعلان کے جواب میں پاکستان نے اس الحاق کو تسلیم نہیں کیا۔ قائد اعظم کا خیال تھا کہ بھارتی حکومت فوجی طاقت کے بل بوتے پر کشمیر پر غاصبانہ قبضہ کرنے پر تُلی بیٹھی ہے۔ اس کا استصوابِ رائے کا وعدہ محض فریب ہے۔ پنڈت نہرو کی ۲ نومبر ۱۹۴۷ء کو نشر کی گئی تقریر جو الحاق کشمیر کے متعلق بھارتی پالیسی کی وضاحتوں سے بھری ہوئی تھی، اس میں یہ تاثر دیا گیا کہ بھارت تو اس درخواست پر بہت دیر سے تامل سے کام لیتا رہا لیکن شیخ عبد اللہ سمیت بہت سے عمائدین کی درخواست کو پیش نظر رکھ کر یہ مشکل فیصلہ کرنا پڑا۔ لیکن اس تقریر میں بھی عوامی رائے پر اصرار موجود تھا۔ لیکن آج ہندوستان اپنے اس وعدے سے پھر گیا ہے اور کشمیری عوام کا حق خود اختیاری غصب کیے بیٹھا ہے[۲۳]۔ یہ مسئلہ ہنوز حل طلب ہے۔ ۱۹۴۷ء

سے لے کر اب تک تین بار یہ دونوں ممالک اس تنازعے کی وجہ سے جنگ کا شکار ہو چکے ہیں۔ اقوام متحدہ نے بھی اس مسئلے کی بابت وہ کردار ادا نہیں کیا بلکہ ایک لحاظ سے مظلوم کشمیریوں کے بجائے بھارتی حکومت کا ساتھ دیا۔

کشمیر کی تحریک آزادی اور اس جدوجہد کے نتیجے میں پیدا ہونے والے سانحات کو اردو شاعری میں بے حد تفصیل سے بیان کیا گیا۔ آزادی کی اس تحریک کو تو اردو شاعری کا اہم ترین موضوع قرار دیا جائے تو بے جا نہ ہو گا۔ جنت نظیر وادیوں اور بے پناہ حسن کی وجہ سے تو یہ خطہ ہمیشہ ہی سے شاعری کا اہم موضوع رہا ہے لیکن اس گل پوش وادی کو انسان کی ہوسِ زر اور اقتدار کی ناپاک سازشوں نے جس طرح جہنم زار بنا دیا تھا، اس کا اظہار اردو کے متعدد شعرا نے کیا ہے۔ فانی نے اس صورتِ حال کا نقشہ کھینچتے ہوئے اپنی رباعی میں کیا خوب کہا کہ:

پھولوں کی نظر نواز رنگت دیکھی　　مخلوق کی دل گداز حالت دیکھی

قدرت کا کرشمہ نظر آیا کشمیر　　دوزخ میں سمائی ہوئی جنت دیکھی[۲۴]

ابتدا میں جہاں کشمیر کا فطری حسن اہل قلم کی تخلیقات کا موضوع بنا وہیں اہل کشمیر کی زبوں حالی، مفلسی، ڈوگرا مظالم اور بھارتی استبداد بھی ان شعرا کی تخلیقات کا محرک ہوئے۔ ابتدا میں جسٹس عارف حسین، پیرزادہ خوشی محمد ناظر، سعید الدین سعد، خادم اور کئی دیگر شعرا نے یہاں کے حالات اور سانحات کی تصویر کشی کی۔ بعد ازاں موجودہ صدی کے آغاز میں جب بیداری کی لہر تیز ہوئی تو بے شمار کشمیری اور غیر کشمیری شعرا مثلاً دین محمد فوق، اقبال، حفیظ جالندھری، اے۔ آر۔ ساغر، عبداللہ قریشی، علم الدین سالک، طغرانی اور دیگر کئی لکھنے والوں نے قومی شعور کی بیداری میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اب یہ موضوع اردو شاعری کا ایک بڑا موضوع بن چکا ہے۔

اقبال اور کشمیر کا باہمی تعلق کئی حیثیتوں اور جہتوں پر مشتمل ہے۔ کشمیر اقبال کا آبائی وطن ہی نہیں تھا بلکہ ان کے فکر و عمل کا ایک بہت اہم حوالہ بھی تھا۔ شعور کی آنکھ کھلنے سے لے کر موت تک انھوں نے فکری اور عملی سطحات سے کشمیر کو اپنی جدوجہد کا مرکز اور موضوع بنایا۔ اقبال کا پہلا اور آخری عشق بہ قول ڈاکٹر صابر آفاقی، کشمیر ہی تھا۔ ان کا کہنا ہے کہ:

> علامہ کو بیس سال کی عمر سے بھی پہلے کشمیر سے دل چسپی پیدا ہوئی اور یہ دل چسپی مرتے دم تک باقی رہی۔ انھوں نے ۱۸۹۶ء سے ۱۹۳۸ء، پورے پینتالیس سال ملت کشمیر کے غم میں آنسو بہائے۔ وہ تقریباً نصف صدی تک اپنی شاعری سے اہل کشمیر کی رہنمائی کرتے رہے[۲۵]۔

فروری ۱۸۹۶ء میں لاہور کی کشمیری برادری نے "انجمن کشمیری مسلمانان" قائم کی۔ اس انجمن کے پہلے ہی اجلاس میں انھوں نے ۱۲۷ اشعار پر مشتمل ایک قطعہ سنایا جس کا یہ مصرع اقبال کی کشمیر سے دلی وابستگی کو ظاہر کرتا ہے:

ع　　ہزار شکر کہ اک انجمن ہوئی قائم

کشمیری مسلمانوں کی فکری اور سیاسی قیادت کا یہ پہلا قدم بہت بابرکت ثابت ہوا۔ اقبال کے کلام میں ۱۹۳۰ء کے بعد ایک طرف "جاوید نامہ" سید علی ہمدانی اور ملا طاہر غنی کی زبانی اپنے اہلِ قلم کو پیغامِ بے داری کے واضح اشارے تو موجود ہیں ہی، اس کے ساتھ ساتھ "ارمغانِ حجاز" میں قطعی فرضی ملازادہ ضیغم لولابی کشمیری کی زبانی سترہ نظمیں کہلوا کر اس خطۂ مجبور و محکوم کے مسائل کو بڑی خوبی سے اجاگر کیا۔ صرف ارمغان حجاز میں کشمیر پر اقبال کا جتنا کلام ملتا ہے، اتنا کلام اقبال کے سارے کلام میں کسی قوم اور ملک کے حوالے سے نہیں ملتا[۲۶]۔ سفر کشمیر کے بعد کی شاعری سے صاف محسوس ہوتا ہے کہ اس کے بعد اقبال کو شاعری میں نئے مضامین اور استعارے ہاتھ آئے۔ اقبال جون ۱۹۲۱ء کے پہلے عشرے میں کوہالہ مظفر آباد، چکوٹھی، اوڑی اور سری نگر گئے اور دو ہفتے قیام کے بعد واپس لاہور آ گئے۔ کشمیر کے نظاروں نے تو اقبال کے احساس جمال کو انگیختہ کیا لیکن ساتھ ساتھ وہاں کے افلاس اور غلامی میں جکڑے ہوئے ہم وطنوں کی حالت زار دیکھ کر ان کے کلام میں درد و سوز کی لے اور زیادہ اُبھر کر سامنے آئی۔ یہ درست ہے کہ کشمیر کے حوالے سے اقبال کا موقر و معتدبہ کلام فارسی میں ہے۔ "ساقی نامہ"، "کشمیر"، "غنی کاشمیری" اور "جاوید نامہ" جیسی عظیم الشان نظمیں گو کہ فارسی میں ہونے کی وجہ سے ہمارے موضوع سے خارج ہیں لیکن کشمیر کے حوالے سے ان کا مطالعہ دل چسپی سے خالی نہیں ہوگا۔ البتہ "ارمغانِ حجاز" میں شامل نظمیں بھی اقبال کے فکر و نظر کی وضاحت کے لیے کافی ہیں۔ وادی لولاب دراصل کشمیر کی ایک ذیلی وادی ہے جو موجودہ انتظامی تقسیم میں ضلع کپواڑہ کا حصہ ہے۔ "ملازادہ ضیغم" فرضی نام ہے جس کے معنی "ملا کا بیٹا شیر" ہے۔ علامہ کو کشمیری علما اور صوفیا سے ہمیشہ یہ گلا رہا کہ یہ لوگ منبر و محراب میں بیٹھ کر قوم و ملت کے لیے جو کچھ کر سکتے تھے اس میں ناکام رہے۔ اسی لیے بندۂ مومن کے لیے دین، موت بن گیا ہے یا خواب۔ علامہ کو پھر بھی یقین تھا کہ وادی کے انہی علما صوفیا میں سے دلیر اور شجاع ضرور پیدا ہوں گے جو کشمیر کی آزادی کے لیے جدوجہد کریں گے۔ "ضیغم" نامی ملازادے نے جو بیاض بنا رکھی ہے اس میں اپنی پسند کے اشعار نقل کر رکھے ہیں۔ سترہ نظموں کی اس بیاض میں اُناسی (۷۹) اشعار ہیں۔ ملازادہ ضیغم لولابی کی بیاض میں درج چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

پانی ترے چشموں کا تڑپتا ہوا سیماب　　مرغانِ سحر تیری فضاؤں میں ہیں بے تاب

اے وادیِ لولاب

بے زار ہوں دل جس کی فغانِ سحری سے　　اس قوم میں مدت سے وہ درویش ہے نایاب[۲۷]

تیسرے نمبر پر درج نظم دراصل کشمیری قوم کا نوحہ ہے۔ اس نظم میں ڈوگرا استعمار کے مسلط کیے گئے استیصالی قوانین کی سخت مذمت کی گئی ہے۔ جیسے:

آج وہ کشمیر ہے محکوم و مجبور و اسیر　　کل جسے اہلِ نظر کہتے تھے "ایرانِ صغیر"[۲۸]

کشمیر کو صوفیا اور علماء کی سر زمین کہا جاتا ہے لیکن خرد سے تہی اس رسمی ملائیت کی طرح عمل سے بے گانہ صوفیوں نے بھی کشمیریوں کو ضعیف الاعتقادی کا عادی بنا رکھا تھا۔ اسی بیاض میں شامل ایک نظم میں سالک و محکوم اور سالکِ آزاد کا موازنہ پیش کرنے کے علاوہ ڈوگرا شاہی کے زمانے میں ذہنی غلامی کا شکار صوفیوں اور سالکوں اور خانقاہوں کے مردہ ضمیر رہبانیت پرست اور بے عمل سجادہ نشینوں کو اقبال دعوت عمل دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

نکل کر خانقاہوں سے ادا کر رسمِ شبیری — کہ فقرِ خانقاہی ہے فقط اندوہِ دل گیری

ترے دین و ادب سے آ رہی ہے بوئے رہبانی — یہی ہے مرنے والی امتوں کا عالمِ پیری

شیاطینِ ملوکیت کی آنکھوں میں وہ جادو ہے — کہ خود نخچیر کے دل میں ہو پیدا ذوقِ نخچیری[۲۹]

اقبال کشمیریوں کو یہ باور کراتے ہیں کہ انقلاب اور تبدیلی ایک فطری امر ہے۔ وہ انھیں زندہ قوموں کے اوصاف بتاتے ہوئے حرکت و عمل پر اکساتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

نشاں یہی ہے زمانے میں زندہ قوموں کا — کہ صبح و شام بدلتی ہیں ان کی تقدیریں[۳۰]

اس سلسلے کی پندرھویں نظم بلا کا درد و سوز رکھتی ہے۔ اس نظم میں کشمیر جیسے کمزور و محکوم قوموں کے ساتھ دنیا کے سلوک کو بڑے درد انگیز انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ کشمیریوں کی بد نصیبی کا نوحہ بیان کرتے ہوئے شاعر نے عالمی ضمیر کو جھنجھوڑنے کی جو کوشش کی ہے اسے پڑھ کر ہر آنکھ اشک بار ہو جاتی ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

حاجت نہیں اے خطۂ گل شرح و بیاں کی — تصویر ہمارے دلِ پُر خوں کی ہے لالہ

امید نہ رکھ دولتِ دنیا سے وفا کی — رَم اس کی طبیعت میں ہے مانندِ غزالہ[۳۱]

سیاسیاتِ کشمیر کا یہ المیہ رہا کہ یہاں کی مذہبی قیادت نے ہمیشہ مذہب کے نام پر کشمیریوں کا استیصال کیا چناں چہ کشمیری سیاسی جدوجہد میں میر واعظ خاندان کشمیریوں کی جدوجہد آزادی میں ہمیشہ مالک بست و کشاد بنا رہا۔ شیخ عبد اللہ نے "آتش چنار" میں اس گھرانے کی سیاسی شطرنج بازیوں کا پردہ چاک کرتے ہوئے اقبال کے الفاظ میں "بڑی باریک ہیں واعظ کی چالیں" کے عنوان سے تفصیلات بیان کی ہیں۔ اقبال اگرچہ ہمیشہ غریب الدیار ہونے پر نوحہ کناں رہے لیکن انھوں نے اپنے ہم وطنوں کی زندگی کے مصائب کو ہمیشہ اپنی شاعری میں پیش نظر رکھا۔ انھوں نے کشمیر کے لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے واضح انداز میں کہا کہ میری باتیں غور سے سنو کیوں کہ یہی باتیں اور پیغام تمھیں غلامی سے نجات دلوانے کا سبب بنیں گے۔ وہ کہتے ہیں کہ:

غریبِ شہر ہوں میں سن تو لے مری فریاد — کہ تیرے سینے میں بھی ہوں قیامتیں آباد[۳۲]

اقبال اہل کشمیر کو فکری رہنمائی فراہم کرنے کا بہت بڑا وسیلہ تھے۔ کلام اقبال نے اہل کشمیر میں جذبہ حریت وخودداری بیدار کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ گویا اقبال تحریک آزادیِ کشمیر کا ایک سر چشمہ افکار (Think Tank) تھے۔ ان کے کلام میں وہ تاثیر تھی کہ آج بھی یہ تحریک زندہ ہے اور اپنے مقصد کے حصول کی جدوجہد میں مصروف عمل ہے۔

۱۹۳۱ء کے بعد ڈوگرا شاہی مظالم کے خلاف کشمیریوں کی جدوجہد کو اردو شاعری میں بہت تفصیل سے پیش کیا گیا۔ لٹے ہوئے چمن اور جلتے ہوئے کشمیر کے الم انگیز مناظر اس زمانے میں تقریباً ہر شاعر کا پسندیدہ موضوع رہے۔ ۱۹۴۲ء تک کشمیر میں مسلمانوں کے ساتھ جس طرح خون کی ہولی کھیلی گئی خصوصاً راجا گلاب سنگھ نے محض ۷۵ لاکھ روپے کے عوض جس طرح کشمیر عوام کی قسمت خرید لی، اس سودے بازی کے خلاف اپنا نوشتہ تقدیر خود تحریر کرنے کے عزم کے ساتھ جس طرح کشمیری عوام ان خامیوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے [۳۳] ان مناظر کو بے شمار شعرا نے اپنی تخلیقات میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس زمانے میں مولانا ظفر علی خان کی نظم "ہنگامۂ کشمیر" میں جس طرح مسلمانوں کے جذبات کی عکاسی کی گئی ہے اس کی مثال کم ہی ملتی ہے۔ ظفر علی خان نے ان حالات کی منطقی تصویر اور درست رخ پیش کرتے ہوئے کہا کہ:

ہر طرف ہنگامہ برپا ہے دار و گیر کا — ہو رہا ہے پھر ہرا زخمِ کہن کشمیر کا

گونجتی ہے پھر فضا زنجیر کی جھنکار سے — شور جس میں دب رہا ہے نعرۂ تکبیر کا

ہے خطا اتنی کہ کیوں کرتے ہیں حق اپنا طلب — ہیں یہ ساری سختیاں خمیازہ اس تقصیر کا

بادشہ بے مہر ہے اور بے نیاز اس کا وزیر — شکوہ کس سے کیجیے پھوٹی ہوئی تقدیر کا [۳۴]

مقتدر قوتوں کے خلاف اس واضح انداز میں کلمۂ حق بلند کر کے مولانا ظفر علی خان نے کشمیر کے سلگتے ہوئے موضوع کو بھرپور طریقے سے اجاگر کیا۔

کشمیر ہی سے تعلق رکھنے والی ایک اور اہم شخصیت محمد الدین فوق بھی ایک ہمہ جہت قلم کار کی حیثیت سے مصروف ہیں۔ بحیثیت صحافی انھوں نے ایک بھرپور زندگی گزاری لیکن ایک مؤرخ، سوانح نویس، ناول اور ڈراما نویس کے علاوہ ان کی شاعرانہ عظمت کا بھی اعتراف ناگزیر ہے۔ تاریخ کشمیر کے موضوع پر ان کی تین جلدوں پر مشتمل کتاب کشمیر سے ان کی گہری دل چسپی کا ثبوت ہے۔ ان کے شعری مجموعے "کلام فوق" اور "نغمۂ گلزار" وغیرہ میں کشمیر کے حوالے سے بھی بہت کچھ مواد موجود ہے۔ "کلام فوق" کا تجزیہ کرتے ہوئے پروفیسر علم الدین ثابت کہتے ہیں کہ فوق کا امتیاز یہ ہے کہ وہ پہلے شاعر ہیں جنھوں نے مستقل طور پر مسلمانانِ کشمیر کی ترجمانی کرتے ہوئے عالم اسلام کو ان کشمیریوں کی مظلومی سے روشناس کرایا۔ اس کے ساتھ ساتھ اسلاف کے کارناموں کو پیش کرتے ہوئے کشمیریوں کو ان کے نقش قدم پر چلنے کی تلقین بھی کی۔ "کلام فوق" اور اخبار "فوق" نے اہلیان کشمیر کے اندر ایسا انقلاب پیدا کیا جس کی مثال بہت کم شعرا کے یہاں ملتی ہے۔ ان کی انھی خدمات کی وجہ سے

انھیں کشمیر کا حالی بھی کہا جاتا ہے[۳۵]۔ مولانا عبداللہ قریشی نے ''شاعرِ کشمیر'' میں لکھا کہ فوق فلسفیانہ پیچیدگیوں اور پر کیف بندشوں میں الجھے بغیر سیدھے سادے انداز میں کشمیر کا راگ الاپتے ہیں اور پر سوز نغموں سے کشمیری قوم کے تن مردہ میں زندگی کا خون دوڑاتے ہیں۔ ایسا کلام اندھی بصیرت کو بینائی بخش سکتا ہے، دل کی آنکھیں کھول سکتا ہے، ستونوں کو جگا سکتا ہے، مایوسیوں کی ڈھارس بندھا سکتا ہے اور جمود کو توڑ سکتا ہے[۳۶]۔ اپنے کلام کی بابت فوق کا کہنا تھا کہ:

پھر تڑپ اٹھے ہوا خواہِ وطن　　　اے کلامِ فوق تونے کیا کیا[۳۷]

اُن کی شاعری اعلیٰ مقاصد کے حصول کا ذریعہ تھی۔ وہ شبلی، حالی، اقبال اور ظفر علی خان کی طرح ادب کو زندگی کے اعلیٰ ترین مقاصد اور منزل کی جستجو کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ اپنی غزلوں اور نظموں میں انھوں نے کشمیر اور تحریک کشمیر کو موضوع بناتے ہوئے ایسی سیاسی فضا کو پیش کیا جو اس زمانے میں کشمیر میں موجود تھی۔ ان کی غزلوں کے کچھ اشعار ملاحظہ کیجیے:

ہے پھٹے کپڑوں میں پوشیدہ پریشانیِ قوم　　　دل حیراں ہے آئینہ حیرانیِ قوم
کچھ نہیں اپنے بھلے اور برے کی پروا　　　کس قدر افسوس ہے نادانیِ قوم[۳۸]

فوق کی نظموں میں بھی کشمیر اور جدوجہد آزادی کو خصوصی موضوع بنایا گیا۔ انھوں نے کشمیریوں کو جگہ جگہ خودداری کا درس دیتے ہوئے اپنے پیروں آپ کھڑے ہونے کا مشورہ دیا۔ وہ کہتے ہیں کہ:

کوئی کرتا نہیں شفقت نہ سہی　　　عیش دیتا نہیں دعوت نہ سہی
اہلِ دنیا میں مروت نہ سہی　　　آؤ ہم اپنی مدد آپ کریں
کیوں پسند آئے ہمیں رسوائی　　　ہم پہ ہو کیوں اثرِ خود رائی
کیوں نہ قوت کی کریں یک جائی　　　ہم سب آپس میں ہیں بھائی بھائی[۳۹]

ان کے خیال میں جدوجہد ہی وہ واحد راستہ ہے جس کے ذریعے کشمیری اپنی کھوئی ہوئی عظمت رفتہ کو دوبارہ حاصل کر سکتے ہیں۔ اپنی ایک نظم ''فردوس نام تیرا ہے تو ہے وطن ہمارا'' میں وہ اس جانب اشارہ کرتے ہوئے کشمیریوں کے دل میں ہمت اور حوصلہ پیدا کرنے کی کوشش کرتے نظر آتے ہیں:

فردوس نام تیرا ہے تو ہے وطن ہمارا　　　سب ہیچ تیرے آگے کیا بلخ کیا بخارا
تیری بلندیاں ہیں مینار روشنی کے　　　شہرت پہ آسماں کے بن کر چمک ستارا
اپنی شجاعتوں کا چرچا تھا اک جہاں میں　　　ہمت کرو تو آئے پھر دور وہ دوبارہ[۴۰]

وہ مستقبل میں مایوس کشمیریوں کے تن مردہ میں ایک نئی روح پھونکنا چاہتے تھے۔ اہلِ وطن کے اندر بیداری کا جذبہ جگا کر وہ کشمیر کو غاصبوں سے آزاد کرانے کے خواہش مند تھے۔ اس منظر میں ان کے چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

تیری ہستی ارتقا کے راز سے بے گانہ ہے　　تیری ہستی روح کی پستی کا اک افسانہ ہے

درس حاصل کر رہے ہیں غیر پستی سے تری　　کھیلتا ہے اک زمانہ آج ہستی سے تری

تجھ سے جس کو کام لینا ہو وہ گرما دے تجھے　　اک ذرا نشتر چبھودے اور تڑپا دے تجھے

اب بھی پوشیدہ ہیں تیرے دل میں وہ چنگاریاں　　ہر ضیا میں جن کی مضمر ہیں ہزاروں بجلیاں

پھونکتا رہتا ہوں اس محفل میں بیداری کا صور　　ایک دن میری نوا ہوگی اثر پیدا ضرور

خود بہ خود خاموش دل نالہ سرا ہو جائے گا　　جب وطن میرا سکوں سے آشنا ہو جائے گا[41]

فوق کشمیر کے رستے ہوئے زخم کو دیکھ کر ہر پل ایک بے چینی محسوس کرتے تھے۔ وہ بعض اوقات خدا سے اس بات کا شکوہ بھی کرتے دکھائی دیتے ہیں کہ:

خاک پاکِ خطہِ کشمیر ہے جنت مگر　　قہر دوزخ کا نمونہ ہے وہاں بے گار بھی

خلد ہے کشمیر تو اس میں عذابِ نار کیوں　　کیا ہوا کرتا ہے جنت میں کہیں آزار بھی[42]

وہ اپنے اشعار میں کشمیر کی پکار کو نظم کرتے ہوئے بیرونی طاقتوں پر طنز کرتے ہیں۔ جیسے:

گر زبانِ فوق سے ہو کچھ بیانِ کاشمیر　　ہے یقیں بے چین کر دے داستانِ کاشمیر

اے خدائے لم یزل سن لے فغانِ کاشمیر　　تیرے ہی بندے ہیں آخر بندگانِ کاشمیر

خونِ کثرت دیکھنا ہو تیغِ قلت سے اگر　　دیکھیے آکر کبھی محشرستانِ کاشمیر

دورِ حاضر نے کیے بے دار سب سوئے ہوئے　　کب اٹھیں گے یا الٰہی خفتگانِ کاشمیر[43]

اور کبھی وہ اندرونی سازشوں کا پردہ چاک کرتے ہوئے مقامی قیادت کی چالوں اور ناکام پالیسیوں پر برہم دکھائی دیتے ہیں۔ جیسے:

چل گئے وہ چال ''ماموں بھانجا'' کشمیر میں　　قافیہ ہے تنگ عمو جان کا کشمیر میں

کافروں سے ہے بدتر وہ مسلماں کے لیے　　میر زادہ ہو کہ کوئی میرزا کشمیر میں

خونِ مسلم تیغ مسلم سے جہاں ہو رات دن　　کی یزیدوں نے وہ پیدا کربلا کشمیر میں[44]

فوق کی شاعری کا مطالعہ واضح کرتا ہے کہ کشمیر ہمیشہ ان کی شاعری کا فکری مرکز رہا۔ وہ پہلے کشمیری شاعر تھے جنھوں نے بیداری کشمیر کے لیے موثر طور پر اور تحریک کی صورت میں اپنی شاعری سے کام لیا۔ اجمل نیازی نے درست لکھا کہ خطہِ کشمیر کو ان کے فنی سفر کا مرکز و محور بنا کر دیکھا جائے تو اردو شاعری کی تاریخ میں ان کو جو اوّلیت اور اہمیت حاصل ہے وہ کسی اور کو نہیں[45]۔ اسی افضلیت کی بنا پر فوق کو شاعر کشمیر بھی کہا جاتا ہے۔ عبد اللہ قریشی نے اپنے طویل مقالے ''شاعرِ کشمیر'' میں ان کی عظمت کا اعتراف کیا[46]۔ علامہ سیماب اکبر آبادی نے بھی ''شاعر کشمیر'' کے عنوان سے ایک نظم لکھی جس میں کہا کہ:

فوق صاحب کی ہے سب پر فوقیت درس و حکمت سے ہے ان کو انسیت
ان کی نظمیں نسخۂ اکسیر ہیں وہ حقیقی شاعرِ کشمیر ہیں[۴۷]

بلاشبہ فوق نے اہل کشمیر کی بے داری میں بھرپور حصہ لیا اور ان کی شاعری اردو کی تحریکی ادب کا اہم ترین باب تصور کی جائے گی۔

کشمیر کے حوالے سے کی گئی شاعری میں ایک اور اہم نام حفیظ جالندھری کا ہے۔ کشمیر کے موضوع پر ان کا دستیاب کلام، معیار اور مقدار دونوں لحاظ سے وقیع اور قابل لحاظ ہے۔ یوں تو ان کی نظموں میں ''کشمیر کے جانباز''، ''فردوس بر روئے زمیں''، ''آزاد کشمیر کا قومی ترانہ''، ''ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا'' اور ''شیروں کو آزادی'' وغیرہ جیسی نظمیں بڑی اہمیت کی حامل ہیں اور بعض نظمیں تو کشمیر کی جارحانہ حکومت کے سائے میں کشمیری عوام کے بے بس حالات کی ترجمان ہیں، لیکن ان کی مسدس ''تصویرِ کشمیر'' کو اس موضوع پر حفیظ کی شاہ کار نظموں میں شمار کیا جائے تو غلط نہ ہو گا۔ اس کے علاوہ کشمیر کے موضوع پر متعدد اہم نظمیں ان کے مجموعہِ کلام ''بزم نہیں رزم'' میں بھی شامل ہیں۔ ''چراغِ سحر'' کے نام سے شائع ہونے والے شعری مجموعے میں بھی ایک باب ''آزاد کشمیر'' پر محیط ہے۔ اس کے مطالعے سے بھی کشمیر کی حریت کی داستان کے بہت سے پہلو سامنے آجاتے ہیں[۴۸]۔

''تصویر کشمیر'' غالباً ''شاہ نامہِ اسلام'' کے بعد حفیظ کا سب سے بڑا تخلیقی کارنامہ ہے جسے اگر ''شاہ نامہِ کشمیر'' کہا جائے تو بے جا نہ ہو گا۔ سر راس مسعود اس کتاب کے دیباچے میں لکھتے ہیں کہ:

> مجھے امید ہے کہ حفیظ کا کھینچا ہوا یہ مرقع ہندوستان کے ہر سچے فرزند کے خانہ دل کو تصویر خانہ بنا دے گا، کیوں کہ نہ تو اس میں کوئی سیاسی تبلیغ ہے، نہ وعظ نہ پند و نصائح[۴۹]۔

جزوی طور پر یہ بات درست بھی لگتی ہے لیکن جب ہم اس نظم کا بہ غور جائزہ لیتے ہیں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ سیاسی موضوعات سے یہ نظم خالی نہیں۔ نظم کو پڑھ کر ریاست جموں و کشمیر کے سیاسی منظر نامے کا نقشہ سامنے آجاتا ہے۔ یہ نظم دراصل کشمیر کے حوالے سے ایک البم ہے۔ نظم میں کشمیر کے حوالے سے انچاس تصاویر ہیں۔ ابتدا میں کشمیر کے حسین مناظر اور وہاں کی شادابی کا ذکر ہے، لیکن نصف البم کے بعد خیالات میں تبدیلی رونما ہوتی ہے۔ صاف دکھائی دیتا ہے کہ اس خوش نما کشمیر کے بدنصیب اور صدیوں سے غلامی کی زنجیر میں جکڑے مفلوک الحال، استعمار و استیصال کا شکار کشمیریوں کی خوں چکاں تصویریں دل کو لہولہان کر دیتی ہیں۔ نظم کے اس حصے کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ زمین پر جنت کے مکیں غلامی، محرومی، افلاس اور استبداد کے جہنم سے بھی بدتر زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔ ان کی زندگی کے سانحات سے کسی کو دل چسپی نہیں۔ لوگ یہاں کے حسن اور شادابی میں کھو کر کشمیریوں کے زخم کو شمار نہیں کر پاتے۔ جیسے:

یہ چمن اغیار کی شعلہ خرامی کے لیے　　بے ثمر شیریں یہاں ہیں تلخ کامی کے لیے
ہر نفس اک سلسلہ ہے قید بے زنجیر کا　　ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا[۵۰]

کشمیر کے مقامی لوگ اور سیاحت کی غرض سے آئے ہوئے بیرونی لوگوں کو موازنہ کرتے ہوئے شاعر کا کہنا تھا کہ:

اک طرف مہمان خوش اوقات، خوش دل، خوش لباس　　ایک جانب میزباں فاقہ زدہ، تصویر یاس
اک طرف مے کا نشہ، پھل کا مزہ، پھولوں کی باس　　اک طرف بے کیف مزدوری کا حامل بھوک پیاس
اک تماشائی ہے اک فرزند ہے کشمیر کا　　ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا[۵۱]

لوگ کشمیر کو زعفران زاروں، وادیوں، کوہ ساروں، چناروں، باغوں اور جھیلوں کی سرزمین کہتے اور سمجھتے ہیں۔ وہ افلاس زدہ کشمیریوں کی طرف دیکھ کر اپنا لطف خراب نہیں کرنا چاہتے۔ حفیظ ان مناظر کو بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

خیر! ہم کو کیا غرض اس قوم کے حالات سے　　بدگماں ہوتی ہے دنیا اک ذرا سی بات سے
یہ غریب و مفلس و مجبور ہیں ہم کیا کریں؟　　کم سخن، کمزور دل مزدور ہیں ہم کیا کریں
ان کے گھر افلاس سے معمور ہیں ہم کیا کریں　　یہ نتیجہ ہے کسی نہ گفتنی تقصیر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا[۵۲]

حفیظ نے اس عہد کے ڈوگرا استبداد کے ستائے ہوئے کشمیریوں کی تصویر کشی میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔ نہ انھوں نے مصلحت دکھائی اور نہ ہی اس کیفیت کے بیان میں کسی رعایت سے کام لیا۔ اس کے باوجود کہ مہاجارا ہری سنگھ کا دور اقتدار جو اپنی سفاکی اور سخت گیری کی وجہ سے بے حد مشہور تھا، اور حفیظ کا بارہا اس دور میں وہاں آنا جانا لگا رہتا تھا، حفیظ اپنی شاعری میں اس کے ظلم و بربریت کو ضرور آشکار کرتے۔ اس کے علاوہ مغرب کے جانب دارانہ رویوں پر بھی ان کا دل خون کے آنسو روتا ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

حاکم و محکوم کا کوئی نہیں ہے امتیاز　　سب نگاہِ ناز مغرب پر مجبورِ نیاز
یہ برہمن کے بھجن، یہ شیخ صاحب کی نماز　　کر رہے ہیں قیدِ نا محسوس کی رسی دراز
ہے نگاہوں سے نہاں صیاد اس نخچیر کا　　ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا[۵۳]

یہ نظم کشمیر کے حوالے سے لکھی گئی نظموں میں ایک زندہ جاوید نقش ہے۔ ان کی ایک اور نظم ''فردوس برروئے زمیں'' میں بھی حفیظ کے تیور بڑے تیکھے اور ان کے لہجے میں بلا کی کاٹ دکھائی دیتی ہے۔ کشمیر کے حوالے سے اپنے تلخ تجربات کو حفیظ نے نظم کرتے ہوئے ڈوگرا راج کے خلاگ اٹھ کھڑا ہونے والے کشمیریوں کی آواز سے آواز ملائی اور اس بغاوت کو دل و جاں کی اتھاہ گہرائیوں سے خوش آمدید کہا۔ جیسے:

وہ دیکھو وادیِ کشمیر کے جاں باز جاتے ہیں
ستارے اپنی آنکھیں جن کی راہوں میں بچھاتے ہیں

یہی وہ ہیں کہ جو ایماں کی خاطر جان دے دے کر
عدو کے آہنی پنجوں سے ہم سب کو بچاتے ہیں

خداوندا! ترے محبوبؐ کی امت پہ حملہ ہے
تری نصرت سے یہ غازی مجاہد فتح پاتے ہیں[۵۴]

انھوں نے جہاد کشمیر کو تماشائی بن کے نہیں دیکھا۔ آزادی کشمیر کے ترانے لکھتے ہوئے اس کے فٹ نوٹ میں لکھتے ہیں کہ یہ ترانہ قائد اعظم کے حکم پر ۲۲ نومبر ۱۹۴۷ء کو محاذ کشمیر پر محاربہ کشمیر کے ترانے کا آغاز ہوا۔ بعد ازاں اس میں بارہا ترمیم بھی ہوتی رہی، کچھ حفیظ کی زندگی میں اور کچھ بعد میں۔ آج بھی اہل کشمیر اس ترانے سے اچھی طرح واقف ہیں۔ چند شعر ملاحظہ کیجیے:

آزادی کی دھاک بٹھا دی
تم بھی اٹھو اہلِ وادی

نام خدا کا لے کے سہارا
وطن ہمارا آزاد کشمیر

غاصب اور غدار ہیں لرزاں
آزادی کے تیغ ہیں عریاں

غازی ہیں میدانِ جنگ میں
آزادی ہے جن کا ایماں[۵۵]

۱۹۲۲ء میں جب وہ ۲۲ برس کے نوجوان تھے، اس وقت سے انھوں نے کشمیر کے موضوع پر لکھنا شروع کیا اور تادم مرگ اس موضوع پر لکھتے رہے۔ کشمیر کے موضوع پر ان کی تخلیقات کا انتخاب ۱۹۴۷ء میں "بزم نہیں رزم" کے عنوان سے شائع ہوا۔ ۱۴۴ صفحات کی اس کتاب کو دو ابواب میں تقسیم کیا گیا۔ باب اوّل قبل از پاکستان یعنی جون ۱۹۲۲ء تا ۱۹۴۷ء اور باب دوم ۱۹۴۷ء تا ۱۹۷۴ء کی تخلیقات پر مشتمل ہے۔ پہلی نظم "جموں کے مسلمان" کے عنوان سے ہے جو انھوں نے کشمیر کے پہلے سفر ۱۹۲۲ء کے موقع پر لکھی۔ یہ نظم سرزمین کشمیر پر اوّلین لب کشائی سے تعبیر کی جاسکتی ہے[۵۶]۔ اس نظم میں وہ کہتے ہیں کہ:

جموں ترے در پہ مجھے اللہ نے اتارا
ہمت تھی میری پست ستاروں نے ابھارا

میں توڑ کے انگریز کی زنجیرِ غلامی
نکلا تھا کہ ہو دور میرے عزم کی خامی

ممکن ہے یہ کشمیر نئے رنگ و ضیا دے
اقبال کا پرتو مجھے کچھ اور بنا دے[۵۷]

"چشم شاعر کا پہلا آنسو" جو حفیظ نے ویری ناگ کی سیر کے دوران لکھی۔ اس نظم میں وہ اکثر مقامات پر اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ پائے اور چشمے کے بہتے پانی کی طرح انھوں نے بھی خون کے آنسو بہائے۔ اشعار ملاحظہ کیجیے:

رلتے ہوئے نشاں جو یہاں پر مکاں کے ہیں
بگڑے ہوئے حروف کسی داستاں کے ہیں

جہلم تو بے قرار ہے شرما رہا ہوں میں
آنسو ہوں، تیرے ساتھ بہا جا رہا ہوں میں

کشمیر کو اسیر بلا پا رہا ہوں میں اس کو رہا کروں گا قسم کھا رہا ہوں میں
شیطان کو نکالنا ہے اس بہشت سے انسانیت پلے گی پھر اپنی ہی کشت سے[58]

ریاست میں ہونے والے ظلم سے گھبرا کر جب شاعر دور دراز پہاڑوں میں نکل جاتا ہے تا کہ کچھ دیر کے لیے اس کرب سے نجات مل سکے تو یہ خاموشی شاعر کو کس طرح جھنجھوڑتی ہے، اس جانب اشارہ کرتے ہوئے اپنی نظم ''صبح وشامِ کوہ سار'' میں کہتے ہیں کہ:

کس قدر ہنگامہ پرور ہے سکوتِ کوہ سار کار پردازانِ قدرت ہیں یہاں مصروف کار
دیدہ و دل کو بھی غفلت کے شبستاں سے نکال یہ جو خاموشی کی زنجیریں ہیں ان کو توڑ ڈال[59]

''تصویر کشمیر'' حفیظ کی زندہ رہنے والی نظموں میں سے ایک ہے جو ستمبر ۱۹۳۵ء کی تخلیق ہے۔ واقعہ کچھ یوں تھا کہ ایک ڈوگرا وزیر نے توہین قرآن کے واقعات کے رد عمل میں ہونے والے اجتماعی مظاہرے کے دوران نہتے مسلمانوں پر گولی چلانے کا حکم دیا تھا۔ اسی پس منظر میں حفیظ نے ہزاروں افراد کی موجودگی میں ہونے والے مشاعرے میں یہ نظم سنائی۔ دوسرے دن گرفتار ہوئے اور پھر ریاست بدر کیا گیا[60]۔ نظم میں کشمیر کے حسن اور رنگینی کی جیتی جاگتی تصویر کے ساتھ ساتھ غلامی، عوام کی مظلومیت، غاصبوں کی بربریت اور اس طرح کے دیگر بے شمار مناظر کو پیش کیا گیا ہے۔

بہر جان و جسم ہر نعمت کی ارزانی یہاں بے کس و محتاج لیکن نوعِ انسانی یہاں
نقشِ فریادی ہے یہ تقدیر کی تحریر کا ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا
جس کی محنت سے چمن میں روئے گل پر خندہ ہے اس کا گھر تاریک، اس کا اپنا منظر گندہ ہے
سانس لینے میں بھی اس کو خوف ہے تعزیر کا ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا
یہ چمن اغیار کی شعلہ خرامی کے لیے یہ ثمر شیریں ہیں اپنی تلخ کامی کے لیے
زندگانی ہے یہاں مرگِ دوامی کے لیے مائیں جنتی ہیں یہاں بچے غلامی کے لیے
ہر نفس اک سلسلہ ہے قیدِ بے زنجیر کا ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا[61]

کشمیریوں کی غربت، افلاس اور سسکتی ہوئی انسانیت پر حفیظ بہت مضطرب دکھائی دیتے ہیں۔ ان مناظر کے بیان میں وہ کہتے ہیں کہ:

ہائے یہ مغموم مائیں زیست کے غم سے نڈھال ہائے یہ مدقوق بچے، ہائے روٹی کا سوال
ہائے کترا کر نکلنا ان سے ہر رہ گیر کا ایک پہلو یہ بھی کشمیر کی تصویر کا[62]

نظم ''خون کے چراغ'' میں وہ شہدائے آزادی کی قبور پر سرخ لالہ کے پھولوں کی پکار کے مناظر کے بیان میں کہتے ہیں کہ:

کوئی یہ نغمے شہیدوں کے سوا سنتا نہیں — جنگ آزادی میں ایسے محو ہیں اہلِ زمیں
اک طرف بھوکی رعایا اک طرف جاگیر دار — اک طرف دہقان اک جانب سپاہِ شہریار
بے کسوں کی آہیں، مظلوموں کی چیخیں دردناک — شورِ محشر ہے کہ ہم بھی سن رہے ہیں زیرِ خاک
حملہ آور ہیں نہتوں پر مسلح جنگ جو — آب جہلم کی رگیں ہیں اور کشمیری لہو
یہ لہو جتنا بہے گا رنگ لاتا جائے گا — راہِ آزادی میں تازہ گل کھلاتا جائے گا[۶۳]

اس نظم میں وہ بڑے واضح انداز سے حریت کے سرفروشوں کو ڈٹ جانے اور دشمنوں کے خلاف مردانہ وار مقابلہ کرنے کا درس دیتے دکھائی دیتے ہیں۔ وہ ان شہدا کے لہو اور ان کی قربانیوں کی مثال دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

لالہ و یہ تربتیں یہ سینہ ہائے داغ داغ — ہم نے اپنے خون سے روشن کیے ہیں یہ چراغ
سرفروشو! ان چراغوں سے ضیا لیتے ہوئے — آگے اور آگے بڑھو نامِ خدا لیتے ہوئے[۶۴]

ان کی نظم "سودا پچھتر لاکھ کا" کو بھی کشمیر کے حوالے سے کافی شہرت ملی اور یہ نظم پورے ہندوستان کے متعدد اخبارات میں کئی بار شائع ہوئی۔ اس نظم کا پس منظر شیخ عبداللہ کی کشمیر چھوڑ دو تحریک تھی۔ اس مہم میں حفیظ بھی تخلیقی سطح پر شیخ عبداللہ کے ہم رکاب دکھائی دیتے ہیں۔ وہ شیخ عبداللہ کی مہم کو شیر کی دھاڑ سے تشبیہ دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

شیر وادی میں ہے دھاڑا گونج اٹھے کوہ سار — ہوگئے بیدار مزدور اور جاگے کاشت کار
چار سو آزادیِ جمہور کی سُن کر پکار — ہوگئی برہم نشے میں نخوتِ سرمایہ دار
عیش کے کانوں میں پیغامِ اجل آنے لگا — کاروبار شہر یاری میں خلل آنے لگا[۶۵]

اس نظم میں علامتوں اور استعاروں کا سہارا لے کر انگریزوں کی سازشی چالوں سے پردہ تو چاک کیا ہی گیا ہے ساتھ ساتھ ان کالے چوروں کی بھی مذمت کی جنھوں نے محض پچھتر لاکھ روپے کے عوض اس جنت ارضی کا سودا کیا۔ ان مناظر کے بیان میں حفیظ نے جو زور قلم کے جوہر دکھائے ہیں اس کی نظیر بہت کم ملتی ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

آکے بیٹھے چور منڈی کے پرانے سٹے باز — جانے پہچانے ہوئے ٹھگ، آزمودہ جعل ساز
اور ان کے درمیاں وہ توند صوفے پر دراز — توند ابنِ توند کہلانے پہ جس کو فخر و ناز
مسئلہ کشمیریوں کا بحث میں لایا گیا — توند کی جانب سے یہ ارشاد فرمایا گیا
کیا مچا رکھا ہے ان لوگوں نے اتنا شور و شر — ذبح ہونے سے بدکنے لگ گئے کیوں جانور
لاؤ ان کی چند مادائیں بلاؤ چند نر — پھوڑ ڈالو ان کی آنکھیں توڑ ڈالو ان کے سر
چھوڑ دو کشمیر، کہنے کا مزہ ان کو چکھاؤ — جاؤ قیدِ زندگی سے ان کو آزادی دلاؤ

ہے "بہی کھاتا" پچھتر لاکھ کے بیوپار کا کمپنی سے ہوچکا پیٹنٹ جس کا مارکہ

بھاؤ یہ کنگلے گرادیں آج اس بازار کا کیوں کلیجہ پھٹ نہ جائے سیٹھ ساہوکار کا

یوں اگر آجادی آجادی پکاری جائے گی لالہ جی منڈی میں اپنی ساکھ ماری جائے گی[۶۶]

نظم کیا ہے کشمیر پر ہونے والے مظالم کا بیانیہ ہے۔ ہر منظر جس کی وضاحت حفیظ مختلف بند میں کرتے چلے جاتے ہیں، اتنے واضح اور نمایاں ہیں کہ تاریخی طور پر رونما ہونے والے اس سانحے کی پوری تصویر نگاہوں میں پھرنے لگتی ہے۔ نہ صرف وادی بلکہ اس میں رہنے والے ہر جنس کا جس طرح سودا کیا گیا، اس کے بیان میں حفیظ کا کہنا ہے کہ:

یہ مویشی ہوں کہ آدم زاد سب ہیں زر خرید ان کے بچے بچیاں اولاد سب ہیں زر خرید

کس طرح ہو جائیں گے آزاد سب ہیں زر خرید تا قیامت خانماں برباد سب ہیں زر خرید

بر جبینِ کہتر و مہتر ہماری مہر ہے ماؤں کے پیٹوں میں بچوں پر ہماری مہر ہے

یوں مٹی جموں تری قسمت پچھتر لاکھ میں یوں بکی کشمیر یہ جنت پچھتر لاکھ میں

مرد کی غیرت بھری محنت پچھتر لاکھ میں عورتوں کا جوہرِ عصمت پچھتر لاکھ میں

ملک و ملت قوم، مال و جاں پچھتر لاکھ میں ہاں پچھتر لاکھ میں، جی ہاں پچھتر لاکھ میں[۶۷]

بلاشبہ یہ نظم سانحات کشمیر کے بیان میں ایک عمدہ اضافہ ہے۔ اس نظم کو صرف کشمیر کی تاریخ ہی میں نہیں بلکہ انسانیت کی تاریخ میں تذلیل انسانیت کے بیانیے کے طور پر ہمیشہ یادر کھاجائے گا۔ خصوصاً انگریزوں کے کردار پر جو سوالات حفیظ نے اس حوالے سے اٹھائے ہیں وہ آج بھی اسی طرح قائم و دائم ہیں۔ عالمی دنیا کو ایک نہ ایک روز ان سوالوں کے جواب ضرور دینے ہوں گے۔

اس مجموعے کے دوسرے حصے کا آغاز "ترانۂ آزاد کشمیر" سے ہوتا ہے۔ یہ ترانہ پہلی بار ریڈیو آزاد کشمیر سے نشر کیا گیا[۶۸]۔ اس ترانے کا ذکر مذکورہ بالا صفحات میں آچکا ہے۔ اس زمانے میں ریڈیو آزاد کشمیر تحریکِ حریت کا نغمہ ساز اور مجاہدین کشمیر کا کارساز رہا۔ اس نے اہلِ کشمیر کی جدوجہد کی تشہیر میں اہم کردار ادا کیا۔ اس بابت حفیظ کا کہنا ہے کہ:

آنسوؤں سے اس بہارِ رنگ و بو کے درمیاں سب سے پہلے ریڈیو پر میں نے کھولی تھی زباں

جن کے چہرے تھے شگفتہ جن کے سینے داغ داغ راہِ حق میں بن گئے ہیں زندگانی کے چراغ[۶۹]

حفیظ خود بھی ۱۹۴۸ء تک جہادِ کشمیر کا حصہ رہے۔ قائد اعظم کے حکم پر مشرقی پاکستان تشریف لے گئے تا کہ وہاں کے لوگوں کو بھی کشمیر اور جہادِ کشمیر کے پس منظر سے آگاہ کر سکیں۔ اس حوالے سے لکھی گئی نظم "جہاد کے اوّلین عوامل" میں وہ کہتے ہیں کہ کشمیر کے چپے چپے سے کس طرح لوگوں نے ہندو بنیوں کے خلاف عملی جہاد میں حصہ لیا۔ ان کا کہنا تھا کہ:

ریاسی، میر پور، بھمبھر کے اور برنالہ کے باسی   کفن پہنے ردا غیرت کی پہناتے ہوئے نکلے
بھگایا ہر محاذِ جنگ سے افواجِ باطل کو   پہاڑوں کو صدائے حق سے دہلاتے ہوئے نکلے [۲۰]

کشمیری خواتین کے ساتھ بھارتی افواج کی جانب سے کی جانے والی زیادتی، خصوصاً راتوں کو بھیس بدل کر معصوم لوگوں کے گھروں میں کودنا، عورتوں اور بچوں کو یرغمال بنا کر ظلم و بربریت کا بازار گرم کرنا۔ عصمتیں لٹنا، اغوا ہونا اور اس طرح کے دیگر مناظر حفیظ کی کئی نظموں میں ملتے ہیں۔ "مریاں، میری بہن" وہ اسی قسم کی سفاکانہ کارروائیوں کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

دروازہ کھلا دھم سے، اری آ گئے ڈاکو   وہ سرخ سی چھریاں، وہ ہر اک شکلِ ہلاکو
اتنا تو مجھے یاد ہے چھایا وہ اندھیرا   چیخیں سنیں پھر کوئی نہ میرا تھا نہ تیرا
ابّا نہ چچا، کوئی چچی ہے نہ اب ماں ہے   اور میری وہ "مریاں" نہیں معلوم کہاں ہے
جیتی ہے کہ وہ قتل ہوئی یا ہوئی اغوا   اللہ ملائے تو پتہ اس کا ملے گا [۲۱]

یہ قربانی کسی ایک "مریاں" کی نہیں بلکہ کشمیر پر قربان ہونے والی ہزاروں ماؤں، بہنوں اور بیٹیوں کی داستان ہے۔ نہ صرف خواتین بلکہ ہزاروں نوجوان اور معصوم کشمیری عوام کے لہو کی قسم کھاتے ہوئے حفیظ یہ نعرہ بلند کرنے پر مجبور دکھائی دیتے ہیں کہ:

آزادیِ کشمیر سے ہرگز نہ منھ موڑیں گے ہم   پھر قبضۂ شمشیر سے دشمن کا سر توڑیں گے ہم
ان بے گناہوں کی قسم جن کے گلے کاٹے گئے   ان بے پناہوں کی قسم جن کے لہو چاٹے گئے
جو آگ میں جھونکے گئے ان شیر خواروں کی قسم   جو خاک پر روندے گئے ان ماہ پاروں کی قسم
مظلوم ماؤں کی قسم، بیوہ عروسوں کی قسم   مجروح مستورات کے ننگے جلوسوں کی قسم
اس کی قسم جو بیٹیاں ہیں پنجۂ اغیار میں   بکتی ہیں جن کی ہستیاں ہر کوچہ و بازار میں
کشمیر کی خاطر اگر سر چاہیے سر دیں گے ہم   جو فیصلہ ہوتا نہیں وہ فیصلہ کر دیں گے ہم [۲۲]

نظم کا ہر بند اور ہر منظر بھارت کا مکروہ چہرہ دکھانے کی کوشش کے ساتھ ساتھ مظلوم کشمیریوں کا عزم و حوصلہ بڑھانے کا سبب بھی ہے۔ بوکھلاہٹ میں بھارت جس قسم کی اوچھی اور عجیب و غریب حرکتیں کر رہا تھا ان میں سے ایک واقعہ درگاہ حضرت بل سے موئے مبارک کا چرائے جانے کا ہے۔ اس واقعے پر دنیا بھر سے بھارت پر لعن طعن کی گئی۔ حالات اس قدر

دگرگوں ہوئے کہ بھارت کو گھٹنے ٹیکتے ہوئے پاکستان کی جانب صلح کا ہاتھ بھی بڑھانا پڑا اور شیخ عبد اللہ کو تیرہ برس بعد رہائی بھی دینی پڑی۔ اس پس منظر میں لکھی گئی نظم ''معجزۂ موئے مبارک'' میں حفیظ ان حالات کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

شیر کشمیر اے مجاہد مرد، فردِ بے نظیر　　تو ہے پھر آزاد گیارہ سال تک رہ کے اسیر
ہم مسلماں ہند میں تھے یرغمالِ بے شمار　　کالی دیوی کو پھر اب درکار تھے کچھ سرخ ہار
ہار بننے لگ گئے ہندی مسلمانوں کے سر　　بھینٹ اب تک چڑھ رہی ہے امتِ خیر البشر[34]

غرض کہ کشمیر سے حفیظ کا ذہنی اور روحانی تعلق ہمیشہ گہرا اور مضبوط رہا۔ کشمیر اور تحریک آزادیِ کشمیر کے حوالے سے لکھی گئی تخلیق کے جائزے میں حفیظ کو ایک خاص مقام حاصل رہے گا۔ ان کے کلام کو اردو کے مزاحمتی ادب کے حوالے سے ایک بہترین اثاثہ تصور کیا جانا چاہیے۔ حفیظ نے اس دور کے بعض دغا باز مسلمانوں کے چہرے سے بھی پردہ اٹھانے کی کوشش بھی کی ہے۔ مثلاً ''خواجہ غلام کاذب'' کے نام سے لکھی گئی نظم میں انھوں نے اس سرخے کی دغا بازیوں کا پردہ چاک کیا۔ کمیونسٹ پارٹی سے تعلق رکھنے والے وہ مسلمان جو بھارت کے گماشتے بنے ہوئے تھے ان میں سے ایک مشہور کردار غلام صادق کا تھا، جس نے اپنی چالوں سے شیخ عبد اللہ کو بھی قید کروایا تھا۔ اس کے کرتوت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حفیظ کہتے ہیں کہ:

بھارتی غارت گروں سے داد پانے کے لیے　　پی رہا ہے تو بھی کشمیری مسلمانوں کا خوں
ہیں تیرے دانتوں کے نیچے ہڈیاں کشمیر کی　　بھیڑیے باچھیں ہیں تیری اور انسانوں کا خوں[4]

ایسا ہرگز نہیں کہ ہر ترقی پسند کمیونسٹ نے کشمیریوں کے زخموں پر نمک ہی چھڑکا ہو بلکہ کچھ شاعر ایسے ضرور ہیں جنھوں نے کشمیر کے رستے ہوئے زخم پر پھاہا رکھنے کی کوشش اور عالمی ضمیر کو جھنجھوڑنے میں بھی مثبت کردار ادا کیا۔ ترقی پسند شعرانے بھی کشمیریوں کی اخلاقی حمایت جاری رکھی۔ یہ شعرا سامراجی قوتوں سے نفرت اور مظلوم و محکوم طبقوں سے ہم دردی کا مسلک اپنائے ہوئے تھے[5]۔ کشمیریوں کی جدوجہد آزادی کو بھی ان لوگوں نے ایک خاص پس منظر میں دیکھ کر اپنی مخصوص بلند آہنگ اور احتجاجی لب و لہجے میں شاعرانہ اظہار کا موضوع بنایا۔ ساحر لدھیانوی ان کشمیری مزدوروں اور دہقانوں کو سرخ سلام پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

کشمیری، دہقانوں تم کو لال سلام ہمارا　　با غیرت انسانوں، تم کو لال سلام ہمارا
تم نے سینہ تان کے اندھی طاقت کو للکارا　　لال سلام ہمارا تم کو لال سلام ہمارا[6]

اسی طرح احمد ندیم قاسمی نے بھی کشمیر کے مصائب و مسائل کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔ کشمیر کے رستے ہوئے زخم کا نقشہ کھینچتے ہوئے انھوں نے کہا کہ:

ہر گل کی جبیں پر شکن ہے کشمیر لُٹا ہوا چمن ہے
پھولوں نے چھپا رکھا ہے ورنہ زخموں سے اٹا ہوا بدن ہے
ہر فرد ہے درد و غم کی تاریخ ہر چہرہ حکایتِ مُحَن ہے
پھیلا ہوا ہاتھ برہمن کا اس چاند کا مستقل گہن ہے
جلتے ہوئے گھر چھنے ہوئے کھیت ہر شخص وطن میں بے وطن ہے[۷۷]

اس تکلیف دہ مناظر کے بیان میں قاسمی صاحب کسی لیت و لعل سے کام نہیں لیتے۔ ہندوستانی مظالم کا پردہ چاک کرنے کے ساتھ ساتھ طنزیہ انداز سے عالمی اداروں کی بے حسی اور جانب دارانہ رویوں کی طرف توجہ دلائی ہے۔ وہ ان رویوں کے بیان میں کہتے ہیں کہ:

سنتے ہیں کہ سمندروں کے اس پار اقوام کی ایک انجمن ہے
آج اس کے اصول کے مطابق ظالم ہے وہی جو خستہ تن ہے
آج اس کی بلند مسندوں پر ہر چور کے ہاتھ میں[۷۸]

عالمی اداروں کی ناکامی، ہندوستانی افواج کے مظالم اور مقامی قیادت کے منفی رویوں کے باوجود قاسمی صاحب کشمیری حریت پسندوں کی بہادری اور جدوجہد سے مایوس دکھائی نہیں دیتے۔ ان کا کہنا ہے کہ:

تسلیم کے ظالموں کے نزدیک کشمیر دریدہ پیرہن ہے
کشمیر کی مفلسی میں لیکن اب کیسا بلا کا بانکپن ہے
زخموں سے اٹے ہوئے بدن پر یزداں کا جمالِ ضو فگن ہے
ہیں برق فشاں سلے ہوئے ہونٹ کاٹا ہوا ہاتھ تیغ زن ہے
ہر سمت پہاڑ کٹ رہے ہیں ہر فرد شبیہ کوہ کن ہے[۷۹]

اختر پیامی نے بھی سرخ رنگ کی علامت کو اپنے نظریاتی پیغام کے ساتھ جوڑ کر کشمیر کے انتشار اور کشمیریوں کی بے چینی واضطراب کو موضوع بنایا۔ ان کے مطابق:

سرخ پھولوں سے لہو پھوٹ رہا ہے شاید آج جنت میں جہنم کے نظارے دیکھو
آج محکوم نگاہوں کو جلال آیا ہے راکھ کی گود میں پلتے ہیں شرارے دیکھو[۸۰]

احمد فراز نے بھی اس حسین وادی کی الم ناک صورت حال کی منظر کشی میں حقیقت نگاری کا رنگ اپنایا۔ کشمیریوں کی غربت وافلاس کے ذمے داروں اور اس جنت نظیر وادی کو جہنم میں تبدیل کرنے والوں کی بابت ان کا کہنا تھا کہ:

تیرے سینے پہ محلات کے ناسوروں نے　　تیری شریانوں میں اک زہر سا بھر رکھا ہے
تیرا ماحول تو جنت سے حسیں تر ہے مگر　　تجھ کو دوزخ سے سوا وقت نے کر رکھا ہے

تجھ کو غیروں نے سدا دست نگر رکھا ہے

مہ و انجم سے تراشے ہوئے تیرے باسی　　ظلم و ادبار کے شعلوں سے جہاں سوختہ ہیں
قحط و افلاس کے گرداب میں غرقاب عوام　　جن سے تقدیر کے ساحل بھی برا فروختہ ہیں

سال ہا سال سے لب بستہ زباں دوختہ ہیں[۸۱]

ان کی نظم "نیا کشمیر" کے آخری دو بند صدیوں سے جاری ظلم کی اس داستان کا خلاصہ معلوم ہوتے ہیں۔ وہ ان بدترین حالات کی عکاسی بھی کرتے ہیں اور پھر تبدیل شدہ حالات میں امید اور عزم نو کا پیغام بھی دیتے ہیں۔ ملاحظہ کیجیے:

ان کی قسمت میں رہی محنت و دریوزہ گری　　اور شاہی نے تری خُلد کو تاراج کیا
تیرے بیٹوں کا لہو زینتِ ہر قصر بنا　　مجھ پہ نمرود کی نسلوں نے صدا راج کیا
ان کا مسلک تھا کہ پامال کیا راج کیا　　لیکن اب اے مری شاداب چناروں کی زمیں
انقلابات نیا دور میں لانے والے　　حشر اٹھنے کو ہے اب ظلم کے ایوانوں میں
جن کو کہتا تھا جہاں "بوجھ اٹھانے والے"　　پھر تجھے ہیں گل و گل زار بنانے والے[۸۲]

ترقی پسند نمائندہ شعرا نے جس طرح کشمیر کے مصائب کو اجاگر کیا وہ خود کشمیری حریت پسندوں کے لیے حوصلہ افزا تھے۔ دوسری جانب ان شعرا کی حمایت تو پہلے ہی حاصل تھی جو کسی نظریاتی جتھابندی کے خلاف تھے۔ غرض کشمیر کی بابت ہر طرح کے نظریات اور خیالات رکھنے والے شعرا نے ہر ممکن حد تک حمایت جاری رکھی۔ خلیفہ عبدالحکیم کا شمار بھی ایسے ہی شعرا میں ہوتا ہے جن کے ہاں کشمیر کو بالخصوص موضوع بنایا گیا ہے۔ وہ کشمیر کے پروانوں کی آزادی کے عزم و حوصلے کو بڑھانے کے لیے شاعری سے مدد لیتے ہیں۔ "کلامِ حکیم" میں جابجا ایسے مناظر موجود ہیں جو کشمیر کی ابتر حالت سے متعلق ہیں۔ وہ اپنے زور قلم سے نوحہ آزادی کے بیان میں یوں رقم طراز ہیں:

پھونکی گئی سینے میں تری روحِ الٰہی　　اے حق کے سپاہی
فطرت نے عطا کی تجھے کونین کی شاہی　　از ماہ بہ ماہی
اس پر بھی پسند آئی تجھے کیسے غلامی　　اے فردِ گرامی
یہ رسمِ ستم دہر میں کب تک رہے جاری　　اے خالقِ باری[۸۳]

شاعر جب کشمیر میں جاری مظالم، صدیوں پر محیط غلامی اور استیصال کو دیکھتا ہے تو اس کے درد مند دل پر ایک کاری ضرب لگتی ہے۔ وہ اہل کشمیر کو خواب غفلت سے جگانا اپنا فرض سمجھتا ہے تا کہ غلامی کی شب سیاہ آزادی کی صبح درخشاں میں تبدیل ہو جائے۔ آزادی، انقلاب اور ابتر حالات سے نکلنے کے لیے وہ جس راہ کو لازمی گردانتا ہے وہ مسلسل جدوجہد سے عبارت ہے۔ اسی لیے وہ ظالموں سے آزادی چھین لینے کا حامی اور مشترکہ جدوجہد کو لازمی قرار دیتے ہوئے کہتا ہے کہ:

جس قوم کے ہاتھوں میں نہیں رہتی ہے شمشیر — اے خطۂ کشمیر
کھوتی ہے وہ کونین میں سب عزت و توقیر — اے خطۂ کشمیر
پڑھ دہر کے اوراق پہ یہ خون کی تحریر — اے خطۂ کشمیر
تلوار مجاہد کی ہے قرآن کی تفسیر — اے خطۂ کشمیر
وادی تیری ایمن ہے تو پربت تیرے سینا — دھرتی کا نگینہ
اس پر یہ غلامانہ مشقت کا پسینہ — افگار ہے سینہ
فرعون کشی موسیٰ عمراں کی ہے تدبیر — اے خطۂ کشمیر
سب قوم کے سینے سے اٹھے گرمِ فغاں ایک — دل ایک زباں ایک
مقصود رکھیں قوم کے سب پیر و جواں ایک — ہو سیل رواں ایک
لازم ہے کہ ہو قوم عیاں ایک نہاں ایک — سب خورد کلاں ایک
وابستہ ہو باہم صفتِ حلقۂ زنجیر — اے خطۂ کشمیر[۸۴]

خوشی محمد ناظر کے ہاں بھی کشمیر خصوصی حوالے کے طور پر جانا جاتا ہے۔ ان کے مجموعے ''نغمۂ فردوس'' کی متعدد نظمیں اور غزلیں کشمیر کے حسن سے متعلق ہیں۔ ۱۹۳۷ء میں پہلی اشاعت کے ساتھ ہی اس مجموعے کی نظمیں بے حد مشہور ہوئیں۔ اس کا تیسرا اور آخری ایڈیشن امین الدین قدیر نے ۱۹۹۲ء میں شائع کیا جسے مرتب نے اپنے شہید بھائیوں انور حمید، ارشد حمید، حریت پسندوں اور گم نام شہیدوں کے نام منسوب کیا جن کا خون کشمیر کے لالہ زاروں کو نئی آب و تاب دے رہا ہے۔ ناظر کو کشمیر سے خصوصی ربط و لگاؤ تھا۔ وہ اس کے حسن کے دل دادہ تھے اور اس پر ہزار جان سے فدا تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی بہترین شاعری اسی وادیِ نو نکہت میں قیام کے دوران تخلیق ہوئی۔ کشمیر کے حوالے سے ان کی نظم ''فردوسِ زمیں'' کلاسک کی حیثیت رکھتی ہے۔ نظم کا ایک شعر ملاحظہ کیجیے:

کبھی گلشن کبھی ویرانہ دیکھا — آنکھوں نے بھی کیا کیا نہ دیکھا[۸۵]

بیسویں صدی میں دنیا کے بدلتے حالات اور تبدیلی کا احساس بھی ناظر کے ہاں کہیں کہیں دکھائی دیتا ہے۔ ان کی نظم ''انقلاب'' میں اس تبدیلی کا احساس بہت نمایاں ہے۔ جیسے:

دور گردوں میں نیا ایک انقلاب آنے کو ہے　　میکدے میں محتسب مست شراب آنے کو ہے
ٹھن گئی سرمایہ داری اور مزدوری میں جنگ　　دیکھیں کون اس معرکے سے کامیاب آنے کو ہے[۸۶]

امین طارق قاسمی نے حفیظ کی شاہ نامہِ اسلام کی طرز پر ''جہادِ کشمیر'' کے عنوان سے ''شاہ نامہِ کشمیر'' لکھی۔ ۳۲۲ صفحات کی اس منظوم تاریخ میں ''سلطنتِ مغلیہ کے زوال'' سے لے کر ''حق و باطل کی آویزش'' تک ۲۷ عنوانات کے تحت منظوم حالات قلم بند کیے گئے ہیں۔ اس کتاب کا پیش لفظ لکھتے ہوئے اس وقت کے وزیر دفاع اور بعد میں کشمیر کے صدر کے عہدے پر فائز رہنے والے کرنل سید علی احمد شاہ نے کہا کہ ''یہ کتاب جہاد کشمیر کے لیے لکھی گئی اور ایک مفید اضافہ ثابت ہو گی''[۸۷]۔ اس کتاب کے موضوعاتی اشاریے کو دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ سر آغاز، حمد و نعت، ساقی نامہ اور مناجات وغیرہ کے بعد وادی کشمیر انقلابات عالم اور ہند، سلطنت مغلیہ کا زوال، پنجاب پر سکھوں کا قبضہ، مہاجارا رنجیت سنگھ، ڈوگرا راج، جموں کی محتاجی، جاگیر اور خطاب گلاب سنگھ کو جموں و کشمیر کا ملنا، مہاجارا کا خطاب، کشمیر کا سودا، ڈوگرا شاہی مظالم، بیع نامہ کے بعد، بے گار، ذوقِ شکار، ذبیح گاؤ کی ممانعت، عام چیرہ دستیاں، مسلمانوں کی بے داری اور مسلم کانفرنس کا قیام، اولین تحریکِ حریت، توہینِ قرآن، شیخ عبد اللہ کی علاحدگی، ریاست پونچھ، خونِ ناحق، کشمیر چھوڑ دو، دورِ نو، آزادیِ ہند، ہری سنگھ کا ہندوستان سے خفیہ گٹھ جوڑ، ہندوستانی غنڈوں کا داخلہ، مشقِ ستم، مسلمانوں سے اسلحہ کی ضبطی، مجاہدین کی تربیت، آزاد کشمیر کا قیام، آزاد قبائل کی کشمیر پر یلغار، گلگت کی بغاوت، صوبہ جموں کا قتل عام، ہری سنگھ قاتلانہ روپ میں، شیخ عبد اللہ کی رہائی اور وزارت، کشمیر کا ہندوستان سے الحاق، ہندوستان کی غیر آئینی مداخلت، حق و باطل کی آویزش اور ترانہ کشمیر وغیرہ کے عنوانات کے تحت کو صرف جہاد کشمیر ہی تک محدود نہیں رکھا گیا بلکہ اس میں کشمیر کی سیاسی تاریخ کو منظوم انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ مصنف کا نقطہِ نظر مذہبی ضرور ہے لیکن واضح انداز سے اس طرف اشارہ بھی کیا گیا ہے کہ وادیِ کشمیر کی سرزمین پر صدیوں سے سکھ، بدھ اور مسلم نہایت محبت اور اخوت سے رہتے چلے آ رہے تھے۔ کشمیری مسلمانوں نے ڈوگرا سامراجیت کے خلاف جو جہاد شروع کیا وہ محض اس لیے نہیں تھا کہ ڈوگرا ہندو تھے بلکہ یہ جہاد اس لیے شروع ہوا کہ وہ غاصب تھے، آمر تھے اور حکومت کے معاملات سفاکی سے چلا رہے تھے۔ بالخصوص ان حکمرانوں نے مسلمانوں کے شہری حقوق غصب کر رکھے تھے۔ اسی لیے وہ بڑے جذباتی انداز سے بلکہ کسی حد تک انتہا پسندانہ رویہ اختیار کرتے ہوئے پورے ہندوستان کی غاصبانہ چال بازیوں سے نجات حاصل کرنے کے لیے لال قلعہ تک چڑھائی کا اور ہندوستان کو تہس نہس کر دینے کا عندیہ تک دیتے دکھائی دیتے ہیں۔ جیسے:

جہانِ کفر کی ہر خشت کو زیر و زبر کر دو
تمھارا منتظر ہے لال قلعہ اے جواں مردو

بلند اس پر کرو جا کر ہلالی سبز پرچم کو
سنوارو قسمتِ ہندوستاں کی زلف برہم کو

فقط کشمیر کو سمجھو نہ مقصودِ نظر اپنا
خدا کے فضل سے سارا جہاں تسخیر کرنا ہے[۸۸]

کشمیر کی تاریخ اور ظلم و ستم کا ہر منظر شاعر کے ہاں بہت نمایاں ہے۔ کبھی وہ بیع نامہ امر تسر کا ذکر ''کشمیر کا سودا'' کے عنوان سے کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

پچھتر لاکھ ہے چالیس لاکھ انسان کی قیمت
یہ طے پائی بہم کشمیر کے دہقان کی قیمت

پچھتر لاکھ میں آخر ہوا کشمیر کا سودا
غریب و مفلس و نادار کی تقدیر کا سودا

گلستاں، کھیت دشت و بن پچھتر لاکھ میں بیچے
جوان و پیر و مرد و زن پچھتر لاکھ میں بیچے

پچھتر لاکھ میں بیچی گئی کشمیر کی وادی
یہ کیا کوئی طویلہ تھا کہ انسانوں کی آبادی[۸۹]

کشمیریوں بالخصوص مسلمانوں سے جبری مشقت ''بے گار'' لیے جانے کا ذکر کرتے ہوئے شاعر کا حساس دل سخت اذیت کا شکار دکھائی دیتا ہے۔ وہ ان تکلیف دہ مناظر کے بیان میں کہتے ہیں کہ:

جو بے گاری علاقے سے پکڑ کر لائے جاتے تھے
غریبوں سے گدھے کی طرح بوجھ اٹھوائے جاتے تھے

زیادہ وزن، خالی پیٹ، رستے پُر خطر سارے
سرِ منزل پہنچتے کس طرح سے ظلم کے مارے

عذابِ نزع ان پر تھا نہ جیتے تھے نہ مرتے تھے
بہت سے راستے میں جاں بحق تسلیم کرتے تھے[۹۰]

کشمیر کے حوالے سے منظوم رزمیہ نگاری کی ایک اور کاوش خان کفایت اللہ خان جلیس کی کتاب ''فغانِ کشمیر'' ہے۔ اس منظوم تصنیف کے سرورق پر کتاب کے نام کے ساتھ ''اردو نظم میں ریاست کے قدیمی حالات، مخالفین کی تحریکات، گزشتہ سانحات، حال کے واقعات، موجودہ مشکلات و آئندہ ضروریات'' کی توجیہی عبارت سے اس کتاب کے نفسِ مضمون کا اچھی طرح اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ کتاب میں کوئی شعری تخلیقی حسن کی تلاش بے سود ہے۔ مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاعر کو روایتی شاعری میں رائج معروف بحروں اور اوزان سے بھی پوری طرح واقفیت نہ تھی۔ فنی کمزوریوں سے قطع نظر اس کتاب کو واقعہ نویسی کی منظوم کوشش قرار دیا جاسکتا ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

اٹھارہ سو نواسی میں ہوا تھا آخرش یہ بھی
مسلماں جب نہ یہ بے گار کرنے کو ہوئے راضی

تو اک دم آگئیں اس ڈوگرا راجا کی سب فوجیں
مسلماں لوگ ان کے ظلم سے ہر حال تنگ آکر

لگے کھیتی کا سارا کام کرنے بعد کو جا کر

یا محصولات کے ظالمانہ طریقوں کی بابت شاعر کا بیان ہے کہ:

لکھا لارنس نے محصول کی حالت ہوئی ایسی — کہ پانی اور ہوا کو چھوڑ کر ہر شے تھی محصولی

تعصب اس قدر پرتاب سنگھ دکھاتا تھا — سحر میں اس کو چہرہ تک مسلماں کا نہ بھاتا تھا[91]

محض سطحی، بے رس اور بے مزہ شاعری لیکن واقعہ نگاری میں کچھ ایسی معلومات اور اشارے ضرور ہیں جو اس دور کے حالات کو سمجھنے میں مدد ضرور دیتے ہیں۔

تحسین جعفری کا شمار بھی ریاست جموں وکشمیر کی ان شخصیات میں ہوتا ہے جنھوں نے ریاست میں اردو کی ترویج وترقی میں نمایاں کردار ادا کیا۔ ایک ادیب، شاعر اور صحافی کے علاوہ انھوں نے تحریک آزادی کشمیر میں بھی اپنا حصہ خوب ڈالا۔ وہ ہفت روزہ "کشمیر" اور "آزاد کشمیر" کے مدیر بھی رہے۔ متعدد تصانیف کے علاوہ شعری مجموعہ "جنتِ سوزاں" میں اپنے وطن مالوف یعنی کشمیر میں جاری حریت پسندانہ تحریک کو موضوع سخن بنایا۔ ۱۴۱ صفحات پر مشتمل یہ مجموعہ ۱۹۹۲ء میں شائع ہوا۔ ان کا دل ہمیشہ کشمیر کے حریت پسندوں کے ساتھ دھڑکتا تھا۔ اسی لیے وہ ہمیشہ ان حریت پسندوں کا عزم وحوصلہ بڑھانے کی کوششوں میں مصروف دکھائی دیتے ہیں:

مجاہدینِ صف شکن بڑھے چلو، بڑھے چلو

سروں سے باندھ کر کفن بڑھے چلو، بڑھے چلو[91]

کشمیر جس طرح حریت پسندوں اور مظلوم ومعصوم عوام کے لہو سے رنگین تھا، اس صورت حال کے بیان میں شاعر کا کہنا تھا کہ:

خونِ مسلم سے ہے رنگیں سر زمینِ کاشمر — جس کے ہر قطرے میں اک طوفان آتا ہے نظر

خون کی موجیں اٹھی ہیں ہر در و دیوار سے — پُر نظر آتے ہیں خوں سے آج سارے بحر وبر[93]

وہ کشمیری نوجوانوں، حریت پسندوں اور جہد آزادی میں حصہ لینے والوں کو امید اور عزم وحوصلے کا درس ہی نہیں دیتے بلکہ وہ شواہد کی بنیاد پر کشمیر کی فتح کی نوید سناتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

کٹنے کو ترے پاؤں سے ہے ظلم کی زنجیر — مٹنے کو ہے یہ درد اور کرب کی تحریر

تو جنتِ ارضی نہیں کفار کی جاگیر — فردوس بریں کی ہے تو اک خوش نما تصویر

اے وادیِ کشمیر اے وادیِ کشمیر[94]

وادی میں جاری ظلم وبربریت، انسانی لہو کی ارزانی اور استیصال کی حالت کا نقشہ انھوں نے کچھ اس طرح کھینچا ہے:

حشر برپا ہے وادیِ گل میں — آگ ہی آگ ہے جدھر دیکھو

خوں برستا ہے لالہ زاروں سے — خوں کا دریا کمر کمر دیکھو[95]

اس موضوع پر لکھی گئی ان کی بہترین نظموں میں "حریتِ پسند"، "یزیدانِ وقت"، "مقبوضہ کشمیر کی حالتِ زار"، "کشمیری مجاہدین کا نعرہِ حق"، "اے مسلمِ دین دار"، "خون کی ہولی"، "گیدڑ کی موت"، "اے مجاہد"، "کشمیر کے مجاہد کی للکار"، "جنتِ سوزاں"، "داستانِ کشمیر"، "کشمیر جنت نظیر"، "صبحِ آزادی"، "نگارِ آزادی"، "خود ارادیت اور کشمیر" اور "عہدِ آزادی اور ہم" وغیرہ خاصی اہمیت کی حامل ہیں۔

شیخ غلام علی بلبل کاشمیری کا مجموعہ کلام "دستِ چنار" کی بابت سید ضمیر جعفری کا کہنا ہے کہ:

> جس اخلاص، جس تاثیر اور جس توانائی کے ساتھ وادیِ کشمیر کا درد بلبل کے لفظوں میں دھڑکتا سنائی دیتا ہے، مٹی کا ایسا لمس پورے عصری ادب میں کم دکھائی دے گا... ان کی نظمیں ہماری تاریخ کے ایک سانحے کی امانت کے طور پر ہماری ادبی میراث میں شامل رہیں گی[۹۶]۔

کشمیر کے حوالے سے بلبل نے بہت سی نظمیں لکھیں۔ اختر شیرانی کی پیروڈی میں کشمیر کے حوالے سے "او دیس سے آنے والے بتا" کا راگ بھی الاپا اور "اے وادی تجھ سے عہد میرا" جیسی نظموں میں فتح مندی کے ساتھ اس وادی میں واپس آنے کے سہانے خواب بھی دکھائے۔ ملاحظہ کیجیے:

مری محبوب وادی میں کسی دن لوٹ آؤں گا

میں آؤں گا جلو میں لشکرِ فتح و ظفر لے کر　　تیرے برگ و ثمر لے کر تیرے شمس و قمر لے کر
ترے ذروں کا دل بن کر، ترے شب کی سحر لے کر　　میں تیرے جشن آزادی کے دل کش گیت گاؤں گا

مری محبوب وادی میں کسی دن لوٹ آؤں گا[۹۷]

ماسٹر غلام حیدر کا تعلق اہل کشمیر کی اس نسل سے تھا جنھوں نے ریاست میں تحریک آزادی کی ابتدا ہوتے ہوئے دیکھی اور پھر ۱۹۴۷ء کی جدوجہد اور ریاست کی جبری تقسیم کا عمل بھی ان کی نگاہوں کے سامنے ہوا۔ نتیجتاً ہزاروں کشمیریوں کو مہاجرت اختیار کرنی پڑی۔ "کشمیر میں رائے شماری" ماسٹر غلام حیدر کا معروف مجموعہ کلام ہے۔ یہ ان کے انگریزی مجموعے Plediseite in Kashmir کا منظوم اردو ترجمہ ہے۔ یہ مجموعہ انگریزی اور اردو میں یکجا صورت میں شائع ہوا۔ ابتدائی ۵۰ صفحات میں انگریزی نظمیں ہیں جب کہ ۳۲ صفحات اردو منظومات پر مشتمل ہیں۔ اس تصنیف کے متعلق قاضی خورشید عالم کہتے ہیں کہ اس میں مادر وطن کی پکار اور مجاہد کی للکار دونوں سنائی دیتی ہے۔ وہ کشمیر کی آزادی سے متعلق خالی خولی دعوؤں اور باتوں کے بجائے عمل پر پختہ یقین رکھتے تھے۔ ان کے نزدیک ان جلسے جلوسوں سے کچھ نہیں ہونے والا۔ وہ عملی جدوجہد کی طرف توجہ دلاتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

دانش ور سوچیں تدبیریں　　کام کریں قلمیں شمشیریں
لاشوں کے انبار لگائے　　لاکھوں کاٹے اور بہائے

اب جلسوں کے کھیل رچا کر تقریروں میں جوش دکھا کر
چھوڑو یہ خوش فہمی ساری جموں کی اب کرو تیاری[۹۸]

ماسٹر غلام حیدر ہمیشہ سے حق خود ارادیت کے قائل رہے۔ ان کے خیال میں ریاست کے رستے ہوئے ناسور کا واحد علاج کشمیر میں آزادانہ رائے شماری ہے۔ اس مناسبت سے اپنے مجموعے کا نام بھی انھوں نے یہی رکھا۔ وہ اس رائے شماری کو کشمیر کے درد کا درماں گردانتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

تنگ کرتی ہے مجھے جب بے قراری رات کو یاد آتی ہے مجھے رائے شماری رات کو
سسکیاں لیتے ہوئے کرتا ہوں منہ کشمیر کو یاد آتا ہے وطن روتا ہوں میں تقدیر کو
چوٹیاں ہیں سرنگوں دعوت ہماری کے لیے جمو و کشمیر کی رائے شماری کے لیے[۹۹]

اس کس مپرسی کے عالم میں جب کہ کشمیریوں پر ظلم کے پہاڑ توڑے جا رہے تھے اور دشمن اپنے مذموم مقاصد کے حصول کے لیے ہر وہ اقدام کرنے پر تلا بیٹھا تھا جس سے مسلمانوں کو کچلا جا سکے۔ اس لیے شاعر نے حق کا علم بلند کرتے ہوئے حقائق سے پردہ بھی اٹھایا ہے:

ہاتھ میں تلوار ہے اور امن کا اعلان ہے راستی بدنام ہے اور ایمان کا فقدان ہے
چیختے لاکھوں ہزاروں اور چلاتے ہیں لوگ سسکیاں لیتے تڑپتے اور مر جاتے ہیں لوگ
کاشمیری موت کے پنجے میں ہے مغموم ہے دن بدن ظلم و ستم کا زور ہے اک دھوم ہے[۱۰۰]

وہ ان ظالموں کے خلاف ربِّ کعبہ کے آگے دست دعا کے طالب ہو کر گریہ وزاری کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

ہمیں آج دستِ کرم سے اٹھانا تباہی سے کشمیر کو اب بچانا
خدایا بچالے! خدایا بچالے لیے آج کنکر ابابیل آئیں
وہ کشمیر کے ظالموں پر گرائیں خدایا بچالے! خدایا بچالے[۱۰۱]

کشمیر کی سیاسی تقسیم سے قبل کے شعرا میں ڈاکٹر عماد الدین سوز کا شمار بھی اہم ترین شعرا میں ہوتا ہے۔ کشمیر کے حوالے سے ان کی متعدد نظمیں مشہور ہوئیں۔ اپنی ایک نظم ''مقبوضہ کشمیر کی تصویر'' میں وہ کشمیر کے بدلتے ہوئے سیاسی منظر نامے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

وطن میں اہلِ وطن دوزخی معاذ اللہ بہشتِ حرص کی جاگیر ہوتی جاتی ہے
ستم! کہ دستِ عدو و جفائے دوراں سے خراب جنتِ کشمیر ہوتی جاتی ہے
سنو کہ بجھ نہیں سکتا شرارِ آزادی ہر آہ نعرہِ تکبیر ہوتی جاتی ہے[۱۰۲]

حکیم عبدالنبی عرف شجر طہرانی بھی موروثی شاعر تھے۔ تقسیم ملک سے کچھ عرصے قبل سیال کوٹ میں آبسے۔ قطعات نگاری میں خاص شہرت کمائی۔ کشمیر کے حوالے سے ان کے متعدد قطعات بے حد مشہور ہوئے۔

کچھ ایسے طور سے آئی خزاں فصلِ بہاراں میں زبانِ غنچہ و گل بہاروں کو بھی ماتم ہے
جلائے پھول کلیاں نوچ کر برباد کر ڈالیں خزاں کے جور بے جا پر تو خاروں کو بھی ماتم ہے[۱۰۳]

انھوں نے کشمیریوں کے ذاتی دکھ کو اجتماعی رنگ دے کر پورے ماحول میں اس الم کی کیفیت تلاش کرنے کی کوشش کی۔ ان چیزوں نے مل کر اس کے کلام کو دو آتشہ بنا دیا ہے۔

نغمے افسردہ پریشاں پھول، کلیاں سرنگوں نالہ زن ہیں بلبلیں، زاغ و زغن خاموش ہیں
باغ بانوں نے بہاریں بیچ دیں گل چیں کے ہاتھ خندہ زن ہیں بجلیاں، اہلِ چمن خاموش ہیں[۱۰۴]

امرتسر کے کشمیری خاندان سے تعلق رکھنے والے ملک محی الدین قمر جب ملازمت کے سلسلے میں کشمیر گئے تو ایک بار پھر وہیں کے ہو رہے۔ ان کی ایک طویل نظم ''وادیِ کشمیر'' بہت مشہور ہے۔ اس نظم کی ایک خاص بات مصرعوں کی مخصوص ترتیب ''ایم سیکم'' ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

کس دن نہ رہا تیرے مخالف فلکِ پیر اے وادیِ کشمیر
حل تیرے مسائل کا ہے موقوف بہ شمشیر اے وادیِ کشمیر[۱۰۵]

اپنی ایک اور نظم ''گردشِ ایام آخر تابہ کے؟'' میں بھی شاعر کشمیریوں پر ہونے والے مظالم اور ابتر حالات کا نقشہ کھینچتا ہے۔ وہ سوالیہ انداز میں عالمی استعمار سے یہ سوال پوچھتے ہیں کہ:

گردشِ ایام آخر تابہ کے؟ ہم سہیں آلام آخر تابہ کے؟
بے زباں کشمیریوں کے حلق پر تیغِ خوں آشام آخر تابہ کے؟
یہ ستم، یہ ظلم، یہ جور و جفا اس پہ صبح و شام آخر تابہ کے؟
کیا انھیں بھی ہوگی آزادی نصیب وہ اسیر دام آخر تابہ کے؟[۱۰۶]

قیس شروانی بھی کشمیر الاصل شاعر تھے۔ ان کی شاعری میں کشمیر کا موضوع اہمیت کا حامل ہے۔ ایک نظم ''کشمیر کے شہیدوں سے'' میں وہ ان شہدا کی قربانیوں کو یاد کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

پھر یاد آ رہی ہیں قربانیاں تمھاری پھر فرط رنج و غم میں کرتا ہوں آہ و زاری
ہر لحظہ بڑھ رہی ہے پھر دل کی بے قراری آنکھوں سے بے کلی میں پھر جوئے خوں ہے جاری
تم یاد آ رہے ہو کشمیر کے شہیدو[۱۰۷]

جموں سے تعلق رکھنے والے حبیب اللہ کوثر نے بھی مسلمانوں کے قتل عام کے حوالے سے نظموں کا ایک مجموعہ ''ہنگامۂ کشمیر'' کے نام سے مرتب کیا۔ یہ مجموعہ بہت مقبول ہوا۔ ۱۹۵۱ء میں اس کا پہلا اور فوراً ہی ۱۹۵۲ء میں دوسرا ایڈیشن شائع ہوا۔ شاعر خود بھی ۱۹۴۷ء کے واقعات میں زخمی ہوئے ان کا چھے برس کا بیٹا اپنے دو ہم زادوں سمیت لاپتا ہو گیا۔ اس لیے ایک درد انگیز فضا کی جھلک ان کی شاعری میں دکھائی دیتی ہے۔ اپنے درد و غم کا اظہار کرتے ہوئے شاعر کہتے ہیں کہ:

حالِ دل اپنا بتائیں تو بتائیں کس کو قصۂ درد سنائیں تو سنائیں کس کو
دیکھنے والی کوئی آنکھ نظر نہیں آتی چیر کر دل بھی دکھائیں تو دکھائیں کس کو
میں لاکھ گریہ کروں بھی الم کی شدت سے یہ دل کا درد ہے آنکھوں سے بہہ نہیں سکتا[۱۰۸]

محمد سعید شاہ بخاری کی نظم ''وادیِ کشمیر'' میں بھی کشمیر پر ہونے والے مظالم اور پوری وادی کے المیے کو موثر انداز سے پیش کیا گیا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

میں سر و پا درد ہوں میں وادیِ کشمیر ہوں مجھ کو کیا جنت سے نسبت، ظلم کی جاگیر ہوں
نیم جاں ہوں، مضطرب ہوں، آہِ بے تاثیر ہوں داغ ہیں میرے کلیجے پر نشاط و شالی مار
خوں چکاں ہیں میرے چشمے، سینہ کوہاں آب شار[۱۰۹]

پیر زادہ غلام مہجور، مولانا شبلی نعمانی سے رشتہ تلمذ رکھتے تھے۔ کمیونسٹ ذہن اور باغی خیالات کے حامل تھے۔ ڈوگرا استعمار کے ملازمت میں ہونے کے باوجود اس آمریت کے خلاف حق کی آواز بلند کی۔ کشمیر کے حوالے سے مہجور کے چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

شکستہ حالیِ بغداد پر ہے نوحہ خواں سعدی ہے اندلس کے لیے اقبال محوِ مرثیہ خوانی
مگر صد حیف اجڑا گلشنِ اسلام کشمیر میں کوئی کرتا نہیں جز آب شبنم اشک افشانی[۱۱۰]

ہدایت اللہ اختر نے بھی کشمیر کی تحریک آزادی کو شروع ہوتے اور پروان چڑھتے اپنی نظروں کے سامنے دیکھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس تحریک سے ان کو والہانہ لگاؤ اور عشق تھا۔ ریاست کی جبری تقسیم اور ہجرت کے کرب نے ان کے درد کو دو آتشہ کر دیا۔ ''حدیثِ لالہ و گل'' ان کا پہلا شعری مجموعہ ہے۔ اس کے دیباچے میں احمد ندیم قاسمی نے ان کی شاعری کو مقصدی شاعری قرار دیتے ہوئے کہا کہ وہ کشمیر کے نغمہ ساز ہیں اس کشمیر کا جو کہ استیصال کا شکار ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ:

دیکھو کہ زخم خوردہ ہے کشمیر کی فضا بس آشنائے حالِ پریشاں تم ہی تو ہو[۱۱۱]

وہ اپنی نظموں میں کشمیریوں پر گزرنے والے ہر اس لمحے کو یاد کرتے دکھائی دیتے ہیں جس نے ظلم و بربریت کی نئی تاریخ رقم کی ہے۔ کبھی وہ ۱۳ جولائی ۱۹۳۱ء کے روز ہونے والی سرفروشوں کی قربانی کو یاد کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

سرفروشوں کے گراں قدر چلن یاد آئے　　　پھر وہی بازوئے شمشیر فگن یاد آئے

تیرہ جولائی کا دن جب بھی نمودار ہوا　　　ہم کو ہر لمحہ شہیدانِ وطن یاد آئے[۱۱۲]

اور کبھی عالمی برادری خصوصاً اقوام متحدہ کی بے حسی پر انھیں حق و باطل کے فرق کی طرف توجہ دلاتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

واجب ہے چارہ سازیِ حالات کیجیے　　　حق جس سے مطمئن ہو وہی بات کیجیے[۱۱۳]

وہ کشمیر کے ابتر حالات پر دورِ حاضر کے دانش وروں اور امن کے دعویٰ داروں کی توجہ مبذول کراتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

خون مظلوم کی موج ہے جان ہے　　　ہر طرف بربریت کا طوفان ہے

کیا کوئی زندگی کا بھی امکان ہے　　　زندگی ایک گم گشتہ ارمان ہے

یا پھر یہ سوال اٹھاتے ہیں کہ:

قصہ گیسوئے کشمیر پریشاں کب تک　　　اپنے سائے سے یہ فردوسِ ہراساں کب تک

روشنی تیرہ نصیبوں سے گریزاں کب تک　　　سخت بے رحم یہاں گردش دوراں کب تک[۱۱۴]

اختر کی واحد امید وہ مجاہدین حریت تھے جو اپنی جدوجہد سے کشمیر کو آزاد کرانے کی سعی میں مصروف کار تھے۔ وہ ان مجاہدین کو نقیب آزادی جان کر ان سے امیدیں باندھ لیتے ہیں۔ ان کے عزم و حوصلے کی تعریف و توصیف میں وہ کہتے ہیں کہ:

سینے میں ابلتا ہوا ایک سیل رواں ہے　　　آزادیِ کشمیر کا احساس جواں ہے

کشمیر کی جنگلی سے برستے ہیں شرارے　　　شعلوں کی چٹانیں ہیں کہ یہ باغِ جناں ہیں

چلیں تو ہر بتِ پندار توڑ کر رکھ دیں　　　بڑھیں تو ظلم کی دیوار توڑ کر رکھ دیں

یہ لوگ وقت کی تقدیر کے اشارے ہیں　　　یہ لوگ جموں و کشمیر کے ستارے ہیں[۱۱۵]

''لہو کی سرخی''، ''آئینہِ انقلاب''، ''وطن کے محافظ''، ''قائداعظم اور کشمیر''، ''منگلا کی کہانی'' اور ''ترانہِ شیخ عبداللہ'' وغیرہ ان کی ایسی نظمیں ہیں جن میں کشمیر کے سلگتے ہوئے مسائل پر عالمی برادری کی توجہ مبذول کرانے کی عمدہ کوشش نظر آتی ہے۔ کشمیر کی آزادی اختر کی شاعری کا محور و مرکز ہے۔ اسی لیے ان کی شاعری ایک باقاعدہ مقصدیت کا پہلو لیے ہوئے ہے۔

پروفیسر نذیر انجم کا شمار بھی کشمیر کے معتبر شعرا میں ہوتا ہے۔ ان کا مجموعہ کلام ''نفس نفس تعزیر'' ابتدا میں ''فرازِ دار'' کے عنوان کے تحت ۱۹۷۵ء میں مجلسِ فکر و ادب میرپور کے تحت شائع ہوا۔ بعد میں تینوں مجموعوں کو یکجا کر کے ''قرضِ سخن'' کے عنوان سے ۱۹۹۸ء میں شائع کیا گیا۔ ان کے ہاں بھی کشمیر کے سیاسی حالات کو موضوع بنایا گیا۔ وہ ظلم و استیصال کی زنجیروں کو توڑنا اور وادیِ غنچہ و گل کشمیر کو آزاد دیکھنا چاہتے ہیں۔ ان کے مطابق عالمی دنیا:

ظلم کو امن، عداوت کو وفا کہتے ہیں کیسے ناداں ہیں جو صرصر کو صبا کہتے ہیں
میرے کشمیر ذرا جاگ کہ کچھ جاہ طلب غیر کو تیرے مقدر کا خدا کہتے ہیں[۱۱۶]

ان کے کلام کی سب سے نمایاں خصوصیت ظلم وناانصافی کے خلاف بہادرانہ اور مزاحمتی رویہ ہے۔ حریت پسندی اور کشمیر کی آزادی ان کی فکر کے بنیادی عناصر ہیں۔ اس لیے وہ اپنے آپ کو باغی سے تعبیر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

اسیر زلفِ آزادی رہا ہوں میں ہر فرعون کا باغی رہا ہوں
سپاہِ جور کے نرغے میں انجم اکیلا ہی بہت بھاری رہا ہوں[۱۱۷]

ان کے ایک اور مجموعے "کرن کرن تصویر" میں بھی کشمیر کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ وہ کشمیریوں پر طرح طرح کی پابندیوں اور حقوق غصب کیے جانے کی کیفیت پر نہ صرف خود بلبلا اٹھتے ہیں بلکہ اپنی آزاد قوموں کی طرف رشک بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

طوقِ سلاسل کی جھنکاریں ہم سے مسلسل کہتی ہیں سوچ کی سرحد پر پہرے ہیں، سچ یہ ہے تعزیر بہت
کوئی دیس مناتا ہے جب دن اپنی آزادی کا دل کا درد سلگ اٹھتا ہے، یاد آئے کشمیر بہت
جس گردن میں طوقِ غلامی، وہ گردن ہر حال میں خم جو قومیں آزاد ہیں انجم، وہ ہیں خوش تقدیر بہت[۱۱۸]

پروفیسر نذیر انجم کشمیر کے ہیرو کو بھی نہیں بھولتے وہ آزادی کی راہ میں شہادت پانے والے جاں بازوں کو نہ صرف خراج عقیدت پیش کرتے نظر آتے ہیں بلکہ نوجوانوں کو اس راہ پر چلنے کی تلقین بھی کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ "مقبول بٹ" پر لکھی گئی ایک نظم کے چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

وہ شہیدِ وفا، جاں نثارِ وطن جس پر نازاں رہے گی عروسِ وطن
بہرِ آزادیِ خطۂ کاشمیر نقدِ جاں وار کے ہو گیا ہے امر
بڑھ کر زنجیر جور و جفا توڑ دی موجِ خوناب فسطائیت توڑ دی
کاروانِ سحر کا وہ سالار تھا جشنِ ظلمات سے محوِ پے کار تھا
سر جھکایا نہیں آخری وار تک وہ رجز خواں رہا منزل دار تک
اس کا عزمِ صمیم و ثباتِ قدم روحِ تاریخ پر ہو گیا ہے رقم[۱۱۹]

ڈاکٹر صابر آفاقی کی شاعری میں بھی انسان دوستی اور عالمی امن کے موضوعات کی بھرمار ہے لیکن جب یہی انسان دوست شاعر کشمیر کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑا دیکھتا ہے تو اس کے اندر بغاوت کے شعلے بھی بھڑکتے دکھائی دیتے ہیں اور آزادی کا احساس بھی شدت سے موج زن ہوتا ہے۔ وہ تبدیلیِ حالات کو محسوس کر کے یہ تک کہنے سے گریز نہیں کرتے کہ:

کچھ اور دہکی ہے آتش ترے چناروں کی ۔۔۔۔ کچھ اور تیرے سپوتوں کا بڑھ گیا ہے جنوں
افق پہ نجم و سحر جگ مگانے والا ہے ۔۔۔۔ رہے گا ٹوٹ کے آخر سیہ شبی کا فسوں[۲۰]

کشمیر کی غلامی کی تاریخ تو خاصی طویل ہے لیکن اب یہ کہنا بھی غلط نہ ہو گا کہ اس کی آزادی کی جدوجہد کی داستان بھی درازتر ہوتی جارہی ہے۔ شہدائے جموں اس لہو رنگ جدوجہد کا تابندہ کردار ہیں۔ صابر ان کی قربانیوں کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور انھیں خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

کان میں شہرِ فغاں آج بھی میرے یا رب ۔۔۔۔ خون بہتا ہے نگاہوں میں جدھر کو دیکھو
میری آنکھوں میں بسا ہے وہی خونیں منظر ۔۔۔۔ یاد ہے مجھ کو ابھی مقتلِ شہر جموں[۲۱]

اسی لیے وہ حریت پسند نوجوانوں اور عام شہریوں کو دشمنوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے کا مشورہ اور فتح کی بشارت دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

اٹھو کہ مادرِ کشمیر کے ملول حزیں ۔۔۔۔ بڑھو کہ جموں و کشمیر نے پکارا ہے
چلو کہ عظمتِ انساں پہ وقت مشکل ہے ۔۔۔۔ سنو یہ خطۂ جنت نشاں ہمارا ہے
پھر یہ آتش کدۂ ارضِ گلستاں ہوگا ۔۔۔۔ رو کشِ غنچہ و گل خارِ بیاباں ہوگا
عہدِ نو آتا ہے جینا ہمیں آساں ہوگا[۲۲]

صابر نے اپنے وطن کشمیر کو ایک محب وطن اور باشعور دانش ور کی نظر سے دیکھا۔ ان کے نکتہ رس ذہن نے جو کچھ دیکھا اور سوچا اسے اپنی خوب صورت شاعری میں سمو دیا۔ کشمیر کی تحریک سے ان کی فکری وابستگی نے ان کے اشعار کو مزید شعلہ بار کر دیا۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ ایک طویل عرصے تک انھوں نے اہلِ کشمیر کی فکری رہنمائی کا فریضہ بہ خوبی انجام دیا۔

احمد شمیم کا شمار بھی کشمیر کے معروف شعرا میں ہوتا ہے۔ کشمیر ان کا وطن اور اپنے وطن سے انھیں بے پناہ محبت تھی۔ وطن کی حرمت، حفاظت اور آزادی کی جدوجہد کی پاداش میں انھیں پس دیوار بھی رہنا پڑتا۔ ۱۹۴۸ء کا واقعہ ہے جب اقوام متحدہ کے کمیشن کے دورے کے موقع پر ہزاروں طلبا کے ساتھ بھارتی جارحیت کے خلاف مظاہرے کے جرم میں طلبا اور اساتذہ کے ساتھ انھیں بھی زندان میں ڈال دیا گیا۔ ان کی خوب صورت شاعری "اجنبی موسم میں ابابیل" اور "ریت پر سفر کا لمحہ" کی صورت میں منظر عام پر آئی۔ ان دونوں مجموعوں میں کشمیر کی بربادی کے کئی رنگ بے حد نمایاں ہیں۔ یہ تمام رنگ احمد شمیم کے حساس دل اور مشاہدے کی گہرائی سے اور بھی شدید ہو جاتے ہیں۔ مثلاً طویل غلامی کے باعث وطن میں ہر سو پھیلی سسکیوں اور لٹے پٹے پیڑوں کو جب وہ نظم کے قالب میں ڈھالتے ہیں تو کہتے ہیں کہ:

سسکتی ہوا کے بے نام فاصلے! / تیرا پیرہن بوئے گل سے محروم ہے کہ اب / تو غبارِ

راہ سفر کا بارِ گراں اٹھائے / خزاں گزیدہ، خموش پیڑوں کی / ننگی بانہوں میں ... خارِ

حسرت چھپائے دل میں / کئی بہاروں کا نوحہ خواہ بن کے رو رہا ہے [۲۳]

اپنی ایک اور نظم ''بانجھ لمحوں میں مناجات'' میں وہ بوڑھی ماں سے جب مخاطب ہوتے ہیں تو ان کے لہجے کی تلخی دیکھیے:

بوڑھی، ماں تیرا جواں سال لہو / ریت میں جذب ہوا / نوحہ نہ کر / اب تیرے جسم

کے خالی کمرے / کسی آواز کے محتاج نہیں / تو سرِ بام کوئی نوحہ نہ کر، نوحہ نہ کر [۲۴]

۱۳ جولائی کا دن تحریک آزادی کشمیر میں انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔ احمد شمیم نے جبر کے اس رائج قانون کے خلاف نہ صرف مزاحمتی رویہ اختیار کیا بلکہ ظلم اور جبر کے کالے قانون کے خلاف علم بغاوت بھی بلند کیا۔ جیسے:

ساری صبحیں ایک سی تھیں / ساری شامیں ایک سی تھیں / سارے دن یکساں

تھے / جبر کی زنجیر میں جکڑے ہوئے / جبر ہی قانون تھا [۲۵]

میراجی اور راشد کی تقلید کرتے ہوئے انھوں نے آزاد نظموں میں کشمیر کے موضوع پر متعدد اچھی نظمیں لکھیں۔ ان نظموں میں لفظ لہو اور زنجیر کو استعارے کے طور پر اس قدر استعمال کیا گیا ہے کہ کشمیر کی آزادی کے حوالے سے یہ استعارے زبان زد عام ہو گئے ہیں۔ ان کا کشمیر حقیقتاً آج بھی پابہ زنجیر ہے اور لہو لہو بھی اور احمد شمیم نے اس کشمیر کا عکس اپنی شاعری میں پیش کیا ہے۔

پروفیسر مقصود جعفری کا شمار بھی کشمیر کے معتبر شعرا میں ہوتا ہے۔ وہ بھی ہمہ وقت کہنہ نظام اور جابرانہ انداز کے مخالف رہے۔ غزل کے ساتھ ساتھ ان کی نظموں میں کشمیر کے حالات اور وہاں پیش آنے والے واقعات و سانحات کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ کشمیر کے غم والم کی داستان بیان کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ:

درد افزا پیکرِ آلام اب کشمیر ہے   خستہ دل وابستۂ ایام اب کشمیر ہے

ہر طرف وادی میں ہے اک خون کا دریا رواں   برگِ گل آتا نظر ہے ایک قلبِ خوں چکاں

جل رہا ہے صحنِ گلشن پتا پتا زرد ہے   ہر دلِ بے تاب میں اک کرب ہے اک درد ہے

بجلیاں کس نے گرادیں حسن کے باغات پر   گولیاں کس نے چلائیں قوم کی بارات پر [۲۶]

ان کی مسدس ''شعلہ کشمیر'' کو اردو ادب میں منفرد مقام حاصل ہے۔ یہ مسدس ان کے فنی رتبے کا اظہار اور فنی لگاؤ کا منھ بولتا ثبوت ہے وہ کشمیر کے مظالم کے باوجود امید کا دامن کبھی نہیں چھوڑتے اور نوجوانوں کے دلوں میں دیا جلاتے ہوئے کبھی کہتے ہیں کہ:

اب افق سے صبح نو کی پھوٹنے کو ہے کرن　　رشک جنت بن رہے ہیں کاشمر کے سبز بن
گائیں گے اب نغمہ آزادی و دل شاد ہم　　ہو رہے ہیں ظلم کے پنجوں سے اب آزاد ہم
اب سیاہی ظلم کی کافور ہوتی جائے گی　　تیرگیِ شامِ ہجراں دور ہوتی جائے گی
امن سے وادی میری معمور ہوتی جائے گی　　وادیِ کشمیر شمعِ طور ہوتی جائے گی[۱۲۷]

اور کبھی وہ اس دھرتی ماں کی محبت میں گیت گاتے ہوئے اس کے تقدس کو لازمی قرار دیتے ہیں۔ جیسے:

کشمیر کی اجڑی مانگ سجا　　کشمیر میں بہتے خون کو روک
کشمیر میں شعلے بھڑکے ہیں　　کشمیر بھی دھرتی ماں ہی تو ہے
اور ماں کا تقدس لازم ہے[۱۲۸]

بشیر احمد کا شمار بھی کشمیر کے صاحب طرز ادیبوں اور شاعروں میں ہوتا ہے۔ ڈوگرا راج کے زمانے میں گرفتاری کی اذیت بھی اٹھائی۔ تازہ تحقیق کے مطابق کشمیر کے شعرا میں بشیر مغل زود گو شاعر کی حیثیت سے افضل مقام رکھتے ہیں۔ اب تک ان کے پندرہ شعری مجموعے آ چکے ہیں۔ ان کو بجا طور پر شاعر کشمیر کہا جاتا ہے۔ "صبح زندگی"، "کونپل کا بدن"، "رہرو تنہا"، "برگ آوارہ"، "کشت لالہ و گل"، "دشت طلب"۔ "دریا دریا ساحل ساحل"، "حلقہ میری زنجیر کا"، "ڈوبتے منظر" اور "شہر دربدراں" وغیرہ ان کے مشہور مجموعاتِ شعری ہیں۔ ان کے کلام میں بھی صداقت اور انسان دوستی کے جذبات موجود ہیں۔ ان کے ہاں بھی کشمیر کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ غزل کے چند اشعار دیکھیں:

اٹھا کر آنکھ جب بھی جانبِ کشمیر دیکھا ہے　　وطن کے ذرے ذرے کو بہت دل گیر دیکھا ہے
لبوں سے نالہ و فریاد کے اٹھتے حزیں نغمے　　دلوں سے پھوٹتا اک حرف بے تاثیر دیکھا ہے
سکوتِ کوہ میں ڈوبا ہوا چالیس سالوں سے　　جہادِ شوق کا ہنگامہِ شمشیر دیکھا ہے[۱۲۹]

بنیادی طور پر بشیر کے ہاں غزل کی غنائیت اپنی بھرپور توانائی کے ساتھ موجود ہے لیکن کبھی کبھی کشمیر کے تناظر میں ان کے لہجے میں ایک بلند آہنگی بھی دکھائی دیتی ہے اور انقلابی نعرے کی گونج بھی۔ اس پس منظر میں یہ نظم کے چند اشعار دیکھیے:

مرد ہے وہ جو آگ اور خوں کا تیر کے دریا پار کرے　　مرد ہے وہ جو سر دھڑ دے کر حق کی راہ ہموار کرے
مرد نہیں جو باطل کی یلغار ستم سے دبتا پھرے　　مرد ہے وہ جو دست و پا سے ہر باطل پر وار کرے
مرد نہیں جو مومن کی ناموس کو لٹتا دیکھ سکے　　مرد ہے وہ جو ملت کی ناموس کا بیڑا پار کرے[۱۳۰]

کشمیر کے موضوع پر بشیر مغل کی کہی گئی بیشتر نظموں کو "دھواں دھواں کشمیر" کے عنوان سے مجموعے کی صورت میں مرتب کر دیا گیا ہے۔ کشمیر میں تحریک جہاد کے سلسلے میں جو بھی حالات و واقعات پیش آئے اور بربریت نے وہاں جس قسم کے سانحات کو جنم دیا، اس مجموعے میں اس کی جھلک دیکھی جا سکتی ہے۔ نظم "اہلِ کشمیر" کے چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

افق پہ دیکھو تو سورج نکلنے والا ہے — نظام تیرگیِ شب بدلنے والا ہے
حسین وطن کے حسیں باسیو! یقیں کرلو — الم کا لمحہ مسرت میں ڈھلنے والا ہے
گزار لو یہ کڑی ساعتیں وقت آ پہنچا — خدارا اس سانپ کا سر اب کچلنے والا ہے
ہر ایک ذرہ تقدم مآب وادی کا — غضب کا، قہر کا لاوا ابلنے والا ہے[۱۳۱]

ماجد صدیقی کی متعدد تصانیف اردو، انگریزی اور پنجابی زبانوں میں شائع ہوئیں۔ "دیوار گریہ" کشمیر و فلسطین سے متعلق ان کی نظموں کا مجموعہ ہے۔ انھوں نے کشمیر اور اہل کشمیر کے کرب کا نہ صرف احساس کیا بلکہ لہو میں ڈوبی کشمیر کو اپنی شاعری کا موضوع بھی بنایا۔ اس مجموعے کے آغاز ہی میں "میں نہ کہہ دوں" کے عنوان سے جو نظم ہے اس کے مطالعے سے کشمیر کے سیاسی حالات سے مکمل واقفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ جب وہ کہتے ہیں کہ:

کب تلک ہو اسیری رہِ شوق کی — گردنوں میں زمانوں سے جو ہے پڑا
فکر کیوں کر نہ ہو مجھ کو اس طوق کی — کب تلک دیکھتا میں رہوں گا یونہی
فاختاؤں پر شاہیں جھپٹے ہوئے — پیڑ آکاس بیلوں میں لپٹے ہوئے[۱۳۲]

ماجد کشمیر پر غیروں کے تسلط اور جبر کو اپنی روح پر لگے زخم کی مانند محسوس کرتے ہیں اور اس احساس کو جب لفظوں کا روپ دیتے ہیں تو قاری کے ذہنوں تک اس کیفیت کا بھرپور تاثر پہنچنا لازمی ہو جاتا ہے۔ وہ اس جبر کے خلاف کلمۂ حق بلند کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

ایک تسلط / جبر اور جور کا ایک تسلسل / جس کا واویلا ہے / نصف صدی پر پھیلا / کوئی
نہیں کیا؟ / جو یہ واویلا نبٹائے / جسموں جسموں / کھولتے اور ابلتے خون میں صبح
سکونِ قلب سا ٹھہراؤ / لے آئے[۱۳۳]

کشمیر پر تخلیق کی گئی ان کی بہترین نظموں میں "مختارو"، "نادانیاں"، "ایک لا فہمی المیہ"، "جواب دو"، "سیدھا سا ایک سوال"، "ایک واضح حقیقت"، "دوٹوک"، "دم بخود"، "نیا عجوبہ"، "سارک کانفرنس" اور "ایک نظم خداوندانِ بھارت کے لیے" وغیرہ بڑی اہمیت کی حامل ہیں۔

ضلع باغ سے تعلق رکھنے والے اسلم راجا پیشے کے اعتبار سے وکیل تھے لیکن بچپن سے ہی شاعری سے لگاؤ پیدا ہوا۔ ''کونپل کا بدن'' ان کا پہلا شعری مجموعہ ہے۔ اس مجموعے میں کشمیر سے متعلق کی گئی شاعری کو اہمیت حاصل ہے۔ اسلم راجا کے ہاں بھی وطن کی آزادی کا احساس موج زن ہے۔ وہ انقلابی انداز کے نعرے کو اپنی شاعری کا حصہ بناتے نظر آتے ہیں۔ ملاحظہ کیجیے:

ہر دستِ فضا کو توڑ دو	سامراجیت کا ہر سر پھوڑ دو
روحِ آزادی سے رشتہ جوڑ دو	ہم نواؤ بس یہی تدبیر ہے

یہ وطن میرا وطن کشمیر ہے[۱۳۴]

راولاکوٹ سے تعلق رکھنے والے صابر حسین کا پہلا مجموعہ ''دشتِ تنہائی'' کے نام سے شائع ہوا۔ اس مجموعے میں بھی کشمیر سے متعلق متعدد نظمیں موجود ہیں۔ ''اے وادیِ کشمیر'' کے عنوان سے لکھی گئی نظم میں وہ کشمیریوں کی بے بسی اور لاچاری کو موضوع بناتے ہوئے اس قرض کی طرف اشارہ کرتے نظر آتے ہیں جو ابھی تک ادا نہیں ہو سکا۔ وہ کہتے ہیں کہ:

ہم تیرے خطا کار ہیں اے وادیِ کشمیر	غفلت کے گنہ گار ہیں اے وادیِ کشمیر
یہ تیرے حسیں ہاتھوں میں زنجیر کا کنگن	دل کے لیے آزار ہیں اے وادیِ کشمیر
جن نعروں سے بڑھتی نہیں کچھ خون میں حدت	تیرے لیے بے کار ہیں اے وادیِ کشمیر
لیکن ہیں کئی لوگ قدم جن کے ہمیشہ	اٹھتے ہیں سوئے دار اے وادیِ کشمیر[۱۳۵]

بوٹا خان راجس کا تعلق بھی میرپور آزاد کشمیر سے تھا۔ وطن سے دور انگلستان میں رہنے کے باوجود انھوں نے اپنے وطن کشمیر کے بارے میں نہ صرف سوچا بلکہ بڑے سلیقے اور قرینے سے اپنے شعری مجموعے ''زخم نرالے'' میں پیش بھی کیا۔ ان کی غزلوں میں بھی وطن کی محبت کی جھلک واضح ہے۔ شعر ملاحظہ کیجیے:

اس دہر کے مقتل میں بپا ظلم ہے ایسا	مظلوم کو فریاد بھی کرنے نہیں دیتے[۱۳۶]

مسعود کشفی کا تعلق بھی ریاست جموں و کشمیر کے ایک علمی اور ادبی گھرانے سے تھا۔ ''کاروان'' ان کی اردو اور کشمیری نظموں کا مجموعہ ہے۔ یہ نظمیں جذبہ حریت کی ترجمان ہیں۔ ان نظموں کے مطالعے سے آزادی کے جذبات کو یقیناً جلا ملے گی۔ ہمارے مزاحمتی ادب میں اسے اچھا اضافہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ ان کی شاعری اس کرب کا اظہار بھی ہے جو انھوں نے ۴۲ برس تک اپنے عزیز و اقارب کی جدائی میں سہے۔ وہ اپنے ذاتی غم کے ساتھ ساتھ کشمیر کے اس سانحے کو جو بھارتی اقوام کی مشق ستم کی وجہ سے جاری تھی، بھرپور انداز میں پیش کرتے ہیں۔ وطن کے جسم پر رسنے والے زخم ان کی شاعری کا بنیادی موضوع ہیں۔ اسی

لیے ان نظموں میں جذبات واحساسات کا ایک دریا موج زن دکھائی دیتا ہے۔ وہ اقبال کی طرز اختیار کرتے ہوئے قندیل نور اس طرح روشن کرتے ہیں:

مٹاتی ہے دلوں سے تیرگی عہدِ غلامی کی ضمیرِ ملتِ آزاد کی تشکیل باقی ہے[۱۳۷]

ناز کولگامی کے کشمیری ترانے کا اردو ترجمہ "مجاہدین کا ترانہ" کے نام سے کچھ اس طرح کیا کہ یہ نظم ترجمے کے بجائے اصل تخلیق معلوم ہوتی ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

پھر جاگ اٹھی قوم کی سوئی ہوئی تقدیر بیدار ہے بیدار ہے بیدار ہے کشمیر
اب ایک نیا دور نیا رنگ لیے ہے اب نغمہ نئے سوز کا آہنگ لیے ہے
اب ظلم کی کوئی نہ یہاں رسم چلے گی ملت کے مخالف کو سزا خوب ملے گی
واللہ یہ ہے کاتبِ تقدیر کی تحریر بیدار ہے بیدار ہے بیدار ہے کشمیر[۱۳۸]

یوم تاسیس کے موقع پر کہی گئی ان کی ایک نظم نے بے پناہ مقبولیت حاصل کی۔ اکثر محفلوں میں اس نظم کو دہرایا جاتا۔

اک نئے عزم نئے جوش کے ساتھ یوم تاسیس منانا ہے ہمیں
وادیِ گل تیری عظمت کی قسم تجھ کو آزاد کرانا ہے ہمیں
آج اس پار جو ہیں محوِ فغاں ان کو سینوں سے لگانا ہے ہمیں
توڑ کر عہدِ خزاں کا افسوں مژدہ آزادیِ گلشن کا سنانا ہے ہمیں[۱۳۹]

مشتاق شاد بھی غزل کے قادر الکلام شاعر تھے۔ "ریگ رنگ" اور "نمبل" وغیرہ ان کے شعری مجموعے ہیں۔ خصوصاً "نمبل" کا موضوع کشمیر سے متعلق ہے۔ یہ مجموعہ اس دور میں شائع ہوا جب کشمیر میں تحریک آزادی اپنے عروج پر تھی۔ اس مناسبت سے چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

پھر خونِ جگر نامِ وطن کر دیا میں نے ہر شاخ پہ کانٹے کو چمن کر دیا میں نے
اٹھ دیکھ تیری وادیاں جنت کی طرح ہیں کشمیر تجھے رشکِ عدن کر دیا میں نے
اب خونِ شہیداں ترے ماتھے پہ سجے گا تیرے لیے روحوں کو بدن کر دیا میں نے[۱۴۰]

شاد کے ہاں ایک فکری مزاحمت کی جھلک بھی دکھائی دیتی ہے۔ ان کے ہاں لوک گیتوں کا رنگ بھی ہے اور غزل کی تازہ خیالی بھی، لیکن کہیں کہیں گیت نما ترانوں میں کشمیر کے حوالے سے تلخ نوائی بھی دکھائی دیتی ہے۔ "چلو کشمیر چلتے ہیں" کا ایک بند دیکھیے:

یہاں جو کچھ بھی کرتے ہیں وہاں بھی ہو رہا ہو گا نظر کے سامنے رکھی ہوئی ادھڑی ہوئی لاشیں
کوئی معصوم سا بچہ اکیلا رو رہا ہو گا چلو کشمیر چلتے ہیں، چلو کشمیر چلتے ہیں[۱۴۱]

''نمبل'' میں شامل منظومات میں ''دعا''، ''فتح مبین کی بشارت''، ''شہادت کا امر گیت''، ''گلنار تجھے ارضِ وطن کر دیا میں نے''، ''یہی ہے سچائی''، ''ارض فردوس''، ''میرا نام ہے کشمیر''، ''ماں مجھے مت روکو''، ''میرے جلتے ہوئے کشمیر کی پیاری بہنا''، ''ہم مجاہد ہیں''، ''خاکِ وطن''، ''موجِ حریت''، ''مرے لہو سے مری خاک سرخ ہے''، ''ماں اجازت دے مجھے''، ''یہ سلسلہ دار ورسن ٹوٹ چلا ہے''، ''جو مجاہد گھر لوٹیں شام کو''، ''لہو کی آگ'' اور ''کرچی کرچی آئینہ'' وغیرہ اہمیت کی حامل ہیں۔

سید عارف ایک تجربے کار صحافی اور عمدہ شاعر کی حیثیت سے معروف رہے۔''لہو کی فصلیں'' ان کی نظموں کا مجموعہ ہے جو کشمیر کے پس منظر میں تخلیق کیا گیا۔ یہ مجموعہ ایک طرح کی دستاویز ہے جو ایک حساس شاعر نے خونِ دل میں انگلیاں ڈبو کر تحریر کی ہے۔ کشمیر کا دکھ سید عارف کی شاعری کا بنیادی حوالہ ہے۔ ''دشتِ بارود'' کے نام سے ابتدائی نظم میں ہی وہ کشمیری مجاہدین کا مقدمہ لڑتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

کتنی ہی تیز ہوں / ظلم کی بارشیں / جبر کی آندھیاں / آتش وسنگ و آہن کی کتنے ہی
طوفان اٹھتے رہیں / شوق کی راہ میں / خاک اور خون کے کتنے سیلاب اڈتے
رہیں / شاخِ جاں پر شراروں کے بادل برستے رہیں / ہر نفس گولیوں سے ہو چھلنی
مگر / ہم کسی طرح بھی رکنے والے نہیں / جھکنے والے نہیں[۱۴۲]

ظالم کو للکارتے ہوئے انھیں پختہ یقین تھا کہ ایک نہ ایک روز یہ ظلم کی سیاہ رات ضرور ختم ہو گی اور امید کا دیا روشن ہو گا۔اسی لیے وہ کہتے ہیں کہ:

اے ظالم دوراں مجھے جو چاہے سزا دے لیکن تیری بیعت مجھے منظور نہیں ہے
اب صورتِ حالات مرے بس میں ہے عارف اب میری ہر اک شام گماں صبح یقیں ہے[۱۴۳]

وہ ان مظالم پر نوحہ کناں بھی دکھائی دیتے ہیں اور کشمیر پر ہونے والے مظالم کے خلاف معصوم لوگوں خصوصاً اس ماں کے استفسار کو ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں جس کا سب کچھ اس سے چھین لیا گیا اور اس بڑھاپے میں اسے جوان بیٹوں کی نعشوں کو کفن دینا پڑا۔

گرے گی ٹوٹ کر جسموں سے آخر دہکتے شعلوں کی زنجیر کب تک
یہ کس نے میرے نشیمن میں آگ بھر دی جلا دیا مرا ہنستا ہوا چمن کس نے
سپرد رقصِ فنا کس نے کر دیا مجھ کو یہ نوچ ڈالا ہے سپنوں کا بانک پن کس نے[۱۴۴]

وہ کشمیر کو عہد حاضر کی کربلا سے تعبیر کرتے ہیں۔ مسلسل ظلم نے جو ماحول کشمیر میں پیدا کر دیا تھا اس نے مایوسی کے گہرے بادل ضرور طاری کر رکھے تھے لیکن مجاہدین کی جدوجہد اس تاریکی میں امید کی کرن بن کر چمکتی تھی۔ اس حوالے سے شاعر کا کہنا تھا کہ:

یہ عہدِ حاضر کی کربلا ہے / کہ تو اکیلا / کئی یزیدوں کے لشکر میں گھرا ہوا ہے / حسین
بن کر ڈٹا ہوا ہے... تو روشنی ہے / افق افق پھیلتا اجالا / جسے اندھیرے کی کوئی
سازش / کبھی نہ زنجیر کر سکے گی / کبھی نہ تسخیر کر سکے گی [۱۴۵]

عزم و حوصلے کی داستان رقم کرتے کرتے ایک نسل سے دوسری نسل تک جاری سفر کو شاعر کچھ انداز سے بیان کرتے ہیں کہ ہر منظر بہت واضح اور نمایاں ہوتا چلا جاتا ہے۔

ہے میری عادت یزید لمحوں میں مسکرانا ہے میری فطرت رعونتوں کو شکست دینا
لہو کی یہ لہلہاتی فصلیں یہ بازوؤں کی سلگتی شاخیں
یہ خون میں غسل کرتی نسلیں سروں کے روشن چراغ ہر سو
مری روایت یہی ہے میرا چلن یہی ہے

حنین ہو بدر کی فضا ہو احد ہو میدانِ کربلا ہو
کہ میں ازل سے بہ لوحِ گیتی رفاقتیں تحریر کر رہا ہوں
ستم کو زنجیر کر رہا ہوں [۱۴۶]

آگ کا دریا، سوال، خدائے برتر، چلو کہ منزل پکارتی ہے، میں جینے کا مرنے کا فن جانتا ہوں، لہو کے دیپ، بدگمانی کا زہر، حنین بن کر حسین بن کر اور بے حسی کی گرد وغیرہ ان کی ایسی نظمیں ہیں جو کشمیر کی حریت فکر میں اہمیت کی حامل ہیں۔ انھوں نے کشمیر کی جدوجہد کے ہر شہید کو فرداً فرداً خراج تحسین پیش کیا۔ کبھی وہ مجاہد مجید وانی کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

یہ تیرا ملح و ملائم بدن یہ لہو میں نہایا ہوا جسم تیرا
شجاعت کے جاں بازیوں کے افق پر ستاروں کی صورت چمکتا رہے گا [۱۴۷]

سید عارف کی شاعری تحریکی ادب کے حوالے سے اہم حوالہ ہے۔ اردو کے مزاحمتی ادب میں اسے ہمیشہ ایک بلند مقام دیا جائے گا۔

نثار ہمدانی بھی کشمیر کے شعرا میں ایک معتبر نام ہے۔ ”چنار، چاندنی اور چنبیلی“ ان کا پہلا شعری مجموعہ ہے۔ چنار کو نثار کی شاعری میں خاص اہمیت حاصل ہے۔ وہ اسے محض ایک درخت نہیں بلکہ اپنے وطن کا دوسرا نام گردانتے ہیں۔ اس لیے چنار ان کی فکر و نظر کا محور و مرکز بن کر ابھرا۔ وطن کو ماں سمجھنے والے اس شاعر نے اپنی تخلیق کو بھی اسی سے منسوب کرتے ہوئے اس کے نغمے گائے۔ انھوں نے کشمیر میں جاری تحریک کے لمحہ بہ لمحہ بدلتے مناظر کو اپنی شاعری کے کینوس میں قید کیا۔ خصوصاً بعد کے حالات میں جو کچھ واقعات پیش آئے وہ نثار کی شاعری میں بہ آسانی تلاش کیے جاسکتے ہیں۔ مثلاً ۱۱ فروری ۱۹۹۲ء کو جب ہزاروں کشمیریوں نے آزاد کشمیر سے سری نگر کی طرف خونی کنٹرول لائن توڑنے کی کوشش میں مارچ کا آغاز کیا تو شاعر نے ان مناظر کو اس طرح پیش کیا:

وہ ظلمتوں کی سر زمیں پہ روشنی کے ترجماں ہیں پستیوں کے درمیاں میں عظمتوں کے جو نشاں

نکل پڑے ہیں لے کے اب ہتھیلیوں پہ اپنی جاں سری نگر کی سمت ہیں رواں دواں رواں دواں[۱۴۸]

نثار کو تقسیمِ کشمیر اور غلامی کے کرب کا بھرپور احساس تھا۔ مقبول بٹ نے شہادت پا کر جس طرح اس پورے نظام کے خلاف بغاوت کی، نثار کے خیال میں یہی جذبہ تمام کشمیریوں کے دلوں میں موج زن ہے۔ ایک نظم میں وہ ان خیالات کو پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

میں ایک سوچ ہوں ذہنوں میں گھر بناؤں گا میں ایک دور ہوں صدیوں پہ پھیل جاؤں گا

کہاں کہاں سے دباؤ گے کیسے روکو گے! میں انقلاب ہوں سینوں میں پھوٹ آؤں گا[۱۴۹]

نثار ہمدانی کے دل میں وطن کی محبت کا جو لاوا ابلتا ہے، وہ اسے شعری قالب میں ڈھال کر اپنے وطن کو تحفے کے طور پر پیش کرتے چلے جاتے ہیں۔ ایک نظم ”تم اور میں“ کے عنوان کے تحت وہ نوجوانوں کی جدوجہد پر ان کا عزم، و حوصلہ بڑھاتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

تم دیس کا نغمہ ہو تم فکرِ وطن بھی ہو تم رنگ ہو دھرتی کا تم حسنِ چمن بھی ہو

تم ایک نئے کل کی تابندہ روایت ہو تم مثل چناروں کے دھرتی کی علامت ہو[۱۵۰]

نسل در نسل سے جاری اس جدوجہد میں لوگوں کی عمریں بیت گئیں لیکن ابھی تک منزل تک پہنچنے کی کوئی سبیل پیدا نہیں ہوئی۔ اسی فکر مندی کا اظہار کرتے ہوئے شاعر کہتے ہیں کہ:

وہ رنگ و روپ لطف و شرارت وہ شوخیاں موجِ مزاج کی وہ روانی بھی چھن گئی

بچپن کے ساتھ ہی بڑھاپے میں ڈھل گیا فکرِ وطن میں مجھ سے جوانی بھی چھن گئی[۱۵۱]

نظموں کے ساتھ ساتھ ان کی غزلوں میں بھی کشمیر کے مسائل کو اجاگر کر کے انھوں نے اپنی شاعری کو بامقصد بنانے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ آپس کی اس قدر قربت ور رشتے داریوں کے باوجود دونوں طرف کے کشمیری ربط و تعلق کے معاملے میں جس قسم کی دشواریوں کا سامنا کر رہے تھے ان کا اظہار کرتے ہوئے ایک شعر میں کہا کہ:

اس قدر دشوار ان کا تذکرہ ہو جائے گا　　　کیا خبر تھی ربط بھی ایک مسئلہ ہو جائے گا[۱۵۲]

افتخار مغل بھی کشمیر کے نام ور قلم کاروں میں سے ایک ہیں۔ ان کا پہلا شعری مجموعہ "لہو لہو کشمیر" اپنے موضوعات کے حوالے سے کشمیری ادب کی تاریخ میں خاصی اہمیت کا حامل ہے۔ اس مجموعے کے پہلے شعر سے ہی افتخار مغل کے نظریات کا پوری طرح اندازہ ہو جاتا ہے:

یزیدیت کی مہیب شب میں حسینیت کے دیے جلیں گے　　　تمام تر مصلحت کے باوصف بھی ہمارا یہ فیصلہ ہے[۱۵۳]

ایک وطن دوست شاعر کی حیثیت سے انھوں نے اس دھرتی سے اپنے رشتے کا اظہار کچھ ان الفاظ میں کیا:

میں تیری کوکھ سے ابھرا بڑھا پلا تجھ میں　　　مرے وطن تو مجھے ہو بہو ہے ماں کی طرح

جدا کرے گا بھلا کوئی کیا مجھے تجھ سے　　　کہ تیرا میرا تعلق ہے جسم و جاں کی طرح[۱۵۴]

اس جسم و جاں کے تعلق کے اظہار کے ساتھ اس دھرتی ماں پر روا رکھے جانے والے مظالم کس طرح شاعر کو گوارا ہو سکتے تھے۔ وادی کا ہر گوشہ جہاں ظالموں نے طرح طرح کے مظالم کا بازار گرم کر رکھا تھا، کشمیر کا چپا چپا اس بربریت کا شکار تھا۔ اس ظلم و ستم کو دیکھ کر بھلا شاعر کیسے خاموش رہ سکتا تھا۔ لہٰذا اس کا اظہار کچھ اس طرح ہوا:

جب کوئی خاک میں لتھڑا ہوا لاشہ دیکھوں　　　کسی دہلیز پہ ڈھاکا ہوا بے گور و کفن

اجلے ملبوس پہ تہذیب کا دھبا بن کر　　　ثبت ہو جاتا ہے جس لاشے کا سوزِ باطن

صفحۂ وقت کی پیشانی پہ جس کا مدفن　　　سوچتا ہوں کہ میری آنکھوں کو کب تک آخر

دیکھنا ہو گا یہ ماحول کا خونی منظر[۱۵۵]

افتخار اپنی شاعری کو اس دھرتی کا قرض گردانتے ہیں۔ وہ ہر دم اس احساس کے ساتھ جیتے ہیں کہ اس قلم کے قرض کو کیسے اتارا جائے اور اس کا اظہار بھی کرتے دکھائی دیتے ہیں:

قلم اٹھایا ہے تجھ پر تو یوں لگا مجھ کو　　　کہ سر نگوں ہے ترے قرض سے ہنر اپنا

یہ قرض اپنی جگہ ہے مگر ترے اوپر　　　خلوصِ عشق تو روشن ہے کاشمر اپنا[۱۵۶]

وہ اس ظلم کی سیاہ رات سے نجات کے لیے اپنے لہو کے دیے جلا کر کشمیر کی آزادی کے خواہش مند دکھائی دیتے ہیں۔ وہ قربانیوں کی بابت کہتے ہیں کہ:

لہو مانگتی ہے چناروں کی دھرتی بہاروں کا دیس، آبشاروں کی دھرتی
اٹھو! اس کو خونِ جگر سے سجائیں اٹھو! ظلمتِ شب میں شمعیں جلائیں
صدا میں صدا خون میں خوں ملائیں یہ اپنی زمیں، اپنے پیاروں کی دھرتی

لہو مانگتی ہے چناروں کی دھرتی[۱۵۷]

وہ ظلم اور جبر کے اس موسم کو نہیں بھول پاتے اور ان کرب ناک مناظر کو بیان کرتے ہوئے وہ انتہائی جذباتی انداز میں کہتے ہیں کہ:

بڑا بے کیف موسم ہے اندھیروں کا تسلط ہے یہ دن جب سوچ پر گھمبیر پہروں کا تسلط ہے
دعائیں بدعا بننے سے پہلے ٹوٹ جاتی ہیں صدائیں التجا بننے سے پہلے ٹوٹ جاتی ہیں
خلل آمادہ ہیں ہستی کی نبضیں لمحے ویراں ہیں بڑی مدت ہوئی حالات کے گیسو پریشاں ہیں
خزاں کے پاؤں آکر رک گئے ہیں اپنے آنگن میں حدیثِ دلبری تحریر ہے ہر سمت گلشن میں[۱۵۸]

وطن میں پھیلنے والی تیرہ شبی اور مایوسیوں کے بادل شاعر کو بھی شدید مایوسی کا شکار کر دیتے ہیں۔ مایوسی کے کسی منظر کو شاعر فراموش نہیں کر پاتا۔ ۲۷ اکتوبر ۱۹۴۷ء کی وہ خونیں شب ہو جب بھارتی قابض فوجیوں نے اس پاک دھرتی پر قبضہ کر کے اپنے ناپاک عزائم کو پایہ تکمیل تک پہنچایا تو شاعر نے ان مناظر کو کچھ اس طرح پیش کیا:

وہ بھی اک رات تھی شبنم میں نہائی ہوئی رات وہ بھی اک رات تھی خوابوں سے بسائی ہوئی رات
وہ بھی اک رات کا لمحہ تھا بھیانک لمحہ جب سیاہ رات کا ایوان لرز اٹھا تھا
نیند کافور ہوئی رات کا منظر بدلا دیکھتے دیکھتے ہر آنکھ سے کاجل پھیلا[۱۵۹]

لیکن افتخار کو یہ پختہ یقین ہے کہ یہ سیاہ رات کے بادل ایک نہ ایک روز ضرور چھٹ جائیں گے اور اس جبر کی سیاہ رات کے بعد آزادی کا سویرا ضرور طلوع ہو گا۔ اس لیے وہ کہتے ہیں کہ:

ظلم پھر ظلم ہے / اس کا پندار کیا / ایک دن امن کی ایک ننھی کرن / دیکھتے ہی دیکھتے
جبر کے سب اندھیرے نگل جائے گی[۱۶۰]

وہ امن کی بات ضرور کرتے ہیں مگر قاتلوں کو ان کے کیے کی سزا دیے بغیر چین سے نہ بیٹھے رہنے کا عزم کرتے ہوئے یہ بھی کہتے ہیں کہ:

نہیں اے قاتلو! دامن تمھیں دھونے نہیں دیں گے		ہم اپنے خون کی بے حرمتی ہونے نہیں دیں گے[۱۶۱]

حقیقت بھی یہی ہے کہ ان حریت پسندوں کے خونِ ناحق کو شاعر کیسے فراموش کر سکتے تھے۔ وہ تو اپنی نظموں میں ہر دم انھیں خراجِ تحسین پیش کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ کبھی وہ شہدائے چکوٹھی کو یہ یقین دلاتے ہیں کہ:

فصیلِ جبر مسلسل پھلانگنے والو		تمھارا نقشِ کفِ پا ہماری منزل ہے[۱۶۲]

تو کبھی وہ مقبول بٹ کی جلائی ہوئی شمع کو ہمیشہ جلائے رکھنے کا عزم کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

تو نے جو شمع جلائی تھی لہو سے اپنے		جگ مگا اٹھا ہے آج اس سے ہر اک ذرہ تری دھرتی کا

تو نے جو راہ سجھائی تھی ہمیں ظلمت میں		آج اس دھرتی کا ہر بیٹا اسی پر ہے رواں[۱۶۳]

اور کبھی وہ کیپٹن حسین خان شہید اور کرنل خان محمد خان جیسے زندہ جاوید کرداروں کا حوالہ دیتے ہوئے کشمیری نوجوانوں کو ان کے نقشِ قدم پر چلنے کی تلقین کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

انھی سے زندگی کرنے کی رسم چلنی ہے		سروں سے اپنے جو دار و رسن سجاتے ہیں

یہ بندگانِ محبت بھی ہیں غنی کیسے		خوشی سے زیست کے اشرفیاں لٹاتے ہیں[۱۶۴]

تحریک آزادیِ کشمیر اور تاریخِ کشمیر کا ورق ورق شاعر کے سامنے کسی فلمی سین کی طرح چلتا دکھائی دیتا ہے۔ وہ ان مشاہدات کی روشنی میں کشمیر سے متعلق اس بارے میں پر عزم دکھائی دیتے ہیں کہ اب وہ وقت دور نہیں جب ظلم کا ہر باب بند ہو جائے گا اور شاعر کے مطابق:

کشمیر تیرے بیٹوں نے یہ عہد کیا ہے		اب اہلِ ستم سے تجھے آزاد کریں گے

ہر سانس پہ پابندیاں ہر سوچ پہ قدغن		سمٹی ہوئی سہمی ہوئی ہر سینے میں دھڑکن

زنداں نما گل بام، قفس رنگ نشیمن		ٹوٹیں گے مگر اب یہ زبردستی کے بندھن[۱۶۵]

قطعات اور غزلیات کے علاوہ "ظلم کا زہر گھولنے والے"، "اے شہر جاناں"، "کشمیر توجہ چاہتا ہے"، "یہ حشر ہے کیا"، "آنگن آنگن"، "سالِ نوبر"، "خون میں ڈوبی ہوئی عید مبارک"، "شہریاروں کی سازش"، "آج کی رات مجھ پہ بھاری ہے" اور "اب زنجیریں کٹ جائیں گی" وغیرہ ان کی بہترین نظمیں ہیں جن میں کشمیر کی جیتی جاگتی تصویر اپنی بھرپور توانائی کے ساتھ موجود ہے۔

کشمیر کے نوجوان شعرا میں اسرار ایوب نے بہت جلد ایک اہم مقام حاصل کر لیا ہے۔ ان کے دو مجموعے "برف سے حرف تک" اور "سرسوں برسوں کی" کا مطالعہ اس جانب اشارہ کرتا ہے کہ اس نوجوان شاعر کے ہاں امکانات کی ایک دنیا روشن ہے۔ ضمیر جعفری کے مطابق ان کے شعروں میں چناروں کے جلتے ہوئے لہجے کی آگ اور جہلم کے پانی کا درد جھلکتا نظر آتا ہے۔ ان کے دوسرے مجموعے "برف سے حرف تک" میں کشمیر اور اس میں جاری تحریک آزادی کی خوں چکاں داستان کے مناظر پوری آب و تاب کے ساتھ موجود ہیں۔ اس کتاب کا انتساب بھی تحریکِ آزادیِ کشمیر کے نام کیا گیا ہے۔ اسرار ایوب نے کشمیر کی جلتی وادی کی آگ کو بڑی شدت سے محسوس کیا اور اسے اپنی نظموں میں بیان کیا۔ وہ ان کرب ناک لمحوں کی بابت کہتے ہیں کہ:

نہیں سکوں نہ سہی کرب کا گماں ہی سہی   چلو خوشی نہ سہی درد کا بیاں ہی سہی

تھکی رتوں میں کبھی تو نکھار آئے گا   یہ درد ہو گا جب ہی تو قرار آئے گا

خیال ہو گا درخشاں سحر بھی آئے گی   ہو رات جتنی پریشاں گزر ہی جائے گی[۱۶۶]

کشمیر کے سلگتے ہوئے زخم اور سسکتی ہوئی زندگی شاعر کو ہمیشہ مضطرب اور بے چین رکھتی ہے۔ وہ عجیب گومگوں کیفیت کا شکار ہو کر ان مناظر کو اپنے ذہن و دل پر رقصاں پاتا ہے اور بے اختیار یہ کہنے پر مجبور ہوتا ہے کہ:

مجھ کو جلتی ہوئی فضاؤں میں   جب بھی آواز دے چنار کوئی

اور شگوفوں میں مسکرائے کوئی   کسمسانے لگے بہار کوئی

جب اچھالا ہو وقت نے سورج   جس کو پالے لہو کی دھار کوئی

موت سستی حیات مہنگی ہو   نصب بازار میں ہو دھار کوئی

جب ہو مجبوس ڈل کا پانی   اور اجڑتا ہو شالامار کوئی

سوچتا ہوں کہ کچھ نہ سوچوں میں[۱۶۷]

ایک جوان فکر شاعر ہونے کی حیثیت سے ان کا مخاطب زیادہ تر نوجوان ہیں۔ اسی لیے نوجوانوں کے عزم و حوصلے کر بڑھاتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

اے جوانانِ، نجیب و تر دماغ / تم شبِ تاریک میں / صبح فردا کے چراغ / توڑ دو / وادیِ
کشمیر کی زنجیر کو[۱۶۸]

اور ساتھ ہی سرحد پار مقبوضہ کشمیر کے لوگوں کو جس قسم کی پابندیوں کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ ظلم کے خلاف لب تک ہلانے کی آزادی نہ تھی۔ اس صورتِ حال میں شاعر کہتا کہتے ہیں کہ:

جبر لفظوں کو مٹا دے تو صدا بولتی ہے　　اتنا آسان نہیں ہونٹ کا سلنا لوگوں!
چار جانب سے عدو گھیرنے آئے گا تمھیں　　اپنے قدموں سے کسی طور نہ ہلنا لوگوں![۱۶۹]

خونی لکیر کے اس پار ہونے والے مظالم کا درد ہر وقت شاعر کے دل میں موج زن رہا۔ وہ وہاں مصروف عمل لوگوں کے ساتھ خود کو اس جدوجہد کا حصہ بنانے کا عزم کرتے ہوئے شاعر کا کہنا تھا کہ:

چلے چلو / ہاں چلے چلو / وادی کے چنار بلاتے ہیں / مہجور سلاسل خانے سے / ہمیں
پیارے یار بلاتے ہیں[۱۷۰]

اسرار ایوب کی شاعری آزادیِ وطن کے لیے مصروف لوگوں کی ہم زبان و ہم سفر ہے۔ وہ ان کشمیریوں کے دکھ میں ساجھے داری کر کے اس کرب کو خود بھی محسوس کرتے ہیں اور اپنی شاعری کے ذریعے دوسروں کو بھی محسوس کراتے ہیں۔ ''حقیقت بھرے فریب''، ''بلا عنوان''، ''یومِ حساب''، ''مجھے میرا پتا دینا''، ''خود اپنی نفی''، ''سناٹا''، ''تو کیا ہو گا''، ''ایک اور سوال'' اور ''یہ لہو آنکھ میں'' وغیرہ جیسی نظمیں اسی کرب کا احساس لیے ہوئے ہیں۔ لیکن اس رجائیت میں بھی ہمیں وہ للکار سنائی دیتی ہے جو دشمنوں کے دلوں میں لرزہ طاری کر دے۔ جیسے:

کر دیں گے آگ چناروں کو　　مرنے نہیں دیں گے یاروں کو
صدیوں کی رسمِ وفا کی قسم　　چھوڑیں گے نہیں غداروں کو
ماں اپنے گبھرو بیٹے کو　　خود آپ کفن پہنائے گی
اک شاخ اگر مرجھا بھی گئی　　گلشن پہ جوانی آئے گی[۱۷۱]

شاعر اس امید پر نوجوانوں کو صبحِ نو کی بشارت دیتا دکھائی دیتا ہے کہ:

شبِ ستم شبِ فرقت بھی کٹ ہی جائے گی　　کبھی تو صبحِ تمنا افق پہ چھائے گی
ذرا سا صبر، اداسی بھی رنگ روئے گی　　یہ زرد پتے جھڑیں گے، بہار آئے گی[۱۷۲]

رحیم داد ساگر بھی کشمیر کے مسائل اور مصائب پر گہری نظر رکھے ہوئے ہیں۔ ''کوئے مقتل'' ان کا پہلا شعری مجموعہ ہے جس میں عمل اور جدوجہد کے پیغام کو شعری قالب میں ڈھال کر اپنے جذبات و خیالات کو پیش کیا گیا ہے۔ اشعار ملاحظہ کیجیے:

ہم نے ظلم کو ظلم کہنے کی عادت سی بنا لی ہے　　حق چھین لے لینے کی عادت سی بنا لی ہے
سب قرض چکانے سوئے مقتل چلیں گے　　دستِ قاتل آزمانے کی عادت سی بنا لی ہے[۱۷۳]

میاں کریم اللہ قریشی بھی کشمیر کے معروف قلم کاروں میں سے ہیں۔ وہ بھی اپنی شاعری کے ذریعے تحریک آزادیِ کشمیر کے قلمی جہاد میں شامل ہوئے۔ ان کا پہلا شعری مجموعہ ''خضر دیکھتا ہے وُلر کے کنارے'' منفرد حیثیت کا حامل ہے۔ نظم کا ایک بند ملاحظہ کیجیے:

ہمالہ کے چشموں کے عالم میں چرچے — جریدوں، رسالوں کے کالم میں چرچے
رسائل و جرائد بھرے ان سے سارے — خضر دیکھتا ہے ولر کے کنارے
ہمالہ کے چشمے جو ابلے ہیں سارے — لگے ان میں طوفان دیتا اشارے
لگے گی نہ بھارت کی نیّا کنارے — خضر دیکھتا ہے ولر کے کنارے[۱۷۴]

پروفیسر رفیق بھٹی کا نام آزاد کشمیر کے علمی و ادبی حلقوں میں کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ وہ عملاً جدوجہد آزادی سے منسلک رہے۔ شعر گوئی کا شوق بچپن ہی سے تھا۔ لہٰذا ان کے مجموعے ''ستونِ دار'' کی شاعری کی بنیاد اور مواد کشمیر اور تحریک آزادیٔ کشمیر سے متعلق نظمیں ہی بنیں۔ وہ خود تحریک آزادیِ کشمیر کو اپنے فن کی اساس قرار دیتے ہیں۔ اس مجموعے کے آغاز ہی میں شاعر رب کریم کے حضور سربسجود دعا کرتا ہے کہ:

کشکول آرزو کا اٹھائے ہوئے ہوں میں — سر کو ترے حضور جھکائے ہوئے ہوں میں
لب پہ دعا ہے ہاتھ اٹھائے ہوئے ہوں میں — نظریں ترے کرم پہ جمائے ہوئے ہوں میں
میرے وطن کو اب تو غلامی سے دے نجات — تجھ سے نہیں بعید کچھ اے رب کائنات[۱۷۵]

''ستون دار'' کی پوری شاعری رفیق بھٹی کا نقش اوّل ہے جس میں ان کا خونِ جگر شامل ہے۔ وہ قوم کی غلامی کے اسباب اور جواز پر مستقل طور غور و فکر کرنے والے شاعر ہیں۔ لہٰذا ''شکوہ'' اور ''جوابِ شکوہ'' کے انداز میں وہ اپنے رب سے وطن کی طویل غلامی کے متعلق فریاد کناں ہیں۔

قوت گویائی بخشی ہے تو فریاد بھی سن

سر زمینِ لالہ و گل آج خوں آلود ہے — جانے کیوں کشمیر سے رحمت تری مفقود ہے
تیرے ہی بندے ہیں یہ تو ان کا معبود ہے — ان کی محکومی سے آخر تیرا کیا مقصود ہے
جنتِ ارضی کے باسی آج تک محکوم ہیں — کس قدر مجبور و بے بس بے نوا مظلوم ہیں
جو میری آنکھوں نے دیکھا دل پہ جو گزری کہی — یہ تیرے نزدیک شکوہ ہے تو شکوہ ہی سہی[۱۷۶]

اس شکوے کے ساتھ وہ کشمیری قوم کی نااہلی سے بھی اچھی طرح واقف ہیں اور اس کا اظہار جوابِ شکوہ کے ان اشعار میں ہوتا ہے:

تم ہو آدابِ ستونِ دار سے نا آشنا ہفت خوانِ صبحِ آزادی کجا اور تم کجا
قوم ہوتی ہے وہی اقوامِ عالم میں پسند جو شعورِ سرفرازی سے رہے شیرازہ بند
پرچمِ اسلاف رکھتی ہے ہمیشہ سر بلند موت جس کو زندگی سے زیادہ ہو ارج مند
اس نگر کے باسیوں کو راس آزادی نہیں تین صدیوں سے جنھیں احساس بربادی نہیں[۱۷۷]

رفیق بھٹی آزادی کی راہ میں اپنی جانیں نچھاور کرنے والے شہدائے کشمیر کو زبردست خراج عقیدت پیش کرتے ہیں۔ کبھی وہ مقبول بٹ کی طرح وفا کا درس دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

چوم کر خاکِ وطن عہد کیا تھا اس نے اے مری خاکِ وطن جانِ وفا ذوقِ جبیں
تجھ کو اغیار کے پنجے سے چھڑا ڈالیں گے رشکِ فردوسِ بریں تجھ کو بنا ڈالیں گے
تذکرہ جب بھی شہیدوں کا کیا جائے گا اس وفا کوش کا بھی نام لیا جائے گا[۱۷۸]

اور کبھی شہدائے چکوٹھی کو یاد کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

خونِ دل سے تم نے دیکھی ہے نرالی داستاں جس نے مٹی کو بنا ڈالا ہے رشکِ آسماں[۱۷۹]

وہ ہر خوشی کو کشمیر کی آزادی سے مشروط کرتے ہوئے یوم تاسیس کے موقع پر کہتے ہیں کہ:

اگر بربادیوں کی زد میں ہے کشمیر کی وادی ہمیں زیبا نہیں ایسے میں کوئی جشن آزادی[۱۸۰]

انھیں اس بات کا کامل یقین ہے کہ آزادی کی صبح جلد طلوع ہونے والی ہے۔ اسی امید کا دامن تھام کر وہ کہتے ہیں کہ:

افق سے صبحِ آزادی درخشاں ہونے والی ہے میرے کشمیر کی وادی زر افشاں ہونے والی
ہے[۱۸۱]

"اے وادیِ لولاب"، "اعلان آزادی"، "احمد شمیم کی یاد میں"، "گنگا جمنا کے باسیوں سے" اور "دخترِ کشمیر" وغیرہ جیسی بہترین نظموں کے علاوہ انھوں نے کشمیر پر متعدد ترانے بھی لکھے۔ وہ ایسے سلجھے ہوئے شاعر تھے کہ شعر میں بھی وطن کی غلامی کا تجزیاتی انداز موجود ہے۔ ان کے دوسرے مجموعے "لہو نگر" میں بھی متعدد نظمیں ان ہی موضوعات کا احاطہ کرتی ہیں۔ اس مجموعے کو بھی اردو کے مزاحمتی ادب میں اضافہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ ان کی بعض نظموں کے مناظر اس خون میں ڈوبے ہوئے کشمیر کے مناظر ہیں جس پر عالمی برادری اب بھی خاموش ہے۔ وہ ان مناظر کے بیان میں کہتے ہیں کہ:

لت پت ہے خوں میں وادیِ لولاب آج کل حیرت زدہ ہیں جھیل کے گرداب آج کل
آب و ولر موجہِ خوں ناب آج کل اس ظلم کے خلاف میں تدبیر کیا لکھوں
نوحہ لکھوں کہ مرثیہ تحریر کیا لکھوں شعلوں کی زد میں ہے مرا کشمیر کیا لکھوں[۱۸۲]

انھوں نے ہمیشہ قلم سے جہاد کا کام لیا۔ وہ اپنے ہم عصر، ہم قلم اور نغمہ گروں کو واضح پیغام دیتے ہوئے شاعری کی مقصدیت پر زور دیتے ہیں اور بے مقصد شاعری سے پیچھا چھڑانے کی نصیحت کرتے نظر آتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ:

حریّت کا سلسلہ فکر و ادب سے جوڑ دو ۔۔۔ سوچ کے سب زاویے بس اس کی جانب موڑ دو

جس میں آزادی نہ ہو اس شاعری کو چھوڑ دو ۔۔۔ جو قلم نغماتِ آزادی نہ لکھے توڑ دو

شاعری کو قوم کی آواز ہونا چاہیے ۔۔۔ شعر ہر اک حریت کا ساز ہونا چاہیے[۱۸۳]

سردار بشیر احمد صدیقی اپنی بہت سی تصنیفات کی وجہ سے علمی و ادبی حلقوں میں بلند مقام رکھتے ہیں۔ ''دیوان صدیقی'' ان کا پہلا شعری مجموعہ ہے جو چھے حصوں پر منقسم ہے۔ اس دیوان میں کشمیر کی معروف شخصیات اور حریت پسند رہنماؤں پر بھی نظمیں موجود ہیں۔ ممتاز کشمیری سیاست دان کے۔ ایچ۔ خورشید کی جرأت مندی کو سلام پیش کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ:

گلشنِ کشمیر کی رونق تھا وہ تو بے گماں ۔۔۔ جس کی ہمت اور جرأت تھی ہمیشہ ضوفشاں

جب چلی تحریکِ آزادی تو اک للکار تھا ۔۔۔ جنگِ آزادی میں وہ اک قافلہ سالار تھا

کاشمر کشمیریوں کا ہے وطن کہتا تھا وہ ۔۔۔ اس صدا پر بے گماں جور و ستم رہتا تھا وہ[۱۸۴]

اسی طرح تہاڑ جیل میں پھانسی کا پھندا چومنے والے عظیم کشمیری حریت پسند مقبول بٹ شہید کے متعلق ان کا کہنا تھا کہ:

کس قدر معروف تھا مشہور تھا مقبول بٹ ۔۔۔ جہدِ آزادی میں کوہ طور تھا مقبول بٹ

قوتِ باطل کو للکارا تھا جس نے ہر گھڑی ۔۔۔ جانبِ منزل رواں رہتا تھا وہ مردِ جری

کس قدر درسِ شہادت دے گیا مقبول بٹ ۔۔۔ مسکراتا سوئے مقتل چل پڑا مقبول بٹ[۱۸۵]

ان کے بہت سے ترانوں میں دشمنوں کے خلاف ایک للکار کی فضا ہے۔ کشمیر اور اس کے چپے چپے سے محبت کا اظہار ان ترانوں میں دکھائی دیتا ہے۔ جیسے:

کشمیر کا ہر ذرہ اک ذرہِ تاباں ہے ۔۔۔ گلرنگ بہاریں ہیں، شاداب خیاباں ہے

کشمیر ہمارا ہے کشمیر ہمارا ہے

اغیار سے اے جنت ہم تجھ کو چھڑالیں گے ۔۔۔ اسلام کی خاطر ہم یہ جان لڑا دیں گے

باطل کے ارادوں کو ناکام بنا دیں گے ۔۔۔ تو آن ہماری ہے ہم سب کا سہارا ہے

کشمیر ہمارا ہے کشمیر ہمارا ہے[۱۸۶]

بلاشبہ ان کے جذبے نہایت صادق ہیں۔ وہ ان جذبوں کو سری نگر کے خیالوں کی توصیف میں بھی صرف کرتے ہیں اور ساتھ ساتھ اپنے وطن کے باسیوں کو بھی یہ ترغیب دیتے ہیں کہ ان کی مدد کا سامان کیا جائے۔ جیسے:

کشمیر چلو، کشمیر چلو لہراتے ہوئے شمشیر چلو
اس پار ہے کیسی آہ و فغاں کیسی ہے دار و گیر چلو
کشمیر چلو، کشمیر چلو لہراتے ہوئے شمشیر چلو[۱۸۷]

وہ صبح آزادی کا گیت گاتے ہوئے اپنے نوجوانوں پر نازاں وشاداں دکھائی دیتے ہیں۔ انھیں ان نوجوانوں پر پورا بھروسا ہے اور اسی بھروسے وہ اس طرح کے نغمے گاتے ہیں۔

مرحبا کشمیر تیرے نوجواں اب آگئے تیرے دشمن کو مٹانے پاسباں اب آگئے
اب زمانے بھر سے کہہ دو برملا اے دوستو آگئے ایماں بکف، خنجر کشاں اب آگئے[۱۸۸]

ماجد نذر بھی کشمیر کے نوجوان شاعروں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ ان کا مجموعہ کلام ''محبت پیراہن میرا'' میں غزلیں بھی ہیں اور نظمیں بھی۔ ان کی بعض نظمیں حب وطن اور تعمیر وطن کے جذبے سے سرشار دکھائی دیتی ہیں۔ جیسے:

آدھی صدی غلام رہے ہیں مگر ابھی آزاد مجھ کو یہ مرا کشمیر چاہیے
پابند کر سکے جو ستم کو بھی ایک بار ایسی بھی اب کہیں کوئی زنجیر چاہیے
اک انقلاب برپا کرے گی یہ نسلِ نو اک اک جواں کو سایہ شبیر چاہیے
ماجد حدیثِ وقت کی توقیر کے لیے تازہ لہو کو بھی نئی تفسیر چاہیے[۱۸۹]

مقصود الزماں سحر شہید محض شاعر ہی نہیں بلکہ ان کا اعزاز یہ ہے کہ وہ تلوار کے بھی دھنی تھے۔ انھوں نے بندوق تھامے عملی جدوجہد میں حصہ لے کر میدان کارزار میں جام شہادت نوش کیا۔ ''ہمیں رکنا نہیں آتا'' ان کا پہلا شعری مجموعہ ہے جس میں ایک شہید کے جذبات واحساسات شعر کی شکل ڈھل کر رجز کا ماحول پیدا کرتے ہیں۔ انھوں نے کشمیر کے خون آلود ماحول کی عکاسی کچھ اس طرح کی کہ:

ساری بستی لہو لہو دیکھی جو بھی چہرہ تھا خون خون ملا[۱۹۰]

انھوں نے جو زندگی بھی جی، وہ بڑی شان سے جی اور ہمیشہ اسی شان سے مرنے کا اظہار بھی کیا۔ لہٰذا ان خیالات کا اظہار بھی اپنے اشعار میں کیا۔ جیسے:

جییں تو غازی جو مر جائیں تو شہیدِ سحر ہمیں قبول نہیں کوئی درمیان کی بات
ذوقِ یقیں نے قلب کو بینائی بخش دی در کیا ہے میری راہ سے دیوار ہٹ گئی[۱۹۱]

ان کی سب سے اہم نظم ''کشمیر: عہد بہ عہد'' جو کہ تین حصوں پر منقسم ہے، پہلا حصہ عہدِ غلامی کا ہے۔ اس کا آغاز کچھ یوں ہوتا ہے کہ:

ضمیر موت کی وادی میں گم رہے جب تک شجر پہ آس کے تب تک ثمر نہیں آتے

دوسرا عہد بیداری کا ہے:

ہر اک جوان میں ٹیپو کی روح جاگی ہے ہوا ہے خواب سے بیدار دین کی خاطر

اور تیسرا حصہ عہد جہاد کا ہے:

بدل لیے ہیں زمانے نے اب چلن اپنے یہ دور تو ہے پرانا نظام ٹوٹے گا[۱۹۲]

انھوں نے کشمیری نوجوانوں میں جذبہ جہاد جگانے کی بھرپور اور عملی کوشش کی۔

دوستو رختِ سفر باندھو، چلو کشمیر کو تھام لو ہاتھوں میں اب ایمان کی شمشیر کو

میرے جذبے کہاں پابند ہیں زنجیروں کے عمر گزری ہے مری سائے میں شمشیروں کے[۱۹۳]

اسی لیے مجاہدوں کو امید کا پیغام اور فتح کی نوید دیتے ہوئے عزم و حوصلے سے کام لینے کی تلقین بھی کرتے نظر آتے ہیں اور ساتھ ہی عملی جدوجہد کی مثال بن کر وہ خود بھی میدان کارزار میں کود پڑتے ہیں:

سر کٹانے کی ادا جنگ کی خو لایا ہے اپنی مسلی ہوئی کچھ کلیوں کو تو لایا ہوں

خون دینے کے لیے جام و سبو لایا ہوں

عرض ہے کہ تم سے پیغامِ مجاہد سن لو جو بھی دیکھے ہیں فلک نے وہ شواہد سن لو

ہم رنگ اور ڈھنگ میں دنیا سے جدا ہیں کشمیر کی وادی پہ دل و جاں سے فدا ہیں

ہم ظلم کے رستے میں ہیں اک آہنی دیوار ہم اہلِ وطن کے لیے پیمانِ وفا ہیں

کشمیر کے ہر فرد کے ہونٹوں کی صدا ہیں ہم شیر خدا شیر خدا شیر خدا ہیں[۱۹۴]

کشمیر کی تحریک آزادی کے حوالے سے تخلیق ہونے والے شعری ادب میں اس مجموعے کی اہمیت سب سے الگ ہے۔ فنی طور پر ضرور خامیاں موجود ہیں لیکن جذبے کی صداقت نے اور میدان جنگ میں عملی شرکت نے اس کو کسی حد تک دبا دیا ہے۔ ”نجانے کیوں یاد آرہا ہے“، ”روشنی اے روشنی“، ”یہ البدر ہے“، ”مبارک باد اے چشم فطرت گواہ رہنا“ وغیرہ اس مجموعے کی اچھی شعری مثالیں ہیں۔

نو آموز شعرا میں منصور راٹھور کا شعری مجموعہ ”چلو میں ہار جاتا ہوں“ میں بھی کشمیر کی حریت فکر کے حوالے سے مواد موجود ہے۔ وہ غاصبوں کے رویوں کی شکایت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

ظلم سہتے ہی رہیں اور شکایت نہ کریں کیسے ممکن ہے اندھیروں سے عداوت نہ کریں

لب سلے، ہاتھ بندھے، جسم لہو رنگ ہوا اس پر سرکار یہ کہتے ہیں بغاوت نہ کریں[۱۹۵]

بعض شعرا کے مجموعے ابھی تک منظر عام پر نہیں آئے لیکن رسائل اور جرائد میں شائع ہونے والی نظموں اور تخلیقات سے ان کے موضوعات اور شعری حسن کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ قمر جرال کا شمار بھی ایسے ہی شعرا کی صف میں ہوتا ہے۔ ان کی ایک نظم ''خطاب'' کے کچھ اشعار دیکھیے:

جن کے لیے غلامی سراسر عذاب ہے ۔۔۔ ایسے ہی جاں فروشوں سے میرا خطاب ہے
لیڈر تو ہر کوئی یہاں خادم نہیں کوئی ۔۔۔ اس واسطے ہی ملک یہ زیرِ عتاب ہے[۱۹۶]

اسی طرح احمد قدیر راجا کی نظم ''دعا'' کا ایک بند ملاحظہ کیجیے:

اب خون کی بارش ہوتی ہے ۔۔۔ اب چاند سی دھرتی روتی ہے
اب میرے خواب کے بستر پر ۔۔۔ اک موت کی دیوی سوتی ہے[۱۹۷]

دل چسپ بات یہ ہے کہ غزل کے لکھے لگے بندھے موضوعات سے ہٹ کر شعرائے کشمیر نے کشمیر کے مسائل اور مصائب کو موضوع بنایا۔ بھارتی مظالم کی داستان ہو یا کشمیر میں جاری ظلم و تشدد کے واقعات، ہر پہلو پر شعرا نے کھل کر اظہار خیال کیا۔ ظفر اکبر آبادی نے اپنی ایک غزل میں کہا کہ:

قرض ہے جنت ارضی کا تحفظ مجھ پر ۔۔۔ مجھ کو بننا ہے ابھی پشت پناہِ کشمیر
روز و شب ہے مجھے کچھ ایسے چراغوں کی تلاش ۔۔۔ مٹ سکے جس سے ظفر ظلمتِ راہِ کشمیر[۱۹۸]

ڈاکٹر سلیم واحد سلیم بھی ان شعرا میں شامل ہیں جنھوں نے کشمیر کے حوالے سے قلم کا قرض پوری طرح ادا کیا۔ ادبی دنیا کے کشمیر نمبر میں ان کی ایک غزل شائع ہوئی۔ چند شعر ملاحظہ کیجیے:

دوسروں کے آنسوؤں سے بجھ بھی جاتی ہے وہ آگ ۔۔۔ جس سے تابندہ شہادت کی دلھن کا ہے سہاگ
کیوں ہو استبداد کی زد میں کوئی بھی سر زمین ۔۔۔ کیوں نہ مٹ جائے کسی بھی دیو کی مکروہ لاگ
حسن آفاقی ہے اور کشمیر ہے آفاقِ حسن ۔۔۔ اپنا نغمہ بھی سلیم آفاقیت کی ایک راگ[۱۹۹]

آمنہ بہار کی غزلوں میں بھی کشمیر کے لہو رنگ کی جھلک موجود ہے۔ ان کے پہلے مجموعے ''چناروں کی آگ'' میں بھی بعض غزلیں خالصتاً کشمیر کی تحریک آزادی کے پس منظر میں لکھی گئیں۔ چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

جن پہ سر کٹ کر گرے ان راستوں کو چوم لوں ۔۔۔ میں شہیدوں کے لہو کی عظمتوں کو چوم لوں
جی میں آتا ہے کہ شوریدہ ہوا بن کے کبھی ۔۔۔ وادیِ گل کے گھنیرے جنگلوں کو چوم لوں[۲۰۰]

انجم ثاقب نے علامتوں اور کنایوں میں کشمیر کے سانحے کو پیش کرتے ہوئے کہا کہ:

مری چھینی ہوئی جاگیر ہوتا جا رہا ہے ۔۔۔ میں پاکستان وہ کشمیر ہوتا جا رہا ہے[۲۰۱]

ریحانہ روحی نے بھی کچھ اسی قسم کے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ:

میرا تھا اور غیر کی جاگیر ہو گیا گویا کہ دل میں خطۂ کشمیر ہو گیا[۲۰۲]

شیر از ساگر نے ظلم اور کشمیر کو استعارتاً اس قدر خوب صورتی سے استعمال کیا کہ دونوں لازم و ملزوم ٹھہرے۔ چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

کرب میں ڈوبی ہوئی چیخ جو سنتا ہوں میں دل مرا جانب کشمیر رواں ہوتا ہے
اس قدر ظلم روا کوچہ و بازار میں ہے مجھ کو اس شہر کا ہر شخص ہی کشمیر لگے[۲۰۳]

کشمیر کی تاریخ میں ۱۹۴۷ء کے بعد کشمیر کی ڈرامائی تقسیم کے نتیجے میں کشمیر میں ریاستی تشخص اور وحدت کی تقسیم کا وہ عبرت ناک باب شروع ہوا جو آج بھی کشمیر کو ایک غیر مرئی دیوار برلن کے ذریعے منقسم کیے ہوئے ہے۔ اس تقسیم نے مجموعی طور پر پانچ لاکھ سے زائد انسانی جانوں کو موت کی وادی میں پہنچا دیا۔ بھائی کو بھائی سے، خون کو خون سے، کھیت کو کھیت سے، دھرتی کو دھرتی سے، رشتوں کو رشتوں سے، اہل وطن کو اہل وطن سے جدا کر دیا۔ اس ہجر، اس ظلم، اس استیصال اور مفارقت کے نتیجے میں کشمیر میں درد والم کی ایک نہ ختم ہونے والی داستان شروع ہو گئی۔ حالاں کہ اس سے قبل بھی کشمیری مسلمانوں کے حالت کچھ زیادہ قابل ذکر نہ تھی۔ ۱۹۲۵ء میں ہری سنگھ کی تخت نشینی کے بعد ہی سے مسلمانوں پر مظالم اور جور و ستم کے ایک نئے باب کا اضافہ ہو چکا تھا۔ ڈوگرا راج کے زمانے میں بھی مسلمان تنگ دستی، افلاس اور مظلومی و محکومی کا شکار دکھائی دیتے ہیں۔ مسلمانوں کو برباد کرنے کے جو بھی مواقع میسر آئے، ان پر عمل کیا گیا۔ اس افلاس کا عالم بیان کرتے ہوئے الڈوس ہیکسلے کا کہنا تھا کہ ایک مال گاڑی بھرا ہوا بوجھ دو گھوڑوں یا بیلوں کے مقابلے میں نصف درجن انسان زیادہ سستے داموں کھینچ لیتے ہیں۔ محض چند ہی برسوں بعد ہری سنگھ کو بمبئی کے مشہور زمانہ ہفتہ وار اخبار ''بلٹز'' نے حرام زادہ Bastard کے لقب سے سرفراز کیا[۲۰۴]۔ کشمیر کے عوام اس سے قبل بھی ظالم ڈوگرا راج کے خلاف اٹھے تھے۔ اب جب اٹھے تو اس طرح اٹھے کہ ''کشمیر چھوڑ دو'' ان کے لیے محض زبانی نعرہ نہیں رہا۔ وہ ڈوگرا فوجوں کو پسپا کرتے نہایت جارحانہ انداز سے راج دھانی کی طرف بڑھے[۲۰۵]۔ عوامی بیداری کی سب سے بڑی لہر پونچھ میں نظر آئی جہاں دوسری عالمی جنگ سے لوٹے ہوئے ہزاروں جنگ آزمودہ سپاہی تھے۔ وہ جری اور بہادر تھے... یہ آگ بہت جلد پونچھ سے میرپور تک پھیل گئی۔ مہاجارا کی آنکھیں تب بھی نہ کھلیں۔ اس نے ظلم و جبر اور تیر و تفنگ کو ہی مناسب ہتھیار جانا۔ ڈوگرا افواج نے پونچھ پر مظالم کے وہ پہاڑ توڑے جس کی مثال اس سے پہلے سننے کو نہیں ملی۔ پورے کے پورے گاؤں جلا کر راکھ کر دیے اور بے قصور انسانوں کو گاجر مولی کی طرح کاٹ کے رکھ دیا گیا[۲۰۶]۔ اس زبردست عوامی طاقت کی تاب نہ لا کر مہاجارا لرزہ و ہراساں سری نگر سے بھاگ کھڑا ہوا[۲۰۷]۔ اس صورت حال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بھارت نے پیش قدمی کی۔ بھارت کی ہوس ملک گیری امن و امان کا جنازہ نکالنے پر تلی بیٹھی تھی۔ جنگ کے ہول ناک اور تباہ کن بادل پوری مملکت

پر تیزی سے پھیلتے گئے۔ دکن رپورٹ جو کہ شائع ہو چکی ہے، اس میں بھارت کی شاطرانہ چالوں کی نشان دہی کی گئی ہے[۲۰۸]۔ حالاں کہ یہ مسئلہ دو ریاستوں کا مسئلہ نہیں بلکہ ایک بین الاقوامی گتھی ہے۔ عالمی امن و امان کا دار و مدار اس گتھی کے سلجھانے ہی میں پوشیدہ ہے۔ بھارتی رہنماؤں کا یہ استدلال کہ حق خود اختیاری ایک بڑا تفرقہ انگیز اصول ہے جس سے افریقہ و ایشیائی ریاستیں ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گی۔ وہ دعویٰ کرتے ہیں کہ اگر جموں و کشمیر میں رائے شماری کرائی گئی تو بھارت کی جمہوریت اور اس کی ملکی وحدت خطرے میں پڑ جائے گی۔

پاکستان کے کئی وزرائے اعظم نے خطوط بھیج کر کشمیری عوام کی مرضی کے مطابق استصواب رائے پر زور دیا لیکن اقوام متحدہ کی بے حسی اور لاچاری بھی قابل دید ہے۔ گراہم رپورٹ میں اس رویے پر کھل کر اظہار خیال کیا گیا ہے۔ سلامتی کونسل کی بے عملی کی کہانی بھی بہت دکھ بھری ہے۔ ۱۹۴۶ء میں جموں و کشمیر میں عام بغاوت کے بعد بڑی مشکل سے کونسل نے اجلاس تو بلوایا لیکن اس کے ممتاز نمائندوں کے بیانات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ اس مسئلے کے حل کی بابت کتنے سنجیدہ تھے۔ کسی نمائندے کا بیان تھا کہ ''ہم ایک پرانا مردہ اکھاڑ لائے ہیں''۔ ایک اور نمائندے نے کہا کہ ''ہم داخلی پروپیگنڈے کے لیے کونسل کو استعمال کر رہے ہیں''۔ ۱۹۶۵ء میں ہی بھارتی وزیر داخلہ گل زاری لال نندا نے یہ اعلان کیا کہ ''کشمیر بھارت کا لازمی حصہ ہے'' اس بیان نے بھارت کی اصل نیت کا پردہ چاک کر دیا[۲۰۹]۔ اس حوالے سے اس وقت کے پاکستانی وزیر خارجہ ذوالفقار علی بھٹو کی تقریر جو کہ جنرل اسمبلی میں خطاب کرتے ہوئے پیش کی گئی تھی، بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ بھٹو نے افریقی اور ایشیائی اقوام کا نو آبادیاتی تسلط سے چھٹکارے کو اس صدی کا سب سے اہم واقعہ قرار دیتے ہوئے اس بات پر زور دیا کہ آزادی کے اس عمل کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے نو آبادیاتی نظام کی بقیہ نشانیوں کو مٹانا ازحد ضروری ہے۔ اس حوالے سے کشمیری عوام کے حق خود ارادی کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ بھٹو نے عوام کے حق خود ارادی کے اصول کا ۱۴ اگست ۱۹۴۱ء کے اٹلانٹک چارٹر، یکم جنوری ۱۹۴۲ء کو واشنگٹن میں دستخط شدہ اعلان اقوام متحدہ، ۱۹۴۳ء کے اعلان ماسکو اور ۲۶ نومبر ۱۹۴۳ء کے اعلان قاہرہ کا حوالہ دیتے ہوئے اس اصول کو اقوام متحدہ کے منشور کے آرٹیکل ۱ کے پیر گراف ۲ میں شامل کر کے پوری عالمی دنیا کا منشور بنایا گیا۔ منشور کی دفعات ۵۵، ۷۳ اور ۷۶ میں بھی اس اصول کو منضبط کیا گیا۔ ۱۹۵۵ء کی بنڈونگ کانفرنس کے اعلان، تنظیم افریقی اتحاد کے منشور ۱۹۶۴ء میں غیر جانب دار ممالک کی دوسری کانفرنس میں بھی حق خود ارادی کے اصول کی علم برداری کی گئی۔ حق خود ارادی کا یہی اصول ۱۹۴۷ء میں برصغیر کی تقسیم اور بھارت و پاکستان کے دو علاحدہ خود مختار مملکتوں کے قیام کا باعث بنا۔ اس اصول کا بین طور پر برصغیر کی ان دیسی ریاستوں پر اطلاق کیا گیا جن کا دونوں مملکتوں میں سے کسی ایک کے ساتھ الحاق متنازع فیہ تھا۔ خود بھارتی وزیر اعظم پنڈت نہرو نے ۲ نومبر ۱۹۴۷ء کو کشمیر کے تنازعے کا ذکر کرتے ہوئے کشمیر کی حق خود ارادی کو تسلیم کیا تھا[۲۱۰]۔

وقت گزرنے کے ساتھ اس مسئلے کو بھارتی طالع آزماؤں نے اس قدر پیچیدہ بنا دیا کہ آج ستر برس گزرنے کے باوجود اس کے حل کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ اس دوران بھارتی فوجیوں کے ظلم و جبر کی ہیبت ناک داستانیں وقتاً فوقتاً عالمی ضمیر کو جھنجھوڑنے کا باعث ضرور بنیں لیکن مجموعی طور پر عالمی برادری میں ایک بے حسی کا ماحول طاری ہے۔ مقتدر قوتوں کے اس رویے نے بھارت کو مزید خود سر بنا دیا۔ درندہ صفت فوجیوں نے فطرت کے حسن سے مالا مال کشمیر کو کچلنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ فطرت کی اس رعنائی کو کچل کر رکھ دیا گیا۔ بم پھٹے اور کشمیر کے آبشاروں کے نغمات چھین لیے گئے۔ توپیں گرجیں اور حسن و تبسم مٹ گئے۔ تباہی و غارت گری اس نوع کی کہ چنگیزوں اور ہلاکوؤں کو رحم آجائے۔ جبر و استبداد کے یہ انداز کے فرعون و نمرود بھی کبھی نہ سوچے[۲۱۱]۔ فقیر سید امیر احمد امید نے اس صورت حال کی عکاسی کرتے ہوئے اپنی نظم ''کشمیر کی فریاد'' میں کہا کہ:

خبردار اے سرفروشانِ ملت — تمھارا وطن ہے گرفتارِ آفت
وہ کشمیر وہ باغِ عالم کی زینت — وہ زائیدہِ کوہ دنیا کی جنت
سراپا ہے لب ریز سامانِ غم سے — اجڑتا ہے یلغارِ فوجِ ستم سے
ستم ہند والوں کے سب پر عیاں ہیں — ابھی خاک پر بے کفن استخواں ہیں
مساجد کے محراب و در ترجماں ہیں — شہیدانِ پنجاب نوحہ کناں ہیں
فضا میں گو پنہاں ہیں آثار غم کے — وہ افسانے ہیں کشت گانِ ستم کے
عمل اب بھی غارت گروں کا ہے ایسا — بہاتے ہیں اکثر لہو بے کسوں کا
رعایا کا ہو جن کے ہاتھوں یہ نقشہ — حکومت انھیں کب ہے غیروں پہ زیبا
نشیمن ہے جو مسلمِ دل حزیں کا — ستم گر کو دعویٰ ہے اس سر زمیں کا[۲۱۲]

ابتدا میں عالمی ذرائع ابلاغ میں اس مسئلے کو خصوصی اہمیت ضرور دی گئی اور ۱۰ مارچ ۱۹۵۱ء کی اشاعت میں لندن ٹائمز نے لکھا کہ:

> بدلتے ہوئے ہندوستان کے نظریات سن سن کر کان پک گئے۔ سب سے بڑا مسئلہ بنیادی مسئلہ، کشمیر کو غیر عسکری کرنے کا ہے تا کہ ثالث اطمینان سے استصواب رائے کروا سکے۔ ہندوستان کی منطق یہ ہے کہ کشمیر ان کا ہے۔ اس نے اپنے آہنی پنجوں میں مختلف ریاستوں کو دبوچ رکھا ہے[۲۱۳]۔

اسی طرح نیو یارک ٹائمز نے اپنے ۱۷ جنوری ۱۹۵۱ء کے اداریے میں لکھا کہ:

> صاف اور واضح حقیقت تو یہ ہے کہ ہندوستان نے بالقصد وہ ساری رکاوٹیں پیدا کر دی ہیں جو ایک استصواب کی ہر اس تدبیر کا گلا گھونٹ دیتی ہے جو پر امن کی حامل ہوتی ہے۔ بر خلاف اس کے پاکستان ہے کہ اس نے کسی بات کی مخالفت نہیں کی[۲۱۴]۔

تقسیم کے بعد جب ریاست دو حصوں میں تقسیم ہو گئی اور "دست از یک بند تا افتاد در بندے دگر" کے مصداق کشمیر ڈوگروں کے پنجے سے نکل کر ان ہی کے ہم پیشہ اور ہم مشربوں کے چنگل میں پھنس گیا۔ صرف اس کا تھوڑا سا حصہ ان کے استبداد سے محفوظ رہ سکا تو اس صورت حال میں جدوجہد آزادی کی تحریک کا بروئے کار آنا لازم تھا۔ لہٰذا ان تحریکات کا بڑی شد و مد سے آغاز بھی ہوا[۱۵]۔ ظاہر ہے ایسی صورت حال میں کچھ لوگ تو خطۂ جنت کو خیر باد کہہ کر جہاں جہاں ان کے ہم درد اور خیر خواہ تھے، منتقل ہو گئے، لیکن کچھ وہیں رہ کر اس تحریک میں اپنا حصہ ڈالتے رہے۔ بقول محمود ہاشمی جموں کا شاعر اب بھی جموں میں ضرور ہے، لیکن اب وہ شعر نہیں کہتا کیوں کہ اب جموں اس کے سپنوں والا جموں نہیں رہا۔ پھر وہ شعر کیسے کہے؟ وہ کہتا ہے کہ سورج کی کرنیں اب بھی سب سے پہلے مندروں کے کلس پر ہی پڑتی ہیں پر اب ان کی چاندنی نہیں جگمگاتی[۱۶]۔ ظاہر سی بات ہے کہ اب شعرا اس کشمیر کو کیوں کر بیان کر سکتے تھے جو پھولوں کی مہکتی ہوئی سرزمین کی حیثیت سے مشہور تھا۔ اب تو سرخ لالے کی جگہ سرخ لہو نے لے لی تھی۔ لہٰذا شاعری کا جو نیا سلسلہ شروع ہوا اور جو کسی نہ کسی شکل میں آج تک جاری ہے، اس میں سیاسی نغمہ سرائی کا عنصر بڑھتا چلا گیا۔ اس سیاسی نغمہ سرائی کی سب سے بڑی مثال احمد ندیم قاسمی کی نظم "کشمیری مجاہد کا نعرہ" ہے۔ اس میں جوش ہی جوش ہے۔ فن کا فقدان ہے۔ ایسی ہنگامہ خیز نظمیں جنھیں سیاست و صحافت کا آمیزہ کہنا زیادہ مناسب ہو گا۔ ۱۹۴۷ء کے بعد کشمیر کے حوالے سے کی گئی تمام تر شاعری خواہ وہ غزلیں ہوں، نظمیں یا دیگر اصناف، کشمیریوں کے اسی درد و المیے کو موضوع بنایا گیا۔ قاسمی صاحب کی ایک اور نظم "جریدہ" کشمیر نمبر میں بھی شائع ہوئی۔ "کشمیر" کے عنوان سے اس نظم میں بھی وہی رنگ نمایاں ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

تاریخ الٹ رہی ہے اوراق	کشمیر کی برف شعلہ زن ہے
جلتے ہوئے گھر چھنے ہوئے کھیت	ہر شخص وطن میں بے وطن ہے
سنتے ہیں سمندروں کے اس پار	اقوام کی ایک انجمن ہے[۱۷]

شفقت تنویر مرزا نے ترقی پسند تحریک سے جڑے رہنے کے باوجود زیادہ تر پابند نظموں کو اپنے اظہار کا ذریعہ بنایا۔ ان کے ہاں فیض، جاں نثار اختر، مجاز، علی سردار جعفری، قتیل، مخدوم اور اختر الایمان کی جھلک واضح طور پر دیکھی جا سکتی ہے۔ ان کی نظموں میں "پہلی پکار"، "مری عرض بھی سنو"، "تیرا نام میرے نام"، "شاہ ہمدان"، "دو کنارے"، "حرم کا ورثہ"، "تقلید کا فرض"، "ارضِ مظلوم"، "ذکر، خوابِ گل"، "کشمیر اداس ہے"، "کہاں سے کہاں تک"، "انتظار کرو"، "تذبذب"، "منزل منزل"، "دیوانے، ذوق سفر"، "شگوفے"، "بگولوں کی دستک" اور "نوید صبح" وغیرہ میں یہ رنگ بہت نمایاں ہے۔ ان کی شاعری ایک بحران کے نتیجے میں وجود میں آئی۔ لہٰذا رجائیت کا رنگ گہرا ہے:

خوں چکانی بھی حوادث کی نظر سے گزری	واژ گوں دیکھی ہے انسانی جبینوں کی دمک
عظمتیں نوحہ کناں چاک گریباں دیکھیں	بجھتی دیکھی ہے سلگتی ہوئی آنکھوں کی چمک
ہم ہیں آگاہ حریفوں کی ہر اک سازش سے	ان کے خوں ریز عزائم سے بھی ہم واقف ہیں
انتظار اور ستم دیدہ نگاہوں کے قرار	ہم بدل دیں گے سلگتے ہوئے یہ لیل و نہار[۲۱۸]

اپنے وطن کو مخاطب کر کے اس کے تکلیف اور مصائب کو ختم کرنے کا عزم ایک خاص طرز احساس لیے ہوئے ہے۔ وہ ان تلخ موضوعات کو بیان کرتے ہوئے بھی لہجے کی نرمی اور مٹھاس بر قرار رکھنے میں کامیاب رہتے ہیں۔ جیسے:

مرے وطن! مرے گل بن! مری متاع حیات	میں جانتا ہوں ترے رخ پہ جو بھی گزری ہے
اسیر رنج و تعب تو ہے، میں رہینِ الم	ہے با خبر یہ جہاں ہم پہ جو بھی گزری ہے
جو بیج غیروں نے بوئے ترے خیالوں میں	اُگے ہیں ان سے بہت سے زقوم اور حنظل
ہے آج جن کے تصرف میں کل گدوں کی بہار	انھی کے دم سے ترا حسن ہوگیا او جھل[۲۱۹]

شاہد لطیف ادبی حلقوں میں زیادہ معروف نہیں ہیں لیکن کشمیر کے تناظر میں ان کا شعری مجموعہ ''معرکہِ کشمیر'' ان کی شناخت بن گیا ہے۔ اس مجموعے میں شاعر نے جہاں کشمیر کے سلگتے مسائل پر توجہ دی ہے وہیں مقبوضہ وادی میں سماجی سطح پر بھارتی ہٹ دھرمی کی مثالیں بھی پیش کی گئیں ہیں۔ مثلاً تقسیم کے بعد پورے بھارت کی طرح مقبوضہ وادی میں بھی اردو دشمنی کا جو رویہ اختیار کیا گیا اس جانب اشارہ کرتے ہوئے شاعر کہتے ہیں کہ:

بازاروں میں بورڈ لگے ہیں ہندی میں	کشمیری الفاظ لکھے ہیں ہندی میں
ایک نئی تعلیم عطا کی جاتی ہے	اب اردو کے لفظ ملے ہیں ہندی میں
پڑھنا ہے تو ان کے اردو لفظ پڑھیں	جن لوگوں کے لفظ چھپے ہیں ہندی میں[۲۲۰]

شاہد لطیف کے ہاں فنی کمزوریاں ضرور ہیں لیکن اس مجموعے کی بعض نظمیں بہت عمدہ ہیں۔ ان کی ایک نظم ''لہو لہو کشمیر'' سے یہ بند ملاحظہ کیجیے:

انگاروں میں سلگ رہی ہے جنت کی تصویر	دھواں دھواں ہے آزادی کے خوابوں کی تعبیر
اس عالم میں کیسی ہوگی انساں کی توقیر	دیکھ ذرا کشمیر ـــــ لہو لہو کشمیر[۲۲۱]

شاہد کی نظموں میں نعرے بازی کی خاص فضا موجود ہے۔ مجموعے کا مطالعہ اس جانب توجہ مبذول کراتا ہے کہ اکثر نظمیں ایک خاص ہیجانی کیفیت میں لکھی گئی ہیں۔ ان نظموں کو کسی مخصوص فضا میں تخلیق کرنے کا مقصد محض عوامی جذبات کو برانگیختہ کرنا اور لوگوں کی توجہ حاصل کرنا ہی رہا ہوگا۔ ''نعرے'' کے عنوان کے تحت لکھی گئی یہ نظم دیکھیے:

اللہ کا کرم ہے آزادی

مومن کا دھرم ہے آزادی

اب بچے مانگیں آزادی

اب بوڑھے مانگیں آزادی

دشمن کو بتا دو آزادی

دشمن کو بھگا دو آزادی

کشمیر کا حق ہے آزادی

یہ سچ ہے سچ ہے آزادی

مومن کی عزت آزادی

دشمن کی ذلت آزادی

ہم لڑ کے لیں گے آزادی

ہم مر کے لیں گے آزادی[۲۲۲]

ایک اور نظم ''کشمیر کا مطلب کشمیری'' میں بھی یہی انداز نمایاں ہے:

دشمن بھی جس کو جان گئے   اپنے بھی اسے پہچان گئے

سب مان گئے سب مان گئے   کشمیر کا مطلب کشمیری

دنیا کا نقشہ بدلے گا   اب رستہ کون یہ روکے گا

جو روکے گا وہ دیکھے گا   کشمیر کا مطلب کشمیری[۲۲۳]

اس مجموعے میں شامل منظومات میں ''الاؤ''، ''بہار میں خزاں''، ''سری نگر''، ''راہِ صداقت کے امیں''، ''چنار ہے لہو لہو''، ''بڑگام کے راستے ہیں''، ''اسیر پرندے''، ''کشمیر کی دوشیزہ کا خواب''، ''وہ کیوں خاموش ہیں''، ''چلے چلو مجاہدو''، ''مٹی کی آواز''، ''جہانِ دانش''، ''امن کا پیغام''، ''اقوامِ متحدہ''، ''ماں''، ''ذرا سوچو''، ''یہ جاں بازوں کی آہٹ ہے''، ''جہاد اور دہشت گردی''، ''ڈپلومیسی''، ''کشمیر''، ''اک ذرا''، ''طمانچا''، ''ماں کی فریاد''، ''آزادی سے غلامی تک''، ''پناہ گزین کیمپ''، ''اندھی گلی''، ''امام ضامن''، ''نیند نہیں آتی''، ''سلامتی کونسل اور گمنام سپاہی'' وغیرہ بہترین نظمیں ہیں۔ موضوعات کی ہمہ جہتی ہمیں شاعر کے احساسات تک پہنچنے میں خاصی مدد دیتی ہے۔

اصغر عابد کا شعری مجموعہ ''الم تا علمِ کشمیر'' میں ۲۱ نظمیں، ایک طویل رزمیہ ''کشمیر نامہ'' اور چند غزلیں شامل ہیں۔ ان نظموں میں جدید عصری حسیّت بدرجہ اتم موجود ہیں۔ ذرائع ابلاغ سے تعلق رکھنے کی وجہ سے کہیں کہیں خبریت کا انداز جھلکتا ہے۔ ان کی نظمیں مزاحمت اور احتجاج سے بھرپور ہونے کے باوجود موسیقیت سے لب ریز ہیں۔ نظم ''بارودی پھول'' کے چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

آنکھیں ساری بارودی ہیں دل پتھریلے نیلے ‌ ‌ ‌ کوہ و دمن میں کھیلتے موسم ہوگئے زرد اور پیلے

سرحد پر جو ہاتھ دھرے تھے سب کے سب برفیلے ‌ ‌ ‌ ظلم اور ظلمت کے یہ چھلکے کوئی کہاں تک جھیلے

شعلے اور شہادت بانٹے شور جہازوں والا ‌ ‌ ‌ آزادی کی خواہش عابد کیسے ہوگی پوری[۲۲۴]

اصغر کے اس مجموعے میں ''ہمیں تو مسکرانا ہے''، ''آزاد آزادیاں''، ''کربلا کی قسم''، ''بارودی پھول''، ''میں نے پوچھا''، ''ہمارا نام آزادی''، ''المدد''، ''روشنی کی صدی''، ''تمام گھر ہیں دھواں دھواں''، ''ضعیفی کا لہجہ''، ''فریاد کناں اور اک ماں'' وغیرہ عمدہ نظمیں ہیں۔ اس کے علاوہ ''کشمیر نامہ'' کے عنوان سے ۳۱۵ اشعار کی مثنوی ہے۔ اس میں زیادہ تر کشمیر کی تہذیب اور ثقافت کے رنگ بکھرے ہوئے ہیں۔ آخر میں کچھ گیت ہیں۔

کشمیر سے متعلق ان مجموعوں کے مطالعے سے ایک بات پوری طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ اکثر شعرا نے کشمیر کے حسن و جمال کے بجائے کشمیر کے سیاسی بحران اور کشمیری عوام کی جرأت مندانہ جدوجہد کو موضوع بنایا ہے۔ بیسویں صدی ظاہر سی بات ہے کہ کشمیر کی سیاسی بیداری اور قومی شعور کے بیدار ہونے کی صدی ہے۔ اس صدی میں جنوبی ایشیائی مسلمان خصوصاً کشمیری انقلاب اور سراپا جدوجہد نظر آتے ہیں۔ اقبال اور حفیظ سے شروع ہونے والے انقلابی نعروں کی گونج ایک صدی گزرنے کے باوجود ابھی تک سنائی دے رہی ہے۔ حفیظ کی نظم ''کشمیر کے جاں باز'' میں ان انقلابی نوجوانوں کے عزم و حوصلے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے شاعر نے درست کہا ہے کہ:

وہ دیکھ! وادیِ کشمیر کے جاں باز جاتے ہیں ‌ ‌ ‌ ستارے اپنی آنکھیں جن کی راہوں میں بچھاتے ہیں

یہی وہ ہیں کہ جو ایماں کی خاطر جان دے دے کر ‌ ‌ ‌ عدو کے آہنی پنجوں سے ہم سب کو بچاتے ہیں

جہاں انسانیت کی آبرو ملتی ہے مٹی میں ‌ ‌ ‌ وہاں پر شدتِ غیرت سے اپنا خوں بہاتے ہیں

زمانے بھر کی دولت ان کے اس ایثار پر قرباں ‌ ‌ ‌ یہ ہم پر ڈھال بن کے گولیاں سینے پہ کھاتے ہیں

جہاں ہیبت سے خود دشمن کی جرأت کانپ اٹھتی ہے ‌ ‌ ‌ یہ اس خونیں فضا میں فتح کا پرچم اڑاتے ہیں

خداوند! تیرے محبوب کی امت پہ یہ حملے ‌ ‌ ‌ تری نصرت سے یہ غازی مجاہد فتح پاتے ہیں[۲۲۵]

کشمیر کو اس کے مکینوں کے جذبہ آزادی کے رخ سے دیکھنے اور اس کے بیٹوں کی جدوجہد کے حوالے سے پہچاننے کا یہ رویہ ہر دور میں دکھائی دیتا ہے۔ اس جنگ کی رجز خوانی، مزاحمتی اور انقلابی مزاج رکھنے والے کئی دوسرے شعرا نے بھی کی۔ حبیب جالب کی نظم ''لہرا کے رہو پرچم'' کا ایک بند ملاحظہ کیجیے:

یہ شعلہ نہ دب جائے یہ آگ نہ سو جائے ۔۔۔ پھر سامنے منزل ہے، ایسا نہ ہو کھو جائے
ہے وقت یہی یارو! ہونا ہے جو ہو جائے ۔۔۔ کشمیر کی وادی میں لہرا کے رہو پرچم
ہر ظالم و جابر کا کرتے ہی چلو سر خم[۲۲۶]

یہ کسی مذہبی ذہن رکھنے والے مخصوص مسلک کے شاعر کا کلام نہیں بلکہ ایک اشتراکی مزاج کے بائیں بازو کے سامراج دشمن کی تخلیق ہے۔ جو دنیا کی سیاسی بساط پر بچھے جبر کے کھیل کے اسرار و رموز سے واقف ہے اور جانتا ہے کہ دنیا کے امن کے اصل دشمن کون ہیں۔ اس کے مقابلے میں جب ہم نعیم صدیقی کی نظم ''بھڑکتی ہوئی آگ'' کا مطالعہ کرتے ہیں تو صاف پتا چلتا ہے کہ نظم کا خالق اپنے مخصوص فکری پس منظر کے اثر میں لاشوں، شعلوں، زخموں، خنجروں، تلواروں، خون کے فوّاروں اور لہو کے رستے دھاروں کے نقشہ کھینچتے ہوئے تشدد اور استیصال کا مقابلہ قتال سے کرنے پر مصر دکھائی دیتا ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

ٹیلوں کے آس پاس، وہ غاروں کے درمیاں ۔۔۔ بھڑکی ہوئی ہے آگ چناروں کے درمیاں
راہِ ظفر گزرتی ہے لاشوں کے بیچ بیچ ۔۔۔ جیسے یہ کہکشاں ہو ستاروں کے بیچ بیچ
کیا جانیں کیا ہے لطفِ تپیدن بہ کارِ زار ۔۔۔ آرام سے جو بیٹھے ہیں پیاروں کے درمیاں
محصور کاشمیر کے ہیں زعفرانِ زار ۔۔۔ شعلوں کے درمیان، شراروں کے درمیاں
تم ڈھونڈتے ہو گنبد و محراب میں جسے ۔۔۔ شاید ملے وہ خون کے دھاروں کے درمیاں[۲۲۷]

اس ''شورِ ضربتِ آہن'' میں کشمیر کی تہذیب کی بہت سی آوازیں دب کر رہ گئی ہیں۔ آتش و آہن کی اس گھن گرج میں خاک و خان کے سیلاب میں کشمیر کے بہت سے رنگ بہہ گئے۔ کشمیر کی یک رخی تصویر کشمیر کی اصل تصویر کو دھندلا کر رکھ دیتی ہے۔ ظہیر کاشمیری جیسے ترقی پسند اور اشتراکی شاعر بھی کشمیر میں تیغ و تیر اور خنجر و تلوار کے استعاروں میں بات کرنے پر مجبور دکھائی دیتے ہیں۔ ان کی نظم ''آج کا کھیل'' کے چند بند ملاحظہ کیجیے:

کج کلاہوں کو زمیں بوس کیا ہے ہم نے ۔۔۔ شہر یاروں سے صدا باج لیا ہے ہم نے
ظلم کو موت کا پیغام دیا ہے ہم نے ۔۔۔ جب بھی اٹھے ہیں ہم جذبہ بیدار کے ساتھ
آج کا کھیل رہے برشِ تلوار کے ساتھ

آج وادی کی بہاروں نے پکارا ہے ہمیں آج چشموں نے، چناروں نے پکارا ہے ہمیں

آج گل بار نظاروں نے پکارا ہے ہمیں ہم ہیں کشمیر کے ہر سرو سمن زار کے ساتھ

آج کا کھیل رہے برشِ تلوار کے ساتھ[۲۲۸]

اس قسم کے موضوعات اور مناظر تقریباً ہر شاعر کے پاس کسی نہ کسی صورت میں موجود ہیں۔ یہ لہو رنگ تصویریں اس وقت سے لے کر آج تک کے کشمیر کا بیانیہ ہیں۔ احمد ظفر کی نظم "گردابِ خوں: کشمیر" کے چند مصرعے دیکھیے:

پھر شہیدوں نے ترے ایک نیا باب لکھا اپنے ہی خوں سے کوئی خواب لکھا[۲۲۹]

افضل تحسین کی نظم "خون کی بہنے لگی ہیں ندیاں کشمیر میں" کے چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

پھر نہیں محفوظ کوئی آشیاں کشمیر میں جبر کی گرنے لگی ہیں بجلیاں کشمیر میں

سن کے ننھے بچوں کی آہ و فغاں کشمیر میں موت بھی ہے نوحہ گر ماتم کناں کشمیر میں

ختم سارے ہوگئے انسانیت کے ضابطے زندگی کی اڑ رہی ہیں دھجیاں کشمیر میں

پھر یزیدِ وقت دہرانے لگا ہے دیکھیے خونِ رنگِ کربلا کی داستاں کشمیر میں[۲۳۰]

توصیف تبسم کی نظم "آتشِ چنار" میں آگ اور خون کی یہی ملی جلی علامت کا رنگ بھی ملاحظہ کیجیے:

ظلم کی آگ میں جلتا ہے برسوں سے دیس چناروں کا چمن چمن جو تختۂ گل ہے، بستر ہے انگاروں کا

نغمہ و نے بے موت مرے ہیں الجھے تار ربابوں کے سنتے جاؤ، چنتے جاؤ ٹکڑے ٹوٹے خوابوں کے[۲۳۱]

شفیق حیدر آبادی کی نظم "بے نوا کشمیری" میں بھی یہی رنگ موجود ہے۔ شعر ملاحظہ کیجیے:

ہے تقاضا وقت کا عزمِ سفر تازہ کریں راہ تکتے ہیں ہماری، بے نوا کشمیر میں[۲۳۲]

اسی طرح شمیم بلتستانی کی نظم "رنگ لائے گا شہیدوں کا لہو" کا یہ شعر دیکھیں:

خونِ مسلم بہہ رہا ہے آج پھر کشمیر میں رنگ لائے گا مگر خونِ شہیدانِ وطن[۲۳۳]

طاہر احمد کی نظم "خزاں کے اس دور کی تصویر" کے چند اشعار بھی ملاحظہ کیجیے:

ہر ایک پھول پہ پہرے، ہر ایک شاخ اسیر ہر ایک باغ گرفتار، ہر شجر دل گیر

نظر نظر میں اداسی، قدم قدم زنجیر رخِ حیات پہ زخموں کی خوں چکاں تصویر

تھکی تھکی سی نگاہیں، بجھی بجھی تنویر خزاں کی گود میں خوابیدہ وادیِ کشمیر

طویل دورِ غلامی چمن سے تا بہ چمن کہیں ہیں وحشتِ زنداں کہیں پہ دار و رسن[۲۳۴]

اسی طرح ظفر اکبر آبادی کی نظم "کشمیر" کے چند اشعار دیکھیں:

میں کسی اور طرف دھیان نہیں دے سکتا — ہے میرے پیشِ نظر حالِ تباہِ کشمیر
روزِ روشن کی قسم صبحِ درخشاں کی قسم — ہے بہت مجھ پہ گراں شامِ سیاہِ کشمیر[۲۳۵]

پروفیسر کرم حیدری کی نظم "وقت کے رخ کو بدلنا ہو گا" کے پہلے Canto کو دیکھیں:

سال ہا سال سے کشمیر کے چہرے پہ رقم / درد اور دکھ کی سلگتی ہوئی تحریریں ہیں / غم و
اندوہ کی تفسیریں ہیں / جسم پر زہر بجھی تیغوں کے زخموں کے نشاں / ظلم اور جبر کی
منھ بولتی تصویریں ہیں / آگ اور خون کی زنجیریں ہیں / کھل نہیں سلگتے ہیں تیروں
سے پروئے ہوئے لب / اور سینوں میں ابھرتی ہوئی تقریریں ہیں[۲۳۶]

کیف بنارسی کی نظم "کشمیر جنگ کے شعلوں میں" کا یہ بند ملاحظہ کیجیے:

یہ ظلم زمانے کا قیامت سے کم نہیں — آتش کدہِ دہر ہے اور جلوہِ شبنم
کشمیر جسے کہتے ہیں سب جنت عالم — تہذیب و تمدن کا وہاں آج ہے ماتم
اب ارضِ مسرت ہے نہ وہ کیف کی مستی — یہ منزل دل کش ہے رہین غم و ہستی[۲۳۷]

خوں آشامی اور لہو ریزی کی ایسی تصویریں بے تحاشا ہیں لیکن صفحات اس بات کی اجازت نہیں دیتے کہ ہر مثال یہاں پیش کی جائے۔ اس خوں آشامی کے بارے میں متین فطری کے اس مصرعے کو دیکھیے:

بہہ رہا ہے سینۂ کشمیر سے تازہ لہو

اس سے حالات کو پوری طرح سمجھا جا سکتا ہے۔ وقاص صدیقی کی نظم میں بھی خون کی اسی ارزانی کا ذکر پڑھ کر دل دکھتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ جب وہ کہتے ہیں:

صبحیں آتی ہیں وہاں اور شفق خونیں بھی — شامیں لاتی ہیں ہمیشہ افقِ خونیں بھی
اور اس خوں کے الاؤ میں جلی جاتی ہے یہ وادیِ گل — کھیتیاں راکھ ثمر دار چمن خاک ہیں، ایندھن جنگل
لالہ زاروں میں بنی لالہ رخوں ہی کے لہو سے دَل دَل — جبر کی آنکھ سے دوزخ ہیں چنار
اور ہر اک کوہ دمن موت کے سکرات میں ہے[۲۳۸]

منیر کمال کی نظم "سری نگر" بنیادی طور پر کشمیر کے حسن و جمال کا قصیدہ ہونے کے باوجود کشمیر کے مرثیے کی صورت اختیار کر گیا۔ جیسے:

پھرتی ہیں جس جگہ پہ لٹیروں کی ٹولیاں — بولے جہاں پہ کاگ عنادل کی بولیاں
مومن کے خوں سے کفر جہاں کھیلے ہولیاں — بھر لی ہے ڈاکوؤں نے جہاں اپنی جھولیاں

کشمیریوں کی آنکھ کا تارا سری نگر　　　جنت نشاں شہر وہ ہمارا سری نگر

وادی پکارتی ہے مسلماں اجڑ گئے　　　جنت کی سر زمیں کے ثنا خواں اجڑ گئے

وہ زعفرانِ ڈل کے نگہ باں اجڑ گئے　　　اس سبزہ زارِ خلد کے عنواں اجڑ گئے

کشمیریوں کی آنکھ کا تارا سری نگر　　　جنت نشاں شہر وہ ہمارا سری نگر[۲۳۹]

رئیس امروہوی کے ہاں متعدد قطعات میں کشمیر کے سلگتے مسائل کو موضوع بنایا گیا۔ ۳۰ اگست ۱۹۶۵ء کا ایک قطعہ بہ عنوان ''چمن زار کشمیر'' ملاحظہ کیجیے:

جو بھڑکی ہوئی تھی یہاں اور وہاں　　　وہی آگ ادھر اور اُدھر لگ گئی

بہارِ چمن زارِ کشمیر کو　　　خدا جانے کس کی نظر لگ گئی[۲۴۰]

اسی طرح صہبا اختر کا قطعہ ''مینار'' میں سری نگر کی دہشت ناک فضا کا احوال بیان کیا گیا ہے۔ دلّی میں بننے والے انسانی سروں کے مینار کو سری نگر کے قتل و غارت گری سے تشبیہ دیتے ہوئے شاعر کہتا ہے کہ:

کچھ اور نزدیک آگئے ہیں سحر کے آثار　　　اجالے تاریکیوں کے چلمن سے چھن رہے ہیں

بلند تر ہو رہی ہے ہر دن اذان حق کی　　　سری نگر میں سروں کے مینار بن رہے ہیں[۲۴۱]

نقش ہاشمی کی نظم ''مقبوضہ کشمیر'' میں اس خون آلودہ ماحول کی عکاسی کچھ اس انداز سے کی گئی ہے:

بہارِ جنتِ کشمیر میں شعلے برستے ہیں　　　یہاں کے اہلِ ایماں زندگانی کو ترستے ہیں

خداوندا! یہ دنیا کون سی ہے کون بستے ہیں　　　یہ کیسے دیوتا ہیں ناگ بن بن کر جو ڈستے ہیں

جہنم بن چکی ہے آج کل کشمیر کی وادی　　　جہاں کل تک تھی آبادی وہاں ہے خانہ بربادی[۲۴۲]

ڈاکٹر وحید قریشی کی نظم ''کشمیر'' میں کشمیر کے حسن و جمال کے ساتھ ساتھ وہاں کی سر زمین کے لٹے پٹے، برباد ہونے والے وادیٔ کشمیر میں ظلم و جبر اور استبداد کے ہاتھوں ہونے والی چیرہ دستیوں، مایوسیوں، اداسی اور خستہ حالی کی تصویر کشی کچھ اس طرح سے کی گئی ہے۔

ہواؤں کی زد میں شفق کا نکھار　　　خنک سبزہ زار

بہاروں پہ چھایا اداسی کا جال　　　چمن خستہ حال

خراماں بگولے درندوں کی فوج　　　اٹھی تند موج

نہ کانٹے نہ کلیاں نہ دشتِ جنوں　　　فقط جوئے خوں[۲۴۳]

صفدر صدیق رضی کی نظم ''کشمیر'' میں بھی کشمیر کے خاک وخوں ہونے کے مناظر کا بیان موجود ہے۔ وہی مخصوص لفظیات اور استعارے جو عام طور پر اس قسم کی شاعری کے لیے مطلوب ہیں اور وہی امیجری جو اس فکری دھارے کے دیگر شعرا میں پائی جاتی ہے۔ صفدر رضی کے ہاں بھی اس کی کمی نہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ:

وادیِ کشمیر پر بھی نظم لکھنا چاہتا ہوں / اس کی آزادی کے متوالوں پر / جن کے جسم ریزہ ریزہ ہیں / جو آج بھی ثابت قدم ہیں / ہر روپہلی صبح اعزازِ شہادت کے / جہاں پر پھول کھلتے ہیں / جو ہر محراب شاخِ سبز پر مصلوب ہو جاتے ہیں / ہر اک شب قتل گاہوں سے جہاں اٹھتی ہوئی لاشیں[۲۴۴]

محسن احسان کی متعدد نظمیں مختلف رسائل وجرائد میں شائع ہوتی رہیں۔ ان کی نظم ''اہلِ کشمیر کے نام'' میں بلند آہنگی بھی ہے اور امیدِ آزادی کا دیا بھی روشن دکھائی دیتا ہے۔ شاعر جب کہتا ہے کہ:

مصاحبانِ اجل سرمہ در گلو ہیں کہ اب — یہ شہر و قریہ یہ کوہ و دمن یہ کوچہ و بام
یہ اضطرابِ مسلسل یہ جوئے خونِ رواں — یہ زخم زخم مرادیں یہ کرب کرب نشاط
بس اب سلیقۂ توقیر چاہتی ہے یہ خاک — بس اب قرینۂ انصاف مانگتی ہے زمیں[۲۴۵]

اپنی ایک اور نظم ''جو اں لاشوں کی آمد ہے'' میں بھی کچھ یہی فضا دکھائی دیتی ہے:

جواں لاشوں کی آمد ہے / چناروں سے بھری پر نور بستی میں / جواں لاشوں کی آمد ہے / سجا کر بوڑھے کاندھوں پر / جواں لاشوں کو لاتے ہیں[۲۴۶]

اس کے علاوہ کشمیر پر مختلف جرائد ورسائل کے جو خاص نمبر اب تک شائع ہوئے ان میں بھی متعدد غزلیں اور نظمیں اسی رنگ میں ڈوبی ہوئی ہیں۔ افتخار عارف کی نظم ''نوید'' کا انداز دیکھیے:

کشمیر! / سرخ لہو سے لوحِ خاک پہ کھینچی ہوئی تحریر / مرے کشمیر / تری تقدیر... / اب ظالم بھی رات کی پسپائی کی اڑتی ہوئی گرد میں / لہولہان دنوں کی راکھ سے اٹھنے والے / زندہ شعلوں کی قوت کا لوہا مان گیا ہے[۲۴۷]

امجد اسلام امجد کی نظم ''اے میرے کشمیر'' میں عالمی استعماری چالوں کا پردہ چاک کرتے ہوئے طنزیہ انداز میں کہا گیا ہے کہ:

لہو اگلتی وادی سے گر تیل نکل آتا — پل بھر میں ان اہلِ حشم کا روپ بدل جاتا
تیرا دکھ اک تیر کی صورت ان پر چل جاتا — اٹھتے جاگ ضمیر[۲۴۸]

نصیر احمد ناصر کی ایک نظم ”کشمیری حریت پسند کا عہد نامہ“ میں اس نفسیاتی فضا کا احوال بھی موجود ہے جو نئی نسل کے ذہن و فکر پر منفی اثرات مرتب کر رہی تھی۔ اس نظم کا بیانیہ نہایت فکر انگیز ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

مری ماں! / مجھے تو نے دستی بموں کے دھماکوں میں / جلتی زمیں پر جنا تھا / کوئی اور
آواز سننے سے پہلے ہی میری سماعت کے در جل چکے تھے / مجھے دودھ پینے کی خواہش
میں اکثر / ترے پاک سینے کے جلتے شگافوں سے / ابلا ہوا خون پینا پڑا تھا / مرا بچپنا
ہجرتوں میں / لڑکپن طنابیں اٹھاتے ہوئے اپنے خیموں کی گزرا / مری ماں! جوانی کی
سرحد تک آتے ہوئے / گولیوں سے مرا جسم چھلنی ہوا ہے / مری سوچ لاوا بنی اور
مری رگوں میں / پگھلتا ہوا گرم سیسہ بھرا ہے / مری ماں! / میں جس قلزمِ خوں سے
گزرا ہوں تو جانتی ہے... / میں دیکھوں گا میزائلوں کی نظر سے / میرے جسموں میں
بارود بھر کر / ترے دشمنوں کے ٹھکانے اڑاتا رہوں گا[۲۴۹]

اسی طرح لاہور سے شائع ہونے والے ادبی رسالے ”کتاب“ نے اکتوبر ۱۹۶۹ء میں کشمیر نمبر شائع کیا۔ اس خاص نمبر میں شعری حوالے سے تو محض دو ہی نظمیں ہیں۔ اوّل صوفی غلام مصطفیٰ تبسم کی ”مناجات“ اور دوم احمد ندیم قاسمی کی نظم ”کشمیر“ جس کا ذکر مذکورہ صفحات میں آ چکا ہے۔ لیکن اس خاص نمبر کی سب سے اہم بات اس کے آخری صفحات ہیں جن میں مدیر نے کشمیر کے موضوع پر شائع ہونے والی اردو اور انگریزی کتب اور شعری مجموعوں کی طویل فہرست دی ہے۔ یہ فہرست بھی مطالعۂ کشمیر کے حوالے سے بڑی اہمیت کی حامل ہے[۲۵۰]۔

کشمیر کے حوالے سے شائع ہونے والے خاص نمبروں میں لاہور ہی سے شائع ہونے والے ”ادبی دنیا“ کے کشمیر نمبر کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ ۵۰۴ صفحات پر مشتمل اس خاص نمبر میں کشمیر کے حوالے سے بہت سا مواد موجود ہے۔ موضوع کی حدود میں رہتے ہوئے جب اس خاص نمبر کے شعری حصے کا مطالعہ کیا تو اندازہ ہو کہ بہت سی ایسی نظمیں اس میں شامل ہیں جن کو اب تک کشمیر کے حوالے سے موضوع نہیں بنایا گیا۔ مثلاً ۱۸۸۶ء میں سید امجد علی اشہری اٹاوی کے لکھے گئے ”قومی ترانہ“ کے عنوان سے جو نظم شامل ہے، اس کے ایک شعر میں وہ کشمیری عوام کی خوابیدہ حالت کے بیان میں کہتے ہیں کہ:

سونے کی کانیں اس میں قسمت جگا رہی ہیں لیکن سلا رہا ہے خوابِ گراں ہمارا[۲۵۱]

ثاقب زیروی بھی کشمیر کی رزم گاہ پر مجاہدین کی جاں بازیوں کو دیکھ کر اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ ارد گرد کے ماحول کا حال بیان کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ:

آزاد مجاہد وادی میں جب شب کو طرارے بھرتے ہیں

اور چرخ کے پختہ کار ستارے آنکھ ملاتے ڈرتے ہیں

تکبیر کے نعرے سن سن کر بے موت بھی دشمن مرتے ہیں

بربط کے نظارے اف توبہ، افسوس کہ ان سے دور ہوں میں [۲۵۲]

حفیظ تائب کی نظم ''ہائے کشمیر کی حسیں وادی'' بھی اسی خاص نمبر میں شائع ہوئی۔ اس نظم میں بھی کشمیریوں کی حالت زار اور بھارت کو مظالم ڈھانے والے دیو کی صورت میں پیش کرتے ہوئے شاعر کہتے ہیں کہ:

ہے شہیدوں کے خون سے گلنار — خلد زادوں کی ہم نشیں وادی

گرد گرد اور دھواں دھواں سی ہے — گل و ریحاں کی عنبریں وادی

دیکھی جاتی نہیں ہے اب ہم سے — کھوئی کھوئی، غمی غمی وادی

ہم چھڑا کر رہیں گے اے تائب — دیو بھارت سے نازنیں وادی [۲۵۳]

اختر ہوشیار پوری کی نظم ''کشمیر'' بھی اسی شمارے میں شائع ہوئی۔ اس نظم میں بہت دکھ اور کرب کے ساتھ اختر نے انگریزوں کی سازش اور ڈوگرا راج کے دور میں ہونے والے اس سودے کو طنز کا نشانہ بنایا ہے جس کے تحت کشمیر کی ہر شے مع انسان گروی رکھ دیے گئے تھے۔ شاعر اس منظر کو بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

اجنبی ہاتھوں نے لیکن بڑی عیاری سے — دیکھتے دیکھتے غیروں کو اسے سونپ دیا

اور ہم مہر بہ لب محو تماشا ہی رہے — یہ مگر علم نہ تھا زیست کے بازاروں میں

یوں بھی بک جاتے ہیں دریا ہو کہ صحرا کہ چمن — یوں بھی نیلام پہ اٹھ جاتے ہیں گل پیراہن [۲۵۴]

علامہ سیماب اکبر آبادی کے کئی قطعات بھی اسی شمارے میں شائع ہوئے۔ حکمرانوں کی خود غرضی اور ظلم و جبر کا نقشہ کھینچتے ہوئے ایک قطعے میں کہتے ہیں کہ:

ستم سے جور و استبداد سے قوت کے طوفاں سے — لیے جاتے ہیں بدلے سادہ لوحی کے مسلماں سے

نہیں حیوانیت تو اور پھر کیا اس کو کہتے ہیں — حکومت پیٹ اپنا بھر رہی ہے خونِ انساں سے [۲۵۵]

کشمیر اور پاکستان کو لازم و ملزوم قرار دیتے ہوئے اثر صہبائی نے کہا کہ:

کچھ بات بن سکے گی نہ تدبیر کے بغیر — کشمیر مل سکے گا نہ شمشیر کے بغیر

اے سر زمینِ پاک کے ارباب حل و عقد — ہم زندہ رہ سکیں گے نہ کشمیر کے بغیر [۲۵۶]

فارغ بخاری کی ایک نظم ''جنتِ گم گشتہ'' کے عنوان سے اسی شمارے میں شامل ہے۔ اس نظم میں بھی موجودہ کشمیر کی زبوں حالی اور ابتر حالت کو پیش کیا گیا ہے۔ شاعر کہتے ہیں کہ:

دیکھ اس خطے کو کہتے ہیں جسے خلد بریں ذرہ ذرہ ہے جہاں چاند ستاروں سے حسیں
آج وہ خلد ہے اپنے ہی لہو سے رنگیں

دیکھ اس خلد میں اب عام ہوئی ہے بیداد آج اس خلد کے باسی ہیں حزیں و ناشاد
آج اس خلد سے محروم ہے اس کی اولاد[۲۵۷]

صدیق افغانی کی نظم ''کشمیر'' کے آخری دو اشعار دیکھیے جس میں وہ کشمیر کے بہتے ہوئے لہو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ظلم کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے کا پیغام دے رہے ہیں:

ٹپک رہا ہے رگِ سنگ سے لہو اب تک زمین سرخ، فلک سرخ، آدمی نخچیر
اٹھو کہ وقت یہی ہے کرو اسے تسخیر بلا رہا ہے بڑی دیر سے تمھیں کشمیر[۲۵۸]

ساغر نظامی کی نظم ''کشمیر کا مستقبل'' بھی جو کہ مسلم کشمیری کانفرنس منعقدہ ۱۹۴۶ء گوجرانوالہ میں پڑھی گئی تھی، اس شمارے میں شامل ہے۔ اس طویل نظم کے آخر میں شاعر امید کا دیا روشن کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

یہ بیگاریں، یہ استبداد بھی مٹ جائے گا اک دن یہ سب ہنگامۂ بیداد بھی مٹ جائے گا اک دن
ستم کرتا ہے تم پہ کوئی دنیا میں تو کرنے دو ستم کر کے ستم ایجاد بھی مٹ جائے گا اک دن
جگر کے زخم دل کے داغ یہ سب مندمل ہوں گے نشانِ لالہ و فریاد بھی مٹ جائے گی اک دن
کسی بے کس کی آہیں رائیگاں ہرگز نہ جائیں گی مٹا کر صید کو صیاد بھی مٹ جائے گا اک دن[۲۵۹]

اسلم تاب نے اپنی نظم ''کشمیر: ایک صلیب'' میں وادی کی دل خراش حالت کا نقشہ کھینچا ہے۔ انھوں نے مظلوم کشمیریوں کی حالت زار بیان کرتے ہوئے کہا کہ:

وہی دم توڑتی مخلوق کا سیلابِ عظیم وہی زنجیرِ غلامی، وہی زنداں کی فضا
وہی افلاس، وہی بھوک کے مارے ہوئے جسم وہی مقتل، وہی مظلوم، وہی تیغِ جفا
شاہراہوں پہ وہی موت کے خونیں سائے ریگزاروں پہ وہی خون سے کھلتے ہوئے پھول
وہی قانون کے شعلوں سے جلائے ہوئے ہونٹ حلقۂ شب میں وہی صبح کے تمنا کے رسول
میرے بیٹو مری آنکھوں کے درخشاں تارو جاگ اٹھو ظلم کی دیوار گرانے کے لیے
خون سے طاق در و بام فروزاں کر دو جشنِ آزادیِ جمہور منانے کے لیے[۲۶۰]

جاذب سہیل کی نظم "کشمیر" میں بھی اسی طرح کے جذبات کے عکاسی کی گئی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

وقت کی آنچ سے جھلسے ہوئے کلیوں کے بدن ظلم کی آگ میں جلتے ہوئے جسموں کے چنار
سینوں پہ کھلتے ہوئے زخموں کے گل ترنگ چمن شعلوں میں لپٹی ہوئی وادیِ کشمیر کہ آج
ہم بہر حال بہر طور سنبھالا دیں گے ایشیا بھر سے مٹائیں گے غلامی کا رواج[۲۶۱]

عزیز حاصل پوری نے بھارتی مظالم اور بربریت کا حال بیان کرتے ہوئے اپنی نظم "جنگِ کشمیر" میں لکھا کہ:

رات کی تاریکیوں میں ناگہاں ہر طرف چھوڑا مظالم کا دھواں
کر کے استبداد کو آتش فشاں پھونک ڈالیں بستیوں کی بستیاں
آگ کی کچھ اس طرح دوڑائی لہر راکھ جل کر ہو گیا پھولوں کا شہر[۲۶۲]

اصغر یگانہ کی بھی ایک نظم "تحریکِ آزادیِ کشمیر" میں اس جنگی ماحول اور نوجوانوں کے جذبۂ حریت کا نقشہ کھینچتے ہوئے کہا گیا کہ:

جور کے بان چلے، ظلم کے شعلے لپکے گاؤں جلنے لگے، اٹھنے لگا شہروں سے دھواں
دور سے کان میں آتی ہے کچھ ایسی آواز دکھ میں جیسے کوئی معصوم پکارے "اے ماں"
چوڑیاں ٹوٹ کے گرتی تھیں جو سنگینوں پر تو چھنا چھن کی صدا آتی تھی آبادی سے
قوم کی راہ میں فرزند جو ہوتا تھا شہید ماں کی آنکھوں سے ٹپکتے تھے خوشی کے آنسو[۲۶۳]

غافل کرنالی کی بھی ایک نظم "وادیِ کشمیر کی ایک لہو رنگ شام" اسی شمارے کی زینت بنی۔ اس نظم میں بھی کشمیر کے لہو رنگ مناظر کا حال بیان کرتے ہوئے شاعر کہتے ہیں کہ:

نگارِ حریت! تری محبتوں کے جرم میں ہزاروں بے گناہ دار پر چڑھا دیے گئے
یہ کیسی آگ لگ رہی ہے دامنِ بہار میں یہ کیا ہوا خیامِ رنگ جلا دیے گئے
یہی تو ظلم ہے کہ ان سے کوئی پوچھتا نہیں غریب لوگ گولیوں سے کیوں اڑا دیے گئے
وفا کی راہ میں جواں لہو بکھیرتے چلو کہے زمانہ کس قدر چمن کھلا دیے گئے
یہ کس کے گرم خوں سے بزمِ زیست جگ مگا اٹھی یہ کون لوگ تھے جو دار پر چڑھا دیے گئے[۲۶۴]

جن سنگھیوں نے ہٹلر کے نقش قدم پر چلتے ہوئے جو ظلم روا رکھے اور عورتوں کی عصمتوں کو جس طرح تار تار کیا گیا، ڈاکٹر سلیم واحد سلیم کی نظم "جہنتی کیمپ" میں اس کا حال یوں بیان کیا گیا ہے:

جہاں جن سنگھیوں میں روح ہٹلر کار فرما ہے　　　　جہاں محسوس معصوموں پہ ہے شب خون سامانی
جہاں ہیں ریزہ ریزہ عصمتوں کے شیشۂ نازک　　　　جہاں کتنے ہی مہر و ماہ ہیں محرومِ تابانی[۲۶۵]

ڈوگروں کے ظلم واستبداد کی ایک اور جھلک قربان حسین شہید کی نظم "وادیِ جنت نما کشمیر کی" میں دیکھی جاسکتی ہے۔ ایک شعر ملاحظہ کیجیے:

ڈوگروں نے کر دیا بدتر جہنم سے اسے　　　　ہائے یہ وادی کہ تھی جنت نما کشمیر کی[۲۶۶]

ہندوستان سے شائع ہونے والے ادبی رسالے ماہ نامہ "آج کل" نے بھی اگست ۱۹۵۵ء میں کشمیر پر خصوصی اشاعت کا اہتمام کیا۔ ظاہر سی بات ہے بھارت اور پاکستان کے کشیدہ حالات اور کشمیری حریت آزادی کی وجوہات کو نظر انداز کر کے بعض شعرا نے اس میں وہ مؤقف اپنایا جو لازماً کشمیریوں کا مؤقف ہر گز نہیں تھا، جیسے عرش ملسیانی کی نظم "نگاروں کا دیس" کے آخری دو اشعار دیکھیں:

مسکنِ خلق اور آشتی کی زد میں　　　　عظمتِ ملک کے پاس داروں کا دیس
مل کے بھارت سے جس کو مرادیں ملیں　　　　محترم مغتنم کام گاروں کا دیس[۲۶۷]

یا پھر حسن نعیم نے اپنی نظم "وادیِ کشمیر کے نام" میں اسی مؤقف کا اعادہ کرتے ہوئے آخری شعر میں کہا ہے کہ:

تجھ کو ہم جنتِ شدّاد نہ ہونے دیں گے　　　　نکہتوں کو تری برباد نہ ہونے دیں گے[۲۶۸]

اسی طرح اظہار ملیح آبادی کی نظم "آج کا کشمیر" میں بھی کچھ اشعار میں اس جانب اشارہ کیا گیا ہے کہ آج کا کشمیر نہایت مسرور اور خوش ہے۔ ہر کوئی ہندوستان کی حکومت سے خوش ہے اور امن وامان کی صورت حال بہت بہتر ہے۔ جیسے:

جس میں ہیں مسرور ہندو اور مسلماں شاد ہیں　　　　عرصۂ گیتی میں وہ بزمِ اماں کشمیر ہے
دیکھتا ہوں جس گھڑی اظہار میں کشمیر کو　　　　دل یہ کہتا ہے دلِ ہندوستاں کشمیر کو[۲۶۹]

اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ کشمیر نہ ہی آشتی کی زمین ہے جیسا کہ عرش ملسیانی نے کہا اور نہ ہی اس سر زمین میں ہندو اور مسلمان شاد ہیں جیسا کہ اظہار ملیح آبادی نے مؤقف اختیار کیا بلکہ درست صورتِ حال خود کشمیری شعرا نے بیان کر دی ہے، جس کا تفصیلی ذکر مذکورہ صفحات میں کیا جاچکا ہے۔ کشمیر سے دور بیٹھے شعرا کو نہ تو زمینی حقائق کا اندازہ ہوتا ہے اور نہ ہی وہ ان مصائب سے گزرے ہیں جس کا خود کشمیری شکار ہیں۔ اسی لیے بعض ہندوستانی ادیب اور شاعر کشمیر کے بیانیے کو اس طور پر نہیں سمجھ پاتے جیسا کہ انھیں سمجھنا چاہیے تھا۔ اسی لیے اس رسالے میں بعض مضامین ایسے بھی ہیں جن میں حریت پسندوں کو تخریب کار اور دہشت گرد کے القابات سے بھی نوازا گیا ہے۔ جیست عبالباقی نے اپنے ایک مضمون میں لکھا کہ:

جموں وکشمیر میں بعض تخریب پسند عناصر کی سرگرمیاں سامراج کے بازو مضبوط کر رہی ہیں اور عوام کو جمہوری اور صالح سیاست سے دور رکھنا چاہتی ہے ... وہ غیر ملکی طاقتیں کشمیر کے خلاف سازش کر رہی ہیں، اور جن کی آج بھی یہ کوشش ہے کہ جموں وکشمیر غلامی کے شکنجے میں کس دیے جائیں[۲۷]۔

حالاں کہ انڈیا نے جس طرح کشمیریوں کو غلامی کے شکنجے میں جکڑ رکھا ہے، اس کے ناقابل تردید شواہد عالمی ذرائع ابلاغ پر وقتاً فوقتاً پیش کیے جاتے رہے ہیں۔ لیکن بھارتی ہٹ دھرمی کی مثال ان مسلم پارلیمانی ارکان کے بیان کی صورت میں بھی سامنے آتے رہے جو بھارتی حکومت کی وفاداری نبھاتے ہوئے اپنی آنکھیں اور کان کلی طور پر بند رکھنا ہی بہتر سمجھتے ہیں۔ بہت سی مثالیں اس بابت پیش کی جاسکتی ہیں۔ صرف ایک مثال جمعیت علمائے ہند کے اس وقت کے سیکریٹری جنرل اور پارلیمانی رکن مولانا محمد حفظ الرحمٰن کے بیان کی دے کر اس کی وضاحت کروں گا جس میں وہ کہتے ہیں کہ:

پاکستان نے زور اور طاقت کے بل پر اُن [کشمیریوں] کی رائے کا رخ اپنی جانب پھیرنا چاہا۔ اس نازک وقت میں کشمیر نے ہندو یونین سے مدد چاہی۔ چناں چہ حکومت ہند نے بروقت مدد کی اور کشمیر کو پاکستان کی دستبرد سے بچالیا[۲۷]۔

حالاں کہ کشمیر کی جنگ آزادی اب ایک ایسے مرحلے میں داخل ہو چکی ہے کہ اسے عالمی سطح پر ایک متنازعہ مسئلہ قرار دیا جاتا رہا ہے۔ دنیا میں فقط بھارت ہی ایسا ملک ہے جو اب بھی تجاہل عارفانہ سے کام لے کر اپنے دل میں یہ گمان رکھتا ہے کہ وہ خود ہی اس مسئلے کو حل کرے گا[۲۷]۔ بھارت کی اس ہٹ دھرمی کے خلاف بعض حق گو ہندو رہنما بھی آواز بلند کرتے رہے ہیں۔ درجنوں مثالیں اس ضمن میں پیش کی جاسکتی ہیں۔ ایک اہم نام پنڈت پریم ناتھ بزاز کا ہے۔ کشمیری حریت پسند کبھی بھی پنڈت بزاز کی خدمات کو نظر انداز نہیں کرسکتے کیوں کہ طویل عرصے تک ڈوگرا راج اور پھر اٹھارہ برس تک بھارتی مظالم اور جارحیت کے خلاف برسرپیکار رہ کر انھوں نے حریت فکر کی لازوال مثال قائم کی۔ چودھری غلام عباس کے ساتھ دوستانہ مراسم ہونے کی وجہ سے وہ ہندو مسلم یکجہتی کی بھی علامت تھے۔ ۱۹۳۳ء میں ڈوگرا راج کے خلاف شیخ عبداللہ اور چودھری غلام عباس کے ساتھ چھے ماہ کے لیے جیل کی سلاخوں کے پیچھے قید رہے۔ نیشنل کانفرنس کے قیام میں بھی بزاز اور ان کے اخبار کا بڑا حصہ تھا۔ ۱۹۴۷ء میں تقسیم ہند کے موقع پر جب نیشنل کانفرنس نے اپنا چولا بدلہ تب بھی پنڈت بزاز نے واضح مؤقف اختیار کرتے ہوئے کہا کہ کشمیر کے سامنے واحد راستہ پاکستان کے ساتھ الحاق ہے۔ سچائی کی حمایت کی پاداش میں انھیں زیر حراست لے لیا گیا اور تین برس تک تاریک کوٹھڑی میں بند کر دیا گیا اور بعد میں رہائی کے بعد کشمیر بدر بھی کر دیا گیا۔ دہلی میں بھی وہ خاموش نہ بیٹھے اور ”حقیقت کشمیر، آزاد کشمیر اور آزاد کشمیر کا یہ راستہ“ کے عنوان سے انگریزی میں کتابیں لکھیں۔ انھوں نے ہمیشہ کشمیر کے معاملے پر

آزادانہ رائے شماری کی حمایت کی [273]۔ بعد میں شیخ عبد اللہ کو بھی اپنی اس غلطی کا پچھتاوا رہا اور ۲۷ اگست ۱۹۴۷ء کو ایک جلسے سے خطاب کرتے ہوئے اعلان کیا کہ:

> حق خود اختیاری حاصل کرنے کے لیے کسی قربانی سے بھی دریغ نہیں کیا جائے گا۔ الجزائری عوام کی طرح کشمیری عوام بھی حصولِ حقوق کی جدوجہد سے کبھی دست بردار نہیں ہوں گے [274]۔

۹ اگست ۱۹۶۵ء کو مقبوضہ کشمیر میں جموں و کشمیر کے عوام نے ایک انقلابی کونسل قائم کی، اور وہی دن تھا جب کشمیر کی جدوجہد آزادی اپنے فیصلہ کن مرحلے میں داخل ہو گئی۔ اس انقلابی کونسل کا سب سے بڑا مقصد ہی مقبوضہ کشمیر کو ہندوستانی سامراجیوں کے ظلم، جبر و استبداد سے نجات دلا کر کشمیری عوام کے لیے خود اختیاری کا حق حاصل کرنا تھا [275]۔ ۱۹۵۳ء ہی میں ہندوستان کو احساس ہو گیا تھا کہ مقبوضہ کشمیر کے وزیر اعظم شیخ عبد اللہ ہندوستان سے کشمیر کے الحاق کے حامی نہیں ہیں۔ انھیں اس جرم کی پاداش میں ۹ اگست ۱۹۵۳ء کو برطرف کر کے قید کر دیا گیا۔ نتیجتاً عوام میں غم و غصے کی لہر دوڑ گئی۔ ہنگامے برپا ہوئے۔ ہندوستانی افواج نے اس موقع پر معصوم کشمیریوں کے خون سے ہولی کھیلی اور قتل و غارت گری کا بازار گرم کیا۔ ڈیڑھ ہزار سے زائد کشمیری عوام شہید ہوئے اور ہزاروں کی تعداد میں زخمی اور گرفتار ہوئے۔ یہ جدوجہد مسلسل جاری رہی۔ اس کا زور کبھی کم اور کبھی زیادہ ہوتا رہا۔ ۹ جنوری ۱۹۵۷ء کو شیخ عبد اللہ رہا کر دیے گئے مگر وہ اپنے مؤقف سے دست بردار ہونے کو تیار نہ تھے اس لیے ایک بار پھر ۲۹ اپریل ۱۹۵۸ء کو انھیں گرفتار کر لیا گیا۔ ایک بار پھر ہنگامے پھوٹ پڑے اور بھارتی فوج کی فائرنگ سے بیس کے قریب کشمیری شہید ہوئے۔ ۱۹۶۳ء میں درگاہ حضرت بل سے موئے مبارک کی چوری کا واقعہ اور نتیجے کے طور پر حکومت کے خلاف عوامی مظاہرے۔ مہینوں ریاست کا نظام درہم برہم رہا۔ اخبارات نے اسے عوام کی کھلی بغاوت گردانا۔ ۱۹۶۴ء میں ایک بار پھر شیخ عبد اللہ رہا کر دیے گئے لیکن ایک بار پھر جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے کہ انھوں نے کنونشن سے خطاب کرتے ہوئے حق خود ارادی کے حصول کی خاطر بڑی سے بڑی قربانی دینے کا اعادہ کیا۔ غیر ملکی دوروں میں بھی شیخ عبد اللہ اور مرزا افضل بیگ نے بھارتی بدنیتی کا پردہ چاک کیا۔ ابھی کشمیر میں غم و غصے کی لہر جاری تھی کہ ۸ مئی ۱۹۶۵ء کو شیخ عبد اللہ کی گرفتاری سے نئی بغاوت شروع ہوئی۔ اس بار بھی ۲۷ کشمیری شہید کیے گئے۔ سیکڑوں کو جیل میں ڈال دیا گیا۔ ذرائع ابلاغ پر پابندی لگا دی گئی۔ شہدا کی نعشوں کی بے حرمتی کی گئی اور انھیں دریائے جہلم میں پھینک دیا گیا۔ ۱۶ اخبار اس جرم میں بند کر دیے گئے۔ میر واعظ عمر فاروق نے واضح طور پر ہندوستانی افواج کو کشمیر کی وادی چھوڑنے کے مؤقف کا اعادہ کیا۔ سیاسی و مذہبی جماعتوں کے اشتراک سے سول نافرمانی کی تحریک کا آغاز ہوا۔ کثیر تعداد میں گرفتاریاں ہوئیں اور اس جبر و استبداد کے نتیجے میں آزادی کی تحریک میں نئی روح پھونک دی۔ ہندوستانی افواج نے درجنوں گاؤں نذر آتش کر دیے۔ تیس ہزار عوام کو زبردستی وادی سے نکال دیا گیا اور وہ آزاد کشمیر میں پناہ گزین کیمپ میں رہنے پر مجبور ہو گئے۔ مسلمان خاندانوں کو زندہ جلا دیا گیا۔ مال و اسباب اور مکانات لوٹ لیے گئے [276]۔

یہ اور اس طرح کے بے شمار مظالم اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ کشمیر کے حالات ہر گز نارمل نہیں۔ لہٰذا ایسی صورت میں یہ راگ الاپنا کہ وہاں امن و آشتی کا دور دورہ ہے محض خواب و خیال کی باتیں ہی معلوم ہوتی ہیں۔ اس بابت ایک تیسرا مؤقف سوشلسٹ قیادت کا بھی ہے۔ ایک گم نام سوشلسٹ شاعر نے اس نقطہ نظر کو اپنی ایک مخمس میں کچھ اس طرح پیش کیا ہے:

ہند و پاک کے لیڈر سارے چاہے ہوں آکاش کے تارے
لیکن سب ہیں حرص کے مارے کوئی بھی ان میں شاد نہیں ہے
وطن ابھی آزاد نہیں ہے

جھگڑا ہے سب حرص و ہوس کا حل بھی نہیں ہے ان کے بس کا
کس کی زمیں اور کس کا قبضہ حق کا یہ ارشاد نہیں ہے
وطن ابھی آزاد نہیں ہے

وہ بھی ہیں کشمیر کے خواہاں یہ بھی اس جنت کے خواہاں
اتنا بھی یہ نہ سمجھے ناداں دلِ حزیں کچھ شاد نہیں ہے
وطن ابھی آزاد نہیں ہے

کیوں مسئلہ کشمیر کا چھیڑا تم بھی جاؤ تم بھی نکلو
جس کا حق ہے اس کو دے دو کل کا وعدہ یاد نہیں ہے
وطن ابھی آزاد نہیں ہے[۲۷۷]

مگر اس نظم میں بھی واضح طور پر ہندوستان کو اس کا وعدہ یاد دلانے کی کوشش کی گئی ہے۔ ان کے خیال میں یہ مسئلہ ہندوستان اور پاکستان کا مسئلہ نہیں بلکہ ان چالیس لاکھ کشمیریوں کا اور ان کی آزادی کی سالمیت کا مسئلہ ہے۔ اس مسئلے کے حل کے بغیر ان کے بقول دونوں ممالک کے درمیان پیدا ہونے والی خلیج بھی پُر نہیں ہو سکتی۔ ۷۰ برسوں میں اس متنازعہ مسئلے میں مزید تناؤ ہی پیدا ہوا ہے[۲۷۸]۔ اسی لیے ''کشمیر! عوامی سوشلسٹ کانفرنس کا اہم فیصلہ'' کے نام سے شائع ہونے والی کتاب میں کشمیر کے اس تنازعے کو پر سوز انداز میں بیان کرتے ہوئے کہا گیا کہ:

> ہائے عروس کشمیر تو نے دو حقیقی بھائیوں کو اپنی پُر فریب ناروا ادا سے ایک دوسرے کے خون کا پیاسا بنا دیا۔ تو حور نہیں، حضیم خود ڈائن ہے۔ تری آغوش ان میں سے کسی کے لیے بھی جائے قرار و سکون نہیں۔ بلکہ ہوس کاروں کا ایک مدفن ہے… آج ترے چاہنے والے موت و زندگی کی کش

کش مکش کا شکار ہیں... او بد نصیب! تو نے کیوں یہ جامۂ حسن اوڑھ رکھا ہے؟ اپنی اصل شکل میں نمودار ہو جا۔ کیوں کہ تیرے طلب گار بڑے سادہ دل ہیں۔ وہ تیری سحر کاریوں کا طلسم از خود نہ توڑ سکیں گے، یوں ہی تیرے لیے لڑتے مرتے رہیں گے[۲۷۹]۔

حقیقت تو یہ ہے کہ ان اشتراکیوں نے کبھی بھی کشمیر کے مؤقف کو پوری طرح سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔ ہندوستان نے اشتراکیوں کا اخبار ''نیا زمانہ'' جس پر ترقی پسند ادیب سجاد ظہیر کا نام چھپتا تھا، اس میں ایک سلسلۂ مضامین شائع ہوا۔ ان مضامین میں سردار ابراہیم اور چودھری غلام عباس وغیرہ جیسے کشمیری رہنماؤں کو جاگیر دار طبقے کا نمائندہ قرار دے کر ان کی حیثیت کم کرنے کی کوشش کی گئی۔ ان لوگوں نے کشمیر کے مسئلے کو کوئی مثبت یا دیانت دارانہ رائے یا زاویۂ نظر کا اظہار نہیں کیا۔ پطرس اور تاثیر نے اپنی سیاسی حیثیت میں کچھ اخباری بیان ضرور دیے لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس دور کا اتنا اہم مسئلہ اس دور کی سب سے بڑی ادبی تحریک کے موضوعات میں مناسب جگہ نہ بنا سکا۔ اس بارے میں ایک مؤقف یہ ہے کہ ادب میں ہنگامی موضوعات کو کوئی بلند مقام نہیں دیا جاتا لیکن اس بابت یہ بھی ذہن میں رہے کہ کشمیر کا مسئلہ محض ہنگامے یا حادثے کی پیداوار نہیں بلکہ ایک مستقل تاریخی تسلسل کے ساتھ روا رکھے جانے والے جبر کے نتیجے کی پیداوار ہے[۲۸۰]۔

حقیقت یہ ہے کہ کشمیر کو سمجھنے کے لیے ان کشمیری ادیبوں کا مطالعہ بے حد ضروری ہے جن کا براہ راست اس وادی سے تعلق رہا۔ اس لیے مذکورہ صفحات میں اکثر شعرا کے کلام کی مثالیں پیش کر کے ان کشمیریوں کے مؤقف کی وضاحت کی گئی جو تقریباً ایک صدی سے زائد عرصے گزرنے کے باوجود آج بھی اپنی آزادی کی راہ تک رہے ہیں۔ ان کی نگاہیں عالمی برادری کی طرف مرکوز ہیں جو ہمیشہ انصاف کی دعویٰ دار رہی ہیں۔

ان نظموں کے مطالعے سے یہ بات پوری طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ ان نظموں میں کشمیر کی محکومیت، مظلومیت، اہل کشمیر کی بد نصیبی، بے بسی، مجبوری، اداسی اور لاچاری کے مناظر دکھائے گئے ہیں اور کشمیر میں ہونے والی خوں ریزی اور بربریت اور مسلسل ہونے والی تباہی کی تصویر پیش کی گئی ہے۔ کشمیر کی اس تصویر میں یاسیت، انفعالیت اور بے بضاعتی کا پہلو بہت نمایاں ہے جس کی بنا پر کشمیر کا سارا منظر مایوسی کے رنگ میں ڈوبا دکھائی دیتا ہے۔ ظاہر سی بات ہے کہ جس طرح کے سانحات سے کشمیر پچھلی سات دہائیوں سے دوچار ہے، اس میں اس طرزِ فکر کا پیدا ہونا کوئی اچنبھے کی بات نہیں۔ پھر یہ کہ کشمیریوں کی جی داری، بہادری اور عسکری پہلوؤں کو پیش کرتے ہوئے شعرا کی بڑی تعداد نے انھیں خراجِ تحسین بھی پیش کیا ہے۔ یہ فہرست بہت طویل ہے اور اس کے ذکر کی یہاں گنجائش نہیں۔ کچھ مثالیں ضرور پیش کی جاتی ہیں۔ مثلاً انجم رضوانی کی نظم ''مجاہدو'' کے چند اشعار دیکھیے:

دکھائی ہر محاذ پر وہ جرأت و دلاوری — صنم کدے کے بام و در پکار اٹھے ''ہری ہری''

مجاہدوں کی تیغ الاماں کی ضرب الاماں — غرور ظلم ناروا کی اڑ رہی ہیں دھجیاں[۲۸۱]

بہرام ساحل کی نظم میں بھی مزاحمت اور عسکریت کا نقشہ کچھ اس طرح کھینچا گیا ہے:

وہ کشمیری جنھوں نے ذلتیں پیہم اٹھائی تھیں　　وہ جن کے خون سے آقا نے قندیلیں جلائی تھیں

مصیبت، آفتیں، فاقے، اذیت جس کی قسمت ہے　　وہ جن کے کھیت اپنے تھے مگر فصلیں پرائی تھیں

انھیں کے ہاتھ میں حق و صداقت کا علم دیکھو　　ذرا سی دیر میں سر سامراجی کا قلم دیکھو[۲۸۲]

پیام شاہ جہاں پوری کی نظم ''مجاہدین کشمیر کا نغمہِ آزادی'' دراصل رزمیہ کی عمدہ مثال ہے۔ اشعار ملاحظہ کیجیے:

گواہی دے رہا ہے گلشن و کشمیر کا ہر گل　　تہہِ تیغ و سناں بھی مسکرانا ہم کو آتا ہے

ہمیں بپھرے ہوئے طوفاں سے گھبرانا نہیں آتا　　سمندر میں لہو کے، تیر جانا ہم کو آتا ہے

ہمیں اپنے لہو سے غسل کرنا ہی نہیں آتا　　حریفوں کے لہو سے بھی نہانا ہم کو آتا ہے

چراغِ حریت کی لو ذرا کم ہو نہیں سکتی　　یہ گردن کٹ تو سکتی ہے مگر خم ہو نہیں سکتی[۲۸۳]

حزیں صدیقی کی نظم ''نعرۂ آزادی'' میں بھی نعرے کی لے کافی بلند ہے۔ چند اشعار دیکھیے:

اب نقشہ دنیا کو بدلنا ہی پڑے گا　　اس لشکرِ اعدا کو نکلنا ہی پڑے گا

ہے ایک یہی فیصلہ انصاف کی رو سے　　کشمیر کو آزاد کرائیں گے عدو سے

تاریخ کا لکھیں گے نیا باب لہو سے　　ہم گردشِ افلاک کا منھ پھیر چکے ہیں[۲۸۴]

ضیاء احمد ضیاء کی نظم ''جہاد کشمیر'' میں میدان جہاد اور محاذ جنگ کی شوریدگی اور صاف سنائی دیتی ہے۔ دیکھیے:

فتنہِ خوابیدہِ محشر یہاں بیدار ہے　　تیرے آبا کے وطن پر یورشِ یلغار ہے

گونجتا ہے وادیوں میں نعرہِ تکبیر چل　　گر شہادت کی تمنا ہے تو چل کشمیر چل[۲۸۵]

عاصم صہبائی کی نظم ''وطن آزاد ہو جائے'' میں بھی سارا ماحول رزمیہ شاعری کا ہی ہے۔ عسکریت پسندانہ جذبات کا اظہار کرتے ہوئے شاعر کہتے ہیں:

سلام اے خطہِ گل پوش! اے کشمیر کی وادی　　ترے فرزند ہیں تیار بہرِ جنگ آزادی

ترے بیٹے جنھوں نے مسکرا کر گولیاں کھائیں　　ترے بیٹے تری حالت پہ جن کی آنکھ بھر آئی[۲۸۶]

عطا حسین کلیم کی نظم ''جہادِ کشمیر'' کا انداز بھی جنگ جویانہ ہے۔ اپنی ایک اور نظم ''مجاہدینِ آزادی کے نام'' میں بھی وہ جنگی ترانے کا انداز اختیار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

چمک رہی ہیں بجلیاں　　فضا میں ہے دھواں دھواں

سلگ رہا ہے آشیاں　　رجز بہ لب رواں رواں

اٹھے جہاد کے لیے سری نگر کے نوجواں[۲۸۷]

یہی لہجہ اور یہی کیفیت فوق لدھیانوی کی نظم "مجاہدینِ کشمیر" میں بھی موجود ہے۔ چند اشعار دیکھیں:

سیلِ خوں کی تند موجوں سے گزر جاتے ہو تم   قلب گردابِ بلا میں بھی اتر جاتے ہو تم
تم نے چیرا عزمِ راسخ سے چٹانوں کا جگر   تم ہی وہ جاں باز ہو جو کھیل جائیں جان پر[۲۸۸]

منصور عاقل کی نظم میں بھی ابلاغ اور تاثیر کا پہلو نمایاں ہے۔ نرم انداز میں وہ غزل کی غنائیت کو برقرار رکھتے ہوئے جدوجہد کی تلقین کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

راہرو! ترکِ سفر کا نہ ارادہ کرنا   آج خود منزلِ جاناں نے پکارا ہے تجھے
تجھ کو دی ہے کسی مجبور قفس نے آواز   پھر کسی دیدۂ گریہ نے پکارا ہے تجھے[۲۸۹]

نرگس شیخ کی نظم "سری نگر کے ننھے شہید کے نام" کا آہنگ بھی بہت بلند ہے۔ اس نظم میں زخموں پہ پھایا رکھنے کا مادرانہ انداز اور غم گساری کی فضا دکھائی دیتی ہے۔

سری نگر کے شہیدوں کی جرأتوں کو سلام   اور ان شہیدوں کی ماؤں کی عظمتوں کو سلام
بڑھے چلو کہ بہت ہی قریب ہے منزل   بڑھے چلو کہ وہ منزل ہے صرف چند ہی گام[۲۹۰]

کشمیر میں صدیوں سے جاری تحریک مزاحمت اور وہاں پر برپا معرکہ آزادی وخود اختیاری کے حوالے سے تخلیق کی گئی منتخب نظموں کا مطالعہ ثابت کرتا ہے کہ اردو شعرا نے عوام کو آزادی وخود محاذ اختیاری کے اس معرکے میں تنہا نہیں چھوڑا اور فکر و فن کے محاذ پر انھیں اپنے جذبوں کی کمک بہم پہنچانے میں کسی قسم کے بخل سے کام نہیں لیا۔ کشمیر کی تحریک آزادی کے حوالے سے لکھی گئی ان نظموں کا مزاج رزمیہ اور آہنگ مجاہدانہ ہے۔ شان الحق حقی کی نظم "مجاہدِ کشمیر" کا رنگ دیکھیے:

وہ اٹھی سازِ بغاوت کی لرزہ خیز ترنگ   وہ ابھری قلبِ کشمیری کی بے قرار امنگ
وہ گونج اٹھا فضاؤں میں دیکھو! نعرۂ جنگ   پکارتا ہے مجھے ضربِ تیغ کا آہنگ

مرے رفیق! مرا انتظار مت کرنا[۲۹۱]

ان میں سے اکثر نظمیں فنی لحاظ سے دیرپا اثر نہیں چھوڑتیں اور نہ ہی وہ لازوال تخلیق کہلانے کی مستحق ہیں لیکن ان نظموں میں جنگ کے طبل بجتے ہوئے، مورچوں سے دھویں اٹھتے ہوئے اور سے پشتے لگتے ہوئے صاف دکھائی دیتے ہیں۔ بعض نظموں میں تو جذبات خیزی کی سطح اس قدر بلند ہے کہ یہ خود اختیاری اور خود ارادی کی جنگ کے بجائے ایسا معرکہ محسوس ہوتا ہے جس کا ہر مرکز و محور محض مذہبی تعصب ہے۔ ایسی نظموں کے خیالات عدم توازن کے شکار ہیں۔ اس میں معرکۂ کشمیر کو صرف کشمیر ہی کا نہیں بلکہ پاکستان کی بقا اور سلامتی کا مسئلہ بنا کر پیش کیا گیا۔ مثلاً ابو ظفر نازش کی نظم "پاکستان کے بچوں کا ترانہ" اپنے عنوان ہی سے ایک متنازعہ نظم لگتی ہے۔ اس نظم میں پاکستانی بچوں کو یہ سبق سکھایا گیا ہے کہ "کشمیر ہمارا ہے" اس طرح تو پاکستان

بھی بھارت کی طرح کشمیر کو اپنا اٹوٹ انگ قرار دے رہا ہے جب کہ حکومت پاکستان کا ہمیشہ سے موقف ہے کہ کشمیر کا فیصلہ وہاں کے عوام کی مرضی اور استصواب رائے سے کیا جانا چاہیے۔ جب کہ نازش کہتے ہیں کہ:

سو بات کی اک بات یہ لاکھوں میں کہیں گے   کشمیر ہمارا ہے اسے لے کے رہیں گے[۲۹۲]

حسن بخت کی نظم ''پرچم اسلام لہراتے چلو کشمیر میں'' بھی اپنے عنوان کے تعلق سے جارحانہ رنگ لیے ہوئے ہے۔ اس میں اسلام کے پرچم سے شاعر کی کیا مراد ہے۔ یہ بات ناقابل فہم ہے کیوں کہ کشمیر کی غالب اکثریت تو ہے ہی مسلم البتہ بھارتی تسلط کے خاتمے کی جدوجہد ضروری ہے۔ لیکن شاعر اسے تسلط کے بجائے کہتا ہے کہ:

پرچمِ اسلام لہراتے چلو کشمیر میں   سامراجی قوتوں کو زیرِ پا لاتے چلو

بن کے طوفاں توڑ دو اب کفر کی دیوار کو   آگے بڑھ کے قوتِ باطل سے ٹکراتے چلو[۲۹۳]

یہی عدم توازن کی فضا ارشد صابری کی نظم ''وادیِ کشمیر تجھے سلام'' میں بھی دکھائی دیتا ہے۔ مسدس کی ہیئت میں لکھی گئی اس نظم کے ٹیپ کا مصرعہ دیکھیں جس میں شاعر آزادی کی اس لڑائی کو مذہبی رنگ دیتے ہوئے کہتا ہے کہ:

جنتِ کشمیر تیری وادیوں میں ایک دن   نعرہِ اللہ اکبر ہم لگاتے آئیں گے[۲۹۴]

بعض نظموں میں سامراجی روّیوں کے خلاف عزم و حوصلے سے کشمیر کو آزاد کرانے کی باتیں بھی کی گئی ہیں۔ حیات میرٹھی نے اپنی نظم ''قوت بازو سے لیں گے وادیِ کشمیر ہم'' میں یہی انداز اختیار کیا۔ ملاحظہ کیجیے:

سامراجی آندھیوں کا رخ بدلنے کے لیے   کام لیں حسنِ تدبّر سے بلا تاخیر ہم

یہ ہمارا فیصلہ ہے، یہ ہمارا عزم ہے   قوتِ بازو سے لیں گے وادیِ کشمیر ہم[۲۹۵]

اسی طرح خورشید میرٹھی کی نظم ''عزم صمیم'' میں بھی یہی انداز اختیار کیا گیا ہے:

توڑ دیں گے بے کسوں کے پاؤں کی زنجیر ہم   قوتِ بازو سے لیں گے وادیِ کشمیر ہم

صدقِ دل سے گر لگائیں نعرہِ تکبیر ہم   ایک پل میں قصرِ باطل کو کریں تسخیر ہم[۲۹۶]

کچھ یہی کیفیت عبدالکریم ثمر کی نظم ''اٹھو حق کے نگہبانو تمھیں کشمیر لینا ہے'' میں بھی موجود ہے۔ اس نظم میں شاعر کشمیر پر قبضہ کرنے کے لیے ہوائی جنگ کی ترغیب دیتا نظر آتا ہے۔ ظاہر سی بات ہے کہ اس کے مخاطب کشمیری فضائیہ نہیں بلکہ وہاں تو کسی قسم کی فضائیہ کا وجود ہی نہیں تو پھر اس کے مخاطب لازماً پاکستانی افواج ہیں۔ ملاحظہ کیجیے:

اگر اقوامِ مغرب کی نظر حق سے گریزاں ہے   تو ذوقِ سرفروشی بے نیاز ساز و ساماں ہے

نگاہِ عزم و ہمت سے فضا بدلو فضا سازو   غیور، حق پرستو، شیر، شاہینوں، ہوا بازو

ہوا کا رخ بھی پہچانو تمھیں کشمیر لینا ہے   اٹھو حق کے نگہبانو تمھیں کشمیر لینا ہے[۲۹۷]

ظہیر کاشمیری کی نظم ”لالہ و گل کی وادی میں“ بھی اسی عزم و حوصلے کو پروان چڑھاتے ہوئے حق اور سچ کی جیت کا راگ الاپا گیا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

روتی آنکھوں، بے کس چہرو، کلفت کا ہنگام گیا — وادیِ رنگیں کے شہزادو! دورِ غم و آلام گیا

طوق و سلاسل کٹنے لگے، زنداں کا زمانہ بیت گیا — جور کی فوجیں ہار گئیں، انصاف کا لشکر جیت گیا

ظہیر و وادی کے مظلوموں! آتے ہیں ہم آتے ہیں[۲۹۸]

قیوم نظر کی مشہور نظم ”سری نگر کی بیٹیاں“ بھی انھیں جذبات کی عکاسی کرتی نظر آتی ہے۔ اس نظم میں بھی امید اور عزم کی شمع روشن کی گئی ہے۔ ظاہر ہے جس قوم کی بیٹیوں میں آزادی کی تڑپ پیدا ہو جائے، آزادی ان سے بہت زیادہ عرصے تک دور نہیں رہ سکتی۔ ان مناظر کو دکھاتے ہوئے شاعر کہتے ہیں کہ:

امید کا کھلا چمن / اتر گیا / خزاں کا خستہ پیراہن / وہ بے دریغ آ گئیں / سروں پہ اپنے

باندھ کر کفن / نڈر دلیر بچیاں / سری نگر کی بیٹیاں[۲۹۹]

محسن نقوی کی نظم ”قسم اپنے لہو کی“ میں بھی رجائیت کا پہلو نمایاں ہے۔ وہ کشمیری عوام سے وعدہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

اے وادیِ کشمیر! ترا حسن سلامت — ہم لوگ ترا حسن بکھرنے نہیں دیں گے

مر جائیں گے لیکن ترے دشمن کی سپاہ کو — احباب کی لاشوں سے گزرنے نہیں دیں گے[۳۰۰]

اس طرح کے نعرے لگانا دراصل خود حریت آزادی کو نقصان پہچانے کے مترادف ہے۔ صدیوں سے کشمیر میں مختلف مذاہب کے لوگ آباد رہے ہیں۔ یہ درست ہے کہ غالب اکثریت مسلمانوں کی ہے لیکن ۴۵ فی صد غیر مسلم بھی اسی کشمیر کا حصہ ہیں جس کی آزادی کی بات کی جا رہی ہے۔ کشمیر کے تین صوبوں میں سے وادیِ کشمیر میں مسلمانوں کی آبادی کی شرح زیادہ ہے۔ لداخ میں بدھ مت کے پیروکاروں کی بڑی تعداد رہتی ہے اور جموں میں ہندوؤں کی کثیر تعداد سکونت پذیر ہے۔ تمام مذاہب کے پیروکار کشمیری ہیں اور کشمیر سے محبت کا دم بھی بھرتے ہیں، لہٰذا اس قسم کے نعرے ان کی یکجہتی اور حریت پسندانہ سوچ کو نقصان پہنچانے کا سبب بن سکتے ہیں۔ اگر اس قسم کی سوچ ہو کہ کشمیر پاکستان کا حصہ ہے اور ہم اسے اپنے ملک کا حصہ بنا کر رہیں گے تو پھر بھارت کے یہ کہنے میں کہ کشمیر بھارت کا اٹوٹ انگ ہے اعتراض کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ کشمیری کئی دہائیوں سے آزادی کی جنگ لڑ رہے ہیں۔ کشمیر کے مستقبل کا فیصلہ خود کشمیریوں کو کرنا ہے اور یہی موقف خود پاکستان اور بھارت دونوں کے لیے بہتر ہے۔ بہتر یہی ہے کہ اقوام متحدہ کی قرار دادوں کے مطابق اس ریاست کو حق خود ارادیت اور حق خود اختیاری دے کے فیصلہ عوام پر چھوڑ دیا جائے کہ وہ اپنے لیے کیا بہتر سمجھتے ہیں۔ بھارت اور پاکستان کو محض ایک وکیل کا فریضہ انجام دے کر انھیں اپنے معاملات میں آزاد چھوڑ دینا چاہیے۔

عزم و امید کے چراغ روشن کرنے کی منزل سے بھی ایک قدم آگے بڑھ کر بعض شعرا نے ضمیر عالم کو جھنجھوڑنے کے لیے بھی عمدہ نظمیں کہیں۔ احمد ندیم قاسمی اور احمد فراز کی نظموں کا ذکر مذکورہ صفحات میں کیا جا چکا ہے لیکن اس کے علاوہ بھی بہت سے شعرا نے جبر و استبداد کے خلاف استغاثے کا فورم اقوام متحدہ اور سلامتی کونسل کو آواز دے کر اس اہم مسئلے کی طرف توجہ دلانے کی کوشش کی ہے۔ جسٹس اے۔ آر۔ رحمان کی نظم بھی عالمی ضمیر کو جھنجھوڑنے کی ایک کوشش ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

ستم گر! ستم جاودانی نہیں   جو نہ ختم ہو، وہ کہانی نہیں
سلگنے لگی پھر چناروں کی آگ   ابلنے لگے آبشاروں کے راگ[۳۰۱]

شفقت بٹالوی اپنی نظم "صدائے کشمیر: یو این او کے نام" میں اقوامِ کی انجمن کے ضمیر کو یوں جھنجھوڑ رہے ہیں:

کب تک گلو کے خون سے دامن بچاؤ گے   کب تک صدائے خلق کو سولی چڑھاؤ گے
کب تک چھپی رہے گی اندھیروں میں روشنی   کب تک لٹے گی رنگیں بہاروں میں زندگی[۳۰۲]

ماجد نور نے اپنی نظم "کشمیر کی تسخیر" میں جانب دار اور بے بس مجلسِ اقوام کے دستور کو تنقید کا نشانہ بناتے ہوئے ان کے چہرے سے اس طرح نقاب الٹا ہے:

حق مجلسِ اقوام کا دستور نہیں   انصاف پر مبنی کوئی منشور نہیں
ناکام ہمیں لوٹنا منظور نہیں   اب منزل مقصود کوئی دور نہیں[۳۰۳]

عالمی بے بسی اور بھارت نواز پالیسی کے خلاف مزاحمت کرتے ہوئے نقش ہاشمی نے اپنی نظم میں مہذب دنیا کی سرد مہری کا ماتم کچھ ان الفاظ میں کیا ہے:

جہاں منڈلا رہے ہوں زندگی پر موت کے سائے   ستم یہ ہے لبوں تک بھی نہ آنے دے کوئی "ہائے"
زباں پر کس طرح حرفِ شکایت پھر کوئی لائے   جو کرنا ہو کسی نے استغاثہ تو کہاں جائے[۳۰۴]

اسی طرح منظور عارف نے بھی اپنی نظم "وِٹو پاور" میں مجلس اقوام کی سلامتی کونسل کی سرد مہری پر سوال اٹھاتے ہوئے کہا کہ:

گر یہی انصاف ہے / تو امنِ عالم کی محافظ کونسل! / تو ہی بتا / کس طرح معلوم ہو کہ
امن کیا ہے، جنگ کیا / قدر دانِ شانِ جمہوریت اقوامِ ارض / تیری جاں پر خود تری
جمہوریت کا خوں ہے قرض[۳۰۵]

افتخار مغل کا ذکر بھی مذکورہ صفحات میں کیا جا چکا ہے۔ ان کے مجموعے "لہو لہو کشمیر" میں شامل نظم "کشمیر توجہ چاہتا ہے" میں بھی مہذب دنیا کا دامن پکڑ کر فریاد کی گئی ہے کہ خدارا کشمیر پر بھی کچھ توجہ کی جائے تا کہ کشمیریوں کی کلفتیں دور ہو سکیں۔ چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

دنیا کے مہذب انسانو! کشمیر توجہ چاہتا ہے — کشمیر کے درد کو پہچانو! کشمیر توجہ چاہتا ہے
انسان کے خون کی ارزانی، دیکھو تو سہی! سوچو تو سہی — خوں سستا ہے، مہنگا پانی، دیکھو تو سہی! سوچو تو سہی
اس دیس میں ہر صبح، ہر شب کو دوزخ کی ہوائیں چلتی ہیں — کشمیر کے شہر سلگتے ہیں، کشمیر کی گلیاں جلتی ہیں
انسان کے درد کو پہچانو! کشمیر توجہ چاہتا ہے — دنیا کے مہذب انسانو! کشمیر توجہ چاہتا ہے
اس عہد میں بھی اس دھرتی پر نمرود کی شاہی چلتی ہے — ظالم کی عدالت لگتی ہے، قاتل کی گواہی چلتی ہے
ہر ایک زباں پر پابندی، ہر ایک نظر پر پہرا ہے — ہر نالہ ہے زنجیر وہاں ہر ایک فغاں پر پہرا ہے
اس دھرتی کے غم کو جانو، کشمیر توجہ چاہتا ہے — دنیا کے مہذب انسانو! کشمیر توجہ چاہتا ہے[۳۰۶]

کشمیر کے موضوع پر کہی گئی نظموں کے مطالعے سے یہ بات تو پوری طرح سامنے آجاتی ہے کہ اس مناسبت سے کی گئی بیش تر نظمیں جذباتی رد عمل کے تحت لکھ گئی ہیں۔ ان نظموں میں خاک وخوں کے استعارے، وحشت، دہشت، مایوسی، بد دلی، ناکامی اور کہیں کہیں عزم، امید اور رجائیت کے مضامین کی بھرمار ہے۔ اکثر شعرا فکری عدم توازن کا شکار دکھائی دیتے ہیں۔ کچھ نظمیں ایسی ضرور ہیں جن میں توازن، ابلاغ اور تاثیر کی سطح نہایت بلند ہے۔ جذباتی انتشار اور فکری عدم توازن سے پاک نظموں کا ذکر بھی کیا گیا۔ اس حوالے سے مزید مثالیں بھی پیش کی جا سکتی ہیں۔ مثلاً آل عمران کی نظم ''کشمیر'' کا لہجہ مترنم اور اسلوب کی سادگی اسے دیگر نظموں سے کس طرح ممتاز کرتی ہے، ملاحظہ کیجیے:

اے لختِ خُلد / ارضِ کاشمیر مجھے بتا / تری حسین! بستیوں سے ادھ کھلے محبتوں کے
پھول کون لے گیا؟ / بہار ساز وادیوں کے گنگناتے آبشار / سبز ٹہنیاں، حسین بلند پیڑ
سایہ دار / گنگناتے پانیوں کو ہونٹ کس نے سی دیے / یہ کس نے جگنوؤں کے گھر سپردِ
تیرگی کیے / یہ کون ہے جو روشنی کو شب کا نام دے گیا؟[۳۰۷]

اسی قسم کی نظموں میں کشمیر کے دل کش مناظر، حسن اور رنگینی کے ساتھ ساتھ وہاں جاری ظلم و جبر کی تصویریں بھی پیش کی گئی ہیں۔ نہ اس میں جنگ و جدل کی گھن گرج ہے اور نہ ہی انسانی سروں کے مینار، لیکن ایک احتجاج کی فضا ضرور موجود ہے۔

کچھ اسی قسم کی کیفیت یاسمین حمید کی نظم ''کشمیری مجاہدوں کے نام'' میں بھی نظر آتی ہے۔ ان کے ہاں بھی مزاحمت کی فضا تو موجود ہے لیکن وہ گھن گرج نہیں جو شعری حسن میں رکاوٹ ڈالے۔ ملاحظہ کیجیے:

یہی وہ وقت ہے / کشمیر کی وادی میں جب حسنِ ازل آباد کرنا ہے / جب ایسی فصل بونی
ہو / تو سر اور خون بے معنی سے ہوتے ہیں / زمیں کو سرخ رو کرنے کو تھوڑا سا لہو دینا

ہی پڑتا ہے / لہو ___ جو بے زباں مٹی کے لب بھی کھول دیتا ہے / لہو ___ قطروں
میں ظلمت کے خزانے تول دیتا ہے / لہو ___ مردہ فضاؤں کو از خود سیراب کرتا
ہے / لہو ___ اندھی رتوں میں زندگی کے خواب بھرتا ہے / لہو کی آبشاریں دیکھ کر
آنکھیں نہ کھو دینا / لہو کی بھینٹ دے کر آج کا لمحہ امر کرنا / یہ ہونے اور نہ ہونے کا
لمحہ ہے / اسے برباد مت کرنا[308]

محسن احسان کے ہاں بھی کئی نظمیں اسی رنگ میں رنگی ہوئی ہیں۔ ان کے مجموعے میں شامل کئی نظمیں مثلاً ''اہلِ کشمیر کے نام''، ''چناروں کی دھوپ''، ''جہاد''، ''زندگی کے لیے جنگ کرتے رہو'' اور ''گیت'' وغیرہ میں بہت نرم لہجے میں ان مسائل پر گفتگو کی گئی ہے۔ ان کی ایک نظم ''جواں لاشوں کی آمد ہے'' کا رنگ ملاحظہ کیجیے جس میں انسانی حقوق کی تذلیل اور ریاستی دہشت گردی کے مناظر دکھاتے ہوئے شاعر کہتا ہے کہ:

ذرا ہٹ جاؤ رستہ دو / جواں لاشوں کی آمد ہے / یہ لاشہ اس جواں کا ہے / کہ جس کی
دھڑکنوں میں انقلابی کشت و سبزہ رقص کرتے تھے / کہ جس کی مدھ بھری آنکھوں
میں / خون آلود دریا رقص کرتے تھے / یہ لاشہ اس گماں کا ہے / جسے کامل یقیں
تھا / شام کے سورج نے کرنوں کی شفق میں / ریشمی رعنائی گھولی ہے / لہو نے عاجزوں
کے حوصلوں میں / قرمزی سچائی گھولی ہے / ذرا ہٹ جاؤ رستہ دو / جواں لاشوں کی آمد
ہے / یہ لاشہ مسلے پھولوں کی دل آرائی کا لاشہ ہے / اجل کے بازوؤں میں روتی تنہائی کا
لاشہ ہے / کہ جس کی سانس پر آتش فشاں کہسار پلتے تھے / کہ جس کے آنسوؤں میں
منبر و محراب کے افکار ڈھلتے تھے / ذرا ہٹ جاؤ رستہ دو / کئی لاشوں کی آمد ہے[309]

اسی طرح انجم رومانی کی نظم ''سلامتی کونسل'' میں بھی کشمیر کے حوالے سے اقوامِ متحدہ کے کردار پر تنقید تو کی گئی ہے لیکن اس شکوے اور نالے کی لے بڑی مدھم اور پُر اثر ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

ستم رسیدوں کو اب تک یہی گلہ ہے یہاں	کہ سامراجیوں کا ایک سلسلہ ہے یہاں
کسی غریب کو انصاف بھی ملا ہے یہاں	چراغِ مصلحتوں کے جلائے جاتے ہیں
ستم گروں کے یہاں دل بڑھائے جاتے ہیں	فلاحِ امن کے ڈنکے بجائے جاتے ہیں
رہے ہمیشہ سلامت سلامتی کونسل	سلامتی کی علامت، سلامتی کونسل[310]

مگر ان سب سے بڑھ کر تاثیر یونس متین کی نظم ''کنہیا لال کے نام خط'' لیے ہوئے ہے۔ یہ نظم اپنی پُر سوز اور دردمندانہ کیفیت کی وجہ سے قاری کے دلوں کو چھولیتی ہے۔ نظم ملاحظہ کیجیے:

کنہیالال! کیسے ہو / سنا ہے آج کل کشمیر کی وادی میں / آہ و آتش و آہن کی بارش روز ہوتی ہے / وہاں بارود پھٹتا ہے / فضا میں پھول سے معصوم بچوں کے بدن / جب ریزہ ریزہ ہو کے اڑتے ہیں / تو ماؤں کے کلیجے ساتھ ہوتے ہیں / کنواری بچیوں کی عصمتوں کے داغ / فاتح فوجیوں کے سرد سینوں پر چمکتے ہیں / یہ تمغے ہیں؟ / کنہیالال یہ کیسی سیاست ہے / سرا کشمیر زندہ پانیوں پر موت کی تہمت لکھی جائے! / کسی انکار سے / تحریر کے صد چاک پیراہن رفو کرنا / ڈبو کر خون میں بندوق کی نالی / چمکتے لفظ ''امن و آشتی'' لکھنا / کنہیالال! / فطرت کے عمل کو جاری رہنا ہے / یہ سورج کا چمکنا رک نہیں سکتا / ہوائیں تھم نہیں سکتیں / جسے آزاد ہونا ہے / اسے آزاد ہونا ہے [۳۱۱]

غزل کی ہیئت اور اس کا مزاج ہمیشہ سے موسیقیت اور ترنم سے ہم آہنگ رہا ہے۔ اس صنف میں تو مشکل، دقیق اور سیاسی موضوعات بھی اس قدر نزاکت اور پُر لطف طریقے پر بیان کیے جاتے ہیں کہ کسی طرح کی کرختگی اور تلخی کا احساس نہیں رہتا۔ اردو غزل میں ہمیشہ سے کشمیر کے حسن کو موضوع بنایا گیا۔ اقبال کے زمانے سے سیاسی موضوعات بھی اس صنف میں بیان کیے جانے لگے۔ انھوں نے اپنی غزلوں میں کشمیر کے سیاسی اور سماجی ڈھانچے کو جس قدر مہارت سے برتا ہے اس کا مذکورہ صفحات میں ذکر کیا جا چکا ہے۔ اسی طرح احمد شمیم اور نذیر انجم سمیت متعدد غزل گو شعرا کے حوالے درج بالا صفحات میں پیش کیے جا چکے ہیں۔ کچھ اور شاعر بھی ہیں جنھوں نے کشمیر کے سسکتے اور سلگتے مسائل کو غزل کا موضوع بنایا۔ شوکت مہدی نے اس چمن کی بے رونقی کا حال اپنی غزل میں کچھ اس طرح بیان کیا ہے

گلاب وادی میں جلتے چنار دیکھ چکے — تمھارا عدل بھی اے شہر یار دیکھ چکے
وہی چمن ہے مگر خار و خس کے مرقد ہیں — غبار ہوتے ہوئے مرغزار دیکھ چکے [۳۱۲]

سرزمین کشمیر سے دوری اور غریب الوطنی کو بھی بہت سے غزل گو شعرا نے موضوع بنایا۔ عاصی کاشمیری کا یہ شعر ملاحظہ کیجیے:

ہجرتوں کی نئی تاریخ لکھی ہے عاصی — ایک ہجرت کے لیے دوسری ہجرت کی ہے [۳۱۳]

غرض کہ اردو شاعری میں کشمیر کے سانحات اور مسائل کے اس جائزے سے ایک بات تو پوری طرح عیاں ہے کہ شعرا نے بہت بھرپور انداز سے کشمیر کے مصائب کو شاعری کا موضوع بنایا۔ نہ صرف بیسویں صدی میں ہونے والی تقسیم کے نتیجے میں پیدا ہونے والے المیے کو اردو شعرا نے مختلف اصناف سخن میں برتا بلکہ کئی صدیوں سے جاری مزاحمت کے حوالے بھی اردو

شاعری میں بھرے پڑے ہیں۔ قانون آزادیٔ ہند کے مطابق اور اقوام متحدہ کی قراردادوں کے مطابق اس خطے کی حیثیت کیا؟ یہ کوئی معمولی مسئلہ نہیں۔ اس مسئلے نے ان گنت سانحات کو جنم دیا ہے۔ یہ مسئلہ دراصل ڈیڑھ کروڑ لوگوں کی زندگی اور موت کا مسئلہ ہے۔ جن کی آس اور امید اقوام عالم سے جڑی ہوئی ہے۔ اس مسئلے نے جنوبی ایشیا کی دو بڑی ریاستوں پاکستان اور بھارت کے درمیان نفرت کی ایسی دیوار کھڑی کر رکھی ہے جو کسی طرح بھی ختم ہونے کا نام نہیں لے رہی۔

۱۹۴۷ء سے لے کر آج تک ستر برس سے زائد کا عرصہ گزر چکا ہے۔ ان سات دہائیوں میں پانچ لاکھ سے زائد انسانوں کی زندگی لقمۂ اجل بن چکی ہے۔ تقریباً اسی قدر لوگ معذوری کی زندگی گزارنے پر مجبور ہو چکے ہیں۔ ۵۰ لاکھ سے زائد لوگ بے گھر ہو چکے ہیں۔ اعداد و شمار کے مطابق ایک لاکھ کے قریب خواتین کی عصمتیں تار تار کی جا چکی ہیں۔ یہ وہ قربانیاں ہیں جو کشمیریوں نے محض خود اختیاری حاصل کرنے کے لیے پیش کی ہیں۔ عالمی برادری کو اب اس مسئلے پر سنجیدگی سے توجہ دینے کی ضرورت ہے تاکہ مزید انسانی جانوں کو ضیاع سے بچایا جاسکے۔ کشمیر نہ تو بھارت کی جاگیر ہے اور نہ پاکستان کی۔ یہاں کے لوگوں کو آزادانہ اور اپنی مرضی سے فیصلے کرنے کا حق ہونا چاہیے۔ اب یہ کشمیریوں کی مرضی ہے کہ وہ بھارت کے ساتھ الحاق کریں یا پاکستان کے ساتھ یا پھر دونوں میں سے کسی کے ساتھ بھی نہیں بلکہ اپنی علاحدہ اور آزاد ریاست قائم کرنے کی راہ ہموار کریں۔

اردو شعرا نے ان تمام مسائل کو بہت گہرائی سے اردو شاعری میں جگہ دی۔ تمام مصائب، مسائل اور پریشانیوں کا احاطہ کیا اور یہ شعری سرمایہ اس قدر قیمتی ہے کہ محض اس شعری سرمائے سے ہی کشمیر کی جہد آزادی کی داستان رقم کی جاسکتی ہے۔

حوالہ جات

۱۔ مینن، وی۔ پی۔ "ہندوستانی ریاستوں کی داستانِ الحاق"، مترجم، رئیس احمد جعفری، کتاب منزل، لاہور، ۱۹۶۰ء، ص ۶۷

۲۔ عرفی، بہ حوالہ "کشمیر میں اردو نثر کا تحقیقی مطالعہ"، غیر مطبوعہ مقالہ برائے پی ایچ۔ ڈی۔ از ممتاز صادق خان، شعبہ اردو، سندھ یونی ورسٹی، جام شورو، ۲۰۰۰ء، ص ۲۶؛ عرفی کا مغل حکمران اکبر اور جہانگیر کے ساتھ کشمیر آنا ثابت ہے۔ غالباً کشمیر کے حسن سے متاثر ہو کر اسی زمانے میں یہ شعر کہا گیا ہوگا۔

۳۔ تشنہ، ایم۔ نذیر، "جموں و کشمیر البم"، گلوب پبلشرز، لاہور، سن ندارد، ص ۸

۴۔ صولت، ثروت، "ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ"، حصہ سوم، مکتبہ جدید پریس، لاہور، ۱۹۹۵ء، ص ۶۹

۵۔ سراج الدین، سراج، "کشمیر کی بود و باش"، مشمولہ: ہفت روزہ "نصرت" (لاہور)، کشمیر نمبر، مرتبہ حنیف رامے، مکتبہ جدید، لاہور، شمارہ ۱۲۔ ۱۴، ۱۹۶۰ء، ص ۱۰۱

۶۔ خان، ممتاز صادق، "کشمیر میں اردو نثر کا تحقیقی مطالعہ"، غیر مطبوعہ مقالہ برائے پی ایچ۔ ڈی۔ شعبۂ اردو سندھ یونی ورسٹی، جام شورو، ۲۰۰۰ء، ص ۲۹

۷۔ حسرت، چراغ حسن، "کشمیر"، اتحاد پریس، لاہور، ۱۹۴۸ء، ص ۹۱۔ ۹۷

۸۔ ایضاً، ص ۹۸

۹۔ ڈبلیو، لارنس، "Vellay of Kashmir"، آکسفرڈ یونی ورسٹی پریس، لندن، ۱۸۹۵ء، ص ۶۴

۱۰۔ Husband، Young، "Kashmir"، ویری ناگ پبلشرز، میرپور کشمیر، سن ندارد، ص ۱۶

۱۱۔ درانی، عبدالصمد، "کشمیر کی کہانی"، مشمولہ: ہفت روزہ "اقدام"، لاہور، ۱۹۶۰ء، ص ۴

۱۲۔ حسرت، چراغ حسن، محولہ بالا، ص ۱۱۲۔۱۱۵

۱۳۔ صادق، بریگیڈیئر، "یگانہ کشمیر"، مرتبہ، ڈاکٹر غلام حسین اظہر، پرنس پرنٹرز، لاہور، ۱۹۸۶ء، ص ۱۹

۱۴۔ گمی، سلیم خان، "کشمیر ادب و ثقافت"، یونی ورسل بکس، لاہور، سن ندارد، ص ۹۸

۱۵۔ اقبال، علامہ، "کلیات اقبال" (فارسی)، نقوش پریس، لاہور، ۱۹۹۴ء، ص ۶۳۴

۱۶۔ ابراہیم، سردار محمد، "کشمیر کی جنگ آزادی"، دین محمدی پریس، لاہور، ۱۹۶۶ء، ص ۲۴۔۲۵

۱۷۔ احمد، سفیر، "کشمیر: آزادی کی جدوجہد"، انسٹی ٹیوٹ آف پالیسیز اسٹڈیز، اسلام آباد، سن ندارد، ص ۱۷

۱۸۔ ایضاً، ص ۱۷

۱۹۔ عبداللہ، شیخ محمد، "آتش چنار"، چودھری اکیڈمی، لاہور، ۱۹۸۵ء، ص ۳۲

۲۰۔ احمد، ص ۱۸

۲۱۔ عبداللہ، شیخ محمد، ص ۲۳۱

۲۲۔ اے۔ ایچ۔ سہروردی، "Kashmir the Incredible Freedom Fight", Jang Publishers, 1991, P 128

۲۳۔ احمد، سید نور، "مارشل لا سے مارشل لا تک"، دین محمد پریس، لاہور، ۱۹۶۵ء، ص ۳۴۴۔۳۵۱

۲۴۔ بدایونی، فانی، بہ حوالہ ڈاکٹر طاہرہ نیّر، مشمولہ: "اردو شاعری میں پاکستانی قومیت کا اظہار"، انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۹۹ء، ص ۱۳۹

۲۵۔ آفاقی، ڈاکٹر صابر، "اقبال اور کشمیر"، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ۱۹۷۷ء، ص ۴۱

۲۶۔ ایضاً، ص ۴۲

۲۷۔ اقبال، بہ حوالہ ڈاکٹر صابر آفاقی، ص ۱۳۰

۲۸۔ ایضاً، ص ۱۳۲

۲۹۔ ایضاً، ص ۱۴۱

۳۰۔ ایضاً

۳۱۔ ایضاً، ص ۱۶۱۔۱۶۲

۳۲۔ ایضاً، ص ۱۶۴

۳۳۔ نیّر، طاہرہ، ڈاکٹر، "اردو شاعری میں پاکستانی قومیت کا اظہار"، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی، ۱۹۹۹ء، ص ۱۴۰

۳۴۔ خان، ظفر علی، "نگارستان"، مشمولہ: "کلیات مولانا ظفر علی خان"، مرتبہ: زاہد علی خان، الفیصل پبلشرز، لاہور، ۲۰۰۷ء، ص ۱۳۲

۳۵۔ سالک، علم الدین، "دیباچہ"، مشمولہ: "کلام فوق"، طبع اوّل، راج پوت پرنٹنگ ورکس، لاہور، ۱۹۰۹ء، ص ۴۔۵

۳۶۔ قریشی، عبداللہ، مولانا، "شاعر کشمیر"، ظفر برادرز، لاہور، سن ندارد، ص ۳۹

۳۷۔ فوق، محمد الدین، "کلام فوق"، روج پوت پرنٹنگ ورکس، لاہور، ۱۹۰۹ء، ص ۶۳

۳۸۔ ایضاً، ص ۱۳۴

۳۹۔ فوق، محمد الدین، "نغمہ و گلزار"، ظفر برادرز، لاہور، ۱۹۴۰ء، ص ۱۸۲

۴۰۔ ایضاً، ''کلام فوق''، ص ۱۹۰

۴۱۔ ایضاً، ''نغمہ و گلزار''، ص ۳۰

۴۲۔ ایضاً

۴۳۔ ایضاً، ''کلام فوق''، ص ۱۳۹

۴۴۔ ایضاً، ''نغمہ و گلزار''، محولہ بالا، ص ۱۱۰

۴۵۔ نیازی، اجمل، ''فوق الکشمیر''، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۰ء، ص ۳۵۵

۴۶۔ قریشی، عبداللہ، ''شاعر کشمیر''، محولہ بالا، ص ۴۰۔۴۵

۴۷۔ اکبر آبادی، سیماب، ''کشمیر کی جدوجہد آزادی اور اردو ادب''، از محمد صغیر خان، غیر مطبوعہ مقالہ برائے ایم۔ اے۔ کراچی یونی ورسٹی، ۱۹۹۷ء، ص ۱۹۴

۴۸۔ جوش، محمد شفیع، ''تعارف''، مشمولہ: ''بزم نہیں رزم''، از حفیظ جالندھری، نقوش پریس، لاہور، ۱۳۹۳ھ، ص ۱۴

۴۹۔ مسعود، راس، سر، ''دیباچہ''، مشمولہ: ''تصویرِ کشمیر''، از حفیظ جالندھری، اردو اکیڈمی پنجاب، لاہور، ۱۹۳۷ء، ص ۸

۵۰۔ جالندھری، حفیظ، ''تصویرِ کشمیر''، اردو اکیڈمی پنجاب، لاہور، ۱۹۳۷ء، ص ۲۷

۵۱۔ ایضاً، ص ۲۱

۵۲۔ ایضاً، ص ۲۹۔ ۳۲

۵۳۔ ایضاً، ص ۲۸

۵۴۔ حفیظ، بہ حوالہ ''کشمیر ہمارا ہے کشمیر ہمارا ہے''، مرتبہ، ناصر زیدی، نقوش، لاہور، ۱۹۹۱ء، ص ۲۸

۵۵۔ ایضاً، ص ۲۹

۵۶۔ شفیع، محمد جوش، ''تعارف''، مشمولہ: ''بزم نہیں رزم''، از حفیظ جالندھری، نقوش پریس، لاہور، ۱۳۹۳ھ، ص ۱۲۔۱۳

۵۷۔ حفیظ جالندھری، ''بزم نہیں رزم''، نقوش پریس، لاہور، ۱۳۹۳ھ، ص ۳۳

۵۸۔ ایضاً، ص ۳۸۔۴۰

۵۹۔ ایضاً، ص ۱۴۔۴۵

۶۰۔ ایضاً، ص ۴۹

۶۱۔ ایضاً، ص ۵۴۔۵۶

۶۲۔ ایضاً، ص ۳۷

۶۳۔ ایضاً، ص ۶۷

۶۴۔ ایضاً، ص ۹۷

۶۵۔ ایضاً، ص ۸۰

۶۶۔ ایضاً، ص ۸۲۔۸۴

۶۷۔ ایضاً، ص ۸۵

۶۸۔ ایضاً، ص ۹۱

۶۹۔ ایضاً، ص ۹۵۔۹۶

۷۰۔ ایضاً، ص ۹۸

۷۱۔ ایضاً، ص ۱۰۳

۷۲۔ ایضاً، ص ۱۰۵۔۱۰۶

۷۳۔ ایضاً، ص ۱۰۹۔۱۱۳

۷۴۔ ایضاً، ص ۱۱۸

۷۵۔ نیّر، طاہرہ، ڈاکٹر، محولہ بالا، ص ۱۴۰

۷۶۔ ساحر، بہ حوالہ: ڈاکٹر طاہرہ نیّر، ص ۱۴۱

۷۷۔ قاسمی، احمد ندیم، ''کشمیر''، مشمولہ: ''جریدہ''، پشاور، کشمیر نمبر، جون ۱۹۹۹ء، ص ۱۱۔۱۲

۷۸۔ ایضاً، ص ۱۹۳۔۱۹۴

۷۹۔ ایضاً، ص ۱۹۴

۸۰۔ پیامی، اختر، بہ حوالہ ڈاکٹر طاہرہ نیّر، محولہ بالا، ص ۱۴۱

۸۱۔ فراز، احمد، ''نیا کشمیر''، مشمولہ: ''جریدہ''، پشاور، محولہ بالا، ص ۱۹۷۔۱۹۸

۸۲۔ فراز، بہ حوالہ: ''تحریکِ آزادیِ کشمیر: اردو ادب کے آئینے میں''، از فتح محمد ملک، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۱ء، ص ۲۸۵

۸۳۔ خلیفہ، عبدالحکیم، ''کلام حکیم''، مرتبہ: ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی، ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور، ۱۹۷۳ء، ص ۱۳۳

۸۴۔ ایضاً، ص ۱۳۶

۸۵۔ ناظر، خوشی محمد، ''نغمہ فردوس''، مکتبہ فانوس، لاہور، ۱۹۹۲ء، ص ۴۳

۸۶۔ ایضاً، ص ۱۷۶

۸۷۔ شاہ، سید علی احمد، ''پیش لفظ''، مشمولہ: ''جہادِ کشمیر''، تعمیری کتب خانہ، راول پنڈی، ۱۹۸۳ء، ص ۲۳

۸۸۔ قاسمی، امین طارق، ''جہادِ کشمیر''، تعمیری کتب خانہ، راول پنڈی، ۱۹۸۳ء، ص ۴۵

۸۹۔ ایضاً، ص ۸۰۔۸۱

۹۰۔ ایضاً، ص ۹۳

۹۱۔ خان، کفایت اللہ خاں، ''فغانِ کشمیر''، ہم درد پریس، راول پنڈی، ۱۹۵۳ء، ص ۴۵۔۴۶

۹۲۔ جعفری، تحسین، ''جنتِ سوزاں، ص ا، بہ حوالہ: ''آزاد کشمیر میں اردو زبان و ادب کا فروغ''، محولہ بالا، ص ۲۳۰

۹۳۔ ایضاً، ص ۲۱

۹۴۔ ایضاً، ص ۳۰

۹۵۔ ایضاً، ص ۳۴

۹۶۔ جعفری، سید ضمیر، ''دیباچہ''، مشمولہ: ''دستِ چنار''، از شیخ غلام علی بلبل کاشمیری، کشمیر اکیڈمی، مظفر آباد، ۱۹۹۵ء، ص ۱۱

۹۷۔ بلبل کاشمیری، شیخ غلام علی، ''دست چنار''، از شیخ غلام علی بلبل کاشمیری، کشمیر اکیڈمی، مظفر آباد، ۱۹۹۵ء، ص ۲۲

۹۸۔ حیدر، ماسٹر غلام، ''کشمیر میں رائے شماری''، ذکاء الدین بٹ پبلشرز، ۱۹۵۷ء، ص ۷

۹۹۔ ایضاً، ص ۹

۱۰۰۔ ایضاً، ص ۱۳

۱۰۱۔ ایضاً

۱۰۲۔ سوز، عماد الدین، بہ حوالہ ''کشمیر میں اردو''، از حبیب کیفوی، مرکزی اردو بورڈ، لاہور، ۱۹۸۱ء، ص ۴۴۷

۱۰۳۔ شجر طہرانی، بہ حوالہ ''کشمیر میں اردو''، محولہ بالا، ص ۴۵۳

۱۰۴۔ ایضاً، ص ۴۵۴

۱۰۵۔ قمر، ملک محی الدین، بہ حوالہ ''کشمیر میں اردو''، محولہ بالا، ص ۴۷۰۔۴۷۲

۱۰۶۔ ایضاً، ص ۴۷۴

۱۰۷۔ شروانی، قیس، بہ حوالہ: ''کشمیر میں اردو''، محولہ بالا، ص ۴۷۷

۱۰۸۔ کوثر، حبیب اللہ، بہ حوالہ: ''کشمیر میں اردو''، محولہ بالا، ص ۴۸۲

۱۰۹۔ بخاری، محمد سعید شاہ، بہ حوالہ: ''کشمیر میں اردو''، محولہ بالا، ص ۵۰۷۔۵۰۸

۱۱۰۔ مہجور، پیرزادہ غلام، بہ حوالہ: ''کشمیر میں اردو''، محولہ بالا، ص ۵۲۱

۱۱۱۔ اختر، ہدایت اللہ، ''حدیث لالہ و گل''، ویری ناگ پبلشرز، میرپور آزاد کشمیر، ۱۹۶۹ء، ص ۷

۱۱۲۔ ایضاً، ص ۸

۱۱۳۔ ایضاً، ص ۱۱

۱۱۴۔ ایضاً، ص۱۹۔۴۹

۱۱۵۔ ایضاً، ص۵۴۔۶۱

۱۱۶۔ انجم، نذیر، ”پلک پلک زنجیر“، کاشر پبلشرز، میر پور، ۱۹۹۲ء، ص۳۹

۱۱۷۔ ایضاً، ص۵۵

۱۸۸۔ انجم، نذیر، ”قرضِ سخن“، ارشد بک سیلرز، میر پور، ۱۹۹۸ء، ص۱۵۷

۱۱۹۔ انجم، نذیر، مشمولہ: ”خراجِ عقیدت“، مرتبہ، محمد سعید احمد، نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف کشمیر اسٹڈیز، میر پور، ۲۰۰۶ء، ص۱۴۔۱۵

۱۲۰۔ آفاقی، ڈاکٹر صابر، ”شہرِ تمنّا“، آئینہ ادب، لاہور، ۱۹۸۰ء، ص۱۲۹

۱۲۱۔ ایضاً، ص۱۳۸

۱۲۲۔ ایضاً، ص۱۴۷

۱۲۳۔ شمیم، احمد، ”اجنبی موسم میں ابابیل“، عکسی پبلشرز، اسلام آباد، ۱۹۸۳ء، ص۱۴۴

۱۲۴۔ ایضاً، ص۱۹۵

۱۲۵۔ شمیم، احمد، ”ریت پر سفر کا لمحہ“، عکسی پبلشرز، اسلام آباد، ۱۹۸۸ء، ص۱۱۷

۱۲۶۔ جعفری، مقصود، ”گوشۂ قفس“، بہ حوالہ: ”کشمیر کی جدوجہد آزادی اور اردو ادب“، محولہ بالا، ص ۲۷۲۔۲۷۳

۱۲۷۔ ایضاً

۱۲۸۔ ایضاً، ص۲۷۵

۱۲۹۔ مغل، بشیر احمد، ”حلقہ میری زنجیر کا“، ص۱۰، بہ حوالہ: ”حبیب کیفوی“، محولہ بالا، ص۱۳۶

۱۳۰۔ مغل، بشیر احمد، ”شہر دربدراں“، کاشر پبلشرز، میر پور، ۱۹۹۳ء، ص۳۷

۱۳۱۔ مغل، بشیر احمد، ”دھواں دھواں کشمیر“، ص ۶۱، بہ حوالہ: محولہ بالا، ص۲۸۴

۱۳۲۔ صدیقی، ماجد، ”دیوار گریہ“، یار پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۱ء، ص۲۳

۱۳۳۔ ایضاً، ص۵۰

۱۳۴۔ راجا، اسلم، ”کونپل کا بدن“، ادارہ معارف کشمیر، باغ، ۱۹۸۴ء، ص۶۰

۱۳۵۔ صابر، صابر حسین، ”دشت تنہائی“، بزم قلم و قرطاس پاکستان، ۱۹۸۴ء، ص۵۸

۱۳۶۔ راجس، بوٹا خان، ”زخم نرالے“، راجس پبلشرز، میر پور، ۱۹۸۹ء، ص۱۳

۱۳۷۔ کشفی، مسعود، ”کارواں“، بک سنٹر، راول پنڈی، ۱۹۸۹ء، ص۴۷

۱۳۸۔ ایضاً، ص۴۱

۱۳۹۔ ایضاً، ص۵۱

۱۴۰۔ شاد، مشتاق، ”نمبل“، الحمد پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۶ء، ص۲۱۔۲۲

۱۴۱۔ ایضاً، ص۱۹

۱۴۲۔ عارف، سید، ”لہو کی فصلیں“، ص۲۶، بہ حوالہ ”کشمیر کی جدوجہد آزادی اور اردو ادب“، محولہ بالا، ص ۳۰۹

۱۴۳۔ ایضاً، ص۲۷

۱۴۴۔ ایضاً، ص۲۱۔۳۳

۱۴۵۔ ایضاً، ص۳۶

۱۴۶۔ ایضاً، ص۳۷

۱۴۷۔ ایضاً، ص۵۸

۱۴۸۔ ہمدانی، سید نثار حسین، ”چنار چاندنی اور چنبیلی“، کشمیر سوسائٹی آف سائنٹفک اینڈ سوشل ریسرچ، مظفر آباد، ۱۹۹۳ء، ص۴۴

۱۴۹۔ ایضاً، ص۸۲

۱۵۰۔ ایضاً، ص۱۰۱

۱۵۱۔ ایضاً، ص۱۱۳

۱۵۲۔ ایضاً، ص۲۰۱

۱۵۳۔ مغل، افتخار، ''لہو لہو کشمیر''، کشمیر سوسائٹی برائے سائنس و سماجی تحقیق، مظفر آباد، سن ندارد، ص۳

۱۵۴۔ ایضاً، ص۳۰

۱۵۵۔ ایضاً، ص۳۴

۱۵۶۔ ایضاً، ص۱۹

۱۵۷۔ ایضاً، ص۲۱

۱۵۸۔ ایضاً، ص۲۳

۱۵۹۔ ایضاً، ص۴۱

۱۶۰۔ ایضاً، ص۲۹

۱۶۱۔ ایضاً، ص۳۷

۱۶۲۔ ایضاً، ص۴۹

۱۶۳۔ ایضاً، ص۷۷

۱۶۴۔ ایضاً، ص۴۷

۱۶۵۔ ایضاً، ص۴۹

۱۶۶۔ ایوب، اسرار، ''برف سے حرف''، کشمیر سوسائٹی آف سائنٹفک اینڈ سوشل ریسرچ، ۱۹۹۵ء، ص۱۶

۱۶۷۔ ایضاً، ص۱۹

۱۶۸۔ ایضاً، ص۲۶

۱۶۹۔ ایضاً، ص۳۵

۱۷۰۔ ایضاً، ص۳۹

۱۷۱۔ ایضاً، ص۵۰

۱۷۲۔ ایضاً، ص۹۰

۱۷۳۔ ساگر، رحیم داد، ''کوئے مقتل''، کاشر پبلشرز، میر پور، ۱۹۹۴ء، ص۳۹

۱۷۴۔ قریشی، میاں کریم اللہ، ''خضر دیکھتا ہے وُلر کے کنارے''، بزم سوز کشمیر، مظفر آباد، ۱۹۹۵ء، ص۱۰۰

۱۷۵۔ بھٹی، محمد رفیق، ''ستون دار''، پنجاب پبلشرز، میر پور، ۱۹۹۷ء، ص۲۹

۱۷۶۔ ایضاً، ص۴۷

۱۷۷۔ ایضاً، ص۸۸

۱۷۸۔ ایضاً، ص۸۰

۱۷۹۔ ایضاً، ص۱۱۳

۱۸۰۔ ایضاً، ص۶۶

۱۸۱۔ ایضاً، ص۱۶۰

۱۸۲۔ بھٹی، محمد رفیق، ''لہو نگر''، پنجاب پبلشرز، میر پور، ۱۹۹۷ء، ص۳۷

۱۸۳۔ بھٹی، محمد رفیق، ''ستون دار''، محولہ بالا، ص۱۳۸

۱۸۴۔ صدیقی، بشیر احمد، سردار، ''دیوان صدیقی''، مکتبہ شعاع ادب، آزاد کشمیر، ۱۹۹۲ء، ص۳۹

۱۸۵۔ ایضاً، ص۴۲

۱۸۶۔ ایضاً، ص۵۰

۱۸۷۔ ایضاً، ص۶۰

۱۸۸۔ ایضاً، ص۵۶

۱۸۹۔ نذر، ماجد، ''محبت پیرہن میرا''، خواب پبلشرز، ۱۹۹۶ء، ص۱۵۔۱۶

۱۹۰۔ سحر، مقصود الزماں، ''ہمیں رکنا نہیں آتا''، الحمد پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۴ء، ص۳۱

۱۹۱۔ ایضاً، ص۳۸

۱۹۲۔ ایضاً، ص۸۶

۱۹۳۔ ایضاً، ص۹۰

۱۹۴۔ ایضاً، ص۹۶۔ ۹۹

۱۹۵۔ راٹھور، منصور، ''چلو میں ہار جاتا ہوں''، ہم خیال پبلشرز، فیصل آباد، ۱۹۹۹ء، ص ۱۲۲

۱۹۶۔ جرال، قمر، ''خطاب''، مشمولہ: ''ضوفشاں''، مجلّہ ڈگری کالج پلندری، ۱۹۸۹ء، ص ۳۹

۱۹۷۔ راجا، محمد قدیر، ''دعا''، مشمولہ: سہ ماہی ''تخلیق''، میر پور، شمارہ ۱، اکتوبر۔ دسمبر ۱۹۸۹ء، ص ۴۴

۱۹۸۔ ظفر اکبر آبادی، بہ حوالہ ''کشمیر ہمارا ہے کشمیر ہمارا ہے''، مرتبہ، ناصر زیدی، نقوش، لاہور، ۱۹۹۱ء، ص ۱۷۸

۱۹۹۔ سلیم، واحد سلیم، ''غزل''، مشمولہ: ''ادبی دنیا''، اپریل ۱۹۶۶ء، ص ۱۷۸

۲۰۰۔ بہار، آمنہ، ''چناروں کی آگ''، انقلاب پبلی کیشنز، راول پنڈی، ۱۹۸۵ء، ص ۳۷

۲۰۱۔ ثاقب، انجم، بہ حوالہ ''کشمیر میں اردو شاعری''، غیر مطبوعہ مقالہ از افتخار مغل، ۱۹۹۵ء، ص ۱۵۰

۲۰۲۔ روحی، ریحانہ، ''اور میں تنہا بہت''، دنیا پبلشرز، کراچی، ۲۰۰۶ء، ص ۳۳

۲۰۳۔ ساگر، شیراز، ''تیری یاد کا دکھ''، غم گسار پبلی کیشنز، راول پنڈی، سن ندارد، ص ۶۶

۲۰۴۔ خان، انعام اللہ، ''کشمیر پکار رہا ہے''، اردو اکیڈمی سندھ، کراچی، ۱۹۵۱ء، ص ۱۵۔ ۴۰

۲۰۵۔ شیریں، ممتاز، ''تعارف''، مشمولہ: ''کشمیر اداس ہے''، قومی کتب خانہ، راول پنڈی، ۱۹۵۰ء، ص ۳۳

۲۰۶۔ خان، انعام اللہ، محولہ بالا، ص ۵۰۔ ۵۱

۲۰۷۔ شیرین، ممتاز، محولہ بالا، ص ۳۳

۲۰۸۔ خالد، علاء الدین، ''جب کشمیر نے مجھے پکارا''، مشمولہ: ''کشمیر پکار رہا ہے''، از انعام اللہ خان، محولہ بالا، ص ۱۱

۲۰۹۔ بھٹو، ذوالفقار علی، ''کشمیر: اقوام متحدہ کے لیے آخری موقع''، محکمۂ مطبوعات و فلم سازی پاکستان، ۱۹۶۵ء، ص ۹

۲۱۰۔ ایضاً، ص ۱۔ ۶

۲۱۱۔ خان، انعام اللہ، محولہ بالا، ص ۱۲۔ ۱۵

۲۱۲۔ امید، فقیر سید، امیر احمد، ''کشمیر کی فریاد''، مشمولہ: ''کشمیر: اقوام متحدہ کے لیے آخری موقع''، محولہ بالا، ص ۱۴۔ ۱۸

۲۱۳۔ لندن ٹائمز، بہ حوالہ ''کشمیر پکار رہا ہے''، محولہ بالا، ص ۱۳۲

۲۱۴۔ نیو یارک ٹائمز، بہ حوالہ ''کشمیر پکار رہا ہے''، محولہ بالا، ص ۱۴۴

۲۱۵۔ گمّی، سلیم خان، ''کشمیر: ادب و ثقافت''، یونیورسل بکس، لاہور، ۱۹۸۷ء، ص ۱۵۵

۲۱۶۔ ہاشمی، محمود، ''کشمیر اداس ہے''، قومی کتب خانہ، راول پنڈی، ۱۹۵۰ء، ص ۲۳۳

۲۱۷۔ قاسمی، احمد ندیم، ''کشمیر''، مشمولہ: ''جریدہ''، پشاور، کشمیر نمبر، ص ۱۹۳

۲۱۸۔ مرزا، شفقت تنویر، ''سر وادی کشمیر''، دوست پبلشرز، اسلام آباد، ۱۹۹۴ء، ص ۶۵۔ ۶۶

۲۱۹۔ ایضاً، ص ۱۲۳۔ ۱۲۴

۲۲۰۔ لطیف، شاہد، ''معرکہ کشمیر''، حیدر پبلشرز، لاہور، ۲۰۰۱ء، ص ۳۱

۲۲۱۔ ایضاً، ص ۱۹

۲۲۲۔ ایضاً، ص ۹۰

۲۲۳۔ ایضاً، ص ۹۱

۲۲۴۔ عابد، اصغر، ''الم تا علم کشمیر''، القلم پبلشرز، لاہور، ۲۰۰۳ء، ص ۳۷۔ ۳۸

۲۲۵۔ حفیظ، بہ حوالہ "تحریک آزادی کشمیر اردو ادب کے آئینے میں"، از فتح محمد ملک، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۱ء، ص۲۷۳

۲۲۶۔ جالب، حبیب، بہ حوالہ: "تحریکِ آزادیِ کشمیر اردو ادب کے آئینے میں"، محولہ بالا، ص۲۷۹

۲۲۷۔ صدیقی، نعیم، بہ حوالہ: "تحریکِ آزادیِ کشمیر اردو ادب کے آئینے میں"، محولہ بالا، ص۲۸۶

۲۲۸۔ کاشمیری، ظہیر، بہ حوالہ: "تحریکِ آزادیِ کشمیر اردو ادب کے آئینے میں"، محولہ بالا، ص۲۹۰۔۲۹۱

۲۲۹۔ ظفر، احمد، مشمولہ: "کشمیر ہمارا ہے، کشمیر ہمارا ہے"، محولہ بالا، ص۳۷

۲۳۰۔ تحسین، افضل، بہ حوالہ: "کشمیر ہمارا ہے، کشمیر ہمارا ہے"، محولہ بالا، ص۵۸

۲۳۱۔ تبسم، توصیف، بہ حوالہ: "کشمیر ہمارا ہے، کشمیر ہمارا ہے"، محولہ بالا، ص۸۴

۲۳۲۔ حیدر آبادی، شفیق، بہ حوالہ: "کشمیر ہمارا ہے، کشمیر ہمارا ہے"، محولہ بالا، ص۱۲۸

۲۳۳۔ بلتستانی، شمیم، بہ حوالہ: "کشمیر ہمارا ہے، کشمیر ہمارا ہے"، محولہ بالا، ص۱۳۴

۲۳۴۔ احمد، طاہر، بہ حوالہ: "کشمیر ہمارا ہے، کشمیر ہمارا ہے"، محولہ بالا، ص۱۳۴

۲۳۵۔ اکبر آبادی، ظفر، بہ حوالہ: "کشمیر ہمارا ہے، کشمیر ہمارا ہے"، محولہ بالا، ص۱۳۸

۲۳۶۔ حیدری، کرم، پروفیسر، بہ حوالہ: "کشمیر ہمارا ہے، کشمیر ہمارا ہے"، محولہ بالا، ص۱۷۶

۲۳۷۔ بنارسی، کیف، بہ حوالہ: "کشمیر ہمارا ہے، کشمیر ہمارا ہے"، محولہ بالا، ص۱۸۲

۲۳۸۔ صدیقی، مختار، بہ حوالہ: "کشمیر ہمارا ہے، کشمیر ہمارا ہے"، محولہ بالا، ص۱۹۴

۲۳۹۔ کمال، منیر، بہ حوالہ: "کشمیر ہمارا ہے، کشمیر ہمارا ہے"، محولہ بالا، ص۲۰۷

۲۴۰۔ امروہوی، رئیس، مشمولہ: روزنامہ "جنگ"، کراچی، ۳۰ / اگست ۱۹۶۵

۲۴۱۔ اختر، صہبا، مشمولہ: "کشمیر ہمارا ہے، کشمیر ہمارا ہے"، محولہ بالا، ص۲۱۰

۲۴۲۔ ہاشمی، نقش، بہ حوالہ: "کشمیر ہمارا ہے، کشمیر ہمارا ہے"، محولہ بالا، ص۲۱۶

۲۴۳۔ قریشی، وحید، محولہ بالا، ص۲۲۱

۲۴۴۔ رضی، صفدر صدیق، مشمولہ: سہ ماہی "فنون"، لاہور، شمارہ ۴۵، ۱۹۹۵ء، ص۹۰

۲۴۵۔ احسان، محسن، مشمولہ: "جریدہ"، کشمیر نمبر، محولہ بالا، ص۲۰۴

۲۴۶۔ احسان، محسن، مشمولہ: "فنون"، لاہور، اگست ۲۰۰۲ء، ص۸۷

۲۴۷۔ عارف، افتخار، مشمولہ: "جریدہ"، محولہ بالا، ص ۱۹۹

۲۴۸۔ امجد، امجد اسلام، مشمولہ: "جریدہ"، محولہ بالا، ص۲۰۲

۲۴۹۔ ناصر، نصیر احمد، مشمولہ: "جریدہ"، محولہ بالا، ص۲۱۶

۲۵۰۔ فہرست، مشمولہ: "کتاب"، لاہور، کشمیر نمبر، ۱۹۶۹ء، ص۹۷۔۱۰۴

۲۵۱۔ اشہری، سید امجد علی، مشمولہ: "ادبی دنیا"، لاہور، کشمیر نمبر، مارچ۔اپریل ۱۹۶۶ء، ص۱۱

۲۵۲۔ زیدی، ثاقب، "بربط کے نظارے"، مشمولہ: "ادبی دنیا"، محولہ بالا، ص۶۶

۲۵۳۔ تائب، حفیظ، مشمولہ: "ادبی دنیا"، محولہ بالا، ص۷۰

۲۵۴۔ ہوشیارپوری، اختر، ''کشمیر''، مشمولہ: ''ادبی دنیا''، محولہ بالا، ص۱۲۵

۲۵۵۔ اکبر آبادی، سیماب، مشمولہ: ''ادبی دنیا''، محولہ بالا، ص ۱۴۸

۲۵۶۔ صہبائی، اثر، مشمولہ: ''ادبی دنیا''، محولہ بالا، ص۱۴۹

۲۵۷۔ بخاری، فارغ، مشمولہ: ''ادبی دنیا''، محولہ بالا، ص۲۱۰

۲۵۸۔ افغانی، صدیق، مشمولہ: ''ادبی دنیا''، محولہ بالا، ص۳۵۰

۲۵۹۔ نظامی، ساغر، مشمولہ: ''ادبی دنیا''، محولہ بالا، ص۴۰۸

۲۶۰۔ تاب، اسلم، مشمولہ: ''ادبی دنیا''، محولہ بالا، ص۴۳۰

۲۶۱۔ سہیل، جاذب، مشمولہ: ''ادبی دنیا''، محولہ بالا، ص۴۳۲

۲۶۲۔ حاصل پوری، عزیز، مشمولہ: ''ادبی دنیا''، محولہ بالا، ص ۴۴۵

۲۶۳۔ یگانہ، اصغر، مشمولہ: ''ادبی دنیا''، محولہ بالا، ص۴۴۸

۲۶۴۔ کرنالی، غافل، مشمولہ: ''ادبی دنیا''، محولہ بالا، ص۴۸۷

۲۶۵۔ سلیم، ڈاکٹر سلیم واحد، مشمولہ: ''ادبی دنیا''، محولہ بالا، ص۴۹۱

۲۶۶۔ حسین، قربان شہید، مشمولہ: ''ادبی دنیا''، محولہ بالا، ص ۵۰۲

۲۶۷۔ ملسیانی، عرش، مشمولہ: ماہ نامہ ''آج کل''، دہلی، کشمیر نمبر، اگست ۱۹۵۵ء، ص۴۳

۲۶۸۔ نعیم، حسن، مشمولہ: ''آج کل''، محولہ بالا، ص ۵۲

۲۶۹۔ ملیح آبادی، اظہار، مشمولہ: ''آج کل''، محولہ بالا، ص ۸۷

۲۷۰۔ عبدالباقی، مشمولہ: ''آج کل''، محولہ بالا، ص ۱۳

۲۷۱۔ حفظ الرحمٰن، مولانا محمد، مشمولہ: ''آج کل''، محولہ بالا، ص۶

۲۷۲۔ قریشی، عبداللہ، ''بزم ادب''، مشمولہ: ''ادبی دنیا''، لاہور، محولہ بالا، ص۷

۲۷۳۔ بدر، سعید، ''کشمیر کی سچی کہانی''، مشمولہ: ''ادبی دنیا''، محولہ بالا، ص۴۰۹۔۴۱۱

۲۷۴۔ عبداللہ، شیخ، بہ حوالہ ''کشمیر کی جنگ آزادی''، از پروفیسر میر عبدالعزیز، مشمولہ: ''ادبی دنیا''، محولہ بالا، ص۴۲۱

۲۷۵۔ عبدالعزیز، میر، ''کشمیر کی جنگ آزادی''، مشمولہ: ''ادبی دنیا''، محولہ بالا، ص۴۲۱

۲۷۶۔ ایضاً، ص۴۲۱۔۴۲۵

۲۷۷۔ نام ندارد، ''وطن ابھی آزاد نہیں ہے''، مشمولہ: ''کشمیر عوامی سوشلسٹ کانفرنس کا اہم فیصلہ''، مرکنٹائل پریس، سری نگر، سن ندارد، ص۲

۲۷۸۔ بہ حوالہ ''کشمیر عوامی سوشلسٹ کانفرنس کا اہم فیصلہ''، محولہ بالا، ص۳

۲۷۹۔ ایضاً، ص۹۔۱۰

۲۸۰۔ سید، مظفر علی، ''کشمیر اور اردو ادیب''، مشمولہ: ''کتاب''، کشمیر نمبر، محولہ بالا، ص۳۴۔۳۶

۲۸۱۔ انجم رضوانی، ''کشمیر ہمارا ہے، کشمیر ہمارا ہے''، محولہ بالا، ص۶۶

۲۸۲۔ ساحل، بہرام، بہ حوالہ: ''کشمیر ہمارا ہے کشمیر ہمارا ہے''، محولہ بالا، ص۴۷

۲۸۳۔ شاہ جہاں پوری، پیام، بہ حوالہ: ''کشمیر ہمارا ہے کشمیر ہمارا ہے''، محولہ بالا، ص۷۶

۲۸۴۔ صدیقی، حزیں، بہ حوالہ: ''کشمیر ہمارا ہے کشمیر ہمارا ہے''، محولہ بالا، ص۸۹

۲۸۵۔ ضیاء، ضیاء احمد، بہ حوالہ: ''کشمیر ہمارا ہے کشمیر ہمارا ہے''، محولہ بالا، ص۱۳۲

۲۸۶۔ صہبائی، عاصم، بہ حوالہ: ''کشمیر ہمارا ہے کشمیر ہمارا ہے''، محولہ بالا، ص۱۴۲

۲۸۷۔ عطا حسین، کلیم، بہ حوالہ: ''کشمیر ہمارا ہے کشمیر ہمارا ہے''، محولہ بالا، ص ۱۶۳

۲۸۸۔ لدھیانوی، فوق، بہ حوالہ: ''کشمیر ہمارا ہے کشمیر ہمارا ہے''، محولہ بالا، ص ۱۷۰

۲۸۹۔ عاقل، منصور، بہ حوالہ: ''کشمیر ہمارا ہے کشمیر ہمارا ہے''، محولہ بالا، ص ۲۰۵

۲۹۰۔ شیخ، نرگس، بہ حوالہ: ''کشمیر ہمارا ہے کشمیر ہمارا ہے''، محولہ بالا، ص ۲۱۳

۲۹۱۔ حقی، شان الحق، بہ حوالہ: ''کشمیر ہمارا ہے کشمیر ہمارا ہے''، محولہ بالا، ص ۲۸۸

۲۹۲۔ نازش، ابوظفر، بہ حوالہ: ''کشمیر ہمارا ہے کشمیر ہمارا ہے''، محولہ بالا، ص ۳۲

۲۹۳۔ بخت، حسن، بہ حوالہ: ''کشمیر ہمارا ہے کشمیر ہمارا ہے''، محولہ بالا، ص ۹۰

۲۹۴۔ صابری، ارشد، بہ حوالہ: ''کشمیر ہمارا ہے کشمیر ہمارا ہے''، محولہ بالا، ص ۵۰

۲۹۵۔ میرٹھی، حیات، بہ حوالہ: ''کشمیر ہمارا ہے کشمیر ہمارا ہے''، محولہ بالا، ص ۹۸

۲۹۶۔ میرٹھی، خورشید، بہ حوالہ: ''کشمیر ہمارا ہے کشمیر ہمارا ہے''، محولہ بالا، ص ۹۸

۲۹۷۔ عبدالکریم، بہ حوالہ: ''کشمیر ہمارا ہے کشمیر ہمارا ہے''، محولہ بالا، ص ۱۵۱

۲۹۸۔ کاشمیری، ظہیر، بہ حوالہ: ''کشمیر ہمارا ہے کشمیر ہمارا ہے''، محولہ بالا، ص ۱۳۹

۲۹۹۔ نظر، قیوم، بہ حوالہ: ''کشمیر ہمارا ہے کشمیر ہمارا ہے''، محولہ بالا، ص ۱۷۵

۳۰۰۔ نقوی، محسن، بہ حوالہ: ''کشمیر ہمارا ہے کشمیر ہمارا ہے''، محولہ بالا، ص ۱۹۰۔۱۹۲

۳۰۱۔ رحمن، اے۔ آر۔ بہ حوالہ: ''کشمیر ہمارا ہے کشمیر ہمارا ہے''، محولہ بالا، ص ۶۹۔۷۰

۳۰۲۔ بٹالوی، شفقت، بہ حوالہ: ''کشمیر ہمارا ہے کشمیر ہمارا ہے''، محولہ بالا، ص ۱۲۸

۳۰۳۔ نور، ماجد، بہ حوالہ: ''کشمیر ہمارا ہے کشمیر ہمارا ہے''، محولہ بالا، ص ۱۸۵

۳۰۴۔ ہاشمی، نقش، بہ حوالہ: ''کشمیر ہمارا ہے کشمیر ہمارا ہے''، محولہ بالا، ص ۲۱۸

۳۰۵۔ عارف، منظور، بہ حوالہ ڈاکٹر فتح محمد ملک، محولہ بالا، ص ۲۹۳

۳۰۶۔ مغل، افتخار، ''لہو لہو کشمیر''، محولہ بالا، ص ۸۶

۳۰۷۔ عمران، آل، بہ حوالہ ڈاکٹر فتح محمد ملک، محولہ بالا، ص ۳۰۵

۳۰۸۔ حمید، یاسمین، مشمولہ: ''جریدہ''، کشمیر نمبر، محولہ بالا، ص ۲۰۸

۳۰۹۔ احسان، محسن، مشمولہ: سہ ماہی ''فنون''، لاہور، شمارہ ۱۱۷، اپریل تا اگست ۲۰۰۲ء، ص ۷۸۔۷۹

۳۱۰۔ رومانی، انجم، مشمولہ: سہ ماہی ''فنون''، لاہور، شمارہ ۴، فروری تا مارچ ۱۹۶۶ء، ص ۲۱

۳۱۱۔ متین، یونس، بہ حوالہ ڈاکٹر فتح محمد ملک، محولہ بالا، ص ۲۹۳

۳۱۲۔ مہدی، شوکت، مشمولہ: ہفت روزہ ''اخبار جہاں''، لاہور، ۶۔۱۲ مارچ ۲۰۰۶ء، ص ۵۸

۳۱۳۔ کاشمیری، عاصی، بہ حوالہ افتخار مغل، ''کشمیر میں اردو شاعری''، غیر مطبوعہ مقالہ AIOU، ۱۹۹۵ء، ص ۹۳

مسئلہِ فلسطین: عالمی اداروں اور بڑے ممالک کی ناکامی

ارضِ فلسطین قبلہِ اوّل کی وجہ سے دنیا بھر کے مسلمانوں کے لیے عقیدت کا مرکز ہے۔ اس کے علاوہ نبیِ رحمت ﷺ کے سفر معراج کے حوالے سے بھی اسے تقدس حاصل ہے۔ ارضِ فلسطین کو ارضِ مقدسہ بھی کہا جاتا ہے کیوں کہ یہاں قبلہِ اوّل کے علاوہ بہت سے انبیائے کرام کی قبور کے آثار بھی پائے جاتے ہیں اور صحابہ کرام کی ایک بڑی تعداد یہاں آسودۂ خاک ہے۔ مسجدِ اقصیٰ کے ساتھ سیدنا عمر بن الخطاب اور صلاح الدین ایوبی کا تذکرہ بھی لازم سمجھا جاتا ہے۔ یہ سرزمین مسلمانوں کے سنہرے دور کی شاہد ہے۔ یہودی یہاں تقریباً سات دہائیوں سے قابض ہیں لیکن فلسطین کو کسی بھی طرح یہود کا وطن تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ یہود یہاں غاصبانہ قبضہ جمائے ضرور بیٹھے ہیں اور دنیا بھر کی اسلام دشمن قوتوں کی پشت پناہی انھیں حاصل ہے۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ عالمِ اسلام کا رویّہ بھی اس ارضِ مقدسہ کے ساتھ کچھ قابلِ تحسین نہیں[1]۔ لیکن اس کے باوجود فلسطینی عوام وہاں کی نمائندہ تنظیم ”حماس“ اور دیگر تنظیموں نے اس مسئلے کو زندہ رکھا ہے۔ تاریخِ انسانی کے بدترین مظالم کے باوجود فلسطینی اپنے وطن کی سرزمین سے دست بردار ہونے کو کسی طرح تیار نظر نہیں آتے۔

فلسطین اس علاقے کا نام ہے جو ایشیا کے جنوب مغربی خطے میں واقع ہے۔ اس کے شمال میں لبنان، شمال مشرق میں شام، مشرق میں اُردن، جنوب میں بحیرۂ قلزم، جنوب مغرب میں مصر کا سینائی اور مغرب میں بحیرۂ روم واقع ہے۔ اس خطے کے پہلے باسی کنعانی (Canaanites) تھے۔ بعد میں سمندر کے راستے فلسطینی آئے اور یہاں کی آبادی میں مدغم ہو گئے۔ رومی، یہودی، مغل اور عیسائی صلیبی حملہ آور بن کر یہاں وارد ہوئے۔ ان لوگوں کا اس سرزمین سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ ساتویں صدی عیسوی تک فلسطین کی بیش تر آبادی مشرف بہ اسلام ہوئی اور ۱۹۱۷ء تک یکے بعد دیگرے تشکیل پانے والی اسلامی ریاستوں میں شامل رہی۔ ۱۹۱۷ء ہی وہ بد قسمت سال ہے جب عثمانی سلطنت اختتام پذیر ہوئی اور اس کی جگہ برطانوی تسلط قائم ہوا۔ یہی وہ زمانہ تھا جب برطانویوں نے اس بغاوت کو پروان چڑھایا جس کا مقصد فلسطین کو یہودیوں کے لیے جائے مسکن بنانا تھا۔ ۱۹۴۸ء میں برطانوی اقتدار کا بھی خاتمہ ہو گیا لیکن اس نے جس سازش کا بیج بویا تھا وہ اب ایک تناور درخت بن چکا تھا۔ برطانیہ کی اچانک رخصتی کے بعد مقامی عرب آبادی اور یہودی تارکینِ وطن کے درمیان مسلح تنازعات سامنے آئے۔ برطانیہ اور امریکا نے یہودیوں کی پشت پناہی کی جس کے نتیجے میں صیہونی طاقتیں فلسطینیوں کے ۷۷ فی صد علاقے پر قابض ہو کر ”اسرائیلی ریاست“ کی مالک بن بیٹھیں۔ مقامی عربوں کی نو لاکھ آبادی جو نسلی طور پر کنعانی، فلسطینی اور عرب تھی، اپنے وطن سے بے وطن ہونے پر مجبور ہوئی۔ پھر ۱۹۶۷ء کی جنگ ہوئی جس میں اسرائیل نے فلسطینی علاقوں پر قبضہ کر لیا جو اب تک ہم سائے عرب ممالک کے ساتھ وابستہ تھے۔ اسرائیل نہ صرف پورے فلسطین بلکہ شام لبنان اور مصر کے کچھ علاقوں پر بھی اپنی فوجی طاقت کے بل بوتے پر قابض ہو گیا ہے۔

اس ناجائز قبضے کے خلاف عوام میں بے چینی پیدا ہوئی اور کئی فوجی تصادم ہوئے جن کے بعد دنیا کو اس مسئلے کی نزاکت کا احساس ہوا[۲]۔

یہودی سلطنت کے قیام کی تحریک، اس صدی کی عظیم سازشوں میں سے ایک ہے جن کی بنیاد دراصل یہود دوستی نہیں بلکہ مسلم دشمنی پر رکھی گئی تھی۔ تاریخ کے کسی بھی دور میں یہودیوں کی کوئی حکومت یا مملکت قائم نہیں ہوئی۔ اس خطے کا پرانا نام "ارضِ کنعان" تھا۔ یہ نام ۲۵۰۰ قبل مسیح، عرب سے آنے والے کنعانیوں کی نسبت معروف ہوا۔ فلسطین کی وجہ تسمیہ کے بارے میں ایم۔ ووتھن نے اپنے مقالے "بائبل کے عہد کی اصطلاحات" میں لکھا "لاطینی زبان کے لفظ پیلس ٹینا(Plasteina) کو اس سر زمین کے لیے استعمال کیا گیا"[۳]۔ ووتھن کی جانب سے اسرائیل کا اخلاقی دفاع کرنے کے جتن کے باوجود اس بابت آج بھی سب سے معتبر رائے ڈاکٹر محسن محمد صالح کی مانی جاتی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ:

> Palestine acquired name from the Mediterranean immigrants who came from the Southern Greek islands in the 12th century B.C. and were known as the "People of the sea" in the old Egyptian scripts. They were referred to as the P.I.S.T. then was added later possibly to pluralize the noun. They are referred to as the Philistines[۴]

دنیا کی نصف سے زائد آبادی یعنی ۳ارب سے زائد افراد فلسطین یا اس کے کسی ایک حصے کو مقدس تسلیم کرتے ہیں۔ کرۂ ارض پر کوئی دوسرا ایسا مقام نہیں جس کی اس قدر زیادہ تکریم کی جاتی ہو۔ دینِ ابراہیمی کے تینوں مذاہب، اسلام، نصرانیت اور یہودیت اور دیگر کئی مذاہب و مسالک کے نزدیک فلسطین ارضِ مقدس ہے۔ اس کی ایک وجہ متعدد پیغمبروں کے مقابر اور مزارات بھی ہیں۔ یہودیوں کے نزدیک اسرائیلی نسل کے جد امجد حضرت یعقوب علیہ السلام اپنے بیٹوں کے ساتھ فلسطین میں رہتے تھے۔ یہی وہ سر زمین ہے جس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کو اس وقت پناہ دی جب وہ فرعون کے ظلم و ستم سے بچ کر بہ حفاظت یہاں مقیم ہوئے۔ حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت سلیمان علیہ السلام کی عظیم الشان مملکتیں یہیں قائم ہوئیں۔ اسرائیل اور یہودیہ کے اقالیم بھی اسی سر زمین پر ابھریں جو بعد میں اسیر بائی اور بابلی حملہ آوروں کے ہاتھوں نیست و نابود ہوئیں۔ نصرانیوں کے نزدیک فلسطین اس لیے مقدس ہے کہ مسیح ناصری کی ولادت یہیں ہوئی۔ عیسائیوں کا یہ عقیدہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے انسانیت کی نجات کے لیے پہلے صلیب پر موت پائی اور پھر زندہ ہوئے۔ مسلمانوں کے لیے بھی فلسطین اس لیے مقدس ہے کہ قبلہِ اوّل مسجدِ اقصیٰ جو بیت اللہ شریف اور مسجد نبوی کے بعد تیسری مکرم مسجد ہے، حضور ﷺ کے مطابق مسجدِ اقصیٰ کی ایک نماز ۵۰۰ نمازوں کے برابر ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں سے حضور ﷺ نے اپنے سفر شب (اسراء) پر تشریف فرما ہوئے اور پھر معراج پر تشریف لے گئے۔ اسی لیے مسلمان مسجدِ اقصیٰ کو "آسمانوں کے دروازے" سے موسوم کرتے ہیں۔ متعدد احادیث میں بھی بیت المقدس اور اس کے گرد و نواح کو بارہا اجاگر کیا گیا ہے۔ یہودیوں کا کہنا تھا یہ سر

زمین انھیں اللہ کے حکم سے ملی تھی اور اب وہ وقت آ گیا ہے کہ انھیں دوبارہ یہاں لوٹ آنا چاہیے۔ یہ ان کے دو ہزار سالہ جلا وطنی کے خاتمے کا وقت ہے۔ جب کہ حقیقتاً اس خطے کے اوّلین باسی توحید کا پیغام لانے والے پیغمبروں کی تعلیمات پر ایمان رکھتے ہیں۔ توحید کے اسی عقیدے کی بنیاد پر وہ اس سرزمین کے اصل وارث ٹھہرے کیوں کہ مسلمانوں کا تمام انبیاء کرام سے رشتہ کسی لسانی یا نسلی تعلق سے نہیں بلکہ اس کی بنیاد اسلامی عقیدۂ توحید ہے[۵]۔

خود قرآن حکیم کی سورۃ آل عمران میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے کہ ”ابراہیم نہ یہودی تھا اور نہ عیسائی، بلکہ وہ تو ایک مسلم یک سو تھا اور وہ ہرگز مشرکوں میں سے نہ تھا“۔ ابراہیمؑ سے نسبت رکھنے کا سب سے زیادہ حق اگر کسی کو پہنچتا ہے تو ان لوگوں کو پہنچتا ہے جنھوں نے ان کی پیروی کی[۶]۔ یہودی ربی اپنے مذموم مقاصد پورے کرنے کے لیے تورات میں مسلسل تحریفیں کرتے رہے۔ اس طرح اللہ کا پیغام مسخ ہو گیا[۷]۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے خطۂ فلسطین چند شرائط کے ساتھ حضرت موسیٰ کے سپرد کیا اور حضرت موسیٰ نے اپنے برادرانِ قوم سے اس مقدس سرزمین میں داخل ہونے کو کہا تو سوائے دو اشخاص کے سب نے یہی کہا کہ ہم تو وہاں کبھی نہیں جائیں گے اور ان طاقت ور لوگوں سے ہم مقابلہ نہیں کریں گے۔ بس تم اور تمھارا رب، دونوں جاؤ اور لڑو، ہم یہاں بیٹھے ہیں۔ حضرت موسیٰ نے جب رب تعالیٰ سے اپنی بے بسی کا اظہار کیا تو اللہ نے ۴۰ برس تک یہ ملک ان پر حرام کر دیا اور جب چالیس برس کے بعد انھیں فلسطین میں داخلے کی اجازت ملی تو اس شرط پر کہ توحید کا راستہ اختیار کریں گے اور اللہ کے بتائے ہوئے راستے پر زندگی گزاریں گے۔ لیکن فطرت میں جب سرکشی ہو تو اللہ سے کیے گئے وعدے اور معاہدے کی بھی کوئی اہمیت نہیں رہتی۔ لہٰذا پھر سے نافرمانیاں جاری ہوئیں اور رب تعالیٰ نے بالآخر انسان کی فلاح و بھلائی کے لیے دوسری قوموں کو چنا۔ ان میں پیغمبر مبعوث کیے گئے اور پھر آخر میں پرہیز گار مسلم اس ارضِ مقدس کے وارث ہوئے[۸]۔ تورات میں شامل ان فرضی داستانوں کی بنیاد پر یہودی اس بات کے دعوے دار بن بیٹھے کہ وہی فلسطین کے اصلی باشندے ہیں اور ان کے ساتھ جو باہر سے وارد ہوئے ہیں وہ ناجائز قابض ہیں۔ یہ بات خود تاریخی حقائق کے بھی خلاف ہے۔ ڈاکٹر محسن محمد صالح نے اپنی تصنیف ”تاریخ فلسطین“ میں ان حقائق سے پوری طرح پردہ اٹھایا ہے[۹]۔

اس کے علاوہ متعدد ایسی تصانیف تاریخ فلسطین کے پوشیدہ گوشوں کے مطالعے کے لیے اہمیت کی حامل ہیں۔ مقالات اور مسلسل مضامین کا ایک لامتناہی سلسلہ ہے جو اس موضوع کی بہت سی پرتوں کو ہمارے سامنے آشکار کرتا ہے، اس ضمن میں مولوی امیر احمد صاحب علوی کے سلسلہ وار طویل مضامین جو تیس کی دہائی میں ”الناظر“ کے مختلف پرچوں میں شائع ہوتے رہے، ان میں ”زوال بنی اسرائیل“[۱۰]، ”اسیریٔ بنی اسرائیل“[۱۱]، ”رہائی بنی اسرائیل“[۱۲]، ”نیم آزادی بنی اسرائیل“[۱۳]، ”ریاست بنی اسرائیل“[۱۴]، ”تباہی بنی اسرائیل“[۱۵]، ”اسرائیلیات“[۱۶]، ”بنی اسرائیل کا دورِ شباب“[۱۷]، ”شباب بنی اسرائیل کے دو افسانے“[۱۸]،

"سلطنت داؤد"[۱۹]، "شوکت سلیمانی"[۲۰] اور "قصص سلیمانی"[۲۱] وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ان مضامین کا مطالعہ بنی اسرائیل کے پس منظر کو سمجھنے کے لیے معاون و مددگار ہوگا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد صحرائے سینا میں بنی اسرائیل کی نئی نسل پروان چڑھی۔ یہی نسل حضرت یوشع علیہ السلام کی قیادت میں ارضِ فلسطین کی طرف روانہ ہوئی اور دریائے اُردن کے پار شمال مشرقی فلسطین آباد ہوئی۔ حضرت داؤد علیہ السلام کو نبوت کے ساتھ اقتدار بھی ملا۔ انھوں نے بنی اسرائیل میں از سر نو قائدانہ صلاحیتیں پیدا کیں اور ارضِ فلسطین پر مکمل قبضہ بھی کر لیا۔ اس وقت ارضِ فلسطین کا دارالحکومت یروشلم تھا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کا عہد اقتدار بھی شان و شوکت کا حامل تھا۔ حضرت علیہ السلام کی وفات کے بعد ریاست دو حصوں میں بٹ گئی۔ اوّل سلطنت اسرائیل شمالی فلسطین میں قائم ہوئی جو کہ ایک ناکام ریاست تھی۔ انسائیکلوپیڈیا بریٹانیکا میں اس ریاست کے لیے The Tale Kingdom کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ جب کہ دوسری ریاست سلطنت "جودھا" کے نام سے قائم ہوئی جس کا دارالحکومت یروشلم تھا۔ یہ ریاست بھی اوّل الذکر کی طرح کمزور حکومت ثابت ہوئی[۲۲]۔ یعنی کہ "حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمانؑ کے مختصر دور کے علاوہ (یہودی) مخدوش زندگی گزارتے رہے جو ان کے طاقت ور پڑوسیوں کے درمیان دب کے رہ گئی"[۲۳]۔

یہ پڑوسی بابل، فارس، مصر اور روم کی سلطنتیں تھیں جو ہمیشہ سے بنی اسرائیل کی ریشہ دوانیوں اور حریف طاقتوں سے رابطوں کے سبب ان سے نالاں رہتی تھیں۔ اکثر و بیش تر ان کی سرکوبی کے لیے محاذ گرم رکھتے۔ بالآخر ۵۸۷ قبل مسیح میں بابل کے فرماں روا بخت نصر کا حملہ یہودیت کے لیے جان لیوا ثابت ہوا۔ فلسطین میں قائم یہودیوں کی عبادت گاہ کو بھی بخت نصر نے تباہ کر دیا[۲۴]۔ مکمل طور پر اسے تاراج کرنے کے بعد وہ ۴۰،۰۰۰ یہودیوں کو غلام بنا کر اپنے ساتھ لے گیا۔ جو باقی بچے تھے وہ جان بچا کر مصر کی طرف بھاگے۔ ۵۳۹ تا ۳۳۲ قبل مسیح فلسطین، ایرانی سلطنت کا حصہ رہا۔ سائرس دوم کے عہد میں یہودیوں کو بابل سے واپس فلسطین لوٹنے کی اجازت ملی۔ ۳۳۲ قبل مسیح میں سکندر مقدونی نے فلسطین کو تسخیر کر کے یونانی سلطنت کا حصہ بنالیا۔ بعد میں شام کے سلیوسی (Seleucides) حکمرانوں نے یکے بعد دیگرے بطلیموس حکمرانوں کو شکست دے کر شام اور فلسطین کے ان تمام علاقوں کو چھڑالیا جن پر ۳۳۲ قبل مسیح میں قبضہ ہوا تھا۔ اس وقت تک یونانی رسوم کی جڑیں مضبوط ہو چکی تھیں لہٰذا سلیوسی حکمرانوں کی سخت پابندیوں کے باوجود وہ اپنی خود مختاری دکھاتے رہے۔ ۶۳ قبل مسیح میں یہ پورا خطہ رومنوں کے زیر تسلط آ گیا۔ ۶۶ تا ۷۰ عیسوی میں یہودیت کی جانب سے کی گئی بغاوت کو رومنوں نے پوری قوت کے ساتھ کچل دیا۔ انھوں نے یروشلم کی اینٹ سے اینٹ بجادی اور وہاں نئے تعمیر کردہ ہیرود کے کلیسا کو مسمار کر دیا۔ اتنی بڑی تباہی کے بعد بھی ۱۳۲۔۱۳۵ء میں ایک بار پھر یہودیوں نے بغاوت کی تو رومنوں نے پہلے کی نسبت زیادہ سختی کے ساتھ کام لے کر پورے شہر کا نام و نشان مٹادیا اور اسی جگہ نیا

شہر بسایا جسے ایلیا کیپی تولینا(Aelia Capitalina) کا نام دیا گیا۔ اس دور کے بعد یہاں یہودیوں کے آثار باقی نہ رہے [۲۵]۔ سوائے اس دیوارِ گریہ کے جس کو پکڑ کر یہودی روتے ہیں اور اس کو بڑی عبادت سمجھتے ہیں [۲۶]۔

رومی حکمرانوں کی عیسائیت قبول کر لینے کے بعد بھی یہودیوں پر مظالم کا سلسلہ جاری رہا۔ نہ صرف فلسطین بلکہ عیسائی دنیا کے ہر علاقے میں ان کی حیثیت وہی رہی جو ہندوستان میں پست اقوام کی تھی۔ انھیں نہ کہیں سیاسی حقوق حاصل تھے اور نہ ہی سماجی آزادیاں۔ زمانۂ حال تک یورپ کے بیش تر ممالک میں انھیں مخصوص بستیوں کے باہر رہنے کی اجازت تک نہ تھی۔ ان کے ساتھ سخت متعصبانہ سلوک برتا جاتا۔ جن علاحدہ جگہوں میں وہ رہتے تھے، انھیں Ghettos کہا جاتا۔ غلامی کی وجہ سے ان میں بہت سی مذموم عادتیں رواج پا گئیں اور ان عادتوں کی بنا پر ہر جگہ انھیں قابل نفرین سمجھا جاتا۔ یورپی ادبیات میں ان کے مسخ شدہ کردار کو بہت زیادہ پیش کیا گیا ہے [۲۷]۔

اگلے دو سالوں تک یہودیوں کا داخلہ اس شہر میں ممنوع قرار پایا۔ ۱۸ سو سال تک یہودی اس سرزمین پر انتہائی اقلیت میں رہے۔ اس کے برعکس کنعانی اور عرب قبائل کی اکثریت یہاں آباد رہی۔ بازنطینی سلطنت نے ۳۹۴عیسوی تک فلسطین پر اپنا قبضہ برقرار رکھا۔ بلآخر ۶۳۶ء میں حضرت عمرؓ کے دورِ خلافت میں یہ علاقہ اسلامی ریاست میں شامل ہوا [۲۸]۔ ۱۵ ہجری بمطابق ۶۳۶ء میں جب فلسطین فتح ہوا تو حضرت عمرؓ نے خود تشریف لا کر وہاں کے بطریق شہر کی چابیاں لیں اور مسلمان بغیر کسی خون خرابے کے اس شہر میں داخل ہو گئے۔ اس موقع پر مشہور معاہدہ جسے ''عہد العمریہ'' کہا جاتا ہے، ہوا جس کی رو سے مقامی لوگوں کو پہلی بار مذہبی آزادی عطا ہوئی اور ان کے کلیساؤں کو تحفظ کی ضمانت ملی۔ اس حُسنِ سلوک کے نتیجے میں پوری کی پوری آبادی جو کنعانیوں اور فلسطینیوں پر مشتمل تھی، نے اسلام قبول کر لیا۔ اسلام کی آمد کے بعد خوش حالی کے ساتھ ساتھ رواداری کا ایک نیا باب شروع ہوا۔ مقامی آبادی بہت جلد ہی جزیرۂ عرب سے آنے والوں کے ساتھ اس طرح گھل مل گئی کہ ان میں کوئی امتیاز باقی نہ رہا اور عربی ہی ان سب کی مشترکہ زبان بن گئی [۲۹]۔ اس معاہدے کی بابت تاریخِ طبری میں تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے [۳۰]۔ اس معاہدے کا اطلاق بیت المقدس کے علاوہ تبنیٰ، سمطّیہ، بیت جبرین، یافا، لدُ، نابلس اور عمواس کے باشندوں پر بھی ہوا جو بعد میں مسلم ریاست کا حصہ بنے۔ البتہ فلسطین کا ساحلی شہر قساریہ ۱۹ھ میں حضرت معاویہ بن ابوسفیان کے ہاتھوں فتح ہوا [۳۱]۔ کچھ ہی عرصے میں فلسطین اسلامی تہذیب کا اہم مرکز اور امن و امان کا گہوارہ بن گیا۔ خلافت بنو امیہ میں فلسطین کے شہر عسقلان، قیاریہ، رملّہ اور لدّ وغیرہ اسلامی سلطنت کے اہم مراکز رہے۔ امیر معاویہ کی بیعت ۳۷ھ کے آخر میں بیت المقدس ہی میں ہوئی۔ ۶۴ھ میں واقعہ کربلا کے سبب دنیائے اسلام میں داخلی انتشار رہا۔ موقعے کا فائدہ اٹھا کر رومی افواج نے شام اور فلسطین کے ساحلی شہروں پر حملہ کیا۔ بعد میں عبد الملک بن مروان کے عہد میں ان شہروں کو از سرِ نو تعمیر کیا گیا [۳۲]۔

بنو عباس کے دورِ خلافت میں بھی "مبر قع" کی بغاوت کے سوا فلسطین میں خوش حالی کا دور دورہ رہا۔ ابنِ خلدون کے مطابق اس شہر کا مالیہ "تین لاکھ دس ہزار دینار سالانہ" [33] تک جا پہنچا تھا۔ اس دور میں خلیفہ ہارون الرشید نے عیسائی زائرین کو بہت سی سہولیات فراہم کیں۔ ان امور کا نگران فلسطین کا گورنر اور عباسی سپہ سالار ثمرین اعین تھا۔ ۲۴۷ھ میں خلافت عباسیہ کے زوال کے ساتھ ہی مصر و شام کے طاقت ور امیر احمد بن طولوت نے ۲۶۴ھ میں فلسطین پر قبضہ کر لیا۔ بیت المقدس اس وقت بھی مسلمانوں، یہودیوں اور عیسائیوں تینوں مذاہب کے لیے "دار الامن" رہا۔ مسلمانوں کے تمام ادوار میں یہاں آباد مذاہب کو اپنے رسوم و عبادات کی مکمل آزادی حاصل رہی۔ خلافت فاطمیہ کے دور میں یہ آزادی اور بڑھی۔ فاطمیوں کے قبضے سے عیسائیوں کو اور زیادہ فائدہ ہوا کیوں کہ مصر کے فاطمی حکمرانوں نے عیسائیوں کی تاجرانہ سرگرمیوں کی خوب سرپرستی کی [34]۔ نتیجتاً عیسائی زائرین کی تعداد میں خاطر خواہ اضافہ ہوا حتیٰ کہ لاطینی دنیا سے بڑی تعداد میں عیسائی ارضِ فلسطین میں داخل ہونے لگے۔ گیارھویں صدی تک یہ تعداد بہت بڑھ گئی۔ البتہ اس زمانے میں کچھ ایسے واقعات ضرور پیش آئے جو اس دورِ حکومت میں ایک تاریک باب کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان میں سے ایک واقعہ "کنیسہ قمامہ" کے انہدام کی شکل میں رونما ہوا۔ علی محسن صدیقی کے مطابق:

> ۳۹۸ھ میں مصری خلیفہ الحاکم نے القدس کے کینسہ قمامہ کو منہدم کر دیا جو دنیائے مسیحیت کی ایک مقدس عبادت گاہ تھا اور یہاں عیسائی زائرین کی آمد اور ان کی مذہبی رسومات کی ادائیگی پر پابندی لگا دی [35]۔

اس عہد میں حکمرانوں کے باہمی اختلافات کے سبب عالم اسلام کی حالت داخلی لحاظ سے انتہائی دگر گوں تھی۔ اس صورتِ حال کا فائدہ اٹھا کر مشہور سلجوقی سلطان ملک شاہ کے بھائی تاج الدولہ ابن الپ ارسلان نے فلسطین پر قبضہ کر لیا۔ یوں وہاں "دولت بوریر" کا آغاز ہوا [36]۔ اس زمانے میں بھی امن و امان کی صورت حال نہایت مخدوش تھی۔ لہٰذا بیت المقدس آنے والے عیسائی زائرین کو خاصی پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا۔ ان کی جان و مال کی حفاظت سے مسلمان حکمران قاصر تھے۔ اس صورت حال سے فائدہ اٹھا کر یورپ میں پاپائے روم نے یہ تحریک چلائی کہ عیسائیوں کے مقدس مقامات پر سے مسلمانوں کے قبضے کو ختم کرایا جائے۔ یوں تاریخ میں "حروب صلیبیہ" کے دور کا آغاز ہوا جو تقریباً دو صدیوں تک جاری رہا [37]۔

مسلمانوں کی خوش حال اور رواں دواں حکومت میں صلیبیوں نے پہلی بار اس وقت رخنہ ڈالا جب وہ ۱۰۹۹ء میں القدس پر قابض ہو گئے۔ قبضے کے بعد انھوں نے جو لوٹ مار مچائی اور قتل و غارت گری کی اس کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی۔ صلیبیوں نے یہاں یروشلم کی لاطینی مملکت قائم کی جس نے ۸۸ برسوں تک مسلمانوں کو صفحۂ ہستی سے مٹانے اور انھیں ختم کر دینے کے لیے ہر ممکن اقدام کیا [38]۔

پہلا صلیبی محاربہ ۴۹۰ھ میں ہوا۔ ۴۹۱ھ میں الطاکنیہ کے سلجوق حاکم کو شکست دے کر ساری مسلم آبادی قتل کرادی گئی۔ ۴۹۲ھ میں بیت المقدس کا محاصرہ ہوا۔ چالیس دن کے محاصرے کے بعد شہر پر حملہ آوروں کا قبضہ ہو گیا[۳۹] اور پھر:

> شہر قدس میں داخل ہو کر جو کچھ ظلم ان لوگوں نے ناکردہ گناہ یہودیوں اور مسلمانوں پر ڈھایا...
> عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کی لاشیں بے گور وکفن تھیں۔ اگر کوئی شخص یا خاندان گھروں میں پناہ لیتا تو اسے آگ لگادی جاتی[۴۰]۔

صلیبی جنگوں کا اوّلین محرک مذہبی تعصب تھا۔ یہ جنگیں یورپی اقوام کے باہمی اتحاد کا پیش خیمہ ثابت ہوئیں۔ رد عمل میں مسلم دنیا کی آنکھ اشک بار تھی اور انھوں نے بھی آپس کے اختلافات بھلا کر یگانگت کی طرف توجہ کی۔ گزرتے وقت کے ساتھ مسلمان پھر سے سنبھلے۔ شام کی کام یاب مہم بالخصوص ایڈیسا کی فتح نے فلسطین کے عیسائیوں میں ایسی ہیبت طاری کی کہ انھوں نے گھبرا کر یورپ سے مدد طلب کی۔ لیکن اس امداد کے باوجود فلسطینی عیسائی پسپائی پر مجبور ہوئے اور بالآخر صلاح الدین ایوبی کی تلوار اٹھی جس نے مسلمانوں کو ان ظالموں سے مکمل طور پر نجات دلائی۔ ۱۲اکتوبر۱۱۸۷ء میں حطین کی فیصلہ کن جنگ میں عیسائیوں کو عبرت ناک شکست سے دوچار ہونا پڑا۔ اسی روز مسلمان فاتحانہ انداز سے فلسطین میں داخل ہوئے[۴۱]۔ مسلمانوں نے مسجدِ اقصیٰ اور قبۃ الصخرہ سے عیسائی علامتوں کو نوچ کر نکال باہر پھینکا اور پھر سے ان عمارتوں کو مزیّن کر کے حلب سے صنوبر کی لکڑی کا منبر بنوایا گیا[۴۲]۔ صلاح الدین ایوبی نے اپنے عہد اقتدار میں یہودیوں کے ساتھ حسن سلوک برتا اور انھیں شہر میں قیام کی اجازت دی۔ اس دور میں فلسطین کے شہر عمواس، لد، نابلس، منقورہ، سامرہ، فیساریہ، یافہ، جبرین، عسقلان اور غزہ عالم اسلام کے اہم مراکز ہو گئے[۴۳]۔ اس دور میں یہودیوں کو ان کی مذہبی رسومات کی ادائیگی کی مکمل اجازت تھی۔ اکثر مذاہب سے رواداری کا مظاہرہ کیا گیا۔ ''The History of Jews'' کے مصنف ڈاکٹر مل مسلمانوں کی اس روشن روایات کے متعلق فرماتے ہیں کہ ''خلافت اسلامیہ کے تحت ان یہودیوں کو جو امن حاصل رہا اور انھوں نے جو کچھ ترقی ہر لحاظ سے کی، وہ یہود کا عہدِ زریں ہے''[۴۴]۔

فلسطین طویل عرصے تک خلافت عثمانیہ کا حصہ رہا لیکن جب اس سلطنت کی جڑیں کھوکھلی ہونے لگیں تو ۱۷۹۹ء میں نپولین بوناپارٹ نے مصر پر حملہ کیا اور بآسانی اس پر قابض ہو گیا۔ رئیس احمد مغل کے مطابق نپولین ہی وہ پہلا حکمران تھا جس نے یہودیوں کو سرکاری سطح پر سب سے پہلے اپنا علاحدہ وطن قائم کرنے کی ترغیب دی[۴۵]۔ انیسویں صدی میں فرانس اور برطانیہ نے یہودیوں کے متعلق اپنا رویہ بدلا تو یہ دونوں ممالک یہودیوں کے لیے محفوظ پناہ گاہ بن گئے[۴۶]۔ خصوصاً برطانیہ اس دور میں عالمی طاقت ہونے کے ناطے اس خطے کی اہمیت سے بخوبی واقف تھا۔ اس نے اپنے مخصوص نو آبادیاتی منصوبے کی تکمیل کے لیے فلسطین میں یہودیوں کی آباد کاری کی سرپرستی کی اور:

> ۱۸۳۸ء میں برطانیہ نے یروشلم میں اپنا سفارت خانہ قائم کیا جو ۱۹۱۴ء کی عالمی جنگ چھڑنے تک نا جائز طور پر آباد ہونے والے یہودیوں کے لیے محفوظ پناہ گاہ کے طور پر کام کرتا رہا۔ اس سفارت خانے کے اوّلین سفیر کو برطانیہ کے دفتر خارجہ سے پہلا حکم یہی ملا تھا کہ بلا امتیاز قومیت پر یہودی کو تحفظ فراہم کیا جائے[47]۔

اس کے بعد ۱۸۹۷ء میں عالمی صیہونی تنظیم World Zionist Organization (WZO) قائم ہوئی اور اس تنظیم نے فلسطین میں یہودیوں کا ایک محفوظ وطن تشکیل دینے کے لیے اپنے تمام مادی، سیاسی اور انسانی وسائل بروئے کار لائے۔ اس تنظیم کا بانی اسٹریا سے تعلق رکھنے والا یہودی صحافی تھیوڈور ہرزل Theodore Hertzl تھا۔ اُس نے زوال پزیر عثمانی حکومت کے سلطان عبدالحمید دوم کو اس شرط پر مالی امداد دینے کی پیش کش کی کہ بدلے میں یہودیوں کو فلسطین میں آنے اور رہنے کی اجازت دی جائے گی۔ سلطان نے پیش کش حقارت سے ٹھکرا دی اور انکار پر صیہونیوں نے دوسرے راستے نکالے اور برطانیہ، امریکا اور دیگر ممالک کو اپنا ہم نوا بنانے میں کام یاب ہو گئے۔ خلافت عثمانیہ کے خاتمے نے یہودیوں کی راہ سے بڑی رکاوٹ دور کر دی۔ خلافت کے برعکس جدید سیکولر ترکی کا ظہور ہوا جو مغرب کے رنگ میں رنگ گیا۔ اس اثنا میں یورپ میں ہونے ولے عالم گیر معاشی اور سماجی بحران نے یہودیوں کو ایک بار پھر ترک وطن پر مجبور کیا۔ عالمی یہودی تنظیم نے موقعہ غنیمت جانتے ہوئے کثیر فنڈ جمع کیا جس کا مقصد فلسطین میں زمین کا حصول تھا۔ انھوں نے یہودیوں کو دل کھول کر رقوم فراہم کیں اور انھیں فلسطین جا کر رہنے کی ہدایات دیں[48]۔

انیسویں صدی کے آغاز پر محض پانچ ہزار یہودی فلسطین میں رہ رہے تھے۔ زیادہ تر لوگ ہنر مند یا تجارت پیشہ تھے۔ ان کے پاس زرعی زمینیں نہیں تھیں۔ کمزور عثمانی حکومت کے دور میں بد عنوان رشوت خور افسروں کو لالچ دے کر ۱۹۱۸ء تک انھوں نے ۲۶۰۰۰۰ ایکڑ سرکاری اراضی ہتھیالی جو اس وقت کے فلسطین کے کل رقبے کا ۵۲.۱ فی صد حصہ تھا۔ ۱۹۱۷ء میں فلسطین برطانیہ کے قبضے میں چلا گیا۔ اس وقت صیہونی قیادت تھیوڈور ہرزل کے انتقال ۱۹۱۱ء کے بعد ڈاکٹر ویز مین (Chain Weizmann) کے ہاتھوں میں تھی۔ وہ ایک سائنس دان تھا اور اس کے تیار کردہ آتش گیر مادے نے جنگ میں اتحادیوں کی بہت مدد کی تھی۔ بدلے میں اس نے انگریزوں سے مطالبہ کیا تھا کہ وہ یہودیوں کو فلسطین میں آباد کریں گے۔ اس سے قبل ۱۹۰۳ء میں بھی کینیا میں قومی وطن کے لیے علاقہ فراہم کرنے پر برطانیہ نے رضامندی کا اظہار کیا تھا لیکن یہودیوں نے اس پیش کش کو رد کر دیا اور فلسطین پر مصر رہے۔ چناں چہ لندن میں ڈاکٹر ویز مین اور لارڈ راٹھ چالڈ (Rottschild) کے درمیان اس موضوع پر مذاکرات ہوئے[49]۔ اس وقت مسلم دنیا میں اتنی سکت نہ تھی کہ کھل کر برطانوی پالیسی پر احتجاج کرتی یا اس کے خلاف عملی اقدامات کیے جاتے[50]۔ برطانوی حکمرانوں نے خصوصی قوانین تشکیل دیے جس سے یہودیوں کے فلسطین میں آنے اور زمینیں ہتھیانے کی راہ ہم وار ہو گئی۔ اس طرح یہودی آباد کاروں کی آمد کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا۔ اس زمانے میں برطانوی

وزارت خارجہ کے سیکریٹری لارڈ بالفور نے لارڈ راتھ چائلڈ کو ۲ نومبر ۱۹۱۷ء کو ایک خط لکھا جس میں درج تھا کہ ''ہز میجسٹی کی حکومت فلسطین میں یہودیوں کے قومی وطن بنائے جانے پر ہمدردانہ غور کرتی ہے اور اس مقصد کے حصول کے لیے بھرپور جدوجہد کرے گی''[۵۱]۔ یہ خط بعد میں اعلان بالفور کے نام سے مشہور ہوا۔ نئے یہودی آبادکاروں کو زمینوں کے ساتھ ضروری ساز و سامان اور اسلحہ رکھنے کی بھی اجازت ملی۔ ان سہولتوں کی بدولت انھوں نے اپنی نو آبادیات قائم کیں۔ یہ آبادیاں خود مختار حیثیت اختیار کرتی گئیں۔ انھیں خاص پولیس رکھنے کی بھی اجازت ملی جب کہ اس کے مقابلے میں عربوں کے ساتھ امتیازی سلوک روا رکھا گیا۔ ان پر بھاری ٹیکس لگائے گئے۔ ان کی آزادانہ آمدورفت پر پابندی لگائی گئی۔ ان سے ہتھیار چھین لیے گئے۔ انھیں زمینیں خریدنے کے حق سے محروم کر دیا گیا۔ ۱۹۴۸ء تک اسرائیل ۱۸۰۰۰۰ ایکڑ زمین جو اس وقت کے کل رقبے کا ۶.۶۷ فی صد تھی۔ امیر شامی اور لبنانی زمین داروں سے خریدنے میں کام یاب ہو چکے تھے[۵۲]۔ ۱۹۲۰ء کے بعد متعدد مواقع پر فلسطینی عربوں نے ان اقدامات کے خلاف مسلح جدوجہد کی مگر نقصان ہمیشہ انھی کو اٹھانا پڑا اور ہزاروں عرب اپنے وطن کی حفاظت کرتے ہوئے شہید ہوئے۔ ۱۹۲۴ء میں ہٹلر کو جرمنی میں اقتدار حاصل ہوا تو اس نے بھی اپنے ملک سے یہودیوں کا انخلا شروع کیا جس کے نتیجے میں فلسطین میں ان کی امداد مزید بڑھ گئی۔ ۱۹۳۲ء میں برطانیہ نے فلسطین کے مسئلے کو حل کرنے کے لیے '' پیل کمیشن'' (Peel) بنایا۔ کمیشن نے فلسطین کو دو حصوں میں تقسیم کرنے کی تجویز پیش کی مگر یہ تجویز بھی بار آور ثابت نہ ہوئی۔ متعدد بے نتیجہ کانفرنسیں بھی ہوئیں پھر ۱۹۳۹ء میں برطانیہ نے فلسطین سے متعلق اپنی پالیسی کا واضح طور پر اعلان کرتے ہوئے قرطاس ابیض (Whitepaper) شائع کیا۔ اس کے اہم نکات یہ تھے:

(۱)۔ دس سال بعد فلسطین میں ایک آزاد مملکت قائم کی جائے گی:

(۲)۔ فلسطین میں مکمل امن و امان قائم ہونے کے ۵ سال بعد فلسطین اور برطانیہ کے نمائندے مل کر ایک آئین مرتب کریں گے:

(۳)۔ عبوری دور میں بتدریج اہل فلسطین کو نظم و نسق سے وابستہ کیا جائے گا:

(۴)۔ ۱۹۴۴ء تک مزید ۷۵ ہزار یہودی فلسطین میں بسائے جائیں گے اور بعد کے ۵ سال کے دوران ۲۵ ہزار یہودی درآمد ہوں گے۔

اس لحاظ سے ۱۹۴۹ء تک فلسطین میں یہودیوں کی تعداد کل آبادی کا ایک تہائی ہو جاتی۔

دوسری عالمی جنگ کے آغاز کی وجہ سے برطانیہ کو ان عزائم کی تکمیل کا موقع نہ مل سکا۔ مگر کچھ نئے مسائل ضرور پیدا ہو گئے۔ یہودیوں نے جرمنی سے مقابلہ کرنے کے بہانے فلسطین میں اپنی فوجیں مرتب کرنے کی اجازت حاصل کر لی اور اس طرح اپنی حربی طاقت بڑھانے لگے۔ دوسری طرف یہودی اپنی امریکی حکومت سے توڑ جوڑ میں مصروف ہوئے۔ امریکی معیشت پر

یہودی اثرات کی وجہ سے انھیں اپنے مقاصد میں خاطر خواہ کامیابی ملی۔ ۱۱ مئی ۱۹۴۲ء کو نیویارک میں ہونے والی صیہونی کانفرنس میں فریقین کے درمیان طے پایا کہ فلسطین میں یہودی مملکت قائم ہوگی۔ برطانوی پابندیوں کو بھی فی الفور اٹھالیا گیا۔ اس طرح امریکی سرپرستی میں یہودی عزائم پوری طرح کھل کر سامنے آگئے۔ جدید ترین اسلحہ اور کھلے بندوں امریکی تائید اور سرپرستی نے یہودی موقف کو مضبوط تر بنادیا۔ یہودی تیزی کے ساتھ فلسطین میں آکر آباد ہونے لگے۔ یہ سب بڑے بڑے سرمایہ دار تھے اور مقابلے میں غریب، مفلس فلسطینی۔ اس صورت، حال سے یہودیوں نے خوب فائدہ اٹھایا۔ عربوں سے زمینیں اور جائیدادیں خریدی جانے لگیں۔ مسلم دنیا کا احتجاج محض بے اثر ہو کر رہ گیا۔ دوسری عالمی جنگ نے برطانوی اقتدار کو بھی کھوکھلا کر دیا تھا اور امریکا بجا طور پر اس برطانوی اقتدار کا جانشین بن بیٹھا۔ امریکی سرپرستی میں یہودیوں کو مکمل طور پر کھل کھیلنے کا موقع فراہم کیا۔ اب انھیں نہ عربوں کی پرواہ تھی اور نہ ہی برطانویوں کی۔ چناں چہ ۱۹۴۶ء میں ہی دہشت پسندوں نے یروشلم کے کنگ ڈیوڈ ہوٹل کو تباہ کر دیا۔ اس ہوٹل میں برطانوی حکومتی دفاتر تو تباہ ہوئے ساتھ ساتھ ۹۱ افراد موت کے گھاٹ اتار دیے گئے[۵۳]۔ فلسطینی اپنی تمام تر بے بسی اور کمزوریوں کے باوجود اپنے موقف پر ڈٹے رہے۔ ان کے مطالبات میں "معاہدہ بالفور" کا خاتمہ یہودی آباد کاری اور انھیں فلسطینی زمین کی فروخت پر پابندی اور ایک قومی فلسطینی حکومت کا قیام سرفہرست تھے۔ فلسطین کی قومی تحریک انھیں خطوط پر پروان چڑھی۔ فلسطین کی قومی تحریک کا باقاعدہ آغاز ۲۷ جنوری تا فروری ۱۹۱۹ء کو یروشلم میں منعقدہ پہلی عرب کانفرنس کے موقعے پر ہوا۔ ۱۹۱۹ء تا ۱۹۲۷ء ایسی سات کانفرنسیں منعقد ہوئیں۔ ان کانفرنسوں کے نتیجے میں موسیٰ کاظم الحسینی اور الحاج امین الحسینی تحریکِ آزادئ فلسطین کے قائدین بن کر سامنے آئے[۵۴]۔ ان سرفروشوں کی داستان جہاد کو متعدد اہل قلم نے قلم بند کیا۔ محمد علی ملا صدیقی نے بھی "الحاج مفتیِ اعظم امین الحسینی و جہاد فلسطین" میں ان واقعات کی تفصیل درج کی ہے[۵۵]۔ کانفرنس کے پانچویں اجلاس میں مندوبین نے قومی چارٹرڈ پیش کرتے ہوئے عہد کیا کہ:

> ہم عرب فلسطین کے نمائندہ نابلوس میں منعقدہ پانچویں عرب فلسطین کانفرنس میں اللہ، تاریخ اور عوام کے سامنے یہ عہد کرتے ہیں کہ اپنے وطن کی آزادی اور عرب اتحاد کے لیے ہر جائز طریقے سے جدوجہد کرتے رہیں گے۔ اور کسی بھی صورت میں یہودی آباد کاری اور فلسطین میں یہودی سلطنت کے قیام کی اجازت نہیں دیں گے[۵۶]۔

برطانوی مینڈیٹ اپنے خاتمے کے قریب پہنچا تو انھوں نے اپنی رہی سہی ساکھ بچانے کی غرض سے اس مسئلے کو فروری ۱۹۴۷ء میں اقوامِ متحدہ میں پیش کیا۔ جس کے بعد اقوامِ متحدہ کی جنرل اسمبلی کی خصوصی کمیٹی بنادی گئی[۵۷]۔ اقوام متحدہ نے ممکنہ فوجی تصادم سے بچنے کے لیے فلسطین کو دو حصوں میں تقسیم کرنے کا منصوبہ پیش کیا۔ روس اور امریکا نے برطانوی راج کے خاتمے اور دو متوازی حکومتوں کے قیام کی تجویز کی حمایت کی۔ برطانیہ کی مخالفت کے باوجود اس کی ایک نہ سنی گئی۔ دوسری جانب یہودی دہشت پسندوں کی کارروائیاں برطانوی نظم و نسق کو بے اثر بنا چکی تھیں۔ ہزاروں عرب اپنا گھر چھوڑ کر بے سروسامانی کے عالم میں

دیگر عرب علاقوں میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے تھے۔ ایسے میں ۱۹۴۸ء کو فلسطین سے اپنا اقتدار اٹھالیا۔ دوسرے ہی دن اسرائیلی حکومت کے قیام کا علان کر دیا گیا۔ دو دن کے اندر روس اور امریکا نے اس نئی حکومت کو تسلیم بھی کر لیا۔ ایسے میں عربوں کے پاس بھی ہتھیار اٹھانے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ جولائی تک جنگ جاری رہی مگر اس جنگ میں اسرائیل کا پلڑا۔ اقوامِ متحدہ نے جنگ بندی کا حکم دیا اور کاؤنٹ فوک برناڈوٹ کو ثالث بنا کر بھیجا جنھیں یہودی دہشت پسندوں نے ہلاک کر ڈالا۔ اقوام متحدہ نے مختلف عرب مملکتوں اور اسرائیل کے درمیان عارضی صلح نامے کے ذریعے اپنے حساب سے اس مسئلے کو سمیٹ کر یہ طے کر دیا تھا کہ فلسطین کی تقسیم کا کام مکمل ہو چکا تھا۔ انگریزوں کی خود غرضانہ سیاست نے اس مسئلے کو کافی الجھا دیا اور اسے عالمی سطح پر انتہائی پیچیدہ مسئلہ بنا کر رکھ دیا تھا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اسلامی فتوحات سے قبل بھی خطۂ فلسطین میں عرب ہی رہتے تھے۔ چاروں جانب سے عرب علاقوں میں گھرا فلسطین میں ۱۹۸۱ء تک اتحادیوں کے قبضے کے وقت تک یہودیوں کی آبادی محض پچاس ہزار جو کل آبادی کا ۷ فی صد تھے۔ بقیہ ۹۳ فی صد عیسائی اور مسلم آبادی تھی۔ عثمانی دور میں عرب فلسطین انتہائی اہم عہدوں پر فائز رہے۔ شریف حسنین اور ہنری میک کے درمیان ۱۹۱۵ء میں جو خط کتابت ہوئی تھی اس میں واضح طور پر سلطنت برطانیہ سے مطالبہ کیا گیا تھا کہ عرب ممالک کی آزاد حیثیت کو تسلیم کرے، جس کی حد بندی انھوں نے کر کے بھیجی ہے اور جس میں فلسطین کو بھی شامل کیا گیا تھا۔ مگر اس مسئلے کو پیچیدہ تر بنانے کی غرض سے کچھ ہی عرصے بعد برطانیہ نے یہ کہنا شروع کر دیا تھا کہ فلسطین، متعلقہ عرب یونین کی حد بندیوں میں شامل نہیں تھا۔ ۱۹۱۷ء میں برطانیہ نے فرانس اور روس کے ساتھ ساز باز کر کے عربوں کے حصے بخرے کرنے کی سازش کی۔ رفتہ رفتہ عربوں کا تناسب آبادی بھی متاثر ہوا جو گھٹتے گھٹتے ۶۵ فی صد تک آ گیا۔ فلسطین کی قابل کاشت اراضی کا ۹۰ فی صدی حصے کے مالک یہودی ہو گئے جب کہ مذکورہ صفحات میں ۱۹۱۸ء کے اعداد و شمار کے مطابق محض ۵ فی صدی حصے کے مالک یہودی تھے۔ ان کارروائیوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ زمین دار بالکل تباہ ہو گئے۔ عربوں کی خانقاہوں اور مساجد کو حرف غلط کی طرح مٹایا جانے لگا۔ انگریزوں نے ایسے قوانین بنائے جن میں عربوں کا خون چوس کر یہودیوں کی صنعت کو فروغ دیا گیا۔ تجارت پر اجارہ داری قائم کی۔ منڈیاں یہودیوں کے اشارے پر ناچنے لگیں۔ ۱۹۳۷ء کی شاہی کمیشن کی رپورٹ سے پتا چلتا ہے کہ یہ انتداب بھی یہودیوں کا ہی تیار کردہ پروگرام تھا[۵۸]۔ لارڈ ملنشٹ کے الفاظ میں:

> وہ مبارک دن بہت قریب ہے، جب ہم از سر نو "ہیکل سلیمانی" کی تعمیر کریں گے۔ میں نے طے کر لیا ہے کہ اپنی بقیہ زندگی مسجدِ اقصیٰ کی جگہ پر اس عظیم الشان ہیکل کے بنانے میں صرف کروں گا[۵۹]۔

۱۹۲۰ء میں بھی فلسطین میں خونی واقعات پیش آ چکے تھے۔ ۱۹۲۹ء میں زبردست انقلابی طوفان برپا ہوا جس نے نہ صرف فلسطین بلکہ یربن، سفاد اور دیگر شہروں کو بھی لپیٹ میں لے لیا۔ ۱۹۳۳ء میں فلسطین، جانا، حیفا اور نابلس وغیرہ میں بھی سخت فسادات ہوئے۔ ۱۹۳۶ء میں ہڑتالوں کا سلسلہ اور ان سے بھی بڑھ کر ۱۹۳۷ء میں جنگ آزادی اور انقلاب کی ایسی آگ

بھڑک اٹھی جو بمشکل ۱۹۳۹ء کے موسم گرما میں بجھنا شروع ہوئی۔ اس زمانے کے تمام کمیشن کی رپورٹ یہ بتاتی ہے کہ ان فسادات کے ذمے دار یہودیوں کے قومی وطن بنانے کی تجویز تھی۔ یہودیوں کے عزائم میں سرفہرست مسلم آثار کو مٹانا تھا۔ لہٰذا اس حوالے سے متعدد اقدامات کیے گئے خصوصاً ۷ا جولائی ۱۹۴۰ء کی رات بیت المقدس کے لیے قیامت سے کم نہ تھی۔ یہودیوں نے سرنگ کھود کر جال بچھایا، بم گرائے گئے، ذاتی توپوں سے حملہ کیا گیا جو مقدس عبادت گاہوں پر آکر گری۔ مسجدِ اقصیٰ پر ایک بم گرا کر چھت اور دیگر گوشے شہید کر دیے گئے۔ بعد کے برسوں میں بھی یہ سلسلہ جاری رہا۔ ۱۹۴۸ء میں ۳۰۰ فلسطینیوں جن میں عورتیں اور بچے بھی شامل تھے چن چن کر "دیریٰسین" نامی بستی میں ذبح کر دیے گئے۔ بے شمار نعشوں کو کنویں میں پھینک دیا گیا۔ یہ لوگ مسلمانوں کے خلاف نفرت آمیز رویہ اختیار کرتے۔ عورتوں پر تھوکتے، بچوں پر ٹینک چڑھا دیتے۔ اس سے زیادہ مشکل حالات حیفا، یافہ، سارس، شجرہ وغیرہ کے تھے اسپتالوں میں بہ کثرت زخمیوں کو قتل کیا گیا۔ ڈاکٹروں اور نرسوں تک کو مار ڈالا گیا۔ بیرکوں میں قید لوگوں کو سوکھی روٹی کے ٹکڑے دیے جاتے۔ کوڑوں سے سزائیں دی جاتیں۔ بے ہوشی کے عالم میں سخت سردی میں ٹھنڈے پانی میں ڈال دیے جاتے۔ ہوش میں آنے پر پھر وہی وحشیانہ سلوک کا سلسلہ شروع ہو جاتا۔ بہ کثرت انسانوں کو زندہ جلایا گیا۔ بچوں تک کو آگ میں ڈال دیتے۔ نوجوان لڑکیوں کو اغوا کر کے ساتھ لے جاتے اور تل ابیب میں شرم ناک پیشہ اختیار کرنے پر مجبور کرتے۔ شہر لد پر یہودیوں نے قبضے کے بعد مسجد میں موجود چار ہزار اشخاص کو جو روزے سے تھے، انھیں دو دو دنوں تک کھانے پینے سے محروم رکھا جاتا۔ جو پانی دیا بھی جاتا تو اس میں پیشاب شامل کر کے پینے پر مجبور کیا جاتا۔ رملّہ میں بھی بڑی تعداد میں قتل و غارت گری ہوئی۔ وہاں بھی دو ہزار افراد کی ہلاکتوں کی تصدیق بین الاقوامی ریڈ کراس نامی تنظیم نے کی[۱۰]۔

جنگ کے دوران اسرائیلی جتھوں نے اپنے دیرینہ منصوبے دیلت(Dalet Plan) جو کہ نسلی صفایا کرنے کا سب سے بڑا منصوبہ تھا، اور جس کا نشانہ وہ مقامی عرب تھے جو اسرائیلی ریاست کی جغرافیائی اور نسلی ہم آہنگی میں سب سے بڑی رکاوٹ تھے۔ انھیں یہاں سے نکالے یا ان کی نسل کشی کے بغیر اسرائیل کا استحکام مکمل نہ تھا۔ اس مقصد کے حصول کے لیے عرب آبادیوں کا محاصرہ معمول ہو گیا۔ انھیں لوٹ مار کر قتل و غارت گری کا نشانہ بنایا گیا۔ ان یہودی قاتلوں نے بڑی تباہی مچائی، ایک اندازے کے مطابق ۳۴ مقامات پر ۱۳۰۰۰ بے گناہ عرب شہری ہلاک کیے گئے۔ ۴۰۰ سے زائد بستیوں کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیا گیا اور تقریباً ۷۲۶۰۰۰ فلسطینیوں کو بندوق کے زور پر گھر سے بے گھر کیا گیا۔ اسرائیلی ریاست کے قیام کے وقت فلسطین میں یہودیوں کی آبادی تقریباً سات لاکھ تھی۔ وہ خوش قسمت عرب جو کسی نہ کسی طرح اسرائیلی یورش سے جان بچانے میں کام یاب ہو کر گھروں میں رہے ان کی تعداد تقریباً ۱۵۶۰۰۰ بنتی ہے۔ ظاہر ہے عربوں کی بڑے پیمانے پر نسل کشی کیے بغیر اسرائیل کا قیام ناممکن تھا۔ پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ یہ جنگ اسرائیلیوں کی ضرورت تھی، سو اس نے جنگ چھیڑی تاکہ عربوں کو ان علاقوں سے نکالا جا

سکے۔ لاکھوں افراد جو بے گھر ہوئے وہ اپنی مرضی سے نہیں نکلے۔ ۱۹۴۸ء کی جنگ کی پوری عیارانہ منطق صیہونی ارادوں کی بنیاد پر گھڑی گئی اور اسے عملی جامہ پہنانے والے بھی صیہونی اور ان کے اتحادی تھے۔ جہاں تک اقوام متحدہ کی تقسیم فلسطین کی قرارداد نمبر ۱۸۱ کا تعلق ہے تو اس میں صاف صاف یہ کہا گیا تھا کہ مجوزہ یہودی ریاست ۴۹۸۰۰۰ ہزار یہودیوں اور ۴۹۷۰۰۰ فلسطینیوں پر مشتمل ہو گی۔ اس تجویز سے صاف ظاہر تھا کہ مجوزہ ریاست اسرائیلی ریاست نہیں کہلوائی جاسکتی تھی۔ اس وقت بھی یہودیوں کے مقابلے میں فلسطینیوں کی شرح پیدائش ۱۰ فی صد تھی۔ اس تناسب سے یہودی یقیناً اقلیت میں چلے جاتے اور یہ نوزائیدہ ریاست جلد یا بدیر عرب ریاست میں تبدیل ہو جاتی۔ ۱۹۶۷ء کی جنگ بھی اسرائیل اور اس کے تین ہم سائے عرب ممالک کے درمیان برپا ہوئی۔ عرب یہ جنگ بھی ہار گئے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ فلسطین کے باقی ماندہ ۲۳ فی صد علاقے پر بھی اسرائیل کا قبضہ ہو گیا۔ اس کے علاوہ مصر سے صحرائے سینا اور شام سے جولان کی پہاڑیاں بھی چھن گئیں۔ اسرائیل کی جارحیت اور انسانی حقوق کی پے در پے پامالی کے باوجود فلسطینیوں کی تحریک مزاحمت جاری رہی اور وہ اپنے حقوق کے لیے ہمیشہ کفن بردوش رہے [۱۱]۔ فلسطینیوں نے ابتدا ہی سے یہ مطالبہ جاری رکھا کہ ''معاہدہ بالفور'' کا فوری خاتمہ ہو، یہودی آبادکاری اور انھیں فلسطینی زمین کی فروخت پر پابندی اور ایک قومی فلسطینی حکومت کا قیام عمل میں لایا جائے۔ فلسطین کی قومی تحریک انھی خطوط پر پروان چڑھی تھی۔ اس تحریک کا باقاعدہ آغاز تو ۲۷ جنوری تا فروری ۱۹۱۹ء کو یروشلم میں منعقدہ پہلی عرب کانفرنس کے موقع پر ہو چکا تھا۔ جس کا ذکر مذکورہ صفحات میں کیا جا چکا ہے۔ یہودی آبادکاروں کے خلاف اس دوران مسلح مزاحمت کے واقعات بھی پیش آئے۔ اس مزاحمت کو برطانیہ نے جبر کے ساتھ دبانے کی پالیسی پر عمل جاری رکھا۔ اسی دوران ''البراق'' مزاحمت کا اغاز بھی ہوا جس کی فوری وجہ یہودیوں کا مسجدِ اقصیٰ کی مغربی دیوار پر حملہ تھا۔ اس مزاحمت میں بھی کئی قیمتی جانیں ضائع ہوئیں۔ اکتوبر ۱۹۳۳ء میں برطانوی حکومت کو عوامی مظاہروں کا سامنا بھی کرنا پڑا [۱۲]۔ ان مظاہروں کی بابت امیر الحسن شائی لکھتے ہیں کہ:

> دیکھتے ہی دیکھتے یہ جدوجہد حیفہ، یروشلم، نابلوس اور دیگر شہروں تک پھیل گئی۔ اس سات روزہ ہڑتال میں انسانی جانوں کا بہت نقصان ہوا۔ تحریک کے قائد موسیٰ کاظم الحسینی کو اس قدر پیٹا گیا کہ وہ زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے ۱۹۳۴ء میں ۸۱ برس کی عمر میں شہید ہو گئے [۱۳]۔

برطانوی پالیسیوں کے خلاف مسلح بغاوت کا آغاز فلسطینیوں کی خفیہ تنظیم ''الجہادیہ'' نے کیا۔ اس کے رہ نما شیخ عزالدین القسام تھے۔ وہ فلسطینی تحریک کے عسکری ونگ کی اہم ترین شخصیت تھے۔ ظفر الاسلام کے مطابق وہ:

> شام کے عالم تھے، جنھوں نے جامعہ الازہر سے تعلیم حاصل کی تھی۔ وہ پہلے شخص تھے جنھوں نے باقاعدہ مسلح مزاحمت کا اعلان کیا اور عملی طور پر اسے کر دکھایا۔ اس کی جدوجہد برطانیہ کے خلاف تھی [۱۴]۔

شیخ عزالدین القسام بھی ۲۰ نومبر ۱۹۳۵ء میں برطانوی حکومت سے آزادی حاصل کرنے کی جدوجہد میں شہید ہو گئے۔ ان کی مزاحمت مختصر عرصے کے لیے تھی مگر ان کی شہادت کے دوررس اثرات مرتب ہوئے۔ بعد میں مسلح بغاوت کا دائرہ پھیلتا گیا۔ حتیٰ کہ برطانیہ کا اس مسلح جدوجہد پر قابو پانا مشکل تر ہوتا گیا۔ ظفر الاسلام کے مطابق:

> عرب کے شاہ ابنِ سعود، عراق کے شاہ غازی اور اردن کے امیر عبداللہ نے اکتوبر ۱۹۳۶ء میں ایک ہی جیسی اپیلوں کے ذریعے فلسطینی عوام سے درخواست کی کہ وہ برطانیہ کے خلاف مسلح جدوجہد ختم کر دیں[۶۵]۔

فلسطین میں ہونے والی بغاوت اور نقصانات کا جائزہ لینے کے لیے بننے والی پیل کمیشن کا فلسطینی عربوں نے بائیکاٹ کیا کیوں کہ اس کمیشن کے قیام کے پس منظر میں انھیں برطانوی سازش کا شبہ تھا۔ اس کمیشن کے مطابق اس سارے قبضے کے تین فریق برطانیہ، عرب اور یہودی تھے۔ لہٰذا طے پایا کہ ایک حصہ یہودی ریاست کے لیے، دوسرا عرب ریاست کے لیے اور تیسرا حصہ جس میں یروشلم اور دوسرے مقدس مقامات میں شامل ہوں، برطانیہ کے زیر انتظام دیے جائیں۔ یہودیوں نے اس منصوبے کو پسند کیا جب کہ عربوں نے اسے تنقید کا نشانہ بنایا[۶۶]۔ کیوں کہ ان کے خیال میں یہودیوں کو فلسطین کی بہترین زمینیں آبادی میں ان کے تناسب سے زیادہ دے دی گئی تھی[۶۷]۔ ۱۹۳۸ء کی بغاوت کا بے رحمانہ خاتمہ، فلسطینیوں کے لیے بے حد نقصان دہ ثابت ہوا۔ رہی سہی کسر جنگ عظیم دوم نے پوری کر دی۔ دورانِ جنگ فلسطینی عسکری لحاظ سے کمزور ہوتے چلے گئے اور یہودی پوری طرح طاقت ور۔ اس دوران یہودی لابی نے عالمی ہمدردی کے حصول کے لیے جرمنی اور مشرقی یورپ میں ہونے والے مظالم کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا۔ ان کا کہنا تھا کہ ان کی سلامتی کا واحد راستہ یہی ہے کہ فلسطین میں ان کے لیے ایک علاحدہ ملک ہو۔ اس لابی نے ''ہولوکاسٹ'' کا چرچا کر کے امریکی حمایت بھی حاصل کر لی۔ یہودیوں کی نسل کشی کے حوالے سے یہ اصطلاح پھر سے زندہ ہو گئی۔ یہودیوں کے اس پروپیگنڈے کو پوری دنیا میں بڑی اہمیت ملی۔ عالم اسلام کے اکثر ممالک اس وقت یورپی نو آبادیات بنے ہوئے تھے، اس لیے ان کی جانب سے مناسب رد عمل سامنے نہ آسکا۔ بالآخر ۱۲ اپریل ۱۹۴۷ء میں برطانیہ مسئلہ فلسطین کو اقوام متحدہ میں لے گیا جہاں فلسطین کو دو ریاستوں میں تقسیم کرنے کی تجویز پیش کر دی گئی[۶۸]۔ ۱۹۴۸ء میں یہودی ریاست کے قیام کے اعلان کے ساتھ ہی جنگ کے شعلے ایک مرتبہ پھر بھڑک اٹھے تھے۔ ابتدائی چھے ماہ میں فلسطینیوں کو بڑی کام یابی ملی۔ فلسطین کے رقبے کا ۸۲ فی صد حصہ اس جنگ میں یہودیوں سے محفوظ رہا[۶۹]۔ اس جنگ میں عربوں کی شکست کا سبب آپس کی نااتفاقی اور مخاصمت تھی۔ جنگ کا منطقی نتیجہ یہ نکلا کہ فلسطین کو شکست دینے کے بعد یہودی ۷۸ فی صد علاقے پر قابض ہو گئے۔

اسرائیل کے قیام کو فلسطینی عوام نے نامنظور کیا۔ اس دن کو ''رنج اور خواری'' کے دن کے طور پر منایا جاتا۔ آج بھی فلسطینی اس دن کو تباہی و بربادی کے دن کے طور پر مناتے ہیں۔ اس شکست نے پوری فلسطینی قوم کے اندر احساسِ شرمندگی پیدا

کیا۔ "النکبۃ" کے بد ترین اثرات کا جائزہ لیتے ہوئے محمود درویش نے کہا کہ یہودیوں نے امن کے سراب آسا دعووں پر سے جلد نقاب اتار دیے [۷۶]۔ تمام تر حالات کی خرابی کے باوجود بہادر فلسطینی عوام نے مشکلات کا مقابلہ کرنے کی ٹھانی۔ ۱۹۴۹ء سے ۱۹۶۷ء کے درمیانی ماہ و سال صیہونی ریاستی تشدد کے خلاف مزاحمت میں گزرے۔ اس دوران جمال عبدالناصر کا "قومیت المعرکۃ" عربوں کی مشترکہ جدوجہد کا تصور بھی خاصا مقبول ہوا۔ ۱۹۵۶ء میں جمال عبدالناصر نے نہر سویز کو قومی ملکیت میں لینے کا اعلان کیا جس کے ردعمل میں اسرائیل، فرانس اور برطانیہ نے مصر پر حملہ کر دیا۔ اس جنگ میں مصر کو شکست تو نہ دی جا سکی لیکن اس کی سیاسی اور عسکری نااہلی کا راز فاش ہو گیا۔ مصری فضائیہ کو بھی شدید نقصان پہنچا۔ صحرائے سینا اور غزہ وغیرہ پر حملہ آوروں کا قبضہ ہو گیا جسے بعد میں امریکی اور روسی کوششوں سے واگزار کرایا گیا۔ چیم ہرزونگ (Chaim Herzong) کے مطابق:

> The United Nation issued a resolution of 2 November demanding the retreat of the attacking forces to pre-war position nontheless they tried to maintain their positions as long as possible, but finally forced to withdraw under American-Soviet pressure[۷۷]

۱۹۵۹ء میں کویت میں "حرکت تحریر فلسطین" نامی تنظیم کی بنیاد رکھی گئی جو بعد میں "فتح" کے نام سے معروف ہوئی۔ ایک تاثر یہ بھی ہے کہ "فتح" یا "الفتح" نامی تنظیم کے قیام کے پس منظر میں مصر کے اسلامی انقلاب کی تحریک "اخوان المسلمون" کا ہاتھ بھی تھا۔ ۱۹۶۳ء میں یہ تحریک "اخوان المسلمون" اور اس کے قائد حسن البنا کی فکری جہت پر گامزن رہی۔ "الاخوان" کے متعدد کارکن بیک وقت "الفتح" سے بھی منسلک رہے۔ بعد میں دونوں تنظیموں نے بیک وقت رکنیت پر پابندی عائد کر دی۔ "الفتح" کی عسکری جدوجہد نے نئی نسل کو اپنی طرف مائل کیا۔ "الکرامہ" کی جنگ کے بعد "الفتح" میں شمولیت کے لیے نوجوانوں کا تانتا بندھ گیا۔ محض ۴۸ گھنٹوں میں نوجوانوں کی طرف سے پانچ ہزار درخواستیں موصول ہوئیں۔ ۱۹۶۷ء کی عرب اسرائیل جنگ میں "الفتح" نے نہایت موثر کردار ادا کیا۔ اسرائیل کے خلاف دو سو گوریلا آپریشن ہوئے۔ ۱۹۵۹ء میں جمال عبدالناصر کی کوششوں سے کونسل آف عرب لیگ نے فلسطینیوں کے ایک علاحدہ قوم کے طور پر شناخت دینے کی قرارداد پاس کر لی تھی۔ ۲۸ مئی ۱۹۶۴ء میں پہلی فلسطین کانگریس کا انعقاد ہوا۔ اردن کے شاہ حسین نے اس کی صدارت کی۔ اس کانفرنس میں ۴۳۲ فلسطینی نمائندوں نے شرکت کی اور اس میں پی۔ ایل۔ او۔ کے قیام اور احمد الشکیری کی صدارت کا اعلان کر دیا گیا[۷۸]۔ پی۔ ایل۔ او۔ نے نئی تنظیم کے عسکری ونگ "فلسطین لبریشن آرمی" کی بنیاد رکھی۔ مئی ۱۹۶۷ء میں جمال عبدالناصر نے یک طرفہ طور پر بحر الکاہل اور طیران میں بحری نقل و حمل پر پابندی عائد کر دی اور اقوام متحدہ کے امن مشن کو بھی سرحد سے نکلنے کا حکم دے دیا۔ یہ ایک طویل مدت سے "موعودہ جنگ" کا اعلان تھا۔ جون ۱۹۶۷ء میں لڑائی شروع ہوئی۔ مصر اور اس کے اتحادیوں کی طویل جنگی تیاریوں کے باوجود محض چند روز میں اسرائیلی فضائیہ نے مصر، اردن اور شام کی فضائیہ کے اکثر طیاروں کو جبراً زمین پر اترنے پر مجبور کر دیا۔ محض چھے دن کے مختصر عرصے میں اسرائیل نے باقی ماندہ علاقے پر قبضہ کر لیا۔ اس جنگ میں مصر، اردن

اور شام کو شدید جانی و مالی نقصان اٹھانا پڑا۔ عالمی طاقتوں کی اسرائیلی سرپرستی اس جنگ میں عربوں کی حزیمت کا باعث بنی۔ جنگ کا نتیجہ فلسطینیوں کے لیے خاصا پریشان کن تھا[۳]۔ القدس پر اسرائیلی قبضے کے بعد اسرائیلی وزیر دفاع نے ''براق شریف'' کے صحن میں کھڑے ہو کر واشگاف الفاظ میں اعلان کیا کہ ''ہم دوبارہ مقدس ہیکل کی طرف لوٹ آئے ہیں۔ ہم اب اسے کبھی بھی اپنے ہاتھوں سے جانے نہ دیں گے''[۴]۔ عربوں کی شکست نے عوام کو ہلا کر رکھ دیا۔ فلسطینی عرب جو اس سے قبل مصر، شام اور اردن کو اپنا نجات دہندہ تصور کرتے تھے، ان کا اعتماد اس ممالک سے اٹھ گیا۔ ۱۹۷۴ء میں رباط کانفرنس میں پی۔ ایل۔ او۔ کے سربراہ یاسر عرفات سے عرب نے اپنا مطالبہ منوالیا کہ پی۔ ای۔ او۔ کو فلسطین کی واحد نمائندہ تنظیم تسلیم کیا جائے۔ اسی حیثیت سے انھوں نے ۱۹۷۴ء میں اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی سے خطاب بھی کیا جس میں ایک ایسے سیکولر فلسطین کی حکومت کا مطالبہ کیا گیا جہاں مسلمان، عیسائی اور یہودی مل جل کر رہ سکیں[۵]۔

۷۰ء کی دہائی میں اقوام متحدہ نے ایسی کئی قراردادیں پاس کیں جن میں فلسطینیوں کے حق خود ارادی اور مسلح جدوجہد کو تسلیم کیا گیا۔ ۱۹۷۵ء کی قرارداد نمبر ۳۲۳۶ فلسطینی عوام کی خود مختاری اور اپنی زمین پر واپسی کے حق کو تسلیم کرتے ہوئے اسرائیل کو جارح قرار دیتی ہے۔ فلسطینیوں کی مسلح جدوجہد ہی کی وجہ سے دنیا بھر کی توجہ مسئلہ فلسطین کے حل کی طرف مرکوز ہوئی۔ اگر مزاحمت کی یہ تحریک متعدد حادثات کا شکار نہ ہوتی اور عرب ممالک باہمی اختلافات کا شکار نہ ہوتے تو بین الاقوامی برادری کی یہ حمایت مسئلہ فلسطین کے لیے زیادہ موثر انداز میں استعمال ہو سکتی تھی۔ ۱۹۶۷ء تا ۱۹۷۰ء کے درمیانی تین سال فلسطینیوں کی عسکری جدوجہد کے حوالے سے یادگار رہیں گے۔ اس دوران اردن اور اسرائیل کے درمیان ۳۶۰ کلومیٹر طویل سرحد فلسطینی گوریلا کارروائیوں کی وجہ سے محاذ جنگ بنی رہی۔ بعد میں ۱۹۷۰ء۔ ۱۹۷۱ء میں اردن کی فوج اور مسلح فلسطینی گوریلوں کے درمیان جھڑپوں کے بعد فلسطینی مزاحمتی تحریک سے یہ اہم محاذ چھن گیا۔ ۱۹۶۹ء میں ''معاہدہ قاہرہ'' کے تحت لبنانی سرحد کے ساتھ فلسطینیوں کی نقل و حمل پر پابندی لگا دی گئی۔ دوسری طرف فلسطینی مجاہدین کو اردن سے بھی نکال دیا گیا۔ لبنان میں الکتاب پارٹی اور اس کے اتحادیوں نے بھی فلسطینیوں کو بے دست و پا کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی[۶]۔ ۸۰ء کی دہائی میں فلسطینیوں کی گوریلا کارروائیاں انتہائی سست رہیں۔ پی۔ ایل۔ او۔ کو فلسطین کی نمائندہ تنظیم قرار دلوانا اور عالمی انجمنوں میں بطور مبصر شرکت کروانا عرب لیگ کے لیے مفید ثابت ہوا۔ اب ان کی آواز عالمی عوام میں سنی جانے لگی۔ دوسری طرف اندرونی سازشوں نے فلسطینی مؤقف کو خاصا نقصان بھی پہنچایا۔ مصر کے انور سادات نے ۱۹۷۸ء میں اسرائیل کے ساتھ کیمپ ڈیوڈ امن معاہدہ کر کے عرب دنیا کو حیرت میں ڈال دیا۔ اس معاہدے کے تحت مصر نے اسرائیل کو تسلیم کرنے کے بدلے صحرائے سینا پر اپنے قبضہ برقرار رکھنے کی شرط منوالی۔ اس طرح اسرائیل کے خلاف مشترکہ کارروائی کی آخری امید بھی دم توڑ گئی۔ ادھر قوم پرستی اور سیکولرازم کی پالیسی میں ناکامی سے پی۔ ایل۔ او۔ میں بھی تقسیم در تقسیم کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ پی۔ ایل۔ او۔ نے اپنا

عسکری کردار ختم کر کے امن مذاکرات کی ابتدا کی۔ البتہ اس نے دور اندیشی کا مظاہرہ کرتے ہوئے "انتفاضہ" کے لیے متحدہ قیادت ضرور فراہم کی۔ اسرائیلی ریاست کی جوابی کارروائیاں بھی جاری رہیں۔ "انتفاضہ" نے مختصر عرصے میں وہ کارہائے نمایاں کر دکھائے جن کے اثرات تادیر محسوس کیے گئے۔ فلسطین کونسل کے انیسویں اجلاس میں اقوام متحدہ کی قرارداد نمبر ۱۸۱۸ کو قبول کرنے کی حکمت عملی اپنا کر فلسطین کو عرب اور یہودی ریاست میں تقسیم کرنے کی بات مان لی گئی[۷۷]۔

فلسطین کی آزادی کا اعلان کر دیا گیا اور بشمول پاکستان دنیا بھر کے ۱۲۰ ممالک نے فوراً اس ریاست کو تسلیم کر لیا۔ ۱۹۸۰ء کی دہائی میں عرب دنیا میں ہونے والی تبدیلیوں خصوصاً ۲ اگست ۱۹۹۰ء کو عراق کے کویت پر حملے نے بھی فلسطین کاز کو خاصا نقصان پہنچایا۔ صدام حسین نے کویت سے اپنے فوجیوں کی واپسی کو فلسطین کی آزادی سے مشروط کر دیا۔ پی۔ ای۔ او۔ کا جھکاؤ بھی عراق کی جانب تھا جس کے نتیجے میں سعودی عرب اور کویت وغیرہ نے فلسطین کی حمایت سے ہاتھ کھینچ لیا۔ ۹۰ء کی دہائی میں امریکا دنیا کی واحد عالمی طاقت کی صورت میں منظر عام پر آیا۔ اس کے بعد فلسطینیوں کی مشکلات میں روز بروز اضافہ ہوتا گیا۔ ڈیمو کریٹ امریکن صدر بل کلنٹن کے چار اہم وزرا نسلاً یہودی تھے۔ امریکی خارجہ پالیسی پر ان کا اثر و نفوذ گہرا تھا۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ آج بھی امریکا کے علاوہ دنیا کا کوئی ایسا ملک نہیں جہاں صیہونیت کو متبرک مقام پر فائز کیا جاتا ہو یعنی ایک ایسی چیز جس کی پاکیزگی کی قسم خود دیوتا بھی اٹھاتے ہوں۔ امریکا کا اسرائیل کی طرف جو واضح جھکاؤ موجود ہے وہ اب کسی سے چھپا ہوا نہیں[۷۸]۔ حالانکہ بعض معتدل یہودی محقق اس رویے کے خلاف آوز بلند کرتے رہے ہیں۔

ڈیوڈ شلمین (David Shulman) جو یہودی اسکالر تھے، نے اسرائیلی استبداد اور فلسطینیوں کی خون ریزی کی اسرائیلی پالیسی اور ان کی اراضی پر ناجائز قبضے کی اور آبادکاری کی کھل کر مخالفت کی ہے۔ انھیں فلسطینیوں کی حمایت پر کئی بار سرزنش بھی کی گئی[۷۹]۔ انھوں نے فلسطین میں ان کے حوالے سے اسرائیلی پالیسی کو ہدف تنقید بناتے ہوئے واضح طور پر کہا کہ اسرائیلی حکومت کسی بھی حالت میں قیام امن سے مکمل انکار کر دے گی۔ موجودہ اسرائیلی حکومت اور فوج در حقیقت یہی چاہتی ہے کہ کسی نہ کسی طرح مقبوضہ علاقوں پر اپنا تسلط برقرار رکھے[۸۰]۔ مغرب کی دانش گاہوں میں تعلیم پانے والے ایڈورڈ سعید بھی عمر بھر فلسطینی بچوں اور نوجوانوں کے لیے مضطرب رہے۔ نو آبادیاتی آقاؤں کی پرستش کرنے والے گھرانے میں پیدا ہونے والے ایڈورڈ سعید اسی استعمار کا سب سے بڑا دشمن اور فلسطینیوں کا وکیل بن کر ابھرا۔ ۱۹۶۷ء کی جنگ میں عربوں کی شکست کے بعد دنیا انھیں تضحیک کا نشانہ بنا رہی تھی۔ اس مشکل وقت میں بھی ایڈورڈ سعید خاموشی سے شکست خوردہ عربوں کے ساتھ کھڑا نظر آتا ہے، لیکن اس تمام حمایت کے باوجود وہ فلسطینی رہنماؤں، سیاست دانوں، دانش وروں اور ادیبوں کا سب سے بڑا نکتہ چیں بھی تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ ہماری قسمت گھٹیا قیادت کے ہاتھوں میں رہی اور ہم اب بھی غلطیوں اور تباہیوں والی اس دیوالیہ قیادت کی حمایت میں لگے ہوئے ہیں[۸۱]۔

نوم چومسکی کے مطابق فلسطینیوں کو زیر نگیں رکھنے کے لیے اسرائیل نے قتل و غارت گری، مار پیٹ، آنسو گیس، اجتماعی گرفتاریاں، بے دخلیاں، مکانوں کا انہدام، کرفیو، اجتماعی سزا کی دیگر سفاک اقسام، غرض کون سا حربہ ہے جو اسرائیل نے نہیں اپنایا۔ تاہم اس کے کسی حربے سے نہ تو فلسطینی عوام تابع داری پر مجبور ہوئے اور نہ انھوں نے پر تشدد ردعمل کا اظہار کیا۔ فلسطینی انتفاضہ خود نافذ کردہ اجتماعی نظم و ضبط کا ایک قابل تعریف کارنامہ ہے۔ اسرائیلی تاریخ پر تشدد کارروائیوں سے بھری ہوئی ہے۔ یہودیوں نے ریاست کے قیام کی جدوجہد کے دوران برطانوی افسران کو قتل کرنے سے بھی گریز نہیں کیا۔ اقوام متحدہ کے ثالث فولک برنادوت کو ہلاک کیا، برطانوی یرغمالیوں کو پھانسی کے پھندے پر لٹکایا۔ عرب شہریوں کے خلاف کئی مظالم کا ارتکاب کیا۔ اسرائیلی وزیر اعظم اضحاک شمیر اس گروپ کے کمانڈر تھے جس نے برنادوت کا قتل کیا۔ اسرائیل کی سیاسی قیادت دہشت گردی پر مبنی سرگرمیوں کی مذمت کرنے میں ہچکچاہٹ سے کام لیتی رہی ہے[۸۲]۔ اس دوران نام نہاد امن معاہدے بھی ہوتے رہے۔ ۱۹۹۱ء میں امریکا نے اپنا اثر و رسوخ استعمال کرتے ہوئے عرب ممالک کو میڈرڈ کانفرنس میں شمولیت پر راضی کر لیا۔ یوں پی۔ ایل۔ او۔ اور اسرائیل کے درمیان مذاکرات کا باقاعدہ آغاز ہوا۔ دو سال تک جاری رہنے والے یہ مذاکرات بے نتیجہ رہے۔ البتہ اس کے ساتھ ساتھ خفیہ طور پر مذاکرات کا سلسلہ ناروے کے شہر ''ارسلایہ'' میں جاری رہا۔ حیران کن طور پر ان مذاکرات کے نتائج اوسلو امن معاہدے کی صورت میں ۹ اگست ۱۹۹۳ء کو ظاہر ہوئے[۸۳]۔ فلسطین کی جانب سے محمود عباس اور اسرائیل کی جانب سے شمعون پیریز نے معاہدے پر دستخط کیے۔ امریکی اور روسی وزرائے خارجہ بطور گواہ شریک ہوئے۔ اس معاہدے پر تنقید کرتے ہوئے راجا ذاکر خاں کا کہنا تھا کہ یہ معاہدہ ۹۹ فی صد یہودیوں اور اسرائیل کے حق میں تھا[۸۴]۔ اس معاہدے کے تحت اریحا اور غزہ کے علاقوں میں تو عبوری خود مختاری ضرور حاصل ہوئی لیکن مسجدِ اقصیٰ کا معاملہ مزید التوا کا شکار ہو گیا۔ اس کے علاوہ اردن، شام، لبنان اور مصر میں موجود فلسطینی مہاجرین کی وطن واپسی بھی التوا کا شکار رہی۔ ایڈورڈ سعید کے مطابق:

> اوسلو معاہدوں پر دستخط کے بعد فلسطینیوں کی حالت مسلسل خراب ہوتی گئی۔ فلسطینیوں کے لیے ایک جگہ سے دوسری جگہ سفر کرنا ناممکن ہو گیا۔ یروشلم کو حدود سے باہر کر دیا گیا اور بھاری بھرکم عمارتی منصوبوں نے ملک کا جغرافیہ بدل کر رکھ دیا۔۔۔ اوسلو کے بعد سامنے آنے والی قانونی صورت حال کا سب سے زیادہ واضح تجزیہ راجا شہادہ نے اپنی کتاب From Occupation to Interim accords: Israel and the Palestinian Territories میں کیا ہے[۸۵]۔

یہ معاہدہ بھی فلسطینیوں میں نامقبول رہا۔ اس معاہدے سے یہ تاثر بھی ابھرا کہ فلسطینیوں نے ۸۰ فی صد حصے پر مستقل طور پر یہودیوں کے حق کو تسلیم کر لیا ہے۔ پی۔ ایل۔ او۔ کی اس حکمت عملی کی وجہ سے فلسطینی جدوجہد دو واضح حصوں میں تقسیم ہو گئی۔ لیکن پی۔ ایل۔ او۔ اور حماس کے اس باہمی تصادم سے حماس کے حق میں کافی بہتری آئی۔ حماس کا قیام تو ۱۵

دسمبر ۱۹۸۷ء میں عمل میں آیا تھا۔ شیخ احمد یاسین اس کے پہلے چیئرمین تھے۔ اس تنظیم کو عروج اس وقت ملا جب پی۔ ایل۔ او۔ کا عسکری کردار ختم ہوگیا۔ حماس کا فکری اشتراک حسن البناء کی "اخوان المسلمون" سے ہے۔ حماس کلی طور پر اوسلو معاہدے کے خلاف تھی۔ جس کی وجہ سے امریکا اور مغربی میڈیا اس تنظیم کو پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھتے تھے۔ دونوں تنظیموں میں آپس میں جھڑپیں بھی ہوتی رہیں۔ ۲۰۰۵ء میں فلسطین اتھارٹی کے زیر انتظام علاقوں غزہ اور مغربی کنارے میں ہونے والے صدارتی انتخاب میں یاسر عرفات کے جانشین محمود عباس پی۔ ایل۔ او۔ کے پلیٹ فارم سے ۶۲.۵ فی صد ووٹ لے کر کامیاب ہوئے۔ حماس نے ان انتخابات کا بائیکاٹ کیا تھا لیکن اگلے ہی سال ۲۵ جنوری ۲۰۰۶ء کو ہونے والے قانون ساز اسمبلی کے الیکشن میں حماس نے اسرائیل کے ساتھ تعلقات رکھنے یا نہ رکھنے کے واحد ایجنڈے کے ساتھ الیکشن میں حصہ لیا[۸۶]۔ نتیجہ ظاہر ہے حماس کے حق میں نکلا۔ "الفتح" محض ۴۵ نشستیں جیت پائی اور حماس کو ۷۴ نشستیں ملیں۔ حماس کے اسماعیل ہانیہ وزیر اعظم نامزد ہوئے لیکن ان کے حلف اٹھاتے ہی محمود عباس اور اسماعیل ہانیہ میں اختلاف شروع ہو گئے جو مسلح حملے تک جا پہنچے۔ نتیجہ حماس کی حکومت کے خاتمے کی صورت میں برآمد ہوا۔ جون ۲۰۰۷ء میں غزہ میں فلسطینیوں کے درمیان خانہ جنگی شروع ہوئی۔ حماس نے غزہ کا اور الفتح نے مغربی کنارے کا کنٹرول سنبھال لیا۔ اس طرح موجودہ صورت حال کو دیکھیں تو فلسطینی جدوجہد آزادی کی تحریکیں باہمی انتشار اور عدم اعتماد کی وجہ سے موثر کردار ادا نہیں کر پا رہی ہیں۔ خطرہ ہے کہ یہ انتشار اور مسلح لڑائیاں کہیں فلسطینی خطے کو مزید دو الگ ریاستوں میں تقسیم نہ کر دے۔ فلسطینی قیادت کے باہمی اختلافات نے حکومت پر بھی اس کی گرفت کو کمزور کر دیا ہے[۸۷]۔ اندرونی کمزوری پر ہی جب قابو پانا مشکل ہو رہا ہو تو بیرونی خطرات سے فلسطینی انتظامیہ کیوں کر نبرد آزما ہو سکے گی، لہٰذا اسرائیل اس موقعہ کا خوب خوب فائدہ اٹھاتا ہے۔ بقول ڈیوڈ شلمین:

> بلا کسی وجہ کے مار دیے جاتے ہیں . . . آباد کاروں کے گھروں میں گھس کر انھیں گولی مار دیتے ہیں
> . . . یہ لوگ دکانوں کی کھڑکیوں کو توڑ ڈالتے ہیں، فلسطینی سپاہیوں کو پیٹتے ہیں، ان پر انڈے پھینکتے
> ہیں۔ بوڑھوں کو پیٹ پیٹ کر یا کسی طریقے سے انھیں جان سے مار ڈالتے ہیں[۸۸]۔

اوسلو میں اسرائیل اس بات پر تو ضرور رضامند ہو گیا کہ بعض بڑے شہر فلسطینی اتھارٹی کے حوالے کر دے مگر ان شہروں کے چاروں طرف کے علاقے اس نے خود اپنے پاس رکھے۔ چناں چہ ایک شہر سے دوسرے شہر جانے کے لیے فلسطینیوں کو اجازت نامے کی ضرورت ہوتی جو اسرائیلی چوکیوں پر دیکھے جاتے۔ انتفاضہ کے دوران اسرائیلی فوجیوں نے ان شہروں کو گھیر کر آنے جانے سے روک دیا۔ اوسلو کے نکتہ چینیوں نے اسی وقت کہہ دیا تھا کہ یہ تباہی کا نقشہ ہے۔ کسی کی سمجھ میں نہ آیا کہ فلسطینی اتھارٹی اس معاہدے پر کیوں کر رضامند ہوئی[۸۹]۔ ایک کاغذ کے ٹکڑے کے بدلے میں یاسر عرفات نے تشدد کو خیرباد کہنے کا وعدہ تو کر لیا[۹۰] لیکن عام فلسطینی عوام اس بات کو قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ لہٰذا اس کے خلاف سخت رد عمل بھی سامنے آیا۔ اقصیٰ انتفاضہ کے جو مقاصد تھے، فلسطینی افسران اس کے بارے میں مبہم بیانات دیتے رہے تھے۔ انتفاضہ کے شروعات کے چند

ہی ہفتوں بعد عرفات اور پیریز میں مفاہمت کے بعد شرم الشیخ کا معاہدہ تحریر کیا گیا تھا۔ دونوں فریق چاہتے تھے کہ پارٹیاں مذاکرات کی میز پر واپس آئیں۔ ان دونوں میں ہر فریق کو تشدد کے خاتمے کے لیے پریس کانفرنس بلانا تھی، اس مفاہمت کے ساتھ کہ اسرائیلی فوجیں فلسطینی سرحدوں سے ۲۸ ستمبر سے پہلے والی پوزیشن پر واپس بلائی جائیں۔ جب کہ یہی وہ واقعہ تھا جس نے انتفاضہ میں چنگاری بھڑکا دی۔ فلسطینی اپنے خلاف اسرائیل کے سیاسی اور معاشی دباؤ کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔ ایک خود مختار ریاست کے لیے جس کا دارالحکومت یروشلم ہو[۹۱]۔ ستمبر ۹۲ء کو ایرل شیرون، اسرائیلی پولیس کی تقریباً ایک ہزار محافظوں اور سپاہیوں کے ساتھ نہایت طنطنے سے حرم شریف میں داخل ہوئے تھے، محض یہ حق جتانے کے لیے کہ وہ اسرائیلی ہونے کی بنا پر مسلمانوں کی مقدس عبادت گاہ میں داخل ہونے کا اختیار رکھتے ہیں۔ ظاہر ہے اس کے رد عمل میں احتجاج کا لاوا بھڑکا[۹۲]۔ شیرون نے واضح طور پر فلسطینیوں کو پیغام دیا کہ:

> فلسطینی علاقوں میں مرد، عورت اور بچوں کے لیے، تم ہی میرا نشانہ ہو، تمھیں دکھ جھیلنا ہوں گے، اور تمھیں اس جرم کی سزا بھگتنی ہوگی کہ تم فلسطینی ہو... ہر کیمپ، گاؤں، قصبے اور شہر کو فوری طور پر قید خانہ قرار دیا جاتا ہے۔ بجائے اس کے کہ ہر ایک فرد کو گرفتار کیا جائے اور نظر بندی کے مزید مراکز قائم کیے جائیں اور تمھاری گرفتاری پر ہمیں اخراجات کرنے پڑیں، میں بس یہ کروں گا کہ فوج کو ہدایت کروں گا کہ خندقیں کھودیں اور تمھاری آبادی کے مراکز کے گرد رکاوٹیں تعمیر کر دیں اور یوں ایک ہی وار میں تمھیں پوری دنیا سے بالکل کاٹ کے رکھ دیں[۹۳]۔

ظاہر ہے کہ اسرائیل پوری دنیا کے خلاف خم ٹھونک کے کھڑا ہو جانے کے لیے تیار ہے۔ ایمنسٹی انٹرنیشنل کی رپورٹ کے مطابق اسرائیلی حکام ۱۹۸۷ء سے مغربی کنارے، بشمول مشرقی یروشلم میں کم از کم ۲۶۵۰ فلسطینی مکانات منہدم کیے۔ اس کے نتیجے میں ۱۶۷۰۰ فلسطینی جن میں ۷۳۰۰ بچے بھی شامل تھے، اپنے گھروں سے محروم ہوگئے۔ ۱۹۹۳ء میں اسرائیل اور پی۔ ایل۔ او۔ کے درمیان معاہدے کے باوجود انہدام کی سالانہ شرح کم نہیں ہوئی۔ انھوں نے اپنی رپورٹ میں یہ تفصیل ان خاندانوں کا ذکر کیا ہے جن کو غیر قانونی طور پر نشانہ بنایا گیا[۹۴]۔ فلسطینیوں کی ایک بڑی تعداد آج اس بحران سے نکلنے کے لیے ہاتھ پیر مار رہی ہے۔ پچاس برس سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا ہے جب ان کے علاقوں پر قبضہ کر کے انھیں بے وطن کر دیا گیا۔ اوسلو معاہدے کے بعد بھی مغربی کنارے میں اسرائیلی بستیاں بسانے کی کارروائی جاری ہے[۹۵]۔ بعض محققین اس قضیے کو محض مذہبی اور نسلی قضیہ ماننے سے انکاری ہیں۔ ان کے مطابق کئی دہائیوں قبل برطانیہ، فرانس، امریکا، روس اور عثمانی عہد میں ترکی بھی اس کوشش میں لگے رہے کہ بحر مردار کے خزائن پر ان کا تسلط قائم ہو جائے۔ بحر مردار کے بارے میں یہ تحقیق ہو چکی ہے کہ وہ ایک طرف سے خشک ہوتا جا رہا ہے اور اس میں قدرت کے جمع کردہ خزانوں کا انبار موجود ہے۔ پوٹاس، کیلشیم، سونا اور دیگر بہت سی قیمتی دھاتیں وافر مقدار میں موجود ہیں جن کی مستقبل کی دنیا کو شدید ضرورت ہے۔ مختلف زمانوں میں عالمی طاقتیں بحر مردار کے

خزانوں کے حصول کی اسکیمیں تیار کرتی رہی ہیں۔ کمیٹیاں قائم ہوئیں اور لطف کی بات یہ ہے کہ ہر ملک کی کمیٹی میں یہودی جزو لاینفک کی طرح موجود رہے۔ خود یہودیوں کی کونسل (امریکا) میں بحر مردار ہمیشہ موضوع بحث رہا ہے، لہٰذا قضیۂ فلسطین کا فیصلہ انصاف کے متقاضی ہوتا دکھائی نہیں دیتا[۹۶]۔

اسرائیل کو عربوں کے مقابلے میں جو کامیابیاں حاصل ہوئیں اس کی وجہ برطانوی ملوکیت اور امریکی سامراجیت کی مدد واعانت میں مضمر ہے۔ جب کہ عربوں کی شکست ان کے باہمی نفاق، انتشار، بدنظمی، سیاسی رقابتوں اور عیاشیوں کی وجہ سے ہوئی[۹۷]۔ عرب قوم کو جس نظریے نے قصرِ منزلت سے نکال کر دنیا پر حکمران بنایا تھا اس کو فراموش کر دینے کی کوشش اس قوم کی سب سے بڑی بدقسمتی بن گئی۔ پندرہ صدیوں سے ایک نظریے پر مسلسل ایمان اور اس کی کامیابی پر تاریخ کی شہادت ایسی بات نہ تھی جسے چند برسوں کی کوششوں سے ختم کیا جاسکے[۹۸] لیکن عالمی استعمار صیہونی عزائم کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے ہر ممکن اقدام اٹھانے سے گریز نہیں کر رہے۔ صیہونیوں کی آبادکاری کی غرض سے انھوں نے نہ صرف فلسطین سے عرب مسلمانوں کو نکالنے کا سلسلہ شروع کر رکھا ہے بلکہ عیسائی عربوں کو بھی محض اس لیے نشانہ بنایا گیا کہ وہ معاشی، معاشرتی اور علمی لحاظ سے یورپی اور امریکی صیہونیوں سے مختلف ہیں۔ یہ نسلی امتیاز اس حد تک برتا گیا کہ مغربی یہودیوں کو صیہونی Zionists اور مقامی یہودیوں کو Jews یا دقیانوسی یہودی کہا جانے لگا۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ مراکش اور تیونس میں جو لاکھوں یہودی آباد تھے اور اب بھی ہیں، انھیں فلسطین کے نئے وطن میں آباد ہونے کے لیے مدعو نہیں کیا گیا۔ فلسطین سے نکالے گئے عربوں کے اعداد و شمار سے پتا چلتا ہے کہ ان میں چالیس فی صد مسلمان، تیس فی صد عیسائی اور تیس ہی فی صد دقیانوسی یہودی بھی شامل ہیں۔ عربوں کے اسرائیل سے نکالنے کا یہ جواز پیش کیا گیا کہ غیر قوموں کی موجودگی میں انتقاضہ میں شر اور فساد پیدا ہوتا ہے اور جاسوسی کا خطرہ بھی ہر وقت موجود رہتا ہے۔ ایک وجہ یہ بھی بتائی گئی کہ مقامی عرب فلسطینیوں میں شامل مسلمانوں، یہودیوں اور عیسائیوں کا معاشی اور معاشرتی معیار صیہونیوں کے مقابلے میں خاصا پست ہے، اس لیے یہاں اشتراکیت کے پھیلنے کا بھی خطرہ ہو سکتا ہے۔ مغربی اخبارات جو شروع سے ہی روس اور چین کے حوالے سے جھوٹے سچے پروپیگنڈے میں مصروف عمل ہیں۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ اقوام متحدہ سمیت کسی بھی عالمی ادارے نے اسرائیل میں نسلی امتیاز کے خلاف آج تک ایک لفظ نہیں کہا اور نہ ہی کسی یورپی اخبار نے آج تک اس حوالے سے آواز بلند کی ہو[۹۹]۔

اس حوالے سے یہ بات بھی سمجھنے کی ہے کہ فلسطینیوں کے ساتھ اسرائیل کی دشمنی اصلاً سیاسی ہے نہ کہ دینی۔ مگر فلسطینیوں اور عربوں نے انتقامی جذبے کے تحت دونوں میں فرق نہیں کیا۔ انھوں نے اسرائیل کو اپنا سیاسی دشمن بنانے پر اکتفا کرنے سے بڑھ کر یہ کہنا شروع کر دیا کہ وہ مذہبی اعتبار سے بھی اسلام دشمن ہیں حالاں کہ حقیقتاً فلسطینی خود بھی اپنی حالت بدلنے کی کوئی کوشش نہیں کرتے۔ مسجدِ اقصیٰ کے گرد و پیش جو آبادی ہے وہاں زبان کو مستثنیٰ کر کے بڑی حد تک پرانی نااہلی کا منظر

دکھائی دیتا ہے۔ بھیڑ، گندگی، بدنظمی، شوروغل، بچوں کی اچھل کود، دیواروں پر حکومت کے خلاف احتجاجی نعرے وغیرہ۔ آزادیِ فلسطین کے لیے جو تنظیمیں وہاں سرگرم ہیں ان میں ایک ''حماس'' بھی ہے جس کے بارے میں عام تاثر یہی ہے کہ یہ ایک جذباتی اور انتہاپسند تنظیم ہے۔ اس کے زیر قیادت ۷ دسمبر ۱۹۸۷ء کو ایک مخصوص حادثہ ''المقطورہ'' کے بعد وہ پرشور تحریک وجود میں آئی جو اخبارات میں ''الانتفاضہ'' کے نام سے مشہور ہوئی۔ اس کے تحت فلسطینی نوجوانوں کو اکسایا گیا کہ وہ جہاں کہیں بھی یہودی کو دیکھیں، پتھر مار کر ان کا چہرہ زخمی کر دیں۔ جن لڑکوں نے اس تحریک میں حصہ لیا انھیں طنزیہ طور پر ''اولاد الحجارۃ'' کہا جاتا ہے۔ جدید ترین ہتھیاروں سے مسلح ایک طاقت ور فوج کے مقابلے میں ''پتھر'' اٹھانا بلاشبہ ایک مجنونانہ حرکت ہے۔ مگر اپنے اس طریق کار پر حماس کو اس قدر یقین ہے کہ اس کے بقول عربوں کے تمام ٹینک اور میزائل بھی وہ کارنامہ انجام نہ دے سکے جو ان کے پتھر نے کر دکھایا۔ اس علاقے میں جس طرف سے بھی گزریں اکثر دیواریں حماس کی طرف سے لکھے گئے جذباتی نعروں سے رنگین نظر آئیں گی۔ عرب اخبارات میں بھی عام طور پر یہودیوں کو ازراہِ تحقیر ''اخفاد القردۃ والخنازیر'' یعنی بندروں اور خنزیروں کی اولاد کہا جاتا ہے۔ جب کہ اس طرح کہنا بھی سراسر سرکشی اور جہالت ہے۔ غرض کہ فلسطین کا مسئلہ نصف صدی سے زائد عرصہ گزرنے کے باوجود آج تک حل نہیں ہو سکا۔ آج بھی مسلم دنیا خصوصاً عرب دنیا پر یہ مسئلہ پوری طرح چھایا ہوا ہے۔ اس دور کا عرب لٹریچر فلسطین کی باتوں سے پُر ہے۔ لکھنے اور بولنے والوں نے نہایت جذباتی انداز میں اس پر طبع آزمائی کی ہے[۱۰۰]۔ ایک عرب شاعر الزرکلی نے کہا کہ صلاح الدین کو دوبارہ ہمارے درمیان لاؤ اور ''حطین'' جیسا معرکہ دوبارہ تازہ کرو:

حقات صلاح الدین ثانیۃ فینا   حد دی حطین او شبہ حطینا[۱۰۱]

ایک اور عرب شاعر احمد مطار جو کہ لندن میں مقیم تھے، ان کی نظم کے دو شعر دیکھیے:

القدس لدنیا قمر   فی القدس قد نطق الحجر
لا مؤتمر لا مؤتمر   انا لا رید سوی عمر[۱۰۲]

موجودہ فلسطینی ادب اضطراب اور مزاحمتی جذبات کا آئینہ دار ہے۔ اگر ہم فلسطینی ادب کا جائزہ لیں تو جذبۂ حریت ابتدا ہی سے ان کے مزاج کا حصہ ہے۔ جدید فلسطینی ادب کا آغاز دوسری جنگ عظیم سے ہوتا ہے۔ جب مسئلہ فلسطین ایک رستے ہوئے ناسور کی طرح عالم اسلام کے ضعیف بدن پر نمودار ہوا۔ اس عہد کے اصناف سخن میں زندگی کے مسائل یہودیوں کو زمینوں کی فروخت اور مٹی سے وابستگی کو موضوع بنایا گیا[۱۰۳]۔ ۱۹۶۷ء کی بدترین شکست نے فلسطینی ادب کو نئی جہت عطا کی۔

> اس شکست خوردگی نے ادب کو نئی کروٹ بدلنے پر مجبور کیا اور اہلِ قلم نے اس سانحے کو قلم کی تنقیدی نوک پر رکھنا شروع کیا، جس میں ایک درد اور عاجزی کا ملا جلا احساس موجود تھا جو عرب شاعر اور ادیب کو اندر ہی اندر کھا رہا تھا[۱۰۴]۔

احتجاج کی اس فضا میں فلسطینی شعرا اور ادبا کی اکثریت آزادی کی اس جدوجہد میں حصہ لے رہی تھی۔ معین بسیسو نے جہاں فلسطین کے لیے جان کا نذرانہ پیش کیا وہاں محمود درویش، سمیع القاسم، فوزی اسمر، بلند الحیدری، توفیق زیاد، حنا ابو حنا، غسان کنفانی، بدر شاکر، السیاب اور احمد علی سعید وغیرہ نے اسرائیلی مظالم، قید و بند کی صعوبتوں کو برداشت کرنے اور ملک بدر ہونے کا کرب سہا۔ فلسطینی ادب میں اجتماعی مسائل اور قومی کش مکش کی بازگشت سنائی دینے لگی اور یہ رجحان ۱۹۴۸ء میں اسرائیل کے قیام کے فوراً بعد ہی عالمی منظر نامے پر نمودار ہونا شروع ہو گیا تھا[۵۰]۔ محمود درویش اور سمیع قاسم کے اشعار نے نہ صرف زنداں میں نمایاں پختگی اور وسعت نظری حاصل کی بلکہ ادائیگی کے لحاظ سے بھی اچھوتے فکری اور فنی انداز تخلیق کیے۔ محمود درویش نے احتجاجی بے انصافی کو پہلے مجرد حیثیت سے پیش کیا بعد میں احتجاجی پہلو کو قومی زاویہ نظر سے دیکھا۔ پروفیسر ڈاکٹر اسما رشید نے اس دور کے مزاحمتی ادب کے نمونوں کو اپنے مقالے میں بڑی تفصیل سے پیش کیا ہے[۵۱]۔ جون ۱۹۶۷ء کی شکست کے بعد عربی شاعری پر گہرا اثر ہوا۔ عرب شعرا نے "حزیراں" کے عنوان کے تحت متعدد نظمیں کہیں۔ مثلاً عبدالوہاب البسیانی نے "بکائیۃ الی شمس حزیراں" (آفتاب جون کی نذر ایک نوحہ) نامی نظم میں حزن ملال کی اس کیفیت کو خوب اجاگر کیا۔ "حزیراں" کے المیے کے بعد عرب شعرا کے ہاں دوسرا رویہ جو زیادہ ہمہ گیر ہے وہ خود الزامی اور اپنی ذات کی تحقیر کا رویہ ہے۔ یہ وہ رویہ ہے جو شدید احساسِ کمتری اور بے مائیگی کے نتیجے میں پیدا ہوا[۵۲]۔

عربوں کی امید کا واحد مرکز قوانین کی تنظیمیں "الفتح" اور "العاصنعہ" ہیں۔ جنھوں نے قومی اور وطنی جذبے، صداقت، ایثار اور سرفروشی سے اسرائیل کو یہ باور کرا دیا ہے کہ سرزمین فلسطین میں وہ چین کی نیند کبھی نہیں سو سکیں گے۔ یہ خطہ مسلسل جنگ اور پیکار کی حالت میں رہے گا۔ مشہور شاعر نزاد قبانی کی نظم کا ترجمہ محمد کاظم نے اپنے مضمون میں کیا ہے، اس کے کچھ اشعار ملاحظہ کیجیے:

> تم فتح کے نشے میں چور نہ ہو/ تم نے خالد کو ہلاک کر دیا/ تو عمر لڑنے آئے گا/ تم نے ایک پھول روند ڈالا/ تو اس کی مہک باقی رہے گی/ ایک نیا شہید... مسجدِ اقصیٰ/ ہم اسے بھی اپنے حساب میں شامل کریں گے/ یہ آگ؟... اور یہ شعلے!/ یہ مشعلیں... ہماری راہ کو روشن کریں گی/ اے آلِ اسرائیل ایسا اترانا بھی کیا؟/ گھڑی کی سوئیاں اگر آج رک گئی ہیں/ تو کل یہ پھر چل پڑیں گی/ زمین کے چھن جانے کا غم نہیں ہے/ باز کے پر بھی جھڑ جایا کرتے ہیں/ اور اس طویل تشنگی کا بھی خوف نہیں/ پانی ہمیشہ چٹانوں کی تہہ میں ہوتا ہے/ تم نے فوجوں کو ہرا دیا... لیکن تم نے/ شعور کو ہزیمت نہیں دی/ تم نے درختوں کی

چوٹیاں کاٹ لیں/مگر جڑیں باقی رہ گئیں/جون ۱۹۶۷ء... زمانے کا ایک دن ہی تو ہے

/اور پھولوں میں وہی سب سے حسیں ہوتا ہے/جو آلام کے چمن زار میں کھلتا ہے[۱۰۸]

آج کا فلسطینی ادب جذبۂ حریت سے سرشار نوجوانوں اور حب الوطنی کے قائل انسانوں کی نمائندگی کرتا ہے جس میں وطن فروش رہنماؤں اور آزادی کے تاجروں کی مذمت بھی کی گئی ہے۔ فلسطینی ادبا اور شعرا کی تخلیقات کو ہر دور میں عالمی سطح پر پذیرائی ملتی رہی ہے۔ بہت سے تخلیق کاروں کی نگارشات کے تراجم دنیا کی مختلف زبانوں میں ہوئے ہیں۔ ہندوستانی مسلمانوں پر بھی صیہونی جارحیت نے بہت گہرا اثر ڈالا۔ مقامی ہندوستانی مسلمانوں نے نہ صرف اردو بلکہ عربی میں بھی فلسطین اور صیہونی جارحیت کو موضوع سخن بنایا۔ بے شمار علما اور شعرا نے عربی میں فلسطین کے قضیے کو شاعرانہ اظہار کا موضوع بنایا۔ ہندوستان میں فلسطین کے حوالے سے عربی شاعری کی متعدد مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں لیکن یہاں محض ایک ہی مثال پر اکتفا کروں گا۔ مولانا ظفر احمد عثمانی نے ''جہاد فلسطین'' کے عنوان کے تحت ایک عربی قصیدہ لکھا جو ۱۹۴۸ء کی عرب اسرائیل جنگ کے پس منظر میں تخلیق کیا گیا۔ اس قصیدے میں واضح طور پر عرب نوجوانوں کے جذبات کو نہ صرف ابھارنے کی کوشش کی گئی ہے بلکہ عالمی استعمار خصوصاً اس جنگ میں امریکی پشت پناہی کی جانب بھی واضح اشارے موجود ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

من معشر باء وابلعنة ربهم — فی العالمین مُدنسی الاثوابِ
جاء واوقد صربت علیهم ذلة — من عند ربّی سید الاربابِ
جاءت امیریکا لنصرة معشر — لُعنو الأخر هذه الاحقابِ
جاءت یهود لکی تغالب ربِها — فلیغلنَّ مُغالب الغَلّابِ
یا معشر الاسلام قومو واضربوا — اعداء کم ضربا بغیر حسابِ
یا قومنا قوموا الیهم وانزعوا — بیت المقدس من ید الخلّابِ
طوبیٰ لقوم قدّ موا فتقدّ موا — لنکال کل مکذب مرتابِ
یا معشر العرب الکرام فدیتکم — لا تغلبنکم الیهود بیابِ
انتم جنود اللہ فی یوم الوغیٰ — انتم اُسود فی صریمة غابِ
یا قوم لا تهنوا ولا تخشوهم — وامحوا ظلا مهم بضوء شهابِ
بُعدا و سحقّا للیهود ومن الّیٰ — معهم یرید غنائم الاسلابِ
اللہ ینصرکم علی اعدائکم — ویبید هم حقا بشر عقابِ
هذی فلسطین لنا من غیر ما — ریب عطاء ملیکنا الوهابِ[۱۰۹]

فلسطینی عوام سے یک جہتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اردو شعرا اور ادبا نے نہ صرف مسئلہ فلسطین کو اپنی تخلیقات کا موضوع بنایا بلکہ فلسطین کے شاعروں اور ادیبوں کے خوب صورت تراجم بھی کیے۔ اردو ادیبوں اور شاعروں نے ''ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے'' کے آفاقی تصور کے زیر اثر دنیا کے کسی بھی خطے میں موجود مظلوم مسلمانوں کے ساتھ اظہارِ یک جہتی کے لیے ''جہاد بالقلم'' کا سہارا لیا ہے۔ قلم کے ذریعے مزاحمت کی یہ روایت مسلم معاشرے میں کافی قدیم اور مقبول رہی ہے۔ اردو ادب میں بھی ایسی طبع زاد تحریروں اور تراجم کی متعدد مثالیں موجود ہیں جن میں تحریکِ آزادیٔ فلسطین کے لیے

بالواسطہ یا بلاواسطہ ہمدردی کا پہلو نکلتا ہے۔ ان تحریروں سے اردو ادب میں نئے احساسات، کیفیات اور جہات کی دریافت ممکن ہوئی"[۱۱]۔ یہ سرمایہ شعر و ادب اس بات کا متقاضی ہے کہ ان شعری تخلیقات کو نقد و تحقیق کی کسوٹی پر پرکھا جائے۔ ان ادب پاروں کے محاسن و معائب کا تجزیہ کیا جائے۔ فلسطین جہد آزادی آج بھی جاری و ساری ہے اور ہر دور کا اردو شاعر و ادیب تخلیقی سطح پر اس جدوجہد کا حصہ رہا ہے۔ زاہدہ حنا کے مطابق "ہمارے ادب میں یہ مولانا حسرت موہانی تھے، جنھوں نے اعلان بالفور کے بعد ۱۹۲۹ء میں سب سے پہلے فلسطین کے حق میں آواز اٹھائی تھی" حالانکہ یہ بات درست نہیں بلکہ حسرت سے قبل اکبر الہٰ آبادی کی ۱۹۰۷ء میں شائع ہونے والی نظم "برقِ کلیسا" میں واضح طور پر کہا کہ:

پہلوئے حسنِ بیاں شوخیِ تقریر میں غرق　　　　ترکی و مصر و فلسطین کے حالات میں غرق[۱۱]

اس کے علاوہ براہ راست صیہونی پس منظر سے قطع نظر انیسویں صدی کے شعرا کے ہاں بھی بیت المقدس کو موضوع سخن بنایا گیا ہے۔ میر انیس کا مصرع کہ:

اے بیتِ مقدس، تیری عزت کے دن آئے[۱۲]

اس بات کا ثبوت ہے کہ اردو کے کلاسیکی شعرا بھی قبلہِ اوّل کی حرمت و تکریم کے بیان میں اشعار کہتے رہے ہیں۔

حالی کی "مسدس مد و جزر اسلام" کی اشاعت ۱۸۷۹ء نے تو اردو میں قومی شعور کو بیدار کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ حالی کا تعلق جس بحرانی دور سے تھا، اس دور میں اس قسم کی نظموں نے بکھری ہوئی ملت کے شیرازے کو پھر سے یکجا کرنے کی کوشش کی۔ مسدس میں شیرازۂ ملت کے اجزائے پریشاں کے انفرادی انحطاط و انتشار کی تفصیل یا خارجی طاقتوں کی سازشوں اور آویزشوں کا ذکر نہیں کیا گیا، لیکن حالی نے زوال کے داخلی اسباب کا تجزیہ خوبی سے کیا ہے۔ مسدس ہماری قومی زندگی اور قومی شاعری کا سرچشمہ ہے"[۱۳]۔ انھوں نے براہ راست فلسطین کے مسئلے کو اس نظم میں پیش نہیں کیا لیکن عربوں کی آپس کی لڑائی اور کمزوریوں کا ذکر جابجا دکھائی دیتا ہے۔ عربوں کی آپس کی چپقلش اور نااتفاقی نے انھیں جس حال تک پہنچایا، اس کی انتہا اور نتیجہ فلسطین پر صیہونی قبضے کی صورت میں نکلا۔ اس چپقلش کی طرف اشارہ کرتے ہوئے شاعر کہتے ہیں کہ:

خصومت سے ہیں اپنی گو خواریاں سب　　　　نزاعوں سے باہم کے ہیں ناتواں سب
خود آپس کی چوٹوں سے ہیں خستہ جاں سب　　　　یہ ہیں متفق اس پہ پیر و جواں سب
کہ نا اتفاقی نے کھویا ہے ہم کو　　　　اسی جز و مد نے ڈبویا ہے ہم کو[۱۴]

عالمی سطح پر مسلمانوں کی جو حالت تھی اس نے حالی کو ہمیشہ اضطراب میں رکھا۔ وہ اسلام کے شاندار ماضی سے بھی واقف تھے اور اس کی اثر پذیری کے قائل بھی۔ لیکن اس دور میں جس طرح عالم اسلام تتر بتر تھا، اس نے پوری دنیا کے سامنے انھیں رسوا کر رکھا تھا۔ اسی لیے حالی یہ کہنے پر مجبور ہوئے کہ:

جس دین کے مدعو تھے کبھی سیزر و کسریٰ | خود آج وہ مہمانِ سرائے فقرا ہے
عشرت کدے آباد تھے جس قوم کے ہر سو | اس قوم کا ایک ایک گھر اب بزم عزا ہے[۱۱۵]

حسرت نے بھی واضح انداز سے عالم اسلام کے خلاف اغیار کی سازش کا ذکر کرتے ہوئے صلح اور نرمی کے رویے کو ترک کرنے کی تلقین کی۔ ان کا کہنا تھا کہ عالم اسلام جس نہج پر آج کھڑی ہے، اس کا تقاضا یہی ہے کہ ہم بھی مغرب کی سازشوں سے بیزاری کا اظہار کھل کر کریں۔ اپنی ایک غزل میں حسرت اس جانب اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

غضب ہے کہ پابند اغیار ہو کر | مسلمان رہ جائیں یوں خوار ہو کر
اٹھے ہیں جفا پیشگانِ مہذب | ہمارے مٹانے کو تیار ہو کر
تقاضائے غیرت یہی ہے عزیزو | کہ ہم بھی رہیں ان سے بیزار ہو کر
کہیں صلح نرمی سے رہ جائے دیکھو | نہ یہ عقدہِ جنگ دشوار ہو کر[۱۱۶]

مغرب نے جس طرح سے مشرق کو اپنے شکنجے میں جکڑ رکھا تھا، جس طرح کی پابندیاں اور جانب دارانہ رویہ اہل مغرب نے روا رکھے ہوئے تھے۔ حسرت نے ان رویوں پر سخت تنقید بھی کی اور اس سازش سے پردہ بھی اٹھایا۔ ان کا کہنا تھا کہ:

اچھا ہے اہلِ جور کیے جائیں سختیاں | پھیلے گی یوں ہی شورشِ حبِّ وطن تمام
سمجھے ہیں اہلِ شرق کو شاید قریب مرگ | مغرب کے یوں ہیں جمع یہ زاغ و زغن تمام[۱۱۷]

محمد دین فوق نے بھی اپنے عہد کے اہم واقعات کو شاعری کا موضوع بنایا۔ انھوں نے حالی اور ظفر علی خان کے نقش قدم پر چلتے ہوئے اہم سیاسی اور معاشرتی واقعات سے متعلق ہنگامی موضوعات پر نظمیں لکھیں۔ ان کی نظم ''اتحادِ ثلاثہ اور دنیائے اسلام'' اس حوالے سے اہمیت کی حامل ہے جس میں وہ کہتے ہیں کہ:

چھائی ہیں کالی گھٹائیں عالمِ اسلام پر | اس میں ایراں ہو، مراکو ہو کہ ترکستان ہو
نوچ کھایا حرصِ یورپ نے ہمارے جسم کو | کیوں نہ وقفِ کاہش و اندوہ دل اور جان ہو[۱۱۸]

سامراجی قوتوں نے جب ارضِ مقدس اور قبلہِ اوّل کو مسلمانوں کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے یہود کے پنجۂ صیہونیت کے ہاتھوں برباد کرنے کی سازش کی اور پھر اس پر غارت گری کہ اس کو تاراج کرنا شروع کیا تو اسی روز ہی نہ مسلمان مجاہدین کو چین آیا اور نہ ہی مسلمان دانش ور اپنے احساسات کے اظہار سے باز آئے ہیں۔ مسلمان مجاہد اپنی جان ہتھیلیوں پر رکھے بے سروسامانی کے باوجود غلیلوں سے لڑتے رہے۔ ساتھ ساتھ قلم کے دھنی بھی کسی ملامت اور سزا کی پرواہ کیے بغیر اپنے محاذ پر ڈٹے رہے[۱۱۹]۔ مولانا ظفر علی خان نے بھی تمام تر مصلحتوں کو بالائے طاق رکھ کر انگریزوں کی اس سازشوں پر کڑی تنقید کی۔ انگریزوں سے نفرت کا جذبہ ان کے خون میں رچ بس گیا تھا۔ ان کی سیاسی شاعری اسلام کے عروج کی تمنا، بقائے احترام کعبہ اور

احترامِ سرزمین کعبہ، کفر کی آندھیوں اور عالمی سیاسی جھگڑوں کا مقابلہ کرنے کی داستان ہے[120]۔ ۱۹۳۶ء میں لکھی گئی ایک نعت میں وہ سرزمین عرب کے معاملے میں عالمی بے حسی پر نہ صرف دل گرفتہ دکھائی دیتے ہیں بلکہ واضح انداز سے یہ کہتے دکھائی دیتے ہیں کہ:

یہود و نصاریٰ کو رہنے نہ دیں گے عرب میں کبھی جاں نثارانِ احمدؐ
نکالیں گے گن گن کے ان کو یہاں سے کہ پہنچا ہے ہم کو یہ فرمانِ احمدؐ[121]

فلسطین کے مسئلے پر براہ راست انھوں نے جو کچھ کہا وہ اس دور کے خونی مناظر کا نہ صرف بھرپور عکس ہے بلکہ عالمی حالات سے ظفر علی خاں کی واقفیت اور ملت اسلامیہ سے اظہار یک جہتی کا ظہار بھی ہے۔ ۱۹۳۶ء میں لکھی گئی نظم کا یہ شعر ملاحظہ کیجیے:

خونِ اسلام سے گل رنگ ہوا حوضۂ قدس خبر اڑتی ہوئی آئی یہ فلسطین سے ہے[122]

ایک اور نظم میں وہ فلسطین کے حالات اور مغربی سازشوں کے باوجود اس امید کا اظہار کرتے دکھائی دیتے ہیں کہ:

فلسطین آزاد ہوگا ضرور نہیں بند دروازہ امید کا[123]

وہ مختلف محافل میں جب بھی نظمیں پیش کرتے ان نظموں میں فلسطین میں ہونے والے مظالم کا ذکر ضرور کرتے۔ فلسطین میں ہونے والی قتل و غارت گری اور عربوں کی مزاحمت کو اپنی مشہور نظم ''تمائیں'' میں کچھ اس انداز سے پیش کرتے ہیں:

فلسطیں کے مظالم کا ہوا ذکر ندائیں ساری محفل سے یہ آئیں
یہودی کے لہو کی ندیوں میں مسلمانوں کی تلواریں نہائیں
یتیمانِ عرب کا جب سنا حال تو آنکھیں آنسوؤں سے ڈبڈبائیں
خدا کی رحمت ان پر راہِ حق میں جنھوں نے گردنیں اپنی کٹائیں
شہیدانِ عرب کے خوں کی بوندیں فلسطیں کی فضا میں رنگ لائیں
پھر اٹھے ہیں وہی غازی جنھوں نے مسیحیت کی بنیادیں ہلائیں
کوئی دن میں نصاریٰ دیکھ لیں گے کہ ہم نے گردنیں ان کی جھکائیں[124]

وہ اتحاد بین المسلمین اور ملت واحدہ کے تصور کو اجاگر کرتے ہوئے مسلمانوں کو مسئلہ فلسطین کے معاملے میں سر سے کفن باندھ کر اٹھ کھڑے ہونے کا مشورہ دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

گر ان سارے کاموں سے فرصت ملے　　　کفن سر سے باندھ اور فلسطین چل
لگا ہے فلسطین میں چل چلاؤ　　　چلا ہے تو بن کر قرابین چل[۱۲۵]

اپنی ایک نظم ''تثلیث کے نئے اقانیم'' میں وہ برطانوی اور امریکی سازشوں سے پردہ اٹھاتے ہوئے بڑے واضح انداز سے اس جانب توجہ دلا رہے ہیں کہ:

اللہ ان آفاتِ ثلاثہ سے بچائے　　　جکڑا ہوا تینوں کی پکڑ میں ہے فلسطین[۱۲۶]

وہ امتِ مسلمہ کو جہد مسلسل اور عمل پیہم کا درس دیتے ہوئے مغرب کی کاسہ لیسی ترک کرنے کا مشورہ دے رہے ہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ:

ضرور کیا کہ اٹھاؤ مسیح کا احساں　　　تم اپنے درد کے جب آپ ہی مداوا ہو
ملائکہ کی قطاریں کمک کو آ پہنچیں　　　اگر یہود پہ بطحائیوں کو دھاوا ہو
چڑھاؤ جا کے فلسطین کے مزاروں پر　　　ہمارے خوں کا بھی منظور اگر چڑھاوا ہو[۱۲۷]

انھیں برطانوی اور مغربی استعمار سے انصاف کی توقع نہیں تھی۔ اعلان بالفور کے بعد جس طرح سے مسلمانوں کا استیصال ہو رہا تھا اور یہودیوں کی کھلم کھلا حمایت کا سلسلہ جاری تھا، اس منظر نامے کو بیان کرتے ہوئے انھوں نے مغرب کو کفن چور کی حیثیت سے مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ:

مشرق میں غریبوں کی نہیں کوئی رہی گور　　　سر پکڑے ہوئے بیٹھے ہیں مغرب کے کفن چور
لکھتا ہوں فلسطیں کے شہیدوں کی کہانی　　　آلودہ لہو سے ہیں مری انگلیوں کے پور
یہ خوں ہے وہی جس کی جھلکتی ہوئی سرخی　　　ہے مایہ رنگینیِ افسانۂ بالفور
ملتا ہے کسی کو نہ یہ زاری سے نہ زر سے　　　انصاف ملے گا اسے حاصل ہو جسے زور[۱۲۸]

یہودی و نصاریٰ نے اتحاد کر کے جس طرح سے فلسطینی مسلمانوں کو زیر نگیں کیا تھا، اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے شاعر کا کہنا تھا کہ:

دنیا کے سب یہود ہیں انگریز کے حلیف　　　دونوں کے ساتھ جنگ مسلمان کی ٹھنی
تہذیبِ نو کی جلوہ گری سے خدا بچائے　　　پھیلی ہوئی ہے جس کی فلسطیں میں روشنی[۱۲۹]

وہ سوالیہ انداز سے برطانوی استعمار کو ہدفِ تنقید بناتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

فلسطیں میں مٹا کر ہم کو آخر تم نے کیا پایا　　　اسی باعث تو قتلِ عاشقاں سے منع کرتے تھے[۱۳۰]

اسرائیلی اور مغربی گٹھ جوڑ اور مسیحیوں کی تائید و حمایت کی جانب بھی انھوں نے واضح اشارے کیے ہیں۔ ایک نظم میں وہ کہتے ہیں کہ:

چھینے ہیں یہودی نے مسیحی کی مدد سے دولت کے لگا رکھے تھے اسلام نے جو ڈھیر
کب ہوگی نمودار خدایا سحر اس کی جس رات نے ڈالا ہے فلسطیں میں اندھیر[۱۳۱]

وہ عربوں کی بیداری اور صیہونی جارحیت کے خلاف مزاحمت پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے نوجوانوں سے کہتے ہیں کہ:

عبرانیوں کو ایک رگڑ میں رگید ڈال نصرانیوں کو ایک پکڑ میں پچھاڑ دے[۱۳۲]

وہ فلسطین کے معاملے کو برطانوی استعمار کے خلاف حتمی مزاحمت تصور کرتے تھے اور دوسری عالمی جنگ کے بعد ہوا بھی یہی کہ برطانیہ جو کہ عالمی طاقت کے طور پر دنیا پر حکم چلاتا تھا، ایک کمزور ملک کی طرح اس کا شیرازہ بکھر گیا۔ ان کا کہنا تھا کہ:

جسے خاکِ فلسطیں نے اٹھایا وہ فتنہ بننے والا ہے قیامت[۱۳۳]

برطانوی حکمت عملی کے نتیجے میں صیہونی مداخلت اور امریکا سمیت دیگر عالمی طاقتوں کی صیہونی حمایت نے پوری دنیا کے مسلمانوں کو دل گرفتہ کر رکھا تھا۔ بے شک اس وقت مسلمان اس قابل نہیں تھے کہ ان سازشوں کا مقابلہ کر سکیں لیکن پھر بھی نامساعد حالات کے باوجود اسرائیلیوں کا اپنے مقاصد کا حصول اتنا آسان نہ تھا۔ عربوں نے سخت مزاحمت کی اور جس حد تک ممکن ہو سکا اپنی آزادی کو برقرار رکھنے کے جتن جاری رکھے۔ اس جانب اشارہ کرتے ہوئے مولانا ظفر علی خان نے اپنی نظم ''برطانیہ کی فلسطینی حکمت عملی'' میں کہا کہ:

کفن باندھے ہوئے صحرا سے نکلے فلسطیں کے شہادت پیشہ غازی
لگا رکھی ہے آزادی کی خاطر انھوں نے ہر طرف سر دھڑ کی بازی
برستی گولیوں میں سر بسجدہ کبھی دیکھے ہیں ایسے بھی نمازی
رسن سازانِ مغرب سے یہ کہہ دو کہ گزری حد سے رسی کی درازی
کہاں تک قدس کی تخریب کا شوق کہاں تک یہ پرانی خاک بازی
حمایت تابہ کے صیہونیوں کی کہاں تک یہ یہودیت نوازی[۱۳۴]

فلسطین کی تقسیم کی جو تجویز اس زمانے میں پیش کی جا رہی تھی، ظفر علی خاں نے کھل کر اس کی مخالفت کی۔ ۱۹۳۷ء میں جب کہ عالمی سطح پر اس مسئلے کی سنگینی کو پوری طرح سمجھا بھی نہیں جا رہا تھا، ان کی دور اندیشی نے محسوس کر لیا کہ اس مسئلے کا واحد حل تلوار ہے۔ اپنی نظم ''تجویز تقسیم فلسطین بنوکِ سنگین'' میں وہ کہتے ہیں کہ:

لندن کے کمیشن کی سفارش سے پریشاں | سب شیخ فلسطین ہیں اور شابِ فلسطین
ساماں ہیں نئی جنگِ صلیبی کے نمودار | خنجر بکف اٹھنے کو ہیں اعرابِ فلسطین
زینت جسے دی سرخیِ خونِ شہدا نے | اسلام کے قصّے میں وہ ہے بابِ فلسطین
کھیتے ہیں جسے مل کے یہود اور نصاریٰ | ہے تاک میں اس ناؤ کی گرداب فلسطین
وہ جنگ پلٹ دے گی جو کایا عربوں کی | لکھیں گے اسے غزوۂ احزاب فلسطین
ہیں آج کہاں مسجدِ اقصیٰ کے محافظ | دیتے ہیں ندا منبر و محرابِ فلسطین[۱۳۵]

قبلہ اوّل کی حفاظت کو فرضِ اوّلین سمجھتے ہوئے پوری دنیا کے مسلمانوں کو وہ اس تقسیم کی تجویز کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے کا مشورہ دیتے دکھائی دیتے ہیں۔ ۱۹۳۷ء میں لکھی گئی ایک نظم میں وہ کہتے ہیں کہ:

مسلمانوں کا پہلا قبلہ واقع ہے فلسطیں میں | اور ان کا فرض ہے تطہیر اور تقدیس اس گھر کی
جناب حضرتِ فاروق اعظمؓ کے تجمّل نے | بڑھائیں رونقیں جب مسجدِ اقصیٰ کے منبر کی
تو فرمایا کہ اب اس میں یہودی رہ نہیں سکتے | فلسطیں میں نہیں گنجائش ان کے فتنہ و شر کی
فلسطیں پہلے دن سے گھر ہے فرزندانِ بطحا کا | نکلنا ان کا اس کشور سے صف بچھتی ہے محشر کی[۱۳۶]

جس طریقے سے فلسطینیوں پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑے جارہے تھے، ان سے اراضی چھینی جارہی تھی اور انھیں تیسرے درجے کا شہری بنایا جارہا تھا، اس جانب اشارہ کرتے ہوئے ان کا کہنا تھا کہ:

ستم گروں کی ستم گری پر فضا فلسطیں میں ہنس رہی ہو | تنور مغرب بھڑک رہا ہو نظر ہو شعلوں کی پرنیاں پر[۱۳۷]

امریکا، روس، برطانیہ اور فرانس نے عرب دنیا کو تتر بتر کرنے کی جو کامیاب منصوبہ بندی کی تھی، اس نے عالمی سطح پر نئے نئے محاذ کو جنم دیا۔ ان بین الاقوامی الجھنوں کو پیش کرتے ہوئے وہ طنزیہ انداز میں کہتے ہیں کہ:

روس زخمی ہے تو المانیہ ہے بے پر و بال | رہا اٹلی سو ہے بیچارے کی اکھڑی ہوئی سانس
پڑ نہیں سکتی بھتیجے پر چچا سام کی زد | جس سے اندیشۂ ایذا ہے وہ طاقت ہے فرانس
شیر برطانیہ، ان سب کو کچل سکتا ہے | نہ جگر میں ہو جو اٹکی ہوئی اسلام کی پھانس
پھرتے ہیں اہلِ فلسطیں بھی باندھے ہوئے لٹھ | اور بریلی سے چلے جارہے ہیں بانس پہ بانس[۱۳۸]

تثلیث نے جس طریقے سے مسلم دنیا کو پریشان کر رکھا تھا، ظفر علی خان اس صورتِ حال میں ناامید ہونے کے بجائے امید کا دیا روشن کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ وہ عرب مسلمانوں کی بیداری کو مغربی استعمار کے خاتمے کا پیش خیمہ سمجھتے ہوئے اعلان کرتے ہیں کہ:

تثلیث کو یہ جا کے سنا دو کہ آج سے   تگنی کا ناچ ہم کو نچایا نہ جائے گا[۱۳۹]

ظاہر سی بات ہے کہ بیسویں صدی کے ابتدائی عشروں میں جس طرح اسرائیلیوں کو فلسطین میں بسایا جا رہا تھا اور سر زمین فلسطین کے مسلمانوں کو اقلیت میں تبدیل کرنے کی جن سازشوں کا آغاز ہوا تھا، ظفر علی خان نہ صرف ان سے واقف تھے بلکہ اپنے ادراک کا استعمال کرتے ہوئے مسلمانانِ عالم کی توجہ اس جانب مبذول کرانے کی کوشش بھی کر رہے تھے۔ اپنی نظم ''تطہیر یثرب'' کے آخری شعر میں انھوں نے واضح طور پر کہا کہ:

جدّہ سے رہگر اے فلسطین ہی تو ہو   جو بن رہا ہے جائے پناہِ یہود آج[۱۴۰]

اقبال کو ذاتی طور پر مسئلہ فلسطین اور عربوں کے مستقبل سے نہایت گہری دلچسپی تھی۔ ان کے ذاتی خطوط خصوصاً مس فار قوہرسن کے نام لکھے گئے رقعات میں مسئلہ فلسطین کے بارے میں ان کے دلی اضطراب کا پتا چلتا ہے[۱۴۱]۔ قائداعظم محمد علی جناح کو ایک خط میں لکھتے ہیں کہ:

> مسئلہ فلسطین نے مسلمانوں کو مضطرب کر رکھا ہے (مسلم لیگ کی بدولت) شاید فلسطین کے عربوں کو کچھ فائدہ پہنچ جائے۔ ذاتی طور پر میں کسی ایسے امر کے لیے جس کا اثر ہندوستان اور اسلام دونوں پر پڑتا ہو، جیل جانے کے لیے تیار ہوں، ایشیا کے دروازے پر ایک مغربی چھاؤنی کا مسلط کیا جانا اسلام اور ہندوستان دونوں کے لیے پُر خطر ہے[۱۴۲]۔

مس فار قوسن کو ایک خط میں لکھتے ہیں کہ:

> فلسطین پر یہودیوں کا بھی کوئی حق نہیں۔ یہودیوں نے تو اس ملک کو رضامندانہ طور پر عربوں کے فلسطین پر قبضے سے بہت پہلے خیرباد کہہ دیا تھا[۱۴۳]۔

ہندوستان میں جتنی بھی کانفرنسیں فلسطین کے حوالے سے منعقد کی گئیں، سب کی سب اقبال کے مشورے سے منعقد ہوئیں۔ انھوں نے فلسطین رپورٹ کے خلاف مسلمانانِ لاہور کی منعقدہ کانفرس کے موقعے پر دیے گئے بیان میں کہا کہ عربوں کے ساتھ جو ناانصافی برتی گئی ہے، مجھے اس کا ایسے ہی شدید احساس ہے جیسا مشرق قریب کی صورتِ حال سے واقف کسی بھی شخص کو ہو سکتا ہے۔ یہ مسئلہ مسلمانانِ عالم کو ایک موقعہ بہم پہنچاتا ہے کہ وہ پوری قوت سے اس امر کا اعلان کریں کہ وہ مسئلہ جس کا حل برطانوی سیاست دان تلاش کر رہے ہیں محض قضیۂ فلسطین ہی نہیں بلکہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس کا شدید اثر تمام دنیاے اسلام پر ہو گا۔ مسئلہ فلسطین کو اگر تاریخی پس منظر میں دیکھا جائے تو یہ خالص اسلامی مسئلہ ہے۔ بنی اسرائیل کی تاریخ کی روشنی

میں دیکھا جائے تو فلسطین میں مسئلہ یہود تو ۱۳ صدی قبل حضرت عمرؓ کے یروشلم میں داخلے سے قبل ہی ختم ہو چکا تھا۔ فلسطین سے یہودیوں کا جبری اخراج کبھی بھی عمل میں نہیں آیا۔ بلکہ پروفیسر ہاکنگ کے بقول یہود اپنی مرضی اور ارادے سے اس ملک سے باہر پھیل گئے اور ان کے مقدس صحائف کا غالب حصہ فلسطین سے باہر مرتب و مدوّن ہوا۔ پہلی جنگ عظیم کے افسوس ناک انجام نے ملت اسلامیہ کا شیرازہ بکھیر کے رکھ دیا۔ اتحادیوں نے سیاسی بندر بانٹ اور تقسیم کا پرانا حربہ خوب استعمال کیا۔ چناں چہ ترکی کا مشرقی حصہ روس کے ہاتھ لگا اور مغرب کے یورپی صوبے بلقان، ہنگری اور بلغاریا وغیرہ مکمل طور پر خود مختار ہو گئے۔ ایران و شام فرانس کے ہاتھ لگا اور مصر و عراق پر برطانیہ نے قبضہ جما لیا۔ اس طرح عالم اسلام کے حصے بخرے ہو گئے۔ فلسطین کا مسئلہ ذرا بین الاقوامی نوعیت کا تھا، اسی لیے اسے تہذیب و ترقی کی راہ پر گام زن کرنے کے لیے برطانیہ کے زیر انتداب رکھا گیا۔ اقبال اس صورتِ حال پر نہ صرف روشنی ڈالتے ہیں بلکہ ان عالمی طاقتوں کی من مانی کارروائیوں اور یورپ کی سیاسی چال کو سامنے لانے کی ہر ممکن کوشش کرتے نظر آتے ہیں کہ کس طرح یورپ پہلے کمزور ممالک کو ظلم کا نشانہ بناتا ہے اور پھر اس کے غم میں مگرمچھ کے آنسو بہا کر ہمدردی کا اظہار کرتا ہے[۱۴۴]۔ اپنے فارسی کلام میں انھوں نے ان سازشوں کا بہت زیادہ ذکر کیا ہے۔ جیسے:

آفریں بر دلِ نرم تو کہ از بہرِ ثواب　　کشتۂ غمزۂ خود را بہ نماز آمدۂ[۱۴۵]

مجلس اقوام League of Nations کے کردار کے حوالے سے بھی اقبال کچھ زیادہ پُر امید دکھائی نہیں دیتے۔ اس ادارے کے پاس خود نہ تو وہ قوت تھی کہ وہ انصاف کی بالادستی قائم کر سکے اور نہ ہی مظلوم اقوام کو ان سے انصاف کی توقع تھی۔ اس جانب اشارہ کرتے ہوئے اقبال نے کہا کہ:

من ازیں بیش ندانم کہ کفن دزدے چند　　بہرِ تقسیم قبور انجمنے ساختہ اند[۱۴۶]

یورپ اس حکمت عملی کو تہذیب اور اصلاح، انتداب اور نگرانی گردانتا رہا لیکن تمام حکمت عملی فلسطینیوں کے استیصال کے سوا اور کچھ نہ تھی۔ یورپ کی ارضِ فلسطین کی بابت پالیسی خصوصاً اس کے حصے بخرے کرنے، ارضِ فلسطین کو پنجۂ یہود میں دینے کی سازش کو[۱۴۷] اقبال نے اپنی نظم ''دامِ تہذیب'' میں کچھ اس طرح بیان کیا ہے:

اقبال کو شک اس کی شرافت میں نہیں ہے　　ہر ملتِ مظلوم کا یورپ ہے خریدار
جلتا ہے مگر شام و فلسطیں پہ مرا دل　　تدبیر سے کھلتا نہیں یہ عقدۂ دشوار
ترکانِ جفا پیشہ کے پنجے سے نکل کر　　بے چارے ہیں تہذیب کے پھندے میں گرفتار[۱۴۸]

فلسطین چوں کہ عالم اسلام کا جغرافیائی، مذہبی اور تہذیبی حصہ تھا، لہٰذا عالم اسلام کا دل اس مسئلے پر مضطرب بھی تھا۔ دوسری جانب اسرائیلی جارحیت اور اس کے قیام کو جائز قرار دینے کے لیے برطانوی حکام نے آثار قدیمہ کی دریافتوں کو جذباتی سطح پر اپنے سیاسی مقاصد کے حصول کا ذریعہ بنایا[۱۴۹]۔ اس خطے کے یہودی حقِ ملکیت ثابت کرنے کے لیے اس سرزمین سے

یہودیوں کے قدیم اور جذباتی تعلق کا ذکر بارہا کیا گیا۔ ۱۹۴۸ء میں جب اسرائیل کا قیام عمل میں آیا تو اس وقت اقبال کی وفات کو دس برس گزر چکے تھے، لیکن اس سازش کے تمام خدوخال ظاہر سی بات ہے اقبال کے سامنے ترتیب پائے۔ وہ اس خطے میں عالمی طاقتوں کی ریشہ دوانیوں سے پوری طرح آگاہ تھے[۱۵۰]۔ ان کے خیال میں فلسطین میں جو کچھ ہو رہا تھا اس کے ذمے دار مسلمان خود بھی تھے۔ ان کے اندر اب وہ دم خم باقی نہیں رہا تھا جس سے جارح دشمن کو منھ توڑ جواب دے سکتے۔ اس جانب اشارہ کرتے ہوئے مسلمانوں کی بے عملی کی بابت ان کا کہنا تھا کہ:

مسلمانوں میں خوں باقی نہیں ہے　　محبت کا جنوں باقی نہیں ہے
صفیں کج، دل پریشاں، سجدہ بے ذوق　　کہ جذبِ اندروں باقی نہیں ہے[۱۵۱]

اقبال اس محاذ کے مجاہد اوّل تھے۔ وہ آزادیِ فلسطین کے محاذ پر عربوں سے بھی پہلے پہنچے۔ انھوں نے اس جنگ کو اپنی قومی آزادی کی جنگ کا اٹوٹ حصہ سمجھا اور اس کی تہ در تہ معنویت کو آشکار کیا۔ ان کے نزدیک فلسطین کی آزادی اتنی اہمیت رکھتی تھی کہ دسمبر ۱۹۳۱ء میں وہ عالمِ اسلام کے نمائندوں کی کانفرنس میں شرکت کی خاطر لندن میں ہندی مسلمانوں کی آزادی کے مذاکرات کو ادھورا چھوڑ کر بیت المقدس جا پہنچے تھے۔ انھوں نے اقوامِ مشرق کو مغرب کے نوآبادیاتی سامراجی عزائم سے خبردار کیا۔ زندگی کے آخری چند برسوں تک تو وہ تقسیم فلسطین کے تصور سے سخت بے چین رہے لہٰذا اسی زمانے میں انھوں نے فکری اور عملی پیش بندیاں شروع کر دی تھیں۔ جب برطانیہ اس مسئلے کو ایجاد کر کے سازشوں میں مصروف تھا۔ اقبال کے خیال میں یہ مسئلہ یہودیوں کے لیے وطن کی تلاش کی خاطر ایجاد نہیں کیا گیا بلکہ درحقیقت یہ مشرق کے دروازے پر مغربی سامراج کے فوجی اڈے کی تعمیر کا شاخسانہ ہے۔ وہ اسے عالمِ اسلام کے قلب میں ناسور سے تعبیر کرتے ہیں۔ رائل کمیشن کی رپورٹ میں تقسیم کی تجویز نے اقبال کو اس قدر مضطرب کیا کہ اس رپورٹ کے شائع ہوتے ہی انھوں نے لاہور کے موچی دروازے میں ایک اجتماعی جلسہ عام کا اہتمام کیا۔ اس اجتماع میں اقبال کا بیان پڑھا گیا بیان سیاسی بصیرت اور پیش بینی کا اظہار ہونے کے ساتھ ساتھ اسلام کی جدید سیاسی فکر میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اقبال کا یہ بیان تحریکِ آزادیِ فلسطین کو عرب بادشاہوں کی مسند اقتدار سے متصادم دیکھتا ہے[۱۵۲]۔ ان کے مطابق:

طہران ہو اگر عالمِ مشرق کا جنیوا　　شاید کرہِ ارض کی تقدیر سنور جائے[۱۵۳]

اقبال نے عرب عوام کو عرب بادشاہوں سے بیزاری کا درس صرف اپنی سیاسی تحریروں ہی میں نہیں بلکہ جمالِ فن سے بھی دیا ہے۔ خود عرب بادشاہوں کے پیش نظر یہ بات ضرور رہی ہو گی کہ برطانیہ نے جنگ کے بعد مصر، عراق اور اُردن پر قبضہ کر لیا ہے۔ اور فرانس نے لبنان اور شام پر۔ شریف حسین اور ان کے صاحب زادے امیر فیصل اور امیر عبداللہ کے سپرد حجاز، عراق اور اُردن کی بادشاہتیں ہوئیں۔ ان ممالک کو داخلی امور میں محدود پیمانے پر آزادی حاصل تھی لیکن بقیہ امورِ سلطنت

برطانیہ کے سپرد تھے۔ شریف حسین کو بعد ازاں آلِ سعود نے حجاز سے نکال باہر کیا۔ انتداب کے بعد فلسطین کو ایک جداگانہ اور علاحدہ مملکت کو تسلیم کیا گیا لیکن انتداب کی جو وجوہات بتائی گئیں اقبال نے ان پر سخت تنقید کی[۱۵۴]۔ ضرب کلیم میں اسی عنوان کے تحت لکھی گئی نظم میں وہ کہتے ہیں کہ:

جہاں قمار نہیں زن تنگِ لباس نہیں — جہاں حرام بتاتے ہیں شغلِ مے خواری

نظر و رانِ فرنگی کا ہے یہی فتویٰ — وہ سر زمین مدنیت سے ہے ابھی عاری[۱۵۵]

اتحادیوں نے اپنی ہوس ملک گیری کو قانونی حیثیت دینے کی کوشش کی۔ اقبال کے خیال میں فلسطین اور فلسطینی عوام کے حقوق غصب کرنے میں برطانیہ کے ساتھ ساتھ مجلس اقوام عالم اور عرب ملوکیت بھی برابر کی شریک ہیں[۱۵۶]۔ ایک جگہ اس کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

یہی شیخ حرم ہے جو چرا کر بیچ کھاتا ہے — گلیم بو ذرؓ و دلقِ اویس و چادر زہراؓ[۱۵۷]

ایک اور شعر میں کہا کہ:

مکے نے دیا خاکِ جنیوا کو یہ پیغام — جمعیتِ اقوام کہ جمعیتِ آدم؟[۱۵۸]

اس انتداب کو امیر فیصل نے بدرجہِ مجبوری قبول کیا اور ڈاکٹر ویزمن کے ساتھ معاہدے پر دستخط کرتے ہوئے یہ شرط رکھی کہ جلد عربوں کو مکمل خود مختاری دے دی جائے گی۔ اعلان بالفور کو بھی اس شرط پر منظور کیا گیا کہ سالانہ تین ہزار سے زیادہ یہودیوں سے زیادہ باشندوں کو فلسطین میں آباد نہ ہونے دیا جائے، لیکن معاملہ بالکل الٹ ہوا۔ یہودی دولت کے بل بوتے پر صدیوں سے آباد عربوں کی اراضی پر قابض ہو گئے اور خود عرب ہی اس معاشرے میں اجنبی ہوتے گئے اور مہاجر کی زندگی اختیار کرنے پر مجبور ہو گئے۔ برطانیہ نے دیگر عرب ممالک کو تو آزادی دے دی لیکن فلسطین میں انتداب کو غیر معینہ مدت کے لیے قائم رکھا۔ اس صورت میں عربوں اور یہودیوں کے درمیان فسادات کے شعلے بھی بھڑکائے۔ ۱۹۲۱ء میں پہلا فساد بھی ہوا اور پھر ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہوا[۱۵۹]۔ اقبال مغربی سیاست پر یہودیوں کے بڑھتے ہوئے اثر ورسوخ کو اچھی طرح سمجھ چکے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ وہ وقت دور نہیں کہ یورپ مکمل طور پر ان یہودیوں کے دامِ فریب کا شکار ہو جائے گا۔ اس جانب اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

تاک میں مدت سے بیٹھے ہیں یہودی سود خور — جن کی روباہی کے آگے ہیچ ہے زور پلنگ

خود بہ خود گرنے کو ہے پکے ہوئے پھل کی طرح — دیکھیے پڑتا ہے آخر کس کی جھولی میں فرنگ[۱۶۰]

اپنی ایک اور نظم ''یورپ اور یہود'' میں بھی وہ یہودیوں کی ان چال بازیوں کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

ہے نزع کی حالت میں یہ تہذیبِ جواں مرگ — شاید ہوں کلیسا کے یہودی متولّی![۱۶۱]

۵ جون ۱۹۶۷ء کی عرب اسرائیل جنگ کے بعد جب مسلمانوں کے بڑے حصے پر صیہونی قبضہ ہوا تو یہودیوں اور بعض یہودی نواز طبقے کی جانب سے یہ تاویل سننے میں آئی کہ یہودیوں کو عربوں نے ان کے وطن سے نکالا تھا، اس لیے آج اگر وہ اپنا وطن دوبارہ زبردستی بھی لے رہے ہیں تو اس میں کیا غلط ہے؟ یہ سرزمین تو جیسا کہ صیہونی (Zionists) کہتے ہیں ارضِ موعودہ (Promised Land) ہے جہاں پر یہودیوں کا آنا ضروری ہے۔ اقبال نے اس حوالے سے بہت پہلے ہی اپنے خطوط، بیانات اور شاعری میں اظہار خیال کیا ہے۔ اقبال نے ان تاریخی حقائق سے پردہ اٹھانے کی کوشش کی ہے جن کے مطابق یہودی فلسطین سے اپنی مرضی سے نکلے تھے، اور یہ ''خروج'' عربوں کی فتح فلسطین سے پہلے ہی ہو چکا تھا۔ تاہم اقبال نے یہودیوں کے اس دعوے کو تسلیم کرتے ہوئے ایک چبھتا ہوا سوال ضرور اٹھایا ہے کہ اگر واقعی فلسطین پر یہودیوں کا حق ہے تو عربوں کا حق اسپین اور سسلی اور دیگر یورپی مقبوضہ علاقوں پر کیوں نہیں ہو سکتا۔ یہودیوں کا یہ دعویٰ ایسا ہی ہے جیسے ریڈ انڈین امریکا پر، گاتھ اور گال قومیں ؟؟، ہندوستان کے آریا، ایران اور روس پر دعویٰ کر دیں کہ ان کا وطن اصلی انھیں دیا جائے[۶۲]۔ اقبال نے اس حوالے سے طنزیہ انداز اختیار کرتے ہوئے کہا کہ:

ہے خاکِ فلسطین پر یہودی کا اگر حق	ہسپانیہ پر حق نہیں کیوں اہلِ عرب کا
مقصد ہے ملوکیت انگلیس کا کچھ اور	قصہ نہیں نارنج کا یا شہد و رطب کا[۶۳]

اس بات سے کوئی مؤرخ کیوں کر انکار کر سکتا ہے کہ جس زمانے میں لندن اور یورپ کے دیگر معروف شہروں کی تاریک گلیوں میں لوگ گھٹنوں تک کیچڑ اور غلاظت میں دھنس جاتے تھے، صقلّیہ اور اسپین میں مسلمانوں نے علم واکتشاف، تمدن، نظام ریاست، فلسفہ اور تاریخ کے چراغ روشن کر رکھے تھے۔ نبیؐ کریم ﷺ کے زمانے میں عیسائی وفد کے سربراہ کو کمال رواداری سے مسجد نبوی میں اس بات کی اجازت دے کر کہ وہ اور ان کے رفقا دین عیسوی کے مطابق عبادت ادا کریں، نوع انسانی کو آزادی اور حقوقِ انسانی کا لازوال چارٹر مہیا کیا گیا۔ حضرت عمرؓ فتح یروشلم کے بعد بنفس نفیس وہاں تشریف لے گئے اور وہاں کے عیسائیوں کو ایک چارٹر کے ذریعے امان مہیا کیا اور ان کے گرجے اور صلیبوں کی حفاظت کی ذمہ داری اٹھائی۔ اس کے برعکس یورپ کی تمام سلطنتوں نے یہودیوں کے ساتھ نفرت کا رویہ روا رکھا[۶۴]۔ یہ پہلا موقع تھا کہ برطانیہ نے یہود نواز پالیسی شروع کی اسی لیے اقبال ''برطانیہ کی یہود نوازی کے خلاف احتجاج'' کے زیر عنوان ستمبر ۱۹۴۹ء میں تقریر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

> ترک یہودیوں کے ساتھ غیر معمولی رواداری کا سلوک کرتے رہے۔ یہودیوں کی خواہش پر انھیں دیوارِ براق کے ساتھ کھڑے ہو کر گریہ وبکا کرنے کی اجازت عطا کی۔ اس وجہ سے اس دیوار کا نام ان کی اصطلاح میں ''دیوار گریہ'' مشہور ہو گیا۔ شریعت اسلامیہ کی رو سے مسجدِ اقصیٰ کا سارا احاطہ وقف ہے۔ جس پر قبضے اور تصرف کا یہود اب دعویٰ کرتے ہیں، قانونی اور تاریخی اعتبار سے اس کا حق انھیں ہرگز نہیں پہنچتا[۶۵]۔

اس حقیقت سے کیسے انکار کیا جاسکتا ہے کہ ۶۲۷ عیسوی سے لے کر ۶۴۷ عیسوی تک کے بیس برس دمشق کی جامع مسجد میں مسلمان اور عیسائی اکٹھے اپنی عبادت میں مصروف رہے تا آں کہ عیسائیوں نے اپنا گرجاگھر تعمیر کرنے کا فیصلہ کیا اور کیا دنیا اس بات کو بھول سکتی ہے کہ دنیا کا قدیم ترین یہودی معبد اب تک دمشق میں موجود ہے[۶۶]۔ اس طرح کی مذہبی رواداری کی مثالیں اسلام میں بھری پڑی ہیں۔ اسلام کو تنگ نظری اور ظلمت پسندی کا مذہب قرار دینے والوں کو اپنی متعصبانہ عینک اتار کر تاریخ کے ان اوراق کا مطالعہ ضرور کرنا ہوگا۔ شہر آفاق مصنفین کے ہاں بھی اس قسم کی جانب داری نظر آتی ہے۔

مشہور اطالوی مصنف دانتے اپنے طربیہ ٔخداوندی میں مجاہد اسلام صلاح الدین ایوبی کو تو بہشت میں جگہ عطا کرتا ہے مگر نبی ﷺ کو خاکم بدہن دوزخ (Inferno) میں دکھاتا ہے۔ دوسری جانب دانتے کی طرز پر اقبال نے ''جاوید نامہ'' لکھا۔ اوّل تا آخر مذہبی رواداری اور کمال وسعتِ نظر کا شاہ کار اپنے ہر ورق میں انسانیت کے درس کو مقدم رکھتے ہوئے امتوں کے مرگ و حیات کے راز بتاتی ہے۔ اس تصنیف میں کبھی وہ ہندو صوفی وشوامتر کو ''جہاں دوست'' کہتے دکھائی دیتے ہیں اور کبھی ''نہ تا سخن از عارف ہندی'' کے زیر عنوان ان کی زبان سے عارفانہ حقائق کو منکشف کرتے ہیں۔ چار طواسین کے بیان میں طاسین گوتم، طاسین زرتشت، طاسین مسیح اور آخر میں طاسین محمدؐ کا ذکر آتا ہے۔ اہل یورپ کی بدقسمتی کہ انھوں نے اسلام کو رحمت اور نوعِ انسانی کے لیے بے نظیر نعمت سمجھنے کے بجائے عہدِ وسطیٰ کے مذہبی تعصبات کی روشنی میں دیکھا[۶۷]۔ اسی لیے جب مسلم اُمہ کی کمزوری ان کے سامنے عیاں ہوئی تو انھوں نے ہر طرح سے انھیں نابود کرنے کی ٹھانی۔ انھوں نے مکمل جانب داری کا مظاہرہ کرتے ہوئے یہود نواز پالیسی کو فروغ دیا۔ چناں چہ اقبال امت مسلمہ کو اس سازشوں سے باخبر رہنے کے بھرپور جتن کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ وہ امت مسلمہ کو یہ سبق پڑھاتے ہیں کہ اب ان اقوام کی دوڑ، یہودیوں کے ہاتھ میں ہے لہٰذا ان سے کسی قسم کے انصاف کی توقع رکھنا عبث ہے۔ وہ فلسطین عربوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

زمانہ اب بھی نہیں جس کے سوز سے فارغ   میں جانتا ہوں وہ آتش ترے وجود میں ہے
تری دوا نہ جنیوا میں ہے نہ لندن میں   فرنگ کی رگِ جاں پنجۂ یہود میں ہے[۶۸]

اقبال نے اپنی استعمار زدہ ملت کو مسلسل خود شناسی، خود انحصاری، ضبطِ نفس، اپنے مرکز سے اٹوٹ وابستگی، اعتمادِ نفس اور تیز نگاہی کا سبق دیا۔ یہی عناصر زندہ قوموں کو وجود میں لاتے ہیں اور یہی زندہ قومیں وحدت ملی جاروپ دھار کر ایک ناقابلِ تسخیر اکائی، ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن جاتی ہیں[۶۹]۔ قوم کے اندر جب یہ صفات موجود ہوں تو اقبال کے مطابق استعماری قوتیں خود بہ خود ان سے لرزہ براندام رہیں گی۔ اپنے فارسی کلام میں اس حکیمانہ نکتے کو سمجھتے ہوئے ان کا کہنا تھا کہ:

نہ کر دم از کسی دریوزۂ چشم   جہاں را جز بہ چشم خود ندیدم[۷۰]

مسلم امہ کی کم زوری کی اصل وجوہات پر غور کرتے ہوئے اقبال نے ان مغربی افکار کو بھی سخت تنقید کا نشانہ بنایا جس کی وجہ سے امت کمزور ہوتی جا رہی تھی۔ انھوں نے نظم ’’ابلیس کا فرمان اپنے سیاسی فرزندوں کے نام‘‘ میں واضح طور پر یورپ کی سازشوں کی نشان دہی کرتے ہوئے کہا کہ:

فکرِ عرب کو دے کے فرنگی تخیلات　　اسلام کو حجاز و یمن سے نکال دو[۱۷۱]

مسئلہ فلسطین کے ساتھ اقبال کی گہری وابستگی کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ جب تک اقبال کے قویٰ میں طاقت تھی وہ اس مسئلے پر ہونے والے ہر اجلاس میں شریک ہوتے رہے، خواہ وہ انگلستان میں ہونے والے اجلاس ہوں یا موتمر عالم اسلامی کی کانفرنس۔ اقبال کی زندگی کے آخری برسوں میں جب وہ سخت علیل تھے اور ان کے لیے کسی جلسے میں شرکت ممکن نہیں تھی، مسئلہ کشمیر پر برطانیہ کے قائم کردہ رائل کمیشن کی رپورٹ سامنے آئی، برطانوی ہند کے مسلمانوں کی تنظیم مسلم لیگ نے لاہور میں ۲۶ جولائی ۱۹۳۷ء کو موچی دروازے کے باغ میں ایک عوامی جلسہ کیا۔ اقبال بہ وجہِ علالت اس میں شرکت سے معذور تھے لیکن اس کے باوجود اپنا تحریری پیغام بھیجا جس کا اردو ترجمہ پڑھ کر جلسے میں سنایا گیا[۱۷۲]۔ پوری تقریر کے مطالعے سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ اس مسئلے میں عربوں کے ساتھ کس طرح ناانصافی برتی گئی۔ انھوں نے تاریخی پس منظر کو پیش نظر رکھ کر فلسطین کا مقدمہ بڑی خوب صورتی سے لڑا[۱۷۳]۔ اس سے قبل ۱۹۳۱ء کے اواخر میں ہونے والی گول میز کانفرنس کے دوران موتمر عالم اسلامی کے زیر اہتمام یروشلم میں صیہونی خطرے کے سدباب کے لیے عالم اسلام کے نمائندوں کی کانفرنس منعقد ہوئی تو اقبال گول میز کانفرنس کو ادھورا چھوڑ کر مذکورہ کانفرنس میں شرکت کے لیے روانہ ہو گئے۔ اس کانفرنس میں مولانا غلام رسول مہر بھی ان کے ساتھ تھے، جب کہ ہندوستان سے مولانا شوکت علی اور مولانا شفیع داؤدی بھی اس میں شامل تھے[۱۷۴]۔ ۱۴ دسمبر کی شام اقبال نے اس اجلاس میں ایک عالمانہ خطاب کیا جو انگریزی میں تھا۔ ۱۵ دسمبر کو وہ فلسطین سے واپس روانہ ہو کر ۲۸ دسمبر کو ہندوستان پہنچے۔ واپسی پر سول اینڈ ملٹری گزٹ نے اقبال کی روداد سفر شائع کی۔ اپنے بیان میں اقبال نے فلسطین کے سفر کو اپنی زندگی کا یادگار سفر اور فلسطین میں صیہونی تنظیم کی سکیم کا تفصیلی ذکر کیا[۱۷۵]۔ اقبال نے اس اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے مسلم امہ کے اتحاد پر زور دیا۔ تیسری گول میز کانفرنس میں بھی لارڈ لیمنگٹن کی صدارت میں ہونے والے ایک اجلاس میں اقبال خود تو شریک نہ ہوئے لیکن موضوع چونکہ فلسطینی عربوں کے حقوق کا تحفظ تھا برقیہ بھیجا جسے حاضرینِ محفل کے سامنے پڑھ کر سنایا گیا[۱۷۶]۔ اقبال نے اس برقیے میں لکھا کہ:

> فلسطین کے مسئلے نے مسلمانوں کو سخت مضطرب اور پریشان کر رکھا ہے۔ اگر اس قضیے کا فیصلہ ہمارے حسبِ منشا نہ ہوا تو اندیشہ ہے کہ نتائج سخت ناگوار ثابت ہوں گے ... مجھے امید ہے کہ (آپ نے کوششیں جاری رکھیں تو) فلسطین میں یہودیوں کا داخلہ روک دیا جائے گا۔ اس طرح آپ برطانیہ اور دنیا اسلام کے باہمی تصادم کو روک سکیں گے[۱۷۷]۔

۱۹۳۳ء میں مفتیٔ اعظم فلسطین امین الحسینی علوبہ پاشا کے ہمراہ ہندوستان تشریف لائے۔ اس دورے کا مقصد یہاں کی رائے عامہ کو بیدار کرنا اور مسئلے کی نزاکت اور سنگینی کا احساس دلانا تھا۔ دوسرا مقصد غریب عربوں کے لیے چندہ جمع کرنا تھا۔ اس دوران لاہور میں اقبال سے آپ کی ملاقات بھی ہوئی۔ اقبال نے انھیں یروشلم میں یونی ورسٹی کے قیام اور مسئلہ فلسطین پر مکمل مدد کا یقین دلایا[۱۷۸]۔ اقبال وقتاً فوقتاً انھیں اپنے مشورے سے بھی نوازتے[۱۷۹]۔ حکومت برطانیہ کی حکمت عملیوں سے اقبال کو یقین ہو گیا تھا کہ برطانیہ عربوں کے مفاد کے خلاف عمل پیرا ہو کر فلسطین میں یہودیوں کی قومی حکومت قائم کر دے گا۔ وہ اس مسئلے پر دن بدن مضطرب ہوتے جا رہے تھے۔ ان کے اضطراب کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ وہ کسی ایسے اقدام کے لیے، جس کا اثر ہندوستان اور اسلام دونوں پر پڑتا ہو، جیل تک جانے کے لیے تیار تھے[۱۸۰]۔ اسی لیے وہ عربوں خصوصاً فلسطینی مسلمانوں سے مخاطب ہو کر انھیں خود اعتمادی اور خود آگاہی کی تلقین کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

سنا ہے میں نے غلامی سے امتوں کی نجات خودی کی پرورش و لذّت نمود میں ہے[۱۸۱]

اردو کے علاوہ ان کے فارسی کلام میں بھی جا بہ جا فلسطین اور عرب دنیا کے مسائل اور ان کے حل کی تجاویز موجود ہیں۔ وہ بڑی دردمندی کے ساتھ عربوں کو خوابِ غفلت سے بیدار ہونے اور اجداد کی طرح دنیا کو تسخیر کرنے کی طرف توجہ دلاتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

گفت اے روحِ عرب بیدار شو چوں نیا گاں خالقِ اعصار شو
زندگی کن در سینہ آں سوزی کہ رفت در جہاں باز آوراں روزی کہ رفت
ای جہانِ مومنانِ مشک فام از قوی آید مرا بوی دوام
زندگانی تا کجابی ذوقِ سیر تا کجا تقدیر تو در دستِ غیر
بر مقامِ خود نیائی تابہ کی استخوانم در یمی نالد چونی
از بلا ترسی؟ حدیثِ مصطفیٰ است مرد را روزِ بلا روز صفا است[۱۸۲]

افسوس کی بات تو یہ ہے کہ جس خطرے کی جانب اقبال نے تقریباً ایک صدی قبل اشارہ کیا تھا، فلسطینیوں پر آج بھی وہ خطرے منڈلا رہے ہیں۔ اقبال نے اپنی شاعری کے ذریعے غلامی سے نجات اور اپنی کھوئی ہوئی عزت، شان و شوکت کی بازیافت کا جو راستہ بتایا، اس پر چل کر ہی فلسطینی اپنی سرزمین کو پھر سے آزاد کرا پائیں گے۔ اپنے عہد کے معروضی حالات سے پوری طرح آگاہ تھے۔ فلسطینی عوام کے غم و اندوہ میں شریک ہو کر انھوں نے ملت اسلامیہ کو یک جہتی کا پیغام تو ضرور دیا مگر اقبال کی آواز صدا بالصحرا ثابت ہوئی۔ ہماری طرح دنیائے عرب بھی اپنی خودی کی پرورش کی بجائے غیر کے دست و بازو پر ناز کرتی رہی۔ نتیجہ یہ کہ ۱۹۴۹ء کی پسپائی سے اسرائیل کو قدموں تلے روند ڈالنے اور صفحۂ ہستی سے مٹا کر دم لینے کے نعروں کا طلسم ٹوٹ کر بکھر گیا۔

اس شکست نے مصر میں شہنشاہیت کے خلاف فوجی انقلاب کی راہ ہم وار کی۔ صدر ناصر کی قیادت میں تمام عرب دنیا میں انقلاب کی صدائیں گونجنے لگیں۔ برطانیہ اور فرانس کی مشترکہ یلغار کے نتیجے میں مصر کی ثابت قدمی اور فتح و کامرانی نے غریب عوام کو اعتماد اور عزت نفس بخشا[۱۸۳]۔

اقبال کے بعد متعدد ایسے شعرا ہیں جنھوں نے عالمی استعماری چال بازیوں کو نہ صرف سمجھا بلکہ اس کے خلاف قلمی جہاد میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ بیسویں صدی کے تیسرے اور چوتھے عشرے کے اردو رسائل و جرائد کے مطالعے سے یہ بات پوری طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ اس دور کے شاعر خواہ وہ نظریاتی طور پر جس مکتب فکر سے بھی تعلق رکھتے ہوں، مسئلہ فلسطین کے معاملے میں مضطرب ضرور ہوئے۔ جوشؔ نے مسلم نوجوانوں سے خطاب کرتے ہوئے افسردگی کو چھوڑ کر عمل پیہم تصویر بننے کا مشورہ دیتے ہوئے کہا کہ:

پھر سے دل شکستہ میں پھونک دے ولولوں کی روح	پھینک کلیمِ خستگی، چھوڑ فسردہ خاطری
گردِ زوال میں دکھا رقص کواکبِ عروج	بختِ سیاہ کو بنا، آئینۂ قلندری
آتشِ دل کو تیز کر، سوز و زیاں سے دے ہوا	موجِ نسیم میں بدل، بادِ سموم خود سری
خاکِ بسر ہے آج کیوں یاد کر اپنی رفعتیں	کل تیرے نقش پا میں تھی شانِ کلاہِ قیصری
منزلِ ماہ مصر تھی کل تیری محفلِ شباب	ماند ہیں آج کیوں تیرے نقش و نگارِ دل بری
تیغ زن در جز سرا، عرصہِ جنگ میں ورا	طبلِ وفا سے پھر جگا زمزمہِ دلاوری
خاک پہ دیکھ گر نہ جائے جوش کے دل کا ہے لہو	نظم نہیں یہ درس ہے، پڑھ نہ اسے تو سرسری[۱۸۴]

جوش نے شبلی کے رنگ میں مغربی استعمار خصوصاً عیسائی دنیا کی چیرہ دستیوں اور امن کے نعروں کے پس پشت مسلم امہ کے خلاف محاذ کو اپنی بہت سی نظموں کا موضوع بنایا۔ اپنی ایک نظم ''کب تک'' میں وہ عرب اسرائیل جنگ کے پس منظر میں وہ تثلیث کے حامیوں کے کردار پر کچھ سوال اٹھاتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

ستم شعار یہ انداز ساحری کب تک؟	رہے گی رونقِ بازار سامری کب تک؟
یہ درسِ امن کی ابلہ فریبیاں نا چند	یہ اشتہارِ کرم کی فسوں گری کب تک؟
یہ طنطنے، یہ تحکم، یہ دبدبے تا کے	ربوں خصال! یہ جھوٹی سپاہ گری کب تک
یہ چیرہ دستیِ تثلیث ناروا تا چند	یہ فتنہ خیزیِ توحیدِ آذری کب تک[۱۸۵]

وہ عربوں کی بیداری کے نعرے کو دیگر دانش وری کی طرح محض تعریف و توصیف کے بجائے شک کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ ان کے خیال میں:

یہ بے داری کہ جس پہ ناز ہے اربابِ دانش کو مجھے تو جوش اک خوابِ گراں معلوم ہوتی ہے[۱۸۶]

ایسے متعدد شعرا جو غیر معروف تھے لیکن اس سانحے پر اپنے جذبات و محسوسات کے اظہار کا ذریعہ شعر کو بنایا، اس عہد کے رسائل میں شائع ہوتے رہے۔ حکیم افتخار علی جگر صدیقی بسواق نے ماضی کے مسلمانوں کی بہادری اور ہمت کا موازنہ موجودہ عہد کے مسلمانوں سے کرتے ہوئے ان کے دل میں اس عظمت رفتہ کے نشان ثبت کرنے کی کوشش کی ہے۔ اپنی نظم ''تلوار ہم وہی ہیں لیکن وہ دم نہیں'' میں وہ کہتے ہیں کہ:

اے قوم تو وہی ہے، اے قوم تو وہی ہے اب کیا ہوا ہے تجھ کو تو کیوں بدل گئی ہے
بے خوف دل میں خالص نیت نہیں ہے باقی ہم ہیں وہی مسلماں ہمت نہیں ہے باقی
اب کوئی ہم میں باقی خالد حشم نہیں ہے تلوار ہم وہی ہیں لیکن وہ دم نہیں ہے[۱۸۷]

مسلم امہ کی بدحالی اور قیادت کی دگرگوں حالت کا نوحہ مسلم عظیم آبادی کی نظم ''رہروی منزل حق'' میں بھی بہت نمایاں ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

کر دیے آباد خرمن تخم نے ہو کر فنا مزرعِ خونِ شہیداں کا بھی ہے حاصل یہی
منزلِ حق سب کو ہے معلوم رہبر نا پدیر خود نکال اے رہرو راہیں کہ ہے مشکل یہی[۱۸۸]

عالمی سطح پر امن و امان کی بگڑتی صورت حال اور دوسری جنگ عظیم کے بعد عرب دنیا پر استعماری قبضے کی جنگ نے اقوام متحدہ کے کردار کو بھی مشکوک بنا دیا تھا۔ اس تناظر میں ابو عمر یہ کہتے دکھائی دیتے ہیں کہ:

جستجو امن و سکوں کی مجلسِ اقوام میں جلوہِ حق کی تلاش ان مغربی اصنام میں
سادہ لوحی چھوڑ دے اور دعوت قرآں تو سن ہے سکونِ قلب و امنِ عام اس پیغام میں[۱۸۹]

امیر مینائی کے شاگرد منشی ممتاز علی آہ نے بھی ان حالات کے تناظر میں امریکی اور یورپی اثر و رسوخ اور مسلم حکمرانوں کی کاسہ لیسی کا حال بیان کرتے ہوئے ایک غزل میں کہتے ہیں کہ:

رحم آئے کس کو ہم پر کون ان سے جا کے جھگڑے دربارِ رس ہیں جتنے صاحب کے ہو رہے ہیں
ظاہر میں ہیں مسیحا، باطن میں پکے قاتل سہلا کے سر کو دل میں نشتر چبھو رہے ہیں
اس پر نظر نہیں کچھ کیا حال ہے اب اپنا اتنا سبق پڑھا ہے، ماضی کو رو رہے ہیں
سورج نکل رہا ہے کچھ روشنی ہے پھیلی دنیا تو جاگ اٹھی ہم اب بھی سو رہے ہیں
امریکا اور یورپ اپنے جہاز بھرلیں ایسوں ہی کے لیے تو ہم جوت بو رہے ہیں[۱۹۰]

ن۔م۔راشد نے اس خطے میں موجود طاقت کے عدم توازن کو ایک عالمی دانش جو کی نگاہ سے دیکھا[191]۔ انھوں نے عالمی استعمار اور اس کے ہتھکنڈوں کے خلاف اور مظلوم لوگوں کی حمایت میں جو نظمیں کہیں، وہ ان کی رمزیت پسندی کے باوجود اردو ادب کا اثاثہ ہیں۔ صحرا اور آگ ن۔م۔راشد کی شاعری کے بنیادی تلازمے ہیں۔ اسی ریگ صحرا کی جنگ صحرائی ماحول میں جلوہ گر شاعر اپنے ہم خیالوں سے مخاطب ہوتے ہوئے کہتا ہے کہ:

سیالکو، فیروز بختو، آنے والے قافلو!/ شہر سے لوٹو گے تم تو پاؤ گے/ ریت کی سرحد پہ جو

روحِ ابد خوابیدہ تھی/ جاگ اٹھی ہے "شکوہِ پائے نے" سے وہ/ ریت کی تہہ میں جو

شرمیلی سحر روئیدہ تھی/ جاگ اٹھی ہے حریت کی لے سے وہ[192]

راشد یا اس قبیل کے دیگر شعرا کے ہاں ابہام ایک شعری حُسن ہے جو قاری اور تخلیق کار دونوں کو فن پارے کی تفہیم میں سوچ کے نئے زاویے کی طرف لے جاتا ہے۔ راشد نے بھی مشکل تراکیب اور اجنبی علامتوں کے پردے میں صحرائے عرب کے عالمی منظر نامے اور عالمی طاقتوں کی سازشوں سے پردہ اٹھانے کی کوشش ضرور کی۔ عالمی طاقتوں کے زیرِ اثر فلسطین میں یہودیوں کے "قومی گھر" کے قیام اور ساتھ ساتھ تیل کے سوداگروں کی اس خطے میں بڑھتی ہوئی سرگرمیاں راشد کو اضطراب میں مبتلا کر دیتی ہیں[193]۔ اپنی ایک نظم میں وہ ان مظالم کے خلاف حریت سے سرشار لوگوں کی مقدس جدوجہد کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

صبح صحرا، اے عروسِ عزوجل	آ کہ ان کی داستاں دہرائیں ہم
ان کی عزت، ان کی عظمت گائیں ہم	صبح، ریت اور آگ ہم سب کا جلال
یک ولی کے کارواں ان کا جمال	آؤ اس تحلیل کے حلقے میں ہم مل جائیں آؤ

شاد باد اپنی تمناؤں کا بے پایاں الاؤ[194]

وہ عالمی استعمار کے ظلم و جبر کے خلاف احتجاجی رویہ اختیار کرتے ہوئے ان غارت گروں کو موت کا پیغام دیتے ہیں جنھوں نے دنیا بھر کے مظلوموں پر غاصبانہ قبضہ جما رکھا تھا۔ ایک نظم میں اس جانب اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

ریگ شب بیدار ہے، سنتی ہے ہر جابر کی چاپ/ ریگ شب بیدار ہے، نگراں ہے مانندِ

نقیب/ دیکھتی ہے سایہ عامر کی چاپ!/ ریگ ہر عیار غارت گر کی موت!/ ریگ استبداد

کے طغیاں کے شور و شر کی موت/ ریگ جب اٹھتی ہے اڑ جاتی ہے ہر فاتح کی نیند/ ریگ

کے نیزوں سے زخمی سب شہنشاہوں کے خواب/ ریگ اے صحرا کی ریگ/ ان کو اپنے

جاگتے ذروں کے خوابوں کی نئی تعبیر دے[195]

عرب اسرائیل جنگ میں عربوں کی شکست اور جمال عبد الناصر کے ہاتھوں شہنشاہیت کے خاتمے کے بعد عرب دنیا میں تبدیلی کی جو لہر اٹھی، اس سے ترقی پسند شعرا بھی بے حد متاثر ہوئے۔ اقبال اور اس مکتب فکر کے ہاں مسئلہ فلسطین، امت مسلمہ کا مسئلہ ٹھہرا جس میں مذہبی عنصر سب سے مقدم اور لازمی شے تھی جب کہ ترقی پسندوں کے نزدیک یہ یقیناً انسانی مسئلہ تھا۔ لہٰذا اس انسانی مسئلے کو بہت سے ترقی پسند شعرا نے اپنے احساسات کے اظہار کا ذریعہ بنایا۔ فیض کے ہاں بھی مسئلہ فلسطین اور مشرق وسطیٰ کی صورت حال پر متعدد نظمیں ملتی ہیں۔ یہ نظمیں انسانی دردمندی کے جذبے سے سرشار ہیں۔ یہ نظمیں فیض نے اپنے جلاوطنی کے زمانے میں کہیں۔ فیض کے لیے ''لوٹس'' کی ادارت کی پیش کش انگولا میں منعقدہ ایفرو ایشیائی ادیبوں کے اجتماع میں یاسر عرفات کے مشیر ثقافت اور معروف شاعر معین بسیسولائے ''جن سے فیض کی پرانی یاد اللہ تھی''[۱۹۶]۔ لیکن فیض نے اس دعوت کو یاسر عرفات کی جانب سے باقاعدہ پیش کش اور ملاقات کے بعد قبول کیا۔ اس کے بعد وہ بیروت میں اس وقت تک قیام پذیر رہے جب تک ان کا مکان بم باری سے تباہ نہ ہو گیا[۱۹۷]۔ اس دوران فیض کے کئی ممتاز شخصیات سے قریبی مراسم رہے۔ فلسطینی تحریک آزادی سے وابستگی کے دنوں میں معین بسیسو اور محمود درویش جیسی شخصیات سے فیض کے دوستانہ تعلقات تھے۔ یہ قیام بیروت کے زمانے کی تخلیقات میں بالواسطہ اور بلاواسطہ فلسطینی حالات کی سنگینی کا ذکر موجود ہے۔ اس دور کی شاعری وہاں کی مقامی اور عالمی حالات سے بہت زیادہ متاثر ہے۔ فیض اسی وجہ سے عربی لب و لہجے اور عربی لفاظی میں کشش محسوس کرتے تھے۔ ان کے ہاں ''حقا''، ''بفضلِ خدا'' اور ''فرمودۂ رب اکبر'' وغیرہ جیسے الفاظ و تراکیب اس زمانے کی شاعری میں زیادہ دکھائی دیتے ہیں[۱۹۸]۔ اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے عزیز حامد مدنی کا کہنا تھا کہ یہ کاوش اس لیے تھی کہ ان کے کلام کا بآسانی عربی ترجمہ ممکن ہو[۱۹۹]۔ ان کے پانچویں مجموعہ کلام ''سرِ وادیِ سینہ'' کی بیش تر شاعری ان ہی موضوعات کا احاطہ کرتی ہے۔ یہ مجموعہ فیض کے قیام کراچی کے دوران مرتب ہوا۔ جیسا کہ اس مجموعے میں شامل نظم ''سرِ وادیِ سینہ'' کے نام ہی سے ظاہر ہے کہ عرب اسرائیل جنگ کا گہرا اثر اس میں موجود ہے۔ مجموعے میں شامل دیگر کئی نظمیں بھی اسی رنگ میں رنگی ہوئی ہیں[۲۰۰]۔ اپنے عہد کے بعض انتہائی اہم اور سنگین واقعات جن کا تعلق اقوام عالم سے تھا، فیض نے ان موضوعات پر بے مثال نظمیں لکھیں۔ عرب اسرائیل جنگ اور فلسطینیوں کی جدوجہد آزادی کو انھوں نے ظالم و مظلوم کی آویزش قرار دیتے ہوئے ان حالات کو معروضی تناظر میں دیکھنے کی کوشش کی۔

فیض نے ہمیشہ امن کی ضرورت پر زور دیا، لیکن امن جب محض خواب رہ جائے اور خواب دیکھنے والی آنکھوں میں میزائلوں کا زہر اور آتش زدہ انسانی بستیوں کا دھواں نشتر زنی کرنے لگے تو فیض بھی یہ کہنے پر مجبور دکھائی دیتے ہیں کہ ''لوٹ جاتی ہے اُدھر کو بھی نظر کیا کیجیے''۔ عرب اسرائیل کشمکش ظاہر سی بات ہے کہ ہمارے عہد کا ایک سنگین مسئلہ ہے۔ اس مسئلے کو ہمارے ہاں مختلف زاویوں سے دیکھنے کی کوشش کی گئی۔ فیض کو بھی عرب کاز سے گہرا لگاؤ تھا۔ اس زمانے میں نزار قبانی کو بڑی

شہرت حاصل تھی۔ انھوں نے اپنی کتاب ''پسپائی کے حاشیے'' کے عنوان سے جون ۱۹۶۷ء کے المیے پر ایک نہایت موثر اور باغیانہ نظم لکھی۔ اگست ۱۹۶۷ء میں اس نظم کے شائع ہوتے ہی عرب دنیا میں تہلکہ مچ گیا۔ کئی ممالک میں تو اس نظم کی اشاعت ممنوع قرار دی گئی۔ واقعہ چوں کہ سنگین تھا اور عرب شعرا نے اس کو نزار قبانی کی طرح نہ صرف محسوس کیا بلکہ اس طرز کی بے شمار نظمیں اس المیے پر لکھی گئیں۔ فیض کی نظم ''سرِ وادیِ سینا'' بھی ۱۹۶۷ء ہی میں لکھی گئی۔ اس نظم کو بھی عرب روایت کے مطابق حزیرانی ادب میں شامل کیا جانا چاہیے۔ فیض اس المیے سے اس قدر متاثر ہوئے کہ اس مجموعے کا نام بھی ''سرِ وادیِ سینا'' رکھا۔ اس کا سرورق میں جو ان کی بیٹی نے بنایا تھا، اس المیے کا عکس نمایاں ہے[۲۰۱]۔ اس نظم کا آغاز کچھ اس طرح ہوتا ہے:

پھر برق فروزاں ہے سرِ وادیِ سینا/پھر رنگ پہ ہے شعلۂ رخسارِ حقیقت/پیغامِ اجل

دعوتِ دیدارِ حقیقت/اے دیدۂ بینا[۲۰۲]

اسرائیلی جارحیت فیض کو وادیِ سینا پر آتش و آہن کی بارش کی طرح دکھائی دیتی ہے۔ ان کا دل فلسطینیوں کی حالت زار پر سخت مضطرب دکھائی دیتا ہے۔ نظم میں فیض نے جارحیت کی مذمت کرنے کے ساتھ ساتھ مفتیِ دین کی مصلحت کوشی پر بھی طنز کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ:

پھر دل کو مصفا کرو اس لوح پہ شاید — مابین من و تو نیا پیماں کوئی اترے

اب رسمِ ستم حکمتِ خاصانِ زمیں ہے — تائیدِ ستم مصلحتِ مفتیِ دیں ہے

اب صدیوں کے اقرارِ اطاعت کو بدلنے — لازم ہے کہ انکار کا فرماں کوئی اُترے[۲۰۳]

فیض کے مزاحمتی اسلوب نے سانحہ فلسطین کے بیان میں موثر کردار ادا کیا۔ ان کے اس اسلوب اور رویے کو انسانی ہمدردی اور دردمندی کے تناظر میں دیکھنا ضروری ہے۔ ان کی شاعری انسانی ضمیر کی آواز سنائی دیتی ہے۔ ان کے نزدیک حق و صداقت اور خیر کی ازلی قوتیں ہمیشہ فتح و نصرت سے ہم کنار ہوتی ہیں[۲۰۴]۔ اس حوالے سے فیض اپنی ایک نظم ''ترانۂ مجاہدینِ فلسطین کے لیے'' میں کہتے ہیں کہ:

ہم جیتیں گے/حقا ہم اس دن جیتیں گے/بالآخر اک دن جیتیں گے/کیا خوفِ زیلغارِ

اعداء/ہے سینہ سپر ہر غازی/کیا خوفِ زیورش جیشِ قضا/صف بستہ ہیں ارواح الشہداء

/ڈر کا ہے کا/ہم جیتیں گے/حقا ہم جیتیں گے[۲۰۵]

فیض کی شاعری فلسطین کے مظلوم مسلمانوں، مجاہدین کے نالہ و فریاد اور صیہونی مظالم کے خلاف ایک صدائے احتجاج ہے۔ مذکورہ نظم بھی اسرائیل میں فلسطینی مسلمانوں کے قتل عام خصوصاً ''صابرہ اور شتیلا'' میں ستمبر ۱۹۸۲ء کے قتل عام کے دوران ۱۶ اور ۱۸ ستمبر کو جس بے دردی سے ۲۵۰۰ مسلمانوں کو ذبح کیا گیا[۲۰۶] اس پس منظر میں لکھی گئی تھی۔ ان کے مجموعۂ کلام

"مرے دل مرے مسافر" اور اس کے بعد جو کلام "غبارِ ایام" کے نام سے مرتب ہوا، وہ اس لحاظ سے اہمیت کا حامل ہے کہ ان نظموں کی تخلیق کا بیش تر حوالہ فلسطین اور اس میں رونما ہونے والے الم ناک واقعات ہیں۔ انھوں نے اپنی شاعری کے ذریعے عرب کاز کو کافی تقویت پہنچائی۔ ان کے پیش نظر فلسطین کے حوالے سے عربی شاعری کا پورا ذخیرہ موجود تھا۔ اس کے علاوہ جلا وطنی کا وہ احساس جو اس دور کی شاعری میں دکھائی دیتا ہے، اسی دور کی نظمیں اور غزلیں ان حالات کی بھرپور عکاسی کرتی ہیں[۲۰۷]۔ غزلوں کے چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

اب کے برس دستورِ ستم میں کیا کیا باب ایزاد ہوئے　　　جو قاتل تھے مقتول ہوئے جو صید تھے اب صیاد ہوئے

پہلے بھی طوافِ شمع تھی، رسمِ محبت والوں کی　　　ہم تم سے پہلے بھی یہاں منصور ہوئے فرہاد ہوئے[۲۰۸]

فلسطین کے حوالے سے "سرِ وادئ سینا" کے آخر میں انھوں نے واضح طور پر اس یقین کا اظہار کیا جو مظالم عربوں خصوصاً فلسطینیوں پر جاری ہیں، وہ اس جانب اشارہ کرتے ہیں کہ "ظلم پھر ظلم ہے بڑھتا ہے تو مٹ جاتا ہے" لہٰذا ان مظالم کے مٹنے کا وقت بہت قریب ہے۔ روز محشر اور یوم حساب کی تراکیب استعمال کر کے وہ اپنی نظموں کی معنویت کو اور بڑھا دیتے ہیں۔ جیسے:

پڑیں گے دار و رسن کے لالے　　　کوئی نہ ہوگا کہ جو بچالے

جزا سزا سب یہیں پہ ہو گی　　　یہیں عذاب و ثواب ہو گا

یہیں سے اٹھے گا روزِ محشر　　　یہیں پہ روزِ حساب ہوگا[۲۰۹]

فیض ایک صاحب بصیرت اور روح عصر کے نبض شناس دانش ور تھے۔ اس بحرانی دور کی صورت حال کے پیش نظر، زمینی حقائق کو پیش نظر رکھ کر انھوں نے ہار نہ ماننے کا فیصلہ کیا۔ زمانے کے طول و عرض میں جو غبار اڑ رہے تھے، اسے فیض نے شیشۂ ساعت سے لمحہ لمحہ گرتی ریت کی طرح دیکھا، محسوس کیا اور پھر شاعری کا لازمی حصہ بنایا[۲۱۰]۔ ۱۹۷۹ء میں امریکا میں لکھی گئی اس نظم میں بھی وہ گونج اور تڑپ دکھائی دے گی جس کی طرف مذکورہ صفحات میں اشارہ کیا گیا ہے:

ہم دیکھیں گے/ لازم ہے کہ ہم بھی دیکھیں گے/وہ دن کا جس کا وعدہ ہے/جو لوحِ ازل میں لکھا ہے/جب ظلم و ستم کے کوہِ گراں/ روئی کی طرح اڑ جائیں گے/ہم محکوموں کے پاؤں تلے/جب دھرتی دھڑ دھڑ دھڑکے گی/اور اہل حکم کے سر اوپر/جب بجلی کڑ کڑ کڑکے گی/جب ارض خدا کے کعبے سے سب بت اٹھوائے جائیں گے/ہم اہلِ صفا مردودِ حرم/مسند پہ بٹھائے جائیں گے/سب تاج اچھالے جائیں گے/سب تخت گرائے جائیں گے[۲۱۱]

قیام بیروت کے زمانے کی اکثر نظمیں بیروت اور اہل فلسطین کو مخاطب کر کے لکھی گئی ہیں۔ بیروت کی تباہی اور فلسطینیوں کے انخلا پر ان کی نظم ''عشق اپنے مجرموں کو پابہ جولاں لے چلا'' گہرا حزنیہ تاثر چھوڑتی ہے:

لوٹ کے آکے دیکھا تو پھولوں کا رنگ/جو کبھی سرخ تھا، زرد ہی زرد ہے/اپنا پہلو ٹٹولا تو
ایسا لگا/دل جہاں تھا وہاں درد ہی درد ہے/گلو میں کبھی طوق کا واہمہ/کبھی پانو میں رقصِ
زنجیر/اور پھر ایک دن عشق انھیں کی طرح/اس در گلو، پابجولاں ہمیں/اس قافلے میں
کشاں لے چلا[۲۱۲]

اس دور کی پوری شاعری اس فضا سے بہت قریب ہے جو عرب شعرا کی مزاحمتی شاعری کا خاصہ ہے۔ قیام بیروت نے فیض کو فلسطینیوں کے معاملات و مسائل سے بہت قریب کر دیا۔ خود بیروت کے بارے میں ان کی نظم پڑھ کے اس شہر سے ان کی جذباتی وابستگی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے:

بیروت نگارِ بزم جہاں/بیروبدیل باغِ جناں/بچوں کی ہنستی آنکھوں کے/جو آئینے چکنا
چور ہوئے/اب ان کے ستاروں کی لو سے/اس شہر کی راتیں روشن ہیں/اور رخشاں ہے
ارضِ لبنان[۲۱۳]

قیام بیروت کے زمانے میں فیض نے زندگی کی حقیقی جدوجہد کا ذائقہ اپنے سارے وجود میں محسوس کیا۔ اس بات کی گواہی ان کی وہ نظمیں اور غزلیں ہیں جو انھوں نے فلسطین کی جدوجہد آزادی کے نتیجے میں بے مثال قربانیوں کے حوالے سے لکھیں۔ جون ۱۹۸۲ء میں اسرائیل نے لبنان پر حملہ کر کے بیروت پر قبضہ کر لیا تو پی۔ ایل۔ او۔ کو بیروت سے اپنا مستقر ہٹانا پڑا۔ خزیر ان کا تجربہ ۱۹۶۷ء سے ۱۹۸۲ء تک رہا۔ اس کے بعد کی شاعری فلسطینی مفاہمت اور المیہ بیروت کے پس منظر میں ایک نئے رخ کو پیش کرتی ہے۔ اس دور کے کلام میں تلخی بھی ہے اور شکایتی لب و لہجہ بھی[۲۱۴]۔ ۱۹۸۰ء کی تخلیق کردہ ایک نظم ''کیا کریں'' میں شاعر نا صرف غم زدہ نظر آتا ہے بلکہ اس غم میں بظاہر فطرت بھی اسے لہو لہو دکھائی دیتی ہے۔ نظم کے آخر میں شاعر کی بے بسی اپنے نقطہ عروج پر دکھائی دیتی ہے[۲۱۵]۔ ملاحظہ کیجیے:

کسی پہ راکھ چاند کی   کسی پہ اوس کا لہو
یہ ہے بھی یا نہیں بتا   یہ ہے کہ محض جال ہے
مرے تمھارے عنکبوتِ وہم کا بنا ہوا   جو ہے تو اس کو کیا کریں
نہیں ہے تو بھی کیا کریں   بتا، بتا، بتا، بتا[۲۱۶]

ایک اور نظم ''فلسطینی شہدا جو دیس میں کام آئے'' میں بھی رجائی عناصر کی فراوانی دکھائی دیتی ہے۔ نظم کے آخر میں شاعر سرزمین فلسطین سے براہ راست مخاطب ہوتے ہوئے کہتے ہیں کہ انھوں نے تو صرف ایک فلسطین کو برباد کیا مگر میرے دل میں جتنے زخم لگے ہیں وہ قلم کی نوک سے لہو بن کر ٹپک رہے ہیں اور ان قطروں سے کئی فلسطین جنم لیں گے [۲۱۷]۔

جس زمیں پر بھی کھلا میرے لہو کا پرچم لہلہاتا ہے وہاں ارضِ فلسطیں کا علم

تیرے اعداء نے کیا ایک فلسطیں برباد میرے زخموں نے کیے کتنے فلسطیں آباد[۲۱۸]

ایک اور نظم ''فلسطینی بچے کے لیے لوری'' میں فلسطین میں ہونے والی تباہ کاری کی منظر کشی کرتے ہوئے ان دردناک مناظر کو بھی پیش کیا گیا جن سے معصوم دودھ پیتے بچے نہ صرف شہید ہوئے بلکہ ان کی بے گور و کفن نعشیں دنیا سے یہ سوال کرتی رہیں کہ ان کا کیا قصور تھا۔ انھیں کس جرم کی سزا ملی۔ اس رقص ابلیس اور شقی القلب دشمن کی طرف سے روا رکھے جانے والے مظالم اپنے پیاروں کی لاشوں پر آہ و زاری کرتے ہوئے معصوم تنہا بچے اور ان کی آہیں، سسکیاں۔ اس حوالے سے بچے کو تسلی دیتے ہوئے شاعر کا کہنا تھا کہ:

مت رو بچے!/ تیرے آنگن میں/مردہ سورج نہلا کے گئے ہیں/چندر ما دفنا کے گئے ہیں/مت رو بچے!/ امی، ابا، باجی، بھائی/چاند اور سورج/تو گر روئے گا تو سب/اور بھی تجھ کو رلوائیں گے/تو مسکائے گا تو شاید/سارے اک دن بھیس بدل کر/تجھ سے کھیلنے لوٹ آئیں گے [۲۱۹]

ایک اور نظم ''ترانہ مجاہدینِ فلسطین کے لیے'' میں فیض عدو کی یلغار کے سامنے سینہ سپر ہونے والے غازیوں کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے انھیں فتح و نصرت کی نوید بھی سناتے ہیں۔

فرمودہِ رب کریم/ہے جنت اپنے پاؤں تلے/اور سایہ رحمت سر پر ہے/پھر کیا ڈر ہے/ہم جیتیں گے/حقا کہ ہم اک دن جیتیں گے/بالآخر اک دن جیتیں گے [۲۲۰]

فیض ان نظموں میں فلسطینی شعرا کے اسلوب سے خاصے متاثر دکھائی دیتے ہیں۔ اپنے ایک مضمون میں فلسطینی شعرا سے اپنی محبت اور وابستگی کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

ان کا ادب ان کے ہم عصروں سے کہیں زیادہ جذباتی رنگ کا حامل ہے اور ان کی زبان و بیان بھی ان کے مقابلے میں شستہ اور مرجع ہے۔ یہ فلسطینی ادیبوں اور شاعروں کی اجتماعی کوششیں ہیں، جو جدید ادب کا ایک ضخیم ذخیرہ وجود میں لانے کا سبب بنیں... اس اعتبار سے دیکھا جائے تو فلسطینی شعرا نے آئیڈیل ازم اور حقائق کے درمیان خوب صورت توازن پیدا کیا ہے [۲۲۱]۔

فیض آخری عہد تک اپنے مسلک پر قائم رہے۔ تحریک آزادیِ فلسطین کی بابت انھوں نے جہاد بالقلم کے ذریعے اپنا خوب حصہ ڈالا۔ ان کے جذبے کو سراہتے ہوئے یاسر عرفات کا کہنا تھا کہ ''فیض احمد فیض جیسا اردو کا سب سے بڑا اور عظیم شاعر بین الاقوامی شہرت کا پاکستانی انقلابی اور عالم اپنے ابدی خواب کی تکمیل کے لیے ہمارے درمیان آپہنچا تھا''[۲۲۲]۔

ترقی پسند شعرا میں احمد ندیم قاسمی کے ہاں بھی فلسطین میں ہونے والے ظلم و ستم کو شاعری کا موضوع بنایا گیا۔ قاسمی نے مسئلہ فلسطین کو کارل مارکس کے انسان دوستی کے تناظر میں دیکھنے کی کوشش کی۔ یہودی جو ہمیشہ سے اس کوشش میں رہے کہ اس ارض مقدسہ میں مسلمانوں کے آس پاس ان کی مضبوط و مستحکم ریاست کے قیام کا خواب پورا ہو جائے[۲۲۳]۔ اس مقصد کے حصول کے لیے وہ ہر جائز و ناجائز قدم اٹھانے کو تیار بیٹھے تھے۔ استعمار کی آرزو بھی ہمیشہ سے یہی رہی کہ فلسطین کی مقدس سرزمین پر یہودیوں کا تسلط قائم ہو جائے۔ قاسمی کے ہاں استعمار کے اس رویے کے خلاف سخت احتجاجی رویہ موجود ہے۔ ان کی شاعری میں موجود مزاحمت اور عملی جدوجہد کے پیغام کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ ان نظموں میں شعوری اور غیر شعوری طور پر سامراج کے ہتھکنڈوں کے خلاف موثر صدائے احتجاج کی فضا موجود ہے۔ سامراج کے دباؤ سے پیدا ہونے والی صورت حال ایک خود کار نظام کے تحت ان کے شعری مزاج کا حصہ بنتا چلا جاتا ہے۔ اس کی جھلک دیکھنی ہو تو ''اردن'' کے عنوان کے تحت لکھی گئی نظم اس کی بہترین مثال ہے۔ ۱۹۷۰ء میں اردن کے شاہ حسین کے حکم پر فلسطینیوں کا جس طرح قتل عام ہوا، اس نے پوری دنیا کو عجیب کرب سے دوچار کیا۔ یہ سانحہ اس قدر دل دوز اور اندوہ ناک تھا کہ ہر دردمند دل اس سانحے سے غم زدہ دکھائی دیتا ہے۔ یہ سانحہ اس لیے بھی تکلیف دہ تھا کہ اس واقعے میں اپنے ہم مذاہب معصوم فلسطینیوں کی جانیں کسی اور نے نہیں بلکہ ان کے ہم مذہب لوگوں نے ہی تلف کی تھیں۔ اس واقعے نے قاسمی کے دل کو نہ صرف مضطرب کیا بلکہ وہ اپنے کرب کا اظہار کرتے ہوئے یہ کہنے پر مجبور ہوئے کہ:

یہاں تو حدِ نظر اک دشت ہے لہو کا/ لہو کہ جس میں ہمارے اپنے لہو کی خوشبو بسی ہے/
... لہو ہمارے جگر کے ٹکڑوں کا/ ان ماؤں کا/ جو بچوں کو اپنے سینے کے جھونپڑوں میں سمیٹ کر رو رہی تھیں/ اور کہہ رہی تھیں/ ربِ عظیم! پیغمبروں کی اس سرزمین کا واسطہ/ خدائے جلیل! اپنے حبیبؐ کا واسطہ/ ہمیں خود ہمارے بیٹوں کے خنجروں سے بچا/ کہ وہ جس لہو کے پیاسے ہیں/ وہ خود ان کا لہو ہے/ ہم سب لہو کے اس دشت میں کھڑے سوچتے ہیں/ جو ہاتھ ہم پر اٹھے/ ہمارے ہی ہاتھ تھے/ مگر ان میں کس کے خنجر تھے ؟/ کس کے خنجر تھے ؟/ کس کے خنجر تھے ؟/ چلو چلیں آئینوں سے پوچھیں[۲۲۴]

لہو کے اس بہتے منظر میں آئینہ کسی اور کا نہیں بلکہ اپنا ہی عکس دکھا رہا تھا۔ اس منظر سے قاسمی جیسے انسان دوست شاعر کا دل افسردہ بھی تھا اور فکر مند بھی۔ دکھ، کرب اور یاس و حرماں کے ماحول میں لکھی گئی اس نظم کی فضا انتہائی غم ناک ہے۔ ان کی ایک اور نظم ''فاتحین بیروت سے'' میں نام نہاد مغربی تہذیب کے علم برداروں سے شکوہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

صرف یہ ننھا سا شکوہ ہے/ کہ تم بے خانمانوں کے کلیجوں میں اترتی ہوئی برچھیوں کو تو

عجائب گھر/ میں فن کارانہ اندازِ تناسب سے سجاتے ہو/ مگر چھلنی کلیجے بھول جاتے

ہو[۲۲۵]

اسرائیل نے جس طرح سے پوری عرب دنیا کے ساتھ محاذ قائم کر رکھا تھا، اس بیانیے کو پیش کرنے کے ساتھ ساتھ قاسمی نے عالمی سطح پر اسرائیلی جارحیت اور مسلم امہ کی بے حسی کی صورت حال پر سخت افسوس کا اظہار کیا ہے۔ اپنی ایک نظم ''روشنی کی تلاش'' میں اسرائیل کے ہاتھوں مصر کی شکست پر وہ نہایت غم گین دکھائی دیتے ہیں۔ مصری دوستوں کی بے حسی کے پس منظر میں لکھی گئی اس نظم کا انداز نہایت مایوسانہ ہے۔ نہایت کرب کے ساتھ وہ اس نظم میں کچھ سوالات اٹھاتے دکھائی دیتے ہیں:

اب کہاں جاؤ گے اے دیدہ ورہ؟/ اب تو اس سمت بھی ظلمت ہے/ جہاں شب کے الاؤ

میں نہا کر/ مرے سورج کو ابھرنا تھا، گجر بجنے تھے/ اب تو مشرق پہ بھی مغرب کا گماں

ہوتا ہے/ اب تو جب ذکر کرو نور و سحر کا/ تو بلک اٹھتی ہے دنیا کہ، کہاں ہوتا ہے/ اب تو

اس شب کی سیاہی نے ہمیں گھیر لیا ہے/ کہ جہاں چاند تو کیا کوئی ستارہ بھی نہیں جی

سکتا[۲۲۶]

نظم کے آخر میں وہ واضح انداز میں روشنی کی اس منزل کا راستہ ''مشرق'' کو قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

صرف اک سمت کے ماتھے پہ لرزتی ہے اجالے کی لکیر/ اور یہ سمت گزرتی ہے ہمارے

ہی گھروں اور ہمارے ہی دلوں سے/ یہ ہے وہ سمت کہ جس پہ مرے ٹیپو کے نقوشِ

کفِ پا چاند ستاروں کی طرح روشن ہیں/ اور اس سمت سفر کرنے کی یہ شرط ہے/ ہم

ظلمت مغرب کو بتا دیں/ کہ ہم صبح کے وارث ہیں/ کہ ہم مشرق ہیں[۲۲۷]

اپنی ایک اور نظم ''چاند گھبرا گیا'' میں بنی نوع انسان پر ہونے والے مظالم اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے سانحات کو موضوع بنایا گیا ہے۔ قاسمی کے مطابق یہ انسان ہی ہے جو دوسرے انسانوں پر نہ صرف ظلم و ستم ڈھاتا ہے بلکہ اس پر فخر و مباہات کا اظہار بھی کرتا ہے۔ ایسی صورتِ حال پر انسانیت کا سر شرم سے جھک جاتا ہے۔ شاعر کہتے ہیں کہ انسانیت ان مظالم

پر افسردہ ہو یا نہ ہو مگر فطرت ان سانحات پر ضرور افسردہ دکھائی دیتی ہے۔ وہ یہاں اپنے کرب میں فطرت کو حصہ دار بنا کر کہتے ہیں کہ ان مظالم کو دیکھ کر چاند بھی بادلوں کی اوٹ میں چھپ گیا۔ ظلم و بربریت کے ان مناظر کا اظہار قاسمی کی زبانی دیکھیے:

چھپ گیا/بادلوں میں مگر/اس کے چہرے کا سونا پگھلتا رہا/اس کے اشکوں کی چاندی
چمکتی رہی/اور فلسطیں کے خیمہ گاہوں میں/تہذیب کے پاسبانوں کے دلال/منظر کے
دھبے مٹانے میں/انسانیت کو ٹھکانے لگانے میں مصروف تھے[۲۲۸]

ظفر علی خان کی طرح ملکی اور بین الاقوامی سیاست پر ہنگامی نوعیت کی نظمیں شورش کاشمیری نے بھی بہت لکھیں۔ وہ بھی اسرائیل کو استعمار کا لے پالک بچہ قرار دیتے ہوئے ایک نظم ''اسرائیل'' میں کہتے ہیں کہ:

مصر تا شام مصائب کی گھٹا چھائی ہے — برقِ اعراب پہ ٹوٹی ہے کہ لہرائی ہے
شرقِ اردن کا جگر چیر گئی تیغِ یہود — عرصہ جنگ میں انگریز کی بن آئی ہے
للعجب قبلۂ اوّل میں مسلماں کی شکست — ربّ کعبہ! ترے اسلام کی رسوائی ہے[۲۲۹]

قبلۂ اوّل مسجدِ اقصیٰ کا عرب اسرائیل جنگ کے نتیجے میں یہود کے قبضے میں چلا جانا ایسا سانحہ تھا جس نے مسلمانانِ عالم کو تڑپا کے رکھ دیا۔ اس شکست نے تخلیقی فن کاروں کی عزت نفس کو سخت مجروح کیا۔ شورش نے بھی اس حوالے سے ایک نظم بہ عنوان ''قبلۂ اوّل مسجدِ اقصیٰ'' لکھی۔ مسجدِ اقصیٰ میں آگ لگنے کی وحشت ناک خبر جب پہنچی تو اس سانحے کے پس منظر میں یہ نظم لکھی گئی۔ خود شاعر درد کی لہروں کے تلاطم کی وجہ سے اس نظم کو شاعری کم اور زخموں کی شدت کا احساس زیادہ قرار دیتا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اس جاں کاہ المیے پر خیالات کی متنوع لہریں دماغ سے اٹھ اٹھ کر خم خانۂ افکار میں ڈھلتی رہیں"[۲۳۰]۔ وہ ان مناظر پر نہ صرف افسردہ ہیں بلکہ اپنے اضطراب کا اظہار ان الفاظ میں کرتے نظر آتے ہیں کہ:

خاکِ فلسطیں؟ خون میں غلطاں — قبلۂ اوّل؟ چاک گریباں
مسجدِ اقصیٰ؟ شعلہ بداماں — مردِ مسلماں؟ یہ بھی دیکھا؟
قبلۂ اوّل مسجدِ اقصیٰ[۲۳۱]

ہزیمت اور پسپائی نے امت مسلمہ کا جو حال کیا ان مناظر کے بیان میں شاعر پر جس قسم کی مایوسی کی کیفیت طاری تھی۔ وہ دراصل اس دور کے تمام ہی مسلمانوں کے فکری رویوں کا عکس ہے۔ اس منظر کو بیان کرتے ہوئے شاعر کہتے ہیں کہ:

خاکِ حرم پہ خون کا دھارا — کوئی سفینہ؟ کوئی سہارا
ایک کنایہ ایک اشارہ — ہم ہیں مسلماں پارا پارا
قبلۂ اوّل مسجدِ اقصیٰ

وائے مقدر! یہ پسپائی اف یہ ہزیمت! یہ رسوائی

ربّ محمدؐ تیری دہائی نرغے میں اسلام ہے تنہا

قبلۂ اوّل مسجدِ اقصیٰ[۲۳۲]

اپنی ایک اور نظم ''عجمی اسرائیل'' میں وہ قادیانیوں کو ہندوپاک کے درمیان اسرائیل قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

کرہِ ارضی کی ہر عنوان سے تذلیل ہے قادیاں! مابین ہند و پاک اسرائیل ہے[۲۳۳]

ایک سچے ترقی پسند شاعر ہونے کے باوجود ان کے ہاں محض نعرے بازی نہیں بلکہ حقیقت کا درست ادراک بھی موجود ہے۔ عظمت آدم کے ترجمان بن کر انھوں نے درد و کرب کی راہوں میں گام زن فلسطینیوں کو ایک نئی صبح روشن کی بشارت دی اور انھیں فتح مبین کا مژدہ سنایا:

اے برگزیدہ/ مگر دل دریدہ زمین/ تیرے زیتون کے باغ/ انجیر و انگور سے رس بھری

وادیاں/ سبز کم خواب بنتی ہوئی کھیتیاں/ رقص کرتی ہوئی ندیاں/ اب ترے نونہالوں کی

دولت نہیں/ ان پہ اب اژدہوں کا تسلط ہوا[۲۳۴]

جالب بھی فلسطین کے قضیے پر اپنے رفقا کے ہم آواز دکھائی دیتے ہیں۔ وہ فلسطین کی آزادی کے حامی اور جدوجہد آزادی سے یک جہتی کا اظہار متعدد مواقعوں پر کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ وہ مظلوم فلسطینیوں کی کھل کر حمایت کرتے ہوئے مرتے دم تک صیہونی عزائم کو خاک میں ملانے کا عزم کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ اپنی ایک نظم ''اے جہاں دیکھ لے'' میں عالمی ضمیر کو جھنجھوڑتے ہوئے پرجوش انداز میں کہتے ہیں کہ:

اتنا سادہ نہ بن تجھ کو معلوم ہے/ کون گھیرے ہوئے ہے فلسطین کو/ آج کھل کر یہ نعرہ

لگا اے جہاں/ قاتلو رہزنوں یہ زمیں چھوڑ دو/ ہم کو لڑنا ہے جب تک کہ دم میں ہے

دم/ اے جہاں دیکھ لے کب سے بے گھر ہیں ہم/ اب نکل آئے ہیں لے کے اپنا

علم[۲۳۵]

وہ مظلوم، بے گھر فلسطینیوں کے غم میں خود بھی غم زدہ دکھائی دیتے ہیں۔ ان کی کلیات میں تین مزید نظمیں اس موضوع کا احاطہ کرتی ہیں۔ نظم ''فلسطین'' میں ان کا عوامی لب و لہجہ نمایاں دکھائی دیتا ہے۔ فلسطینی عوام کی مظلومیت شاعر کو روشنی کے ایک ہالے کی طرح دکھائی دیتی ہے جو ہر تاریک دیوار کو مٹاتے ہوئے اجالے کی طرف قدم بڑھاتی ہے، جیسے:

روشنیوں کی راہ میں جو دیوار بنے گی/ نہیں رہے گی/غاصب کو غاصب جو کھل کر نہیں
کہے گا/ نہیں رہے گا/ چھائی ہے صدیوں کی سیاہی، چھٹ جائے گی/کٹ جائے گی، درد
کی منزل کٹ جائے گی/ کوخوں خوار لٹیروں کے ہم راہ چلے گا/ نہیں رہے گا[۲۳۶]

اس نظم میں جو خطابانہ انداز ہے وہ جالب ہی سے مخصوص ہے۔ اس گھن گرج میں دل سوزی بھی ہے اور اس کاز سے گہرا تعلق بھی۔ وہ سامراج کو ایک گرتی ہوئی دیوار سے تشبیہ دے کر اس سے مدد کے بجائے خود انحصاری کا درس دیتے دکھائی دیتے ہیں:

گرتی ہوئی دیوار سے ناتا توڑو بھی/خوش فہمو! ان سامراج کو چھوڑو بھی/وقت کی جو
آواز کو اب بھی نہیں سنے گا/ نہیں رہے گا[۲۳۷]

فلسطین کے لیے یہ نظم جالب نے اس وقت کہی تھی جب ضیاء الحق جنھیں اس وقت تک جنرل ہونے کا اعزاز حاصل نہیں ہوا تھا، شاہ حسین کی خواہش پر دریائے اردن کے کنارے فلسطینی پناہ گزینوں کا صفایا کر رہے تھے۔ خبروں کے مطابق اس کارروائی میں ہزاروں فلسطینی بچے، مرد و خواتین قتل کیے گئے۔ ان ہی کی خدمات کے صلے میں انھیں ستارۂ اردن سے بھی نوازا گیا[۲۳۸]۔

نظم ''الفتح کا جوانو!'' میں فلسطینی جدوجہد آزادی کے اہم اور ہراول دستے کو مخاطب کرتے ہوئے ''الفتح'' کے جاں بازو کو زبردست خراج تحسین پیش کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ:

الفتح کے جوانو! کعبے کے پاسبانو/اب وقت آگیا ہے گھر سے قدم نکالو/جاں بازو،
کامرانو/الفتح کے جوانو[۲۳۹]

اس نظم میں جذبہ حریت کو اجاگر کرتے ہوئے محکوم وطن کی آزادی کے جذبات کو فروغ دیا گیا ہے۔ الفتح کا تعلق خود بھی بائیں بازو سے تھا اور جالب بھی اسی نقطۂ نظر کے حامی تھے۔ لہٰذا احماس اور دیگر جہادی تنظیموں کے مقابلے میں وہ ''الفتح'' کی حمایت کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ وہ ''الفتح'' کے جوانو کو عزم و ہمت کا پیکر قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

محکوم ہے فلسطین، ہے خاک اپنا جینا/ نیزوں سے نفرتوں کے چھلنی ہے آج سینہ/اس کا
نشاں مٹا دو جس نے ہے چین چھینا/ لے کر رہو فلسطیں، جھپٹو مثالِ شاہیں/اے عزم
کے چٹانو/الفتح کے جوانو[۲۴۰]

اس موضوع پر اگلی نظم ''یزید سے ہیں نبرد آزما فلسطینی'' میں ان کا لہجہ مدہم اور پرسکون ہے۔ نظم کے عنوان اور بعض اشعار کے مطالعے سے یہ بات مترشح ہوتی ہے کہ وہ تلمیح کا سہارا لے کر اس واقعے کی طرف ہماری توجہ مبذول کروانا چاہتے ہیں

جس میں بیروت کی مقامی حزنی قوتوں سے فلسطینی حریت پسندوں کے تصادم کے نتیجے میں سینکڑوں لوگ لقمۂ اجل بن گئے۔ وہ بیروتی رویے کو یزید سے مماثل قرار دے کر کہتے ہیں کہ:

یزید سے ہیں نبرد آزما فلسطینی/اٹھائے ہاتھوں میں اپنے ؟؟ کا علم/ادیبو، شاعرو، دانش
ورو، سخن دانو/کرو حکایتِ بیروت خونِ دل سے رقم/شکست جہل کو ہو گی، شعور جیتے
گا/کرے کا جہل کہاں تک سرِ شعور قلم[۲۴۱]

''مشرق وسطیٰ کا ساتھ دو'' کے عنوان سے لکھی گئی نظم میں جالب عوام سے یہ اپیل کرتے دکھائی دیتے ہیں کہ فرنگیوں سے ہر قسم کا ناتا توڑ کر ہمیں مشرق وسطیٰ کے مسلمانوں کا ساتھ دینا چاہیے، وہ کہتے ہیں کہ:

بجھنے نہ پائیں موج ہوائے یہود سے — اک جوت جگ رہی ہے سہارے سویز کے
عقبیٰ کا ہے خیال تو عقبہ کا ساتھ دو — ٹوٹے ہوئے دلوں کی تمنا کا ساتھ دو
ناتا ہر اک توڑ کے افرنگیوں سے آج — خود دار ہو تو مشرقِ وسطیٰ کا ساتھ دو
مغرب کے رہزنوں کا جنوں پھر ہے جوش پر — گر امن چاہتے ہو تو دنیا کا ساتھ دو[۲۴۲]

ابن انشاء نے بھی ''دیوار گریہ'' کے عنوان سے ۱۹۶۷ء میں ایک طویل نظم کہی۔ اس نظم میں وہ مسلم امہ کی حالت زار پر نوحہ کناں دکھائی دیتے ہیں۔ نظم میں یہودیوں کے ہاتھوں فلسطینی مسلمانوں کی ہزیمت ناک شکست اور اقوام مسلم کی تاراجی کو بڑے دردناک پیرائے میں نظم کیا گیا ہے۔ وہ عربوں کو غیرت دلاتے ہوئے انھیں اجداد کے کارناموں کی یاد بھی دلاتے ہیں اور انھیں مخاطب کرتے ہوئے اس ظلم و بربریت کے ماحول سے چھٹکارے کی تدبیر سوچنے پر مجبور کرتے ہیں۔ دیوار گریہ کے تیسرے حصے میں وہ کہتے ہیں کہ:

آج سینائی کی مسجدیں بے اذاں — آج سینائی میں عہدِ صیہونیاں
روح قبلہ تپاں درد کی آگ میں — ہو رہا ہے چراغاں سنا گاگ میں
جورِ دجّال ہے شورِ فریاد ہے — یہ قیامت ہے یا محض افتاد ہے[۲۴۳]

یہودیوں کی اجتماعی آہ و زاری کو شاعر نے طنز کا نشانہ بناتے ہوئے دیوار گریہ کے ساتھ لگ کر رونے دھونے کو کتھارسس کے نقطۂ نظر سے دیکھتا ہے۔ انھوں نے فلسطینیوں کی غیرت جگاتے ہوئے کہا کہ کاش! فلسطینیوں کے لیے بھی کوئی دیوار گریہ بنائی جاتی جہاں وہ بھی یہودیوں کی طرح اپنے روشن ماضی کو یاد کر کے آنسو بنا سکتے۔ لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ عربوں کے لیے ''صحرا میں اے خدا کوئی دیوار بھی نہیں'' نظم کی اثر پذیری کا اندازہ مذکورہ نظم کے مطالعے سے اچھی طرح لگایا جا سکتا ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

ایک دیوار گریہ بناؤ کہیں/یا وہ دیوار گریہ ہی لاؤ کہیں/وہ جو اس طرف بیت المقدس
میں ہے/تا کہ اس سے لپٹ/اردن و شام کے ان شہیدوں کو یک بار روئیں/ان کے
زخموں کو اشکوں سے دھوئیں/وہ جو غازہ میں لڑ کر/وہ جو سینائی کے دشت میں بے
اماں/وحشی دشمن کی توپوں کا ایندھن بنے/جن پہ گِدھوں کے لشکر جھپٹتے رہے/وہ جو
مرتے رہے، وہ جو کٹتے رہے[۲۴۴]

مسلمانوں کی اس حالت کے ذمہ دار شاعر خود مسلمانوں ہی کو قرار دیتے ہیں۔ مسلمانوں کی بے عملی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ان کا کہنا تھا کہ:

وہ تو فوجوں کے اڈے بنایا کریں ۔۔۔ آپ رونق حرم کی بڑھایا کریں
ان کا مقصد جہان عرب پر بزن ۔۔۔ آپ کی ترکتازی کی حد ہے یمن[۲۴۵]

اس نظم میں فلسطینی کاز کی ترجمانی کے ساتھ ساتھ ہندوستانی مسلمانوں کے جذبات کی بھی نمائندگی کی گئی ہے۔ قیام پاکستان سے قبل تحریک خلافت کے زیر اثر عام مسلمان جس انداز میں سوچتا تھا، ابن انشاء نے اس نقطۂ نظر کی بھرپور عکاسی کی ہے۔ مولانا محمد علی جوہر کی وفات اور تدفین کے ذکر سے اس خطۂ زمین کی اہمیت اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

دیکھ بیت المقدس کی پرچھائیاں ۔۔۔ اجنبی ہوگئیں جس کی پہنائیاں
ہر طرف پرچم نجمِ داؤد ہے ۔۔۔ راہِ صخرہ کے گنبد کی مسدود ہے
میں نہ لوٹوں گا مجھ کو نہ آواز دو ۔۔۔ جب تلک ملک میرا نہ آزاد ہو
قول ہارا تھا جس مردِ بے باک نے ۔۔۔ ہاں اسے بھی پناہ دی تری خاک نے
وہ کہ جوہر تھا شمشیرِ اسلام کا ۔۔۔ ایک ہندی محمد علی نام کا
آج یوروشلم تو جو پامال ہے ۔۔۔ روحِ آزاد کا اس کی کیا حال ہے[۲۴۶]

بیت المقدس پر اسرائیلی پرچم لہرانے اور مسلمانوں پر اس کے دروازے بند ہونے کے منظر کو بیان کرکے شاعر خود بھی تڑپے اور قاری کو بھی تڑپایا۔ اس نظم میں جو تکنیک استعمال کی گئی وہ بھی ایک الگ ہی طرح کا تجربہ لگتا ہے۔ مختلف ہیئتوں کو آپس میں مربوط کر کے اس کے مختلف حصوں کو ساخت اور موضوع کے اعتبار سے منقسم کرنا اس فن میں شعری مہارت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ کہیں مثنوی کا انداز اور کہیں آزاد نظم کی ہیئت استعمال کی گئی ہے[۲۴۷]۔ لیکن ہر منظر میں ۱۹۶۷ء کے بعد رونما ہونے والی صورت حال کی زبردست عکاسی کی گئی ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

ایک جانب وہ طیارہ بردار تھے جن پہ مغرب کے بمبار سوار تھے

وہ تو اڑتے رہے اور جھپٹتے رہے آگے بڑھتے رہے پیچھے ہٹتے رہے

روکا یاروں کو اک فکر انجام نے بیڑے یاروں کے دیکھا کیے سامنے

آئے بمبار جو کارواں کارواں ان کی یلغار سے تھا سیاہ آسماں

ان کی زد میں عرب کے سجیلے جواں جن کے نیزوں نے جیتا تھا آدھا جہاں[۲۴۸]

مولانا ظفر علی خان کے معروف شاگرد امامی بنگلوری نے بھی اپنی نظم ''معرکہِ صلیب و ہلال'' میں فلسطین کے معرکے پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ:

گر دیکھنا ہو رزمِ فلسطیں کو دیکھیے ڈھونڈے سے بھی ملے گی نہ ایسی مثال پھر[۲۴۹]

ایک اور نظم ''غازیِ فلسطین'' میں جنگ سے لوٹنے والوں کا حوصلہ بڑھاتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

بڑھتے ہوئے طوفان میں پیچھے نہ ہٹے گا کتنا بھی ہو کمزور فلسطین کا غازی[۲۵۰]

قضیہ فلسطین پر اپنی فکر مندی کا اظہار کرتے ہوئے اسد ملتانی کے لہجے میں جو فریاد ہے، اس سے مسئلے کی سنگینی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ وہ کشمیر اور فلسطین دونوں مسئلوں پر مضطرب دکھائی دیتے ہیں:

قصہ فلسطیں کا بھی ہے، کشمیر کا بھی ذکر ہے/ دونوں کی از حد فکر ہے/ ہے اس سے دنیا
کے مسلمانوں کا دل اندوہ گیں/ رہے رحمت اللعالمیں[۲۵۱]

ماہر القادری نے ''مشہدِ اکبر'' کے عنوان سے قبلہِ اوّل پر ایک نظم کہی۔ یہ نظم ''چراغِ راہ'' ۱۹۶۷ء میں شائع ہوئی۔ نظم میں ۱۹۶۷ء کے بعد پیدا ہونے والی صورتِ حال، بیت المقدس پر صیہونی قبضے اور مسجدِ اقصیٰ پر مسلمانوں کے داخلے کی پابندی جیسے مسائل کی جھلک نمایاں ہے۔ وہ دردمند اور دکھی دل کے ساتھ اس منظر کو بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

یہ قبلہِ اوّل پہ عجب وقت پڑا تکبیر کے نغمے نہ مؤذن کی صدا ہے

سب عالمِ حیرت میں ہیں ہیکل ہو کہ صخرا زیتون کی وادی ہے کہ گنجِ شہدا ہے

ہیں سوگ میں ڈوبے ہوئے نابلس و اریحا القدس کے اطراف میں اک حشر بپا ہے

محرابِ حرم نالہ و فریاد سراپا یہ مسجدِ اقصیٰ ہے کہ اک بزمِ عزاء ہے

اردن ہے کہ ہے مشہدِ اکبر کا نمونہ پانی کی طرح خونِ مسلماں کا بہا ہے[۲۵۲]

نظم میں مسلمانوں پر صیہونیوں کی غارت گری کی منظر کشی کچھ اس طرح کی گئی ہے کہ ہر منظر اپنی مکمل داستان سناتا محسوس ہوتا ہے[۲۵۳]۔ وہ بین الاقوامی تناظر میں اس مسئلے کو سمجھنے کی کوشش بھی کرتے ہیں اور عالمی طاقتوں کے کردار کا پردہ چاک کرتے ہوئے امریکی اور یورپی اقوام کی پس پردہ سازشوں پر تنقید کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

سب دشمنِ اسلام ہیں امریکا و افرنگ	کافر نے مسلمان کا کب ساتھ دیا ہے
شیطان کی ایجنٹ نصاریٰ کی ہے ٹولی	اور روس بھی در پردہ شرارت پہ تُلا ہے
فرعون کی اولاد سے امید یہی تھی	ناصر کی قیادت سے نہ شکوہ نہ گلہ ہے[۲۵۴]

مسلمانوں کے خلاف عالمی سطح پر ہونے والی سازشوں، ظلم اور بربریت کے خلاف ماہر القادری نے صدائے احتجاج بلند کرتے ہوئے اس امید کا بھی اظہار کیا کہ بہت جلد ان ظالموں سے چھٹکارا مل جائے گا اور شب کی سیاہی ضرور ختم ہو گی، اب وہ دن زیادہ دور نہیں۔ نظم ''دنیا کا مستقبل'' میں وہ اس جانب اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

جبر و استبداد کی نبیاد ڈھائی جائے گی	پھر سرے سے اک نئی دنیا بسائی جائے گی
وہ کہانی جس کا عنواں ہے ''شہیدوں کا لہو''	دہر کے اک ایک ذرے کو سنائی جائے گی[۲۵۵]

ان کی ایک نظم بہ عنوان ''فلسطین سے ندا آتی ہے'' کو محمد علیم اللہ صدیقی نے ''الحاج مفتیٔ اعظم امین الحسینی و جہاد فلسطین'' کے ابتدائی صفحات میں شائع کیا ہے۔ یہ نظم غالباً ان کے کلیات میں شامل نہیں۔ نظم کیا ہے ایک فریاد ہے جو شاعر کے دل سے نکلتی اور قاری کے دلوں پر نقش ہو جاتا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

وادیِ قدس میں پھر معرکہ آرائی ہے	دیدۂ انجم و ماہ تاب تماشائی ہے
قابلِ رشک ہے اس مردِ وفا کا انجام	جس نے جاں دے کے حیاتِ ابدی پائی ہے
ایک وہ ہیں کہ فدا مسجدِ اقصیٰ پہ ہوئے	ایک ہم ہیں کہ فقط شوقِ جبیں سائی ہے
ایک ہی سطح پہ ہیں سارے نصاریٰ و یہود	آج اسلام پہ پھر عالم تنہائی ہے
اے غلامانِ محمد ہے یہی وقتِ جہاد	سن رہا ہوں کہ فلسطیں سے ندا آئی ہے[۲۵۶]

اس حوالے سے ماجد صدیقی کا مجموعۂ کلام ''دیوارِ گریہ'' کی ۱۸ منظومات بھی کافی اہمیت کی حامل ہیں۔ اس مجموعے میں ۳۲ نظمیں کشمیر کے حوالے سے لکھی گئیں۔ حصہ دوم کا عنوان ''فلسطین آشوب'' رکھا گیا۔ فلسطین کے پس منظر میں لکھی گئیں یہ نظمیں ان کے جذبات کی زبردست عکاس ہیں[۲۵۷]۔

رئیس امروہوی نے اس بدعملی اور بے حسی کو ایک مختلف زاویہ نگاہ سے دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ فلسطینیوں کی بابت یہ بے بسی ہر حساس دل رکھنے والے انسانوں کے لیے لمحۂ فکریہ رہی ہے[۲۵۸]۔ رئیس نے اپنے قطعات میں اسی بے حسی کو موضوع

بنایا۔ ان کے اسلوب میں جو طنز کی کاٹ ہے وہ اس دور کے کسی اور شاعر کے ہاں موجود نہیں۔ مسلم امہ کی بے عملی کا نقشہ کھینچتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ:

پاؤں شل، ہاتھ ہیں مفلوج مگر ضد یہ ہے　　کبھی ایران، کبھی روس کبھی چین چلو
دو قدم مار کے کشمیر تلک ہو آئیں　　جو بہ صد جوش یہ کہتے ہیں ''فلسطین چلو''[۲۵۹]

''فلسطین چلو'' ایک ایسا نعرہ تھا جس نے ایک طویل عرصے تک ملکی سیاست کو گرمائے رکھا۔ افسوس ناک بات یہ ہے کہ عملی طور پر کسی مذہبی یا سیاسی جماعت نے اس جانب کوئی توجہ نہ دی۔ شاعر اسی مجموعی قومی رویے پر طنز کر رہے ہیں۔ اسی طرح شاعر کے ہاں قومی سطح پر بد عملی کا جو رویہ پایا جاتا ہے، اس کا تدارک ''دعا'' سے کرنا بھی بد عملی کی علامت اور معاشرے پر گہرا طنز ہے، جیسے:

سکوتِ عالمِ اسلام و جبرِ اسرائیل　　کسی قیامتِ صغریٰ کی ابتدا تو نہیں
یقیناً آپ دعا میں ہیں رات دن مصروف　　مگر جہاد کا نعم البدل دعا تو نہیں[۲۶۰]

ایک اور قطعے ''فلسطینی فدائین'' میں بھی وہ معصوم فلسطینیوں کی ہلاکتوں کو عالم اسلام کے امرا اور رؤسا کا فدیہ قرار دے کر گہرا طنز کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ ملاحظہ کیجیے:

دعائے فاتحہ مبارک مگر سوال یہ ہے　　نہیں جہاد پہ ہم لوگ مستعد یا ہیں؟
رئیس عالم اسلام دے جواب اس کا　　فدائینِ فلسطین کس کا فدیہ ہیں[۲۶۱]

ان کے بہت سے قطعات مثلاً ۲۰ جون ۱۹۶۷ء ''ارضِ عرب''، ۷ جولائی ۱۹۶۷ء ''دیوار گریہ''، ۲۱ جولائی ۱۹۶۷ء ''داغ'' اور ۱۴ جون ۱۹۶۷ء ''قبلۂ اوّل'' وغیرہ میں فلسطینیوں پر ہونے والے مظالم اور عالمی قوتوں کے کردار پر گہرا طنز موجود ہے۔ وہ فلسطینی مجاہدین سے اظہار یک جہتی کرتے ہوئے اپنی ہجرت کے غم کو ان کے ساتھ ملا کر کہتے ہیں کہ:

ستم کشانِ عذابِ یہود و اسرائیل　　مہاجرینِ فلسطین و اردن و غازہ
تمھارے درد سے ہم اہلِ درد واقف ہیں　　ہمارے دل پہ بھی ہجرت کا داغ ہے تازہ[۲۶۲]

اسی طرح وہ قبلۂ اوّل پر صیہونی قبضے پر انتہائی دکھ کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

مسجدِ اقصیٰ کے صحنِ پاک میں　　قوتِ باطل کے جھنڈے گڑ گئے
قبلۂ اوّل پہ قابض ہیں یہود　　سجدۂ اوّل کے لالے پڑ گئے[۲۶۳]

فلسطین کے تعلق سے بعض شعرا نے اپنی نظموں میں صلاح الدین ایوبی اور بیت المقدس کا تذکرہ لازم و ملزوم سمجھا۔ افق کاظمی امروہوی بھی نہایت پر جوش انداز میں یورپ کو مخاطب کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

کیا صلاح الدین ایوبی نہیں یورپ کو یاد | کیا بھلا دی کاٹ وہ اسلام کی تلوار کی
یاد ہے جنگِ صلیبی کا زمانہ یا نہیں | جنگ وہ بیت المقدس کی وہ ذلت ہار کی[۲۶۴]

مسجدِ اقصیٰ کا یہودیوں کے قبضے میں چلے جانا، ایسا سانحہ تھا جس پر امت مسلمہ خون کے آنسو رونے پر مجبور تھی۔ یہی وجہ ہے کہ تحریک ادب اسلامی سے تعلق رکھنے والے شعرا نے بھی ان واقعات پر متعدد نظمیں کہیں۔ اس جہاد بالقلم کی عمدہ مثال نعیم صدیقی کی شاعری ہے۔ "بحضورِ رسالت مآبؐ" ان کی ایک طویل نظم ہے اور نظم کیا ہے بلکہ مسلمانوں کی جانب سے نبیٔ مکرم ﷺ کے سامنے ایک استغاثہ ہے۔ قبلۂ اوّل کے چھن جانے پر شاعر چشم نم اور ندامت کے احساس کے ساتھ بارگاہِ رسالت میں اس عزم کا اظہار کر رہا ہے کہ ابھی مسلمانوں کے دلوں میں نہ تو ذوقِ جہاد میں کسی قسم کی کمی آئی ہے اور نہ ہی مسلمان زیادہ عرصے تک قبلۂ اوّل کو صیہونی تسلط میں رہنے دیں گے۔ وہ اس شکست کے مناظر بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

شہر یروشلم کہ جو قبلہ تھا اوّلین | پامال جور لشکرِ غیراں ہے اے حضورؐ!
اسلام دشمنوں کا تسلط ہے اس پہ آج | یہ مرکزِ مسیح و سلیماں ہے اے حضورؐ!
پہلا وہ مرحلہ رہِ معراج کا بنا | واں قبضۂ یہود کیا شایاں ہے اے حضورؐ!
ہر ذرہ خون خون ہے، ہر کوچہ قتل گاہ | ہر قصر و بام شعلہ بداماں ہے اے حضورؐ!
گنبد سے اپنے دیر و کلیسا کو دیکھیے | مسلم کے خوں سے آج چراغاں ہے اے حضورؐ![۲۶۵]

لیکن جیسے جیسے نظم آگے بڑھتی ہے، شاعر کے لہجے میں ناامیدی اور مایوسی کی جگہ امید کا دیا روشن ہو جاتا ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

احزاب گرچہ جنگِ صلیبی کو پھر اٹھے | سینوں میں اپنے جوشِ فراواں ہے اے حضورؐ!
لاتقنطوا کا ذکر ہے لاتحزنوا کا ورد | مایوس ہے کوئی نہ ہراساں ہے اے حضورؐ!
تاتار جیسا فتنہ نیا اور اک سہی | خوگر ان آفتوں کا مسلماں ہے اے حضورؐ!
ذوقِ جہاد ہے سرو ساماں نہیں تو کیا | ذوقِ جہاد خود سروساماں ہے اے حضورؐ!
نسلیں کئی کئی ہیں کھڑی آج صف بہ صف | مصر و حجاز، ترکی و ایراں ہے اے حضورؐ!
لاہور سے جکارتا! غزنی سے انقرہ | سارا ہجوم پیکرِ یک جاں ہے اے حضورؐ![۲۶۶]

اس سانحے پر ریاض صدیقی کے تاثرات بھی کچھ اسی قسم کے ہیں۔ ان کی نظم "سوز" میں بھی وہی غم والم کی فضا ہے جو اس وقت تمام مسلمانوں کے دلوں میں تھی۔ وہ اس شکست پر آنسو بہاتے ہوئے عالمی استعماری چالوں سے پردہ بھی چاک کرتے ہیں اور ساتھ ہی مستقبل میں نئے عزم کے ساتھ خدا کی رحمت کے منتظر دکھائی دیتے ہیں۔ چند شعر ملاحظہ کیجیے:

خونِ عرب سے لالہ گوں، دامنِ دشت و کوہسار موجِ سویز خون رنگ، اردن و شام شعلہ زار

بر سرِ عام کھل گیا، وعدے وعید کا بھرم ہار گئے وفا پرست، جیت گئے جفا شعار

چشمِ جہاں نے گرچہ آج، دیکھا ہے تم کو خستہ حال میری نظر میں ہیں مگر، عہد کہن کے کار زار

لشکرِ ابرہہ ذلیل، خاسر و خوار بولہب پرچمِ دینِ مصطفیؐ، عرشِ نشانِ با وقار

پھر وہی سر زمین ہے، پھر وہی شعلہ زار ہے صدق خلیل کا ہے پھر، رحمتِ حق کو انتظار

مزدعہِ زیست لے چکی، خونِ شہید سے خراج پھیلے گا دشت و در میں نور، پھولے پھلیں گے مرغزار[۲۶۷]

نعیم صدیقی کی مسئلہ فلسطین سے ذاتی وابستگی اس فکر کی بدولت ہے جس فکر نے ماضی میں شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ سے لے کر اقبال تک کو اپنی گرفت میں لیے رکھا۔ عالم اسلام کو پیش آنے والے ہر سانحے پر نعیم صدیقی مضطرب بھی دکھائی دیے اور اسے ہر مسلمان کا مسئلہ قرار دے کر کچھ نہ کچھ ضرور کہا۔ ان کی شاعری میں پیرویِ اقبال کا گمان بھی ہوتا ہے[۲۶۸]۔ ان کی مشہور نظم ''یروشلم یروشلم'' دراصل اس مقدس شہر کا نوحہ ہے جو اُس وقت غیروں کے ہاتھوں پامال ہو رہا تھا۔ وہ کہتے ہیں کہ:

لہو اُگل رہا ہے آج، میرا پر فنوں قلم شکستِ آرزو کا کیا، فسانہ ہو سکے رقم

خیال پرزے پرزے ہیں، کروں میں کس طرح بہم یروشلم یروشلم[۲۶۹]

وہ ارضِ فلسطین کے تاریخی پس منظر کو بیان کرتے ہوئے سفر معراج کے اوّلین نقوش کو اسی سرزمین میں تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہوئے نہایت جذباتی انداز اختیار کرتے ہیں۔ جگہ جگہ قتل و غارت گری اور بارود میں رچی زہرناک بو کے باوجود شاعر براقِ نور کے قدموں کے نشان اور نبیِ مکرم ﷺ کے جسم معطر کی مہک کو محسوس کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

یہیں سے ہو کے عرش کو، سواریِ نبیؐ گئی ابھی تک ان فضاؤں میں ہے اک مہک بسی ہوئی

یہاں کی خاک پر ٹکے براقِ نور کے قدم یروشلم یروشلم[۲۷۰]

ارضِ فلسطین پر صیہونی تسلط کسی بھی صورت شاعر کو قبول نہیں، وہ پھر سے صلاح الدین ایوبیؒ کو علم کو اس سرزمین پر لہرانے کے لیے بے چین دکھائی دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

تسلطِ یہود یاں، رہے؟ نہیں، کبھی نہیں یہ ظلم ایسا ظلم ہے کہ جس کی تاب ہی نہیں

میں دیکھتا ہوں آج پھر ''صلاحِ دین کا علم'' یروشلم یروشلم[۲۷۱]

یروشلم یروشلم کی تکرار یعنی ٹیپ کے مصرعے نے نظم میں ایک نغمگی کی کیفیت بھی پیدا کی اور اسے ایک رزمیہ شکل میں بھی ڈھالا۔ ایسا شہر جہاں مسجد، کلیسا، دیر، صومعہ اور دیگر عبادت گاہیں اپنے اپنے عقائد پر قائم رہ کر لوگوں کے اندر بھائی

چارے کی فضا پیدا کرنے کا سبب ہو سکتی تھی، لیکن امریکا کی جنگ زرگری اور یورپ کی سازشوں کا شکار ہو کر اب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اس جملے کی عملی تفسیر بن گیا تھا جس میں انھوں نے یروشلم کی عورتوں کو مخاطب کرتے ہوئے ان کی آہ و بکا کی بابت کہا کہ ''میرے لیے نہ رو بلکہ یروشلم کے لیے رو''۔ یہ نظم اپنی طوالت کے باوجود فنی پختگی کی عمدہ مثال ہے۔ حیرت کی بات تو یہ ہے کہ نعیم صدیقی زندگی بھر جس نصب العین کے داعی رہے، خود ان کے دعوے داروں نے بھی ان کی اس طرح قدر نہیں کی جس کے وہ مستحق تھے[۲۷۲]۔

فلسطین کے ان حالات کے پیشِ نظر احسان دانش بھی کیوں کر پیچھے رہتے۔ اپنی نظم ''ایک المیہ'' میں وہ بھی بیت المقدس کے لیے صدائے آہ و فغاں بلند کرتے نظر آتے ہیں۔ وہ اللہ تعالیٰ سے اس شکست کا شکوہ بھی کرتے ہیں اور ساتھ ہی یہ باور بھی کراتے ہیں کہ امت مسلمہ کی خواری اور ذلت اور محبوب کائنات حضرت محمد ﷺ کے نقش کی پامالی دراصل خود خدا کی توہین کے مترادف ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ:

یہ کیسا تغیّر ہے، یہ کیا رنگِ فضا ہے	جو شخص مسلماں ہے گرفتارِ بلا ہے
جو قریہ روایاتِ مقدس کا امیں تھا	اس وقت وہ اک شہر خموشانِ وغا ہے
ہم لاکھ خطا کار و گناہ گار ہیں لیکن	بے رحمیِ ماحول کا شکوہ بھی بجا ہے
یوں خوار و زبوں ہو ترے محبوبؐ کی امت	آخر تری توہین نہیں ہے تو یہ کیا ہے
اے وائے ہو دنیا میں تیرے دین کی تحقیر	یہ جبر بھی کیا تیری مشیّت کو روا ہے[۲۷۳]

مسجدِ اقصیٰ کی پامالی پر خواتین شاعرات نے بھی اپنے جذبات کا کھل کر اظہار کیا۔ ادا جعفری کا دل بھی اس سانحے پر خون کے آنسو رویا۔ ''مسجدِ اقصیٰ'' کے عنوان سے لکھی گئی نظم میں ان محسوسات کو بہ آسانی محسوس کیا جا سکتا ہے۔ وہ قبضۂ اغیار پر نہ صرف نوحہ کناں ہیں بلکہ قبلۂ اوّل کی بابت کہتی ہیں کہ:

جادۂ شوق کہ ہے مسجدِ اقصیٰ پہلے	دل بھی قبلہ ہے، یہ قبلہ نہ ڈھہا تھا پہلے[۲۷۴]

مسجدِ اقصیٰ کی صورت حال پر وہ اپنا دکھ بیان کرتے ہوئے حرم پاک کے تقدس کی بابت کہتی ہیں کہ:

محترم ہے مجھے اس خاک کا ذرہ ذرہ	ہیں یہاں سرورِ کونینؐ کے سجدے کے نشاں
اس ہوا میں مرے آقاؐ کے نفس کی خوشبو	اس حرم میں مرے مولا کی سواری ٹھہری

اس کی عظمت کی قسم ارض و سما نے کھائی

تم نے کچھ قبلۂ اوّل کے نگہباں، سنا؟	حرمتِ سجدہ گہہ شاہ کا فرمان سنا؟[۲۷۵]

وہ امت مسلمہ کی حالت زار اور ان کی کمزوریوں پر مضطرب ہونے کے ساتھ ساتھ ماضی میں ہونے والے واقعات سے موازنہ کرتے ہوئے کہتی ہیں کہ:

ایسا اندھیر تو پہلے نہ ہوا تھا لوگو! لو چراغوں کی تو ہم نے بھی لرزتے دیکھی

آندھیوں سے کبھی سورج نہ بجھا تھا لوگو!

آئینہ اتنا مکدر ہو کہ اپنا چہرہ دیکھنا چاہیں تو اغیار کا دھوکا کھائیں[۲۷۶]

مسئلہ فلسطین پر ان کی قلبی اور فکری وابستگی کا اظہار مذکورہ نظم میں دیکھا جاسکتا ہے۔ ایک نظم ''الفتح'' میں وہ فلسطین کی جہد آزادی میں کوشاں ان فلسطینیوں سے وابستگی کا اظہار کرتی نظر آتی ہیں جنھوں نے اس راہ میں اپنی جانیں تک قربان کرنے سے گریز نہیں کیا۔ آزاد نظم کی ہیئت میں ہونے کے باوجود اس کی اثر انگیزی سے انکار ممکن نہیں۔ نظم کی ابتدا میں وہ فلسطین کی جدوجہد آزادی کے حوالے سے سب سے منظم تنظیم ''الفتح'' کا پس منظر بیان کرتے ہوئے کہتی ہیں کہ:

ابھی کل کی بات ہے ہم نوا! مرے پاس میری نگاہ تھی

جو وقار تھی جو پناہ تھی وہ نگاہِ کشتِ فسونِ جاں

ترے درد سے مرے درد تک وہی رنگ تھا، وہی روپ تھا[۲۷۷]

لیکن جب ان مسافرانِ آزادی کی راہ میں عالمی استعمار نے رکاوٹیں کھڑی کرنے کی ٹھانی تو آزادی کے یہ متوالے برہنہ پا ہونے کے باوجود اپنے آہنی عزم کی بدولت ان طاقتوں سے ٹکرانے کی ٹھان لیتے ہیں۔ اس منظر کو بیان کرتے ہوئے شاعرہ کہتی ہیں کہ:

یہ مسافرانِ برہنہ پا اسی اک نگاہ کی ہے جھلک

وہی ہیں لباسِ شعاع میں جہاں راکھ اٹی تھی پلک پلک

یہ مثیلِ زرہِ ناتواں جو زمیں کی کوکھ سے پھوٹ کر

یہ جمالِ غم، یہ فسونِ جاں یہ ہوائے رنجِ نمو رہا

ہے دراز درد کا سلسلہ یہ مسافرانِ برہنہ پا[۲۷۸]

نظم کے آخر میں وہ آزادی کے متوالوں کو روشن مستقبل کی نوید سناتے ہوئے کہتی ہیں کہ آزادی کی راہ میں لڑنے والوں کا راستہ روکنا اب کسی کے بس کا روگ نہیں۔ ملاحظہ کیجیے:

یہیں کہیں سپرِ آفتاب کھوئی تھی جہاں پہ ڈوب گئی ہے، وہیں سے ابھرے گی

شفق سا رنگ گھلا ہے بدن بدن کے لیے گلوں نے آج تلک چاک پیرہن نہ سیے

لہو لہو ہیں جو چہرے تو رنگ زرد نہیں دریدہ پیرہنوں کی جبیں پہ گرد نہیں[۲۷۹]

ظہیر کاشمیری کی شاعری بھی عظمت آدم کی ترجمان ہے۔ وہ بھی فلسطین کو مذہب سے زیادہ انسانی مسئلہ سمجھتے ہیں۔ ان کے خیال میں حق کی راہ میں چلنے والے فلسطینیوں کو جلد فتح مبین کی خوش خبری ملنے والی ہے۔ وہ فلسطین کی موجودہ صورتِ حال پر اپنے غم کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

اے برگزیدہ/ مگر دل دریدہ زمیں/ تیرے زیتون کے باغ/ انجیر وانگور سے رس بھری
وادیاں/ سبز کم خواب بنتی ہوئی کھیتیاں/ رقص کرتی ہوئی ندیاں/ اب ترے نونہالوں کی
دولت نہیں/ ان پہ اب اژدہوں کا تسلط ہوا[۲۸۰]

شاعر نے آسودہ حال فلسطینیوں پر اژدہوں کا قبضہ دکھا کر عالمی استعمار کے چہرے سے پردہ اٹھایا اور ان کے مکروہ چہرے کو سب کے سامنے پیش کیا۔ ان عالمی طاقتوں کی فتنہ سامانی اور زہرناکی نے پورے عرب کے امن وسکون کو چھین رکھا تھا۔ اس منظر کو بیان کرتے ہوئے شاعر کا کہنا تھا کہ:

ہر چیز لوٹی گئی/ غاصبوں، جنگ بازوں نے/ تری روایاتِ صلح بشر کی جگہ/ جا بجا قتل
گاہوں کی بنیاد رکھ دی/ تجھے ایسے بارود کے ڈھیر میں/ منتقل کر دیا/ جس سے تو ہی
نہیں/ ساری دنیا کی تہذیب آتش بجاں ہے[۲۸۱]

نظم کے آخری میں فلسطینیوں کو فتح مندی کی نوید سناتے ہوئے شاعر رجائی انداز اختیار کرتے ہیں۔ یہ نظم بھی موضوع پر مزاحمتی رنگ لیے ہوئے ہے۔ خصوصاً آخری حصے میں جس طرح سے ایک للکار کی فضا دکھائی دیتی ہے وہ مظلوم فلسطینیوں کے لیے عزم وحوصلے کا سبب بنتی ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

غاصبوں جنگ بازوں کی یہ کبریائی/ مثالِ شب مختصر ہے/ ترے آبرومند فرزند/ خورشیدِ
فردا کی تلوار سے/ اس شبِ مختصر کا/ گلا کاٹ دیں گے/ ترے سر پر کرنوں کا سہرا سجے
گا/ تری فتح مندی کے دن/ اب قریب آچکے ہیں[۲۸۲]

مخدوم نے براہ راست تو فلسطین کو موضوع نہیں بنایا لیکن ان کی بعض نظموں میں سامراجی مظالم اور انبیاء کی سرزمین پر ان کی جانب سے روا رکھے جانے والے ہتھکنڈوں کی طرف واضح اشارے موجود ہیں۔ اپنی نظم ''زلف چلیپا'' میں وہ سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف بغاوت کا اعلان اور سرض انقلاب کی نوید سناتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

آفریں ہے تجھ پہ اے سرمایہ داری کے نظام اپنے ہاتھوں اپنی بربادی کا اتنا اہتمام
آندھیاں شعلہ بداماں خون کی برسات ہے اب تو بوئے آتش و بارود ہے ہر بات میں

کتنی ماؤں کی سہانی گودیاں ویراں ہیں آج
فرق گیتی پر نظر آتا ہے پھر کانٹوں کا تاج
موت محوِ شادمانی، غرق ماتم ہے حیات
لٹ رہی ہے ساری خلقت جل رہی ہے کائنات
جس زمیں سے ارتقا کے انبیاء پیدا ہوئے
جس زمیں سے علم و حکمت کے خدا پیدا ہوئے
اس زمیں کے ہر نشیلے بام و در میں موت ہے
اس کے دل میں موت ہے اس کی نظر میں موت ہے
زرگری کا رقص ہے سود و زیاں کا رقص ہے
ہر گلی کوچے میں مرگِ ناگہاں کا رقص ہے
عزمِ آزادی سلامت، زندگی پائندہ باد
سرخ پرچم اور اونچا ہو، بغاوت زندہ باد[۲۸۳]

ہر طرف خندقوں، باڑ اور قتل و غارت گری کے مناظر اس زمانے میں دنیا کے مختلف حصوں کی پہچان بن چکے تھے۔ لیکن مظلوم فلسطینیوں پر صیہونی افواج نے جو مظالم ڈھائے اس کی مثال کم ہی ملے گی۔ ایسے ماحول کی بابت شاعر کا کہنا تھا کہ:

وہ تہذیب کے زخم/خندقیں/باڑھ کے تار/باڑھ کے تاروں میں الجھے ہوئے انسانوں
کے جسم/اور انسانوں کے جسموں پہ بیٹھے ہوئے گدھ/وہ تڑختے ہوئے سر/میتیں ہات
کٹی پاؤں کٹی/لاش کے ڈھانچے کے اس پار سے اُس پار تلک/سرد ہوا/نوحہ و نالہ و فریاد
کناں/شب کے سناٹے میں رونے کی صدا/کبھی بچوں کی کبھی ماؤں کی/چاند کے تاروں
کے ماتم کی صدا[۲۸۴]

احمد فراز کا شمار بھی حریت فکر کے ترجمان کی حیثیت سے کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ ان کے ہاں بھی فلسطینیوں سے اظہارِ یک جہتی مذہبی ہم آہنگی کی وجہ سے نہیں بلکہ اس کی بنیادی وجہ سامراج کے خلاف مزاحمت کا رویہ تھا۔ انھوں نے فلسطینیوں کے بنیادی حقوق سلب کیے جانے اور اپنے انسان دوستی کے پیغام کو عام کرنے کے لیے یہودیوں کے عزائم کے خلاف بغاوت کی۔ ان کے ہاں فلسطینیوں سے محبت اور وابستگی کی مختلف جہتیں دکھائی دیتی ہیں۔ انھوں نے اپنی شاعری کے ذریعے فلسطینیوں کا مقدمہ پوری دنیا کے سامنے مؤثر انداز سے پیش کیا۔ معصوم فلسطینیوں پر ہونے والے مظالم کو انھوں نے اپنی معروف نظم "بیروت" میں بڑے سلیقے سے پیش کر کے عالمی سطح پر لوگوں کی توجہ اس جانب دلائی۔

یہ سر بریدہ بدن ہے کس کا
یہ جامۂ خوں کفن ہے کس کا
یہ زخم خوردہ ردا ہے کس کی
یہ پارہ پارہ صدا ہے کس کی
یہ کس لہو سے زمین یاقوت بن گئی
یہ کس کی آغوش کس کا تابوت بن گئی[۲۸۵]

فلسطینی بیٹیوں کی پاکیزہ چادروں کو جس طرح تار تار کیا جا رہا تھا اور حریت فکر کے متوالوں کے خون سے جس طرح ارضِ فلسطین رنگین ہو رہی تھی، وہ سارا منظر اس نظم میں موجود ہے۔ اس کے علاوہ جنگ کے بنیادی اصولوں کو پس پشت رکھ کر

عورتوں اور بچوں پر جو مظالم ڈھائے جارہے تھے اور اس کے نتیجے میں جو آہ و بکا جاری تھی، ان مناظر کو پیش کرتے ہوئے شاعر کہتے ہیں کہ:

یہ کس کی ماں ہے/جو اپنے لختِ جگر کو ملبے میں ڈھونڈتی ہے/یہ کون بوڑھا ہے/جس کی
آواز شورِ محشر میں دب گئی ہے/ یہ کون معصوم ہیں/کہ جن کو/ستم کی آندھی/دیے
سمجھ کر بجھا رہی ہے/انھیں کوئی جانتا نہیں ہے[۲۸۶]

ایک طرف تو یہ معصوم جانیں ہیں، دوسری طرف عرب حکمران جو اپنی اپنی شہنشاہی پر نازاں، عیش و عشرت کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ حرم کی حفاظت کے یہ ذمے دار فلسطین کے مسئلے پر چپ سادھے بیٹھے ہیں۔ ان کی بے ضمیری کے خلاف فراز نے صدائے احتجاج بلند کرتے ہوئے کہا کہ:

محل سراؤں میں خوش مقدر شیوخ چپ بادشاہ چپ ہیں/حرم کے سب پاسبانِ عالم پناہ
چپ ہیں/منافقوں کے گروہ کے سربراہ چپ ہیں/تمام اہلِ ریا کہ جن کے لبوں پہ ہے
لا الہٰ چپ ہیں[۲۸۷]

"بیروت" کے ہی عنوان سے لکھی گئی ایک اور نظم میں شاعر فلسطینی عوام پر کیے جانے والے مظالم کی منظر کشی کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

میرے بچوں کے خیموں میں زخموں کے پیراہن میں
ممتاؤں کی خالی گودیاں بن کتبوں کے مدفن ہیں[۲۸۸]

غم و الم کے اس منظر میں تیل کے خزانوں کی کنجی جن لوگوں کے پاس ہے وہ خوش و خرم زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اس موقعے پر شاعر طنزیہ انداز اختیار کرتے ہوئے جارحانہ لہجے میں کہتا ہے کہ:

تیل کے چشموں کے سوداگر اَن داتا خوش بیٹھے ہیں
محل سرا کی حرم سرا میں خواجہ سرا خوش بیٹھے ہیں[۲۸۹]

ان کی ایک اور نظم "شائیلاگ" کا موضوع بھی صیہونی عزائم اور دنیا بھر میں معاشی کنٹرول ہے۔ اس نظم کا مرکزی کردار شیکسپئیر کے معروف ڈرامے "The Merchant of Venice" سے ماخوذ ہے۔ ڈرامے کا یہ کردار یہودی ساہوکار ہے جو معصوم لوگوں سے ادھار لے کر ان کے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے پر اپنا حق جمالیتا ہے۔ اس نظم میں بھی شاعر نے صیہونی عزائم کو "شائیلاگ" قرار دے کر اس کے مکروہ چہرے سے پردہ اٹھانے کی کوشش کی ہے۔ نظم کے آغاز ہی میں وہ کہتے ہیں کہ:

شائیلاگ نے صدیوں پہلے/ایک طلائی مہر کے بدلے/میرے بدن کے گوشت کا ٹکڑا
مانگا تھا/اور دنیا حیران ہوئی تھی/یہ لمحہ انسان کی ساری لاف زنی پر/گویا خطِ تنسیخ بنا/یہ
قصہ تمثیل بنا تاریخ بنا[۲۹۰]

آج بھی یہودیوں کی حکمت عملی یہی ہے۔ وہ اپنے ساہوکاروں کے ذریعے فلسطینیوں کی انا، خودداری اور آزادی کا خریدار ہے۔ زمین کی اراضی پر قبضے سے لے کر فلسطینی وسائل پر تسلط تک یہ سارا عمل صدیوں سے آج تک جاری ہے۔ اس جانب اشارہ کرتے ہوئے شاعر کہتے ہیں کہ:

آج کے شائیلاگ نے لیکن/مجھ کو میری انا کے بدلے/اشرفیوں اور درہم کے انبار
دیے/اس سودے میں اس نے بربطِ جان کے/جتنے زندہ تار تھے سارے مار دیے[۲۹۱]

مشہور فلسطینی جہادی رہنما ابو جہاد کی شہادت پر خراج تحسین پیش کرتے ہوئے وہ حکومت پاکستان کی خارجہ پالیسی پر بھی طنز کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ اس وقت پاکستان فلسطینیوں کے مخالف کیمپ کی حمایت میں ہراول دستہ بنا ہوا تھا۔ فراز جیسے شاعر اس عمل پر سخت ندامت اور شرمندگی محسوس کر رہے تھے۔ اسی لیے اس نظم میں وہ کھل کر اس کا اظہار کرتے بھی دکھائی دیتے ہیں۔ ملاحظہ کیجیے:

ابو جہاد ! مرا دل لہو لہو ہے مگر　　معاف کر کہ تیرے دشمنوں کے ساتھ ہیں ہم
ترا جنوں، تیرا ایثار محترم لیکن　　جو سچ کہوں تو ترے قاتلوں کے ساتھ ہیں ہم[۲۹۲]

فراز کی یہ نظمیں ایک اچھے شاعر کی فریاد معلوم ہوتی ہیں۔ مجموعی طور پر ان نظموں میں داخلی جذبات کی عکاسی کی گئی ہے۔ موسیقیت سے بھرپور ان نظموں میں سامراج کے خلاف احتجاجی رویہ موجود ہے۔

عادل منصوری نے بھی اپنی ایک نظم ''فلسطینی کے لیے'' میں ارض فلسطین کی خوب صورتی کو تاریخی روایات کے پس منظر میں دیکھنے کی کوشش کی۔ وہ جدوجہد آزادی فلسطین کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

اونٹ کی پیٹھ پہ بے خواب اندھیری راتیں　　زندگی جھلسے ہوئے صحراؤں میں شبنم لمحہ
اپنے خیموں کو سرابوں کے کنارے گاڑو　　اور ہر اک موج کو پھر خونِ جگر سے باندھو[۲۹۳]

پوری نظم میں ایک تلمیحاتی فضا ہے۔ اپنی خوب صورت امیجری کے ذریعے اس سارے منظر کو دل کش بنا کر پیش کرتے ہیں۔ اس کے خیال میں دجالی فتنے کے خاتمے کا وقت قریب آ چکا ہے اور حضرت عیسیٰ کی آمد نو کے ساتھ ہی یہودی غلبے کا خاتمہ ہو جائے گا۔ وہ ان یہودیوں کی چال بازیوں اور مکاریوں سے پردہ اٹھاتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

جلتے صحراؤں میں اک شور ہے پانی پانی　　　پیٹھ مشکیزہ اٹھائے ہوئے جلتے سائے

گونجتی دور تلک خوفِ خموشی میں اذان　　　بکریاں کان ہلاتی ہوئی خیمہ خیمہ

کون سے ریت پر کھینچو نئی سرحد کی لکیر　　　آسمانوں میں نمودار، نزولِ عیسیٰ[۲۹۴]

سانحہ بیت المقدس کے موقع پر امت مسلمہ کی بے رخی اور بے وفائی نے یوسف ظفر کو بھی مضطرب کیا۔ اس بے وفائی کا ذکر نہایت بلیغ انداز میں انھوں نے مشہور نظم ''سانحۂ بیت المقدس'' میں کیا ہے۔ یہ نظم ان کی کتاب ''یہودیت'' میں شامل ہے۔ چند شعر ملاحظہ کیجیے:

دیکھ اے چشمِ زلیخا! قدر اپنے پیار کی　　　آج پھر یوسف کے بھائی ہیں خریداروں کے ساتھ

آج موسیٰ نے کیا عیسیٰ کو پھر بالائے دار　　　ہیں حواری بھی یہودی سنگ دل یاروں کے ساتھ

دین سے کٹ کر ہوا مالِ عرب، پیشِ عرب　　　اور عصا بھی ہے یدِ بیضا میں ہتھیاروں کے ساتھ[۲۹۵]

مغرب کی سازشوں کو انھوں نے اپنی مذکورہ تصنیف میں بے نقاب تو کیا ہی ہے لیکن ساتھ ہی اس بات کی طرف ہماری توجہ بھی مبذول کروائی ہے کہ ان چالوں نے کس طرح فلسطینیوں کی ہر صبح کو یوم عاشورہ میں تبدیل کر دیا ہے۔ اس نظم میں استعمال ہونے والی تلمیحات اور اپنوں کی بے وفائی، یہ دو ایسے پہلو ہیں جو اس نظم کو زندہ رکھنے کا سبب ہیں۔ نظم کا مجموعی تاثر حزنیہ ہے۔ اس غم والم کی صورت حال میں وہ ایک بار پھر صلاح الدین ایوبی کے منتظر دکھائی دیتے ہیں۔ دیکھیے:

قبلۂ اوّل صلاح الدین ایوبی کو ڈھونڈ　　　آملی دیوارِ گریہ، تیری دیواروں کے ساتھ

اے مسیحا زہر دے، لیکن نہ دست غیر سے　　　یہ ستم، اللہ اکبر! اپنے بیماروں کے ساتھ[۲۹۶]

نظم میں ایک مقام ایسا بھی ہے جہاں وہ مسلمانوں کی بے بسی اور مایوس کن صورت حال پر مغرب سے ان کا موازنہ کرتے ہوئے یہ کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ:

صبح نو مغرب میں ہے بیدار، بیداروں کے ساتھ　　　اور ہم گردش میں ہیں بے نور، سیاروں کے ساتھ

چیختی کرنیں فضا کی دل کشی کو لے اڑیں　　　دھوپ سایوں سے لگی ہے، سائے دیواروں کے ساتھ[۲۹۷]

بے سمتی کا ایسا احساس بہت کم نظموں میں پایا جاتا ہے۔ یوسف ظفر کی یہ نظم مسلمانوں کی بے سمتی کو پوری طرح ظاہر کرتی ہے۔

فلسطین پر بیرونی حملہ آوروں اور تسلط کے نتیجے میں عربوں کو غریب الوطنی کا تجربہ کرنا پڑا۔ صیہونی حکمت عملی کے نتیجے میں عرب اپنے گھروں کو چھوڑ کر نقل مکانی پر مجبور ہوئے۔ لاتعداد فلسطینی آج بھی پڑوس کے ممالک میں بے گھری اور بے توقیری کی زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔ اس مہاجرت کے کرب کو خاطر غزنوی نے تمثیلی انداز سے اپنی نظم ''انخلا'' میں پیش کیا

ہے۔ شاعر مہاجر پرندوں کو بطور علامت استعمال کر کے ایسے ایسے مناظر دکھاتے ہیں جو ہماری روح اور دل کو زخمی کرنے کے لیے کافی ہیں۔ ان پرندوں کو موسم کی شدت اور خوراک کی کمی وغیرہ جیسے مسائل گھیر لیتے ہیں۔ یہ عمل حالاں کہ ان پرندوں کے لیے نیا نہیں تھا، صدیوں سے یہ عمل جاری تھا لیکن اس سال یہ ہجرت کیوں خاص تھی اس جانب اشارہ کرتے ہوئے اس نئی صورت حال کو شاعر کچھ اس طرح بیان کرتے ہیں:

تو موسموں کا یہ فیصلہ ہے / کہ طائرانِ شمال / برفاب کے ستم سے گھروں کو تج کر / کفن

سفر کی اذیتوں کو قبول کر لیں / کہاں ہے منزل ... کہاں ہے راستے؟ / شمال اپنا نہ

مشرق اپنا / جنوب اپنا نہ غرب اپنا / ہماری دنیا کہاں ہے لاؤ[۲۹۸]

یہ نظم فلسطینی مہاجر کیمپوں کی ایک حقیق تصویر ہے جہاں لوگ ایک ایسے خطۂ اراضی کے متلاشی ہیں جہاں امن و سکون سے جی سکیں۔

تحریکِ آزادئ فلسطین کی نام ور مجاہدہ "لیلیٰ خالد" کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے ضمیر جعفری نے "لیلیٰ خالد" ہی کے عنوان کے تحت ایک نظم لکھی۔ لیلیٰ خالد سر فروشوں کے اس گروہ میں شامل تھیں جنھوں نے فلسطینی گوریلوں کے ساتھ مل کر ہوائی جہاز اغوا کیا تھا۔ اس کے بعد عالمی سطح پر ذرائع ابلاغ میں انھیں موضوع بنایا گیا۔ سید ضمیر جعفری کی یہ نظم اسی پس منظر میں لکھی گئی ہے۔ ۱۹۷۰ء کی یہ نظم، ظاہر ہے اسی واقعے سے متاثر ہو کر لکھی گئی ہے۔ انھوں نے نظم میں لیلیٰ خالد کی قربانی کو اہم قرار دیا۔ ان کے مطابق یہ قربانی رائیگاں نہیں جائے گی اور اس قربانی سے آزادی کا سورج ضرور طلوع ہو گا۔ ملاحظہ کیجیے:

تیری آزادی کے نغمے گائے گی / تیرے آنچل کی ہوا / تیرے خیموں پر گھر برسائے گی

/ تیرے ماتھے کی ضیا / تیرے پھولوں میں لہو دوڑائے گی / تیرے ہاتھوں کی حنا

/ تیرے صحراؤں میں دریا آئے گی / تیری زلفوں کی گھٹا[۲۹۹]

ان کے مطابق لیلیٰ کی شہادت ہر دور اور ہر تہذیب کے لیے ایک مثال ہے۔ مستقبل کی نسلیں اس بات پر ضرور غور کریں گی کہ کس طرح اس مجاہدہ نے موت کی پرواہ کیے بغیر اپنے مستقبل تک کا نہ سوچا اور طیارہ اغوا کر کے بہادری کی ایسی مثال قائم کی جو اس سے قبل خال خال ہی دکھائی دیتی ہے۔

ہر افق، ہر دور، ہر تہذیب کی / روشنی بن جائے گی / موت پر تیرے جھپٹنے کی ادا[۳۰۰]

عرب اسرائیل جنگ کے تناظر میں لکھی گئی ایک اور نظم "حسین کا سبق" شہزاد احمد کی ایک عمدہ نظم ہے۔ ہئیت کے اعتبار سے غزل کے قریب ہونے کی وجہ سے اس نظم میں داخلی جذبات کی عمدہ عکاسی دکھائی دیتی ہے۔ شاعر مسئلہ فلسطین پر اپنی

گہری وابستگی کا ثبوت دیتے ہوئے ۱۹۶۷ء میں ہونے والی آتش زدگی کے پیچھے یہودی سازش کے تانے بانے بننے کے بعد اس واقعے پر اپنے غم و غصے کا اظہار کچھ اس طرح کرتے ہیں:

آگ کی سن کے خبر سینے ہمارے ہوئے شق ہم کو تو مسجدِ اقصیٰ بھی ہے قرآں کا ورق

دشت میں خون نظر آتا ہے چاروں جانب آسمانوں سے زمیں پر اتر آتی ہے شفق

صبر کا وقت نہیں آؤ علم لہرائیں پاٹ دیں رات کی لاشوں سے سحر کے خندق[۳۰۱]

آخر میں وہ جوش و جذبے کو بیدار کرنے اور صبر کا دامن جھٹک کر یہودیوں سے مقابلے کے لیے علم جہاد بلند کرنے کا مشورہ دیتے ہیں۔ اس بابت وہ نواسۂ رسول ﷺ کی مثال پیش کرتے ہوئے اسی طرز فکر کو اپنانے کا مشورہ دیتے ہیں۔ ملاحظہ کیجیے:

سر کٹا دینا جھکانے سے کہیں بہتر ہے ہے ابھی یاد حسین ابنِ علیؓ کا یہ سبق[۳۰۲]

منظور عارف نے بھی مسئلہ فلسطین پر براہ راست متعدد نظمیں لکھیں۔ ان کی معروف نظم ''آئینے کے داغ'' میں ایک مایوس کن فضا دکھائی دیتی ہے۔ مشرق وسطیٰ کے بحران پر لکھی گئی نظموں میں اس نظم کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ اسرائیلی جارحیت کے پس منظر میں لکھی گئی اس نظم میں شاعر نے جو منظر پیش کیا اس کا عکس دیکھیے:

منجمد یوں تو کبھی نہر نہ تھی /خشک ایسا کبھی دریا تو نہ تھا /اس قدر ٹھہری ہوئی، سہمی

ہوئی کب تھی خلیج /تپتے سورج کی تمازت کے طفیل /اتنا ٹھنڈا کبھی صحرا تو نہ تھا /میں

نے دیکھا نہیں محسوس کیا ہے منظر /پھر بھی اک درد کی شدت ہے مرے سینے میں[۳۰۳]

شاعر فطرت اور دیگر مظاہر کے ردعمل کے ذریعے اسرائیلی جارحیت کی شدت کا احساس دلانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ وہ اس صورت حال پر خدا کے حضور سربسجود ہیں اور فطرت کے تحفظ کے لیے فریاد کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ دیکھیے:

جانے کب ہو سازشِ شب ناکام /جانے کب ٹوٹے یہ پھیلا ہوا کہر کا دام /جانے کب

برف سے ماحول کی سل /آپ ہی اپنی حرارت سے پگھلنے کے بہانے ٹوٹے /دھند اور

قہر چھٹے /آئینہ صاف ہو، شفاف ہو کاش /کاش یہ درد کی شدت نہ رہے سینے میں[۳۰۴]

اسی طرح اپنی ایک اور نظم میں وہ قبلۂ اوّل کے پہلو میں تعمیر شدہ مسجدِ اقصیٰ کو نذر آتش کیے جانے والے واقعے پر ان ظالموں کی مذمت کرتے ہیں جنھوں نے یہ قبیح فعل انجام دیا ''قبلۂ اوّل'' کے عنوان سے لکھی گئی اس نظم میں وہ کہتے ہیں کہ:

آتش بازی کرنے والو! /یاد ہے تم کو /کیسی آگ تھی جس کے شعلے /صحراؤں سے

دریاؤں تک /دریا سے میدانوں تک / میدانوں سے کہساروں تک پہنچے تھے /قبلہِ

اوّل ایک عقیدہ ایک نظریہ[305]

قبلہِ اوّل ایک نظریہ ہی نہیں بلکہ مسلم امہ کے لیے بشر کو اوجِ کمال تک پہنچانے کے لیے نبی ﷺ کا پہلا پڑاؤ بھی تھا۔ اس پڑاؤ کے ذریعے انسانیت کو کیا کیا مدارج طے کرنے تھے، شاعر نے اس جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ:

جس جا ہے انسان کی عظمت /شاہ پر جبرئیل کی ہمت /آنے والی صدیوں کی پرواز کی

جرأت /فرش سے اٹھ کر عرش تلک جا پہنچی تھی /اس عظمت، ہمت، جرأت کو

/آگ لگانا کب ممکن تھا[306]

مسجدِ اقصیٰ جو کہ بیت المقدس سے کچھ ہی فاصلے پر قائم ہے، اس کو لگائی جانے والی آگ نے پورے عالم اسلام کو خون کے آنسو رلایا۔ بعض اوقات جذبات کی رو میں بہہ کر شاعر اور ادیب حقائق کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ ایسا ہی کچھ اس نظم میں بھی معلوم ہوتا ہے[307]۔ کیوں کہ قبلہِ اوّل میں لگنے والی آگ کی طرف شاعر نے جو اشارہ کیا ہے وہ حقائق کے برعکس ہے۔ اصل صورت حال یہی ہے کہ یہ آگ مسجدِ اقصیٰ میں لگائی گئی تھی۔

منظور عارف کی ایک اور نظم "وٹو پاور" میں مجلس اقوام عالم کی بے ضمیری کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ دنیا بھر کے مظلوم اقوام اپنے مسائل کے حل کے لیے جب اس عالمی ادارے سے رجوع کرتے ہیں، تو سلامتی کونسل کے رکن ممالک اپنے مفادات کی خاطر ان کے حقوق کو کس طرح پامال کرتے ہیں، نظم میں اس جانب توجہ دلاتے ہوئے عالمی طاقتوں کے دہرے معیار کو سخت تنقید کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ گو کہ اس میں براہ راست فلسطین کا ذکر نہیں لیکن اس کے مخفی پہلو عالمی استعمار کا وہی کردار ہے جو اس حوالے سے تاریخ کا حصہ ہے۔ وہ کونسل جو بڑی کوششوں کے بعد دنیا میں امن قائم کرنے کے لیے بنائی گئی تھی، شاعر کہتے ہیں کہ:

کونسل /امن عالم کی محافظ کونسل /کتنی مظلوم صدیوں کی تمناؤں کا پھل /کتنی ماؤں،

بیواؤں، یتیموں کے بہائے آنسوؤں کا ماحصل[308]

لیکن اس کا کردار کس قدر بھیانک ہے ذرا غور کیجیے:

ظلم تو اس راز میں ہے /چار بھی گر اک طرف ہوں، پانچواں آزاد ہے /ایک جو چاہے

کر لے /پیش ہی ہونے نہ دے /امن عالم میں خلل کا مسئلہ /خون بہتا ہے تو کیا

/رونقیں گر شہر کی ویران ہوتی ہیں تو ہوں /مائیں بچوں کی جو ان لاشوں پہ روتی ہیں تو

روئیں /دلھنیں، بیوائیں بنتی ہیں تو کالی چادریں سر پر رکھیں /گر یہی انصاف ہے تو امنِ
عالم کی محافظ کونسل تو ہی بتا /کس طرح معلوم ہو کہ امن کیا ہے جنگ کیا /قدر دانِ
شانِ جمہوریتِ اقوامِ ارض /تیری جاں پہ خود تری جمہوریت کا خوں ہے قرض[309]

ام ہانی کی نظموں میں عصری آگہی کا عنصر پوری طرح موج زن ہے[310]۔ "مسلمانانِ عالم کے یہ درد انگیز نالے" کے عنوان سے لکھی گئی نظم میں انھوں نے دنیا کے مختلف خطوں میں مسلمانوں سے روا رکھے جانے والے مظالم اور مصائب کو موضوع بنایا۔ اس نظم میں وہ فلسطین کی صورت حال پر کہتی ہیں کہ:

مسلمِ لبنان پر اب ہے عقوبت کی ردا /اور فلسطینی مجاہد کا بھی ہے حال زبوں /قبلہِ اوّل
کے وہ دیدار کو ترسا کرے /آسماں سے روز و شب اک قہر سا برسا کرے[311]

نیّر واسطی کی نظم "دعا" میں بھی شاعر خدا کے ذوالجلال سے معرکہ فلسطین میں فتح و نصرت کے لیے ہاتھ پھیلا رہے ہیں۔ وہ مسجدِ اقصیٰ کے بچاؤ، حضور ﷺ کے نام کو سربلند کرنے اور حیدر کرارؓ کو میدانِ وغا میں بھیجنے کی درخواست کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

لب پہ پھر تذکرہِ بدر و حنین آتا ہے — پھر شہادت گہہِ ایماں میں حسینؓ آتا ہے
تو نے یثرب کے ضعیفوں کو توانائی دی — فقر کو شانِ شہنشائی و دارائی دی
ناتوانوں کو زمانے میں توانا کر دے — بول دینِ شہِ لولاکؐ کا بالا کر دے
شور ہے مسجدِ اقصیٰ کے نگہبانوں میں — بھیج دے حیدرِ کرارؓ کو میدانوں میں
دمِ فریاد ہے دادِ دل ناشاد کو آ! — اے خدا! ناصر اسلام کی امداد کو آ[312]

مذکورہ نظم ۱۹۶۷ء کے سانحے کے فوراً بعد "نوائے وقت" (لاہور) میں شائع ہوئی۔ اس دور کے اخبارات اور رسائل میں اس سانحے کے حوالے سے کافی مواد موجود ہے۔ روزنامہ "حریت" (کراچی) کے پورے صفحے پر صہبا اختر کی مشہور نظم "عرب، افریقا اور خوف" بھی اسی زمانے میں شائع ہوئی۔ اس نظم میں ان مقامات کی اہمیت، ماضی کے تناظر میں اس کا جائزہ، انبیائے کرام کے آثار، ان کے قیام اور سرورِ کائنات حضور ﷺ کی ان مقامات سے قلبی وابستگی کو موضوع بنایا گیا ہے۔ موجودہ تناظر میں جب کہ یہ سرزمین جنگ زدہ علاقوں میں تبدیل ہو چکی تھی شاعر بہادری سے دشمنوں کے عزائم کو خاک میں ملانے کا عندیہ دے رہے ہیں:

جہاں انبیاء کا رہا ہے قیام — خدا نے جہاں خود کیا ہے کلام
جہاں بارشِ نور ہے مستقل — دھڑکتا ہے جس میں محمدؐ کا دل

فقط شرقِ اوسط میں کیوں جنگ ہو　　نہ کیوں ارض مغرب بھی خوں رنگ ہو

نہیں اب کسی دام کے جو غلام　　وہ شیر آ رہے ہیں پئے انتقام[۳۱۳]

ایک اور نظم میں شاعر اپنے عرب بھائیوں کو یہ یقین دلاتے نظر آتے ہیں کہ پوری دنیا کے مسلمان اس جہاد میں ان کے ساتھ شریک ہیں۔ اس کے لیے انھوں نے ''مواخات یثرب'' کی تلمیح استعمال کی جو سرکار دوعالم ﷺ نے قائم فرمائی تھی۔ شاعر اس بابت کہتے ہیں کہ:

عرب میرے بھائی لہو میں نہائے　　جبینوں پہ سینوں پہ سو زخم کھائے

یہودی لٹیروں کے ہم دم بہت ہیں　　کہ اس رازِ وحشت کے محرم بہت ہیں

مگر میرے بھائی تمھارے بھی بھائی　　''مواخاتِ یثرب'' کے سارے فدائی

صداقت کے غارت گروں کو بتا دو　　سماواتِ عالم میں بڑھ کر صدا دو

کہ ہم بھی سراپائے قہر و غضب ہیں　　کہ ہم بھی شریکِ جہادِ عرب ہیں[۳۱۴]

نظم ''فتح کی دعا'' میں نصرت قریشی بھی جہاد میں مصروف سرفروشوں کو بہ نظر تحسین دیکھتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

صفِ باطل سے ٹکراتے رہیں گے مصطفیٰؐ والے　　لڑیں گے بے جگر ہو کر علیِ مرتضیٰؓ والے

سرِ اعدا قلم کرتے رہیں گے لا فتیٰ والے　　فلسطیں میں یہودی کو نہ چھوڑیں گے خدا والے[۳۱۵]

مسجدِ اقصیٰ پر آہ وزاری کرنے والوں میں محسن بھوپالی بھی شامل رہے۔ ''مسجدِ اقصیٰ'' کے عنوان سے لکھی گئی نظم جس میں انھیں بھی اس بات پر گہرا دکھ اور رنج ہے کہ جس فرش پر نقش پائے رسول ﷺ فروزاں تھے، اب وہاں یہود کے بے باک اور گستاخ قدم محو گل گشت ہیں۔ انھوں نے عرب کی قوم پرستی پر طنز بھی کیا اور انھیں احساس دلانے کی کوشش کی کہ اب بھی وہ عرب کہلوانا پسند کریں گے یا مسلمان؟ وہ کہتے ہیں:

آج اس سقفِ منوّر پہ ہے ظلمت کا نشاں　　آج اس ارض مقدس پہ ہیں ناپاک قدم

جس کے ہر ذرّے سے سجدوں کی مہک آتی تھی　　محوِ گل گشت ہیں اس فرش پہ بے باک قدم

نقش پائے شہِ لولاکؐ فروزاں تھا جہاں　　سایہ کفر وہاں رقص کناں ہے، افسوس

قومیت دین کی بنیاد نہیں بن سکتی　　رشتہِ جہد ہے ایمان، کہو گے کہ نہیں

سانحہ ملتِ بیضا کا ہے یہ اہلِ عرب　　اب بھی تم خود کو مسلمان، کہو گے کہ نہیں[۳۱۶]

کیف بنارسی کی ایک طویل نظم ''بیت المقدس'' کی تلاش اس موضوع پر غالباً سب سے طویل نظم کہلائی جانے کی مستحق ہے۔ اس نظم میں شاعر نے چار ہزار سال کی تاریخ کو منظوم انداز میں پیش کر کے دریا کو کوزے میں بند کر دیا ہے۔ بیت

المقدس جو اب قبضۂ غیر میں ہے، اس کی بازیابی کے لیے شاعر کی تڑپ دیدنی ہے۔ ہر شعر کے ساتھ اس کا عربی ترجمہ بھی موجود ہے تا کہ شاعر کے جذبات واحساسات عرب دنیا تک بھی پہنچ جائیں۔ ''تلاش کرتا ہوں'' کی ردیف استعمال کر کے شاعر اس حصے میں گہری معنویت پیدا کر دیتا ہے۔ کیوں کہ شاعر خود بھی متلاشی ہے ماضی کی عظمت کا۔ وہ اس نظم میں عاشقانِ رسول ﷺ سے سوال کرتے ہیں کہ ان کی محبت کہاں دفن ہو گئی۔ آخر میں حضور ﷺ سے دعا بھی کرتے ہیں کہ وہ ان مسائل سے چھٹکارے کے لیے خدا کے حضور ان مظلوموں کی فریاد پہنچائیں[۳۱۷]۔ اس نظم کے چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

تجلّیوں کا سراپا تلاش کرتا ہوں | نیاز پیکرِ جلوہ تلاش کرتا ہوں
مرے حبیبؐ مرے دل کو روشنی ہو عطا | ترے خیال کی دنیا تلاش کرتا ہوں
وہ جس کے لٹنے پہ غیرت نہ آئی ملت کو | وہ نقشِ مسجدِ اقصیٰ تلاش کرتا ہوں
الٰہی بیت مقدس کی جستجو کے سوا | تجھے خبر ہے کہ میں کیا تلاش کرتا ہوں
بتائیں راہ مجھے واعظان ذوالاکرام | میں اپنا قبلۂ اوّل تلاش کرتا ہوں
شکستِ فاش کی ذلّت اٹھائی ملت نے | شعور رہبر دانا تلاش کرتا ہوں
عدو سے چھین لے بڑھ کر جو قبلۂ اوّل | وہ مردِ حُر و جیالا تلاش کرتا ہوں
کدھر چلے گئے دنیا میں عاشقانِ رسولؐ | فضائے یثرب و بطحا تلاش کرتا ہوں
دعائے کیف حزیں مستجاب ہو جائے | رسولِ حقؐ کا وسیلہ تلاش کرتا ہوں[۳۱۸]

رحمان کیانی نے ایک مسدس میں اس سانحے پر اپنے غم وغصے کا اظہار کرتے ہوئے امت مسلمہ کو سخت سست اور مطعون کیا ہے۔ حقیقت یہی ہے کہ اس زمانے میں عرب اور پوری مسلم دنیا اس ایک مسئلے پر بھی یک جہتی کا مظاہرہ نہ کر سکی جس کی اس وقت اشد ضرورت تھی۔ اس بابت شاعر کہتے ہیں کہ:

لعنت خدا کی گردشِ لیل و نہار پر | آپس کی رنجشوں پہ دلوں کے غبار پر
نسل و وطن، زبان کے اس خلفشار پر | اے ملتِ وحید ترے انتشار پر
یہ دن دکھایا ہمیں چرخِ گبود نے | اقصیٰ میں آکے آگ لگا دی یہود نے
چھینیں یہود رہروِ معراجؐ کا پڑاؤ | اور بیربل کی طرح سے تم کھچڑیاں پکاؤ
یہ سازشوں کا روز نیا ایک گل کھلاؤ | سب برملا کہیں گے برا لاکھ تم مناؤ
یکجا نہ ہو سکیں جو محمدؐ کے نام پر | لعنت خدا کی ایسے خواص و عوام پر[۳۱۹]

مذاق العیشی کی نظم "ارض مقدس" میں بھی اس زمانے میں مسلم امہ کے جذبات کی ترجمانی کا احساس ملتا ہے۔ وہ ان مجاہدین کو بڑے فخر کے ساتھ موضوع بناتے ہیں جو اس المیے کے بعد دورِ جدید کے فرعونوں کے آگے سیسہ پلائی دیوار بن گئے۔ شاعر کہتے ہیں کہ:

مل بیٹھے ہیں آپس میں یہود اور نصاریٰ — پھر ارضِ مقدس نے مسلمان کو پکارا
اس سمت سے اس دور کے فرعونوں کی طاقت — اک سمت "غلامانِ محمدؐ" ہیں صف آرا
یہ معرکہ ہے اک حق و باطل کا تصادم — یہ معرکہ طوفان سے ساحل کا تصادم
اسلام کے غازی سوئے میداں ہیں روانہ — پھر تیزی و تندی سے قدم اٹھنے لگے ہیں
ہے پیشِ نظر مسجدِ اقصیٰ کا تقدس — پھر بھولی ہوئی کھا کے قسم اٹھنے لگے ہیں[۳۲۰]

عاطر ہاشمی اپنی نظم "نوجوانانِ عرب" سے خطاب کرتے ہوئے انھیں بھرپور جذبے سے آگے بڑھنے کا درس دیتے ہیں۔ وہ ان کے عزم و حوصلے کو بڑھاتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

ہاں بڑھو اے نوجوانانِ عرب تم تیز گام — مثل برق و باد سے لو دشمنوں سے انتقام
خلق دیتی ہے شہادت، اشجع عالم ہو تم — ان یہودی بھیڑیوں کے واسطے ضیغم ہو تم
یاد رکھو! کفر کو ایماں کی شہ سے مات ہے — رحمتِ یزداں ہمیشہ سے تمھارے ساتھ ہے
حق و باطل کے یہیں پر فیصلے ہونے کو ہیں — سامراجی طاقتیں ساری فنا ہونے کو ہیں[۳۲۱]

اسی طرح خورشید انور اپنی نظم "عرب مجاہدین" کے نام میں پاکستانی مسلمانوں کی جانب سے یقین دلاتے ہیں کہ وہ مشکل کی اس گھڑی میں اپنے عرب بھائیوں کے ساتھ ہیں۔ ملاحظہ کیجیے:

اسلام کے سپوتو! ہم ساتھ ہیں تمھارے — اے صبح کے نقیبو! ہم ساتھ ہیں تمھارے
تم پرتوِ علی ہو مضبوط ہو جری ہو — تم حق کے پاسباں ہو عظمت کی روشنی ہو
ہر عہد ہر فضا میں ہر جنگ ہر وغا میں — میدان تم نے مارے ہم ساتھ ہیں تمھارے[۳۲۲]

اسی طرح سردار اورنگ زیب آزردہ اپنی اور دوسرے لوگوں کے جذبہ ایمانی کو جگاتے ہوئے مجاہدانہ نعرہ بلند کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ ان کی نظم "میں آرہاہوں" میں وہ حق و باطل کی اس جنگ میں خود بھی شمولیت کی خواہش کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

مری محبت / نہیں ہے جغرافیہ کی پابند / میرا جذبہ / نہیں زمان و مکاں کی حد بندیوں میں
آتا / میں اک مسلماں ہوں / مرا خون کھولتا ہے / مرے لہو کے ہر ایک قطرے میں /

مصر و شام بولتا ہے /مرے جواں سخت اور مضبوط بازوؤں میں /حجاز کا انتقامِ خونیں ابل

رہا ہے /میں جا رہا ہوں / خلیج عقبہ کو جا رہا ہوں [۳۲۳]

افسوس کی بات تو یہ ہے کہ یہ تمام نعرے اور رجزیہ نغمے عرب کی قسمت کو نہ بدل سکے۔ بدترین شکست ان کا مقدر بنی۔ بیت المقدس کے قبضے کے بعد روح صلاح الدین بھی تڑپ اٹھی اور دنیاے اسلام میں صف ماتم بچھ گئی۔ یہ شکست پورے عالم اسلام کے لیے باعث ندامت بن گئی۔ مسلمانوں کی بے عملی اور یک جہتی کے فقدان نے انھیں اس حال تک پہنچایا کہ وہ دنیا میں سر اٹھا کر جینے کے قابل نہ رہے۔ رفتہ رفتہ اس سانحے کی شدت میں کمی تو ضرور آئی لیکن یہ زخم ایک ناسور کی طرح آج بھی مسلمانوں کے جسم میں موجود ہے۔ اسی لیے حفیظ تائب جیسے نعت گو شاعر اپنی نظم "یارسول اللہؐ یا انظر حالنا" میں اس سرزمین کے محروم اذاں ہونے کی روداد سناتے ہوئے نوحہ کناں ہیں کہ:

کب سے محروم اذاں ہے سر زمین مرسلیںؑ　　قبلۂ اوّل ہے اہل جور کے زیر نگیں

اک نگاہِ خاص ہے درکار شاہ انبیاءؑ　　یا رسول اللہؐ انظر حالنا [۳۲۴]

عشرت ظفر کی نظم "تن بجولاں ہے اگر ارض فلسطین تو کیا" بھی اس موضوع پر لکھی گئی عمدہ نظم ہے۔ نظم کے پانچ حصے ہیں جن میں شاعر نے فلسطینیوں پر روا رکھے جانے والے مظالم کی داستان سنانے کی کوشش کی ہے۔ اس نظم میں حزنیہ عناصر اس کی اثر پزیری میں اضافہ کرتے ہیں۔ ناامیدی کے گہرے سائے اس نظم میں بدرجہ اتم موجود ہیں۔ مگر شاعر آخر میں فلسطینیوں کا حوصلہ بڑھانے کی غرض سے امید کے جوت بھی جگاتا چلا جاتا ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

تن بجولاں ہے اگر ارض فلسطیں تو کیا؟　　کوچہ و راہ میں رقصاں ہے فراعین تو کیا

یک قلم نرغہ دشمن میں ہے بیت المقدس　　ذرہ ذرہ ہے اگر خون سے رنگیں تو کیا

ظلمت شب میں دہکتے ہوئے گل زار بھی ہیں　　مشرق اوسط میں نئی صبح کے آثار بھی ہیں [۳۲۵]

صیہونیت کے عزائم اور بنی اسرائیل کے جھوٹ اور اختزاع کو تاریخی تناظر میں تحریر کرتے ہوئے شاعر کا کہنا ہے کہ:

کاذب و غاصب و سفاک ہیں گئو سالہ پرست　　یعنی مثلِ حسن و خاشاک ہیں گئو سالہ پرست

ختم ہونے کو ہے اب عہدِ بنی اسرائیل　　کر چکے ہیں رگ و ریشہ میں شیاطین حلول [۳۲۶]

نظم کے آخر میں وہ گھن گرج کا لہجہ اختیار کرتے ہوئے مجاہدین کے جذبۂ ایمانی کو بیدار کرنے کی کوششوں میں مگن دکھائی دیتے ہیں۔ وہ عملی جدوجہد میں شامل مجاہدین کی کوششوں کو سراہتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

یہ فضاؤں میں ابھرتی ہوئی شیروں کی گرج　　جھاڑیوں میں دبکتے ہوئے روباہ و شغال

چشمِ خوں بستہ میں یہ عزم کے طوفاں کی نمود　　دل میں ہر ایک مجاہد کے یہ آتا ہے خیال

نابہ کہ پابہ سلاسل وطنِ مابا شد　　　رقصِ عفریتِ خزاں در چمنِ مابا شد[۳۲۷]

خلیق قریشی نے بھی اپنی نظم "اے خاصائے خاصانِ رُسل" میں مسلمانانِ عرب کی حالت زار بیان کرتے ہوئے اسرائیل کے ہاتھوں شکست کے بعد کی صورت حال کا نقشہ کھینچا ہے۔ وہ حضور اقدس ﷺ کی شان میں اس بد ترین صورت حال سے نکلنے کی درخواست کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

فریاد ہے فریاد یہ سلطانِ عربؐ ہے　　　پامالِ خزاں، حسنِ گلستانِ عرب ہے

وہ طنطنۂِ فتح ظفر خواب تھا اب تو　　　بدلہ ہوا ہر باب میں عنوانِ عرب ہے

بڑھتا ہوا طوفان ہیں یہود و نصاریٰ　　　گرتی ہوئی دیوار دبستانِ عرب ہے

اے سرورِ دارینؐ، خدا کے لیے فرمائیں　　　اس حال میں کیا چارہ و درمان عرب ہے

جز آپ کے امت کی کسے لاج ہے آقاؐ　　　جز آپ کے کون آج نگہبانِ عرب ہے[۳۲۸]

حافظ لدھیانوی بھی اپنی ایک نظم "قصدۂ مدحت و التجا" میں حضور ﷺ سے مدد کی درخواست کرتے ہوئے صیہونیت کے تسلط اور کفر کی یلغار پر مضطرب دکھائی دیتے ہیں۔ وہ ہاتھ پھیلا کر ملتجیانہ انداز میں دعا گو ہیں کہ:

ہے دل گداز عجب صورتِ زبوں حالی　　　حضورؐ! امتِ مرحوم پر نگاہِ کرم

وہ سجدہ گاہِ نبوت، وہ قبلۂِ اوّل　　　وہ جس کی سمت جباہِ رُسلؑ رہی ہیں

وہ ارضِ پاک ہے صیہونیت کے قبضے میں　　　غبارِ راہ میں ہے شور نالہ و ماتم

حضورؐ آج ہے مسلم پہ کفر کی یلغار　　　ہو اس پر بہرِ خدا اک نگاہِ لطف و کرم[۳۲۹]

منظور احمد ڈیسوی کی کتاب "انقلاب انقلاب" کا عنوان ہی در اصل ان کی نہایت پر جوش نظم سے ماخوذ ہے۔ اس نظم میں بھی شاعر امت مسلمہ کو خواب غفلت سے بیدار کرنے کی شعوری کوششوں میں مصروف دکھائی دیتے ہیں۔ ملاحظہ کیجیے:

آہ! وہ بیت المقدس انبیاء کی سرزمیں　　　آج مسلم ہیں جہاں مظلوم و بے بس بالیقیں

وہ زمیں وابستہ ہے معراج ختم المرسلینؐ　　　زندگی اور موت کا یہ مسئلہ کر انتخاب

انقلاب اے مسلمِ محوِ تغافل انقلاب

پنجۂِ صیہونیت اور گنبدِ صخرہ کو دیکھ　　　ہیں زبوں حالی کا منظر ملتِ بیضا کو دیکھ

ہیں یہودی سازشیں اور مسجدِ اقصیٰ کو دیکھ　　　دیکھ اسرائیل پہ چھایا ہے شیطانی شباب

انقلاب اے مسلمِ محوِ تغافل انقلاب[۳۳۰]

ایک اور نظم ''چھوڑ دے تو سارے راگ و رنگ'' میں بھی امت مسلمہ کو جھنجھوڑتے ہوئے وہ عیش و آرام کی راہ ترک کر کے دشمن کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے کی ترغیب دیتے نظر آتے ہیں۔ ملاحظہ کیجیے:

ہیں ارضِ مقدس پر قابض پھر آج یہودی ظلم بپا — تو پردہِ غفلت اب تو اٹھا، ہنگامہ عشرت ختم ہوا

دشمن ملت گھات میں ہیں، کچھ ہوش میں آ اور جاگ ذرا — تاریخ سلف تو دہرا دے اور باطل سے اب جا ٹکرا

چھوڑ تو سارے راگ و رنگ بھڑک رہا ہے شعلہِ جنگ[۳۳۱]

شوق عظیم آبادی نے اپنے نظم ''مسلمانوں سے'' میں مسلمانوں کو ان کے زوال کی وجوہات بتاتے ہوئے آئینہ دکھانے کی کوشش کی ہے۔ وہ ایک نئے عزم و حوصلے کو مجتمع کر کے راہ حق میں جان قربان کرنے کا درس دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

شوق کس حسرت سے منھ تکتا ہے تیرا آسماں — قبلہِ اوّل کی خاطر کیا ہے جانِ ناتواں

تازہ کر دے پھر صلاح الدین کی تو داستاں — راہِ حق میں جان دینا بھی ہے عمرِ جاوداں

کچھ تو کر غافل نہیں کچھ اعتبارِ زندگی — کچھ تو رہ جاتے جہاں میں یادگارِ زندگی[۳۳۲]

پروفیسر عنایت علی خان نے نعیم صدیقی کا انداز اختیار کرتے ہوئے اپنی ایک نظم ''سبب زوالِ امت'' میں مسلمانوں کے متنوع مسائل کا ذکر کیا ہے۔ وہ قوم جس کی دھاک پوری دنیا میں بیٹھی ہوئی تھی آج بے وقعت ہو کر رہ گئی ہے، اس بے وقعتی پر وہ آنسو بہاتے ہوئے پوری دنیا کے مسلمانوں کی حالت پر کہتے ہیں کہ:

کشمیری و افغان ہوں کہ ہوں اہلِ فلسطیں — ہر اک کے تصور سے مری آنکھ ہے نم ناک[۳۳۳]

فلسطینیوں سے اظہارِ یک جہتی کے ضمن میں احمد شمیم کی نظم ''موت سے پہلے اپنا نوحہ'' بھی بہت اہمیت کی حامل ہے۔ یہ نظم سانحہ بیروت کے پس منظر میں لکھی گئی اس لیے ''تل کرم'' شہر ایک بنیادی علامت بن کر ابھرا ہے۔ شاعر نے وہاں پیش آنے والے مظالم پر ''تل کرم'' کی ہوا کی نوحہ خوانی کرتے ہوئے ضمیرِ انسانی کو جھنجھوڑنے کی کوشش کی ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

ہوائے تل کرم / کیوں میرے دروازے پر دستک دے کہ میں لفظوں میں بدبو

کاشت کرتا ہوں/ہوائے تل کرم تیری ردا میں ساری صدیوں کی صداقت ہے/ ...

ہوائے تل کرم[۳۳۴]

اس نظم میں شاعر نے غم و اندوہ کی کیفیت کو عمدہ پیرائے میں بیان کیا ہے۔ دنیا بھر کے پناہ گزین فلسطینی اس دکھ اور سانحے کو جس شدت سے محسوس کر رہے تھے، نظم میں اس کی بھرپور عکاسی کی گئی ہے۔

ہوائے تل کرم!/ وہ گولیوں سے گیت لکھتے تھے/ہوائے تل کرم!/ جب راستہ چننے
کی ساعت آگئی/تو میں نے ٹوٹی سانس کے رسے کو تھامے/عافیت کی راہ اپنالی[۳۳۵]

۱۹۶۷ء کے تناظر میں شہزاد احمد کی ایک نظم "حسینؑ کا سبق" اس مسئلے پر شاعر کی قلبی وابستگی کو ظاہر کرتا ہے۔ غزل کی ہئیت سے قریب تر ہونے کی وجہ سے اس نظم میں داخلیت کا عنصر گہرا ہے۔ وہ اس نظم میں مسجدِ اقصیٰ کو آگ لگانے کی یہودی سازش پر غم والم کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

آگ کی سن کر خبر سینے ہمارے ہوئے شق ہم کو مسجدِ اقصیٰ بھی قرآں کا ورق
دشت میں خوں نظر آتا ہے چاروں جانب آسمانوں سے زمیں پر آتی ہے شفق
صبر کا وقت نہیں آؤ علم لہرائیں پاٹ دیں رات کی لاشوں سے سحر کی خندق[۳۳۶]

مسجدِ اقصیٰ کی بے حرمتی اور اور دشت سینا کو انسانی خون سے رنگ دینے والے مناظر پر وہ غم وغصے کا اظہار کرتے ہوئے صبر کا دامن جھٹک کر ظالموں اور جابروں کے ہاتھ کاٹ دینے کا مشورہ دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

کاٹ دو، قبلہِ اوّل پہ جو ہاتھ اٹھے ہیں ہے اگر دل میں تمھارے ابھی ایماں کی رمق
سر کٹا دینا جھکا دینے سے کہیں بہتر ہے ہے ابھی یاد حسین ابن علیؓ کا یہ سبق[۳۳۷]

سلیم ناز بریلوی نے ریڈیو پر نشر ہونے والی نظم "جاگو جاگو صبح ہوئی" کی تضمین لکھی جس میں امت مسلمہ کے مقبوضات کی آزادی کی نوید سناتے ہوئے امت کو پیغام دیا کہ:

خونِ شہیداں رنگ لایا فتح کا پرچم لہرایا جاگو جاگو صبح ہوئی[۳۳۸]

وہ مسجدِ اقصیٰ کی تباہی وبربادی کا گریہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

مسجدِ اقصیٰ روتی ہے کیوں یہ تباہی ہوتی ہے
جاگ رہے ہیں جہاں یہود امت مسلم سوتی ہے
جاگو جاگو صبح ہوئی[۳۳۹]

بعض شاعرات نے اس انسانی مسئلے کو خالصتاً انفرادی سطح پر دیکھنے کی کوشش کی ایسے میں فرضی کردار بھی تراشے گئے اور اس کے عمل سے اس مسئلے کی سنگینی کی طرف توجہ بھی دلائی گئی۔ فہمیدہ ریاض کی نظم "فلسطین" میں یہی رنگ اختیار کرتے ہوئے شاعرہ نے شدت غم اور دیوانگی کے عالم میں گریبان اور لباس چاک کر کے اپنے آپ کو اپنے ناخنوں سے نوچ نوچ کر لہو تر کر دینے کی کیفیت جس طرح اس سانحے کی شدت کے غم کو موثر انداز میں ظاہر کرتی ہے وہ اس نظم کو کامیابی سے ہم کنار کرتی ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

شدت غم نے فلسطینی کو دیوانہ کیا/ پارہ پارہ کر کے اپنے ننگ کو بوسیدہ بر/ اپنے ناخن کر

کے پیوست گلو/ اپنا پنجہ اس نے اپنے ہی لہو سے بھر لیا[۳۴۰]

ایک ایسا فلسطینی کردار جس سے اس کے وطن کی مٹی چھین لی گئی اور اس پر دوسری قوم کا قبضہ ہو گیا ہے۔ شاعرہ کے مطابق اس روح فرسا سانحے کے بعد ہر فلسطینی کا حال کم و بیش مذکورہ فلسطینی جیسا ہی ہے۔

آخرش دو نیم ہو کر رہ گیا اس کا دماغ/ ریزہ ریزہ ہو گیا اس کا ایاغ/ آہ! لیکن بوجھ سے ہر

رات کے آرام پر/ ان پتا گاہوں سے بھیجے طعنہ و دشنام پر/ دور صحرا میں کسی کے سر پٹخنے

کی صدا/ شدتِ غم سے فلسطینی کو دیوانہ کیا[۳۴۱]

انور حارث بھی اپنی نظم ''مسجدِ اقصیٰ'' میں مسلمانوں کے مقدس ترین مقام کی مظلومیت کی داستان سناتے ہوئے یہود و نصاریٰ کے سازشی کردار کو طنز و تعریض کا نشانہ بناتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ:

مظلوم نہیں زیر فلک کوئی بھی تجھ سا ۔۔۔ سایہ کی طرح وقت پڑا آ کے یہ کیسا

اے مسجدِ اقصیٰ

ہیں درپئے دینِ نبویؐ اہلِ نصاریٰ ۔۔۔ سینا کا قضیہ ہو کے لبنان کا قصہ

اے مسجدِ اقصیٰ

کیا جور و جفا کیا ہے یہودی کی شرارت ۔۔۔ اخلاص عمل ہو تو پلٹ سکتا ہے پانسہ

اے مسجدِ اقصیٰ[۳۴۲]

اسی طرح رئیس الشاکری اپنی نظم ''غم پنہاں'' میں بیت المقدس کی بے حرمتی پر اشک فشاں ہیں۔ ان کے مطابق آج بھی امت حضور ﷺ کے بتائے ہوئے راستے پر چل پڑے تو تمام مشکلات کا خاتمہ ممکن ہے۔ چند شعر ملاحظہ کیجیے:

طاغوت کے قبضے میں ہے ہر شے چلو تسلیم ۔۔۔ مانا کہ بہر سمت ہے دنیا میں اندھیرا

واللہ بدل جائیں زمانے کی ادائیں ۔۔۔ تبدیل ہو تاریکیِ شب نورِ سحر میں[۳۴۳]

فلسطینیوں سے اظہار یک جہتی کرنے والے اور ان سے ہمدردی کے جذبے کے ساتھ نظمیں لکھنے والے ایک اور اہم شاعر صلاح الدین پرویز ہیں۔ ان کی نظم ''بیت المقدس کے نام ایک خط'' میں بیت المقدس کو ایک مجسم صورت میں پیش کر کے اس درد اور کرب کا اظہار کیا جو ۱۹۶۷ء کے سانحے کے بعد اس سے وابستہ رہنے والوں کی زندگی کا حصہ بن چکی تھی[۳۴۴]۔ آس پاس کے لوگوں کی چیخ و پکار اور آزادی کی راہ میں ہوتے بلند نالے کی بابت شاعر کا کہنا ہے کہ:

سنائی کچھ نہیں دیتا/ آوازیں ندارد/ گم صمی کی تیلیوں میں قید ہیں/مٹیاں مٹی کے بچے/اور ان کی بند آنکھوں میں منور تتلیاں/سنائی کچھ نہیں دیتا/بشارت دینے والی آنکھ ہوتی ہے[۳۴۵]

شاعر پر حزن وملال کی کیفیت طاری ہونے کی وجہ بیت المقدس کی وہ صورت حال بنی جس نے پورے عرب کی بے عملی کو ظاہر کر دیا تھا۔ شاعر پوری مسلم امت کو "لذت لیلیٰ کے پانی سے بندھی" قوم قرار دیتے ہوئے کہتا ہے کہ:

نظر آتا ہے بس اک ریت کا بیت المقدس/اور ہم، بے پاؤں والے سنگِ سر/اپنے ہاتھوں میں دبوچے سب غروبِ آبلہ پائی کے منظر/لذتِ لیلیٰ کے پانی سے بندھے سوتے ہیں/سنتے ہی نہیں/اونٹوں کے پاؤں کی دھمک/اور ان کے سرر کوہانوں سے لپٹی/باوضو رفتارہا، چلتی ہوا، آتش میں بجتی گھنٹیاں[۳۴۶]

سانحہ بیت المقدس نے ان کا سکون و قرار چھین لیا تھا۔ وہ راتوں کو بے خوابی کا شکار ہو چکے تھے۔ اس صورت حال کے بیان میں ان کا کہنا تھا کہ:

سویرے نیند کی اینٹوں کا خیمہ جاگتا ہے/نیند کے کاسوں میں بھر کے نیند سو جاتا ہے/پھر بھی نیند آتی ہے … /نہیں آتی ہے، پھر بھی نیند آتی ہے/ہمیں سونے دے تھوڑی دیر/اے بیت المقدس/نیند آتی ہے/ہمیں کچھ نیند آتی ہے[۳۴۷]

ان کی ایک اور نظم "فلسطینی مسافر کے نام ایک خط" بھی اسی جذبے کی آئینہ دار ہے جس میں یہ فلسطینی مسافر جو کئی بچوں کا باپ ہے، ایک ماں کا بیٹا اور خوب صورت عورت کا خاوند تو تھا ہی لیکن ان سب سے بڑھ کر وہ بندوق تھامے عزم وہمت کا پیکر اپنے وطن سے محبت کا دم بھرنے والا مجاہد بھی ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

ایک مسافر جس کا چہرہ جلا ہوا/ایک مسافر جس کا سینہ کھلا ہوا/لیکن آنکھیں اس کی آنکھیں آج بھی دل مین مدفن ہیں/اس کا دل اس کی دھڑکن آج بھی آنکھ میں روشن ہے[۳۴۸]

فلسطینی مجاہدین کی حوصلہ افزائی کے ضمن میں صلاح الدین پرویز کی ایک اور نظم "لا الہٰ الا اللہ" میں ترانے کا رنگ غالب ہے۔ شاعر کا کہنا ہے کہ:

ہم شامیانوں اور خیموں میں کب تھے رہنے والے/ہم صحرا کے بادل ہیں ہم دھوپ میں بسنے والے/ریت اڑا کرتی ہے ہر دم سینوں کی آتش میں/ہم جو چاہیں اس کو بجھا

دیں آنکھو کی بارش میں/جب یہ جہاں افروز ہوا ہم/اس دن بھی تھے زندہ/ہم ہی شب ماتے ہیں، بھیّا/ہم ہی صبح رمیدہ[۳۴۹]

اختر صدیقی کی نظم ''اے انقلاب اے انقلاب'' میں ٹیپ کے اس مصرعے ''انقلاب اے ساکنانِ شرقِ وسطیٰ انقلاب''[۳۵۰] نے گھن گرج کی فضا پیدا کر دی ہے۔ ''بنت اقصیٰ'' اس موضوع پر لکھی گئی عمدہ نظموں میں سے ایک جو محمود شام کی تخلیق ہے۔ شاعر اس نظم میں مسجدِ اقصیٰ کو آگ لگائے جانے والے واقعے پر نوحہ خوانی کرتا دکھائی دیتا ہے۔ ان کے مطابق اس آگ سے اٹھتے ہوئے دھویں نے لاکھوں مسلمانوں کے دلوں پر بجلیاں گرائیں۔ حشر کے اس منظر پر غم والم کا اظہار کرتے ہوئے شاعر کہتے ہیں کہ:

بنت اقصیٰ! اپنی آنکھوں ہم نے دیکھا ہے دھواں — وہ دھواں، جس سے گری لاکھوں دلوں پر بجلیاں
ہم نے دیکھا ہے وہ منظر حشر سے جو کم نہیں — قبلہِ اوّل! ملے گی اب کہاں ہم کو اماں[۳۵۱]

وہ امت مسلمہ کی بدحالی اور بے عملی پر افسردہ بھی ہیں اور اس بے عملی پر شرمندگی کا اظہار کرتے بھی دکھائی دیتے ہیں۔ مصلحتوں کے اسیر ہو کر عرب جس قدر ذلیل ورسوا ہو رہے تھے، اس منظر کو دکھاتے ہوئے شاعر کا کہنا تھا کہ:

گردنیں خم ہیں ہماری تجھ سے شرمندہ ہیں — جل رہے ہیں یہ در و دیوار اور ہم زندہ ہیں
ہم اسیر مصلحت ہیں ہم قتیل گرم و سرد ہیں — خود فریبی کی مثالیں ہم سے ہی پائندہ ہیں[۳۵۲]

بہ ظاہر دوست ہونے کے باوجود جس طرح سامراجی طاقتیں دوستی کے لبادے میں مسلم دشمنی کر رہی تھیں، اس پر تلخ انداز میں شاعر دنیا کے تمام مظلوموں کو مخاطب کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

ایک ہی دشمن ہے اپنا، صورتیں اس کی ہزار — ہم ہی ہیں اس کے رفیق اور ہم ہی ہیں اُس کا شکار
وہ ہے اپنا دوست بھی اور آستیں کا سانپ بھی — ہوشیار اے ایشیا و افریقا ہوشیار[۳۵۳]

ظاہر ہے اس زمانے میں اسرائیلی کارروائیوں کو مکمل طور پر امریکی حمایت حاصل تھی۔ پاکستان سیٹو اور سینٹو کے تحت امریکی بلاک سے منسلک تو ضرور تھا لیکن مسجدِ اقصیٰ کو نذر آتش کیے جانے والے واقعے کے بعد عوامی رد عمل خاصا سخت تھا۔ محمود شام نے اس صورت حال پر حکومتی حلقوں کو بھی تنقید کا نشانہ بناتے ہوئے کہا کہ:

ہم ہیں اب سیٹو کے گرفتار اور سنٹو کے اسیر — ہم ہی اب اس کا ہدف ہیں، ہم ہیں جس ترکش کے تیر
ہم ہی ان ہاتھوں کو اب تک قوتیں بخشا کیے — بڑھ کے اب جو ہو گئے ہیں اپنے دامانِ گیر[۳۵۴]

۱۹۶۹ء میں لگائی جانے والی اس آگ نے حقیقتاً مسلم دنیا میں بھی زبردست آگ بھڑکائی۔ اس سانحے سے دنیا کے طول وعرض میں پھیلے مسلمانوں میں غم وغصے کی لہر دوڑ گئی۔ ان کے جذبات بری طرح مجروح ہوئے، پوری دنیا میں اسرائیلی جارحیت

کے خلاف احتجاج شروع ہو گیا۔ مسلماں حکمراں بھی وقتی طور پر ہی سہی، خاصے متحرک نظر آئے۔ شعرا نے ملی جذبے سے مغلوب ہو کر آوازِ فغاں بلند کی اور اپنے احساسات کو شعری جامہ پہنایا۔ شورش کاشمیری کی نظم ''قبلۂ اوّل مسجدِ اقصیٰ'' کا حوالہ مذکورہ بالا صفحات میں کیا جا چکا ہے۔ صہبا اختر نے بھی اس حوالے سے بڑی پر جوش نظمیں کہیں۔ اپنی طویل نظم ''سلطان صلاح الدین ایوبی'' میں انھوں نے عالم اسلام کے اس عظیم فاتح کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے ایک بار پھر صلاح الدین ایوبی جیسا بہادر عطا کرنے کی درخواست ربِّ کائنات کے حضور کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ:

مسجدِ اقصیٰ کے بام و در ہیں محرومِ سجود — سرنگوں کب تک نہ ہو گا پرچمِ ظلمِ یہود
اہلِ حق کے خوں میں غلطاں، دستِ استبداد ہے — اے خدا فریاد ہے، فریاد ہے، فریاد ہے
مسجدِ اقصیٰ کی خاکستر زمیں فریاد ہے — عالمِ اسلام کی روحِ حزیں فریاد ہے
آج پھر روحِ محمدؐ پر فدا کر دے ہمیں — اک صلاح الدین ایوبی عطا کر دے ہمیں[۳۵۵]

اسی طرح روزنامہ ''مشرق'' میں لکھے گئے ایک قطعے میں ملت اسلامیہ کو قبلۂ اوّل کی قسم دے کر حضور اقدس ﷺ کے نقشِ قدم کو تلاش کرنے کی طرف توجہ مبذول کرواتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

قبلۂ اوّل کی تجھ کو ہے قسم — سربکف ہو ملتِ خیر الاممؐ
سر بلندی چاہیے تو کر تلاش — صاحبِ معراجؐ کے نقشِ قدم[۳۵۶]

خلیق قریشی بھی مسلمانوں کو ''مسجدِ اقصیٰ'' کی عظمت کی یاد دلاتے ہوئے یہ باور کراتے ہیں کہ یہی وہ مقام ہے جہاں کائنات کے رہبر ﷺ کا ورود مسعود ہوا تھا۔ اسی لیے ہر مسلمان پر اس کی حفاظت فرض بھی ہے اور اس کو یہود کے پنجوں سے چھڑانا قرض بھی۔

عظمتِ مسجدِ اقصیٰ کی خبر کس کو نہیں — ہادیِ سرورِ برحقؐ پہ سلام اور درود
شبِ معراج پہ تھا مسجدِ اقصیٰ کا مقام — کہ ہوا اس میں شہنشاہِ دو عالمؐ کا ورود
ہر مسلماں پہ ہے فرض اس کی حفاظت بے شک — اب سے ہم اس کی حفاظت کی ضمانت دیں گے
خوں سے لکھیں گے تاریخ کے یہ باب، خلیق — خوں کے ہر قطرے سے ہم اس کی شہادت دیں گے[۳۳۰]

تنویر الدین احمد پھول کی نظم ''خوابِ غفلت سے ہو بیدار'' میں بھی شاعر ملت کے ہر فرد کو مخاطب کر کے پر جوش انداز میں عزم و شجاعت دکھانے کی ہدایت کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ انھوں نے جو انداز اختیار کیا وہ نظم میں ایک گھن گرج کی فضا پیدا کرنے کا سبب بنا۔ ملاحظہ کیجیے:

ربِّ کعبہ کی قسم، حرمتِ مکہ کی قسم
شاہِ بطحاؐ کی قسم، گنبدِ خضرا کی قسم

دشمنِ دین کو دنیا سے مٹا کر دم لے
ارضِ اقصیٰ کی قسم، قبلہِ اولیٰ کی قسم

تجھ کو اسلام کی عظمت کا امیں بننا ہے
بیت اقدس کی قسم، گنبد صخرا کی قسم

تجھ کو بو بکرؓ، عمرؓ، حیدرؓ و عثماںؓ کی قسم
تجھ کو شبر کی قسم، شاہِ شہیداں کی قسم

باغِ ایمان کا ہر پھول صدا دیتا ہے
"خوابِ غفلت سے ہو بیدار" ندا دیتا ہے[۳۵۸]

انعام درّانی کی نظم "شب معراج" میں بھی اس دگر گوں حالت کی منظر کشی کی گئی ہے۔ انھوں نے مسجدِ اقصیٰ میں لگی آگ کو اپنے اشکوں سے بجھانے کی ناکام کوشش بھی کی۔ فرماتے ہیں:

کیفیت احساس ہے امسال دگرگوں
یاد آئی ہے اقصیٰ کی لگائی شبِ معراج

عشّاق نبیؐ بیٹھے بچھا کر صفِ ماتم
ہر دل میں جلن سی ہے ہر اک آنکھ ہے پر نم

کام آتی ہے کب ایسے میں خاموشیِ احساس
اشکوں کے یہ قطرات ہیں اظہار کے شبنم

ایسے میں ضروری ہے کہ دیوانہ کوئی آئے
سلگائے کچھ ایسی کہ بھڑک جائے جہنم[۳۵۹]

لکھنؤ سے نکلنے والے ماہ نامہ "رضوان" کے مسجدِ اقصیٰ نمبر میں بھی متعدد ایسی نظمیں شائع ہوئیں جن میں اس سانحے کو موضوع بنایا گیا۔ مذکورہ بالا صفحات میں نعیم صدیقی کی نظم "یروشلم یروشلم" کا حوالہ درج کیا گیا۔ ان کی یہ نظم "بہ زخم دل بہ چشم نم" کے عنوان سے ابتداً اسی شمارے میں شائع ہوئی[۳۶۰]۔ اسی شمارے میں محمد ثانی حسنی کی ایک نظم بہ عنوان "دیدہِ تر سے" بھی شائع ہوئی۔ اس نظم میں بھی شاعر نے سوال وجواب کے انداز میں ایک مرد قلندر سے مسجدِ اقصیٰ کی تباہی وبربادی کا سبب پوچھا ہے۔ بعد میں قلندر نے ان اسباب کا تعین کر کے اس کے حل کی تجاویز بھی دی ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

کیا شکوہ کسی نے جا کے یوں مردِ قلندر سے
عطا ہو غیر کو عزت جو اپنا ہو وہی ترسے

یہ کتنا روح فرسا انقلابِ شرقِ اوسط ہے
عرب کے سورما پسپا ہوئے صیہونی لشکر سے

قلندر نے یہ فرمایا تم اس کے پاس آئے ہو
کہ جس کے دل میں خود ناسور ہے اس حالِ ابتر سے

ضرورت ہے صلاح الدین ایوبی سے قائد کی
صلیبی طاقتوں کو توڑ دے جو ایک ٹھوکر سے

انھیں جیسے جوانوں کی اب امت کو ضرورت ہے
نہائیں جو خدا کے راستے میں آبِ خنجر سے

دلوں میں جن کے روشن ہوں یقین وعزم کی شمعیں
محبت ہو خدا سے، عشق ہو اس کے پیمبرؐ سے[۳۶۱]

ریاض حسین چودھری نے "استغاثہ اور جواب استغاثہ" میں اس صورت حال پر لکھا کہ:

اُٹھ رہے ہیں مسجدِ اقصیٰ سے شعلے آج بھی	جن میں تیرئے نقشِ پا کی رفعتوں کا ہے گلال
کیا مسلماں کٹ نہ جائیں گے ترئے ناموس پر	تیریؐ تربت پر نظر ہے اہلِ شر کی یہ مجال
سینۂ افگار سے رستا ہے زخموں کا لہو	دیکھ! تیریؐ رحمتوں سے میں نے پوچھا ہے سوال[۳۶۲]

اس کے بعد جوابِ استغاثہ میں ملت کے مسائل کے حل کی بابت کہا کہ:

بے حسی کو مت چھپا مظلومیت کی آڑ میں	زہر قاتل ہے یہی احساسِ ملت کا زوال
غیر کی امداد کے طالب نہ تم ہوتے کبھی	کچھ بھی ناموسِ پیمبرؐ کا اگر ہوتا خیال
مسجدِ اقصیٰ کے میناروں سے اٹھتا ہے دھواں	جانتے ہیں ہم کہ ہے ارضِ فلسطیں پر ملال
ہاں فقط جوشِ عمل میں منزلوں کا ہے سراغ	بے بسی، کم ہمتی دونوں دل و جاں کا وبال
ڈھونڈ لے صدیق اکبرؓ کے سراغِ نقشِ پا	جذبۂ فاروق اعظمؓ کو رگ و پے میں اچھال[۳۶۳]

اپنی ایک اور نظم ''یومِ مسجدِ اقصیٰ'' میں بھی پوری ملت اسلامیہ پر طنز کے نشتر چلاتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

ہے داغ داغ مسجدِ اقصیٰ کی چاندنی	جانِ بلالؓ تیری بلاغت کو کیا ہوا
اقصیٰ کا حادثہ کسی محشر سے کم نہیں	لیکن مرے خدا، وہ قیامت کو کیا ہوا
اقصیٰ کا دن منائیں بڑے شوق سے مگر	اتنا بتا دیں آپ کی غیرت کو کیا ہوا
دربارِ مصطفیؐ میں چلو سر کے بل چلیں	فریاد یا نبیؐ! ترئ امت کو کیا ہوا[۳۶۴]

روزنامہ ''جنگ'' کراچی میں بھی ''کلام شاعرات'' کے عنوان کے تحت بلا عنوان چار منظومات شائع کی گئیں۔ ان تمام منظومات کا موضوع بھی ارضِ مقدس ہی تھا۔ محترمہ عزیز بدایونی مسجدِ اقصیٰ میں لگی آگ کو آتش نمرود قرار دے کر عزم حسینی کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے کہتی ہیں کہ:

وہ دیکھ خداوندِ جہاں دیکھ رہا ہے	وہ آگ وہ شعلوں کا دھواں دیکھ رہا ہے
حق، مسجدِ اقصیٰ کا سماں دیکھ رہا ہے	باطل کو نہیں جائے اماں، دیکھ رہا ہے

اے دیں محمدؐ کے پرستار خبردار!
اے ارضِ مقدس کے وفا دار خبردار[۳۶۵]

بیگم مسیح الدین کی نظم ''اٹھو صیہونیت کے دیوانے پھر سر اٹھایا ہے'' میں قبلۂ اوّل کے تحفظ کے لیے اٹھ کھڑے ہونے کی تلقین کی گئی ہے۔

اٹھو صیہونیت کے دیو نے پھر سر اٹھایا ہے ہمارے قبلۂ اوّل پہ پھر قبضہ جمایا ہے

ہماری غیرت و ناموس کا خاکہ اڑیا ہے ہماری بے حسی سے آج یہ دن ہم پہ آیا ہے

مسلمانوں اٹھو! اللہ کی للکار ہو جاؤ اٹھو! بہرِ خدا چلتی ہوئی تلوار ہو جاؤ[۳۶۶]

فیروز الدین فیروز نے بھی مسجدِ اقصیٰ کے تحفظ کی خاطر سر کٹانے کے عزم کا اظہار کیا۔ ان کی نظم ''مسجدِ اقصیٰ ہمارا قبلۂ اوّل ہے تو'' میں ان جذبات کا اظہار کرتے ہوئے کہا ہے کہ:

مسجدِ اقصیٰ! تو ہے اسلام کی آنکھوں کا نور تیرے سینے پہ درخشاں ہے کفِ پائے حضورؐ

تیری عظمت کو بچانے کے لیے تیار ہوں تیری خاطر سر کٹانے کے لیے تیار ہوں[۳۶۷]

رضیہ نور امروہوی اس سانحے پر اس قدر دل گرفتہ ہیں کہ وہ زندگی کی کوئی بھی خوشی یہاں تک کہ عید بھی منانے سے گریزاں ہیں۔ اپنی نظم ''عید مناؤں کیسے'' میں وہ قبلۂ اوّل کی عظمت رفتہ کی بحالی کی خواہش کا اظہار کرتے ہوئے مسلمانوں کو خواب غفلت سے جگانے کی کوشش کرتی دکھائی دیتی ہیں۔ ملاحظہ کیجیے:

اپنی روٹھی ہوئی عظمت کو منالوں پہلے دینِ احمدؐ کی میں شوکت کو بڑھا لوں پہلے

جزبۂ شوقِ شہادت کو جگا لوں پہلے دشمنِ دین کو دنیا سے مٹا لوں پہلے

ہم نشیں تو ہی بتا عید مناؤں کیسے

جان دینا ہے ابھی قبلۂ اوّل کے لیے خوں بہانا ہے مجھے کفر کے باطل کے لیے

تند موجوں سے لڑوں گی ابھی ساحل کے لیے راہ دشوار سہی گو مری منزل کے لیے

ہم نشیں تو ہی بتا عید مناؤں کیسے[۳۶۸]

سرور انبالوی نے بھی ''ارض فلسطین کی فریاد'' کے عنوان سے ایک نظم لکھی۔ اس نظم میں بھی فلسطین کی دگر گوں حالت کا نقشہ کھینچتے ہوئے اپنے احساسات کو یوں قلم بند کیا ہے:

آتش و آہن کی بارش اور دھواں بارود کا عقل حیراں امن کی دیوی کو آخر کیا ہوا

ہنستے بستے شہر بمباری سے کھنڈر ہوگئے آدمی نے آدمیت کو بھی ننگا کر دیا[۳۶۹]

شاعر اس نظم میں انسان کے ہاتھوں انسانیت کی تذلیل، سرِ بازار حوا کی بیٹی کے بے ردا ہونے اور ننھے منھے بچوں کی خون میں نہائی نعشوں پر گریہ وزاری کرتے ہوئے امن کے سوداگروں کے ضمیر پر دستک دینے کی کوشش کر رہے ہیں[۳۷۰]۔ وہ اہلِ فلسطین کی ہجرت اور در بدری پر دنیا بھر کے لوگوں سے انصاف طلب کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

یہ فلسطینی رہیں گے در بدر یوں تا کجا کوئی چارہ بھی تو ہوگا آخر ان کے درد کا[۳۷۱]

نظم کے آخر میں وہ فلسطینیوں کی فتح کی نوید سناتے ہوئے ظلم و جبر کے خاتمے کے دن کا اعلان کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

معرکہِ بیم و رجا میں وہ فلسطینیوں کو منزل تک پہنچنے کی جدوجہد میں ثابت قدم رہنے کی تلقین کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

ٹل نہیں سکتا کسی صورت بھی لکھا وقت کا — ہو گا آزاد ایک دن آخر فلسطیں دیکھنا

اور سفینہ غرق ہو گا جبر و استبداد کا[372] — آخرش بازو کٹے گا ایک دن صیاد کا

اس مسئلے پر ڈاکٹر اسلم فرخی نے بھی نوحہ خوانی کی ہے۔ ان کی نظم ''فلسطین'' کی ابتدا ہی میں وہ لٹی عصمتوں اور بے دریغ انسانی جانوں کے زیاں پر وہ غم گین دکھائی دیتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ:

ڈوبا ہے لہو میں کیوں فلسطین — ہے اس کے لہو سے کس کی تزئین

ہے قبلہِ اوّل ایک فریاد — انسانی درندگی کی روداد

ہر گام پر قتل آدمیت — تعزیر، عقوبت اور ذلت

ہر گام پر ظلمتوں کے پہرے — لٹتی ہوئی عصمتوں کے نوحے[373]

صیہونی مظالم کا رد عمل آزادی کی جدوجہد کی صورت میں سامنے آ چکا تھا۔ ہر شخص اسرائیلی جارحیت کے خلاف شمشیر بکف دکھائی دیتا تھا۔ بے حسی کی بنیاد پر استوار کیا گیا عالمی نظام سیاست مظلوموں کی حمایت کے بجائے خاموش تماشائی بنا ہوا تھا۔ عالمی ضمیر سو رہا تھا۔ مسلمانوں کی تباہی کا تماشا دیکھ کر لطف اٹھانے والوں کی تعداد دن بدن بڑھتی جا رہی تھی۔ اس صورت حال پر شاعر نے لکھا کہ:

بے چہرہ ہوئے گلاب چہرے — سنگینوں کے سائے میں پلے تھے

آتا ہے نظر یہاں سراپا — بندوق سے آدمی کا رشتہ

گولی، سنگیں، برقی صدمے — اس دیس میں طور زندگی کے

انسان کو مٹا رہا ہے انساں — محبس میں بدل گیا گلستاں

عربوں کا لہو پکارتا ہے — دنیا کا ضمیر سو رہا ہے[374]

اکرم باجوہ بھی پنجابی کے ساتھ ساتھ اردو کے بھی عمدہ شاعر سمجھے جاتے ہیں۔ انھوں نے عرب کے ایام جاہلیت کے عظیم شاعر امراؤالقیس کے ایک شعر کا مفہوم ''میرے دوست آؤ چند لمحوں کے لیے یہاں رک جائیں کبھی اس جگہ میں میری محبوبہ کے خیمے ہوا کرتے تھے'' کو مرکزی نقطہ سمجھ کر ارضِ فلسطین پر ایک نظم لکھی۔ اس غیر مطبوعہ نظم کا عنوان ''کھنڈر'' ہے۔ وہ اس نظم کا آغاز اس طرح کرتے ہیں:

ہم سفر روک لے رہوارِ حسیں روک بھی لے آ کے اس قریہ محبوب کے آثاروں پر
آج آئے ہیں تو پھر بیٹھ کے دم بھر رو لیں آ کے اس خاکِ معطر کے حسیں زانوں پر
طفلِ معصوم کی مانند گھڑی بھر سو لیں[۳۷۵]

شاعر ماضی کے دریچوں میں جھانکتے ہوئے نہایت رومانوی انداز میں ان حسین یادوں میں کھو جانا چاہتا ہے جس میں ہر جانب مہکتے پھولوں کی خوشبو، قمر چہرہ، پریزادیوں اور جوانانِ رعنا کا تذکرہ کر کے موجودہ عہد کی تیرہ و تار فضا میں پھیلی بارود کی بو دامنِ شب میں سلگتی ہوئی نعشوں اور دشتِ پُر ہول میں یاروں کے بہتے ہوئے لہو پر ماتم کرتے ہوئے شاعر کا کہنا ہے کہ:

ان منڈیروں میں کبھی طلعتیں لہراتی تھیں اُن خرابوں میں برستے تھے وفا کے بادل
آج اک سحر کی زد میں ہیں یہ برباد مکاں مٹ گئے جیسے کسی کتبۂ شاہی کے حروف
مٹ گئے جیسے مٹا کرتے ہیں محلوں کے نشاں کون وہ آنکھ ہے اس حال پہ جو روئی نہیں
اب یہاں کوئی نہیں، کوئی نہیں، کوئی نہیں[۳۷۶]

سید مطلوب علی مطلوب کا شعری دیوانِ ''صبوحی'' کے نام سے شائع ہوا۔ یہ دیوان چودہ مختلف لمعات پر مشتمل ہے۔ ان لمعات میں تمغۂ یازدہم اور تمغۂ چہاردہم خاص طور پر مشہور ہوئے۔ جو بالترتیب طنز و مزاح اور منظومات برائے اطفال پر مشتمل ہیں۔ دونوں میں ہلکے پھلکے فکاہیہ انداز میں مختلف موضوعات پر شعر کہے گئے ہیں۔ ان لمعات کے مطالعے سے شاعر کے فہم و فکر کی گہرائی اور امت مسلمہ کا درد صاف دکھائی دیتا ہے۔ شاعر اپنے شان دار ماضی پر فخر، اپنی تہذیب سے جڑے رہنے اور اغیار کی سازشوں سے ہوشیار رہنے کی تلقین کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ بالخصوص بچوں کے لیے لکھی گئی نظم ''بڑی اور چھوٹی'' دو بہنوں کی گڑیوں اور گڈوں کی کہانی کو نہایت خوب صورت انداز سے پیش کرتے ہوئے گڈی اور گڈے کی لڑائی کے دوران امریکی باگڑ بلے کا آدھمکنا اور آن کی آن میں نفرت کی خلیج کو بڑھا دینے کے قصے کو پیش کرتے ہوئے شاعر نے بڑی مہارت سے کام لیا ہے۔ دونوں بہنیں بالآخر اس سازش کو سمجھ جاتی ہیں اور دونوں مل کر باگڑ بلے کو مار بھگاتی ہیں۔ طنز و مزاح کے انداز میں ہی لکھی گئی ایک اور نظم ''یو۔ این۔ او۔'' میں وہ بچوں کو پہیلی کے انداز میں ''یو۔ این۔ او۔'' کا مطلب سمجھاتے دکھائی دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ:

ایک پہیلی بوجھو بچو! کیا ہے بتاؤ یو این او یو ایس اے کا یو ہے اور باقی سب ہے نو ہی نو
شام سویرے یہ ڈائن امریکا کے گُن گاتی ہے مظلوموں پر آفت آئے بہری یہ بن جاتی ہے[۳۷۷]

پھر آگے چل کر فلسطینیوں اور عربوں کے معاملے میں اقوام متحدہ کے کردار پر طنزیہ انداز میں مظالم کا پردہ چاک کرتے دکھائی دیتے ہیں:

عربوں کی دولت کے بل پر ہر دم عیش اڑاتی ہے اسرائیل کے سانپ سے اُن کو آئے دن ڈسواتی ہے[۳۷۸]

خالد سہیل نے ایک سیّاح کی جذباتی آنکھ سے فلسطین کا لہو رنگ منظر دیکھا۔ شاعر کے مطابق بنی اسرائیل اور بنی اسماعیل دونوں حضرت ابراہیمؑ کی اولاد ہیں۔ یروشلم شہر اس بھائی چارے اور نسلی تعلق کی عمدہ مثال تھا۔ لیکن اب یہاں کے لوگ ایک دوسرے کے خون کے پیاسے دکھائی دیتے ہیں۔ ایک باپ کی اولاد ہونے کے باوجود یہاں دشمنی کی روایت زوروں پر ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

نفرت بھی عجب اور محبت بھی عجب تھی اس شہر میں قربت کی روایت بھی عجب تھی

دیواریں تھیں ہم راز مگر دل میں خلیجیں ہم سایوں کی آپس میں رفاقت بھی عجب تھی

اک باپ کی اولاد مگر خون کے پیاسے دشمن تھے مگر ان میں شباہت بھی عجب تھی

خاموشی کا ہر لمحہ وہاں چیخ رہا تھا آوازوں کی بستی میں بغاوت بھی عجب تھی[۳۷۹]

پوری نظم دراصل انسانیت کا نوحہ ہے۔ خالد سہیل کی یہ نظم ان کے شعری مجموعے میں ''اسرائیل'' کے نام سے درج ہے۔ انھوں نے اس خطے کی سیاحت کے دوران جو کچھ بربریت کے مناظر دیکھے، معصوم چہروں پر لہو کے چھینٹے دیکھے تو بے اختیار یہ کہنے پر مجبور ہوئے کہ:

معصوم جبینوں پہ ملے خون کے چھینٹے اور اس پہ ستم خون کی رنگت بھی عجب تھی

جو شخص ملا کانچ کا پیکر لگا مجھ کو اور کانچ کے پتھر سے رفاقت بھی عجب تھی

ہر نسل نئی نسل کو دیتی رہی ہتھیار اس شہر میں خالد یہ روایت بھی عجب تھی[۳۸۰]

ان کی شاعری کا سادہ اسلوب اور پر اثر انداز قاری کو ایک لمحے کے لیے سوچنے پر ضرور مجبور کر دیتا ہے۔ ان کی دوسری نظم ''یروشلم'' میں بھی یہی انداز جھلکتا ہے۔ اس شہر کی تاریخی اہمیت کے پیش نظر یہود و نصاریٰ اور مسلمان سب ہی یکساں طور پر اس سے عقیدت رکھتے ہیں۔ شاعر اس شہر کی حیثیت اور مقام پر نازاں اور اسے بنانے، سجانے اور سنوارنے میں تینوں امتوں کی کوششوں کو سراہتے ہوئے کہتا ہے کہ:

براہیمؑ کا شہر کہ جس میں/ بنیادوں کو محکم کرنے/امن نے مٹی، عشق نے گارا/ قربانی
کے پتھر ڈالے/ابراہیمؑ کا شہر کہ جس کی/دیواروں کو اونچا کرنے/موسیٰؑ، عیسیٰؑ اور
محمدؐ/اپنی اپنی امت لائے[۳۸۱]

لیکن شاعر اس شہر کی تباہی و بربادی پر کف افسوس بھی ملتا دکھائی دیتا ہے۔ اخوت اور بھائی چارے کی بنیاد پر تعمیر کردہ اس شہر "یروشلم" سے جب شاعر کا گزر ہوا تو یہ تمام روایات اسے ماضی کا قصہ دکھائی دیں۔ اس نے یہاں لوگوں کو باہم دست و گریباں دیکھا۔ شاعر اس منظر کو پیش کرتے ہوئے کہتا ہے کہ:

آج جو میں اس شہر سے گزرا/ایک عجب ہی منظر دیکھا/بنیادوں کو خون اگلتے/میناروں کو

آہیں بھرتے/ہم سایوں کو لڑتے دیکھا/انسانوں کو مرتے دیکھا[۳۸۲]

پوری نظم میں کہیں بھی مذہبی اختلاف اور شدت پسندی کے جذبات موجود نہیں بلکہ انسان دوستی کی وہ روایت جو کہیں دم توڑ چکی تھی، شاعر کے پیش نظر ضرور رہی۔ نظم کے مطالعے سے انسان یہ سوچنے پر ضرور مجبور ہو جاتا ہے کہ کون سی ایسی طاقت ہے جو ان ہم سایوں کو آپس میں لڑوا رہی ہے اور انسانیت کا قتل عام کروا رہی ہے۔ شاعر نے جانتے بوجھتے اس قوت کی نشان دہی نہیں کی البتہ شہر کی آہ و بکا کے مناظر پیش کر کے قاری کو ضرور اس جانب متوجہ کیا۔

سید محمد جعفری نے بھی "یو۔این۔او۔" کے عنوان سے ایک نظم کہی جس میں امریکا کے پٹھو اس ادارے کے دہرے معیار اور ملت اسلامیہ کے حوالے سے اس کے جانب دارانہ کردار پر سخت تنقید کی گئی ہے۔ اس نظم میں وہ آگے چل کر قضیۂ فلسطین پر اس ادارے کے کردار پر تنقید کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

گرچہ بٹواتا فلسطیں میں خود اپنی کرد ہے	ایسی قوموں سے جفا ہے جن کی رنگ زرد ہے
پیش قدمی کو عرب کی اس نے روکا بار بار	اور اسرائیل کے فتنے کو سونپا اختیار[۳۸۳]

اصغر ندیم سید کی ایک نثری نظم "وہ کیا کہتے ہیں؟" اس نفسیاتی کش مکش پر روشنی ڈالتی ہے جو آج ہر فلسطینی کو درپیش ہے۔ نظم کی ابتدا ہی میں شاعر اس کش مکش کو پیش کرتے ہوئے کہتا ہے کہ:

میں نے فلسطینی بھائیوں کے لیے اخبار میں بیان دیا/انھوں نے یہ بیان میرے منھ پہ

دے مارا/اور کہا/ہمارے پاس اب صرف مورچے باقی بچے ہیں/عرب بھائیوں کے

بیانات سے ہمارے گھر اور گودام بھر گئے ہیں[۳۸۴]

شاعر مسلم دنیا پر طنز کرتے ہوئے زبانی جمع خرچ کے بجائے عملی اقدمات کی طرف توجہ دلاتا ہے۔ ان کے مطابق فلسطینیوں کو دعاؤں اور اخباری بیانات کی ضرورت نہیں اور نہ ہی اب وہ انھیں قبول کرنے کو تیار ہیں بلکہ وہ ہم سب مسلمانوں سے عملی اقدامات کا تقاضا چاہتے ہیں:

میں نے ان کے لیے دعا کو ہاتھ اٹھائے/انھوں نے افسوس کیا/کہ کاش یہ ہاتھ ان کے

دشمن پر اٹھتے/وہ اور کیا چاہتے ہیں/میں انھیں اپنے بچے کا ٹینک بھیج سکتا ہوں/جس کی

چابی اس نے توڑ دی ہے/میں فلسطینی بھائیوں کی مدد کرنا چاہتا ہوں/ان سے پوچھو وہ کیا
چاہتے ہیں[۳۸۵]

سلطان احمد رشک نے فلسطینی مجاہدین کی جدوجہد آزادی کو نذرانۂ عقیدت بھی پیش کرتے ہیں اور انھیں تاریخ عالم خوں چکاں اوراق لکھنے والی اقوام کی فہرست میں بلند مرتبہ عطا کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

جو نغمے حریت کے باب میں لکھے گئے اب تک — جو تحریکِ ستم کے سامنے ڈٹتے رہے اب تک
جو تاریخِ الم کے خوں چکاں اوراق لکھتے ہیں — ستارے توڑ لاتے ہیں، جو کہتے ہیں وہ کرتے ہیں

زمیں کا صحن جو وسعت میں بے انداز و مکاں ہے
سما سکتے ہیں جس میں سینکڑوں صدیوں کے ہنگامے[۳۸۶]

شاعر عالمی سطح پر ہونے والی سازشوں کا مکمل ادراک بھی رکھتے ہیں اور انسانیت پر ہونے والی اس آتش و آہن کی بارش، عالمی قوتوں کے جانب دارانہ رویوں پر دکھ اور افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

یہ رسمِ آہن و بارود جاری کس کے دم سے ہے؟ — یہ یک طرفہ نظامِ دہر، آخر کس لیے اب تک
یہ ویٹو کے خداؤں کا طلسمِ سامری کب تک؟ — علاج اس کا یقیناً دوستو اک ضرب کاری ہے[۳۸۷]

حسن عباس رضا نے اس مشکل صورت حال میں بھی امید کا دیا جلائے رکھا۔ انھوں نے خوش آئند مستقبل کی نوید سناتے ہوئے اپنی نظم ''ابھی بھی عَلم پھڑ پھڑا رہے ہیں'' میں حزنیہ کیفیت بیان کرنے کے ساتھ ساتھ امید افزا آزادی کی خوش خبری بھی سناتے دکھائی دیتے ہیں۔ ملاحظہ کیجیے:

سنو کہ اب تک/یروشلم کی جنازہ گاہوں میں بین کرتی/برہنہ سر ماؤں کی عقابی نگاہ
میں/آنے والی رت کے گلاب سپنے کھلے ہوئے ہیں/تمام گل رنگ خواب/آنکھوں میں
جاگتے ہیں... بہت قریں ہے وہ سانس لیتا ہوا زمانہ/کہ جب زمین زاد/اپنی دھرتی
کو/سامراجی گماشتوں کے سیاہ ہاتھوں سے/چھین لیں گے/وہ دن/وہ موسم بہت قریں
ہے/وہ صبح آزادیِ فلسطیں بہت قریں ہے/ہمیں یقیں ہے[۳۸۸]

گوہر ملسیانی اپنی ترانہ نما نظم ''جاگ مسلماں اب تو جاگ'' میں اہلِ فلسطین کی حالت زار بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

خونِ مسلماں ارزاں ارزاں — اہلِ فلسطیں لرزاں لرزاں
ظلم و ستم ہے رقصاں رقصاں — دنیا بنی ہے شہر خموشاں
کیسی لگی ہے ہر سو آگ — جاگ مسلماں اب تو جاگ

اجڑا ہے بیروت کا گلشن غنچوں اور پھولوں کا مسکن
چھوٹا ہے اب آس کا دامن چلنے پر ہے ان کے قدغن
ڈستے ہیں صیہونی ناگ جاگ مسلماں اب تو جاگ[۳۸۹]

''صدائے فلسطین'' کے عنوان سے لکھی گئی نظم میں وہ مظلوم اور معصوم لوگوں کی بدترین حالت زار پر خود بھی روتے ہیں اور اوروں کو بھی رلاتے ہیں۔

آنسوؤں کا سمندر ہوا موج زن زخمی زخمی نظر آ رہے ہیں بدن
خوں چکاں پیرہن
بلبلاتے ہیں چاروں طرف مرد و زن آنسوؤں کا سمندر ہوا موج زن[۳۹۰]

نظم کے آخر میں وہ ارضِ مقدس پر ڈھائے جانے والے مظالم اور بربادی کے مناظر کی بابت کہتے ہیں کہ:

امن کی سر زمین زیر افتاد ہے قدس کا ہر گھرانہ بھی برباد ہے
ظلم شدّاد ہے
دندتا پھرے ہر طرف اہرمن آنسوؤں کا سمندر ہوا موج زن[۳۹۱]

اپنی ایک اور نظم میں وہ اقبال کے معروف شعر:

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے نیل کے ساحل سے لے کر تابہ خاکِ کاشغر

کی زمین میں بڑے موثر انداز سے ملت اسلامیہ کو پیغام دیا کہ:

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے سر زمین قدس کی پھر ضوفشانی کے لیے
اہلِ ایماں کی پریشاں زندگانی کے لیے نورِ قرآں کی مقدس ترجمانی کے لیے
نوعِ انساں کی حیاتِ جاودانی کے لیے ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے[۳۹۲]

وہ ملت کے انتشار اور افتراق کو پوری مسلم امہ کے لیے زہر قاتل گردانتے تھے۔ اسی لیے وہ نیل کے ساحل سے لے کر کاشغر تک کے مسلمانوں کو اتحاد و اتفاق کا درس دیتے ہوئے مغرب اور اسرائیلی چال بازیوں سے نبرد آزما ہونے کی ہدایت کر رہے ہیں۔ وہ دعا گو ہیں کہ:

نیل کے ساحل سے لے کر تابخاکِ کاشغر عظمتِ اسلام کا پھر سے بجائیں اب گجر
مشرکوں کا بیت اقدس میں رہے نہ جو شرر پھر صلاح الدین ایوبی کا تاباں ہو قمر
باندھ لو سر پر کفن اب کامرانی کے لیے ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے[۳۹۳]

محمد فیروز شاہ کی نظم ''کامران لہو کی بشارتیں'' بھی اس موضوع پر عمدہ نظم ہے۔ اس نظم میں شاعر مقدس لہو کے ابدی ہونے کی خبر دیتے ہوئے موثر پیرائے میں کہتے ہیں کہ:

یہ میرے ماضی کا ایک سچ ہے/ جو دورِ حاضر کو اس نے ورثے میں دے دیا ہے/ یہ
سچ فلسطینیوں کے خوں میں صداقتوں کی امانتوں کی مزاحمت کے وہی قرینے سکھا
رہے ہیں/ جو ایک دن پھر بشارتوں کے لباس پہنے/ امر صحیفوں کے لفظ بن کر
چمک اٹھیں گے [۳۹۴]

صلاح الدین محمود اپنی نظم ''یاسر عرفات کے نام'' میں براہ راست فلسطینی تحریک آزادی کو قائد یاسر عرفات کو مخاطب کرتے ہوئے انھیں خراج تحسین پیش کرتے ہیں:

تو یاسر/ جس بچے کو اپنے/ بوڑھے ہوتے تن سے تھامے/ شعلوں سے باہر آتے
تھے/ یاسر/ وہ بچہ بولا/ یاسر تم اس کی مٹی تھے/ یاسر وہ تم سے بولا تھا [۳۹۵]

فلسطینی جدوجہد آزادی میں یاسر عرفات کے کردار سے کون واقف نہیں۔ ستر کی دہائی میں وہ پورے فلسطین کے لیے واحد امید کی کرن تھے۔ اسی لیے متعدد شعرا نے ان کی شخصیت پر نظمیں کہیں۔ نذیر قیصر نے بھی اپنی دو مختلف نظموں میں انھیں موضوع بنایا۔ اوّل ان کی نظم ''اے یاسر عرفات'' میں ان کو امید کی کرن گردانتے ہوئے اپنے جذبات کا یوں اظہار کرتے دکھائی دیتے ہیں:

تیری جانب دیکھ رہا ہے لہو سے بھر افرات/ اے یاسر عرفات !/ اپنی ماؤں بہنوں
کی ''قسمت'' زخموں کی سوغات/ اے یاسر عرفات/ میں زخمی ہونٹوں سے
چوموں تیرے زخمی ہاتھ/ اے یاسر عرفات [۳۹۶]

اسی طرح ایک اور نظم ''یاسر عرفات'' میں صبح آزادی کے اس نقیب کو یوں خراج تحسین پیش کرتے دکھائی دیتے ہیں:

ریت بھری بندوق سے نکلا/ شعلہ بن کر تیرا نام/ صحرا صحرا، خیمہ خیمہ اترتی جلتی
شام/ پھیل گیا کہرام [۳۹۷]

مقصود جعفری بھی آزادی فکر و نظر کے علم برداروں میں سے تھے، اسی لیے غلامی کی ہر شکل سے انھیں نفرت تھی۔ جہاں کہیں بھی لوگ غلامی کے خلاف جدوجہد میں مصروف تھے، مقصود جعفری ان کے طرف دار نظر آتے ہیں۔ فلسطینیوں کی جہد آزادی کے متعلق بھی انھوں نے کہا کہ:

دے رہے ہیں جو چراغوں کو لہو سے روشنی　　　یہ فلسطینی وفا کی، امن کی تفسیر ہیں

ان چراغوں میں ہے رقصاں صبح نو کی روشنی　　　یہ اندھیرے میں سراغِ منزلِ تنویر ہیں[۳۹۸]

فلسطینی مجاہدہ لیلیٰ خالد کے لیے بھی وہ بڑے عقیدت مندانہ جذبات رکھتے تھے۔ ان احساسات کو پیش کرتے ہوئے ان کا کہنا تھا کہ:

تو نے دلوں کو کی ہے عطا آتشِ جنوں　　　تو جانِ انقلاب ہے، ملت کی آن ہے

روکے سے جو نہ رک سکے تو ایسی موجِ تند　　　تیشے سے جو نہ ٹوٹے تو ایسی چٹان ہے[۳۹۹]

اس کے علاوہ یاسر عرفات کی جدوجہد بھی ہمیشہ ان کے پیش نظر رہی۔ ان کی شخصیت اور جدوجہد سے متعلق شاعر کا کہنا تھا کہ:

تو افق پر زندگی کے اک دمکتی کہکشاں　　　کفر کی تاریکیوں میں برقِ بے اماں

تو جو چاہے برگِ گل سے سنگ خارا توڑ دے　　　اور ٹوٹے آئینوں کو اک نظر سے جوڑ دے[۴۰۰]

ارضِ فلسطین کی آزادی کے لیے اس قدر شدید جذبات رکھنے والے مقصود جعفری کا اپنا وطن کشمیر بھی کیوں کہ غلامی میں جکڑا ہوا تھا لہٰذا احساس کی شدت کا پیدا ہونا قدرتی امر تھا۔

اعتبار ساجد کی نظم ''گواہی'' کو بظاہر تو فلسطینی شہید اور مجاہدین کے نام موسوم کیا گیا ہے لیکن نظم کے عنوان سے قطع نظر اس میں فلسطین کے معاملات و مسائل کو براہ راست موضوع نہیں بنایا گیا۔ البتہ نظم کی مزاحمتی فضا ایسے حالات کا منظر نامہ ضرور بنا دیتے ہیں۔ ملاحظہ کیجیے:

سرِ مقتل کے عزیزانِ گرامی! سرِ عام　　　ہم نے بخشا ہے صداقت کو گواہی کا دوام

اپنی بس اتنی گزارش ہے پسِ طول کلام　　　کہ مقرر نہ ہوں بہتے ہوئے اس خونِ دوام[۴۰۱]

ایزد عزیز کی نظم ''فلسطینی بچے کا شبیہ مادر سے مکالمہ'' میں بہت سے رقت آمیز مناظر قاری کو حزنیہ کیفیت سے دوچار کرتے ہیں۔ فلسطینی بچے کا اپنی مرحومہ والدہ سے ہونے والا ل مکالمہ ان دکھوں کا اظہار ہے جو اس دور کے ہر فلسطینی بچے سہہ رہے تھے۔ ماں سے دکھوں کے اظہار کے بعد اس سے ملنے والی نصیحت گو پھر سے امید اور تیقن کو ضرور پروان چڑھاتی ہے لیکن مجموعی طور پر نظم کی فضا بہت حزنیہ ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

میرے ہجر میں رونے والے میرے طفلِ تنہا　　　نیند میں ملنے والی پریوں کے دل ہوئے پرائے

دیکھ یہ اپنے دیس میں چھائے تاریکی کی سائے　　　گونج رہے ہیں اس ظلمت میں مظلوموں کے نوحے

ان سب کے قدموں سے اپنے قدم ملاؤ پیارے　　　آس وطن کی آزادی کی دل میں روش رکھنا

میری گود نہیں تم دھرتی کو گود سمجھنا[۴۰۲]

ذیشان ساحل نے بھی اپنی ایک نثری نظم ''محمود دوریش کے لیے ایک خط'' میں اس احساس ندامت کا اظہار کرتے دکھائی دیتے ہیں کہ ان کے پاس فلسطینی اہل قلم کو محض جھوٹی تسلی اور آنسوؤں میں بھیگی ہوئی خاموشی کے سوا کچھ بھی نہیں۔ یہ غم ناک خاموشی، سناٹے میں ایک چیخ کی مانند سنائی دیتی ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

محمود درویش/تمھیں تسلی دینے اور تمھارے لوگوں کی حمایت میں کہنے کے
لیے/میرے پاس سوائے غم ناک خاموشی کے کچھ بھی نہیں/یا کچھ لوگ جو میری
طرح اپنی میزوں کے بند دروازوں کے سامنے/بیٹھے اِن کے خود بہ خود کھلنے یا کسی
اور نہ ہونے والے/معجزے کے منتظر ہیں[۴۰۳]

اردو شعرا نے فلسطین کی جدوجہد کے مختلف پہلوؤں کو معروضی حقائق کی روشنی میں خوب برتا۔ مثلاً خود محمود درویش نے ''انتفاضہ'' کے ضمن میں جھلکتے شعور کی منظر کشی کرتے ہوئے کہا تھا کہ فلسطینیوں کے ہاتھ میں ابھی اتنا دم ہے کہ وہ شاخِ زیتون کو اس تباہ شدہ کنج کے ملبے سے ضرور نکال لیں گے۔ انھوں نے اسرائیلی مقتدر حلقوں کو باور کرایا کہ وہ بین الاقوامی قراردادوں کی پیروی کرتے ہوئے فلسطینیوں کے قانونی اور جائز حقوق کو تسلیم کریں[۴۰۴]۔ لیکن صیہونی عزائم اس قدر بے قابو ہو چلے تھے کہ وہ کسی بین الاقوامی اداروں کے موقف کو سننے کے لیے بھی تیار نہیں دکھائی دیتے۔ اس صورتِ حال پر ''انتفاضہ'' کے عنوان کے تحت محسن انصاری نے جو نظم لکھی وہ بھی جدوجہد آزادی کے اس روشن پہلو کو پیش کرتے ہوئے اسرائیل کو تنبیہ کر رہے ہیں کہ ان نہتے فلسطینیوں کو نہ دیکھو، یہ بے سروسامانی میں بھی اپنی جدوجہد کو منطقی انجام تک پہنچانے کی پوری پوری صلاحیت رکھتے ہیں۔ اس بابت انھوں نے کہا کہ:

غلیل ہاتھوں میں لے کر جو نکلے ہیں بچے — وہ پتھروں ہی سے باطل کا سر کچل دیں گے
عرب کی آن کو سمجھا نہیں ہے اسرائیل — وہ چٹکیوں سے غرورِ عدو مسل دیں گے[۴۰۵]

اسی طرح سعید روشن کے ہاں بھی ہاتھ میں پتھر اٹھائے معصوم فلسطینی بچہ، اپنی عظیم خواہش کے ساتھ کچھ اس طرح سامنے آتا ہے:

ہر پل اس کی خواہش ہے/پتھر سے ٹکرا ٹکرا کر/جو ہے وہ خود مٹ جائے/ریزہ
ریزہ ہو جائے/لیکن اس کے مٹنے سے/زیتون کی شاخ ہری ہو جائے[۴۰۶]

''انتفاضہ'' ہی کے عنوان کے تحت لکھی گئی ایک اور نظم میں شاعر منیب الرحمٰن کچھ اس طرح کے مناظر پیش کرتے ہیں کہ:

کسی نہتے ستم رسیدہ کو گولیوں کا ہدف بنا کر/انھیں خوشی تھی کہ آخر کار روح کی
آگ بجھ چکی ہے/وہ بے خبر تھے کہ زندگی کے تنور پھر بھی جلتے رہیں گے[۴۰۷]

ناصر نظامی خود تو وطن سے دور ایمسٹرڈیم میں مقیم رہے لیکن ان کے دل میں وطن کی مٹی سے محبت اور عالم اسلام کا درد ہمیشہ موج زن رہا۔ "صلیب گر" کے عنوان سے شائع ہونے والے شعری مجموعے میں متعدد نظمیں اسلام اور عالم اسلام کے مسائل پر مبنی ہیں۔ ان کی ایک نظم "لبنان و آسام" کا یہ شعر دیکھیں:

بہتا رہا لبنان کے گلشن میں لہو عام　　خاموشی سے منھ دیکھا کیا عالمِ اسلام[۴۰۸]

وہ اقوام متحدہ کے ادارے کو مغربی مفادات کے تحفظ کا نگہبان قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

دنیا میں ریا کاری کا سب سے بڑا اڈّا!　　افرنگی مفادات کی ماں عالمِ اسلام[۴۰۹]

اسرائیل کے قیام کے بعد منظّم طریقے سے فلسطینی باشندوں کی بے دخلی، ان کے مکانات کے انہدام اور ہجرت کے کرب کو سید ضیا احتشام نے اپنی نظم "نالۂ فلسطین" میں بڑے کرب کے ساتھ پیش کیا۔ ملاحظہ کیجیے:

گھر سے بے گھر پھر رہے ہیں خانما برباد ہم　　دشتِ غربت میں ہیں کب سے زیرِ استبداد ہم
چیر کر کس کو دکھائیں یہ دلِ ناشاد ہم　　کون ہے درد آشنا کس سے کریں فریاد ہم
ایک بے حس بت کی صورت عالمِ اسلام ہے　　اتحادِ دین و ملت کیا اسی کا نام ہے[۴۱۰]

اسی طرح سید دلاور علی حزیں نے اپنی نظم "تو فلسطینی مجاہد ہے فلسطیں ہے تیرا" میں درد سے بھٹکتی فلسطینی زندگی کی منظر کشی کچھ اس طرح کی ہے کہ فلسطینیوں کا سانحہ پوری طرح نمایاں ہو جاتا ہے۔ ان کے مطابق ظالموں کو ایک نہ ایک روز ضرور مکافات عمل سے گزرنا پڑے گا۔ ملاحظہ کیجیے:

کیوں فلسطینی مجاہد آج در در ہو گئے　　اپنے گھر رہتے ہوئے مظلوم بے گھر ہو گئے
اب وہ فرسودہ فرنگی چال چل سکتی نہیں　　آئے گی آفت وہ دشمن پر جو ٹل سکتی نہیں[۴۱۱]

دل دار ہاشمی بھی فلسطینیوں کے بے گھر ہونے پر افسردگی محسوس کرتے ہیں لیکن وہ ساتھ ساتھ یہ بھی کہتے ہیں کہ ظلم سہنا بھی ظالموں کی مدد کرنے کے مترادف ہے۔ لہٰذا ظلم کرنے والے ہاتھوں کو روکنا بھی از حد ضروری ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

ظلم سہنا بھی کسی کا ظلم ہے سب سے بڑا　　اس لیے کہتا ہوں تجھ سے جنگ کا پرچم اٹھا
کیسے ظالم ہیں وہ گھر والوں کو بے گھر کر گئے　　پھول کے بدلے میں وہ کانٹوں سے دامن بھر گئے[۴۱۲]

رؤف خیر نے اپنی نظم "یا بنی اسرائیل" میں صیہونی مظالم کی غم ناک تصاویر پیش کرنے کے ساتھ ساتھ قوم اسرائیل کو اللہ کے وہ احسانات یاد دلاتے ہوئے جو بحیثیت قوم انھیں عطا ہوئے، ان احسانوں کو بدلہ مخلوق خدا پر مظالم کی صورت میں اس

طرح ظاہر ہونا شروع ہوا کہ معصوم و مظلوم فلسطینیوں کو ان کے اپنے ہی گھر سے بے دخل کیا جانے لگا۔ اس صورتِ حال پر قوم اسرائیل سے سوال کرتے ہوئے شاعر پوچھتے ہیں کہ:

گھر والوں کو گھر سے بے گھر کر دینے کی ٹھانی　　تم نے کی ہے کس بل بوتے پر ایسی من مانی
پڑ جائے گی آخر اس دن تم کو منھ کی کھانی　　نص کے آگے ٹک پائے گی کب یہ تاویل

کیا گیا احسان جھٹلاؤ گے یا بنی اسرائیل[۱۳]

اسی طرح وصف الرحمٰن واصف نظامی بھی فلسطینی باشندوں کے گھروں کی تباہی کے سانحے پر مضطرب دکھائی دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

ہم نہیں یہ دیکھ سکتے تیرا گھر برباد ہو　　آہ تجھ پہ ظلم ٹوٹے اور استبداد ہو
دل ہمارے مضطرب ہیں تیری حالت دیکھ کر　　چاہتے ہیں ہم بھی یہ تیرا وطن آباد ہو[۱۴]

بے گھری اور غریب الوطنی کے تصور کو وسیع تناظر میں دیکھتے ہوئے متعدد شعرا نے مسجدِ اقصیٰ اور قبلۂ اوّل پر اغیار کے مسلط ہونے اور مسلمانوں کے ہاتھوں سے نکلنے کے تکلیف دہ واقعے کو بڑے رنجیدہ انداز سے پیش کیا ہے۔ پوری امت ان دونوں مقامات سے ایک جذباتی وابستگی رکھتی ہے۔ اسی لیے مسجدِ اقصیٰ کو درپیش خطرات اور چیلنجز پر مسلم سربراہان کے مذمتی بیانات ذرائع ابلاغ کی زینت بنتے رہے۔ احتجاج کی یہ لہر محض رسمی کارروائیوں سے آگے نہ بڑھ سکی۔ مسجدِ اقصیٰ کے امام محمد الشیخ محمود الصیام کے مطابق:

> ایسا لگتا ہے کہ معاملہ صرف مسجدِ اقصیٰ کا ہے اور ان حکمرانوں کو فلسطین اور مسئلہ فلسطین سے کوئی واسطہ نہیں۔ لیکن میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ فلسطین قوم کو اگر اللہ تعالیٰ کے بعد کسی پر بھروسا ہے تو وہ ملت اسلامیہ کے عوام ہیں، حکمران نہیں[۱۵]

ظاہر ہے ۲۱ اگست ۱۹۶۹ء کا دن مسجدِ اقصیٰ کی تاریخ میں کسی قیامت سے کم نہیں۔ اس دن کو "یوم سیاہ" کے طور پر یاد کیا جاتا ہے۔ اس روز مسجد ہدیٰ میں مختلف جانب سے ہونے والی یلغار اس بات کا بین ثبوت ہے۔ ۲۱ اگست ۱۹۶۹ء کے دن آسٹریلیا سے تعلق رکھنے والے یہودی باروخ روہان نے طے شدہ منصوبہ بندی کے تحت مسجدِ اقصیٰ میں آتش زدگی کی تاکہ اس مسجد کو منہدم کر کے اس کی جگہ ہیکل کی تعمیر کو ممکن بنایا جا سکے[۱۶]۔ اسی طرح ۹ اگست ۱۹۸۱ء کو یہودی تنظیم جوش امونیم نے یہودی عبادت کے لیے "باب المغاربہ" کے دروازے کا قفل توڑ ڈالا۔ ایک اور یہودی تنظیم "جرشتوں" نے ۲۹ اپریل ۱۹۸۷ء کو ایک بار پھر اسی نوعیت کی جارحیت کی کوشش کی۔ ایک اور تنظیم "افاء ہیکل" نے مسجد کے احاطے میں ہیکل کی تعمیر کا سنگ بنیاد رکھنے کے لیے ۵۰۲ ٹن پتھروں کے ساتھ مسجد میں داخل ہونے کی کوشش کی[۱۷]۔ اس مسجد کی شناخت کو مسخ کرنے کے لیے صیہونی عزائم کھل کر سامنے آگئے اور انھوں نے اجتماعی اور انفرادی سطح پر ہر طرح کی کوشش کی۔ یہ دراصل اسرائیلی رہنماؤں خصوصاً

بن گوریان کے وصیت نامے کی تکمیل کا عمل تھا، جس میں کہا گیا تھا کہ ''القدس کے بغیر اسرائیلی سلطنت کا وجود بے کار اور ہیکل کے بغیر القدس بے فائدہ ہے''[۱۸]۔

ظاہر سی بات ہے کہ امت مسلمہ، صیہونی عزائم کو کسی طرح قبول کرنے کو تیار کیوں کر ہو سکتی ہے۔ مسلمانوں کی تعمیر کردہ یادگار مسجدِ اقصیٰ سے روحانی اور مذہبی وابستگی کے اظہار کی متعدد منظوم مثالیں مذکورہ صفحات میں پیش کی جا چکی ہیں۔ قیصر الجعفری کی نظم ''حریف جاں سے کہو'' میں بھی اس سازش کی بابت اظہارِ خیال کرتے ہوئے قیصر الجعفری نے کہا کہ:

سمٹنے والا ہے یہ کاروبارِ تیرہ شبی　　تمھاری رات چراغِ حرا کی زد پر ہے

لہولہان شہر چیختے ہیں صدیوں سے　　تمھاری تیشہ زنی بد دعا کی زد میں ہے

کھلیں گے مسجدِ اقصیٰ کے بند دروازے　　تمھاری ساری خدائی خدا کی زد میں ہے[۱۹]

ایوب بسمل نے تو اس صورتِ حال پر واضح موقف اختیار کرتے ہوئے دوٹوک انداز میں مسجدِ اقصیٰ کی اہمیت کی بابت کہا کہ:

اک فلسطین نہیں مسجدِ اقصیٰ ہے اہم　　اب بھی عیسیٰ سے محبت ہے بہت بیتِ لحم

سن یہود! اب تجھے اس بیت مقدس کی قسم　　خوں کے آنسو نہ رلائے کہیں دارِ ارقم

کل کا گہوارہِ دیں آج بنا شہر ستم　　لحنِ داؤدی کا غمازہ نہیں یروشلم[۲۰]

اپنی طویل نظم میں انھوں نے برسوں سے جاری مظالم پر افسوس کا ظہار کرتے ہوئے کہا کہ:

کفر ہے بر سرِ پیکار یہاں برسوں سے　　گرم ہے ظلم کا بازار یہاں برسوں سے

امن ہے نقش بہ دیوار یہاں برسوں سے　　حق عدالت میں سرِدار یہاں برسوں سے

دی گئی تحفہِ نایاب تجھے جنگِ عظیم　　کر گئی ارضِ مقدس کو بالآخر تقسیم[۲۱]

تقی عابدی کی نظم ''فریاد مسجدِ اقصیٰ'' میں براہ راست امت مسلمہ کو مخاطب کر کے شاعر نے اس مقدس مسجد کو مجسم شکل میں نوحہ کناں دکھایا ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

کیوں بھلا درھم و دینار سے نیلام ہوں میں　　کیا سمجھ رکھا ہے گردش میں کوئی جام ہوں میں

عظمتِ دین ہوں، معراج کا پیغام ہوں میں　　مسجدِ اقصیٰ ہوں، اسلام کا انعام ہوں میں

دہن بستہ ہوں تقی تم مری فریاد کرو

بیتِ اقدس ہوں، مسلماں مجھے آزاد کرو[۲۲]

شاہد ساکری بھی اپنی نظم ''مسجدِ اقصیٰ'' میں مسلم دنیا کی اس علامت کی بے حرمتی پر مضطرب دکھائی دیتے ہیں۔ وہ مسلم امہ کے جوش اور جذبے کو ابھارتے ہوئے مسجدِ اقصیٰ کو پھر سے مسلمانوں کا مسکن دیکھنا چاہتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ:

اٹھ کے اب مردود کے قلب و جگر کو پھونک دے	جس نے مسجد کو جلایا اس کے گھر کو پھونک دے
مضطرب اس غم سے ساری مسلم آبادی ہے آج	مسجدِ اقصیٰ کی حرمت تجھ سے فریادی ہے آج[۴۲۳]

محمد طاہر نے بھی اپنی نظم ''سانحہ مسجدِ اقصیٰ'' میں آتش زدگی کے نتیجے میں پیدا ہونے والی صورت حال پر رنج و غم کا اظہار کرتے ہوئے لکھا کہ:

اور سب سے بڑھ کر وہ پیاری مقدس سرزمیں	مسجدِ اقصیٰ کو جو ہے سجدہ رانی کے لیے
گونجتے تھے نعرۂ تکبیر سے جو بام و در	اب ترستے ہیں وہی تسبیح خوانی کے لیے[۴۲۴]

معصوم انصاری نے بھی اپنی نظم ''دعوتِ عزم'' میں مسلمانوں کو ان کا نصب العین یاد دلاتے ہوئے کہا کہ:

پہلے تھا، اب بھی قبلۂ اوّل ہمارا ہے	خاطر میں غاصبوں کو نہیں لانا چاہیے
ہم چاہتے ہیں مسجدِ اقصیٰ میں ہو نماز	فاسد یہودیوں کو زبوں خانہ چاہیے[۴۲۵]

شمیم فاروقی نے اپنی نظم ''خدا کے گھر کو آباد پھر کر دو'' میں مسجد میں ہونے والی صیہونی بربریت اور ایک ایک کر کے مسلم عظمت رفتہ کے مٹتے نشان پر افسردگی کا اظہار کیا ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

مسلمانو/ تمھاری مسجدِ اقصیٰ/ تمھارا قبلۂ اوّل/ تمھارے ابا و اجداد کی

پیشانیاں/ جھکتی رہیں جس جا، وہاں اب زور ہے/ وحشی درندوں کا[۴۲۶]

درد چاپدانوی کو ''ارض فلسطین'' اس لیے پُرنور دکھائی دیتی ہے کہ اس میں مسجدِ اقصیٰ جیسی یادگار موجود ہے۔ وہ مسجدِ اقصیٰ پر ناز کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

ہیں ناز کے قابل تری صبحیں تری شامیں	عظمت جو نہ سمجھے تری بے دین ہے بے دین

اے ارضِ فلسطین، مری ارضِ فلسطین[۴۲۷]

ضمیر یوسف نے بھی ایک رباعی میں ''مسجدِ اقصیٰ'' سے جذباتی وابستگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ:

سر ظلم کا اک روز جھکائیں گے ضرور	اے دشمنِ حق تجھ کو مٹائیں گے ضرور
ہم قبلۂ اوّل کی قسم کھاتے ہیں	اقصیٰ تجھے قبضے سے چھڑائیں گے ضرور[۴۲۸]

"اگلے کرسمس میں" کے عنوان سے ف۔ س۔ اعجاز نے جو آزاد نظم کہی وہ انسان دوستی کی عمدہ مثال کہی جاسکتی ہے۔ نظم کے آغاز ہی میں وہ کرسمس کے پیڑوں کو معصوم فلسطینی شہدا کے سوگ میں ڈوبے دکھا کر اس مذہبی آہنگی کا اظہار کر رہے ہیں جو اس دنیا سے ناپید ہو چکی ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

اس برس فلسطیں کی سرزمین کے حق میں/سوگ میں شہیدوں کے/پیڑ سب

کرسمس کے/سر سے پاؤں تک ننگے/چپکے چپکے روتے ہیں[۴۲۹]

فلسطین میں ہونے والی بربریت اور انسانی حقوق کی پامالی کے بے شمار واقعات کو عالمی اداروں نے بھی ہدف تنقید بناتے ہوئے اسرائیلی جارحیت کی مذمت کی۔ اس بربریت سے سب سے زیادہ بچے متاثر ہوئے مگر حیرت ہے کہ بچوں کی فلاح و بہبود کی عالمی اور مقامی انجمنوں نے مجرمانہ خاموشی اختیار کرتے ہوئے اس مسئلے پر مہرلب نہ کھولی۔ ہوائی حملوں اور ٹینکوں کی گولہ باری سے لقمہِ اجل بننے والے معصوم بچوں کے علاوہ لاکھوں بچے ایسے بھی ہیں جو اس پُر تشدد ماحول میں جینے کی وجہ سے نفسیاتی طور پر متعدد امراض کا شکار ہو گئے۔ ایک رپورٹ کے مطابق مسئلہ فلسطین کی وجہ سے فلسطینی بچے اپنی معصومیت بچپن کی بے فکری سے محروم کر دیے گئے ہیں۔ انھیں روزانہ اذیت اور تشدد کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ خوف و ہراس، ظلم و بربریت، عصمت دری اور تفتیشی مراحل کے اس اذیت ناک ماحول نے ان کا جینا دوبھر کر دیا ہے۔ ان کی جسمانی و ذہنی نشو و نما متاثر ہو رہی ہے[۴۳۰]۔ اس حوالے سے بھی شعرا نے کافی مواد چھوڑا۔ دورِ جدید کے شعرا کو اس موضوع سے خاصی دل چسپی رہی۔ القمہ شبلی کی نظم "زندگی کی داستان" کا انداز ملاحظہ کیجیے:

کھو گئی معصوم بچوں کی ہنسی/ہر تمنا دلہنوں کی لٹ گئی/ماں کی آنکھیں ہو گئیں بے

نور سی[۴۳۱]

اسی طرح قمر سنبھلی کی نظم "اے ارض فلسطین" میں بھی ان دل دوز مناظر کو بڑی مہارت سے نظم کیا گیا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ایک چیخ ہے جو پوری فضا پر محیط ہوتی جارہی ہے اور ایک آہ ہے جو پورے ماحول پر سوگواری طاری کیے ہوئے ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

معصوم تڑپتے ہوئے بچوں کی وہ آہیں　　　برماتی ہوئی روح کی دل دوز کراہیں

سینوں میں ہمارے تری روداد رقم ہے　　　اے ارضِ فلسطین! تری عظمت کی قسم ہے[۴۳۲]

اس ضمن میں عائشہ مسرور کی نظم "نئی لوری" بھی اہمیت کی حامل ہے۔ یتیم بچے کو لوری دیتی ہوئی ماں جو باپ کے جنگ میں مارے جانے کے بعد پناہ گزین کیمپ میں رہنے پر مجبور ہے، بچے کو کس طرح تسلی دے رہی ہے، ملاحظہ کیجیے:

تشنہ ذہن کے ہاتھ میں موت کا جام آگیا/ تیرا شفیق باپ تو جنگ میں کام
آگیا/اے مرے دل کے چین! جاگ/اے مرے نور عین! جاگ/دشت و
دمن لہو لہو/سارا وطن لہو لہو/صحنِ چمن لہو لہو/دم بچھڑ کے رہ گئی/ساکھ بگڑ کے رہ
گئی/مانگ اجڑ کے رہ گئی [۴۳۳]

خوف و دہشت کی اس فضا میں ایک فلسطینی بچے کو ہر وقت موت کا دھڑکا لگا رہتا ہے۔ خوف اس بچے کی رگ و پے میں سرائیت کرتا جا رہا ہے۔ خان ارمان کی نظم ''فلسطینی جیالے'' میں ان ہی خدشات کا اظہار کرتے ہوئے شاعر کہتے ہیں کہ:

ہاں... مجھے معلوم ہے/میری ماں بھی جانتی ہے/کسی پل بھی/کوئی خوں خوار
بم/جگر کو چھیدتی بندوق کی گولی/کوئی سفاک میزائل/اس طرف آئے گی/میری
زندگی کی ڈور ہی کٹ جائے گی [۴۳۴]

ڈاکٹر مختار الدین احمد نے بھی اپنی نظم ''فریادِ فلسطین'' میں فلسطینی بچوں کی عظیم قربانیوں کا ذکر کرتے ہوئے حضرت اسماعیل علیہ السلام کی قربانی یعنی ذبیح عظیم سے نسبت جوڑتے ہوئے کہا کہ:

یا خلیل اللہ/کتنے اور اسماعیلؑ/بارہ اور تیرا سال کے بچے/ہمیں قربان کرنے ہیں
ابھی/بھیڑوں کے جیسے آج پھر/ارضِ مقدس پر، فلسطین کی زمیں پر/اب کٹیں
گے اور کتنے بے سر/جوئے خوں کب تک بہے گی [۴۳۵]

یہ نفسیاتی کرب محض فلسطینی بچوں تک محدود نہ رہا بلکہ اس کے اندوہ ناک اثرات سرحد پار دیگر ممالک تک بھی پہنچیں۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ اس سے صرف مسلمان بچے نہیں بلکہ دیگر مذاہب مثلاً عیسائی بچے بھی متاثر ہوئے۔ ف۔س۔اعجاز کی نظم ''اگلے کرسمس میں'' شاعر سانتا کلاز کو فلسطینی بچوں کے لیے امید کی کرن قرار دیتے ہوئے کہتا ہے کہ:

اگلے سال اترے گا/برف پوش چوٹی سے/جادوئی چھڑی لے کر/اک ضعیف
نورانی/چاکلیٹ کی ایک گٹھڑی/اپنی پیٹھ پر لادے/گیت گاتا آئے گا/اگلے سال
کی رت میں/وہ ضرور آئے گا/سوگ وار بچوں کو/ہر یتیم جھولی کو ٹافیوں سے بھر
دے گا [۴۳۶]

عبدالرحمٰن واصف بھی ارضِ مقدس کی بے حرمتی پر مضطرب دکھائی دیتے ہیں۔ قبلۂ اوّل کے چھن جانے کے غم میں وہ غم واندوہ کی کیفیت سے دوچار ہو کر یہ کہنے پر مجبور ہوئے کہ:

زمین قبلۂ اوّل مجھے خدا رکھے کہ دل ہوا ہے ترے غم میں پارا پارا مرا[۴۳۷]

عطاالرحمٰن طارق کی نظم "فلسطینی بچے کے نام" کا مرکزی کردار ایک ایسا بچہ ہے جس کا سارا کنبہ جاں بحق ہو چکا ہے۔ اس نے جب سے ہوش سنبھالا ہے فضا میں بارود کی بو کے سوا کچھ نہیں دیکھا۔ ان لہو رنگ مناظر کو دیکھ کر وہ ہاتھ میں کھلونے کی جگہ بندوق تھامنے پر مجبور ہوا۔ شاعر اس کیفیت کا اظہار کچھ اس انداز میں کرتا ہے:

ہے آج کھلونے کی جگہ بندوق میرے ہاتھ میں اور اک لشکر دعاؤں کا ہے میرے ساتھ میں

شیر مادر آج خوں بن کر مری نس نس میں ہے فی سبیل اللہ حاضر ہے جو میرے بس میں ہے[۴۳۸]

ڈاکٹر مناظر عاشق ہر گانوی بھی اس حوالے سے عجیب ایسے سے دوچار ہوئے۔ ان کی نو عمر بیٹی نے ٹیلی وژن پر چلنے والی خبروں کے حوالے سے فلسطینی بچوں پر ہونے والے مظالم پر جب سوالات کی بوچھاڑ کر دی تو ان سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔ اس کیفیت کو نظم کرتے ہوئے شاعر اس کرب کو کچھ اس طرح سے پیش کر رہے ہیں:

چھوٹی سی اکلوتی بیٹی/ مجھ سے پوچھتی ہے/پاپا فلسطین کہاں ہے/وہاں کی خبریں ٹی۔
وی۔ پر کیوں بار بار آتی ہیں ؟/اور یہ جنگ کیوں لڑی جا رہی ہے[۴۳۹]

رفعت سروش نے اپنی نظم "ارضِ فلسطین" کے آخری بند میں ترانے کا رنگ اختیار کرتے ہوئے رجزیہ انداز میں کہا کہ:

مظلوم بھی جاگ اٹھے ہیں یلغار کریں گے/دستِ حق و انصاف کے باطل سے
لڑیں گے/کہہ دو یہ ممولوں سے کہ اب آتے ہیں شاہین!/ اے ارضِ فلسطین!
اے ارضِ فلسطین[۴۴۰]

فلسطین اور فلسطینیوں کے حقوق کے دفاع کے سلسلے میں امریکی اور یورپی پاکستان یہودی لابی کے تابع ہیں[۴۴۱]۔ گو انھوں نے نام نہاد امن کے قیام کے دعوے تو خوب کیے لیکن بقول نوم چومسکی:

> سرکاری نظریہ یہی ہے کہ امریکا اور اسرائیلی لیبر پارٹی امن کی متلاشی ہیں جس کی راہ میں ہر جانب کہ انتہا پسند رکاوٹ ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ یہ جھوٹ اب تک بلا خوف تردید زندہ ہے اس بات کا اور گواہ ہے کہ فلسطینی انتقاضہ سے ہمارے ہاتھ جو موقع آیا تھا، ان سے فائدہ اٹھانے میں ہم کتنے ناکام رہے ہیں[۴۴۲]۔

امریکا برطانیہ اور دیگر عالمی طاقتوں کے ساتھ خود عرب ممالک کے سربراہان اور اقوام متحدہ بھی بوجوہ فلسطین اور فلسطینی عوام کو انصاف نہیں دلا سکے۔ اس بے حسی کی فضا میں ہر طرف ایک عدم تحفظ کا احساس پیدا ہونا ایک فطری امر تھا۔ اور

شاعری میں فلسطین کے اس عدم تحفظ اور اضطراب کو بھی موضوعِ سخن بنایا گیا۔ مثلاً ایوب صابر کی نظم "اے فلسطینی مجاہد!" میں امریکی کردار کو کچھ اس طرح پیش کیا گیا ہے:

نت نئی شہرت کا حامل آج امریکا ہوا　　مکر کے ہر فن سے کامل آج امریکا ہوا

دشمنِ دینِ خدا ہے دشمنِ ایمان بھی　　ظلم کا پیغام بر ہے بندہِ شیطان بھی

ملک اسرائیل اس کا نسلِ بد فرزند ہے[۴۴۳]

معصوم لوگوں کی نعشوں اور امریکا کے رائج کردہ قطبی نظام کی بابت تاج الدین اشعر راج نگری نے طنزیہ انداز اختیار کرتے ہوئے کہا کہ:

ہیں اک طمانچہِ تحقیر گل بدن لاشے　　نظام یک قطبی کے چمکتے گالوں پر

اجارہ دار بنے ہیں جو امنِ عالم کے　　ہے ان کو ناز بہت مکر و فن کی چالوں پر[۴۴۴]

فلسطین کے مسئلے پر فلسطین کے دہرے معیارات اور جانب دارانہ رویوں کا پردہ چاک کرتے ہوئے محسنہ جیلانی نے اپنی نظم "بالدم بالروح نفدیک یا فلسطین" میں کہا کہ:

آسماں چپ ہے، زمیں چپ ہے، ہوائیں چپ ہیں　　اہلِ مغرب کی ریاکار فضائیں چپ ہیں

تخت و تاج سنبھالے ہوئے شاہانِ زمیں چپ ہیں　　کچھ کہتے نہیں[۴۴۵]

اقوام متحدہ کی بے بسی اور عالمی طاقتوں کی کاسہ لیسی کی جانب اشراق حمزہ پوری نے اپنی نظم "مجاہد ہو تو . . ." میں کچھ اس طرح اشارہ کیا ہے کہ:

ناپاک ہیں یہ ان کے ارادے بھی ہیں ناپاک　　ہر چند کہ رکھتے ہیں یہ یو۔این۔او۔پہ بھی دھاک

لاحول سے اولادِ شیاطیں کو بھگاؤ　　جو مردِ مجاہد ہو تو کچھ کر کے دکھاؤ[۴۴۶]

مسلم امہ خصوصاً عربوں کی بے مہری اور خود اپنے ہی ہاتھوں عرب قومیت کے تصور کو غرق آب کر دینے والے عربوں کے رویوں کا شکوہ آزاد حسین آزاد نے اپنی نظم "زخمی فلسطین کی پکار" میں کچھ اس طرح کیا ہے:

ذرا سوچو عرب والو فلسطیں کی مصیبت پر　　یہ کیوں خاموش بیٹھے ہو سگے بھائی کی رحلت پر

رسولوں کی زمیں کا پاس رکھتے ہو اگر کچھ بھی　　فلسطیں کے یتیموں کی ذرا لے لو خبر کچھ بھی[۴۴۷]

اسرائیلی رہنما ایرل شیرون کی فلسطین دشمن پالیسیوں کے خلاف ناوک حمزہ پوری کی نظم "ایھاالاخوان" میں مزاحمتی رویہ اختیار کرتے ہوئے فلسطینیوں کے لیے اٹھ کھڑا ہونے کا مشورہ دیتے ہیں:

اٹھو کہ شہر پہ ہے آمادہ ایریل شیرون　　اٹھو کہ مادّی آلات کا اسے ہے جنون
اٹھو کہ درہم برہم ہوا ہے امن و سکون　　اٹھو یہود و نصاریٰ کا توڑ دو افسوں[۴۴۸]

کوثر صدیقی نے بھی تمام مسلمانوں کو لا الہ کے پرچم تلے متحد ہو کر فلسطین کی آزاد ریاست کے خواب کو پورا کرنے کی جدوجہد کی تلقین کرتے ہوئے کہا کہ:

لا الہ کی لے کے مشعل ساتھ چل　　لوٹ لے ظلمت نہ رختِ کارواں
لا الہ کو چھوڑ کر ہے ناتواں　　لا الہ کے ساتھ رکھ تیغ و سناں
لا الہ کے برق شعلہ بار سے　　ختم اسرائیل کا کر آشیاں[۴۴۹]

اسرائیلی خفیہ ایجنسی موساد اور ایرل شیرون کی درندہ صفتی کی بابت خالد علیم کی نظم ”جہاں آشوب“ کا یہ بند ایسا آئینہ ہے جس میں اسرائیل کا مکرہ چہرہ پوری طرح واضح دکھائی دیتا ہے:

ہاں یاد ہے، ہاں یاد ہے، ہاں یاد ہے مجھ کو　　وہ صابرہ وہ شہر شتیلا کی تباہی
شیرون کے لشکر کی درندہ صفتی بھی　　اور اس پر وہ موساد کی سفاک نگاہی[۴۵۰]

مسئلہ کشمیر کے وہ کردار جنھوں نے عالمی سطح پر اثر انداز ہو کر اس مسئلے کی سنگینی کا احساس کیے بغیر اپنے منفی کردار کے ذریعے اسے مزید پیچیدہ بنایا، شعرا نے انھیں بھی ہدف تنقید بنایا۔ خالد علیم کی نظم ”کونڈالیزا کا ترانۂ مستی“ میں انھیں سیاہ فام ہونے کی وجہ سے کالی ماتا کا خطاب دیتے ہوئے شاعر کہتے ہیں کہ:

ہم نے اب جنگیں لڑنی ہیں اپنی بقا کی خاطر　　اپنی بد مستی کی خاطر، حرص و ہوا کی خاطر
ہم ہی دنیا دار ہیں، زندہ ہیں دنیا کی خاطر　　جو رستے میں آئیں وہ ساری دیواریں ڈھا دو

کالی ماتا کا یہ حکم ہے، سارا شہر جلا دو[۴۵۱]

سلیم شہزاد نے فلسطین میں ہونے والی حالیہ شہادتوں پر کف افسوس ملتے ہوئے تجریدی انداز میں نظم لکھی۔ ”ابو ندال کے لیے نظم“ کے عنوان سے لکھی گئی نظم میں وہ کہتے ہیں کہ:

ابو ندال!/ تیرے شہر کے کتے بھونکتے کم/اور گھورتے بہت ہیں/ابو ندال/
تیرے جذبے سرمئی ریت میں / بھید کے بھید لیے سرسراتے/تیری لال
آنکھوں سے/ڈھلکتی سبز کھجوروں کا/رومال مانگتے ہیں[۴۵۲]

جدید شعرا نے علامت نگاری کے ذریعے نئے نئے تلازمے بنا کر اس موضوع پر بہت کچھ کہا۔ عامر سہیل کی نظم ”کنار اردن کے پار“ میں یہ پہلو دل کش انداز سے سامنے آیا ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

کنار اردن کے پار کا خواب گوں اندھیرا! بلکتی خلقت جو ایک سے دوسری ہوئی ہے

کنار اردن کے پار ہیکل کے پتھروں سے کھجور اوندھے گئے ہیں، صورت گری ہوئی ہے [۵۳]

ایک اور نظم ''یہودی بستیوں سے تیر آئے'' میں فلسطین کی گلیوں میں ماتم و گریے کے مناظر دکھاتے ہوئے شاعر کہتے ہیں کہ:

پڑا ہے دن کہ کچھ دکھتا نہیں ہے/گریبانوں تلک، حلقوم تک اور گرہ تک ناخنِ

تدبیر آئے/بڑھی جاتی ہیں، انگوروں کی بیلیں!/ کوئی توراۃ میں انجیر

آئے/یہودی بستیوں سے تیر آئے [۵۴]

انتظار نعیم کے مرتبہ شعری مجموعے بہ عنوان ''اے ارضِ فلسطین'' میں اس موضوع پر لکھی گئی متعدد نظمیں شامل ہیں جو متنوع خصوصیات کی وجہ سے اہمیت کی حامل ہیں۔ ان نظموں میں اسلامی اصطلاحات اور تلمیحات کی کثرت بھی ہے اور جوش و ولولہ بھی۔ خان انجم کا یہ شعر دیکھیں:

سلام اے بیتِ اقدس کے امینو اور شہبازو! تمھارے عزم نے مجھ کو دلا دی یاد کوفے کی [۵۵]

اسی طرح بعض نظموں میں مشاہدے کی گہرائی کے ساتھ ساتھ مخصوص لفظیات نے اس پورے ماحول کا منظر نامہ ہمارے سامنے پیش کر دیا ہے۔ اس المیے کے تناظر میں حفیظ بنارسی کا شعر دیکھیے:

حق دار ہے تو اپنے وطن، اپنی زمیں کا چھوٹے نہ تیرے ہاتھ سے دامانِ یقیں کا [۵۶]

اور ابو البیان حماد نے تو یہ تک کہہ دیا کہ:

ضرور خون شہیدوں کا رنگ لائے گا یہودیوں کی بھی ہوگی ضرور بربادی [۵۷]

اس موضوع پر زہرہ نگاہ، کشور ناہید، شاہدہ حسن اور ہمارے کتنے ہی شاعروں نے دل چاک نظمیں لکھیں۔ شاہدہ حسن کی نظم ''وادیِ خوں رنگ'' میں کیسا زندہ اور دھڑکتا ہوا درد ہے جو کہ ایک ایک سطر سے عیاں ہے [۵۸]۔ ملاحظہ کیجیے:

یہ خطہ/وادیِ خوں رنگ ہے، اپنے لہو میں تر/اندھیروں میں کہیں گم اس کے بام و

در/یہاں پھولوں سے نازک جسم بھی/بارود کے شعلوں میں جلتے ہیں/یہاں پر

چاند، سورج اور ستارے قتل ہوتے ہیں [۵۹]

اس کے علاوہ نور منیری کی ''فلسطینیوں کے نام''، کبیر حنفی کی ''اے فلسطینی مجاہد''، ساغر ملک کی ''اے مقدس سر زمین''، عرفات جعفری کی ''فلسطین''، افتخار احمد اقبال کی ''فلسطینی مجاہدین سے خطاب''، محمد طیب انصاری کی ''ور تنہا فلسطین''، شکیل احمد شرر کی ''شوق شہادت جاگے''، حاذق ضیائی کی ''یروشلم''، کیف گوگانوی کی ''اے قبلہِ اوّل پاک حرم''، اسد رضوی کی

''ارضِ فلسطین کے نام''، محبوب راہی کی ''فلسطین بلا رہا ہے''، شاکر سیالوی سوہاروی کی ''خیموں میں آگ''، انتظار نعیم کی ''انتباہ'' اور نشاط قدیری کی ''عزم اہل فلسطین'' قابل ذکر ہیں[۶۰]۔

فلسطین اور اہل فلسطین کے لیے کی گئی شاعری نہ صرف اہل فلسطین بلکہ برصغیر کی ملی تاریخ میں بھی اہمیت کی حامل ہے۔ یک جہتی کے اس عہد کی جو ابتدا جنگ بلقان سے ہوئی تھی وہ آج بھی جاری و ساری ہے۔ مذکورہ صفحات کے مطالعے سے یہ بات پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ اردو شاعری میں تذکرۂ فلسطین ایک لازمی عنصر کے طور پر موجود رہا۔ خصوصاً ملی شاعری کا کوئی دور ایسا نہیں جس میں شعرا نے قضیۂ فلسطین کو نظر انداز کیا ہو۔ عرب اسرائیل جنگ ۱۹۶۷ء اور نتیجے میں بیت المقدس کا سقوط اس کے علاوہ مسجدِ اقصیٰ میں ہونے والی آتش زدگی ۱۹۶۹ء ایسے واقعات ہیں جنھوں نے پورے عالم اسلام کو ہلا کر رکھ دیا تھا، لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ اتنے بڑے سانحے کے باوجود عرب اتحاد کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔ نام نہاد غیر جانب داری کے اصول سے اعلانیہ بے تعلقی کا اظہار ہی در اصل موجودہ صورت حال میں عربوں کی اوّلین ضرورت ہے[۶۱]۔ بہ ظاہر ۶۰ء کی دہائی میں شائع ہونے والے رسائل و جرائد میں اسرائیلی حملوں کی بابت جو انداز اختیار کیا جاتا رہا، اس سے تو یوں محسوس ہوتا تھا کہ ان حملوں کا سخت جواب دیا جائے گا مثلاً جون ۱۹۶۷ء کے ''البلاغ'' کراچی کے شمارے میں عرب اتحاد کی بابت کہا گیا کہ:

> ریڈیو کی اطلاع کے مطابق اسرائیل کے ۱۵۰ طیارے گرائے جا چکے ہیں اور اردن کے جاں باز مجاہدین نے جبل المکبر پر قبضہ کر لیا ہے، عرب ممالک کے مثالی اتحاد نے ایک بار پھر یہ ثابت کر دیا ہے کہ مسلمانوں کے باہمی اختلافات مشترکہ مقاصد کی راہ میں رکاوٹ نہیں بن سکتے۔ بلا شبہ یہ اسرائیل پر فیصلہ کن ضرب لگانے کا بہترین موقع ہے۔ وقت آ گیا ہے کہ صیہونیت کے اس زہریلی اژدھے کو ہمیشہ کے لیے کچل ڈالا جائے جو عرصے سے عالم اسلام کے سینے پر اپنا پھن اٹھائے کھڑا ہے[۶۲]۔

حقیقت یہ ہے کہ عرب اتحاد تو اسرائیلی جارحیت کا موثر جواب نہ دے سکی البتہ اسرائیل نے مزید فلسطینی علاقوں کو اپنے زیر تسلط ضرور کر لیا۔ مفتیِ اعظم فلسطین الحاج محمد امین الحسینی نے درست کہا کہ:

> اتحاد عالم اسلامی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ استعمار اور اس کے جاں نشین ہیں، مغربی استعمار نے اپنے سامراجی مقاصد میں کام یابی ہی اس طرح حاصل کی کہ مسلمانوں میں پھوٹ ڈال کر انھیں کمزور کر ڈالا''[۶۳]۔

اسی لیے ہم اس تحقیقی مطالعے میں بھی اس بات کو واضح طور پر محسوس کرتے ہیں کہ فرطِ جذبات میں بہہ کر ہمارے اکثر شعرا نے زمینی حقائق کو کلی طور پر نظر انداز کیا۔ شعری نزاکتوں اور حقائق کو بالائے طاق رکھ کر محض انھوں نے زبانی کلامی دعوے اور مشتعل جذبات کے اظہار ہی پر اکتفا کیا۔ حقیقت کے بر خلاف لکھی گئی یہ نظمیں محض دل کے بہلانے کا سبب تو بن

سکتی ہیں مگر امت مسلمہ کے مصائب و آلام میں کوئی کمی نہیں لا سکتی۔ البتہ شاعروں کے عزائم اب بھی جواں ہیں۔ پوری مسلم دنیا یہودیوں کے خلاف ضرور ہیں، وہ سمجھتے ہیں کہ اسرائیل ایک جابر قوم ہے۔ یہ لوگ فلسطینیوں پر دن رات ظلم کرتے ہیں۔ دو جنگوں کے نتیجے میں ان لوگوں نے فلسطینیوں کے بڑے علاقے قبضے میں لے لیے ہیں۔ انھیں حقوق سے محروم رکھا جا رہا ہے"[۶۴]۔ مشہور پاکستانی شاعر منیر نیازی نے ایک فلسطینی نظم کا جو اردو ترجمہ کیا وہ پوری طرح ان شعرا کے جذبات کی ترجمان ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

میں اپنے باپ کے گھر کی مدافعت کروں گا/اپنے ہتھیاروں کے ساتھ/میرے
دشمن میرے ہتھیار مجھ سے چھین لیں گے/میں اپنے باپ کے گھر کی مدافعت
کروں گا/اپنے ہاتھوں کے ساتھ/وہ میرے ہاتھ کاٹ دیں گے/میں اپنے باپ
کے گھر کی مدافعت کروں گا/اپنے بازوؤں کے ساتھ/وہ میرے بازو کاٹ دیں
گے/میں اپنے باپ کے گھر کی مدافعت کروں گا/اپنے جسم کے ساتھ/وہ مجھے قتل
کر دیں گے/میں اپنے باپ کے گھر کی مدافعت کروں گا/اپنی روح کے ساتھ[۶۵]

بلاشبہ موجودہ عالم اسلام کا یہ سب سے بڑا المیہ ہے جس پر آج بھی ہر مسلمان کا دل بے چین اور ہر آنکھ اشک بار ہے۔ ہمیں کھل کر اعتراف کرنا چاہیے کہ یہ ایک ایسی شکست ہے جس کی نظیر اسلام کی تاریخ میں نظر نہیں آتی۔ صرف اسّی گھنٹے میں متعدد عرب ملکوں کی پوری طاقت تباہ و برباد ہو گئی۔ آٹھ ہزار مربع میل پر بسنے والے ملک نے چوبیس ہزار مربع میل کے علاقے کو فتح کر لیا۔ آٹھ سو سال بعد بیت المقدس سے مسلمانوں کو ہاتھ دھونا پڑا۔ یہ ایسا زخم نہیں جسے آسانی سے بھلایا جا سکے[۶۶]۔ عرب حکومتوں اور تمام مسلم سربراہوں کو اسرائیل سے مقابلے کے لیے متحد ہونا پڑے گا۔ کیوں کہ امریکا، برطانیہ اور دیگر مغربی طاقتیں ان کی پشت پناہی کر رہی ہیں[۶۷]۔ گو یہ بات درست ہے کہ ظلم کی یہ سیاہ رات ابھی چھٹنے کا نام نہیں لے رہی اور بقول ذکی کیفی:

بہت تاریک شب ہے ظلمتوں کا دور دورہ ہے — خرد والو! چراغِ آگہی مدھم نہ ہونے دو
ہزاروں جاں بہ لب ہیں اس نئی تہذیب کے زخمی — بہت کچھ ہو چکا یہ ظلم اب پیہم نہ ہونے دو
ستم ہے حریت کے ساز پر نغمہ یہ چھڑتا ہے — کسی کو اب خیالِ عظمتِ آدم نہ ہونے دو[۶۸]

عرب اسرائیل جنگ کے موقع پر ان کی ایک اور نظم "حادثہ" بھی اہمیت کی حامل ہے۔ امتیازِ نسل و وطن کو بھلا کر ذکی اس نظم میں نغمۂ توحید کو پھر سے چھیڑنے کا مشورہ دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

ہمت نہ ہار کفر کی اس ترکِ تاز سے	تو آشنا ہے سارے نشیب و فراز سے
ساز و رباب و بربط و مینا کو توڑ کر	گرما، دلوں کو آتشِ سوز و گداز سے
یہ امتیازِ نسل و وطن اک فریب ہے	یہ نغمہ بے سرا ہے، نہ چھیڑ اپنے ساز سے
کر سر بلند وحدتِ اسلام کا علم	اردن، عراق، مصر، یمن اور حجاز سے
پھر سازِ دل یہ نغمۂ توحید چھیڑ دے	سجدے میں رکھ کے سر کو ادب اور نیاز سے
اس میں کوئی کلام نہ حاجت دلیل کی	فرعونیت شکن ہے ہر اک موج نیل کی[۶۹]

آج مسلم دنیا اقوامِ متحدہ اور دیگر اداروں سے آس لگائے بیٹھی ہے کہ وہ اس مسئلے پر ثالثی کا کردار ادا کرے گا حال آں کہ دشمن سے توقع رکھنے کے بجائے اپنے آپ کو درست کرنے کی زیادہ ضرورت ہے۔ عبدالعزیز شرقی نے درست کہا کہ:

غیروں سے شکایت ہے نہ اپنوں سے گلہ ہے	یہ شامتِ اعمال ہے جو کچھ کہ ہوا ہے
حق بات کہی جس نے وہ ہے شاہِ مراکش	ہر چند یہ اپنے ہی گناہوں کی سزا ہے
اللہ سے رخ پھیر لیا غیر کی جانب	یوں نصرتِ حق نے ہمیں چھوڑ دیا ہے
دشمن کے سہارے سے جو اٹھے گا گرے گا	سچ یہ ہے کہ دشمن سے توقع ہی خطا ہے[۷۰]

اسرائیل جو بین الاقوامی سازش کی پیداوار ہے ان ممالک کے عالم گیر اور وسیع ذرائع خبر رسانی، اس کی خدمت کے لیے ہر وقت کمربستہ ہیں۔ جب تک یہ صورتِ حال باقی ہے اسرائیل کو جنگی تیاری کے ذریعے ختم کرنے کی کوششیں بظاہر کام یاب نہیں ہوں گی[۷۱]۔ یہ مسئلہ جنگی سے زیادہ سیاسی ہے۔ لہٰذا اسے سیاسی طور پر ہی حل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے[۷۲]۔ اس طرح ہم متعلقہ فریقوں کے سوا بقیہ دنیا کی ہمدردیاں ضرور حاصل کر سکتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ مغربی دنیا کی اکثریت خصوصاً اس کے عوام کی کوئی جذباتی وابستگی اسرائیل کے ساتھ ہر گز نہیں ہے[۷۳]۔ اس شکست کے سائے گہرے ضرور ہیں لیکن اتنے بھی نہیں کہ آمدِ صبح کے آثار ہی پیدا نہ ہو سکیں۔ شعرا نے امید کے دامن کو اس ضمن میں کبھی بھی ہاتھ سے جانے نہ دیا۔ شکست کے سائے میں جو فلسطین کی مسلح کش مکش ابھری، وہ نہ صرف مقبوضہ فلسطین کے عربی شعرا کے خوابوں کی تفسیر اور ان کی طویل جدوجہد کا ثمر تھی[۷۴]۔ بلکہ ان کے خونِ جگر سے لکھے گئے اشعار کے ساتھ ساتھ برصغیر کے اردو شعرا نے بھی اس جدوجہد کو خوب موضوع بنایا اور اس مسلح انقلاب اور جدوجہد کی پزیرائی بھی کی اور رہنمائی بھی۔

اردو شاعری میں آج یہ موضوع کو بطور استعارہ استعمال کیا جاتا ہے۔ ہجرت اور بے زمینی کے کرب کو اگر مثال میں پیش کرنا ہو تو سرشار صدیقی کی طرح شاعر یہ کہتا ہے کہ:

اس دور میں یہاں بھی فلسطین کی طرح	کچھ لوگ بے زمین ہوئے کچھ لوگ بے وطن[۷۵]

حوالہ جات

۱۔ ادریس، حافظ محمد، مشمولہ: ''تاریخ فلسطین''، از ڈاکٹر محسن محمد صالح، ادارۂ معارف اسلامی، لاہور، ۲۰۰۸ء، ص ۱۱

۲۔ صالح، محسن محمد، ڈاکٹر، ''تاریخ فلسطین''، مترجم، فیض احمد شہابی، محولہ بالا، ص ۱۷۔۱۸

۳۔ علی، ڈاکٹر مبارک، ''اسرائیلی اور فلسطینی تاریخ نویسی کے رجحانات''، کتابی سلسلہ، دنیا زاد، کراچی، شمارہ ۴، جلد اوّل، ۲۰۰۱ء، ص ۶۵

۴۔ صالح، ڈاکٹر محمد محسن، "History of Palestine, Cairo", Al-Falah Foundation, 2005, p-

۵۔ ایضاً، ۲۰۰۸ء، ص ۲۱۔۲۶

۶۔ سورۃ آل عمران، آیت ۶۷۔۶۸

۷۔ صالح، ۲۰۰۸ء، ص ۲۶۔۲۷

۸۔ سورۃ المائدہ، آیت ۲۱۔۲۶

۹۔ صالح، ۲۰۰۸ء،، ص ۲۹۔۳۷

۱۰۔ علوی، مولوی امیر احمد، مشمولہ: ''الناظر'' (لکھنؤ)، جون ۱۹۳۵، ص ۳۷۱۔۳۸۲

۱۱۔ علوی، مولوی امیر احمد، مشمولہ: ''الناظر'' (لکھنؤ)، جولائی ۱۹۳۵ء، ص ۱۔۱۴

۱۲۔ علوی، مولوی امیر احمد، مشمولہ: ''الناظر'' (لکھنؤ)، اگست ۱۹۳۵ء، ص ۶۵۔۷۹

۱۳۔ علوی، مولوی امیر احمد، مشمولہ: ''الناظر'' (لکھنؤ)، ستمبر ۱۹۳۵ء، ص ۱۲۹۔۱۴۵

۱۴۔ علوی، مولوی امیر احمد، مشمولہ: ''الناظر'' (لکھنؤ)، اکتوبر ۱۹۳۵، ص ۱۹۳۔۲۰۵

۱۵۔ علوی، مولوی امیر احمد، مشمولہ: ''الناظر'' (لکھنؤ)، نومبر ۱۹۳۵ء، ص ۲۵۷۔۲۷۰

۱۶۔ علوی، مولوی امیر احمد، مشمولہ: ''الناظر'' (لکھنؤ)، جولائی ۱۹۳۴ء، ص ۷۔۱۰

۱۷۔ علوی، مولوی امیر احمد، مشمولہ: ''الناظر'' (لکھنؤ)، اگست ۱۹۳۴ء، ص ۱۔۱۰

۱۸۔ علوی، مولوی امیر احمد، مشمولہ: ''الناظر'' (لکھنؤ)، ستمبر ۱۹۳۴ء، ص ۱۔۸

۱۹۔ علوی، مولوی امیر احمد، مشمولہ: ''الناظر'' (لکھنؤ)، اکتوبر ۱۹۳۴ء، ص ۱۔۱۴

۲۰۔ علوی، مولوی امیر احمد، مشمولہ: ''الناظر'' (لکھنؤ)، نومبر ۱۹۳۴ء، ص ۱۔۱۳

۲۱۔ علوی، مولوی امیر احمد، مشمولہ: ''الناظر'' (لکھنؤ)، دسمبر ۱۹۳۴ء، ص ۱۔۸

۲۲۔ مغل، رئیس احمد، ''فلسطین: فرعون سے شیرون تک''، مشمولہ: ماہ نامہ ''بیت المقدس'' (اسلام آباد)، جلد ۹، شمارہ ۵۔۶، ۲۰۰۶ء، ص ۶۰

۲۳۔ خاں، ظفر الاسلام، ''فلسطین کا تاریخی جائزہ''، مترجم، آصف فرخی، مشمولہ: کتابی سلسلہ ''دنیا زاد''، کراچی، شمارہ ۴، ص ۴۱

۲۴۔ خلیل اللہ، ایم۔ اے۔ ''فلسطین کا سانحہ''، عزیز پریس، کراچی، س ن، ص ۴؛ حمزہ فاروقی نے Thomus Arnold کا حوالہ دیتے ہوئے بخت نصر کے حملے کا سال ۵۸۶ قبل مسیح قرار دیا ہے۔ دیکھیے ''اقبال اور مسئلہ فلسطین''، مشمولہ: ''اقبال ریویو''، کراچی، جولائی ۱۹۶۹ء، ص ۳۶

۲۵۔ صالح، ص ۳۲۔۳۳

۲۶۔ خلیل اللہ، ص ۴

۲۷۔ فاروقی، حمزہ، ''اقبال اور مسئلہ فلسطین''، مشمولہ: ''اقبال ریویو''، کراچی، جولائی ۱۹۶۹ء، ص ۳۷؛ پروفیسر خلیل

اللہ نے Ghettos کی جگہ Ghretto لکھا ہے۔ دیکھیے ''فلسطین کا سانحہ''، محولہ بالا، ص ۴

۲۸۔ شفیع، محمد افتخار، ''اردو ادب اور آزادیِ فلسطین''، کتاب سرائے، لاہور، ۲۰۱۱ء، ص ۲۱

۲۹۔ صالح، ص ۳۴۔۳۵

۳۰۔ طبری، ابن جریر، ''تاریخ الرسل والملوک''، جلد سوم، دارالمعارف، مصر، ۱۹۶۲ء، ص ۲۰۷۔۲۱۰

۳۱۔ البلاذری، احمد بن یحییٰ، ''فتوح البلدان''، مصر، مکتبہ التجاریہ، ۱۹۵۹ء، ص ۱۴۷

۳۲۔ شفیع، ص ۲۲۔۲۳

۳۳۔ بحوالہ ''اردو دائرہ معارف اسلامیہ''، جلد ۱۶، پنجاب یونی ورسٹی، لاہور، ۱۹۷۸ء، ص ۴۶۶۔۴۶۵

۳۴۔ علی، امیر، ''تاریخ اسلام''، مترجم، باری علیگ، آئینہ ادب، لاہور، ۱۹۷۰ء، ص ۲۴۷

۳۵۔ صدیقی، علی محسن، ''فلسطین اسلامی عہد میں''، مشمولہ: کتابی سلسلہ ''دنیازاد''، کراچی، شمارہ ۴۰، ص ۳۸

۳۶۔ ندوی، شاہ معین الدین، ''تاریخ اسلام''، جلد چہارم، دارالمصنفین، اعظم گڑھ، ۱۹۵۳ء، ص ۱۰۵

۳۷۔ شفیع، ص ۲۴

۳۸۔ صالح، ص ۳۵

۳۹۔ شفیع، ص ۲۵

۴۰۔ اختر، خواجہ عباد اللہ، ''خلافت اسلامیہ''، جلد اوّل، ادارۂ ثقافت اسلامیہ، لاہور، ۱۹۵۱ء، ص ۲۹

۴۱۔ صالح، ص ۳۵

۴۲۔ پرائس، کرسٹن، ''اسلامی فنون کی داستان''، مترجم، ہلال احمد زبیری، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ۱۹۶۸ء، ص ۱۲

۴۳۔ ندوی، رشید احمد، ''تہذیب و تمدن اسلامی''، حصہ دوم، ادارۂ ثقافت اسلامیہ، لاہور، ۱۹۵۲ء، ص ۴۰۴

۴۴۔ مل، ڈاکٹر، بحوالہ خواجہ عباد اللہ اختر، ''خلافت اسلامیہ''، حصہ اوّل، محولہ بالا، ص ۹۴

۴۵۔ مغل، ص ۶۴

۴۶۔ خلیل اللہ، ص ۵

۴۷۔ ایضاً

۴۸۔ صالح، ص ۳۸۔۳۹

۴۹۔ فاروقی، ص ۳۹

۵۰۔ خلیل اللہ، ص ۷۔۸

۵۱۔ بالفور، لارڈ، بحوالہ محمد حمزہ فاروقی، محولہ بالا، ص ۴۰

۵۲۔ صالح، ص ۳۹۔۴۰

۵۳۔ خلیل اللہص ۷۔۹

۵۴۔ شفیع، ص ۳۳

۵۵۔ صدیقی، محمد علیم اللہ، ''الحاج مفتی اعظم امین الحسینی و جہاد فلسطین''، افضل الکتابت، لاہور، س ن، ص تمام

۵۶۔ مغل، ص ۶۶

۵۷۔ صالح، ص ۴۰

۵۸۔ خلیل اللہ، ص ۱۰

۵۹۔ ملنشت، لارڈ، بحوالہ ''الحاج مفتی اعظم امین الحسینی و جہاد فلسطین''، محولہ بالا، ص ۳۰

۶۰۔ صدیقی، ص ۳۲۔۷۸

۶۱۔ صالح، ص ۴۰۔۴۲

۶۲۔ شفیع، ص ۳۳۔۳۴

۶۳۔ شائق، امیر الحسن، ''برطانوی نو آبادیات''، مکتبۂ تعمیر نو، لاہور، ۱۹۷۷ء، ص ۱۱۷

۶۴۔ ظفر الاسلام، "فلسطین کا تاریخی جائزہ"، مترجم، ڈاکٹر آصف فرخی، مشمولہ: کتابی سلسلہ "دنیا زاد"، کراچی، شمارہ ۴، ص ۴۷

۶۵۔ ایضاً، ص ۴۶

۶۶۔ شفیع، ص ۳۵

۶۷۔ مغل، ص ۶۷

۶۸۔ شفیع، ص ۳۵۔۳۶

۶۹۔ غبان، عبداللہ، "تاریخ اسلام کے حیرت انگیز کارنامے"، مترجم، عبدالوہاب ظہوری، نفیس اکیڈمی، حیدر آباد دکن، ۱۹۴۷ء، ص ۱۱۲

۷۰۔ درویش، محمود، "انجام سے شروع نہ ہو"، مترجم، آصف فرخی، مشمولہ: کتابی سلسلہ "دنیا زاد"، محولہ بالا، ص ۹۴

۷۱۔ چیم، ہرزونگ، "War and Peace in the Middle East", Random House, New York, 1982, p-270

۷۲۔ مغل، ص ۷۳

۷۳۔ شفیع، ص ۳۹۔۴۱

۷۴۔ مغل، ص ۷۴

۷۵۔ ایضاً، ص ۷۸

۷۶۔ شفیع، ص ۴۲۔۴۳

۷۷۔ مغل، ص ۷۶

۷۸۔ سعید، ایڈورڈ، "صیہونیت اور یورپی استعمار کے رویے"، مترجم، شاہد حمید، روزنامہ "ایکسپریس" لاہور، ۱۰ مارچ ۲۰۰۸ء، ص ۱۳

۷۹۔ فاروقی، شمس الرحمٰن، بحوالہ "اسرائیل اور فلسطین: خاموشی پر ضرب"، از ڈیوڈ شلمین، مترجم، نجم فاروقی، مشمولہ: کتابی سلسلہ "دنیا زاد"، کراچی، شمارہ ۳۳، ص ۹۷

۸۰۔ شلمین، ڈیوڈ، "اسرائیل اور فلسطین: خاموشی پر ضرب"، مترجم: انجم فاروقی، مشمولہ: کتابی سلسلہ "دنیا زاد"، کراچی، شمارہ ۳۳، ص ۱۰۴

۸۱۔ حنا، زاہدہ، "وہ فلسطین کا عاشق تھا"، مشمولہ: کتابی سلسلہ "دنیازاد"، کراچی، شمارہ ۱۱، ص ۲۲۹۔۲۳۲

۸۲۔ چومسکی، نوح، "انتقاضہ کے چند مناظر"، مترجم، سید کاشف رضا، مشمولہ: کتابی سلسلہ "دنیا زاد"، کراچی، شمارہ ۴، ص ۲۸۶

۸۳۔ منصوری، شفیع موسیٰ، "غزہ: پامال ہوتا شہر"، روزنامہ "ایکسپریس" لاہور، ۲۶ اگست ۲۰۰۷ء، ص ۱۰

۸۴۔ خان، راجا ذاکر، "صبح نو"، نیوز روم پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۴ء، ص ۱۱۴

۸۵۔ سعید، ایڈورڈ، "محرومی کے پچاس سال"، مترجم، شاہ محی الدین، مشمولہ: کتابی سلسلہ "دنیازاد"، کراچی، شمار ۴، ص ۱۵۳

۸۶۔ شفیع، ص ۴۷۔۴۹

۸۷۔ ایضاً، ص ۵۰

۸۸۔ شلمین، ص ۱۰۸

۸۹۔ سوئیف، اہداف، "بندوقوں کے سائے میں: میرا فلسطینی سفر"، مترجم، آصف فرخی، مشمولہ: کتابی سلسلہ "دنیازاد"، کراچی، شمارہ ۴، ص ۹۲

۹۰۔ روز، ایموس، "اراڈ سے ایک پوسٹ کارڈ"، مترجم کاشف رضا، کتابی سلسلہ "دنیازاد"، کراچی، شمارہ ۴، ص ۱۰۶

۹۱۔ ہاس، آمرہ، "ناکہ بندی کے چند مناظر"، مترجم، رفاقت حیات، کتابی سلسلہ "دنیازاد"، کراچی، شمارہ ۴، ص ۱۱۴

۹۲۔ سعید، ایڈورڈ، ”فلسطینی محاصرے میں“، مترجم، حسن عابدی، مشمولہ: کتابی سلسلہ ”دنیازاد“، کراچی، شمارہ ۴، ص۱۱۶

۹۳۔ اشراوی، حنا، ”فلسطینی عوام کے نام شیرون کا پیغام“، مترجم، آصف فرخی، مشمولہ: کتابی سلسلہ ”دنیا زاد“، کراچی، شمارہ ۴، ص۱۳۶

۹۴۔ بحوالہ ایمنسٹی انٹرنیشنل، ”انہدام اور بے دخلی: فلسطینی گھروں کی تباہی“، مترجم، آصف فرخی، مشمولہ: کتابی سلسلہ ”دنیا زاد“، کراچی، شمارہ ۴، ص ۲۳۴۔ ۲۴۳

۹۵۔ غانم، سعد، ”ایک مسئلہ، ایک حل“، مترجم، انور حسن صدیقی، مشمولہ: کتابی سلسلہ ”دنیازاد“، کراچی، شمارہ ۴، ص۲۷۶۔۲۷۷

۹۶۔ مائل، محمد ذکریا، ”قضیۂ فلسطین“، العرب پریس، کراچی، ۱۳۶۹ھ، ص ۱۹۲۔ ۱۹۳

۹۷۔ ملک، ممتاز، ”صیہونی جارحیت کیوں کام یاب رہی“، مشمولہ: ”عرب و اسرائیل“، مرتبہ عارف دہلوی، فرینڈز پبلی کیشنز، ملتان، ص۲۷۔ ۲۸

۹۸۔ حسن، عبدالقادر، ”عربوں کی شکست کے اصل اسباب“، مشمولہ: ”عرب و اسرائیل“، محولہ بالا، ص ۵۸

۹۹۔ خان، محمد اکبر، میجر جنرل، ”محشر فلسطین“، مکتبہ داستان، لاہور، ۱۹۶۸ء، ص۲۸۔ ۲۹

۱۰۰۔ نعیم، سی۔ ایم۔ ”انتفاضہ: ان کہی کہانی“، مترجم، خورشید قائم خانی، مشمولہ: مشمولہ: کتابی سلسلہ ”دنیا زاد“، کراچی، شمارہ ۴، ص۳۷۸۔ ۳۸۷

۱۰۱۔ الزرکلی، بحوالہ: سی۔ ایم۔ نعیم، ص۳۷۹

۱۰۲۔ مطار، احمد، بحوالہ سی۔ ایم۔ نعیم، ص۳۷۹

۱۰۳۔ شفیع، ص۵۱۔ ۵۲

۱۰۴۔ قزلباش، علی کمیل، ”عربی ادب از آغاز تاسانحہ فلسطین“، مشمولہ: سہ ماہی ”پیغام آشنا“، اسلام آباد، شمارہ ۲۸، ص۱۴۶

۱۰۵۔ شفیع، ص۵۲۔ ۵۳

۱۰۶۔ رشید، ڈاکٹر اسماء، ”مقبوضہ فلسطین کا ادب مقاومت“، مشمولہ: ”فلسطین اردو ادب میں“، مرتبہ پروفیسر فتح محمد ملک، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۰ء، ص ۲۲۔ ۴۱

۱۰۷۔ کاظم، محمد، ”جون ۱۹۶۷ء کی شکست کے بعد جدید عربی شاعری“، مشمولہ: ”فلسطین اردو ادب میں“ محولہ بالا، ص ۴۲۔ ۴۹

۱۰۸۔ قبانی، نزاد، بحوالہ محمد کاظم، ”عربی افسانہ: جون ۱۹۶۷ء کی شکست کے بعد“، مشمولہ: ”فلسطین اردو ادب میں“، محولہ بالا، ص۵۳۔ ۵۴

۱۰۹۔ عثمانی، مولانا ظفر احمد، ”جہاد فلسطین“، مشمولہ: ماہ نامہ ”البلاغ“، کراچی، جولائی ۱۹۶۷ء، ص۵۳

۱۱۰۔ شفیع، ص۵۳۔ ۵۴

۱۱۱۔ اکبر حسین، الہٰ آبادی، سید، ”کلیات اکبر الہٰ آبادی“، اسرار کریمی پریس، الہٰ آباد، ۱۹۳۶ء، ص۱۷۶

۱۱۲۔ انیس، میر، https://www.rekhta.org/shayari/baitulmaqdus

۱۱۳۔ صدیقی، افتخار احمد، ڈاکٹر، ”مقدمہ“، مشمولہ: ”کلیات نظم حالی“، جلد اوّل، مرتبہ ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۶۸ء، ص۶۰۔ ۶۲

۱۱۴۔ حالی، مولانا الطاف حسین، ”کلیات نظم حالی“، جلد دوم، مرتبہ ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۷۰ء، ص۱۴۳

۱۱۵۔ ایضاً، ص۱۷۷۔۱۷۸

۱۱۶۔ موہانی، حسرت، ''کلیات حسرت موہانی''، مکتبہ معین الادب، لاہور، ۱۹۷۶ء، ص۱۵۸۔۱۵۹

۱۱۷۔ ایضاً، ص۱۶۶

۱۱۸۔ فوق، محمد الدین، مشمولہ: ماہ نامہ ''تخلیق''، لاہور، دسمبر ۱۹۸۵ء، ص۸۶

۱۱۹۔ لنگڑیال، ڈاکٹر الطاف حسین، ''مسئلہ فلسطین کے حوالے سے اردو کی مزاحمتی شاعری کا ایک تنقیدی جائزہ''، مشمولہ: ''القلم''، دسمبر ۲۰۱۲ء، ص۲۵۵

۱۲۰۔ زیدی، ڈاکٹر نظیر حسین، ''مولانا ظفر علی خان بحیثیت شاعر''، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی، ۱۹۷۹ء، ص ۱۰۹۔۱۱۳

۱۲۱۔ خان، ظفر علی، ''چمنستان''، پبلشرز یونائیٹڈ، لاہور، ۱۹۴۴ء، ص۲۴

۱۲۲۔ ایضاً، ص۸

۱۲۳۔ ایضاً، ص۴۰

۱۲۴۔ ایضاً، ص۴۳۔۴۴

۱۲۵۔ ایضاً، ص۴۸

۱۲۶۔ ایضاً، ص۵۱

۱۲۷۔ ایضاً، ص۵۹

۱۲۸۔ ایضاً، ص۶۲

۱۲۹۔ ایضاً، ص۶۸

۱۳۰۔ ایضاً، ص۷۴

۱۳۱۔ ایضاً، ص۷۵

۱۳۲۔ ایضاً، ص۷۷

۱۳۳۔ ایضاً، ص۷۹

۱۳۴۔ ایضاً، ص۱۰۹۔۱۱۰

۱۳۵۔ ایضاً، ص۱۲۹

۱۳۶۔ ایضاً، ص۱۳۳۔۱۳۴

۱۳۷۔ ایضاً، ص۱۵۶

۱۳۸۔ خان، ظفر علی، ''حبسیات''، منصور اسٹیم پریس، لاہور، ۱۹۲۲ء، ص۴۴

۱۳۹۔ خان، مولانا ظفر علی، ''کلیات ظفر علی خان''، مرتبہ زاہد علی خان، الفیصل ناشران و تاجران کتب، لاہور، ۲۰۰۷ء، ص۹۸

۱۴۰۔ ایضاً، ص۲۵۴

۱۴۱۔ بہ حوالہ مولانا ابوالحسن ندوی، ''اقبال اور مسئلہ فلسطین''،
https:bagewafa.wordpress.com/…/iqbal aurmadlap

۱۴۲۔ اقبال، علامہ، ''اقبال نامہ''، مجموعہ مکاتیب، مرتبہ شیخ عطاءاللہ، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ص۲۔۲۷

۱۴۳۔ ایضاً، ص۴۴۶

۱۴۴۔ ایضاً

۱۴۵۔ اقبال، بہ حوالہ: مولانا ابوالحسن ندوی، محولہ بالا

۱۴۶۔ اقبال، بہ حوالہ: حمزہ فاروقی، محولہ بالا، ص ۴۲

۱۴۷۔ لنگڑیال، ڈاکٹر الطاف حسین، ''مسئلہ فلسطین کے حوالے سے اردو کی مزاحمتی شاعری کا تنقیدی جائزہ''، مشمولہ: ''القلم''، دسمبر ۲۰۱۶ء، ص۲۵۵

۱۴۸۔ اقبال، ڈاکٹر محمد، ''ضرب کلیم''، مشمولہ: ''کلیات اقبال''، مکتبہِ جمال، لاہور، ۲۰۰۴ء، ص۱۰۴۱

۱۴۹۔ علی، مبارک، ''اسرائیلی اور فلسطینی تاریخ نویسی کے رجحانات''، مشمولہ: کتابی سلسلہ ''دنیازاد''، کراچی، شمارہ ۴، ۴نومبر ۲۰۰۱ء، ص۶۴

۱۵۰۔ شفیع، محمد افتخار، محولہ بالا، ص۱۳۷

۱۵۱۔ اقبال، علامہ، ''کلیات اقبال''، ص۶۸۴

۱۵۲۔ ملک، فتح محمد، ''فلسطین اور اردو ادب''، مشمولہ: ''فلسطین اردو ادب میں''، مرتبہ پروفیسر فتح محمد ملک، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ص۱۷۹

۱۵۳۔ اقبال، علامہ، بہ حوالہ فتح محمد ملک، ص۱۰

۱۵۴۔ اقبال، علامہ، ''کلیات اقبال''، ص۱۰۳۳

۱۵۵۔ اقبال، علامہ، ''کلیات اقبال''، ص۱۰۳۹

۱۵۶۔ شفیع، محمد افتخار، محولہ بالا، ص۱۳۶

۱۵۷۔ اقبال، علامہ، ''کلیات اقبال، ص۵۷۰

۱۵۸۔ ایضاً، ص۹۱۰

۱۵۹۔ فاروقی، حمزہ، محولہ بالا، ص۴۳۔۴۴

۱۶۰۔ اقبال، علامہ، ''کلیات اقبال''، ص ۸۱۵

۱۶۱۔ ایضاً، ص۱۰۲۱

۱۶۲۔ ندوی، مولانا ابوالحسن علی، محولہ بالا، ص۴۔۵

۱۶۳۔ اقبال، علامہ، ''کلیات اقبال، ص۱۰۴۵

۱۶۴۔ فراقی، تحسین، ''علامہ اقبال اور اتحادِ عالم اسلامی''، مشمولہ: ''معیار'' (اسلام آباد)، جولائی تا دسمبر ۲۰۱۰ء، ص۲۴۶

۱۶۵۔ اقبال، علامہ، ''گفتار اقبال''، مرتبہ محمد رفیق افضل، ادارۂ تحقیقات پاکستان، لاہور، ۱۹۸۶ء، ص۹۳

۱۶۶۔ احمد، اکبر، ''Journey into Islam''، پنگوئن، انڈیا، ۲۰۰۷ء، ص۱۸۔۱۹

۱۶۷۔ فراقی، تحسین، محولہ بالا، ص۲۴۶۔۲۴۷

۱۶۸۔ اقبال، علامہ، ''کلیات اقبال، ص۱۰۴۹

۱۶۹۔ فراقی، تحسین، ص۳۴۹

۱۷۰۔ اقبال، علامہ، بہ حوالہ: ''علامہ اقبال اور اتحادِ عالمِ اسلامی''، محولہ بالا، ص۳۴۹

۱۷۱۔ اقبال، علامہ، ''کلیات اقبال''، ص۱۰۳۱

۱۷۲۔ عامر، زاہد منیر، ڈاکٹر، ''اقبال کا دردمند دل اور فلسطین: کل اور آج''، مشمولہ: ''معیار''، اسلام آباد، جنوری تا جون ۲۰۱۲ء، ص۷۱

۱۷۳۔ بٹالوی، عاشق حسین، ''اقبال کے آخری نو سال''، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۰ء، ص۳۔۴

۱۷۴۔ فاروقی، ص۴۶۔۴۷

۱۷۵۔ عبدالقادر، امتیاز، ''اقبال کا دورۂ فلسطین''، مشمولہ: ''عبارت''، حیدر آباد، اقبال نمبر، جنوری ۲۰۱۴ء تا مارچ ۲۰۱۴ء، ص۴۵۳

۱۷۶۔ ایضاً، ص۴۹

۱۷۷۔ روزنامہ لندن ٹائمز، ۵ نومبر ۱۹۳۲ء، بحوالہ: ''ہماری قومی جدوجہد''، از عاشق حسین بٹالوی، محولہ بالا، ص ۲۰۹۔۲۱۰

۱۷۸۔ فاروقی، ص۴۹۔۵۰

۱۷۹۔ اقبال، علامہ، ''مکتوبِ اقبال بنام عطیہ فیضی''، مورخہ ۲۹ مئی ۱۹۳۳ء، مشمولہ: ''انگریزی تحریریں''، ص۱۰، بحوالہ ڈاکٹر معین الدین عقیل، ''اقبال اور جدید دنیائے اسلام''، مکتبہ تعمیر انسانیت، لاہور، ۲۰۰۸ء، ص۲۶۶

۱۸۰۔ عقیل، معین الدین، ڈاکٹر، ''اقبال اور جدید دنیاے اسلام''، مکتبۂ تعمیر انسانیت، لاہور، ۲۰۰۸ء، ص۲۶۹

۱۸۱۔ اقبال، علامہ، بہ حوالہ: ڈاکٹر معین الدین عقیل، محولہ بالا، ص۲۷۲

۱۸۲۔ اقبال، علامہ، ''جاوید نامہ''، ص۹۷، مشمولہ: ''کلیات اقبال، فارسی''، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، سن ندارد، ص۶۸۵

۱۸۳۔ ملک، فتح محمد، ''فلسطین اردو ادب میں''، ص۱۱

۱۸۴۔ ملیح آبادی، جوش ،"جواں مردوں سے خطاب"، مشمولہ: "الناظر" (لکھنؤ)، دسمبر ۱۹۲۴ء، جلد ۲۷، نمبر ۶۲، ص ۶۰

۱۸۵۔ ملیح آبادی، جوش، مشمولہ: "الناظر" (لکھنؤ)، جولائی ۱۹۶۷ء، ص ۱۳

۱۸۶۔ ملیح آبادی، جوش ، "جھٹپٹے کے تاثرات"، مشمولہ: "الناظر" (لکھنؤ)، اپریل ۱۹۳۵ء، جلد ۳۹، شمارہ ۴، ص ۲۸۳

۱۸۷۔ بسواق، حکیم افتخار علی جگر صدیقی، مشمولہ: "الناظر" (لکھنؤ)، ۱۹۳۵ء، جلد ۳۹، شمارہ ۶، ص ۴۳۷

۱۸۸۔ مسلم عظیم آبادی، مولوی محمد، مشمولہ: "الناظر" (لکھنؤ)، مارچ ۱۹۲۴ء، جلد ۲۶، شمارہ ۱۵۳، ص ۱۰

۱۸۹۔ عمر، ابو، "خیالات"، مشمولہ: "الناظر" (لکھنؤ)، نومبر ۱۹۲۷ء، جلد ۳۳، شمارہ ۵، ص ۵۶

۱۹۰۔ آہ، منشی ممتاز علی، مشمولہ: "الناظر" (لکھنؤ)، اکتوبر ۱۹۲۶ء، جلد ۳۱، شمارہ ۴، ص ۲۳

۱۹۱۔ شفیع ، ص ۱۵۲

۱۹۲۔ راشد، ن۔م۔ "کلیات راشد"، ماورا پبلشرز، لاہور، س ن، ص ۲۰۱

۱۹۳۔ شفیع ، ص ۱۵۳

۱۹۴۔ راشد، ص ۲۰۲

۱۹۵۔ راشد، ن۔م۔ "کلیات راشد"، کتابی دنیا، دہلی، ۲۰۱۱ء، ص ۲۷۲۔۲۷۳

۱۹۶۔ سلیم، احمد، "موجِ زر"، نگارشات، لاہور، ۱۹۹۰ء، ص ۲۴۷

۱۹۷۔ ناہید، کشور، "مرے دل مرے مسافر"، مشمولہ: ماہ نامہ "ماہ نو"، فیض نمبر، لاہور، شمارہ، ۵، جلد ۶۱، جون ۲۰۰۸ء، ص ۸۰

۱۹۸۔ شفیع ، ص ۱۳۹

۱۹۹۔ مدنی، عزیز حامد، "آج بازار میں پابجولاں چلو"، اردو اکیڈمی سندھ، کراچی، ۱۹۸۸ء، ص ۹۳

۲۰۰۔ انصاری، سحر، "فیض کے آس پاس"، پاکستان اسٹڈیز سنٹر، جامعہ کراچی، ۲۰۱۱ء، ص ۱۱۶۔۱۱۷

۲۰۱۔ انصاری، سحر، "فیض اور فلسطین"، https:www.urduweb,org

۲۰۲۔ فیض، فیض احمد، "نسخہ ہائے وفا"، مکتبہ کارواں، لاہور، ۲۰۰۱ء، ص ۴۲۱۔۴۲۲

۲۰۳۔ ایضاً، ص ۴۲۲

۲۰۴۔ بلوچ، عبدالغفور، ڈاکٹر، "مسئلہ فلسطین پر فیض احمد فیض کی مزاحمتی شاعری اور اس کے اثرات"، مشمولہ: "معیار"، اسلام آباد، جنوری۔ جون ۲۰۱۲ء، ص ۵۷۰۔۵۷۶

۲۰۵۔ فیض ، ص ۲۸۰۔۲۸۱

۲۰۶۔ بلوچ ، ص ۵۷۶

۲۰۷۔ انصاری، سحر، پروفیسر، "فیض کے آس پاس"، ص ۱۴

۲۰۸۔ فیض، ص ۶۴۶

۲۰۹۔ فیض ، ص ۶۱۹

۲۱۰۔ انصاری، سحر، پروفیسر، "فیض کے آس پاس"، محولہ بالا، ص ۲۳۱۔۲۳۲

۲۱۱۔ فیض، بہ حوالہ: "تنقیدی افق"، محولہ بالا، ص ۲۳۱۔۲۳۲

۲۱۲۔ فیض، ص ۶۷۴۔۶۷۵

۲۱۳۔ فیض، ص ۶۷۸

۲۱۴۔ انصاری، سحر، پروفیسر، "فیض کے آس پاس"، ص ۶۳

۲۱۵۔ شفیع ، ص ۱۴۰

۲۱۶۔ فیض ، ص ۲۳۶

۲۱۷۔ شفیع ، ص ۱۴۰۔۱۴۱

۲۱۸۔ فیض ،ص ۲۳٦

۲۱۹۔ ایضاً،ص ٦۳۸۔٦۳۹

۲۲۰۔ ایضاً،ص ٦۸۱؛یہ نظم ''لا خوف علیھم'' کے نام سے بھی مشہور ہوئی۔

۲۲۱۔ فیض، فیض احمد، ''فلسطینی ادب''، مشمولہ: کتابی سلسلہ ''دنیازاد''، کراچی، شمارہ ۵، جلد دوم، نومبر ۲۰۰۱ء، ص ٦۴۔٦۵

۲۲۲۔ عرفات، یاسر، ''فیض ہمارے دوست تھے''، ماہ نامہ ''ادب لطیف''،لاہور، اپریل ۱۹۸۵ء، ص ۴۷

۲۲۳۔ ندوی، مولانا حسن مثنیٰ، ''قضیہ فلسطین عالم اسلام کا مسئلہ ہے''، مشمولہ: ''جریدہ''، کراچی، غیر مطبوعہ کتابیں، شمارہ ۳۴، جلد ششم، ص ۳۹۵

۲۲۴۔ قاسمی، احمد ندیم، ''محیط''، اساطیر پبلشرز، لاہور، ۲۰۰۱ء، ص ۲۰۸

۲۲۵۔ قاسمی، احمد ندیم، ''لوح خاک''، اساطیر پبلشرز، لاہور، ۲۰۰۱ء، ص ۲۰۸

۲۲٦۔ قاسمی، احمد ندیم، ''روشنی کی تلاش''، مشمولہ: ''فلسطین اردو ادب میں''، محولہ بالا، ص ۱۷۰

۲۲۷۔ ایضاً

۲۲۸۔ قاسمی، احمد ندیم، ''لوح خاک''، ص ۱۷۸

۲۲۹۔ کاشمیری، شورش، ''کلیات شورش کاشمیری''، الفیصل ناشران و تاجران کتب، لاہور، ۱۹۹٦ء، ص ۱۰۱۷

۲۳۰۔ ایضاً، ص ۱۰۹۵

۲۳۱۔ ایضاً

۲۳۲۔ ایضاً، ص ۱۰۹٦۔۱۰۹۷

۲۳۳۔ ایضاً، ص ۱۰۲۴

۲۳۴۔ القاسمی، عبد الحق حقانی، ''فلسطین کے چار ممتاز شاعر''، تخلیق کار پبلشرز، نئی دہلی، ۱۹۹۵ء، ص ۱۲۱

۲۳۵۔ جالب، حبیب، بہ حوالہ https://www.rekhta.org/shayari/philistene

۲۳٦۔ جالب، حبیب، ''کلیات حبیب جالب''، ماورا پبلشرز، لاہور، ۱۹۹۲ء، ص ۲۰۸

۲۳۷۔ ایضاً، ص ۲۰۹

۲۳۸۔ حنا، زاہدہ، ''عاشق من الفلسطین''، روزنامہ ''ایکسپریس''، ۳ ستمبر ۲۰۱۴ء

۲۳۹۔ ایضاً، ص ۴۴۳

۲۴۰۔ ایضاً

۲۴۱۔ ایضاً، ص ۲۱٦

۲۴۲۔ جالب، حبیب، مشمولہ: روزنامہ ''نوائے وقت''، لاہور، جون ۱۹٦۷ء؛ حبیب کی یہ نظم ان کی کلیات میں شامل نہیں۔

۲۴۳۔ انشا، ابن، ''اس بستی کے اک کوچے میں''، لاہور اکیڈمی، لاہور، ۱۹۹۲ء، ص ۱٦۲۔۱٦۵

۲۴۴۔ ایضاً، ص ۱٦۲

۲۴۵۔ ایضاً، ص ۱٦۵

۲۴٦۔ ایضاً

۲۴۷۔ شفیع ،ص ۱۴۹

۲۴۸۔ انشا ،ص ۱٦۴

۲۴۹۔ بنگلوری، امامی، ''خشتِ خوں''، انجمن ترقی اردو، میسور ص ۱۰٦

۲۵۰۔ ایضاً، ص ۱۰۸

۲۵۱۔ ملتانی، اسد، ''کلیات اسد ملتانی''، سرائیکی ریسرچ سینٹر، ملتان، ۲۰۰۴ء، ص ۱۸۳۔۱۸۴

۲۵۲۔ ماہر القادری، ''کلیات ماہر''، القمر انٹر پرائزز، لاہور، ۱۹۹۴ء، ص ۸۸۵

۲۵۳۔ لنگڑیال، ص ۲٦۰۔۲٦۱

۲۵۴۔ ماہر القادری، ص۸۸۶

۲۵۵۔ ایضاً، ص۲۱۸

۲۵۶۔ ماہر القادری، مشمولہ: ''الحاج مفتیٔ اعظم امین الحسینی و جہاد فلسطین''، محولہ بالا، ص 'د'

۲۵۷۔ بہار، سیدہ آمنہ، غیر مطبوعہ مقالہ، ''اردو شاعری میں کشمیر''، قرطبہ یونی ورسٹی آف سائنس اینڈ ٹیکنالوجی، پشاور، ۲۰۱۳ء، ص۱۲۳

۲۵۸۔ شفیع، ص۱۴۶

۲۵۹۔ رئیس امروہوی، ''قطعات رئیس امروہوی''، اخبار جہاں پبلی کیشنز، کراچی، ۱۹۹۴ء، ص۵۷

۲۶۰۔ رئیس امروہوی، بحوالہ ''فلسطین اردو ادب میں''، محولہ بالا، ص۲۲۲

۲۶۱۔ ایضاً، ص۲۰۶

۲۶۲۔ رئیس امروہوی، ''قطعات رئیس امروہوی''، جلد دوم، رئیس اکاڈمی، کراچی، ۱۹۸۷ء، ص۱۶۹

۲۶۳۔ ایضاً، ص۱۶۲

۲۶۴۔ امروہوی، افق کاظمی، ''تریاق مشرق''، افق پبلشرز، امروہہ، ۱۹۳۳ء، ص۱۵۱

۲۶۵۔ صدیقی، نعیم، مشمولہ: ''سیارہ''، لاہور، جولائی ۱۹۶۷ء، ص۴۵

۲۶۶۔ ایضاً، ص۴۶۔۴۷

۲۶۷۔ احمد، ریاض، مشمولہ: ماہ نامہ ''سیارہ'' (لاہور)، اگست ۱۹۶۷ء، ص۵۰

۲۶۸۔ شفیع، ص۱۵۳۔۱۵۴

۲۶۹۔ صدیقی، نعیم، مشمولہ: ''اے ارضِ فلسطین''، مرتبہ انتظار نعیم، ادارۂ ادب اسلامی، دہلی، ۲۰۰۶ء، ص۱۵

۲۷۰۔ ایضاً، ص

۲۷۱۔ ایضاً، ص۱۶

۲۷۲۔ شفیع، ص۱۵۵

۲۷۳۔ دانش، احسان، مشمولہ: ماہ نامہ ''سیارہ''، لاہور، اگست ۱۹۶۷ء، ص۶۹۔۷۰

۲۷۴۔ جعفری، ادا، ''غزالاں تم تو واقف ہو''، مکتبہ فنون، لاہور، ۱۹۷۴ء، ص۵۶

۲۷۵۔ ایضاً، ص۵۵۔۵۶

۲۷۶۔ ایضاً، ص۵۵

۲۷۷۔ ایضاً، ص۱۳

۲۷۸۔ ایضاً

۲۷۹۔ ایضاً، ص۱۴

۲۸۰۔ کاشمیری، ظہیر، مشمولہ: ''فلسطین کے چار ممتاز شاعر''، ص ۲۱

۲۸۱۔ ایضاً، ص۲۲

۲۸۲۔ ایضاً، ص۲۳

۲۸۳۔ محی الدین، مخدوم، ''سرخ سویرا''، اشاعت گھر، حیدر آباد دکن، ۱۹۴۴ء، ص۹۳۔۹۵

۲۸۴۔ ایضاً، ص۱۰۲۔۱۰۳

۲۸۵۔ فراز، احمد، ''نابینا شہر میں آئینہ''، دوست پبلی کیشنز، اسلام آباد، ۱۹۹۸ء، ص۱۰۸

۲۸۶۔ ایضاً

۲۸۷۔ ایضاً، ص۱۰۹

۲۸۸۔ ایضاً، ص۱۱۱

۲۸۹۔ ایضاً، ص۱۱۴

۲۹۰۔ فراز، احمد، ''شائیلاگ''، مشمولہ: کتابی سلسلہ ''دنیا زاد''، کراچی، شمارہ۵، ص۴۳۸

۲۹۱۔ ایضاً

۲۹۲۔ فراز، احمد، ''پس انداز موسم''، دوست پبلی کیشنز، اسلام آباد، ۱۹۹۸ء، ص۱۳۵

۲۹۳۔ منصوری، عادل، مشمولہ: "فلسطین کے چار ممتاز شاعر"، محولہ بالا، ص ۲۷

۲۹۴۔ ایضاً

۲۹۵۔ ظفر، یوسف، "یہودیت"، نفیس پرنٹرز، لاہور، ۱۹۸۲ء، ص ۲۱۔۲۲

۲۹۶۔ ایضاً

۲۹۷۔ ایضاً

۲۹۸۔ غزنوی، خاطر، "جواب در جواب"، سنڈیکیٹ آف رائٹرز، پشاور، ۱۹۹۶ء، ص ۱۲۳

۲۹۹۔ جعفری، سید ضمیر، "کھلیان"، باب العلم، لاہور، ۱۹۸۰ء، ص ۱۶۰

۳۰۰۔ ایضاً، ص ۲۷

۳۰۱۔ احمد، شہزاد، "خالی آسمان"، مطبوعات، لاہور، سن ندارد، ص ۵۱۔۵۲

۳۰۲۔ ایضاً، ص ۵۲

۳۰۳۔ عارف، منظور، "لہر لہر دریا"، مطبوعات، لاہور، ۱۹۸۱ء، ص ۱۱۹

۳۰۴۔ ایضاً

۳۰۵۔ ایضاً، ص ۱۴۸

۳۰۶۔ ایضاً، ص ۱۴۹

۳۰۷۔ شفیع، ص ۱۷۳

۳۰۸۔ عارف، منظور، ص ۱۸۷۔۱۸۸

۳۰۹۔ ایضاً، ص ۱۸۸

۳۱۰۔ انور، صبیحہ، ڈاکٹر، "مقدمہ"، مشمولہ: "نالۂ نیم شبی"، از ام ہانی، مکتبۂ اسلام، لکھنؤ، ۱۹۸۶ء، ص ۲۰

۳۱۱۔ ام ہانی، "نالۂ نیم شبی"، مکتبۂ اسلام، لکھنؤ، ۱۹۸۶ء، ص ۱۱۶

۳۱۲۔ واسطی، نیرّ، مشمولہ: روزنامہ "نوائے وقت"، لاہور، ۷ جون ۱۹۶۷ء، ص ۱۱۶

۳۱۳۔ اختر، صہبا، مشمولہ: روزنامہ "نوائے وقت"، لاہور، ۷ جون ۱۹۶۷ء

۳۱۴۔ اختر، صہبا، مشمولہ: روزنامہ "حریت"، کراچی، ۹ جون ۱۹۶۷ء

۳۱۵۔ قریشی، نصرت، مشمولہ: روزنامہ "مشرق"، کراچی، ۸ جون ۱۹۶۷ء

۳۱۶۔ بھوپالی، محسن، "موضوعاتی نظمیں"، ایوانِ ادب، کراچی، ۱۹۹۳ء، ص ۶۲

۳۱۷۔ قریشی، طاہر، "ہماری ملی شاعری میں نعتیہ عناصر"، غیر مطبوعہ مقالہ برائے پی ایچ۔ ڈی۔ کراچی، جون ۲۰۱۲ء، ص ۳۷۶

۳۱۸۔ بنارسی، کیف، "بیت المقدس کی تلاش"، مکتبۂ کیف، کراچی، ۱۹۸۱ء، ص ۳۵۔۱۲۶؛ یہ نظم ان کے مجموعے "شعلۂ آزادی" میں بھی شامل ہے۔

۳۱۹۔ کیانی، رحمٰن، "سیف و قلم"، ایوانِ اردو، کراچی، ۱۹۷۱ء، ص ۷۹۔۸۰

۳۲۰۔ مذاق العیشی، مشمولہ: روزنامہ "نوائے وقت"، لاہور، ۹ جون ۱۹۶۷ء، ص ۷۹۔۸۰

۳۲۱۔ ہاشمی، عاطر، مشمولہ: روزنامہ "نوائے وقت"، لاہور، ۸ جون ۱۹۶۷ء

۳۲۲۔ انور، خورشید، مشمولہ: روزنامہ "نوائے وقت"، لاہور، ۸ جون ۱۹۶۷ء

۳۲۳۔ آزردہ، سردار اورنگزیب، مشمولہ: روزنامہ "نوائے وقت"، لاہور، ۷ جون ۱۹۶۷ء

۳۲۴۔ تائب، حفیظ، "وہی یٰسیں وہی طٰہٰ"، القمر انٹر پرائزز، لاہور، ۱۹۹۸ء، ص ۱۲۲

۳۲۵۔ ظفر، عشرت، مشمولہ: کتابی سلسلہ ”دنیازاد“، کراچی، شمارہ۵، ص۴۴۳

۳۲۶۔ ایضاً، ص۴۴۴

۳۲۷۔ ایضاً، ص۴۴۵

۳۲۸۔ قریشی، خلیق، ”سرِ دوش ہوا“، مرتبہ ریاض مجید، قرطاس پبلشرز، فیصل آباد، ۱۹۹۴ء، ص۵۸۵۔۵۸۷

۳۲۹۔ لدھیانوی، ”کیفِ مسلسل“، بیت الادب، فیصل آباد، ۱۹۸۲ء،، ص۳۴۔۳۵

۳۳۰۔ ڈیسوی، منظور، ”انقلاب انقلاب“، رہبر پبلشرز، کراچی، ۱۹۹۵ء، ص۶۰

۳۳۱۔ ایضاً، ص۸۷

۳۳۲۔ عظیم آبادی، شوق، ”کف گل فروش“، مرتبہ انور فخری، بساطِ ادب، کراچی، ۱۹۹۶ء، ص۱۵۸۔۱۶۱

۳۳۳۔ خان، پروفیسر عنایت علی، ”عنایتیں کیا کیا“، منشورات، لاہور، سن ندارد، ص۷۵۔۷۶

۳۳۴۔ احمد، شمیم، مشمولہ: ”فلسطین اردو ادب میں“، محولہ بالا، ص۲۰۵

۳۳۵۔ ایضاً

۳۳۶۔ احمد، شہزاد، ”خالی آسمان“، مطبوعات، لاہور، سن ندارد، ص۵۱۔۵۲

۳۳۷۔ ایضاً، ص۵۲

۳۳۸۔ بریلوی، سلیم ناز، ”جنگ جاری ہے“، اسلامک پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۰ء، ص۱۸۳

۳۳۹۔ ایضاً

۳۴۰۔ ریاض، فہمیدہ، ”میں مٹی کی مورت“، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۸ء، ص۴۲۱

۳۴۱۔ ایضاً

۳۴۲۔ حارث، انور، ”صدائے تیشہ“، غازی نصیر الدین پبلشرز، کراچی، ۱۹۸۰ء، ص۲۵۔۲۷

۳۴۳۔ رئیس الشاکری، مشمولہ: ”الجامعہ“، جھنگ، فلسطین نمبر، اکتوبر۔نومبر ۱۹۶۷ء، ص۱۱۲

۳۴۴۔ شفیع، ص۱۷۵

۳۴۵۔ پرویز، صلاح الدین، ”صلاح الدین پرویز کے خطوط“، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۱۹۸۸ء، ص۱۲۷

۳۴۶۔ ایضاً، ص۱۲۸

۳۴۷۔ ایضاً، ص۱۱۹

۳۴۸۔ ایضاً، ص۱۲۲

۳۴۹۔ ایضاً

۳۵۰۔ صدیقی، اختر، مشمولہ: ”الجامعہ“، جھنگ، محولہ بالا، ص۱۹۱

۳۵۱۔ شام، محمود، مشمولہ: ماہنامہ ”الفتح“، کراچی، اکتوبر ۱۹۸۶ء، ص۳۲

۳۵۲۔ ایضاً، ص۳۴

۳۵۳۔ ایضاً

۳۵۴۔ ایضاً

۳۵۵۔ اختر، صہبا، مشمولہ: روزنامہ ”مشرق“ (کراچی)، ۲۹ ستمبر ۱۹۶۹ء

۳۵۶۔ اختر، صہبا، مشمولہ: روزنامہ ”مشرق“ (کراچی)، ۳۱ اگست ۱۹۶۹ء

۳۵۷۔ قریشی، خلیق، ”سرِ دوش ہوا“، محولہ بالا، ص۲۷۸

۲۵۸۔ پھول، تنویر الدین، مشمولہ: روزنامہ ”جنگ“، کراچی، ۱۳ اگست ۱۹۶۹ء

۳۵۹۔ درانی، انعام، مشمولہ: روزنامہ ”جنگ“، کراچی، ۱۳ اگست ۱۹۶۹ء

۳۶۰۔ صدیقی، نعیم، مشمولہ: ماہ نامہ ''رضوان''، مسجدِ اقصیٰ نمبر، اکتوبر ۱۹۶۹ء، ص ۱۷۔۱۸

۳۶۱۔ حسنی، محمد ثانی، مشمولہ: ماہ نامہ ''رضوان''، مسجدِ اقصیٰ نمبر، محولہ بالا، ص ۷۔۸

۳۶۲۔ چودھری، ریاض حسین، مشمولہ: ''خونِ رگ جاں''، چودھری سنز، سیال کوٹ، ۱۹۷۱ء، ص ۳۳۔۳۹

۳۶۳۔ ایضاً

۳۶۴۔ ایضاً، ص ۴۸

۳۶۵۔ بدایونی، محترمہ عزیز، مشمولہ: روز نامہ ''جنگ''، کراچی، ۱۵ ستمبر ۱۹۶۹ء

۳۶۶۔ مسیح الدین، بیگم، مشمولہ: روزنامہ ''جنگ''، کراچی، ۱۵ ستمبر ۱۹۶۹ء

۳۶۷۔ فیروز، فیروز الدین، مشمولہ: روزنامہ ''مشرق''، کراچی، ۱۵ ستمبر ۱۹۶۹ء

۳۶۸۔ امروہوی، رضیہ نور، مشمولہ: ''عصمت''، کراچی، دسمبر ۱۹۶۹ء، ص ۱۱

۳۶۹۔ انبالوی، سرور، غیر مطبوعہ کلام، بہ حوالہ: ''فلسطین کے حوالے سے اردو کی مزاحمتی شاعری کا تنقیدی جائزہ، محولہ بالا، ص ۲۶۲

۳۷۰۔ لنگڑیال، ص ۲۶۲

۳۷۱۔ انبالوی، محولہ بالا، ص ۲۶۲

۳۷۲۔ ایضاً

۳۷۳۔ فرخی، ڈاکٹر اسلم، مشمولہ: کتابی سلسلہ ''دنیا زاد''، کراچی، شمارہ ۵، ص ۴۳۷

۳۷۴۔ ایضاً

۳۷۵۔ باجوہ، اکرم، غیر مطبوعہ، بہ حوالہ: ''فلسطین کے حوالے سے اردو کی مزاحمتی شاعری کا تنقیدی جائزہ''، محولہ بالا، ص ۲۶۳

۳۷۶۔ ایضاً

۳۷۷۔ صبوحی، سید مطلوب علی مطلوب، ''لمعات''، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ۱۹۹۷ء، ص ۵۲۹۔۵۳۲

۳۷۸۔ ایضاً

۳۷۹۔ سہیل، خالد، ''آزاد فضائیں''، پاکستان بکس اینڈ لٹریری ساؤنڈ، لاہور، ۱۹۹۳ء، ص ۷۵

۳۸۰۔ ایضاً، ص ۷۶

۳۸۱۔ ایضاً، ص ۷۳

۳۸۲۔ ایضاً، ص ۷۴

۳۸۳۔ جعفری، سید محمد، مشمولہ: ''تحریکِ آزادیٔ فلسطین: اردو ادب کے آئینے میں''، مرتبہ ڈاکٹر فتح محمد ملک، محولہ بالا، ص ۲۱۴۔۲۱۶

۳۸۴۔ سید، اصغر ندیم، ''وہ کیا چاہتے ہیں''، مشمولہ: کتابی سلسلہ ''دنیازاد''، کراچی، شمارہ ۵، ص ۴۴۸

۳۸۵۔ ایضاً

۳۸۶۔ رشک، سلطان، مشمولہ: ''فلسطین اردو ادب میں''، محولہ بالا، ص ۲۱۷

۳۸۷۔ ایضاً

۳۸۸۔ رضا، حسن عباس، مشمولہ: ''فلسطین اردو ادب میں''، ص ۲۱۵۔۲۱۶

۳۸۹۔ ملسیانی، گوہر، ''شوقِ شہادت زندہ ہے''، گوہر پبلشرز، صادق آباد، ۱۹۹۳ء، ص ۷۱۔۷۲

۳۹۰۔ ملسیانی، گوہر، غیر مطبوعہ کلام، بہ حوالہ: ''فلسطین کے حوالے سے اردو کی مزاحمتی شاعری کا تنقیدی جائزہ''، محولہ بالا، ص ۲۶۷

۳۹۱۔ ایضاً، ص ۲۶۷۔۲۶۸

۳۹۲۔ ایضاً، ص ۲۶۸

۳۹۳۔ ایضاً

۳۹۴۔ شاہ، محمد فیروز، مشمولہ: ’’فلسطین اردو ادب میں‘‘، محولہ بالا، ص ۲۲۳

۳۹۵۔ محمود، صلاح الدین، مشمولہ: ’’فلسطین اردو ادب میں‘‘، محولہ بالا، ص ۲۱۲

۳۹۶۔ قیصر، نذیر، مشمولہ: ’’فلسطین اردو ادب میں‘‘، محولہ بالا، ص ۲۰۸

۳۹۷۔ ایضاً، ص ۲۱۰

۳۹۸۔ جعفری، مقصود، ’’گوشہ قفس‘‘، مشمولہ: ’’فلسطین اردو ادب میں‘‘، محولہ بالا، ص ۱۶۹

۳۹۹۔ ایضاً، ص ۱۵۰

۴۰۰۔ ایضاً، ص ۱۷۰

۴۰۱۔ ساجد، ’’دل کی دہلیز پر‘‘، علم و عرفان پبلشرز، لاہور، ۲۰۰۲ء، ص ۱۰۲

۴۰۲۔ عزیز، ایزد، ’’غروب شب‘‘، سارنگ پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۷ء، ص ۱۰۲

۴۰۳۔ ساحل، ذیشان، مشمولہ: کتابی سلسلہ ’’دنیازاد‘‘، کراچی، شمارہ ۵، ۲۰۰۱ء، ص ۴۵۰

۴۰۴۔ درویش، محمود، ’’انجام سے شروع نہ ہو‘‘، مترجم، آصف فرخی، کتابی سلسلہ ’’دنیازاد‘‘، کراچی، شمارہ ۵، ۲۰۰۱ء، ص ۴۸۱

۴۰۵۔ انصاری، محسن، مشمولہ: ’’اے ارض فلسطین‘‘، مرتبہ، انتظار نعیم، ادارۂ ادب اسلامی ہند، دہلی، ۲۰۰۶ء، ص ۱۲۰

۴۰۶۔ ایضاً، ص ۱۴۱

۴۰۷۔ منیب الرحمٰن، مشمولہ: کتابی سلسلہ ’’دنیازاد‘‘، کراچی، شمارہ ۵، ۲۰۰۱ء، ص ۴۳۹

۴۰۸۔ نظامی، ناصر، ’’صلیب گر‘‘، اسٹڈی سرکل، کراچی، ۱۹۸۸ء، ص ۴۶

۴۰۹۔ ایضاً

۴۱۰۔ احتشام، سید ضیا، مشمولہ: ’’اے ارض فلسطین‘‘، محولہ بالا، ص ۱۹۴

۴۱۱۔ حزیں، سید دلاور علی، مشمولہ: ’’اے ارض فلسطین‘‘، محولہ بالا، ص ۱۹۰

۴۱۲۔ ہاشمی، دل دار، مشمولہ: ’’اے ارض فلسطین‘‘، محولہ بالا، ص ۱۷۹

۴۱۳۔ خیر، رؤف، مشمولہ: ’’اے ارض فلسطین‘‘، محولہ بالا، ص ۱۷۷

۴۱۴۔ واصف، واصف الرحمٰن، مشمولہ: ’’اے ارض فلسطین‘‘، محولہ بالا، ص ۱۳۰

۴۱۵۔ محمود الصباح، محمد الشیخ، مشمولہ: ’’اے ارض فلسطین‘‘، محولہ بالا، ص ۱۴

۴۱۶۔ خان، راجا ذاکر، ’’صبح نو‘‘، نیوز روم پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۴ء، ص ۱۰۷

۴۱۷۔ ایضاً، ص ۱۰۸

۴۱۸۔ گوریان، بن، بہ حوالہ: ’’صبح نو‘‘، محولہ بالا، ص ۱۰۷

۴۱۹۔ قیصر الجعفری، مشمولہ: ’’اے ارض فلسطین‘‘، محولہ بالا، ص ۲۲

۴۲۰۔ بسمل، ایوب، مشمولہ: ’’اے ارض فلسطین‘‘، محولہ بالا، ص ۵۸

۴۲۱۔ بسمل، ایوب، بہ حوالہ: ’’لالۂ خونیں کفن، فلسطین اردو شاعری میں‘‘، از پروفیسر محسن عثمان ندوی، مشمولہ: https//urdu.siasat.com ادبی ڈائری، ۹ اگست ۲۰۱۴ء

۴۲۲۔ عابدی، تقی، مشمولہ: ’’اے ارض فلسطین‘‘، محولہ بالا، ص ۶۲

۴۲۳۔ ساکری، شاہد، مشمولہ: ''اے ارض فلسطین''، محولہ بالا، ص۸۰

۴۲۴۔ طاہر، محمد، مشمولہ: ''اے ارض فلسطین''، محولہ بالا، ص ۸۸

۴۲۵۔ انصاری، معصوم، مشمولہ: ''اے ارض فلسطین''، محولہ بالا، ص۹۲

۴۲۶۔ فاروقی، شمیم، مشمولہ: ''اے ارض فلسطین''، محولہ بالا، ص۱۰۱

۴۲۷۔ درد چاپداونی، مشمولہ: ''اے ارض فلسطین''، محولہ بالا، ص۱۱۸

۴۲۸۔ یوسف، ضمیر، مشمولہ: ''اے ارض فلسطین''، محولہ بالا، ص۲۰۳

۴۲۹۔ اعجاز، س۔ف۔ مشمولہ: ''لالۂ خونیں کفن: فلسطین اردو شاعری میں''، محولہ بالا،

۴۳۰۔ خان، راجا ذاکر، ''صبح نو''، نیوز روم پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۴ء، ص۸۰

۴۳۱۔ شبلی، القمہ، مشمولہ: ''اے ارض فلسطین''، محولہ بالا، ص۳۱

۴۳۲۔ سنبھلی، قمر، مشمولہ: ''اے ارض فلسطین''، محولہ بالا، ص۳۵

۴۳۳۔ مسرور، عائشہ، مشمولہ: ''اے ارض فلسطین''، محولہ بالا، ص۴۲

۴۳۴۔ ارمان، خان، مشمولہ: ''اے ارض فلسطین''، محولہ بالا، ص۱۴۵

۴۳۵۔ احمد، ڈاکٹر مختار الدین، مشمولہ: ''اے ارض فلسطین''، محولہ بالا، ص۱۴۲

۴۳۶۔ اعجاز، ف۔ س۔ مشمولہ: ''اے ارض فلسطین''، محولہ بالا، ص۱۵۹

۴۳۷۔ واصف، عبدالرحمٰن، ''جہان فکر پر چمکے گا جب ستارہ مرا''، مشمولہ: ''اے ارضِ فلسطین''، محولہ بالا، ص ۱۳۹

۴۳۸۔ طارق، عطا الرحمٰن، مشمولہ: ''اے ارض فلسطین''، محولہ بالا، ص۱۳۰

۴۳۹۔ ہرگانوی، ڈاکٹر مناظر عاشق، مشمولہ: ''اے ارض فلسطین''، محولہ بالا، ص۹۹

۴۴۰۔ سروش، رفعت، بہ حوالہ: ''لالۂ خونیں کفن: فلسطین اردو شاعری میں''، محولہ بالا،

۴۴۱۔ شفیع، ص۲۰۰

۴۴۲۔ چومسکی، نوم، ''انقاضہ کے چند مناظر''، مترجم، کاشف رضا، کتابی سلسلہ ''دنیازاد''، شمارہ ۴، محولہ بالا، ص۳۱۷

۴۴۳۔ صابر، ایوب، مشمولہ: ''اے ارض فلسطین''، محولہ بالا، ص۱۷۰

۴۴۴۔ اشعر، تاج الدین، مشمولہ: ''اے ارض فلسطین''، محولہ بالا، ص۵۴

۴۴۵۔ جیلانی، محسنہ، مشمولہ: ''اے ارض فلسطین''، محولہ بالا، ص۶۹

۴۴۶۔ حمزہ پوری، اشراق، مشمولہ: ''اے ارض فلسطین''، محولہ بالا، ص۱۰۶

۴۴۷۔ آزاد، حسین آزاد، مشمولہ: ''اے ارض فلسطین''، محولہ بالا، ص۱۶۰

۴۴۸۔ حمزہ پوری، ناوک، مشمولہ: ''اے ارض فلسطین''، محولہ بالا، ص۶۳

۴۴۹۔ صدیقی، کوثر، ''لالۂ خونیں کفن: فلسطین اردو شاعری میں''، محولہ بالا، ص

۴۵۰۔ علیم، خالد، مشمولہ: سہ ماہی ''ہم عصر''، لاہور، شمارہ ۴، ۲۰۰۶ء، ص۱۵

۴۵۱۔ ایضاً، ص۱۵۶

۴۵۲۔ شہزاد، سلیم، مشمولہ: سہ ماہی ''سمبل''، راولپنڈی، شمارہ ۳، ۲۰۰۷ء، ص۹۱

۴۵۳۔ سہیل، عامر، ''تیوہار کا پانی''، بک ہوم، لاہور، ۲۰۰۸ء، ص۱۲۹

۴۵۴۔ ایضاً، ص۱۶۹

۴۵۵۔ انجم، خان، مشمولہ: ''اے ارض فلسطین''، محولہ بالا، ص ۱۴۸

۴۵۶۔ بنارسی، حفیظ، مشمولہ: ''اے ارض فلسطین''، محولہ بالا، ص۱۹

۴۵۷۔ حماد، ابوالبیان، مشمولہ: ''اے ارض فلسطین''، محولہ بالا، ص۱۳۷

۴۵۸۔ حنا، زاہدہ، ''عاشق من الفلسطین''، محولہ بالا، ص

۴۵۹۔ حسن، شاہدہ، بہ حوالہ: زاہدہ حنا، محولہ بالا،

۴۶۰۔ بہ حوالہ: ''اے ارضِ فلسطین''، محولہ بالا، ص ۲۹۔۲۱۰

۴۶۱۔ المسدوسی، احمد عبداللہ، ''قضیہ فلسطین اور اسرائیل کی جنگ''، مشمولہ: ماہ نامہ ''البلاغ''، کراچی، جنوری ۱۹۶۸ء، ص۴۱۔۴۹

۴۶۲۔ ادارہ، ''اسرائیل کا حملہ''، مشمولہ: ماہ نامہ ''البلاغ''، کراچی، جون ۱۹۶۷ء، ص۱۸

۴۶۳۔ امین الحسینی، الحاج محمد، ''اسلام کو مغربی تہذیب کے مطابق بنانے کی کوشش''، مشمولہ: ماہ نامہ ''البلاغ''، کراچی، جون ۱۹۶۷ء، ص۴۲

۴۶۴۔ سہیل، خالد، ''امن کی دیوی''، مشمولہ: کتابی سلسلہ ''دنیازاد''، کتابی سلسلہ نمبر ۴، نومبر ۲۰۰۱ء، ص۳۳۵

۴۶۵۔ منیر نیازی، بہ حوالہ خالد سہیل، ص۳۳۶

۴۶۶۔ عثمانی، محمد تقی، ''رولے اب دل کھول کے اے دیدۂ خونابہ بار''، مشمولہ: ماہ نامہ ''البلاغ''، کراچی، جولائی ۱۹۶۷ء، ص۳

۴۶۷۔ عثمانی، ظفر احمد، ''ذلت یہود اور عربوں کی حالیہ شکست''، مشمولہ: ماہ نامہ ''البلاغ''، کراچی، اگست ۱۹۶۷ء، ص۴۲

۴۶۸۔ کیفی، ذکی، ''التجا''، مشمولہ: ماہ نامہ ''البلاغ''، کراچی، اگست ۱۹۶۷ء، ص۴۷

۴۶۹۔ کیفی، ذکی، ''حادثہ''، مشمولہ: ماہ نامہ ''البلاغ''، کراچی، نومبر ۱۹۶۷ء، ص۵۰

۴۷۰۔ عبدالعزیز شرقی، ''تیار برسنے کو مرے دل کی گھٹا ہے''، مشمولہ: ماہ نامہ ''البلاغ''، کراچی، اکتوبر ۱۹۶۷ء، ص۴۵

۴۷۱۔ المسدوسی، ستمبر ۱۹۶۷ء، ص۴۱

۴۷۲۔ المسدوسی، اکتوبر ۱۹۶۷ء، ص۳۷۔۴۴

۴۷۳۔ المسدوسی، نومبر ۱۹۶۷ء، ص۴۸

۴۷۴۔ رشید، ڈاکٹر اسماء، ''مقبوضہ فلسطین کا ادب مقاومت''، مشمولہ: ''فلسطین اردو ادب میں''، محولہ بالا، ص۴۰

۴۷۵۔ صدیقی، سرشار، ''میرے بدن میں تھی تری خوشبوئے پیرہن''، مشمولہ: https://www.rekhta,org/shayari/phelistin

۱۹۶۵ء: محرکات وعوامل

پاکستان کی قومی وملی تاریخ میں ۶ ستمبر ۱۹۶۵ء کا دن امتحان حریت بن کر طلوع ہوا اور ہماری ادبی تاریخ پر دوررس نتائج چھوڑ کر رخصت ہوا۔ یہ وہ الم ناک تاریخ ہے جب ہم سایہ ملک بھارت نے اپنے معاندانہ رویے کی انتہا کو چھوتے ہوئے رات کی تاریکی میں شہری آبادیوں پر حملے شروع کر دیے۔ اس حملے کو پاکستانی افواج اور عوام دونوں نے مل کرنا کام بنایا۔ سترہ دن کی اس جنگ میں وہ ملی شعور جو ۱۹۵۸ء کے مارشل لا کے بعد سرد پڑ گیا تھا، ابھر کر سامنے آیا جس کا دستاویزی ثبوت وہ ملی ترانے اور نغمے ہیں جو ہمارے شعرا نے تخلیق کیے اور جن کی گونج آج بھی سنائی دیتی ہے۔ ہزاروں کی تعداد میں ترانے اور نظمیں جن کا انتخاب ''جنگ ترنگ''، ''جاگ رہا ہے پاکستان''، ''لہو ترنگ''، ''رزمیہ گیت''، ''ایثار کا ہوا آغاز''، ''تیرے جاں نثاروں کو سلام''، ''رزم و نظم''، ''قلم کے سپاہی''، ''ضرب الم''، ''گل بانگ جہاد'' اور دیگر انتخاب میں محفوظ ہیں۔ بعض شعرا نے اس قدر بھرپور انداز سے اس واقعے کو موضوع بنایا کہ باقاعدہ مجموعے تیار ہو گئے۔ ان مجموعوں میں ضمیر جعفری کا ''لہو ترنگ''، طفیل ہوشیار پوری کا ''میرے محبوب وطن''، رحمٰن کیانی کا ''حرفِ سپاس'' اور نعیم صدیقی کا مجموعہ ''خونِ آہنگ'' وغیرہ کافی اہمیت کے حامل ہیں۔ یہ ترانے اور ملی نغمے ممکن ہے ان ادبی معیارات پر پورا نہ اترتے ہوں لیکن ان میں وطن دوستی، شجاعت، مردانگی، حریت فکر اور اپنی مٹی سے پیار و الفت کے جذبات کو ضرور تلاش کیا جا سکتا ہے۔

جنگ ستمبر پاکستان اور بھارت کے درمیان لڑی جانے والی پہلی باقاعدہ جنگ ہے۔ یہ ان دونوں ممالک کے درمیان پہلی بین الاقوامی جنگ تھی جس میں بھارت نے بین الاقوامی سرحد عبور کر کے پاکستان پر جنگ مسلط کی۔ آپریشن جبرالٹر اس کی بنیادی وجہ تھی[۱]۔ ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ کے پس منظر میں ان دونوں ممالک کا دیرینہ تنازعہ کشمیر کا مسئلہ بھی اہمیت کا حامل تھا۔ جان فریکر نے اس بابت لکھا کہ اس جنگ کے آغاز سے قبل ہی بھارت نے پاکستان پر الزامات کی بوچھاڑ کر رکھی تھی کہ وہ مقبوضہ کشمیر میں گڑبڑ پھیلانے کی سازشوں میں مصروف ہے۔ پاکستان کی فوجی حکومت نے واضح طور پر جواباً کہا کہ وہ کشمیریوں کے حق خود ارادیت کے حصول کی جدوجہد میں ان کی حمایت جاری رکھیں گے۔ دونوں ممالک کے درمیان اگست ۱۹۶۵ء میں مقبوضہ کشمیر کے تنازعے کے مسئلے پر بے چینی بڑھنے لگی۔ کشمیر میں احتجاجی تحریکوں کے زور پکڑنے کی ایک بڑی وجہ ۱۹۶۳ء میں ''موئے مبارک'' کی چوری تھی۔ اس کے علاوہ ۷ جنوری ۱۹۴۹ء کو قائم ہونے والی جنگ بندی اور کشمیری عوام کی آزادانہ نقل و حرکت میں رکاوٹ بھی احتجاجی رویوں کو بڑھا رہی تھی۔ جان فریکر نے اس معاملے میں بھارت کی تشویش کی حمایت بھی کی اور اس تشویش کو بلاوجہ قرار نہیں دیا[۲]۔

کشمیر میں پاکستانی فوجوں کی دراندازی کے حوالے سے متضاد آرا ملتی ہیں۔ پاکستان کے عسکری دانش وروں نے بھارتی مظالم اور کشمیر پر غاصبانہ قبضے کی جو تصویر پیش کی ہے وہ اس نقطۂ نظر سے بالکل الگ ہے جو بھارتی دانش وروں نے پیش کیا ہے۔ بہرحال آپریشن جبرالٹر کے نتائج خاصے بھیانک نکلے اور اسی آپریشن کے بطن سے ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ نے جنم لیا۔ اس کے علاوہ دوسرے سرحدی تنازعات مثلاً Runn of Kuch کا مسئلہ جس نے پہلی بار ۱۹۶۵ء میں سر اٹھایا تھا، بی۔ بی۔ سی۔ نے تو اپنی رپورٹ میں ۱۹۶۵ء کی جنگ کی بنیاد رن آف کچھ کے علاقے میں ہونے والی چھوٹی سی جھڑپ کو قرار دیا۔ یہ پورا علاقہ صحرا تھا جہاں کبھی کبھار

چڑھوا ہے یا کبھی بھولا بھٹکا پولیس کا دستہ نکل آتا تھا۔ اس علاقے سے محض ۲۶ میل کے فاصلے پر پاکستان کے علاقے بدین کا ریلوے اسٹیشن تھا جب کہ بھارت کی جانب سے اس جگہ پہنچنے کے تمام راستے مشکل اور دشوار گزار تھے۔ بی۔ بی۔ سی۔ کے مطابق جھگڑے کی ابتدا اس وقت ہوئی جب پاکستان نے ڈینگ اور سرائی کو ملانے کے لیے بھارتی سرحد کے قریب ۱۸ میل طویل ایک کچی سڑک بنائی۔ یہ سڑک کئی مقامات تک بھارتی سرحد کے ڈیڑھ میل اندر تک جاتی تھی۔ بھارت نے اس مسئلے پر مقامی سفارتی سطح پر احتجاج ریکارڈ کروایا۔ پاکستان نے اس کے جواب میں بریگیڈیر اظہر کی سربراہی میں جارحانہ رویہ اختیار کرتے ہوئے مزید گشت بڑھا دی۔ دوسری جانب بھارت نے بھی کنجر کوٹ کے مقام پر سردار چوکی بنالی۔ جنرل ٹکا خان کے حکم پر بریگیڈیر اظہر نے اس چوکی پر حملہ کر دیا۔ بھارتی فوج اور اسپیشل ریزرو فورس کے جوان مقابلے کی تاب نہ لا کر شالی مار چوکی، جنگل اور سردار چوکی سے پسپا ہو گئے لیکن حیرت انگیز طور پر پاکستانی فوج کو یہ پتا نہ چلا کہ چوکیاں خالی ہو چکی ہیں۔ انھوں نے بھی اپنے فوجیوں کو اس مقام پر واپس بلوا لیا جہاں سے صبح حملے شروع ہوئے تھے۔ بی۔ سی۔ چکرورتی نے اپنی کتاب "History of Indo-Pak war, 1965" تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ پاکستان کی اکیاون ویں بریگیڈ کے کمانڈر نے اتنے ہی اناڑی پن سے اس آپریشن کو ہینڈل کیا جتنا ہندوستان کی اکتیس ویں انفنٹری بریگیڈ کے بریگیڈیر پہلجانی نے[۳] رن آف کچھ کے محاذ کے کچھ ہی دنوں بعد بھارت نے جوڑیاں[۲] ممب پر پاکستان کے ساتھ محاذ آرائی شروع کر دی۔ پاکستانی افواج نے بہادری سے جواب دیا اور ہر محاذ پر بھارت کو شکست کھانی پڑی۔ اپنی ہزیمت مٹانے کے لیے بھارتی فوج لاہور سے واہگا بارڈر عبور کر کے پاکستان میں داخل ہوئی جس سے اس خون ریز جنگ کا آغاز ہوا۔ اس جنگ نے ہجرت کے واقعات کو از سر نو زندہ کر دیا۔ قوم اپنی ۱۹۴۷ء کی تلخیوں کو پوری طرح نہیں بھول پائی تھی۔ اس بار پوری قوم نے بھارتی جارحیت کا مقابلہ کرنے کی ٹھانی۔ افواج پاکستان کے ہمراہ شہریوں نے بھی بے مثال قربانی پیش کی[۴]۔ جنگی نقصانات اور تباہی سے متعلق بھارت اور پاکستان کی جانب سے متضاد دعوے سامنے آئے۔ لاتعداد ہوائی جہاز، سیکڑوں ٹینک اور شہری املاک تباہ ہوئیں۔ بھارت کی جانب سے سات لاکھ اور پاکستان کے دو لاکھ ساٹھ ہزار فوجیوں نے اس جنگ میں حصہ لیا۔ پاکستانی دعوے کے مطابق ۸۲۰۰ افراد ہلاک یا گرفتار ہوئے جب کہ بھارتی اعداد و شمار کے مطابق یہ تعداد ۵۲۵۹ تھی۔ غیر جانب دار ذرائع نے بھارت کے ۳۰۰۰ اور پاکستان کے ۳۸۰۰ افراد کی ہلاکتوں کی تصدیق کی[۵]۔

بھارت کا تو یہ منصوبہ تھا کہ زبردست حملہ کر کے لاہور پر قبضہ کر لیا جائے، اس کے بعد سیال کوٹ کی جانب سے حملہ کر کے گوجراں والا اور وزیر آباد تک پہنچ کر پاکستان کو مفلوج کر دیا جائے[۶] لیکن پاکستانی افواج کے عزم و حوصلے نے محض چند گھنٹوں کے اندر ہی ان منصوبوں کی بنیادیں گرا دیں۔ اس موقع پر ایوب خان کے قوم سے خطاب نے عوام اور فوج دونوں کو برانگیختہ کر دیا۔ اس آزمائش کی گھڑی میں پوری قوم جذبہ ایثار کی حرارت سے سرگرم کار ہو گئی[۷]۔ سترہ روزہ اس جنگ نے اردو شاعری پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ جنگ کے واقعات کی منظر کشی، عسکری اوزار کی لغت اور جذبہ حب الوطنی کے اظہار نے اردو شاعری کو نئے مزاج سے روشناس کرایا۔ شعرا نے ان نظموں میں بھارتی جارحیت کی کھل کر مذمت کی۔ اپنی جغرافیائی خد و خال کی حفاظت کے جذبے سے معمور ہو کر حفیظ جالندھری نے ان جوانوں کو تلقین کرتے ہوئے کہا کہ:

کچل دو دشمنوں کو خار زاروں سے گزر جاؤ   جہاں بھی فوجِ باطل ہے وہاں پر آگ برساؤ[۸]

قومی جذبے سے سرشار احسان دانش نے بھی ''اعلان بیداری'' کرتے ہوئے وطن کی محبت کے جذبے کو خوب ابھارا۔ انھوں

نے اپنے ہم وطنوں اور نوجوانوں کو مخاطب کرنے کے ساتھ ساتھ شعرا اور دانش وروں کو بزم کے بجائے رزم کے موضوعات کی طرف متوجہ ہونے کا مشورہ دیتے ہوئے کہا کہ:

بزمیہ شاعری کے دیے بجھ گئے آڑ لینے لگے ماہرینِ سخن[9]

جنگ کے فوری اثرات کسی بھی قوم پر مایوسی اور محرومی کی شکل میں ظاہر ہوتے ہیں۔ تباہی و بربادی اور آگ و خون کے اس بے اماں کھیل میں سوائے افسوس کے قوموں کو اور کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ فیض احمد فیض نے اپنی نظم ''بلیک آؤٹ'' میں اس صورت حال کو شمعوں کی بے نوری سے تعبیر کرتے ہوئے کہا کہ:

جب سے بے نور ہوئی ہیں شمعیں/ خاک میں ڈھونڈتا پھرتا ہوں نہ جانے کس جا/ کھو گئی
ہیں مری دونوں آنکھیں/ تم جو واقف ہو بتاؤ کوئی پہچان مری/ اس طرح ہے کہ ہر اک رگ
میں اتر آیا ہے/ موج در موج کسی زہر کا قاتل دریا/ اہل پل ٹھہرو کہ اس پار کسی دنیا سے/
برق آئے مری جانب یدِ بیضا لے کر/ اور مری آنکھوں کے گم گشتہ گہر/ جام ظلمت سے سیہ
مست/ نئی آنکھوں کے شب تاب گہر لوٹا دے[10]

فیض نے یہ نظم ۱۹۶۵ء میں لکھی۔ اس کے علاوہ اکتوبر ۱۹۶۵ء ہی میں ایک اور نظم ''سپاہی کا مرثیہ'' بھی لکھی۔ اس نظم کی فضا بھی عام جذباتی نغموں سے قدرے مختلف ہے۔ وطن کی محبت، زمین کی محبت اور زندگی سے محبت کی تثلیث کو شاعر مقامی رنگ دے کر جو منظر کشی کرتے ہیں، وہ منفرد قسم کا تاثر پیدا کرتا ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

اٹھو اب ماٹی سے اٹھو/ جاگو میرے لال/ اب جاگو میرے لال/ تمری سیج سجاون کارن/
دیکھو آئی رین اندھیارن/ نیلے شال دوشالے لے کر/ جن میں اِن دکھیں اکھین نے/ ڈھیر
کیے ہیں اتنے موتی[11]

مجید امجد کی شاعری میں بھی حب الوطنی کا یہ جذبہ ایک عام شہری کا جذباتی اظہار بن کر سامنے آیا۔ وہ جنگ کے اثرات کا جائزہ جذبات سے لینے کے بہ جائے خلوص دل کے ساتھ لیتے ہیں۔ ان کا لہجہ جذباتی پروپگنڈے کی گرد سے مملو نہیں ہوتا۔ ۱۹۶۵ء کے نقوش میں ''محاذِ وطن'' کے عنوان سے شائع ہونے والی نظم ان کی کلیات میں ''خطۂ پاک'' کے عنوان کے تحت شامل ہے۔ یہ مجید امجد کی منفرد نظم ہے جسے ۱۹۶۵ء کے پس منظر میں بہترین قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس نظم میں شاعر زبردست منظر نگاری سے کام لیتے ہوئے ہر تصویر کو عیاں کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ ملاحظہ کیجیے:

خطۂ پاک ترے نام دل آرا کی قسم/ کتنے سچے ہیں، سجیلے ہیں، جیالے ہیں، وہ دل/ جاگتی،
جیتی، زرہ پوش، چٹانوں کے وہ دل/ جن کی امواج لہو کا سیلاب/ تیری سرحد کی
طرف بڑھتی ہوئی آگ سے ٹکرایا ہے/ دیکھتے دیکھتے بارود کی دیوار گری/ ہٹ گئے دشمن
کے قدم/ خندقیں اٹ گئیں شعلوں سے ... مگر ہائے وہ دل/ زندہ ... ناقابل تسخیر ...
عظیم/ ہائے دلوں کی وہ فصیل/ جاوداں اور جلیل/ جس کے زیتون پہ ظفر مند ارادوں کی

سپاہ/ جس کے برجوں میں ملائک کے جیوش/ جس کے پیکر ہے کہ اک سطرِ جلی/ لوحِ ابد پر
تاباں/ آیے عمرِ شہیداں کی طرح [۱۲]

اس جنگ میں پاکستان کی حکمت عملی دفاعی تھی۔ انھیں نہ صرف اپنے وطنِ عزیز کا دفاع کرنا تھا بلکہ اپنی ملی انفرادیت، مذہبی اقدار، تہذیبی روایات اور بہ حیثیت قومی وجود کے تحفظ اور بقا کا مرحلہ بھی درپیش تھا۔ بقول نسیم حجازی، یہ اس جنگ کا ہی معجزہ تھا کہ آزادی کے ناقابل تسخیر ولولے نے پاکستان کے دس کروڑ انسانوں کو اس قدر بیدار، منظّم اور متحد کر دیا [۱۳]۔ اس دور کی اردو شاعری کے لیے جنگ ستمبر صورِ اسرافیل ثابت ہوئی۔ اپنے ماحول سے بیزاری اور مایوسی جو شعر و ادب پر دھند کی طرح چھائی ہوئی تھی، یکسر معدوم ہو گئی۔ ۱۹۶۵ء سے ۱۹۶۶ء تک محض ایک برس میں شاعری کا جتنا بڑا ذخیرہ شائع ہوا، اس کا مکمل جائزہ لینا ممکن نہیں۔ اس دور کی شاعری کو جمع و ترتیب میں نمایاں حصہ ان رسائل و جرائد کا ہے، جنھوں نے خصوصی جنگ نمبر اور یوم آزادی نمبر شائع کیے۔ خاص طور پر ماہ نامہ ''نقوش''، لاہور، ماہ نامہ ''نقش''، کراچی، ماہ نامہ ''فنون''، لاہور، ماہ نامہ ''ادبی دنیا''، کراچی، ماہ نامہ ''ساقی''، کراچی، ماہ نامہ ''افکار''، کراچی، ماہ نامہ ''خاتون پاکستان''، کراچی، ماہ نامہ ''ماہِ نو'' اور دیگر رسائل کی جنگ سے متعلق خصوصی اشاعتوں کے علاوہ ملک کے تمام چھوٹے بڑے اخبارات میں بھی رزمیہ اور قومی و وطنی شاعری کے ایسے جان دار نمونے شائع ہوئے جو طویل عرصے تک لوگوں کے دلوں کو گرماتے رہیں گے۔ اس دور میں فکر و عمل کے سب انداز بدل گئے۔ اہل قلم نے نہایت خوش اسلوبی سے اس لمحۂ آزمائش کا قرض ادا کیا۔ انھوں نے قلم کو تلوار بنا کر شعری اور ادبی جنگ لڑی جو مصروفِ جنگ سپاہ کی سب سے بڑی پشت پناہ ثابت ہوئی۔ شاعروں نے حسنِ تخیل کی دنیا سے ناتا توڑ کر عمل کی سچائیوں سے رشتہ جوڑا۔ امن اور انسانیت کا قصیدہ لکھنے والوں کے قلم میں بھی گویا آگ بھڑک گئی [۱۴]۔ قتیل شفائی نے اس تبدیلی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اپنی نظم ''قلم کار'' میں واضح طور پر کہا کہ:

صبح کے نور میں لپٹا ہوا توپوں کا دھواں	میں نے حیرت کے دریچے سے جو باہر جھانکا
مر گیا امن کے گلشن کا سجیلا پنچھی	یوں مرے گھر کے در و بام سے ٹکرایا تھا
مرا گھر پھونکنے والا مرا ہم سایہ تھا	خون کی جھیل میں حل ہو گئے چاہت کے کنول [۱۵]

ہم سایہ ملک کا یہ جنگی جنون امن و محبت کے تمام امکانات کو ختم کر دینے کے لیے کافی تھا۔ کیوں کہ جنگ میں خون بہتا ہے، انسانی لاشیں پامال کی جاتی ہیں۔ آہوں، آنسوؤں اور سسکیوں کا بسیرا ہوتا ہے لیکن اس دکھ اور کرب کے لمحات میں بھی شاعروں نے اپنے قلم میں مرثیے کا سوگ سمونے کے بہ جائے حالات کی سچی تصویر پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ قتیل کی مذکورہ نظم میں بھی ہم سایہ ملک کی بد نیتی کا پردہ چاک کیا گیا ہے۔ جب وہ کہتے ہیں کہ:

اس نے چاہا مرے گھر میں صفِ ماتم بچھ جائے	مری پلکوں پہ لرزتی جو غموں کی شبنم
مرا فن موت نہ بنتا جو مرے دشمن کی	میں قلم کار ہوں مجھ میں وہی دم باقی ہے
مرثیہ بن نہ سکی پھر بھی مری کوئی غزل	میں زمانے سے بھلا آنکھ ملاتا کیسے
مری عظمت کا یقیں بھی اُسے آتا کیسے	میرے ہاتھوں میں ابھی میرا قلم باقی ہے [۱۶]

شاعر لکھنوی بھی اہل قلم کی ترجمانی کرتے ہوئے بڑے آن بان سے شریک جہاد دکھائی دیتے ہیں۔ ان کے دل میں بھی وطن

کی عقیدت اور آزادی کی قدر و قیمت کا احساس پوری طرح موج زن ہے۔اس بابت ان کا کہنا ہے کہ:

ہر لفظ پہ مفہوم کی رکھتے ہیں نئی دھار | لہجے سے بدل دیتے ہیں ہم وقت کی رفتار
شاخوں پہ لچک ہیں کہیں تلوار کا خم ہیں | ہم اہل قلم، اہل قلم، اہل قلم ہیں [۱۷]

احمد ندیم قاسمی نے بھی ۱۹۶۵ء کی بھارتی جارحیت کو سخت تنقید کا نشانہ بنایا۔ جنگ کے باعث انسانی زندگی کی مادی اور روحانی شکست و ریخت محض جنگ کے زمانے تک محدود نہیں رہتے بلکہ طویل عرصے تک اس کے اثرات کو محسوس کیا جا سکتا ہے۔ اپنی نظم ''۶ ستمبر'' میں وہ اپنی نفسیاتی کیفیت کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

چاند اس رات کا نکلا تھا مگر اس کا وجود | اتنا خوں رنگ تھا، جیسے کسی معصوم کی لاش
تارے اس رات بھی چمکے تھے مگر اس ڈھب سے | جیسے کٹ جائے کوئی جسم حسیں قاش بہ قاش
اتنی بے چین تھی اس رات مہک پھولوں کی | جیسے ماں، جس کو ہو کھوئے ہوئے بچے کی تلاش
پیڑ چیخ اٹھتے تھے امواج ہوا کی زد سے | نوکِ شمشیر کی مانند تھی جھونکوں کی تراش
اتنے بیدار زمانے میں یہ سازش بھری رات | میری تاریخ کے سینے پہ اتر آئی تھی
اپنی سنگینوں میں اُس رات کی سفاکی سیاہ | دودھ پیتے ہوئے بچوں کو پرو لائی تھی
گھر کے آنگن میں رواں خوں، تھا گھر والوں کا | اور ہر کھیت پہ شعلوں کی گھٹا چھائی تھی
راستے بند تھے لاشوں سے پٹی گلیوں میں | بھیڑ سی بھیڑ تھی تنہائی سی تنہائی تھی [۱۸]

اس سے قبل احمد ندیم قاسمی تقسیم کے اذیت ناک واقعات کو بھی نہ صرف دیکھ چکے تھے بلکہ اپنی تخلیقات کا حصہ بھی بنا چکے تھے۔ اسی لیے ان کی مذکورہ نظم میں جو جارحیت، سفاکی اور خون آلودگی کے مناظر دکھائے گئے ہیں وہ ہندوستان کے جارح رویوں کی بھرپور عکاس ہیں۔ یہ مناظر خوف کی کیفیات کو سمیٹے ہوئے ہیں۔ خصوصاً ۶ ستمبر کی صبح بھارتی افواج کی لاہور سیکٹر پر چڑھائی، کھیتوں اور کھلیانوں پر بارود کی بارش، نہتے شہریوں پر فائرنگ، لاشوں کے انبار، فضائی حملے، جاسوسی اور قتل و غارت گری نے ایک انسان دوست شاعر کے جذبات کو بھی بری طرح متحرک کر دیا۔ اسی لیے قاسمی جیسا شاعر یہاں اپنی غیر جانب داری برقرار نہیں رکھ پائے بلکہ پوری قوم کے شانہ بشانہ اس جارحیت کا منھ توڑ جواب دینے کے حامی نظر آئے۔ وہ محبت کا جواب محبت اور نفرت کا جواب نفرت سے دینے کا اعادہ کرتے ہوئے دشمنوں کو خبردار کرتے ہیں کہ:

میں محبت کا تو دیتا ہوں محبت سے جواب | لیکن اعدا کے لیے قہر و قیامت ہوں میں
امن میں موجہِ نکہت مرا کردار سہی | جنگ کے دور میں غیرت ہوں، حمیت ہوں میں
میرا دشمن مجھے للکار کے جائے گا کہاں | خاک کا طیش ہوں، افلاک کی دہشت ہوں میں [۱۹]

ملکی حالات و واقعات اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی صورت حال کو ندیم نے پوری سچائی کے ساتھ منظوم کیا۔ اپنی نظم ''کارواں بہاروں کا'' میں وہ مٹی کے اس قرض اور اپنے فرض کے مابین نسبت کی وضاحت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

فضا سے ابر برستا رہا شراروں کا | مگر رواں ہی رہا کارواں بہاروں کا

مجھے تو پھول کھلانے ہیں، وہ لہو کے سہی　　　مجھے تو قرض چکانا ہے شاخساروں کا
یہ جی میں ہے کہ شہیدوں کی طرح زندہ رہوں　　　میں اپنے فن کو بنا لوں دیا مزاروں کا[۲۰]

فارغ بخاری بھی اس جارحیت کے خلاف اپنی نظم ''ہم ایک آواز بن گئے ہیں'' میں اپنی قوم کے ہم آواز دکھائی دیتے ہیں۔اس نظم میں انھوں نے بڑے جوش اور دبدبے کے ساتھ دشمن کو للکارا ہے۔وہ کہتے ہیں کہ:

میں اپنے قاتل کو جانتا ہوں/ وہ جو بھی بہروپ بھر کے آئے/ میں اس کے انداز جانتا ہوں/
امان و یونس عزیز بھٹی سے غازیانِ جری کا قاتل/ عوام و جمہوریت کا قاتل/ وہ ساری
انسانیت کا قاتل/ وہ میرا قاتل، وہ تیرا قاتل/ ہم آج اس بے بہار قاتل کا سر کچلنے کو/
سارے فن کار، سارے شاعر، ادیب، نغمہ گر و مصور/ اب ایک مرکز پہ آ گئے ہیں/ ہم ایک
آواز بن گئے ہیں[۲۱]

عوامی لہجے کے معروف شاعر شورش کاشمیری کی شاعری کا فکری محور صحافیانہ رنگ لیے ہوئے ہے۔وطن کی محبت میں جنگ ستمبر کے پس منظر میں ان کی متعدد نظمیں رسائل و جرائد میں شائع ہوتی رہی ہیں۔''میرا سب کچھ مرے وطن کا ہے''، ''یلغار کرو''، ''یلغار چلے''، ''الجہاد الجہاد الجہاد''، ''دوٹوک فیصلہ''، ''عساکر پاکستان''، ''پاک فوج زندہ باد''، ''چھے ستمبر''، ''غازی یا شہید'' وغیرہ جیسی نظموں میں رجزیہ آہنگ دکھائی دیتا ہے۔ان کی نظم ''میرا سب کچھ مرے وطن کا ہے'' میں ان کے لہجے کی تلخی اور کاٹ ملاحظہ کیجیے:

یہ قلم اور اس کا سیلِ رواں　　　یہ زباں اور اس کا زورِ بیاں
عرصۂ جنگ خنجر براں　　　میری بے باک جرأتوں کے نشاں
میری عزت کا پاسباں ہے وطن　　　میرے اسلاف کا نشاں ہے وطن
جو عدو اس زمیں پہ آئے گا　　　لوٹ کر پھر کبھی نہ جائے گا
مار کھائے گا سر کٹائے گا　　　موت مانگے گا موت پائے گا
اس پہ اولاد تک لٹا دوں گا　　　میرا سب کچھ مرے وطن کا ہے[۲۲]

قیوم نظر کی نظم ''ترانہ'' میں وہ وطن کو نئی زندگی کی نوید دیتے دکھائی دیتے ہیں۔احمد فراز کی نظم ''اے وطن اے وطن'' میں بھی وطن کی محبت کا جذبہ پوری شدت کے ساتھ موجود ہے۔حمایت علی شاعر نے بھی جنگوں کی تباہ کاریوں کے نتیجے میں دعائیہ انداز سے اپنے وطن کی بقا اور سلامتی اور اچھے مستقبل کی خواہش کا اظہار کیا۔اپنی نظم ''اے صبحِ وطن'' میں وہ اس آزمائش کی گھڑی میں اہلِ وطن کے دِلوں میں ولولہ پیدا کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

اب بھی ہے یہی عہد کہ ہم اپنے لہو سے　　　ہر گام یہ حرفِ جنوں تحریر کریں گے[۲۳]

منیر نیازی بھی شہروں پر ہونے والی بم باری اور عام شہریوں کی ہلاکتوں سے شدید خائف نظر آتے ہیں۔وہ مملکتوں کے درمیان جاری چپقلش میں معصوم جانوں کی ہلاکتوں پر نوحہ کناں ہیں۔کشت و خون کی جو ہولی سرحدوں پر کھیلی جا رہی تھی، اس پر تو انھوں نے برہمی کا اظہار کیا ہی ہے لیکن شہروں میں بھاگتی دوڑتی زندگی کے چراغ گل ہوتا دیکھ کر وہ انتہائی مضطرب ہیں۔اسی اضطراب میں وہ

ایک نظم ''اپنے شہریوں کے لیے دعا'' میں کہتے ہیں کہ:

پاکستان کے سارے شہرو زندہ رہو، پائندہ رہو
روشنیوں، رنگوں کی لہرو زندہ رہو، پائندہ رہو
نئے اجالوں کے سر چشمو زندہ رہو، پائندہ رہو[۲۴]

احسان دانش کی نظم ''دورانِ جنگ'' معرکہ لاہور کی خون آشام کارروائیوں کو پوری طرح اجاگر کرتی ہے۔ اس وقت صرف لاہور ہی نہیں بلکہ قصور کے قریب کھیم کرن کا علاقہ بھی دشمن کی سفاکانہ کارروائیوں کا نشانہ بنا ہوا تھا۔ اس سیکٹر کے تین اطراف سے یکے بعد دیگرے حملے شروع کر دیے گئے تھے۔ اسی سبب قصور کی شہری آبادی بھی نشانہ بنی ہوئی تھی۔ ۷ ستمبر کو ایک بھاری بم بھی جہاز سے قصور شہر پر گرایا گیا تھا جس سے متعدد افراد شہید اور زخمی ہوئے۔ سیال کوٹ سیکٹر بھی دشمنوں کے عتاب کا شکار تھا۔ ۹ اور ۱۰ ستمبر کی درمیانی رات ایک ہزار پونڈ وزنی بم گرائے گئے۔ جونڈہ کے معرکے میں پاکستانی فوج دلیری سے لڑ رہی تھی۔ اس ساری صورتِ حال سے شاعر اور ادیب سخت پریشانی کا شکار تھے۔ احسان دانش اس پورے منظر نامے کو دیکھ کر خونِ عدو سے اپنے گلوں کے رنگ سرخ دیکھنے کے تمنائی ہیں۔ اسی لیے کہتے ہیں کہ:

وہ سر زمیں کہ جس پہ تھا بارود کا دھواں — خونِ عدو سے لالہ بد اماں ہے آج کل
اس کی طرف مشین گنیں ہیں، ہوا کریں — اپنی طرف تو رحمتِ یزداں ہیں آج کل
بھڑکا دیا ہے کفر نے للکار کر اسے — پھر کشت و خوں، مذاقِ مسلماں ہے آج کل
شق ہو رہے ہیں شب کے دھاکوں سے بام و در — ہر راستے پہ موت خراماں ہے آج کل
مومن ازل سے جس کا طلب گارِ خاص ہے — وہ موت اس دیار میں ارزاں ہے آج کل[۲۵]

بعض شعرا نے اس واقعے کو مذہب کی عینک سے دیکھنے کی کوشش بھی کی۔ فتح و نصرت کی دعاؤں میں یہ رنگ بہت گہرا ہے۔ عبدالعزیز خالد، رئیس امروہوی، جعفر طاہر، اقبال صفی پوری اور دیگر بہت سے شعرا کی مناجاتوں میں تائیدِ غیبی اور روحِ جہاد کی سرشاری دکھائی دیتی ہے[۲۶]۔ رئیس امروہوی کا لکھا ہوا مشہور نغمہ ''اللہ کے وعدے پہ مجاہد کو یقیں ہے'' بھی اسی ضمن میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ بہت سے جنگی ترانے اور قومی نغمے بھی مذہبی رنگ میں رنگے ہوئے ہیں۔ حتیٰ کہ جوش کی نظم ''وارثانِ حیدرِ خیبر شکن'' بھی اپنے تمام دبدبے، گھن گرج اور بلند آہنگی کے باوجود رسول ﷺ کی امت کے پیروکار ہونے پر فخر کے احساس سے بھرپور ہیں۔

رئیس امروہوی کی چند نظمیں لاہور کے معرکے پر پاکستانی قوم کی سچی آواز ہیں۔ ان کا ترانہ ''خطۂ لاہور! تیرے جاں نثاروں کو سلام'' ۱۹۶۵ء کے پس منظر میں مقبول ترین نغموں میں شمار ہوتا ہے۔ یہ نغمہ اس حوالے سے پاکستانی جذبات کی صحیح عکاسی کرتا ہے۔ کچھ شعر ملاحظہ کیجیے:

خطۂ لاہور! تیرے جاں نثاروں کو سلام — شہریوں کو، غازیوں کو شہ سواروں کو سلام
خطۂ لاہور! کیا کہنا ہے تیری خاک کا — تو ہے اسٹالن گراڈ اس سر زمینِ پاک کا
ارضِ شالامار! راوی کے کناروں کو سلام — خطۂ لاہور! تیرے جاں نثاروں کو سلام

ایک ہی جھٹکے میں دشمن کی کلائی موڑ دی　　تو نے باطل کی کمر ضربِ گراں سے توڑ دی
اے شہیدوں کے چمن! تیری بہاروں کو سلام　　خطۂ لاہور! تیرے جاں نثاروں کو سلام [۲۷]

یاور عباس کی نظم میں یقین اور طمانیت کا جو احساس موجود ہے، اس سے دشمن کے خلاف اعتماد میں بھرپور اضافہ ہوتا ہے۔ اس افتخار کے سبب کڑے وقت میں حوصلے بلند رکھتے ہوئے اپنے سے کئی گناہ بڑی طاقت سے مقابلہ کرنے کا ایقان پیدا ہو جاتا ہے۔ جب وہ کہتے ہیں کہ:

بڑی پاک سرزمیں ہے یہاں سنتری کھڑے ہیں　　کوئی دشمنوں سے کہہ دے یہاں غزنوی کھڑے ہیں
گئی جان تو شہادت، ہوئے سرخرو تو غازی　　کبھی بھول کر نہ آنا، مری سرحدوں کی جانب
مری سرحدوں کے اندر نہ قدم بڑھا سکو گے　　مری سرحدوں پہ آئے تو نہ بچ کے جا سکو گے [۲۸]

اس موقعے پر بعض ایسی طویل نظمیں بھی سامنے آئیں جو فکر و فن کے اعتبار سے اس موضوع پر یادگار نظمیں کہیں جا سکتی ہیں۔ ممتاز صدیقی کی دو نظمیں ''وقت کی آواز'' اور ''میرے شب و روز''، سید فیضی کی نظم ''سترہ سال اور سترہ دن'' اور ادا جعفری کی نظم ''سترہ دن'' قابل قدر نظمیں کہلائے جانے کی مستحق ہیں۔ مختار صدیقی کی نظم کا ابتدائی حصہ ہندی تہذیب و تاریخ کی عمدہ مصوری اور معنوی اشاروں پر مبنی ہے۔ مادر کائنات کی طرف سے انھوں نے یہ سوال اٹھایا ہے کہ آج کی سیتا، ساوتریاں، یہ کیسے راکشسوں کو جنم دے رہی ہیں جو بے محابہ آگ اور خون کی ہولی رچانے کو تیار بیٹھے ہیں۔ بعد میں شاعر نے مسلم تاریخ کی عظیم مثالوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ:

مرے پیمبرؐ کے جدِ امجد نے کیسے دکھ کے الاؤ جھیلے　　اور ان کو گل زار کر دیا تھا
سنو! یہ صدیاں گواہ ہیں　　میں ازل سے بدر و احد کا عادی ہوں
مجھے نہ کوئی ہرا سکا ہے　　مجھے نہ کوئی ہرا سکے گا
مجھے نہ کوئی مٹا سکا ہے　　مجھے نہ کوئی مٹا سکے گا [۲۹]

نظم ''سترہ سال، سترہ دن'' میں سید فیضی کے مطابق تیرگی اجالے کا سندیسا لائی ہے۔ جنگ کے یہ سترہ دن امن کے گزشتہ سترہ سال سے بہتر ہیں کیوں کہ ان دنوں میں قوم کے خفیہ جوہر کھل کر سامنے آئے ہیں۔ یہ نظم حالات و واقعات پر ایک فکر انگیز تبصرے کی حیثیت رکھتی ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

ستّر سال امن کے اور جنگ کے سترہ دن　　سوچیے اس میں تفاوت کیا ہے
قوم کی زیست کے آئینے میں دونوں لیکن　　ایک شفاف ہے اور ایک غبار آلودہ
سترہ دن قوم کی رگ رگ میں وہ دوڑا ہے لہو　　جس کی ہر موج سے شاداب ہوئی خاکِ وطن [۳۰]

ادا جعفری کی نظم ''سترہ دن'' بھی اسی مفہوم میں لکھی گئی۔ قوم نے جس لگن اور محنت سے یہ ملک حاصل کیا تھا اس کی یاد ذہنوں سے محو ہو چکی تھی۔ دفعتاً تاریخ نے انھیں ایک بار پھر جھنجھوڑا، جدوجہد کی روایت عام ہوئی۔ یہ سترہ دن قوم کو جینے مرنے کی ادا سکھلا گئے۔

کوئی تمناؤں، دعاؤں کی سحر / آج جاگی ہے اجالے کا سندیسا لے کر / سترہ دن کی کہانی ہم
دم! / سترہ سال پرانا قصہ / اور سوچو تو کئی صدیوں کا افسانہ تھا / مجھ سے پوچھو تو وہ بس ایک ہی

لمحہ تھا کہ جب/ایک جری قوم نے جینے کی قسم کھائی تھی [۳۱]

میجر ضیاء الدین عباسی کی شہادت پر بھی ان کی نظم ''میرے شہید'' اس حوالے سے اہمیت کی حامل ہے۔ان کے مطابق ان شہدا کی قربانیوں کے ذریعے ہی ملک سے تاریکی کے بادل چھٹنا شروع ہوئے ہیں۔اس ضمن میں ان کا کہنا تھا کہ:

مرے شہید! ترے خون کے چراغوں سے ترے وطن کے اندھیرے نے روشنی پائی [۳۲]

احمد فراز کی نظم ''میں کیوں اداس نہیں'' بھی قومی جذبات کے استحکام کو بھرپور انداز سے پیش کرتی ہے۔ جنگ کے روحانی پہلوؤں کو اتنے دل آویز طریقے سے کم ہی پیش کیا گیا ہوگا جتنا کہ اس نظم میں پیش کیا گیا ہے۔ یہ محض شاعرانہ فن کاری نہیں بلکہ شاعر کے خلوص اور دردمندی کے احساس نے اس نظم کو اور زیادہ پُر اثر بنا دیا ہے۔ملاحظہ کیجیے:

لہو لہان مرے شہر، مرے یار شہید مگر یہ کیا کہ مری آنکھ ڈبڈبائی نہیں
دلاورانِ وفا کیش کی شہادت پر مرا جگر بھی لہو ہے یہ وقفِ یاس نہیں
مرے وطن کی جبیں پر دمک رہا ہے جو زخم وہ نقشِ فتح ہے داغِ غمِ شکست نہیں [۳۳]

جنگ ستمبر کی ہول ناک تباہیوں کے پس پردہ ہمارے شاعروں نے عظمت رفتہ کی بازیافت کا کام بھی لیا۔ لاہور جو صوفیوں، خانقاہوں، ادیبوں، شاعروں اور ثقافتی سرگرمیوں کا گہوارہ تھا، اس پر حملہ صرف جغرافیائی سطح پر تسلط کا مسئلہ نہیں تھا بلکہ ایک عظیم کلچر کی موت کا پیغام بھی تھا۔ اس حوالے سے صفدر میر، انیس ناگی اور سید رضی ترمذی کی نظمیں لاہور کے ان ہی تصورات کو پیش کرتی ہوئی ۱۹۶۵ء کی جنگ کے واقعات وحوادث کو آگے بڑھاتی ہیں۔صفدر میر کی نظم ''لاہور کو سلام'' نو حصوں پر محیط ہے۔ ہر بند پچھلے بند کے ساتھ مربوط ہے۔ بھارتی حملے کے بعد امن پسند شہر کے باسی جس خوف اور اذیت میں مبتلا رہے، دشمن فوج کے سپاہیوں نے دیہات کے گھروں میں گھس کر تلاشی لینے اور خوف وہراس پھیلانے کا جو سلسلہ شروع کیا، اس کی عکاسی کرتے ہوئے شاعر کہتے ہیں کہ:

بوڑھی مائیں/ لڑکے لڑکیاں/ نئی دلہنیں/ اور جوان/ سب سوئے ہوئے تھے/ خاک اور
خاکستر اور خون/ ہر جانب خاک وخاکستر اور خون میں ڈوبے ہوئے [۳۴]

ابتدائی پانچ بند تک نظم کا لہجہ اس قدر تند وتیز نہیں لیکن اگلے بند سے شاعر کے خیالات نعرے بازی کی شکل میں سامنے آتے ہیں۔اس حصے میں نظم بے ترتیب خیالات اور سستے جذبات کا پرتو بن جاتی ہے۔ملاحظہ کیجیے:

میری آنکھوں میں خون اتر آیا/ تیری آنکھوں میں خون اتر آیا/ شہر کی آنکھوں میں خون اتر
آیا/ چلو واہگا کی سرحد پر/ دلیر وغازیو! آگے بڑھو/ علی حیدر کے شیرو/ اپنے آقاؤں سے جا
کے کہہ دو/ یہ لاہور ہے گیدڑو/ شہر ہشیار ہے [۳۵]

انیس ناگی کی نظم بھی لاہور سے وابستہ پرانی یادوں کی محبت سے مملو ہے۔ وہ لاہور شہر کو چھوڑ جانے کے خیال سے ہی رنجیدہ ہو جاتے ہیں۔انھیں اپنی یادیں قیمتی سرمایہ دکھائی دیتی ہیں جنھیں بھارتی نیتاؤں نے برباد کرنے کا عزم کر رکھا تھا۔اس جارحیت کے خلاف ردعمل ہر شہری کا حق تھا، اسی لیے وہ اپنی نظم ''میرا شہر'' میں اسی احتجاج کو ریکارڈ کراتے دکھائی دیتے ہیں:

کس طرح چھوڑ جائیں یہ بستا ہوا شہر لاہور/ جس میں میری آبرو دفن ہے/ شہر لاہور میں

سالہا سال سے امن تھا/ ایک دن چھے ستمبر کے دن/ سرحدوں سے ذرا دور چاروں طرف

امن کے رہزنوں نے/ حسد سے مرے شہر لاہور پر بزدلوں کی طرح موت کے تیر پھینکے [۳۶]

سید رضی ترمذی کی طویل نظم ''لاہور کی سرزمین اور ہم'' میں بھی لاہور سے والہانہ محبت کا اظہار ملتا ہے۔ نظم کے آخر میں وہ اس بے حرمتی کے تصور سے بے چین ہو جاتے ہیں جو بھارتی افواج کے ہاتھوں اس شہر کی ہوئی۔ وہ اس جارحیت کو کفر کی سازش قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

یہ شہر کے کوچے کوچے میں پاکیزہ روحوں کے مسکن/ ایک ہی سلسلہ، ایک ہی کارواں/ نور کا

ایک سیل رواں جاوداں/ اور کہاں آج ناپاک قدموں کی یہ اجنبی آہٹیں [۳۷]

شبنم رومانی جیسے خوش گو شاعر بھی جنھیں پھولوں کی مہکار اور چڑیوں کی چہکار کے گیت گانے سے فرصت نہ تھی، متاع لوح و قلم کو دلاوروں کے حوصلے بڑھانے کے لیے وقف کر دینے کی تلقین کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ وہ قلم کی ضرب سے دشمن کے ارادوں کو پاش پاش کرنے کا ارادہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

زمیں پر ہم انھیں سُرمہ بنا کے رکھ دیں گے — فضا میں ان کے پرخچے اڑا کے رکھ دیں گے

انھیں کی توپ کو لاشوں سے ان کی بھر دیں گے — انھیں کی کھائی میں ہم ان کو دفن کر دیں گے

پکار چاروں طرف مادرِ وطن کی ہے — وطن کو آج ضرورت ہر اہلِ فن کی ہے

جہاد میں تو ہر اک چیز اہم ہے یارو — وہ توپ ہو کہ گرجتا ہوا قلم یارو

متاعِ لوح و قلم جس کی پرورش کی ہے — اب اس کو کام میں لاؤ دلاوروں کے لیے

ہر ایک دل میں نیا مورچہ تلاش کرو — قلم کی ضرب سے دشمن کو پاش پاش کرو [۳۸]

مصطفیٰ زیدی کی نظم ''ایک بے نام سپاہی کی قبر پر'' اور ''سپر سانگ''، نقش کے جنگ نمبر میں شامل ہیں۔ ان نظموں میں بھی جنگ کی شکست و ریخت اور ہول ناکیوں کو موضوع بنایا گیا ہے۔ وہ شہیدوں کے غم میں نوحہ کناں ماؤں کے آنسوؤں کی فریاد سناتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

تجھ سے ممکن ہو تو اے ناسخِ ایّام کہن — اپنے مدفون خزانوں کو بچا کر رکھ لے

رات گم نام شہیدوں کے لیے روتی ہے — ان شہیدوں کے لہو دل سے لگا کر رکھ لے

ماؤں کے میلے دوپٹوں میں ہیں جو آنسو جذب — ان کو آنکھوں کے خزانوں میں سجا کر رکھ لے [۳۹]

سیال کوٹ کے محاذ پر اہل قلم کا ردعمل نہایت شدید تھا۔ بکتر بند گاڑیوں اور بھاری توپ خانے پر مشتمل پیش قدمی صرف پاکستانی افواج ہی کی طرف سے نہیں ہو رہی تھی بلکہ ان کے ساتھ پوری قوم کی امیدیں اور غم و غصہ سب ہی کچھ شامل تھا۔ سترہ روزہ جنگ میں قوم نے بڑے والہانہ انداز سے مجاہدین کو خراج تحسین پیش کیا۔ قوموں کی تاریخ میں ایسی مثالیں کم ہی ملتی ہیں کہ پوری قوم سپاہیوں کے شانہ بشانہ دشمنوں کے خلاف صف آرا تھی۔ خصوصاً سیال کوٹ، لاہور اور ان سے ملحقہ اضلاع کے عوام نے ہر ممکن تعاون فراہم کیا۔ شعرا نے بھی اس بابت زندہ روایت چھوڑی۔ ترانے، رجز، رسیلے گیتوں کے علاوہ شہیدوں کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے قصائد بھی لکھے۔

یعنی شاعر عوام کی آواز بن کر اپنے خوابوں کی عظمت کے گن گاتے رہے۔ سید عابد علی عابد نے زیادہ تر غزلوں میں طبع آزمائی کی لیکن ستمبر کی جنگ پر ان کا والہانہ اظہار نظم کی صورت میں سامنے آیا۔ اس جنگ میں پاکستانی مجاہدین کی غیر معمولی کارکردگی اور وطن کی سالمیت کے لیے ان کے جذبات کی تعریف کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

پھر بھڑک اٹھی ہے آگ / دھیمے دھیمے اس کی آنچ، ہو رہی ہے تیز تر / جل رہے ہیں بام و در /
سب وطن کے نوجوانِ پاسباں / ڈٹ گئے ہیں اپنے اپنے مورچے سنبھال کر / خوف ہے نہ
کچھ خطر / سب کے سب جری نڈر / بلند ہیں ہمارے حوصلے ادھر / یہ ہے قوم کا سہاگ /
جب تمھارے ساتھ تھے / اب تمھارے ساتھ ہیں / سب تمھارے ساتھ ہیں [۴۰]

شاعر یہاں پوری قوم کے یک زباں ہو کر سپاہیوں کی مدد کا اعلان کر رہے ہیں۔ جوش کی بلند آہنگی نے بھی ۶۵ء کی جنگ کو خاص زاویے سے دیکھا۔ وہ اس جنگ کو دو ممالک کے درمیان عسکری مقابلے بازی کے طور پر نہیں دیکھ رہے تھے بلکہ اس معرکے کو حق و باطل کا معرکہ تصور کرتے تھے۔ ان کی نظم ''وارثانِ حیدرِ خیبر شکن'' میں شہدا کی عظمت، غازیوں کی جرات اور شہادت کی تڑپ کا والہانہ اظہار ملتا ہے۔ ان کے لہجے کی کاٹ موضوع سے ان کی شدید وابستگی کا پتا دیتی ہے۔ ان کی نظم میں جوش و جذبے کی فراوانی بھرپور انداز میں دکھائی دیتی ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

قسم ان سورماؤں، ان جیالوں، ان دلیروں کی — دہک جاتی ہے جن کے روبرو ڈھکار شیروں کی
قسم ان من چلوں کی موت کو جو زیر کرتے ہیں — منوں مٹّی کے نیچے دفن ہو کر بھی ابھرتے ہیں
شہادت جب رخِ گل رنگ سے گھونگھٹ اٹھاتی ہے — سرِ میداں حیاتِ جاودانی گنگناتی ہے
کچل دو راہ کے کانٹے، مسل دو پاؤں کے چھالے — اٹھا لو گرز، تلواریں سنبھالو، تان لو بھالے
مرا یہ نعرہ سن کے نسلِ نو جب رن میں آئے گی — جوانی گونج اٹھے گی قیامت گھڑ گھڑائے گی [۴۱]

جوش کے اسلوب میں ہی ایک طرح کا آہنگ موجود ہے۔ وہ لفظوں سے رزمیہ کیفیت پیدا کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔ نظم میں ایک شور اور بلند آہنگی سنائی دیتی ہے۔ جو رفتہ رفتہ ایک شورانگیزی کی صورت حال پیدا کر دیتی ہے۔ جوش عظمت انسانی پر کسی بھی طرح کا سمجھوتا کرنے کو تیار دکھائی نہیں دیتے۔ ان کا کہنا ہے کہ:

یہ مانا آدمی کو ہم جہاں داور سمجھتے ہیں — دو عالم سے بشر کے خون کو بہتر سمجھتے ہیں
مگر ہم کیا کریں جب سر پہ دشمن ٹوٹ پڑتے ہیں — تو درسِ امن دینے کے لیے ہم لوگ لڑتے ہیں
ہمارے دامنِ شمشیر سے مرہم ابلتا ہے — جہاں ہم آگ رکھ دیں چشمۂ زم زم ابلتا ہے [۴۲]

عساکر پاکستان کو خراج تحسین پیش کرنے کا یہی انداز احسان دانش کی نظم ''پاکستانی عساکر کے حضور'' میں بھی نمایاں ہے۔ وہ ان بہادروں پر فخر کرتے ہوئے خیر و شر کی اس جنگ میں فتح مبین کا یقین دلاتے ہیں۔ فتح مندی کا یہ احساس شعرا کے ہاں عمومی طور پر ملتا ہے۔ مجاہدین کو آگے بڑھنے اور دشمن سے ڈٹ کر مقابلہ کرنے کے لیے جس جوش اور جذبے کی ضرورت ہوتی ہے، شعرا کے نغمے اس کے لیے مہمیز کا کام کرتے ہیں۔ احسان دانش نے بھی اپنی نظموں سے یہی کام لیا۔ ملاحظہ کیجیے:

زمین رشکِ آسماں تمھاری انجمن سے ہے　　　رگِ وفا میں خوں رواں تمھارے بانک پن سے ہے
رہے تمھارا بانک پن بڑھے چلو بڑھے چلو　　　مجاہدینِ صف شکن، بڑھے چلو بڑھے چلو[۴۳]

ماہرالقادری بھی پاک بھارت جنگ کو سیاسی سے زیادہ مذہبی رنگ سے دیکھتے ہیں اور اس جنگ کو حق و باطل کی لڑائی قرار دے کر دلیر سپوتوں کے خون کو گرمانا چاہتے ہیں۔ ''شہیدوں کے لہو سے'' میں وطن پر جان قربان کرنے والوں کی عظمت بڑے احترام کے ساتھ بتاتے ہیں۔ اس قسم کے موضوعات اور خیالات کو غزلوں میں بھی پیش کیا ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

شہیدوں کے لہو سے جو زمیں سیراب ہوتی ہے　　　بڑی زرخیز ہوتی ہے بہت شاداب ہوتی ہے
یہ بھارت کے درندے قتل و غارت پر نہ اترائیں　　　کوئی دن میں یہ کشتی دیکھنا غرق آب ہوتی ہے[۴۴]

نظم ''آج کا پیام'' رجزیہ انداز کی نظم ہے جس میں مجاہدوں کو ترغیب دی گئی ہے کہ سرحدوں پر دشمن آپہنچا ہے اور ذرا سی چوک نقصان دہ ثابت ہوسکتی ہے۔ دشمن کے ناپاک عزائم کو خاک میں ملانے کے لیے وہ تیار رہنے کی تلقین کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

بیدار رہو، ہشیار رہو　　　دشمن ہے تمھاری سرحد پر
تیار رہو، تیار رہو　　　بھارت پر ہیبت طاری ہے
اس پر بھی شرارت جاری ہے　　　تم مومن وہ زنّاری ہے[۴۵]

غزل میں رزمیہ موضوعات کو پیش کرنا خاصا دشوار ہوتا ہے لیکن ماہرالقادری کی طرح شیر افضل جعفری بھی اپنی غزلوں میں رزمیہ لب و لہجے کو برقرار رکھنے میں کامیاب رہے ہیں۔ انھوں نے اپنے مخصوص غنائی لب و لہجے میں تغزل کے رنگ کو ترک کیے بغیر بڑی نرمی اور حلاوت سے کہا کہ:

یا علی کہہ کے جو ہم جنگ پہ تل جاتے ہیں　　　چھمپ سے جموں تلک توپوں کے ''ٹل'' جاتے ہیں
تند راوی کی بھنور مست و جواں لہروں میں　　　گولے مصری کی طرح ڈوب کے گھل جاتے ہیں[۴۶]

جنگ سے متعلق رزمیہ نغموں، گیتوں اور ترانوں میں وقتی اور ہنگامی تاثر پوری طرح غالب دکھائی دیتا ہے۔ متعدد نظموں میں فکر کی گہرائی کی کمی بھی دکھائی دیتی ہے۔ ان شعرا کے جذبے اور خلوص میں کوئی کمی نہیں لیکن جذباتی ابال اور گہرائی کی کمی کی وجہ سے اسے شاعری کا وقیع سرمایہ قرار نہیں دیا جاسکتا۔ اس بات سے قطع نظر بہت سے شعرا نے ۱۹۶۵ء کی جنگ کے حوالے سے بہت عمدہ نظمیں کہیں۔ جمیل الدین عالی، صوفی غلام مصطفیٰ تبسم، احمد فراز، مسرور انور، وغیرہ کے نغموں ''اے وطن کے سجیلے جوانو''، ''تیرے کھیتوں کا سونا سلامت رہے''، ''خطۂ لاہور تیرے جاں نثاروں کو سلام''، ''اپنی جاں نذر کروں اپنی وفا پیش کروں'' وغیرہ نے تو اس دور میں دھوم مچا دی۔ آج بھی ان نغموں کی تاثیر محسوس کی جاسکتی ہے۔ اس دور کی شاعری میں جذبہ اور ولولہ مشترکہ طور پر کارفرما تھا۔ اس جذبے کو ظاہر کرتے ہوئے مصطفیٰ زیدی نے درست کہا کہ:

دیکھنا اہلِ وطن ساعتِ جہد آپہنچی　　　اب کوئی نقش بہ دیوار نہ ہونے پائے
دشت میں خونِ حسین ابن علی بہہ جائے　　　بیعتِ حاکمِ کفار نہ ہونے پائے
یہ نئی نسل اس انداز سے نکلے سرِ رزم　　　کہ مورخ بھی گنہ گار نہ ہونے پائے[۴۷]

اس طرح کے مشترکہ جذبے پیش کرنے والے شعرا کی فہرست اس قدر طویل ہے کہ سب کی تخلیقات کو احاطہ تحریر میں لانا ممکن نہیں۔ البتہ مختار صدیقی کی ''حرف اوّل''، رئیس امروہوی کی ''لا الہ الا اللہ''، محشر بدایونی کی ''بیادِ امام شہید''، حسن بخت کی ''خون''، سید عابد علی عابد کی ''روح شہید کا جواب''، عاصی کرنالی کی ''شہیدانِ کرام''، سجاد باقر رضوی کی ''یہ زمین امینِ بہار ہے''، حافظ لدھیانوی کی ''اے شہیدانِ وطن''، حزیں لدھیانوی کی ''سلام اے غازیو''، خلیق قریشی کی ''گم نام شہیدانِ وطن کی نذر''، جون ایلیا کی ''وطن اور مجاہدین کے نام''، انیس بدایونی کی ''فوجی بھائیوں کو مبارک باد''، سرمد صہبائی کی ''شہید''[48] عاشور کاظمی کی ''وطن کو تم پہ فخر ہے وطن کی تم ہی جان ہو''، محمود شام کی ''آگے بڑھیں تو موج رکیں تو چٹان ہیں''، جرات حیدر کی ''ان زندہ مثالوں کو سلام''، امید فاضلی کی ''ہمارے پاک وطن کی شان ہمارے شیر دل جوان''، ناصر کاظمی کی ''ان غازیوں پہ سایہ فگن ہے خدا کی ذات''، رئیس فروغ کی ''ہم ان کے نام کی عظمت پہ سر جھکاتے ہیں''، اقبال صفی پوری کی ''تم مردِ میدان تم جانِ لشکر''، حمید نسیم کی ''اور میرے وطن کے پاسباں'' جیسے نغمے مجاہدین پاک کے قابل فخر کردار اور کارناموں کو ظاہر کرتے ہیں[49]۔ یہ نظمیں اپنے اندر عقیدت اور محبت کا موج بے کراں سمیٹے ہوئے ہیں۔ ان شعرا نے جنگی ترانوں، نظموں اور نغموں سے پوری قوم کے عزم و حوصلے کو بلند کیا۔ ان نغموں نے دلوں میں گداز بھی پیدا کیا۔ دانش وروں، ادیبوں اور شاعروں کے اسی جذبے کو ان ادیبوں نے خوب سراہا جن کا تعلق دفاع سے تھا۔ میجر رحمٰن کیانی نے ان شعرا اور مطرب کے جذبے کو سراہتے ہوئے کہا کہ:

محترم شاعرو! مہرباں مطربو!	بحر و بر اور فضاؤں کے خدّام کو
اپنے شعروں میں جس حسنِ اظہار سے	یاد کرتے رہے گیت گاتے رہے
حوصلوں کو ہمارے بڑھاتے رہے	اس توجہ عنایت کرم کے لیے
بحر و بر اور فضا کے سپاہی تمھیں	اور کہنا بھی چاہیں تو کیا کہہ سکیں
شہر یارانِ شہرِ سخن شکریہ	کج کلاہانِ اقلیمِ فن شکریہ[50]

اس ضمن میں میجر منظور کی نظم ''سپاہی کا جواب'' بھی ایک اعترافی نظم ہے جس میں بڑے خلوص اور جذبے کے ساتھ اپنے وطن کے فن کاروں کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

اے مرے پیارے وطن، اے مرے محبوب وطن	جس طرح تو نے دیا اپنے سپاہی کو خراج
اس پزیرائی کا انداز کہاں سے لاؤں	شکریہ کہنے کو آواز کہاں سے لاؤں[51]

غرض کہ فوجی حکام ہوں یا عوامی نمائندے ۱۹۶۵ء کی جنگ کے دوران حب الوطنی کا جذبہ پوری قوم کے رگ و پے میں سرائیت کر چکا تھا۔ پاکستان کی بقا کا احساس ہر فرد کے دل میں موج زن تھا۔ پاکستان کے تحفظ کا مسئلہ سرحدوں کے تحفظ سے کہیں بڑھ کر تھا۔ اسی لیے جنگ سے متاثرہ اردو شاعری میں بھی وطنیت کے نقش بہت گہرے ہیں۔ ۶ ستمبر ۱۹۶۵ء کے بعد بقول جیلانی کامران:

کشف اترا قیام گاہوں پر	کشف اترا گھنے درختوں پر
کشف پھیلا تمام راہوں پر	باغ و صحرا کا معجزہ بن کر[52]

جمود توڑنے کے لیے جس دھاکے کی ضرورت تھی وہ دشمن نے فراہم کر دیا تھا۔ ان حالات میں شعرا نے ارض وطن کی محبت اور

اس کی عظمت وتقدیس کا جذبہ پیدا کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ آگ اور خون کے اس معرکے میں قوم جب فکر و عمل کے چراغ لے کر آگے بڑھی تو انھیں خاک وطن کی قدر و قیمت کا خوب اچھی طرح سے اندازہ ہوا۔ اس احساس کو امجد اسلام امجد نے اپنی نظم ''مٹی'' میں پیش کرتے ہوئے کہا ہے کہ:

مٹی ایک ایسی کسوٹی ہے جو ہر انساں کو — اس کی قیمت کی بلندی کا پتا دیتی ہے
کتنی ارزاں ہے زمانے میں بہ ظاہر مٹی — اس کی عزت کے لیے جان لٹا دیتے ہیں
اسی مٹی کے خزانے کی حفاظت کے لیے — ہم نے ہر دور کے ماتھے کو ضیا بخشی ہے [۵۳]

اس مٹی پر جارح دشمن نے جو خون بہایا تھا، شاعر اس کا حساب لینا چاہتا ہے۔ حمایت علی شاعر کی نظم میں یہی جذبہ نمایاں ہے۔ ان کے لہجے میں جارحانہ عزم اور ولولہ موجود ہے۔ وہ اس پاک مٹی میں بہائے گئے ایک ایک قطرۂ خون کا حساب لینے کا عزم کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

لہو جو سرحد پہ بہہ رہا ہے — لہو جو سرحد پہ بہہ چکا ہے
ہم اس لہو کا خراج لیں گے — ہم اس لہو کا خراج لیں گے [۵۴]

اس معرکے میں خواتین کا کردار بھی مثالی تھا۔ انھوں نے اپنے پیاروں کے جسم پر ہتھیار سجا کر مقتلِ شہیداں کی طرف روانہ کیا۔ خاتون شاعرہ رشیدہ سلیم سیمیں کی نئی نظمیں ان حقیقی تاثرات پر مبنی ہیں جو شہیدوں کی ماؤں بہنوں اور بیویوں کی زندگی کی درست ترجمانی کرتے ہیں۔ ان نظموں میں جذبات کی صداقت بھی ہے اور شعریت بھی [۵۵]۔ ان نظموں کی اثر انگیزی کا اندازہ لگانے کے لیے چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

ان مسلمان ماؤں کا ورثہ ہیں ہم — جو شہیدوں کی لاشوں پہ روئی نہیں
جن کے ایثار کی داستاں ہے رقم — جو رہیں کربلا میں بھی ثابت قدم
یہ لہو داستاں داستاں جائے گا — خوں شہیدوں کا کیا رائیگاں جائے گا [۵۶]

انجم صدیقی کی نظم میں بھی ماؤں اور بہنوں کو خراج تحسین پیش کرنے کا جذبہ موجود ہے۔ وہ تاریخ کی نام ور خواتین کی مثالیں دے کر اس نظم میں پاکستانی خواتین کا موازنہ کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ خواتین کی سرفروشی اور جاں نثاری کے جذبات کی عکاسی کرتے ہوئے شاعر کہتے ہیں کہ:

جاگ اٹھا رضیہ کا جذبہ چاند بی بی کا خروش — اے متاعِ فتح و نصرت دخترانِ سر فروش
جذبۂ خولہ نے پھر بدلی ہے کروٹ دہر میں — پھر جمیلہ کی نگاہیں آگئی ہیں قہر میں
جب مجاہد لڑ رہے ہوں عرصۂ پیکار میں — ہم ہوں مصروفِ دعا اللہ کے دربار میں [۵۷]

اردو شاعری میں نعروں، للکار اور رجزیہ عناصر کا بہت بڑا ذخیرہ اس دور کی شاعری میں تلاش کیا جا سکتا ہے۔ جعفر طاہر کی بلند آہنگ نظم میں جو گھن گرج سنائی دیتی ہے، اس کے چند اشعار دیکھیے:

گھنن گھنن گھنن گھنن — یہ دیو آتشیں دہن

یہ توپ توپ شعلہ زن بھڑک اٹھے وہ باغ و بن
یہ ٹینک ٹینک الاماں علیؑ علیؑ علیؑ علیؑ
ستم کا سیل بے کراں فضا، خلد دھواں دھواں
فلک جلا، زمیں جلی علیؑ علیؑ علیؑ علیؑ
رہی یہ ستم گری یہ ظلم و جور و خود سری
کرم بہ نام ہر ولی علیؑ علیؑ علیؑ علیؑ[58]

ضمیر جعفری جو کہ خود بھی افواج پاکستان سے وابستہ تھے، کی نظمیں بھی اس ضمن میں اہمیت کی حامل ہیں۔ وہ بنیادی طور پر مزاح نگار تھے، اسی لیے ۱۹۶۵ء جیسے سنجیدہ موضوع پر بھی شگفتگی اور طنز کے جوہر دکھانے سے انھوں نے گریز نہ کیا۔ ان کی نظمیں ''لام پہ آئے تولا رام''، ''تولا رام براعیّار'' اور ''بھارتی سیناپتی کے نام'' وغیرہ میں یہ عنصر نمایاں ہے۔ برجستہ فقرے اور لفظوں کے برمحل استعمال نے نظم میں ایک منفرد احساس پیدا کر دیا ہے۔ ''لام پہ آئے تولا رام'' کے چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

پیچھے ٹانگیں آگے پیٹ ٹوپی چھوٹی کوٹ گریٹ
خندق میں پورے لم لیٹ شکتی تھوڑی چربی عام
لام پہ آئے تولا رام

چھمب سے آگے اکھنور ہڈی پسلی چکنا چور
بھاگے پاک زمیں سے دور ہند کے تین ڈویژن سور
الٹے پاؤں سرپٹ گام لام پہ آئے تولا رام[59]

ضمیر جعفری نے بھارتی افواج کی بزدلی کو نشانہ بنایا۔ اس کے علاوہ ان کارروائیوں کو بھی ہدف تنقید بنایا جو بھارتی افواج کی جانب سے رات کی تاریکی میں چھپ کر بزدلوں کی طرح کی گئی تھیں۔ ''بھارتی سیناپتی کے نام'' میں انھوں نے جینو ناتھ چودھری کے روپ میں پوری ہندو قوم کی نمائندگی کی ہے۔ اس برتری کے دعوے کو جو وہ سیال کوٹ، چھمب، کھیم کرن، ٹیٹوال اور قصور سیکٹر کی بابت کر رہا تھا، کا مضحکہ اڑاتے ہوئے شاعر کہتے ہیں کہ:

ہماری پاک سرحدوں پہ جب یہ سور آگئے حدِ سیال کوٹ اور سرِ قصور آگئے
یہ چور رام راج کے نشے میں چور آگئے تو پاک پاسباں بھی مثلِ برقِ طور آگئے
فضائے جنگ گونج اٹھی علیؑ علیؑ علیؑ علیؑ سنبھال اپنی کھوپڑی ''جینو ناتھ چودھری''
سیال کوٹ، چھمب، کھیم کرن، ٹیٹوال میں پہاڑ، ریت، کھیت، شہر، نہر، جھال، تال میں
مقابلہ ہوا جو شیر خام ہر دیال میں کھلا جہاں پہ فرق کیا ہے شیر اور شغال میں
وہ چار چار پلٹنیں، یہ ایک ایک کمپنی یہی تھی تیری برتری، جینو ناتھ چودھری[60]

محشر بدایونی کی دو نظمیں ''ضربِ حق'' اور ''نصار نامہ'' میں بھی دشمن فوج کی عسکری قوت کا مذاق اڑایا گیا ہے۔ وہ دشمن کی بد

حواسی پر لطف اندوز ہوتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

مقابل آ کے تم اپنا ہراس لاکھ چھپاؤ تمھارا حال تمھارے حواس کہہ دیں گے[۶۱]

اسی طرح دشمن کی بڑی کمک، بے تحاشا اسلحہ، گولا بارود، ٹینک اور حربی طاقت کے باوجود پاکستانی افواج کی للکار کے آگے ڈھیر ہونے کے مناظر دکھاتے ہوئے شاعر کہتے ہیں کہ:

یہ مال، رسد، املاک، کمک یہ خیمے چھاتے غبارے یہ گولے توپیں بندوقیں یہ ٹینک مشین طیارے

یہ رائفلیں یہ سنگینیں یہ خود زرہ بکتر سارے میدان میں گر کر ڈھیر ہوئے جب فوجِ خدا نے للکارا[۶۲]

احسن جمال اکبر آبادی نے بھی دشمنوں کی پسپائی اور بہادر فوج کی دلیری کے نغمے گاتے ہوئے کہا کہ:

سارا جوش و ولولہ دشمن کا ٹھنڈا کر دیا تم نے بے شک سرنگوں دشمن کا جھنڈا کر دیا[۶۳]

تجمل حسین اختر نے بھی دشمنوں کے خلاف سیسا پلائی دیوار بننے اور اپنی آزادی اور خودمختاری کے لیے زمیں و آسمان ایک کر دینے کی کیفیت کا اظہار کچھ اس انداز سے کیا ہے:

اس شان سے یہ جنگ مجاہد نے لڑی ہے دشمن جہاں ابھرا ہے وہیں مار پڑی ہے

صحرا ہو کہ دریا ہو فلک ہو کہ زمیں ہو دشمن کو نہ چھوڑا کبھی ہم نے وہ کہیں ہو[۶۴]

شکیب جلالی نے بھی وطن دشمن عناصر کے خلاف سفاک اندازِ بیاں اپنایا۔ نظم ''غازی کا ترانہ'' کی بلند آہنگی میں دشمن کے خلاف ایک جلال اور للکار کی فضا محسوس کی جا سکتی ہے۔ پاکستان نے دفاعی پوزیشن ضرور اختیار کی لیکن دشمن کو یہ واضح پیغام بھی دیا کہ:

فرشتوں کی کمک اور آسماں کی ڈھال رکھتا ہوں سدا بڑھتا ہوں آگے پیٹھ دکھلانا نہیں آتا

میں غازی ہوں قضا سے مجھ کو گھبرانا نہیں آتا میں اعداد کو فنا کر کے ہی اب شمشیر ڈالوں گا

آگے بھاگے کا دشمن پاؤں میں زنجیر ڈالوں گا میں پربت کاٹ ڈالوں گا سمندر چیر ڈالوں گا[۶۵]

۱۹۶۵ء کی جنگ سے متعلق ایک اور اہم موضوع ان شہروں کو سلام پیش کرنا ہے جو اس آگ اور بارود کے دھویں سے بری طرح متاثر ہونے کے باوجود کمال بہادری اور دلیری سے دشمن کے عزائم خاک میں ملا رہے تھے۔ لاہور، سیال کوٹ اور سرگودھا پر جنگ کا زور سب سے زیادہ تھا۔ چونڈہ میں ٹینکوں کی دوسری بڑی جنگ لڑی گئی۔ پاکستان کے ان ہی شہروں سے جنگ کے منھ زور عفریت کو کچلا گیا۔ اسی لیے بے شمار نظمیں ان شہروں کی تعظیم میں کہی گئیں۔ لاہور، سرگودھا اور سیال کوٹ تینوں شہروں کو جنگ کے بعد پرچم استقلال سے نوازا گیا۔ سب سے زیادہ نظمیں بھی ان ہی شہروں پر کہی گئیں۔ رئیس امروہوی نے ''لاہور تیرے جاں نثاروں کو سلام''، ''داتا کی نگری اے شہر لاہور''، ''لاہور پھر لاہور ہے''، ''سیال کوٹ کے میدان کارزار کو دیکھ''، جمیل الدین عالی نے ''سیال کوٹ سے کہہ دے کوئی سلام مرا''، جون ایلیا نے ''لاہور سر بلند ہے لاہور زندہ باد''، شاعر لکھنوی نے ''سیال کوٹ ہمیں سرخ رو کیا تو نے''، شفیع عقیل نے ''لاہور کے جوانو، سرحد کے پاسبانو''، حمید نسیم کی ''ارضِ سیال کوٹ حرم مرتبت ہے تو''، کرار نوری کی ''چونڈہ، وارث بدر وحنین کیا کہنا'' وغیرہ جیسی نظمیں ہر فرد کے دل کی آواز بن کے ابھریں۔ ان نغموں کی گونج فضا میں طویل عرصے تک گونجتی رہی[۶۶]۔ منیر نیازی نے تو پاکستان کے تمام ہی شہروں کو یہ دعا دی کہ:

پاکستان کے سارے شہرو زندہ رہو، پائندہ رہو روشنیوں رنگوں کی لہرو زندہ رہو پائندہ رہو[۶۷]

غرض کہ ۱۹۶۵ء کی جنگ کے زمانے کی شاعری ہمارے قومی مزاج کی عکاسی کرتی ہے۔ اکثر شعرا نے فنی تکمیل کے بجائے جذبات کی ترسیل تک اکتفا کیا۔ علامتوں کے ذریعے اس عہد کی فکری اور جذباتی بے چینی کو سمیٹا۔ یہ علامتیں بھی جنگی نوعیت کی ہیں۔ چنگاری، ترازو، مٹی، آہن، ہلالی، خنجر، کربلا، پرچم اور اس طرح کی متعدد علامتوں کو شاعروں نے نئے معنی پہنائے جن کی عکس بندی میں مختلف مثالوں سے بھی کام لیا گیا۔ غزلوں کی نسبت نظموں کی تعداد زیادہ ہے۔ اس کی بڑی وجہ موضوعات کا پھیلاؤ ہے جنھیں نظم میں بہ آسانی سمیٹا جا سکتا ہے۔ بہت سے مواقع پر المیے کا تاثر بھی ابھرتا ہے۔ جنرل ایوب کے دورِ حکومت میں عسکری نظم و نسق کی فضا پہلے سے موجود تھی جس کی وجہ سے شعرا نے حکومت کے شانہ بشانہ فوجی حکمت عملیوں کا ساتھ دیا لیکن معاہدہ تاشقند کے بعد یہ حمایت بھی یکسر ختم ہو گئی۔

اس بابت اگلے باب میں تفصیل سے اظہار خیال کروں گا۔ یہاں اس بات کی وضاحت بہر حال ضروری ہے کہ جنگ کے دوران چھپنے والی تمام تحریروں میں خلوص اور سچائی کو ضرور تلاش کیا جا سکتا ہے۔ خواہ وہ تخلیقات جنگ مخالف ہوں یا حکومت مخالف۔ مثلاً ابن انشا کے ہاں نہ صرف اپنے ملک بلکہ عالمی سطح پر ہونے والے جنگی سانحات پر بھی مذمتی انداز دکھائی دیتا ہے۔ وہ جنگ ستمبر کے دوران اس پورے عسکری منظر نامے سے مایوس نظر آتے ہیں۔ انسان اور انسان دوستی پر مبنی جذبات انھیں پیغامِ امن کا مبلغ بنا دیتے ہیں۔ اپنی نظم ''جھلسی سی ایک بستی میں'' وہ اس المیے کو بڑے دکھ اور کرب سے پیش کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک یہ جنگ بھی دوسری تمام جنگوں کی طرح تہذیب کا نوحہ ہے جس کا باعث وہ عسکری اور حربی عمل ہے جس سے عالمی امن متاثر ہوتا ہے۔ وہ جنگ کے منفی اثرات، بھوک، قحط، افلاس اور زندگی کی مایوسی و محرومی کے ساتھ ساتھ بے رونقی کی جو تصویریں پیش کرتے ہیں وہ دراصل تلخ اور کڑوی ہونے کے باوجود حقائق پر مبنی ہیں۔ ان مناظر کو دکھاتے ہوئے وہ جس طرح کی منظر نگاری سے کام لیتے ہیں وہ موثر بھی ہے اور جان دار بھی، ملاحظہ کیجیے:

سوچ رہا ہوں جنگ سے پہلے جھلسی سی اک بستی میں کیسا کیسا گھر کا مالک، کیسا کیسا مہماں تھا
سب کلیوں میں تجن تھے اور ہر تجن میں سکھیاں تھیں سب کے جی میں آنے والے کل کا شوق فروزاں تھا
میلوں ٹھیلوں، باجوں گانوں، باراتوں کی دھومیں تھیں آج کوئی دیکھے تو سمجھے یہ تو سدا کا بیاباں تھا
چاروں جانب ٹھنڈے چولہے، اجڑے اجڑے آنگن میں ورنہ ہر گھر میں تھے کمرے، ہر کمرے میں ساماں تھا
آج کی اک روٹی کے خاطر کارڈ دکھاتا پھرتا ہے سارے کمپ کو روٹی دے دے، ایسا ایسا دہقاں تھا
تاب نہیں ہر ایک سے پوچھیں، بابا تم پر کیا گزری کل تھا ایک کو روک کے پوچھا، سینہ اس کا بریاں تھا[۶۸]

یا پھر سرشار صدیقی نے اپنی نظم ''بلیک آؤٹ'' میں شہر کی ویرانی تاریکی اور حسرت ناکی کے بیان میں جو منظر پیش کیا ہے وہ بھی جنگوں کی ہول ناکی کو سمجھنے میں مدد دیتے ہیں۔ ملاحظہ کیجیے:

شہر تاریک ہے/ شہر خاموش ہے/ شہر ویران ہے/ میرے دل کی طرح/ کھا گئی شہر کو جانے
کس کی نظر/ کوئی ہنگامۂ جسم و جاں ہی نہیں/ دور تک زندگی کا نشاں ہی نہیں/ مقبروں کی

طرح ایستادہ ہیں گھر/ رہ گزر رہ گزر/ وحشتیں وحشتیں/ ظلمتیں ظلمتیں/ روشنی، روشنی؟/
حسرتیں،حسرتیں/ ہرصدا زیرِلب ہے قیامت اثر [۶۹]

جنگوں کی اسی تباہی نے انسان کوتو خون رلائے، لیکن اس غارت گری پر دھرتی بھی آنسو بہاتی دکھائی دیتی ہے جیسا کہ فارغ بخاری نے اپنی نظم ''ہم ایک آواز بن گئے ہیں'' میں دھرتی کے ذرے ذرے کی فریاد پیش کرتے ہوئے کہا ہے کہ:

افق کا دامن لہولہو ہے/ لہولہو ہے افق کا دامن/ یہ کس ستم گر نے زندگی کا سہاگ لوٹا/ یہ کون
امن واماں کی دیوی پہ/ راکھشس بن کے آج ٹوٹا/ یہ کس سے نالاں ہے/ آج دھرتی کا
ذرہ ذرہ/ ہر ایک کنج اور ہر ایک گوشہ/ اس آشتی کے عدو کے ہاتھوں/ تڑپ رہا ہے سسک
رہا ہے/ لہولہو ہے/ یہ کون ظالم، یہ کون غارت گرِ جہاں ہے/ کہ جس کی غارت گری پر سب
دھرتی نوحہ خواں ہے [۷۰]

اس حقیقت سے آنکھیں کیسے چرائی جا سکتی ہیں کہ برصغیر میں رہنے والوں کی ایک بڑی تعداد بھوک اور افلاس کی چکی میں پس رہی تھی۔ ایسے میں جنگ کی تباہ کاری نے انھیں مزید مفلسی اور لاچاری سے دوچار کر دیا۔ ملکی معیشت کا دیوالیا نکل چکا تھا۔ زرمبادلہ کا بڑا ذخیرہ ہتھیاروں کی خریداری میں صرف ہو رہا تھا۔ ایسی صورت میں جنگ دونوں ممالک کی عوام کے لیے کیوں کر مفید ہو سکتی تھی۔ لہٰذا اس کے اثرات دونوں ملکوں کے عوام پر منفی صورت میں مرتب ہوئے۔ گو ۲۳ ستمبر ۱۹۶۵ء کو جنگ بندی کا اعلان کر دیا گیا۔ روس نے اس سلسلے میں ثالث کا کردار ادا کیا اور تاشقند کے مقام پر دونوں متحارب ممالک کے سربراہوں نے ایک دستاویز پر دستخط کیے جس کے مطابق یہ فیصلہ ہوا کہ دونوں ممالک کی فوجیں اپنی اپنی سابقہ پوزیشن پر واپس چلی جائیں اور اپنے مسائل کا پرامن حل تلاش کریں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جدال وقتال، امن وسلامتی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہوتی ہے [۷۱] لیکن قوموں کی زندگی میں ایسے موڑ ضرور آتے ہیں جب وہ اس طرح کی صورت حال سے بچنا بھی چاہیں تو نہیں بچ پاتے۔ دونوں ممالک کے حکمرانوں کو یہ سوچنا ہوگا کہ آخر اس طرح کی خون ریزی میں انھیں کیا حاصل ہوا۔ ہزاروں انسانوں کی نعشوں اور تعداد سامانِ حرب کی تباہی کے سوا یہ جنگ دونوں ممالک کو کچھ اور نہ دے سکی۔ البتہ اس جنگ کے معاشی اثرات اس قدر منفی پڑے کہ دونوں ممالک کی کروڑوں عوام آج بھی غربت کی لکیر سے نیچے زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔ ان لوگوں کے افسردہ چہرے آج بھی ان حکمرانوں سے یہ ہی سوال کرتے ہیں کہ اس غربت، افلاس، بھوک اور لاچاری کے خلاف کبھی یہ حکمران اعلان جنگ کریں گے؟ یا ان دونوں ممالک کی عوام اسی طرح نفرت کی آگ میں جل کر ایک دوسرے کی تباہی وبربادی کا سبب بنتے رہیں گے۔

حوالہ جات

۱۔ بہ حوالہ: پاک بھارت جنگ
https://www.wikipedia.org/wiki/۱۹۶۵ء

۲۔ فریکر جان، ''جنگ پاکستان''، مترجم: لطیف احمد خان، مصباح الاسلام پبلشرز، کراچی، سن ندارد، ص ۵۳

۳۔ بہ حوالہ: http:// www. bbc. com/ urdu/ regional/ 2015/ 09india- pakistan- 1965- war-sh

۴۔ یعقوب، قاسم، ''اردو شاعری پر جنگوں کے اثرات''، مثال پبلشرز، فیصل آباد، ۲۰۱۱ء، ص ۱۱۲۔۱۱۳

۵۔ پاک بھارت جنگ
https://www.wikipedia.org/wiki/۱۹۶۵ء

۶۔ محمود، خالد، ''رن کچھ سے چونڈہ تک''، مقبول اکیڈمی، لاہور، ۱۹۶۷ء، ص ۲۸۸

۷۔ نیر، ڈاکٹر طاہرہ، ''اردو شاعری میں پاکستانی قومیت کا اظہار''، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی، ۱۹۹۹ء، ص ۲۶۷۔۲۶۸

۸۔ جالندھری، حفیظ، مشمولہ: ''جنگ ترنگ''، مرتبہ، شان الحق حقی، وزارت اطلاعات، سن ندارد، ص ۱۵۵

۹۔ دانش، احسان، ''اعلان بیداری''، مشمولہ: ماہ نامہ ''نقوش''، سال نامہ، لاہور، شمارہ ۱۰۵، ۱۹۶۶ء، ص ۱۱۷۸

۱۰۔ فیض، احمد فیض، ''نسخہ ہائے وفا''، مکتبہ کارواں، لاہور، سن ندارد، ص ۴۰۵

۱۱۔ ایضاً، ص ۴۰۶۔۴۰۷

۱۲۔ امجد، مجید، ''کلیات مجید امجد''، مرتبہ، خواجہ محمد ذکریا، ماورا پبلشرز، لاہور، ۱۹۹۱ء، ص ۴۲۸

۱۳۔ حجازی، نسیم، ''مقدمہ''، مشمولہ: ''رن کچھ سے چونڈہ تک''، محولہ بالا

۱۴۔ نیر، ص ۲۷۵۔۲۷۶

۱۵۔ شفائی، قتیل، بہ حوالہ: ''اردو شاعری میں پاکستانی قومیت کا اظہار''، محولہ بالا، ص ۲۷۶

۱۶۔ ایضاً

۱۷۔ لکھنوی، شاعر، ''اردو شاعری میں پاکستانی قومیت کا اظہار''، محولہ بالا، ص ۲۷۷

۱۸۔ قاسمی، احمد ندیم، مشمولہ: ماہ نامہ ''نقش''، جنگ نمبر، ۱۹۶۶ء، ص ۳۹۲

۱۹۔ قاسمی، احمد ندیم، ''ندیم کی نظمیں''، جلد اوّل، سنگ میل پبلشرز، لاہور، ۱۹۹۱ء، ص ۴۲۳

۲۰۔ ایضاً، ص ۴۵۸

۲۱۔ بخاری، فارغ، مشمولہ: ماہ نامہ ''نقش''، کراچی، جنگ نمبر، ۱۹۶۶ء، محولہ بالا، ص ۴۵۰

۲۲۔ کاشمیری، شورش، ''کلیات شورش کاشمیری''، الفیصل پبلشرز، لاہور، ۲۰۰۹ء، ص ۲۶۴۔۲۶۵

۲۳۔ شاعر، حمایت علی، مشمولہ: ''جنگ ترنگ''، محولہ بالا، ص ۳۹۸

۲۴۔ نیازی، منیر، مشمولہ: ''جاگ رہا ہے پاکستان''، مرتبہ، اویس صدیقی، اردو اکیڈمی سندھ، کراچی، ۱۹۶۶ء، ص ۲۱۰

۲۵۔ دانش، احسان، بہ حوالہ قاسم محمود، محولہ بالا، ص ۱۲۹۔۱۳۰

۲۶۔ نیر، ص ۲۸۲۔۲۸۳

۲۷۔ رئیس امروہوی، بہ حوالہ: ''اردو شاعری پر جنگوں کے اثرات''، محولہ بالا، ص ۱۳۵

۲۸۔ عباس، یاور، مشمولہ: ماہ نامہ ''نقش''، کراچی، جنگ نمبر، محولہ بالا، ص ۴۰۵

۲۹۔ صدیقی، مختار، بہ حوالہ ''اردو شاعری پر جنگوں کے اثرات''، محولہ بالا، ص ۳۰۰

۳۰۔ فیضی، سید، بہ حوالہ ''اردو شاعری پر جنگوں کے اثرات''، محولہ بالا، ص ۳۰۱

۳۱۔ جعفری، ادا، ''شہر درد''، غالب پبلشرز، لاہور، ۱۹۸۲ء، ص ۱۸۵۔۱۸۶

۳۲۔ ایضاً، ص ۱۹۱

۳۳۔ فراز، احمد، ''شہر سخن آراستہ ہے: کلیات احمد فراز''، دوست پبلی کیشنز، اسلام آباد، ۲۰۰۴ء، ص ۶۰۷

۳۴۔ میر، صفدر، مشمولہ: ''جنگ ترنگ''، محولہ بالا، ص ۵۸۹۔۵۹۰

۳۵۔ ایضاً، ص ۵۹۰

۳۶۔ ناگی، انیس، مشمولہ: ''جنگ ترنگ''، محولہ بالا، ص ۶۰۲

۳۷۔ ترمذی،سیدرضی،مشمولہ:''جنگ ترنگ''،محولہ بالا،ص۲۰۵
۳۸۔ رومانی،شبنم،''ضربِ قلم''،مشمولہ: ماہ نامہ''نقش''،کراچی،جنگ نمبر،۱۹۶۶ء،ص۴۱۲
۳۹۔ زیدی، مصطفیٰ، مشمولہ: ماہ نامہ ''نقش''، کراچی، جنگ نمبر، ۱۹۶۶ء،ص۳۹۷
۴۰۔ عابد،سید عابد علی،مشمولہ:''جنگ ترنگ''،محولہ بالا،ص۳۶۴
۴۱۔ جوش،ملیح آبادی،مشمولہ:'جنگ ترنگ''،محولہ بالا،ص۳۶۴
۴۲۔ ایضاً،ص۳۶۵
۴۳۔ دانش،احسان،''آج کا پیام''،مشمولہ:''جنگ ترنگ''،محولہ بالا، ص۱۸۵
۴۴۔ ماہرالقادری،مشمولہ:''جنگ ترنگ''،محولہ بالا،ص۱۸۴
۴۵۔ ایضاً،ص۱۸۵
۴۶۔ جعفری،شیر افضل، بہ حوالہ:''اردو شاعری میں پاکستانی قومیت کا اظہار''،محولہ بالا،ص۳۰۳
۴۷۔ زیدی، مصطفیٰ، بہ حوالہ: ''اردو شاعری میں پاکستانی قومیت کا اظہار''،محولہ بالا،ص۳۰۵
۴۸۔ یعقوب،قاسم،ص۱۵۲
۴۹۔ نیر،ص۲۸۰
۵۰۔ کیانی، رحمٰن، بہ حوالہ: ''اردو شاعری میں پاکستانی قومیت کا اظہار''،محولہ بالا،ص۲۸۰
۵۱۔ منظور، میجر، بہ حوالہ: ''اردو شاعری میں پاکستانی قومیت کا اظہار''،محولہ بالا،ص۲۸۱
۵۲۔ کامران، جیلانی، بہ حوالہ:''اردو شاعری میں پاکستانی قومیت کا اظہار''،محولہ بالا،ص۲۸۷
۵۳۔ امجد، اسلام امجد، بہ حوالہ:''اردو شاعری میں پاکستانی قومیت کا اظہار''،محولہ بالا،ص۲۸۸
۵۴۔ شاعر،حمایت علی، بہ حوالہ:''اردو شاعری میں پاکستانی قومیت کا اظہار''،محولہ بالا،ص۲۹۷
۵۵۔ نیر،ص۲۹۷
۵۶۔ سیمی، رشیدہ سلیم، بہ حوالہ:''اردو شاعری میں پاکستانی قومیت کا اظہار''،محولہ بالا،ص۲۹۷
۵۷۔ صدیقی، انجم، بہ حوالہ: ''اردو شاعری میں پاکستانی قومیت کا اظہار''،محولہ بالا،ص۲۹۸
۵۸۔ طاہر، جعفر، بہ حوالہ: ''اردو شاعری میں پاکستانی قومیت کا اظہار''،محولہ بالا،ص۲۹۳
۵۹۔ جعفری،سید ضمیر،مشمولہ:''جنگ ترنگ''،محولہ بالا،ص۴۲
۶۰۔ جعفری،سید ضمیر،مشمولہ:''جاگ رہا ہے پاکستان''،محولہ بالا،ص ۴۲
۶۱۔ بدایونی،محشر،بہ حوالہ:''جنگ اور ادب''،مشمولہ:''ادب اور کلچر''، از ڈاکٹر سلیم اختر،سنگ میل پبلشرز،لاہور،۲۰۰۱ء،ص۱۳۹
۶۲۔ ایضاً،ص۱۴۱
۶۳۔ اکبرآبادی، احسن جمال،مشمولہ:''جنگ ترنگ''، محولہ بالا،ص ۲۸
۶۴۔ اختر،تجمل حسین،مشمولہ:''جنگ ترنگ''،محولہ بالا،ص۱۶۲
۶۵۔ جلالی،شکیب،مشمولہ:''نقوش''،لاہور،سال نامہ،۱۹۶۶ء،محولہ بالا،ص۱۲۰۱
۶۶۔ نیر،ص۲۹۸
۶۷۔ نیازی، منیر، بہ حوالہ: ''اردو شاعری میں پاکستانی قومیت کا اظہار''،محولہ بالا،ص۲۹۹
۶۸۔ انشا،ابن،مشمولہ:''نقوش''،لاہور،سال نامہ،۱۹۶۶ء،محولہ بالا، ص۱۱۸۸
۶۹۔ صدیقی، سرشار، مشمولہ: ماہ نامہ''نقش''، کراچی، جنگ نمبر، ۱۹۶۶ء،ص۴۱۳
۷۰۔ بخاری، فارغ، ماہ نامہ''نقش''، کراچی،محولہ بالا، ص۴۵۰
۷۱۔ نیر،ص۳۰۵

سقوطِ مشرقی پاکستان: پاکستان کا دولخت ہونا

پاکستان کی سیاسی تاریخ کوالمیوں اور بحرانوں کی تاریخ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ یوں تو عمومی تاریخ کے محققین اس بات کا برملا اظہار کرتے نظر آتے ہیں کہ تاریخ حادثات اور واقعات کا مجموعہ ہے لیکن ضروری نہیں کہ جن جغرافیائی حدود میں کوئی تاریخی واقعہ رونما ہوا ہو وہاں کے رہنے والوں کے ذہنوں پر اس کی یاد بھی برقرار رہ سکے۔ یہ ضرور ہے کہ ہر خطّے میں کچھ سانحات ضرور ہوتے ہیں جو وہاں کی مقامی آبادی کو بری طرح متاثر کرتے ہیں۔ ۱۶ دسمبر ۱۹۷۱ء ہماری بہت ساری کوتاہیوں، غفلت شعاریوں، غلط منصوبہ بندی، تاریخ، جغرافیہ، انسانی نفسیات اور سیاسی عمل سے ہماری بے خبری اور عدم توجہی کا نقطۂ اختتام ثابت ہوا[۱]۔ اس روز قوم کے نام جو بیان نشر ہوا تھا وہ حقیقتاً دل و دماغ اور عزم و ہمت کی شکست کا اعتراف تھا[۲]۔ اس شکست کا اثر قوم پر اتنا گہرا پڑا کہ آج بھی ہم اس سوگ وار قصے سے باہر نہیں نکل پائے ہیں۔

برصغیر میں ایک آزاد اسلامی ریاست کے قیام اور استحکام کی جدوجہد میں مشرقی پاکستان نے ہمیشہ ہراول دستے کا کام کیا تھا[۳]۔ ڈھاکا شہر صدیوں سے اسلامی تہذیب وتمدن کا گہوارہ رہا ہے۔ ۱۹۰۶ء میں اسی شہر میں پاکستان کی خالق جماعت مسلم لیگ کی داغ بیل ڈالی گئی۔ ۱۹۴۰ء میں قرارداد پاکستان پیش کرنے والے مولوی اے۔ کے۔ فضل الحق کا تعلق بھی اسی خطے سے تھا۔ یہاں سے تعلق رکھنے والے بے شمار رہنماؤں نے برصغیر کو انگریزوں کے تسلط سے آزاد کرنے اور ہندوؤں کی بالادستی ختم کرنے میں اہم کردار ادا کیا تھا لیکن پھر گردش دوراں نے یہ دن بھی دکھائے کہ اسی شہر ڈھاکا میں اسلاف کی ساری محنت اور جدوجہد رائیگاں ہوئی اور یہاں سے نظریہ پاکستان کو دیس نکالا کر دیا گیا۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ پاک و بھارت کے بعد قائد احرار کے آخری شعلہ بیاں آغا شورش کاشمیری کے ''مشرقی بنگال کے آتش بجانوں کو سلام،''[۴] کی گونج ابھی مدھم بھی نہ پڑی تھی۔ یہ نظم انھوں نے ہزوراں میل دور سے آئے ہوئے فسٹ ایسٹ بنگال رجمنٹ کے ان جاں بازوں کو پیش کیا تھا جنھوں نے ستمبر ۱۹۶۵ء میں اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کر کے لاہور کو بھارتی دشمنوں سے بچایا تھا۔ ڈھاکا، میسور، سلہٹ اور کومیلا کے بیسیوں بنگالی مسلمان آج بھی لاہور چھاؤنی کے گنج شہیداں میں پڑاؤ ڈالے۔ پاکستان کے تحفظ کے ہراول دستے کی مثال بن کر ہم سے یہ سوال کرتے نظر آتے ہیں کہ کیا یہ قربانیاں انھوں نے اس لیے دیں تھی کہ اس ملک کے دو لخت ہونے کا عذاب اس قوم کو سہنا پڑے۔ اگرچہ مملکت خداداد پاکستان کی تعمیر میں خرابی کی کوئی صورت تو مضمر نہ تھی لیکن قیام پاکستان کے ابتدائی زمانے سے ہی کچھ ایسے تلخ حقائق منظر عام پر آنا شروع ہو گئے جس سے رفاقت کی بیل منڈھے چڑھنے کے آثار مشکوک ہوتے چلے گئے۔ ایک تو مشرقی اور مغربی پاکستان کا جغرافیہ کچھ اس قسم تھا کہ آپس میں زمینی راستہ کوئی نہ تھا طرہ یہ کہ دونوں حصّوں کے درمیان فاصلہ بھی ایک ہزار میل کا جس پر دشمن ملک بھارت ہر وقت سازشوں کے جال بننے کے لیے سرگرم رہتا۔ قائداعظم نے دونوں صوبوں کو ملانے کے لیے بھارت کے درمیان سے گزرنے والے خشکی کے راستے پر راہداری (Corridor) کا مطالبہ بھی کیا تھا جسے حکومت برطانیہ نے مسترد کر دیا[۵]۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ کسی وفاق کو کامیابی سے چلانے کے لیے جغرافیائی اتصال کس قدر لازمی چیز ہے۔ ظاہر سی بات ہے کہ جغرافیائی بعد وفاق کی اکائیوں کے رشتے کو کمزور کر دیتا ہے۔ ڈاکٹر اسرار احمد نے مشرقی اور

مغربی پاکستان کی علاحدگی کے مضمرات پر بحث کرتے ہوئے لکھا کہ ان دو ریاستوں کے درمیان سب سے زیادہ اور نمایاں ترین پیچیدگی خالص جغرافیائی بُعد ہے۔ دو علاحدہ خطوں پر مشتمل ہزاروں میل کے فاصلے پر واقع ان دونوں ریاستوں کے درمیان ایک ایسی مملکت حائل ہے جو حالت جنگ ہی میں نہیں بلکہ حالت امن میں بھی دشمن بالقوہ (Potential Enemy) کی حیثیت رکھتی ہے۔ یوں تو پاکستان کا وجود ہر اعتبار سے ہی ایک معجزے کی حیثیت رکھتا ہے لیکن خاص اعتبار سے تو یہ تاریخ عالم کا نہایت ہی محیر العقول تجربہ ہے جس کی شاید ہی کوئی نظیر موجود ہو۔ اگر دین و مذہب کے سوال کو خارج از بحث کر دیا جائے تو دنیا کے مروجہ معیارات میں سے کسی معیار کے اعتبار سے بھی انھیں ایک قوم قرار نہیں دیا جا سکتا[7]۔ ڈاکٹر اسرار کی رائے سے قطع نظر اس زمانے میں نظریہ پاکستان جن اصولوں پر استوار ہوا ان میں ایک اہم عنصر قوم و ملت کا جسد واحد ہونے کا تصور سب سے اہم تصور تھا۔ متحدہ پاکستان کا تصور اسی کا مرہون منت تھا۔ اصل حقائق جو علاحدگی کے اس عمل کے پیچھے کارفرما تھے وہ ہندوؤں کی دیرینہ سازشیں اور دشمنی تھی۔ ہندوؤں نے پاکستان کی آزادی، سالمیت اور خود مختاری کو کبھی بھی دل سے تسلیم نہیں کیا۔ مشرقی پاکستان میں چوں کہ تجارت، صنعت اور تعلیم کے میدان میں شروع سے ہی ہندوؤں کی اجارہ داری قائم تھی لہٰذا قیام پاکستان کے بعد بھی انھیں وہاں نظریہ پاکستان کے خلاف صوبائی عصبیت کے زہر کو پھیلانے کا خوب خوب موقعہ ملا۔ حیرت کی بات تو یہ ہے کہ مشرقی پاکستان کے جن غیور اور شجیع مسلمانوں نے انگریز کے دسترخوان سے پھینکی ہوئی ہڈی چوسنے سے انکار کر دیا تھا نانِ جویں پر قانع قوم، سرد و گرم چشیدہ، سراج الدولہ کے ساتھ جان دینے پر آمادہ۔ جب کلائیو نے اس قوم کی رگوں کا آخری قطرہ خوں بھی نچوڑ لیا تھا تب بھی اس کا دماغ خوب کام کرتا رہا[8] لیکن صدیوں کی بدحالی اور اپنے اوپر ہونے والے مظالم سے تنگ آ کر بالآخر وہ ہندوؤں کی سازشوں کا شکار ہوا۔ وہی بھارتی ہندو جنھوں نے اس خطے کو ہمیشہ پس ماندہ رکھا۔ اچانک انھیں یہاں کے عوام سے غیر معمولی ہمدردی پیدا ہوگئی۔ قیام پاکستان کے بعد مشرقی پنجاب اور دہلی میں مسلمانوں کے خون سے جو ہولی کھیلی گئی اس کی مثال دنیا کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ اسی طرح پولیس ایکٹ کے نام پر بھارت نے جس طرح حیدرآباد دکن پر ۱۹۴۸ء میں قبضہ کیا اور بے گناہ مسلمانوں کے خون کی ندیاں بہائیں تو بھی ہندوستانی دانش واروں کے کان پر جوں نہ رینگی۔ خود بھارت کے اندر جب مسلمانوں کی گردنیں کاٹی جاتیں تو بھی وہ لوگ خاموشی اختیار کر کے در پردہ جن سنگیوں اور دیگر مسلم دشمن عناصر کا ساتھ دیتے۔ کشمیر کو جس طرح آج تک ان لوگوں نے مظالم کا نشانہ بنا رکھا ہے وہ بھی عالمی ذرائع ابلاغ سے پوشیدہ نہیں۔ ظاہر سی بات ہے کہ مشرقی پاکستان کے بنگالی مسلمانوں سے ہمدردی کو ماضی کے ان حالات کے تناظر میں دیکھنے سے اچھی طرح اندازہ ہو جاتا ہے کہ اس کے پیچھے کتنی گہری سازش موجود تھی۔ انیسویں صدی میں مشرقی بنگال کے ہندوؤں کی جانب سے مسلمانوں پر جس قسم کے مظالم کے پہاڑ توڑے گئے اس کا حوالہ ولسن ہنٹر نے اپنی کتاب ''دی انڈین مسلمانز'' میں تفصیل سے دیا ہے۔ مشرقی بنگال کے گوشے گوشے سے مغربی بنگال کے ہندوؤں کے ظلم و ستم کے خلاف آواز بلند ہونا شروع ہو چکی تھی۔ انگریز بھی ہندوؤں کی بڑھتی ہوئی طاقت سے پریشان ہو رہے تھے اور لارڈ کرزن نے ۱۹۰۵ء میں بنگال کی تقسیم کا اعلان مسلمانوں کے دیرینہ مطالبے سے مجبور ہو کر ہی کیا تھا مگر استیصالی ہندوؤں کی مخالفت میں شدت پسندانہ رویہ اختیار کر کے بالآخر انگریز حکومت کو اس بات پر مجبور کر دیا گیا کہ وہ بنگال کی علاحدگی کے اعلان کو منسوخ کریں۔ آخر کار ۱۹۱۱ء میں تقسیم بنگال کو منسوخ کر دیا گیا۔ لووٹ فریزر نے اپنی مشہور کتاب "India Under Curzen and after" جو ۱۹۱۱ء میں ہی پہلی بار شائع ہوئی، بنگال کے ایک سابق جج کے حوالے سے لکھا کہ ''مغربی بنگال کا ہندو سو سال تک مشرقی بنگال کے مسلمانوں پر مسلط رہے گا[9]۔ بعض

جانب دارمورخین بنگالی مسلمانوں کی پس ماندگی کا ذمے دار مغربی پاکستان کی مفاد پرستانہ پالیسی کو قرار دیتے ہیں۔ حالاں کہ مشرقی بنگال کے مسلمانوں کی غربت کے اصلی اسباب تک اس وقت تک نہیں جانا جا سکتا جب تک مغلیہ دور سے لے کر انگریز عہد میں بنگال کی معاشی اور سماجی منظر نامے کو پوری طرح سمجھنے کی کوشش نہ کی جائے۔ مغلیہ دور میں ہی مالیا جمع کرنے والے کارندوں سے لے کر ہر قریہ میں لگان کی نیلامی کے نظام تک ہر دور میں عوام سے لوٹ کھسوٹ کا سلسلہ جاری رہا۔ لارڈ کارنوالس (Cornwallis) کے عہد تک تو یہ لگان جمع کرنے والے اہل کار بڑی بڑی زمینوں کے مالک بن بیٹھے۔ ہندوستان کے تاریخی جغرافیہ میں پی۔ ای۔ رابرٹس لکھتے ہیں کہ زمین داری کا نظام جو پہلے ایک موروثی لگان جمع کرنے والوں پر مشتمل تھا۔ انھوں نے مالکان زمین کی حیثیت اختیار کر لی۔ مغل سلطنت کے انحطاط کے ساتھ ساتھ ان لوگوں کی طاقت بڑھتی چلی گئی۔ ۱۷۸۷ء میں لارڈ کارنوالس نے بنگال کے دوامی بندوبست کی صورت میں مسلمانوں پر غلامی کی آخری مہر ثبت کر دی۔ اس بندوبست کے نظام نے جس کی باگ دوڑ ہندو زمین داروں کے ہاتھوں میں تھی، غریب کاشتکاروں کے مفادات کو کچل کر رکھ دیا۔ مسلمان زمینوں کے مالک بھی رفتہ رفتہ ان ٹیکس جمع کرنے والے حریص اور دھوکے باز ہندو کارندوں کے غلام بن کر رہ گئے۔ اور ان کی حیثیت مزارعین کی سی ہوگئی۔ دوسری طرف ہندوؤں نے جو اس سے قبل مسلمان بادشاہوں کی خوش نودی کے لیے فارسی کو اپنا لیا تھا۔ وقت کے دھارے کو بدلتا دیکھ کر انگریزی تعلیم کی طرف راغب ہو گئے۔ لہٰذا ہندوؤں کے لیے ملازمتوں کے دروازے تو کھلے لیکن مسلم اکثریت اس انگریزی دور میں سرکاری ملازمتوں سے محروم رہی۔ سر سید تحریک کو مشرقی بنگال میں پھیلنے میں وقت لگا جس کی وجہ سے مشرقی بنگال کے مسلمان دوسری ریاستوں کے مسلمانوں کے مقابلے میں کافی پیچھے رہ گئے۔ ہندو زمین داروں کے مظالم نے ان کی حیثیت غلاموں کی سی بنا دی۔ مفلسی اور بدحالی ان کی زندگی کا معمول بن گئی۔ مشرقی بنگال میں سیلاب اور سمندری ہوائیں ہمیشہ ان لوگوں کی تباہی و بربادی کا سامان پیدا کرتی رہیں [۱۱]۔ سر ولیم ہنٹر کی کتاب گزشتہ صدی کے مسلمانوں کی سرکاری ملازمتوں کے بارے میں نہایت پست صورتِ حال کا نقشہ پیش کرتی ہے۔ خصوصاً سابقہ مشرقی پاکستان میں اعلیٰ تعلیم کے فقدان کی جانب اس نے اشارہ کرتے ہوئے بتایا کہ ہر قسم کے اعلیٰ تعلیمی ادارے کلکتا میں مرتکز تھے جب کہ مشرقی پاکستان کے لوگوں میں یہ استطاعت نہ تھی کہ وہ اعلیٰ تعلیم کے لیے کلکتا جائیں۔ یہ سب کچھ ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت ہو رہا تھا تا کہ انھیں پست معاشی حالت کا شکار بنا کر ہمیشہ ہندوؤں اور انگریزوں کا دست نگر بنایا جا سکے۔ اس کے علاوہ کچھ جغرافیائی اسباب بھی ان کی ترقی کی راہ میں حائل رہے۔ اس زمانے میں ذرائع نقل و حمل اس قدر ناقص تھے کہ مغربی بنگال سے جو ہندوستان سے ملا ہوا تھا، سے بھی یہ حصہ رسل و رسائل کی حد تک کٹا ہوا تھا۔ دونوں حصّوں کے درمیان سفر بھی کافی تکلیف دہ تھا۔ کشتیوں اور لانچوں کے سفر میں جو دقتیں تھیں اس کا اندازہ اچھی طرح لگایا جا سکتا ہے۔ ۱۹۳۱ء میں بڑی بڑی ہندوستانی آبادی والے شہروں میں ڈھاکا کا ستائیسواں نمبر ہونے کے باوجود، اس کی آبادی ایک لاکھ اڑتیس ہزار ہونے کے باوجود، اس شہر کے اندر سڑکوں وغیرہ کی صورت کوئی حوصلہ افزا نہیں تھی۔ کلکتا جو اس وقت چودہ لاکھ کی آبادی کے ساتھ اوّل نمبر پر تھا، انگریزوں کی سب سے زیادہ نظرِ کرم کا محور و مرکز بنا ہوا تھا۔ بنگالیوں کی کلکتا پرستی کے اثرات کا نتیجہ تھا کہ مشرقی بنگال ہر قسم کی صنعتی، تجارتی اور تعلیمی ترقی سے محروم رہا۔ اسی وجہ سے روزگار کے مواقع بھی کم پیدا ہوئے بلکہ مسدود ہوتے گئے۔ ان عوامل کی وجہ سے بنگالی مسلمانوں کی حالت بتدریج بد سے بدتر ہوتی گئی۔ پٹ سن کی اسّی فی صد پیداوار مشرقی بنگال میں ہونے کے باوجود اس کے تمام کارخانے مغربی بنگال خصوصاً کلکتا میں لگائے گئے۔ چٹاگانگ کی بندرگاہ اپنے محلِ وقوع اور فنی نقطۂ نگاہ سے موزوں ہونے کے

باوجود ہوگلی (کلکتا) کی بندرگاہ پر ہر سال کثیر روپیہ خرچ کر کے وہیں سے دیگر ممالک میں پٹ سن بھیجا جاتا۔ ہندوؤں اور انگریزوں کی ان سازشی چالوں سے نتیجہ یہ نکلا کہ کلکتا تو دن دونی رات چوگنی ترقی کرتا گیا اور مشرق کا مشہور ترین شہر بن گیا لیکن اس کے برعکس ڈھاکا اور مشرقی بنگال کے دیگر شہروں کی حالت ابتر رہی۔ ڈھاکا کے نصیب میں صرف یہ رہ گیا تھا کہ وہ مغربی بنگال اور بالخصوص کلکتے کے کارخانوں کے لیے خام مال فراہم کرے اور انھیں چاول، مچھلی، انڈے، مرغی اور دیگر خوردنی اشیا مہیا کرے[11]۔

قیامِ پاکستان کے بعد ظاہر ہے اس نئی مملکت کو مشرقی بنگال کے یہ مسائل ورثے میں ملے۔ مشرقی پاکستان میں جیسا کہ عرض کیا گیا کہ تجارت، صنعت اور تعلیم کے میدان میں ہندوؤں کی اجارہ داری قائم تھی لہٰذا انھوں نے اس نئی مملکت کے قیام کی ابتدا سے ہی نظریہ پاکستان کے خلاف صوبائیت کے حوالے سے عصبیت کے زہر کو ہوا دینا شروع کر دیا۔ قائد اعظم نے ہندوؤں کے مذموم عزائم کو بھانپتے ہوئے بارہا اس کی مذمت کی۔ ۲ مارچ ۱۹۴۸ء کو ڈھاکا میں جلسۂ عام سے خطاب کرتے ہوئے انھوں نے فرمایا کہ:

> پاکستان کے بدخواہوں نے پاکستانی مسلمانوں کو آپس میں لڑانے کے لیے نئے بنگالی اور غیر بنگالی کا مسئلہ کھڑا کر دیا ہے۔ اس طرح صوبائی عصبیت نے جنم لیا ہے جو پاکستان کی سالمیت کے لیے سب سے بڑا خطرہ ہے۔ جب تک اس عصبیت کو نکال نہ پھینکا جائے گا آپ صحیح معنوں میں ایک قوم نہیں بن سکتے۔ میں آپ کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ آپ سب یہاں سے باہر سے آئے تھے بنگال کے اصل باشندے کون تھے؟ وہ نہیں جو آج یہاں سکونت پذیر ہیں۔ لہٰذا یہ کہنا تو بے کار ہوگا کہ ہم بنگالی ہیں یا سندھی، پٹھان ہیں یا پنجابی، بلکہ ہم سب مسلمان ہیں[12]۔

اسی زمانے میں بنگالی کو قومی زبان بنانے کا ایک نیا شوشا چھوڑا گیا۔ دستور ساز اسمبلی کے ایک ہندو رکن دھرمیندر ناتھ نے فروری ۱۹۴۸ء میں ترمیم کی ایک تحریک اس حوالے سے پیش کی کہ اردو کے ساتھ ساتھ بنگالی کو بھی سرکاری زبان کا درجہ دیا جائے۔ وزیر اعظم لیاقت علی خان نے اس کی مخالفت کی اور اسے پاکستانی عوام کے درمیان کشیدگی پیدا کرنے کا باعث قرار دیا لیکن سازشوں نے اسے عوامی مہم کی شکل دے کر علاحدگی کا بیج اسی دن بو دیا تھا۔ اس کے نتیجے میں ۱۹۵۱ء میں مشرقی پاکستان میں فسادات بھی ہوئے۔ اگرچہ ۱۹۵۶ء کے آئین میں بنگالی کو دوسری قومی زبان کی حیثیت دے دی گئی لیکن دلوں کی دوریاں اس کے بعد کبھی ختم نہ ہو سکیں۔ یہ جھگڑا ابھی کوئی نیا نہیں تھا بلکہ قیامِ پاکستان سے قبل ۱۹۴۳ء میں ابوالمنصور نے ایک مقالہ بہ عنوان ''پوربو پاکستانیر زبان'' (The languag of East Pakistan) مشہور بنگالی ماہ نامہ ''محمدی'' میں شائع ہوا۔ اس مقالے میں غالباً پہلی مرتبہ اس بات پر زور دیا گیا کہ بہ جائے اردو کو مشرقی پاکستان کی ریاستی زبان بنانے کے، بنگالی کو ریاست کی زبان قرار دیا جائے تو پاکستان بننے کے فوراً بعد ایک مضبوط، خوش حال اور ثقافتی اور سماجی حوالے سے بہتر حالت میں اس نئی مملکت کا حصہ بن سکیں گے۔ بنگالی کو دوسری قومی زبان کا درجہ ملنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ مغربی بنگال کے ہندوؤں کی کوششوں سے بنگالی لٹریچر نے مشرقی بنگال میں فکری انتشار کو بڑی تیزی سے آگے بڑھایا[13]۔ اس طرح مشرقی پاکستان کے تار و پود بننا شروع ہو گئے جنھیں حکم رانوں کے بعض اقدامات نے اس علاحدگی کی تحریک کو اور ہوا دی۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ بھارت کے ریڈیو اسٹیشنوں سے برابر یہ ڈھنڈورا پیٹا جا رہا تھا کہ مشرقی پاکستان کے عوام کی موجودہ بغاوت مغربی پاکستان کے اس رویے کے خلاف ہے جس نے ۲۳ سال تک مشرقی پاکستان کا استیصال کیا اور اسے اپنی نو آبادی سمجھا۔ بدقسمتی سے مشرقی پاکستان میں ایک طبقہ

ایسا پیدا ہو گیا جو ہندوستان کے اس پروپیگنڈے پر یقین بھی کرتا تھا۔ ان لوگوں نے مقامی سطح پر اپنے لوگوں میں یہ گمراہی پھیلانا شروع بھی کر دی تھی جب کہ پچھلے صفحات میں مختصراً ان عوامل کی نشان دہی کی جا چکی ہے۔ اس نومولود مملکت کو حوادث سے بچانے اور یگانگت اور یک جہتی کی فضا پیدا کرنے کے لیے مشرقی پاکستان کے رہنماؤں نے جن میں شیر بنگال مولوی فضل الحق مرحوم اور دوررس سیاست داں سہروردی مرحوم وغیرہ پیش پیش تھے[14]۔ لیکن ۱۹۵۶ء کے آئین کے تحت ون یونٹ یعنی وحدت مغربی پاکستان کا قیام عمل میں لایا جسے بنگالیوں نے اپنے خلاف ایک سازش خیال کیا۔ اس سے قبل خواجہ ناظم الدین کی برطرفی کو بھی مشرقی پاکستان کے لوگوں نے مغربی پاکستان کی آمریت سمجھا۔ ۱۹۵۶ء کے آئین کے تحت حکومتوں کا آنا جانا معمول بن گیا جس نے ۱۹۵۸ء کے مارشل لا کی راہ ہموار کی۔ احتساب کی ایسی ہوا چلی کہ مشرقی پاکستان کے بہت سے سیاست داں بشمول حسین شہید سہروردی میدان سیاست سے باہر کر دیے گئے۔ سیاست دانوں کی اچھی خاصی تعداد ایبڈو (EBDO) کی زد میں آ کر سیاست سے باہر ہو گئی۔ اس سیاسی عمل کے رکنے کے نتیجے میں بھی ماحول میں گھٹن اور احساسِ محرومی پیدا ہوئی۔ جسٹس کیانی مرحوم نے لکھا کہ اگر آپ لوگوں کو اظہارِ رائے کی آزادی نہیں دیں گے تو یا تو ایک دھماکا ہو گا یا پھر وہ لوگ اپنے خیالات کے بوجھ تلے دب کر مر جائیں گے۔ افسوس کی بات یہ ہوئی کہ مشرقی بنگال میں پہلی صورت پیش آئی۔ حکم رانوں کی مسلسل آمرانہ اقدامات نے بنگالیوں کے دلوں میں احساسِ محرومی کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہوا۔ ۱۹۵۶ء کے آئین کے تحت تمام تر اختیارات جب مرکز خصوصاً صدر کو منتقل ہوئے تو پاکستان مخالف پروپگنڈے میں مزید اضافہ ہوا۔ نام نہاد اقتصادی ماہرین نے یہ دعویٰ کرتے ہوئے کہا کہ ملکی مجموعی آمدنی میں زیادہ حصّہ مشرقی پاکستان ملاتا ہے لیکن وسائل پر قبضہ مغربی پاکستان کے لوگوں کا ہے تو مزید مایوسی پھیلی۔ عوامی لیگ کے تحت شائع ہونے والے لٹریچر میں یہ دعویٰ تک کیا گیا کہ پاکستان کی مجموعی آمدنی کا ۶۰ فی صد حصّہ مشرقی پاکستان سے حاصل ہوتا ہے جب کہ قومی آمدنی کا صرف بیس فی صد مشرقی پاکستان پر خرچ کیا جاتا ہے۔ اس کے برعکس مغربی پاکستان صرف ۴۰ فی صد کماتا ہے اور وسائل کا ۷۵ فی صد ہڑپ کیا جاتا ہے[15] جب کہ حقائق اس کے بالکل برعکس تھے۔ قومی اعداد و شمار کے گوشوارے بتاتے ہیں کہ ۱۹۶۱ء تا ۱۹۶۹ء کے درمیان مشرقی پاکستان نے مرکز کو ۲۶اعشاریہ۴ جب کہ مغربی پاکستان نے ۷۳اعشاریہ۶ فی صد حصّہ دیا۔ اسی طرح مرکز سے صوبوں کی آمدنی میں حصّہ ڈالا گیا اس کے مطابق مشرقی پاکستان کو ۳۶۷ کروڑ ۸ لاکھ روپے جب کہ مغربی پاکستان کو ۳۹۰ کروڑ ۲ لاکھ روپے دیے گئے جو مجموعی طور پر تناسب کے لحاظ سے مشرقی پاکستان کے لیے ۴۸ اعشاریہ ۷ فی صد اور مغربی پاکستان کے لیے ۵۱ اعشاریہ ۳ فی صد تھا۔ اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ مشرقی پاکستان میں غربت کی شرح مغربی پاکستان سے کہیں زیادہ تھی مگر اس کی وجہ مغربی پاکستان نہیں بلکہ وہ تاریخی استیصال تھا جو ہندو بنگالیوں نے ان کے ساتھ روا رکھا تھا۔ یہ معاشی عدم مساوات جیسا کہ ابتدائی صفحات میں ذکر کیا گیا انگریزوں سے پاکستان کو ورثے میں ملا تھا[16]۔ انگریزوں نے مشرقی بنگال کا استیصال کرنے میں کوئی کمی نہیں چھوڑی تھی۔ اس کی سب سے بڑی ناانصافی تو یہ تھی کہ وہ ہندوؤں کی بداعمالی سے چشم پوشی کرتا رہا۔ یہی وجہ ہے کہ قیام پاکستان کے وقت مشرقی پاکستان کی معاشی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ رہی سہی کسر دوسری جنگِ عظیم کے دوران ذرائع نقل و حمل کی تباہی کی صورت میں پوری ہو گئی کیوں کہ جاپانیوں کی حکمت عملی کو سامنے رکھتے ہوئے برطانوی فوج نے ان چھوٹی چھوٹی کشتیوں تک کو تباہ کر دیا جو ان بنگالیوں کے روزگار کا اہم ترین ذریعہ تھیں۔ ان ہی کشتیوں کے ذریعے مچھلیاں پکڑ کر بڑا طبقہ روزگار کا بندوبست کرتا تھا۔ ایک اور بڑا ہولناک واقعہ ۱۹۴۲ء میں قحط کی صورت میں رونما ہوا۔ یہ حربہ بھی برطانویوں نے خاص حکمت عملی کے

تحت اس خطے کو خوراک سے محروم رکھ کر اختیار کیا جس کے خاطر خواہ نتائج برآمد ہوئے اور جاپانیوں نے یہ دیکھ کر کہ یہ حصہ پہلے ہی قحط کا شکار ہے، ہندوستان پر حملے سے گریز کیا۔ انگریزوں کی اس پالیسی کے نتیجے میں لاکھوں لوگ قحط اور فاقہ کشی کا شکار ہو کر مر گئے۔ ان تمام حالات پر پچھلے ابواب میں تفصیلی جائزہ لیا جا چکا ہے۔ تیسری بڑی وجہ جنوب مشرقی کمان کا ہیڈ کوارٹر مشرقی بنگال میں قائم ہونا تھا تا کہ اسے جاپان کے خلاف حملے کے لیے اڈے کے طور پر استعمال کیا جا سکے۔ یہاں کی سڑکیں جو پہلے ہی تباہ حال تھیں، جنوب مشرقی کمانڈ کی فوجوں نے مزید خراب کر دیں اور نقل و حمل کے ذرائع مسدود ہو کر رہ گئے۔ اسی وجہ سے قیام پاکستان کے ابتدائی برسوں میں یہ خطّہ ترقی کی برکات سے فوری طور پر محروم رہا[۱۷]۔ مزید یہ کہ مشرقی پاکستان شروع ہی سے قدرتی آفات کا شکار رہا ہے۔ اس سے ہونے والی تباہی کو بھی شیخ مجیب الرحمٰن نے اپنے علاحدگی کے پروگرام کو عملی جامہ پہنانے کے لیے استعمال کیا۔ اس نے لوگوں کو گمراہ کرنے کے لیے یہ پروپیگنڈا شروع کیا کہ ''مغربی پاکستان میں تربیلا اور منگلا ڈیم بن سکتے ہیں تو مشرقی پاکستان میں کیوں نہیں بن سکتے۔ مسلسل ۲۳ سالوں سے ہمارے عوام پانی کی بے رحم موجوں کے ہاتھوں موت کے منہ میں چلے جاتے ہیں لیکن مغربی پاکستان ٹس سے مس نہیں ہوتا''[۱۸]۔

انگریزوں نے چلتے چلتے پاکستان پر جو آخری اور گہرا وار کیا وہ یہ تھا کہ مشرقی بنگال کی شہ رگ ''کلکتا'' کو پاکستان کا حصہ نہ بننے دیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ دسمبر ۱۹۴۷ء میں حکومت ہند نے تمام تر بین الاقوامی قوانین کو بالائے طاق رکھ کر یہ رویہ اختیار کیا کہ مشرقی پاکستان کی جو پٹ سن کلکتے کے راستے دوسرے ممالک جاتی، وہ مغربی بنگال کی برآمد سمجھی جائے گی اور اس کا زرمبادلہ مشرقی پاکستان کو نہیں دیا جائے گا۔ اس طرح تقسیم کے بعد پاکستان اور ہندوستان کے مابین باقاعدہ تصادم کا آغاز ہوا۔ خود گاندھی جی نے ہندوستان کے اس رویے پر احتجاج کرتے ہوئے جس میں اثاثوں کی تقسیم کے حوالے سے ۵۵ کروڑ کی رقم پاکستان کو دینے سے انکار پر سخت الفاظ میں مذمت بھی کی اور اس وقت تک برت رکھنے کا اعلان کیا جب تک پاکستان کو یہ رقم ادا نہ کر دی جائے۔ بعد میں مذاکرات کے بعد اس رقم میں سے ۵۰ کروڑ کی رقم دینے پر ہندوستانی حکومت راضی ہوئی اور پانچ کروڑ ہضم کر ڈالے۔ اس صورتِ حال کا تذکرہ یہاں اس لیے بھی ضروری ہے کہ قیامِ پاکستان کے بعد ابتدائی برسوں میں مالی، تجارتی اور معاشی سطح پر حکومت پاکستان کو کس قسم کی مشکلات کا سامنا تھا، اس کا اندازہ لگایا جا سکے۔ یہ وہ دور تھا جب قائداعظم کا سایہ پاکستان کے سر پر موجود تھا۔ اور ملک کے دونوں خطوں میں باہمی اخوت اور یگانگت کا جذبہ موجود تھا۔ ہندوستان نے اپنی معاندانہ پالیسی کے ذریعے ان تمام معاہدوں کو پایۂ تکمیل تک نہ پہنچنے دیا جو مغربی پاکستان نے محض مشرقی پاکستان کے معاشی حالت کو بہتر بنانے کے لیے ہندوستان سے کیے تھے۔ ظاہر سی بات ہے کہ جو خطہ اپنی ضرورت کی ہر چیز کے لیے کلکتا کا محتاج تھا وہاں اشیاء کی قیمتیں ہندوستان کی ہٹ دھرمی کی بنا پر خود بہ خود بلند ہو جاتیں اور قیمتوں کے اس اضافے کا اثر بھی عوام پر ہی پڑتا۔ بعض اوقات لوگوں کو سرکاری کنٹرول نرخوں کے بہ جائے دوگنی قیمت میں اشیائے خورد و نوش خریدنی پڑتی تھیں۔ خود مشرقی پاکستان کا بجٹ خسارہ بھی سال بہ سال بڑھتا گیا۔ صنعتی ترقی کی رفتار نہایت سست تھی۔ قیام پاکستان کے وقت مشرقی پاکستان میں ہر قسم کے چھوٹے بڑے کارخانوں کی تعداد ۳۴۱ تھی جب کہ مغربی پاکستان میں یہ تعداد ۱۰۴۵ تک جا پہنچی تھی۔ مشرقی پاکستان کے کارخانے ۵۵ ہزار جب کہ مغربی پاکستان کے کارخانے سوا لاکھ افراد کو روزگار فراہم کر رہے تھے۔ ان اعداد و شمار سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ صوبے میں ترقیاتی انفرا اسٹرا کچر کی صورت حال کیا تھی۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ قیام پاکستان کے بعد مشرقی پاکستان میں بجٹ کے اعداد و شمار یہ بتاتے ہیں کہ اس خطے میں بتدریج ترقی ہو رہی تھی۔ ۴۹-۱۹۴۸ میں مغربی پاکستان کا بجٹ تقریباً دوگنا سے کچھ کم تھا جب

کہ ۷۱-۱۹۷۰ء کے معاشی جائزے کے مطابق دونوں صوبوں کے درمیان بجٹ کے میدان میں بہت کم فاصلہ رہ گیا یعنی مغربی پاکستان کے تمام صوبوں کا متحدہ بجٹ ۱۸۵ کروڑ تھا جو مشرقی پاکستان سے محض سات کروڑ زیادہ تھا۔ بجلی کی پیداوار کی حد تک تو ان بائیس برسوں میں سترہ ہزار میگا واٹ سے بڑھ کر ۶۵-۱۹۶۴ء تک تیس ہزار میگا واٹ تک جا پہنچی اور ۱۹۷۰ء میں اندازاً ۸۳ ہزار میگا واٹ تک جا پہنچی۔ اس کے علاوہ بھی مشرقی پاکستان میں صنعتی ترقی کی صورت حال ماضی کے مقابلے میں بہتر ہوتی جا رہی تھی۔ ۵۱-۱۹۵۰ء میں جوٹ میل کا قیام عمل میں نہیں تھا لیکن ۵۴-۱۹۵۳ء میں کمرشل پیمانے پر جوٹ کے کارخانوں نے کام شروع کر دیا اور اس سال پٹ سن کی جو مصنوعات تیار کی گئیں اس کا وزن ساڑھے اڑتالیس ہزار ٹن تھا۔ قیام پاکستان تک مشرقی پاکستان میں پٹ سن کا کوئی کارخانہ نہ تھا لیکن ۴۹-۱۹۴۸ء تک ایسے کارخانوں کی تعداد ۵۳ تک جا پہنچی تھی۔ کاغذ اور گتا کا بھی کارخانہ ابتداء میں موجود نہیں تھا۔ ۶۶-۱۹۶۵ء میں ان اشیاء کی پیداوار ۲۴ ہزار ٹن سے اوپر تھی اور محض دو تین برس یعنی ۶۹-۱۹۶۸ء میں ان اشیاء کی پیداوار بیاسی ہزار ٹن سے اوپر چلی گئی۔ اسی طرح ۵۵-۱۹۵۴ء سے پہلے مشرقی پاکستان میں مصنوعی سلک کا کپڑا بنانے کا کوئی انتظام نہ تھا۔ ۶۶-۱۹۶۵ء میں اس صنعتی شعبے میں ڈیڑھ لاکھ مربع گز سے شروع ہونے والی ترقی ۶۹-۱۹۶۸ء تک ۶۸ لاکھ مربع گز تک جا پہنچی۔ دیا سلائی کے کارخانوں کی حد تک تو ہمیشہ ہی مشرقی پاکستان کی اجارہ داری قائم رہی اور ۶۹-۱۹۶۸ء تک ۲۳ کارخانوں میں سے ۲۰ مشرقی پاکستان میں قائم ہوئے۔ اسی طرح چینی بنانے کی صنعت میں بھی مشرقی پاکستان میں خاطر خواہ ترقی ہوئی۔ ۷۱-۱۹۷۰ء تک ایک لاکھ ٹن چینی تیار ہونے لگی[۱۹]۔

اس صورت حال میں اس پروپیگنڈے کی کوئی اہمیت تو نہیں ہونی چاہیے تھی جس کے تحت پاکستان مخالف جذبات کو ہوا دینے کی کوشش کی جاتی تھی۔ ۴۸-۱۹۴۷ء کے ڈھاکا اور چٹا گانگ کو دیکھنے والے ۲۲ برس کے بعد ان شہروں کو دیکھ کر یقین کرنے کو تیار نہ ہوتے تھے کہ یہ وہی پس ماندہ شہر ہیں۔ مشرقی پاکستان کی بندرگاہوں کی حالت بھی ان بائیس برسوں میں کافی بہتر ہوگئی تھی۔ ۷۰-۱۹۶۹ء میں چٹا گانگ کی بندرگاہ نے ساڑھے اڑتالیس لاکھ ٹن مال درآمد اور برآمد کیا۔ ذرائع نقل و حمل نے بھی غیر معمولی ترقی کی۔ باوجود دشواریوں کے کثیر تعداد میں سڑکوں کا جال بچھایا گیا۔ دیہی ترقیاتی پروگرام شروع ہوا۔ گیارہ ہزار سے زائد پل اور پلیاں تعمیر کی گئیں۔ ریڈیو جو اس زمانے میں ترقی اور خوش حالی کی علامت تھی، ۱۹۵۲ء میں صرف ۸۸۴۸ لوگوں کے پاس ریڈیو کا لائسنس تھا، جو بڑھ کر ۴ لاکھ تک پہنچ گیا تھا۔ یہ وہ مختصر خاکہ ہے جو ان تمام دعووں کو غلط ثابت کرتا ہے جو مشرقی پاکستان کی کس مپرسی کے حوالے سے پیش کیے جاتے رہے ہیں اور جن کو بنیاد بنا کر ایسا سیاسی بحران پیدا کیا گیا جو بالآخر علاحدگی پر منتج ہوا[۲۰]۔ یہاں یہ بات ضرور ذہن میں رکھنی چاہیے کہ صنعتی حوالے سے جو کچھ بھی ترقی کے آثار تھے، وہ ابھی ناکافی تھے۔ ان کارخانوں کی چمنیاں تو محض چند شعلے تھے جو اس بھوکے بنگال کا پیٹ بھرنے کے لیے ناکافی تھے۔ ابھی تو ان کے وافر غلے کی فراہمی کے لیے بہت کچھ کرنا باقی تھا، ان کے ننگے جسم کو ڈھانپنے کے لیے وافر کپڑا اپنے ہی جوٹ سے بنانا تھا۔ انھیں خود کفالت کی طرف لے کر جانا تھا[۲۱]۔ لیکن وقت نے ان اچھے حالات کا انتظار نہیں کیا۔ سازشی عناصر خفیہ طور پر اپنی تخریبی کارروائیوں میں مصروف تھے۔ غیر مسلم متعصب ذہنیت اس معاملے میں پیش پیش تھی جس نے اس سیاسی کش مکش کو بڑھانے میں جلتی پر تیل کا کام کیا۔ ان غیر تسلی بخش حالات نے رفتہ رفتہ نازک صورت اختیار کر لی[۲۲]۔ سیاسی محرومی، ثقافتی جبر، معاشی ناہمواری کے احساس اور معروضی اثرات کے زیر اثر مشرقی پاکستان میں بنگالی قومیت کی وہ تحریک جو بنگالی زبان کی تحریک کی صورت میں شروع ہوتی جو بعد میں کم اختیار والے مرکز اور زیادہ اختیار والے صوبے کے مطالبے میں تبدیل ہوگئی۔ اس مطالبے کی حتمی شکل شیخ

مجیب الرحمٰن کے چھے نکاتی پروگرام کی صورت اختیار کر گئی[۲۳]۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ سقوط ڈھاکا سے محض چند برس پیش تر جنگ ستمبر ۱۹۶۵ء کے دوران مغربی اور مشرقی پاکستان میں رہنے والے تمام پاکستانیوں کے درمیان جس بے مثال اتحاد و یک جہتی کا مظاہرہ دیکھنے میں آیا وہ اتنے مختصر سے عرصے میں کیوں کر پارہ پارہ ہو گیا، اس پر ماہرین سیاسیات اب تک کوئی جواب دینے سے قاصر ہیں، ڈاکٹر فرمان فتح پوری اس ضمن میں کہتے ہیں کہ:

> قومی ذمے داری و ملّی بے داری کی عجیب و غریب لہر معاشرے کے رگ و پے میں دوڑ گئی۔ فلاح ملک و ملت کے سلسلے میں اقدام و استحکام کی گئی، راہیں ہم وار ہوتی نظر آئیں۔ لیکن افسوس سیاسی عدم استحکام و آمرانہ اقدام کے نتیجے میں یہ خوش گوار موسم تا دیر باقی نہ رہا اور پاکستانی معاشرہ ایک بار پھر انھیں کج ادائیوں اور ناہم واریوں کا شکار ہو گیا جن سے وہ پہلے دو چار تھا۔ اب کے داخلی انتشار و اضطراب نے ایسی صورت اختیار کر لی کہ چند ہی سال بعد مشرقی پاکستان کا المیہ پیش آ گیا[۲۴]۔

بدقسمتی سے مغربی پاکستان کے حکم راں طبقے نے اس احساس محرومی کو ختم کرنے کی کوشش نہیں کی۔ نتیجتاً نفرت کی یہ دیوار رفتہ رفتہ اونچی ہوتی چلی گئی۔ رہی سہی محبت اور مروت نومبر ۱۹۷۰ء کے سمندری طوفان میں غرق ہو گئی جس میں اندازاً عورتوں، بچوں اور نو جوانوں سمیت ۲۰ لاکھ بنگالی لقمۂ اجل بن گئے[۲۵]۔ ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ میں میدانِ جنگ کیوں کہ مغربی پاکستان تھا لہٰذا مشرقی پاکستان کے دفاع اور تحفظ کو خاطر خواہ اہمیت نہیں دی گئی۔ دفاعی تجزیہ کاروں کے مطابق مشرقی سرحدوں کے دفاع کا دارومدار ہماری مغربی سرحدوں کے دفاع سے منسلک تھا[۲۶]۔ ایک بنگالی رکن اسمبلی نے جب یہ سوال اٹھایا کہ پانچ ملین کشمیریوں کی خاطر پچیس ملین مشرقی پاکستانیوں کی جانیں کیوں خطرے میں ڈالی گئیں تو اس وقت کے وزیر خارجہ ذوالفقار علی بھٹو نے جواب دیا تھا کہ چین کے خوف سے ہندوستان مشرقی پاکستان پر ایک انگلی بھی نہیں اٹھا سکتا[۲۷]۔ اس قسم کے روّیے سے فطری طور پر بنگالیوں نے یہ محسوس کرنا شروع کر دیا کہ اگر ان کا دفاع چین ہی کو کرنا ہے تو انھیں مغربی پاکستان کے ساتھ اکٹھا رہنے کی کیا ضرورت ہے؟ اس طرح کے ناعاقبت اندیشی سے لاوا اندر ہی اندر پکتا رہا۔ چناں چہ ۱۹۶۶ء میں بالآخر شیخ مجیب الرحمٰن نے اپنے مشہور چھے نکات پیش کیے جن پر عمل پیرا ہو کر ملک کی حیثیت وفاقی (Fedration) سے زیادہ نیم وفاقی (Confedration) کی شکل اختیار کر لیتی۔ بعض سیاسی رہنماؤں کی جانب سے اسے علاحدگی کے پروگرام کی جانب پہلا قدم قرار دیا۔ ۱۹۶۸ء میں علاحدگی کی ایک اور سازش بے نقاب ہوئی۔ یہ سازش اگرتلا سازش کے نام سے مشہور ہے۔ اس سازش میں شیخ مجیب کے علاوہ ۲۸ دیگر افراد بھی ملوث تھے جو ہندوستانی سفارت خانے کے افراد سے مل کر علاحدگی کے پروگرام پر کام کر رہے تھے۔ اس مقصد کے لیے بھارت میں اگرتلہ کے مقام پر مرکز قائم کیا گیا تھا جہاں سے تحریک کو اسلحہ اور دیگر مواد فراہم کیا جاتا تھا۔ اس معاملے میں بھی حکومت نے معاملہ فہمی کا ثبوت نہیں دیا حالاں کہ اس معاملے سے اگر سمجھ داری کے ساتھ نبرد آزما ہوا جاتا تو یہ معاملہ شیخ مجیب اور ان کے حواریوں کے لیے سیاسی موت کا پیش خیمہ ثابت ہو سکتا تھا۔ صدیق سالک کے مطابق ابتدا میں شیخ مجیب کو اس سازش کے حوالے سے مشرقی پاکستان میں نفرت کا سامنا کرنا پڑا، مگر جلد ہی وہ اس مقدمے کے طفیل مقبولیت کے آسماں پر جا پہنچا[۲۸]۔ اس قسم کے مقدمات کی تشہیر کرنے کے بہ جائے بند کمرے میں سماعت ہوتی تو مجرموں کو کیفر کردار تک پہنچانا بھی آسان ہوتا اور ملکی سلامتی کے منافی تفصیلات بھی آشکارنہ ہوتیں۔ اس مقدمے سے بنگالی علاحدگی پسندوں کو اپنی جائز اور ناجائز

شکایتوں کی تشہیر کا نادر موقع ہاتھ آیا اور انھوں نے اس کا خوب فائدہ بھی اٹھایا۔ قدرت اللہ شہاب نے اس جانب اشارہ کرتے ہوئے لکھا کہ:

> جس کروفر سے یہ سب تفصیلات اخبارات میں اچھالی جاتی تھیں، اس کے دو پہلو تھے۔ ایک یہ کہ مغربی پاکستان کے خلاف نفرت بڑھتی تھی اور صدر ایوب کی مرکزی حکومت پر اعتماد کمزور ہوتا تھا۔ دوسری یہ کہ علاحدگی کے جراثیم عوام کے ذہن میں زور پکڑتے گئے اور شیخ مجیب الرحمٰن کی قیادت کو بیٹھے بٹھائے فروغ حاصل ہوگیا[۲۹]۔

دوسری جانب معاہدہ تاشقند کے بعد بھٹو مستعفی ہوگئے اور ایوب خان کی حکومت سے اپنی راہیں جدا کرلیں۔ نہ صرف راہیں جدا کرلیں بلکہ ایوب خان کے خلاف بھٹو نے بھرپور تحریک شروع کردی جس کے بعد پورے ملک میں ہنگامے پھوٹ پڑے۔ حکومت کا دس سالہ جشن کا پروگرام بھی ان ہنگاموں کی نذر ہوگیا۔ ایوب خان نے بوکھلاہٹ میں سیاست دانوں سے مذاکرات کا ڈول تو ڈالا مگر حالات کا رخ بتا رہے تھے کہ سازش کی کڑیاں پیچیدہ سے پیچیدہ تر شکل اختیار کرتی جارہی تھیں۔ ایوب حکومت بہت دباؤ کا شکار تھی۔ مولانا عبدالمجید بھاشانی، ذوالفقار علی بھٹو اور میاں ستار دولتانہ نے شیخ مجیب الرحمٰن کے کانفرنس میں شرکت پر اصرار کیا[۳۰]۔ لہٰذا حکومت نے گھٹنے ٹیکتے ہوئے مجیب کو رہا کرنے پر آمادگی ظاہر کردی لیکن بھلا ہو ان ناعاقبت اندیش سیاست دانوں کا جنھوں نے مجیب کو خبردار کیا کہ پیرول پر آنے کی حامی نہ بھرنا، ہم تمہیں ضرور رہا کرا کرلائیں گے[۳۱]۔ نوابزادہ نصر اللہ کے مطابق گول میز کانفرنس کے دوران مجیب الرحمٰن کو یحییٰ خان سے ملوانے کے لیے یوسف ہارون بہ ذریعہ ہیلی کاپٹر لے گئے تھے۔ ملاقات سے واپسی پر شیخ مجیب کا روّیہ کافی سخت تھا۔ کانفرنس میں تقریر کے دوران ایک طویل بے ربط تقریر میں مجیب الرحمٰن نے اپنے چھے نکات کا ذکر کیا۔ اس تقریر کے اختتام پر مجیب نے زور دے کر کہا تھا کہ ان کی پیش کردہ تجاویز پر عمل کرکے ہی ملک سلامت رہ سکتا ہے جس پر صدر ایوب نے برجستہ پوچھا تھا کہ کون سا ملک؟ غرض کانفرنس کا اختتام اس رنگ پر ہوا[۳۲]۔ اس کے بعد ملکی حالات روز بروز دگرگوں ہوتے چلے گئے۔ یحییٰ خان کے دباؤ کے تحت ۲۵ مارچ ۱۹۶۹ء کو ایوب خان نے اقتدار آئینی طریقے سے سونپنے کے بہ جائے یحییٰ خان کو سونپ دیا۔ ۱۹۶۲ء کا آئین منسوخ کرکے ملک میں مارشل لا نافذ کردیا گیا۔ یحییٰ خان نے ''لیگل فریم ورک آرڈر'' کے نام سے ایسا عبوری آئینی ڈھانچا نافذ کیا جو کسی معمے سے کم نہیں تھا۔ ون یونٹ کا بھی خاتمہ ہوا اور ایک فرد ایک ووٹ کے اصول کو لاگو کرکے ۱۹۷۰ء کے انتخابات کروائے گئے۔ انتخاب سے قبل مشرقی پاکستان میں آنے والے سمندری طوفان اور نامساعد حالات میں حکومتی کوتاہی نے مجیب الرحمٰن کی عوامی لیگ کے لیے حالات سازگار بنا دیے۔ مجیب نے ان حالات سے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ نتیجتاً مشرقی پاکستان کی تاریخ (Before cyclon & after cyclon) یکسر تبدیل ہوکر رہ گئی۔ تجزیہ کاروں کے مطابق سمندری طوفان کے فوراً بعد انتخابات کا انعقاد عمداً تمام کی تمام نشستیں عوامی لیگ کی جھولی میں ڈالنے کے مترادف تھا۔ انتخابات مخلوط بنیادوں پر ہوئے تھے، نتیجتاً ہندوؤں کی اکثریت نے اپنا سیاسی اور اقتصادی تعاون مکمل طور پر عوامی لیگ کے پلڑے میں ڈال دیا۔ اسی وجہ سے عوامی لیگ کی قوت میں فیصلہ کن حد تک اضافہ ہوگیا[۳۳]۔ مشرقی پاکستان میں عوامی لیگ نے ۱۶۷ میں سے ۱۶۴ اور مغربی پاکستان میں پیپلز پارٹی نے ۱۴۶ میں سے ۸۳ نشستیں جیت لیں۔ دونوں سیاسی جماعتیں دوسرے صوبے میں کوئی ایک نشست بھی حاصل کرنے سے قاصر رہیں۔ جمہوری روایت کے مطابق اگلے مرحلے میں انتقال اقتدار کی کارروائی ہونی تھی۔ اس

سے قبل یحییٰ خان، مجیب الرحمٰن کو پاکستان کا اگلا وزیراعظم قرار دے چکے تھے۔ تاریخ کے ان کلمات میں جس جس تدبیر کی ضرورت تھی وہ ہماری مقتدر قوتوں اور رہنماؤں میں ناپید تھی۔ یحییٰ خان اور بھٹو اشتراک نے حالات کو مزید گھمبیر بنا دیا۔ بھٹو اشتراک اقتدار کے خواہاں تھے۔ ۱۴ فروری ۱۹۷۱ء کو حیات محمد شیرپاؤ کے گھر ایک پریس کانفرنس کے دوران انھوں نے واضح انداز میں کہا کہ:

> Peoples party would not be attending the forthcoming session of National Assembly because we would be treated as double Rostage and that we would be going to slaughter house[۳۴].

اس کے ساتھ ساتھ بھٹو نے مغربی پاکستان سے اسمبلی میں شرکت کرنے والوں کی ٹانگیں توڑنے کی دھمکی بھی دی چناں چہ یکم مارچ ۱۹۷۱ء کو بلایا گیا اسمبلی کا اجلاس ملتوی کر دیا گیا۔ اس کے نتیجے میں شرکا مغربی پاکستان کی ٹانگیں تو بچ گئیں لیکن مشرقی اور مغربی پاکستان کا رشتہ ہمیشہ کے لیے ٹوٹ گیا[۳۵]۔ خود وفاق کے نمائندے ایڈمرل احسن نے جنرل یحییٰ خان کی پالیسی سے اختلاف کرتے ہوئے گورنر کے عہدے سے استعفیٰ دے دیا[۳۶]۔ یحییٰ خان کے لیے انتخابی نتائج بڑے حیران کن تھے۔ اس کے برعکس مجیب الرحمٰن کے اعتماد کی یہ حالت تھی کہ وہ متعدد تقریروں میں برملا کہتا تھا کہ ایوب خان نے اسے مقبولیت کی معراج تک پہنچا دیا ہے۔ اب کوئی شخص اس کی مرضی کے خلاف نہیں جا سکتا۔ یحییٰ خان بھی میرے مطالبات کو رد نہیں کر پائے گا۔ میرا مقصد بنگلا دیش کا قیام ہے۔ انتخابات ختم ہوتے ہی میں لیگل فریم ورک آرڈر کے پرزے پرزے کر دوں گا[۳۷]۔ اس سے قبل جون ۱۹۷۰ء میں بھی وہ یہ اعلان کر چکا تھا کہ اس کی پارٹی آئندہ انتخابات کو چھے نکات پر ریفرنڈم سمجھتی ہے[۳۸]۔ اسمبلی کے اجلاس کی منسوخی اور یحییٰ خان کی پالیسیوں کے خلاف مجیب نے پہلے ڈھاکا میں ہڑتال کی کال دی اور پھر تیسرے دن سے پورے صوبے میں عدم تعاون اور سول نافرمانی کی تحریک شروع کر دی۔ جواب میں حکومت نے کرفیو نافذ کر دیا۔ حکومت کے ان اقدامات پر تنقید کرتے ہوئے الطاف حسین قریشی نے لکھا کہ اجلاس کی منسوخی کا اعلان سنتے ہی:

> ہم نے سمجھ لیا کہ آگ پر تیل چھڑک دیا گیا ہے اور اب حالات پر قابو پانا مشکل ہو جائے گا۔ اس اعلان کے بعد ملک کے اکٹھے رہنے کے آئینی اور اخلاقی رشتے ختم ہو گئے تھے[۳۹]۔

حیرت تو اس بات پر ہوتی ہے کہ مجیب نے یہ چھے نکات حزب اختلاف کے جلسے میں پیش کیے تھے لیکن حزب اختلاف حکومتی مخالفت میں اس قدر اندھی ہو چکی تھی کہ اس کے کسی بھی رہنما نے ملکی مفادات کو مقدم رکھتے ہوئے مجیب الرحمٰن کی مذمت میں کوئی پبلک بیان جاری نہیں کیا[۴۰]۔ جس سے مجیب الرحمٰن کی ہمت بڑھتی گئی اور ان چھے نکات کا زہر ملک و قوم کی رگ و پے میں سرایت کرتا رہا۔ یحییٰ خان کا دور اس اعتبار سے پاکستان کی تاریخ کا سنگین اور الم ناک باب ہے کہ اس عہد میں وطن عزیز دولخت ہو گیا۔ بہ ظاہر یہ سانحہ محض چند ماہ کی بے چینی اور اضطراری کارروائیوں کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے[۴۱] لیکن قابل اجمیری کے اس شعر کی مصداق کہ:

وقت کرتا ہے پرورش برسوں   حادثہ ایک دم نہیں ہوتا[۴۲]

سانحہ مشرقی پاکستان بھی اچانک رونما ہوا بلکہ اس کے پیچھے طویل عرصے کی محرومیاں، سیاسی و معاشی ناانصافیاں اور پاکستان دشمن سازشی عناصر کی کارفرمائیاں بھی شامل ہیں۔ سول اور ملٹری بیوروکریسی نے بھی اس ٹوٹ پھوٹ کے عمل میں اپنا بھرپور حصہ ڈالا۔

بیوروکریسی کے طریقہ واردات کا تذکرہ کرتے ہوئے احمد حسن جو اس وقت حکومت پاکستان کے پریس انفارمیشن آفیسر تھے، لکھا کہ:

> مشرقی پاکستان جل رہا تھا... نیویارک ٹائمز کا نامہ نگار میلکم براؤن مجھ سے ملنے آیا۔ وہ حال ہی میں مشرقی پاکستان سے ہو کر آیا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ مغربی پاکستان میں جو کچھ چھپ رہا ہے، اس کا حقائق سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ میں اپنی آنکھوں سے دیکھ کر آیا ہوں۔ حالات بہت سنگین ہیں... میں اپنے علم اور تجربے کی بنا پر آپ کو بتاتا ہوں کہ آپ کی پوزیشن بہت مخدوش ہو چکی ہے... میں نے... دل میں کہا... یہ امریکن ہمارا بدخواہ ہے... میں حکومت کی مشینری کا ایک اہم پرزہ تھا لیکن اطلاعات کی جو تاریکی ملک بھر میں مسلط کر دی گئی تھی اس نے میری بینائی بھی سلب کر لی تھی۔ جلد ہی مجھے پتا چل گیا کہ مسٹر براؤن روشنی میں تھا اور میں اندھیرے میں[۴۳]۔

غرض کہ سول ملٹری بیوروکریسی کے ناپاک گٹھ جوڑ اور اقتدار کے بھوکے سیاست دانوں کی خود غرضی، باہمی چپقلش اور کھینچا تانی کے باعث ایک طویل جدوجہد کے بعد حاصل کیا گیا یہ پاک وطن دولخت ہو گیا۔ اگر فوجی حکم راں چاہتے تو عوامی لیگ کے ساتھ افہام و تفہیم سے سیاسی انداز میں سمجھوتہ طے پا سکتا تھا لیکن طاقت کے نشے میں چور فوجی حکمرانوں نے مجیب الرحمٰن سے سمجھوتہ کرنے کے بہ جائے طاقت کا بلا وجہ استعمال کیا۔ ملک دشمنوں کے ساتھ ساتھ نہتے بنگالیوں کو بھی نشانہ بنا گیا۔ بستیاں تاراج کی گئیں، گھروں کو جلایا گیا۔ آخر کار اقتدار کی ہوس اور طاقت کے جنون کے باعث ملک دو ٹکڑے ہو گیا[۴۴]۔ سول اور ملٹری بیوروکریسی کی ناعاقبت اندیشی اپنی جگہ لیکن مشرقی پاکستان کے تناظر میں ہمیں اس بات کو بھی ہر وقت اپنے ذہنوں میں ضرور رکھنا چاہیے کہ صوبہ بنگال کی ہندو اقلیت تعلیمی اور معاشی لحاظ سے منظّم اور مضبوط ہونے کے سبب خطے میں اپنا گہرا اثر ورسوخ رکھتی تھی۔ اس ہندو اقلیت کی ہم دردیاں تمدنی اور مذہبی روابط کی بنا پر قدرتی طور پر بھارت کے ساتھ تھیں۔ جغرافیائی اعتبار سے یہ خطہ مغربی بنگال سے جڑا ہوا تھا۔ آزادی کے وقت سے غیر منقسم بنگال کی بابت جو ذہنی اور فکری روّیے فروغ پا رہے تھے[۴۵]۔ اس کی نمو اور افزائش کا سلسلہ بھی بدستور جاری تھا۔ رونق جہاں کے مطابق:

> With independence,Spare Bengal was partitioned, but there major tradition of Bengali politics...a demand for Bengali autonomy (or special treatment for Bengal) tactice of violence, and a leflist idelogy countinued to flourish in both Bengals[۴۶].

ظاہر سی بات ہے کہ پاکستان کے ازلی دشمن بھارت نے ان فکری، ثقافتی اور لسانی رشتوں سے خاطر خواہ فائدہ اُٹھایا۔ مشرقی پاکستان کی منظّم ہندو اقلیت کے تعاون سے اس نے ابتدا سے ہی مشرقی پاکستان کو اپنی تخریبی شازشوں کا مرکز بنالیا۔ گاندھی نہرو، پٹیل اور دیگر رہنماؤں نے دو قومی نظریے کو کبھی دل سے تسلیم نہیں کیا تھا۔ انھوں نے تقسیم کے تلخ فیصلے کو محض اس توقع پر بادل ناخواستہ قبول کیا تھا کہ یہ نوزائیدہ مملکت بہت زیادہ عرصے تک اپنا وجود برقرار رکھنے میں کامیاب نہیں رہ سکے گی[۴۷]۔ اس نقطہ نظر سے اختلاف کرتے ہوئے جے۔ آر۔ سہگل کا کہنا ہے کہ پاکستان کو ٹکڑے کر کے ایک علاحدہ ملک کا قیام نہ تو انڈیا کے مفاد میں تھا اور نہ پاکستان کے۔ دو دہائیوں

سے لگنے والے اس الزام کے خلاف وہ کہتے ہیں کہ اس وقت کے آرمی چیف نے بنگلا دیش کے عوام کی فریاد سن کر تقسیم کے اس عمل کو پایہ تکمیل پہنچایا[۴۸]۔ لیکن یہ بات اتنی سادہ نہیں جس طرح بیان کی گئی ہے۔ ہندوستانی مقتدر قوتوں نے بار ہا اس بات کا اعتراف کیا کہ سقوط ڈھاکا کے پس پشت ہندوستانی سازش اور مکتی باہنی کی جماعت ہی وہ واحد وجہ تھی جس نے پاکستان کو اس عظیم المیے سے دو چار کیا۔ لیفٹیننٹ جنرل جے۔ایف۔آر۔جیکب نے اس بات کا اعتراف کرتے ہوئے اس پورے آپریشن کو تفصیل سے پیش کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ:

> Goverment of India directed the Army to provide assistance to the Mukti Bahini who controlled areas of East Pakistan contiguous to our borders. The code name given to the guerrilla operations in East Pakistan was, Operation Jackpot. The recuitment and control operation of the mukti Bahini was set up on a reginal basis with their Headquarters located at Calcutta at, Mujibnagar, a theatre Road[۴۹].

سچ تو یہ ہے کہ پاکستان کے خلاف ہندوستان کی جارحانہ کارروائی کے معاملے میں سلامتی کونسل کے طرزِ عمل نے بھی یہ ثابت کر دیا کہ اقوام متحدہ ایک دھوکا ہے اور چھوٹی طاقتوں کو اس سے اپنے تحفظ اور بقا کے معاملے میں کسی مدد کی توقع نہیں رکھنا چاہیے۔ ہندوستان اور پاکستان کی جنگ کے دوران فائر بندی کی تین قراردادوں کے خلاف روس کا ویٹو اس حقیقت کا واضح ثبوت ہے۔ برطانیہ، فرانس اور دیگر عالمی طاقتوں کا رویہ بھی یہ ثابت کرتا ہے کہ اصول، حق اور انصاف کی باتیں محض دھوکے کے سوا کچھ نہیں[۵۰]۔ ہندوستانی رہنماؤں کو اپنے ناپاک عزائم کی تکمیل کے لیے مشرقی پاکستان میں حالات خاصے سازگار نظر آئے۔ لہٰذا نئی مملکت کے قیام کے ابتدائی زمانے سے ہی ان لوگوں نے بنگال میں بحرانی کیفیت پیدا کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ بنگلا زبان کی حمایت کی تحریک ہو یا دیگر تنازعات، بھارت نے مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان تفاوت بڑھانے میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا۔ ۱۹۵۳ء سے ۱۹۵۸ء کی تاریخ دونوں صوبوں کے درمیان تناؤ اور کش مکش کی تاریخ ہے۔ صوبائی خودمختاری کے نام پر پنجاب کی بالادستی کے خلاف اجتماعی تحریکیں اس بڑی تعداد میں ابھریں کہ محسوس ہوتا تھا کہ کوئی غلام قوم غیر ملکی تسلط کے خلاف جدوجہد کر رہی ہو۔ بعض معروف صوبائی رہنماؤں نے ابتدائی زمانے سے ہی دانستہ یا نادانستہ اس قسم کی منفی سیاست کا آغاز کر دیا تھا۔ شیر بنگال مولوی فضل حق جنھوں نے ۱۹۴۰ء میں بڑے پر جوش انداز سے قرارداد پاکستان پیش کی تھی، برملا یہ کہنے لگے تھے کہ صوبائی خودمختاری سے ان کی مراد مشرقی پاکستان کی آزادی ہے[۵۱]۔

بنگال کے ایک اور اہم رہنما حسین شہید سہروردی کا کردار بھی قیام پاکستان کے زمانے سے ہی متنازعہ بنا دیا گیا۔ وہ تقسیم کے فوراً بعد پاکستان تشریف لائے اور قائداعظم سے ملاقات بھی کی۔ ان کی آمد کے مختلف اسباب بتائے گئے۔ شورش کاشمیری نے لکھا کہ گاندھی نے سہروردی کو جناح صاحب کے پاس کراچی کے ہندو شرنارتھیوں کی دوبارہ آبادکاری کے غرض سے بھیجا تھا[۵۲]۔ جب کہ اشرف علی قریشی کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ قیامِ پاکستان کے فوراً بعد سہروردی اس امید پر پاکستان آئے کہ انھیں کوئی بڑا منصب ملے گا لیکن متحدہ بنگال

کے مطالبے کے سبب سہروردی کا کردار چوں کہ مشکوک ہو چکا تھا لہٰذا قائداعظم نے انھیں کوئی ذمہ داری نہیں سونپی اور وہ مایوس ہو کر واپس ہندوستان چلے گئے[۵۳]۔

وہاں بھی ان کے ساتھ کوئی اچھا سلوک نہیں ہوا۔ ان کی جائیدادیں ضبط کر لی گئیں اور مجبوراً مارچ ۱۹۴۹ء میں وہ پاکستان آ گئے۔ لیاقت علی خان سے اختلافات کے سبب بھی انھیں نوزائیدہ مملکت کے سیاسی ڈھانچے میں کوئی کردار نہیں سونپا گیا۔ ردعمل میں سہروردی نے مسلم لیگی امیدوار شہود الحق کے مقابلے میں کاغذات نامزدگی جمع کرائے۔ انھیں شکست ضرور ہوئی لیکن یہ پہلا موقع تھا کہ اس نئی مملکت میں حزب اختلاف کی تشکیل ہوئی[۵۴]۔ یہ سہروردی ہی تھے جو اپنی تقریروں میں شیخ مجیب الرحمٰن کو علی الاعلان (آمر شیخ آمر جھیلو) ''میرا شیخ میرا بیٹا'' کہہ کر مخاطب کرتے۔ عوام میں مسلم لیگ کی غیر مقبولیت کو دیکھتے ہوئے سہروردی نے ہی مشرقی پاکستان میں عوامی مسلم لیگ کی بنیاد رکھی[۵۵]۔ پھر اختلاف کے بعد جنوری ۱۹۵۳ء میں لفظ مسلم حذف کر کے ''عوامی لیگ'' کے نام سے سیاسی جماعت منظّم کی[۵۶]۔ سہروردی کی شخصیت پر لکھی گئی کتب کے مطالعے سے یہ بات عیاں ہے کہ مشرقی اور مغربی پاکستان کے لکھنے والوں کے نقطۂ نظر میں واضح فرق دکھائی دیتا ہے۔ مغربی پاکستان کے اکثر مصنفین نے ان کے ہر اقدام پر کڑی تنقید کی اور مشرقی پاکستان کے لکھنے والوں نے انھیں سب سے بڑا لیڈر گردانے کی کوشش کی۔ مغربی پاکستان کے نقطۂ نظر سے تو وہ ایک غدّار کے روپ میں نظر آئیں گے جب کہ متوازن رویہ یہی ہے کہ ان کے ہر فعل کو حالات کے تناظر میں دیکھنے کی کوشش کی جائے۔ اس تناظر میں سہروردی ہمیں اس پل کی طرح دکھائی دیتے ہیں جو مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان واحد راستہ بنا رہا۔ اور جب یہ پل ٹوٹ گیا تو دونوں ملک بھی ٹوٹ کر بکھر گئے۔ عوامی لیگ کی تشکیل کا مقصد سہروردی کے نزدیک ملک توڑنے کی سازش کرنا نہیں تھا بلکہ ملک میں یک جماعتی نظام کے تحت پیدا ہونے والی ممکنہ خرابیوں کو روکنا اور بگاڑ کی اصلاح کرنا تھا لیکن عوامی لیگ کی بعد کی قیادت خصوصاً مجیب الرحمٰن کی باغیانہ سازشی چالوں کی وجہ سے اس مثبت مقصد کا انجام منفی انداز میں ہوا۔ ۱۲ ستمبر ۱۹۵۶ء سے ۱۰ اکتوبر ۱۹۵۷ء تک وزیر اعظم کے عہدے میں رہنے کے بعد مفاد پرست تجارتی حلقوں اور نوکر شاہی کی سازشوں سے تنگ آ کر وہ مستعفی ہو گئے[۵۷]۔ اس کے بعد بھی وہ سیاسی طور پر سرگرم رہے۔ ری پبلک پارٹی کے ساتھ مل کر حکومتی حلقوں میں بھی ان کا اثر و رسوخ برقرار رہا لیکن ایوب خان کے دور میں ۱۷ اگست ۱۹۵۹ء کو نافذ ہونے والے Elective Bodies Disqualification Act کے تحت تمام آزمودہ سیاست دانوں پر سات سال کے لیے سیاست میں حصّہ لینے پر پابندی عائد کر دی گئی۔ جولائی ۱۹۶۰ء میں سہروردی پر بھی ایبڈو کا وار کیا گیا۔ ۱۹۶۲ء میں بغیر کسی الزام کے انھیں گرفتار کر لیا گیا جس پر بڑا احتجاج بھی ہوا[۵۸]۔ سات ماہ بعد انھیں رہا کیا گیا۔ جیل سے رہائی کے بعد ۱۲ ستمبر کو ڈھاکا میں ان کا شان دار استقبال بھی کیا گیا۔ بحالیِ جمہوریت کی تحریک میں بھی ان کا کردار نمایاں ہے۔ جمہوریت کا یہ سپاہی ۵ دسمبر ۱۹۶۳ء کی صبح بیروت کے سیوئل انٹر کانٹی نینٹل میں مردہ پایا گیا۔ اس کی موت کا ذکر اس لیے بھی اہم ہے کہ بعد کے زمانے میں مشرقی پاکستان میں کوئی دوسرا رہنما پیدا نہیں ہوا جو ان جیسی قائدانہ صلاحیتوں کا مالک ہو اور جو پاکستان کے دونوں حصوں کو متحد رکھنے میں اپنا کردار ادا کر سکتا ہو۔ ملک کے دونوں حصّوں میں ان کی یکساں مقبولیت کی وجہ سے وہ ہمیشہ دونوں خطّوں کے درمیان پل بنے رہے اور اسی دوران انتہا پسندانہ قوتوں کو سہروردی نے پنپنے کا موقع نہ دیا لیکن افسوس اس کے جانے کے بعد اسی کے پروردہ مجیب الرحمٰن سازش کا شکار ہو کر ملک کے دولخت ہونے کا سبب بنے۔ سہروردی نے اپنے زمانے میں علاحدگی پسند سوچ کو کسی حد تک روکنے کی کوشش ضرور کی حالاں کہ ایک اور سیاسی رہنما ابوالمنصور احمد نے دستور ساز

اسمبلی میں اپنی تقریر کے دوران واضح طور پر کہا تھا کہ:

'یہ غلط ہے کہ پاکستانی ایک قوم ہیں، پاکستان میں دو قومیں بستی ہیں۔ ایک مغربی پاکستان کی قوم اور مشرقی پاکستان کی قوم.... ان دونوں قوموں کی تہذیب جدا ہے'[۵۹]۔

ایک اور بنگالی رہنما عطاء الرحمٰن نے ان کی تائید میں کہا کہ ''مذہب کے کمزور رشتوں اور مشترکہ سیاسی جدوجہد کی تیزی سے ختم ہونے والی یاد کے سوا مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان کوئی قدر مشترک نہیں''[۶۰]۔ مشرقی پاکستان کے سیاسی رہنماؤں کی اس شدت پسندی کو مغربی پاکستان میں بسنے والے اس طبقے کی ذہنیت سے کافی تقویت ملی جو مشرقی صوبے کے رہنے والوں کو برابری کا درجہ دینے پر کسی صورت میں تیار نہ تھے ہفت روزہ لیل ونہار کے اداریے میں ان لوگوں کی نشان دہی کرتے ہوئے مدیر نے لکھا کہ:

یہ عنصر سیاسی موقع پرستوں پر مشتمل ہے جس نے ابتدائی چھے سات برس کے دوران اپنے گروہی مفاد کے لیے ان دونوں صوبوں کے درمیان منافرت کو ہوا دی۔ یہ عنصر دونوں صوبوں میں موجود تھا، اس کی اصل طاقت مغربی پاکستان بالخصوص کراچی میں برا جمان رہی۔ مملکت کی باگ ڈور اس عنصر کے ہاتھ میں رہی۔ چناں چہ اس کی شہ پر بعض قومی اخبارات نے مشرقی پاکستان کے خلاف غلط فہمیوں کی ایک دیوار کھڑی کر دی... ''بنگالی پاکستان کے خلاف ہیں''، ''تہذیبی طور پر ہندوؤں سے متاثر ہیں''، ''ہندوستان سے مل جانا چاہتے ہیں''، ''مچھلی کھانے والی بزدل قوم'' یہ تھے وہ نعرے جو بعض صوبہ پرست اور بداندیش سیاسی، اخباری اور کاروباری حلقوں نے ان ہم وطنوں کے خلاف استعمال کیے جو مغربی پاکستان سے کم پاکستانی نہیں... اور جن کا تہذیبی اور سیاسی شعور ہمیشہ قابلِ رشک رہا ہے[۶۱]۔

اس طرح کے عمل سے حب الوطنی کے جذبات کی نشوونما کو ٹھیس پہنچی۔ اگر قوم کا ایک عنصر بھی بے اطمینانی اور استیصال کے احساس کا شکار ہو تو قومی استحکام کی بنیادیں متزلزل ہو جاتی ہیں۔ مشرقی پاکستان کے عوام مملکت کا اکثریتی حصّہ تھے۔ حکومت کو ان کے مسائل کا بہت کم ادراک تھا۔ ہمیشہ ان مسائل کو حل کرنے کی کوششیں نیم دلانہ رہیں۔ ان کی جائز شکایات کو بھی کبھی درخورِ اعتنا نہیں سمجھا گیا۔ ذہنی اور فکری روابط کو مستحکم کرنے کے لیے دوررس منصوبہ بندی نہیں کی گئی[۶۲]۔ سوائے ایوب خان کے دور کے جس کا ذکر مذکورہ صفحات میں کیا جا چکا ہے۔ نتیجتاً مشرقی خطے میں قومی یک جہتی کے جذبے پر علاقائیت غالب آ گئی۔ معیشت، تعلیم اور تجارت پر ہندوؤں کی عمل داری کی وجہ سے مشرقی پاکستان کی کمائی ہوئی دولت بھی بھارت منتقل ہونے لگی۔ ہندوؤں کے اس سیاسی اثر ورسوخ نے نئی نسل کی فکری نشوونما پر بھی گہرا اثر چھوڑا۔ نئی نسل پاکستان کے اساسی نظریات سے بے بہرہ ہو کر بنگلا قومیت کی نشوونما اور ارتقا کو زیادہ اہمیت دینے لگے[۶۳]۔ ہندو اساتذہ اور دانش وروں نے اپنے ہم خیال مقامی عنصر کی مدد سے مسلم قومیت کے مقابلے میں بنگالی قومیت کے فروغ کی ہر ممکن کوشش کی۔ ان تعلیمی اداروں میں کس قسم کی تعلیم دی جا رہی تھی اور ان کی فکری سطح کو کس طرح متاثر کیا جا رہا تھا، اس کا اندازہ بنگالی روزنامہ ''دی ینگ پاکستان'' میں شائع ہونے والے اس مراسلے سے لگایا جا سکتا ہے جس میں مغربی پاکستان کے حکم رانوں کو غیر ملکی آقاؤں سے تشبیہ دی گئی ہے اور جبر وزور سے ان پر مسلط حکم رانوں کی مذمت کی گئی ہے[۶۴]۔ اس قسم کی سوچ اور طرز فکر قومی یک جہتی کے لیے زہر قاتل سے کم نہیں تھا۔ جی۔ ڈبلیو۔ چودھری اس طرز فکر کی بابت کہتے ہیں کہ:

> قیام پاکستان کے بعد بنگالیوں نے دیکھا کہ مراعات یافتہ انگریزوں اور ہندوؤں کی جگہ اب مغربی پاکستانیوں نے لے لی ہے، تو وہ پیچ و تاب کھا کر رہ گئے۔ انھوں نے انتقامی جذبے کے تحت اپنی زبان و ثقافت کے ڈانڈے مغربی بنگال سے ملانا شروع کر دیے...مزاحمت کی سبز آندھیوں نے نہ صرف اس کی جڑیں مضبوط نہ ہونے دیں بلکہ فضا میں ایسا زہر گھولا کہ خود اسلام خطرے سے دوچار ہو گیا...مشرقی پاکستان کا مسلمان دانش ور، مغربی پاکستان کے مسلمان دانش وروں کی بہ نسبت مغربی بنگال کے ہندو دانش وروں سے زیادہ قریب تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ نفسیاتی اور ثقافتی طور پر پاکستان ۱۹۷۱ء کے بحران سے کہیں پہلے ہی دولخت ہو چکا تھا[۶۵]۔

معاشی ناہمواری اور ثقافتی جبر نے بالآخر ۱۹۶۶ء میں چھے نکات کی صورت اختیار کر لی۔ اس طرح ذہنی اور فکری روابط جو پہلے ہی خاصے کمزور تھے، ٹوٹ کر بکھر گئے۔ ان چھے نکات کے ذریعے:

> مغربی پاکستان کی برتری کا چرچا اس انداز سے کیا گیا جس طرح غیر ملکی تسلط کے خلاف مہم کے دوران کیا جاتا ہے۔ پروپیگنڈا یہ تھا کہ مشرقی پاکستان ان گنت مصائب میں مبتلا ہے۔ ملازمتوں اور ڈیفینس سروسز میں مغربی پاکستانیوں کے مقابلے میں مشرقی پاکستانی بہت کم ہیں اور فوج، فضائیہ اور بحریہ کا کمانڈر انچیف کبھی کوئی مشرقی پاکستانی نہیں ہوتا ہے اور مشرقی پاکستان کی آمدنی مغربی پاکستان پر خرچ ہوتی ہے[۶۶]۔

کلکتے سے بھی بنگال کی نظریاتی تشہیر کا کام جاری رہا۔ عصبیت کی اساس پر قائم ٹیگور اور بنکم چٹر جی کے سونار بنگلا کے تصورات معرضِ وجود میں آئے۔ کٹر بنگالی ہندوؤں کا ایک گروہ بنگال کو دوبارہ بھارت میں ضم کرنے کی جدوجہد کرنے لگا، جسے بھارت کی حمایت اور سرپرستی بھی حاصل رہی۔ مولانا بھاشانی نے ایوب حکومت کے خلاف تحریک کے دوران سی۔آئی۔اے۔ کی ایک ایسی دستاویز کا بھی انکشاف کیا جس میں مشرقی پاکستان کی علاحدگی کا منصوبہ موجود تھا۔ حکومت بھی اس حقیقت سے پوری طرح آگاہ تھی کہ امریکی دانش وروں کے ایک گروہ نے ۱۹۶۰ء سے ہی علاحدگی کے رجحانات کی مالی اور اخلاقی حمایت شروع کر رکھی تھی[۶۷]۔ ان امور سے قطع نظر مغربی پاکستان میں موجود مخصوص ٹولے نے بھی یہ سوچنا شروع کر دیا تھا کہ مشرقی پاکستان اقتصادی طور پر ایک بوجھ ہے اور اب اس کا ساتھ رہنا ممکن نہیں۔ مظلومیت اور غلامی کے پروپیگنڈے نے عوامی مقبولیت حاصل کر لی۔ سونار بنگلا کے سہانے خواب نے تعصّبات کی ایسی دیوار کھڑی کر دی کہ جس کا پاٹنا ناممکن ہوتا گیا۔ اس پس منظر میں مجیب بنگالیوں کے عظیم رہنما اور بنگالی مفادات کے محافظ قرار پائے۔ جب مغربی پاکستان کے رہنما چھے نکات کے تیر کھا کر بھی نہ تڑپے تو مجیب الرحمٰن نے بنگلا دیش کی آزادی کی درپردہ کوشش بند کر دیں۔ اس کے پیش کردہ چھے نکات کو بین الاقوامی سطح پر خوب بڑھا چڑھا کر پیش کیا گیا۔ لندن ٹائمز نے ان نکات کو مشرقی پاکستان میں آنے والے سیاسی طوفان کا پیش خیمہ قرار دیا۔ بھارتی ڈپٹی ہائی کمشنر سے وزیراعظم شاستری کی موت پر تعزیت کے بہانے پہلے ہی مجیب سے رابطہ استوار ہو چکے تھے۔ بھٹو کا مجیب کو مناظرے کا چیلنج دے کر میدان سے راہ فرار اختیار کرنا بھی مجیب کے حق میں گیا[۶۸]۔

۲ جنوری ۱۹۶۸ء کو اگرتلا سازش منظر عام پر آئی جس کا مقصد بھارت کے تعاون سے مشرقی پاکستان کو الگ کرنا تھا۔ مجیب

الرحمٰن سمیت اس میں ۲۸ افراد گرفتار ہوئے جن کا تعلق کسی نہ کسی حیثیت میں بھارتی سفارتی حلقوں خصوصاً فرسٹ سیکریٹری پی۔این۔ اوجھا سے ثابت ہو گیا اس سازش کے دوران بنگلا دیش کا واضح تصور سامنے آیا۔ مجوزہ مملکت کے قومی ترانے اور پرچم وغیرہ کی تفصیلات بھی اس کے ذریعے معلوم ہو گئیں۔حکومت مخالف تحریک اور عوامی دباؤ کی بنا پر ایوب خان گول میز کانفرنس کے انعقاد پر مجبور ہوئے۔ سیاسی دباؤ میں آ کر ایوب کو اگرتلا سازش کیس واپس لے کر مجیب کو رہا بھی کرنا پڑا۔ رہائی پاتے ہی مجیب نے پورے جوش سے تحریک شروع کی۔اس دوران بنگالی اور غیر بنگالی تعصب اس حد تک بڑھ چکا تھا کہ تخریبی قوتوں نے اس سے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ یحییٰ نے ۱۹۷۰ء میں جب سیاسی سرگرمیاں بحال کیں تو انتخابی مہم کے دوران جس قسم کی باغیانہ سرگرمیاں ظہور میں آئیں وہ ہندوستانی مداخلت کے بغیر ہرگز ممکن نہ تھیں۔عوامی لیگ کے رہنماؤں کے لیے بہترین پناہ گاہ کلکتے کی سرزمین ٹھہری۔ ہر سخت اقدام کے موقع پر وہ سرحد پار کر کے کلکتا پہنچ جاتے اور حالات سازگار ہوتے ہی نئی ہدایت لے کر واپس لوٹ آتے۔تشدد اور لاقانونیت روز کا معمول بن گئے۔۱۵ فروری کو انتخابی مہم کے دوران تقریر کرتے ہوئے مجیب نے کہا کہ ہر گھر کو عوامی لیگ کا قلع بنا دو، اور اس حصار سے عوام دشمن عناصر کا مقابلہ کرو۔ میں آپ سب کو یقین دلاتا ہوں کہ آئندہ اکتوبر میں ہونے والے انتخابات ''بنگلا دیش مخالفوں کے تابوت میں آخری کیل ثابت ہونگے۔ میں یہاں بنگالیوں کو خود مختار دیکھنا چاہتا ہوں۔ میں بنگلا دیش کے حصول کی خاطر اپنے خون کا آخری قطرہ تک بہادوں گا۔اس قدر واضح اور دلیرانہ انداز سے پاکستان کی سالمیت کے حصے بخرے کیے جا رہے تھے لیکن بنگالی عوام کے جذبات کے طوفان کے آگے ہر قانون بے بس تھا۔اس بحرانی کیفیت میں مجیب الرحمٰن نے اپنی تقریر میں بار بار دہرایا کہ برسر اقتدار آ کر مشرقی پاکستان سے ایک پیسہ مغربی پاکستان نہیں جانے دیں گے یا ہم یہ آخری جنگ لڑ رہے ہیں وغیرہ[۶۹]۔ مجیب نے بڑی ہوشیاری سے ان بنگالی وڈیروں کی حمایت بھی حاصل کر لی جو نظریہ پاکستان کو لازمی اساس سمجھتے تھے۔ مجیب نے ان سے اپیل کرتے ہوئے کہا کہ یہ چھ نکات مشرقی اور مغربی خطوں کو ایک نئی مفاہمت کے ذریعے قریب لا کر زیادہ موثر تعاون کی بنیاد فراہم کریں گے[۷۰]۔حقیقتاً اس وقت تک مجیب نے کبھی بھی ان چھ نکات کو علاحدگی کا ذریعہ قرار نہیں دیا۔اس کے مطابق یہ محض ایک علامت اور لوگوں کو جمع کرنے کا آغاز تھا[۷۱]۔۲۷ فروری کو بھی مجیب نے اپنی تقریر میں دوٹوک انداز میں کہا کہ پاکستان مجھے بہت عزیز ہے اور اس کے وجود کو برقرار رکھنے کے لیے جو بھی ضروری ہوگا میں کر گزروں گا۔اس سے قبل بھی مجیب اور اس کے ساتھیوں نے بارہا کہا کہ یہ کوئی الہامی کتاب نہیں کہ ردوبدل نہ ہو سکے۔ان نکات کو بات چیت کے ذریعے سانچے میں ڈھالا جا سکتا ہے[۷۲]۔اس طرح مجیب نے بڑی ہوشیاری سے حکومت کو بھی یہ یقین دلایا کہ انتخابات کے بعد وہ ایسا لائحہ عمل اختیار کریں گے جس سے مناسب ترمیم کے ذریعے ان چھ نکات کو قابل عمل بنایا جا سکے[۷۳]۔عوامی لیگ نے اس منظّم تحریک اور پرکشش نعرے کے ذریعے متاثر کن کامیابی حاصل کی جب کہ دیگر جماعتوں کے پاس نہ تو کوئی پرکشش نعرہ تھا اور نہ ہی منظّم منصوبہ بندی، عوامی لیگ کے پرجوش کارکنوں نے سیاسی رہنما کے قدم بھی نہ جمنے دیے۔ نتیجے کے طور پر مشرقی پاکستان میں عوامی لیگ کو صد فی صد کامیابی حاصل ہوگئی۔محبِّ وطن مشرقی پاکستانیوں کی اکثریت مملکت کی سالمیت کے خلاف نہیں بلکہ اقتصادی، بدحالی سے نجات کے لیے عوامی لیگ کو ووٹ دیا تھا[۷۴]۔ مارچ ۱۹۷۱ء میں مشرقی پاکستان کا مدتوں سے اگلتا ہوا آتش فشاں ایک زوردار دھماکے سے پھٹ گیا۔ مجیب نے قومی اسمبلی کے اجلاس کے التوا کو بہانہ بنا کر ہر قسم کی مفاہمت کی یک جہتی کے امکان کو مسترد کر دیا۔ بنگلا دیش کی آزادی کے لیے اشتعال انگیز تقریریں شروع ہوئیں۔ بنگالی اور غیر بنگالی کا الم ناک تصادم شروع ہوا جس سے بازار اور گلیاں سرخ ہو گئیں۔کسی کی

جان، مال، عزت و آبرو محفوظ نہ رہی۔ ڈھاکا، سلہٹ، چٹا گانگ کی دخترانِ عزتِ مآب کلکتے کے بازاروں میں نیلام ہوئیں۔ بھارتی فوج کی مداخلت کھلنا اور جیسور تک پہنچ گئی۔ صدر مملکت اور مغربی پاکستان کے دیگر سیاسی رہنما مذکرات کے لیے ڈھاکا پہنچے لیکن ''مارچ کے پہلے دو ہفتوں میں حالات نے جو رخ اختیار کر لیا تھا اور یحییٰ خان نے انھیں جس طرح خراب سے خراب تر ہونے کا موقع دیا تھا، اس کے بعد گفت و شنید اور صلاح و مشورے کے امکانات خاصے کم ہو چکے تھے''[۷۵]۔ یہ ایک نو زائیدہ ملک و ملت کے خلاف انتہائی شرم ناک و کراہیت آمیز سازش تھی جو اس قدر ضرر رساں ثابت ہوئی کہ دو سو سالہ غلامی میں انگریز بھی اس قدر گھناؤنی سازش کر کے قوم کو اس قدر ضرر نہ پہنچا سکا۔ یہ سازش کسی دشمن نے نہیں بلکہ غاصب آمر ایوب خان، اس قوم کی نمک حرام نوکر شاہی، بھٹو، یحییٰ اور مجیب کے ہاتھوں انجام پائی۔ بھٹو بھی اپنے وقت کے ''شاہ'' ایوب کی مصاحبی میں پروان چڑھا۔ جسے وہ اپنا باپ بھی کہا کرتا تھا[۷۶]۔ اور پھر ان سیاسی ناخداؤں نے کشتی کو کنارے لگانے کے بہ جائے بھنور میں ایسا چھوڑا کہ ڈوبتے کو تنکے کا سہارا بھی نہ ملا۔ یحییٰ کی جانب سے اقتدار کی منتقلی کی بابت ٹال مٹول کے رویے نے سول نافرمانی کی تحریک شروع کرنے پر مجبور کیا۔ حکومتی اقدامات حالات کے مزید بگاڑ کا سبب بنتے چلے گئے۔ حکومت کی جانب سے اخبار پر سنسر شپ عائد تو کر دی گئی لیکن حالات اس نہج پر پہنچ چکے تھے کہ ۷ مارچ ۱۹۷۱ء کو ڈھاکا ریڈیو نے سنسر شپ کے احکام کو نظر انداز کرتے ہوئے پلٹن میدان سے شیخ مجیب کی تقریر نشر کر دی۔ دوسری طرف بنگالی فوجیوں نے نہتے عوام پر گولیاں چلانے سے انکار کر دیا چناں چہ حکومت نے بنگالیوں، فوجیوں اور پولیس سے ہتھیار جمع کر لیے تھے۔ واضح طور پر دیکھا جا سکتا تھا کہ بنگال کی حکومتی مشینری بھی مجیب کے رحم و کرم پر ہے۔ ان حالات میں مجیب نے حکومت کے سامنے چار مطالبات پیش کیے، اوّل مارشل لا اٹھایا جائے، دوم اقتدار منتخب عوامی نمائندوں کے حوالے کیا جائے، سوم فوج کو بیرکوں میں واپس بھیجا جائے اور چہارم حالیہ کشت و خون کی عدالتی تحقیقات کرائی جائے[۷۷]۔ ۷ مارچ کو ہی ٹکا خاں گورنر اور مارشل لا ایڈمنسٹریٹر بنا کر بھیجے گئے لیکن ڈھاکا ہائی کورٹ کے چیف جسٹس نے یہ کہہ کر حلف لینے سے انکار کر دیا کہ ''شیخ مجیب نے چوں کہ عدالتوں سمیت سب سے کہا ہے کہ اقتدار منتقل ہونے تک وہ کوئی کام نہ کریں، اس لیے وہ حلف اٹھوانے کی رسم ادا کرنے سے معذور ہیں''[۷۸]۔ اس صورت حال سے اچھی طرح اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ سرکاری مشینری میں مجیب کا اثر کس حد تک سرائیت کر چکا تھا۔ ڈھاکا بار نے بھی جسٹس صدیقی کے اس اقدام کو سراہتے ہوئے ان کی جرأت پر خراجِ تحسین پیش کیا[۷۹]۔ لیکن ان تمام حالات کے باوجود حکومت نوشتۂ دیوار پڑھنے کو تیار نہ تھی۔ ۱۲ مارچ کو بھٹو نے کراچی میں ایک جلسے سے خطاب کرتے ہوئے مطالبہ کیا کہ اگر کسی آئینی مفاہمت سے قبل اقتدار منتقل کرنا ہے تو پھر مشرقی پاکستان میں اقتدار عوامی لیگ کو اور مغربی پاکستان میں پیپلز پارٹی کو سونپ دیا جائے[۸۰]۔ یحییٰ اور بھٹو اپنے مشیروں کو لے کر ڈھاکا پہنچے ضرور تا کہ مجیب کے ساتھ مذکرات کا سلسلہ شروع کیا جا سکے لیکن اس کا بھی کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ اس کے بعد ہونے والے فوجی ایکشن جس کی بابت فیض علی چشتی کا بیان ہے کہ یہ فوجی ایکشن ''ہماری ذہنی بد دیانتی کا شاہ کار تھا۔ اس میں سارا قصور مرکزی حکومت کا تھا۔ بدقسمتی سے اس کی سربراہی کا فرض ایک جرنیل ادا کر رہا تھا[۸۱]۔ ڈھاکا میں کرفیو کے باوجود قتل و غارت گری کے واقعات معمول بن گئے تھے۔ مکتی باہنی کے مسلح دستے غیر بنگالی آبادیوں پر اجتماعی حملے کر کے لوٹ مار کرتے رہے۔ کالج اور یونی ورسٹی دہشت پسندانہ سرگرمیوں کا مستقر بنے ہوئے تھے۔ جیلیں توڑ کر قیدیوں کو آزاد کرایا جا رہا تھا۔ حتیٰ کہ ۷ مارچ کو ایک متوازی حکومت کا اعلان کر کے ٹیکس نہ دینے اور احکامات نہ ماننے کا رویہ اپنایا جا چکا تھا۔ ۲۵ مارچ کو مشرقی پاکستان میں فوجی کارروائی کا فیصلہ کیا گیا۔ اس سے قبل بنیادی مفروضہ یہ تھا کہ بنگال کی عوام کی اکثریت

پاکستان کی حامی ہے لیکن موجودہ صورتِ حال میں عوامی تعاون کی توقع نہیں کی جاسکتی تھی۔اس لیے ایک نئے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کی گئی جس کے تحت مجیب الرحمٰن کی غیر قانونی حکومت کا قلع قمع کر کے حکومت کی رٹ کو قائم کیا جاسکے[۸۲]۔لہٰذا عوامی لیگ کو غیر قانونی جماعت قرار دے کر پابندی لگادی گئی۔مجیب الرحمٰن کو گرفتار کرلیا گیا۔اس فوجی کارروائی کے دوران سخت مزاحمت کا سامنا بھی کرنا پڑا کیوں کہ بغاوت کرنے والوں کو بھارت کی تائید وحمایت حاصل تھی۔ولیم رش بروک William rush brook کے مطابق:

> The East Pakistan border was regularly peneterated by former member of the east Bengali regiment, The East Pakistan Rifles, and frontier guards. These men were collected into special traning camps on the Indian side of the border, where they were given instructions in sabotaging and guerilla warfare[۸۳].

بھارت بنگالی پناہ گزینوں کو جواز بنا کر اپنا یہ اقدام جائز قرار دیتا تھا۔اس کشیدہ صورتِ حال میں ۲۶ مارچ کو بھٹو کا فوج کی حفاظت میں ڈھاکا پہنچنا شیخ مجیب الرحمٰن کو غدّار اور عوامی لیگ کو غیر قانونی جماعت قرار دے کر آرمی ایکشن کی تائید کرتے ہوئے کہنا کہ ''خدا کا شکر ہے کہ پاکستان بچ گیا''[۸۴]،ایسی نادانیاں ہیں کہ جسے مورخ کبھی نظر انداز نہیں کر سکے گا۔تجزیہ کاروں کے مطابق قومی اسمبلی کے اجلاس کو سبوتاژ کرنے سے لے کر پولینڈ کی پیش کردہ قرارداد کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے تک بھٹو کا کردار ہمیشہ سقوطِ مشرقی پاکستان کی گتھیاں سلجھانے والوں کے لیے سوالیہ نشان بن کر ابھرتا رہے گا[۸۵]۔یہ رویہ ہی بڑا عجیب تھا کہ حالات پہلے ہی قابو سے باہر تھے اس پر سے مزید ابتر کرنے کو تریاق سمجھا گیا۔ہر باشعور محبِّ وطن پاکستانی کے ذہن میں یہ سوال پھانس بن کر چبھتا ہے کہ یحیٰی اور مجیب کے مابین ہونے والے مذاکرات اچانک اس قدر ہولناک انجام سے کیوں دوچار ہوئے[۸۶]۔ان بگڑے ہوئے حالات میں ملٹری ایکشن محض حماقت نہیں تو اور کیا تھا۔یہ ایک ایسی تاریخی اور سیاسی غلطی تھی جس کا تدارک ممکن نہیں۔اس حکم نامے نے ملکی سالمیت کے ٹوٹ پھوٹ کے عمل کو تیز تر کر دیا۔یہ ایک ایسا عمل تھا جس کی زد میں محبِ وطن بنگالی بھی آئے۔اس طرح فوج کی مخالفت کا رویہ مزید بڑھتا گیا[۸۷]۔شیخ مجیب کے روایتی حریف عبدالحمید بھاشانی اور عطاالرحمٰن وغیرہ بھی فوج اور حکومت مخالف احتجاج میں شامل ہوگئے۔حالات کی ستم ظریفی کی انتہا یہ تھی کہ ۲۳ مارچ ۱۹۷۱ء کو اس قائد کے ہاتھوں بنگلا دیش کا پرچم لہرایا گیا جس کی کوشش اور سعی پیہم کی بہ دولت سلہٹ پاکستان کا حصّہ بنا تھا۔مولانا بھاشانی نے ہی سب سے پہلے مشرقی پاکستان سے مغربی پاکستان کو آخری سرخ سلام پیش کیا تھا[۸۸]۔چناں چہ ۲۳ مارچ کی تقریبات کو یومِ پاکستان کے بہ جائے یومِ مزاحمت کے طور پر منایا گیا۔تمام نجی اور سرکاری عمارتوں سے پاکستانی پرچم اتار کر بنگلا دیش کا پرچم لہرادیا گیا۔مزاحمت کی اس فضا میں حالات کو سدھارنے کے لیے بہ جائے پر امن راستہ اختیار کرنے کے، آہنی ہاتھوں سے نمٹنے کا فیصلہ کیا گیا۔حمودالرحمٰن کمیشن کی رپورٹ کے مطابق:

> غصیلی آنکھوں والے سول اور فوجی بیروکریسی کے ساتھ مشورے کے بعد مارشل لاٹولے نے شہریوں کو خوف زدہ کر کے حالات پر قابو پانے کا نسخہ تیار کیا تھا جو حالات کی اصلاح تو کیا کرتا، اس نے پاکستان کا ایک بازو کاٹنے کا عمل شروع کر دیا[۸۹]۔

حکومت کے اس وحشیانہ اقدام کے نتیجے میں بنگالی عوام کی ایک کثیر تعداد نقل مکانی کر کے ہندوستان میں داخل ہونے پر مجبور ہوئے۔ ہندوستان نے بھی بین الاقوامی عوام کی ہمدردیاں حاصل کرنے کے لیے بنگالیوں کے پناہ گزین کیمپ بنائے۔ اس اقدام کا واحد مقصد پاکستان کے خلاف جارحیت کا جواز پیدا کرتا تھا۔ ۱۶ اپریل ۱۹۷۱ء کو بنگالی باغیوں نے کلکتے میں پاکستان کے ڈپٹی ہائی کمشنر کے دفتر پر دھاوا بول کر قبضہ کرلیا اور اگلے ہی روز بھارتی سرحد کے قریب خصوصی تقریب منعقد کر کے بنگلا دیش کی آزادی کا باقاعدہ اعلان کر دیا گیا۔ یہ تقریب بھارتی فوج کی حفاظت میں ہوئی اور پیپلز ری پبلک آف بنگلا دیش کے نام سے عبوری حکومت قائم کر دی گئی لیکن اپریل کے آخری عشرے تک پاکستانی فوج نے بڑے شہروں سے تقریباً تمام ہی باغیوں کا قلع قمع کر دیا تھا۔ وسط مئی تک ہر قابلِ ذکر جگہ تک پاکستانی فوج پہنچ چکی تھی لیکن یہ کنٹرول چوں کہ طاقت کے بل بوتے پر تھا اس لیے زیادہ عرصے تک قائم نہ رہ سکا۔ دلوں پر حاکمیت سے اس کا کوئی تعلق نہ تھا[۹۰]۔ اس وقت تک براہِ راست دخل اندازی سے بچنے کی تمام قوتیں کوشش کر رہی تھیں لیکن خانہ جنگی کے بعد بیرونی طاقتوں مثلاً امریکا، روس اور چین وغیرہ نے بنگلا دیش کے حالات میں براہِ راست دخل دینا شروع کیا۔ اس صورتِ حال سے ہندوستان کو شہ ملی جس کے بعد اس نے براہِ راست فوجی کارروائی کرنے کی جرات کی۔ اس کارروائی میں اسے خاطر خواہ کامیابی بھی ملی[۹۱]۔ مشرقی پاکستان کے ناگفتہ بہ حالت سے فائدہ اٹھانے کا بھارت کے پاس یہ بہترین موقع تھا۔ لہٰذا بھارتی حکومت اس دوران اپنا کھیل کھیلنے میں مصروف رہی۔ اس نے پاکستان کے خلاف فیصلہ کن جنگ کرانے اور مشرقی پاکستان کو آزاد کرانے کے لیے بھرپور منصوبہ بندی کی۔ اگست ۱۹۷۱ء میں اس نے روس کے ساتھ بیس سالہ دفاعی معاہدہ کیا۔ اکتوبر میں اندرا گاندھی یورپی ممالک کے دورے پر گئیں تاکہ اپنے حق میں فضا ہموار کر سکیں۔ دوسری جانب پاکستان کی نااہل قیادت اپنی عیاشی اور کالے دھندے میں مصروف رہی۔ ۲۲ نومبر ۱۹۷۱ء کو بھارت نے مشرقی پاکستان پر حملہ کر دیا۔ پاکستانی فوج کے محبِ وطن، دشمنوں کے مقابلے میں ڈٹے ضرور رہے لیکن انھیں اندرونی اور بیرونی دونوں محاذوں پر مخالفت کا سامنا تھا۔ ۳ دسمبر ۱۹۷۱ء کو مغربی محاذ بھی کھول دیا گیا۔ مسلح فوج اور فضائیہ مغربی سرحدوں میں بھی زمین بوس ہو کر رہ گئی۔ مشرقی پاکستان میں بھی ہندوستان نے گھیرا تنگ کرنا شروع کر دیا جہاں مناسب کمک نہ ملنے کے سبب پاکستانی افواج بے بسی کی تصویر بن کر رہ گئی۔ ۱۳ دسمبر ۱۹۷۱ء تک فضا سرنڈر کے لیے بالکل تیار ہو چکی تھی لیکن عملی طور پر یہ سرنڈر ۱۶ دسمبر ۱۹۷۱ء کو ہوا۔ یوں اسلام اور پاکستان کی تاریخ میں ایک اور سیاہ دن کا اضافہ ہو گیا۔ میر جعفر کے جانشینوں نے ننگِ دیں، ننگِ ملت اور ننگِ وطن کردار ادا کرنے میں ذرا بھی کوتاہی نہیں برتی۔ اس سارے عمل میں سب سے اذیت ناک پہلو یہ تھا کہ ہمارے مقابلے میں وہ دشمن سرخ رو ہوا تھا جس نے ہمیشہ ہمارے نظریہ قومیت کو طنز و تضحیک کا نشانہ بنایا تھا۔ اس کو باطل قرار دینے کے لیے جامع منصوبہ بندی بھی کر رکھی تھی۔ ہم نے نہ صرف اس دشمن کو نظر انداز کیا بلکہ اس کی منصوبہ بندیوں کے مقابلے میں خود کو حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔ دشمن فوج کی پزیرائی مشرقی پاکستان میں بہ طور نجات دہندہ کی جا رہی تھی۔ ڈھاکا میں موجود ایک سول افسر ایم۔ ایم۔ حسن نے ان لمحات کی تصویر کھینچتے ہوئے ایک مضمون میں لکھا کہ جب سہ پہر کے وقت میں بھارتی ٹینک ہوٹل انٹر کانٹی نینٹل کے سامنے آ کر رکے تو ہمارے بنگالی بھائیوں نے ان کے حق میں نعرے لگا کر ان کا پر جوش سواگت کیا۔ اور مسلمان دوشیزاؤں نے ہندو اور سکھ فوجیوں کے گلے میں پھولوں کی مالائیں ڈالیں۔ ان پر گلاب کی پتیاں نچھاور کیں اور فرطِ عقیدت سے ان کے ہاتھ چومے۔ یہ روح فرسا منظر دیکھ کر میں غیرت سے گڑ گیا اور اپنے رب سے شکوہ کیا کہ مجھ گناہ گار کو یہ دن دیکھنے کے لیے کیوں زندہ رکھا۔ فرطِ جذبات

سے افکار نے یوں شعر کا جامہ پہن لیا کہ:

شادماں سب تھے لشکرِ کفار	ان پر پڑتے تھے ہر قدم پر ہار
بیٹھا کاندھوں پہ آج تھا سردار	کرتے سب مرد و زن تھے اس سے پیار
دن خدا نے ہمیں یہ دکھلایا	ملک پر کفر کا ہوا سایہ
ہند کی فوج نے کیا یہ بیر	ہو گئے ہم وطن میں اپنے غیر[۹۲]

میجر جنرل حکیم ارشد قریشی نے ایک سپاہی کے بیانیے کو پیش کرتے ہوئے اپنی تصنیف میں لکھا کہ فوجی کارروائی کے لیے ارادوں سے زیادہ ان چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے جن کا تعلق ہتھیاروں کی ترسیل، فوجیوں کی غذائی ضروریات، انتظامی عملے کی امداد، طبی سہولیات، پکے بنکرز جو بموں کی تباہ کاری سے بچاسکیں، پاکستانی فوج کی قیادت نے ان تمام اہم امور کو نظرانداز کرتے ہوئے محض ارادے کی بنیاد پر میدان جنگ میں کود پڑے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کو ناکامی کا منھ دیکھنا پڑا۔ بہ ظاہر کاغذوں میں یہ منصوبہ ایک مکمل منصوبہ تھا اور ہماری دفاعی ضروریات کے عین مطابق بھی لیکن زمینی حقائق کے منافی اس منصوبے میں کئی طرح کے نقائص اور خامیاں موجود تھیں۔ دراصل یہ منصوبہ ایک تصوراتی اور خیالی بنیادوں پر استوار تھا۔ اقدامی کارروائیاں، جسے اختیار کرنا ضروری تھا، نہیں اختیار کی گئیں۔ جس کی وجہ سے ہم بری طرح ناکام ہوئے[۹۳]۔ حمودالرحمٰن کمیشن میں بھی پاکستانی افواج کی جانب سے اس ناقص منصوبہ بندی پر سخت باز پرس کی گئی ہے۔ سقوط ڈھاکا کے اسباب اور اس شکست کی وجوہات کے تعین کے ضمن میں کمیشن نے واضح طور پر کہا کہ فوج کے اعلیٰ افسران اپنی ذمہ داریوں سے نبردآزما ہونے میں بری طرح ناکام رہے۔ خصوصاً دفاعی منصوبہ بندی میں کیے گئے اقدامات ناقابل فہم تھے۔ شرم ناک بات یہ ہے کہ ان افسران میں سے کچھ ایسے بھی تھے جو جنگی حالات میں اپنے مورچے چھوڑ کر بھاگ جانے کے مرتکب بھی ہوئے۔ یہاں تک کہ ایسٹرن کمانڈ کے چیف بریگیڈیئر باقر صدیقی نے دانستہ ان منصوبوں پر عمل پیرا ہونے سے انکار کر دیا۔ بروقت فوجی ساز و سامان کی ترسیل ممکن نہ بنانے کی وجہ سے جہاں جہاں ہندوستانی فوج سے مڈبھیڑ ہوئی، وہاں پسپائی اختیار کرنے کی وجہ سے تمام کا تمام فوجی ساز و سامان بھی ہندوستانی فوج کے ہاتھ لگا[۹۴]۔ کم وبیش اسی قسم کی صورت حال ہندوستانی فوج کو بھی ابتدا میں پیش آئی۔ میجر جنرل اشوک کلیان ورما جو خود بھی ان فوجی کارروائیوں کا حصہ رہے، کا کہنا ہے کہ ایسٹ بنگال میں جو بھی پیش رفت ہو رہی تھی، وسائل کی کمی کے باعث ہم پوری طرح اس معاملے میں دخل اندازی نہیں کر رہے تھے۔ وسائل کی قلت کی وجہ سے اس معاملے کو ترجیح بھی نہیں دی جارہی تھی۔ ان کے یونٹ کو افرادی قوت، لازمی گاڑیوں، ریڈیو آلات اور چھوٹے اسلحے کی کمی کا سامنا تھا۔ اس حد تک منفی رائے سامنے آئی کہ یہ یونٹ جنگ کے لیے ناموزوں ہے لیکن بقول مصنف ہندوستان نے ان تمام کمیوں پر بہت جلد قابو پا لیا[۹۵]۔ جب کہ افواج پاکستان کے لیے ہر آنے والا دن مشکل سے مشکل تر ہوتا چلا گیا۔ جنرل نیازی اور جنرل اروڑا نے ۱۶ دسمبر ۱۹۷۱ء کو ڈھاکا میں تقسیم پاکستان کی جس دستاویز پر مشترکہ دستخط کیے تھے اور تاریخ نے جس دستاویز کو ہتھیار ڈالنے کی دستاویز کے نام سے موسوم کرنے کے بہ جائے تقسیم پاکستان کا عہد نامہ قرار دیا، اس میں درج کہ:

Lieutenant-General Jagitif Singh Aurora given a solemn assurance

that persons who surrendr shall be treated with dignity and respect

that soldiere are entitled to in accordance with the provision of the

Geneva convention[۹۶].

غیرت اور وقار کا سلوک اور برتاؤ پڑھ کر پوری پاکستانی قوم کا سر شرم سے جھک جاتا ہے کیوں کہ اس دستاویز میں پاکستانی فوج ،عوام اور ریاست کی جو تضحیک کا پہلو شامل ہے، اس کے بعد عزت اور وقار کی بات چہ معنی دارد۔

جنرل نیازی کے اس اقدام کو بعض سیاسی تجزیہ نگاروں نے غداری قرار دینے کی کوشش کی ہے جب کہ زمینی حقائق جس کا ذکر مذکورہ صفحات میں کیا گیا کہ رسل ورسائل کے ذرائع منقطع ہو چکے تھے، کمک پہنچنے کا امکان معدوم تھا تو ایسی صورت حال میں مزید فوجی جوانوں اور لاکھوں مغربی پاکستانی باشندوں کی جانیں محفوظ کرنے کی اور کیا صورت ہوسکتی تھی[۹۷]۔جس وقت حالات بد سے بدتر ہوتے جارہے تھے، اس وقت تو سیاسی رہنما اور مغربی پاکستان کی مقتدر قوتیں واہ واہ کا راگ الاپ رہیں تھیں۔ جب مارشل لا کے ضابطہ نمبر ۶۰ اور ۶۱ منسوخ کر کے ضابطہ نمبر ۷۶ اور ۷۷ جاری کیے گئے جن کے مطابق جلسے، جلوس، تحریر اور گفتار اور ہر قسم کی سیاسی سرگرمیوں پر پابندی عائد کر دی گئی تو اس وقت ان لوگوں نے حکومتی اقدام کی مذمت کیوں نہیں کی۔ جب ہر شخص کے پیچھے حکومت کی سی۔ آئی۔ ڈی اور محکمہ سراغ رسانی کے عملے کے لوگ سائے کی طرح لگے رہتے، ہر شخص خوف زدہ تھا کہ کہیں عوامی لیگ کا کارکن ظاہر کر کے کوئی مخالف سیاسی یا نجی انتقام نہ لے لے۔ ہوٹل ویران، ادبی اور ثقافتی سرگرمیاں سرد پڑ گئیں اور مشرقی بنگال جل رہا تھا، بے گناہ بنگالی خاک وخون میں تڑپائے جارہے تھے، بستیاں تباہ ہو رہی تھیں۔ ترقی پسند اور روشن خیال لوگوں کو بھی چن چن کر ٹنگ کیا جارہا تھا تو اس وقت بھٹو سمیت بیش تر سیاست دان حکومتی حمایت میں کھڑے دکھائی دے رہے تھے۔ بھٹو کے یہ الفاظ کہ ''ہم نے پاکستان بچالیا'' اس بات کا ثبوت ہے کہ ان سیاست دانوں کے ذہنوں میں محض اقتدار کا حصول ہی سب کچھ تھا۔ مفاد پرست، عوام دشمن موقع پرست سیاسی اور مذہبی رہنماؤں نے تو منھ مانگی مرادیں پائیں۔ نورالامین پی۔ ڈی۔ پی کے سربراہ سمیت مولوی فرید احمد، محمود علی، مسلم لیگ قیوم کے عبدالصبور خان، کنونشن لیگ کے سربراہ فضل القادر چودھری، خواجہ خیرالدین، حمید الحق چودھری، امیر جماعت اسلامی پروفیسر غلام اعظم وغیرہ نے تو ریڈیو اور ٹیلی وژن پر تقاریر کے ذریعے حکومت کو اپنی وفاداریوں کا یقین دلایا۔ حالاں کہ کچھ ہی عرصہ قبل مجیب اور عوامی لیگ کو بھی مشروط حمایت کا یقین دلا چکے تھے[۹۸]۔ مشرقی پاکستان میں کام کرنے والے افسروں کے ساتھ حقارت آمیز رویے کا تذکرہ خود ایوب خان اور صدیق سالک نے اپنی تصانیف میں کیا ہے[۹۹]۔ لیکن اس تلخ حقیقت سے بھی انکار ممکن نہیں کہ مقتدر قوتوں کے مظالم کا بدلہ ان معصوم، بے گناہ غیر بنگالیوں سے لیا جن کا ان تمام معاملات سے کچھ لینا دینا نہیں تھا۔ ایسے ایسے الم ناک واقعات پیش آئے کہ انسانیت شرمندہ ہو جائے۔ اردو ڈائجسٹ نومبر ۱۹۷۱ء کی اشاعت میں ''انسان خون میں ڈوب گیا'' کے عنوان کے تحت چند واقعات کی تصویری جھلکیاں پیش کی گئی ہیں جسے دیکھ کر روح کانپ جاتی ہے۔ پیپلز جوٹ مل خالص پور کھلنا کے اسکول کی دیوار اور فرش جہاں رپورٹ کے مطابق ایک ہفتے کے بعد پہنچنے والے فوٹو گرافر کے جوتے خون میں ڈوب گئے۔ اس مل کی سیڑھیوں سے بہتا ہوا خون اور جان بچا کے چھپے ہوئے سیکڑوں مہاجرین جو مکتی باہنی کے غنڈوں کی بھینٹ چڑھ گئے تھے۔ تباہ شدہ اسکول، اجڑی ہوئی بستیاں، راکھ کا ڈھیر بنے مکانات، مہاجروں کی قتل گاہوں میں تبدیل پورے پورے محلے، کریسنٹ جوٹ ملز کالونی میں درختوں سے بندھے انسانیت سوز نعشیں، مساجد میں لٹی ہوئی عورتوں کی آبرو اور پھٹے کپڑے، ایسے مکانات جہاں بیک وقت چھ چھ بچوں کو شہید کیا گیا، انسانی کھوپڑیاں جسے دیکھ کر جلاد

بھی لرز اٹھے، غرض کہ ایسے ایسے قصے جسے بیان کرنے کے لیے بھی پتھر دل ہونا پڑتا ہے[۱۰۰]۔ ظاہر سی بات ہے کہ بنگلا دیش میں مستقل طور پر قیام پذیر بہاریوں نے مکتی باہنی کے خلاف اور پاکستان کی حمایت میں جو واضح موقف اپنایا اس نے مجیب الرحمٰن اور اس کے حواریوں کو بہاریوں سے سخت متنفر کر دیا۔ ۲۳ مارچ کو یوم پاکستان کا نام ''یومِ مزاحمت'' رکھ کر ڈھاکا سمیت مختلف شہروں میں بنگلا دیش کا جو پرچم لہرایا گیا، بہاریوں نے اس اقدام کی کھل کر مخالفت کی۔ میر پور اور دوسری بہاری آبادیوں میں بنگلا دیش کا پرچم لہرانے سے انکار کے بعد صورتِ حال سنگین ہوتی چلی گئی۔ آبادیوں میں لوٹ مار اور جلاؤ گھیراؤ کا سلسلہ شروع ہوا۔ لوگوں کو گاجر مولی کی طرح کاٹا جانے لگا۔ اصفہانی خاندان کی ملکیت جوٹ ملز میں غیر ملکی اخبار نویسوں کے مطابق ۱۵۶ غیر بنگالی عورتوں اور بچوں کی اجتماعی قبریں دریافت ہوئیں۔ ۲۹ مارچ ۱۹۷۱ء جھم جھم پور کالونی بھی ایسٹ پاکستان رائفلز کے باغی عناصر کے ہاتھوں تہہ تیغ کی گئی۔ عورتوں اور بچوں کو گھسیٹ گھسیٹ کر اغوا کر کے ہندوستان کی طرف لے جایا گیا۔ انسانی جسم، کھوپڑیاں اور دیگر اعضا پورے علاقے میں بکھرے پڑے تھے۔ ۲۹۔۳۰ مارچ ۱۹۷۱ء کو رام نگر کالونی میں پناگزیں ۱۵۰ کے قریب لوگ مارے گئے۔ تارا گنج، حمید پور، امبا گاؤں، بچاچار، موہک گنج، کالی گنج، کوٹ چاند پور، تاسفی ڈنکا وغیرہ نامی دیہاتوں میں مکانات لوٹے گئے، گھر جلائے گئے، قتل و غارت گری کا بازار گرم رہا۔ ۲۹ مارچ سے ۱۰ اپریل کے دوران کشتیہ ٹاؤن میں ای۔ پی۔ آر کے باغیوں نے بہاریوں اور مغربی پاکستانی فوجیوں کو اندھا دھند فائرنگ کا نشانہ بنایا جس سے تقریباً ڈیڑھ ہزار افراد مارے گئے۔ ۲۳ مارچ تا یکم اپریل چواڈنگا میں بھی انسانیت سوز مظالم ڈھائے گئے۔ عورتوں سے غیر انسانی سلوک اور غیر بنگالیوں کے قتل عام کا سلسلہ جاری رہا۔ ۲۳ اپریل ۱۹۷۱ء کو ظفر کنڈی میں مقامی شر پسندوں نے بہاریوں کی مختلف کالونیوں پر حملے کیے، املاک تباہ کیں، عورتوں کی عصمت دری کی، چھاتیاں کاٹی گئیں، پیٹ چاک کیے گئے اور تقریباً چھے سو کے قریب لوگ قتل ہوئے۔ ۲۶ مارچ سے ۲۲ اپریل ۱۹۷۱ء کے درمیان نوگاؤں، سانتاہار میں عوامی لیگ کے غنڈوں نے سڑکوں پر رکاوٹیں کھڑی کر کے بنک لوٹے، عورتوں کی آبروریزی کی اور ان کو ننگا کر کے جلوس کی شکل میں گھمایا گیا۔ پھر قتل کر دیا گیا۔ زندہ بچ جانے والے زخمیوں کو بے دردی سے جلایا گیا۔ ماؤں کو بچوں کا خون پینے پر مجبور کیا گیا۔ پوری کی پوری بہاری آبادی کا نام و نشان مٹا دیا گیا۔ تقریباً پندرہ ہزار لوگ قتل ہوئے۔ ۲۳ مارچ تا یکم اپریل ۱۹۷۱ء ٹھاکر گاؤں میں ای۔ پی۔ آر نے بغاوت کر کے بہاری آبادی کی بڑی تعداد کو ختم کر ڈالا[۱۰۱]۔ مہاجروں کی حمایت کرنے والے خبارات و رسائل کو کھلم کھلا دھمکیاں دی جاتیں۔ ''المیہ مشرقی پاکستان'' میں رئیس امروہوی نے خود کو لکھے گئے ایک خط کی نقل درج کی ہے جس سے مکتی باہنیوں کی نفرت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ خط میں رئیس امروہوی کو مخاطب کرتے ہوئے دھمکی آمیز انداز میں کہا گیا کہ:

> اس آزاد بنگلا دیش میں نہ ہی ایک مہاجر رہ سکتا ہے اور نہ یہ ایک مغربی پاکستانی۔ یہ زمین صرف بنگالیوں کی ہے۔ آج سے اگر تو نہ سنبھلا تو تیری موت بھی ہمارے ہاتھوں بہت جلد ہونے والی ہے... یہ ہمارے لیے ناگ ہیں۔ انھیں ہر حال میں ختم کرنا ہمارا فرض ہے... اب تک صرف ۵ لاکھ مہاجر مارے گئے ہیں۔ ہمارے اندازے کے مطابق ابھی ہمیں اور ۷۵ لاکھ مہاجروں کو موت کی گھاٹ اتارنا ہے[۱۰۲]۔

رئیس امروہوی نے مذکورہ تصنیف میں متعدد خطوط شامل کیے ہیں جن سے مشرقی پاکستان کے ناگفتہ بہ حالات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ شاہین بدر کے مطابق شر پسند ریل گاڑیوں میں دھاوا بول دیتے ہیں راکٹ اور مشین گنوں سے حملہ کرتے، ریلوے لائنوں کو

بموں سے اڑاتے۔قمر عالم مونگیری کے مطابق ان کے بڑے بھائی راشن کے غرض سے نکلے مگران کا کہیں پتا نہ چلا، رات کو تمام گھر والے جمع تھے کہ محلے کی مسجد کے امام کی شنا سا آواز سن کر دروازہ کھولا، سامنے لاٹھی اور تلوار سے مسلح لوگ کھڑے تھے۔ابّا تو مولوی کے پہلے ہی وار سے ڈھیر ہو گئے۔تمام مرد گھر کے آنگن میں کھڑے کر دیے گئے۔عورتوں کی آہ وفغاں رکنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔اتنے میں مولوی آگے بڑھا اور ہماری ماموں زاد بہن کے دونوں پستان اپنے داؤ سے کاٹ ڈالے اور پیشاب کی جگہ بنگلا دیش کا پرچم نصب کر دیا۔تمام مردوں کو الٹالٹا کر کسی کی گردن کاٹی گئی اور کسی کی شرم گاہ غرض سب کو مار ڈالا گیا۔یہاں تک کہ ایک سالہ چچیری بہن کو مولوی دونوں ٹانگوں سے پکڑ کر چیر رہے تھے۔میں متعدد نعشوں کے نیچے پھنسا بے ہوش بنا یہ سارا منظر دیکھ رہا تھا۔محمد رضا نے میر پور سے لکھا کہ سنتاہار کی ۲۵ ہزار آبادی اور ٹھاکر گاؤں کی ۸ ہزار آبادی پر کوئی رونے والا نہیں،نیٹیو رکی ۳ ہزار آبادی پر کوئی فاتحہ خواں بھی نہ رہا۔فیضان شاہ آبادی شہید آباد (سنتاہار) سے لکھتے ہیں کہ یہاں تو قتل عام کرنے والوں کے لیے نقدی انعامات مقرر کیے گئے تھے۔کیا جاہل، کیا تعلیم یافتہ، کیا ڈاکٹر اور کیا دانش ور سب ایک ہی رنگ میں رنگے تھے۔بہاریوں کو مارو، ان کو نیست و نابود کرو۔مسجد کو بھی قتل گاہ بنایا گیا۔ہزاروں مرد، بوڑھے، عورتیں، بچے اسٹیشن میں لٹے ہارے بیٹھے ہیں۔اسٹیشن کیا ہے حشر کا میدان ہے۔نہ آب نہ دانہ۔چاروں جانب مجیب کے غنڈے پہرا ڈالے بیٹھے ہیں۔برچھیوں اور نیزوں سے چھلنی نعشیں اور زخمی ہر طرف الگ الگ کہانی سنا رہے ہیں۔ہر قتل کے بعد جے بنگلا اور مجیب کی جے جے کار ہوتی۔عمر رسیدہ عورتوں کو ان کی جوان لڑکیوں کے سامنے برہنہ کر کے چھاتیاں کاٹتے۔پھر برچھیوں سے اور نیزوں سے ان کے جسم کا ہر عضو چھلنی کر دیتے۔کچھ معصوموں کو ماؤں سے چھین کر ان کے سامنے ہی ذبح کر دیا گیا۔حاملہ عورتوں کے پیٹ چاک کر کے بچہ نکالا جاتا۔چھے دنوں میں تقریباً سترہ ہزار عورتیں، بچے، بوڑھے، جوان شہید کر دیئے گئے۔بیسیوں مجروحین کی دبی دبی سسکیاں، آہ وفغاں فضا کو سوگ وار کر دیتیں۔سیف الدین نے پاربتی پور سے لکھا کہ تقریباً روزانہ ہی دو چار پلوں کو اڑا دیا جاتا۔ریل گاڑیاں بارودی سرنگ کے ذریعے اڑا دی جاتیں۔مشین گنوں سے شہری آبادی پر حملے ہوتے۔بھارتی تخریب کاروں کے ساتھ مل کر پاربتی پور میں راکٹوں کی بارش ہوتی۔ایک لاکھ تو صرف دیناج پور میں شہید ہوئے۔ہدایت النساء نے محمد پور ڈھاکا سے جو طویل خط لکھا جس میں بتایا کہ ''عوامی لیگ کے غنڈے زبردستی چندہ لیتے۔ایگری کلچرل یونی ورسٹی تمام تر بنگالیوں کا مرکز تھی۔تمام جلسے جلوس یہیں ہو تے، جلسے کے بعد لوگ ہاتھوں میں ننگی تلواریں، بلّم، بھالا، برچھی اور نوکیلے راڈ وغیرہ لے کر جلوس نکالتے، اشتعال انگیز نعرے لگاتے مثلاً ''ایکٹا ایکٹا بہاری دھورو شکالے بیکالے ناشتہ کورو'' یعنی ایک ایک کر کے بہاری کو پکڑو اور صبح وشام ناشتے کرو، اور ''دلال را حلال کورو'' یعنی دلال کو ذبح کرو وغیرہ۔ان حالات کو دیکھ کر محلے میں امن کمیٹی بنائی گئی جس میں بنگالی بہاری سب ہی شامل تھے لیکن حالات پھر بھی بدتر ہوتے چلے گئے۔تخریبی کارروائیاں شروع ہوگئیں۔۲۶ مارچ کو صبح صبح بڑے بڑے درخت کاٹ کر سڑک پر ڈال دیئے گئے۔ہزاروں افراد جلوس کی شکل میں میمن سنگھ اور ریلوے کالونی کی طرف روانہ ہوتے۔بہاریوں کی دکانیں لوٹی گئیں۔۲۷ اور ۲۸ مارچ کی درمیانی شب کو F-P-R کیمپ میں بنگالیوں نے بغاوت کر دی، رات کی تاریکی میں ہوتے ہوتے پنجابی افسروں اور جوانوں کو گولی کا نشانہ بنایا۔۶۲ پنجابی افسر و جوان، معصوم بچے سمیت ہلاک ہو گئے۔پنجابی عورتوں کو ننگا کر کے شہر میں پھرایا گیا۔پنجابی افسروں کی نعشوں کو جو بھی دیکھتا ٹھوکریں مارتا، لوہے کی راڈ یا ڈنڈوں سے مار کر بربریت کا مظاہرہ کیا جاتا۔ایک بھی سنجیدہ بنگالی ایسا نہیں تھا جو لاشوں کی بے حرمتی سے روکے۔بہاری ملازمین کا ریلوے کالونی سے باہر جانا بھی دوبھر ہو گیا۔۲۵ مارچ تک میمن سنگھ میں بنگلا دیش کا جھنڈا نہیں لگا

تھا۔ ۲۶ مارچ سے ہر جگہ بنگال کا جھنڈا لہرا دیا گیا۔ شانتی پاڑا مہاجر کالونی میں ۱۷ اپریل کی شام ۳۰۰۰ کے قریب لوگ مارے دیے گئے۔ ریلوے کالونی میں بھی لوٹ مار کا بازار گرم ہوگیا۔ پہلے سے ایک خفیہ نشان گھروں پر لگایا جاتا بعد میں ان نشان زدہ گھروں کو نشانہ بنایا جاتا۔ ظالموں نے عورتوں کے پیٹ چاک کر کے بچوں کا نکالا اور یہ کہ کر قتل کیا کہ یہ سانپ کا بچہ ہے اس کو پیدا ہونے سے پہلے ہی مار دو۔ چٹا گانگ میں ایک امام مسجد نماز ادا کرنے کے بعد بولے دیش کی آزادی کے لیے جو بنگالی ایک بہاری کو قتل کرے گا اسے ایک حج کا ثواب ملے گا۔ یہ کہہ کر مسجد میں آئے دو بہاری نمازیوں کو اپنے ہاتھ سے قتل کر ڈالا۔ محمد ابوالبرکات نے میرپور ڈھاکا سے لکھا کہ مہاجر لڑکی کے جسم کو دو دو مردوں نے روندا۔ محسن الدین احمد نے چٹا گانگ سے لکھا کہ یہاں کے لوگ مکتی باہنیوں کو اپنا نجات دہندہ سمجھتے ہیں اور پاکستان کے نام سے نفرت کرتے ہیں۔ سید اسلم جعفری کے مطابق ان کے نانا کو بیٹیوں کے سامنے ذبح کیا گیا۔ ایک بے نام خط میں لکھا گیا کہ پنجابی فوجیوں کے گھر والوں کو بے دردی سے قتل کیا گیا۔ عورتوں کی بے حرمتی کی گئی۔ مہاجرین سے ہتھیار جمع کر لیے گئے۔ ان کی جوان لڑکیوں کو اغواء کیا گیا۔ عبدالحق کے مطابق مشرقی پاکستان میں شاید ہی کوئی ایسا فرد ملے گا جس کا کوئی عزیز اس بحران میں شہید نہ ہوا ہو۔ ڈاکٹر پیر محمد انصاری کے مطابق ہمارے ہاں مسجد میں دو دو انچ خون کی تہہ پڑی تھی۔ مسجدوں میں زنا کا الگ انتظام تھا۔ مقتل بھی جگہ جگہ بنے ہوئے تھے۔ محمد ارمان لال باغ ڈھاکا سے لکھتے ہیں کہ راتوں کو بہاریوں کا نکلنا مخدوش ہو چکا ہے۔ عبدالوہاب نے لکھا کہ ۲۴ سال سے چاچا کہلانے والے نے گود کھلائی بھتیجی کا دامن عصمت اس لیے تار تار نہیں کیا کہ بھتیجی چاچا کو ان پڑھ سمجھتی تھی بلکہ اس کا قصور یہ تھا کہ اس کا باپ پاکستان کا حامی تھا۔ حدیثہ خاتون نے اپنے نو جوان بیٹے کے قتل کی جو روداد سنائی، سن کر دل خون کے آنسو رونے لگا [۴۳]۔ غرض کہ اس طرح کے لاتعداد خطوط ہیں جن کے ذکر اور ہیبت ناک داستانوں سے دل لرز اٹھیں۔ بہاریوں کے ساتھ نفرت کا یہ رویہ کوئی نیا نہیں تھا، ۱۹۵۹ء میں محمد پور گورنمنٹ اسکول کی جانب سے اردو ذریعہ تعلیم کے مطالبے نے بھی بنگالیوں کے دلوں میں نفرت کی چنگاری ضرور بھڑکی ہوگی۔ اس کے علاوہ اس نفرت کا اظہار ۱۹۵۴ء میں آدم جی جوٹ ملز میں سیکڑوں بہاریوں کے قتل اور سیتا لکھیا دریا میں لاشوں کے بہانے کے واقعے سے بھی ظاہر ہے۔ ۱۹۵۴ء ہی میں چندر گھونا پیپر ملز میں بھی بہاریوں کو بے دردی سے قتل کر کے نعشوں کو کرنا فلی دریا برد کر دیا گیا تھا۔ ۱۹۵۹ء میں پاربتی پور میں بہاریوں کی دو سو جھگیوں کو جلا دیا گیا تھا [۴۴]۔ اس طرح کے واقعات اس بات کے شاہد ہیں کہ یہ نفرت ابتدائی دنوں سے ہی موجود تھی۔ البتہ سقوطِ ڈھاکا سے قبل اس میں بے تحاشا شدت ضرور آ گئی تھی۔ ملکی ذرائع ابلاغ میں ان واقعات کو تو پیش کیا ہی گیا، قرطاس ابیض میں بھی ان مظالم کی تفصیلات بیان کی گئی تھیں [۴۵]۔ اس کے علاوہ غیر ملکی اخبارات نے بھی ان واقعات کی سنگینی محسوس کرتے ہوئے خصوصی اداریے اور کالم لکھے۔ ۲ مئی ۱۹۷۱ء کو سنڈے ٹائمز لندن نے لکھا کہ دس دنوں میں جمع کی گئی تفصیلات کے مطابق افواج پاکستان میں بڑے پیمانے پر تقریباً کامیاب بغاوت اور ساتھ ہی ساتھ ہزاروں کی تعداد میں غیر بنگالی مرد، عورتوں اور بچوں کو بے دردی سے قتل کیے جانے کا پتا چلتا ہے۔ اخبار نے عینی شاہدین کے انٹرویو کی بابت بتایا کہ عصمت دری کرنے، اذیت دینے، آنکھیں نکالنے، عورتوں کی چھاتیاں کاٹنے اور گولیوں، خنجروں سے قتل کرنے کے واقعات معمول بن چکے تھے۔ اسی طرح واشنگٹن سے شائع ہونے والے اخبار ''دی واشنگٹن ایوننگ اسٹار'' کے صحافی Mort Rosenblum نے اپنے دورہ مشرقی پاکستان کی رپورٹ میں لکھا کہ بندرگاہ والے شہر چٹا گانگ کے ایک جوٹ مل کے تفریحی کلب میں ۱۸۰ عورتوں اور بچوں کو ذبح کیا گیا۔ نیویارک ٹائمز کے صحافی Malcolm Brown نے اس مئی کی اشاعت میں مراسلہ لکھا کہ بڑی تعداد میں بہاریوں کو قتل کر دیا۔ اخبار

دی سنڈے ٹائمز نامہ نگار Anthony Mascarenhas کے مطابق ملٹری کرنال کو قتل اور اس کی حاملہ بیوی کی آبروریزی کی گئی۔ بہت سی نو جوان لڑکیوں کی شرم گاہوں میں بنگلا دیش کا پرچم آویزاں کر دیا گیا تھا۔ دی ٹائمز آف لندن کی ۱۶ اپریل ۱۹۷۱ء کی اشاعت میں لکھا کہ غیر بنگالیوں پر ہجوم پل پڑتا۔ معلوم نہیں کتنی ہلاکتیں ہوتیں [۱۰۶]۔ اس طرح کی متعدد مثالیں ایس۔ ایم۔ عمر عالم نے اپنی مذکورہ تصنیف میں پیش کی ہیں جنھیں دیکھ کر مجیب اور مکتی باہنی کے مظالم کا اچھی طرح اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

بنگلا دیش میں مسلم بنگالیوں نے ہندوؤں کے ساتھ مل کر جو لرزہ براندام مظالم اور خوں آشامیوں کا مظاہرہ کیا اس کا بیان مشکل ہے۔ بہاریوں پر جو مظالم روا رکھے گئے وہ بالکل اچھوتے، نرالے اور ناقابلِ یقین تھے۔ انھیں ستانے، مارنے، کاٹنے، لوٹنے کا کوئی کون سا ایسا طریقہ ہے جسے بنگالیوں نے نہ آزمایا ہو۔ ظالموں کو اس قتل وغارت گری میں ذرا بھی ترس نہ آیا۔ ان مظالم سے جو لوگ بچ نکلنے میں کامیاب ہوئے وہ خوش قسمت تھے کیوں کہ بہاریوں پر پوری بنگالی قوم بھیڑیوں کی طرح ٹوٹ پڑی تھی۔ بنگالی جو ہندوؤں کی غلامی کو دل سے قبول کر چکے تھے۔ گلی گلی، کوچے کوچے ما دیش تو ما ر دیش، بنگلا دیش بنگلا دیش کا نعرہ بلند کرتے دکھائی دیتے، سوار دھن کرو سوار دھن کرو کے مطالبے ہر سو بلند ہو رہے تھے۔ بھلا ایسی صورت میں بہاریوں کے گھروں پر پاکستان کے لہراتے جھنڈے انھیں کیوں کر قبول ہوتے، اردو کی حمایت انھیں کس طرح قبول ہوتی، لہٰذا یہ بدلہ تو انھیں لینا ہی تھا۔ انتقام کے اس جذبے کی تسکین کے لیے بہاریوں کے خون سے ہولی کھیلی گئی۔ بستیوں اور آبادیوں میں قتل عام جاری رہا، عورتوں کی عصمتیں لوٹی گئیں۔ عضو خاص میں مرچیں بھری گئیں، گردن اڑانے کی نئی نئی مشینیں ایجاد کی گئیں۔ لوگوں کے جسموں سے سرنج سے خون نکال کر زندہ پھڑ پھڑایا گیا۔ چن چن کر قتل کیا گیا، لوگوں سے قبر کھدوائے گئے اور اسی میں پھینک کر زندہ دفن کیا گیا۔ مجیب کے بھانجے فضل الحق (مونی) اور کمال نے بنگالی غنڈوں کو لے جا کر بہاری لڑکیوں کو اغوا کر کے فحاشی کے اڈے چلوائے، شوہر کے سامنے بیوی اور باپ کے سامنے بیٹی کی عزت لوٹی گئی [۱۰۷]۔ معروف صحافی قطب الدین عزیز ۱۹۷۱ء کے زمانے میں ایک خبر رساں ایجنسی یونائٹیڈ پریس آف پاکستان کے مینیجنگ ایڈیٹر تھے [۱۰۸]۔ انھوں نے اپنی مشہور تصنیف Blood and Tears کے ۲۲۸ صفحات میں ان ہول ناک واقعات کا تقریباً ہر ہر منظر رقم کرنے کی کوشش کی ہے [۱۰۹]۔ یہ کتاب مشرقی پاکستان میں پیش آنے والے ہیبت ناک واقعات کا ایسا منظر نامہ ہے جسے ایک ایسے صحافی نے قلم بند کیا جو خود ان واقعات کا عینی شاہد بھی تھا۔ کتاب کے ابتدائی چار صفحات میں ۱۹۷۱ء کی وہ تصاویر پیش کی گئی ہیں جو مکتی باہنی کے مظالم اور قتل وغارت گری کی ہول ناکی کا ثبوت ہیں۔ انھوں نے عوامی لیگ کی تخریب کاریوں اور منفی سرگرمیوں کی بابت روزنامہ کی بنیاد پر درج ہونے والے واقعات کو مقامی اور بین الاقوامی صحافیوں اور ان واقعات کا شکار لوگوں سے انٹرویو لے کر ہر کڑی کو بہت واضح انداز سے پیش کیا ہے۔ کس طرح عوامی لیگ کے نمائندوں اور مکتی باہنی کے تربیت یافتہ فورس نے اسلحے کے ڈپو لوٹے۔ درس گاہوں میں کہاں کہاں اسلحے کے ذخیرے جمع کیے گئے۔ کس طرح غیر بنگالیوں کی املاک کو لوٹا گیا۔ ہلاکتوں کی تعداد اور درست حالات کا منظر نامہ اس کتاب کے پہلے ہی باب کے مطالعے سے کیا جا سکتا ہے [۱۱۰]۔ دوسرے باب میں نارائن گنج میں ہونے والی دہشت گرد سرگرمیوں کا حال عینی شاہدین کی روشنی میں پیش کرتے ہوئے ہلاکتوں کی اعداد و شمار کا نقشہ کھینچا ہے [۱۱۱]۔ اسی طرح اگلے ابواب میں چٹا گانگ، رنگا ماٹی، کھلنا، دیناج پور، پاربتی پور، ٹھاکر گاؤں، راج باڑی، مہر پور، ظفر کنڈی، نوا کھالی، سلہٹ، مولوی بازار، رنگ پور، سید پور، جیسور، میمن سنگ، راج شاہی، برہمن باڑی، سراج گنج اور سانتاہار وغیرہ وغیرہ کی بابت ایسی ایسی معلومات اس کتاب کو پڑھ کر ملتی ہیں کہ انسانیت ان پر شرما

جائے[۱۱۲]۔ افسوس کی بات تو یہ ہے کہ مارچ اور اپریل کے درمیان عوامی لیگ کے غنڈوں کے ہاتھوں غیر بنگالیوں کے قتل عام پر وزارت اطلاعات حکومت پاکستان کی جانب سے سخت ہدایت تھیں کہ لوٹ مار اور قتل کی خبریں ایجنسی کی جانب سے جاری نہ کی جائیں۔ دیگر خبر رساں ایجنسیوں کو بھی اسی قسم کی ہدایات تھیں۔ حکومت کا یہ موقف تھا کہ کہیں ان خبروں کی اشاعت سے مغربی پاکستان میں مقیم بنگالیوں کی زندگیوں کو خطرہ نہ لاحق ہو جائے۔ اس قتل عام کے دوران تقریباً ۳۵ غیر ملکی صحافی ڈھاکا میں موجود تھے لیکن کسی نے بھی اس قتل و غارت کی تفصیلات شائع نہیں کیں۔ تمام ٹیلی فون ایکسچینج پر بھی عوامی لیگ کے غنڈوں کا قبضہ تھا۔ حکومتی جماعت کا یہ عالم تھا کہ ان ۳۵ صحافیوں کو بھی ملک سے نکل جانے کو کہا گیا۔ ملک بدر ہونے والے صحافیوں میں بعض بااثر امریکی صحافی بھی تھے۔ اس واقعے کے بعد انھوں نے بنگالیوں اور باغیوں کی بابت خوب بڑھا چڑھا کر حمایت میں لکھا[۱۱۳]۔

۱۹۷۱ء کے آخر میں پاکستانی صحافیوں کے ایک گروپ کو ان علاقوں کا دورہ کرایا گیا جنھیں باغی بنگالیوں نے تباہ و برباد کر دیا تھا۔ کراچی سے شائع ہونے والے انگریزی روزنامے مارننگ نیوز کے اسسٹنٹ ایڈیٹر اور سنڈے ٹائمز میں لندن کے پاکستان میں نمائندے Anthony Mascarenhas نے مئی ۱۹۷۱ء کو سنڈے ٹائمز لندن میں یہ خبر شائع کی جس میں ایک لاکھ غیر بنگالیوں کے جاں بحق ہونے کا ذکر کیا گیا تھا[۱۱۴]۔ اصل تعداد اس سے کہیں زیادہ تھیں۔ اپریل ۱۹۷۱ء کے آخر میں واشنگٹن میں پاکستانی سفارت خانے نے بہاریوں اور مغربی پاکستان سے تعلق رکھنے والے پاکستانیوں کے قتل عام کی بابت ایک کتابچہ شائع کیا[۱۱۵]۔ ۶ مئی ۱۹۷۱ء کو چھے بین الاقوامی صحافی جن کا تعلق نیو یارک ٹائمز، رائٹرز، ایسوسی ایٹڈ پریس آف امریکا، ٹائمز میگزین، فنانشل ٹائمز آف لندن، اور چائنا نیوز ایجنسی سے تھا، نے بنگالی باغیوں کے ہاتھوں بہاریوں کے بہیمانہ اور سفاکانہ قتل عام سے متعلق جو تفصیلات بتائیں، امریکا میں پاکستانی سفارت خانے نے فوری طور پر ان غیر ملکی نامہ نگاروں کے مراسلوں پر مشتمل کتابچہ شائع کیا جس میں بھارتی پروپیگنڈا کی قلعی کھولنے کی کوشش کی گئی۔ بھارت ہمیشہ یہ الزام لگاتا رہا کہ مارچ اور اپریل میں بڑے پیمانے پر بنگالیوں کا قتل عام ہوا۔ وہ بہاریوں اور دیگر غیر بنگالیوں کو بنگالی قرار دیتی رہی۔ اس طرح بہاریوں اور دیگر غیر بنگالیوں کے قتل کا معاملہ اس پروپیگنڈے تلے دب گیا۔ قرطاس ابیض کی شکل میں جو کچھ شائع بھی ہوا تو بین الاقوامی سطح پر اس کا خاطر خواہ اثر نہیں ہوا[۱۱۶]۔ اور بالآخر اس کا حتمی نتیجہ سقوط ڈھاکا کی صورت میں نکلا۔

سقوط ڈھاکا کا یہ سانحہ قومی یک جہتی کے تابوت میں آخری کیل ٹھونکنے کے مترادف تھا۔ یہ وہ دل دوز لمحہ تھا جب ہماری تقریباً ۹۰ ہزار سویلین اور فوج کو ڈھاکا کے ریس کورس گراؤنڈ میں ہتھیار ڈالنے اور سر جھکانے پر مجبور ہونا پڑا۔ اس تعداد کے بیان میں اختلاف ہے جس کا ذکر آئندہ کے صفحات میں کیا جائے گا۔ جنرل امیر عبداللہ نیازی نے ہندوستانی جنرل جگجیت اروڑا کے سامنے دستاویز پر دستخط کر کے اسلام اور پاکستان کے لیے رسوائیاں سمیٹ لیں۔ یہ ہماری قومی بے حمیتی اور ندامت کا بدترین دن تھا۔ اس دن ہم ایک ایسی شکست سے دوچار ہوئے جس کے اثرات سے جان چھڑانا ممکن نظر نہیں آتا[۱۱۷]۔ پاکستان کے خلاف عوامی لیگ نے جس بنگالی قوم پرستی کو ہتھیار کے طور پر استعمال کیا، اسے فریب اور سراب کے اور کیا کہا جا سکتا ہے؟ زبان کی بنیاد پر ابھاری جانے والی قوم پرستی لوگوں کو ہیروازم کی طرف لے جا سکتی ہے۔ انھیں نئے آدرش پر وان چڑھانے کی تحریک دے سکتی ہے، انھیں جنگوں پر اکسا سکتی ہے اور معاشرے میں شدید بے چینی پیدا کر سکتی ہے۔ مگر کیا بنگال قوم پرستی کو معروف معنوں میں قوم پرستی قرار دیا جا سکتا ہے[۱۱۸]؟

مشرقی پاکستان میں جو قیامت برپا ہوئی وہ ایک ایسا المیہ ہے جس کی مثال تاریخ میں ملنی محال ہے۔ اس سانحے پر ہر محبِّ وطن نے اپنے رنج وغم اور غصّے کا اظہار کیا۔ جو قومی سانحہ پیش آیا تھا اس کی ذمہ داری پوری قوم پر عائد ہوتی ہے۔ ہم نے جو کچھ کھویا، جو روسیاہی اور ذلت اُٹھائی، وہ ہماری ہی بدعنوانیوں، خودغرضیوں، بے عملی اور بدکرداری کا نتیجہ تھی[۱۱۹]۔ اس بے ضمیری اور بے حسی پر رحمان کیانی نے خوب کہا کہ:

جوئے خوں سے گزر گئے ہوتے — ذرہ ذرہ بکھر گئے ہوتے

بے حیائی کی خیر ہو ورنہ — لوگ غیرت سے مر گئے ہوتے[۱۲۰]

حقیقتاً غیرت قومی کی کمی ہی نے ہمیں اس سانحے سے دوچار کیا۔ اس قومی بے حسی کے اسباب وعلل پر بہت کچھ لکھا گیا۔ فوجی شکست دراصل اسی مجموعی بے حسی کے نتیجے میں ہمارا مقدر بنی۔ اس سانحے کے بعد پاکستان کی قیادت میں بھی تبدیلی ہوئی۔ یحییٰ خان دست بردار ہو گئے اور ۲۰ دسمبر ۱۹۷۱ء کو ذوالفقار علی بھٹو نے ملک کے صدر اور پہلے سویلین چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر کی حیثیت سے حلف اُٹھایا۔ انھوں نے ہی ۲۶ دسمبر کو اس سانحے کے اسباب وعلل اور ذمہ داریوں کے کے تعین کے لیے حمود الرحمٰن کمیشن بنایا۔ جس نے اپنی رپورٹ ۱۹۷۲ء میں پیش کر دی تھی۔ اس کے کچھ حصّے منظر عام پر آ چکے ہیں۔ بھٹو نے ہی شیخ مجیب کو رہا کر کے بہ راستہ لندن روانہ کیا۔ اس دوران بنگلا دیش میں عبوری صدر نذر السلام اور وزیر اعظم تاج الدین کابینہ کے دیگر ارکان کے ساتھ ۲۵ دسمبر کو ڈھاکا پہنچے۔ تاج الدین نے اپنی حکومت کو انقلابی حکومت قرار دیا۔ انکا اصل مقصد سوشلزم کا قیام تھا[۱۲۱]۔

سقوط ڈھاکا کے بعد ایک مرتبہ پھر بہاریوں پر ظلم وستم کا سلسلہ شروع کر دیا گیا۔ بنگالیوں نے ان کی جائیدادوں پر قبضہ کرنا شروع کر دیا، اسلحے کی تلاش کے نام پر مکانوں میں گھس جاتے، گرفتاریاں کی جاتیں، اغوا کے واقعات بھی شروع ہو گئے۔ بھارتی فوجیوں نے صورت حال کی نزاکت بھانپتے ہوئے تمام بہاریوں کو میرپور منتقل کیا[۱۲۲]۔ ۸ جنوری ۱۹۷۲ء کو مجیب رہائی ہونے کے بعد اندرا گاندھی کا شکریہ ادا کرنے ہندوستان گئے اور پھر ۱۰ جنوری کو ریس کورس گراؤنڈ ڈھاکا میں جلسہ عام سے خطاب کے دوران پاکستان مخالف تقریر کی۔ انھوں نے بہاریوں کے لیے کوئی واضح اعلان نہیں کیا جس کا لازمی نتیجہ بعد میں ان کے قتل عام کی صورت میں ظاہر ہوا۔ ۳۰ جنوری ۱۹۷۲ء کو میرپور میں کرفیو نافذ کر کے توپیں نصب کر دی گئیں۔ کرنل حنفی کی کمانڈ میں صبح تک سیکڑوں بہاریوں کو قتل کر دیا۔ مکتی باہنی کے لڑکے نوجوانوں کو گھسیٹ گھسیٹ کر میدان میں جمع کرتے اور پھر قتل وغارت گری کا گھناؤنا کھیل کھلتے۔ بعد میں بھارتی سپاہیوں نے ان کی جان بچائی۔ بین الاقوامی ریڈ کراس کی انجمنوں نے بھی ان بہاریوں کی مدد کی۔ قتل عام کا یہ سلسلہ محمد پور، چٹاگانگ، کھلنا اور دیگر بہاری علاقوں میں بھی جاری رہا۔ ترک جائیداد کے تحت بہاریوں کی جائیدادوں کو حکومت نے اپنے کنٹرول میں لے لیا۔ کوئی دکان، مکان اور فیکٹری ایسی نہ تھی جس پر بنگالیوں نے قبضے کا منصوبہ نہ بنایا ہو[۱۲۳]۔

جنوری ۱۹۷۲ء کو مجیب بنگلا دیش کے وزیر اعظم بن گئے پاکستان اور بھارت کے درمیان جون، جولائی ۱۹۷۲ء میں شملا کے مقام پر سربراہی مذاکرات ہوئے جس کے نتیجے میں مغربی سرحد کے مقبوضہ علاقے ہندوستان نے واپس کر دیئے۔ بعد میں مذاکرات کے کئی ادوار کے نتیجے میں مرحلہ وار جنگی قیدیوں کی واپسی کا سلسلہ شروع ہوا۔ اس سانحے کو تجزیہ کار سقوط بغداد اور ہسپانیہ سے بڑا سانحہ قرار دیتے ہیں جس میں تقریباً ۷ کروڑ آبادی براہ راست متاثر ہوئی۔ مسعود مفتی کے مطابق ۱۹۷۱ء میں یہ سب کچھ اس شدت سے ہوا کے

۱۹۴۷ء کے فسادات بہت پیچھے رہ گئے ہیں۔اس سانحے میں مسلمانوں نے مسلمانوں کو مارا۔نفرت کے ابال میں قتل وغارت گری ہوتی آئی ہے۔لیکن اس عمل سے لذت حاصل کرنے کا مظاہرہ مشرقی پاکستان میں دکھائی دیا[۱۲۴]۔اپنی ایک تصنیف میں وہ کہتے ہیں کہ ''سقوط ڈھاکا ایک انتہائی پیچیدہ عمل کی انتہا تھا۔اس کی پیچیدگی میں نیتوں کا کھوٹ،حماقتوں کی تکرار،سازشوں کے جال،اقتدار کی بھوک اور نظریے کا الحاد سبھی کچھ شامل تھا[۱۲۵]۔اس پورے عمل میں جہاں اپنوں نے پیٹ میں چھرا گھونپا وہیں بین الاقوامی سازش بھی ضرور کارفرما تھی۔بنگالیوں کی ہٹ دھرمی سے انکار نہیں کیا جاسکتا لیکن ہماری نا اہل قیادت،عیاش اور دین سے بے بہرہ مقتدر حلقے،شراب وشباب میں مست فوجی سربراہان غرض ان تمام اسباب وعمل کا تجزیہ کئی کڑیوں کو آپس میں جوڑنے میں ہماری مدد اور رہنمائی کرے گا۔مشرقی پاکستان کی نئی نسل کی ذہن سازی جس انداز میں کی گئی تھی اور جس طرح سے سیکولرازم کے نام پر ہندو تہذیب وثقافت کے رنگ میں رنگ دیا گیا تھا۔اس کا لازمی نتیجہ نظریہ پاکستان کے خلاف نفرت اور بنگلا قوم پرستی کی صورت میں نکلنا تھا۔اس صورت حال میں مجیب وہ آخری بنگالی تھے جن کے ساتھ مغربی پاکستان بات چیت کر کے کسی سمجھوتے پر سکتی تھی۔بنگال کے نوجوان جو قیام پاکستان کے وقت کم عمر تھے اور ان کی پرورش اور تربیت میں ملک سے نفرت اور حقارت اس قدر سرایت کر چکی تھی کہ انھیں باقی ماندہ وطن کے ساتھ کسی قسم کی الفت ومحبت نہیں تھی[۱۲۶]۔دوسری جانب مغربی پاکستان میں بھی یحییٰ خان جیسا شرابی وعیاش شخص ملک کا سربراہ بن بیٹھا۔جس کے بعد ''ایوان صدر کی دیوار پر نوشتہ تقدیر کی صورت میں ذلت وتخریب کے اٹل کتبے آویزاں ہوگئے''[۱۲۷] تھے۔اس کا ذہن بھی سازشوں کی آماج گاہ بن چکا تھا۔ایک طرف اسے ناؤنوش سے فرصت نہیں تھی تو دوسری جانب اقتدار کی حوس میں وہ ہوش وخرد سے بے گانہ ہو چکا تھا۔شراب نے اس کا ذہن ماؤف کر کے فیصلہ سازی کی صلاحیت چھین لی تھی۔وہ خود کو جز وقتی صدر کہلواتا۔صدر یحییٰ اور جنرل نیازی نے آخر تک قوم کو دھوکے میں رکھا کہ ''ہم ہتھیار نہیں ڈالیں گیں''[۱۲۸]۔یہ تمام دعوے ریت کی دیوار ثابت ہوئے۔اس فوجی شکست کی بابت میاں طفیل محمد کا کہنا ہے کہ ''بنگلا دیش قرارداد پاکستان سے نہیں،اندرا اور جنرل اروڑا کی فوجوں کے قبضے سے بنا ہے''[۱۲۹]۔اسی طرح میجر ابرار حسین کا بھی یہی کہنا ہے کہ یہ جنگ منصوبہ بندی کرنے والے جرنیلوں کی نا اہلی کی وجہ سے ہاری گئی۔اسے سازش قرار نہیں دیا جاسکتا[۱۳۰]۔حقیقتاً یہ شکست فوجی بھی تھی اور سیاسی بھی بلکہ اس شکست کو قومی شکست وریخت کا بیانیہ سمجھنا چاہیے۔بقول مسعود مفتی اس وقت ''میر کارواں نے وطن کو بچانے کی کوئی تدبیر نہ کی،بہت کیا تو تساہل کو تدبیر کہہ ڈالا اور حماقتوں کو نوشتہ تقدیر سمجھ لیا''[۱۳۱]۔الطاف حسن قریشی کے مطابق:

> جی۔ایچ۔کیو کا وہ حصّہ جسے بجلی کی طرح کام کرنا چاہیے تھا،اپنے ہوش وحواس کھو بیٹھا تھا۔گجرات کی جنرل رانی کا ذکر،یہاں تو ہر شہر میں جنرل رانی موجود تھی۔گندگی ہمارے معاشرے میں پہلے بھی موجود تھی لیکن اسے حکومت کا مقام اس سے پہلے کبھی یوں نہ ملا تھا۔یہ بدبودار اور کوڑھی قیادت پاکستان کو رسوائی اور ذلت کے سوا اور کیا دے سکتی تھی[۱۳۲]۔

بھارت کی مداخلت کو اپنی بربادی کا جواز بنا کر ہم تمام تر ذمے داریوں سے مبرا ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔ہم ایک طویل عرصے سے اس غلط مبحث کا شکار ہیں کہ یحییٰ،بھٹو اور مجیب میں کون پاکستان کو دولخت کرنے کا ذمے دار ہے[۱۳۳]۔حمود الرحمٰن کمیشن کی جو رپورٹ اس وقت تک منظر عام پر آچکی ہے اس میں بہت کچھ اشارے موجود ہیں۔اس وقت کی سیاسی قیادت جس نے مشرقی پاکستان کے بارے میں بے اعتنائی کا رویہ اختیار کیے رکھا،یا اس وقت کی فوجی قیادت جس نے عوامی لیگ کی سرگرمیوں کے لیے مناسب حکمت

عملی اختیار نہ کی اور آرمی ایکشن اس وقت لیا جب صورت حال انتہائی سنگین ہو چکی تھی [۱۳۴]۔ آنے والی نسلیں پاکستان کی تاریخ کا جب جب مطالعہ کریں گی، فوجی اور سول بیوروکریسی اور ماہر سیاست دانوں سے ان کا یہ سوال ضرور ہوگا کہ اپنی تمام تر چال بازیوں کے باوجود وہ علاحدگی پسندوں سے مفاہمت کیوں نہ کر سکے۔ یہ تمام لوگ اپنی غلطیوں اور کوتاہیوں پر شرم سار ہونے کے بہ جائے محض بنگالی مسلمانوں کو ہی موردِ الزام ٹھہراتے ہیں کہ وہ غدّار تھے، لیکن اس تاریخی حقیقت کو کیسے جھٹلا سکتے ہیں کہ یہ وہی بنگالی تھے جنھوں نے قیام پاکستان میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا تھا۔ یہ لوگ اقتصادی وجوہ کی بنا پر صوبائی خودمختاری کے طلب گار ضرور تھے۔ خود مجیب آخری وقت تک یہ کہتا رہا کہ وہ ایک پاکستان کا حامی ہے اور یہ جنگ بنگالی عوام کے حقوق کی جنگ ہے [۱۳۵]۔ اس سانحے کے پیچھے کس کا کیا کردار رہا اس کو سمجھنے کے لیے حمودالرحمٰن کمیشن نے پاکستان کی سیاسی تاریخ کے منفی رویوں پر بھی کڑی تنقید کی۔ حسین شہید سہروردی کو سیاسی منظر نامے سے ہٹانے سے لے کر لسانی جھگڑوں کے ذریعے نہ ختم ہونے والے تنازعے پر بھی روشنی ڈالی۔ گورنر جنرل ملک غلام محمد کا جمہوری تقاضوں کو بالائے طاق رکھ کر سکندر مرزا کو گورنر مقرر کرنا اور وزیرِ اعلیٰ فضل الحق کو غدّار قرار دے کر الزام تراشی کے انبار [۱۳۶] وغیرہ جیسے مسائل کے بعد ۶ مارچ کو جنرل ٹکا خان کو مشرقی پاکستان کا گورنر مقرر ہونے اور پورے مشرقی پاکستان میں پھیلی ہوئی بے چینی کے اسباب کو تلاش کرنے کے لیے کیے گئے اقدامات تفتیشی رپورٹس اور حقائق جاننے کے بعد کمیشن نے واضح طور پر کہا کہ:

> ڈھاکا میں خانہ جنگی شروع ہو چکی تھی۔ فوج پر حملے ہو رہے تھے۔ غیر بنگالیوں کو ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر قتل کیا جا رہا تھا۔ بنگالی عوام منھ زور گھوڑے کی طرح اچھل رہے تھے اور ان کی لگامیں عوامی لیگ کے ہاتھوں میں تھیں [۱۳۷]۔

کمیشن نے واضح طور پر کہا کہ شیخ مجیب الرحمٰن کی باغیانہ تقاریر، قومی ترانے اور پرچم کی بے حرمتی وغیرہ جیسے اقدام جو عوامی لیگ کی جانب سے کیے جا رہے تھے، مملکت کو کمزور کرنے کا سبب بن رہے تھے۔ اس کے علاوہ ہندوستان کی جانب سے تخریبی کارروائیوں کو بڑھاوا دینے کے لیے کیے گئے اقدامات کی بابت لکھا کہ سرحد کے قریب تقریباً ۳۰ مختلف کیمپوں میں ہندوستانی انسٹرکٹر تیس ہزار رنگروٹوں کی تربیت میں مصروف تھے۔ نام نہاد بنگلا دیش ریڈیو بھی ہندوستانی علاقے میں قائم تھا۔ ۲۰ اپریل ۱۹۷۱ء کو فرانس کے اخبار کے حوالے سے بنگلا دیش کی عبوری حکومت کے قیام کا اعلان جو کہ ہندوستانی سرحد سے ایک میل کے فاصلے پر ایک آم کے درخت کے نیچے عمل میں آیا۔ اس کے علاوہ پاکستان کو کمزور کرنے کے لیے ہندوستان کے دفاعی تعلیمات کے ڈائریکٹر سبرامنیم کا ۷ اپریل ۱۹۷۱ء کا بیان جس میں انھوں نے واضح طور پر کہا کہ ہندوستان کو سمجھ لینا چاہیے کہ پاکستان کے مٹنے میں ہی ہمارا فائدہ ہے۔ آج ہمیں جو موقع ملا ہے وہ پھر کبھی نہیں ملے گا [۱۳۸]۔ کمیشن کے سامنے بیان دیتے ہوئے یحییٰ خان نے اعتراف کیا کہ اس وقت مجیب، بھٹو کے برعکس محبِّ وطن نظر آتا ہے۔ یحییٰ کا یہ بھی کہنا تھا کہ سقوطِ ڈھاکا کی سازش بھٹو لمبے عرصے سے کر رہے تھے اور اس کی خواہش تھی کہ یہ سانحہ جلد سے جلد ہو جائے۔ اس نے فوجیوں کے ضبط اور برداشت کی بابت کہا کہ جب مشرقی پاکستان کے اخبارات اور عوامی لیگ کے کارکنان، فوجی کتّو واپس جاؤ، یحییٰ کے کتّو واپس جاؤ، ۱۹۶۵ء کے شکست خوردہ کتّو واپس جاؤ، ہم تم کو بحیرہ بنگال میں پھینک دیں گے، وغیرہ جیسے نعروں سے اشتعال دلانے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس وقت بھی فوج نے انتہائی ضبط اور برداشت سے کام لیا۔ اس کا یہ بھی کہنا تھا اس نے ہتھیار ڈالنے کا حکم نہیں دیا۔ ۹ دسمبر کے دن گورنر ڈاکٹر ملک اور جنرل نیازی کی جانب سے موصول ہونے والے اس پیغام کے بعد جس میں بھارتی فضائیہ

کی جارحیت، شدید بمباری، جانی نقصان اور متوقع سقوط ڈھاکا کی جانب توجہ دلائی گئی تھی، یحییٰ کا کہنا تھا کہ یہ معاملہ میں نے جنرل نیازی کے مشورے سے ان کی صواب دید پر چھوڑا تھا[۱۳۹]۔ یحییٰ خان نے اپنے ایک اور انٹرویو میں اعتراف کیا کہ حالات کی سنگینی کو محسوس کرتے ہوئے اس نے نیازی کو کہا کہ:

> آپ پاکستان کے محاذ پر سینئر ترین فوجی افسر ہیں۔ آپ ڈپٹی مارشل لا ایڈمنسٹریٹر بھی ہیں۔ وہاں کے انڈی پنڈٹ کمانڈر ہو۔ تم میری نسبت صورت حال کو بہتر جانتے ہو۔ میں ایک ہزار میل دور بیٹھا ہوں۔ تم سچویشن کا صحیح اندازہ کر سکتے ہو۔ گونر کو کنسلٹ کرو اور یو۔ این۔ او والوں کو بولو کہ وہ سیز فائر کروادیں۔ جب سیز فائر ہوتا ہے تو کمانڈر آپس میں ملتے ہیں۔ تو کوئی سمجھوتہ ہو جاتا ہے۔ لیکن ہتھیار ڈالنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا[۱۴۰]۔

حالاں کہ جب سیز فائر ہوتا ہے تو مخالف اپنی شرائط خود منواتا ہے۔ پھر سامنے دشمن اگر بھارت جیسا ہو تو ایک انتظامی سربراہ کی حیثیت سے ہر فیصلہ ہر وقت واضح اور ابہام سے پاک ہونا ضروری ہوتا ہے۔ اگر یحییٰ کا حکم یہ ہوتا کہ ہتھیار نہیں ڈالنا ہے تو فوج کیا یہ اقدام کرتی؟ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یحییٰ سمیت تمام کرداروں کو پہلے سے ہی معلوم تھا کہ کب کیا واقعہ پیش آنا ہے۔ جنگ کے نتائج سے انھیں قطعی دل چسپی نہیں تھی۔ خود بھٹو کی بابت یحییٰ کے بیان سے بھی یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ سب کچھ ایک طے شدہ منصوبے کے تحت ہوا جو پروگرام کے عین مطابق اپنے منطقی انجام تک پہنچا۔ اس کا ایک ثبوت بھٹو کی وہ تجویز تھی جس میں بھٹو عوامی لیگ کو مشرقی پاکستان اور پیپلز پارٹی کو مغربی پاکستان سنبھالنے کا مشورہ دے رہے تھے۔ اس تجویز پر عوامی لیگ کے رہنما اور ماہر معاشیات رحمٰن سبحانی نے زوردار قہقہہ لگاتے ہوئے کہا تھا کہ ہم اس پر کیوں معترض ہوں۔ ہم نے تو چھے نکات کی بنیاد پر صوبائی خود مختاری کا مطالبہ کیا تھا جب کہ بھٹو صاحب کی تجویز کے مطابق تو ہمیں مکمل آزادی مل رہی ہے[۱۴۱]۔ بھٹو نے اس زمانے میں اس تاثر کو عام کرنا شروع کر دیا تھا کہ بنگالی ہم پر بوجھ ہیں، اگر یہ الگ ہوتے ہیں تو ہمارا بوجھ اتر جائے گا اور ہم مغربی پاکستان والے ترقی کریں گے[۱۴۲]۔ مجیب اور بھٹو اس مسئلے کو افہام و تفہیم سے حل کرنے میں ناکام رہے جس کے بعد آرمی کی دخل اندازی کی راہ ہموار ہوئی۔ دونوں رہنماؤں نے اپنے اپنے ذاتی مفادات کو مقدم جانا اور ایک دوسرے کی برتری قبول نہ کی۔ آرمی بھی مجیب کو مرکز میں حکومت اس لیے نہیں بنانے دینا چاہتی تھی کہ اسے خطرہ تھا کہ مجیب آرمی کی دفاعی بجٹ میں خاطر خواہ کمی کا ارادہ رکھتی ہے[۱۴۳]۔ کمیشن نے ۱۳ اعلیٰ فوجی افسروں کو اس سانحے کا براہ راست ذمے دار تسلیم کیا اور ان کا کورٹ مارشل کرنے کی سفارش بھی کی۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ ان میں سے ۱۲ افسروں کو بھٹو حکومت نے تمام مراعات کے ساتھ ریٹائر کیا۔ اطلاعات کے مطابق کسی بھی ذمے دار افسر کا کورٹ مارشل نہیں ہوا۔ صرف امیر عبداللہ نیازی کو ۱۹۷۵ء میں فوج سے برطرف کر کے پنشن اور مراعات ضبط کی گئیں۔ ۱۹۷۷ء میں بھٹو کے خلاف چلنے والی تحریک کے دوران جنرل نیازی کو گرفتار بھی کیا گیا لیکن بعد میں جنرل ضیا نے رہا کر دیا[۱۴۴]۔ ۴۵۶ صفحات پر مشتمل کمیشن کی یہ رپورٹ ۱۹۶ دنوں میں مکمل ہوئی۔ اس میں سات ماہ کے اندر ۲۱۲ سے زائد گواہوں کے بیانات قلم بند کیے گئے۔ ان میں ۷۲ جنگی قیدیوں کے بیانات بھی شامل تھے۔ یہ بیانات ۱۹۷۴ء میں ان قیدیوں کی واپسی کے بعد لیے گئے۔ اس کمیشن میں لاہور ہائی کورٹ کے چیف جسٹس انوار الحق، سندھ، بلوچستان کے چیف جسٹس ہائی کورٹ مسٹر جسٹس طفیل علی اے۔ رحمٰن بھی ممبر کی حیثیت سے شریک تھے۔ کمیشن نے اپنی تحقیقات میں واضح طور پر کہا کہ جنرل یحییٰ اس

وقت کی سب سے بڑی جماعت عوامی لیگ کو اقتدار دے دیتے تو ملک کبھی نہ ٹوٹتا۔کمیشن نے یہ بھی کہا کہ یحییٰ دونوں بڑی جماعتوں کو لڑوا کر خود ہی اقتدار کے مزے لینے پر تلا بیٹھا تھا۔اس کمیشن نے غیر جانب دارانہ تفتیش کر کے جرنیلوں کی بزدلی اور غفلت پر سخت سرزنش کی۔رپورٹ میں پاکستان آرمی کی فوجی ناکامی، درجنوں جرنیلوں، لیفٹیننٹ جنرلوں، میجر، بریگیڈیروں کی عیاشیوں، غفلت، مجرمانہ سرگرمیوں، کرپشن، نااہلی، اخلاقی بدکرداری اور شرم ناک انداز میں ہتھیار ڈال کر ملک کو شکست سے دوچار کرنے پر صدر یحییٰ، لیفٹیننٹ جنرل امیر عبداللہ خان نیازی، چیف آف جنرل اسٹاف لیفٹیننٹ جنرل عبدالحمید، جی۔ایچ۔کیو فارمیشن کے کور کمانڈروں، لیفٹیننٹ جنرل پیرزادہ، لیفٹیننٹ جنرل گل حسن، میجر جنرل عمر، میجر جنرل مٹھا، لیفٹیننٹ جنرل ارشاد احمد خان، میجر جنرل عابد زاہد، میجر جنرل بی۔ایم مصطفیٰ، میجر جنرل اے۔کے جمشید، میجر جنرل ابراہیم خان وغیرہ، کو کورٹ مارشل کرنے کی سفارش کی تھی۔اس کے علاوہ کمیشن نے اپنی رپورٹ میں اس شکست کے پیچھے بعض اخلاق سوز واقعات کو بھی ذمے دار قرار دیا۔جنرل یحییٰ اور اس کے ہم نوالہ، ہم پیالہ جرنیلوں کے ساتھ فلمی اداکاراؤں، گلوکاراؤں اور دوسرے فوجی افسروں، جوانوں، سیاست دانوں کی بیگمات، بیٹیوں، بہنوں وغیرہ کے ساتھ جائز و ناجائز تعلقات اور مراسم کا بھی ذکر کیا۔رپورٹ میں یہ انکشاف کیا گیا کہ مذکورہ جرنیل اپنے ماتحت سینئر فوجی افسروں کی بیگمات سے بھی راہ و رسم رکھتے تھے[۱۴۵]۔معروف دانش ور اور محقق سید شاہد حسین نے اپنی تصنیف میں واضح طور پر کہا کہ ایک خاص قسم کے جرنیلی نقطہ نظر کے تحت اس سقوط کا الزام سب پر دھرا جاتا ہے لیکن فوج کو اس سے بری الذمہ قرار دینے کی کوشش کی جاتی ہے جب کہ حقیقت یہ ہے کہ اس دوران فوج نے بڑی تعداد میں لوگوں کو قربانی کا بکرا بنایا۔مجیب، بھٹو اور جنرل نیازی وغیرہ کو اجتماعی اور انفرادی سطح پر ذمے دار ضرور ٹھہرایا گیا لیکن اصل ذمے دار CNCO تھی جس نے طاقت کو پوری طرح اپنے تسلط میں رکھ کر اس ہول ناک کھیل میں اپنا اہم کردار ادا کیا[۱۴۶]۔ولیم بی میلام نے اس جانب اشارہ کرتے ہوئے فوج کو نشانہ نہ بنائے جانے کی وجوہات پر روشنی ڈالی ہے۔ان کا کہنا ہے کہ پاکستان آرمی کو ایک طرح سے ریاست کے مترادف لیا جاتا ہے اور آرمی کو برا بھلا کہنے کا مطلب ریاست کو برا بھلا کہنے کے مترادف ہے[۱۴۷]۔لہٰذا کم ہی لوگ اس معاملے میں زبان کھولنے کی جرات کرتے ہیں۔کمیشن نے ایوان صدر میں ملاقات کرنے والی خواتین کی فہرست بھی فراہم کی[۱۴۸]۔رپورٹ کے صفحہ نمبر ۳۸۷ تا ۳۹۹ میں یحییٰ خان کے ساتھ وقت گزارنے والی ان ۵۰۰ خواتین کی فہرست درج ہے۔شراب اور عورتوں کے کلب، ایوان صدر کراچی اور راول پنڈی کے اندر قائم تھے۔جنگ کے دنوں میں جب کہ پوری قوم پریشانی کے عالم میں حالات پر نظر رکھے ہوئے تھی، یحییٰ خان شراب کے نشے میں دھت ان عورتوں کے ساتھ وقت گزارتا۔صفحہ ۴۰۰ تا ۴۰۶ میں ان مشہور بیگمات کے نام نامی شائع کیے گئے جو پریزیڈنٹ ہاؤس کراچی میں آتی جاتی رہیں۔دگرگوں حالات میں بھی بری شہرت رکھنے والی خواتیں کی آمد و رفت بند نہ ہوئی۔نور جہاں سے لے کر مشہور اداکاراؤں کا راج رہا۔بعض ادھیڑ عمر خواتین اپنی مارکیٹ قائم رکھنے کے لیے نصف درجن جواں سال لڑکیوں کو ایوان صدر میں لایا کرتیں۔ان تعلقات کے بدلے ان خواتین کو بڑی بڑی مراعات ملتیں۔بیگم شمیم سے خصوصی تعلق کی وجہ سے اس کے خاوند کو یحییٰ خان نے سوئزرلینڈ اور آسٹریلیا کا سفیر مقرر کیا۔اس کے والد کو جو ۷۰ برس سے بھی زیادہ کے تھے، نیشنل شپنگ کارپوریشن کا چیئرمین مقرر کر دیا۔یحییٰ کی محبوبہ نازلی بیگم کو حکم کے باوجود ٹیکسٹائل ملز لگانے کے لیے قرضہ نہ ملا تو بینک کے مینیجنگ ڈائریکٹر کو ہی برطرف کر دیا گیا۔چیف آف اسٹاف جنرل عبدالحمید، زمین، زر اور زن میں یحییٰ کے پارٹنر تھے۔لاہور میں سینی ٹوریم کی آڑ میں عورتوں کا دھندا کرنے والی سعیدہ بخاری، جنرل اے۔کے۔نیازی کی ٹاؤٹ تھی۔اس کے

علاوہ شمیم فردوس اور دیگر بہت سی خواتین کے ناجائز مراسم کی بابت کمیشن میں بہت سے سوالات اٹھائے گئے [۱۴۹]۔ اخلاقی پستی کے یہ مظاہرے دیگر فوجی افسروں اور جوانوں میں بھی دکھائی دیے۔ مشرقی پاکستان میں حالات کا فائدہ اٹھاتے ہوئے بعض ایسے واقعات ضرور ہوئے جس سے ہمارا سر شرم سے جھک گیا۔ بریگیڈئر ہدایت اللہ کی بابت کمیشن کو ایک گم نام خط موصول ہوا جس میں ۱۱ اور ۱۲ دسمبر کی درمیانی شب بنکر میں چند خواتین کو بلوائے جانے کا انکشاف کیا گیا۔ اس پر بریگیڈ کے میجر منور نے بھی اس بات کی تصدیق کی [۱۵۰]۔ گواہ نمبر ۱۶۴ میجر سجاد الحق جو سقوط ڈھاکا کے وقت خدمات انجام دے رہے تھے، نے بتایا کہ رمضان کے مہینے میں بھی ناچنے والی لڑکیوں کو جنرلوں اور کور کمانڈروں کے لطف اندوز ہونے کے لیے ایک مکان میں بلایا جاتا۔ جنرل نیازی بھی ناچنے والی لڑکیوں کے مکانوں پر اپنی گاڑی میں جاتے۔ البتہ کمیشن نے عوامی لیگ کے اس الزام کو قطعی طور پر مسترد کر دیا جس کے مطابق پاکستانی فوجیوں نے لاکھوں بنگالی لڑکیوں کو اپنی ہوس کا نشانہ بنا کر حاملہ کر دیا تھا [۱۵۱]۔ ابتدا میں شیخ مجیب الرحمٰن نے یہ الزام لگایا کہ:

Pakistani troop had raped 200,000 Bengali girls[۱۵۲].

بعد میں یہ تعداد بڑھ کر تین لاکھ [۱۵۳] اور مضحکہ خیز حد تک اس سے بھی زیادہ بتائی گئی۔ مگر کمیشن نے ان تمام الزامات کو مسترد کر دیا۔ ۱۹۷۱ء کے واقعات پر مبنی Pulitzer Prize یافتہ کتاب A Problem from hell: America and the age of Genocide میں سمنتھا پاور یہ دعویٰ کرتی دکھائی دیتی ہیں کہ مارچ ۱۹۷۱ء میں شروع ہونے والے فسادات میں پاکستانی فوج نے ۲۰۰،۰۰۰ لڑکیوں اور عورتوں کو زیادتیوں کا نشانہ بنایا [۱۵۴]۔ اس دعوے کی کسی حوالے سے تصدیق کی کوشش نہیں کی گئی [۱۵۵]۔ بھارت کے پروپیگنڈے کی وجہ سے غیر ملکی میڈیا بلا تصدیق مبالغہ آرائی پر مبنی کہانی قبول کرنے پر تیار بیٹھا تھا۔ جس میں ڈھاکا کے مظالم کو پیش کیا گیا تھا [۱۵۶]۔ قطب الدین عزیز کا کہنا ہے کہ اس پروپیگنڈے پر کہ دو لاکھ لڑکیوں کو پاکستانی فوجیوں نے حاملہ کر دیا ہے، ۱۹۷۲ء کی ابتدا میں ایک برطانوی کمیشن کی Abortion ٹیم آئی جس نے دیکھا کہ محض ایک سو سے کچھ زائد حاملہ عورتوں نے اس کمیشن کی سہولت سے فائدہ اٹھایا [۱۵۷]۔ حیرت کی بات ہے کہ جو فوجی جوان جیبوں میں قرآن حکیم لے کر جنگی ڈیوٹی انجام دے رہے تھے، وہ اس قدر بڑی تعداد میں ریپ میں کس طرح مشغول ہو گئے؟ نہ تو عوامی لیگ نے اور نہ ہی بین الاقوامی ذرائع ابلاغ نے اس سے متعلق کوئی شواہد پیش کیے اور نہ ہی بنگلا دیش کی حکومت درست اعداد و شمار کا آج تک تعین کر سکی ہے۔ عبد المنعم چودھری کی کتاب میں یہ ضرور درج ہے کہ حکومت بنگلا دیش نے ان خواتین کے لیے جو فلاحی ادارے قائم بھی کیے تو ان تین لاکھ میں کتنے لوگوں نے اس سے فائدہ اٹھایا۔ ریکارڈ کے مطابق محض سو خواتین کی شادی کی گئی [۱۵۸]۔ ان تمام مبالغہ آمیز واقعات کی بابت شرمیلا بوس جو ایک معتبر محقق کی حیثیت سے جانی جاتی ہیں، اپنی تصنیف میں عمدہ دلائل کے ساتھ تفصیل سے اظہار خیال کیا ہے۔ اس کتاب میں شامل کیس اسٹڈی کو نہایت سائنسی انداز میں ترتیب دے کر مشرقی پاکستان میں ہونے والی خانہ جنگی کو موضوع بنایا ہے۔ حکومت پاکستان کی جانب سے پیش کردہ قرطاس ابیض جس کو بنگلا دیش اور ہندوستان یکسر مسترد کرتا ہے، شرمیلا بوس کے مطابق بہت سے واقعات کے شواہد مذکورہ تحقیق سے ثابت ہوئے۔ مصنفہ اعتراف کرتے ہوئے کہتی ہیں کہ:

میری تحقیق کا آغاز بنگالیوں کے حق میں بے پناہ ہمدردی سے ہوا تھا، میرے سامنے بنگالی بہ طور مظلوم قوم موجود تھے اور یہی انصاف کے تقاضے معلوم ہوتے تھے کیوں کی دوسری جانب فوجی آمریت تھی جس

> نے الیکشن جیتنے والی پارٹی کو حکومت دینے سے انکار کر دیا تھا اور فوجی قوت کے ذریعے ان کی بغاوت کو کچلنے کی کوشش کی تھی... مجھے اپنی تحقیق کے آخری مراحل تک ان لوگوں سے دلی ہمدردی تھی جو ۱۹۷۱ء کی جنگ کے متاثرین تھے لیکن جوں جوں کہانی آگے بڑھتی گئی، اصل مظلوم میرے سامنے آتے گئے... اس پر تشدد اور برادر کش جنگ میں متاثرین کا تعلق ہر طبقے، زبان اور مذہب سے تھا اور دونوں اطراف سے سیاسی خلیج موجود تھی... جنگی واقعات کے بارے میں ایسے بہت سے افسانے جنھیں میں حقیقی سمجھتی ہوئی پروان چڑھی، یا تو جھوٹ کا پلندہ ثابت ہوئے یا ان میں حقائق کو بری طرح مسخ کیا گیا تھا[۱۵۹]۔

یہ ایک ایسی بنگالی مصنفہ کا بیان ہے جس کے اعترافی بیان سے یہ تو ثابت ہوتا ہے کہ اس سانحے کی بابت جو حقائق بین الاقوامی سطح پر خصوصاً ہندوستان، بنگلا دیش کے مصنفین نے پیش کیے ہیں وہ مبالغہ آرائی پر مبنی ہیں۔ اسی وجہ سے وہ تمام اعداد و شمار جو اس سانحے میں قتل و غارت گری کے حوالے سے بھی پیش کیے گئے وہ بھی درست معلوم نہیں ہوتے۔ پاکستانی فوج کے خلاف جو تین بڑے الزامات لگائے گئے ان میں:

> اوّل یہ کہ تیس لاکھ بنگالیوں کو فوج نے بے دردی سے قتل کیا۔ دوم تین لاکھ عورتوں کی آبروریزی کی اور سوم یہ کہ گاؤں کے گاؤں جلا دیے۔ یہی کچھ بھارتی میڈیا نے بین الاقوامی میڈیا کو فیڈ کیا اور بین الاقوامی میڈیا نے بغیر الزامات کی تفتیش پاکستان کے تشخص کو اس برے طریقے سے مسخ کیا کہ ہم پوری دنیا میں نہ صرف تنہا رہ گئے تھے بلکہ پوری دنیا کی نفرت کا نشانہ بنے[۱۶۰]۔

پاکستانی فوج نے ۲۵-۲۶ مارچ کی درمیانی شب ایک سیاسی مسئلے کو فوجی طریقے سے حل کرنے کا جو فیصلہ کیا وہ کسی بھی لحاظ سے مسئلے کا موزوں حل نہیں تھا۔ بالآخر یہی فیصلہ پاکستان کے لیے تباہی کا باعث بنا۔ اوّلاً شدید خونی خانہ جنگی اور پھر بھارت کے ساتھ باقاعدہ جنگ کے نتیجے میں پاکستان دولخت ہو گیا۔ اس سانحے کے دوران سب سے زیادہ بدنامی کا واقعہ پاکستان کی فوج کی جانب سے ڈھاکا یونی ورسٹی میں باغیوں کو کچلنے کا واقعہ تھا۔ شرمیلا بوس نے اس واقعے کی بابت بھی تحقیق کر کے دل چسپ صورت حال پیش کی ہے۔ ان کے مطابق بھارت اور بنگلا دیش میں ڈھاکا یونی ورسٹی سے متعلق سنائی جانے والی کہانیوں میں ایسا کوئی ذکر نہیں ملتا کہ یونی ورسٹی میں اسلحہ بھی موجود تھا اور یہ کہ اسٹوڈنٹ ہالز میں فائر دونوں فریقوں کی طرف سے کیے گئے تھے بلکہ کہانی کا صرف ایک رخ سامنے لایا جاتا ہے کہ آرمی نے طلبا اور پروفیسروں کو قتل کیا۔ اس طرح سے اصل واقعات کو مسخ کرنے کی کوشش کی گئی ساتھ ہی بنگالی قوم پرستوں بالخصوص ڈھاکا یونی ورسٹی میں موجود طلبہ کے موقف کی بھی نفی کی ہے جس کے مطابق مسلح طلبہ قومی ہیرو تھے۔ میڈیا رپورٹوں اور بنگالی قوم پرستی کی تاریخ کے ریکارڈ سے بھی یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ یونی ورسٹی میں بڑی تعداد میں اسلحہ جمع کر کے نوجوانوں کو عسکری تربیت دی جا رہی تھی۔ یہ عجیب متضاد آرا تھیں جن میں ایک جانب انھیں ہیرو اور دوسری جانب نہتے مظلوم بنا کر پیش کیا گیا[۱۶۱]۔ شرمیلا بوس نے ان واقعات کے عینی شاہدین کے انٹرویو کر کے حالات کا درست تجزیہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ یونی ورسٹی میں ہلاکتوں کی تعداد ۱۷۷، ۱۸۸ اور ۳۰۰ تک بتائی گئی۔ حالاں کہ یونی ورسٹی میں مرنے والوں کی جو یادگار تعمیر کی گئی اس کے مطابق فیکلٹی ممبران، اسٹاف اور طلبا کو ملا کر پورے سال کے دوران مرنے والوں کی تعداد ۱۴۹ تھی[۱۶۲]۔ اسی طرح سنکھری پاڑہ کے ایک ہندو علاقے کی بابت سنڈے ٹائمز کے رپورٹر اپنی

تصنیف میں ہلاکتوں کی تعداد ۸۰۰۰ تک بتاتے ہیں۔شرمیلا بوس نے اس پر بھی اعتراض کیا اور متعلقہ خاندان جو اس سانحے کے وقت وہاں آباد تھا، کے لواحقین سے مل کر ہلاکتوں کی درست تعداد کا تعین کرنے کی کوشش کی۔اس کے نتیجے میں محض ۱۴ سے ۱۶ ہلاکتوں کا انکشاف ہوا[۱۶۳]۔اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ بنگالی قوم پرستوں اور ہندوستانی ذرائع ابلاغ کے واقعات کو کس قدر توڑ مروڑ کر پیش کیا ہے۔ایسی متعدد مثالیں اس تصنیف میں ملتی ہیں جن کے بعد مختلف بنگالی اور ہندو مصنفین کا یہ دعویٰ کہ سقوط ڈھاکا کے سانحے میں تیس لاکھ بنگالی مارے گئے[۱۶۴]، غلط معلوم ہوتا ہے۔حمود الرحمٰن کمیشن نے تین ملین بنگالیوں کے قتل عام کو مبالغہ آمیز قرار دیتے ہوئے کہا کہ اس فوجی آپریشن میں ۲۶ ہزار افراد مارے گئے[۱۶۵]۔لیفٹیننٹ کرنل سکندر خاں بلوچ نے تین ملین ہلاکتوں کی تعداد کو اس صدی کا سب سے بڑا جھوٹ قرار دیا[۱۶۶]۔شرمیلا بوس نے انگریزی اور بنگالی زبانوں میں ۱۹۷۱ء کے حوالے سے دست یاب مواد کا جائزہ لینے کے بعد تین ملین افراد کی نسل کشی کے اعداد وشمار کو خود ساختہ اور حقائق کے برخلاف قرار دیا ہے۔سیزن اور روز کا حوالہ دیتے ہوئے بنگالیوں کی جانب سے یہ اعداد وشمار خود مجیب الرحمٰن نے بتائے۔یہی تعداد میڈیا رپورٹوں سے ظاہر ہے۔مثلاً ۱۱ جنوری ۱۹۷۴ء کو ''دی ٹائمز'' کے پیٹر ہیز ہرسٹ نے، ڈھاکا میں مجیب کی واپسی اور استقبال کے بعد خطاب کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ ''میرے تین ملین لوگوں کو مار ڈالا''[۱۶۷]۔مجیب کے اس دعوے کی قلعی خود بنگال کے مشہور محقق ڈاکٹر عبدالمنعم چودھری کے اس بیان سے کھل جاتی ہے جس میں انھوں نے کہا کہ مجیب الرحمٰن مغربی پاکستان سے رہا ہوکر ۸ جنوری ۱۹۷۲ء کو ڈھاکا آنے کے لیے لندن پہنچے تو وہاں انھوں نے بیان دیتے ہوئے ہلاکتوں کی تعداد دس لاکھ بتائی مگر محض دو روز بعد دس جنوری کو بھارتی ایجنسیوں سے ملنے کے بعد ڈھاکا پہنچ کر دینے والے بیان میں تین ملین افراد کی ہلاکتوں کا دعویٰ کیا[۱۶۸]۔شرمیلا بوس کے مطابق کسی بھی سرکاری دستاویز سے اس بیان کی تصدیق نہیں ہوئی۔یہ محض عوامی جلسے میں کیا جانے والا دعویٰ تھا۔ان شواہد کے باوجود جنوبی ایشیائی اور مغربی میڈیا سمیت علمی حلقے تین ملین کی تعداد کو دہائیوں تک بلاتصدیق استعمال کرتے رہے[۱۶۹]۔رونق جہاں جیسی معتدل مصنفہ نے بھی ۹ ماہ کے دوران ہلاکتوں کی تین ملین تعداد کو بغیر کسی حوالے سے اپنی کتاب میں درج کر دیا[۱۷۰]۔کئی حلقوں کی جانب سے بلا جواز تین ملین کے اعداد وشمار کو دہرائے جانے کے باوجود حقائق کے مابین پایا جانے والا فرق مبصرین کی آنکھوں میں کھٹکتا رہا۔۶ جون ۱۹۷۲ء کو ''دی گارجین'' میں لاکھوں لاپتا ''The Missing Millions'' کے عنوان سے شائع ہونے والی رپورٹ میں ولیم ڈارمنڈ لکھتے ہیں کہ:

> شیخ مجیب کے جنوری کے اوائل میں بنگلا دیش آنے کے بعد تین ملین افراد کے مارے جانے کا ذکر بار بار دہرانے سے بعض فی نفسہ ان میں جواز پیدا ہو جاتا ہے اور پھر کسی قسم کے حوالوں کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔میں نے بنگلا دیش کے کئی دورے کیے ہیں اور گاؤں کی سطح سے لے کر حکومتی اہل کاروں تک سے میں نے اس سلسلے میں بات کی ہے۔اپنی ساری کاوشوں کے بعد مجھ پر یہ منکشف ہوا کہ تین ملین اموات کا دعویٰ اس قدر مبالغہ آرائی پر مبنی ہے کہ یہ مضحکہ خیز نظر آنے لگتا ہے[۱۷۱]۔

لیفٹیننٹ کرنل سکندر خاں بلوچ کے مطابق ۹ ماہ تک جاری رہنے والے اس فوجی ایکشن میں حصّہ لینے والے فوجیوں کی تعداد کسی بھی مرحلے پر تیس ہزار سے زیادہ نہ تھی۔مکتی باہنی اور ایسٹ بنگال رجمنٹ اور ایسٹ پاکستان رائفلز کے لوگ مکمل طور پر تربیت یافتہ اور مسلح تھے، وہ مقامی تھے اس لیے موثر گوریلا کارروائیاں کررہے تھے، ان حالات میں پچیس، تیس ہزار پاکستانی فوجی اگر تیس لاکھ لوگوں

کو مار دیتے ہیں اور تین لاکھ ریپ کرتے ہیں تو یہ مافوق الفطری قسم کی کارروائی معلوم ہوتی ہے، انسانی ہرگز نہیں۔ اگر تمام فوجیوں اور پولیس اہل کاروں سمیت ۴۵ ہزار کو بیک وقت رائفلیں دے کر اس قتل عام پر لگایا جائے تو ہر فوجی کو کئی کئی ہزار افراد مارنا پڑیں گے۔ اگر مخالفین کے ہاتھ پاؤں باندھ کر لائن میں اکٹھا کھڑا کر کے بھی یہ کارروائی کی جاتی تب بھی فی جوان، کئی ہزار آدمی روزانہ رائفلوں سے نہیں مارا جا سکتا۔ سوال یہ ہے کہ اگر اتنے لوگ مارے گئے تو انھیں دفن کہاں کیا گیا [۲۷۱]۔ کئی ایسے شواہد پیش کیے جا سکتے ہیں جو ان مبالغہ آمیز دعوؤں کی قلعی کھولنے کے لیے کافی ہے۔ مثلاً اپریل ۱۹۷۱ء میں بنگالیوں کی جانب سے ہزاروں لاشوں اور قبروں کے دعوؤں کے برعکس ہنری کسنجر کے مطابق صرف بیس کے لگ بھگ لاشیں مل پائیں۔ اسی واقعے کی بابت جون ۱۹۷۲ء میں ڈرمنڈ نے لکھا کہ اس بات میں کوئی شبہ نہیں کہ بنگلا دیش کے طول وعرض میں ''اجتماعی قبریں'' موجود ہوں گی لیکن پاکستان کا شدید سے شدید مخالف بھی اس بات کا دعویٰ نہیں کر سکا کہ ان اجتماعی قبروں میں ایک ہزار سے زائد مقتولین کو دفن کیا گیا۔ مزید برآں یہ کہ کسی شخص کے اجتماعی قبر میں موجود ہونے کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ مرنے والا بنگالی ہی تھا۔ قتل گاہوں اور اجتماعی قبروں کی سائنسی انداز میں تفتیش نہیں کی گئی کہ مرنے والا بنگالی تھا کہ غیر بنگالی۔ حالات و واقعات کے مطابق تین ملین کے اعداد وشمار کی حیثیت ایک افواہ عظیم سے زیادہ نہیں۔ اس لیے دانش وروں اور اسکالروں کو چاہیے کہ اس تعداد کو دہرانے سے گریز کریں [۳۷۱]۔ حمود الرحمٰن کمیشن کے سربراہ جو کہ خود بھی بنگالی تھے نے لکھا کہ ''اتنا نقصان تو اس وقت بنگلا دیش میں موجود پاکستان آرمی کی پوری نفری اس صورت میں بھی نہیں پہنچا سکتی کہ وہ تمام کام چھوڑ کر صرف یہی کام کرتے رہتے [۴۷۱]۔ کمیشن نے محض ۲۶۰۰۰ ہلاکتوں کا ذکر کیا۔ سیزن اور روز نے ہندوستانی اہل کاروں سے جو انٹرویو کیے اس کے مطابق ابتداً تین لاکھ اور پھر دباؤ کے تحت اس کے ساتھی نے اشارتاً اس سے اختلاف کیا تو یہ تعداد پانچ لاکھ بتائی [۵۷۱]۔ دونوں میں سے کوئی بھی تعداد زمینی حقائق پر مبنی نہ ہونے کی وجہ سے شرمیلا بوس اس تعداد کو ماننے سے انکاری ہیں [۶۷۱]۔ خود بنگلا دیش سے تعلق رکھنے والے معتدل صحافیوں اور دانش وروں نے اس سے اختلاف کیا ہے۔ مشہور صحافی جوہری نے لکھا کہ ''مجھے سمجھ نہیں آتی کہ ۸ ماہ کی معمولی گوریلا کارروائیوں میں تیس لاکھ لوگ کیسے مارے گئے اور تین لاکھ عورتوں کی کس طرح عصمت دری کی گئی [۷۷۱]؟ کمال متین الدین اپنی تصنیف "Tragedy of Error" میں مرنے والوں کی تعداد ایک لاکھ تک بتاتے ہیں اور ان میں سے ۸۰ فی صد تعداد ان لوگوں کی ہے جو غیر بنگالی تھے [۸۷۱]۔

ان تمام تحقیقات کے نتیجے میں شرمیلا بوس نے تعداد کے متعلق اہم نکتہ اٹھاتے ہوئے لکھا کہ تعداد جو بھی ہو، اب بھی ممکن ہے کہ ایسی تعداد کا پتا لگایا جا سکے جسے ہم قابل بھروسا کہہ سکیں جیسے (۱) کتنے ''عسکریت پسند'' اس جنگ میں مارے گئے۔ (۲) کتنے بہاری مسلمان اور پاکستان کے حامی مسلمان بنگالیوں کے ہاتھوں قتل ہوئے۔ (۳) کتنے لوگ پاکستان، بھارت اور مکتی باہنی کی فائرنگ اور بمباری سے مارے گئے۔ ایک بات تو واضح ہے کہ ظلم و بربریت کا مظاہرہ کسی ایک فریق کی جانب سے نہیں کیا گیا۔ مرنے والوں کی قابل قدر تعداد ان غیر بنگالیوں کی تھی جو بنگالیوں کی لسانی عصبیت کی بھینٹ چڑھ گئے۔ ان رپورٹوں میں جن میں زمین دریاؤں کو نعشوں سے بھرا ہوا بتایا گیا ہے، ان میں جہاں کہیں بھی مردوں کے ساتھ عورتوں اور بچوں کا ذکر ملتا ہے، وہ لازماً بہاری ہی تھے کیوں کہ بنگالیوں نے بہاریوں کو بلا امتیاز قتل کیا تھا، جب کہ پاکستان آرمی کے اہل کاروں نے صرف بالغ بنگالی مردوں کو نشانہ بنایا تھا۔ ہلاک ہونے والے بنگالیوں اور غیر بنگالیوں میں تفریق مشکل تھی، اسی طرح عسکریت پسندوں اور غیر عسکریت پسندوں میں بھی تمیز ممکن نہیں تھی۔ حقیقتاً فی

الوقت یہ ممکن نظر نہیں آتا کہ ہلاکتوں کی علاحدہ علاحدہ درجہ بندی کی جا سکے۔شرمیلا بوس نے مسلح افواج خصوصاً بھارتی افسروں کی مرتب کردہ اعداد و شمار کا جو نقشہ اپنی تصنیف میں کھینچا ہے اس سے بھی مبالغہ آرائی کی قلعی پوری طرح کھل جاتی ہے۔اس کے علاوہ جنگی قیدیوں سے متعلق بھی جو اعداد و شمار پیش کیے گئے وہ درست نہیں۔عام دعویٰ یہی ہے کہ ۹۳۰۰۰ پاکستانی فوجی اہل کاروں کو جنگ کے خاتمے پر جنگی قیدی بنایا گیا۔مختلف ذرائع ابلاغ میں اس تعداد کو پیش بھی کیا گیا،لیکن کبھی کسی نے اس تعداد کو چیلنج نہیں کیا۔شرمیلا بوس کا کہنا ہے کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ ۳۴۰۰۰ فوجی اہل کار اور ۱۱۰۰۰ سویلین پولیس و دیگر مسلح اہل کار جن کی مجموعی تعداد ۴۵۰۰۰ بنتی ہے، ۹۳۰۰۰ میں تبدیل ہو گئے ہوں۔مگر بھارتی اور عالمی پروپیگنڈے کے مطابق ۹۳۰۰۰ فوجیوں کو جنگی قیدی بنایا گیا۔اس طرح وہ ان اعداد و شمار کو بھی حرف غلط قرار دیتی ہیں [۱۷۹]۔تقریباً نصف صدی گزرنے کے باوجود سانحہ ۱۹۷۱ء کے واقعات پر غیر جذباتی اور جانب دارانہ انداز میں کی گئی،علمی تحقیق کا فقدان پایا جاتا ہے۔البتہ رچرڈ سیزن اور لیو روز کی تصنیف "War and secession: Pakistan,India and the creation of Bangladesh,1990" وہ واحد معتبر کتاب مانی جاتی ہے جس میں اصل حقائق کو جدید اور معتبر حقائق کی روشنی میں جامعیت کے ساتھ استعمال کیا گیا ہے۔ویں ولکوسن کی تصنیف:The Emergence of Bangladesh اس جانب ہماری توجہ مبذول کرواتی ہے کہ ان واقعات سے سبق حاصل کرنے کے بعد جنوبی ایشیا میں مستقبل کی امریکی پالیسی کیا ہونی چاہیے۔کتاب میں واقعات کا مفید تجزیہ بھی ملتا ہے۔اس تصنیف میں تحقیق کو اس طرح برتا گیا جس پر چل کر سیزن اور روز نے اپنی تحقیقات کو آگے بڑھایا۔آل سوئلز کالج،آکسفرڈ (All Souils College Oxford) کے رفیق رابرٹ جیکسن نے ۱۹۷۲ء میں بھارت، پاکستان اور بنگلا دیش کا دورے کے دوران حاصل ہونے والی معلومات پر مبنی تاثرات کو جنوبی ایشیا کا بحران (South Asian Crisis) کے عنوان کے تحت قلم بند کیا۔اس کتاب میں حالات اور واقعات کو بڑی قوتوں کے مفادات کے تناظر میں دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔مصنف نے اس بحث کو سمیٹتے ہوئے آخری باب میں واضح طور پر اس بحران کا ذمے دار بھارت کو قرار دیا ہے۔بنگلا دیشی مصنف رونق جہاں کی تصنیف Pakistan: Failure in National Integration "The disintegration of Pakistan and Birth of Bangladesh میں ۱۹۷۱ء کے واقعات اور قیام بنگلا دیش کے عوامل پر روشنی ڈالتے ہوئے ایوب اور یحییٰ خان کی پالیسی وغیرہ کا تجزیہ بھی کیا ہے۔کمال متین الدین پاکستان آرمی میں لیفٹیننٹ جنرل کے عہدے پر فائز رہے۔انھوں نے اپنی تصنیف Tragedy of Errors: East Pakistan crises میں رونق جہاں کی جانب سے پیش کردہ مبینہ طور پر بنگالیوں کے خلاف ہونے والے امتیازی سلوک کو زیر بحث لاتے ہوئے مواد کا تجزیہ بھی کیا اور آرمی اور حکومت وقت کی پالیسیوں کا ناقدانہ جائزہ بھی لیا ہے۔تاہم پاکستانی جرنیل ہونے کے ناتے کہیں کہیں جانب داری ضرور دکھائی دیتی ہے۔برطانوی مورخ صحافی ایل۔ایف۔رش بروک ولیمز اپنی تصنیف The East Pakistan Tragedy میں عوامی لیگ،مغربی میڈیا اور بھارت پر سخت تنقید ملتی ہے۔اس کتاب میں پاکستان کے حق میں جھکاؤ دکھائی دیتا ہے۔ان کے مطابق عوامی لیگ دراصل نسل قتل کشی کے جرم میں ملوث رہی۔اس کے علاوہ بعض ملکی اور بین الاقوامی سرکاری دستاویزات کا ذکر بھی شرمیلا بوس نے اپنی تصنیف میں کیا ہے۔اس کے علاوہ غیر شریک افراد کے تبصرے اور جنگ میں شریک افراد کی تحریروں کا ناقدانہ تجزیہ بھی کیا ہے [۱۸۰]۔

اس سانحے کے بعد زندہ بچ جانے والے بہاری بھی کسی المیے سے کم نہیں۔لاکھوں کی تعداد میں محصورین پاکستانیوں نے کئی دہائیوں تک کس مپرسی کی زندگی گزاری۔شیخ مجیب نے اقوام متحدہ میں اپنے خطاب میں ابتداً ان ۶۳ ہزار پاکستانی خاندانوں کا ذکر کرتے

ہوئے اسے ایک بڑا انسانی مسئلہ قرار دیا۔ مجیب کے مطابق ۱۷ لاکھ غیر بنگالی جنھیں بہاری کہا جاتا ہے، نے بنگلا دیش میں رہنے کا عندیہ دیا لیکن ۳ لاکھ محصورین جنھوں نے ریڈ کراس کے تحت پاکستان کا انتخاب کیا، وہ پاکستانی حکومت کے قبول نہ کرنے کی وجہ سے اب تک بنگلا دیش میں پھنسے ہوئے ہیں۔ ۱۹۷۴ء میں پاکستانی موقف اس طرح سامنے آیا کہ وہ ایک لاکھ سے زائد غیر بنگالیوں کو پاکستان منتقل کر کے اس مسئلے کو حل کر چکا ہے۔ روز نامہ ''بنگلا دیش ٹائمز'' اپریل ۱۹۷۵ء کی اشاعت میں بنگلا دیش کے سیکریٹری خارجہ مبارک حسین کے مطابق ICRC کے تحت ایک لاکھ ۹ ہزار افراد کو پاکستان منتقل کیا گیا[۱۸۱]۔ جنرل ضیاالحق کی توجہ جب اس انسانی مسئلے کی طرف مبذول کرائی گئی تو دسمبر ۱۹۸۴ء میں انھوں نے اسے بنگلا دیش کا مسئلہ گردانتے ہوئے وہ متنازعہ جملہ کہا کہ ''ہم یہاں بھکاری اکٹھے نہیں کر سکتے''، جس کے بعد اورنگی ٹاؤن کراچی اور دیگر آبادیوں میں احتجاجی سلسلہ شروع ہو گیا۔ پولیس نے آنسو گیس کے گولے چھوڑے تو پتھراؤ کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ متعدد افراد زخمی ہوئے۔ کراچی کے میئر عبدالستار افغانی اور امیر تحریک اسلامی محمود اعظم فاروقی سمیت متعدد سیاست دانوں نے صدر کے اس بیان پر تنقید کی۔ دوسری طرف سندھ کے ۳۰ سے زیادہ دانش وروں نے متعصّبانہ رویہ اختیار کرتے ہوئے کہا کہ ان بہاریوں کی آبادکاری کو سندھ میں قبول نہیں کیا جائے گا[۱۸۲]۔ اس طرح کے مسائل کا شکار ہو کر محصورین بنگلا دیش کی زندگی اذیت ناک ہوتی چلی گئی اور آج بھی ان لوگوں کا کوئی پرسان حال نہیں۔

دوسری طرف بنگلا دیش میں شیخ مجیب کا دور شروع ہوتے ہی نئی مملکت میں ہر قسم کے جرائم نے اپنا رنگ جما لیا۔ بعض استیصال پسند اسی موقع کے انتظار میں تھے، رشوت خوری اور اقربا پروری عام ہوئی۔ پولیس اور فوج کے دستے بھی چوری اور ڈاکا زنی میں ملوث ہو گئے۔ خود مجیب نے اپنے عزیزوں اور دوستوں کو نوازنے کے علاوہ کئی کئی بینکوں میں رقمیں جمع کرنی شروع کر دیں۔ یہ رقم بھارتی بنکوں تک پہنچ گئیں۔ کوٹھیاں خریدی گئیں۔ اس صورت حال پر بعض انصاف پسند فوجی افسروں میں غم و غصّے کی لہر دوڑ گئی اور انھوں نے فیصلہ کر لیا کہ مجیب کی مذموم حکومت کو ہر صورت میں بدلنا ضروری ہے جو پچھلے تین برس آٹھ ماہ سے بنگالی قوم پر مسلط ہے۔ لہٰذا ۱۵ اگست ۱۹۷۵ء کی صبح پانچ فوجی افسران جو ابتداً مجیب ہی کے ہم نوا تھے، پوری طرح مسلح ہو کر ان کی کوٹھی پہنچے۔ مجیب اوپر کی منزل پر موجود تھے۔ وہ نیچے اترنا چاہتے تھے کہ گولیوں کی بوچھاڑ نے چشم وزدن میں بنگلا بندھو کا کام تمام کر دیا[۱۸۳]۔ برہان الدین احمد نے اپنے مضمون "The Assassination of Shaikh Mujib" میں مجیب الرحمٰن کے قتل کی لمحہ بہ لمحہ روداد کو تفصیل سے بیان کیا ہے[۱۸۴]۔ اس کے علاوہ آندھا حافظ جو اس قتل وقت مجیب کے ہم راہ موجود تھے، نے اپنے مضمون "The Killing of Shaikh Mujib" میں بھی ان کرب ناک حالات کی لمحہ بہ لمحہ روداد کو قلم بند کیا۔ ان کے بیان کے مطابق ۱۴ اگست ۱۹۷۵ء کے قریب پانچ بج کر ۴۰ منٹ پر مشین گن سے نکلنے والے برسٹ نے مجیب کے جسم کے دائیں حصے میں ایک بڑا سوراخ بنا کر بنگلا دیش کے خالق کو ہمیشہ کی نیند سلا دیا۔ بیس منٹ تک ہونے والی مسلسل فائرنگ کے نتیجے میں مجیب کی والدہ، بیوی اور بیس برس کی بہن بھی خون میں لت پت پڑی تھیں۔ اس کی دونوں جوان بیٹیاں بھی اس واقعے میں زخمی ہوئیں۔ اس کا پانچ برس کا بیٹا، دس اور پندرہ برس کی دو بہنیں، گیارہ برس کا بھائی، گھریلو آیا، ملازم اور کزن شہید الاسلام وغیرہ موقع پر ہی ہلاک ہو گئے[۱۸۵]۔ اس سے قبل ڈھاکا یونی ورسٹی کے بعض ہالوں میں مجیب واد کے حامیوں اور مخالفوں میں مسلح جھڑپیں ہوئیں[۱۸۶]۔ جس سے ان اختلافات کی شدت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ سنار بنگلا کے جو سہانے خواب اس قوم کو دکھائے گئے تھے، وہ بہت جلد چکنا چور ہو گئے۔ ہر طرف دہشت کے اس ماحول میں لوگوں کو بہ مشکل تن ڈھانپنے کے لیے کپڑے میسر تھے۔ اسمگلنگ عام

ہوگئی۔مولانا بھاشانی نے اس صورت حال کے خلاف آواز بھی بلند کی۔ردعمل میں انھیں چین اور پاکستان کا ایجنٹ قرار دیا گیا۔۱۹۷۲ء کے ابتدامیں ہی چترا لیگ جوکہ عوامی لیگ کے طلبا کی نمائندہ جماعت تھی، کے اندراختلاف رائے پروان چڑھنا شروع ہو چکا تھا۔اے۔ ایس۔ایم رب اور شاہ جہاں سراج نے اعلان کردیا کہ وہ مجیب واد پر یقین نہیں کر سکتے۔دوسری جانب عبدالقدوس مکھن اور نور عالم صدیقی کا موقف تھا کہ مجیب واد ہر قیمت پر قائم ہوکر رہے گا۔بہت مختصر وقت میں یہ بحران پورے بنگلا دیش میں پھیل گیا۔یونی ورسٹی میں مسلح جھڑپوں کے علاوہ انقلابی حکومت کے قیام کے مطالبے نے خوب زور پکڑا۔۲۴ جولائی ۱۹۷۲ءکو بیت المکرّم کے سامنے متحارب گروپوں کے درمیان شدید جھڑپیں بھی ہوئیں۔عوامی لیگ نے ہندوستانی آئین کے برخود متناقص چار اصولوں یعنی قوم پرستی، جمہوریت، سوشل ازم اور سیکولرازم پر چلانے جا جو بیڑہ اٹھایا،اس نے اس انتشار کو مزید پروان چڑھایا۔مولانا بھاشانی اور دیگر رہنماؤں کی گرفتاری، عوامی جلسوں میں شیخ مجیب سے القابات و خطابات کی واپسی، ڈریکولائی اسپیشل پاور ایکٹ جیسے اقدامات، بکسال کی تشکیل اور ایسے ۸ متعدد اقدامات نے مجیب کو اپنے زوال کے قریب تر کر دیا[۱۸۷]۔

اس پورے پس منظر میں پاکستانی ذرائع ابلاغ کا کردار بھی بہت منفی رہا۔اخبارات اور ٹیلی وژن سب اچھا ہے کا راگ الاپ کر حکومت کو خوش کرنے کی کوشش کرتے رہے۔اس کے علاوہ حکومت نے بھارت کے عزائم اور ارادوں کو بھی بالکل نظر انداز کیا جب کہ عالمی اخبارات ۱۹۷۱ء کے آغاز سے ہی ہندوستان کی فوجی تیاریوں کی خبر دے رہے تھے[۱۸۸]۔پوری قوم جنگ کے نتیجے کے بارے میں تشویش میں مبتلا تھی لیکن مشرقی محاذ کے جنرل حالات کے معمول پر ہونے کا دعویٰ کر کے یہ اعلان کر رہے تھے کہ دشمن کے ٹینک ان کے سینے پر سے گزر کر ڈھاکا میں داخل ہوں گے[۱۸۹]۔قرطاس ابیض کی روداد اور اس بحران کے دوران صدر یحییٰ خان کی تقریروں کے درجنوں اقتباس اس قلعی کو کھولنے کے لیے کافی ہیں۔ان کھوکھلے نعروں اور دعوؤں کو لاہور سے شائع ہونے والے ہفت روزہ ’’پاک جمہوریت‘‘ نے اگست ۱۹۷۱ء کے خاص نمبر میں بڑے اہتمام کے ساتھ شائع بھی کیا گیا[۱۹۰]۔اس کے علاوہ ستمبر ۱۹۷۱ء کے ’’ماہ نو‘‘ میں صدر یحییٰ کا جو ٹیلی وژن انٹرویو شائع کیا گیا،اس میں بھی اس قسم کے دعوے کیے گئے کہ پاکستان ’’اپنے دفاع کے لیے پوری قوت سے جنگ کرے گا‘‘، ’’میں جلد اقتدار عوام کے نمائندوں کو منتقل کر دوں گا‘‘، ’’شیخ مجیب کے خلاف غداری اور تشدد کے الزامات میں مقدمہ چلایا جائے گا‘‘[۱۹۱] وغیرہ۔مگر یہ تمام دعوے محض سیاسی چال کے طور پر کیے گئے۔حقیقت تو یہ ہے کہ رفتہ رفتہ مشرقی پاکستان اپنے انجام کی طرف بڑھ رہا تھا اور مقتدر قوتیں عوام کو دھوکا دینے میں مصروف تھیں۔افسوس اور ستم کی بات یہ ہے کہ اس تنازعے نے نہ صرف ملک کو دو لخت کیا بلکہ پوری قوم کی تذلیل بھی ہوئی۔اسباب شکست چنداں نا قابلِ فہم نہیں، اپنے گریباں میں جھانکنے کی ضرورت ہے۔کمزوری ہماری ذات میں تھی اس کی بیرونی عوامل میں تلاش بے سود ہے۔ہم نے جس طرح سے نو آبادیاتی نظام کی یادگار افسر شاہی، چودھراہٹ اور طاقت کے استعمال کو فروغ دیا،اس کے زہریلے اثرات کو معاشرے کے رگ و پے میں سرایت کرنے کا پورا پورا موقع ملا۔یونی ورسٹی، کالجز اور ملک کے دانش وراس معاملے میں ناکام ثابت ہوئے۔لوگوں کی توجہ اور تمام تر قوت قومی مفاد سے ہٹ کر علاقائی مفادات پر مرکوز ہوگئی۔معاشرہ طبقات اور لسانی اختلافات کا شکار ہوگیا۔قومی زندگی میں غیر یقینی صورت حال کی وجہ سے بھی لوگ علاقائی عصبیت کا شکار ہو گئے۔ہمارے ذرائع ابلاغ قومی زندگی کے اصولوں اور پاکستان کے نظریاتی اساس کو اجاگر کرنے کے بجائے مخصوص شخصیتوں کے ڈھنڈورچی بن گئے۔۱۹۷۱ء کے دوران محکمہ اطلاعات نے اپنا تمام تر وقت اور وسائل، ناپسندیدہ ٹولے کے سیاسی اقتدار کو تحفظ

دینے میں مصروف رہے اور دشمن کے معاندانہ پروپیگنڈے سے کوئی تعرض نہ کیا گیا۔ بھارتی پروپیگنڈے نے افواج پاکستان کے خلاف افترا پردازی کا طوفان کھڑا کر دیا اور پاکستانی فوجی افسروں اور جوانوں کو شیطان مجسم روپ میں دنیا کے سامنے پیش کیا [۱۹۲]۔ اس پروپیگنڈے کا اثر عالمی رائے عامہ پر بہت منفی پڑا۔ مشرقی پاکستان میں کام کرنے والے افسران کے حقارت آمیز رویے کا تذکرہ ایوب خان اور صدیق سالک نے بھی اپنی تصانیف میں کیا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مغربی پاکستانیوں نے بنگالیوں کی محبت اور حمایت حاصل کرنے کی بھی صدق دل سے کوشش نہیں کی۔ امریکی نامہ نگار نے اس رویے کی بابت لکھا کہ یہ نسلی منافرت ان دونوں خطوں کے لوگوں کے درمیان دشمن قوموں سے بھی زیادہ تھی۔ سوائے مذہب کے دونوں میں کوئی قدر مشترک نہ تھی۔ پنجابی بے حس اور سنگ دل ہوتے ہیں، سپہ گری اور حکم رانی ان کے محبوب پیشے ہیں جب کہ بنگالی متلون مزاج اور زندہ دل ہیں، انھیں ادب اور سیاست سے لگاؤ ہے [۱۹۳]۔ اس سے عالمی سطح پر پاکستانی افواج کے بارے میں کیے جانے والے پروپیگنڈے کے نتائج کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ بیروت سے تعلق رکھنے والے ایک محقق نے اس بابت لکھا کہ ایک محتاط اندازے کے مطابق دنیا بھر کے اخبارات اور رسائل میں اس حوالے سے نو ہزار آٹھ سو بہتّر مقالات شائع ہوئے۔ یہ سب کے سب پاکستان کے خلاف زہریلے مواد سے بھرپور تھے۔ اسی اثنا میں کوئی دو سو کتب اور آٹھ سو فلمیں بھی تیار کی گئیں جنھیں دنیا بھر کے سینما اور ٹیلی وژن میں دکھایا گیا۔ تقریباً ڈھائی ہزار کے قریب تصاویر دنیا بھر کے اخبارات کو فراہم کی گئیں۔ بنگالی زبان میں چھوٹے بڑے تین ہزار کتابچے اور پمفلٹ بانٹے گئے۔ اور ان سب عمل میں روس، برطانیہ، امریکا، اسرائیل اور بھارت پیش پیش رہے [۱۹۴]۔

بنگلا دیش کے قیام سے قبل جیسا کہ مذکورہ صفحات میں بیان کیا جا چکا ہے کہ کس طرح سادہ لوح بنگالیوں کو یہ باور کرایا گیا کہ اگر وہ پاکستان سے ایک دفعہ چھٹکارا حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے تو مسرت و شادمانی، خودمختاری، امن اور خوش حالی کے نئے دور کا آغاز ہوگا۔ غریب بنگالیوں کا یہ خواب تو آج تک شرمندہ تعبیر نہ ہوسکا البتہ بنگلا دیش کی عوام آج بھی غربت اور پس ماندگی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔ آج کا بنگال کلی طور پر ہندوستان پر انحصار کیے بیٹھا ہے۔ کئی ایسے معاہدے اس بات کا ثبوت ہیں جن میں بنگلا دیش سے زور اور زبردستی کی بنیاد پر ہندوستان نے ان کی خودمختاری کو روندا۔ ہمیشہ سے وہاں کے فوجی معاملات پر ہندوستان کا عمل دخل رہا۔ میاں افسر یاب قریشی نے ''۱۹۷۱ء حقیقت اور فسانہ'' میں یہ تک لکھا کہ بنگلا دیش کی مسلح افواج کی ترقی بھی نئی دلّی کی منظوری سے مشروط ہوتی ہے۔ کابینہ کی ردوبدل میں بھی ہندوستان کی مرضی شامل ہوتی ہے [۱۹۵]۔ پاکستان کے دولخت کرنے کے عمل میں شامل بعض بنگالی اس قدر نفرت، قتل و غارت گری اور ظلم کے بعد یہ کہنے پر مجبور ہوئے انھیں بنگال کی آزادی ضرور چاہیے تھی لیکن اس کی بہت بھاری قیمت ادا کرنی پڑی ہے۔

جن بنگالیوں نے ہندوستان میں پناہ لی ان کے ساتھ ہونے والے سلوک پر بھی بہت کچھ لکھا گیا۔ اس زمانے میں جب مکتی باہنی سرحد پر برسرپیکار ہوتی تھی۔ تو دوسری طرف خیموں کے شہر منڈیوں میں تبدیل ہو جاتے تھے۔ اسپرو کی ایک گولی موٹے چاولوں کے ایک پاؤ اور ریلیف کارڈ کی ایک جھلک سے کیا کچھ نہیں خریدا جاسکتا تھا۔ ایک بھارتی ٹکے سے جو اس وقت آدھے ٹکے کے برابر تھا، آپ پوری دنیا خرید سکتے تھے۔ امدادی محکموں کے بھارتی کارندے رات رات بھر گدھوں کی طرح کیمپ کے اردگرد منڈلاتے رہتے [۱۹۶]۔ دوسری طرف بہاریوں کے ساتھ جو سلوک بنگلا دیش اور پھر خود ان کے اپنے ملک پاکستان میں ہوا، ان کی قابلِ رحم حالت پر افسوس ہوتا

ہے۔ بنگلا دیش انھیں قبول کرنے کو تیار نہیں اور پاکستان میں بھی زندگی ان کے لیے آسان نہیں۔محصورین کی آباد کاری کی بابت مشہور وکیل ایم۔ ڈی۔ طاہر کی درخواست لاہور ہائی کورٹ میں ان کے انتقال کے بعد داخل دفتر کردی گئی۔قطب الدین عزیز نے خود بھی ۲۰۱۰ء میں ایک آئینی درخواست دائر کی جو فوری طور پر رد کردی گئی۔سپریم کورٹ نے بھی ۲۰۱۵ء میں عبدالجبار خان کی جانب سے دائر کی گئی درخواست مسترد کردی [۱۹۷]۔ان بہاری خاندان کے حصے میں محض خوف و دہشت کے سوا کچھ نہیں آیا۔معروف صحافی اور تجزیہ کار علی احمد خان نے اپنی یادداشوں پر مبنی تصنیف ''جیون کہانی''میں اس کرب انگیز احساس کی بابت لکھتے ہیں کہ:

> ایک زندگی میں بسنے اور اجڑنے کے اس عمل کے بار بار دہرائے جانے کا ایک انسان پر کیا اثر پڑتا ہے، یہ تو میں نہیں جانتا،لیکن میری ذات پر اگر اس کا کچھ اثر ہوا ہے تو صرف اتنا کہ میرے حال پر میرے ماضی کا غلبہ کچھ زیادہ ہو گیا ہے اور مستقبل کا خوف ہمہ وقت ذہن پر مسلط رہتا ہے۔گھر میں بیٹھا سوچتا رہتا ہوں کہ یہ کہیں پھر نہ لٹ جائے۔بچوں کو جوان ہوتا دیکھتا ہوں تو ڈر لگتا ہے کہ کہیں یہ پھر قتل نہ ہو جائیں [۱۹۸]۔

سقوط ڈھاکا کا المیہ مسلم ملت کے لیے ایک رستا ہوا ناسور ہے لیکن بدقسمتی سے آج تک ہمارے ہاں اس کے ذمے داروں کا تعین کرنے کی سنجیدہ کوشش نہیں کی گئی۔ بہ قول مجیب الرحمٰن شامی مشرقی پاکستان:

> اب ہماری تاریخ کا ناگزیر حصہ ہے۔دنیا کی کوئی طاقت اسے مٹا نہیں سکتی، کھرچ نہیں سکتی...لیکن اتنے بڑے سانحے کی تہہ میں جائے بغیر، اس کے ذمے داروں کا حساب چکائے بغیر کیا کبھی ہم اطمینان کا سانس لے سکیں گے [۱۹۹]۔

مقتدر اور حکمراں بے شک اس معاملے سے چشم پوشی کریں لیکن قدرت نے وقتاً فوقتاً اس کے تمام ہی کرداروں سے اپنا انتقام لے لیا۔اس سانحے کے تین بڑے کردار عبرت کا نشانہ بن گئے۔صرف یحییٰ خان جسے غدار قرار دے کر مقدمہ چلانے کا حکم دیا گیا تھا مگر بھٹو نے یہ مقدمہ نہیں چلنے دیا اور محض نظر بندی پر اکتفا کیا۔ نہ صرف یہ بلکہ بھٹو حکومت نے یحییٰ کو شراب اور دیگر سہولیات بھی بہم پہنچائیں۔ یہ وہی رنگیلا حکمراں تھا جس نے اس قدر اہم معرکے میں مشرقی پاکستان پر بھارتی حملے کے بعد یہ تاریخی مضحکہ خیز جملہ کہا تھا کہ ''میں اب سوائے دعا کے اور کیا کرسکتا ہوں''۔اینڈرسن پیپرز میں اقوام متحدہ کے سیکریٹری جنرل پال مارک ہنری کے حوالے سے ایک جگہ درج ہے کہ لگتا ہے کہ یہ سب کچھ سوچے سمجھے منصوبے کے تحت ہوا۔ پاکستانی کمانڈ اس سارے واقعے کا محور تھی۔میرا ذاتی خیال ہے کہ نیازی کو ہتھیار ڈالنے کے لیے رشوت دی گئی تھی [۲۰۰]۔ بہر حال اس سانحے کے تمام مرکزی کردار اپنے انجام کو پہنچ چکے ہیں۔یحییٰ خان اپنی طویل نظر بندی اور لوگوں کی لعن طعن کے بعد اپنی فطری موت مرا۔جن لوگوں کے سبب یہ ملک دولخت ہوا ان سب کا انجام مع اہل خانہ انتہائی بھیانک ہوا۔ بھارتی وزیر اعظم اندرا گاندھی جو قائد اعظم کے دو قومی نظریے کو بحر ہند میں غرق کرنے کے بلند و بانگ دعوے کو پایہ تکمیل تک پہنچانے میں سرگرم تھیں، زیادہ عرصے اقتدار کا لطف نہ اٹھا سکیں۔اکتوبر ۱۹۸۴ء میں ان کے ذاتی محافظ سب انسپکٹر انت سنگھ نے فائرنگ کی۔تین گولیاں ان پر چلائی گئیں۔زمین پر گرتے ہی دوسرے محافظ ستونت سنگھ نے اسٹین گن کی تین گولیاں ان کے جسم میں اتار دیں۔اس سے چار برس قبل جون ۱۹۸۰ء میں سنجے گاندھی محض ۳۴ برس کی عمر میں نئی دہلی فضائی حادثے میں ہلاک ہو چکے تھے۔ان کے بڑے بیٹے راجیو گاندھی جب وزیر اعظم بنے تو بھانو نامی عورت نے چنائے کے قریب خود کش حملہ کرکے ۱۹۹۱ء میں ہلاک کر دیا۔

مجیب الرحمٰن کا حال بیان کیا جا چکا ہے، جنھیں بنگلا دیش آرمی کے افسر میجر فاروق الرحمٰن نے چند دیگر افسروں کے ساتھ مل کر ان کی ذاتی رہائش گاہ میں حملہ کر کے ہلاک کر دیا تھا۔ اس حملے میں ان کی بیوی فضیلت النساء، تین بیٹے شیخ کمال، شیخ جمال اور دس سالہ شیخ رسل، دو بہوؤں اور دیگر اہل خانہ بھی ہلاک ہوئے۔ مکتی باہنی کے ساتھ ظلم ڈھانے والے شیخ مجیب الرحمٰن کے بھانجے فضل الحق مانی بھی اپنی بیوی کے ہم راہ مارے گئے۔ برادر نسبتی عبدالرب کو بھی ۱۳ دوسرے افراد کے ساتھ بھون دیا گیا اور ان سب کی لاشیں تین دن تک بے گور و کفن دھان منڈی والے مکان پر پڑی رہیں[۲۰۱]۔ اس المیے کے تیسرے بڑے کردار ذوالفقار علی بھٹو کو بھی اقتدار سے محرومی کے بعد پونے دو سال جیل میں گزارنا پڑا۔ بالآخر انھیں بھی تختۂ دار پر لٹکا دیا گیا[۲۰۲]۔ تین اور چار اپریل ۱۹۷۹ء کی درمیانی شب انھیں پھانسی کی سزا سنائی گئی[۲۰۳]۔ بعد میں شاہ نواز بھٹو، میر مرتضٰی بھٹو اور بینظیر بھٹو کو بھی طبعی موت نہ ملی اور یہ تمام افراد کسی نہ کسی سانحے کا شکار ہوئے۔

ان تمام تلخ حقائق کے باوجود پاکستانی قوم آج بھی حمود الرحمٰن کمیشن رپورٹ کی اشاعت کی منتظر ہے تاکہ اس سانحے کے پس پردہ حقائق سے واقف ہو سکیں۔ قوم اب اس سانحے کو دہرانے کی متحمل نہیں ہو سکتی لہٰذا رہ نماؤں پر یہ بھاری ذمے داری عائد ہوتی ہے کہ وہ نہ صرف اس داغ کو دھونے کی کوشش کریں بلکہ ان عوامل اور مسائل کا تجزیہ کر کے قومی زوال کے سفر کو روکنے کا بندوبست بھی کریں۔ سقوط ڈھاکا کے اس سانحے نے ہماری سیاسی اور تہذیبی ڈھانچے میں ایسی اتھل پتھل مچائی کہ زندگی کا کوئی شعبہ اس کے کرب کو محسوس کیے بغیر نہ رہ سکا۔ شعرا کی حساس جماعت نے بھی اس موضوع پر اپنے رنج و الم کو پیش کرتے ہوئے تاریخ کے اس المیے کو محفوظ کرنے کی بھرپور کوشش کی۔

سقوط ڈھاکا کی بدولت اردو شاعری کو جو بڑے بڑے موضوعات ملے ان میں احساسِ شکست و ندامت، رسوائیوں کا تذکرہ، اس الم ناک سانحے کے اسباب، اپنوں کی بے وفائی و غداری، رہ نماؤں کی موقع پرستیاں، حب الوطنی کے جذبات، شہدا کو خراج تحسین، جارح دشمن کی مذمت، جنگی قیدیوں کا تذکرہ، بنگلا دیش میں محصور پاکستانیوں پر کیے جانے والے مظالم، زندگی کی بے ثباتی، قوم کے مرض کی تشخیص و علاج، خود احتسابی اور عزم و تعمیرِ نو وغیرہ بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ ۱۹۶۵ء کے بعد حب الوطنی کے جو گیت بڑی تعداد میں گائے گئے تھے، وہ کچھ زیادہ عرصے تک قائم نہ رہ سکے۔ حکم رانوں کی نا اہلیوں اور مقتدر قوتوں کی ناعاقبت اندیشی کی وجہ سے جب سقوطِ ڈھاکا کا المیہ پیش آیا تب سے شاعری میں واضح تبدیلی رونما ہوئی۔ قومی ترانوں اور ملی نغموں کی جگہ مراثی نوحے اور مناجات نے لے لی۔ اس ماتمی فضا میں سوز خوانی اور اشک فشانی کے ساتھ ساتھ قومی ملکی مسائل سے بے نیازی، بے دلی، مایوسی، بے زاری، بدگمانی اور بے یقینی کے عناصر نے معاشرے میں رائج رجحانات کی عکاسی کرنے کے ساتھ ساتھ اردو شاعری کو متاثر کیا۔ یہ شعری سرمایہ نہ صرف ضخامت بلکہ مضامین کے تنوع کے لحاظ سے بھی اہمیت کا حامل ہے۔ شعرا کے لیے یہ جاں کاہ کا حادثہ فوری ردِعمل کا سبب بنا[۲۰۴]۔ معاشرے کے حساس طبقے کی حیثیت سے شعرا اس حقیقت سے غافل نہیں رہے۔ وہ اس شکست و ریخت کو چشمِ باطن سے دیکھ بھی رہے تھے اور اپنے اضطراب کا اظہار بھی کر رہے تھے۔ اس کی تشویش اور اضطراب کی جھلکیاں اس دور کی شاعری میں واضح طور پر دیکھی جا سکتی ہیں۔ مشیر کاظمی کی دل سوز نظم ''یہ چمن مجھ کو آدھا گوارا نہیں'' جو اس سانحے کے رونما ہونے کی محض چند ماہ بعد یوم اقبال کی تقریب کے موقع پر پڑھی گئی۔ یونی ورسٹی ہال لاہور میں منعقدہ اس تقریب میں شاعر شدت غم سے اپنی پوری نظم نہ سنا سکے۔ حاضرین کا حال بھی کچھ مختلف نہ تھا۔ پورے حال میں دھاریں مار مار کر رونے کی آوازیں آ رہی تھیں[۲۰۵]۔ نظم کیا ہے پورے پاکستان کے ہر فرد کا نوحہ ہے۔ اس سانحے نے

اہل وطن کو جو دل سوز زخم لگا یا اس کی شدت کا اندازہ نظم کے مطالعے سے پوری طرح عیاں ہو جاتا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

پھول لے کر گیا آیا روتا ہوا، بات ایسی ہے کہنے کا یارا نہیں
قبرِ اقبال سے آرہی تھی صدا، یہ چمن مجھ کو آدھا گوارا نہیں
شہرِ ماتم تھا اقبال کا مقبرہ، تھے عدم کے مسافر بھی آئے ہوئے
خوں میں لت پت کھڑے تھے لیاقت علی، روحِ قائد بھی سر کو جھکائے ہوئے
کہہ رہے تھے سبھی کیا غضب ہوگیا، یہ تصور تو ہرگز ہمارا نہیں
کیا فسانہ کہوں ماضی و حال کا، شیر تھا میں بھی اک ارضِ بنگال کا
شرق سے غرب تک میری پرواز تھی، ایک شاہیں تھا میں ذہنِ اقبال کا
ایک بازو پہ اڑتا ہوں میں آج کل، دوسرا دشمنوں کو گوارا نہیں
یوں تو ہونے کو گھر ہے سلامت رہے، کھینچ دی گھر میں دیوار اغیار نے
ایک تھے جو کبھی آج دو ہو گئے، ٹکڑے کر ڈالے دشمن کی تلوار نے
دھڑ بھی دو ہو گئے در بھی دو ہو گئے، جیسے کوئی بھی رشتہ ہمارا نہیں
تم نے روکے محبت کے خود راستے، اس طرح ہم میں ہوتی گئیں دوریاں
کھول تو دوں میں رازِ محبت مگر، تیری رسوائیاں بھی گوارا نہیں
وہ جو تصویر مجھ کو دکھائی گئی، میرے خونِ جگر سے بنائی گئی
قوم کی ماؤں بہنوں کی جو آبرو، نقشۂ ایشیا میں سجائی گئی
موڑ دو آبرو یا وہ تصویر دو، ہم کو حصوں میں بٹنا گوارا نہیں[۲۰۶]

سقوطِ ڈھاکا کے پس منظر میں کی گئی شاعری میں سب سے زیادہ ابھر کر جو تاثر نمایاں ہوا، وہ ''المیہ'' کا تاثر تھا۔ حقیقتاً فضا بھی کچھ ایسی ہی تھی جو دکھ اور غم انگیز جذبات کو پروان چڑھا رہی تھی۔ ایک ملک جو دو حصوں میں بٹ چکا تھا۔ بنگالی اس تقسیم پر نہ صرف خوش تھے بلکہ تقسیم کے اس عمل میں خود شریک بھی تھے۔ اسی لیے محبِّ وطن پاکستانیوں کو اس بات کا بھی دکھ تھا کہ کس طرح اپنوں ہی نے اس گھر کو اجاڑ کر رکھ دیا ہے۔ فیض احمد فیض کی نظم ''ڈھاکا سے واپسی پر'' میں اس المیے کی شدت کو واضح طور پر محسوس کیا جا سکتا ہے۔ اپنوں کے اجنبی بن جانے کا دکھ بیان کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہا:

هم کہ ٹھہرے اجنبی اتنی ملاقاتوں کے بعد | پھر بنیں گے آشنا کتنی مداراتوں کے بعد
کب نظر میں آئے گی بے داغ سبزے کی بہار | خون کے دھبے دھلیں گے کتنی برساتوں کے بعد
تھے بہت بے درد لمحے ختمِ دردِ عشق کے | تھیں بہت بے مہر صبحیں مہرباں راتوں کے بعد
دل تو چاہا پر شکستِ دل نے مہلت ہی نہ دی | کچھ گلے شکوے بھی کر لیتے مناجاتوں کے بعد
ان سے جو کہنے گئے تھے فیض جاں صدقہ کیے | ان کہی ہی رہ گئی وہ بات سب باتوں کے بعد[۲۰۷]

فیض نے اپنی نظم ''خورشیدِ محشر کی لو'' میں اپنے مخصوص انداز میں دلوں کو لہو کر دینے والے اس سانحے کی تڑپ کو شعری پیکر میں ڈھالا۔ استعاروں اور کنایوں میں انھوں نے غم والم کی شدت کو پیش کرتے ہوئے کہا کہ:

آج کا دن زبوں ہے، مرے دوستو — آج کے دن تو یوں ہے، مرے دوستو
جیسے درد و الم کے پرانے نشاں — سب چلے سوئے دل کارواں، کارواں
آج کے دن نہ پوچھو، مرے دوستو — سب تمھارے لہو کے دریدہ علم
فرق خورشیدِ محشر پر ہوں گے رقم — از کراں تا کراں کب تمہارے قدم
لے کے اٹھے گا وہ بحرِ خوں یم بہ یم — جس میں ڈھل جائے گا آج کے دن کا غم
سارے دردوالم سارے جور و ستم — دور کتنی ہے خورشیدِ محشر کی بو[۲۰۸]

اس الیے پر فیض نے متعدد نظمیں لکھیں۔ ''حذر کرو میرے تن کو'' تہ بہ تہ دل کی کدورت، غبارِ خاطرِ محفل ٹھہر جائے، رفیق راہ تھی منزل، پاؤں سے لہو کو دھوڈالو'' وغیرہ جیسی نظمیں پوری قوم کی سیاسی ہزیمت کی عکاسی کرتی دکھائی دیتی ہیں۔ محض سیاسی وجوہ کی بنا پر بے گناہ انسانوں کا قتل عام، فیض کے لیے ایک ناقابل برداشت صدمہ تھا۔ ان نظموں میں شاعر کا دھیما لہجہ اور ضبط کا بندھن ٹوٹتا ہوا محسوس ہو تا ہے۔ خصوصاً ''حذر کرو مرے تن سے'' میں ان کا دل چیر دینے والا لہجہ قاری کو ایک حزینہ کیفیت میں ضرور مبتلا کر دیتا ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

سجے تو کیسے سجے قتلِ عام کا میلہ — کسے لبھائے گا میرے لہو کا واویلا
حذر کرو مرے تن سے یہ سَم کا دریا ہے — حذر کرو کہ مرا تن وہ چوبِ صحرا ہے
بہ جائے سرو سمن میری ہڈیوں کے ببول — اسے بکھیرا تو دشت وزمن میں بکھرے گی
بہ جائے مشکِ صبا، میری جانِ زار کی دھول — حذر کرو کہ مرا دل لہو کا پیاسا ہے[۲۰۹]

فتح محمد ملک نے اس نظم کو پاکستان کی تاریخ کی اہم ترین سیاسی دستاویز میں سے ایک دستاویز قرار دیا ہے[۲۱۰]۔ اس کے علاوہ مشرقی پاکستان کی علاحدگی کا عمل مکمل ہو جانے کے بعد فیض کا درج ذیل قطعہ، ان کے سیاسی شعور کی عمدہ مثال ہے۔

رفیقِ راہ تھی منزل ہر اک تلاش کے بعد — چھٹا یہ ساتھ تو ان کی تلاش بھی نہ رہی
ملول تھا دلِ آئینہ ہر خراش کے بعد — جو پاش پاش ہوا اک خراش بھی نہ رہی[۲۱۱]

سقوط ڈھاکا کے پس منظر میں کی گئی شاعری کا ذکر ان شعرا کے بغیر نامکمل ہے جو براہِ راست اس سانحے کے عینی شاہد تھے۔ مشرقی پاکستان میں موجود شعرا نے اپنی نظموں اور غزلوں میں کھل کر اس سانحے کے محرکات اور عوامل پر روشنی ڈالی ہے۔ اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے ان شعرا نے نہ صرف اپنے دل کا بوجھ ہلکا کیا بلکہ ادبی تاریخ کو ایک ایسا مستقل موضوع بھی دیا جس سے اس سانحے کی منظوم تاریخ مرتب کی جاسکتی ہے۔ ذاتی طور پر اس سانحے سے متاثر شعرا کی ایک طویل فہرست ہے۔ سب کا بیان ممکن نہیں البتہ کچھ نمائندہ شعرا کا ذکر ناگزیر ہے۔

افسر ماہ پوری بنیادی طور پر غزل کے شاعر تھے۔ سانحہ سقوط ڈھاکا کے ہلاکت خیز لمحات کو انھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا اسی لیے ان کے مجموعے ''غبارِ ماہ'' اور ''نگارِ ماہ'' میں اس درد و کرب کے مرقعے جابجا دکھائی دیتے ہیں۔ ''غبارِ ماہ'' ان کی غزلیات کا مجموعہ

ہے جس نے متعدد اشعار میں وہ اس المیے پرخون کے آنسو بہاتے دکھائی دیتے ہیں۔ ہر طرف جاری قتل و غارت گری پر وہ دل گرفتگی کے عالم میں کہتے ہیں کہ:

چمن میں ہر طرف اپنا لہو دیکھا نہیں جاتا　　　　الٰہی یہ مآلِ آرزو دیکھا نہیں جاتا[۲۱۲]

افسر ماہ پوری کا لہجہ نرم اور سادہ ہے لیکن اس نرمی کے پیچھے چھپے طوفان کو بہ خوبی محسوس کیا جا سکتا ہے۔ سقوط ڈھاکا کی تمام تر جزئیات کو ان غزلوں میں تلاش کیا جا سکتا ہے۔ ان اشعار میں ذاتی دکھ سکھ کے ساتھ اجتماعی زندگی کے مسائل، ہجرت کا عذاب، خانہ بدوشی کے اضطراب اور ماحول کے اضطرار کی پرچھائیاں ملتی ہیں[۲۱۳]۔ ایک مورخ واقعات کو پوری جزئیات کے ساتھ پیش کرتا ہے لیکن شاعر کی تفتیش اور تحقیق اتنی مکمل نہیں ہوتی لیکن اس کی شاعری میں موجود اشارے اور کنائے قاری کو اصل حقائق کی تلاش اور جستجو کی طرف ضرور متوجہ کرتے ہیں۔ جیسے:

ہم کیا کہیں لوٹا ہے ہمیں کس کی نظر نے　　　　اربابِ بصیرت کو اشارہ بھی بہت ہے[۲۱۴]

بعض اوقات یہ اشارے اتنے واضح ہوتے ہیں کہ عام لوگ بھی ان اسباب سے واقف ہوتے ہیں۔ سانحہ مشرقی پاکستان کے چند بڑے اسباب میں اپنوں کی سازش اور بے وفائی کو سب سے بڑا سبب قرار دیا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ اسی جانب اشارہ کرتے ہوئے شاعر کہتے ہیں کہ:

ہم کو کوئی گلہ نہیں گردشِ صبح و شام سے　　　　راہِ وفا میں ہم لٹے اپنوں کے اہتمام سے[۲۱۵]

کل تک جنھیں وہ اپنا سمجھتے تھے، آج وہ بے گانے بن چکے تھے۔ سازشوں کی بدولت نفرت کے الاؤ ہر طرف جل رہے تھے۔ ظلم کی ایسی ایسی داستانیں جنھیں دیکھ کر کلیجا منھ کو آتا تھا۔ افسر نے ان حالات کا نقشہ کھینچتے ہوئے کہا کہ:

حال اپنوں کا نہ پوچھو افسر　　　　ناگ شہروں میں بھی ڈس لیتے ہیں[۲۱۶]

المیہ تو یہ تھا کہ اپنے گھر میں رہتے ہوئے بے گھری اور وطن میں رہتے ہوئے بے وطنی کے احساس نے ایک بے بسی کی کیفیت پیدا کر دی تھی۔ ڈھونڈنے سے کہیں پناہ نہیں ملتی تھی۔ اس صورت حال کا اظہار کرتے ہوئے افسر کہتے ہیں کہ:

آخر پناہ ڈھونڈنے جاتے بھی ہم کہاں　　　　نیچے زمیں تھی اور فلک اپنے سر پر تھا[۲۱۷]

حالات نے اس قدر بے بسی مسلط کر دی تھی کہ لوگ اسے اپنی قسمت کا لکھا سمجھ کر وقت کے بے رحم ہاتھوں میں خود کو سونپنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ اس بے بسی اور بے سر سامانی کی بابت افسر کا کہنا تھا کہ:

اپنی آواز بھی گم ہو گئی ہنگاموں میں　　　　اور ہونا ہے تمھیں بے سروساماں کتنا[۲۱۸]

ان حالات میں تعصب کی وہ آندھی چلی کہ حق و باطل کی تمیز مٹ گئی۔ اس صورتِ حال میں بہت سے چہرے بے نقاب بھی ہوئے جن کی جانب اشارہ کرتے ہوئے شاعر کہتے ہیں کہ:

عجب لوگ ہیں آپ کے شہر والے　　　　اگر حق کہیں تو زباں کھینچتے ہیں
افسر لہو سے لال تھیں ان کی بھی آستیں　　　　چہرے پہ جو نقاب تھی آخر اتر گئی[۲۱۹]

سانحہ مشرقی پاکستان نے ایک طرف رشتوں کی پہچان کو توختم کیا، ساتھ ساتھ پورے معاشرے میں ایک قسم کی بے حسی اور بے

زاری کے احساس نے بھی جنم لیا۔لوگوں کی بے وفائی اور بے حسی کا رونا روتے ہوئے شاعر شہر کی اداسی اور ویرانی کا بھی گلہ کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ملاحظہ کیجیے:

ہمارے شہر پہ سایہ ہے کوئی آفت کا مکاں مکاں ہے خموشی گلی گلی چپ ہے[۲۲۰]

افسر ماہ پوری نے دو ہجرتوں کے کرب کو سہا۔وہ مشرقی پاکستان سے لٹ لٹا کر جب مغربی پاکستان پہنچے تو یہاں کے لوگوں کی سرد مہری نے بھی انھیں ملول رکھا۔ان کے دل میں ہجرت کے کرب کی یادیں ہمیشہ کے لیے جاگزیں ہو چکی تھیں۔اپنی نظم ''زرد پتے'' میں انھوں نے اس کرب کو جس انداز سے پیش کیا وہ اس قدر متاثر کن تھا کہ یہ المیہ ان کا ذاتی المیہ نہیں بلکہ اس کیفیت سے گزرنے والے تمام لوگوں کا المیہ معلوم ہوتا ہے۔ہجرت جس طرح سے زندگی کی رمق اور کشش کو چھین لیتی ہے،شاعر اس بے کیفی کی حالت کو زرد پتے سے تشبیہ دے کر کہتے ہیں کہ:

یہ زرد پتے/ بچھڑ کے شاخوں کی انجمن سے/ بھٹکتے پھرتے ہیں صحرا صحرا/ تڑپتے پھرتے
ہیں قریہ قریہ/ خزاں کی سفاکیوں سے لرزاں/ خموش گریاں/ سموم وصرصر کی ٹھوکروں
سے/ جہاں میں ہر سو بکھر گئے ہیں/ تھکے پرندوں کے قافلے بھی/ رواں دواں سوئے گلستاں
ہیں/ مگر بے خانماں مسافر/ یہ زرد پتے/ شجر شجر سے سوال کرتے ہیں/ ہم کہاں ہیں؟/
کہیں ہمارے بھی آشیاں ہیں[۲۲۱]

شاعر نے اس نظم میں سقوطِ ڈھاکا کے خانماں برباد لوگوں کا نقشہ بڑے دردناک انداز سے کھینچا ہے۔جاذب قریشی نے افسر ماہ کی بابت درست لکھا کہ:

ہجرت اور خانماں بربادی ہمارے عہد کے گہرے زخم ہیں جن کی آگ ابھی تک جل رہی ہے۔افسر صاحب کو دوبار اس آگ سے گزرنا پڑا۔صبر و برداشت کے باوجود جو لفظ اور کراہیں انھوں نے لکھیں اور محسوس کی ہیں،وہ سب ہماری تاریخ کے زندہ سوالوں کی طرح ہیں[۲۲۲]۔

''زرد پتے'' افسر کی خوب صورت لیکن اداسی سے بھرپور نظم ہے۔سقوطِ ڈھاکا کے ضمن میں کی جانے والی شاعری میں اس قسم کی اداسی کے گہرے سائے جا بجا دکھائی دیتے ہیں۔افسر اس قسم کے موضوعات پر کی گئی شاعری کے قافلہ سالاروں میں سے ایک ہیں۔انھوں نے سانحہ سقوطِ ڈھاکا کی تلخی اور کڑواہٹ کو شعر کے قالب میں ڈھالتے ہوئے جہاں عوام کی بے حسی دکھائی ہے وہیں ان پتھر دل رہ نماؤں کو بھی تنقید کا نشانہ بنایا جو گھر کے جلنے کا تماشا دیکھنے کے باوجود اس کے سدّ باب کی کوششوں سے لاپروا ہے۔کبھی وہ مغربی پاکستان میں بیٹھے پرسکون رہ نماؤں اور چین کی بانسری بجاتے ناخداؤں کے ضمیر کو جھنجھوڑنے کے لیے کہتے کہ:

سر سے ہمارے سیکڑوں طوفاں گزر گئے لیکن چمن میں ایک بھی پتا نہیں ہلا[۲۲۳]

اور کبھی ماحول میں چھائی بے حسی اور امید کے بجھتے دیے کو دیکھ کر دلوں پر گزرنے والی قیامت کا منظر پیش کر کے ان ناخداؤں کی خاموشی پر حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہتے کہ:

اگرچہ ناؤ ہماری بھنور میں ڈوبی تھی مگر کچھ اور ہی کہتا تھا ناخدا کا سکوت[۲۲۴]

سقوط ڈھاکا محبّ وطن پاکستانیوں کے لیے ایک سانحہ عظیم سے کم نہ تھا لیکن ۱۹۷۱ء میں بنگالیوں کے لیے یہ ایک حسین خواب کی تعبیر سے کم نہ تھا لیکن جب یہ تعبیر حسبِ خواہش نہ نکلی تو بہت ہی قلیل عرصے میں انھوں نے مجیب الرحمٰن کو نشانِ عبرت بنا کر رکھ دیا۔ حالات اور وقت نے انھیں احساس ضرور دلایا کہ علاحدگی کا فیصلہ ایک سنگین غلطی تھی۔ افسر نے بنگالیوں کے اس احساس کی ترجمانی بھی کی اور کہا کہ:

صبح کے بھولے ہوئے شام کو گھر آتے ہیں　　　خیر اب وہ بھی پشیمان نظر آتے ہیں[۲۲۵]

لیکن تاریخ کا جبر اس دوئی کو اکائی میں تبدیل کرنے سے قاصر ہے۔ افسر کی شاعری میں یہ خواہش ضرور دکھائی دیتی ہے لیکن اس کی تکمیل اب ممکن نہیں۔ بہرحال افسر کی توانا آواز اس موضوع کی بہت سی پرتوں کو ہمارے سامنے کھول کر رکھ دیتی ہے۔ بہ قول انجم اعظمی کے افسر کی شاعری کے مطالعے کے بغیر ''اس عہد کا شعری مطالعہ ادھورا رہے گا''[۲۲۶]۔

مشرقی پاکستان سے تعلق رکھنے والے شعرا کی غزلوں میں اس سانحے سے متاثر ہو کر اجتماعی غم والم کا احساس تو نمایاں ہے ہی لیکن متعدد ایسے شعرا بھی ہیں جو اس سانحے سے براہِ راست خود بھی متاثر ہوئے۔ لہٰذا ان غزلوں میں اس الم کے عکس کو ذاتی المیے کے طور پر پیش کیا ہے۔ یہ شعرا، ان تمام تر ہولناکیوں سے بہ نفسِ نفیس گزرے۔ ان کی حیثیت محض تماشائی کی نہیں بلکہ وہ خود بھی تماشا تھے، اس لیے ان کا المیہ ذاتی بھی ہے اور قومی بھی۔ ان کی شاعری آپ بیتی بھی ہے اور جگ بیتی بھی۔ محمود الحسن اختر لکھنوی کا شمار بھی ان شعرا میں ہوتا ہے جو اس شورش اور ہنگامے کے زمانے میں ریڈیو پاکستان ڈھاکا میں ملازمت کی وجہ سے وہیں مقیم تھے۔ انھوں نے اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر نہ صرف اپنا فرض نبھایا بلکہ ان واقعات کے چشم دید گواہ کی حیثیت سے ان تمام واقعات کو اپنی شاعری کا موضوع بھی بنایا۔ ان کی ابتدائی غزلیں معاشرتی اور سماجی موجوعات کا احاطہ کرتی دکھائی دیتی ہیں لیکن ۱۹۷۱ء کے سقوط ڈھاکا کے بعد کی داستان نے ان پر ایک سکتے کی کیفیت طاری کر دی۔ اپنے مجموعے ''دیدۂ تر'' کے دیباچے میں اس ہولناک ماحول کی جھلک دکھاتے ہوئے انھوں نے لکھا کہ:

> اس المیے نے لاکھوں افراد کا شیرازۂ ہستی بکھیر کر رکھ دیا جس سے لاتعداد گھر اجڑے، مکینوں کے ساتھ مکان جلے، معصوم بچے ماؤں کی گود سے چھین کر نیزوں پر چڑھائے گئے، گلی کوچوں اور بازاروں میں قتل عام ہوا[۲۲۷]۔

سانحہ مشرقی پاکستان کے موضوع پر لکھے گئے اس مجموعے میں انھوں نے اس داستان الم کو بہ چشم نم بیان کیا ہے۔ یہ مجموعہ اس سانحے کی دردناک سچی کہانی ہے۔ اختر نے ان بھیانک حالات کا جائزہ ایک حساس دل شاعر کی حیثیت سے لیا[۲۲۸]۔ انھوں نے اپنی غزلوں میں اس المیے کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کیا ہے۔ خواہ اس کا تعلق اسباب سے ہو یا واقعات سے، ظلم وستم سے ہو یا اپنوں کی بے حسی سے۔ اس سانحے کے بہت سے اسباب وعلل کا جائزہ لینے کے بعد یہ بات تو پوری طرح واضح ہے کہ اس سقوط کا بڑا سبب ہمارے رہ نماؤں کی خود غرضی اور کوتاہ اندیشی تھی۔ قیادت کا منصب جن لوگوں کے پاس تھا، انھوں نے اس ملک کی قسمت کے ساتھ کھیلنا شروع کر دیا تھا۔ نام ونہاد خردمندوں نے اس سانحے کی راہ ہموار کی۔ اختر نے اس تلخ حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے واضح طور پر کیا کہ:

داناؤں نے پہلے سر جوڑے، پھر گھر گھر قتل عام ہوا　　　ہم کیا جانیں اسباب تھے کیا ہم نے تو بس یہ دیکھا ہے[۲۲۹]

حالات جب اس نہج پر پہنچ جائیں تو غیروں کو بھی کھل کھیلنے کا موقع مل جاتا ہے۔ شاعر کا حساس دل ان محرکات سے لاتعلق نہیں

رہ سکتا۔ اختر نے سازش کی ایسی کڑیوں کو بے نقاب کرتے ہوئے استفہامیہ انداز سے کہا کہ:

وہ کون لوگ تھے جو باعثِ شکست ہوئے　　یہ ہم سے پوچھو ہمارے ہیں زخم تازہ ابھی[۲۳۰]

ان حالات میں ہمیشہ دوست ممالک کو امید بھری نظروں سے دیکھا جاتا ہے لیکن اس جانب سے کبھی مدد کے وعدے پایہ تکمیل کو نہ پہنچ سکے۔ جن پہ تکیہ تھا ان ہی پتوں نے اس آگ کو خوب سلگایا۔ مصلحتوں کی دہلیز پر اصولوں کو قربان کیا گیا۔ آج یہ تمام گھناؤنے کردار تاریخ کا حصہ بن چکے ہیں لیکن اختر کی شاعری میں محفوظ ہیں۔ ملاحظہ کیجیے:

جب بھی اپنے خوں کے پس منظر کھلے　　کیسے کیسے ہوں گے چہرے بے نقاب
کیسی کیسی مصلحت کے در کھلے　　بس ہمیں تاراج کرنے کے لیے
اپنوں میں بھی ایسے تھے جو معصوم نہیں تھے　　کیسے کہیں غیروں نے ہی تاراج کیے گھر[۲۳۱]

یہ وہ تلخ حقائق ہیں جنھیں اختر نے اپنی شاعری کی داستان الم کا موضوع بنا کر ہمارے سامنے پیش کیا۔ انھوں نے سقوط ڈھاکا کو ذاتی المیے کے طور پر بھی پیش کیا اور قومی المیے کے طور پر۔ اس قسم کی شورشوں میں سب سے پہلے اہل علم اور دانش وروں کو نشانہ بنایا جاتا ہے۔ لہٰذا اختر کو بھی طرح طرح سے زک پہنچانے کی کوشش کی گئی۔ اس صورتِ حال کے پیش نظر اختر کو دوسرے نظریاتی لوگوں کی طرح دوسری ہجرت کا غم بھی سہنا پڑا۔ ایک بار پھر بے گھری کا عذاب سہنا پڑا۔ اس صورتِ حال کو انتہائی افسردگی کے عالم میں پیش کرتے ہو ئے شاعر کہتے ہیں کہ:

قبول کیجیے دو ہجرتوں کا افسانہ　　عیاں ہے آپ پر ہم بے گھروں کا افسانہ
دل کیسی عنایات سے مضروب ہوئے ہیں　　اک عمر عطا کیجیے پھر پوچھیے ہم سے[۲۳۲]

ظاہری بات ہے کہ شاعر کو دو ہجرتوں کی اذیت اس لیے سہنی پڑی کہ انھوں نے مصلحت کا شکار ہوکر در باطل پر سر جھکانے سے کلی طور پر انکار کر دیا۔ انھوں نے بہت کچھ لٹانا تو گوارا کیا لیکن زمانہ سازوں کی طرح فیض یاب ہونے کے بہ جائے ڈٹ کر مقابلہ کرنے کو ترجیح دی۔ اس جانب اشارہ کرتے ہوئے انھوں نے واضح انداز سے کہا کہ:

بس ایک بات تھی ہم مصلحت پسند نہ تھے　　تمھارے قرب کے دروازے ہم پہ بند نہ تھے[۲۳۳]

انھیں ڈھاکا شہر کی تباہی و بربادی کا بے حد افسوس تھا۔ اسی لیے اس شہر کا شہر آشوب بادیدِ تر لکھا۔ شہر کی ویرانی کو اپنے دل کی ویرانی سے تشبیہ دے کر وہ انفرادی غم کے احساس کو اجتماعی رنگ میں پیش کرتے ہیں۔ ان کے اشعار محض ذاتی غم والم کی داستان نہیں بلکہ اس عہد کی جیتی جاگتی تصویریں ہیں۔ ملاحظہ کیجیے:

تھوڑی دیر ہنستے ہیں، تھوڑی دیر روتے ہیں　　اب تو یوں بسر لمحے روز و شب کے ہوتے ہیں
ایک دوسرے کا منھ، دیکھ کر روتے ہیں　　جب بھی شام آتی ہے بیٹھ کر کہیں ہم لوگ[۲۳۴]

مشرقی پاکستان میں جو لوگ حالات کی بے رحم موجوں کا شکار ہوئے، ان کی زندگی میں موت کے گہرے سائے نے ایسا گھر کیا کہ اس سے نکلنے کی کوئی صورت دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ ظلم کے ایسے پہاڑ توڑے گئے کہ ہر گھر میں صفِ ماتم بچھ گئی۔ ان حالات کو پیش کرتے ہوئے شاعر نے جو مناظر پیش کیے وہ انتہائی تکلیف دہ تھے۔ ملاحظہ کیجیے:

جوئے خوں آنکھوں سے یوں پہلے کبھی جاری نہ تھی زندگی کے نام پر گھر گھر عزا داری نہ تھی
ممکن ہی نہیں ہے کسی صورت یہ بتانا ماتمِ غم حالات کا کس گھر نہ ہوا تھا[۲۳۵]

حالات ایسے دگرگوں ہوئے کہ انسانوں نے اپنے جیسے انسانوں کے لیے زمین تنگ کردی۔قتل عام نے ہر طرف خون ہی خون بکھیر کر رکھ دیا۔گھر کے درودیوار اس قتل عام کی گواہی دینے لگے۔شاعر اس کیفیت کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

ہمارے گھروں میں لہو سے ہمارے منقش تھے دیوار و در کیسے کیسے[۲۳۶]

درندگی اور شقاوت کی ایسی ایسی داستانیں رقم ہوئیں کہ انسانیت شرمندہ ہو جائے۔ظلم و بربریت کی ان داستانوں کے تصور سے ہی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔اختر تو خود ان واقعات کے چشم دید گواہ تھے۔اپنوں اور غیروں کے ستم بالائے ستم کا حال بیان کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ:

اب بھی وہاں ڈھونڈھو گے تو راہوں میں ملیں گے، کچھ خون دھبّے
انبوہ کی صورت میں جہاں قتل ہوا تھا، اپنوں نے کیا تھا[۲۳۷]

اس وقت کی فضا کچھ اس قدر وحشت ناک ہو چکی تھی کہ ہر طرف ظلم ہی ظلم کے مناظر نظر آتے تھے۔نظریاتی اختلاف کو بنیاد بنا کر ایذا رسانی کے نت نئے حربے استعمال کیے گئے۔مولوی فرید جو ایک محبِّ وطن پاکستانی تھے، انھیں جس طرح تڑپا تڑپا کر مارا گیا۔تیز بلیڈ سے ان کی کھال اتاری گئی، گوشت پر نمک پاشی کی گئی، آہنی پنجرے میں بند کر کے ڈھاکا کے لال باغ میں نمائش کی گئی[۲۳۸]۔تو شاعر کے ضبط کا بندھن بھی ٹوٹ گیا۔انھوں نے اس وحشت ناک منظر کی عکاسی کرتے ہوئے کہا کہ:

کھینچ کر کھال یہاں چھوڑ دیا جاتا ہے بے خطاؤ! رسن و دار غنیمت جانو[۲۳۹]

ایسی تکلیف دہ موت کا شکار ایک مولوی فرید ہی نہیں بلکہ سیکڑوں ہزاروں لوگ اس قسم کی اذیت کا نشانہ بنائے گئے۔ظالم نے ظلم کا ہر حربہ استعمال کیا۔ہزاروں بے خطاؤں کے بے گور و کفن نعشوں کو دیکھ کر شاعر تا عمر ان مناظر کو نہ بھول پائے۔اس ضمن میں ان کا کہنا تھا کہ:

لاکھ بھولنا چاہا، بھولتے نہیں لمحے، بے اثر دعاؤں کے
ہائے وہ بھی کیا دن تھے، گام گام بکھرے تھے، جسم بے خطاؤں کے[۲۴۰]

ظلم و جبر کے اس ماحول میں جو لوگ نشانہ بنتے ہیں ان کا ایک ہی رنگ ہوتا ہے۔وہ رنگ بے بسی کا رنگ ہے جہاں طاقت ور ظالم کے روپ میں ظاہر ہوتا ہے اور مظلوم بے بس و بے کس۔اختر نے بے بسی کے یہ رنگ دکھاتے ہوئے اس بربریت کو کربلا سے تعبیر کرتے ہوئے کہا کہ:

ہم نے دیکھی ہیں مہینوں کربلا کی صورتیں سر زمینِ آب پر رکھے گئے بے آب ہم[۲۴۱]

جب بے حسی شعار بن جائے اور پرانے حوالے اور تعلق سب حالات کی نیرنگی کی نذر ہو جائیں۔آشنا اجنبی بن جائیں تو شاعر کا حساس دل تڑپ کر رہ جاتا ہے۔اجنبیت اور بربریت کی یہ دیوار چاروں طرف اپنے پھن پھلائے کھڑی تھی۔اس صورتِ حال کو پیش کرتے ہوئے شاعر کا یہ کہنا درست معلوم ہوتا ہے کہ:

سینوں میں جو رکھتے تھے اک سنگ بہ جائے دل　　　　کچھ لوگ یہاں بھی تھے، کچھ لوگ وہاں بھی تھے[۲۴۲]

اختر کے اس مجموعے میں بہت سے ایسے مناظر دکھائی دیتے ہیں جسے پیش کرنے کے لیے بہت مضبوط دل کا ہونا ضروری ہے۔ بے گناہ لوگوں کو گھروں سے نکال کر آنکھوں میں پٹی باندھی جاتی اور دریا کے کنارے ان کے قتل سے جب انھیں ''پاکستان مردہ باد'' کا نعرہ لگانے پر مجبور کیا جاتا۔ خوف و دہشت کے اس ماحول میں بھی کچھ سر پھرے ایسے ضرور ہوتے جو بہ آواز بلند ''پاکستان زندہ باد'' کا نعرہ اس وقت تک بلند کرتے جب تک ان کی گردن تن سے جدا نہ کر دی جاتی[۲۴۳]۔ اختر نے ان مناظر کو پیش کرتے ہوئے کہا کہ:

گردن تہِ خنجر ہے مگر لب پہ ہے اک نام　　　　یہ سرکشیِ جرأتِ اظہار تو دیکھو[۲۴۴]

اختر نے سانحہ مشرقی پاکستان میں محبِّ وطن افراد کے انجام کی طرف جا بہ جا اشارے کیے ہیں۔ ''دیدۂ تر'' ایک طرح سے ان کی منظوم آپ بیتی ہے۔ باغیوں کے غیظ و غضب اور بستی بستی نعشوں کے انبار نے تو شاعر کے ذہن و دل کو مجروح کیا اور اس سے اس قسم کے شعر کہلوائے کہ:

کوچے کوچے، میداں میداں شانے تو ہیں سر کوئی نہیں　　　　آشفتہ سروں کو دیکھو تو کیا ہوش رُبا انجام ہوا

ہم نے وفا کی راہ کو جب طے کر کے دیکھا تو دیکھا　　　　ہاتھ نہیں ہیں، پاؤں نہیں ہیں اور ہے بے سر تن اپنا[۲۴۵]

لیکن اس قربانی کے بدلے انھیں کیا ملا، یہ وہ سوال تھا جو اختر کو ہمیشہ بے چین رکھتا۔ اختر کے مطابق جن لوگوں نے اس مٹی سے اپنی محبت کا قرض ادا کرتے ہوئے جان تک کی پروا نہیں کی اور پاکستان سے عہد وفاداری کو ہر حال میں نبھایا، ان کے ساتھ کچھ اچھا سلوک روا نہیں رکھا گیا۔ اس بات کا شکوہ کرتے ہوئے اختر کہتے ہیں کہ:

وہ جن کے واسطے ہم لوگ لخت لخت ہوئے　　　　ہمیں وہ اپنا سمجھتے نہیں کسی عنواں[۲۴۶]

غرض اختر نے ان بھیانک حالات کا جس طرح جائزہ لیا اسے دیکھتے ہوئے تابش دہلوی نے درست لکھا کہ اس مجموعے کا ''ہر شعر ظلم و ستم کی بھیانک داستان کا عنوان جلی ہے''[۲۴۷]۔ نظیر صدیقی نے بھی اس مجموعے کی بابت لکھا کہ:

> میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اختر لکھنوی کی ان غزلوں کو غزلیں کہوں یا مرثیے ...ان غزلوں میں اس المیے کے واقعاتی، کیفیاتی اور تجزیاتی تینوں پہلو آ گئے ہیں...اختر نے ان غزلوں میں سقوط سے لے کر سکوت تک کی داستان مرتب اور محفوظ کر دی ہے[۲۴۸]۔

یہ سانحہ کسی دھچکے سے کم نہ تھا۔ اس کی داستان اس وقت تک ختم نہیں ہو سکتی جب تک بنگلا دیش میں محصور لاکھوں محبِّ وطن پاکستانیوں کی آبادکاری کا بندوبست نہ ہو جائے۔ طاہر مسعود نے اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اختر کی شاعری کی بابت لکھا کہ:

> دیدۂ تر محض شعری مجموعہ نہیں... یہ تو ان خانماں برباد انسانوں کی خوں چکاں داستان ہے جو اپنے آدرش کی خاطر قتل ہوئے، برباد ہوئے اور اب بھی جن کی کثیر تعداد ڈھاکا کے بے آسرا کیمپ میں پناہ گزین ہے[۲۴۹]۔

موت کی ایسی بے یقینی کی کیفیت جو اس زمانے میں لوگوں کو درپیش تھی، اس کی حقیقی تصویر جس طرح اختر نے دکھائی ہے، بہت

کم شاعر اس کیفیت کو پیش کرنے میں کامیاب رہے ہیں۔ جب زندگی کا یقین مٹ جائے تب ہی شاعر اس قسم کے اشعار کہتا ہے کہ:

نکلنے والا ہے پھر آج قاتلوں کا جلوس   نہ جانے کون ہیں وہ جن کی آج باری ہے [۲۵۰]

اختر نے اپنی غزلوں کے ذریعے ماضی سے سبق حاصل کرنے کی طرف توجہ دلائی۔ تاریخ سے سبق حاصل کرنا زندہ قوموں کا شیوہ ہے لیکن ہمارے یاں یہ رسم ابھی عام نہیں۔ قوم نے اس سانحے کو نظر انداز کر کے حقیقت سے فرار حاصل کرنے میں ہی عافیت جانی۔ سانحہ مشرقی پاکستان کے براہِ راست متاثرین آج بھی قوم سے یہی گلہ ہے۔

مظفر حسین رزمی بھی مشرقی پاکستان میں محکمۂ تعلیم سے منسلک تھے۔ سقوط ڈھاکا کے بعد ۱۹۷۴ء میں ہجرت کر کے پاکستان آئے اور یہاں بھی محکمۂ تعلیم سے وابستہ ہو گئے۔ ''خواب کی ریت'' ان کا شعری مجموعہ ہے جو سقوط ڈھاکا کے حوالے سے ایک اہم دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔ سانحہ سقوط ڈھاکا کے پس و پیش منظر میں جو کچھ ہوا، اس کا عکس ان کی غزلیات میں ملتا ہے۔ رزمی بھی اس ہول ناک سانحے کے وقت مشرقی پاکستان میں مقیم تھے۔ لہٰذا انھوں نے اپنی آنکھوں کے سامنے لاتعداد انسانوں کو فنا کی گھاٹ اترتے دیکھا۔ ان کی آنکھوں کے سامنے بستیاں اجڑیں۔ اسی لیے ان کی شاعری میں مرثیے اور شہر آشوب کی کیفیت پیدا ہو گئی۔ یہ دل خراش سانحہ ایک کڑے امتحان کی صورت ان کی زندگی میں آیا لہٰذا ان کے اشعار میں اس کی کسک واضح محسوس کی جا سکتی ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

وہ سخت لمحے جو اہلِ وفا پہ گزرے ہیں   سنو سنو انھیں لمحات کی صدا ہوں میں [۲۵۱]

اس سانحے کے پس و پیش جو داؤ پیچ کھیلے گئے اس کو تلاش کرتے ہوئے شاعر نے نہ صرف اسباب و علل پر غور کیا بلکہ ان سازشوں کو بے نقاب کرنا بھی اپنا فرض سمجھا۔ وہ حکمراں اور اہلِ فکر و دانش سے سوال کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

عام زندان و سلاسل کی فضا کس سے ہوئی   اس ستم کی بندہ پرور ابتدا کس سے ہوئی
چاہتوں کو نفرتوں کے پیرہن کس نے دیے   پارہ پارہ مہر و الفت کی ادا کس سے ہوئی
کیوں فضا پر ہے خموشی جبر کی چھائی ہوئی   وادیِ مہر و محبت بے صدا کس سے ہوئی [۲۵۲]

قیامِ پاکستان کے ابتدائی زمانے سے ہی یہ روایت رہی کہ کسی بھی بڑے سے بڑے واقعے یا حادثے کے بعد ذمے داروں کے پرستش نہ ہوئی۔ اوّل تو تفتیش یا تحقیق کا کوئی بندوبست نہیں اور اگر ہو بھی تو تاعمر سربستہ راز ہی رہتی ہے۔ اس قسم کی مصلحت پسندی سانحہ سقوط ڈھاکا کے بعد بھی دیکھنے میں آئی۔ رزمی نے اس مصلحت کوشی کی بابت درست لکھا کہ:

گو اپنے قاتلوں میں ان کو بھی شامل سمجھتا ہوں   مگر اس دور میں سچ بولنا مشکل سمجھتا ہوں [۲۵۳]

اس وقت کی فضا کچھ اس قسم کی تھی کہ کسی کی جان و مال، عزت و آبرو محفوظ نہ تھی۔ اس تیز آندھی کی زد میں پورا ملک آیا ہوا تھا۔ ان خطرات کی بابت رزمی کا کہنا ہے کہ:

کہاں جائیں نکل کر گھر سے رزمی   چمن میں حیف وہ موسم نہیں ہے [۲۵۴]

تباہی و بربادی کے مناظر ہوں یا قتل و غارت گری کے واقعات، شاعر کو ہر طرف ایک سوگ وار فضا دکھائی دیتی ہے۔ اپنی کیفیت کا اظہار کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ:

اب تو ہر راہ پر مقتل کا گماں ہوتا ہے   جبر و طاقت کی نمائش کبھی ایسی تو نہ تھی

یہ پھول کھلے ہیں کہ مرا زخم کھلا ہے   گلشن میں جدھر دیکھیے مقتل کی فضا ہے[۲۵۵]

ابھی پہلی ہجرت کا غم مندمل بھی نہ ہو پایا تھا کہ ایک نئے صدمے نے انھیں آلیا۔ ہجرتوں کا یہ کرب بھی سقوط ڈھاکا کے ضمن میں شاعری کا اہم موضوع رہا ہے۔ خود رزمی بھی اس ہجرت کا دو بار شکار ہوئے اسی لیے اس کرب کا اظہار بھی ان کی شاعری میں جا بہ جا ملتا ہے۔ رزمی نے پہلی ہجرت کے دوران اپنے گھروں کے ملبے سے آدرش کے سورج کو طلوع ہوتے دیکھا جب کہ دوسری بار انھوں نے اس سورج کو اپنوں کی غیرت میں گہناتے ہوئے دیکھا[۲۵۶]۔ اسی لیے بے وطنی کا احساس ہمیشہ انھیں گھیرے رہا اور اس کا اظہار بھی انھوں نے خوب کیا۔ ملاحظہ کیجیے:

کون جانے کون پوچھے کس طرح جیتے ہیں ہم   ہو گئے جو لوگ خود اپنے وطن میں بے وطن

الم نصیب تلاشِ بہار کیا کرتے   وطن سے دور غریب الدیار کیا کرتے[۲۵۷]

رزمی نے اس پرآشوب حالات کا گہرا اثر قبول کیا۔ سید ضمیر جعفری نے ان کی بابت درست لکھا کہ ان کی ذاتی زندگی کا کرب اور مشرقی پاکستان کے زخموں کا لہوان کی شاعری میں جا بہ جا رستا دکھائی دیتا ہے[۲۵۸]۔

سرور بارہ بنکوی اگرچہ سقوط ڈھاکا سے قبل مشرقی پاکستان سے نکل چکے تھے لیکن اس سرزمین کی یاد ہمیشہ انھیں بے چین رکھتی۔ ذہنی طور پر وہ کبھی اس خطہء زمین سے اپنا رشتہ نہیں توڑ پائے۔ سرور نے اس سانحے کے حوالے سے پر درد نظمیں لکھیں۔ ان نظموں میں اقدار کے مٹنے کا نوحہ بھی ہے اور سفاکی اور بربریت پر حیرت بھی۔ وہ زمامِ اقتدار کے رکھوالوں کے ذاتی مفاد پر مستعجب دکھائی دیتے ہیں اور نفرتوں کی تجارت کرنے والے اس سازشی ٹولے کے چہرے سے نقاب اٹھانا ضروری سمجھتے ہیں۔ اپنی نظم ''پل پل ہے انمول'' میں وہ اس صورتِ حال کا نقشہ کھینچتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

نیّا والے اک دوجے کے خون سے کھیلیں پھاگ   سب کی اپنی اپنی ڈفلی، اپنا اپنا راگ

اک پتوار تو ٹوٹ چکا ہے باقی ہیں بس چار   اونچی ہی ہوتی جاتی ہے نفرت کی دیوار

سب کو اپنی فکر ہے نیّا کون لگائے پار   چوراہے پر بھانڈا پھوٹا ڈھول میں نکلا پول

ملّا مذہب کے بیوپاری لیے پھریں قرآن   لیڈر کی جھولی میں روٹی کپڑا اور مکان

بیچ میں ننگی بھوکی جنتا ہو گئی لہو لہان   دیس کے بے بس ہاتھوں میں ہے آج نیا کشکول[۲۵۹]

اس نفسانفسی کے ماحول میں جہاں برائی اور بھلائی کی تمیز مٹ چکی ہو، جہاں چاروں طرف تاریکی ہی تاریکی ہو، سرور نے اپنی نظم ''بلیک آؤٹ'' میں معاشرے کی اس تیرگی کا خوب پردہ چاک کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ:

ہر ایک بلب بجھا دو، چراغ گل کر دو   پہنا دو آج سے ہر شے کو تیرگی کا کفن

یہ حکم تازہ ہے اب اس اندھیر نگری میں   اندھیرا جاں کا محافظ ہے روشنی دشمن[۲۶۰]

نظم میں بے حسی اس وقت اپنی انتہا کو پہنچ جاتی ہے جب انسان خونی رشتوں کی حرمت کا احساس بھی کھو بیٹھے۔ نظم ''شکست سے پہلے'' اس بے بسی کا نہایت بھیانک روپ پیش کرتی ہے جہاں زندگی کی تلخیوں کا مارا انسان موت کو سامنے دیکھ کر آخری لمحات کو عیاشی کی نذر کر دینا چاہتا ہے۔ درندگی کا یہ نمائندہ عورت پر جب دست درازی کی کوشش کرتا تو رسمی حجاب اترتے ہی اس کی اپنی بہن سامنے آتی

ہے۔سرور نے اس منظر کو دکھاتے ہوئے شاعرانہ فن کاری سے کام لیا۔ملاحظہ کیجیے:

نہیں/یہ وہم ہے/شاید نظر کا دھوکا ہے/یہ کن خطاؤں کی پاداش ہے خداوندا/ کہ یہ تو میری
بہن فاطمہ کا چہرا ہے/پہنچ گیا ہوں میں یارب کس جہنم میں/یہ کیسا قہر ہے مجھ پر عذاب کیسا
ہے[۲۶۱]

اردو میں اس نوع کی نظم اس سے قبل نہیں لکھی گئی۔المیہ اور حزینہ کے بیان میں شاعر نے بڑی چابک دستی سے کام لیا۔انھوں نے بڑی مہارت سے انسانوں کی درندگی کو ایک المیے کے طور پر پیش کیا۔بہ قول سرور:

فرق باقی ہے درندوں میں نہ انسانوں میں	بربریت کا ہر اک سمت عجیب عالم ہے[۲۶۲]

سانحہ مشرقی پاکستان کے پس منظر میں انسانی بے حسی کی جو داستانیں رقم ہوئیں،سرور کے بے باک قلم نے ان کا پردا چاک کیا۔محمد علی صدیقی کے مطابق:

''بلیک آوٹ'' سے لے کر ''شکست سے پہلے'' تک کی نظمیں ۱۹۷۱ء کے الم ناک سانحے سے متعلق ہیں...خصوصاً ''شکست سے پہلے'' سابق مشرقی پاکستان کی انسانی المیے میں گرفتار معصوم انسانوں کا یک بیک سفا کی اور چیرہ دستیوں کا بہت عجیب وغریب مرقع ہے[۲۶۳]۔

پروفیسر اقبال عظیم بھی سابقہ مشرقی پاکستان کے اہم شعرا میں شمار کیے جاتے ہیں۔پہلی ہجرت ہندوستان سے ڈھاکا اور پھر ۱۹۷۰ء میں کراچی آئے۔ان کی غزلوں میں بھی سانحہ سقوط ڈھاکا کا عکس نمایاں ہے۔گھر کے لٹنے کے باوجود عبرت حاصل نہ کرنے کے زخم کو وہ کبھی نہیں بھولے۔اس ضمن میں ان کا کہنا تھا کہ:

جو زخم بھر چکے ہیں انھیں مت کریدنا	جو اپنا گھر تھا کیسے لٹا یا نہ پوچھنا
کس کس نے ہم پہ ظلم کیا یہ نہ پوچھنا	صرف اپنے ہی قبیلے کے لوگوں سے کیا گلا[۲۶۴]

جن لوگوں نے اپنا سب کچھ قربان کر کے وطن سے الفت اور محبت کا فرض نبھایا،شاعر انھیں نہ صرف خراجِ تحسین پیش کرتے ہیں بلکہ وطن کی مٹی سے دیوانگی کی حد تک پیار کی منظر کشی کچھ اس طرح کرتے دکھائی دیتے ہیں:

دیوانے کے ہاتھوں میں یہ مٹی ہے کہاں کی	چومے ہے کبھی اور کبھی آنکھوں سے ملے ہے[۲۶۵]

وطن سے محبت کا اظہار وہ کبھی طنزیہ انداز سے بھی کرتے ہیں۔رہبروں کے چہرے بے نقاب کرتے ہوئے کبھی وہ کہتے ہیں کہ:

مجھے سچی محبت ہے وطن سے	میں شاعر ہوں کوئی رہبر نہیں ہوں[۲۶۶]

اور کبھی وہ تاریخ کے اس جبر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے محبِّ وطن لوگوں کی ناقدری پر کفِ افسوس ملتے ہوئے تلخ نوائی پر اتر آتے ہیں:

راہِ وفا میں ہم پہ جو گزری وہ پوچھنا	منزل پہ کیا سلوک ہوا یہ نہ پوچھنا[۲۶۷]

بے وطنی کا دکھ بار بار سہنے کی وجہ سے اپنے ہی دیس میں اجنبیت کا جو احساس ان کی رگ و پے میں سرائیت کر چکا تھا،اس کا اظہار ان کی شاعری میں جابجا دکھائی دیتا ہے۔ملاحظہ کیجیے:

جہاں بھی ہم نے صدا دی یہی جواب ملا   یہ کون لوگ ہیں، پوچھو کہاں سے آئے ہیں [۲۶۸]

انھیں ہر وقت مسافرت اور مہاجرت کا احساس کچوکے لگاتا رہتا تھا۔ پاکستان میں آنے کے بعد بھی یہ لوگ مہاجر نام سے موسوم ہوئے۔شاعر نے اس صورتِ حال کی عکاسی کرتے ہوئے کہا کہ:

کل کہیں تھے اب کہیں ہیں اور سفر میں ہیں ہنوز   ہم مسافر کیا بتائیں مستقل اپنا پتا

یہ لطفِ خاص ہے مجھ پر خدا کا   مہاجر ہوں مگر بے گھر نہیں ہوں [۲۶۹]

وہ حادثے سے پہلے ہوش میں آنے کی تلقین تو کرتے ہی ہیں مگر حادثے کے گزر جانے کے بعد ماضی کی کرب ناک یادوں میں کھونے کے بہ جائے مستقبل کی فکر کرنے کی طرف بھی متوجہ ہوتے دکھائی دیتے ہیں۔منزل تک پہنچنے کے لیے منزل کا تعین ضروری ہے اور منزل کے تعین سے قبل راہ بر اور راہ زن میں فرق کرنا ضروری۔وہ اس نکتے کو سمجھاتے ہوئے قوم کو یہ پیغام دیتے ہیں کہ:

جو کاری زخم لگا ہے دل پر پہلے اس کی فکر کرو   بعد میں دیکھا جائے گا کہ یہ کس کی کارگزاری ہے

اس راہ سے ہو کر گزرے ہیں کچھ رہبر بھی کچھ رہزن بھی   اب نقشِ قدم پہچان کے چلنا آپ کی ذمے داری ہے [۲۷۰]

صبا اکرام کی غزلوں میں بھی اس المیے کا رنگ نمایاں ہے۔ہجرت کے عذاب اور دربدری کے دکھ کو وہ اپنے ذہن سے کبھی نہ کھرچ پائے۔اس احساس کی شدت کا یہ عالم تھا کہ اکثر و بیش تر تلخ یادیں انھیں بے چین و بے کل کیے رکھتی ہیں جن کا اظہار وہ کچھ اس طرح کرتے ہیں:

سرحدوں سے کب کٹے احساس کے رشتے صبا   گھر کہیں کوئی جلا، ہم لوگ بے کل ہو گئے [۲۷۱]

سانحہ مشرقی پاکستان سے وہ براہ راست متاثر ہوئے اور اس حادثے کو دل کا روگ بنا کر اس کے نشتر اور چرکے کو ہمیشہ محسوس کیا۔اس المیے کے گیت انھوں نے خونِ دل سے کشید کر کے کاٹے۔حالات کی وہ تلخیاں جو محبِّ وطن عناصر نے سانحہ سقوط ڈھاکا کے دوران برداشت کیں اس کی چبھن آج بھی ان کے دل میں محسوس ہوتی ہے۔اس بابت وہ کہتے ہیں کہ:

ابھی تو نظروں کے لب پہ تازہ/ لہو میں ڈوبے ہوا ایک منظر کا ذائقہ ہے/ غموں کے پتھر کی

نوک نے جو/ ایک دلوں کے شیشے پہ/ ایک کتبہ لکھا تھا/ اب بھی چمک رہا ہے [۲۷۲]

منظر علی خاں بھی قیام بنگلا دیش کے بعد ۱۹۷۲ء میں لٹ لٹا کر کراچی آئے۔''کرب آ گہی'' اور ''یہ بات چلی مجھ سے'' میں سقوط ڈھاکا کا الم ناک بیان اور دو ہجرتوں کا کرب بہت نمایاں ہے۔ہجرت کے ستائے شاعر کے لیے یہ حادثہ جاں کاہ تھا لہٰذا خوشی کے لمحات میں بھی ایک خوف کا عالم ہر وقت ان پر طاری رہتا ہے۔

غم اتنا دوامی ہے کہ ہنگامِ مسرت   آتا ہے تو لگتا ہے مہمان ہو جیسے [۲۷۳]

جن شعرا نے سقوط ڈھاکا کے حوالے سے شاعری کی، انھوں نے اس کے اسباب و علل پر ضرور غور کیا۔منظر نے بھی اپنے قاری کے سامنے کچھ حقائق پیش کیے۔ان کے مطابق ہم نے خود اپنی بے عملی اور کوتاہی سے اس سانحے کے سامان پیدا کیے۔قوم کے کھوئے سکون نے ملک کو اس بھیانک انجام تک پہنچایا۔ان راہ بروں کی بابت شاعر کا کہنا تھا کہ:

وہ جن کا پیشہ ہی رہ زنی ہے، وہ درس دیتے ہیں رہ بری کا

جو خود اندھیروں کے ہیں پجاری، علم اٹھاتے ہیں روشنی کا[۲۷۴]

سقوط ڈھاکا کے المیے کا احساس شاعر کو بے تاب رکھتا ہے۔ یہ احساس اس وقت مزید دوچند ہو جاتا ہے جب اس کا محرک بھی اپنے ہوں۔ جن پر مان ہو، وہی ستم بالائے ستم ڈھانے لگیں تو زندگی میں غم کا احساس شدت کی انتہا تک پہنچ جاتا ہے۔ شاعر اس غم والم کی شدت بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

یہ پھول ہیں زخموں کے، بہاراں تو نہیں ہے
جلتے ہوئے آنسو ہیں، چراغاں تو نہیں ہے
مرے ہونٹ آگ سے جل گئے، مرے دل کا درد سوا ہوا
جو کسی نے پرسشِ حال کی، مرا زخم اور ہرا ہوا[۲۷۵]

حادثے سے بڑھ کر سانحہ بار بار کی ہجرت تھی۔ ہجرت نے جو بے مائیگی اور احساس کمتری کی کیفیت پیدا کی، شاعر نے اس کیفیت کا اظہار بھی کھل کر کیا۔ بے گھری اور بے وطنی کا احساس جب شدت سے عود آیا تو پھر اس قسم کے اشعار تخلیق ہوئے:

گھر بناتے ہیں ہم لٹانے کو　　ہائے کتنے عجیب ہیں ہم لوگ
مجھے اضطراب کیوں ہے جو گری ہے برق منظر　　مرا آشیاں تو یوں بھی کئی بار جل چکا ہے
ہم لٹتے رہے ایسے کہ اب اپنے مکاں کو　　کہتے ہوئے ڈرتے ہیں کہ یہ اپنا مکاں ہے[۲۷۶]

المیوں سے برا یہ المیہ ہے کہ جن لوگوں نے عظمت وطن کے لیے قربانیاں دیں، وہی نظر انداز ہوئے۔ ستم تو یہ ہے کہ صلے کا وقت آتا تو بہت سے زمانہ شناس فیض یاب ہوتے اور اصل حق داروں کو فراموش کر دیا جاتا۔ منظر اس صورت حال پر بھی مضطرب دکھائی دیتے ہیں۔ اس کیفیت کا اظہار کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ:

میں بھی تو ہوا تھا ترے ناموس پہ قرباں　　اب ڈھونڈ رہا ہوں کہ مرا نام کہاں ہے[۲۷۷]

ان ساری تلخ نوائیوں کے باوجود منظر اپنے حوصلوں کو پست نہیں ہونے دیتے۔ وہ ان حالات میں بھی وطن سے محبت کی شمع روشن رکھنے کی ہر ممکن کوشش اور جستجو کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ حالات کی تلخی ان کے جذبے کو سرد نہیں ہونے دیتی۔ اسی لیے وہ کہتے ہیں کہ:

بایں حقیقت کہ غم کے مارے ہوئے زخموں سے چور ہم ہیں
وفا کی وادی میں پھر بھی یارو کوئی نہیں پر ضرور ہم ہیں
وہ جس کی گردن نہ جھک سکی ہزار دشمن نے زور مارا
وہ جس سے بے زار آپ بھی ہیں، وہ دل شکستہ حضور ہم ہیں
جگر ہے اب لخت لخت لیکن لہو میں بوئے وفا ہے باقی
تمہارے گروہ نہیں بلا سے، یہ سچ ہے ان کے ضرور ہم ہیں[۲۷۸]

منظر حالات کی ستم ظریفی پر گردن جھکانے اور آنسو بہانے کے بہ جائے عزم اور حوصلے کو ہمیشہ بلند رکھنے پر زور دیتے ہیں۔

ان کے مطابق:

مری سرکشی سے ہیں باخبر یہاں ظلم وجور کی طاقتیں　　گری لاکھ برقِ ستم مگر مرا سر ہے اب بھی اٹھا ہوا [۲۷۹]

رشید الزماں خلش کلکتوی بھی سقوط ڈھاکا سے قبل وہاں سے نکل آئے تاہم ان کی شاعری میں اس المیے کی پرچھائیاں ضرور دکھائی دیتی ہیں۔انھوں نے اپنی نظم ''تقسیم در تقسیم'' میں سقوط ڈھاکا کے کئی مناظر دکھائے ہیں۔خصوصاً آزادی ہند جو کہ مسلمانانِ ہند کے لیے خوشی کا باعث تھی لیکن تقسیم در تقسیم کے عمل نے آزادی کی اس خوشی کو کس طرح چھینا اس کا اظہار کرتے ہوئے خلش کا انداز دیکھیے:

دیئے ہیں یوں ہمیں تقسیم در تقسیم نے چرکے　　کہ آزادی بلائے نا گہاں معلوم ہو تی ہے

جلا دیتے ہیں میرا آشیاں میں پھر بنا تا ہوں　　خدا رکھے ابھی ہمت جواں معلوم ہوتی ہے

عزیزوں سے خلش ہم جیتے جی کچھ اس طرح بچھڑے　　کہ ان کی یاد یادِ رفت گاں معلوم ہوتی ہے [۲۸۰]

شمس الضحیٰ ضحیٰ آروی کو بھی سقوط ڈھاکا کے وقت کڑی آزمائشوں سے گزرنا پڑا۔اس سانحے کے بعد دو برس تک نا گفتہ بہ زندگی گزارنے کے بعد نومبر ۱۹۷۳ء کو کراچی تشریف لائے۔''ذوقِ ضحیٰ'' کے عنوان سے شائع ہونے والے شعری مجموعے کا غالب حصہ سقوط ڈھاکا کے الم ناک واقعات سے متعلق ہے۔ان کی شاعری میں ان تمام واقعات و واردات کے سائے لرزتے ملیں گے جن سے ہماری قومی زندگی اور ملی شناخت نا قابلِ بیان حد تک مجروح و مضروب ہوئی ہے۔چناں چہ اس اندوہ ناک صورت حال کے زیرِ اثر راہ برو راہ زن، دار و رسن، گلستان و گل چیں، صیاد و باغ باں، برق و آشیانہ اور اس قسم کی دوسری علامتیں بہ کثرت استعمال ہوئی ہیں [۲۸۱]۔اس اندوہ ناک سانحے کی بابت خود شاعر کا بیان ہے کہ ''۱۶ دسمبر ۱۹۷۱ء کو جب سانحہ سقوط ڈھاکا رونما ہوا تو آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔زمین پاؤں سے نکلتی ہوئی محسوس ہوئی'' [۲۸۲]۔ضحیٰ کے مطابق سانحہ مشرقی پاکستان کے اسباب میں سب سے اہم سبب ان رہ نماؤں کی بے عملی تھی جنھوں نے اپنی ذاتی انا اور مفادات کو ملکی اور قومی مفادات پر ترجیح دی۔ان بے عمل رہ نماؤں کی ریشہ دوانیوں کا پردہ چاک کرتے ہوئے ان کا کہنا تھا کہ:

جو برتاؤ کرتے ہیں رہرو زن　　وہی کام اب راہ بر کر رہے ہیں [۲۸۳]

ضحیٰ کو اس زمانے کی قیادت کی بے عملی اور نا عاقبت اندیشی سے کافی شکایت تھی۔اس لیے انھوں نے اپنی شاعری میں انھیں سخت تنقید کا نشانہ بنایا۔ان کے خیال میں اس سانحے کے سب سے بڑے ذمے دار یہی نام و نہاد رہ نما تھے جن کے غلط فیصلوں سے قوم کو اس اندوہ ناک سانحے سے گزرنا پڑا۔

یہ اتفاق ہے کہ جتنے بھی راہ بر آئے　　وہ راہ زن تھے مگر قا فلے میں در آئے

کیوں رہ زنوں کا ذکر چھیڑتے ہیں آپ　　اس وصف کو بھی دیکھیے جو راہ بر میں ہے

لٹی ہے عین منزل پر متاعِ زندگی اپنی　　کسے معلوم تھا رہ زن امیرِ کارواں ہوگا [۲۸۴]

قیادت کی بے عملی کے ساتھ ساتھ ضحیٰ نے اپنوں کی بے رخی اور نفرت پر بھی سخت مضطرب دکھائی دیتے ہیں۔وہ لوگ جو کل تک دوست اور ہم درد تھے، آج دشمنی اور ایذا رسانی کی سرحد پار کرنے پر تیار بیٹھے تھے۔ضحیٰ نے اس کیفیت کی منظر کشی کرتے ہوئے کہا کہ:

کسے خبر تھی ضحیٰ کہ ہوں گے جو دوست کل تھے وہ آج دشمن　　ستم رسانی کا سوچتے ہیں کوئی طریقہ، کوئی بہانہ

اپنا جو تھا وہ در پئے آزار ہوگیا　　گل ہم نے جس کو سمجھا تھا وہ خار ہوگیا[۲۸۵]

اپنے گلشن کے اجڑنے کا غم بھی شاعر کو ہر وقت بے چین رکھتا۔ وہ چمن جس کے ایک ایک پودے کی آبیاری کے لیے کیا کیا جتن کیے گئے، اس کی تباہی اور ویرانی ناقابلِ بیان تھی۔ اس صورت حال کو بیان کرتے ہوئے ضحیٰ کا کہنا تھا کہ:

جب گلستاں ہی جل گیا سارا　　کوئی کیا روئے آشیانے کو

کیوں تار تار ہوگیا داماں نہ پوچھیے　　کیسے ہوا ہے چاک گریباں نہ پوچھیے

آتی ہے کیسی فصلِ بہاراں نہ پوچھیے　　کیسا ہوا ہے رنگِ گلستاں نہ پوچھیے

راہِ وفا میں ہوگئے پروانے سرخ رو　　کس حال میں ہے شمعِ شبستاں نہ پوچھیے

وہ تھی بلائے آسماں، دورِ خزاں نہ تھا　　ایسا مٹا ہے گویا کبھی گلستان نہ تھا[۲۸۶]

ہجرت کے کرب اور غریب الوطنی کے عذاب کو انھوں نے نہ چاہتے ہوئے بھی قبول تو کیا لیکن وہ اس بے جرم کی سزا پر قدرت سے شکوہ ضرور کرتے ہیں:

گھر سے بے گھر ہو گئے معاذ اللہ　　ہم نے کس جرم کی سزا پائی[۲۸۷]

اس دوسری ہجرت کے بعد بھی انھیں وہ اپنائیت نہیں ملی جس کی انھیں توقع تھی۔ نئی جگہ، نئے لوگ اور بے گانگی کا احساس انھیں ہر دم کچوکے لگاتا۔ اس تکلیف کی شدت کا اظہار کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ:

یہاں تو اور بھی ہم اجنبی سے لگتے ہیں　　سمجھ لیا تھا یہ ہم نے کہ اپنے گھر آئے[۲۸۸]

ان کی شاعری میں سقوط ڈھاکا کا ہر منظر موجود ہے۔ اس سانحے کے بعد محصورین کی حالت کا بیان ہو یا اقدار کے کھو جانے کا غم، انھوں نے ہر منظر کو اپنی شاعری کے کینوس میں پیش کر دیا۔ سقوط ڈھاکا کے بعد باوسیلہ لوگ تو کسی نہ کسی طرح پاکستان آ گئے لیکن لاکھوں غیر بنگالی وہاں کے کیمپوں میں کس کس مپرسی اور بے بسی کی تصویر بنے آج بھی پاکستان کی طرف حسرت بھری نگاہوں سے دیکھ رہے ہیں۔ ان کی بے بسی بھی ضحیٰ کو بے چین کرتی ہے اور وہ ان محصورین کے جذبات کی ترجمانی کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

آج بھی لاکھوں وہاں ہیں چشم گریاں ہر طرف　　چاک داماں ہر طرف، چاکِ گریباں ہر طرف[۲۸۹]

اس کے علاوہ وہ نادان بنگالی جن کو سونار بنگلا کے خواب دکھا کر بغاوت پر اکسایا گیا تھا، جلد ہی خواب کے بکھرنے پر پچھتاوے کا شکار دکھائی دینے لگے۔ شاعر نے ان کے جذبات کی عکاسی بھی کی اور کہا کہ:

وہی تو ہوا ہے جو وہ چاہتے تھے　　مگر اب وہ کیوں چشم تر کر رہے ہیں[۲۹۰]

محمد جمیل احسن، جمیل عظیم آبادی بھی مشرقی پاکستان سے ہجرت کر کے کراچی آئے۔ اسی لیے ان کی شاعری میں بھی اس سانحے کی جھلک بہت نمایاں ہے۔ دیگر شعرا کی طرح انھوں نے بھی اس دور کی نااہل قیادت کو اس سانحے کا ذمے دار قرار دیا۔ ان کے مطابق:

ناخدا کے تغافل سے طوفان میں　　غرق کشتی ہوئی بادباں کھو گیا[۲۹۱]

اس سانحے نے جمیل عظیم آبادی کی غزلوں میں ایک سوز و گداز کی کیفیت پیدا کر دی۔ کاروان کے لٹنے کے غم کا اظہار جس طرح ان کے ہاں دکھائی دیتا ہے، کم ہی شاعر اس المیے کو اس قدر موثر انداز سے پیش کر سکے ہیں۔ ملاحظہ کیجیے:

غم کی آندھی چلی کارواں کھو گیا یہ زمیں کھو گئی آسماں کھو گیا[۲۹۲]

ان کے مجموعے ''گیان درپن''اور''دل کی کتاب''میں سقوط ڈھاکا کے بہت سے رنگ تلاش کیے جا سکتے ہیں۔

معروف شاعرادیب سہیل بھی ۱۹۴۷ء میں دوسری ہجرت کر کے کراچی منتقل ہوئے۔ پہلے ماہ نامہ''افکار''اور پھر''قومی زبان'' کے مدیر مقرر ہوئے۔ان کی تصنیف''بکھراؤ کا حرف آخر''سانحہ سقوط ڈھاکا کا منظوم اظہار ہے۔سقوط ڈھاکا ہماری قومی تاریخ کا ایسا دل خراش سانحہ تھا کہ جن لوگوں نے ان واقعات کو اپنی آنکھوں سے دیکھا،ان کے لیے یہ سانحہ زندگی بھر کا روگ بن گیا۔یہ سانحہ حساس دل رکھنے والوں کے لیے ایک تازیانہ تھا۔اس بابت شاعر کا کہنا تھا کہ یہ سانحہ اس قدر بڑا ہے کہ بیان کی دسترس سے باہر ہے۔صرف احساس کے احاطے میں آ سکے گا[۲۹۳]۔اس غم کو اظہار کے لیے جو لفظ چاہیے،شاعر اسے برتنے سے قاصر ہیں،اپنی اس کم مائیگی کا اظہار کرتے ہوئے وہ اس غم کی شدت کی بابت اپنی ایک نظم''رائیگاں''میں کہتے ہیں کہ:

میری بھی خواہش ہے غم کو جاودانی روپ دوں/ میں نے لفظوں کے کئی پیکر تراشے بھی مگر/
سب مرے معیار،احساسات سے کم تر ہوئے/ درحقیقت اتنا قد آور ہے غم/اس کے سائے
میں اگائے جو بھی پودے لفظ کے/ پنپے نہیں/ حرف جو رکھے برابر اس کے، بونے ہو
گئے[۲۹۴]

تاہم شاعر نے وہ تمام ہول ناک مناظر رقم کیے جسے سوچ کر آج بھی روح کانپ جاتی ہے۔مثلاً شانتاہار میں جو خونی کھیل کھیلا گیا،اس لہولہو منظر کو دکھاتے ہوئے بربادیوں کا جو نقشہ پیش کرتے ہیں اس سے سفاکی اور انسانیت سوز مظالم کا پورا منظر ہماری نظروں کے سامنے پھرنے لگتا ہے۔ملاحظہ کیجیے:

لہولہو کے تمام منظر/ تمام گھر بے مثال بربادیوں کے مظہر/ کچھ ایسے گھر ہیں جو اپنے ہی بے
کفن مکینوں کے مقبرے ہیں/ کچھ ایسے گھر ہیں کہ جن کی طاقوں میں/ سر بریدہ نفوس گل
دان کی طرح سجے ہیں[۲۹۵]

ایک اور نظم''میرا شہر''میں بھی تباہی و بربادی کے مناظر کو شہر آشوب کے انداز میں بیان کرتے ہوئے لوگوں کے کس مپرسی کی بابت کہتے ہیں کہ:

یہ ہے مرگ انبوہ میں غم کا عالم/ کہ کہسار بھی سر پہ خاشاک سا ہے/ جو گھر بار رکھتے تھے گھر
سے نکل کر/ بھلا کر سبھی حال و ماضی کے سپنے/ کھلے آسماں اور درختوں کے نیچے بسیرا کیے
ہیں/ درختوں کے پتوں ہی پہ جی رہے ہیں[۲۹۶]

قتل و غارت گری کے بعد جو لوگ بچ گئے تھے ان کے غم کا اندازہ وہی لوگ لگا سکتے ہیں جو اس کرب سے خود گزرے ہوں۔ ایسے بہت سے افراد تھے جن کے پورے پورے کنبے کو موت کی نیند سلا دیا گیا۔ان لوگوں کی حالت بیان کرتے ہوئے شاعر کا کہنا تھا کہ:

میں اس کے شانے پہ ہاتھ رکھ کر یہ کہہ رہا ہوں/ مجھے پتا ہے کہ اپنے کنبے میں تم ہی شاید بچے
ہو تنہا/ تمہارا غم میرے غم کے آگے پہاڑ سا ہے[۲۹۷]

حالات کی ستم ظریفی یہ تھی کہ اردگرد، آس پڑوس کے لوگوں نے ہی بے اعتنائی شروع کی اور یہ بے اعتنائی اس قدر بڑھی کی لوٹ مار اور خوف ودہشت کا بازار اس طرح گرم کیا گیا کہ رسم آشنائی سے ہی نفرت ہونے لگی۔ اس صورت حال کو پیش کرتے ہوئے شاعر کہتے ہیں کہ:

پریشاں ہے ہر شخص جینے کے ہاتھوں/ یہ جینا بھی اک مسلہ بن گیا ہے/ مقامی کئی دوست صورت/ عجب اجنبی سے ہوئے ہیں/ کئی جانے پہچانے چہرے/ جو شے چاہتے ہیں گھروں سے اٹھا کر لیے جا رہے ہیں/ کہ رسم ورہِ آشنائی یہی ہے [۲۹۸]

ادیب سہیل نے صرف اہل بنگال کی غلطیوں اور کوتاہیوں سے پردہ نہیں اٹھایا بلکہ بنگال کی سرزمین میں بسنے والے اس طبقے کو بھی اس سانحے کا ذمے دار ٹھہرایا جو مقامی تہذیب ومعاشرت میں گھل مل جانا پسند نہیں کرتے تھے۔ ایسے لوگوں کو تلخ انداز میں نصیحت کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ:

ہجرت کرنے والے ہزاروں لاکھوں لوگو/ سب تو نہیں تم میں اکثر مٹی کی خوشبو سے نامانوس ہوا اب تک/ دھرتی سے جب لہر اٹھتی ہے جانے یا ان جانے اس کی راہوں کا پتھر بنتے ہو/ خود کو کنارہ کش رکھتے نئے نئے خطرات کے وہم میں پھنس جاتے ہو/ ڈر جاتے ہو/ گھبراتے ہو/ ہجرت کرنے والے ہزاروں لاکھوں لوگو/ مٹی کی خوش بو سے اپنا رشتہ جوڑو [۲۹۹]

ان کی شاعری سقوط ڈھاکا کا ایسا بیانیہ ہے جسے سامنے رکھ کر حالات اور واقعات کی تلخی کو پوری طرح محسوس بھی کیا جا سکتا ہے اور ان حالات اور واقعات کے محرکات کو بھی سمجھا جا سکتا ہے۔ احمد الیاس نے درست کہا کہ آپ اسے اس پرآشوب دور کی تاریخ کہہ سکتے ہیں۔ یہ کلام ان چھوٹے چھوٹے واقعات کے دریچے وا کرتا ہے جو اس دور میں مرحوم مشرقی پاکستان میں رونما ہوئے [۳۰۰]۔ ظاہری بات ہے اس کو سمجھنے کے لیے تجربے اور مشاہدے کی گہرائی چاہیے، وہ موجودہ حالات میں ناپید ہے۔ اسی لیے ادیب سہیل کا اس بابت کہنا درست معلوم ہوتا ہے کہ:

کس طرح باور کروں میرا کہا سمجھیں گے آپ — جس قیامت کو نہ دیکھا، اس کو کیا سمجھیں گے آپ [۳۰۱]

ظاہری بات ہے کہ مارچ ۱۹۷۱ء سے لے کر سقوط ڈھاکا کے رونما ہونے اور پھر بعد کے چند ماہ کے دوران محبّ وطن لوگوں کے لیے حالات کس قدر سخت تھے، اس کا اندازہ صرف اور صرف وہی لوگ کر سکتے ہیں جنھوں نے ان سارے معاملات کو اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ ظلم وستم کے وہ پہاڑ توڑے گئے کہ ان کی تفصیل سے دل دہل جاتے ہیں۔ محبّ وطن بہاریوں پر جو بیتی اس کی جھلک صدیق سالک کے اس بیان میں دیکھی جا سکتی ہے:

آج وہ دھتکارے ہوئے انسانوں کی طرح ڈھاکا کی نواحی بستی محمد پور اور میرپور میں امید وبیم کی حالت میں دم سادھے بیٹھے تھے۔ بادِ سموم کا ایک جھونکا آتا اور کئی خاندان کے چراغ بجھا کر چلا جاتا۔ جس ہتھیار بند بنگالی کا دل چاہتا، ان کی جان، مال اور عزت سے کھیل جاتا۔ وہ جاتے تو کہاں جاتے۔ ان کی پاسبانی

کرنے والی پاک فوج خود ذلت کے بندھن میں اسیر تھی[۳۰۲]۔

ادیب سہیل کی آنکھوں کے سامنے بھی متعدد بار ایسے واقعات دہرائے گئے۔ چناں چہ حالات کی ستم ظریفی پر انتہائی بے بسی کے عالم میں وہ یہ کہنے پر مجبور ہوئے کہ:

قتل گہہ میں آج فردِ جرم کی پرستش نہیں　　ہے اسی میں عافیت ہو جائیے چپ چاپ قتل[۳۰۳]

چوبیس برس کی رفاقت کے باوجود نفرت کی ایسی آندھی چلی کہ اس نے تمام رشتوں ناتوں کو توڑ کر رکھ دیا۔ سب کی علاحدہ علاحدہ شناخت اور سب کے اپنے اپنے مفاد اس تکلیف دہ احساس نے بھی شاعر کو مضطرب رکھا اور اس سے اس قسم کے شعر کہلوائے کہ:

ہم بہاری تھے، وہ بنگالی تھے　　سارے آدرش ہوئے چکنا چور[۳۰۴]

ان ہجرتوں کے مارے شعرا کے ہاں درد کی پرچھائیاں بہت گہری ہیں۔ مسکن اور مرکز کی تلاش میں وہ اس قدر محوِ سفر رہے کہ آخر کار وہ اس کے حصول سے ہی دست بردار ہو کر یہ کہنے پر مجبور ہو گئے کہ:

ہم پتا بتلائیں کیا، اپنا کوئی مسکن نہیں　　بے تعارف ہی بھلے لگتے ہیں رہنے دو یوں ہی[۳۰۵]

نظیر صدیقی کی زندگی کا بیش تر حصہ مشرقی پاکستان میں گزرا۔ سانحہ سقوطِ ڈھاکا سے صرف دو برس قبل ۱۹۶۹ء میں انھوں نے مغربی پاکستان کوچ کیا۔ بنیادی طور پر تحقیق و تنقید کے شعبے سے دل چسپی تھی لیکن خود ان ہی کے مطابق ''مشرقی پاکستان کا سقوط میری زندگی کا سب سے بڑا سانحہ ہے''[۳۰۶]۔ جس نے لوگوں کو اجاڑ کر رکھ دیا۔ اس سانحے نے لوگوں سے گھر بار، مال و متاع سب کچھ چھین لیا۔ نظیر صدیقی کے بھائی بھی اس سانحے میں جاں بحق ہوئے لہٰذا ان کی شاعری میں یہ کرب نمایاں ہے۔ ستم رسیدہ لوگوں کی بابت ان کا یہ شعر ان کے جذبات کا صحیح عکس ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

وہ بھی ہیں جن کے ہاتھ سے دیوار چھن گئی　　محروم ہم ہیں سایۂ دیوار سے تو کیا[۳۰۷]

پروفیسر افتخار اجمل شاہین بھی سقوط ڈھاکا کے بعد مشرقی پاکستان سے ہجرت کر کے کراچی آباد ہوئے۔ ان کے کلام میں بھی اس المیے کی شدت کو واضح طور پر محسوس کیا جا سکتا ہے۔ ظاہر سی بات ہے کہ اس حادثے کی کسک نے لوگوں کو ایک مدت تک خون کے آنسو رلایا۔ یہ ایسا داغ تھا جو جیتے جی نہیں مٹنے والا تھا۔ اس کا اظہار کرتے ہوئے شاعر نے کہا کہ:

اک ایسا زخم بھی دل پر لگا ہے　　نہیں جو مندمل اب تک ہوا ہے[۳۰۸]

افتخار اجمل شاہین نے اس سانحے پر خوب آنسو بہائے۔ دکھ کی شدت کو کم کرنے کا غالباً سب سے موثر طریقہ یہی ہے۔ اسی سبب انھوں نے اشک شوئی سے کام لیا تا کہ غم کی شدت میں کچھ کمی آ سکے۔

سیلِ غم تھم جائے گا کچھ اشک بہہ جانے کے بعد　　خوب جی بھر کے روئے اپنی بربادی پہ آج[۳۰۹]

شاعر کو اس بات کا شکوہ بھی ہے کہ اس سانحے نے ایک خلقت کو متاثر کیا۔ جو لوگ خون کے دریا عبور کر کے اس اندوہ ناک حادثے سے بچ بھی گئے تو ان کا سب کچھ کھو چکا تھا۔ جان، مال اور اولاد کے بچھڑنے کا غم ایک طرف، جس کی بابت شاعر کا کہنا تھا کہ:

سرخ رو یوں بھی ہو کے آئے ہیں　　خود کو خوں میں ڈبو کے آئے ہیں
ہم کہ ان سب کو رو کے آئے ہیں　　اپنا آنگن بھرا تھا بچوں سے[۳۱۰]

دوسری جانب بین الاقوامی برادری سے یہ شکوہ کہ ان لوگوں نے بھی اس سانحے پر دہرا معیار اختیار کر کے ان مظلوموں کی داد رسی نہ کی۔ شاعر کا کہنا تھا کہ یہ واقعہ تو بہت بڑا تھا لیکن:

مشرق میں شر پسندوں نے کیا کیا نہ ڈھائے ظلم　　　دنیا تو ویت نام کی جنگ دیکھتی رہی[۳۱۱]

بار بار کی ہجرت نے اس کرب کو نہ صرف دو چند کر دیا بلکہ شعرا کو ایک مستقل موضوع بھی مل گیا۔ المیہ تو یہ ہوا کہ جو لوگ تمام تر مشکلات سہہ کر پاکستان آ بھی گئے تو انھیں کوئی مثالی ماحول میسر نہ آیا۔ اس ماحول نے دل میں جو خوف کی کیفیت پیدا کی اس کا اظہار کرتے ہوئے اب ان کا کہنا تھا کہ:

یوں خانماں برباد رہے کوئی کب تلک　　　کب تک رہے گا جانے یہ ہجرت کا سلسلہ
کس تمنا سے آیا تھا اس شہر میں　　　خاک میں مل گئے دل کے سب ولولے[۳۱۲]

سید علم دار رضا بھی سقوط ڈھاکا کے وقت ڈھاکا میں کمشنر کے عہدے پر فائز تھے۔ انھوں نے قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کیں۔ ان کی کتاب ''جگنو میری تنہائی کے'' کو بھی اس زمانے کی منظوم داستان قرار دیا جا سکتا ہے۔ رضا کی شاعری کا بنیادی موضوع غم ہے۔ یہ غم انھیں سقوط ڈھاکا کی وجہ سے ملا۔ اس سانحے نے ان کے اشعار کو درد اور کرب کے قالب میں ڈھالا جس کے بعد وہ یہ کہنے پر مجبور ہوئے کہ:

سوزشِ غم کی آگ ہے وہ آگ　　　جس میں اشکوں کے دیپ جلتے ہیں[۳۱۳]

رضا نے اس پر آشوب دور کو ایک ذمے دار فرد کی حیثیت سے دیکھا۔ چناں چہ ان کے اشعار میں درد و غم کی پرچھائیاں دکھائی دیتی ہیں بلکہ اس کے ساتھ ساتھ ان کی شاعری میں جذبات کا ایک طلاطم بھی دکھائی دیتی ہیں۔ ملاحظہ کیجیے:

رستے ہوئے دلوں کے وہ ناسور دیکھ لو　　　ماؤں کو ان کے بچوں کو مجبور دیکھ لو
آہ فغاں سے درد کے شعلوں سے پوچھ لو　　　دامن پہ کتنے داغ ہیں اشکوں سے پوچھ لو[۳۱۴]

اس سانحے سے متاثرہ تقریباً تمام شعرا نے اقدار کی پامالی کا ماتم کیا ہے۔ ہم مسلک و ہم دین ہونے کے باوجود ستم گروں نے اس کا کہیں پاس نہیں کیا۔ اس منظر کو دکھاتے ہوئے شاعر اپنی نظم ''ہنستے ہوئے تارو'' میں یوں گویا ہوئے کہ:

دیکھی ہیں کبھی تم نے مصائب کی گھٹائیں　　　ہنستے ہوئے ہونٹوں پہ مچلتی ہوئی آہیں
روتی ہوئی اقدار سسکتا ہوا انساں　　　تہذیب کے دعوؤں میں گرفتار پریشاں
بہتے ہوئے آنسو، کبھی بے ربط سی فریاد　　　احساس میں جذبات میں کھوئے ہوئے افراد[۳۱۵]

نظم ''بنگال آشوب'' میں بھی شاعر نے اس المیے کو بڑے دردناک انداز سے پیش کیا ہے۔ اس نظم کے کئی منظر ہیں اور ہر منظر درد آشوب کہانی لیے ہوئے ہے۔ ایک منظر ملاحظہ کیجیے:

اور اب ڈر ہے کہ اک کشتی یہاں آئے کبھی / اک ہوس کا شاہ کار / اس کو لے جائے کسی
سنسان بستی میں / آنسوؤں کے باوجود / ہچکیوں کے باوجود / بے بسی کی لاش کو / بے کسی کی
لاش کو / اور پھر چپکے سے اک دن / وہ چلی جائے وہاں / جہاں سے آج تک / کوئی بھی آیا

نہیں[۳۱۶]

معاشرے کے ٹوٹنے کے حالات کو بھی رضا نے بہ غور دیکھا۔ اپنی نظم ''اب دردِ مسلسل سے میں گھبرا سا گیا ہوں'' میں انھوں نے اپنے جذبات کو موثر انداز سے پیش بھی کیا۔ ملاحظہ کیجیے:

اب دردِ مسلسل سے میں گھبرا سا گیا ہوں — ہر سو وہی اندوہ کے اٹھتے ہوئے بادل
ہر سمت وہی تیز کڑکتی ہوئی بجلی — ہر روز یہ دہشت کہ بھلا گزرے گی کیسے[۳۱۷]

رضا کا تعلق چوں کہ محکمۂ پولیس سے تھا، لہٰذا انھیں سقوط ڈھاکا کے بعد دشمن کی قید و بند کی صعوبتیں جھیلنی پڑیں۔ نظم ''بہارِ زنداں'' کے یہ اشعار قید میں گزرے ہوئے لمحات کی سچی تصویر ہیں۔ ملاحظہ کیجیے:

آئی ہے پھر بہار نظاروں سے پوچھ لو — زنداں کے ناخداؤں سے، تاروں سے پوچھ لو
کیسے نسیم آ کے ستاتی ہے بار بار — آہ و فغاں کے اٹھتے شراروں سے پوچھ لو
کلیاں کھلی ہیں زخم کے انگور کی طرح — گزرے ہیں روز و شب کسی مجبور کی طرح[۳۱۸]

رضا نے ایک جرأت مند شاعر کی حیثیت سے اس سانحے کے مکروہ کرداروں کو کھل کر تنقید کا نشانہ بنایا۔ قوم کی تقدیر کے مالک وہ رہ نما جو بے حسی اور بے عملی کی حد سے گزر چکے تھے، ان کے خلاف شاعر نے کھل کر اظہارِ خیال کیا۔ یحییٰ خان کے مکروہ کردار کی بابت ان کی نظم ''رہبر'' بعض ایسے مناظر بھی پیش کرتی ہے جن کے اظہار کے لیے بڑی جرأت درکار ہوتی ہے۔ رضا بے خوف و خطر اس ضمن میں کہتے ہیں کہ:

اور وہ ہنستا رہا/ اپنی لہو و لعب میں کھویا رہا/ شب کی تاریکی بڑھی، ظلمت کدے بڑھتے گئے/
روشنی قعرِ منزلت میں چھپی ڈرتی رہی[۳۱۹]

اس کے علاوہ وہ بہاری جنھیں موجودہ پاکستان میں تیسرے درجے کے شہری سے بھی کم تر حیثیت دی گئی۔ ان کے کردار کو شاعر خوب سراہتے ہیں۔

قیامِ بنگلا دیش کے اعلان کے فوراً بعد جب پاکستان کے سول افسران کو ریڈ کراس کی حفاظت میں ہوٹل انٹر کانٹی نینٹل لایا گیا تو اس وقت بھی یہ بہاری ہاتھ میں پاکستانی جھنڈا اٹھائے، پاکستان زندہ باد کے نعرے بلند کرتے، جلوس کی شکل میں وہاں سے گزرتے جاتے اور ان لوگوں کا حوصلہ بڑھاتے جاتے۔ شاعر نے ان بہاریوں کی وفاداری اور جرات کا اعتراف کرتے ہوئے انھیں یوں خراجِ تحسین پیش کیا:

گرتے ہوئے پرچم کو دیا کس نے سہارا — وہ کون تھا جو ملک کے گاتا تھا ترانے
بے خوف و خطر کون چلا نعرے لگانے — مقتل میں گرانبارئ ناموس لیے تھے
تھی جان ہتھیلی میں مگر خوف سے عاری — ہیں روحِ وطن کہتے ہیں سب ان کو بہاری[۳۲۰]

وفا براہی کی شاعری میں بھی سانحہ سقوط ڈھاکا کی الم ناک کہانیوں کی جھلک دیکھی جاسکتی ہے۔ ان کی شاعری میں لٹنے کا دکھ بھی ہے اور اپنوں کی بے وفائی کا تذکرہ بھی، رسوائیوں کا ماتم بھی ہے اور وطن سے الفت و محبت کا اظہار بھی۔ اپنوں کی غداریوں کا ذکر

کرتے ہوئے انھوں نے رازداں کے قاتل بننے کی روداد کچھ اس طرح بیان کی ہے:

نام لیتے ہو اے وفا ان کا   راز داں جو بنے ہیں قاتل [۳۲۱]

ذکی احمد صدیقی، ذکی آذر بھی سقوط ڈھاکا کے وقت جناح گورنمنٹ ڈگری کالج ڈھاکا میں تدریس کے پیشے سے وابستہ تھے۔ ان کا شعری مجموعہ ''حاصلِ سفر'' سے ان کے عمدہ شعری ذوق کا پتا چلتا ہے۔ سقوط ڈھاکا کے عینی شاہد ہونے کی حیثیت سے انھوں نے اس حادثے کو اپنی جان کا روگ بنالیا۔

افسر ماہ پوری کے مطابق اس واقعے کے بعد وہ بجھ سے گئے اور شعر و ادب کی محفلوں سے زیادہ انھیں مسجد کے گوشے میں سکون قلبی حاصل ہوتا[۳۲۲]۔ ان کے المیہ تاثر کو اس سانحے نے اور گہرا کر دیا۔ یہ سانحہ اپنے اندر اخلاق باختگی اور انسانیت سوزی کے ایسے عبرت انگیز پہلو رکھتا ہے جس سے ساری دنیا چیخ اٹھتی ہے۔

ذکی آذر نے اس المیے سے متاثر ہو کر بعض ایسے شعر کہے جو اردو شاعری میں ہمیشہ زندہ رہیں گے[۳۲۳]۔ ڈھاکا کے سیاسی حالات، افراتفری اور ہنگاموں کی تصویر پیش کرتے ہوئے ذکی کا انداز ملاحظہ کیجیے:

امواج کی شورش بھی ہے یہاں، طوفان کی یورش بھی ہے یہاں
بیٹھے ہیں جہاں ہم آبلہ پا، یہ دریا ہے یا ساحل ہے[۳۲۴]

ان حالات میں اربابِ فکر و دانش کی بے وقعتی پر انھوں نے افسوس کا اظہار کیا۔ جس ماحول میں حماقتوں نے گھر کر رکھا ہو وہاں اہل فہم و فراست مذاق بن کر رہ جاتے ہیں۔ حالات کے اس جبر کو بیان کرتے ہوئے ذکی نے جو سچی تصویر دکھائی اسے ملاحظہ کیجیے:

حاصلِ فکر و نظر کچھ بھی اگر ہے تو یہی   زہر کا جام ہے، دشنام ہے، رسوائی ہے[۳۲۵]

ایک جانب پاکستانی فوج کے دستے دشمن سے برسرِ پیکار امن و امان کی صورت حال کو بہتر بنانے کی کوششوں میں مصروف تھے تو دوسری جانب بنگالی شر پسند محبِّ وطن پاکستانیوں کی قتل و غارت گری کا بازار گرم کیے ہوئے تھے۔ بہاری اور غیر بنگالیوں کے گروہ کو دریا کے کنارے لے جا کر ذبح کر دیا جاتا جس سے دریا کا پانی سرخ ہو جاتا۔ شاعر نے بربریت کے ان مناظر کو دکھاتے ہوئے کہا کہ:

دریا کا پانی خون سے گل رنگ ہو گیا
خاموش دیکھتا رہا تنہا چمکتا چاند
اس شہر کو اب مقتل نہ کہو، اس شخص کو اب قاتل نہ کہو
ہر شہر یہاں اب مقتل ہے، ہر شخص یہاں اب قاتل ہے[۳۲۶]

محبِّ وطن بہاریوں نے جس طرح وفاداری کا حق ادا کیا، شاعر کو اس بات کا پوری طرح ادراک تھا۔ اسی سبب وہ انھیں خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے برملا کہتے ہیں کہ:

لہو سے حق کا علم سر بلند جس نے کیا   زمانہ کر نہیں سکتا اسے نظر انداز[۳۲۷]

اسی طرح جب ان وفا شعاروں کی زندگی تلخ کر دی گئی اور ان کی زندگی آزمائش میں مبتلا ہوگئی۔ بے گناہوں کے خون سے ہولی کھیلی جانے لگی تو شاعر بے اختیار کہنے پر مجبور ہوئے کہ:

درد جھیلنے والے، جاں پہ کھیلنے والے — بے بسی کے یہ پیکر، کھل کے کیوں نہیں روتے

اپنوں کے ستم، غیروں کا قصہ بھی لکھوں گا — بچھڑے ہوئے احباب کا نوحہ بھی لکھوں گا[۳۲۸]

ہجرت کا کرب بھی ذکی کے یاں بھرپور شدت احساس لیے ہوئے ہے، وہ خود بھی ہجرت کے ستائے ہوئے تھے لیکن گھر کی یاد جب جب انھیں آتی وہ اس کی تکلیف کو محسوس کی بغیر نہیں رہ سکے۔ درج ذیل اشعار میں ان کے کرب کو محسوس کیا جاسکتا ہے:

لوگ ملتے ہیں تو گھر پوچھتے ہیں — تھا کوئی اپنا بھی گھر یاد نہیں

یہ سلسلہ سفر کا، یہ فاصلہ نظر کا — کس طرح ختم ہو گا، کچھ آپ ہی بتائیں

فی الحال نہ گھر ہے نہ کوئی ٹھکانا اپنا — گھر کوئی بنالوں تو ٹھکانا بھی لکھوں گا

اس شہر میں تو اے دل ہر شخص اجنبی ہے — ہم کس کے پاس بیٹھیں، ہم کس سے دل لگائیں

یوں دیکھتے ہیں ہم کو جیسے جلا وطن ہوں — ہم بود و باش اپنی کس کس کو اب بتائیں[۳۲۹]

محمد مصطفیٰ ہاشمی، نوشاد نوری کے کلام میں بھی اس تاریخی المیے کی پرچھائیاں تلاش کی جاسکتی ہیں۔ ایک نظم میں اس دائمی المیے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ:

مجھ پہ ہر دورِ گراں بار میں کیا کیا بیتی — کچھ مرا کچھ خطِ تنسیخ کا دل جانتا ہے[۳۳۰]

کاوش عمر بھی مشرقی پاکستان کے اہم شعرا میں شمار کیے جاتے ہیں۔ انھیں زبان و بیان پر ماہرانہ قدرت حاصل تھی[۳۳۱]۔ ان کا مجموعہ ''بحرِ خوں'' سابقہ مشرقی پاکستان اور اس کی علاحدگی کی الم ناک داستانِ منظوم ہے۔ انھوں نے اپنی شاعری کے ذریعے عوام اور خواص دونوں کو مستقبل سے خبردار کرنے کا فریضہ خوب نبھایا۔ وہ حالات کی سنگینی کے لیے بروقت اقدام اٹھانے پر زور بھی دیتے رہے اور انھیں تنبیہ بھی کرتے رہے۔ اپنی ایک نظم میں وہ قوم کو خبردار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

الا! یا بے خبر، تاچند غافل — مٹانے پر تلے ہیں تجھ کو قاتل

سیاسی دشمنانِ دین و ملت — ہیں مصروفِ علاقائی سیاست

ہے جے بنگال، جے پختون، جے ہند — نہیں اسلام کے حق میں خوش آئند

گراں خوابانِ ملت کو خبر دے — کہ ان خوابوں کو اب بے دار کردے[۳۳۲]

شاہین بدر بھی سقوط ڈھاکا کے بعد مشرقی پاکستان سے کراچی منتقل ہوئے۔ اس سانحے نے ان کی شاعری میں ہمیشہ کے لیے ایک اداسی کی کیفیت پیدا کردی۔ اس المیہ کیفیت کو بیان کرتے ہوئے شاعر نے کہا کہ:

کوئی بھی موسم ہو فصلِ اشک اگتی ہے یہاں — آنکھ کی مرطوب دھرتی کس قدر زرخیز ہے[۳۳۳]

اس کڑے وقت میں جبر کی آندھیوں کے کئی روپ سامنے آئے جس نے رنج والم کے دائرے کو مزید بڑھا دیا۔ سقوط ڈھاکا کا بعض منظر اس قدر الم ناک تھا کہ اسے لفظوں کی شکل میں پیش کرنا خاصا مشکل امر تھا۔ خاص طور پر جب کنبے کے کنبے قتل کردیئے گئے ہوں اور کوئی معصوم تنہا اپنے پیاروں کی آس میں بیٹھا ہو تو یہ منظر سخت سے سخت دل کو بھی پگھلا کر رکھ دیتا ہے۔ شاہین بدر نے اپنی شاعری میں ایسے کئی مناظر دکھائے ہیں۔ ان میں سے ایک منظر دیکھیے:

گھر کی دہلیز پہ بیٹھا رہا بچہ تنہا	شاید آجائے کبھی باپ کھلونا لے کر[۳۳۴]

ایسے حالات میں زندگی آہوں اور سسکیوں کا مرقع بن جاتی ہے۔ مایوسی کی اس کیفیت میں شاعر اپنے اردگرد محض اداسی کے گہرے سائے ہی محسوس کرسکتا ہے اسی لیے وہ یہ کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ:

کوئی بھی صفحہ کتابِ زیست کا سادہ نہیں	آنسوؤں کے دستخط موجود ہیں شاہیں بدر[۳۳۵]

اس سانحے کا سب سے الم ناک پہلو یہ ہے کہ ظلم وستم کا بازار گرم کرنے والے تمام کردار کوئی غیر نہیں بلکہ اپنے تھے۔ مکتی باہنی کی تربیت میں ہندوستان کی فوج نے ضرور کردار ادا کیا لیکن اس میں شامل ارکان بنگالی مسلمان ہی تھے۔ مسلم لیگ کے مقامی مسلح دستے نے بھی اس کھیل میں اپنی بساط کے مطابق حصہ لیا۔ ایک مسلمان کا دوسرے مسلمان پر ظلم جہاں تاریخ کا رستا ہوا ناسور اور نہ مٹنے والا داغ بنا وہیں اس نے المیے کی شدت کو مزید بڑھانے میں مہمیز کا کام کیا۔ شاہین نے اس صورت حال کا نقشہ کھینچتے ہوئے کہا کہ:

جو روند ڈالے ہیں ہم نے وہ تن بھی اپنے تھے	وطن بھی اپنا تھا، اہلِ وطن بھی اپنے تھے
کہ سر بھی اپنے تھے، دار و رسن بھی اپنے تھے[۳۳۶]	خود اپنے ذوق کی تقریب رونمائی تھی

سانحہ مشرقی پاکستان ایک فرد سے بڑھ کر قومی المیے کے طور پر ہماری تاریخ میں یاد رکھا جائے گا۔ شاہین نے جہاں ایک فرد کی حیثیت سے اس سانحے پر آنسو بہائے وہیں اس سازش میں ملوث ہاتھوں کو بے نقاب کرنے کی کوشش بھی کی۔ ہماری سیاسی تاریخ میں بانی پاکستان کی وفات کے بعد سرکردہ رہنماؤں کا کردار قابلِ فخر نہیں رہا۔ سانحہ سقوط ڈھاکا کے معاملے میں تو ان رہنماؤں نے بہ جائے گھر کی آگ بجھانے کے مزید جلتی پر تیل ڈالنے کا کام انجام دیا۔ رہنماؤں کے اس مکروہ کردار کی جانب اشارہ کرتے ہوئے شاعر نے کہا کہ:

جس شجر نے عمر بھر سایہ کیا	اس شجر کو آپ نے کٹوا دیا
سدا بہار و سرّ و سمن بھی اپنے تھے[۳۳۷]	جنھیں ہوس کی کلہاڑی سے آپ نے کاٹا

درد کے ان لمحات میں شاہین نے ان وفاداروں اور جاں نثاروں کو خراج تحسین پیش کرنا بھی ضروری سمجھا جنھیں کبھی بھی مقتدر حلقوں نے اس بے لوث وفاؤں کا صلہ دینا ضروری نہیں سمجھا۔ اسی لیے شاعر کو کہنا پڑا کہ:

ہمارے خون سے دیپک جلا رہے ہیں لوگ	ہمارا خون بھی ارزاں ہے اس زمانے میں[۳۳۸]

گھر سے بے گھر ہونے کا عذاب ناک منظر ہو یا وطن سے بے وطن ہونے کا کرب، شاہین نے درد کے ان تمام مناظر کو اپنی شاعری کے کینوس میں قید کرنے کی کوشش کی ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

ہمارے سر پر ہے دوپہر کی خزاں کا سایہ بہت گھنیرا
تھکن مقدر ہے ہجرتوں کی، عذاب سہنا ہے بے گھری کا[۳۳۹]

کسی کے سر پہ گھنا سایہ آسمان کا ہے	کسی کے پاؤں تلے سے زمیں نکلتی ہے[۳۴۰]

ولی عالم شاہین کی نظموں میں بھی ظلم وستم کی ان داستانوں کو بڑے موثر انداز سے قلم بند کیا گیا ہے۔ سقوط ڈھاکا کے بعد بربریت کے جو مظاہر دیکھنے کو ملے، اسے شاعر نے اپنی ایک نظم ''سلسلے خواب کے'' میں بڑے دردناک انداز سے کھینچا ہے۔ انھوں نے

پناہ گزینوں کے کیمپ کی حالتِ زار بیان کرتے ہوئے اس نظم میں جو منظر پیش کیا اس کی ایک جھلک ملاحظہ کیجیے:

اپنے ماں جائے تھے/ جن کے سر/ اپنے نیزوں میں رکھ کر/ قبیلے کی وحشی جواں رات بھر/
رقص کرتے رہے/ اور پھر/ خوں چشیدہ زبانوں سے/ روحوں کے بے پیرہن/ زخم کھائے
ہوئے نیم جاں جسم کو چاٹ کر/ سوم/ رس کی نشیلی گھپاؤ میں/ روپوش ہوتے گئے/ اور
چاروں طرف/ ان کے ماں جایوں کے خواب/ نیزوں پہ لٹکے رہے [۳۴۱]

پاشا رحمٰن ابتداً گورنمنٹ کالج ڈھاکا میں درس و تدریس کے شعبے سے وابستہ ہوئے۔ اس کے بعد ''مارننگ نیوز'' کے مدیر اور پھر سول سروس سے منسلک ہو گئے۔ ۱۹۷۱ء میں مشرقی پاکستان سے کراچی آ گئے۔ ذاتی طور پر تو وہ سانحہ سقوط ڈھاکا سے محفوظ رہے لیکن اس سانحے نے ان کی شاعری پر گہرے اثرات مرتب کیے [۳۴۲]۔ سقوط ڈھاکا نے ان کی روح تک کو گھائل کر دیا۔ لہٰذا ان کے شعری مجموعے ''نشاطِ کرب'' میں اس سانحے کی جھلک بہت نمایاں ہے۔ انھوں نے اس المیے کے کرداروں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بہت سے عوامل اور محرکات کو اس کا ذمے دار ٹھہرایا۔ ان کا کہنا تھا کہ:

قاتل کا تو نام نہ پوچھ   کس کس پہ الزام دھروں [۳۴۳]

یہ ایسا قومی سانحہ تھا جس نے زندگی کے ہر شعبے سے تعلق رکھنے والے افراد کو متاثر کیا۔ اس سوہانِ روح حادثے کی شدت کا احساس وہی کر سکتا ہے جسے پاکستان سے بے پناہ عشق ہو۔ بالخصوص اگر اس نے مشرقی بازو میں زندگی کے دن گزارے ہوں تو اس درد کی شدت اور بھی بڑھ جاتی ہے [۳۴۴]۔ پاشا رحمٰن نے زندگی کا بڑا حصہ وہیں گزارا تھا۔ لہٰذا اس المیے کی شدت کو بھی بہت زیادہ محسوس کیا۔ انسانی خون کی ارزانی اور زندگی کی دشواری کا حال ان کے درج ذیل شعر سے سمجھا جا سکتا ہے:

صلیبِ زیست ہیں کاندھے پہ ہم اٹھائے ہوئے   گو سر سے پاؤں تک ہیں خون میں نہائے ہوئے [۳۴۵]

حالات کا بے رحم کوڑا سب پر اس طرح برسا کہ سب کچھ ختم ہو گیا۔ ان لوگوں کے لیے تو یہ سانحہ ایک کڑے امتحان سے کم نہ تھا جو اپنے وطن سے وفاداری نبھانے کے لیے کسی قسم کا سمجھوتہ کرنے پر تیار نہ تھے۔ اسی لیے ہر قسم کے ستم بنام وطن ان پر کیے گئے۔ اس صورتِ حال کی عکاسی کرتے ہوئے شاعر کہتے ہیں کہ:

بارش کی جب دعائیں کیں شعلے برس پڑے   حالات ہم پہ دیکھیے سفاک کتنے ہیں [۳۴۶]

اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے ان جراتوں کے امین وطن پرستوں کی بلند حوصلگی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ:

کس نے صلیبِ درد کو شانے پہ رکھ لیا   اہلِ جنوں میں ایسا جگر دار کون ہے؟
اے صبح گم شدہ ذرا تصدیق تو ہی کر   ظلمت سے آج برسرِ پیکار کون ہے [۳۴۷]

احمد الیاس کے شعری مجموعے ''آئینہ ریزے'' کا بیشتر کلام سقوط ڈھاکا سے متعلق ہے۔ حکم رانوں کی بے عملی کی بدولت جب ملک دو نیم ہو گیا تو اس سانحے نے بہت سے لوگوں کی شناخت چھین لی۔ اس کیفیت کا اظہار کرتے ہوئے شاعر کا کہنا تھا کہ:

اے لوگو بس یہی ہے ہماری شناخت اب   ہم وہ ہیں جو قبیلے سے اپنے نکل گئے
کھو چکا ہے اپنی جو ساری شناخت   اس کا اب نام و نسب کیا پوچھنا [۳۴۸]

سقوط ڈھاکا کے اکثر کردار اپنے اپنے انجام تک پہنچ گئے۔ مکافاتِ عمل نے ان سے ہر ظلم کا حساب لیا۔ شاعر اس جانب اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

دیکھنا جس روز چلنا راستوں کو آ گیا　　قتل گہہ کی راہ بھی سب قاتلوں تک جائے گی [۳۴۹]

ہجرت کے کرب نے بھی شاعر کو بے چین رکھا۔ احمد نے بھی اپنے اشعار میں اس کرب کی کیفیت کو موثر انداز سے پیش کیا ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

ہم خیمہ نشینوں کی پہچان یہی ٹھہری　　مٹی پہ قدم رکھنا اور سر پہ مکاں رکھنا

الیاس حال یہ ہے کہ اب پوچھتا ہوں روز　　یہ اپنا گھر ہے یا میں کسی اور گھر میں ہوں [۳۵۰]

یہ چھوٹے چھوٹے مصرعے ان محصورین کی حالت زار کو پیش کرتے ہوئے ان کی قابلِ رحم حالت کی سچی تصویر پیش کر دیتے ہیں گویا شاعر ان مصروں میں اس عہد کی تاریخ رقم کر رہا ہو۔ ملاحظہ کیجیے:

غیر کی طرح اجنبی بن کر　　عمر بھر اپنے گھر رہا ہوں میں

اے زمیں تھوڑی سی پناہ کہیں　　بے زمیں عمر بھر رہا ہوں میں [۳۵۱]

ان کی نظموں میں ڈھاکا کے غم والم کی داستانیں جا بہ جا بکھری ہوئی ہیں۔ ماضی کی یاد الیاس کے لیے ایک تکلیف دہ احساس سے کم نہیں۔ اسی لیے وہ تلخ یادوں کو قلم بند کرتے ہوئے نظم ''خوابوں کا کرب'' میں کہتے ہیں کہ:

ہاں یاد ہمیں کچھ آتا ہے / اک بستی تھی، اس بستی میں / ایک گھر تھا / آنگن میں سب رہتے تھے / جب جاگے تو ویرانی تھی / تنہائی تھی، حیرانی تھی [۳۵۲]

رشتوں کے ٹوٹنے بکھرنے کے مناظر ہوں یا رفاقتوں کو روندے جانے کا بیان، الیاس کے ہاں نیرنگ زمانہ کا ہر رنگ اپنی جھلک ضرور دکھاتا ہے۔ نظم ''۱۹۷۱ء کی آخری رات'' میں وہ اس سارے کرب کو کچھ اس طرح بیان کرتے ہیں:

اے دل زار مرے / یہ مری رات کہ جس کے لیے صدیوں میں نے / اپنے غم خانے کو روشن رکھا / اپنے ہر زخم کو مہتاب کے داغوں کی طرح / دبدبہ تر کے چراغوں کی طرح ...اے دل زار مرے / چند لمحوں کی رفاقت بھی غنیمت ہے یہاں / لوگ تو صدیوں کی قربت بھی بھلا بیٹھے ہیں / سب رہ و رسم مٹا بیٹھے ہیں / آج اس شہر میں کوئی بھی شناسا نہ رہا / کتنے ہی چہرے تھے اب ایک بھی چہرہ نہ رہا [۳۵۳]

اسی طرح جب وہ اپنے ہی وطن میں پناہ گزین کی حیثیت سے رہنے پر مجبور ہوئے تو ہجرت کا دکھ اور زیادہ شدت کے ساتھ انھیں دکھی کرنے لگا۔ نظم ''وطن بدر'' میں اپنے اسی کرب کو وہ اس طرح بیان کرتے ہیں:

ہر ایک رہ گزر سے اب　　نشان مٹ گئے ہیں سب

شکستہ کاریاں تمام　　راستوں سے ہٹ گئیں

نہ گولیوں کا شور تھا　　نہ رائفل کی چیخ ہے

لہو کا رنگ گھل گیا گزر گئی وہ ساعتیں
جلی جلی عمارتیں کہانیاں، حکایتیں
یہ آنکھ جیسی آج ہے یہ اشک بار کل بھی تھی
یہ چہرہ، جیسا آج ہے یہ خستہ حال کل بھی تھا
یہ جسم جو نڈھال ہے شکستہ حال کل بھی تھا
میں سوگوار آج بھی میں پر ملال کل بھی تھا
نہ کوئی در نہ کوئی گھر ازل سے ہوں میں در بدر
میں بے زمیں و بے وطن ہوں کہیں بھی میرا گھر نہیں[۳۵۴]

صدیق فتح پوری نے بھی اپنی شاعری میں سقوط ڈھاکا کا معروضی تجزیہ پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔اس سانحے کے پسِ پشت پوری قوم کی بے عملی کا شکوہ کرتے ہوئے شاعر نے درست کہا کہ:

میں کیسے کہوں اغیار کی سازش نے پھونکا ہے وہ خرمن ہوں جو جل اٹھا ہے آپ اپنی حرارت سے[۳۵۵]

۱۶دسمبر ۱۹۷۱ء کو پاکستانی قومیت کے پاؤں میں چبھنے والا کانٹا آج تک دل دردمند کی سوزش کا سبب بنا ہوا ہے۔مشرقی پاکستان کی علاحدگی سے چند ماہ قبل تک مختلف رسائل و جرائد میں شائع ہونے والا کلام اس غبار آلود سیاسی منظر نامے کی ہر الجھن کو پیش کرتا ہے۔رہ نماؤں کی ضد، ہٹ دھرمی اور اقدار کی پامالی کی متعدد مثالیں اس دور کے کلام میں واضح طور پر دیکھی جاسکتی ہیں۔اگر مشرقی پاکستان کے واقعاتِ الم ناک بیان کی صداقت کا اصل پیمانہ قرطاس ابیض کے بہ جائے ان گم نام شعرا کی بیاضوں کو بنایا جائے جن کا کلام اب تک مرتب نہیں ہوسکا تو اس اندوہ ناک المیے کی مزید چشم کشا تصویریں ہمارے سامنے واضح ہوسکیں گی[۳۵۶]۔

علامہ تمنا عمادی بھی ایک قادرالکلام شاعر تھے ان کی سیاسی اور قومی نظموں کے دو مجموعے ''ہوک'' اور ''لیڈر نامہ'' منظر عام پر آچکے ہیں۔۱۹۶۹ء میں مشرقی پاکستان سے کراچی منتقل ہوئے[۳۵۷]۔ان کے ہاں بھی سقوطِ ڈھاکا کے تناظر میں کلام ملتا ہے۔ہجرت اور اجنبیت کے کرب کو انھوں نے نہ صرف محسوس کیا بلکہ اپنی شاعری کا مستقل موضوع بھی بنایا جیسے:

نکلے اجل کے معرکہِ جاں کنی سے ہم تب جا کے روشناس ہوئے زندگی سے ہم
کیا کرسکیں گے اپنا تعارف کسی سے ہم اپنی نظر میں آپ ہیں اک اجنبی سے ہم[۳۵۸]

فضل احمد کریم فضلی بنیادی طور پر ناول نگار کی حیثیت سے مشہور ہوئے۔انھوں نے ناولوں اور افسانوں میں بھی بنگال کے معاملات اور مسائل کو موضوع بنایا۔''خون جگر ہونے تک''قحطِ بنگال سے متعلق ان کا مشہور ناول ہے لیکن اپنی طویل نظم ''نذرِ اقبال'' میں انھوں نے نظریہ پاکستان کی وضاحت کرتے ہوئے سقوطِ ڈھاکا کے سانحے کو مسلمانوں کے دلوں کی تقسیم قرار دیتے ہوئے کہا کہ:

کر دیا تیری نواؤں نے دلِ مسلم دو نیم ضرب جو تیری پڑی ثابت ہوئی ضربِ کلیم[۳۵۹]

مبارک مونگیری نے اپنی طویل نظم ''مقدس لہو'' میں مشرقی پاکستان کی وحشت ناکیوں کو سمیٹنے کی کوشش کی ہے۔نظم کا ہر بند ایک نئے المیے کا اظہار بھی ہے اور اہل وفا کے قتل عام کی دل دوز عکاسی بھی۔ملاحظہ کیجیے:

یہ تھے بربریت میں بے باک کتنے | شکم حاملہ کے ہوئے چاک کتنے
مظالم تھے اف زیرِ افلاک کتنے | ہوس کے پجاری تھے ناپاک کتنے
کہ مسجد کی حرمت بھی بے آبرو ہے | ادب اے زمیں یہ مقدس لہو ہے
یہ سلمیٰ کی چیخیں فضا کانپتی ہے | برہنہ ہے سر تا بہ پا کانپتی ہے
لبوں پر اجل کی دعا کانپتی ہے | لرزتی ہے حیرت حیا کانپتی ہے
لہو میں شرابور ہے ما ہرو ہے | ادب اے زمیں یہ مقدس لہو ہے[۳۶۰]

مہاجرین کی بدحالی اور ان سے اظہار یک جہتی کے تاثر کو ابھارنے کے لیے یہ بند ملاحظہ کیجیے:

یہ ترک وطن کرکے آئے ہوئے تھے | یہ تجھ پر سبھی کچھ لٹائے ہوئے تھے
یہ تیرے تھے تجھ میں سمائے ہوئے تھے | اخوت کا پرچم اٹھائے ہوئے تھے
وہی جس کی مرہونِ احسان تو ہے | ادب اے زمیں یہ مقدس لہو ہے[۳۶۱]

شاعر صدیقی کا شمار بھی مشرقی پاکستان کے معروف شعرا میں ہوتا ہے۔۱۹۷۳ء میں سقوط ڈھاکا کے بعد براستہ نیپال، پاکستان آئے۔المیہ مشرقی پاکستان کے تناظر میں ان کا غیر مطبوعہ مجموعہ کلام ''پانی کا ملک پتھر کے لوگ'' کے چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

آ پھنسے جال میں ستم گر کے | ملک پانی کا لوگ پتھر کے
آگ کا جسم اور دل پتھر | جس کو دیکھو وہ ظلم کا پیکر
بولتے ہیں یہ پیار کی بولی | کھیلتے ہیں یہ خون کی ہولی
خون ہی خون ہے نگاہوں میں | مسجدوں میں گھروں میں راہوں میں
اس میں شامل ہے خون بچوں کا | ننھے ننھے نحیف جسموں کا
مرد کا خون، خون عورت کا | خون عزت کا خون عصمت کا
توبہ توبہ درندگی توبہ | ہائے انساں کی بے بسی توبہ
لے کے چٹگام سے بینا پل تک | عصمتیں لٹ رہی ہیں بیچ سڑک[۳۶۲]

پروفیسر فروغ احمد مشرقی پاکستان میں ''ادب اسلامی'' کے ترجمان و علم بردار رہے۔سقوط ڈھاکا کے بعد لاہور آ گئے۔فروغ کے متعدد اشعار میں گلستان کے لٹ جانے کا ماتم ملتا ہے۔اس سانحے کے دانش وروں اور شاعروں کے لب تک پر مہر لگا دی تھی جس کا اظہار کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ:

شاعرِ بے کساں کب سے خاموش ہے | مرد آتش بجاں کب سے خاموش ہے
کب سے خاموش ہیں شب کی تنہائیاں | کب سے خاموش ہیں غم کی پنہائیاں
پھول خاموش ہیں کوئی خوش بو نہیں | لب ہیں خاموش آنکھوں میں آنسو نہیں
ہائے بجھتے ستاروں کی خاموشیاں | ہائے اجڑے دیارو کی خاموشیاں[۳۶۳]

حافظ دہلوی نے تو دوسری ہجرت سے بہتر اسی سرزمین میں رہنا پسند کیا لیکن حالات کا کرب ان کی شاعری میں بھی نمایاں ہے۔خضر وسالار کی بے راہ روی ہو یا قاتل ومقتول کے مکالمے، ان کے ہاں سقوط ڈھاکا کے کئی مناظر اپنے بھرپور تاثر کو پیش کرتے ہیں۔چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

وہ جیسے دشمن وہ جیسے قاتل، یہ جیسے نا آشنا ہمارے — نہ خضر وسالار اپنے بس میں نہ ہم سفر اختیار میں ہیں
اک وار کرے اور سکتا ہوں ابھی میں — کہہ دو مرے دشمن سے کہ زندہ ہوں ابھی میں[۳۶۴]

سقوط ڈھاکا کا غم ناک منظر وہ کبھی بھلا نہیں پائے۔شہرِ خموشاں کا منظر ہو یا سرد نعشوں کے انبار ہر زخم ان کے ہاں ہر وقت تازہ دکھائی دیتا ہے۔ملاحظہ کیجیے:

سنگ در چہرۂ زرد خاموش ہیں — سیکڑوں لاشۂ سرد خاموش ہیں
ہم جو شہرِ خموشاں میں کھوئے گئے — اشک ویران راہوں میں بوئے گئے[۳۶۵]

سانحہ سقوط ڈھاکا کے اثرات صرف مشرقی پاکستان میں آباد شعرا پر ہی نہیں ہوئے بلکہ مغربی پاکستان کے شعرا کو بھی اس المیے نے تڑپا کر رکھ دیا۔ یہاں موجود شعرا نے اس دکھ کو روح کی گہرائیوں تک اترتے محسوس کیا۔حفیظ جالندھری نے تشکیل پاکستان کے بعد کے حالات بالخصوص صوبائیت اور عصبیت کے ناسور کو پروان چڑھتے دیکھا تھا،اس کی جانب پیش گوئی کرتے ہوئے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ:

آج ہم گھر ہی میں ہیں اجڑے ہوئے لوٹے ہوئے — لیڈروں کی اقتداری ضرب سے ٹوٹے ہوئے
دیکھ کر یہ تفرقے یہ ''لیڈریت'' کے عناد — بھارتی غارت گری کیسے نہ دے آشیر باد[۳۶۶]

پاکستانی ادیبوں اور شاعروں نے اس لمحۂ ناپرساں کو اپنے موضوعات میں شامل کر کے اسے تاریخ پاکستان کا ایک سیاہ باب قرار دیا۔خاور اعجاز نے اپنی تصنیف ''نئی پاکستانی غزل'' میں المیہ مشرقی پاکستان کے اسباب وعلل کا تجزیہ کرتے ہوئے اسے فریقین کی پے در پے غلط کاریوں کا نتیجہ قرار دیا اور کہا کہ اس زمانے کی غزلیں ان غلط کاریوں کی طویل فہرست اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے[۳۶۷]۔اس کے علاوہ پاکستانی نظم گو شعرا کے ہاں بھی سانحہ سقوط ڈھاکا ایک مستقل موضوع رہا ہے۔مجید امجد کا کلیات میں متعدد نظمیں اس موضوع کی تلخی اور جھنجھلاہٹ کو سمیٹے ہوئے ہیں۔ایک محبِّ وطن فرد کی حیثیت سے مجید نے اس سانحے پر دل گرفتہ بھی تھے اور مایوس بھی۔اپنی ایک نظم ''اے قوم'' میں وہ قوم سے مخاطب ہوتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

پھولوں میں سانس لے کہ برستے بموں میں جی — اب اپنی زندگی کے مقدس غموں میں جی
وہ مائیں جن کے لال لہو میں نہا گئے — صدیوں اب ان کے آنسوؤں اکھڑے دموں میں جی[۳۶۸]

ان کی کلیات میں شامل ''ریڈیو پر اک قیدی، جنگی قیدیوں کے نام، نظم بہ عنوان ۲۱ دسمبر ۱۹۷۱ء اور غزلِ جنگ بھی، تیر دھیان بھی ہم بھی'' وغیرہ میں براہ راست سقوط ڈھاکا کو ہی موضوع بنایا گیا ہے۔اس دور کے سیاسی انتشار کو بڑی خوب صورتی سے ان نظموں میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ڈاکٹر شبیر احمد قادری کے مطابق:

> ۱۹۶۵ء اور ۱۹۷۱ء کی جنگوں کے حوالے سے مجید امجد نے معرکہ آرا نظمیں لکھی ہیں۔سقوط ڈھاکا نے

شاعروں، ادیبوں اور دانش وروں کو جس شدید صدمے سے دوچار کیا اس کا اظہار اس عہد کے شعر و ادب میں ضرور ملتا ہے۔ ۱۹۷۱ء کے بعد تو گویا مجید امجد بھی احساس شکست کا شکار دکھائی دیتے ہیں۔ وہ ان لوگوں کی ذہنیت کا مرثیہ لکھتے ہیں جن کی وجہ سے دنیا کی سب سے بڑی اسلامی مملکت دولخت ہو گئی[۳۶۹]۔

نظم ''ریڈیو پر ایک قیدی'' کی تخلیق کا باعث فیاض محمود فیضی بنے جو مدتوں کیفے ڈی روز میں مجید کے ساتھ بیٹھا کرتے تھے[۳۷۰]۔ سقوط ڈھاکا کے بعد وہ بھی جنگی قیدی بن گئے۔ پھر ایک روز اچانک انھوں نے اپنے زندہ ہونے کی خبر سنائی تو مذکورہ تلخ اور طنز سے بھرپور نظم کی تخلیق ہوئی۔ شاعر اس نظم میں قوم کے وقار کا سودا کرنے والوں پر بھرپور طنز کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ ملاحظہ کیجیے:

ریڈیو پر ایک قیدی مجھ سے کہتا ہے، میں سلامت ہوں / سنتے ہو، میں زندہ ہوں / بھائی تو یہ کس سے مخاطب ہے، ہم کب زندہ ہیں / ہم اپنی چمکیلی زندگی کے لیے، تیری مقدس زندگی کا یوں سودا کر کے / کب کے مر بھی چکے ہم / ہم قبرستان میں ہیں / ہم اپنی قبروں سے باہر بھی نہیں جھانکتے / ہم کیا جانیں کس طرح ان پر باہر تیری دکھی پکاروں / کے یہ ماتمی دیے روشن ہیں / جن کے اجالوں میں اب دنیا ان لوگوں پر ہمارے ناموں کو / پہچان رہی ہے[۳۷۱]

نظم ''جنگی قیدی کے نام'' میں وہ ان قوتوں سے بے زار دکھائی دیتے ہیں جنھوں نے قومی آبرو کا جنازہ نکالنے میں اہم کردار ادا کیا۔ محاذ جنگ پر سامان حرب کی عدم فراہمی کے مسائل ہوں یا ناچار ماؤں کا اپنے اسیر سپوتوں کے لیے اداس ہونا، مجید نے اس مختصر سی نظم میں ہر منظر کو کھول کر رکھ دیا ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

وہاں جہاں مشکلوں سے آزاد گلشنوں کی ہوائیں پہنچیں / وہیں دور ادھر تمھاری دکھوں بھری کی کال کوٹھری تک / ہماری ٹوٹے ہوئے دلوں کی صدائیں پہنچیں / دعائیں پہنچیں / وفائیں پہنچیں[۳۷۲]

مشرقی پاکستان کا بنگلا دیش بن جانا آج کی ایک تلخ حقیقت ہے لیکن جب اس جنگ کا فیصلہ نہیں ہوا تھا تو شعرا اور ادبا کا اپنے فوجی جوانوں کے ساتھ اظہار یک جہتی کرنا فطری امر تھا۔ جنگ کے آغاز کے دنوں میں گورنمنٹ کالج ساہی وال کے میدان میں جب جنرل ٹکا خاں نے افواج پاکستان کے ہم راہ کیمپ لگایا تو مجید نے بھی اس اقدام کو سراہتے ہوئے کہا کہ:

جنگ بھی تیرا دھیان بھی ہم بھی	سائرن بھی، اذان بھی ہم بھی
اک عجب اعتماد سینوں میں	فتح کا یہ نشان بھی ہم بھی
تو بھی اور تیری نفرتوں کے ساتھ	شہر میں ٹکا خاں بھی ہم بھی[۳۷۳]

۱۶ دسمبر کو پلٹن میدان میں سقوط ڈھاکا کی دستاویز پر دستخط ہوئے اور پاکستان کا دایاں بازو ہم سے جدا ہو گیا۔ یہ سانحہ کوئی معمولی سانحہ نہ تھا۔ یہ افسوس ناک منظر جن لوگوں نے دیکھا، اس نے خون کے آنسو روئے۔ صدیق سالک کے مطابق:

منا ریس گراؤنڈ میں ہندوستانی فوج کا پہرا تھا جب کہ چاروں طرف بپھرے ہوئے لوگ ہاتھوں میں لا

ٹھیاں، برچھے، کلہاڑیاں، بندوقیں اور رائفلیں لیے منڈلا رہے تھے۔ جب دونوں جنرل وہاں پہنچے تو شور اٹھا۔ انھوں نے پاکستان اور پاکستانی افواج کے خلاف نعرے لگائے۔ جنرل نیازی نے شکست کے کاغذات پر دستخط کیے اور اپنا ریوالوار اور پیٹی جنرل اروڑا کو پیش کی۔ ان کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ وہ ڈائس سے اتر کر اپنی کار کی طرف بڑھے تو بپھرے ہوئے ہجوم میں سے ایک شخص نے آگے بڑھ کر ناک سے اینٹھ نکالا اور ان کی طرف اچھال دیا۔ ایک اور شخص نے آگے بڑھ کر جنرل نیازی کی طرف اپنا جوتا پھینک دیا[۳۷۴]۔

یہ اور اس طرح کے دیگر مناظر سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اس وقت فوج سمیت محبِّ وطن پاکستانیوں پر کیا گزری ہوگی۔ مجید نے اس اندوہ ناک منظر کو دکھاتے ہوئے کہا کہ:

آج ہم اپنے جیالے بیٹوں کو روتے ہیں/ آنسو ہم پر ہنستے ہیں/اس مٹی کے وہ بیٹے ہم نے قسمت ہی نہ جانی جن کے چہروں کی/ اور ہم اپنے بھرے بھرے/ پھیپھڑوں کے/ ٹھنڈے ٹھنڈے دخانوں کے پیچھے/ یہی سمجھتے رہے کہ ہمارا لہو تو گاڑھا ہے[۳۷۵]

نظم ''۱۶ دسمبر ۱۹۷۱ء'' میں وہ رنج و غم کی اس کیفیت کو بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

کیسی ہے یہ بھوری اور بھسمنت اور بھربھری ریت/ جس کے ذرا ذرا سے ہر ذرے میں پہاڑوں کا دل ہے/ ابھی ابھی ان ذروں میں ایک دھڑکن تڑپی تھی/ ابھی ابھی اک سلطنت ڈوبی ہے/ ابھی ابھی ریتوں کی سلوٹوں کا اک کنگرہ ٹوٹا ہے/ سب کچھ ریت سرکتی ریت[۳۷۶]

بنگال میں ہونے والی قتل و غارت گری اور زخم زخم منظر پر بھی شاعر کا دل افسردہ دکھائی دیتا ہے۔ ایک نظم میں وہ اداسی کے یہ مناظر دکھاتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

ان سالوں میں سیاہ قتّالوں میں/ چلی ہیں جتنی تلواریں بنگالوں میں/ ان کے زخم اتنے گہرے ہیں روحوں کے پاتالوں میں/ صدیوں تک روئیں گی قسمتیں جکڑی ہوئی جنجالوں میں/ ظالم آنکھوں والے خداؤں کی ان چالوں میں[۳۷۷]

احمد ندیم قاسمی کی نظم ''ایک ہی رنگ ہے'' میں بھی خوں ریز جنگ کی تباہ کاریوں پر نوحہ خوانی ملتی ہے۔ مشرقی پاکستان میں ملک کے اندر جس طرح خون کی ہولی کھیلی گئی اور مغربی سرحدوں پر بمباری سے سیکڑوں افراد کے لقمۂ اجل بن جانے پر احمد ندیم قاسمی بھی ضبط کے بندھن کو روک نہ سکے۔ ملاحظہ کیجیے:

مگر خون کا تو فقط ایک ہی رنگ ہے/ چاہے ڈھاکے کا ہو/ چاہے لاہور کا/ آج کے دن کا/ یا آنے والے دنوں کا/ ہزاروں کا ہو یا کروڑوں کا ہو/ رنگ تو خون کا ایک ہے/ اور یہی رنگ ہے آج کی زندگی کا/ مرے شہر بھی، میرے گاؤں بھی، جنگل بھی، میدان بھی، میرے

کہسار، میرے سمندر/ سبھی خون ہی خون ہیں/ میرے کڑیل جواں خون ہی خون ہیں/
میرا گھر خون ہے/ میرا دل خون ہے [۳۷۸]

یہ خون ان خوابوں، خواہشات اور امیدوں کا استعارہ ہے جسے کھلے عام مشرقی پاکستان کی گلیوں اور بازاروں میں بہایا گیا [۳۷۹]۔ ان کی شاعری میں پاکستان سے محبت کا والہانہ اظہار ملتا ہے اسی لیے ۱۹۷۱ء کے سانحے نے ان کی نظموں میں اشک باری اور افسوس کی فضا پیدا کر دی۔ اس المیے کی یاد سے لپٹے ہوئے شاعر کے دکھ کو ان مصرعوں سے بہتر طریقے سے سمجھا جا سکتا ہے:

میں روتا ہوں/ اے ارضِ وطن/ میں روتا ہوں/ الميوں کے تانبے کی طرح تپتی ہوئی زرد
فصلوں کے آئینوں میں/ جب خود کو مقابل پاتا ہوں/ میں روتا ہوں/ میں جب بھی اکیلا ہو
تا ہوں/ میں روتا ہوں [۳۸۰]

وطن کی محبت سے سرشار دلوں پر جب اس طرح بجلی گرے گی تو سانحے کی شدت انھیں خود بہ خود پھوٹ پھوٹ کر رونے پر مجبور کر دے گی۔ خود کو رسوا ہوتے دیکھ کر اور دنیا کو اپنے اوپر ہنستا ہوا دیکھ کر شاعر خون کے آنسو رونے پر مجبور ہوئے۔ محصورین کے دکھ نے بھی انھیں آنسو بہانے پر مجبور کیا۔ عالمی ریڈ کراس نے جب محصورین کے لیے محض پچیس الفاظ کی حد طے کی تو احمد ندیم قاسمی نے ''۲۵ الفاظ'' بنگلا دیش کی بہاری آبادی کے خطوط'' کے عنوان سے جو نظم کہی اس کے کچھ اشعار دیکھیے:

رات ہے/ گھات میں دشمن ہے/ وہ دشمن جو میرا بھائی ہے/ مرا ہتھیار فقط اے مرے
اربابِ وطن/ آپ کی بخشی ہوئی تنہائی [۳۸۱]

یا پھر!

بھیا جب مجھ کو لینے آنا/ اردو کا ایک لفظ نہ کہنا، چپکے رہنا/ مجبوراً کچھ کہنا بھی پڑے تو اتنا کہنا/
میں گونگا ہوں [۳۸۲]

قاسمی کی غزلوں میں بھی جا بہ جا ایسے اشارے ملتے ہیں۔ اتحاد کے پارہ پارہ ہونے سے لے کر صوبائی، مذہبی اور لسانی تفرقے بازی نے جس طرح سے اس قوم کو تقسیم کیا، ندیم اس جانب اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

جب سے ہم تقسیم ہوئے ہیں نسلوں اور زبانوں میں — حائل ہیں کتنے آئینے آپس کی پہچانوں میں [۳۸۳]

شاعر اس تفریق کی جڑ تلاش کرتے ہوئے ان رہ نماؤں کو بھی ہدفِ تنقید بناتے ہیں جن کے سیاہ کرتوت نے قوم کو اس انجام تک پہنچایا۔ ان کا کہنا تھا کہ:

میرے گناہوں کی فہرستیں شاہوں کے فرمانوں میں — میری ایک اک نیکی چمکے میرے عوام کے چہروں پر [۳۸۴]

حکم رانوں کی اس روش پر ندیم سخت مضطرب دکھائی دیتے ہیں جس کے تحت انھوں نے عوام کو بحران کا شکار رکھ کر خود اقتدار کے مزے لوٹنے میں مصروف رہے۔ امن و سکون کا یہی فقدان جب اس المیے کا سبب بنا تو شاعر یہ کہنے پر بھی مجبور ہوئے کہ:

ایسی نسل سے امن و سکوں کی آخر کون امید کرے — جس کی ساری عمر کٹی ہو جنگوں اور بحرانوں میں [۳۸۵]

ان کی غزلوں میں المیے کے مختلف رنگ تلاش کیے جا سکتے ہیں۔ قدروں کی پامالی سے لے کر بے بسی کے احساس تک کے ہر

منظر کو ندیم نے انتہائی دکھ اور افسردگی کے عالم میں پیش کیا۔ اس سوگ واری کے احساس کو پیش کرتے ہوئے شاعر نے درست لکھا کہ:

اڑا کے لے گئی پتے، خزاں کی تند ہوا — شجر، علامتِ ماتم دکھائی دیتا ہے[۳۸۶]

رسوائیوں کے اس عہد میں صاحب ضمیر لوگوں کی زندگی آزار ضرور بنی لیکن اپنی سخت جانی کے سبب اس سانحے کو بھی جھیل گئے۔ مگر اس کی الم ناکی نے ان کی زندگی سے خوشی کی تمام رمق چھین لی تھی۔ ندیم اس جانب اشارہ کرتے ہوئے ایک غزل میں کہتے ہیں کہ:

لوگ اس بزم میں کیا دیکھنے آتے ہیں جہاں — کچھ جو باقی ہے تو شمعوں کا دھواں باقی ہے
میں جو زندہ ہوں تو صرف اپنی انا کے دم سے — کٹ چکا جسم مگر یہ رگِ جاں باقی ہے[۳۸۷]

حالات کے بھیانک انجام کی خبر شعرا کی جماعت نے قبل از وقت ہی دینا شروع کر دیا تھا لیکن معاشرے نے پر چھائی بے بسی نے اس پر کان نہ دھرنے کا فیصلہ کر رکھا تھا۔ مثلاً ضیا جالندھری کی نظم ''بگولے'' میں شاعر نے رمز و کنائے کے پردے میں اپنی تشویش اور اضطراب کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

خاک باغی ہوگئی/ بے کس و مجبور و عاجز خاک باغی ہوگئی/ خاک کے ناچیز ذرے/ مشتعل
ہو کر/ ہوا کی تال پر بر پا ہوئے/ حملہ آور فوج کی مانند دڑاتے پھرے/ اب بگولے ہی
بگولے ہیں یہاں[۳۸۸]

ایسی ہی ایک مثال غافل کرنالی کی نظم ''خطرہ'' میں بھی ملتی ہے۔ شاعر وطن کے خدّام کو ہوشیار رہنے کی تلقین کرتے ہوئے دشمن کے ناپاک عزائم سے خبردار کر رہے ہیں۔ ملاحظہ کیجیے:

وادیِ سبز کے شاداب کناروں کے قریب/ حسنِ فطرت کے سمن بوس نظاروں کے قریب/
ایک اژدر ہے کہ منھ کھولے ہوئے بیٹھا ہے/ اور یہ چاہتا ہے/ وادیِ سبز کے خدّام کو غافل پا
کر/ ایک اک لالۂ فردوسِ قبا کو ڈس لے/ اور اس وادیِ خوش رنگ کو ویراں کر دے[۳۸۹]

لیکن ہوا وہی جس کا غافل کو ڈر تھا۔ اس کے بعد شاعر اس الم ناک منظر کو بیان کرنے کے لیے جو کچھ کہنا چاہتے ہیں وہ نوحے کی طرح لوگوں کو خون کے آنسو رلاتی ہیں۔ ''آشوب ڈھاکا'' کے عنوان کے تحت لکھی گئی اس نظم کا انداز دیکھیے:

ہر زباں چپ ہوئی ہر سخن لٹ گیا — زندگانی کا اندازِ فن لٹ گیا
کٹ گیا ایک حصہ مرے جسم کا — آنکھ کا حسن دل کا چمن لٹ گیا
میرے اشعار کی چاندنی مرگئی — میری نظموں کا دیوانہ پن لٹ گیا
جانے کس روسیاہ کی نظر لگ گئی — ایک پل میں مرا پھول بن لٹ گیا[۳۹۰]

قیوم نظر کی نظموں میں بھی سقوط ڈھاکا کے المیے کا دل دوز بیان جا بہ جا ملتا ہے۔ اپنی ایک نظم ''اے جواں حوصلہ سرزمیں'' میں وہ اس سانحے پر اپنے دکھ کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

اے شہیدوں کے تازہ لہو سے درخشاں جہاں/ تیری جنگاہ پر چھائے اسرار کی داستاں/ تیری
آنکھوں میں شعلہ بنے درد سے ہے عیاں/ تیرے چہرے کی رعنائیوں کا چمن لٹ گیا/ حق

پرستی نے جو بخشا تھا بانک پن لٹ گیا[۳۹۱]

نظریۂ پاکستان کو جب غرق کرنے کی باتیں ہونے لگیں تو اس سے ایک اور المیے نے جنم لیا۔اس تلخ حقیقت کا دردناک بیان قیوم نظر کے ان اشعار میں دیکھیے :

ایک نظریے کو جب/ خون میں نہلایا گیا/قلعۂ توحید پر/ قہر برسایا گیا/ مسجدوں کے نام پر/
حق کو ٹھکرایا گیا/ بھائیوں سے بھائی کو/ قتل کروایا گیا/ ایک نظریے کو جب/ خوں میں نہلایا
گیا[۳۹۲]

جب اپنوں پر ظلم وستم کی انتہا ہوگئی۔ایک طرف بے بسی کی تصویر بنے معصوم نہتے لوگ اور دوسری طرف جبر وقہر سے لب ریز بے لگام دشمن،اس صورت حال کو منظر کشی شاعر نے ''سقوط ڈھاکا'' کے عنوان سے لکھی گئی نظم میں کچھ اس طرح کی ہے:

آبرو ریزی کی نیہ چوک میں رکھی گئی
جو تصور میں نہ ہو شکل وہ دیکھی گئی
ظلم و استبداد کی طرح نو ڈالی گئی
ایک دوزخ ظلم کا ہر طرف کھلتا ہوا
ایک شعلہ جبر کا ہر طرف تنتا ہوا
ہر گھڑی دیوار سے اک جواں لٹکا ہوا
ہر گلی کے موڑ پر ایک سر چپٹا ہوا
ہر جگہ نیزا بلند جس پہ دل ٹانکا ہوا
عضو انسان کا جا بہ جا بکھرا ہوا[۳۹۳]

احمد فراز کے ہاں بھی اپنے عہد کے مسائل بھرپور انداز سے زیر بحث آئے ہیں۔سقوط ڈھاکا کا المیہ ایک ایسا طوفانِ بلاخیز تھا جس سے شاید ہی کسی بڑے شاعر کا کلام متاثر نہ ہوا ہو۔یہ سانحہ ایک حساس دل شاعر کے لیے کسی تازیانے سے کم نہ تھا۔فراز کی وطن دوستی نے اس صورت حال میں وطن کی سلامتی کی دعا مانگتے ہوئے کہا کہ:

میں تو ہر طرح کے اسبابِ ہلاکت دیکھوں اے وطن کاش تجھے اب کے سلامت دیکھوں[۳۹۴]

احمد فراز نے اس سانحے پر خود بھی آنسو بہائے اور قوم کو بھی رلایا۔نظم ''سحر کے سورج'' میں اس درد وغم کی جھلک کو محسوس کیا جا سکتا ہے۔ملاحظہ کیجیے:

سحر کے سورج/ میں رو رہا ہوں/ کہ میرا مشرق لہولہو ہے/ جو میرا بازو ہے/ میرا دل ہے/
میری نمو ہے/ جو میرے اطراف کا نشاں/ میری آبرو ہے/ لہولہو ہے/ سحر کے سورج/ میں
نصف تاریک/ نصف روشن ہوں/ کہ میرا وجود ٹکڑوں میں بٹ گیا ہے/ کہ آج ہر رشتۂ
رفاقت ہی کٹ گیا ہے/ سحر کے سورج/ میں اپنے پیکر کی نصف تصویر ہو گیا ہوں/ میں آپ

ہی آج اپنی تحقیر ہو گیا ہوں/ میں اپنا آدھا بدن لیے کس طرف کو جاؤں/ کسے دکھاؤں [۳۹۵]

فراز کے ہاں اس سانحے پر ایک احتجاج کی فضا بھی دکھائی دیتی ہے۔انھوں نے موقع پرست رہ نماؤں کی عیاریوں پر احتجاج بھی کیا اور انھیں سخت تنقید کا نشانہ بھی بنایا۔اس رنگ میں لکھی گئی ایک نظم ’’اب کس کا جشن مناتے ہو‘‘ میں بڑے دردناک انداز میں حقیقتِ حال کو بیان کیا گیا ہے۔ملاحظہ کیجیے:

اب کس کا جشن مناتے ہو — اس دیس کا جو تقسیم ہوا
اب کس کا گیت سناتے ہو — اس تن من کا جو دو نیم ہوا
اس پرچم کا جس کی حرمت — بازاروں میں نیلام ہوئی
اس مٹی کا جس کی حرمت — منسوب عدو کے نام ہوئی
اس جنگ کا جو تم ہار چکے — اس رسم کا جو جاری بھی نہیں
اس زخم کا جو سینے پہ نہ تھا — اس جان کا جو واری بھی نہیں
ان معصوموں کا جن کے لہو — سے تم نے فروزاں راتیں کیں
یا ان مظلوموں کا جن سے — خنجر کی زباں میں باتیں کیں
اس مریم کا جس کی عفت — لٹتی ہے بھرے بازاروں میں
اس عیسا کا جو قاتل ہے — اور شامل ہے غم خواروں میں [۳۹۶]

ضمیر جعفری کی شناخت طنز و مزاح کے حوالے سے معتبر ہے لیکن ان کا سنجیدہ کلام بھی اعلیٰ پائے کا ہے۔عسکری پس منظر ہونے کی وجہ سے وطن کی محبت کا جذبہ ایک فطری امر ہے۔حق و باطل کی کش مکش کے حوالے سے وہ ترانے لکھتے رہے لیکن سقوط ڈھاکا نے ان کی شاعری کا رخ بدل دیا۔۶۵ کی جنگ میں دشمن کی بھرپور ہجو کرنے والے شاعر نے ۱۹۷۱ء میں بھی افواج پاکستان کی پسپائی کے باوجود ان کے کارناموں پر خراج تحسین پیش کرنا ضروری سمجھا۔کمال پور کے معرکے پر ان کی نظم ’’کمال پور کا دستہ‘‘ اس حوالے سے اہم حوالہ ہے ۔سقوط ڈھاکا کے سانحے کے بعد شاعروں اور ادیبوں نے حب وطن پاکستانی سپاہیوں کی قربانیوں کو یکسر فراموش کر دیا تھا۔قیوم نظر کی نظم ’’کمال پور میں جو لڑے‘‘ اور ضمیر جعفری کی مذکورہ نظم میں اس کمی کو پورا کرنے کی کوشش کی گئی ۔ضمیر جعفری نے ان جاں نثاروں کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ:

عدو کے بریگیڈ کے مقابل وہ کچھ سجیلے، جری سپاہی/ کمال پور کا دلیر دستہ/ وہ شیر لشکر کا شیر دستہ/ زمیں کی سمعو! گواہ رہنا! فلک کے تارو گواہ رہنا/ اداس کھیتو! جلی منڈیرو! نئی بہارو گواہ رہنا/ وفا کے بیدار منزلوں میں/ غنیم کے سرد مقتلوں میں!/ ہماری تاریخ کے شفق رنگ یادگارو! گواہ رہنا/ ہمیشہ روشن! ہمیشہ زندہ/ کمال پور کا دلیر دستہ/ وہ شیر لشکر کا شیر دستہ [۳۹۷]

اسی طرح سیلمانکی سیکٹر میں فرنٹیر فورس، پنجاب اور بلوچ بٹالین کی جاں بازی، خصوصاً اس سیکٹر میں دشمنوں کے خلاف بھرپور مزاحمت کے بعد نشانِ حیدر پانے والے عظیم سپوت میجر شبیر شریف شہید اور صوبے دار محمد افضل تحسین شہید وغیرہ کو یاد کرتے ہوئے ’’

معرکہ سیلمانکی'' کے عنوان سے ایک یادگار نظم لکھی:

مرے ندیمو! / مرے رفیقو! / یہ پاک کشور کے سرفروشوں کی جرات انگیز داستاں ہے / جہاں
تھی مضبوط قلعہ بندی / جہاں پہ مٹی کے تودوں کی تھی کھڑی بلندی / جہاں مزاحم رکاوٹیں زیرِ
آب بھی تھیں / اندھیری شب میں تھا دیو آتش کا رقص جاری / قدم قدم پہ تھی شعلہ باری /
یہیں پہ راجا نے اور عدالت نے اپنی دکھلائی تھی شجاعت / بنائی توپوں کی خوب درگت /
دلاوری کا عجیب منظر جہاں نے دیکھا[۳۹۸]

نظم میں بالترتیب حوالدار راجا خان، حوالدار عدالت خان اور میجر شبیر شریف نشانِ حیدر کے کارناموں کو یاد کیا گیا ہے لیکن یہ فخر وانبساط کے لمحے زیادہ دیر برقرار نہ رہ سکے۔ احساس شکست نے ضمیر کو بلندی سے اتر کر شرمندگی اور افسوس کی کیفیت میں مبتلا کر دیا۔ اسی شرمندگی کے احساس کے ساتھ شاعر اپنی نظم ''۳۰۰ دانش وروں کی مشترکہ قبر پر'' میں یہ کہنے پر مجبور ہوئے کہ:

شامِ قتل عام کی خاموش آشاؤں کے ساتھ / شاعروں، دانش وروں، پروفیسروں / نوجواں،
قرطاس خواں / اہلِ قلم کی قبر پر / میں کھڑا ہوں ایک قاتل کی طرح[۳۹۹]

اس احساس شکست نے ہمیشہ انھیں مغموم رکھا۔ ان کے خیال میں اسلاف کی میراث گنوا کر وہ نئی نسل کے سامنے کس طرح فخر وانبساط کے نغمے سنا سکتے ہیں۔ اسی المیے کو پیش کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ:

میرے بیٹے تجھ کو کیا تاکید کر سکتا ہوں میں   تو نے دیکھا ہے محاذِ جنگ میں پسپا مجھے[۴۰۰]

ان نظموں میں المیہ مشرقی پاکستان کی آہیں سنائی دیتی ہیں۔ یہ المیہ شاعر کو بے کل رکھتا ہے۔ مسلم بنگال سے قائم صدیوں کا رشتہ ٹوٹ گیا تو اپنی نظم ''مانوس اجنبیوں کی نذر'' میں اس کا اظہار کچھ یوں کیا:

مہرباں گلیوں، گھروں کو ڈھونڈنے آیا ہوں میں   راز داں پد ماں کی لہریں چومنے آیا ہوں میں
کر رہا ہوں اجنبی ڈھاکا کی گلیوں میں طواف   شہرِ یاراں جو کہ تھا ہم دم مرا، محرم مرا
دیکھتا ہوں ایک اجڑے درد کو بکھرا ہوا   ان مناظر پر کہ اڑتا تھا کبھی پرچم مرا[۴۰۱]

غم کی شدت جب اپنی انتہا کو پہنچ جاتی ہے تو شاعر بانی پاکستان اور مفکر پاکستان سمیت اپنے آباؤ اجداد کا ذکر کر کے نالہ وشیون کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ ایک نظم کے یہ اشعار دیکھیں:

درد کی پھیلی آگ میں قائد اعظم کے مہتاب جلیں   کرب کی بھڑکی بھٹی میں اقبال کے اجلے خواب جلیں
کیا دے گی یہ کور نظر تاریخ جواب زمانے کو   کیا ہم کو یہ ہاتھ ملے تھے اپنی لاش اٹھانے کو[۴۰۲]

ضمیر جعفری نے جہاں اس سانحے پر گہرے رنج وغم کا اظہار کیا وہیں اس سانحے کے اسباب کا تجزیہ کرتے ہوئے بہ حیثیت قوم اپنی غلطیوں اور کوتاہیوں کا پردہ بھی چاک کیا۔ حقیقت یہی ہے کہ اس سانحے کی ذمہ داری اغیار پر ڈالنے کے بہ جائے اپنی کوتاہیوں پر نظر ڈالنا زیادہ ضروری لگتا ہے؛ جیسا کہ ضمیر نے کہا:

چوبیس برس کی فردِ عمل، ہر دل زخمی، ہر گھر مقتل   اے ارضِ وطن ترے غم کی قسم، ترے دشمن ہم، ترے قاتل ہم

افکار کو ہم نیلام کریں، اقدار کا ہم بیوپار کریں ان اپنے منافق ہاتھوں سے، خود اپنا گریباں تار کریں[۴۰۳]

ضمیر کے خیال میں اس وقت کی قیادت کو ناموس وطن اور ملت کی عزت و آبرو سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ غدّاروں کی ٹولیاں اپنی صفوں میں بیٹھی تھیں۔ لہٰذا شکست ہمارا مقدر بنی۔ ان کا خیال ہے کہ:

یہ جاں باز لشکر نہ کھاتا شکست مگر تھا قیادت کا کردار پست
عزائم تو بے دار سینوں میں تھے مگر سانپ بھی آستینوں میں تھے
نگوں سر ہوئے سر اٹھائے بغیر سپر ڈال دی مات کھائے بغیر[۴۰۴]

اس سانحے عظیم نے ہماری تاریخ کو داغ دار کر دیا۔ ذلت اور رسوائی کی ایسی تاریخ رقم ہوئی کہ شاعر اس کرب کو کبھی فراموش نہیں کر پائے۔ اس کرب کا اظہار کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ:

نیازی نے اروڑا کو باچشمِ تر کیا پیش جب اپنا ریوالور
تو اک پل میں صدیوں کا خوں ہوگیا سرِ پاک پرچم نگوں ہوگیا[۴۰۵]

اپنی غزلوں میں بھی انھوں نے سقوط ڈھاکا کے المیے کو پیش کیا ہے۔ اپنوں کے خلاف ہتھیار اٹھانے اور غلط حکمت عملی کے نتائج پر وہ افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

بر خلاف اپنے بھی کارِ دشمناں کرنا پڑا اپنی شمشیروں سے اپنا امتحاں کرنا پڑا
جو نہ کرنا چاہیے تھا وہ یہاں کرنا پڑا یعنی یہ سارا سفر بھی رائیگاں کرنا پڑا[۴۰۶]

مجروح سلطان پوری نے بھی رمز و ایما کے پردے میں اس سانحے کے کرب ناک پہلوؤں کو ہمارے سامنے پیش کیا۔ اپنے ہاتھوں اپنا گھر جلانے کا منظر دکھاتے ہوئے انھوں نے کہا کہ:

جلا کے مشعلِ جاں ہم جنوں صفات چلے جو گھر کو آگ لگائے ہمارے ساتھ چلے
دیارِ شام نہیں، منزلِ سحر بھی نہیں عجب نگر ہے یہاں دن چلے نہ رات چلے
ستون دار پہ رکھتے چلو سروں کے چراغ جہاں تلک یہ ستم کی سیاہ رات چلے[۴۰۷]

مجروح لکھنوی نے ایک نظم میں آگ اور خون کے اس کھیل کی بابت لکھا کہ:

مشر ق میں ہوا کھیل جو آگ و خون کا ختم ہوا ہے اس جگہ، جس جا سے واپسی نہیں
کتنی جوانیاں لٹیں، کتنے سہاگ اجڑ گئے نظریں ملا کے اب کہو، یہ بھی درندگی نہیں[۴۰۸]

اختر ہوشیار پوری کی غزلوں میں اس سانحے کا رنگ بہت نمایاں ہے۔ انھوں نے حالات کی خرابی سے قبل ہی اس سنگین صورت حال سے خبر دار کرتے ہوئے کہا کہ:

یوں اب کے برس ہوئیں جرم کی فردیں جیسے کسی سر پہ کوئی دستار نہیں تھی
حالات تو سنسان دریچوں سے عیاں تھے ہاں آنکھ مکینوں کی خبر دار نہیں تھی[۴۰۹]

ان کی متعدد غزلوں میں مرثیے اور شہرِ آشوب کا رنگ جھلکتا ہے۔ سوز میں ڈوبے ہوئے ان کے یہ اشعار ملاحظہ کیجیے:

خود مرا قتل ہے قتلِ ڈھاکا ... میری مٹی میں خدا تھا پہلے
مجھ کو لے جاؤ کہ میں، میں نہ رہا ... مجھ میں اک شہر بسا تھا پہلے
میری میت کو کہیں پھینک آؤ ... ہائے اب کیا ہوں میں، کیا تھا پہلے[۴۱۰]

حبیب جالب نے ظالم حکمرانوں اور جابر آمروں کے خلاف کھل کر لکھا۔ اس سانحے کے پس پردہ حقائق تلاش کرتے ہوئے ۱۹۷۱ء میں یحییٰ دورِ حکومت میں اسی کے خلاف یہ قطع پڑھا اور جیل کی سلاخوں کے پیچھے چلے گئے۔ ملاحظہ کیجیے:

محبت گولیوں سے بو رہے ہو ... وطن کا چہرہ خوں سے دھو رہے ہو
گماں تم کو کہ رستہ کٹ رہا ہے ... یقین مجھ کو کہ منزل کھو رہے ہو[۴۱۱]

جالب نے مقتدر حلقوں کی اس روش کہ جب چاہا جسے چاہا غدّار کے لقب سے نواز دیا، سخت تنقید کا نشانہ بناتے ہیں۔ گولیوں کے زور پر بنگال میں جو کھیل کھیلا گیا اس کی جانب اشارہ کرتے ہوئے ایک اور قطعے میں کہتے ہیں کہ:

وہ کہہ رہے ہیں محبت نہیں وطن سے مجھے ... سکھا رہے ہیں محبت مشین گن سے مجھے
میں بے شعور ہوں کہتا نہیں ستم کو کرم ... یہی خطاب ملا ان کی انجمن سے مجھے[۴۱۲]

نظم ''بگیا لہولہان''، میں بھی وہ ظلم و ستم کے ان مناظر کی بابت کہتے ہیں کہ:

چھلنی ہیں کلیوں کے سینے خون میں لت پت پات ... اور نہ جانے کب تک ہوگی اشکوں کی برسات
دنیا والوں کب بیتیں گے دکھ کے یہ دن رات ... خون سے ہولی کھیل رہے ہیں دھرتی کے بلوان
بگیا لہو لہان[۴۱۳]

سقوطِ ڈھاکا کے المیے پر بھٹو کے کردار پر بہت کچھ لکھا گیا۔ جالب نے اپنی ایک نظم میں بھٹو کے کردار کی بابت واضح طور پر لکھا کہ:

میں قائدِ عوام ہوں/ جتنے میرے وزیر ہیں سارے ہی بے ضمیر ہیں/ میں ان کا بھی امام
ہوں، میں قائدِ عوام ہوں/ میں پسرِ شاہ نواز ہوں، میں پدرِ بے نظیر ہوں/ میں نکسن کا غلام
ہوں، میں قائدِ عوام ہوں/ دیکھو میرے اعمال کو، میں کھا گیا بنگال کو/ پھر بھی میں نیک نام
ہوں، میں قائدِ عوام ہوں[۴۱۴]

ماہر القادری نے بھی اس سانحے سے متاثر ہو کر جنوری ۱۹۷۲ء کے ''فاران'' میں ''مشرقی پاکستان کے المیے کے بعد'' کے عنوان سے ایک نظم لکھی۔ اس کے چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

دل کا یہ حال کہ مصروفِ عزاداری ہے ... اب مسرت کے تصور سے بھی بیزاری ہے
اپنے غازی سپر انداز نہیں ہوسکتے ... یہ تو سازش ہے، سیاست کی فسوں کاری ہے
آج بھی جعفر و صادق کے ہیں وارث موجود ... ملک و ملت سے وہی رسمِ دغا جاری ہے[۴۱۵]

حمایت علی شاعر کے ہاں ۱۹۷۱ء کے سانحے سقوطِ ڈھاکا کے کئی مناظر نظر آتے ہیں۔ کبھی وہ پاکستان کے نام پر خون کا نذرانہ پیش کرنے والے بہاریوں کی بے وطنی اور کس مپرسی کی بابت کہتے ہیں کہ:

اب اپنے آنسوؤں میں ہیں ڈوبے ہوئے تمام   آتے تھے اپنے خون کے دریا جو پاٹ کر[۲۱۶]

اور کبھی فکری یک جہتی کے فقدان پر ''یورپ پچھم'' کی وحدت کے گیت گاتے ہوئے کسی ایک طبقے کو اس کا ملزم ٹھہرانے کے بہ جائے باہمی کوتاہیوں کا اس سانحے کا سبب گردانتے ہیں:

کس کو قاتل کہوں کس کو بسمل کہوں   یہ مرا دوست ہے وہ مرا بھائی ہے

شیشہ و سنگ میں عہدو پیماں ہیں کیا   سنگ زن کون ہے شیشہ گر کون ہے[۲۱۷]

رئیس امروہوی نے اس زمانے میں روزانہ کے واقعات اور حالات پر عوام کے جذبات کی زبردست ترجمانی کا فریضہ انجام دیا ۔ان قطعات سے اس زمانے کی سیاست اور معیشت کے معاملات کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔سقوط ڈھاکا کے پس منظر میں لکھے گئے قطعات ان کا قابلِ قدر سرمایہ ہیں۔سقوط ڈھاکا پر ان کا دل بھی خون کے آنسو رویا جس کا اظہار کرتے ہوئے ایک قطعے میں انھوں نے لکھا کہ:

سن اے ارضِ ڈھاکا، ترے شروش   ترے سر سے صدقے اتارے گئے

تجھے علم ہے اے عروسِ بلاد   جو مرتے تھے تجھ پر وہ مارے گئے[۲۱۸]

مسلمانوں کو عظمت رفتہ کے کھو جانے اور ملک دو ٹکڑے ہو جانے کے بعد ۲۳ مارچ کو یوم پاکستان کے موقع پر ایک ماتم کی فضا تھی۔المیے سے دوچار اس قوم کے لیے اب ان تقریبات کی کوئی وقعت نہیں رہی۔لہٰذا وہ یہ کہنے پر مجبور ہوئے کہ:

لکھتے لکھتے رک گیا قومی مورّخ کا قلم   بات ادھوری رہ گئی، تحریر آدھی رہ گئی

قوم پاکستان دو حصّوں میں اب تقسیم ہے   یومِ پاکستان کی توقیر آدھی رہ گئی[۲۱۹]

وقت گزرنے کے باوجود محصورین کی واپسی کا بندوبست نہیں ہوا تو رئیس امروہوی نے اس مسئلے کو متعدد بار قطعات کی صورت میں مقتدر حلقوں تک پہنچایا۔ان بہاریوں کی کس مپرسی کے ضمن میں حکم رانوں کے رویے کی بابت کہتے ہیں کہ:

مر مٹے جو لوگ استحکامِ پاکستان پر   آپ بنگلا دیش سے ان کو نہ بلوائیں گے کیا؟

خود ہی پاکستان کی منطق کو اپنانے کے بعد   خود ہی پاکستان کی منطق کو جھٹلائیں گے کیا؟[۲۲۰]

قوم کی بے عملی نے جس طرح سے اس سانحے کی طرف رفتہ رفتہ قدم بڑھائے اس کا احساس بھی شاعر کو پوری طرح تھا۔مشرقی پاکستان کے بگڑتے حالات کا تجزیہ کرتے ہوئے رئیس امروہوی نے درست کہا کہ:

کیا فائدہ حضور جواب و سوال سے   کوئی بری نہیں ہے یہاں احتمال سے

تحریک بنگلا دیش نہیں عہدِ حال سے   اس فکر میں مجیب تھے چوبیس سال سے[۲۲۱]

وطن کے لیے قربانیاں دینے والوں نے جان و مال کی پرواہ کیے بغیر ناموس وطن کے لیے زندگی کی بازی تک ہار دی۔شہر شہر قریہ قریہ قربانیوں کی تاریخ رقم کی گئی۔شاعر اس جانب اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

ديناج پور و سلہٹ و میسور و چاٹگام   ان میں ہر ایک شہر دیارِ قبور ہے

کتنے جواں شہید ہوئے میر پور میں   اب میر پور صرف جواں میر پور ہے[۲۲۲]

جنگی قیدیوں کی بڑھتی ہوئی فہرست اور پسپائی کا غم بھی ان کے قطعات میں جا بہ جا ملتے ہیں۔ایک قطعہ ملاحظہ کیجیے:

پیش قدمی کے حقائق تو فسانہ بن گئے — داستاں پسپائیوں کی کم و بیش پڑھنی پڑی
نمازیانِ راہِ حق کے کارناموں کے بہ جائے — قیدیانِ جنگ کی فہرستِ غم پڑھنی پڑی [۴۲۳]

اس سے قبل ۱۹۷۱ء میں شائع ہونے والے قطعات میں شاعر کا لہجہ مختلف دکھائی دیتا ہے۔مایوسی اور افسردگی کی جو کیفیت بعد کے قطعات میں دکھائی دیتی ہے وہ ان قطعات میں نہیں۔ایسٹ بنگال رجمنٹ کی غدّاری کے بعد شاعر کا لہجہ دیکھیے:

اڑیسا میں تباہی ایسٹ بنگالی بھگوڑوں کی — ہمارا خونِ ناحق رفتہ رفتہ رنگ لائے گا
اماں غدّار کو روئے زمیں پر مل نہیں سکتی — جہاں جائیں گے یہ ظالم وہیں طوفان جائے گا [۴۲۴]

امن وامان کی بگڑتی ہوئی صورت حال اور خوف و دہشت کی جو فضا سقوط ڈھاکا سے محض دو ماہ قبل پورے مشرقی پاکستان میں پھیلی ہوئی تھی اس منظر کو دکھاتے ہوئے شاعر کہتے ہیں کہ:

اے دورِ امن آ جا آنکھیں ترس رہی ہیں — بنگال کی بلائیں روحوں کو ڈس رہی ہیں
انساں اجڑ رہے ہیں آفات بس رہی ہیں — توپیں گرج رہی ہیں لاشیں برس رہیں ہیں [۴۲۵]

حالت جنگ میں پھیلی ہر طرف بارود کی بو اور خوں ریز مناظر کی عکاسی اس قطعے میں دیکھی جاسکتی ہے:

خوں ریز فضاؤں میں ہے جاں کاہ ہر اک سانس — محسوس یہ ہوتا ہے لہو سونگھ رہا ہوں
کب دیکھیے ہوتا ہے قیامت کا دھماکا — جلتی ہوئی بارود کی بو سونگھ رہا ہوں [۴۲۶]

سقوط ڈھاکا کے عالمی کرداروں کی بابت بھی رئیس امروہوی کے ہاں بہت کچھ کہا گیا۔ایک قطعے میں بھارت کو روسی اسلحے کی ترسیل کی بابت کہتے ہیں کہ:

مسلح روس والوں نے کیا ہے اہلِ بھارت کو — اسی باعث وہ کچھ آزردہ دل محسوس ہوتے ہیں
عرب کے بعض ملکوں کا تو اب تک تجربہ یہ ہے — بوقت جنگ روسی اسلحے منحوس ہوتے ہیں [۴۲۷]

اسی طرح بھارت خصوصاً اندرا گاندھی کے کردار پر طنز کرتے ہوئے شاعر کا کہنا تھا کہ:

پاک بھارت کی جنگ کے باعث — بتر کوچک میں یہ جو گڑبڑ ہے
سچ کہا ہے یہ نیک مردوں نے — ایک عورت فساد کی جڑ ہے [۴۲۸]

بھارتی جارحیت جب حد سے بڑھی اور کراچی پر فضائی حملے ہوئے اور سو سے زائد زخمی اس کے علاوہ آئے دن بم دھماکے اور لوگوں کے شہید ہونے کی خبریں آئیں اس صورت حال پر بھی رئیس امروہوی نے ایک قطعے میں اظہار خیال کیا ہے۔ملاحظہ کیجیے:

حیاتِ جاوداں ملتی ہے وقفِ جستجو ہو کر — شہیدِ عشق جیتا ہے قتیل آرزو ہو کر
ہمارے خونِ ناحق سے سراپا رنگ و بو ہو کر — کراچی اور دل کش ہوگئی ہے سرخ رو ہو کر [۴۲۹]

رئیس امروہوی کی متعدد نظموں میں بھی اس سانحے کو موضوع بنایا گیا ہے۔دشمن ملک کا قیدی بن جانا پاک فوج اور ان کے لواحقین کے لیے ایک بھیانک تجربہ تھا۔ان کی واپسی پر ایک نظم میں سرشاری کا اظہار کرتے ہوئے شاعر کہتے ہیں کہ:

کیا تم کو حالِ ہجر سنائیں تم آگئے تم بن اداس تھیں یہ فضائیں تم آگئے
دل ہائے غم زدہ کی یہ ہے آرزو کہ اب لمحات ہجر یاد نہ آئیں تم آگئے[۴۳۰]

سقوط ڈھاکا کے حوالے سے نظم اور قطعات کے علاوہ غزلوں میں بھی اس المیے کے کرب کو محسوس کیا جا سکتا ہے۔ دشمن کے ہاتھوں بدترین ہزیمت اٹھانے کے بعد جو بے بسی کی کیفیت دکھائی دیتی تھی اس کا اظہار درج ذیل اشعار میں واضح دکھائی دیتا ہے:

کیسی نجات مل نہ سکے گی پناہ تک اب تیر آ رہے ہیں مری خیمہ گاہ تک
بھاگو کہ ایک سیلِ بلا ہے رواں دواں قومِ تباہ حال سے شہرِ تباہ تک[۴۳۱]

انھیں شکوہ تھا کہ اس سانحے کے بعد جو کچھ کرنا ضروری تھا مقدر حلقوں نے اس جانب بالکل بھی توجہ نہیں دی۔ اپنے تحفظات کا اظہار کرتے ہوئے یہ تک کہہ دیا کہ:

ہمارے قتل کا لینا تھا انتقام جسے اسی نے خون کی قیمت وصول کر لی ہے[۴۳۲]

سانحہ سقوط ڈھاکا نے امجد اسلام امجد کی انا کو بھی مجروح کیا۔ چناں چہ اپنی نظم ''شکستِ انا'' میں انھوں نے اس المیے کی دل دوز تصویر کھینچی ہے:

اس طرح ٹوٹ کے بکھرا ہے انا کا شیشہ میرا پندار مرے دل کے لیے گالی ہے
داغِ رسوائی چھپانے سے نہیں چھپ سکتا یہ تو یوں ہے کہ جبیں بول رہی ہو جیسے[۴۳۳]

یہ المیہ شاعر کے مطابق قوم کے مجموعی مزاج کی بے حسی کا شاخسانہ تھا۔ امجد نے اس کا پردہ چاک کرتے ہوئے نظم ''ہم گناہ گار ہیں'' میں اس بات کا اعتراف کیا کہ:

اے زمین وطن ہم گناہ گار ہیں / ہم نے نظموں میں تیرے چمکتے ہوئے بام و در کے جہاں
تاب قصے لکھے / پھول چہروں پہ شبنم سی غزلیں کہیں، خواب آنکھوں کے خوشبو قصیدے لکھے /
تیرے کھیتوں کی فصلوں کو سونا گنا، تیری گلیوں میں دل کے جریدے لکھے / ہم ترے دکھ
سمندر سے غافل رہے، تیرے چہرے کی رونق دھواں ہو گئی / جب ترے زرد پڑتے ہوئے
موسموں کو مہکتی شفق کی ضرورت پڑی، ہم نے اپنا لہو آزمایا نہیں / ہم بھی ان کی سیاست کی
نخچیر ہیں، آستینوں کے جو سانپ ثابت ہوئے / ہم بھی تیری طرح سازشوں کی ہوا کے گر
فتار ہیں / ہم گناہ گار ہیں / اے زمین وطن / ہم گناہ گار ہیں[۴۳۴]

یہ سانحہ دو ممالک کا نہیں بلکہ ایک تہذیب کے دولخت ہونے کا سانحہ تھا۔ امجد کی مذکورہ نظم میں مشرقی پاکستان کے ساتھ روا رکھے جانے والے رویے کا دھندلا سا عکس ضرور دکھائی دیتا ہے۔ نظم کے آخر میں اس اعترافِ گناہ کے بعد اس کی تلافی کے عہد پر ہوتا ہے۔ اس بابت انھوں نے لکھا کہ:

اب محافظ نما دشمنوں کے علم، ان کے کالے لہو سے بھگوئیں گے ہم / تیرے دامن پہ رسوائیوں
کے نشاں آنسوؤں کے سمندر سے دھوئیں گے ہم / آخری مرتبہ اے متاعِ نظر، آج اپنے

گناہوں پہ روئیں گے ہم/ تیری آنکھوں میں اب اے نگارِ وطن شرم ساری کے آنسو نہیں
آئیں گے/ ہم کو تیری قسم اے بہارِ وطن اب اندھیرے سفر کو نہ دہرائیں گے [۴۳۵]

انھوں نے اس موضوع پر کئی قطعات بھی لکھے۔ ان قطعات میں اپنوں کی بے وفائی، رفاقتوں کے بھرم ٹوٹنے اور خود احتسابی کی طرف توجہ دینے کی ضرورت کا احساس دلاتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

آخرِ شب کے دھندلکو آ گیا وقتِ حساب   ہشیار، اے ظلم زادو، آ گیا وقت حساب
بام و در سے مٹ رہی ہیں درد کی پر چھائیاں   خوف کے کالے ہیولو، آ گیا وقتِ حساب [۴۳۶]

یوسف ظفر کی نظم ''قیامت'' بھی فنی پختگی اور مشاہدے کی صداقت کے ساتھ جذبوں کی سچائی کو پیش کرتی ہے۔ ارض مشرق کے ساتھ ابھرتے سورج کا نام وابستہ ہے۔ امن و تہذیب کے اس مرکز میں ظلم و بربریت کی ایسی اذیت ناک آندھی چلی کہ سارے جذبے غبار ہو گئے۔ نظم میں شاعر نے اشاروں، کنایوں میں ان مناظر کو دکھانے کی کوشش کی ہے:

ہزار صدیوں سے خاکِ مشرق ابھرتے سورج کی سر زمیں تھی/ یہاں جہاں خون ہو رہے
ہیں/ یہاں جہاں لوگ رو رہے ہیں/ یہاں وہ جھیلیں تھیں سرخوشی کی جہاں ہر آواز نغمہ خواں
تھی/ مگر اب اس خاک سے اندھیرے ابل رہے ہیں/ ہوس کے عفریت پل رہے ہیں/
یہاں! یہاں ارضِ مشرق میں یہ قیامت/ چلو مری جاں چلیں یہاں سے [۴۳۷]

یوسف ظفر کی غزلوں میں بھی اس المیے کا مسلسل تاثر ملتا ہے۔ ان کے آخری مجموعے ''عشق پیچاں'' کا ایک حصّہ سقوط مشرقی پاکستان کے سانحے سے ہی عبارت ہے۔ اس جانب اشارہ کرتے ہوئے اپنی غزلوں کی بابت انھوں نے لکھا کہ:

اشکوں سے بچ رہا تھا کچھ خونِ حسرتِ دل   قطرے ظفر یہ جس کے اشعار ہو گئے ہیں [۴۳۸]

جنگی قیدیوں کی بابت تقریباً ہر شاعر نے کچھ نہ کچھ لکھا۔ قید و بند کی بے بسی اور ان کی ابتر حالت کا نقشہ کھینچتے ہوئے یوسف کا کہنا تھا کہ:

سندر بن کے شہر ہیں قیدی کس پنجرے میں یوسف   بند ہیں حشم و لت ان کے دست و بازو زخمی [۴۳۹]

شاعر اس واقعے کا ذمے دار خود کو بھی سمجھتے ہیں۔ اس بات کا اعتراف کرتے ہوئے وہ کاٹ دار لہجے میں کہتے ہیں کہ:

یہ کیا کہ ان کے لطف و کرم سے مایوس ہو گئے   جو کچھ ہوا ہے اپنے کیے کی سزا تو ہے [۴۴۰]

شاعر کے مطابق رہنماؤں کی مفاد پرستی اور بے حسی کے سبب وطن عزیز کا سودا کیا گیا۔ کسی نے بھی مملکت کا نہ سوچا۔ محض اپنے ذاتی مفاد کو مدنظر رکھا۔ شاعر اس طرزِ عمل پر افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

گلشن کی شاخ شاخ کو ویراں کیا گیا   یوں بھی علاج تنگیِ داماں کیا گیا [۴۴۱]

جب پاکستان کا وجود دو نیم ہو گیا اور تاریخ داغ دار ہو گئی تو شاعر نے اس حقیقت کا اظہار کچھ اس طرح کیا کہ:

لوحِ جبیں پہ ہم نے خود دیکھ لیا کہ اب ہم   تاریخ بنتے بنتے کردار ہو گئے ہیں [۴۴۲]

رہ نماؤں اور راہ بروں کی چیرہ دستیوں سے وہ بنگالی جو کل تک تحریک پاکستان کا ہراوّل دستہ تھے، آج ان کے چہرے پر بے زاری کا رنگ جھلکتا تھا۔ رفاقتوں کی شکست و ریخت کا یہ منظر شاعر کو بے چین رکھتا ہے جس پر وہ یہ کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ:

پست و بلند اتنے کے ہم وار ہوگئے ہیں
صدیوں کے رابطے بھی بے کار ہوگئے ہیں

چہروں پہ آگئی ہیں ہاتھوں کی سب لکیریں
ہم اپنی صورتوں سے بے زار ہوگئے ہیں

امروز کر رہا ہے توہینِ دوش و فردا
احباب دیکھتا ہوں اغیار ہو گئے ہیں[۹۴۳]

عبدالکریم شورش کاشمیری کے ہفت روزہ ''چٹان'' میں بھی سقوط ڈھاکا کے تناظر میں بہت کچھ لکھا گیا۔اس سانحے نے شورش کو ہلا کر رکھ دیا۔صحافی ہونے کے ناتے ہنگامی موضوعات پر ان کی شاعری میں گہرا اثر پایا جاتا ہے۔ پاکستان کی سیاسی تاریخ جسے شورش عیاریوں کی داستان کہتے تھے اور جس نے قوم کو لہولہان کر رکھا تھا،اس پر شورش کے یہاں بھرپور طنز ملتا ہے۔انھیں سقوط ڈھاکا کے بعد بے بسی و بے کسی کے تناظر نے مضطرب رکھا۔قوم کی ہونے والی جگ ہنسائی اور رسوائیوں پر انھوں نے شاعری کے ذریعے خوب نشتر زنی کی اور حادثے کے ذمے داروں کی مذمت کرتے ہوئے ان کے چہرے بے نقاب کیے۔اس سانحے کے اہم کردار یحییٰ خان کے کردار کے مکروہ روپ کو اجاگر کرتے ہوئے ان کا کہنا تھا کہ:

مشرقی بنگال ہے ویران تیرا شکریہ
قوم کے غدّار یحییٰ خاں، تیرا شکریہ، شکریہ

کاٹ کر ملت کی شہہ رگ تو لہو پیتا رہا
پٹ گئے اس پار کے انسان تیرا شکریہ، شکریہ

ہو گیا بالآخر ثابت میر جعفر کے بروز
تیرے پیکر میں نہیں انسان تیرا شکریہ، شکریہ[۹۴۴]

اس سانحے کے ذمے داروں میں یحییٰ خان کو مرکزیت حاصل ہے۔شراب وشباب کو زندگی کا مقصد قرار دے کر جس طرح یحییٰ نے قوم کی قسمت سے کھلواڑ کیا، تاریخ اسے کبھی معاف نہیں کر سکے گی۔ایک نظم ''جنرل یحییٰ: عالم خیال میں گنگنا تا رہا ہے'' میں اس کردار کی کچھ تہوں کو بے نقاب کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

سبو کا ذکر چلے، شیشۂ بہار چلے
بھلے دنوں کی قسم ذکرِ حسنِ یار چلے

خدا کا خوف کوئی شے ہے اگلے وقتوں کی
پرانے لوگ، پرانی روش گزار چلے[۹۴۵]

اور آخر کار اس ناسور کو کیفر کردار تک پہنچنا پڑا۔قصر صدارت سے فارغ ہونے کے بعد اس کے رخصت ہونے کے منظر کو دکھاتے ہوئے شاعر کہتے ہیں کہ:

اڑھائی سال بڑے دبدبے کے ساتھ رہے
چلے تو قصرِ صدارت سے اشک بار چلے[۹۴۶]

اس المیے کا شکار زیادہ تر وہ لوگ بنے جو پہلے بھی ہجرت کے کرب سے گزر چکے تھے۔ان ہی میں ایک مشہور شخصیت پروفیسر غلام اعظم بھی تھے جن کی شہریت تو سب سے پہلے بنگلا دیش نے منسوخ کر دی تھی اور پھر جب وہ مغربی پاکستان آنے کے بعد حج کے ارادے سے نکلے تو اس وقت حکومت نے انھیں جانے سے روک دیا۔شورش نے اس واقعے کے ردِعمل کے طور پر ایک نظم ''پروفیسر غلام اعظم کے تاثرات'' میں لکھا کہ:

میں نے سوچا تھا خداوندِ ابراہیم کے گھر
اس کا بندہ ہوں عبادت کے جبیں لے کے چلوں

داستانِ دل مرحوم سنانے کے لیے
ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں کے نگیں لے کے چلوں

آستانِ شہِ کونین پہ حاضر ہو کر
گم شدہ ملک کی فریاد و فغاں پیش کروں[۹۴۷]

ایک طویل عرصے تک ہزیمت اور شکست کے آثار شعرا اور ادیبوں کے دل میں پژمردگی کے احساس پیدا کرتے رہے۔ اپنوں اور بے گانوں کے طنز اور طعنوں نے جس طرح دلوں کو چھلنی کیا اس جانب اشارہ کرتے ہوئے شاعر کا کہنا تھا کہ:

کچھ اس طرح سے گو کنارے کھڑا ہوں میں ڈھاکا کی سر زمیں ہے نگو اسار جس طرح
یوں عزتوں کے ساتھ حریفوں کا طعن و طنز زیرِ قدم ہو شیخ کی دستار جس طرح[۴۴۸]

سانحہ سقوط مشرقی پاکستان کا بیان عبدالحمید عدم کی نظموں میں بھی جا بہ جا ملتا ہے۔ یحییٰ خان کی عیاشیوں اور قوم کی رسوائیوں پر انھوں نے آنسو بہائے۔ حکم رانوں کی بے حسی خصوصاً یحییٰ خان کی عیاشی اور ناؤنوش کو شاعر محمد شاہ رنگیلا اور شاہانِ اودھ کے دور سے تعبیر کرتے ہوئے جو منظر کشی کی ہے اسے ملاحظہ کیجیے:

شرابوں کے ساگر لنڈھاتے گئے سمندر پیے اور پلائے گئے
گھٹا ٹوپ عیاشیاں کی گئیں بھیانک ہوس رائیاں کی گئیں
نگاروں سے راتیں جواں کی گئیں پیالوں سے صبحیں رواں کی گئیں[۴۴۹]

غرض اس صورت حال نے اس ملک کی کشتی ڈانواڈول کر دی اور بالآخر ملک دولخت ہو گیا۔ اس دوران ملک میں جو افراط و تفریط رہی اس کا ذکر کرتے ہوئے شاعر کہتے ہیں کہ:

خلاصہ یہ ہے ان وجوہات کا کہ یہ دیو تخریب، یہ اژدہا
حکومت پہ جب تک مسلط رہا وطن قہر و آفت کا مہبط رہا[۴۵۰]

اور پھر ملک کے دو ٹکڑے ہونے کے بعد جو جگ ہنسائی ہوئی، اس رسوائی کے مناظر بیان کرتے ہوئے شاعر کہتے ہیں کہ:

بالآخر وہ منحوس وقت آ گیا وہ دورِ مہیب اور سخت آ گیا
کہ احوال بے حد زبوں ہو گئے تمنائی بھی کشت و خوں ہو گئے
لڑائی ہوئی ہاتھا پائی ہوئی تماشا بنا، جگ ہنسائی ہوئی[۴۵۱]

حکم رانوں اور مقتدر حلقوں کو اس کا ذمے دار قرار دیتے ہوئے شاعر سخت غم و غصے کے عالم میں یہ کہنے پر مجبور ہوئے کہ:

مگر اس تباہی کی یلغار سے ہلاکت کے خلقومِ خوں خوار سے
فقط ایسے پیچھا چھڑایا گیا کہ آدھا نگر بیچ کھایا گیا[۴۵۲]

وقار انبالوی بھی صحافت کے پیشے سے وابستہ رہے۔ اسی لیے ہنگامی نوعیت کے موضوعات کی ان کے ہاں بھی بھرمار دکھائی دیتی ہے۔ سقوط ڈھاکا کے موضوع پر متعدد قطعات کے علاوہ انھوں نے بے شمار نظمیں بھی لکھیں۔ ان نظموں میں سیاست دوراں کی جھلک بہت نمایاں ہے۔ رہ نماؤں کی بے حسی اور غفلت کو سانحہ سقوط ڈھاکا کے پس منظر میں دیکھتے ہوئے اپنی نظم ''وہی امیدِ فردا'' میں کہتے ہیں کہ:

سازشوں کا گڑھ بنا اکثر حریمِ اقتدار اپنی من مانی میں تھے آزاد سب اغیار و یار
جو بھی ظل اللہ تھا، مستی سے اس کو کام تھا حکم رانی کیا تھی، دادِ عشق کا ایک نام تھا

بیچ کر آدھا وطن آخر یہ حاکم کھا گئے مار کر اپنوں کی جڑ، اغیار کے کام آ گئے[۵۳]

وقار انبالوی نے اس موقعے پر جو تڑپ محسوس کی، اس نے ان کے لہجے میں طنز اور کاٹ کی کیفیت پیدا کر دی۔ درد کی ٹیس جب بے کیفی پیدا کر دے تو خود بہ خود لب و لہجے میں یہ تلخی در آتی ہے۔ اس کی جھلک درج ذیل اشعار میں پوری طرح عیاں ہے:

یہ کہہ کر ایک آہِ سرد اٹھی ملت کے سینے میں کہ کھویا تم نے آدھا ملک سازش کے قرینے سے
کوئی جا کر کہے تو آج سازش گر کمینے سے اگر ذلت کا جینا ہو تو موت اچھی ہے جینے سے[۵۴]

فوج نے جس طرح سے سیاست اور سول امور میں دخل اندازی شروع کی اس نے فوج کے کردار کو بھی مشکوک بنا دیا۔ اس عمل سے فوج اپنی پیشہ ورانہ مہارت بھی کھو بیٹھی۔ اس جانب اشارہ کرتے ہوئے شاعر کا کہنا تھا کہ:

نگہبانِ وطن ہو، سرفروشی میں یگانہ ہو شہادت کی طلب میں فوج مشہورِ زمانہ ہو
ضرورت آج ایسی فوج کی ہے ملک و ملت کو نہ وہ دستے جنھیں حاصل سیاسی آب و دانہ ہو[۵۵]

سقوط ڈھاکا کے پس منظر میں ہوس اقتدار، ملک و ملت سے غداری اور ذاتی مفاد کو سامنے رکھ کر قومی مفاد سے بے رخی جیسے معاملات کو شعرا نے نہ صرف موضوع بنایا بلکہ اس دور کے رہ نماؤں اور راہ بروں کے بھیانک کردار کی ایسی تصویر کشی کی ہے کہ ہمارے سر شرم سے جھک جاتے ہیں۔ ملاحظہ کیجیے:

آہ وہ قوت جو خونِ گرم سے تھی سرخ رو دستِ غداری نے لوٹی کیسے اس کی آب رو
سر جھکا دے ایسی قوت دشمنوں کے سامنے یہ نظارہ کیسے دیکھا دیدہِ ایام نے
رہ بروں کو تو تو میں میں سے فراغت ہی نہیں راہ رو حیران ہیں جائیں کدھر اس حال میں[۵۶]

ملک سے غداری کرنے والے اہم ترین کردار شیخ مجیب الرحمٰن کو بہت سے شعرا نے ہدف تنقید بنایا۔ وقار انبالوی نے بھی موجودہ دور کے اس میر جعفر کا نقشہ اپنی نظم ''شیخ مجیب سے'' میں کچھ اس طرح کھینچا ہے:

تجھ کو اک مدت رہا شکوہِ ارباب ملک سے نا پسندیدہ ترے نزدیک تھیں ان کی صفات
تو سمجھتا تھا کہ مرکز کچھ نہیں اس کے سوا مال پر صوبے کے تیرے مارتا رہتا ہے ہاتھ
ہو گیا وہ کچھ جو بھارت کہہ رہا تھا دیر سے ہوگئی ہے ختم اب تیرے گلے شکوے کی رات[۵۷]

مشرقی پاکستان کے سانحے کے بعد اسیران جنگ کے مصائب کا ذکر بھی تقریباً ہر شاعر کے ہاں ملتا ہے۔ کبھی ان کی رسوائیاں شاعر کو شرمندہ کرتیں اور کبھی ان قیدیوں کے ساتھ ہونے والے سلوک سے وہ غم زدہ ہو جاتے۔ جیسے:

قوم کے عاشق وطن کے پاس باں کیا ہو گئے دوستوں کے فیض سے اعدا میں رسوا ہو گئے[۵۸]
شہیدانِ وفا تو سرخ رو ہو کر اٹھے لیکن مجاہد قید اعداء میں ہدف ہیں ناوک غم کا
سہاگ اور ماما کی آنکھ پتھر ہو گئی آخر نہ قطرہ اِس میں ہے غم کا، نہ قطرہ اُس میں غم کا[۵۹]

اس دور کی شاعری میں غم والم کی جو کیفیت پائی جاتی ہے اس میں شرمندگی کے آنسو بھی شامل تھے۔ شاعر اپنی نظم ''اے قائداعظم'' میں قائد سے مخاطب ہو کر جس شرمندگی کا اظہار کر رہے ہیں اس غم والم کی فضا اپنے عروج پر دکھائی دیتی ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

خشک ہونے میں نہیں آتے ہمارے آنسو | جانے کب ختم ہوں، ہر آنکھ کے سارے آنسو
ترے ترکے کی حفاظت میں رہے ہم ناکام | خون پیا را رہا، صدقے میں اتارے آنسو
چاشنی ان میں اخلاص و مروت کی نہ رہی | کچھ دکھاوے کے ہیں کچھ شرم کے مارے آنسو
کٹ گئی شاخ ترے نخلِ وفا پرور کی | اب بہاتے رہیں اس شاخ پہ آرے آنسو[۴۶۰]

اپنی ایک نظم ''قمری سال کوالوداع'' میں غم والم کی کیفیت بیان کرتے ہوئے شاعر نے بچوں، عورتوں اور بے گناہوں پر ہونے والی ناقابل بیان بربریت کا حال کچھ اس طرح بیان کیا ہے:

یوں تو تیری ہر سحر، پیغامِ شامِ غم رہی | عید کے دن بھی بپا اک محفلِ ماتم رہی
مشرقی بازو رہا آفات، ارضی میں گھرا | تو نے اب چھوڑا اسے غیروں کی مرضی میں گھرا
ننھے منے، پھول سے بچوں کی چیخیں یاد ہیں | جن پہ وہ بھونے گئے وہ سرخ چیخیں یاد ہیں
بیٹیوں کی عزت و عصمت کا خونِ بے بہا | ذکر گلیوں کا نہیں، وہ جو مساجد میں بہا[۴۶۱]

ذکی کیفی کی شاعری میں بھی سانحہ مشرقی پاکستان کے اثرات نمایاں ہیں۔کیفی نے اس سانحے کو اپنے دل کا روگ بنا کر غزلوں اور نظموں کو قومی نوحے کی شکل میں پیش کیا۔غزل کے یہ اشعار دیکھیں:

گلشن کی تباہی کا الم کم تو نہیں ہے | دل خوں ہے مگر فرصتِ ماتم تو نہیں ہے
کہنا پھر اس کے بعد تباہی کی داستاں | مجھ خانماں خراب کو گھر دیکھنے تو دو[۴۶۲]

وہ بنگال کی سرزمین کو تاریخی پس منظر میں دیکھتے ہوئے سقوط ڈھاکا کو ان ہی واقعات اور غداری کا تسلسل قرار دیتے ہیں۔ان کے مطابق:

جعفرو صادق کی غداری بھی زندہ کی گئی | قاسم و محمود کے قصے بھی دہرائے گئے[۴۶۳]

مشرقی پاکستان میں حب الوطنی ایک گالی بن چکی تھی۔اہل وفا کا انجام بھیانک تھا۔غیر بنگالیوں پر طرح طرح کے مظالم ڈھائے جا رہے تھے۔ذکی نے اپنی نظم ''قومی نوحہ'' میں گلشن کی بربادی کا نوحہ کچھ اس انداز سے پڑھا ہے:

حادثہ سخت بہت ہے رو لے اے دل | خشک آنکھیں ہیں انھیں خون سے دھولے اے دل
ایک طوفانِ بلا بن کے قیامت ٹوٹا | قوم گرداب میں کھاتی ہے جھکولے اے دل
قصہ گلشنِ برباد سنا، ماتم کر | خوب دل کھول کے رو، نالہ و شیون کر لے
آسمانوں کو ہلا آہِ فغاں سے لیکن | کچھ سکوں ہو تو ذرا ذہن کو روشن کر لے[۴۶۴]

کوئی بھی حادثہ اچانک رونما نہیں ہوتا بلکہ اس کے پس پشت اسباب وعوامل ہوتے ہیں۔قیام پاکستان کے بعد قوم نے جس طرح بے راہ روی اختیار کی اور ترقی کے نام پر بھونڈی نقالی اور تنزلی کا جو راستہ اختیار کیا، اس نے تاریخ پاکستان کے سب سے بڑے المیے کو جنم دیا۔اس اسباب کی جانب اشارہ کرتے ہوئے ذکی کہتے ہیں کہ:

تو نے اللہ سے یہ کہہ کے وطن مانگا تھا | غلبہ اس خطے میں اسلام کو حاصل ہوگا

اور اللہ نے جب پاک وطن بخش دیا — اپنے ہر عہد کو پیمان کو توڑا تونے
تو نے عیار لٹیروں کا سہارا ڈھونڈا — تو نے عیاش امیروں کی طرف داری کی
تونے خود اپنی صداقت کا گلا گھونٹ دیا — تو نے ہر فرض کے احساس سے غداری کی
رقص گا ہوں میں اس انداز سے پائل چھنکی — اس کی آواز میں آوازِ اذاں ڈوب گئی
نسل اور رنگ کے فتنوں کو ہوائیں دے کر — نظم برباد کیا اور سنورنا چاہا[۴۶۵]

وہ غداران وطن سے ان کے سیاہ کارناموں کا حساب بھی مانگتے دکھائی دیتے ہیں اوران کی مذمت بھی کرتے ہیں۔اپنی نظم ''غارت گرانِ خونِ شہیداں حساب دو'' میں وہ کہتے ہیں کہ:

کیا صف شکن تھے جنگ سے نالاں؟ نہیں نہیں — کیا شہرِ دل تھے کفر سے ترساں؟نہیں نہیں
کیا غازیوں میں شوقِ شہادت کی تھی کمی — کم ہو گئی تھی غیرتِ ایماں؟ نہیں نہیں
کیا عرصہ گاہِ جنگ میں ہنگامہ کار زار — کم پڑ گیا تھا جنگ کا ساماں؟ نہیں نہیں[۴۶۶]

شاعر کے نزدیک جب یہ سب کچھ نہیں تھا تو پھر شکست ہمارا مقدر کیوں ٹھہری۔ وہ اس شکست کے اسباب کو تلاش کرتے ہوئے حکم رانوں سے جواب مانگتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

برباد کیوں ہوا ہے گلستاں جواب دو — اے قاتلانِ غیرتِ ایماں جواب دو
کس دل سے تم نے ذلتِ اسلام قبول کی — کہتا ہے تم سے خونِ شہیداں جواب دو
وہ اپنے سر فروش جو کوہِ وقار تھے — کیوں ہیں اسیر حلقۂ زنداں جواب دو
تم نے کہا تھا عہدِ وفا ملک و قوم سے — اب کیا ہوا وہ عہدو پیماں جواب دو[۴۶۷]

سید شرافت علی صہبا لکھنوی کو بھی مشرقی پاکستان سے دلی لگاؤ تھا۔ یہ تعلق صہبا کے قیام بنگال کے دوران پیدا ہوا۔اس تعلق کا اظہار انھوں نے اپنی تصنیف ''میرے خوابوں کی سرزمیں مشرقی پاکستان'' میں بڑی خوب صورتی سے کیا ہے۔سقوط ڈھاکا کا اثر ان کی شاعری پر بھی جا بہ جا دکھائی دیتا ہے۔ان کی غزلوں میں اس سانحے نے ایک سوز کی کیفیت پیدا کر دی۔ان کے نزدیک اس سانحے کے نتیجے میں وہ کچھ ہوا جس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔وہ اس غم والم کی کیفیت کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

لٹا جو گھر تو تبا ہی پہ اشک بھی نہ بہے — غبارِ راہ میں گم کتنے فا صلے ہی رہے
چلے تھے سوچ کے منزل قریب ہوگی مگر — نہ منزلوں کے نشاں تھے نہ فا صلے ہی رہے[۴۶۸]

اس سانحے کے پس پشت رہ نماؤں اور راہ بروں کی بے حسی اور غداری نے صہبا کو دل گرفتہ رکھا۔اس کا اظہار بھی ان کی غزلوں میں دکھائی دیتا ہے۔ملاحظہ کیجیے:

چلے تھے گھر سے لیے زندگی کا نور مگر — سفر میں رہ برو راہ زن کے رابطے میں رہے[۴۶۹]

اس سانحے نے ان نظموں میں بھی غم والم کی کیفیت پیدا کر دی۔غم کی شدت جب حد سے بڑھ گئی تو شاعر کے نزدیک ان کا دل جذبات واحساسات سے عاری ہوگیا۔نظم کے یہ اشعار دیکھیں:

کون ہارا کون جیتا؟/ فیصلہ کرتا ہے کون/ میں تو بس احساس سے، جذبات سے محروم ہوں/
اتنی محرومی کہ دل آٹھوں پہر رویا گیا [۷۰]

شکست کے بعد احساس شکست اور رسوائی نے اس دور کے تمام ہی شعرا کو مضطرب رکھا۔ صہبا نے بھی اپنی نظموں میں اس قسم کے سوالات اٹھاتے ہوئے کہا کہ:

جاں نثارانِ وطن نے جان دی ۔۔۔ جان کتنی عظمتوں کی ہے امیں
اس امانت میں خیانت کس نے کی ۔۔۔ کس کے ہاتھوں سر نگوں پرچم ہوا؟
اور بر بادی تباہی موجبِ غم بن گئی ۔۔۔ کس نے آزادی سے لوٹا صحنِ گل [۷۱]

عبدالعزیز خالد ہر محبِّ وطن کی طرح اس سانحے سے بے حد متاثر ہوئے۔ سقوط ڈھاکا کا المیہ ان کے لیے تازیانے سے کم نہیں تھا۔ اس لیے وہ رنج ومحن کی تصویر بن کر رہ گئے۔ اسی رنج کا اظہار کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ:

تباہ حال تھے اندر بھی پیچ و تاب نہ ہو ۔۔۔ ہماری طرح کوئی خانماں برباد نہ ہو
وہ ہم کہ تھے گلِ ریحان باغِ یکتائی ۔۔۔ وہ ہم کہ ہیں خس وخاشاک کوئے رسوائی [۷۲]

وہ اپنی عظمت رفتہ کو یاد کر کے موجودہ صورت حال پر افسوس کا اظہار کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ ہوس اقتدار اور اس کے نتیجے میں پھیلنے والی افراط وتفریط کو بیان کرتے ہوئے شاعر کا کہنا تھا کہ:

ہمارے دامنِ عریاں پہ خون کے دھبّے ۔۔۔ ہمارے چہرہِ پنہاں پہ داغ نکبت کا
گرا منارہِ خود رائی و خود آرائی ۔۔۔ ہوس نے دامنِ عصمت کو تار تار کیا [۷۳]

ان کی شاعری میں سب سے گہرا رنگ، اس بے بسی کا رنگ ہے جو ہم وطنوں پر ہونے والے مظالم کی وجہ سے پیدا ہوا۔ جارح اور بدطینت دشمن بنگالیوں کی لوٹ مار خصوصاً عورتوں کی عصمت دری نے شاعر کو یہ کہنے پر مجبور کر دیا کہ:

ہیں کنواریاں غضب آلود، بیاہیاں دل گیر ۔۔۔ کریں ستم زدہ خود کو حوالہِ تقدیر
کہ دیکھی ہے سارے جہاں نے برہنگی ان کی ۔۔۔ ملامتوں نے کیا ہے محا صرہ ان کا [۷۴]

محسن احسان نے بھی سانحہ مشرقی پاکستان کے مضمرات '' تلاش کرتے ہوئے اپنوں اور غیروں کی بے وفائی اور بڑی طاقتوں کی عیاریوں کا پردہ فاش کیا ہے۔ ان کے مطابق:

مری شکست میں کیا کیا تھے مضمرات نہ پوچھ ۔۔۔ عدو کا ہاتھ تھا اور چال آشنا کی تھی [۷۵]

اس سانحے کے پس پشت قوم کی مجموعی بے عملی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے شاعر نے طاؤس ورباب میں ڈوب کر اپنی عظمت رفتہ کے کھونے کے عوامل بھی تلاش کیے ہیں اور اس صورت حال پر افسوس کا اظہار بھی کیا ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

ہم کبھی شمشیرِ جوہر دار تھے لیکن ہمیں ۔۔۔ دستِ ناہنجار میں تلوار ہونا تھا، ہوئے
اپنا گھر جی کھول کر تاراج کرنا تھا، کیا ۔۔۔ اپنے ہاتھوں خود ہمیں مسمار ہونا تھا، ہوئے [۷۶]

مشرقی پاکستان کی علاحدگی دراصل اسی شکست وریخت کا نتیجہ تھی۔ اس ٹوٹ پھوٹ کی بنا تو قیام پاکستان کے فوراً بعد پڑنا

شروع ہو چکی تھی۔ یہ سانحہ صرف حکم رانِ وقت کی بداعمالیوں کا ساخسانہ نہیں تھا بلکہ ماضی میں گزرے وہ تمام حکم راں اور سربراہانِ مملکت بھی اس کے ذمے دار تھے جنھوں نے اپنی بے عملی اور ناسمجھی میں انتشار کو فروغ دیا۔ محسن کے مطابق:

تم سے پہلے بھی تھے کچھ لوگ اس دھرتی پر　　　زہر پھیلا گئے جو آب و ہوا میں یارو[۹۷۷]

عوام کو اندھیرے میں رکھنے کی روایت کا بیان ہو یا دانستہ اس سانحے کے اسباب وعلل کے سراغ لگانے سے چشم پوشی کا معاملہ ہو، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مجرموں تک پہنچنے اور ان کے چہرے بے نقاب کرنے سے کس کو دل چسپی نہیں رہی۔ حمود الرحمٰن کمیشن کی مکمل روداد بھی آج تک منظرِ عام پر نہ آسکی۔ اس مجموعی قومی رویے پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے شاعر نے معنی خیز انداز میں یہ ضرور کہا کہ:

کس کے ہاتھوں پہ لہو ہے کس کے ہاتھوں پہ حنا　　　کھینچ سکتا ہے مرے عہد کی تصویر کون

وقت منصف ہے کرے گا قوت پر ہی فیصلہ　　　شہر کی تخریب میں ہے، قابلِ تعزیر کون[۹۷۸]

ان کی نظموں میں بھی اس سانحے کے گہرے اثرات دکھائی دیتے ہیں۔ شاعر نے اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے متعدد نظموں میں سقوط ڈھاکا کو موضوع بنایا۔ ان کی نگاہ اس سانحے پر شرم ساری سے مملو تھی۔ وہ تصویر میں بابائے قوم کی طرف دیکھتے اور شاعر اور قائد کے درمیان جو مکالمہ ہوتا اس پر ان کی شرمندگی اور بڑھ جاتی۔ یقیناً اس سانحے نے قائد کی روح کو بے چین کر دیا ہوگا۔ اس حوالے سے شاعر کا کہنا ہے کہ:

رات کی سیاہی میں / شہر کی فصیلوں پر / میں نے گھومتے دیکھا روشنی کے ہالے میں / اک ملول سائے کو / اس کا مضمحل چہرا / اس کی بے طلب آنکھیں / اس کا بے ریا لہجہ / فرطِ درد میں مجھ سے / یہ سوال کرتا تھا / اے مرے جری لوگو / کوہ سے قوی لوگو / میں نے تم کو یہ خطہ / عمر بھر کی محنت سے / اس لیے دیا لے کر / تم اسے سجا لینا / اس کا ایک اک گوشہ / عنبریں بنا لینا[۹۷۹]

افسوس کہ قائد کے وارثوں نے اس خطۂ زمین کی حفاظت نہیں کی۔ شاعر قائد کی روح سے مکالمہ کرتے ہوئے ان اسباب کی بھی نشان دہی کرتے ہیں جو اس المیے کا سبب بنے۔ قوم کی خود غرضی، مصلحت کوشی اور تفرقہ بازی نے جس طرح قوم کے وقار کو روند ڈالا اس جانب اشارہ کرتے ہوئے ان کا کہنا تھا کہ:

اس خدائے برتر نے / جو زمیں عطا کی ہے / تم نے اس کا ہر ذرا / مصلحت کی آندھی میں / بے وقار کر ڈالا / خود غرض ہواؤں نے / سبز پوش پیڑوں کو / نخل دار کر ڈالا / رشوتوں کے جھکڑ نے / فقر کی قباؤں کو / تار تار کر ڈالا / فرقہ وار سوچوں نے / مسکنِ محبت کو / گلشنِ لطافت کو / شعلہ زار کر ڈالا[۹۸۰]

قومی تشخص اور شناخت پر جب سوالیہ نشان اٹھنے لگے تو اس موقعے پر قائد اعظم کی شخصیت ہی وہ مرکز تھی جن کی صفات کو مثال بنا کر لوگ رہبری تلاش کرتے رہے۔ لہٰذا اس موقعے پر قوم نے دردمند اور مدبر قائد کو بہت یاد کیا۔ اس سانحے کے بعد ۲۵ دسمبر قائد اعظم کی یومِ ولادت کے موقعے پر شعرانے جو کرب محسوس کیا وہ فطری تھا۔ مضطرب اور بکھرے ہوئے ذہنوں نے اس یومِ جشن کو یومِ فریاد میں

بدل دیا۔اس لمحے سود و زیاں کا ہر لمحہ یاد آیا[۴۸۱]۔محسن نے اس صورت حال پر جو نظم کہی وہ اس صورت حال کی زبردست عکاسی کرتی ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

سب تھے بے گانہِ احساسِ وفا تیرے بعد	سب نے سورج کا گلا گھونٹ دیا تیرے بعد
سب نے مل جل کے فضا میں وہ سیاہی گھولی	ڈھونڈنے پر بھی نہ خورشید ملا تیرے بعد
جو وطن تو نے دیا تھاہمیں سر تاجِ وطن	آ ذرا دیکھ کہ کیا حال ہوا تیرے بعد
وہ ندامت ہے کہ آنکھیں بھی نہیں اٹھ سکتیں	خطہِ پاک کا وہ حال ہوا تیرے بعد[۴۸۲]

اکبر کاظمی نے بھی اپنی شاعری میں ہمیشہ خود احتسابی کا انداز اختیار کیا۔۱۹۷۱ء کے المیے پر انھوں نے اہل وطن کو مخاطب کر کے اپنے مخصوص انداز میں ایک طویل نظم لکھی اور قائداعظم کا حوالہ دے کر روح جہاد کی بازیافت پر زور دیا۔اس نظم میں واقعیت کا رنگ بہت نمایاں ہے۔ملاحظہ کیجیے:

غضب ہے ارضِ مقدس کے ایک گوشے میں	غرور قہر کا طوفاں امنڈ کے آیا ہے
یتیم بچوں کے لاشے دہائی دیتے ہیں	لہو زمیں پہ فلک پہ غبار چھایا ہے
لہو میں ڈوبی ہوئی سرزمین ڈھاکا کی	تمہاری جراءت و غیرت کو دے رہی ہے صدا
ادیبوں، شاعروں، دانش وروں کی ہر اک لاش	فریب کار قیامت کا کررہی ہے گلہ
اٹھو چراغ جلاؤ یقینِ محکم کے	خدا کی ذات اور خود پہ اعتماد کرو
پکارتی ہے تمہیں روحِ قائد اعظم	بہ نام غیرتِ اسلام اٹھو جہاد کرو[۴۸۳]

قوم کے ٹوٹے ہوئے حوصلوں کو عزم میں تبدیل کرنے کے لیے بھی شعرا کی کوششیں قابلِ تحسین رہی ہیں۔اس جذبے کا اظہار اسلم کمال کی نظم ''حسین پرندے کی دعا'' میں بہت واضح ہے۔ملاحظہ کیجیے:

میں دیکھتا ہوں، فضا میں کتنے حسیں پرندے/ گھروں کو واپس پلٹ رہے تھے/ میں سوچتا
تھا/ کی جس پرندے کا آشیانہ تھا میرے بازو کے اس شجر پر/ جو کٹ چکا تھا/ وہ کیا کہے گا/
میں کیا کہوں گا/ اسے میں کچھ بھی نہ کہہ سکوں گا/ او کالی دیوی کے وحشی بیٹو/ حسیں پرندے کا
آشیانہ جلانے والو/ حسیں پرندے کی بددعا ہے/ تمہارا گلشن بھی راکھ ہوگا/ کہ جنگ ہوگی
ضرور ہوگی/ طویل ہوگی شدید ہوگی/ تمہاری نسلوں سے جنگ ہوگی/ کہ میرا بازو جو تم نے کا
ٹا/ وہ اک شجر تھا وہ اک شجر تھا/ وہ میرا بازو جو کٹ گیا ہے/ وہ امن و تہذیب کا شجر تھا/ وہ
آشیانہ تھا فاختہ کا[۴۸۴]

اسی طرح عدیم ہاشمی کی نظم ''ہم سب چڑیا گھر میں کیوں ہیں'' میں رنج سے زیادہ غم و غصے کی کیفیت کا اظہار ملتا ہے۔شاعر نے علامتی انداز میں ان پابندیوں اور مجبوریوں کے خلاف احتجاج کیا جو فکر و عمل کو محبوس کیے دے رہی تھیں۔ملاحظہ کیجیے:

ہم مٹی کے مادھو کب تک بنے رہیں گے/ کب تک اک بکاؤ مال کی مثل بکیں گے/ اے

پنجرے کے مالک کھول ہمارے پنجرے/ کھول کہ اب جی زخمی ہیں وہ وار کریں گے/
کھول ہمارے پنجرے ورنہ زخمی ہو کر ہم نے وہ فن سیکھ لیا ہے/ جن سے اپنے آپ سلاخیں
سب پنجروں کی گل جائیں گی/ کھول ہمارے پنجرے چڑیا گھر کے مالک/ اپنے زور سے
نکلے تو ایک پنجرے میں تو ہوگا/ جس کی سلاخیں دہک اٹھیں گی/ گل نہ سکیں گی/ ہم مٹی کے
مادھو کب تک بنیں رہیں گے [۴۸۵]

ان کی نظموں میں ایک احتجاج کی فضا موجود ہے۔ حکم رانوں کے ہوس اقتدار کے خلاف اور مغربی آقاؤں کی غلامی کا طوق پہننے کے خلاف وہ اعلانِ جنگ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

ہم جو ہارے نہیں/ ہم جو مارے گئے/ ہم جو مفلوج کر کے لڑائے گئے/ ہم جو معذور کر کے
سرِ عرصہِ جنگ لائے گئے/ ہم جو ہارے نہیں مفت مارے گئے/ سالمیت کے ان دشمنوں
سے جو ارضِ وطن پر نگاہیں جمائے/ وطن کا بدن کاٹنے کے لیے مضطرب ہیں/ ان غلط حا
کموں سے کہ جن کی غلامی نے/ آج ایک ہاتھ دانستہ چالوں سے کٹوا دیا ہے [۴۸۶]

سقوط ڈھاکا کے حوالے سے جمیل الدین عالی کے ہاں بھی متعدد نظمیں موجود ہیں۔ ان نظموں میں سقوط ڈھاکا کے حالات اور واقعات کی جانب واضح اشارے ملتے ہیں۔ محبِّ وطن لوگوں نے جب دیکھا کہ حکم راں وطن کی تعمیر و ترقی کی طرف توجہ دینے کے بہ جائے اس گلشن کی آزادی کے لیے کی گئی محنت پر پانی پھیرنے پر تلے بیٹھے ہیں تو عالی جیسے شعرا یہ کہنے پر مجبور ہو گئے کہ:

مالی اپنے خون سے سینچیں جس کی اک اک کیاری — روندنے والے روند رہے تھے وہ تازہ پھلواری [۴۸۷]

ادا جعفری کی شاعری میں بھی اس سانحے پر شدید غم انگیز کیفیات کا سراغ ملتا ہے۔ عورت ہونے کے ناتے انھوں نے رشتوں کی پامالی کو زیادہ شدت سے محسوس کیا۔ اسی لیے ان کی شاعری میں یہ احساس بہت نمایاں ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

رشتہِ درد فرسودہ زنجیر تھی/ آج زنجیر توڑ دی گئی/ پیار کے گیت ہونٹوں پر ہیں منجمد/ آج
احساس کی رسمِ دیرینہ چھوڑی گئی/ آج کھیتوں میں نفرت کی فصلیں اگیں/ میرے اپنے
درختوں کی شاخیں صلیبیں بنیں/ میرے بچوں کو کیسی امانت ملی/ خوں میں لپٹا ہوا ہے یہ
پیرہن/ میری نسلوں کو میری وراثت ملی [۴۸۸]

اپنی نظم ''تو جانتا ہے'' میں انھوں نے جنگی قیدیوں کی تلخ یادوں کو موضوع بناتے ہوئے اپنے احساسات کو کچھ اس انداز سے پیش کیا کہ:

میری مجبور نگاہوں میں لہو کا نوحہ/ میری چاہت بھی، مرے خواب کرم بھی گھائل/ حد تو یہ
ہے مرے غم بھی گھائل/ پسِ زندہ مرے سرور یحاں/ نالہ و گل مرے زنجیر بکف دیکھے ہیں/
جانے کس ہاتھ نے تو جانتا ہے/ میرے آنگن کے اجالوں میں لہو گھول دیا [۴۸۹]

ان اشعار میں وطن کی خاطر قیدی بنائے جانے والوں کا نوحہ بھی ہے اور اس رسوائی پر تلخیِ دوراں سے شکایت بھی۔ وہ ان

قیدیوں کے عزم وحوصلے کو بڑھانے کے لیے بھی کہتی ہیں کہ:

اے شہرِ عزیزاں! ترے ناموس کی خاطر — ہم جاں سے بھی گزرے تو کوئی بات نہیں ہے
ابھرے گا اندھیروں سے تیرا نیّر و تاباں — اس رات کے بعد اور کوئی رات نہیں ہے[۴۹۰]

اور کبھی وہ وطن کی خاطر ہونے والی رسوائی اور بدنامی پر افسوس کا اظہار کرتے ہوئے جنگی قیدیوں کے جذبات واحساسات کی عکاسی کرتے ہوئے کہتی ہیں کہ:

پہنچے ترے پندار کی چاہت میں کہاں تک — رسوا بھی سرِ کوچہ و بازار ہوئے ہیں
دنیا نے سنے حلقۂ زنجیر کے نوحے — تنہائیِ زنداں کے خریدار ہوئے ہیں[۴۹۱]

پروین شاکر نے بھی اس سانحے کا تجزیہ کرتے ہوئے بہت سے عناصر کو بےنقاب کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس سلسلے میں ان کا یہ شعر تو ضرب المثل کی حیثیت رکھتا ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

لے جائیں مجھ کو مالِ غنیمت کے ساتھ عدو — تم نے تو ڈال دی ہے سپر تم کو اس سے کیا[۴۹۲]

اس سانحے نے ایک طویل عرصے تک حساس دلوں کو غم والم کی کیفیت میں مبتلا رکھا۔ یہ المیہ ان لوگوں پر تازیانے سے کم نہ تھا۔ لوگوں پر ظلم وستم کے پہاڑ توڑنے کے ساتھ ساتھ اپنے ہی وطن کی زمین جب ان کے لیے تنگ کر دی گئی تو شاعرہ یہ کہنے پر مجبور ہوئیں کہ:

بے وطن کہلائے اپنے دیس میں — اپنے گھر میں رہ کر بے گھر ہو گئے[۴۹۳]

مشرقی پاکستان میں ہونے والی عورتوں کی بےحرمتی پر بھی پروین کے ہاں ایک کرب کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ ایک دوسرے کے دکھ درد بانٹنے والے ہی جب عزتوں کے لٹیرے بن گئے تو انھوں نے اپنوں کی بےبسی اور لاچاری کے اظہار کے ساتھ ان لوگوں کے منافقانہ رویوں کی بھی نشان دہی کی جو کبھی ان لوگوں کی رکھوالی کا دم بھرتے تھے۔ ملاحظہ کیجیے:

جو میرے سر سے دوپٹا نہ ہٹنے دیتا تھا — اسے بھی رنج نہیں میری بے ردائی کا
ردا چھینی مرے سر سے مگر میں کیا کہتی — کٹا ہوا تو نہ تھا ہاتھ میرے بھائی کا[۴۹۴]

ماجد صدیقی بھی اس سانحے پر اپنی شرمساری کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

نہ تجھ سے آنکھ ملانے کے ہم رہے قابل — یہ دن بھی آئے ہیں پھر اے بریدہ دست بازو
یہ دن بھی آئے ہیں جب سر بلندیاں اپنی — یہیں نشانۂ تضحیکِ دشمناں ٹھہریں[۴۹۵]

وطن سے محبت ماجد کی شاعری کا مرکزی موضوع ہے۔ ان کی شاعری میں رجائی پہلو نمایاں ہے اسی لیے فیض احمد فیض انھیں خوش فکر اور خوش گو شاعر[۴۹۶] قرار دیا ہے۔ سقوط ڈھاکا کے سانحے پر بھی وہ اپنی دل گرفتگی کا اظہار ضرور کرتے ہیں لیکن آگے بڑھنے اور مستقبل کی منصوبہ بندی کا مشورہ دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

دل شکستہ تجھے رنجِ رائیگاں کیوں ہے — یہ تیرے سامنے ماضی کا ہی سماں کیوں ہے
گزر گئی جو گزرنی تھی شاخِ ہستی پر — خزاں کے بعد بھی سنسان آشیاں کیوں ہے
شکست پر ترا ایماں ہی جب نہیں ماجد — یہ کچھ دنوں سے تری طبیعت گراں کیوں ہے[۴۹۷]

ملک کرم داد کرم حیدری کی غزلوں میں حب الوطنی کا احساس بہت نمایاں ہے۔مشرقی پاکستان کے جاں گداز المیے پر انھوں نے اپنے غم و غصے کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ:

ارضِ مشرق میں بجھے مہر و محبت کے چراغ | بستی بستی میں سم آلود دھواں پھیل گیا
چشمہ کورانا تعصب کا جو پھوٹا تھا کبھی | بڑھتے بڑھتے صفتِ سیل رواں پھیل گیا[۴۹۸]

شاعر کے نزدیک یہ سانحہ اچانک وقوع پذیر نہیں ہوا بلکہ نفرتوں کے بیج برسوں پنپتے رہے۔اسی تعصب اور نفرت کے نتیجے میں ملک دولخت ہوا۔ان کے مطابق:

زہر برسوں سے جو گھلا ذہنوں میں وہ آخر کار | سرحدِ ہوش سے تا مرکزِ جاں پھیل گیا[۴۹۹]

مشرقی پاکستان میں تباہی و بربادی کے مناظر کا بیان ہو یا خون کی ہولی کھیلے جانے کے واقعات، کرم حیدری کے ہاں یہ تمام مناظر اپنی بھرپور شکل میں موجود ہیں۔ملاحظہ کیجیے:

لہو لہو ہے وجود اپنا دیارِ دل سے سوادِ جاں تک | بیاں کریں حالِ دل تو کیسے کہ ساتھ دیتی نہیں زباں تک
دیارِ غیر کے افسانے سنتے آئے تھے | لہو میں ڈوبا ہوا اپنا گھر بھی دیکھ لیا[۵۰۰]

صہبا اختر کی شاعری میں بھی سانحہ سقوط ڈھاکا کا بیان انتہائی دردناک انداز میں کیا گیا ہے۔ان کے مطابق یہ سانحہ تاریخ پاکستان کا ایسا الم ناک سانحہ تھا جس کا مداوا کبھی نہیں ہو سکے گا۔نظم ''میری آزادی کہ جس کا نام پاکستان ہے'' میں ان کا یہ انداز ملاحظہ کیجیے:

نصف آزادی کی دولت چاٹ کر لے جا چکے | میرے دشمن ایک بازو کاٹ کر لے جا چکے
گو مسیحائی کو آئی ہے ہوائے گل فروز | میرے سینے میں ہزاروں زخم تازہ ہیں ہنوز[۵۰۱]

اس سانحے پر صہبا نے بہت درد انگیز اشعار کہے۔ایسی الم ناک شاعری دوسرے شعرا کے ہاں کم دکھائی دیتی ہے۔خود اپنی شاعری کی بابت ان کا کہنا ہے کہ:

یہ میری نظم نہیں، درد کا دفینہ ہے | یہ میرے حسرت و آلام کا خزینہ ہے[۵۰۲]

اس سانحے کے اسباب کا کھوج لگاتے ہوئے شاعر نے جس طرح کے خیالات کا اظہار کیا وہ ہمارے لیے دعوت فکر کی حیثیت رکھتے ہیں۔اس سازش کی طرف اشارہ کرتے ہوئے شاعر کا کہنا ہے کہ:

شکار گاہ کی خواہش تھی اہلِ سازش کو | بہ طور خاص مرا ملک انتخاب ہوا
ہمارے قتل کے مل جائیں گے سراغ تمام | کبھی جو احمریں ہاتھوں کا احتساب ہوا[۵۰۳]

ان کی شاعری میں درد کے کئی پہلو نمایاں ہیں۔لوگوں کے قتل کے مناظر ہوں، املاک کی تباہی کی داستاں، صہبا نے ہر منظر کو بڑے موثر انداز سے اپنی شاعری کے کینوس میں پیش کیا ہے۔ملاحظہ کیجیے:

کہیں مکاں ہوئے غارت، کہیں مکیں برباد | کوئی غبار، کوئی خانماں خراب ہوا
وہ ظلم روح پہ ٹوٹے کہ کربلا بھولی | وہ اشک برسے کہ طوفانِ نوح خراب ہوا[۵۰۴]

شاعر کا دل اس حادثے پرخون کے آنسو روتا ہے۔ ہزاروں لوگوں کی ہلاکت اور آخر کار ہتھیار ڈالنے کی ہزیمت نے اس کرب میں مزید اضافہ کیا۔ جنگی قیدیوں کی بے بسی اور مظلوموں پر ہونے والے ظلم وستم نے انھیں یہ کہنے پر مجبور کر دیا کہ:

ارض بنگالا کا حال پوچھتے ہیں جب خیال — کرتی ہے کیا کیا سوالِ حسرتِ گفت و شنید
ان گنت انجم قبا، کھا گیا سیلِ بلا — پھر بھی مقتل میں بپا نعرہِ ہل من مزید[۵۰۵]

شکست اور ہزیمت کے احساس سے ان کا دل چور چور تھا۔ یہ کرب انھیں بے کل رکھتا۔ ان کے وہم وگمان میں بھی یہ بات نہ تھی کہ کبھی ایسا سانحہ بھی رونما ہوسکتا ہے۔ اسی لیے وہ کہتے ہیں کہ:

نہ تھا خیال بھی جس کا ہمیں وہ ہار ہوئی — عجب طرح سے فنا روحِ اعتبار ہوئی[۵۰۶]

صہبا کے بے باک قلم نے کھل کر قوم کی بے عملی کی طرف اشارہ کیا۔ قوم کے مسیحاؤں کے مکروہ عزائم کو بے نقاب بھی کیا اور ان اسباب کا سراغ لگانے کی کوشش بھی کی جس نے تاریخ کے دھارے کو موڑ کر رکھ دیا۔ ان کے مطابق:

شرارِ برقِ عدو نے نہیں حقیقت میں — خود اپنے گھر کے چراغوں نے گھر جلایا ہے
ان مسیحاؤں نے یوں کارِ مسیحائی کی — گھول کر جام شفا میں زہرِ قاتل دے دیا[۵۰۷]

شہزاد احمد نے بھی خود احتسابی کے عمل کو دہراتے ہوئے اس سانحے کے پس پردہ حقائق پر روشنی ڈالی ہے۔ اپنی ایک نظم میں سانحہ سقوط ڈھاکا کے ضمن میں ہونے والی بے نتیجہ تحقیق اور تفتیش پر تنقید کرتے ہوئے ان کا کہنا تھا کہ:

اور اپنے آپ سے ہی برسرِ پیکار ہیں — ہم خود اپنی راہ کی دیوار تھے دیوار ہیں
اس لڑائی میں ہزاروں بار ہم مارے گئے — شمع کی مانند اپنے آپ پر وارے گئے
اس لڑائی کا سبب ہم سے نہ پہچانا گیا — حاکمانِ شہر کو مجرم نہ گردانا گیا[۵۰۸]

رفعت سلطان کی نظموں میں بھی سقوط ڈھاکا کا ذکر کثرت سے ملتا ہے۔ وہ اس سانحے کے اسباب سے لے کر نتائج تک کے بارے میں غور وفکر کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ شاعر اس سانحے کی وجوہات بھی بتاتے ہیں اور پھر حکم رانوں کے ناؤنوش اور نااہلی کو یوں موضوع بناتے ہیں کہ:

کفر کیوں فاتح و جرا رہے سو چو تو سہی — کیوں اب اسلام نگوں سا رہے سو چو تو سہی
بہہ گیا بادہِ احمر میں شہیدوں کا لہو — کیا مسلماں کا یہ کردار ہے سو چو تو سہی[۵۰۹]

پاکستانی قوم کے لیے سقوط ڈھاکا کسی کلنک کے ٹیکے سے کم نہ تھا۔ قوم جس ہزیمت سے دوچار ہوئی اسے تاریخ کے صفحات سے کھرچا نہیں جاسکتا۔ دوقومی نظریے کو خلیج بنگال میں ڈبو دینے کے دعوے کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے بعد جس طرح بھارت بغلیں بجا رہا تھا، اس نے قوم کی شکست کے دکھ کو اور زیادہ تکلیف دہ بنا دیا تھا۔ یہ سب کچھ مجموعی قومی بے حسی کا آئینہ دار تھا جس کے بعد اس بے عملی اور نااہلی کے خلاف قوم کو جھنجھوڑتے ہوئے شاعر کہتے ہیں کہ:

اپنے ماتھے پہ سجا رکھا ہے داغِ شکست — کیا تمہارا یہی شہکار ہے سو چو تو سہی[۵۱۰]

سانحے نے پوری قوم کو نڈھال کر کے رکھ دیا تھا۔ قوم میں اتنی بھی سکت نہ تھی کہ اس درد کا افسانہ بھی سنا سکے۔ اس غم ناک فضا

میں شاعر کہتے ہیں کہ:

ابھی فرصت کہاں شرح و بیاں کی ابھی چاکِ گریباں سی رہے ہیں[۵۱۱]

قوم کو اس انجام تک پہنچانے میں مفاد پرست رہ نماؤں کے کردار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ساغر و مینا کی محفلوں کا ذکر کچھ اس طرح کرتے ہیں:

انھیں ہوتی بھلا کیوں فکرِ فردا جو وقفِ ساغر و ساقی رہے ہیں[۵۱۲]

جعفر طاہر کے ہاں بھی جگہ جگہ یہی کیفیت دکھائی دیتی ہے۔ دسمبر ۱۹۷۱ء کے ''فنون'' میں شائع ہونے والا نوحہ اپنے اندر مخصوص کیفیت کا حامل ہے۔ اجڑے ہوئے ڈھاکا کی بربادگلیوں سے لے کر سر بریدہ لاشوں کا ذکر ہو یا اپنوں کی بے مہری کا شکوہ ہو، مسدس کی صنف میں لکھی گئی اس نظم میں ہر طرح کے مناظر پوری جزیات کے ساتھ موجود ہیں۔ اس نوحے کی فضا واقعات کربلا سے بہت قریب ہے۔ ماتمی فریاد کے انداز سے ایک رقت سی طاری ہو جاتی ہے۔ اس سوز و گداز نے سقوط ڈھاکا کے المیے کی شدت کو اور زیادہ بڑھا دیا ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

شمشیرِ ستم سے کوئی بسمل، کوئی گھائل میں اپنا کہیں اور وہ ظالم نہ ہو قائل
دل جوئیِ احباب نہ جینے کی لگن ہائے اے وائے وطن وائے، اے ہائے چمن ہائے
یہ لاشوں کے انبار ترے کوچہ و کو میں ڈوبے ہوئے خورشید سے چہرے وہ لہو میں
ڈھاکا کی وہ گلیاں ہیں نہ باقی رہے بازار رہ رہ کے مکینوں پہ ہیں روتے ہوئے دیوار
کعبے میں سنائی مجھے دیتے ہیں بھجن ہائے اے وائے وطن وائے، اے ہائے چمن ہائے[۵۱۳]

ہتھیار ڈالنے کے حکم نامے کے محرکات پر شاعر کے ہاں طنز کے نشتر کی چبھن کو واضح طور پر محسوس کیا جا سکتا ہے۔ اس حکم پر وہ خود تو متعجب ہیں ہی، ساتھ ساتھ اس حیرت انگیز فیصلے کی بابت سوچنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ:

وہ تگ و تاز کا عالم، نہ وہ جوش پیکار نہ دمِ معرکہ سازی، نہ وہ جنگ و جدل
حکم پر پہنچا کہ بس ڈال دو فوراً ہتھیار وہ گیا کاٹ کے ہاتھوں کو جیالا جرنل
صورتِ آئینہ دشمن کے مقابل حیراں ہائے وہ ہاتھ کہ جو ہو گئے میدان میں شل[۵۱۴]

افواج پاکستان اور سول سرکاری اہل کاروں کی بڑی تعداد کو جنگی قیدی بنائے جانے کے بعد ان کے عزیز و اقارب پر جو بیتی، اس تکلیف کا اظہار بھی جعفر طاہر کے ہاں موجود ہے۔ وہ ان بے خطا قیدیوں کی خیر و عافیت کی دعا مانگتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

دعائیں بہنو کی یہ التجائیں ماؤں کی الٰہی خیر ہو اک لاکھ بے خطاؤں کی
نہ رنج سہنے کی طاقت نہ صبر کا یارا او بے نیاز کوئی حد بھی ہے سزاؤں کی
نہ ان کے چہروں کو چھو کر کبھی صبا گزری نہ ان کے سر پہ کبھی بادلوں نے چھاؤں کی
یہ کس نے کاٹ دیے پر مرے عقابوں کے وہ چیخ چیخ اٹھیں وسعتیں خلاؤں کی[۵۱۵]

نعیم صدیقی نے بھی سقوط ڈھاکا کے سانحات کو شدت سے محسوس کیا۔ ایک صحافی کی حیثیت سے ان کے قلم میں بے باکی کی

جھلک نمایاں ہے۔لہٰذا اس سانحے پر جب ان کا قلم اٹھتا ہے تو ایک کھرا پن نظر آتا ہے۔کہیں وہ اس سانحے کے اسباب کا تجزیہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

فارغ ہوئے ہم آپ ہی اپنا گھر اجاڑ کر خانہ ہمارا غیر کرے گا خراب کیا[۵۱۶]

ان کے لہجے کی تلخی ان کے اندرونی کرب کا اظہار ہے۔وہ کبھی کبھی احتجاج کی حد تک چلے جاتے ہیں۔متعدد مقامات پر ان کے اس رجحان کو دیکھا جاسکتا ہے۔ملاحظہ کیجیے:

سو بار آستین کے سانپوں سے ڈس چکے اب کوئی حکم قومِ فروشاں نہیں قبول
ہم خاک وخوں میں لوٹ گئے ہیں تو کیا ہوا ہم کو یہ رقص لشکرِ شیطاں نہیں قبول[۵۱۷]

وہ اس سانحے میں جہاں اپنوں کی بے رخی اور غداری کا ذکر کرتے ہیں وہیں ان بین الاقوامی کڑیوں کو بھی تلاش کرتے دکھائی دیتے ہیں۔کبھی وہ شراب ومستی میں ڈوبے حکمرانوں کو طنز کا نشانہ بناتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

جشنِ شکست ذلت و خواری کی رات ہے نا چو گے اب یہ مستیِ جام و شراب کیا؟
تیغِ شکست ہاتھ میں، تن پر جراحتیں کچھ لطف دے گی تم کو نوائے رباب کیا؟
باقی نہیں ہے قلب و زبان وعمل کا ربط کیشِ منا فقت میں ہمارا جواب کیا؟[۵۱۸]

اور کبھی ہندوستان، روس اور امریکا کے کردار کو قابل مذمت قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

میری شکست عظمتِ انسان کی شکست اقوامِ شرق و غرب کے ایوان کی شکست
درندگی کی، ظلم کی، چنگیزیت کی فتح جمہوریت کی، عقل کی، برہان کی شکست
مکروہ فریب و کینہ کی سازش کی ہے یہ فتح یہ دوستوں کے وعدہ و پیمان کی شکست[۵۱۹]

سقوط ڈھاکا کے جگر پاش مناظر ان کے مجموعے ''پھر ایک کارواں لٹا'' میں جا بہ جا دیکھے جا سکتے ہیں۔''سقوط ڈھاکا'' کے عنوان سے لکھی گئی نظم میں سقوط ڈھاکا کے کرب کو پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

پھر ایک سازش، پھر ایک شب خوں، پھر اک شرارت، پھر اک دھما کا
تمام ماحول سہما سہما، اٹھا ہے طوفان کس کس بلا کا
پھر اپنے گلشن کی ٹہنیوں کو خزاؤں سے بجلیوں نے تا کا
نحوستیں ساتھ لے کے وارد ہوئی ہے شامِ سقوطِ ڈھاکا
ہماری پستی بھی حد سے گزری ، بھڑک اٹھا ہے غضب خدا کا
تمام خطے کے کونے کونے میں اک منظر ہے کر بلا کا
خود اپنے گھر میں بگاڑ ہو جب، عدو سے آخر کوئی گلا کیا
نحوستیں ساتھ لے کے وارد ہوئی ہے شامِ سقوطِ ڈھاکا[۵۲۰]

اپنی ایک اور نظم ''میرا وطن مجھ سے کھو گیا ہے!'' میں بھی شاعر وطن کے دولخت ہونے پر افسوس کا اظہار کر رہے ہیں۔ان کے

مطابق یہ ایسا حادثہ تھا کہ جس کے غم کو برداشت کرنے کی سکت قوم کے اندر موجود نہیں۔ یاروں کے اغیار بننے کا بیان ہو یا اپنے پیاروں کے لہو رنگ دریا بہنے کی داستانِ الم، شاعر ہر منظر کو بڑے دردناک انداز سے بیان کرتے ہیں۔ ملاحظہ کیجیے:

میں کیا بتاؤں / کسے سناؤں / عجب انوکھا سا حادثہ ہے !/ کھڑے کھڑے اپنے ہی وطن میں
، مرا وطن مجھ سے چھن گیا ہے / جو یار تھے ہیں وہ بارِ خاطر، مثال اغیار اجنبی ہیں !/ وہاں
جہاں میرا اپنا گھر تھا / وہاں کے پیارے مکین سارے لہو کے دریا میں بہہ گئے ہیں / یہ گھر بھی
اب میرا گھر نہیں ہے، پرانی یادوں کا مقبرہ ہے / دلوں میں کینہ بھرا ہوا ہے جبیں پہ نفرت لکھی
ہوئی ہے / جگہ جگہ خوں کی روشنائی سے اپنی ذلت لکھی ہوئی ہے [۵۲۱]

شاعر نے ''البدر'' اور ''بنام جوانانِ البدر'' کے عنوان سے لکھی گئی نظموں میں اس تنظیم کے نوجوانوں کو زبردست خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔ ان کی بہادری اور کردار کی پختگی کے گن گائے ہیں لیکن ''ڈھاکا کے مہاجر سے'' کے عنوان سے لکھی گئی نظم میں انھوں نے ہجرت کے کرب کو بیان کرنے کے ساتھ ساتھ خطۂ بنگال کے چپے چپے کو یاد کر کے اس سے اپنی وابستگی کا اظہار بھی کیا ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

ڈھاکا کے مہاجر کچھ تو بتا / کس ابتر حال میں ہجرت کی، کیوں اپنے وطن کو چھوڑ دیا / خوں
دے کے جہاں مہکائے تھے گل، اس بزمِ چمن کیوں بوڑھی گنگا سے روٹھے، کیوں سندر بن
کو چھوڑ دیا / کیا حال ہے پلٹن میداں کا، اب بیت المکرّم کیسا ہے ؟/ جنت میں سنہری دھر
تی کی، اس دور کا آدم کیسا ہے ؟/ جسموں میں ہے کیسی رعنائی، روحوں کا عالم کیسا ہے [۵۲۲]

علی عباس زیدی بہ سلسلہ ملازمت ڈھاکا میں مقیم بھی رہے لہٰذا ان کی شاعری میں المیہ مشرقی پاکستان کا رنگ بہت گہرا ہے۔ اپنی طویل نظم ''مناجات'' میں انھوں نے قوم کی بے عملی اور عیش کوشی کو اس سانحے کی وجہ قرار دیا۔ انھیں ہمیشہ یہ دکھ رہا کہ ''جن مقاصد کی خاطر پاکستان بنا، ان مقاصد کو نظر انداز کر دیا گیا'' [۵۲۳]۔ اور اسی کے نتیجے میں یہ سانحہ رونما ہوا۔ ان کے مطابق:

تبدیل یوں اندازِ بہاراں نہ ہوا تھا	گلشن کوئی اس طرح بیاباں نہ ہوا تھا
گل سے کبھی یوں رنگ گریزاں نہ ہوا تھا	یوں تو کبھی تاراج گلستا ں نہ ہوا تھا [۵۲۴]

پاکستان کے دولخت ہونے کی ہزیمت کا احساس انھیں ہر دم شرمندہ رکھتا۔ دشمنوں کے قبضے سے لے کر قیدیوں کی بے بسی اور لاچاری کو وہ بہت تکلیف دہ احساس سمجھ کر یوں گویا ہوئے کہ:

ورنہ یہ جفا، ظلم وستم یوں تو نہ ہوتا	سامان دل آزاری بہم یو تو نہ ہوتا
اک گلشنِ رنگین قلم یوں تو نہ ہوتا	اک بابِ سایہ کا کارِ قلم یوں تو نہ ہوتا [۵۲۵]

اس کے علاوہ ہجرت کا کرب بھی انھیں غمگین رکھتا۔ یہ ایسا کرب ہے جو انسان سے زندگی کا لطف چھین لیتا ہے۔ بقول شاعر:

یوں خواب دل افروز پریشاں نہ ہوئے تھے	یوں لوگ کبھی بے سروساماں نہ ہوئے تھے [۵۲۶]

سرو سہارن پوری نے بھی ایک محبِّ وطن پاکستانی کی طرح اس سانحے کے کرب کو شدت سے محسوس کیا۔ پاکستان کے دو نیم ہونے کا حادثہ ان پر بجلی بن کر گرا۔ وہ اس سانحے کے محرکات تلاش کرتے ہوئے اس نتیجے پر پہنچے کہ ہم نے خود اپنے ہاتھوں اس نشیمن کو بر

یاد کیا۔ مجموعی قومی بے حسی اور نظریہ پاکستان سے انصاف نہ کرنے کے نتیجے میں جو کچھ ہوا اس کا مداوا ممکن نہیں۔ اسی لیے وہ قوم کے جذبات کو جھنجھوڑتے ہوئے طنزیہ انداز سے کہتے ہیں کہ:

نقش نقش کہتا ہے وادیِ تمنا کا	جان بوجھ کر جیسے ہم نے بازی ہاری ہے
رنگ و روپ کا شکوہ دشمنوں سے کیا کیجیے	ہم نے اپنی یہ تصویر آپ ہی اتاری ہے [۵۲۷]

پھر اس المیے کے بعد شرمندگی کا جو احساس دردمند دل پر طاری تھا۔ دنیا بھر میں رسوائی اور بدنامی جو داغ اس قوم کے ماتھے پر نقش ہو چکا تھا، اس کی شدت کو محسوس کرتے ہوئے شاعر نے کہا کہ:

چہرہ داغ، داغ اپنا، کس کو جا کے دکھلائیں	شرم کا یہی احساس، سرو دل پہ طاری ہے [۵۲۸]

قتل و غارت گری کے مناظر سے تو ہر دردمند پاکستانی متاثر ہوا۔ خصوصاً ۲۱ دسمبر کے اخبارات نے جب یہ دل خراش خبر شائع کی کہ مکتی باہنی نے اہل علم، صحافیوں اور ماہرین تعلیم کو بے دردی سے قتل کرنا شروع کر دیا ہے تو مغربی پاکستان کے ادیب و شاعر اس خبر سے سناٹے میں آ گئے۔ پروفیسر منیر چودھری، مولوی فرید احمد اور احمد احسن اشک جیسے نام ور لوگ اس قتل و غارت گری کا نشانہ بنے۔ شاعروں اور ادیبوں نے خاموش جلوس نکال کر علم و فن کے اس قتل و عام پر احتجاج ریکارڈ کروایا۔ عبیداللہ علیم کے مندرجہ ذیل اشعار اس صورت حال کی بہترین عکاسی کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ ملاحظہ کیجیے:

میں یہ کس کے نام لکھوں جو الم گزر رہے ہیں	مرے شہر جل رہے ہیں، مرے لوگ مر رہے ہیں
کبھی رحمتیں تھیں نازل اسی خطۂ زمیں پر	وہی خطۂ زمیں ہے کہ عذاب اتر رہے ہیں
کوئی اور تو نہیں ہے پس خنجر آزمائی	ہمیں قتل ہو رہے ہیں، ہمیں قتل کر رہے ہیں [۵۲۹]

سانحہ سقوط ڈھاکا نے خاقان خاور کی غزلوں کو بھی متاثر کیا۔ لہٰذا اس سانحے کی پرچھائیاں ان کے کلام میں بھی دیکھی جا سکتی ہیں۔ ہوس اقتدار کے چکر میں حکمرانوں اور مقتدر قوتوں نے جو کھیل کھیلا، ایک محبّ وطن پاکستانی اس کے نتائج کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ لہٰذا اس صورت حال کی بابت خاقان نے درست لکھا کہ:

بھائی کے مقابل میں آ کر ڈٹ جائیں گے	کب سوچا تھا بازو بھی کٹ جائیں گے
وقت ہماری ذات کے ٹکڑے کر دے گا	گھر کی صورت کمروں میں بٹ جائیں گے
مدت سے جس کا نام مرے بھائیوں میں تھا	ایسی ہوا چلی کہ وہ بلوائیوں میں تھا [۵۳۰]

سبط علی صبا کی شاعری میں بھی سقوط ڈھاکا کا المیہ پوری طرح جاگزیں ہے۔ ملک کی ٹوٹ پھوٹ اور خوں آشام واقعات کا ماتم کرتے ہوئے وہ اس المیے کو اس طرح پیش کرتے ہیں:

مسکراتے گاؤں آثارِ قدیمہ بن گئے	لشکری خوش ہیں کہ ان کی وردیاں ہیں خوں میں تر
خون اپنے ہی برادر کا مرے آنگن میں ہے	گردش حالات تھم جا انگلیاں ہیں خوں میں تر
میں کہ آدھے جسم کے بارِ گراں سے چور ہوں	رینگتا آخر کہاں تک کہنیاں ہیں خوں سے تر [۵۳۱]

سانحہ سقوط ڈھاکا کے الم ناک واقعات کا بیان ایوب خاور کے ہاں بھی جا بہ جا ملتا ہے۔ وہ مشرقی پاکستان کی علاحدگی کو جزو

بدن کے کٹ جانے سے تشبیہ دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

یہ قتل کیسا ہوا کے میرے بدن کا آدھا، سنہری حصہ / الگ ہے لیکن میں پھر بھی زندہ ہوں /
میرے آدھے بدن پر پر چھائیاں رینگتی ہے / میرے لہو کا ہر ایک قطرہ، بدن کے خاموش
نصف حصے میں / کہر کی طرح جم چکا ہے / مگر میں آنکھیں جھپک رہا ہوں / سسک رہا
ہوں [۵۳۲]

شاعر ماضی کی یادوں میں کھو کر اپنے شہروں کو یاد کرتے ہیں۔ پھر اس شہر میں ہونے والی قتل و غارت گری کے مناظر پر نوحہ کناں ہوتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

شفق شفق ہے / جو میرا کھلنا رواں دواں تھا / زمیں پہ بہتے لہو کی مانند جم چکا ہے / جو میرا اڑھا کا
چمن چمن تھا / کھنڈر کھنڈر ہے [۵۳۳]

اسلم گورداس پوری کے مطابق یہ سانحہ ہماری اپنی نااہلی، بے حسی اور موقع پرستی کا شاخسانہ تھا۔ ان کے مطابق:

حرص ہوس نے اس بستی کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا — جرم نہیں یہ ایک کا اسلم، مجرم اس میں سارے ہیں [۵۳۴]

وہ بنگالیوں کی بے رخی اور دشمنوں سے راہ و رسم بڑھانے کو ہدف تنقید بناتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

ساتھ اپنے جو انھیں رہنا گوارا ہوتا — اپنے خطے میں وہ بھارت کو نہ آنے دیتے
وہ اگر دل سے ہمیں اپنا سمجھتے اسلم — قید اغیار میں فوجوں کو نا جانے دیتے [۵۳۵]

اس کے علاوہ ان آمروں کے سیاہ کرتوت پر بھی وہ طنز کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ ان کے مطابق:

قوم کی عزت و ناموس لٹانے والو — اب تمھارے لیے ذلت کے سوا کچھ بھی نہیں
اب مرے دیس میں لوگوں کی حکومت ہوگی — اب تمھارے لیے نفرت کے سوا کچھ بھی نہیں [۵۳۶]

روحی کنجاہی نے اس سانحے پر غم کے آنسو بہانے کے ساتھ ساتھ ان سازشی عناصر کے سیاہ کارناموں کو بھی موضوع بنایا جن کی وجہ سے یہ ملک دو نیم ہوا۔ ننگِ ملت اور ننگِ وطن کرداروں کے بیان میں ان کا کہنا تھا کہ:

زخمِ جدائی کیسا رہا مجھ سے پوچھیے — یہ سانحہ ہے کتنا بڑا مجھ سے پوچھیے
میرا وجود مجھ سے الگ ہو کے رہ گیا — کیوں رو رہا ہوں، کون مرا مجھ سے پوچھیے
کاٹیں جڑیں مری میرے سائے میں بیٹھ کر — لوگوں نے کیا سلوک کیا، مجھ سے پوچھیے
وہ ملک ہوں کہ سازشوں میں گھِر کے رہ گیا — کیوں وقت مجھ کو روند گیا، مجھ سے پوچھیے
میں جانتا ہوں اور انھیں پہچانتا بھی ہوں — کس کس نے مرا خون کیا، مجھ سے پوچھیے [۵۳۷]

اقبال صفی پوری بھی اس سانحے کا سوگ مناتے ہوئے اپنی غزلوں میں کہتے ہیں کہ اس المیے کے زخم کبھی مندمل نہ ہو سکیں گے۔ ان کا کہنا تھا کہ:

خبر نہ تھی کہ اپنوں سے زخم کھائیں گے — یہ وہ زخم ہیں جو صدیوں لہو رلائیں گے

یہ حادثہ تو ہمارے گماں میں بھی نہ تھا ہمارے ہاتھ ہمارا ہی گھر جلائیں گے[۵۳۸]

رہنماؤں کی موقع پرستی کا بھی انھیں خوب ادراک تھا۔ وہ ان کے طرزِ عمل پر افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

وہ نا خدا بھی عجب تھے کہ یہ نہیں سوچا ہمیں ڈبویا تو کیا خود نہ ڈوب جائیں گے[۵۳۹]

سازشی عناصر نے اپنے مفاد کے لیے جس طرح سے حالات کو خراب سے خراب تر کیا، اس جانب اشارہ کرتے ہوئے شاعر نے کہا کہ:

ابھی تو ہے ذرا تھم کے دیکھنا سرِ بزم بہت سے چہرے ابھی روشنی میں آئیں گے[۵۴۰]

محسن بھوپالی نے بھی شکست و ریخت کی ہزیمت کو اپنی نظم ''نئی کرن'' میں کچھ اس طرح پیش کیا کہ غم و الم کا پہلو مزید اجاگر ہو گیا۔ ملاحظہ کیجیے:

سیلِ اندوہ میں ڈوبا ہوا قریہ قریہ سوچ میں ڈوبی ہوئی راہ گزر راہ گزر

چیرتی دیدۂ بے دار، سخن مہر بلب ایک اک رخ سے عیاں رنجِ ہزیمت کا اثر[۵۴۱]

اسی طرح شبنم رومانی نے بھی اس سانحے پر تنقیدی نظر ڈالی۔ وہ قوم کی بربادی کا تجزیہ کرتے ہوئے ان اسباب کا کھوج لگاتے ہیں جو اس سانحے کا سبب بنے۔ ان کے مطابق:

اوصاف کو کھا جاتا ہے قوموں کا تعیش اقوام کو دی جاتی ہے کم بخت مئے ناب[۵۴۲]

سانحہ مشرقی پاکستان کے حوالے سے جون ایلیا کے اشعار میں بھی وہی بے باکی پائی جاتی ہے جو ان کی شاعری کا خاصا ہے۔ ان کی نظموں میں بھی احتجاج کا رنگ نمایاں ہے۔ ۲۸ نومبر ۱۹۷۱ء کو روزنامہ جنگ میں شائع ہونے والی نظم ''رجز'' کا انداز ملاحظہ کیجیے:

سرکشی ہے جنگ آمادہ تو پھر یوں ہی سہی خوں ہی گر مضمون کی سرخی ہے تو پھر یوں ہی سہی

خیر کے ناموس کو شر سے بچانے کے لیے امن کے گوہر کو پتھر سے بچانے کے لیے

فکر کو اظہار کا لہجہ بدلنا ہی پڑا آج ہم شیریں لبوں کو زہر اگلنا ہی پڑا[۵۴۳]

اس کے علاوہ ۲۸ دسمبر ۱۹۷۱ء کو اسی روزنامے میں ''استفسار'' کے عنوان کے تحت لکھی گئی نظم کا انداز ملاحظہ کیجیے:

کیا اس قدر حقیر تھا اس قوم کا وقار ہر شہر تم سے پوچھ رہا ہے جواب دو

ملت کے احترام کو رسوا کیا گیا پُر حوصلہ عوام کو رسوا کیا گیا

اے غازیو! جہاد کی توہین کی گئی اے شاعروں کلام کو رسوا کیا گیا

یہ پوچھتی ہیں وقت سے خوددار بستیاں جس نے ہمیں فریب دیا ہے وہ کون ہے

کس نے کیا ہے قوم کے زخموں کو بے وقار جس نے ہمیں ذلیل کیا ہے وہ کون ہے[۵۴۴]

خواجہ مشتاق احمد کاشمیری شرقی بن شائق معروف صحافی تھے۔ روزنامہ نوائے وقت میں ان کی تخلیقات شائع ہوتی رہیں۔ شرقی نے اپنی متعدد نظموں میں سانحہ مشرقی پاکستان کو موضوع بنایا۔ ان نظموں میں اس المیے کی داستانِ غم کو پوری وضاحت اور دکھ سے بیان کیا گیا ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

عزم و عمل کی زندہ نشانی بکھر گئی پچیس سال بعد کہانی بکھر گئی

سورج اداس دن کے اجالے ہیں مضمحل — پھولوں کی شوخ رنگ جوانی بکھر گئی
تاریخِ پاک اور یہ داغِ سقوطِ مشرق — کتنی شدید ہم پہ قیامت گزر گئی[۵۴۵]

شائق کے مطابق اس سانحے نے صرف ہمارا جسم ہی زخمی نہیں کیا بلکہ روح کو بھی زخموں سے چور چور کر دیا۔ اس واقعے کے تناظر میں اپنوں کی بے وفائی اور بے عملی کا تذکرہ کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ:

اپنوں کی بے وفائی سزا دے گئی ہمیں — یعنی پیام مرگِ وفا دے گئی ہمیں
ہے جسم داغ دار تو دل سوگ وار ہے — کتنے ہی زخم موجِ صبا دے گئی ہمیں
مشرق کی آندھیوں سے بچھڑ کر ہوائے غم — بربادیِ وطن کا پتا دے گئی ہمیں[۵۴۶]

لیکن یہ سب کچھ ہونے کے باوجود قوم نے اس سے کوئی سبق حاصل نہیں کیا۔ اس قومی بے حسی کا ماتم کرتے ہوئے شاعر نے درست کہا کہ:

زخمِ شکست بارِ ملامت ہے سر بسر — محسوس کیوں کسی کو ندامت نہیں ہوئی
قاتل بھی پرسکون، ہمیں بھی نہیں ملال — کچھ اور گل کھلائے نہ ملت کی بے حسی[۵۴۷]

وزیر آغا نے بھی اس افتاد پر قلم اٹھایا۔ ان کے خیال میں اس ہزیمت اور ذلت کا کوئی مداوا نہیں۔ دکھ اور غم انسان کو رلاتے ضرور ہیں لیکن بہ قول شاعر:

آنکھ سے لب ریز جیسے رو پڑے گا تو ابھی — جیسے ذلت کا مداوا آنکھ کے پانی میں ہے
ان گنت رنگوں کے پر بکھرے پڑے ہیں ہر طرف — وقت کا گھائل پرندہ پھر سے جولانی میں ہے[۵۴۸]

مسلم ضیائی نے بھی مشرقی پاکستان میں ڈھائے گئے مظالم کی داستان کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔ اپنی ایک نظم میں ان مظالم کی تصویرکشی کرتے ہوئے انھوں نے جو کچھ کہا وہ تکلیف دہ بھی ہے اور سوالیہ نشان بھی۔ ملاحظہ کیجیے:

کتنے گھر مرے بنگال! کہ جن میں کل سے/ ہر طرف موت کا سناٹا ہے/ ہر طرف بکھری ہوئی
لاشیں ہیں/ بھائی بہنیں ہیں کہیں/ جن کے ہاتھوں میں توانائی تھی/ اور ماں باپ کہیں/ جن
کی باتوں میں سچائی تھی/ ننھے بچے ہیں کہیں/ مسکراتے تھے جو پھولوں کی طرح/ نو جواں
جاتے کدھر بہہ گئے تنکوں کی طرح/ ہر طرف موت کی خاموشی ہے/ ہر طرف بکھری ہوئی
لاشیں ہیں[۵۴۹]

سید منیر نے بھی زندگی کے بہت سے ماہ و سال مشرقی پاکستان میں گزارے۔ لہٰذا یہ سانحہ ان پر بھی بجلی بن کر گرا۔ مشرقی پاکستان کی علاحدگی ان کے لیے تازیانے سے کم نہ تھی۔ چناں چہ ان کی نظموں اور غزلوں میں اس سانحے کے رنگ بہت نمایاں ہے۔ ایک نظم میں قدرون کے مٹتے ہوئے نقش کو تلاش کرتے ہوئے ان کا کہنا تھا کہ:

عقیدہ بنی دانش وفہم کی شر پسندی/ تفکر پہ لفظوں کے پڑے ہوئے تازیانے/ کوئی سہہ رہا
ہے/ لہو بہہ رہا ہے/ شقاوت کے پتھر، ثقافت کے شیشوں کو/ مسمار کرتے چلے جا رہے

ہیں [۵۵۰]

شعرا نے اس سانحے کے اسباب کو تلاش کرتے ہوئے مختلف وجوہات پر روشنی ڈالی ہے۔ منیر نے بھی اپنی نظم ''اللسان'' میں اس سانحے کا تجزیہ کرتے ہوئے کہا کہ:

مرا شہر لفظوں کے سیلاب میں بہہ رہا ہے/ در و بام و بازار و کوچا/ صداؤں کے انبار میں دب
گئے ہیں/ تھرکتی زبانوں کے پتے/ تعصب کے طوفانوں میں ناچتے ہیں [۵۵۱]

ایک اور نظم ''مادرِ وطن'' میں وہ اس غم کی پرچھائیوں کو تلاش کرتے ہوئے بہت غم گین لہجہ اختیار کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ نظم ''اندھیرا اجالا'' کے اشعار بھی المیہ کیفیت کو ظاہر کرنے کے ساتھ ساتھ جھنجھلاہٹ کو پیش کرنے کا عمدہ اظہار کہے جا سکتے ہیں۔ ملاحظہ کیجیے:

ظلم کے ڈھیر کو تاریخ کی عظمت نہ کہو — خونِ آدم کو تمدّن کی ضرورت نہ کہو
قتل انسان کا پیشہ تو نہیں ہوسکتا — ظلم انصاف کا حصہ تو نہیں ہو سکتا [۵۵۲]

ان کے مجموعے ''بہ زیرِ شاخِ گل'' کا محرک بہ قول شاعر یہی حالات تھے جنھوں نے اس تاریخی المیے کو جنم دیا تھا [۵۵۳] اسی لیے وطن کی بے توقیری پر پھوٹ پھوٹ کر روئے۔ اس دکھ کا اظہار غزل کے ایک شعر میں کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

دیکھتے ہی دیکھتے ڈوبی ہیں اتنی کشتیاں — ساحلوں پر بھی نہیں اب ساحلوں کا تذکرہ [۵۵۴]

اس زمانے میں انعام درانی کی متعدد نظمیں اخبارات و رسائل میں شائع ہوئیں۔ جن میں بہت جذباتی انداز سے سقوط ڈھاکا کو موضوع بنایا گیا۔ بعض اوقات ان کی نظموں میں حقیقت کے ادراک کی کمی کا احساس شدید ہو جاتا ہے۔ حب الوطنی کے جذبات سے سرشار ہو کر جب وہ یہ کہتے ہیں کہ:

یہ فوج عدو جو مری سرحد پہ کھڑی ہے — کہتے ہیں نجومی کہ لڑے گی نہ لڑی ہے
منڈلاتی مہینوں سے جو ہے سر پہ ہمارے — یہ جنگ کی دھمکی نہیں بنیے کی تڑی ہے
گولے جو برستے ہیں وہ گویا ہیں پٹاخے — جو توپ گرجتی ہے وہ ایک پھول جھڑی ہے [۵۵۵]

جنگ و جدل کی پریشان حالی کے مناظر اور اس کے نقصانات سے باخبر کرتے ہوئے شاعر دونوں فریقوں کو اس سے باز رہنے کی تلقین بھی کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ ۸ نومبر ۱۹۷۱ء کو شائع ہونے والی اس نظم کا انداز ملاحظہ کیجیے:

پھر تماشے خونِ انساں کو دکھائے جائیں گے — سروروں کے سر، سرِ مقتل سجائے جائیں گے
پھر کہا جائے گا چڑھ جا ابنِ آدم دار پر — رجزیہ اشعار پھر چن چن کے گائے جائیں گے
روشنی پر جس کے آیا بھی نہ تھا جس کا شباب — اس چراغِ شام کے شعلے بجھائے جائیں گے
راکشش بن جائیں گے بھگوان کچھ دن کے لیے — پھر نقوش انساں کی عظمت کے مٹائے جائیں گے
چھین کر بھوکوں کے ہاتھوں سے نوالہ رزق کا — جان لیوا آگ کے گولے بنائے جائیں گے
خون کی سرخی لیے ابھرے گا پھر اک آفتاب — ظلمتوں کے فرش ہر جانب بچھائے جائیں گے

حال سے بے حال ہوں گے لڑتے لڑتے جب فریق مغربی سر پنچ باہر سے بلائے جائیں گے [۵۵۶]

سقوطِ ڈھاکا کے بعد بھی بہت سے محبّ وطن یہ سوچ رہے تھے کہ ایک بار پھر یہ دونوں بازو ایک ہو جائیں گے۔ اس خواہش کا اظہار بھی بعض شعراء کے کلام میں ملتا ہے۔ ریاض احمد نے اس جذبے کا اظہار کرتے ہوئے اپنی ایک نظم میں کہا کہ:

میرے دل پر زخم لگا ہے کاری / میرے جسم کا ایک حصہ کٹ کر مجھ سے دور پڑا ہے / لیکن دل
میں اب تک حسرت باقی ہے / میں ایک بار تو اس کو چھو کر دیکھوں / شاید اب تک زندہ ہو اور
مجھ سے آ کر مل جائے [۵۵۷]

دشمن سے برسرِ پیکار فوج کو شکست کے بعد قوم کو جس طرح کی رسوائیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کا غم بھی شاعر کو بے چین رکھتا ہے۔ ہندوستان نے اس موقعے پر بے عزت کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ اس غم والم کی کیفیت کو اپنے اشعار میں سمو کر شاعر وہ سارا منظر ہمارے سامنے پیش کر دیتے ہیں۔ ملاحظہ کیجیے:

بہنوں کے شیون، ماؤں کے نوحے / اجڑی مانگیں، باپ کے پیار کو ترستے بچے، شہر، مساجد،
کفر کے لشکر / دشمنِ دیں کے لب پہ تبسّم / دین کے غازی سر بہ گریباں / کاش قیامت
آ جاتی، اے کاش زمین ہی پھٹ جاتی [۵۵۸]

مشیر کاظمی کی ایک معروف نظم کا ذکر ابتداء میں کیا گیا ہے۔ اس نظم کے علاوہ بھی متعدد نظمیں سقوط ڈھاکا کے تناظر میں لکھی گئیں۔ ان کی ایک اور مؤثر نظم ''قائداعظم کی تربت پر'' میں بھی درد والم کے گہرے بادل دکھائی دیتے ہیں۔ اس نظم کے کچھ اشعار میں بھی اس سانحے کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

تیرے کچھ بیٹوں نے اپنی ماں کا زیور کھو دیا ایک گوہر کان میں ہے ایک گوہر کھو دیا
آج تم زندہ اگر ہوتے تو اے سردارِ قوم قوم پر یہ دن کبھی آتا نہ اے معمارِ قوم [۵۵۹]

جنگی قیدیوں کی رہائی کے موقعے پر ایک طرف تو خوشی وانبساط کا اظہار اور دوسری طرف لیکن اچانک اس خوشی کے موقع پر بھی علاحدگی کے زمانے کی ہولناکی شاعر نہیں بھلا پائے۔ اپنے جذبات کا اظہار بڑے پُر درد انداز سے کرتے ہوئے شاعر کہتے ہیں کہ:

کچھ اسیرانِ ستم بھی غم کے آنسو لائے ہیں آج ہی تو قید سے آزاد ہو کر آئے ہیں
دو برس تک ظلم کاٹے ہند کے زندان میں ایک پاکستاں لٹا کر آئے پاکستان میں
ان کو ان کے گھر میں لوٹا دشمنِ سفاک نے بھائی کو بھائی سے کر ڈالا جدا چالاک نے [۵۶۰]

اعجاز رحمانی کا شمار بھی پاکستان کے ممتاز غزل گو شعرا میں ہوتا ہے۔ انھوں نے بھی اپنی غزلوں میں قومی اور سیاسی مسائل کو موضوع بنایا۔ سقوط ڈھاکا کے پس منظر میں اپنوں کے ہاتھوں اپنے ہی بھائیوں کے قتل عام پر ان کا کہنا تھا کہ:

کانٹوں کی تکلیف بھلا دی پھولوں کی جاں سوزی نے اپنوں نے جو زخم دیے وہ زخم بہت ہی گہرے ہیں [۵۶۱]

محمد افضل حسین تحسین ایک زود گو شاعر تھے۔ انھوں نے بھی سقوط ڈھاکا کے اسباب سے لے کر جنگی قیدیوں کی حالت زار، عیاشی و تن آسانی وغیرہ کو اپنی نظموں کا موضوع بنایا۔ فوج کے محکمے سے وابستہ رہنے کے باوجود انھوں نے حکم رانوں کی بے راہ روی کا پردہ

چاک کرتے ہوئے لکھا کہ:

بے مہریِ ایّام کا شکوہ نہیں زیبا ہر خواب کی تعبیر نکلتی ہے عمل سے

ان سے عبث ہے معرکہ گیری کی موقع بہلائیں جو دل ساز و مے و جام غزل سے[۵۶۲]

دلاور فگار جیسے مزاحیہ شاعر کو بھی اس سانحے نے مجروح کیا۔ سقوط ڈھاکا کے حوالے سے ان کے ہاں بڑی دردناک نظمیں ملتی ہیں۔ یہ نظمیں سوز سے اس قدر بھرپور ہیں کہ مرثیے کا گمان ہوتا ہے۔ ان کی نظموں میں طنز کے نشتر بھی نظر آتے ہیں اور اس سانحے کے اسباب اور محرکات کا تجزیہ بھی۔ وہ قوم کی مجموعی صورت حال پر طنز کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

دین آدھا رہ گیا ایمان آدھا رہ گیا پھر تعجب کیا جو پاکستان آدھا رہ گیا[۵۶۳]

اپنی معروف نظم ''قائداعظم کے حضور میں'' کا انداز بھی بڑا غم انگیز ہے۔ وہ قائد کے حضور رو رو کر مشرقی پاکستان کی روداد سناتے ہیں جس پر روح قائد بے چین ہو کر ان سے پوچھتی ہے کہ:

کیا تم نے بنگلا دیش کو تسلیم کرلیا ٹکڑوں میں ایک ملک کو تقسیم کر لیا[۵۶۴]

اس کے بعد قائداعظم کی روح جب شاعر سے اس سانحے کے اسباب و علل کی بابت دریافت کرتے ہیں تو شاعر اس کی وضاحت بڑی تفصیل سے کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ:

کچھ لوگ اس کو فتنۂ بنگال کہتے ہیں کچھ لوگ اس کو شامتِ اعمال کہتے ہیں

ایوب کو بتاتے ہیں کچھ لوگ ذمے دار کچھ یحییٰ خاں کے کاندھے پہ رکھتے ہیں سارا بار

کچھ لوگ کہتے ہیں یہ لیاقت کی ہے خطا آئین کیوں نہ کر سکے وہ ملک کو عطا؟

کچھ لوگ کہتے ہیں یہ خطا ہے مجیب کی کچھ کہہ رہے ہیں تھی یہ خرابی نصیب کی

کچھ کہتے ہیں یہ سازشِ اقوامِ غیر تھی کب سے حرم کی چشمِ فسوں کار دیر تھی[۵۶۵]

اپنی نظم ''چمن میں جب واپس آؤ گے تم'' میں وہ جنگی قیدیوں کی واپسی کی امید کا اظہار کرتے ہوئے بھرپور انداز سے ان کے عزم و حوصلے کو بڑھاتے دکھائی دیتے ہیں۔ ابراہیم عالم کی نظم ''اے دوست بہت یاد آتے ہو'' میں شاعر نے اس واقعے کے اسباب پر بے لاگ تجزیہ کیا ہے۔ انھوں نے اس سانحے کے پس پشت فوج کے کردار پر بھی تنقید کی اور کہا کہ:

تھے لاکھ ہمارے بھی فوجی اور پھر بھی سقوطِ ڈھاکا ہوا ہے عقل ہماری خود حیران، اے دوست بہت یاد آتے ہو

جس فوج کے ہم ہی خالق تھے کیا اچھا صلہ اس نے ہے دیا کٹوا دیا آدھا پاکستاں، اے دوست بہت یاد آتے ہو[۵۶۶]

سڑکوں اور گلیوں پر بہنے والے خون کی ارزانی پر شاعر دکھ اور رنج کا اظہار کرتے ہوئے اپنے دوست سے بچھڑنے کے غم کو اس طرح بیان کر رہے ہیں:

سڑکوں پہ گلی کوچوں میں وہاں بہتا ہے لہو معصوموں کا ہے کتنا وہاں پر خون ارزاں، اے دوست بہت یاد آتے ہو[۵۶۷]

انور عزمی کے قطعات بھی روزنامہ جسارت میں شائع ہوتے رہے۔ بابائے قوم کے حوالے سے لکھی گئی نظم ''قائداعظم کا پیام'' میں شاعر نے قوم سے ہم کلام ہو کر قائد کی زبانی کہا کہ:

تم نے آدھا کردیا ہے میرے پاکستان کو　　　　بیچ ڈالا اپنے ہاتھوں اپنی آن اور بان کو
تم نے مٹی میں ملا یا ہے مرے احسان کو　　　　تم نے جھٹلا یا ہے ان دیکھے خدا کی شان کو
تم نے پاکستان کے جھنڈے کو نیچا کر دیا　　　　خود بھی رسوا ہو گئے مجھ کو بھی رسوا کردیا[۵۶۸]

وہ اس سانحے کے اسباب کا سراغ لگانے اور ہزیمت کا باعث بننے والے رہ نماؤں کے احتساب پر زور دیتے ہیں۔سانحہ مشرقی پاکستان کے غداروں،ملت فروشوں کے چہرے سے نقاب الٹنے کا مشورہ دیتے ہوئے شاعر کا کہنا تھا کہ:

کون غدار ہے اور کون وطن کا خادم　　　　کون مظلوم ہے اور کون یہاں ہے ظالم
کون ہے ملک کی تقسیم کا اصلی مجرم　　　　سب کے چہروں کی شناسائی ہےتم پر لازم
سب کے چہروں سے نقابوں کو ہٹاؤ لوگو　　　　وقت کہتا ہے اب ہوش میں آؤ لوگو[۵۶۹]

سانحے کے اصل ذمے داروں خاص طور پر راہ برقوم کا کردار جو سراسر خودغرضی اور مفاد پرستی سے بھری ہوئی تھی۔ان راہ بروں کا کردار راہ زن کا تھا جنھوں نے ملک کو تقسیم کرنا تو گوارا کرلیا لیکن اپنے مفاد اور خودغرضی کے ساتھ سختی سے جڑے رہے۔شاعر ان رہ نماؤں سے ہوشیار رہنے کا مشورہ دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

خود غرض رہ نماؤں سے بچاؤ دامن　　　　ہیں یہی لوگ حقیقت میں تمہارے دشمن
ان کے ہر فعل سے ہوشیار رہو اہلِ وطن　　　　غیر کے ہاتھ کہیں بیچ نہ ڈالیں یہ چمن
ان سے ہر حال میں گلشن کو بچاؤ لوگو　　　　وقت کہتا ہے کہ اب ہوش میں آؤ لوگو[۵۷۰]

واصف علی نے بھی اپنی ایک نظم میں قائداعظم کو مخاطب کر کے سقوطِ ڈھاکا کے المیے پر اپنے دکھ کا اظہار کیا ہے۔وہ طنزیہ انداز میں کہتے ہیں کہ:

تونے ہمیں بخشی تھی جو آزادی کی دولت　　　　ہم نصف لٹا کر ہیں مگن قائداعظم
یہ زخم بھرے گا تو عدو کے ہی لہو سے　　　　زخمی ہیں عساکر کے بدن قائداعظم[۵۷۱]

شفیع عقیل کی نظم ''آگ کا مدفن'' میں بھی سقوط ڈھاکا کے الم ناک باب کو نہایت دل دوز انداز سے بیان کیا ہے۔وہ فساد کے بعد اور سناٹے کی فضا دکھاتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

اب نہ آواز نہ آہٹ، نہ کوئی شور یہاں　　　　راکھ کا ڈھیر فقط رہ گیا یادوں کا نشاں
دیکھ اس راکھ میں ڈوبے ہیں ستارے کیا کیا　　　　دیکھ اس رات میں کھوئے ہیں اجالے کیا کیا
کتنی کلیوں کا تقدس ہے یہاں خاک بہ سر　　　　دل کی بستی کے مکیں جانے کہاں خواب ہوئے[۵۷۲]

۱۲ دسمبر ۱۹۷۱ء کو سقوط ڈھاکا سے محض چار روز قبل ان کی جو نظم روزنامہ ''جنگ'' کراچی میں شائع ہوئی۔اس میں بھی وہ وطن کی پکار پر لبیک کہتے ہوئے قوم کے عزم و حوصلے کو بلند کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ملاحظہ کیجیے:

تجھے آج تیرے وطن نے پکارا/ حسین سرزمیں کا تو روشن ستارا/ اگر چہ تیرے راستے میں الم ہیں/ کٹھن منزلوں میں بڑے پیچ و خم ہیں/ مگر بازوؤں میں ارادوں کے دم ہیں/ تو بن

آج اپنے وطن کا سہارا/ تجھے آج تیرے وطن نے پکارا[۵۷۳]

یونس نشاط کے ہاں بھی شاعری میں احتجاجی رنگ غالب ہے۔ سقوط ڈھاکا کے حوالے سے اسباب وعلل پر غور وفکر ہو یا رسوائیوں کا تذکرہ، ہر موقع پر ان کے قلم کی کاٹ کو محسوس کیا جا سکتا ہے۔ ہوس اقتدار اور راہ بروں کی نا عاقبت اندیشی کو وہ اس سانحے کا ذمے دار قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

حضور آپ کو نشہ تھا کج کلاہی کا　　　تماشا دیکھ لیا شہر کی تباہی کا
حضور آپ تو رہ بر تھے آپ ہی کہیے　　　لٹا تو کیسے لٹا ساز و رختِ راہی کا[۵۷۴]

۱۹۷۱ء میں سانحہ سقوط ڈھاکا کے وقت فوجی آمروں کی حکومت تھی۔ پھر بھی قوم نے ذلت آمیز شکست کی ہزیمت اٹھائی۔ شاعر اس پر سخت متحیر اور متفکر نظر آتے ہیں۔ وہ اس جانب اشارہ کرتے ہوئے طنزیہ انداز اختیار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

تمہارے ہاتھ میں تلوار بھی تھی طاقت بھی　　　تمہارے وار سے پھر کیوں ردائے شب نہ کٹی[۵۷۵]

محمد جلیل عالی نے البتہ عزم و حوصلے کو بڑھاتے ہوئے ہمت کا درس دینا ضروری سمجھا۔ ان کی نظم ''میں لڑتا رہوں گا'' میں ان کا یہ انداز بہت نمایاں ہے۔

مرے بھائی ہو تو مجھے اس سمے امن کی لوریاں مت سناؤ/ مجھے مت سلاؤ/ کہ ہر لمحہ بیدار
رہنے کی میں اب قسم کھا چکا ہوں/ میرے دوستو، ساتھیو/ میرے سب دشمنوں کو بتا دو/ کہ
جب تک میرے جسم میں خون کا ایک قطرہ بھی موجود ہے/ میں لڑتا رہوں گا[۵۷۶]

اس زمانے کے اخبارات ورسائل میں شائع ہونے والے قطعات، حالات حاضرہ پر حقیقت پسندانہ تبصرے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ابن ادریس نے طنز کے تیر برساتے ہوئے اپنے ایک قطعے بہ عنوان ''منطقی انجام'' میں کہا کہ:

داستانِ سابق صدر پڑھ کے یہ کہنا پڑا　　　جو بھی گزرا ملک پر وہ منطقی انجام تھا
ہیچ تھا شاہِ رنگیلا دہلیِ مرحوم کا　　　آخری شاہِ اودھ تو مفت میں بد نام تھا[۵۷۷]

ایک اور قطعے میں انھوں نے پاکستان اور بھارت کے سربراہان مملکت اور فوجی سربراہوں کا موازنہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

بجز ہار جانے کے چارا ہی کیا تھا　　　مقدر تو ہونا ہی تھا اپنا چوپٹ
اُدھر مستعد فوج تھی اندرا کی　　　اِدھر راجا اندر کی پریوں کا جمگھٹ[۵۷۸]

محمد نیاز کے قطعے میں بھی اس قسم کا گہرا طنز ملتا ہے۔ انھوں نے بہت بے باکی کے ساتھ اس وقت کے حکم رانوں اور سربراہوں کو تنقید کا نشانہ بناتے ہوئے بڑے بڑے دعووں کی قلعی کچھ اس طرح کھولی ہے:

مست ہے کس خیال میں اندرا　　　اور کیا شوق دل میں پالے ہیں
ہم نہ چھوڑیں گے ایک انچ زمیں　　　صرف آدھا وطن حوالے ہے[۵۷۹]

۱۹۷۱ء کے حالات سے ہندوستان نے خوب فائدہ اٹھایا۔ مذکورہ صفحات میں سقوط ڈھاکا کے پس منظر میں کی گئی شاعری کا تفصیلی جائزہ پیش کیا گیا لیکن یہ جائزہ اس وقت تک ادھورا سمجھا جائے گا جب تک سرحد کے اس پار ہندوستان میں موجود اردو شعرا کے

کلام کا جائزہ بھی پیش نہ کیا جائے۔ اس حوالے سے یہ دل چسپ حقیقت بھی سامنے آتی ہے کہ بنگلا دیش کے سوال پر جمہوریت اور آمریت کے درمیان ہونے والے اس تصادم میں ہندوستانی شعرا نے بنگلا دیش کی جدوجہدِ آزادی کا کھل کر ساتھ دیا۔ اس دور میں ہندوستان سے اٹھنے والی ہر آواز دراصل دوقومی نظریے کی نفی کرتی دکھائی دیتی ہے[۵۸۰] چناں چہ اس دور کی بیش تر نظمیں جو بنگلا دیش کے پس منظر میں لکھی گئیں وہ پاکستان مخالف جذبات لیے ہوئے ہیں۔ نازش پرتاب گڑھی کے مجموعے ''نیا سار نیا انداز'' میں اس رجحان کی واضح جھلک دکھائی دیتی ہے۔ وہ جب مخالفیں پر وار کرتے ہیں تو طنز کے نشتر، للکار، تشنیع اور استہزا وغیرہ جیسے تمام حربوں کو استعمال کرتے ہیں۔ جنگ کی ہول ناکیوں اور تباہ کاریوں کا انھیں احساس ضرور ہے لیکن اپنے وطن کے ذرے ذرے سے بھی انھیں پیار ہے۔ نظم ''لہو کس کا ہے'' میں وہ گلیوں اور سڑکوں پر بہنے والے خون کی طرف اشارہ کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ:

ہماری دھرتی پہ چاروں طرف جو بکھرا ہے ... بھلا یہ کس کا لہو ہے، کہاں سے آیا ہے[۵۸۱]

ماہ نامہ ''شاعر'' آگرہ کے ۱۹۷۶ء کے شمارے میں ان کی نظم ''شانِ آزادی'' کے عنوان سے شائع ہوئی۔ اس نظم میں بھی وہ ہندوستانی نوجوانوں کو ہندوستان کے لیے خون بہانے کی ترغیب دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

ہزاروں نوجواں ہو جاتے ہیں قربانِ آزادی ... غلامانِ کہن کرتے ہیں جب اعلانِ آزادی

جوانو! اپنے خون دل کے ہر قطرے کو لے آؤ ... لکھا جائے گا ہندوستان کو فرمانِ آزادی[۵۸۲]

کیفی اعظمی نے ''بنگلا دیش'' کے عنوان سے لکھی گئی نظم میں پاکستانی فوج کے کردار کو سخت تنقید کا نشانہ بنایا۔ بنگلا دیش میں ہونے والی فوج کشی پر ان کا کہنا تھا کہ:

کتنے نادان ہو تم/ تم نے خیرات میں پائے ہیں جو ٹینک/ ان کو لے کر مرے سینے میں
چڑھے آتے ہو/ رات دن کرتے ہو ناپام بموں کی بارش/ دیکھو تھک جاؤ گے/ کون سے
ہاتھ میں پہناؤ گے زنجیر بتاؤ/ کہ مرے ہاتھ تو ہیں سات کروڑ/ کون سا سر مری گردن سے
جدا کر دو گے/ مری گردن پہ ہیں سر سات کروڑ[۵۸۳]

دسمبر ۱۹۷۱ء میں پاک بھارت جنگ کے تکلیف دہ پہلوؤں کا ذکر کرتے ہوئے نظم ''فرد'' میں اپنے تاثرات کو یوں قلم بند کیا ہے:

یہ پڑوسی جو محبت کا چلن بھول گئے/ ان میں بھائی بھی ہیں بیٹے بھی ہیں احباب بھی ہیں/
ساتھیو! دوستو! ہم آج کے ارجن ہی تو ہیں/ ہاتھ بھی ان سے ملیں، دل بھی ملیں، نظریں بھی/
اب یہ ارمان ہے سب فتح کے ارمان کے بعد[۵۸۴]

سلام مچھلی شہری کی نظم ''بنگال کی رقاصہ'' اور ''آئینہ ٹوٹ گیا'' وغیرہ میں بھی یہ طنز بہت نمایاں ہے۔ جب وہ کہتے ہیں کہ:

انھیں سوکھے ہوئے اجسام کے پس منظر میں/ ایک ٹینک، اک جہاز، ایک زنجیر/ آیئے
چائے پئیں/ یہ حسیں لسٹ مرے ایک دوست نے کلکتے سے/ جنگ سے پہلے مجھے عید کے
دن بھیجا تھا[۵۸۵]

اس کے علاوہ نیاز حیدر کی ''جوانِ وطن''، عمیق حنفی کی ''سنار بنگلا'' اور کمار پاشی کی ''بنگلا دیش'' وغیرہ کے تحت لکھی گئی نظمیں، اس

حوالے سے خصوصی اہمیت کی حامل ہیں۔ اردو شاعری کے اس مطالعے سے یہ بات تو پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ اس دور کی شاعری نے اپنے زمانے کے سیاسی اور سماجی حالات کو پوری طرح شعر کے قالب میں ڈھالا۔ سقوط کے زمانے کے ارتعاش اور انتشار کا عکس پوری طرح اس عہد کی شاعری میں موجود ہے۔ شعرا نے تقسیم کے واقعات، ہجرت کے مصائب، مارشل لا کی قدغنیں اور قتل و غارت گری کے واقعات کو پیش کرتے ہوئے بے باک انداز اختیار کیا۔ سقوط ڈھاکا سے اردو شاعری کی ضخامت میں بھی اضافہ ہوا اور مضامین میں بھی تنوع پیدا ہوا۔ اس سانحے کے زیر اثر جو بڑے موضوعات شعرا کو ملے ان میں احساس شکست، ندامت، رسوائیوں کا تذکرہ، اس الم ناک سانحے کے اسباب، اپنوں کی بے وفائی اور غداری، راہ نماؤں کی خود غرضیاں اور موقعہ پرستیاں، حب الوطنی کے جذبات، شہدا اور جنگی قیدیوں کو خراج تحسین، جارح دشمن کی مذمت اور محصورین پر ہونے والے ظلم و ستم اور انسانی حقوق کی خلاف ورزیاں وغیرہ بڑی اہمیت کی حامل ہیں۔

اس دور کی شاعری کی لفظیات، علامتیں اور تشبیہات میں بھی شعرا نے ایک نئی معنویت پیدا کرنے کی کوشش کی۔ ہیت کے حوالے سے بھی اس دور میں پابند نظموں کے ساتھ ساتھ آزاد نظموں کی بھرمار اس جانب اشارہ کرتی ہے کہ شعرا اس دکھ کو بیان کرنے کے لیے کسی قسم کی پابندی کے حق میں نہیں تھے۔ اس دور کی لفظیات پرشکوہ ہونے کے بہ جائے جذبات اور احساسات کی دروں بینی کو ظاہر کرتی ہیں۔ مثلاً رشتۂ رفاقت، سرشاخ چمن، سسکتا، بچھڑنا، شکست آرزو، رسم دیرینہ، سیہ پیرہن، نگوسار، ویرانی، غم ناک، دونیم، ہاتھ شل ہوئے وغیرہ جیسے الفاظ سوز و گداز اور احساس شکست کے جذبات کو دوآتشہ کرنے میں معاون ثابت ہوئے [۵۸۶]۔ علامتی سطح پر نظموں میں گہری معنویت پیدا کرنے کے لیے اشعاروں اور کنایوں سے بڑی مدد لی گئی۔ گزشتہ صفحات میں مشرقی پاکستان کے حوالے سے کی گئی شاعری کا جو جائزہ پیش کیا گیا وہ سقوط ڈھاکا کے رونما ہونے تک کے واقعات پر مبنی تھا۔ بعد کے زمانے میں سیاسی حالات تیزی سے بدلنا شروع ہوئے تو پاکستانی قوم نے سقوط مشرقی پاکستان کو نوشتہ دیوار سمجھ کر قبول کر لیا۔ بعد کے حالات نے ثابت کیا کہ اس سانحے کے پس پشت بین الاقوامی سازشوں کا بھی گہرا عمل دخل تھا۔ اقوام متحدہ میں جنگ بندی سے متعلق لاحاصل مباحث نے یہ ثابت کر دیا کہ اس ملک کو دولخت کرنے میں ایک سے زیادہ ممالک کا مفاد وابستہ تھا۔ جنگ ہارنے کی مختلف تفصیلات و توجیحات پیش کی گئیں۔ سقوط ڈھاکا کے بعد پھر سے مملکت کی شیرازہ بندی کی کوشش تیز ہوئیں۔ اس وقت کے صدر ذوالفقار علی بھٹو نے جو بیان دیا اس کے مطابق مشرقی پاکستان کے عوام خود اس علاحدگی کے حامی تھے بہ صورتِ دیگر بھارت ہمارے خلاف جارحیت کی کبھی جرات نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن اگر ان کی اس بات کو درست مان لیا جائے تو بنگلا دیش کی جیلوں میں لاکھوں محبّ وطن کیوں قید کر دیے گئے [۵۸۷]۔ لاتعداد بنگالی کارکنان پر مقدمات چلائے گئے۔ حقیقتاً یہ معرکہ جیسا کہ صدیق سالک نے لکھا کہ حق و باطل کا معرکہ نہیں تھا۔ جیسا کہ ان پڑھ مغربی پاکستانی ان پڑھ سپاہیوں کو بنایا گیا تھا۔ یہ سپاہ یہ سن کر گئے تھے کہ حق و باطل کا معرکہ ہو رہا ہے اور کافروں کو اس کی حرکتوں کا مزا چکھانا ہے لیکن وہ لوگ جب وہاں گئے تو اپنے ہی جیسے مسلمان بنگالیوں کو اپنے سامنے پا کر حیران رہ گئے۔ وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ جب بنگالی ہمارے ساتھ رہنے پر رضا مند ہی نہیں تو انھیں زبردستی اپنے ساتھ رکھ کر کیا فائدہ [۵۸۸]۔ اس کے باوجود جس قسم کی سختی بنگالیوں کے ساتھ روا رکھی گئی ہمارے شعرا نے اس حقیقت کو پوری طرح بیان کرنے سے گریز کیا۔ بنگالیوں کی مظلومیت پر شعرا نے کم توجہ دی۔ جس طرح سے فوج نے بنگالیوں کے گاؤں کے گاؤں جلائے اور انھیں ظلم کا نشانہ بنایا، شعرا اور ادیبوں نے ان مظالم کو بیان کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ اس طرح سے

اردو شاعر ایک حوالے سے اپنی جانب داری کھو بیٹھا۔ یہ درست ہے کہ بہاریوں پر جو مظالم ڈھائے گئے وہ ناقابل بیان تھے اور اس میں بربریت کی حد کو پار کیا گیا۔ لہٰذا یہ فطری امر تھا کہ ان کی مظلومیت کو زیادہ ابھارا جائے اور انھیں پیش کیا جائے لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بنگالیوں پر ہونے والے مظالم پر ہمارے شعرا کی خاموشی مجرمانہ حد تک انھیں جانب دار ثابت کرتی ہے۔ تصویر کے دونوں رخ دیکھنے کے بہ جائے ہمارا ادیب سرکاری بیانات اور قرطاس ابیض کا ہم نوا بن بیٹھا[۵۸۹]۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اس سانحے کے تناظر میں ہونے والی تمام تحقیقاتی رپورٹ کو منظر عام پر لایا جائے۔ خصوصاً حمودالرحمٰن کمیشن کی رپورٹ کی روشنی میں اس سانحے کے تمام کرداروں کو خواہ وہ اس دنیا میں نہ رہے ہوں، علامتی طور پر سزا دی جائے تاکہ قوم سے غداری کرنے والے ان بے ضمیروں کے مکروہ عزائم اب کے سامنے آسکیں۔

حوالہ جات

۱۔ قریشی، الطاف حسن، ''سقوطِ ڈھاکا کے پوشیدہ اسباق''، مشمولہ: ''اردو ڈائجسٹ''، کراچی، مشرقی پاکستان نمبر، دسمبر ۲۰۰۰ء، ص ۲۲

۲۔ جیلانی، بی۔اے۔ ''پہلی بات''، مشمولہ: ''مشرقی پاکستان سے بنگلا دیش تک''، مرتبین، محمد نواز منہاس و عباس اختر عوان، القمر انٹر پرائزز، لاہور، ۱۹۹۵ء، ص ۹

۳۔ احمد، میجر آفتاب، ''مشرقی پاکستان کے میدانِ جنگ سے''، جمہوری پبلشرز، لاہور، ۲۰۱۲ء، ص ۷

۴۔ کاشمیری، آغا شورش، بہ حوالہ: ''میں نے سنہ ۷۱ء کے لہو لہو دسمبر میں کیا دیکھا''، از ڈاکٹر ساجد علی، مشمولہ: ''ہم سب''، https://www.humsub.com.pk/36368/sajid-ali-2/

۵۔ احمد، ص ۸

۶۔ محمود، ڈاکٹر صفدر، ''پاکستان کیوں ٹوٹا''، ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، لاہور، طبع سوم، سن ندارد، ص ۱۴

۷۔ احمد، منظور، ''ڈھاکا پس منظر و پیش منظر''، مشمولہ: روزنامہ ''جنگ''، کراچی، ۱۶ دسمبر ۱۹۸۵ء

۸۔ فہمی، سلیم اللہ، ''مشرقی پاکستان''، ینگ پریس، ڈھاکا، سن ندارد، ص ۳۔۴

۹۔ فریئر، بہ حوالہ ڈاکٹر انور اقبال قریشی، ''مشرقی پاکستان کا معاشی پس منظر''، ریڈیو پاکستان، کراچی، ۱۹۷۱ء، ص ۷۔۹

۱۰۔ قریشی، ڈاکٹر انور اقبال، ''مشرقی پاکستان کا معاشی پس منظر''، ریڈیو پاکستان، کراچی، ۱۹۷۱ء، ص ۹۔۱۷

۱۱۔ ایضاً، ص ۱۸۔۲۵

۱۲۔ بہ حوالہ روزنامہ ''جسارت''، کراچی، (خطاب ۲۱ مارچ ۱۹۴۸ء، ڈھاکا کا جلسہ عام)

۱۳۔ خالد، سلیم منصور، ''البدر''، ادارۂ مطبوعاتِ طلبہ، لاہور، ۲۰۱۰ء، ص ۲۸۔۳۱

۱۴۔ قریشی، ڈاکٹر انور اقبال، ص ۲۶۔۲۸

۱۵۔ سالک، صدیق، ''میں نے ڈھاکا ڈوبتے دیکھا''، مکتبہ سرمد، راول پنڈی، ۱۹۸۴ء، ص ۱۸

۱۶۔ خالد، سلیم منصور، ص ۲۷۔۴۷

۱۷۔ قریشی، ڈاکٹر انور اقبال، ص ۳۱۔۳۲

۱۸۔ خالد، ص ۵۲

۱۹۔ قریشی، ڈاکٹر انور اقبال، ص ۵۲۔۵۴

۲۰۔ ایضاً

۲۱۔ صدیقی، شمیم احمد، ''مشرقی پاکستان کی صنعتیں''، مشمولہ: ''تعمیر انسانیت''، لاہور، اکتوبر ۱۹۵۵ء، ص ۱۱۶

۲۲۔ حجازی، عارف، ''ڈھاکا: میرے خوابوں کا شہر''، ادبیات پاکستان، کراچی، ۱۹۶۱ء، ص ۸۴

۲۳۔ شبلی، اے۔آر۔ ''پاکستان اور بھارت کے دوطرفہ تعلقات اور کشمیر''، انتخاب پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۷۰ء، ص ۲۸۶۔۲۸۷

۲۴۔ فتح پوری، فرمان، ''اردو شاعری اور پاکستانی معاشرہ''، وکٹری بک بنک، لاہور، ۱۹۹۰ء، ص ۳۳

۲۵۔ عنایت اللہ، ''ہماری شکست کی کہانی: کچھ آنکھوں دیکھی، کچھ غیروں کی زبانی''، مکتبۂ داستان، لاہور، ۱۹۹۰ء، ص ۳۳۔۳۸

۲۶۔ رانا، لیفٹیننٹ جنرل بختیار، ''انٹرویو''، ماہ نامہ ''اردو ڈائجسٹ''، لاہور، اپریل ۱۹۷۲ء، جلد ۱۲، شمارہ ۶۰، ص ۹۰

۲۷۔ سنگھ، سنگت، "Pakistan's Foreign Policy", Farhan Publishers, Lahore, 1977, p-21

۲۸۔ سالک، ص ۲۱۹

۲۹۔ شہاب، قدرت اللہ، ''شہاب نامہ''، آر۔آر۔ پرنٹرز، لاہور، ۱۹۹۲ء، ص ۱۰۳۰

۳۰۔ خالد، ص ۱۲۳

۳۱۔ منیر، احمد منیر، ''المیہ مشرقی پاکستان کے پانچ کردار''، انٹرویو آغا محمد علی، آتش فشاں پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۰ء، ص ۲۵

۳۲۔ شہاب، قدرت اللہ، ص ۱۰۴۶

۳۳۔ خالد، سلیم منصور، ص ۶۸

۳۴۔ قصوری، احمد رضا خان، ''اِدھر ہم اُدھر تم''، برٹینکا پبلشنگ ہاؤس، لاہور، سن ندارد، ص ۱۶۷

۳۵۔ ہاشمی، ایم۔ کے۔ حسیب، ''سقوط ڈھاکا کا الم ناک سانحہ''، روزنامہ ''جنگ''، کراچی، ۱۵ دسمبر ۱۹۸۹ء

۳۶۔ سلیم، احمد، ''حمود الرحمٰن کمیشن رپورٹ: جرنیل اور سیاست داں''، فرنٹیئر پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۳ء، ص۱۲۔۱۳

۳۷۔ سالک، ص۱۳

۳۸۔ ایضاً، ص۲۸

۳۹۔ قریشی، الطاف حسین، مشمولہ: ماہ نامہ ''اردو ڈائجسٹ''، پاکستان نمبر، مارچ ۱۹۷۳ء، ص۲۶

۴۰۔ افضل، میاں محمد، ''سقوط بغداد سے سقوط ڈھاکا تک''، الفیصل پبلشرز، لاہور، ۲۰۰۲ء، ص۴۶۶۔

۴۱۔ نیر، ڈاکٹر طاہرہ، ''اردو شاعری میں پاکستانی قومیت کا اظہار''، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی، ۱۹۹۹ء، ص۳۲۵

۴۲۔ اجمیری، قابل، بہ حوالہ: رئیس فاطمہ، مشمولہ: ''ایکسپریس نیوز''، ۳۱ اگست ۲۰۱۴ء

۴۳۔ شیخ، احمد حسن، مشمولہ: روزنامہ ''نوائے وقت''، لاہور، جولائی ۱۹۸۶ء

۴۴۔ قریشی، محمد فاروق، ''پاکستان میں جمہوریت کا زوال''، مکتبہ فکر و دانش، لاہور، سن ندارد، ص۳۶۷۔۳۶۸

۴۵۔ نیر، ڈاکٹر طاہرہ، ص۳۳۷

۴۶۔ جہاں، رونق، "Pakistan Failure in National Integration", Columbia University Press, New York, 1972, p.20

۴۷۔ بھٹو، ذوالفقار علی، ''آزادیِ موہوم''، مترجم کرم حیدری، نیشنل بک فاؤنڈیشن، کراچی، ۱۹۷۳ء، ص۲۳۸

۴۸۔ سہگل، جے۔ آر۔ "Pakistan Splits: The birth of Bangladesh ", Manas Publication, Dehli, 2000, Pg.168

۴۹۔ جیکب، جے۔ ایف۔ آر۔ "Surrender at Dacca: Birth of Nation", Manohar Publishers, 1997, p.90

۵۰۔ ملک، زاہد، ''سقوط ڈھاکا''، مکتبہِ سلیم، کراچی، ۱۹۷۲ء، ص۴۸

۵۱۔ احمد، نور، ''مارشل لا سے مارشل لا تک''، دین محمدی پریس، لاہور، ۱۹۶۵ء، ص۴۱۷

۵۲۔ کاشمیری، شورش، ''حسین شہید سہروردی''، مطبوعات چٹان، لاہور، ۱۹۶۸ء، ص۳۸

۵۳۔ قریشی، اشرف علی، ''حسین شہید سہروردی''، پنجاب نیشنل پرنٹنگ پریس، لاہور، ۱۹۶۴ء، ص۱۹

۵۴۔ ایضاً، ص۲۱

۵۵۔ فلک دار، محمد ایچ۔ ایم۔ آر۔ ''سہروردی کی سیاست بیتی''، مترجم وجاہت مسعود، جنگ پبلشرز، لاہور، ۱۹۹۲ء، ص۷۲

۵۶۔ ایضاً، ص۷۳

۵۷۔ ایضاً، ص۹۸

۵۸۔ ایضاً، ص۱۰۲

۵۹۔ احمد، ابوالمنصور، بہ حوالہ: ڈاکٹر طاہرہ نیر، محولہ بالا، ص۳۳۹

۶۰۔ قریشی، اشرف علی، ص۱۲۸

۶۱۔ ''اداریہ'' ہفت روزہ ''لیل و نہار''، کراچی، ۱۶ فروری ۱۹۵۸ء

۶۲۔ خان، محمد ایوب، ''جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی''، مترجم: غلام عباس، آکسفرڈ یونی ورسٹی پریس، لاہور، ۱۹۶۷ء، ص۴۳

۶۳۔ ادیب، ہمایوں، ''پاکستان کی خارجہ پالیسی''، عزیز پبلشرز، لاہور، ۱۹۷۵ء، ص۱۱۵

۶۴۔ مراسلہ: مشمولہ: روزنامہ ''دی ینگ پاکستان''، ۷ مئی ۱۹۶۹ء، ص۱۱۵

۶۵۔ چودھری، جی۔ ڈبلیو۔ "The Last days of United Pakistan", C. Hurst Co, London, 1974, p. 10-11

۶۶۔ ظفر، رانا رحمٰن، ''مشرقی پاکستان کی علاحدگی''، ایشن پبلشرز، لاہور، ۱۹۷۶ء، ص۵۵

۶۷۔ ادیب، ہمایوں، ص۱۱۵

۶۸۔ مجیب الرحمٰن، ''تقریری اقتباسات''، بہ حوالہ: رانا رحمٰن ظفر، محولہ بالا، ص۱۷۰

۶۹۔ ایضاً

۷۰۔ ولیم، ایل۔ رشبروک، "The East Pakistan Tragedy", Tom Stacey, London, 1972, p.43

۷۱۔ بھٹو، ذوالفقار علی، ''عظیم المیہ''،

۷۲۔ ایضاً، ص۱۹

۷۳۔ ایضاً، ص۱۶۔۱۷

۷۴۔ احمد، مشتاق، "Politics without Social Changes", Space Publishers, Karachi, 1971, p. 100

۷۵۔ سالک صدیق، ص۶۹

۷۶۔ خان، کیپٹن نذیر الدین، ''پہلا پتھر''، نیو ہورائزن پبلی کیشنز، کراچی، ۲۰۰۸ء، ص۲۸۶، ۳۰۵

۷۷۔ خالد، سلیم منصور، ص۱۴۲

۷۸۔ بہ حوالہ: روز نامہ ''مشرق''، لاہور، ۱۰ مارچ ۱۹۷۱ء

۷۹۔ سالک، صدیق، ص۴۶

۸۰۔ بہ حوالہ: روز نامہ ''مساوات''، لاہور، ۱۵ مارچ ۱۹۷۱ء

۸۱۔ چشتی، جنرل فیض علی، ''بھٹو، ضیاء اور میں'' جنگ پبلشرز، لاہور، ۱۹۹۱ء، ص۴۰

۸۲۔ ولیم، ایل۔ رشبروک، ص۹۷

۸۳۔ ایضاً

۸۴۔ بہ حوالہ: روز نامہ ''نوائے وقت''، لاہور، ۲۷ مارچ ۱۹۷۱ء

۸۵۔ اقبال، احسن، ''سانحہ سقوط مشرقی پاکستان: اسباب اور ہم نے کیا سیکھا''، روز نامہ ''جنگ''، لاہور، ۱۶ دسمبر ۱۹۹۴ء

۸۶۔ قریشی، الطاف حسین، مشمولہ: ماہ نامہ ''اردو ڈائجسٹ''، مارچ ۱۹۷۳ء، ص۴۳

۸۷۔ عنایت اللہ، ص۶۶

۸۸۔ ہاشمی، ایم۔ کے۔ حسیب، محولہ بالا

۸۹۔ سلیم، احمد، ص۱۴

۹۰۔ سالک، ص۱۰۰

۹۱۔ رضوی، حسن عسکری، Internal Strife and External Intervention", Prograssive publishers, Lahore, 1981, pg. 214-215.

۹۲۔ حسن، ایم۔ ایم۔ ''سولہ دسمبر''، مشمولہ: روز نامہ ''جنگ''، کراچی، ۱۶ دسمبر ۱۹۸۹ء

۹۳۔ قریشی، حکیم ارشد، " The 1971 Indo Pak War: A Soldiers Narrative," Oxford University Perss Pakistan, Karachi, 2002, p.119-127.

۹۴۔ The report of the Hamoodur Rehman Comission of Inquiry into the 1971 war (as declassified by the government of Pakistan),Vanguard Lahore, nd, p.536

۹۵۔ ورما، اشوک کلیان، " Bridge on the River Meghna the Dash of Dhaka; Bangladesh Libration war 1971, KW publisher pvt ltd, New Dehli, 2009,p.10

۹۶۔ ''دستاویز''، نقل، مشمولہ: ''تقسیم پاکستان: صدارت سے غداری تک''، از انوار مزدکی، طارق پبلشرز، لاہور، ۱۹۷۲ء، ص ندارد

۹۷۔ مزدکی، انوار، ''تقسیم پاکستان: صدارت سے غداری تک''، از انوار مزدکی، حصہ دوم، طارق پبلشرز، لاہور، ۱۹۷۲ء، ص۱۷۷

۹۸۔ ایضاً، ص۳۰۔۳۱

۹۹۔ نیر، ڈاکٹر طاہرہ، ص۳۴۸

۱۰۰۔ حسن، ایم۔ ایم۔ مشمولہ: ''اردو ڈائجسٹ''، لاہور، مشرقی پاکستان نمبر، نومبر ۱۹۷۱ء، ص۴۴۔۴۷

۱۰۱۔ اعوان، انور بیگ، ''بہاری مسلمان: تاریخ کے آئینے میں''، شوکت پرنٹنگ پریس، لاہور، ۱۹۷۳ء، ص۱۹۵۔۱۹۹

۱۰۲۔ امروہوی، رئیس، ''المیہ مشرقی پاکستان''، رئیس اکاڈیمی، کراچی، ۱۹۷۴ء، ص۸۔۹

۱۰۳۔ ایضاً، ص۱۰۔۸۹

۱۰۴۔ عالم، ایس۔ ایم۔ عمر، ''بہاریوں کا مقدمہ''، مجاہد پرنٹرز، کراچی، ۲۰۱۱ء، ص۳۳۔۳۴

۱۰۵۔ قرطاس ابیض، ''مشرقی پاکستان کے بحران پر حکومت پاکستان کا جاری کردہ''، ۵ اگست ۱۹۷۱ء، ص۳۵۔۵۱

۱۰۶۔ عالم، ایس۔ ایم۔ عمر، ص۴۴۔۵۶

۱۰۷۔ قمر الہدیٰ، سید، ''بنگلا دیش میں ہم بہاریوں پر کیا گزری''، ڈیسنٹ پریس، کراچی، سن ندارد، ص۹۸۔۱۰۱

۱۰۸۔ عزیز، قطب الدین، "Blood and Tears", United Press of Pakistan, Karachi, 1974, p. 232

۱۰۹۔ ایضاً، ص۱۔۱۲۸

۱۱۰۔ ایضاً، ص۱۵۔۴۳

۱۱۱۔ ایضاً، ص۴۴۔۴۷

۱۱۲۔ ایضاً، ص۴۸۔۲۱۸

۱۱۳۔ عالم، ایس۔ ایم۔ عمر، ص۵۴۔۵۵

۱۱۴۔ عزیز،قطب الدین،ص۵

۱۱۵۔ عالم،ایس۔ایم۔عمر،ص۵۶

۱۱۶۔ عزیز،قطب الدین،ص۷۔۸

۱۱۷۔ حسین،سید سجاد،''پیش لفظ''،مشمولہ:''شکست آرزو''،اسلامک ریسرچ اکیڈمی،کراچی،۲۰۱۳ء،ص۱۳

۱۱۸۔ حسین، پروفیسر ڈاکٹر سید سجاد، ''شکست آرزو''، اسلامک ریسرچ اکیڈمی،کراچی،۲۰۱۳ء،ص۱۲۱۔۱۲۲

۱۱۹۔ عبدالرزاق، عبدالخالق، ''تازیانہ عبرت''، مشمولہ: ماہ نامہ ''سوداگر''،کراچی،مشرقی پاکستان نمبر،مارچ ۱۹۷۲ء،ص۱۱

۱۲۰۔ کیانی، رحمان، ''سقوط مشرقی پاکستان''، مشمولہ: ''اردو ڈائجسٹ''،مشرقی پاکستان نمبر،دسمبر ۲۰۰۰ء،ص۲۴۲

۱۲۱۔ دالیم،شریف الحق،''پاکستان سے بنگلا دیش: ان کہی جدوجہد''، جمہوری پبلی کیشنز،لاہور،۲۰۱۲ء،ص۲۵۵

۱۲۲۔ عالم،ایس۔ایم۔عمر،ص۶۲؛ مذکورہ تصنیف میں سہواً جنوری کے بہ جائے ۸ فروری درج ہے۔ مزید دیکھیے:
http:\\www.thefamouspeople.com/profiles/sheikh-mujibbur-rahman-6878.php

۱۲۳۔ عالم،ایس۔ایم۔عمر،ص۶۱۔۶۷

۱۲۴۔ مفتی،مسعود،''لمحے''،نقوش پریس،لاہور،۱۹۷۹ء،ص۲۲

۱۲۵۔ مفتی،مسعود،''ریزے''،اقرا پبلشرز،اسلام آباد،۱۹۷۹ء،ص۱۲

۱۲۶۔ سلیم،احمد،محولہ بالا،ص۴۷

۱۲۷۔ شہاب،قدرت اللہ،ص۱۰۹۷

۱۲۸۔ سالک،صدیق،ص۱۲۳

۱۲۹۔ محمد، میاں طفیل، مشمولہ: روزنامہ ''جسارت''، کراچی، ۱۰ستمبر ۱۹۷۲ء

۱۳۰۔ حسین، میجر جنرل ابرار، ''انٹرویو''، مشمولہ: ماہ نامہ ''اردو ڈائجسٹ''،لاہور،اپریل ۱۹۷۲ء،ص۹۲

۱۳۱۔ مفتی،مسعود،''لمحے''،ص۱۰۴

۱۳۲۔ قریشی، الطاف حسین، مشمولہ:''اردو ڈائجسٹ''، لاہور، جنوری ۱۹۷۲ء،ص۲۸

۱۳۳۔ سلیم،احمد،''یحییٰ، مجیب، بھٹو مذاکرات کی اندرونی کہانی''، گورا پبلشرز،لاہور،۱۹۹۶ء،ص۷

۱۳۴۔ خان،اشفاق علی،مترجم،''حمود الرحمٰن کمیشن رپورٹ: المیہ مشرقی پاکستان کے سیاسی اور فوجی اسباب''، دارالشعور پبلشرز، جلد اوّل،۲۰۰۲ء،ص پیش لفظ

۱۳۵۔ انجم، مرتضیٰ، ''حرف اوّل''، مشمولہ: ''حمود الرحمٰن کمیشن رپورٹ''،جلد اوّل،۲۰۰۲ء،ص۸

۱۳۶۔ خان،اشفاق علی،ص۱۱۔۱۶

۱۳۷۔ ایضاً،ص۲۶۔۲۸

۱۳۸۔ ایضاً،ص۳۰۔۱۴۹

۱۳۹۔ ایضاً،ص۱۵۸۔۲۰۳

۱۴۰۔ خان،یحییٰ،مشمولہ:''المیہ مشرقی پاکستان کے پانچ کردار''،از منیر احمد منیر،محولہ بالا،ص۵۲۔۵۳

۱۴۱۔ خان،اشفاق علی،ص۲۵۴

۱۴۲۔ خان، اشفاق علی،حمود الرحمٰن کمیشن رپورٹ،جلد دوم، دارالشعور پبلشرز،لاہور،۲۰۰۲،ص۲۲۔

۱۴۳۔ بھویان،عبدالودود، " Emergence of Bangladash and Awami League", Vikas Publishing House Dehli, 1982, p. 268-269

۱۴۴۔ خان،اشفاق علی،''حمود الرحمٰن کمیشن رپورٹ''،جلد دوم،ص۳۶۔۳۷

۱۴۵۔ ایضاً،ص۳۹۔۴۵

۱۴۶۔ حسین، سید شاہد، "What was once East Pakistan", Oxford University Press, Pakistan, Karachi, 2010, p.88-93

۱۴۷۔ میلان،ولیم،بی۔ "Bangladesh and Pakistan: Flirting with Failure in South Assia" , Foundation Books, London, 2009, p. 14-27.

۱۴۸۔ خان،اشفاق علی،''حمود الرحمٰن کمیشن رپورٹ''،جلد سوم،ص۱۹۳۔۲۲۵

۱۴۹۔ ایضاً،جلد دوم،ص۴۶۔۴۷

۱۵۰۔ ایضاً،ص۱۹۰

۱۵۱۔ ایضاً،ص۲۸۲

۱۵۲۔ عزیز،قطب الدین،ص۲۸۸

۱۵۳۔ بلوچ، لیفٹیننٹ کرنل سکندر خان،''جان نثارانِ وطن''، دوست

پبلی کیشنز، کراچی، ۲۰۰۸ء، ص ۲۶۳

۱۵۴۔ پاوریہ، سمنتھا، بہ حوالہ: ''ڈھاکا کی کہانی: کچھ اپنی کچھ غیروں کی زبانی Dead Reckoning''، سرمیلا بوس، مترجم نذر حسین کاظمی، آرمی پبلشنگ ہاؤس، کراچی، ۲۰۱۳ء، ص ۲۱۸

۱۵۵۔ ایضاً

۱۵۶۔ سیزن، رچرڈ، اینڈ، روز، "War and Secession: Pakistan, India and the Creation of Bangladesh", University of Colifornia Press, 1990, p. 306

۱۵۷۔ عزیز، قطب الدین، ص ۱۲۸

۱۵۸۔ بلوچ، لیفٹیننٹ کرنل سکندر خاں، ص ۲۶۳

۱۵۹۔ بوس، سرمیلا، ''Dead Reckoning ڈھاکا کی کہانی: کچھ اپنی کچھ غیروں کی زبانی''، مترجم نذر حسین کاظمی، آرمی پبلشنگ ہاؤس، کراچی، ۲۰۱۳ء، ص ۱۵۔۱۷

۱۶۰۔ بلوچ، لیفٹیننٹ کرنل سکندر خاں، ص ۲۵۵۔۲۵۶

۱۶۱۔ بوس، سرمیلا، ص ۶۱۔۶۷

۱۶۲۔ ایضاً، ص ۸۳۔۸۵

۱۶۳۔ ایضاً، ص ۹۵۔۹۶

۱۶۴۔ عزیز، قطب الدین، ص ۲۲۸

۱۶۵۔ خان، اشفاعلی، ''حمودالرحمٰن کمیشن رپورٹ''، جلد دوم، ص ۳۸۳

۱۶۶۔ بلوچ، لیفٹیننٹ کرنل سکندر خاں، ص ۲۵۶

۱۶۷۔ "The Times"، جنوری ۱۹۷۱ء، بہ حوالہ سرمیلا بوس، ص ۲۱۱

۱۶۸۔ چودھری، عبدالمنعم، بہ حوالہ: لیفٹیننٹ کرنل سکندر خاں بلوچ، محولہ بالا، ص ۲۵۶

۱۶۹۔ بوس، سرمیلا، ص ۲۱۷۔۲۱۸

۱۷۰۔ جہاں، رونق، ص ۲۰۳۔۲۰۴

۱۷۱۔ "The Guardian"، ۶ جون ۱۹۷۲ء، بہ حوالہ: سرمیلا بوس، محولہ بالا، ص ۲۱۸۔۲۱۹؛ اس کتاب کے ترجمے میں سہواً سن ۱۹۷۱ء لکھا گیا ہے۔

۱۷۲۔ بلوچ، لیفٹیننٹ کرنل سکندر خاں، ص ۲۶۲۔۲۶۳

۱۷۳۔ بوس، سرمیلا، ص ۲۲۰

۱۷۴۔ ''حمودالرحمٰن کمیشن رپورٹ'، ص ۵۱۳، بہ حوالہ: سرمیلا بوس، محولہ بالا، ص ۲۲۰

۱۷۵۔ بہ حوالہ: سرمیلا بوس، محولہ بالا، ص ۲۲۱

۱۷۶۔ ایضاً

۱۷۷۔ جوہری، بہ حوالہ: لیفٹیننٹ کرنل سکندر خاں بلوچ، محولہ بالا، ص ۲۶۴

۱۷۸۔ متین الدین، کمال، بہ حوالہ: ایضاً، ص ۲۶۴

۱۷۹۔ بوس، سرمیلا، ص ۲۲۱۔۲۲۷

۱۸۰۔ ایضاً، ص ۲۱۵۔۲۴۴

۱۸۱۔ عالم، ایس۔ ایم۔ عمر، ص ۶۸۔۷۰

۱۸۲۔ ایضاً، ص ۷۴۔۱۲۶

۱۸۳۔ قریشی، فضل حق، ''قیام بنگلا دیش کے مضمرات''، نوید پرنٹنگ پریس، ناظم آباد، کراچی، ۱۹۸۷ء، ص ۱۷۵۔۱۷۶

۱۸۴۔ احمد، برہان الدین، "The Generals of Pakistan and Bangladesh", Vikas Publishing House Pvt. Ltd, Delhi, 1993, p. 75. 78

۱۸۵۔ حافظ، آندھا، "The Killing of Shaikh Mujib"، مشمولہ: "Bangladesh A Legacy of Blood", Compiled by Anthony Mascarenhas, Hodder and Stoughton, London, 1986, p. 68-78

۱۸۶۔ دالیم، لیفٹیننٹ کرنل شریف الحق، ص ۲۵۹۔۲۶۰

۱۸۷۔ ایضاً، ص ۲۵۹۔۳۱۳

۱۸۸۔ ملک، زاہد، ''سقوط ڈھاکا''، مکتبۂ سلیم، کراچی، ۱۹۷۲ء، ص ۴۹۔۵۸

۱۸۹۔ نیر، ڈاکٹر طاہرہ، ص ۳۴۸

۱۹۰۔ بہ حوالہ: ''صدر کی اہم تقریروں سے اقتباسات''، مشمولہ: ہفت روزہ ''پاک جمہوریت''، لاہور، قرطاس ابیض خاص نمبر، ص ۲۰۔۲۹

۱۹۱۔ بہ حوالہ: ''اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی''، صدر یحییٰ کا ٹیلی وژن انٹرویو، مشمولہ: ''ماہ نو''، کراچی، ستمبر ۱۹۷۱ء، ص ۳۰۔۳۵

۱۹۲۔ خان، میجر جنرل فضل مقیم، ''پاکستان کا المیہ''، آرمی ایجوکیشن پریس، راول پنڈی، سن ندارد، ص ۳۶۴۔۳۶۷

۱۹۳۔ شان، سڈنی ایچ۔ نمائندہ فارن افیئر امریکا، مشمولہ: ''اردو

ڈائجسٹ''، مشرقی پاکستان نمبر، ۲،۱۹۷۲ء، ص۵۱

۱۹۴۔ اشرف، آغا، ''آشوبِ پاکستان''، بساطِ ادب، لاہور، ۱۹۹۱ء، ص ۶۷

۱۹۵۔ احمد، ڈاکٹر جنید، ''بنگلا دیش کی تخلیق: فسانے اور حقائق''، مترجم محمود عالم صدیقی، اے۔ جے۔ اے۔ پبلشرز، ۲۰۱۸ء، ص ۴۶۸۔۴۷۳

۱۹۶۔ احمد، میجر آفتاب، ''آخری سلام: مشرقی پاکستان کے میدان جنگ سے''، محولہ بالا، ص۲۳۰

۱۹۷۔ عزیز، قطب الدین، ''خون اور آنسوؤں کا دریا''، ترجمہ و تدوین: سلیم منصور خالد، ظہور احمد قریشی، منشورات، ۲۰۱۷ء، ص ۴۰۹۔۴۱۵

۱۹۸۔ خاں، علی احمد، ''جیون کہانی''، مشمولہ: ''آج''، کتابی سلسلہ نمبر ۹۰، مرتبہ اجمل کمال، جولائی ۲۰۱۵ء، ص۲۱۹

۱۹۹۔ شامی، مجیب الرحمٰن، ''سقوط ڈھاکا کا حساب''، مشمولہ: روزنامہ ''جنگ''، لاہور، ۱۶ دسمبر ۱۹۹۴ء

۲۰۰۔ شیخ، وسیم، ''ہتھیار کیوں ڈالے''، یو پبلشرز، لاہور، سن ندارد، ص ۸۵۔۱۰۱

۲۰۱۔ عزام، ابو، ''سقوط ڈھاکا کے چاروں کردار''، بہ حوالہ: forum.mohaddis.com

۲۰۲۔ خان، توصیف احمد، ''آدھا پاکستان''، نگارشات پبلشرز، لاہور، ۲۰۰۴ء، ص۳۸۵

۲۰۳۔ عزام، ابو، محولہ بالا

۲۰۴۔ مرسل، سید محمود، ''سقوط ڈھاکا کے تناظر میں اردو شاعری کا مطالعہ''، مشمولہ: ''زبان و ادب''، شمارہ ۱۴، جنوری تا جون ۲۰۱۴ء، فیصل آباد، ص۹۷

۲۰۵۔ چیمہ، ذوالفقار، ''برطانیہ کی کچھ باتیں اور دسمبر کے زخم''، مشمولہ: روزنامہ ''جنگ''، کراچی، ۲۰ جنوری ۲۰۱۳ء

۲۰۶۔ کاظمی، مشیر، مشمولہ: ''شکستِ آرزو''، محولہ بالا، ص ۷

۲۰۷۔ فیض، فیض احمد، ''نسخہ ہائے وفا''، مکتبۂ کارواں، لاہور، سن ندارد، ص ۵۴۷

۲۰۸۔ ایضاً، ص ۴۳۷۔۴۳۸

۲۰۹۔ ایضاً، ص ۴۵۳۔۴۵۴

۲۱۰۔ ملک، فتح محمد، ''فیض: شاعری اور سیاست''، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۸ء، ص ۶۰

۲۱۱۔ فیض، فیض احمد، ص ۶۹۷

۲۱۲۔ ماہ پوری، افسر، بہ حوالہ: ''جدید اردو غزل ایک مطالعہ''، از نظیر صدیقی، گلوبل پبلشرز، لاہور، ۱۹۸۴ء، ص ۱۹۶

۲۱۳۔ فوق، ڈاکٹر حنیف، ''غبار ماہ کی گواہی''، مشمولہ: ''غبار ماہ''، ایجوکیشنل پریس، کراچی، ۱۹۸۶ء، ص ۴۳

۲۱۴۔ ماہ پوری، افسر، ''غبارِ ماہ''، ایجوکیشنل پریس، کراچی، ۱۹۸۶ء، ص ۱۴۹

۲۱۵۔ ایضاً، ص ۱۹۰

۲۱۶۔ ایضاً، ص ۱۱۴

۲۱۷۔ ایضاً، ص ۱۳۶

۲۱۸۔ ایضاً، ص ۶۸

۲۱۹۔ ایضاً، ص ۱۰۱۔۱۱۳

۲۲۰۔ ایضاً، ص ۸۰

۲۲۱۔ ماہ پوری، افسر، ''نگارِ ماہ''، ایجوکیشنل پریس، کراچی، ۱۹۹۲ء، ص ۴۰

۲۲۲۔ قریشی، جاذب، ''شاعری اور تہذیب''، مشمولہ: ''نگارِ ماہ''، محولہ بالا، ص ۲

۲۲۳۔ ماہ پوری افسر، ''غبارِ ماہ''، ص ۱۱۵

۲۲۴۔ ایضاً، ص ۸۰

۲۲۵۔ ایضاً، ص ۱۸۰

۲۲۶۔ اعظمی، انجم، ''آئینہ در آئینہ''، مشمولہ: ''غبارِ ماہ''، محولہ بالا، ص ۳۳

۲۲۷۔ لکھنوی، اختر، ''کچھ اپنے بارے میں''، مشمولہ: ''دیدۂ تر''، بزم اربابِ سخن پاکستان، کراچی، ۱۹۸۶ء، ص ۳۲

۲۲۸۔ احمد، خالد جاوید، ''اردو شاعری پر سقوط ڈھاکا کے اثرات''، غیر مطبوعہ مقالہ برائے ایم۔فل، علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی، اسلام آباد، ۱۹۹۴ء، ص ۳۰

۲۲۹۔ لکھنوی، اختر، ''دیدۂ تر''، بزم اربابِ سخن پاکستان، کراچی، ۱۹۸۶ء، ص ۴۷

۲۳۰۔ ایضاً،ص۸۷

۲۳۱۔ ایضاً،ص۸۲۔۱۰۴

۲۳۲۔ ایضاً،ص۳۳۔۴۴

۲۳۳۔ ایضاً،ص۸۳

۲۳۴۔ ایضاً،ص۳۸

۲۳۵۔ ایضاً،ص۵۳۔۵۷

۲۳۶۔ ایضاً،ص۱۲۷

۲۳۷۔ ایضاً،ص۴۷

۲۳۸۔ بہ حوالہ: روزنامہ ''جسارت''، کراچی، ۲۹ اکتوبر ۱۹۷۲ء، ''ایک چشم دید گواہ کی رپورٹ''، مترجم احمد حمید

۲۳۹۔ لکھنوی،اختر،''دیدۂ تر''،محولہ بالا،ص۱۰۶

۲۴۰۔ ایضاً،ص۱۳۸

۲۴۱۔ ایضاً،ص۳۹

۲۴۲۔ ایضاً،ص۱۳۸

۲۴۳۔ لکھنوی،اختر،''کچھ اپنے بارے میں''،محولہ بالا،ص۳۴

۲۴۴۔ لکھنوی،اختر،''دیدۂ تر''،ص۱۱۴

۲۴۵۔ ایضاً،ص۱۱۱

۲۴۶۔ ایضاً،ص۸۸

۲۴۷۔ دہلوی، تابش،مشمولہ:''تعارفی مجلّہ بزم ارباب سخن پاکستان''، کراچی، ۱۹۸۷ء،ص۱۱

۲۴۸۔ صدیقی،نظیر،''سقوط سے سکوت تک''،مشمولہ:''دیدۂ تر''،محولہ بالا،ص۱۱۔۱۳

۲۴۹۔ مسعود، طاہر،مشمولہ:''تعارفی مجلّہ بزم ارباب سخن پاکستان''، کراچی، ۱۹۸۷ء،ص۲۰

۲۵۰۔ لکھنوی،اختر،''دیدۂ تر''،محولہ بالا،ص۱۲۶

۲۵۱۔ رزمی،مظفر حسین،''خواب کی ریت''،زاہد پبلشرز،اسلام آباد، ۱۹۸۳ء،ص۵۵

۲۵۲۔ ایضاً،ص۱۳۵

۲۵۳۔ ایضاً،ص۱۱۴

۲۵۴۔ ایضاً،ص۴۵

۲۵۵۔ ایضاً،ص۳۷،۹۴

۲۵۶۔ شمیم،آفتاب اقبال،''تبصرہ خواب کی ریت''،مشمولہ:''فنون''، لاہور،مئی جون ۱۹۸۵ء،ص۶۳۹

۲۵۷۔ رزمی،مظفر حسین،محولہ بالا،ص۱۲۰۔۱۲۵

۲۵۸۔ جعفری،سید ضمیر،''رزمی''،مشمولہ:''رفتار''،کراچی،مئی ۱۹۸۴ء، ص۳۲

۲۵۹۔ بارہ بنکوی، سرور،''سنگ آفتاب''، رحمٰن پبلشرز، کراچی، سن ندارد،ص۵۹

۲۶۰۔ ایضاً،ص۶۱

۲۶۱۔ ایضاً،ص۱۶۱

۲۶۲۔ ایضاً،ص۱۵۱

۲۶۳۔ صدیقی،محمد علی،''دیباچہ سنگ آفتاب''،مشمولہ:''سنگ آفتاب''، محولہ بالا،ص۸۔۱۰

۲۶۴۔ عظیم، پروفیسر اقبال،''چراغ آخر شب''، ایجوکیشنل پریس، کراچی،۱۹۹۳ء،ص۲۵

۲۶۵۔ ایضاً،ص۲۲۱

۲۶۶۔ ایضاً،ص۱۹

۲۶۷۔ ایضاً،ص۲۴

۲۶۸۔ ایضاً،ص۲۱۶

۲۶۹۔ ایضاً،ص۱۹۔۲۱

۲۷۰۔ ایضاً،ص۱۲۲

۲۷۱۔ اکرام،صبا،مشمولہ:''اوراق''، لاہور، جنوری۔فروری ۱۹۷۹ء، ص۲۰۸

۲۷۲۔ اکرام،صبا،''سورج کی صلیب''، دبستان جدید،کراچی،۱۹۸۱ء، ص۲۳

۲۷۳۔ منظر، منظر علی خاں،''یہ بات چلی مجھ سے''، افسر پبلی کیشنز، کراچی،۱۹۹۶ء،ص۶۰

۲۷۴۔ منظر،منظر علی خاں،''کرب آگہی''، ایڈورڈ پبلی کیشنز،کراچی، ۱۹۸۱ء،ص۴۶

۲۷۵۔ ایضاً،ص۵۱۔۶۵

۲۷۶۔ ایضاً،ص۸۴۔۱۱۶

۲۷۷۔ منظر،منظر علی خاں،''یہ بات چلی مجھ سے''،ص۱۱۶

۲۷۸۔ ایضاً،ص۴۴۔۴۵

۲۷۹۔ ایضاً،ص۶۵

۲۸۰۔ خلش کلکتوی، رشید الزماں، ''تقسیم در تقسیم''، بزم شعر و ادب، اسلام آباد،۱۹۸۲ء،ص۳۲

۲۸۱۔ ماہ پوری، افسر، ''ضحیٰ آروی کی شاعری''، مشمولہ: ''ذوق ضحیٰ''، ظہیر پبلی کیشنز، کراچی، ۱۹۸۷ء،ص۱۸۔۱۹

۲۸۲۔ آروی، ضحیٰ، ''دیباچہ''، مشمولہ: ''ذوق ضحیٰ''، ظہیر پبلی کیشنز، کراچی، ۱۹۸۷ء،ص۲۷

۲۸۳۔ آروی، ضحیٰ، ''ذوق ضحیٰ''، ظہیر پبلی کیشنز، کراچی، ۱۹۸۷ء،ص۴۰

۲۸۴۔ ایضاً،ص۷۰،۷۴،۱۳۷

۲۸۵۔ ایضاً،ص۶۰۔۶۷

۲۸۶۔ ایضاً،ص۶۳،۸۶،۱۷۲

۲۸۷۔ ایضاً،ص۸۷

۲۸۸۔ ایضاً،ص۷۰

۲۸۹۔ ایضاً،ص۱۶۳

۲۹۰۔ ایضاً،ص۱۳۳

۲۹۱۔ عظیم آبادی، جمیل، مشمولہ: سہ ماہی ''سیپ''، کراچی، شمارہ ۴۵، خاص نمبر،ص۲۲۴

۲۹۲۔ ایضاً

۲۹۳۔ سہیل، ادیب، ''دیباچہ''، مشمولہ: ''بکھراؤ کا حرف آخر''، سعد پبلی کیشنز، کراچی، ۱۹۹۶ء،ص۵

۲۹۴۔ سہیل، ادیب، ''بکھراؤ کا حرف آخر''، سعد پبلی کیشنز، کراچی، ۱۹۹۶ء،ص۷

۲۹۵۔ ایضاً،ص۴۴

۲۹۶۔ ایضاً،ص۳۲

۲۹۷۔ ایضاً،ص۵۰

۲۹۸۔ ایضاً،ص۳۴

۲۹۹۔ سہیل ادیب، بہ حوالہ ''اردو شاعری میں پاکستانی قومیت کا اظہار''، محولہ بالا،ص۳۵۵۔۳۵۶

۳۰۰۔ الیاس، احمد، ''بات سے بات''، مشمولہ: ''بکھراؤ کا حرف آخر''، ص۷

۳۰۱۔ سہیل، ادیب، ''بکھراؤ کا حرف آخر''، ص۱۱۲

۳۰۲۔ سالک، صدیق، ''ہمہ یاراں دوزخ''، مکتبہ اردو ڈائجسٹ، ۱۹۷۵ء،ص۲۶

۳۰۳۔ سہیل، ادیب، ''بکھراؤ کا حرف آخر''، ص۱۱۶

۳۰۴۔ ایضاً،ص۱۱۱

۳۰۵۔ ایضاً،ص۱۲۷

۳۰۶۔ صدیقی، نظیر، ''وہ قیامت جو سر سے گزری ہے''، مشمولہ: ''فنون''، لاہور، اپریل مئی ۱۹۷۲ء،ص۴۱

۳۰۷۔ صدیقی، نظیر، ''حسرت اظہار''، ایجوکیشنل پریس، کراچی، ۱۹۹۴ء،ص۵۰

۳۰۸۔ شاہین، افتخار اجمل، مشمولہ: سہ ماہی ''سیپ''، اگست ستمبر ۱۹۷۲ء، ص۳۰۰

۳۰۹۔ ایضاً

۳۱۰۔ ایضاً

۳۱۱۔ ایضاً

۳۱۲۔ ایضاً

۳۱۳۔ رضا، سید علم دار، ''جگنو میری تنہائی کے''، ورڈ ویژن پبلشرز، اسلام آباد، ۱۹۷۳ء،ص۶۳

۳۱۴۔ ایضاً،ص۶۰

۳۱۵۔ ایضاً،ص۲۷

۳۱۶۔ ایضاً،ص۳۶۔۳۷

۳۱۷۔ ایضاً،ص۱۳۰

۳۱۸۔ ایضاً،ص۷۵

۳۱۹۔ ایضاً،ص۳۹

۳۲۰۔ ایضاً،ص۵۲

۳۲۱۔ براہی، وفا، مشمولہ: ''افکار''، کراچی، ستمبر ۱۹۷۵ء،ص۵

۳۲۲۔ ماہ پوری، افسر، ''دیباچہ''، مشمولہ: ''حاصلِ سفر''، از ذکی آذر، ایجوکیشنل پریس، کراچی، ۱۹۹۴ء،ص۹

۳۲۳۔ ایضاً،ص۱۰

۳۲۴۔ آذر، ذکی، ''حاصلِ سفر''، ایجوکیشنل پریس، کراچی، ۱۹۹۴ء،ص۴۴

۳۲۵۔ ایضاً،ص ۵۱

۳۲۶۔ ایضاً،ص ۴۵۔۴۸

۳۲۷۔ ایضاً،ص ۶۳

۳۲۸۔ ایضاً،ص ۴۲۔۵۳

۳۲۹۔ ایضاً،ص ۴۲۔۵۸

۳۳۰۔ نوری،نوشاد،مشمولہ:''افکار''،کراچی،مئی ۱۹۷۸ء،ص ۳۹

۳۳۱۔ ہارون الرشید،پروفیسر،''دو ہجرتوں کے اہلِ قلم''،میڈیا گرافکس، کراچی،۲۰۱۲ء،ص ۱۷۵

۳۳۲۔ عمر،کاوش،''بحرِ خوں''،مرتبہ:یوسف راہی،رابطہ پبلشرز،کراچی، ۲۰۱۱ء،ص ۴۹۔۵۴

۳۳۳۔ بدر،شاہین،مشمولہ:سہ ماہی ''تمثیل''،کراچی،جلد۱،شمارہ ۲،۲،۳، ۱۹۹۲ء،ص ۲۱۰

۳۳۴۔ بدر،شاہین،مشمولہ:''اوراق''،لاہور،دسمبر ۱۹۹۱ء،ص ۳۳۷

۳۳۵۔ بدر،شاہین،مشمولہ: ماہ نامہ ''شاعر''،بمبئی،اپریل ۱۹۸۴ء،ص ۳۶

۳۳۶۔ بدر،شاہین،مشمولہ:''تجدیدِ نو''،لاہور،اسلام آباد،نومبر ۱۹۹۰ء، ص ۴۸

۳۳۷۔ ایضاً و نیز ماہ نامہ ''تحریریں''،لاہور،فروری ۱۹۸۵ء،ص ۱۳

۳۳۸۔ بدر،شاہین،مشمولہ:''اوراق''،لاہور،جنوری فروری ۱۹۷۶ء،ص ۱۶۴

۳۳۹۔ بدر،شاہین،مشمولہ: ''اوراق''، لاہور، نومبر دسمبر ۱۹۹۲ء،ص ۳۶۷

۳۴۰۔ بدر،شاہین،مشمولہ: ماہ نامہ ''تخلیق''، لاہور،اپریل ۱۹۹۵ء،ص ۵۳

۳۴۱۔ شاہین، ولی عالم،''بے نشان''، مکتبہ افکار،کراچی،۱۹۸۴ء،ص ۷۵

۳۴۲۔ رحمٰن، پاشا،''دیباچہ''،مشمولہ:''نشاطِ کرب''،اردو اکیڈمی سندھ، کراچی،۱۹۷۸ء،ص ۹

۳۴۳۔ رحمٰن، پاشا،مشمولہ: سہ ماہی ''سیپ''،کراچی،شمارہ ۳۷،ص ۲۶۵

۳۴۴۔ رحمٰن، پاشا،''دیباچہ''،محولہ بالا،ص ۹

۳۴۵۔ رحمٰن، پاشا،مشمولہ: سہ ماہی ''سیپ''،کراچی،شمارہ ۳۲، اگست ستمبر ۱۹۷۵ء،ص ۲۱۳

۳۴۶۔ رحمٰن، پاشا،مشمولہ: سہ ماہی ''سیپ''،کراچی،شمارہ ۳۶،ص ۲۳۶

۳۴۷۔ ایضاً

۳۴۸۔ الیاس، احمد،''آئینہ ریزے''، شاہ کار پبلی کیشنز، ڈھاکا، ۱۹۸۹ء،ص ۳۳،۵۱

۳۴۹۔ الیاس،احمد،مشمولہ:''افکار''،کراچی،اکتوبر ۱۹۸۵ء،ص ۴۵

۳۵۰۔ الیاس،احمد،''آئینہ ریزے''،محولہ بالا،ص ۲۴۔۴۲

۳۵۱۔ الیاس،احمد،مشمولہ:''افکار''،کراچی،جون ۱۹۸۹ء،ص ۴۵

۳۵۲۔ الیاس،احمد،شمولہ:''افکار''،کراچی،مارچ ۱۹۸۷ء،ص ۲۰۴

۳۵۳۔ الیاس،احمد،''آئینہ ریزے''،محوالہ بالا،ص ۱۰۰۔۱۰۱

۳۵۴۔ الیاس،احمد''آئینہ ریزے''،ص ۱۰۲

۳۵۵۔ فتح پوری،صدیق،''لمحوں کی دھوپ''،حسان پبلشرز،کراچی، ۱۹۹۷ء،ص ۱۲۹

۳۵۶۔ تنظیم الفردوس، پروفیسر،''قومی شعور کی بازیافت: سقوطِ مشرقی پاکستان کے اثرات اردو غزل پر''،مشمولہ:''اردو شاعری کی چند کلاسیکی اصناف''،ادارۂ یادگارِ غالب،کراچی،۲۰۱۳ء،ص ۶۹۔۷۰

۳۵۷۔ ہارون الرشید،پروفیسر،''دو ہجرتوں کے اہلِ قلم''،ص ۲۷۔۲۸

۳۵۸۔ عمادی،تمنا،بہ حوالہ:''دو ہجرتوں کے اہلِ قلم''،محولہ بالا،ص ۲۹

۳۵۹۔ فضلی،فضل احمد،بہ حوالہ:''دو ہجرتوں کے اہلِ قلم''،محولہ بالا،ص ۳۶

۳۶۰۔ مونگیری،مبارک،بہ حوالہ:''دو ہجرتوں کے اہلِ قلم''،محولہ بالا،ص ۶۴۔۶۵

۳۶۱۔ ایضاً،ص ۶۵

۳۶۲۔ صدیقی،شاعر،بہ حوالہ:''دو ہجرتوں کے اہلِ قلم''،محولہ بالا،ص ۱۷۲

۳۶۳۔ احمد،فروغ،پروفیسر،مشمولہ:ہفت روزہ ''آئین''،لاہور،۷ستمبر ۱۹۷۳ء،ص ۲

۳۶۴۔ دہلوی، حافظ،''آندھیوں میں چراغ''، دبستانِ لوحِ ادب، کراچی،۲۰۰۰ء،ص ۷۷۔۹۷

۳۶۵۔ ایضاً

۳۶۶۔ جالندھری، حفیظ، بہ حوالہ: روز نامہ ’’نوائے وقت‘‘، لاہور، ۲۹ جون ۱۹۸۷ء

۳۶۷۔ اعجاز، خاور، ’’پاکستانی غزل‘‘، الوقار پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۱ء، ص۶۳۲

۳۶۸۔ امجد، مجید، مشمولہ: ہفت روزہ ’’زندگی‘‘، لاہور، ۷ تا ۱۳ فروری ۱۹۷۲ء، ص۱۹

۳۶۹۔ قادری، شبیر، ’’مجید امجد کی شاعری کے رثائی پہلو‘‘، مشمولہ: ’’اوراق‘‘، لاہور، نومبر دسمبر ۱۹۹۳ء، ص۴۵

۳۷۰۔ شہزاد، ناصر، ’’کون دیس گئیو‘‘، الحمد پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۶ء، ص۲۷۲

۳۷۱۔ امجد، مجید، مشمولہ: ہفت روزہ ’’زندگی‘‘، لاہور، ۷ تا ۱۳ فروری ۱۹۷۲ء، ص۳۲

۳۷۲۔ امجد، مجید، بہ حوالہ: ’’مجید امجد اور پاک و ہند محاربے: ایک مطالعہ‘‘، از محمد افتخار شفیع، مشمولہ: ’’زبان و ادب‘‘، فیصل آباد، شمارہ ۱۴، جنوری تا جون ۱۹۱۴ء، ص۱۶۱

۳۷۳۔ امجد، مجید، ’’کلیات امجد مجید‘‘، مرتبہ: ڈاکٹر خواجہ ذکریا، ماورا پبلشرز، لاہور، ۱۹۹۱ء، ص۶۱۴

۳۷۴۔ سالک، صدیق، ’’میں نے ڈھاکا ڈوبتے دیکھا‘‘، محولہ بالا، ص ۳۸۷

۳۷۵۔ امجد، مجید، بہ حوالہ: ’’مجید امجد اور پاک و ہند محاربے: ایک مطالعہ‘‘، محولہ بالا، ص۱۶۰

۳۷۶۔ ایضاً، ص۱۶۱

۳۷۷۔ امجد، مجید، مشمولہ: ہفت روزہ ’’زندگی‘‘، لاہور، ۷ تا ۱۳ فروری ۱۹۷۲ء، ص۲۰

۳۷۸۔ قاسمی، احمد ندیم، ’’ندیم کی نظمیں‘‘، جلد اوّل، سنگ میل پبلشرز، لاہور، ۱۹۹۱ء، ص۳۵۶

۳۷۹۔ یعقوب، قاسم، ’’اردو شاعری پر جنگوں کے اثرات‘‘، مثال پبلشرز، فیصل آباد، ۲۰۱۱ء، ص۱۸۰

۳۸۰۔ قاسمی، احمد ندیم، ’’ندیم کی نظمیں‘‘، محولہ بالا، ص۳۵۷

۳۸۱۔ ایضاً، ص۴۲۴

۳۸۲۔ ایضاً، ص۳۲۸

۳۸۳۔ قاسمی، احمد ندیم، مشمولہ: ماہ نامہ ’’ماہ نو‘‘، کراچی، اپریل ۱۹۷۰ء، ص۸

۳۸۴۔ قاسمی، احمد ندیم، ’’ندیم کی غزلیں‘‘، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۱ء، ص۳۵۵

۳۸۵۔ ایضاً، ص۳۵۶

۳۸۶۔ ایضاً، ص۳۵۱

۳۸۷۔ قاسمی، احمد ندیم، ’’ندیم کی نظمیں‘‘، محولہ بالا، ص۳۴۷۔۳۴۸

۳۸۸۔ جالندھری، ضیاء، مشمولہ: ’’ماہ نو‘‘، کراچی، مارچ ۱۹۷۲ء، ص۲۳

۳۸۹۔ کرنالی، غافل، مشمولہ: ماہ نامہ ’’سیارہ‘‘، لاہور، جولائی ۱۹۷۰ء، ص۵۸

۳۹۰۔ کرنالی، غافل، بہ حوالہ: ’’اردو شاعری میں پاکستانی قومیت کا اظہار‘‘، محولہ بالا، ص۳۹۵

۳۹۱۔ نظر، قیوم، مشمولہ: ہفت روزہ ’’زندگی‘‘، لاہور، ۱۰ تا ۱۴ جنوری ۱۹۷۲ء، ص۹۱۴

۳۹۲۔ نظر، قیوم، ’’قلب و نظر کے سلسلے‘‘، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۷ء، ص۹۱۴

۳۹۳۔ ایضاً، ص۹۱۳

۳۹۴۔ فراز، احمد، ’’کلیات احمد فراز‘‘، مرتبہ: فاروق ارگلی، فرید بک ڈپو، دہلی، ۲۰۱۰ء، ص۵۲۶

۳۹۵۔ ایضاً، ص۵۹۔۶۰

۳۹۶۔ ایضاً، ص۴۸۔۴۹

۳۹۷۔ جعفری، ضمیر، مشمولہ ہفت روزہ ’’ہلال‘‘، راول پنڈی، جلد ۳۵، شمارہ ۲۶۔۲۸، ۱۹۹۹ء، ص۲۹

۳۹۸۔ ایضاً، ص۳۵

۳۹۹۔ جعفری، ضمیر، ’’قریۂ جاں‘‘، دوست پبلشرز، اسلام آباد، ۱۹۸۸ء، ص۱۹۴

۴۰۰۔ ایضاً، ص۱۵۴

۴۰۱۔ ایضاً، ص۱۹۷۔۱۹۸

۴۰۲۔ ایضاً، ص۱۹۹۔۲۰۰

۴۰۳۔ جعفری، ضمیر، مشمولہ: روز نامہ ’’مشرق‘‘، کراچی، ۳۱ جنوری

۱۹۷۲ء

۴۰۴۔ جعفری،ضمیر،''قریۂ جاں،محولہ بالا،ص۷۹

۴۰۵۔ ایضاً،ص۸۷

۴۰۶۔ ایضاً،ص۱۵۴

۴۰۷۔ سلطان پوری، مجروح، بہ حوالہ: https:\\dailypakistan.com.pk.16dec-2016/49208

۴۰۸۔ لکھنوی، مجروح، بہ حوالہ:''اردو شاعری میں پاکستانی قومیت کا اظہار''،محولہ بالا،ص۳۵۰

۴۰۹۔ ہوشیار پوری،اختر، بہ حوالہ:''اردو شاعری میں پاکستانی قومیت کا اظہار''،محولہ بالا،ص۳۵۲

۴۱۰۔ ہوشیار پوری، اختر، مشمولہ: ماہ نامہ ''افکار''، کراچی، مارچ ۱۹۷۲ء،ص۴۰

۴۱۱۔ جالب، حبیب،''کلیات حبیب جالب''، ماورا پبلشرز، لاہور، ۱۹۹۳ء،ص۲۱۸

۴۱۲۔ ایضاً

۴۱۳۔ ایضاً،ص۲۲۰

۴۱۴۔ جالب، حبیب، بہ حوالہ: https:\\dailypakistan.com.pk.16dec.2016

۴۱۵۔ ماہر القادری،''کلیات ماہر''، مرتبہ: ڈاکٹر عبدالغنی فاروق، ادارۂ تعمیر ادب، کراچی،۱۹۹۴ء،ص۸۹۲

۴۱۶۔ شاعر، حمایت علی، بہ حوالہ:''اردو شاعری میں پاکستانی قومیت کا اظہار''،محولہ بالا،ص۳۵۵

۴۱۷۔ ایضاً،ص۳۵۶

۴۱۸۔ امروہوی، رئیس، مشمولہ: روزنامہ ''جنگ''، کراچی، ۷ مارچ ۱۹۷۲ء

۴۱۹۔ امروہوی، رئیس، مشمولہ: روزنامہ ''جنگ''، کراچی، ۳ مارچ ۱۹۷۲ء

۴۲۰۔ امروہوی، رئیس، مشمولہ: روزنامہ ''جنگ''، کراچی، ۲۵ اپریل ۱۹۷۳ء

۴۲۱۔ امروہوی، رئیس، مشمولہ: روزنامہ ''جنگ''، کراچی، ۲۱ جنوری ۱۹۷۲ء

۴۲۲۔ امروہوی، رئیس، مشمولہ: روزنامہ ''جنگ''، کراچی، ۶ فروری ۱۹۷۲ء

۴۲۳۔ امروہوی، رئیس، مشمولہ: روزنامہ ''جنگ''، کراچی، ۲۲ جنوری ۱۹۷۲

۴۲۴۔ امروہوی، رئیس، مشمولہ: روزنامہ ''جنگ''، کراچی، ۵ نومبر ۱۹۷۱ء

۴۲۵۔ امروہوی، رئیس، مشمولہ: روزنامہ ''جنگ''، کراچی، ۷ نومبر ۱۹۷۱ء

۴۲۶۔ امروہوی، رئیس، مشمولہ: روزنامہ ''جنگ''، کراچی، ۲۸ نومبر ۱۹۷۱ء

۴۲۷۔ امروہوی، رئیس، مشمولہ: روزنامہ ''جنگ''، کراچی، ۴ دسمبر ۱۹۷۱ء

۴۲۸۔ امروہوی، رئیس، مشمولہ: روزنامہ ''جنگ''، کراچی، ۱۵ دسمبر ۱۹۷۱ء

۴۲۹۔ امروہوی، رئیس، مشمولہ: روزنامہ ''جنگ''، کراچی، ۱۱ دسمبر ۱۹۷۱ء

۴۳۰۔ امروہوی، رئیس، مشمولہ: روزنامہ ''جنگ''، کراچی، یکم اکتوبر ۱۹۷۳ء

۴۳۱۔ امروہوی، رئیس، مشمولہ:''اوراق''، لاہور، ستمبر اکتوبر ۱۹۷۳ء، ص۱۵

۴۳۲۔ امروہوی، رئیس، بہ حوالہ:''اردو غزل کے عصری رویے''، از نثار احمد، غیر مطبوعہ مقالہ برائے پی ایچ۔ ڈی۔ کراچی یونی ورسٹی، ۲۰۰۵ء،ص۱۹۶

۴۳۳۔ امجد، امجد اسلام،''برزخ''، ماورا پبلشرز، لاہور، ۱۹۸۶ء،ص ۱۴۰

۴۳۴۔ ایضاً،ص۱۴۱۔۱۴۲

۴۳۵۔ ایضاً،ص۱۴۴

۴۳۶۔ امجد، امجد اسلام، مشمولہ: روزنامہ ''مساوات''، لاہور، ۲۷ دسمبر ۱۹۷۱ء

۴۳۷۔ ظفر، یوسف، بہ حوالہ:''اردو شاعری میں پاکستانی قومیت کا اظہار''،محولہ بالا،ص۳۸۶

۴۳۸۔ ظفر، یوسف،''عشق پیچاں''، فیروز سنز، لاہور، ۱۹۷۳ء،ص

۲۶۴

۴۳۹۔ ایضاً،ص۲۶۷

۴۴۰۔ ایضاً،ص۲۶۵

۴۴۱۔ ایضاً،ص۳۶۳

۴۴۲۔ ایضاً،ص۲۶۳

۴۴۳۔ ایضاً،ص۳۶۳

۴۴۴۔ کاشمیری، آغا، شورش، مشمولہ ہفت روزہ ''چٹان''، لاہور، ۳ جنوری۱۹۷۲ء،ص۲

۴۴۵۔ کاشمیری، آغا، شورش، مشمولہ: روز نامہ ''جسارت''، کراچی، ۱۷ نومبر۱۹۷۲ء

۴۴۶۔ کاشمیری، آغا، شورش، مشمولہ ہفت روزہ ''چٹان''، لاہور، ۳۱ جنوری۱۹۷۲ء،ص۲

۴۴۷۔ کاشمیری، آغا، شورش، مشمولہ: روز نامہ ''جسارت''، کراچی، ۱۷ نومبر۱۹۷۲

۴۴۸۔ کاشمیری، آغا، شورش، مشمولہ ہفت روزہ ''چٹان''، لاہور، ۱۰ جنوری۱۹۷۲ء،ص۲

۴۴۹۔ عدم، عبدالحمید، مشمولہ: روزنامہ ''امروز''، لاہور، ۶ فروری ۱۹۷۲ء

۴۵۰۔ ایضاً

۴۵۱۔ ایضاً

۴۵۲۔ ایضاً

۴۵۳۔ انبالوی، وقار، مشمولہ: روز نامہ ''نوائے وقت''، لاہور، ۱۸ جنوری ۱۹۷۲ء

۴۵۴۔ انبالوی، وقار، مشمولہ: روز نامہ ''نوائے وقت''، لاہور، ۱۲۵پریل ۱۹۷۳ء

۴۵۵۔ انبالوی، وقار، مشمولہ: روز نامہ ''نوائے وقت''، لاہور، ۱۰ اگست ۱۹۷۳ء

۴۵۶۔ انبالوی، وقار، مشمولہ: روز نامہ ''نوائے وقت''، لاہور، ۶ فروری ۱۹۷۳ء

۴۵۷۔ انبالوی، وقار، مشمولہ: روز نامہ ''نوائے وقت''، لاہور، ۹ جنوری ۱۹۷۲ء

۴۵۸۔ انبالوی، وقار، مشمولہ: روز نامہ ''نوائے وقت''، لاہور، ۶ فروری ۱۹۷۲ء

۴۵۹۔ انبالوی، وقار، مشمولہ: روز نامہ ''نوائے وقت''، لاہور، ۲۳ مارچ ۱۹۷۲ء

۴۶۰۔ انبالوی، وقار، مشمولہ: روز نامہ ''نوائے وقت''، لاہور، ۲۵ دسمبر ۱۹۷۳ء

۴۶۱۔ انبالوی، وقار، مشمولہ: روز نامہ ''نوائے وقت''، لاہور، ۶ فروری ۱۹۷۲ء

۴۶۲۔ کیفی، محمد ذکی، ''کیفیات''، ادارۂ اسلامیات، لاہور، ۱۴۰۸ھ، ص۲۷۳

۴۶۳۔ ایضاً،ص۲۴۳

۴۶۴۔ ایضاً،ص۳۱۱

۴۶۵۔ ایضاً،ص۳۱۵

۴۶۶۔ ایضاً،ص۳۱۷

۴۶۷۔ ایضاً

۴۶۸۔ لکھنوی، صہبا، مشمولہ: ماہ نامہ ''افکار''، مارچ ۱۹۷۲ء،ص۴۶

۴۶۹۔ ایضاً

۴۷۰۔ لکھنوی، صہبا، مشمولہ: ماہ نامہ ''فنون''، لاہور، اپریل مئی ۱۹۷۲ء،ص۳۵

۴۷۱۔ ایضاً

۴۷۲۔ خالد، عبدالعزیز، مشمولہ: ''اوراق''، لاہور، مارچ اپریل ۱۹۷۳ء،ص۸۸

۴۷۳۔ ایضاً

۴۷۴۔ ایضاً،ص۸۹

۴۷۵۔ احسان، محسن، ''ناگزیر''، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۸ء، ص۴۶

۴۷۶۔ ایضاً،ص۱۸۶

۴۷۷۔ ایضاً،ص۱۰۲

۴۷۸۔ ایضاً،ص۴۷۔۴۸

۴۷۹۔ ایضاً،ص۱۲۰۔۱۲۱

۴۸۰۔ ایضاً،ص۱۲۲

۴۸۱۔ نیر، ڈاکٹر طاہرہ، ''اردو شاعری میں پاکستانی قومیت کا اظہار''، ص ۴۰۸
۴۸۲۔ احسان، محسن، بہ حوالہ: ''اردو شاعری میں پاکستانی قومیت کا اظہار''، محولہ بالا، ص ۴۰۹
۴۸۳۔ کاظمی، اکبر، بہ حوالہ: ''اردو شاعری میں پاکستانی قومیت کا اظہار''، محولہ بالا، ص ۴۱۰
۴۸۴۔ کمال، اسلم، بہ حوالہ: ''اردو شاعری میں پاکستانی قومیت کا اظہار''، محولہ بالا، ص ۴۰۶۔۴۰۷
۴۸۵۔ ہاشمی، عدیم، بہ حوالہ: ''اردو شاعری میں پاکستانی قومیت کا اظہار''، محولہ بالا، ص ۴۰۶
۴۸۶۔ ہاشمی، عدیم، بہ حوالہ: روزنامہ ''مساوات''، لاہور، ۲۰ دسمبر ۱۹۷۱ء
۴۸۷۔ عالی، جمیل الدین، ''لا حاصل''، مکتبہ اسلوب، کراچی، ۱۹۸۴ء، ص ۹۹
۴۸۸۔ جعفری، ادا، ''غزالاں تم تو واقف ہو''، مقبول اکیڈمی، لاہور، ۱۹۸۸ء، ص ۱۱۶
۴۸۹۔ ایضاً، ص ۱۲۰
۴۹۰۔ ایضاً، ص ۱۲۹
۴۹۱۔ ایضاً، ص ۱۲۸
۴۹۲۔ شاکر، پروین، ''خوشبو''، غالب پبلشرز، لاہور، ۱۹۸۳ء، ص ۹۵
۴۹۳۔ ایضاً، ص ۱۶۶
۴۹۴۔ ایضاً، ص ۱۳۰
۴۹۵۔ صدیقی، ماجد، ''شاد باد منزل مراد''، نیشنل بک فاؤنڈیشن، کراچی، ۱۹۷۵ء، ص ۴۳۔۴۴
۴۹۶۔ فیض، فیض احمد، ''تعارف''، مشمولہ: ''شاد باد منزل مراد''، محولہ بالا، ص ۱۱
۴۹۷۔ صدیقی، ماجد، محولہ بالا، ص ۳۶
۴۹۸۔ حیدری، کرم، ''متاعِ شام و سحر''، مکتبہ المحمود، راول پنڈی، ۱۹۹۳ء، ص ۵۲
۴۹۹۔ ایضاً، ص ۵۶
۵۰۰۔ ایضاً، ص ۵۶۔۵۸
۵۰۱۔ اختر، صہبا، مشمولہ: روزنامہ ''مشرق''، کراچی، ۱۵ اگست ۱۹۷۲ء
۵۰۲۔ اختر، صہبا، مشمولہ: روزنامہ ''مشرق''، کراچی، ۲۵ دسمبر ۱۹۷۱ء
۵۰۳۔ اختر، صہبا، مشمولہ: ''فنون''، لاہور، جنوری فروری ۱۹۷۲ء، ص ۵۸
۵۰۴۔ ایضاً، ص ۵۸۔۵۹
۵۰۵۔ اختر، صہبا، مشمولہ: روزنامہ ''مشرق''، کراچی، ۸ جنوری ۱۹۷۲ء
۵۰۶۔ اختر، صہبا، مشمولہ: روزنامہ ''مشرق''، کراچی، ۲۵ دسمبر ۱۹۷۱ء
۵۰۷۔ ایضاً
۵۰۸۔ احمد، شہزاد، مشمولہ: ''فنون''، لاہور، اگست ستمبر ۱۹۷۲ء، ص ۱۵۹
۵۰۹۔ سلطان، رفعت، مشمولہ: روزنامہ ''امروز''، لاہور، ۱۲ جنوری ۱۹۷۲ء
۵۱۰۔ ایضاً
۵۱۱۔ سلطان، رفعت، مشمولہ: ماہ نامہ ''افکار''، کراچی، اپریل ۱۹۷۲ء، ص ۲۵
۵۱۲۔ ایضاً
۵۱۳۔ طاہر، جعفر، مشمولہ: ماہ نامہ ''فنون''، لاہور، دسمبر ۱۹۷۱ء، ص ۳۷
۵۱۴۔ طاہر، جعفر، مشمولہ: ''ماہ نو''، کراچی، فروری ۱۹۷۲ء، ص ۴۴
۵۱۵۔ طاہر، جعفر، مشمولہ: سہ ماہی ''اوراق''، لاہور، ستمبر اکتوبر ۱۹۷۳ء، ص ۱۲۸۔۱۲۹
۵۱۶۔ صدیقی، نعیم، مشمولہ: ''آئین''، لاہور، ۳۱ مئی ۱۹۷۲ء، ص ۲
۵۱۷۔ صدیقی، نعیم، مشمولہ: ''آئین''، لاہور، ۸ مارچ ۱۹۷۲ء، ص ۲
۵۱۸۔ صدیقی، نعیم، مشمولہ: ''آئین''، لاہور، ۳۱ مئی ۱۹۷۲ء، ص ۲
۵۱۹۔ صدیقی، نعیم، مشمولہ: ''آئین''، لاہور، ۸ مارچ ۱۹۷۲ء، ص ۲
۵۲۰۔ صدیقی، نعیم، ''پھر ایک کارواں لٹا''، میٹرو پرنٹرز، لاہور، ۲۰۰۳ء ص ۱۰۸۔۱۰۹
۵۲۱۔ صدیقی، نعیم، ''پھر ایک کارواں لٹا''، ص ۱۱۰۔۱۱۳
۵۲۲۔ صدیقی، نعیم ''پھر ایک کاروں لٹا''، ص ۱۱۸
۵۲۳۔ اطہر، ڈاکٹر غلام حسین، ''سید علی عباس زیدی''، مشمولہ: ماہ نامہ ''اردو ادب''، اسلام آباد، مئی جون ۱۹۹۵ء، ص ۷
۵۲۴۔ زیدی، علی عباس، ''دجلہ خوں''، ناشر ندارد، سن ندارد، ص ۱۸
۵۲۵۔ ایضاً، ص ۲۳
۵۲۶۔ ایضاً، ص ۱۹

۵۲۷۔ سہارن پوری، سرو، مشمولہ: ہفت روزہ ''چٹان''، لاہور، ۲۱ فروری۱۹۷۲ء،ص۲۲

۵۲۸۔ ایضاً

۵۲۹۔ علم، عبید اللہ، بہ حوالہ: ''اردو شاعری میں پاکستانی قومیت کا اظہار''، محولہ بالا،ص۳۹۴

۵۳۰۔ خاور، خاقان، ''بھنور کی آنکھ''، قرطاس پبلشرز، فیصل آباد، ۱۹۸۰ء،ص۵۲۔۵۵

۵۳۱۔ صبا، سبط علی، ''طشت مراد''، مجلس تصنیف و تالیف، واہ کینٹ، ۱۹۸۶ء،ص۴۹۔۵۰

۵۳۲۔ خاور، ایوب، مشمولہ: ماہ نامہ ''فنون''، لاہور، جون جولائی ۱۹۷۲ء،ص۶۷

۵۳۳۔ ایضاً

۵۳۴۔ گورداس پوری، اسلم، مشمولہ: روزنامہ ''مساوات''، لاہور، ۱۸ اگست۱۹۷۲ء

۵۳۵۔ ایضاً

۵۳۶۔ گورداس پوری، اسلم، مشمولہ: روزنامہ ''مساوات''، لاہور، ۱۵ اگست۱۹۷۲ء

۵۳۷۔ کنجاہی، روحی، مشمولہ: ''فنون''، لاہور، اپریل مئی۱۹۷۲ء،ص ۸۴

۵۳۸۔ صفی پوری، اقبال، مشمولہ: ''ماہ نو''، کراچی، مئی۱۹۷۲ء،ص۳۹

۵۳۹۔ ایضاً

۵۴۰۔ ایضاً

۵۴۱۔ بھوپالی، محسن، ''نئی کرن''، مشمولہ: ''ماہ نو''، کراچی، مارچ ۱۹۷۲ء،ص۵

۵۴۲۔ رومانی، شبنم، مشمولہ: ''ماہ نو''، کراچی، کارچ۱۹۷۲ء،ص۴۹

۵۴۳۔ ایلیا، جون، ''رجز''، مشمولہ: روزنامہ ''جنگ''، کراچی، ۲۸ نومبر ۱۹۷۱ء

۵۴۴۔ ایلیا، جون، ''استفسار''، مشمولہ: روزنامہ ''جنگ''، کراچی، ۲۸ دسمبر۱۹۷۱ء

۵۴۵۔ شائق، شرقی بن، مشمولہ: روزنامہ ''نوائے وقت''، لاہور، ۱۷ دسمبر۱۹۷۲ء

۵۴۶۔ ایضاً

۵۴۷۔ ایضاً

۵۴۸۔ آغا، وزیر، مشمولہ: ''اوراق''، لاہور، مارچ اپریل ۱۹۷۲ء،ص۱۲

۵۴۹۔ ضیائی، مسلم، مشمولہ: ''افکار''، کراچی، فروری۱۹۷۲ء،ص۲۳

۵۵۰۔ منیر، سید، ''بہ زیر شاخ گل''، اساطیر پبلشرز، لاہور، ۱۹۹۴ء،ص ۳۲

۵۵۱۔ ایضاً

۵۵۲۔ ایضاً،ص۳۳

۵۵۳۔ منیر، سید، ''دیباچہ''، مشمولہ: ''بہ زیر شاخ گل''، محولہ بالا،ص۱۰

۵۵۴۔ ایضاً،ص۷۶

۵۵۵۔ درّانی، انعام، ''بری گھڑی''، مشمولہ: روزنامہ ''جنگ''، کراچی، یکم نومبر۱۹۷۱ء

۵۵۶۔ درّانی، انعام، ''سر مقتل''، مشمولہ: روزنامہ ''جنگ''، کراچی، ۸ نومبر۱۹۷۱ء

۵۵۷۔ احمد، ریاض، ''دہانِ زخم''، مرتبہ اسلام رانا، ضیائے ادب، لاہور، ۱۹۸۳ء،ص۱۱۰

۵۵۸۔ ایضاً،ص۱۰۸۔۱۰۹

۵۵۹۔ کاظمی، مشیر، ''قائداعظم کی تربت پر''، مشمولہ: روزنامہ ''نوائے وقت''، لاہور، ۳۰ اپریل۱۹۷۲ء

۵۶۰۔ کاظمی، مشیر، مشمولہ: روزنامہ ''نوائے وقت''، لاہور، ۲۵ دسمبر ۱۹۷۳ء

۵۶۱۔ رحمانی، اعجاز، بہ حوالہ: ''اردو شاعری کی چند کلاسیکی اصناف''، محولہ بالا،ص۲۷

۵۶۲۔ تحسین، افضل، مشمولہ: ''ہلال''، راولپنڈی، ۲۱ اپریل۱۹۷۲ء، ص۱۵

۵۶۳۔ فگار، دلاور، بہ حوالہ: غیر مطبوعہ مقالہ ''اردو غزل کے عصری رویے''، از نثار احمد، محولہ بالا،ص۱۹۶

۵۶۴۔ فگار، دلاور، ''قائداعظم کے حضور میں''، مشمولہ: روزنامہ ''جسارت''، کراچی، ۲۴ نومبر۱۹۷۲ء

۵۶۵۔ ایضاً

۵۶۶۔ عالم، ابراہیم، ''اے دوست بہت یاد آتے ہو''، مشمولہ: روزنامہ

''مشرق''،۱۸فروری۱۹۷۲ء

۵۶۷۔ ایضاً

۵۶۸۔ عزمی، انوار،''قائداعظم کا پیام''،مشمولہ: روزنامہ''جسارت''، کراچی،۲۶دسمبر۱۹۷۲ء

۵۶۹۔ عزمی، انوار،مشمولہ: روزنامہ''جسارت''، کراچی، ۲۹ جنوری ۱۹۷۳ء

۵۷۰۔ ایضاً

۵۷۱۔ واصف، واصف علی،''شب چراغ''، کاشف پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۷ء،ص۴۰

۵۷۲۔ عقیل، شفیع،''آگ کا مدفن''، مشمولہ: روزنامہ''جنگ''، کراچی، ۱۴فروری۱۹۷۲ء

۵۷۳۔ عقیل، شفیع،مشمولہ:روزنامہ''جنگ''،کراچی،۱۲دسمبر۱۹۷۱ء

۵۷۴۔ نشاط، یونس،''آب جو آئینہ''، دستاویزات مطبوعات، لاہور، ۱۹۹۶ء،ص۲۷

۵۷۵۔ ایضاً،ص۲۸

۵۷۶۔ عالی،محمد جلیل،''میں لڑتا رہوں گا''،مشمولہ:ہفت روزہ''زندگی''، لاہور،۱۳تا۱۹مارچ،۱۹۷۲ء،ص۱۰

۵۷۷۔ ابن ادریس،مشمولہ:''امروز''،لاہور،۹جنوری۱۹۷۲ء

۵۷۸۔ ایضاً

۵۷۹۔ نیاز،محمد،مشمولہ:روزنامہ''جسارت''،کراچی،۲۱نومبر۱۹۷۲ء

۵۸۰۔ حسین،سید مجاور،''اردو شاعری میں قومی یک جہتی کے عناصر''، اتر پردیش اردو اکیڈمی،لکھنؤ،۲۰۰۴ء،ص۴۴۹

۵۸۱۔ پرتاب گڑھی،نازش،''نیا ساز نیا انداز''،اتر پردیش اردو اکیڈمی، لکھنؤ،۱۹۸۰ء،ص۱۴۰

۵۸۲۔ ایضاً،ص۳۳۶

۵۸۳۔ اعظمی، کیفی، ''کیفیات''، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۱۲ء،ص۳۳۴

۵۸۴۔ اعظمی،کیفی،''فرد''،مشمولہ:''آج کل''،دہلی،جنوری۱۹۷۲ء،ص ۱۸

۵۸۵۔ مچھلی شہری،سلام،''وسعتیں''،مکتبہ اردو،لاہور،سن ندارد،ص۱۱۸

۵۸۶۔ یعقوب،قاسم،''اردو شاعری پر جنگوں کے اثرات''،محولہ بالا،ص

۱۹۸۔۱۹۹

۵۸۷۔ اشرف، زاہد،''کیا مشرقی پاکستان کے عوام علاحدگی چاہتے تھے؟''،مشمولہ:''المنبر''، لائل پوری،مشرقی پاکستان نمبر، دسمبر جنوری۱۹۷۲ء،ص۱۹۔۲۵

۵۸۸۔ سالک صدیق،''میں نے ڈھاکا کا ڈوبتے دیکھا''،محولہ بالا،ص ۱۲۴

۵۸۹۔ ریاض، فہمیدہ،''ادھورا آدمی''، دارالاشاعت، لاہور،۱۹۷۲ء، ص۹۲

باب ہشتم:

اردو شاعری کا سانحاتی منظر نامہ: بیسویں صدی کا ربع آخر

کراچی: تاریخ، ہجرت، سیاسی رسا کشی اور انتشار

سندھ کے سیاسی، سماجی اور اقتصادی معاملات پر نظر رکھنے والوں کو اس بات کا پوری طرح ادراک ہے کہ قیامِ پاکستان کے چند ہی برسوں بعد حکمران طبقے کی مخصوص پالیسیوں کے نتیجے میں سندھ کے اندر ایک مخصوص قسم کی بے چینی اور انتشار نے جنم لینا شروع کر دیا تھا۔ اس بے چینی نے ون یونٹ کے دوران اندر ہی اندر ایک پکتے ہوئے لاوے کی شکل اختیار کر لی تھی[1]۔ بہ نظر غائر دیکھا جائے تو یہ بات پوری طرح عیاں ہو جائے گی کہ سندھ کے دوسرے طبقوں اور گروہوں مثلاً اردو بولنے والے مہاجروں، پنجابی آباد کاروں اور پٹھان محنت کشوں کے گوناگوں مسائل سے قطع نظر، خود سندھیوں میں احساسِ محرومی بھی کوئی سادہ اور بسیط شے نہیں بلکہ بہت سی مختلف النوع محرومیوں اور بے چینیوں کا معجون مرکب ہے جو کئی تہوں اور متعدد سطحوں پر مشتمل ہے[2]۔ سندھ کا منظر نامہ ایک ایسی تصویر پیش کرتا ہے جس پر بے یقینی اور تشکیک کی دبیز دھند چھائی ہوئی ہے۔ قومیتوں کے تانوں بانوں نے ایسے جال بُن رکھے ہیں کہ انھیں دیکھ کر ایک عجیب سے خوف کا احساس پورے جسم میں سرائیت کرنے لگتا ہے۔ یہ تصویر دھندلاہٹ سے آگے بڑھ کر طوائف الملوکی، بد انتظامی، افراتفری، فتنہ و فساد، رشوت ستانی اور قانون شکنی کے ہیولوں میں تبدیل ہو کر دہشت گردی اور قتل و غارت گری کی صورت میں پورے معاشرے کا حصہ بن جاتی ہے۔

کسی علاقوں کے باشندوں میں قوم پرستی کے جذبات زمین یا قوم کی وجہ سے نہیں ابھرتے بلکہ ان کے پس منظر میں اندرونی و بیرونی خطرات، ان کی ضروریات اور مفادات ضرور کارفرما ہوتے ہیں۔ ان مفادات کی وجہ ہی سے معاشرے کے بکھرے ہوئے مختلف سماجی گروہ متحد ہوتے ہیں۔ سندھ میں پہلے اوّلین قوم پرستی کی ابتدا سندھی ہندوؤں سے ہوئی۔ جب انگریزی فتح کے بعد وہ تالپور حکمرانوں سے آزاد ہوئے اور پہلی بار انھیں احساس ہوا کہ بحیثیت اقلیت وہ اب اکثریت کے تابع نہیں۔ بعد کے دنوں میں ان کی تجارتی صلاحیتوں کے پنپنے کا بھرپور موقع ملا۔ برطانوی تحفظ میں اپنی تجارت کو انھوں نے سندھ کے باہر تک پھیلانا شروع کیا۔ تمام برطانوی نو آبادیوں میں ہندوؤں نے تجارتی مراکز کھولے جن کے نتیجے میں سندھ کے مختلف شہر مثلاً حیدر آباد، شکارپور، لاڑکانہ، میرپور خاص اور نواب شاہ وغیرہ سندھ کے جدید ثقافتی شہر بن کر ابھرے۔ خوش حالی اور تعلیم کی وجہ سے انھوں نے تہذیب و تمدن میں ترقی کی اور اس کا اظہار شہروں میں کتب خانوں، باغات اور سماجی کلبوں کی شکل میں ظاہر ہوا۔ ان ہندو تاجروں کی سرگرمیوں سے سندھ کی شہری زندگی میں انقلاب برپا ہوا۔ جدید طرز کی تعمیرات اور صاف ستھری کشادہ سڑکوں نے ان شہروں کے حسن کو بڑھایا۔ تعلیم اور خوش حالی کی وجہ سے سندھی ہندو عورتوں کا سماجی رتبہ بھی بلند ہوا اور

خواتین بھی سماجی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے لگیں۔ برطانوی حکومت کے نتیجے میں تصویر کا ایک رخ تو یہ ہے کہ سندھی ہندوؤں میں بیداری کی جو لہر پیدا ہوئی اس نے شہری کلچر کو فروغ دیا۔ اس کے برعکس مسلمان زمین دار اور ہاری شہروں سے دور دیہاتوں میں رہائش پذیر رہے۔ نہ ان میں جدید تعلیم آئی اور نہ ہی اس جدید تبدیل شدہ کلچر سے انھوں نے کچھ سیکھا۔ بظاہر یہ فرق دیہی پس ماندہ اور شہری تعلیم یافتہ لوگوں کا فرق دکھائی دیتا ہے لیکن بعد کے آنے والے دنوں میں مذاہب کے فرق نے اسے مذہبی رنگ میں تبدیل کر دیا۔ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ حیدر آباد سندھ میں ہندوؤں کے ایک محلّے "ہیر آباد" جو اپنے وقت کا زبردست فیشن ایبل اور جدید ترین علاقہ تصور کیا جاتا تھا، وہاں پانچ بجے کے بعد مسلمانوں کو داخلے تک کی اجازت نہیں تھی[۳]۔ تاریخ سندھ کے بغور مطالعے سے یہ بات پوری طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ سندھ کی عمومی بے چینی اور عمومی اضطراب کا سب سے گہرا اور بنیادی سبب وہ ظالمانہ اور استیصالی سیاسی و معاشی نظام ہے جو بالعموم پورے ملک پر مسلّط ہے اور جس کے نتیجے میں پوری پاکستانی قوم شدید قسم کی افقی تقسیم اور محاذ آرائی (Horizontal Polarization) کا شکار ہو گئی ہے۔ اسی لیے پورے ملک میں بالعموم اور سندھ میں بالخصوص ظالم و مظلوم، قاہر و مقہور اور جابر و مجبور کی تقسیم بہت نمایاں طور پر دکھائی دیتی ہے۔ طبقاتی تقسیم نے اس خلیج کو بڑھانے میں اہم کردار ادا کیا۔ مستکبرین (Aristocrats)، مستضعفین (Oppressed) کے علاوہ مستحصِلین (Exploiters) اور مستحصَلین (Exploited) کے مستقل طبقات کی آویزش اور ردعمل یوں تو کم و بیش پورے ملک میں موجود ہے لیکن بوجوہ اس کی شدت اور تلخی سب سے زیادہ صوبہِ سندھ میں محسوس کی جاسکتی ہے۔ اس کا تاریخی پس منظر یہ ہے کہ اولاً خود سلطنت مغلیہ کی اساس از منہ وسطیٰ کے اس ظالمانہ جاگیر داری نظام پر قائم تھی جو پوری دنیا میں صدیوں سے رائج تھا۔ پھر جب وہ کمزور پڑ گئی اور برعظیم پاک و ہند کے طول وارض میں طوائف الملوکی کا دور دورہ ہوا تو "جس کی لاٹھی اس کی بھینس" کا قانون مزید گھناؤنی صورت میں نافذ ہو گیا اور ہر جگہ جتھے داروں اور قبائلی سرداروں نے اپنی اپنی حکومتیں قائم کر لیں۔ اس کے بعد انگریزوں کے دورِ حکومت میں کمال حکمت عملی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسی نظام کو اپنے جبر و استیصال کا ذریعہ بنایا اور مقامی وڈیروں، جاگیرداروں اور سرداروں کے مابین رابطے کے لیے ایک مضبوط اور مستحکم سول سروس قائم کی جو اکثر و بیشتر ایسے لوگوں پر مشتمل ہوتی جو رنگ اور شکل و صورت کے اعتبار سے تو ہندوستانی تھے لیکن ذہن و فکر اور تہذیب و تمدن کے اعتبار سے خالص انگریزی بن گئے تھے[۴]۔ محمود رضویہ کے مطابق سر چارلس نیپیئر فاتح سندھ نے فخریہ کہا تھا کہ "ہم کو سندھ پر قبضہ کرنے کا کوئی حق نہیں تھا، تاہم قبضہ کر ہی لیا اور یہ ہماری مکاری اور دغابازی کا ایک مفید کرشمہ ثابت ہوا"[۵]۔

بلاشبہ وادیِ سندھ کے پیچیدہ اور الم ناک حالات، انتشار اور انارکی کی ایک طویل تاریخ اور معاشی اور سیاسی پس منظر رکھتے ہیں۔ جن کا تفصیلی جائزہ معاصرانہ حقائق کو مکمل تناظر اور عواقب میں سمجھنے کے لیے اشد ضروری محسوس ہوتا ہے، لیکن موضوعاتی محدودات کے پیش نظر[۶] انتہائی مختصر جائزہ یہاں پیش کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ سندھ کی تاریخ اور سیاسی و سماجی

حالات پر لکھی گئی متعدد کتب میں اعجاز الحق قدوسی کی ''تاریخ سندھ'' کا مطالعہ کافی سود مند ثابت ہو سکتا ہے[7]۔ اس کے علاوہ سید مظہر جمیل نے اپنی تصنیف ''آشوب، سندھ اور اردو فکشن'' کے ابتدائی صفحات میں مختصراً ان تمام حکمرانوں کی تفصیلات فراہم کرنے کی کوشش کی ہے جو مختلف وقتوں میں یہاں قابض رہے[8]۔ سندھ پر انگریزوں کی عمل داری ۱۷ فروری ۱۸۴۳ء میں جنگ میانی کی فتح کے بعد مکمل ہو سکی۔ یہ جنگ میر پور خاص اور حیدر آباد کے امیر میر محمد خاں اور انگریزوں کے مابین لڑی گئی تھی جس میں سندھی فوج کے سردار ہوش محمد خاں شیدی جو عرف عام میں جنرل ہوشو کے نام سے معروف تھے، نے ''مرسوں مرسوں سندھ نہ ڈے سوں'' کا دلیرانہ نعرہ لگایا اور بلاآخر اسی لڑائی میں شہادت پائی۔ سندھ میں انگریزوں کی فتح کا بڑا سبب انگریزوں کی بہتر اور منظم فوجی حکمت عملی تو تھی ہی البتہ تالپوروں کی انتہائی غیر منظم فوج، افراتفری اور بدنظمی نے بھی انگریزوں کی فتح کی راہ ہموار کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ اس کے علاوہ بعض غدارانِ سندھ کی مفاد پرستی اور ابن الوقتی نے بھی فیصلہ کن کردار ادا کیا جنھوں نے انگریزوں کے لیے جاسوسی کے فرائض انجام دیے[9]۔ غلام محمد لاکھو کے مطابق سندھ کی تہذیب، تاریخ اور قومی یادداشت میں جنگ میانی کو وہی اہمیت حاصل ہے جو شمالی ہندوستان میں جنگ پلاسی کو رہی۔ یہی وہ فیصلہ کن جنگیں تھیں جن میں فتح حاصل کرنے کے بعد انگریزی اقتدار کا قیام ممکن ہو سکا[10]۔ کرنل کیتھ (Colonel Keith) اپنی تصنیف ''Sindh in Forties'' میں لکھتے ہیں کہ میں نے سر چارلس کی تصنیف کردہ کتاب ''Sight & Shadows of Military Life'' کا مطالعہ کیا۔ اس میں چارلس نیپیئر نے واضح طور پر یہ اعتراف کیا ہے کہ ہمارا ہندوستان پر قبضہ کرنے کا مقصد اور تمام بے رحمیوں کا مدعا حصولِ زر تھا''[11]۔ کیتھ کا کہنا ہے کہ اس قسم کی ہر شلنگ خون سے رنگیں ہے اور اس کو صاف کر کے قاتل انگریز نے اپنی جیب میں ڈال لیا۔ اس عمل کو جنرل اوٹ رم General Out Ram نے بھی سخت مذمت کی لیکن اس حق گوئی کو بھی لارڈ آرک لینڈ وغیرہ نے کوئی وقعت نہ دی بلکہ یہ کہنا درست ہو گا کہ حریص ایسٹ انڈیا کمپنی کے حصے دار اس صورتِ حال پر خوش ہوتے رہے اور آک لینڈ اور چارلس نیپیئر کی خدمات کو خوب سراہا[12]۔ ۱۸۴۳ء میں جس وقت تالپوروں نے سندھ انگریزوں کے حوالے کیا تب یہاں کی آبادی جو کلہوڑہ کے دور میں تیس لاکھ تک تھی، گھٹ کر آدھی رہ گئی۔ برطانوی ایلچی پوٹنجر نے سندھ میں ''جبری لوٹ (Extortion)، جہالت اور ظلم و تعدی'' کا ایسا رواج پایا جس کی مثال شاید تاریخ عالم میں کہیں نہ مل سکتی تھی۔ ان خامیوں کے باوجود اس دور کے مؤرخین مثلاً ایسٹوک کو لاہور کے دربار میں سال بھر میں جتنا جرم دکھائی دیا، اتنا تالپوروں کے ساٹھ برس میں نہیں ہوا تھا[13]۔ لیمرک نے لکھا کہ ''دریائے سندھ سے دریائے فرات تک کسی بھی ریاست کے مقابلے میں سندھ کو تہذیبی طور پر خاصا ترقی یافتہ کہا جا سکتا ہے''[14]۔ ڈاکٹر برنس کے مطابق ''وزیر اعظم ولی محمد خاں لغاری کی ذات میں ایک ''نشاۃ الثانیہ'' کے نمونے کا متنوع جینئس موجود تھا''[15]۔ ٹھٹھے میں انگریزوں کا منافع بخش کاروبار جاری تھا۔ فرانسیسیوں اور روسیوں کی بڑھتی ہوئی پیش قدمی سے انگریز پہلے ہی متفکر تھے لہٰذا ابتدأ ۱۸۰۷ء میں Tilsit میں فرانس اور روس کے معاہدے نے اس تشویش کو اور

بھی بڑھاوا دیا۔ برطانیہ نے سندھ، کابل، ایران اور جودھ پور میں ایلچی بھیجے یہاں تک کہ ۱۸۱۹ء میں کچھ علاقوں پر تسلط بھی جمالیا۔ اس کے بعد کے ادوار میں وہ میروں کو ایک کے بعد ایک غیر مساویانہ معاہدے تسلیم کرنے پر مجبور کرتے رہے کیوں کہ میروں میں مزاحمت کی طاقت نہیں تھی۔ ۱۸۲۰ء میں تو یہ صورتِ حال ہوگئی کہ برطانویوں نے میروں کو اس بات کا پابند کیا کہ وہ امریکیوں اور دیگر یورپی لوگوں کو سندھ میں داخل نہ ہونے دیں۔ دریائے سندھ پر جہاز رانی کے حقوق بھی انھوں نے جبراً حاصل کر لیے۔ اُدھر رنجیت سنگھ جو سندھ پر قبضے کا خواہش مند تھا شکار پور کو شاہ شجاع پہلے ہی سکھوں کے حوالے کر چکا تھا۔ انگریزوں نے پندرہ لاکھ کے عوض سکھوں سے شکار پور واپس لے لیا۔ گورنر جنرل آکلینڈ نے میروں کے ساتھ ''آزاد حکمرانوں'' کا برتاؤ کرنے کا جو فیصلہ کیا اس سے تالپوروں پر کاری ضرب لگی۔ ہندو ویسے ہی یہاں دوسرے درجے کے شہری تھے لہٰذا حیدر آباد کے میدانوں میں برطانوی پرچم لہراتا دیکھ کر وہی سب سے زیادہ خوش ہوئے[۱۶]۔ اس زمانے میں مشہور ہندو تاجر ناؤمل نے پوٹنجر کے مطابق ''برطانوی فوجوں کے ہاتھوں اور پیروں کی سی اہمیت اختیار کر لی''[۱۷]۔ سیٹھ ناؤمل ہوت چند نے اپنی خود نوشت سوانح Memoirs of Seth Nawmal Hotchand میں تالپوروں کے قبضے کا احوال بڑی تفصیل سے درج کیا ہے[۱۸]۔ اس دور کی تاریخ کا مطالعہ ہمیں کافی حد تک ان بین الاقوامی سازشوں اور اندرونی بیرونی خلفشار سے واقف کرانے میں کام یاب رہتا ہے جو بعد میں سندھ پر برطانوی تسلط پر جاکر منتج ہوئی۔

افغانستان میں برطانوی فوج کی شکست کے بعد کسی اور جگہ فتح حاصل کر کے اس شکست کا ازالہ ضروری تھا، لہٰذا اس مشق کے لیے سندھ کا انتخاب کیا گیا۔ الفنسٹن نے اسی بابت بڑی ہی دل چسپ بات کہی کہ افغانستان میں شکست کے بعد سندھ پر چڑھائی ''بالکل اسی زور آور سے مشابہہ ہے جو گلی میں مار کھانے کے بعد گھر جائے اور بیوی کو پیٹ ڈالے''[۱۹]۔ برطانوی راج میں سندھ کو بمبئی ریزیڈنسی کے ماتحت کر دیا گیا۔ انگریزوں نے سندھ پر اقتدار قائم کر لینے کے باوجود مروّجہ طرزِ معیشت اور سماجی ڈھانچے کو تبدیل کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ جس قسم کی تبدیلی پنجاب، بنگال، یوپی اور ہندوستان کے دیگر علاقوں میں جاری تھی، سندھ میں اس کے کوئی آثار دکھائی نہیں دیے۔ البتہ ذرائع آمد و رفت، ریلوے لائن کی تعمیر، سرکاری املاک کا سروے، معدنی وسائل کی دریافت، آمدن کے ذرائع، انتظامی امور اور دفاتر کے علاوہ شہری نظم و نسق میں باقاعدگی پیدا کرنے کی نمایاں کوششیں ضرور ہوئیں۔ لیکن ان تبدیلیوں کے پیچھے خود انگریزوں کی اپنی ضرورتیں اور احتیاج کو اوّل اوّل پیش نظر رکھا گیا۔ دوسری طرف مغلیہ دور کی باقیات مثلاً جاگیر دارانہ نظام کا تحفظ اور قبائلی سرداروں اور گدی نشینوں کی حمایت کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ کمپنی بہادر کی حکومت کے قیام اور استحکام میں مدد اور تعاون فراہم کرنے والوں کو اسناد وفاداری، خطابات اور انعام و اکرام سے نوازا گیا۔ اس طرح تاج برطانیہ کے وفادار حلیفوں پر مشتمل ایک موئثر اور طاقت ور طبقے کو سندھ کے عوام پر مسلط کر دیا

گیا۔ دن بہ دن یہ طبقہ زیادہ سے زیادہ معاشی وسائل پر قابض ہوتا چلا گیا۔ عام کسان اور غریب مزدور، ہاری وغیرہ مفلوک الحال، تنگ دست اور فاقہ کش ہوتے رہے[۲۰]۔

انگریزوں کی آمد سے قبل مجموعی قابل کاشت ایک لاکھ سترہ ہزار دو سو ہیکڑ اراضی پر محض گیارہ جاگیر دار قابض تھے جب کہ بقیہ بائیس ہزار ہیکڑ زمین پر پچیس قبائلی سردار مسلط تھے۔ دو لاکھ ہیکڑ اراضی پر تالپوروں کے سترہ خاندان براجمان تھے۔ انگریزوں نے اپنی آمد کے بعد ہندو جاگیر داروں کا نیا حلقہ پیدا کیا۔ اس سے قبل سندھ میں ہندوؤں کو مخصوص مقدار سے زائد جائیداد خریدنے کا اختیار نہیں تھا۔ نتیجتاً ہندوؤں میں زرعی جائیدادیں بنانے کی حوصلہ افزائی ہوئی۔ خود تاج برطانیہ سے وفا داری کے صلے میں بھی سرکردہ لوگوں کو بڑی بڑی لمبی چوڑی جاگیریں بخشی گئیں۔ رفتہ رفتہ یہ ہندو جاگیر دار قرضوں کی وصول یابی کے نام پر مسلمانوں کی جاگیروں پر قابض ہونا شروع ہو گئے اور سندھ کے معاشی اور سیاسی معاملات میں زبردست اثر ورسوخ پیدا کر لیا۔ ۱۹۲۰ء تک حکومت کے شائع کردہ اعداد و شمار کے مطابق سندھ میں متوسط درجے کے مسلمان کاشت کاروں کی تعداد ایک لاکھ ستائیس ہزار تھی۔ ان لوگوں کے پاس محض ۲۵ ایکڑ فی کس تک کی زمینیں تھیں۔ ۱۹۴۶ء تک ان زرعی زمینوں کی لگ بھگ ۷۰ فی صد اراضی مسلمانوں کے ہاتھوں سے نکل کر ہندو مہاجنوں کے ہاتھوں میں جا چکی تھی[۲۱]۔ اس صورتِ حال میں یہ اندازہ لگانا کوئی مشکل بات نہیں کہ انگریزوں کی آمد سے قبل اور بعد میں سندھی معاشرہ صدیوں سے مکمل طور پر جاگیر دارانہ جبر واختیار کی گرفت میں رہا ہے[۲۲]۔

اس کے علاوہ سندھ میں آج کل جس قسم کے سیاسی مسائل نے جنم لیا ہے اس کے ابتدائی نقوش بھی ہمیں اسی دور میں ملتے ہیں۔ ناؤمل ہوت چند نے اپنی یادداشت میں ایسے کئی واقعات درج کیے ہیں جن سے مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان ہونے والے مذہبی تنازعات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ۹۴-۱۷۹۳ء میں قلات کے خان کی طرف سے ملا شفیع علی خان نواب تھا۔ وہ اپنے مسلم عقائد پر اس قدر کاربند تھا کہ ایک بار ''دریاتھان'' نائی ہندوؤں کے مندر پر حملہ کر کے مندر اور ہندوؤں کے گھروں کے بیچ مسجد تعمیر کی جس سے ہندوؤں اور مسلمانوں میں خاصی کشیدگی رہی[۲۳]۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ ڈاکٹر غلام علی الانا جیسے صاحب فکر و نظر کا کہنا ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان نفاق کا بیج انگریزوں نے بویا[۲۴]۔ جب کہ حقیقت اس کے برخلاف ہے۔ انگریزوں کے سندھ پر قبضے سے قبل ۳۲-۱۸۳۱ء میں نصرپور کے ایک ہندو مزدور کندا کے بیٹے کا واقعہ بیان کرتے ہوئے ناؤمل ہوت چند نے اپنی یادداشت میں لکھا کہ معمولی سا جھگڑا دونوں اقوام کے درمیان سخت کشیدگی کا باعث بنا کہ آس پاس کے شہروں مثلاً ٹھٹھہ، شاہ بندر، ٹنڈو، حیدرآباد اور ہالا وغیرہ تک کے مسلمانوں کی آنکھوں میں انتقام کی آگ جھلکنے لگی۔ رد عمل میں ہندوؤں نے بھی سندھ کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک احتجاج شروع کر دیا[۲۵]۔ یہ اور اس طرح کے کئی اور واقعات ایسے ہیں جن کی تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں۔ البتہ سندھ پر پورودلی حملہ آوروں کی شکل میں جن اقوام نے اپنی حریص نظریں

گاڑھیں اور جن کا ذکر اس دور کے سندھی شعرا کے یہاں ملتا ہے جیسے شاہ عبداللطیف بھٹائی (۱۶۸۹ء۔ ۱۷۵۲ء) نے اپنی ابیات میں فرنگیوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

دنگي وچ درياه، ڪي ٻڏي ڪي اُپڙي
هوجي واڍي واٽيا، سي سونهڻ سپ سڙيا
معلم ماڳ اڳئيين، قلنگي منجھ ڦريا
ملاح تنهنجي مڪڙي اچي چور چڙهيا
جتي دينگ دريا، تتي تاري تنهنجي[۲۶]

یعنی اے ملاح! تیری کشتی دریا کے اندر بڑے خطرے میں ہے / وہ ہوا کے دباؤ سے کبھی لہروں کے اندر چھپ جاتی ہے / تو کبھی پانی کی سطح کے باہر ہو جاتی ہے / تیری کشتی پرانی ہو گئی ہے / آری نے لکڑی کے جو کیل بنا کر تختے جوڑے تھے وہ کیل سب پرانے ہو گئے ہیں اور گل گئے ہیں / دریائی لٹیروں یعنی فرنگیوں نے کشتی پر حملہ کر دیا ہے اور ان حملوں کی وجہ سے معلم اپنی جگہ سے ہٹ گئے ہیں / اے ملاح! تیری کشتی پر بحری قزاقوں نے حملہ کر دیا ہے / اے میرے مولا! میں خطرناک حالات میں تیرے آسرے پر ہوں کیوں کہ بڑے بڑے جہاز بھی ان حملوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے / اور ڈوب گئے[۲۷]۔

ظاہر سی بات ہے کہ شاہ عبداللطیف بھٹائی جب ان فرنگیوں کی بڑھتی ہوئی جارحیت کی بابت اپنی شاعری میں اظہار کرتے تھے، اس سے بہت پہلے مغربی اقوام خصوصاً پرتگیزوں نے سندھ پر حملے شروع کر دیے تھے۔ سندھ کی سیاست میں پرتگیزوں کی پہلی سیاسی مداخلت کا زمانہ ۱۵۵۵ء کا ہے جب ٹھٹھے کے حاکم مرزا عیسیٰ خان نے بکھّر (شمالی سندھ) کے حاکم سلطان محمود کے خلاف پرتگیزوں سے مدد مانگی تھی اور اس کے عوض خطیر رقم دینے کا وعدہ کیا تھا۔ پرتگیزوں کی مدد پہنچنے سے قبل ہی دونوں کی صلح ہو گئی۔ نتیجتاً مرزا عیسیٰ نے پرتگیزی سپہ سالار پیڈرو کو واپس جانے کو کہا اور رقم دینے سے انکاری ہوا۔ رقم کی ادائیگی نہ ہونے پر پیڈرو نے ٹھٹھہ کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ شہر پر پرتگیزی لشکر لوٹ مار کرتے رہے۔ بعد میں پورے شہر کو آگ لگا دی۔ اس سانحے میں آٹھ ہزار افراد قتل ہوئے، لاکھوں کی املاک نذر آتش ہوئی۔ ایٹکن لکھتا ہے کہ "اس حادثے سے پہلے ایشیا میں ایسی لوٹ مار کبھی نہیں ہوئی تھی"[۲۹]۔ سندھ میں علاقائیت اور قومیت پروان چڑھنے کا ایک بڑا سبب وہ استیصال بھی ہے جو گزشتہ صدیوں کے دوران سندھ کے وڈیروں کے ساتھ ساتھ بیرونی حملہ آوروں اور بیرونی علاقوں سے آتے ہوئے غیر سندھیوں نے روا رکھا۔ تعلیم کے میدان میں سندھ کے مسلمان دوسرے علاقوں کے مقابلے میں بہت زیادہ پیچھے رہ گئے۔ اس کی بنیادی وجہ بھی وہ جاگیر دار اور زمیں دار طبقہ تھا جو نہ صرف خود علمی سرگرمیوں سے بے بہرہ تھا بلکہ ترویج علم کو بھی اپنے حشم و اقتدار کے

لیے مہلک اور خطرناک سمجھتا تھا۔ یہ جاگیر دار طبقہ اس قدر جابر مطلق العنان تھا کہ ان کے حکم پر ان کی رعیت میں رہنے والا عام آدمی سانس لینے کی جرات بھی نہیں کر سکتا تھا[۲۹]۔ یہ درست ہے کہ بڑے پیمانے پر سندھیوں کو معاشی اور معاشرتی اعتبار سے پسماندہ رکھنے میں ہندوؤں اور انگریزوں کا کردار بہت گھناؤنا رہا ہے لیکن خود اس دھرتی سے تعلق رکھنے والے وڈیروں نے جو سلوک روا رکھا وہ بھی کچھ کم قابل مذمت نہیں۔ ہاری کے روزگار کا پورا انحصار وڈیرے کی زمین پر ہوتا۔ پولیس، چوروں اور ڈاکوؤں کے ساتھ وڈیرے کی سازباز ہوتی اس لیے ہاری اس کے علاوہ کسی اور کو ووٹ دینے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ اگر غلطی سے کسی نے وڈیرے کے خلاف علم بغاوت بلند کیا اور اپنے حق کی بات کی تو سب سے پہلے اسے معاشی طور پر تباہ کر دیا جاتا۔ اس کی زمینیں چھین لی جاتیں۔ چوروں اور ڈاکوؤں کے ذریعے اس کے مال مویشی چوری کروا لیے جاتے۔ پولیس کے ذریعے اس پر غلط مقدمات درج کر کے گرفتار کرایا جاتا۔ ظلم کی انتہا یہ ہوتی کہ اس کی بیوی اور جوان بچیوں تک کو اغوا کر لیا جاتا۔ سندھ کا وڈیرہ اس قدر تنگ نظر اور تنگ دل ثابت ہوا ہے کہ تاریخ میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔ اس کی ہمیشہ سے یہ کوشش ہوتی کہ ہاری کی اولاد در اولاد نسل در نسل اس کی غلام رہے[۳۰]۔ اب اس صورتِ حال میں یہ کیوں کر ممکن ہوتا کہ سندھ کے عام لوگ اپنے حقوق کے لیے آواز بلند کرتے۔ نتیجتاً وہ صدیوں سے ظلم کی چکی میں پستے رہے اور کم و بیش آج بھی یہ سلسلہ جاری ہے۔

اس سے قبل کہ سندھ کے دارالخلافہ کراچی کی تاریخ اور اس شہر میں رونما ہونے والے سانحات سے متعلق ہونے والی شاعری کا جائزہ لیا جائے ضروری ہے کہ مختلف ادوار میں سندھ خصوصاً کراچی کی آبادی کے مختلف گروہ اور اس شہر کے سیاسی، سماجی اور معاشی منظر نامے کا مختصر حال بھی یہاں بیان کیا جائے۔

سندھ اپنے جغرافیائی محل وقوع کی وجہ سے ہمیشہ حملہ آوروں کی زد میں رہا۔ ان حملہ آوروں کی اکثریت شمالی سرحدی علاقوں سے درۂ بولان، گومل، ٹوچی، کُرم اور خیبر کے راستوں سے آئی تھی۔ شمالی ہندوستان میں ترکوں اور مغلوں کی حکومت قائم ہونے کے بعد یہ بھی سندھ کو اپنے ماتحت رکھنے کی خاطر حملے کرتے رہے۔ حملہ آوروں کی کامیابی کا ایک بڑا سبب یہ تھا کہ سندھ کے اکثر حکمراں خاندانوں کا تعلق باہر کے ممالک سے تھا۔ ان کا تعلق سندھ کی آبادی سے نہ ہونے کے برابر تھا۔ فاتح ہونے کی حیثیت سے وہ خود کو افضل و برتر سمجھتے تھے۔ رعیت کے ساتھ سخت گیری کا رویہ تھا۔ فوج کی سختی، عمال کی رشوت ستانی اور عدم تحفظ کی وجہ سے رعایا خود کو بے یار و مددگار سمجھتی تھی۔ سندھ کی تاریخ کا یہ المیہ رہا کہ ان غیر ملکی خاندانوں نے مقامی باشندوں کے ساتھ نہ صرف ناروا سلوک رکھا بلکہ ہر صورت میں انھیں آگے بڑھنے سے روکا اور ان کی صلاحیتوں کو کبھی بھی ابھرنے کا موقع نہیں دیا۔ ارغون، ترک خان، مغل، کلہوڑہ اور تالپوروں کے دور میں یہاں ان لوگوں کو پذیرائی ملتی جو وسط ایشیا، ایران، افغانستان یا شمالی ہندوستان سے آتے تھے یا جن کی مادری زبان فارسی ہوتی۔ مسلسل محکومیت نے ان مقامی سندھیوں کے جذبات اور امنگوں کو ختم کر دیا۔ ان حالات میں جاگیر دار طبقے نے عوام کو محض استیصال کا ایک ذریعہ سمجھ لیا اور ان کے مسائل بھی

بڑھتے رہے۔ ان کے دکھوں، تکالیف اور اذیتوں میں روز بروز اضافہ ہوتا چلا گیا۔ غربت، مفلسی، ناداری، مجبوری، بیماری، جسمانی کمزوری، ظلم و ستم اور ڈر خوف اس معاشرے کی خصوصیات بن گئیں۔ عوام میں اعتماد کا فقدان ہو گیا اور رد عمل کے طور پر تصوف میں پناہ لینے کا رویہ عام ہوا۔ مقابلے کے بجائے برداشت کرنے کی تبلیغ عام ہوئی۔ جگہ جگہ پیروں اور ولیوں کے مزارات، عوام کی مرادوں اور تمناؤں کا محور و مرکز بن گئے [۱۳]۔ اس صورتِ حال میں معمولی سی تبدیلی انگریزی حکومت کے قیام کے بعد آئی۔ گو کہ انگریزوں نے اس پرانے نظام کو جاری رکھا لیکن سماجی اور تعلیمی سطح پر کسی حد تک تبدیلی کے آثار نمایاں ہونے شروع ہوئے۔ ۱۸۴۲ء میں چارلس نیپیر سندھ میں برطانوی فوج کے کمانڈر انچیف مقرر ہوئے [۳۲]۔ وہ نپولینی جنگوں میں ڈیوک آف ولنگٹن کا پسندیدہ جونیئر افسر رہا تھا۔ اب اسے بمبئی اور بنگال کی فوج کا کمانڈر بنا کر سندھ فتح کرنے کے لیے بھیجا گیا۔ اس کے سندھ میں آنے کا مقصد محض ''ایک لاکھ روپیہ حاصل کرنا'' تھا تاکہ اپنی تین بیٹیاں بیاہ سکے۔ اسی لیے وہ نہایت جلد سندھ کو فتح کر لینا چاہتا تھا۔ میر اس کی زبردستیوں اور زیادتیوں کی شکایت ہی کرتے رہ گئے۔ برطانوی پولیٹیکل ایجنٹ آؤٹرام کی صبر کی تلقین بھی بے سود گئی، خود نیپیر کا کہنا تھا کہ:

''ہمیں سندھ پر قبضہ کرنے کا کوئی حق نہیں ہے، مگر ہم ایسا ضرور کریں گے۔ اور یہ بے حد سود مند، کار آمد اور درد مندانہ بدمعاشی ہوگی'' [۳۳]۔ ابتدا میں نیپیر کو کراچی کی اہمیت کا خیال تک نہ تھا۔ مگر بعد میں انجینئروں اور سیاسی مدبروں نے ایک رپورٹ تیار کر کے لارڈ آک لینڈ کو بھیجی۔ اس کے بعد کراچی کو کمپنی کی مقبوضات کا جز قرار دیا گیا اور نیپیر کو اس کا پہلا گورنر مقرر کیا گیا [۳۴]۔ اس نے سندھ کو فتح تو کر لیا لیکن اس فتح میں جس دھاندلی اور چیرہ دستی سے کام لیا گیا، اس نے ہندوستان اور انگلستان میں مقیم نفیس مزاج انگریزوں کو سخت صدمہ پہنچایا۔ سندھیوں نے تو خیر نیپئیر کا نام ہی ''شیطان کا بھائی'' رکھ دیا تھا۔ میروں نے اس کی شکایت کی غرض سے ملکہ وکٹوریا تک کو عرض داشت بھیجی لیکن کہیں اس کی شنوائی نہ ہوئی۔ ٹائمز لندن نے ۶ مئی ۱۸۴۳ء کی اشاعت میں ایک ادارتی مضمون شائع کیا جس میں ''لوٹ مار اور سرسری سزائے موت کے ایک سوچے سمجھے منصوبے'' کی مذمت کی گئی۔ ٹائمز بمبئی نے اسے ایک غیر دانش مندانہ جنگ قرار دیا۔ اس بابت نیپئر کی دلیل یہ تھی کہ سندھ کے بلوچ حکمران بھی غیر ملکی تھے لہٰذا اگر یہ جنگ ۱۸۴۳ء میں نہ بھی ہوتی تو ۱۸۵۳ء میں ضرور ہو جاتی [۳۵]۔

۲۴ نومبر ۱۸۴۲ء کو گورنر بمبئی کی جانب سے بھیجے گئے نئے معاہدے کے مسودے پر دستخط نہ کر کے گویا میروں نے جرأت کا مظاہرہ تو کیا تھا لیکن ان کی فوج میں وہ طاقت کہاں تھی کہ وہ انگریزوں سے پنجہ آزمائی کر سکیں۔ میرانِ حیدر آباد کے دل میں انگریزوں سے لڑائی یا مقابلے کا سوال تک نہ تھا بلکہ میجر اوٹرام نے تو سمجھا بجھا کر ان مطلوبہ علاقوں کی حوالگی کا تحریری معاہدہ بھی کر لیا تھا جن کی انگریزوں کو ضرورت تھی۔ لیکن میر رستم خاں کے دربدر ہو کر ریگستان میں مارے مارے پھرنے اور بلوچوں کو غیرت دلانے کے واقعے نے بختیار خاں لغاری تریاقی کو مقابلے پر اکسایا۔ اس نے انگریزوں سے مقابلے کی ٹھانی اور اس

سلسلے میں اپنے خاندان اور قبیلے والوں کو اپنا ہم نوا بنایا۔ سارے قبیلۂ لغاری نے متحد اور متفق ہو کر قرآن مجید پر قسم اٹھائی اور انگریزوں سے مقابلہ کرنے کا عہد کیا۔ لغاری قوم کے افراد یہ نعرہ لگاتے کہ:

"ایں ملک سندھ بمنزلہ مادر ما بلوچاں است۔ کہ از پستان شیر پیدائش آں پشت بہ پشت۔ پرورش یافتہ ایم حقوق مادر و پدر بر۔ اولاد بسیار است، نہایت جان را نثار۔ راہ خدمت ایں والدہ خواہم نمودا"[۳۶]۔

اس طرح انھوں نے اپنی دھرتی ماں پر اپنی جانیں نثار کرنے کا نہ صرف عہد کیا بلکہ تمام تر نصیحت آمیز باتوں کے باوجود وہ اپنے فیصلے پر قائم رہا کچھ انگریز چھاؤنیوں کو تباہ بھی کیا لیکن ۱۷ فروری ۱۸۴۳ء کو جب چارلس نپیئر کی قیادت میں انگریز فوج دریائے سندھ کے کنارے خیمہ زن ہوئی تو سوائے چند بلوچوں کے جن میں حاجی خدا بخش اور اس کے پچاس ساٹھ سوار مراد علی چانگ، نصیر خاں چانگ، حاجی غلام محمد خاں ٹالپر، مبارک خاں ٹالپر، میر غلام شاہ خلف میر محراب خاں ٹالپر اور میر جان محمد خان وغیرہ نے مردانہ وار لڑتے ہوئے سندھ دھرتی پر اپنی جان قربان کر دی۔ بعض بہادر بلوچ جو بندوقوں اور توپوں کی زد میں آنے سے بچ گئے تھے ان میں عبد اللہ خان نظامانی اور میر زا خان نظامانی نے شجاعت کے خوب جوہر دکھائے اور وطن کی حفاظت پر اپنی جان قربان کر دی۔ ساتھ ساتھ لغاری قبیلے سے محمد علی خاں لغاری، دریا خاں لغاری، غلام حیدر لغاری و دیگر بہت سے جان باز بھی اس جنگ میں شہید ہوئے۔ میانی جنگ میں بلوچوں کی شکست کے بعد ایک خط کے ذریعے میران حیدرآباد انگریزوں سے معافی کے خواست گار ہوئے۔ چارلس نپیئر نے شاطرانہ انداز میں اس کی درخواست قبول بھی کر لی اور جب میران حیدرآباد شاہانہ انداز سے چارلس نپیئر نے ملاقات کے لیے پہنچے تو سوائے میر نصیر خاں کے سب کو پہرے داروں کے ذریعے گھیرے میں لے لیا۔ ان کی گرفتاری کے بعد چارلس نپیئر کی پلٹن فاتحانہ انداز سے قلعہ حیدر آباد میں داخل ہوئی۔ میروں کے خزانوں، دفینوں اور توشک خانوں پر قبضہ جمالیا۔ لاکھوں روپے کے طلائی زیورات اور دیگر قیمتی سامان کے علاوہ دو کروڑ تیس لاکھ روپے نقد میروں کے توشک خانے سے انگریزوں کو حاصل ہوئے۔ ان واقعات کے دو ماہ بعد تک سندھ میں افرا تفری اور ابتری کا عالم رہا۔ چند روز تک میران، حیدر آباد میں قید رہے پھر جلا وطن ہو کر بمبئی لے جائے گئے۔ ان پر مختلف الزامات کے تحت مقدمات چلائے گئے۔ ۱۴ اپریل ۱۸۴۵ء کو میر محمد نصیر خاں کی رحلت اسی اسیری کے دوران ہوئی۔ بعض مؤرخین کا کہنا ہے کہ جلا وطنی اور ریاست سندھ ہاتھ سے نکل جانے کے غم کو وہ برداشت نہ کر پائے اور زہر کا پیالہ پی لیا جس کی بنا پر ان کی موت واقع ہوئی[۳۷]۔ انگریزوں نے اس خاندان پر مظالم کے جو پہاڑ توڑے اس کا اندازہ اس عرض داشت سے بھی ہوتا ہے جو بیگمات میران حیدر آباد نے ملکہ وکٹوریا کے نام روانہ کی تھی۔ اس عرض داشت پر دستخط کرنے والی خواتین میں بیگم میر کرم علی خاں، بیگم نور محمد خاں، بیگم محمد نصیر خاں، بیگم میر صوبدار خاں اور بیگم میر محمد خاں شامل تھیں۔ اس عرض داشت کے مطابق نپیئر نے نہ صرف قیمتی جواہرات اور سامان کی لوٹ مار کی بلکہ ان کے جگر گوشوں کو بھی چھین کر لے گئے اور قیدی بنا کر ہندوستان روانہ کر دیا۔ ان کی رہائش گاہوں میں داخل ہو کر اس طرح لوٹا کہ زندگی گزارنے کے واسطے ایک تنکا تک نہ چھوڑا۔ مکانات اور آبائی گھروں سے محروم کیا۔ انھیں

خانہ بدوشوں کی طرح جھونپڑیوں میں رہنے پر مجبور کیا[۳۸]۔ یہ کس بد قسمتی کی بات ہے کہ سندھ کے مستقل فرمانرواؤں کی بیگمات کے ساتھ انگریزوں نے کس قدر ہتک آمیز اور ناروا سلوک روا رکھا۔ سندھ ٹالپوروں کا ملک تھا۔ وہ اس سرزمین کے مستقل فرمانروا تھے۔ انگریزوں کی حیثیت ان رہزنوں کی سی تھی جنھوں نے اس خطے میں کہیں لوٹ مار سے اور کہیں اپنی عیاری سے قبضہ جمالیا تھا[۳۹]۔ جن انگریزوں نے ٹالپوروں کے زوال میں اہم کردار ادا کیا ان میں لارڈ ایلین برو گورنر جنرل ہند ۱۷۹۰ء۔ ۱۸۷۱ء، سر جیمز آؤٹرم ۱۸۰۳ء۔ ۱۸۶۳ء، مسٹر برنس ۱۸۰۵ء۔ ۱۸۴۱ء، رابرٹ پیچ، لارڈ آکلینڈ گورنر جنرل ہند ۱۷۸۴ء۔ ۱۸۴۹ء، جنرل جان جیکب ۱۸۱۲ء۔ ۱۸۵۸ء اور سر چارلس نیپیئر ۱۷۸۲ء۔ ۱۸۵۳ء کا نام خاصی اہمیت کا حامل ہے[۴۰]۔

سر چارلس نیپیئر نے سندھ کا دار الحکومت حیدر آباد سے کراچی منتقل کیا۔ سندھ کو صوبائی حیثیت دے کر اس کو تین اضلاع کراچی، حیدر آباد اور شکار پور میں تقسیم کیا گیا۔ ۱۸۴۷ء میں سندھ کی صوبائی حیثیت ختم کر دی گئی اور اسے صوبہ بمبئی کے ساتھ ضم کر دیا گیا۔ انتظامی امور کے لیے سندھ پر کمشنر کو سربراہ مقرر کیا گیا جسے تقریباً گورنر جیسے اختیارات حاصل تھے۔ انگریزوں کے اس فیصلے نے بھی سندھیوں میں بے چینی کی لہر دوڑادی۔ بمبئی میں ضم ہوتے ہی سندھ خصوصاً کراچی میں گجراتی اور مرہٹہ تاجر جوق در جوق آنا شروع ہو گئے۔ وہ مقامی تجارت، کاروبار اور ملازمت پر مامور ہونے لگے جس سے مقامی اور غیر مقامی کا فرق نمایاں طور پر محسوس کیا جانے لگا[۴۱]۔ غیر سندھیوں کی ہجرت کا یہ عمل بھی کچھ نیا نہیں تھا بلکہ اس سے قبل ۱۸۱۱ء۔ ۱۸۱۲ء کے زمانے میں بھی ہالار، کچھ، مارواڑ اور ارد گرد کے دیگر علاقوں میں جب سخت قحط کی صورت حال پیدا ہوئی اور اناج کی شدید قلت پیدا ہو گئی تو گجرات، ہالار، مارواڑ اور کچھ وغیرہ سے لوگوں کا جم غفیر سندھ کے مختلف شہروں میں آ جمع ہوئے۔ اجناس کی قلت سے باحیثیت لوگ بھی بھوکوں مرنے لگے۔ قیمتیں آسمان سے باتیں کرنے لگیں۔ جوار، نانگلی اور جو جیسے معمولی اناج بھی اس زمانے میں ایک روپے کے تین چار سیر ملتے۔ ناؤمل ہوت چند کے مطابق اس قحط سالی سے بے شمار ہلاکتیں ہوئیں۔ اس صورتِ حال کو دیکھتے ہوئے سیٹھ دریانومل، اور سیٹھ لعلمن داس نے بغیر مذہب کی تفریق کیے ہر کسی کو سیر بھر باجرا یا اناج فراہم کرتے[۴۲]۔ دیکھنے کی بات یہ ہے کہ قحط سالی سے متاثرہ جو مہاجرین سندھ میں آئے ان کے ساتھ مقامی لوگوں کا رویہ خاصا ہمدردانہ اور دوستانہ تھا، لیکن انگریزوں کے قبضے کے بعد آنے والے مہاجرین کے ساتھ صورت حال بالکل مختلف تھی۔ ظاہر سی بات ہے اس کی بڑی وجہ انگریزوں کی وہ پالیسیاں تھیں جنھوں نے سندھی مسلمانوں کو اس نفرت سے دوچار کیا۔ انگریزی حکومت ابتدا ہی سے مسلمانوں کے مقابلے میں ہندوؤں کو ترجیح دیتے تھے۔ ویسے بھی مسلمانانِ سندھ اقتصادی اور معاشی لحاظ سے ہندوؤں کے مقابلے میں بہت پس ماندہ تھے۔ تجارت، کاروبار یہاں تک کہ سرکاری ملازمتیں بھی زیادہ تر ہندوؤں کے ہاتھ میں تھیں۔ انگریزوں نے ہندوؤں کو کھلی چھوٹ دے رکھی تھی کہ وہ مسلمانوں کی زمین گروی رکھ کر بھاری سود وصول کریں اور ادا نہ کرنے پر زمین کی ضبطی میں بھی وہ ہندوؤں کے مفادات کا خیال رکھتے۔ ان استیصالی کارروائیوں نے سندھی مسلمانوں کے دلوں میں

انگریز حکومت کے خلاف نفرت کا زہر بھر دیا[۴۳]۔ مسلمان اس بات کو سمجھنے کے لیے تیار نہ تھے کہ اس مسئلے کا حل زیادہ سے زیادہ تعلیمی سرگرمیوں کو حصہ لینا ہے تاکہ اس مایوس کن صورتِ حال سے نکلا جا سکے۔ سرکاری اعداد و شمار کے مطابق ۱۸۷۱ء میں صوبے بھر میں مسلمان طالب علموں کی تعداد بہ مشکل ایک فی صد جب کہ ہندو طلبہ کی تعداد تین فی صد تھی۔ ۱۸۸۰ء۔۸۱ء تک صوبے بھر میں پرائمری سطح تک محض پانچ ہزار طالب علموں کا اندراج ہوا تھا۔ ثانوی درجے میں اور زیادہ مایوس کن صورت حال تھی۔ ۱۸۸۵ء تک جب کہ اس زمانے میں سرکاری مدارس کا رواج ہو چکا تھا، پندرہ بیس برس گزرنے کے باوجود محض تیس مسلم طلبہ کی تعداد ایسی تھی جنھوں نے میٹرک کی سند حاصل کی ہو[۴۴]۔

اس دوران ہندو طلبہ کی کھیپ ان مدارس سے فارغ التحصیل ہو کر سرکاری اور نیم سرکاری آسامیوں پر اپنا تسلط جما چکی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں انگریزوں کی پالیسیوں کے بجائے خود تعلیم سے دوری نے مسلمانوں کو اس نہج تک پہنچانے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ ٹی پوسٹن نے سندھ کے دربار کا نقشہ کھینچتے ہوئے لکھا کہ:

> سندھ کے سردار نیم وحشی پن کے حامل اور جاہل ہیں اور جہالت کی وجہ سے وہ ان غلطیوں کے بھی سزاوار ہیں جن کا ان پر الزام عائد کیا جاتا ہے۔ ... اتنے زرخیز اور عمدہ ملک کہ جس کی خصوصیات مزید مہذب اور اچھے حکمرانوں کے حامل ہونے سے اور بھی زیادہ بڑھ سکتی ہیں اور ان حکمرانوں کی خود غرضی اور رشوت خوری کی وجہ سے قربانی کی بھینٹ چڑھ رہی ہیں ... ان کو کسی طرح کی حکومت سازی کا علم نہیں اور ان کے اپنے حقوق و استحقاقات و اختیارات کے علاوہ وہ اور کچھ نہیں جانتے چناں چہ سندھی امیروں کی واحد منزل یہ ہے کہ خزانے بھر و اور اپنی زندگی سے لطف اندوز ہو[۴۵]۔

ظاہر سی بات ہے کہ اس صورتِ حال میں کسی ریاست کے برقرار رہنے کا نہ تو جواز باقی رہتا ہے اور نہ ہی وہاں رہنے والی رعایا کی زندگیوں میں کوئی مثبت تبدیلی آتی ہے۔ جہاں تک سندھ میں بسنے والی مختلف نسلوں اور گروہوں کی آبادی کا تعلق ہے، قدیم عہد میں تصنیف کی گئی کتابوں میں اس بابت زیادہ معلومات نہیں ملتیں البتہ ہنری پوٹنجر نے کراچی کی بابت لکھا کہ اس شہر کی پہلی مردم شماری تالپوروں کے دور ۱۸۰۹ء میں ہوئی، جس کے مطابق کراچی کی کل آبادی ۲۵۰۰ نفوس پر مشتمل تھی۔ دوسری مردم شماری ۱۸۱۳ء میں ہوئی جس میں آبادی کا تناسب دگنا یعنی ۱۳۰۰۰ ظاہر کیا گیا۔ اس بار مردم شماری کے ساتھ ساتھ خانہ شماری کا بھی اہتمام کیا گیا جس کے مطابق فصیل کے اندر مکانات کی کل تعداد ۳۲۵۰ تھی۔ اس مردم شماری کے مطابق شہر میں ہندوؤں کی تعداد مسلمانوں سے کہیں زیادہ تھی[۴۶]۔ ۱۸۲۰ء میں کیپٹن میک مردو نے سندھ کے دورے کے دوران یہاں کے مختلف شہروں کی بابت کہا کہ حیدر آباد کی آبادی ۳۰،۰۰۰، ٹھٹھہ ۲۰،۰۰۰ اور اس کے مقابلے میں کراچی کی کل آبادی ۱۵۰۰۰ نفوس پر مشتمل تھی[۴۷]۔ برطانوی قبضے سے قبل ٹی۔ جی۔ کاریس اور کیپٹن ایس۔ وی۔ ڈبلیو۔ ہارٹ نے کراچی سے متعلق بمبئی کے

انگریز افسروں کو ۱۸۳۹ء میں جو خفیہ رپورٹ ارسال کی اس میں کراچی کی آبادی صرف ۱۳۸۵۰ بتائی گئی۔ اس رپورٹ کے مطابق شہر میں ۹۰۰۰ کے قریب ہندو اور ۴۸۵۰ مسلمان آباد ہیں[۴۸]۔ ۱۸۸۱ء میں سندھ کی کل آبادی ۲۵۴۲۹۷۶ تھی۔ ۱۹۳۱ء تک یہ تعداد ۳۹،۰۰،۰۰۰ تک جا پہنچی[۴۹]۔ سید مظہر جمیل نے سہواً یہ تعداد انچاس لاکھ درج کی ہے[۵۰]۔ ۱۹۴۱ء کی مردم شماری کے مطابق سندھ کی آبادی ۴۵،۳۵،۰۰۸ تک جا پہنچی جب کہ قیام پاکستان کے بعد ۱۹۵۱ء کے جائزے میں آبادی ۴۹،۲۸۰۵۷ تک بڑھ گئی۔

اس دوران کراچی کی آبادی کا جائزہ لیا جائے تو انیسویں صدی کے نصف اوّل تک کی مردم شماری کا جو جائزہ مذکورہ صفحات میں پیش کیا گیا، اس کے مطابق انگریزوں کے قبضے کے بعد ۱۸۴۲ء کے وقت اس شہر کی آبادی کا اندازہ تقریباً ۱۵۰۰۰ لگایا گیا۔ ۱۸۵۰ء کی مردم شماری کے مطابق ۱۶۷۷۳، ۱۸۵۶ء میں یہاں کی آبادی ۲۲،۲۲۷، ۱۸۶۱ء تک ۵۶،۸۵۹ اور بیس برس بعد ۱۸۸۱ء میں یہاں کی آبادی بڑھ کر ۷۳،۵۶۰ تک جا پہنچی[۵۱]۔ اس دوران سب سے تیز رفتار اضافہ ۱۸۵۶ء سے ۱۸۶۱ء کے درمیان دیکھنے کو ملتا ہے اور یہ اضافہ ۱۵۶ فی صد تک ہے[۵۲]۔ عارف حسن نے لورا گائے اور احمد حسین صدیقی کی رائے سے اختلاف کرتے ہوئے لکھا کہ ۱۸۵۶ء سے ۱۸۷۲ء تک کراچی کی آبادی میں کوئی اضافہ نہیں ہوا[۵۳]۔ ۱۸۴۷ء میں سندھ کو کمشنری قرار دے کر صوبہ بمبئی سے ملحق کر لیا گیا۔ یہاں کا پہلا کمشنر کیتھ پرنگل ۱۸۴۷ء کی ابتدا میں کراچی پہنچا۔ بعد میں یہ سلسلہ ۹۰ برس تک جاری رہ کر ۱۹۳۶ء میں مسٹر آر۔ ای۔ گبسن پر ختم ہوا۔ اس دوران کراچی میں سر بارٹل فریئر ۱۸۵۱ء۔ ۱۸۵۶ء، جنرل جون جیکب ۱۸۵۷ء۔ ۱۸۵۸ء، جوناتھن ڈمکن انوایرا ٹرئی ۱۸۵۹ء۔ ۱۸۶۲ء، سیموئل مینس فیلڈ ۱۸۶۲ء۔ ۱۸۶۷ء، میجر سر ولیم لا کبر میری ویدر ۱۸۶۷ء۔ ۱۸۷۷ء، فرانس ڈیوس میل ول ۱۸۷۷ء۔ ۱۸۷۸ء، ہنری نیپیئر بروار سکن ۱۸۷۹ء۔ ۱۸۸۷ء، چارلس بریڈلے پریچرڈ ۱۸۸۸ء۔ ۱۸۸۹ء اور آرتھر چارلس ٹریور ۱۸۸۹ء۔ ۱۸۹۰ء تک کمشنری کے پہلے زمانے کا اختتام ہوتا ہے۔ اس دوران یہ شہر ہندوستان کے مشہور شہروں میں شمار ہونے لگا۔ اس کی آبادی میں تیز رفتار اضافہ ہوا۔ تجارت میں دن دوگنی رات چوگنی ترقی ہوئی۔ شہر کی دولت میں اضافہ ہوا۔ دنیا بھر کے تاجروں سے یہاں روابط بڑھے اور دیکھتے ہی دیکھتے پندرہ ہزار آبادی والا یہ شہر ایک لاکھ کی آبادی میں تبدیل ہو گیا۔ اس دور میں کراچی میں ہندو، مسلمان اور پارسی تاجروں کی کمپنی کے علاوہ متعدد یورپی کمپنیوں کے دفاتر بھی کھل گئے اور اس شہر نے ہندوستان کے دوسرے شہروں کی نسبت قابل رشک حیثیت حاصل کر لی[۵۴]۔

یہاں کی تجارت میں اضافے کا بڑا سبب امریکی خانہ جنگی تھا جس کی وجہ سے تجارتی سامان کی ترسیل انگلستان کے لیے بند ہو گئی چناں چہ انگلستان کے کپڑے کے کارخانوں کے لیے خام مال کے طور پر امریکی کپاس کی جگہ سندھ کی کپاس نے لے لی۔ کپاس کی تجارت میں تیزی کا نتیجہ تھا کہ چیمبر آف کامرس کی ضرورت پیش آئی جس نے شہر کی معاشی خوش حالی میں اہم کردار ادا کیا۔ لیکن امریکی خانہ جنگی کے خاتمے کے بعد کراچی کی تجارت کی مالیت ۶ کروڑ ۲۰ لاکھ روپے سے گر کر ۳ کروڑ ۸۰ لاکھ روپے تک

آ گئی۔ ۱۸۶۱ء میں قائم ہونے والی سندھ ریلوے نے بھی اس تجارتی ترقی نے بھی اہم کردار ادا کیا۔ عارف حسن کے مطابق ۱۸۷۲ء سے ۱۹۰۱ء تک کراچی کی آبادی دگنی سے بھی زیادہ ہو گئی۔ ریلوے کے ذریعے کپاس کی پیداوار کراچی کے ذریعے بیرون ملک جانے لگی[۵۵]۔ یہاں اس امر کو ذہن میں رکھنا بھی ضروری ہے کہ ۱۸۸۱ء تک کی آبادی کے جو اعداد و شمار مذکورہ صفحات میں پیش کیے گئے ہیں ان کے مطابق سندھ کی ساڑھے پچیس لاکھ کی آبادی میں سے کراچی میں صرف ۷۳۰۵۶ لوگ آباد تھے جو پورے سندھ کی کل آبادی کا تقریباً تین فی صد بنتے ہیں۔ ان اعداد و شمار کو پیش کرنے کا ایک اہم مقصد یہ ہے کہ آئندہ کے صفحات میں جب کراچی کے بڑھتے ہوئے شہری مسائل کی تفصیلات کا ذکر ہو تو اس دور کے اعداد و شمار اور شہری سہولیات کا موازنہ کرنا آسان ہو۔

کراچی کی آبادی میں مسلسل اضافے کے ساتھ ساتھ ہزاروں کی تعداد میں غریب کارکن اس شہر میں کھنچے چلے آئے جو روزانہ بندرگاہ، بازار اور نئے قائم صنعتی علاقوں میں کام کرتے تھے۔ ان لوگوں کی رہائشی ضروریات کو پورا کرنے کا کوئی مناسب انتظام نہیں تھا۔ لہٰذا یہ مزدور طبقہ اور قدیم مچھیرے پرانے شہر کے اطراف میں آباد ہونا شروع ہوئے۔ اس زمانے میں ان کے کچے گھر اور بے ترتیب جھگیاں اس بے ترتیبی سے قائم ہوئیں کہ دنیا کے کم ہی شہر اس کی مثال میں پیش کیے جا سکیں گے۔ ان علاقوں میں صحت عامہ کا بھی کوئی کام نہیں ہو سکتا تھا۔ مسٹر مرامزانے جو حکومت بمبئی کے سرویر تھے، اپنی رپورٹ "Development of Karachi" میں لکھا کہ پرانے شہر کی گنجان آبادی میں آبادی کا اڑتالیس فی صد حصہ ایسے کمروں میں رہائش پذیر ہے جہاں ایک ایک کمرے میں چھے یا اس سے بھی زیادہ افراد رہتے ہیں[۵۶]۔

سندھ کے قبضے اور دارالحکومت کی کراچی منتقلی کے وقت سندھ کو بمبئی پریزیڈنسی کا ایک ضلع اور کراچی اس ضلع کا صدر مقام ٹھہرا۔ چوں کہ انگریز فوجی یہاں مقیم ہونے لگے، لہٰذا ان کی اشیاے ضرورت کی فراہمی کے لیے وہ علاقے ابھر کر سامنے آئے جنھیں آج ہم صدر، کنٹونمنٹ یا چھاؤنی کا علاقہ کہتے ہیں۔ اس زمانے میں ضلعی انتظامیہ کے دفاتر سول لائنز میں قائم ہوئے۔ اس طرح یہ شہر دو واضح حصوں میں تقسیم ہونا شروع ہوا۔ ایک انگریزوں سے پہلے کا پرانا دیسی شہر اور اس کے مضافات اور دوسرا جدید یورپی طرز کا شہر جو کنٹونمنٹ، صدر بازار اور سول لائنز کے علاقوں پر مشتمل تھا۔ اسی دور میں کراچی بندرگاہ کو بھی ترقی دی گئی۔ ہندوستان میں اپنی نوعیت کی پہلی میونسپل کمیٹی وجود میں آئی[۵۷]۔ انگریزی دور میں قائم ہونے والے تقریباً تمام ترقیاتی مراحل، تجارتی ادارے، بندرگاہ کی ترقی، عمارات، آمد و رفت کے ذرائع، آب رسانی کے بدلتے وسائل، تعلیمی ادارے، ثقافتی مراکز، ادارۂ ترقیات کراچی کا قیام، تفریح گاہوں اور دیگر اہم واقعات پر احمد حسین صدیقی[۵۸] اور عثمان دموہی[۵۹] و دیگر مصنفین نے کافی معلومات فراہم کی ہیں۔ تفصیلات سے بچنے کے لیے یہاں ان پہلوؤں کو نظرانداز کرتے ہوئے صرف سیاسی اور سماجی منظرنامے پر توجہ مرکوز رکھنا ہی مناسب ہو گا تاکہ اردو شاعری پر پڑنے والے اثرات کا جائزہ لیا جا سکے۔ اس حوالے سے

ڈاکٹر لئیق زرداری نے جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے دور کے چند اہم سانحات کی نشان دہی کرتے ہوئے لکھا کہ اس زمانے میں کراچی کے کچھ دیسی فوجیوں نے انگریزوں کے خلاف بغاوت کی جسے انگریز فوجیوں نے سختی سے کچل دیا۔ اس بغاوت میں حصہ لینے والے سپاہیوں میں سے سات کو سرعام آرٹلری میدان میں پھانسی پر لٹکایا گیا اور تین سپاہیوں کو توپ سے باندھ کر اڑا دیا گیا۔ عینی شاہدین سے روایت ہے کہ ان نعشوں کے بچے کھچے حصوں کو بھنگیوں نے فوراً اکٹھا کیا اور فوراً گاڑی میں رکھ کر دور ایک گڑھے میں پھینک آئے۔ جن سپاہیوں کو پھانسی دی گئی ان کی نعشوں کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے گدھوں پر لاد کر عبرت ناک اور انتہائی بھیانک منظر کی صورت میں پیش کیا گیا۔ اس واقعے کے ایک ہفتے بعد جنگ آزادی کے چودہ دوسرے سپاہیوں کو پھانسی دی گئی۔ رام دین پانڈے جو کہ کراچی کے باغیوں کا سرغنہ تھا، اسے توپ کے دہانے سے باندھ کر اڑا دیا گیا[۶۰]۔ عارف حسن نے شکوہ کرتے ہوئے لکھا کہ آزادی کی خاطر لڑنے والے ان سپاہیوں کی کراچی نے آج تک کوئی قدر نہیں کی۔ نہ ہی انھیں کوئی اعزاز دیا گیا اور نہ ہی ان کی کوئی یادگار تعمیر ہوئی[۶۱]۔

ڈاکٹر غلام علی الانا کا کہنا ہے کہ اس دور میں سندھ کے تقریباً تمام ہی بڑے شہروں، کراچی، حیدر آباد اور شکار پور وغیرہ میں انگریزوں کے خلاف سخت ردعمل آیا اور بہت فسادات برپا ہوئے۔ کراچی میں کمشنر اور دیگر افسران کو قتل کرنے کے منصوبے بھی بنائے گئے لیکن تمام ہی منصوبے راز فاش ہونے کے سبب ناکام رہے۔ بہت سے انقلابیوں کو گرفتار کر کے سزائیں بھی دی گئیں۔ دیسی فوجیوں میں حیدر آباد میں مقیم ۱۳ نمبر کی پلٹن اور بنگال کے باغیوں کا پیغام لانے والے چھے سپاہیوں کو گرفتار کر کے شکار پور وغیرہ میں خوف وہراس کی فضا پیدا کی گئی۔ ۱۴ نمبر پلٹن سے رات بارہ بجے ہتھیار چھین لیے گئے۔ کراچی چھاؤنی کی ۲۱ نمبر پلٹن کے ۲۶ جوانوں کا کورٹ مارشل کیا گیا۔ تین جوانوں کو گولیوں سے اڑا دیا گیا۔ بعض نعشوں کے ٹکڑے کر کے نہروں میں بہا دیا گیا۔ ایک حوالدار سمیت متعدد سپاہیوں کو توپ کے منہ میں ڈال کر اڑا دیا گیا۔ مقامی لوگوں پر ملازمت کے دروازے بند کر دیے گئے[۶۲]۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ اتنے بہت سے دل دوز واقعات اور سانحات کے باوجود ہمیں اس دور کی شاعری میں کچھ ایسے اشارے نہیں ملتے۔ شمالی ہند میں ہونے والے واقعات کی تفصیل اور شاعرانہ اظہار کی متعدد مثالیں پچھلے ابواب میں پیش کی جا چکی ہیں، لیکن کراچی کے واقعات پر ادیبوں اور شاعروں کی مجرمانہ خاموشی سمجھ سے بالاتر ہے۔

جنگ آزادی کے بعد کراچی کی آبادی میں اضافے کا جو رجحان جاری تھا وہ اگلی چند دہائیوں تک اپنی اسی رفتار سے جاری رہا۔ لوراں گائے کے مطابق ۱۸۹۰ء میں ۳۳ فی صد اضافے کے بعد کراچی کی آبادی ۹۸۰۰۰ تک جا پہنچی۔ ۱۹۰۱ء میں ۳۹ فی صد اضافے کے ساتھ ۱۳۶،۲۹۷، ۱۹۱۱ء میں ۳۷ فی صد اضافے کے ساتھ ۱۸۶،۱۷۷، ۱۹۲۱ء میں ۳۰ فی صد اضافے کے ساتھ ۲۴۴،۱۶۲، ۱۹۳۱ء میں ۲۳ فی صد اضافے کے ساتھ ۳۰۰،۷۷۹ اور ۱۹۴۱ء میں ۴۵ فی صد اضافے کے ساتھ ۴۳۵،۸۸۷ تک جا پہنچی[۶۳]۔ عثمان دموہی نے ۱۹۴۱ء کی مردم شماری کا حوالہ دیتے ہوئے سہواً یہ تعداد چھ لاکھ تک بتائی ہے[۶۴]۔ جب کہ سید مظہر جمیل

نے عارف حسن کا حوالہ دیتے ہوئے سہواً یہ تعداد ڈھائی تین لاکھ درج کی ہے[۶۵]۔ جب کہ عارف حسن نے اپنی تصنیف میں یہ تعداد ساڑھے چار لاکھ تک ہی بتائی ہے[۶۶]۔

دوسری طرف مذکورہ صفحات میں بیان کیا جاچکا ہے کہ ۱۹۴۱ء تک سندھ کی مجموعی آبادی ۴۴،۰۴۹۰۸ تھی۔ اس لحاظ سے سندھ کی کل آبادی کا ۱۹۔۱۱ اعشاریہ ۸ فی صد حصہ ۱۹۴۱ء میں کراچی میں مقیم تھا۔ اس سے قبل ۱۸۸۱ء کے حوالے سے یہ بتایا جا چکا ہے کہ پورے سندھ کی آبادی کا تقریباً تین فی صد کراچی میں مقیم تھا۔ جو اگلی چھے دہائیوں میں بڑھ کر سندھ کی آبادی کا ۱۰ فی صد تک ہو گیا۔ اب یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کراچی کے اس مجموعی اضافے کے مطابق شہری سہولیات کی طرف بھی توجہ دی گئی یا نہیں؟ اس بابت قیامِ پاکستان سے قبل لکھی گئی ان غیر ملکیوں کی تصانیف ہماری مدد اور رہنمائی کرتی ہیں جن کا کسی نہ کسی نسبت سے اس شہر سے تعلق قائم ہوا۔ اس حوالے سے مذکورہ صفحات میں مسٹر مرامز کی رپورٹ کا حوالہ دیا جا چکا ہے۔ ظاہر سی بات ہے کہ کراچی کے بارے میں جو قصے کہانیاں سنائی جاتی ہیں، مرامز کی بات اس کی نفی کرتی ہے۔ ایسا نہیں کہ کراچی کی سڑکیں دھلا نہیں کرتی تھیں یا کراچی کا تمام ہی علاقہ گندگی کا ڈھیر ہوا کرتا تھا، لیکن محض ان سڑکوں کی دھلائی جن کے گرد انگریز مقیم تھے، پورے شہر کی صفائی ستھرائی اور نکاسی آب کی صورت حال سے جوڑنا محض مبالغہ آرائی کے سوا کچھ نہیں۔ بارٹل فریر کے زمانے کی صورت حال کا ذکر خود اسی نے ان الفاظ میں کیا کہ ''میں جب بھی کراچی کے پرانے شہر کا دورہ کرتا ہوں، اسے دنیا کا گندا ترین علاقہ پاتا ہوں اور ہر طرف سے بدبو کے بھبکے اٹھ رہے ہوتے ہیں''[۶۷]۔ پینے کے صاف پانی کا مسئلہ بھی ہمیشہ سے اس شہر کے بڑے مسائل میں شمار کیا جانا چاہیے[۶۸]۔ اس بابت بہت سے اقدامات کے باوجود آج بھی یہ شہر پانی کے شدید ترین بحران کا شکار نظر آتا ہے۔ عثمان دموہی نے لکھا کہ:

> انگریزی تسلط کے بعد سے کراچی اکثر طاعون اور ہیضے کی وبا کا شکار رہتا تھا۔ ۱۸۴۶ء میں ہیضے کی وبا نے ایسی شدت اختیار کی کہ سات ہزار سے زائد شہری لقمۂ اجل بنے۔ آبادی شہر چھوڑ کر مضافات کے کھلے میدانوں میں منتقل ہو گئے اور شہر شہرِ خموشاں کا منظر پیش کرنے لگا[۶۹]۔

ظاہر سی بات ہے اس سانحے اور ہلاکتوں کی بنیادی وجہ شہر کی گندگی، نکاسی آب کی ناکافی سہولتیں اور پینے کے صاف پانی کی قلت تھی۔ چارلس نپیئر نے اس بدترین صورت حال سے نبٹنے کے لیے ۱۸۴۶ء میں ایک کنزرویینسی بورڈ بھی قائم کیا[۷۰]۔ ۱۹۲۹ء میں کراچی میونسپل کارپوریشن کے اس وقت کے صدر جمشید جی نسروان جی نے واضح طور پر یہ مؤقف اپنایا کہ کراچی میں تعینات ہونے والے اعلیٰ فوجی افسروں نے کراچی کے نہایت عمدہ علاقے کو کینٹ ایریا قرار دے کر اس پر اپنا قبضہ جما رکھا ہے۔ اس سے قبل ۱۹۲۸ء کو کاسموپولیٹن ہاؤسنگ سوسائٹی کا افتتاح کرتے ہوئے کراچی کو بمبئی پریزیڈینسی کے سب سے زیادہ گنجان مکانیت والا شہر قرار دیتے ہوئے مکانوں کی کمی پر اپنی ناکامی اور شرمندگی کا اظہار کر چکے تھے۔ حالاں کہ ان کے زمانے کے بنائے گئے مکانات اور تعمیرات کو ہم آج بھی تحسین کی نظر سے دیکھتے ہیں[۷۱]۔ اس شہر کی تاریخ میں سر مونٹیگو وب کی خدمات کو کبھی

فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ اپنے چار سالہ قیام میں اس نے اس شہر کے بدلتے منظر کو اپنی آنکھوں سے دیکھا اور اس کی جغرافیائی اور تجارتی حیثیت کا کھل کر اظہار کیا۔ اس نے اپنی ایک تقریر میں کراچی بندرگاہ کو ہندوستان کا ''لیورپول'' قرار دیا[۲]۔ کرنل ینگ کیتھ نے اس زمانے کے کراچی کی قلمی تصویر کھینچتے ہوئے لکھا کہ:

حد نگاہ تک سبزے کا نشان تک نہ تھا۔ گرد و غبار کو سبزہ بہ نظر تحقیر دیکھتا تھا۔ قمری اور بلبل کے لیے نگاہ ترستی تھی۔ نہ کہیں چشمہ آب شیریں تھا اور نہ شفاف ندی۔ البتہ ایک دریائے شور ضرور تھا[۳]۔

رچرڈ برٹن نے شہر کی گندگی کا نقشہ کھینچتے ہوئے لکھا کہ:

شہر میں ہر طرف گندگی کے ڈھیر لگے ہوئے ہیں جن کی وجہ سے کراچی ایک دیہات کا منظر پیش کر رہا ہے۔ شہر کی تنگ سڑکیں کوڑا کرکٹ سے اٹی ہوئی ہیں اور رہائشی مکان بھی گندگی سے مستثنیٰ نہیں ہے[۴]۔

سندھ کا سب سے بڑا مسئلہ ۱۹۴۷ء کے بعد شہری آبادی میں ہونے والی تبدیلیوں کے باعث سماجی، معاشی اور سیاسی تبدیلیوں کے موجودہ حقائق کے ساتھ سائنسی بنیادوں پر ایک ایسا تصفیہ ہے جسے لسانی گروہ قبول کر لے۔ موجودہ سندھ کا بنیادی مسئلہ ۱۹۵۱ء تا ۱۹۸۱ء کی مردم شماری کے درمیانی وقفے میں صوبے کی آبادی میں ہوش ربا اضافہ ہے۔ ۱۹۸۱ء تک سندھ کی آبادی ۱۹،۸۰۰،۰۰۰ تک جا پہنچی۔ اعداد و شمار کے مطابق پورے ملک میں آبادی میں اضافے کی شرح ۲۷۰ فی صد جب کہ سندھ میں ۳۰۱ فی صد تک رہی[۵]۔ سید مظہر جمیل نے سہواً ۱۹۵۱ء میں سندھ کی آبادی ایک کروڑ اٹھانوے لاکھ[۶] ظاہر کی ہے جب کہ ۱۹۵۱ء میں سندھ کی کل آبادی ۴۹۲۸۰۵۷ تھی۔ اس دوران کراچی کی آبادی ۱۶۱ فی صد اضافے کے ساتھ ۱۹۵۱ء میں ۱۳۷،۶۶۷ تک پہنچ گئی[۷]۔ اس طرح سندھ کی کل آبادی کا ۲۳ فی صد حصہ کراچی میں مقیم تھا۔ اس طرح محض دس برسوں میں کل سندھ کی آبادی کی دس فی صد آبادی بڑھ کر ۲۳ فی صد تک جا پہنچی جو کراچی میں مقیم تھی۔ یوری گنکوفسکی نے پاکستان کی مختلف قومیتوں اور لسانی اکائیوں کا جائزہ لیتے ہوئے لکھا کہ ۱۹۲۳ء کے وسط تک ہندوستان سے پاکستان کی طرف جن لوگوں نے ہجرت کی ان کی تعداد ایک کروڑ یعنی آبادی کا دس اعشاریہ سات فی صد تھی۔ اس مدت میں نوے لاکھ غیر مسلم پاکستان چھوڑ کر ہندوستان چلے گئے۔ اس سلسلے میں سندھ کے جنوبی علاقوں کے علاوہ کسی اور شہر کو آبادی کا اس قدر دباؤ برداشت نہیں کرنا پڑا جس قدر کراچی اور سندھ کے دیگر شہروں کو کرنا پڑا۔ ۱۹۶۱ء کے اعداد و شمار کے مطابق پنجاب میں ۹۴.۶ فی صد باشندے پنجابی بولتے ہیں، شمال مغربی صوبہ سرحد میں آبادی کا ۹۰ فی صد پشتو، بلوچستان میں قلات کو چھوڑ کر عام زبان بلوچی جب کہ سندھ کے جنوبی علاقے جہاں کراچی واقع ہے، ۵۱.۷ فی صد لوگوں کی مادری زبان اردو تھی۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ ۱۹۴۱ء سے ۱۹۵۱ء تک کے اعداد و شمار بتاتے ہیں کہ سندھ اور بشمول خیرپور میں جن لوگوں کی مادری زبان سندھی تھی وہ ۳۵ لاکھ ۳۶ ہزار تھے، جو گھٹ

کر اس مدت میں ۳۳لاکھ ۴۹ ہزار رہ گئی یعنی ۳.۵ فی صدی کم ہوئی حالانکہ اس مدت میں سندھ کی آبادی میں ۹.۱۱ فی صد اضافہ ہوا ہے[۸۰]۔

۱۹۶۱ء میں کراچی کی آبادی ۲۰۴۴۰۴۴، ۱۹۷۲ء میں ۳۶۰۶۷۴۶ اور ۱۹۸۱ء تک ۵۴۳۷۹۸۴ تک پہنچ گئی جو پورے سندھ کی مردم شماری کی رپورٹ کے بموجب ۱۹۸۰۰۰۰۰ کا ۱۲۷۱ اعشاریہ ۴۶ فی صد تھا[۷۹]۔ موجودہ سندھ کا سب سے بڑا مسئلہ ہی ۱۹۵۱ء تا ۱۹۸۱ء کی مردم شماری کے درمیانے وقفے میں صوبے کی آبادی بالخصوص کراچی کی آبادی کا ہوش رُبا اضافہ ہے۔ اس دوران شماریاتی جائزے کے مطابق پورے پاکستان کی آبادی میں ۲۷۰ فی صد اور سندھ کی آبادی کی ۳۰۱ فی صد تک اضافہ دیکھنے میں آیا[۸۰]۔ جب کہ کراچی میں یہ اضافہ ۲۶۸ فی صد تک رہا[۸۱]۔ ۱۹۹۱ء میں سندھ کی آبادی ۱۹۵۱ء کے مقابلے میں ۹ گناہ اضافے کے ساتھ تقریباً ساڑھے چار کروڑ تک پہنچ گئی۔ سید مظہر جمیل کے مطابق غیر سرکاری اعداد و شمار کے مطابق بیسویں صدی کے خاتمے تک سندھ کی آبادی پانچ کروڑ سے تجاوز کر چکی ہے[۸۲]۔ گویا سندھ نے مردم شماری میں دس سالہ تغیّرات کے سارے ریکارڈ توڑ دیے۔ اس غیر سرکاری جائزے میں کتنا غلو ہے اس بات سے قطع نظر اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ بہت تیزی سے سندھ کے شہری علاقوں میں آبادی کا تناسب بڑھا ہے اور یہ شرح بیسویں صدی میں ۴۵ سے ۵۰ فی صد تک پہنچنے کا امکان ہے۔ محمد علی صدیقی کے مطابق ہم ایک ایسے سندھ میں رہ رہے ہیں جہاں سندھی اور اردو بولنے والے دو بڑے لسانی گروہوں کے علاوہ پنجابی اور پشتو بولنے والوں کی بھی معتدبہ تعداد موجود ہے۔ اس طرح سندھی قوم پرستی کے وکلا سندھ کی جغرافیائی اور انتظامی سالمیت برقرار رکھنے کے لیے اور خاص طور پر وفاق پاکستان میں اردو بولنے والوں اور سندھ میں مستقل آباد پنجابی اور پشتون آبادی کو سندھی تسلیم کیے بغیر اس صوبے کو متحد رکھنے میں دشواری محسوس کریں گے[۸۳]۔

۱۹۷۴ء کے بعد مہاجروں کی آمد نے آبادی کے اس توازن کو یکسر تبدیل کر کے رکھ دیا ہے۔ اس کے علاوہ ون یونٹ کے قیام کے بعد پاکستان کے دیگر علاقوں سے آنے والوں کی یلغار نے صوبۂ سندھ کی آبادی کے تناظر کو بالکل درہم برہم کر کے رکھ دیا اور اب سندھ کی Demographic صورتِ حال مسلسل تغیّر پذیر ہے۔ ایک اندازے کے مطابق تقسیم ہند کے نتیجے میں لگ بھگ دو سے ڈھائی کروڑ افراد کو اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر نقل مکانی کے عذاب سے گزرنا پڑا۔ ہندوستان سے ہجرت کر کے آنے والے مہاجرین کی تعداد ترکِ وطن کر کے جانے والے شرنارتھیوں سے کہیں زیادہ تھی۔ چناں چہ سندھ سے جانے والے ۹ لاکھ ہندوؤں کے مقابلے میں آنے والے مہاجرین تین گنا زیادہ تھے۔ ابتدا میں صرف چھے لاکھ مہاجر کراچی آئے جن کی تعداد ۱۹۵۱ء میں دس لاکھ تک ہوگئی۔ اتنی ہی تعداد حیدرآباد، سکھر، میرپور خاص اور نواب شاہ وغیرہ میں آباد ہونے والے مہاجرین کی بھی تھی۔ ۱۹۶۱ء کے بعد ہندوستان سے نقل مکانی تقریباً رُک چکی تھی۔ بعد میں محض اکا دکا خاندان ہی ہجرت کر کے پاکستان میں داخل ہو سکے ہوں گے۔ البتہ سقوطِ مشرقی پاکستان کے بعد تقریباً ڈیڑھ لاکھ مہاجرین بنگلا دیش سے یہاں آکر آباد

ہوئے۔ اس طرح ہندوستان سے سندھ نقل مکانی کرنے والوں کی تعداد تیس لاکھ سے زیادہ نہ تھی لیکن گزشتہ نصف صدی میں آبادی کے تیز رفتار اضافے کے نتیجے میں یہ تعداد کم و بیش ڈیڑھ کروڑ تک بتائی جاتی ہے[۸۴]۔

بعض حلقے یہ تعداد دو کروڑ تک بتاتے ہیں۔ اتنی ہی تعداد پنجابی اور پٹھان آباد کاروں کی بھی ہوگی۔ اس طرح غیر سندھیوں کی تعداد سندھی بولنے والوں سے تجاوز کرتی دکھائی دیتی ہے۔ جیے سندھ تحریک کی تیار کردہ ایک دستاویز کے مطابق ہر سال تقریباً ۵ لاکھ ۶۴ ہزار افراد باہر سے آکر سندھ میں آباد ہو جاتے ہیں جس کی وجہ سے آبادی کا تناسب مسلسل تغیر پذیر رہتا ہے۔ نتیجتاً بھیانک معاشی، معاشرتی اور انتظامی مسائل پیدا ہوتے چلے جا رہے ہیں[۸۵]۔ اور سندھ ہر روز ایک نئے سانحے سے دوچار ہوتا دکھائی دیتا ہے۔

قیام پاکستان کے وقت ۱۹۴۷ء کے بعد مہاجروں کے قافلے آنا شروع ہوئے تو وہ شہر جو صرف تین لاکھ نفوس کے لیے بنا تھا، نے دس لاکھ بے خانماں افراد کو اپنی گوشۂ عافیت میں کشادہ دلی سے سمیٹ لیا۔ شہر کے اندر اور باہر تمام پختہ و نیم پختہ عمارتیں، چھپر، سائے بان، احاطے، کھلے میدان مہاجر کیمپوں میں تبدیل ہو گئے۔ راتوں رات بانس اور چٹائیوں کی جھونپڑیوں اور جھگیوں کے جنگل کے جنگل اُگ آئے جن میں لٹے پٹے بے آسرا لوگ زندگی گزارنے پر مجبور ہوئے۔ ان لوگوں کو بنیادی شہری سہولیات تک میسر نہ تھیں اور نہ اتنی آبادی کو فوری سہولیات مہیا کرنا ممکن تھا۔ چناں چہ کراچی کی مضافاتی بستیاں کورنگی، ملیر، ڈرگ روڈ، سعود آباد، اورنگی ٹاؤن، لیاقت آباد اور دیگر بہت سی کچی پکی بستیوں میں غریب اور متوسط مہاجر خاندانوں کی آباد کاری کی گئی۔ آس پاس صنعتی علاقے بھی قائم کیے گئے[۸۶]۔ ۱۹۴۷ء میں یہاں قائم صنعتی کارخانوں کی تعداد اکتالیس تھی جو اگلے بیس برسوں میں بڑھ کر تین ہزار سے زیادہ ہو گئی۔ پاکستان کی تمام مصنوعات کا ایک چوتھائی حصہ اس شہر میں تیار ہونے لگا[۸۷]۔ اس دوران شہر کی متعدد رہائشی اسکیمیں ناظم آباد، نارتھ ناظم آباد، پی۔ ای۔ سی۔ ایچ۔ ایس، فیڈرل بی ایریا، کے۔ ڈی۔ اے۔ اسکیم، گلشن اقبال، گلستانِ جوہر، کراچی ٹاؤن شپ، نارتھ ٹاؤن شپ، سرجانی ٹاؤن، اورنگی ٹاؤن وغیرہ جیسی وقتاً فوقتاً اس شہر کی رہائشی ضرورتوں کے تحت بنائی گئیں جن پر لوگوں نے ہاؤس بلڈنگ فنانس کارپوریشن سے سودی قرضے حاصل کر کے جگمگاتی فیشن ایبل سوسائٹیاں قائم کر لیں۔ ان بستیوں میں اندرون سندھ کی نسبت زیادہ آسودہ حال لوگ آباد ہوئے اور اس طرح شہر میں آسودہ اور ناآسودہ بستیوں کے دو متضاد کلچر وجود میں آئے[۸۸]۔ احمد حسین صدیقی نے قیام پاکستان سے لے کر ۹۰ کی دہائی تک مختلف طبقات کے لیے جو رہائشی اور ترقیاتی اسکیمیں شروع کیں ان کی تفصیلات پیش کرتے ہوئے لکھا کہ:

> تمام بڑے شہروں کی طرح کراچی بھی بے شمار مسائل کا شکار ہے بلکہ یہ شہر تحقیقی مضامین میں اور رپورٹوں میں ضروری شہری سہولتوں کے فقدان اور پیچیدہ ترین مسائل کے حامل شہر کی حیثیت سے ایک ''کیس'' یا مثال کے طور پر پیش کیا جاتا ہے[۸۹]۔

اس شہر کے گوناگوں مسائل پر ایک ایسے شخص کا اعتراف ہے جو خود بھی ادارۂ ترقیاتِ کراچی میں ڈائریکٹر جنرل کے عہدے سے سبک دوش ہوئے۔ جس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اس شہر میں تعینات افسران بھی اس معاملے میں کس قدر بے بس رہے ہیں۔ کراچی کی سندھ سے علاحدگی اور پھر کراچی سے دارالحکومت کی اسلام آباد منتقلی نے یقیناً کراچی کی ترقی پر منفی اثرات چھوڑے ہیں۔ لیکن سب سے زیادہ نقصان ان لسانی گروہوں، بھتا خوروں، دہشت گردوں اور زمین کی ناجائز خرید و فروخت کرنے والوں نے پہنچایا۔ ان لوگوں نے ذاتی اور گروہی مفادات کے حصول اور لسانی منافرت نے سندھ کے شہروں کو طویل عرصے تک یرغمال بنائے رکھا۔ اسی طرح اندرونِ سندھ میں بھی متعصب سندھیوں اور شر پسند عناصر نے یہی کردار ادا کیا۔ اس طرح دیکھا جائے تو سندھ میں آباد سندھیوں، مہاجروں، پشتونوں اور دیگر تمام لسانی اکائیوں نے اس شہر سے لیا تو بہت کچھ لیکن اسے اپنی منافرت کی بھینٹ چڑھا کر وہ ناقابل تلافی نقصان پہنچایا ہے کہ آئندہ کئی نسلیں مل کر بھی اس کی تلافی نہیں کر پائیں گی[۹۰]۔

سندھ کی تاریخ میں قوم پرستی کی روایت بھی کوئی نئی چیز نہیں تھی۔ مذہبی انتہا پسندی کی تحریکوں نے جب یہاں زور پکڑا اور آر۔ ایس۔ ایس۔ نے اپنے نظریات کو فروغ دینا شروع کیا تو وہ ۹۰ فی صد ہندو لڑکے جو پہلے فارسی کا مضمون لیا کرتے تھے، سنسکرت کا انتخاب کرنے لگے[۹۱]۔ پیر محمد علی راشدی کے مطابق سندھ کے بمبئی سے الگ ہونے کے بعد ۱۹۳۷ء میں بعض دیہاتی ناخواندہ اہل کاروں کے سکھائے پڑھائے وڈیروں اپنی عددی برتری کی بنیاد پر سندھ اسمبلی میں داخل ہوئے اور سیاست کو آلودہ کرنا شروع کر دیا۔۔ اب سیاسی جوڑ توڑ، دروغ گوئی، ضمیر فروشی، بے اصولی پن اور ہر ابھرتے سورج کی پوجا وغیرہ جیسی قبیح عادتیں رواج پانے لگیں۔ ان دنوں ممبران ہر وقت پارٹیاں بدلتے۔ خان بہادر اللہ بخش گبول کا جملہ نقل کرتے ہوئے انھوں نے لکھا کہ سندھ کی سیاست میں اسی طرح اتار چڑھاؤ ہے جس طرح یہاں کے دریا کے پانی میں اتار چڑھاؤ آتا ہے[۹۲]۔ بمبئی سے سندھ کے الگ ہونے کے بعد یہاں نئی قومی زندگی کی بنیادیں تو پڑنا شروع ہوئیں لیکن غلط اصولوں پر۔ اس صورتِ حال نے منفی اقدار کو جنم دیا۔ سندھ کے وڈیرے اور پیر صاحبان اپنی دولت، حاکمانہ زور اور پیری مریدی کے زور پر سندھ کی سیاسی زندگی میں پوری طرح چھاگئے۔ ان لوگوں کے پیش نظر سندھ کے عوام کی بھلائی نہ تھا اور نہ آج ہے ان لوگوں کی سیاست کا محور و مرکز یہ ہے۔ وہ ہندو اور مسلمان جو اس صوبے میں ایک دوسرے کے لیے بے حد قریب تھے، ۱۹۲۰ء کی سیاسی اصلاحات اور ہندوؤں اور مسلمانوں کے الگ الگ چناؤ کے حق کی پالیسی کی وجہ سے شدھی اور سنگھٹن، آریا سماج، برہمو سماج اور ہندو مہاسبھا جیسی تحریکوں نے جنم لیا۔ اس رجحان کے بعد سیاسی فضا آلودہ ہونی شروع ہوئی۔ لہٰذا ہندو سندھی گروپ اب مسلمانوں کو حقیر، جاہل اور کم عقل سمجھ کر ان کے ساتھ بُرا برتاؤ کرنے لگے۔ نفرت کا بیج بونے کے بعد اس خرابی کا پہلا مرکز لاڑکانہ اور سکھر بنے۔ کراچی، میر پور خاص اور حیدر آباد سے نکلنے والے اخبارات اس کی تائید میں پیش کیے جاسکتے ہیں۔ اس ایجی ٹیشن کے نتیجے میں مسلمانوں کے کان

بھی کھڑے ہوئے۔ ہندو جو مسلمانوں کو وحشی اور ذلیل سمجھنے لگے تھے[93] رد عمل میں ہندوؤں کا سماجی بائیکاٹ شروع کیا گیا۔ اس دور میں ہندو مسلم فساد کی ابتدا لاڑکانہ سے ہوئی۔ ۲۱ مارچ ۱۹۲۷ء کو ایک مسلمان عورت کریما کے معاملے پر جو ایک ہندو کے ساتھ مع اپنے چار بچوں کے لاڑکانہ فرار ہو گئی، اس کے مرتد ہونے کے رد عمل میں مسلمان نوجوانوں نے کورٹ سے بھی رجوع کیا لیکن شنوائی نہ ہوئی۔ بعد میں مسلمان نوجوانوں نے ہندوؤں کے چند سگریٹ کے کھوکھے جلا ڈالے مگر کوئی جانی نقصان نہیں ہوا۔ ہندوؤں نے اس معمولی واقعے کے رد عمل میں مسلمانوں کو پست کرنے کے لیے زور دار مہم چلائی۔ مسلمانوں پر جھوٹے مقدمات بنوائے گئے۔ اسی سے زیادہ مسلمانوں کو جیل بھجوا دیا۔ لاڑکانہ کے نمایاں مسلمانوں کو نشانہ بنایا گیا۔ خود خان بہادر ایوب کھوڑو کو بھی اس مقدمے میں پھنسانے کی سازش کی گئی۔ لاڑکانہ کے بعد روہڑی اور سکھر میں بھی یہ سلسلہ جاری رہا۔ بمبئی پریزیڈنسی میں ہندوؤں کی اکثریت کی وجہ سے مسلمانوں کی پامالی کا سلسلہ ۱۹۳۱ء تک جاری رہا جس کے نتیجے میں سندھ کو بمبئی سے علاحدہ کرنے کی تحریک زور پکڑتی گئی۔ ۱۹۳۹ء میں سندھ الگ تو ہو گیا لیکن ہندوؤں نے سازش کے ذریعے مسلمانوں کو اس کے ثمرات پہنچنے نہ دیے۔ آپس میں لڑوا کر کسی ایک فریق کو ہمیشہ اپنی مٹھی میں رکھا۔

۱۹۳۹ء میں بھی مسجد منزل گاہ سکھر کے سلسلے میں فسادات ہوئے۔ مقامی اخبارات نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان تلخی کو بڑھانے میں اہم کردار ادا کیا۔ خود مسلمانوں میں آپس کی چپقلش نے بھی ہندوؤں کو فائدہ پہنچایا۔ مسلم اکثریت کی مخالفت کے باوجود جس میں مولانا آزاد اور سردار نبیل جیسے کانگریسی رہنما تک کو کراچی آنا پڑا، اللہ بخش کی وزارت کے حق میں فیصلہ رہا۔ یہ وہی اللہ بخش ہیں جنھوں نے سکھر کی ویران حالت میں پڑی مسجد منزل گاہ کی تحویل کے مسلمانوں کے مطالبے کو نامنظور کیا تھا۔ رد عمل میں مسلمانوں نے ستیا گرہ شروع کی تو اللہ بخش نے سختی دکھائی۔ اس ستیا گری نے خون ریزی کی شکل اختیار کر لی۔ سیکڑوں ہندو مارے گئے۔ ہزاروں مسلمان گرفتار ہوئے اور بلآخر اللہ بخش کی وزارت ختم کر کے مسلم لیگیوں کو وزارت پر بٹھانا پڑا[94]۔ یہ وہ عوامل تھے جس نے آگے چل کر ہندوؤں کی سندھ بدری میں اہم کردار ادا کیا۔ اس بابت گوپال داس کھوسلا کی یہ رائے ہے کہ اللہ بخش چوں کہ نیشنلسٹ رجحان رکھتے تھے کانگریس کی ''بھارت چھوڑو'' تحریک سے اس قدر متاثر ہوئے تھے کہ اپنا خان بہادر کا خطاب انگریزوں کو لوٹا دیا۔ نتیجتاً گورنر ہاؤس طلب کر کے وزارتِ عظمیٰ سے برطرف کیا گیا۔ بعد میں محض چند ماہ بعد ۱۴ مئی ۱۹۴۳ء کو انھیں قتل کر دیا گیا۔ ایوب کھوڑو پر ان کے قتل کا مقدمہ بھی چلا جو کہ اس وقت وزیر کے عہدے پر تعینات تھے۔ انھیں بھی وزارت سے ہاتھ دھونا پڑا۔ ۱۹۴۶ء میں جی۔ ایم۔ سید کی مخالفت کے بعد اسمبلی برخاست کر دی گئی۔ اس زمانے میں بھی انتخابی دھاندلی کے ایسے ہی شواہد ملتے ہیں جیسے آج کل کے انتخابات میں دکھائی دیتے ہیں۔ خود ضلع کراچی میں ووٹ ڈالنے کے لیے حیدر آباد سے ۵۰۰ ووٹر منگوائے گئے تاکہ جعلی ووٹ کے ذریعے برتری حاصل کی جا سکے۔ ان تمام ہتھکنڈوں کے باوجود مسلم لیگ ساٹھ میں سے ۳۵ نشستوں پر کامیاب رہی۔ قیام پاکستان کے بعد کے زمانے میں وزرا سمیت وزیر اعلیٰ پر اسی

طرح بد عنوانی کے الزامات لگے جیسا کہ آج کے زمانے میں سندھ کے وزیر پر لگتے رہے ہیں۔ جس طرح سیاست میں ذاتی منفعت سیاست دانوں کا بنیادی مقصد آج کل کے زمانے میں دکھائی دیتا ہے، اس دور میں بھی کم و بیش یہی صورتِ حال تھی۔ سندھ کے انتظامی معاملات میں حکمرانوں کی گرفت خاصی کمزور تھی۔ ان ناخوش گوار حالات میں پیر پگارا اور ان کے بدنام زمانہ غارت گروہ نے بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ ۱۹۴۲ء میں پگارا کے ہزاروں پیروکاروں نے وسیع پیمانے پر قتل و غارت گری بھی کی۔ ۱۹۴۲ء میں مارشل لا لگا کر ان جنونیوں کو قابو میں کیا گیا۔ گھنے جنگلوں میں مقیم یہ لوگ ۷۰ سالہ مجرمانہ تاریخ رکھتے تھے۔ حروں کو اس زمانے میں بنیادی طور پر ایک جرائم پیشہ قبیلہ مانا جاتا تھا۔ خود اللہ بخش کے قتل کا مجرم بھی ایک معروف حُر ثابت ہوا[۹۵]۔ یعنی ایک طرف ہندوؤں کی خود سری اور ہٹ دھرمی نے مسلمانوں کو ان سے بدزن کیا تو دوسری جانب ان حُروں کی پیش قدمی نے انھیں حوصلہ بھی دیا۔ قیامِ پاکستان سے قبل ہی مسلمان رہنماؤں نے ہندوؤں کے خلاف سفاکانہ کارروائیاں شروع کر دی تھیں۔ ساتھ ہی پروپیگنڈا مہم بھی جاری تھی۔ پبلک ورک کے وزیر کی حیثیت سے ایوب کھوڑو کا یہ بیان کہ:

> سندھ کے ہندوؤں کو سندھ چھوڑ کر کہیں جانا ہوگا۔ انھیں اسی وقت چلے جانا چاہیے جب امن و امان ہے اور ان کے لیے جانا ممکن ہے۔ ورنہ میں انھیں خبردار کرتا ہوں کہ بہت جلد وقت آنے والا ہے، جب انھیں سندھ سے بھاگنے کے لیے کوئی گھوڑا، کوئی گاڑی یا کوئی سواری نہیں مل سکے[۹۶]۔

ظاہر سی بات ہے وہ ہندو جو سندھ کے حقیقی مالک بنے ہوئے تھے اور سندھ کے تمام لوگ ان کے رحم و کرم پر تھے، بقول اعجاز الحق قدوسی ''یہ ہندو مسلمانانِ سندھ کی معیشت کے لیے وہ جونک تھے جو ان کے خون کے آخری قطرے کی کمائی کو بھی چوس لینا چاہتے تھے''[۹۷]۔ اس صورتِ حال میں مسلمانوں کا شدید ردعمل فطری بھی تھا۔ اس ردعمل میں کہیں کہیں بے جا ظلم کے آثار بھی دکھائی دیتے ہیں، جیسے حیدر آباد سے نکلنے والے ایک سندھی روزنامے ''ہلالِ پاکستان'' کی ۱۶ اکتوبر ۱۹۴۷ء کی اشاعت میں ایک اشتعال انگیز مضمون شائع ہوا جس میں مسلمان جرائم پیشہ افراد اور غنڈوں سے یہ اپیل کی گئی ہے کہ وہ اپنی توانائیاں ہندوؤں کے خلاف استعمال کریں[۹۸]۔ مقامی زمین داروں اور مذہبی معلم نے بھی معاندانہ رویّہ اختیار کیا۔ بڑے پیمانے پر بدامنی اس وقت شروع ہوئی جب مشرقی پنجاب کے مسلمان مہاجر وہاں پہنچے اور مظالم کی داستانیں سنائیں۔ اس طرح سندھ کے سکھوں اور ہندوؤں سے انتقام لینے کے لیے آمادہ کرنے میں سندھ کے مسلمانوں کو کچھ زیادہ دیر نہ لگی۔ اکا دکا واقعات میں مسلمانوں نے فسادات روکنے کی نیم دلانہ کوششیں بھی کیں۔ ہندوؤں کے اثاثوں پر قبضے کا سلسلہ بھی شروع ہوا۔ ہندو کاشت کاروں کی فصلیں ضبط کی جانے لگیں۔ ہندوؤں کی جائیدادیں کوڑیوں کے بھاؤ بکنے لگیں۔ دن دیہاڑے دروازے توڑ کر ہندوؤں کے مال و اسباب کو لوٹا جاتا۔ مذہبی مقامات کو تباہ کیا گیا، مورتیوں کو توڑا گیا۔ اس صورتِ حال میں غیر مسلموں کی کثیر تعداد ترکِ وطن پر مجبور ہوئی۔ ہندوستان ٹائمز میں ۱۹ جنوری ۱۹۴۹ء کی اشاعت میں خود حکومتِ پاکستان کے اعلامیے کے مطابق سندھ چھوڑ کے جانے والوں کی تعداد آٹھ لاکھ اکیس ہزار تھی لیکن غیر سرکاری ذرائع کا کہنا تھا کہ یہ تعداد اندازاً دس لاکھ تک ہو سکتی ہے۔

البتہ سندھ میں ان غیر مسلموں کا جانی نقصان اتنا نہیں ہوا جس پیمانے پر مشرقی پنجاب وغیرہ میں یا شمال مغربی سرحدی صوبے میں ہوا لیکن پھر بھی یہ تعداد ہزاروں میں تھی۔ بعض بڑے واقعات مثلاً کونٹر کے سانحے میں اندازاً ایک ہزار ہندوؤں کی ہلاکت، حیدر آباد میں ۱۶ دسمبر ۱۹۴۷ء کے اجمیر شریف جلائے جانے کے رد عمل اور سینکڑوں مسلمانوں کے قتل عام کی خبر پر ڈھائی سو سے زیادہ ہندوؤں کا قتل عام۔ اسی طرح ۱۹۴۸ء میں کراچی آتے ہوئے ۲۰۰ سکھوں کے قافلے پر ہونے والے حملے میں متعدد سکھوں کا زندہ جل کر ہلاک ہونا وغیرہ[99] ایسے واقعات ہیں جنھیں سندھ کی تاریخ میں فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

موہن کلپنا نے تصویر کا دوسرا رخ دکھاتے ہوئے لکھا کہ سکھر کے ہندو جو اکثریت میں بھی تھے اور دوسرے شہروں کی نسبت لڑاکا بھی، لہٰذا فساد برپا کر کے وہاں مسلمانوں کو مارا پیٹا گیا۔ قیام پاکستان کے بعد مہاجرین کی آمد کا سلسلہ شروع ہوا تو ۶ جنوری ۱۹۴۸ء کو بہار سے آئے ہوئے مہاجرین نے بھی فساد برپا کر کے بے شمار لوگوں کو ہلاک کیا۔ ان غیر سندھیوں کے فساد کے باعث بھی پورے سندھ میں کھلبلی مچی اور کافی خوف و ہراس پھیلا[100]۔ ان حالات پر اس زمانے کی اردو شاعری میں کچھ زیادہ مواد تو نہیں ملتا البتہ اکا دکا اشعار ضرور ملتے ہیں، جیسے:

جے چند تونے ہند کو برباد کر دیا　　غیروں کو لا کر ہند میں آباد کر دیا

کاشی بنی بنارس، پریاگ الہ آباد　　ایودھیا پوری کو فیض آباد کر دیا[101]

سوبھو گیان چند نے اپنی یادداشتوں میں اس دور کے حالات پر تبصرہ کرتے ہوئے کراچی کے فسادات میں ہونے والی تین سو ہلاکتوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا کہ:

> میں اس قتل عام کا چشم دید گواہ ہوں۔ میں نے اس فساد میں لٹیرے، ڈاکو اور قاتل بھی دیکھے اور فرشتہ صفت انسان بھی جنھوں نے جان کا خطرہ مول لے کر نہ صرف میری، ایک کامریڈ کی، بلکہ عام ہندوؤں کی بھی جان بچائی اور لاکھوں کو بحفاظت ہندوستان جانے دیا[102]۔

سندھ میں منافرت کی فضا پیدا کرنے میں ان ہندوؤں کی چھوڑی ہوئی شہری اور دیہی متروکہ جائیداد کی غیر منصفانہ تقسیم، کلیموں اور سیٹل منٹ کی بندر بانٹ نے اہم کردار ادا کیا۔ نوزائیدہ ملک کی سول نوکر شاہی نے مہاجروں کی آبادکاری کے نام پر جو گورکھ دھندا پیش کیا اس نے مہاجروں اور سندھیوں کے دلوں میں ابتدائی زمانے میں ہی ایک خلیج پیدا کر دی تھی۔ سندھ، بلوچستان اور سرحد میں کل ۷۸ لاکھ ۵۰ ہزار مہاجرین نے نقل مکانی کی جب کہ یہاں سے جانے والے شرنارتھیوں کی تعداد ۵۶ لاکھ سے زائد نہ تھی۔ سندھ سے تقریباً دس لاکھ ہندوؤں نے ترک وطن کیا اور ان کی جگہ ۲۰ لاکھ مہاجر سندھ میں وارد ہوئے۔ ۱۹۶۱ء تک اس تعداد میں مزید اضافہ ہوا۔ مشرقی پنجاب سے آنے والے چھے لاکھ مہاجرین کو جب پنجاب نے فاضل قرار دیا تو ان لوگوں نے بھی سندھ کا ہی رخ کیا۔ شہری متروکہ جائیدادیں نسبتاً کم تھیں لہٰذا ان کی الاٹمنٹ کے سلسلے میں دھاندلی، رشوت اور جعل سازی کے ہتھکنڈے کھلے عام استعمال کیے گئے۔ معاشرے میں رات ورات صاحبِ جائیداد اور مال دار ہونے کا کلچر عام ہوا۔

طمع اور خود غرضی نے ابتدائی زمانے میں ہی جڑیں مضبوط کرنا شروع کر دیں۔ سندھیوں اور مہاجروں میں اصل جھگڑا اس وقت شروع ہوا جب زرعی اراضی کی تقسیم کا معاملہ در پیش ہوا۔ ہندوؤں نے سندھ میں کل تیرا لاکھ ایکڑ زرعی زمین چھوڑی تھی جن میں سے سات لاکھ ایکڑ زمین پر سندھ کے بااثر زمین داروں نے مقامی اہل کاروں اور ریونیو ڈپارٹمنٹ سے ساز باز کر کے قبضہ کر لیا تھا۔ بقیہ چھے لاکھ ایکڑ زمین محکمۂ سیٹلمنٹ کے توسط سے مہاجروں میں تقسیم کی گئی تھی۔ مذکورہ قابض شدہ زمین آج تک واج گزار نہیں کرائی جا سکی۔ پھر جن مہاجروں کو زرعی زمینیں ملیں بھی تو وہ اونے پونے بیچ کر شہر میں لوٹ آئے۔ اس طرح شہری اور دیہی مخلوط معاشرے کا خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا[۳۰]۔

اس نقل مکانی کا نتیجہ یہ بھی نکلا کہ کراچی میں آبادی کا منظر نامہ ہی یکسر تبدیل ہو گیا۔ وہ شہر جہاں قیام پاکستان سے قبل ۶۱.۲ سندھی اور محض ۶.۳ فی صد اردو اور ہندی بولنے والوں کی آبادی مقیم تھی، اس شہر میں اکیاون فی صد ہندو اور بیالیس فی صد مسلمان تھے۔ ۱۹۵۱ء تک پوری کی پوری صورتِ حال بدل گئی اور ہندوستانی مہاجرین کی آمد کے بعد سندھی بولنے والوں کی آبادی محض ۸.۶ فی صد تک رہ گئی جب کہ اردو بولنے والے پچاس فی صد تک اس شہر میں بس گئے۔ اس میں صرف دو فی صد ہندو اور ۹۶ فی صد تک مسلمان تھے[۴۰]۔ یعنی وہ ہندو آبادی جو اس شہر میں نمایاں طور پر چھائے ہوئے تھے، ان کی جگہ ان مہاجرین نے لے لی تھی۔ ان تبدیلیوں کا کراچی کی ثقافت اور سیاست پر گہرا اثر ہوا۔ متروکہ جائیداد کی تقسیم کی ابتدا ہی میں ملک کے ایک اہم ترین سیاست دان افتخار الدین نے کلیم کے ذریعے متروکہ جائیداد کے بٹوارے کی نہ صرف مخالفت کی بلکہ یہ تجویز بھی پیش کی کہ بجائے اس امر کے کہ پاکستان میں بھی وہ زمین دار جو ہجرت کر کے یہاں آ گیا ہے، پھر سے اپنی طبقاتی حیثیت کو برقرار رکھنے میں کامیاب ہو سکے، اس متروکہ جائیداد کے ذریعے عوامی بہبود کا ایسا خود کار امدادی نظام متعارف کرایا جائے جو ضرورت مند مہاجرین کو مالی اور تکنیکی امداد فراہم کرے[۵۰]۔ لیکن نوکر شاہی کی سازشوں سے اس کو عملی جامہ نہ پہنایا جا سکا۔

۱۹۴۷ء میں جب کراچی کو پاکستان کا دارالحکومت بنایا گیا اور اسے سندھ سے علاحدہ کر کے وفاق کا حصہ بنایا گیا تو بے شمار سرکاری عمارتیں جو اس سے قبل صوبے کی ملکیت تھیں، وفاقی حکومت کے قبضے میں چلی گئیں۔ عارف حسن صاحب نے اس واقعے کو کراچی اور سندھ کا پہلا سیاسی تصادم قرار دیا ہے[۶۰]۔ ظاہر سی بات ہے کہ سندھ کے دانش وروں اور سیاست دانوں نے اس علاحدگی پر سخت اعتراضات کیے۔ انھوں نے اس عمل کو مہاجرین کو نوازنے کی پالیسی کے مترادف قرار دیا۔ جب کہ تلخ حقیقت اور ستم ظریفی یہ ہے کہ وہ متروکہ جائیداد اور نوکر شاہی کی سازشوں سے سندھ کا بے وسیلہ ہاری جس طرح محروم رہا بالکل اسی طرح مہاجر محنت کش بھی یکساں طور پر محروم رہا۔ نتیجتاً منافرت، حسد اور چپقلش کا خمیازہ بھی براہ راست انھی محروم طبقات کو برداشت کرنا پڑا[۷۰]۔ آج بھی اس ظلم کے نظام کی وجہ سے بے وسیلہ اور بے بس ہاری نسل در نسل غلامی کی زنجیروں میں بندھا ہوا ہے اور ان موروثی ہاریوں کی تعداد میں دن بدن اضافہ ہی ہو رہا ہے[۸۰]۔ دوسری جانب غریب محنت کش مہاجر بھی کراچی کی

غریب بستیوں میں کس مپرسی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔ غرض ون یونٹ کی پوری مدت میں ایسی سرگرمیاں جاری رہیں جس نے سندھی قوم پرستی کے جذبات کو خوب ابھارا۔ سندھی صحافت نے بھی اس میں نمایاں کردار ادا کیا۔ نتیجتاً پہلے سے موجود نفرت اور محرومی کا احساس مزید تلخ شکل اختیار کرتا چلا گیا۔

سندھ کی شہری آبادی میں ہونے والی سیاسی اور سماجی تبدیلیوں کے موجودہ حقائق کا سائنسی تجزیہ نہایت ضروری ہے۔ سندھ کے دوسرے بڑے لسانی گروپ یعنی اردو بولنے والے سندھیوں (مہاجر) جن کی سب سے بڑی سیاسی جماعت ایم۔ کیو۔ ایم۔ نے ۱۹۹۰ء کے انتخابات میں علاحدہ قومیت کی بنیاد پر کراچی، حیدرآباد، میرپور خاص اور نواب شاہ وغیرہ کے علاقوں سے وفاقی اور سندھ اسمبلی کے لیے مختص نشستوں کی اکثریت پر انتخاب جیتنے اور خود کو مہاجر کہلوانا پسند کیا۔ ۱۹۴۷ء سے ۱۹۹۰ء کے انتخابات تک پہنچتے پہنچتے اس لفظ مہاجر یعنی اردو بولنے والے لسانی گروہ کے ساتھ کیسا سلوک روا رکھا گیا، اس کی تفصیلات متعدد کتابوں میں تفصیلاً درج ہے۔ میں یہاں صرف ایک مثال جو ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے اپنی خود نوشت میں درج کی، پیش کرنا چاہوں گا تاکہ اس بات کا اندازہ لگایا جاسکے کہ پچاس کی دہائی میں ہی جب کہ ایم۔ کیو۔ ایم۔ جیسی لسانی جماعت کا وجود تک نہیں تھا اردو بولنے والی عام آبادی تو درکنار ان کے دانش وروں اور اہل قلم کے ساتھ کیا رویہ روا رکھا جاتا تھا۔ اس کا اندازہ اس زمانے کے اہلِ علم نے بھی اپنی تصانیف میں کیا ہے۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کے مطابق:

> وہ سب سختیاں دیکھ لیں جو ہجرت، ترکِ وطن، پناہ گیری، آپ جس نام سے چاہیں یاد کرلیں۔ اس وقت بلوچستان میں مہاجرین کو پناہ ''پناہ گیرا'' کے معزز لقب سے سرفراز کیا گیا تھا۔۔۔ اس کے بعد ۔۔۔ لاہور۔۔۔ ترک مکانی یا نقل مکانی تھی۔۔۔ اسباب ایسے ہوگئے کہ میں اس فیصلے پر مجبور ہوا، ان کے بیان میں اب کوئی فائدہ نہیں[۹۰]

ظاہر سی بات ہے یہ مسلم اردو بولنے والے دانش ور اور بیوروکریسی کے افسران یوں ہی ہجرت کرکے نہیں آئے بلکہ قیام پاکستان کے اعلان کے بعد مسلم لیگی قیادت نے نئے ملک کی انتظامی ذمے داریوں کو سنبھالنے کے لیے حکومت ہند کے مسلمان افسروں اور اہلکاروں کو یہاں آنے کی ترغیب دی تھی۔ مسلمان عملے کے ارکان اور حکام نے کچھ تو پاکستان دوستی کے روایتی جذبے کے تحت اور کچھ ہندوستانی حکومت کی ناانصافیوں کے خوف سے یہاں آنا شروع کردیا۔ اہل کاروں کے ساتھ کنبہ، پاس پڑوس، برادری اور خاندان کے خاندان کو ترغیب دی تو یو۔ پی۔ بہار، سی۔ پی۔ اور جنوبی ہند سے لاکھوں کی تعداد میں مہاجرین سندھ میں بس گئے۔ ابتدا میں بدگمانی نے جنم نہیں لیا لیکن کراچی کی علاحدگی کے بعد دلوں میں میل آنے لگا۔ جن پرانے سندھیوں کو یہ امید تھی کہ ہندو مہاجنوں سے واپس ملنے والی اراضی ان کے اصل مالکوں کو واپس کردی جائے گی، ان کی یہ امید کبھی پوری نہ ہوئی بلکہ اس کے برخلاف جھوٹے سچے کلیم کے دعوے داروں کو یہ سرکاری اراضی بانٹ دی گئی۔ مزید یہ کہ قیام پاکستان کے فوری بعد ملازمتوں کا جو خلا پیدا ہوا تھا، اسے پُر کرنے کے لیے پرانے سندھیوں میں اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد کی بے حد کمی

تھی۔ نتیجتاً ملازمتوں کی منڈی میں بھی مہاجروں کے ساتھ پنجابیوں کی آمد تو شروع ہوئی لیکن کافی عرصے تک سندھی نوجوان اس دوڑ میں پیچھے رہا۔ ون یونٹ اور اس کے بعد ملک میں لگنے والے پہلے مارشل لانے بھی جو تباہی مچائی اس کی تفصیلات اندوہ ناک ہے۔ جمہوری اور سیاسی اداروں کی سرگرمیوں کے نتیجے میں آبادی کے مختلف حصوں کو ایک دوسرے کے ساتھ گھلنے ملنے کا جو موقع ملنا چاہیے تھا، وہ ختم ہو گیا۔ وفاقی دارالحکومت کو اس کے تمام ملازمین سمیت جن میں مقامی لوگوں کی کثیر تعداد تھی، اسلام آباد پہنچا دیا گیا۔ ملازمتوں میں کوٹا سسٹم نافذ کر کے نئے اور پرانے سندھیوں میں مزید دوریاں اور نفرت کی دیوار کھڑی کی گئی۔ صوبہ پنجاب میں صنعتی سرگرمیوں کو شروع کرنے کے بجائے وہاں کی بڑی آبادی کی منتقلی نے بھی نئے مسائل کو جنم دیا۔ نتیجتاً سندھ کے قوم پرستوں نے یہ نعرہ تک لگانا شروع کر دیا کہ "ہمیں سندھ میں صنعتی ترقی نہیں چاہیے"[۱۱]۔ کراچی کو سیاسی طور پر تباہ کرنے اور یہاں کے لوگوں کو آپس میں لڑانے کی کوششیں اس وقت شدت اختیار کر گئیں جب ایوب خان محترمہ فاطمہ جناح کے خلاف صدارتی انتخاب اخلاقی طور پر ہارنے کے تحت حکومت کو بہ حفاظت اسلام آباد لے جانے میں کامیاب ہو گئے۔ انھیں کراچی میں ہر طرف دہشت گردہی نظر آتے تھے۔ ۱۹۵۸ء میں ایوب خان نے متعدد فیصلے کیے جنھوں نے کراچی اور پاکستان کے بقیہ حصوں کے ساتھ اس کے تعلقات پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ گریٹر کراچی ری سیٹلمنٹ پلان کے تحت ایک یونانی کمپنی کو ایسا منصوبہ تیار کرنے کا حکم دیا گیا جس کے مطابق دو نئی بستیاں لانڈھی، کورنگی اور شمال کی طرف نیو کراچی کو آباد کرنا تھا۔ اس مقصد کے حصول کے لیے وہ تمام مہاجر بستیاں ناجائز قرار دے دی گئیں جن میں لوگ اپنے رہائشی مکانات تعمیر کر چکے تھے۔ اندرونِ شہر مہاجر بستیوں اور غیر قانونی آبادیوں کو مسمار کر دیا گیا۔ دور دراز مقام پر قائم ان نئی بستیوں کے درمیان خشک قدرتی نالوں کے کنارے دلالوں نے کچی آبادیاں بنانی شروع کر دیں۔ رفتہ رفتہ غریبوں کو رہائشی زمین فراہم کرنے والے یہ آڑھتی اس شہر کے طاقت ور مفاد پرست گروہ بن گئے۔ یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے اور ان پر کسی قسم کی قانونی قدغن نہیں۔ اس صورتِ حال نے گنجان آباد شہر کو دور دور تک بکھری ہوئی پس ماندہ بستیوں کے مجموعے میں بدل دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ غریب شہری، شہر سے دور ہو گئے۔ اُمرا نے مرکزِ شہر سے ملحق آبادیوں میں بہترین طرزِ رہائش اختیار کر لی۔ کراچی میں آج جو نسلی مسائل نظر آتے ہیں، عارف حسن کے مطابق ان میں سے زیادہ تر مسائل گریٹر کراچی پلان کے نتیجے ہی میں پیدا ہونا شروع ہوئے[۱۱]۔

دوسری جانب اندرونِ سندھ کے ہاریوں کے ساتھ روا رکھے جانے والے غیر انسانی سلوک کی داستان بھی کچھ کم اندوہ ناک نہیں۔ ان ہاریوں کی معاشی، سماجی اور اخلاقی حالت کا اندازہ قائد اعظم کی تشکیل کردہ "سندھ ہاری انکوائری کمیٹی" کی رپورٹ سے لگایا جا سکتا ہے۔ یہ کمیٹی چار ارکان پر مشتمل تھی۔ سر راجر ٹامس بطور مشیر زراعت حکومت سندھ اس کمیٹی کے اور مسعود آئی۔ سی۔ ایس۔ کلکٹر نواب شاہ، نور الدین صدیقی منیجر انکم ٹیکس بورڈ حکومت سندھ اس کے ارکان اور آغا شاہی اس بورڈ کے سیکریٹری نامزد تھے۔ اس کمیٹی کی رپورٹ انتہائی اہمیت کی حامل ہے۔ اس رپورٹ کے ذریعے پہلی بار سندھ کے ہاریوں کی

قابلِ رحم حالت دنیا کے سامنے منظر عام پر آئی اور صدیوں سے جاری ظلم اور استیصال کا پردہ چاک ہوا۔ اس رپورٹ میں مسعود کھدر پوش کا وہ اختلافی نوٹ ایسے حقائق اور شواہد سے پُر تھا جس کے باعث وزیر اعلیٰ ایوب کھوڑو نے اس کی اشاعت پر پابندی لگا دی لیکن بعد میں اس اختلافی نوٹ کے کچھ حصے منظر عام پر آئے[۱۲]۔ جس کے مطابق ہاریوں کی نسل در نسل اس بات سے واقف ہی نہیں تھی کہ جس زمین پر وہ کاشت کر رہے ہیں، وہ کتنے عرصے تک اس میں کھیتی باڑی کر سکیں گے۔ خوف ان کی زندگی کا لازمی جز بن چکا ہے۔ اپنی قید و بند کا خوف، زمین اور بچوں تک سے جبراً علاحدگی کا خوف، زندگی چھن جانے کا خوف، بغیر کسی مہلت کے زمین دار کی خفگی پر پکی پکائی فصل، ڈھور ڈنگر اور آبائی گاؤں تک کو چھوڑ دینے کا خوف، جسمانی تشدد اور لوٹ مار کا خوف، جھوٹے مقدمات کا خوف، بغیر کسی گناہ کے حوالات میں بند کروانے کا خوف، غرض کہ زمین دار اس ہاری اور اس کے خاندان پر مکمل اختیار رکھتا ہے کہ اس کے ساتھ جیسا چاہے سلوک کرے۔ ہر قسم کی بے گار کے علاوہ اگر ہاری کی بیوی غلطی سے خوب صورت ہو تو ایسی صورت میں خطرہ دوچند ہو جاتا ہے۔ اگر زمین دار کی مرضی سے اپنی بیوی اس کے حوالے نہ کی تو اغوا کر کے اس کی عصمت دری کرنا زمین دار کے لیے کوئی بڑی بات نہیں سمجھی جاتی۔ کھدر پوش کے مطابق انھوں نے کوئی ایسا ہاری آج تک نہیں دیکھا جو زمین دار کے آگے سیدھے کھڑا ہونے کی جرات کر سکے۔ انسانیت کی جو دُرگت زمین دار کے ہاتھوں بنتی ہے نہ اس کا اخلاقی جواز ہے اور نہ قانونی[۱۳]۔

اس اختلافی نوٹ سے قطع نظر ہاری انکوائری کمیٹی نے تو زمین داروں اور جاگیر داروں کو کسانوں کا بہترین دوست اور ہم درد ثابت کرنے کی ناکام کوشش کی[۱۴]۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ قیام پاکستان کے بعد مولانا عبد الحامد بدایونی کی سر کردگی میں سولہ علما کی ایک جماعت نے مسعود کھدر پوش کے اس اختلافی نوٹ کو جھوٹ کا پلندہ، گمراہ کن، غیر اسلامی اور کمیونسٹ رجحانات کی حامل دستاویز قرار دے کر سندھ کے غریب عوام سے انوکھے انداز میں خیر سگالی کا پیغام دیا[۱۵]۔ کراچی کی اردو پریس نے بھی بالعموم سندھی عوام سے اظہار یکجہتی کرنے کے بجائے وفاق کے ہر فیصلے کی آنکھ بند کر کے حمایت کی۔ اس طرح صوبہ سندھ کی دیہی اور شہری آبادیوں میں نفاق بڑھتا گیا۔ اس دوران اندرون سندھ میں کامریڈ عبد القادر، جیٹھ مل پرس رام، حیدر بخش جتوئی، عبد المجید سندھی، سوبھو گیان چندانی، کامریڈ نذیر لغاری اور کامریڈ عزیز اللہ جیسے لوگوں نے ہاریوں پر روا رکھے جانے والے غیر انسانی سلوک کے خلاف نہ صرف آواز بلند کی بلکہ عوامی آگہی بیدار کرنے کے لیے "ہاری حق دار" کے نعرے کو فروغ بھی دیا۔ اس تحریک کو بائیں بازو کی تنظیموں اور کمیونسٹوں کی حمایت بھی حاصل رہی[۱۶]۔ ۱۹۳۶ء سے ہی ترقی پسندوں کا اثر سندھ پر خاصا گہرا رہا۔ کرشن چندر اور خواجہ احمد عباس کے افسانے تراجم کی صورت میں سندھی ادب کا حصہ بنے۔ عینشی ودھیارتی نے مختلف ترقی پسند ادیبوں کی کہانیوں اور مضامین کا مجموعہ "انقلاب" کے نام سے شائع کرایا۔ سندھی ہندو شاعر ہوندراج، رکھابل اور کیشن چند بیوس کے اشعار میں اس تحریک کے اثرات دیکھے جاسکتے ہیں۔ سندھ میں "باغی" کے نام سے نکلنے والا رسالہ اسی دور میں نکلا

جس کی حمایت بعض اشتراکی مسلمانوں نے بھی کی[۱۷]۔ یہ سارے اثرات قیام پاکستان سے قبل سندھی ادب میں بڑے واضح انداز میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ حیدر بخش جتوئی جو ہاری پارٹی کے فعال رہنما تھے، انھیں سندھ کی سیاسی تحاریک میں جی۔ ایم۔ سید اور ابراہیم جویو کی صف میں شمار کیا جانا چاہیے۔ ''تحفظ سندھ'' ان کی معروف تصنیف ہے جس میں اسلام اور حضور ﷺ کی ذاتِ مبارکہ کو ہدفِ تنقید بنایا گیا ہے۔ اس سے ان کے ذہنی روّیوں اور رجحانات کا اندازہ لگانا کچھ خاص مشکل نہیں رہتا۔ ان کی اس حرکت کے خلاف کچھ معتبر سندھی خاندانوں نے وائسرائے تک کو شکایت بھیجی جس کے ردعمل میں حیدر بخش جتوئی سے معافی نامہ لکھوایا گیا۔ ان کی ایک اور کتاب جو شائع نہ ہو سکی، اس میں قرآن کو الہامی کتاب کے بجائے نعوذ باللہ حضور ﷺ کی ذہنی تخلیق ثابت کرنے کی کوشش کی گئی۔ انھوں نے سندھی اور انگریزی میں تقریباً ۳۱ کُتب لکھیں جن میں پیاری سندھی، ہاریوں کی کہانیاں، ہاری انقلاب، آزادیٔ قوم وغیرہ کافی مقبول ہوئیں۔ جیے سندھ کا نعرہ بھی پہلی بار حیدر بخش جتوئی کا دیا ہوا نعرہ ہے۔ ان کی ایک غزل بہ نام ''جیے سندھ'' کافی مشہور ہوئی۔ ہاری پارٹی کی سرگرمیوں کو دیکھ کر ظفر علی خان اور مولانا خیر محمد نظامانی نے سندھ کے ہاریوں کو خبردار کیا کہ وہ ہاری پارٹی کے سرکردہ لوگوں سے ہوشیار رہیں۔ اس پارٹی کے لیڈر خدا اور رسول ﷺ کے دشمن اور روس کے ایجنٹ ہیں[۱۸]۔ سندھ کے اسلام پسند عوام اس تحریک کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس تحریک نے جہاں ان غریب ہاریوں میں بیداری کی لہر پیدا کی وہیں جرائم پسندی کے رجحانات کو بھی خوب فروغ دیا۔ سندھ کے متوسط اور چھوٹے زمین داروں کی زمینوں پر اب ہاریوں کے قبضے سے لے کر ان کی فصل میں سے اناج کا حصہ نہ دینے تک کے اقدامات دراصل اسی تنظیم کی سرپرستی میں سندھ میں پروان چڑھے۔ ایک اندازے کے مطابق بعد کے وقتوں تک یعنی پیپلز پارٹی کی اوّل حکومت کے دور تک سندھ میں آٹھ ہزار ایکڑ اراضی پر ان لوگوں نے ناجائز قبضہ جمار کھا تھا[۱۹]۔

سندھ میں قومیت کے شعور کو پروان چڑھانے، صوبائیت اور علاقائیت کے رجحانات کو فروغ دینے میں جی۔ ایم۔ سید، پیر علی محمد راشدی اور ابراہیم جویو کے کردار کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ سندھ کی لسانی اور علاقائی تحریک کو فکری غذا دینے اور اس تحریک کو سندھو دیش کے لیے استعمال کرنے کی اصل محرک جی۔ ایم۔ سید کی ذات ہے۔ جی۔ ایم۔ سید نے ۲۷ سال کے اندر تین درجن سے زائد کتابیں لکھیں۔ ان کی بعض کُتب مثلاً ''سندھو دیش کیوں اور کس لیے'' اور ''دیارِ دل و داستانِ محبت'' وغیرہ جیسی کتابوں کو بھارت میں چھپوا کر سندھ میں تقسیم کیا گیا۔ انھوں نے اپنی تصانیف میں جن امور کو پیش نظر رکھا ان میں اسلام کے انقلابی تصور پر تابڑ توڑ حملے کیے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کہ اسلام کا یہ تصور محض سندھیوں کے استیصال کے لیے گھڑا گیا ہے۔ سندھو دیش کا قیام اور نوجوانوں کو اس جانب راغب کرنا، سندھی قوم پرستی کے جذبات کو ابھار کر علاقائی سیاست کو فروغ دینا وغیرہ اہم ہیں۔ ۳۱ مارچ ۱۹۷۳ء کو سندھ یونی ورسٹی میں کی گئی ان کی تقریر کو کئی رسائل نے متعدد بار شائع کیا۔ اس تقریر میں کھل کر ملک کے خلاف، دو قومی نظریے کے خلاف، سندھو دیش کی حمایت میں اور مہاجر اور پنجابی گٹھ جوڑ کے خلاف انھوں نے

زہر اگلا۔ انھوں نے دوٹوک الفاظ میں سندھی نوجوانوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ یہ مہاجر اور پنجابی ہی ہیں جو مستقل سندھیوں کا استیصال کر رہے ہیں۔ ہماری اقتصادیات پر قابض ہیں، ہمارے کلچر پر غالب ہیں۔ اس کے سدباب کے لیے ہمیں غور و فکر کرنا ہے [۱۲۰]۔

اس سے قبل فروری ۱۹۷۲ء کو ذوالفقار علی بھٹو کے سامنے وہ اپنا ۲۷ نکاتی ایجنڈا بھی پیش کر چکے تھے جس میں قراردادِ لاہور کے بارے میں اپنی تاویل پیش کرتے ہوئے آزاد اور خود مختار ریاست کے قیام پر زور دے کر سندھ کی علاحدگی پر زور دیا تھا۔ اس کے علاوہ اس عرصے میں یعنی ۲۴ برسوں میں ۱۲ صدور اور وزرائے اعلیٰ کی تبدیلی کا ذمہ دار مہاجر پنجابی مستقل مفاد کو قرار دیا تھا۔ اسی ۲۷ نکات میں صوبائی خود مختاری اور کنفڈریشن کی طرز پر آئین سازی پر بھی زور دیا گیا تھا۔ پولیس، نوکر شاہی وغیرہ میں سندھی افسران کی تقرری سے لے کر تینوں بیراجوں کے گرد دی گئی فوجیوں کی اراضی کی منسوخی کے مطالبات بھی اس میں شامل تھے۔ دریائے سندھ کے پانی کی تقسیم سے لے کر سندھ ملیشیا کے قیام تک کے منصوبے اس میں شامل تھے۔ بہت سے سرکاری اداروں کو سندھ صوبے کو منتقلی کا مطالبہ بھی اس میں شامل تھا، ان میں خالص وفاقی محکمے مثلاً واپڈا، پورٹ اینڈ شپنگ کے محکمے، ٹیلی گراف، ریلوے وغیرہ کے محکمے بھی شامل تھے۔ اس میں اور بھی ایسی بہت سی نکات شامل تھیں جو اس زمانے میں حکمرانوں کے لیے ناقابلِ قبول تھیں۔ ان نکات کو سندھی زبان میں بڑی تعداد میں چھپوا کر لوگوں میں تقسیم کیا گیا۔ ابتدا میں ان نکات کو ہفت روزہ ''ندائے سندھ'' حیدر آباد نے اپنی ۲۵ اپریل کی اشاعت میں شامل کیا [۱۲۱]۔ یہ وہ عمل تھا جس نے سندھ میں علاحدگی پسندی کے رجحان کو خوب فروغ دیا۔ ظاہر سی بات ہے کہ جی۔ ایم۔ سید اور ان کے پروردہ شیخ ایاز نے اعلانیہ الحادی کلمات بھی کہے اور ملک دشمنی کی باتیں کر کے اس کو خوب فروغ دینے کی کوشش بھی کی۔ آزاد بن حیدر نے اپنی ایک تصنیف میں ان کے نظریات و خیالات کا محاکمہ کیا ہے اور کھل کر ان کی گمراہیوں کا پردہ چاک کیا ہے [۱۲۲]۔ جی۔ ایم۔ سید نے سندھ متحدہ محاذ قائم کر کے سندھ کو مہاجر، پنجابی اور پٹھانوں یعنی تمام غیر سندھیوں کو سندھ سے نکالنے کی بات کی تو ان ملک دشمن ایذا رسانیوں سے بچنے کے لیے سندھ مہاجر، پنجابی، پٹھان متحدہ محاذ کے نام سے ۴ اکتوبر ۱۹۶۹ء کو نواب مظفر حسین خان کی سربراہی میں ایک جماعت بھی قائم ہوئی۔ انتخابات میں جی۔ ایم۔ سید کو بدترین شکست ضرور ہوئی اور بھٹو کو سندھ میں واضح کامیابی ملی لیکن جی۔ ایم۔ سید کا یہ دعویٰ کہ ''اب اسی کی حکومت ہوگی'' [۱۲۳] رفتہ رفتہ صحیح ثابت ہوا۔ بھٹو نے اس کے خواب کی تکمیل کی راہ ہموار کی۔ شیخ ایاز کی وائس چانسلر کی تقرری سے لے کر لسانی بل تک کے معاملات میں بھٹو، جی۔ ایم۔ سید کے ہم نوا نظر آتے ہیں۔ ۱۸ جنوری ۱۹۷۲ء کو دادو کے گاؤں سن میں آزاد سندھو دیش تحریک اور خدام سندھ نامی گوریلا فوجی تنظیم کی داغ بیل ڈالی گئی۔ اقبال ترین نے واشگاف الفاظ میں اعلان کیا کہ ہم بنگلا دیش کے نقشِ قدم پر چل کر سندھ کو آزاد کرالیں گے۔ کسی نے اس راہ میں رکاوٹ ڈالی تو دریائے سندھ کو خون سے سرخ کر دیا جائے گا۔ پیپلز پارٹی کی حکومت کے قیام کے بعد سندھ میں جی۔ ایم۔ سید کی فتح

کے جھنڈے لہرانے لگے۔ سندھ یونی ورسٹی جام شورو میں غیر سندھی طلبہ کی پٹائی اور لوٹ مار روز کا معمول بن گیا۔ کراچی میں مزدوروں پر گولیاں برسائی جانے لگیں۔ ڈومیسائل کا حصول غیر سندھیوں کے لیے ناممکن بنا دیا گیا۔ سندھی کو سندھ کی واحد قومی زبان بنانے کے اعلانات نے مزید بگاڑ پیدا کیا۔ غیر سندھی کاشت کاروں کی زمینوں پر زبردستی قبضے کیے جانے لگے۔ سندھ یونی ورسٹی کے غیر سندھی اساتذہ کے گھروں کو لوٹنے کے علاوہ ان کو بہیمانہ تشدد کا بھی نشانہ بنایا گیا۔ کالج اساتذہ کو قتل کیا گیا۔ اس کی ایک مثال گورنمنٹ کالج سکھر کے پروفیسر عباس بن عبد القادر کی ہے جنھیں ۲ ستمبر کو گولیاں برسا کر خیرپور میرس کے مقام پر شہید کر دیا گیا۔ لاڑکانہ میں گورنمنٹ کالج کے پرنسپل پروفیسر شبیہ حیدر کو گولیوں کا نشانہ بنایا گیا۔ سندھ کے میڈیکل، انجینئرنگ کالجوں اور دیگر ٹیکنیکل تعلیمی اداروں میں طلبہ کو داخلوں سے زبردستی روکا جاتا۔ ان کو جسمانی اور جنسی تشدد کا نشانہ بنایا جاتا۔ اس زمانے کے قومی اخبارات ان واقعات سے بھرے ہوئے ہیں[۱۲۴]۔

بھٹو اور جی۔ ایم۔ سید سمیت بے شمار سندھی رہنماؤں، وزیروں اور مشیروں نے اردو اور سندھی اختلافات کو ہوا دینے میں اہم کردار ادا کیا۔ ۱۳ جون ۱۹۷۲ء کو اندرونِ سندھ اردو میں لکھے گئے تمام سائن بورڈ اور ناموں کی تختیاں زبردستی اتار دی گئیں یا توڑ دی گئیں۔ پاکستان پیپلز پارٹی کا ترجمان سندھی اخبار ''ہلال پاکستان'' کراچی سے ہی شائع ہوتا تھا، اس کے ادارتی کالموں میں مدیر کو مخاطب کرتے ہوئے آداب، تسلیمات یا السلام علیکم کے بجائے لفظ ''جیے سندھ'' تحریر ہوتا تھا جو ہندوستان میں ''جیے ہند'' کے نعرے سے متاثر ہو کر اختیار کیا گیا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ ان ۲۷ نکات میں شیخ مجیب الرحمٰن کے چھے نکات کی طرز پر مزید اضافہ کر کے کھلم کھلا اعلان بغاوت کیا گیا لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ ان چھے نکاتی تجزیے کے باوجود ان لوگوں کے خلاف کوتادیبی کارروائی نہیں کی گئی۔ اس کے برخلاف نیشنل عوامی پارٹی کے خلاف ملک کی سب سے بڑی عدالت سے رجوع کر کے اس پر پابندی لگوائی گئی۔ دیگر زبانوں کے اخبارات و جرائد کے خلاف معمولی معمولی باتوں پر سخت کارروائی ہوتی اور کسی نئے اخبار یا جریدے کا اجازت نامہ حاصل کرنا ہی بھٹو دور میں جوئے شیر لانے کے مترادف تھا۔ لیکن سندھی اخبارات و جرائد بغیر کسی اجازت کے جو کچھ زہریلا مواد چاہتے چھاپتے رہتے، ان پر کوئی قدغن نہیں تھی۔ ان اخبارات و رسائل میں تحریک، جدوجہد، پیغام، آزاد مارواڑ، انقلاب اور شاگرد وغیرہ بہت اہم ہیں۔ کچھ تو سرکاری سرپرستی میں اور کچھ سندھ یونی ورسٹی جام شورو کے ہاسٹل سے شائع کیے جاتے۔ سندھو دیش کے لیے باقاعدہ مہم چلانے والے رسائل میں سوہنی، تحریک، پیغام اور جدوجہد وغیرہ سرفہرست ہیں۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ ان اخبارات و رسائل میں غیر سندھیوں کے خلاف وہ سندھی اکابرین بھی لکھتے رہے جن کا علمی مرتبہ کافی بلند تھا۔ اسلام، پاکستان اور غیر سندھیوں کے خلاف لکھنے والوں میں جی۔ ایم۔ سید، شیخ ایاز کے علاوہ عبد الواحد اریسر، طارق اشرف، امر جلیل، سراج الحق میمن، ابراہیم جویو، فولاد خان (عبد الوحید صدیقی)، ابراہیم منش، شاہ محمد شاہ، مدد علی سندھی، مولا بخش لغاری، شوکت سندھی، نجم عباس، پیر حسام الدین راشدی، میر امداد علی، حفیظ قریشی، ضمیر لاڑک، ایاز قادری،

عبد الکریم گدائی، عثمان ڈیلائی، شیخ علی محمد اور غلام محمد گراہی وغیرہ پیش پیش تھے۔ اس زمانے کے قومی وصوبائی اسمبلی کے بعض ارکان بھی انھیں نظریات کو نہ صرف فروغ دے رہے تھے بلکہ عملی جدوجہد میں بھی شامل رہے۔ ان باتوں کے واضح شواہد موجود ہیں کہ پاکستان پیپلز پارٹی جیسی قومی جماعت جس کی حمایت پنجاب میں بے حد زیادہ تھی، درپردہ جیے سندھ کے نظریات کی آلہ کار بنی رہی۔ پیپلز مزدور فیڈریشن میں ممتاز بھٹو گروپ دراصل جیے سندھ تحریک ہی کی ایک ذیلی تنظیم تھی۔ اس تنظیم کا علامتی نشان انسانی کھوپڑی پر کلہاڑی کا وار ہے چناں چہ ہفت روزہ "افریشیا" لاہور کے شمارے ۷ جنوری ۱۹۷۶ء اور ہفت روزہ "استقلال" لاہور کے شمارے ۵ جنوری ۱۹۷۶ء کی رپورٹ کے مطابق ۲۱/۲۲ دسمبر ۱۹۷۵ء کو اس وقت کے وفاقی وزیرِ مواصلات ممتاز علی خان بھٹو جب خیرپور پہنچے تو پیپلز اسٹوڈنٹس فیڈریشن (غلام مصطفیٰ بھٹو کا ممتاز بھٹو نواز جیے سندھ گروپ) کے ایک کلہاڑی بردار دستے نے انھیں کلہاڑی کی سلامی پیش کی۔ کچھ قومی اخبارات نے بھی ڈرتے ڈرتے اس خبر کو شائع کیا ہے[۱۲۵]۔ یہ وہ شواہد ہیں جن کے مطابق صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ سندھ میں منافرت اور لسانیت کی آگ کو بھڑکانے میں پیپلز پارٹی کا کیا کردار رہا ہے۔ پیر محمد علی راشدی جیسے سندھی مفکرین تو کھلم کھلا یہ بات کہتے تھے کہ اب تک سندھ انگریز کا غلام تھا لیکن اب پنجاب کا غلام بن جائے گا اور اہلِ پنجاب سندھ کا بچا کھچا خون بھی چوس لیں گے۔ ان کے مضامین کا مجموعہ "فریادِ سندھ" کے نام سے شائع ہوا۔ یہ ان مضامین پر مشتمل ہے جو اخبار "قربانی" میں تسلسل کے ساتھ شائع ہوتے رہے۔ ان میں سے بعض مضامین کو ہندوؤں نے اپنے مفاد میں استعمال کرنے کے لیے انگریزی ترجمہ کر کے "سندھ آبزرود" میں قسط وار شائع کروایا۔ انھوں نے اپنی کتاب "سندھ کے سیاست دانوں کی سچی تصویر" میں پنجابی تسلط اور سندھ کی معیشت پر ان کے قبضے پر بہت زور دار انداز میں آواز بلند کی۔ اسی طرح ابراہیم جویو جو شیخ ایاز ہی کے تربیت یافتہ تھے، سندھی قوم پرستی اور علاحدگی کے جراثیم پیدا کرنے میں پیش پیش تھے۔ "Save Sindh save the constant" میں انھوں نے ۱۹۴۶ء کے انتخابات میں جب کہ پورا سندھ مسلم لیگ کی حمایت میں اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ انھوں نے کھل کر پاکستان کی مخالفت کی۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ جویو صاحب ساری عمر تنخواہ تو پاکستان کی اسلامی ریاست سے لیتے رہے لیکن کام ہمیشہ دشمنوں کا کرتے رہے[۱۲۶]۔ اسی دور میں سندھی اخبارات ورسائل میں اسلامی لٹریچر کے فقدان نے وطن اور مذہب بیزار رویہ پیدا کرنے کی جو راہ ہموار کی اس نے سندھ کے اندر لسانی عصبیتوں اور تفرقے بازی کو خوب فروغ دیا۔ بھارتی ہندو ادیبوں کی تحریروں سے بھی نفرت کے بیج کو خوب کھاد ملا۔ سہ ماہی "مہران" میں ایک بھارتی ہندو شاعر کھیل داس فانی نے بھارت سے آئے ہوئے مسلمانوں کو سندھ کا دشمن بتاتے ہوئے لکھا کہ:

> ہرن ریت کی طرف واپس لوٹنا چاہتا ہے/ جنھوں نے خود بھاگ کر مجھے اپنے وطن سے
> بھگایا اور جنھوں نے/ مجھے اور میرے وطن کو تباہ کر ڈالا/ کاش اے فانی!/ میں ایسے
> لوگوں کو ہمیشہ دکھ میں دیکھوں[۱۲۷]

واضح طور پر شاعر ان مہاجرین کو سندھ کا دشمن قرار دے رہا ہے جو ہندوستان کے مختلف علاقوں سے سندھ میں آباد ہو گئے تھے۔ اسی طرح کئی اخبارات اور رسائل ایسے مضامین بھی چھاپتے جن میں انھیں پناہ گیر وغیرہ کے القاب سے نوازا جاتا۔ رسالہ سہ ماہی "مہران" ہی میں ایک مضمون شائع ہوا جس میں ایک ہندو مضمون نویس کشور جیون نے لکھا کہ:

ہر جگہ پناہ گیر چھائے ہوئے ہیں۔ جدھر دیکھو پناہ گیر ہی پناہ گیر نظر آتے ہیں۔ اگر قانون نے ہماری مدد نہیں کی تو ہم دوسرے طریقوں سے پناہ گیروں کو مار بھگائیں گے[۱۲۸]۔

بھارت سے سندھی میں شائع ہونے والے رسائل اور جرائد بھی سندھ میں بڑی تعداد میں تقسیم کیے جاتے۔ ہفت روزہ "پشت بھوی" جو اندور سے شائع ہوتا تھا۔ اس نے ۱۴ مئی ۱۹۶۷ء کے شمارے میں لکھا کہ:

سندھ کے اندر سندھی مسلمانوں میں سندھ قومیت کا جو عمدہ جذبہ پیدا ہوا ہے، اس نے سندھ کی پاک سرزمین کو ایوب شاہی ناپاک ہاتھوں سے پاک کرنے کا راستہ ہموار کر دیا ہے۔ سندھی مسلمان اس وقت خود کو خالص سندھی سپوت تصور کرتے ہیں اور غیر سندھی مسلمانوں کے مظالم نے اب ان کی آنکھیں کھول دی ہیں[۱۲۹]۔

ایک طرف تو اسلام، پاکستان اور غیر سندھیوں سے نفرت آمیز لٹریچر کی بھرپور ترسیل کی جارہی تھی، دوسری طرف اسلامی لٹریچر سے بے خبری بھی سندھی نوجوانوں میں اس طرح کا رویہ بیدار کر رہی تھی۔ "ہلال پاکستان" جو کہ سندھ کا پرانا اخبار تھا، ۱۹۶۹ء میں پیپلز پارٹی نے جب خریدا تو پارٹی چیرمین ذوالفقار علی بھٹو نے ۱۳ اگست ۱۹۶۹ء کو اس کی افتتاحی تقریب میں اخبار کا پالیسی بیان دیتے ہوئے کہا کہ "ہلال پاکستان" صحیح معنوں میں عوامی اخبار ہونے کی مثال قائم کرے گا۔ انھوں نے نئے سندھیوں کی بابت کہا کہ انھوں نے قیام پاکستان میں شان دار خدمات انجام دی ہیں اس لیے انھیں خراجِ عقیدت پیش کرتا ہوں، مزید یہ کہ سندھ پر نئے اور پرانے دونوں سندھیوں کا برابر کا حق ہے"[۱۳۰]۔ بھٹو کے ان عمدہ خیالات نے سندھ میں بسنے والے تمام طبقات کو کچھ عرصے کے لیے مطمئن تو کر دیا تھا لیکن جیسا بھٹو نے سوچا تھا ویسا ہوا نہیں بلکہ اس کے برخلاف اس اخبار نے سندھ کے مسلمانوں کے مختلف طبقات کو لڑانے اور انھیں لسانی اور علاقائی بنیادوں پر ایک دوسرے کے خلاف کھڑا کرنے میں جو گھناؤنا کردار ادا کیا، اس نے آگے جا کر سندھ میں انتہائی خطرناک صورت اختیار کر لی۔ ظاہر سی بات ہے کہ جو بیج قیام پاکستان کے بعد جی۔ ایم۔ سید اور ان کے پروردہ لوگوں نے بویا تھا، اگلی دو تین دہائیوں میں اس نے ایک تناور درخت کی شکل اختیار کر لی تھی۔ ۲۹۴ صفحات پر مشتمل کتاب "سندھو دیش کیوں اور کس لیے" میں جی۔ ایم۔ سید نے جس طرح اسلام، پاکستان اور قائداعظم کی ذات کے خلاف ہرزہ سرائی کی تھی، اس پر حکومتِ پاکستان کی مجرمانہ خاموشی سمجھ سے بالاتر تھی۔ اس کتاب میں قومی زبان کی حیثیت سے اردو کی حیثیت پر سوال اٹھانے کے ساتھ ساتھ پنجابی مہاجر تسلط، مہاجر وزیراعظم لیاقت علی خان کی تقرری، سندھ کو مہاجروں کے ذریعے کالونائز کرنے کی سازش، سندھیوں کو متروکہ وقف املاک سے محروم کرنے، حکومت کی باگ ڈور مہاجروں

اور پنجابیوں کے حوالے کرنے، قائد اعظم کو آمرانہ سوچ کے مالک قرار دینے[۱۳۱] وغیرہ جیسے بے ہودہ الزامات لگا کر سندھ کے معصوم عوام کو گمراہ کرنے کی سازشوں کا آغاز تو پہلے ہی ہو چکا تھا۔ اس پر جلتی پر تیل ڈالنے کا کام اس قسم کے متعصبانہ اخبارات و رسائل نے کیا جن کا ذکر مذکورہ صفحات میں کیا جا چکا ہے۔ ''ہلالِ پاکستان'' میں کھلم کھلا آزادی کے نعرے بلند کیے گئے[۱۳۲]۔ ستر کی دہائی میں اس اخبار نے نفرت انگیز مواد کی اشاعت کو ہی اپنا شعار بنایا۔ کچھ ترقی پسند معروف شعرا نے بھی اس عمل میں ان کا ساتھ دیا۔ فیض احمد فیض کے کلام میں بھی اس بات پر خوشی کا اظہار کیا گیا کہ جن امور پر ستر کی دہائی سے قبل پاکستان میں بولنے کی اجازت نہیں تھی، اب ان پر تنقید کی کھلی چھوٹ مل گئی ہے۔ اپریل ۱۹۷۵ء میں ''پاکستانی ادب'' کے ایک شمارے میں فیض کی ایک نظم ''بہار آئی'' کے عنوان سے شائع ہوئی۔ اس آزاد نظم میں کہتے ہیں کہ:

جو بند آنکھوں میں کھو گئے تھے/جو بند نبضوں میں سو رہے تھے/ملال احوال دوستاں
بھی/خمار آغوش مہ وشاں بھی/''غبارِ خاطر'' کے باب سارے/اترے ہمارے سوال
سارے/جواب سارے/بہار آئی تو کھل گئے ہیں/نئے سرے سے حساب سارے[۱۳۳]

حالاں کہ فیض احمد فیض جن معاملات پر لب کشائی کی اجازت کو بہار کی آمد قرار دے رہے ہیں، وقت نے ثابت کیا کہ ان معاملات نے سندھ کی سیاسی فضا کو بگاڑنے میں کس قدر منفی کردار ادا کیا۔ پاکستان کے استحکام کے حوالے سے جس قسم کے تحفظات آج تک اندرونِ سندھ اور بلوچستان کے مختلف علاقوں سے روا رکھے جاتے ہیں، وہ دراصل اسی آزاد روی کا نتیجہ ہیں۔ قومی معاملات میں ملک کے استحکام کو افضلیت دینے کے بجائے اپنی نظریاتی اساس پر ہی انگلی اٹھانے سے بہر حال حکومت اور ملک دونوں کی جڑیں کمزور ہوئیں۔ اسی عمل سے جمہوریت کے تسلسل کو بھی نقصان پہنچا۔ نصف پاکستان کھونے کے باوجود ہمارے ادبا اور شعرا کے اس رویے میں کوئی تبدیلی نظر نہیں آئی۔ مذکورہ شمارے ہی میں فیض کے ساتھ ساتھ حمایت علی شاعر کی بھی ایک نظم ''موئن جو دڑو کا دوسرا آدمی'' شائع ہوئی۔ حمایت علی شاعر بھی فیض اور سبطِ حسن کے قبیل اور سیاسی ذہن رکھنے والے شاعر تھے چناں چہ صوبائی تعصب اور حقوق کے نام پر مختلف قومیتوں اور لسانی گروہ کو آپس میں لڑانا اور اختلاف پیدا کرنا ہی ان لوگوں کا شعار ٹھہرا[۱۳۴]۔ اپنی مذکورہ نظم میں بھی وہ انھی خیالات کی حمایت کرتے ہیں کہ پاکستانیت اور اسلام کے رشتے اور مذہبی بندھن اتنے اہم نہیں جتنے کہ جغرافیائی رشتے ہوتے ہیں۔ وہ ہندوؤں اور دراوڑوں کے رشتۂ یگانگت پر تو زور دیتے ہیں مگر اسلام اور پاکستان کے رشتے کو ایک طرف چھوڑ کر آگے بڑھ جانا چاہتے ہیں:

بدل گئے ہیں عقیدے، بدل گئی تہذیب
مگر وہ خون کہ آتی ہے جس سے بوئے حبیب
بدن کا دوست ہے لیکن دماغ و دل کا رقیب[۱۳۵]

یہ صرف ایک شاعر کی بڑ نہیں بلکہ ایک باقاعدہ منصوبہ بندی کے تحت صوبائیت اور لسانیت کو ابھارنے کی ایک تحریک تھی۔ اس رسالے میں اکثر ایسی نظمیں اور افسانے شائع ہوتے جن میں سندھ دھرتی کی قدامت اور اس کی علاحدہ شناخت کے اشارے ملتے۔ مئی ۱۹۷۵ء میں شیخ ایاز کی نظم "سندھ صدیوں سے" بھی اسی رسالے میں شائع ہوئی۔ اس نظم کا مقصد بھی محض اس کے سوا کچھ نہیں کہ سندھ کی تہذیب کو محمد بن قاسم اور اسلام سے الگ کر کے راجہ داہر اور موئن جو داڑو اور دراوڑوں سے ملا کر پیش کیا جائے تاکہ سندھو دیش کی راہ ہم وار کی جاسکے[۳۶]۔

ایک جماعت تو نوزائیدہ مملکت میں رہنے والی مختلف قومیتوں کے مسائل اور باہمی اختلاف اور دوسری جانب حکومتی مشنری کا منفی کردار جس نے مذکورہ بالا تعصب کی آگ کو ہوا دینے میں ایندھن کا کام کیا، اس زمانے میں اس ملک کی بیوروکریسی کا حصہ بننے والے متعدد اہل قلم نے اپنی تصانیف میں جس قسم کے خیالات کا اظہار کیا وہ ہماری آنکھیں کھولنے کے لیے کافی ہے۔ کراچی انتظامیہ کے منتظم ہاشم رضا نے اپنے سرکاری نوٹ مورخہ ۶ فروری ۱۹۵۱ء کو کراچی کی انتظامیہ کی کارکردگی کا نقشہ کھینچتے ہوئے لکھا کہ اس زمانے میں عوامی بہبود کا وہ تمام کام جو بالعموم شہری انتظامیہ کو انجام دینے چاہیے تھے، مسلسل نظر انداز ہوتے رہے اور مقامی انتظامیہ میں افسران کا ایسا حلقہ پیدا ہوتا چلا گیا جو وزرا، سفرا اور سیاست دانوں سے تعلقات عامہ قائم رکھنے کو اپنے فرائضِ منصبی پر ترجیح دیتا تھا[۳۷]۔ پاکستان میں اس کے قیام کے زمانے سے ہی افسر شاہی نے جو کھیل کھیلا، اس کا کچّا چٹھّا بڑی حد تک متعدد کتابوں میں شائع ہو چکا ہے۔ ایک طرح سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ سول اور ملٹری بیوروکریسی نے شروع سے ہی اقتدارِ اعلیٰ پر نظریں گاڑھی ہوئی تھیں اور بڑی حد تک حکومتوں کو یرغمال بنا رکھا تھا۔ پاکستان کے ابتدائی زمانے کے ایک سینئر بیوروکریٹ شہاب الدین رحمت اللہ جن کا تعلق صوبۂ بہار سے تھا، وہ قیام پاکستان کے بعد ڈھاکا کے پہلے ڈپٹی کمشنر بھی مقرر ہوئے، ۱۹۵۶ء میں کراچی میں سیکریٹری کے عہدے پر ریٹائرڈ ہوئے، اپنی خودنوشت "شہاب بیتی" میں لکھتے ہیں کہ:

> پاکستان میں صحت مندانہ اور منصفانہ سیاست شہید ملت نواب زادہ لیاقت علی خان مرحوم کے بعد کبھی وجود میں نہ آسکی کیوں کہ سیاسی لیڈروں اور نوکر شاہی کے درمیان اقتدار کی جنگ شروع ہو گئی ... حکمراں، نوکر شاہی اور خود ساختہ سربراہ مملکت کے لیے من مانی کرنے کا میدان صاف ہوتا گیا اور کھلی بدعنوانی، ناانصافیوں، سازشوں اور تشدد کی راہیں ہم وار ہوتی گئیں۔ نوکر شاہی کے چند اراکین اپنی چال بازیوں کے ذریعے بہت سے اہم محکموں اور علاقوں میں برسرِ اقتدار آئے تو انھوں نے ذاتی مفاد کے مد نظر انتظامیہ کے ایمان دار اور ... کارآمد افسران کو اکھاڑ پھینکنے کی مہم چلائی ... لسانی اور صوبائی تعصبات کی سرپرستی اپنے مفاد میں کی ... انصاف کی جگہ حق تلفیوں کو اپنا نصب العین بنایا ... سول سروس اور پولیس میں ایسے افسران کا چناؤ ملک کے اہم ترین عہدوں پر ہوتا رہا جن کا کوئی قابلِ ذکر ملازمتی کارنامہ ہندوستان میں نہ تھا[۳۸]۔

مذکورہ اقتباس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ پاکستان کی بیوروکریسی ابتدائی ایام سے ہی کن خطوط پر استوار تھی۔ خصوصاً پولیس سروس اور شہری انتظامیہ میں نا اہل افسروں نے رشوت اور اقربا پروری کا جو بازار گرم کیا، اس نے کراچی میں رہنے والے اردو بولنے والی آبادی میں احساسِ محرومی میں بہت زیادہ اضافہ کیا۔ مملکت کے اندر ہونے والے اس سازشی ڈرامے کے کردار صرف بیوروکریسی ہی نہیں بلکہ موقع پرست سیاست دان، چاپلوس زمین دار، جاگیر دار، وزیر، سفیر، صنعت کار اور صحافی سب ہی اس کھیل کے برابر کے شریک تھے۔ لڑاؤ اور حکومت کرو کی اس پالیسی کو جو کہ انگریزوں نے مسلمانوں اور ہندوؤں میں دوریاں پیدا کرنے کے لیے اختیار کی تھی، صوبائیت اور لسانیت کی آگ میں جھونک کر اسی عمل کو مقامی سطح پر پھر سے دہرایا جارہا تھا۔ سندھ کے بیشتر مسائل اسی بیوروکریسی اور موقع پرست سیاست دانوں ہی کے گھناؤنے اشتراکی عمل کا نتیجہ رہے ہیں اور یہ ان ہی کے بوئے ہوئے زہریلے بیج ہیں جن کی فصل باشندگانِ سندھ اب تک کاٹ رہے ہیں[۱۳۹]۔ سندھ کی دیہی اور شہری آبادی کے درمیان آج جو دوریاں نظر آتی ہیں، ظاہر سی بات ہے کہ اس کا بیج بھی قیام پاکستان کے ابتدائی زمانے میں ہی بویا جاچکا تھا۔ افسوس کہ ہجرت کی تاریخ میں یہی ایک مثال ہے کہ نئی آبادی پرانوں کو جاہل، مفلس، اچھوت تصور کرنے لگی۔ اپنے آپ آریہ تہذیبی تمدنی لحاظ سے اونچا سمجھ کر الگ کھچڑی پکانے لگی"[۱۴۰]۔ سندھی قوم پرستی کے سیاسی لٹریچر نے نئے آنے والے اس گروہ کو جو اب اس نوزائیدہ مملکت کو اپنا وطن سمجھنے لگا تھا، مہاجر اور پناہ گیر کے القابات سے نوازا[۱۴۱] تو دوسری جانب خود ان نئے آنے والوں سندھیوں نے بھی سندھ کے قدیم باشندوں کے مسائل پر بالکل توجہ نہ دی۔ وہ غریب کچلا ہوا سندھی جس کے مسائل کسی طرح بھی نئے سندھیوں سے کم نہ تھے بلکہ بعض صورتوں میں ان سے کہیں زیادہ ہی تھے، ان کے سیاسی، سماجی اور معاشی مسائل کو اردو شعرا نے درخورِ اعتنا نہیں جانا اور ایک طرح سے سندھیوں کے ان معاملات سے مجرمانہ خاموشی برتی گئی۔ ظاہر سی بات ہے قیامِ پاکستان کے زمانے کے خونچکاں فسادات، لاکھوں انسانوں کے قتلِ عام، آبائی علاقوں سے کروڑوں انسانوں کی جبری ہجرت، انتہائی بے سروسامانی کی عالم میں دنیا کی سب سے بڑی اسلامی مملکت کا قیام، نئی مملکت کے محض تیرہ برسوں کے اندر ہی قائداعظم کی وفات اور مسلم لیگ کا زوال، لیاقت علی خان کا وحشیانہ قتل، عوامی قیادت کا انتشار، صوبائی رقابتیں، مہاجرین کے مسائل، نئے پاکستانیوں کی محرومیاں اور مایوسیاں، متروکہ جائیداد کے دعوے، جائز و ناجائز الاٹمنٹ کا سلسلۂ دراز، فرقہ پرستی اور ترقی پزیر ہونے جیسے نعرے وغیرہ نے[۱۴۲] ان شعرا کو مقامی سندھیوں کی طرف دیکھنے سے غافل رکھا۔ وہ زمانہ سخت ہیجان و اضطراب کا زمانہ تھا۔

اس زمانے کی واضح جھلک اگر دیکھنی ہو تو رئیس امروہوی اس کی بہترین مثال ہیں۔ ان کے قطعات میں جابجا ان گہرے پرشور طوفانی ہیجانات کی جھلکیاں نظر آئیں گی۔ ہندو مسلم فسادات کے بعد برصغیر میں جس قسم کی سیاسی صورتِ حال تھی، اس کا اظہار کرتے ہوئے ۱۱ اگست ۱۹۴۷ء کے ایک قطعے میں رئیس امروہوی کہتے ہیں کہ:

بر کوچک خوف اور نفرت کا گھوارہ ہوا　　دامنِ امن و اماں صد چاک و صد پارہ ہوا

دیکھنا انگریز کی منصوبہ بندی کا کمال　　ہند پاکستان سکھ تینوں کا بٹوارہ ہوا[۱۴۳]

اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ قیام پاکستان کے بعد اردو بولنے والوں پر سندھ کا یہ بڑا احسان ہے کہ اس صوبے نے نئے سندھیوں کو ایک خطۂ زمین فراہم کیا جس نے باہمی جذب و انجذاب کا ایک سلسلہ وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا گیا۔ غیر موافق سیاسی حالات کے باوجود عوامی سندھیوں کا مہاجروں کے درمیان خیر سگالی کے تعلقات بھی پروان چڑھتے دکھائی دیتے رہے۔ اندرونِ سندھ آباد نئے سندھیوں نے اپنے آپ کو سندھ کے ماحول سے مانوس کرنا شروع کر دیا تھا اور معاشرتی سطح پر باہمی اخوت، تعاون اور اشتراک کی فضا قائم ہونے لگی تھی۔ یہ ساز گار فضا ۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۴ء تک برقرار رہی۔ سندھ میں ایک دولسانی مخلوط تہذیبی معاشرہ ظہور پانے لگا تھا۔ مختلف خاندانوں کے درمیان رشتے ناطے بھی جڑنے لگے تھے لیکن اس پر سکون فضا میں بعض مہاجر خود ساختہ رہنماؤں کی جاہلانہ احساسِ برتری اور دوسری جانب سندھی قوم پرستی اور تنگ نظری کے ساتھ ساتھ دونوں جانب سے متعصبانہ بیان بازیوں نے وہ ارتعاش پیدا کیا[۱۴۴] جو آج تک تھمنے کا نام نہیں لیتا۔ ابتدا میں یہ مہاجرین جب کراچی میں آ کر بسے تو کراچی کسی مسائلستان سے کم نہ تھا۔ ۱۶ فروری ۱۹۴۸ء کے ایک قطعے میں رئیس امروہوی اس جانب اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

کس نے کہا کہ شہر کراچی میں آج کل　　کچھ بھی نہیں ہیں زہرِ مصیبت کے گھونٹ ہیں

کس چیز کی کمی ہے ہمارے دیار میں　　مفلس ہیں، اہلِ زر ہیں، مہاجر ہیں، اونٹ ہیں[۱۴۵]

نئے آنے والے سندھیوں کی آباد کاری کے جو مسائل کراچی اور پورے سندھ کو درپیش رہے، ابتدائی زمانے سے ہی رئیس امروہری کے ہاں اس کا اظہار ملتا ہے۔ قطعہ ملاحظہ کیجیے:

کیا خوب اک بزرگ کو میں نے دیا جواب　　آئے تھے دور سے جو تمنائے سندھ میں

حضرت کو ہے ابھی سے ٹھکانے کی آرزو　　کچھ روز بلبلایئے صحرائے سندھ میں[۱۴۶]

ظاہر سی بات ہے جن چھے لاکھ مہاجروں نے کراچی میں دھاوا بولا وہ شہر کی تمام کھلی جگہوں اور یہاں سے جانے والے ہندوؤں کی چھوڑی ہوئی عمارتوں پر قابض ہوگئے۔ یہ مہاجر آبادیاں مختلف طبقات اور مختلف نسلوں پر مشتمل تھیں۔ دانش ور، فن کار، شاعر، اداکار اور مزدور پیشہ لوگ سب کے سب ایک ساتھ صدر بازار سے چند قدم کے فاصلے پر رہتے تھے۔ قیام پاکستان کے چار برس کے اندر ہی کراچی ایک انوکھی اور وسیع المشرب ثقافت کے ساتھ مختلف طبقات پر مشتمل ایک گنجان آباد شہر بن گیا[۱۴۷]۔ اسی لیے رئیس امروہوی سمیت متعدد شعرا نے اس شہر کی خوب صورتی اور عظمت کے گیت بھی گائے۔ ۱۹ فروری ۱۹۴۸ء کو انھوں نے کراچی کو جنت سے تشبیہ دیتے ہوئے کہا کہ:

جلوۂ صبحِ بنارس منظرِ شامِ اودھ — ہم کو ہر دولت کراچی کی بدولت مل گئی

ہر قدم صد حسن و جلوہ ہر نفس صد رنگ و بو — ہم نے پاکستان مانگا تھا سو جنت مل گئی[۱۴۸]

رئیس امروہوی نے کراچی کے مسائل کو ایک الگ ہی نظر سے دیکھا۔ صحافت سے وابستہ رہنے کی وجہ سے وہ اس شہر میں ہونے والے روز مرہ مسائل سے پوری طرح واقف تھے۔ اس زمانے کی سیاست اور معیشت پر بھی ان کی گہری نظر تھی۔ معاشیات کے موضوع پر ان کا مضمون ''انسان اور لامحدود وسائل''[۱۴۹] خاصے کی چیز ہے۔ اس مضمون سے ہم معاشی امور میں رئیس امروہوی کی بصیرت کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ لیکن ان کا اصل میدان سیاسی اور سماجی موضوعات کا گہرا فہم و ادراک ہے۔ انھوں نے کراچی کے سماجی، سیاسی اور معاشی مسائل کے بارے میں نہ صرف شاعری کے ذریعے اپنے خیالات کا اظہار کیا بلکہ اپنے کالموں کے ذریعے حکومتِ وقت کو اس شہر کے مسائل اور ان کے حل کی طرف توجہ دلائی۔ اس بابت کالم ''کراچی نامہ'' خاص اہمیت کا حامل ہے۔ ''کراچی نامہ'' کے عنوان سے پہلا کالم ''یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا''[۱۵۰] شائع ہونا شروع ہوا تو لوگوں نے ان کالموں کو خوب سراہا۔ یہ کالم دراصل اس شہر کے حوالے سے رئیس امروہوی کی جانب سے کی جانے والی شاعری کی وضاحت ہے۔ ان کالموں میں شہر کے حوالے سے کی جانے والی شاعری کے پیرامیٹرز بتاتے ہوئے وہ خود کہتے ہیں کہ:

> یوں تو اس شہر عظیم الشان کا ہر شخص خود ایک مسئلہ ہے لیکن چاروں وزرائے کرام چار روز کی تحقیق و تدقیق کے بعد اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ کراچی کے بنیادی دیوزاد مسئلے صرف چار نہیں۔ آبادکاری کا مسئلہ، پانی کا مسئلہ، صفائی کا مسئلہ اور ٹریفک کا مسئلہ[۱۵۱]۔

دل چسپ اور افسوس کی بات یہ ہے کہ ۱۹۶۷ء میں لکھے گئے اس کالم میں کراچی کے جن مسائل کی نشان دہی کی گئی ہے وہ نصف صدی کے بعد بھی جوں کے توں ہیں بلکہ ان میں قدرے اضافہ ہو رہا ہے۔ اہم بات تو یہ ہے کہ اس شہر کے وسائل پر تو سب نے ہی اپنا حق جتایا لیکن اسے حقیقی معنوں میں اپنا شہر سمجھنے میں تمام ہی طبقہ ہائے فکر نے کنجوسی سے کام لیا۔ ابتدا میں جو مہاجرین یہاں آکر بسے وہ بھی خود کو عرصۂ دراز تک دہلوی، لکھنوی، الہ آبادی، بہاری، مرادآبادی، یوپی، سی پی وغیرہ وغیرہ کہہ کر اپنی شناخت کے گورکھ دھندوں میں الجھے رہے جو رفتہ رفتہ مکڑ، مٹروے، پناہ گیر سے ہوتا ہوا لفظ ''مہاجر'' کی تان پر ختم ہوا اور بلآخر یہی لفظ ان نئے سندھیوں کی شناخت ٹھہرا۔ بعد میں دارالخلافہ ہونے کی وجہ سے جن بڑے لسانی گروہ کا اس شہر پر غلبہ رہا وہ بھی خود کو سرائیکی، پنجابی، ہزارے وال اور پختون کی حیثیت سے اپنی علاحدہ شناخت پر اصرار کرتے رہے۔ پروین شاکر نے شہر کے ساتھ ہونے والے اس سلوک پر شدید غم و غصے کا اظہار کیا۔ اپنی نظم ''کراچی'' میں انھوں نے اس شہر کو طوائف سے تشبیہ دیتے ہوئے کہا کہ جس طرح بازار میں ان طوائفوں کے ساتھ سلوک ہوتا ہے، یہاں سے اپنی معاشی ضروریات پوری کرنے والے لوگ شہر کے ساتھ اس طرح کا سلوک روا رکھے ہوئے ہیں۔ اس نظم میں ان کا غم و غصہ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ وہ کہتی ہیں کہ:

کراچی/ایک ایسی بیسوا ہے/جس کے ساتھ/پہاڑوں، میدانوں اور صحراؤں سے آنے
والا/ہر سائز کے بٹوے کا آدمی/رات گزارتا ہے/اور صبح اٹھتے ہی/اس کے داہنے
رخسار پر/ایک تھپڑ رسید کرتا ہے/اور دوسرے گال کی توقع کرتے ہوئے/کام پر نکل
جاتا ہے/اگلی رات کے نشے میں سرشار![۱۵۲]

کراچی کے ساتھ یہ رویہ کوئی نیا نہیں بلکہ قیام پاکستان کے ابتدائی زمانے سے ہی یہاں کے باسیوں کا یہی وتیرہ رہا۔ رئیس امروہوی نے ۴مارچ ۱۹۴۸ء کے ایک قطعے میں بھی اس جانب اشارہ کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ:

ہم کو ملا ہے شہر کراچی نصیب سے — چھینکا جو گر پڑا ہے تو بلی کے بھاگ ہیں
جس جس سے ہم یہاں پہ ملے یہ پتہ چلا — یہ ''بمبئی'' کے سیٹھ یہ ''دلّی'' کے گھاگ ہیں[۱۵۳]

اپنے ایک اور قطعے میں انھوں نے طنزاً کہا ہے کہ:

یہ ذکر تھا کہ فخر کراچی ہیں کون لوگ — اک رہ نمائے قوم پکارا کہا کہ ہم
اک شوخ نازنیں بھی گزرتی تھی راہ سے — برقع الٹ کے اس نے اشارہ کیا کہ ہم[۱۵۴]

قومی شناخت اور تشخص کے مسئلے نے مہاجر نوجوانوں کو قیام پاکستان کے ابتدائی زمانے سے ہی شدید قسم کے احساسِ محرومی اور جھنجلاہٹ سے دوچار رکھا۔ ایک خاص حصۂ آبادی کے خلاف متعصبانہ کارروائیوں نے اس جھنجلاہٹ کو اور ہوا دی۔ بلا شبہ پاکستان کے ابتدائی برسوں میں معاشی اور سیاسی حالات کا رخ نسبتاً مہاجروں کے حق میں رہا۔ وہ جب لٹے پٹے یہاں آئے تو سندھی عوام نے کھلے دل اور کشادہ بازوؤں کے ساتھ ان کا استقبال کیا۔ سول اور فوجی بیوروکریسی میں بھی اس وقت اچھا خاصا حصہ ان مہاجروں کے حصے میں آیا۔ اگر دیکھا جائے تو اس نوزائیدہ مملکت کی باگ ڈور ہی ہندوستان سے آئے ہوئے آئی۔ سی۔ ایس افسران کے ہاتھوں میں تھی۔ وفاقی اور صوبائی محکموں میں ان کی اچھی خاصی کھپت تھی۔ صنعت و حرفت اور تجارت کے میدان میں بھی انھیں خاص مسابقت کا سامنا نہ تھا۔ ہندوؤں کے جانے کے بعد تجارت میں جو خلا پیدا ہوا تھا، بڑی حد تک مہاجر تاجروں نے اسے پورا کیا۔ جب کہ ان مہاجروں کو شروع سے ہی نہایت کٹھن حالات اور دشواریوں کا سامنا تھا اور ان دشواریوں اور چیلنجوں سے نبٹنے کے لیے ان کے پاس صرف اور صرف ایک ہی راستہ تھا ''محنت اور انتہائی محنت'' اور انھوں نے بڑی حد تک اپنی محنت اور جدوجہد سے حالات کو اپنی موافقت میں ڈھال بھی لیا اور اپنی پوری صلاحیتوں سے اس نوزائیدہ مملکت میں اپنا مستقبل سنوارنے اور اس مملکت کی تعمیر و ترقی میں مصروف ہوگئے۔ اپنی جدوجہد اور کوشش سے ہر مشکل کا مقابلہ ان لوگوں نے کرکے دکھایا۔ لیکن یہ صورتِ حال زیادہ عرصے تک قائم نہ رہ سکی۔ ایوب خان، یحییٰ خان، ذوالفقار علی بھٹو ضیاالحق کے عہد میں سول اور

فوجی بیورو کریسی کی تطہیر کے نام پر مہاجر افسران کو چن چن کر ملازمت سے نکالا جانے لگا جس کے نتیجے میں مہاجروں کے اندر شدید احساسِ ہزیمت و بے بسی پیدا ہوا[۱۵۵]۔

بعد کے سیاسی حالات اور ریاستی جبر نے اس سوچ میں مزید پختگی پیدا کی۔ ظاہر سی بات ہے کہ ملکی حالات اور ریاستی معاملات کی دگر گوں حالت خصوصاً سندھ کے محب وطن مہاجروں کے ساتھ روا رکھے جانے والے رویے نے اس دور کے تقریباً تمام ہی شعرا کو متاثر کیا۔ سیماب اکبر آبادی قیام پاکستان کے بعد کچھ زیادہ عرصے زندہ نہیں رہے۔ ۱۹۵۱ء میں ان کا انتقال ہو گیا۔ مگر جاتے جاتے وہ اس آزادی کی بابت اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہہ گئے کہ:

لتھڑی ہوئی ہے خوں میں آزادیِ وطن　　　اچھے رہے وہ لوگ جو زنداں میں رہ گئے[۱۵۶]

غریب الوطنی کے جس کرب سے سیماب گزرے، اس نے انھیں بہت بے تاب رکھا۔ اس غریب الوطنی کا اظہار جا بہ جا ان کے کلام میں دکھائی دیتا ہے۔ ساتھ ساتھ ناگفتہ بہ ملکی حالات نے بھی انھیں بے حد پریشان رکھا۔ ان پریشانیوں کو انھوں نے شعر کے قالب میں ڈھالا۔ وہ کہتے ہیں:

کفن کو خاک، لحد کو زمیں، نفس کو سکوں　　　اب اور قدر غریب الدیار کیا ہو گی
کوئی حالاتِ وطن کا نہیں پرساں سیماب　　　سب یہی پوچھنے آتے ہیں وطن کیوں چھوڑا[۱۵۷]

اسی طرح استاد قمر جلالوی (۱۸۸۷ء۔۱۹۶۷ء) کے ہاں بھی ہجرت کا کرب بہت نمایاں رہا۔ ہندوستان سے آنے والے مہاجرین کو جس قسم کے مصائب اور تنفر کا نشانہ بنایا گیا، اس کا احساس قمر جلالوی کے ہاں بہت گہرا ہے۔ وہ اس احساس کو شاعرانہ پیرایۂ اظہار دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

کب میرا نشیمن اہلِ چمن گلشن میں گوارا کرتے ہیں
غنچے اپنی آوازوں میں بجلی کو پکارا کرتے ہیں
تجھے باغ باں پھر میں سمجھا رہا ہوں، ہواؤں کے رخ اور کچھ کہہ رہے ہیں
کہیں آگ پھیلے نہ سارے چمن میں، مرا گھر جلانے کی کوشش نہ کرنا[۱۵۸]

حامد لکھنوی کے ہاں بھی اس عہد کے غیر یقینی حالات اور سیاسی منظر نامے کی عکاسی بھرپور انداز میں نظر آتی ہے۔ ان کی شاعری میں ایک اضطرابی کیفیت ہے جو ان حالات کی بے یقینی نے ان کی شاعری میں پیدا کی۔ دیکھیے:

ابتدا ہی سے تھی انجامِ نشیمن پہ نظر　　　اپنے ہاتھوں سے مگر آگ لگائی نہ گئی
چُپ نہ رہتے تو اسیرانِ وطن کیا کرتے　　　آشیانے کی لگی آگ بجھائی نہ گئی
ہر خوشی باعثِ آزار ہوئی جاتی ہے　　　صبحِ امید شبِ تار ہوئی جاتی ہے[۱۵۹]

ناامیدی کی یہ کیفیت ان کے ہاں جا بہ جا ملتی ہے۔ اس نسل سے تعلق رکھنے والے اکثر شعرا کا رنگ اسی مخصوص انداز کی غمازی کرتا ہے۔ رعنا اکبر آبادی کے ہاں بھی ہجرت کا کرب اور نئے وطن میں ہونے والے سلوک پر نہ صرف غم و غصے کی کیفیت نمایاں ہے بلکہ ایک طرح کی پشیمانی کا احساس بھی ابھر کر سامنے آتا ہے۔ یہ پشیمانی ہجرت کا کرب سہنے کی نمائندہ ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

یہ سوچتا ہوں گلستاں میں رائیگاں ہی گیا — جو وقت صرف ہوا آشیاں بنانے میں

ہائے وہ حسرت نشیمن کی قفس سے چھوٹ کر — آشیاں برباد اک اک آشیاں دیکھا کیا

قفس کے بعد کوئی گھر نظر نہیں آتا — قفس سے پہلے بسیرا تھا آشیانے میں

بے کسی، یادِ وطن، ذکرِ حیاتِ رفتہ — خوب سامان ملے، بے سرو ساماں ہو کر[۱۶۰]

یہ احساسِ رائیگاں جب شعرا میں پیدا ہونے لگا تو ظاہر سی بات ہے کہ عام لوگوں میں بھی اس بے چینی کو واضح طور پر محسوس کیا گیا۔

جلیل قدوائی کا شمار بھی کراچی کے بزرگ اساتذہ میں کیا جاتا تھا۔ ان کا ایک مجموعہ "نوائے سینۂ تاب" کے نام سے منظر عام پر آیا۔ ان کے ہاں بھی عصری ماحول کا اثر نمایاں ہے۔ جیسے:

سانحہ یہ بھی عجب عشق میں مجھ پر گزرا — میری امید کے گلشن کا بیاباں ہونا

کب تک آخر فقط امید پر جینا ہوگا — پار ہوگا کہ مرا غرق سفینہ ہوگا

کٹے گی کس سہارے پر جلیل اب زندگی اپنی — زمین و آسماں اپنا نہ دل اپنا نہ یار اپنا[۱۶۱]

اس دور میں بہزاد لکھنوی کراچی کے ادبی افق پر ایک منفرد آواز بن کر ابھرے۔ ادبی حلقوں میں اپنے منفرد لب و لہجے کی وجہ سے انھیں جلد ہی اعتبار حاصل ہو گیا۔ ان کی شاعری کے متعدد مجموعے منظر عام پر آئے۔ ہجرت کا کرب، وطن سے دوری، نئے ماحول ستم ظریفی اور اپنوں کے ظلم و ستم وغیرہ ان کی شاعری کے بنیادی موضوعات میں شمار کیے جاتے ہیں۔ ان کی غزلوں میں ہجرت کر کے پاکستان کو اپنا مسکن سمجھنے والوں کے حالات پر آنسو بھی ہیں اور آہیں بھی، بے کیفی، ستم ظریفی، بے وفائی، نشیمن کے لٹنے کا کرب اور آشیاں برباد ہونے کی کسک غرض وہ سب کچھ ہے جو اس زمانے کے ماحول کی سچی منظر کشی کر سکے۔ اشعار ملاحظہ کیجیے:

کچھ عجب دل کا حال ہے پیارے — زندگی اک وبال ہے پیارے

کیوں آسماں مٹاتا ہے نام و نشاں مرا — بہزاد نقشِ ہستیِ باطل نہیں ہوں میں[۱۶۲]

حیدر دہلوی کے ہاں بھی اس ہجرت کا اثر بہت گہرا ہے۔ وہ ہندوستان سے ہجرت کر کے پہلے ڈھاکا گئے اور پھر ہجرت کا دہرا عذاب سہہ کر کراچی آ گئے لیکن وہ اس نئے ماحول سے اپنے آپ کو ہم آہنگ نہ کر سکے۔ اسی لیے ہجرت کی کسک ان کی غزلوں میں نمایاں ہے:

حیدر مرے وطن میں ہمیشہ سے ہے روا — اہلِ ہنر کے باب میں تضحیک بالخصوص

کیا کیا ستم ہوں مجھ پر اہلِ وطن کے حیدر — پامال ہو رہا ہوں اپنی ہی رہ گزر میں [۱۶۳]

صبا اکبر آبادی نے بھی اپنے عہد کی ناانصافیوں، ظلم اور سفاکیوں کے خلاف کھل کر آواز بلند کی۔ ہجرت کے کرب کو بھی ان کی غزلوں میں محسوس کیا جا سکتا ہے۔ اسی لیے وہ اپنی شاعری کو خونِ جگر کی فریاد قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

شعروں میں مرا خونِ جگر بول رہا ہے — الفاظ ہیں خاموش ہنر بول رہا ہے

اے ساکنانِ شہر گوارا نہ ہو اگر — لے جائیں یہ ہم اٹھا کر یہ دیوار و در کہاں

کسی مظلوم کی کوئی پکار اب تک نہیں آئی — زبانیں کٹ گئیں یا ظلم نے کچھ بھیس بدلا ہے [۱۶۴]

شیوا بریلوی کے ہاں بھی ترکِ وطن اور کراچی کی تکلیف دہ صورتِ حال کی بھرپور عکاسی دکھائی دیتی ہے۔ ان کے کلام کا مجموعہ شائع نہیں ہوا لیکن رسائل و جرائد میں جو بھی ان کی غزلیں شائع ہوئیں ان میں غم واندوہ اور یاس کی ایک کیفیت نظر آتی ہے۔ ڈاکٹر لطیف حسین نے بھی ''چند شعرائے بریلی'' میں ان کے کلام کا نمونہ پیش کیا ہے۔ اس زمانے کے چلن پر طنز کرتے ہوئے شاعر کہتے ہیں کہ:

کچھ بدلتے ہوئے حالات پہ رونا آیا — کچھ ہنسی آئی زمانے کی روش پہ شیوا [۱۶۵]

بہار کوٹی کے ہاں بھی حالات کی سنگینی پر بھرپور تبصرہ موجود ہے۔ وہ جس دورِ انتشار سے تعلق رکھتے تھے، ان کی شاعری میں اس کی جھلک بے حد نمایاں ہے۔ شہر کی تباہی و بربادی اور مجموعی ملکی صورتِ حال پر ان کی غزلیں نوحے کی شکل اختیار کر لیتی ہیں۔

کیوں سنایا جا رہا ہے مژدہِ فصلِ بہار — ہم تو خود تیار بیٹھے تھے بیاباں کے لیے

گلستاں میں سکوں کا ایک لمحہ بھی غنیمت ہے — نشیمن پھونکنے والو، نجانے کب بہار آئے

لٹتے لٹتے مختصر سا رہ گیا ہے قافلہ — اور میر کارواں نے مڑ کے دیکھا بھی نہیں [۱۶۶]

شور علیگ کی غزلیں اور نظمیں بھی وطن کے بدلے ہوئے حالات کا نوحہ نظر آتی ہیں۔ ان کی شاعری کا موثر اظہار نہ صرف اس عہد کا آئینہ ہے بلکہ وطن میں رہنے والے بے شمار باسیوں کے دل کی آواز بھی ہے۔

کچھ لوگوں کے مل جانے سے بھر جاتے ہیں وقت کے زخم — لیکن اس مقتل میں ایسے لوگ میسر کتنے ہیں [۱۶۷]

انجم فوقی کا شمار بھی قیام پاکستان کے زمانے کے اساتذۂ سخن میں ہوتا ہے۔ ہجرت سے قبل ہی ان کے دو مجموعہ کلام شائع ہو چکے تھے۔ ہجرت کے بعد ایک اور مجموعۂ غزلیات ''مہر وماہ'' شائع ہوئی۔ اس مجموعے میں بھی ہجرت کا کرب نمایاں ہے۔ وطن سے دوری اور کراچی میں سکونت اختیار کرنے کے بعد اجنبیت کے احساس نے انھیں ہمیشہ اپنے حصار میں رکھا۔ وہ خود کہتے ہیں کہ:

یہ کس ماحول میں ہم آگئے ہیں　　کوئی اپنا یہاں اپنا نہیں ہے[۱۶۸]

حفیظ ہوشیار پوری نے بھی اس حبس زدہ ماحول میں حق گوئی کا کلمہ بلند کرنے کی کوشش کی۔ امید اور ناامیدی کی کیفیت اور شہر کے ناگفتہ بہ حالت پر وہ یہ تک کہنے پر مجبور ہوئے کہ:

ہمیں اس دور میں بھی یہ جرأت　　رات کو رات دن کو دن کہنا

خزاں نصیب یہ سمجھے کہ آگئی ہے بہار　　حفیظ جب بھی چمن سے بہار گزری ہے

وہی بشر ہے، وہی اس کا خونِ ناحق ہے　　یہ اور بات ہے قاتل بدلتے رہتے ہیں[۱۶۹]

اس کے علاوہ حیا لکھنوی بھی اس دور کی معتبر شاعرہ ہیں جو کراچی کی صورتِ حال سے غیر معمولی طور پر متاثر دکھائی دیتی ہیں۔ مہاجرین کے مسائل اور ان کے دکھوں پر آہ وبکا ان کی شاعری میں نمایاں ہے۔ جیسے:

مظالم پر مظالم ہو رہے ہیں　　گناہوں کی یہ ارزانی تو دیکھو[۱۷۰]

کرار نوری نے بھی اس دور میں بے سر و سامانی، گھر کی ویرانی اور دربدری کا خوب رونا رویا ہے۔ ہجرت کے کرب کے ساتھ کراچی میں شب و روز رونما ہونے والے واقعات پر بھی ان کے کلام میں واضح اشارے ملتے ہیں۔ ان کے ہاں احتجاجی رویہ ضرور ہے مگر اس میں نعرے بازی کی رمق نہیں۔ احمد حسین صدیقی نے بھی ''دبستانوں کا دبستان'' میں ان کے مذکورہ رجحان کے حامل اشعار درج کیے ہیں۔ ملاحظہ کیجیے:

جن بہاروں نے دیا ہے گل و گلزار کو خوں　　ان بہاروں کے ہیں پروردہ و پرداختہ ہم

اب بھی آزاد فضاؤں کا نہ امکاں نکلا　　بابِ گلشن جسے سمجھے درِ زنداں نکلا

اڑا پھرتا ہوں غم کی آندھیوں میں　　شجر تو ہوں مگر میں بے زمیں ہوں

ہائے یہ شہر مرا اور یہ تپتی ہوئی دھوپ　　کوئی سایہ نہیں ہے کسی دیوار کے پاس

جی میں آتا ہے کسی در پہ بھی دستک دے دوں　　اور پھر پوچھوں کہ اے شخص ترا گھر ہے کہاں[۱۷۱]

نازش حیدری کا مجموعہ کلام ''صدیوں کا سفر'' بھی کراچی سے شائع ہوا۔ اس مجموعے میں بھی سندھ خصوصاً کراچی کے حالات پر اشک فشانی ملتی ہے۔ دیکھیے:

ہر ایک گھر میں بپا روشنی کا ماتم ہے　　چراغ کتنے بجھائے ہوا کو دوش کہاں

تھے جو راہوں سے بے خبر نازش　　رہبر کارواں وہ ٹھہرے ہیں[۱۷۲]

راز مراد آبادی کا مجموعہ کلام ''حرفِ راز'' کے نام سے شائع ہوا۔ اس مجموعے میں بھی تلخیِ دوراں کا احساس بہت نمایاں ہے۔ ان کے ہاں وطن پرستی اور نام نہاد رہنماؤں کی ناعاقبت اندیشی کا دکھڑا بہت واضح طور پر دیکھا جاسکتا ہے۔ جیسے:

دستِ جنوں کو فصلِ بہاراں کو کیا ہوا　　رکنے لگا ہے سانس گریباں کو کیا ہوا

تیغوں کی چھاؤں میں سرِ مقتل ہیں رقص میں　　آسودگانِ کوچہ جاناں کو کیا ہوا

میں اپنے دور کی تاریخِ خوں چکاں ہوں راز　　لہو لہو مرا چہرہ یہ زخم زخم بدن

وطن کی خاک پہ بارود کا گماں ہے مجھے　　وطن کو رازِ شرر بار دیکھتا ہوں میں

ساحل پہ لا کے کس نے سفینہ ڈبو دیا　　اب کس سے راز شکوہ کریں ناخدا کے بعد[۱۷۳]

انور دہلوی کا شمار بھی کراچی کے نمائندہ شعرا میں ہوتا ہے۔ ان کی غزلوں میں بھی اپنے شہر کے حالات اور نامناسب ماحول کے کرب کا احساس پوری طرح جھلکتا ہے۔ وہ شہر کے مسائل اور یہاں کے باسیوں کے دکھوں کو شعر کے قالب میں ڈھالتے رہے۔ ہجرت، حسرت و یاس، ناامیدی، وطن سے دوری، اپنوں کی بے مروتی وغیرہ کا احساس بھی ان کی شاعری میں بہت نمایاں ہے۔ ان کا مجموعہ کلام ''گلشنِ کرب'' اور ''کشید فکر'' میں ان کے اس رجحان کی جھلک دیکھی جاسکتی ہے:

اتنے فریبِ ہم سفری کھائے ہیں کہ آج　　ہم اپنے گھر میں اپنے ہی سائے سے ڈر گئے

انور جہاں ہے موت سزا لب کشائی کی　　ہم اس مقام سے بھی غزل خواہ گزر گئے

ان ہی شاخوں پہ تھا اپنا نشیمن　　مگر فصلِ بہار آنے سے پہلے

کسی کی راہ کا پتھر نہیں تھا　　مگر سو بار ٹھکرایا گیا ہوں

کل اسی گھر میں تھا دنیا کو چمن کا دھوکا　　آج کچھ اور ہے انور مرے گھر کا عالم

ہر طرف سائے ہی سائے غم کے لہرانے لگے　　حادثے اب مرے گھر میں پرورش پانے لگے[۱۷۴]

شاعر لکھنوی بھی اس دور کے نمائندہ شاعروں میں شمار کیے جاتے تھے۔ ان کی شاعری میں بھی ہجرت کا کرب اور اپنے ماحول کی عکاسی بہت نمایاں ہے۔ ملک سے وفاداری کے صلے میں ملنے والی سزاؤں پر وہ نہ صرف دم بخود ہیں بلکہ اشاروں کنایوں میں وہ رہ زن نما راہبروں کی اصلیت بھی ظاہر کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ جیسے:

لٹ گیا قافلہ کیا کہیے کہ لوٹا کس نے　　راہ میں کوئی نہ تھا راہ نما سے پہلے

ہر دور میں قابلِ سزا ہیں　　ہم لوگ کہ مجرمِ وفا ہیں

فصلِ گل اب کے اس انداز سے آئی شاعر خون میں ڈوب گئے پھول بھی رخسار کے ساتھ
کیسے کہیے گل مرجھائے کیسے کہیے باغ صدیوں میں بھی کہہ نہ سکیں گے لمحوں کے افسانے لوگ[۱۷۵]

شان الحق حقی کی شاعری میں بھی ہجرت کرنے والوں کی بے بضاعتی، مجبوری، ناامیدی اور ذہنی پریشانیوں کا خوب خوب حال درج ہے۔ وہ خود بھی ان پریشانیوں سے گزرے اور اپنے ذاتی تجربات کا اظہار وقتاً فوقتاً شاعری کے ذریعے کیا۔ پاکستان کے قیام کے وقت دیگر بہت سے لوگوں کے ساتھ ساتھ خود اپنی جانب سے کی جانے والی کوششوں کا تذکرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

تھا ہجومِ بہار میں شامل اک ہمارا بھی تارِ پیرہن[۱۷۶]

ان کے کئی مجموعہ کلام منظر عام پر آئے۔ ''حرفِ راز'' اور ''حرف دل رس'' کے علاوہ ''تارِ پیرہن'' وغیرہ بھی ان کے اہم مجموعہ کلام ہیں۔ ہجرت کے بعد مہاجرین کی الم ناک حالت اور کس مپرسی کا حال بیان کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ:

کیا سناتی ہے یہ سازوں کی صدائے دل سوز کچھ ہمیں درد نصیبوں کا بیاں ہو جیسے
خرمنِ دل پہ مرے ٹوٹ پڑے بجلیوں کے بنے ہوئے انساں[۱۷۷]

محشر بدایونی بھی اس عہد کے حقیقی ترجمان بن کر ابھرے۔ اس عہد کی تلخ سچائیوں کو انھوں نے اپنی شاعری میں سمیٹا۔ ان کی شاعری کا مطالعہ اس دور کے کراچی کے ستم رسیدہ حالات کی صحیح معنوں میں عکاسی کرتا ہے۔ کلام کے مطالعے کے بعد شہر کی اصل صورتِ حال کا نقشہ پوری طرح ابھر کر سامنے آتا ہے۔ کراچی کی روز بروز بڑھتی آبادی اور گوناگوں مسائل کی جانب اشارہ کرتے ہوئے انھوں نے درست کہا کہ:

یہ شہر کتنے شہروں کا اک سمندر ہے تلاش کیجیے کس رخ جو گھر نہ آئے کوئی
ملا بس یہ مجھے ہمسائیگی سے نہیں میرے در و دیوار میرے
لوگ کس گھر کی ہوا میں ہوتے یوں وارفتہ نہ تو سائے کا بھروسا ہے نہ دیوار کا ہے[۱۷۸]

مہاجر سندھی اختلاف کے بعد اندروں شہر میں بسنے والے بے شمار گھرانوں کے ساتھ جو سلوک ہوا، اس کی بازگشت بھی ان کی شاعری میں سنائی دیتی ہے۔ انھوں نے حد سے بڑھی ہوئی بے گانگی اور انسانیت سوز رویے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ:

کیسے کر سکتی ہے اس ظلم کو تاریخ معاف میرا گھر لوٹنے والے میرے ہمسائے تھے
شہر سے ہم کو اختلاف نہیں یہاں اپنوں کے دل ہی صاف نہیں
آج جو شہر میں ہنگامے ہیں کل بھی ہوں گے کیا کمی ہو گی اگر جاں سے گزر بھی گئے ہم[۱۷۹]

شہر کے کرتا دھرتا جس انداز سے "سب اچھا ہے" کا نعرہ بلند کرتے تھے، اخبارات اور رسائل جس قدر مجرمانہ خاموشی کا رویہ اختیار کیے ہوئے تھے، محشر اس روش پر بے اختیار یہ کہنے پر مجبور ہوئے کہ:

سبھی ہیں مطمئن اس شہر میں یہ کیا کیا تونے ترے کوچے ہی میں اک خانماں برباد رہتا ہے[۱۸۰]

محشر کے بعض اشعار تو ضرب المثل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ حق اور باطل کی کش مکش میں وہ فیصلہ کن انداز میں یہ تک کہنے سے گریز نہیں کرتے کہ:

اب ہوائیں ہی کریں گی روشنی کا فیصلہ جس دیے میں جان ہوگی وہ دیا رہ جائے گا[۱۸۱]

جوہر سعیدی بھی اس عہد کے قادر الکلام شاعر تھے۔ ان کے شعری مجموعے "بادِ سبک دست" اور "سفارتِ گل" میں بھی عصری شعور اور زمانے کی بے صبری کا سوز بہت نمایاں ہے۔ شہر کی بے مروتی اور بے سر و سامانی کو دیکھ کر وہ اکثر ماضی سے اپنا رشتہ جوڑنے کی کوشش کرتے نظر آتے ہیں۔ وہ حالات اور واقعات کو بھی اپنی شاعری میں قلم بند کرنے کی کوشش کرتے ہیں جس پر اس عہد میں سخت پابندیاں عائد تھیں۔ مہاجرین کی بے سر و سامانی کا نقشہ کھینچتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ:

اے خاک کوئے زندہ دلاں کر انھیں سلام کچھ کج کلاہ، بے سر و ساماں سے آئے ہیں

ان شہروں سے اچھے تھے جنگل اپنی بستی کے

ہر طرف سہمے ہوئے پھرتے ہیں لوگ سینۂ ساحل پہ ہے طوفاں کھلا

گر یوں ہی راستے سنسان رہے حوصلہ کس کو سفر کا ہوگا

گھر جسے مان لیا مرے بچے اب تو ایسا کوئی گھر دے مجھ کو

پھر بٹھاؤ نگر نگر پہرے پھر درِ شہر درد کھلتا ہے

اے مرے ساکنانِ شہر نوا خامشی اور اس قیامت کی[۱۸۲]

امید فاضلی نے بھی کراچی میں ایک بھرپور ادبی زندگی گزاری۔ وطن سے دوری اور کراچی کی بے سکونی اور ناامیدی ان کی شاعری میں جگہ جگہ پائی جاتی ہے۔ غزل کو نئے آہنگ سے روشناس کرانے کے ساتھ ساتھ انھوں نے شہر کی تلخ نوائی میں بھی اپنے مخصوص آہنگ سے ایک نرالی شان پیدا کی ہے۔ ماحول کی سفاکی اور بے مہری کو انھوں نے بڑے سلیقے سے اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔ وہ اس شہر کے منافقت بھرے سیاسی ماحول کو سخت ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتے ہیں:

جانے کیسا زہر دلوں میں اتر گیا پرچھائیں زندہ رہ گئی انسان مر گیا

یہ پوچھتی ہے دلوں سے گھروں کی ویرانی وہ لوگ کیا ہوئے جو ہم کو چاہتے تھے بہت

اس شہر میں خراج طلب ہے ہر ایک راہ وہ خوش نصیب تھا جو سلیقے سے مر گیا

آپ نے پہلے بھی دیکھے ہوں گے   بے زمیں لوگ نہ ہم سے ہوں گے

گھر تو ایسا کہاں کا تھا لیکن   در بدر ہیں تو یاد آتا ہے

ہائے کیا لوگ یہ آباد ہوئے ہیں مجھ میں   پیار کے لفظ لکھیں، لہجے سے رستے جائیں

ہر ایک ہاتھ میں پتھر، ہر ایک جسم پہ زخم   یہ شہر ہے کہ مری وحشتوں کا سایہ ہے[۱۸۳]

کراچی کے شہریوں کے ساتھ ہونے والے سلوک اور ناروا رویے کا ایسا کھل کر اظہار اس عہد کے بہت کم شعرا میں دکھائی دیتا ہے۔ کراچی کو رفتہ رفتہ جس آگ کی طرف دھکیلا جا رہا تھا، شاعر اس پر بہت بے تاب اور بے چین دکھائی دیتا ہے اور یہ بے چینی ان کی شاعری سے پوری طرح عیاں ہے۔

فدا خالدی کے ہاں بھی ہجرت کا کرب اور وطن سے دوری کی تڑپ بہت نمایاں ہے۔ انھوں نے تاریخ کی بدترین انسانی ہجرت کے عمل کو نہ صرف محسوس کیا بلکہ اس تجربے سے وہ خود بھی گزرے۔ نئے وطن میں آکر جس قسم کی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا اسے پوری دردمندی کے ساتھ اپنی شاعری کا موضوع بنایا:

مرے خاموش رہنے پر نہ جانا   یہ ایک مظلوم کی آواز بھی ہے

ہائے کتنے سفینے ڈوب گئے   اک فریبِ تلاشِ ساحل میں

میں اس ماحول میں زندہ ہوں جس میں   ہے نفرت آدمی کو آدمی سے

نہ منزلوں کی خبر ہے نہ قاتلوں کا پتا   کرم شعار بہت اپنے راہ پر نکلے

شہر کا شہر سلگتا نظر آئے لوگو   ہر در و بام پر اس طرح چراغاں نہ کرو[۱۸۴]

عزیز حامد مدنی بھی اس دور کے انتہائی معتبر شعرا میں شمار کیے جاتے ہیں۔ ہجرت کے بعد رونما ہونے والے ذہنی اور روحانی کرب کو انھوں نے بھی بڑی خوب صورتی سے اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔ حالات کی سختی اور روز بروز رونما ہونے والے واقعات پر ان کے اشعار ضرب المثل کی حیثیت رکھتے ہیں۔

کل سے کچھ اور تھا اندازِ غبارِ صحرا   شہر میں آج کوئی تازہ خبر آئی ہے

صلیب و دار کے قصے رقم ہوتے ہی رہتے ہیں   قلم کی جنبشوں سے سر قلم ہوتے ہی رہتے ہیں[۱۸۵]

ساقی امروہوی کے مجموعہ کلام ''افتاد'' اور ''شام ہوتی جا رہی ہے'' میں ایک ایسے دل جلے کی فریاد کی جھلک موجود ہے جس میں کراچی کے معاشی حالات اور فرد کی بدحالی کو نمایاں کیا گیا ہے۔ معاشرے کی سرد مہری اور حالات کی ستم ظریفی پر وہ بے اختیار یہ فریاد کرتے نظر آتے ہیں:

ستم سبھی نے کیے ہیں کسی سے شکوہ کیا   کبھی کرم بھی کوئی خیر خواہ کر دیتا[۱۸۶]

جمیل نظر کا شمار بھی کراچی کے اہم شعرا میں ہوتا ہے۔ ان کے لہجے میں بھی حالات کی تلخی اور ظلم و جبر کے خلاف کلمۂ حق بلند کرنے کی کیفیت موجود ہے۔ وہ اپنے دور کے بے باک ترجمان اور نقاد ہیں۔ ان کے ہاں مفاہمت کے بجائے نبرد آزمائی کی کیفیت نمایاں ہے[۱۸۷]۔ نئے ماحول کی بے گانگی اور سرد مہری سے بے چین ہو کر وہ عجیب طرح کی امید و بیم کی کیفیت کا شکار دکھائی دیتے ہیں:

ایک امید کے سہارے پر
گھپ اندھیروں کو کر رہا ہوں عبور

ان اندھیروں کو خبر کیا کہ زندگی کیا ہے
گرا شجر تو پرندوں کا گھونسلا بھی گیا

یہ دشت دشت سا آنگن یہ اجنبی ماحول
مسافروں کی طرح اپنے گھر میں آئے کون

راستے ہیں کہ لہو کے دریا
کس نے کس کی رہ نمائی اب کے

کوچہ کوچہ میں ہیں نظر قاتل
گلیوں گلیوں میں ہائے ہیں مقتول

کچھ تو ہو جاتا ہے ماحول سے انساں مایوس
اور کچھ سانحے مجبور بنا دیتے ہیں

کارواں سے جو بچھڑ جاتے ہیں اکثر ان کو
پیچ و خم راہ کے خود راہ دکھا دیتے ہیں[۱۸۸]

خالد علیگ نے اس عہد کے بین الاقوامی منظر نامے کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔ ان کے ہاں ایک خاص ڈھب کی نظریاتی اور انقلابی شاعری کی جھلک واضح دکھائی دیتی ہے۔ سامراجیت کی انسانیت دشمن ہتھکنڈوں کے خلاف انھوں نے کھل کر لکھا۔ ان کا واحد مجموعہ پروفیسر ریاض صدیقی نے ۲۰۰۲ء میں شائع کروایا، جس میں کچلے ہوئے لوگوں کے خیالات و احساسات کو بڑے موثر پیرائے میں پیش کیا گیا ہے:

گھروں میں آگ لگا کر بھی کیا ملا خالد
دلوں میں آگ لگی تھی اسے بجھا دیتے

میں ڈرا نہیں، میں دبا نہیں میں جھکا نہیں، میں بکا نہیں
مگر اہلِ بزم میں کوئی بھی تو ادا شناس وفا نہیں

تمھیں کیا خبر کہ میں کون ہوں
مرے قاتلوں ہی سے پوچھ لو

جنھیں حکمِ قتل ملا مگر
جنھیں اجرِ قتل ملا نہیں

ستم تو یہ ہے وہی میرا رہنما ٹھہرا
جو میرے ساتھ کبھی دو قدم چلا ہی نہیں[۱۸۹]

رئیس فروغ بھی اس دور کے مصائب اور حالات کی سنگینی کو محسوس کیے بغیر نہ رہ سکے۔ وہ حالات کی ستم ظریفیوں اور ناموافق سیاسی رویوں کے خلاف اپنے خیالات کو شعر کے قالب میں ڈھالتے رہے۔ امید اور ناامیدی کی اس کیفیت کا اظہار ان کی شاعری میں بھی بدرجہ اتم موجود ہے۔ جیسے:

سخت برہم تھیں ہوائیں پھر بھی ریت پر پھول بنائے میں نے
اپنے حالات سے میں صلح کرلوں لیکن مجھ میں روپوش جو ایک شخص ہے مر جائے گا[190]

حیرت الہ آبادی کے تین مجموعے "کشکول وفا"، "پتے، کانٹے پھول" اور "آگ خون پانی" میں بھی سیاسی بے مہری اور معاشی مسائل کا شکوہ جا بجا ملتے ہیں۔ حالات کی گرمی اور اپنے ہی وطن کی مٹی سے بے مروتی کے رویے نے انھیں یہ کہنے پر مجبور کر دیا کہ:

پوچھتی پھرتی ہے ہر تنکے سے بجلی ان دنوں آشیاں کو آگ کا یہ پیرہن کیسا لگا
باغباں نے یہ کہہ کر کاٹ دیں سب ہی شاخیں کیا ملے گا گلشن کو ان فضول شاخوں سے[191]

جمیل الدین عالی بھی اسی دور کے معتبر شاعر گردانے گئے۔ ان کی شاعری میں بھی قیام پاکستان کے مضمرات کی جھلک بہت واضح طور پر دکھائی دیتی ہے۔ ہجرت کے مصائب اور بے وطن ہونے کا احساس ان کے ہاں بہت گہرا ہے:

بھٹکے ہوئے عالی سے پوچھو گھر واپس کب آئے گا کب یہ در و دیوار سجیں گے کب یہ چمن لہرائے گا
کب سے ہم انصاف کے پیاسے جلتے ہیں اور کہتے ہیں کوئی نہ کوئی صدی آئے گی اپنی آگ بجھانے کو[192]

اس کے علاوہ شہر کے کشیدہ حالات میں نفرتوں کا بیج بو کر جس قسم کا ماحول پیدا کیا گیا، عالی صاحب اس پر اضطراب کا اظہار بھی کرتے دکھائی دیتے ہیں اور ساتھ ہی اپنی اشعار کے ذریعے مقتدر حلقوں کو اس کے تدارک کی تدبیر بھی بتاتے چلے جاتے ہیں۔ مثلاً:

بچے پوچھیں، مائیں پوچھیں، پوچھیں بڑے جوان کیا یہ پھولتی پھلتی بستی ہوتی ہے ویران
دشمن تو پھر دشمن ہے وہ جو بھی ظلم کرائے غضب یہ ہے خود بھائی کے ہاتھوں، بھائی مارا جائے
کٹ جائیں گے پھٹ جائیں گے یہ سارے اندھیرے سب کو ان کا حق دینے میں کرو نہ اتنی دیر
ہاں یہ بستی مٹ نہیں سکتی یاد رہے ہر آن ہے اس کا اک نام کراچی دوجا پاکستان[193]

حمایت علی شاعر کا شعری مجموعہ "آگ میں پھول"، "مٹی کا قرض"، "ہارون کی آواز" میں بھی عالم گیر انسانی برادری کی فلاح و بہبود کے ساتھ ساتھ عصری مسائل کا ادراک بھی گہرا نظر آتا ہے۔ ہجرت کے عوامل اور نئے سندھیوں کی کسمپرسی کی حالت دیکھ کر وہ بے اختیار یہ کہنے پر مجبور نظر آتے ہیں کہ:

یہ شہر سجدہ گزاراں، دیارِ کم نظراں یتیم خانۂ ادراک کے سوا کیا ہے
ہر شخص اپنے گھر کی طرف جا رہا ہے اب اے آسماں بتا کہ ہمارا ہے گھر کہاں
زمیں پہ دھوپ کی چادر بچھائے لیٹے ہیں مرے وطن یہ ترے خوش نصیب بیٹے ہیں

بنیاد پر نظر ہو تو شاید سمجھ سکو	کیوں ٹوٹنے لگا ہے مرا گھر بنا ہوا
رہنے کی یہ جگہ تو نہیں ہے مگر یہاں	پتھر بنے ہوئے ہیں رہے جا رہے ہیں ہم
شاہی حرم سے ”شاہی محلہ“ تک آگئیں	شام اودھ کے ساتھ کراچی کی جالیاں[۱۹۴]

تاریخ شاہد ہے کہ وادیِ مہران اپنے ابتدائی ایام سے ہی مختلف تہذیبوں، ثقافتوں، نسلوں اور قبیلوں کی آماج گاہ رہی ہے۔ موجودہ سندھ کو اس اعتبار سے بھی فوقیت حاصل ہے کہ یہاں مختلف نسلوں، قبیلوں، بولیوں اور تہذیبوں کے حامل گروہ کئی کئی نسلوں سے مستقل طور پر آباد ہو چکے ہیں۔ وہ اپنی جداگانہ شناخت رکھنے کے باوجود سندھ کی تہذیبی و معاشرتی اکائی کا حصہ بن جاتے ہیں۔ ایرانیوں، بلوچوں، افغانوں کے ساتھ ساتھ نئے آبادکاروں مثلاً پٹھانوں، میمنوں، گجراتیوں، میواتیوں، راجپوتوں، راجستھانیوں اور ہندوستان کے مختلف علاقوں سے آنے والے مہاجروں اور قیامِ پاکستان سے دو تین نسل قبل آنے والے پنجابیوں کو بھی سندھی معاشرت اور تہذیب نے اپنے آپ میں جذب کر لیا۔ سب سے دل چسپ صورتِ حال تو افریقی نسل کے مکرانیوں اور شیدیوں کی ہے جو لگ بھگ چار پانچ سو سال قبل جنگی سپاہیوں، غلاموں اور تجارتی محنت کشوں کی صورت میں یہاں آئے۔ وہ لوگ اپنی عادات، رنگ و نسل اور بود و باش میں مقامی لوگوں سے یکسر مختلف ہونے کے باوجود سندھ کی قوم پرست تحریکوں سے اپنا تاریخی اور قومی ہیرو ہوش محمد شیدی (ہوشو شیدی) کو ہی منتخب کیا۔ یہ وہی ہوشو شیدی تھا جس نے کراچی میں انگریزوں کے قبضے سے قبل آخری مقابلے کے وقت مشہورِ زمانہ نعرہ لگایا کہ ”مرسوں مرسوں سندھ نہ ڈےسوں“ یعنی مرتے مر جائیں گے لیکن سندھ پر قابض نہ ہونے دیں گے۔ غرض کہ وہ تمام تہذیبی و ثقافتی اور معاشرتی گروہ جو تاریخ کے مختلف ادوار میں سندھ میں وارد ہوئے، یہاں کے تہذیبی، ثقافتی اور معاشرتی منظر نامے کا حصہ بن گئے۔ اس تناظر میں مہاجروں اور سندھیوں کے ذہنوں میں ایک دوسرے کے خلاف ابلنے والی منافرت اور اندیشے کا بظاہر کوئی جواز نظر نہیں آتا[۱۹۵]۔

ان مہاجروں کے ذہنوں سے علاحدہ قومیت کا تصور ختم کروانے کے لیے اولاً سندھ کو یہ حقیقت تسلیم کرنی پڑے گی کہ اردو بولنے والے سندھ کی سیاست کا نہ صرف دوسرا سب سے بڑا گروپ ہیں بلکہ اب سندھ ہی ان کا وطن ہے۔ اس مستقل وطنیت کی وجہ سے وہ اپنے حقوق کو خیرات کے طور پر نہیں بلکہ اپنا جائز حق سمجھ کر لینا چاہتے ہیں۔ جس طرح اس سے پیش تر سندھ میں آباد ہونے والے متعدد ریلے امتدادِ زمانہ کے سبب اس صوبے کے فرزندِ زمیں بنتے چلے گئے[۱۹۶]۔ سید مظہر جمیل نے سندھو دیش اور مہاجر صوبے وغیرہ کو جذباتی اور غیر منطقی نعرہ قرار دیا ہے اور سندھ کا سب سے بڑا مسئلہ معاشی حق تلفی کو قرار دیا ہے[۱۹۷]۔ سماجیات کے ماہرین متعدد مواقع پر اس بات کا برملا اظہار کر چکے ہیں کہ اگر یہ مواقع معاشی ناہمواریاں اور حق تلفی کی حد سے زیادہ بڑھ جائے تو بعض اوقات شدید ترین جذبات کسی بڑے انقلاب یا تبدیلی کا پیش خیمہ ثابت ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ سندھ خصوصاً کراچی کے مسئلے کو معاشی مسئلہ کہہ کر اسے محدود تناظر میں دیکھنا غالباً کوتاہ نظری ہوگی بلکہ اسے وسیع تناظر میں

سیاسی، سماجی اور انفرادی شناخت کے حصول کا مسئلہ سمجھ کر یہاں کے رہنے والوں کے احساسِ محرومی کو دور کرنے کی کوشش کرنا بے حد ضروری ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ون یونٹ کے زمانے میں سندھ کی تجارت، صنعت اور روزگار پر جس طرح غیر سندھی قابض تھے، اور جس کی وجہ سے سندھ کے نوجوانوں میں بھی احساسِ محرومی کی جو شدید لہر پیدا ہوئی تھی، اس کا سدِ باب بھی ضروری تھا[۹۸]۔ بعد میں آنے والی حکومتوں خصوصاً ذوالفقار علی بھٹو، بے نظیر بھٹو اور سندھ کے اندر بسنے والی پیپلز پارٹی کی متعدد صوبائی حکومتوں نے اس مسئلے کو حل کرنے کی حتیٰ الامکان کوشش ضرور کی مگر ابھی اس سلسلے میں بہت کچھ کرنا باقی ہے۔ دوسری جانب کراچی کی اردو بولنے والی آبادی کے معاشی اور سیاسی استیصال کا سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ اور ان مسائل پر اربابِ اقتدار کی ابھی تک توجہ مبذول نہیں ہوئی ہے جس کی وجہ سے سندھ کی شہری آبادی میں احساسِ محرومی بڑھا۔

سندھ کے اندر احساسِ محرومی کا یہ سلسلہ کوئی نیا نہیں ہے بلکہ اگر فوج اور سویلین نوکر شاہی میں ملازمتوں کے اعداد و شمار کا جائزہ لیا جائے تو اندازہ ہو جائے گا کہ یہ مسئلہ کس قدر پرانا ہے اور اس کے تدارک کی کیا کوششیں اب تک بروئے کار لائی گئیں۔ ۱۹۶۰ء کے عشرے میں فوج میں ۶۰ فی صد پنجابی، ۳۵ فی صد پختون اور محض ۵ فی صد دوسری قومیتوں کے لوگ شامل تھے۔ آرمی کے ۴۸ جنرلوں میں ۱۷ پنجابی، ۱۹ پختون، ۱۱ مہاجر اور صرف ایک بنگالی جنرل تھا[۹۹]۔ ذوالفقار علی بھٹو کے زمانے میں فوج سے پشتونوں اور مہاجر افسروں کی جبری سبک دوشی کے بعد فوج کے اعلیٰ ترین عہدوں سے یہ تناسب و توازن قطعی طور پر یک طرفہ ہو گیا۔

کچھ یہی صورتِ حال سول بیورو کریسی کی رہی۔ ایوب خان کے بدعنوانی کے الزام کا سہارا لے کر جن ۱۳۱۳ افسران کو ملازمت سے برخاست کیا ان میں بہت بڑی تعداد مہاجر افسروں کی تھی۔ بعد میں یحییٰ خان اور بھٹو نے بھی نوکر شاہی سے اعلیٰ افسران کی چھانٹی کے دوران اعتدال، انصاف اور غیر جانب داری کے تقاضے پورے نہیں کیے بلکہ ایک طرح کا متعصبانہ رویہ اختیار کر کے بڑی تعداد میں مہاجروں کو سرکاری ملازمتوں سے نکال دیا۔ یہی عمل بینکاری اور صنعت کے شعبوں میں بھی دہرایا گیا[۱۰۰]۔ نتیجتاً سندھ کے شہری علاقوں کے احساسِ محرومی میں دن بدن اضافہ ہوتا چلا گیا۔ ایک جانب سرکاری ملازمتوں کے دروازے ان پر بند ہوتے چلے گئے۔ دوسری جانب شہری ترقی خصوصاً بنیادی انسانی ضروریات کے حصول میں بھی سندھ کے شہری علاقوں کے ساتھ سوتیلی ماں جیسا سلوک روا رکھا گیا۔ اس صورتِ حال نے اس دور کے شاعروں اور ادیبوں کو کافی متاثر کیا۔ روزمرہ کے ان مسائل اور سیاسی، سماجی اور معاشی معاملات پر رئیس امروہوی کے قطعات نے بھرپور انداز سے روشنی ڈالی۔ قیامِ پاکستان کے بعد لاکھوں کروڑوں افراد نے روزمرہ کی سیاسی، سماجی اور معاشی زندگی کے بارے میں جو کچھ سوچا اور سماجی تبدیلیوں کے جو اثرات قبول کیے، یہ سب اثرات ان قطعات کی صورت میں موجود ہیں[۱۰۱]۔ گویا یہ قطعات نصف صدی کی تاریخ ہیں جن میں ہر اس اہم واقعے کو ضرور موضوع بنایا گیا ہے جس نے ہماری انفرادی اور اجتماعی زندگی پر کسی بھی طرح سے اثرات

مرتب کیے ہوں۔ انھوں نے تقریباً ہر اہم موضوع پر قطعے لکھے اور اپنی قادر الکلامی کے جوہر دکھائے۔ برصغیر میں رونما ہونے والے اہم سیاسی واقعات کو بنیادی موضوع بنانے کے ساتھ ساتھ اردگرد پیش آنے والے سیاسی اور سماجی معاملات پر بھی ان کی نظر گہری تھی۔ یہ قطعات قیام پاکستان سے قبل اور بعد کی سیاسی و سماجی صورتِ حال کا آئینہ دار ہیں[۲۰۲]۔

وہ ابتدا ہی سے ایک سیاسی کارکن کے طور پر ہندوستان کی سیاست میں سرگرم عمل رہے۔ خود رئیس امروہوی کا کہنا تھا کہ وہ ۱۹۳۷ء سے ۱۹۳۹ء تک کانگریس سے وابستہ رہے۔ انھوں نے جواہر لال نہرو کے ساتھ بھی کام کیا لیکن جلد ہی کانگریس کی سازشی سیاست کا عقدہ ان پر کھل گیا اور وہ ۱۹۴۰ء میں مسلم لیگ میں بطور رضاکار شامل ہوگئے۔ صہبا لکھنوی نے سہواً رئیس امروہوی کے قطعات کے آغاز کی بابت لکھا کہ ۳۱ جنوری ۱۹۳۸ء سے قطعہ نگاری کا آغاز روزنامہ ''جنگ'' کراچی سے کیا جو تادمِ زیست جاری رہا[۲۰۳]۔ اس بابت یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ ۱۹۳۸ء کو روزنامہ ''جنگ'' نامی کسی اخبار کا وجود نہیں تھا بلکہ اس اخبار کا آغاز ۱۹۳۹ء سے ہوا۔ صہبا لکھنوی کی یہ بات اس لیے بھی غلط ثابت ہوتی ہے ۳۱ جنوری ۱۹۳۸ء میں رئیس امروہوی کے قطعات کے آغاز کی بابت جو پہلا قطعہ انھوں نے درج کیا وہ یہ ہے:

جس نے امید زیست باندھی تھی	لے اڑی اس کو موت کی آندھی
گولیاں کھا کے گالیاں کھا کے	چل بسے اف مہاتما گاندھی[۲۰۴]

اس قطعے کو پڑھ کر سیاسی تاریخ کا ایک ادنیٰ طالب علم بھی یہ بات اچھی طرح سمجھ جائے گا کہ گاندھی کے قتل کا واقعہ تقسیم ہند کے اگلے برس یعنی ۳۰ جنوری ۱۹۴۸ء کو رونما ہوا[۲۰۵]۔ اور یہ قطعہ اسی واقعے کی جانب اشارہ کر رہا ہے۔ رئیس امروہوی نے یہ قطعہ اس کے اگلے روز ہی ۳۱ جنوری ۱۹۴۸ء کو لکھا اور غالباً سہو کاتب سے یہاں ۱۹۳۸ء درج ہو گیا۔

رئیس امروہوی ۳۳ برس کی عمر میں کراچی آئے اور یہاں مستقل ۴۱ برس تک قطعات لکھتے رہے۔ ان برسوں میں وہ کراچی کی پہچان بن گئے۔ رونامہ ''جنگ'' کے قطعہ نگار کی حیثیت سے وہ نہ صرف پاکستان بلکہ پوری اردو دنیا میں اپنا ایک خاص مقام بنا چکے تھے۔ وہ سیاسی قطعہ نگاری کے باوا آدم تھے اور یہ بات پورے وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ اردو ادب کی تاریخ میں کوئی بھی شاعر اس میدان میں ان کا حریف نہیں ہے۔ ان کے قطعات کا انتخاب ابتداً دو جلدوں میں ''اخبار جہاں'' پبلی کیشنز کراچی نے شائع کیا جس میں ۵ جون ۱۹۴۷ء سے دسمبر ۱۹۵۸ء تک کے قطعات کا انتخاب شامل ہے۔ اس کے بعد ۱۹۸۷ء ۔۱۹۸۸ء میں چار جلدوں پر مشتمل ایک اور انتخاب ۱۹۴۷ء تا ۱۹۸۶ء کے قطعات پر مشتمل پاک اورینٹل پبلی کیشنز نے شائع کیا۔ ۱۹۸۶ء تا اختتام زندگی کے قطعات کا مجموعہ ہنوز اشاعت کا منتظر ہے۔ ان قطعات میں پاکستان اور دنیا بھر میں وقوع پذیر ہونے والے اہم معاملات پر ایک فوری ردعمل سامنے آتا ہے۔ شاید ہی کوئی ایسا سماجی، معاشی، سیاسی، اخلاقی، مذہبی اور عوامی مسئلہ ہو جس پر انھوں نے قلم نہ اٹھایا ہو[۲۰۶]۔ اپنے قطعات کی بابت انھوں نے خود لکھا کہ:

جو ناسخِ آثارِ کہن ہے وہ کتاب | بے خطرہِ تنسیخ لکھی ہے میں نے
آئینہِ امروز ہیں میرے قطعات | اس عہد کی تاریخ لکھی ہے میں نے[۲۰۷]

ظاہر ہے ان قطعات سے حکمرانوں کی جبینوں پر شکنیں آنا ایک فطری امر تھا۔ وہ خود بھی اس امر سے پوری طرح واقف تھے کہ ان قطعات سے بعض اوقات جبینِ خسروی پر شکنیں پڑ جاتی ہیں لہٰذا اس بات کا برملا اظہار بھی ان کے ہاں موجود ہے۔ معاشرے کی طبقاتی تقسیم، تضادات، عوام کے بنیادی حقوق کا مسئلہ، محنت کشوں کی حق تلفی کا مسئلہ، حرصِ زر، پاکستان کی نظریاتی شکست و ریخت، قائداعظم کی تعلیمات سے انحراف، اسلام کے نام پر عوام کا استیصال، پاکستان میں بسنے والی مختلف قومیتوں اور زبانوں کے تصادم خصوصاً کراچی کے مخصوص مسائل، آبادی کی بے تحاشا توسیع، پانی کی قلت، ٹرانسپورٹ اور ٹریفک کی زبوں حالی، صنعتی زندگی کا پیدا کردہ سماجی بحران اور اس کے نفسیاتی اثرات، مشینی اور میکانکی طرزِ حیات اور اس کے نقصانات، خاندانی شیرازوں کا بکھرنا، غرض قومی منظر نامے کے ہر پہلو کا جائزہ رئیس امروہوی کے قطعات میں موجود ہے۔ نئے شہر میں نئے مہاجرین کا سب سے بڑا مسئلہ اپنی انا کو برقرار رکھتے ہوئے عزت و ناموس کی حفاظت کا تھا۔ دین کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے ہجرت کے جس عذاب کو ان مہاجرین نے سہا تھا اس کی واحد وجہ عزت و ناموس کی حفاظت تھی لیکن نئی مملکت میں جاگیردارانہ اور وڈیرانہ سوچ کے نتیجے میں جب مہاجر کیمپ سے ہی ان کی بہو بیٹیوں کو غائب کیا جانے لگا تو رئیس امروہوی نے نہایت کرب کے ساتھ لکھا کہ:

کل مہاجر کیمپ سے لڑکی کوئی گم ہوگئی | دل شکستہ باپ نے حسرت سے چھاتی کوٹ لی
رو کے بولا کافروں نے گھر ہی لوٹا تھا فقط | ان مسلمانوں نے گھر کی آبرو تک لوٹ لی[۲۰۸]

نئے مہاجرین کی آبادکاری اس دور کا سب سے بڑا مسئلہ تھا۔ ابتدا ہی سے اس جانب توجہ تو دی گئی لیکن جیسا کہ رئیس امروہوی کے قطعات سے اندازہ ہوتا ہے کہ:

ستم کشانِ فسادات ہند کا دھارا | کہیں سے اے دلِ بے تاب رک نہیں سکتا
ہزاروں راہ میں ہیں قید و بند کے پشتے | مہاجرین کا سیلاب رک نہیں سکتا[۲۰۹]

لہٰذا اتنی بڑی تعداد میں آنے والوں کی رہائش اور آبادکاری کوئی آسان کام نہ تھا۔ اس بابت کچھ حکومتی تساہل بھی تھی اور کچھ معاشی مسائل بھی درپیش تھے۔ لیکن ہر صورت میں عام مہاجرین کی زندگی کس مپرسی کی حالت میں بسر ہو رہی تھی۔ اس صورتِ حال کا نقشہ کھینچتے ہوئے انھوں نے کہا کہ:

مردہ مہاجرین کی قبروں کے نوحہ خواں | میں تجھ سے کر چکا ہوں گزارش یہ بار بار
مردہ کو چھوڑ شہر کے گوشوں میں جا کے دیکھ | زندہ مہاجرین کی قبریں ہزار ہا[۲۱۰]

مہاجرین کی آمد کے بعد رہائشی مسائل اور مشکلات میں مبتلا لوگوں کی پریشانیوں کا ذکر کرتے ہوئے حکام بالا کو اس سنگین مسئلے کی طرف توجہ دلائی اور ان لاکھوں مہاجرین کی نمائندگی کرتے ہوئے لکھا کہ:

تم مجھے اشک بہانے پر ملامت نہ کرو　　ضبط کر لوں گا ان اشکوں کو اگر ضبط ہوا
مبتلا خبط میں کیوں ہوں نہ کرے خانہ بدوش　　سندھ میں گھر نہ ملا، ہند میں گھر ضبط ہوا"[۲۱۱]

وہ مہاجرین جو اپنا سب کچھ قربان کر کے اس نئی مملکت میں بسنے کے سہانے خواب دیکھ رہے تھے، بہت جلد انھیں احساس ہونے لگا کہ یہاں ان کے ساتھ غیریت کا سلوک روا رکھا جانے لگا ہے۔ ان کے مسائل کی طرف بالکل توجہ نہیں دی جا رہی ہے اور انھیں عجیب عجیب ناموں اور القابات سے نواز کر طنز و تحقیر کا نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ اسی لیے بہت جلد ان مہاجرین کے دلوں میں طرح طرح کے وسوسوں نے جنم لینا شروع کر دیا۔ اور انھوں نے بھی تلخ لہجہ اختیار کرتے ہوئے سوالات اٹھانے شروع کر دیے۔ ان سوالات کو شاعری کا جامہ پہنا کر رئیس امروہوی نے بھی کچھ قطعات لکھے اور ان مظلوموں کی نمائندگی کرتے ہوئے کہا کہ:

ہم نے اس ارضِ پاک کی خاطر　　ساری دنیا کو تج دیا گویا
تم کو عشقِ وطن کے دعوے ہیں　　تم بتاؤ کہ تم نے کیا کھویا"[۲۱۲]

ظاہر سی بات ہے کہ اس قربانی کے بعد ایک نئے شہر میں بس جانا کوئی آسان نہ تھا۔ لوگ بغیر تحقیق کے کراچی کے بارے میں بہت سی ایسی باتیں کہہ جاتے ہیں جس کا حقیقت سے دور کا بھی تعلق نہیں ہوتا۔ مثلاً عام طور پر لوگوں کا یہ ماننا ہے کہ قیام پاکستان کے بعد ابتدائی بیس تیس برسوں تک کراچی بہت صاف ستھرا شہر ہوا کرتا تھا۔ اس کی سڑکیں روزانہ دھلا کرتی تھیں۔ لیکن بہت تیزی سے پھیلتے ہوئے اس شہر میں قیام پاکستان کے ابتدائی زمانے سے ہی ہر طرح کے مسائل نے جنم لینا شروع کر دیا تھا۔ یہ ضرور ہے کہ جن مقامات پر انگریز اور پارسی آبادیاں تھیں وہاں پر ہر طرح کی صفائی ستھرائی کا انتظام موجود تھا لیکن تیزی سے پھیلتی ہوئی نئی آبادیوں میں صورتِ حال دگر گوں تھی۔ اس منظر کو پیش کرتے ہوئے اگست ۱۹۴۹ء ہی میں رئیس امروہوی نے کہا کہ:

حد سے گزر چکی ہے کراچی کی گندگی　　یہ ذکر تھا کہ شہر کے مہتر ہیں کام چور
میں نے کہا درست ہے لیکن خطا معاف　　ہیں سلطنت میں آپ کے کتنے حلال خور"[۲۱۳]

اس کے باوجود اس زمانے کے قطعات کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ رئیس امروہوی ان حالات سے کبھی مایوس نہیں ہوئے۔ جب جب کوئی نئی بستی بسائی جاتی، رئیس امروہوی اس میں بسنے والے مہاجرین کی حب الوطنی اور زندگی کی مشکلات

سے نبرد آزما ہونے کی لگن کا تذکرہ ضرور قطعات کی صورت میں کرتے۔ مثلاً کراچی کے ایک علاقے نئی کراچی کی آبادکاری پر ۲۲ دسمبر ۱۹۴۸ء کے ایک قطعے میں وہ کہتے ہیں کہ:

جہاں کہنہ کو رونے والے نئی کراچی کا تذکرہ کیا
نئی کراچی سے زندگی کا نیا فسانہ شروع ہوگا
یہی وہ کوچے ہیں جن میں ڈھل کر بنیں گے تہذیبِ نو کے سانچے
یہی وہ گلیاں ہیں جن میں پل کر نیا تمدن طلوع ہوگا[۲۱۴]

کراچی کے ساتھ یہ بے رخی کوئی نہیں بات نہیں۔ جس بات کا رونا آج ہم روتے دکھائی دیتے ہیں، یہ مسائل ابتدائی زمانے میں بھی موجود تھے۔ حکمرانوں کی عدم توجہی کے باعث ان مسائل میں روز بروز بے تحاشا اضافہ ہوتا جارہا تھا۔ اس کے باوجود امید افزا نغموں کی گونج ہمیں یہ بتارہی تھی کہ یہ شہر ایک روز ضرور اپنی عظمت کا اعتراف کروالے گا۔ جنوری ۱۹۵۱ء ہی میں رئیس امروہوی کراچی کی بابت یہ فرمارہے تھے کہ:

جو ساری و جاری ہے ذروں میں کراچی کے ۔۔۔ تخلیق کا وہ جذبہ ٹھہرے کا نہ دم لے گا
ان ریت کے ٹیلوں کو دیکھو نہ حقارت سے ۔۔۔ ان ریت کے ٹیلوں سے اک شہر جنم لے گا[۲۱۵]

اور حقیقتاً ایسا ہی ہوا۔ نئے آنے والے مہاجرین نے مل جل کر اپنی مدد آپ کے تحت ایسے ایسے کام کیے جن کی تفصیل کا بیان یہاں ممکن نہیں البتہ ان کے عزائم دیکھ کر شاعر ضرور مستقبل کی پیش بینی کررہے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ:

نواحِ سندھ و کراچی کہ آج ہے ویراں ۔۔۔ اسی زمین پر بہشتِ بریں سجا دیں گے
اودھ کا نام نہ لے، لکھنؤ کا ذکر نہ کر ۔۔۔ اسی دیار کو ہم لکھنؤ بنا دیں گے[۲۱۶]

ملک کے مختلف حصوں میں صوبوں اور مختلف لسانی گروہوں کے درمیان باہمی چپقلش کی داغ بیل بھی اسی زمانے میں پڑ چکی تھی بلکہ کراچی وہ واحد شہر تھا جہاں ابھی تک اس قسم کی آواز نہیں اٹھائی گئی تھی۔ اس تاریخی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جنوری ۱۹۵۳ء کے ایک قطعے میں وہ کہتے ہیں کہ:

ہر صوبہ اپنے حق کے لیے ہے زباں دراز ۔۔۔ گز بھر زبان رکھتے ہوئے بے زباں ہو تم
خود پوچھتی ہے مجلسِ دستور ساز بھی ۔۔۔ اے قائدینِ شہر کراچی کہاں ہو تم[۲۱۷]

اور اس حق تلفی اور صوبائی و لسانی نعرے بازی سے متاثر ہو کر بلآخر کراچی میں بھی کچھ حقوق کی بات کی جانے لگی۔ پہلی بار ۱۹۵۴ء میں کراچی کے لیے علاحدہ صوبہ یا صوبائی حقوق کا مطالبہ پیش کیا گیا۔ اس حوالے سے مخالفین کا بہت سخت ردعمل

دیکھنے میں آیا۔ حکومتی مشینری اور طاقت کا استعمال کرتے ہوئے مہاجر آبادیوں کو گولیوں کا نشانہ بنایا گیا۔ اس جانب اشارہ کرتے ہوئے شاعر کہتے ہیں کہ:

کچھ شعوری جوش نے کچھ لاشعوری جوش نے — عقل کو آمادۂ جنگ و جنوں کر ہی لیا

انقلابی جوش کا آتش فشاں پھٹ ہی پڑا — اے کراچی! تو نے آخر غسلِ خوں کر ہی لیا[۲۱۸]

لالوکھیت اور گولی مار کے فسادات میں ہلاکتوں اور مہاجر نوجوانوں اور بزرگوں کی ہلاکتوں پر کہا کہ:

کیسے کیسے زندہ دل ساتھی کراچی میں رئیس — کھاد بن کر رہ گئے اور کھیت ہو کر رہ گئے

جو بہارِ باغِ ملت تھے وہ اہلِ دل یہاں — نذرِ گولی مار، لالوکھیت ہو کر رہ گئے[۲۱۹]

حکومتی تساہل اور کراچی کے ساتھ بے حسی کے رویے نے بلآخر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مایوسی کی شکل اختیار کر لی۔ اب لوگ حکمرانوں سے مایوس ہو کر دور دراز کی بستیوں میں اپنی مدد آپ کے تحت آبادکاری کا سوچ رہے تھے۔ اس حکومتی رویے کے خلاف طنز کرتے ہوئے شاعر کا کہنا تھا کہ:

صعود و ماہ و ستارے کا سلسلہ فی الحال — بس اس قدر ہے ہماری نگاہ میں شاید

مہاجرین کی بستی بسائی جائے گی — نواحِ مہر و مضافاتِ ماہ میں شاید[۲۲۰]

ظاہر سی بات ہے کہ ایک طرف امریکا اور روس جیسے ممالک تسخیر خلا کے پروگرام پر زور و شور سے عمل پیرا تھے اور یہاں یہ مسئلہ حل ہو کر نہیں دے رہا تھا کہ ہندوستان سے آنے والے مہاجرین کو کہاں بسایا جائے۔ ان عقل مند حکمرانوں کی بے عقلی پر رئیس امروہوی طنز کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

بھینس افضل ہے کہ عقل، الجھا ہوا سا اک سوال — کوئی تو اس مسئلے کا حل بتانا چاہیے

جو کراچی میں بہت نازاں ہیں اپنی عقل پر — بھینس کالونی میں ان سب کو بسانا چاہیے[۲۲۱]

پچاس کی دہائی میں آبادی کے بڑھتے ہوئے دباؤ اور ناقص شہری منصوبہ بندی کے نتیجے میں اس شہر کی فضا بہت آلودہ ہو گئی تھی۔ اسی سبب دارالحکومت کی منتقلی کا فیصلہ بھی سامنے آیا۔ یہ فیصلہ کراچی والوں کو اپنے اوپر ایک اور ظلم دکھائی دیا۔ ظاہر سی بات ہے کہ جب یہ شہر وفاق کی سرپرستی میں گندگی اور غلاظت کا ڈھیر بنتا جا رہا تھا۔ بقول شاعر:

وبا اور غلاظت کا احوال سن کر — یہ بولیں مسماۃ اللہ رکھی

کہ دونوں غریبوں کے پیچھے پڑے ہیں — علاقے کا گھیا، محلّے کی مکھی[۲۲۲]

حکام بجائے اس کے کہ اس بڑے شہر کے مسائل کو حل کرنے کی جانب توجہ مبذول کرتے، حل یہ نکالا کہ کراچی کی آب و ہوا کو مضرِ صحت قرار دے کر دارالحکومت کی تبدیلی کو ناگزیر قرار دے ڈالا۔ مارشل لا حکام کے اس فیصلے پر طنز کرتے ہوئے شاعر کا کہنا تھا کہ:

شہر کی مکھیاں خدا کی پناہ   کیا ندیدی ہیں کیا بھنکتی ہیں
یہ جسارت تو دیکھیے ان کی   ذہنِ حکام پہ بھنکتی ہیں[۲۲۳]

آلودگی اور گندگی کی صورتِ حال اس قدر دگرگوں تھی کہ رئیس امروہوی اس شہر کی حالت پر کف افسوس ملتے ہوئے یہ کہنے پر مجبور ہوئے کہ:

حالتِ آب و ہوا یہ کہ ہوا گرد آلود   اب رہا آب تو کیچڑ کا دو آبہ نکلا
ہم کراچی کو سمجھتے تھے بہشتِ مشرق   اب جو اس عہد میں دیکھا تو خرابہ نکلا[۲۲۴]

ایک عام تاثر یہ ہے کہ کراچی میں رہنے والے تمام افراد معاشی طور پر بہت آسودہ حال ہیں۔ حالاں کہ یہ خیال مجموعی صورتِ حال کی درست عکاسی نہیں۔ اس شہر کے پھیلاؤ، اس کی آبادی کا دباؤ اور گوں ناگوں مسائل کو دیکھتے ہوئے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ زبان ولسان سے قطع نظر ہر طبقۂ فکر کے لوگوں میں بے تحاشا غربت پائی جاتی ہے۔ محض چند آسودہ حال بستیوں کی خوش حالی دیکھ کر بد حال لوگوں کے معاشی مسائل سے نظریں چرانا عقل مندی کی دلیل نہیں۔ ہاں کچھ ایسے ضرور تھے جو اس زمانے میں بھی مکر و فریب اور دھوکے سے اپنی دولت میں بے دریغ اضافہ کرنے کا ہنر جانتے تھے۔ ایسی صورتِ حال کا نقشہ کھینچتے ہوئے شاعر نے کہا کہ:

زندگی بے جلوہ و بے رنگ و بے جوہر کہاں   خود فروزی، خود نمائی، خود تراشی چاہیے
سادہ لوحوں کا مقدر فقر و فاقہ کیوں نہ ہوا   خوش معاشی کے لیے بھی بد معاشی چاہیے[۲۲۵]

خراب معاشی صورتِ حال پر یہ بھی کہا کہ:

رزق و معاش تنگ تو ماحول دل خراش   ہم لوگ اس فضا میں بہ صد بے دلی جیے
سچ مچ ہوائے شہر کراچی ہے دوست کش   قائد یہاں جیے نہ لیاقت علی جیے[۲۲۶]

آبادی کے دباؤ اور ناقص منصوبہ بندی کے نتیجے میں کراچی میں ٹریفک کے مسائل بھی کئی دہائیوں سے جوں کے توں موجود ہیں۔ ۱۹۶۰ء کے ایک قطعے میں بسوں میں گنجائش سے زیادہ مسافروں کی حالت بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

لو ہم سفر کو ہم سفروں سے گریز ہے   لو ہم نفس کو ہم نفسوں میں جگہ نہیں
یہ عذر بھی عجیب ہے یارانِ راہ کا   دل میں جگہ ہے اور بسوں میں جگہ نہیں[۲۲۷]

انتظامیہ کی بے حسی اور ٹریفک اہل کاروں کی لاپرواہی کا رونا بھی کراچی کے لیے کوئی نئی بات نہیں۔ اسی سبب ۶۰ کی دہائی میں بھی بعض قطعات اس اہم مسئلے کی جانب اشارہ کرتے دکھائی دیتے ہیں، جیسے:

کیا ہیں یہ حادثے ٹریفک کے — خونِ انساں کی رنگ رلیاں ہیں
یہ کراچی کی خوں چکاں سڑکیں — شاہرہِ عدم کی گلیاں ہیں
ملک الموت سے ٹکرا کے رئیس — دیکھتا ہے کہ کہاں گرتے ہیں
ہم کہ اس شہر کے بازاروں میں — سر ہتھیلی پہ لیے پھرتے ہیں[۲۲۸]

حکومت کی بے حسی کا یہ عالم تھا کہ حادثے کا شکار ہونے والوں کے لیے محض دس ہزار روپے کا معاوضہ مقرر کر کے اپنی ذمہ داریوں سے سبک دوش ہو جاتے تھے۔ اس صورتِ حال کی بابت رئیس امروہوی نے لکھا کہ:

سرِ بازار ایک ٹکر میں — ختم آلام زندگی کر لو
ہے ہر اک بس ڈرائیور کی صدا — چند آنے میں خود کشی کر لو[۲۲۹]

ٹریفک کے مسائل نے رفتہ رفتہ سنگین صورت اختیار کر لی گئی۔ پولیس اور انتظامیہ کی بے حسی نے اس صورتِ حال کو مزید بگاڑ کر رکھ دیا تھا۔ سڑکوں پر ہونے والے حادثات میں بتدریج اضافے پر اپنی تشویش کا اظہار کرتے ہوئے ان کا کہنا تھا کہ:

کوئی اندازہ کر سکتا ہے کیا رفتار ہستی کا — کہ یہ گاڑی بقدرِ ہمتِ ہر کس نہیں چلتی
یہ سڑکیں آہ یہ سڑکیں کہ ان خوں خوار سڑکوں پر — کسی کا بس نہیں چلتا کسی کی بس نہیں چلتی[۲۳۰]

ایک اور قطعے میں کچھ اس قسم کی صورتِ حال پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

سوار و سواری برابر ہوئے — ترقی کی لے اس قدر بڑھ گئی
کہ بس پر مسافر کے چڑھنے سے قبل — سنا ہے مسافر پہ بس چڑھ گئی[۲۳۱]

ٹریفک کے علاوہ کراچی میں پانی اور بجلی کے مسائل نے بھی ایک طویل عرصے سے لوگوں کو پریشان کر رکھا ہے۔ قیام پاکستان کے بعد سے اب تک کسی بھی حکومت نے عوام کے اس دیرینہ مسئلے کی جانب خاطر خواہ توجہ نہیں دی۔ جون ۱۹۸۱ء کے ایک قطعے میں رئیس امروہوی اس جانب اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

اس شہر میں پانی کی بجلی کی مصیبت ہے — اب کس سے کہیں جا کر اُٹھ رفعِ مصیبت کر
اے ابرِ کرم! تو ہی یاروں کا سہارا ہے — بجلی بھی عنایت کر پانی بھی عنایت کر[۲۳۲]

خصوصاً پانی جیسی اہم بنیادی ضرورت کو جس طرح اس شہر کی مقامی اور صوبائی حکومتوں نے نظر انداز کیا اس نے شہر میں کئی بار امن و امان کی صورتِ حال کو بھی تشویش ناک صورتِ حال تک پہنچایا۔ یہ صورتِ حال بھی کراچی کے لیے کوئی نئی نہیں تھی، بلکہ پچاس اور ساٹھ کی دہائی میں بھی ان مسائل نے پوری طرح شہر کو جکڑ رکھا تھا۔ ۱۹۶۱ء کے اس قطعے کو دیکھیے:

دستِ تقدیر کی ہم تشنہ لبوں کی خاطر — بس یہی زہر کا ساغر ہے پیو یا نہ پیو

زم زم و کوثر و تسنیم و لبن کے پیاسو — آبِ گندہ ہی میسر ہے پیو یا نہ پیو[۲۳۳]

ظاہر سی بات ہے کہ ۱۹۵۱ء میں کراچی کی جو آبادی محض ۱.۰۶ ملین نفوس پر مشتمل تھی، جو محض ۴ برسوں میں بڑھ کر ۲ ملین تک جا پہنچی۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ حکمران اس سنگین مسئلے کی طرف سنجیدگی سے توجہ دیتے لیکن فوری طور پر اس جانب کوئی توجہ نہیں دی گئی۔ اس کا اندازہ مزید چار برس گزرنے کے بعد رئیس امروہوی کے ۱۹۶۵ء کے اس قطعے سے لگایا جا سکتا ہے جس میں وہ کہتے ہیں کہ:

زندگی سے سیر جینے کی طلب موجود ہے — آبِ شیریں کم گروہِ تشنہ لب موجود ہے

اے کراچی! حیف پینے کے لیے پانی نہیں — ڈوب مرنے کے لیے بحرِ عرب موجود ہے[۲۳۴]

بعد میں اس مسئلے کے حل کے لیے کچھ ضروری اقدامات ضرور اٹھائے گئے اور گریٹر کراچی پبلک واٹر سپلائی اسکیم کو چار مرحلوں میں مکمل کرنے کا منصوبہ بھی بنایا گیا۔ اس کا پہلا فیز ۱۹۶۷ء میں مکمل ہوا جس سے کراچی کو ۷۰MGD پانی ملنے لگا[۲۳۵]۔ لیکن ۱۹۶۷ء میں رئیس امروہوی کے ان قطعات سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ مسئلہ اس وقت بھی پوری طرح حل نہ ہو سکا۔ ملاحظہ کیجیے:

انتظامِ آب کی تنظیم بھی کافی نہیں — اہتمامِ آب کی تقسیم بھی کافی نہیں

اے کراچی! تیری رفعِ تشنگی کے واسطے — سلسبیلِ کوثر و تسنیم بھی کافی نہیں

چلنے لگا ہے الٹا قدرت کا کارخانہ — کیا چاہتی ہے آخر اے گردشِ زمانہ

پانی کو کیوں نہ ترسیں دانے کو کیوں نہ پھڑکیں — بندوں کے ہاتھ میں ہے تقسیمِ آب و دانہ[۲۳۶]

حکومتی اداروں کا یہ کہنا تھا کہ جون ۱۹۷۰ء تک کراچی میں پانی کا مسئلہ نہیں رہے گا۔ اس بابت جو اقدامات کیے جا رہے تھے وہ وقتاً فوقتاً پایۂ تکمیل تک بھی پہنچ رہے تھے مثلاً ۱۹۷۲ء میں دوسرے فیز کے طور پر مزید ستر MGD پانی کی سپلائی، پھر ۱۹۷۷ء میں ستر MGD کا مزید اضافہ اور چوتھے فیز یعنی ۱۹۸۵ء میں پچاس MGD پیپری تک مہیا کیا جانا تھا[۲۳۷]۔ لیکن جب تک یہ منصوبے پایۂ تکمیل تک پہنچتے اس شہر کی آبادی میں مزید کئی گنا اضافہ ہو چکا ہوتا۔ اس لیے یہ مسائل ہر زمانے میں جوں کے توں رہے اور اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے رئیس امروہوی نے بھی کہا کہ:

آبشارِ زندگانی بند ہے آبِ رحمت کی روانی بند ہے
با ہمہ تشنہ دہانی بند ہے شہر والو! آج پانی بند ہے

ہمیشہ با وضو رہتے ہیں جو لوگ وہ یوں پانی کو ترسائے گئے ہیں
کہ بے چارے بہ عذرِ قلتِ آب تیمم کر کے دفنائے گئے ہیں

کمی اس شہر میں ہرگز نہیں آبی وسائل کی کنویں، جھیلیں، ندی، دریا، سمندر، نہر، نل، نالے
مگر بایں ہمہ یہ تین دن سے حال ہے اپنا وفورِ تشنگی سے ہونٹ پیلے اور منھ کالے[۲۳۸]

حقیقت تو یہ ہے کہ ستر سال گزرنے کے باوجود آج تک کراچی کا یہ مسئلہ حل نہ ہو سکا۔ ۸۰ کی دہائی میں لکھے گئے قطعات سے اندازہ ہوتا ہے کہ کراچی کے شہری مسائل میں کمی کے بجائے روز بروز اضافہ ہی ہوتا چلا گیا۔ پانی کی شدید قلت کا بیان تو ہر دور میں موجود تھا ہی۔ جیسا کہ ۱۹۸۳ء میں بھی انھوں نے کہا کہ:

قطرہ قطرہ کر کے پانی مل رہا ہے آج کل آپ کو دینا پڑے گا قطرے قطرے کا حساب[۲۳۹]

بجلی کے مسائل نے بھی ساتھ ساتھ اسی دور میں خوب سر اٹھایا۔ دور دراز تک آبادی کے پھیلنے کے نتیجے میں بنیادی سہولیات کی فراہمی کے لیے جتنے سرمائے کی ضرورت تھی، اس قدر وسائل صوبائی اور وفاقی حکومتیں اسے فراہم نہیں کر پا رہی تھیں۔ اسی لیے اس جانب توجہ دلاتے ہوئے رئیس امروہوی کا کہنا تھا کہ:

شہری سہولتوں کے نہ ہونے سے آج کل آگے جو بڑھ رہے تھے وہ پیچھے کو ہٹ گئے
پانی پہ احتجاج کیا، نل خطج گیا بجلی پہ اعتراض کیا تار کٹ گئے[۲۴۰]

غلاظت اور گندگی کی صورتِ حال بھی اس شہر کو ورثے میں ملی۔ دل چسپ بات یہ کہ گندے پانی کی نکاسی کا جو بندوبست مقامی اور صوبائی حکومتوں کو کرنا چاہیے تھا، اس جانب بڑے عرصے تک توجہ نہ دی جا سکی۔ افسوس ناک حد تک اس حقیقت سے کیسے نظریں چرائیں کہ KWSB نامی ادارہ جو گندے پانی کی نکاسی کا انتظام کرنے کے لیے بنایا گیا تھا، اس کا قیام ہی ۱۹۸۳ء میں عمل میں آیا[۲۴۱]۔ گویا اس سے قبل ۱۹۶۰ء میں گریٹر کراچی سیوریج ڈسپوزل اسکیم پر کام شروع ہو چکا تھا، لیکن ناقص منصوبہ بندی کے نتیجے میں شہر میں گندے پانی کی نکاسی اور ٹریٹمنٹ کرنے کا نظام بہت پیچھے رہ گیا[۲۳۱]۔ اس صورتِ حال کی وجہ سے یہ شہر ہمیشہ سے غلاظت اور گندگی کا ڈھیر رہا ہے۔ کبھی یہاں ہیضے کی وجہ سے ہلاکتیں ہوئیں تو کبھی گندا پانی پیچس کی بیماری کا باعث

ہوا جس نے بچوں کی ہلاکتوں کو بڑھا دیا۔ اس صورتِ حال پر ۱۹۶۰ء میں لکھے گئے قطعات سے بھرپور روشنی پڑتی ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

کہیں بارش کا موسم گاہے گاہے بوندا باندی تک　　　کہیں ابرِ کرم سے پے بہ پے بارش برستی ہے

کراچی میں بھی برساتیں ہیں لیکن فرق اتنا　　　کہیں ہیضہ برستا ہے کہیں پیچش برستی ہے[۲۴۲]

کراچی کی دگرگوں حالت کے باوجود صنعتی ترقی کی رفتار خاصی تیز رہی۔ وفاق کو سب سے زیادہ ریونیو دینے والے اس شہر کو بجٹ کی مالیاتی تقسیم کے موقع پر ہمیشہ نظر انداز کیا جاتا تھا۔ کراچی کے مقابلے میں پنڈی اور اسلام آباد جیسے چھوٹے شہروں کے لیے زیادہ رقم مختص کی جاتی۔ ۱۹۶۶ء میں اس صورتِ حال پر رئیس امروہوی نے وفاق کی اس غیر منصفانہ پالیسی پر سخت برہمی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ:

لاہور بھی محروم نہیں فیض سے لیکن　　　پنڈی میں ہے بارانِ کرم سب سے زیادہ

برسوں سے یہ احبابِ کراچی کو گلہ ہے　　　اس شہر میں برسات ہے کم سب سے زیادہ[۲۴۳]

شہر سے بے رخی اور بے اعتنائی کا جو رویہ اس عہد میں اہلِ اقتدار کی جانب سے روا رکھا گیا اس نے اس شہر کے انتظامی معاملات میں بہت زیادہ بگاڑ پیدا کیا۔ لاقانونیت، چور بازاری، ملاوٹ اور ذخیرہ اندازی کے مسائل بھی اسی زمانے سے پیدا ہونا شروع ہو گئے۔ اس جانب اشارہ کرتے ہوئے شاعر نے کہا کہ:

کہو کہ شہر میں خالص غذا نہیں ملتی　　　کہو کہ لاگ کا موقع نہ یہ لگاوٹ کا

جو ذائقے ہیں ملاوٹ کو روکنے کے لیے　　　کہیں خود ان میں نہ ہو شائبہ ملاوٹ کا[۲۴۴]

لوگ اس ملاوٹ والی غذاؤں سے اس قدر خوف زدہ تھے کہ شاعر کو یہ کہنا پڑا:

اف یہ آمیزشِ اشیائے غذائی کی وبا　　　یا رب اس طرح تو بندوں پہ ترے قہر نہ ہو

چائے چکھتے ہوئے خطرہ کہ نہ ہو شربتِ مرگ　　　دودھ پیتے ہوئے دہشت کہ کہیں زہر نہ ہو[۲۴۵]

سماجی اور سیاسی زندگی کے وہ کون سے صنعتی پہلو ہیں جو رئیس امروہوی کی نظروں سے پوشیدہ رہے ہوں۔ ۶۰ء کی دہائی میں انتخابی نتائج کے اعلان کے بعد کراچی میں خاصے خون ریز فسادات ہوئے، اس منظر کو پیش کرتے ہوئے بھی انھوں نے کہا کہ:

اللہ اللہ یہ نتائج انتخابِ صدر کے　　　وقت اک خونیں فسانہ کہہ رہا ہے آج کل

شہریوں کے دو گروہوں میں یہ پیکار و فساد　　　انتخابی خونِ فاسد بہہ رہا ہے آج کل[۲۴۶]

کراچی کی نواحی بستیوں میں جس طرح غنڈوں کی ٹولیوں نے لوٹ مار کا بازار گرم کیا، یہ بھی اس عہد کا المیہ ہے۔ اس جانب اشارہ کرتے ہوئے اپنے ایک قطعے میں لکھتے ہیں کہ:

مضطرب رہرو، شکستہ راستے، اجڑے مکان　　　کارپوریشن نے اپنے شہریوں کو کیا دیا

لوٹنے والوں نے لوٹی تھیں نواحی بستیاں　　　کھودنے والوں نے سارے شہر کو کھدوا دیا[۲۴۷]

صوبہ پرستی، فرقہ واریت اور لسانی گروہ بندیوں نے ملک کو جس قدر نقصان پہنچایا، شاید دشمن کے جارحانہ حملوں سے اس قدر نقصان نہ پہنچا۔ عام خیال یہ ہے کہ اس وبا نے ۸۰ء کی دہائی میں پوری طرح سے معاشرے کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا مگر درست صورتِ حال تو یہ تھی کہ ابتدا ہی سے جیسا کہ بنگلا زبان کے قومی زبان بنائے جانے کی تحریک کے باعث فسادات اور ہنگامے ہوں یا مکتی باہنی کی شکل میں ملک کو ٹکڑے کرنے کی سازش، ہر دور میں اس طرح کے خطرات سے یہ نوزائیدہ ملک نبرد آزمارہا ہے۔ اکتوبر ۱۹۶۹ء میں اس صورتِ حال پر رئیس امروہوی نے لکھا کہ:

ہمیں فکرِ اصلاحِ حالات کیا　　　کہ ہم کیا؟ ہماری روایات کیا

مہاجر بچارے پہ آفات کیوں　　　مہاجر بچارے کی اوقات کیا[۲۴۸]

جو لوگ ہجرت کر کے کراچی میں بس گئے تھے، ان کے لیے اب یہ شہر ہی حاصل متاع تھا، لیکن مقامی سطح پر انھیں جس طرح نظر انداز کیا جارہا تھا، ملازمت اور معاشی سطح پر انھیں دیوار سے لگانے کی جو سازشیں ہو رہی تھیں، وہ اب بھی تاریخ کے ایک کڑوے سچ کی صورت میں معاشرے پر اپنے گہرے اثرات مرتب کر رہی ہیں۔ اس شہر سے اپنے تعلق اور جذباتی وابستگی کا اظہار کرتے ہوئے رئیس امروہوی کا کہنا تھا کہ:

ہم نے پایا ہے کراچی کو سبھی کچھ کھو کر　　　نخل قربانی و ایثار کا پھل ہے یہ شہر

ہم غریبوں کے لیے ہجر نصیبوں کے لیے　　　ہند کے پانچ سو شہروں کا بدل ہے یہ شہر[۲۴۹]

اپنی ہی سرزمین پر حقارت بھرے رویے کو دیکھ کر رئیس امروہوی یہ کہنے سے نہ رک سکے کہ:

مہاجرین جو ہندوستاں سے آئے ہیں　　　خود اپنے ساتھ ہی اپنی بہار لائے ہیں

ہمیں نہ دیکھ حقارت سے اے عروسِ چمن　　　ہمیں نے خونِ جگر سے یہ گل کھلائے ہیں[۲۵۰]

کوٹا سسٹم کے نام پر جس طرح مہاجر نوجوانوں کا استیصال ہو رہا تھا، اس پر مہاجر بزرگوں کو خاصی تشویش تھی۔ اپنی اس تشویش کا اظہار بھی وقتاً فوقتاً کیا جاتا رہا۔ اس سسٹم نے جس طرح میرٹ کا قتل عام کیا اس پر رئیس امروہوی نے ردعمل دکھاتے ہوئے ۲۱ جولائی ۱۹۷۱ء میں لکھا کہ:

عدل و انصاف پہ مبنی ہو تو ہے قابلِ قدر　　　بڑا سسٹم ہو مری جان کہ چھوٹا سسٹم

ظلم ہے اہلِ کراچی پہ کھری بات یہ ہے　　　کوٹا سسٹم کہ حقیقت میں ہے کھوٹا سسٹم[۲۵۱]

اس کے بعد ۱۸ اگست ۱۹۷۱ء کو بھی اپنے ایک قطعے میں اس جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ:

صنعت میں روزگار میں جہدِ معاش میں ۔۔۔ کوٹا ہو فرضِ عین تو کیا حق ملے ہمیں
نا مستحق ہیں اہلِ کراچی یہ طے ہوا ۔۔۔ دو فی صدی حقوق بھی ناحق ملے ہمیں[۲۵۲]

اپنے حقوق کے لیے آواز بلند کرنے پر ناحق جو ظلم و ستم کے پہاڑ توڑے گئے۔ اندرونِ سندھ مہاجر اقلیت کے قتلِ عام کا سلسلہ جاری ہوا۔ انھیں زیادہ نمبر حاصل کرنے کے باوجود طب اور انجینئرنگ کالج میں میں داخلوں سے محروم رکھا جاتا۔ ملازمت کے دروازے ان کے لیے بند کیے جانے لگے۔ سرکاری سطح پر ان کا استیصال شروع ہوا تو رئیس امروہوی یہ کہنے پر مجبور ہوئے کہ:

اخوت کی، صداقت کی، وفا کی ۔۔۔ شرافت کی، حمیت کی، حیا کی
شعور و انقلاب و ارتقا کی ۔۔۔ مہاجر نے بڑی قیمت ادا کی[۲۵۳]

پیپلز پارٹی کی حکومت قائم ہونے کے بعد سندھ کی سیاسی فضا کافی مکدر تھی۔ سندھ میں تعصب کی جو آگ بھڑکی تھی، اس نے محب وطن پاکستانیوں کو تشویش میں مبتلا کر رکھا تھا۔ ابھی سقوطِ ڈھاکا کا غم تازہ تھا اور سندھ کے حالات بھی دگرگوں ہوتے جا رہے تھے۔ ان حالات میں رئیس امروہوی نے تنبیہ کرتے ہوئے کہا کہ:

اے اہلِ نظر! حشر کے آثار ہیں ہر سو ۔۔۔ دیکھو نہ قیامت کہیں اس گھر سے گزر جائے
طوفانِ تعصب ابھی پہنچا ہے کمر تک ۔۔۔ ڈرتا ہوں کہ پانی نہ کہیں سر سے گزر جائے[۲۵۴]

موجودہ سندھ ایک کثیر اللسانی اور کثیر القومی صوبہ ہے۔ صوبے کی اسی کثیر اللسانی (Multilingual) حیثیت نے اسے ابتدا ہی سے قوم پرستی کی کش مکش کا مرکز بنائے رکھا۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ سندھی قوم خود بھی برابری کے حقوق کا نعرہ لگاتی رہی ہے۔ جی۔ ایم۔ سید کے پیروکار ۱۹۷۳ء کے آئین کو ماننے کے بجائے آزادی کی بات کرتے نظر آتے ہیں اور ”سندھو دیش“ کو اپنی منزل قرار دیتے رہے ہیں[۲۵۵]۔ اس صورتِ حال پر رئیس امروہوی نے واضح طور پر ان گمراہ لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ہے کہ:

کس چیز کے ترجماں ہیں آخر ۔۔۔ نفرت کے بیان پے بہ پے یہ
اربابِ فساد یاد رکھیں ۔۔۔ بنگال نہیں ہے سندھ ہے یہ[۲۵۶]

حالاں کہ بھٹو بھی اس بات کا اچھی طرح ادراک رکھتے تھے کہ ان سیاسی مسائل کی اساس یہ ہے کہ موجودہ نظام کو ناگہانی انقلاب اور ہلاکت آفریں خانہ جنگی کی راہ اختیار کیے بغیر کیوں کر منسوخ کیا جائے۔ اس بابت انھوں نے خود اپنی ایک تحریر میں واضح موقف اختیار کرتے ہوئے کہا کہ اگر اقتصادی اور سماجی انصاف کے سوال کو نظر انداز کیا گیا تو ملک کی سالمیت نہ صرف خطرے میں پڑ جائے گی بلکہ اس کا پارہ پارہ ہونا یقینی ہو جائے گا[۲۵۷]۔ مگر ادراک کے باوجود خود بھٹو سماجی انصاف اور معاشی برابری

کے اصولوں کو ملک میں رائج نہ کر سکے بلکہ سندھ کی ایک لسانی اکثریت کے دباؤ میں آکر بعض ایسے فیصلے میں بھی کیے جو دوسری لسانی اقلیت کو ہرگز قبول نہ تھے۔ حالاں کہ یہ بات پوری طرح واضح تھی کہ سندھ کی دوسری بڑی لسانی اکثریت یعنی مہاجرین نے اب صوبۂ سندھ ہی کو اپنا سب کچھ سمجھ لیا تھا۔ رئیس امروہوی نے اپریل ۱۹۷۲ء کے ایک قطعے میں واضح موقف اختیار کرتے ہوئے کہا کہ:

گہوارۂ جاں، ملت و مذہب کے لیے سندھ — منزل گہہ دل، مقصد و مطلب کے لیے سندھ
اربابِ تعصب کی جہالت پہ نہ جاؤ — ہم سندھ کے ہیں اور ہے ہم سب کے لیے سندھ[۲۵۸]

۱۹۷۲ء کے لسانی بل کا معاملہ ہو یا جیسے سندھ کے پُر تشدد عناصر کا ہاتھ میں کلہاڑا لے کر جلوس نکالنے کا معاملہ ہو، سماجی اور سیاسی زندگی کے ہر پہلو پر رئیس امروہوی کے قطعات اس دور کا عکس ہیں۔ جیسے:

لوگ کہتے ہیں کہ لطفِ خاص ہے اس قہر میں — شہد کی تاثیر ہے، قومیّتوں کے زہر میں
رفتہ رفتہ یہ حقیقت ہم پہ واضح ہوگئی — دوسرے درجے کے شہری ہیں ہم اپنے شہر میں[۲۵۹]

قتل وغارت گری، خوف و دہشت اور پُر تشدد ماحول میں کبھی رئیس امروہوی یہ کہتے دکھائی دیتے ہیں کہ:

یہ پوچھے تو کوئی کشتِ وطن کے باغ بانوں سے — ہم اس صحرا میں آخر کیا کریں گے جھاڑیاں لے کر
ہمیں گل دستۂ اخلاص کی جن سے تمنا تھی — تماشا ہے وہ نکلے ہاتھ میں کلہاڑیاں لے کر[۲۶۰]

ناانصافی پر مبنی لسانی بل کے بعد کراچی کے حالات خاصے کشیدہ رہے۔ قتل، اغوا، فائرنگ اور آئے دن کی ہڑتالوں نے لوگوں کی زندگی اجیرن بنادی۔ اسی صورتِ حال کا نقشہ کھینچتے ہوئے اس زمانے کے چند قطعات دیکھیے:

حیات آوارۂ صحرائے وحشت کوبکو ہوگی — بقا تیغِ فنا کی آب سے بے آبرو ہوگی
شہیدوں کے چمن کو احتیاجِ رنگ و بو ہوگی — نجانے یہ زمیں کس کس کے خوں سے سرخ رو ہوگی

ہم تو اخلاص و محبت سے نہ باز آئیں گے — اُس طرف جہل و تعصب کے مظاہر ہی سہی
ہم تو اپنے کو سمجھتے ہیں مقامی لیکن — وہ سمجھتے ہیں مہاجر تو مہاجر ہی سہی

تالا بندی، فائرنگ، اغوا، لسانی حادثات — روز مرہ کی روش ہے وادیِ مہران میں
دیکھ کر مرکز کی خاموشی یہ اٹھتا ہے سوال — سندھ کوئی مختلف صوبہ ہے پاکستان میں[۲۶۱]

ظاہر سی بات ہے کہ اس زمانے میں مسلسل نسلی اور لسانی حادثات ہو رہے تھے اور وفاق اس جانب کوئی توجہ نہیں دے رہا تھا۔ اسلام اور پاکستان کے خلاف جو ہرزہ سرائی جی۔ ایم۔ سید کی جانب سے ہو رہی تھی، وہ تو اپنی جگہ دائیں بازو سے تعلق رکھنے والے لوگوں کی دل آزاری کا باعث بن رہی تھی۔ اس کے علاوہ سید صاحب کھل کر لسانی منافرت کو ہوا دے رہے تھے۔ غیر سندھیوں کو یہ دھمکی دی جارہی تھی کہ انھوں نے جی۔ ایم۔ سید کے نظریات سے اختلاف کیا تو ان کی حالت بہاریوں جیسی کر دی جائے گی [۲۶۲]۔ لسانی بل کے خلاف مظاہرے کرنے والوں کو بھی جیے سندھ کی جانب سے یہ دھمکی مل رہی تھی کہ اس حمایت پر ان کی زبان کاٹ دی جائے گی:

اتنے بسمل ہوں تو پھر ہیبت ہی کیا جلاّد کی — صید اتنے ہوں تو پھر طاقت ہی کیا صیاد کی
دیکھنا یہ ہے کہ اردو بولنے پر سندھ میں — کون کاٹے گا زباں آدھے کروڑ افراد کی [۲۶۳]

رئیس امروہوی نے قرار دادِ پاکستان سے انحراف کرنے والوں کے خلاف کھل کر لکھا کہ:

آپ نے بکواس سُن لی دشمنانِ سندھ کی — گو کہ اس بکواس کی پرواہ ہمیں مطلق نہیں
آج بھی منکر ہیں جو تحریکِ پاکستان سے — ان کو پاکستان میں رہنے کا کوئی حق نہیں [۲۶۴]

۷ جولائی کو سندھ اسمبلی نے وہ متعصبانہ لسانی بل پاس کیا جس کے تحت صوبۂ سندھ کی واحد سرکاری زبان سندھی کو قرار دیا گیا تھا۔ اس پر جو کچھ اشتعال انگیزیاں ہوئیں اور جس قسم کے فسادات ہوئے اسے دیکھ کر تھوڑی دیر کے لیے یہ محسوس ہوتا تھا کہ چند روز تک اس صوبے میں حکومت نام کی کوئی چیز ہی نہیں تھی۔ ان لسانی ہنگاموں کا مرکز کراچی تھا۔ اس تنازعے میں کافی جانی و مالی نقصان ہوا۔ ان شہیدوں کی یاد میں لیاقت آباد میں مسجدِ شہدا قائم کی گئی۔ ان حالات کی منظر کشی کرتے ہوئے رئیس امروہوی نے کہا کہ:

پہن کے خونِ شہیداں کا پیرہن ہم نے — بنا دیا ہے کراچی تجھے دلہن ہم نے
اُدھر ہے جسم پہ تیرے لباسِ خوں آلود — سروں پہ باندھ رکھے ہیں اِدھر کفن ہم نے

سرخ رو تو ہوگی خونِ شہیداں کے طفیل — اے کراچی! تیرے مقتل تیرے مشہد کو سلام
ابتدائی کامیابی ہوگئی تجھ کو نصیب — اہلِ پنجاب و بلوچستان و سرحد کو سلام [۲۶۵]

اس موقع پر رئیس امروہوی کی ایک نظم جو سندھ اسمبلی میں پیش کیے گئے اس بل کے تناظر میں نہیں لکھی گئی تھی، کو اخبارات نے پھر سے شائع کر کے اردو کی حمایت میں مظاہرے اور تحریک شروع کی۔ کلیاتِ رئیس امروہوی میں وہ نظم ''اردو کا جنازہ'' کے عنوان سے شامل ہے۔ چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

اردو کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے

کیوں نالۂ حسرت دلِ مغموم سے نکلے　　کیوں جانِ حزیں خطرۂ موہوم سے نکلے؟
آنسو نہ کسی دیدۂ مظلوم سے نکلے　　کہہ دو کہ نہ شکوہ لبِ مغموم سے نکلے

اردو کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے

اس لاش کو چپکے سے کوئی دفن نہ کر دے　　پہلے کوئی سر سیدِ اعظم کو خبر دے
وہ مردِ خدا ہم میں نئی روح تو بھر دے　　وہ روح کہ موجود نہ معدوم سے نکلے

اردو کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے[۲۶۶]

نسلی اور علاقائی عصبیت نے دراصل اس زمانے میں اضطراب کی کیفیت پیدا کر دی تھی۔ سندھ کی لسانی اقلیت یعنی مہاجروں کو پناہ گیر کہہ کر تیسرے درجے کا شہری بننے پر مجبور کیا جارہا تھا۔ ان حالات کی ترجمانی اس عہد کے متعدد قطعات میں کی گئی ہے۔ جیسے جولائی ۱۹۷۲ء کے یہ قطعات دیکھیے:

اگرچہ بسمل و مجروح و دل فگار ہیں ہم!　　خدا گواہ کہ اس قوم کا وقار ہیں ہم!
عروسِ قوم و وطن کو پناہ دی ہم نے　　پناہ گیر نہیں ہیں پناہ گار ہیں ہم

سندھ میں آدھے کروڑ افراد سے ایسا سلوک؟　　آپ کے فہم و رسا میں کوئی گڑبڑ تو نہیں
آپ ہم کو بے محابا ہانکتے ہیں کس لیے　　سندھ کے صحرا میں ہم بھیڑوں کا ریوڑ تو نہیں[۲۶۷]

رئیس امروہوی سندھ کی سیاسی فضا میں موجود بے چینی اور اضطراب کی بنیادی وجہ صوبائی عصبیت اور لسانی اختلاف کو قرار دیتے ہیں۔ قبیلہ پرستی اور صوبائیت کے نعرے جو پوری دنیا سے متروک ہو کر ملت کے تصور میں ضم ہو رہے تھے، اس نئی مملکت میں اسے جو فروغ حاصل ہوا، وہ اس پر متفکر بھی تھے اور اسے قوم وملت کے لیے زہرِ قاتل بھی سمجھتے تھے۔ ملک کی سیاسی فضا بالعموم اور سندھ کی سیاسی فضا بالخصوص جس قسم کی فرقہ بندی، گروہ بندی اور لسانی عصبیت میں مبتلا تھی، وہ کسی سانحے سے کم نہیں تھی۔ یہ صورتِ حال چھوٹے بڑے بہت سے سانحات کا پیش خیمہ ثابت ہوئی تھی۔ اس صورتِ حال پر انتہائی کرب میں مبتلا ہو کر شاعر کہتے ہیں کہ:

وہی تعصب کی مستیاں ہیں وہی تخیل کی پستیاں ہیں　　وہی قبیلہ پرستیاں ہیں خجل ہیں جن سے قبائلی تک
تم اپنی ملت کو قوم کہتے ہو اس کا احساس کیوں نہیں ہے　　تمھاری ملت گزر رہی ہے قبائلی دور سے ابھی تک

آج بھی ارضِ پاک کو درپیش قبل تاریخ کے مسائل ہیں
آپ کس قومیت پہ ہیں نازاں قوم کیسی یہاں قبائل ہیں[۲۶۸]

یہ تعصب اور نفرت مجموعی طور پر پورے ملک میں موجود تھی۔ اس زمانے میں مشرقی پاکستان، سندھ اور بلوچستان سب سے زیادہ متاثر ہوئے۔ جی۔ ایم۔ سید نے فروری ۱۹۷۴ء میں ''سندھو دیش کیوں اور کس لیے'' نامی جو کتاب لکھی اس میں پنجابیوں کے ساتھ مہاجر بیورو کریسی کو بھی استیصالی ٹولہ قرار دیا۔ ان کی کتاب میں بھی سندھ میں ہونے والے لسانی فسادات کا اثر بہت گہرا اور نمایاں ہے[۲۶۹]۔ ان سیاسی حالات پر بھی اس زمانے میں رئیس امروہوی نے متعدد قطعات لکھے۔ ملاحظہ کیجیے:

سخت الجھن ہے بلوچستان و سرحد کی رئیس ان مسائل میں ہے اپنی روح تک اٹکی ہوئی
سامنے آنکھوں کے سندھو دیش کا گرد و غبار سر پہ بنگلا دیش کی تلوار ہے لٹکی ہوئی[۲۷۰]

عام خیال یہی ہے کہ کراچی میں مہاجر قومیت کا نعرہ ایم۔ کیو۔ ایم۔ نے بلند کیا، حالاں کہ یہ نعرہ اس زمانے سے لگ رہا تھا جب سے کراچی اور سندھ کے دیگر شہروں میں رہنے والے مہاجروں کے حقوق غصب کیے جا رہے تھے۔ صورتِ حال یہ تھی کہ پاکستان کا ایک بازو علاحدہ ہونے کے باوجود حکمرانوں نے ہوش کے ناخن نہیں لیے تھے۔ کومیٹرو پولیٹن کے قیام کی تحریک کے دوران جس قسم کی حکومتی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا، وہ اب تاریخ کے اوراق میں محفوظ ہے۔ اس رویے میں نصف صدی گزرنے کے بعد بھی کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ جون ۱۹۷۳ء میں لکھے گئے ایک قطعے میں اس صورتِ حال پر رئیس امروہوی کہتے ہیں کہ:

کوئی اپنے حق سے نہ محروم ہو سنا ہے یہ سرکار کا حکم ہے
ملے سارے شہروں کو شہری حقوق کراچی کے بارے میں کیا حکم ہے[۲۷۱]

حقوق کی پامالی کا یہ سلسلہ جب اسی طرح جاری رہا تو ایم۔ کیو۔ ایم۔ کے قیام سے بہت پہلے ہی رئیس امروہوی اور اسی طرح کے دیگر مہاجر دانش وران خیالات کا اظہار کرنے لگے تھے کہ:

ان کو اندازہِ شمار نہیں ہمیں اپنے پہ اعتبار نہیں
بھائیو! اس بھرے گھرانے میں پانچ بھائی ہیں صرف چار نہیں[۲۷۲]

یہ وہی زمانہ تھا جب ۳۱۳ مہاجر سرکاری افسران کو جبری ریٹائر کیا گیا تھا۔ کوٹا سسٹم بھی اسی دور میں نافذ ہوا تھا۔ مہاجروں کے کارخانوں اور بنکوں کو قومیا لیا گیا تھا۔ انھیں دوسرے اور تیسرے درجے کا شہری بننے پر مجبور کیا جا رہا تھا۔ صوبے کے تمام وسائل سندھیوں کے لیے وقف کر دیے گئے تھے۔ اس صورتِ حال کو دیکھتے ہوئے مہاجر سیاست دانوں کی آنکھ کھلی۔ جن مہاجر دانش وروں نے چند ماہ پیش تر ہی کراچی کو سندھ میں ضم کرنے کی درخواست جنرل یحییٰ سے کی تھی، انھی میں سے چند

بزرگ مثلاً بابا ایم۔ ایم۔ بنشیر نے ''کراچی صوبہ تحریک'' کے نام سے تحریک شروع کی۔ ۱۹۸۰ء میں محمود الحق عثمانی نے ''کراچی صوبہ تنظیم'' قائم کی۔ احمد الطاف نے ''تحریک صوبہ کراچی'' اور اسلام صدیقی نے ''کراچی صوبہ پارٹی'' تشکیل دی۔ اسی زمانے میں مرزا جوّاد کو کراچی کے لیے میٹروپالیٹن سٹی کے اختیارات کا مطالبہ کرنے کی پاداش میں ۴ برس قید کی سزا دی گئی۔ یہ وہی زمانہ تھا جب کہ مہاجر شدید ترین احساسِ محرومی کا شکار تھے[273]۔ مہاجر زعما نے جنرل یحییٰ خان کی صوبہ کراچی کے قیام کے بارے میں پیش کش کو ٹھکرا کر سندھ کے ساتھ اپنی قسمت وابستہ کرنے کا شعوری فیصلہ کیا تھا[274]۔ لیکن اس فیصلے کے جو بھیانک نتائج اس قوم کو بھگتنے پڑے ہیں، اس پر خو مہاجر اکابرین بھی شرمندگی کا اظہار کر چکے ہیں۔ حسن عابدی نے تو خیر سندھ کی اس خراب صورتِ حال کا ذمہ دار سندھ کے وڈیروں، جاگیر داروں اور زمین داروں کو قرار دینے کے ساتھ ساتھ ان مہاجر زعما کو بھی موردِ الزام ٹھہرایا ہے جو اپنی چرب زبانی، جاہ پسندی بیوروکریسی کے اشارے پر مقتدر حلقوں کے ساتھ مل کر کبھی بنگالیوں، کبھی پٹھانوں اور کبھی سندھیوں سے اپنی نفرت اور بیزاری کا اظہار کرتے رہے ہیں[275]۔

حسن عابدی کے اس تجزیے کو جانب دار بھی قرار دیں تو بعض کڑوے حقائق سے انکار ممکن نہیں۔ اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ سندھ کے دیہی علاقوں اور شہری آبادی کے مشترکہ احساسِ محرومی کا ازالہ کرنے کے بجائے حکمرانوں نے یک طرفہ رویہ اختیار کرتے ہوئے شہری آبادی کو ان ثمرات سے محروم رکھنے کی جانب دارانہ کوششیں جاری رکھیں۔ کراچی کی آبادی جو سندھ کی آبادی کا تقریباً ۴۰ فی صد ہے، لیکن ملازمتوں کے کوٹے میں ان کا جائز حصہ تک انھیں نہیں دیا جاتا۔ وفاق نے بھی ہمیشہ اس شہر کے استیصال میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ آبادی کا ۸ فی صد ہونے کے باوجود وفاق کی ملازمتوں میں اس شہر کا کوٹا صرف ۲ فی صد مختص ہے۔ سندھ میں آباد ان ۴۸ فی صد مہاجرین جن کا جینا مرنا اور اقتصادی مفاد اسی صوبے سے وابستہ ہے وہ احساسِ محرومی کا شکار نہ ہوں تو پھر کیا ہوں[276]۔ اس پر طرّہ یہ کہ شہر کے تقریباً تمام ہی انتظامی محکموں میں مقامی لوگوں کے بجائے غیر مقامی لوگ قبضہ جمائے بیٹھے تھے۔ پولیس کے محکمے میں مہاجروں کی تعداد نہ ہونے کے برابر تھی۔ زیادہ تر پنجاب اور اندرون سندھ کے لوگوں کو اس محکمے میں ملازمتیں دی جاتی تھیں۔ کمشنر، ڈپٹی کمشنر کے دفاتر میں بھی کچھ یہی صورتِ حال تھی۔ ان غیر مقامی افراد نے ہمیشہ اس شہر سے روزگار تو حاصل کیا لیکن کبھی اس کو اپنا نہ سمجھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مسائل کے حل کے بجائے یہ لوگ مسائل بڑھانے کا سبب بنے۔ نفع اندوزی، رشوت اور ناجائز ذرائع کا استعمال ان دفاتر میں معمول بن چکا تھا۔ اس صورتِ حال پر بھی رئیس امروہوی نے متعدد قطعات لکھے۔ جیسے:

یہ سازشیں یہ تصادم یہ مصلحت کوشی　　قدم قدم پہ سیاسی تضاد ہیں کیا کیا
یہ رشوتیں یہ خیانت یہ نفع اندوزی　　معاشرے میں معاشی فساد ہیں کیا کیا[277]

شہر کے ساتھ برتی جانے والی اس بے رخی اور لاقانونیت نے شہر کا نقشہ بگاڑ کر رکھ دیا تھا اور اب یہ شہر بقول رئیس امروہوی ایک کھنڈر کا نقشہ پیش کرنے لگا تھا۔اس جانب توجہ دلاتے ہوئے انھوں نے کہا کہ:

مسائل کی کثرت ہے اس شہر میں زمانے کی حالت یہ کیا ہوگئی
کراچی تھی پہلے عروس البلاد مگر اب عروس البلا ہوگئی[۲۷۸]

جب لاقانونیت کسی شہر میں بسیرا کرلے تو غیر قانونی سرگرمیوں میں ملوث افراد کو کھلی چھوٹ مل جاتی ہے۔بد قسمتی سے ۱۹۸۰ء کی دہائی میں ہونے والی روس اور افغانستان کی جنگ کے نتیجے میں افغان مہاجرین کا جو ریلا کراچی آیا،اس نے بھی شہر میں ہونے والے جرائم کو خوب پروان چڑھایا۔افغانیوں کی ہجرت کے نتیجے میں سب سے بڑا جو عفریت اس شہر کو ملا وہ مذہبی تشدد پسندی اور فرقہ بندی تھی۔اس کا احساس بھی رئیس امروہوی کو اسی وقت ہوگیا تھا۔اپنے کچھ قطعات میں اس جانب انھوں نے واضح اشارے بھی کیے۔جیسے:

یہ تقاضا ہے ہوش مندی کا فرق کر پستی و بلندی کا
ابتدا ہی سے بعض لوگوں کو روگ ہے انتہا پسندی کا[۲۷۹]

اسی دور میں ہیروئن اور چرس کے کاروبار نے بھی خوب عروج حاصل کیا۔جگہ جگہ شہر میں ہیروئن کے اڈے قائم تھے جہاں سے تھانے والوں کو معقول رقم ماہانہ پہنچ جاتی تھی اور بدلے میں شہریوں کو انتظامی مافیا کے رحم و کرم پر چھوڑ دیتی تھی۔اس صورتِ حال پر بھی رئیس کے ہاں قطعات ملتے ہیں۔جیسے:

ہیروئن کا اور چرس کا کاروبار ہاں! مفادِ عامہ میں تو نہیں
پھر بھی ہر گوشے میں پاکستان کے ہیروئن موجود ہے ہیرو نہیں

اگر تم میں جینے کی ہمت نہیں پیو ہیروئن اور مرتے رہو
کہ فی الحال قومی چرا گاہ میں چرس رہ گیا ہے سو چرتے رہو[۲۸۰]

اسی دور میں شہر میں ہتھوڑا گروپ نامی ایک تنظیم نے بڑی سنسنی پھیلا رکھی تھی۔شہری اس گروہ سے بے حد خوف زدہ رہتے۔اس گروہ نے فٹ پاتھ پر سوئے درجنوں افراد کو ہتھوڑے کے وار سے موت کی نیند سلا دیا تھا۔اس خوف کی فضا کا حال بیان کرتے ہوئے رئیس امروہوی کا کہنا تھا کہ:

بھلا مجھ سے کیوں خوف کھائے کوئی قلم ہاتھ میں ہے ہتھوڑا نہیں[۲۸۱]

رئیس امروہوی نے تشدد کی کبھی حمایت نہیں کی لیکن بد قسمتی سے اس شہر کی ریاست میں تشدد کے عنصر نے بڑی تیزی سے گھر کر لیا تھا۔ وہ نوجوانوں کو اپنے رویے میں تبدیلی لانے کا درس دیتے ہوئے واضح طور پر کہتے ہیں کہ:

سکوت و سادگی سے غور کر احوالِ حاضر پر   کبھی فکر و تردد سے مسائل حل نہیں ہوتے

تشدد بھی یقیناً فطرتِ انساں میں شامل ہے   مگر پیارے تشدد سے مسائل حل نہیں ہوتے[۲۸۲]

مگر رئیس امروہوی اور اس قبیل کے دانش وروں کی باتوں کا کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہ نکلا۔ شہر آہستہ آہستہ آگ اور خون کی لپیٹ میں گھرتا چلا گیا۔ پے در پے ہونے والے واقعات نے اس تشدد کی فضا کو مزید ہوا دی۔ ۱۵ اپریل کو اک ٹریفک حادثے میں ہلاک ہونے والی سرسید گورنمنٹ گرلز کالج کی طالبہ بشریٰ زیدی کا سانحہ ہو[۲۸۳] یا بعد میں ہونے والے ردعمل، ان تمام واقعات کا بیانیہ رئیس کے قطعات میں موجود ہے۔ شہر کی اس صورتِ حال کا نوحہ لکھتے ہوئے رئیس کا کہنا تھا کہ:

افسوس کہ ویران ہے یہ خلد ادا شہر   آلام کدہ شہر ہے آفات کدہ شہر

ہر شخص پہ اک وحشتِ بے نام ہے طاری   صد حیف کہ یہ شہر ہے آسیب زدہ شہر[۲۸۴]

سہراب گوٹھ میں ہونے والے فوجی آپریشن کے بعد ہیروئن اور کلاشنکوف مافیا نے جس طرح اس شہر کو یرغمال بنایا اور مقامی لوگوں کو ظلم و تشدد کا نشانہ بنایا، اس شہر کی تاریخ میں لاقانونیت کی ایسی مثالیں کم ہی ملیں گی۔ کراچی کی ایک غریب بستی قصبہ اور علی گڑھ کالونی میں مہاجر نوجوانوں کے خون سے ہولی کھیلی گئی۔ اس صورتِ حال پر پورے شہر کی فضا نہایت افسردہ تھی۔ ایک قیامت تھی جو اس شہر پر گزری۔ ان قیامت خیز مناظر کو بھی رئیس نے اپنے قطعات میں قید کرنے کی کوشش کی ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

وہ شہر جس میں کبھی تھا عروجِ فکر و نظر   وہاں رواجِ جنوں کے سوا کچھ اور نہیں

میرے شہر میں تمھیں ہے تلاش غنچہ و گلُ   یہاں تو چشمہِ خوں کے سوا کچھ اور نہیں

یقیناً اشرف المخلوق ہے انسان دنیا میں   مگر انسان کی پستی بھی یارو کم نہیں ہوتی

چرس اور ہیروئن کے زہر کی تم کو شکایت ہے   کلاشنکوف کی مستی بھی یارو کم نہیں ہوتی[۲۸۵]

ایسا نہیں کہ مقامی آبادی نے جو کچھ ردعمل دکھایا اس پر رئیس امروہوی خاموش تماشائی بنے رہے ہوں۔ اس زمانے میں نہتے عوام اس قتل و غارت گری کے خلاف متحد ہونا شروع ہو چکے تھے۔ ۱۹۸۰ء کی دہائی اس لحاظ سے بھی اہم ہے کہ سیاسی سرگرمیوں کے نتیجے میں یہاں نئے نئے سیاسی اتحاد اور نئی نئی سیاسی جماعتیں قائم ہو رہی تھیں مگر اس عوامی اتحاد میں بھی کہیں

کہیں تشدد کے آثار نظر آنا شروع ہو گئے تھے۔ مثلاً عوام کی طرف سے جلاؤ گھیراؤ اور املاک کو نقصان پہچانے کا جو رویہ اس دور میں پیدا ہوا اس پر رئیس نے بر ملا کہا کہ:

تابکے خود پہ قہر ڈھاؤ گے　　　　خود کشی سے نہ باز آؤ گے
دوستو! بس کرو خدا کے لیے　　　　کب تک آخر بسیں جلاؤ گے[۲۸۶]

مجموعی طور پر یہ قطعات ایک ایسے شاعر کی فریاد ہے جو ہر دم اور ہر پل اپنے ملک کی سیاسی، سماجی اور معاشی فضا سے نہ صرف مایوس ہے بلکہ ہر اس مسئلے پر طنزیہ انداز میں اجتماعی اور انفرادی شعور کو اجاگر کرنے کی کوشش بھی کر رہا ہے۔ ایسے سیاسی و سماجی مسائل جنھوں نے ہمارے معاشرے کو اندر سے کھوکھلا کر کے رکھ دیا ہے۔ زندگی کے مختلف شعبوں سے متعلق افراد جو ذاتی مفادات کی خاطر قومی نقصانات کا موجب بنتے ہیں، رئیس کے نزدیک انتہائی قابلِ مذمت ہیں[۲۸۷]۔ ان کے قطعات کو اگر پاکستان کے تاریخی ارتقا کی روشنی میں دیکھا جائے تو ان کا یہ دعویٰ کہ ''آئینۂ امروز ہیں مرے قطعات'' بجا طور پر درست اور مناسب نظر آتا ہے کیوں کہ یہ قطعات وقتاً فوقتاً رونما ہونے والے مختلف اور متنوع معاملات و مسائل کا دفتر ہیں۔ ان قطعات میں بڑے حقیقت افروز موضوعات ہیں۔ اور ان قطعات میں ادب اور زندگی اور تاریخ کے مابین ایک قوس سی کھنچی دکھائی دیتی ہے[۲۸۸]۔ خصوصاً شہر قائد کے حوالے سے یہ کہنا نہایت مناسب ہو گا کہ یہ قطعات کراچی کے حوالے سے ''شہر آشوب'' کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جن میں مختلف النوع کے مسائل اور حادثات و سانحات کو یکجا کر کے اس شہر سے اپنے گہرے تعلق کا اظہار کیا گیا ہے۔ جو کچھ مظالم اور استیصال کا رویہ اس شہر کے ساتھ روا رکھا گیا اس پر کھل کر احتجاج بھی کیا گیا اور اس کی مذمت کچھ اس انداز سے کی گئی کہ قطعات پڑھنے والے کو وہ چشم کشا حقائق کچھ سوچنے پر مجبور کر دیں۔ شہر قائد کی بابت اسی قطعے کو دیکھیے:

گزر گیا ہے جو قائد کے شہر پر طوفان　　　　وہ دفترِ ستم و قصہ و جفا پڑھ لو
مزارِ قائداعظم کے فاتحہ خوانو!　　　　دیارِ قائداعظم پہ فاتحہ پڑھ لو[۲۸۹]

کراچی سے تعلق رکھنے والے ایک اور اہم شاعر دلاور فگار بھی اپنے معاشرے میں رونما ہونے والے مختلف نوعیت کے واقعات، حادثات اور سانحات کو محسوس کرنے والے حساس شاعر کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ انھوں نے معاشرے میں پھیلے ہوئے ان مسائل کو اجاگر کرنے کے لیے طنز و مزاح کا سہارا لیا اور اپنے ارد گرد پرورش پاتے ان گنت شہری مسائل اور معاشرے کے تلخ حقائق کو کھل کر اور دیدہ دلیری سے ہمارے سامنے پیش کیا۔ زندگی کے شب و روز اس شہر میں گزارنے کی وجہ سے وہ اس شہر کے سیاسی بحران، معاشی حالات، انتظامی امور کی خستہ حالی، ریاستی اداروں کی نااہلی، شہریوں کے ردِ عمل اور اس طرح کی دیگر صورتِ حال پر ان کا قلم کیوں نہ حرکت کرتا[۲۹۰]۔ انھوں نے ظرافت کے حوالے سے کبھی ذاتی طنز نہیں کیا لیکن سماجی تنقید میں وہ خوب محنت کرتے۔ ان کی تنقید ایک طرح سے سیاسی اور معاشی تاریخ کا حصہ ہے[۲۹۱]۔ شہر کے چھوٹے بڑے ہر

طرح کے مسائل پر اپنی شاعری میں اظہار خیال کیا۔ پاکستان کی سیاست میں لیڈر شپ کے فقدان اور ان کی باہمی چپقلش نے جو صورتِ حال پیش کی اس کا حال بیان کرتے ہوئے کہا کہ:

خود نہیں پٹتی مگر اوروں کو پٹواتی ہے یہ — جب کہیں جلسہ ہوا لگوا دیے دو چار ہاتھ
لیڈری جوشِ جنوں میں یوں نکلتی ہے کبھی — جیسے عاشق کا جنازہ جیسے مجنوں کی برات[۲۹۲]

معاشرے میں تیزی سے پھیلتے رشوت کے ناسور کو جس نے انتظامی سطح پر سرکاری افسروں میں ایک طرح کی بے عملی پیدا کر رکھی تھی، اپنی مزاح نگاری کے ذریعے بڑے دل نشیں پیرائے میں کہا کہ:

حاکم رشوت ستاں فکر گرفتاری نہ کر — کر رہائی کی کوئی آسان صورت چھوٹ جا
میں بتاؤں تجھ کو تدبیرِ رہائی مجھ سے پوچھ — لے کے رشوت پھنس گیا ہے، دے کے رشوت چھوٹ جا[۲۹۳]

شہر میں وقتاً فوقتاً جس قسم کے مسائل نے بھی گھر کیا دلاور فگار نے ان موضوعات کو اپنی شاعری میں ضرور جگہ دی۔ انتظامیہ کے غیر ذمہ دارانہ رویہ، شہر میں بڑھتی ہوئی آبادی کا دباؤ اور وسائل کی کمی، مہنگائی، بیروزگاری، اشیائے خورد و نوش کی قلت، پانی کی قلت اور اس طرح کے تمام مسائل پر دلاور فگار کے ہاں اشعار ملتے ہیں۔ کبھی وہ پانی کی کمی کا رونا روتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

پانی کی کمی ہے شہر میں — کم ہے پانی جھیل میں اور نہر میں
پانی آئے یا نہ آئے ٹینک میں — بل ادا کرنا پڑے گا بینک میں[۲۹۴]

نکاسی آب کے نظام کی تباہی کا منظر دیکھیے:

ڈھل گیا دیدۂ اربابِ نظر کا پانی — ہوگیا خشک مرے دیدۂ تر کا پانی
ابرِ رحمت سے کہو اب نہ برس اب کے برس — اب تو سڑکوں پہ ابلتا ہے گٹر کا پانی[۲۹۵]

شہر میں پھیلی گندگی، غلاظت اور اس کے نتیجے میں پھیلنے والی بیماریوں کا حال بیان کرتے ہوئے وہ شہری حکومت کو سخت تنقید کا نشانہ بناتے ہیں۔ جگہ جگہ پھیلی گندگی کا نقشہ کھینچتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

ایک خبر ہے شہر میں ہیضے کا خطرہ بڑھ گیا — یہ جو دریا ہے وبا کا قطرہ قطرہ بڑھ گیا
مکھیوں کی شہر پر یلغار ہے بارش کے بعد — پھنسیاں بھی جسم پر نکلیں گی اب خارش کے بعد[۲۹۶]

شہر میں پھیلی لاقانونیت، پولیس اور شہری انتظامیہ کی رشوت ستانی، اس شہر کے بسنے والوں کے بنیادی مسائل سے بے اعتنائی اور اس کے اثرات پر ان کی بہت سی نظمیں اور قطعات مشہور ہوئے۔ ۸۰ء کی دہائی میں تیزی سے پھیلتی منشیات کی لعنت کا نقشہ کھینچتے ہوئے انھوں نے قانون کی کمزور گرفت کی قلعی بھی کھولنے کی کوشش کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ:

کچھ اس طرح کوئی صاحب تھے بس میں آئے ہوئے چرس چھپائے ہوئے ہیروئن چڑھائے ہوئے[۲۹۷]

اسی طرح مختلف انتظامی اداروں کی بے حسی کے باعث اشیائے خورد و نوش میں ملاوٹ، چوری، ڈاکے، رہزنی اور دیگر ایسے بے شمار مسائل کو اجاگر کر کے اس شہر کی بے بسی کا حال بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ کبھی وہ غیر قانونی طور پر قائم تجاوزات کا نقشہ کھینچتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

تجاوزات کا عالم یہ ہے کراچی میں کہ راہ گیروں کو اک روڈ تک نہیں ملتی
یہاں سڑک پر ہر اک چیز ملتی ہے لیکن سڑک کو ڈھونڈ رہا ہوں، سڑک نہیں ملتی[۲۹۸]

دلاور فگار نے کراچی شہر کے ان گنت مسائل کو اپنی بہت سی نظموں اور قطعات میں بار بار بیان کیا ہے۔ طوالت سے بچنے کے لیے یہاں مثالیں کم پیش کی گئی ہیں لیکن اس سارے بیانیے میں جو ایک بات اہم دکھائی دیتی ہے وہ ان کی غیر جانب داری ہے۔ وہ جہاں بہت سے مسائل کا ذمے دار حکومت اور انتظامیہ کو قرار دیتے ہیں، وہیں وہ بعض معاملات میں عوام کو بھی آئینہ دکھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں بہت سے مسائل عوام کے خود اپنے پیدا کردہ مسائل ہیں۔ شاعر کا کے۔ ڈی۔ اے۔ سے شکوہ علامہ اقبال کے ''شکوہ'' کی پیروڈی ہے۔ اس نظم میں انھوں نے پانی کی قلت، وسائل کی کم یابی، ٹوٹی پھوٹی سڑکوں اور دیگر شہری مسائل کو اجاگر کرتے ہوئے جہاں ارباب اقتدار کو سخت تنقید کا نشانہ بنایا ہے وہیں عوام کے تعاون، ان کی ذمے داریوں اور طرزِ عمل کو بھی اس مسائل کی وجہ قرار دیا ہے۔ وہ عوام کو اپنا فرض ادا کرنے کا درس دیتے ہوئے اپنی ایک اور جواب ''جواب شکوہ'' میں کہتے ہیں کہ:

ہم سے تم لوگ جو پانی کا گلہ کرتے ہو یہ بھی سوچا کہ کبھی ٹیکس ادا کرتے ہو
تم کو اس بات کا افسوس نہیں ہے احساس ہے تمھارے ہی تعاون پہ ترقی کی اساس
شہر کاروں کے بھی کچھ خواب ہوا کرتے ہیں شہریت کے بھی کچھ آداب ہوا کرتے ہیں[۲۹۹]

ایک اور قطعے میں وہ ملاوٹ کے خلاف عوامی تعاون پر زور دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

گو حکومت کر رہی ہے اس مرض کی روک تھام پھر بھی اک تنہا حکومت سے نہیں ہوگا یہ کام
جب تک اس تحریک میں شامل نہیں ہوں گے عوام مٹ نہیں سکتا ملاوٹ اور مہنگائی کا نام[۳۰۰]

بہر حال وہ اس شہر کو ایک بحران زدہ شہر سمجھتے تھے اور یہاں بسنے والوں کو داد و تحسین کی نظر سے دیکھتے ہوئے برملا اس بات کا اظہار کرتے تھے کہ:

یہ کراچی ہے میاں بحران رہتے ہیں یہاں ملٹی پرپز قسم کے انسان رہتے ہیں یہاں[۳۰۱]

کراچی اور اس شہر کے سیاسی و سماجی منظر کو بیان کرنے والے ایک اور اہم شاعر سرشار صدیقی بھی اس حوالے سے خاصی اہمیت کے حامل ہیں۔ ''ہجرت پر مامور تھے ہم'' کی تمام تر شاعری اس نظریاتی وطن کو اختیار اور قبول کرنے کے بعد کی داستان ہے۔ خود سرشار صدیقی کا اس مجموعے کی بابت یہ بیان بڑی اہمیت کا حامل ہے کہ:

یہ نہ ہجرت پر ندامت کا نوحہ ہے نہ برادرانِ یوسف کے سلوک ناروا کا شکوہ، بلکہ ٹھوس حقائق کی صورت میں ہم پر گزرنے اور ساری دنیا کو نظر آنے والے تلخ حقائق اور ان کے انسانی رد عمل کا محضر نامہ ہے[۳۰۲]۔

خود سرشار کو اس نئی مملکت میں ہجرت کے بعد کس قسم کے متعصبانہ رویے کا سامنا کرنا پڑا، اس کا مختصر جائزہ انھوں نے اپنے مذکورہ مضمون میں لیا ہے۔ مہاجر نوجوانوں پر تعلیم اور رزق کے دروازوں کی بندش، کراچی اور حیدر آباد کی بستیوں کو آگ لگانے اور پھر پاک دامنی کے دعوے، نہتے لوگوں پر گولیوں کی یلغار، غداری کے الزامات اور اس طرح کے متعدد ناروا رویے کے سائے میں جس قسم کی شاعری انھوں نے لکھی وہ شعلۂ جوالہ کی صورت میں سامنے آئی۔ انھوں نے اس ہجرت کی بابت واضح موقف اختیار کرتے ہوئے کہا کہ:

آزادی کے نشّے میں سرشار کچھ ایسے چور تھے ہم وہ آنکھیں بھی چھوڑ آئے تھے جن آنکھوں کا نور تھے ہم
ترکِ وطن تو سنت بھی تھی، اور ہماری قسمت بھی ہجرت پر مجبور نہیں تھے، ہجرت پر معمور تھے ہم[۳۰۳]

بے زمینی کا دکھ سرشار کی شاعری میں بہت نمایاں ہے۔ اسی بے زمینی کا احساس ظاہر سی بات ہے۔ مقامی لوگوں کے رویے کی وجہ سے مہاجرین میں بہت زیادہ احساس پیدا ہو گیا تھا۔ خصوصاً جب حکمرانوں کی جانب سے ہی ان مہاجروں کو بحرِ عرب میں غرق کرنے کی باتیں کی جانے لگیں تو شاعر کا یہ کہنا کچھ غلط معلوم نہیں ہوتا کہ:

عجب سفر ہے/ سفر تو جاری ہے/ لیکن اہلِ وطن/ زمین زاد/ دائرے تنگ کر رہے ہیں /عرب کے ہجرت نصیب لوگوں کو/ پھر سے بحرِ عرب کا راستہ دکھا رہے ہیں/ عرب کے لوگو!/ عجم کے لوگو!!/ زمین کم پڑ گئی ہے ہم کو[۳۰۴]۔

اپنی ایک اور نظم ''پہچان'' میں بھی انھوں نے استیصالی ٹولے کے اس رویے کی نشان دہی کرتے ہوئے کہا کہ:

بھائیو تم کو یاد تو ہوگا اب سے بیس برس پہلے بھی
تنگ دلوں کے نمائندے نے بحرِ عرب کی دھمکی دی تھی

وہ دن ہے اور آج کا دن ہے ہم پر چین حرام ہوا ہے[۳۰۵]

مسلسل ہونے والے استیصال اور ظلم کے نتیجے میں کراچی کے نوجوانوں کے رویے میں جو واضح تبدیلی رونما ہو رہی تھی، شاعر کو اس کا پوری طرح ادراک تھا۔ انھوں نے اس بدلتے ہوئے تیور کو محسوس کرتے ہوئے اپنی شاعری میں اس کے واضح اشارے بھی دیے۔ مثلاً ۱۹۸۶ء میں لکھی گئی ایک نظم ''آنکھوں اور زبانوں کی فصلیں'' کے آخری حصے میں واشگاف الفاظ میں لکھا کہ:

یہ آنکھیں، یہ زبانیں/ اپنے تیور، اپنے لہجے سے/ بہت واضح تصور دے رہی ہیں/ کہ
اب حق مانگنے کے دن نہیں ہیں/ کہ اب حق چھیننے کی بات ہوگی[۳۰۶]۔

یہ وہی زمانہ تھا جب کراچی، حیدر آباد اور سندھ کے دیگر چھوٹے بڑے شہروں پر مہاجر قومی موومنٹ کے نام سے ایک نئی تحریک جنم لے چکی تھی۔ اس تحریک نے مہاجر نوجوانوں کو نہ صرف متحد کیا ان کے سوچنے کے انداز کو یکسر بدل کر رکھ دیا۔ یہ تبدیلی کسی ایک واقعے، حادثے یا سانحے کہ وجہ سے نہیں آئی تھی بلکہ نصف صدی سے جاری استیصال نے ان کے اندر بہت سے منفی خیالات کو پروان چڑھانے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ اس استیصال کی جھلک دیکھنی ہو تو سرشار کی نظم ''تیسری نسل'' کا جائزہ ہی کافی ہوگا۔ اس نظم میں ایک طرف تو شاعر یہ شکوہ کرتے نظر آتے ہیں کہ:

ترکِ وطن تو میرا گناہ تھا/ پھر میری خوش فہمی کی پاداش میں/ میرے ان بچوں پر/ ارضِ
وطن کیوں تنگ ہوئی/ جنھوں نے اس کی گود میں آنکھیں کھولیں/ اس کی عظمت کا
اقرار کیا/ جنھوں نے اس بنجر، بے مصرف دھرتی کو/ گل زار کیا/ جنھوں نے اس بے
فیض فضا سے پیار کیا/ اور اب وہ بھی/ آدھی عمر اور پورے مستقبل کو گنوا کر/ سوچ رہے
ہیں/ ان سے ان کے باپ کی جائے پیدائش کے پوچھنے والے/ اب بھی ان کے بچوں
کے رستے میں اڑے ہیں/ وہ جو عقل میں پستہ ہیں/ اور قد میں بڑے ہیں[۳۰۷]۔

نظم کے آخر میں وہ اس شہر کی بدلتی سیاسی فضا اور ایم۔ کیو۔ ایم۔ کی نوجوان قیادت کے جوش اور ولولے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اب اس استیصال کے خاتمے کی نوید سنا رہے ہیں۔ ملاحظہ کیجیے:

کب تک وہ محروم رہیں گے/ جن میں وقت کے علم و ہنر کا جوہر ہے/ یہی وہ سوچ ہے
جس کا پرچم لے کر/ میری تیسری نسل اٹھی ہے/ اور اپنے اجداد کی راہوں پر نکلی ہے
/ وہ جو نکہتِ گل بھی ہے اور موجِ حیا بھی/ صرصر بھی طوفانِ بلا بھی/ ہمت ہے تو کوئی
بڑھے/ اور اس سیلاب کو روکے/ کب تک یہ کھائیں گے دھوکے[۳۰۸]۔

الزام در الزام کی سیاست نے پورے صوبہ سندھ کی سیاست کو بہت زہر آلود کر دیا تھا۔ جس زمانے میں ایم۔ کیو۔ ایم۔ کا وجود بھی نہیں تھا، اس زمانے میں بھی غداری جیسے سنگین الزامات کراچی اور دیگر شہری آبادی کا مقدر تھے۔ اس صورتِ حال پر اپنی نظم ''چارج شیٹ'' میں شاعر کا کہنا ہے کہ:

مجھ پر فردِ جرم ہے عائد/میں جس ڈالی پر بیٹھا ہوں/اس ڈالی کو کاٹ رہا ہوں/لیکن شاید
مجھ پر/یہ الزام لگانے والوں کو/معلوم نہیں ہے/وہ ڈالی جس پیڑ کی ہے/وہ پیڑ تو میرے
اپنے باغ کے مالی نے/اور میرے اپنے بزرگوں نے ہی/مل کے کب سے لگایا تھا[309]۔

مگر الزام لگانے والے اپنی سازشی چالوں میں مصروف نظر آتے۔ وہ اس شہر کے باسیوں پر شب خون مارنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیتے۔ اس جانب اشارہ کرتے ہوئے ان کا کہنا تھا کہ:

دشتِ انفاس میں ہے/شام غریباں کا سماں ... اور ہر چہرے کی بجھتی ہوئی لو/مرگ
انبوہ میں ہے نوحہ کناں/دامنِ وقت میں/جگنو، نہ ستارا کوئی/افق ذہن پہ شعلہ نہ شرارا
کوئی/اور اسی وادیِ ظلمات کی پنہائی میں/بے ضمیروں کا گروہ/فتح مندی کا عَلم لہراتا/بے
گناہوں کا دبے پاؤں تعاقب کرتا/نکل آتا ہے پر اسرار کمین گاہوں سے/اور پھر آہنِ
سفاک کی اک چنگاری/سنسناتی ہوئی سینے میں اتر جاتی ہے/اور بارود کی بو/گرم اور تازہ
لہو میں بس کر/شاہ راہوں پہ بکھر جاتی ہے[310]۔

سرشار کی غزلوں میں بھی شہر کی ناگفتہ بہ صورت حال کا واقعاتی منظر نامہ موجود ہے۔ بظاہر پر ہجوم اور روشنی کے اس شہر میں اندر سے جو سناٹا اور تاریکی پھیلی ہوئی ہے اس کا احساس شاعر کے حساس دل نے بہت زیادہ محسوس کیا اور پھر اس کا اظہار بھی کیا۔ اشعار ملاحظہ کیجیے:

نہ بام و در ہیں سلامت، نہ سائبان، نہ ہم ۔۔۔ ہمارے شہر میں ہے سنگ و خشت کا موسم
وہ فصل بوئی وہ نفرت کی آب یاری ہوئی ۔۔۔ کہ اُگ رہے ہیں زمینوں سے نعرہِ پرچم
مرے خدا مرے گھر کی مرے دیار کی خیر ۔۔۔ ہجوم لے کے بڑھا امن و آشتی کا علم
وہ زندہ باد کے نعروں نے زندگی بخشی ۔۔۔ کہ سارے شہر پہ چھایا ہے موت کا عالم[311]

سندھ میں جمہوریت پسندی کا نعرہ بلند کرنے والی بڑی سیاسی جماعت کے لیے انصاف کا تقاضا تو یہ تھا کہ مہاجروں کے ان مسائل کو سنا جاتا اور ان کی داد رسی کی جاتی۔ مہاجروں نے اپنے آپ کو سندھ کا حصہ تصور کر کے سندھی کہلوانا پسند کیا لیکن سندھی قوم پرستوں نے ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت انھیں پناہ گیر اور مہاجر کے القاب دیے۔ اکثر صوبہ سندھ کے استیصال کی

ذمہ داری مہاجروں پر عائد کی جاتی ہے جب کہ حقیقت یہ ہے کہ مہاجروں کا سب سے بڑا استحصال پیپلز پارٹی کے پہلے دور میں کوٹا سسٹم نافذ کر کے کیا گیا۔ سندھ کے رہنماؤں نے ہمیشہ سندھ کی شہری آبادیوں کو ترقیاتی حوالے سے بری طرح نظر انداز کیا۔ صرف پیپلز پارٹی پر ہی بس نہیں بلکہ محمد خان جونیجو کے دور حکومت میں بھی کراچی اور حیدر آباد کے بلدیاتی اداروں کو گرانٹ سے محروم رکھا گیا۔ سندھ کی درس گاہوں مثلاً حیدر آباد، ٹنڈو جام، نواب شاہ، خیر پور اور سکھر وغیرہ میں مہاجر طلبہ کے ساتھ جو سلوک روا رکھا گیا وہ ہر لحاظ سے علم دشمن بلکہ امن دشمن بھی تھا۔ ایک گہری سازش کے تحت سندھ میں جہاں کہیں بھی مہاجر آبادی اقلیت میں تھی، اسے بے دخل کر کے شہروں کی طرف دھکیلنے کا عمل شروع ہوا۔ ان مہاجروں کو کبھی بحیرہ عرب کبھی ہندوستان اور کبھی کیمپوں میں محصور کر دینے کی دھمکیاں بھی دی جانے لگیں۔ اردو بولنے والے نوجوانوں کو ۸۰ فی صد سے زائد نمبر لینے کے باوجود میڈیکل اور فنی تعلیم میں داخلوں سے محروم رکھا جاتا۔ مہاجروں کی سیاست اور ان کے طرزِ فکر کو اگر ۸۰ء کی دہائی سے پہلے کے سیاسی تناظر میں دیکھا جائے تو یہ بات وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ انھوں نے قیامِ پاکستان کے بعد بھی ہمیشہ دو قومی نظریے کو اپنے ذہن سے محو نہ ہونے دیا جب کہ پاکستان کی پانچ قومیتوں نے دو قومی نظریے کو پانچ قومی نظریہ تسلیم کرنے پر اصرار شروع کر دیا تھا۔ اس کی مثال پانچ کروڑ بنگالیوں کے خلاف محض پانچ لاکھ مہاجر (بہاریوں) کی وہ للکار ہے جس کا نتیجہ بالآخر انھیں بنگلا دیش کے مہاجر کیمپوں کی محصوری کی صورت میں بھگتنا پڑا۔ اندرون سندھ کے طلبہ کی سیاست میں سندھی قوم پرست طلبہ تنظیموں نے بہت زیادہ جارحانہ اور بے لچک رویہ اختیار کرتے ہوئے ۱۹۶۶ء۔۱۹۶۷ء میں ہی قوم پرستی کی آڑ میں اردو زبان، پان کھانے والوں کی ثقافت اور مہاجروں کی طرز فکر پر رکیک حملے شروع کر دیے تھے۔ طلبہ کا دوسرا دھڑا مہاجر طلبہ پر مشتمل تھا جس کا گڑھ سٹی آرٹس کالج تھا۔ یہ کوئی مضبوط تنظیم نہیں تھی بلکہ مختلف گروہوں اور برادریوں کی بنیاد پر قائم کی گئی تھی۔ سندھ کی سیاست میں طلبہ کا تیسرا دھڑا ترقی پسند بائیں بازو کے طلبہ کا تھا۔ جس نے اس زمانے میں کافی مثبت کردار ادا کیا۔ طلبہ کا یہ دھڑا سندھی شاؤنزم اور مہاجروں کی رجعت پسندی، دونوں کے انتہا پسندانہ رویے کی مذمت کرتا تھا۔ این۔ ایس۔ ایف۔ نامی اس دھڑے کا موقف تھا کہ سندھ کے مظلوم طبقات کو خواہ وہ کوئی بھی زبان بولتے ہوں اس ملک کے دیگر مظلوم طبقات کے ساتھ مل جل کر جدوجہد کرنی چاہیے۔ لیکن بدقسمتی سے اس دھڑے کو سندھ میں کوئی خاص کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ سندھ میں طلبہ کی سیاست میں تشدد کا عنصر شامل کرنے کا سہرا جیے سندھ نوجوان محاذ کے سر بندھتا ہے، لیکن یہ بھی ایک تلخ حقیقت ہے کہ کراچی اور ملک کے دیگر شہروں میں طلبہ کو تشدد کی سیاست میں دھکیلنے کی ذمے داری بائیں بازو کی طلبہ تنظیم اسلامی جمعیت طلبہ پر عائد ہوتی ہے[۱۳]۔ جی۔ ایم۔ سید کے پاکستان مخالف خیالات نے ان مہاجر نوجوانوں کو شعوری طور پر قوم پرست تحریکوں سے دور رکھا۔ اس مخالفانہ رویے کے اظہار موصوف اپنی متعدد تحریروں اور انٹرویوز میں کرتے رہے ہیں۔ قائد

اعظم محمد علی جناح کو وہ غدار سندھ اور خان لیاقت علی خان کو پنجابی اور مہاجروں کے قائد ملت اور انھیں فرقہ وارانہ فسادات کا ذمے دار قرار دیا[۱۳]۔

اس سوچ کے حامل سیاست دانوں کے ساتھ وہ مہاجر جو اپنا سب کچھ لٹا کر اس نئی مملکت میں بسنے آئے تھے، کس طرح مفاہمانہ رویہ اختیار کرتے۔ ایسی صورت میں حسن عابدی وغیرہ جیسے دانش وروں کی منطق سمجھ سے باہر ہے جس کے مطابق ان مہاجروں نے سیاسی بے بصیرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے سندھیوں کے ساتھ بھائی چارے کا رشتہ مضبوط کرنے کی کوشش نہیں کی[۱۴]۔ اس کے برعکس پیر صاحب پگاڑہ نے برملا اس بات کا اظہار کیا کہ مہاجروں کے رہنما الطاف حسین نے دراصل ملاؤں اور مولویوں کو واپس مدرسوں میں پہنچا دیا اور لفظ مہاجر کو نئی معنویت دے کر شہر سے فرقہ واریت کا خاتمہ کر دیا[۱۵]۔ الطاف حسین کے ان اقدامات کی تائید تو خود جی۔ ایم۔ سید بھی کرتے ہیں[۱۶]۔ مذکورہ صورتِ حال کا اندازہ ایک مہاجر دانش ور اختر رضوی کی اس تحریر سے بھی لگایا جاسکتا ہے جس میں انھوں نے لکھا کہ:

> مہاجر روایتی طور پر اسلام، پاکستان اور مسلم قومیت کے نعروں کا دیوانہ رہا ہے... اہل سیاست و اقتدار نے اس کی سادگی اور کمزوری کو خوب اپنے مفاد میں استعمال کیا[۱۷]۔

اسی لیے سندھ کے عوام کو وفاق پاکستان کے سیاست دانوں سے جو بھی شکایات رہی ہیں ان میں بیشتر جائز اور درست معلوم ہوتی ہیں۔ لیکن ان تمام صورت کا ذمے دار مہاجروں کو قرار دینا اور انھیں ہدف ملامت و منافرت بنا کر شدید جارحانہ اور عصبیتی رویے اختیار کرنا کہ مہاجروں کو سندھ کے دیہی علاقوں سے ترک سکونت اختیار کر کے شہروں کا رخ کرنا پڑ جائے، قطعی غیر اصولی، غیر جمہوری اور غیر منطقی رویہ تھا۔ اس کے علاوہ اب اس بات میں بھی شک وشبہے کی گنجائش نہیں رہی کہ پاکستان کے مقتدر حلقے جن میں سول اور فوجی اسٹیبلشمنٹ، محلاتی سازش کے پروردہ سیاست دان، خود غرض اور موقع پرست طالع آزما بھی شامل ہیں، کراچی اور سندھ کو درپیش مسائل کے انتظامی اور سیاسی حل تلاش کرنے کے بجائے انھیں دیدہ و دانستہ لسانی، گروہی اور نسلی فسادات میں تبدیل کرنے میں کامیاب ہو چکے ہیں۔ اس طرح سندھ کی پر امن فضا کو دہشت گردی اور قتل غارت گری کے ہلاکت خیز دلدل میں دھکیل چکے ہیں تاکہ پاکستان کی سیاسی بساط پر اپنی مرضی کی شطرنج کھیلی جاسکے[۱۸]۔ کراچی کی وہ سیاسی جماعتیں جن کا ایم۔ کیو۔ ایم۔ کے قیام سے قبل اس شہر میں گہرا اثر و رسوخ تھا، وہ اور ان کے نمائندے بھی اس بات کا برملا اعتراف کرنے پر مجبور نظر آتے ہیں کہ ''یہ شہر اپنی حیثیت سے بہت کم توجہ پاتا ہے۔ ملک بھر کی اور خصوصاً سیاسی بساط کے بڑے کھلاڑیوں کی توجہ اسے اُس وقت ملتی ہے جب درجنوں کے حساب سے لاشیں گرنے لگے۔ لاشوں کی سینچری کبھی ہفتے میں پوری ہوتی ہے اور کبھی اس سے کم دنوں میں''[۱۹]۔ ایسی صورت میں قومی شناخت اور تشخص کے مسئلے نے مہاجر نوجوانوں کو شدید قسم کے احساسِ محرومی اور جھنجلاہٹ سے دوچار کر دیا۔ ایوب خان، یحییٰ خان، ذوالفقار علی بھٹو اور ضیاء الحق کے عہد میں سول اور فوجی بیوروکریسی کی تطہیر کے نام پر مہاجر افسران کو چن چن کر نکالا گیا جس کے نتیجے میں مہاجروں میں شدید احساس ہزیمت و بے

بسی پیدا ہوئی۔ تعلیمی اداروں میں ڈومیسائل کا حصول تک ان مہاجر نوجوانوں کے لیے مشکل بنا دیا گیا۔ اس وقت پاکستان کی سیاست میں کوئی ایسی جماعت تھی ہی نہیں جو ان مہاجروں کے لیے آواز اٹھاتی۔ شہر کے وسائل سکڑتے جا رہے تھے اور مسائل میں دن دگنا رات چوگنا اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ اس شہر میں مختلف نسلی گروہ اور مفادات ایک دوسرے کو شک و شبہے کی نظر سے دیکھتے تھے۔ پنجابی اور پٹھان کے فیکٹر کے علاوہ افغان مہاجرین کی آمد نے اس شہر کے رنگ و آہن کو ہی بدل کر رکھ دیا تھا۔ آہستہ آہستہ شہر کی فضا گرم سے گرم تر ہوتی چلی گئی۔ مختلف تہذیبی اور لسانی اکائیوں میں کش مکش کا آغاز ہوا[۳۲۰]۔

اسی زمانے میں متحدہ قومی موومنٹ کا قیام مہاجروں کے حقوق کے تحفظ کے نام پر عمل میں آیا۔ پاکستان کی سیاست میں پہلی مرتبہ ایم۔ کیو۔ ایم۔ جیسی نوزائیدہ تنظیم نے دیکھتے ہی دیکھتے سندھ کی شہری آبادی کے ووٹ بینک پر بڑے موثر انداز سے قابو پایا اور صوبے کی مہاجر سیاست کو دائیں بازو کی سیاست اور مذہبی فرقہ وارانہ تنگ نظری سے نجات دلانے میں انتہائی فعال اور اہم کردار ادا کیا۔ اسی جماعت نے پہلی بار سیاست میں متوسط طبقے کی لیڈر شپ متعارف کروائی[۳۲۱]۔ دوسری جانب سندھ کے دیہی علاقوں میں جیے سندھ تحریک کے خاصے اثرات رہے۔ انھوں نے سیاسی طور طریقوں اور ڈائیلاگ کو اپنی سرگرمیوں کا محور و مرکز بنانے کے بجائے جارحانہ و پر تشدد انداز سیاست اختیار کر کے معاشرے میں جبر و انتشار، نراجیت و انارکی پیدا کرنے کی کوشش کی۔ ضیاء الحق کے زمانے میں افغانیوں کی آمد، ہیروئن اور کلاشنکوف کلچر کے فروغ نے آتشیں اسلحے کی فراہمی بھی آسان بنا دی تھی چناں چہ سیاسی جماعتیں اور ان کے دھڑے باشعور سیاست دان بننے کے بجائے ہتھیار بند جنگجوؤں کا روپ دھارنے لگے۔ پیشہ ور قاتل اور لٹیرے دندناتے پھرتے اور تمام شہری خوف زدہ تھے کہ نہ جانے اس کے نام کی لکھی گولی کس سمت سے آ کر ان کی زندگی کا خاتمہ کر دے۔ اغوا برائے تاوان اور بھتا مافیا نے سندھ کے پورے معاشرے خاص طور پر شہری آبادی کو یرغمال بنا رکھا تھا۔ نادیدہ خفیہ ہاتھ اور سرکاری و نیم سرکاری ایجنسیوں اور اداروں کی کار فرمائیاں بھی اس شہر کی سیاست میں بہت واضح تھیں۔ ایم۔ کیو۔ ایم۔ کے اندرونی اختلاف اور آپریشن کلین اپ کے بعد اس کے دو دھڑے بھی آپس میں مورچہ بند ہو چکے تھے۔ مذہبی اور فرقہ وارانہ گروہوں کے ذریعے بھی پر تشدد کارروائیوں کا سلسلہ جاری تھا۔ پولیس اور دیگر فورسز عوام کو تحفظ فراہم کرنے کے بجائے خوف و دہشت پھیلانے اور لاقانونیت، انارکی پھیلانے میں مصروف دکھائی دیتے تھے۔ گلی گلی میں عقوبت خانے، ایذا رسانی کے مراکز اور قتل گاہیں، جہاں ایک گروہ دوسرے گروہ کے اراکین کو لا کر ایذا پہنچاتا اور قانون نافذ کرنے والے ادارے جعلی مقابلے کے ذریعے حکومت کے مخالفین کو قتل کرواتے۔ یہ سب کارروائیاں انتہائی منظم انداز سے جاری تھیں۔ اس شہر میں قانون کی حکمرانی کے آثار مفقود تھے۔ ایک طویل عرصے تک حکومتی اہل کار اس حد تک دہشت کا شکار تھے کہ انھیں ہدایت تھی کہ وہ اپنی سرکاری شناخت کو پوشیدہ رکھیں۔ صوبائی اور وفاقی ایجنسیوں نے باقاعدہ اپنی گاڑیوں سے سرکاری شناختی نمبر پلیٹ کی عام نمبر پلیٹ لگانی شروع کر دی تھی۔ اس سے خوف و دہشت کی صورت حال کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

آئے دن کی ہڑتالوں، مظاہروں اور فتنہ فساد نے سندھ کے شہری اور دیہی علاقوں کی معمولاتِ زندگی کو تہس نہس کر کے رکھ دیا تھا۔ صنعتیں بند اور تجارت تباہ ہو رہی تھیں۔ بے روزگاری عروج پر تھی۔ یہ وہ پر آشوب مسائل و مصائب تھے جنھوں نے سندھ کے شہری و دیہی معاشرے کو مسلسل ارتعاش، تصادم، صدمات اور شکست و ریخت سے دو چار کر رکھا تھا۔ لوگوں کا ایک دوسرے پر سے اعتماد اٹھ چکا تھا۔ معمولی سیاسی اختلاف رکھنے والوں کو عقوبت خانوں میں بے دردی سے قتل کیا جا رہا تھا۔ سرکار نے بھی آپریشن کلین اپ کے نام پر وہی ظلم و جبر کے ہتھکنڈے اختیار کر رکھے تھے۔ محلہ محلہ، گلی گلی خانہ تلاشی کے نام پر عام شہریوں کو ہر پل تذلیل، بے حرمتی، بے بسی اور مجبوری کی ایسی ایسی صورتوں سے گزرنا پڑتا کہ شاید دشمن فوج کے ہاتھوں بھی کسی کی ایسی ذلت نہ ہوتی ہو۔ ایک ایک دن میں ہزاروں افراد عمر اور جنس کی تفریق کے بغیر، بغیر تفتیش و انکوائری حوالات میں بند کر دیے جاتے۔ زیر تفتیش قیدیوں کے ساتھ غیر انسانی سلوک کیا جاتا۔ بعض اوقات جعلی مقابلوں میں انھیں مار دیا جاتا۔ بوریوں میں بند سر بریدہ نعشوں کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ روز مرہ زندگی کا معمول بن گیا۔ بستیاں کی بستیاں ذہنی خلفشار اور نفسیاتی عوارض میں مبتلا ہو چکی تھیں[۳۲۲]۔ کراچی کی سیاست پر گہری نظر رکھنے والے صحافی منیر احمد نے لکھا کہ:

> ۱۹۹۴ء۔۹۵ء میں رینجرز نے جس خوف ناک طریقے سے ایم۔ کیو۔ ایم۔ کے خلاف آپریشن کا آغاز کیا تھا، اس سے ملکی سلامتی کو شدید خطرات لاحق ہوئے۔ مہاجروں نے اپنے جلاوطن رہنما الطاف حسین سے مطالبہ شروع کر دیا تھا کہ وہ آزادی کا اعلان کریں، لیکن الطاف حسین نے عقل مندی کا ثبوت دیا اور لندن میں بیٹھ کر بار بار یہ کہتے رہے کہ وہ سندھ کی تقسیم کے حامی نہیں[۳۲۳]۔

اس سیاسی کش مکش کے نتیجے میں ایک بار پھر ۱۹۷۱ء جیسے حالات پیدا ہو گئے۔ صوبۂ سندھ میں خصوصاً نفرت اور تعصب کی ایسی لہر اٹھی کہ دور دراز بیٹھے شعرا کو بھی اس جانب توجہ دینی پڑی۔ احمد فراز نے اسی صورتِ حال کا منظر نامہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ:

> اے مرے سارے لوگو / اب مرے دوسرے بازو پہ وہ شمشیر ہے جو / اس سے پہلے
> بھی مرا نصف بدن کاٹ چکی / اسی بندوق کی نالی ہے مری سمت کہ جو / اس سے پہلے
> مری شہ رگ کا لہو چاٹ چکی / پھر وہی آگ در آئی ہے مری گلیوں میں / پھر مرے شہر
> میں بارود کی بو پھیلی ہے / پھر سے "تو کون ہے میں کون ہوں" آپس میں سوال / پھر
> وہی سوچ میانِ من و تو پھیلی ہے / میری بستی سے پرے بھی مرے دشمن ہوں گے / پر
> یہاں کب کوئی اغیار کا لشکر اترا / آشنا ہاتھ ہی اکثر مری جانب لپکے / میرے سینے میں
> ہمیشہ مرا خنجر اترا / پھر وہی خوف کی دیوار تذبذب کی فضا[۳۲۴]۔

اپنی ایک اور نظم "چلو اس شہر کا ماتم کریں" میں وہ شہر کے ناگفتہ بہ حالات پر دل گرفتہ ہو کر کہتے ہیں کہ:

چلو اس شہر کا ماتم کریں/جس کے سبھی موسم ہمارے پیارے تھے/وہ رت چاک دامانی
کی تھی/یا خون رونے کی/ہوائے مہرباں کی راہ تکنے کا زمانہ تھا... ڈری سہمی ہوئی بے زار
لاشیں/اس لیے گلیوں میں پھرتی تھیں[۳۲۵]۔

شہر کے ان افسردہ مناظر اور وہاں رہنے والے بجھے بجھے لوگوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ:

آ کے دیکھو تو کبھی تم کہ مرے شہر کے لوگ   کیسے سہمے ہوئے رہتے ہیں گھروں میں اپنے[۳۲۶]

کراچی کی مایوس کن فضا اور انسانی بے حسی کے نتیجے میں انسانیت کی بے توقیری نے سحر انصاری کو بھی یہ کہنے پر مجبور کر دیا کہ:

عجب طرح سے میں صرف ملال ہونے لگا   جو شہر کا ہے وہی دل کا حال ہونے لگا[۳۲۷]

محاصرے کے دوران ایک طرف فوج اور رینجرز کی گولیوں کی تڑتڑاہٹ اور دوسری طرف سیاسی کارکنوں کی فائرنگ نے خوف کی فضا پیدا کر دی تھی لیکن اغوا اور مسخ شدہ نعشوں کی تعداد گھٹنے کا نام نہیں لے رہی تھیں۔ اس صورتِ حال کی عکاسی کرتے ہوئے سلیم کوثر نے کہا کہ:

لوری کی رم جھم میں سونے والے بچّے/گولی کی آواز سے ڈر کر اٹھ جاتے ہیں/لوری کی
رم جھم سے ڈر کر اٹھ جاتے ہیں/گولی کی آواز پہ ہنس کر سو جاتے ہیں/دنیا بھر کے
اخباروں میں الٹ پلٹ کر/روزانہ ہی یہ خبر چھپ جاتی ہے/کل بھی جب اخبار آئے گا
اس میں نام بدل جانے ہیں/مسخ شدہ لاشوں کے چہرے لیکن کس نے پہچانے ہیں[۳۲۸]۔

کون مقتول ہے اور کون قاتل، کون مظلوم ہے اور کون ظالم، اس سوال کا جواب تلاش کرتے اب کئی دہائیاں گزر چکی ہیں لیکن آج بھی الزامات در الزامات کا سلسلہ تو جاری ہے لیکن ظالموں اور قاتلوں کو سزائیں نہیں ملیں۔ اسی جانب اشارہ کرتے ہوئے رضی اختر شوق نے اپنی ایک غزل میں کہا کہ:

میں جب بھی قتل ہو کر دیکھتا ہوں   تو اپنوں ہی کا لشکر دیکھتا ہوں[۳۲۹]

اس کے علاوہ اپنی ایک نظم ''کرفیو'' میں بھی شاعر شہر میں ہونے والے ان مناظر کو پیش کر رہے ہیں جو اس زمانے میں حکومتی جبر کے نتیجے میں پیدا ہوئے تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ:

آج تو یوں لگتا ہے جیسے/ہم سب اک ویران مکان ہیں/جس کے شکستہ دروازے پر
/صدیوں سے زنجیر پڑی ہے/ہم برسوں کے زندانی ہیں/ساری عمر یونہی گزری ہے/جبر
و سزا کی مٹی دھوتے/قید ہوئے زنجیریں پہنے/آج مگر قیدی ہونے کے/اک/رسمی
اعلان نے جیسے/سب زنجیریں/بھاری کر دیں[۳۳۰]۔

وطن سے محبت کرنے والوں کو یہاں غدارانِ وطن اور اس وطن کو دیمک کی طرح چاٹ کر کھوکھلا کرنے والوں کو اعزازات سے نوازا جارہا تھا۔ اعجاز رحمانی اس صورت حال پر خاموش نہ رہ سکے اور بے اختیار یہ کہنے پر مجبور ہوئے کہ:

ہم نے چمن کو خون سے سینچا ہم ہی ذلیل و خوار ہوئے

آگ لگائی جن لوگوں نے پھولوں کے حق دار ہوئے[۳۳۱]

شاعر خالد علیگ بھی حالات کی ستم ظریفی کا شکوہ کرتے ہوئے اپنے ذہنی کرب کا اظہار کچھ اس طرح کرتے ہیں کہ:

میرے زخم زخم یہ جسم و جاں میں نفس نفس میں دھواں دھواں

مجھے اہلِ بزم سے کیا ملا مجھے اہلِ بزم نے کیا دیا

میرے محسنوں کی زبان میں میری فردِ جرم لکھی گئی

میرے قاتلوں کے بیان نے مجھے سنگ سار کرا دیا

میری بستیاں میرے گھر جلے میرے شہر لوٹ لیے گئے

میرے لوگ قتل کیے گئے مجھے خاک و خوں میں نہا دیا

یہی منصفی ہے تو منصفو میرا خون تم کو معاف ہے

نہ گواہیاں نہ شہادتیں میرا فیصلہ بھی سنا دیا[۳۳۲]

پوری یہ غزل کراچی، حیدر آباد، سکھر اور سندھ کے دیگر شہروں میں ہونے والی قتل و غارت گری کا منظر نامہ ہے۔ اس کے علاوہ ریاستی قتل جیسے گھناؤنے کھیل جس طرح اس صوبے میں کھیلے جارہے تھے، بے گناہوں کو جس طرح جھوٹے مقدمات میں پھنسا کر سزائیں دی جارہی تھیں۔ شاعر نے اس پورے ماحول کی ترجمانی کی ہے۔ انھوں نے مقتدر حلقوں کے جانب دارانہ رویے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے یہ تک کہا کہ:

نمرود لکھا جائے نہ شدّاد لکھا جائے یہ حکم ہے قاتل کو پری زاد لکھا جائے

اس شہر کو آباد کہ برباد لکھا جائے جو کچھ بھی لکھا جائے مرے بعد لکھا جائے[۳۳۳]

اپنی بے بسی اور بے بضاعتی کی حالت بیان کرتے ہوئے شاعر نے طویل بحروں والی غزلوں میں شہر میں پھیلی ہوئی بے چینی اور بے اعتباری کا نقشہ کھینچا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ:

میرا شہر مجھ پہ گواہ ہے کہ ہر ایک عہدِ سیاہ میں

وہ چراغ راہِ وفا ہوں میں کہ جلا تو جل کے بجھا نہیں

نہ وہ حرف و لفظ کی داوری نہ وہ ذکر فکرِ قلندری
جو مرے لہو سے لکھی تھی یہ وہ قراردادِ وفا نہیں
میں صلیبِ وقت پہ کب سے ہوں مجھے اب تو اس سے اُتار لو
کہ سزا بھی کاٹ چکا ہوں میں میرا فیصلہ بھی ہوا نہیں
تمھیں کیا خبر کہ میں کون ہوں میرے قاتلوں ہی سے پوچھ لو
جنھیں حکمِ قتل ملا مگر جنھیں اجرِ قتل ملا نہیں[۳۳۴]

جمہوریت کے نام پر ریاستی جبر کی بد ترین مثالیں اس دور کے کراچی میں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ جھوٹ وریا کی سیاست کے ساتھ ساتھ مخالفین کو دیوار سے لگانے کے اس عمل پر واصل عثمانی نے لکھا کہ:

جبر کے عہدِ سلطانی میں بے شک مرنا مشکل تھا
اس دورِ جمہور میں لیکن جینا بھی دشوار ہوا
ظلم و ستم معیارِ سیاست کذب و ریا اقدارِ حیات
حرفِ صداقت کم ظرفوں میں اتنا ذلیل و خوار ہوا[۳۳۵]

وہ شہر جو کبھی روشنیوں کا شہر کہلاتا تھا، اب اسی شہر پر تاریکیوں نے ڈیرہ ڈال رکھا تھا۔ خوف وہراس، قتل وغارت گری، دہشت وخون ریزی اس شہر کے گلی کوچوں کو ایک مہیب عفریت کی طرح نگل رہی تھی۔ اخباروں کے صفحات ایسی ایسی لرزہ خیز خبروں سے بھرے ہوتے تھے کہ ان کو پڑھ کر عام لوگوں پر لرزہ طاری ہو جاتا تھا۔ بقول پروفیسر سحر انصاری ''یہی وہ صورتِ حال تھی جس نے راغب مراد آبادی کو کراچی کے الم ناک واقعات کی منظوم تصویر کشی کی طرف راغب کیا''[۳۳۶]۔ ان کی شاعری کا ایک مجموعہ ''روشنیوں کا شہر'' کے نام سے شائع ہوا جو اس شہر میں ہونے والے سانحات کا حقیقت پسندانہ تجزیہ بھی ہے اور اس شہر میں بسنے والے ایک حساس اور دردمند دل شاعر کے دل کی فریاد بھی۔ انھوں نے روشنیوں کے اس شہر کی بابت مقتدر حلقوں کی جانب دارانہ اور عقل وشعور سے عاری رویوں کی بابت کھل کر کہا کہ:

روشنیوں کے شہر کو تیرہ و تار کر دیا پردۂ شب میں کون تھا جس نے یہ وار کر دیا[۳۳۷]

اس مجموعے میں انھوں نے کراچی کے خوں چکاں حالات کو قلم بند کرنے کے لیے بیش تر رباعی کا پیرایہ اختیار کیا۔ البتہ کچھ غزلوں میں بھی ان موضوعات کو زیرِ بحث لانے کی کوشش کی ہے۔ نظموں اور غزلوں کے علاوہ تقریباً دو سو کے قریب رباعیات شہر کے ان ہی پیچیدہ مسائل کا منظر نامہ ہیں جس کا ذکر مذکورہ صفحات میں تفصیل سے کیا جا چکا ہے۔ اکثر قطعات روزنامہ ''جنگ'' میں شائع بھی ہوئے۔ اس قسم کی شاعری کی بابت خود راغب کا دعویٰ تھا کہ:

آئینہِ امروز میں میرے قطعات ‌ ‌ ‌ اس دور کی تاریخ لکھی ہے میں نے[۳۳۸]

اور واقعی ان رباعیات میں راغب مراد آبادی نے اپنے شہر کی منظوم تاریخ رقم کرنے کی کوشش کی ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ایک مؤرخ کی لکھی ہوئی تاریخی تصنیف سے زیادہ بہتر اور حقائق پر مبنی تاریخ اس عہد کے ادبی شہ پاروں میں محفوظ ہوتی ہے۔ شاید اسی لیے ارسطو نے شاعری کو تاریخ پر ترجیح دی ہے۔ مشہور مورخ جی۔ ایم۔ ٹریویلین نے جب انگلستان کی سماجی تاریخ (Social History of England) لکھی تو اس میں بھی چاسر (Chaucer) کی شاعری سے لے کر عہد حاضر تک کے شعرا کے کلام سے تاریخی واقعات اور شواہد پیش کیے۔ راغب مراد آبادی نے بھی اسی روش کو اختیار کرتے ہوئے اخبارات میں شائع شدہ خبروں کی بنیاد پر اپنے مجموعے ''روشنیوں کا شہر'' کا مواد حاصل کیا۔ کراچی کی جو مجموعی صورتِ حال تھی اس کی بابت ان کا کہنا تھا کہ:

ہم خون کے گھونٹ، روز و شب پیتے ہیں ‌ ‌ ‌ جو زخم بھی لگتے ہیں، وہ خود سیتے ہیں
اس شہر کراچی میں ہزاروں ہوئے قتل ‌ ‌ ‌ لاکھوں، خوف و ہراس میں جیتے ہیں[۳۳۹]

انھوں نے ایک حساس شاعر کی حیثیت سے ہمارے خونچکاں شہر کی لہولہان تصویریں اپنے اس مجموعے میں پیش کر دی ہیں۔ قتل و غارت گری کے اس ماحول میں شہر پر جو سوگواری کی فضا چھائی ہوئی تھی، اس کی بابت لکھا کہ:

محرومِ تبسم ہیں کراچی والے ‌ ‌ ‌ معتوبِ تکلم ہیں کراچی والے
دہشت گردوں کے خوف و دہشت کے طفیل ‌ ‌ ‌ اک عمر سے گم سم ہیں کراچی والے[۳۴۰]

یہ مایوسی اور اداسی محض چند روزہ نہ تھی بلکہ برسوں کراچی کے مختلف علاقوں میں مقیم لوگ اس کیفیت کا شکار رہے۔ پسماندہ اور متوسط طبقے کے علاقے اس قتل و غارت گری سے سب سے زیادہ متاثر ہوئے۔ راغب مراد آبادی نے ان علاقوں میں قتل و غارت گری کی صورت حال بیان کرتے ہوئے کہا کہ:

اورنگی میں جاری ہے ہلاکت کا عمل ‌ ‌ ‌ اور اس کا محاصرہ بھی جارہی رہا کل
افراد حراست میں ہیں سو سے زائد ‌ ‌ ‌ تعداد میں چھے ہیں جو ہوئے نذرِ اجل[۳۴۱]

اس دہشت گردی کا شکاریوں تو معاشرے کا ہر ایک طبقہ تھا، یعنی عام لوگوں کے ساتھ ساتھ خود پولیس اہلکاروں کی زندگی بھی محفوظ نہیں تھی۔ اس جانب اشارہ کرتے ہوئے شاعر کہتے ہیں کہ:

عام آدمی سے کیا ہو حفاظت اپنی ‌ ‌ ‌ ہر چند شدید ہے، ضرورت اس کی
اس شہر کا ہے خدا ہی اب تو حافظ ‌ ‌ ‌ جس شہر میں اغوا ہوں پولیس والے بھی[۳۴۲]

مائیں جس طرح اپنے جواں سال اولاد کی موت پر نوحہ کناں تھیں وہ لوگوں کے دل دہلانے کے لیے کافی تھی۔ اس منظر کو پیش کرتے ہوئے راغب نے کہا کہ:

اے پاک زمیں کی خاک میرا بیٹا   بچہ ہی تھا، ارضِ پاک میرا بیٹا
رو رو کے یہ کہہ رہی تھی کل اک بیوہ   یہ کس نے کیا ہلاک میرا بیٹا[۳۴۳]

راغب کی غزلوں میں بھی کراچی کے المیے کو بڑے موثر انداز سے پیش کیا گیا ہے۔ ان کے مطابق:

ہو رہے ہیں روز ہی دو چار قتل   کیوں نہ ہو جائیں سبھی اک بار قتل
ہو رہا ہے اسلحہ تقسیم پھر   اب نہیں ہیں مطلقاً دشوار قتل
ہائے یہ بے حرمتی قانون کی   ہو رہے ہیں اب سرِ بازار قتل[۳۴۴]

شہر میں تیزی سے پنپنے والے اسلحہ کلچر اور اس کے بے دریغ استعمال کی وجہ سے بے گناہوں کو جس طرح اپنی زندگیوں سے ہاتھ دھونا پڑ رہا تھا، اس کا نقشہ کھینچتے ہوئے راغب کہتے ہیں کہ:

کراچی اب ہے اک مقتل، مجھے اس پر تعجب ہے   یہ جنت تھی، جہنم بن گئی کیوں کر تعجب ہے
کفن پہنا دیا کس نے یہ تہذیبِ نیاگاں کو   کلوشنکوف کا غالب ہے کیوں کلچر تعجب ہے
سراسیمہ یہ کس نے کر دیا ماؤں بہنوں کو   نکل آئیں گھروں سے اور بے چادر تعجب ہے
یہاں تو بھائی بھی ہے بھائی کے اب خون کا پیاسا   قلم کتنے جوانوں کے ہوئے ہیں سر تعجب ہے[۳۴۵]

شہر میں ہونے والی افراط و تفریط اور روز مرہ کی لاقانونیت کا حال بیان کرتے ہوئے شاعر کا کہنا تھا کہ:

آغاز فائرنگ کا ہوا جاگتے رہو   گلیوں میں پھر ہے شور بپا جاگتے رہو
نیت میں کچھ فتور ہے ٹی ٹی لیے ہوئے   وہ ایک شر پسند بڑھا، جاگتے رہو[۳۴۶]

اس سیاسی فضا نے شہر میں جو اداسی کی کیفیت پیدا کی اس کا حال بیان کرتے ہوئے شاعر کا کہنا تھا کہ:

رخصت ہوئی بہار کراچی اداس ہے   بکھرے ہوئے ہیں خار کراچی اداس ہے
ناپید ہو گئی ہے متاعِ سکونِ دل   ہر دل ہے بے قرار کراچی اداس ہے
انسانیت کی جیب و گریباں ہیں تار تار   انساں ہے بے وقار کراچی اداس ہے[۳۴۷]

یہ پُر رونق شہر جب شہرِ خموشاں کا منظر پیش کرنے لگا، ایک علاقے سے دوسرے علاقے تک پہنچنا دشوار ہو گیا اور ہر طرف وحشت نے بسیرا کر لیا تو شاعر یہ کہنے پر مجبور ہوا کہ:

پہلے تو نگاہیں پڑتی تھیں، خوش رنگ ہلالی پرچم پر
اب شہر کے گوشے گوشے میں وحشت کا علم لہراتا ہے
قتل کرتے ہیں مسلماں کو مسلماں ہائے ہائے
شہر قائد بن گیا شہر خموشاں ہائے ہائے[۳۴۸]

اس دہشت ناک صورتِ حال میں گلی گلی کوچے کوچے لوگ نعشوں پر ماتم کرتے نظر آتے تھے۔ شہر کی کوئی بستی اور کوئی محلہ ایسا نہیں تھا جہاں اشک شوئی نہ ہوتی رہی ہو۔ اس صورتِ حال کی منظر کشی کرتے ہوئے شاعر نے درست کہا کہ:

ہر گوشے میں ہے آہ و فغاں — مائیں بہنیں ہیں اشک فشاں
بچوں کے جوانوں، بوڑھوں کے — ہیں شہر میں ماتم دار بہت[۳۴۹]

کراچی میں بسنے والے محب وطن پاکستانیوں کے ذہن میں ہمیشہ ہی سے یہ سوالات ابھرتے رہے کہ آخر ان تمام تر بد ترین حالات کا مقصد کیا ہے۔ اس کے پیچھے کس کس کا ہاتھ ہے۔ ان حالات کو بدلنے کی کیا تدبیر کی جائے، لیکن جب انھیں ان سوالوں کے جواب نہیں ملتے تو حبس اور گھٹن میں اور اضافہ ہو جاتا ہے۔ بہت سے تحقیقی مقالات میں لکھا گیا کہ اس صورتِ حال کی وجہ سے شہر میں ذہنی امراض اور عارضۂ قلب میں بہت زیادہ اضافہ ہوا[۳۵۰]۔ کراچی پر منڈلاتی بلاؤں کو دیکھ کر لگتا یہی ہے کہ ایم۔ کیو۔ ایم۔ کے بقول شخصے ''بلیک میلنگ کارڈز'' کو غیر موثر کرنے کا فیصلہ مقتدر قوتوں نے کر لیا ہے لیکن اس مقصد کے حصول کے لیے ''شیطان بمقابلہ شیطان'' اور ''عسکریت بمقابلہ عسکریت'' کا فارمولا اپنایا گیا تو کراچی مزید تباہ و برباد ہو جائے گا[۳۵۱]۔ اس سے قبل سندھیوں میں پائی جانے والی بے چینی اور دوسری اقوام خصوصاً مہاجر اور پنجابی آباد کاروں کے حوالے سے سندھیوں کے تحفظات کا ذکر کیا گیا جس کے مطابق اگر اسی رفتار سے دوسرے صوبوں سے لوگوں کی آمد کا سلسلہ جاری رہا تو یہاں کے مقامی سندھی بہت جلد اقلیت میں تبدیل ہو جائیں گے[۳۵۲]۔ دوسری طرف ایم۔ کیو۔ ایم۔ کے قائد الطاف حسین نے مہاجروں کا مقدمہ لڑتے ہوئے واضح طور پر لکھا کہ صوبے میں مہاجروں کو تیسرے درجے کا شہری بنا دیا گیا ہے۔ اسی نعرے کو سامنے رکھتے ہوئے انھوں نے مہاجر کی جانب سے جدوجہد کا باقاعدہ آغاز کیا۔ اس تحریک نے عوامی سطح پر مقبولیت تو ۸۰ء کی دہائی میں کی لیکن اس کی بنیاد الطاف حسین کے مطابق ۱۹۷۷ء میں ڈال دی تھی[۳۵۳]۔

مہاجر قومی موومنٹ کے قیام کے بعد الطاف حسین اور ان کے ساتھیوں نے مہاجر قومیت کے نظریے کو زور و شور سے پھیلانا شروع کر دیا۔ ۱۹۸۶ء میں اس نظریے کو مہاجر نوجوانوں میں خاصی مقبولیت حاصل ہو چکی تھی لہٰذا سازشی ٹولے نے ۲۱ اکتوبر ۱۹۸۶ء کے دن مہاجروں اور پٹھانوں کو آپس میں لڑوانے کا جو خونی کھیل کھیلا، اس نے بڑی شدت کے ساتھ ہمارے قومی اور سماجی امتزاج کو بدل کر رکھ دیا۔ جب کسی طبقے میں معاشی ناانصافیوں کا احساس شدت پکڑے تو لازمی ردعمل پیدا ہوتا ہے۔

الطاف حسین نے اپنی بھرپور پروپیگنڈا مہم اور حالات کے تقاضوں کے تحت پیش رفت تیز کی، لیکن مولانا رضی مظہر ندوی وغیرہ جیسے مہاجر اکابرین نے الطاف حسین پر یہ الزام لگایا کہ انھوں نے مہاجروں کے بنیادی مقاصد کو نظر انداز کرتے ہوئے سندھ کو دو قومی صوبہ اور وسائل کی منصفانہ تقسیم کے حوالے سے کوئی کام نہیں کیا[۵۴]۔ حالاں کہ کراچی کے سیاسی افق پر الطاف حسین کے نمودار ہونے سے دو تین دہائیوں قبل ہی مرکز اور صوبے میں صوبۂ سندھ سے کراچی کی علاحدگی کی بابت بہت سی تحاریک کا آغاز ہو گیا تھا۔ کراچی کو الگ صوبے کا درجہ دلانے کے حق میں مسٹر حسین امام کے شروع کیے ہوئے ایجی ٹیشن اور روزنامہ ''ڈان'' میں سلسلہ وار لکھے گئے مضامین اس حوالے سے اہم دستاویز کا درجہ رکھتے ہیں۔ لیکن اس تحریک کی سب سے زیادہ مخالفت دینی جماعتوں خصوصاً علامہ شبیر احمد عثمانی وغیرہ نے ہی کی۔ اس کے علاوہ خود مولانا رضی مظہر ندوی کی جماعت اور دیگر بہت سے مہاجر اکابرین کراچی کی علاحدگی کے حق میں نہیں تھے[۵۵]۔ اس حقیقت کو سامنے رکھتے ہوئے مہاجر حقوق کی بابت الطاف حسین کی پوری تحریک کو محض کھوکھلے نعرے قرار دے کر نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ الطاف حسین کی مہاجر قومی موومنٹ پر ایک الزام یہ بھی شدت سے لگایا جاتا ہے کہ اس جماعت نے ہتھیاروں کی سیاست کو خوب پروان چڑھایا۔ ۱۹ اگست ۱۹۸۶ء کو کراچی اور ۳۱ اکتوبر ۱۹۸۶ء کو حیدر آباد کے جلسے میں جدید خودکار اسلحہ اور روایتی اسلحے کی نمائش نے آئندہ کے لیے کراچی اور حیدر آباد کی سیاست کے پُرتشدد رجحان کا واضح تعین کر دیا تھا[۵۶]۔ اس کے بعد تو یہ شہر ہمیشہ ہی ہنگاموں کی زد میں رہا۔

ایم۔ کیو۔ ایم کے قیام کے بعد ہنگاموں کی بڑی لہر کا آغاز ۳۱ اکتوبر کی صبح کراچی کے علاقے سہراب گوٹھ سے ہوا جہاں مہاجر قومی موومنٹ کے طویل جلوس پر فائرنگ کر کے پولیس انسپکٹر سمیت آٹھ افراد کو موت کی نیند سلا دیا گیا۔ شرکا حیدر آباد میں ایم۔ کیو۔ ایم۔ کے جلسے میں شرکت کے لیے جا رہے تھے۔ اس کے بعد یہ جلوس جب دیگر جلوسوں کے ساتھ مل کر مارکیٹ چوک پہنچا تو ایک بار پھر فائرنگ کا سامنا کرنا پڑا۔ ان دو واقعات نے کراچی اور حیدر آباد میں آگ لگا دی اور اس کے بعد آتش و آہن کا نہ ختم ہونے والا خونی کھیل شروع ہو گیا جس کی تپش آج تک محسوس کی جا سکتی ہے۔ کرفیو، قتل و غارت گری، قصبہ علی گڑھ کا سانحا، اورنگی ٹاؤن سیکٹر ساڑھے گیارہ اور توحید کالونی وغیرہ کے پہاڑوں کے دامن میں پیش آنے والے واقعات میں ہلاک شدگان کی تعداد ۴۷ سے زیادہ ہو گئی تھی۔ سب سے زیادہ ہلاکتیں اورنگی ٹاؤن میں ہوئیں[۵۷]۔ اس شہر میں ایک نو آبادی کی طرح حکومت کی جا رہی تھی جیسا کہ اعداد و شمار سے ظاہر ہوتا ہے کہ ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج، انسپکٹر جنرل پولیس، ڈپٹی انسپکٹر جنرل آف پولیس، ایس۔ ایس۔ پیز، ایس۔ ایچ اوز، ڈپٹی کمشنر، ایس۔ ڈی۔ ایم، اے۔ سی۔ ایم۔ سی۔ اے، ٹریفک مجسٹریٹ اور سب رجسٹرار وغیرہ جیسے انتظامی عہدوں پر مہاجر یا کراچی کے مقامی باشندوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر تھی[۵۸]۔ اس صورتِ حال میں اس شہر کا کوئی والی وارث نہ تھا۔ حقوق اور قومیت کے نام پر شروع ہونے والی جدوجہد اب فسادات اور باہمی نفرت میں تبدیل ہوتی جا رہی تھی۔ علاقائی گروہ اور لسانی تعصبات کو زور و شور سے ہوا مل رہی تھی[۵۹]۔ وفاقی حکومت نے ۱۹۸۵ء میں

کراچی میں ہونے والے لسانی اور فرقہ وارانہ فسادات کے اسباب اور ان کے حل کی تلاش کے لیے اس وقت کے وفاقی سیکریٹری داخلہ مسعود الزماں کی سربراہی میں کراچی انکوائری کمیشن تشکیل دیا تھا۔ مارچ ۱۹۸۶ء میں ۱۲۰ سے زائد صفحات پر مشتمل اس رپورٹ میں کراچی کے لیے بہت سی سفارشات کی گئی تھیں۔ اقبال یوسف نے اپنی تصنیف "کراچی پیپرز" میں اس کا انگریزی متن شائع کیا ہے[۳۶۰]۔ اگر اس رپورٹ کی روشنی میں بھی اس شہر کے مسائل کے حل کی طرف توجہ دی جاتی تو آئندہ رونما ہونے والے بہت سے حادثات و سانحات سے محفوظ رہا جا سکتا تھا۔ مگر اس جانب کبھی سنجیدہ کوشش نہیں کی گئی جس کے نتیجے میں اس شہر میں وقتاً فوقتاً قتل و غارت گری اور لسانی فسادات کا سلسلہ جاری رہا۔ اس دور میں بعض مہاجر اکابرین اس واضح نکتے پر جدوجہد کر رہے تھے کہ موجودہ صورتِ حال میں جب کہ لسانی عصبیت نے پوری طرح سے صوبہ سندھ کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے، مہاجروں کے مسائل کا واحد حل ایک علاحدہ صوبے کا قیام ہے۔ نہ صرف مہاجر قیادت بلکہ بعض سندھی دانش وروں مثلاً جمنا داس اختر نے بھی اپنے تبصرے میں ان مسائل کا حل ایک علاحدہ صوبے کا قیام ہی بتایا[۳۶۱]۔ ڈاکٹر سلیم حیدر نے تو اپنی ایک نظم میں اس جانب واضح اشارے بھی دیے ہیں۔ ملاحظہ کیجیے:

تقسیم سندھ اپنے مقدر کی بات ہے — یہ بات، بات وہ ہے کہ گھر گھر کی بات ہے
خوش فہمیوں میں گم ہیں تشدد پرست لوگ — قطرہ سمجھ رہے ہیں سمندر کی بات ہے[۳۶۲]

۱۹۸۷ء میں بھی اورنگی ٹاؤن اور دیگر علاقے لسانی فسادات کی زد میں رہے۔ مہاجروں اور پٹھانوں نے ایک دوسرے کو قتل کرنا شروع کر دیا۔ اب یہ نعرے زبان زدِ عام ہونا شروع ہوئے کہ اب ہم ہرگز ساتھ نہیں رہ سکتے۔ وی۔ سی۔ آر۔ بیچو کلاشنکوف خریدو۔ گلیوں اور محلوں میں مورچے بننے لگے۔ مسلح گشت کا آغاز اسی زمانے میں ہوا[۳۶۳]۔ رہی سہی کسر حیدرآباد میں رونما ہونے والے اس واقعے نے پوری کر دی جس میں بربریت کا مظاہرہ کرتے ہوئے محض اڑھائی گھنٹے میں دو سو سے زائد افراد فائرنگ سے ہلاک ہوئے[۳۶۴]۔ اس واقعے پر حیدرآباد کے معروف شاعر پروفیسر عنایت علی خان نے "پرسہ" کے عنوان سے ایک نظم تحریر کی، ملاحظہ کیجیے:

میں اپنے شہر میں کس کس کو پرسہ دوں

بلکتے بچوں کو دوں پرسہ جن کے گالوں پر — ڈھلکتے اشک لکیریں بنائے جاتے ہیں
اور آنے والے مصائب کے بادلوں کی خبر — ہر اہلِ دل کو مسلسل سنائے جاتے ہیں
کہ پرسہ دوں انھیں جن کے سہاگ اجاڑے گئے — دلوں کا چین لٹا زیست کے سہارے گئے
لرزتے ہونٹوں سے آنکھیں چرا کے چپ ہو جاؤں — جو پوچھتے ہیں کہ "وہ" کس خطا پر مارے گئے
کہ ان اداروں کو دوں پرسہ جن کے پروردہ — ابھی کچھ اور یہ دشمن کا کھیل کھیلیں گے

پھر اس کے بعد ملامت زدہ مریں گے یہاں اور آخرت میں عذاب الیم جھیلیں گے

میں اپنے شہر میں کس کس کو آج پرسہ دوں[۳۶۵]

سندھ کے حالات جس سمت جارہے تھے اس میں سوائے نفرت اور تعصب کے کوئی اور بیانیہ لوگوں کے اندر اتفاق اور اتحاد کی صورت پیدا نہیں کر رہا تھا۔ وہ لوگ جو حب الوطنی اور بھائی چارے کی فضا پیدا کرنے کی کوشش بھی کر رہے تھے تو ان کے خلاف ایسا محاذ قائم کیا جاتا کہ ان کی زندگی تنگ ہو جاتی۔ اس منظر کو دکھاتے ہوئے عنایت علی خان نے اپنی نظم ''دیبلِ جدید'' میں لکھا کہ:

داہری لٹیروں نے عصرِ نو کے طوفاں میں، دہریت کے ساحل پر/ نسل نو کے دانش کو / قافلے کو جل دے کر/ مکر و فق کے حیلوں سے/ نفرتوں کے محبس میں/ قید کر کے ڈالا ہے/ فکر کی توانائی/ حوصلوں کی جولانی.../ دیبل تعصب کا، نفرتوں کے معبد کا، ہر نشاں گرانا ہے/ فکر نو کی دانش کو/ داہری ٹھکانوں سے/ تنگ قید خانوں سے/ بازیاب کرنا ہے[۳۶۶]

اپنی غزلوں میں بھی انھوں نے حالات کی سنگینی اور سندھ کے شہری علاقوں کے بدلتے منظر نامے کی طرف واضح اشارے کیے ہیں۔ جیسے:

قوم کے جب نظریّات بدل جاتے ہیں دیکھتے دیکھتے حالات بدل جاتے ہیں[۳۶۷]

نظریات بدلنے کے ساتھ ساتھ قوم کی امیدیں بھی ان لوگوں سے وابستہ ہوگئیں، جنھوں نے ان نوجوانوں کے سہارے مستقبل کے خواب دکھائے تھے، لیکن طویل جدوجہد کے بعد بھی سوائے رسوائی، بدنامی اور غدارانِ وطن کے القابات کے سوا کچھ نہ ملا۔ اس صورت میں شاعر بے اختیار یہ کہنے پر مجبور دکھائی دیتا ہے کہ:

منزل کہاں نشانِ سرِ راہ تک نہیں لے آئے اے خدا، یہ مرے راہبر کہاں[۳۶۸]

جن رہبروں پر طنز و تعریض کی جاتی رہی ان ہی لوگوں کے ساتھ مختلف سیاسی جماعتیں اقتدار کے مزے بھی لوٹتی رہیں۔ بعض خیال پسند دانشوروں نے مہاجروں کو یہ مشورہ دینا بھی شروع کر دیا کہ:

سیاسی نقطہ نگاہ سے اب مہاجروں کو ایم۔ کیو۔ ایم۔ کے اِس یا اُس گروپ کی حمایت یا تعاون سے گریز کرنا چاہیے... مہاجروں کو اپنی سیاسی جماعت کے قیام سے دستبردار ہو جانا چاہیے[۳۶۹]۔

یہ مشورہ دینے والے نام نہاد دانش ور ۱۹۶۰ء میں کراچی کے سیاسی منظر نامے کو فراموش کر دیتے ہیں جب ایوب خان کی آمریت کے خلاف اسی شہر کے نوجوانوں نے مسلسل جلسے جلوس کر کے عوامی شعور پیدا کرنے کی کوشش کی۔ نتیجتاً بہت سے

نوجوانوں کو شہر سے نکال کر جیلوں میں ڈالا گیا اور آخر کار ایوب خان کی حکومت نے کراچی سے دارالخلافہ منتقل کرنے کا فیصلہ کر کے اس شہر کی سیاسی حیثیت کو کم کرنے کی کوشش کی۔ ۱۹۸۰ء اور ۱۹۹۰ء کی دہائیوں میں جب حکومت کی جانب سے فوجی آپریشنز کیے گئے تو اس نے شہر کی فضا مزید زہر آلود کر دی۔ قتل و غارت گری، خون ریزی، لوٹ مار، عدم تحفظ اور غیر یقینی صورت حال نے شہریوں کو مسلسل خوف اور دہشت کے عالم میں مبتلا رکھا[۳۷۰]۔ حسین مجروح نے شہر کے یہ مناظر بیان کرتے ہوئے لکھا کہ:

> کوئی آسیب ہے کہ عفریت جو گلی گلی چتائیں دہکا رہا ہے، شب زاد گاں، ہاتھوں میں آتش فشاں لیے پھرتے ہیں، جب چاہتے ہیں، جہاں چاہتے ہیں، اپنے دلوں کے لوہے سے خلق خدا کو سیسہ بنا دیتے ہیں۔ اب یہاں مرنے کے لیے بہانے کی ضرورت ہے نہ مارنے کے لیے حیلے کی حاجت... کراچی کی گلیوں میں بہتا ہوا لہو اور رستوں سے اٹھتا ہوا دھواں ہمارے ضمیر پر دستک دے رہا ہے۔ کیا ہم بھی اس کی تپش محسوس کر رہے ہیں[۳۷۱]۔

سیاسی عمل میں مہاجروں کے متشددانہ رویے کی ایک بڑی وجہ ماہرین سماجیات یہ بھی بتاتے ہیں کہ ملک کے دوسرے لسانی یا صوبائی گروہ کے مقابلے میں مذکورہ گروہ کی سماجی حیثیت مسلسل تنزل کا شکار ہے[۳۷۲]۔ اسی زوال کے دور میں ایم۔ کیو۔ ایم۔ کی شکل میں نچلے درمیانے طبقے کی ایک سیاسی پارٹی تو بن گئی، ابتدائی زمانے ہی سے اس تنظیم کی بنیاد ''مقبولیت اور دہشت گردی کے دو ستونوں پر قائم ہے اور اپنے حامیوں کو ان دونوں حربوں سے قابو رکھتی ہے''[۳۷۳]۔ صد افسوس! سندھی مہاجر اتحاد کا عمل دیرپا ثابت نہیں ہوا۔ حالانکہ مرکز کے خلاف اس اتحاد ہی میں دونوں گروہوں کے مفاد وابستہ تھے۔ ۱۹۸۸ء میں ایم۔ کیو۔ ایم۔ نے سندھ کے شہری علاقوں میں ٹھوس کامیابی حاصل کی۔ سندھ کے شہری علاقوں کی تقریباً تمام ہی نشستوں پر اس کا قبضہ ہو گیا اور یہ جماعت ملک کی تیسری بڑی سیاسی قوت بن کر ابھری۔ اس فتح کے بعد ہی ایم۔ کیو۔ ایم۔ اور پی۔ پی۔ کے درمیان اتحاد ہوا، جسے ''معاہدۂ کراچی'' کا نام دیا گیا۔ مگر اس معاہدے پر بھی عمل درآمد نہ ہونے کی وجہ سے سندھیوں اور مہاجروں کے درمیان خلیج اور زیادہ بڑھتی چلی گئی۔ ان اختلافات نے سنگ دلانہ اور بے رحمانہ تشدد کی شکل اختیار کر لی۔ یہ اختلافات، بقول حمزہ علوی، سندھ کی قیادت کی نااہلی اور تنگ نظری کے سبب پیدا ہوئے، جو سیاسی دور اندیشی اور شائستگی سے عاری تھے۔ پی۔ پی۔ پی۔ کا ''معاہدۂ کراچی'' سے انحراف کرنا احمقانہ اقدام تھا، کیوں کہ معاہدے میں درج اکثر مطالبات سندھیوں کے قابل ذکر مفادات کو قربان کیے بغیر پورے کیے جاسکتے تھے۔ ایم۔ کیو۔ ایم۔ کے بعض رہنما بھی یہ سمجھتے تھے کہ مہاجروں اور سندھیوں کی مشترکہ جدوجہد کے ذریعے ہی مرکز سے حقوق کا حصول ممکن ہے۔ الطاف حسین بھی کچھ اسی قسم کے خیالات رکھتے تھے، لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ نہ صرف ان کا رویہ سخت ہوتا چلا گیا بلکہ اپنی پارٹی کے اندرونی دباؤ کے باعث مایوسی میں مزید اضافہ ہوتا چلا گیا۔ مقتدر طاقتوں نے اسی زمانے میں سندھی مہاجر خلیج بڑھانے میں سرگرم کردار ادا کیا تاکہ پی۔ پی۔ کی حکومت کے

خاتمے کا جواز پیدا کیا جاسکے۔ منظم تشدد اور جدید ہتھیاروں سے لیس مسلح گروہوں نے سندھ کے تمام ہی شہروں میں پُر تشدد کارروائیاں شروع کردیں۔ ان گروہوں کی اذیت گاہوں کے بارے میں ملکی اور بین الاقوامی ذرائع ابلاغ نے دستاویزی پروگرام بھی نشر کیے۔ دوسری جانب اس تشدد کے نتیجے میں فطری طور پر سندھ پولیس کی ہمدردیاں پی۔ پی۔ حکومت اور سندھیوں کے ساتھ ہونے لگیں۔ الزام لگنا شروع ہوا کہ پولیس مہاجروں پر تشدد کر رہی ہے۔ مہاجروں نے فوج کو بلانا اور مارشل لا کے لیے دعائیں مانگنا شروع کردیں[۳۷۴]۔

سندھ کے موجودہ بحران کا مرکزی نکتہ سندھیوں کا یہ خوف معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے صوبے میں اقلیت بن رہے ہیں اور اب سیاسی اور انتظامی اقتدار ان کے ہاتھوں سے نکلا چاہتا ہے۔ سندھ کے قوم پرست رہنما برملا اس بات کا اظہار کرچکے ہیں۔ جب تک اس خوف کا ازالہ نہیں کیا جائے گا، سندھ کا بحران بھی قابلِ اطمینان طریقے سے حل نہیں ہو پائے گا[۳۷۵]۔ دوسری جانب کراچی کے لاکھوں پرامن شہری اس خلجان میں گرفتار ہیں کہ وہ کون سی ابروئے چشم ہے جس کے اشارے پر دہشت گردی کی بدترین مثالوں سے بھی مصلحتاً چشم پوشی اختیار کی جاتی ہے اور کبھی جب ان کے مفادات پر ضرب پڑتی ہے تو گوشمالی اس قدر ضروری ہو جاتی ہے کہ لاکھوں شہریوں کے انسانی حقوق کو بھی بالائے طاق رکھ دیا جاتا ہے۔ باضمیر ادیبوں نے ہر دور میں اس غیر جمہوری رویے اور ظلم و استبداد کی مخالفت کی ہے۔ یہ مخالفت کبھی جلی اور کبھی خفی انداز میں ہوتی رہی ہے۔ ہم جہاں ایک سیاسی جماعت کے عقوبت خانوں کی دریافت پر لرزہ بر اندام ہیں وہیں اس سیاسی کلچر کی بھی مذمت کرتے ہیں جس کے تحت تھانوں میں قائم عقوبت خانوں کے سرکاری سطح پر انسانی حقوق کو بری طرح روندھا جارہا ہو[۳۷۶]۔ وہ شہر جو پاکستان میں میر تقی میرؔ کے دلّی کی طرح منتخب روزگار تھا، وہ اپنے ہی لوگوں کے ہاتھوں تباہ ہوتا چلا گیا۔ وہ شہر جو غریب پروری میں سب سے آگے تھا، جس کی راتیں کبھی تاریک نہیں ہوتی تھیں، جو ہر بے درماں کو اپنے دامن میں سمیٹ لینے کی صلاحیت رکھتا تھا، اس شہر کو چند مفاد پرست دہشت گردوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا گیا۔ اور اس دہشت گردی کو فروغ دینے میں سب ہی نے اپنا اپنا حصہ ڈالا۔ افراد، افسران، ادارے، محکمے، حکومت، مقتدر قوتیں اور وہ تمام لوگ جو اس شہر میں اپنا کچھ بھی اثر ورسوخ رکھتے تھے، سب نے اس کی بربادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ حقوق انسانی کمیشن برائے پاکستان کے مشن نے اس حوالے سے جو تحقیقاتی رپورٹ پیش کی ہیں وہ ریاست کے ان تمام کرداروں کے چہروں سے پردہ اٹھانے کے ساتھ ساتھ بحیثیت قوم ہمارے لیے شرمندگی کا باعث بھی بنتی ہیں۔ اس رپورٹ کو اردو میں ترجمہ کرکے عامر حبیب نے قسط وار کراچی سے شائع ہونے والے کتابی سلسلے ''ارتقاء'' میں شائع کیا[۳۷۷]۔

کمیشن نے کراچی میں اپنے چار روزہ قیام کے دوران ان تمام عناصر سے جو ان ہنگاموں میں براہ راست متاثر تھے یا ملوث تھے، علاحدہ علاحدہ ملاقاتیں کیں۔ ان میں پاکستان پیپلز پارٹی، مہاجر قومی موومنٹ، پنجابی پختون اتحاد، جماعت اسلامی، جیے

سندھ، غیر وابستہ مبصرین مثلاً صحافی، وکلا، خواتین کی تنظیموں کے ممبران، صوبائی حکومت کے عمائدین، گورنر، سابق اور موجودہ وزرائے اعلیٰ، انسپکٹر جنرل پولیس اور وہ تمام خاندان جو اس طرح کی کارروائیوں کے نتیجے میں نقل مکانی پر مجبور ہوئے۔ اس کے علاوہ تشدد کا نشانہ بننے والے زخمیوں سے بھی ملاقاتیں کر کے انھوں نے یہ رپورٹ تیار کی۔ اس کمیشن نے ان تمام الزامات کی تحقیق کی جو فریقین ایک دوسرے پر لگایا کرتے تھے اور ان حقائق تک پہنچنے کی کوشش کی۔ اردو بولنے والی آبادی کے ساتھ تعلیم اور ملازمتوں میں امتیازی سلوک سے لے کر ریاستی دہشت گردی تک کے تمام معاملات اور متاثرین کی درخواستوں کا جائزہ لیا گیا[۷۸]۔ دوسری طرف پاکستان پیپلز پارٹی، جیے سندھ اور ان کے معاونین سمیت تمام دیگر گروپ نے یہ الزام لگایا کہ یہ تمام مسائل مہاجر قومی موومنٹ کے قیام کے بعد شروع ہوئے۔ زیادہ تر ہنگامے ایم۔ کیو۔ ایم۔ کے گڑھ کراچی اور حیدر آباد ہی میں ہوئے۔ ان کے مطابق مہاجر قومی موومنٹ کا پہلا نشانہ پٹھان، اس کے بعد پنجابی اور اس کے بعد سندھیوں کی جانب ہو گیا۔ کمیشن نے فوج کے کردار کو بھی اس معاملے میں شکوک و شبہات سے بالاتر قرار نہیں دیا۔ ان کے خیال میں فوج جب چاہتی ہے ان دہشت گردوں کو کھلی چھوٹ دے دیتی ہے[۷۹]۔ کمیشن نے پولیس کے کردار پر بھی سوالات اٹھائے ہیں۔ ان کے مطابق سیاسی مخالفت پر بے بنیاد الزامات لگا کر نوجوانوں کو ننگا کر کے چمڑے کے ہنٹروں سے مارا پیٹا جاتا اور کئی کئی دن تک ان کو بھوکا پیاسا رکھ کر ان سے مرضی کے بیانات لیے جاتے تھے۔ ایم۔ کیو۔ ایم۔ کے بعض لوگوں نے تو یہ بھی الزامات لگائے کہ جیل میں موجود ڈاکوؤں اور دہشت گردوں سے مدد لے کر پولیس مختلف علاقوں کا محاصرہ کرتی۔ اس دوران عورتوں کو بے آبرو کرنے کے واقعات بھی پیش آئے۔ ۳۶، ۳۶ گھنٹے تک علاقوں کا محاصرہ کر کے بجلی پانی بند کر دیا جاتا اور فلاحی اداروں کی ایمبولینس تک کو اندر آنے کی اجازت نہ ملتی۔ کمیشن نے پکا قلعہ آپریشن کی وجوہات اور ہلاکتوں کا بھی جائزہ لیا[۸۰]۔

اس جائزے میں اس دل چسپ حقیقت کا بھی انکشاف ہوا کہ عام لوگوں کے ساتھ ساتھ ملک کی صحافی برادری اور وکلا تنظیمیں بھی دو گروہوں میں بٹے ہوئے تھے۔ قومی سطح کے اخبارات مثلاً "ڈان"، "جنگ" اور "جسارت" وغیرہ نے سرکاری سطح پر اردو بولنے والوں کے ساتھ امتیازی رویے کے اعتراضات کی نہ صرف تائید کی بلکہ ناقابل تردید ثبوت بھی پیش کیے۔ ان لوگوں کا کہنا تھا کہ حکومت اردو بولنے والی آبادیوں کے تحفظ کے لیے کوئی اقدام نہیں کر رہی۔ ان لوگوں نے متاثرہ کیمپوں کی مثال دیتے ہوئے یہ بھی الزام لگایا کہ مہاجر متاثرہ کیمپوں میں کسی قسم کی سرکاری امداد نہیں دی جا رہی جب کہ سندھی کیمپوں کو خوب نوازا جا رہا ہے۔ صحافیوں نے یہ الزام بھی لگایا کہ سندھی انتہا پسند اردو بولنے والے صحافیوں کو دھمکیاں دیتے ہیں، لیکن کسی سرکاری ایجنسی کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگتی اور وہ ان کی حفاظت کے لیے کوئی اقدام نہیں اٹھاتی۔ پکا قلعہ آپریشن کے دوران، جس میں بے شمار بے گناہ لوگ مارے گئے، شہری آبادی کو ظلم و ستم کا نشانہ بنایا گیا۔ عوام کی نجی زندگی میں مداخلت کی گئی اور عورتوں کو بے آبرو کیا گیا اور خصوصی طور پر اردو مخالف فورس تیار کی گئی وغیرہ جیسے الزامات ایم۔ کیو۔ ایم۔ کے اراکین نے

نہیں بلکہ صحافی اور وکلا برادری کی جانب سے بھی منظر عام پر آئے۔ اس گروپ کے مطابق اس آپریشن کے خلاف نصف سے زائد ایگل اسکواڈ کے ارکان نے استعفیٰ دے دیا تھا۔ دوسری جانب سندھی وکلا ایم۔ کیو۔ ایم۔ کے کونسلروں پر سندھی دانش وروں کے قتل کا الزام لگاتے ہیں جب کہ داور حسین خان ایڈوکیٹ نے وکلا کے بیانات کو یک طرفہ اور غیر متوازن قرار دیا۔ وہ پکا قلعہ آپریشن کو قانون نافذ کرنے والے ادارے کی جنگی جارحیت سے تشبیہ دے کر اسے غیر انسانی رویہ قرار دیتے ہیں۔ ان تمام جائزوں کے بعد کمیشن نے بھی پکا قلعہ آپریشن کی بابت کہا کہ اسے غلط طور پر تشکیل دیا گیا۔ ان کے مطابق فورس میں نظم وضبط نام کی کوئی چیز نہیں تھی جس کی وجہ سے بے شمار بے گناہ افراد جن جس میں عورتیں اور بچے بھی شامل تھے، شہید کر دیے گئے[۳۸۱]۔

کمیشن نے تمام متحارب گروپوں کی جانب سے پیش کی گئی دستاویزات کی فہرست پیش کرنے کے ساتھ ساتھ آئندہ ایسے واقعات پیش نہ آئیں، اس کے لیے کچھ تجاویز بھی دیں تھیں[۳۸۲]۔ لیکن ظاہر سی بات ہے جیسا کہ اس ملک کے حاکموں کا رویہ ہے کہ وہ تمام دستاویزات ردی کی ٹوکری کا حصہ بن گئیں۔ آج سندھ ملک کا وہ صوبہ ہے جہاں قومیتی، نسلی، لسانی اور گروہی سیاست اپنے نقطۂ عروج پر ہے۔ سندھ کے باسیوں کا مسئلہ حقوق سے محرومی ہے۔ اس صوبے میں بسنے والے اکثر افراد ان بنیادی انسانی حقوق سے بھی محروم ہیں جو انھیں حقوقِ انسانی کے چارٹر کے مطابق پیدائشی طور پر حاصل ہیں[۳۸۳]۔ دیہی آبادی زمین داروں، جاگیرداروں اور وڈیروں کے تسلط اور شہری آبادی سرمایہ داروں کے شکنجے میں جکڑی ہوئی ہے۔ اسی تسلط اور شکنجے کو برقرار رکھنے کے لیے یہ سرمایہ دار اور وڈیرے مقتدر حلقوں کے ساتھ مل کر ایسے حربے استعمال کرتے ہیں، جن کی وجہ سے عوام باہم دست و گریباں رہیں۔ اس بارے میں سوچنے، سمجھنے اور اس شہر کے مسائل کے حل کی شعوری کوشش کرنے کا تو حکمرانوں کے پاس وقت ہے اور نہ ہی یہاں پر موجود سیاسی قوتوں نے آج تک اس بارے میں کوئی ٹھوس کوشش کی ہے۔ ہر کوئی اپنی اپنی سیاسی پوائنٹ اسکورنگ کے چکر میں اپنے اپنے مفادات کی جنگ میں مصروف ہے۔ ملک کا واحد طبقہ ادیب جو کہ حساس طبیعت کا مالک ہوتا ہے، داخلی طور پر وہ اپنے احساسات اور جذبات کے کتھارسس یا اظہار پر مجبور ہوتا ہے اور خارجی طور پر وہ اپنے معاشرے اور سماج سے بھی جڑا ہوتا ہے۔ لہٰذا اس بحرانی کیفیت میں اس کی آواز کو معتبر بھی مانا جاتا ہے اور حقیقت کا پرتو بھی۔ فہیم اعظمی نے ادیب کی اس کیفیت کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

> ہم آج کل جس بحران سے گزر رہے ہیں وہ اپنے شہر کراچی کا بحران ہے اور آج جب میں اداریہ لکھ رہا ہوں تو باہر کی روشیاں بجھی ہوئی ہیں۔ سڑکیں سنسان پڑی ہیں۔ اخبار نوجوانوں، معصوم بچوں اور عورتوں کے مرنے اور زخمی ہونے کی خبروں سے بھرے پڑے ہیں۔ گولیوں کی آوازیں کئی طرف سے آرہی ہیں ... گولیوں کی آواز پر کان کھڑے ہو جاتے ہیں۔ لیکن حاکموں اور لیڈروں اور محافظوں اور بحران سے پہلے دیے گئے ووٹ سے منتخب نمائندوں کی رجائیت آمیز بات یاد آجاتی

ہے۔ سوچتا ہوں شاید کان پھر سے بجنے لگے۔ ڈرتے ڈرتے دروازے تک جاتا ہوں۔ ڈرتے ڈرتے دروازہ کھولتا ہوں کہ کہیں کوئی سرکاری یا غیر سرکاری گولی مجھے نہ دیکھ لے۔ گاڑیاں جلتی ہوئی اور دھواں نکلتا ہوا دیکھتا ہوں۔ فائر ٹینڈر کی آواز سنائی دیتی ہے۔ گرم خون دکھائی دیتا ہے اور پھر سوچنے لگتا ہوں کہیں یہ فلم کی شوٹنگ نہ ہو، لیکن ڈراپ سین کے بعد لوگ اپنا سامان لے کر جاتے ہوئے دکھائی نہیں دیتے بلکہ ایمبولینس میں زخمی اور مردہ بدن رکھے جا رہے ہیں۔ کچھ گھروں کے باہر سے کچھ اندر سے اور میں پھر سوچنے لگتا ہوں کراچی کا رہنے والا گھر کے اندر زیادہ محفوظ ہے یا گھر کے باہر؟[۳۸۴]

ڈاکٹر فہیم اعظمی کا لکھا گیا یہ اداریہ کراچی میں بسنے والے ہر شہری کی دل کی فریاد ہے۔ یہ سب لوگ ہر پل یہی سوال دل میں لیے گھر کے اندر اور باہر زندگی کے امور انجام دیتے ہیں کہ ان کی زندگی کہیں بھی محفوظ نہیں۔ کراچی میں روز بروز پھیلتی دہشت گردی اور ظلم و بربریت پر ادیبوں اور شاعروں نے بے نیازی نہیں برتی[۳۸۵]۔ شاعروں اور ادیبوں کی ایک طویل فہرست ہے جو شہر کے حالات سے متاثر بھی ہوئے اور اس پر اشک شوئی بھی کی۔ عبدالعزیز خالد نے شہر کی تبدیل شدہ فضا کا منظر نامہ کچھ اس طرح سے پیش کیا ہے:

تو اے کراچی وہی شہر ناز ہے کہ جسے — کمال حسن کا دیتے تھے نام حسن شناس
پکارتا تھا جہاں فرحتِ جہاں تجھ کو — نجانے تجھ پہ عقوبت انڈیل دی کس نے
نجانے کس نے کیا تجھ کو وقفِ ہول و ہراس — بنی سہی جو دلہن تھی ہے بیوہ زن کی تھا
جو کھو رہی ہے بتدریج اپنے ہوش و حواس — گلاب خانوں کے مرجھائے صرصرِ غم سے
ہے گھاؤ تیرا سمندر سے بھی کہیں گہرا — کسی کی پھونک میں لیکن نہیں دم عیسیٰ
ہیں محفلیں تری سنسان مجلسیں ویران — جو رنگ و نور سے معمور تھی وہ بزم رواں[۳۸۶]

اپنی ایک اور نظم ''اے کراچی کی ہوائے سوگوار'' میں بھی وہ شہر کی پُرسوز فضا اور اس میں سرائیت کرتی اداسی کو پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

اے کراچی کی ہوائے سوگ وار — تونے دیکھا ہے مری زندہ محبت کا مزار؟
وہ سنہرا دیس وہ گم گشتہ خوابوں کا دیار — وادیِ مہران کے گیسو ہیں جن سے تاب دار
دامنِ امید کس کے ہاتھ سے چھوٹا نہیں؟ — کون سے دل کا پھپھولا آنکھ سے پھوٹا نہیں
بے غبار اس کی نظر اس کا نشانہ بے اماں — زد میں رکھتی ہے ہمیں ہر وقت مرگِ ناگہاں[۳۸۷]

حکمراں اور مقتدر قوتیں جس طرح سے اس سنگین مسئلے پر بے حسی کا رویہ اختیار کیے بیٹھے تھے اور ظاہری طور پر جو اقدامات لیے جارہے تھے، ان میں بھی جو نیم دلانہ کوششیں تھیں، اس کا ادراک شعرا اور ادیبوں کو بہت گہرا تھا۔ ناقص منصوبہ بندی اور کراچی سے متعلق ان رویوں پر محسن بھوپالی نے بہت کچھ لکھا۔ ان کے خیال میں:

آگ سے آگ بجھانے کا عمل جاری ہے — یوں کراچی کو بچانے کا عمل جاری ہے

موت کا رقص گلی کوچوں میں ہر روز اِدھر — اور اُدھر بزم سجانے کا عمل جاری ہے

کس مصیبت میں ہیں اپنے یہ نہیں ان کو خیال — غیر کو اپنا بنانے کا عمل جاری ہے

میرے ایثار کو وہ بھول گئے ہیں محسن — اپنے احسان جتانے کا عمل جاری ہے[۳۸۸]

محسن بھوپالی کے ذکر کے بغیر کراچی کی شاعری کا کوئی حوالہ مکمل نہیں سمجھا جائے گا۔ ان کا شمار یوں تو بزرگ شعرا میں ہوتا ہے لیکن ان کی شاعری میں جو زندگی اور تازگی ہے وہ انھیں عہدِ حاضر کے شعرا میں بھی ایک منفرد حیثیت عطا کرتی ہے۔ زندگی میں موجود محرومیوں اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے معاشرتی کرب، ناانصافیوں اور ظلم کے خلاف محسن نے جس طرح آواز بلند کی وہ اپنی مثال آپ ہے[۳۸۹]۔ ان کا یہ شعر تو کئی دہائیوں تک زبان زدِ عام رہا کہ:

نیرنگیِ سیاستِ دوراں تو دیکھیے — منزل انھیں ملی جو شریکِ سفر نہ تھے[۳۹۰]

اس شعر کو پڑھ کر یوں محسوس ہوتا ہے کہ شاعر نے اپنے وجدان کے آئینے میں نصف صدی قبل ہی آج کا منظر نامہ دیکھ لیا تھا۔ عصرِ حاضر کے حوالے سے اپنی شاعری میں جو کچھ انھوں نے پیش کیا وہ بلاشبہ ایک تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔ سیاسی الزام تراشیوں اور مقتدر قوتوں کے کردار پر ان کے اشعار ہمیں مغنیات اور تفہیم کی ایک نئی دنیا میں لے جاتے ہیں۔ جیسے:

لکھے تھے نام مرے قتل کرنے والوں کے — عجیب بات ہے میں بھی اسی شمار میں تھا[۳۹۱]

عصرِ حاضر کی سیاسی فضا اور حادثاتی انداز میں سامنے آنے والے سیاست دانوں اور نظریۂ ضرورت کے تحت کیے جانے والے ان کے فیصلوں نے قوم کو جو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچایا۔ محسن نے اس ساری کیفیت کو وقت کی رَو کا نام دے کر اس المیے کو پیش کیا ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

کس نے فضا میں گھول دیا نفرتوں کا زہر — کیوں بدگمانیوں کا ہدف کو بکو ہیں ہم[۳۹۲]

کراچی کی بدترین حالت اور گروہی اور لسانی تقسیم کی جو سیاست اس شہر میں ہو رہی تھی اس کا اظہار کرتے ہوئے انھوں نے پُر درد انداز میں کہا کہ:

کراچی کرچیوں میں بٹ گیا ہے　　یہ اپنے آئینے سے کٹ گیا ہے
تسلط کی کشاکش میں بلآخر　　یہ اپنے آئینے سے کٹ گیا ہے
کل آجائے گا میرے مقابل　　ابھی جو چوم کر چوکھٹ گیا ہے
وطن اہل وطن کا کب ہے محسن　　وطن اہلِ زمیں میں بٹ گیا ہے[۳۹۳]

محسن بھوپالی کے خیال میں یہ وہ نگر نہیں جس کے لیے ہمارے آباؤاجداد نے قربانیاں دی تھیں۔ یہاں تو ہر دم غداری کے سرٹیفکیٹ بانٹے جا رہے تھے جب کہ ان کے مطابق:

وہ وطن جس کے اک گوشۂ خاک میں/میری ماں دفن ہے/جو سناتی تھی گا کے مجھے
لوریاں، دفن ہے/اس کے آغوش میں/میرے بچپن کے دن دفن ہیں/وہ وطن
میرے گزرے ہوئے کل کی/روشن روایت بھی ہے/حافظے کی مقدس امانت بھی ہے!
... یہ وطن مرے جذبات کا آئینہ دار ہے/حاصل جہد و ایثار ہے/یہ وطن/یہ زمیں/یہ
مری دوسری ماں/اس کے قدموں میں میں نے/بتا دی ہے اک عمر/اس آرزو میں کہ
جو ساعتیں بچ رہی ہیں/اس کی دمکتی ہوئی خاک کی نذر ہوں/میرا پیکر ہو اور اس کی
آغوش ہو!/میرا پیکر ہو اور اس کی آغوش ہو![۳۹۴]

کراچی سے تعلق رکھنے والے ایک اور اہم شاعر جاذب قریشی کے ہاں بھی شہر کے ان مسائل کا گہرا ادراک موجود ہے۔ وہ اس شہر کو قتل گاہ کی مانند تعبیر کرتے ہوئے نظم ''بے اعتبار موسم'' میں لکھتے ہیں کہ:

میں قتل گاہ میں ہوں/میرے قاتلو آؤ/لہو کے تازہ چمکتے ہوئے اجالوں میں/سیاہ رنگ
اڑاؤ/مجھے شکار کرو/مجھے غبار کرو آؤ میرے پاس آؤ/مجھے قریب سے دیکھو/میں قتل گاہ
میں ہوں[۳۹۵]

احمد ہمدانی بھی اس سیاسی حبس اور گھٹن کو محسوس کرتے ہوئے یہ کہنے پر مجبور ہوئے کہ:

ہر طرف حبس اور دھواں لوگو　　آ گئے ہو یہ تم کہاں لوگو
اڑ رہا ہے غبار سے ہر سو　　خوف کا ہے عجب سماں لوگو
دہشتوں نے جمائے ہیں ڈیرے　　سہمے سہمے ہیں جسم و جاں لوگو[۳۹۶]

بے گناہوں کو ملنے والی سزائیں اور ظلم و بربریت پر اقبال عظیم کی غزلوں میں بھی ایک احتجاجی رنگ دکھائی دیتا ہے۔ جیسے:

ہم سزا کے مستحق ہوتے تو کوئی غم نہ تھا　　بے خطا حکمِ سزا ہو جائے تو ہم کیا کریں
ظلم سے ہم ڈر گئے یہ تم سے کس نے کہہ دیا　　ظلم قانوناً روا ہو جائے تو ہم کیا کریں[۳۹۷]

کراچی کے ایک اور اہم شاعر جون ایلیا بھی شہر کے حالات پر خاصے رنجیدہ دکھائی دیتے ہیں۔ اسی لیے اپنی ایک غزل میں سوالیہ انداز سے اس شہر کی خبر گیری میں مصروف دکھائی دیتے ہیں۔ غزل ملاحظہ کیجیے:

شہر کا کیا حال ہے پوچھو خبر　　آسماں کیوں لال ہے پوچھو خبر
نام سے جس کے کوئی واقف نہیں　　کون وہ قتال ہے پوچھو خبر[۳۹۸]

لاہور سے شائع ہونے والے رسالے ''تجدید نو'' نے ستمبر ۱۹۹۶ء کی اشاعت کو ''کراچی المیہ نمبر'' کے نام سے موسوم کیا۔ اس خاص اشاعت میں بہت سے افسانے اور مضامین کے ساتھ ساتھ متعدد شہر آشوب، نظمیں اور غزلیں بھی شائع ہوئیں۔ اس اشاعتِ خاص میں معروف اور غیر معروف شعرا نے شہر کے حالات پر اپنے اپنے انداز میں مشق سخن کے جوہر دکھائے۔ محمد امین نے اپنی ایک نظم ''مجھے اک نظم لکھنی ہے'' میں تخلیقی بے بسی کا حال کچھ اس طرح بیان کیا ہے:

مجھے اک نظم لکھنی ہے مگر کیسے لکھوں/ نظمیں محبت مانگتی ہیں اور نفرت کے الاؤ میں
/لکھی نظمیں کوئی معنی نہیں رکھتیں/ مرے چاروں طرف بارود ہے اور قتل و غارت
ہے/ محبت سر جھکائے رو رہی ہے اور کبوتر شاخ پر/ غمگین بیٹھا ہے/ کلاشنکوف کے
سائے میں شاعر کانپتا ہے/ سکھ نہیں سکتا/ قلم میری حفاظت کر نہیں سکتا/ یہ میرے لفظ
بے بس ہیں کہ نفرت کو چھپا سکتے نہیں[۳۹۹]

اظہر ضیائی کی بھی ایک تخلیق ''آشوبِ کراچی'' کے عنوان سے شائع ہوئی۔ شہر کے حالات خصوصاً قتل و غارت گری اور دہشت گردی کا منظر نامہ بیان کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ:

کس نے کیا، کیوں قتل کیا، اور کون ہوا کیوں قتل ہوا
اک اک سے یہ پوچھ رہے ہیں میرے شہر کے سارے لوگ
بستی بستی مقتل ہے اور کوچہ کوچہ آہ و بکا
ڈھونڈ رہے ہیں اپنے اپنے قلب و جگر کے پارے لوگ
روتی مائیں، بلکتے بچے، گرتی لاشیں، جلتے مکاں
مہر بہ لب ہیں دیکھ کے کیوں کر یہ دل دوز نظارے لوگ[۴۰۰]

پروفیسر افتخار اجمل شاہین نے بھی شہر کے اسی پس منظر کو مد نظر رکھ کر ''شہر آشوب'' کے نام سے ایک نظم لکھی۔ اس نظم میں ان کا کہنا تھا کہ:

وقت وہ ہے کہ اب تو بچے بھی　　　سہمے سہمے سے گھر میں رہتے ہیں
نیند بھی خوف سے نہیں آتی　　　ایسے منظر نظر میں رہتے ہیں
پہلے حاصل سکوں کی دولت تھی　　　وسوسوں کے اثر میں رہتے ہیں
رقص کرتی ہیں وحشتیں شاہیں　　　ہم یہ کیسے نگر میں رہتے ہیں[۲۰۱]

پوری نظم میں شاعر نے کراچی کے باسیوں کی اس نفسیاتی اور ذہنی کش مکش کا احوال بیان کیا ہے جو واقعی ہر عمر کے لوگوں کے لیے ذہنی کرب کا باعث بن رہا تھا۔

محمد سبطین شاہ جہانی بھی کراچی کی خوش گوار دنوں کی یاد کو تازہ کر کے موجودہ تبدیل شدہ حالات کی زہر ناکی کو کچھ اس انداز سے بیان کرتے ہیں:

یہ کس نے وقت کے ساگر میں زہر گھول دیا　　　نہ خوش گوار فضائیں نہ ساز گار برس[۲۰۲]

تاج سعید نے اپنی نظم ''ستم کاری کا موسم'' میں عام لوگوں کی حالت بیان کی ہے جو روز ان لوگوں کے ستم سہتے ہیں جن کے سیاسی مفادات اس شہر سے وابستہ ہیں۔ ان لوگوں کی بابت شاعر کا کہنا ہے کہ:

کہ ان میں ہی ہمارے اپنے پیاروں کا لہو شامل ہے/وہی پیارے جو گھر سے تلاش رزق
میں نکلے/مگر جو لوٹ کر گھر کو نہیں آئے/ستم کی آندھیوں کا اک بگولا لے گیا/اور ان
کو رزقِ خاک کر ڈالا/وہ ایندھن بن گئے ظلم و ستم کا[۲۰۳]

آثم مرزا نے بھی شہر کے بدلتے منظر نامے کی طرف اپنی نظم ''شہر قائد'' میں واضح اشارے کیے ہیں۔ وہ شہر جہاں محبت کی جگہ نفرت نے لے لی تھی۔ پیار اور مروت کے سبق بھول کر لوگ بربریت کا راستہ اختیار کرنے پر تُلے بیٹھے تھے۔ اس کی منظر کشی کچھ اس طرح کی ہے:

شہر قائد کا مہتاب گہنا گیا/خون ہی خون ہے/آگ ہی آگ ہے... /سارے رخشندہ
چہروں کی تابانیاں/کون بے رحم اب چھین کر لے گیا/سارے اک دوسرے سے
گریزاں ہوئے/اے خدا! شہر قائد کو کیا ہو گیا[۲۰۴]

ماہ طلعت زاہدی کی ایک نظم ''لہو بہہ رہا ہے'' کے عنوان سے شائع ہوئی۔ نظم میں حکمرانوں کی بے حسی اور شہریوں کے رد عمل کی جانب اشارہ کرتے ہوئے شاعر نے کہا کہ:

زمیں پر وہ کیسے خدا کے ہوں نائب/ تکبر میں فرعون/طینت میں گرگِ بد اطوار ہیں جو

/ہمیشہ سے خلقت نے اپنے لہو کے بلا خیز دھاروں سے/ان کے ستم کی فصلیں گرائیں

/سو اب بھی روایت ہے باقی/لہو بہہ رہا ہے [۴۰۵]

کراچی کے الم ناک حالات و واقعات کے تناظر میں لکھی گئی خاور نقوی کی ایک غزل بھی اسی شمارے میں شائع ہوئی شہر میں پھیلی ہوئی خوف و دہشت کی فضا کا نقشہ کھینچتے ہوئے شاعر نے سوالیہ انداز میں مقتدر حلقوں سے یہ پوچھنے کی کوشش کی ہے کہ:

خزاں آثار آندھی نے چمن کو روندھ ڈالا ہے　　　　گلوں پر خوف طاری ہے نجانے اور کیا ہو گا [۴۰۶]

ظاہر سی بات ہے کہ ظلم و بربریت کے اس ماحول میں شہر میں رہنے والے ہر فرد کے ذہن و دل میں یہی سوال تھا کہ اب کیا ہو گا؟ اس صورتِ حال میں شاعر کبھی فریادی بن کر سوال کرتا دکھائی دیتا ہے تو کبھی دوٹوک انداز میں ساغر صدیقی کی طرح یہ مطالبہ کرتا ہے کہ:

ہاں مرے گل، مرے غنچے، مرے لالہ دے دو　　　　تم مرے شہر نگاراں کا اجالا دے دو [۴۰۷]

یاور امان نے اپنے ''شہر آشوب'' میں شہر میں ہونے والی خون ریزی اور بے گناہوں کی اموات پر اسے کربلا سے تشبیہ دیتے ہوئے لکھا کہ:

وہی ابتلا ہے وہی معرکہ ہے　　　　مرا شہر بھی دشتِ کرب و بلا ہے

خدا جانے کس سمت سے موت آئے　　　　دریچے سے کوئی کہاں جھانکتا ہے

جنازوں سے ہیں گورکن بھی پریشاں　　　　لحد کھودتے کھودتے تھک گیا ہے [۴۰۸]

حمایت علی شاعر نے تو اس شہر کو اور یہاں کے حالات کو دیکھتے ہوئے اسے خدا کا قہر تک کہہ ڈالا:

عجیب شہر ہے　　　　خدا کا قہر ہے

ہر ایک آدمی　　　　متاعِ زندگی

لٹا رہا ہے یوں　　　　کہ جیسے اس کا خوں

بدن کا بوجھ ہے　　　　وطن کا بوجھ ہے [۴۰۹]

محمود شام چوں کہ صحافت سے وابستہ رہے لہٰذا شہر کے ہر بدلتے منظر نامے سے وہ پوری طرح واقف ہیں۔ جغرافیائی سطح پر یہ شہر جس طرح ٹکڑوں میں بٹ چکا تھا اور مختلف متحارب گروپ اس پر قبضے کا دعویٰ کر رہے تھے، اس منظر کو بیان کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ:

پہلے تقسیم ملک بھی تھا جہاد — اب محلوں میں سرحدیں ہیں کھینچی[10]

ہمارے سامنے جس طرح ہمارا شہر اجڑ رہا تھا، سڑکوں اور گلیوں پر انسانی نعشیں پڑی ہوئی تھیں، اسپتال زخمیوں سے بھرے ہوئے تھے، عورتوں کے سہاگ لٹ رہے تھے، بچے یتیم ہو رہے تھے لیکن ان حالات کے باوجود لاکھوں کروڑوں لوگ چین کی بنسی بجا رہے تھے۔ ایسے پُر آشوب دور میں محمود شام کی چار نظمیں ''ہمیں انسان رہنے دو''، ''روپوشی''، ''شہر میں را کھشس'' اور ''کراچی'' میں ان کے دل کا کرب بہت نمایاں ہے۔ یہ نظمیں ان کی دل فگاری اور اجڑتے ہوئے شہر کراچی کے لیے فکر مندی اور درد مندی کے حقیقی جذبات لیے ہوئے ہیں[11]۔ ان نظموں کو پڑھ کر ہم بے اختیار یہ کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ شہر میں کوئی تو ہے جو ان بد ترین حالات کا صحیح تناظر میں تجزیہ کر رہا ہے۔ اشعار ملاحظہ کیجیے:

بنامِ دین، حق مانگا/ تو ہم اجڑے/ ہمارے گھر چھُٹے/ ورثے لٹے/ ہم کٹ گئے صدیوں
کے رشتوں سے/ پرانے حق تو کیا ملتے/ نئی محرومیاں ہی ریزہ ریزہ کر گئیں ہم کو![12]

محمود شام ایک دکھی دل کے ساتھ عروس البلاد کی فضاؤں کو زہر آلود ہوتا دیکھ رہے تھے۔ یہاں بارود بھری ہوائیں چل رہی تھیں۔ نادیدہ ہاتھ ''نادیدہ'' ہوتے ہوئے بھی اپنے ہی ہاتھ میں اور اب تو یہی ہاتھ تہذیب و تمدن کی دھجیاں اڑا رہے ہیں۔ جیسے:

لہو بہنے لگا/ کٹنے لگے بازو/ بدن کی دھجیاں اڑنے لگیں/ روحیں تڑپتی ہیں/ ہمارے حق تو
کیا ملتے/ ہمیں پھر بانٹ ڈالا/ کاٹ ڈالا[13]

انھیں اس شہر کی بین کرتی گلیوں نے یہ پیغام سنایا کہ حالات اب اتنی آسانی سے سدھرنے والے نہیں۔ ان حالات پر نوحہ خوانی کرنے کے بجائے مثالی صورت اسی وقت ممکن ہے جب:

حاکمِ وقت نہ جب قتل پہ مہلت مانگیں — خدمتِ خلق پہ مامور نہ خدمت مانگیں
باپ بیٹوں سے نہ جب مالِ غنیمت مانگیں — مائیں بچوں سے نہ جب دودھ کی قیمت مانگیں
جب زمیں پیار سے گر گر کے سنبھلتی ہوگی — کیا سماں ہوگا ملاقات جب اپنی ہوگی[14]

نظموں کے علاوہ ان کی غزلوں میں بھی کراچی کے کرب کو موضوع بنایا گیا ہے۔ بہت سے اشعار ایسے ہیں جو اس زمانے کے ظلم و جبر کا آئینہ دار ہیں۔ جیسے:

اک غزل جس میں کراچی بولے — سن کے جس کو یہ فلک بھی رو لے
خوف کی دھند میں کھوئی گلیاں — کس میں جرأت ہے کہ کھل کر رو لے[15]

افتخار عارف بھی شہر کی اس بے بسی پر دست دعا بلند کرتے ہوئے یہ کہنے پر مجبور ہوئے کہ:

یہ بستیاں ہیں کہ مقتل دعا کیے جائیں   دعا کے دن ہیں مسلسل دعا کیے جائیں[۴۱۶]

اس شہر پر جو شب خون مارا گیا۔ نوجوانوں کو جس طرح سیاسی مخالفت کی بنیاد پر غائب کیا گیا۔ مہینوں بلکہ برسوں تک ہزاروں نوجوان لاپتا کر دیے گئے۔ یہاں کے باسیوں کی دادرسی کا کوئی سامان نہیں کیا گیا۔ اس صورتِ حال پر شہر کی فریاد پیش کرتے ہوئے شاعر کا کہنا تھا کہ:

کسی کے جور و ستم یاد بھی نہیں کرتا   عجیب شہر ہے فریاد بھی نہیں کرتا[۴۱۷]

ظاہر سی بات ہے کہ ان ادیبوں اور شاعروں نے شہر کے بدلتے منظر نامے کو نہ صرف دیکھا بلکہ محسوس بھی کیا ہے۔ شہر میں برسوں سے بد امنی پھیلی ہوئی تھی۔ فائرنگ ہوتی اور لوگ مارے جاتے۔ چوریاں، ڈاکے، اغوا، پُر تشدد جرائم یا واقعات آئے دن ہوتے۔ کبھی رفتار تیز اور کبھی سست ہو جاتی۔ تشدد اور قتل و غارت گری میں گھرا ہوا یہ شہر، شعلوں میں جھلسا ہوا یہ شہر، جہاں ہمیشہ گڑبڑ رہتی ہے، ایسا شہر جسے اس ملک کے جنگ جو حکمرانوں نے جرائم تشدد اور مذہبی جنون کی تاریک جہالت کا زہریلا فضلہ پھینکنے کے لیے کوڑے دان کی طرح استعمال کیا۔ جہاں لوگ نفرت کی بھینٹ چڑھ کر ہاتھوں میں بندوقیں لیے ایک دوسرے پر فائرنگ کر رہے تھے۔ جتھے بنا کر ایک دوسرے کا خون بہا رہے تھے[۴۱۸]۔ فہمیدہ ریاض جب اپنی جلاوطنی گزار کر کراچی واپس لوٹیں اور شہر کی اس صورتِ حال پر جو نظم لکھی اس سے بھی شہر کے بدلتے منظر نامے کا پوری طرح ادراک ہو جاتا ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

> اس شہر میں میں اجنبی یوں نہ تھی میرے خدا/اس کی زمیں، اس کے فلک، اس کی ہوا کو کیا ہوا/پہچان میں آتا نہیں، پہچان بھی پاتا نہیں، مجھ کو کوئی بدلا ہوا سارا آسماں/ہے روشنی اتنی مگر کچھ بھی نظر آتا نہیں/گھر تھے یہاں/رہتے تھے جن میں کچھ مکیں/اک پیڑ تھا اس جا کھڑا/جھولا پڑا تھا ڈال پر/اک دوست رہتا تھا یہاں/کیوں مٹ گئے سارے نشاں؟/اب تو فقط، ہر موڑ پر ہر گام پر/بازار ہے، بازار ہے، بازار ہے... پھر شور اٹھا ناگہاں/لو لڑ پڑے گاہک نئے/خنجر چلی، پستول نکلے، بم پھٹا پھیلا دھواں/دوڑا پولیس کا آدمی سیٹی بجی[۴۱۹]

ملک کے حکمرانوں کی بے حسی اور کراچی کے پیچیدہ حالات سے چشم پوشی پر فہمیدہ ریاض نے کھل کر تنقید کی۔ ان کی بد کرداریوں کا پردہ چاک کیا اور سیاسی چالوں کے نتیجے میں پیدا ہونے والی بے چینی اور بے یقینی کی فضا کو پیش کرتے ہوئے لکھا کہ:

> اس کے حاکم تجھے رلائیں گے/چار سو اتنے ظلم ڈھائیں گے/اس کے باسی نظر بدل لیں گے/تیری ہر سوچ کو کھنگالیں گے/تجھ پر شک کی نگاہ ڈالیں گے/یہ فضا تجھ کو سازگار

نہیں... حکم حاکم یہ برملا کہہ دے/کون غدارِ ملک و ملت ہے/پیشگی اُس کا کر کے دل

میں خیال/کون غدار ہو گا اگلے سال [۴۲۰]

سید معراج جامی نے اس شہر کو بے ضمیروں کی بستی قرار دیا جہاں ظلم سہہ کر بھی لوگ خاموش ہیں اور ظالم طاقت کے نشے میں بدمست ہاتھی کی طرح بستی بستی روند رہا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ:

خوف آنے لگتا ہے/آدمی کی پستی سے/آؤ کوچ کر جائیں/بے ضمیر بستی سے/بے ضمیر

بستی سے، گھر کے سازشی سارے/مجھ پہ حملہ آور ہیں/میری سمت سے ان پر/کیا جوابی

حملہ ہو/میں دفاع میں اپنے/کچھ بھی کر نہیں سکتا/لے گئے ہیں مجھ سے وہ/چھین کر

جواں میرے/تیر اور کماں میرے [۴۲۱]

اقبال سحر انبالوی نے اس بے امان شہر کے کرب کو بیان کرتے ہوئے اپنی غزل میں کہا کہ:

کہا ہے دل نے کوئی سچی داستاں لکھوں ۔۔۔ میں اپنے شہر کو کس طرح بے اماں لکھوں

یتیم بچے تڑپتے یہاں کہاں دیکھے ۔۔۔ کہاں کہاں لٹے بہنوں کے سائباں لکھوں

کوئی تو کہتا ہے غدار کوئی دہشت گرد ۔۔۔ مرا یہ ظرف انھیں پھر بھی مہرباں لکھوں

وہاں پہ شہر کراچی کا ذکر بھی ہو گا ۔۔۔ ستم یزید کی افواج کا جہاں لکھوں [۴۲۲]

محمد فیروز شاہ نے شہر قائد میں پھیلی دہشت اور جگہ جگہ بکھرے لہو کے چھینٹوں کو بڑے کرب سے نہ صرف بیان کیا بلکہ شعرا، ادبا اور دانش وروں کو اس عظیم سانحے کا حل تلاش کرنے کی طرف توجہ بھی مبذول کروائی۔ ملاحظہ کیجیے:

ملول آنکھوں میں رت جگا ہے کہ شہر قائد لہو لہو ہے

دلوں میں کہرام مچ گیا ہے کہ شہر قائد لہو لہو ہے

اجاڑ شاخوں پہ زخم کھائے ہوئے پرندوں کے جھمگٹے ہیں

سسکتی پھرتی ہوئی ہوا ہے کہ شہر قائد لہو لہو ہے

جہاں سے اٹھی ہوئی صدا نے دلوں کو یک جان کر دیا تھا

وہیں اب اک حشر سا بپا ہے کہ شہر قائد لہو لہو ہے

وطن کے شاعر، ادیب، عالم اور اہلِ فضل و کمال آئیں

علاج کوئی تو سوچنا ہے کہ شہر قائد لہو لہو ہے [۴۲۳]

خواجہ رحمت اللہ جری نے بھی شہر کے حالات پر کئی نظمیں لکھیں۔ "قلم اور اسلحہ"، "امن کی فریاد" اور "نامعلوم دہشت گرد" وغیرہ میں شہر کے پُر تشدد ماحول کی عکاسی کرنے کے ساتھ ساتھ امن و آتشی کے لیے کچھ مشورے بھی دیے ہیں۔ اپنی نظم "کراچی کا خریدار کون" میں وہ کہتے ہیں کہ:

اپنے کرتوت کی اچھی یہ سزا پائی ہے ۔۔۔ چاہے قاتل ہو یا مقتول مرا بھائی ہے
بند بازار ہے بکتا ہے لہو انساں کا ۔۔۔ چھپ کے بیٹھا ہے جو لاشوں کا وہ سودائی ہے
مختلف خون کے رنگوں سے سجی ہیں سڑکیں ۔۔۔ ہر طرف ظلم و تشدد کی پزیرائی ہے[۴۲۴]

اپنے ایک اور قطعے میں انھوں نے شہر میں استعمال ہونے والی معروف اصطلاح "نامعلوم دہشت گرد" کو بڑی خوب صورتی سے پیش کیا ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

ہے وقتِ موت معین تو اس میں شک کیا ہے ۔۔۔ جو مارے جاتے ہیں گھر لوٹ کر نہیں آتے
رہیں گے اہلِ تشدد ہمیشہ نامعلوم ۔۔۔ فرشتے موت کے یوں بھی نظر نہیں آتے[۴۲۵]

ہر سو خون، بوری میں بند نعشیں اور گولیوں سے چھلنی جسم کو دیکھ کر نئی نسل خصوصاً نوجوانوں کے ذہن کس طرح نفرت کی آگ میں جل رہے تھے، اس منظر کی عکاسی شہناز مزمل نے اپنی نظم "کراچی جلتا دیکھ کر" میں کی ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

خون کا بہتا دریا دیکھا ۔۔۔ ہر سو موت کا پہرہ دیکھا
ایک الاؤ بھڑکا دل میں ۔۔۔ شہر کراچی جلتا دیکھا
بازی الٹی بکھری دیکھی ۔۔۔ بچپن سہما سہما دیکھا
کچے ذہنوں میں نفرت کے ۔۔۔ ناسوروں کو پلتا دیکھا
زندہ مردہ لاشیں دیکھیں ۔۔۔ اعضا اعضا بکھرا دیکھا[۴۲۶]

امن و امان کی بگڑتی صورتِ حال اور روز بروز کی خراب حالت پر پیرزادہ حمید صابری نے اپنی نظم "اے شہر کراچی" میں لکھا کہ:

گلیوں سے تری امن و محبت ہے گریزاں ۔۔۔ اے شہر کراچی تیرا اللہ نگہباں
کیوں امن کی خوشبو ترے پھولوں سے خفا ہے ۔۔۔ کیوں ظلم و ستم تیرے گلستاں پہ روا ہے
پہنا کے تجھے خون کی پوشاک ستم گر ۔۔۔ روزانہ بپا کرتے ہیں یہ کس لیے محشر[۴۲۷]

یہ خوف کے سائے تقریباً اس عہد کے ہر شاعر نے محسوس کیے اور اس ماحول اور فضا کو شعری جامہ پہنایا۔ فیروز خسرو نے کراچی کی صورتِ حال پر ایک غزل میں لکھا کہ:

آئی ہوئی ہے خوف کی اک لہر ان دنوں　　آسیب کی ہے زد میں مرا شہر ان دنوں

اک دوسرے سے دست و گریباں ہیں آج کل　　ڈھایا ہے دوستو نے بڑا قہر ان دنوں[۴۲۸]

اپنی ایک نظم "یقین" میں انھوں نے کراچی کے باسیوں کے روز و شب کا حال بیان کرتے ہوئے خوف اور سراسیمگی کے عالم میں کیے گئے اقدامات اور اس خوف سے چھٹکارے کے تدارک کی بابت لکھا کہ:

یہ خوف و دہشت کا دور دورہ رہے گا کب تک　　گلی گلی کوچہ کوچہ پہرہ رہے گا کب تک

یہ آگ، جنگل کی آگ کب تک　　فلک سے برسے کی راکھ کب تک

یہ پھول، پتے، ہوائیں، موسم　　کریں گے کس کس کا اور ماتم[۴۲۹]

مختلف طبقوں اور گروہوں کے درمیان تعصبات کی لہر نے جو دوریاں پیدا کر دی تھیں، اس نے شہر کو تقسیم در تقسیم کے عمل سے دوچار کر رکھا تھا۔ اس تقسیم کے نتیجے میں کراچی کی روشنی بھی ماند پڑ گئی تھی۔ خالد ندیم نے اپنی ایک غزل میں اس بابت لکھا کہ:

بچپن سے سُن رہے تھے جسے روشنی کا شہر　　اب دن کو بھی وہ تیرہ شبی کی مثال ہے

یوں تو "تعصبات" ہے اس داستاں کا نام　　لیکن ندیم دیکھتا موضوع "زوال" ہے[۴۳۰]

اسی بے رونقی کی طرف فدا خالدی نے بھی اشارہ کیا ہے۔ اپنی نظم "کراچی" میں وہ انسانوں سے بھرے اس جنگل کی ویرانی کا احوال بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

ایک انبوہ نظر آتا ہے مظلوموں کا　　شہر کا شہر ہی مصروفِ فغاں ہے یارو

سڑکیں ویران نظر آتی ہیں گلیاں سنسان　　وہ جو رونق تھی کبھی آج کہاں ہے یارو

لوگ سڑکوں سے گزر جاتے ہیں سائے کی طرح　　زندگی جیسے انھیں بارِ گراں ہے یارو[۴۳۱]

شہر میں رہنے والوں کی بے بسی، خوف اور بے چارگی کا نقشہ کھینچتے ہوئے انھوں نے انسان کی ذہنی کش مکش کو کچھ اس طرح سے بیان کیا ہے:

شہر خالی نہیں ہے خطروں سے　　آدمی جائے تو کہاں جائے

گھر میں بیٹھے تو بھوک مارتی ہے　　باہر آئے تو گولیاں کھائے[۴۳۲]

اس شہر کے باسیوں کو مشورہ دیتے ہوئے انھوں نے ہر طرح کے متعصبانہ رویے کو ترک کرنے اور محبتوں کے دیپ جلانے کی طرف توجہ دلائی ہے۔ وہ لوگ جو اپنے ہاتھوں اپنا گھر جلانے پر تلے بیٹھے تھے، ان کی بابت فدا خالدی کا کہنا تھا کہ:

عداوتوں کو جگانے کا فائدہ کیا ہے　　خود اپنا شہر جلانے سے فائدہ کیا ہے

حنا بدوش درختوں سے سرخیاں لے لو　　لہو سے ہاتھ رچانے سے فائدہ کیا ہے[۴۳۳]

نجم الحسن عطانے بھی اس قتل و غارت گری کے مناظر سے شہر میں پھیلی دہشت کی فضا کو پیش کرتے ہوئے اپنی نظم "سوال" میں کہا کہ:

غسلِ خوں قتل و غارت گری/ان دنوں رسمِ شہر نگاراں ٹھہری/راستوں پر جما خوں ہی خوں کا کلف/آسماں پر بجھی ماتمی چاند تاروں کی صف/پیشہ ور قاتلوں کے بنے کتنے چہرے ہدف.../میرے چاروں طرف راکھ کا ڈھیر ہے/سامنے جسم جلنے کی بو، ہڈیوں کے ببول /ہر طرف سنسناہٹ، دھواں، سہمے سہمے مکیں/یہ زمیں ــــ یہاں گولیاں کاشت ہوتی ہیں[۴۳۴]

کراچی نے ہزاروں نوجوانوں کی نعشیں دیکھی ہیں۔ وہ نعشیں کسی نہ کسی ماں کے لاڈلے اور بہنوں کے پیارے تھے۔ وہ نوجوان کسی کے سہاگ تھے تو کسی بزرگ کے بڑھاپے کا واحد سہارا۔ ان نوجوانوں کو سرکاری سطح پر اور کبھی نامعلوم دہشت گردوں کی اصطلاح استعمال کر کے منوں مٹی تلے پہنچادیا گیا۔ اغوا کر کے ان کے جسم کے ہر حصے کو اذیت ناک انداز سے نوچا گیا۔ منہ پر ڈھاٹا باندھے مخالف جماعت کے سیاسی کارکن ہوں یا سرکاری ایجنسی کے لوگ، دونوں جانب سے ماؤں کو ایک ہی دھڑکا لگا رہتا تھا کہ گھر سے اٹھالے جانے کے بعد ان کا بیٹا گھر واپس لوٹ کر آئے گا یا نہیں۔ فوقیہ مشتاق نے اپنی نظم "ہمارے شہر" میں انھی جذبات کی عکاسی کرتے ہوئے لکھا کہ:

وہ جو اغوا ہوا ہے/اس کی ماں کے دل سے پوچھو/کہ ہر آہٹ پر اس کا دل/دھڑکنا بھول جاتا ہے/اسے لگتا ہے جیسے/موت کا پیغام آیا ہے/کوئی اس کے جوان بیٹے کی شاید/لاش لایا ہے/مگر ایسا نہیں ہوتا/کئی دن بیت جاتے ہیں/کئی دن بعد یہ اخبار سے معلوم ہوتا ہے/کہ وہ لختِ جگر/جو ماں کے جینے کا سہارا تھا/خوشی تھا، روشنی تھا/چاند تھا، سورج تھا، تارا تھا/اسی کی لاش بے گور و کفن /ویران گوشے میں پڑی پائی گئی ہے /تشدد کے نشانوں سے/بدن کا کوئی بھی حصہ /نہیں باقی بچا ہے[۴۳۵]

فوقیہ مشتاق کے مطابق اس شہر میں بسنے والی ہر ماں کو ہر گھڑی اپنے جوان بچوں کے لیے بس یہی فکر لاحق رہتی تھی کہ:

میں لرز سی اٹھتی ہوں/مجھ کو خوف آتا ہے/سوچ کر بھی وہ لمحہ/جب کہیں سے اک گولی/اس کے چوڑے سینے کے/آر پار ہو جائے[۴۳۶]

اس عہد میں ایک اور اہم شاعرہ گلنار آفرین کی شخصیت بھی محتاج تعارف نہیں۔ ان کا مزاج بھی اپنے گرد و پیش کی زندگی اور اس کی کرب ناکیوں سے بے نیازانہ گزرنے نہیں دیتا۔ وہ ایسے انسان دوست اور درد مند دل کی مالکہ تھی جو انسانی دکھ درد سے آنکھیں بند کر کے گزرنا بھی چاہے تو نہیں گزر سکتی۔ اپنے گرد و پیش کی زندگی پر ان کی نظریں پوری طرح جمی ہوئی تھیں۔ اسی لیے زمانے کی ساری ناہمواریوں کو انھوں نے اپنے شاعری کا موضوع بنایا۔ بعض اوقات زندگی کی ایسی سچی تصویر ہمارے سامنے پیش کی ہے کہ جنھیں پڑھ کر ہماری آنکھیں نم ہو جاتی ہیں[۳۷]۔ فسادات، ہنگامے اور قتل و غارت گری کے بعد شہر میں جو ویرانی پھیلی ان مناظر کو پیش کرتے ہوئے گلنار آفرین نے بہت سے اشعار کہے۔ مثلاً:

یہ شہرِ وفا اور بھی ویران نہ ہوتا　　اے گردشِ دوراں ترا احسان تو ہوتا

رو دیتی سرِ صحنِ چمن بادِ صبا بھی　　شیرازۂ گل اتنا پریشان تو ہوتا

ہو تو سکتا ہے گلستاں بھی گلستاں لیکن　　جانے کیا سوچ کے تم آگ لگا دیتے ہو

اب یہاں موت کے سائے کے سوا کچھ بھی نہیں　　شہرِ جاناں میں کسے آ کے صدا دیتے ہو

اے شہرِ ستم پیشہ بتا کس کو صدا دوں　　اب کون رہا ہے جسے پیغامِ وفا دوں

کون مانگے گا خوں بہا میرا　　کون آئے گا ساتھ مقتل میں

گھر کی دہلیز جل رہی تھی مری　　اور دھواں چھا رہا تھا جنگل میں

ہے شفق خون میں ڈوبی ڈوبی　　ہاتھ اٹھاؤ کہ مناجات کریں[۳۸]

شہر کراچی کے منظر نامے اور خونی مناظر کی عکاسی ان کی متعدد نظموں میں کی گئی ہے۔ ”لمحات فکر“، ”مقتلِ جاں“، ”کراچی تہہِ خاک“ وغیرہ میں انھوں نے شہر کی تباہ حالی اور ظلم و جبر کو موضوع بنایا ہے۔ اپنی طویل نظم ”وقت کا مسیحا“ میں بھی ان مناظر کی عکاسی کرتے ہوئے کہا کہ:

ہیں مقدر اب بنامِ امن چلتی گولیاں / شہر ہے شہرِ خموشاں / بستیاں ویران، گھر ہیں مہ
کدے / غم زدہ ماؤں کے آنسو ہر طرف بکھرے ہوئے / اور آسماں اوڑھے ہوئے چادر
سیاہ / وحشتیں رقصاں یہاں شعلوں کے بیچ[۳۹]

شہر کے حالات پر سچ بولنا کوئی آسان کام نہ تھا۔ گلنار آفرین نے تمام تر مصلحتوں کو بالائے طاق رکھ کر حق اور سچ کے لیے آواز بلند کی۔ وہ شاعری میں اس مکتبِ فکر کی نمائندہ تھیں جس کے مطابق:

گلنار مصلحت کی زباں میں نہ بات کر　　وہ زہر پی کے دیکھ جو سچائیوں میں ہے[۴۰]

اسی جرأتِ اظہار اور حق گوئی کو انھوں نے شاعری کی بنیاد بنا کر کراچی کے سیاسی حالات کی سچی تصویر کشی کرتے ہوئے کہا کہ:

کس میں دم تھا جرأت اظہار کر سکتا تھا کون — سر اٹھانے کی سزا تھی قید، زنداں، بیڑیاں

حق طلب کرنے کا تھا انعام مرگِ ناگہاں — رات آتی تھی تو چاروں سمت لہراتا تھا خوف

صبح دم سورج جو آتا تھا تو لہراتا تھا خوف — سرخیِ خونِ شفق کو دیکھ کر آتا تھا خوف[۴۴۱]

نقاش کاظمی نے بھی اس شہر کے بدلتے سیاسی منظر نامے کو نہ صرف قریب سے دیکھا بلکہ روشنی کے اس شہر میں ہونے والے خوں ریز فسادات اور اس کے نتیجے میں اٹھنے والے جنازوں پر بھی آنسو بہائے۔ شہر کی بے چین فضا پر ساحر لدھیانوی کی طرز اختیار کرتے ہوئے اپنی نظم ''ایک سوال'' میں انھوں نے کہا کہ:

بولو کہ یہ میت کس کی ہے بولو یہ جنازہ کس کا ہے — یہ کس کا ستوں ہے کون گرا یہ کون ہے کس کا خون بہا

اَن مول بہاروں کے جیسے یہ جلتے خزانے کس کے ہیں — بہتے ہوئے خوں کی تھاپ سنو ماتم کی صدائیں کس کی ہیں

کیا شہر وفا کے دامن میں بس آگ، دھواں اور شعلے ہیں — کیا شہر وفا کی قسمت میں بس مقتلِ جاں کے تحفے ہیں[۴۴۲]

اپنی غزلوں میں بھی نقاش نے شہر کی سوگ وار کیفیت کا جا بجا تذکرہ کیا ہے۔ سماجی ناانصافیوں اور مہاجروں کے ساتھ ہونے والے ناروا سلوک پر ان کا دل خون کے آنسو رویا۔ کبھی ایوب خان کی دھمکی کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ:

یارو اب کس کو سمندر کا پتا دیتے ہو — اب کے ہم لوگ بنائیں گے تو گھر پانی میں[۴۴۳]

اور کبھی شہر میں موجود گھٹن اور نفرت انگیز فضا کا نقشہ کھینچتے ہوئے کہا کہ:

یہ مانتا ہوں بہت رات ہے اندھیرا ہے — گھٹن بھی ایسی کہ جس کی کوئی مثال نہیں

لے گئی رنگ و بو شہر کی نا سمجھ ہوا — کر گئی دل کو پھر لہو شہر کی نا سمجھ ہوا

ہم نہ رہے تو دیکھنا کس پہ کرے گی ناز وہ — تنہا پھرے گی کو بہ کو شہر کی نا سمجھ ہوا

میں بھی ہوں نفرتوں کے بیچ تو بھی ہے قتل گاہ میں — کاٹ نہ دے رگِ گلو شہر کی نا سمجھ ہوا[۴۴۴]

کراچی سے تعلق رکھنے والے ایک اور اہم شاعر عارف شفیق کے ہاں بھی اس شہر میں ہونے والے سانحات کا اظہار جا بجا دکھائی دیتا ہے۔ وہ استیصالی ٹولے کی سازشوں اور متعصبانہ رویوں پر شدید احتجاجی رویہ اختیار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

کراچی شہر کی رونق کو لوٹنے والے — جو بس میں ہو تو سمندر اٹھا کے لے جائیں[۴۴۵]

غربت و افلاس، محرومی و استیصال اور سازشوں میں مصروف حکمراں ٹولے کے خلاف بالحقیقت صدائے احتجاج بلند کر کے انھوں نے بلکتے سسکتے عوام کے دلوں سے نکلنے والی آہ کو اپنی شاعری میں پیش کیا۔ ان کی تخلیقات میں احتجاج، درد اور ظلم کے

خلاف نفرت کا لاوا ابلتا ہوا محسوس ہوتا ہے[۴۴۶]۔ اپنے اشعار میں مقصدیت کو عارف شفیق پوری طرح برتتے نظر آتے ہیں۔ اشعار ملاحظہ کیجیے:

وار کر سکتا تو ہوں میں اپنے دشمن پر مگر   سوچتا ہوں درمیاں پھر فرق کیا رہ جائے گا

یہ اپنے عہد کے حالات کو سمجھتے ہیں   اداس ہوگئے بچے بھی سب بڑوں کی طرح

لوگوں کے چہروں پر ان کے دل کا حال لکھا ہے یا   سڑکوں پر اخباروں کے کالم آوارہ پھرتے ہیں

ہر شخص ملا ہے مجھے بے گانہ سمجھ کر   میں اپنے ہی ماحول میں غیروں کی طرح ہوں

اب کارواں کو راہ میں لٹنے کا ڈر نہیں   جو راہ زن تھے قافلہ سالار بن گئے

چلی ہے شہر میں اب کے ہوا جو سر پھری لوگو   بہت ممکن ہے چہروں سے نقابوں کو الٹ جائے

لوگ سڑکوں پہ آگئے عارف   وقت کروٹ بدلنے والا ہے

زمیں سے آئے ہیں یا آسماں سے آئے ہیں   عذاب شہر پہ جانے کہاں سے آئے ہیں

سانس لیتے ہوئے بھی ڈرتا ہوں   زہر ہے شہر کی ہواؤں میں

شب خون پھر ہے مارتا لشکر یزید کا   اس شہر میں بھی کوئی حسینی نہیں رہا

ان کی نظروں میں یہ بغاوت ہے   میرے لہجے میں جو صداقت ہے

بھوک کی گود میں ہر جرم جنم لیتا ہے   فاقے انسان کو ڈاکو بھی بنا دیتے ہیں

حق دے رہا ہے کیوں مجھے خیرات کی طرح   کیوں بات کر رہا ہے تو چہرہ بگاڑ کے

اس شہر کی فضا میں وہ نفرت کی آگ ہے   بازار سے میں لوٹا ہوں اکثر لہو میں تر

فضا میں شہر کی جانے یہ کیسے ڈر جاگے   بڑوں کے ساتھ یہاں بچے رات بھر جاگے

کراچی شہر کی پہلی سی رونقوں کے لیے   جو بے اثر ہوئیں عارف دعائیں روتی ہیں[۴۴۷]

عارف شفیق کے مطابق بزرگوں نے انھیں نفرت، تعصب، حسد، خود نمائی، جھوٹی انا، خود غرضی، جھوٹ، فریب، احساسِ محرومی اور حرص ولالچ کے سوا کچھ نہیں دیا[۴۴۸]۔ وہ اس صورتِ حال کو بدلنے کے خواہش مند دکھائی دیتے ہیں لیکن کچھ نا معلوم قوتیں ان حالات کو بدلنے نہیں دیتیں۔ اس پس منظر میں ان کا کلام ملاحظہ کیجیے:

نوکِ قلم سے کاٹ رہا ہوں پسپائی اور خوف   ایک جگہ کب رہ سکتے ہیں سچائی اور خوف

ایسا امن ہوا ہے قائم شہر قائد میں   چیخ رہے ہوں جیسے مل کر شہنائی اور خوف

بھاری بوٹ کی چاپ میں دب گئی اک سہمی سی چیخ   رقص میں ہے پھر سرخ لہو کی پروائی اور خوف

روز جنازے اٹھتے ہیں مظلوموں کے　　شہر کے میرے ظالم مت کشمیر بنا

اپنی دھرتی سے بچھڑ کر میں تو ویراں ہوگیا　　ہیں یہاں سب ہی پرائے رنگ خوشبو روشنی

پھر گونج اٹھا شہر جو بوٹوں کی چاپ سے　　سہمے ہوئے ہیں لوگ سبھی اپنے آپ سے

شہر میں قتل کرنے والے ہاتھ　　تھے سبھی کے ہی دیکھے بھالے ہاتھ

سندھ کی دھرتی ہی پر ہم کو　　اب ہے جینا مرنا سائیں[449]

سیاست دانوں نے نفرت کا جو بیج بویا تھا اس نے سندھ میں رہنے والے دو بڑے طبقات سندھیوں اور اردو بولنے والوں کے درمیان وسیع خلیج پیدا کر دی تھی۔ یہ دونوں نفرت کی آگ میں جل کر اپنا ہی گھر بھسم کرنے پر تُلے بیٹھے تھے۔ اس منظر کی عکاسی کرتے ہوئے عارف شفیق کا کہنا تھا کہ:

سیاستوں نے بچھائے ہیں جال دونوں طرف　　دلوں کے شیشے میں آیا ہے بال دونوں طرف

اِدھر بھی ظلم و ستم ہے اُدھر بھی جبر و قید　　ہے ایک جیسا ہی لوگوں کا حال دونوں طرف[450]

نفرت اور تعصب کے نتیجے میں پیدا ہونے والی صورتِ حال اور استیصال پر وہ بلبلا کر یہ کہنے پر مجبور ہوئے کہ:

چالیس سال سے اس دھرتی پہ بے گھر ہیں ہم لوگ　　اتنے بے بنیاد نہیں تھے آزادی سے پہلے

جو دھرتی کی آزادی کے مجرم تھے　　ان کی اولادیں ہیں زندانوں میں قید

مقتل تھا یا شہر کراچی اے عارف　　بوڑھے بچے سب ہی تھے تھانوں میں قید

لہو لہو مری گلیاں بجھے بجھے چہرے　　لگی ہے کس کی مرے شہر کو نظر آخر

بچے گلیوں میں کھیلتے کیسے　　دل میں خوف وہراس بیٹھا تھا

یہ قومیں یہ زبانیں اور عقیدے　　بنیں گے قتل کی بنیاد کب تک

یہ دلّی کی طرح اجڑا کراچی　　نہ جانے ہوگا پھر آباد کب تک

یہ کون لوگ ہیں کہ جو گلیوں کے موڑ پر　　بیٹھے ہیں مرے شہر کو زنداں کیے ہوئے

گھر جل رہے ہیں روشنی پھیلی ہے ہر طرف　　عارف ہیں لوگ کیسا چراغاں کیے ہوئے

سوتے میں بزدلوں نے جنھیں کر دیا شہید　　عارف شفیق کیسے وہ کڑیل جوان تھے

نہیں ہے شہر میں فریاد کی بھی آزادی　　یہ کیسا قہر ہے چھپ چھپ کے رو رہے ہیں لوگ

سب کے چہروں پہ لکھا ہے قبرستان کا سناٹا　　روز یہ کس پہ روتے ہیں ہم روز کسے دفناتے ہیں

عذاب کیسے مرے شہر پر اتارے گئے　　جو لوگ جان سے بڑھ کر تھے مجھ کو پیارے گئے

بلند امن کا پرچم تھا سرحدوں پہ مگر مرے ہی شہر پر لشکر مرے اتارے گئے
لہو سے دیپ جلانے کی رُت میں پھر عارف نہ جانے کتنے ہی ماؤں کے چاند تارے گئے
شہر کراچی شہر نگاراں اب مثلِ بیروت ہوا عارف جیسا آوارہ بھی گھر سے نکلتے ڈرتا ہے
وہ میرے شہر میں پھر قتلِ عام کروا کر عجیب شان سے بیٹھا ہے سوگواروں میں[۴۵۱]

نوّے کی دہائی کی سیاست میں تشدد کے عنصر نے اس شہر کو بُری طرح اپنے شکنجے میں جکڑ رکھا تھا۔ آئے دن کی ہڑتالیں، گرفتاریاں، بوری بند نعشیں اور سیاسی مخالفین کو صفحۂ ہستی سے مٹانے کے علاوہ عام شہریوں کو جس ذہنی کرب کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا، اس کا احساس تک حکمرانوں کو نہ تھا بلکہ عام شہریوں کے ساتھ پولیس اور رینجرز کے ناروا سلوک، بے گناہوں کی گرفتاریاں اور ماورائے عدالت قتل نے پورے شہر میں ایک سوگ وار فضا پیدا کر دی تھی۔ یہ سوگ واری بعض اوقات بے چینی کا روپ دھار کر شہر میں ہنگامے اور خوف وہراس کو بڑھاوا دے رہی تھی۔ اس صورتِ حال کی عکاسی عارف شفیق نے جس طرح سے اپنے اشعار کے ذریعے کی ہے اس کی مثال کم کم ملتی ہے۔ کچھ اشعار ملاحظہ کیجیے:

ہوگی پھر تفتیش مجھ سے ایک مجرم کی طرح اس طرح مجھ کو بغاوت پر ابھارا جائے گا
لکھ دیا ہے پھر کسی نے سچ ہر اک دیوار پر پھر لگے گی آگ پھر شب خون مارا جائے گا
چاپ بھاری بوٹ کی گونجے گی اور پھر اس کے بعد رات کاٹی جائے گی کب دن گزارا جائے گا
باندھ کر آنکھوں میں پٹّی مجھ کو میرے شہر میں مجرموں کی طرح گلیوں سے گزارا جائے گا
لاش بوری میں ملے گی پھر اُسی مظلوم کی اس بہانے پھر کوئی لشکر اتارا جائے گا[۴۵۲]

قانون نافذ کرنے والوں کے کردار اور شہریوں کے ساتھ روا رکھے جانے والے ناروا سلوک کی جیسی منظر کشی عارف شفیق کے ہاں ملتی ہے، بہت کم شاعر کے ہاں ایسی مثال ملے گی۔ ظلم و جبر کے نت نئے طریقوں اور بے گناہ لوگوں کے ساتھ ہتک آمیز سلوک اس دور کے کراچی میں عام تھے۔ شاعر نے اس صورتِ حال پر اپنے کرب کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ:

کتنے گھروں کے پہلے بجھائے گئے چراغ پھر پیش کیسی کیسی نہ تاویل کی گئی
جس نے ہمارا شہر کھنڈر میں بدل دیا اس سے ہماری سوچ نہ تبدیل کی گئی
جاری ہوا جو حکم نیا شہر کے خلاف کس کس طرح نہ حکم کی تعمیل کی گئی
پھر گولیوں سے گونج اٹھی ہیں سماعتیں جب بھی کسی کی سوگ میں تعطیل کی گئی
ہر ایک گھر میں رات تلاشی کے نام پر عارف شفیق پھر مری تذلیل کی گئی[۴۵۳]

ایک طرف دہشت گردوں کے ٹولے نے شہر کو یرغمال بنا رکھا تھا تو دوسری جانب قانون نافذ کرنے والے ادارے اور حکمران سیاسی جماعتوں نے بھی اپنی طاقت اور اقتدار کے نشے میں چُور ہو کر عوام کو یرغمال بنا رکھا تھا۔ ظلم کا کون سا ایسا طریقہ تھا جو ان لوگوں نے اختیار نہ کیا ہو۔ جیل اور تھانے میں ملزموں کی ہلاکتوں کا معاملہ ہو یا بے گناہ ہزاروں گرفتاریاں، ان مناظر کو عارف شفیق نے کھل کر بیان کیا ہے۔ کبھی سیاسی افہام و تفہیم کے نام پر قاتل اور مقتول ایک دوسرے سے ہاتھ ملا رہے ہیں، تو کبھی اختلاف کی وسیع خلیج پیدا ہونے کے بعد لوگوں کی زندگی چھینی جا رہی ہے۔ جیسے:

میں راکھ ہوتے ہوئے شہر میں بجھے دل سے
چلا ہوں ہاتھ ملانے خود اپنے قاتل سے

مر گیا ملزم تشدد سے جو رات
لاش خاموشی سے دفنا دی گئی

عارف شفیق شہر سے مقتل کا راستہ
بہتے ہوئے لہو کے سبب پاک ہو گیا

نفرت کی آگ کتنے گھروں کو جلا گئی
اک بھیڑ سی لگی تھی کفن کی دکان پر

قتل ہو جاتے ہیں انساں اب بھرے بازار میں
کوئی بھی دیتا نہیں لیکن شہادت دیکھ کر

میرے شہر میں پھیل رہے ہیں ظلم و جبر کے سائے
کتنی ماؤں کے بچے پھر گھر کو لوٹ نہ پائے

ظلم اگر اب بھی نہ رکا تو پھر یہ ڈر ہے مجھ کو
مرے قبیلے کا ہر بچہ باغی بن ہی نہ جائے

کتنی مانگیں سونی ہوئیں اور کتنی ماؤں نے
اپنے دل کے چاند اور سورج مٹی میں دفنائے

میرا ہی لہو ہے جو بہہ رہا ہے سڑکوں پر
قتل کا مرے الزام اس لیے مجھی پر ہے

جدا جو ہوگئے ساتھی کچھ ان کا غم بھی کرنا ہے
کسی بھی جشن سے پہلے ہمیں ماتم بھی کرنا ہے

ہر اک شخص یہاں ظلم کا نشانہ ہے
لپٹ کے روتے ہیں سب ہی یہاں دعا سلام کے بعد

وہ دفتروں سے ہی مقتل کی سمت جا نکلے
گھروں کو لوٹ رہے تھے جو اپنے کام کے بعد[۴۵۴]

جب شہر کو سخت مایوسیوں نے گھیر لیا اور ہر طرح کی خوشیاں مفقود ہو گئیں تو عارف شفیق نے اس صورتِ حال کی منظر کشی کرتے ہوئے لکھا کہ:

کوئی بزم کیا سجاؤں مرا شہر جل رہا ہے
بھلا کیسے مسکراؤں مرا شہر جل رہا ہے

ترے شہر میں چراغاں مرے شہر میں اندھیرا
کوئی دیپ کیا جلاؤں مرا شہر جل رہا ہے

اسی آگ میں جلوں گا اسی خاک میں ملوں گا
اسے کیسے چھوڑ جاؤں مرا شہر جل رہا ہے

جن ہاتھوں میں عکس تھے تتلی پھولوں کے
ان ہاتھوں میں اب بارود کا گولہ ہے

بلکتے بچوں کو کیسے بھلا یہ سمجھاؤں
محاصرہ ہے میں گھر سے نکل نہیں سکتا

ہمارے شہر کی سڑکوں پہ عارف لٹیرے پھر رہے ہیں وردیوں میں
قید گھر میں ہو کے اپنے رہ گئے سب خوف سے جتنے قاتل تھے ضمانت پر وہ باہر آ گئے
زمیں پر ہر طرف مقتل سجے ہیں ہر اک دل نفرتوں سے اٹ چکا ہے
اداس یوں ہے عروس البلاد کا چہرہ اجڑ گئے ہوں حسیں خواب جیسے دلہن کے
علم کی سند بھی ہے ہاتھ میں ہنر بھی ہے پھر بھی میرے بچوں کو نوکری نہیں ملتی
اپنے ہی لہو سے تو شہر میں چراغاں کر بھیک میں بھی عارف روشنی نہیں ملتی
مرے تو لوگ مارے جا رہے ہیں تجھے کس بات کا غم ہو رہا ہے
نہ جانے کیوں مرے اشعار پڑھ کر امیر شہر برہم ہو رہا ہے
یہ مرا شہر جو راتوں کو جاگتا تھا کبھی اب اس کے لوگ سرِ شام گھر میں قید ہوئے
جہاں قاتل ہو میرا منصف ہی اس عدالت سے کیا ملے گا مجھے
وہاں راہ بر نے لا کر ہم کو چھوڑا جہاں اب سامنے بند اک گلی تھی[۴۵۵]

شہر میں اداروں کی جانب داریاں، عدالتی استیصال، ریاستی مظالم اور انسانی بے حسی کی بہت سی تصاویر عارف شفیق کے اشعار میں ملتی ہے۔ ان کی شاعری سے ہم کراچی کے سیاسی اور سماجی منظر نامے کی پوری تصویر دیکھ سکتے ہیں۔ جیسے:

ثبوت مل گئے جب میری بے گناہی کے تو کس لیے مجھے منصف بری نہیں کرتے
پہنچ نہ سکتے تھے قاتل مرے ٹھکانے تک مرے ہی لوگ اگر مخبری نہیں کرتے
جرمِ حق گوئی کی تم ہم کو سزا دے کر اور بھڑکاؤ گے یہ آگ ہوائیں دے کر
جانے کس خوف سے سہمی ہوئی گم صم سی ہیں مائیں بچوں کو جوانی کی دعائیں دے کر
کراچی شہر کی رونق کو لوٹنے والے جو بس میں ہو تو سمندر اٹھا کے لے جائیں
وہ میرے شہر میں پھر قتلِ عام کروا کر عجیب شان سے بیٹھا ہے سوگواروں میں[۴۵۶]

ڈاکٹر سکندر مطرب نے بھی سندھ کے شہری علاقوں میں ہونے والے مظالم اور استیصال پر بہت سی نظمیں لکھیں۔ شہر آشوب کا انداز اختیار کرتے ہوئے اس اجڑے گلشن کی ہر چیز سے اپنی وابستگی کا اظہار کرتے ہوئے انھوں نے استفہامیہ انداز میں کہا کہ:

اے مرے شہر بتا اے مرے دل دار بتا مرے اجڑے ہوئے گلشن! اے مرے یار بتا
ترے کوچے تری گلیوں کی فضا کیسی ہے ترے قاتل ترے دشمن کی ادا کیسی ہے

ہر جواں بچہ تری گلیوں میں مرتا کیوں ہے　　آج تو اپنے ہی رکھوالوں سے ڈرتا کیوں ہے
اے مرے شہر تری گلیوں میں کیا خون جواں　　صبح سے شام تلک اب بھی یونہی بہتا ہے
اب بھی کیا تجھ پہ ستم ہوتے ہیں سب روتے ہیں　　ترے برباد مکیں کون سی شب سوتے ہیں[۵۷]

شہر کی مایوس فضا اور روز بروز ہونے والے اندوہ ناک واقعات پر منظر بھوپالی بھی یہ کہنے پر مجبور ہوئے کہ:

ہمارے شہر میں ہر روز اک قیامت ہے　　یہاں کسی کو کسی کی خبر نہیں معلوم[۵۸]

حق اور سچ کہنے کی پاداش میں شہر کے لوگوں کو جس قسم کی سزاؤں کا سامنا کرنا پڑتا اس کا اندازہ خالد معین کے اس شعر سے لگایا جاسکتا ہے:

حرفِ حق کوئی زبان پر نہیں ملنے والا　　سر اٹھایا تو یہاں سر نہیں ملنے والا[۵۹]

اسی طرح شہر کی تبدیل ہوتی سیاسی فضا اور اس میں موجود پُر تشدد عناصر کو دیکھ کر مصطفیٰ عزیز آبادی بھی یہ کہنے پر مجبور دکھائی دیتے ہیں:

میرا شہر اجڑ گیا اب شکلِ گلستاں نہیں　　صحنِ چمن اداس ہے گلشن میں وہ سماں نہیں[۶۰]

جدید دور میں بعض آزاد اور نثری نظم لکھنے والے شعرا نے بھی کراچی کو اپنا موضوعِ سخن بنایا۔ اس حوالے سے ایک اہم ترین آواز ذیشان ساحل کی ہے۔ اپنی نظموں کی بابت خود شاعر نے لکھا کہ کراچی کے لیے لکھی گئی یہ نظمیں ایک مشترکہ اثاثہ ہیں۔ ان نظموں میں اس شہر کے ذرے سہمے باسیوں کی آواز بھی ہے اور اس کے دکھوں کی چیخ بھی'[۶۱]۔ یہ نظمیں کسی رنگ، نسل، قوم یا زبان سے تعلق رکھنے والے لوگوں کے لیے نہیں بلکہ ہر اس شخص اور اس شہر کے لیے ہیں جو شہر کی بدترین صورتِ حال سے دوچار ہوئے۔ خود شاعر نے کہا کہ یہ نظمیں مئی ۱۹۹۵ء کے آخری ہفتے سے لے کر اگست ۱۹۹۵ء کے پہلے ہفتے تک مسلسل کراچی میں رہتے ہوئے لکھی گئیں۔ ظاہر سی بات ہے کہ یہ تمام عرصہ کراچی والوں کے لیے جس اذیت سے گزرا اس کی روداد اس دور کے اخبارات میں دیکھی جاسکتی ہے۔ روز اس شہر میں حادثے جنم لے رہے تھے اور آئے دن دہشت اور خوف کے سائے بڑھتے جارہے تھے۔ باوجود ان مسائل اور مشکلات کے اس شہر کے رہنے والوں نے جس بہادری اور جواں مردی سے اس بدترین صورتِ حال کا سامنا کیا، وہ بھی قابلِ تعریف ہے۔ دہشت گردی کی اس صورتِ حال نے جن دورویوں کو جنم دیا ان میں سے ایک بے حسی کا رویہ اور دوسرا خوف اور بے بسی کا۔ لہٰذا اپنی ایک نظم میں شاعر کراچی کے باسیوں کے دونوں رویّوں کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

سب سے بڑی غلطی یہ ہوئی /کانوں میں روئی ڈال کے /اپنی میز کرسی پر مزے سے
/چائے پیتے لکھنے کے بجائے /باہر کی طرف کھلنے والے /دروازے کے سامنے جا بیٹھا /دو

فائر ہوئے، میرا دل/چڑیوں کی طرح/زور زور سے دھڑکنے لگا/اور میں سب کچھ بھول

کر/شہر کے بارے میں سوچنے لگا"[۶۲]

شہر میں موجود سوگواری اور ڈھائے جانے والے مظالم کا نوحہ لکھتے ہوئے ذیشان ساحل نے خود شہر کی زبانی ایک خط تحریر کروایا۔ خط لکھتے ہوئے شہر اپنے اندرونی کرب کا اظہار جس انداز سے کرتا ہے، وہ اس شہر کے باسیوں کے لیے تو کوئی نیا نہیں لیکن جن لوگوں کا اس شہر سے تعلق نہیں وہ بھی اس کرب کو محسوس کر سکتے ہیں۔ نظم بہ عنوان "خط" میں وہ بیان کرتے ہیں:

جس وقت شہر نے خط لکھنا شروع کیا/شاید وہ رو رہا تھا/نیلی روشنائی سے لکھے گئے فقط

/جگہ جگہ سے پھیل گئے ہیں/اور کاغذ اتنا خستہ ہے کہ اگر خط/زیادہ دیر ڈاک میں رہتا تو

شاید/لفافے کے اندر ہی کٹ پھٹ جاتا/خط لکھنے کے دوران ہی شہر کے سینے پر/ڈھیر

ساری گولیاں داغی گئیں/شہر کی آنکھوں میں/راکھ اور بارود کے ذرے/بھرے گئے

... اور ڈر کے مارے/بہت سی باتیں لکھتے لکھتے رہ گیا"[۶۳]

اپنی ایک اور نظم "ہلکی اور بھاری چیزیں" میں شاعر بندوق سے نکلنے والی گولی اور تکلیف سے بہنے والے آنسوؤں کا موازنہ کرتے ہوئے بڑے کرب ناک انداز سے کہتا ہے کہ:

گولیوں سے بھی کم وزن رکھنے والے آنسو/بستر کی چادر اور پروں سے بھرے تکیوں

میں/جذب ہو جاتے ہیں/بازو میں اٹکی ہوئی گولی کے خیال سے/وہ یہ بھی نہیں سوچتا

/کہ اگر اس کے بہت ہلکے آنسو/تکیے یا چادر پر گرنے کے بجائے/بھاری بندوق پر

گرتے رہتے/تو ایک نہ ایک دن/اسے زنگ لگ جاتا/یا پھر اس کی طرف گولی بھیجنے

والے/لڑکے کا سخت دل/اس کے آنسو دیکھ کر/موم ہو جاتا ہے"[۶۴]

ظلم کے خلاف ڈرنے اور سہم کر خاموشی اختیار کرنے کے بجائے شاعر حرکت و عمل کا درس دیتے دکھائی دیتے ہیں۔ ان کے خیال میں یہی حرکت و عمل اس شہر کو ظالموں کے چنگل سے چھٹکارا دلائے گی۔ شہر میں ہونے والی مسلسل ہڑتالوں نے جس طرح لوگوں کی زندگی اجیرن بنا رکھی تھی، اس کا نقشہ کھینچتے ہوئے ذیشان ساحل کہتے ہیں کہ:

جب بچوں کو/اسکول لے جانے والی وین/گلی میں جلا دی گئی تو پتا چلا/پھر حامد صاحب/

فائرنگ کرتی یلو کیب کو آتا دیکھ کر/بس اسٹاپ سے گھر تک دوڑتے ہوئے آئے/اور

کونے پر بنے اسپیڈ بریکر سے ٹھوکر کھا کے/گر پڑے... جب کہ اگلے دن اخبار سے

معلوم ہوا/صبح سے شام تک/ستائیس آدمی مارے گئے/اخبار ہی سے پتا چلا کہ صبح سے

رات تک / شہر ویران رہا۔ دفتر، بنک، بازار / سب بند رہے۔ لاشیں مردہ خانے میں
/ اور زخمی اسپتالوں میں رہے[٦٥]

یہ ہڑتالیں اور قتل و غارت گری تو جیسے اس شہر کا مقدر ہو چکی تھیں۔ نفسیاتی طور پر اس کے بڑے منفی اثرات مرتب ہو رہے تھے۔ اس نئے ماحول نے خصوصاً بچوں کی نفسیات پر بہت گہرا اثر ڈالا۔ اس کا تجزیہ کرتے ہوئے شاعر کہتے ہیں کہ:

فائرنگ ہو رہی ہے / فائرنگ ہو رہی ہے / کرکٹ کھیلتے بچے / گیند کے پیچھے بھاگتے ہیں
/ شور مچاتے ہیں / مگر گھر میں نہیں جاتے / جیسے فائرنگ ایک جدید لوک گیت ہے / جس
کی دھن پر / شور مچاتے دوڑتے ہوئے / کرکٹ کھیلی جاتی ہے[٦٦]

کراچی کی بابت عام رائے یہی ہے کہ چاہے کتنے ہی بدترین حالات کیوں نہ ہوں، اس کی رونق کبھی ماند نہیں پڑتی۔ ہڑتالوں اور آئے دن کے فسادات کے باوجود اس شہر کی زندگی کے معمولات میں کوئی کمی نہیں آتی۔ لوگوں نے ان حالات سے جس طرح سمجھوتہ کر رکھا ہے، اس کیفیت کا اظہار کرتے ہوئے وہ اپنی ایک نظم ''سرخ ہیئر بینڈ والی لڑکی'' میں کہتے ہیں:

ایک ایسے شہر میں / جہاں ہر صبح / ڈرتے ہوئے چہروں کا / نیا جلوس لیے / طلوع ہوتی ہے
ہر روز / ہڑتالوں، اندھا دھند فائرنگ / اور مایوس لوگوں سے بھری بستی / وہ اپنے آپ
میں مگن چاولوں میں نمک ڈالتی رہتی ہے / ... مجھے لکھتا دیکھ کے / سیٹی بجاتی ہے اور
/ میرے دوبارہ دیکھنے پر ہنستی ہے / اور اپنی کھڑکی / اگلی صبح تک کے لیے / شہر کے بارے
میں کچھ سوچے بغیر / بند کر دیتی ہے[٦٧]

حالات نے کیسے کیسے لوگوں کو نگل لیا اس کی تفصیل بیان کرنے کا یہاں موقع نہیں، لیکن یہ ضرور ہے کہ ہر طبقے اور گروہ کے لوگ اس دہشت گردی کا نشانہ بنے۔ اس بابت اپنی نظم ''ایک آدمی'' میں وہ کہتے ہیں کہ:

کل شام تک شہر میں / کتنے لوگ مارے گئے / وہ انھیں نہیں جانتا / وہ ڈاکٹر، ہاکی کا
کھلاڑی، سیاسی کارکن، دودھ والا / اور پتا نہیں کون کون[٦٨]

شہر کے باسیوں نے اس کے ساتھ جو بے مروّتی کا رویہ اختیار کیا، اس کا اظہار کرتے ہوئے اپنی ایک نظم ''شہر کی فریاد اور پکار'' میں شاعر اس اندرونی کرب کی طرف توجہ دلا رہے ہیں، جسے لوگ محسوس کرنے سے قاصر تھے:

میں بہت اکیلا ہوں / تم مجھ سے دوستی کر لو / شہر کہتا ہے / اور اپنے ہاتھ / ہماری طرف
پھیلا دیتا ہے / ہم اس کے ہاتھوں کو دیکھتے ہیں / اور ڈر جاتے ہیں / شہر کے ہاتھ / کہنیوں
تک جلے ہوئے ہیں / اس حالت میں / کوئی کسی کے ہاتھ / بھلا کیسے تھام سکتا ہے / کوئی کسی

کے ساتھ /کیسے دوستی کر سکتا ہے /ہم اپنا منھ پھیر لیتے ہیں... ہمیں اپنے پاس سے جاتا دیکھ کر /شہر کو بہت ڈر لگتا ہے /وہ جلدی جلدی ہمارے پیچھے آنے لگتا ہے/ ... اپنے ہاتھوں کو ایک سفید کپڑے سے چھپاتے ہوئے/وہ اپنی بات دہراتا ہے/ ... ہم اُن کے پیروں کو دیکھتے ہیں /اور اپنی آنکھیں بند کر لیتے ہیں /ان کے پیروں کی انگلیوں میں /بہت سے چھالے پڑے ہوئے ہیں /اس کی ایڑی اور تلوؤں سے خون بہہ رہا ہے /ہماری باتوں سے شہر کی آنکھوں میں /کتنے آنسو جمع ہو جاتے ہیں.../ہمیں اس کی کوئی فکر نہیں[۶۹]

لا قانونیت کی جو لہر اس شہر کی فضاؤں میں رقص کر رہی تھی۔ نوجوانوں کے ہاتھوں میں موجود غیر قانونی اسلحہ جس طرح لوگوں کو خوف وہراس میں مبتلا کر رہا تھا، منظر کو دکھاتے ہوئے اپنی ایک نظم "ہنسی" میں وہ کہتے ہیں کہ:

لڑکے ہنستے ہیں /اور چل پڑتے ہیں /ٹولیوں کی شکل میں/ ... اپنے ہاتھوں میں /پستولوں کو گھماتے ہوئے /اپنی بندوقوں کی نوکوں سے /دکانوں کے شٹر بجاتے /اپنے ہتھیار لہراتے /وہ بڑے فخر سے /جہاں سے گزرتے ہیں /لوگوں کے چہرے /خوف و دہشت سے /غیر معمولی حد تک پھیل جاتے ہیں /وہ جہاں ٹھہرتے ہیں /موت ان کے ساتھ /تھوڑی دیر کے لیے وہیں ٹھہر جاتی ہے /وہ چلتے ہی رہتے ہیں /ہر سمت میں بے شمار گولیاں چلاتے /ہر دیوار، ہر دروازے پر /بہت سے سوراخ کرتے سیاہ سڑک پر /انسانی خون سے /سرخ نشان ڈالتے[۷۰]

شہر کی جدید تاریخ کی بابت شاعر کا کہنا ہے کہ دہشت پسندانہ رجحانات نے اس کو مسخ کر کے رکھ دیا ہے۔ ان کے مطابق:

ہم نے یہ باتیں پہلے کبھی نہیں سنیں/کسی نے ہمیں کچھ نہیں بتایا/مگر شہر کی تاریخ جب /سیسے اور بارود سے لکھی جانے لگی/اور جغرافیہ دھوئیں اور آنسوؤں کے سوا کچھ واضح نہ کر سکے[۷۱]

وہ سفاکیت جو اس شہر کی قسمت میں کئی دہائیوں سے لکھی جا چکی تھی، تھمنے کا نام ہی نہ لیتی تھی۔ روزانہ ملنے والی نعشوں کا رونا ہو یا اپنی جان کے جانے کا خوف، ہر منظر ذیشان ساحل کے یہاں بہت واضح ہے۔ وہ سادہ انداز اختیار کرتے ہوئے روزمرہ کے حالات کی بابت کہتے ہیں کہ:

ہر روز شہر میں/اِدھر اُدھر جاتے ہوئے/سب کو ڈر لگتا ہے/کہیں کوئی آتی ہوئی گولی

/ہمیں نہ مار دے/جنھیں گولیاں لگتی ہیں/وہ مر جاتے ہیں یا زخمی ہو کر/اسپتال میں اپنی

باری کا انتظار کرتے ہیں/ہر روز موت کی خبریں/ہر روز جلی ہوئی گاڑیوں کا ڈھیر [۷۲]

ایک اور نظم ''لاش'' میں وہ شہر میں جگہ جگہ ملنے والی نعشوں کی بابت کہتے ہیں کہ:

ہر روز/شہر کے مختلف علاقوں میں/اکٹھا کیے جانے والے/ناکارہ جسموں کو/آخر کیا کہا

جا سکتا ہے/شیکسپیئر کے فارمولے کے مطابق/صرف لاش [۷۳]

اداروں کی ناکامی کا حال بیان کرتے ہوئے وہ اپنی ایک نظم ''شہری سہولتیں'' میں طنزیہ انداز اختیار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

ہمارے شہر میں/جتنا خون بہتا ہے/اس سے کچھ زیادہ پانی/تھوڑی دیر کے لیے/ہمارے

گھروں میں فراہم کیا جاتا ہے [۷۴]

اندھی گولیاں جس طرح معصوم بچوں تک کو اپنا نشانہ بنا رہی تھیں، اس منظر کو اپنی ایک نظم ''آسمان تک کچھ نہیں پہنچتا'' میں پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

بچہ اپنی چھوٹی بہن کے ساتھ/چھت پر جا کر/آسمان کو دیکھنے لگتا ہے/اچانک کہیں سے

دو گولیاں آکر/اس کی بہن کو اس سے چھین لیتی ہیں/سب اس سے کہتے ہیں/تمھاری

بہن آسمان پر چلی گئی ہے [۷۵]

سیاسی بے چینی کے نتیجے میں پھیلنے والی افراتفری ہو یا بے نام گولیوں کا نشانہ بنتے لوگ۔ منزل پر جاتے مسافر کا سفر آخرت پر پہنچنا ہو یا خوف کے مارے گھروں کے دروازے مقفل کرنے والے لوگ۔ ذیشان ساحل کے ہاں ہر منظر بہت واضح ہے۔ وہ اپنی نظموں میں اس افراتفری کی ایسی تصویر پیش کرتے ہیں کہ ہر منظر نمایاں ہو جاتا ہے۔ جیسے:

کچھ لوگ بھاگتے ہوئے مارے گئے/اور کچھ پیدل چلتے ہوئے/کام پر جانے والوں کا رخ

گھر کی طرف ہو گیا/اور گھر جانے والے/قبرستان پہنچ گئے/دیوار کے پیچھے چھپے ہوئے

لوگ بھی مارے گئے/اور اپنے گھروں کا دروازہ بند کرنے والے بھی/چھت پر سوئے

ہوئے لوگ بھی ختم ہوئے/کھڑکیوں سے جھانکتے ہوئے بھی/ہر سڑک پر موت چل

رہی تھی/اور ہر دیوار پر/اس کے ہاتھوں کے نشانات موجود تھے [۷۶]

اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ شہر کی اس فضا میں جب کہ بعض سیاسی بازی گر اپنی طاقت کے نشے میں بدمست ہاتھی کی طرح شہریوں کو روند رہے تھے، اس ماحول میں ذیشان ساحل نے حق و صداقت کا علم بلند کیا۔ اپنی نظم ''چیف صاحب'' میں جو منظر وہ پیش کر رہے ہیں، اس دور میں کسی شاعر کے لیے ان مناظر کو پیش کرنا آسان نہ تھا۔ جیسے:

چیف صاحب بھاشن دیتے ہیں/سب لوگ اپنے کان بند کر لیتے ہیں /بھاشن جاری رہتا ہے/اب کچھ لوگ اپنا ایک کان کھول کر/ان کی باتوں کو/دوسرے کان سے باہر نکال دیتے ہیں/ ...چیف صاحب بولتے رہتے ہیں/نان اسٹاپ یعنی بغیر رُکے/بھاشن پورا ہونے سے پہلے/لوگ گھر نہیں جاسکتے''[۷۷]

واضح طور پر اس نظم میں بانی ایم۔ کیو۔ ایم۔ کی جانب اشارہ ہے۔ شہر کے اس خطرناک ماحول میں اس طرح بات کہنا کوئی آسان کام نہ تھا۔ مخالف سیاسی گروہوں اور قانون نافذ کرنے والے اداروں سے بچ کر روپوشی بھی اس دور میں عام تھی۔ بہت سے سیاسی کارکن مہینوں نہیں بلکہ سالوں روپوشی اختیار کر کے جب گھر واپس لوٹتے تھے تو کیا صورتِ حال پیش آتی تھی، ان کی نظم ''قطب الدین واپس آتا ہے'' میں ملاحظہ کیجیے:

اپنی خود ساختہ روپوشی کے/ڈھائی سال بعد/دیر سے شروع ہونے والے مون سون میں/قطب الدین واپس آتا ہے/کوئی اسے خوش آمدید نہیں کہتا/اس کی بہنیں اسے دیکھتے ہی دروازہ بند کر لیتی ہیں/لیکن اس کی غم زدہ ماں/دوبارہ دروازہ کھول دیتی ہے/اور وہ اندر آتا ہے/ماں رونے لگتی ہے/ ... غیر معمولی اجرت پر کام کرنے والے/اسے دیکھ لیتے ہیں/وہ اسے اپنے ساتھ لے جاتے ہیں/جب گھر میں جمع ہونے والا پانی/باہر چلا جاتا ہے/بارش رک جاتی ہے اور دھوپ نکلتی ہے/گندم کی خالی بوری میں بند/ایک بے جان جسم کی صورت میں/قطب الدین واپس آتا ہے[۷۸]

اس شہر کی بدترین صورتِ حال کا اندازہ ان کی نظم ''خودکشی'' سے لگایا جاسکتا ہے، جس میں وہ بہت طنزیہ انداز اختیار کر کے ان اندھی گولیوں کی کارستانی بتارہے ہیں جو بلا رنگ و نسل اور زبان ہر کسی کو نگلنے کو تیار بیٹھی ہیں۔

شہر میں اب جن کو بھی خودکشی کرنی ہو/اسے بہت زیادہ تگ و دو نہیں کرنی پڑتی/وہ باہر نکلتا ہے/اور تھوڑی دیر کے لیے/نشانہ بازوں والی یلو کیب کا/انتظار کرتا ہے/یا جب اس کی سڑک کے دونوں طرف/خوب فائرنگ ہو رہی ہو/وہ بلا ارادہ بالکنی میں جا کر کھڑا ہو جاتا ہے/جب لوگ خودکشی کرنا چاہتے ہیں/یقین کیجیے/کسی جنسی امتیاز کے بغیر/رنگ،

نسل اور زبان کے فرق کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے/گولیاں ہر جگہ/انھیں ڈھونڈ نکالتی
ہے[۷۹]

کراچی اور سندھ کے شہری علاقوں میں خوف اور دہشت کی فضا میں جینے والے انسان کس قدر غیر محفوظ تھے، اس کا حال بیان کرنے کے ساتھ ساتھ شاعر انسانوں کے اس جنگل کی بے حسی کا بھی نقشہ کھینچ رہے ہیں۔ جیسے:

کراچی/ایک جنگل ہے/جہاں تاریکی، شور/اور خوف کے ہزاروں درخت/آسمان سے
باتیں کرتے نظر آتے ہیں/اتنی آوازیں کہ/کراچی کے اندر یا باہر رہنے والوں کو/کسی
کی چیخ بھی/نہیں سنائی دیتی/اصل میں اب کراچی/کوئی شہر نہیں/بلکہ خطرے کی حالت
میں/حلق سے نکلنے والی چیخ ہے/وہ چاروں طرف گونج کے رہ گئی ہے[۸۰]

شہر کے اس ماحول سے بیزار لوگ جب دیگر شہروں کا رخ کرتے ہیں تو وہاں بھی صورتِ حال کوئی قابلِ ذکر نہیں۔ سیاسی بے چینی اور ہڑتالوں نے وہاں کے لوگوں کی زندگیوں کو کس طرح مصیبت کا شکار کر رکھا ہے، اس نظم میں ملاحظہ کیجیے:

سمن حیدر آباد جاتی ہے/مگر وہاں بھی/دکانیں بند رہتی ہیں/گاڑیاں جلائی جاتی ہیں
/لڑکے فائرنگ کرتے رہتے ہیں/سمن حیدر آباد میں بھی/ڈر کے مارے گھر سے باہر
نہیں نکلتی ہے/اور پھر کراچی لوٹ آتی ہے[۸۱]

شہر کی حالت پر آسمان بھی خون کے آنسو رو رہا ہے۔ شاعر نے شہر کے دکھ کو نہ صرف محسوس کیا بلکہ اس کرب کو لفظی جامہ پہنا کر اپنی نظم ''دوسرا آسمان'' میں بڑے موثر انداز سے پیش بھی کیا۔ جیسے:

پہلے دن بادل زخمی ہوگئے/دوسرے دن ستارے/اور تیسرے دن/بہت سی گولیاں
نیلے آسمان کو جا لگیں/اور وہ سیاہ ہو گیا/آنسوؤں کی طرح کی کوئی چیز/زمین پر گرنے لگی
/کبھی خاموشی کے ساتھ بہت ساری بوندیں/اور کبھی سڑک پر شور مچاتا ہوا/موسلا
دھار پانی/زخمی آسمان/بری طرح رو رہا تھا/اس نے اپنا چہرہ/بہت سارے بادلوں سے
ڈھکا ہوا تھا[۸۲]

حسن عابدی نے بھی اپنے شعری مجموعے ''جریدہ'' میں اپنے زمانے کی سرگزشت بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ زمانے کے مصائب و آلام کو شعری شکل میں ڈھال کر انھوں نے اس دور کے کرب کو نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے۔ کراچی کی بابت ان کا کہنا ہے کہ:

ابھر رہا ہے نیا شہر اپنے ملبے سے　　　ظہور کرتی ہیں صدیاں فنا کے لمحے سے[۸۳]

اس شہر کے بدلتے منظر نامے اور سیاسی افرا تفری کے نتیجے میں پیدا ہونے والی صورتِ حال کو انھوں نے متعدد غزلوں میں پیش کیا ہے۔ ان غزلوں میں ریاستی تشدد کے نتیجے میں پیدا ہونے والی بے چینی اور خونِ ناحق کا رونا ہو یا شہر کی بے رونقی کا غم، ہر منظر ان کے ہاں بہت واضح ہے۔ دیکھیے:

ہمیں بے جرم مارا جا رہا ہے　　یہ کس کا قرض اتارا جا رہا ہے

لہو کی رائے گانی پر نہ جاؤ　　سمندر میں یہ دھارا جا رہا ہے

یہ کیا ہوا کہ شورِ فغاں اب نہیں رہا　　یہ شہر، شہر دل زدگاں اب نہیں رہا[۸۴]

شہر کراچی کے لیل و نہار نے بعض اوقات انھیں حیرت زدہ کر دیا اور بعض مواقع پر انھیں رُلایا بھی۔ ایسے حالات میں وہ اگر اُداس نہ ہوتے تو اس کا مطلب یہ ہوتا کہ حالات نے اس کے احساس کو کند کر دیا ہے۔ ایک سچے اور کھرے فن کار کی طرح انھوں نے ان حالات کی سچی ترجمانی کی۔ جیسے:

زمیں نظر نہیں آتی دماغ عرش پہ ہیں　　ہماری طرح کوئی بے زمین ہے تو کہو

دھواں اڑا رہا ہے کون، آگ لگا رہا ہے کون　　اے مرے شہر بے اماں، لوگ ترے کدھر گئے[۸۵]

آصف فرخی کی وجۂ شہرت شاعری تو نہیں لیکن ان کے مجموعۂ کلام "اس وقت تو یوں لگتا ہے" میں موجود بیش تر کلام اس بحران کا عکس ہے جو ان دنوں ملکی سطح پر درپیش تھے۔ ان کی نظم "اندیشۂ شہر" میں کراچی میں پھیلی اس بے چینی اور بے اطمینانی کی جھلک دیکھی جاسکتی ہے، جس کا نقش آج بھی شہریوں کے دل و دماغ پر محفوظ ہے۔ نظم ملاحظہ کیجیے:

پریل، لعل بخش اور اللہ ورایو/ حکومت کی حالیہ تبدیلی سے/ بہت پریشان ہیں/ وہ روز
صبح/ سندھ سیکر ٹریٹ میں/ اپنے بیرک میں/ داخل ہونے سے پہلے/ کن انکھیوں سے
/ اس اخبار کی چیختی ہوئی سرخی پر/ نظر ضرور ڈال لیتے ہیں/ جن کو وہ پڑھنا نہیں
چاہتے/ "کراچی میں وسیع پیمانے پر تخریب کاری کا اندیشہ ہے"/ صبح کی روشنی اور سنکی
ہوئی ڈبل روٹی کی خوشبو کی طرح/ ایک اندیشہ سارے شہر میں پھیل جاتا ہے/ اپنی اپنی
کرسیوں پر بیٹھ کر/ وہ چاروں دیواروں کو/ اور ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں[۸۶]

اس مجموعے کی دیگر نظموں میں "تازہ خبر"، " قواعد کی رو سے"، "چوکلیٹ مرڈر"، "میڈ ان کراچی"، "آئندہ نہ دیکھوں" اور "سکیورٹی" وغیرہ میں کراچی کی مایوس فضا اور ناہم وار سماجی رویوں پر گہرا طنز موجود ہے۔ وہ کبھی اس شہر کے مسائل کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

کیا میرے شہر کی سڑکیں زیادہ محفوظ ہو جائیں گی/گڑھے بھر جائیں گے/کھلے گٹر بند ہو
جائیں گے/زندگی اور ہاتھ پاؤں کی سلامتی ہو گی/اکھڑتی دیواریں، گرتی چھتیں/شور،
کوڑے کے ڈھیر/شہری زندگی کی ہول ناکیوں کے ساتھ/حد سے بڑھے ہوئے پل
/تازیانے لگاتے رہیں گے/یا مر ہم مل جائے گا[۸۷]

دو دہائی قبل کی ان نظموں میں جو سوالات اٹھائے گئے تھے اور جن مسائل پر طنز کیا گیا تھا، آج بھی وہ مسائل جوں کے توں موجود ہیں۔ نہ صرف سماجی ناہمواری بلکہ ریاستی تشدد کی جو دردناک کہانیاں اس دور میں سنی گئیں، اس کے بہت واضح اشارے ان نظموں میں موجود ہیں۔ جیسے

نئی حکومت نے چند اور بھی فیصلے کیے ہیں/حالات معمول پر لانے کی کوشش کی جائے
گی/ایسے واقعات کا سلسلہ ختم کیا جائے گا/قانون نافذ کرنے والے ہاتھوں سے/مارنے
جانے والوں کے لیے/قتل کے مقدمات درج ہوں گے/ ...ایک ایسے واقعے سے میں
بھی پریشان ہوں/اسے اجمیر نگری تھانے میں نظر بند نہیں کیا گیا/اسے لائنز ایریا میں
حبس بے جا میں نہیں رکھا گیا/نہیں توڑے گئے اس کے ہاتھ/نیو کراچی تھانے سے چار
گلیاں چھوڑ کر/اسے پولیس مقابلے میں ہلاک قرار نہیں دیا گیا/اسے چلتی ٹیکسی سے
دھکیل کر/ایک سنسان راستے پر نہیں پھینکا گیا/اسے گل بہار تھانے کی حدود میں
/بوری میں بند مردہ نہیں پایا گیا/"مخبری کا انجام یہی ہوتا ہے"/اس کے کٹے ہوئے
گوشت پر نہیں لکھا پایا گیا/نہ جانے کب اسے دہشت گرد قرار دے دیا گیا[۸۸]

نظم میں موجود ایسے کئی مناظر ہیں جو نہ صرف اندوہ ناک نہیں بلکہ ریاستی جبر کی ان کہی داستانوں کا بیانیہ بھی ہیں۔ یہ نظمیں ان دہشت گردوں کے چہروں سے تو نقاب الٹتی ہی ہیں لیکن ساتھ ساتھ ریاست کی کوتاہیوں اور مظالم کا پردہ بھی چاک کرتی ہیں۔ آصف فرخی نے "Look at the city from here" کے عنوان سے کراچی کی بابت تحریروں کا ایک انگریزی انتخاب بھی شائع کیا۔ اس انتخاب میں سندھی، اردو اور دیگر زبانوں کے تراجم بھی شامل کیے گئے ہیں۔ اکثر نظمیں اس شہر کی سماجی اور تہذیبی زندگی کا عکس ہیں لیکن بعض تحریریں سیاسی رنگ میں بھی رنگی ہوئی ہیں۔ ن۔م۔ دانش کی نظم "لیاری" کا انگریزی ترجمہ میں اس میں شامل ہے۔ اس کے علاوہ شہر کی مشینی زندگی کے عنوان سے عطیہ داؤد کی نظم جسے سندھی سے انگریزی میں خود آصف فرخی نے ہی منتقل کی۔ "The people of the Machine" کے عنوان سے اس مجموعے میں شامل ہے۔ عزیز حامد مدنی کی ایک نظم اردو سے انگریزی میں سلیم الرحمٰن نے منتقل کی "The last Tramcar" کے عنوان سے اس مجموعے میں شامل ہے۔

توفیق رفعت کی انگریزی میں لکھی گئی نظمیں "Karachi, 1955" اور "Karachi, 1968" بھی اس مجموعے کی زینت ہیں۔ اس طرح کی بہت سی نظمیں اور نثری تحریروں کا انتخاب کراچی کی بابت اچھی معلومات فراہم کرتے ہیں۔[۸۹]

تنویر انجم کے ہاں بھی عصری شعور بہت گہرا ہے۔ وہ شہر کے حالات کو شہری بے حسی کے پس منظر میں دیکھنے کی کوشش کرتی نظر آتی ہیں۔ اپنی نظم "کلفٹن، ناظم آباد اور اور نگی ٹاؤن" میں انھوں نے مختلف علاقوں میں رہنے والوں کے رویے اور اجنبیت کو موضوع بنایا ہے۔ جیسے:

کلفٹن میں زمین کی قیمتیں تیزی سے بڑھ رہی ہیں / لوگوں کو اندیشہ ہے / مکانوں کی
ایک حد پر رکی ہوئی قیمتیں کہیں گر نہ جائیں / کورنگی میں لوگ مر رہے ہیں / کلفٹن
والے ناظم آباد اور کورنگی کی کہانیاں نہیں جانتے / ناظم آباد والے کلفٹن کی کہانی جانتے
ہیں / اور اس بات پر جز بز اور پریشان ہوتے ہیں / کہ کلفٹن والے کورنگی کے ساتھ / ناظم
آباد کو بھی کیوں خطرناک سمجھتے ہیں ... / کورنگی سے شہر زاد کہانیاں لے کر آتی ہے
/ جن سے یہ وضاحت نہیں ہو پاتی / کہ کورنگی اور دوسرے علاقوں کے بیچ میں / اکا دکا
کانٹوں بھری جھاڑیوں والا / بہت بڑا بنجر میدان / کیوں رکھا گیا / جس میں فائرنگ کے
دوران اگر کوئی پھنس جائے / تو لازماً بندوقیں اسے ڈھونڈ لیں[۹۰]

اپنی ایک اور نظم "کراچی فلک شگاف چیخوں پر ایمان نہیں رکھتا" میں بھی شاعرہ نے ان مناظر کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے جو ۱۹۹۰ء کے بعد سے لے کر دو دہائیوں تک کراچی کا مقدر رہے۔ ایک ایسا ہی منظر ملاحظہ کیجیے:

زہرہ کے بے ضرر فکروں میں گھرے ساتوں بچوں کو / ایم۔ کیو۔ ایم۔ میں شامل ہوئے
بغیر / آرمی ایکشن کے دوران / اس کی سگی ماں کی التجا بھری چیخوں کے باوجود / ایک
ایک کر کے / رینجرز یا پولیس یا دوسرے دہشت گردوں کے ہاتھوں / تشدد کے مختلف
حربوں کا شکار ہو کے / مارا جانا چاہیے[۹۱]

نعشوں کی سیاست کی جو اصطلاح کئی دہائیوں سے اس شہر کے سیاسی منظر نامے میں استعمال ہوتی رہی ہے، اس کا اظہار تنویر انجم کی ایک نظم "ایک موت کی سیاسی روداد" میں بہت خوب صورتی سے پیش کی گئی ہے۔ یہ نظم محض ایک شخص احمد قریشی کی موت کا منظر نامہ ہے، مگر اس نظم کو پڑھ کر اس شہر کے ہزاروں نوجوانوں کی موت کے مناظر ہماری آنکھوں میں رقص کرتے محسوس ہوں گے۔ نظم ملاحظہ کیجیے:

احمد قریشی/فوراً مرنے والے چار لڑکوں میں/سب سے پہلے مرا/احمد قریشی نے ایک گولی کھانے کے بعد/کسی کونے کھدرے میں چھپنے کے بجائے/ایک حملہ آور کی کلوشنکوف پکڑ کر مقابلے کی کوشش کی/اور چار گولیاں کھا کر مرا/یہ قصہ کسی عینی گواہ نے مشہور کیا ہو گا/ ...احمد قریشی اور دوسرے مرنے والوں کے رشتے داروں کی /مرضی کے مطابق/یا مرضی کے خلاف/ان لاشوں کو جھنڈوں کے کفن پہنائے گئے /ان کی موت کی رسوم/اجنبی لوگوں نے ادا کیں/اور ان کے مشترکہ جنازے میں /ایک لاکھ لوگوں کی شرکت کے باعث/ان کے رشتے دار/ان کی موت کا سوگ/صحیح طور پر نہیں منا سکے/احمد قریشی کی تعزیت کے لیے/بڑے سیاسی رہنماؤں نے/اس کے معمولی گھر میں قدم رکھا/سارے شہر میں ہڑتال کروائی/اور احمد قریشی کے قاتلوں کے نام/صاف صاف اخباروں میں شائع کر دیے[۹۲]

عذرا عباس کے مختلف مجموعوں میں بھی عصری شعور بہت نمایاں ہے۔ شہر کی بے چینی اور بے اطمینانی کو انھوں نے بھی شدت سے محسوس کیا پھر شہریوں کی بے حسی کو شاعری کا موضوع بنایا۔ شہر میں ہونے والی قتل و غارت گری اور خون کی ارزانی کا ذمہ دار ان کے مطابق خود اس شہر کے شہری بھی ہیں جو کہ ہر ظلم کے خلاف بجائے مزاحمت کرنے کے کترا کر گزر جانے کو عافیت جانتے ہیں۔ اس طرح کے موضوعات عذرا عباس کے ہاں جا بجا موجود ہیں۔ ایک نظم ''آئی وٹ نیس'' میں ان کا کہنا ہے کہ:

اگر کسی آدمی کو/آپ کے سامنے گولی مار دی جاتی ہے/تو کیا___! /آپ کو بس اس دیوار/یا ڈسٹ بن کی طرح/یا اس درخت کی طرح/جو مرنے والے سے کچھ ہی فاصلے پر/بے جان ساکت کھڑے رہتے ہیں/آپ سہم جاتے ہیں/آپ اُف بھی نہیں کرتے /یہ تو روز ہوتا ہے/آپ تو روز دیکھتے ہیں/گھر واپس ہوتے ہوئے قدموں سے/پلٹ کر بھی نہیں دیکھتے[۹۳]

ان کی شاعری میں ایک طنزیہ کاٹ بھی موجود ہے۔ یہ کاٹ ان کی نظموں کو اور زیادہ پُر اثر بنا دیتی ہے۔ ان کی نظم ''نفرت شرط ہے'' میں ان کے لہجے کی کاٹ دیکھیے:

ایک جنگ کے لیے/دو نفرتوں کا ہونا ضروری ہے/دو نفرتوں سے ایک جنگ لڑی جا سکتی ہے/آقا ہو یا غلام/ظالم ہو یا مظلوم/جس کی نفرت زیادہ ہو گی/وہی فاتح ہو گا[۹۴]

سندھ میں ان ہی دو نفرتوں کی جنگ کئی دہائیوں سے جاری ہے۔ علامتوں اور استعاروں میں جو بات کہی گئی وہ ہماری اپنی زندگیوں کا استعارہ بن گئی۔ لالچ اور حرص و ہوس نے لوگوں کو اپنا اسیر بنا رکھا ہے۔ اسی سوچ نے مفاد پرستی کو جنم دیا اور اس کے نتیجے میں شہریوں کی جانوں کی ارزانی کی صورتِ حال پیدا ہوئی۔ اس جانب اشارہ کرتے ہوئے عذرا عباس کا کہنا تھا کہ:

ہر طرف اندھیرا مچا ہوا ہے/سب لوٹ پر لگے ہیں/پھر بھی گھر نہیں بھر رہے/سب
بادشاہ بننا چاہتے ہیں/اور جو بادشاہ بن گئے ہیں/وہ شہنشاہ بننا چاہتے ہیں[۹۵]

اس شہر نے عام شہریوں بے تحاشا نعشیں تو دیکھیں لیکن بعض واقعات ایسے بھی رونما ہوئے جس میں سر گردہ سیاسی رہنماؤں کو بھی نشانہ بنایا گیا۔ کبھی دہشت گردوں نے متحدہ قومی موومنٹ کے ذمے داران کبھی پاکستان پیپلز پارٹی اور کبھی مقتدر قوتوں نے بااثر سیاسی رہنماؤں کو گولیوں کا نشانہ بنا کر خاک میں ملا دیا۔ ایسی ہی صورت بے نظیر بھٹو کے دورِ حکومت میں خود ان کے سگے بھائی مرتضیٰ بھٹو کے ساتھ بھی پیش آئی۔ اپنی نظم "ایک اداس نظم" میں وہ ان ہی مناظر کی عکاسی کرتے ہوئے کہتی ہیں کہ:

موت یہیں کہیں ہوتی ہے/ ... سڑک پر/بالکل ہمارے سامنے/پھر بھی/ہم کبھی نہیں
سوچتے/اس سے ہماری ملاقات کیسے ہو گی/گولیوں کی صورت میں/جو/جسم کے کسی
بھی حصے میں داخل ہو سکتی ہے/گردن میں/کاندھوں میں/سینے میں/یا ٹانگوں میں/گولی
چلانے والا کون ہوتا ہے/یہ بھی پتا نہیں چلتا[۹۶]

عذرا کی شاعری میں شہر کے تکلیف دہ مناظر کی کمی نہیں۔ ۲۰۱۶ء میں شائع ہونے والے مجموعے "اندھیرے کی سرگوشیاں" میں بھی بے شمار ایسی نظمیں شامل ہیں جو اس ماحول کی عکاسی کر رہی ہے۔ جس میں شہر کے لوگ جی رہے ہیں۔ کبھی وہ بھیانک تخریب کاریوں کی بابت کہتی ہیں کہ:

اب نفرتوں کی بازی جیتے ہوئے/ہمارے دشمن/ہمیں بھیانک نظر نہیں آتے/ ... بس
وقت کی بد شکل تخریب کاریاں ہیں/ہم شانت رہتے ہیں[۹۷]

اس کھیل میں بے شمار لوگوں نے اپنے ہاتھ بے گناہوں کے خون سے رنگے۔ نعشوں کی سیاست پر اپنی طاقت اور اقتدار کی عمارت تعمیر کرنے والے سیاست دانوں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ:

خدارا، اس سے پہلے کہ میں آپ کا نشانہ بنوں/میں بھی وہی کھیل کھیلوں/جو آپ کھیل
رہے ہیں/وہی کھیل جسے میں موت کہتی ہوں/اور آپ لذت/جن لاشوں پر آپ

چہل قدمی کرتے ہیں روز / آپ کی گنتی میں اضافے کے باعث / زمین تنگ ہو رہی ہے[۴۹۸]

موت کے اس کھیل میں نہ مرنے والوں کو پتا تھا کہ انھیں کیوں نشانہ بنایا گیا ہے اور نہ ہی مارنے والے کو ادراک کہ وہ کیوں خون کی ہولی کھیل رہا ہے۔ اندھی گولی جس طرح آئے دن بے گناہوں کو نشانہ بنا رہی تھی، عذرا نے اس جانب اشارہ کرتے ہوئے اپنی نظم "جب ایک گولی مجھے لگی" میں کہتی ہیں کہ:

جب ایک گولی مجھے لگی / میں وہاں نہیں تھی / نشانہ باندھنے والے نے / میرے بالوں سے دھوکا کھایا / اور چلا دی گولی / وہ گولی جس کو لگی وہ وہ نہیں تھا / جس کو گولی ماری جانی تھی / مرنے سے پہلے وہ جان گیا تھا / یہ گولی اس کے نام کی نہیں تھی[۴۹۹]

انسانی بے حسی اور بے بسی دونوں طرح کی تصویریں عذرا کی شاعری میں دکھائی دیتی ہیں۔ جب وہ مظلوم، بے بس لوگوں کے غائب ہو جانے یا بے گناہ سزائیں بھگتنے کی دل خراش روداد سنتی ہے تو بے اختیار یہ مناظر اس کی شاعری کا موضوع بنتے ہیں۔ جیسے:

کھڑکی سے جھانکو، دیکھو / کون مبتلائے بلا ہیں / ہاں جھانکتی ہوں، دیکھتی ہوں / ارے یہ تو اپنے قدم ہیں / دھول سی چھپ گئی ہے ان قدموں کی آہ و بکا / چہروں پر ہے بے بسی / بے یاری و مددگاری کی سلیں / اپنے کندھے پر لادے ہوئے / چلے آرہے ہیں / میری کھڑکی کے نیچے سے گزرتے ہوئے / چلے آرہے ہیں / اپنے ماتھے پہ باندھے ہوئے سوگ کی پٹیاں / جو کہہ رہی ہیں / ہمارے پیاروں کو ہم سے ملا دو / ہمارے بچوں کو جنگل کی لومڑیاں لے گئی ہیں / ان کو واپس دلا دو ہمیں[۵۰۰]

شہر کی دہشت ناک فضا میں جہاں زندگی کے آثار مفقود ہوتے جا رہے تھے، وہاں محبت اور الفت کی نظمیں لکھنا خاصا دشوار تھا۔ حکومت تو سب اچھا ہے کا راگ الاپ رہی تھی مگر لوگ عجیب ذہنی کرب میں مبتلا تھے۔ اس صورتِ حال کا بیان ان کی ایک نظم "کیسے لکھیں اب محبت کی نظم" میں دیکھیے:

کیسے لکھیں موسم بہت سہانا ہے / کیسے بتائیں سب کو، اپنے گھروں کے ٹی۔ وی۔ بند کر دو / ہر چینل پر لاشوں کی کتھا بیان کی جا رہی ہے / لیکن کھڑکیاں سب گھروں کی کھلی ہیں / لاشیں اٹھانے والی گاڑیوں نے شور مچایا ہوا ہے / کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی / اور وہ نظم جو لکھوانا چاہتی تھی / کونے میں دبکی کھڑی ہے[۵۰۱]

ذرائع ابلاغ میں شائع ہونے والی خبروں اور روزانہ نشر ہونے والے سیاسی پروگراموں میں جس طرح نعشوں کی گنتی اور انسانیت کی تذلیل کے مناظر دکھائے جارہے تھے، اسے دیکھ کر ہر انسان کی روح کانپ اٹھتی تھی۔ مہینے اور سال تو گزرتے رہے لیکن اس بربریت کی شدت میں کمی آنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ اس منظر کو دکھاتے ہوئے عذرا نے شہر کے دکھ اور کرب کو موضوع بناتے ہوئے کہا کہ:

کون بتائے گا اسے ؟/وہ جو مارے گئے /یا وہ جو نشانے پر ہیں /نیا سال جب آتا ہے /وہ جن پر کچھ نہیں گزری /اپنے اپنے علاقوں میں ناچتے ہیں، گاتے ہیں/ ... یہ جانے بوجھے بغیر، کس پر کیا گزری /اس سال پر بھی جو ابھی لہو لہان گزرا ہے /اپنی زخمی آنکھوں سے یہ دیکھ دیکھ کر [۵۰۲]

متاثرہ خاندان پر اس غم واندوہ کی کیفیت کا کیا اثر ہوتا ہے اس کا اظہار کرتے ہوئے عذرا نے اپنی ایک نظم میں کہا کہ:

اسماعیل اپنے دروازے کی چوکھٹ پر بیٹھا رو رہا ہے /سوچ بھی رہا ہے /اگر باپ زندہ ہوتا تو پہلی تاریخ پر اپنی تنخواہ سے /مجھے نیا بستہ دلاتا/اسماعیل رو رہا ہے/وہ کب تک روتا رہے گا؟ /اس کی ماں کھڑی چارپائی پر منھ لپیٹے پڑی ہے /فوزیہ سڑک پر کھڑی ہے /ڈھونڈ رہی ہے /رات ختم ہوگئی /راجا نہیں آیا/ کیا وہ بیوہ ہوگئی ؟ /اس نے ابھی رونا شروع نہیں کیا /بس دہلے ہوئے دل سے وہ/اپنے بیوہ ہونے کی علامت ڈھونڈ رہی ہے /احمد کو یقین آگیا/اس کا بیٹا کل رات مار دیا گیا/وہ رو نہیں رہا/اس کی ماں اتنا رو رہی ہے کہ /اس کے آنسوؤں سے اسے اپنے گھر کے بہہ جانے کا بھی ڈر ہے /شاہدہ پوچھ رہی ہے کیوں مر گیا اُس کا بھائی / ... موت کا تماشا دیکھنے والے /اور موت کا تماشا کھیلنے والے /اپنی اپنی آرام گاہوں میں ڈرائی فروٹ کھاتے ہوئے سوچ رہے ہیں/ کل کا تماشا کام یاب ہو گیا/ کیا اتنے ہی لوگ مارے گئے / جتنا انھوں نے اندازہ لگایا تھا [۵۰۳]

حارث خلیق کے ہاں بھی اس فرسودہ نظام کے خلاف مزاحمت کی فضا بھرپور انداز میں موجود ہے۔ ان کی اکثر نظموں میں ایک ایسی گونج سنائی دیتی ہے جو بے بس اور لاچار لوگوں میں پھر سے نیا حوصلہ پیدا کرتی ہے۔ مقتدر قوتوں کی سازشوں نے کراچی اور سندھ کے شہری علاقوں میں جو صورتِ حال پیدا کر رکھی تھی، اس جانب کھل کر اظہار کرتے ہوئے اپنی ایک نظم ”حساب کا وقت آگیا ہے“ میں وہ کہتے ہیں کہ:

بناؤ قبریں/اٹھاؤ/پھر پھاوڑا اٹھاؤ/ ... کہ ایک بھی امن کا سپاہی/زمین کے اوپر نہ رہنے

پائے/ہر اس بشر کا گلا دبا دو/جو امن عالم کے گیت گائے/ ... وہی کرو/جو سدا کیا ہے

/جفا کی ٹکسال سے/نئے خوف ڈھال لاؤ/ہمیں ڈراؤ/نہ ہم ڈریں تو/کسی کو مارو/کسی کو

زندہ ہی دفن کر دو/بناؤ قبریں/ہزار ہا سال سے تمھارا/یہی وتیرہ یہی ہے عادت [۵۰۴]

آزاد اور نثری نظم کے علاوہ بے شمار شاعر ایسے بھی تھے جو اس زمانے میں شہر کے اس منظر نامے پر گہری نظریں جمائے بیٹھے تھے۔ ان میں روایت شکن بھی تھے اور روایت کی ڈگر پر چلتے ہوئے شعر کہنے والے لوگ بھی۔ اس زمانے کے رسائل اور جرائد ان شعرا کی تخلیقات سے بھرے ہوئے ہیں۔ مختصراً کچھ کا بیان یہاں ضروری ہے۔

ادیب سہیل کا شمار کراچی کے معتبر شعرا میں ہوتا ہے۔ کئی دہائیوں تک وہ اس شہر کی بدلتی سیاسی فضا کا مشاہدہ کر کے شہر کے اس بدلتے منظر کو کچھ اس طرح بیان کرتے دکھائی دیتے ہیں:

روشنیوں کے شہر میں/اک عرصے سے شہری/اندھیاروں کے رحم و کرم پر رہتے ہیں

/ایک زمانہ وہ تھا جب اجداد ہمارے قلعہ بند ہوا کرتے تھے/آج ''محلہ بند'' ہوئے ہیں

جان کی امان کی خاطر ہم سب/ ... کیوں دشمن سے پھرتے ہیں/کیوں آپس میں گھات

لگائے بیٹھے ہیں/کیوں اس ہنستے بستے گھر میں/دوست بہت کم دشمن کی بہتات ہوئی ہے

/اپنی صبح کی اپنے ہاتھوں ایک بھیانک رات ہوئی ہے؟ [۵۰۵]

پوری نظم میں کراچی میں پھیلی تخریب کاری، لسانی بنیادوں پر محلوں کی تقسیم اور آئے دن پھیلنے والے خوف و ہراس کا محلوں اور مختلف علاقوں پر اثر دیکھا جا سکتا ہے۔ ایک اور نظم ''میرا شہر ___ سب کا شہر'' میں بھی وہ انھی جذبات کی عکاسی کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

یہ شہر بڑا جتنا ہو گا/اتنا ہی تجربہ ہو گا بڑا/اتنا ہی بڑا اور پھیلا ہوا/پیمانہ دکھ سکھ کا ہو گا/ہاں

اسی تناسب سے اس پر/آفاق کی وسعت وا ہو گی/انفس کا دامن پھیلے گا/ادراک کے

منظر نامے میں/دکھلائے گی چھب بالغ نظری/اس شہر کی بیساکھی ہو گی/کس کونے

کھدرے میں دم سادھے/دیکھیں گے شہر کو حیرت سے/یہ پاؤں پہ اپنے کھڑا ہو گا [۵۰۶]

عشرت آفریں کا شمار بھی کراچی کے ان شعرا میں ہوتا ہے جنھوں نے اپنے شہر اور اپنی مٹی کے قرض کو اپنی شاعری کے ذریعے اتارنے کی پوری پوری کوشش کی۔ ان کی بہت سی نظمیں اور غزلیں اس تناظر میں پیش کی جا سکتی ہیں، لیکن اختصار کے

سبب سب کا بیان ممکن نہیں۔ ان کی نظم "یہ بستی میری بستی" سے ان کے اس رجحان کا پوری طرح اندازہ ہوتا ہے۔ شہر کے تبدیل شدہ منظر کی بابت ان کا بیان ملاحظہ کیجیے:

وہی کردار ہیں سارے/وہی میرا محلّہ ہے/وہی ہیں میرے ہم جولی/ہر اک مانوس چہرہ
ہے/مگر جو ہے وہ سہما ہے یہ پیڑوں کے بجائے/خوف کے سائے میں بیٹھے ہیں! یہ بچے
کیسے بچے ہیں؟/مسلسل/گفتگو کا ان کے محور/صرف گولی ہے/مگر گولی کے پیچھے اختر و
انور بھی لڑتے تھے/مجھے بھی اچھے لگتے تھے بہت یہ خوشنما کنچے[۵۰۷]

اس زمانے کے مشاعروں میں مختلف شعرا کے بعض اشعار اس حوالے سے اس قدر مشہور ہو گئے کہ زبان زدِ عام ہو گئے۔ ان میں طارق سبزواری کا یہ شعر جو انھوں نے ۱۹۹۷ء میں ہونے والے مشاعرے میں سنایا تھا، نے بے پناہ داد وصول کی:

اب کہ وہ سرِ مقتل رسم یہ نبھا دے گا حق کی بات بولے گا اور سر کٹا دے گا[۵۰۸]

اسی طرح امتیاز ساغر جو عہدِ بے نظیر میں کھلے عام مشاعروں میں گرجتے برستے رہے اور خود پیپلز پارٹی کے وزرا کی صدارت میں ہونے والے مشاعروں کی صدارت کے دوران انھیں کچھ اس انداز سے مخاطب کرتے رہے کہ:

مقتل بنا دیا ہے ستم گر نے شہر کو لیکن کسی کے چاہنے والے عجیب ہیں[۵۰۹]

اس وقت ان کی جرأت اظہار دیکھنے والی تھی اور وزرا کا حال بھی قابلِ دید ہوتا تھا۔ انھوں نے حکمرانوں کی ہٹ دھرمی کے نتیجے میں ہزاروں نوجوانوں کی ہلاکت پر کیا خوب کہا کہ:

ہمارے شہر کے حالات پوچھنے والو جگہ جگہ تمھیں کتبے نظر نہیں آتے[۵۱۰]

مسلم شمیم نے بھی شہر کی مایوس فضا سے متاثر ہو کر اپنے "شہر آشوب" میں اس خدشے کا اظہار کیا کہ:

یہ شہر آرزو آتش نفس صحرا نہ بن جائے یہ خوابوں کا جزیرہ خون کا دریا نہ بن جائے[۵۱۱]

شمیم بلگرامی کی ایک نظم بہ عنوان "پیچ" میں بھی انھوں نے روز مرہ کی فائرنگ اور دہشت گردی کے مناظر کی منظر کشی کرتے ہوئے کہا کہ:

جگہ چیرتی/گولیوں کی تڑاتڑ سے چھلنی/میری آخری اور پہلی محبت کا پیکر/صبح اخبار میں
بیچ کے صفحے پر/شہر میں قتل و دہشت گردی کی/بہت چھوٹی چھوٹی بہت عام سی/روز مرہ
خبروں کے بیچ/ایک یہ بھی خبر[۵۱۲]

مختار اجمیری نے بھی اپنی ایک نظم بہ عنوان "اے مرے شہر بتا" میں کراچی کی ناساز حالت پر حکمرانوں کے سامنے بہت سے سوالات رکھے ہیں۔ وہ اس فریادی شہر کا نقشہ کھینچتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

موت کا رقص ہے ہر گام لہو بہتا ہے   تیرا فرزند ہر اک تھام کے دل کہتا ہے

کس لیے ٹوٹا ہے ہر سمت سے یہ قہر بتا   اے مرے شہر بتا[۵۱۳]

نہ صرف پاکستان بلکہ سرحد پار کے شعرا بھی کراچی کے ان حالات سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ خصوصاً وہ شعرا جن کا مستقل یہاں آنا جانا رہا۔ مثلاً مظفر حنفی کے ہاں بھی کراچی کے سیاسی حالات کا منظر نامہ ملتا ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

جو ''دہشت گرد'' کہہ کر بے خطا پر وار کرتے ہیں   زمانے کو بغاوت کے لیے تیار کرتے ہیں

ہمیں بھی جان پیاری ہے مگر اتنی نہیں پیاری   یزیدِ وقت کی بیعت سے ہم انکار کرتے ہیں

اگر خاموش رہتے ہیں تو سر جاتا ہے کاندھے سے   ہماری جان جاتی ہے اگر تکرار کرتے ہیں[۵۱۴]

بھارت کے معروف شاعر منور رانا کی نظم ''مہاجر نامہ'' کے ذکر کے بغیر اس موضوع کی تکمیل ممکن نہیں۔ اس نظم کی وجہ تخلیق بیان کرتے ہوئے خود منور رانا کا کہنا ہے کہ کراچی میں منعقدہ ۲۰۰۸ء کے عالمی مشاعرے کے دوران ساجد رضوی نے حیدر آباد کے عالمی مشاعرے میں شرکت کی درخواست کی، خرابیِ صحت کے عذر اور معذرت طلب کرنے کے باوجود بضد رہے اور انھیں سادات امروہا کے نذرانے سے زیادہ نذرانہ دینے کی پیش کش کچھ اس طرح سے کی کہ منور رانا کو یہ بات بہت ناگوار گزری۔ رانا صاحب کے تلخ جواب کے بعد انھوں نے اپنی شرمندگی کا اظہار ضرور کیا۔ یہی وہ لمحہ تھا جب منور رانا نے ۱۹۴۷ء سے آج تک کی نمایاں تصاویر کو سامنے رکھ کر غزل کے چند اشعار مہاجرین پاکستان کی جانب سے حکومت پاکستان کی نذر کیے[۵۱۵] اور کہا کہ:

مہاجرین ہیں مگر ہم ایک دنیا چھوڑ آئے ہیں   تمھارے پاس جتنا ہے ہم اُتنا چھوڑ آئے ہیں[۵۱۶]

یہ عجیب المیہ تھا کہ وہ لوگ جو اپنا گھر بار، مال متاع اور خونی رشتوں کو چھوڑ کر بے سروسامانی کے عالم میں اس نئے مسکن آئے ان پر کیسے کیسے ستم ڈھائے گئے۔ ان مہاجرین کی اولاد کے ساتھ ہونے والے سلوک کی تفصیلات مذکورہ صفحات میں تفصیلاً پیش کی جاچکی ہیں۔ جس قسم کی قربانی ان لوگوں نے دی، اس کی نظیر تاریخ میں کم ہی ملتی ہے۔ اس جانب اشارہ کرتے ہوئے منور رانا نے درست کہا کہ:

کئی آنکھیں ابھی تک یہ شکایت کرتی رہتی ہیں   کہ ہم بہتے ہوئے کاجل کا دریا چھوڑ آئے ہیں

کہانی کا یہ حصہ آج تک سب سے چھپایا ہے   کہ ہم مٹی کی خاطر اپنا سونا چھوڑ آئے ہیں

کئی درجن کبوتر تو ہمارے پاس ایسے تھے   جنھیں پہنا کے ہم چاندی کا چھلّا چھوڑ آئے ہیں

سرابوں میں ہمیں اب عمر بھر یوں ہی بھٹکنا ہے   ہم اپنے اونٹ کو صحرا میں مرتا چھوڑ آئے ہیں

یہ کیسی نفرتیں ہیں جو ہمیں اب تک ستاتی ہیں   محبت میں تجھے شاید ادھورا چھوڑ آئے ہیں[۵۱۷]

پاکستان میں ہجرت کر کے آنے والوں کی کس مپرسی کو ان لوگوں نے ضرور دیکھا جو قیامِ پاکستان کے زمانے میں ان بستیوں میں مقیم رہے۔ نامساعد حالات کے باوجود ان لوگوں نے ملک کی ترقی اور استحکام کے لیے سر دھڑ کی بازی لگادی مگر بدلے میں انھیں طرح طرح کے القابات یہاں تک کہ بھکاری تک کہہ کر مخاطب کیا گیا۔ منور رانا نے ان تمام معاملات کو ایک حساس شاعر کی طرح محسوس کیا اور اس نظم میں اس منظر نامے کو پیش کرنے کی عمدہ کوشش کی ہے۔ جن لوگوں نے یہ صعوبتیں نہیں دیکھی انھیں کیا معلوم کہ ہجرت کا کرب کیا ہوتا ہے؟ جب گھر کے افراد دو ملکوں میں تقسیم ہو جائیں تو گھر والوں پر کیا گزرتی ہے، شاعر نے اس کرب کو بیان کرتے ہوئے درست کہا کہ:

ہماری اہلیہ تو آگئیں ماں چھُٹ گئی آخر — کہ ہم پیتل اٹھا لائے ہیں سونا چھوڑ آئے ہیں
خدا جانے یہ ہجرت تھی کہ ہجرت کا تماشا تھا — اجالے کی تمنا میں اجالا چھوڑ آئے ہیں
مہاجر کہہ کے دنیا اس لیے ہم کو ستاتی ہے — کہ ہم آتے ہوئے قبروں میں شجرہ چھوڑ آئے ہیں
مروّت، دوستی، اخلاق، اپنا پن، ملنساری — یہاں آتے ہوئے کیا کیا اثاثہ چھوڑ آئے ہیں
ہمیں مرنے سے پہلے سب کو یہ تاکید کرنی ہے — کسی کو مت بتا دینا کہ کیا کیا چھوڑ آئے ہیں[۵۱۸]

آفاق صدیقی کے ہاں بھی شہر کے حالات اور بے گناہوں کے خون آلود مناظر کو دیکھ کر ایک عجیب طرح کی کرختگی کا رویہ پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ شہر کے حالات کی منظر کشی کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

وہ ظالم سنگ دل خونی درندے / جنھوں نے اپنے خوں آشام جبڑوں سے / لہو سر تاج کا
تیرے پیا ہے / نظر میں ہیں وہ سب قاتل ستم گر / جنھوں نے ایک تجھ کو ہی نہیں
/ ارضِ وطن کی جانے کتنی ماؤں بہنوں کو / بھیانک بیوگی کا دکھ دیا ہے[۵۱۹]

عام لوگوں کی زندگی کا پوچھنا ہی کیا، شہر کی موقر ہستیوں کو جس طرح چُن چُن کر نشانہ بنایا جا رہا تھا۔ رئیس امروہوی کی مثال ہو یا ۹۰ء کی دہائی میں ہونے والے حکیم محمد سعید کا قتل، ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اس شہر کے تمام دانش وروں کو مٹا دینے کا فیصلہ ہو چکا ہے۔ اس حوالے سے شعرا کے ہاں بہت کلام ملتا ہے۔ سبکتگین صبا نے اپنی نظم "شہید حکیم محمد سعید کی یاد میں" اس مناظر کو بیان کرتے ہوئے لکھا کہ:

سانس کی ڈوری کاٹ کے، اس نے / ایک کفن کی چادر بُن کر / ایک عہد کو / تیرے
میرے سپنوں کی / اندھی قبروں میں دفن کیا تھا / قاتل کو معلوم نہیں تھا / اس سے
کیا تقصیر ہوئی ہے! / ویرانی تقدیر ہوئی ہے[۵۲۰]

اور حقیقت بھی یہی تھی کہ اس طرح کے صاحبِ علم لوگوں سے معاشرہ جب خالی ہو جائے گا تو ویرانی ہی اس شہر کا مقدر بنے گی۔ قیصر نجفی نے اس جانب اشارہ کرتے ہوئے بڑے دکھ اور اضطراب کی حالت میں لکھا کہ:

یہ کس کا شہر میں اٹھا جنازہ لگا ہر گھر سے اک میت اٹھی ہے
مسیحا دم پڑا ہے خوں میں لت پت مسیحائی لپٹ کر رو رہی ہے[۵۲۱]

امجد اسلام امجد گو اس شہر کے باسی نہیں تھے لیکن دور بیٹھ کر بھی وہ اس شہر کے دل دہلا دینے والے واقعات سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ انھوں نے شہر کے بدلتے منظر نامے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے لکھا کہ:

میں جب شہر کے دل دہلانے، خون جلانے، ہاتھ چھڑانے / والی باتیں سنتا ہوں تو سوچتا ہوں / کل تک تو یہ شہر ہمارے دل کے ساتھ دھڑکتا تھا / اس کے سارے خواب ہماری آنکھوں میں تابندہ تھے / اس کے نام پر مر جانے کی خواہش میں ہم زندہ تھے / آج یہ اس کی آنکھوں میں کیوں نفرت اور ویرانی ہے / ہر منظر، ہر راہ گزر نے شکست کی چادر تانی ہے[۵۲۲]

قتیل شفائی کے ہاں تو اس شہر میں موجود تعصب اور زہرناکیوں کا ایسا حقیقت پسندانہ اظہار ہے کہ دل خون کے آنسو رونے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ وہ اس شہر میں لسانیت اور صوبائیت کی بنیاد پر ہونے والی قتل وغارت گری کو بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

تڑ تڑ گولیاں چلنے لگیں/ دھڑ دھڑ جل کر گھرے بدن/ راکھ کے ڈھیر بنیں سڑکوں پر کاریں اور بسیں/ اور پھر وقفے وقفے سے/ گولیاں چلنے لگیں لوگوں پر/ اردو گولیاں/ سندھی گولیاں/ کہیں کہیں سے پنجابی گولی کی آواز بھی آئی/ اور پھر پشتو گولی کیسے چُپ رہتی/ اردو، سندھی، پنجابی، پشتو کے ساتھ بلوچی بھی؟/ ... نفرت کے اس کھیل میں گویا/ ہر بولی اک گولی ہے[۵۲۳]

لیکن ان تمام تر خرابیِ حالات کے باوجود وہ امید کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتے۔ اپنے آشیانے کو بچانے کے لیے وہ ہم وطنوں کو ہر ہر طرح کے جشن کرنے پر مجبور کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ:

آشیانہ جو بنا ہے تنکا تنکا جوڑ کر / کون ایسا ہے جو سُکھ پائے گا اس کو توڑ کر / جس طرح بھی ہو سکے گھر کو بچانا چاہیے / پنچھیوں کو خوب صورت آشیانہ چاہیے / آج ضد پر جو اڑے ہیں کل وہی پچھتائیں گے / مالا ٹوٹے گی تو یہ موتی بکھر جائیں گے / اک دوجے کو گلے سے اب لگانا چاہیے / پنچھیوں کو خوب صورت آشیانہ چاہیے[۵۲۴]

کشور ناہید نے یوں تو نسائی موضوعات پر زیادہ طبع آزمائی کی لیکن وہ بھی شہر کے بدلتے منظر نامے سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکیں۔ وہ شہر جہاں تمدن کی بنیادوں کو مزید گہرا ہونے کی ضرورت تھی، وہاں ہر طرف بارود کی بو سونگھ کر وہ یہ کہنے پر مجبور ہوئیں کہ:

اور سر اٹھا کر شہر میں رہنے والوں کو دیکھا / ان کے بدن پہ ہاتھوں کی جگہ بندوقیں / اور آنکھوں کی جگہ گولیاں تھیں / بارود جو قوموں کی تقدیریں / سرحدوں پہ بدلتا ہے / وہ بارود گز کی طرح اڑاتے شہر والے / مجھ سے پوچھ رہے ہیں / تمھارا اس زمین سے کیا رشتہ ہے[۵۲۵]

نوّے کی دہائی میں اس شہر پر جو بیتی اور قانون نافذ کرنے والے اداروں نے بے گناہ عام شہریوں کے ساتھ جو ناروا سلوک کیا، اس کا اظہار اپنی نظم "چارج شیٹ ۹۰ء" میں بڑی خوب صورتی سے کیا ہے:

میرے دروازے پر چڑھی کنڈی کھول دی گئی / مگر دروازہ اب بھی بند ہے / میری آنکھوں پر بندھی پٹّی اتار دی گئی / مگر نظر کچھ نہیں آتا / مرے ہونٹوں پر سے مہریں ہٹالیں گئی ہیں / مگر بولنے کا ہنر مجھے بھول گیا ہے / ...میری چارج شیٹ بہت لمبی ہے[۵۲۶]

کراچی کو تباہ کرنے کی جب ساری کوششیں رائیگاں گئیں اور زندہ دلانِ شہر نے اپنے زخموں کو بھول کر یہاں ہر سازش کا مقابلہ کیا تو احمد رئیس نے بے اختیار یہ کہا کہ:

کراچی مر نہیں سکتا / کراچی اب بھی زندہ ہے / کراچی دیکھتا ہے تو / ملو ہم ایسے لوگوں سے / جو سب سے پیار کرتے ہیں[۵۲۷]

کراچی کی تعمیر و ترقی میں جن لوگوں نے حصہ لیا، وہ اس شہر کو برباد ہوتا نہیں دیکھ سکتے تھے۔ اسی لیے آپس کی چپقلش اور لڑائی جھگڑے کو دیکھ کر وہ اپنی فکر مندی کا اظہار کرتے تھے۔ قمر ہاشمی نے اسی فکر مندی کا اظہار کرتے ہوئے اپنی نظم "قتل گہہ اہلِ وفا" میں کہا کہ:

یہ شہر ہماری ہی تگ و تاز سے گل زار ہوا ہے / اس شہر کی تعمیر میں / ہم سب نے بہایا ہے پسینا / ...اپنوں ہی کی پے کار سے / افسردہ و مغموم ہو رہے / بے مہری یارانِ وطن عام ہوئی ہے / ہم دست و گریباں ہیں تو ہنستا ہے زمانہ / یہ شہر ہے یا قتل گہہِ اہلِ وفا ہے / کیا قہر ہے ہم گھر سے نکلتے ہوئے گھبراتے ہیں / محفوظ گھروں میں ہیں / نہ اب قریۂ

جاں میں / اس شہر کو لے رکھا ہے / آفات نے اب اپنی اماں میں / آزاد ہوئے تھے تو

دل افگار نہ ہوتے / نفرت کے الاؤ میں سیہ کار نہ ہوتے [۵۲۸]

پروین فنا سید نے روشنیوں کے اس شہر میں ہونے والے لہو رنگ مناظر کو اپنی شاعری کا موضوع بناتے ہوئے کہا کہ:

تری خیرات کے صدقے / روشنیوں کا شہر ملا تھا / لیکن / کیسی زہر بھری آندھی اٹھی

/ مہران کی، سر پٹختی لہریں / ساگر تک پہنچی تو / بوند بوند میں لہو بھرا تھا [۵۲۹]

مظفر وارثی نے ان خونیں مناظر کو بیان کرتے ہوئے اپنے کرب کا اظہار کچھ اس طرح سے کیا ہے کہ:

خون ہی خون ہے، آگ ہی آگ ہے — زندگی اُڑ رہی ہے دھویں کی طرح

آدمیت درندوں کے قبضے میں ہے — خفیہ ہاتھوں میں ہیں دھجیاں امن کی

گھر سے باہر بھی موت گھر کے اندر بھی موت — موت کوئی بہانہ نہیں ڈھونڈتی

میتوں کے نکلنے لگے ہیں جلوس — اب دکانوں پہ لٹکے ہوئے ہیں کفن

روشنی گورکن تیرگی گورکن [۵۳۰]

افضال احمد سید بھی آزاد اور نثری نظم کے حوالے سے منفرد مقام رکھتے ہیں۔ کراچی کے حالات پر انھوں نے بھی متعدد نظمیں لکھیں لیکن ان کی ایک نظم "دریائے سندھ ہمارے دکھ کیوں نہیں بہالے جاتا" میں انھوں نے چارلس نپیئر کے دور کے مظالم کا موازنہ موجودہ مقتدر قوتوں کے مظالم سے کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ:

اس تمام خون سے / جو بہا / چارلس نپیئر / اپنی نگاہ میں بری الذمہ تھا / جیسا کہ ڈیڑھ

سو سال بعد تک / اس کے جاں نشین ثابت ہوئے / اس کے علاوہ بھی / سب کچھ اسی

طرح تھا / صرف / جسمانی ریمانڈ میں آئی ہوئی خواتین پر / خراب پسی ہوئی مرچ کے

بجائے / حساس اداروں میں "Tabassco Sauce" کا استعمال کیا گیا / اور کارکردگی بہتر

ہو جانے کی وجہ سے / لوگوں کو چند منٹوں میں / ایک خوب صورت میز تک پہنچانا

ممکن ہوا / جن پر ان کی طبعی موت کے / دستخط ہوئے سرٹیفکیٹ جمع تھے [۵۳۱]

ان کے شعری مجموعے "مٹی کی کان" میں بہت سی طنزیہ نظمیں ہیں جو اس زمانے کے شہری منظر نامے کا مرقع تو ہیں ہی اس کے ساتھ ساتھ اس عہد کے صاحبِ اقتدار لوگوں کے سفلی پن اور منافقانہ رویوں کی عکاس بھی ہے۔ اس بابت ان کی نظم "شہر میں بہار لوٹ آئے گی" سے ایک منظر دیکھیے:

وزیرِ اعظم کی / فوٹوجینک مسکراہٹ کے نتیجے میں / ... قتل کیا گیا نوجوان موت کی سر
زمین سے لوٹ آئے گا / اور دوسرے مرنے والے تھے / صدر کے کھنکھارتے ہی
/ دہشت گرد ہتھیار پھینک دیں گے / اور مہران بینک میں ملازمت اختیار کر لیں
گے [۵۳۲]

کراچی کی دو بڑی بستیوں نارتھ ناظم آباد، ناظم آباد اور اورنگی ٹاؤن کے ملانے والی سڑک میں آئے دن خون ریز فسادات اور انسانی جانوں کے زیاں کے سدِّ باب کے لیے بجائے پٹھانوں اور مہاجروں کے درمیان کوئی مفاہمت کی فضا پیدا کی جاتی، پہاڑ کاٹ کر ایک علاحدہ راستہ نکالنے کا بندوبست کیا گیا۔ اس منظر کو پیش کرتے ہوئے دورِ جدید کے ایک اور شاعر سعید الدین نے ''کٹی پہاڑی'' کے عنوان سے ایک نظم لکھی۔ اس نظم میں جو مناظر پیش کیے گئے ہیں وہ بعض ایسے تلخ حقائق پر مبنی ہیں جن کا بیان یہاں مناسب نہیں۔ نظم ملاحظہ کیجیے:

ہمارے شہر کی آبادی کے درمیان / کسی بھی سمجھوتے کے امکان کو مسترد کرتے
ہوئے / شہر کے شمال مغرب میں / دور تک پھیلی ہوئی پہاڑی میں ایک شگاف ڈال دیا
گیا ہے / پہاڑ کو کاٹنے کا یہ اچھوتا خیال / شہر کے کچھ معماروں کے ذہن میں کیا آیا
/ شہر کے مکانوں کے درودیوار / اس نئی تفریق کے شور و شر سے / تپ کے سرخ ہو
گئے / اور شہر کے اوپر منڈلانے لگے / قسمت آزماؤں کے عزائم [۵۳۳]

اس اقدام سے اس مقام پر واقع ایک قدیم آبادی قصبہ ٹاؤن کے مکین جس قدر خوف میں مبتلا ہوئے اور انھیں جس قدر ڈرایا دھمکایا گیا، اس نے وہاں مقامی سطح پر منتقلی کے عمل کو تیز تر کر دیا۔ لوگ اپنا گھر بار بیچ کر کسی بھی طرح دوسرے محفوظ مقام پر منتقل ہونے کی کوششوں میں مصروف ہو گئے۔ اس منظر کا بیان بھی اس نظم میں خوب کیا گیا ہے۔ دیکھیے:

آس پاس آبادیوں نے اپنی حدود کو / نئے سرے سے ترتیب دے لیا ہے / ... جمی جمائی
آبادی متزلزل ہو گئی / بازاروں اور خریداروں کے رنگ و روپ / اور چہرے مہرے
تبدیل ہو گئے ہیں [۵۳۴]

ساحر لکھنوی کا نام بھی رثائی ادب کے حوالے سے کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ انھوں نے اپنے ایک قصیدے کی تشبیب میں ۹۰ء کی دہائی میں ہونے والے خونی مناظر اور واقعات کو نظم کرنے کی کوشش کی ہے۔ محاکات کے لحاظ سے ان کی یہ نظم لا جواب ہے۔ کچھ اشعار ملاحظہ کیجیے:

بڑھی ہوئی ہے مزاجوں میں اس قدر حدت — کہ جیسے آگ سے اٹھا ہو آدمی کا خمیر
یہ ڈر ہے لکھوں جو شعلہ مزاجیِ انساں — ورق میں آگ لگا دے نہ گرمیِ تحریر
وہ شہر جس کو عروس البلاد کہتے تھے — وہ آج رزم کے میداں کی بن گیا تصویر
بھڑک رہی ہے دلوں میں عناد و بغض کی آگ — کھڑک رہی ہے ہر اک گام ظلم کی زنجیر
گھلی ہوئی ہے مزاجوں میں تلخیاں اتنی — کہ زہر ہو گئے قند و نبات و شکر و شیر
ہوئی ہے اس طرح پامال کشتِ امن و اماں — در آئیں جس طرح سرسوں کے کھیت میں خنزیر
کہ جیسے روندتے پھرتے ہوں جوشِ مستی میں — خود اپنی فوج کو فیلانِ مست بے زنجیر[۵۳۵]

صبا اکرام نے بھی اپنی ایک نظم میں کراچی کے کرب کو محسوس کرتے ہوئے مستقل اور مسلسل رونما ہونے والے فسادات اور اس کے ذریعے ہونے والے سماجی اور ذہنی رویوں میں تبدیلیوں کا اظہار کیا ہے۔ دیکھیے:

ابھی / تو جسموں پہ / گولیوں سے / بنے گلابوں میں / تازگی سی / بسی ہوئی ہے / ... یہ
جیسے کچھ / ہم سے کہہ رہی ہے، مگر ہمیں تو / محبتوں کی زبان / بھولے ہوئے / زمانہ
گزر چکا ہے[۵۳۶]

کراچی سے متعلق حبیب فخری کی نظم کا ایک حصہ ''افکار'' میں شائع ہوا۔ اس نظم کا عنوان بھی ''کراچی'' ہی تھا۔ اس زہر آلود سیاسی فضا کو سامنے رکھتے ہوئے انھوں نے درست لکھا کہ:

بہر حال یہ اک نتیجہ تو اس کا سبھی جانتے ہیں / کہ تب سے کراچی کو اک خوف ناک
آگ نے / اپنے پنجوں میں جکڑا ہوا ہے / ... گلی کوچے اور نالیاں دھوئی جاتی ہیں ہر روز
/ انھیں دھونی دی جاتی ہے / ہر روز لوگوں کے تازہ لہو سے / انھیں دھونی دی جاتی
ہے نوجوانوں کو زندہ جلا کر[۵۳۷]

انھی مظالم کا نقشہ دور امریکا میں بیٹھے شاعر وکیل انصاری نے بھی کھینچا۔ اپنی نظم ''کراچی جل رہا ہے'' میں انھوں نے ان مناظر کو بڑی خوب صورتی سے نظم کیا ہے، اشعار ملاحظہ کیجیے:

پانی کی طرح بہتا ہے انسان کا لہو — یعنی کہ ایک قوم کے ارمان کا لہو
کیا چاہتا ہے ان کا ابلتا ہوا لہو — ہر طاق کے چراغ میں جلتا ہوا لہو[۵۳۸]

شہر کی ویرانی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے متین فکری نے بھی اپنی ایک نظم ''شہر بے ندا'' میں افسوس کا اظہار کیا ہے۔ روز روز کے جھگڑوں اور بے حسی کے یہ مناظر شاعر کو کس طرح اذیت میں مبتلا کرتے ہیں، نظم میں ملاحظہ کیجیے:

عجب سے لوگ ہیں کہ جن کے چہروں پہ / کسی کو دیکھنے سے مسکراہٹ بھی نہیں کھلتی

/ سڑک، بازار، دکانیں / مکانوں کی قطاریں / سبھی کچھ ہے مگر اک ہو کا عالم ہے / ...

مجھے کچھ ایسے لگتا ہے / کہ شہرِ بے ندا میں آن نکلا ہوں / جہاں ساری صدائیں / ...

ناگ بن کر دل کو ڈستی ہیں / میں اس بستی کو شہرِ آرزو کیسے کہوں آخر[۵۳۹]

محمد نذیر نے کراچی کے ماضی اور حال کا موازنہ کرتے ہوئے موجودہ کراچی کی ابتر صورتِ حال کا منظر نامہ اپنی نظم ''شہر آشوب'' میں پیش کیا ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

یہی ہے شہر کراچی یہاں جب آتے تھے — تو ہم سے چاند ستارے کلام کرتے تھے

شفق میں غرق سمندر ہمیں بلاتا تھا — اترتی شام کے سائے سلام کرتے تھے

ہر اک راہ گزر یورشِ ستم گاراں — نہ مال و جاں کی ضمانت نہ آبرو کا بھرم

ہوا ہے گولہ و بارود کا پیام رساں — لہو کے داغ ہیں یا دشمنوں کے نقشِ قدم

کھلی فضا کی گھٹن ہے عجیب عالم ہے — ہے شہر جشنِ طرب میں کہ عہدِ ماتم میں

نہ مہربانیِ مسند نہ شیوۂ رندی — بدل گیا ہے زمانہ کہ ہم نہیں ہم میں[۵۴۰]

رفیعہ شبنم عابدی نے سوالیہ انداز میں امیر شہر سے شہر کی ناگفتہ بہ حالت کا سبب بھی پوچھا اور ان اداس مناظر کو اپنی نظم ''امیر شہر! کچھ بتا'' میں قید کرنے کی کوشش بھی کی ہے۔ وہ کہتی ہیں کہ:

امیر شہر! / کچھ بتا / حنا کے پھول کس لیے ہتھیلیوں سے مٹ گئے؟ / چمکتی مانگ میں

سیاہ راکھ کیسے بھر گئی؟ / یہ کیا جلا؟ / یہ کیوں جلا؟ / یہ کس کے ہاتھ تھے کہ جو

/ ہوائیں آگ بن گئیں / دعائیں بانجھ ہو گئیں / جو چاند جیسی صبحیں تھیں / وہ کیسے

سانجھ ہو گئیں؟ / امیر شہر! کچھ بتا / بتا ذرا / بتا ذرا / امیر شہر کیا کہے / کہ اس کی میز پہ

چُنے ہوئے / تمام ذائقے لہو کے ہیں[۵۴۱]

شاہد نقوی نے بھی گولیوں سے چھلنی اس شہر کی خرابی کا نقشہ کھینچتے ہوئے ایسے حقائق کو نظم کیا ہے جس پر نہ جانے کیوں مقتدر قوتیں عرصۂ دراز تک آنکھ بند کیے بیٹھی رہیں۔ شہر میں کلاشنکوف اور اسلحے کا کلچر پروان چڑھتا رہا اور حکمران چین کی بانسری بجاتے رہے۔ اس صورتِ حال پر شاعر کا کہنا تھا کہ:

گزشتہ سال جب اس شہر میں ہنگامے برپا تھے / کلاشنکوف، پستولوں، دھماکوں سے

/ بھری آبادیوں کی رونقیں بارود کی بو اور دھویں کی سیاہ چادریں / لپٹ کر سو گئیں

تھیں اس طرح جیسے / طلوعِ صبح کا مژدہ / کوئی سورج کبھی لے کر نہ اس بستی میں آئے
گا[۵۴۲]

ڈاکٹر قمر آراء نے بھی اپنی ایک نظم ''عروس البلاد کراچی کی خیر'' میں دن رات گولیوں کی بوچھاڑ اور انسانی ہلاکتوں کا ذکر کیا ہے۔ جیسے:

کہیں گولیوں سے ہے چھلنی بدن　　کہیں آگ میں جل رہا ہے بدن[۵۴۳]

ڈاکٹر منصور عمر نے بھی حکمرانوں کی کوتاہ اندیشی اور رہنماؤں کی بے عقلی کا روناروتے ہوئے درست لکھا کہ:

بکھیرا رہنماؤں نے جو ہے ملت کا شیرازہ　　بھگتنا ہی پڑے گا سب کو خمیازہ
جو نکلے ہیں ہوا کا رخ بدلنے کو　　انھیں اے کاش ہو جائے ذرا اپنا ہی اندازہ
یہ کیسا وقت آیا ہے کہ　　کھلتا ہی نہیں فہم و فراست کا وہ دروازہ[۵۴۴]

بقا صدیقی نے بھی نظم ''دید وحشی مناظر کی ہے'' میں اس شہر پر پھیلے دہشت کے مناظر کو بیان کرتے ہوئے کہا کہ:

خوب صورت مرا شہر تھا / ... گولیوں کی صداؤں سے اب / بام و در گونجتے ہیں یہاں
/ بین کرتی ہوئی ہے فضا / دید وحشی مناظر کی ہے / رنگتوں کی جگہ خون ہے / بارشوں
کی جگہ آگ ہے / ... قتل گاہیں سجی ہیں یہاں / اک ہلاکت بجھی ہے یہاں[۵۴۵]

مشتاق شاد نے ''سائے کے چور'' کے عنوان سے کراچی کے بدلتے منظر نامے پر ایک نظم لکھی۔ اس نظم میں اپنے شہر کو گھنے پیڑ سے تشبیہ دے کر نسلِ نو کو اس کی حفاظت اور تعمیر و ترقی میں اپنا حصہ ڈالنے کی طرف توجہ مبذول کراتے ہوئے شاعر کہتے ہیں کہ:

یہ وہی پیڑ ہے / مدتوں جو مجھے سائے ماں کی طرح / دھوپ کی سختیوں سے بچاتا رہا / ...
وہ حلاوت پھلوں سے کہاں کھو گئی / آج اس پیڑ کے پھل کسیلے ہیں کیوں / اس کے
پھولوں کی خوش بو کہاں سو گئی / ... اس کی چھاؤں نہ جانے کہاں گم ہوئی / آ گئے کس
طرف سے یہ سائے کے چور / ہر طرف اجنبی اجنبی صورتیں / کس نے منگوا لیے ہیں
کرائے کے چور / میرے بچّو! اٹھو پیڑ گرنے کو ہے / اس امانت کو آؤ سنبھالا کریں[۵۴۶]

اپنی ایک اور نظم ''نقش بہ دیوار'' میں بھی انھوں نے شہر میں پھیلی لاقانونیت، نامعلوم دہشت گردوں کی جانب سے ہونے والی مسلسل قتل و غارت گری اور انسانی زندگی کی پائمالی کا نقشہ کھینچا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ:

قیامت سی اتر آئی مری دہلیز پر جیسے / مرے گھر کے سبھی افراد بندوقوں کی زد پر تھے

/ مرے بھائی، مری بہنیں / مرے ماں باپ میرے سامنے محبوس بیٹھے تھے / اور ان

کی ڈولتی نظریں جمی تھیں میرے چہرے پر / اچانک میں نے دیکھا / بلاؤں نے مجھے

کمرے کی دیواروں پہ دے مارا / کبھی دائیں کبھی بائیں / کبھی اوپر کبھی نیچے / ...اور اس

کے بعد شاید گولیوں کی باڑ آئی تھی[۵۴۷]

سردار زیدی نے ''رپور تاژ'' کے عنوان سے لکھی گئی نظم میں شہر کے امن و امان کے ذمے دار اداروں پر گہرا طنز کیا ہے۔ پولیس میں بھرتی کا طریقہ کار اور امن و امان کے معاملے میں حکومتی غیر سنجیدہ رویے نے شہریوں کو کس طرح سے عدم تحفظ سے دوچار کر رکھا تھا، اس کا نقشہ کھینچتے ہوئے کہا کہ:

تیسری دنیا کے ایک ملک میں / اخبار میں ایک شہ سرخی چھپی / کہ عوام کے جان و مال

کے / بہتر تحفظ کی خاطر / پولیس میں پانچ ہزار افراد کی / نفری بڑھا دی گئی ہے / ...

کسی نے اس خبر کا نوٹس نہیں لیا / حسنِ اتفاق سے / دوسرے ہی دن اسی اخبار میں

/ ایک چھوٹی سی خبر اور چھپی / کہ شہر کے چڑیا گھر سے / سانپ گھر کی چھت گر جانے

کے باعث / کئی ہزار سانپ / شہر میں پھیل گئے ہیں / اس خبر کے چھپتے ہی / سارے

شہر میں بھگدڑ مچ گئی / لوگوں نے کاروبار بند کر دیے / کتنے ہی لوگ جان کے خوف

سے شہر چھوڑ گئے[۵۴۸]

صفدر صدیقی رضی نے بھی ریاستی تشدد اور جبر کے نتیجے میں پیدا ہونے والی صورتِ حال کا نقشہ کھینچتے ہوئے اپنی ایک نظم ''ریاست'' میں لکھا کہ:

جہاں انصاف صرف اہلِ حکومت، اہلِ منصب کو میسر ہو / جہاں رسوائی ناداروں کا

حصہ ہو / جہاں توقیر صرف اہلِ فراغت کا مقدر ہو / جہاں تکریم سلطانوں جہاں

داروں کا حصہ ہو / جہاں تذلیل مظلوموں کی قسمت ہو / جہاں ہر ظلم ناچاروں

غریبوں کی وراثت ہو / جہاں عزت مراعت یافتہ طبقے کو حاصل ہو / کہ ہر ایسی ریاست

میں ریاست جنم لیتی ہے / ہمیشہ ہر خباثت سے خباثت جنم لیتی ہے[۵۴۹]

بقا صدیقی نے بھی سیاسی و سماجی سطح پر بدلتی ہوئی اس فضا کو نہ صرف محسوس کیا بلکہ اس پر مضطرب بھی دکھائی دیے۔ انسانی جانوں کے زیاں اور روز بروز بڑھتی ہوئی اجنبیت کے سائے پر وہ متفکر ہو کر یہ کہنے پر مجبور ہوئے کہ:

جس کو دیکھو وہی خوں خوار نظر آتا ہے — اپنے خطے میں یہ جنگل تو نہیں تھے پہلے
قتل ہو جاتے ہیں ہر روز ہی دس بیس جوان — یوں سرِ شہر یہ مقتل تو نہیں تھے پہلے
ہر نئی صبح کوئی گود اجڑ جاتی ہے — حادثے ایسے مسلسل تو نہیں تھے پہلے[۵۵۰]

اقبال مجیدی نے بھی شہر کے حبس زدہ ماحول میں لب کھولنے کے ہول ناک نتائج کی جانب اشارہ کرتے ہوئے اپنی نظم "یہ خراج ملتا ہے" میں کہا کہ:

یہ سوال اٹھتا ہے / لوگ مر رہے ہیں کیوں؟ / آپ ڈر رہے ہیں کیوں؟ / ہر گلی و کوچہ
سے / بس صدا یہ آتی ہے / آپ لڑ رہے ہیں کیوں؟ / آپ مر رہے ہیں کیوں؟ / کیا
جواب دوں تجھ کو / ذہن اب لرزتا ہے / دل مرا دھڑکتا ہے / گولیوں پہ مرتا ہوں
/ گولیوں پہ زندہ ہوں / حق کی بات کرنے سے یہ خراج ملتا ہے[۵۵۱]

پروفیسر حسن عسکری فاطمی نے بھی شہر میں جاری خون کی ہولی اور کلاشنکوف کلچر پر کھل کر اظہار کیا ہے۔ شہر کے بدلتے منظر نامے اور دگر گوں حالات پر انھوں نے متعدد اشعار کہے۔ ملاحظہ کیجیے:

کلاشنکوف چلتی ہے سروں مینہ برستا ہے — قیامت کا سماں ہے شہر قائد خوں اگلتا ہے
کبھی جس شہر میں مہر و وفا کے پھول کھلتے تھے — اب اس کی وسعتوں میں دشمنی کا زہر گھلتا ہے
وہ جس کی مہرباں آغوش سب زخموں کا مرہم تھی — اب اس میں بے بسی ہے کرب ہے آشوب ملتا ہے
کبھی اک نغمگی بکھری ہوئی تھی جس کی گلیوں میں — وہاں آنسو ہیں، اب آہوں کا اک نوحہ ابھرتا ہے
سوادِ شہر پر چھائے ہوئے ہیں موت کے سائے — درونِ شہر اک غارت گری کا دور چلتا ہے
کھلے بندوں گلی کوچوں میں قاتل دندناتے ہیں — کہیں پر لاش گرتی ہے کہیں پر مال لٹتا ہے
نہیں کوئی نہتے شہریوں کا پوچھنے والا — یہ قسمت ہے کہ بچ جاتا ہے جو گھر سے نکلتا ہے[۵۵۲]

ثاقب رزمی کے ہاں شہر سے فرار کی کیفیت نمایاں ہے۔ وہ اپنی نظم "اس شہر خرابی میں" حالات سے تنگ آ کر کہیں دور نکل جانے کی بات کرتے نظر آتے ہیں۔ جیسے:

آؤ! اس شہر خرابی سے کہیں دور چلیں — اور اک گوشۂ تنہائی کو آباد کریں
نفسا نفسی کا یہ عالم ہے کہ دم گھٹتا ہے — جنس ہر قدرِ محبت کا یہاں لٹتا ہے
جاہ و دولت کی ہوس شہر کا خوں پیتی ہے — سہم و افلاس میں مخلوقِ خدا جیتی ہے
اک حقیقت ہے شبِ شہر خرابی کا حصار — اور ممکن نہیں سنگین حقیقت سے فرار[۵۵۳]

ایک پُر امن اور غیر پرور شہر میں جس طرح نفرتوں کا زہر گھولا گیا اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے رفعت سروش نے اپنی ایک نظم "کہانی ایک درخت کی" میں علامتوں اور اشاروں کنایوں میں مختلف علاقوں سے آنے والے لوگوں کے مکروہ چہروں کو عیاں کیا ہے۔ جیسے:

نفرتوں کی کثیف وادی سے / کچھ پرندے اڑتے اڑتے آئے ادھر / اور بہار آشنا
پرندوں کو / بولیاں وہ سکھا گئے اپنی / گھل گیا زہر سا ہواؤں میں / پھر تناور درخت
میں اک دن / ایک بھونچال سا ہوا پیدا / کھوکھلی ہو گئیں جڑیں اس کی / اور ہر شاخ
آگ اگلنے لگی[554]

عذیر رضوی نے تو شہر کے حالات کا بیروت سے موازنہ کرتے ہوئے کراچی کو بدتر قرار دیا ہے جہاں ہر وقت گولیوں کی تڑتڑاہٹ اور دھماکوں کی گونج لوگوں کو مستقل اضطراب کا شکار بنائے رکھتی ہے۔ اپنی ایک غزل میں اس جانب اشارہ کرتے ہوئے ان کا کہنا تھا کہ:

زہرِ زیاں میں خون کا بازار گرم ہے — دشت گماں میں صرصر اظہار گرم ہے
آشوب ہے بلا ہے قیامت ہے قہر ہے — بیروت سے بھی بڑھ کے خرابہ یہ شہر ہے
ہر سمت گولیوں کی دھماکوں کی گونج ہے — آہ و بکا کا شور ہے نالوں کی گونج ہے
بارود کی فضاؤں میں بو ہے رچی ہوئی — ہر ہر گلی ہے مقتلِ انساں بنی ہوئی[555]

ڈاکٹر شہریار نے بھی شہر کے اِنھیں ہول ناک مناظر کو اپنی شاعری کے کینوس میں قید کرنے کی کوشش کی ہے۔ ایک غزل میں وہ خود کلامی کے انداز میں کہتے ہیں کہ

تمھارے شہر میں کچھ بھی ہوا نہیں ہے کیا — کہ تم نے چیخوں کو سچ مچ نہیں سنا ہے کیا
میں اک زمانے سے حیران ہوں کہ حاکمِ شہر — جو ہو رہا ہے اُسے دیکھتا نہیں ہے کیا
اُجاڑتے ہیں جو ناداں اسے اجڑنے دو — کہ اجڑا شہر دوبارہ بسا نہیں ہے کیا[556]

اقبال حیدر نے بھی شہر کے گلی کوچوں کی بے اماں صورتِ حال پر اپنی غزلوں اور نظموں میں فکر مندی کا اظہار کیا ہے۔ وہ شہر کی ناگفتہ بہ کیفیت پر کہتے ہیں کہ:

شہر کے گلی کوچے / جب سے بے اماں ٹھہرے / چیختی فضاؤں میں لوگ بے زباں
ٹھہرے[557]

شہر کے ان اداس اور بے چین مناظر کی نشان دہی کرتے ان کا کہنا ہے کہ:

آئینہ حیران ہے اور آسماں رونے کو ہے — اس تماشا گاہ میں اب اور کیا ہونے کو ہے

اے ہوائے بے یقینی گل نہ کر گھر کے چراغ — چند لمحوں کو ٹھہر جا کچھ نہ کچھ ہونے کو ہے[۵۵۸]

اس موضوع پر نہ صرف انھوں نے خود شعر کہے بلکہ حالات کی سنگینی کا ادراک کرتے ہوئے ہم عصر شعرا کو بھی یہ احساس دلایا کہ سخن کا قرض ان سے کچھ تقاضا کر رہا ہے۔ وہ تقاضا یہ ہے کہ اس شہر ناگفتہ بہ پر کچھ نہ کچھ کہا جائے۔ خاموشی توڑ کر اپنے لبوں کو آزاد کیا جائے۔ اپنی نظم ''حسابِ دوستاں درِ دل'' میں وہ کہتے ہیں کہ:

خدا کے واسطے بولو کہ چُپ رہے ہو بہت — یہ خامشی کہیں لب بستہ آرزو تو نہیں

کہ جس کی اوٹ میں ایک بزدلانہ نفرت ہے — گزرنا کوچۂ قاتل سے سر جھکائے ہوئے

یہ چشم پوشی نہیں مجرمانہ غفلت ہے — شریکِ ظلم ہے جو ظلم کے خلاف نہیں

کہو کہ ہم نے صدا مصلحت سے کام لیا! — جو آگیا سرِ مسند اسی کا نام لیا

امیر شہر کی نظروں میں معتبر بھی رہے — غریبِ شہر کی دھڑکن کا بھی سلام لیا

پناہ گاہوں سے کرتے رہے رجز خوانی — جو ہم نے خون سے لکھا وہ اور قصہ تھا

لہو کے داغ دھلیں یا رہیں ہمیں کیا ہے — نئے چراغ جلیں یا بجھیں ہمیں کیا ہے

ہدف بنا رہا ڈھاکا تو ہم نے کیا لکھا — کہ اب ہے زد پہ کراچی تو قرض ہے ہم پر[۵۵۹]

ن۔م۔ دانش نے بھی اپنے شہر بلکہ ملک سے دور رہ کر بھی اس کے درد کو نہ صرف محسوس کیا بلکہ سیاسی حوالے سے جو کچھ اس شہر میں ہو رہا تھا، ان مناظر کو اپنی شاعری میں بیان بھی کیا۔ ایک اشارے پر شہر ویران وسنسان ہونے کے مناظر ہوں یا غزل کی روایتی فضا سے ہٹ کر ان حالات کا بیان ہو، ہر مقام پر وہ ایک کام یاب فن کار کی طرح بہت کچھ مناظر دکھاتے چلے جاتے ہیں۔ اپنی ایک نظم ''کتا بھونکتا ہے'' میں وہ کہتے ہیں کہ:

> فصیلِ شہر پہ سر کاٹ کر لٹکائے جاتے ہیں / نیا فرمان جاری ہوتا ہے / اور اطاعت کے
> لیے سب لوگ جھکتے ہیں / زمیں پر / آسماں سے اک ستارہ ٹوٹ گرتا ہے / ہوا فریاد
> کرتی ہے[۵۶۰]

اسی طرح ایک غزل میں بھی شہر کے ان مناظر کو پیش کرتے دکھائی دیتے ہیں جو مجموعی طور پر اس شہر کی فضا میں چھائی ہوئی تھی۔ ملاحظہ کیجیے:

لوگ سہمے ہوئے اک عجب بے کلی آسماں زرد ہے — جانے کیا ہو یہ کل دیکھیے گا ابھی آسماں زرد ہے

رات کی گود میں ماہتابِ جہاں کی سڑی لاش ہے — دن کی بانہوں میں مردہ سیہ روشنی آسماں زرد ہے[۵۶۱]

اسی طرح رشیدہ عیاں بھی ملک سے باہر رہنے کے باوجود ان حالات پر دل گرفتہ دکھائی دیتی ہیں۔ اپنی ایک نظم ''دھرتی ماں کی پکار'' میں انھوں نے اس جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ:

میں نے کب سوچا تھا ایسے دن بھی مجھ پر آئیں گے　　　میری گود کے پالے دہشت گردی کے گُن گائیں گے

کیا ان سب کو دہشت اور نفرت کی بھینٹ چڑھادو گے　　　اپنے ہاتھوں بیٹو، اپنے گھر کے دیپ بجھا دو گے [۵۶۲]

نصف صدی سے زائد عرصے پر محیط کراچی کے بحران اور سانحات کے مطالعے سے یہ بات پوری طرح عیاں ہے کہ ملک کے کسی بھی ادارے نے اس شہر کے مسائل کے حل کی طرف خاطر خواہ توجہ نہیں دی۔ نتیجتاً سیاسی محاذ پر مکمل انتشار دکھائی دیتا ہے۔ اس شہر کا پورا نظام مفلوج ہو چکا ہے۔

دنیا کے بہت سے ممالک میں آج نسلی مسائل کو بہت زیادہ اہمیت دی جا رہی ہے۔ جنوبی ایشیائی ممالک کی سیاست میں بھی ان کی خاصی اہمیت ہے۔ پاکستان میں اتھنک (Ethnic) تحریکوں نے قومیت کی شکل اختیار کر کے خود کو خوب ابھارا ہے۔ قیامِ پاکستان کے بعد مسلم نیشنل ازم کا مقصد پورا ہو گیا تو عملی طور پر اس کی ضرورت باقی نہیں رہی لیکن ریاست میں مراعات اور محروم طبقے کے درمیان کش مکش نے نئی صورت اختیار کر لی۔ لہٰذا اتھنک سیاست کا نئے سرے سے آغاز ہوا۔ پنجابی جو تعداد میں زیادہ تھے، فوج اور بیوروکریسی میں اپنا تسلط رکھتے تھے، اب نئے مراعات یافتہ لوگ کہلائے۔ ردِ عمل میں سرحد، سندھ، بلوچستان اور بنگال کے کمزور طبقے نے اپنی شناخت مسلمان اور پاکستان کے بہ جائے بنگالی، سندھی، پٹھان، بلوچی اور مہاجر میں تبدیل کر لی۔ سندھ کی صورتِ حال اس لیے بھی زیادہ پے چیدہ ہو گئی کہ یہاں کئی اتھنک گروپس آباد ہوئے۔ اسی لیے نسلی تفاوت یہاں سب سے زیادہ پیدا ہوا۔ خاص طور پر مہاجرین کی وجہ سے جو تقسیم کے بعد اسی صوبے میں آ کر آباد ہوئے۔ ابتدا میں شہروں میں مہاجروں کی مکمل اکثریت تھی جس کی وجہ سے سندھ میں مہاجروں کی صنعتی کلاس ابھری لیکن بعد میں پٹھان اور پنجابی ورکرز کے آنے سے شہری آبادی غیر متوازن ہوتی چلی گئی۔ تقسیم کے وقت مہاجر بیوروکریسی نے بھی دوسری قومیتوں کے دل میں نفرت کے جذبات پیدا کیے۔ بعد میں جب مہاجر بیوروکریسی کمزور ہوئی اور اس پر شب خون مارا گیا تو کوٹا سسٹم نے مزید مسائل پیدا کیے تو مہاجروں نے اس نئے نظام میں خود کو مجبور اور لاچار پایا۔ ایم۔ کیو۔ ایم۔ کا قومی منظر پر آنا اچانک اور ڈرامائی تھا۔ ان چند اہم واقعات کا جو ۱۹۸۶ء میں وقوع پذیر ہوئے اس سے چند ماہ قبل تک کوئی یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اتنی بڑی تعداد میں لوگ مہاجر نعرے کے تحت متحد ہو جائیں گے۔ ان مہاجروں نے بھی یک لخت پاکستانی اور مسلمان کی شناخت کو رد کر دیا اور مہاجر شناخت کو ابھارا۔ بعد میں منشیات اور اسلحے کے فروخت میں ملوث پٹھان مافیا جو شہری زمینوں پر قبضا کر کے فروخت کرنے کے کام میں بھی سرگرم تھی، جس کا بڑا حصہ قانون نافذ کرنے والے اداروں اور ایجنسیوں کو بھی جاتا تھا، نے بنگلا دیش سے آئے ہوئے بہاریوں اور پٹھانوں کے درمیان اتھارٹیز کے تعاون سے خوں ریز فسادات کروائے [۵۶۳]۔ اس سے قبل جنرل ایوب خان کی حکم رانی میں جب

مہاجروں نے قائداعظم کی بہن محترمہ فاطمہ جناح کو ایوب خان کے مقابلے میں ترجیح دی تھی تب بھی انھیں اس قسم کی صورتِ حال کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ ایوب خان بہر حال جیت گئے۔ فہمیدہ ریاض کے مطابق کرسی نشین جنرل کبھی ہارا نہیں کرتے۔ البتہ ان کے صاحب زادے گوہر ایوب نے فاطمہ جناح کی حمایت کرنے پر کراچی والوں سے اس گستاخی کا خوب بدلہ لیا۔ شہر کی غریب آبادیوں میں رہنے والے مہاجروں کی جھونپڑیوں پر حملہ، فائرنگ، ہلاکتیں اور ساتھ ساتھ اس طرح کے تبصرے کہ پہلی بار ان مہاجروں کی کسی نے خبر لی ہے[۵۶۴]۔ البتہ فیض احمد فیض نے اس قتلِ عام پر یہ ضرور کہا کہ:

نہ رزم گاہ میں برسا کہ معتبر ہوتا　　　کسی عَلم پہ رقم ہو کے مشتہر ہوتا[۵۶۵]

لیکن اس وقت فیض کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ آنے والے برسوں میں یہ لہو ایم۔ کیو۔ ایم۔ کے پرچم پر رقم ہو گا۔ شاعر تاریخ کو مستقبل میں غیر متوقع موڑ کھاتے سفر میں نہیں دیکھتا، وہ تو حال کے ایک لمحے میں آنسو بہاتے ہوئے کرب کے عالم میں شعر جوڑتا ہے۔ فہمیدہ ریاض کے مطابق نچلے درمیانہ مہاجر طبقے کے اس جم غفیر نے آخر کار اپنی ایک نمائندہ نسلی نام رکھنے والی سیاسی تنظیم بنالی۔ ایک ایسی تنظیم جس میں اختلاف رائے کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ یہ تنظیم اچانک وجود میں نہیں آئی بلکہ اس کے پیچھے بہت سے عوامل کار فرما تھے۔ ایسے ایسے عوامل جن کا ذکر کرتے ہوئے الفاظ ساتھ نہیں دیتے۔ ایسے ایسے سانحات جن کو پڑھ کر اور سن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ مہاجر نوجوانوں کی سندھ یونی ورسٹی جام شورو میں پتلونیں اتارے جانے اور فہمیدہ ریاض کے مطابق مقعد میں دو تین گلابی صحت مند عضو تناسل طاقت ور دھکوں کے ساتھ گھساتے ہوئے جئے سندھ کے نعرے لگانے کی آوازوں[۵۶۶] نے ان نوجوانوں کو عجیب اضطراب میں مبتلا کر دیا تھا۔ ابتدا میں اس سیاسی تنظیم کا نظم و ضبط اور عوامی مسائل سے آگہی نے مہاجر بزرگوں، عورتوں اور لوگوں کو یہ کہنے پر مجبور کر دیا کہ "ایسا جوش، ایسی وفاداری، ایسا جذبہ تو کبھی دیکھنے میں نہ آیا"، "بھئی واہ! یہ اتحاد دیکھ کر تو قیامِ پاکستان سے پہلے کا منظر آنکھوں میں پھر جاتا ہے" وغیرہ۔ اس طرح تحریک پاکستان کو اصل ایندھن مہیا کرنے والوں کی اولاد نے ایم۔ کیو۔ ایم۔ بنائی اور لوگ جوش و خروش سے اس سیاسی تحریک کے حامی بن گئے۔ اتنی بڑی تعداد میں ایک جھٹکے سے اتنی بڑی ڈیموگرافک تبدیلی پر مخالفین میں غم و غصہ پیدا ہونا فطری امر تھا۔ بعد کے برسوں میں شہر ان گنت لکیروں میں تقسیم ہو تا گیا اور ہر لکیر ایک دوسرے کو کاٹتی ہوئی گزر رہی تھی۔ نفرت اور انتقام کی آگ میں جھلستا ہوا یہ شہر[۵۶۷] ہزاروں نوجوانوں کو نگل گیا۔ مہذب گھرانوں کے نوجوان ہاتھ میں اسلحہ تھامے دہشت پسند کارروائیوں میں ملوث ہونے لگے۔ تنظیمی ڈھانچا رفتہ رفتہ شدت پسند رجحان رکھنے والے نوجوانوں کے ہاتھوں میں چلا گیا۔ رہ نماؤں کی کارکنوں پر گرفت ڈھیلی ہونے کے نتیجے میں شہر کے ہر مرکز پر مفاد پرستوں نے اپنے اپنے انداز سے لاقانونیت دہشت پسندی کے نت نئے طریقے ایجاد کر لیے۔ اندرونِ سندھ مہاجروں کے ساتھ ہونے والے سلوک نے ان مہاجر نوجوانوں کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ سندھی پولیس جو اس شہر پر مسلط ہے، سب کے سب ہندو ہیں۔ راجا داہر کی اولاد۔ ان کی نظر میں ہندو اس وقت تک

ٹھیک طرح سے قابلِ نفرت نہیں ہو سکتا جب تک وہ سندھی نہ ہو۔ سندھی بھی فرشتہ نہیں تھے۔ کراچی سے نکلنے والے سندھی اخبارات میں ایک آدھ مضمون کو چھوڑ کر اس مصیبت زدہ شہر کے لیے نفرت اور حقارت کے سوا کچھ نہیں ملتا۔ وہ لوگ سرکاری زبان میں بات کرتے ہوئے مہاجر صوبہ بنانے پر زور دینے والوں کو باغی اور تمام مہاجروں کو صرف اور صرف دہشت گرد کے نام سے یاد کرتے[۵۶۸]۔

آپریشن کلین اپ بھی شہر میں امن اور سکون لانے میں ناکام رہا۔ اس آپریشن کے نتیجے میں یہ شہر آنسوؤں کا، ہر روز اٹھتے جنازوں کا اور نفرتوں کا شہر بنا۔ شہر کی ایک بڑی تنظیم معتوب ٹھہری۔ اس کی بنائی ہوئی اذیت گاہیں ٹیلی وژن پر دکھائی گئیں، انھیں ختم کر دیا گیا۔ پھر بھی اس وقت شہر کے لوگوں نے خوشیاں نہیں منائیں۔ ہزاروں نفوس پر مشتمل پوری تنظیم زیرِ زمین چلی گئی۔ ہزاروں گرفتاریاں جس کے بعد لڑکوں کے ہاتھ پیر توڑ کر، ٹانگیں چیر کر نامرد بنانے کا سلسلہ شروع ہوا۔ راہ گیروں کی تلاشیاں لے کر انھیں بے عزت کرنا ہو، یا اندھا دھند گرفتاریاں کر کے شہر کے کونوں کھدروں میں ان کی نعشیں ملنے کا سلسلہ، اس شہر نے یہ سارے عذاب دیکھے۔ سترا سے ستائیس برس کے لڑکے شہر سے غائب ہونے لگے۔ ۱۸ ہزار کے قریب نوجوانوں کا آج تک پتا نہیں چل سکا[۵۶۹]۔ اس سیاسی تنظیم کو جو کہ بڑے منظم انداز سے اپنے حقوق کی جدوجہد میں مصروف تھی، جو لاکھوں لوگوں کی نمائندہ جماعت بن چکی تھی، کن قوتوں نے اذیت گاہوں کے قیام سے، خون سے اور ہتھیاروں سے داغ دار کیا، یہ وہ سوال ہے جو ابھی تک حل طلب ہے۔ انھیں ہر طرح کی بدعنوانیوں، بھتا وصولیوں، ظلم، دھونس اور خوں ریزی کا رویہ اختیار کرنے کی کھلی چھوٹ برسوں تک کیوں رہی، اس سوال کا جواب بھی ابھی تشنہ ہے۔ غالباً مقتدر قوتیں ان پردہ نشینوں کے چہرے سے نقاب الٹنا نہیں چاہتیں۔ جیئے مہاجر کا نعرہ بلند کرتے یہ مہاجر نئے وڈیرے اب اس حد تک آگے بڑھے کہ جگہ جگہ شہر میں اس قسم کے بینرز اور وال چاکنگ کرتے پھرے کہ جو قائد کا غدار ہے وہ موت کا حق دار ہے۔ اب شہر میں باغی گروپ، حقیقی گروپ نے فاش ازم کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے موت کا رقص جاری رکھا۔ کراچی میں روز کا اسکور نعشوں کی تعداد کے لیے استعمال ہونے لگا۔ بوریوں میں بند نعشیں، کبھی ۱۶، کبھی ۱۰، کبھی ۲۵ تک ملتیں۔ درجنوں افراد اس دوران پولیس مقابلوں میں بھی ہلاک کیے گئے۔ غرض کراچی کے مختلف علاقے خاص طور پر خواجہ اجمیر نگری، قصبہ، علی گڑھ، اورنگی ٹاؤن، بلدیہ، نئی کراچی، لانڈھی، کورنگی، ناظم آباد وغیرہ خون میں نہا گئے۔ اس گھمسان نے اس لاوارث شہر کو جھنجھوڑ دیا۔ جو لوگ آج بڑے داؤں مار لیں گے انھیں کے خاندان کل کی اشرافیہ کہلائیں گے[۵۷۰]۔ خواہش نے ایم۔ کیو۔ ایم۔ کے سرکردہ رہنماؤں کو بھی مال بنانے اور ظلم پر آنکھیں بند رکھنے کے فارمولے پر عمل کرنے پر مجبور کر دیا۔ ایک پوری نسل تعلیم سے بے گانہ ہو کر ہتھیار اٹھائے پیسہ بنانے میں مصروف ہو گئی۔ اٹھارہ انیس برس کے لڑکوں کے ہاتھ میں جب اسلحہ آ جائے تو وہ بادشاہ بن جاتے ہیں اور اپنی مرضی سے کسی کو بھی قتل کر سکتے ہیں۔ اس شہر کے ساتھ بھی یہی ہوا اور قانون نافذ کرنے والے جانب داری کا مظاہرہ کرتے ہوئے تماشا

دیکھنے میں مصروف رہے۔ ان سنگ دلانہ کارروائیوں کا حقوق سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ جب ایم۔ کیو۔ ایم۔ کے طلبا یا پیپلز پارٹی کے طلبا ایک دوسرے کے ارکان کے پیٹ میں برمے سے سوراخ کر دیتے ہیں یا گھٹنے میں چھینی سے سوراخ کر دیتے ہیں یا جب مخالفین کو زندہ جلا دیتے ہیں تو ان حرکتوں کا قومیتوں کے مطالبات سے کوئی علاقہ نہیں چاہے وہ سندھی ہوں یا مہاجر۔ یہ تمام چیزیں قومیتوں کے حقوق سے باہر کی چیزیں ہیں لیکن کراچی اور سندھ کے دیگر شہروں میں گزشتہ کئی دہائیوں سے یہی حبس زدہ ماحول دکھائی دے رہا ہے۔ گزشتہ دہائیوں میں فوجی حکومت کے طفیل بھی معاشرے میں بربریت نے فروغ پایا ہے۔ سیاسی جبر اور تشدد کے ذریعے جنگل کا قانون ہمارے معاشرے میں بری طرح سرائیت کر چکی ہے۔ تشدد سے تشدد ہی جنم لیتا ہے۔ آج جو کچھ سندھ میں ہو رہا ہے اس کے ذمے دار وہ تمام انتہا پسند ہیں جنھوں نے حقوق کے حصول کے نام پر عام لوگوں کو بے وقوف بنایا اور ایم۔ کیو۔ ایم۔ کا یہ دیرینہ مطالبہ ہے کہ مہاجروں کو پانچویں قومیت تسلیم کرنے اور مہاجر صوبے کے قیام سے تمام مسائل حل ہو سکتے ہیں جب کہ سندھ کی تقسیم سندھیوں کے مفاد میں نہیں[۵۷۱]۔

اس صورتِ حال کی وجہ سے غیر یقینی فضا آج بھی برقرار ہے۔ وقتی طور پر امن کی صورتِ حال بہتر ضرور ہوئی ہے لیکن اس مسئلے کا مستقل حل اس صوبے کو دو انتظامی یونٹوں میں تقسیم میں مضمر ہے۔ سندھی مہاجر تضاد نے سندھ کے معاشرے کی ساخت کو بدل کر رکھ دیا ہے۔ اس تبدیلی کا اظہار شہر اور دیہات کے درمیان فرق کی صورت میں دیکھا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر مبارک علی کے مطابق لوگوں نے نئے ملک میں اس شناخت کو پختہ کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ ان کی خواہش تھی کہ تمام صوبے کے لوگ صوبائی شناخت ختم کر کے قومی شناخت کو تسلیم کر لیں تاکہ ان میں اور مقامی لوگوں میں کوئی فرق نہ رہے، لیکن مقامی لوگوں کی اتھنک فرق نے ۱۹۵۰ء کی دہائی میں مہاجروں کے اندر بھی تبدیلی پیدا کی۔ سندھی اور بلوچی ادیبوں نے جب سندھ میں قومیت کے تصور کو خوب ابھارا تو پڑھے لکھے لوگوں کے ذریعے اس قسم کا رجحان سندھ کے عام لوگوں میں بھی پھیلا۔ اس عمل کے نتیجے میں دونوں جانب پاکستانی شناخت کمزور ہو گئی اور اس کی جگہ سندھی اور مہاجر شناخت نے لے لی[۵۷۲]۔ محمد علی صدیقی نے اس ضمن میں لکھا کہ:

> مہاجر زعما نے جنرل یحییٰ خان کی صوبہ کراچی کے قیام کے بارے میں پیش کش کو ٹھکرا کر سندھ کے ساتھ اپنی قسمت وابستہ کرنے کا شعوری فیصلہ کیا تھا۔ ممکن ہے کہ آج کے سندھی پرست اس فیصلے کے مضمرات کو اہمیت نہ دیں لیکن یہ ایک مسلمہ حقیقت کہ آج کے لیے صوبہ کراچی کو مسترد کرنا جس قدر آسان ہے اسی قدر اہلِ کراچی کے لیے ۱۹۶۷ء میں کراچی کی علاحدہ صوبائی حیثیت کا حصول تھا[۵۷۳]۔

حقیقت یہ ہے کہ اردو بولنے والوں کی سیاست اس وقت الجھاؤ، افسردگی اور غیر یقینی کیفیت کا شکار ہے۔ اس اندھیرے میں انھیں راہ دکھانے والا کوئی نہیں مل رہا[۵۷۴]۔ پاکستان میں آنے والی موجودہ سیاسی تبدیلی کے اس شہر پر کیا مضمرات ہوں گے،

ابھی اس سوال کا جواب دینا مشکل ہے لیکن اس بات کا ادراک بہر حال تمام ہی سیاسی جماعتوں کو ہے کہ اس تمام خرابی کے پس پردہ اقتصادی، سیاسی اور انتظامی اسباب ہیں۔ ایسا اچانک نہیں ہوا کہ ایک صبح کچھ سندھی اور کچھ اردو بولنے والے اچانک ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہوگئے۔ ماضی میں سندھیوں کے ساتھ روا رکھے جانے والا سلوک، بیراج کی اراضی کی تقسیم، سنگین بے ضابطگیاں، کوٹا سسٹم کے ذریعے ہونے والا استیصال، شہری اور دیہی تقسیم، ملازمتوں اور داخلوں میں کوٹا سسٹم کے ذریعے ہونے والا استیصال، مختلف زبانیں بولنے والوں کے درمیان پیدا ہونے والی بد گمانیاں اور نفرت کے بیج نے ان زہریلے کانٹوں کی لہلہاتی فصل تیار کی۔ ادیبوں اور دانش وروں نے بھی اس ضمن میں اپنی ذمے داری ادا نہیں کیں بلکہ بعض ادیبوں نے تو نفرت، عصبیت اور دوریاں پھیلانے میں اپنے قلم کا سہارا بھی لیا۔ ادیبوں کا کام محبت، رواداری، ذہنی کشادگی، امن اور اخوت کا درس ہے [۵۷۵]لیکن سندھ کے معاملات میں دونوں سندھی اور اردو ادیب ناکام دکھائی دیتے ہیں۔ جس طرح سے شہر کی سڑکوں پر بہنے والے خون میں مختلف سیاسی جماعتیں اپنے کارکنوں کا خون تلاش کرتی دکھائی دیتی ہیں، جیسے دوسری جماعت کے کارکن کا خون شاید خون نہیں محض ایک رنگ ہے [۵۷۶]۔ اسی طرح ادیب اور شاعر نے بھی تعصب اور نفرت کا شکار ہو کر مخالف لوگوں کے خون کو خون نہیں سمجھا۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہمیں اپنے ملک میں پھر سے معاشرتی اور سیاسی نظم و ضبط پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ ایک ایسا معاشرہ تشکیل دینے کی ضرورت ہے جو تشدد، عدم رواداری، ناانصافی اور دولت کے بل پر دھونس جیسی چیزوں کے خلاف صف آرا ہو اور جس کی لاٹھی اُس کی بھینس والے تصور کو رد کر سکے [۵۷۷]۔ عام لوگوں کے لیے فلاحی منصوبے اور غربت کے خاتمے کے لیے حکم رانوں کو احساس پیدا کرنا ہوگا۔ شہری زندگی میں جس اجنبیت کے احساس نے ہمیں ایک دوسرے سے دور کر دیا ہے، اس کا خاتمہ بھی ضروری ہے کیوں کہ بہ قول شاعر:

غربت کی تیز آنچ پہ اکثر پکائی بھوک — خوش حالیوں کے شہر میں کیا کچھ نہیں کیا

شہر بھی قبرستان ہے گویا — سڑکیں سونی خالی ہوٹل

کس نے بوئی ہیں فضا میں ہر طرف بے چینیاں — شہر سارے چہرے ہائے بے وگاں ہونے لگے

ہر ایک موڑ کمیں گاہ ہر قدم مقتل — ہمارے شہر کی صورت ہے کربلا کی سی [۵۷۸]

سرکاری ایجنسیوں کے سفاکانہ رویے سے نجات، مقامی پولیس کا تجربہ اور کراچی کو اس کے جائز مالی حقوق دینے جیسے اقدامات بھی اس شہر کے امن و امان کو واپس لانے میں اہم کردار ادا کر سکتے ہیں۔ افسوس کی بات تو یہ ہے کہ یہ شہر جو وفاق کو ٹیکسوں کی مد میں ملکی مجموعی آمدنی کا پچاس فی صد سے زیادہ اور سندھ کی کل آمدنی کا ۷۵ فی صد سے زیادہ کما کر دینے کے باوجود موہن جو داڑو کا نقشہ پیش کر رہا ہے [۵۷۹]۔ مسئلہِ کراچی کو حل کرنے کے لیے سندھ شہری اور دیہی آبادی کے درمیان تعلیمی اور اقتصادی شعبوں میں وسائل کی مساوی تقسیم کا کوئی فارمولا وضع کرنا ضروری ہے۔ مالیاتی اختیارات مرکز سے صوبوں اور صوبوں

سے ضلعی سطح پر منتقل کر دینے سے بھی عام لوگوں کو سہولیات کی فراہمی ممکن بنانے میں مدد مل سکتی ہے۔ روزگار کے نئے مواقع اور تعلیم یافتہ نوجوانوں کو حقوق دے کر بھی نوجوانوں کی بے چینی کو ختم کیا جاسکتا ہے۔ انتظامی بنیاد پر صوبوں کی تقسیم سے بھی پے چیدگی میں کمی آسکتی ہے۔ ان تمام معاملات سے لاپرواہی اور عدم توجہی کسی بڑے سانحے کا پیش خیمہ ثابت ہو سکتی ہے [۵۸۰]۔ اب تک جس طرح سے حکم رانوں نے ان مسائل سے چشم پوشی برتی ہے جس کی وجہ سے شہر ایک آتش فشاں کی صورت اختیار کرتا جارہا ہے، اس رویے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے شبنم رومانی نے درست کہا کہ:

دھواں اس شہر کے اندر ہے کیسا — ہر اک چہرے پر ہیں دہری نقابیں [۵۸۱]

کراچی آج تک کیوں جل رہا ہے۔ کئی دہائیوں سے جاری خوف و دہشت کی فضا اب تک مکمل طور پر کیوں ختم نہیں ہو سکی اور آخر اس شہر کو کس جرم کی سزا مل رہی ہے۔ مقالے کے اس حصے میں تفصیلاً ان سوالات کے جوابات تلاش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ کراچی میں جو کچھ ہوا، یہ سانحہ بہت بڑا ہے۔ یہ کوئی ناگہانی آفت نہیں جو کراچی پر ٹوٹ پڑی ہے بلکہ یہ سانحا برسوں سے پرورش پا رہا تھا۔ مفادات کا غلبہ، جذبات کا غلبہ اور تعصبات کا غلبہ، سارے غلبے جب انسانیت پر غلبہ پالیتے ہیں تو ایسے سانحات جنم لیتے ہیں۔ کراچی میں آج بھی طبقاتی، نسلی اور گروہی کش مکش نمایاں ہے [۵۸۲] جس کی وجہ سے عدم تحفظ کا احساس بہت گہرا ہے۔ جس کی جانب اشارہ کرتے ہوئے انور شعور نے درست کہا کہ:

کیسا ڈرا ہوا ہے ہر خاص و عام اپنا — سیلِ آب و خوں سے جینا حرام اپنا
ہر صبح ڈھونڈتے ہیں خبروں میں نام اپنا [۵۸۳] — روزانہ مر رہے ہیں لوگ اس قدر کہ ہم بھی

اس صورت حال میں محب وطن طاقتوں کو آگے بڑھ کر اس مسئلے کا فوری حل تلاش کرنا ہوگا۔ سندھ کی شہری آبادی کے ساتھ جاری ناانصافیوں کے ازالے کے لیے ملک بھر میں نہایت جاں دار اور موثر مہم چلا کر ایک جانب اہلِ کراچی کا احساسِ تنہائی دور کرنا چاہیے اور دوسری طرف خرابی کی اصل جڑ کا علاج کر کے اصلاح احوال کی راہ ہم وار کرنی چاہیے [۵۸۴]۔ اس وقت سندھ کی صورتِ حال ایک نئی سوچ اور نئی اپروچ کا تقاضا کرتی ہے۔ الگ تھلگ رہنے والی سیاست سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ سندھ میں رہنے والے تمام لوگوں کو بات چیت کے ذریعے مشترکہ مفادات کا تعین کرنا ہوگا۔ کوٹا سسٹم جو سندھی اور اردو بولنے والوں کے درمیان تنازعے کی بڑی وجہ ہے، اسے ختم کر دینا ہوگا۔ اکیسویں صدی میں داخل ہونے کے باوجود سندھ میں جاگیردارانہ نظام کی جڑیں اب بھی مستحکم ہیں، اس کے لیے زرعی اصلاحات، صنعت کاری اور تعلیم کا پھیلاؤ بھی ضروری ہے۔ یہ کام دانش وروں کے کرنے کا بھی ہے اور دوسری پیشہ ور تنظیمیں بھی اس کام میں مدد کر سکتی ہیں [۵۸۵]۔ مختلف بااثر افراد کے درمیان مکالمے اور گفت و شنید سے مسائل کے حل کے لیے ایسی تجاویز مرتب کرنا ضروری ہیں جو اس صوبے کے دونوں لسانی گروہوں کے مشترکہ

مفادات کا دیرپا حل پیش کرتی ہوں تا کہ سندھ کے عوام کی رنجشیں دور ہو سکیں اور اس صوبے کے باسی کسی اور بڑے سانحے سے دوچار نہ ہوں۔

حوالہ جات

۱۔ مغل، غلام نبی، ''سندھ کیا سوچ رہا ہے''، پاکستانی ادب پبلشرز، ۱۹۸۶ء، ص ۱۱
۲۔ احمد، ڈاکٹر اسرار، ''استحکامِ پاکستان: مسئلہ سندھ''، مطبع ندارد، س ن، ص ۳۵
۳۔ علی، ڈاکٹر مبارک، ''سندھ: خاموشی کی آواز''، پروگریسو پبلشرز، ۱۹۹۲ء، ص ۳۵۱۔۳۵۳
۴۔ احمد، ص ۳۵۔۳۶
۵۔ نیپئر، سر چارلس، بہ حوالہ محمودہ رضویہ، ''ملکہ مشرق''، عباس لیتھو آرٹ پریس، کراچی، س ن، ص ۳۸
۶۔ جمیل، سید مظہر، ''آشوب سندھ اور اردو فکشن''، اکادمی بازیافت، ۲۰۰۲ء، ص ۳۸
۷۔ قدوسی، اعجاز الحق، ''تاریخ سندھ'' (۳ جلدیں)، اردو سائنس بورڈ، لاہور، ۱۹۸۴ء
۸۔ جمیل، ص ۳۹۔۴۴
۹۔ ایضاً، ص ۴۵
۱۰۔ لاکھو، غلام محمد، ''سندھ جو تاریخِ تحقیقی جائزو''، مارتی سماجی سنگت، ملیر کراچی، سن ندارد، ص ۱۱
۱۱۔ نیپئر، ص ۶۹
۱۲۔ کیتھ، سر کرنل، بہ حوالہ محمودہ رضویہ، ص ۶۹
۱۳۔ ملکانی، کیول رام رتن مل، ''سندھ کی کہانی''، مشمولہ ''کراچی کی کہانی''، جلد اول، سٹی پریس، کراچی، ۲۰۰۷ء، ص ۸۲
۱۴۔ لیمرک، بہ حوالہ، ملکانی، ص ۸۲
۱۵۔ برنس، بہ حوالہ، ملکانی، ص ۸۲
۱۶۔ ملکانی، ص ۸۳۔۸۴
۱۷۔ پوٹنجر، ہنری، بہ حوالہ، ملکانی، ص ۸۵
۱۸۔ دموہی، محمد عثمان، ''کراچی: تاریخ کے آئینے میں''، راحیل پبلی کیشنز، کراچی، ۲۰۱۳، ص ۸۰
۱۹۔ الفنسٹن، بہ حوالہ، ملکانی، ص ۸۵
۲۰۔ منظر، ڈاکٹر شہزاد، ''سندھ کے نسلی مسائل''، فکشن ہاؤس، لاہور، ۱۹۹۴ء، ص ۲۹۔۳۲
۲۱۔ آگنتیف، وی۔ ایف، ''سندھ: تاریخ کے آئینے میں''، مترجم ڈاکٹر محمود صادق، مکتبہ دانیال کراچی، ۱۹۸۹ء، ص ۴۰۲
۲۲۔ جمیل، ص ۴۹
۲۳۔ ہوت چند، ناؤں مل، 'یادداشتیں''، مترجم اجمل کمال، مشمولہ: ''کراچی کی کہانی''، جلد اول، محولہ بالا، ص ۳۳
۲۴۔ الانا، ڈاکٹر غلام علی، ''پاکستان کی تحریک میں سندھ کا حصہ''، مکتبہ اسماقیہ، کراچی، ۱۹۸۳ء، ص ۱۴
۲۵۔ ہوت چند، محولہ بالا، ص ۴۰۔۴۱؛ گستاخیِ رسول کے ساتھ نعرے کے ساتھ اس دور کا شدید ترین واقعہ تھا۔
۲۶۔ بھٹائی، شاہ عبداللطیف، بہ حوالہ، الانا، ص ۶
۲۷۔ ایضاً
۲۸ الانا، ص ۴
۲۹۔ جمیل، ص ۴۹
۳۰۔ بھٹو، محمد موسیٰ، ''سندھ کے حالات کی سچی تصویر''، سندھ نیشنل اکیڈمی، حیدرآباد، ۱۹۷۵ء، ص ۲۷۔۳۰
۳۱۔ علی، ص ۱۵۵۔۱۶۶
۳۲۔ ہوت چند، محولہ بالا، ص ۶۱
۳۳۔ ملکانی، محولہ بالا، ص ۸۵
۳۴۔ محمودہ رضویہ، ''ملکۂ مشرق''، عباس لیتھو آرٹ پریس، کراچی، سن ندارد، ص ۶۹
۳۵۔ ملکانی، محولہ بالا، ص ۸۷
۳۶۔ قدوسی، جلد دوم، ص ۶۹۴۔۶۹۸
۳۷۔ ایضاً، ص ۶۹۹۔۷۰۹
۳۸۔ ایضاً، ص ۷۰۹۔۷۱۰
۳۹۔ قدوسی، جلد سوم، ص ۳۳
۴۰۔ قدوسی، جلد سوم، ص ۳۳۔۴۴
۴۱۔ الانا، ص ۱۴
۴۲۔ ہوت چند، بہ حوالہ، کراچی، جلد اول، ص ۳۵۔۳۶
۴۳۔ الانا، ص ۱۴
۴۴۔ منظر، ص ۳۲۔۳۵
۴۵۔ پوسٹن، ٹی، "Personal Observations on

"Sindh"، مترجم، مسعود الحسن خان، مشمولہ: سہ ماہی ''تاریخ''، لاہور، سندھ نمبر، شمارہ ۱۶، جنوری ۲۰۰۳، ص ۲۱۸۔۲۱۹

۴۶۔ یوٹنجر،، بہ حوالہ عثمان دموہی، ص ۸۴

۴۷۔ ایضاً

۴۸۔ ایضاً

۴۹۔ منظر، ص ۱۴۷

۵۰۔ جمیل، ص ۵۱

۵۱۔ صدیقی، احمد حسین، ''گوہر بحیرہ عرب: کراچی''، فضلی سنز، کراچی، ۱۹۹۵ء، ص ۶۲؛ لوراگائے، ص ۲۶

۵۲۔ لوراگائے، "Karachi: Ordered Disorder and the Struggle for the City"، ہرسٹ اینڈ کو پبلشرز، نیودہلی، ۲۰۱۴ء، ص ۲۶

۵۳۔ حسن، عارف، ''تفہیم کراچی: شہری مسائل اور مستقبل کی منصوبہ بندی''، مترجم: شاہ محی الحق فاروقی، راشد مفتی، سٹی پریس، کراچی، ۲۰۰۱ء، ص ۱۷؛ لوراگائے نے ۳۵۶۰۷ جب کہ عارف حسن نے ۳۰۵۶۷ بتائی ہے۔

۵۴۔ صدیقی، ص ۶۴۔۶۸

۵۵۔ حسن، ص ۱۷

۵۶۔ صدیقی، ص ۸۷

۵۷۔ حسن، ص ۱۴۔۱۵

۵۸۔ صدیقی، ص ۵۸۔۲۲۳

۵۹۔ دموہی، ص ۲۵۲۔۳۴۵

۶۰۔ زرداری، ڈاکٹر محمد عتیق، "History of Sindh"، ۱۹۹۶ء، بہ حوالہ عارف حسن، ۲۰۰۱ء، ص ۱۵۔۱۶

۶۱۔ حسن، ص ۱۶

۶۲۔ الانا، ص ۱۹

۶۳۔ لوراگائے، ص ۲۶

۶۴۔ دموہی، ص ۹۷

۶۵۔ جمیل، ص ۵۳

۶۶۔ حسن، ص ۲۱

۶۷۔ صدیقی، ص ۲۹

۶۸۔ ایضاً، ص ۳۸

۶۹۔ دموہی، ص ۲۹۷

۷۰۔ صدیقی، ص ۳۰۔۳۱

۷۱۔ ایضاً، ص ۳۸۔۳۹

۷۲۔ صدیقی، ص ۴۹۔۵۰

۷۳۔ کیتھ، کرنل ینگ، بہ حوالہ احمد حسین صدیقی، ص ۶۲

۷۴۔ دموہی، ص ۲۹۸

۷۵۔ صدیقی، محمد علی، ''سندھ کا مسئلہ: پس منظر اور موجودہ صورتِ حال''، مشمولہ: ''ارتقا''، کتابی سلسلہ نمبر ۱۱، ص ۵۹۔۶۰

۷۶۔ جمیل، ص ۵۱

۷۷۔ لوراگائے، ص ۲۶

۷۸۔ گنگوفسکی، یوری، ''پاکستان کی قومیتیں''، دارالاشاعت ترقی، ماسکو، ۱۹۷۶ء، ص ۱۰۔۱۲

۷۹۔ صدیقی، محمد علی، ص ۵۹

۸۰۔ ایضاً، ص ۶۰

۸۱۔ لوراگائے، ص ۶۲

۸۲۔ جمیل، ص ۵۲

۸۳۔ صدیقی، محمد علی، ص ۶۱

۸۴۔ جمیل، ص ۵۲۔۵۳

۸۵۔ منظر، ص ۱۶۸۔۱۶۹

۸۶۔ جمیل، ص ۵۳

۸۷۔ ہیورڈ، رفعت خان، ''کراچی کے گوئن''، مترجم: اجمل کمال، مشمولہ: ''کراچی کی کہانی''، جلد اول، محولہ بالا، ص ۲۱۵

۸۸۔ صدیقی، تسنیم احمد، ''کچی آبادیاں کیوں؟''، مترجم: اجمل کمال، مشمولہ: ''کراچی کی کہانی''، جلد دوم، محولہ بالا، سٹی پریس، کراچی، ۲۰۰۷ء، ص ۶۹۸۔۶۹۹

۸۹۔ صدیقی، ص ۱۹۴۔۲۳۶

۹۰۔ منظر، ص ۵۴۔۵۵

۹۱۔ ملکانی، ص ۹۹

۹۲۔ راشدی، پیر علی محمد، ''وہ دن، وہ لوگ''، مترجم: اجمل کمال، مشمولہ: ''کراچی کی کہانی''، جلد اول، محولہ بالا، ص ۱۰۹۔۱۱۰

۹۳۔ ایضاً، ص۱۴۸۔۱۵۱

۹۴۔ ایضاً، ص۱۵۲۔۱۵۶

۹۵۔ کھوسلا، گوپال داس، ''سندھ کی سیاست اور ہندو مسلم فسادات''، مترجم: اجمل کمال، مشمولہ: ''کراچی کی کہانی''، جلد اول، محولہ بالا، ص۲۳۰۔۲۳۴

۹۶۔ کھوڑو، ایوب، بہ حوالہ: گوپال داس کھوسلا، محولہ بالا، ص۲۳۵

۹۷۔ قدوسی، اعجاز الحق، ''تاریخ سندھ''، اردو سائنس بورڈ، لاہور، ۱۹۸۴ء، ص۳۱۸

۹۸۔ بلال پاکستان، سندھی روزنامہ، ۱۶ اکتوبر ۱۹۴۷ء، بہ حوالہ: گوپال داس گھوسلا، محولہ بالا، ص۲۳۵

۹۹۔ ایضاً، ص۲۴۱۔۲۴۳

۱۰۰۔ کلپنا، موہن، ''سندھ کی یادیں''، مترجم: اجمل کمال، مشمولہ: ''کراچی کی کہانی''، جلد اوّل، محولہ بالا، ص۲۴۵۔۲۷۲

۱۰۱۔ ایضاً، ص۲۶۶

۱۰۲۔ چندانی، سوبھوگیان، ''کراچی کی یادداشتیں''، مترجم: اجمل کمال، مشمولہ: ''کراچی کی کہانی''، جلد اوّل، محولہ بالا، ص۲۷۳۔۲۷۹

۱۰۳۔ جمیل، ص۵۵۔۵۶

۱۰۴۔ حسن، ص۲۱۔۲۲

۱۰۵۔ بہ حوالہ آگتیف، ص۱۷۲۔۱۷۳

۱۰۶۔ حسن، ص۲۲

۱۰۷۔ جمیل، ص۵۷

۱۰۸۔ منظر، ص۵۱

۱۰۹۔ صدیقی، ڈاکٹر ابواللیث، ''رفت و بود''، مرتبہ ڈاکٹر معین الدین عقیل، ادارۂ یادگارِ غالب، کراچی، ۲۰۱۱ء، ص۴۳۸

۱۱۰۔ عابدی، حسن، ''سندھ : اب کیا کیا جائے؟''، مشمولہ: ''ارتقا'' کتابی سلسلہ نمبر ۱۱، ص۷۷۔۷۹

۱۱۱۔ حسن، ص۲۴۵

۱۱۲۔ جمیل، ص۵۹۔۶۰

۱۱۳۔ پوش، مسعود کھدر، بہ حوالہ، پارسی رپورٹ، جنگ پبلشرز، کراچی، ۱۹۹۰ء، ص۶۹۔۷۰

۱۱۴۔ عظمیٰ، گوہر سلطانہ، مقدمہ، کل اور آج، مشمولہ: پارسی رپورٹ، جنگ پبلشرز، ۱۹۹۰ء، لاہور، ص۹

۱۱۵۔ منظر، ص۶۰۔۶۵

۱۱۶۔ جمیل، ص۶۳۔۶۴

۱۱۷۔ لاشاری، رشید احمد، ''ادب کی آڑ میں''، مطبع انجمن پریس، کراچی، ۱۹۷۰ء، ص۱۰

۱۱۸۔ بھٹو، ص۶۵۔۶۸

۱۱۹۔ ایضاً، ص۶۹

۱۲۰۔ سید، جی ایم، بہ حوالہ: بھٹو، ص۷۵

۱۲۱۔ ہفت روزہ ''ندائے سندھ''، بہ حوالہ: ''جی ایم سید کی سوچ: عزائم اور سیاست''، از آزاد بن حیدر، دید شنید پبلی کیشنز، لاہور، سن ندارد، ص۱۵۔۲۴

۱۲۲۔ حیدر، آزاد بن، ''جی ایم سید کی سوچ: عزائم اور سیاست''، دید شنید پبلی کیشنز، لاہور، سن ندارد، ص۲۳۔۳۶

۱۲۳۔ ایضاً، ص۳۸

۱۲۴۔ ایضاً، ص۴۰۔۴۲

۱۲۵۔ ایضاً، ص۵۹۔۶۲

۱۲۶۔ بھٹو، ص۸۷۔۹۰

۱۲۷۔ بھٹو، ص۱۰۱

۱۲۸۔ فانی، کھیل داس، بہ حوالہ: ''سندھ کے حالات کی سچی تصویر''، محولہ بالا، ص۱۰۱

۱۲۹۔ جیون، کشور، بہ حوالہ: ''سندھ کے حالات کی سچی تصویر''، محولہ بالا، ص۱۰۲

۱۳۰۔ بھٹو، بہ حوالہ، ہلال پاکستان، ۱۹۶۹ء، ص۱۳۰

۱۳۱۔ حیدر، ص۸۳۔۸۴

۱۳۲۔ بھٹو، بہ حوالہ: ''ہلال پاکستان''، ۲۱ اگست ۱۹۷۰ء، ص۱۳۱

۱۳۳۔ فیض، فیض احمد، بہ حوالہ، حیدر، ص۸۵

۱۳۴۔ حیدر، ص۸۶

۱۳۵۔ شاعر، حمایت علی، بہ حوالہ، حیدر، ص۸۷

۱۳۶۔ حیدر، ص۸۶۔۸۷

۱۳۷۔ جمیل، بہ حوالہ، سید، ہاشم رضا، "Our Destination"، مصطفین اینڈ مرتضین، آئی سی ایس لمیٹڈ، کراچی،

ص۳۸۴-۳۸۵

۱۳۸۔ رحمت اللہ، شہاب الدین، ''شہاب بیتی''، پرنٹ میڈیا، پبلی کیشنز، کراچی، سن ندارد، ص۲۴-۲۶

۱۳۹۔ جمیل، ص۷۰

۱۴۰۔ علی، میرامداد، ''مس کراچی''، مترجم: فہمیدہ ریاض، مشمولہ: ''کراچی کی کہانی، جلداول، محولہ بالا، ص۳۱۶

۱۴۱۔ صدیقی، ڈاکٹر محمد علی، ص۶۲

۱۴۲۔ امروہوی، رئیس، ''مقدمہ''، مشمولہ: ''قطعات''، جلداوّل، رئیس اکاڈیمی، ۱۹۸۷ء، ص۷

۱۴۳۔ امروہوی، ''قطعات''، جلداول، ص۹

۱۴۴۔ جمیل، ص۴۳-۴۷

۱۴۵۔ امروہوی، ''قطعات''، جلداول، ص۱۱

۱۴۶۔ ایضاً، ص۱۲

۱۴۷۔ حسن، ص۲۲

۱۴۸۔ امروہوی، ''قطعات''، جلداول، ص۱۲

۱۴۹۔ امروہوی، رئیس، ہفت روزہ، شیراز، کراچی، اپریل ۱۹۹۵ء، ص۱۵، بہ حوالہ سید قاسم جلال ''رئیس امروہوی: احوال و آثار''، انجمن ترقی اردو، کراچی، ۲۰۰۸ء، ص۳۰

۱۵۰۔ امروہوی، رئیس، ہفت روزہ، اخبارِ جہاں، کراچی، ۵ فروری ۱۹۶۷ء، ص۱۰

۱۵۱۔ امروہوی، رئیس، ''کراچی ۱۲۴ سال قبل''، کراچی نامہ (کالم)، مشمولہ: ہفت روزہ اخبارِ جہاں، کراچی، ۱۲ فروری ۱۹۴۷ء، ص۱

۱۵۲۔ شاکر، پروین، ''کراچی''، مشمولہ: افکار، از مجموعہ ماہ تمام، مراد پبلی کیشنز، اسلام آباد، ص۱۷۷؛ لورا گائے نے اپنی تصنیف مذکور میں سہواً اس نظم کا حوالہ دیتے ہوئے خودکلامی کا حوالہ رقم کیا ہے جو غالباً درست نہیں۔

۱۵۳۔ امروہوی، ''قطعات''، جلداول، ص۱۲

۱۵۴۔ ایضاً، ص۱۳

۱۵۵۔ جمیل، ص۸۵-۸۶

۱۵۶۔ اکبرآبادی، سیماب، ''لوحِ محفوظ''، مشمولہ انتخاب سیماب اکیڈمی، کراچی، ۱۹۸۳ء، ص۱۹۶-۲۳۶

۱۵۷۔ ایضاً

۱۵۸۔ جلالوی، استاد قمر، ''اوجِ قمر''، شیخ شوکت علی سنز، س ن، ص۲۵-۳۱

۱۵۹۔ حامد، لکھنوی، مشمولہ، ماہ نامہ، جام جم، کراچی، جلد۱، شمارہ۲، ۱۹۷۱ء، ص۴۱

۱۶۰۔ اکبرآبادی، رعنا، ''غزل رعنا''، عدنان اکیڈمی، کراچی، ۱۹۶۸ء، ص۱۵-۱۲۲

۱۶۱۔ قدوائی، جلیل، ''نوائے سینہ تاب''، بیگم ہرمزی جلیل اکیڈمی، کراچی، ۱۹۵۱ء، ص۱۷-۴۳

۱۶۲۔ لکھنوی، بہزاد، ''نغمہ نور''، ساقی بک ڈپو، س ن، طبع چہارم، ص۷-۸۶

۱۶۳۔ دہلوی، حیدر، ''صبح الہام''، مکتبہ حیدری، کراچی، ۱۹۶۵ء، ص۴۰-۲۰۲

۱۶۴۔ اکبرآبادی، صبا، ''ثبات''، بختیار اکیڈمی، کراچی، ۱۹۸۷ء، ص۱۹-۱۰۴

۱۶۵۔ بریلوی، سیوا، مشمولہ: چند شعرائے بریلوی''، مرتبہ لطیف حسین ادیب، مرکز ادب اردو، لکھنؤ، ص۱۹۷۶ء، ص۱۸۸-۱۹۰

۱۶۶۔ کوٹی، بہار، ''ذات و کائنات'' محمد اظہارالاسلام یونی ورسٹی انجینئر، کراچی ۱۹۷۷ء، ص۳۴-۱۰۸

۱۶۷۔ مشمولہ سہ ماہی سیپ، کراچی، شمارہ۱۷، ص۲۹۰

۱۶۸۔ بدایونی، انجم فوقی، ''مہرو ماہ''، ادارۂ فوق الادب، کراچی، ۱۹۸۰ء، ص۲۵-۲۰۴

۱۶۹۔ ہوشیارپوری، حفیظ، مشمولہ: ''جدید شعرائے اردو''، مرتبہ ڈاکٹر عبدالوحید، فیروزسنز، کراچی، س ن، ص۷۵۷-۷۶۲

۱۷۰۔ لکھنوی، حیا، مشمولہ، ''جدید شعرائے اردو''، مرتبہ ڈاکٹر عبدالوحید، فیروزسنز، کراچی، س ن، ص۹۷۰

۱۷۱۔ نوری، کرار، ''میدان حق''، مشمولہ ''دبستانوں کا دبستان''، جلد اول، محمد حسین اکیڈمی، ۲۰۰۳ء، ص۳۶۸

۱۷۲۔ حیدری، نازش، ''دوصدیوں کا سفر''، آئیڈیل پکچرز، کراچی، س ن، ص۳۶-۹۰

۱۷۳۔ مرادآبادی، راز، ''حرف راز''، شعبہ اردو جامعہ کراچی، ۱۹۷۸ء،

ص۵۰۔۱۳۱

۱۷۴۔ دہلوی، انور، ''گلشنِ کرب''مکتبہ حیدری، کراچی، ۱۹۸۸ء، ص۵۸۔۱۴۵

۱۷۵۔ لکھنوی، شاعر، ''زخمِ ہنر''، شاعر لکھنوی اکیڈمی، کراچی، ۱۹۷۹ء، ص۲۴۳۔۲۹۳

۱۷۶۔ حقی، شان الحق، بہ حوالہ: ''کراچی کے دبستانِ شاعری میں اردو غزل کا ارتقا''، از ڈاکٹر جاوید منظر، مکتبہ عالمین پاکستان، کراچی، ۲۰۱۲ء، ص۱۷۱

۱۷۷۔ ______، ''تارِ پیراہن''، اردو اکیڈمی سندھ، کراچی، ۱۹۵۸ء، ص۲۰۔۱۱۹

۱۷۸۔ بدایونی، محشر، ''شہرِ نوا''، مکتبہ ماحول، کراچی، ۱۹۶۴ء، ص۱۱۔۱۰۲

۱۷۹۔ ______، ''غزل دریا''، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۷۷ء، ص۲۶۔۶۰

۱۸۰۔ _____، ''مشمولہ: ''ہمارے مشاعرے'' ساکنانِ شہر قائد کراچی کے مشاعرے، جلد دوم، ساکنانِ شہر قائد پبلشرز، کراچی، ۲۰۰۷ء، ص۴۰۸

۱۸۱۔ بدایونی، ''غزل دریا''، ص۲۶

۱۸۲۔ سعیدی، جوہر، ''سفارتِ گل''، ندیم پبلی کیشنز، کراچی، ۱۹۹۸ء، ص۳۵۔۱۱۷

۱۸۳۔ فاضلی، امید، ''دریا آخر دریا ہے''، سیپ پبلی کیشنز، کراچی، ۱۹۸۸ء، ص۳۵۔۲۰۰

۱۸۴۔ خالدی، فدا، ''آتش احساس''، بزم یوسفی، کراچی، ۱۹۸۴ء، ص۱۷۔۱۶۷

۱۸۵۔ مدنی، عزیز حامد، ''دشت امکان''، نشاط پریس، کراچی، ۱۹۶۴ء، ص۸۲۔۱۱۹

۱۸۶۔ امروہوی، ساقی، ''شام ہوتی جارہی ہے''، ایس آر پبلی کیشنز، کراچی، ۲۰۰۲ء، ص۸

۱۸۷۔ فرخی، اسلم، مقدمہ، مشمولہ: ''غزل چہرہ'' از جمیل نظر، جمیل نظر فاؤنڈیشن، کراچی، ۱۹۸۰ء، ص۳۱۔۳۲

۱۸۸۔ نظر، جمیل، ''غزل چہرہ''، جمیل نظر فاؤنڈیشن، ۱۹۸۰ء، ص۱۶۔۱۷۶

۱۸۹۔ علیگ، خالد، ''غزال دشتِ سگاں''، فکشن ہاؤس، لاہور، ۲۰۰۲ء، ص۳۵۔۲۰۵

۱۹۰۔ فروغ، رئیس، ''رات بہت اجلی ہوا چلی''، شمیم نوید پبلشرز، کراچی، ۱۹۸۴ء، ص۳۵۔۱۹۵

۱۹۱۔ الہ آبادی، حیرت، ''کشکول وفا''، بزم عبرت پبلشرز، کراچی، ص۱۹۸۹ء، ص۴۵۔۶۶

۱۹۲۔ عالی، جمیل الدین، ''لاحاصل''، پاکستان رائٹرز کوآپریٹو سوسائٹی کراچی، لاہور، ۱۹۹۵ء، ص۲۴۔۱۸۶

۱۹۳۔ عالی، جمیل الدین، مشمولہ: ''دنیائے ادب''، کراچی، اپریل ۱۹۹۵ء، ص۲۱

۱۹۴۔ شاعر، حمایت علی، ''ہارون کی آواز''، المصنفین پبلشرز، کراچی، ۱۹۸۵ء، ص۲۵۔۱۷۷

۱۹۵۔ جمیل، ص۸۰۔۸۲

۱۹۶۔ صدیقی، ڈاکٹر محمد علی، ص۶۱

۱۹۷۔ جمیل، ص۸۲۔۸۳

۱۹۸۔ ایضاً، ص۸۳

۱۹۹۔ منظر، ص۱۰۱۔۱۰۲

۲۰۰۔ جمیل، ص۸۳

۲۰۱۔ امروہوی، ''مقدمہ''، مشمولہ: ''قطعات''، جلد اول، ص۵

۲۰۲۔ جلال، ڈاکٹر سید قاسم، ''رئیس امروہوی: احوال و آثار''، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی، ۲۰۰۸ء، ص۱۵۷

۲۰۳۔ صہبا لکھنوی، ''رئیس امروہوی: زندگی فن و شخصیت کا جائزہ''، مشمولہ ''رئیس امروہوی: فن و شخصیت''، مرتبہ صہبا لکھنوی، رئیس امروہوی میموریل ٹرسٹ، کراچی، ۱۹۹۰ء، ص۳۸

۲۰۴۔ امروہوی، بہ حوالہ صہبا لکھنوی، ص۳۸

۲۰۵۔ http/len.m.wilkipedia.org.wiki

۲۰۶۔ صدیقی، محمد علی، ''رئیس امروہوی''، جام جہاں نما، مشمولہ: ''رئیس امروہوی فن اور شخصیت''، مرتبہ صہبا لکھنوی، ص۱۴۱۔۱۴۲

۲۰۷۔ امروہوی، ''قطعات''، جلد اول، ص۳

۲۰۸۔ ایضاً، ص۱۸

۲۰۹۔ ایضاً،ص۲۱

۲۱۰۔ ایضاً،ص۴۶

۲۱۱۔ امروہوی، رئیس، بہ حوالہ ڈاکٹر سید قاسم جلال، ص۱۶۶

۲۱۲۔ امروہوی،''قطعات''،جلد اول،ص۴۵

۲۱۳۔ ایضاً،ص۲۰

۲۱۴۔ ایضاً،ص۲۲

۲۱۵۔ ایضاً،ص۴۰

۲۱۶۔ ایضاً،ص۳۸

۲۱۷۔ ایضاً،ص۵۱

۲۱۸۔ ایضاً

۲۱۹۔ ایضاً،ص۶۰

۲۲۰۔ ایضاً،ص۸۳

۲۲۱۔ ایضاً،ص۱۱۷

۲۲۲۔ ایضاً،ص۱۰۸

۲۲۳۔ ایضاً

۲۲۴۔ ایضاً،ص۱۰۵

۲۲۵۔ ایضاً

۲۲۶، ایضاً

۲۲۷۔ ایضاً،ص۱۴۳

۲۲۸۔ ایضاً،ص۲۸۹،۳۴۴

۲۲۹۔ ایضاً،ص۳۳۵

۲۳۰ امروہوی، رئیس، ''قطعات''، جلد دوم، رئیس اکاڈمی، کراچی، ۱۹۸۷ء،ص۴۰

۲۳۱ ایضاً

۲۳۲۔ امروہوی، رئیس،''قطعات''، جلد چہارم، رئیس اکاڈمی، کراچی، ۱۹۸۷ء،ص۱۴۸

۲۳۳۔ امروہوی، رئیس،''قطعات''،جلداوّل،ص۱۸۶

۲۳۴۔ امروہوی،''قطعات''،جلد دوم،ص۵۰

۲۳۵۔ صدیقی،ص۱۶۴

۲۳۶۔ امروہوی،''قطعات''،جلد دوم،ص۲۰۳۔۲۰۷

۲۳۷۔ صدیقی،ص۱۶۴۔۱۶۵

۲۳۸۔ امروہوی،''قطعات''،جلد دوم،ص۲۳۰۔۲۳۵

۲۳۹۔ امروہوی،''قطعات''،جلد چہارم،ص۲۶۶

۲۴۰۔ ایضاً،ص۱۹۶

۲۴۱۔ صدیقی،ص۱۶۸

۲۴۲۔ امروہوی،''قطعات''،جلداوّل،ص۱۶۲

۲۴۳۔ ایضاً،ص۱۱۰

۲۴۴۔ ایضاً،ص۱۶۰

۲۴۵۔ ایضاً،ص۱۷۸

۲۴۶۔ امروہوی،''قطعات''،جلد دوم،ص۲۹

۲۴۷۔ ایضاً،ص۳۲

۲۴۸۔ ایضاً،ص۳۰۴

۲۴۹۔ ایضاً،ص۳۱۵

۲۵۰۔ ایضاً،ص۳۶۴

۲۵۱۔ امروہوی،''قطعات''،جلد سوم،ص۱۰

۲۵۲۔ ایضاً،ص۱۳

۲۵۳۔ ایضاً،ص۱۳۔۱۴

۲۵۴۔ ایضاً،ص۴۵

۲۵۵۔ حیدر، ڈاکٹر سلیم،''اب سندھ تقسیم ہونا چاہیے''، مطبوعات مہاجر تحریک، کراچی، ۱۹۹۱ء،ص۸۔۹

۲۵۶۔ امروہوی،''قطعات''،جلد سوم،ص۴۵

۲۵۷۔ بھٹو، ذوالفقار علی،''پاکستان کی سیاسی حالت''، پاکستان پیپلز پارٹی، کراچی، ۱۹۶۸ء،ص۵۶

۲۵۸۔ امروہوی،''قطعات''،جلد سوم،ص۵۰

۲۵۹۔ ایضاً،ص۵۹

۲۶۰۔ ایضاً،ص۶۰

۲۶۱۔ ایضاً،ص۶۱۔۶۲

۲۶۲۔ حیدر، آزاد بن،''جی ایم سید کی سوچ، عزائم اور سیاست''، دید شنید پبلی کیشنز، لاہور، س ن،ص۱۲۳

۲۶۳۔ امروہوی،''قطعات''،جلد سوم،ص۶۶

۲۶۴۔ ایضاً،ص۶۳

۲۶۵۔ ایضاً،ص۶۷۔۶۸

۲۶۶۔ امروہوی، کلیات رئیس امروہوی، ویلکم بک پورٹ، کراچی، ۱۹۹۳ء،ص۴۸۰

۲۶۷۔ ایضاً،ص۶۹

۲۶۸۔ ایضاً،ص۸۲

۲۶۹۔ احمد،ظہیر،''سندھ میں قوم پرستی کے نئے اور پرانے رجحانات''، نیادور پبلی کیشنز،حیدرآباد، ۱۹۸۷ء،ص۱۰۱

۲۷۰۔ امروہوی،''قطعات''،جلد سوم،ص۱۱۷

۲۷۱۔ ایضاً،ص۱۲۱

۲۷۲۔ ایضاً،ص۱۹۔۲۰

۲۷۳۔ حیدر،ڈاکٹر سلیم،ص۵۶۔۵۷

۲۷۴۔ صدیقی،ڈاکٹر محمد علی،ص۶۸

۲۷۵۔ عابدی،حسن،ص۸۰۔۸۱

۲۷۶۔ شاکر،الیاس،''جی ایم سید کے نظریات''،مشمولہ:''جی ایم سید کی مثبت اور منفی سیاست''، مرتبہ جاوید احمد صدیقی، شبلی پبلی کیشنز،کراچی،۱۹۸۷ء،ص۱۵۱

۲۷۷۔ امروہوی،''قطعات''،جلد سوم،ص۴۴۳

۲۷۸۔ امروہوی،''قطعات''،جلد چہارم،ص۴۳

۲۷۹۔ ایضاً،۱۳۷

۲۸۰۔ ایضاً،ص۲۵۱،۴۰۵

۲۸۱۔ ایضاً،ص۳۹۷

۲۸۲۔ ایضاً،ص۳۴۰

۲۸۳۔ بہ حوالہ: http://en.wikipedia.org/wiki/death_of_Bushra_Zaidi

۲۸۴۔ امروہوی،''قطعات''،جلد چہارم،ص۴۴۳

۲۸۵۔ ایضاً،۴۴۳۔۴۴۴

۲۸۶۔ ایضاً،ص۴۳۹

۲۸۷۔ جلال،ڈاکٹر سید قاسم،ص۱۷۶

۲۸۸۔ بریلوی، اکرام،''رئیس امروہوی کے قطعات''،مشمولہ:''رئیس امروہوی:فن وشخصیت''،مرتبہ صہبا لکھنوی،محولہ بالا،ص۱۷۴

۲۸۹۔ امروہوی،''قطعات''،جلد چہارم،ص۴۴۴

۲۹۰۔ صدیقی، ڈاکٹر احمد معاویہ،''بیسویں صدی کے طنز و مزاح میں دلاور فگار کا مقام''،معارج پبلی کیشنز،کراچی،۲۰۱۵ء،ص۵۲۱

۲۹۱۔ عالی،جمیل الدین،انور مسعود ایک باخبر ظرافت نگار''، بہ حوالہ، ''بیسویں صدی کے طنز و مزاح میں دلاور فگار کا مقام''از ڈاکٹر احمد معاویہ صدیقی،محولہ بالا،ص۵۲۱۔۵۲۲

۲۹۲۔ فگار،دلاور،''مطلع عرض ہے''،روزنامہ نوائے وقت،کراچی،۲۸ فروری۱۹۹۸ء

۲۹۳۔ فگار،دلاور،می بک ڈپو،حیدرآباد،سن ندارد،ص۲۵۷

۲۹۴۔ فگار،دلاور،''کہا سنا معاف کرنا''، بہ حوالہ:''بیسویں صدی کے طنز و مزاح میں دلاور فگار کا مقام''،محولہ بالا،ص۵۳۵

۲۹۵۔ فگار، دلاور،''خدا جھوٹ نہ بلوائے''، بہ حوالہ:''بیسویں صدی کے طنز و مزاح میں دلاور فگار کا مقام''،محولہ بالا،ص۵۳۶

۲۹۶۔ ایضاً،ص۵۳۷

۲۹۷۔ فگار،دلاور،''منشیات فروشی کے اڈے''،مشمولہ: روزنامہ نوائے وقت، ۲۹ نومبر ۱۹۸۳ء، بہ حوالہ:''بیسویں صدی کے طنز و مزاح میں دلاور فگار کا مقام''،محولہ بالا،ص۵۴۰

۲۹۸۔ فگار،دلاور،''مطلع عرض ہے''، بہ حوالہ:''بیسویں صدی کے طنز و مزاح میں دلاور فگار کا مقام''،محولہ بالا،ص۵۳۸۔۵۳۹

۲۹۹۔ ایضاً،ص۵۴۳

۳۰۰۔ ایضاً

۳۰۱۔ ایضاً،ص۵۳۳

۳۰۲۔ صدیقی،سرشار،''پس منظر''،مشمولہ''ہجرت پر مامور تھے ہم''، مرتبہ شبیر احمد انصاری، ہمارا ادارہ، کراچی،ص۲۰۰۵،ص۱۱

۳۰۳۔ ایضاً،ص۱۵

۳۰۴۔ ایضاً،۲۱

۳۰۵۔ صدیقی، سرشار،محولہ بالا،ص۵۹

۳۰۶۔ ایضاً،ص۲۶

۳۰۷۔ ایضاً،ص۲۸

۳۰۸۔ ایضاً،ص۲۸۔۲۹

۳۰۹۔ ایضاً،ص۵۱۔۵۲

۳۱۰۔ صدیقی، سرشار، کافور، لوبان اور بارور،مشمولہ'اقدار' کراچی، جلد،جلد پانچ،شمارہ ۷۔۸،ص۵۹

۳۱۱۔ صدیقی، سرشار، ’ہجرت پر مامور تھے ہم‘، ص۹۱۔۹۲

۳۱۲۔ محی الدین، ظفر، ’سندھ کی عدالت میں‘، عوامی فورم، کراچی، ۱۹۹۰، ص۲۷۔۳۹

۳۱۳۔ خاور، محمد علی، ’’زنجیروں میں بندھی قوم‘‘، مشمولہ: ’’جی ایم سید کی مثبت اور منفی سیاست‘‘، محولہ بالا، ص۱۰۶۔۱۰۹

۳۱۴۔ عابدی، ص۸۱

۳۱۵۔ ضیاء، شکیل احمد، ’’سندھ کا مقدمہ‘‘، شیل پبلی کیشنز لمیٹڈ، کراچی، ۱۹۸۷ء، ص۱۸۸۔۱۸۹

۳۱۶۔ احمد، ظہیر، ص۱۲۸

۳۱۷۔ رضوی، اختر، بہ حوالہ: شہزاد منظر، ’’سندھ کے نسلی مسائل‘‘، محولہ بالا، ص۱۵۹۔۱۶۰

۳۱۸۔ جمیل، ص۹۷۔۸۵

۳۱۹۔ ہاشمی، سید شاہد، ’’گہر کا آتش فشاں: تہ در تہ حقائق‘‘، نیو وژن پبلی کیشنز، ۲۰۱۲ء، ص۱

۳۲۰۔ جمیل، ص۸۵۔۸۸

۳۲۱۔ احمد، سلیم، ’’مہاجر قومی موومنٹ: تشکیل اور جدوجہد‘‘، رنگ پبلی کیشنز، لاہور، ص۳۷۔۴۰

۳۲۲۔ جمیل، ص۸۸۔۹۱

۳۲۳۔ احمد، منیر، ’’پاکستان ٹوٹ جائے گا‘‘، ادارہ تحقیقاتِ لاہور، ۱۹۹۴ء، ص۱۶

۳۲۴۔ فراز، احمد، مشمولہ ’ہمارے مشاعرے‘، جلد اول، مرتبہ اظہر عباس ہاشمی، ساکنانِ شہر قائد پبلشرز، کراچی، ۲۰۰۷ء، ص۲۱۱۔۲۱۲

۳۲۵۔ فراز، احمد، ’چلو اس شہر کا ماتم کریں‘، مشمولہ ’روشن خیال‘، کراچی، جلد۱، شمارہ۶، ص۴۹

۳۲۶۔ فراز، احمد، مشمولہ ’دنیائے ادب‘، کراچی، مارچ، ۱۹۹۵، ص۱۳

۳۲۷۔ انصاری، سحر، مشمولہ ’ہمارے مشاعرے‘، جلد دوم، مرتبہ اظہر عباس ہاشمی، ساکنان شہر قائد پبلشرز، کراچی، ۲۰۰۷، ص۱۰۵

۳۲۸۔ کوثر، سلیم، مشمولہ ’ہمارے مشاعرے‘، جلد دوم، ص۱۴۰

۳۲۹۔ شوق، رضی اختر، ’ہمارے مشاعرے‘، جلد دوم، ص۵۲

۳۳۰۔ رحمانی، اعجاز، مشمولہ ’سیپ‘، کراچی، شمارہ ۵۶، ص۸

۳۳۱۔ رحمانی، اعجاز، مشمولہ ’ہمارے مشاعرے‘، جلد اول، ص۲۶۱

۳۳۲۔ علیگ، خالد، مشمولہ ’ہمارے مشاعرے‘، جلد اول، ص۵۴۶

۳۳۳۔ ایضاً، ص۵۴۷

۳۳۴۔ علیگ، مشمولہ ’دنیائے ادب‘، کراچی، مارچ، ۲۰۰۰، ص۳۵

۳۳۵۔ عثمانی، واصل، ’ہمارے مشاعرے‘، جلد دوم، ص۵۳۹

۳۳۶۔ انصاری، پروفیسر سحر، ’’حرفِ حق‘‘، مشمولہ ’’روشنیوں کا شہر‘‘ از راغب مرادآبادی، راغب مرادآبادی اکیڈمی، کراچی، ۱۹۹۵ء، ص۲۵

۳۳۷۔ مرادآبادی، راغب، مشمولہ ’’روشنیوں کا شہر‘‘، راغب مرادآبادی اکیڈمی، کراچی، ۱۹۹۵ء، ص۱۴۱

۳۳۸۔ ایضاً، ص۲۶

۳۳۹۔ ایضاً

۳۴۰۔ ایضاً، ص۶۳

۳۴۱۔ ایضاً، ص۱۱۵

۳۴۲۔ ایضاً، ص۱۰۹

۳۴۳۔ ایضاً

۳۴۴۔ ایضاً، ص۱۴۴۔۱۴۶

۳۴۵۔ ایضاً، ص۱۵۵۔۱۵۶

۳۴۶۔ ایضاً، ص۱۶۴

۳۴۷۔ ایضاً، ص۱۵۸۔۱۵۹

۳۴۸۔ ایضاً، ص۱۵۰۔۱۵۲

۳۴۹۔ ایضاً، ص۱۴۸

۳۵۰۔ انصاری، ص۳۰

۳۵۱۔ ہاشمی، ص۲۱

۳۵۲۔ احمد، پروفیسر عزیز الدین، ’’کیا ہم اکٹھے رہ سکتے ہیں‘‘، مکتبہ فکر و دانش، لاہور، ۱۹۸۸ء، ص۱۱۲

۳۵۳۔ حسین، الطاف، ’’سفر زندگی‘‘، مرتبہ، خالد اطہر، جنگ پبلشرز، لاہور، ۱۹۸۸ء، ص۲۸

۳۵۴۔ ندوی، مولانا وصی مظہر، ’’مہاجر قومیت کا مسئلہ‘‘، مشمولہ: ’’مہاجر قومیت‘‘، مرتبہ، جاوید احمد صدیقی، شیل پبلی کیشنز لمیٹڈ، ۱۹۸۷ء، ص۹

۳۵۵۔ انوار، شیخ، ’’کراچی کی سندھ سے علیحدگی‘‘، مترجم اجمل کمال،

مشمولہ: ''کراچی کی کہانی''، جلد اوّل، ص ۳۰۸۔۳۱۲

۳۵۶۔ ندوی، ص ۳۹۔۴۰

۳۵۷۔ عاقل، مختار، ''آتش و آہن کی سیاست''، مشمولہ، ''مہاجر قومیت''، محولہ بالا، ص ۴۱۔۴۸

۳۵۸۔ بیگ، مرزا جواد، ''ناانصافیاں اور بے قاعدگیاں''، مشمولہ: ''مہاجر قومیت''، محولہ بالا، ص ۵۸

۳۵۹۔ شاکر، الیاس، ''وہ چنگاریاں جو شعلہ بن گئیں''، مشمولہ: ''مہاجر قومیت''، محولہ بالا، ص ۸۶

۳۶۰۔ یوسف، اقبال، ''کراچی پیپرز''، سائبان پبلشرز، کراچی، ۱۹۹۵ء، ۲۱۶۔۲۲۶

۳۶۱۔ حیدر، ڈاکٹر سلیم، ص ۳۶

۳۶۲۔ ایضاً، ص ۶۴

۳۶۳۔ خان، اختر حمید، ''جینے کا ہنر''، مشمولہ: ''کراچی کی کہانی''، جلد دوم، ص ۵۶۳

۳۶۴۔ خان، پروفیسر عنایت علی، ''عنایتیں کیا کیا''، منشورات، لاہور، س ن، ص ۹۷

۳۶۵۔ ایضاً، ص ۹۷۔۹۸

۳۶۶۔ ایضاً، ص ۱۱۰۔۱۱۱

۳۶۷۔ ایضاً، ص ۱۳۷۔۱۴۱

۳۶۸۔ ایضاً

۳۶۹۔ انور، سید سلطان، ''مہاجر اور حالات کے تقاضے''، مشمولہ: روشن خیال، کراچی، جلد ۱، شمارہ ۱، ص ۲۸

۳۷۰۔ علی، ڈاکٹر مبارک، ''کراچی: زندہ شہر کا مرتا ہوا کلچر''، مشمولہ، سہ ماہی 'تاریخ'، لاہور، نمبر ۷، اکتوبر ۲۰۰۰ء، ص ۱۸۳

۳۷۱۔ مجروح، حسین، ''اداریہ''، مشمولہ: ماہ نامہ ''طلوع افکار''، کراچی، دسمبر۔جنوری ۱۹۹۵ء، ص ۷۔۸

۳۷۲۔ بنوری، طارق، ''نسلی سیاست و تشدد''، مترجم، خالد حمیدی، مشمولہ: ارتقا، مارچ ۱۹۹۱ء، ص ۱۵

۳۷۳۔ زیدی، اکبر ایس، ''سندھ میں سیاسی محرکات''، مترجم، محمد مطاہر، ''مشمولہ، ارتقا، مارچ، ۱۹۹۱ء، ص ۳۹۔۴۱

۳۷۴۔ علوی، حمزہ، ''پاکستان میں تشکیل قوم اور تشدد''، مترجم، وہاب صدیقی، مشمولہ: ارتقا، کراچی، ستمبر، ۱۹۹۱ء، ص ۵۲۔۵۵

۳۷۵۔ نقوی، ایم بی، ''سندھ میں قومیت کا مسئلہ''، مترجم، راحت العین، مشمولہ: ارتقا، کراچی، مئی ۱۹۹۳ء، ص ۴۵

۳۷۶۔ صدیقی، ڈاکٹر محمد علی، ''ادیب اور سماجی عقوبت خانے''، مشمولہ: ماہ نامہ افکار، کراچی، ستمبر، ۱۹۹۲ء، ص ۱۲۔۱۳

۳۷۷۔ دیکھیے ستمبر ۱۹۹۱ء، فروری ۱۹۹۲ء، اگست ۱۹۹۲ء، اور جنوری ۱۹۹۳

۳۷۸۔ دیکھیے ''حقوق انسانی کمیشن کی رپورٹ''، المیہ سندھ، مترجم عامر حبیب، مشمولہ: ارتقا، کراچی، ستمبر ۱۹۹۱ء، ص ۹۳

۳۷۹۔ ایضاً، ص ۹۸

۳۸۰۔ دیکھیے ''حقوق انسانی کمیشن کی رپورٹ''، فروری ۱۹۹۲ء، ص ۱۴۹۔۱۷۰

۳۸۱۔ دیکھیے، ''المیہ سندھ''، تیسرا حصہ، مشمولہ، ارتقا، کراچی، اگست ۱۹۹۲ء، ص ۱۷۲۔۱۹۵

۳۸۲۔ ''المیہ سندھ''، چوتھا حصہ، مشمولہ، ارتقا، کراچی، جنوری ۱۹۹۳ء، ص ۱۵۲۔۱۶۵

۳۸۳۔ سعید، راحت، ''ہمارا موقف''، مشمولہ: ارتقا، کراچی، ستمبر، ۱۹۹۰ء، ص ۶۔۷

۳۸۴۔ اعظمی، فہیم، ''ادب اور بحران''، مشمولہ: ماہ نامہ، صریر، کراچی، جنوری، ۱۹۹۵ء، ص ۵۔۶

۳۸۵۔ طاہرہ، قراۃ العین، ''شہ رگِ جاں''، مشمولہ: تجدید نو، لاہور، ستمبر۔اکتوبر، ۱۹۹۶ء، ص ۷

۳۸۶۔ خالد، عبدالعزیز، ''اے پُر آشوب کراچی''، مشمولہ: تجدید نو، لاہور، ستمبر۔اکتوبر، ۱۹۹۲ء، ص ۱۹۔۲۰

۳۸۷۔ خالد، عبدالعزیز، مشمولہ ماہ نامہ صریر، کراچی، جون۔جولائی، ۱۹۹۴ء، ص ۳۷۴۔۳۷۵

۳۸۸۔ بھوپالی، محسن، غزل، مشمولہ: تجدید نو، لاہور، محولہ بالا، ص ۲۲

۳۸۹۔ کمال، شاہد، ''کراچی میں اردو غزل اور نظم''، طارق پبلی کیشنز، کراچی، ۱۹۹۹ء، ص ۱۱۵

۳۹۰۔ بھوپالی، مشمولہ: ''کراچی میں اردو غزل اور نظم''، محولہ بالا، ص ۱۵۵

۳۹۱۔ ایضاً، ص ۱۱۶

۳۹۲۔ بھوپالی، مشمولہ: ''ہمارے مشاعرے''، جلد دوم، ساکنانِ شہر قائد پبلشرز، ۲۰۰۷ء، ص ۳۹۸

۳۹۳۔ ایضاً ص ۳۹۵۔۳۹۶۔۳۹۷

۳۹۴۔ بھوپالی، محسن، 'دو وطن'، مشمولہ ماہِ نو، لاہور، مارچ ۱۹۹۲ء، ص ۱۲

۳۹۵۔ قریشی، جاذب، مشمولہ: 'اقدار'، کراچی، جلد ۳، شمارہ ۷۔۸، ص ۶۹

۳۹۶۔ ہمدانی، احمد، مشمولہ: 'سیپ'، کراچی، شمارہ ۵۹، ص ۱۷۴

۳۹۷۔ عظیم، اقبال، مشمولہ: 'دنیاے ادب'، کراچی، اپریل ۱۹۹۵ء، ص ۲۰

۳۹۸۔ ایلیا، جون، ''شہر آشوب''، مشمولہ: ''تجدید نو''، لاہور، محولہ بالا، ص ۳۳

۳۹۹۔ تجدید نو، لاہور، محولہ بالا، ص ۲۳

۴۰۰۔ ضیائی، اظہر، مشمولہ: ''تجدیدِ نو''، محولہ بالا، ص ۲۴

۴۰۱۔ شاہین، افتخار اجمل، مشمولہ: ''تجدید نو''، محولہ بالا، ص ۲۴

۴۰۲۔ شاہ جہانی، محمد سبطین، مشمولہ: ''تجدید نو''، محولہ بالا، ص ۲۵

۴۰۳۔ سعید، تاج، مشمولہ: ''تجدیدِ نو''، محولہ بالا، ص ۲۶

۴۰۴۔ میرزا، آثم، مشمولہ: ''تجدیدِ نو''، محولہ بالا، ص ۲۷

۴۰۵۔ زاہدی، ماہ طلعت، مشمولہ: ''تجدید نو''، محولہ بالا، ص ۲۹

۴۰۶۔ نقوی، خاور، مشمولہ: ''تجدید نو''، محولہ بالا، ص ۳۱

۴۰۷۔ صدیقی، ساغر، مشمولہ: ''تجدید نو''، محولہ بالا، ص ۳۱

۴۰۸۔ امان، یاور، مشمولہ: ''تجدید نو''، محولہ بالا، ص ۳۲

۴۰۹۔ شاعر، حمایت علی، مشمولہ: ''تجدیدِ نو''، محولہ بالا، ص ۶۷

۴۱۰۔ شام، محمود، مشمولہ: ''ہمارے مشاعرے''، جلد دوم، محولہ بالا، ص ۴۱۱

۴۱۱۔ رضی، قمر، 'محمود شام کی چار نظمیں'، مشمولہ 'اقدار'، کراچی، جلد ۴، شمارہ ۱۱۔۱۲، ص ۱۱۱۔۱۱۲

۴۱۲۔ بہ حوالہ، سید قمر رضی، محولہ بالا، ص ۱۱۲

۴۱۳۔ ایضاً

۴۱۴۔ ایضاً ص ۱۱۴

۴۱۵۔ شام محمود، مشمولہ 'اقدار'، کراچی، جلد ۴، شمارہ ۲۳۔۲۴، ص ۱۱۷

۴۱۶۔ عارف، افتخار، مشمولہ: 'ہمارے مشاعرے'، جلد اول، ص ۲۷۵

۴۱۷۔ ایضاً، ص ۲۶۹

۴۱۸۔ ریاض، فہمیدہ، مشمولہ 'آج'، کراچی نمبر، جلد دوم، ص ۴۷۴۔۴۸۵

۴۱۹۔ ایضاً، ص ۴۸۸۔۴۸۹

۴۲۰۔ ریاض، فہمیدہ، مشمولہ 'ہمارے مشاعرے'، جلد دوم، ص ۳۴۵

۴۲۱۔ جامی، سید معراج، مشمولہ: ''تجدید نو''، محولہ بالا، ص ۷۷

۴۲۲۔ انبالوی، اقبال سحر، مشمولہ: ''تجدید نو''، محولہ بالا، ص ۸۷

۴۲۳۔ شاہ، محمد فیروز، مشمولہ: ''تجدید نو''، محولہ بالا، ص ۸۳

۴۲۴۔ جری، خواجہ رحمت اللہ، ''کراچی کا خریدار کون''، مشمولہ: دنیائے ادب، کراچی، اپریل ۱۹۹۵ء، ص ۲۲

۴۲۵۔ جری، رحمت اللہ، ''نامعلوم دہشت گرد''، مشمولہ: ماہ نامہ صریر، کراچی، جون جولائی ۱۹۹۵ء، ص ۳۴۷

۴۲۶۔ مزمل، شہناز، مشمولہ: ''تجدیدِ نو''، محولہ بالا، ص ۸۸

۴۲۷۔ صابری، پیرزادہ حمید، مشمولہ: ''تجدید نو''، محولہ بالا، ص ۸۹

۴۲۸۔ خسرو، فیروز، مشمولہ: ''تجدید نو''، محولہ بالا، ص ۹۵

۴۲۹۔ ایضاً ص ۹۴

۴۳۰۔ ندیم، خالد، مشمولہ: ''تجدیدِ نو''، محولہ بالا، ص ۹۷

۴۳۱۔ خالدی، فدا، مشمولہ: ''تجدیدِ نو''، محولہ بالا، ص ۹۸

۴۳۲۔ ایضاً

۴۳۳۔ ایضاً ص ۹۹

۴۳۴۔ عطا، نجم الحسن، مشمولہ: ''تجدید نو''، محولہ بالا، ص ۱۰۰

۴۳۵۔ مشتاق، فوقیہ، مشمولہ: ''تجدیدِ نو''، محولہ بالا، ص ۱۰۱

۴۳۶۔ ایضاً ص ۱۰۲

۴۳۷۔ فتح پوری، ڈاکٹر فرمان، دیباچہ، مشمولہ: '' جرسِ گل'' از گلنار آفرین، تمثال پبلی کیشنز، کراچی، ۱۹۹۱ء، ص ۷۔۸

۴۳۸۔ آفرین، گلنار، ''جرسِ گل''، تمثال پبلی کیشنز، کراچی، ۱۹۹۱ء، ص، ۵۷۔۱۴۴

۴۳۹۔ ـــــــ، ''وقت کا مسیحا، نہال پریس، کراچی، ۱۹۹۹ء، ص ۸

۴۴۰۔ ـــــــ، ''ہمارے مشاعرے''، جلد دوم، ساکنانِ شہر پبلشرز، ۲۰۰۷ء، ص ۳۸۷

۴۴۱۔ ـــــــ، ''وقت کا مسیحا''، ص ۱۰

۴۴۲۔ کاظمی، نقاش، مشمولہ: ''ہمارے مشاعرے''، جلد دوم، محولہ بالا، ص۵۱۲۔۵۱۳

۴۴۳۔ ایضاً، ص۵۱۳

۴۴۴۔ ایضاً، ۵۱۴۔۵۱۷

۴۴۵۔ شفیق، عارف، مشمولہ: ''ہمارے مشاعرے''، جلد دوم، محولہ بالا، ص۲۵۱۔۲۵۲

۴۴۶۔ ادیب، یونس، ''اظہاریہ''، مشمولہ: ''میں ہواؤں کا رُخ بدل دوں گا''، اردو مورچہ، کراچی، ۱۹۹۱ء، ص۲۴

۴۴۷۔ شفیق، عارف، ''میں ہواؤں کا رُخ بدل دوں گا''، اردو مورچہ، کراچی، ۱۹۹۱ء، ص۳۰۔۳۸؛ اس تعلق سے ان صفحات کو بھی ملاحظہ فرمایئے: ۳۹۔۴۱؛ ۵۵؛ ۸۹؛ ۱۰۰؛ ۱۰۳؛ ۱۰۹؛ ۱۱۶؛ ۱۲۰؛ ۱۳۸؛ ۱۴۳؛ ۱۵۴؛ ۱۶۵؛ ۲۹۵

۴۴۸۔ ـــــــــ، ''اظہاریہ''، مشمولہ ''یقین''، ماہ نامہ ادبی دنیا، کراچی، ۲۰۰۴ء، ص۱۶

۴۴۹۔ ـــــــــ، ''یقین''، ماہ نامہ ''ادبی دنیا''، کراچی، ۲۰۰۴ء، ص۳۱؛ ان صفحات کو بھی ملاحظہ فرمائیں: ۳۳؛ ۳۵؛ ۴۲؛ ۷۰؛ ۱۱۶؛ ۱۱۷

۴۵۰۔ ایضاً، ص۱۱۸

۴۵۱۔ ایضاً، ص۱۲۱؛ ان صفحات کو بھی ملاحظہ فرمائیں: ۱۲۶، ۱۴۳، ۱۶۴، ۱۹۸، ۲۲۳، ۲۳۵، ۲۶۲، ۲۳۴، ۲۵۱

۴۵۲۔ ایضاً، ص۲۵۵

۴۵۳۔ ایضاً، ص۲۵۴۔۲۵۵

۴۵۴۔ ایضاً، ص۲۵۶؛ ان صفحات کو بھی ملاحظہ فرمائیں: ۲۵۷، ۲۵۸، ۲۶۶، ۲۷۶، ۲۸۰، ۲۸۴، ۲۵۶، ۲۸۷

۴۵۵۔ ایضاً، ۲۹۲؛ ان صفحات کو بھی ملاحظہ فرمائیں: ۲۹۸، ۳۰۶، ۳۰۸، ۳۰۹، ۳۶۶، ۳۷۸، ۳۸۸، ۳۹۱، ۵۱۳، ۵۱۴، ۵۲۳

۴۵۶۔ ـــــــــ، مشمولہ: ''ہمارے مشاعرے''، جلد دوم، محولہ بالا، ص۲۵۱۔۲۵۳

۴۵۷۔ مطرب، ڈاکٹر سکندر شیخ، مشمولہ: ''ہمارے مشاعرے''، جلد دوم، محولہ بالا، ص۲۵۱۔۲۵۳

۴۵۸۔ بھوپالی، منظر، مشمولہ: ''ہمارے مشاعرے''، جلد دوم، محولہ بالا، ص۴۶۹

۴۵۹۔ معین، خالد، مشمولہ: ''ہمارے مشاعرے''، جلد دوم، محولہ بالا، ص۵۵۲

۴۶۰۔ عزیز آبادی، مصطفیٰ، مشمولہ: ''ہمارے مشاعرے''، جلد دوم، محولہ بالا، ص۷۶۹

۴۶۱۔ ساحل، ذیشان، ''پیش لفظ''، مشمولہ: کراچی اور دوسری نظمیں، فضلی سنز، کراچی، ۱۹۹۵ء، ص ندارد

۴۶۲۔ ایضاً، ص۱۸

۴۶۳۔ ایضاً، ص۲۲۔۲۳

۴۶۴۔ ایضاً، ص۲۷۔۲۸

۴۶۵۔ ایضاً، ص۳۱۔۳۲

۴۶۶۔ ایضاً، ص۴۲

۴۶۷۔ ایضاً، ص۵۲

۴۶۸۔ ایضاً، ص۵۵

۴۶۹۔ ایضاً، ص۶۴۔۶۶

۴۷۰۔ ایضاً، ص۶۹

۴۷۱۔ ایضاً، ص۹۹

۴۷۲۔ ایضاً، ص۱۲۴

۴۷۳۔ ایضاً، ص۱۳۲

۴۷۴۔ ایضاً، ص۱۳۰

۴۷۵۔ ایضاً، ص۱۳۷

۴۷۶۔ ایضاً، ص۱۵۴

۴۷۷۔ ایضاً، ص۱۰۹

۴۷۸۔ ایضاً، ص۱۵۷۔۱۵۸

۴۷۹۔ ایضاً، ص۱۵۰۔۱۵۱

۴۸۰۔ ایضاً، ص۱۴۰

۴۸۱۔ ایضاً، ص۱۴۶۔۱۴۷

۴۸۲۔ ایضاً، ص۱۵۲

۴۸۳۔ عابدی، حسن، ''جریدہ''، پاکستانی ادب پبلشرز، کراچی، ۱۹۹۸ء، ص۱۳

۴۸۴۔ ایضاً، ص۱۵۔۱۶

۴۸۵۔ ایضاً،ص۱۰۹

۴۸۶۔ فرخی، آصف،''اس وقت تو یوں لگتا ہے''،فضلی سنز،کراچی، ۱۹۹۸ء،ص۳۳

۴۸۷۔ ایضاً،ص۹۶۔۹۷

۴۸۸۔ ایضاً،ص۱۰۷۔۱۰۸

۴۸۹۔ فرخی، آصف، "Look at the City From Here"، آکسفرڈ یونی ورسٹی پریس،۲۰۱۰ء،ص۱۹۰۔۱۲۳

۴۹۰۔ انجم،تنویر،''طوفانی بارشوں میں رقصاں ستارے''، وعدہ کتاب گھر،کراچی،۱۹۹۷ء،ص۳۲۔۳۳

۴۹۱۔ ایضاً،ص۲۶

۴۹۲۔ ایضاً،ص۱۴۵۔۱۴۸

۴۹۳۔ عباس،عذرا،''میں لائنیں کھینچتی ہوں''،ایجوکیشنل پریس،کراچی، ۱۹۹۲ء،ص۳۸۔۳۹

۴۹۴۔ ایضاً،ص۴۴

۴۹۵۔ ــــــــ،''خواب مجھے دیکھتے ہیں''، بناش پرنٹرز کراچی، ۱۹۹۶ء،ص۲۶

۴۹۶۔ ایضاً،ص۸۲۔۸۳

۴۹۷۔ ــــــــ،''اندھیرے کی سرگوشیاں''، سٹی پریس، کراچی، ۲۰۱۶ء،ص۱۱

۴۹۸۔ ایضاً،ص۱۳

۴۹۹۔ ایضاً،ص۵۱

۵۰۰۔ ایضاً،ص۱۱۱۔۱۱۲

۵۰۱۔ ایضاً،ص۱۱۸

۵۰۲۔ ایضاً،ص۱۳۸

۵۰۳۔ ایضاً،ص۱۳۱۔۱۳۲

۵۰۴ خلیق،حارث،مشمولہ'ارتقا'،کراچی،اپریل۱۹۹۰ء،ص۲۶۷

۵۰۵۔ سہیل،ادیب،''عروس البلاد''،مشمولہ:افکار،کراچی،مئی۱۹۹۱ء، ص۳۷

۵۰۶۔ ــــــــ،''میرا شہر سب کا شہر''، مشمولہ: افکار، کراچی، مارچ،۱۹۹۱ء،ص۳۲

۵۰۷۔ آفرین،عشرت،''یہ بستی میری بستی ہے''،مشمولہ:فنون،لاہور، جنوری۔مئی،۱۹۹۷ء،ص۶۰

۵۰۸۔ سبزواری، طارق،''رپورٹ''، عالمی مشاعرہ،مشمولہ: ماہ نامہ، دنیائے ادب،کراچی،مارچ۱۹۹۷ء،ص۱۱

۵۰۹۔ ساغر، امتیاز،''مشمولہ:''رپورٹ''، عالمی مشاعرہ،مشمولہ: ماہ نامہ،دنیائے ادب،کراچی،مارچ۱۹۹۷ء،ص۱۱

۵۱۰۔ ایضاً،ص۱۲

۵۱۱۔ شمیم،مسلم،''شہرآشوب''،مشمولہ:ماہ نامہ''طلوع افکار''،کراچی، دسمبر۔جنوری۱۹۹۵ء،ص۹

۵۱۲۔ بلگرامی،شمیم،مشمولہ: سہ ماہی''ارتقا''، کراچی ، اپریل۱۹۹۰ء، ص۲۶۳

۵۱۳۔ اجمیری، مختار،مشمولہ: ماہ نامہ،''صریر''، کراچی، دسمبر۱۹۹۵ء، ص۶۱

۵۱۴۔ حنفی،مظفر،مشمولہ:اقدار،کراچی،جلد۴،شمارہ،۱۹۔۲۰،ص۱۰۶

۵۱۵۔ رانا،منور،'مہاجرنامہ'،ایم آرپبلی کیشنز،دہلی،۲۰۱۰ء،ص۸۔۹

۵۱۶ ایضاً،ص۱۰

۵۱۷ ایضاً،ص۴۸۔۵۰

۵۱۸ ایضاً،ص۵۰۔۵۹

۵۱۹ صدیقی، آفاق، نیادن روشنی کا،مشمولہ: آگہی، کراچی، مئی جون۱۹۹۱ء،ص۹۷

۵۲۰ سبتگین،صبا،مشمولہ:اقدار،کراچی،جلد۵،شمارہ۷۔۸،ص۶۳

۵۲۱ نجفی، قیصر،حکیم محمد سعید کی یاد میں،مشمولہ: سہ ماہی، ارمغان، کراچی،جنوری تامارچ۱۹۹۹ء،ص۸

۵۲۲ امجد،امجداسلام،اب تم میرے نہیں رہے،مشمولہ:افکار،کراچی، جنوری۱۹۹۰ء،ص۲۷

۵۲۳ شفائی،قتیل،سوچتا ہوں،مشمولہ: افکار، کراچی ، اگست۱۹۹۱ء، ص۱۶

۵۲۴ ــــــــ، آشیانہ، مشمولہ: افکار، کراچی، اکتوبر۱۹۹۵ء، ص۳۹

۵۲۵۔ ناہید،کشور،مشمولہ:اقدار،کراچی،جلد۱،شمارہ۳۔۴،ص۴۶

۵۲۶۔ ــــــــ،مشمولہ:روشن خیال،کراچی،جلد۱،شمارہ۴،ص۴۳

۵۲۷۔ رئیس، احمد،''کراچی مرنہیں سکتا''، مشمولہ: ماہ نامہ''افکار''،

کراچی، جولائی ۱۹۹۵ء، ص۳۰

۵۲۸۔ ہاشمی، قمر، ''مشمولہ: ماہ نامہ ''افکار''، کراچی، اگست، ۱۹۹۰ء، ص۳۲

۵۲۹۔ سید، پروین فنا، ''بوند بوند ہو''، مشمولہ: سیپ، کراچی، شمارہ۶۱، ص۱۱۷

۵۳۰۔ وارثی، مظفر، کراچی، مشمولہ: روشن خیال، کراچی، جلد۱، شمارہ۲، ص۳۶

۵۳۱۔ سید، افضال احمد، مشمولہ: روشن خیال، کراچی، جلد۱، شمارہ۲، ص۳۶

۵۳۲۔ ـــــــ، ''مٹی کی کان''، سٹی پریس، کراچی، ۲۰۰۹ء، ص۳۰۴

۵۳۳۔ سعید الدین، ''کٹی پہاڑی''، مشمولہ: آج، کراچی، شمارہ۶۹، جنوری ۲۰۱۱ء، ص۳۴۳۔۳۴۴

۵۳۴۔ ایضاً، ص۳۴۴

۵۳۵۔ لکھنوی، ساحر، ''شہر آشوب''، مشمولہ: ماہ نامہ ''طلوع افکار''، کراچی، فروری۔مارچ، ۱۹۹۵ء، ص۵۲۔۵۳

۵۳۶۔ اکرام، صبا، ''کراچی کے لیے ایک نظم''، مشمولہ: ماہ نامہ ''طلوع افکار''، کراچی، جولائی ۱۹۹۵ء، ص۵۹

۵۳۷۔ فخری، حبیب، ''کراچی''، مشمولہ: ماہ نامہ ''افکار''، کراچی، دسمبر ۱۹۹۵ء، ص۳۸

۵۳۸۔ انصاری، وکیل، مشمولہ: ماہ نامہ ''دنیائے ادب''، کراچی، جنوری ۱۹۹۵ء، ص۴۸

۵۳۹۔ فکری، متین، ''شہرِ بے ندا''، مشمولہ: ماہ نامہ ''افکار''، کراچی، ستمبر ۱۹۹۶ء، ص۳۸

۵۴۰۔ نذیر، محمد، ''شہر آشوب''، مشمولہ: صریر، کراچی، نومبر ۱۹۹۴ء، ۵۳

۵۴۱۔ عابدی، رفیعہ شبنم، مشمولہ: ''روشن خیال''، کراچی، جلد۱، شمارہ۴، ص۴۳

۵۴۲۔ نقوی، شاہد، ''تعاقب''، مشمولہ: ماہ نامہ ''طلوع افکار''، کراچی، مارچ ۱۹۹۳ء، ص۴۸

۵۴۳۔ آراء، ڈاکٹر قمر، مشمولہ: ماہ نامہ ''دنیائے ادب''، کراچی، ستمبر، ۱۹۹۶ء، ص۵۲

۵۴۴۔ عمر، ڈاکٹر منصور، ''آزاد غزلیں''، مشمولہ: ماہ نامہ ''صریر''، کراچی، اکتوبر ۱۹۹۲ء، ص۴۳

۵۴۵۔ صدیقی، بقا، مشمولہ: ماہ نامہ ''صریر''، کراچی، جون جولائی ۱۹۹۵ء، ص۲۵۲

۵۴۶۔ شاد، مشتاق، مشمولہ: ماہ نامہ ''افکار''، کراچی، اگست ۱۹۹۵ء، ص۳۹

۵۴۷۔ شاد، مشتاق، مشمولہ: ماہ نامہ، صریر، اگست ۱۹۹۱ء، ص۵۶

۵۴۸۔ زیدی، سردار، ''رپورتاژ''، مشمولہ: ماہ نامہ ''صریر''، کراچی، ستمبر ۱۹۹۵ء، ص۶۰

۵۴۹۔ رضی، صفدر صدیقی، مشمولہ: ماہ نامہ ''صریر''، کراچی، جنوری ۱۹۹۳ء، ص۵۷

۵۵۰۔ صدیقی، بقا، مشمولہ: ماہ نامہ ''طلوع افکار''، کراچی، جون ۱۹۹۵ء، ص۴۹

۵۵۱۔ مجیدی، اقبال، مشمولہ: ماہ نامہ ''صریر''، کراچی، اگست ۱۹۹۵ء، ص۵۵

۵۵۲۔ فاطمی، حسن عسکری، ''شہر قائد خوف اگلتا ہے''، مشمولہ: ماہ نامہ ''دنیائے ادب''، کراچی، اپریل ۱۹۹۵ء، ص۲۲

۵۵۳۔ رزمی، ثاقب، مشمولہ: ماہ نامہ ''طلوع افکار''، کراچی، اکتوبر، ۱۹۹۲ء، ص۶۳

۵۵۴۔ شروش، رفعت، مشمولہ: ماہ نامہ ''افکار''، کراچی، اکتوبر ۱۹۹۰ء، ص۲۸

۵۵۵۔ رضوی، عذیر، ''غزل خواں کوئی نہیں''، مشمولہ: ''ارتقا''، کراچی، مارچ ۱۹۹۵ء، ص۲۷۹

۵۵۶۔ شہریار، ڈاکٹر، مشمولہ: ماہ نامہ ''افکار''، کراچی، دسمبر ۱۹۹۵ء، ص۴۴

۵۵۷۔ حیدر، اقبال، ''آئینہ اکیلا ہے''، مشمولہ: ماہ نامہ افکار، کراچی، اکتوبر ۱۹۹۱ء، ص۲۹

۵۵۸۔ ـــــــ، مشمولہ: ماہ نامہ دنیائے ادب، کراچی، مارچ ۱۹۹۵ء، ص۱۴

۵۵۹۔ حیدر، اقبال، مشمولہ: 'ارتقا'، کراچی، مئی ۱۹۹۳ء، ص۲۸۳

۵۶۰۔ دانش، ن م، مشمولہ: ماہ نامہ ''دنیائے ادب''، کراچی، نومبر ۱۹۹۸ء، ص۲۶

۵۶۱۔ ایضاً

۵۶۲۔ عیاں، رشیدہ، مشمولہ: ماہ نامہ ''دنیائے ادب''، کراچی، نومبر۱۹۹۸،ص۴۶

۵۶۳۔ علوی،حمزہ،''ہندوستان اور پاکستان میں اتھنی سٹی کی سیاست''، مترجم: ڈاکٹر مبارک علی،مشمولہ: سہ ماہی ''تاریخ''، لاہور،نمبر ۱۰، جولائی۲۰۰۱ء،ص۷۔۴۵

۵۶۴۔ ریاض،فہمیدہ،''کراچی''،مشمولہ: ''کراچی کی کہانی''،جلد دوم، ص۵۰۵۔۵۱۲

۵۶۵۔ فیض،احمد فیض، بہ حوالہ: ''کراچی''،مشمولہ: ''کراچی کی کہانی''، جلد دوم،ص۵۱۳

۵۶۶۔ ریاض،فہمیدہ،ص۵۱۳۔۵۱۷

۵۶۷۔ ایضاً،ص۴۹۶۔۵۰۲

۵۶۸۔ ایضاً،ص۵۰۲۔۵۰۳

۵۶۹۔ ایضاً،ص۵۱۹

۵۷۰۔ ایضاً،ص۵۲۸۔۵۲۹

۵۷۱۔ زیدی، اکبر ایس۔''سندھ میں سیاسی محرکات''،مترجم محمد مظاہر، مشمولہ: سہ ماہی ''ارتقا''،کراچی، مارچ۱۹۹۱ء،ص۳۴۔۵۱

۵۷۲۔ علی، ڈاکٹر مبارک، ''سندھی و مہاجر شناخت: تضادات و اشتراک''،مشمولہ: سہ ماہی ''تاریخ''، لاہور،سندھ نمبر،شمارہ۱۶، جنوری۲۰۰۳ء،ص۲۲۳۔۲۲۵

۵۷۳۔ صدیقی،ڈاکٹر محمد علی،ص۶۸

۵۷۴۔ نقوی، ایم۔ بی۔''سندھ میں قومیت کا مسئلہ''،مترجم راحت العین،مشمولہ: ''ارتقا''،کراچی،مئی۱۹۹۳ء،ص۱۷

۵۷۵۔ عابدی،حسن،''اشاریہ''،مشمولہ: ماہ نامہ ''افکار''،کراچی،اگست ۱۹۹۰ء،ص۱۳۔۱۴

۵۷۶۔ صدیقی،ڈاکٹر محمد علی،''اشاریہ''،مشمولہ: ماہ نامہ ''افکار''،کراچی، جولائی۱۹۹۰ء،ص۱۲

۵۷۷۔ احمد، نبی،''صحت مند معیشت کے لیے تجاویز''،مترجم سید محمد علی، مشمولہ: ''ارتقا'،کراچی،دسمبر۱۹۹۳ء،ص۱۱۱

۵۷۸۔ طاہرہ،قرۃ العین، ''جدید غزل میں شہر کی علامت''،مشمولہ: ''اقدار''،کراچی،جلد۴،شمارہ۳۔۴،ص۱۱۴۔۱۱۵

۵۷۹۔ جمال، رشید،''سندھ دوراہے پر''، پاکستانی ادب پبلی کیشنز، کراچی،۱۹۹۴ء،ص۲۵۹۔۲۶۸

۵۸۰۔ جمال،رشید،''مسئلہ کراچی: اسباب و حل''،لوحِ ادب پبلی کیشنز، کراچی،۱۹۹۶ء،ص۲۰۱۔۲۰۳

۵۸۱۔ رومانی،شبنم، بہ حوالہ: ''شبنم رومانی: شخصیت اور فن''، از فرحانہ اختر، غیر مطبوعہ مقالہ برائے ایم۔ اے۔ کراچی یونی ورسٹی، کراچی،۲۰۰۵ء،ص۴۴

۵۸۲۔ احد،شہناز،''کراچی کیوں جلتا رہا''، ورکنگ وومن پبلی کیشنز، کراچی،۱۹۸۷ء،ص۱۵۔۱۶

۵۸۳۔ شعور،انور، بہ حوالہ: ''انور شعور: حیات اور فن''،از فرح شریف، غیر مطبوعہ مقالہ برائے ایم۔اے۔کراچی یونی ورسٹی، کراچی، ۲۰۰۲ء،ص۴۵

۵۸۴۔ بہ حوالہ: ''اداریہ''،مشمولہ: ''فاران''،کراچی،جون۱۹۹۵ء،ص۶

۵۸۵۔ نظامانی،رؤف،''سندھ کی صورتِ حال: کیا کرنا چاہیے''،مشمولہ: ''ارتقا''،کتابی سلسلہ نمبر۱۱،ص۹۰۔۹۱

ماحصل

شاعری جذبات کے ساتھ ساتھ شعور اور ادراک سے بھی گہرا ربط رکھتی ہے۔ زندگی میں اس سے روشنی حاصل کی جاسکتی ہے۔ یہ زندگی کو برتنے اور بسر کرنے کا شعور پیدا کرتی ہے۔ اس کے نشیب وفراز سے آگاہ کرتی ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس کی بدولت تھوڑی دیر کے لیے انسان اپنی سطح سے بلند ہو کر سوچنے لگتا ہے۔ شاعری کے اثرات دوررس ہوتے ہیں جن کا تعلق صرف مشاہدے سے نہیں، اس کا آغاز مشاہدے سے ضرور ہوتا ہے لیکن جذبات واحساسات کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر نئی نئی صورتیں اختیار کرتا چلا جاتا ہے۔ شاعری میں سب سے زیادہ اہمیت تو ان عناصر کو حاصل ہے جو موضوع اور مواد کو ایک خاص شکل دیتے ہیں۔ شاعر جن باتوں کو جذبے کا روپ دیتا ہے ان میں سے ہر ایک کی نوعیت انسانی ہوتی ہے۔ ان میں انسانی زندگی کے کسی انفرادی یا اجتماعی، داخلی یا خارجی پہلو کو پیش کیا جاتا ہے۔ کبھی کبھی ہنگامی معاملات بھی جذبات کے روپ میں پیش کیے جاتے ہیں لیکن اعلیٰ درجے کی شاعری وہی کہلائی جانے کی مستحق ہے جس میں جذبات کی نوعیت آفاقی ہو[1]۔ اس تناظر میں پیش کی گئی اردو شاعری کہاں تک آفاقی شاعری کہلائی جانے کی مستحق ہے، اس کا فیصلہ تو مستقبل کے نقاد کریں گے لیکن اس تحقیقی مطالعے میں کم وبیش چار صدیوں پر محیط اردو شاعری کے سانحاتی بیانیے پر نظر ڈالنے سے یہ بات کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ ہر دور کے اردو شعرا نے اپنے سماج کے بڑے مسائل پر آواز ضرور بلند کی۔ کہیں یہ آواز احتجاجی رنگ اختیار کر گئی اور کہیں محض اس کی دبی دبی چنگاریاں محسوس کی گئیں۔

اس تحقیقی مطالعے میں کم وبیش چار صدیوں پر محیط اردو شاعری کے سانحاتی بیانیے کو پیش کیا گیا ہے لیکن ابتدائی ابواب کی نوعیت تمہیدی ہے جب کہ بیسویں صدی کے متعدد سانحات کو مطالعے کا خصوصی موضوع بنایا گیا ہے۔

دورانِ تحقیق سترھویں صدی تک کی شاعری کے مطالعے سے یہ بات سامنے آئی کے اس دور کے اکثر حادثات وسانحات کو شعرا نے موضوع تو ضرور بنایا لیکن ذریعہ اظہار فارسی رہا۔ تمہید کے طور پر میں نے ان سانحات میں سے چند کو اپنی تحقیق کا موضوع بنایا ہے۔ اقتدار اور حکم رانی کی رساکشی سے پیدا ہونے والے سانحات سے قطع نظر میں نے اس باب میں خاص طور پر امیر خسرو اور خواجہ حسن سجزی کے واقعہِ اسیری سے متعلق جو غلط فہمیاں فارسی اور اردو کی درجنوں کتب میں پائی جاتی تھیں، انھیں بنیادی ماخذ سے دور کر کے درست تصویر پیش کی ہے۔ اس ضمن میں سب سے اہم ماخذ خود امیر خسرو کی شاعری اور خواجہ حسن سجزی کا منثور مرثیہ ہے جس سے اس سانحے کے مختلف ابہام کو دور کرنے میں بڑی مدد ملی۔ اسی باب میں دارالخلافہ کی دلّی سے دولت آباد منتقلی کا مختصر جائزہ بھی لیا گیا ہے جس نے دلّی کی سیاسی اور سماجی زندگی میں ایک بھونچال کی کیفیت پیدا کر دی تھی۔ فارسی شاعری میں ان واقعات کو بھی پیش کیا گیا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اس زمانے تک اردو کی سانحاتی شاعری کے شواہد نہ ہونے کے برابر ہیں۔ اس باب کے آخر میں جنوبی ہندوستان خصوصاً دکنی علاقوں میں اقتدار کی کش مکش، جنگ تالی کوٹ کے نتیجے میں پیدا ہونے والی صورتِ حال اور انسانی المیہ کو پیش کرتے ہوئے اس دور کی اردو شاعری کے بیانیے کو تفصیل سے پیش کیا گیا ہے۔ جنگ وجدل اور آپس کی محاذ آرائی نے کس طرح اس خطے کو قحط اور دیگر قدرتی آفات کی لپیٹ میں لیے رکھا اور اس حوالے سے دکنی شعرا کے کیا جذبات ومحسوسات تھے تھے، مختصراً یہ مناظر بھی اسی باب میں دکھائے

گئے ہیں۔

جہاں تک اٹھارھویں صدی کے اہم سانحات اور اس کے شعری منظر نامے کا تعلق ہے مشاہیر کے کئی عمدہ تحقیقی کام پہلے ہی منظر عام پر آ چکے ہیں۔ راقم نے ان تحقیقی مقالات کا جائزہ لیتے ہوئے اس موضوع سے متعلق تمام مواد کو یکجا کیا اور اس دور کے اہم شعرا خصوصاً میر جعفر زٹلی، میرزا جعفر علی حسرت، اشرف علی فغاں، مرزا محمد رفیع سودا، میر تقی میر، شاہ حاتم، شیخ غلام علی ہمدانی مصحفی، شاہ کمال الدین، لچھمی نارائن شفیق، قیام الدین قائم چاند پوری، سراج اورنگ آبادی اور نظیر اکبر آبادی وغیرہ کے کلام سے ان اشعار اور نظموں کی نشان دہی کی ہے جو اس دور کے مختلف سانحات سے متعلق تھے۔ خصوصاً اورنگ زیب کی وفات کے بعد پیدا ہونے والی طوائف الملوکی، نادر شاہ اور احمد شاہ ابدالی کے حملوں کے نتیجے میں پیدا ہونے والی صورتِ حال اور شعرا کا انسان ان سانحات سے متعلق ردِعمل، دلّی کی تباہی و بربادی کے نوحے اور شہر آشوب کے ذریعے اس زمانے کی سماجی اور معاشی صورتِ حال کو جس طرح شعرا نے درد انگیز پیرائے میں پیش کیا، اسے اس باب کا حاصل قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس دور کی شاعری اس قدر اثر انگیز اور واقعات اور جزئیات سے بھرپور ہے کہ یہ شاعری بہ طور تاریخ کے ایک مستند ماخذ کے طور پر بھی پیش کی جا سکتی ہے۔ اس دور کی شاعری اظہار کی مکمل خوبیوں کے ساتھ ہمارے سامنے آئی۔ کم و بیش اسی قسم کی صورتِ حال انیسویں صدی کے مطالعے کے دوران پیش آئی۔ اس صدی کا سب سے بڑا سانحہ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی اور اس کے نتیجے میں انگریزی سرکار کا ردِعمل ہے۔ اس باب میں استعماری قوتوں کی نو آبادیاتی پالیسی اور مختلف ریاستوں کو اپنی عمل داری میں لینے کے نتیجے میں پیدا ہونے والی صورتِ حال پر شعرا کے ردِعمل کا خصوصی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ ابتدا میں سکھ راج کے خلاف برطانوی استعمار کی سازشوں کا پردہ چاک کرتے ہوئے خالصا فوج کی شکست کے اسباب و عوامل کا تجزیہ بھی کیا گیا ہے۔ اس صورتِ حال پر لکھے جانے والے غم انگیز نوحے، مرثیے، جنگ نامے اور واریں کا تجزیہ کرتے ہوئے ایامِ گزشتہ میں سکھوں کی جانب سے کیے جانے والے مظالم کے شعری بیانیے کو بھی پیش کیا گیا ہے۔ اس باب کا دوسرا اہم موضوع انتزاعِ سلطنت اودھ کا سانحہ ہے۔ اس ضمن میں ابتدائی طور پر اودھ کے انتشار زدہ معاشرے کا شعری منظر نامہ دکھانے کے بعد امرا کی بدحالی، اہلِ علم کی بے توقیری اور فن کاروں کی بے روزگاری کی بابت شعرا کے ردِعمل کا تفصیل سے احاطہ کیا گیا ہے۔ آخر میں نواب واجد علی شاہ کی معزولی اور جلاوطنی کے سانحے کو تفصیل سے پیش کرنے کے ساتھ ساتھ اس دور کے متعدد شعرا کے ہاں اس سانحے کے ضمن میں کی جانے والی شعری تخلیقات کو بھی موضوع بنایا گیا ہے۔ اس قسم کی شعری تخلیقات عموماً واقعاتی رنگ لیے ہوئے ہوتے ہیں۔ ان تخلیقات میں مخصوص ادبی محاسن کی تلاش بے سود ہے لیکن ان تخلیقات کی سب سے بڑی اہمیت یہ ہے کہ ان کے مطالعے سے اس زمانے کے حکم رانوں کی بے بسی اور لاچاری کی سچی تصویر ہمارے سامنے آ جاتی ہے۔ اس باب کے آخر میں ۱۸۵۷ء کے انقلاب اور اس سے جنم لینے والے سانحے کو موضوع بنایا گیا ہے۔ ابتدا میں ۱۸۵۷ء کی داستان خوں چکاں کو بیان کرنے میں جس قسم کی جانب داری برتی گئی اور جو متعصّبانہ رویہ اختیار کیا گیا، مختصراً جائزہ لیا گیا ہے۔ سو برس تک غدر، بغاوت اور جنگِ آزادی کے نام پر گمراہ کن پروپیگنڈے میں اس سانحے کے حقائق کہیں دب کر رہ گئے تھے، مقالے میں کوشش کی گئی ہے کہ ان تمام پہلوؤں کا غیر جانب دارانہ تجزیہ کیا جائے۔ اس ضمن میں شعرا کی تخلیقات ایک اہم ماخذ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اسی لیے ان تخلیقات کی مدد سے انگریزوں کی سازشوں کو بے نقاب کیا گیا ہے۔ اس سانحے کے متاثرین میں ایک طرف بہادر شاہ ظفر اور ان کے خاندان کے افراد تھے تو دوسری جانب عام شہری جنھیں چن چن کر قتل و غارت گری کا نشانہ بنایا گیا تھا۔ لٰہذا ان تمام

صورتِ حال پر اردو شعرا نے کھل کر اظہار خیال کیا۔شہر آشوب سے لے کر غزلوں اور نظموں میں اس دور کی داستانِ الم کو پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ان شعرا کی ایک طویل فہرست ہے جنھوں نے حصولِ آزادی کی کھل کر حمایت کی اور بعض ایسے شعرا بھی ہمارے مطالعے کا موضوع بنے جنھوں نے اس انقلاب کی مخالفت اور مذمت کرتے ہوئے انگریزوں کی مدح سرائی کی۔انیسویں صدی میں شعرا نے زندگی کی مشکلات اور معاشرتی المیے کو پیش کرتے ہوئے کمال مہارت سے کام لیا۔اس دور کی شاعری اظہار کی مکمل خوبیوں کے ساتھ ہمارے سامنے آئی۔غالب، بہادر شاہ ظفر،ظہیر دہلوی،صدرالدین آزردہ، ناصر دہلوی،غلام مصطفیٰ خان شیفتہ،داغ دہلوی،قربان علی سالک، میر مہدی مجروح،محمد علی تشنہ، الطاف حسین حالی اور مولانا محمد حسین آزاد وغیرہ کی توانا آواز نے اس سانحے کو پوری جزئیات کے ساتھ پیش کر کے مورخین کے لیے اہم ماخذ فراہم کیا۔اپنے اصل موضوع سے ہم آہنگ رہنے کے لیے راقم نے اس صدی کے مطالعے کو بہت محدود رکھنے کی کوشش کی ہے تاہم اس صدی کے تمام اہم سانحات اور اس کے نمائندہ شعرا کی تخلیقات کی جھلک اس باب میں ضرور دیکھی جاسکتی ہے۔

بیسویں صدی کو سانحات کی صدی کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔اس صدی کے اہم سانحات کے پس منظر میں جو کچھ شاعری ہوئی، تاحال اسے تحقیق کا موضوع نہیں بنایا گیا۔پوری دنیا میں پیش آنے والے حادثات اور سانحات نے اس صدی کے اردو شعرا کو کس طرح متاثر کیا، اس بابت کچھ زیادہ مواد نہیں ملتا، راقم نے اس ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے اس صدی کے سانحات کو اپنی تحقیق اور تجزیے کا خاص موضوع بنایا اور اس کام کا ڈول ڈالا۔دورانِ تحقیق اندازہ ہوا کہ بلاشبہ اس موضوع پر تحقیق کی اشد ضرورت تھی۔بلا مبالغہ یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ صرف بیسویں صدی کے سانحات کے مطالعے کے ضمن میں راقم نے جن اہم سانحات کو اپنی تحقیق کے دوران پیش نظر رکھا، ان سانحات کی بابت سے سیکڑوں شعرا کی تخلیقات سامنے آتی چلی گئیں جن کے نمونے مختلف ابواب میں پیش کیے گئے ہیں۔اس مطالعے سے اردو شاعری کے سانحاتی بیانیے کی پوری تاریخ مرتب کی جاسکتی ہے۔

دورانِ تحقیق میں یہ بات بھی سامنے آئی کہ ہندوستان میں پیش آنے والے بعض سانحات کا عمومی تاریخوں میں ذکر تک نہیں ملتا۔مخصوص علاقائی اور جغرافیائی تاریخوں میں اس کے کچھ حوالے مل جاتے ہیں مثلاً بیسویں صدی کی ابتدا میں حیدرآباد دکن میں طغیانی رودِ موسیٰ کا سانحہ ایسا ہے جس نے وہاں کی نصف سے زائد آبادی کو بری طرح متاثر کیا لیکن اس واقعے کا ذکر ادبی اور عمومی تاریخوں میں مفقود ہے جس کی وجہ سے اس موضوع پر تسلی بخش تحقیق کی ضرورت تھی۔مقالہ نگار نے جب اس موضوع پر تلاش و تحقیق کا سلسلہ شروع کیا تو اساسی مآخذ تک رسائی آسان نہ تھی۔اس بابت مانک راؤ وٹھل راؤ کی ''بستان آصفیہ'' اور حیدرآباد دکن سے شائع ہونے والے ماہ نامہ ''ادیب'' کے طوفان نمبر (۱۹۰۸ء) سے درست نتائج تک پہنچنے میں بڑی مدد ملی۔اس ضمن میں بعض نئے انکشافات بھی سامنے آئے۔مثال کے طور پر ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار اپنی دو مختلف تصانیف ''ظفر علی خان: ادیب و شاعر'' اور ''مولانا ظفر علی خان: حیات و خدمات'' میں سہواً اس سانحہ کا سال ۱۹۰۵ء بتایا جب کہ اس سانحے کا درست سال ۱۹۰۸ء ہے۔یہ سہو ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار سے کیوں ہوا؟ اس کی تفصیل مقالے میں ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔ماحصل میں اس کی وضاحت اس لیے ضروری ہے کہ شاعری نے ہی یہ ممکن بنایا کہ ان واقعات کی درست تاریخ کا تعین ممکن ہو سکے اور آئندہ کا مورخ اس سے استفادہ کر سکے۔

اس مطالعے کے ذریعے یہ بات بھی سامنے آئی کہ اردو شعرا بعض معاملات میں جذباتیت اور یکسانیت کا شکار دکھائی دیتے

ہیں۔ حیرت تو اس وقت ہوتی ہے کہ بعض بڑے اہم سانحات ان شعرا نے کلی طور پر نظر انداز کیا جن کے محرکات اور عوامل کو آئندہ کا محقق اپنی تحقیق کا موضوع بنائے گا۔ مثال کے طور پر تقسیم اور تنسیخ بنگال جو کہ بنگالی مسلمانوں کے لیے زندگی اور موت کا مسئلہ تھا، اس اہم قومی مسئلے پر اردو شعرا کی خاموشی معنی خیز ہے جب کہ کان پور کی مسجد کے غسل خانے کے انہدام، جس کا مقصد سڑک کی توسیع تھا، اس پر شبلی نعمانی اور دیگر شعرا کی جانب سے جو ردعمل سامنے آیا، وہ نری جذباتیت کے سوا کچھ نہیں اور جذباتیت نے درجنوں انسانی زندگی کو اس واقعے کی بھینٹ چڑھا دیا۔ اس مطالعے کا ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ ہم نے تاریخ کے متعدد مآخذ کو اس دور کی شاعری کے ذریعے سمجھنے کی کوشش کی اور اکثر و بیشتر شعرا کو ان سانحات سے ہم آہنگ پایا۔ تاریخ کے بعض اہم سانحات مثلاً جلیاں والا باغ اور قحط بنگال کے سانحے کے حوالے سے تاریخی کتب میں تو تفصیلات ملتی ہیں لیکن ان کے شعری منظر نامے پر ابھی تک تحقیقی کام دست یاب نہیں۔ مقالہ نگار نے تلاش و بسیار کے بعد مختلف رسائل اور شعرا کے مجموعہ کلام سے درجنوں ایسی نظمیں اور شعری تخلیقات دریافت کیں اور حوالہ بنایا جو ان موضوعات سے راست تعلق رکھتی تھیں۔ ان میں معروف شعرا کی تخلیقات بھی ہیں اور غیر معروف شعرا کی تخلیقات بھی۔ بلا مبالغہ یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ ان موضوعات کو پہلی بار کسی بھی تحقیق کا موضوع بنایا گیا ہے اور ان سانحات کے شعری بیانیے کو بھرپور انداز سے پیش کیا گیا ہے۔ اس تحقیقی مطالعے سے جنگِ عظیم اوّل اور خلافت تحریک کے خاتمے کے بعد اردو شعرا کے ردعمل کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ خلافت تحریک نے جس طرح ہندو مسلم قومی یک جہتی کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا، شعرا نے اس بیانیے کو خوب پروان چڑھایا۔ اس مطالعے سے شعرا کے اس بیانیے کو سمجھنے میں بھی مدد ملتی ہے۔ اس کے علاوہ جنگ عظیم دوم کے موقع پر جب کہ برعظیم پاک و ہند اس سانحے سے براہ راست متاثر بھی نہیں ہوئی تھی، اس کے باوجود شعرا کی طاقت ور آواز نے عالمی سطح پر اس واقعے کی طرف لوگوں کی توجہ مرکوز کی۔ جنگ عظیم سے ہونے والی لاکھوں ہلاکتیں شعرا کے حساس دل کو نہ صرف لحہ بہ لحہ المیے سے دوچار کر رہی تھی بلکہ مجھے یہ بات کہنے میں کوئی عار نہیں کہ راقم نے جنگ عظیم دوم کے موضوع پر کی جانے والی اردو شاعری کے بڑے ذخیرے کو بہ غور دیکھا، لکھا اور مقالے کے اس حصے میں تفصیلاً اسے پیش کیا۔ کچھ ایسی ہی صورتِ حال تقسیم ہند کے حوالے سے بھی درپیش رہی۔ اس موضوع پر اس سے قبل بہت کچھ لکھا گیا لیکن تقسیم کے اس عمل سے برصغیر کے لوگوں پر کیسے کیسے سانحات گزرے فسادات اور ہنگاموں نے شعرا کو کیسے بے چین رکھا اور ہجرت کے احساس کو اردو شعرا نے کس طرح پیش کیا، یہ وہ اہم پہلو ہیں جو اس ضمن میں تفصیل سے پیش کر کے اردو شاعری کے نئے امکانات کو دریافت کیا گیا ہے۔ دورانِ تحقیق جہاں عالمی تناظر میں رونما ہونے والے سانحات مثلاً فلسطین وغیرہ جیسے موضوعات پر اردو شعرا کے احساسات کو سمجھنے میں مدد ملی تو دوسری جانب کشمیر جیسے انسانی المیے پر کی جانے والی شاعری کے ماخذ تلاش کر کے اس سانحے کے نتیجے میں پیدا ہونے والی صورت کو سمجھنے میں بھی مدد ملی۔ خاص طور پر شعرا نے کشمیر کے دردانگیز ماحول اور ظلم و بربریت کے نہ ختم ہونے والے سلسلے کو موضوع بنا کر اس سانحے کو عالمی سطح پر اجاگر کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ مقالے میں ان تمام پہلوؤں پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔

دورانِ تحقیق پاکستان کی سیاسی تاریخ میں پیش آنے والے اہم سانحات اور المیوں کو بھی موضوع بنایا گیا ہے۔ سقوط ڈھاکا جیسے سانحے کے بعد ملک کے دولخت ہونے کا عذاب اس قوم کو سہنا پڑا۔ مقالے میں اس سانحے کے اسباب و عوامل کا تفصیلی جائزہ لینے کے ساتھ ساتھ ان سیاسی، سماجی اور تاریخی المیے پر کی گئی شعری تخلیقات کا بھی بھرپور جائزہ لیا گیا ہے تا کہ اس سانحے کی بابت موجود ابہام کو شعری مآخذ سے دور کیا جا سکے۔ سقوط ڈھاکا کی بدولت اردو شاعری کو جو بڑے بڑے موضوعات ملے ان میں احساس شکست و

ندامت، رسوائیوں کا تذکرہ، اپنوں کی بے وفائی، سیاسی رہنماؤں کی موقع پرستی، جارح دشمن کی مذمت، بنگلا دیش میں محصور پاکستانیوں پر روا رکھے جانے والے مظالم اور جنگی قیدیوں کا تذکرہ اہمیت کے حامل ہیں۔ مقالے میں ان تمام پہلوؤں کا تفصیلی جائزہ لینے کے ساتھ ساتھ ان تمام معروف اور غیر معروف شعرا کے کلام کے نمونے بھی پیش کیے گئے ہیں جنھوں نے اپنی شاعری میں اس سانحے کو موضوع بنایا۔ ان میں براہ راست متاثر ہونے والے عینی شاہدین کی طویل فہرست بھی شامل ہے جن کی نظمیں اور غزلیں احساسات اور جذبات کے اظہار کے ساتھ ساتھ اس سانحے کے محرکات اور عوامل پر درست طریقے سے روشنی بھی ڈالتی ہیں۔ اختر لکھنوی، افسر ماہ پوری، سرور بارہ بنکوی، پروفیسر اقبال عظیم، منظر علی خاں، خلش کلکتوی، ضحیٰ آروی، جمیل عظیم آبادی اور ادیب سہیل وغیرہ جیسے شعرا نے نہ صرف اس سانحے کو دیکھا بلکہ ہجرت کے قرب کو بھی محسوس کیا۔ اس سانحے پر انھوں نے خود بھی آنسو بہائے اور دوسروں کو بھی رونے پر مجبور کر دیا۔ لہٰذا مقالے کا یہ حصہ بھی سقوط ڈھاکا کے المیے کو سمجھنے میں معاون ثابت ہوگا۔

مقالے کے آخری باب میں ایک ایسے موضوع پر مبسوط تحقیقی کام کیا گیا جس کو عرفِ عام میں سانحہ کہتے ہوئے محققین گریزاں دکھائی دیتے ہیں۔ سندھ کے سیاسی، سماجی اور اقتصادی معاملات پر نظر رکھنے والوں کو اس بات کا پوری طرح ادراک ہے کہ پچھلی چند دہائیوں سے حکم راں طبقے کی مخصوص پالیسیوں کے نتیجے میں کراچی جیسے بڑے شہر کے اندر ایک مخصوص قسم کی بے چینی اور انتشار نے جنم لینا شروع کیا جو بعد میں دہشت گردی اور لسانی فساد کی شکل بھی اختیار کر گیا۔ ان فسادات کے نتیجے میں ہزاروں افراد لقمۂ اجل بن چکے ہیں۔ مقالے کے آخری باب میں کراچی کی تاریخ، ۱۹۴۷ء کے مہاجروں کی آمد اور نقل مکانی کے نتیجے میں پیدا ہونے والے انتظامی، معاشی اور معاشرتی منظر نامے کو تفصیل سے پیش کرنے کے ساتھ ساتھ ۱۹۸۰ء کی دہائی میں پیدا ہونے والی شدت پسندی کے محرکات کا بھی جائزہ لیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ اس باب میں اس شہر سے وابستہ شعرا کے احساسات کو بھی موضوع بنایا گیا ہے جنھوں نے شہر میں رونما ہونے والے ہر چھوٹے بڑے سانحہ کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔ رئیس امروہوی کے قطعات میں اس شہر کے مسائل اور محرومی کا ادراک ہو یا پروین شاکر کا اس شہر کو ''بیسوا'' سمجھ کر نوچنے کھسوٹنے کا معاملہ، شعرا نے کراچی کے کرب کو بڑی خوب صورتی سے اپنی تخلیقات میں پیش کیا ہے۔ اس باب میں بھی درجنوں کی تعداد میں معروف اور کم معروف شعرا کی تخلیقات حوالے طور پر پیش کی گئی ہیں تاکہ کراچی کے انتشار کے شہری منظر نامے کو سمجھنے میں مدد مل سکے۔ غرض کے کثیر الجہت موضوع ہونے کی وجہ سے اس مقالے کے محاصل کو اسی ایک سانحے تک محدود کر کے اپنی توجہ محض اسی سانحے پر مرکوز نہیں کی جا سکتی بلکہ مختلف ابواب میں ایسے ایسے انکشافات سامنے آئے ہیں جن کی بنیاد پر مستقبل میں مزید گہرائی سے ان سانحات کے دیگر پہلوؤں پر سیر حاصل تحقیق ممکن ہو سکے گی۔

حوالہ

۱۔ بریلوی، ڈاکٹر عبادت، ''شاعری اور شاعری کی تنقید''، اردو دنیا، کراچی، ۱۹۶۵ء، ص ۱۱۔۱۶

کتابیات

ابرار، صدیقی، بدایونی، ''صدر رنگ''، انجمن پریس، کراچی، ۱۹۷۸ء

ابراہیم، سردار محمد، ''کشمیر کی جنگ آزادی''، دین محمدی پریس، لاہور، ۱۹۲۲ء

ابن ادریس، ''امروز''، لاہور، ۹ جنوری ۱۹۷۲ء

ابن بطوطہ، ''الرحلۃ''، بہ حوالہ ''تاریخ سلاطین تغلق''، قرطاس پبلشر، کراچی، ۲۰۰۸

ابن نشاطی، بہ حوالہ ''قدیم اردو'' از مولوی عبدالحق، سہ ماہی اردو، جولائی ۱۹۲۹

ابوسعد، سید اسمٰعیل سید، ''شاہ رباعی، امجد''، ''سب رس''، کراچی، امجد نمبر ۱۹۶۲ء

اثر، ڈاکٹر محمد علی، ''اورنگ زیب، دکنی شعرا کی نظر میں''، غیر مطبوعہ مقالہ

________، ''غزل''، سب رس، کراچی، مئی ۱۹۹۱

________، ''غواصی شخصیت اور فن''، اردو اکیڈمی آندھرا پردیش، حیدرآباد، ۱۹۷۷

اجمیری، قابل، بہ حوالہ: رئیس فاطمہ، ''ایکسپریس نیوز''، ۳۱ اگست ۲۰۱۴ء

اجمیری، مختار، ماہ نامہ، ''صریر''، کراچی، دسمبر ۱۹۹۵ء

احد، شہناز، ''کراچی کیوں جلتا رہا''، ورکنگ وومن پبلی کیشنز، کراچی، ۱۹۸۷ء

احسان الحق، مرزا، ''قطعات و رباعیات''، حصہ دوم، بزم اکبر، کراچی، سن ندارد

احسان محسن، سہ ماہی ''فنون''، لاہور، شمارہ ۱۱۷، اپریل تا اگست ۲۰۰۲ء

________، ''فنون''، لاہور، اگست ۲۰۰۲ء

________، ''ناگزیر''، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۸ء

احمد، بشیر الدین، ''واقعات مملکت بیجاپور''، مطبع مفید عام، آگرہ، ۱۹۱۵

احمد، سلیم، ''مہاجر قومی موومنٹ: تشکیل اور جدوجہد''، رنگ پبلی کیشنز، لاہور

احمد، ظہیر، ''سندھ میں قوم پرستی کے نئے اور پرانے رجحانات''، نیا دور پبلی کیشنز، حیدرآباد، ۱۹۸۷ء

احمد، منیر، ''پاکستان ٹوٹ جائے گا''، ادارہ تحقیقاتِ لاہور، ۱۹۹۴ء

احمد، میجر آفتاب، ''مشرقی پاکستان کے میدانِ جنگ سے''، جمہوری پبلشرز، لاہور، ۲۰۱۲ء

احمدی، سید نثار احمد، ''سیلِ فنا''، ''ادیب''، حیدرآباد دکن، طوفان نمبر، ۱۹۰۸ء

احمد، اکبر، "Journey into Islam"، پنگوئن، انڈیا، ۲۰۰۷ء

احمد، برہان الدین، "The Generals of Pakistan and Bangladesh", Vikas Publishing House Pvt. Ltd, Delhi, 1993,

احمد، پروفیسر نعیم، ''میر کی شہر آشوبیہ شاعری: ایک مطالعہ''، مشمولہ: ''میر تقی میر''، مرتبین: ڈاکٹر تحسین فراقی و ڈاکٹر عزیز ابن الحسنی، مقتدرہ قومی زبان پاکستان، اسلام آباد، ۲۰۱۰ء

احمد، پروفیسر عزیز الدین، ''کیا ہم اکھٹے رہ سکتے ہیں''، مکتبہ فکر و دانش، لاہور، ۱۹۸۸ء

احمد، خالد جاوید، ''اردو شاعری پر سقوط ڈھاکا کے اثرات''، غیر مطبوعہ مقالہ برائے ایم۔فل، علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی، اسلام آباد، ۱۹۹۴ء

احمد، ڈاکٹر اسرار، ''استحکامِ پاکستان: مسئلہ سندھ''، مطبع ندارد، س ن

احمد، ڈاکٹر جنید، ''بنگلا دیش کی تخلیق: فسانے اور حقائق''، مترجم محمود عالم صدیقی، اے۔جے۔اے۔پبلشرز، ۲۰۱۸ء

احمد، ڈاکٹر نعیم، ''شہر آشوب کا تحقیقی مطالعہ''، ادبی اکادمی، علی گڑھ، ۱۹۷۹ء

احمد، ڈاکٹر نعیم، ''شہر آشوب''، مکتبہ جامعہ، دہلی، ۱۹۶۸ء
احمد، رضوان، مرتب، ''روح چکبست''، رام نرائن لال اون کمار پبلشرز، الہ آباد، ۱۹۸۸ء
احمد، ریاض، ماہ نامہ ''سیارہ''، لاہور، اگست ۱۹۶۷ء
________، ''دہانِ زخم''، مرتبہ اسلام رانا، ضیائے ادب، لاہور، ۱۹۸۳ء
احمد، سفیر، ''کشمیر: آزادی کی جدوجہد''، انسٹی ٹیوٹ آف پالیسیز اسٹڈیز، اسلام آباد، سن ندارد
احمد، سلیم، ''شاعری اور ارادہ''، مشمولہ: ''مضامین سلیم احمد''، مرتبہ جمال پانی پتی، اکادمی بازیافت، کراچی، ۲۰۰۹ء
احمد، سید سعید، ''شہر ادب کان پور''، سید اینڈ سید پبلشرز، کراچی، ۲۰۰۱ء
احمد، سید محمد تقی، ''تاریخ اودھ''، مشمولہ: سہ ماہی ''ہندوستانی''، الہ آباد، جنوری ۱۹۴۲ء
احمد، سید نور احمد، ''مارشل لا سے مارشل لا تک، اپریل ۱۹۱۹ء تا اکتوبر ۱۹۵۸ء''، دین محمدی پریس، لاہور، ۱۹۶۵ء
احمد، شہزاد، مشمولہ: ''فنون''، لاہور، اگست ستمبر ۱۹۷۲ء
________، ''خالی آسمان''، مطبوعات، لاہور، سن ندارد
احمد، عتیق، ''اردو ادب میں احتجاج''، مکتبہ عالیہ، لاہور، ۱۹۸۷ء
احمد، عزیز، "Islamic Modernism in India and Pakistan 1857 to 1964"
احمد، فروغ، پروفیسر، مشمولہ: ہفت روزہ ''آئین''، لاہور، ۷ ستمبر ۱۹۷۳ء
احمد، مشتاق، "Politics without Social Changes", Space Publishers, Karachi, 1971
احمد، منظور، ''ڈھاکا پس منظر و پیش منظر''، روزنامہ ''جنگ''، کراچی، ۱۶ دسمبر ۱۹۸۵ء
احمد، مولوی نذیر، ''توبۃ النصوح''، مشمولہ: ''مجموعہ ڈپٹی نذیر احمد''، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۴ء
احمد، نبی، ''صحت مند معیشت کے لیے تجاویز''، مترجم سید محمد علی، مشمولہ: ''ارتقا''، کراچی، دسمبر ۱۹۹۳ء
احمد، نذیر، پروفیسر، ''امیر خسرو کے ادبی و شعری کمالات''، مشمولہ: ''شرح کلام امیر خسرو المعروف جہانِ خسرو''، مترجم فاروق ارگلی، مشتاق بک ڈپو، لاہور، ۲۰۰۷ء
احمد، نور، ''مارشل لا سے مارشل لا تک''، دین محمدی پریس، لاہور، ۱۹۶۵ء
احمر، فروغ، ''مشرقی پاکستان تاریخ اور جائزے''، ''تعمیرِ انسانیت''، لاہور، اکتوبر ۱۹۵۵ء
اخبار انڈین مرر (Indian Mirror)، ۲۰ دسمبر ۱۸۸۷ء
اختر الایمان، ''کلیات اختر الایمان''، مرتبہ، سلطانہ ایمان اور بیدار بخت، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی، ۲۰۰۰ء
اختر، پنڈت چندر کا پرشاد جگیاسو، بہ حوالہ: ''ضبط شدہ نظمیں''، مجلس جشن علی جواد زیدی، نئی دہلی، ۱۹۷۵ء
اختر، جاں نثار، بہ حوالہ: ''جاں نثار اختر: حیات و فن''، از ڈاکٹر کشور سلطانہ، مکتبہ ادب، بھوپال، ۲۰۰۸ء
________، ''کلیات جاں نثار اختر''، الحمد پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۳ء
اختر، خواجہ عباد اللہ، ''خلافت اسلامیہ''، جلد اوّل، ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور، ۱۹۵۱ء
اختر، ڈاکٹر ملک حسن، ''اردو شاعری میں ایہام گوئی کی تحریک''، فروغِ ادب اکادمی، گوجرانوالہ، ۱۹۹۲ء
اختر، صہبا، روزنامہ ''مشرق'' (کراچی)، ۳۱ اگست ۱۹۶۹ء
________، روزنامہ ''مشرق'' (کراچی)، ۲۹ ستمبر ۱۹۶۹ء

اختر، صہبا، روزنامہ ''حریت''، کراچی، ۹ جون ۱۹۶۷ء

______، روزنامہ ''نوائے وقت''، لاہور، ۷ جون ۱۹۶۷ء

______، مشمولہ: روزنامہ ''مشرق''، کراچی، ۱۵ اگست ۱۹۷۲ء

______، مشمولہ: روزنامہ ''مشرق''، کراچی، ۲۵ دسمبر ۱۹۷۱ء

______، مشمولہ: روزنامہ ''مشرق''، کراچی، ۸ جنوری ۱۹۷۲ء

______، مشمولہ: ''فنون''، لاہور، جنوری فروری ۱۹۷۲ء

اختر، ہدایت اللہ، ''حدیث لالہ وگل''، ویری ناگ پبلشرز، میر پور آزاد کشمیر، ۱۹۶۹ء

ادارہ، ''اسرائیل کا حملہ''، ماہ نامہ ''البلاغ''، کراچی، جون ۱۹۶۷ء

ادریس، حافظ محمد، ''تاریخ فلسطین''، از ڈاکٹر محسن محمد صالح، ادارۂ معارف اسلامی، لاہور، ۲۰۰۸ء

ادیب، ہمایوں، ''پاکستان کی خارجہ پالیسی''، عزیز پبلشرز، لاہور، ۱۹۷۵ء

ادیب، یونس، ''اظہاریہ''، ''میں ہواؤں کا رُخ بدل دوں گا''، اردو مورچہ، کراچی، ۱۹۹۱ء

ارشد، غلام حسین، ''اسلام''، ماہ نامہ ''تمدن''، دہلی، اگست ۱۹۱۲ء

______، ''نالۂ جگر سوز''، ماہ نامہ ''تمدن''، دہلی، اپریل ۱۹۱۲ء

ارمان، فخر الدین، ''رودِ موسیٰ''، سب رس، دکن، جنوری ۱۹۳۹ء

اسحاق، میجر محمد، ''روداد قفس''، مشمولہ: ''زنداں نامہ''، ''نسخہ ہائے وفا''، مکتبہ کارواں، لاہور، سن ندارد

اسیر، منشی مظفر علی خاں، ''دیوان اسیر''، جلد سوم، کان پور، مطبع نول کشور، ۱۹۷۰ء

اشراوی، حنا، ''فلسطینی عوام کے نام شیرون کا پیغام''، مترجم، آصف فرخی، کتابی سلسلہ ''دنیا زاد''، کراچی، شمارہ ۴

اشرف، آغا، ''آشوب پاکستان''، بساط ادب، لاہور، ۱۹۹۱ء

اشرف، پروفیسر محمد سلیمان، ''البلاغ''، ادارہ پاکستان شناسی، لاہور، ۲۰۱۰ء

اشرف، زاہد، ''کیا مشرقی پاکستان کے عوام علاحدگی چاہتے تھے؟''، ''المنبر''، لائل پوری، مشرقی پاکستان نمبر، دسمبر جنوری ۱۹۷۲ء

اشہری، سید امجد علی، ''ادبی دنیا''، لاہور، کشمیر نمبر، مارچ۔اپریل ۱۹۶۶ء

اصغر، آفتاب، ڈاکٹر، ''مقدمۂ مترجم''، مشمولہ: ''تاریخ مبارک شاہی''، از یحییٰ بن احمد سرہندی، مترجم، ڈاکٹر آفتاب اصغر، مرکزی اردو بورڈ، لاہور

اطہر، ڈاکٹر غلام حسین، ''سید علی عباس زیدی''، مشمولہ: ماہ نامہ ''اردو ادب''، اسلام آباد، مئی جون ۱۹۹۵ء

اظفر، محی الدین، ''امیر خسرو اور علی گڑھ''، نسرین پبلشنگ ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۸۱ء

اعجاز، اے۔ڈی۔ ''کان بلبیندی''، پنجابی ادبی بورڈ پاکستان، لاہور، ۱۹۸۳ء

اعجاز، خاور، ''پاکستانی غزل''، الوقار پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۱ء

اعظمی، افتخار، ''اردو کی سیاسی شاعری میں روش کا مقام''، ''افسونِ تکلم''، از روش صدیقی، مکتبہ جامعہ، نئی دہلی، ۲۰۱۳ء

اعظمی، انجم، ''شاعری کی زبان''، الباقریہ پبلی کیشنز، کراچی، ۱۹۸۹ء

اعظمی، ڈاکٹر منظر، ''اردو ادب کے ارتقا میں ادبی تحریکوں اور رجحانوں کا قصہ''، اُتر پردیش اردو اکیڈمی، لکھنؤ، ۲۰۰۹ء

اعظمی، شہاب ظفر، ''راجا رام نرائن موزوں کی اردو شاعری''، مشمولہ: ''فکر و تحقیق''، اپریل۔مئی ۲۰۱۲ء

اعظمی، فضا، بہ حوالہ: Lib.bazmeurdu.net/

اعظمی، فہیم، ''ادب اور بحران''، ماہ نامہ صریر، کراچی، جنوری، ۱۹۹۵ء

اعظمی، کیفی، ''برما کا چاول''، 'جھنکار'، قومی دارالاشاعت، بمبئی، سن ندارد

______، ''خانہ جنگی''، ''کیفیات: کلیات کیفی اعظمی''، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۰۲ء

______، ''فرد''، ''آج کل''، دہلی، جنوری ۱۹۷۲ء

______، ''کیفیات''، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۱۲ء

______، ''کیفیات''، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۰۳ء

اعوان، انور بیگ، ''بہاری مسلمان: تاریخ کے آئینے میں''، شوکت پرنٹنگ پریس، لاہور، ۱۹۷۳ء

افتخار، خواجہ، ''جب امرتسر جل رہا تھا''، خواجہ پبلشرز، لاہور، ۱۹۸۱ء

افراہیم، ڈاکٹر صغیر، ''پہلی جنگ آزادی کا پہلا سپہ سالار''، ''دریافت''، اسلام آباد، جنوری ۲۰۰۹ء

افضل، میاں محمد، ''سقوط بغداد سے سقوط ڈھاکا تک''، الفیصل پبلشرز، لاہور، ۲۰۰۲ء

اقبال، احسن، ''سانحہ سقوط مشرقی پاکستان: اسباب اور ہم نے کیا سیکھا''، روزنامہ ''جنگ''، لاہور، ۱۶ دسمبر ۱۹۹۴ء

اقبال، علامہ محمد، بہ حوالہ خواجہ منظور حسین، ''تحریک جدوجہد آزادی بہ طور موضوع سخن''، نیشنل بک فاؤنڈیشن، لاہور، ۱۹۷۸ء

______، ''ضرب کلیم''، ''کلیات اقبال''، مکتبہ جمال، لاہور، ۲۰۰۴ء

______، ''اقبال نامہ: مجموعہ مکاتیب اقبال''، مرتبہ شیخ عطاءاللہ، اقبال اکادمی پاکستان، ۲۰۰۵ء

______، ''کلیات اقبال''، اردو، مکتبہ جمال لاہور ۲۰۰۴

______، بہ حوالہ سہ ماہی صحیفہ، لاہور، ''ٹیپو سلطان''، از محمود بنگلوری، گوشہ ادب، لاہور، ۱۹۲۷ء

______، ''اقبال نامہ''، مجموعہ مکاتیب، مرتبہ شیخ عطاءاللہ، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور

______، ''جاوید نامہ''، ص ۹۷، ''کلیات اقبال، فارسی''، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، سن ندارد

______، ''دیباچہ''، مشمولہ: ''پیام مشرق''، الحمرا پبلشنگ، اسلام آباد

______، ''کلیات اقبال'' (فارسی)، نقوش پریس، لاہور، ۱۹۹۴ء

______، ''کلیات باقیات شعر اقبال''، مرتبہ ڈاکٹر صابر کلوروی، لاہور، ۲۰۰۴ء

______، ''گفتار اقبال''، مرتبہ محمد رفیق افضل، ادارہ تحقیقات پاکستان، لاہور، ۱۹۸۶ء

______، ''مکتوب اقبال بنام عطیہ فیضی''، مورخہ ۲۹ مئی ۱۹۳۳ء

______، ''اقبال نامہ: مجموعۂ مکاتیب''، جلد دوم، مرتبہ شیخ عطاءاللہ، طبع اوّل، لاہور، دین محمدی پریس، ۱۹۵۱ء

______، ''شیر میسور سلطان ٹیپو سلطان شہید'' از فیض عالم صدیقی، بک کارنر پبلشر، جہلم، سن ندارد

اکبر آبادی، رعنا، ''غزل رعنا''، عدنان اکیڈمی، کراچی، ۱۹۶۸ء

اکبر آبادی، سیماب، بھوکا ہندوستان، 'شعر انقلاب'، مکتبہ قصر الادب، آگرہ، ۱۹۴۷ء

______، ''ساز و آہنگ''، رفاہ عام برقی پریس، آگرہ، ۱۹۴۱ء

______، ''شعر انقلاب''، مکتبہ قصر الادب، آگرہ، ۱۹۴۷ء

______، ''عالم آشوب''، مکتبہ قصر الادب، آگرہ، ۱۹۴۳ء

______، ''کشمیر کی جدوجہد آزادی اور اردو ادب''، از محمد صغیر خان، غیر مطبوعہ مقالہ برائے ایم۔اے۔ کراچی یونی ورسٹی، ۱۹۹۷ء

________، ''لوحِ محفوظ''، طبع اوّل، احمد برادرز پرنٹرز، کراچی، ۱۹۸۳ء
اکبرآبادی، سیماب، ''لوحِ محفوظ''، سیماب اکیڈمی، کراچی، ۱۹۸۳ء
________، http:// daleel. pk/ 2017/ 11/ 18/ 66473
________، بہ حوالہ ''ٹیپو سلطان شہید: شعرا کا خراجِ عقیدت'' از سید محمود خاور، dunya. com. pk/ index. php/ special- feature 2013- 05- 043714...
اکبرآبادی، صبا، ''ثبات''، بختیار اکیڈمی، کراچی، ۱۹۸۷ء
اکبرآبادی، ظفر، ''کشمیر ہمارا ہے کشمیر ہمارا ہے''، مرتبہ، ناصر زیدی، نقوش، لاہور، ۱۹۹۱ء
اکبرآبادی، میکش، ''حسین سا گر ایک غم گین صبح''، سب رس، حیدرآباد دکن، جون ۱۹۶۴
________، ''خدا بندے سے تانا شاہ کی آخری گفتگو''، ''سب رس''، میکش نمبر، مارچ ۱۹۴۸
________، سید محمد علی شاہ، ''گولکنڈہ کے سرفروش''، مشمولہ ''سب رس''، (میکش نمبر)، مارچ ۱۹۴۸
اکبرآبادی، نظیر، ''کلیات نظیر اکبرآبادی''، مرتبہ: عبدالباری آسی، لکھنؤ، ۱۹۵۱ء
اکبر، احسان، ''عراق آشوب''، ''تخلیقی ادب''، اسلام آباد، مارچ ۲۰۰۴ء
اکرام، شیخ محمد، ''آبِ کوثر''، فیروز سنز، لاہور، ۱۹۶۵ء
________، ''رودِ کوثر''، ادارۂ ثقافت اسلامیہ، لاہور، ۱۹۸۲ء
اکرام، صبا، ماہ نامہ ''آئندہ''، کراچی، اپریل ۲۰۰۲ء
________، ''اوراق''، لاہور، جنوری۔ فروری ۱۹۷۹ء
________، ''سورج کی صلیب''، دبستانِ جدید، کراچی، ۱۹۸۱ء
________، ''کراچی کے لیے ایک نظم''، ماہ نامہ ''طلوعِ افکار''، کراچی، جولائی ۱۹۹۵ء
اکمل، فصیح، ''امیر خسرو: میوزیکل اوپیرا''، ایم۔ آر۔ پبلی کیشنز، نئی دہلی، ۲۰۱۰ء
الانا، ڈاکٹر غلام علی، ''پاکستان کی تحریک میں سندھ کا حصہ''، مکتبہ اسا قبہ، کراچی، ۱۹۸۳ء
البلاذری، احمد بن یحییٰ، ''فتوح البلدان''، مصر، مکتبہ التجاریہ، ۱۹۵۹ء
القاسمی، عبدالحق حقانی، ''فلسطین کے چار ممتاز شاعر''، تخلیق کار پبلشرز، نئی دہلی، ۱۹۹۵ء
المسدوسی، احمد عبداللہ، ''قضیہ فلسطین اور اسرائیل کی جنگ''، ماہ نامہ ''البلاغ''، کراچی، جنوری ۱۹۶۸ء
المنجد، عربی۔ اردو لغت، اضافہ شدہ جدید ایڈیشن، کراچی، دارالاشاعت، ۱۹۷۵ء
الہ آبادی، اکبر، ''کلیات اکبر الہ آبادی''، اسرار کریمی پریس، الہ آباد، ۱۹۳۲ء
________، ''اکبر کی شاعری پر ایک نظر''، از ڈاکٹر ممتاز حسن، ''افکار''، کراچی، اکبر الہ آبادی نمبر، نومبر دسمبر ۱۹۶۹ء
________، ''کلیات اکبر الہٰ آبادی''، اسرار کریمی پریس، الہٰ آباد، ۱۹۳۶ء
________، ''کلیات اکبر''، مرتبہ: نارنگ ساقی، میڈیا انٹرنیشنل، دہلی، ۱۹۸۸ء
الہ آبادی، حیرت، ''کشکول وفا''، بزمِ عبرت پبلشرز، کراچی، ۱۹۸۹ء
الہ آبادی، طالب، ''اکبر الہ آبادی''، مطبع انوار احمدی، الہ آباد، س ن
الہ آبادی، وحید، ماہ نامہ ''ماہِ نو''، کراچی، جولائی ۱۹۵۷ء

الیاس،احمد،''افکار'' کراچی،مارچ ۱۹۸۷ء

________،''افکار''،کراچی،اکتوبر ۱۹۸۵ء

________،''افکار''،کراچی،جون ۱۹۸۹ء

________،''آئینہ ریزے''،شاہ کار پبلی کیشنز،ڈھاکا،۱۹۸۹ء

الیاس،احمد،''بات سے بات''،''بکھراؤ کا حرف آخر''

الٰہی،محبوب،دیکھیے shayari/ rekhta.org:http

ام ہانی،''نالۂ نیم شبی''،مکتبہ اسلام لکھنؤ،۱۹۸۶ء

امجد حیدرآبادی،سید احمد حسین،''رباعیات امجد''،احمد برادرز،کراچی،۱۹۶۸ء

________،''رباعیات امجد''،دارالاشاعت،کراچی،۱۹۶۰ء

________،''ریاض امجد''،عماد پریس،حیدرآباد دکن،۱۳۴۵ھ

________،''نالۂ ہائے دردمند''،''ادیب''،حیدرآباد دکن،طوفان نمبر،۱۹۰۸ء

________،''افسانۂ غم''،''زمانہ''،کان پور،فروری ۱۹۰۹ء

________،''جمال امجد''،اعظم اسٹیم پریس،دکن،۱۹۴۸ء

________،''ریاض امجد''،بار دوم،عماد پریس،حیدرآباد دکن،۱۳۴۲ھ

________،''اردو شاعری کا انتخاب''،مرتبہ ڈاکٹر محی الدین قادری زور،ساہتیہ اکیڈمی،نئی دلّی،۱۹۹۳ء

امجد،امجد اسلام،اب تم میرے نہیں رہے،افکار،کراچی،جنوری ۱۹۹۰ء

________،روزنامہ''مساوات''،لاہور،۲۷دسمبر ۱۹۷۱ء

________،''برزخ''،ماورا پبلشرز،لاہور،۱۹۸۶ء

امجد،ڈاکٹر ساجد،''اردو شاعری پر برصغیر کے تہذیبی اثرات''،الوقار پبلی کیشنز لاہور،طبع دوم

امجد،مجید،ہفت روزہ''زندگی''،لاہور،۷تا۱۳فروری ۱۹۷۲ء

________،بہ حوالہ:''مجید امجد اور پاک و ہند محاربے:ایک مطالعہ''،از محمد افتخار شفیع''زبان و ادب''،فیصل آباد،شمارہ ۱۴،جنوری تا جون ۱۹۱۴ء

________،''کلیات امجد مجید''،مرتبہ:ڈاکٹر خواجہ ذکریا،ماورا پبلشرز،لاہور،۱۹۹۱ء

________،''کلیات مجید امجد''،مرتبہ خواجہ محمد زکریا،ماورا پبلشرز،لاہور،۱۹۸۹ء

________،''کلیات مجید امجد''،مرتبہ خواجہ محمد ذکریا،ماورا پبلشرز،لاہور،۱۹۹۱ء

امرتسری،ظہور الدین خان،''ناشر کے قلم سے''،''البلاغ''،از پروفیسر سید محمد سلیمان اشرف،ادارہ پاکستان شناسی،لاہور،۲۰۱۰ء

امروہوی،افق کاظمی،''تریاق مشرق''،افق پبلشرز،امروہہ،۱۹۳۳ء

امروہوی،انیس،سہ ماہی،''قصے''،عراق نمبر،جنوری ۲۰۰۵ء

امروہوی،رضیہ نور،''عصمت''،کراچی،دسمبر ۱۹۶۹ء

امروہوی،رئیس،ہفت روزہ،اخبارِ جہاں،کراچی،۵فروری ۱۹۶۷ء

________،بہ حوالہ:''اردو غزل کے عصری رویے''،از نثار احمد،غیر مطبوعہ مقالہ برائے پی ایچ۔ڈی۔کراچی یونی ورسٹی ۷۷،۲۰۰۵ء

________،روزنامہ''جنگ''،کراچی،یکم اکتوبر ۱۹۷۳ء

________،روزنامہ ''جنگ''، کراچی،۱۱دسمبر ۱۹۷۱ء

________،روزنامہ ''جنگ''، کراچی،۲۱ جنوری ۱۹۷۲ء

________،روزنامہ ''جنگ''، کراچی،۲۲ جنوری ۱۹۷۲

________،روزنامہ ''جنگ''، کراچی،۳ مارچ ۱۹۷۲ء

امروہوی، رئیس، روزنامہ ''جنگ''، کراچی،۴ دسمبر ۱۹۷۱ء

________،روزنامہ ''جنگ''، کراچی،۵نومبر ۱۹۷۱ء

________،روزنامہ ''جنگ''، کراچی،۱۵دسمبر ۱۹۷۱ء

________،روزنامہ ''جنگ''، کراچی،۲۵اپریل ۱۹۷۳ء

________،روزنامہ ''جنگ''، کراچی،۶فروری ۱۹۷۲ء

________،روزنامہ ''جنگ''، کراچی،۷مارچ ۱۹۷۲ء

________،روزنامہ ''جنگ''، کراچی،۷نومبر ۱۹۷۱ء

________،روزنامہ ''جنگ''، کراچی،۲۸نومبر ۱۹۷۱ء

________ہفت روزہ، شیراز، کراچی، اپریل ۱۹۹۵ء

________،''المیۂ مشرقی پاکستان''، رئیس اکاڈیمی، کراچی،۱۹۷۴ء

________،''اوراق''، لاہور، ستمبر اکتوبر ۱۹۷۳ء، ص ۱۵

________،''قطعات''، جلد اوّل، رئیس اکاڈیمی، ۱۹۸۷ء

________،''قطعات''، جلد چہارم، رئیس اکاڈیمی، کراچی، ۱۹۸۷ء

________،''قطعات''، جلد دوم، رئیس اکاڈیمی، کراچی، ۱۹۸۷ء

________،''قطعات رئیس امروہوی''، اخبار جہاں پبلی کیشنز، کراچی،۱۹۹۴ء

________،''کراچی ۱۲۴سال قبل''، کراچی نامہ (کالم)، ہفت روزہ اخبارِ جہاں، کراچی،۱۲فروری ۱۹۴۷ء

________،''مقدمہ''، ''قطعات''، جلد اوّل، رئیس اکاڈیمی، ۱۹۸۷ء

________، کلیات رئیس امروہوی، ویلکم بک پورٹ، کراچی،۱۹۹۳ء

________،روزنامہ ''جنگ''، کراچی،۳۰/ اگست ۱۹۶۵ء

امروہوی، ساقی، ''شام ہوتی جارہی ہے''، ایس آر پبلی کیشنز، کراچی،۲۰۰۲ء

امروہوی، نسیم، ''مقدمہ''، ''جنگ عظیم''، از پنڈت سندر نرائن مشران فرخ آبادی، حاجی محمد اسمٰعیل ادبی پریس، لکھنؤ،۱۹۴۳ء

امین الحسینی، الحاج محمد، ''اسلام کو مغربی تہذیب کے مطابق بنانے کی کوشش''، ماہ نامہ ''البلاغ''، کراچی، جون ۱۹۶۷ء

امین، خالد، ''تحریک اتحاد اسلامی...''، غیر مطبوعہ مقالہ، کراچی یونی ورسٹی،۲۰۱۴ء

انبالوی، وقار، بہ حوالہ: ''جب امرتسر جل رہا تھا''، از خواجہ افتخار، خواجہ پبلشرز، لاہور، ۱۹۸۱ء

________،روزنامہ ''نوائے وقت''، لاہور،۱۰اگست ۱۹۷۳ء

________،روزنامہ ''نوائے وقت''، لاہور،۲۳مارچ ۱۹۷۲ء

________،روزنامہ ''نوائے وقت''، لاہور،۲۵دسمبر ۱۹۷۳ء

________ ،روزنامہ ''نوائے وقت''، لاہور، ۶ فروری ۱۹۷۲ء

________ ،روزنامہ ''نوائے وقت''، لاہور، ۱۸ جنوری ۱۹۷۲ء

________ ،روزنامہ ''نوائے وقت''، لاہور، ۹ جنوری ۱۹۷۲ء

انجم، تنویر، ''طوفانی بارشوں میں رقصاں ستارے''، وعدہ کتاب گھر، کراچی، ۱۹۹۷ء

انجم، خلیق، ''مولانا آزاد: شخصیت اور کارنامے''، طیب پبلشرز، لاہور، ۲۰۰۵ء

انجم، ڈاکٹر سید خواجہ علی، ''شمیم کرہانی: حیات، شخصیت اور شاعری''، ریکھا آرٹس پبلشرز، مہاراشٹر، ۱۹۸۶ء

انجم، مرتضیٰ، ''جنگی معرکے''، خزینہ علم و ادب، لاہور، ۲۰۰۴ء

________ ، ''حرف اوّل''، ''حمود الرحمٰن کمیشن رپورٹ''، جلد اوّل، ۲۰۰۲ء

انجم، نذیر، ''پلک پلک زنجیر''، کاشر پبلشرز، میر پور، ۱۹۹۲ء

________ ، ''خراجِ عقیدت''، ، مرتبہ، محمد سعید احمد، نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف کشمیر اسٹڈیز، میر پور، ۲۰۰۶ء

________ ، ''قرضِ سخن''، ارشد بک سیلرز، میر پور، ۱۹۹۸ء

انشا، ابن، ''اس بستی کے اک کوچے میں''، لاہور اکیڈمی، لاہور، ۱۹۹۲ء

________ ، ''نقوش''، لاہور، سال نامہ، ۱۹۶۶ء

انصاری، اسلوب احمد، ''اقبال کی تیرہ نظمیں''، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۷۷ء

انصاری، پروفیسر سحر، ''حرفِ حق''، ''روشنیوں کا شہر'' از راغب مراد آبادی، راغب مراد آبادی اکیڈمی، کراچی، ۱۹۹۵ء

________ ، ''تحریک آزادی میں اہل قلم کا حصہ''، ''تنقیدی افق''، پاکستان اسٹڈی سینٹر جامعہ کراچی، کراچی، ۲۰۱۴ء

________ ، ''جنگ اور ادب''، ''تنقیدی افق''، پاکستان اسٹڈی سینٹر، کراچی، ۲۰۱۴ء

________ ، ''تحریک آزادی میں اہل قلم کا حصہ''، ''تنقیدی افق''، پاکستان اسٹڈی سنٹر، جامعہ کراچی، ۲۰۱۴ء

________ ، ''تنقیدی افق''، پاکستان اسٹڈی سینٹر، جامعہ کراچی، کراچی، ۲۰۱۴ء

________ ، ''حسرت ایک اشتراکی مسلم''، ''جہات حسرت''، مرتبہ، ڈاکٹر سید جعفر احمد، پاکستان اسٹڈی سنٹر جامعہ کراچی، کراچی، ۲۰۰۸ء

________ ، ''فیض اور فلسطین''، www.urduweb,org:https

________ ، ''فیض کے آس پاس''، پاکستان اسٹڈیز سنٹر، جامعہ کراچی، ۲۰۱۱ء

________ ، ''ہمارے مشاعرے''، جلد دوم، مرتبہ اظہر عباس ہاشمی، ساکنان شہر قائد پبلشرز، کراچی، ۲۰۰۷

انصاری، ظ، ''دیباچہ''، مشمولہ: ''خسرو کا ذہنی سفر''، انجمن ترقی اردو ہند، دہلی، ۱۹۸۸ء

انصاری، محسن، ''اے ارض فلسطین''، مرتبہ، انتظار نعیم، ادارہ ادب اسلامی ہند، دہلی، ۲۰۰۶ء

انصاری، مراد اللہ شاہ، ''تفسیر مرادیہ''، طبع اوّل، بنگال، مطبع ستاریہ، ۱۸۶۶ء

انصاری، مفتی محمد رضا فرنگی محلی، ''مولانا محمد علی اور مولانا فرنگی محلی''، جامعہ دہلی، مولانا محمد علی نمبر، جنوری فروری ۱۹۸۰ء

انصاری، نور الحسن، ڈاکٹر، ''مقدمہ''، ''امیر خسرو: احوال و آثار''، مرتبہ: ڈاکٹر نور الحسن انصاری، مطبع کوہ نور پریس، دہلی، ۱۹۷۵ء

انصاری، وکیل، ماہ نامہ ''دنیائے ادب''، کراچی، جنوری ۱۹۹۵ء

انور، سید سلطان، ''مہاجر اور حالات کے تقاضے''، روشن خیال، کراچی، جلد ۱، شمارہ ۱

انور، خورشید، روزنامہ ''نوائے وقت''، لاہور، ۸ جون ۱۹۶۷ء

انور، صبیحہ، ڈاکٹر، ''مقدمہ''، ''نالۂ نیم شبی''، از امام ہانی، مکتبۂ اسلام لکھنؤ، ۱۹۸۶ء
انیس، میر ببر علی، ''مراثی انیس''، جلد اوّل، طبع دوم، مرتبہ علی حیدر طباطبائی نظم لکھنوی، نظامی پریس، بدایوں، ۱۹۳۵ء
_______، https://www.rekhta.org/shayari/baitulmaqdus
او کے، میم کمال، ''تحریک خلافت (۱۹۱۹ء۔۱۹۲۴ء)''، قائد اعظم اکادمی، ۱۹۹۱ء
ایلیا، جون، ''استفسار''، روز نامہ ''جنگ''، کراچی، ۲۸ دسمبر ۱۹۷۱ء
ایلیا، جون، ''رجز''، روز نامہ ''جنگ''، کراچی، ۲۸ نومبر ۱۹۷۱ء
ایوب، اسرار، ''برف سے حرف''، کشمیر سوسائٹی آف سائینٹفک اینڈ سوشل ریسرچ، ۱۹۹۵ء
اے۔ایچ۔سہروردی، "Kashmir the Incredible Freedom Fighter", Jang Publishers, 1991
آبرو، شاہ مبارک، ''دیوان آبرو''، مرتبہ ڈاکٹر محمد حسن، علی گڑھ، ادارۂ تصنیف، سن ندارد
آذر، ذکی، ''حاصلِ سفر''، ایجوکیشنل پریس، کراچی، ۱۹۹۴ء
آراء، ڈاکٹر قمر، ماہ نامہ ''دنیائے ادب''، کراچی، ستمبر، ۱۹۹۶ء
آرنلڈ، پروفیسر، ٹی۔ڈبلیو، ''دعوت اسلام''، مترجم، عنایت اللہ دہلوی، آگرہ، مطبع مفید عام، ۱۸۹۷ء
آروی، ضحیٰ، ''ذوق ضحیٰ''، ظہیر پبلی کیشنز، کراچی، ۱۹۸۷ء
آزاد، ابوالکلام، مولانا، ''غبار خاطر''، طبع اوّل، لاہور، مکتبۂ القریش، ۱۹۷۲ء
آزاد، جگن ناتھ، ''تمہید''، ''کاروانِ وطن''، از تلوک چند محروم، مکتبہ جامعہ، دہلی، ۱۹۶۰ء
آزاد، مولانا ابوالکلام، ''آزادیٔ ہند''، مترجم: رئیس احمد جعفری، مقبول اکیڈمی، لاہور، ۱۹۶۵ء
_______، ''خطبۂ صدارت مجلس خلافت آگرہ''، ''خطبات خلافت''، مرتبہ ڈاکٹر محمود الٰہی، اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ، ۲۰۰۵ء
_______، ''۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی نئی تاریخ''، ''انقلاب ۱۸۵۷ء: جدید انکشافات''، ترتیب و تدوین، پی۔سی۔جوشی، محمد علی فاروق، مکتبہ اخور، لاہور، ۱۹۹۵ء
آزاد، مولانا محمد حسین، ''سخندانِ فارس''، حصہ دوم، طبع اوّل، لاہور، مطبع مفید عام، ۱۹۷۲ء
_______، ''آب حیات''، شیخ مبارک علی، لاہور، ۱۹۵۴ء
_______، ''آب حیات''، مرتبہ: ابرار عبدالسلام، بہاؤالدین ذکریا یونی ورسٹی، ملتان، ۲۰۰۶ء
_______، ''اردو شاعری پر سیاسی اثرات''، از ڈاکٹر محمد ذاکر اللہ، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۱۱ء
_______، ''حبِ وطن''، ''آزادی کی نظمیں''، مرتبہ سبط حسن، حلقہ ادب مال روڈ، لاہور، سن ندارد
آزردہ، سردار اورنگزیب، روز نامہ ''نوائے وقت''، لاہور، ۷ جون ۱۹۶۷ء
آزردہ، صدرالدین، ''مسدس''، ''شہر آشوب''، مرتبہ: ڈاکٹر نعیم احمد، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، ۱۹۶۸ء
_______، ''۱۸۵۷ء (تاریخی، علمی اور ادبی پہلو)، مرتبہ محمد اکرم چغتائی، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۷ء
آشوب، ''ہسٹری آف پرشیا''، جلد دوم، ''تاریخ شاہ عالم''، از ڈبلیو۔فرینکلن، مترجم نثار الحق صدیقی، آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس، کراچی، ۱۹۷۶ء
آشیانہ، مشمولہ: افکار، کراچی، اکتوبر ۱۹۹۵ء
آغا، وزیر، ''اوراق''، لاہور، مارچ اپریل، ۱۹۷۲ء
آفاقی، ڈاکٹر صابر، ''اقبال اور کشمیر''، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، ۱۹۷۷ء

________، ''شہرِ تمنا''، آئینہ ادب، لاہور، ۱۹۸۰ء

آفتاب، نسرین، سہ ماہی ''سیپ''، کراچی، شمارہ ۶۱

آفریدی، عمر، https://www.bbc.com/urdu/pakistan

آفرین، عشرت، ''یہ بستی میری بستی ہے''، فنون، لاہور، جنوری۔مئی، ۱۹۹۷ء

آفرین، گلنار، ''جرسِ گل''، تمثال پبلی کیشنز، کراچی، ۱۹۹۱ء

آ گنتیف، وی۔ایف، ''سندھ: تاریخ کے آئینے میں'' مترجم ڈاکٹر محمود صادق، مکتبہ دانیال کراچی، ۱۹۸۹ء

آہ، صفدر، ''امیر خسرو بہ حیثیت ہندی شاعر''، امیر خسرو اکیڈمی، دہلی، سن ندارد

آہ، منشی ممتاز علی، ''الناظر'' (لکھنؤ)، اکتوبر ۱۹۲۶ء، جلد ۳۱، شمارہ ۴

بابر، ظہیر الدین، ''تزکِ بابری''، مترجم مرزا نصیر الدین حیدر، کراچی، محمڈن پرنٹنگ ورکس، دہلی، ۱۹۲۴

بارہ بنکوی، سرور، ''سنگِ آفتاب''، رحمٰن پبلشرز، کراچی، سن ندارد

باقر، آغا محمد، ''محمد حسین آزاد''، ''نقوش''، لاہور، شخصیات نمبر، شمارہ ۴۷۔۴۸، جنوری ۱۹۵۵ء

بال، چارلس، "The History of Indian Mutiny"، جلد اوّل، کلاسکس بکس اینڈ ایفی میرا، لندن، ۱۸۵۸ء

بان، ڈاکٹر گستان، ''تمدنِ ہند''، مترجم سید علی بلگرامی، مقبول اکیڈمی، لاہور، ۱۹۶۲

بٹ، عبداللہ، ''ٹیپو سلطان''، مرتبہ عبداللہ بٹ، قومی کتب خانہ، لاہور، ۱۹۶۳ء

بٹالوی، عاشق حسین، ''اقبال کے آخری نو سال''، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۰ء

بٹ، نثار عزیز، ''گئے دنوں کے سراغ''، سنگ میل پبلشرز، لاہور، ۲۰۰۴ء

بحری، قاضی محمود، ''کلیات بحری''، مرتبہ محمد حفیظ سید، نول کشور، س ن

________، ''من لگن''، مرتبہ: محمد سخاوت مرزا، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی، ۱۹۵۵

بخاری، ڈاکٹر سہیل، ''لسانی مقالات'' (حصہ سوم)، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۹۱ء

بخاری، فارغ، ماہ نامہ ''نقش''، کراچی، جنگ نمبر، ۱۹۶۶ء

________، ''قیام پاکستان: ردِقبول کا شعری منظر نامہ''، از صائمہ ناز انصاری، ''دریافت''، اسلام آباد، نمبر ۹، جنوری ۲۰۱۰ء

بدایونی، انجم فوقی، ''مہر و ماہ''، ادارۂ فوق الادب، کراچی، ۱۹۸۰ء

بدایونی، عبدالحامد قادری، ''خطبہ صدارت پاکستان کانفرنس''، مطبوعہ نظامی پریس، بدایوں، ۱۳ اگست ۱۹۴۱ء

بدایونی، فانی، بہ حوالہ ڈاکٹر طاہرہ نیّر، ''اردو شاعری میں پاکستانی قومیت کا اظہار''، انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۹۹ء

بدایونی، محترمہ عزیز، روزنامہ ''جنگ''، کراچی، ۱۵ ستمبر ۱۹۶۹ء

بدایونی، محشر، بہ حوالہ: ''جنگ اور ادب''، ''ادب اور کلچر''، از ڈاکٹر سلیم اختر، سنگ میل پبلشرز، لاہور، ۲۰۰۱ء

________، ''شہرِ نوا''، مکتبہ ماحول، کراچی، ۱۹۶۴ء

بدایونی، ملا عبدالقادر، ''منتخب التواریخ'' (فارسی)، مرتبہ: مولوی احمد علی، ایشیاٹک سوسائٹی بنگال، کلکتہ، ۱۸۶۸ء

________، ''منتخب التواریخ''، مترجم محمود احمد فاروقی، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ۱۹۶۲ء

بدایونی، نظامی، ''قاموس مشاہیر''، جلد اوّل، نظامی پریس، بدایوں، ۱۹۲۴ء

بدایوں، شہید حسین، ''تذکرہ شعرائے بدایوں''، جلد اوّل، طبع اوّل، انجمن بدایوں، کراچی، ۱۹۸۷ء

بدر، شاہین، سہ ماہی ''تمثیل''، کراچی، جلد ا، شمارہ ۲، ۳،۲، ۱۹۹۲ء
________، ماہ نامہ ''تخلیق''، لاہور، اپریل ۱۹۹۵ء
________، ماہ نامہ ''شاعر''، بمبئی، اپریل ۱۹۸۴ء
________، ''اوراق''، لاہور، جنوری فروری ۱۹۷۶ء
________، ''اوراق''، لاہور، دسمبر ۱۹۹۱ء
بدر، شاہین، ''اوراق''، لاہور، نومبر دسمبر ۱۹۹۲ء
________، ''تجدید نو''، لاہور، اسلام آباد، نومبر ۱۹۹۰ء
بدر، شکیب، ''حیدرآباد کا عروج و زوال''، عثمانیہ اکیڈمی کراچی، ۱۹۶۴
براہی، وفا، ''افکار''، کراچی، ستمبر ۱۹۷۵ء
برق دہلوی، مہاراجہ، بہادر، ''مطلع انوار''، طبع اوّل، دہلی، محبوب المطابع، ۱۹۲۹ء
________، ''نغمات حسرت''، مرتبہ خلیق انجم، قومی کونسل برائے فروغ اردو، دہلی، ۲۰۰۷ء
برلاس، مرزا علی اظہر، ''واجد علی شاہ اختر''، سہ ماہی ''اردو''، کراچی، شمارہ ۴، ۱۹۶۸ء
برنی، سید حسن، ''مقالات برنی''، انجمن ترقی اردو، کراچی، ۱۹۸۶ء
برنی، ضیاالدین احمد، ''عظمت رفتہ''، تعلیمی مرکز، کراچی، ۱۹۶۱ء
________، ''عظمت رفتہ''، تعلیمی مرکز، کراچی، ۱۹۶۱ء
بریلوی، اکرام، ''رئیس امروہوی کے قطعات''، ''رئیس امروہوی: فن و شخصیت''، مرتبہ صہبا لکھنوی، رئیس امروہوی میموریل ٹرسٹ، کراچی، ۱۹۹۰ء
بریلوی، ڈاکٹر عبادت، ''روایت کی اہمیت''، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی، ۱۹۵۳ء
بریلوی، سلیم ناز، ''جنگ جاری ہے''، اسلامک پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۰ء
بریلوی، سیوا، چند شعرائے بریلوی''، مرتبہ لطیف حسین ادیب، مرکز ادب اردو لکھنؤ، ص ۱۹۷۶ء
بریلوی، شمس، ''مقدمہ''، ''مآثر الکرام''، از میر غلام علی آزاد بلگرامی، مترجم، مولانا شاہ محمد خالد میاں فاخری، دارالمصنفین، کراچی، ۱۹۸۳ء
بسمل، رام پرشاد، ''نغمات حریت''، مرتبہ: خلیق انجم و شمس الرحمٰن فاروقی، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان و ادب، دہلی، ۲۰۰۷ء
بسمل، عبدالحکیم، ''فغان بسمل''، ''الناظر''، لکھنؤ، یکم مارچ ۱۹۱۰ء
بسمل، عبدالغفور، ''وسطی ایشیا کے ترک''، سہ ماہی ''العلم''، کراچی، اکتوبر تا دسمبر ۱۹۵۴ء
بسواق، حکیم افتخار علی جگر صدیقی، ''الناظر'' (لکھنؤ)، ۱۹۳۵ء، جلد ۳۹، شمارہ ۶
بشیر النسا بیگم، ''یاد امجد''، ''سب رس''، کراچی، امجد نمبر، ۱۹۶۲ء
________، ''دکن کے فن کار سے'' (نظم)، سب رس، حیدرآباد دکن، جنوری ۱۹۴۰
بلبل کاشمیری، شیخ غلام علی، ''دست چنار''، از شیخ غلام علی بلبل کاشمیری، کشمیر اکیڈمی، مظفرآباد، ۱۹۹۵ء
بلگرامی، سید علی، ''تاریخ دکن'' (جلد سوم)، مطبع مفید عام، آگرہ، ۱۸۹۷
________، ''تاریخ دکن''، (جلد سوم)، مطبع مفید عام، آگرہ، ۱۸۹۷
________، ''تاریخ دکن''، (جلد سوم)، مفید عام پریس آگرہ، ۱۹۰۳
بلگرامی، شمیم، مشمولہ: سہ ماہی ''ارتقا''، کراچی، اپریل ۱۹۹۰ء

بلگرامی، میر غلام علی آزاد،''خزانۂ عامرہ''، مطبع نول کشور، کان پور، ۱۹۰۰ء
بلوچ، عبدالغفور، ڈاکٹر،''مسئلہ فلسطین پر فیض احمد فیض کی مزاحمتی شاعری اور اس کے اثرات''،''معیار''، اسلام آباد، جنوری۔ جون ۲۰۱۲ء
بلوچ، لیفٹیننٹ کرنل سکندر خان،''جان نثارانِ وطن''، دوست پبلی کیشنز، کراچی، ۲۰۰۸ء
بنارسی، کیف، بہ حوالہ: https://www.nawaiwaqt.com.pk/14-aug.2013
_______،''بیت المقدس کی تلاش''، مکتبۂ کیف، کراچی، ۱۹۸۱ء
بنگلوری، امامی، خشیتِ خوں، انجمنِ ترقی اردو، بنگلور، ۱۹۵۶ء
بنگلوری، محمود خان،''تاریخ جنوبی ہند''، یونائیٹڈ بک ڈپو، لاہور، ۱۹۴۷
_______،''صحیفہ ٹیپو سلطان''، گوشہ ادب، لاہور، ۱۹۴۷ء
بنوری، طارق،''نسلی سیاست وتشدد''، مترجم، خالد حمیدی، ارتقا، مارچ ۱۹۹۱ء
بوس، سرمیلا،''Dead Reckoning ڈھاکا کہانی: کچھ اپنی کچھ غیروں کی زبانی''، مترجم نذر حسین کاظمی، آرمی پبلشنگ ہاؤس، کراچی، ۲۰۱۳ء
بہار، آمنہ،''چناروں کی آگ''، انقلاب پبلی کیشنز، راول پنڈی، ۱۹۸۵ء
_______، غیر مطبوعہ مقالہ،''اردو شاعری میں کشمیر''، قرطبہ یونی ورسٹی آف سائنس اینڈ ٹیکنالوجی، پشاور، ۲۰۱۳ء
بہزادی، کامل،''تلوک چند محروم: ایک مطالعہ''، محروم میموریل لٹریری سوسائٹی، نئی دہلی، ۱۹۹۷ء
بھٹا، پروفیسر ڈاکٹر سعید،''بیرونی حملہ آوروں پر پنجابی واریں''،''تحقیق نامہ''، شمارہ ۲۳، جولائی تا دسمبر ۲۰۱۸ء
بھٹو، ذوالفقار علی،''آزادیِ موہوم''، مترجم کرم حیدری، نیشنل بک فاؤنڈیشن، کراچی، ۱۹۷۳ء
_______،''پاکستان کی سیاسی حالت'' پاکستان پیپلز پارٹی، کراچی، ۱۹۶۸ء
_______،''کشمیر: اقوام متحدہ کے لیے آخری موقع''، محکمۂ مطبوعات وفلم سازی پاکستان، ۱۹۶۵ء
بھٹو، محمد موسیٰ،''سندھ کے حالات کی سچی تصویر''، سندھ نیشنل اکیڈمی، حیدرآباد، ۱۹۷۵ء
بھٹی، محمد رفیق،''ستون دار''، پنجاب پبلشرز، میر پور، ۱۹۹۷ء
_______،''لہونگر''، پنجاب پبلشرز، میر پور، ۱۹۹۷ء
بھنڈاری، سبحان رائے،''خلاصۃ التواریخ''، از سبحان رائے بھنڈاری، مطبع جی اینڈ سنز، دہلی، ۱۹۱۸ء
بھوپالی، محسن،'دو وطن'، ماہِ نو، لاہور، مارچ ۱۹۹۲
_______،''موضوعاتی نظمیں''، ایوانِ ادب، کراچی، ۱۹۹۳ء
_______،''نئی کرن''،''ماہ نو''، کراچی، مارچ ۱۹۷۲ء
بھوئیان، عبدالودو، " Emergence of Bangladash and Awami League", Vikas Publishing House Dehli, 1982
بیگم، سید عبداللہ،''ابوالکلام کی نثر''،''ابوالکلام آزاد''، از عبداللہ بٹ، قومی کتب خانہ، لاہور، ۱۹۸۶ء
بیگم، شہناز،''اردو شاعری میں مغل سلطنت کے زوال کی عکاسی''، انجمن ترقی اردو ہند، دہلی، ۲۰۰۴ء
بیگ، اکبر علی، مرزا،''محمد عزیز مرزا: شخصیت، حیات اور کارنامے''، ادارۂ شعر وحکمت، حیدرآباد دکن، ۱۹۸۷ء
بیگ، فرحت اللہ، مرزا،''میری داستان''، فکشن ہاؤس، لاہور، ۱۹۹۸ء
بیگ، مرزا جواد،''ناانصافیاں اور بے قاعدگیاں''،''مہاجر قومیت''، مرتبہ، جاوید احمد صدیقی، شیل پبلی کیشنز لمیٹڈ، ۱۹۸۷ء
بے خود، عبدالرحمٰن،''بنگال کی سیاست ومعاشرت''،''ماہ نو''، خاص نمبر، مئی ۱۹۵۷ء

پاریکھ، ڈاکٹر رؤف، جلد بیست و یکم، اردو لغت بورڈ، کراچی، ۲۰۰۷ء
_______، ''اوکسفرڈ اردو انگریزی لغت''، طبع اوّل، کراچی، اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس، ۲۰۱۳ء
پاک بھارت جنگ ۱۹۶۵ء/https://www.wikipedia.org/wiki
پرائس، کرسٹن، ''اسلامی فنون کی داستان''، مترجم، ہلال احمد زبیری، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ۱۹۶۸ء
پرتاب گڑھی، نازش، ''نیا ساز نیا انداز''، اتر پردیش اردو اکیڈمی لکھنؤ، ۱۹۸۰ء
پرشاد، اوم پرکاش، ''اورنگ زیب: ایک نیا زاویہ نظر''، مشمولہ: سہ ماہی ''تاریخ''، ۵، لاہور، اپریل ۲۰۰۰ء
پرویز، صلاح الدین، ''صلاح الدین پرویز کے خطوط''، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۱۹۸۸ء
پوسٹن، ٹی، "Personal Observations on Sindh"، مترجم، مسعود الحسن خان، سہ ماہی ''تاریخ''، لاہور، سندھ نمبر، شمارہ ۱۶، جنوری ۲۰۰۳
پوش، مسعود کھدر، پارسی رپورٹ، جنگ پبلشرز، کراچی، ۱۹۹۰ء
پہلی جنگ عظیم/https:ur.wikipedia.org
پھپھوندی، احمق، ''جذبات احمق''، دار الاشاعت احمقیات، سن ندارد
_______، ''سنگ وخشت''، دانش پبلشرز، دہلی، سن ندارد
_______، ''نقش حکمت''، مکتبہ برہان، دہلی، ۱۹۴۴ء
_______، ''نقش حکمت''، مکتبہ برہان، دہلی، ۱۹۴۴ء
پھول، تنویر الدین، روزنامہ ''جنگ''، کراچی، ۳۱ اگست ۱۹۶۹ء
پیٹرسن، کیپٹن، ''ڈائری''، https://www.bbc.com/urdu/world/2014/01/140114_ww1_soldier_diaries_online_tk
تاباں، غلام ربانی، ''غم دوراں''، مرتبہ غلام ربانی تاباں، حالی پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۱۹۵۱ء
تاراچند، ڈاکٹر، ''امیر خسرو اور ہندوستان''، امیر خسرو اکیڈمی، دہلی، سن ندارد
_______، ''امیر خسرو اور ہندوستان''، ''امیر خسروؔ''، مرتبہ، شیخ سلیم احمد، ادراہ ادبیات دلّی، دہلی، ۱۹۷۶ء
_______، ''تمدن ہند پر اسلامی اثر''، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۶۴ء
تائب، حفیظ، ''وہی یٰسین وہی طٰہٰ''، القمر انٹر پرائزز، لاہور، ۱۹۹۸ء
تحسین، افضل، ''ہلال''، راول پنڈی، ۲۱ اپریل ۱۹۷۲ء
ترین، ڈاکٹر حنیف، ماہ نامہ ''آگہی''، کراچی، اگست ستمبر ۱۹۹۴ء
ترین، ڈاکٹر روبینہ، ''انقلاب ۱۸۵۷ء اور ہم عصر اردو صحافت''، ''الماس''، خیرپور، شمارہ دہم، ۲۰۰۸ء
تشنہ، ایم۔ نذیر، ''جموں وکشمیر البم''، گلوب پبلشرز، لاہور، سن ندارد
تقسیم سے متاثرہ افراد کی کہانی، /https://www.dw.com/ur
تقسیم کی لکیر https:// www.bbc.com/ urdu_ resources/ idt-sh/ partition- timeline- urdu
تنظیم الفردوس، پروفیسر، ''قومی شعور کی بازیافت: سقوط مشرقی پاکستان کے اثرات اردو غزل پر''، ''اردو شاعری کی چند کلاسیکی اصناف''، ادارۂ یادگارِ غالب، کراچی، ۲۰۱۳ء
تنہا، محمد یحیٰ، ''سیر المصنفین''، حصہ دوم، مکتبہ جامعہ، دہلی، ۱۹۲۸ء
تھامسن، ایڈورڈ، ''انقلاب 1857: تصویر کا دوسرا رخ''، مترجم، شیخ حسام الدین امرتسری، گوتم پبلشرز، لاہور، ۱۹۹۳ء

ٹکر، ہنری سینٹ جارج، Memorials of the Indian Govt. being a selection from the papers لندن،۱۸۵۳ء

ثانی، شاہ عالم، ''عجائب القصص''، طبع اوّل مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۶۵ء

جالبی، ڈاکٹر جمیل، ''تاریخ ادب اردو''، جلد اوّل، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۱۹۸۹ء

________، (مقدمہ)، ''دیوان حسن شوقی''، مرتبہ ڈاکٹر جمیل جالبی، انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۷۱

________، ''تاریخ ادب اردو''، جلد اوّل، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۸۴ء

________، ''تاریخ ادب اردو''، جلد اوّل، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۲۰۰۸ء

جالبی، ڈاکٹر جمیل، ''تاریخ ادب اردو''، جلد چہارم، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۲۰۱۲ء

________، ''تاریخ ادب اردو''، جلد دوم، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۲۰۰۹ء

جالب، حبیب، روزنامہ ''نوائے وقت''، لاہور، جون ۱۹۶۷ء

________، ''کلیات حبیب جالب''، ماورا پبلشرز، لاہور، ۱۹۹۲ء

________، ''کلیات حبیب جالب''، ماورا پبلشرز، لاہور، ۱۹۹۳ء

________، https://www.rekhta.org/shayari/philistene

________، https:\\dailypakistan.com.pk.16dec.2016

جالندھری، حفیظ، بہ حوالہ: روزنامہ ''نوائے وقت''، لاہور، ۲۹ جون ۱۹۸۷ء

________، ''تحریک آزادی کشمیر اردو ادب کے آئینے میں''، از فتح محمد ملک، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۱ء

________، ''کشمیر ہمارا ہے کشمیر ہمارا ہے''، مرتبہ، ناصر زیدی، نقوش، لاہور، ۱۹۹۱ء

________، ''بزم نہیں رزم''، نقوش پریس، لاہور، ۱۳۹۳ھ

________، ''تصویر کشمیر''، اردو اکیڈمی پنجاب، لاہور، ۱۹۳۷ء

________، ''جنگ ترنگ''، مرتبہ، شان الحق حقی، وزارت اطلاعات، سن ندارد

________، ''کلیات حفیظ جالندھری''، مرتبہ خواجہ محمد ذکریا، فرید بک ڈپو، نئی دہلی، ۲۰۰۸ء

جالندھری، ضیاء، ''ماہ نو''، کراچی، مارچ ۱۹۷۲ء

جامعی، سید نصیر احمد، ''مشہور تاریخی واقعات''، قومی کتب خانہ، لاہور، ۱۹۷۹ء

جان صاحب، میر یار علی، ''دیوان جان صاحب''، نیر پریس، لکھنؤ، سن ندارد

جاوید، ڈاکٹر زینت اللہ، تلوک چند محروم: شخصیت اور فن، محروم میموریل لٹریری سوسائٹی، دہلی، ۱۹۹۷ء

جذبی، معین احسن، ''کلیات جذبی''، فرید بک ڈپو، دہلی، ۲۰۰۷ء

جرال، قمر، ''خطاب''، ''ضوفشاں''، مجلّہ ڈگری کالج پلندری، ۱۹۸۹ء

جری، خواجہ رحمت اللہ، ''کراچی کا خریدار کون''، دنیائے ادب، کراچی، اپریل ۱۹۹۵ء

________، ''نامعلوم دہشت گرد''، ماہ نامہ صریر، کراچی، جون جولائی ۱۹۹۵ء

جعفری، ادا، ''شہر درد''، غالب پبلشرز، لاہور، ۱۹۸۲ء

________، ''غزالاں تم تو واقف ہو''، مقبول اکیڈمی، لاہور، ۱۹۸۸ء

________، ''غزالاں تم تو واقف ہو''، مکتبہ فنون، لاہور، ۱۹۷۴ء

جعفری، ڈاکٹر مسعود، ''ساحر کی شاعری میں صدائے احتجاج''، http://urdu.siasat.com/news/671383
جعفری، ڈاکٹر قمقام، ''شہر آشوب''، سہ ماہی ''اردو''، کراچی، شمارہ ۲، ۱۹۷۷ء
جعفری، رئیس احمد، ''افاداتِ محمد علی''، ادارہ اشاعت اردو، حیدر آباد دکن، ۱۹۴۵ء
________، ''سیرت محمد علی''، مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی، ۱۹۳۲ء
________، ''کاروان گم گشتہ''، سید انیس احمد جعفری اکیڈمی، کراچی، ۱۹۷۱ء
________، ''کاروانِ گم گشتہ''، سید رئیس احمد جعفری اکیڈمی، کراچی، ۱۹۷۱ء
________، ''واجد علی شاہ اوران کا عہد''، کتاب منزل، لاہور، ۱۹۵۸ء
________، ''اوراق گم گشتہ''، محمد علی اکیڈمی، لاہور، ۱۹۶۸ء
________، ''کاروانِ گم گشتہ''، سید رئیس احمد جعفری اکیڈمی، کراچی، ۱۹۷۱ء
جعفری، رئیس احمد، ''کاروان گم گشتہ''، سید رئیس احمد جعفری اکیڈمی، کراچی، ۱۹۷۱ء
جعفری، سید ضمیر، ''دیباچہ''، ''دستِ چنار''، از شیخ غلام علی بلبل کاشمیری، کشمیر اکیڈمی، مظفر آباد، ۱۹۹۵ء
________، ''رزمی''، ''رفتار''، کراچی مئی ۱۹۸۴ء
________، ''کھلیان''، باب العلم، لاہور، ۱۹۸۰ء
________ ہفت روزہ ''ہلال''، راول پنڈی، جلد ۳۵، شمارہ ۲۶۔۲۸، ۱۹۹۹ء
________، روز نامہ ''مشرق''، کراچی، ۳۱ جنوری ۱۹۷۲ء
________، ''قریۂ جاں'، دوست پبلشرز، اسلام آباد، ۱۹۸۸ء
جعفری، علی سردار، ''ایشیا جاگ اُٹھا''، مکتبہ شاہراہ، دہلی، ۱۹۵۲ء
________، ''بنگال''، کلیات علی سردار جعفری، جلد اوّل، مرتبہ: علی احمد فاطمہ، قومی کونسل برائے فراغ اردو زبان، دہلی، ۲۰۰۴ء
________، ''کلیات علی سردار جعفری''، جلد دوم، مرتبہ علی احمد فاطمی، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، ۲۰۰۵
________، ''کلیات علی سردار جعفری''، جلد دوم، مرتبہ: علی احمد فاطمہ، قومی کونسل برائے فراغ اردو زبان، دہلی، ۲۰۰۶ء
________، ''کلیات علی سردار جعفری''، مرتبہ علی احمد فاطمی، قومی کونسل برائے فروغ اردو، دہلی، ۲۰۰۴ء
جعفری، قمقام، ''شہر آشوب''، مشمولہ: سہ ماہی ''اردو''، کراچی، شمارہ ۳، ۱۹۷۷ء
جعفر، سیدہ، و ڈاکٹر گیان چند جین، ''تاریخ ادب اردو''، جلد اوّل، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی، ۲۰۱۱ء
________، ''تاریخ ادب اردو''، جلد پنجم، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی، ۲۰۱۱ء
________، ''تاریخ ادب اردو''، جلد چہارم، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی، ۲۰۱۱ء
________، ''تاریخ ادب اردو''، جلد دوم، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی، ۲۰۱۱ء
________، ''تاریخ ادب اردو''، جلد سوم، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی، ۲۰۱۱ء
جلال، ڈاکٹر سید قاسم، ''رئیس امروہوی: احوال و آثار''، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی، ۲۰۰۸ء
جلالوی، استاد قمر، ''اوجِ قمر''، شیخ شوکت علی سنز، س ن
جلالی، شکیب، ''نقوش''، لاہور، سال نامہ، ۱۹۶۶ء
جمال، رشید، ''سندھ دوراہے پر''، پاکستانی ادب پبلی کیشنز، کراچی، ۱۹۹۴ء

________، ''مسئلہ کراچی: اسباب وحل''، لوحِ ادب پبلی کیشنز، کراچی، ۱۹۹۶ء
جمیل، سید مظہر، ''آشوب سندھ اور اردو فکشن''، اکادمی بازیافت، ۲۰۰۲ء
جون پوری، وامق، جرس، دانش محل لکھنؤ، ۱۹۵۰ء
جودت، محمد احمد علی، ''قیامت صغریٰ''، ''ادیب''، حیدر آباد دکن، طوفان نمبر، ۱۹۰۸ء
جوش، محمد شفیع، ''تعارف''، ''بزم نہیں رزم''، از حفیظ جالندھری، نقوش پریس، لاہور، ۱۳۹۳ھ
جوہر، شوکت اللہ، ''اردو شاعری میں ظرافت نگاری''، الفاظ اکیڈمی، کراچی، ۲۰۱۶ء
جوہر، محمد علی، بہ حوالہ، ''محمد علی جوہر اور ان کی شاعری''، مرتبہ، عبدالروف عروج، سلطان حسین اینڈ سنز، کراچی، سن ندارد
________، ''My life A Fragment''، مرتبہ، ایس۔ایچ۔محمد اشرف، لاہور، ۱۹۴۲ء
جہاں آبادی، درگا سہائے سرور، ''خم خانۂ سرور''، زمانہ پریس، کان پور، ۱۹۱۱ء
جہاں آبادی، درگا سہائے سرور، ''نوائے سرور''، ادارۂ روزنامہ ہندوستان، بنارس، ۱۹۹۷ء
________، ''پیمانۂ سرور''، شورہ بک ڈپو، دہلی، سن ندارد
________، ''خم کدۂ سرور''، اعظم اسٹیم پریس، حیدر آباد دکن، سن ندارد
جہاں، رونق، "Pakistan Failure in National Integration", Columbia University Press, New York, 1972
جیکب، جے۔ایف۔آر۔, "Surrender at Dacca: Birth of Nation", Manohar Publishers, 1997
جیلانی، بی۔اے۔''پہلی بات''، ''مشرقی پاکستان سے بنگلا دیش تک''، مرتبین، محمد نواز منہاس و عباس اختر عوان، القمر انٹر پرائزز، لاہور، ۱۹۹۵ء
جین، ڈاکٹر گیان چند، ''اردو مثنوی شمالی ہند میں''، جلد اوّل، انجمن ترقی اردو ہند، دہلی، ۱۹۸۶ء
جیوا خان، شیخ نور الدین، ''قصہ شاہ روم''، مطبع صفدر، بمبئی، ۱۳۰۲ھ
چراغ، محمد علی، ''پاکستان منزل بہ منزل''، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۷ء
چشتی، جنرل فیض علی، ''بھٹو، ضیاء اور میں''، جنگ پبلشرز، لاہور، ۱۹۹۱ء
چشتی، یوسف سلیم، ''شرح بانگ درا''، عشرت پبلشنگ ہاؤس، لاہور، سن ندارد
چغتائی، ابراہیم بیگ، ''جنگ یونان وروم''، مطبع خیر خواہ اسلام، ۱۹۰۹ء
________، ''جنگ یونان وروم''، در مطبع خیر خواہِ اسلام، ۱۹۰۹ء
چغتائی، ڈاکٹر عبداللہ، ''اقبال کی صحبت میں''، مجلس ترقی ادب، کراچی، ۱۹۷۷ء
چغتائی، محمد اکرام، ''پیش لفظ''، ''۱۸۵۷ء (تاریخی، علمی اور ادبی پہلو)، مرتبہ محمد اکرم چغتائی، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۷ء
________، ''۱۸۵۷ء: خطوطِ غالب کے آئینے میں''، ''۱۸۵۷ء: روزنامچے، معاصر تحریریں، یادداشتیں''، مرتبہ اکرام چغتائی، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۷ء
چکبست، پنڈت برج نارائن، ''مرقع عبرت وخاک ہند''، فخر المطابع لکھنؤ، ۱۹۰۹ء
________، ''صبح وطن''، مرتبہ اُما چکبست، دانش محل لکھنؤ، ۱۹۸۵ء
چندانی، سوبھو گیان، ''کراچی کی یادداشتیں''، مترجم: اجمل کمال، ''کراچی کی کہانی''، جلد اوّل، سٹی پریس، کراچی، ۲۰۰۷ء
چندر، پروفیسر ستیش، ''عہدِ وسطیٰ کا ہندوستان''، قومی کونسل برائے فروغِ اردو، دہلی، ۲۰۰۳
________، ''عہد وسطیٰ کا ہندوستان: سلطنت سے مغل عہد تک''، قومی کونسل برائے فروغِ اردو، دہلی، ۲۰۰۳

________، ''مغل دربار کی گروہ بندیاں اوران کی سیاست''، مترجم: محمد قاسم صدیقی، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، ۱۹۸۷ء
چند، تارا، ''تحریک آزادی ہند''، جلد سوم، مترجم: عدیل عباسی، ترقی اردو بیورو، دہلی
چنگیزی، یاس یگانہ، ''آیات وجدانی''، طبع اوّل، مطبع شیخ مبارک علی، لاہور، ۱۹۲۷ء
چودھری، اعظم، ''آہِ مظلوم ماں''، ''تحریک خلافت کی باغیانہ نظمیں''، ''زعمائے پاکستان''، سن ندارد
چودھری، جی۔ڈبلیو۔، "The Last days of United Pakistan", C. Hurst Co, London, 1974
چودھری، ریاض حسین، ''خونِ رگ جاں''، چودھری سنز، سیال کوٹ، ۱۹۷۱ء
چودھری، زاہد، ''بنگالی مسلمانوں کا تحریک پاکستان میں نمایاں ترین کردار''، جلد ۹، ادارہ مطالعہ تاریخ، لاہور، ۱۹۹۶ء
چومسکی، نوح، ''انتقاضہ کے چند مناظر''، مترجم، سید کاشف رضا، کتابی سلسلہ ''دنیازاد''، کراچی، شمارہ ۴
چیمہ، ذوالفقار، ''برطانیہ کی کچھ باتیں اور دسمبر کے زخم''، روزنامہ ''جنگ''، کراچی، ۲۰ جنوری ۲۰۱۳ء
چیم، ہرزونگ، "War and Peace in the Middle East", Random House, New York, 1982
حاتم، شاہ، مشمولہ: ''شہر آشوب''، مرتبہ ڈاکٹر نعیم احمد، مکتبہ جامعہ، دہلی، ۱۹۶۸ء
حاتم، شیخ ظہور الدین، ''دیوان زادہ''، مرتبہ: ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار، لاہور، ۱۹۷۵ء
حارث، انور، ''صدائے تیشہ''، غازی نصیر الدین پبلشرز، کراچی، ۱۹۸۰ء
حافظ، آندھا، "The Killing of Shaikh Mujib"، "Bangladesh A Legacy of Blood", Compiled by Anthony Mascarenhas, Hodder and Stoughton, London, 1986,
حالؔی، مولانا الطاف حسین، ''دکن ریویو کی عزت افزائی''، ''دکن ریویو''، حیدرآباد دکن، مارچ ۱۹۰۵ء
________، ''حب وطن''، صدیق بک ڈپو، لکھنؤ، سن ندارد
________، ''دہلی مرحوم''، ''اردو میں قومی شاعری کے سو سال''، مرتبہ علی جواد زیدی، اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ، ۱۹۸۲ء
________، ''شکوہِ ہند''، محمدن پریس، علی گڑھ، ۱۸۹۵ء
________، ''کلیات نظم حالی''، جلد اوّل، مرتبہ، شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی، حالی بک ڈپو، پانی پت، جنوری ۱۹۲۴ء
________، ''حیات جاوید''، طبع اوّل، کان پور، محمد احمد اللہ رعد پریس، ۱۸۹۹ء
________، ''حیات جاوید''، انجمن ترقیِ اردو ہند، دہلی، ۱۹۳۹ء
________، ''حیات جاوید''، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی، ۱۹۹۰ء
________، ''حیات سعدی''، طبع اوّل، محمڈن پریس، علی گڑھ، ۱۸۸۶ء
________، ''دیوان حالی''، طبع دوم، الناظر پریس، لکھنؤ، ۱۸۹۲ء
________، ''کلیات نظم حالی''، جلد دوم، مرتبہ ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۷۰ء
________، ''مقدمہ شعر وشاعری''، نیشنل پریس، الہ آباد، ۱۹۵۳ء
________، ''کلیات نظم حالی''، دوم، مجلس ترقی ادب، لاہور، جنوری ۱۹۷۰ء
حامد، لکھنوی، ماہ نامہ، جام جم، کراچی، جلد ۱، شمارہ ۲، ۱۹۷۱ء
حبیب النسا، ڈاکٹر، ''ریاست میسور میں اردو کی نشوونما'' ترقی اردو پریس، بنگلور، ۱۹۶۲ء
حبیب، عامر، مترجم، ''حقوق انسانی کمیشن کی رپورٹ''، المیہ سندھ، ارتقا، کراچی، ستمبر ۱۹۹۱ء

________، ''المیہ سندھ''، تیسرا حصہ، ارتقا، کراچی، اگست ۱۹۹۲ء

________، ''حقوق انسانی کمیشن کی رپورٹ''، فروری ۱۹۹۲ء

حجازی، عارف، ''ڈھاکا: میرے خوابوں کا شہر''، ادبیات پاکستان، کراچی، ۱۹۶۱ء

حسرت، جعفر علی، ''کلیات حسرت''، مرتبہ ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی، دانش محل لکھنؤ، ۱۹۶۶ء

حسرت، چراغ حسن، ''کشمیر''، اتحاد پریس، لاہور، ۱۹۴۸ء

حسرت، فضل الحسن، ''کلیات حسرت''، کتاب منزل، لاہور، ۱۹۵۹ء

حسن، ایم۔ایم۔ ''اردو ڈائجسٹ''، لاہور، مشرقی پاکستان نمبر، نومبر ۱۹۷۱ء

________، ''سولہ دسمبر''، روزنامہ ''جنگ''، کراچی، ۱۶ دسمبر ۱۹۸۹ء

حسن، پروفیسر محمد، ''دہلی میں اردو شاعری کا تہذیبی وفکری پس منظر: میر کے عہد تک''، اردو اکادمی، دہلی، ۱۹۸۹ء

حبیب، پروفیسر محمد، ''سوانح امیر خسروؒ''، مترجم حیات اللہ انصاری، ہندوستانی اکیڈمی، الہ آباد، ۱۹۸۴ء

حسن، سید ریاض، ''پاکستان ناگزیر تھا''، شعبہ تصنیف وتالیف وترجمہ، کراچی یونی ورسٹی، کراچی، ۱۹۶۷ء

حسن، ظفر، بی۔اے۔ ''مقدمہ''، ''خلاصۃ التواریخ''، از سبحان رائے بھنڈاری، مطبع جی اینڈ سنز، دہلی، ۱۹۱۸ء

حسن، عارف، ''تفہیم کراچی: شہری مسائل اور مستقبل کی منصوبہ بندی''، مترجم: شاہ محی الحق فاروقی، راشد مفتی، سٹی پریس، کراچی، ۲۰۰۱ء

حسن، فاطمہ، ڈاکٹر، ''ز۔خ۔ش۔ حیات وشاعری کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ''، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی، ۲۰۰۷ء

حسن، محمد، الاعظمی، ''المعجم الاعظم''، عربی۔اردو لغت، کراچی، مکتبۂ اعظمیہ، ۱۹۵۴ء

حسن، محمد، ''ہندی ادب کی تاریخ''، اورینٹ لانگ مین، نئی دہلی، ۱۹۷۳ء

حسن، میر، ایم۔اے۔ ''جنگ زدہ ممالک''، ادارۂ ادبِ جدید، حیدرآباد دکن، ۱۹۴۲ء

________، ''تذکرۂ شعرائے اردو''، مرتبہ: محمد حبیب الرحمٰن خاں شروانی، انجمن ترقی اردو ہند، دہلی، ۱۹۴۰ء

حسین، احتشام، ''نقش حالی''، مرتبہ نورالحسن ہاشمی، حصہ دوم، قومی پریس لکھنؤ

حسین، الطاف، ''سفر زندگی''، مرتبہ، خالد اطہر، جنگ پبلشرز، لاہور، ۱۹۸۸ء

حسین، پروفیسر ڈاکٹر سید سجاد، ''شکست آرزو''، اسلامک ریسرچ اکیڈمی، کراچی، ۲۰۱۳ء

حسین، پروفیسر ممتاز، ''غالب ایک مطالعہ''، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی، ۱۹۶۹ء

________، ''امیر خسرو دہلوی: حیات اور شاعری''، پاکستان ہیرالڈ لمیٹڈ، کراچی، ۱۹۷۵ء

حسین، ڈاکٹر سید اعجاز، ''اکبر فنکار کی حیثیت سے''، ''علی گڑھ میگزین''، جلد ۲۴، شمارہ: ۳، ۱۹۵۰ء

________، ''مختصر تاریخِ ادب اردو''، اردو اکیڈمی سندھ، کراچی، ۱۹۵۶ء

حسین، ڈاکٹر سید عابد، ''قومی تہذیب کا مسئلہ''، انجمن ترقی اردو ہند، علی گڑھ، ۱۹۵۵ء

________، ''ہندوستانی مسلمان آئینہ ایام میں''، مکتبہ جامعہ، نئی دہلی، ۱۹۶۵ء

حسین، ڈاکٹر یوسف، ''تاریخ دستورِ حکومتِ ہند''، دہلی، ۱۹۳۹ء

حسین، سید احتشام، ''پیش لفظ''، ''جرس''، از وامق جون پوری، دانش محل لکھنؤ، ۱۹۵۰ء

حسین، سید سجاد، ''پیش لفظ''، ''شکست آرزو''، اسلامک ریسرچ اکیڈمی، کراچی، ۲۰۱۳ء

حسین، سید شاہد، "What was once East Pakistan", Oxford University Press, Pakistan, Karachi, 2010

حسین، سید عابد، ''ہندوستانی مسلمان آئینہِ ایام میں''، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی ۲۰۱۲ء

حسین، سید غلام، ''سیر المتاخرین''، جلد دوم، کلکتا، ۱۲۴۸ھ

حسین، سید مجاور، ''اردو شاعری میں قومی یک جہتی کے عناصر''، اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ ۲۰۰۴ء

حسین، مہدی، "Bahadur Shah II and the War of 1857 in Delhi with its unforgettable scenes"، آتما رام پبلشرز، دہلی، ۱۹۵۸ء

حسین، میجر جنرل ابرار، ''انٹرویو''، ماہ نامہ ''اردو ڈائجسٹ''، لاہور، اپریل ۱۹۷۲ء

حقی، شان الحق، ''فرہنگ تلفظ''، طبع اوّل، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۹۵ء

حقی، شان الحق، ''کراچی کے دبستانِ شاعری میں اردو غزل کا ارتقا''، از ڈاکٹر جاوید منظر، مکتبہ عالمین پاکستان، کراچی ۲۰۱۲ء

________، ''نشید حریت''، ادارۂ مطبوعات پاکستان، مطبوعہ فیروز سنز، کراچی، ۱۹۵۷ء

________، ''نشید حریت''، فیروز سنز، کراچی، اگست ۱۹۵۷ء

________، ''نقطہ راز''، عصری کتب، کراچی ۱۹۷۲ء

________، "Oxford English-Urdu Dictionary"، طبع اوّل، اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس، کراچی ۲۰۰۳ء

حکیم، شیخ فاضل، ''حکمت الاشراق''، مترجم: مرزا ہادی رسوا، اوّل، دکن، جامعہ عثمانیہ ۱۹۲۵ء

حنا، زاہدہ، ''عاشق من الفلسطین''، روز نامہ ''ایکسپریس''، ۳ ستمبر ۲۰۱۴ء

________، ''عورت زندگی کا زنداں''، کراچی، سمیع سنز پرنٹرز ۲۰۰۴ء

________، ''وہ فلسطین کا عاشق تھا''، کتابی سلسلہ ''دنیا زاد''، کراچی، شمارہ ۱۱

حنفی، مظفر، اقدار، کراچی، جلد ۴، شمارہ، ۱۹۔۲۰

حیدر، اقبال، '' آئینہ اکیلا ہے''، ماہ نامہ افکار، کراچی، اکتوبر ۱۹۹۱ء

حیدری، حیدر بخش، ''طوطا کہانی''، مطبع اسماعیلیہ، لکھنؤ ۱۲۷۰ھ

حیدری، سید احمد بخش، ''مختصر کہانیاں''، مرتبہ ڈاکٹر عبادت بریلوی، لاہور، اشرف پریس ۱۹۶۴ء

حیدری، کرم، ''متاع شام وسحر''، مکتبہ المحمود، راول پنڈی ۱۹۹۳ء

حیدری، نازش، ''دو صدیوں کا سفر''، آئیڈیل پکچرز، کراچی، س ن

حیدر، اقبال، مشمولہ: 'ارتقا'، کراچی، مئی ۱۹۹۳ء

حیدر، آزاد بن، ''جی ایم سید کی سوچ: عزائم اور سیاست''، دید شنید پبلی کیشنز، لاہور، سن ندارد

________، ''جی ایم سید کی سوچ، عزائم اور سیاست''، دید شنید پبلی کیشنز، لاہور، س ن

حیدر، ڈاکٹر سلیم، ''اب سندھ تقسیم ہونا چاہیے''، مطبوعات مہاجر تحریک، کراچی، ۱۹۹۱ء

حیدر، ماسٹر غلام، ''کشمیر میں رائے شماری''، ذکا الدین بٹ پبلشرز، ۱۹۵۷ء

خالدی، فدا، '' آتش احساس''، بزم یوسفی''، کراچی ۱۹۸۴ء

خالد، سلیم منصور، ''البدر''، ادارہِ مطبوعاتِ طلبہ، لاہور، ۲۰۱۰ء

خالد، عبدالعزیز، مشمولہ ماہ نامہ صریر، کراچی، جون۔ جولائی ۱۹۹۴ء

________، ''اوراق''، لاہور، مارچ اپریل ۱۹۷۳ء

________، ''اے پُر آشوب کراچی''، تجدید نو، لاہور، ستمبر۔ اکتوبر ۱۹۹۲ء

خان،اختر حمید، ''جینے کا ہنر''، ''کراچی کی کہانی''، جلد دوم،محولہ بالا،سٹی پریس،کراچی،۲۰۰۷ء
خان،اشفاعلی،حمودالرحمٰن کمیشن رپورٹ،جلد دوم، دارالشعور پبلشرز، لاہور،۲۰۰۲ء
________،مترجم،''حمودالرحمٰن کمیشن رپورٹ: المیہ مشرقی پاکستان کے سیاسی اورفوجی اسباب''،دارالشعور پبلشرز،جلداوّل،۲۰۰۲ء
خان،انعام اللہ،''کشمیر پکار رہا ہے''، اردو اکیڈمی سندھ، کراچی،۱۹۵۱ء
خان، پروفیسرعصمت اللہ، ''ایک تہذیبی کیمیا گر''، ''ہم سخن''، مجلّہ جناح کالج، کراچی،امیرخسرونمبر
خان، پروفیسرعنایت علی،''عنایتیں کیا کیا''،منشورات، لاہور،س ن
خان، پروفیسرعنایت علی،''عنایتیں کیا کیا''،منشورات، لاہور،سن ندارد
خان،توصیف احمد،''آدھا پاکستان''، نگارشات پبلشرز، لاہور،۲۰۰۴ء
خان،خافی،''منتخب اللباب''، (جلد دوم) نفیس اکیڈمی، کراچی،۱۹۶۸
خان،خواجہ غلام حسین،''تاریخ گلزار آصفیہ''،مطبع محمدی، حیدرآباد دکن،۱۳۰۸ھ
خان،ڈاکٹر صابر علی،''سعادت یار خان رنگین''، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی،۱۹۵۶ء
خاں،ڈاکٹر غلام مصطفیٰ،''کلام اقبال کا تاریخی وسیاسی پس منظر''،''صریر خامہ''،قومی شاعری نمبر،سندھ یونی ورسٹی،شعبہ اردو،۱۹۶۶ء
خان،ڈاکٹر یوسف حسین،''تاریخ ہند: عہد جدید''،مطبع جامعہ عثمانیہ،حیدرآباد دکن،۱۹۴۸ء
خان،راجاذاکر،''صبح نو''، نیوز روم پبلی کیشنز، لاہور،۲۰۰۴ء
خان،سرسید احمد،''اسباب بغاوتِ ہند''، اردو اکیڈمی سندھ، کراچی،۱۹۵۷ء
________،''خطبات احمدیہ''،طبع اوّل، (علی گڑھ،مطبع فیض عام،۱۸۷۰ء)
________،''مکمل مجموعہ لیکچرز واسپیچز''، نول کشور، لاہور،سن ندارد
خان،سعیدالدین احمد،سب رس، کراچی،نومبر۱۹۹۷
خان،ظفرعلی، مولانا،''رودِ موسیٰ''، دکن ریویو،حیدرآباد دکن،جنوری۱۹۰۵ء
________،''چمنستان''، پبلشرز یونائیٹڈ، لاہور،۱۹۴۴ء
________،''حبسیات''، منصور اسٹیم پریس، لاہور،۱۹۲۲ء
________،''نگارستان''،''کلیات مولانا ظفر علی خان''،مرتبہ: زاہد علی خان،الفیصل پبلشرز، لاہور،۲۰۰۷ء
________،''رودِ موسیٰ''، دکن ریویو،حیدرآباد دکن،جنوری۱۹۰۵ء
________،''کلیات ظفر علی خان''،مرتبہ زاہد علی خان،الفیصل ناشران وتاجران کتب، لاہور،۲۰۰۷ء
________،''مولانا ظفر علی خان کی آپ بیتی''،مرتبہ،رابعہ طارق، ندوۃ العلم معارف، لاہور،۱۹۹۹ء
________،''شورمحشر''،''مخزن''، دہلی،جنوری۱۹۰۹ء
________،''دکن ریویو کی عزت افزائی''،''دکن ریویو''،حیدرآباد دکن، مارچ۱۹۰۵ء
________،''شورمحشر''،''بہارستان''،مکتبۂ کاروان، لاہور،سن ندارد
خان،عبدالوحید،''تقسیم ہند''،مکتبۂ ایوانِ ادب، لاہور،۱۹۵۹ء
خان، کفایت اللہ خاں،''فغانِ کشمیر''، ہمدرد پریس، راولپنڈی،۱۹۵۳ء
خان،کیپٹن نذیرالدین،''پہلا پتھر''، نیوہورائزن پبلی کیشنز، کراچی،۲۰۰۹ء

خان، محمد اکبر، میجر جنرل، ''محشرِ فلسطین''، مکتبہ داستان، لاہور، ۱۹۶۸ء
خان، محمد ایوب، ''جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی''، مترجم: غلام عباس، آکسفرڈ یونیورسٹی پریس، لاہور، ۱۹۶۷ء
خان، ممتاز صادق، ''کشمیر میں اردو نثر کا تحقیقی مطالعہ''، غیر مطبوعہ مقالہ برائے پی ایچ۔ڈی۔ شعبۂ اردو سندھ یونیورسٹی، جام شورو، ۲۰۰۰ء
خان، میجر جنرل فضل مقیم، ''پاکستان کا المیہ''، آرمی ایجوکیشن پریس، راول پنڈی، سن ندارد
خان، نجم الغنی، ''تاریخ اودھ''، جلد پنجم، مطبع نول کشور، لکھنؤ، ۱۹۱۹ء
خان، نذیر محمد، ''لکچروں کا مجموعہ''، جلد اوّل طبع دوم، مفید عام پریس، آگرہ، ۱۹۱۸ء
خان، یوسف حسین، ''تاریخ دستور حکومت ہند''، انجمن ترقی اردو، ہند، سن ندارد
خاں، سردار علی احمد، ''ہندوستان سے پاکستان''، استقلال پبلشرز، لاہور، ۱۹۸۹ء
خاں، ظفر الاسلام، ''فلسطین کا تاریخی جائزہ''، مترجم، آصف فرخی، کتابی سلسلہ ''دنیا زاد''، کراچی، شمارہ ۴
خاں، علی احمد، ''جیون کہانی''، ''آج''، کتابی سلسلہ نمبر ۹۰، مرتبہ اجمل کمال، جولائی ۲۰۱۵ء
خاں، نجم الغنی، علامہ، ''تاریخ ریاستِ حیدر آباد''، مطبع نول کشور، لکھنؤ، ۱۹۳۰ء
خاور، ایوب، مشمولہ: ماہ نامہ ''فنون''، لاہور، جون جولائی ۱۹۷۲ء
خاور، خاقان، ''بھنور کی آنکھ''، قرطاس پبلشرز، فیصل آباد، ۱۹۸۰ء
خدام کعبہ (دستور العمل)، ''ہمدرد''، دہلی، ۱۲ مئی ۱۹۱۳ء
خسرو، امیر، بحوالہ حنیف نجمی، ''کلام خسرو میں گریہ''، مشمولہ: ''معارف''، جون ۲۰۰۹ء
________، ''تغلق نامہ''، مرتبہ، سید ہاشمی فرید آبادی، مطبع اردو اورنگ آباد، دکن، ۱۹۳۳ء
________، ''دیباچۂ غیر الکمال''، بحوالہ: جیلانی کامران، ''امیر خسرو کا صوفیانہ مسلک''، جنگ پبلشرز، لاہور، ۱۹۹۲ء
________، ''قرآن السعدین''، بہ حوالہ: ''وطن اور حب وطن''، ''خسرو شناسی''، مرتبین: ظ۔ انصاری، ابوالفیض سحر، نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا، نئی دہلی، ۱۹۷۵ء
________، ''قرآن السعدین''، ''وطن اور حب وطن''، از سید صباح الدین عبدالرحمٰن، ''خسرو نامہ المعروف خسرو شناسی''، مؤلف، ظ انصاری و ابوالفیض سحر، مشتاق بک ڈپو، سن ندارد
خلش کلکتوی، رشید الزماں، ''تقسیم در تقسیم''، بزم شعر و ادب، اسلام آباد، ۱۹۸۲ء
خلیفہ، عبدالحکیم، ''کلام حکیم''، مرتبہ: ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی، ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور، ۱۹۷۳ء
خلیق انجم اور شمس الرحمٰن فاروقی، ''نغمات حریت''، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی، ۲۰۰۷ء
خلیق، حارث، 'ارتقا'، کراچی، اپریل ۱۹۹۰
خلیل اللہ، ایم۔اے۔ ''فلسطین کا سانحہ''، عزیز پریس، کراچی، س ن
خورجوی، تقی محمد خان، ''حیات امیر خسرو مع ایجاد موسیقی''، شیخ غلام علی اینڈ سنز، کراچی، سن ندارد
خوشنود، ملک، مشمولہ، ''اردو شہ پارے''، مکتبہ ابراہیمیہ، حیدر آباد دکن، ۱۹۲۹
خویشگی، محمد عبداللہ خان، ''فرہنگ آمرہ''، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۸۹ء
دالیم، شریف الحق، ''پاکستان سے بنگلا دیش: ان کہی جدوجہد''، جمہوری پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۲ء
دانش، احسان، ماہ نامہ 'سیارہ'، لاہور، اگست ۱۹۶۷ء

________، ''اعلان بیداری''، ماہ نامہ ''نقوش''، سال نامہ، لاہور، شمارہ ۱۰۵، ۱۹۶۶ء

دانش، ن م، ماہ نامہ ''دنیائے ادب''، کراچی، نومبر ۱۹۹۸ء

دانی، ڈاکٹر اے ایچ ''اے شورٹ ہسٹری آف پاکستان''، (جلد اول)، شعبہ تصنیف وتالیف، جامعہ کراچی، کراچی، ۱۹۶۷

دبیر، مرزا سلامت علی، ''دفتر ماتم''، جلد چہارم، طبع دوم، لکھنؤ، مطبع احمدی، ۱۹۰۹ء

________، ''دفتر ماتم''، جلد چہارم، طبع دوم، مطبع احمدی، لکھنؤ، ۱۹۰۹ء

________، ''دفتر ماتم''، جلد ۱۶، مطبع احمدی، لکھنؤ، ۱۸۹۷ء

دتاسی، گارسیں، تصحیح، عبدالستار صدیقی، طبع اوّل، دہلی، انجمن ترقی اردو ہند، ۱۹۴۰ء

دتاسی، گارسیں، ''تمہیدی خطبے''، بہ تصحیح عبدالستار صدیقی، اوّل، انجمن ترقی اردو، دہلی، ۱۹۴۰ء

________، ''خطبات گارسیں دتاسی''، جلد دوم، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی، ۱۹۷۴ء

________، ''مقالات گارساں دتاسی''، حصہ اوّل، انجمن ترقی اردو ہند، دہلی، ۱۹۴۳ء

دت، رمیش (Romesh Dutt)، Economic History of India، جلد ا، لندن، سن ندارد

________، ''ہندوستان کی معاشی تاریخ''، جلد اوّل، مترجم غلام ربانی تاباں، ترقی بورڈ اردو، نئی دہلی، ۱۹۷۹ء

درانی، عبدالصمد، ''کشمیر کی کہانی'' ہفت روزہ ''اقدام''، لاہور، ۱۹۶۰ء

درانی، انعام، روز نامہ ''جنگ''، کراچی، ۱۳۱ اگست ۱۹۶۹ء

درویش، محمود، ''انجام سے شروع نہ ہو''، مترجم، آصف فرخی، کتابی سلسلہ ''دنیازاد''، کراچی، شمارہ ۵، ۲۰۰۱ء

دریابادی، عبدالماجد، ''اکبر کا سیاسی مسلک''، مشمولہ ماہ نامہ ''نگار''، اکبر الہ آبادی نمبر، کراچی، ۱۹۶۹ء

درّانی، انعام، ''بری گھڑی''، روز نامہ ''جنگ''، کراچی، یکم نومبر ۱۹۷۱ء

________، ''سر مقتل''، روز نامہ ''جنگ''، کراچی، ۸ نومبر ۱۹۷۱ء

دکن ریویو، حیدرآباد دکن، جنوری ۱۹۰۵ء

دموہی، محمد عثمان، ''کراچی: تاریخ کے آئینے میں''، راحیل پبلی کیشنز، کراچی، ۲۰۱۳

دوڈے، اللین، ''محمد علی اور بپن چندر پال: ایک تلخ بحث ۱۹۱۹ء۔۱۹۲۵ء''، تلخیص انور صدیقی ''جامعہ''، دہلی، جولائی ۱۹۸۰ء

دوسری جنگ عظیم https://ur.wikipedia.org/wiki/

دہلوی، انور، ''گلشنِ کرب''، مکتبہ حیدری، کراچی، ۱۹۸۸ء

دہلوی، تابش، کتابی سلسلہ ''دنیازاد''، کراچی، اکتوبر ۲۰۰۳ء

________، ''تعارفی مجلّہ بزم ارباب سخن پاکستان''، کراچی، ۱۹۸۷ء

دہلوی، حافظ، ''آندھیوں میں چراغ''، دبستانِ لوحِ ادب، کراچی، ۲۰۰۰ء

دہلوی، حیدر، ''صبح الہام''، مکتبہ حیدری، کراچی، ۱۹۶۵ء

دہلوی، سید احمد، ''فرہنگ آصفیہ''، جلد سوم، مکتبہ سہیل لمیٹڈ، لاہور، ۱۹۷۴ء

دہلوی، محمد مرزا، ''دوسری جنگ عظیم''، کتب خانہ علم وادب، دہلی، ۱۹۴۱ء

دہلوی، نسیم، ''اکیلے سفر کا اکیلا مسافر''، طارق پبلشنگ ہاؤس، لاہور، ۱۹۸۱ء

ڈبلیو، لارنس، ''Vellay of Kashmir''، آکسفرڈ یونی ورسٹی پریس، لندن، ۱۸۹۵ء

ڈیسوی،منظور،’’انقلاب انقلاب‘‘،رہبر پبلشرز،کراچی،۱۹۹۵ء
ڈیوس،مائیک،(Mike, Davis)،The Guardians،برطانیہ،جنوری۲۰۱۱ء
ذاکراللہ،ڈاکٹر محمد،’’اردو شاعری پر سیاسی اثرات‘‘،ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس،دہلی،۲۰۱۱ء
ذکااللہ،مولوی،’’تاریخ عروج عہد سلطنت انگلشیہ ہند‘‘،شمس المطابع،۱۹۰۴ء
________،’’تاریخ ہند‘‘،جلد۱۰،علی گڑھ پریس،علی گڑھ،۱۹۱۵ء
________،’’تاریخ ہندوستان‘‘،جلد اوّل،مطبع انسٹی ٹیوٹ،علی گڑھ،۱۹۱۵ء
ذکاءاللہ،مولوی،’’تاریخ ہندوستان‘‘،جلد پنجم،طبع سوم،علی گڑھ،مطبع انسٹی ٹیوٹ،۱۹۱۶ء
________،’’تاریخ ہندوستان‘‘،جلد چہارم،طبع اوّل،دہلی،مطبع شمس المطابع،۱۸۹۷ء
ذکریا،خواجہ محمد،’’حرف چند‘‘،’’پاک افغان اسلامی محاذ‘‘،۱۹۸۱ء
ذکریا،ڈاکٹر رفیق،’’ہندوستانی سیاست میں مسلمانوں کا عروج‘‘،قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان،نئی دہلی،۲۰۰۳ء
ذوالفقار،ڈاکٹر غلام حسین،’’اردو شاعری کا سیاسی اور سماجی پس منظر‘‘،مطبع جامعہ پنجاب،لاہور،۱۹۶۶ء
________،’’جلیانوالہ باغ کا قتل عام اور مظالم پنجاب‘‘،سنگ میل پبلی کیشنز،لاہور،۱۹۹۶ء
________،’’ظفر علی خاں:ادیب وشاعر‘‘،مکتبۂ خیابان ادب،لاہور،۱۹۶۷ء
________،’’مولانا ظفر علی خان،حیات وخدمات‘‘،سنگ میل پبلی کیشنز،لاہور،۱۹۹۳ء
راٹھور،منصور،’’چلو میں ہار جاتا ہوں‘‘،ہم خیال پبلشرز،فیصل آباد،۱۹۹۹ء
راجا،اسلم،’’کونپل کا بدن‘‘،ادارہ معارف کشمیر،باغ،۱۹۸۴ء
راجا،محمد قدیر،’’دعا‘‘،سہ ماہی’’تخلیق‘‘،میرپور،شمارہ۱،اکتوبر۔دسمبر۱۹۸۹ء
راجس،بوٹا خان،’’زخم نرالے‘‘،راجس پبلشرز،میرپور،۱۹۸۹ء
راحت،محمود بیگ،’’نتائج المعانی‘‘،مترجم:ڈاکٹر گوہر نوشاہی،طبع اوّل،مجلس ترقی ادب،لاہور،۱۹۶۷ء
راز،اطہر،’’حیدرآباد دکن‘‘،سب رس،کراچی،اکتوبر۱۹۸۰
راشدی،پیر علی محمد،’’وہ دن،وہ لوگ‘‘مترجم:اجمل کمال،’’کراچی کی کہانی‘‘،جلد اوّل،سٹی پریس،کراچی،۲۰۰۷ء
راشد،ن۔م۔’’کلیات راشد‘‘،کتابی دنیا،دہلی،۲۰۱۱ء
________،’’کلیات راشد‘‘،ماورا پبلشرز،لاہور،۱۹۹۱ء
رامیا،سیتا،"The History of the Indian National Congress"،جلد دوم،مدراس،۱۹۳۵ء
رام،تیرتھ،’’سودیشی تحریک کا زوال‘‘،’’زمانہ‘‘،کان پور،نومبر۱۹۱۳ء
رانا،لیفٹیننٹ جنرل بختیار،’’انٹرویو‘‘،ماہ نامہ’’اردو ڈائجسٹ‘‘،لاہور،اپریل۱۹۷۲ء،جلد۱۲،شمارہ۶۰
رانا،منور،’مہاجر نامہ‘،ایم آر پبلی کیشنز،دہلی،۲۰۱۰
راؤ،مانک راؤ وٹھل،’’بستانِ آصفیہ‘‘،حصہ اوّل،مطبع انوارالاسلام،حیدرآباد دکن،۱۳۲۷ھ
رائے پوری،اختر حسین،’’رنگون میں آخری مغل شہنشاہ‘‘،’’صحیفہ‘‘،لاہور،یادگارِ۱۸۵۷ء،جنوری تاجون۲۰۰۷ء
رپورٹ بی۔بی۔سی۔http://www.bbc.com/urdu/world
رحمانی،اعجاز،’’سیپ‘‘،کراچی،شمارہ۵۶

رحمانی،عشرت،’’ہماری آزادی کی کہانی‘‘،مکتبہ معین الادب،لاہور،۱۹۵۷ء
رحمت اللہ،شہاب الدین،’’شہاب بیتی‘‘،پرنٹ میڈیا،پبلی کیشنز،کراچی،سن ندارد
رحمٰن،پاشا،سہ ماہی’’سیپ‘‘،کراچی،شمارہ ۳۲،اگست ستمبر ۱۹۷۵ء
________،سہ ماہی’’سیپ‘‘،کراچی،شمارہ ۳۶
________،سہ ماہی’’سیپ‘‘،کراچی،شمارہ ۳۷
________،’’دیباچہ‘‘،’’نشاط کرب‘‘،اردو اکیڈمی سندھ،کراچی،۱۹۷۸ء
رحیم،تقی،’’تحریک آزادی میں بہار کے مسلمانوں کا حصہ‘‘،خدابخش اورینٹل لائبریری،پٹنہ،۱۹۹۸ء
رزمی،ثاقب،مشمولہ: ماہ نامہ’’طلوع افکار‘‘،کراچی،اکتوبر ۱۹۹۲ء
رزمی،مظفر حسین،’’خواب کی ریت‘‘،زاہد پبلشرز،اسلام آباد،۱۹۸۳ء
رشید،ڈاکٹر اسما،’’مقبوضہ فلسطین کا ادب مقاومت‘‘،’’فلسطین اردو ادب میں‘‘،مرتبہ پروفیسر فتح محمد ملک،سنگ میل پبلی کیشنز،لاہور،۲۰۰۰ء
رضا،راہی معصوم،’’اجنبی شہر اجنبی راستے‘‘،سعید پبلی کیشنز،الہ آباد،سن ندارد
رضا،سید علم دار،’’جگنو میری تنہائی کے‘‘،ورڈ ویژن پبلشرز،اسلام آباد،۱۹۷۳ء
رضوی،حسن عسکری،Internal Strife and External Intervention", Prograssive publishers, Lahore, 1981
رضوی،شفقت،پروفیسر،’’امیر خسرو کے ہم عصر اردو شعراء‘‘،مشمولہ:’’ہم سخن‘‘،مجلّہ جناح کالج،کراچی،امیر خسرو نمبر
________،’’مولانا ظفر علی خان کا تعلق ریاست حیدر آباد سے‘‘،’’خدابخش جنرل‘‘،پٹنہ،اپریل جون ۲۰۰۹ء
رضوی،عذیر،’’غزل خواں کوئی نہیں‘‘،’’ارتقا‘‘،کراچی،مارچ ۱۹۹۵ء
رضوی،مسعود حسن،’’اردو ڈراما اور اسٹیج،ابتدائی دور کی مفصل تاریخ‘‘،کتاب نگر،لکھنؤ،۱۹۵۷ء
________،’’ہماری شاعری‘‘،نول کشور پریس،لکھنؤ،۱۹۵۳ء
رضوی،میر سعادت علی،(مقدمہ)،’’طوطی نامہ‘‘از غواصی،مرتبہ مصنف مذکور،مجلس اشاعت دکنی مخطوطات،حیدر آباد دکن،۱۳۵۷ھ
رضوی،نیر مسعود،’’لکھنؤ کا عروج و زوال‘‘،’’نقوش‘‘،لاہور،شمارہ ۱۰۴
رضی،صفدر صدیقی،ماہ نامہ’’صریر‘‘،کراچی،جنوری ۱۹۹۳ء
________،سہ ماہی’’فنون‘‘،لاہور،شمارہ ۴۵،۱۹۹۵ء
رضی،قمر،’’محمود شام کی چار نظمیں‘‘،’’اقدار‘‘،کراچی،جلد ۴،شمارہ ۱۱-۱۲
رفاعی،احمد،’’اردو ادب میں طنز و مزاح کی روایت: اپنے عبوری مراحل میں‘‘،’’ادب اور نقدِ ادب‘‘،جاوداں پبلشرز،کراچی،۲۰۰۱ء
رند،سید محمد خان،’’دیوان رند‘‘،طبع اوّل،لکھنؤ،مطبع نول کشور،۱۸۳۲ء
رنگین،سعادت یار خاں،’’اخبار رنگین‘‘،پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی،کراچی،۱۹۶۲ء
روحی،ریحانہ،’’اور میں تنہا بہت‘‘،دنیا پبلشرز،کراچی،۲۰۰۶ء
روز نامہ لندن ٹائمز،۵ نومبر ۱۹۳۲ء
روز نامہ’’جسارت‘‘،کراچی،خطاب ۲۱ مارچ ۱۹۴۸ء
________،کراچی،۲۹ اکتوبر ۱۹۷۲ء
روز نامہ’’مساوات‘‘،لاہور،۱۵ مارچ ۱۹۷۱ء

روز نامہ ''مشرق''، لاہور، ۱۰ مارچ ۱۹۷۱ء

روز نامہ ''نوائے وقت''، لاہور، ۲۷ مارچ ۱۹۷۱ء

روز، ایموس، ''اراڈ سے ایک پوسٹ کارڈ''، مترجم کاشف رضا، کتابی سلسلہ ''دنیازاد''، کراچی، شمارہ ۴

روشن خیال، کراچی، جلد ۱، شمارہ ۴

رومانی، انجم، سہ ماہی ''فنون''، لاہور، شمارہ ۴، فروری تا مارچ ۱۹۶۶ء

رومانی، شبنم، ''شبنم رومانی: شخصیت اور فن''، از فرحانہ اختر، غیر مطبوعہ مقالہ برائے ایم۔اے۔ کراچی یونی ورسٹی، کراچی، ۲۰۰۵ء

رومانی، شبنم، ''ضربِ قلم''، ماہ نامہ ''نقش''، کراچی، جنگ نمبر، ۱۹۶۶ء

________، ''ماہِ نو''، کراچی، کارچ ۱۹۷۲ء

رئیس الشاکری، ''الجامعہ''، جھنگ، فلسطین نمبر، اکتوبر۔نومبر ۱۹۶۷ء

رئیس خان، ڈاکٹر نسرین، ''جذبی کی شاعری کا تنقیدی مطالعہ''، آزاد آفسٹ پریس، دہلی، ۱۹۹۳ء

رئیس، احمد، ''کراچی مر نہیں سکتا''، ماہ نامہ ''افکار''، کراچی، جولائی ۱۹۹۵ء

ریاض، سید حسن، ''پاکستان ناگزیر تھا''، شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ جامعہ کراچی، کراچی، ۱۹۸۴ء

ریاض، فہمیدہ، ''ادھورا آدمی''، دارالاشاعت، لاہور، ۱۹۷۲ء

________، ''کراچی کی کہانی''، جلد دوم، سٹی پریس، کراچی، ۲۰۰۷ء

________، ''میں مٹی کی مورت''، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۸ء

زاہدی، ماہِ طلعت، ماہ نامہ ''افکار''، کراچی، جنوری ۱۹۹۳ء

زبیری، جمیل، ''ہندو عداوت کا تاریخی پس منظر''، ''نقش''، کراچی، جنگ نمبر، ۱۹۶۶ء

زبیری، محمد امین، ''مسلمانانِ ہند کی سیاست وطنی''، عزیزی پریس، آگرہ، سن ندارد

زٹلی، مرزا جعفر، ''زٹل نامہ: کلیاتِ جعفر زٹلی''، مرتبہ: رشید حسن خاں، انجمن ترقی اردو ہند، دہلی، ۲۰۱۱ء

زرداری، ڈاکٹر محمد عتیق، "History of Sindh"، ۱۹۹۶ء

زکریا، ڈاکٹر خواجہ محمد، ''اردو میں قطعہ نگاری''، منیب بک ڈپو، لاہور، ۱۹۷۷

________، ''مجید امجد: سوانحی خاکہ''، ''کلیاتِ مجید امجد''، مرتبہ، خواجہ محمد ذکریا، ماورا پبلشرز، لاہور، ۱۹۸۹ء

زمین دار، بابت ۱۴ر جولائی ۱۹۶۴ء

زور، ڈاکٹر محی الدین قادری، ''دکنی ادب کی تاریخ''، اردو اکیڈمی سندھ، کراچی، ۱۹۶۰

________، ''گولکنڈہ کی قطب شاہی سلطنت''، مشمولہ ''سب رس''، حیدرآباد دکن، ۱۹۳۹

________، ''دکنی ادب کی تاریخ''، اردو اکیڈمی سندھ، کراچی، ۱۹۶۹

زیدی، کلیم، ''مکالمہ شاعر و بلبل''، سب رس، کراچی، اپریل ۱۹۸۷

زیدی، اکبر ایس، ''سندھ میں سیاسی محرکات''، مترجم محمد مطاہر، ''مشمولہ، ارتقا، مارچ، ۱۹۹۱ء

زیدی، ڈاکٹر نظیر حسین، ''مولانا ظفر علی خان بحیثیت شاعر''، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی، ۱۹۷۹ء

زیدی، سردار، ''رپورتاژ''، ماہ نامہ ''صریر''، کراچی، ستمبر ۱۹۹۵ء

زیدی، علی عباس، ''دجلۂ خوں''، ناشر ندارد، سن ندارد

زیدی، مصطفیٰ، ماہ نامہ ''نقش''، کراچی، جنگ نمبر، ۱۹۶۶ء

ز۔خ۔ش۔ ''فردوسِ تخیل''، دارالاشاعت پنجاب، لاہور، ۱۹۴۱ء

ساجدہ، زینب، ''امیر خسروؔ''، ''صبا''، حیدرآباد دکن، فروری ۱۹۶۱ء

ساجد، ''دل کی دہلیز پر''، علم و عرفان پبلشرز، لاہور، ۲۰۰۲ء

ساحل، ذی شان، ''جنگ کے دنوں میں''، آج پبلشرز، کراچی، ۲۰۰۴ء

ساحل، ذیشان، کتابی سلسلہ ''دنیازاد''، کراچی، شمارہ ۵، ۲۰۰۱ء

________، ''پیش لفظ''، کراچی اور دوسری نظمیں، فضلی سنز، کراچی، ۱۹۹۵ء

ساغر، امتیاز، ''مشمولہ: ''رپورٹ''، عالمی مشاعرہ، ماہ نامہ، دنیائے ادب، کراچی، مارچ ۱۹۹۷ء

ساگر، رحیم داد، ''کوئے مقتل''، کاشر پبلشرز، میرپور، ۱۹۹۴ء

ساگر، شیراز، ''تیری یاد کا دکھ''، غم گسار پبلی کیشنز، راول پنڈی، سن ندارد

سالک، شاہدہ نسیم، مشمولہ: ماہ نامہ ''اقدار''، کراچی، جلد ۶، شمارہ ۳۔۴

سالک، صدیق، ''میں نے ڈھاکا ڈوبتے دیکھا''، مکتبہ سرمد، راول پنڈی، ۱۹۸۴ء

________، ''ہمہ یاراں دوزخ''، مکتبہ اردو ڈائجسٹ، ۱۹۷۵ء

سالک، علم الدین، ''دیباچہ''، ''کلام فوق''، طبع اوّل، راج پوت پرنٹنگ ورکس، لاہور، ۱۹۰۹ء

سالک، قربان علی، ''نوائے آزادی''، مرتبہ عبدالرزاق قریشی، مکتبہ جامعہ، دہلی، سن ندارد

________، ''انقلاب دہلی''، ''نغماتِ حریت''، مرتبہ خلیق انجم اور شمس الرحمٰن فاروقی، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی، ۲۰۰۷ء

سبتگین، صبا، اقدار، کراچی، جلد ۵، شمارہ ۷۔۸

سبزواری، طارق، ''رپورٹ''، عالمی مشاعرہ، ماہ نامہ، دنیائے ادب، کراچی، مارچ ۱۹۹۷ء

سپیر، پرسیوال، "The Twilight of the Mughuls"، کیمبرج یونی ورسٹی پریس، لندن، ۱۹۵۱ء

سجزی، سید حسن، ''اوراق پارینہ، ایک نایاب قلمی بیاض''، ''نوائے ادب''، بمبئی، جولائی ۱۹۵۶ء

سجزی، میر حسن، ''تاریخ مبارک شاہی''، از یحییٰ بن احمد سرہندی، مترجم، ڈاکٹر آفتاب اصغر، مرکزی اردو بورڈ، لاہور

سحر، مقصود الزماں، ''ہمیں رکنا نہیں آتا''، الحمد پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۴ء

سراج الدین، سراج، ''کشمیر کی بود و باش''، ہفت روزہ ''نصرت''، کشمیر نمبر، مرتبہ حنیف رامے، مکتبہ جدید، لاہور، شمارہ ۱۲۔۱۴، ۱۹۶۰ء

سرشار، پنڈت رتن ناتھ، ''الف لیلہ با تصویر''، نول کشور، لکھنؤ، ۱۹۰۱ء

________، ''فسانۂ آزاد''، جلد دوم، طبع سوم، لکھنؤ، نول کشور پریس، ۱۸۹۴ء

سروری، عبدالقادر، ''جدید اردو شاعری''، انجمن امداد باہمی مکتبہ ابراہیمیہ، حیدرآباد دکن، ۱۹۳۲ء

________، ''دکن میں اردو مثنوی کا ارتقا''، صفیہ اکیڈمی، کراچی، ۱۹۶۶

سرور، آل احمد، ''پیش لفظ''، ''فروزاں''، از جذبی، مکتبہ اردو، لاہور، سن ندارد

________، ''غالب''، ''غالب نام آور''، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی، ۱۹۶۹ء

سرور، محمد، ''مولانا محمد علی کے یورپ کے سفر''، ادارہ ادبیات نو، لاہور، ۱۹۴۶ء

سرہندی، وارث، ''قاموسِ مترادفات''، طبع اوّل، اردو سائنس بورڈ، لاہور، ۱۹۸۶ء

سرہندی، یحییٰ بن احمد، ’’تاریخ مبارک شاہی‘‘ (فارسی) تصحیح محمد ہدایت حسین، ایشیاٹک سوسائٹی بنگال، کلکتہ، ۱۹۳۱ء

سعید الدین، ’’کٹی پہاڑی‘‘، آج، کراچی، شمارہ ۶۹، جنوری ۲۰۱۱ء

سعید، راحت، ’’ہمارا موقف‘‘، ارتقا، کراچی، ستمبر، ۱۹۹۰ء

سعیدی، جوہر، ’’سفارتِ گل‘‘، ندیم پبلی کیشنز، کراچی، ۱۹۹۸ء

سعید، ایڈورڈ، ’’صیہونیت اور یورپی استعمار کے رویے‘‘، مترجم، شاہد حمید، روزنامہ ’’ایکسپریس‘‘ لاہور، ۱۰ مارچ ۲۰۰۸ء

سعید، ایڈورڈ، ’’فلسطینی محاصرے میں‘‘، مترجم، حسن عابدی، کتابی سلسلہ ’’دنیازاد‘‘، کراچی، شمارہ ۴

_______، ’’محرومی کے پچاس سال‘‘، مترجم، شاہ محی الدین، کتابی سلسلہ ’’دنیازاد‘‘، کراچی، شمارہ ۴

سعید، ڈاکٹر ظفر، ’’تقسیم ہند اور اردو افسانہ‘‘، ناولٹی بکس، دربھنگہ، ۲۰۰۰ء

سفیر، فخر الدین احمد، ’’جنگ بلقان‘‘، ’’زمانہ‘‘، کان پور، دسمبر ۱۹۱۲ء

سکسینہ، رام بابو، ’’تاریخ ادب اردو‘‘، مترجم: مرزا محمد عسکری، لکھنؤ، ۱۹۵۱ء

سلطان پوری، مجروح، https:\\dailypakistan.com.pk.16dec-2016/49208

سلطانہ، ڈاکٹر کشور، ’’جاں نثار اختر حیات و فن‘‘، مکتبہ ادب، بھوپال، ۲۰۰۸ء

سلطان، رفعت، روزنامہ ’’امروز‘‘، لاہور، ۱۲ جنوری ۱۹۷۲ء

_______، ماہ نامہ ’’افکار‘‘، کراچی، اپریل ۱۹۷۲ء،

سلٹیوف، میجر جنرل، ’’ہندوستان پر حملے: مغرب اور افغانستان کی جانب سے‘‘، مترجم: میرزا علی حسین، خادم التعلیم اسٹیم پریس، لاہور، ۱۹۰۹ء

سلیم احمد، ’’حسرت کی سیاست‘‘، پاکستان اسٹڈی سینٹر جامعہ کراچی، کراچی، دسمبر ۲۰۰۰ء

_______، ’’حمود الرحمٰن کمیشن رپورٹ: جرنیل اور سیاست داں‘‘، فرنٹیر پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۳ء

_______، ’’موجِ زر‘‘، نگارشات، لاہور، ۱۹۹۰ء

_______، ’’یحییٰ، مجیب، بھٹو مذاکرات کی اندرونی کہانی‘‘، گورا پبلشرز، لاہور، ۱۹۹۶ء

سلیم، واحد سلیم، ’’غزل‘‘، ’’ادبی دنیا‘‘، اپریل ۱۹۶۶ء

سندیلوی، اشتیاق، ’’درد دل‘‘، حسن برقی پریس، لکھنؤ، سن ندارد

سندیلوی، سلام، ڈاکٹر، ’’مولانا شبلی کی اردو شاعری‘‘، ماہ نامہ ’’ادیب‘‘، شبلی نمبر، علی گڑھ، ستمبر ۱۹۶۰ء

سنگھ، انگد، بی۔اے۔ ’’امیر خسرو کی ہندی شاعری‘‘، ’’آج کل‘‘ (دہلی)، ۱۵ جون ۱۹۴۳ء

سنگھ، جسونت، ’’جناح اتحاد سے تقسیم تک‘‘، روپا اینڈ کو، دہلی، ۲۰۰۹ء

سنگھ، سنگت، "Pakistan's Foreign Policy", Farhan Publishers, Lahore, 1977,

_______، "The Sikhs in History"، سنگھ برادرز، دہلی، ۲۰۰۲ء

سنگھ، گرمکھ، ’’انقلاب‘‘، ’’ضبط شدہ نظمیں‘‘، حلقۂ ادب، لکھنؤ، سن ندارد

سنہا، این۔کے، ’’جان کمپنی سے جمہوریہ تک: جدید ہندوستان کی کہانی‘‘، از مشیر الحسن، قومی کونسل برائے فروغ اردو، دہلی، ۲۰۰۱ء

سودا، محمد رفیع، ’’کلیات سودا‘‘، جلد اوّل، مرتبہ: عبدالباری آسی، نول کشور، لکھنؤ، ۱۹۳۲ء

سوز، عماد الدین، ’’کشمیر میں اردو‘‘، از حبیب کیفوی، مرکزی اردو بورڈ، لاہور، ۱۹۸۱ء

سول اینڈ ملٹری گزٹ، ۱۸ مئی ۱۹۴۳ء، لاہور

سوئیف،اہداف،''بندوقوں کے سائے میں: میرا فلسطینی سفر''،مترجم،آصف فرخی،کتابی سلسلہ''دنیازاد''،کراچی،شمارہ۴
سہ ماہی سیپ،کراچی،شمارہ۷۱
سہارن پوری،سرو،ہفت روزہ''چٹان''،لاہور،۲۱فروری۱۹۷۲ء
سہگل،جے۔آر۔,"Pakistan Splits: The birth of Bangladesh ", Manas Publication, Dehli, 2000
سہیل،احمد،میلہ رام وفا، http://rekhta.org/shayari نیز https:// facebook. com
سہیل،ادیب،''بکھراؤ کا حرف آخر''،سعد پبلی کیشنز،کراچی،۱۹۹۶ء
_______،''عروس البلاد''،افکار،کراچی،مئی۱۹۹۱ء
سہیل،خالد،''امن کی دیوی''،کتابی سلسلہ''دنیازاد''،کتابی سلسلہ نمبر۴،نومبر۲۰۰۱ء
_______،''آزاد فضائیں''،پاکستان بکس اینڈ لٹریری ساؤنڈ،لاہور،۱۹۹۳ء
سہیل،عامر،''تیوہار کا پانی''،بک ہوم،لاہور،۲۰۰۸ء
سہیل،''تاریخ منظوم سلاطین بہمنیہ''،انجمن ترقی اردو،دہلی،۱۹۴۱
سید،پروفیسر محمد،''امجد،جواب سرمد''''سب رس''،دکن،امجد نمبر،مئی جون۱۹۶۲ء
سیتاپوری،نادم،''تحریک خلافت کی باغیانہ نظمیں''،''صریر خامہ''،قومی شاعری نمبر،۱۹۶۶ء
سید قاسم جلال''رئیس امروہوی:احوال وآثار''،انجمن ترقی اردو،کراچی،۲۰۰۸ء
سید،پروین فنا،''بوند بوند ہو''،سیپ،کراچی،شمارہ۶۱
سید،اصغر ندیم،''وہ کیا چاہتے ہیں''،کتابی سلسلہ''دنیازاد''،کراچی،شمارہ۵
سید،افضال احمد،روشن خیال،کراچی،جلد۱،شمارہ۲
سید،محمد حفیظ،''بحری کے عہد کی تاریخ''،''کلیاتِ بحری''،مرتبہ،مصنف مذکور،نول کشور،لکھنو،س ن
سید،ہاشم رضا،"Our Destination"،مصطفین اینڈ مرتضین ،آئی سی ایس لمیٹڈ،کراچی،سن ندارد
سیزن،رچرڈ،اینڈ،روز،"War and Secession: Pakistan, India and the Creation of Bangladesh", University of Colifornia Press, 1990
شاد،مشتاق،ماہ نامہ''افکار''،کراچی،اگست۱۹۹۵ء
_______،ماہ نامہ،صریر،اگست۱۹۹۱
_______،''نمبل''،الحمد پبلی کیشنز،لاہور،۱۹۹۶ء
شاستری،کے اے نیل کنٹھ''جنوبی ہند کی تاریخ: زمانہ ماقبل تاریخ سے وجے نگر کے زوال تک''،مترجم آر کے بھٹ ناگر،ترقی اردو بیورو،دہلی،۱۹۸۰
شاعر،حمایت علی''ہارون کی آواز''،المصنفین پبلشرز،کراچی،۱۹۸۵ء
شاکر،الیاس،''جی ایم سید کے نظریات''''جی ایم سید کی مثبت اور منفی سیاست''،مرتبہ جاوید احمد صدیقی،شبلی پبلی کیشنز،کراچی،۱۹۸۷ء
شاکر،پروین،''خوشبو''،غالب پبلشرز،لاہور،۱۹۸۳ء
_______،''کراچی''،افکار،از مجموعہ ماہ تمام،مراد پبلی کیشنز،اسلام آباد
شامی،شرف الدین،سہ ماہی''آفاق''،راول پنڈی،جون۲۰۰۲ء
شامی،مجیب الرحمٰن،''سقوط ڈھاکا کا حساب''،روزنامہ''جنگ''،لاہور،۱۶دسمبر۱۹۹۴ء
شام محمود،ماہنامہ''الفتح''،کراچی،اکتوبر۱۹۸۶ء

________، اقدار، کراچی، جلد ۴، شمارہ ۲۳۔۲۴
شان، سڈنی ایچ۔ نمائندہ فارن افیئر امریکا، ''اردو ڈائجسٹ''، مشرقی پاکستان نمبر، ۱۹۷۲ء
شائبی، امیر الحسن، ''برطانوی نوآبادیات''، مکتبۂ تعمیر نو، لاہور، ۱۹۷۷ء
شائق، شرقی بن، روزنامہ ''نوائے وقت''، لاہور، ۱۷ دسمبر ۱۹۷۲ء
شاہ جہاں پوری، ابوسلمان، ''انجمن خدام کعبہ: تاریخ، قیام اور مقاصد''، تخلیقاتِ افکار و تحریکات ملی پاکستان، کراچی، س ن
شاہ جہاں پوری، ڈاکٹر ابوسلمان، ''بیسویں صدی میں ہندوستان کی ملی تحریکیں''، قندیل پبلشرز، لاہور، ۲۰۰۹ء
شاہ جہاں پوری، عبدالحکیم سیف، ''الہلال''، جلد ا، شمارہ ۶۴
شاہ جہاں پوری، فرحت، ''مولانا محمد علی جوہر''، سہ ماہی ''صحیفہ''، لاہور، اکتوبر ۱۹۶۶ء
شاہد خواجہ حمیدالدین، پروفیسر، ''حکیم الشعرا حضرت امجد حیدرآبادی ایک تعارف''، بہادر یار جنگ اکیڈمی، کراچی، ۱۹۹۳ء
شاہین، افتخار اجمل، سہ ماہی ''سیپ''، اگست ستمبر ۱۹۷۲ء
شاہین، ولی عالم، ''بےنشان''، مکتبہ افکار، کراچی، ۱۹۸۴ء
شاہ، سلیم اللہ، ''ضبط شدہ نظمیں''، ایک جائزہ، ''معیار''، اسلام آباد، جولائی دسمبر ۱۹۱۳ء
شاہ، سید علی احمد، ''پیش لفظ''، ''جہادِ کشمیر''، تعمیری کتب خانہ، راول پنڈی، ۱۹۸۳ء
شاہ، محمد حسین، ''طلسم ہوش ربا''، طبع اوّل، نول کشور، لکھنؤ، ۱۸۸۲ء
شاہ، محمد واجد علی، ''حزن اختر''، دائرہ ادبیہ، لکھنؤ، ۱۹۲۲ء
شباب، سیف الدین، ''سیل فنا''، ''ادیب''، حیدرآباد دکن، طوفان نمبر، ۱۹۰۸ء
شبلی، اے۔ آر۔ ''پاکستان اور بھارت کے دوطرفہ تعلقات اور کشمیر''، انتخاب پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۷۰ء
شرر، عبدالحلیم، جلد دوم، بمبئی، مکتبۂ سلطانی، ۱۹۰۰ء
________، ''ایام عرب''، جلد دوم، مکتبہ سلطانی، بمبئی، ۱۹۰۰ء
________، ''مقدمہ''، ''حزن اختر''، از محمد واجد علی شاہ، دائرہ ادبیہ، لکھنؤ، ۱۹۲۲ء
________، ''موسیٰ ندی! موسیٰ ندی!!''، ''دل گداز''، حیدرآباد دکن، اکتوبر ۱۹۰۸ء
________، ''ہندوستان کی تحریک آزادی اور اردو شاعری''، از گوپی چند نارنگ، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی، ۲۰۰۳ء
شروانیہ، انیسہ ہارون، ''حیات ز۔ خ۔ ش۔''، اعجاز پرنٹنگ پریس، حیدرآباد، سن ندارد
شروش، رفعت، ماہ نامہ ''افکار''، کراچی، اکتوبر ۱۹۹۰ء
شریف، ڈاکٹر محمد جمال، ''دکن میں اردو شاعری: ولی سے پہلے''، ادارہ ادبیات اردو، حیدرآباد، ۲۰۰۴
شعور، انور، ''انور شعور: حیات اور فن''، از فرح شریف، غیر مطبوعہ مقالہ برائے ایم۔اے۔ کراچی یونی ورسٹی، کراچی، ۲۰۰۲ء
شفائی، قتیل، ''قتیل شفائی کی آپ بیتی: قسط نمبر ۱۰۶''، https://dailypakistan.com.pk.
________، سوچتا ہوں، افکار، کراچی، اگست ۱۹۹۱ء
شفیع، محمد افتخار، ''اردو ادب اور آزادیٔ فلسطین''، کتاب سرائے، لاہور، ۲۰۱۱ء
شفیع، محمد جوش، ''تعارف''، ''بزم نہیں رزم''، از حفیظ جالندھری، نقوش پریس، لاہور، ۱۳۹۳ھ
شفیع، محمد ڈاکٹر، ''آغا حشر کاشمیری اور ان کے ڈراموں کا تنقیدی مطالعہ''، فخر الدین علی میموریل کمیٹی، اتر پردیش، ۱۹۸۸ء

شفیق، عارف، ''میں ہواؤں کا رُخ بدل دوں گا''، اردو مور چہ، کراچی، ۱۹۹۱ء

شلمین، ڈیوڈ، ''اسرائیل اور فلسطین: خاموشی پر ضرب''، مترجم: انجم فاروقی، کتابی سلسلہ 'دنیازاد'، کراچی، شمارہ ۳۳

شمیم، احمد، ''اجنبی موسم میں ابابیل''، عکسی پبلشرز، اسلام آباد، ۱۹۸۳ء

________، ''ریت پر سفر کا لمحہ''، عکسی پبلشرز، اسلام آباد، ۱۹۸۸ء

شمیم، آفتاب اقبال، سہ ماہی ''فنون''، دسمبر ۲۰۰۴ء

شمیم، آفتاب اقبال، ''پاکستانی ادب''، مرتبین، سحر انصاری اور شاہدہ حسن، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، ۲۰۰۴ء

________، ''تبصرہ خواب کی ریت''، ''فنون''، لاہور، مئی جون ۱۹۸۵ء

شمیم، مسلم، ''شہر آشوب''، ماہ نامہ ''طلوع افکار''، کراچی، دسمبر۔جنوری ۱۹۹۵ء

شور، منظور حسین، علیگ، ''نبض دوراں''، کراچی، مکتبۂ افکار، ۱۹۵۹ء

شوقی، حسن، ''دیوان حسن شوقی''، مرتبہ ڈاکٹر جمیل جالبی، انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۷۱

شوکت علی، ''چین میں اسلام اور عیسائیت کا مقابلہ''، ''ہمدرد''، بہ حوالہ 'علی برادران'، مرتبہ، رئیس احمد جعفری''، ۱۹۶۳ء

شہابی، مفتی انتظام اللہ، ''ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علما''، دینی بک ڈپو، دہلی، ۱۹۴۶ء

________، ''مشاہیر جنگ آزادی''، دینی بک ڈپو، کراچی، ۱۳۷۶ھ

شہاب، قدرت اللہ، شہاب نامہ، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۱۹۹۹ء

________، ''شہاب نامہ''، آر۔آر۔ پرنٹرز، لاہور، ۱۹۹۲ء

شہریار، ڈاکٹر، ماہ نامہ ''افکار''، کراچی، دسمبر ۱۹۹۵ء

شہزاد سلیم، سہ ماہی ''سمبل''، راولپنڈی، شمارہ ۳، ۲۰۰۷ء

شہزاد، ناصر، ''کون دیس گئیو''، الحمد پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۶ء

شہید فرنگی محلی، مولانا صبغت اللہ، ''مولانا محمد علی کے کچھ واقعات''، ''علی برادران''، مرتبہ، سید رئیس احمد جعفری، محمد علی اکیڈمی، لاہور، ۱۹۲۳ء

شیخ، احمد حسن، روزنامہ ''نوائے وقت''، لاہور، جولائی ۱۹۹۲ء

شیخ، وسیم، ''ہتھیار کیوں ڈالے''، یو پبلشرز، لاہور، سن ندارد

شیرانی، اختر، ''کلیات اختر شیرانی''، مرتبہ، گوپال متل، موڈرن پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۱۹۹۷ء

شیرانی، حافظ محمود، ''پنجاب میں اردو'' (جلد اوّل)، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۸۸ء

________، ''پنجاب میں اردو''، آئینہ ادب، لاہور، ۱۹۷۲ء

________، ''پنجاب میں اردو''، مکتبہ معین الادب، لاہور، سن ندارد، طبع چہارم

________، ''مقالات حافظ محمود شیرانی'' (جلد دوم) مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۶۶ء

شیروانی، ہارون خان، ''دکن کی بہمنی سلاطین''، مترجم رحم علی الہاشمی، نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا، نئی دہلی، ۱۹۷۸

________، ''مختصر تاریخ دکن''، شمس المطابع مشین پریس، حیدر آباد دکن، ۱۳۴۴ھ

شیریں، ممتاز، ''تعارف''، ''کشمیر اداس ہے''، قومی کتب خانہ، راول پنڈی، ۱۹۵۰ء

صابری، امداد، ''۱۸۵۷ء کے غدار شعرا''، یونین پریس، دہلی، ۱۹۶۰ء

صابر، صابر حسین، ''دشت تنہائی''، بزم قلم و قرطاس پاکستان، ۱۹۸۴ء

صادق الخیری، علامہ، ''میری زندگی فسانہ''، طبع اوّل، نوید پرنٹنگ پریس، کراچی، ۱۹۸۲ء
صادق، ڈاکٹر قیوم، ''بیجاپوری کی اردو مثنویاں''، مرہٹ وارا ادبی سرکل، مہاراشٹر، ۱۹۸۰
صادق، بریگیڈیئر، ''یگانہ کشمیر''، مرتبہ، ڈاکٹر غلام حسین اظہر، پرنس پرنٹرز، لاہور، ۱۹۸۶ء
صالح، ڈاکٹر محمد محسن، "History of palestine", Al-Falah Foundation, Cairo, 2005
صبا، سبط علی، ''طشت مراد''، مجلس تصنیف وتالیف، واہ کینٹ، ۱۹۸۶ء
صبا، سید محمد یحییٰ، ''قومی شعور کے فروغ میں اردو کا کردار''، www.urdu.starnews/today
صبر دہلوی، عبدالکریم خاں، ''فسانہ عبرت''، ''ادیب''، حیدرآباد دکن، طوفان نمبر، ۱۹۰۸ء
______، ''شرکتِ جمعیت خدام کعبہ''، ''ہمدرد''، دہلی، ۵ فروری ۱۹۱۴ء
صبوحی، سید مطلوب علی مطلوب، ''لمعات''، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ۱۹۹۷ء
صدیقی، روش، ''افسوسِ تکلم''، کتاب بھون، دہلی، ۱۹۱۳ء
صدیقی، شمیم احمد، ''مشرقی پاکستان کی صنعتیں''، ''تعمیرِ انسانیت''، لاہور، اکتوبر ۱۹۵۵ء
صدف، ڈاکٹر شازیہ، ''اشفاق احمد کی ادبی خدمات اردو ادب کے تناظر میں''، غیر مطبوعہ مقالہ برائے پی۔ایچ۔ڈی، جامعہ پنجاب
صدیقی، نعیم، ''پھر ایک کارواں لٹا''، میٹرو پرنٹرز، لاہور، ۲۰۰۳ء
صدیقی، ابواللیث، ''لکھنؤ کا دبستان شاعری''، مسلم یونی ورسٹی پریس، علی گڑھ، ۱۹۴۴ء
______، ''لکھنؤ کا دبستان شاعری''، اردو مرکز، لاہور، ۱۹۶۷ء
______، ''رفت وبود''، مرتبہ ڈاکٹر معین الدین عقیل، ادارۂ یادگارِ غالب، کراچی، ۲۰۱۱ء
صدیقی، احمد حسین، ''گوہر بحیرہ عرب: کراچی''، فضلی سنز، کراچی، ۱۹۹۵ء
صدیقی، احمد صدیق، ''شبلی کی سیاسی شاعری پر ایک نظر''، ماہ نامہ ''ادیب''، شبلی نمبر، علی گڑھ، ستمبر ۱۹۶۰ء
صدیقی، اسرار احمد، ''پوسٹ''، debunking - athesim. blogspot. com
صدیقی، افتخار احمد، ڈاکٹر، ''مقدمہ''، ''کلیات نظم حالی''، جلد اوّل، مرتبہ ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۶۸ء
صدیقی، آفاق، نیا دن روشنی کا، آگہی، کراچی، مئی جون ۱۹۹۱ء
صدیقی، بشیر احمد، سردار، ''دیوان صدیقی''، مکتبہ شعاع ادب، آزاد کشمیر، ۱۹۹۲ء
صدیقی، بقا، ماہ نامہ ''صریر''، کراچی، جون جولائی ۱۹۹۵ء
______، ماہ نامہ ''طلوع افکار''، کراچی، جون ۱۹۹۵ء
صدیقی، پروفیسر ریاض، ''ایسٹ انڈیا کمپنی کی کہانی''، سہ ماہی ''تاریخ''، شمارہ ۱۹، فکشن ہاؤس کتابی سلسلہ، لاہور، ۲۰۰۳ء
صدیقی، پروفیسر علی محسن، ''تاریخ سلاطین تغلق''، قرطاس پبلشر، کراچی، ۲۰۰۸
صدیقی، تسنیم احمد، ''کچی آبادیاں کیوں؟''، مترجم: اجمل کمال، ''کراچی کی کہانی''، جلد دوم، محولہ بالا، سٹی پریس، کراچی، ۲۰۰۷ء
صدیقی، ثناء الحق، ''میر وسودا کا دور: اردو شاعری کا عہد زریں''، اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ، کراچی، ۱۹۹۳ء
صدیقی، حکیم فیض عالم، ''شیر میسور سلطان شہید''، بک کارنر پبلشر، جہلم، س ن
صدیقی، ڈاکٹر احمد معاویہ، ''بیسویں صدی کے طنز ومزاح میں دلاور فگار کا مقام''، معارج پبلی کیشنز، کراچی، ۲۰۱۵ء
صدیقی، ڈاکٹر محمد علی، ''ادیب اور سماجی عقوبت خانے''، ماہ نامہ افکار، کراچی، ستمبر ۱۹۹۲ء

______ ،''اشاریہ''، ماہ نامہ ''افکار''، کراچی، جولائی ۱۹۹۰ء
صدیقی، روش، ''قحطِ بنگال''، ''افسوس تکلم''، کتاب بھون، دہلی، ۱۹۱۳ء
صدیقی، ریاض، ''جوش نو آبادیاتی بعد نو آبادیاتی تناظر میں''، ''ارتقا''، کتابی سلسلہ نمبر ۲۴، دسمبر ۱۹۹۹ء تا مارچ ۲۰۰۰ء
صدیقی، سرشار، ''پس منظر''، ''ہجرت پہ مامور تھے ہم''، مرتبہ شبیر احمد انصاری، ہمارا ادارہ، کراچی ص ۲۰۰۵
______ ، کافور، لوبان اور بارور، ''اقدار''، کراچی، جلد، جلد پانچ، شمارہ ۷۔۸
صدیقی، سرشار، ماہ نامہ ''نقش''، کراچی، جنگ نمبر، ۱۹۶۶ء
______ ،''میرے بدن میں تھی تری خوشبوئے پیرہن''، https://www.rekhta.org/shayari/phelistin
صدیقی، شاہد، ''حیدر آباد''، (نظم)، سب رس، حیدر آباد دکن، ستمبر ۱۹۴۳
صدیقی، شکیل، ''بیگم حضرت محل''، ''نیا دور''، لکھنؤ، انقلاب ۱۸۵۷ء نمبر، اپریل۔مئی ۲۰۰۷ء
صدیقی، شمیم احمد، ''مشرقی پاکستان کی صنعتیں''، ''تعمیر انسانیت''، لاہور، اکتوبر ۱۹۵۵ء
صدیقی، عبدالمجید، ''تاریخ گولکنڈہ''، اعجاز پرنٹنگ پریس، حیدر آباد دکن، ۱۹۶۴
صدیقی، علی محسن، ''فلسطین اسلامی عہد میں''، کتابی سلسلہ ''دنیا زاد''، کراچی، شمارہ ۴۰
صدیقی، ماجد، ''دیوار گریہ''، یار پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۱ء
______ ،''شاد باد منزل مراد''، نیشنل بک فاؤنڈیشن، کراچی، ۱۹۷۵ء
صدیقی، محمد عتیق، ''ہندوستان کی اخبار نویسی: کمپنی کے عہد میں''، انڈس پبلی کیشنز، کراچی، ۱۹۸۰ء
صدیقی، محمد علیم اللہ، ''الحاج مفتی اعظم امین الحسینی و جہاد فلسطین''، افضل الکتابت، لاہور، س ن
صدیقی، محمد علی، ''رئیس امروہوی''، جام جہاں نما، ''رئیس امروہوی فن اور شخصیت''، مرتبہ صہبا لکھنوی
______ ،''امیر خسرو کا سیاسی و سماجی پس منظر''، ''افکار''، امیر خسرو ایڈیشن، نومبر۔دسمبر ۱۹۷۵ء
______ ،''سندھ کا مسئلہ: پس منظر اور موجودہ صورتِ حال''، ''ارتقا''، کتابی سلسلہ نمبر ۱۱
صدیقی، نظیر، ''حسرت اظہار''، ایجوکیشنل پریس، کراچی، ۱۹۹۴ء
______ ،''وہ قیامت جو سر سے گزری ہے''، ''فنون''، لاہور، اپریل مئی ۱۹۷۲ء
صدیقی، نعیم، ماہ نامہ ''رضوان''، مسجدِ اقصیٰ نمبر، اکتوبر ۱۹۶۹ء
______ ،''اے ارضِ فلسطین''، مرتبہ انتظار نعیم، ادارہ ادب اسلامی، دہلی، ۲۰۰۶ء
______ ،''آئین''، لاہور، ۳۱ مئی ۱۹۷۲ء
______ ،''آئین''، لاہور، ۸ مارچ ۱۹۷۲ء
______ ،''سیارہ''، لاہور، جولائی ۱۹۶۷ء
صدیقی، نفیس احمد، ''حسرت موہانی اور انقلاب آزادی''، اوکسفرڈ یونی ورسٹی پریس، کراچی، ۲۰۰۴ء
______ ،''ڈاکٹر حسرت موہانی اور انقلاب آزادی''، خدا بخش اورینٹل لائبریری، پٹنہ، ۱۹۹۸ء
صفی پوری، اقبال، ''ماہ نو''، کراچی، مئی ۱۹۷۲ء
صفی، سید علی نقی، ''رجز مسلم''، ''نشید حریت''، مرتبہ، شان الحق حقی، فیروز سنز، کراچی
صلاح الدین، اقبال، ''خسرو شیریں زباں''، مکتبہ میری لائبریری، لاہور

صولت، ثروت، ''ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ''، حصہ سوم، مکتبہ جدید پریس، لاہور، ۱۹۹۵ء
صہبا، لکھنوی، ''رئیس امروہوی: زندگی فن وشخصیت کا جائزہ''، ''رئیس امروہوی: فن وشخصیت''، مرتبہ صہبا لکھنوی، رئیس امروہوی میموریل ٹرسٹ، کراچی، ۱۹۹۰ء
ضیائی، مسلم، ''افکار''، کراچی، فروری ۱۹۷۲ء
ضیاء، شکیل احمد، ''سندھ کا مقدمہ''، شیل پبلی کیشنز لمیٹڈ، کراچی، ۱۹۸۷ء
طاہرہ، قراۃ العین، ''شہر رگِ جاں''، تجدید نو، لاہور، ستمبر۔اکتوبر، ۱۹۹۶ء
________، ''جدید غزل میں شہر کی علامت''، ''اقدار''، کراچی، جلد ۴، شمارہ ۳۔۴
طاہر، جعفر، سہ ماہی ''اوراق''، لاہور، ستمبر اکتوبر ۱۹۷۳ء
________، ماہ نامہ ''فنون''، لاہور، دسمبر ۱۹۷۱ء
________، ''ماہ نو''، کراچی، فروری ۱۹۷۲ء
طباطبائی، سید علی حیدر، ''شہر آشوب''، ''ادیب''، حیدر آباد دکن، طوفان نمبر، ۱۹۰۸ء
________، ''الناظر''، لکھنؤ، یکم مئی ۱۹۱۱ء
طباطبائی، غلام حسین خان، ''سیر المتاخرین''، جلد دوم، نول کشور لکھنؤ، ۱۸۶۶ء
________، ''سیر المتاخرین''، جلد سوم، مطبع نول کشور لکھنؤ، ۱۸۶۶ء
________، ''سیر المتاخرین''، مترجم یونس احمر، نفیس اکیڈمی، کراچی، ۱۹۶۸ء
طبری، ابن جریر، ''تاریخ الرسل والملوک''، جلد سوم، دار المعارف، مصر، ۱۹۶۲ء
طوقار، خلیل، ''جہان اسلام: ترکی کا ایک اردو اخبار''، اردو اکیڈمی پاکستان، لاہور، ۲۰۱۱ء
ظفر الاسلام، ''فلسطین کا تاریخی جائزہ''، مترجم، ڈاکٹر آصف فرخی، کتابی سلسلہ ''دنیا زاد''، کراچی، شمارہ ۴
ظفر الحسن، مرزا، ''دکن اداس ہے یارو''، ادارۂ یادگارِ غالب، کراچی، ۱۹۷۸ء
ظفر، رانا رحمٰن، ''مشرقی پاکستان کی علاحدگی''، ایشین پبلشرز، لاہور، ۱۹۷۶ء
ظفر، عشرت، کتابی سلسلہ ''دنیا زاد''، کراچی، شمارہ ۵
ظفر، یوسف، ''عشق پیچاں''، فیروز سنز، لاہور، ۱۹۷۳ء
________، ''یہودیت''، نفیس پرنٹرز، لاہور، ۱۹۸۲ء
ظہیر، ڈاکٹر نگار سجاد، ''جدید ترکی''، قرطاس، کراچی، ۲۰۰۱ء
ظہیر، سجاد، ''روشنائی''، آزاد کتاب گھر، دہلی، ۱۹۵۹ء
عابدی، حسن، ماہ نامہ ''آئندہ''، کراچی، جون جولائی ۲۰۰۳ء
________، ''اشاریہ''، ماہ نامہ ''افکار''، کراچی، اگست ۱۹۹۰ء
________، ''جریدہ''، پاکستانی ادب پبلشرز، کراچی، ۱۹۹۸ء
________، ''دنیا زاد''، شمارہ ۱۰
عابدی، رفیعہ شبنم، مشمولہ: ''روشن خیال''، کراچی، جلد ۱، شمارہ ۴
عابد، اصغر، ''الم تا علم کشمیر''، القلم پبلشرز، لاہور، ۲۰۰۳ء

عابد،سیدہ افصح،''مغلیہ عہد میں جاگیرداری نظام کا عروج اور اردو شاعری''،''معیار''،اسلام آباد،جنوری۔جون ۲۰۱۳ء
عارف،منظور،''لہر لہر دریا''،مطبوعات،لاہور،۱۹۸۱ء
عاصم محمود،''سکوت شب''،طبع اوّل،مکتبہ عالیہ،لاہور،۱۹۷۶ء
عاظمی،شکیل،''غزل''،سب رس،حیدر آباد،اکتوبر ۲۰۱۱
عالم،ابراہیم،''اے دوست بہت یاد آتے ہو''،روزنامہ''مشرق''،۱۸ فروری ۱۹۷۲ء
عالم،افتخار،منشی،''حواشی''اقبال صلاح الدین،''دیباچہ''،''کلیات غزلیات خسرو''،جلد اوّل،مرتبہ اقبال صلاح الدین،پیکجز لمیٹڈ،لاہور،۱۹۷۲ء
عالم،ایس۔ایم۔عمر،''بہاریوں کا مقدمہ''،مجاہد پرنٹرز،کراچی،۲۰۱۱ء
عالی،جمیل الدین،''دنیائے ادب''،کراچی،اپریل ۱۹۹۵ء
________،''لاحاصل''،مکتبہ اسلوب،کراچی،۱۹۸۴ء
________،''لاحاصل''،پاکستان رائٹرز کوآپریٹو سوسائٹی کراچی،لاہور،۱۹۹۵ء
عالی،محمد جلیل،''میں لڑتا رہوں گا''،ہفت روزہ''زندگی''،لاہور،۱۳ تا ۱۹ مارچ ۱۹۷۲ء
عامر،حبیب،''المیہ سندھ''،چوتھا حصہ،ارتقا،کراچی،جنوری ۱۹۹۳ء
عامر،زاہد منیر،ڈاکٹر،''اقبال کا دردمند دل اور فلسطین: کل اور آج''،''معیار''،اسلام آباد،جنوری تا جون ۲۰۱۲ء
عباسی،محمد عدیل،''تحریک خلافت''،قومی کونسل برائے فروغ اردو،دہلی،۲۰۱۳ء
عباس،عذرا،''میں لائنیں کھینچتی ہوں''،ایجوکیشنل پریس،کراچی،۱۹۹۲ء
عبدالقادر،سر،''شورمحشر''،مخزن،دہلی،جنوری ۱۹۰۹ء
عبدالباری،ڈاکٹر سید،''لکھنؤ کے شعروادب کا معاشرتی وثقافتی پس منظر''،نشاط آفسٹ پریس،فیض آباد،۱۹۸۷ء
عبدالحق،مولوی،''اردو کی نشوونما میں صوفیائے کرام کا حصہ''،انجمن ترقی اردو پاکستان،کراچی،۱۹۸۶ء
عبدالرحمٰن،صباح الدین،سید،''دیباچہ''،''ہندوستان امیر خسرو کی نظر میں''،معارف پریس،اعظم گڑھ،۱۹۶۶ء
عبدالرزاق،عبدالخالق،''تازیانہ عبرت''،ماہ نامہ''سوداگر''،کراچی،مشرقی پاکستان نمبر،مارچ ۱۹۷۲ء
عبدالرسول،صاحب زادہ،''پاک وہند کی اسلامی تاریخ''،ایم۔آر۔برادرز،لاہور،۱۹۶۶ء
عبدالعزیز شرقی،''تیار برسنے کو مرے دل کی گھٹا ہے''، ماہ نامہ''البلاغ''،کراچی،اکتوبر ۱۹۶۷ء
عبدالعزیز،شاہ،''فتاوائے عزیزی''،جلد اول،سعید کمپنی،کراچی،۱۴۰۸ھ
عبدالعزیز،محمد،مطبع مجیدی،کان پور،۱۹۲۹ء
عبدالغفار،قاضی محمد،''آثار ابوالکلام آزاد: ایک نفسیاتی مطالعہ''،طبع سوم،آزاد کتاب گھر،دہلی،۱۹۵۸ء
عبدالقادر،امتیاز،''اقبال کا دورہ؟ فلسطین''،''عبارت''،حیدرآباد،اقبال نمبر،جنوری تا مارچ ۲۰۱۴ء
عبداللہ،ڈاکٹر سید،''تنقیدی مقالات''،مرتبہ: مرزا ادیب،لاہور اکیڈمی،لاہور،۱۹۶۳ء
________،''دہلی مرحوم کا مرثیہ''،ہفت روزہ''لیل ونہار''،لاہور،مئی ۱۹۵۷ء
________،''سانحات ۱۸۵۷ء کا ایک مرثیہ خواں: ظہیر دہلوی''،''۱۸۵۷ء،تاریخی،علمی اور ادبی پہلو''،مرتبہ محمد اکرم چغتائی،سنگ میل پبلی کیشنز،لاہور،
۲۰۰۷ء
عبداللہ،شیخ محمد،''آتش چنار''،چودھری اکیڈمی،لاہور،۱۹۸۵ء

عبدالمجید، خواجہ، جامع اللغات، جامع اللغات کمپنی، لاہور، سن ندارد
عبدالودو، قاضی، ''آوارہ گرد اشعار''، خدابخش لائبریری، پٹنہ، ۱۹۸۴ء
________، ''مقالات قاضی عبدالودو''، پٹنہ، خدابخش اورینٹل لائبریری، پٹنہ، ۱۹۸۶ء
عبرت، سید ظفر حسن، ''انقلاب دہر''، ''ادیب''، حیدرآباد دکن، طوفان نمبر، ۱۹۰۸ء
عثمانی، ظفر احمد، ''ذلت یہود اور عربوں کی حالیہ شکست''، ماہ نامہ ''البلاغ''، کراچی، اگست ۱۹۶۷ء
عثمانی، محمد تقی، ''رو لے اب دل کھول کے اے دیدۂ خونابہ بار''، ماہ نامہ ''البلاغ''، کراچی، جولائی ۱۹۶۷ء
عثمانی، مولانا ظفر احمد، ''جہاد فلسطین''، ماہ نامہ ''البلاغ''، کراچی، جولائی ۱۹۶۷ء
عدم، عبدالحمید، روز نامہ ''امروز''، لاہور، ۶ فروری ۱۹۷۲ء
عرفات، یاسر، ''فیض ہمارے دوست تھے''، ماہ نامہ ''ادب لطیف''، لاہور، اپریل ۱۹۸۵ء
عزام، ابو، ''سقوط ڈھاکا کے چاروں کردار''، forum.mohaddis.com
عزت، حسن علی، ''فتح نامہ ٹیپو سلطان''، مرتبہ ڈاکٹر معین الدین عقیل، الوقار، پبلی کیشنز، لاہور
عزمی، انوار، روز نامہ ''جسارت''، کراچی، ۲۹ جنوری ۱۹۷۳ء
________، ''قائداعظم کا پیام''، مشمولہ: روز نامہ ''جسارت''، کراچی، ۲۶ دسمبر ۱۹۷۲ء
عزیز لکھنوی، مرزا محمد ہادی، بہ حوالہ ''ظفر علی خان بحیثیت صحافی''، از نظیر حسنین زیدی، مکتبۂ اسلوب، کراچی، ۱۹۸۵ء
عزیز، ایز د، ''غروب شب''، سارنگ پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۷ء
عزیز، اے۔ "Discovery of Pakistan"، شاہ غلام علی پبلشرز، لاہور، ۱۹۵۷ء
عزیز، قطب الدین، ''خون اور آنسوؤں کا دریا''، ترجمہ و تدوین: سلیم منصور خالد، ظہور احمد قریشی، منشورات، ۲۰۱۷ء
________، "Blood and Tears", United Press of Pakistan, Karachi, 1974,
عسکری، سید حسن، پروفیسر، "Amir Khusrau as a Historian"، خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ، ۱۹۹۲ء
عصامی، ''فتوح السلاطین'' (فارسی)، مرتبہ: ای۔ ایس۔ یوشع، یونیورسٹی آف مدراس، ۱۹۴۸ء
عطا، اشرف، ''کچھ شکستہ داستانیں''، سندھ ساگر اکادمی، لاہور، ۱۹۶۶ء
عظمیٰ، گوہر سلطانہ، مقدمہ، کل اور آج، پارسی رپورٹ، جنگ پبلشرز، ۱۹۹۰ء، لاہور
عظیم آبادی، جمیل، سہ ماہی ''سیپ''، کراچی، شمارہ ۴۵، خاص نمبر
عظیم آبادی، شوق، ''کف گل فروش''، مرتبہ انور فخری، بساطِ ادب، کراچی، ۱۹۹۶ء
عظیم، اقبال، 'دنیاے ادب'، کراچی، اپریل ۱۹۹۵ء
________، ''چراغ آخر شب''، ایجوکیشنل پریس، کراچی، ۱۹۹۳ء
عفیف، شمس سراج، ''تاریخ فیروز شاہی''، ترجمہ از مولوی محمد فدا علی صاحب طالب، جامعہ عثمانیہ، حیدرآباد دکن، ۱۹۳۸
عقیل، ڈاکٹر معین الدین، ''تحریک آزادی میں اردو کا حصہ''، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی، ۱۹۷۶ء
________، ''اقبال اور جدید دنیائے اسلام''، مکتبہ تعمیر انسانیت، لاہور، ۲۰۰۸ء
________، ''تحریک آزادی میں اردو کا حصہ''، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی، ۱۹۷۶ء
________، ''تحریک آزادی میں اردو کا حصہ''، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۲۰۰۸

________، ''فتح نامہ ٹیپو سلطان''، الوقار پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۹ء
________، ''امیر خسرو فرد اور تاریخ''، ابوالکلام آزاد انسٹی ٹیوٹ، کراچی، ۱۹۹۷ء
عقیل، شفیع، روزنامہ ''جنگ''، کراچی، ۱۲ دسمبر ۱۹۷۱ء
________، ''آگ کا مدفن''، روزنامہ ''جنگ''، کراچی، ۱۴ فروری ۱۹۷۲ء
علوی، حمزہ، ''پاکستان میں تشکیل قوم اور تشدد''، مترجم، وہاب صدیقی، مشمولہ: ارتقا، کراچی، ستمبر، ۱۹۹۱ء
________، ''تخلیقِ پاکستان: تاریخی و سماجی مباحث''، مترجم: ڈاکٹر ریاض احمد شیخ، تاریخ پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۴ء
________، ''ہندوستان اور پاکستان میں اتھنی سٹی کی سیاست''، مترجم: ڈاکٹر مبارک علی، سہ ماہی ''تاریخ''، لاہور، نمبر ۱۰، جولائی ۲۰۰۱ء
علوی، ظفر الملک، ''تبصرہ''، ماہ نامہ ''الناظر''، لکھنؤ، دسمبر ۱۹۱۲ء
علوی، محمد اظہر علی، ''مصطفیٰ کمال: تاریخ ترکی فلسطین وغیرہ''، جلد سوم، برکی پریس لکھنؤ، ۱۹۳۸ء
علوی، مولوی امیر احمد، ''الناظر''، لکھنؤ، اکتوبر ۱۹۳۴ء
________، ''الناظر''، لکھنؤ، اکتوبر ۱۹۳۵ء
________، ''الناظر''، لکھنؤ، اگست ۱۹۳۴ء
________، ''الناظر''، لکھنؤ، اگست ۱۹۳۵ء
________، ''الناظر''، لکھنؤ، جولائی ۱۹۳۴ء
________، ''الناظر''، لکھنؤ، جولائی ۱۹۳۵ء
________، ''الناظر''، لکھنؤ، جون ۱۹۳۵ء
________، ''الناظر''، لکھنؤ، ستمبر ۱۹۳۴ء
________، ''الناظر''، لکھنؤ، ستمبر ۱۹۳۵ء
________، ''الناظر''، لکھنؤ، نومبر ۱۹۳۴ء
________، ''الناظر''، لکھنؤ، نومبر ۱۹۳۵ء
________، '''الناظر''، لکھنؤ، دسمبر ۱۹۳۴ء
علی، ڈاکٹر مبارک، ''ہندوستانی معاشرہ اور نظریات کا تصادم: سولہویں صدی سے اٹھارویں صدی تک''، سہ ماہی ''تاریخ''، شمارہ ۱۹
علیگ، خالد، ''بغداد آشوب''، اقدام پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۳ء
________، ''غزال دشتِ سگاں''، فکشن ہاؤس، لاہور، ۲۰۰۲ء
________، 'دنیاے ادب'، کراچی، مارچ، ۲۰۰۰
علیم، خالد، سہ ماہی ''ہم عصر''، لاہور، شمارہ ۴، ۲۰۰۶ء
علی، امیر، ''تاریخ اسلام''، مترجم، باری علیگ، آئینہ ادب، لاہور، ۱۹۷۰ء
علی، خورشید، سید، ''حیدرآباد کی حسرت ناک تباہی''، ''ادیب''، حیدرآباد دکن، طوفان نمبر، ۱۹۰۸ء
علی، ڈاکٹر مبارک، ''اسرائیلی اور فلسطینی تاریخ نویسی کے رجحانات''، کتابی سلسلہ، دنیازاد، کراچی، شمارہ ۴، جلد اوّل، ۲۰۰۱ء
________، ''اورنگ زیب ایک تعارف''، ''اورنگ زیب عالم گیر''، مرتبہ ڈاکٹر مبارک علی، فکشن ہاؤس، لاہور، ۲۰۰۰ء
________، ''ایسٹ انڈیا کمپنی''، سہ ماہی ''تاریخ''، شمارہ ۸، جنوری ۲۰۰۱ء

________،''آخری عہدِ مغلیہ کا ہندوستان''، آگہی پبلی کیشنز، حیدرآباد سندھ، ۱۹۸۴ء

________،''سندھ: خاموشی کی آواز''، پروگریسو پبلشرز، ۱۹۹۲ء

________،''سندھی و مہاجر شناخت: تضادات و اشتراک''، سہ ماہی ''تاریخ''، لاہور، سندھ نمبر، شمارہ ۱۶، جنوری ۲۰۰۳ء

________،''کراچی: زندہ شہر کا مرتا ہوا کلچر''، سہ ماہی 'تاریخ'، لاہور، نمبر ۷، اکتوبر ۲۰۰۰ء

________،''بدلتی ہوئی تاریخ''، فکشن ہاؤس، لاہور، ۱۹۹۷ء

________،''اسرائیلی اور فلسطینی تاریخ نویسی کے رجحانات''، کتابی سلسلہ 'دنیازاد'، کراچی، شمارہ ۴، ۴ نومبر ۲۰۰۱ء

علی، ساجد، ''میں نے سن ۱۹۷۱ء کے لہولہو دسمبر میں کیا دیکھا''، ''ہم سب''، https://www.humsub.com.pk/36368/sajid-ali-2/

علی، لیاقت، ''رام پور میں اردو شاعری کا منظر نامہ''، ''اورینٹل کالج میگزین''، لاہور، جلد ۹۱، شمارہ ۴، اکتوبر۔ دسمبر ۲۰۱۶ء

عمادی، مولانا تمنا، ماہ نامہ ''الناظر''، لکھنؤ، جلد ۶، شمارہ ۳۲، ۱۳۲۷ھ

________،''اپنا ترانہ''، ماہ نامہ ''تمدن''، دہلی، مئی ۱۹۱۲ء

________،''قطعہ''، ماہ نامہ ''تمدن''، دہلی، دسمبر ۱۹۱۲ء

________،''کیا اسلام تلوار کے زور سے پھیلا''، ماہ نامہ ''تمدن''، دہلی، دسمبر ۱۹۱۲ء

________،''دنیائے اسلام''، ماہ نامہ ''تمدن''، دہلی، جون ۱۹۱۲ء

عمر، ابو، ''خیالات''، ''الناظر''، لکھنؤ، جلد ۳۳، شمارہ ۵، نومبر ۱۹۲۷ء

عمر، ڈاکٹر محمد، ''سراج الدولہ''، انجمن ترقی اردو ہند، دہلی، ۱۹۴۶ء

عمر، ڈاکٹر منصور، ''آزاد غزلیں''، ماہ نامہ ''صریر''، کراچی، اکتوبر ۱۹۹۲ء

عمر، کاوش، ''بحر خوں''، مرتبہ: یوسف راہی، رابطہ پبلشرز، کراچی، ۲۰۱۱ء

عمر، محمد، ''اٹھارھویں صدی میں ہندوستانی معاشرت (میر کا عہد)''، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی، ۱۹۷۳ء

________،''اٹھارھویں صدی میں ہندوستانی معاشرت: میر کا عہد''، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی، ۲۰۱۳ء

عنایت اللہ، ''ہماری شکست کی کہانی: کچھ آنکھوں دیکھی، کچھ غیروں کی زبانی''، مکتبۂ داستان، لاہور، ۱۹۹۰

عنایت، افشاں، ''تحریک اتحاد اسلامی اور اردو شاعری''، مقالہ برائے ایم۔اے۔ شعبہ اردو جامعہ کراچی، ۲۰۰۶ء

عیاں، رشیدہ، ماہ نامہ ''دنیائے ادب''، کراچی، نومبر ۱۹۹۸

غالب، مرزا اسداللہ خاں، ''اردوئے معلیٰ''، مطبع مفید عام، آگرہ، ۱۹۱۴ء

________،''خطوطِ غالب''، مرتبہ غلام رسول مہر، غلام علی اینڈ سنز، کراچی، سن ندارد

________،''دستنبو''، مترجم: رشید حسن خاں، ''۱۸۵۷ء: روز نامچے، معاصر تحریریں، یادداشتیں''، مرتبہ اکرام چغتائی، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۷ء

________،''دیوان غالب''، طبع اوّل، مرتبہ امتیاز علی عرشی، انجمن ترقی اردو، علی گڑھ، ۱۹۵۸ء

________، مشمولہ: ''نشید حریت''، مرتبہ شان الحق حقی، فیروز سنز، کراچی، ۱۹۵۷ء

________،''مکتوب بنام میر مہدی مجروح''، ''خطوطِ غالب''، حصہ دوم، کتاب منزل، لاہور، ۱۹۴۹ء

غانم، سعد، ''ایک مسئلہ، ایک حل''، مترجم، انور حسن صدیقی، کتابی سلسلہ 'دنیازاد'، کراچی، شمارہ ۴

غبان، عبداللہ، ''تاریخ اسلام کے حیرت انگیز کارنامے''، مترجم، عبدالوہاب ظہوری، نفیس اکیڈمی، حیدرآباد دکن، ۱۹۴۷ء

غزنوی، خاطر، ''جواب در جواب''، سنڈیکیٹ آف رائٹرز، پشاور، ۱۹۹۶ء

غواصی، بہ حوالہ ''اردو قطب شاہی دور میں'' از ڈاکٹر محی الدین قادری زور، ''علی گڑھ تاریخ ادب اردو'' (جلد اول)، مسلم یونی ورسٹی پریس علی گڑھ، ۱۹۶۲ء

________، بہ حوالہ ''غواصی شخصیت اور فن'' از محمد علی اثر، اردو اکیڈمی آندھرا پردیش، حیدر آباد، ۱۹۷۷ء

________، ''سیف الملوک بدیع الجمال''، مرتبہ میر سعادت علی رضوی مجلس اشاعت دکنی مخطوطات، حیدر آباد دکن، ۱۳۵۷ھ

فاران، کراچی، جون ۱۹۹۵ء

فاروقی، حمزہ، ''اقبال اور مسئلہ فلسطین''، ''اقبال ریویو''، کراچی، جولائی ۱۹۶۹ء

________، ''انقلاب ۱۸۵۷ء اور اردو شاعری''، ''صحیفہ''، لاہور، یادگار ۱۸۵۷ء، جنوری تا جون ۲۰۰۷ء

فاروقی، شمس الرحمٰن، بحوالہ ''اسرائیل اور فلسطین: خاموشی پر ضرب''، از ڈیوڈ شلمین، مترجم، نجم فاروقی، کتابی سلسلہ ''دنیازاد''، کراچی، شمارہ ۳۳

فاروقی، نثار احمد، پروفیسر، ''مقدمہ''، ''فوائد الفواد''، مرتبہ: خواجہ امیر حسن علا سجزی، مترجم، خواجہ حسن نظامی، اردو اکادمی، دہلی، ۱۹۹۱ء

فاروق، سید محمد، ''حیدر آباد کی تباہی''، ''زمانہ''، کان پور، دسمبر ۱۹۰۸ء

فاضلی، امید، ''دریا آخر دریا ہے''، سیپ پبلی کیشنز، کراچی، ۱۹۸۸ء

فاضل، عبدالرشید، پروفیسر، ''مطلع الانوار''، سہ ماہی ''اردو'' (کراچی)، اکتوبر۔دسمبر ۱۹۷۵ء

فاطمی، پروفیسر علی احمد، ''مقدمہ''، ''کلیات علی سردار جعفری''، جلد اوّل، مرتبہ علی احمد فاطمی، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، ۲۰۰۴ء

فاطمی، حسن عسکری، ''شہر قائد خوف اگلتا ہے''، ماہ نامہ ''دنیائے ادب''، کراچی، اپریل ۱۹۹۵ء

فاطمی، قدرت اللہ، ''Pakistan Movement Kamalist Revolution''، انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک کلچر، لاہور، ۱۹۷۷ء

فتح پوری، ڈاکٹر فرمان، ''اردو لغت تاریخی اصولوں پر''، جلد دوازدہم، اردو لغت بورڈ، کراچی، ۱۹۹۱ء

________، ''اردو لغت تاریخی اصولوں پر''، جلد ہشتم، اردو لغت بورڈ، کراچی، ۱۹۷۸ء

________، ''اردو لغت تاریخی اصولوں پر''، جلد یازدہم، اردو لغت بورڈ، کراچی، ۱۹۹۰ء

________، دیباچہ ''جرس گل'' از گلنار آفرین، تمثال پبلی کیشنز، کراچی، ۱۹۹۱ء

________، ''اردو شاعری اور پاکستانی معاشرہ''، وکٹری بک بنک، لاہور، ۱۹۹۰ء

________، ''ہندی اردو تنازعہ''، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۱۹۸۸ء

فتح پوری، صدیق، ''لمحوں کی دھوپ''، حسان پبلشرز، کراچی، ۱۹۹۷ء

فتح پوری، ظہیر، ڈاکٹر، ''ہندی میں خسرو کا شعری رویہ''، ''افکار''، نومبر۔دسمبر ۱۹۵۰ء

فتح پوری، نیاز، علامہ، ''دعوت درد''، ''الہلال''، جلد ۳، شمارہ ۱۹

________، ''قطرات اشک''، ''الہلال''، جلد ۴، شمارہ ۳

فخری، حبیب، ''کراچی''، ماہ نامہ ''افکار''، کراچی، دسمبر ۱۹۹۵ء

فرید آبادی، سید ہاشمی، ''تاریخ مسلمانانِ پاکستان و بھارت''، جلد دوم، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی، ۱۹۸۸ء

فراز، احمد، مشمولہ 'ہمارے مشاعرے'، جلد اول، مرتبہ اظہر عباس ہاشمی، ساکنانِ شہر قائد پبلشرز، کراچی، ۲۰۰۷ء

________، مشمولہ 'دنیاے ادب'، کراچی، مارچ، ۱۹۹۵ء

________، 'چلو اس شہر کا ماتم کریں'، 'روشن خیال'، کراچی، جلد ۱، شمارہ ۶

________، ''پس انداز موسم''، دوست پبلی کیشنز، اسلام آباد، ۱۹۹۸ء

________، ''شائیلاگ''، کتابی سلسلہ ''دنیازاد''، کراچی، شمارہ ۵

________، ''شہرِ سخن آراستہ ہے: کلیاتِ احمد فراز''، دوست پبلی کیشنز، اسلام آباد، ۲۰۰۴ء
________، ''کلیاتِ احمد فراز''، مرتبہ: فاروق ارگلی، فرید بک ڈپو، دہلی، ۲۰۱۰ء
________، ''کلیاتِ فراز''، مرتبہ، فاروق ارگلی، فرید بک ڈپو، دہلی، ۲۰۱۰ء
________، ''نابینا شہر میں آئینہ''، دوست پبلی کیشنز، اسلام آباد، ۱۹۹۸ء
فراز، احمد، ''تحریکِ آزادیِ کشمیر: اردو ادب کے آئینے میں''، از فتح محمد ملک، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۱ء
فراقی، تحسین ''علامہ اقبال اور اتحادِ عالمِ اسلامی''، ''معیار''، اسلام آباد، جولائی تا دسمبر ۲۰۱۰ء
فراقی، کنور پریم کشور، ''وقائع عالم شاہی''، سلسلۂ مطبوعات کتاب خانۂ رام پور ہندوستان پریس، رام پور، ۱۹۴۹ء
فرانسس، رابرٹ سن، ''سیپر یٹ ازم امنگ انڈین مسلم''، کیمبرج، ۱۹۴۷ء
فرخی، اسلم، مقدمہ، ''غزل چہرہ'' از جمیل نظر، جمیل نظر فاؤنڈیشن، کراچی، ۱۹۸۰ء
فرخی، آصف ''اس وقت تو یوں لگتا ہے''، فضلی سنز، کراچی، ۱۹۹۸ء
________، مترجم، ایمنسٹی انٹرنیشنل ''انہدام اور بے دخلی: فلسطینی گھروں کی تباہی''، کتابی سلسلہ ''دنیا زاد''، کراچی، شمارہ ۴
________، "Look at the City From Here"، آکسفرڈ یونی ورسٹی پریس، ۲۰۱۰ء
فرخی، ڈاکٹر اسلم، کتابی سلسلہ ''دنیا زاد''، کراچی، شمارہ ۵
فرشتہ، محمد قاسم، ''تاریخ فرشتہ''، جلد اوّل، مترجم، مولوی فدا علی، مطبع جامع عثمانیہ، حیدر آباد دکن، ۱۹۲۶ء
________، ''تاریخ فرشتہ''، جلد چہارم، مترجم، مولوی فدا علی، مطبع جامع عثمانیہ، حیدر آباد دکن، ۱۹۲۶ء
________، ''تاریخ فرشتہ''، جلد دوم، مترجم، مولوی فدا علی، مطبع جامع عثمانیہ، حیدر آباد دکن، ۱۹۲۶ء
________، ''تاریخ فرشتہ''، جلد سوم، مترجم، مولوی فدا علی، مطبع جامع عثمانیہ، حیدر آباد دکن، ۱۹۲۶ء
فرشی، محمد علی، ادبی سلسلہ ''نقاط''، اپریل ۲۰۰۶ء
________، ''زندگی خودکشی کا مقدمہ نہیں''، پبلشر زندارد، راول پنڈی، ۲۰۰۲ء
فرقت، غلام احمد، ''خاندانِ بہادر شاہ کی تباہی''، ''آج کل''، دہلی، جنگ آزادی نمبر، اگست ۱۹۵۷ء
فروغ، رئیس، ''رات بہت اجلی ہوا چلی''، شمیم نوید پبلشرز، کراچی، ۱۹۸۴ء
فرئیر، بہ حوالہ ڈاکٹر انور اقبال قریشی، ''مشرقی پاکستان کا معاشی پس منظر''، ریڈیو پاکستان، کراچی، ۱۹۷۱ء
فرید آبادی، سید مطلبی، ''جدوجہد آزادی''، ''نغماتِ حریت''، منتخب کردہ خلیق انجم، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، ۲۰۰۷ء
فرید آبادی، سید ہاشمی، ''تاریخ مسلمانانِ پاکستان و بھارت''، جلد اوّل، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی، ۱۹۸۷ء
________، ''تاریخ مسلمانانِ پاکستان و بھارت''، جلد دوم، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی، ۱۹۸۸ء
________، ''بس اب ہے آج سے آغاز میری کارفرمائی''، ''نوائے آزادی''، مرتبہ عبدالرزاق قریشی، ادبی پبلشرز، بمبئی، ۱۹۵۷ء
________، ''ٹریپولی''، ماہ نامہ ''تمدن''، جلد ۲، نمبر ۳، دسمبر ۱۹۱۱ء
________، ''چل بلقان چل''، ماہ نامہ ''الناظر''، لکھنؤ، دسمبر ۱۹۱۲ء
________، ''تاریخ مسلمانانِ پاکستان و بھارت''، (جلد دوم)، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی، ۱۹۹۳ء
فریکر جان، ''جنگِ پاکستان''، مترجم: لطیف احمد خان، مصباح الاسلام پبلشرز، کراچی، سن ندارد
فرینکلن، ڈبلیو، ''تاریخ شاہ عالم''، مترجم ثناالحق صدیقی، آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس، کراچی، ۱۹۷۶ء۔۱۹۷۷ء

فضل الرحمٰن، ''آفت کا ٹکڑا''، طبع اوّل، مکتبہ جدید، لاہور، ۱۹۶۲ء

فکری، متین، ''شہرِ بے ندا''، ماہ نامہ ''افکار''، کراچی، ستمبر ۱۹۹۶ء

فگار، دلاور، ''قائد اعظم کے حضور میں''، روز نامہ ''جسارت''، کراچی، ۲۴ نومبر ۱۹۷۲ء

________، ''مطلع عرض ہے''، روز نامہ نوائے وقت، کراچی، ۲۸ فروری ۱۹۹۸ء

فگار، دلاور، ''منشیات فروشی کے اڈے''، روز نامہ نوائے وقت، ۲۹ نومبر ۱۹۸۳ء

فلک دار، محمد ایچ۔ ایم۔ آر۔ ''سہروردی کی سیاست بیتی''، مترجم وجاہت مسعود، جنگ پبلشرز، لاہور، ۱۹۹۲ء

فنکارانہ تشبیہات، http://www.rekhta.org./?/

فوق، ڈاکٹر حنیف، ''غبار ماہ کی گواہی''، ''غبار ماہ''، ایجوکیشنل پریس، کراچی، ۱۹۸۶ء

فوق، محمد الدین، ''نغمہ وگلزار''، ظفر برادرز، لاہور، ۱۹۴۰ء

________، ماہ نامہ ''تخلیق''، لاہور، دسمبر ۱۹۸۵ء

________، ''ظفر علی خان''، ''اخبار نویسوں کے حالات''، رفاہ عام اسٹیم پریس، لاہور، ۱۹۱۲ء

________، ''کلام فوق''، روج پوت پرنٹنگ ورکس، لاہور، ۱۹۰۹ء

فہرست، ''کتاب''، لاہور، کشمیر نمبر، ۱۹۶۹ء

فہمی، سلیم اللہ، ''مشرقی پاکستان''، ینگ پریس، ڈھاکا، سن ندارد

فیروز، فیروز الدین، روز نامہ ''مشرق''، کراچی، ۱۵ ستمبر ۱۹۶۹ء

فیض، احمد فیض، ''نسخہ ہائے وفا''، مکتبہ کارواں، لاہور، سن ندارد

________، ''فلسطینی ادب''، کتابی سلسلہ ''دنیا زاد''، کراچی، شمارہ ۵، جلد دوم، نومبر ۲۰۰۱ء

________، ''نسخہ ہائے وفا''، مکتبہ کاروان، کچہری روڈ لاہور، سن ندارد

________، ''نسخہ ہائے وفا''، مکتبہ کارواں، لاہور، ۲۰۰۱ء

قادری، ایوب، ڈاکٹر، ''تعارف''، ''مآثر الکرام''، از میر غلام علی آزاد بلگرامی، مترجم، مولانا شاہ محمد خالد میاں فاخری، دار المصنفین، کراچی، ۱۹۸۳ء

قادری، حامد حسن، ''سیلاب''، ''زمانہ''، کان پور، ستمبر ۱۹۰۹ء

قادری، شبیر، ''مجید امجد کی شاعری کے رثائی پہلو''، ''اوراق''، لاہور، نومبر دسمبر ۱۹۹۳ء

قادری، شمس اللہ، ''اردوے قدیم''، تاج پریس، حیدر آباد دکن، ۱۸۸۹ء

قادری، محمد ایوب، ''۱۸۵۷ء اور ہم''، ''۱۸۵۷ء (تاریخی، علمی اور ادبی پہلو)، مرتبہ محمد اکرم چغتائی، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۷ء

قاسمی، احمد ندیم، ماہ نامہ ''ماہ نو''، کراچی، اپریل، ۱۹۷۰ء

________، ماہ نامہ ''نقش''، جنگ نمبر، ۱۹۶۶ء

________، ''افکار''، کراچی، اپریل ۲۰۰۳ء

________، ''پاکستانی ادب''، مرتبین، جلیل عالی، یوسف حسن، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، ۲۰۰۳ء

________، ''جلال و جمال''، نیا ادارہ، لاہور، سن ندارد

________، ''دھڑکنیں''، اردو اکیڈمی، لاہور، ۱۹۴۲ء

________، ''کشمیر''، ''جریدہ''، پشاور، کشمیر نمبر، جون ۱۹۹۹ء

_______،''لوحِ خاک''،اساطیر پبلشرز،لاہور،۲۰۰۱ء

_______،''محیط''،اساطیر پبلشرز،لاہور،۲۰۰۱ء

_______،''محیط''،سنگ میل پبلی کیشنز،لاہور،۲۰۱۲ء

_______،''ندیم کی غزلیں''،سنگ میل پبلی کیشنز،لاہور،۱۹۹۱ء

قاسمی،احمد ندیم،''ندیم کی نظمیں''،جلداوّل،سنگ میل پبلشرز،لاہور،۱۹۹۱ء

قاسمی،امین طارق،''جہادِ کشمیر''،تعمیری کتب خانہ،راول پنڈی،۱۹۸۳ء

کامریڈ،دہلی،۲۱مئی۱۹۱۳ء

http:// ur.wikipedia.org/wiki/قحط

قدسی،سید محمد جعفر،''الناظر''،لکھنؤ،یکم جنوری۱۹۱۳ء

قدسی،عبیداللہ،''آزادی کی تحریکیں''،ادارۂ ثقافت اسلامیہ،لاہور،۱۹۸۸ء

قدوائی،جلیل،''نوائے سینۂ تاب''،بیگم ہرمزی جلیل اکیڈمی،کراچی،۱۹۵۱ء

قدوسی،اعجازالحق،''تاریخ سندھ''(۳ جلدیں)،اردو سائنس بورڈ،لاہور،۱۹۸۴ء

قرطاس ابیض،''مشرقی پاکستان کے بحران پر حکومت پاکستان کا جاری کردہ''،۵اگست ۱۹۷۱ء

قریشی،اشتیاق حسین،''برصغیر پاک و ہند کی ملت اسلامیہ''،مترجم ہلال احمد زبیری،شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ جامعہ کراچی،کراچی،۱۹۹۹ء

_______،''The Administration of the Sultanat of Delhi''،محمد اشرف پبلشرز،لاہور،۱۹۴۲ء

قریشی،اشرف علی،''حسین شہید سہروردی''،پنجاب نیشنل پرنٹنگ پریس،لاہور،۱۹۶۴ء

_______،''سقوطِ ڈھاکا کے پوشیدہ اسباق''،''اردو ڈائجسٹ''،کراچی،مشرقی پاکستان نمبر،دسمبر۲۰۰۰ء

قریشی،الطاف حسین،ماہ نامہ''اردو ڈائجسٹ''،پاکستان نمبر،مارچ۱۹۷۳ء

_______،''اردو ڈائجسٹ''،لاہور،جنوری۱۹۷۲ء

قریشی،جاذب،'اقدار'،کراچی،جلد۳،شمارہ ۷۔۸

قریشی،حکیم ارشد، " The 1971 Indo Pak War: A Soldiers Narrative," Oxford University Perss Pakistan, Karachi, 2002,

قریشی،خلیق،''سرِ دوش ہوا''،مرتبہ ریاض مجید،قرطاس پبلشرز،فیصل آباد،۱۹۹۴ء

قریشی،ڈاکٹر اشتیاق حسین،''برصغیر پاک و ہند کی ملت اسلامیہ''،مترجم:ہلال احمد زبیری،شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ،کراچی یونی ورسٹی،کراچی،۱۹۹۹ء

قریشی،ڈاکٹر انور اقبال،''مشرقی پاکستان کا معاشی پس منظر''،ریڈیو پاکستان،کراچی،۱۹۷۱ء

قریشی،سلیم اللہ،''۱۸۵۷ء کے غداروں کے خطوط''،مترجم سلیم اللہ قریشی،مرتبہ سید عاشور کاظمی،انجمن ترقی اردو ہند،دہلی،۲۰۱۱ء

قریشی،طاہر،ڈاکٹر،''قرآن اور ظفر علی خان''،قرطاس،کراچی،۲۰۱۴ء

_______،''ہماری ملی شاعری میں نعتیہ عناصر''،غیر مطبوعہ مقالہ برائے پی ایچ۔ڈی۔کراچی،جون۲۰۱۲ء

_______،''اردو کی ابتدائی ملی شاعری میں نعتیہ موضوعات''،مشمولہ نعت رنگ،کراچی،شمارہ ۲۷

قریشی،عبدالرزاق،''نوائے ادب''،ادبی پبلشرز،بمبئی،۱۹۵۷ء

قریشی،عبداللہ،مولانا،''شاعرِ کشمیر''،ظفر برادرز،لاہور،سن ندارد

قریشی، فضل حق، ’’قیام بنگلا دیش کے مضمرات‘‘، نوید پرنٹنگ پریس، ناظم آباد، کراچی، ۱۹۸۷ء

قریشی، محمد فاروق، ’’پاکستان میں جمہوریت کا زوال‘‘، مکتبہ فکر و دانش، لاہور، سن ندارد

قریشی، میاں کریم اللہ، ’’خضر دیکھتا ہے وُلر کے کنارے‘‘، بزم سوز کشمیر، مظفر آباد، ۱۹۹۵ء

قریشی، نصرت، روز نامہ ’’مشرق‘‘، کراچی، ۸ جون ۱۹۶۷ء

قزل باش، مرزا ثاقب، ’’خوں نابہ؟ جگر‘‘، ’’الناظر‘‘، لکھنؤ، یکم مارچ ۱۹۱۳ء

قزلباش، علی کمیل، ’’عربی ادب از آغاز تا سانحہ فلسطین‘‘، سہ ماہی ’’پیغام آشنا‘‘، اسلام آباد، شمارہ ۲۸

قسم الدین، شاہ، ’’درد جگر‘‘، حصہ اول۔ در مطبع اخبار الپنچ بانکی پورہ، س ن

قصوری، احمد رضا خان، ’’اِدھر ہم اُدھر تم‘‘، برٹینکا پبلشنگ ہاؤس، لاہور، سن ندارد

قلق، خواجہ ارشد علی خاں، ’’مظہر عشق‘‘، نول کشور، کان پور، ۱۸۷۲ء

قلق، ’’انتخاب اردو معلیٰ: ۱۹۰۳ء۔۱۹۰۸ء‘‘، مرتبہ حسرت موہانی، مولانا حسرت موہانی میموریل لائبریری ٹرسٹ، کراچی، ۱۹۹۹ء

قمر الہدیٰ، سید، ’’بنگلا دیش میں ہم بہاریوں پر کیا گزری‘‘، ڈیسنٹ پریس، کراچی، سن ندارد

قمر سندیلوی، سید قمر الدین، ’’انجمن خدام کعبہ‘‘، ’’ہمدرد‘‘، دہلی، ۱۱ جنوری ۱۹۱۴ء

قیصرانی، م۔ی۔ ’’سرائیکی تاریخی واراں‘‘، ری پبلکن بکس، لاہور، ۱۹۹۴ء

قیوم، ڈاکٹر صادق، ’’بیجاپور کی اردو مثنویاں‘‘، مرہٹ وار ادبی سرکل، مہاراشٹرا، ۱۹۸۰ء

کاظمی، روشن اختر، ’’اردو میں طویل نظم نگاری کی روایت اور ارتقا‘‘، ماڈرن پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۱۹۸۴ء

کاکوروی، فرقت، بنگال کی رقاصہ، http:// rekhta. org/ shayari

کاٹن، سرہنری، بہ حوالہ: ’’کاروان گم گشتہ‘‘، از رئیس احمد جعفری، سید انیس احمد جعفری اکیڈمی، کراچی، ۱۹۷۱ء

کاشمیری، آغا، شورش، ہفت روزہ ’’چٹان‘‘، لاہور، ۳۱ جنوری ۱۹۷۲ء

________ ہفت روزہ ’’چٹان‘‘، لاہور، ۳ جنوری ۱۹۷۲ء

________، روز نامہ ’’جسارت‘‘، کراچی، ۱۷ نومبر ۱۹۷۲ء

________ ہفت روزہ ’’چٹان‘‘، لاہور، ۱۰ جنوری ۱۹۷۲ء

________، ’’حسین شہید سہروردی‘‘، مطبوعات چٹان، لاہور، ۱۹۶۸ء

________، ’’کلیات شورش کاشمیری‘‘، الفیصل ناشران و تاجران کتب، لاہور، ۱۹۹۶ء

________، ’’کلیات شورش کاشمیری‘‘، الفیصل پبلشرز، لاہور، ۲۰۰۹ء

________، ’’مولانا ظفر علی خان‘‘، ’’نقوش‘‘، شخصیات نمبر، لاہور، ۱۹۵۶ء

کاشمیری، حامدی، ’’غزل‘‘، سب رس، حیدر آباد دکن، اکتوبر ۲۰۱۱

کاشمیری، عاصی، بہ حوالہ افتخار مغل، ’’کشمیر میں اردو شاعری‘‘، غیر مطبوعہ مقالہ AIOU، ۱۹۹۵ء

کاظمی، ڈاکٹر روشن اختر، ’’اردو میں طویل نظم نگاری کی روایت اور ارتقا‘‘، ماڈرن پبلشنگ ہاؤس نئی دہلی، ۱۹۸۴ء

کاظمی، سیدہ فلیحہ، ڈاکٹر، ’’مرثیہ حسن سجزی در رثای محمد خان شہید و دیگر آثارش‘‘، اورینٹل کالج میگزین، لاہور، اکتوبر۔ دسمبر ۲۰۱۳ء

کاظمی، مشیر، روز نامہ ’’نوائے وقت‘‘، لاہور، ۲۵ دسمبر ۱۹۷۳ء

________، ’’قائد اعظم کی تربت پر‘‘، روز نامہ ’’نوائے وقت‘‘، لاہور، ۳۰ اپریل ۱۹۷۲ء

کاظمی، ناصر، ''برگِ نے''، شانِ ہند پبلی کیشنز، دہلی، ۱۹۹۰ء

کاکوروی، نادر، ''انتخاب نادر کاکوروی''، مرتبہ ذکی کاکوروی، اتر پردیش اردو اکیڈمی، لکھنؤ، سن ندارد

______، ''مخمس''، ''زمانہ''، کان پور، جنوری، ۱۹۰۹ء

کاکوی، عطا، ''غلطی ہائے مضامین''، جلد اوّل، خدا بخش جرنل، پٹنہ، ۱۹۸۴ء

کامران، طاہر، ''رنجیت سنگھ کے بعد انتشار کا دور: ۱۸۳۹ء۔۱۸۴۹ء''، سہ ماہی ''تاریخ''، پنجاب اور سکھ تاریخ نمبر، شمارہ ۱۴، جولائی ۲۰۰۲ء

کامریڈ، دہلی، ۷ جون ۱۹۱۳ء

کاوس جی، میزہ بانو، ''امجد بحیثیت رباعی گو شاعر''، ''ارمغانِ امجد'' مرتبہ خواجہ حمید الدین شاہد، ادارۂ ادبیات اردو، حیدر آباد دکن، ۱۹۵۹ء

کرنالی، غافل، مشمولہ: ماہ نامہ ''سیارہ''، لاہور، جولائی ۱۹۷۰ء

کرہانی، شمیم، ''روشن اندھیرا''، دانش محل، لکھنؤ، ۱۹۴۲ء

کریوی، اعظم، ''ہند شاعری''، ہندوستان اکیڈمی، الہ آباد، ۱۹۳۱ء

کشفی، ابوالخیر، ڈاکٹر، ''اردو شاعری کا سیاسی اور تاریخی پس منظر''، ادبی پبلشرز، کراچی، ۱۹۷۵ء

کشفی، مسعود، ''کارواں''، بک سنٹر، راول پنڈی، ۱۹۸۹ء

کشّاف، ''خدمتِ کعبہ''، ''ہمدرد''، دہلی، ۳ مارچ ۱۹۱۴ء

کلیم، طارق، ''اردو کی ظریفانہ شاعری میں مزاحمتی عناصر''، انجمن ترقی اردو، پاکستان، کراچی، ۲۰۱۸

کمال، شاہد، ''کراچی میں اردو غزل اور نظم''، طارق پبلی کیشنز، کراچی، ۱۹۹۹ء

کنجاہی، روحی، ''فنون''، لاہور، اپریل مئی ۱۹۷۲ء

کنہیا لال، پنڈت، ''تاریخ بغاوت ہند مسمّی بہ محاربہ عظیم''، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۷ء

کوٹی، بہار، ''ذات و کائنات'' محمد اظہار الاسلام یونی ورسٹی انجینئر، کراچی ۱۹۷۷ء

کومل، بلراج، ''گریہ سگاں''، http:// www. rekhta. org.nazms/girya-e-sagann

کیانی، رحمان، ''سقوط مشرقی پاکستان''، ''اردو ڈائجسٹ''، مشرقی پاکستان نمبر، دسمبر ۲۰۰۰ء

______، ''سیف و قلم''، ایوانِ اردو، کراچی، ۱۹۷۱ء

کیفی، ذکی، ''التجا''، ماہ نامہ ''البلاغ''، کراچی، اگست ۱۹۶۷ء

______، ''حادثہ''، ماہ نامہ ''البلاغ''، کراچی، نومبر ۱۹۶۷ء

______، ''کیفیات''، ادارۂ اسلامیات، لاہور، ۱۴۰۸ھ

کے۔ کے۔ عزیز، ''Ameer Ali; His life and works''، لاہور، ۱۹۶۸ء

گرفن، سرلیپل ہنری، ''تمہید''، سہ ماہی ''تاریخ''، پنجاب اور سکھ تاریخ نمبر، شمارہ ۱۴، جولائی ۲۰۰۲ء

گرینوال، ہیری جے۔ ''His Highness The Agha Khan Imam of Ismailies''، لندن، ۱۹۵۲ء

گریوال، جے۔ ایس۔ "The Sikhs of the Punjab"، کیمبرج یونی ورسٹی پریس، ۱۹۹۱ء

گمّی، سلیم خان، ''کشمیر: ادب و ثقافت''، یونیورسل بکس، لاہور، ۱۹۸۷ء

گنکوفسکی، یوری، ''پاکستان کی قومیتیں''، دارالاشاعت ترقی، ماسکو، ۱۹۷۶ء

گوپال، رام، "Indian Muslims: A Political History (1858-1947)"، ایشیا پبلی کیشنز ہاؤس، ۱۹۶۴ء

گورکھپوری، مجنوں، ''پچیس سال کی چند اہم شخصیتیں''، مطبوعہ افکار، جوبلی نمبر، کراچی، ۱۹۷۰ء

گورداس پوری، اسلم، روزنامہ ''مساوات''، لاہور، ۱۵ اگست ۱۹۷۲ء

________، روزنامہ ''مساوات''، لاہور، ۱۸ اگست ۱۹۷۲ء

گورکھپوری، فراق، ''جدید اردو شاعری''، از عزیز حامد مدنی، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی، ۱۹۹۰ء

گورکھپوری، فراق، ''روح کائنات''، ایوانِ اشاعت، گورکھپور، سن ندارد

گویا، فقیر محمد، ''بستان حکمت''، ترجمہ انوارِ سہیلی، طبع اوّل، لکھنؤ، نول کشور، ۱۸۳۸ء

گھوش، اے جے، ''بھگت سنگھ اور اس کے ساتھی''، قومی دارالاشاعت، لاہور، سن ندارد

گیلانی، مولانا مناظر احسن، ''حکم الشعرا حضرت امجد حیدر آبادی اور فقیر گیلانی''، ''سب رس''، حیدر آباد دکن، ش ۸۔۷، جلد ۱۹، امجد نمبر، سن ندارد

لاشاری، رشید احمد، ''ادب کی آڑ میں''، مطبع انجمن پریس، کراچی، ۱۹۷۰ء

لاکھو، غلام محمد، ''سندھ جو تاریخِ تحقیقی جائزو''، مارتی سماجی سنگت، ملیر کراچی، سن ندارد

لبیب گورگانی، دہلوی، مرزا نظام شاہ، ''سیل فنا''، ''ادیب''، حیدر آباد دکن، طوفان نمبر، ستمبر ۱۹۰۹ء

لدھیانوی، ساحر، پھر وہی کنجِ قفس، ناز پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۱۹۹۵ء

________، بنگال، www. rekhta. org/nazms/ bangal

________، ''کلیات ساحر''، کتابی دنیا، دہلی، ۲۰۰۳ء

________، ''کلیات ساحر''، ناز پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۱۹۹۵ء

لدھیانوی، ''کیفِ مسلسل''، بیت الادب، فیصل آباد، ۱۹۸۲ء

لطیف، شاہد، ''معرکہ کشمیر''، حیدر پبلشرز، لاہور، ۲۰۰۱ء

لکھنوی عزیز، مرزا محمد ہادی، ''الناظر''، لکھنؤ، دسمبر ۱۹۱۲ء

لکھنوی، اختر، ''دیدۂ تر''، بزم اربابِ سخن پاکستان، کراچی، ۱۹۸۶ء

________، ''کچھ اپنے بارے میں''، ''دیدۂ تر''، بزم اربابِ سخن پاکستان، کراچی، ۱۹۸۶ء

لکھنوی، آرزو، انور حسین، ''فغان آرزو''، طبع دوم، حیدر آباد دکن، رزاقی مشین پریس، ۱۹۴۵ء

________، ''اردو شاعری پر سیاسی اثرات''، از ڈاکٹر ذاکر اللہ، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۱۱ء

لکھنوی، بہزاد، ''نغمہ نور''، ساقی بک ڈپو، س ن، طبع چہارم

لکھنوی، حیا، ''جدید شعرائے اردو''، مرتبہ ڈاکٹر عبدالوحید، فیروز سنز، کراچی، س ن

لکھنوی، ساحر، ''شہر آشوب''، ماہ نامہ ''طلوع افکار''، کراچی، فروری۔ مارچ، ۱۹۹۵ء

لکھنوی، شاعر، ''زخم ہنر''، شاعر لکھنوی اکیڈمی، کراچی، ۱۹۷۹ء

لکھنوی، شمس، ''زمین دار''، ۱۹ جون ۱۹۲۰ء

لکھنوی، صہبا، ماہ نامہ ''افکار''، مارچ ۱۹۷۲ء

________، ماہ نامہ ''فنون''، لاہور، اپریل مئی ۱۹۷۲ء

لکھنوی، مہذب، ''مہذب اللغات''، نامی پریس، لکھنؤ، ۱۹۶۹ء

لندن ٹائمز کے شمارے مورخہ ۲۷ نومبر ۱۹۱۸ء، ۶ جون ۱۹۱۹ء، ۱۲ اگست ۱۹۱۹ء

لنگڑیال، ڈاکٹر الطاف حسین، ''مسئلہ فلسطین کے حوالے سے اردو کی مزاحمتی شاعری کا تنقیدی جائزہ''، ''القلم''، دسمبر ۲۰۱۶ء
لورا گائے، "Karachi: Ordered Disorder and the Struggle for the City"، ہرسٹ اینڈ کو پبلشرز، نیو دہلی، ۲۰۱۴ء
لویٹ فریزر، ''India Under Curzen and After''، لندن، ۱۹۱۱ء
لی پولڈ، کیپٹن وان آرلچ، "Travel in India", vol. II، لانگ مین پبلشرز، لندن، ۱۸۴۵ء
مارہروی، محمد سعید احمد، منشی، ''حیات خسرو''، مطبع اکبری، آگرہ، ۱۹۰۳ء/۱۳۲۱ھ
_______، ''حیات خسرو''، ''امیر خسرو''، مرتبہ: شیخ سلیم احمد، ادارۂ ادبیات دلّی، دہلی، ۱۹۷۶ء
مائل، محمد ذکریا، ''قضیۂ فلسطین''، العرب پریس، کراچی، ۱۳۶۹ھ
مائیک، وائس (WiseMike)، Late Victorian Holocausts:Et Nino Famines and the Making of the third world، ورسو، یوکے، ۲۰۰۰ء
ماہ پوری، افسر، ''جدید اردو غزل ایک مطالعہ''، از ظہیر صدیقی، گلوبل پبلشرز، لاہور، ۱۹۸۴ء
_______، ''دیباچہ''، ''حاصلِ سفر''، از ذکی آذر، ایجوکیشنل پریس، کراچی، ۱۹۹۴ء
_______، ''ضحیٰ آروی کی شاعری''، ''ذوقِ ضحیٰ''، ظہیر پبلی کیشنز، کراچی، ۱۹۸۷ء
_______، ''غبارِ ماہ''، ایجوکیشنل پریس، کراچی، ۱۹۸۶ء
_______، ''نگارِ ماہ''، ایجوکیشنل پریس، کراچی، ۱۹۹۲ء
ماہ نامہ ادبی دنیا، کراچی، ۲۰۰۴ء
ماہ نامہ دنیائے ادب، کراچی، مارچ ۱۹۹۵ء
ماہ نامہ ''تحریریں''، لاہور، فروری ۱۹۸۵ء
ماہر القادری، ''کلیات ماہر القادری''، ادارۂ تعمیر ادب، کراچی، ۱۹۹۴ء
_______، ''کلیات ماہر''، تعمیر انٹرپرائزز، لاہور، ۱۹۹۴ء
_______، ''کلیات ماہر''، مرتبہ: ڈاکٹر عبدالغنی فاروق، ادارۂ تعمیر ادب، کراچی، ۱۹۹۴ء
_______، ''کلیات ماہر''، القمر انٹرپرائزز، لاہور، ۱۹۹۴ء
ماہر کنتوری، ''تاریخ ہائے طغیانی''، مشمولہ: ''ادیب''، حیدرآباد دکن، طوفان نمبر، ۱۹۰۸ء
مترجم، مہدی علی خاں، کان پور، نول کشور، ۱۸۷۳ء
مٹک، ''پنجاب دیاں واراں''، از گنڈا سنگھ، پبلی کیشن بیورو، پنجابی یونی ورسٹی، پٹیالہ، ۱۹۹۴ء
مجاز، اسرار الحق، ''آہنگ''، مکتبہ جامعہ، نئی دہلی، ۲۰۱۱ء
_______، ''کلیات مجاز''، کتابی دنیا، دہلی، ۲۰۰۶ء
_______، ''کلیات مجاز''، کتابی دنیا، نئی دہلی، ۲۰۰۲ء
مجروح، حسین، ''اداریہ''، ماہ نامہ ''طلوع افکار''، کراچی، دسمبر۔جنوری ۱۹۹۵ء
مجیب، محمد، ''مولانا محمد علی: اپنی شکست کی آواز''، مترجم، انور احمد صدیقی، ''جامعہ''، دہلی، جوہر نمبر، جلد ۷۶ شمارہ ۳، اپریل ۱۹۷۹ء
مجیدی، اقبال، ماہ نامہ ''صریر''، کراچی، اگست ۱۹۹۵ء
مچھلی شہری، سلام، ''وسعتیں''، مکتبہ اردو، لاہور، سن ندارد

محبّ الحسن، ''تاریخ ٹیپو سلطان''، مترجمین حامد اللہ افسر اور عتیق صدیقی، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی، ۲۰۱۳ء
محبّ حسین، محبّ، ''مرثیہ شہدائے طغیانی رود موسیٰ''، ''ادیب''، حیدرآباد دکن، طوفان نمبر، ۱۹۰۸ء
محروم، تلوک چند، قحط بنگال، 'کاروانِ وطن'، مکتبہ جامعہ، دہلی، ۱۹۶۰ء
________، ''قوم سے خطاب''، ''تلوک چند محروم''، مرتبہ: جگت ناتھ آزاد، انجمنِ ترقی اردو ہند، دہلی، ۱۹۶۰ء
محروم، تلوک چند، ''کاروانِ وطن''، مکتبہ جامعہ، دہلی، ۱۹۶۰ء
محمد ظہیر، ''عالم گیر اور سلطنتِ مغلیہ کا زوال''، ایجوکیشنل پریس، کراچی، ۲۰۰۶ء
محمد، سید، (مقدمہ)، ''دیوان عبداللہ قطب شاہ''، مرتبہ مصنف مذکور، مکتبہ ابراہیمیہ ۱۹۵۹ء
محمد، شاہ، ''جنگ ہند پنجاب''، مرتبہ محمد آصف خاں، عزیز بک ڈپو، لاہور، ۱۹۷۲ء
محمد، عبدالعزیز، ''لغاتِ سعیدی''، مطبع مجیدی، کان پور، ۱۹۲۹ء
محمد، میاں طفیل، روزنامہ ''جسارت''، کراچی، ۱۰ ستمبر ۱۹۷۲ء
محمود الرحمٰن، ''جنگ آزادی کے اردو شعرا''، قومی ادارہ برائے تحقیق و تاریخ و ثقافت، اسلام آباد، ۱۹۸۶ء
محمود، محمود خاں، ''حیدر علی: تاریخی ناول''، کوثر پریس، بینگلور، ۱۹۳۶ء
محمودہ رضویہ، ''ملکۂ مشرق''، عباس لیتھو آرٹ پریس، کراچی، سن ندارد
محمود، خالد، ''رن کچھ سے چونڈہ تک''، مقبول اکیڈمی، لاہور، ۱۹۶۷ء
محمود، ڈاکٹر صفدر، ''پاکستان کیوں ٹوٹا''، ادارہ ثقافتِ اسلامیہ، لاہور، طبع سوم، سن ندارد
محمود، سید قاسم، ''انسائیکلو پیڈیا پاکستان''، شاہکار بک فاؤنڈیشن، کراچی، ۱۹۹۸ء
محوی، مسعود علی، ''ترجیع بند''، سب رس، حیدرآباد دکن، جولائی ۱۹۹۵
________، ''مقدمہ''، ''کلیات حسن سجزی''، شاد ایڈیشن، مکتبہ ابراہیمیہ پریس، حیدرآباد دکن، ۱۳۵۲ھ
محی الدین، ظفر، 'سندھ کی عدالت میں'، عوامی فورم، کراچی، ۱۹۹۰
محی الدین، مخدوم، بنگال، 'بساطِ رقص'، استقبالیہ کمپنی جشن مخدوم، حیدرآباد دکن، ۱۹۶۶ء
________، ''بساطِ رقص''، ادبی ٹرسٹ، حیدرآباد دکن، ۱۹۷۶ء
________، ''سرخ سویرا''، اشاعت گھر، حیدرآباد دکن، ۱۹۴۴ء
مخدوم، معین الدین، ''سرخ سویرا''، اشاعت گھر، حیدرآباد دکن، ۱۹۴۴ء
مدنی، عزیز حامد، ''آج بازار میں پابجولاں چلو''، اردو اکیڈمی سندھ، کراچی، ۱۹۸۸ء
________، ''جدید اردو شاعری''، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی، ۱۹۹۰ء
________، ''دشت امکان''، نشاط پریس، کراچی، ۱۹۶۴ء
مذاق العیشی، روزنامہ ''نوائے وقت''، لاہور، ۹ جون ۱۹۶۷ء
مرادآبادی، جگر، ''قحطِ بنگال''، ''کلیاتِ جگر''، مرتبہ، کرشن کانت، آزاد بک ڈپو، امرت سر، سن ندارد
مرادآبادی، راز، ''حرف راز''، شعبہ اردو جامعہ کراچی، ۱۹۷۸ء
مرادآبادی، راغب، ''روشنیوں کا شہر''، راغب مرادآبادی اکیڈمی، کراچی، ۱۹۹۵ء
مرزا، شفقت تنویر، ''سروادی کشمیر''، دوست پبلشرز، اسلام آباد، ۱۹۹۴ء

مرزا،محمد سخاوت، (مقدمہ)،مشمولہ ''من لگن''، از قاضی محمود بحری، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی، ۱۹۵۵
مرزا، وحید، ڈاکٹر، ''امیر خسرو''، نیشنل امیر خسرو سوسائٹی، دہلی، ۱۹۸۶ء
مرسل، سید محمود، ''سقوط ڈھاکا کے تناظر میں اردو شاعری کا مطالعہ''، ''زبان وادب''، شمارہ ۱۴، جنوری تا جون ۲۰۱۴ء، فیصل آباد
مزدکی، انوار، ''تقسیم پاکستان: صدارت سے غداری تک''، از انوار مزدکی، حصہ دوم، طارق پبلشرز، لاہور، ۱۹۷۲ء
مزدکی، انوار، ''تقسیم پاکستان: صدارت سے غداری تک''، طارق پبلشرز، لاہور، ۱۹۷۲ء
مسعود، راس، سر، ''دیباچہ''، ''تصویر کشمیر''، از حفیظ جالندھری، اردو اکیڈمی پنجاب، لاہور، ۱۹۳۷ء
مسعود، طاہر، ''تعارفی مجلّہ بزم ارباب سخن پاکستان''، کراچی، ۱۹۸۷ء
مسلم عظیم آبادی، مولوی محمد، ''الناظر''، لکھنؤ، جلد ۲۶، شمارہ ۱۵۳، مارچ ۱۹۲۴ء
مسلم گزٹ لکھنؤ، جلد نمبر ۴۹، ۱۸ دسمبر ۱۹۱۲ء
________، جلد ۱، نمبر ۳۵، ۱۱ دسمبر ۱۹۲۱ء
مسیح الدین، بیگم، روز نامہ ''جنگ''، کراچی، ۱۵ ستمبر ۱۹۶۹ء
مشتاق، ''صادق الاخبار''، دہلی، مورخہ ۱۲ ذی الحجہ ۱۲۷۳ھ
مشیر الحسن، ''جان کمپنی سے جمہوریہ تک: جدید ہندوستان کی کہانی''، قومی کونسل برائے فروغ اردو، دہلی، ۲۰۰۱ء
مصحفی، غلام ہمدانی، ''انتخاب مصحفی''، مرتب نامعلوم، تاج المطابع، رام پور، ۱۹۷۸ء
________، ''دیوانِ مصحفی''، مرتبہ ومنتخبہ: اسیر لکھنوی وامیر مینائی، پٹنہ، ۱۹۹۰ء
مظہری، جمیل، ''آزادی کی نظمیں''، مرتبہ: سبط حسن، حلقہ ادب لکھنؤ
معین الحق، سید، ''مقدمہ''، ''اخبار رنگین''، از سعادت یار خان رنگین، پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی، کراچی، ۱۹۶۲ء
مغل، افتخار، ''لہولہو کشمیر''، کشمیر سوسائٹی برائے سائنس وسماجی تحقیق، مظفر آباد، سن ندارد
مغل، بشیر احمد، ''شہر در بدراں''، کاشر پبلشرز، میر پور، ۱۹۹۳ء
مغل، رئیس احمد، ''فلسطین: فرعون سے شیرون تک''، ماہ نامہ ''بیت المقدس''، اسلام آباد، جلد ۹، شمارہ ۵۔۶، ۲۰۰۶ء
مغل، غلام نبی، ''سندھ کیا سوچ رہا ہے''، پاکستانی ادب پبلشرز، ۱۹۸۶ء
مفتی، مسعود، ''ریزے''، اقرا پبلشرز، اسلام آباد، ۱۹۷۹ء
________، ''لمحے''، نقوش پریس، لاہور، ۱۹۷۹ء
مکر جی، مدھوسری، Churchill's Secrets War، انکشافات/http:///www.dw.com/ur
ملاّ، آنند نرائن، ''قحطِ کلکتہ''، ''کلیاتِ آنند نرائن ملاّ''، مرتبہ: خلیق انجم، قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، دہلی، ۲۰۱۰ء
________، ''کلیات آنند نرائن ملا''، مرتبہ: خلیق انجم، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی، ۲۰۱۰ء
ملتانی، اسد، ''کلیات اسد ملتانی''، سرائیکی ریسرچ سینٹر، ملتان، ۲۰۰۴ء
ملسیانی، عرش، ماہ نامہ ''آج کل''، دہلی، کشمیر نمبر، اگست ۱۹۵۵ء
ملسیانی، گوہر، ''شوق شہادت زندہ ہے''، گوہر پبلشرز، صادق آباد، ۱۹۹۳ء
ملکانی، کیول رام رتن مل، ''سندھ کی کہانی''، ''کراچی کی کہانی''، جلد اول، سٹی پریس، کراچی، ۲۰۰۷ء
ملک، عبداللہ، ''پنجاب کی سیاسی تحریکیں''، نگارشات، لاہور، ۱۹۷۱ء

ملک، اے آر، British policy and Muslims in Bengal، ڈھاکا، ۱۹۶۱ء
ملک، زاہد، ''سقوط ڈھاکا''، مکتبہ سلیم، کراچی، ۱۹۷۲ء
ملک، عبداللہ، ''بنگالی مسلمانوں کی صد سالہ جہد آزادی: ۱۷۵۷ء۔۱۸۵۷ء''، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۶۷ء
ملک، فتح محمد، ''فلسطین اور اردو ادب''، ''فلسطین اردو ادب میں''، مرتبہ پروفیسر فتح محمد ملک، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور
ملک، فتح محمد، ''فیض: شاعری اور سیاست''، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۸ء
ملک، ممتاز، ''صیہونی جارحیت کیوں کامیاب رہی''، ''عرب و اسرائیل''، مرتبہ عارف دہلوی، فرینڈز پبلی کیشنز، ملتان
ملیح آبادی، جوشؔ، مشمولہ: ''حرف و حکایت''، مکتبہ اردو، لاہور، ۱۹۴۱ء
_______، کسان، https:// www. rekhta. org/ nazms/ kisan
_______، ''الناظر''، لکھنؤ، جولائی ۱۹۶۷ء
_______، ''جھٹپٹے کے تاثرات''، ''الناظر''، لکھنؤ، جلد ۳۹ شمارہ ۴، اپریل ۱۹۳۵ء
_______، ''جواں مردوں سے خطاب''، ''الناظر''، لکھنؤ، جلد ۲۷ نمبر ۶۲، دسمبر ۱۹۲۴ء
_______، ''ایسٹ انڈیا کے فرزندوں سے خطاب''، ''نغماتِ حریت''، مرتبہ: ڈاکٹر خلیق انجم و شمس الرحمٰن فاروقی، قومی کونسل برائے فروغِ اردو، نئی دہلی
_______، ''اردو شاعری پر سیاسی اثرات''، از ڈاکٹر ذاکر اللہ، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۱۱ء
_______، ''ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں سے خطاب''، ''نشید حریت''، مرتبہ: شان الحق حقی، ادارۂ مطبوعات پاکستان، فیروز سنز، کراچی، ۱۹۵۷ء
_______، ''آزادی کی نظمیں''، مرتبہ سبط حسن، حلقۂ ادب، لکھنؤ، سن ندارد
_______، ''آیات نغمات''، مکتبہ اردو، لاہور، ۱۹۴۱ء
_______، ''روح ادب''، ''کلیات جوش''، مرتبہ ڈاکٹر رفعت ملیح آبادی، فرید بک ڈپو، دہلی، ۲۰۰۷ء
_______، ''سیف و سبو''، طبع دوم، مکتبہ اردو، لاہور، ۱۹۳۳ء
_______، ''مستقبل''، ''اردو شاعری میں قومی یکجہتی کے عناصر''، از: سید مجاور حسین، اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ، ۲۰۰۴ء
منٹو، سعادت حسن، ''۱۹۱۹ء کی ایک بات''، http:// www. rekhta.org./?/
منصوری، شفیع موسیٰ، ''غزہ: پامال ہوتا شہر''، روزنامہ ''ایکسپریس'' لاہور، ۲۶ اگست ۲۰۰۷ء
منظر، ڈاکٹر شہزاد، ''سندھ کے نسلی مسائل''، فکشن ہاؤس، لاہور، ۱۹۹۴ء
منظر، منظر علی خاں، ''کرب آگہی''، ایڈورڈ پبلی کیشنز، کراچی، ۱۹۸۱ء
_______، ''یہ بات چلی مجھ سے''، افسر پبلی کیشنز، کراچی، ۱۹۹۶ء
منیب الرحمٰن، ''باز دید''، انجمن ترقی اردو ہند، علی گڑھ، ۱۹۶۵ء
_______، کتابی سلسلہ ''دنیا زاد''، کراچی، شمارہ ۵، ۲۰۰۱ء
منیر، احمد منیر، ''المیہ مشرقی پاکستان کے پانچ کردار''، انٹرویو آغا محمد علی، آتش فشاں پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۰ء
منیر، سید، ''بہ زیر شاخ گل''، اساطیر پبلشرز، لاہور، ۱۹۹۴ء
موجمدار، ایس۔ کے، ''جناح اور گاندھی''، مترجم: ثوبیہ طاہر، سارنگ پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۶ء
موزوں، راجا رام نرائن، بہ حوالہ: ''تذکرۂ شعرائے اردو''، از میر حسن، مرتبہ: محمد حبیب الرحمٰن خاں شروانی، انجمن ترقی اردو ہند، دہلی، ۱۹۴۰ء
مولانا عبدالماجد دریا آبادی، اخبار ''سچ''، ۱۵ جولائی ۱۹۲۳ء

موہانی، حسرت، ''دیوان حسرت موہانی''، رئیس المطابع، کان پور، سن ندارد
________، ''رسالہ اردوئے معلیٰ''، علی گڑھ، ۱۹۰۲ء
________، ''کلیات حسرت موہانی''، مکتبہ معین الادب، لاہور، ۱۹۷۶ء
________، ''مقدمہ''، ''کلیات حسرت''، فرید بک ڈپو، دہلی، سن ندارد
مہدی صغرا، ''اکبرالہ آبادی''، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی، ۱۹۸۳ء
مہدی، شوکت ہفت روزہ ''اخبار جہاں''، لاہور، ۶۔۱۲ مارچ ۲۰۰۶ء
مہر، آغا علی خان، لکھنوی، ''دیوان مہر''، مطبع ندارد، ۱۸۴۶ء
مہر، غلام رسول، ''جماعت مجاہدین''، جلد سوم، کتاب منزل، لاہور، سن ندارد
________، ''۱۸۵۷ء کے مجاہد''، کتاب منزل، لاہور، ۱۹۷۱ء
________، ''۱۸۵۷ء: کوائف وصحائف''، ادارۂ مطبوعاتِ پاکستان، ۱۹۵۷ء
میرٹھی، اسمٰعیل، ''حیات وکلیات اسمٰعیل میرٹھی''، مکتبہ اسلامیہ، دہلی، ۱۹۳۹ء
________، ''کلیات اسمٰعیل میرٹھی''، دی اورینٹل پبلشنگ کمپنی، میرٹھ، ۱۹۱۰ء
میر، تقی میر، ''کلیات میر''، مرتبہ عبدالباری آسی، نول کشور پریس، لکھنؤ، ۱۹۴۱ء
________، ''کلیات میر''، طبع اوّل، اردو دنیا، کراچی، ۱۹۵۰ء
________، ''ذکر میر''، انجمن ترقی اردو، اورنگ آباد، ۱۹۲۸ء
________، ''شہر آشوب''، مرتبہ: ڈاکٹر نعیم احمد، مکتبہ جامعہ، دہلی، ۱۹۶۸ء
________، ''کلیات میر''، مرتبہ ڈاکٹر عبادت بریلوی، طبع اوّل، اردو دنیا، کراچی، ۱۹۵۰ء
میلان، ولیم، بی۔ "Bangladesh and Pakistan: Flirting with Failure in South Assia" , Foundation Books, London, 2009,
مینائی، امیر، ''صنم خانۂ عشق''، مطبع مفید عام، آگرہ، ۱۸۸۸ء
مینن، وی۔ پی۔ ''ہندوستانی ریاستوں کی داستانِ الحاق''، مترجم، رئیس احمد جعفری، کتاب منزل، لاہور، ۱۹۶۰ء
مُشران فرخ آبادی، پنڈت سندر نرائن، حاجی محمد اسمٰعیل ادبی پریس، لکھنؤ، ۱۹۴۳ء
ناتھ، دھرمیندر، ''دہلی اور آزادی''، مترجم انیس مرزا، اردو اکیڈمی، دہلی، ۲۰۱۱ء
نارنگ، گوپی چند، ''ہندوستان کی تحریکِ آزادی اور اردو شاعری''، قومی کونسل برائے فروغِ اردو، نئی دہلی، ۲۰۰۳ء
________، ''امیر خسرو کا ہندی کلام مع نسخہ برلن ذخیرۂ اسپرنگر''، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۰ء
________، ''ہندوستان کی تحریک آزادی اور اردو شاعری''، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان وادب، دہلی، ۲۰۰۳ء
ناسخ، امام بخش، ''دیوانِ ناسخ''، دوم، نول کشور پریس، لکھنؤ، ۱۹۳۷ء
________، ''دیوان ناسخ'' اوّل، طبع پنجم، نول کشور، کان پور، ۱۸۸۶ء
ناشاد، ڈاکٹر ارشد محمود، ''پاکستانی اردو غزل: رجحانات اور امکانات''، ''معیار''، اسلام آباد، نمبر ۷، جنوری تا جون ۲۰۱۲ء
ناظر، خوشی محمد، ''نغمہ فردوس''، مکتبہ فانوس، لاہور، ۱۹۹۲ء
نام ندارد، ''وطن ابھی آزاد نہیں ہے''، ''کشمیر عوامی سوشلسٹ کانفرنس کا اہم فیصلہ''، مرکنٹائل پریس، سری نگر، سن ندارد

نامعلوم،''جلیانوالہ باغ''،http:// www. rekhta. org/ ebook/ jalianwala-bagh. ebooklang. org
نامعلوم،''نوائے آزادی''،مرتبہ،عبدالرزاق قریشی،ادبی پبلشرز،بمبئی،۱۹۵۷ء
نامعلوم،''نوحہ ٹیپو سلطان''،مشمولہ ''نشید حریت'' مرتبہ شان الحق حقی،فیروز سنز،کراچی،۱۹۵۷ء
ناہید،کشور،اقدار،کراچی،جلد۱،شمارہ ۳۔۴
________،''بصرہ کی مردہ ماں کے لیے بچے کی لوری''،کتابی سلسلہ ''دنیازاد''،شمارہ ۱۰
________،''مرے دل مرے مسافر''،ماہ نامہ ''ماہِ نو''،فیض نمبر،لاہور،شمارہ ۵،جلد ۲۱،جون ۲۰۰۸ء
________،''نوحہ اسلامی ملکوں کا''،کتابی سلسلہ ''دنیازاد''،شمارہ ۱۰
نجفی،قیصر،حکیم محمد سعید کی یاد میں،سہ ماہی،ارمغان،کراچی،جنوری تا مارچ ۱۹۹۹ء
نجی اللہ،''ٹیپو سلطان شہید''،ادارہ اشاعتِ چنچل گوڑھ،حیدرآباد دکن،سن ندارد
ندوی،ابوالحسن علی،''انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر''،طبع دوازدہم مجلس نشریات،اسلام آباد،۱۹۷۳ء
ندوی،ابوالہاشم،''جلیانوالہ باغ: تاریخ آزادی پاک وہند کا ایک خونیں باب''،سنگ میل پبلی کیشنز،لاہور،سن ندارد
ندوی،پروفیسر محسن عثمان،https// urdu.siasat.com ادبی ڈائری،۱۹ اگست ۲۰۱۴ء
ندوی،رشید احمد،''تہذیب وتمدن اسلامی''،حصہ دوم،ادارۂ ثقافت اسلامیہ،لاہور،۱۹۵۲ء
ندوی،سلیمان،''یادِ رفتگاں''،مکتبہ الشرق،کراچی،۱۹۵۵ء
________،''حیات شبلی''،ادارۂ معارف،اعظم گڑھ،۱۹۴۳ء
________،''حیات شبلی''،مطبع معارف،اعظم گڑھ،۱۹۷۰ء
________،''سیرۃ النبی''،جلد سوم،طبع دوم،مطبع معارف،اعظم گڑھ،۱۹۲۸ء
________،''کلیات شبلی''،از علامہ شبلی نعمانی،مرتبہ سید سلیمان ندوی،دارالمصنفین،اعظم گڑھ،۲۰۰۷ء
ندوی،شاہ معین الدین،''تاریخ اسلام''،جلد چہارم،دارالمصنفین،اعظم گڑھ،۱۹۵۳ء
ندوی،محمد الیاس،''سیرت سلطان ٹیپو''،مجلس نشریات اسلام،کراچی،۱۹۹۷ء
ندوی،مولانا ابوالحسن علی،''سیرۃ سید احمد شہید''،نامی پریس،لکھنؤ،۱۹۳۹ء
________،''اقبال اور مسئلہ فلسطین''،https://bagewafa.wordpress.com/…/iqbalaurmadlap
ندوی،مولانا حسن مثنیٰ،''قضیہ فلسطین عالم اسلام کا مسئلہ ہے''،''جریدہ''،کراچی،غیر مطبوعہ کتابیں،شمارہ ۳۴،جلد ششم
ندوی،مولانا وصی مظہر،''مہاجر قومیت کا مسئلہ''،''مہاجر قومیت''،مرتبہ،جاوید احمد صدیقی،شبل پبلی کیشنز لمیٹڈ،۱۹۸۷ء
نذرالاسلام،بہ حوالہ ''بنگال کا عظیم قومی شاعر''،از وفا راشدی،''صریر خامہ''،قومی شاعری نمبر،۱۹۶۶ء
نذر،ماجد،''محبت پیرہن میرا''،خواب پبلشرز،۱۹۹۶ء
نذیر،محمد،''شہر آشوب''،صریر،کراچی،نومبر ۱۹۹۴ء
نسیم،حمید،''پانچ جدید شاعر''،فضلی سنز لمیٹڈ،کراچی،۱۹۹۴ء
نسیم،ڈاکٹر الف۔د۔''بارھویں صدی ہجری میں دلّی کا شاعرانہ ماحول''،اردو اکیڈمی پاکستان،لاہور،۱۹۹۹ء
نسیم،وحیدہ،''پیش لفظ''،''موتی کے کنارے''،مصنفہ حبیبہ قاضی،گلستان مصطفےٰ،کراچی،۱۹۹۱ء
نشاط،یونس،''آب جو آئینہ''،دستاویزات مطبوعات،لاہور،۱۹۹۶ء

نظامی، ساغر، ''کلیاتِ ساغر نظامی''، جلد دوم، مرتبہ: ڈاکٹر مظفر حنفی، ماڈرن پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۱۹۹۸ء

نظامانی، رؤف، ''سندھ کی صورتِ حال: کیا کرنا چاہیے''، ''ارتقا''، کتابی سلسلہ نمبر ۱۱

نظامی، خلیق احمد، ''تاریخ مشائخ چشت''، ندوۃ المصنفین، دہلی، ۱۹۵۳ء

نظامی، خواجہ حسن، ''بہادر شاہ کا مقدمہ: غدر دہلی کے افسانوں کا چوتھا حصہ''، کارکن حلقہِ مشائخ بک ڈپو، دہلی، ۱۹۲۳ء

نظامی، ساغر، ''عہد''، مشمولہ: ''دہلی اور آزادی''، از دھرمیندر ناتھ، مترجم: رئیس مرزا، اردو اکادمی، دہلی، ۲۰۱۱ء

نظامی، ظفر احمد، ''مولانا آزاد کی کہانی''، مکتبہِ جامعہ، دہلی، ۲۰۱۱ء

نظامی، ناصر، ''صلیب گر''، اسٹڈی سرکل، کراچی، ۱۹۸۸ء

نظر، جمیل، ''غزل چہرہ''، جمیل نظر فاؤنڈیشن، ۱۹۸۰ء

نظر، قیوم، مشمولہ: ہفت روزہ ''زندگی''، لاہور، ۱۰ تا ۱۴ جنوری ۱۹۷۲ء

________، ''قلب و نظر کے سلسلے''، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۷ء

نظیر، سعادت، ''نذرِ عقیدت''، ''آج کل''، دہلی، جنگ آزادی نمبر، اگست ۱۹۵۷ء

نعمانی، علامہ شبلی، ''بیان خسروؔ''، الناظر پریس، لکھنؤ، سن ندارد

________، ''حیات خسروؔ''، جامعہ ملیہ برقی پریس، دہلی، سن ندارد

________، ''حیات خسروؔ''، ''امیر خسروؔ''، مرتبہ، شیخ سلیم احمد، ادراہ ادبیات دلّی، دہلی، ۱۹۷۶ء

________، ''شعر العجم'' حصہ دوم، عشرت پبلشنگ ہاؤس، لاہور، ۱۳۲۴ھ۔۱۳۲۵ھ

________، ''مقالاتِ شبلی''، جلد سوم، اعظم گڑھ، مطبع معارف، ۱۹۳۲ء

________، ''حیات شبلی''، از سید سلیمان ندوی، مطبع معارف، اعظم گڑھ، ۱۹۴۳ء

________، ''کلیات شبلی''، معارف پریس، اعظم گڑھ، سن ندارد

________، ''کلیات شبلی''، معارف پریس، اعظم گڑھ، سلسلہِ مطبوعات نمبر ۲۳

________، ''کلیات شبلی'' اردو، مرتبہ سید سلیمان ندوی، دار المصنفین، اعظم گڑھ، ۲۰۰۷ء

________، ''سرۃ النبیؐ''، جلد سوم، طبع دوم، مطبع معارف، اعظم گڑھ، ۱۹۲۸ء

________، ''سیرۃ النبیؐ''، جلد سوم، طبع اوّل، مطبع معارف، اعظم گڑھ، ۱۹۲۳ء

________، ''شعر العجم'' (جلد اوّل)، عشرت پبلشنگ ہاؤس، لاہور، ص ۱۹۶۶ء

________، ''مقالات شبلی''، جلد ۵، مطبع معارف، اعظم گڑھ، ۱۹۳۵ء

نعیم، سی۔ ایم۔ ''انتقاضہ: ان کہی کہانی''، مترجم، خورشید قائم خانی، کتابی سلسلہ ''دنیا زاد''، کراچی، شمارہ ۴

نقوی، ایم بی، ''سندھ میں قومیت کا مسئلہ''، مترجم، راحت العین، ارتقا، کراچی، مئی ۱۹۹۳

________، ''سندھ میں قومیت کا مسئلہ''، مترجم راحت العین، ''ارتقا''، کراچی، مئی ۱۹۹۳ء

نقوی، ڈاکٹر سید طلعت حسین، ''نظیر اکبر آبادی کی نظم نگاری''، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۱۹۹۲ء

نقوی، ذکی، http://www.laaffain.com jalianwala-bagh جولائی ۱۹۱۴ء

نقوی، شاہد، ''تعاقب''، ماہ نامہ ''طلوع افکار''، کراچی، مارچ، ۱۹۹۳ء

نقوی، صادق، ''تاریخ حیدر آباد''، سب رس، حیدر آباد دکن، ستمبر۔ اکتوبر ۱۹۸۳

نگم، ڈپٹی لال صاحب بی۔اے۔''سوانح عمری حیدر علی''، کرزن اسٹیم پریس، دہلی، سن ندارد
نگم، نرائن، ''رفتار زمانہ''، ''تحریک آزادی کے چالیس سال''، حصہ اول، خدا بخش اورنٹیل پبلک لائبریری، پٹنہ،۱۹۹۴ء
نوازش، محمد خاور، ''مشاہیر ادب خارزار سیاست میں''، مقتدرہ قومی زبان پاکستان، اسلام آباد،۲۰۱۲ء
نوری، کرار، ''میدان حق''، ''دبستانوں کا دبستان''، جلد اول، محمد حسین اکیڈمی،۲۰۰۳ء
نوری، نوشاد، مشمولہ: ''افکار''، کراچی، مئی ۱۹۷۸ء
نونہروی، سید شبیہ الحسن، ''مضامین اکبر'' علی گڑھ میگزین، اکبر نمبر، جلد ۳۴، علی گڑھ،۱۹۵۰ء
نیازی، اجمل، ''فوق الکشمیر''، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور،۱۹۹۰ء
نیازی، قمر، "The makers of A. Bomb"، مشمولہ: ''زمین کا نوحہ''، مرتبہ ضمیر نیازی، شہزاد پبلی کیشنز، کراچی
نیازی، منیر، ''جاگ رہا ہے پاکستان''، مرتبہ، اویس صدیقی، اردو اکیڈمی سندھ، کراچی،۱۹۶۶ء
نیاز، محمد، روزنامہ ''جسارت''، کراچی، ۲۱ نومبر ۱۹۷۲ء
نیپئر، سر چارلس، بہ حوالہ محمودہ رضویہ، ''ملکہ مشترق''، عباس لیتھو آرٹ پریس، کراچی، س ن
نیرنگ، میر غلام، ''نوائے آزادی'' مرتبہ، عبد الرزاق قریشی، ادبی پبلشرز، بمبئی،۱۹۵۷ء
نیر، نور الحسن، ''نور اللغات''، نیر پریس، لکھنؤ، ۱۳۴۷ھ
نیّر، ڈاکٹر حکیم چند، ''مقدمہ''، ''نوائے سرور''، مرتبہ، ڈاکٹر حکیم چند نیّر، روزنامہ ''ہندوستان''، بنارس،۱۹۶۷ء
وفا، پنڈت میلا رام، اے فرنگی، rekhta. org/ shayari. org
واٹسن، فرانسس، ''اے کنسائز ہسٹری آف ماڈرن انڈیا''، تھامس اینڈ ہڈسن، لندن،۱۹۷۴
وارثی، عبد الغنی، ''دیباچہ''، ''ریاض امجد''، عماد پریس، حیدر آباد دکن،۱۳۴۲ھ
وارثی، مظفر، کراچی، روشن خیال، کراچی، جلد ۱، شمارہ ۲
واسطی، نیّر، روزنامہ ''نوائے وقت''، لاہور، ۷ جون ۱۹۶۷ء
واصف، واصف علی، ''شب چراغ''، کاشف پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۷ء
وائلڈ، انتونی، "The East India Company: Trade and Conquest from 1600", Lyons Press, 2000
وجدی، سید عابد علی، ''بھوپال: تحریک آزادی کے آئینے میں''، بھوپال بک ہاؤس، بھوپال،۱۹۸۶ء
وجہی، ملاّ ''سب رس''، طبع اوّل، انجمن ترقی اردو، کراچی،۱۹۵۲ء
وحشت کلکتوی، رضا علی، ''خروش یاد''، ''الہلال''، جلد ۲، شمارہ ۱۸
وحید الزماں، ڈاکٹر، "A Short History of Pakistan"، جلد چہارم، شاہ غلام علی پبلشرز، کراچی، ۱۹۶۷ء
ورما، اشوک کلیان، " Bridge on the River Meghna the Dash of Dhaka; Bangladesh Libration war 1971, KW publisher pvt ltd, New Dehli, 2009
وقار الملک، نواب، ''دیباچہ''، ''خیالات عزیز''، مرتبہ منشی دیا نرائن نگم، انجمن ترقی اردو، کراچی،۱۹۶۱ء
ولی اللہ، شاہ، ''شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات''، مرتبہ: خلیق احمد نظامی، ندوۃ المصنفین، دہلی،۱۹۶۹ء
ولیم کئی، سر جان، "History of the Sepoy War in India"، جلد دوم، لانگ مینز، لندن،۱۸۷۴ء
ولیم کیتھ، جان، "A History of the Great Revolt"، گین پبلشنگ ہاؤس، دہلی،۱۹۸۸ء

ولیم،ایل۔رشبروک،"The East Pakistan Tragedy", Tom Stacey, London, 1972

ویچ،ڈبلیواین،''ہسٹری آف دی ورلڈ''،ادھم پریس لمیٹڈ،لندن،۱۹۶۱

ہاتف،مرزا،''بیاض مراثی''،مرتبہ افسر صدیقی،امروہوی،طبع اوّل،انجمن ترقی اردو،۱۹۷۵ء،کراچی،

ہارون الرشید،پروفیسر،''دوہجرتوں کے اہل قلم''،میڈیا گرافکس،کراچی،۲۰۱۲ء

ہاس،آمرہ،''نا کہ بندی کے چند مناظر''،مترجم،رفاقت حیات،کتابی سلسلہ''دنیازاد''،کراچی،شمارہ ۴

ہاشمی،انوار،''تاریخ پاک وہند''،ادارہ ثقافتِ پاکستان،کراچی،۱۹۷۴

______،''تاریخ پاک وہند''،ادارۂ ثقافت اسلامیہ،کراچی،۱۹۷۴ء

ہاشمی،ایم۔کے۔حسیب،''سقوط ڈھاکا کا المناک سانحہ''،روزنامہ''جنگ''،کراچی،۱۵دسمبر۱۹۸۹ء

ہاشمی،رفیع الدین،ڈاکٹر،''اقبال کی طویل نظمیں''،سنگ میل پبلی کیشنز،لاہور،۲۰۰۴ء

______،''اقبال کی طویل نظمیں''،سنگ میل پبلی کیشنز،لاہور،۲۰۰۴ء

ہاشمی،سید شاہد،''گہر کا آتش فشاں: تہ درتہ حقائق''،نیو وژن پبلی کیشنز،۲۰۱۲ء

ہاشمی،ضیاعباس،''ضیائے سخن''،طبع اوّل،ابن حسن پرنٹنگ پریس،کراچی،۱۹۷۷ء

ہاشمی،عاطر، روزنامہ''نوائے وقت''،لاہور،۸جون ۱۹۶۷ء

ہاشمی،عدیم،روزنامہ''مساوات''،لاہور،۲۰دسمبر ۱۹۷۱ء

ہاشمی،قمر،ماہ نامہ''افکار''،کراچی،اگست،۱۹۹۰ء

______،''طلوع افکار''،اپریل ۱۹۹۳ء

ہاشمی،محمود،''کشمیر اداس ہے''،قومی کتب خانہ،راول پنڈی،۱۹۵۰ء

ہاشمی،نصیرالدین،''امجد حیدرآبادی''،''نقوش''،لاہور،شخصیات نمبراوّل،جنوری ۱۹۵۶ء

______،''امجد حیدرآبادی''،''یادگار امجد''،مرتبہ محمد اکبرالدین صدیقی،مطبع ابراہیمیہ،حیدرآباد دکن،۱۹۶۴ء

______،''دکن میں اردو،نظام دکن پریس،حیدرآباد دکن،۱۹۳۹

______،''فتح نامہ ٹیپو سلطان''،سہ ماہی''اردو''،کراچی،جولائی ۱۹۶۶ء

______،''قدیم اردو کی رزمیہ مثنویاں''،''نقوش''،لاہور،دسمبر،۱۹۵۰

______،''مقدمہ''،''مکتوبات امجد''،مرتبہ نصیرالدین ہاشمی،شمس المطابع،حیدرآباد دکن،۱۳۴۵ھ

ہاشمی،نورالحسن،''لکھنؤ اور جنگ آزادی''،ادبی اکیڈمی،لکھنؤ،۱۹۵۷ء

ہجرا،ملک محمد غلام امام خان ترین،''تاریخ رشید الدین خانی''،خورشید پریس،حیدرآباد دکن،۱۲۸۲ھ

ہرگانوی،مناظر عاشق،''عبدالحلیم شرر بحیثیت شاعر''،ماڈرن پبلشنگ ہاؤس،دہلی،۱۹۹۰ء

ہروی،خواجہ نعمت اللہ،''تاریخ خان جہانی ومخزن افغانی''،مترجم،ڈاکٹر محمد بشیر حسین،مرکزی اردو بورڈ،لاہور،۱۹۷۸ء

ہری داس،مجمدار،Shadow of Famine،۱۹۴۴ء

ہزبنڈ،ینگ،"Kashmir"،ویری ناگ پبلشرز،میرپور کشمیر،سن ندارد

ہفت روزہ''پاک جمہوریت''،لاہور،قرطاس ابیض خاص نمبر

ہفت روزہ''لیل ونہار''،کراچی،۱۶فروری ۱۹۵۸ء

ہفت روزہ ’’ندائے سندھ‘‘، بہ حوالہ: ’’جی ایم سید کی سوچ: عزائم اور سیاست‘‘، از آزاد بن حیدر، دید شنید پبلی کیشنز، لاہور، سن ندارد
ہلال پاکستان، سندھی روزنامہ، ۱۶ اکتوبر ۱۹۴۷ء
________، ۲۱ اگست ۱۹۰۷ء
________، ۱۹۶۹ء
ہمدانی، احمد، ’سیپ‘، کراچی، شمارہ ۵۹
ہمدانی، سید نثار حسین، ’’چنار چاندنی اور چنبیلی‘‘، کشمیر سوسائٹی آف سائنٹفک اینڈ سوشل ریسرچ، مظفر آباد، ۱۹۹۳ء
ہوت چند، ناوَں مل، ’یادداشتیں‘، مترجم اجمل کمال، ’’کراچی کی کہانی‘‘، جلد اوّل، سٹی پریس، کراچی، ۲۰۰۷ء
ہوشیار پوری، اختر، ماہ نامہ ’’افکار‘‘، کراچی، مارچ ۱۹۷۲ء
ہوشیار پوری، حفیظ، ’’جدید شعرائے اردو‘‘، مرتبہ ڈاکٹر عبدالوحید، فیروز سنز، کراچی، س ن
یعقوب، قاسم، ’’اردو شاعری پر جنگوں کے اثرات‘‘، مثال پبلشرز، فیصل آباد، ۲۰۱۱ء
یقین، انعام اللہ، ’’دیوان یقین‘‘، مرتبہ مرزا فرحت اللہ بیگ، طبع اوّل، مطبع مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، ۱۹۳۰ء
یلدرم، سجاد حیدر، ’’محاربہ؟ بلقان‘‘، ’’علی برادران‘‘، مرتبہ سید رئیس احمد جعفری، محمد علی اکیڈمی، لاہور، ۱۹۶۳ء
یوسفی، اشرف، ’’بیل اس دریچے کے‘‘، مثال پبلشرز، فیصل آباد، ۲۰۰۷ء
یوسف، اقبال، ’’کراچی پیپرز‘‘، سائبان پبلشرز، کراچی، ۱۹۹۵ء
یٰسین، مزمل، ’’دیباچہ‘‘، ’’سلطنت عثمانیہ کی انقلابی تحریکیں‘‘، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی، ۱۹۷۳ء
عابدی، حسن، ’’سندھ: اب کیا کیا جائے؟‘‘، ’’ارتقا‘‘ کتابی سلسلہ نمبر ۱۱
’’اردو دائرۂ معارف اسلامیہ‘‘، جلد ۱۶، پنجاب یونی ورسٹی، لاہور، ۱۹۷۸ء
’’اقبال اور مسئلہ فلسطین‘‘، ’’اقبال ریویو‘‘، کراچی، جولائی ۱۹۶۹ء
’’اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی‘‘، صدر یحییٰ کا ٹیلی وژن انٹرویو، ’’ماہِ نو‘‘، کراچی، ستمبر ۱۹۷۱ء
’’شورٹ ہسٹری آف انڈیا۔ پاکستان‘‘، پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی، کراچی، ۱۹۶۳ء
’’ضبط شدہ نظمیں‘‘، مرتبین: خلیق انجم و مجتبیٰ حسین، مجلسِ جشنِ علی جواد زیدی، دہلی، ۱۹۷۵ء
’’علامہ اقبال اور ٹیپو‘‘، http:// urdu. siasat. com. /news/ 812180
’’مسلم ہیرالڈ‘‘، بابت ۱۵ اور ۲۳ دسمبر ۱۸۸۷ء
’’نقشِ آزاد‘‘، بہ حوالہ: ہفتہ وار ’’خلافت‘‘، گجراتی، بمبئی، یکم جون ۱۹۲۳ء

A.R.Mallick, "British Policy and Muslims in Bengal", Dacca, 1961

Dutt, Kali-kankar, "Ali Wardi Khan and His times", Calcutta, 1939

Hunter, William (Sir), "The Indian Musalmans", The premier book house, Lahore, 1974

Karim, Abdul, "Social History of Muslims in Bengal", Dacca, 1995

Noah, Webster, "Webster's New Twentieth Century Dictionary of the English Language", Second Edition, Colon World, America, 1978.

فائل نمبر ۱۲ PNA

PNAفائل نمبر۱۶

Rupert, Fruencalus, "Massacre At Amritsar", London. 1946,

Sirkar, Jadunath, "History of Bengal", Dacca, 1948, vol. 11

TBMMZC(ترکی کی قومی اسمبلی)GCZجلدسوم، ریکارڈ،

TBMMZC۱داخلی، جلددوم،

The Guardian"۶ جون۱۹۷۲ء،

The Indian Annual Register", 1923; vol: 11, suppl.

The Timesفروری۱۸۸۶ء،

The Times"جنوری۱۹۷۱ء،

The report of the Hamoodur Rehman Comission of Inquiry into the 1971 war (as declassified by the government of Pakistan),Vanguard Lahore, nd, p.536

http/len.m.wilkipedia.org.wiki

http:// www. bbc. com/ urdu/ regional/ 2015/ 09india- pakistan- 1965- war-sh

http:// www. distancefrom. com/pk/distance-from- multan-to-Depalpur- Pakistan/ DistanceHistory/ 18050239. aspx

http:// www.distancefrom.com/ distance- from- ravi-river- to- Okara/ Distance History/ 10616933. aspx

http://en.wikipedia.org,wiki Great B.

http://en.wikipedia.org/wiki/death_of_Bushra_Zaidi

http://www.ushmm.org/wlc/ur/article.php

http:\\www.thefamouspeople.com/profiles/sheikh-mujibbur-rahman-6878.php

https:// www. encyclopedia. ushmm. org/ org/ content/ ur/ article/ world_ war_ii_in_europe

https://www.bbc.com/urdu/world/2014

https://www.encyclopedia.ushmm. org/ content/ ur/ article/ world_war_ii_ in_ europe

https://www.encyclopedia.ushmm. org/ content/ ur/ article/ world_war_ii_ in_ europe

https://www.mashriqtr.pk.nov15 2017

https:\\en.wikipedia.org/wiki/partition_of_Bangal_1905

https:urdu.geo.tv

ushmm.org/content/ur/article/world_war_ii _in_europe